2ND EDITION

ہماری ویب ڈیجیٹل بک

ایم ابراہیم خان

M.IBRAHIM KHAN

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "M.Ibrahim Khan"
at Hamariweb.com

ڈھول کی تھاپ پر احتجاج اور گھاس خوری

ہم بھی کیا غضب ناک حدتک "جشن پسند" قوم واقع ہوئے ہیں۔ لوگ ہمیں خوشی کے لمحات میں جامے سے باہر ہوتا دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، اگر وہ "غمی" کی حالت میں ہمارے مسرت آمیز جذبات کا بے قابو ہو جانا دیکھیں تو حیرانی کی منزل سے آگے بڑھ کر پریشانی کو بھی گلے لگالیں!

زندہ دلان فیصلہ آباد کی مہربانی سے ایک نیا تماشا دیکھنے کو ملا ہے۔ گیس کی بندش کو دو ماہ گزر جانے پر بھی جب باقاعدگی سے بل موصول ہوئے تو مکینوں نے ڈھول کی تھاپ پر احتجاج کیا اور بیچ سڑک پر آکر دھمال ڈالتے ہوئے سارے بل جلا ڈالے! مگر صاحب، صرف یہ بل جلانے سے کیا ہوگا؟ ہمیں وہ سارے بل جلا ڈالنے ہیں جن سے نکل کر نااہلی کے سانپ ہمیں ڈستے رہتے ہیں! رزق دینے والی ذات اللہ کی ہے، مگر وسیلہ ہم بن جاتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں احتجاج کے لئے سڑکوں پر آنے والے بھی ڈھول والوں کے لئے دو وقت کی روٹی کا اہتمام کرتے ہیں!

جیکب آباد سے یہ اطلاع ملی ہے کئی ماہ سے تنخواہیں نہ ملنے پر اساتذہ نے

گھاس کھا کر احتجاج کیا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اساتذہ کو مزید گھاس کھانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اب اِس ملک میں "ٹیچری" کرنا گھاس کھانے ہی کے مترادف ہے! کہاں ڈھول کی تھاپ اور کہاں گھاس! ساحر لدھیانوی نے کہا تھا

بربادیوں کا سوگ منانا فضول تھا.

بربادیوں کا جشن مناتا چلا گیا.

لگتا ہے یاروں نے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں نام لکھوانے کا عہد کر رکھا ہے! چند ماہ کی تنخواہیں نہ ملنے پر اساتذہ نے اپنے معاملے کو ایٹمی پروگرام سے جوڑ دیا! آپ سوچ رہے ہوں گے ایٹمی پروگرام کہاں سے بیچ میں آگیا؟ جناب، شاید آپ کو یاد نہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو نے 1974 میں بھارت کی طرف سے ایٹمی دھماکے کے بعد کہا تھا کہ گھاس کھانی پڑی تو کھائیں گے، مگر ایٹم بم ضرور بنائیں گے! ایٹم بم ہم بنا چکے ہیں، اب اگر گھاس کھانی پڑ رہی ہے تو غم کیسا! ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ جس ملک میں آبادی کے بڑے حصے کو پینے کا صاف پانی، توانائی اور صحت و تعلیم کی بنیادی سہولتیں میسر نہ ہوں اُس کے پاس ایٹمی ڈیٹیرنٹ کا ہونا اچھی بات سہی مگر کبھی کبھی لگتا ہے ہم نے کوئی تیر نہیں مارا بلکہ صرف گھاس کھودی ہے! یہ بھی بھٹو صاحب کی اعلیٰ ظرفی تھی

کہ ایک بڑے پروگرام کے عوض گھاس چروانے کا عندیہ دیا ورنہ بعد کے حکمران تو
!ہمیں، کسی جواز کے بغیر، بس "ایویں ای" گھاس کھانے پر مجبور کرتے رہے ہیں
کے عشرے میں بننے والی فلم "آوارہ" کا ایک سین لاجواب تھا۔ اس فلم میں 1950
راج کپور نے جیب کترے کا کردار ادا کیا تھا۔ سین یہ ہے کہ جج صاحب یعنی پرتھوی راج
کپور سنار کی دکان سے ایک ڈبہ تھامے ہوئے باہر آتے ہیں۔ نرگس کو سالگرہ کے موقع
پر دینے کے لئے انہوں نے ہار خریدا ہے جو ڈبے میں ہے۔ راج کپور جیب کترا ہے۔ وہ
یہ بات نہیں جانتا کہ جج صاحب اس کے والد ہیں۔ راج کپور ان سے ٹکراتا ہے اور ڈبے
سے ہار لے اڑتا ہے۔ جج صاحب اس بات سے بے خبر ہیں کہ ڈبے سے ہار غائب ہوچکا
ہے۔ وہ نرگس کے گھر پہنچتے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد راج کپور بھی وہاں پہنچتا ہے اور
نرگس کو جیب سے نکال کر، "بغیر ڈبے کا" ہار پیش کرتا ہے۔ اگلے ہی لمحے جج صاحب
بھی نرگس کو سالگرہ کے تحفہ یعنی ہار کا ڈبہ پیش کرتے ہیں۔ نرگس ڈبہ کھولتی ہے تو حیران
رہ جاتی ہے، ظاہر ہے ہار اس میں نہیں تھا۔ وہ کہتی ہے۔۔ آج کا دن بھی عجیب ہے۔
!کسی نے ہار دیا ہے تو ڈبہ نہیں تھا۔ اور اب کسی نے ڈبہ دیا ہے تو اس میں ہار نہیں

پاکستان کا فسانہ بھی "آوارہ" کی کہانی سے خاصی مماثلت رکھتا ہے۔ جو لوگ باقاعدگی سے بجلی کا بل ادا کرتے ہیں انہیں بجلی میسر نہیں ہوتی۔ اور جنہیں باقاعدگی سے بجلی نصیب ہو جائے ان کے لئے بلنگ کا اہتمام نہیں کیا جاتا! ہو سکتا ہے بجلی کی فراہمی پر مامور ادارہ ہمیں "شاک پروف" رکھنا چاہتا ہو! مگر اُسے کیا معلوم کہ جو کرنٹ تاروں میں نہیں وہ بجلی کے بل میں پایا جاتا ہے! پانی کی فراہمی پر مامور ادارہ بھی کچھ ایسا ہی کھیل کھیلتا ہے۔ پانی ویسے تو آتا نہیں۔ جب بے پانی کا بل آتا ہے تب آنکھوں میں پانی ضرور آ جاتا ہے! اور اگر پانی نہ آنے کی شکایت درج کرانے جایئے تو لگتا ہے متعلقہ اہلکاروں کی آنکھوں کا پانی بھی مر چکا ہے!

کسی زمانے میں "بھائی بھلکّڑ" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی تھی۔ ان کا حال یہ تھا کہ جوتا پہنتے تو موزے پہننا بھول جاتے تھے اور موزے پہن لیتے تو جوتے پہننا یاد نہیں رہتا تھا! ہم پاکستانی بھی خاصے بھلکّڑ اور سادہ ہیں۔ بقول میر تقی میر

اُسی عطّار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں!

جن لوگوں کو بار بار آزما چکے ہیں پھر اُنہی کو آزمانے کا ارادہ ہے! اب تک کتنی ہی حکومتوں نے ہمیں لوٹا ہے مگر ہم ایسے بھلکّڑ ہیں کہ ساری کوتاہیاں

بھول جاتے ہیں، معاف کردیتے ہیں! جب تک ہم اہل اقتدار کی حرام خوری برداشت کرتے رہیں گے، گھاس خوری ہی ہمارا مقدر رہے گی!

ہمدم دیرینہ، مدیر تکبیر یعقوب غزنوی سے کسی زمانے میں اِخلاص کا تعلق تھا، اب صرف "اِصرار" کا رشتہ رہ گیا ہے۔ ملتے ہیں تو سلام دعا کے بعد پہلی فرصت میں (غزنوی ہونے نسبت سے!) اٹھارہواں حملہ کرتے ہوئے استفسار آمیز اصرار کرتے ہیں کالم کب دے رہے ہو! یہ جملہ وہ کچھ اِس انداز سے ادا کرتے ہیں جیسے مُرغی سے پوچھ رہے ہوں کہ انڈا کب دوگی! برادرم یعقوب غزنوی جب کالم کا تقاضا کرتے ہیں تو اُن کا چہرہ ایک خاص کیفیت سے دوچار دکھائی دیتا ہے۔ ایک دن ہم نے اُنہیں ایسی حالت میں دیکھ کر کہا کہ کالم دو ایک دن میں مل جائے گا تو وہ بولے ایسی کوئی نہیں۔ ہم نے پوچھا پھر کیا بات ہے، آپ کا چہرہ خاصا "مقبوضہ" کیوں دکھائی دے رہا ہے! اُنہوں نے پریشانی بیان کی "آج کل گیس کا پرابلم چل رہا ہے۔" ہم نے ایک مشہور زمانہ چورن تجویز کیا تو کہنے لگے "نہیں بھئی، ہم تو قدرتی گیس کی بات کر رہے ہیں۔ ہم نے عرض کیا۔۔ بھائی صاحب، معدے کے کنوئیں میں پیدا ہونے والی گیس بھی قدرتی ہی ہوتی ہے! فرق صرف اتنا ہے کہ اِس کی پیداوار و اخراج کے لئے کسی ٹھیکیدار اور مشینری کی ضرورت نہیں پڑتی! یعقوب غزنوی صاحب نے جب گیس کے بحران کی وضاحت کی تب اندازہ ہوا کہ وہ اُس گیس کی بات کر رہے ہیں جو پیدا تو قدرتی طور پر ہی

ہوتی ہے مگر ہم تک پہنچتے پہنچتے خاصی "آرٹیفیشل" یعنی مہنگی اور نخریلی ہو جاتی ہے !
معلوم یہ ہوا کہ اُن کے ہاں گیس نہیں آ رہی۔ پھر جب اُنہوں نے بتایا کہ اُن کا فلیٹ
چوتھے فلور پر ہے تب معاملہ ہماری سمجھ میں آگیا۔ چوتھے فلور تک تو رشتہ دار بھی نہیں
آتے، گیس کہاں سے آئے گی ! پھر ہم نے مبارک باد دی کہ گیس آپ سے دور ہو گئی
تو کیا ہوا، چوتھی منزل پر سکونت اختیار کرنے کی بدولت آپ گیس پیدا کرنے والی
ذات سے تو قریب ہوگئے ہیں ! اتنا سُننا تھا کہ وہ عالم کیف و مستی میں کہیں کھو گئے !
ہم سمجھ گئے کہ پہلی بار کوئی ملا ہے جو اُن کے ٹاپ فلور کو سمجھنے میں کامیاب ہوا ہے !
کاش اِسی طرح ہم کسی دن ارباب و بست وکشاد کا ٹاپ فلور سمجھنے میں بھی کامیاب ہو
جائیں ! اُس دن ڈھول تاشوں کا حق ہوگا کہ اُن کی تھاپ پر احتجاج کیا جائے !

انقلاب سے انقلاب تک

عوام کا احتجاج بھی متعدی مرض کی طرح ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی لوگ سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور احتجاج کے نام پر دل کی بھڑاس نکالنے لگتے ہیں۔ تالاب کے کنارے سب کھڑے ہوتے ہیں مگر اِس انتظار میں رہتے ہیں کہ پہلا پتھر کوئی اور پھینکے! تیونس میں عوامی انقلاب آیا تو مصر کے لوگ بھی بیدار ہوگئے اور اچانک یاد آگیا کہ احتجاج تو اُنہیں بھی کرنا ہے! اور پھر احتجاجی چمن میں کچھ اس انداز سے بہار آئی کہ آس پاس کے بہت سے مہر و ماہ بھی تماشائی ہو رہے۔ لبنان، اردن، یمن اور شام کے عوام بھی اب انگڑائی لیکر بیدار ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔

مشرق کا وسطی حصہ نام نہاد اعتدال کو خیرباد کہتے ہوئے اب انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ مصر کے حالات نے کمال کر دکھایا ہے۔ جسے دیکھیے وہ مصری ہوا جاتا ہے! کپڑوں، جوتوں، پردوں اور دوسری بہت سی چیزوں کی طرح رجحانات کا بھی فیشن اور موسم ہوتا ہے! امریکہ اور اس کے مغربی اتحادی مسلم دنیا کے مرکز میں جو کھیل طویل مدت سے کھیلتے آ رہے ہیں وہ اب ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ مصر کے عوام نے اب شاید کسی بھی فرعون کو کسی بھی شکل میں برداشت نہ کرنے

کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اللہ کرے کہ ہمارا یہ اندازہ درست نکلے اور بھلائی کی طرف جانے والی راہ کچھ تو ہموار ہو۔

تیونس، مصر اور مشرقِ وسطیٰ کے دیگر ممالک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے اثرات ہزاروں میل دور پاکستان میں بھی اِس قدر مرتب ہوئے ہیں کہ اوروں کے ساتھ ساتھ مرزا تفصیل بیگ بھی احتجاجی رنگ میں رنگ گئے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ مزید مرزا ہوگئے ہیں! کبھی کبھی وہ خیالوں کی وادی میں اِس قدر مٹر گشت کرتے ہیں کہ انہیں اِس عالم میں دیکھنے والے اپنی قسمت پر رشک کرتے ہیں کہ اُنہیں بغیر ٹکٹ دیکھنا نصیب ہوگیا! مرزا جب خیالات میں گم ہوتے ہیں تو ان کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے اور خلائی امور کے بعض ماہرین کے اِس اعتقاد پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے کہ کائنات میں کہیں اور بھی زندگی یعنی جاندار مخلوق موجود ہے! خیالات میں گم ہو کر مرزا کسی اور دنیا کی مخلوق دکھائی دیتے ہیں!

ہر انسان اپنے مزاج میں چند ایک چیزیں ڈیفالٹ میں لیکر پیدا ہوتا ہے، یعنی وہ چیزیں بلٹ اِن' ہوتی ہیں۔ مرزا کو اختلاف کرنے کا وصف پیدائشی طور پر ملا ہے۔ اُنہیں تو' اپنی پیدائش پر بھی اختلاف ہے! آج تک سَن کا تعین نہیں کرسکے۔ فرماتے ہیں کہ گزرے ہوئے ہر دور میں حالات اس قدر خراب رہے ہیں کہ

اپنے صحیح سلامت پیدا ہونے کا یقین اب تک نہیں آتا! مگر خیر، دل خراش حقیقت یہ ہے کہ مرزا نہ صرف یہ کہ پیدا ہوئے بلکہ اب تک ہمارے حصے میں لکھے ہوئے ہیں!

مرزا کا نیا نظریہ یہ ہے کہ دنیا بدلنے والی ہے۔ ہمارے سامنے وہ اس نوعیت کی باتیں کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ واضح رہے کہ مرزا کوئی بھی نیا نظریہ اُسی وقت پیش کرتے ہیں جب اُس کا عملی پہلو مکمل شکل میں دنیا کے سامنے آ چکا ہوتا ہے، تاکہ تردید کی گنجائش نہ رہے! ٹی وی پر سیاسی مُرغوں کی یومیہ لڑائی یعنی ٹاک شوز دیکھتے رہنے کے باعث اب وہ "نظریات" بھی خاصی تیزی سے پیش کرنے لگے ہیں! جب بھی ملتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے ذہن (!) کی مارکیٹ میں نیا مال آیا ہوا ہے! ذہن کی مارکیٹ کا نیا مال وہ سب سے پہلے ہم پر ٹرائی کرلیتے ہیں! اُن کا ایک بنیادی شکوہ یہ ہے کہ ہم ایسی باتوں یعنی نئے سیاسی نظریات کے بیان کرنے پر اُن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اُن کی "ویسی" باتوں کو بھی مضحکہ خیز ہی سمجھتے ہیں! مرزا واقعی عوام میں سے ہیں یعنی سادہ لوح ہیں، ذرا سے احتجاج اور باسی کڑھی میں اُبال کو انقلاب قرار دیکر خوش ہولیتے ہیں! غریب آدمی کی "خوشیاں" چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں جو اُس سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ "انقلاب" کا تصور بھی ایک ایسی ہی خوشی ہے۔ پولیس سے جھڑپوں، دس بیس گاڑیاں جلانے اور سو پچاس دکانیں لوٹ

لینے کو بھی لوگ انقلاب سمجھ کر دل بہلا لیا کرتے ہیں ! اب تک پسماندہ دنیا میں یہی ہوتا رہا ہے۔ قومی دولت لوٹنے والوں کو اقتدار سے محروم کرنے کی کوشش کرنے والے مزید قومی دولت کو آگ لگا کر، تلف کرکے اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں اور اِس عمل کو انقلاب سمجھ کر خوش ہو لیتے ہیں !

شمالی افریقہ اور عرب دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی پشت پر عوام کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت سازش بھی دکھائی دے رہی ہے یا محسوس ہو رہی ہے۔ امریکہ کو شاید تازہ دم مہروں کی تلاش ہے۔ اگر عوام جاگ اٹھے اور اپنے مؤقف پر ڈٹے بھی رہے تو ہو سکتا ہے کہ امریکہ کو طاقتور مہرے بٹھانے کا موقع نہ ملے یا شاید وہ مہرے سامنے لانے سے کچھ مدت کے لئے گریز پر مجبور ہو جائے ! مرزا تفصیل بیگ کا استدلال ہے کہ اب مسلم دنیا جاگ اٹھی ہے۔ اُن کے منہ میں گھی شکر، مگر کیا کیجیے کہ محض کہنے سے کوئی بات ہو نہیں جاتی۔ یہ تو اللہ کا معاملہ ہے کہ وہ "کُن" کہے تو "فیکُون" یعنی ہو جاتا ہے۔ ہمارے "کُن" اور "فیکُون" کے درمیان عمل کی دنیا حائل ہے، بیچ میں جہدِ مسلسل کی شرط کا" میدان بھی پڑتا ہے ! کہے کو کئے ہوئے میں تبدیل کرنے کے لئے ایک آگ کا دریا عبور کرنا پڑتا ہے۔۔ اور وہ بھی ڈوب کر ! صرف زبان کی نوک یعنی دل کے اوپری حصے پر "آوے ای آوے" کا نعرہ ہو تو وہی گھسے پٹے چہرے پھر اقتدار کے فریم

میں بُجتر جاتے ہیں ! اور ہم چہروں کی تبدیلی سے بھی بہل جاتے ہیں۔ سیاست اور اقتدار کی منڈی بھی عام بازاروں ہی طرح ہوتی ہے، جیسا گاہک مل جائے ویسے دام بتاؤ اور اُس کے گلے پر ڈیل کی چُھری پھیر دو! ہمارے ہاں ڈیل کی باتیں تجارت سے زیادہ سیاست میں کی جاتی رہی ہیں، بلکہ پوری سیاست ہی پبلک ڈیلنگ میں تبدیل ہو گئی ہے یعنی عوام کا یکٹ مُشت، بیک جنبش قلم سودا کر دیا جاتا ہے! اقتدار کے ایوان میں جو آتا ہے وہ ڈیل کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اِس حقیقت کے منظر عام پر آ جانے کی صورت میں شرمندہ بھی نہیں ہوتا۔۔ بلکہ کبھی کبھی تو فخریہ بتاتا ہے کہ اُس کا اقتدار ڈیل کے بطن سے پیدا ہوا ہے!

جب ماحول میں اِس قدر ڈھٹائی پائی جاتی ہو تو کیسی جمہوریت، کہاں کی جمہوریت ؟ ایسے میں تو بہت کچھ داؤ پر لگنے کی صورت ہی میں کسی بہتری کی توقع کی جا سکتی ہے۔ مصر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مسلم دنیا کے لئے ٹیسٹ کیس ہے۔ ایک آمر تیس سال کے بعد بھی جانے کے لئے تیار نہیں اور زبان پر یہ دعویٰ ہے کہ وہ تو اقتدار کا بھوکا کبھی رہا ہی نہیں، بس مجبوری کا سودا تھا جو نبھانا پڑا!

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خُدا!

واقعی سادگی کی انتہا ہے، اب تو ہاتھ میں تلوار بھی نہیں رہی ! پھر بھی اقتدار کے میدان سے نکل بھاگنے کو جی نہیں چاہ رہا ! بس ایک موہوم سی امید ہے کہ شاید بگڑی بات پھر بن جائے ! لوگوں کو کہنا پڑ رہا ہے۔۔ کچھ شرم، یا شیخ ! مگر شیخ صاحب ہیں کہ شرم الشیخ میں چلمن سے لگے بیٹھے ہیں، صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے یعنی ملک سے جاتے بھی نہیں ! ہر آمر کا ایسا ہی پردہ ہوتا ہے، یعنی چلمن سے لگا بیٹھا رہتا ہے !

مشرق وسطٰی کے تمام آمر اُسی ٹائپ کا پردہ پسند کرتے ہیں جو حسنی مبارک کو پسند ہے۔ بیشتر کے پاؤں قبر میں لٹکے ہوئے ہیں مگر پھر بھی پسپا یا دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ شاید وہ اپنی تدفین بھی اقتدار کے ایوان ہی میں چاہتے ہیں تاکہ جسم کو حکومتی مٹی ملے اور روح کو اختیاری سکون ملتا رہے !

مرزا کا کہنا ہے کہ جو کچھ مصر میں ہوا وہ اب اور بہت سے ممالک میں بھی ہونے والا ہے۔ ہم اُن کی بات سے مکمل طور پر متفق نہیں۔ ہمارا استدلال یہ ہے کہ خود بخود کچھ نہیں ہوگا، ہم کچھ کریں گے تو کچھ ہوگا ! جو کچھ مشرق وسطٰی میں ہو رہا ہے وہ ایسی آسانی سے نہیں ہو جایا کرتا۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ جائز یا ناجائز، کسی بھی طور حاصل کی ہوئی چونّی اٹھنّی بھی آسانی

سے نہیں چھوڑتا۔ ایسے میں کوئی آسانی سے اقتدار کیوں چھوڑے گا؟ مُسلّط کئے ہوئے اقتدار کی دیوار گرتی نہیں، گرائی جاتی ہے۔ یہ وہ منحوس دیوار ہے کہ گر بھی رہی ہو تو بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کبھی کبھی یہ خود ہی کمر سیدھی کرلیتی ہے! یہی سبب ہے کہ اقتدار کی گرتی ہوئی دیوار کو بھی زور سے دھکّا دینا پڑتا ہے! محض بھونکنے کے سے انداز سے نعرے لگانے کی صورت میں "اِنکلاب" تو آ سکتا ہے، انقلاب کسی طور نہیں آسکتا! جب ہم مرزا سے یہ بات کہتے ہیں تو وہ وہ ہتّھے سے اکھڑ جاتے ہیں اور خالص اِنکلابی" انداز اختیار کرتے ہوئے ہم پر برس پڑتے ہیں! ہم اُنہیں عوام اور اپنے آپ" !کو آمر سمجھ کرچپ ہو رہتے ہیں، خوش ہو لیتے ہیں

HIGHLIGHT

ہماری سیاست پبلک ڈیلنگ میں تبدیل ہو گئی ہے یعنی عوام کا یک مُشت، بیک جنبش قلم !سودا کردیا جاتاہے

ہم سب قاتل ہیں

ہم اور آپ روزانہ قتل کرتے ہیں مگر کوئی مقدمہ نہیں بنتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آپ ایک قتل کرتے ہیں اور ہم عامل صحافی روزانہ دوہرے قتل کے مرتکب ہوتے ہیں مگر کسی میں ہمت نہیں کہ ہم پر کوئی مقدمہ دائر کرسکے۔ ایک یومیہ قتل تو وقت کا ہے۔ اور دوسرا قتل خبروں کو قتل (kill) کرنے کا ہے!

دنیا کی ہر قوم کو قدرت نے سب کچھ حساب کتاب سے بخشا ہے۔ وقت بھی حساب ہی سے ملا ہے۔ مگر ہم پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ اُس نے ہمیں وقت کی دولت بے حساب دی ہے۔ ہم خرچ کرتے ہیں اور ختم نہیں ہوتی۔ اور حد یہ ہے کہ ضائع کرنے پر بھی ختم نہیں ہوتی! کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وقت کوئی طلسماتی مخلوق ہے یعنی جس قدر قتل کیجیے اُسی قدر پنپتی جاتی ہے! اہل وطن کا آدھا وقت تو اس اُدھیڑ بُن میں ضائع ہوتا ہے کہ وقت کو قتل کیسے کیا جائے! دنیا بھر میں ایسے کھیل پسند کئے جاتے ہیں جن کے مقابلوں کا دورانیہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا ہو۔ ہم نے کرکٹ کو اپنا رکھا ہے جس میں کم ترین دورانیے کا مقابلہ بھی تین چار گھنٹے سے کم کا نہیں! ٹوئنٹی ٹوئنٹی یا ون ڈے کرکٹ پر کیا موقوف ہے، پانچ روزہ ٹیسٹ کرکٹ بھی ہمارے مزاج کا حصہ ہے! اِس کے بعد

موبائل پر گھنٹوں باتیں، ایس ایم ایس، موبائل فون ہی پر ایف ایم کی نشریات، ایم پی تھری کے ذریعے موسیقی سے محظوظ ہونا، ہینڈ سیٹ ہی پر گانے اور فلمیں دیکھنا۔ کون سی مصروفیت ہے جو ہم نے نہیں اپنا رکھی ؟ مگر کیا کیجیے، ظالم وقت ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جب دیکھیے تب کانوں میں ایک آواز سی آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔۔۔ آپ کا سمے شروع ہوتا ہے اب ! " کسی اچنبھا بچن میں اِتنی ہمت نہیں کہ عملی زندگی کے "کون بنے گا کروڑ پتی؟" پروگرام میں ہمارے روبرو کہہ سکے "اوہ ! سمے سماپتی کی گھوشنا ! "

جہاں جائیے، جس محفل میں بیٹھیے یہ احساس ستانے لگتا ہے کہ لوگ وقت کو کسی نہ کسی طرح ٹھکانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اور وقت ہے کہ رقیب رُو سیاہ کی طرح جان چھوڑنے کو تیار نہیں ! سرکاری دفاتر کا حال یہ ہے کہ لوگ ڈیوٹی پر پہنچنے میں ایک آدھ گھنٹے کی تاخیر پہلے ہی کر دیتے ہیں تاکہ دفتر میں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کے الزام سے بچا جاسکے ! سلام دعا کے بعد دفتر کے ساتھیوں سے گپ شپ میں دس بج جاتے ہیں اور چائے آ جاتی ہے ! چائے کی آمد دراصل وقت کی سزائے موت کا اعلان ہے ! لوگ گزشتہ رات کو دیکھے ہوئے ٹی وی ڈراموں اور ٹاک شوز کی باتیں کرتے ہیں۔ کچھ حالات پر بحث ہوتی ہے۔ حکومت کے بارے میں قیاس آرائیوں کا بازار گرم ہوتا ہے۔ تھوڑی سی رائے زنی اِس امر پر ہوتی ہے کہ کابینہ میں کون رہے گا اور کون کھڈے لین لگا دیا جائے گا۔ ان تمام معاملات

کو نمٹانے کے بعد آخر میں گھریلو دُکھڑے روئے جاتے ہیں۔ یعنی
!کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے

اِتنے میں زوال کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ زوال کی گھڑیوں میں جب عبادت کی اجازت نہیں تو خالص دُنیوی کام کرنے پر بھلا کون راضی ہوگا؟

ویسے سرکاری دفاتر میں زوال کا ذرا جلدی آ جاتا ہے! کچھ دیر میں ظہر کی اذان ہوتی ہے اور بس، لنچ ٹائم شروع ہوتا ہے۔ یعنی دیکھتے ہی دیکھتے سرکاری دن ڈھل جاتا ہے! وقت !کو "عمدگی" سے "صرف" کرنے کا اِس سے موؤثر طریقہ شاید کوئی اور نہیں ہو سکتا

معاشرے میں عمومی روش یہ ہے کہ شام کو دفتر یا فیکٹری سے گھر واپسی پر لوگ فریش ہو کر وقت کو ٹھکانے لگانے کی مہم پر نکل پڑتے ہیں! پان کا کیبن پہلا پڑاؤ ہوتا ہے جو بالعموم گلی کے کونے پر واقع ہوتا ہے۔ کیبن میں پان کے پتّوں پر چونا لگایا جاتا ہے اور باہر کھڑے ہوئے تماش بین چالیس پچاس منٹ تک کھڑے ہو کر اپنے وقت کو چونا !لگاتے رہتے ہیں

پان کے کیبن کی منزل سے آگے ہوٹل پایا جاتا ہے۔ ہوٹل کے باہر دور تک کرسیوں پر وقت گزاری کی محفل سجتی ہے اور پھر کسے یاد رہتا ہے کہ کتنا وقت ضائع

کرنا ہے! کل تک مسئلہ یہ تھا کہ ہوٹل رات ایک ڈیڑھ بجے بند ہو جایا کرتے تھے۔ اب یہ الجھن بھی نہیں رہی۔ اب تک چوبیس گھنٹے کے ہوٹل پائے جاتے ہیں اور بانہیں پسارے کرم فرماؤں کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت اور پیسے ہونے چاہئیں، ہوٹل میں چائے، پراٹھا اور بیٹھنے کی جگہ۔۔۔ سبھی کچھ حاضر ہے!

ہمیں اب تک معلوم نہیں ہوسکا اور کوئی اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکا کہ قدرت نے ہمیں دراصل کتنا وقت ودیعت کیا ہے۔ ہم ڈیوٹی کے دوران بھی وقت کو ٹھکانے لگاتے رہتے ہیں مگر وہ ٹھکانے نہیں لگتا۔ ذرا سا کام اور پھر باتیں، ذرا سا کام اور پھر باتیں۔۔۔ یہ معمول ہماری زندگی کا جُز ہے مگر وقت ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا!

مرزا تنقید بیگ کہتے ہیں کہ روشنی غیر معمولی یعنی زیادہ ہو تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر مارکیٹ میں غیر معمولی ورائٹی ہو تو خریدار کا ذہن کام کرنے سے انکار کردیتا ہے! انسان کے پاس بے حساب دولت ہو تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس دولت کو کس مصرف میں لایا جائے۔ وقت کے معاملے میں ہمارا تقریباً یہی حال ہے۔ قدرت نے ہمیں وقت کچھ ایسی فراوانی سے عطا کیا ہے کہ اب تک ہماری سمجھ میں یہی نہیں آرہا کہ اِسے صرف

کیسے کریں! یہی سبب ہے کہ صرف کرنے کے نام پر ہم اِسے صرف ضائع کر پا رہے ہیں! وقت کے ضیاع کے معاملے میں قوم کو معذور قرار دیتے ہوئے مرزا یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم سے وقت کا حساب لیا جائے گا مگر، گستاخی معاف، قدرت کو ہماری مجبوری بھی تو دیکھنی چاہیے کہ بے حساب وقت پا کر ہمارے ذہن کی حالت کیا ہوئی! ہم تو سوچنے سمجھنے کے قابل بھی نہ رہے!

مرزا نے تجویز پیش کی ہے کہ پاکستان کو اپنی برآمدات پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ دنیا بھر میں وہی چیز زیادہ فروخت ہوتی ہے جس کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ وقت کی کمی کہاں محسوس نہیں کی جاتی؟ بس، اِسی نکتے کو بنیاد بنا کر ہمیں وقت برآمد کرنے پر توجہ دینی چاہیے! دنیا بھر کے لوگ وقت کو ترسے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے پاس فراغت کے چند لمحات نہیں۔ ترقی کے راستوں پر دوڑتے دوڑتے تھکن سے چُور ہو جانے والی دنیا کو آرام کے چند لمحات درکار ہیں۔ کیوں نہ بریک ہم دیں؟ وقت کی برآمدات میں بھی صراحت کی جاسکتی ہے کہ چبوتروں پر بیٹھ کر گپ شپ لگانے کا وقت الگ ہے، ٹی وی پر کرنٹ افیئرز کے پروگرام دیکھتے ہوئے دانشوری جھاڑنے کا پیکیج الگ ہے، شادی بیاہ کی تقریبات میں خوش گپیوں کے لئے استعمال کیا جانے والا وقت الگ ہے! سب سے مہنگا پیکیج سرکاری دفاتر میں بیٹھ کر "صرف" کئے جانے والے وقت کا ہو سکتا ہے۔ دنیا جب ہم سے وقت خریدے گی تب اُسے اندازہ ہوگا کہ وقت کی کمی کو ہم نے کس قدر عمدگی سے

پورا کیا ہے! وقت کو برآمد کرکے ہم دنیا میں ایک انوکھا انقلاب برپا کرسکتے ہیں۔
مرزا کا ہمدردانہ نظریہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ دنیا بہت کھیل چکی، اب اُسے آرام کی
ضرورت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے بے پناہ "سکون" سے پوری دنیا کو مستفید کریں۔
اِس صورت میں دُنیا بھر کے لوگ جان سکیں گے کہ ہزاروں سال قبل جب کچھ نہیں تھا
تب کس قدر سکون تھا!

کھٹا میٹھا ورلڈ کپ

بہت سی کھٹی اور چند ایک میٹھی یادیں اپنے دامن میں سموئے کرکٹ ورلڈ کپ پھر آ گیا ہے۔اِس بار ورلڈ کپ ایسے مرحلے پر آیا ہے جب حکومت کو عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے بہت کچھ درکار ہے۔ گویا کھیلوں کی دنیا نے سیاسی کھلاڑیوں کے من کی مراد پوری کردی ہے! ایک طرف مسلم لیگ (ن) کی ناراضی اور کابینہ کی ترتیب نو ہے اور دوسری طرف ناموس رسالت قانون میں ترمیم روکنے کے لئے بھرپور عوامی رد عمل کے بعد اب ریمنڈ ڈیوس کیس ہے جو وفاق اور پنجاب اور دونوں کے گلے میں ہڈی بن کر پھنس گیا ہے۔ ایسے میں حکومت ہر اس ایونٹ کو گلے لگانے کے لئے تیار ہو گی جس کی مدد سے عوام کو ایک ڈیڑھ ماہ کے لئے بہلانا ممکن ہو۔

کرکٹ نے ہمیں بہت کچھ دیا اور بہت کچھ سکھایا ہے۔ جس کرکٹ نے ہمیں آپس میں لڑایا اُسی نے متحد ہو کر لڑنا بھی سکھایا۔ 1992 کا ورلڈ کپ کوئی کیسے بھول سکتا ہے؟ وہ بھی عجیب کہانی تھی۔ پہلا میچ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے درمیان ہوا۔ نیوزی لینڈ کے آف اسپنر دیپک پٹیل نے فاسٹ بولر کے ساتھ اٹیک کیا اور آسٹریلیا کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ پاکستان کا پہلا میچ ویسٹ انڈیز سے تھا جو اگرچہ بہت اہم اور نازک تھا مگر کپتان یعنی عمران خان نہ

کھیلے۔ پاکستان یہ میچ دس وکٹوں سے ہارا۔ دوسرا میچ زمبابوے سے تھا۔ عمران خان طبیعت ناساز ہونے کے باوجود کھیلے۔ ان کی طبیعت کی ناسازی کا اعتراف ٹیم مینیجر انتخاب عالم نے ریڈیو انٹرویو میں کیا۔ تیسرا میچ انگلینڈ سے تھا جس میں عمران پھر بہ وجوہ نہ کھیلے۔ اس میچ میں پاکستان کی ٹیم 74 رنز اسکور کر پائی۔ بارش نے وکٹ کو خستہ کر دیا تھا۔ بارش کے باعث انگلینڈ کی اننگز شروع ہی نہ ہو سکی اور پاکستان کو ایک ایک پوائنٹ مل گیا۔ اس میچ تک ٹیم کے اندرونی اختلافات غیر معمولی نوعیت اختیار کر چکے تھے۔ چوتھا میچ بھارت سے تھا۔ بھارت نے 216 رنز اسکور کئے۔ پاکستان یہ میچ آسانی سے جیت سکتا تھا۔ جاوید میانداد نے 110 گیندوں پر صرف 40 رنز اسکور کئے۔ کرکٹ سے ذرا سے شغف رکھنے والوں کی سمجھ میں سب کچھ آ سکتا تھا۔ پانچواں میچ جنوبی افریقہ سے تھا۔ اس میچ میں جاوید میانداد شریک نہیں ہوئے ! عمران خان نے ٹیم کو دوبارہ ورلڈ کپ کی دوڑ میں شامل کرنے کے لئے جی جان سے بولنگ کی اور جنوبی افریقہ کو شکست سے دوچار کیا۔ اس میچ کے بعد پاکستان سے ایک مذاکراتی ٹیم آسٹریلیا روانہ کی گئی جس نے تمام کھلاڑیوں کو ساتھ بٹھایا اور قوم کا واسطہ دیکر متحد ہونے اور باقی مقابلوں میں ڈٹ کر شریک ہونے کی گزارش کی۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ بکھری ہوئی ٹیم متحد ہو کر کھیلی تو ورلڈ کپ لیکر وطن لوٹی۔ اس فتح نے پوری قوم کو بھرپور شادمانی سے ہمکنار کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اب پاکستان میں کرکٹ پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔

1996 کے ورلڈ کپ میں پاکستان بھی میزبان تھا۔ ٹیم میں اختلافات پھر ابھر آئے تھے۔ کوارٹر فائنل بھارت سے بنگلور میں تھا۔ پاکستان کے لئے یہ "کرو یا مرو" والا معاملہ تھا مگر وسیم اکرم میچ نہ کھیل پائے! نتیجہ؟ پاکستان ہار گیا۔

1999 کے ورلڈ کپ میں پاکستان کی ٹیم نے بیشتر مقابلے اِس طرح جیتے جیسے سامنے کوئی ٹیم نہ ہو بلکہ گلی کے بچے ہوں! مگر فائنل میں قومی ٹیم جس بُری طرح ہاری اُس نے لوگوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ ورلڈ کپ کے دنوں میں کارگل کا مسئلہ بھی چل رہا تھا اور ایک خیال یہ بھی تھا کہ ممکنہ طور پر قومی قیادت نہیں چاہتی تھی کہ اِس سنگین مرحلے پر کسی فتح کا جشن منایا جائے! فائنل میں بے ڈھنگے انداز سے ہارنے پر کہیں سے بھی سٹے کا الزام عائد نہیں کیا گیا کیونکہ لوگ بین السطور کو سمجھتے تھے!

2003 کے ورلڈ کپ میں بھارت اور کرکٹ سیزن ایک بڑی کاروباری حقیقت بن کر سامنے آئے۔ بھارت میں کرکٹ کے نام پر اربوں روپے کا بزنس داؤ پر لگا ہوا تھا۔ سوال یہ تھا کہ بھارت کو کسی نہ کسی طرح سیمی فائنل یا فائنل تک

پہنچایا جائے۔ بھارتی ٹیم نے "شاندار" کارکردگی کے ذریعے فائنل تک رسائی پائی۔ مگر فائنل میں آسٹریلیا نے "ٹیم انڈیا" کو عبرت ناک شکست سے دوچار کرکے اِس ٹیم کی فائنل تک رسائی کا راز فاش کردیا!

2007 کا ورلڈکپ پاکستان میں کرکٹ کے زوال کی ابتداء ثابت ہوا۔ ابھی میگا ایونٹ شروع ہی ہوا تھا اور تیسرا ہی دن تھا کہ پاکستانی کرکٹ ٹیم آئرلینڈ سے شکست کھا کر ٹورنامنٹ سے باہر ہوگئی! یہ کرکٹ کی دنیا میں اتنا بڑا سانحہ تھا کہ بہتوں کو اپنے کانوں اور آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اہل وطن قومی ٹیم کے لئے پتہ نہیں کیا کیا سوچ کر خوش ہو رہے تھے۔ تین ہی دن میں ٹورنامنٹ سے باہر ہوجانے کے بارے میں کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔ ابھی اِس صدمے سے لوگ نپٹ ہی رہے تھے کہ باب وولمر کی پراسرار موت نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ پوری کرکٹ ہی داؤ پر لگ گئی۔

اب کے ورلڈکپ ایسے وقت آیا ہے جب وفاقی اور پنجاب حکومت مشکل میں ہیں۔ ریمنڈ ڈیوس کیس نے سب کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ حالات نے یارکر مارا ہے اور ہماری حکومت کو بولڈ ہونے سے بچنا ہے! ناموس رسالت قانون میں ترمیم کا عندیہ دیکر حکومت نے عوام میں جو اشتعال پیدا کیا تھا وہ اب قدرے تھم چکا ہے۔ مگر خیر، ریمنڈ ڈیوس کا کیس تو ابھی تازہ ہے۔ یہ تو

ایسے کیسوں میں سے ہے جو باسی ہو کر بھی تازگی کی قسم کھائے ہیں!

کرکٹ کا میلہ سجا ہے اور عوام کو ایک بار پھر میڈیا کے ذریعے بہلایا جا رہا ہے، لارے لپّے دیئے جا رہے ہیں کہ ورلڈ کپ ہمارا ہے۔ یہ سب کچھ ایسی حالت میں ہو رہا ہے کہ ملک کے تین اہم کرکٹرز کو حال ہی میں آئی سی سی نے اسپاٹ فکسنگ کے جرم میں پانچ تا دس سال پابندی کی سزا سنائی ہے۔ اتنے سارے ہنگاموں میں بھی اگر ہماری کرکٹ سلامت رہ جائے تو بڑی بات ہے!

1992 کے ورلڈ کپ کی یاد اس لئے بھی تازہ ہو گئی ہے کہ اب کے بھی ہر ٹیم کو دوسری ٹیم سے لڑنا پڑے گا۔ گروپ نہ بنانا بھی خوب ہے۔ جب ہر ٹیم کی فتح و شکست کا مدار دوسروں کی فتح و شکست پر ہو تو دعاؤں اور بد دعاؤں کا بازار بھی خوب سجتا ہے! کپ کی دوڑ میں شامل رہنے کے لئے ان فتح کے لئے بھی دعا کرنی پڑتی ہے جن سے شدید نفرت ہو! اور کبھی کبھی اپنے پیاروں کی شکست کے لئے بھی پر امید رہنا پڑتا ہے! 1992 میں یہی ہوا تھا۔ کرکٹ دیکھنے والے مقابلے سے زیادہ اس اُدھیڑ بُن میں رہتے تھے کہ کس کس کے ہارنے سے کون کون جیت سکتا ہے اور کس کس کی جیت سے کون کون مقابلوں سے خارج ہو جائے گا!

ورلڈ کپ کا میلہ سجے گا تو کاروبار کے ساتھ ساتھ اربوں روپے کے سٹہ بھی

ہوگا۔ سنا ہے بکیز نے ابھی سے کاروباری افراد سے رابطہ شروع کردیا ہے تاکہ اہم مقابلوں پر خوب جی بھر کے رقوم لگائی جائیں! اب ہم کرکٹ کے مقابلوں پر کیا داؤ لگائیں، ہماری تو پوری کرکٹ ہی داؤ پر لگ گئی ہے! جنوبی ایشیا بھی کیا خطہ ہے، کرکٹ کا سیزن شروع ہوتا ہے تو کاروباری اداروں اور سٹّے بازوں کی بھی چاندی ہوجاتی ہے! کرکٹ کم کھیلی جاتی ہے اور کرکٹ سے زیادہ کھیلا جاتا ہے! ایک ایک گیند کو کئی کاروباری زاویوں اور دیکھا اور پرکھا جاتا ہے! کوئی وکٹ گرتی ہے تو کئی کھلاڑیوں اور ٹیموں کی نیت جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے! کوئی مانے یا نہ مانے، دنیا کی سب سے انوکھی کرکٹ ہمارے خطے میں کھیلی جاتی ہے!

سیاست ہم سے آخر کب تک کھیلے؟ وہی حکمرانوں کی بداعمالی، وہی ہماری بدگمانی۔ ایک طرف حکومت کی جان پر بنی ہوئی ہے کہ ریمنڈ ڈیوس کا کیا کرے۔ اور دوسری طرف عوام ہیں کہ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آرہا کہ تیونس اور مصر سے اٹھنے والی احتجاجی لہر میں بہیں یا بہنے سے گریز کریں! ایسے میں کرکٹ کا ورلڈ کپ ایک نعمتِ غیر مترقبہ بن کر نمودار ہوا ہے۔ اچھا ہے کچھ دن ذہنوں پر کرکٹ سوار رہے گی تو لوگ احتجاج، دھرنا، ریلی، مارچ۔۔۔ سب کچھ بھول جائیں گے! قوم جب عافیہ کو بھول گئی تو، کچھ دن ہی کے لئے سہی، ریمنڈ کو بھی بھول ہی جائے گی۔ کرکٹ کی گرما گرمی حکومت کے لئے تھوڑی بہت ٹھنڈک

ضرور پیدا کرے گی!

ایک ورلڈ کپ وہ تھا جس نے ہمارے اختلافات ختم کئے تھے اور خوشیوں کا سامان کیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ہم دو تین دن ہی میں ورلڈ کپ سے باہر ہوئے اور قتل کے الزام کو بھی سہنا پڑا۔ اب پھر کرکٹ پر عہدِ ستم ہے اور ہم ہیں۔ جس کھیل سے ہمیں عالمگیر شہرت ملی اُس سے ہم نے کھلواڑ کی۔ اس کھلواڑ کے نتیجے میں ہماری عزت داؤ پر لگی اور اب حالت یہ ہے کہ وہ کھیل نزع کے عالم میں ہے اور ہم ہیں۔ ایک کرکٹ نے ہمیں کیسے کیسے اچھے اور بُرے دن دکھائے ہیں! کاش ایک بار پھر ہم کرکٹ ہی کے ذریعے متحد ہو جائیں اور، کچھ دن ہی کے لئے سہی، خوش ہولیں!!

ورلڈ کپ، کمرشل ازم اور کرکٹ

باب وولمر کی ہلاکت اور ہماری کرکٹ کی نیم دِلی کو چار سال گزر گئے اور ورلڈ کپ ایک بار پھر زندہ ہوگیا۔ ورلڈ کپ ایک بار پھر ڈیڑھ ماہ کے لئے ہماری زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ کرکٹ سے شغف رکھنے والی ہر قوم کے لئے ورلڈ کپ اپنے جلو میں بھرپور مسرت اور جوش و خروش کے لمحات لیکر آتا ہے مگر اب تک یہ ایونٹ ہم سے تو صرف کھیلتا آیا ہے! کسی زمانے میں کرکٹ ورلڈ کپ سے ہماری کھٹّی میٹھی یادیں وابستہ ہوا کرتی تھیں اور پھر یہ ہوا کہ کرکٹ کے اِس میگا ایونٹ نے ہمیں تلخ یادوں کی غلامی میں دے دیا! چار سال قبل ورلڈ کپ کچھ اِس انداز سے آیا کہ ہمارے لئے تو گویا آیا ہی نہ تھا اور محض پہلی جھلک کے ختم ہوتے ہوتے ہماری ساری اُمیدوں کے ساتھ ساتھ ٹیم کے کوچ باب وولمر کو بھی اِس طرح ساتھ لے گیا کہ ہمارے پاس آنکھیں، سر اور گردن۔۔ سبھی کچھ جھکانے کے سوا کوئی آپشن نہ رہا!

دس پندرہ سال سے یہ ہو رہا ہے کہ ورلڈ کپ آتا ہے اور ہمیں کلین بولڈ کرکے چلا جاتا ہے! ایسا شاید اِس لئے ہو رہا ہے کہ ہم بہت سے معاملات کی اچھی طرح نیٹ پریکٹس نہیں کرتے! ایک زمانہ تھا کہ جب ہم صرف اور صرف کرکٹ کی

بدولت اِس کھیل سے شغف رکھنے والوں کی دنیا میں پورے وقار کے ساتھ جیا کرتے تھے۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب کرکٹ میں صرف کرکٹ تھی، زیادہ پیسہ ویسہ نہیں تھا۔۔ یعنی کمرشل ازم نے کرکٹ کے میدانوں میں ڈیرے نہیں ڈالے تھے۔ جب "مال پانی" زیادہ تھا ہی نہیں تو جُوا کہاں سے ہوتا؟ کرکٹر بننا بجائے خود ایک بڑا جُوا تھا!
کرکٹرز اُس دور میں بھی قوم کے ہیرو تھے مگر رول ماڈل یا محض ماڈل نہیں بنے تھے! وہ میڈیا اور کیمرے کی پچ سے زیادہ کرکٹ گراؤنڈ کی پچ پر کھیلنے کو اور جیبوں میں مال وزر بھرنے پر داد و تحسین کے حصول کو ترجیح دیا کرتے تھے!
کون سا کارنامہ تھا جو ہم نے (میڈیا کی مدد کے بغیر!) کرکٹ کی دنیا میں انجام نہیں دیا؟ کرکٹ کیا تھی، ایک سُہانا خواب تھا جو ہماری دِل بستگی کا سامان کئے ہوئے تھا! کون چاہتا تھا کہ اِس خواب کی موت واقع ہو اور آنکھ کھلے؟ مگر پھر یہ ہوا کہ کہیں سے سٹہ آ دھمکا اور اِس ستم ظریف نے ہماری کرکٹ ہی کو داؤ پر لگا دیا! کرکٹ جب خلیج کے خطے میں پہنچی تو اُس کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا۔ اِس خطے میں لوگ کمانے جاتے ہیں، کرکٹ بھی کمانے ہی پہنچی! کمرشل ازم کی ابتداء ہوئی تو کھلاڑیوں کو خریدنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ جن کی کمر کرکٹ کھیلتے کھیلتے شَل ہو چکی تھی انہوں نے کمرشل ازم پر آمنّا و صدقنا کہا! کرکٹرز کی کِٹ کا رنگ ہی تبدیل نہیں ہوا، کرکٹ کے اطوار

بھی بدلتے چلے گئے! کرکٹ کھیلتے کھیلتے اہل ستم کرکٹ ہی سے کھیلنے لگے! شارجہ نے کرکٹ کو نیا انداز، گلیمر اور جوش و خروش ہی نہیں دیا، نئی کامیابیوں سے "دوچار" اور نئی ذِلتوں اور رُسوائیوں سے آشنا بھی کیا! شارجہ میں ایک ایسا بھی دور گزرا ہے جب کرکٹ کے میدان میں صرف کرکٹ کی بازی جیتنے کی تگ و دو ہو رہی ہوتی تھی اور اِس میدان سے باہر طرح طرح کی بازیوں کا میدان سجتا تھا! باؤلر کے ہاتھ سے نکلنے والی گیند بیٹسمین کے سامنے گرنے یعنی ٹپہ کھانے سے قبل کسی کو نواز چکی ہوتی تھی اور کسی کو "ٹِکاتی" یا چونا لگا جاتی تھی! batting رفتہ رفتہ betting میں تبدیل ہوتی گئی۔ یہ بڑا "انقلابی" دور تھا جس نے کرکٹ اسٹیڈیم کو کیسینو بنا ڈالا اور کرکٹ سے شغف رکھنے والوں کو سٹّے باز! اور پھر یہ ہوا کہ کرکٹ کی کشتی دولت اور بدنامی کی خلیج میں ڈوب گئی!

1960 کے عشرے میں آں جہانی گرو دت نے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کی حیثیت سے فلم "پیاسا" بنائی تھی۔ مرکزی کردار (جو گرو دت نے ادا کیا تھا) ایک ایسے شاعر کا تھا جسے کوئی نہیں پوچھتا اور پھر جب ایک حادثے میں اُسے مُردہ تصور کرلیا جاتا ہے تب مردہ پرستی کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے لوگ اُس کی شاعری کے دیوانے ہو جاتے ہیں! اُس کے نام پر لوگ تقاریب کا اہتمام کرتے ہیں اور اُس کی شاعری کو بیچ کر جیبیں بھرتے ہیں! یہ تماشا دیکھ کر شاعر

حیران رہ جاتا ہے اور منظر عام پر آکر مُردہ پرستوں کا ضمیر جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہے!

آج کرکٹ کا بھی کچھ کچھ اُس شاعر جیسا ہی حال ہے۔ کرکٹ ہی کے نام پر میلوں کا اہتمام کیا جارہا ہے، یار لوگ "شوکن میلے دی" بنے ہوئے ہیں اور خود کرکٹ ہی کو اِن میلوں میں شرکت کی دعوت نہیں دی جارہی! کھیل بے چارہ جوتے کے تسمے باندھتا رہ گیا ہے اور کھلاڑی آگے نکل گئے ہیں! اور شائقین بھی "ہم کو منزل نہیں، رہنما چاہیے" کی عملی تصویر بن گئے ہیں! اپنے اپنے پسندیدہ کھلاڑی کی کارکردگی ہی کو مقابلے کا حاصل اور حسن سمجھ کر لوگ دل بہلا لیا کرتے ہیں! ہم ملٹیپل آپشنز کے دور میں جی رہے ہیں۔ کرکٹ بے چاری کی کمر پر کئی کام لاد دیئے گئے ہیں! اب کرکٹ کچھ اِس انداز سے کھیلی جاتی ہے کہ کھیل کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی نظر آئے! ہر اہم میچ ٹاسک فورس" دکھائی دیتا ہے! یعنی ہمیں دیکھنے کو مل رہی ہے"

!اِک رنگ میں سو رنگ دکھاتی ہوئی کرکٹ

آج سے کرکٹ کی چار سالہ بادشاہت کے لئے مقابلوں کا میلہ لگ رہا ہے۔ پاکستانی کرکٹ پر بڑا کٹھن وقت ہے۔ تین اہم کھلاڑیوں پر پانچ سے دس سال کی پابندی عائد کی جاچکی ہے۔ یہ گویا آئی سی سی کی طرف سے پار کرائی گئی ہے

اور اب ہمیں اِس کے اثرات سے بچنا ہے! جو کرکٹ دلوں میں کدروتیں بھرتی رہی ہے اُسی نے کبھی کبھی قوم کو سرمستی اور سرخوشی سے آشنا بھی کیا ہے۔ اِس نصیبوں جلی کرکٹ ہی کی بدولت ہم نے دو چار بار قومی سطح پر جشن بھی منایا ہے۔

کرکٹ ورلڈ کپ کی تاریخ گواہ ہے کہ میزبان آج تک چیمپین نہیں بنا۔ آج سے شروع ہونے والے ورلڈ کپ کا پاکستان بھی میزبان تھا مگر بدقسمتی سے حالات نے ہم سے میزبانی چھین لی۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ انتظامی اور سیاسی بدقسمتی کھیل کے لئے خوش قسمتی ثابت ہو اور میزبانی کی "نحوست" سے نجات پانے پر اب ٹیم کچھ کرکے دکھادے! ہماری کرکٹ کے لئے اب نیٹ پریکٹس اور دُعا مساوی اہمیت رکھتے ہیں! چلیے اِس بہانے ہی سہی، لوگ کچھ دن کے لئے اللہ سے لَو تو لگا لیتے ہیں!

بارود کا ڈھیر اور ہیروں کی کان

حالات کی بھی عجیب عادت ہے کہ اچانک بدل جاتے ہیں، سب کچھ اچھا چل رہا ہوتا ہے اور اچانک "دی اینڈ" آ جاتا ہے! اور اس کے بعد مشکلات شروع ہو جاتی ہیں۔ ریمنڈ ڈیوس کی واردات اور گرفتاری حکومت کے ہنی مون پیریڈ کے خاتمے کا اعلان بن کر نمودار ہوئی ہے۔ حکومت کی گاڑی جیسے تیسے چل ہی رہی تھی۔ چند ایک رکاوٹیں ضرور تھیں مگر خیر، راستے میں کوئی کھائی تو نہ تھی! ریمنڈ ڈیوس نے ہماری پیاری سرکار کو "اگنی پریکشا" سے دوچار کردیا ہے! اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب "لکشمن ریکھا" پار کرنے سے کس طرح گریز کیا جائے! جو راج سنگھاسن پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اب ان کے نصیب میں شاید "بن واس" رہ گیا ہے!

کتنے اسلامی ممالک ایسے ہیں جو امریکہ سے متصادم ہو سکتے ہیں؟ (واضح رہے کہ خود امریکہ آکر ٹکرائے تو اور بات ہے، اِس عمل کو متصادم ہونا قرار نہیں دیا جاسکتا!) ہم اپنے حکمرانوں سے امریکہ کے معاملے میں جرات آزمائی کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ بھلا ہو ریمنڈ ڈیوس کا جس نے ہم پاکستانیوں کو ایک ایسا آئینہ بخشا ہے جس میں بہت کچھ صاف صاف دکھائی دے رہا ہے! پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو بھی اس کیس نے دو واضح گروپوں میں تقسیم کردیا ہے۔ اور

اچھا ہی ہوا کہ بہتوں کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹّی اُتر تو گئی۔ سابق وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی اور سیکریٹری خارجہ سلمان بشیر نے خُم ٹھونک کر جس طرح امریکہ کو منہ دیا ہے اُس کی داد نہ دینا اِن دونوں سے زیادتی ہوگی! بعض تجزیہ کار اور تجزیہ نگار بھی امریکہ کی حاشیہ بردای کا حق (یعنی نمک کا حق) ادا کرتے ہوئے ریمنڈ کی وکالت کے لئے کُھل کر میدان میں آ گئے ہیں۔ ایک ٹی وی پروگرام میں جب یہ پوچھا گیا کہ آخر امریکی حکومت ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کے لئے اِس قدر بے تاب کیوں ہے تو تجزیہ کار نے برملا کہا کہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ریمنڈ ڈیوس کی طرح 80، 90 امریکی پاکستان میں آزادانہ گھوم رہے ہیں اور ان کے اِرادوں سے بھی کوئی بے خبر نہیں! یعنی یہ کہ ریمنڈ ڈیوس نے لاہور میں جو کچھ کیا ہے وہ ایک باضابطہ معاہدے کے تحت تھا لہٰذا اُسے مقید رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں! سابق وزیر خارجہ سردار آصف احمد علی کا کہنا ہے کہ ریمنڈ ڈیوس کو رہا نہ کیا گیا تو امریکی امداد بند ہو جائے گی اور قوم کو گھاس کھانی پڑے گی!

سردار صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ریمنڈ کی رہائی کی صورت میں دنیا زیادہ آسانی سے سمجھ جائے گی کہ ہم وہ قوم ہیں جسے کوئی بھی، جب چاہے گھاس کھلا سکتا ہے!

لاہور میں ریمنڈ نے جو کچھ کیا اُس نے تمام پاکستانیوں کو مشتعل کیا ہے اور اشتعال کا گراف اِس قدر بلند ہے کہ اب کسی بھی سطح کے حکمران اِس چوہے دان

سے اپنی گردن چھڑا نہیں سکتے ! حکومتیں جس گراس روٹ لیول کا رونا روتی رہتی ہیں اُسی گراس روٹ لیول پر ریمنڈ نے جرم کا ارتکاب کیا ہے اور زمین میں جڑیں رکھنے والے گھاس کے تنکے اب تناور درخت بن کر اُس کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں !

ریمنڈ نے تین افراد کو لاہور میں قتل کیا۔ معاملہ پنجاب کا تھا اس لئے صوبائی حکومت کی ذمہ داری بڑھ گئی (یا بڑھا دی گئی !)۔ امریکہ نے پنجاب کے پنجرے سے اپنے پنچھی کو نکالنے کے لئے وفاقی حکومت پر دباؤ ڈالا۔ وفاق کے لئے شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا یعنی مسلم لیگ (ن) کی حکومت سے اپنی بات منوانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا ! پنجاب پولیس پر غیر معمولی دباؤ تھا کہ اگر امریکی چھوٹ گیا تو عوام کچا چبا جائیں گے۔ صوبائی حکومت نے بھی بہتر یہ جانا کہ ریمنڈ ڈیوس کی گیند عدالت کے کورٹ میں ڈال دی جائے !

وفاق اور پنجاب دونوں کا معاملہ یہ ہے کہ جائے رفتن نہ پائے ماندن ! اِدھر کھائی ہے اور اُدھر پہاڑ ! مسلم لیگ (ن) کے لئے ریمنڈ کیس زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ اگر عدالتی کاروائی کو skip کرتے ہوئے ریمنڈ کو رہا کردیا جاتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ عوامی جذبات کا سیلاب مسلم لیگ (ن) کو بہالے جائے گا اور عدلیہ کی ساکھ بھی داؤ پر لگ جائے گی۔ اور اگر تمام قانونی اور عدالتی

تقاضوں کو نبھایا جاتا ہے تو ریمنڈ کو سزا سنائے جانے تک مسلم لیگ (ن) کی پوزیشن مستحکم ہوتی رہے گی اور سزا سنائے جانے کی صورت میں ووٹ بینک راتوں رات shoot up کرجائے گا۔ پاکستانی سیاست میں تو ایسا منت مرادوں سے بھی نہیں ہوتا!
صدر زرداری کے لئے صورت حال انتہائی پریشان کن شکل اختیار کرچکی ہے۔ ہمارے "زندہ دل" صدر معاملات کو بالعموم دل پر لیتے نہیں مگر خیر یہ معاملہ تو خود ہی اُچک کر سینے پر پتھر کی سِل بن گیا ہے! ریمنڈ کیس کی پچ پر حکومت کی کئی وکٹیں گری ہیں۔ شاہ محمود اور سلمان بشیر تو ہاتھ سے نکلے ہی تھے، اتحادی بھی صدر زرداری کا ساتھ دینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یعنی اِس فلم کو فلاپ ہی سمجھنا چاہیے!
ریمنڈ ڈیوس وہ کانٹا ہے جس میں کئی مچھلیاں آ پھنسی ہیں۔ ایک طرف پنجاب کی حکومت ہے اور دوسری طرف وفاقی حکومت۔ دونوں کے درمیان ریمنڈ کے معاملے پر چپقلش ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ پنجاب حکومت کو کوئی ایسا معاملہ درکار تھا جس پر وفاقی حکومت کو جی بھر کے دباؤ میں رکھا جاسکے۔ ریمنڈ کیس نے یہ موقع بخوبی فراہم کیا ہے۔ ریمنڈ نے جرم بھی اس قدر دیدہ دلیری سے کیا کہ پنجاب حکومت چاہتی تب بھی اُسے رہا نہیں کرسکتی تھی! عدلیہ کے لئے حقیقی

ٹیسٹ کیس تو اب آیا ہے۔ واحد سپر پاور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے گریز عدلیہ کی ساکھ کو بھی داؤ پر لگا دے گا۔

اور ان دونوں سے کہیں بڑھ کر خود اوبامہ انتظامیہ ہے جو ریمنڈ ڈیوس کو ہر قیمت پر آزاد اور امریکہ میں دیکھنا چاہتی ہے۔ امریکی فوج کو افغانستان میں سخت حالات کا سامنا ہے۔ کچھ تو طالبان نے اوبامہ انتظامیہ کو مشکل میں ڈال رکھا ہے اور رہی سہی کسر ریمنڈ نے پوری کردی۔ اگر ریمنڈ امریکی خواہشات کے مطابق رہا نہ ہوسکا تو براک اوبامہ کو دوسری مدت کے لئے صدر منتخب ہونے میں غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پاکستان کے بارے میں امریکی عوام میں عمومی تاثر یہ ہے کہ جب جی میں آئے، اِس ملک کے کان مروڑ کر جو بات بھی چاہو، منوالو! مگر اِس بار معاملہ خاصی ٹیڑھی کھیر ثابت ہوا ہے! امریکیوں کو پنجاب حکومت سے اِس قدر مزاحمت کی توقع نہ رہی ہوگی۔ ظاہر ہے لاہور میں ہر بار تو امریکیوں کی پھجے کے پائے اور لسی سے تواضع نہیں کی جاسکتی! امریکیوں کا خیال تھا کہ دو ایک دن میں معاملہ رفع دفع ہوجائے گا۔ ہو بھی جاتا مگر زہے نصیب! اب تو سوال عوام کے جذبات کا ہے، اگر وہ بپھر گئے تو اُن پر کون قابو پاسکے گا؟ امریکہ بہادر کا خوف بھلے ہی دامن گیر رہا ہو، مگر حکومت نے تیونس، مصر، بحرین اور یمن کی صورت حال کو بھی ضرور سامنے رکھ کر ممکنہ اقدامات پر غور کیا ہوگا۔ امریکہ بہت دور ہے اور عوام زمینی حقیقت

ہیں!

ریمنڈ کی رہائی کے لئے خود امریکی صدر نے بے تابی کا مظاہرہ کرکے بہت کچھ بیان کردیا ہے۔اِس بے تابی سے.براک اوبامہ کے "اناڑی پن" کے ساتھ ساتھ ریمنڈ کی خصوصی حیثیت بھی ظاہر ہوتی ہے! یہ اندازہ درست ثابت ہوتا جارہا ہے کہ ریمنڈ ڈیوس واقعی کوئی توپ چیز ہے۔الیکٹرانک میڈیا نے اس معاملے میں اپنا کردار مجموعی طور پر بہت عمدگی سے نبھایا ہے۔ ڈان نیوز کے طلعت حسین نے (یقیناً تفتیش کے نکات کی بنیاد پر) کہا ہے کہ سوال دو یا تین افراد کے قتل کا نہیں، ریمنڈ ڈیوس سے لاہور میں سری لنکن کرکٹ ٹیم پر حملے سمیت دہشت گردی کی تمام بڑی وارداتوں کے حوالے سے بھی پوچھ گچھ ہونی چاہیے! اس اعتبار سے دیکھیے تو ریمنڈ کی گرفتاری کو آخری اوور میں چھکّا مارنے سے تعبیر کیا جانا چاہیے!

اب تو امریکی ویب سائٹس نے بھی لکھنا شروع کردیا ہے کہ ریمنڈ ڈیوس سی آئی اے کا اہلکار ہے! اِس کے بعد اُس کی شناخت کا معاملہ تو طے ہوجانا چاہیے۔ ریمنڈ کی گرفتاری کے بعد سے قبائلی علاقوں میں ڈرون حملے بھی بند ہیں۔ یہ گویا اس امر پر تصدیق کی مہر ثبت کرنا ہے کہ ریمنڈ کا ڈرون حملوں سے براہ راست تعلق ہے۔ اُس کے سامان سے ڈرون حملوں میں استعمال ہونے والی چپ بھی

برآمد ہوئی ہے! اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ریمنڈ کی گرفتاری خود امریکہ پر ڈرون حملے سے کم نہیں!

ریمنڈ ڈیوس کیس ہمارے لئے بارود کا ڈھیر بھی ثابت ہو سکتا ہے اور ہیروں کی کان بھی! فیصلہ عدلیہ، حکومت، عوام۔۔ سبھی کے ہاتھ میں ہے! ہر قوم کے لئے ایک نہ ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب اُسے اپنے وجود کو دوبارہ دریافت کرنا پڑتا ہے، اپنی شناخت کا نئے سرے سے تعین کرنا پڑتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے جیسے سانحے کو بھی ہم بھول گئے۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم بیدار ہوں اور دنیا کو بتا دیں کہ ہم صرف جی نہیں رہے بلکہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں؟

ریمنڈ ڈیوس سے خصوصی انٹرویو

آپ دریا کے کنارے بیٹھے ہوں، شکار کا شوق پورا کرنے کے لئے بس "ایویں ای" کانٹا دریا میں ڈال رکھا ہو اور اچانک کئی کلو کی مچھلی لگ جائے تو! کچھ ایسا ہی معاملہ ریمنڈ ڈیوس کا بھی ہے! دریائے راوی کے کنارے آباد لاہور میں وہ حالات کے کانٹے میں اپنا گلپھڑا دے بیٹھا ہے! دینے والے نے چھپڑ پھاڑ کر ریمنڈ کو ہماری جھولی میں ڈالا ہے۔ وہ ہائی پروفائل بندہ ہے اِس لئے اُس سے ملنا بہت مشکل کام ہے۔ پنجاب کی پولیس کے ہاتھ لگنے کے بعد اب خود ریمنڈ کی بھی اپنے آپ تک رسائی نہیں ہو پا رہی! سُنا ہے یہ امریکی ہرن اب ہاتھی ہونے کا اعتراف کرنے کی منزل تک پہنچ چکا ہے! ہم نے کئی "جُگاڑ" لڑائے تب کہیں جاکر ریمنڈ سے مل پائے اور لگے ہاتھوں آپ کے لئے اُس سے چند باتیں کیں۔ ریمنڈ سے گفتگو کے لئے ہمیں کسی مترجم کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ یہ امریکی پنچھی لاہوری پولیس کا دانہ چُگنے کے بعد اب ملی جُلی اردو اور پنجابی بولی بولنے لگا ہے!

....

پیدا ہونے کے بعد آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟

ریمنڈ: میں کچھ سمجھا نہیں؟

آپ نے لاہور دیکھ لیا ہے یعنی اب پیدا ہو گئے ہیں! ہمارے ہاں روایتاً یہ کہا جاتا ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ مرنے سے پہلے پیدا بھی ہو گئے!

ریمنڈ: آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے مگر اِس پیدائش میں تو "لیبر روم" کا بل بہت زیادہ آیا ہے!

یہ تو آپ کو پیدا ہونے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا! مگر خیر، ہم آپ کی مجبوری سمجھتے ہیں۔ یہ تو امریکیوں کا "کمپنی فالٹ" ہے؟

ریمنڈ: کون سا فالٹ؟

امریکی سوچنا جانتے اور چاہتے تو بات ہی کیا تھی! پالیسیوں سے تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ امریکیوں کو سوچنا نہیں آتا اور وہ سوچنے کے بارے میں شاید سوچنا چاہتے بھی نہیں!

اب ہمیں سوچنا پڑے گا۔ پاکستانی جاگ اٹھے ہیں۔ اگر ہم نے اب سوچے سمجھے بغیر کام کیا تو جنون ہو یا ڈیل، ہر دو طرح کا سَودا بہت مہنگا پڑے گا۔ ہم پاکستانیوں کو بالکل پُھس" قوم سمجھ بیٹھے تھے، مگر اب اپنی حماقت کا"

!احساس ہو رہا ہے

پنجاب کی پولیس سے "ٹاکرہ" کیسا رہا؟

ریمنڈ: وُنڈر فل۔ یعنی پنجاب پولیس عجوبہ ہے اور پورے کا پورا! آپ لوگوں نے بہت سی چیزوں کو خواہ مخواہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں شامل نہیں کرایا۔ پنجاب پولیس بھی اُن میں سے ایک ہے!

یہ بات آپ کس تجربے کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟

ریمنڈ: پنجاب پولیس بجائے خود ایک تجربہ ہے!

تفتیشی طریقہ کیسا لگا؟

ریمنڈ: شروع میں تو ایسا لگا جیسے وہ میرا دل بہلا رہے ہیں! مگر پھر اندازہ ہوا کہ تفریح اُن کی ہے اور کھلونا میں ہوں! تین چار دن بعد ذہن پر پڑے ہوئے پردے مزید ہٹے اور اندازہ ہوا کہ یہ سب تفریح وفریح نہیں، سیریس بزنس ہے! کئی بار محسوس ہوا کہ پولیس والے "فمبل" کر رہے ہیں کیونکہ وہ غلطی پر غلطی کرنے کے بعد سب کچھ نئے سرے سے شروع کرتے تھے! بعد میں معلوم ہوا کہ لاہور میں فلم انڈسٹری ہے اس لئے پولیس بھی "ری ٹیک" کی عادی ہو چکی ہے! ایک ہی بات کو چار پانچ طریقوں سے پوچھا جاتا ہے۔ ملزم کی سمجھ میں

کوئی ایک بات تو آ ہی جائے گی! اور چھتروں کے ری ٹیک سے تو بات خاصی تیزی سے سمجھ میں آتی ہے! مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔

وہ کیا؟

ریمنڈ: عجیب لوگ ہیں، جو بات اچھی طرح جانتے ہیں اُسے بھی ملزم کی زبان سے سُننا پسند کرتے ہیں!

مثلاً؟

ریمنڈ: پہلے دن ایک "فور۔ان۔ون" انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا۔ اوئے، کھوتے دے پُتر! تیرا ناں کی اے؟

لہجے سے میں سمجھ گیا تھا کہ اِس سوال کے اندر یا باہر کہیں کوئی جانور موجود ہے! پولیس کے مقرر کردہ ترجمان نے جب کسی نہ کسی طرح اِس جملے کو انگریزی میں مجھ تک منتقل کیا تو میں نے کہا بھائی! جب آپ نے مجھے کھوتے دا پُتر قرار دے ہی دیا ہے تو پھر نام پوچھنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے! ویسے بھی جو آپ کے ہتّھے چڑھ جائے وہ بالآخر کھوتا ہی ہو جاندا اے!

آپ تو پنجابی بڑی روانی سے بول لیتے ہیں۔

ریمنڈ: شالا نظر نہ لگے!

کیا پنجابی بولنے کی تربیت بھی سی آئی اے نے دی تھی ؟

ریمنڈ : جب پولیس والے "انگریزی" بول سکتے ہیں تو کیا میں پنجابی کا تھوڑا بہت حق ادا نہیں کر سکتا؟

ابتداء میں تو پنجابی سمجھنے میں خاصی دشوار پیش آتی ہو گی؟

ریمنڈ : بالکل نہیں۔

کیوں؟آپ کو تو پنجابی آتی نہیں تھی، پھر بات کس طرح سمجھ لیتے تھے؟

ریمنڈ : اہل پنجاب نے پنجابی میں خاصی باڈی لینگویج بھی شامل کردی ہے جس سے بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے ! لاہور میں جب پولیس افسران پنجابی میں سوال داغ رہے ہوتے ہیں تو لہجہ سب کچھ بیان کر رہا ہوتا ہے ! کبھی کبھی تو کچھ نہ کہنے پر بھی چہرے کی باڈی لینگویج (!) بہت کچھ کہہ رہی ہوتی ہے ! بالخصوص گالیوں کو سمجھنا تو چنداں دشوار نہیں!

سُنا ہے آپ کے پاس سے نسوار بھی برآمد ہوئی تھی!

ریمنڈ : خُدا کا قسم ہے، اب ہم نے نسوار لگانے سے توبہ کرلیا ہے!

کیوں؟

ریمنڈ: پولیس اہلکاروں نے میرے سامنے روئی کے پھائے میں چونا اور نسوار لگا کر چھپکلی ماری تو میں نے نسوار کے استعمال سے تائب ہوگیا! نسوار لگانے میں ایک دشواری اور بھی تھی۔

وہ کیا؟

ریمنڈ: نسوار کی ڈبیا کھولنے پر بار بار اپنی ہی شکل دیکھنی پڑتی تھی اور دِن خراب گزرتا تھا!

جیل میں کھانا پینا کیسا ہے؟

ریمنڈ: جو کچھ لاہوری کھاتے ہیں وہی مجھے بھی دیا جاتا ہے۔ نہاری، قورمہ،،بریانی، روسٹ اور کباب کھلا کھلا کر میرا ناک میں دم کردیا ہے! پانی مانگتا ہوں تو بڑے گلاس میں فالودہ دیتے ہیں۔ پندرہ دن میں شوگر ہوگئی مجھے۔

یہ شکوہ تو ناشکرا پن ہے۔ لوگ تو اِن مزوں کے لئے ترستے ہیں۔

ریمنڈ: تو میری جگہ لوگوں کو اندر کردو! اِس مہمان نوازی نے میرے معدے میں دماغ دریافت کرکے اُسے درست کردیا ہے!

آپ نے پھجے کے پایوں کا ذکر نہیں کیا؟

ریمنڈ: پھجے کے پائے؟ یہ کیا ہوتے ہیں؟

!آپ لاہور میں ہیں اور اب تک پھجے کے پائے نہیں کھائے، حیرت کی بات ہے

ریمنڈ: کوئی کھلائے گا تو کھاؤں گا۔ ٹھہرو، مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔ انویسٹی گیٹرز کو میں نے چکنے شوربے والی ڈش کھاتے دیکھا ہے۔ یہ لوگ "موٹے پائپ" کے اندر سے کچھ نکال کر کھاتے ہیں! کئی دن تک تو کھانے کے بعد یہ لوگ پائپ سے مجھے ڈراتے رہے! کہیں یہی تو پھجے کے پائے نہیں؟ ایک بار اُن لوگوں نے مجھے کھلانے کی کوشش کی مگر چکنائی سے میرے ہونٹ آپس میں چپک گئے۔ اِس سے پوچھ گچھ میں دشواری ! ہوئی اور اُنہوں نے پائے پر پابندی لگا دی

اب تو آپ نے سُکون کا سانس لیا ہوگا؟

ریمنڈ: کاہے کا سُکون؟ شروع میں ایک ہفتے تک یہ لوگ مجھے مختلف وڈیو کلپ دکھاتے رہے۔ میں سوچ سوچ کر تھک گیا کہ یہ سب کیا ہے! گمان گزرا شاید غیر ارضی مخلوق کی فوٹیج ہاتھ لگ گئی ہے! جب میں سوچ سوچ کر تھک گیا تو اُنہوں نے کرم کیا اور مجھے بتا دیا کہ یہ پنجابی فلموں کے سین ہیں! میں نے ہاتھ جوڑے کہ میرے اعصاب پر ایسے حملے نہ کرو، عدالتی فیصلے سے پہلے مجھے سزائے موت نہ دو! دنیا اِسے ماورائے عدالت قتل کہے گی! اِس پر ظالموں نے یہ دھمکی

دے کر قیامت ہی ڈھادی کہ اب بھی زبان نہ کھولی تو لاہور کے نگار خانوں میں پنجابی فلم کی شوٹنگ دیکھنے پر مجبور کریں گے! تب سے اب تک میرا منہ کُھلا کا کُھلا ہے اور !زبان رکنے کا نام نہیں لے رہی

اپنی حکومت کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ریمنڈ: عقل مند وہی ہے جو حالات کے مطابق چلے۔ اور ہماری حکومت بھی عقل مند ثابت ہوئی ہے۔

وہ کیسے؟

ریمنڈ: جب سے میڈیا نے میری پول پٹیاں کھولنا شروع کیا ہے تب سے امریکی حکومت بھی خاموش ہو گئی ہے! صدر اوباما نے ایک آدھ مرتبہ میری رہائی کے لئے بڑھک میں آ گئے ہیں تو mode اور mood ماری مگر جب دیکھا کہ میڈیا والے انکشاف کے !انہوں نے بھی چپ سادھ لی! شاید اپنی کسی پالیسی یا مُشیر کو کو سُونگھ لیا ہوگا

تو کیا یہ سمجھا جائے کہ امریکی خارجہ پالیسی آپ کو لے ڈوبی؟

ریمنڈ: خارجہ پالیسی بھی اور وزیر خارجہ بھی؟

کیا مطلب ؟

ریمنڈ : پاک امریکہ دوستی مستحکم کرنے کے لئے ہلیری کلنٹن خود تو شاہ محمود قریشی کے سر سے سر جوڑ کر ہاہاہی ہی کرتی رہی اور ہمیں ڈرون حملوں پر لگا دیا ! سچ ہے کہا ہے کسی نے۔۔۔

غریبوں کی قسمت میں رونا ہی رونا !

ہم مرید بابا کرکٹ شاہ کے

پاکستان جنوبی ایشیا میں ہے۔ اور جنوبی ایشیا کرکٹ میں سما گیا ہے! جب پورا خطہ کرکٹ کے جنون کی زد میں ہے تو پھر ہم کیوں پیچھے رہیں؟ لے دے کے اب بس اِسی قسم کا جنون تو رہ گیا ہے ہمارے لئے! ورلڈ کپ فُل سوئنگ میں ہے اور شائقین کا مزاج ریورس سوئنگ جیسا ہوچکا ہے! جسے دیکھیے وہ کرکٹ کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ کرکٹ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ کم از کم اپریل فول کے ایک دن بعد تک کے لئے کوڑا کرکٹ ہے!

ہمارے دامن میں کیا نہیں؟ مہنگائی، بیروزگاری، کرپشن، جہالت، امن و امان کا مسئلہ، ڈرون حملوں میں بے قصور انسانوں کی ہلاکتیں۔۔۔ سبھی کچھ تو ہے مگر لگتا ہے قوم نے حافظے کو جبراً عارضی رخصت پر بھیج دیا ہے! تمام معاملات ورلڈ کپ کے بعد تک ٹھہر گئے ہیں یا ٹھہرا دیئے گئے ہیں! آٹا، چینی، تیل، گھی، سبزی، پھل، گوشت، مسالوں اور دوسری بہت سی چیزوں کے دام ہم سے بات چیت بند کرنے کے بعد صرف آسمان سے باتیں کر رہے ہیں مگر اب ہمیں اِس غم نے ستانا چھوڑ دیا ہے! یہ ورلڈ کپ کا کمال ہے! مہنگائی پر احتجاج کرنا ہے؟ کیوں نہیں؟ ضرور کریں گے۔ نوکری ڈھونڈنی ہے؟ پیٹ کا معاملہ ہے اِس لئے ضروری ڈھونڈیں گے۔ وزیروں، مشیروں اور افسروں کی کرپشن کے خلاف آواز بلند

کرنی ہے؟ کیوں نہ کریں؟ یہ ہمارا حق اور فرض ہے۔ مگر بھئی، یہ سب کچھ ہوگا ورلڈ کپ کے بعد! اِس وقت تو ہمارے ذہنوں پر "ڈونٹ ڈسٹرب" اور "جسٹ میریڈ" کے بورڈ لگے ہوئے ہیں! ورلڈ کپ کے شامیانے میں کرکٹ سے شادی کے بعد اب قوم کا ہنی مون پیریڈ چل رہا ہے! سیاست دانوں نے مارچ میں مارچ کی تیاری کر رکھی تھی۔ مارچ تو مارچ، اب اپریل فول بھی ورلڈ کپ کے ریلے میں بہہ جائے گا! ورلڈ کپ کا سیلاب آیا ہے تو کرکٹ کا دریا کنارے توڑ کر بہہ نکلا ہے! یہ سیلاب بہت کچھ بہا لے جائے گا۔ اہل سیاست اگر وقت کی نزاکت کو سمجھیں تو احتجاج اور تحریک وغیرہ کو ایک !ڈیڑھ ماہ بعد پر اُٹھا رکھیں

قوم باقی سب کچھ بھول کر کرکٹ کے نام پر بیدار ہوئی تو ہے! اب اگر کسی لیڈر میں کر لے! زندگی بھلے ہی تیز نہ ہو، channelize ہمت ہے تو اس جوش و خروش کو کرکٹ تو تیز ہے! یہ بھی کیا کم ہے! کھلاڑی تیز رفتار ہیں اور اُن سے بھی تیز رفتار ہمارے "جذبے" ہیں! امریکیوں کے مظالم اور حکمرانوں کی بے حسی بھی جنہیں بیدار نہ !کر سکی وہ "جذبے" کرکٹ کے منتر سے پھر زندہ ہوگئے

اب رات دن ہم ہیں اور کرکٹ ہے۔ زندگی نو بال، وائڈ، ایل بی ڈبلیو اور رری پلے کے سانچے میں ڈھل گئی ہے! چولھے پر چڑھی ہانڈی جلتی ہے تو جل جائے، خواتین کچن سے بار بار ڈرائنگ روم کا رخ کرتی ہیں تاکہ کھلاڑی کے آؤٹ ہونے

یا چوکے چھکے کاری پلے دیکھ سکیں ! اور ہانڈی میں سالن ری پلے ہو ہو کر کالا بھجنگ ہو جاتا ہے ! کہا جاسکتا ہے کہ سالن بھی کرکٹ سے خواتین خانہ کی وابستگی اور وفاداری دیکھ کر جل جاتا ہے !

جن کی زندگی میں مشاغل خال خال ہیں وہ بھی کم از کم کرکٹ کا شغل تو پال ہی لیتے ہیں ! آج کل سرپرستی فرمانے اور چیزوں کو گود لینے کا چلن عام ہے۔ کوئی پارک کو گود لیتا ہے، تو کوئی اسکول کو۔ ہم نے من حیثیت القوم کرکٹ کو گود لے لیا ہے اور خود ورلڈ کپ کے آغوش میں ہیں !

کوئی اُفتاد اب ہماری اُفتادِ طبع کو بدل نہیں پاتی۔ حق تو یہ ہے کہ ہماری اُفتادِ طبع بجائے خود اُفتاد ہے جو ہم پر آن پڑی ہے ! زہے نصیب، کرکٹ نے ہم میں زندگی کی رمق پیدا کردی ہے، توانائی ہمارے بدن میں انگڑائیاں لیکر بیدار ہوتی جارہی ہے۔ "بابا کرکٹ شاہ" کی مُریدی اختیار کرتے اور ان کے آستانے پر جبین شوق کو جھکاتے ہی ہمارا ظاہر و باطن ایک ہوچکا ہے یعنی سب نے کرکٹ کو تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیا ہے ! مراقبے کی کیفیت ہے کہ ہم پر پیہم طاری ہے۔ کوئی حال بھی پوچھے تو منہ سے اسکور ہی نکلتا ہے ! شدید غصے کی حالت میں کسی کو گالی بھی دیجیے تو لگتا ہے مخالف ٹیم کے خلاف نعرہ لگ رہا ہے !

زندگی کے تمام بنیادی مسائل ہمارے لئے فی الحال ماضی کے مزار ہیں ! ہماری تمام مشکلات کو کرکٹ نے آنیستھیسیا دے دیا ہے ! میڈیا والے ہمارے ذوق وشوق کی لَے ٹوٹنے نہیں دیتے۔ میچ ختم ہوتا ہے تو کوئی نہ کوئی چینل اُسے دوبارہ پیش کرنے لگتا ہے۔ اور یوں ہم

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کی عملی تصویر بن کر رہ جاتے ہیں ! خواب دیکھیے تو کرکٹ کے، آنکھ کھلے تو کرکٹ، کھانے بیٹھو تو کرکٹ، گھر سے نکلو تو کرکٹ، گھر میں آؤ تو کرکٹ۔ شریفوں کے کھیل نے بدمعاش اور منہ زور ریلے کی شکل اختیار کرلی ہے اور ہمیں بہائے لئے جارہا ہے!

کراچی میں اچھے خاصے بارش کے آثار تھے۔ "انتہائے کرم" دیکھیے کہ دو چار بوندیں برس بھی گئی تھیں مگر جب کرکٹ کے بادل چھائے تو پانی والے بادلوں نے رختِ سفر باندھ لیا! موسم نے سوچا ہوگا جب لوگ کرکٹ کی بارش سے جل تھل ہوگئے ہوں تو پانی بے چارا برس کر کیا کرے گا؟

تصوراتی پچ پر ہم ہر مسئلے کو گیند سمجھ کر چوکے یا چھکے کی شکل میں میدان سے باہر پھینکنے کے درپے رہتے ہیں ! اور عملی زندگی کی کرکٹ میں ہم وکٹوں کے

درمیان دوڑنے پر یقین نہیں رکھتے! ایسے میں منی اسکرین کا دم غنیمت ہے کہ ہم
!کرکٹرز کو فارم میں دیکھ کر اُن کے بیٹ سے اپنی مرضی کے چھکے لگا رہے ہوتے ہیں
کرکٹ رفتہ رفتہ ہمارے مزاج کے مطابق ہوتی جارہی ہے۔ پانچ دن کی ٹیسٹ کرکٹ سے
معاملہ ایک روزہ میچوں تک پہنچا اور اب ٹوئنٹی ٹوئنٹی کا دور ہے۔ ہم سب یہی تو چاہتے
ہیں۔۔۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اسکور! کل کو اگر میچوں کا فیصلہ محض
ٹاس پر ہونے لگے تو شاید کسی کو حیرت نہ ہوگی! فی الحال تو کرکٹ نے ہم سے ٹاس
!جیت لیا ہے اور خوب بیٹنگ کر رہی ہے

سیاسی مرغوں کی یومیہ لڑائی

مرُدم خیز ہونے کا دعویٰ تو شاید مبالغہ آرائی اور تعلّی پر محمول کیا جائے مگر ہاں، ہمارا خطہ سیاسی اعتبار سے خاصا "مُرغم خیز" ہوتا جارہا ہے! بٹیر بازی، کبوتر بازی اور دوسری بہت سے بازیوں کی طرح مُرغ بازی بھی ہمارے مزاج کا حصہ رہی ہے۔ دیہی علاقوں میں آج بھی لوگ کبوتر بازی اور بٹیر بازی کے ہاتھوں وقت کی بازی ہارتے رہتے ہیں! دیہی کلچر میں چونکہ وقت کو صَرف کرنا بھی ایک کام ہے اِس لئے دیگر بازیوں کے ساتھ ساتھ مُرغ بازی یعنی مُرغے لڑانا بھی مزاج میں شامل ہے۔
شہروں میں البتہ اب یہ بازی اپنی بازی ہار چکی ہے! ایسا نہیں ہے کہ مُرغے میدان چھوڑ گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میدان بدل گیا ہے۔ قدرتی مُرغوں کے لئے اب صرف دستر خوان کا میدان رہ گیا ہے!
میڈیا کی ترقی نے مُرغوں کی اوقات بدل دی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مُرغوں کی لڑائی انسانوں کے درمیان تصادم تک جا پہنچتی تھی۔ مُرغے کی شکست اُس کے مالک کی شکست تصور کی جاتی تھی۔ وہ زمانے اب لد گئے۔ مُرغوں کی لڑائی ہمارے کلچر سے غائب ہوتی جارہی ہے۔ سبب اِس کا یہ ہے کہ اب مُرغے نہیں لڑتے بلکہ (بُھنے ہوئے) مُرغوں پر ہم لڑتے ہیں! رہ گئی لڑائی تو وہ اب سیاسی مُرغوں

!ے درمیان کرائی جاتی ہے
سیاسی مُرغوں کی یومیہ لڑائی آپ نے ضرور دیکھی ہو گی۔ اگر نہیں دیکھی تو پرائم ٹائم میں ٹی وی سیٹ آن کیجیے، ہر نیوز چینل پر چند سیاسی مُرغے چونچم چونچ یعنی لڑتے ہوئے ملیں گے ! کرنٹ افیئرز کے پروگراموں میں اب سیاسی جماعتیں مُرغے بھیجتی ہیں جو !جان لڑا کر لڑتے ہیں اور ناظرین کو بھرپور تفریح بہم پہنچاتے ہیں

سیاست اور کاروبار اب ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔ سیاسی جماعتیں بھی اب مارکیٹ کے ٹرینڈ کو دیکھ کر پالیسی اور حکمت عملی بدلتی ہیں۔ مارکیٹ میں جو چیز چل رہی ہو وہی چیز وہ پیش کرتی ہیں۔

ٹی وی کے نیوز چینلز نے اپنے وجود کا بھرم رکھتے ہوئے بہت سی نامعقول روایات کو جنم دیا ہے۔ حالاتِ حاضرہ پر بحث کی آڑ میں سیاسی مُرغوں کی لڑائی اِن روایات میں سرفہرست ہے۔ سیاسی جماعتیں حالاتِ حاضرہ پر بحث کے لئے بندے خوب تیار کرتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب سیاسی ضرورت کے تحت چند غنڈے پالے جاتے تھے۔ سیاسی جماعتوں میں اب پرورش کے دائرے میں سیاسی مُرغے بھی آ گئے ہیں ! پرائم ٹائم میں بکواس کی بازی جیتنے کے لئے خوب چھان پھٹک کر

ایسے مُرغے لائے جاتے ہیں جن کی چونچ لمبی ہو اور ٹکڑوں کوں کی آڑ میں، موقع کی مناسبت سے، بھونک بھی سکیں! اِنہیں خوب کھلا پلا کر لائیو منی اسکرین دنگل کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ لوگ دیکھتے اور حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ کرنٹ افیئرز کے ٹاک شو میں حصہ لینے والی سیاسی مخلوق ایک گھنٹے کے لائیو پروگرام میں ارتقاء کے کئی مراحل طے کرتی ہوئی کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے! ٹاک شو میں شریک سیاسی مُرغے کبھی شیر کی طرح غُرّاتے اور دہاڑتے ہیں، پھر گوٹ پھنسنے پر بھیگی بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرنے لگتے ہیں، اینکر کی سپورٹ نہ ملنے پر چُوں چُوں کے پنجرے میں بند ہو جاتے ہیں اور سپورٹ ملنے پر ہاؤ ہو کرنے پر تُل جاتے ہیں! یہ ارتقائی مراحل اگر چارلس ڈارون بھی دیکھ لے تو دانتوں تلے انگلیاں دبا کر رہ جائے!

ٹی وی چینلز کا یومیہ سیاسی دنگل اب ہماری نفسیاتی ساخت کا حصہ بن چکا ہے۔ لوگ اِس دنگل سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ سیاسی دنیا میں رہتے ہوئے کس طور غیر سیاسی حرکتیں کرنی ہیں، کتنی ڈِھٹائی سے سچ کو جھوٹ اور سیاہ کو سفید قرار دینا ہے، حریف کے تمام نکات کو مرحلہ وار تسلیم کرکے آخر میں کس طرح اپنی تمام باتوں سے یکسر مُکر جانا ہے! سیاسی مُرغوں کی لڑائی ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن جانا کیا ہوتا ہے! اب خواتین خانہ پڑوسنوں کو یہ طعنے دینے لگی ہیں کہ تم تو پرسوں کی بات سے

!ایسے لکر رہی ہو جیسے کسی ٹاک شو میں بیٹھی ہو

کون سی تفریح ہے جو سیاسی مُرغوں کے ڈیلی فیسٹیول میں نہیں پائی جاتی ؟ کئی ممالک میں ٹماٹر، مالٹے اور دوسرے پھلوں سے ایک دوسرے کو مارنے کا تہوار سال میں ایک بار منایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ تہوار ٹی وی پر روزانہ منایا جاتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ سڑے ہوئے انڈے، گلے ہوئے پھل اور اِسی قبیل کی دوسری چیزیں ماری تو جاتی ہیں، دکھائی نہیں دیتیں ! ٹاک شو کے ڈیلی فیچرز میں تھوک سے جھاگ اُڑانا اور ایک دوسرے پر باتوں کا کیچڑ پھینکنا بھی شامل ہے ! دنیا اگر یہ ٹاک شو دیکھنا شروع کرے تو جذباتی اداکاری کے بہت سے اسرار و رموز آسانی سے سیکھ سکتی ہے ! یہ ٹاک شو آپ کو غیر ارضی مخلوق کی ممکنہ طرزِ عمل سے شناسا ہونے میں بھی خاصی مدد دے سکتے ہیں ! کیونکہ اِن کے بیشتر شرکاء کسی اور دنیا کی مخلوق معلوم ہوتے ہیں

کبھی آپ نے فٹ پاتھ پر شعبدے بازوں کا فن ملاحظہ کیا ہے؟ وہ مجمع کو خالی ہاتھ دکھاتے ہیں اور پھر فضا میں ہاتھ لہراتے ہی مٹھی میں انڈا یا سکّہ آ جاتا ہے۔ بس کچھ کچھ ایسا ہی تماشا سیاسی مُرغوں کی لڑائی میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے ! جس بات کا سارے فسانے میں کہیں ذکر نہیں ہوتا اُسی بات کو یہ بہت خوبصورتی سے بحث کے موضوع میں تبدیل کر دیتے ہیں ! خوبی یہ ہے کہ ایک

گھنٹے کی طویل بحث کے دوران بولنے والے کو اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا اور کیوں بول رہا ہے اور سُننے والے بھی محظوظ ہونے کے بعد دامن جھاڑ کر اُٹھ جاتے ہیں، یعنی کچھ یاد نہیں رہتا! روزانہ ایک سی باتیں کی جاتی ہیں اور مجال ہے کہ کوئی بیزاری محسوس کرے! بولتے بولتے کہیں سے کہیں نکل جانے کا فن اگر سیکھنا ہے تو سیاسی مُرغوں سے سیکھیے! نان اِشو کو اِشو بنانا اِن کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ سیاسی جماعتوں کا احسان ماننا پڑے گا کہ اُن کی مہربانی سے ہمارے ہاں اب تک مُرغ بازی کی روایت سلامت اور تابندہ ہے!

مذاق ہی مذاق میں

یہ بھی عجب چلن ہے کہ جن معاملات میں مصروف رہ کر زندگی بسر کی جاتی ہے اُنہی کے بارے میں تحقیق پر تحقیق کی جاتی ہے! معاشی امور کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ معاشی امور سے متعلق کانفرنس ہو رہی تھی۔ دنیا بھر سے ماہرین آئے ہوئے تھے۔ جدید معاشی نظریات پر بحثیں ہو رہی تھیں۔ ترقی یافتہ دنیا کے سرکردہ ماہرین اپنی اپنی معیشت کو رول ماڈل کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ ان کی بات غلط بھی نہ تھی۔ جس نے بھرپور کامیابی حاصل کرلی ہو اسے ضرور اپنے آپ کو دنیا کے سامنے مثال کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے۔ جہاں ماہرین جمع ہوں وہاں ایک ایک نکتے پر گرما گرم بحث ناگزیر ہوتی ہے۔ جس کانفرنس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ ماہرین ایک دوسرے کی کھال اتارنے پر تُلے ہوئے تھے اور حاضرین معاشی امور پر دسترس رکھنے والوں کی لڑائی سے محظوظ اور متاثر ہو رہے تھے۔

کانفرنس ختم ہوئی تو میڈیا سے ملاقات کا سیشن تھا۔ میڈیا والوں کے تابڑ توڑ حملوں کا ماہرین نے خاصا تسلی بخش جواب دیا۔ مگر پھر اچانک کچھ ایسا ہوا کہ تمام ماہرین تیزی سے گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ حاضرین یہ سمجھے کہ

بم کی دھمکی ملی ہے۔ سبھی ایک ایک کرکے وہاں سے کھسکنے لگے۔ میڈیا والے کہاں پیچھے رہنے والے تھے!

سانورے کی بنسی کو بجنے سے کام

رادھا کا بھی شیام، وہ تو میرا کا بھی شیام

یعنی یہ کہ جہاں خبر وہاں میڈیا۔ اچھے۔برے یا صحیح غلط کا فیصلہ تو عوام کو کرنا ہے۔ میڈیا والے خبر کی تلاش میں ماہرین کا تعاقب کرنے لگے۔ جگمگاتی، چمچماتی گاڑیوں کا قافلہ ایک پس ماندہ بستی کی طرف رواں تھا۔ کچھ ہی دیر میں تمام گاڑیاں غریب بستی کے ایک عالی شان مکان کے سامنے کھڑی تھیں۔ ماہرین گاڑیوں سے باہر آئے اور صاحب خانہ سے بتیانے لگے۔ آن کی آن میں وہاں میلہ لگ گیا۔ ڈی ایس این جیز قطار بند ہو گئیں۔

ماہرین اس شاندار مکان کے مالک سے خاصے متاثر اور مرعوب دکھائی دے رہے تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ زندگی کو کامیاب اور آسان کس طور بنایا جا سکتا ہے۔ صاحب خانہ انہیں بہت کچھ بتا رہے تھے مگر جو بتانا چاہیے تھا وہ نہیں بتا رہے تھے! چہ مگوئیوں کا بازار گرم ہوا۔ ماہرین بے تاب تھے کہ جو کچھ وہ جاننا چاہتے ہیں وہ جلد از جلد بتایا جائے۔ مگر صاحب خانہ تھے کہ کسی طور زبان کھولنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ماہرین کے دماغ کس طور چکرائے بغیر رہ سکتے

تھے؟ وہ یہ جاننے کے خواہش مند تھے کہ کوئی معمولی سرکاری ملازم شاندار چار منزلہ مکان میں پُر تعیش لائف اسٹائل کو کس طور افورڈ کرسکتا ہے! 17 ہزار ماہانہ کمانے والا کلرک کس طرح گھر میں دو بیویاں، تین کاریں اور چار نوکر رکھ سکتا ہے! مگر حقیقت تو اپنی جگہ ہے، یعنی یہ کہ وہ افورڈ تو کر رہا ہے!

لاکھ اصرار کرنے پر بھی وہ اللہ کا بندہ "ٹریڈ سیکریٹ" بتانے پر آمادہ نہ ہوا۔ یہ تو بزرگوں کے نسخے اور ٹوٹکے ہوتے ہیں جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے ہیں!

دنیا ہمیں دیکھ کر حیران ہوتی ہے اور ہم دنیا کو دیکھ کر ہنستے ہیں۔ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے "دقیانوسی" طریقے دیکھ کر انسان کو ہنسی ہی آسکتی ہے۔ اہل پاکستان نے ہر شعبے میں آسانیاں پیدا کیں ہیں۔ دنیا چاہے تو اِن آسانیوں سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ مگر تعصب کی انتہا دیکھیے کہ ہماری غیر معمولی آسانیوں کو چھوڑ کر دنیا مشکلات کو گلے لگائے ہوئے ہے! اِنسان دنیا میں آیا ہے تو اُس کا فرض ہے کہ دوسروں سے سیکھے اور سکھائے، مگر کیا کیجیے کہ کوئی ہم سے کچھ سیکھنے کے موڈ میں نہیں۔

دنیا بھر میں ترقی کی دوڑ جاری ہے۔ لوگ آگے بڑھنے کے لئے زندگی بھر کچھ نہ کچھ پڑھنے اور سیکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اگر انسان زندگی بھر محنت ہی کرتا رہے گا تو انجوائے کب کرے گا؟ ہمیں اس دنیا میں صرف محنت کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ اللہ نے بہت کچھ خلق کیا ہے جس پر غور کرنا اور مستفید ہونا لازم ہے۔ ترقی یافتہ اقوام نے ترقی کے عمل کو خاصا پیچیدہ بنا دیا ہے۔ فطری علوم اور اُن سے متعلق فنون کے معاملے میں ترقی یافتہ اقوام نے ایسا کھڑاگ کھڑا کیا ہے کہ دیکھ کر وحشت سی ہوتی ہے! بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بچہ جب ہوش سنبھالے تو اُسے سیکھنے کا پابند کر دیا جائے! علوم اور فنون نے انسان کو فنون لطیفہ کے ذوق سے محروم کر کے لطیفہ بنا دیا ہے! اب وقت آگیا ہے کہ دنیا بھر میں ترقی کا "پیراڈائم" تبدیل کیا جائے۔ اِس ذیل میں پاکستان بہتر خدمات فراہم کر سکتا ہے۔

ہمارے سرکاری افسران اور ملازمین دنیا کے لئے سکون اور راحت کی ایک روشن مثال ہیں۔ کوئی ہمارے سرکاری افسران کی طبع کی روانی دیکھے کہ کیسی smooth زندگی بسر کرتے ہیں! زندگی میں سب کچھ ہے اور محنت کا شائبہ تک نہیں ہوتا! کچھ کئے بغیر شاندار ترقی! کیا کہنے!

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو!

!دنیا اگر دیکھے اور سمجھ بھی پائے تو انگشت بہ دنداں رہ جائے
امریکہ کے بارے میں طرح طرح کی بے ڈھنگی باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ جمہوریت کے راگ الاپنے والے اِس ملک میں فلاح عامہ کے کاموں کے لئے کانگریس میں مہینوں بحث ہوتی رہتی ہے۔ اور جب فنڈز مختص ہو پاتے ہیں تب تک وہ لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہوتے ہیں جن کے لئے فنڈنگ درکار تھی! یہ جمہوریت نہیں، لطیفہ ہے! اگر یہی گڈ گورننس ہے تو ہم لنڈورے ہی بھلے! کوئی ہم سے سیکھے کہ قومی خزانے کو کس طرح استعمال کرنا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک معمولی سی سڑک بنانی ہو اور مہینوں بحث ہوتی رہے! تب تک کتنے ہی گھروں کا چولہا ٹھنڈا پڑا رہے گا! رزق کی تقسیم کو روکنا بے عقلی اور بمنزلہ گناہ ہے! حق تو یہ ہے کہ ہمارے منتخب نمائندوں اور اعلیٰ سرکاری افسران کے سامنے قومی خزانہ ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے! گویا گنگا بہہ رہی ہے، جب جی میں آیا ڈبکی لگالی اور نہال ہو لئے! کوئی خواہش تشنہ نہیں رہ پاتی۔ پتہ نہیں کیوں دنیا یہ آسان طریقہ نہیں اپناتی اور مشکلات میں گھری رہتی ہے! شاید دنیا کو مشکلات کی عادت پڑ گئی ہے! یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ زندگی سہولتیں پیدا کرنے اور اُن سے مستفید ہونے کے لئے ہے، رگڑا کھانے یا رگڑا لگانے کے لئے نہیں۔ ہماری سرکاری مشینری سے وابستہ افسران اور اہلکار اِس معاملے میں

!پوری دنیا کی رہنمائی کر سکتے ہیں

ہمیں تو یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوتی ہے کہ دنیا بھر میں اس امر پر تحقیق ہو رہی ہے کہ کام کے مقام یعنی دفتر، فیکٹری یا دکان وغیرہ کے ماحول کو کس طور ہلکا پھلکا اور معاشی سرگرمیوں کو راحت کے حصول میں معاون بنایا جائے۔ جو کام تحقیق کے بغیر آسانی سے ہو سکتا ہے اس لئے خواہ مخواہ سر اور آنکھیں پھوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارے ہاں !ورک پلیس کل بھی سکون اور راحت کا ذریعہ تھا اور آج بھی ہے

ہمارے بیشتر سرکاری دفاتر کا یہ حال ہے کہ لوگ ذہن پر کوئی بوجھ لئے بغیر آتے ہیں، حاضری لگا کر چائے پیتے ہیں اور کچھ دیر بعد گھر کی راہ لیتے ہیں! اِتنی سی بات ہے جس کے لئے ترقی یافتہ دنیا نے خواہ مخواہ تحقیق کا میلہ سجا رکھا ہے! دنیا اب جس کے پیچھے بھاگ رہی ہے وہ "کونسیپٹ" ہم بہت پہلے دے چکے ہیں۔ مگر بھئی، ہمیں کون پوچھتا ہے! جس کے پاس مغرب کی ڈگری ہو اور جس کے علم کے ساتھ تحقیق کا دُم چھلّا لگا ہو بس اُسی کی واہ واہ ہوتی ہے! مغرب کو صرف اس بات سے غرض ہے کہ اُس کی جامعات پرانے نظریات کو کروڑوں ڈالر خرچ کرکے تحقیق کا جامہ پہنائیں اور دنیا سے داد پائیں! ہم آئیڈیاز مفت بانٹ رہے ہیں مگر لوگ لیتے نہیں، یہ تو سراسر ناقدری اور بے اعتنائی

ہے!

دنیا کو اب یہ فکر لاحق ہوئی ہے کہ معاشی سرگرمیوں میں لطافت اور فرحت کا پہلو تلاش کیا جائے یعنی کسی کو کام کرتے وقت ذہن پر کوئی بوجھ محسوس نہ ہو۔ دیر ہی سے سہی مگر چلیے، خیال تو آیا۔ مگر ذرا دُنیا کا بھولپن تو دیکھیے کہ اُسے یہ معلوم ہی نہیں کہ ہم نے یہ تصور 6 دہائی قبل دیا تھا۔ اور اگر تعلّی یا خود پسندی نہ سمجھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ معاشی سرگرمیوں میں راحت اور انبساط اور انبساط کی کیفیت میں تھوڑی بہت معاشی جدوجہد کا تصور متعارف ہی ہم نے کرایا ہے!

آج بھی بیشتر پاکستانی کام کو تفریح سمجھتے ہیں۔اِس پل صراط سے وہ ایسے آسان گزر جاتے ہیں کہ ایک دنیا دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے! اور تفریحی سرگرمیوں میں ہم پاکستانی ایسے سنجیدہ اور کشیدگی زدہ دکھائی دیتے ہیں جیسے کچھ کمانے اور چولہا جلانے کا اہتمام کرنے گھر سے نکلے ہیں! دنیا کو اپنی ترقی کے لئے ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ اگر ہم تفریحی سرگرمیوں میں کھپانے والا جوش و خروش معاشی سرگرمیوں کی نذر کردیں تو ترقی یافتہ دنیا بس کھڑی کی کھڑی اپنی قسمت کو کوستی رہ جائے اور ہم کہیں سے کہیں جا نکلیں!

کرکٹ اب کرکٹ کہاں

مرزا تفصیل بیگ نے بیویوں اور صحافیوں والا مزاج پایا ہے۔ جہاں ذرا سا موقع ملتا ہے، پہلے تجسس میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر شک کرنے بیٹھ جاتے ہیں! کبھی کبھی تو وہ کچھ اِس انداز سے شک کرتے ہیں کہ فریق ثانی بس رشک کرتا رہ جاتا ہے! ہم نے بارہا یہ محسوس کیا ہے کہ سازش کا نظریہ شاید مرزا ہی کی اختراع ہے!
کرکٹ فیور کے تیور دیکھ کر مرزا تفصیل بیگ اپنی عادت کے مطابق مختلف شکوک میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ جہاں کہیں کرکٹ پر بحث ہو رہی ہوتی ہے، مرزا جھٹ ٹانگ اڑاتے ہیں اور اپنی بات منوا کر دم لیتے ہیں۔ کرکٹ ورلڈ کپ میں کوارٹر فائنل تک کے مرحلے کو بغور دیکھنے کے بعد مرزا نے فیصلہ سنادیا کہ سب کچھ طے شدہ ہے یعنی میچ فکسنگ عروج پر ہے۔ ہمیں اُن کی اِس بات سے شدید اختلاف ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ مرزا تو اچھی خاصی کرکٹ کو کچھ کا کچھ قرار دینے پر کمربستہ دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کوئی ٹیم کم اسکور پر آؤٹ ہو تو مرزا کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوئی باؤلر مار کھا رہا ہو تو مرزا کو ایسا لگتا ہے جیسے اُس نے مال کھا لیا ہے! بیٹسمین دم لگا کر چوکا یا چھکا مارے تو مرزا اُسے باؤلر کی بدنیتی کے کھاتے میں ڈالنے میں دیر نہیں لگاتے! اگر کوئی وکٹ کیپر

اپنی نااہلی کے باعث بھی کیچ چھوڑے تو مرزا اُس کا تعلق سٹّے بازوں سے جوڑنے میں دیر نہیں لگاتے! سٹّے باز بھی سوچتے ہوں گے کہ اُن کے کھاتے میں لوگ کیا کیا ڈال دیتے ہیں!

پاکستان اور بھارت کی ٹیمیں ورلڈ کے سیمی فائنل میں پہنچیں تو مرزا بھی پوری قوم سے ہم آہنگ ہوئے یعنی بیروزگاری، کرپشن، اقربا پروری، افلاس، افراط زر، ڈرون حملوں، ریمنڈ کی رہائی، عافیہ کی اسیری اور دوسرے تمام قومی اشوز کو بھلا کر صرف کرکٹ کے سمندر میں غوطے لگانے لگے۔ کرکٹ سے اُن کا شغف دیکھ کر ہم تشویش میں مبتلا ہوئے۔ کرکٹ اب چیز ہی ایسی ہے کہ اِس میں دلچسپی لینے والے پر پتہ نہیں کیا کیا گمان گزرنے لگتے ہیں!

کرکٹ میں اپنی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا سبب بھی مرزا نے خود ہی بیان کر دیا۔ ان کا فرمان ہے کہ کرکٹ سے پرفیوم کا کام لیا جارہا ہے! ہم مرزا کے دوست سہی، مگر اُن کا سا ذہن رسا کہاں سے لائیں۔ لاچار ہو کر ہم نے اُن سے پوچھا کہ کرکٹ کا پرفیوم سے کیا تعلق ہے؟

مرزا نے مہربانی فرماتے ہوئے وضاحت فرمائی "ہماری پوری زندگی تعفن زدہ ہے۔ کون سا مسئلہ ہے جو گل سڑ نہیں گیا؟ کس اشو کے سڑے ہوئے جسم سے تعفن کے

بھبکے نہیں اٹھ رہے؟ ایسے میں پرفیوم ہی سے تو کام لیا جائے گا۔ اور بِسکّہ بند اشوز کے "تعفن سے بچانے میں کرکٹ سے بڑھ کر پرفیوم کا کردار کون ادا کر سکتا ہے؟

ہم بچپن ہی سے کرکٹ کے دیوانے رہے ہیں اِس لئے جب کوئی ہمارے اِس پسندیدہ کھیل میں کیڑے نکالتا ہے یا اِسے کھیل کے سوا کچھ اور بیان کرتا ہے تو ایک آگ سی لگ جاتی ہے! فطری سی بات ہے کہ مرزا کی بات سے ہمیں اختلاف تھا۔ اور ہم نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اِس کا اظہار بھی کیا۔ بس پھر کیا تھا، مرزا تو جیسے پھٹ پڑے "تم بھی بڑے پختہ ہو، دو اور دو چار پر یقین رکھنے والے۔ یہ حساب کتاب چھوڑو۔ نیا زمانہ ہے، سبھی کچھ بدل گیا ہے۔ ایسے میں کرکٹ کو تبدیل ہونے سے کون روک سکتا ہے؟ تم اسکرین پر یارکر دیکھ کر خوش ہوتے ہو اور لوگ کرکٹ ہی کو یارکر کے طور پر استعمال کر رہے ہیں!"

ہم لاکھ باصلاحیت سہی مگر مرزا کی سی عقل کے حامل تو نہیں، اِس لئے اُن کی باتیں دَھنا دَھن ہمارے سر سے گزر رہی تھیں۔ ہم پر مزید مہربان ہوتے ہوئے مرزا نے وضاحت فرمائی "بھائی، بات یہ ہے کہ حالات کی کھڑا کنڈی میں بہت سے مسائل پڑے پڑے تعفن کا باعث بن رہے ہیں۔ قوم پریشانی کے عالم میں ناک پر رومال رکھے ہوئے ہے۔ ایسے میں اگر تھوڑی سے کرکٹ کا اسپرے کر دیا جائے تو

کیا ہرج ہے، تعفن چند ہفتوں یا مہینوں کے لئے دب ہی جائے گا۔ ویسے بھی کرکٹ کے
"بوجھ تلے بہت کچھ دب چکا ہے۔ قوم نے کرکٹ اور کرکٹرز کو سر پر بٹھا رکھا ہے۔

ہم نے عرض کیا محض کرکٹ سے کیا ہوگا؟ کیا لوگ سارے غم، تمام مسائل بھول بھال جائیں گے؟ کرکٹ فیور محض وقتی اُبال ہے۔ جب کرکٹ کی گرد بیٹھے گی تو لوگوں کو سب کچھ پھر یاد آنے لگے گا۔ مرزا نے "انتہائے شفقت" سے ہمارے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے کہا "دماغ ہلاؤ تو اِس میں کچھ داخل بھی ہو۔ اللہ کے بندے! جب لوگ کرکٹ کے بخار میں مبتلا رہیں گے تو بہت سی دائمی بیماریوں کو کچھ مدت کے لئے تو بھول ہی جائیں گے۔ اچھا ہے، پوری قوم "بوم بوم کرکٹ" کے چکر میں دو چار مہینے بُوم یعنی چغد بنی رہے اور اِس دوران حکومت کو بجٹ کے پُل صراط سے گزرنے میں کوئی دشواری "! پیش نہ آئے

مرزا کی باتوں نے ہمیں الجھن میں ڈال دیا۔ ہم تو کرکٹ کو خاصا شریفانہ کھیل سمجھ بیٹھے تھے اور اپنایا بھی اِسی لئے تھا کہ لوگ ہمیں بھی، اِسی بہانے، شُرفاء میں شمار کرلیں! اب جو مرزا نے "وضاحت" فرمائی تو خیال آیا کہ سیدھی سادہ کرکٹ کو ہم پتہ نہیں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے! گیند بلے کا کھیل تو خاصے بڑے کھیلوں کا جنم داتا نکلا! ہم نے سوچا بھی نہ تھا کہ کرکٹ جیسا

کھیل کبھی دو بڑے ممالک کے ایک ارب سے زائد افراد کو اپنے سحر میں اِس طور جکڑے
گا کہ پھر اُن کے لئے اِس سے نکلنا محال ہو جائے گا!
کل تک ہم کرکٹ پر سٹہ کھیلنے والوں کو بہت بُرا سمجھتے تھے مگر اب ہمیں اندازہ ہو چلا ہے
کہ ہماری سوچ خاصی محدود تھی۔ کھیل بُرا ہے نہ اِس کھیل کو کھیلنے والے بُرے ہیں۔
اگر بُرائی ہے تو اُن میں جو اِس کھیل سے کھیل رہے ہیں! جب حکومتیں ملوث ہو جائیں
تو کوئی بھی کھیل پھر کھیل کہاں رہتا ہے! کرکٹ اب کیا ہے، خوف کرکٹ کھیلنے والوں
کو بھی اندازہ نہیں!
مرزا کا استدلال ہے کہ پاکستانی قوم معقولیت کی تمام حدود پار کر چکی ہے۔ دل بہلانے
کے نام پر پتہ نہیں کیسے کیسے کھیل تماشوں کو گلے لگا لیا گیا ہے۔ اُن کی بات درست ہے
مگر حالات کی ستائی ہوئی قوم کرے تو کیا کرے؟ ہماری اِس بات پر مرزا نے قدرے
برہم ہو کر کہا "کھیل ہی کھیل میں ہم بہت آگے نکل آئے ہیں۔ یہ کہاں کی دانش مندی
ہے کہ کرکٹ میچ جیتنے کے لئے اجتماعی دعاؤں کا اہتمام کیا جائے؟ کسی بھی کھیل کو
روحانی اعصاب پر بھی سوار کرنا کس طور معقول قرار دیا جا سکتا ہے؟ دنیا کیا کہے گی؟ کیا
ہم پر ہنسے گی نہیں؟ ریمنڈ ڈیوس کی رہائی اور ڈرون حملوں کے تسلسل کو ہم بھول گئے۔
دو تین میچ کیا جیت لیے، ہمیں یاد ہی نہ رہا کہ ہم کیا کیا ہار بیٹھے ہیں! کیا اقوام کے حافظے

"اِس قدر کمزور ہوا کرتے ہیں؟

جب مرزا ہمیں آئینہ دِکھانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں بہت بُرا لگتا ہے۔ اور کیوں نہ لگے؟ ہم اُن کے پاس کوئی اِس لئے تو نہیں بیٹھتے کہ وہ ہمیں یوں ذلیل کریں اور آئینہ دِکھا دِکھا کر ضمیر جگانے کی کوشش کریں۔ ہم بھی پاکستانی قوم کا حصہ ہیں۔ ہم بھی گہری نیند کے مزے لوٹنا چاہتے ہیں۔ گوناگوں مسائل کو بھلا کر، نظرانداز کرکے ہم بھی پُرسکون" بیٹھنا چاہتے ہیں۔ اگر کرکٹ کی تھوڑی سی "ڈوز" ہمیں بہت سے غموں اور" پریشانیوں سے نجات دلانے کے لئے تیار ہے تو مرزا کو کیوں اعتراض ہے! ثابت ہوا کہ مرزا ہمارے حقیقی دوست نہیں اور ہمارا بھلا نہیں چاہتے۔ اگر وہ ہمارا بھلا چاہتے تو پاک بھارت سیمی فائنل سے قبل ہی منائے جانے والے جشن فتح میں خود بھی شریک ہوتے اور ہمیں بھی گھسیٹ کر شریک کرتے۔ قوم جشن منانا چاہتی تھی اور مرزا اُسے ریمنڈ ڈیوس کی رہائی اور عافیہ کی اسیری کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے! قوم سونا چاہتی تھی اور مرزا جیسے لوگ اُسے جگائے رکھنے پر مُصِر دکھائی دیئے!

کرکٹ کی کوکھ سے ابھی کیا کیا برآمد ہونا ہے، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ فی الحال تو کیفیت یہ ہے کہ ہم ہیں اور کرکٹ ہے۔ قوم سارے غم بھول جانا

چاہتی ہے۔ قومی غیرت کے معاملات پر پھر کبھی غور کریں گے۔ مہنگائی کا رونا تو عمر بھر روتے رہنا ہے۔ افلاس کون سا ہمیں چھوڑ کر جا رہا ہے؟ مگر مرزا کہاں باز آنے والے ہیں۔ بے چاری دکھوں کی ماری قوم کا ضمیر جگانے کی کوشش کرتے ہی رہیں گے۔ یہ گویا حکومت کے خلاف سازش ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ قوم کو اب کرکٹ کے سوا کچھ بھی یاد نہ رہے۔ نیند ٹوٹے گی تو بہت کچھ یاد بھی آئے گا اور سمجھ میں بھی آئے گا۔ کرکٹ کا سحر ختم ہوگا تو میڈیا کے ذریعے کوئی نیا سحر پھونک دیا جائے گا! حکومت پر قوم کا یہ بڑا احسان ہے کہ اُس نے اہل اقتدار و اختیار کا کام آسان کردیا ہے۔ "حکومت دوست" قومیں ایسی ہی ہوتی ہیں! شاید اِسی رویّے کا پھل ہے کہ حکمران ہمیں کسی نہ کسی طور زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اِس قدر نہیں نچوڑتے کہ وجود ہی مٹ جائے!

یہ مہنگائی بھی غنیمت ہے

ہمارے ملک کی مُرغیاں بھی عجب ناہنجار ہیں، روز مختلف نرخ کے انڈے دیتی ہیں! بھینس لاٹھی سے ہانکی جاتی ہے مگر اُسی بھینس کا دودھ ڈنڈا بن کر ہمارے سروں پر برس رہا ہے! انڈا اور دودھ مہنگا مل رہا ہے تو قصور مرغی کا ہے یا پھر بھینس کا، پتہ نہیں لوگ حکومت کو کیوں بیچ میں لے آتے ہیں! تیل کی قیمت بڑھنے پر بھی لوگ حکومت کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں مگر بھئی جن بیجوں سے تیل نکالا جاتا ہے وہی اگر کم نرخوں پر اُگنے سے انکار کردیں تو؟ معاملہ انڈے کا ہو یا خوردنی تیل کا، لوگ ہماری "معصوم" حکومت کو (مزید) بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے! یہی حال مرچ مسالوں کا ہے۔ پسا ہوا دھنیا ہو یا پسی ہوئی مرچ، ان چیزوں کی اوقات ہی کیا ہے، مگر اِن سب نے مل کر ہماری پیاری حکومت کے سر پر الزامات کا پوٹلا گرا دیا ہے!

دنیا بھر میں ماہرین ہاتھ جوڑ کر لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ کھانے میں نمک مرچ برائے نام رکھا جائے، مگر ہمارے ہاں لوگوں نے ہر ڈش کو مسالوں کی تحویل میں دے دیا ہے! اور سچ کہیے تو مسالوں نے ہمارے کھانوں کو گود لے لیا ہے! زندگی جیسی نعمت کو ہم نمک، مرچ، ہلدی اور ادرک کی محبت میں ضائع کرتے رہتے

ہیں اور الزام حکومت کے سر پر دھرتے ہیں ! دنیا بھر میں زندگی کا دامن وسیع کرنے کی تگ و دو جاری ہے۔ ہم دھارے کی مخالف سمت بہہ رہے ہیں۔ زندگی پھیلے گی تو زیادہ جگہ گھیرے گی۔ ہم نے خاصی محنت سے زندگی کو بریانی، حلیم، چائے، کافی، پراٹھوں اور شربت اور اِسی قبیل کی دیگر اشیاء تک محدود کر رکھا ہے!

بہت سی اقوام نے آزادی اور خود مختاری کے نام پر خواتین کو پتہ نہیں کیسے کیسے دھندوں میں الجھا دیا ہے۔ وہ مختلف شعبوں میں تگ و دو کرتی پھر رہی ہیں۔ جو تھوڑا بہت وقت بچتا ہے اُسے وہ بننے سنورنے پر لگا دیتی ہیں۔ یعنی غیبت اور لگائی بجھائی کے لئے بھی وقت نہیں بچتا! اگر اِدھر کی اُدھر لگانے کا وقت بھی نہ مل پائے تو کیسی کامیابی اور کہاں کی کامیابی! ہماری حکومت کا "بڑپّن" دیکھیے کہ اُس نے خواتین کو دوبارہ کچن اور چار دیواری کے زندان میں ڈال دیا ہے۔ سویرے آنکھ کھلتے ہی خواتین کو کھانا پکانے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے، یعنی حقوق نسواں کی بحث، خواتین کے لئے امکانات تلاش کرنے کی فکر اور اسی قبیل کے دیگر جھمیلوں سے جان چھوٹ گئی ہے!

لوگ مہنگائی کا رونا روتے نہیں تھکتے اور حکومت پر تنقید اور تبرّے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مگر صاحب اپنے کئے دھرے کے لئے حکومت کو

موردِ الزام ٹھہرانا کوئی اچھی بات نہیں۔ لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری "ہر دل عزیز" حکومت نے لوگوں کو مشن سے محروم نہیں رکھا۔ زندگی کسی واضح مشن کے بغیر گزرے تو کس کام کی؟ یہ حکومتِ وقت کی مہربانی ہے کہ اب دو وقت کی روٹی کا حصول بھی مشن کا درجہ رکھتا ہے! لوگ زندگی میں مقصدیت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ اور ذرا یہ دیکھیے کہ ہماری اسمارٹ حکومت نے اِس منزل کو کس قدر آسان کر دیا ہے۔ کسی نہ کسی طرح سانسوں کے تسلسل کو برقرار رکھنا اب ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ یعنی بقول غالب

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا!

دنیا پتہ نہیں کس دنیا میں رہتی ہے۔ جس طرف دیکھیے، تحقیق کا بازار گرم ہے۔ مگر ہمیں تحقیق کے موضوعات پر اختلاف ہے۔ دنیا ذرا ہماری طرف آئے تو ہم بتائیں کہ زندگی کے کن کن بنیادی پہلوؤں پر دادِ تحقیق دی جاسکتی ہے۔ ایسی حکومت کہاں ملے گی جو عام آدمی کو مفکر بناکر عیاشی سے بچالے؟ رات جیسے تیسے بسر ہونے پر صبح آنکھ کھلتے ہی ہمیں روزی روٹی کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ یہ معاملہ اب ایسی شدت اختیار کر گیا ہے کہ کیا زید اور کیا بکر، سبھی مفکر، بلکہ متفکر ہو کر رہ گئے ہیں! پیٹ کی آگ بجھانے کی فکر سے فارغ ہوں گے تو ہم عیاشیوں کے بارے میں بھی سوچیں گے۔ قوم کو عیاشی سے بچانے کا ایسا نُسخہ کس حکومت کے پاس ہوگا؟

زندگی ہمیں اِس لئے ملی ہے کہ اِسے آسان بنائیں اورپُرسکون انداز سے بسر کریں۔ دنیا ہے کہ مہم جوئی میں مصروف ہے۔ کوئی پہاڑ پر چڑھ رہا ہے، کوئی سائیکل پر دنیا کا چکّر کاٹنے نکلا ہے، کسی کو جنگلی جانوروں کے رہن سہن پر تحقیق کی فکر لاحق ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ جنگلوں میں بھٹکیے اور صحراؤں کی خاک چھانتے پھریے۔ زندگی ایسی ہی باتوں سے تو ضائع ہوتی ہے۔ گوشت، سبزی، دودھ، دہی، گھی، تیل، چاول، آٹا، چینی اور ایسی ہی مزید دس پندرہ چیزیں کافی ہیں۔۔ زندگی کو "بامقصد" بنانے کے لئے! زمانے بھر کے غموں اور جھمیلوں کو ہم کہاں ڈھونڈتے اور پالتے پھریں گے! زہے نصیب، پانی، بجلی اور گیس کے بلوں کی مہربانی سے اب لوگ عشق وشق بھی بھول گئے ہیں!

کبھی آپ نے ترقی یافتہ ممالک کے بارے میں دستاویزی فلمیں دیکھی ہیں؟ لوگ گھر سے نکلتے ہیں اورپُرتکلف ٹرینوں یا بسوں میں بیٹھ کر دفتر، دکان یا فیکٹری پہنچتے ہیں۔ اور اِدھر ہم ہیں کہ اِس یومیہ سفر کو بھی مہم جوئی میں تبدیل کردیا ہے! اب ہم کسی کو کیسے سمجھائیں کہ بس کی چھت پر بیٹھ، پائیدان پر لٹک کر کام پر جانا کتنا بڑا ایڈونچر ہے! جن کا سفر "پُرتکلف" ہے وہ اس "پُرتکلیف" سفر کی نزاکت کو بھلا کیا جانیں!

ایک زمانہ تھا کہ جب بارش ہوتی تھی تو پیڑوں پر جھولے ڈالے جاتے تھے اور سکھیاں ایک دوسرے کو جھولا جھلاتی تھیں۔ اِدھر چند بوندیں آسمان سے ٹپکیں اور اُدھر کڑھائی میں تیل ڈال کر پکوڑے تلنے کی فکر لاحق ہو جایا کرتی تھی۔ "درخشاں" روایات کی اِس چونچلے بازی میں خواتین کا اچھا خاصا وقت ضائع ہوتا تھا۔ حکومت نے اب ایسے حالات پیدا کئے ہیں کہ بارش ہوتی ہے تو خواتین کو ٹپکتی چھت کے نیچے برتن رکھنے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے! غریبوں کے پاس پانی ذخیرہ کرنے کی اب یہی ایک موثر، قدرتی صورت رہ گئی ہے! پانی اللہ کی نعمت ہے۔ اللہ کی نعمت نالی میں بہے، اِس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ محفوظ کرکے بروئے کار لائی جائے!

یہ بھی مہنگائی کی کرامت ہے کہ غریبوں سے یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں۔ اب تو خیر سے چادر ہی نہیں رہی! ہاں، سر پر آسمان کی چادر تنی ہے اور پاؤں پھیلانے کے لئے اللہ کی زمین کیا کم ہے! رہی صحت عامہ تو اس کا حال بھی خاصا غریب نواز ہے۔ اول تو کوئی بڑی بیماری کسی غریب کے پاس پھٹکتی نہیں۔ اور اگر بھولے سے اُس کی طرف آ نکلے تو جان لے کر ٹلتی ہے، غریب کو حالات کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتی! بڑے ہسپتالوں کو کھلی چھوٹ دی جاچکی ہے کہ علاج کے نام پر جو چاہیں، چارج کریں۔ ہسپتالوں سے ڈسچارج ہونے کے بعد لوگ کئی سال تک خود کو مالی طور پر ری چارج کرتے پھرتے ہیں!

غریبوں کا تو یہ حال ہے کہ ہسپتال کے چارجز سُن کر ہی ملکِ عدم کے راہی ہو جاتے ہیں!

ہم تو اس کرکٹ کے ہاتھوں مر چلے

زمانے میں اور بھی غم ہیں۔ غموں کے ہونے سے کس کو انکار ہے، ہوتے ہوں گے۔ مگر بھئی، اِس وقت ہمیں کوئی آواز نہ دے۔ کرکٹ ہے اور ہم ہیں۔ ویسے تو کرکٹ ہی کافی ہے۔ اور اگر کرکٹ کی شراب میں پاک بھارت کشیدگی کو بھی ملا دیا جائے تو نشہ کیونکر دو آتشہ نہ ہوگا؟

مرزا تنقید بیگ کرکٹ کے بحر ناپیدا کنار میں ایسے ڈوبے ہیں کہ اب ان کا نام و نشان تک نہیں مل رہا۔ ویسے دیکھیے اور سوچیے تو کہاں کرکٹ اور کہاں مرزا! مگر بھئی کرکٹ ہی تو ہے جس نے لوگوں کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ اور ایسا دیوانہ بنا رکھا ہے کہ قوم نے ریمنڈ ڈیوس، مہنگائی، ٹیکس، بیروزگاری، افلاس، کرپشن اور دیگر تمام غموں کو بھلا رکھا ہے! دکھ درد تو زندگی بھر کے ساتھی ہیں۔ اور جب ساتھی ہیں تو تکلیف دیتے ہی رہیں گے۔ اب کیا قوم گھڑی دو گھڑی کے لئے کرکٹ کے سمندر میں ڈبکی بھی نہ لگائے! مہنگائی کا رونا تو مرتے دم تک رونا ہے۔ ورلڈ کپ تو دو چار دن میں ختم ہو جائے گا۔ مرزا تنقید بیگ کو کرکٹ اچانک اس قدر کیوں بھانے لگی ہے، یہ بات سمجھ میں

نہیں آئی۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ وہ بھی.برساتی مینڈک ہیں یعنی دوسرے کروڑوں اہل وطن کی طرح ورلڈ کپ کے طفیل کرکٹ میں چار روزہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ مگر پھر خیال آیا کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ ان کی بیگم نے خدشہ ظاہر کیا تو ہم نے قسم دے کر پوچھا کہ کہیں سٹہ تو نہیں کھیلنے لگے ! آج کل جو کرکٹ کا زیادہ دیوانہ ہو اس پر سٹے باز ہونے کا گمان گزرتا ہے ! ظالموں نے کھیل کے ساتھ ایسی کھلواڑ کی ہے کہ کوئی بالر فٹنس کی خرابی یا اندازے کی غلطی سے بھی نو بال کر بیٹھے تو گمان گزرتا ہے کہ کہیں دشمنوں نے خرید تو نہیں لیا!

جب ہم نے مرزا کے سامنے سٹّے کے خدشے کا اظہار کیا تو ایسی زندہ دلی سے ہنسے جیسے کبھی پاکستانی قوم کا حصہ رہے ہی نہیں اور کوئی غم لاحق رہا ہی نہیں ! ویسے بھی مرزا ہر معاملے کو ہنسی میں اڑانے کے قائل ہیں۔ ہاں، گھریلو زندگی کے معاملے میں اس روش پر چلنا انہیں کچھ مہنگا پڑ گیا ہے۔ مگر خیر، کوئی بات نہیں۔ مہنگائی.برداشت کرنے کی ویسے بھی عادت پڑ چکی ہے!

ایک دن ہم نے مرزا سے پوچھا کہ کرکٹ میں ایسا کیا نظر آ گیا ہے کہ ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟ کہنے لگے "اب یہ کھیل نہیں رہا، آرٹ بن گیا ہے۔" ہم نے پوچھا وہ کیسے؟ بولے "کرکٹ میں اب کھیل کم اور فنکاری زیادہ ہے ! جو دکھائی دیتا ہے وہ ہوتا نہیں اور میچ کا نتیجہ نکلنے کے بعد ہمیں معلوم

"! ہو پاتا ہے کہ پس پردہ ہوا کیا ہے

ہمارا سر تو چکرا کر رہ گیا! ہم بچپن سے کرکٹ کے شیدائی رہے ہیں۔ اِس ایک عشق کے بعد کوئی دوسرا عشق وشق بھی نہ کرسکے۔ مرزا نے کرکٹ کے بارے میں جو رائے دی وہ ایسی ہی تھی جیسے کسی باحیا اور عفت مآب عورت پر الزام لگایا جائے! کرکٹ تو ویسے بھی شریفوں کا کھیل سمجھا جاتا ہے۔ اب یہ نہ سمجھیے گا کہ شریفوں میں شمار ہونے کے لئے ہم نے کرکٹ کو گلے لگایا تھا! انسان کو کوئی نہ کوئی کھیل تو اپنی زندگی میں شامل کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہم کرکٹ کی طرف اِس لئے جھک گئے کہ اس میں بھاگ دوڑ کم !کم ہوتی ہے

مرزا نے ہمیں ہکّا بکّا دیکھا تو وضاحت فرمائی "میاں جس دکان میں تمام ضروری اشیاء مل جائیں وہ کیسی چلے گی؟" ہم نے کہا ایسی دکان تو سرپٹ چلے گی، بلکہ دوڑے گی۔ مرزا نے کہا "بس، کرکٹ کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اِس ایک دستر خوان پر اب دنیا بھر کی "! نعمتیں چُن دی گئی ہیں۔ جس کا جو جی چاہے، کھائے

ہم تو کرکٹ کو پتہ نہیں کیا سمجھ بیٹھے تھے۔ مرزا نے جو کچھ کہا اُس نے گویا آنکھوں پر پڑے پردے ہٹا دیئے۔ غور کیا تو اندازہ ہوا کہ کرکٹ واقعی آج

بھی چند پردہ نشیں شریفوں ہی کا کھیل ہے! شاعر نے شاید کرکٹ کے نام پر کھیلے جانے والے کھیل کے حوالے ہی سے کہا ہے
!اِس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں
ورلڈ کپ کیا آیا، کسی کے ارمان پورے ہوئے اور کسی کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔
پاکستان میں کرکٹ کو ختم کرنے کے درپے عناصر کو یہ دیکھ کر مایوسی ہی ہوئی ہوگی کہ لاکھ کوشش کے باوجود پاکستان اور پاکستانیوں میں کرکٹ نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ پہلے سے کہیں توانا ہے! لوگوں نے سٹّے بازی اور میچ فکسنگ کی آڑ میں پاکستان بدنام کیا، ٹیم کے لئے ریڑھ کی ہڈی سمجھے جانے والے محمد آصف، محمد عامر اور سلمان بٹ پر اسپاٹ فکسنگ کے الزام میں پابندی بھی لگوائی گئی، پاکستان سے ورلڈ کپ کی میزبانی بھی چھین لی گئی۔ مگر جس ستارے کے مقدر میں جگمگانا لکھا ہو وہ جگمگا کر ہی رہتا ہے!

پاکستان اور بھارت کو کرکٹ کے میدان میں آمنے سامنے دیکھنے کی خواہش دونوں ممالک کے شائقین کی تھی جو پوری ہوئی۔ دو ٹیموں کے درمیان مقابلے کے نام پر کھلاڑیوں اور شائقین کے اعصاب کی خوب نمائش ہوئی۔
کرکٹ کے پردے میں کتنے ہی کھیل ہو رہے ہیں۔ سازش کا نظریہ بھی گردش کر رہا

ہے۔ کچھ لوگوں کی زبان پر سٹے کی افواہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ حکومتی سطح پر کوئی ڈیل ہو رہی ہے۔ وزیر اعظم کے بھارت کے دورے کو بھی اِسی تناظر میں لیا جارہا ہے۔ کھلاڑیوں پر پہلے ہی غیر معمولی دباؤ تھا۔ ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر چائے کی چُسکیاں لیتے ہوئے کھیل سے لطف اندوز ہونے والوں کو بھی اندازہ ہوا کہ کھلاڑی مقابلے کے دوران کس عذاب سے دوچار رہتے ہیں!

کون سا پاکستانی ہے جس کے ہاتھ قومی ٹیم کی فتح کے لئے نہیں اٹھے؟ سب کی خواہش تھی کہ بھارت کو اس کی سرزمین پر شکست دی جائے۔ اگر یہ خواہش پوری ہو جاتی تو کیا بات تھی! بھارت سے جیتنے کا نشہ کچھ اور ہی ہوتا ہے! قوم سارے غم بھول جاتی ہے۔ شاید حکومت بھی یہی چاہتی تھی کہ ہم کرکٹ کو یاد رکھیں اور دوسری تمام باتیں بھول جائیں! حکمران تو چاہتے ہیں کہ کچھ مدت کے لئے ہمیں ریمنڈ ڈیوس یاد رہے نہ مہنگائی۔ بیروزگاری، کرپشن، نا اہلی، بیڈ گورننس، قومی خزانے پر شب خون۔۔ یہ سب کچھ دو چار مہینے یاد نہ آئے تو کیا ہرج ہے!

کرکٹ کی رس ملائی کھاتے وقت ہمیں حالات کے کڑوے گھونٹ فراموش نہیں کرنے چاہئیں۔ زندگی ہم سے بہت کچھ چاہتی ہے۔ کرکٹ کا جنون کہیں ہمیں اُس دیوانگی سے نجات پانے کی فکر سے بیگانہ نہ کردے جو جمہوریت کے نام پر ہمارے نصیب

میں لکھ دی گئی ہے! قومی غیرت پر سودے بازی، نہتے شہریوں پر امریکیوں کی بمباری اور ایسی ہی بہت سی دوسری قباحتیں کرکٹ کے دریائے لطافت میں بہتے ہوئے بھی ہمیں یاد رہیں تو اچھا ہے۔ کرکٹ کا شوق اگر جنون بن جائے تو کوئی بات نہیں۔ ہاں، اِسی جنون کو سازش میں تبدیل کیا جائے تو ہمیں ضرور محتاط رہنا چاہیے۔

شعروں کے "ارتکاب" نے رُسوا کیا مجھے

پکے اور ٹھیٹھ راگوں کے ایک ماہر کے ہاں ایک صاحب راگ راگنیاں سیکھنے جایا کرتے تھے۔ کسی نے دیکھا کہ ایک خاصا معقول آدمی ٹپہ، ٹھمری، دادرا وغیرہ میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو اُن سے رہا نہ گیا اور پوچھ بیٹھے کہ آپ کلاسیکی موسیقی کو کیوں گلے لگا رہے ہیں! اُن صاحب نے مسکراتے ہوئے وضاحت فرمائی

"جناب! میں گویّا بننے کا ارادہ نہیں رکھتا۔"

"تو پھر یہ سب۔۔ گا، ما، پا، دھا، نی، سا۔۔ کیا ہے؟"

وہ بولے "میں شاعر ہوں۔ لوگ میری شاعری کی طرف "بہ وجوہ" متوجہ نہیں ہو رہے اِس لئے ایک سینئیر شاعر کے مشورے کے مطابق کلاسیکی موسیقی سیکھ رہا ہوں تاکہ مشاعروں میں رنگ جمانے کے قابل ہو جاؤں اور کچھ کھا، کماؤں!"

سُنا ہے بعد میں اُن صاحب نے بیاض چھوڑ کر "پیٹی باجا" اپنا لیا کیونکہ اِس صورت میں آمدنی اور عزت دونوں میں غیر معمولی تناسب سے اضافہ ہو رہا تھا! شاعری میں کوئی اُستاد ماننے کو تیار نہ تھا اور پیٹی باجے کی مہربانی سے اُنہیں لوگ اُستاد بھی کہنے لگے۔

ویسے موسیقی کے اسرار و رموز سے شغف رکھنے والے شعراء میں ایک خوبی تو ہم نے بھی پنپتی دیکھی ہے، وہ کسی نہ کسی طرح اپنی شاعری میں بحر اور وزن کا اہتمام کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں ! ماتروں کی تعلیم اور لے کاری اُنھیں "بے بحرا" ہونے سے بچالیتی ہے ! یہی سبب ہے کہ کبھی کبھی ہمیں جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کی گھن گرج میں استاد بڑے غلام علی خاں کی تانیں اور پلٹے سُنائی دیتے ہیں !

جہاں آوے کا آوا بگڑا ہوا ہو وہاں کسی کو کسی کام سے روکا نہیں جاسکتا۔ آپ خود دیکھ لیجیے، کیسے کیسے لوگ با اختیار ہو کر ہم پر مُسلّط ہیں ! ہم نے ایک دن یہی بات مرزا تنقید بیگ کے روبرو کہی تو اُنھوں نے ہر بات میں کیڑے نکالنے کی عادت بالائے طاق رکھتے ہوئے ہماری بات سے مکمل اتفاق کیا ! ہمیں قدرے خوش اور مطمئن دیکھ کر اُنھوں نے وضاحتی شرارت فرمائی۔ "اِس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ آج کل تم بھی کالم لکھ رہے ہو !"

ہم نے جب اُن کی رائے سُن کر ذرا سا "وہ" والا منہ بنایا تو مرزا نے فوراً اباؤٹ ٹرن لیا اور بولے "ایک تم ہی موردِ الزام ٹھہرائے جانے کے قابل نہیں ہو۔ ایک کو ڈھونڈنے نکلو تو ہزار ملتے ہیں۔ جس طور صحافت سے معمولی سا شغف رکھنے والے آؤ دیکھا نہ تاؤ (بالکل تمہاری طرح) کالم لکھنے بیٹھ جاتے ہیں

اُسی طرح ادب سے معمولی سی بھی دلچسپی رکھنے والے سوچے سمجھے بغیر شعر گوئی پر کمر کَس لیتے ہیں! سُنا ہے کسی زمانے میں تم بھی شاعری فرماتے تھے۔ یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے کہ یہ بھاری پتھر چُوم کر رکھ دیا! "

ہم نے مرزا کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے جوابی وار کے طور پر عرض کیا کہ آپ بھی تو جو منہ میں آئے وہ بَکنے کی روش پر گامزن رہتے ہیں! اِس بات کا مرزا نے ذرا بھی بُرا نہ مانا کیونکہ جو منہ میں آئے وہ بَک دینا اُن کے نزدیک "جینئس" ہونے کی نمایاں ترین علامات میں سے ہے! اور وہ اِس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ایک دن اِسی وصف کی بنیاد پر وہ صفِ اول کے دانشور گردانے جائیں گے!

مرزا فرماتے ہیں "ایک زمانہ تھا جب شعر کہنا خون تھوکنے کے مترادف تھا۔ آج کے شعراء خون کی اہمیت جانتے ہیں اِس لئے محض تھوکنے پر اکتفا کرتے ہیں! اور ایسی شاعری کو پڑھنے والے بھی جواب آں غزل کے طور پر حسب توفیق تھوکتے ہیں! ویسے جس قسم کی شاعری اب ہو رہی ہے اُس کا مطالعہ بعض قارئین کو خون تھوکنے پر مجبور کر دیتا ہے! "

ایک دن ہم نے جوش کے عالم میں آج کی شاعری کو وباء قرار دیا تو مرزا نے

اختلافی کارڈ کھیلتے ہوئے فرمایا کہ شاعری کو آج اور کل کے پنجرے میں قید کرنا درست نہیں۔ یہ زمان و مکان کے دائرے میں محدود نہیں کی جاسکتی۔ اور آج کل کی شاعری تو ویسے بھی تمام زمانوں پر محیط ہونے کے ساتھ ساتھ اُن سے پرے ہے! پھر وباء سے متعلق وضاحتی لیکچر دیا "ہر سال سردیوں اور گرمیوں میں مختلف وبائیں پھوٹتی ہیں۔ ہر وباء کسی نہ کسی موسم کی محتاج ہوتی ہے، مگر شاعری چونکہ کسی موسم کی محتاج نہیں اِس لئے ہم اِسے کسی طور وباء قرار نہیں دے سکتے! یہ کیفیت تو وہ ہے کہ سال بھر قوم پر مُسلّط رہتی ہے! ثابت ہوا کہ ہر قوم کو اِسی دُنیا میں گناہوں کی سزا ملتی ہے! کوئی بھی وباء کسی نہ کسی طور زیر دام لائی جاسکتی ہے، مگر شعر گوئی کا کوئی علاج اب تک دریافت نہیں ہوا! یقیناً یہ وباء سے آگے کی کوئی چیز ہے"

بعض شعراء اِس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ بھرتی کے شعر نہیں کہتے اور یہ کہ اُن کی شاعری آورد کا نتیجہ نہیں! حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں خود اُن کی آمد بھی آورد سے کم نہیں! اور جس "ذوق وشوق" سے وہ بھرتی کے شعر کہتے ہیں اُس کی بنیاد پر اُن کا "استحقاق" بنتا ہے کہ کسی فوج میں بھرتی کئے جائیں، جلد از جلد کوئی جنگ ہو اور وہ پہلے ہی معرکے میں اگلے مورچوں پر تعینات کئے جائیں!

بعض شعراء کو شعر کہنے کا "ہوکا" ہوتا ہے! طبیعت موزوں نہ ہو تب بھی وہ شعر کہنے پر کمربستہ اور بضد رہتے ہیں! "سُخن ظریفی" تو دیکھیے کہ اِس حالت میں وہ کبھی کبھی کام کا ایک آدھ شعر کہہ جاتے ہیں! ایسے شُعراء مشق سُخن کے نام پر دراصل سُخن کی مشکیں کس دیتے ہیں! بسیار گوئی کو بھی وصف گردانتے ہوئے یہ شعراء اِتنے زیادہ شعر کہتے ہیں کہ اِس عمل کو "زیادتی" سے کم کچھ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا!

ہر معاملے کی طرح اب شعر کہتے وقت بھی سوچنا بمنزلہ کفر ہے، یعنی سوچیے تو شعر کا حُسن گہنا جاتا ہے! سوچنے کی مشق اب اہل ذوق یعنی سُخن فہم قارئین کے نصیب میں لکھ دی گئی ہے! "بے فکری" کی حالت میں کہے جانے والے اشعار سے مرعوب ہو کر لوگ اُن میں معنی خود تلاش کرلیتے ہیں! اچھے شعر کو پرکھنے کا ایک آسان اور آزمودہ طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ سمجھ میں بالکل نہ آئے! مشاعروں میں ایسے اشعار پر زیادہ داد ملتی ہے جو کسی کی سمجھ میں "کچھ" بھی نہ آئیں اور گھر پہنچ کر لاکھ یاد کرنے پر بھی اُنہیں یاد نہ آئیں!

مرزا کہتے ہیں کہ آج کل کے شعراء جس ڈھب کی شاعری کر رہے ہیں اُسے شعر گوئی سے زیادہ شعری ارتکاب قرار دیا جاسکتا ہے اور اِس بنیاد پر اُن کے خلاف قانونی کاروائی بھی لازم قرار دی جاسکتی ہے! ہم اُن کی رائے سے متفق ہیں

کیونکہ ہمیں اندازہ ہے کہ شعر کہنا کس قدر ذمہ داری کا کام ہے۔ جب ہم شاعری کرتے تھے تب بدخواہ ہماری ہر غزل میں کوئی نہ کوئی انٹ شنٹ شعر تلاش کرکے ہمیں اُس کا ذمہ دار قرار دیتے تھے! ہم نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنا شعری اثاثہ محفوظ نہ رکھا۔ اب افسوس ہوتا ہے۔ ہماری شاعری محفوظ ہوتی تو شاید آج ہم کالم نگاری نہ سہی، شاعری کی بنیاد پر کچھ نام ضرور کما لیتے!

نذیر جونیئر، کولمبین حسینائیں اور گھاس منڈی

ایک زمانہ تھا جب کالی آندھی یعنی ویسٹ انڈیز کی ٹیم کرکٹ کی دنیا پر راج کرتی تھی۔ کرکٹ کی کسی بھی تکنیک سے اِس ٹیم کو ہرانا آسان نہ تھا۔ ایسے میں بہت سی ٹیمیں گھی ٹیڑھی انگلی سے نکالا کرتی تھیں۔ آف اسپنر نذیر جونیئر بھی پاکستانی ٹیم کے لئے ٹیڑھی اُنگلی کی طرح تھے۔ ووین رچرڈز کو نذیر جونیئر نے کئی بار آؤٹ کیا۔ بولنگ کا ہنر تو اپنی جگہ، مگر رچرڈز نے اپنے چت ہونے کا کچھ اور ہی سبب بیان کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ نذیر جونیئر بولنگ کرتے وقت اپنے بڑے بڑے دانت نکال کر ہنستے ہیں تو دھیان ہنسی کی طرف چلا جاتا ہے اور اگلے ہی لمحے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کلین بولڈ فرما چکے ہیں!

لاہور کا قذافی اسٹیڈیم لیبیا کے لیڈر معمر قذافی سے موسوم ہے، اِس لئے کرکٹ کا کچھ اثر اب قذافی میں بھی آ گیا ہے! اب اُنھوں نے بھی انقلابیوں کو زیر کرنے کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو پاکستان کرکٹ بورڈ نے ویسٹ انڈین کرکٹ ٹیم کے مقابل نذیر جونیئر کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرکے اختیار کیا تھا۔ انقلابیوں کا دعویٰ ہے کہ معمر قذافی نے جنوبی امریکہ سے کرائے کی فوج یعنی "فوجنیں" درآمد کی ہیں! یہ ماہر نشانہ باز جنگجو لڑکیاں

یومیہ ہزار ڈالر اُجرت لیں گی۔ اِن قاتل حسیناؤں کو انقلابیوں کی طاقت والے شہروں کی بلند عمارات پر تعینات کیا گیا ہے۔ اب انقلابیوں کی خیر نہیں۔ یہ حسینائیں نذیر جونیئر کی طرح مسکراہٹ کے گولے داغتی رہیں گی اور بے چارے انقلابی زنانہ مسکراہٹ کی گگلی سے زندگی کی پچ پر کلین بولڈ ہوتے رہیں گے ! جنگ کے میدان میں صنفِ مخالف سامنے ہو تو بلا ضرورت بھی "امن مذاکرات" کی خواہش دل میں انگڑائیاں لینے لگتی ہے !

دنیا بھر میں لڑائی کے دوران خواتین اور بچوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور معمر قذافی خواتین کو تلوار بنانے پر تُلے ہوئے ہیں ! آپ سوچیں گے یہ تو چیٹنگ ہے کہ جنگ کے میدان میں انقلابیوں کے سامنے حسیناؤں کو لایا جائے اور وہ میدان کے ساتھ ساتھ دل بھی ہار بیٹھیں ! مگر بھئی، محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے ! اور عوامی انقلاب کے جواب میں تو اِسی نوعیت کا "انقلاب" لایا جاسکتا ہے !

معمر قذافی واقعی ذہنی طور پر معمر ہوچکے ہیں۔ ان کی حماقت مآب حرکتوں نے بے چارے لیبیائی باشندوں کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ہمارے دوست راؤ عمران نے کولمبیا کی "نشانچیوں" کے حوالے سے کہا کہ قذافی اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہے ہیں تو ہم نے عرض کیا کہ بھائی ! اِن دو الفاظ میں اتنی

سکت کہاں کہ معمر قذافی کی شخصیت کو بیان کرنے کا حق ادا کر سکیں! اُن کی عالی مرتبت
!حماقتوں کے بیان کے لئے تو پوری "لُغت المُغلّظات" درکار ہے

معمر قذافی نے پہلے تو یوکرین کی ایک نرس کے حوالے سے اپنی "شہرت" کا گراف بلند کیا! اور پھر رہی سہی کسر اپنی حفاظت کا ذمہ خواتین جنگجوؤں پر مشتمل ایک دستے کے سپرد کرکے پوری کردی! اب سُنا ہے کہ یہ دستہ بھی یوکرینی نرس کی طرح داغ مفارقت دے گیا ہے۔ پیسے کسے اچھے نہیں لگتے، مگر بھئی حماقت برداشت کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے! قذافی خود تو خیمے میں رہتے ہیں مگر اُن کے دماغ کا خیمہ اب تک عقل سے خالی ہے! ہاں، اِس دماغی صحرا میں حماقت کی ریت دور دور تک اڑتی دکھائی دیتی ہے! ثابت ہوا کہ خواتین مردوں کے پیسے پر بھی مرتی ہیں مگر صرف پیسے
!پر نہیں مرتیں

خواتین اور جنگ و جدل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ جنگ کے میدان میں اُتریں نہ اُتریں، بسا اوقات یہی تو جنگ کا میدان سجانے کا باعث بنتی رہی ہیں! خواتین کو جنگ کے میدان میں اُتارنا بھی نئی یا انوکھی بات نہیں۔ کم از کم چھاپہ مار جنگ میں تو خواتین کا کوئی ثانی نہیں۔ جب یہ میدان میں موجود نہیں ہوتیں تب بھی چھاپے مار رہی ہوتی ہیں۔ ایک صاحب کی اہلیہ دس پندرہ دن

کے لئے میکے گئیں۔ ایک دن وہ صاحب نیا، چمکدار سوٹ پہن کر کہیں جانے لگے تو جیب سے پرچی برآمد ہوئی جس پر لکھا تھا۔۔ اِتنا قیمتی اور شاندار سوٹ پہن کر کہاں چلے، یہ نہ سمجھنا کہ مجھے پتہ نہیں چلے گا !

ہم کسی زمانے میں رنچھوڑ لائن کے نزدیک گھاس منڈی میں رہا کرتے تھے مگر یہ بات کسی کو بتاتے نہیں تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ گھاس منڈی کا نام سُن کر یہ نہ سمجھیں کہ ہم گھاس پُھوس سے رغبت رکھتے ہیں ! سچ یہ ہے کہ صحافت کے سبزہ زار میں قدم رکھنے کے بعد اب ہم کسی اور قسم کی گھاس یا لُوسن کے قابل نہیں رہے ! فلیٹ کا پتہ سمجھاتے ہوئے ہمیں مزید اُلجھن کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ دو قدم کے فاصلے پر ایکسائز شاپ یعنی شراب کی دکان تھی۔ کچھ لوگوں کو ہم نے جب اِس دکان کے حوالے سے اپنا پتہ سمجھایا تو وہ سمجھے کہ شاید ہم "ٹُن" ہیں، اِس لئے احتیاطاً ہمارے گھر نہ آئے !

بہر کیف، گھاس منڈی میں رہائش ہی کی بدولت ہم پر یہ عُقدہ وا ہوا کہ جن گھرانوں پر عورت کا راج ہو وہ گویا گھاس کھا کر زندہ رہتے ہیں !

"اے، اگر مجھے ہاتھ لگایا نا تو اپنی ماں کو بلا کے لے آؤں گا !"

اے بھائی ! میرے جیسے کمزور آدمی سے کیا لڑتا ہے، لڑنا ہے تو میری بیوی سے"

”!لڑ۔ پھر پتہ چلے گا تو کتنے پانی میں ہے

”!ابے او گدھیڑے! میرے میاں سے کیا لڑتا ہے، ہمت ہے تو میرے سے بات کر“
تو نے سلیمان بھائی پہ ہاتھ تو اُٹھا لیا مگر اب پتلی گلی سے نکل لے۔ اگر ان کی گھر والی کو“
”!پتہ چلا تو تیری خیر نہیں

یہ اور اِسی قبیل کے دوسرے بہت سے جملے ہمیں اُس دور میں اکثر سنائی دیتے تھے اور ہم اِس قدر انگشت بہ دنداں رہا کرتے تھے کہ اُنگلی میں انفیکشن ہو گیا یعنی اپنا ہی زہر !چڑھ گیا

رنچھوڑ لائن میں رہائش اختیار کرنے سے معلوم ہوا کہ بعض برادریوں میں خواتین ہی کماتی اور گھر چلاتی ہیں۔ ایسی برادریوں میں مردوں کا وجود ”رسمی کاروائی“ کا درجہ !رکھتا ہے! یعنی قذافیوں کی کوئی کمی نہیں، ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

بابر اعوان اور گڑے مُردے

علمی تحقیق کی بات کیجیے تو دنیا اب تک غار کے زمانے میں جی رہی ہے۔ دنیا بھر میں پی ایچ ڈی کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ ہے تحقیق۔ ہم نے اپنی تحقیق سے یہ معلوم کیا ہے کہ پاکستان میں پی ایچ ڈی کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ کل کو اِس موضوع پر بھی پی ایچ ڈی ہونے لگے کہ پاکستان میں پی ایچ ڈی کِس کِس طریقے سے کی جا سکتی ہے!

اب تک تو یہ ہوتا آیا تھا کہ یا تو لوگ خود تحقیق کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری لیا کرتے تھے یا پھر جس طرح اُجرتی قاتلوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں بالکل اُسی طرح دوسروں کو اُجرت دیکر تحقیق کروائی جاتی تھی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری وصول کر لی جاتی تھی! بابر اعوان صاحب کے کیس میں انوکھی بات یہ ہوئی ہے کہ پی ایچ ڈی کی ڈگری تو اُنہوں نے حاصل کی ہے اور دادِ تحقیق ہما شُما دے رہے ہیں! پی ایچ ڈی کے حوالے سے یہ ایک نئی راہ نکالی گئی ہے تو کسی کو زیادہ جُزبُز ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب سیاست دان ملوث ہوں تو "علم" کی دنیا میں "تحقیق" کچھ اِسی طور ہوا کرتی ہے۔ چند گھسے پٹے موضوعات میں کوئی کس طرح جدت پیدا کر سکتا ہے؟

بابر اعوان نے پی ایچ ڈی ہونے کا اعلان کر کے گویا ایک آسمان کو اپنے اوپر گرا لیا۔ جسے دیکھیے وہ اب تک اِس پی ایچ ڈی کی تحقیق میں لگا ہوا ہے! اگر یہی رنگ ڈھنگ رہے تو ہم خبردار کئے دیتے ہیں کہ اِس ملک میں پی ایچ ڈی بننے بند ہو جائیں گے!

بابر اعوان نے پی ایچ ڈی ہو جانے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بھٹو کیس کی دوبارہ سماعت میں وکیل کی حیثیت سے شریک ہونے کے لئے وزارت کی قربانی بھی دے دی ہے۔ بھٹو کیس کی ری اوپننگ کا چاہے جو بھی انجام ہو، بابر اعوان کا وزارت سے دستبردار ہونا بجائے خود ایک تاریخی حقیقت بن سکتا ہے! اُن کی قربانی مثال بنے نہ بنے، جذباتیت ضرور مثال کا درجہ پا سکتی ہے!

پاکستان کی سیاست ایک ایسی قبر کے مانند ہے جس میں گڑے مُردے اُکھاڑنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُتنے مُردے گاڑے نہیں جاتے جتنے اُکھاڑے جاتے ہیں! یعنی ایک ہی مُردہ کئی بار اُکھاڑا جاتا ہے۔ بھٹو کیس بھی ایک ایسا ہی گڑا مُردہ ہے جو اب بہت حد تک اُکھڑے مُردے میں تبدیل ہو چکا ہے! پاکستان کی سیاسی تاریخ میں جس قدر مذاق بھٹو کیس کے ساتھ کیا گیا ہے شاید ہی کسی اور کیس کے ساتھ ہوا ہو۔ اب جس انداز سے اس کیس کو

دوبارہ چلانے کی تیاری کی جارہی ہے اُسے دیکھ کر شاید ذوالفقار علی بھٹو کی روح بھی تڑپ گئی ہوگی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اِس کیس کی ری اوپننگ سے وابستہ شخصیات کو تڑپانے کا بھی خوب اہتمام کیا گیا ہے۔ اِدھر بابر اعوان نے بھٹو کیس لڑنے کا فیصلہ کیا اور اُدھر اُن کے سیاسی ماضی کے بارے میں تحقیق و تحقیر کا بازار گرم ہوگیا! بھائی اعجاز الحق نے تو غضب ہی ڈھا دیا۔ انہوں نے اپنے والد ضیاء الحق مرحوم کی برسی کے ایک اجتماع کی ایسی تصویر جاری کردی جس میں بابر اعوان بھی خطاب فرماتے دیکھے جا سکتے ہیں! اعجاز الحق صاحب! اگر آپ ایسا کریں گے تو کون آئے گا؟ بابر اعوان کی تصویر کھنچ ہی گئی تھی تو فریم یا البم میں کیا بُری لگ رہی تھی! اگر آپ لوگوں کے ماضی کی نقاب کشائی کرتے رہیں گے تو سیاسی دُکان کیسے چلے گی؟ سیاسی بوتیک کپڑے پہنانے کے لئے ہوتی ہے، اُتارنے کے لئے نہیں! اِس طرح تو آتا گاہک بھی بھاگ جائے گا!

میڈیا والوں کو بھی بس بہانہ چاہیے گڑے مُردے اکھاڑنے کا۔ بھٹو کیس ری اوپن کرنے کے لئے درخواست کی سماعت شروع ہونے کی دیر تھی۔ میڈیا کے لوگ اب ماضی کے کوڑا دان کو کھنگال رہے ہیں اور نوبت مٹھائی کی تقسیم اور فاتحہ خوانی تک جا پہنچی ہے! ساری محنت اِس بات کا کھوج لگانے پر صرف کی جارہی ہے کہ بھٹو کی پھانسی پر کِس کِس نے مٹھائی بانٹی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بھٹو

کی پھانسی پر کسی مشہور سنیما کے باہر مٹھائی بانٹے جانے سے متعلق تحقیق کی جائے اور سیاست میں ایک نئی فلم ریلیز ہو ! بہر کیف، جامعات نوٹ فرمالیں کہ بھٹو کی پھانسی پر مٹھائی بانٹنے اور اُن کے بد خواہوں کے لئے فاتحہ خوانی کو بھی پی ایچ ڈی کے موضوع میں تبدیل کیا جاسکتا ہے!

بابر اعوان کو بھی بھٹو کی پھانسی پر مٹھائی بانٹنے کے الزام کا سامنا رہا ہے۔ ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ کسی کے مرنے پر فاتحہ خوانی کے بعد بھی شیرینی تو تقسیم کی ہی جاتی ہے۔ اب اگر کسی کے مرنے پر مٹھائی تقسیم ہو گئی اور بعد میں کسی اور کے مرنے پر فاتحہ خوانی کر لی گئی تو کون سی قیامت آ گئی؟ بس ذرا رسم اور شخصیت کی ترتیب ہی تو بدل گئی!

ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ کسی کا ماضی زیادہ کھنگالنا نہیں چاہیے۔ اب کیا کوئی دو چار سیاسی پارٹیاں بھی نہ بدلے ! اگر کسی ایک پارٹی میں جم کر بیٹھ جائیں تو لوگ سیاسی داؤ پیچ کیسے سیکھ پائیں گے ! الزابیتھ نے آٹھ شادیاں کی تھیں۔ اُسے تو کسی نے نہیں روکا اور ہمارے ہاں کوئی تین چار پارٹیاں بدلے تو لوگ لٹھ لیکر پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

یہ بات ماننا پڑے گی کہ بھٹو صاحب کے نام سے سیاست کی گرم بازاری برقرار

ہے۔ آج بھی لوگ اُن کے نام کا اِتنا کھا رہے ہیں کہ بدہضمی کا شکار ہیں ! بھٹو صاحب تو اپنی قبر میں ابدی نیند سو رہے ہیں مگر اُن کے نام پر گڑے مُردے اکھاڑنے کا سلسلہ کچھ اِس شِدّت سے جاری ہے کہ لوگ چونکے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جو کچھ بھٹو صاحب نے کیا وہ اُن کے ساتھ گیا مگر جو کچھ اُن کے مرنے پر کیا گیا وہ اب بھی لوگوں کے سامنے آ رہا ہے ! بہر کیف، بار بار اعوان کفّارہ ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اُنہیں ایسا کرنے دیا جائے۔ کسی صورت تو سیاست کا میلہ چلتا رہے، میڈیا کی دُکان سجی رہے !

تجربے کی بات، حسینوں کا ساتھ

مرزا تفصیل بیگ (اپنا) سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ہم نے اُنہیں اِس حال میں دیکھا تو موقع غنیمت جانا اور "مشورہ" دیا کہ زیادہ زور سے سر نہ پکڑیں، کہیں کھوپڑی چیخ گئی تو بُرادہ باہر آ جائے گا! ہمارے "مُخلِصانہ" مشورے نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا اور مرزا بھڑک اُٹھے۔ تپ کر بولے۔ "تمہیں اٹکھیلیاں سُوجھی ہیں اور یہاں لوگوں کے کیریئر داؤ پر لگنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔" ہم نے دِل لگی کے مُوڈ کو لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور دریافت کیا کہ ایسا کیا ہوگیا ہے جس سے کیریئر داؤ پر لگ گئے ہیں۔ ویسے اب چاہے کوئی بھی چیز داؤ پر لگ جائے، حیرت نہیں ہوتی۔ جب پورا ملک ہی داؤ پر لگ چکا ہو یا لگایا جاچکا ہو تو کسی بھی بات پر حیرت کیسی اور کیوں!

مرزا بتانے لگے۔ "برطانیہ میں کام کے حوالے سے نئی تحقیق کے حیرت انگیز نتائج سامنے آئے ہیں۔"

ہم سوچ میں پڑگئے کہ گوروں کو کیا ہوگیا ہے۔ اب یہ کوئی کام وام نہیں کرتے، بس کام سے متعلق تحقیق ہی کو کام کو قرار دیکر اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں!

ہمیں آزاد کرنے کے بعد سے گورے خاصے نکھٹو ہو گئے ہیں ! اور ہم بھی عجیب ہیں کہ نکھٹو گوروں کی تحقیق کو بھی بخوشی قبول کر لیتے ہیں ! شاباش ! مرعوبیت ہو تو ایسی ہو !
! گوروں کو ذرا فرصت ملے تو ہماری بے پایاں مرعوبیت پر بھی کچھ تحقیق فرمائیں
خیر، مرزا نے بتایا کہ معمر اور تجربہ کار ملازمین زیادہ عمدگی اور دل جمعی سے کام کرتے ہیں۔ اِتنا سننا تھا کہ ہم حیرت کے مارے اُن کا منہ تکنے لگے۔ مرزا سمجھے کہ ہم اُن کی عمر کا ڈھلنا ملاحظہ فرما رہے ہیں ! بس۔۔۔ پھر کیا تھا، اپنی حد سے گزر گئے۔ یعنی مُنہ بنالیا !
ہم نے اُنہیں مناتے ہوئے کہا کہ ہمیں تو اِس بات پر حیرت ہے کہ معمر اور تجربہ کار افراد تو بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہی ہیں، اِس کے لئے تحقیق کا میلہ سجانے کی کیا ضرورت ہے؟
مرزا پھر گویا ہوئے۔ "تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ کسی بھی دفتر یا فیکٹری کے سینئر ملازمین پُرسکون رہتے ہوئے کام کرتے ہیں، اُن میں غیر معمولی تحمل پایا جاتا ہے، بات بات پر مشتعل نہیں ہوتے، لڑنے بھڑنے سے گریز کرتے ہیں۔" ہم نے عرض کیا کہ یہ بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ جو انسان زندگی کی پچپن ساٹھ بہاریں دیکھ چکا ہو اگر اُس میں بُرد باری پیدا نہیں

ہو گی تو پھر کس میں ہو گی؟ جونیئرز کا خون گرم ہوتا ہے اِس لئے وہ بات بے بات بھڑک اُٹھتے ہیں۔ یہ تو فطری امر ہے۔ زمانے کے سرد و گرم کا سامنا کرنے والوں میں تحمل پسندی در آتی ہے۔ اِس بات کو جاننے کے لئے بھی تحقیق کی چنداں ضرورت نہیں۔

مگر جب مرزا نے خبر کی پنچ لائن سُنائی تو ہم تقریباً اُچھل پڑے۔ محسوس یہ ہوا جیسے کسی نے منہ پر شہید ملت والا مُکّہ رسید کردیا ہو! مرزا بتا رہے تھے کہ برطانیہ کہ مینہائم یونیورسٹی کے عمرانی علوم کے ماہرین نے مشاہدے اور تحقیق سے یہ حسین نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر کسی ادارے میں خواتین بھی نمایاں تعداد میں ہوں تو سینئرز کی کارکردگی بہتر ہو جاتی ہے! ہم نے عرض کیا کہ انسان جب اِس فانی دنیا میں رہتے ہوئے حُوروں کے جلو میں کام کرے گا، پری چہرہ لوگوں کا ساتھ نصیب ہوگا اور غمزہ و عشوہ و ادا کی صحبت ملے گی تو "بادل خواستہ" خود کو جنت میں محسوس کرے گا اور زیادہ سُکون سے کام کرے گا! ایسے میں کارکردگی کا گراف بلند ہونا ہی ہے۔ شاید ایسے ہی ماحول کے لئے حمایت علی شاعر نے کہا ہے

کِس لیے کیجے کِسی گُم گشتہ جنت کی تلاش
! جبکہ مٹی کے کھلونوں سے بَہل جاتے ہیں لوگ

برطانوی محققین مزید فرماتے ہیں کہ خواتین کے ساتھ کام کرنے سے نوجوان مردوں کی کارکردگی گہنا جاتی ہے! یہ ہمارے لیے انکشاف سے کم نہ تھا۔ مرزا نے اِس کی وضاحت یوں فرمائی۔ "خواتین کی موجودگی میں سینئرز کا دماغ کام کرنے لگتا ہے اور جونیئرز کا دماغ چل جاتا ہے! محققین کا کہنا ہے کہ کام کے ماحول میں خواتین زیادہ ہوں تو جونیئرز کی توجہ کام پر نہیں رہتی ہے اور وہ مضطرب اور مشتعل رہتے ہیں!"

ہم نے عرض کیا کہ نوجوانوں کی توجہ اگر کام پر نہیں رہتی تو خواتین پر بھی نہیں رہتی۔ وہ تو بس سینئرز کا "اِنہماک" دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے ہیں! سینئرز اِس صورت حال کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ خواتین اپنے سینئرز میں پدرانہ شفقت (بھی) تلاش کرتی ہوں مگر بھئی، سینئرز کا اُن کی رائے یا خام خیالی سے متفق ہونا ضروری نہیں! جونیئرز بے چارے سینئرز کی شفقت میں میں پائے جانے والے خواتین نواز رُجحان کا تجزیہ کرتے کرتے اپنی ذہنی صلاحیت اور سکت سے محروم ہوتے جاتے ہیں!

خواتین کی موجودگی میں سینئرز کا پُرسکون رہتے ہوئے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ وقت کتنا بڑا ڈائریکٹر ہے اور ڈارون کی تحقیق کے نتیجے کو اداکاری کے کیسے کیسے کرتب سِکھا دیتا ہے! یہ تحقیق اِس

امر کو بھی ثابت کرتی ہے کہ سینئرز کتنے کتنے اچھے منصوبہ ساز ہوتے ہیں۔ تحمل کے ساتھ عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ نوجوانوں کے اشتعال کا گراف بلند اور اپنی جاب پکّی کرتے ہیں! یہ تو میٹھی چُھری والا معاملہ ہوا!

برطانوی تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ نوجوان ملازمین اپنے کام سے بہت جلد اُکتا جاتے ہیں اور دل جمعی سے کام نہیں کرپاتے۔ سیدھی سی بات ہے، جب خواتین کی توجہ سینئرز پر مرکوز ہو تو نوجوانوں میں بیزاری اور اُکتاہٹ کا پیدا ہونا فطری امر ٹھہرا۔ جب کرنے کے لئے کچھ ہوگا ہی نہیں تو بے چارے نوجوان سڑکوں پر ون وھیلنگ نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے! اُن کی نصف ذہنی صلاحیت خواتین کی توجہ حاصل کرنے پر اور نصف توانائی اِس توجہ کو برقرار رکھنے کے لئے کمالات دِکھانے پر صرف ہو جاتی ہے! بے چارے کریں تو کیا کریں، جس عمر میں اِنہیں خواتین کے نزدیک آنے کا چانس ملتا ہے، بزرگ کمالات دِکھانے پر تُل جاتے ہیں!

مرزا زیادہ پریشان دِکھائی دیئے تو ہم نے پوچھا کہ ایسی کیا بات ہوگئی کہ مستقل گم گشتہ دکھائی دے رہے ہو۔ کہنے لگے۔ "ہم زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکے ہیں مگر اب تک عمدہ کارکردگی کے معاملے میں "عہدِ بہاراں" کے محتاج

نہیں رہے۔ کام کے ماحول میں خواتین خال خال بھی ہوں تو ہم کارکردگی پر توجہ دیئے رہتے ہیں! عمر کی حد تک "سٹھیانے" کے باوجود ہم اپنا کام پوری مستعدی اور عمدگی سے کئے جا رہے ہیں۔ اب خیال آ رہا ہے کہ خواتین کی سنگت کے بغیر عمدہ کام کرنا کہیں کسی بڑی نفسیاتی پیچیدگی کا مظہر تو نہیں! کل کلاں کو یہ نہ ہو کہ خواتین کی سنگت کے بغیر بھی عمدہ کام کرنے پر ہماری سینیارٹی کو مشکوک قرار دیکر ہم ہی پر تحقیق کی جانے لگے!"

مرزا کے اِس وسوسے نے ہمارا دل بھی دہلا دیا اور ہم چند لمحات کے لئے سہم گئے۔ پھر ہم نے یہ کہتے ہوئے مرزا کو تسلی دی کہ زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھنے کے بعد اب آپ کا دل دنیا سے بھر گیا ہے اور آپ شاید چشم تصور کی آنکھ (!) سے ہر وقت خود کو حُوروں کے جلو میں پاتے ہیں! اور جب معاملہ حُوروں کا ہو تو اِس دنیا کے معمولی حسینوں کا خیال کیسے آئے اور کیوں آئے! پس ثابت ہوا کہ عمدہ کارکردگی کے لئے آپ آسانی سے جنت کے تصور کا سہارا لے سکتے ہیں، گوروں کی تحقیق کے محتاج ہرگز نہیں! ہماری اِس وضاحت سے مرزا کی ڈھارس بندھی اور وہ اپنے حواس کی دنیا میں واپس آئے۔

جو کچھ فطری ہے اور قدرت کی طرف سے ہم میں "اِن بلٹ" کیا گیا ہے اُس پر تحقیق کرنا وقت کے ضیاع کے سِوا کچھ نہیں۔ مرد کا ایک بنیادی "مسئلہ" یہ ہے

کہ گھر والی آدھا پاؤ دہی منگوائے تو گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے جان جاتی ہے اور اگر پڑوسن لسی منگوائے تو تپتی دوپہر میں دس گلی چھوڑ کر "پنجاب لسی ہاؤس" تک جانا اور آنا بھی ذرا بُرا نہیں لگتا! اِس نوعیت کے معاملات میں جونیئرز اور سینئرز دونوں ہی برابر کے تحمّل پسند اور خواتین نواز پائے گئے ہیں! ایسی ہی صورت حال خواتین خانہ کے دماغ کی لسی بناتی ہے اور وہ بعد میں تادیر "منجن بیچتی" پائی جاتی ہیں! خواتین خانہ کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ جو رجحانات فطری طور پر ودیعت کئے گئے ہیں اُن کے مطابق عمل کرنے کے معاملے میں مرد بے چارے لاچار ہیں! اِن "معصوم پرندوں" کو کچھ نہ کہا جائے!

مہدی حسن کا مشورہ اور لعنتُ المُغلّطات

1994 کی بات ہے۔ ہم نے غزل گائیکی کے شہنشاہ خاں صاحب مہدی حسن خاں کا انٹرویو کیا جو تین نشستوں پر محیط تھا۔ تیسری نشست میں جب ہمارے یاد دلانے پر بھی خاں صاحب کو اپنے ایک گانے کی دُھن یاد نہ آئی تو ہم نے گنگنا کر دُھن یاد دلائی۔
خاں صاحب بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے "میں آپ میں 'وہ' بات دیکھ رہا ہوں!" ہم نے وضاحت چاہی تو فرمایا "باقاعدگی سے ریاض کرو تو اچھا گانے لگو گے!" ہم نے دست بستہ معذرت چاہی کہ ہم جو کچھ (یعنی قلم کاری) کر رہے ہیں بس وہی ڈھنگ سے کر لینے دیجیے! جب یونہی اپنے دل کی تسلی کے لئے ہم نے پوچھا کہ آخر انھوں نے ہم میں کیا دیکھا ہے تو ارشاد ہوا "تمہاری آواز میں کھرج ہے!" اب ہم اُنہیں کیا سمجھاتے کہ ہر شادی شدہ آدمی رفتہ رفتہ کھرج کے سُروں ہی میں گفتگو کرنے لگتا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سوچتا بھی کھرج کے سُروں میں ہے!
آج خیال آتا ہے کہ خاں صاحب کی بات مان لیتے اور چند راگوں کو اچھی طرح گانا سیکھ لیتے تو کالم نویسی کے میدان میں فتوحات کے جھنڈے گاڑ چکے ہوتے! اب کالم لکھنے اور راگ الاپنے میں کچھ خاص فرق نہیں رہا! وہی کالم نویس

کامیاب ہیں جو چند پکے راگ اور بالخصوص راگ درباری الاپتے رہتے ہیں ! جیسا مال ویسی سرگم ! مال ملے تو تانیں ہی تانیں اور لفافوں کی آمد میں وقفہ متعارف ہو تو پلٹے ہی پلٹے ! بعض کلاسیکی گوئیے اگر کسی دن سکّہ بند کالم نویسوں کی نگارشات پڑھ لیں تو محفل میں بھرپور لگن کے ساتھ گاتے ہیں ! ہمارا اندازہ یہ ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب کلاونت گھرانوں کے لوگ اپنے بچوں کو پکے راگ سکھانے کے لئے ٹھیٹھ کالم نویسوں کا گنڈا بند شاگرد بنانے میں فخر محسوس کیا کریں گے !

مگر خیر، کامیاب کالم نویس اور عدیم المثال تجزیہ کار بننے کے لئے راگ راگنیاں ہی کافی نہیں۔ ایڈیٹ باکس یعنی ٹیلی وژن پر بولنے کے لئے انسان کو اور بھی بہت کچھ آنا چاہیے۔ جو منہ میں آئے وہ بولنے کی صلاحیت لازم ہے۔ صلاحیت، بے جگری، بے فکری اور ڈھٹائی۔۔۔ یہ چار عناصر ہوں تو کالم نویس بنتا ہے تجزیہ کار ! کم از کم جملہ باز کالم نویسوں کو تو ہم نے اِسی طور پنپتے دیکھا ہے۔

جب ہم اپنے لئے کام کی چیز خریدنے نکلے تو اردو اور اردو بازار کی تنگ دامانی کا کچھ کچھ اندازہ ہوا ! ہم ٹی وی کے سِکّہ بند تجزیہ کاروں کی گفتگو سمجھنے کے لئے "لُغتُ المُغلّطات" خریدنے نکلے تھے۔ اردو بازار چھان

مارا مگر کہیں بھی یہ لُغت نہ ملی۔ اِن دونوں الفاظ کی "عربیت" سے متاثر ہو کر چند ایک دکانداروں نے خاصے خشوع و خضوع سے معذرت چاہی! بعض دکانداروں نے تو اِس لُغت کا نام سُن کر یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم غلط بازار میں آ گئے ہیں اور پھر دو تین حکیموں کے پتے بھی دیئے! وہ سمجھے شاید ہم کِسی "مُغلّظ" نُسخے کی تلاش میں ہیں! معلوم ہوا کہ بازار میں مُغلّظات تو بہت ہیں، "لُغتُ المُغلّظات" دستیاب نہیں! چند ایک جہاں دیدہ اور بظاہر علمی قسم کے دکانداروں سے دریافت کیا کہ اب ہم کیا کریں تو جواب ملا ٹی وی باقاعدگی سے دیکھیے اور اپنی "لُغتُ المُغلّظات" خود مُرتّب کیجیے! بازار کے حالات پر نظر رکھنے والے چند دکانداروں کا کہنا تھا کہ مُغلّظات کے شعبے میں ٹی وی چینلز اتنی تیزی سے "ترقی" کر رہے ہیں کہ کسی مُستند اور جامع "لُغتُ المُغلّظات" کا شائع کرنا ممکن نہیں۔ کِس کو اِتنی فرصت ہے کہ ہر ماہ نئے الفاظ شامل کر کے نیا ایڈیشن چھاپتا پھرے!

آپ سوچیں گے کہ اِس لُغت کی ضرورت ہمیں کیوں پیش آئی۔ بات یہ ہے کہ ایک مشہور کالم نویس، دانشور اور تجزیہ کار کو جب ہم نے ٹی وی پر آپے اور شرافت کے جامے سے باہر ہوتے دیکھا تو سوچا اُن کی ناقابل فہم باتوں کو سمجھنے کی

کوئی صورت نکالی جائے! موصوف کا حال یہ ہے کہ لکھتے ہیں تو تاریخ اور زبان کو پلٹ دیتے ہیں اور ٹی وی پر بولتے ہیں تو اپنے وجود کو پلٹ دیتے ہیں! چولہے پر چڑھی ہوئی پتیلی کو اُلٹ دیجیے تو کالک منہ چڑاتی ہے۔ یہی حال موصوف کا ہے۔ کوئی اگر اِن کی مرضی کے خلاف کوئی بات پوچھ بیٹھے تو بیچ چوراہے پر اپنی شرافت کی ہنڈیا پھوڑ دیتے ہیں اور بادبانی کشتی کی طرح اپنا رُخ دشمن کی طرف موڑ کر اپنی "دانشوری" کو کچھ اِس طرح نمایاں کرتے ہیں کہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہاتھ آنکھوں پر رکھیں، ناک پر یا کانوں پر! ویسے تو بولنے کے معاملے میں دریائے سندھ کی سی روانی رکھتے ہیں، لیکن اگر کسی مقام پر رُک کر کسی کو لتاڑنا ہو تو اِن کے جوہر انہیں جوہڑ ثابت کرکے دم لیتے ہیں! یہ تماشا اِس حُسن کے ساتھ ہوتا ہے کہ اِن پر نثار ہونے کو جی چاہتا ہے اگر کوئی اِن سے اثاثوں اور آمدنی کے بارے میں پوچھ بیٹھے تو آن کی آن میں میڈیا کے بازار سے نکل کر "اُس" منڈی تک جا پہنچتے ہیں اور شریک گفتگو کو "اُس" منڈی کا کارندہ قرار دینے میں دیر نہیں لگاتے! یعنی بس زبان ہلانے کی دیر ہوتی ہے اور حریف کو آسمان سے پہلے زمین پر لاتے ہیں اور پھر تحت الثریٰ تک پہنچا کر دم لیتے ہیں!

موصوف حریف پر کچھ ایسی تیزی اور طرّاری سے حملہ آور ہوتے ہیں کہ عرش منیر مرحومہ اور عشرت ہاشمی مرحومہ کی ارواح

!دیکھیں تو منہ ڈھانپ لیں اور کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں

ٹی وی چینلز کے ماسٹر کنٹرول روم (ایم سی آر) میں کام کرنے والے بے چارے زمین اور آسمان کے درمیان مُعلّق رہتے ہیں۔ جن کا غائبانہ ذکر ہم کر رہے ہیں وہ اور اُنھی کے قبیل کے بعض تجزیہ کار کچھ اِس روانی سے بکنے پر اُتر آتے ہیں کہ ایم سی آر کے کنٹرول پینل کو آپریٹ کرنے والے ایک ہاتھ سوئچ بورڈ پر رکھتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے سر پکڑے رہتے ہیں! کبھی کبھی تو لاکھ پریکٹس اور مہارت کے باوجود اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس "دانشور" کی کون سی بات سے ناظرین کو محظوظ ہونے دیں !اور کون سی بات سے محفوظ رکھیں

ایک بار ہم نے ٹی وی چینلز کے شاہکار "ٹِکرز" جمع کرکے کتابی شکل میں شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ایک ٹی وی چینل کا یہ شاہکار ٹِکر بھی ہماری الیکٹرانک بیاض میں درج ہوا تھا۔ "مہدی حسن طویل علالت کے بعد.... ہسپتال سے گھر منتقل ہوگئے!" پھر ہم نے سوچا کہ ٹی وی چینلز تو قیامت تک ایسی ہی قیامتیں ڈھاتے رہیں گے، ہم کب تک مُنشی گیری کرتے رہیں! وہ پراجیکٹ تو ادھورا رہ گیا مگر اب ارادہ ہے کہ ٹی وی چینلز کی مدد سے "لُغتُ المُغلّطات" خود مُرتّب کرلیں۔ دُعا کیجیے کہ ہم اپنے مقصد میں نہ صرف

کامیاب ہوں بلکہ سلامت بھی رہیں!

بکنے کا ادب اور ہے، لکھنے کا ادب اور

ہم ایک ایسے ملک میں جی رہے ہیں جس میں بولنے، بلکہ بولتے رہنے ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے۔ جنہیں اللہ نے سوچنے اور لکھنے کا شعور ہی نہیں، مہارت بھی بخشی ہے وہ اب صرف بولنے کو اپنی متاع لوح و قلم سمجھ بیٹھے ہیں! ادب کو ضبطِ تحریر میں لانے کے بجائے اب ادبی بیان بازی ہی کو ادب کا درجہ دیا جانے لگا ہے۔ بلا خوفِ تردید کہا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ ادب پاکستان میں بولا (اور بکا) جاتا ہے! جس طور بہت سے ممالک کا آئین ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا، محض نافذ کردیا گیا ہے بالکل اُسی طرح ہمارے ہاں بھی "غیر تحریری ادب" کو مروج کرنے کی تحریک شباب پر ہے!

بزم آرائی اہل ادب کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ دن اور رات کی کچھ تفریق یا قید نہیں۔ بحث و تمحیص کی قبر کھود کر ادب کو سپردِ خاک کرنے کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے۔ کبھی ایرانی ہوٹلوں کی کافی، کیک اور بسکٹ کے سہارے ادبی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ اب کوئٹہ ہوٹلوں کی چارپائیاں ہیں اور اہل ادب ہیں! کافی اور بسکٹ کی جگہ اب چرغے، کڑھائی اور کڑک دودھ پتی نے لے لی ہے۔ جتنا بڑا ادیب اُتنی ہی بڑی دعوت اور اُتنا ہی زبردست پتھراؤ۔ غالب کا دعویٰ تھا

کہ وہ دیکھنے تو گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا اور اُن کے پُرزے نہ اُڑے۔ آج اگر وہ ہوتے تو بہ چشم خود دیکھ لیتے کہ ادب نوازوں کی محفل میں اُن کے پُرزے کس طور اُڑا کرتے ہیں! میر تقی میر کو خدائے سُخن کہا جاتا ہے مگر اِن محفلوں میں وہ دُنیائے سُخن کے بندہ بے دام ٹھہرتے ہیں! نظیر اکبر آبادی کو عوامی شاعر خیال کیا جاتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کو بھی قوم کا ترجمان تصور کیا جاتا ہے مگر ادبی محفلوں میں اِن بے چاروں کی بھی درگت بنتے دیر نہیں لگتی۔ مرثیہ گوئی میں میر انیس کے قادر الکلام ہونے میں کس کو کلام ہے مگر مرزا دبیر سے اُن کا موازنہ کچھ اِس طور کیا جاتا ہے کہ کبھی وہ مصرع اُولیٰ ہوتے ہیں اور کبھی مصرع ثانی! ادبی بحث و تمحیص کی اِن محافل میں جو کچھ ہوتا ہے اُس کی بنیاد پر !اِنہیں ادبی مجالس قرار دینا زیادہ موزوں ہوگا

ادب کے بخیے اُدھیڑنے کی محافل جب شباب پر ہوتی ہیں تو اساتذہ بھی متبدی کا روپ دھارتے دکھائی دیتے ہیں! اِن محافل میں ادب کی تمام قد آور شخصیات کے مراتب کا تعین یومیہ بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ کل آپ نے جس کے بارے میں صرف توصیفی کلمات سنے تھے، آج کوئی اُس کے حق میں ایک لفظ بھی بولنے کا روادار دکھائی نہ دے گا! آج اگر کسی کی پوجا کی جارہی ہے تو یقین کیجیے کہ کل شاید اُس کی ایسی حالت بنادی جائے کہ ممکن ہے وہ بھی اپنا آپ آراء کے آئینے میں

!پہچان نہ پائے

ہم نے 1983 میں فرسٹ ایئر (کامرس) کے طالب علم کی حیثیت سے ریڈیو پاکستان کراچی کے پروگرام بزم طلباء میں قدم رکھا۔ پہلا اعتراض تو اِسی بات پر ہوا کہ کامرس کا طالب علم ہوتے ہوئے ہم ادب کی طرف کیوں آرہے ہیں! صرف دو تین دن میں ہمیں اندازہ ہوگیا کہ ہم جسے بزم طلباء سمجھ کر آئے ہیں وہ تو بزم اساتذہ ہے! بزم طلباء کے انچارج قمر جمیل مرحوم تھے۔ اُن کے دفتر میں روزانہ ادبی محفل برپا ہوا کرتی تھی اور اس میں جدید شعراء سے اساتذہ تک سبھی کی خیریت اچھی طرح دریافت کی جاتی تھی! اِن محافل میں سلیم احمد مرحوم، ضمیر علی بدایونی مرحوم اور اداکار طلعت حسین پورے جوش و خروش سے شریک ہوا کرتے تھے۔ قمر بھائی کے خُلوص کی انتہا یہ تھی کہ وہ بزم طلباء کے پروگراموں میں شرکت کے لئے آنے والے طلباء کو اِن محافل میں بیٹھنے سے واضح طور پر روک دیا کرتے تھے! اُن کی اِس کرم نوازی ہی کا نتیجہ ہے کہ بہت سے طلباء ادب کے ہاتھوں برباد ہونے سے محفوظ رہے! ہمارے سر پر اُس زمانے میں ادب کا بھوت اچھا خاصا سوار تھا اِس لئے کسی نہ کسی طرح نظر بچا کر ہم کونے کھدرے میں چھپ کر یہ ادبی بحث سنا کرتے تھے۔

کالج سے واپسی پر ہم والد کی ٹیلرنگ شاپ پر دو ڈھائی گھنٹے کام کیا کرتے

تھے۔ اس یکسانیت سے بچنے کے لئے ہم نے بزم طلباء کا رخ کیا تھا مگر یہ دیکھ کر تو ہم حیران رہ گئے کہ ریڈیو پاکستان کی عمارت میں بھی بخیہ گری اور بخیے ادھیڑنے ہی کا ہو رہا تھا! جب ادبی بحث کی محفل پورے شباب پر ہوتی تھی تو کسی بھی عالی مرتبت ثابت کرنے پر لڑی چوٹی کا زور funny ادبی شخصیت کو دبوچ کر اُس کے فنی کمالات کو صرف کیا جاتا تھا۔ مگر یہ معاملہ کھٹا اور میٹھا ہوتا تھا۔ یعنی آج جس ادیب کو بے حیثیت ثابت کرنے کے لئے اُس کے فن کو بے لباس کیا جاتا تھا، کل اُسے نئے کپڑے بھی عطا کر دیئے جاتے تھے!

قمر بھائی کی بزم میں بھی وہی اُصول کارفرما تھا جو دنیا بھر میں دکھائی دیتا ہے۔۔ یعنی دلہن وہی جو پیا من بھائے! اگر قمر بھائی کا موڈ اچھا ہے اور وہ کسی سے خوش ہیں تو سمجھ لیجیے کہ اُس کا ستارہ خاصی بلندی پر اور روشن ہے! اور اگر طبیعت میں آج کچھ ٹھہراؤ نہیں تو سمجھ لیجیے کسی بھی بڑے شاعر یا افسانہ نگار کی شامت آسکتی ہے! کبھی کسی کے ایک آدھ شعر پر خوش ہو کر اُسے نئی نسل کا نمائندہ قرار دے دیا کرتے تھے اور کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ اپنی رائے سے رجوع فرماتے ہوئے اُسی شاعر کو ایسا رگڑا دیتے تھے کہ بے چارہ ہفتہ بھر منہ چھپائے پھرتا تھا! یہی سبب تھا کہ ہم قمر بھائی کو اپنی غزل اُس وقت سناتے تھے جب وہ خاصے اچھے موڈ میں ہوتے تھے! کبھی کبھی

!وہ ہمیں اشعار سے زیادہ اِس چالاکی پر داد دیا کرتے تھے

جب ہم نے بزم طلباء کی بزم اساتذہ میں ادب کا یہ حال دیکھا تو ادب کو اوڑھنا بچھونا بنانے کے ارادے سے تائب ہوئے اور اپنے ذہنی رجحان کی گاڑی کی کو اخباری دُنیا کی طرف موڑ لیا۔ چند ایک احباب نے اِسے بھی ہماری ادب نوازی سے تعبیر کرتے ہوئے !باضابطہ شکریہ ادا کیا

کون ہے جسے ادبی بزم آرائی نے تباہ نہیں کیا؟ ایک مشہور ڈائجسٹ کے دفتر میں جون ایلیا مرحوم، جمال احسانی مرحوم اور آں جہانی عُبیداللہ علیم بحث و تمحیص کا ملاکھڑا منعقد کیا کرتے تھے۔ اِس شوق کی تکمیل ایسی باقاعدگی سے کی جاتی تھی کہ لوگ اِن احباب کو دیکھ کر گھڑی ملا لیا کرتے تھے ! اِس بزم میں بھی لوگ بڑے بڑے بُتوں کو منہ کے بل گرتے دیکھا کرتے تھے، اور پھر اُنہی بُتوں کو دوبارہ طاق میں سجا بھی دیا جاتا تھا ! ہم اِس بزم کے عینی شاہد تو نہیں تاہم جنہوں نے اِن تین شخصیات کو دیکھا ہے وہ بتاتے ہیں کہ جو کچھ بحث کے دوران کہا جاتا تھا وہ اگر بیان کر دیا جائے تو لوگ بہت کچھ سیکھیں اور سیکھنے سے زیادہ عبرت پکڑیں اور ادب کی طرف آنے سے باز رہیں ! ہم نے ادب کی دُنیا میں قدم رکھنے کے بعد ابتدائی زمانے میں زیادہ توجہ اِس بات پر دی کہ جنہیں ادبی ذوق ملا ہے وہ بزم آرائی کے اِس قدر شوقین کیوں

ہیں۔ اندازہ ہوا کہ اِس میں خرچ کچھ نہیں ہوتا اور دل کی تسلی ہو جاتی ہے ! جو کچھ لکھتے ہوئے موت آتی ہے وہ زبان سے بڑی آسانی کے ساتھ ادا ہو جاتا ہے ! قرطاس و قلم کے جھنجھٹ میں کون پڑے؟ اگر زبانی کلامی کسی کے بخیے ادھیڑ بھی دیئے جائیں تو گرفت کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہی کچھ اگر قلم بند ہو اور شائع بھی کر دیا جائے (یا کرا دیا جائے) تو بہت سے لوگ ناراض ہو سکتے ہیں اور معاملہ نالش تک جا سکتا ہے ! عام طور پر اردو کے عہد ہائے رفتہ کے بڑے ناموں کو بار بار تنقید کی قبر میں سپردِ خاک کیا جاتا ہے تاکہ کوئی ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ بھی نہ کر سکے ! اگر کوئی ادیب تازہ تازہ مرا ہو تب بھی اُس کے بارے میں کوئی بھی ایسی بات لکھتے اور شائع کرتے وقت کسی نوع کے محاسبے کا خطرہ اِس لئے نہیں ہوتا کہ ادیبوں کے ورثاء بالعموم ایسی باتوں پر دھیان نہیں دیتے !

ہمارے ایک ادیب دوست کے بارے میں کسی جریدے میں چند انٹ شنٹ ریمارکس شائع ہوئے۔ ہم نے متوجہ کیا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے بولے اچھا ہے، ایسی دو چار باتیں اور چھپ جائیں۔ ہم نے حیران ہو کر اِس خواہش کا سبب پوچھا تو فرمایا اِس صورت کمپنی کی کچھ مشہوری ہی ہو جائے گی ! پھر اُنھوں نے یہ کہتے ہوئے ہمارے معلوماتی علم" میں اِضافہ کیا کہ وہ اپنی ادبی نگارشات میں خود ہی زبان و بیان کی" غلطیاں جانے دیتے ہیں تاکہ تنقیدی نشستوں میں خوب لتے لئے

!جائیں اور ادبی کالموں میں جگہ پائیں

ہم تو سمجھے تھے کہ ادبی محفلوں میں منہ سے جھاگ اُڑاتے ہوئے بیان کی جانے والی ہر بات شائع ہو جائے تو طوفان اُٹھ کھڑا ہو، قیامت برپا ہو جائے۔ معلوم یہ ہوا کہ لوگ !چاہتے ہیں کہ اُن کے بارے میں انٹ شنٹ باتیں بیان کی جائیں

اب ایسے میں ادب کیا فروغ پائے گا، آپ اور ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایک آپشن بہر حال باقی بچا ہے، ادبی محافل کی ریکارڈنگز انٹرنیٹ پر اپ لوڈ کر دی جائیں تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے کہ نری بکواس پر مبنی یعنی بولے جانے اور لکھے جانے والے ادب میں کیا !فرق ہے

مزاح کی فاتحہ خوانی

ایک زمانہ تھا جب طویل مدت تک شعر کہنے کے بعد انتخاب شائع کیا جاتا تھا۔ اور بعض شعراء کو اشعار کا انتخاب رُسوا بھی کر جاتا تھا! اب شعراء انتخابی رُسوائی سے بچنے کے لئے بس اِس قدر شعر کہتے ہیں کہ مجموعہ خیریت سے چھپ جائے! ایسے شُعراء کو الگ سے بیاض نہیں رکھنا پڑتی۔ جو کچھ کہا ہوتا ہے وہ سب اِن کی واحد "کلیات" میں بھر، کھپ چکا ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مشاعروں میں یہ اپنے مجموعے ہی کو سامنے رکھ کر پڑھتے ہیں! مجموعہ چھاپنے کے معاملے میں اب کالم نویس بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔۔برادرم عثمان جامعی نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، مزاحیہ تحریروں کا مجموعہ دُنیا کے سامنے پیش کردیا! عثمان جامعی پراِس سے زیادہ تنقید اِس لئے نہیں کی جاسکتی کہ ہم خود بھی اپنے "سنجیدہ" کالموں کا مزاحیہ مجموعہ چھاپنے کا ارادہ رکھتے ہیں!

عثمان جامعی نے اپنی کالمی مجموعے کی تقریب رونمائی کے لئے فنکاروں کے گڑھ یعنی آرٹس کونسل آنے کی دعوت دی تو ہمیں اُن کے فنکار ہونے کا یقین آگیا۔ اِتنی "چھوٹی سی بالی عمریا" میں جو اپنے کالموں کا مجموعہ بازار میں لے آئے وہ فنکار نہیں تو اور کیا ہے! ویسے بھی آج کے کالم نویس بڑے فنکاروں

میں سے ہیں ! جب ہم نے عثمان جامعی کے سامنے تقریب آرٹس کونسل میں منعقد
کرنے سے متعلق اعتراض کرتے ہوئے فنکاری کا حوالہ دیا تو کہنے لگے کہ لکھنا بھی تو فنون
لطیفہ میں سے ہے۔ ہم متفق ہوئے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ جو کچھ عثمان جامعی لکھتے ہیں وہ
فنون لطیفہ ہو نہ ہو، ہلکا پھلکا ہونے کی بنیاد پر لطائف کے ذیل میں ضرور آتا ہے!
کہے بغیر" کی تقریب رونمائی میں احفاظ الرحمٰن، امر جلیل، نذیر لغاری اور یوسف"
خان جیسی بھاری بھرکم شخصیات کو جمع کرکے عثمان جامعی نے ثابت کردیا کہ اُنہیں
ہماری طرح کے محض قاری ہی نہیں بلکہ جوہر شناس اہل قلم کی شفقت بھی میسر ہے۔
تقریب رُونمائی سے کچھ دیر قبل ہمیں اوپر اوپن ایئر تھیٹر میں آرکیسٹرا والے پریکٹس
کرتے سُنائی دیئے۔ ہم سمجھے شاید عثمان جامعی اُردو ادب کی تاریخ میں ایک نئی
روایت کو جنم دینے والے ہیں یعنی مغربی موسیقی کی تھاپ پر کالم خوانی کریں گے ! ضیاء
محی الدین نے بھی تو غالب کے خطوط اور فیض کا کلام سِتار کی موسیقی کے جلو میں پیش
کیا ہے۔ بعض عاقبت نا اندیش اور منچلے قسم کے لوگ اِسے خالص کلاسیکی موسیقی کی دال
میں خلل کا تڑکا قرار دیتے ہیں ! ہم نے سوچا کالم خوانی کی جارہی ہو اور پس منظر میں
ڈرم بیٹ ہو تو کیا ہرج

ہے؟ جو ڈرم سے پیدا ہوتی ہے وہ سُنائی دینے والی بیٹ ہی تو ہے، سُنگھائی دینے والی بیٹ تو نہیں ! عثمان جامعی نے وضاحت کردی کہ اُن کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اگر وہ ڈرم بیٹ پر کالم خوانی کر گزرتے تو تقریب کچھ آف بیٹ ہو جاتی اور لوگوں کو اِس حوالے سے بھی یاد رہ جاتی!

برادرم عثمان جامعی نے "کہے بغیر" میں بہت کچھ بیان کرنے کی کوشش (بلکہ جسارت) کی ہے۔ بعض مقاماتِ آہ و فغاں کو قدرے بولڈ اور رنگین جملوں کے ذریعے "گارنش" کرنے سے بھی نہیں چُوکے ! اگر قلم کی اِس "سَعی" پر اُنہیں تنقید و تنقیص کی "رَمی" کا سامنا کرنا پڑے تو کسی کو حیران نہیں ہونا چاہیے!

کالم خوانی پر یاد آیا کہ اِس ملک میں ہر آدمی وہ کام کر رہا ہے جو دراصل اُس کا کام نہیں۔ جو لکھنے کے ماہر ہیں وہ صداکاری کر رہے ہیں، جن کی زندگی صداکاری میں گزری ہے وہ اداکاری سکھانے پر مامور ہیں۔ اور اِس قوم پر خدا کا قہر تو دیکھیے کہ جن کی دال اداکاری کے شعبے میں کبھی گل نہ سکی وہ دانشوری پر اُتر آئے ہیں ! رہے دانشور۔۔۔ سو وہ تو اداکار ہیں ہی ! ایک ٹی وی چینل نے بزرگ مزاح نویس مشتاق احمد یوسفی کو مزاح خوانی کی منزل تک پہنچا دیا ! یہ لفظ "خوانی" بھی اپنی ایک دنیا رکھتا ہے۔ یہ کان میں کیا

پڑتا ہے، ذہن فوراً قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کا تصور باندھنے لگتا ہے! معاملہ یوسفی صاحب جیسی عظیم المرتبت ہستی کا ہے اِس لیے ہم یہ لکھنے کی جسارت نہیں کر سکتے کہ مجمع کے سامنے اپنے لکھے کو پڑھنا فاتحہ خوانی کے ذیل میں آتا ہے!

یوسفی صاحب نے 1990 میں "آبِ گم" لکھی اور خود بھی ایسے گم ہوئے کہ اہلِ ذوق ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔ یوسفی صاحب کے رشحاتِ قلم سے محرومی مزاح خوانوں اور مزاح دانوں کے لئے "صدمہ جاریہ" سے کم نہیں۔ خاکم بدہن، یوسفی صاحب کی اُفتادِ طبع کے نتائج سے محروم رہنا چراغ تلے اندھیرا نہیں تو اور کیا ہے؟ ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے کہا تھا کہ ہم مزاح کے عہدِ یوسفی میں جی رہے ہیں۔ اب، بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ ہم یوسفی صاحب کے نتائج طبع سے محرومی کے دور میں زندگی گزار رہے ہیں! یوسفی صاحب کتاب لکھنے یا منظر عام پر لانے سے بچنے کی کچھ ویسی ہی سَعی کر رہے ہیں جیسی زلیخا سے بچنے کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے کی تھی!

ایک ٹی وی چینل کے ذریعے یوسفی صاحب کا اُبھرنا خوش گوار حیرت کا باعث بنا کیونکہ ہم نے تو الیکٹرانک چینلز کی دلدل میں لوگوں کو ڈوبتے، بلکہ غرق ہی ہوتے دیکھا ہے! ہم نہیں جانتے کہ مزاح کو بھرے مجمع میں اِس طور پیش کرنے

کا آئیڈیا کسے اور کیسے سُوجھا؟ ٹی وی چینلز پر اور جو کچھ بھی پیش کیا جاتا ہے وہ مزاح سے کیا کچھ کم ہے؟

ویسے ادیبوں سے اُن کی نگارشات پڑھوانا کسی حد تک اُن پر (اور بہت حد تک سامعین پر) ظلم ہے۔ شعراء تو شاعری کے وزن اور طبیعت کی موزونی کی بدولت اپنی نگارشات کو ڈھنگ سے پڑھ جاتے ہیں مگر نثر خوانی میں حق ادا کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ سنجیدہ تحریر بھی ریہرسل کے بغیر پڑھی جائے تو اُس میں سے اچھا خاصا مزاح برآمد ہوتا ہے! مگر خیر، ہمیں تو اِس بات سے بھی خوشی ہوئی کہ یوسفی صاحب اپنی گزشتہ تحریریں پڑھ کر ہی سہی، درشن تو دے رہے ہیں! بعض اہل رقم۔۔ معاف کیجیے گا، اہل قلم تو اِتنا بھی نہیں کر پا رہے۔

عثمان جامعی کی وضع داری تسلیم کرنا پڑے گی۔ انہوں نے کالم خوانی سے پرہیز کرکے یہ جتا دیا کہ وہ بزرگوں کی ہم سَری نہیں کرنا چاہتے! "کہے بغیر" کی منزل سے ہم کہے بغیر ہی گزر گئے۔ ہماری اور ہمارے تبصرے کی بساط ہی کیا ہے! ہم نے سنجیدگی سے کوئی رائے دی تو اُسے مزاح سمجھ لیا جائے گا اور اگر، خدانا خواستہ، مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی تو لوگ پوری سنجیدگی سے بُرا مان بیٹھیں گے! مگر خیر، عثمان جامعی کے لئے یہ بات بھی خوش نصیبی سے کم تو نہیں کہ اُن کی کتاب کے حوالے سے ہم اور آپ یوسفی صاحب کے ذکر سے سرفراز

ہوئے! یار زندہ، صحبت باقی! اگر عثمان جامعی کا قلم اِسی رفتار سے موجیں مارتا رہا تو
!اُن کے کالموں کا اگلا سونامی یعنی مجموعہ مستقبل قریب ہی کی بات ہے

جنات اور شاعری

یہ ہم کس عہدِ کثیف میں جی رہے ہیں کہ فنون لطیفہ سے شغف رکھنے والا ہر شخص لطیفہ دکھائی دیتا ہے! ذوق لطیف کی ناقدری اور مزاج کثیف کی مقبولیت نے نفاست اور نزاکت کے حامل ہر انسان کو تماشا بنا دیا ہے۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ جب بھی (ہم سمیت) کوئی شخص غزل یا راگ سُنتا ہے تو (اہل خانہ سمیت) سبھی لوگ خاصا بُرا منہ بناتے ہیں۔ خدا جُھوٹ نہ بُلوائے، اِتنا بُرا منہ تو خود کلاسیکل گانے والے بھی نہیں بناتے! بہت سوں کے نزدیک یہ وقت کا ضیاع اور دماغ کا زیاں ہے۔ یہ بات کوئی نہیں بتاتا کہ فنون لطیفہ کے چُنگل سے محفوظ رہنے والے لوگ اپنا قیمتی وقت کس طور بروئے کار لاتے ہیں اور کون سے کار ہائے نمایاں انجام دینے میں کامیاب ہوتے ہیں!

ایک زمانہ تھا (جو یقیناً شادی سے پہلے کا تھا) جب ہم رو پیٹ کر غزلیں کہہ لیا کرتے تھے۔ پھر (گھریلو اور شہری و ملکی) حالات ایسے بدلے کہ ہم غزل گوئی چھوڑ کر صرف شہر آشوب کہنے کے قابل رہ گئے! غزل میں محبوب کی بے وفائی اور رقیب کے مظالم کی بات بھی کرتے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ملکی حالات کا رونا رو رہے ہیں! ایسا بھی ہوا کہ ہم نے بعض سیاسی احباب کو غزل کے چند شعر

سُنائے اور وہ سمجھے کہ ہم اُن کی پارٹی اور اُس کے قائد پر تبرّا بھیج رہے ہیں ! بس کچھ نہ پوچھیے، جو ہم نے خاصی مشق کے ذریعے "ڈیویلپ" کی تھی شعر کہنے کی وہ "خداداد صلاحیت" تو ہمارے لئے وبالِ جاں ہو گئی ! خوفِ فسادِ خلق سے یعنی اِس خیال سے کہ کہیں آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے، ہم شعر کہنے سے تائب ہوئے۔ سُنا ہے بعض ادب نواز احباب اِسی بنیاد پر اب تک ہمیں، بطور اظہار تشکر، احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں ! معاملہ پکے راگوں کا ہو یا شاعری کا، عوامی ردِ عمل یکساں ہوتا ہے۔۔ یعنی دونوں کا ذوق رکھنے والوں سے عوام دور بھاگتے ہیں ! ہم تو اِسے بھی قدرت کی مہربانی سمجھ کر شُکر گزار رہتے ہیں کہ اِس صورت میں ہم کسی کی مداخلت سے محفوظ رہتے ہوئے اپنے شوق کے مطابق ذوق کی تسکین کا سامان تو کر لیتے ہیں !

سلمان احمد عباسی بھی خوب ہیں۔ آج کل وہ جنات پر خاصے جناتی قسم کے مضامین سپردِ خاک .... خاکم بدہن، سپردِ قلم کر رہے ہیں ! بھائی سلمان کی تحقیق یہ ہے کہ بہت سے جنات بھی شاعری کو پسند کرتے ہیں اور بعض اوقات شاعروں پر عاشق بھی ہو جاتے ہیں ! اندازِ بیان سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ادب دشمنوں نے اِس معاملے میں "تحقیق" کے لئے معقول فنڈنگ کی ہے ! قوم ویسے ہی شاعروں اور

ہم ایسے سابق شاعروں سے بچتی پھرتی ہے، جنات اور شاعری سے متعلق اِس نوعیت کی تحقیق لوگوں کو شاعری اور شاعروں سے مزید دور اور متنفر کردے گی ! بھائی سلمان اِس امر پر بھی تحقیق فرمائیں کہ جنات بعض شعراء پر کہیں اِس لیے تو عاشق نہیں ہوتے !اُنہیں شاعری سے تائب ہونے پر مجبور کرنے کی یہی ایک صورت رہ گئی ہے

جب ہم نے اہلیہ کو بتایا کہ بعض جنات بھی شاعری کو پسند کرتے ہیں اور شاعروں پر مر مٹتے ہیں تو انھوں نے فوراً وضاحتی بیان داغ دیا کہ اُنہیں شاعر پسند ہیں نہ شاعری۔ اہلیہ کی جانب سے۔بروقت داغے جانے والے بیان سے ہم نے یہ مفہوم اخذ کیا کہ شعر و ادب اور شاعروں پر تبرّے سے زیادہ وہ اِس امر کی وضاحت کے لئے بے تاب تھیں کہ اُن کا تعلق جنات کے کسی قبیلے سے نہیں ! ہم نے کہا کہ شعر و ادب پسند ہیں نہ شاعری تو پھر ہمارے ساتھ زندگی کیوں اور کیونکر بسر کر رہی ہیں تو انھوں نے ہمیں یاد دلایا کہ ہماری شادی کے ذمہ دار بزرگ ہیں ! شادی کے لئے رضامند ہونے کا دوسرا سبب بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے یاد دلایا کہ رشتہ طے کئے جانے کے وقت ہم شعر ضرور کہتے تھے مگر کمانے پر زیادہ توجہ دیتے تھے ! زمانہ کتنا بدل گیا ہے، اب تو شعر کہنے !پر وہی توجہ دیتا ہے جو کچھ کمانا چاہتا ہے

اہلیہ سے تو کیا بحث کرتے کہ ایسی کسی بھی گستاخی کا انجام سب جانتے ہیں، اِس لئے خیال آیا کہ بھائی سلمان عباسی سے کہیں کہ شاعری کا سلسلہ جنات سے جوڑ کر لوگوں کو شعر و ادب سے مزید متنفر نہ کریں۔ بہت سے لوگ ویسے ہی شاعری کو جناتی عمل گردانتے ہیں اور بعض شعراء کو دیکھ کر ہم خود بھی یہ سوچتے رہے ہیں کہ شاعری کہیں جنات کی دُنیا سے درآمد شدہ عمل تو نہیں! جوش ملیح آبادی جس طرح کے شعر کہتے اور جس انداز سے اُنہیں اہل ذوق کی نذر کرتے تھے اُس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جنات اگر شعر کہیں گے تو کس طرح کہیں گے! مرحوم جس طور اشعار حاضرین کی نذر کیا کرتے تھے اُسے دیکھ کر کبھی کبھی "حاضری" کا گمان گزرتا تھا! عبدالعزیز خالد مرحوم کے محض چند اشعار کو بھی سمجھنے اور "پچانے" کے لئے جنات کا دماغ اور ہاضمہ درکار ہے! سُنا ہے اُن کے بعض مصرعے تو جنات سے گلوخلاصی کے تعویذ کے طور پر بھی استعمال کئے جاتے رہے ہیں! صہبا اختر جس ڈھب سے مشاعرہ پڑھتے تھے کیا اُسے دیکھ کر کوئی دعویٰ کرسکتا ہے کہ مرحوم جناتی صفات کے حامل نہیں تھے؟ فرحت عباس شاہ نے جس قدر شاعری کی ہے وہ بھی کچھ جنات ہی کا خاصہ معلوم ہوتی ہے! اور.... اللہ بخشے، محترم راغب مرادآبادی جس مقدار میں رُباعیاں کہتے تھے وہ کچھ کچھ جنات ہی کے بس کی بات نظر آتی ہے! اور تعدّدِ رباعیات کے معاملے میں تنقید برداشت کرنے کی جو صلاحیت محترم راغب میں تھی وہ بھی کم ہی اِنسانوں میں پائی گئی ہے! اِس حوالے سے دلاور فگار مرحوم کی "تربوز کی

منڈی" والی رباعی سند ہے!

اُردو کے بعض شعراء حُلیّے کے اعتبار سے جنات کی ہم سَری کرتے نظر آتے تھے۔ اِن میں عبدالحمید عدم اور ضمیر جعفری مرحوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں! اُنہیں سامنے پا کر ادب کی دُنیا کے معمولی بھوت پریت تو ویسے ہی بھاگ کھڑے ہوتے تھے! عدم کی کئی غزلیں خاصے اہتمام اور دلچسپی کے ساتھ گائی گئی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عدم اپنی غزل کسی مغنّی یا مغنیہ کے سامنے رکھ کر کہتے ہوں

اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!

اور اُنہیں دیکھ کر بے چارے گانے والے یا گانے والی میں انکار کی جرات ہی پیدا نہ ہو پاتی ہو!

امریکی صدر کا پریکٹیکل جوک

سُنتے آئے ہیں کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ ایبٹ آباد میں جو کچھ ہوا وہ اس بات کو سچ یا درست بھی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ امریکہ نے القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن کو ختم (!) کرنے میں جتنی تیزی دکھائی اُس نے ساری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ امریکیوں نے القاعدہ چیف کو قتل کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس دعوے کی تصدیق جس چیز سے ہوسکتی تھی وہ اب، امریکیوں کے بقول، نہیں رہی۔ اسامہ بن لادن کی لاش کو امریکیوں نے سمندر برد کردیا۔ لیجیے، قصہ ہی ختم۔ غالب نے سچ ہی تو کہا تھا

نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا!

زندہ اسامہ سے امریکہ کو یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں دھماکے نہ کرادے، تباہی نہ پھیلا دے۔ اور مرے ہوئے اسامہ سے شاید یہ خطرہ تھا کہ کہیں مزار نہ بن جائے، مریدین پیدا نہ ہو جائیں، نذر و نیاز کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے! ظاہر ہے یہ "نذر نیاز" بھی خاصی دھماکہ خیز ہوتی!

اتوار (یکم مئی) کو امریکی صدر براک اوبامہ نے وائٹ ہاؤس میں میڈیا والوں

سے ملاقات میں بزم طرب سجائی اور خاصے بے تکلفانہ انداز سے لطائف سنائے۔ اوبامہ نے اپنی جائے پیدائش کے معاملے کو بھی ہلکے پھلکے انداز سے بیان کیا اور محفل لوٹ لی۔ ثابت ہوا کہ امریکی حکمران اپنی جائے پیدائش اور (کمزور) دشمنوں کی جائے ہلاکت کا ذکر فکاہیہ انداز سے کیا کرتے ہیں! اور اگلے ہی دن اُنھوں نے ایبٹ آباد آپریشن کے ذریعے پریکٹیکل جوک بھی کر دکھایا! امریکی صدر کی شگفتہ مزاجی کی مناسبت سے اب امریکی ایوان صدر کو "لائٹ ہاؤس" کہنا بھی کچھ غلط نہ ہوگا!

اسامہ بن لادن کے خلاف آپریشن اور اس آپریشن میں اُن کے مارے جانے کا امریکی دعویٰ بہت حد تک لطیفے کے مشابہ ہے۔ جس اُسامہ کے بارے میں دنیا جانتی ہے کہ وہ کہیں پندرہ بیس دن سے زیادہ نہ ٹھہرتے تھے، دعویٰ کیا جارہا ہے کہ وہ ایبٹ آباد کے ایک وسیع و عریض وِلا میں پانچ چھ سال مقیم رہے! اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ امریکہ نے ان پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پہلے نشانہ کیوں نہ بنایا گیا؟ کیا اوبامہ کی ریٹنگ بڑھانے کے لئے موزوں موقع کا انتظار تھا؟ یاد کیجیے کہ سابق امریکی صدر جارج ہربرٹ بش (سینئر) نے اپنے عہدِ صدارت کے آخری دنوں میں انتخابی فائدے کے لئے عراق پر بلاجواز بمباری کروائی تھی!

ایبٹ آباد آپریشن خاصی عجلت میں کیا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے امریکی فوجیوں کی ٹرین چھوٹی جارہی تھی ! انہیں شاید اندازہ نہیں تھا کہ اب ہمارے ہاں کوئی ٹرین ہی نہیں بچی تو چھوٹے گی کیا ! دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسامہ بن لادن کی لاش بحیرہ عرب میں بہا دی گئی۔ اگر امریکی دریائے گنگا میں بہانے کا دعویٰ کرتے تو اہل ہند بھی خوش ہو جاتے اور بھارت سے دوستی کا حق بھی ادا ہو جاتا !

امریکی میڈیا کا دعویٰ ہے کہ اسامہ بن لادن خاصی طلسماتی شخصیت کے مالک تھے اور ایمن الظواہری میں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ بھی آگ لگانے کی کوشش کا حصہ ہے۔ جسے مارنے کے لئے بے تاب تھے اسے مارنے کا دعویٰ بھی کر رہے ہیں اور ستائش کے ڈونگرے بھی برسا رہے ہیں ! یعنی ایک گال میں آگ اور دوسرے گال میں پانی۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسامہ طلسماتی شخصیت تھے تو امریکی حکومت خود کیا سامری جادوگر سے کم ہے ! آنکھوں سے کاجل چرانے کا محاورہ تو ہم سنتے آئے ہیں مگر آنکھوں میں دھول جھونکنے کا ہنر امریکہ پر ختم ہے ! جس کی شکل سے نفرت تھی اس کی لاش کو بھی جی بھر کے نہ دیکھا اور سمندر برد کر دیا ! ہم ایسی کسی بھی کہانی پر کیسے یقین کر سکتے ہیں؟ ہماری نظر تو خوگر پیکر محسوس ہے۔ کسی ان دیکھے معاملے پر کیوں اور کیونکر ایمان لائیں؟ امریکی حکومت نے اب تک یہ وضاحت بھی نہیں کی کہ اسامہ بن لادن کی لاش کی تصاویر یا وڈیو منظر عام پر

لانے میں کون سی مصلحت دیوار بنی ہوئی ہے؟ آج کے دور میں تو لوگ ہاتھ میں موبائل کیمرے لئے پھرتے ہیں اور ایک ایک چیز کی وڈیو بناتے ہیں۔ ایسے میں اسامہ بن لادن کی لاش کی وڈیو کیوں نہ بنائی جا سکی ! اس حوالے سے امریکہ کی جانب سے ! کوئی بھی وضاحت صدر براک اوبامہ کے لطائف ہی میں شمار کی جائے گی

ایبٹ آباد آپریشن میں اسامہ بن لادن کے مارے جانے پر امریکہ جس طرح زور دے رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم اس کی بات پر آمنا و صدقنا کہیں اسے دیکھ کر ہمیں ایک گیت کی دو لائنیں یاد آ رہی ہیں۔

تم کہو تو سچ ۔۔ ہم کہیں تو جھوٹ

تم کو سب معاف ۔۔ ظلم ہو کہ لوٹ

اب اس سے آگے کیا کہیے۔ امریکی چاہتے ہیں کہ وہ سورج کو سیاہ دھبہ قرار دیں اور ہم مان لیں کہ سورج کالا ہے۔ ذرا سپر پاور کی شان تو دیکھیے۔ چراغ بجھنے سے پہلے بھڑک کر روشنی بڑھا رہا ہے اور اِسے اجالا بھی قرار دے رہا ہے ! افسوس اس بات کا ہے کہ جنہیں ہم نے حکمرانی کا حق دیا ہے وہ امریکی ہدایت کے مطابق سورج کو کالا تسلیم بھی کر ! رہے ہیں

سیاسی قیادت نے امریکہ کو سراہنے میں بازی لے جانے کی بھرپور کوشش کی اور کامیاب رہی۔ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے ایبٹ آباد آپریشن پر بر وقت "ریسپانس" دیا اور کامیاب رہے۔ وہ چاہتے تو خاموش بھی رہ سکتے تھے مگر شاید خاموش رہنا ان کے لئے ممکن نہ تھا اور بولنا گویا فرائض کا حصہ تھا! اور جب وزیر اعظم نے اپنا حق ادا کردیا تو اعلیٰ ترین سطح سے بھی اسامہ بن لادن کے مارے جانے پر امریکیوں سمیت بارہ سے زیادہ ممالک کے عوام اور حکمرانوں کو سکون کا سانس لینے کی نوید سنائی گئی۔ واشنگٹن پوسٹ کے لئے ایک مضمون میں صدر آصف علی زرداری نے لکھا ہے کہ اسامہ نئے ملینیم میں دہشت کی سب سے بڑی علامت تھا۔ اور اس کے بعد انہوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی قربانیاں گنوائی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ پاکستان میں اسامہ کی موجودگی اور پھر امریکیوں کے ہاتھوں ان کے مارے جانے کو own کرنے کا خمیازہ کیا ہوگا، جو باالآخر ہم عوام کو بھگتنا ہے۔ ایبٹ آباد میں جو کچھ ہوا وہ ہمارے لئے ہر اعتبار سے لمحہ فکریہ ہے۔ اگر اسامہ بن لادن واقعی ایبٹ آباد میں مقیم تھے تو اسے محض انٹیلی جنس کی ناکامی قرار دیا جائے یا پھر امریکہ سے پارٹنرشپ کی ایک نمایاں شکل قرار دیا جائے؟ صدر کہتے ہیں کہ آپریشن امریکیوں نے کیا، یعنی پاکستانی فورسز سے مدد لینے سے گریز کیا گیا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ پاکستانیوں کی مدد کے بغیر امریکہ کے لئے اسامہ بن لادن تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ یہی بات دوسرے بہت سے اعلیٰ حکام نے بھی کہی۔ یہ گویا

اس امر کا اعتراف ہے کہ پاکستان کی حکومت اور سیکورٹی حکام کو اسامہ کی موجودگی کا نہ صرف علم تھا بلکہ وہ امریکیوں کو القاعدہ چیف تک لے جانے کے لئے بھی بے تاب تھے ! وسیع تر مفہوم میں تو یہ اقبالی بیان سے کم نہیں !

امریکی میڈیا نے سات آٹھ سال سے شور مچا رکھا تھا کہ اسامہ بن لادن قبائلی علاقوں میں موجود ہیں۔ پاکستان تردید کرتا رہا۔ اور ابھی دس دن قبل ہی امریکی میڈیا نے یہ خبر دی کہ اسامہ بن لادن دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع کئے جانے کے بعد مشرقی افغانستان سے ہوتے شمالی افغانستان چلے گئے۔ یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ پاکستان کو اس معاملے میں مطعون نہ کیا جائے۔ اور پھر محض ایک ہفتے میں یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی کہ اسامہ بن لادن نے تو ایبٹ آباد میں پناہ لے رکھی تھی ! کیا ایبٹ آباد شمالی افغانستان میں ہے ؟

ایبٹ آباد آپریشن ایک تیر سے چار چھ نشانے لگانے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔

افغانستان میں طالبان اور حقانی نیٹ ورک نے امریکیوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ افغان صدر حامد کرزئی نے امریکیوں کی کمزور ہوتی ہوئی پوزیشن سے گھبرا کر طالبان کو گلے لگانے کی کوشش کی۔ آپریشن کی خبر پھیلتے ہی انہوں نے پاکستان کو آنکھیں دکھانا شروع کر دیا ! اتحادیوں کے جانے کے بعد افغانستان

میں بھارت کے لئے شاید کچھ بھی نہ بچتا۔ مگر اب بھارت بھی پاکستان کو جی بھر کے آنکھیں دکھانے کی تیاری کر رہا ہے! گویا سازش کے ذریعے بھارت اور افغانستان کو پاکستان پر "اپر ہینڈ" دیا جا رہا ہے!

امریکی قانون ساز پاکستان کی امداد رکوانے یا گھٹانے کے لئے بے تاب دکھائی دے رہے ہیں۔ پاکستان کی وفاداری پر بھی شک کیا جا رہا ہے۔ امریکی سیاست دان میدان جنگ تبدیل کرنے کی بات بھی کر رہے ہیں۔ حامد کرزئی نے بھی کہا ہے کہ اسامہ کو تلاش کرنے کے نام پر ہزاروں افغانوں کو بلا جواز قتل کیا گیا، جنگ تو پاکستان میں لڑی جانی چاہیے تھی! اب اگر تقدیر ہمیں اس موڑ پر لے آئی ہے تو اللہ سے دعا ہے کہ قوم کم از کم اس معاملے ہی میں متحد ہو جائے اور حکمرانوں کی سوئی ہوئی حمیت کچھ جاگ جائے! قوم ایسے دوراہے پر کھڑی ہے کہ ہمارے کالم کی ابتدا مسکراہٹ سے ہوئی تھی مگر اب اِس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا رہی ہیں!

تحقیق کرنے والوں کی موٹی عقل

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کے بارے میں سوچیں اور آپ کو
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
کی عملی تصویر بنا دیں تو لازم ہے کہ آپ میں کچھ تو ہو جو اوروں سے ہٹ کر ہو۔ سوال خوبی یا خامی کا نہیں، خصوصیت کا ہے۔ اب ہماری ہی مثال لیجیے۔ ہمیں قدرت نے کئی خصوصیات بخشی ہیں مگر ایک خصوصیت ایسی نمایاں ہے کہ لوگ رات دن اُس کا تذکرہ، بلکہ اُس پر بحث کرتے نہیں تھکتے۔

احباب ہمیشہ اِس غلط فہمی میں غلطاں رہے ہیں کہ ہم اپنی آراء اور دلائل میں وزن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہم زیادہ دکھائی دینا چاہتے ہیں! بعض کی رائے یہ ہے کہ ہم فردوس عاشق اعوان ٹائپ کی کوئی چیز بننے کے مرحلے میں ہیں! حقیقت یہ ہے کہ ہمارے موٹاپے کا اِن تمام باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ہمارا موٹاپا محض سُستی کا نتیجہ ہے۔

مرزا تنقید بیگ ہماری بہت سی دوسری باتوں کی طرح سُستی والی منطق سے بھی متفق نہیں۔ اُن کا کہنا ہے۔ "جب کہیں کھانا چُنا جاتا ہے تب تم مختلف

ڈِشوں کو انار کلی سمجھتے ہوئے جتنی چُستی اور پُھرتی سے پیٹ کی دیوار میں چُنتے ہو اُسے دیکھ کر بہت سے لوگ اپنے دانتوں تلے اُنگلیاں دبانے سے ایک قدم آگے بڑھ کر چبالینے کی منزل تک جا پہنچتے ہیں! کسی بھی دعوت میں تم جس سُرعت کے ساتھ کھاتے ہو وہ قابل دید، قابل داد اور قابل رشک ہوتی ہے۔ اور جو تمہیں کھانے کی دعوت دے بیٹھے وہ صرف قابل اشک رہ جاتا ہے!"

دوسرے احباب کی طرح ہم مرزا کی باتوں کا بھی ذرا بُرا نہیں مانتے۔ ہر دور میں کھاتے پیتے انسانوں کو لوگوں نے اِسی طرح استہزاء اور طنز کا نشانہ بنایا ہے! عدنان سمیع خان کو کس نے طنز و مزاح کا ہدف نہیں بنایا مگر سب نے دیکھ لیا کہ اُسے قدرت نے لِفٹ کرادی اور تمام ناقدین اور بدخواہوں کے منہ پر تالے لگ گئے!

مرزا کہتے ہیں۔ "تم جس رفتار سے پَھیل رہے ہو اُسے دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ بہت جلد تمہارا شمار ملک کے 'بڑے' کالم نویسوں میں ہونے لگے گا! سچ تو یہ ہے کہ تم موٹاپے ہی کی بُنیاد پر 'بڑے' کالم نویس بن سکتے ہو!"

ہم ایسی باتیں سُن کر اکثر خاموش ہو رہتے ہیں کیونکہ
کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت

!جس کا جتنا ظرف ہے اُتنا ہی وہ خاموش ہے

آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم اپنا مقدمہ عوامی عدالت میں لے آئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ لوگوں کو کھیلنے کے لئے کچھ نہ کچھ چاہیے۔ زمانہ بدلتا ہے تو رجحانات بھی بدل جاتے ہیں۔ ایک وہ دور بھی تھا جب لوگ گنجوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اگر کسی کے سر پر بال نہ ہوں تو دوسروں کو کیوں الجھن ہوتی ہے، یہ بات ہم آج تک سمجھ نہیں پائے! سر پر بال اُگانے کے نسخے بتا بتا کر لوگ گنجوں کو مزید گنجا کرنے پر تُلے رہتے ہیں! کوئی دُبلا ہو تو لوگ اِس فکر میں دُبلے ہوئے جاتے ہیں کہ وہ دُبلا کیوں ہے! اور جنہیں اللہ نے پورے وزن کے ساتھ پیدا کیا ہے اُن کا وزن کم کرنے کی فکر میں بھی لوگ دُبلے اور پتلے ہوئے جاتے ہیں! اب آپ خود اندازہ لگایئے کہ ہم جیسے "صحت مند نونہالوں" !کا وجود لوگوں کو سلِم رکھنے میں کس قدر مدد دیتا ہے

مغرب میں اب تحقیق کے لئے موضوعات تقریباً ختم ہو چلے ہیں۔پُرانی شراب نئی بوتل میں پیش کرنے ہی کو تحقیق سمجھ لیا گیا ہے! جب کچھ نہیں ملتا تو "سدا بہار" قسم کے موضوعات پر گھسی پِٹی تحقیق کی جاتی ہے۔ مثلاً ڈھائی تین ہزار افراد کی میڈیکل ہسٹری کھنگال کر اور دو ڈھائی سو رضاکاروں پر تجربات کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرکے دُنیا کے سامنے پیش کردیا جاتا ہے کہ انسان زیادہ

کھانے سے موٹا ہو جاتا ہے! ایسا نتیجہ تو ہم کسی بھی قسم کی تحقیق کے بغیر پلک جھپکتے میں اَخذ کر سکتے ہیں! امریکہ میں ایک حالیہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ موٹاپا دراصل سُستی کا نتیجہ ہوتا ہے! ہم نے بعض ماہرین کی یہ رائے بھی پڑھی ہے کہ موٹے افراد سُست ہوتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ ماہرین کی ایک زبان نہیں ہوتی۔ کبھی موٹاپے کو سُستی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور کبھی سبب بتاتے ہیں! ایسے لوگ بھلا کِس طرح جان پائیں گے کہ مُرغی پہلے آئی تھی یا انڈا! کبھی ماہرین دس سال کی تحقیق کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ انسان زیادہ سونے سے موٹاپے کی دُنیا میں داخل ہو جاتا ہے! سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات کو تسلیم کریں اور کسے ردّی کی ٹوکری میں ڈالیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ماہرین خُوش خُوراکی، سُستی اور نیند کے درمیان پَھڈّا کرانے کے موڈ میں ہیں! اب کیا کوئی کھانا، پینا اور سونا چھوڑ دے؟ رہ گئی سُستی۔ تو کیا اعجاز بٹ کا وجود اِس بات کا زندہ ثبوت نہیں کہ سُست رہتے ہوئے بھی انسان خاصی پُھرتی سے کامیابی کی طرف بڑھ سکتا ہے؟

مغرب میں ایک حالیہ تحقیق سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ موٹے لوگوں کی عقل بھی موٹی ہوتی ہے! لیجیے، مرزا کو تو گویا کھلونا مل گیا۔ اخبار میں موٹوں کی موٹی عقل والی خبر پڑھتے ہی ملاقات کے نام پر ہم سے کھیلنے آ دھمکے اور بولے۔ "اِن ماہرین کی عقل ہمیں موٹی معلوم ہوتی ہے۔ موٹی عقل کا راز

جاننے کے لئے اِتنی محنت کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ ہم سے پوچھ لیا ہوتا، تمہیں دیکھ کر ہم بہت پہلے اندازہ لگا چکے تھے کہ عقل موٹی کس طرح ہو جاتی ہے! اور تمہارا لکھا پڑھ کر تو ہمارا اندازہ اب یقین اور عقیدے کی منزل تک پہنچ چکا ہے!"

ابھی ہم جواباً کچھ کہنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ مرزا نے حُسن تکلم کی گاڑی کا ایکسیلریٹر مزید دبا دیا۔ "1942 کی فلم 'تان سین' میں تانی بیگم کسی طور میاں تان سین کے راگوں اور راگنیوں سے متاثر نہ ہوتیں تھیں۔ ایک دن گاؤں میں کہیں سے مَست ہاتھی آنکلا۔ سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر میاں تان سین ہاتھی کے سامنے کھڑے ہوگئے اور اپنی دل نشیں آواز میں 'رم جُھم رُم جُھم چال تہاری، چال بھئ متواری' گا کر ہاتھی کو پُرسکون ہو کر دوزانو بیٹھنے پر مجبور کر دیا! پورے گاؤں نے یہ منظر دیکھا۔ اور جب تان سین نے داد طلب نظروں سے تانی بیگم کی طرف دیکھا تو وہ تان سین کے فن کا اعتراف کرتے ہوئے بولیں۔۔ 'تمہاری راگ ودیا کو ہم بھی مان گئے، مگر ایک تو کہنی پڑے گی۔ تمہارا گانا موٹی عقل والوں ہی کی سمجھ میں آتا ہے!' جب ہم تمہیں اُستاد بڑے غلام علی خاں، اُستاد برکت علی خاں، پنڈت جسراج اور بھیم سین جوشی کے پکے راگ سُنتے اور جُھومتے دیکھتے ہیں تو تانی بیگم کی رائے میں پائی جانے والی صداقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے!"

ہم نے عرض کیا کہ مرزا! صرف موٹاپے پر مت جاؤ۔ فربہ اندام لوگوں نے دُنیا کو
"بہت کچھ دیا ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ موٹے زندہ دل ہوتے ہیں۔
"مرزا نے جواب دیا "زندہ دِلی تو مجبوری ہے۔
ہم نے وضاحت طلب کی تو کہنے لگے۔ "موٹا آدمی اپنے موٹاپے پر کوئی طنزیہ جملہ سن کر
مارنے کے لئے بھاگ تو سکتا نہیں اِس لئے دوسروں کے ساتھ خود بھی ہنسنے لگتا ہے۔ اب
"! چاہو تو اِس مجبوری کو زندہ دِلی کہہ لو
اِس بات پر جی میں تو آیا کہ بڑھ کر مرزا کی گردن دبوچ لیں، مگر اُن کے ساتھ ہمارا
! پیار اور دُلار کا رشتہ ہے اِس لئے دِل کی تمنا کی تعمیل سے اجتناب برتنا بہتر جانا

یہ ہم کس ملک میں پیدا ہو گئے

جگر مراد آبادی نے کہا تھا

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر

جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں !

کچھ لوگ اپنے افکار و اعمال سے چوبیس گھنٹے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں کہ کائنات میں اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، ایک "ناانصافی" ضرور ہوئی ہے۔۔ یعنی یا تو وہ پاکستان کے لیے نہیں بنے یا پھر پاکستان اُن کے لیے نہیں بنا ! پہلی بات البتہ درست معلوم ہوتی ہے !

جس طرح شکر خورے کو کسی نہ کسی طور شکر مل ہی جاتی ہے بالکل اسی طرح اگر انسان ناشکرے پن کا مظاہرہ کرنا چاہے تو بہانے گویا آسمان سے برستے ہیں ! جنہیں اپنے وطن میں ایک پل بھی رہنا گوارا نہیں وہ معاشرے اور سرزمین کے خلاف دل کا غبار نکالنے کے لیے ہر وقت کوئی نہ بہانہ تراشتے رہتے ہیں۔ جی میں آتا ہے اُن سے کہا جائے کہ آپ بہانوں کے محتاج نہیں۔ بس دل کی بھڑاس نکالتے رہیے، یہ مٹی آپ سے کچھ نہیں کہے گی !

زندگی کے دامن سے کوئی بھی کام کی چیز پانے میں ناکام رہنے والوں اور اِس

دل خراش" حقیقت کی آڑ میں وطن سے .برائے نام بھی محبت نہ کرنے والوں کا"
فیورٹ جملہ ہے "یہ ہم کس ملک میں پیدا ہوگئے !" اِسے کہتے ہیں بندر کی بلا طویلے کے
سر! اپنی پیدائش پر وطن کو قصور وار قرار دینے سے متعلق جملے کا جواز پیدا کرنا ہو تو
اپنے ماحول پر نظر دوڑائیے۔ اگر بجلی کا بل جمع کرانے کے لئے آدھا گھنٹہ قطار بند ہونا
پڑے تو آپ بہت سُکون سے، بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہم کس ملک میں پیدا
ہوگئے ! اگر بس کا انتظار کرتے ہوئے، بس اسٹاپ پر چلچلاتی دھوپ میں بیس پچیس
منٹ گزر جائیں یا بس نہ ملے یا بس میں سیٹ نہ ملے تو آپ کسی اور کے بارے میں نہ
سہی، ملک کے جواز و عدم جواز کے بارے میں تو سوچ ہی سکتے ہیں ! اگر لوڈ شیڈنگ کے
شیڈول کے مطابق آپ نے کپڑوں پر اِستری نہیں کی اور کہیں جانے کی جلدی بھی ہے تو
ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اب مملکتِ خداداد کی شامت آیا چاہتی ہے ! اگر شادی میں کھانا
! دیر سے کِھلایا جائے تو قُصور ملک کا نکل آتا ہے ! یعنی کرے بھٹیارا اور بُھگتے پاکستان
مرزا تفصیل بیگ وطن سے محبت تو کرتے ہیں مگر وطن سے محبت نہ کرنے والوں کا دفاع
کرنے میں بھی پیش پیش رہتے ہیں ! یہ تضاد عجیب ہے مگر صاحب ! مرزا کی تو پوری
شخصیت ہی تضادات سے اَٹی پڑی ہے ! وہ خاصی مستقل مزاجی سے اُن لوگوں پر کی جانے
والی تنقید کا جواب دیتے ہیں جن کا کام ہی ہر وقت وطن سے شکوہ سنج

رہتا ہے۔ ہم بھی باز نہیں آتے یعنی مرزا کو بارہا سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو ہر حال میں خوش رہنا چاہیے۔ اِس معاملے میں ہم ہمیشہ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے ہیں یعنی ہر بار ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ غلام مصطفٰی کھر کو مزید شادیاں نہ کرنے پر رضامند کرنا آسان ہے، مرزا کو خوش رہنے پر آمادہ کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے! جب بھی ہم نے کہا ہے کہ انسان کو فلمی ہیرو سے سیکھنا چاہیے کہ ہر حال میں کس طرح خوش رہا جاسکتا ہے تو مرزا نے یہ جواب دیا ہے کہ اُسے تو خوش رہنے کے پیسے ملتے ہیں! موصوف کا اصرار بلکہ ضد ہے کہ حالات کے تھپیڑے کھانے والوں سے ہم مسکرانے اور خوش رہنے کی توقع وابستہ نہیں کرسکتے۔ ہم اِس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جو لوگ خوش نہیں رہتے وہ ناشکرے ہو جاتے ہیں۔ مرزا کا جوابی استدلال یہ ہوتا ہے کہ خوش نہ رہنا اور ناشکرا پن اختیار کرنا ایک دوسرے کے معاون زاویے ہیں۔

چوہدری شجاعت حسین کی دانش کے قربان جائیے۔ ان کا مشہور زمانہ اصول یہ ہے کہ جب بھی کوئی معاملہ سمجھ میں نہ آئے تو "مٹّی پاؤ!" یعنی پہنچاؤ وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر ہو! وہ اپنی اِس بات پر عمل بھی کرتے آئے ہیں۔ اُنہوں نے بہت سے مواقع پر اپنے ہی کیے دھرے پر مٹّی ڈالی ہے۔ جب ہم نے مرزا سے کہا کہ چوہدری شجاعت کی طرح ہمیں بھی مسائل پر مٹّی "پا" دینی چاہیے۔ وہ جواباً فرماتے ہیں کہ چوہدری برادران بھی بس قومی مفاد کے اُمور پر مٹّی "پا" دیتے.

پر یقین رکھتے ہیں، جب کسی اپنے کی گردن پھنستی ہے تو وہ "مٹی پاؤ" کے اصول پر مٹی ڈالنے بلکہ اُسے "زیر زمین کے نیچے" دبانے میں دیر نہیں لگاتے!

یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ کوئی زندگی بھر غلطیاں کرے اور جب اُن کا خمیازہ بھگتنے کی باری آئے تو وطن اور اہل وطن کو کوسنے بیٹھ جائے! اپنے حالات بہتر بنانے اور معیاری زندگی بسر کرنے سے تو کسی نے کسی کو نہیں روکا۔ پھر لوگ کیوں ہر معاملے میں دوسروں کو موردِ الزام ٹھہراتے پھرتے ہیں؟ یقیناً اِس لیے کہ اِس سے آسان راہ کوئی نہیں۔ مرزا ہم سے متفق نہیں۔ وہ کہتے ہیں "انسان کسی نہ کسی کو موردِ الزام اُسی وقت ٹھہراتا ہے جب حالات اُسے مجبور کردیتے ہیں!" ہم نے بیشتر مواقع پر دیوار سے سر پھوڑا ہے یعنی مرزا کو یہ سمجھانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ انسان اپنے لیے مجبوریاں خود پیدا کرتا ہے۔ مگر مرزا اِس بات کو بھی نہیں مانتے۔ اُن کا یہ کہنا ہے کہ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ اُن کی اِس بات سے ہم متفق ہیں کیونکہ اُن کی دوستی ہم پر جس طرح گزرتی رہی ہے وہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں!

مرزا کا استدلال یہ ہے کہ حالات نے انسان کو کہیں رہنے نہیں دیا۔ ہم پر اُن کی خاص مہربانی ہے کہ بے موقع بھی طنز سے گریز نہیں فرماتے اور جو دل میں ہوتا ہے وہ ہم پر انڈیل ہی دیتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ انسان کو اپنے

حالات درست کرنے پر توجہ دینی چاہیے تو مرزا فرماتے ہیں کہ ہر انسان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اِس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حالات کو شکست دی جا سکتی ہے۔ ہم بھی کبھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ حالات کو ہرایا جا سکتا ہے، ہاں حالات کی نوعیت اور شدت دیکھتے ہوئے اپنے لیے کسی نئی راہ کا تعین تو کیا جا سکتا ہے۔ مرزا کے نزدیک یہ بھی ناممکنات میں سے ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حالات کی خرابی فرد کے خلاف معاشرے کی سازش کے سوا کچھ نہیں! ہم جب یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کے بقول مخالف ہوا سے گھبرانا نہیں چاہیے کہ یہ تو انسان کو اونچا اڑانے ہی کے لئے ہوتی ہے تو مرزا کہتے ہیں مخالف ہوا میں تم جیسے عقاب اُڑ سکتے ہیں، چڑیا بے چاری کب تک پَروں کو پھڑپھڑائے! ساتھ ہی وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال نے ایسی بہت سی باتیں فرمائی ہیں جن کا وہ پریکٹیکل کرتے تو کئی غزلیں اور نظمیں تبدیل کیے بغیر دُنیا سے رخصت نہ ہوتے! ایسے میں کون ہے جو مرزا کو یہ سمجھائے کہ مخالف ہوا تو عقاب اور چڑیا دونوں ہی کے لیے مخالف ہوا ہوتی ہے، کسی کو بخشتی نہیں۔

مرزا کہتے ہیں "غریب کی جیب خالی ہو چکی ہے۔ بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں۔ تنخواہ پندرہ تاریخ کو ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ادھار پر گزارا ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ آنسو نہ بہائے تو کیا کرے؟"

مرزا کی بات درست ہے مگر یہاں تو حال یہ ہے کہ جیب بھر کمانے اور پیٹ بھر کھانے والے بھی ملک کو جی بھر کے بُرا بھلا کہنے پر تُلے رہتے ہیں ! ناشکرا پن ختم ہوتا ہے نہ لالچ۔ مہینہ بھر محنت کرکے آٹھ دس ہزار روپے کمانے والا روئے تو بات سمجھ میں آتی ہے، مگر یہاں تو ماہانہ ڈیڑھ دو لاکھ روپے کمانے والے بھی دو وقت کی روٹی کا رونا روتے پائے گئے ہیں !! ہر ماہ کروڑوں کمانے والے کیا سوچتے ہیں یہ ہمیں معلوم نہیں ! کیونکہ وہ ہم سے نہیں ملتے، صرف ڈاکٹرز سے ملتے اور اُنہی کو حال دل لکھواتے ہیں

جن باتوں پر لوگ روتے رہتے ہیں اُن پر صرف ہنسی آتی ہے اور جو باتیں کبھی ہنسایا کرتی تھیں اب اُن پر رونا آتا ہے ! ملک کہاں پہنچ گیا ہے، ہم کہاں کھڑے ہیں اور اب اگلی منزل کیا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مرزا سے ہماری چشمک اپنی جگہ، سچ تو یہ ہے کہ سبھی کا بُرا حال ہے۔ لوگ حالات بدلنے کے نام پر صرف کڑھتے رہتے ہیں اور (نعوذ باللہ) قدرت کو قصور وار ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں !

یہ کس مقام پہ لے آئی بے حسی اپنی !

ملک ٹوٹنے کی باتیں لوگ اِس طرح کرتے ہیں جیسے اسٹیج ڈرامے میں جگت بازی کا محل ہو ! جن باتوں پر سنجیدگی لازم ہے اُنہیں "ہی ہی ہاہا" میں اڑایا جارہا

ہے۔ کبھی کبھی تو ہمیں مرزا کی "اختلاف پسندی" پر بھی پیار آ جاتا ہے! مقام عبرت ہے کہ کھیتوں میں دن بھر دھوپ کی شدت برداشت کرکے ہمارے لیے اناج اگانے والے تو روکھی سوکھی کھا کر بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور جن کے لئے قدرت نے پیٹ بھر کھانے کا اہتمام کیا ہے وہ شکر کے دو الفاظ ادا کرنے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کرتے! اپنی پیدائش کے لئے وطن کو موردِ الزام ٹھہرانے سے گریز تک ہم اخلاقی اور روحانی طور پر پیدا نہیں ہو سکیں گے!

جو رہی سو بے خبری رہی

"آپ کو تو معلوم ہی ہوگا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو معلوم نہ ہو؟"

"اگر آپ کو معلوم نہیں تو پھر کسے معلوم ہوگا؟"

"آپ تو اندر کی ساری باتیں جانتے ہیں۔"

یہ اور ایسے ہی دوسرے بہت سے سوالوں کا سامنا میڈیا سے تعلق رکھنے والوں کو مستقل بنیاد پر کرنا پڑتا ہے۔ فیض احمد فیض نے کہا تھا

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگ لب سے ہے!

بس کچھ ایسا ہی حال میڈیا والوں کا بھی ہے۔ لوگ ہم سے ایسی ایسی باتیں جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کی فرمائش، توقع اور امید دیکھ کر ہمارے پاس حیران و پریشان ہو رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا! اگر میر تقی میر کی زبان میں کہیے تو ناحق ہم مجبوروں پر یہ "باخبری" کی تہمت ہے، اور ظاہر ہے اِس معاملے میں ہمیں عبث بدنام ہونا پڑتا ہے!

ہماری "باخبری" کی جو بھی سطح ہے وہ بس ہمی کو معلوم ہے ! احباب کو جب یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ اقتدار کے ایوانوں میں کیا ہو رہا ہے یا کیا ہونے والا ہے تو ہمارا رخ کرتے ہیں۔ سوال کچھ یوں ہوتا ہے کہ کون آنے والا ہے، کون جا رہا ہے؟ ہم جواباً یہ کہہ کر ان کی لاعلمی میں افاقہ کرتے ہیں کہ ہم کوئی دائی نہیں جو کسی کی "آمد" کا اندازہ لگا سکیں ! اور نہ ہم سامری جادوگر ہیں کہ محض ایک منتر پُھونکنے سے ایک حکومت ! ناپید اور دوسری ہویدا ہو

میڈیا والوں کو لوگوں نے پتہ نہیں کیسے کیسے درجے دے رکھے ہیں۔ عام آدمی کے ذہن کی دیوار پر یہ تصور ٹھونک دیا گیا ہے کہ اعلیٰ و ادنیٰ سرکاری حکام اور سیاست دان ہم میڈیا والوں سے پوچھ کر کھانا تناول فرماتے ہیں اور ہماری اجازت ہی سے واش روم جاتے ہیں ! اِس عمومی تاثر سے ہم خاصے بے مزا رہتے ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ! بہت کچھ جاننے کے باعث ہم "مغرور" ہوگئے ہیں

مشکل یہ ہے کہ ہم کسی کو بتا بھی نہیں سکتے کہ ہم کس قدر بے خبر ہیں کیونکہ یہ خوف ! بھی لاحق ہے کہ بے خبری کا اعتراف کرنے پر کہیں ہمیں وزیر اطلاعات نہ بنا دیا جائے

میڈیا کے لوگ شادی کی تقریب میں جائیں تو لوگ دولہا کو اسٹیج پر تنہا چھوڑ کر اُن کے گرد جمع ہو کر "غیب کا حال" جاننے کا اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے پیش گوئی کے پُھوارے طلب کرتے ہیں! دو دلوں کو قریب لانے کی تقریب دیکھتے ہی دیکھتے بے بنیاد اور بلا جواز پیش گوئیوں کی پٹاری میں تبدیل ہو جاتی ہے! ایسے مواقع پر ہم نے اپنی برادری کے لوگوں کو خاصی دانش مندی سے کام لیتے دیکھا ہے۔ جب لوگ سیاست اور معیشت کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں تو میڈیا والے بعض بے ڈھنگی باتیں نپی تُلی لفاظی کے ساتھ بیان کرکے اپنی بے خبری کی لاج رکھتے ہیں! عجیب سی محسوس ہونے والی باتوں کو لوگ "اندر کی بات" سمجھ کر خوش ہوتے اور اپنی قسمت پر ناز کرتے ہیں کہ دنیا سے "بے جانے" نہیں جائیں گے!

ہمارا حال یہ ہے کہ جب کوئی ہم سے "اندر" کی باتیں جاننا چاہتا ہے تو ہم دست بستہ عرض کرتے ہیں کہ بھائی! وزیر جیل خانہ جات سے رابطہ کیجیے کیونکہ ہم کبھی "اندر" نہیں گئے! غالب کی زبان میں لاکھ سمجھایئے کہ

ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہنر میں یکتا ہیں!

مگر لوگ کب مانتے ہیں۔ وہ اِسے بھی کسر نفسی سمجھتے ہوئے مُصِر رہتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ ہاں بھائی! ہم اِتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں جانتے! ایک صاحب نے بہ صد اِصرار کہا کہ ہر انسان کے دل میں کچھ راز ضرور ہوتے ہیں اور میڈیا والوں کے دل تو راز کے خزانے ہوتے ہیں۔ اُن کی اِس بات پر ہم نے اپنی ہنسی اُسی طرح ضبط کی جس طرح خواتین شوہر کی کمائی کنٹرول کرتی ہیں! پھر اُنہیں سمجھایا کہ ہمارے دل کو خزانہ قرار دینے سے گریز کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ حکمران اِس پر بھی ڈاکہ ڈال دیں!

ایک صاحب نے جب ہم پر زور دیا کہ اپنے دل کے راز افشاء کریں تو ہم نے کہا بھائی صاحب! ہمارا دل کوئی الماری تو ہے نہیں کہ اِس میں فائلیں دھری ہوں اور ہم اُن کے مندرجات آپ کو سُنائیں۔ یہ تو آئینہ ہے اور خدا گواہ کہ

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی!

اُنہوں نے چہک کر کہا ذرا ہمیں تو تصویر یار دکھایئے! ہمارے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بڑی مشکل سے ہم اُنہیں یہ سمجھا پائے کہ ہمارے دل کے

آئینے میں کسی سیاست دان یا سیلیبریٹی کی نہیں بلکہ خالص پرائیویٹ یار کی تصویر ہے جو ہر کس و ناکس کو دِکھائی نہیں جاسکتی!

اللہ کے برگزیدہ بندے دُنیا والوں سے دور رہتے ہیں۔ سبب اِس کا یہ ہے کہ لوگ اپنے مسائل حل کرنے کے لئے اُن کی طرف لپکتے ہیں اور قدم قدم پر اُن سے معجزوں کی توقع رکھتے ہیں۔ کوئی دُعا کرانے آتا ہے اور کوئی روحانی علاج کے نام پر وظائف کا طالب ہوتا ہے۔ اور دَم کرانے کے لئے آنے والے تو ناک میں دَم کردیتے ہیں! ایسے میں اگر اللہ کے یہ بندے بھاگیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے؟ ہم اللہ سے تقرب کے دعویدار تو ہرگز نہیں مگر ذاتی مفاد میں یعنی اپنی بے خبری کی لاج رکھنے کے لئے دُنیا والوں سے بھاگے پھرتے ہیں! لوگ اِسے ہماری شدید مصروفیت یا پھر کسر نفسی سمجھ کر زیادہ لگن کے ساتھ ساتھ ہماری طرف لپکتے ہیں!

سیاسی جماعتوں کے درمیان جو کھچڑی پکتی رہتی ہے لوگ اُس کے اجزا اور "ریسیپی" ہم سے پوچھتے پھرتے ہیں۔ سیاست دان جو فوائد بٹورتے پھرتے ہیں اُن کا علم تو اُن کی اپنی پارٹی کے کارکنوں اور معاونین کو نہیں ہو پاتا، ہمیں کہاں سے ہوگا! کبھی کبھی تو لوگ اِس قدر سادہ لوحی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ہم

یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
کی عملی تصویر بن کر رہ جاتے ہیں !
آپ سوچیں گے جب میڈیا والوں کو زیادہ کچھ معلوم ہی نہیں تو پھر لوگوں کو اُن سے معلومات کس طرح مل جاتی ہیں ! بات کچھ یوں ہے کہ حالات نے ایسے پلٹے کھائے ہیں کہ اب محض ایک بات اَن گِنت زاویوں سے سمجھی اور سمجھائی جا سکتی ہے ! کسی خبر کا ایک ہی جملہ ہر قاری کو اپنے مطلب کا دِکھائی دیتا ہے۔ اب ہمارے کالم ہی کی مثال لیجیے۔ ہم ہنسانے کے لئے لکھتے ہیں مگر کچھ لوگ پڑھتے ہوئے اور پڑھنے کے بعد رو بھی لیتے ہیں، بعض کو ہماری تحریر صرف چونکانے والی لگتی ہے۔۔ حالانکہ ہم کیا اور ہمارا چونکانا کیا ! اور "اندر" کی بات یہ ہے کہ جب کبھی ہم نے اہلیہ سے اپنا کوئی کالم پڑھنے کی فرمائش کی ہے تو اُنھوں نے پڑھ کر خاصا ہَونّق سا منہ بناتے ہوئے یہ تاثر دیا ہے جیسے کسی ہارر مووی کا سین پڑھ لیا ہو !
لوگوں کو کچھ نہ کچھ جاننے کا چسکہ دراصل "آرٹسٹک" قسم کے کالم نگاروں نے لگایا ہے۔ بے پَر کی ہانک کر لوگوں کو بہلایا، بہکایا اور ورغلایا جاتا ہے۔ بہت سے کالم نگار سیاسی معاملات پر کچھ اِس طرح لکھتے ہیں

جیسے کرکٹ میچ پر رواں تبصرہ کر رہے ہوں ! چکنی چُپڑی باتوں کے ذریعے لوگوں کو عجیب اُلجھن میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ جس کالم نگار کے قلم میں جتنی بڑھک ہوتی ہے، اُس کی مقبولیت کا گنڈاسہ اُتنا ہی بلند ہوتا ہے ! باقی صدیقی کے بقول خوش فہمی اور خود فریبی کے ستائے ہوئے لوگوں کو پاس کے ڈھول بھی سُہانے لگتے ہیں اور وہ ہر بات پر آنکھ بند کرکے "آمنّا و صدقنا" کہہ اٹھتے ہیں ! پنجابی فلموں کے بڑھک آمیز ڈائیلاگز جیسا کالم لکھتے ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے ! ہم آپ کو وعدوں اور دعوؤں سے بہلا نہیں سکتے کہ ہمارا کالم کسی سیاسی جماعت کا انتخابی منشور نہیں ! کالم کوئی ڈگڈگی نہیں اور قارئین بچے جمورے نہیں جنہیں تماشا بنایا جائے۔ کالم آئینہ ضرور ہوتا ہے مگر یہ کوئی جام جمشید نہیں کہ دور پرے کی خبریں سُنائے اور دِکھائے ! اِس میں حالات کی تصویر ہوسکتی ہے، خواہشات اور اُمیدوں کا عکس بھی ہوسکتا ہے مگر کالم کی زمین پر سبز باغ اگانا اور قارئین کو دھوکہ دینا صحافتی اخلاق کے منافی ہے !

کسی نے کیا خوب کہا ہے

ہم نے دیکھی ہے اُن آنکھوں کی مہکتی خوشبو

ہاتھ سے چُھو کے اِسے رشتوں کا الزام نہ دو !

صِرف احساس ہے، رُوح سے محسوس کرو

پیار کو پیار ہی رہنے دو، کوئی نام نہ دو !

ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ کالم کو کالم رہنے دیا جائے، پنجابی فلموں کی جُگت بازی کے اکھاڑے میں تبدیل نہ کیا جائے ! خندہ بیانی کی محفل کو بڑھک بازی کی چوپال بنانا اچھی بات تو نہیں ! سرکاری میڈیا پر "سب اچھا ہے" کے راگ سے لوگ بیزار ہو جاتے ہیں۔ یاروں نے اِس کا توڑ یہ نکالا کہ "سب خراب ہے" کی گردان شروع کر دی ! مگر خیر، یہ فارمولا بھی لوگوں کو تادیر اپنی طرف متوجہ نہیں رکھ سکتا ! خیریت اِسی میں ہے کہ جو سچ ہے بس وہی لکھ دیا جائے، کالم نگاری کے نام پر فلموں کے ولنز اور کامیڈینز کا حق نہ مارا جائے !

مہاراج! تھوڑی سی دھیرج تو دکھایئے

دُشمن ممالک کے خفیہ ادارے جادو کی چھڑی کی طرح ہوتے ہیں۔ جس پر یہ مہربانی ہو جائیں اُسے راتوں رات شہرت کی بلندی پر پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ بھلے ہی اُسے خاندان والے نہ جانتے ہوں، ایک دنیا جان جاتی ہے! بات صرف شہرت پر ختم نہیں ہوتی بلکہ ممدوح کو یہ ادارے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں اور کبھی کبھی تو قومی ہیرو یا جینئیس میں بھی تبدیل کر ڈالتے ہیں!

بھارت کا خفیہ ادارہ "را" بہت سے معاملات میں واقعی ابھی خاصا raw یعنی کچا ہے۔ مثلاً اِسی بات کو لیجیے کہ جس طرح امریکہ اُسامہ فوبیا کے دائرے سے باہر نہیں آ سکا بالکل اُسی طرح بھارت اب تک داؤد فوبیا کو چت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اِشو چاہے کچھ ہو، بھارتی انٹیلی جنس کی تان ٹوٹتی ہے تو داؤد ابراہیم کے نام پر! ایسا لگتا ہے کہ بھارتی قیادت کی ساری ذہانت داؤد فوبیا کے اتھاہ ساگر میں ڈوب گئی ہے!

ایبٹ آباد آپریشن کی خبر بریک ہوئی تو بھارتی انٹیلی جنس کے پیٹ میں بھی مروڑ اُٹھا اور پاکستان میں سرجیکل اسٹرائکس کی خواہش کا برملا اظہار کیا

جانے لگا۔ وزیر اعظم من موہن سنگھ سمجھدار آدمی ہیں۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ میڈیا کے ہاتھوں پوری قوم کے بارہ بج رہے ہیں تو میدان میں کودے اور پاکستان میں سرجیکل اسٹرائکس سے متعلق بیانات کا راستہ روکا۔ یہ مقام شکر ہے کیونکہ اپنا اور ہمارا یعنی مشترکہ بھلا سوچنے والا وزیر اعظم بھارت میں خال خال ہی دکھائی دیتا ہے!

دو تین دن میں جب جوش کی گرد بیٹھی تو ایبٹ آباد آپریشن کی طرز پر بھارت کی جانب سے کسی ممکنہ کاروائی کے بارے میں بڑھکیں مارنے والے بھارتی میڈیا نے بھی حکام کے حوالے سے تسلیم کرلیا کہ جو کچھ امریکہ نے ایبٹ آباد میں کیا وہی کچھ اگر بھارت میں بھی ہوتا تو ریسپانس تقریباً وہی رہتا جو پاکستان کا تھا! لیجیے

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!

ہم بھی کیسے عجیب خطے میں واقع ہوئے ہیں۔ اِس میں صورت حال پلک جھپکتے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہمارے خلاف سرجیکل اسٹرائکس کی باتیں کرنے والوں کو اب اپنی سرجری کی فکر لاحق ہوئی ہے۔

بات ہو رہی تھی داؤد بھائی یعنی داؤد ابراہیم کی۔ نام کی تھوڑی سی مماثلت

نے ہمیں اکثر خاصی خوشگوار مشکلات سے دوچار کیا ہے۔ ایک بار کیبل والا ہم سے ماہانہ فیس وصول کرنے آیا تو ہم نے ڈھائی سو روپے نکال کر اُسے دے دیئے۔ ہمارے پڑوسی بھی وہیں کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جب کیبل والا چلا گیا تو اُنہوں نے حیرت سے کہا "یہ کیا؟" ہم نے کہا بھائی صاحب! کیبل والا فیس لینے آیا تھا، ہم نے فیس دے دی۔ وہ بولے "آپ نے فیس کیوں دی؟" ہم نے احترام کے ساتھ استفسار کیا کیوں نہ دیتے؟ وہ کہنے لگے "بھئی آپ سے وہ فیس کیسے وصول کر سکتا ہے، آپ تو جرنلسٹ ہیں!" ہم نے مؤدبانہ عرض کیا کہ جناب ہم ابراہیم ہیں، داؤد ابراہیم نہیں

ایبٹ آباد آپریشن کے بعد بھارتی میڈیا نے ایک بار پھر ہٹ دھرمی کی سارنگی پر مطلوب افراد کی راگنی چھیڑی۔ روزنامہ بھاسکر نے خفیہ اداروں کے حوالے سے بتایا کہ ایبٹ آباد آپریشن کے بعد یعنی پیر 2 مئی کی شب داؤد ابراہیم نے حفظِ ماتقدم کے طور پر پاکستان چھوڑ دیا۔ اخبار کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ شاید بھارت کی جانب سے سرجیکل اسٹرائک کا خطرہ تھا! ویسے تو خیر پوری خبر ہی ہنسانے والی تھی مگر اِس اخبار نے جو رُوٹ بتایا اُس نے قارئین کو یقیناً زیادہ ہنسایا ہوگا۔ خبر کی صورت میں دعویٰ یہ تھا کہ داؤد ابراہیم کو مبینہ طور پر پہلے کابل پہنچایا گیا اور وہاں سے وہ سعودی عرب گئے! امریکی میڈیا نے دعویٰ کیا تھا کہ اُسامہ بن لادن کی لاش کو ایبٹ آباد سے

بگرام ایئر بیس لے جایا گیا تھا۔ بھارت نے بھی امریکہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے داؤد ابراہیم کا یہی رُوٹ ترتیب دیا! فرماں برداری ہو تو ایسی ہو! یعنی کسی اور کے لئے
!حاشیہ برداری کی گنجائش نہیں چھوڑی

خیر، ابھی داؤد ابراہیم کو سعودی عرب پہنچا کر بھارتی خفیہ اداروں اور میڈیا نے انہیں سکون کا سانس لینے اور عمرہ کرنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا کہ ایک جھٹکے میں واپس کراچی پہنچا دیا! اپنے "مہا" خفیہ اداروں کی "تحقیق" پر گنگا کا پوتر جَل پھیرتے ہوئے بھارتی وزیر داخلہ پی چدمبرم نے دعویٰ کر دیا کہ داؤد ابراہیم کراچی میں ہیں۔ لیجیے صاحب

ہے انتہائے یاس بھی اِک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ چلے جہاں سے ہم

اب سوال یہ ہے کہ محض ایک ڈفلی بجا بجا کر سازینہ کس طور ترتیب دیا جا سکتا ہے، پوری کی پوری موسیقی محض ایک راگ الاپتے رہنے سے کس طور پنپ سکتی ہے؟ "را" کے سپر مائنڈز اپنی ناکامیوں کو کب تک داؤد بھائی کے کھاتے میں ڈالتے رہیں گے؟
ممبئی کے آبرائے ہوٹل میں جو کچھ ہوا اُس کی چھان بین کر کے بھارت نے دعویٰ

کیا کہ یہ سب پاکستان کے چند سر پھروں کا کارنامہ تھا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر بھارتی خفیہ اداروں اور سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ کیا گھاس کھودنے پر مامور ہیں۔۔ یا بولی وڈ کی شوٹنگز دیکھنے میں مصروف رہنا انہیں زیادہ پسند ہے؟ اگر دس بارہ سر پھرے پاکستانی نوجوان بھارتی سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ کو ننگی کا ناچ نچا سکتے ہیں تو پھر سوچا جاسکتا ہے کہ۔۔۔ خیر، جانے دیجیے۔ کون نہیں جانتا کہ بھارت نے کئی مواقع پر علاقائی سپر پاور بننے کی اپنی سی کوشش کی ہے اور منہ کی کھائی ہے؟ مگر کون سمجھائے کہ یہ راہ آسان نہیں؟

اِس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں!

برتری کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں کبھی کبھی قومی وجود بھی داؤ پر لگ جاتا ہے۔ دو عالمگیر جنگیں اِس حقیقت کا بیّن ثبوت ہیں۔ کہاں پورے جنوبی ایشیا کے مُستقبل کو مُٹھی میں لینے کی خواہش اور کہاں پاکستان کے معاملے میں صرف ماضی کی طرف منہ کئے رہنا! آگے بڑھنے کے لئے بہت کچھ بھولنا پڑتا ہے۔ اور یہاں یہ حالت ہے کہ بھارت کے حکمران پاکستان کے معاملے میں حافظے کے دانت تیز کرتے رہتے ہیں!

میر انیس کہہ گئے ہیں

جو صاحب جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر

اہل جہاں کو جھکانے کے لئے پہلے جھکنا پڑتا ہے، تعظیمی انداز اختیار کرنا پڑتا ہے، دوسروں کو احترام کی نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ علاقے کا چودھری بننے کی خواہش نے بھارت سے وہ لچک چھین لی ہے جس کی اُس سے سبھی آس لگائے بیٹھے ہیں ! بھارتی حکمرانوں نے تاریخ سے اِتنا سبق بھی نہیں دیکھا کہ تاریخ سے سبق یکھنا چاہیے !

یہ کیا تضاد ہے کہ دعویٰ تو جگمگاہٹ کا ہے اور باطن کی ظُلمت ختم نہیں ہو پارہی؟ دنیا روشنی کی رفتار ناپ رہی ہے اور بھارت اب تک اندھیرے کی رفتار بڑھانے پر کمربستہ ہے !

دستر خوان پر طرح طرح کے پکوان دھرے ہوتے ہیں مگر ذوق اور ضرورت کے مطابق ہی کھایا جاتا ہے۔ دستر خوان پر دھری ہوئی اشیاء کو بے سوچے سمجھے حلق میں ٹھونس کر معدے میں پہنچانا بسا اوقات نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات بھارتی قیادت کو بھی سمجھنی چاہیے۔ سفارتی اور اسٹریٹجک دستر خوان پر بسیار خوری سے بدہضمی کا سامنا بھی ہوسکتا ہے ! بڑا بننا ہے تو بھارتی قیادت کو بڑپّن اپنا کر چھوٹی حرکتوں سے گریز کرنا اور فوبیا کے فوبیا سے بچنا ہوگا۔

اُردو ہے جس کا نام

مادری اور قومی زبان بے چاری،بڑی بے زبان ہوتی ہے۔ لوگ فخر سے مادری زبان کو گھر کی لونڈی قرار دیتے ہیں اور اس کے ساتھ سلوک بھی لونڈی والا ہی کرتے ہیں ! اردو بھی اِس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔

ایک اخبار کے ایڈیٹر سے ہم نے کہا کہ خبر میں ساس کا لفظ بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ خوش دامن ایک اچھا متبادل ہے۔ اُن کا فرمان تھا کہ جب ساس کسی کو بھلی معلوم نہیں ہوتی تو اُسے بیان کرنے والا لفظ بھلا کسی کو کیسے بھلا معلوم ہوگا؟ ساس صرف ساس ہوتی ہے، چاہے اُسے ساس کہو یا خوش دامن۔ جب ہم نے اصرار کیا تو کہنے لگے چلو موقع دیکھ کر استعمال کریں گے۔ کچھ دن بعد کراچی میں ایک خاتون سول جج کے گھر ڈکیتی کے دوران ان کے بیٹے جاں بحق ہو گئے۔ خاتون جج کی ساس کچھ دن بعد امریکہ سے آئیں تو موصوف نے سُرخی یہ لگائی کہ خاتون جج کی خوش دامن امریکہ سے آگئیں ! ہم نے یہ سرخی پڑھی تو ٹپٹا گئے اور اُن کی خدمت میں عرض گزار ہوئے کہ جناب ! خوش دامن تو مرد کی ساس کو کہتے ہیں، عورت کی ساس کو ساس ہی کہا جائے گا۔ موصوف بگڑ کر بولے "ہم جو لکھتے ہیں بس وہی لکھنے دو، اپنی اردو اپنے پاس رکھو۔

اب یہ حساب کون رکھتا

پھرے گا کہ کس لفظ کو کہاں استعمال کرنا ہے؟ کس کو یاد رہے گا کہ کس جگہ ساس خوش دامن میں تبدیل ہوتی ہے اور کہاں صرف ساس ہی رہتی ہے۔" اِس جواب پر ہم !ظاہر ہے اپنا) سر پیٹ کر رہ گئے)

مرزا تفصیل بیگ اس معاملے میں (بھی) قدرے اختلافی رائے رکھتے ہیں۔ جب ہم نے بتایا کہ مرد کی ساس کو خوش دامن اِس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے دامن میں ایک اچھی چیز یعنی بیٹی تھی جو اُس نے دی۔ یعنی مرد کی معنوی ماں اچھے دامن والی ہوئی، تو مرزا تپ کر بولے "جی نہیں، اُن خاتون کے دامن میں جو بلائے ناگہانی تھی اُسے وہ آپ کی "! طرف اُچھال کر خوش ہیں، اِس بنیاد پر خوش دامن کہلاتی ہیں

ہمراہ" بھی ایک ایسا لفظ ہے جسے استعمال کرنے کے معاملے میں ویسی ہی لاپروائی دکھائی" جاتی ہے جیسی لاپروائی قومی کرکٹ ٹیم کی بیٹنگ لائن اکثر دکھاتی ہے۔ اردو اخبارات میں یہ لفظ کچھ اِس طرح استعمال کیا جاتا ہے "فلاں پارٹی کے چیئرمین دیگر عہدیداروں کے ہمراہ پریس کانفرنس کر رہے ہیں۔" ہم نے احباب کی توجہ غلطی کی طرف دلائی اور بتایا کہ "ہمراہ" صرف اُس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی چل رہا ہو، سفر میں ہو۔ یہ مشورہ سُن کر ایک صاحب نے شام میں خراب حالات کے باعث لبنان جانے والوں تصویر کا کیپشن کچھ اِس طرح لکھا

شام کے باشندے خانہ جنگی سے بچنے کے لئے سامان کے ہمراہ (!) لبنان کی طرف" نقل مکانی کر رہے ہیں۔" ہم نے وضاحت کی کہ جناب! سامان کوئی انسان یا از خود چلنے پھرنے والی چیز نہیں جس کے ہمراہ نقل مکانی کی جائے! سامان کے "ساتھ" نقل مکانی کی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ جب لبنان جانے کی بات آ ہی گئی تو نقل مکانی کا لفظ استعمال کرنا محض فضول خرچی ہے! یہ اعتراض سُن کر کیپشن کی شکل تبدیل کی گئی جو کچھ یوں بنی "شام کے باشندے خانہ جنگی کے باعث ایک دوسرے کے ہمراہ (!) لبنان جا رہے ہیں۔" ہم نے استفسار کیا کہ "ہمراہ" استعمال کرنا کیا کسی قانون کے تحت لازم کر دیا گیا ہے! اِس پر کیپشن رائٹر جھلّا کر بولے۔ "ایسی اردو سے ہم باز آئے۔ اگر ایک ایک لفظ کے استعمال پر یوں بحث ہوتی رہی تو ہم اخبار شائع کر چکے! ہم اخبار تیار کرتے ہیں، مقتدرہ قومی زبان کا خبر نامہ نہیں۔"

اردو کے شاہکار دیکھنے ہوں تو ٹی وی چینلز پر ٹِکرز پڑھتے رہیے۔ عجلت میں لکھے جانے والے ٹِکرز سے اردو میں مزاح نگاری کا دامن وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ چند برس قبل ہم ایک ٹی وی چینل پر جاب کرتے تھے تب ایک ٹِکر ہماری نظر سے گزرا جو کچھ یوں تھا "شہنشاہ غزل مہدی حسن طویل علالت کے بعد ہسپتال سے گھر منتقل ہو گئے!" ہم نے ٹِکر ایڈیٹر سے عرض کیا کہ ٹِکر میں صراحت نہیں کی گئی کہ مہدی حسن صاحب اگر طویل علالت کے بعد ہسپتال سے گھر منتقل ہوئے ہیں

تو کس حالت میں، یعنی صحت یاب ہوئے یا نہیں۔ موصوف نے خاصی مدلل وضاحت فرمائی "پہلے علالت آتی ہے اور اس کے بعد اللہ صحت عطا فرماتے ہیں۔ اگر علالت کے بعد ہسپتال سے گھر منتقل ہوئے ہیں تو سیدھی سی بات ہے کہ صحت یاب ہوگئے ہوں گے (!)" ہم نے دست بستہ عرض کی کہ جناب! طویل علالت کے بعد کسی شخص کو ہسپتال سے گھر منتقل کیا جائے تو اِس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ صحت یاب ہوچکا ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا ہو! مگر اُن صاحب نے میڈیا سے وابستہ ہونے کا بھرپور ثبوت فراہم کیا۔۔ یعنی ہم سے متفق نہ ہوئے!

اخبارات میں تصاویر کے کیپشن لکھنا بھی اب مزاح نگاری سے مماثل فن میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ بعض احباب کچھ اس قدر پُرمزاح کیپشن لکھتے ہیں کہ پڑھیے تو کالم کا سا لُطف ملتا ہے۔ ایک مشہور کارٹونسٹ کی عادت ہے کہ کارٹون میں جتنی بھی چیزیں دکھاتے ہیں اُن کے نام بھی لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً مہنگائی یا بجلی کی لوڈ شیڈنگ پر عوامی احتجاج دکھا رہے ہیں تو بہت سے لوگ دِکھا کر اُن پر "عوام" لکھتے ہیں تاکہ قارئین اُنہیں کچھ اور نہ سمجھ لیں! کچھ کچھ یہی حال اب اخباری کیپشنز کا بھی ہے۔ ہمارے ایک اخباری دوست یعنی سب ایڈیٹر نے ایک تصویر کا کیپشن کچھ اِس طرح تحریر کیا "کشیدگی کے باعث گلستان جوہر میں سڑک سنسان پڑی ہے جبکہ ایک پولیس اہلکار بندوق تانے الرٹ

کھڑا ہے۔" ہم نے پوچھا کوئی چیز بیان ہونے سے رہ تو نہیں گئی؟ وہ کہنے لگے "اِس کی نشاندہی تو آپ کریں گے۔" ہم نے کہا کچھ اللہ کا خوف کرو، تصویر میں کیا ہے جو واضح نہیں؟ محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ کیپشن نابینا افراد کے لئے تحریر کیا گیا ہے، یعنی اُنھیں بتایا جائے کہ تصویر میں کیا کیا ہے!

جنوبی امریکہ کے بعض علاقوں سے ڈائنوسار کے حجری شواہد (fossils) ملے تو ایک صاحب نے خبر بنائی جس میں درج تھا کہ یہ حجری شواہد دو کروڑ نوے لاکھ سال "قبل مسیح" کے ہیں! اب آپ بھی غور فرمایئے کہ ماہرین یقین کی کس منزل میں ہیں کہ دو کروڑ نوے لاکھ سال جیسی طویل مدت میں مزید دو ہزار سال کا تعین بھی کر بیٹھے ہیں!

بہت سی خبروں میں زبان و بیان اور کامن سینس کی غلطیاں اِتنی اور اِس قدر ہوتی ہیں کہ خبر نگار کا ماتھا چومنے کو جی چاہتا ہے! چند نمونے آپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

☆ "انڈونیشیا کے قونصل خانے کی تقریب میں شرکت کرنے والوں کا گروپ فوٹو۔"

ہمارا خیال ہے "شرکا" پر بات ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ سب اکٹھے کھڑے تھے تو ظاہر ہے گروپ فوٹو ہی تھا۔

☆ "جرائم پیشہ افراد اور دہشت گردوں کے خلاف کریک ڈاؤن آپریشن ہو رہا ہے۔"
تھوڑی سی وضاحت کر دی جاتی تو اچھا تھا کہ کریک ڈاؤن اور آپریشن میں کیا فرق ہے!
☆ "لیاری گینگ وار کے کارندے بھتہ وصول کر رہے ہیں۔" بہت خوب! لیاری میں مختلف گروہوں کے درمیان جاری لڑائی بھی گویا کوئی تنظیم ہے کہ جس کے کارندے پائے جاتے ہیں! تصادم کو تنظیم کا درجہ دینا شاید صرف اُردو صحافت کا کارنامہ ہے!
☆ "آگ بجھانے کے لئے فائر بریگیڈ کی گاڑیاں موقع پر پہنچ گئیں۔" آگ بجھانے کی وضاحت شاید اِس لیے ضروری تھی کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آگ لگانے آئی تھیں! اور شاید یہ بات بھی ہے کہ فائر بریگیڈ کے بعض اہلکار اب فائر انجن (گاڑی) کو پانی کی سپلائی کے لیے بھی استعمال کرنے لگے ہیں!
☆ "ملبے میں دبے ہوئے لوگوں کو نکالنے کے لئے ریسکیو آپریشن تین گھنٹے جاری رہا۔" اچھا ہوا جو یہ بتا دیا کہ ریسکیو آپریشن لوگوں کو پانی، ملبے یا کسی گڑھے وغیرہ سے نکالنے کے لئے ہوتا ہے، اُس میں پھینکنے کے لیے نہیں!
☆ "اتحادی طیاروں نے فضاء سے زمین پر بمباری کی۔" اگر وضاحت نہ کی جاتی تو لوگ شاید یہ سمجھ بیٹھتے کہ رن وے پر کھڑے ہوئے طیاروں نے فضاء میں بم برسائے!

☆ "دہشت گردوں کی کاروائیاں کئی ماہ سے جاری ہیں۔" بڑی بات ہے صاحب کہ دہشت گرد اب کاروائیاں کر رہے ہیں اور ریاستی ادارے "وارداتیں" فرمارہے ہیں!

☆ "دھماکے میں شہید ہونے والے پولیس اہلکار کی فائل فوٹو۔" یہ بات کون سمجھائے کہ مرنے والے کی ہر تصویر کو فائل فوٹو ہی قرار دیا جائے گا۔ اِس لیے فائل فوٹو لکھنا فضول خرچی ہے!

☆ "دہشت گردوں کے ہاتھوں شدید زخمی ہونے والے پولیس اہلکار کی یادگار تصویر۔" یاروں کو اندازہ ہی نہیں کہ کوئی بھی تصویر یادگار صرف مرنے پر کہلاتی ہے!

☆ "افغانستان کے دارالحکومت کابل میں اتحادی فوجی ایک چیک پوسٹ پر افغان شہریوں کی تلاشی لے رہے ہیں۔" اِسے کہتے ہیں وضاحت ابن وضاحت! ارے بھائی! کابل میں جن کی تلاشی لی جارہی ہوگی کیا وہ کسی اور ملک کے شہری ہوں گے!

☆ "۔۔۔۔ (تنظیم کا نام) کے زیر اہتمام کراچی میں ہلاک ہونے والوں کے لئے فاتحہ خوانی کا منظر۔" یعنی پولیس کو تفتیش کی ضرورت نہیں۔ کیپشن بتا رہا ہے کہ ہلاکتیں کس کے حکم پر ہوئیں!

☆ "امریکی خلائی شٹل اینڈیور کی خلاء میں روانگی خراب موسم کے باعث تیسری بار موخر کی گئی ہے۔" اِس کیپشن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلائی شٹل کو کبھی

پاتال میں روانہ نہیں کیا جاتا، صرف خلاء میں بھیجا جاتا ہے!

☆ "یہ پیغام اسامہ بن لادن نے مرنے سے قبل ریکارڈ کرایا تھا۔" شاباش! کوئی یہ خیال نہ کرے کہ عالم بالا میں پہنچ کر حساب کتاب سے پہلے اُسامہ بن لادن کو پیغام ریکارڈ کروانے کی فکر لاحق ہوئی!

☆ "آئندہ چار ماہ میں ادارے کی پوزیشن مستحکم ہو جائے گی۔" اچھا ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ ادارہ ماضی میں جاکر پوزیشن مستحکم کرے گا!

اور "بم بنانے میں استعمال ہونے والا دھماکہ خیز مواد پکڑا گیا۔" زہے نصیب! وضاحت نہ کی جاتی تو ہم یہ سمجھ بیٹھتے کہ بم بنانے میں اشیائے خور و نوش بھی استعمال کی جاتی ہیں!

چند اور "شاہکار" جملے:

☆ سیلابی پانی کے بہتے ہوئے ریلے سب کچھ بہا کر لے گئے۔

☆ برگد کے گھنے درخت پر "آسمانی بجلی" گر گئی۔

☆ ہنگاموں کے باعث معاشی و کاروباری سرگرمیاں معطل رہیں۔

☆ امداد کی فراہمی کے لیے ریلیف آپریشن جلد شروع کیا جائے گا۔

☆ (ایک تصویر کا کیپشن) اجتماعی شادی کی تقریب میں دولہے بھی شریک ہیں!

سرکتی جائے ہے رُخ سے نقاب آہستہ آہستہ

جس طرح لاٹری میں کسی کمزور دل والے شخص کا بڑا انعام لگ جائے تو اُسے انعامی رقم مرحلہ وار بتائی جاتی ہے تاکہ دل پر کوئی جھٹکا نہ لگے بالکل اُسی طرح ایبٹ آباد آپریشن کی تفصیلات بھی مرحہ وار سامنے لائی جارہی ہیں۔ اوبامہ انتظامیہ کو خدشہ ہے کہ بہت کچھ ایک ساتھ بتانے کی صورت میں امریکی عوام "حُسن انکشاف" کی تاب نہ لاسکیں گے۔ ہمارے خیال میں یہ بھی امریکی قیادت کی مہربانی ہے کیونکہ ایبٹ آباد آپریشن کی تفصیلات تھوک کے حساب سے جاری کئے جانے کی صورت میں بہت سے امریکی زیادہ ہنسنے سے موت کے منہ میں بھی جاسکتے ہیں!

جس طرح پیاز کے چھلکے اُترتے جاتے ہیں، اُسی طرح ایبٹ آباد آپریشن کے بارے میں بھی طرح طرح کی کہانیاں سامنے آتی جارہی ہیں۔ اگر فکشن رائٹرز، اور بالخصوص ڈائجسٹوں میں لکھنے والے، اخبارات غور سے پڑھیں اور ٹی وی دیکھتے رہیں تو بہت سی لازوال کہانیاں قلم بند کرکے سنسنی خیز ادب میں گراں قدر اضافہ کرسکتے ہیں!

ابتدائی رپورٹس میں بتایا گیا کہ امریکی کمانڈوز سے بچنے کے لئے اُسامہ بن

لادن نے خواتین کی آڑ لیتے ہوئے فائرنگ کی۔ برطانوی میڈیا نے جب ڈھول کا پول کھولا تو امریکی حکام نے یہ کہنا شروع کیا کہ اُسامہ نہتے تھے۔ جب اُسامہ کے نہتا ہونے کو تسلیم کیا گیا تو یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ گرفتاری کو ترجیح دینے کے بجائے اُنہیں موت کے گھاٹ کیوں اُتارا گیا؟ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے جھوٹ بولتے جانا سو برائیوں کی ایک برائی ہے۔ امریکی اپنی ہی غلط بیانی کے دام میں ایسے اُلجھے ہیں کہ اب نکلنا محال دکھائی دیتا ہے۔ طاقت کی بنیاد پر جھوٹ کو سچ کے طور پر تسلیم کروا تو جا سکتا ہے مگر اِس سے جھوٹ کی ماہیت تبدیل نہیں ہو جاتی، وہ جھوٹ ہی رہتا ہے! جھوٹ چل بھی نہیں پاتا کیونکہ اُس کے پاؤں نہیں ہوتے! امریکی عوام اب تک فیصلہ نہیں کر پا رہے کہ ایبٹ آباد آپریشن کی تفصیلات کے نام پر اُنہیں جو کچھ بتایا جا رہا ہے اُسے ہضم کر لیں یا محض چبا کر تھوک دیں! کبھی کہا جاتا ہے کہ اُسامہ کے سر میں گولی لگی، پھر کہا جاتا ہے کہ گولی نہیں، گولیاں لگیں۔ اِس کے بعد گولیوں نے لوکیشن بدل لی اور سر کے ساتھ ساتھ سینے میں بھی گھس گئیں! امریکی سینیٹ کی ایک کمیٹی کے چیئرمین کا کہنا ہے کہ اُنہوں نے ایک تصویر میں دیکھا کہ گولی اُسامہ کی کنپٹی سے داخل ہو کر آنکھ سے باہر آئی اور آنکھ کے سُوراخ سے بھیجے کا ٹکڑا بھی باہر لٹک رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے ایبٹ آباد آپریشن کی جو تفصیلات سامنے آ رہی ہیں اُن کی آنکھ سے جھوٹ باہر کو لٹک رہا ہے!

امریکی قیادت جتنی تیزی سے جھوٹ بولتی ہے تقریباً اُتنی ہی تیزی سے امریکی رائے عامہ بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایبٹ آباد آپریشن وہ گنگا ہے جس میں، عارضی طور پر ہی سہی، صدر اوبامہ کے تمام داغ اور گناہ دھلتے دکھائی دے رہے ہیں۔ امریکی صدر نے معاملات میں اِس قدر ابہام پیدا کیا ہے کہ کبھی کبھی تو اُنہیں "اِبہامہ" کہنے کو جی چاہتا ہے۔ رائے عامہ کے جائزوں سے معلوم ہوا ہے کہ اِبہامہ کی کارکردگی کو درست قرار دینے والے امریکیوں کا تناسب 60 فیصد ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی خارجہ پالیسی کو بھی کامیاب قرار دیا جارہا ہے۔ جو کل تک سُوکھا میدان تھا وہ ہرے بھرے جنگل میں تبدیل ہوگیا۔۔ کیا بات سپر پاورز کی!

صدر "اِبہامہ" سوچیں کہ اگر ایبٹ آباد آپریشن کی اصلیت سامنے آ گئی تو ریٹنگ میں اضافہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ آن کی آن میں ملنے والی مقبولیت چشم زدن میں چلی بھی جاتی ہے۔

امریکی قیادت بھی اچھی خاصی بھلکڑ ہے۔ اُسے یاد ہی نہیں رہا کہ ہالی وڈ باصلاحیت لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ اسکرپٹ رائٹرز کی خدمات حاصل کی جاتیں تو وہ اچھی طرح سمجھا دیتے کہ ایبٹ آباد آپریشن کی تفصیلات کس طور دنیا کے

سامنے لائی ہیں۔ ان سے مشورہ اور مدد نہ لینے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اینڈ تو لوگوں کو پہلے بتا دیا گیا ہے اور اب کہانی کو ترتیب سے سنانے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ ابتداء سمجھ میں آسکے! اگر ہالی وڈ کے اسکرپٹ رائٹرز کی خدمات حاصل کی جاتیں تو وہ کم از کم اِتنا تو بتا ہی دیتے کہ میڈیا والوں کو کب، کیا اور کس قدر بتانا ہے! امریکی محکمہ دفاع اور ایوان صدر کے درمیان سرد جنگ بھی چل رہی ہے جس کے نتیجے میں کہانی میں خاصے مضحکہ خیز ٹوئسٹ بھی پیدا ہوتے جارہے ہیں۔ مثلاً امریکی میڈیا کے ذریعے اب یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ ایبٹ آباد آپریشن میں حصہ لینے والے کمانڈوز کی زندگی خطرے میں ہے! یہ خفیہ کاروائی تھی اور اِس میں حصہ لینے والوں کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تو پھر کمانڈوز کی زندگی کو خطرہ کہاں سے لاحق ہوگیا! کیا القاعدہ ارکان نے کیل میں چِپل لگا کر فال نکالی اور کمانڈوز کے نام معلوم کرلیے؟ اگر امریکی حکومت اور خفیہ ادارے ایبٹ آباد آپریشن میں حصہ لینے والے کمانڈوز کے نام بھی صیغہ راز میں نہیں رکھ سکتے تو پھر اور کیا کرسکتے ہیں؟

اُسامہ بن لادن اور القاعدہ کے بارے میں مزید ابہام پیدا کرنے کی کوشش صدر اِبہامہ" کے سیاسی کیریئر کی موت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ بے وقوف بنتے رہنے کی" کوئی حد تو خیر سپر پاور کے لئے بھی نہیں ہوتی مگر لوگوں کو بے وقوف

بنانے کی ایک حد ضرور ہوتی ہے ! "اِبہامہ" انتظامیہ کو اچھی طرح اندازہ ہونا چاہیے کہ القاعدہ کے معاملے میں اُس کے لیے یہ حد اب آچکی ہے ! جس طرح زیادہ کھانے سے بدہضمی ہو جاتی ہے بالکل اُسی طرح ضرورت سے زیادہ جھوٹ بولنے سے سچ بھی دھندلا جاتا ہے۔ القاعدہ کے بارے میں مزید جھوٹ بول کر "اِبہامہ" انتظامیہ اپنے رہے سہے سچ کے خلاف بھی آپریشن کر بیٹھے گی، لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے ! اگر "انکشافات" کا سلسلہ روکا نہ گیا تو لوگ ہر معاملے میں کوئی نہ کوئی کہانی مانگا کریں گے اور کسی بھی معاملے کو صاف صاف بیان کیے جانے پر مزید اُلجھ جایا کریں گے ! افغانستان سے باعزت اور محفوظ انخلاء یقینی بنانا یقیناً اوبامہ انتظامیہ کی ترجیحات میں سرفہرست ہے مگر اِس ایک مقصد کے حصول کی غیر منطقی کوشش کہیں سبھی کچھ داؤ پر نہ لگا دے!

امریکہ حکام تھکن محسوس کئے بغیر کہہ رہے ہیں کہ اسامہ بن لادن کے بارے میں پاکستانی حکومت کو کچھ علم نہیں تھا۔ کسی بھی پریس کانفرنس اور منتخب ایوان کی بریفنگ میں پاکستان کو بری الذمہ قرار دینے کا کوئی موقع ابہامہ انتظامیہ ضائع نہیں کرتی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ "پخ" بھی لگا دی جاتی ہے کہ پاکستانی حکومت میں کسی نہ کسی اعلیٰ عہدیدار کو تو اسامہ بن لادن کے بارے میں معلوم تھا ! یعنی بکری دودھ تو دے رہی ہے مگر ساتھ ہی مینگنیاں بھی ڈال

رہی ہے ! سمجھ میں نہیں آتا

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین

پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ !

امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس کا کہنا ہے کہ اب تک اس امر کے شواہد نہیں ملے کہ اسامہ بن لادن کی ایبٹ آباد میں موجودگی کے بارے میں پاکستانی حکومت کو باضابطہ کچھ علم تھا تاہم پاکستان میں کسی نہ کسی کو اس کا علم ضرور تھا۔ گویا

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات !

سپر پاورز کے ٹائرز اور افغان کیل

اگر ہزاروں نہیں تو کئی صدیوں سے سپر پاور کی طاقت کے پہیّوں کی ہوا نکالنے کے لئے افغانستان کو کیل کی حیثیت سے استعمال کیا جارہا ہے! جب بھی کسی عالمگیر قوت کو کنٹرول کرنا نسبتاً کم طاقتور ممالک کے بس میں نہیں رہتا تو اُسے کسی نہ کسی طرح گھیر گھار کر افغانستان کے تھَڑے پر لایا جاتا ہے۔ افغانستان نے کیل کی طرح گھس کر امریکی طاقت کے پہیّوں سے ہوا نکال دی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ٹیوب کے ساتھ ساتھ ٹائرز کو بھی خاصا نقصان پہنچایا ہے! بڑی طاقتیں سرمستی کی حالت میں آگے بڑھتی ہیں اور ٹائر پنکچر ہونے پر اُنہیں رکنا پڑتا ہے۔ کیل وہی کرتی ہے جو اُسے کرنا ہے۔ رہے ہم تو ہمیں پنکچر لگانے کے سوا کرنا ہی کیا ہے!

افغانی بھی سوچتے تو ہوں گے کہ دنیا اُنہیں کیا کیا سمجھتی اور قرار دیتی ہے! کبھی افغانستان کو سپر پاورز کا قبرستان قرار دیا جاتا ہے اور کبھی دو بڑے خطوں کے درمیان حدِ فاصل! سپر پاورز کے قبرستان والا معاملہ درست ہے۔ طاقتور ممالک افغانستان میں پھنس کر دفن ہوتی رہتی ہیں اور ہم قبریں کھودنے اور تدفین کے عمل کی نگرانی پر مامور رہتے ہیں! عالمگیر مُردوں کے بچے کھچے

!مال سے جیبیں بھرنا اب ہمارا مقدر اور مقدور ہے

عظیم طاقتوں کا ذکر ہو اور افغانستان کا تذکرہ نہ ہو، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بقول غالب

بنتی ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

افغانوں نے ڈیڑھ صدی قبل انگریزوں کا ناک میں دم کیا اور ایسا تگنی کا ناچ نچایا کہ وہ آخر ہار مان کر الگ ہوگئے۔ اس سے سوویت حکمرانوں نے کوئی سبق نہ سیکھا اور بیسویں صدی کے اواخر میں افغانستان پر لشکر کشی کردی۔ اُنہیں گرم پانیوں کی تلاش تھی مگر افغان مجاہدین نے اُن کے ارمانوں پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا اور مار مار کر سُرخ ریچھ کا ایسا بُھرکس نکالا کہ بے چارا سرکس میں کرتب دکھانے کے قابل بھی نہ رہا! جو لوگ مجاہدین کی فنڈنگ کا رونا روتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں جنگ میں بنیادی چیز فنڈز نہیں، ہمت اور سکت ہوتی ہے۔ کسی کو کرکٹ کی کیسی ہی تربیت دے لیجیے، جب بندہ بَلّا تھام کر وکٹ پر باؤلر کا سامنا کر رہا ہوتا ہے تب ساری کوچنگ دھری کی دھری رہ جاتی ہے!

امریکہ، برطانیہ، جرمنی، آسٹریلیا، کینیڈا اور فرانس کو اب شدت سے اِس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ افغانستان ملک نہیں، قفس ہے۔ اور اِس قفس سے نکلنے

کے لئے سبھی بے تاب ہیں۔ ایک عشرے تک مار کھانے کے بعد اِتنی عقل تو آنی ہی چاہیے تھی! ایبٹ آباد آپریشن کے نام پر اسامہ بن لادن کو ختم کرنے کا ناٹک امریکہ کی جانب سے دراصل افغانستان سے گلو خلاصی کی سنجیدہ کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ ایک تیر میں کئی نشانے لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ امریکہ نے افغانستان میں اسامہ بن لادن کی تلاش اور طالبان کے خاتمے کے نام پر جنگ کا میلہ سجایا تھا۔ اب امریکہ ہی دعویٰ کر رہا ہے کہ اسامہ بن لادن کو مار دیا گیا ہے تو افغانستان میں رہنے کا جواز باقی نہیں رہتا۔ گویا "آبرو مندانہ" انخلاء کی راہ ہموار کی جارہی ہے! سپر پاورز اپنی مشکلات اِسی طرح دور کیا کرتی ہیں۔

انقلاب کا راگ پاکستان میں الاپا جارہا تھا اور انقلاب نے ڈیرا مغربی میڈیا کے میدان میں ڈال لیا ہے۔ افغانستان میں سوویت یونین کی شکست کے 19 سال مکمل ہونے پر مغربی میڈیا نے طالبان کی خوبیاں گنوانا شروع کر دیا ہے۔ ع

! تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا

.برطانوی اخبار گارجین نے ایک تجزیے میں لکھا ہے کہ طالبان کو اِس بات کی داد دینا پڑے گی کہ انہوں نے اقتدار میں آنے کے بعد لوٹ مار نہیں کی، خواتین کا احترام یقینی بنایا اور چار دیوار کا تقدس بحال کیا۔ گارجین اور

دیگر مغربی اخبارات کو اب طالبان کی خوبیاں کیونکر یاد آئی ہیں؟ شاید اِس لیے کہ سُرخ ریچھ کے بعد اب سفید بھیڑیے کی پٹائی ہو رہی ہے! گوروں نے سوچا بھی نہ تھا کہ افغانستان میں ایسی گت بنے گی! چپت پر چپت پڑ رہی ہے، ٹھکائی ہو رہی ہے اور خون بہہ رہا ہے تو طالبان بھی اچھے لگ رہے ہیں! بات مفاد کی آ جائے تو اُصولوں پر صرف خاک ڈالی جاسکتی ہے، اور ڈالی جارہی ہے۔ بہت سے لوگ عیدالاضحیٰ پر گائے یا بکرے کو لِٹا کر خوشی خوشی ذبح کر لیتے ہیں مگر اپنے جسم پر معمولی خراش سے نکلتا ہوا خون دیکھ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں! بالکل اِسی طرح گورے بھی اپنا بہتا ہوا خون دیکھ کر بہت گھبراتے ہیں۔ افغانستان میں ہلاکتوں کا بڑھتا ہوا دائرہ مغربی اقوام میں بدحواسی کو جنم دے رہا ہے۔

چھوٹی اقوام طاقت نہیں رکھتیں اِس لیے گھی ٹیڑھی انگلی سے نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ افغانستان سے نکلنے کے لئے گورے اب یہی طریقہ اختیار کر رہے ہیں۔ طاقت سے بات نہیں بن رہی تو مذاکرات کے نام پر چاپلوسی ہی کر لی جائے۔ اگر دنیا پر حکومت کرنے والوں کی طاقت یہ ہے کہ تو ایسی طاقت کو دور سے سلام۔ جب دیکھا کہ افغانستان میں بات نہیں بن رہی تو اب پاکستان کو میدان جنگ بنانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ چلیے، یہ تجربہ بھی کرکے دیکھ لیجیے۔ اسامہ بن لادن کے نام پر افغانستان میں قتل و غارت کرنے والے اسامہ بن لادن کو ایبٹ

آباد میں مارنے کا دعویٰ کرچکے ہیں تو اب میدان جنگ کے لئے کیا جواز لائیں گے ؟
امریکہ میں 2012 انتخابات کا سال ہے۔ ہمیں ڈیموکریٹس کی مجبوریاں سمجھنی چاہئیں۔ اگر طالبان کا اسکور نہ روکا گیا تو ڈیموکریٹس کی پوری اننگز داؤ پر لگ جائے گی اور صدر اوبامہ کے سیاسی کیریئر کی "فوتیدگی" بھی ہوسکتی ہے! مذاکرات کے ذریعے طالبان سے "سیف پیکیج" کی ضمانت لینے میں کیا ہرج ہے؟ کون سی عزت گھٹ جائے گی؟ اور عزت ہے کب؟ اب تو صرف طاقت رہ گئی ہے۔ اور وہ بھی کون جانے کب تک ہے! ثابت ہوا کہ جب سپرپاورز گرتی ہیں تو گرنے کی کوئی حد مقرر نہیں ہوتی۔ طاقت کا حق ادا نہ کیا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔
ہم تو بس اِس انتظار میں ہیں کہ افغانستان کے قبرستان میں چند اور طاقتیں دفنائی جائیں اور ہم اُن کے کفن لے اڑیں، مال غنیمت پر ہاتھ صاف کریں! اِس بار ایک قدم آگے جانے کی ضرورت ہے، یعنی مُردے بھی فروخت کرنے میں کوئی ہرج نہیں! اس میں زیادہ مال ہے! جس طرح امریکی جنگی مشینری کا ملبہ چین اور دیگر امریکہ مخالف ممالک کے ہاتھ فروخت کرنا خاصا منفعت بخش ہے!

کچھ لوگ روٹھ کر "ہی" لگتے ہیں کتنے پیارے

جس طرح لتا منگیشتر کو گانے، دلیپ کمار کو اداکاری کے نام پر لیکچر بازی، "دانشوروں" کو سوچ سمجھے بغیر بولنے، چوہدری شجاعت حسین کو بولنے کی آڑ میں نہ بولنے، محترم انور "شدید" کو ڈاکٹر وزیر آغا کا دفاع کرنے اور بعض ادیبوں کو صرف کتابوں پر تبصرے یا کتابوں کی رونمائی کی تقریبات سے خطاب کے لئے پیدا کیا گیا ہے بالکل اُسی طرح بہت سے لوگ اِس دنیا میں صرف اِس لیے بھیجے گئے ہیں کہ بات بے بات بُرا مانیں اور مینڈک کی طرح مُنہ پُھلائے پھریں ! ہم حیران ہیں کہ نیشنل جیوگرافک والوں نے اِنہیں ڈاکومینٹری کا موضوع بنانے پر اب تک توجہ کیوں نہیں دی !

بات بات پر ناراض ہونے والے دراصل فلموں کی روایتی محبوبہ کا سامزاج لیکر اِس دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ جس طرح فلموں میں محبوبہ کے رُوٹھنے کی کوئی حد نہیں ہوتی بالکل اُسی طرح اِن رُوٹھنے والوں کے لئے کوئی آخری حد مقرر نہیں ہوتی۔ سمندری طوفان کو کسی نہ کسی طور روکنا ممکن ہو سکتا ہے، بات بات پر مُنہ پُھلانے والوں کو اِس عمل سے باز رکھنا ممکن نہیں۔

ہماری فلموں نے یہ فارمولا بھی دیا ہے کہ کم کم ملیے تو محبت پروان چڑھتی ہے۔ مگر مرزا تنقید بیگ اپنے مفاد اور مزاج کے خلاف جانے والے کسی بھی فلمی فارمولے پر یقین نہیں رکھتے۔ اُن کا فلسفہ یہ ہے کہ محبت کی مثال خرگوشوں کی سی ہے، یعنی ملنے سے محبت بڑھتی ہے! ہم نے بارہا سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ملنے اور "ے" کے بغیر ملنے میں واضح فرق ہے! زیادہ ملنے سے محبت کے بڑھنے کو مرزا محبت کی خاصیت گردانتے ہیں جبکہ ہمارے نزدیک یہ محبت کے مُتعدّی ہونے کی بیّن دلیل ہے!

کچھ لوگ بُرا ماننے کے ایسے عادی ہوتے ہیں کہ کسی تقریب میں مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہو رہی ہو اور بُرا ماننے کا موقع ہی نہ مل رہا ہو تو زیادہ بُرا مان جاتے ہیں! جنہیں بُرا ماننے کا "ہَوکا" ہوتا ہے اُن کے لئے خوشی اور غم کی کوئی قید نہیں ہوتی! ایسے لوگ ہر موقع کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال کر طبع آزمائی کرتے اور شکار کھیلتے ہیں! خوشی کا موقع ہو تو اِن کا مزاج خاصا "کِھلا" ہوا ملتا ہے۔ اگر کارڈ تاخیر سے ملے تو مُنہ بن جاتا ہے، تقریب میں کُرسی مرضی کی نہ ملے تو طبع نازک پر گراں گزرتا ہے،، بریانی میں بوٹیاں کم ہوں تو خاصے بھرم کے ساتھ برہم ہو جاتے ہیں، قورمے میں مسالا تیز ہو تو اِن کا "ٹھنکنا" قابل دید ہوتا ہے، پانی ٹھنڈا نہ ہو تو یہ فوراً گرم ہو جاتے ہیں اور فوٹو سیشن میں بروقت نہ بلایا جائے تو سمجھ لیجیے

!قیامت نے تقریب میں قدم رنجہ فرمالیا
بُرا ماننے کے عادی فنکار میت کے موقع پر بھی صاف پہچانے جاتے ہیں۔ شامیانے میں دریاں اور چاندنیاں اِن کی مرضی کے مطابق بچھائی جانی چاہئیں، میت کا گھوارہ اِن کے تجویز کردہ مقام پر رکھا جانا چاہیے۔ تدفین کے موقع پر بھی یہ لوگ مجلس قائمہ کی صورت سفارشات پیش کرتے رہتے ہیں! اِس موقع پر ان کا لہجہ یہ تاثر دے رہا ہوتا ہے کہ اِن کی ہدایات کے مطابق دفن نہ کئے جانے کی صورت میں مُردہ بخشا نہ جائے گا!

تدفین کے وقت لوگ مرنے والے کی ایسی خوبیاں بھی گِنوا رہے ہوتے ہیں جو اُس میں بھول کر بھی نہیں پائی نہ گئی ہوں! مگر کچھ دیر بعد میت والے گھر واپس پہنچنے پر یہی لوگ کھانے میں چھانٹ چھانٹ کر کیڑے نکال رہے ہوتے ہیں! اگر کوئی یاد دلائے کہ بھائی صاحب! جو آپ ٹھونسے جا رہے ہیں وہ میت کا کھانا ہے تو منکر نکیر کی طرح گھُور کر دیکھتے ہیں! ایسے موقع پر اِن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے کچھ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مُردوں پر عذاب کی کیا صورت ہوتی ہوگی!
ہماری حسرت ہی رہ گئی کہ بات بات پر رُوٹھنے والوں میں سے دو چار ہمارے

نصیب میں بھی لکھ دیئے گئے ہوتے۔ اب مرزا ہی کی مثال لیجیے۔ جس طرح طوفان تھوڑے تھوڑے وقفے سے امریکی ساحلوں سے آ ٹکراتے ہیں بالکل اُسی طرح مرزا ہم سے روز آ ملتے ہیں مگر ہمارا حوصلہ، سادگی اور استقامت دیکھیے کہ ہم بے مزا نہیں ہوتے ! مرزا کہتے ہیں کہ زندگی چار دن کی ہے اِس لیے ناراض واراض نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا جوابی استدلال یہ ہے کہ بھائی ! زندگی چار دن کی ہے اِسی لیے ناراض بھی ہونا چاہیے تاکہ کسی کو سُکون کا سانس لینے کا موقع ملے اور وہ اپنے آپ پر بھی توجہ دے سکے ! مرزا ہمارے دوست ہیں اِس لیے عقل سے عاری تو ہو نہیں سکتے، یعنی ہمارے استدلال کی باریکی سمجھتے ہیں مگر ذرا اُن کا "خلوص"، "بھولپن" اور "ابوالہول العزمی" تو دیکھیے کہ ذرا بھی بُرا نہیں مانتے ! مرزا جانتے ہیں کہ اگر وہ ناراض ہوئے تو ہم موقع غنیمت جان کر اُنہیں منانے کی رسمی سی کوشش بھی نہیں کریں گے ! اِس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کم از کم ہماری نفسیات کے تو ماہر ہیں !

لوگ اِس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں کسی کو کوئی بات بُری نہ لگ جائے اور ہم یہ سوچ کر پریشان رہتے ہیں کہ احباب کو ہماری تمام باتیں اچھی ہی لگتی رہیں تو کیا ہوگا ! ہمارے عہد کے بچے ہی نہیں، بڑے بھی اب اِس قدر چالاک ہوگئے ہیں کہ سپاٹ لہجے میں بات کیجیے تو اِسے لکھاریوں کی خاصیت قرار دیکر ہنستے ہوئے نظر انداز کردیتے ہیں !

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو رُوٹھنے سے صرف گریز ہی نہیں کرتے بلکہ ملتے رہنے کا باضابطہ اہتمام بھی کرتے رہتے ہیں ! آپ اِن کی آمد کا بُرا مانتے ہیں تو مانتے رہیں اور اگر آپ کا وقت ضائع ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔ ایسی "معمولی" باتوں کو یہ توجہ کے قابل نہیں سمجھتے ! اِن کی نظر بہت سے "ارفع و اعلیٰ" موضوعات پر رہتی ہے، مثلاً گلی میں کِس کا مکان بن رہا ہے یا کِتنا بن چکا ہے، کِس کا بیٹا آج کل کیسے لوگوں کی صحبت اختیار کئے ہوئے ہے، کون زیادہ کما رہا ہے اور کیوں، کون کم کما رہا ہے اور کیوں، کِس کے گھر میں پَھڈا چل رہا ہے اور کِس کے گھر میں صُلح کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ اِن "کام کی باتوں" میں اُلجھا کر لوگ ہمیں کالم نویسی جیسے سطحی کام سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں مگر ہماری ڈھٹائی دیکھیے کہ ہم غُچّہ دیکر بچ نکلتے ہیں اور اُن کا دل توڑتے ہوئے کچھ نہ کچھ لکھ ہی لیتے ہیں !

جاپانی کبھی "ترقی" نہیں کرسکتے

ہم آج تک سمجھ نہیں پائے کہ دُنیا بھر میں جاپان کو ترقی کی روشن مثال کیوں سمجھا جاتا ہے؟ جاپانیوں میں آخر ایسا کیا ہے کہ اُن کے بارے میں طے کرلیا گیا ہے کہ اگر ترقی کی جائے تو اُن کی طرح کی جائے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ بعض معاملات میں جاپانی آج تک "دقیانوسی" ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے اب تک مشترکہ خاندان کا نظام اپنا رکھا ہے، مغرب کی طرح الگ الگ زندگی بسر کرنے پر زیادہ یقین رکھتے۔ حیرت ہے کہ اِس پر بھی "ترقی یافتہ" کہلاتے ہیں!

دُنیا اِکیسویں صدی میں قدم رکھ چکی ہے بلکہ رواں دواں ہے اور جاپانی ہیں کہ اب تک ڈیڑھ دو ہزار سال پہلے کی دُنیا میں جی رہے ہیں۔ تیزی سے اُبھرتی ہوئی معیشتوں نے ثابت کیا ہے کہ آگے بڑھنا ہے تو بہت کچھ چھوڑنا، بلکہ بے دردی سے روندنا پڑے گا۔ امریکہ اِس کی واضح ترین مثال ہے۔ اُس نے جی بھر کے، بدمست ہاتھی کی طرح، کمزور اقوام پر چڑھائی کی ہے۔ یورپ بھی کئی صدیوں تک اِسی روش پر گامزن رہا ہے۔ امریکہ اور یورپ نے آگے بڑھنے کے لئے دوسروں کو پیچھے رکھنے کا بھرپور اہتمام کیا اور

پس ماندہ اقوام کے دِلوں پر اپنی "عظمت" کا سِکّہ جمایا۔ جاپان جیسے ممالک پر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ کسی کمزور اور ناتواں ملک پر چڑھائی نہیں کرتے اور اِس "خامی" کے باوجود خود کو "ترقی یافتہ" گردانتے ہیں! روایات، اقدار اور اُصولوں کی باتیں کرنے والوں سے دُنیا نے بہت پہلے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ جاپانی اب تک روایات کو رو رہے ہیں، اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ترقی کے معاملے میں وہ بہت آگے نکلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر اُصول پسندی کی بات آ جائے تو اُن کی سُوئی اٹکی ہوئی محسوس ہوتی ہے! گزشتہ دنوں ایک جاپانی کمرشل بینک کے سربراہ نے ایک عجیب حرکت کی جس نے ہمیں قلم اُٹھانے پر مجبور کردیا۔ ادارے کے اے ٹی ایم سسٹم میں خرابی آنے پر اور صرف تین دن کام شدید متاثر ہونے پر موصوف نے خِفّت کے مارے مستعفی ہونے کا اعلان کردیا!

ہم نے سُنا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے برسوں بعد جنگلوں میں کئی جاپانی فوجی خاصی بُری حالت میں ملے۔ خراب حالات کے باوجود وہ "ڈیوٹی" پر تھے اور دُشمن سے مقابلے کے لئے مستعد! جب باہر کی دُنیا کے لوگ اُن تک پہنچے تو وہ بدک گئے۔ بہت مشکل سے اُنہیں سمجھایا جاسکا کہ جاپانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور جنگ کب کی ختم ہوچکی ہے! اُن کی کمٹمنٹ دیکھ کر دُنیا حیران رہ گئی۔ کہاں تو جاپانیوں کا یہ حال تھا کہ جنگ

ختم ہونے پر بھی پسپائی پر آمادہ نہ تھے اور اب ایسا کیا ہوگیا ہے کہ یہی لوگ بات بے بات استعفیٰ دیکر ذمہ داری کا بوجھ سر سے اُتار پھینکنے کے لئے بے تاب رہتے ہیں؟
ذرا سی بات پر اُصولوں کے غار میں اُتر جانے والے بھلا کس طور "ترقی" کر سکتے ہیں؟ ہم تو خدا لگتی کہیں گے کہ جاپانیوں نے جیسے تیسے ترقی تو خیر کرلی، مگر کسی بھی معاملے کی ذمہ داری کا بوجھ اُٹھانے سے بھاگتے، کتراتے ہیں! کہیں کوئی ٹرین بس ذرا سی ٹریک سے اُتر جائے تو ریلوے کا وزیر استعفے کے اسٹیشن پر اُتر جاتا ہے! قتل کی دو چار وارداتیں ہو جائیں تو وزیر داخلہ اپنی وزارت کو قتل کرکے حقیقی معنوں میں "وزیر داخلہ" بن جاتا ہے یعنی گھر بیٹھ جاتا ہے۔ کہیں بجلی کا نظام درہم برہم ہو جائے تو توانائی کے وزیر کی توانائی ختم ہو جاتی ہے اور وہ ری چارج کے لئے مُستعفی ہو جاتا ہے! معمولی سی بے قاعدگی یا بد نظمی پر مستعفی ہونے والے کس طرح "ترقی" کر گئے، یہ بات ہم آج تک سمجھ نہیں پائے!
جاپانیوں کو اگر کچھ سیکھنا ہے تو اپنے سیاست دانوں اور ماہرین کو پاکستان بھیجیں۔ اے ٹی ایم سسٹم کی خرابی پر مستعفی ہونے والے بینک سربراہ کو ہم کیا بتائیں کہ اگر کبھی، خدا ناخواستہ، ہمارے ہاں کسی

بینک کا سربراہ مستعفی ہوا بھی تو اِس بات پر ہوگا کہ اُس کے ہوتے ہوئے بینک کا کوئی بھی سسٹم ڈھنگ سے کام کیسے کرنے لگا! اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ہر معاشرے کے اپنے اُصول اور آدرش ہوتے ہیں! اِسی کو انگریزی میں "کسٹمائزڈ ڈھنگ" کہتے ہیں! دفتر سے ہماری تنخواہ جس بینک میں جاتی ہے اُس کے آن لائن یا اے ٹی ایم سسٹم کا یہ حال ہے کہ کبھی کام کر رہا ہو تو ہم حیرت کے مارے اے ٹی ایم کارڈ یا چیک تھامے رہ جاتے ہیں اور کیشیئر خیریت دریافت کرتا رہ جاتا ہے! اب اگر ہماری اِتنی سی حیرت پر کوئی مستعفی ہو تو ہو، اے ٹی ایم سسٹم کی خرابی پر منصب سے دستبردار ہونا ہرگز "بڑپن" کی دلیل نہیں! کبھی کبھی ہمیں خیال آتا ہے کہ بینک کے اعلیٰ افسران شاید اِس غم میں گھلتے رہتے ہیں کہ نظام درست ہوگیا اور اکاؤنٹ ہولڈرز کو تمام خدمات کسی دُشواری کے بغیر ملنے لگیں تو وہ بینک کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو کیا منہ دِکھائیں گے! کرپشن کے الزام پر مستعفی ہو جانے کی بدعت بھی ترقی یافتہ معیشتوں سے نکلی ہے۔ ترقی یافتہ دُنیا کے مقتدر لوگوں نے ساری دُنیا کی دولت بٹور لی ہے اور اب معمولی کرپشن پر مستعفی ہو کر پس ماندہ ممالک کے اُن حکام کے لیے مثال قائم کرنے کی دُھن میں رہتے ہیں جو "ذرا سی" کرپشن کرکے یہی کوئی سات آٹھ نسلوں کے لیے پُرآسائش زندگی کا اہتمام کرنا چاہتے

ہیں! سیانے کہتے ہیں کہ کل کا کوئی بھروسہ نہیں کہ آئے نہ آئے، مگر پاکستان سمیت تمام پس ماندہ معاشروں کے اُن "سپوتوں" پر آفرین ہے جو، دُنیا بھر کے اہل دانش کے فکری اثاثے کو لات مار کر، اپنی کئی نسلوں کے آنے ہی کا یقین نہیں رکھتے بلکہ اُن کے لئے "کچھ نہ کچھ" چھوڑ جانے پر بھی بھرپور اعتقاد رکھتے ہیں! رات دن محنت کرکے دو وقت کی روٹی کا اہتمام کرنے والے جاپانی ذرا ہمارے درمیان زندگی گزاریں تو ہم بتائیں کہ ہاتھ پیر ہلائے بغیر، فرسودہ اُصولوں کو نظر انداز کرکے کس طرح بہت کچھ خاصی تیزی سے پس انداز کیا جاسکتا ہے! صبح سے شام تک کام کرنا پاکستانی معاشرے کی روش کو دیکھتے ہوئے خاصا دقیانوسی طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے تو ایسے "پہنچے ہوئے" لوگ بھی دیکھے ہیں جو دفتر میں ڈیڑھ دو گھنٹے گزار کر گھر واپس آتے ہیں اور ٹی وی دیکھ کر دل بہلاتے ہیں۔ آپ سوچیں گے اُن کی تنخواہ کٹ جاتی ہوگی۔ بس، یہ خیال ہی آپ کی سوچ کے پس ماندہ ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے، ایسے لوگ صرف تنخواہ نہیں بلکہ اوور ٹائم بھی پاتے ہیں اور پُرآسائش زندگی بسر کرتے ہیں۔ قوم کے ایسے فرزندوں ہی کو دیکھ کر ہمیں ترقی یافتہ دُنیا کے لوگوں پر ترس آتا ہے کہ وہ یہی آسائشیں دن رات ایک کرکے حاصل کر پاتے ہیں! کم محنت میں زیادہ پُرسکون زندگی بسر کرنے کا "ہُنر" سیکھنے اگر وہ پاکستان آئیں تو ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے!

کسی بھی معاملے میں معمولی سی خرابی کے نمودار ہوتے ہی مستعفی ہو جانا جاپان جیسے ممالک میں تو اب فیشن بن چکا ہے۔ یعنی مستعفی ہونے کی تو اب کچھ وقعت ہی نہیں رہی! چند گھنٹے بجلی نہ آئے تو استعفیٰ، دو ایک دن بجلی چلی جائے تو استعفیٰ! ارے بھئی، بجلی نے کبھی نہ جانے کا ٹھیکہ تو لے نہیں رکھا۔ جگ کی یہی ریت ہے، جو آیا ہے اُسے جانا ہے! گھر میں اگر آپ سوئچ آف کردیں تو کیا لائٹس اور پنکھے وغیرہ بند نہیں ہو جاتے؟ بالکل اِسی طرح اگر پاور ہاؤس میں کوئی شخص بٹن بند کردے تو علاقے کی بجلی چلی جاتی ہے۔ اب اِتنی سی بات پر کوئی کیوں اپنے آپ کو استعفے کا جھٹکا دے؟

ہم نے سُنا ہے کہ میڈیا والوں کی کھال موٹی ہوتی ہے، یعنی حالات اِن پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔ اِس اعتبار سے دیکھیے تو ہمارے ہاں حکام اور سیاست دانوں کو قدرت نے شاید گینڈے کی کھال سے نوازا ہے! اُن پر حالات برائے نام بھی اثر انداز نہیں ہوتے۔ سوچنا اُن کے مزاج کا حصہ کبھی رہا ہی نہیں، اور مستعفی ہونے کے بارے میں سوچنا تو شاید حرام کا درجہ رکھتا ہے! دو چار بسیں گہری کھائی میں گرنے سے ڈیڑھ دو سو افراد کا موت کے گھاٹ اُترنا کیا کافی نہیں کہ کوئی وزیر یا اعلیٰ سرکاری

افسر اپنے منصب کو بھی موت کے گھاٹ اُتارے؟ اگر ایسی باتوں پر استعفیٰ دینے کا سلسلہ چل نکلا تو ہمارے ہاں اعلیٰ سطح پر ساری کرسیاں خالی ہو جائیں گی! اور اگر ایسا ہوا تو ریاست کا نظام کیسے چلے گا؟ اللہ نہ کرے کہ ہم جاپانیوں کے نقش قدم پر چلیں اور اپنے ناکام نظام کو مزید ناکامی سے دوچار کریں! ایسے میں غنیمت ہے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ حکام

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے

کی عملی تصویر بنے ہوئے ہیں، یعنی چھوٹی موٹی باتوں پر دل برداشتہ ہو کر مستعفی نہیں ہو جاتے۔ اِن کا وجود غنیمت ہے کہ اِنہیں دیکھ کر لوگ ہمت پکڑتے ہیں اور ضمیر کی خلش کا گلا دبوچ کر اپنے اپنے منصب سے چمٹے رہتے ہیں! اگر جاپانیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مستعفی ہونے کا رواج اپنا لیا گیا تو ہم بہت سے سیاسی نوادرات سے محروم ہو جائیں گے!

عالم بالا سے اُسامہ بن لادن کا انٹرویو

ایک پہنچے ہوئے عامل بابا کے ذریعے ہم نے عالم بالا میں اُسامہ بن لادن کی رُوح سے بمشکل رابطہ کیا۔ جب ہم نے القاعدہ کے سربراہ کی روح کو بتایا کہ ہم انٹرویو کرنا چاہتے ہیں تو اُس نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ہم سمجھے شاید زمین والوں سے اُسامہ کی روح اب تک خوفزدہ ہے۔ مگر پھر وضاحت کے طور پر ارشاد ہوا کہ معاملات اِتنے متنازع ہوگئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کہا جائے اور کیا کہنے سے گریز کیا جائے! ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ شاید ہم اُسامہ کی روح سے رابطہ کرنے والے پہلے انسان ہیں مگر یہ جان کر حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ ٹی وی چینلز والے القاعدہ کے شہید قائد کی روح سے روزانہ رابطہ کرتے ہیں مگر اُن کے سوالات سے وہ بے چاری گھبرا کر دوبارہ عالم برزخ میں جا چُھپتی ہے!

ہم نے بھی چند تگڑے سوالات تیار کر رکھے تھے مگر جب رابطہ کار نے مشورہ دیا کہ ہاتھ ذرا ہلکا رکھنا تو ہمیں سوالات سے تھوڑا مسالا نکالنا پڑا۔ خیر، القاعدہ کے "شہید" چیف سے گفتگو آپ کی نذر ہے۔

☆ آپ کو اب تک چار پانچ مرتبہ شہید کیا جا چکا ہے۔ آپ بار بار کس طرح زندہ

ہو جاتے ہیں؟

اُسامہ بن لادن: شہید کبھی مرتے نہیں! میں نے ٹھان رکھی ہے کہ قیامت تک امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی جان نہیں چھوڑوں گا۔ اور میرے اِس عزم پر عمل کو خود میرے دشمنوں نے آسان بنا دیا ہے؟

☆ وہ کیسے؟

اُسامہ بن لادن: میں امریکہ اور یورپ کی سیاسی اور اسٹریٹجک ضرورت ہوں۔ جب جب ضرورت پڑے گی، یہ لوگ مجھے "شہید" کرتے رہیں گے! امریکہ میں صدارتی انتخابات کی تاریخ جیسے جیسے نزدیک آتی جاتی ہے، میں ایک نئی شہادت کے لیے تیار ہو جاتا ہوں! اب میں وہ کمبل ہوں جسے یہ خود اُتار کر پھینکنا نہیں چاہتے۔

☆ مگراِس مرتبہ توآپ کی شہادت کا اعلان خود امریکی صدر نے پورے وثوق سے کیا ہے؟

اُسامہ بن لادن: عراق اور افغانستان کے بارے میں امریکی صدور کی کون سی بات برحق ثابت ہوئی ہے جو اب میری شہادت کا دعویٰ درست ہوگا؟ اور پھر جس طرح اِنھوں نے مجھے آبی قبر میں دفنایا ہے وہ بھی خاصا غور طلب معاملہ ہے۔ مجھے پھر شہید کرکے غرقاب کرنا علامتی حیثیت رکھتا ہے۔ افغانستان میں

اتحادی فوج کا بیڑا غرق ہو چکا ہے، لہٰذا لازم تھا کہ مجھے غرقاب کر کے امریکہ اور یورپ کے عوام کے کلیجے ٹھنڈے کئے جاتے!

☆ اب القاعدہ کا کیا بنے گا؟

اُسامہ بن لادن: میری تنظیم کے بارے میں دنیا بھر میں جو کچھ لکھا اور شائع کیا جاتا ہے اُسے پڑھ پڑھ کر میں حیران اور پریشان ہوتا رہتا ہوں۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ میری تنظیم کو لوگ اِتنے بلند مقام پر بٹھادیں گے! بہت سے ناکردہ گناہ بھی میرے کھاتے میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ دُنیا سے رخصت ہونے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ واحد سپر پاور کے لیے میں کتنا بڑا دردِ سر تھا! جیتے جی معلوم ہو جاتا تو زیادہ فخر سے جی لیتا اور کسی لابنگ فرم کی مدد سے مارکیٹ ویلیو ہی کچھ بڑھوا لیتا!

☆ کیا آپ جانتے ہیں کہ تازہ ترین شہادت کے بعد آپ کے بارے میں کیا کیا بولا اور لکھا جا رہا ہے؟

اُسامہ بن لادن: جی ہاں، کیوں نہیں؟ میں روحانی ای میلز کے ذریعے دنیا کے حالات سے باخبر اور (ظاہر ہے کہ) پریشان رہتا ہوں۔ سیکڑوں، ہزاروں سال پہلے کے جن سیاسی اور سماجی رہنماؤں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ میں اب بھی دنیا سے رابطے میں ہوں تو بہت جُزبُز ہوتے ہیں۔ اُن کا

اِصرار یہ ہے کہ اب میں دُنیا سے رابطہ منقطع کرلوں اور عالم برزخ کو انجوائے کروں۔ مگر اُنہیں کیا معلوم کہ بار بار جی اُٹھنے اور بار بار مارے جانے کا مزا کیا ہے ! اگر اُنہیں بھی میری طرح، ضرورت کے تحت، بار بار زندہ کرکے موت کی وادی میں پھینکا جائے اور پیٹ بھر شہرت ملے تو شاید اپنا نظریہ بدل لیں ! بے چاروں نے اب تک صرف ایک بار موت کا مزا چکھا ہے، بار بار زندہ کئے جانے اور گلیمرائزڈ موت مارے جانے کی لذت یہ کیا جانیں!

☆ عالم بالا میں آپ کا اسٹیٹس کیا ہے؟

اُسامہ بن لادن : پہلے تو مجھے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی مگر پھر جب نے اپنے بارے میں اور دوسروں نے میرے بارے میں بتایا تو مجھے سیلیبریٹی کا درجہ مل گیا۔ اب حال یہ ہے کہ لوگ حلقہ بنا کر میرے گرد بیٹھے رہتے ہیں اور میں اُنہیں جہادی داستانیں سناتا رہتا ہوں۔ جب میں بتاتا ہوں کہ امریکیوں کے حواس پر القاعدہ کس قدر سوار ہے تو لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں ! جب بھی دنیا میں میری "شہادت" واقع ہوتی ہے، عالم بالا میں لوگ مجھ سے اظہار یکجہتی کے لیے میرے ساتھ مل کر قہقہے لگاتے ہیں!

☆ آج کی دنیا کے بارے میں ہزار سال پہلے کے لوگوں کا کیا رائے ہے؟

اُسامہ بن لادن : میں جب آج کی دنیا کے حالات بیان کرتا ہوں تو ہزار بارہ

سو سال پہلے کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید قیامت برپا ہوچکی ہے اور انہیں نوٹیفائی نہیں کیا گیا!

☆آپ کے بعد کی دنیا میں کون سی ایسی چیز ہے جو آپ کے لیے دم بہ دم حیرت کا باعث ہے؟

اُسامہ بن لادن: کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ میرا کھاتہ کتنا بڑا کھولا گیا ہے کہ بھرنے اور ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ امریکیوں کے لیے میرا نام اب شاید "قبض کشا" کے طور پر بھی استعمال ہونے لگا ہے! اگر کسی کی گاڑی اسٹارٹ نہ ہو رہی ہو تو القاعدہ اور مجھ پر الزام تراشی کرنے لگتا ہے! اور ہاں، میرے بارے میں جتنی اور جیسی کہانیاں پھیلائی جارہی ہیں وہ مجھے ہر وقت حیرت زدہ رکھتی ہیں۔ امریکی محکمہ دفاع، دفتر خارجہ اور ایوان صدر کے درمیان دروغ سازی اور دروغ گوئی کا مقابلہ جاری رہتا ہے۔ مجھ سے متعلق من گھڑت کہانیوں کی فلک بوس عمارت واحد سپر پاور کے اِن تینوں ستونوں پر کھڑی ہے!

☆پاکستان اور پاکستانیوں کے ساتھ آپ کا معاملہ کیسا رہا؟

اُسامہ بن لادن: بہت اچھا۔ میں کبھی پاکستان میں رہا نہیں مگر پاکستانیوں سے تعلق ضرور رہا۔ میں نے عام پاکستانی کو محبت کرنے والا اور جاگتی آنکھوں

سے خواب دیکھنے والا پایا۔ پاکستانی بڑے خوش نصیب ہیں کہ اُنہیں پاکستان ملا ہے اور دوسری طرف پاکستان اور پاکستانی دونوں بہت بد نصیب ہیں کہ اُنہیں آج تک ڈھنگ کے حکمران میسر نہ ہوسکے!

☆ پاکستان یا پاکستانیوں سے کوئی شکایت؟

اُسامہ بن لادن: پاکستان سے شہیدوں کی ایکسپورٹ بڑھ گئی ہے! آج کل وہاں سے جو بھی یہاں، عالم بالا میں، آ رہا ہے خود کو شہید قرار دینے پر تُلا ہوا ہے! اِس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عالم بالا میں شہیدوں کی مارکیٹ ویلیو مسلسل ڈاؤن ہوتی جارہی ہے! پاکستانیوں سے التماس ہے کہ "شہادت" پر ہاتھ ذرا ہلکا رکھیں! بعض شہادتوں کے ہم سب شدت سے منتظر ہیں مگر وہ رونما نہیں ہو رہیں! مگر صاحب

اور سب کچھ تو یہاں ہوتا ہے

ہم جو چاہیں وہ کہاں ہوتا ہے!

عِلاقائی سُپر پاور کا ہاضمہ کب درست ہوگا؟

"پاکستان کا کیا بنے گا؟" یہ بھارت کے سیاست دانوں کا محبوب ترین موضوع ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ موضوع بُھوت بن کر بھارتی سیاست دانوں کے سروں پر ایسا سوار ہوا ہے کہ اب اُترتا ہی نہیں۔ اِس ڈگڈگی کو بجا بجاکر بھارتی قیادت اب مداری پن کی سطح پر اتر آئی ہے۔ بیشتر بھارتی سیاست دان رات دن پاکستان کے غم میں گھلتے رہتے ہیں۔ یہ گویا مُفت کا سلِمنگ کورس ہے! بھارتی وزیر داخلہ پی "چدم بھرم" پر بھی وقفے وقفے سے پاکستان کے خلاف بولنے کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ جس دن وہ پاکستان کے خلاف کچھ بول نہ پائیں وہ دن اُن پر بہت بھاری گزرتا ہوگا! جیسے زندگی میں کوئی کمی سی رہ گئی ہو! موصوف ممبئی حملوں کے ملزمان کے خلاف پاکستان کو دیئے جانے والے شواہد کا رونا روتے رہتے ہیں۔ یہ راگ اُنہوں نے اِس تواتر سے گایا ہے کہ اب تو کلاسیکل گویّوں کی برادری بھی اُنہیں قبول کرنے میں تامّل کا مظاہرہ نہیں کرے گی! مگر اب تک یہ نہیں بتایا کہ ممبئی حملوں کے بعد کی جانے والی کاروائی میں مارے جانے والوں کا آخری دیدار اُن کی حکومت نے کیوں نہیں کرایا۔ شاید اب تک تدفین بھی عمل میں نہیں لائی جاسکی۔ اِن نسبتاً "تازہ" مُردوں کو دفنانے پر توجہ دینے کے بجائے چدمبرم گڑے مُردے اکھاڑنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔

ممبئ حملوں کے بعد ایک اجمل قصاب رہ گیا ہے جسے یہ لوگ بُغدے کی طرح استعمال کرتے رہتے ہیں! ہم اب تک سمجھ نہیں پائے کہ پاکستان کو کمزور قرار دینے والے جب اُس کے آٹھ دس نوجوانوں کے ہاتھوں تگنی کا ناچ ناچنے پر مجبور ہوئے تو خود پاکستان کے ہاتھوں کون سا ناچ ناچیں گے!

چدم برم نے حال ہی میں ایک بار پھر ممبئ حملوں کا رونا روتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان کو اگر بھارت سے تعلقات معمول پر لانے ہیں تو ممبئ حملوں کے ملزمان کے خلاف کاروائی یقینی بنانی ہوگی۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ تمام شواہد پاکستان کے حوالے کر دیئے گئے ہیں۔ بات مقبوضہ کشمیر کی ہو یا ممبئ حملوں کی، پاکستان کے دم سے بھارتی سیاست کا گرم بازاری برقرار رہتی ہے۔

ہاں، یاد آیا۔ ایک راگ اور بھی ہے جو بھارتی سیاست دان اور حکام اکثر الاپتے رہتے ہیں اور وہ ہے مطلوب افراد کی فہرست کا راگ۔ یہ ایسا راگ ہے جسے بھارتی سیاست دان خاصے بے سُرے انداز سے الاپتے ہیں یعنی جو لوگ بھارتی سرزمین پر موجود ہیں اُنہیں بھی پاکستان سے طلب کیا جاتا ہے! جہاں تک ہماری ناقص معلومات کا تعلق ہے، اب تک ایسی کوئی ٹیکنالوجی سامنے نہیں آئی جس کے ذریعے کسی فرد کی دو مقامات پر موجودگی ثابت کی جاسکے! یہ بات چدم برم اینڈ

کمپنی کو بھی تو سوچنی چاہیے! وہ توضیح کرنے سے قاصر ہیں کہ بھارت مطلوب افراد کی جامع اور بے داغ فہرست اب تک کیوں تیار نہیں کر پایا۔

چدم برم نے پاکستان سے یہ بھی کہا ہے کہ ان کا ملک بلوچستان میں کچھ نہیں کر رہا۔ اور اگر کسی کے بارے میں شبہ ہے کہ تو اُس کا نام بتایا جائے، بھارتی حکومت اُس کے خلاف ضرور کاروائی کرے گی۔ چدم برم کی اِس بات پر ہم ضرور یقین کر سکتے ہیں کیونکہ جو لوگ اپنی "ایجنٹی" پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہ ہو پائیں اُن کے خلاف تو کاروائی ہونی ہی چاہیے، خفیہ کاروائی کی دنیا کا سب سے زیادہ تسلیم شدہ اُصول یہی ہے! چدم برم اگر امور داخلہ کے ساتھ ساتھ لطائف کی وزارت بھی سنبھال لیں تو کوئی ہرج نہیں! ایک انٹرویو میں اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان سے تعلقات بہتر بنانے کی کنجی فوج کے پاس ہے۔ اور پھر دوسری سانس میں اُنھوں نے پاکستان کی جمہوری حکومت سے تعاون جاری رکھنے کا عزم بھی ظاہر کیا ہے! جو ملک مقبوضہ کشمیر کے جانبازوں کو قابو میں رکھنے کے نام پر سید علی گیلانی جیسے معمر سیاست دان کو مستقل نظر بند رکھنے پر مجبور ہو وہ دو طرفہ مسائل کا حل دشمن کی فوج سے طلب کر رہا ہے، یہ تو لطیفہ در لطیفہ والی بات ہوئی۔ بات بات پر تخریب کاری کا بازار گرم کرنے والا بھارت پاکستانی فوج سے کون

ساحل طلب کر رہا ہے؟ کیا یہ ایک اور کرگل برپا کرنے کی "دعوت" ہے؟
شمالی مشرقی ریاستوں میں بھارتی حکومت اور فورسز کو جن مشکلات کا سامنا ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ پانچ ریاستوں میں ماؤنواز باغیوں نے سرکاری مشینری کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے بارے میں سوچ سوچ کر دُبلے ہونے والے بھارتی سیاست دانوں کے لیے ماؤ باغی چلتے پھرتے بم کا درجہ رکھتے ہیں اور کہیں بھی پھٹ کر فورسز کے دس پندرہ اہلکاروں کو لے مرتے ہیں! ماؤ باغیوں کے ہاتھوں بعض مقامات پر بھارتی فورسز بھیگی بلی کی طرح محض میاؤں کرنے کے قابل رہ گئی ہیں! افسانوں میں آیا ہے کہ جب مجنوں کو مدرسے میں بید پڑتے تھے تو لیلیٰ کے ہاتھوں پر چوٹ کے نشان پڑ جاتے تھے۔ یہ عجیب "ٹیکنالوجی" آج بھی زندہ ہے۔ بھارت کو جب مشرقی محاذ پر زیادہ مار پڑتی ہے تو اُس کی قیادت مغربی محاذ پر آکر واویلا مچاتی ہے! ماؤ باغیوں پر بس نہیں چلتا تو پاکستان کے خلاف رو پیٹ کر بھارتی قیادت اپنے عوام کو (مزید) بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی ہے! پتہ نہیں ایک پاکستان کس کس کے، کتنا کام آئے گا!
بھارتی وزیر دفاع اے کے انٹونی بھی کچھ کم نہیں۔ انہوں نے ایک بار پھر (اپنا پسندیدہ) خدشہ ظاہر کیا ہے کہ پاکستان کے ایٹمی ہتھیار دہشت گردوں کے

ہاتھ لگ سکتے ہیں۔ یہاں ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا بھارت کی حکومت پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟ پاکستانی ایٹمی اثاثوں کے دہشت گردوں ہاتھ لگنے کے خدشے سے تو یہی تاثر ابھرتا ہے! ہم تو سمجھتے تھے کہ ایٹمی ہتھیار بھارتی بدہضمی کا موثر علاج ثابت ہوں گے مگر یہاں حالت یہ ہے کہ اِن کے باعث بھارتی سیاست دانوں کے پیٹ میں اُٹھنے والے مروڑ بڑھ گئے ہیں! یعنی

!کچھ نہ دوا نے کام کیا ....

اب کیا ہمارا کام یہ رہ گیا ہے کہ بھارتی قیادت کے لیے ہاضمے کا چُورن ڈھونڈتے یا تیار کرتے پھریں؟

ایک زمانے سے بھارت کم از کم علاقائی سطح پر سُپر پاور بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ خواب دیکھنے کے لیے اب گہری نیند میں ڈوبنا بھی لازم نہیں رہا۔ بے ڈھنگے سپنے جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھے جاسکتے ہیں! امریکہ اور برطانیہ سے مرعوب ہوکر اگر سُپر پاور بننے کا اِتنا ہی شوق ہے تو بھارتی قیادت کو اِن دونوں ممالک سے یہ بھی سیکھنا چاہیے کہ کب، کہاں، کتنا اور کیسا جھوٹ بولنا ہے! جھوٹ بولنے میں مہارت کا حصول سُپر پاور بننے کے سفر کی پہلی منزل ہے! جو ملک مطلوب افراد کی خامیوں سے پاک فہرست بھی مرتب نہ کرسکے

اُسے علاقائی سُپر پاور کی حیثیت سے کون قبول کرے گا؟ چدم.برم اینڈ کمپنی کو سیاسی و سفارتی دروغ گوئی میں ریفریشر کورس کرنا چاہیے تاکہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے!

فلم رائٹر سے انٹرویو

(گزشتہ دنوں ایک مشہور فلم رائٹر سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ حُلیے اور باتوں سے ذرا بھی اندازہ نہ ہوسکا کہ وہ فلمیں لکھتے ہوں گے۔ مگر جب اُنھوں نے کسی بات پر برہم ہو کر ایک صاحب کو لتاڑنا شروع کیا تو اُن کی باتوں سے اُن کی فلموں کے ڈائیلاگ جھلکنے لگے۔ تب ہمیں اُن کی "رائٹرانہ" صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ موقع غنیمت جان کر ہم نے اُن سے کچھ گفتگو ریکارڈ کرلی تاکہ آپ کو بھی کچھ اندازہ ہو کہ فلمیں لکھنا یعنی اسکرین رائٹنگ کیا ہوتی ہے!)

☆آپ نے فلموں کے لیے کب لکھنا شروع کیا؟

فلم رائٹر: ٹھیک سے یاد نہیں، شاید تب میں نے پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا! پڑھتا تو خیر میں اب بھی نہیں ہوں!

☆تو پھر کس طرح لکھ لیتے ہیں آپ؟

فلم رائٹر: کلرکی وغیرہ کے لیے ہو تو ہو، لکھنے کے لئے پڑھا لکھا ہونا لازم نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پڑھاکو قسم کے لوگ پروف ریڈر تو بن سکتے ہیں، رائٹر اور بالخصوص فلم رائٹر تو ہرگز نہیں بن سکتے۔

☆آپ کو کب محسوس ہوا کہ آپ فلم رائٹر بن سکتے ہیں؟

فلم رائٹر: یہ احساس مجھے نہیں، دُوسروں کو ہوا تھا۔ جب بھی کسی میں کسی میں کچھ لکھنے کی خُو بُو پیدا ہوتی ہے تو ماحول میں موجود دُوسرے لوگوں کے نتھنوں پر زیادہ گراں گزرتی ہے! میں جب جسمانی طور پر بھی خاصا چھوٹا تھا تب بہت بَک بَک کرتا تھا اور جو کچھ بکتا تھا اُسے لکھ کر دوستوں میں بانٹتا تھا۔ ایک دن میرے والد نے میری تحریر پڑھی اور بس.... اُن پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ہوش آنے پر وہ مجھے علاقے کے ایک بزرگ کے پاس لے گئے۔ اُن بزرگ نے میرے حالات پر بریفنگ لینے کے بعد مُجھے بغور دیکھا اور میرے والد کو دِلاسا دیتے ہوئے بولے "آثار تو یہ ہیں کہ بچہ اخباری کالم نگار بنے گا! دیکھتے ہیں، اللہ نے تمہارے مقدر میں بالآخر کیا لکھا ہے۔

☆مگر آپ تو فلموں کے اسکرپٹ لکھنے کی طرف آ گئے؟ یہ کیسے ہوا؟

فلم رائٹر: بات یہ ہے کہ میں بچپن میں کھانے پینے کی چیزیں چرایا کرتا تھا۔ امی میری اِس عادت سے بہت تنگ تھیں۔ ایک بار اُنھوں نے بد دعا کی کہ جا تو زندگی بھر یونہی چوری کرکے کھائے۔ وہ کوئی قبولیت کی گھڑی تھی۔ بد دعا کے زیر اثر میں فلموں کے اسکرپٹ لکھنے لگا۔ پہلے کھانے پینے کی چیزیں چراتا تھا اور اب ہالی وڈ اور بالی وڈ کی فلموں سے آئیڈیا نکال کر اپنے

!دستر خوان کو ہرا بھرا رکھنے کا اہتمام کرتا ہوں

☆اِس چوری پر آپ کبھی شرمندہ نہیں ہوتے؟

فلم رائٹر: اِس عمل کو انسپیریشن قرار دیکر اپنے دِل پر سے بوجھ اُتار دیتا ہوں۔

☆ کوئی بھی فلم لکھتے وقت آپ تھیم کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں یا کہانی کو؟

فلم رائٹر: سب سے پہلے تو میں فلم کا بجٹ اور پروڈیوسر کی ذہنی سطح دیکھتا ہوں۔ اِس طرف سے مطمئن ہو کر لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ اگر پروڈیوسر کی جیب اجازت دے تو تھیم وغیرہ بھی سوچ ہی لیتا ہوں۔ ویسے میں "تلمیذ الرحمٰن" ہوں، یعنی جو کچھ سیکھا ہے اپنے طور پر سیکھا ہے۔ میں کوئی تھیم ویم کا محتاج نہیں۔

☆ کہانی کس طرح ترتیب دیتے ہیں؟

فلم رائٹر: دُنیا میں بھر میں کہانی پہلے فائنلائز کرنے کا طریقہ رائج ہے جو خاصا فرسودہ ہے۔ اگر اداکار کو پہلے سے معلوم ہو کہ کہانی کیا ہے تو ہر سین میں وہ اُسی کے مطابق ایکسپریشن دیتا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اداکار کو

اِتنا پابند نہیں کیا جاتا۔

☆ اگر کہانی پہلے سے طے نہیں ہوتی تو اداکاروں کو کنٹی نیو ئٹی پیدا کرنے میں تو بہت دُشواری پیش آتی ہو گی!

فلم رائٹر: اگر کسی اداکار کے سامنے صرف ایک سین ہو تو اُس کے مطابق اداکاری کرتا ہے۔ کسی دوسرے سین میں اُس کے ایکسپریشن کچھ اور ہوتے ہیں۔ پوری فلم میں ہمیں اِسی لیے مختلف ایکسپریشنز دکھائی دیتے ہیں۔ یہی تو ہماری فلموں کا کمال ہے۔ ہم ایکسپریشنز کے پنجرے میں قید رہنے والی اداکاری نہیں کرواتے!

☆ تو پھر آپ کے لکھنے کا طریقہ کیا ہے؟

فلم رائٹر: میں سین اور ڈائیلاگ لکھتا جاتا ہوں، کہانی کا کیا ہے.... وہ تو سین اور ڈائیلاگ کی دُم پکڑ کر چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی میں ڈائیلاگ بازی پر اکتفا کرتا ہوں، کہانی کو سمجھنا اور اُس کے سِرے تک پہنچنا فلم بینوں کا کام ہے۔ تھوڑا بہت اُن کی ذہانت پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ ویسے آپس کی بات ہے، جن فلموں میں کہانی نہ ڈالی جائے وہ لوگوں کو زیادہ پسند آتی ہیں!

☆ کیا آپ اپنے اسکرپٹ کی شوٹنگ کے دوران سیٹ یا لوکیشن پر موجود رہتے ہیں؟
فلم رائٹر: جی ہاں۔ یہ ہمارے فلمی ماحول کی ضرورت ہے۔ شوٹنگ کے دوران سیٹ یا لوکیشن پر موجود رہنے کا فائدہ یہ ہے کہ پروڈیوسر یا ڈائریکٹر کی ہدایت اور ہیرو یا ہیروئن کی ڈیمانڈ کے مطابق ہاتھ کے ہاتھ، گرما گرم پکوڑے۔۔ سوری، میرا مطلب ہے سین لکھ کر دیتا رہتا ہوں۔
☆ بات شوٹنگ کی ہو رہی تھی۔ بیچ میں پکوڑے کہاں سے آ گئے؟
فلم رائٹر: بات یہ ہے کہ میں کسی زمانے میں پکوڑے بیچا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اچانک یونہی آٹو فلیش بیک ہو جاتا ہے اور میں فلموں پر گفتگو کے دوران بھی پکوڑا پکوڑا کرنے لگتا ہوں!
☆ کمال ہوگیا، ہمارے ہاں پکوڑے بیچنے والے فلمیں لکھ رہے ہیں! یہ تو بہت حیرت انگیز، بلکہ شرمناک بات ہے۔
فلم رائٹر: اِس میں حیرت یا شرمندگی کی بات ہے؟ جب دودھ، لَسّی اور کھوئے ملائی کی قلفی بیچنے والے پروڈیوسر بن سکتے ہیں تو پکوڑے بیچنے والے اسکرین رائٹر کیوں نہیں بن سکتے؟ اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کن کن پیشوں سے لوگ فلم انڈسٹری میں آتے ہیں!

☆ میرا خیال ہے پیشوں کا معاملہ رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔ بات کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔

فلم رائٹر: آپ خاصے سمجھدار معلوم ہوتے ہیں۔ میڈیا میں کیا کر رہے ہیں؟

☆ اِن باتوں کو رہنے دیں اور یہ بتائیں کہ ایک فلم لکھنے کا معاوضہ کیا ملتا ہے؟

فلم رائٹر: جیسی مُرغی ویسا انڈا۔ جیسی فرمائش ویسا اسکرپٹ۔ جیسا اسکرپٹ ویسے پیسے۔ ہم ایسے نَو دولتیوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن کا باپ نیا نیا مرا ہو۔ ایسے لوگ ہمارے کام میں کیڑے نہیں نکالتے، بس جیب سے پیسہ نکالتے رہتے ہیں۔ یہ جو نئے پروڈیوسرز ہوتے ہیں نا اِنہیں جو بھی پُلندہ تھمادو اُسے اسکرپٹ سمجھ کر شوٹ کرنے لگتے ہیں اور جو کچھ شُوٹ کرتے ہیں اُسے فلم سمجھتے ہوئے ریلیز کردیتے ہیں!

☆ کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ تھیم کے مطابق فلم نہ لکھ سکے اور وہ ہٹ ہو گئی؟

فلم رائٹر: ایسا تو اکثر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو تھیم ویم کہیں ہوتی ہی

نہیں۔ کہانی کے نام پر ہم دو تین ایکسیڈنٹ اور تین چار لڑائیاں لکھ دیتے ہیں اور فلم ہٹ ہو جاتی ہے۔ ایسی فلمیں ماہرین کو بہت پسند آتی ہیں اور وہ ایوارڈ کی سفارش بھی کردیتے ہیں!

☆ کوئی بھی فلم لکھتے وقت آپ کے ذہن میں کیا ہوتا ہے؟

فلم رائٹر: اسکرپٹ تیار کرتے وقت میں تو صرف یہ بات یاد رکھتا ہوں کہ اِس کام کے لیے ذہن کو استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے! جب میں انڈسٹری میں نیا آیا تھا تب دو تین فلمیں ذہن کی مدد سے لکھی تھیں۔ اِس غلطی کا خمیازہ کچھ اِس طرح بھگتنا پڑا کہ میں نے اسٹوڈیو کے باہر ڈیڑھ سال پکوڑے بیچے! جب دماغ ذرا ٹھکانے پر آیا تو میں نے ذہن سے کام لینا چھوڑا۔ پھر تو میں نے ایسے ڈائیلاگ لکھے کہ ہالی وڈ والے ترجمہ کرواکے پڑھیں تو عَش عَش کرنے سے پہلے غَش کھا جائیں!

☆ کبھی کِسی نے مشورہ دیا کہ آپ اسکرین رائٹنگ باضابطہ سیکھیں، کسی ادارے میں داخلہ لیکراِس فن کی باریکیاں اپنے اندر سموئیں۔

فلم رائٹر: دو ایک مرتبہ میرا موڈ تو بنا کہ کچھ سیکھا جائے۔ مگر پھر جب نے بیرون ملک فن کے بڑے بڑے اداروں سے فارغ التحصیل ہو کر آنے والے اداکاروں اور مصنفین کا حال دیکھا تو کچھ سیکھنے کا خیال دل سے نکال ہی دیا۔

فلمی دُنیا کے ایک بزرگ نے مشورہ دیا کہ فلمی دنیا سے باہر کے جو لوگ ہیں اُن کی باتوں پر زیادہ دھیان مت دیا کرو۔ اُن کا کہنا تھا کہ سیکھنے سے لکھنے اور اُسے پیش کرنے کی خوبصورتی اور برجستگی متاثر ہوتی ہے!

☆اپنی کس فلم پر آپ کو ناز ہے؟

فلم رائٹر: "مریخ کی مخلوق"۔ یہ فلم ایک ایسے ایماندار سرکاری افسر کے بارے میں ہے جو اُصولوں اور آدرشوں کو گلے لگائے زندگی بسر کرتا ہے۔ اُس کی ایمانداری جیسے جیسے پُختہ ہوتی جاتی ہے، وہ معاشرے کے لیے ناقابل قبول ہوتا جاتا ہے۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا کہ اُسے وباء قرار دیکر قرنطینہ میں ڈال دیا جاتا ہے!

☆آج کل آپ کو فلم لکھنے کی تحریک کیسے ملتی ہے؟

فلم رائٹر: اب تو معاملہ بہت آسان ہوگیا ہے۔ میں روزانہ ڈھائی تین گھنٹے پرائم ٹائم کے ٹاک شو دیکھتا ہوں۔ اِن میں روزانہ درجنوں کہانیاں ملتی ہیں۔ تھوڑی سی نوٹنگ کرتا ہوں اور بس شروع ہو جاتا ہوں۔ فائدہ اِس میں یہ ہے کہ ڈائیلاگ الگ سے نہیں سوچنے پڑتے۔ ٹاک شوز میں جو کچھ بکا جاتا ہے اُسی میں سے جملے نکال لیتا ہوں، شاندار ڈائیلاگ بنتے چلے جاتے ہیں۔ اِس کے بعد کسی

کہانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی!

دِل کا معاملہ ہے، کوئی دِل لگی نہیں

ایک زمانے سے اردو اور فارسی کے شعراء دِل کے بارے میں طرح طرح کی بد گمانی پھیلاتے اور ہمارے لیے تفنن طبع کا سامان کرتے آئے ہیں۔ کبھی دل کے ہاتھوں مجبور ہونے کی بات کی جاتی ہے تو کبھی دِل ہی کو مجبور قرار دے دیا جاتا ہے۔ کبھی دِل میں ایک نئ دُنیا تلاش کی جاتی ہے اور کبھی دِل کی دُنیا اجاڑنے والوں کو جی بھر کے کوسا جاتا ہے۔ ایک طرف دِل کو ناگزیر قرار دیا جاتا ہے اور دوسری طرف اُس کا رونا بھی اِس قدر رویا جاتا ہے کہ ذہن میں یہ اُلجھ پیدا ہو جاتی ہے کہ کِس کی مانیں اور کِس کی نہ مانیں!

دِل چیز ہی ایسی ہے کہ بچوں اور بڑوں میں پھڈّا بھی کرا دیتی ہے۔ جب ہم چھوٹے تھے تب ایک بار خاندان کے ایک بزرگ نے کہا "دِل لگا کر پڑھا کرو۔" ہم نے جان کی امان چاہتے ہوئے عرض کیا کہ جناب! دِل لگانے کے بعد بھی کبھی کوئی پڑھ سکا ہے! ہماری اِس "نکتہ سنجی" پر اُنھوں نے جان کی امان کا وعدہ بالائے طاق رکھتے ہوئے جو کچھ کہا وہ ہم خوفِ فسادِ خلق کے باعث اِس کالم کی کاروائی سے حذف کر رہے ہیں!

شعراء اور افسانہ نگاروں نے دِل کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اُس کی روشنی میں طرح طرح کی بیماریوں کا دِل کو لاحق ہونا کوئی حیرت انگیز امر نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ محبوب کے خیالوں میں گم رہنے سے بیمار پڑنے والا دِل اِنہی خیالوں میں گم رہنے سے شفاء بھی پاتا ہے! آج کل کی لفظیات کے مطابق اگر کسی کو یاد رکھنا ہو تو دِل کو ایکٹی ویٹ کیجیے، کسی کو بھولنا ہو تو دِل کو ڈی ایکٹی ویٹ کیجیے! دِل نہ ہوا، سوئچ بورڈ ہوگیا! دُنیا کو یہ فکر لاحق ہے کہ دِل کی بیماریوں کا کوئی حتمی عِلاج کب دریافت ہوسکے گا، اور ہم یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتے رہتے ہیں کہ دُنیا بھر کے دُکھ جھیل کر دِل اب تک کیونکر زندہ ہے!

خیر، افسانہ نویسوں، ناول نگاروں اور شعراء نے کیا کوئی کسر چھوڑی تھی جو اب دنیا بھر کے ماہرین دِل کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں؟ اللہ کی بنائی اور بسائی ہوئی اِتنی بڑی دُنیا میں طرح طرح کے انسان اور چیزیں ہیں جو دادِ تحقیق دیئے جانے کے انتظار میں ہیں۔ مگر ماہرین کے دِل میں اللہ جانے کیا سمائی ہے کہ دِل سے متعلق تحقیق کی جاں بخشی کے لیے تیار نہیں! آئے دن دِل سے متعلق تحقیق کے بارے میں عجیب و غریب خبریں آتی رہتی ہیں اور ہم تشویش میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں کیونکہ اللہ نے ایک عدد (صد شکر کہ) بگڑا ہوا دِل ہمارے سینے میں بھی رکھ چھوڑا ہے! دِل کا بگڑا ہوا ہونا مقام شکر

اِس لیے ہے کہ آج کل ایسا ہی دِل کسی کام کا ہے! ہر سیدھا اور سادہ دِل خواہ مخواہ اعتبار اور آسرے میں مارا جاتا ہے! ہمارا دِل کس حد تک عجیب و غریب ہے یہ ہم خوب جانتے ہیں مگر ماہرین طرح طرح کے وسوسے پیدا کرکے اِس کی "نیرنگی وتابانی" میں اضافہ کرتے رہتے ہیں! کبھی کبھی تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ماہرین کو شاید تربیت ہی اِس بات کی دی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ وسوسے پیدا کریں اور کسی بھی معاملے میں لوگوں کے پختہ یقین کی جڑیں ہلا ڈالیں!

خیر، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ (ماہرین کا ذکر چھڑ جائے تو جملہ ہائے معترضہ خود بہ خود بنتے چلے جاتے ہیں!) برطانوی ماہرین نے ایک ایسی دوا تیار کرنے کا دعویٰ کیا ہے جس کی مدد سے دِل اپنے کسی بھی نقصان کی تلافی خود کرسکے گا۔ چوہوں پر اِس دوا کی کامیاب آزمائش کی جاچکی ہے۔اِس نوعیت کے تجربات پر مرزا تنقید بیگ سخت چیں بہ جبیں ہوتے ہیں۔ اُن کا کہنا تھا "یہ بات ہم آج تک سمجھ نہیں پائے کہ طبّی ماہرین کی نظر میں انسان اور چوہے برابر کیوں ہیں! کوئی بھی دوا چوہوں پر اُسی وقت آزمائی جانی چاہیے جب اُسے صرف شادی شدہ مردوں کے لیے تیار کیا جارہا ہو۔"

جب ہم نے چوہوں اور شادی شدہ مردوں کے درمیان تعلق کی وضاحت چاہی تو مرزا

نے کمال مہربانی سے ہمیں سمجھایا "بیشتر شادی شدہ مرد گھر کے ماحول کو خوشگوار رکھنے کی خاطر چوہوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں !"

ہم نے عرض کیا کہ مرزا ! آپ کی یہ بات ہمارے شادی شدہ مرد قارئین کو بُری لگ سکتی ہے۔ یہ بات سن کر مرزا نے کہا "اگر یہ جملہ کسی کی طبیعت پر گراں گزرے تو عرض ہے کہ تم جیسے صحافی و کالم نگار دوستوں کی صحبت کے فیض سے ہم بھی اپنی گفتگو کی رنگینی بڑھانے کے لیے اُس میں تھوڑا بہت جھوٹ ضرور شامل کرلیتے ہیں مگر چونکہ مرنے کے بعد اللہ کو منہ دِکھانا ہے اِس لیے محض شادی شدہ لوگوں کو خوش کرنے کے نام پر سفید جھوٹ نہیں بول سکتے !"

موقع غنیمت جان کر ہم نے عرض کیا کہ مرزا ! شادی شدہ تو آپ بھی ہیں۔ تو کیا آپ بھی چوہے۔۔ ہم ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ مرزا نے تجربہ کار ٹی وی اینکرز کی طرح دخل در معقولات کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے وضاحت فرمائی "شادہ شدہ تو ہم بھی ہیں مگر ہم نے اِس معاملے میں اپنے آپ کو بقلم خود استثنٰی دے دیا ہے !" اِس "حسن استثنٰی" کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہی !!

چوہوں پر آزمائی ہوئی دوا کو، مرزا کے دلائل کی روشنی میں، شادی شدہ مردوں پر آزمانے کی ضرورت نہیں۔ گویا براہِ راست دی جاسکتی ہے ! مگر تمام انسانوں

نے ماہرین کا کیا بگاڑا ہے جو اُنہیں چوہوں کا ہم مشرب سمجھ لیا گیا ہے! خیر، ماہرین کہتے ہیں کہ ایک نئی دوا کے استعمال سے دل کو پہنچنے والے نقصان کا ازالہ خودکار عمل کے ذریعے ہوگا۔ اب تک یہی کہا جاتا رہا ہے کہ دِل کو پہنچنے والے نقصان کا ازالہ ممکن نہیں۔ اِس معاملے میں بھی مرزا کو ماہرین سے اختلاف ہے۔ اُن کا استدلال ہے کہ ماہرین خواہ مخواہ محنت اور وقت ضائع کر رہے ہیں۔ نقصان زدہ دِل کا عِلاج پاکستان میں چند سال قبل دریافت کیا جاچکا ہے۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا کہ وہ کیا عِلاج ہے جس سے دُنیا اب تک آشنا نہیں! مرزا نے ایک بار پھر شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وضاحت فرمائی "پاکستان میں ٹیلی کام کمپنیوں نے موبائل فون پر جو پیکیج متعارف کرائے ہیں وہ دِل کو پہنچنے والے نقصان کے ازالے کی بہترین صورت ہیں۔ نئی نسل کے ٹوٹے ہوئے دِل جوڑنے اور صحت مند دِل ایک دوسرے کے قریب لانے میں یہ پیکیج جادو کا سا اثر رکھتے ہیں! دیکھنے والی آنکھ ہے تو دیکھ سکتے ہو کہ دِلوں کو تقویت بہم پہنچانے اور جوڑنے کا عمل رات رات بھر جوش و خروش سے جاری رہتا ہے!"

محض تین چار روپے میں موبائل فون پر گھنٹہ بھر بات کیجیے اور دِل کو پہنچنے والے ہر نقصان کا ازالہ کیجیے۔ ایسا آسان نُسخہ دُنیا بھر میں کہاں ملے گا؟ واضح رہے کہ اِس معاملے میں سمعی ملاقات ہی اِکسیر ہے۔ فون پر آواز اکثر

دھوکا دے جاتی ہے اور فریق ثانی طرح طرح کے تصورات میں کھو جاتا ہے۔ بعض آوازیں "عُمرچور" ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر آواز سے متاثر ہو کر کوئی نوجوان کسی لڑکی سے "مَرئی و بَصَری" ملاقات کا اہتمام کرتا ہے تو طے شدہ مقام پر کسی آنٹی کا سامنا کرنا پڑتا ہے! ایسی صورت میں دِل کو پہنچنے والے نقصان کا ازالہ دُنیا کا کوئی پیکیج، کوئی نُسخہ نہیں کر سکتا!

بیٹھے ہیں "بس کی چھت" پہ ہم

چند غیر ملکی سیاح کراچی آئے۔ شہر کے مختلف علاقوں کی سیر کے بعد انہوں نے اپنے گائیڈ سے کہا کہ مقامی حکومت نے شہریوں کی تفریح کے لیے خاصا چلتا پھرتا بندوبست کیا ہے۔ گائیڈ نے وضاحت طلب کی تو سیاحوں نے کوچ کی چھت پر سفر کا حوالہ دیا! بے چارے غیر ملکی سیاح یہ سمجھ بیٹھے کہ کوچ کی چھت پر سفر کرنے والے مقامی حکومت کے مقرر کردہ ہیں اور عجیب و حرکتوں سے شہریوں کی تفریح طبع کا اہتمام کرتے ہیں! جھوم اور مٹک کر چلتی گاڑی کی چھت پر بیٹھنا کس اعتبار سے سرکس کے کسی کرتب سے کم ہے؟

کوچ کی چھت پر سفر بہت سے مقاصد کے تحت ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے پھیپھڑوں میں تازہ ہوا داخل کرنے اور دیگر مسافروں کے ساتھ گپ شپ کے نام پر دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر چھت کا رخ کرتے ہیں۔ بعض احباب کوچ کی چھت پر چڑھنے اور اُترنے کے عمل کو ورزش پر محمول کرتے ہیں! یہ اُن کے لیے اپنی ورزش ہوگی، ہم تو اِس عمل کو گاڑی کی ورزش سے تعبیر کرتے ہیں! اگر جاپانی آٹو میکرز اپنی تیار کی ہوئی گاڑیوں میں کوئی ایسا نظام نصب کریں جو گاڑی کے جذبات منظر عام پر لائیں تو یقین کیجیے پاکستان بھر کی سڑکوں پر "شونگ ینگ شانگ"

کے آہنگ میں جاپانی گاڑیوں کی آہیں اور سسکیاں سُنائی دیں گی!

بعض منچلوں کے لیے چھت کا سفر محض مہم جوئی ہے۔ اب شہری حکومت قدم قدم پر پہاڑوں کا اہتمام و انتظام تو کرنے سے رہی، لہٰذا لوگ کوہ پیمائی کا شوق کوچز کی چھت پر چڑھ کر پورا کرتے ہیں! اور سڑک پر چلنے والوں کے لیے اِن بلند و بالا مسافروں کو دیکھنا عشرتِ نظارہ ہے! بعض افراد اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ جسم کوچ کی چھت پر چڑھ رہے ہوتے ہیں تب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گاڑی کی فٹنس چیک کی جارہی ہے! اگر جاپانی اپنی بنائی ہوئی گاڑیوں کو ایسی آزمائش سے گزرتی ہوئی دیکھیں تو شاید گھنٹوں (اپنے) سر پیٹتیں!

مرزا تنقید بیگ کہتے ہیں کہ ہماری حکومت کو اب تک خیال نہیں آیا کہ کوچز کی چھتیں رصدگاہ کا کردار بخوبی ادا کرسکتی ہیں! اِن پر سفر کرنے کی صورت میں کائنات کی وسعتیں بے حجابانہ ہمارے سامنے آتی ہیں، بلکہ آتی رہتی ہیں۔ سُنا ہے جن کے سر پر ہر وقت کوئی نہ کوئی افسر یا بدمزاج بیوی سوار رہتی ہے وہ کچھ دیر کوچ کی چھت پر سفر کر کے اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کے سروں پر سوار ہونے کے احساس سے سرشار ہو لیتے ہیں! غریبوں کی بس یہی تو چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں!

ٹھنڈی ہوا، آزادی کا تصور اور دوسروں سے بلند ہونے کا احساس۔۔ یہ تمام حقائق مل کر چھت پر سفر کرنے والوں کو دُنیا سے ممتاز کرتے ہیں۔ ہم روزانہ کوچ کی چھت پر لوگوں کو چڑھائی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو مارشل لا نافذ کرنے کے اعلان کے ساتھ ہی سرکاری عمارات کو کنٹرول میں لینے کا منظر یاد آنے لگتا ہے! بیشتر نوجوان کوچ کی چھت پر چڑھنے میں ایسے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسے اندر بیٹھنے والوں کی ساری بلائیں اپنے سر لے لیں گے، حالانکہ چھت کا سفر بجائے خود (بس اور اُس کی چھت کے لیے) بلائے جاں ہے! جس طرح بس کے اندر پسندیدہ سیٹ کے حصول کی کوشش دلچسپ مناظر کو جنم دیتی ہے بالکل اُسی طرح چھت پر بھی پسندیدہ مقام کے حصول کی جدوجہد قابل دید مناظر کی راہ ہموار کرتی ہے! اِس کشمکش میں مسافر جس احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ بھی قابل دید ہوتا ہے کیونکہ ذرا سی گڑبڑ سے زندگی داؤ پر لگ سکتی ہے! چھت پر پسندیدہ جگہ کا حصول ضبطِ نفس کے ساتھ کشمکش کا بہترین منظر پیش کرتا ہے! یہ وہی وصف ہے جو سفارت کاروں کو بڑی محنت سے سکھایا اور ذہن نشین کرایا جاتا ہے!

کوچ کی چھت پر سفر کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان خود کو ایک بڑے وڈیو گیم کا کردار سمجھتا ہے۔ یہ وہی فرق ہے جو اسٹیڈیم میں تماشائی کی حیثیت سے مقابلہ دیکھنے اور میدان میں اُتر کر کھیلنے میں ہے! میدان میں اُترنے کے

بعد جوہر دکھانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چھت کے سفر میں مگن بیشتر افراد حسب توفیق و مزاج بولتے، بلکہ چیختے ہیں۔ چھت کے ماحول میں کسی کے ڈسٹرب ہونے کا خدشہ نہیں ہوتا۔

بہت سے نوجوان کوچ کی چھت پر سفر کو انٹرٹینمنٹ میں شمار کرتے ہیں۔ مگر خیر، اِس میں اپنی انٹرٹینمنٹ کم اور دوسروں کی زیادہ ہوتی ہے! چھت پر سفر کرنے والے سمجھتے ہیں کہ بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھنا تفریح ہے اور سڑک پر کھڑے ہوئے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چھت پر طرح طرح کے نمونے کچھ اُنہی کی تفریحِ طبع کے لیے نصب کئے گئے ہیں!

شہری حکومت سڑکیں اور فٹ پاتھ بناتی ہے تو کبھی کبھار ان کی صفائی بھی کرا ہی دیتی ہے، مگر تزئین و آرائش کا اہتمام بھول کر بھی نہیں کیا جاتا۔ کاغذات میں ہماری سڑکیں اور فٹ پاتھ شاید لندن اور پیرس کی سڑکوں اور فٹ پاتھوں کے لیے قابل رشک ہوں مگر حقیقت کی دُنیا کچھ اور ہی فسانہ سناتی ہے۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں کی آرائش کا منصب کوچز کی چھتوں پر سفر کرنے والوں نے کچھ اس انداز سے سنبھالا ہے کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں! بالائی مسافروں کی جانب سے تھوکی جانے والی پیک سڑک اور فٹ پاتھ پر تجریدی آرٹ کے خاصے دل کش اور دل فریب نمونے بناتی ہے۔ تجریدی آرٹ کو یاروں نے بہت بدنام کر رکھا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس آرٹ سے دلچسپی رکھنے کے لیے دنیا سے بیزار ہونا لازمی شرط ہے۔ اللہ بھلا کرے کوچز کی چھتوں پر سفر کرنے والوں کا جنھوں نے پان کی پیک تھوک تھوک کر سڑکوں اور فٹ پاتھوں کو اِس قابل بنادیا ہے کہ عوام اُن میں دلچپی لیکر تجریدی آرٹ کی مائل ہوں ! اِس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تجریدی آرٹ کے نمونے تیار کرنے والوں کا دُنیا سے بیزار ہونا لازم نہیں، بلکہ اُن کی زندگی دِلی تو قابل دید اور قابل داد ہے!

چھت پر سفر کا ایک فائدہ اور بھی ہے جو کم از کم ہم تو اپنائے جانے کے قابل نہیں سمجھتے ! ہر جمعرات کو کراچی کی بیشتر کوچز کی چھتوں پر لوگ بڑی تعداد میں سوار ہو کر کلفٹن جاتے ہیں۔ پہلے مزار پر قوالی سُنتے ہیں اور پھر ساحل کر چکر لگاتے ہیں۔ جب وہ واپس آتے ہیں تب پولیس اہلکار راستے میں گاڑی رکوا کر چھت پر سوار نوجوانوں کو اُتارتے اور اُن کے سانسوں کی مہکار کا جائزہ لیتے ہیں۔ غایت اِس کی یہ ہے کہ مزار پر قوالی کے دوران اگر بتی اور عطر کی مہک سے سرشار ہونے کے بعد بہت سے نوجوان ساحل کا بھی ایک آدھ چکر لگاتے ہیں اور وہاں کیف و سرور کے چند لمحات سے ہمکنار ہو کر جب وہ رات کے ڈھائی تین بجے اپنے گھروں کو روانہ ہوتے ہیں ان میں چند ایک جھومتی گاڑی کی چھت پر چرس کے نشے میں جھوم رہے ہوتے ہیں ! چھت پر بیٹھے بیٹھے یہ خاصی بلند پرواز کرنے لگتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی نیچے کو لُڑھک کر بہت اُوپر بھی

چلا جاتا ہے! زمین سے دس فیٹ اوپر کا سفر زمین سے تین فیٹ نیچے بھی لے جاتا ہے، بس یہی سوچ کر ہم کبھی کوچ یا بس کی چھت پر نہیں چڑھتے اور لوگوں کی تفریح طبع کا اہتمام کرنے سے گریز کرتے ہیں!

اب وہ بوتل کہاں سے لائیں ہم؟

الیکٹرانک میڈیا وہ جن ہے جسے بوتل سے نکالنے کے بعد بوتل توڑ دی گئی ہے! اب یہ جن جائے تو جائے کہاں؟ جس میں اِسے بند کیا جاسکے وہ بوتل کہاں سے لائی جائے؟ اور اگر بنانے کی بات آ جائے تو اِتنی بڑی اور مضبوط بوتل بنائے کون؟ کس میں دم ہے کہ اِس جن پر قابو پانے کا وظیفہ کرے، چلّہ کاٹے؟ پاکستان پانچ چھ سال سے حالتِ جنگ میں ہے۔ یہ جنگ ٹی وی چینلز اور معاشرے کے درمیان ہے! جس طرح کوئی بدمست ہاتھی اپنی موج میں بہتا اور راستے میں آنے والی ہر چیز کو روندتا چلا جاتا ہے بالکل اُسی طرح چینلز بھی بہت کچھ روندتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے دوڑ نے حواس، شعور، اقدار کا احساس و احترام سبھی کچھ تو چھین لیا ہے۔

چینلز کو داد دینا پڑے گی کہ اُنھوں نے اقبال کے فرمان

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

کے مصداق اپنے لیے طرح طرح کے موضوعات خود پیدا کیے ہیں! شدید گرمی اور شدید سردی کروڑوں سال سے پڑتی آئی ہے مگر اب یہ دونوں کیفیتیں چینلز کی ہانڈی کا مَسالا ہیں! حالت یہ ہے کہ مُوسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو کسی چینل پر پانی میں ڈوبی ہوئی بستیاں اور بے گھر ہو جانے والے پریشان حال لوگ

دکھائی دیتے ہیں اور کسی دوسرے چینل پر کوئی مشہور شخصیت مزے لے لے کر بتا رہی ہوتی ہے کہ کس طرح وہ اپنی جوانی کے دنوں میں بارش شروع ہوتے ہی پکوڑے تلنے کی فکر میں ڈوب جاتی تھی! دیکھنے والے فیصلہ نہیں کر پاتے کہ موسم سے محظوظ ہوں یا تباہی کا ماتم کریں!

کوریج کی دوڑ میں تمام چینلز ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ رپورٹرز بھاگم بھاگ اسپاٹ پر پہنچتے ہیں۔ بیپر دینے کی ایسی فکر لاحق ہوتی ہے کہ جو دو چار نکات کاغذ پر لکھ کر دیئے جاتے ہیں اُنہی کی بنیاد پر پندرہ منٹ تک بولنا پڑتا ہے۔ اب ایسے میں کوئی کیا کیا بولے گا، اِس کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں۔

کہیں کوئی دھماکہ ہو جائے تو پھر دیکھیے کہ بے پَر کی اُڑانے کا کیسا مقابلہ شروع ہوتا ہے اور کتنی دور کی، کیسی کیسی کوڑیاں لائی جاتی ہیں! ایسے موقع پر رپورٹر کے لیے جلد از جلد اسپاٹ یعنی جائے وقوع پر پہنچنا لازم ہے اور وہاں پہنچنے کے بعد صرف ایک بنیادی اُصول اُسے یاد رکھنا ہے کہ جو منہ میں آئے وہ بولنا ہے اور بولتے رہنا ہے! چینلز کی ٹیمیں کوریج کے چکر میں اسپاٹ پر امدادی کارکنوں اور سیکورٹی اہلکاروں کا کچھ اِس قدر ناک میں دم کر رہی ہوتی ہیں کہ ہلاک ہونے والوں کا بس نہیں چلتا کہ دوبارہ زندہ

ہو کر دست بستہ معافی مانگیں ! لاشیں بے چاری کہیں جانے کی پوزیشن میں نہیں ہوتیں اور کیمرے دیکھ کر منہ دِکھانے کے شوقین جمع ہوتے چلے جاتے ہیں ! اسپاٹ پر کھڑے ہوئے رپورٹر اور اسٹوڈیوز میں بیٹھے ہوئے اینکرز کے شاندار "کھنڈ" ایونٹ کی ٹریجڈی کو بھی کلاسک کامیڈی میں تبدیل کر دیتے ہیں ! رپورٹرز کی "علمیت" اور اینکرز کی مہارت مل کر وہی کیفیت پیدا کرتی ہیں جس کے بارے میں احمد فراز نے کہا تھا

نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں !

ایک ٹی وی اینکر نے خود کش حملے کے بعد اسپاٹ پر پہنچنے والے رپورٹر سے پوچھا "یہ بتایئے کہ خود کش حملہ آور ہیں یا چلے گئے؟" گویا حملے کے بعد اُنہیں چائے پانی کے لیے رُکنا تھا ! بعض اینکرز کا تو بس نہیں چلتا کہ یہ پوچھ لیں کہ دھماکے کے بعد لاشوں کے تاثرات کیا ہیں اور وہ کیسا محسوس کر رہی ہیں ! دھماکے میں شدید زخمی ہونے والے زندگی اور موت کی کشمش میں مبتلا ہوتے ہیں اور یار لوگ کیمرے اور مائکروفون لیکر اُن کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں ! اُن سے تاثرات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اِس دُنیا پر الوداعی نظر ڈال رہے ہوتے ہیں ! کسی بھی ناخوشگوار واقعے کے بعد موقع سے لاشیں اٹھانے کے لئے مختلف اداروں کی ایمبولینس سروس میں رَسّا کشی بھی اب ایونٹ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے !

دیکھنے والوں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ کہیں کوئی قتل ہوگیا۔ میڈیا والے پہنچے تو مرنے والے کے ماں باپ رونے لگے۔ چینل والوں کی طرف سے ارشاد ہوا کہ ابھی نہ روئیں، کیمرہ ابھی ریڈی نہیں ! اور معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا، ہر چینل کی ٹیم پس ماندگان کو نئے سِرے سے رُلاتی ہے !

یقین کیجیے کہ سیاست دان بھی انسان ہوتے ہیں اور بیمار بھی پڑتے ہیں۔ مگر اب یہ حال ہے کہ کوئی سیاست دان ذرا سا کھانس دے تو ٹی وی چینلز کو بیپر لینے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے ! کوئی مشہور شخصیت غسل خانے میں گر پڑے تو خبر بن جاتی ہے ! کوئی مشہور شخصیت کسی تقریب میں ذرا سی لڑکھڑا جائے تو اُس کے ڈاکٹرز سے رابطہ کرکے کیس ہسٹری تک نکال لی جاتی ہے ! اب تو بے چاری سیلیبریٹیز سرِ عام سَر کھجانے سے بھی کتراتی ہیں کیونکہ چینلز والے خُشکی، لیکھوں اور جُوؤں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگاتے !

دنیا بھر میں طرح طرح کے خود رَو پودے پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ٹی وی چینلز پر مفت دیئے جانے والے مشورے دنیا کے عجیب ترین خود رَو پودوں کی مانند ہیں۔ چینلز نے ایسے ماہرین تیار کئے ہیں جو دس پندرہ منٹ کی بحث میں کوزے میں دریا، بلکہ سمندر کو اِس طرح بند کردیتے ہیں کہ بے چارے کے لیے سانس لینا

دشوار ہو جاتا ہے! جب یہ اسٹارٹ ہوتے ہیں تو کس کی مجال ہے کہ انہیں mute کرے! بپھرے ہوئے بیل کو سامنے آ کر سینگوں سے پکڑنا شاید ممکن ہو، چینلز کے پروردہ ماہرین کو لگام دینا ہما شُما کے بس کی بات نہیں! لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، بکواس کا علاج بکواس ہے۔ یعنی ماہر کا توڑ ماہر ہی کے ذریعے تلاش کیا جاسکتا ہے! اِسی لیے چینلز پر روزانہ پرائم ٹائم میں "مُرغوں" کی لڑائی کا ٹھیک ٹھاک اہتمام کیا جاتا ہے! لوگوں کا یہ حال ہے کہ چینلز سے ذہنی خوراک لیتے نہیں تھکتے یعنی رات کو پرائم ٹائم میں ٹاک شو سے پیٹ بھرتے ہیں اور صبح کے ناشتے میں کسی حسین چہرے کے ساتھ مارننگ شو لیتے ہیں! حد یہ ہے کہ جو ورزش عشروں سے کرتے آئے ہیں اُسے کسی نازک اندام انسٹرکٹر سے دوبارہ سیکھنے میں بھی کوئی ہرج محسوس نہیں کیا جاتا!

قومی سلامتی کے امور پر متعلقہ اداروں کے سربراہان بہت کچھ جانتے ہوں گے مگر صاحب، بند کمرے میں اعلیٰ فوجی افسران جن اُمور پر بحث کر رہے ہوتے ہیں اُن کے بارے میں چینلز پر بیٹھے ہوئے ماہرین جس طرح طرح فَرفَر بول رہے ہوتے ہیں اُسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ قومی سلامتی کے اُمور میں اِن سے مشاورت نہ کرنا محرومی کی دلیل ہے! اگر کسی لڑائی کا فیصلہ ٹی وی کے ٹاک شوز پر منحصر ہو تو ہم کوئی جنگ ہار نہیں سکتے! جس طرح سُوپ کے ٹھیلے پر مُرغیاں لٹکی ہوئی پگھل رہی ہوتی ہیں بالکل اُسی طرح ٹاک شو کے ٹھیلے پر

قوم کے قائدین کی خیریت دریافت کی جاتی ہے اور وہ بھی الزامات کی ٹکٹکی پر اُلٹا لٹکا کر! اِن پروگراموں کو دیکھتے رہنے سے زبان ہی نہیں، مُنہ بھی بگڑ جاتا ہے! ہمارا پُرخُلوص مشورہ ہے کہ جب تک چینلز کے جن کو بند کرنے کے لیے بوتل بازیاب نہیں ہو جاتی یا تیار نہیں کرلی جاتی، بچوں کو اِن چینلز اور بالخصوص ٹاک شوز کی پہنچ سے دور رکھیں!

تدفین کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

زندگی ہمیں ایک ایسے انجانے موڑ پر لے آئی ہے جہاں زندہ رہنا یعنی کسی نہ کسی طور سانسوں کا تسلسل برقرار رکھنا ہی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بلکہ "مشن اسٹیٹمنٹ" ٹھہرا ہے! اِس ایک goal نے باقی تمام چیزوں کا بوریا بستر گول کردیا ہے! اب زندگی اِس ڈھب سے گزر رہی ہے کہ لوگ رات دن فکر معاش میں گم رہتے ہیں۔ زندہ رہنا کچھ اِس قدر "ٹائم کنزیومنگ" ہوگیا ہے کہ لوگوں سے ملنا تو دُور کی بات رہی، اپنے وجود سے ملاقات کی گنجائش بھی پیدا نہیں ہو پاتی!

وقت کی کمی حواس پر کچھ ایسی چھائی ہے کہ جینے والوں کو مرنے کا بھی خیال نہیں آتا! سوال ترجیحات ہی کا نہیں، اِخراجات کا بھی ہے۔ جس جسم کو گل سڑ کر مٹی میں مِل جانا ہے اُسے ٹھکانے لگانے کا اہتمام کرنے میں جیتے جاگتے لوگ ٹھکانے لگ جاتے ہیں!

اِس مہنگائی کے زمانے میں مرنا بھی آسان نہیں۔ رسموں کا ایک سلسلہ ہے جسے نبھانا پڑتا ہے، ورنہ مُردہ شاید بخشا نہیں جائے گا! ذرا سی آخری ہچکی لیکر آنکھیں موند لینے والے کے لیے اِتنا کچھ کرنا پڑتا ہے کہ لوگ اب موت سے نہیں، مرنے سے ڈرتے ہیں! صورت حال جب یہ ہو تو اُنہیں دعائیں دیجیے جو دُنیا سے رخصت ہو کر خاندان کے لوگوں کو مل بیٹھنے

!اور ایک دوسرے کے معاملات سے باخبر ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں

جس گھر میں موت واقع ہوئی ہو وہ بھی دور سے پہچانا جاتا ہے ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میّت کا گھر دیکھتے ہی دیکھتے عجیب و غریب واقعات کی صورت میں رونما ہونے والے زلزلے کا ایپی سینٹر بن جاتا ہے! سوگوار خاندان سے گلے مل کر اُن کے لیے آنسو بہائے جاتے ہیں جن سے ملنے کی توفیق برسوں نہیں ہوتی تھی اور جو ملنے کے لیے بس بے تاب ہی رہتے تھے۔ بہت سے بزرگ بے چارے ملنے کے لیے تڑپتے ہی رہتے ہیں مگر اُن سے ملنے اور حال پوچھنے کی توفیق کم لوگوں کو ملتی ہے۔ اور جب اُن بزرگ کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو کچھ مت پوچھیے کہ کتنی اعلیٰ درجے کی اداکاری کے ذریعے رنج اور غم کا اظہار کیا جاتا ہے! ایسے مواقع پر "اداکارانہ آنسو" دیکھ کر مرنے والے کا دل بھی !پگھل تو جاتا ہوگا

ہائے رے بے حِسی کہ جنہیں ہم جیتے جی پلٹ کر نہیں پوچھتے اور سرد خانے میں رکھتے ہیں اُنہیں بعد از مرگ بھی سرد خانے میں رکھنا اپنا فرض گردانتے ہیں! اِس کی غایت یہ ہے کہ خاندان میں مَیّت اب سوگ ہی کا ہنگام نہیں، ایک بڑا "فیملی ایونٹ" اور بہت حد تک "گیٹ ٹوگیدر" بھی ہے! تمام تفصیلات کے ساتھ جائزہ لیا جاتا ہے کہ کون کون آ رہا ہے، کون نہیں آ رہا۔ جو آ رہا ہے وہ

کیوں آ رہا ہے اور جو نہیں آ رہا وہ کیوں نہیں آ رہا! انسان کو ہر ایونٹ کی تیاری کرنی چاہیے۔ پھر بھلا میّت میں جانے کے لیے خصوصی تیاری کیوں نہ کی جائے؟ دل کی حالت چاہے کچھ ہو، چہرے پر تو سوگ دکھائی دینا چاہیے۔ اب تک تو خواتین نے احتراز کیا ہے یا شاید اُن کا ذہن اِس طرف گیا ہی نہیں مگر ہو سکتا ہے کہ بہت جلد بیوٹی پارلرز میّت کے لیے بھی خصوصی میک اپ اور میک اوور متعارف کرادیں! اِس صورت میں میّت والے گھر ہی کا نہیں، تدفین میں شرکت کرنے والوں کی بھی واٹ لگ جایا کرے گی! بعض سیانے مرد خاندان میں میّت کی اطلاع ملتے ہی اہلیہ سے کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ اُس کا تھوبڑا پُھول جاتا ہے اور "مَیّتی میک اپ" کا ممکنہ خرچ بچ جاتا ہے!

ہم روزمرہ زندگی میں کسی بھی موضوع پر بلا تکلف جی بھر کے باتیں کر سکتے ہیں، تو پھر میّت کے موقع پر میں موضوعات کی کمی کیوں محسوس ہونے لگی؟ لوگ میّت کو گھر سے مسجد اور پھر قبرستان تک لے جائے جانے اور تدفین کی تیاری کے دوران بھی دُنیا بھر کے موضوعات کو پامال کرتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے تو مرنے والے میں طرح طرح کی خوبیاں تلاش کی جاتی ہیں اور دوسروں کو بھی اِن سے کماحقہ آگاہ کیا جاتا ہے۔ اِن میں سے بیشتر خوبیاں تو وہ ہوتی ہیں جن کا مرنے والے سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہوتا! چند رسمی جملے ادا کرنا سب اپنے

پر فرض تصور کرتے ہیں، خواہ اُنہیں سُن کر بھری "بزمِ میّت" میں ہنسی یا قہقہہ ضبط کرنا محال ہو جائے! مثلاً "وسیم بھائی تو ہر ایک سے ہنس کے ملتے تھے۔" چاہے حقیقت یہ ہو کہ وسیم بھائی نے زندگی بھر کسی سے سیدھے منہ بات نہ کی ہو اور ہمیشہ تیوری پر بل چڑھائے رہے ہوں! یہ تحسین اِس قدر خشوع و خضوع سے کی جا رہی ہوتی ہے کہ مرنے والے کا بس نہیں چلتا کہ کفن پھاڑ کر اُٹھے اور زندگی بھر کی محنت سے پیدا کی ہوئی بدمزاجی کو خوش اخلاقی قرار دینے والے کا گلا دبا دے! مرنے والا 80 سال کا ہو تب بھی رسمی طور پر کہا جاتا ہے کہ رب اچھے لوگوں کو "جلدی" اٹھا لیتا ہے! اب آپ ہی بتایئے کہ وقت کی پیمائش کے کس نظام کے تحت 80 سال میں انتقال کو جلدی اُٹھالیا جانا قرار دیا جائے گا؟ (ہو سکتا ہے کہ اِس جملے میں یہ طنز پوشیدہ ہو کہ بھئی مرنے والا اچھا ہوتا تو زندگی اور موت کا مالک 80 انتظار کیوں کرتا!)

تدفین کے بعد سوگواروں کو ذرا سکون کا سانس لینے کا موقع ملتا ہے تاکہ تازہ دم ہو کر دنیا بھر کے موضوعات پر خیالات کے اظہار کا ایک نیا سلسلہ شروع کریں۔ ابتداء اُس کھانے سے ہوتی ہے جس کا اہتمام مرنے والے کے اہل خانہ تدفین میں شریک افراد کے لیے کرتے ہیں۔ یار لوگ میّت کے کھانے میں بھی کیڑے نکالنے سے گریز نہیں کرتے۔ کوئی کہتا ہے مجھے سلیمانی بریانی پسند نہیں۔ کوئی اِس خدشے کا اظہار کرتا ہے کہ میّت میں سُلیمانی بریانی کھلائی

ہے تو تیجے میں کہیں چنے کے پُلاؤ پر نہ ٹرخا دیا جائے! بعض ستم ظریف تو مَیّت کے کھانے میں بھی صاف بوٹیوں کی فرمائش کرنے سے بھی نہیں چُوکتے! اِس معاملے میں بعض لوگوں کا بے صبرانہ پن دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ اُنہیں خود اُنہی کی تِکّہ بوٹی کھلا دی جائے! اب حالت یہ ہے کہ لوگ بے کھائے پیئے ہی مَیّت میں چلے آتے ہیں کہ تدفین کے بعد تو کھانا ہوگا ہی!

دوسرے معاشروں کا تو کچھ پتہ نہیں، ہمارے معاشرے کی حد تک تو رب نے موت کو رنجشیں مٹانے کے وسیلے میں تبدیل کر دیا ہے۔ جیتے جی جس کی شکل دیکھنا گوارا نہ ہو اُس کے مرنے کی اطلاع ملتے ہی لوگ آخری دیدار کے لیے لپک کر پہنچتے ہیں۔ گویا

پھول جسموں کے نہیں، روح کے کِھل سکتے ہیں
جی کے ہم مل نہ سکے، مر کے تو مل سکتے ہیں!

اِسے بھی مرنے والوں کا احسان کہیے کہ وہ موت کو گلے لگا کر بُہتوں کو آپس میں گلے ملنے کا موقع فراہم کرتے ہیں! دُنیا سے اُن کے رخصت ہوتے ہی رنجشیں بھی رخصت ہو جاتی ہیں۔ اِس میں یہ پیغام پوشیدہ ہے کہ اُن کے جیتے جی رنجشیں ختم نہیں ہو سکتی تھیں، گویا مرنے والے فساد کی جڑ قرار پاتے ہیں! بعض افراد کسی سے زندگی بھر شدید ناراض رہتے ہیں اور اور اُس کا نام بھی

اپنی زبان پر لانا پسند نہیں کرتے مگر اُس کی موت کی اطلاع ملتے ہی ایسی تیزی سے مَیّت کے گھر پہنچتے ہیں گویا یہ اطمینان کرنا چاہتے ہوں کہ بندہ واقعی مرگیا ہے نا! مگر صاحب، سوال یہ ہے کہ کسی کی شکل دیکھنے کے لیے اُس کے مرنے ہی کا انتظار کیوں کیا جائے؟ کیا تمام گِلے شکوے دور کرنے کے لیے مرنا لازم ہے؟ خیر، یہ سوال سوچنے ہی کی حد تک کارآمد ہے! یاد رکھیے کہ مَیّت کے موقع پر ایسے سوالات banned ہوتے ہیں! یہ موقع صرف اداکاری اور دِکھاوے کے مشاہدے کا ہے!

تدفین کے بعد ملاقاتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے جو انڈین ڈراموں کی طرح دراز ہوتا جاتا ہے! تدفین کے بعد سوئم کی قرآن خوانی اور فاتحہ۔ اِس کے بعد چار جمعراتوں تک متواتر ملاقاتیں، فاتحہ خوانی اور مُردے کی بخشش کی دعائیں۔ مُردے کی بخشش تو جب ہوگی تب ہوگی، پس ماندگان کے لیے جاں بخشی مشکل ہو جاتی ہے! تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا سا بندھا رہتا ہے۔ اور بے چاروں کو نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام۔ مرنے والا تو کب کا خاک کے آغوش میں آرام سے لیٹ چکا، مگر پس ماندگان بے چارے بے آرامی اور خرچ کی سُولی پر لٹکے رہتے ہیں! اور جب مَیّت کا گھر نارمل دکھائی دینے لگتا ہے تو تعزیت کرنے والے بھی نارمل ہوتے جاتے ہیں اور

ہم اِک دوسرے سے خفا ہوکے دیکھیں

!بہت مل چکے، اب جدا ہو کے دیکھیں

کے مصداق تعلقات میں کھنچاؤ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں! گویا ایک موت سے دوسری موت کی درمیانی مدت کے لیے منہ پُھلانے کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ دوبارہ ملنے میں خوب مزا آئے! شاعر کہتا ہے

قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا

یعنی کم کم بلکہ بہت ہی کم ملیے اور کسی بزرگ کے مرنے کا انتظار کیجیے تاکہ ملنے کا مزا آئے!

جون 2011 کو میرے ہاں 33 ہفتوں کی مُردہ بیٹی پیدا ہوئی۔ یہ کالم اُسی کے نام (26 اور اُسی کی یادگار سمجھا جائے۔)

دماغ کا بٹوارہ

ہم بھی کتنے بھولے ہیں جو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہمارے معاشرے کو کسی بھی معاملے میں دماغ کی ضرورت نہیں رہی اِس لیے راوی کو اب چَین ہی چَین لکھنا چاہیے۔ بہت پہلے غالب نے بھی پیش گوئی کر ہی دی تھی۔

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا!

بھلا ہو ماہرین کا جنہوں نے یہ نیا وسولہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان نہ صرف یہ کہ دماغ کا حامل ہے بلکہ یہ دماغ کسی حال میں خوش اور خاموش نہیں رہتا، یعنی یہ کہ بے ہوشی کی حالت میں بھی انسانی دماغ کے حصے آپس میں باتیں کرتے رہتے ہیں! ماہرین کی اِس عادت پر تو بس فدا ہو جانے کو جی چاہتا ہے کہ جو معاملات ہمارے ذہن میں پوری وضاحت اور یقین کے ساتھ پائے جاتے ہیں اُن کے بارے میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کرکے زندگی کے سمندر میں طوفان اُٹھاتے ہیں! اب اِسی بات کو لیجیے کہ جس دماغ کے بارے میں ہم بھرپور یقین بلکہ اعتقاد رکھتے تھے کہ فی زمانہ خلوص، دانش، قانون پسندی، گڈ گورننس اور ڈائنوسار کی طرح معدوم و مفقود ہے، اُس کے بارے میں یہ "انکشاف سَرائی" کی جارہی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ پایا جاتا ہے بلکہ اُس کے کئی حصے ہوتے ہیں جو

آپس میں رابطہ بھی رکھتے ہیں! ماہرین کی مہربانی سے دل اور دماغ کا فرق بھی واضح ہو گیا۔ ایک فلمی گیت میں بتایا گیا تھا کہ "اِک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے۔ کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا" اور اب ماہرین فرماتے ہیں کہ دماغ کے ٹکڑے اِدھر اُدھر نہیں گرتے بلکہ جُڑے رہتے ہیں اور "بتیاتے" بھی ہیں!

مرزا تنقید بیگ کو ماہرین سے چڑ ہی نہیں، نفرت ہے۔ جب بھی کہیں ماہرین دیکھتے ہیں، جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کرنے لگتے ہیں! پہلے لاحول پڑھ کر غائب ہو" جایا کرتے تھے، لوگوں کے سمجھانے پر مرزا نے وظیفہ تبدیل کیا! ہم نے کئی بار اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ کھوٹے سکّے بھی کبھی کام آ ہی جاتے ہیں، بند گھڑی بھی دن میں دو بار درست وقت بتاتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ قدرت نے ماہرین کا بھی کوئی مصرف رکھا ہو مگر وہ مصرف اب تک ہماری سمجھ میں نہ آیا ہو! مرزا کہتے ہیں کہ ماہرین بھی بند گھڑی کی طرح دن میں دو بار درست وقت بتانے کی صلاحیت ضرور رکھتے ہوں گے مگر وہ وقت آئے تو سہی!

.برطانوی محقق رچرڈ پولاک کا کہنا ہے کہ بے ہوشی کی حالت میں دماغ کے مختلف حصے آپس میں رابطہ کرتے ہیں اور اِن رابطوں کو مختلف مشینوں کی مدد سے گرافک شکل میں دیکھنے پر ایسا لگتا ہے جیسے یہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ سائنس دانوں نے تجربات کے ذریعے دماغ کا بے ہوشی کی حالت میں جائزہ لیا ہے اور ہم کسی تجربے کے بغیر، ہوش و حواس میں رہتے ہوئے، بتا سکتے ہیں کہ دماغ کے کتنے حصے ہوتے ہیں اور آپس میں اُن کا کیا تعلق ہے۔ مرزا کی اِس بات کو ہم نے بلا چوں چرا تسلیم کرلیا کیونکہ اُن کی بہت سی لایعنی باتیں سُن کر اپنے دماغ کو کم از کم دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہوا تو خود ہم نے بھی محسوس کیا ہے! اور اِس احساس کے لیے کسی "نیورو گراف" کی ضرورت نہیں! مرزا کو دیکھتے ہی بہت سے لوگ شاید اِسی لیے (اپنا) سر پکڑتے دِکھائی دیتے ہیں کہ دماغ کے مختلف حصوں کو مُنتشر ہونے سے بچائیں!

مرزا کا استدلال ہے پاکستانیوں کے دماغ بھی کئی حصوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں مگر بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ حصے آپس میں بہتر رابطہ نہیں رکھتے۔ ایک حصہ ایران کی سُناتا ہے تو دوسرا توران کی، ایک حصہ کھیت کی کہتا ہے تو دوسرا کھلیان کی سُنتا ہے! دماغ کے مختلف حصوں کی باہمی گفتگو میں ربط اِس لیے نہیں پایا جاتا کہ مفادات کا تصادم صورت حال کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ مرزا کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ دماغ کے مختلف حصوں کی موجودگی خود دماغ کی موثر موجودگی کا ثبوت یا دلیل نہیں۔ اِس سلسلے میں وہ یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ پنجاب، سندھ، خیبر پختون اور بلوچستان کی نمایاں موجودگی خود پاکستان کی موثر موجودگی کی دلیل نہیں!

اگر ہم ماہرین کی یہ بات مان لیں کہ دماغ ہوتا بھی ہے اور اس کے کئی حصے بھی ہوتے ہیں تو پھر عام مشاہدہ یہ ہے کہ دماغ کے بیشتر حصے رشتہ داروں کی طرح ایک دوسرے سے مُنہ پھلائے رہتے ہیں اور آپس میں کوئی بار آور رابطہ رکھنا پسند نہیں کرتے ! اگر دماغ کے مختلف حصوں کی ایک دوسرے پر لعن طعن کو بھی سائنس دان رابطہ رکھنے سے تعبیر کرتے ہیں تو اُن کی دانش پر قربان جایئے !

معاشرے پر نظر دوڑایئے تو قدم قدم پر اندازہ ہوگا کہ دماغ کے مختلف حصے آپس میں کوئی ربط نہیں رکھتے، بلکہ ایک دوسرے سے متصادم رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ ایسے لوگوں سے اٹا پڑا ہے جن کے دماغ کے حصے آس میں ذرا بھی میل نہیں رکھتے۔اِس پر بھی وہ کس طور زندہ ہیں، یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ مگر صاحب، قدرت نے تو کہیں بھی یہ شرط نہیں رکھی کہ زندگی کا تسلسل "بادماغی" یا "باذہنی" پر منحصر ہے ! ایسا نہ ہوتا تو آج پاکستان کی آبادی چند ہزار نفوس پر مشتمل ہوتی !

کبھی آپ نے اخبارات میں کسی منتخب ایوان کی کارروائی پڑھی ہے؟ ضرور پڑھیے تاکہ اندازہ ہو کہ کسی ایک انسان کا دماغ کیسی کیسی متضاد باتیں سوچ سکتا

ہے! اور وہ بھی کسی بھی درجے کی شرمندگی محسوس کیے بغیر! میڈیا پر سیاست دانوں کی باتیں سُنیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ دماغ کے تمام حصے بیک وقت بول رہے ہیں! اور اِن تمام حصوں کے مفادات یکسر مختلف ہیں اور اِن میں سے ہر مفاد کی تکمیل قومی مفاد کا تقاضا ہے!

شادی کی تقریب میں جایئے تو کھانے کی میز پر اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو دماغ کے کسی بھی حصے پر کوئی اختیار نہیں۔ ایک حصہ کہتا ہے پلیٹ میں بوٹیاں بھرلو، دوسرا کہتا ہے ایک کونے میں تھوڑی سی کھیر بھی ڈال لو، تیسرے کی فرمائش ہوتی ہے کہ تھوڑا بہت سلاد بھی ہونا چاہیے اور چوتھا کہتا ہے اب تافتان کے دو چار ٹکڑے تو رکھ۔ دماغ کے مختلف حصوں کی بات مانتے جایئے اور پھر اُس کا ٹیکنی کلر نتیجہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ پلیٹ دیکھتے ہی دیکھتے کسی عام سی کمرشل فلم کا منظر پیش کرنے لگتی ہے جس میں رومانس، سسپنس، کامیڈی، ٹریجڈی.... سبھی کچھ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے! اور اِن تمام چیزوں کو ٹھونس ٹھونس کر پیٹ میں اُتارنے کے بعد "ٹھنڈی والی کولڈ ڈرنک" پینا بھی لازم ہے کہ دماغ کا ایک حصہ شاید شدید گرمی کی حالت میں چائے اور شدید سردی میں کولڈ ڈرنک کی فرمائش کرنے پر مامور ہوتا ہے!

اب خواتین کے دماغ ہی کی مثال لیجیے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُنھوں نے دماغ کے

صرف اُس حصے کو ایکٹیو حالت میں رہنے دیا ہے جو شاپنگ اور بناؤ سنگھار کی تحریک دیتا ہے! شوہر دن بھر محنت مشقت کرکے گھر آئے تو دماغ کے کئی حصے بیوی کو طرح طرح کے گلے شکوے کرنے پر تو اکساتے ہیں مگر کوئی ایک آدھ حصہ بھی یہ نہیں کہتا کہ بھئی، لوٹ کے بدھو گھر کو آیا ہے تو اِس کی خدمت میں ایک آدھ گلاس شربت ہی پیش کردو!

اب کیا کیا جائے؟ جب دماغ کے حصے آپس میں رابطہ نہیں رکھ پاتے، ایک دوسرے کی بات سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں تو پھر ہم کس طور زندگی بسر کریں؟ مرزا کو دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ کامیاب وہی ہیں جو دماغ کو استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں اور دوسروں کو دماغ کے استعمال سے متنفر کرتے ہیں!

یہ "چُپ" سی کیوں لگی ہے، اجی کچھ تو بولیے

اگر بین الاقوامی سطح پر یہ طے کر دیا جائے کہ بولنا اور محض بولتے رہنا ہی ترقی کی حقیقی علامت ہے تو تمام پاکستانیوں کو یقین ہو جانا چاہیے کہ پوری دُنیا میں اُن سے زیادہ ترقی یافتہ کوئی ہے، نہ ہو سکتا ہے! ہم پاکستانیوں کے لیے خاموش رہنا شاید زندگی کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ دو گھڑی چُپ رہنا بھی اب ایک عمر کی مشقت کے مساوی دکھائی دیتا ہے۔ بولنے کے نام پر شور مچانے کو قومی فریضہ سمجھ لیا ہے۔ بہتوں کو دیکھا ہے کہ خاموش رہنے کو بظاہر قومی مفاد کے منافی گردانتے ہیں! یا شاید اُنہیں یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ نہ بولنے سے شرفِ انسانیت چھین لیا جائے گا، حالاں کہ ہمارے خیال میں زیادہ بول کر وہ ضرور اِنسانوں کی کیٹیگری سے نکلتے دِکھائی دیتے ہیں! بعض کے نزدیک یہ بھی جبری بھرتی والا معاملہ ہے، یعنی بولنا لازمی قومی خدمت ہے! شاید اِسی لیے وہ جب بھی بولتے ہیں بھرتی کا بولتے ہیں! بلا جواز بولنے اور شور مچانے کو لوگوں نے اپنے مزاج میں کچھ اِس طرح بھرتی کر لیا ہے کہ اُس کے لیے اب بھگوڑا ہونے کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی!

دُنیا بھر کے ماہرین نفسیات بھی اگر پاکستانی قوم کی نفسیاتی ساخت پر غور

کریں تو چکرا جائیں اور سب سے پہلے اُنہیں اپنے علاج کی فکر دامن گیر ہو! چند لمحات خاموشی کے آغوش میں گزر جائیں تو ہمیں اپنی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ گمان گزرتا ہے کہ کہیں دارِ فانی سے کوچ تو نہیں کرگئے۔ پھر اپنے ہونے کا یقین بحال کرنے کے لیے ہم تازہ ہوکر پوری قوت سے گفتگو اور شور کا ملغوبہ تیار کرنے لگتے ہیں!

یاروں نے صوتی آلودگی کو قومی خزانہ سمجھ لیا ہے اور حسب توفیق اُس میں اپنا حِصہ ڈالتے رہتے ہیں! "عطیہ" کرنے کے بھی مختلف اور منفرد طریقے ہیں۔ مثلاً موٹر سائیکل کا سائلنسر نکال لینا، بچوں کو اِس ایجنڈے کے ساتھ گلی میں بھیجنا کہ ایک لمحے کو بھی چُپ نہیں رہنا، ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر ٹاک شو کے اینکر اور شرکاء کی آواز میں آواز ملانا، پانی بھی مانگنا تو حلق اور پھیپھڑوں کو پوری قوت سے حرکت دینا وغیرہ وغیرہ۔ محسوس یہ ہوتا ہے جیسے کوئی سر پر توپ لئے کھڑا ہے کہ ہم ذرا خاموش ہوئے تو وہ توپ چلا دے گا! اِس بے بنیاد احساس کے ہاتھوں مجبور ہوکر لوگ منہ کی توپ چلاتے رہتے ہیں!

مرزا تنقید بیگ کو بولنے کا "ہَوکا" ہے اِس لیے ہمارے خاموش رہنے سے اُنہیں باضابطہ چِڑ ہے۔ اُن کا مشورہ یہ ہے کہ خاموش رہنا ہے تو قبرستان میں جا بسو۔ اب ہم اُنہیں کیا سمجھائیں کہ ہم قبرستان ہی میں تو قیام پذیر ہیں۔ جس معاشرے میں ہم جی رہے ہیں وہ اب چلتی پھرتی، بولتی، چیختی، چِلّاتی لاشوں سے

اٹا پڑا ہے!

مرزا کا ایک بنیادی استدلال یہ ہے کہ مُنہ آخر ہوتا کس لیے ہے؟ کھانے کے لیے یا پھر بولنے کے لیے! ہم نے بارہا اُنہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مُنہ کا ایک مصرف یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُسے بُھلا کر اِنسان، چند دنوں ہی کے لیے سہی، کسی کی زندگی سے نکل جائے اور اُسے سُکون کا سانس لینے کا موقع فراہم کرکے دُعائیں لے! اِس پر مرزا جو کچھ فرماتے ہیں اُسے غالب نے ذرا سلیقے سے یوں بیان کیا ہے

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پھر طبیعت اِدھر نہیں آتی

مرزا شور کو زندگی کی علامت سمجھتے ہیں اور اور ہم اُن کی اِس سوچ کو جہالت کی علامت قرار دینے سے نہیں چُوکتے۔ کبھی کبھی مرزا تپ کر ہمارے جال میں پھنس جاتے ہیں یعنی مُنہ پُھلا کر بات چیت بند کرلیتے ہیں اور ہمیں دو چار دن سُکون سے گزارنے کا نادر موقع عطا کرتے ہیں! مگر پھر جب اُنہیں ہماری "سازش" کا اندازہ ہوتا ہے اور دیکھتے ہیں کہ اِس صورت حال سے ہمیں فائدہ اور سُکون مل رہا ہے تو قتیل شفائی کے فرمان

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ

محفل میں اِس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں
پر عمل کرتے ہوئے، مُنہ کے غُبارے کی ساری ہوا نکال کر، پورے زور و شور کے
ساتھ دوبارہ ہماری زندگی میں "انٹری" ڈالتے ہیں!
گفتگو کے نام پر شور مچانا وہ شعبہ ہے جس میں ہم نے نئی "ٹیکنالوجیز" متعارف کرائی
ہیں۔ مثلاً آمنے سامنے بیٹھ کر بھی چیختے ہوئے بات کرنا، غالب کے فرمان
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو!
کو حرزِ جاں بناکر بلاضرورت دلائل پیش کرکے اپنی بات منوانا، فریقِ ثانی کو دیکھ کر بھی
نہ دیکھنا اور غیر حاضر گردانتے ہوئے صرف اپنا موقف پیش کرتے رہنے پر مُصِر رہنا اور
مستند ہے میرا فرمایا ہوا!
کے مصداق ہر معاملے میں صرف اپنی رائے کو درست قرار دیکر دُنیا کو اُس سے باضابطہ
آگاہ کرنا۔ صرف اپنی رائے کو درست قرار دینے والے ہمیشہ اِس طرح لب کشا ہوتے
ہیں گویا کسی کانفرنس کا اعلامیہ پیش کر رہے ہوں!
ایک زمانہ تھا جب داستان گو رات بھر الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنے

مسحور کن انداز سے دُنیا بھر بھی داستانیں سُنایا کرتے تھے۔ اب کہاں وہ داستانیں اور کہاں وہ داستان گو؟ وہ زمانے تو ہوا ہوئے، "رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی" کے مصداق اب ہم سبھی داستان گو کے منصب پر فائز ہو چکے ہیں اور ایک دوسرے کی نفسیاتی ضرورت کو پورا کرنے پر کمربستہ ہیں! مل بیٹھنے کے لیے الاؤ کا ہونا ضروری نہیں کیونکہ آج کا ہر انسان چلتا پھرتا الاؤ ہے اور کیا باتوں سے آگ نہیں لگتی؟ گھریلو گفتگو بالعموم ماچس کی تیلی کا کردار ادا کرتی ہے!

جن دنوں پاکستان کی فلم انڈسٹری تیزی سے پنپ رہی تھی تب چند گانے ایسے بھی ریکارڈ کئے گئے تھے جن میں روٹھے ہوئے محبوب سے کچھ بولنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ مہناز کا گایا ہوا "کچھ بولو نا" اور ناہید اختر کا گایا ہوا "کچھ بولیے حضور" بے حد مقبول ہوئے تھے۔ یہ دونوں گلوکارائیں تو فلمی دنیا بلکہ فن کے افق سے رخصت ہوئیں مگر ہمارے لیے دردِ سر چھوڑ گئیں۔ جس جس نے بھی یہ گانے سُنے، وہ آج تک بولے ہی چلا جا رہا ہے! 53 سال قبل بھارت کی فلم "عدالت" کا ایک گانا

یوں حسرتوں کے داغ محبت میں دھو لیے

بے حد مقبول ہوا تھا۔ اس گانے کے ایک انترے میں لتا نے راجیندر کرشن کی زبانی کہا تھا

ہونٹوں کو سی چکے تو زمانے نے یہ کہا
یہ چُپ سی کیوں لگی ہے، اجی کچھ تو بولیے
ہم سوچتے ہیں وہ کیسے زمانے تھے کہ لوگ ہونٹ سی لیتے تھے یا اُن پر چُپ کی مُہر لگا لیا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ اب فلمی گانوں کی حد تک رہ گیا ہے۔ ہونٹوں پر لگائی جانے والی چُپ کی مُہر آج ڈھونڈے سے نہیں ملتی اور لوگ ہیں کہ بول بول کر اپنی لاعلمی کے سونے پر جہالت کے سُہاگے کا ٹھپّہ لگاتے رہتے ہیں!

کھول آنکھ، کراچی کو مری جان ذرا دیکھ

کراچی نے پاکستان کے اندرونی و بیرونی قرضوں کا سا مزاج پایا ہے، یعنی بڑھتا ہی جا رہا ہے اور کسی کے قابو میں آنے کے لیے رضامند نہیں! کراچی کی آبادی بجٹ خسارے کی طرح بڑھ رہی ہے اور اِس کا مزاج بہت حد تک اڑیل بھینسے جیسا ہوتا جا رہا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ شہر بڑا ہوگیا ہے اور خوف کے مارے لوگ چھوٹے رہ گئے ہیں! شہر کا حال یہ ہے کہ ایک کونے سے دوسرے کونے میں جانے کو سیر سپاٹے سے تعبیر کیا جانے لگا ہے! بہت سے لوگ گھر والوں کے ساتھ آؤٹ ڈور کے لیے نکلتے ہیں اور شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کا سفر کرکے واپس آ جاتے ہیں اور اہل خانہ بھی خوش ہولیتے ہیں کہ کئی شہروں کی سیر کرلی! اور اگر حالات خراب ہوں تو یہی سفر مہم جوئی کے مرتبے پر بھی فائز ہو جاتا ہے! جب سے کراچی کے حالات کی خرابی مستقل ہوئی ہے، لوگ اپنے گھروں ہی کو دُنیا سمجھنے لگے ہیں اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں کچھ دیر بیٹھنے کو بھی شجاعت گردانا جانے لگا ہے! مگر صاحب! یہ تو سراسر تنگ نظری ہے۔ جس نے یہ کائنات بنائی ہے اُس نے کراچی کی شکل میں ایک انوکھا گورکھ دھندا پیدا کیا ہے، ایک رونق میلہ سجایا ہے اور ہم اُسے دیکھنے سے بھی کترا رہے ہیں! اِسے سراسر بے ذوقی نہ سمجھا جائے تو کیا سمجھا جائے؟ علامہ اقبال نے کہا تھا

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ

اگر آپ اِس شعر میں دی گئی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کراچی کو دیکھیں تو آنکھ بس کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں! پھر کچھ اور دیکھنے کی تاب کم از کم آنکھوں میں تو باقی نہیں رہتی!

جس طرح بعض دکانوں پر لکھا ہوتا ہے کہ ہمارا شربت نہ پیا تو کچھ نہ پیا، ہمارا حلیم نہ کھایا تو کچھ نہ کھایا بالکل اُسی طور آپ چاہے پوری دُنیا کی سیر کرلیں، لیکن اگر کراچی کے فٹ پاتھوں پر مٹر گشت کرنا نصیب نہیں ہوا تو سمجھ لیجیے کہ یہ جنم تو "سَفَل" نہ ہوسکے گا! کائنات کی کون سی چیز ہے جو کراچی میں نہیں اور کراچی میں کون اور کیا ہے جو فٹ پاتھوں پر جلوہ افروز نہیں۔ سارے جہاں کی نعمتیں کراچی میں اِس طرح فروخت ہو رہی ہیں جیسے کہیں اور اِن کے قدر دان ہیں ہی نہیں۔

بعض مقامات پر 80 سالہ سنیاسی بابا کچھ اِس طور لیٹے پائے جاتے ہیں گویا ہمالیہ کی ترائی کے طویل اور جاں گسل سفر کے بعد تکان یہیں پہنچ کر اُتاری جارہی ہے۔ اِن بزرگوں کے آرام میں خلل نہ پڑے، اِس خیال سے لوگ اپنی گاڑیوں بھی گھما کر نکالتے ہیں! اِن سنیاسی باباؤں سے دو گھڑی بات کیجیے تو اندازہ

ہوتا ہے کہ ہر انوکھا تجربہ قدرت نے اِنہی کے لیے رکھ چھوڑا تھا! چند لمحوں کی گفتگو میں یہ آپ کو اپنا ایسا گرویدہ کرلیں گے کہ پھر چائے پراٹھے کے پیسے آپ ہی دیں گے اور بخوشی دیں گے! ثابت ہوا کہ ہمالیہ کی وادیوں اور گھاٹیوں سے ہو کر آنے والے کم از کم اِتنا ہنر تو جانتے ہی ہیں کہ ناشتے یا کھانے کا بل مدِ مقابل سے دِلوائیں! آج کی دنیا میں اگر تپسیا اِس حد تک بھی بار آور ثابت ہو تو سودا بُرا نہیں!

اگر آپ بیمار ہیں تو کسی معالج کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے، فٹ پاتھ پر آپ کی خدمت کے لیے لوگ بیٹھے ہیں جو ہمالیہ کی بلندیوں پر پائی جانے والی جڑی بوٹیاں آپ ہی کے لیے تو لائے ہیں! بہت سے لوگ عجلت پسند مزاج کے باعث غلط نتائج اخذ کر بیٹھتے ہیں۔ اگر کسی فٹ پاتھی سنیاسی بابا کی کوئی دوا فوری اثر نہ دکھائے تو اس کے بارے میں طرح طرح کے گمان دلوں میں پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ کراچی میں سڑک کے کنارے فروخت ہونے والی ہر دوا کم از کم دس بارہ بیماریوں سے نجات دلانے کے لیے ہوتی ہے۔ ایک آدھ بیماری کو رفع کرنا ان ادویہ کی شان کے خلاف ہوتا ہے! بہر کیف، بات کچھ یوں ہے صاحب کہ کراچی کے فٹ پاتھوں پر لوگ زندگی بھر کی تپسیا کا ثمر بخوشی آپ کے حوالے کرتے ہیں اور وہ بھی آپ کی بس ایک دن کی کمائی کے عوض! اور دعوؤں پر تو آپ نے شاید کبھی غور ہی نہیں کیا۔ ایک ڈبیہ پر روحانی منجن" کا لیبل بھی"

چسپاں دیکھا گیا ہے! ہم اب تک نہیں سمجھ پائے کہ دانتوں کی صفائی کا روحانی تسکین سے کیا تعلق ہے؟ ایک دکان میں شہد کی بوتل پر "اسلامی شہد" کا لیبل دیکھ کر ہم اب تک سوچ رہے ہیں کہ غیر اسلامی شہد کیسا ہوتا ہوگا! سیاسی نظام سے شہد تک سبھی کچھ اسلام کے نام پر آسانی سے فروخت جاتا ہے!

اگر فٹ پاتھوں سے دل بھر جائے تو کراچی کے قلب میں ایک ایسا قابل دید مقام بھی ہے جس کے بارے میں سوچیے تو ذہن کام کرنے سے انکار کرنے لگتا ہے۔ گوروں نے اپنی ملکہ کے نام پر یہ مارکیٹ کراچی کے سینے میں گاڑی تھی مگر خیر، اب یہ قائدکے شہر کے دل کی دھڑکن میں تبدیل ہوچکی ہے! ایمپریس مارکیٹ ایک ایسی دُنیا کا نام ہے جسے کوئی اب تک سمجھ نہیں پایا۔ گورے بھی اِسے سمجھے بغیر رخصت ہوگئے۔ جس طرح پورے پاکستان میں ہر کام بے وقت ہو رہا ہے بالکل اُسی طرح ایمپریس مارکیٹ میں مختلف ممالک اور خطوں سے تعلق رکھنے والی بے موسم کی سبزیاں اور پھل ملتے ہیں! اگر فلپائن کی سبزی کھانی ہے، سری لنکا کے پھل خریدنے ہیں، بنگلہ دیش کے کچے کیلے اور کٹھل درکار ہیں،.برما کا ناریل چکھنا ہے، شدید گرمی میں پشاوری چکن یخنی سوپ پینا ہے، خون تک سرد کردینے والی سردی میں آم کھانے کا شوق ہے اور جن کے دام سُن کر خون خشک ہو جائے وہ خشک میوہ جات کھانے ہیں تو ایمسپریس مارکیٹ میں قدم رکھیے۔ پرندے، پنجرے، پتنگ، مفلر، سوئیٹر، سلے سلائے کپڑے.... غرض یہ کہ کیا ہے جو اس

مارکیٹ میں دستیاب نہیں۔ اور کراچی کی شناختی علامت کا درجہ رکھنے والی اِس مارکیٹ میں صرف اشیاء ہی نہیں، دکاندار اور خوانچہ فروش بھی عجیب قسم کے ہیں۔ اِن کی فنکاری پر فِدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ خیر گزری کہ گوروں کا دھیان اب تک اِس طرح گیا نہیں ورنہ اپنی ملکہ کے نام پر قائم اس عجیب الخلقت مارکیٹ کو اٹھا کر لے جائیں اور ٹکٹ لگا کر دُنیا کے سامنے پیش کریں!

بچت بازاروں کا رونق میلہ

اِنسان کی بُنیادی "خوبی" یہ ہے کہ کسی بھی معاملے میں اگر کچھ ٹھان لے تو اچھے بھلے کام کو بگاڑ کر ہی دم لیتا ہے! "تحقیق" کا شعبہ اِس نکتے کو دم بہ دم درست ثابت کر رہا ہے۔ ہر دور میں کام بنانے سے زیادہ بگاڑنے والوں کے دَم سے دُنیا کے بازار میں رونق میں اضافہ ہوتا رہا ہے! روشنی کی وقعت بڑھانے میں اُن کا کردار سب سے اہم ہے جو تاریکی کو محکم تر کرنے کے لیے سرگرم و سرگرداں رہے ہیں! اکیسویں صدی کا انسان کچھ زیادہ ہی ہٹ دھرم ثابت ہوا ہے۔ جو کچھ سراسر نقصان دیتا ہے اُسی کو بڑے خلوص کے ساتھ اور ماہرانہ مشوروں کی مدد سے اپنایا جاتا ہے اور پھر اُس کا خمیازہ بھی خاصے اہتمام سے، ہنستے ہنستے "سیلیبریٹ" کرتا ہے! ہر معاملے کو ایونٹ میں تبدیل کرنے کی ذہنیت اِتنی تیزی سے پروان چڑھی ہے کہ اب لوگ خوشی کے ساتھ ساتھ "غمی" کو بھی صرف سیلیبریٹ نہیں، انجوائے بھی کرنے لگے ہیں!
پاکستان بھی دُنیا میں ہے اور دُنیا کے اصول ہم پر بھی اِطلاق پذیر ہیں۔ کام کو سُلجھانے کے نام پر مزید الجھانے والی اشیاء اور "ٹیکنالوجیز" متعارف کرانے میں ہمارا بھی کوئی ثانی نہیں! بحیثیت قوم ہم نے ایسی بہت سی

چیزیں متعارف کرائی ہیں جو خرابیوں کو مستحکم کرنے کی تگ و دَو میں مصروف رہتی ہیں۔
!کچھ یہی حال یومیہ بچت بازاروں کا بھی ہے

ایک زمانہ تھا جب پاکستانی ثقافت کی بات کیجیے تو خاصی شائستہ چیزیں ذہن کے پردے پر جلوہ گر ہوتی تھیں۔ لباس، رہن سہن اور خورد و نوش کے معاملات کی نفاست ہماری ثقافت کے بنیادی اجزا تھے۔ خیر سے وہ زمانہ تو رخصت ہوا اور اب نفاست اور معیار کو ترستی آنکھیں رہ گئی ہیں۔ پاکستانی ثقافت میں اب سجی ہوئی ویگنوں اور ٹرکوں، ون وھیلنگ، ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی پر مبنی مناظر کے ساتھ ساتھ بچت بازار بھی نمایاں ہیں۔ اِن بچت بازاروں میں بچت تو خیر کیا ہونی ہے، بہت سی "شوکن میلے دی" اپنا شوق پورا کرلیتی ہیں! ایک زمانے سے خواتین کو یہ شکایت تھی کہ مرد تو دنیا بھر میں گھوم پھر لیتے ہیں، خواتین بے چاری کہاں جائیں؟ لیجیے، خواتین کی خواہش پوری ہوئی اور کتنی عمدگی سے پوری ہوئی کہ مرد بے چارے بس سڑک ناپتے ہی رہ گئے اور !خواتین سیر سپاٹے کے اسٹاپ پر پہنچ کر خیمہ و خندہ زن ہیں

کبھی کبھی تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ بچت بازار جھاڑ پھونک اور دَم کے ماہر ہیں۔ مگر شاید اِنہیں ابھی پوری طرح دَم کرنا آیا نہیں اِس لیے صرف ناک میں دَم کر رہے ہیں!

،کراچی جیسے بڑے شہروں میں موٹر سائیکلوں، ٹھیلوں

ریستورانوں، پکوان سینٹرز اور موبائل مالز کی طرح اب بچت بازار بھی پیروں میں آ رہے ہیں! دو قدم چلیے اور رک جایئے کیونکہ کوئی نہ کوئی بچت بازار اڑیل بھینسے کی مانند آدھی سڑک کو گھیرے ہوئے اسپیڈ بریکر کا کردار ادا کر رہا ہوتا ہے! آپ میں شاید اب تک وسیع النظری پیدا نہیں ہوئی اِس لیے قناتوں اور شامیانوں پر مشتمل کوئی بچت بازار دیکھ کر بھی اندر جھانکنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ذرا اُن خواتین کی کشادہ دلی اور اعلیٰ ظرفی دیکھیے جو ہر بچت بازار کو عزت اور رونق بخشتی ہیں! اگر یہ خواتین دل چھوٹا کرلیں اور قدم گھر سے باہر رکھنے کی قسم کھالیں (جو ازل سے ناممکن ہے!) تو پھر دیکھیے کہ شہر کیسا اُجڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بچت بازار قائم ہی اُن خواتین کے دَم سے ہیں جنہوں نے ہر بازار کی خاک چھاننے کی ٹھان رکھی ہے۔ اِن کا عزم دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب چھاننے کی خواہش اور جذبہ تو پورے طمطراق کے ساتھ موجود ہوگا مگر اے وائے ناکامی کہ خاک ہی نہ رہے گی!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

اب آپ سوچیں گے خواتین اگر بچت بازاروں کے چکر کاٹتی ہیں تو اِس میں حیرت کی کیا بات ہے کہ یہ کام خواتین ہی کا ہے۔ اب مرد تو بازاروں سے خریداری کرنے سے رہے۔ ٹھیک ہے، مگر بھئی کسی بھی چیز کی ایک حد تو ہونی چاہیے۔ آپ

سوچیں گے اِس ملک میں پہلے کون سی کسی چیز کی حد ہے تو بچت بازاروں کے چکر کاٹنے کی حد مقرر کی جائے ! ہو سکتا ہے آپ یہ بھی سوچیں کہ بچت بازاروں میں مٹر گشت کی بھی کوئی نہ کوئی حد قدرت نے ضرور مقرر کی ہوگی تاہم وہ حد ابھی آئی نہیں !

بعض خواتین کے لیے بچت بازار زندگی کی بنیادی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ پھیپھڑوں میں آکسیجن بھی وہی جائے جو بچت بازار کی فضاء میں پروان چڑھی ہو ! بعض خواتین دل کی بات کسی کو بتائے بغیر قرار نہیں پا سکتیں، بالکل اُسی طرح بہت سی خواتین بچت بازاروں کی خاک چھانے بغیر سُکون کا سانس نہیں لے سکتیں۔ اور یہ یومیہ معمول ہے یعنی ہفتے کے ہر دن کا ایک بچت بازار اور بھرپور باقاعدگی اور پابندی سے اُس کی سیر ! اِسے کہتے ہیں اولوالعزمی اور ثابت قدمی ! بہت سے سرکاری اور سیکورٹی اہلکاروں کو ثابت قدمی، مستقل مزاجی اور وقت کی پابندی سکھانے کے لیے بچت بازاروں کے چکر لگوانے چاہئیں !

بہت سے مرد یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو چکے ہیں کہ بچت بازاروں میں ایسا کیا ملتا ہے جسے خریدنے کے لیے خواتین اُتاؤلی اور باؤلی ہوئی جاتی ہیں۔ لگتا ہے کہ مردوں کے پاس اب کوئی مصروفیت رہی نہیں۔ ارے بھئی، تاریخ کے کس دور میں

خواتین کچھ خریدنے کی نیت سے بازار جاتی رہی ہیں؟ کیا یہ اچھی بات ہے کہ کوئی اِس دنیا میں آئے اور اِس کی سیر کئے بغیر ہی چل دے! ایسی روش کو کفران نعمت ہی کہا جائے گا۔ بازار کی رونقیں دُنیا کی رنگینی کا تعارف کراتی ہیں۔ بازار کی سیر کے ساتھ ساتھ کچھ خریداری بھی کر ہی لی جاتی ہے جسے بونس سمجھنا چاہیے! خواتین کا بازار جانا اگر خریداری کی نیت سے ہوا کرتا تو ہفتے میں ایک دن کا بچت بازار کافی تھا یعنی ہفتہ ایک دن کا ہوا کرتا! آپ کو یاد ہوگا، مرزا غالب فرما گئے ہیں

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

یعنی یہ کہ خواتین کوئی خریداری کے لیے بچت بازار تھوڑی جاتی ہیں۔ یہ تو بس مزاج اور سرشت کا معاملہ ہے۔ جب معاملہ سرشت کا آ جائے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہی حال بہت سی خواتین اور بچت بازاروں کا ہے۔ یہ تو بس ایک لاشعوری عمل ہے، یعنی بچت بازاروں کے چکر کاٹنے کا شعور سے کوئی تعلق نہیں! جس طرح پوری قوم لاشعوری کیفیت کے ساتھ جی رہی ہے، خریداری سے متعلق خواتین کی بیشتر سرگرمیاں بھی شعور سے یکسر عاری ہیں!

گورے اگر ہمارے قومی مزاج پر جامع تحقیق کا بیڑا اٹھائیں تو اُن کی نصف

محنت تو بچت بازاروں کی نذر ہو جائے گی ! اور باقی نصف کا بڑا حصہ بھی ایسی خواتین پر نچھاور ہو جائے گا جنہیں خاصے محتاط الفاظ میں "شوکن میلے دی" ہی کہا جائے گا !

جوگیوں، صوفیوں اور فلسفیوں نے دُنیا کو میلہ قرار دیا ہے۔ اُن کی نظر میں یہ دُنیا بس یونہی سرسری گزر جانے کا مقام ہے۔ اِس نکتے کو اگر کسی حد تک سمجھا ہے تو بس خواتین نے سمجھا ہے۔ وہ بچت بازاروں کی سیر کے ذریعے اِس دنیا کو فانی قرار دیتے ہوئے یہ پیغام دے رہی ہیں کہ دُنیا کا میلہ بس آج ہی آج ہے، جی بھر کے سیر کرلو، کل سارے ٹھیے" اُٹھ جائیں گے" !

ہمارے معاشرے میں تفریحی مقامات کم کم ہیں۔ ایسے میں بچت بازاروں کا دَم غنیمت ہے کہ خواتین پکّی چار دیواری سے نکل کر قناتوں اور شامیانوں کی چار دیواری کچھ وقت گزار کر دل کا بوجھ ہلکا کرلیتی ہیں۔ سہیلیوں سے ملاقات کے ساتھ ساتھ آلو چھولے کی چاٹ اور فالودے کا گلاس !

اور جینے کو کیا چاہیے!

غریبوں کی تو بس یہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں۔ مرزا تفصیل بیگ نے جب سنا کہ ہم بچت بازاروں پر قلمی گولہ باری کرنے والے ہیں تو پلک جھپکتے میں نازل ہوئے اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے اِس ارادے سے باز رہنے کا حکم دیا۔ موصوف کا

استدلال یہ تھا کہ اگر ہفتے میں سات بازاروں کی سیر سے خواتین کو ذہنی سکون ملتا ہے اور اُن کی نفسیاتی حالت درست رہتی ہے تو کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے ! ہم نے انہیں سمجھانا چاہا کہ یہاں تو تک بات درست ہے لیکن ان بچت بازاروں کے باعث گھر کا بجٹ جو بگڑ جاتا ہے اُس کا کیا؟ مرزا نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا اماں رہنے دو، جیسے تم کچھ جانتے نہیں۔ بھائی میرے ! سب کو معلوم ہے کہ ان" بازاروں میں خواتین کیا خریدتی ہیں اور چاٹ، پکوڑوں، فالودے اور شربت پر مہینے میں تین چار سو خرچ کرنے سے گھر کا بجٹ کون سا بگڑ جائے گا؟ مرد بھی تو مہینے میں بارہ پندرہ سو کا پان گٹکا کھا جاتے ہیں !" مرزا کی یہ بات سن کر ہم تو مبہوت رہ گئے۔ قلم اٹھانا دوبھر ہوگیا۔ ایسا لگا جیسے بچت بازار کے شامیانے کا بانس مرزا نے ہمارے دماغ میں گاڑ دیا ہو!

سکوں کہیں بھی میسر نہیں ہے شوہر کو

جو چند باتیں ہم لاکھ کوشش کے باوجود اب تک سمجھ نہیں پائے ان میں ایک یہ بات بھی شامل ہے کہ دنیا بھر میں آج تک لوگ بیویوں کو کیوں سمجھ نہیں پائے ! عورت اِس بات پر فخر کرتی ہے کہ وہ وفا کی پُتلی ہے۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ عورت وفا کی پُتلی ہے مگر کبھی اِس بات پر بھی کسی نے غور کیا ہے کہ وفا کی اِس پُتلی ہی کے باعث بے چارے مردوں کی حالت پتلی ہے؟ بیویوں کی پتلی کمر یا کے لیے بے چارے مردوں کی کمر تختہ ہو جاتی ہے ! کبھی وفا کے اِن غریب پُتلوں کے بارے میں بھی کچھ سوچا جائے !

دُنیا بھر میں خواتین پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ شوہروں کا بھلا نہیں چاہتیں اور اُنہیں تکلیف ہی دیتی رہتی ہیں۔ ہم یہ سوچ کر دل کو مطمئن کرلیتے ہیں کہ جب پوری دنیا ایک بات کہہ رہی ہے تو اُس میں کہیں نہ کہیں صداقت کا عنصر ضرور ہوگا ! مرزا تنقید بیگ یہ بات ہضم کرنے کو تیار نہیں۔ اِس کا سبب یہ نہیں کہ وہ زن مرید ہیں۔ بھابی بے چاری تو اُن کی "جور و جفا" کے قصے سُناتے نہیں تھکتیں ! بات یہ ہے کہ مرزا گھر میں خاصا کم وقت گزارتے ہیں۔ جب انٹر ایکشن یعنی ٹاکرا ہی نہیں ہوگا تو تکلیف کہاں سے ہوگی؟ کچھ دن

قبل مرزا اخبار میں شائع ہونے والی ایک خبر لیکر ہماری خبر لینے آ دھمکے۔ اُن کا کہنا تھا کہ عورت کسی بھی حالت میں شوہر کا بھلا سوچنے سے باز نہیں آتی۔ ہم نے کہا کہ یہی سوچ تو خرابی کی اصل جڑ ہے۔ بیویوں کو ہر وقت شوہر کی فکر لاحق رہتی ہے۔ مگر اس فکر میں تشویش کا کم اور شکوک و تحفظات کا تناسب زیادہ ہوتا ہے! بیویاں اگر ہر وقت شوہروں کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں تو بس یہی کہ کہیں کسی اور میں تو دلچسپی نہیں لے رہے، کسی سے زیادہ ہنسی مذاق تو نہیں کر رہے، کہیں محنت کی کمائی کسی اور کل مُوہی پر تو نہیں لٹا رہے! یہ وہ موضوع ہے جس پر ہر سُہاگن تنہائی میں گھنٹوں سوچ سوچ کر محظوظ بھی ہو سکتی ہے! گویا یہ اُن کا مینٹل وڈیو گیم ہے! بیویاں یہ نہیں سوچتیں کہ گھر کا معاشی بوجھ اٹھاتے اٹھاتے جن غریبوں کے کاندھے جھک گئے ہیں اور کمر میں خم آگیا ہے وہ تو اب کسی نازک کمریا کے خم کا سوچنے کے قابل بھی نہیں رہے! اور پھر ایسی کون سی کمائی اُن کے پاس بچتی ہے کہ کسی ایری غیری پر لٹاتے پھریں؟ بے چارے گھر کا خرچہ نکالنے کے بعد ڈبل پتی پان کو بھی ترستے ہیں! بیویوں کو ہر وقت مبتلائے تشویش دیکھ کر مرد بے چارے خاموشی کی زبان سے بس یہی استدعا کرتے رہتے ہیں کہ

تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو!

خیر، جب ہم نے حیران ہو کر وضاحت چاہی تو مرزا نے ایک اخباری خبر دکھائی جس

کے مطابق میکسیکو میں ایک خاتون نے غیر قانونی اسلحہ فروخت کرنے کے جرم میں اسیر اپنے شوہر سے ملاقات کے بعد اُسے جیل سے فرار کرانے کی کوشش کی۔ یہ عورت اپنے ساتھ سُوٹ کیس لیکر گئی تھی جس میں شوہر کو بٹھاکر وہ جیل سے باہر جانے لگی تو جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور اُس کا تمتماتا چہرہ دل کی کہانی سُنانے لگا۔ گارڈز کو شک گزرا۔ اُنھوں نے جب خاتون کو روک کر سُوٹ کیس کی تلاشی لی تو قیدی برآمد ہوگیا اور میاں بیوی گرفتار کرلیے گئے۔

ہم نے مرزا سے پوچھا کہ کوئی شخص سُوٹ کیس میں بھی جیل سے فرار ہوسکتا ہے؟ عام طور پر، محبت کے کیس میں، سُوٹ کیس لیکر تو لڑکیاں فرار ہوتی ہیں بلکہ گھر سے بھاگ جاتی ہیں!

مرزا نے شوہر کو فرار کرانے کی ناکام کوشش کرنے والی خاتون کے اخلاص سے بے حد متاثر ہوتے ہوئے کہا "تم ہمیشہ حقیقت سے فرار کی راہ اختیار کرتے ہو۔ تمہارے ذہن پر گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کا تصور اب تک سوار ہے۔ بھلے مانس! آج کے زمانے میں ایسی عورتیں کہاں ہیں جو اپنے شوہروں کے لیے اِس حد تک جائیں؟" ہم نے کہا جناب! عورتوں کا مسئلہ یہی تو ہے کہ وہ محبت، نفرت، خلوص، سادگی، رنگینی، بے بسی، جبر.... غرض ہر معاملے میں منطقی حدود سے گزرنے پر یقین رکھتی ہیں! شاید خواتین کی نفسیاتی ساخت میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ

حد سے گزرے بغیر کوئی اُن کی نیت کے اِخلاص پر یقین نہیں کرے گا! سُوٹ کیس کے ذریعے فرار کرانے کی منصوبہ بندی حماقت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اِتنا سننا تھا کہ مرزا بھڑک اُٹھے اور گفتگو کو چند بھاری الفاظ کی مدد سے وزنی بناتے ہوئے بولے "منفی سوچ کا ایسا ہی نتیجہ برآمد ہوا کرتا ہے۔ ایک عورت اپنی وفا ثابت کر رہی ہے اور تم ہو کہ اُس کی نیت اور عقل پر شک کر رہے ہو۔ لکھنے کے لیے نکات کی تلاش میں رات دن منفی انداز ہی سے سوچتے رہتے ہو۔ اپنی یہ کالمانہ یعنی جاہلانہ سوچ اپنے تک ہی رکھا کرو اور کبھی کبھی دانش سے بھی کام لیا کرو۔" مرزا جب ہم سے زیادہ تپ جاتے ہیں تو گفتگو کے دوران ساحل کی سی ہیئت اختیار کر لیتے ہیں یعنی منہ سے جھاگ اڑنے لگتا ہے! ایسے موقع پر ہم "تپڑ ہے تو پاس کر، ورنہ برداشت کر" والے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اُن کے نزدیک آنے سے گریز کرتے ہیں۔

مرزا جب ہمارے خلاف کچھ کہنے پر آتے ہیں تو ایک ہی سانس میں اِتنا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ لوگ غور سے سُنیں تو معروف گلوکار محمد رفیع مرحوم کا پکّا سانس بھی بھول جائیں! ایسے عالم میں آپ اُنہیں سمجھانے کی لاکھ کوشش کریں، وہ صرف اپنا راگ سُنانے اور منجن بیچنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم نے وضاحت کی کہ بھائی صاحب! ایسا نہیں ہے کہ میکسیکو کی وہ عورت خاوند کے بغیر پریشان اور بیزار ہو گئی تھی۔ دراصل اُس سے یہ بات برداشت نہ ہو سکی کہ شوہر جیل میں

ایک طرف پڑا سُکون سے زندگی بسر کرتا رہے۔ نہ رونا پیٹنا، نہ روز روز کی تو تو میں میں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی؟ کوئی بھی عورت شوہر کا اِس قدر آرام کس طور برداشت کر سکتی ہے؟ خوب سوچ بچار کرنے کے بعد اُس نے سُوٹ کیس کے ذریعے شوہر کو فرار کرانے کا منصوبہ تیار کیا تاکہ آسانی سے پکڑی جائے۔

مرزا کو ہماری بات سے ذرا بھی اتفاق نہ تھا۔ کہنے لگے "پکڑے جانے کا خوف ہوتا تو وہ عورت سُوٹ کیس والی ترکیب آزماتی ہی کیوں؟ اور پھر اِس منصوبے کی ناکامی سے وہ خود بھی تو گرفتار کرلی گئی۔"

بس یہی تو وہ بات ہے جو مرزا کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے سمجھایا کہ بھائی! اُس عورت کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ شوہر جیل میں مزے سے پڑا رہے۔ اُس کا سُکون غارت کرنے کے لیے وہ خود بھی اب جیل میں ہے!

یہ بات سُن کر مرزا نے چند ناقابلِ بیان الفاظ کی مدد سے ہماری نفسیاتی ساخت کو "خراجِ تحسین" پیش کیا اور گھر کی راہ لی۔ جاتے جاتے اُنھوں نے یہ حتمی رائے بھی دی کہ اخبار کے لکھاریوں کو کچھ سمجھانے سے بہتر ہے کہ انسان اپنی بیوی کی دل جوئی کرے۔ ہم نے الوداعی جملہ رسید کیا کہ آپ کے لیے موزوں سزا یہ ہے کہ آپ کو سُوٹ کیس میں بند کرکے بھابھی بھول جائیں کہ سُوٹ کیس کہاں

رکھا تھا!

منظور وسان کا خواب

ہر دور میں، ہر معاشرے میں خواب بلا معاوضہ ہوتے ہیں۔ آنکھیں بند کیجیے اور خوابوں کی نگری میں پہنچ جائیے۔ اور کبھی کبھی تو خواب دیکھنے کے لیے آنکھیں بند کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی یا ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ آج کل ہمارا معاشرہ خواب دیکھنے کے دور ہی سے گزر رہا ہے۔ سندھ کے نئے نویلے وزیر داخلہ منظور وسان نے بھی منصب سنبھالتے ہی عندیہ دیا ہے کہ وہ خوابوں پر یقین ہی نہیں رکھتے بلکہ یقین رکھواتے بھی ہیں!

سندھ کے وزیر داخلہ کا "کانٹوں بھری سیج" جیسا منصب سنبھالتے ہی منظور وسان صاحب نے میڈیا سے گفتگو میں کہا کہ انہوں نے خواب دیکھا ہے کہ پیپلز پارٹی اور متحدہ قومی موومنٹ کے درمیان ڈیڈ لاک ختم ہوگیا ہے۔ بات یہاں تک رہتی تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا کہ سیاسی بنیاد پر اِسی طرح کے خواب دیکھے جاتے ہیں اور جو اقتدار میں ہوں اُنہیں تو خواب دیکھتے رہنے ہی سے کام ہوتا ہے۔ مگر صاحب، منظور وسان ایک قدم آگے بڑھے اور یہ بھی فرمایا کہ "میرے حلقے کے لوگ جانتے ہیں کہ میں جب بھی کوئی خواب دیکھتا ہوں تو وہ سچا ثابت ہوتا ہے۔" اس خواب ہی کی روشنی میں انہوں نے بھرپور امید ظاہر کی کہ متحدہ

بہت جلد سیاسی پارک میں بینچیں تبدیل کرلے گی یعنی حکومتی بینچوں پر آ بیٹھے گی، بلکہ اقتدار کے جمپنگ کیسل پر حکومت کے ساتھ کھیلنے کودنے لگے گی!

ہمیں مجروح سلطان پوری مرحوم کا شعر یاد آ رہا ہے

بات تو جب ہے کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

ہم پاکستانیوں کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ جو بھی آتا ہے وہ ہمیں ہنسا ہنسا کر مارنا چاہتا ہے! زندگی نے ہمیں ایسا اور اتنا رُلایا ہے کہ جن سے مسائل کے حل کی توقع کی جاتی ہے وہ ہمیں کسی نہ کسی طرح ہنسانے بلکہ ہنساتے رہنے کو اپنے منصبی فرائض کا حصہ گردانے لگے ہیں! جنھیں عوام مسائل کے حل کی ذمہ داری سونپتے ہیں وہ خوابوں کی نگری میں ڈیرے ڈال دیتے ہیں اور اس کے بعد ہمیں بھی غنودگی کی ڈوز دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ڈیڈ لاک تو کیا ختم ہونا ہے، یہاں تو لاک ہی ڈیڈ دکھائی دے رہا ہے! ایسے میں کوئی چابی تلاش کرلی جائے تب بھی کون سا بھلا ہونے والا ہے؟ اور پھر منظور وسان صاحب کو خوابوں کی دُنیا اپنے حلقے تک محدود رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ خوابوں کی دُنیا تو لامحدود ہوتی ہے۔ آنکھ بند کرکے ہم پوری کائنات کا

چکر لگا سکتے ہیں۔ ایسے میں اپنے حلقے تک محدود رہنا سندھ کے وزیر داخلہ کو زیبا نہیں۔ 1988 سے پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے اشتراک عمل کا حوالہ دیتے ہوئے منظور وسان نے نوید سنائی کہ متحدہ کی ناراضی جلد دور کردی جائے گی۔ یہ بھی منظور وسان صاحب کا کمال ہے کہ 1988 سے اب تک کے پورے دور کو پی پی اور متحدہ کی دوستی اور اخوت کا زمانہ شمار کرلیا! ان کا ارشاد تھا کہ گھر میں چھوٹے۔بڑے بھائیوں میں لڑائی تو ہوتی رہی رہتی ہے۔ متحدہ سے تعلق رکھنے والے دوستوں نے استعفے ضرور دیئے ہیں مگر ہمیں استعفے قبول کرنے کی جلدی نہیں۔ بھائیوں کے درمیان لڑائی والی بات تو خیر تسلیم کی جاسکتی ہے کہ بھائیوں میں اختلافات ہوتے ہی ہیں۔ مگر صاحب! بھائی جب ایک دوسرے کو "بھائیوں" کی طرح برتنے لگیں تب؟ متحدہ سے دوستی اور اُخوت" اب پیپلز پارٹی کے لیے کچھ کچھ خواب ہی کا معاملہ ہے۔ مگر مرزا نوشہ فرماگئے" ہیں۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سُود تھا

سیاسی مصلحتیں بسا اوقات اقتدار کے ایوان میں بیٹھے ہوئے انسانوں کو اس قدر

مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی زمینی حقائق کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔
اِس کا نتیجہ، ظاہر ہے، بہت بھیانک نکلتا ہے۔ فرحت شہزاد نے کہا ہے۔

کھلی جو آنکھ تو وہ تھا، نہ وہ زمانہ تھا
دہکتی آگ تھی، تنہائی تھی، فسانہ تھا

جب کسی نے کراچی میں مہاجر صوبے سے متعلق وال چاکنگ کا ذکر کیا تو منظور وسان صاحب نے فرمایا کہ اگر کوئی مہاجرستان صوبے کے قیام کا خواب دیکھ رہا ہے تو یہ اُس کی بھول ہے! پھر وہی ہنسانے والی بات! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ آپ جب چاہیں اپنی مرضی کا خواب دیکھیں اور کسی دوسرے کے خواب کو برداشت کرنے سے انکار کر دیں!

منظور وسان صاحب نے ایک اچھا راستہ دکھایا ہے۔ آپ سوچیں گے اس میں حیرت کی کیا بات ہے، راہ نُما ہوتا ہی راستہ دکھانے کے لیے ہے۔ حق یہ ہے کہ جنہیں ہم راہ نُما قرار دیتے آئے ہیں انہوں نے تو ہمارے راستے ہی ڈکار لیے ہیں! ایسے میں خیر کی ہر بات کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اگر صوبے کے مزید دو چار وزراء بھی خواب دیکھنے کی عادت ڈال لیں تو بہت سے مسائل کچھ کئے بغیر ہی حل ہو جائیں گے۔ آپ شاید اختلاف کرتے ہوئے یہ کہیں کہ جنہیں اقتدار نہیں ملتا

وہ خوابوں کی دُنیا میں رہتے ہیں اور جب اقتدار مل جاتا ہے تو خوابوں کی تعداد اور شدت بڑھ جاتی ہے اور وہ خوابوں کی نگری سے باہر آنے کا سوچتے بھی نہیں۔ حد یہ ہے کہ تمام تنازعات اور اختلافات خوابوں ہی میں دور کرلیے جاتے ہیں اور اتحادیوں کو منانے کا بھاری پتھر بھی خوابوں ہی میں اُٹھایا جاتا ہے! حالات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اربابِ بست و کشاد خوش فہمی کی بھنگ کا پیالہ چڑھاکر خوابوں کی دُنیا میں گم رہا کریں! بھنگ بھی کیا چیز ہے۔ ہی تو غریبوں کا نشہ مگر "اعلیٰ" سطح پر بھی اپنے مستانہ جلوے خوب دکھاتی ہے!

فی زمانہ سندھ کی وزارت داخلہ بھی کسی بھیانک خواب سے کم نہیں! مشفق خواجہ مرحوم نے لکھا تھا کہ آج کی ادبی دُنیا کے محقق دوسروں کے چراغ سے چراغ جلاتے نہیں، بلکہ اُن کا چراغ ہی اٹھا لاتے ہیں! سندھ کی وزارت داخلہ کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اِس وزارت کے ساتھ زندگی بسر کرنا کسی بھیانک خواب کے آغوش میں زندگی بسر میں جینے سے کم نہیں۔ ایسے میں مزید کوئی خواب دیکھنے کی ضرورت ہے نہ گنجائش! ہوسکتا ہے کہ سندھ کی وزارت داخلہ منظور وسان صاحب کے لیے کسی خواب کی تعبیر ہو مگر کراچی میں امن کے قیام کا چیلنج جاگتی آنکھوں کا خواب نہیں، بلکہ گراؤنڈ ریئلٹی ہے اور اِسے "گراوئنڈیڈ ریئلٹی" ہونے سے بچانا حکومت کا

سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔ یہ وہ بھاری پتھر ہے جسے محض خواب و خیال میں نہیں اُٹھایا جاسکتا۔

دیکھے کوئی کہ ہم بھی تماشے سے کم نہیں

ایک زمانہ تھا جب ہم دنیا کو حیرت سے دیکھا کرتے تھے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ دنیا ہمیں حیرت سے دیکھتی، بلکہ تکتی ہے۔ دُنیا یقیناً دیکھنے کی چیز ہے مگر اُس سے کہیں زیادہ قابل دید تو ہم ہیں! اور کیوں نہ ہوں؟ احتجاج کے نام پر ہم اپنے ہی جیسے انسانوں اور اپنی ہی معاشی سرگرمیوں کا قتل عام کرتے ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اِس پر شرمندہ ہوتے ہیں نہ کبھی نتائج پر غور کرنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں! کیا جون ایلیا نے غلط کہا تھا؟

بے دِلی! کیا یونہی دِن گزر جائیں گے؟
صرف زندہ رہے ہم تو مر جائیں گے!

دنیا بھر میں لوگ تفریح کے مواقع ڈھونڈتے ہیں۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ تفریحی سرگرمیاں ہمیں تلاش کرتی ہیں تاکہ ہم سے محظوظ ہوں۔ ہر معاملے کو ہنسی مذاق میں اڑانے کی روش نے ہمیں مضحکہ خیز بنادیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس حالت کو پہنچنے پر بھی فخر کیا جارہا ہے!

جب پورا معاشرہ بازار بن جائے گا تو کون سی چیز ہے جو فروخت نہیں ہو گی؟

پاکستان کا کچھ ایسا ہی حال ہے۔ جو چیز کہیں نہ بک پائے وہ پاکستان میں بک جاتی ہے۔ چھ سات سال سے یہی حال ٹی وی پروگرامز کا بھی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان پروگرامز کے لیے اب ہم بک جاتے ہیں!

جنگل کے حیوانات کو دیکھنا ہو تو لوگ ٹکٹ خرید کر چڑیا گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کے لوگ اگر پاکستانیوں کو دیکھنا چاہتے ہیں تو اچھی خاصی رقم خرچ کرکے اِتنی دور آنے کی ضرورت نہیں، سیٹلائٹ پر ہمارے ٹی وی چینلز دستیاب ہیں۔ دنیا بھر میں کوئی بھی شخص ٹی وی سیٹ کا سوئچ آن کرنے پر ہمیں دیکھ کر محظوظ ہوسکتا ہے! ٹی وی پروگرامز میں طرح طرح کے تماشے دیکھ دیکھ کر اب ہم بھی تماشے ہی تو کرنے لگے ہیں۔ احتجاج کے نام پر جو کچھ براہ راست نشر کیا جاتا ہے اُسے کیا کہا جائے گا؟ جس طرح بعض اداکاروں کی فلمیں دیکھ کر یہ سیکھا جاسکتا ہے کہ اداکاری کس طرح نہیں کرنی چاہیے، بالکل اُسی طرح ہمارے ٹی وی پروگرامز کی لائیو کوریج دیکھ کر دُنیا سیکھ سکتی ہے کہ زندگی کس طور بسر نہیں کرنی چاہیے!

ویسے تو انسان مختلف ادوار سے گزرتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں یہ کلیہ بھی پلٹ گیا ہے۔ مختلف ادوار ہم میں سے ہو کر گزرتے ہیں! اس وقت بے ہنگم میڈیا کا دور ہم میں سے ہو کر گزر رہا ہے! اور ہمارا یہ حال ہے کہ

!رات کیا گزرے گی، ہم جاں سے گزر جائیں گے

ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ ہر معاملے میں لفظ گراں کے استعمال کا مستحق ہے، بلکہ سچ پوچھیے تو اب گرانی کی ارزانی ہے! گراں خوابی کا شکار کون ہے؟ ہم! گراں فروشی نے کسے جکڑ رکھا ہے؟ ہمیں! حالات کے ہاتھوں گراں باری نے کسے دبوچ رکھا ہے؟ ہمیں! اور اب تو گراں بینی بھی تقدیر نے ہمارے کھاتے میں ڈال دی ہے۔ گراں بینی نے ہماری بصیرت اور بصارت دونوں ہی کو سلب کرلیا ہے۔

آٹھ دس سال سے ہم ٹی وی چینلز کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں۔ ناظرین بنے رہنے کی ہوس ہمیں ڈوبنے بھی نہیں دیتی کہ کہیں کچھ مِس نہ ہو جائے! عوام سانس بھی لے رہے ہیں تو ٹی وی سیٹس کی پکچر ٹیوبز کی مدد سے! ہر ملک کچھ نہ کچھ کرکے دوسروں سے آگے نکلنے کی تگ و دَو میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور "پدرم سلطان بُود" کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ لوگ اپنا بھرپور قیمتی وقت بے سر و پا ٹی وی پروگرامز کی نذر کرکے سمجھتے ہیں کہ بہت بڑا تیر مار لیا۔ یقیناً

!جو لوگ کچھ نہیں کرتے، کمال کرتے ہیں

اگر ٹی وی دیکھنے کے دورانیے کی بات ہو تو بحیثیت قوم شاید ہم گنیز بک آف ورلڈ میں جگہ پا جائیں۔ پاکستان میں آبادی میں اضافے کی رفتار سے چار گنا رفتار سے ٹی وی ناظرین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے! دنیا کی توجہ ابھی اس طرف گئی نہیں، ورنہ وہ ہمارے سے ناظرین درآمد کرے۔ کوئی دیکھے تو سہی کہ ہم کس انہماک سے ٹی وی دیکھتے ہیں! وہ ٹی وی پروگرام بھی ہماری پسند کے معیار پر بخوبی پورے اترتے ہیں جنہیں دیکھنے سے زیادہ جھیلنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے! اور شاید یہ پروگرام دکھا دکھا کر ہمیں مزید بہت کچھ جھیلنے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے! کیا یہی سبب نہیں کہ ہم ہر طرح کے حکمران، پارلیمنٹ، سرکاری ادارے، حالات اور پتا نہیں کیا کیا جھیلنے کے عادی ہو گئے ہیں؟

بہت سے لوگ اس قدر ٹی وی دیکھتے ہیں کہ جب ٹی وی نہیں دیکھ رہے ہوتے تب بھی اُن کے ہاتھوں کی انگلیاں تصوراتی ریموٹ کے بٹنوں پر رقص کر رہی ہوتی ہیں! غالب نے شاید ایسی ہی کسی کیفیت کے لیے کہا تھا۔

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!

الیکٹرانک چینلز نے جو ستم خواتین پر ڈھایا ہے اس کا کوئی جواب نہیں۔ خواتین کی سوچ اور رویے میں ایسی تبدیلی رونما ہوئی ہے کہ اب تو

پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!....

اور کوئی پہچانے بھی تو کیسے کہ

!دِل تو دِل، وہ دماغ بھی نہ رہا

اب یہ ستم نہیں تو اور کیا ہے کہ گھر کی چار دیواری میں اپنے ہی لوگ بھی بدل گئے ہیں؟ گھر کے باہر حالات اور زندگی سے نپٹ کر جب لوگ تھکے ہارے گھر میں داخل ہوا کرتے تھے تو یہ سوچ کر دل کو ایک گونہ سکون ملتا تھا کہ چلو، گھر والے تو اپنے ہیں اور گھر کا کھانا تو نصیب ہوگا۔ مگر صاحب وہ زمانے بھی ہوا ہوئے۔ اب وہ زمانہ کہاں کہ خواتین خانہ ماں کے بتائے ہوئے نُسخوں کی مدد سے کچھ پکائیں؟ خواتین خانہ کھانے پکانے کی تراکیب سکھانے والے چینلز اس قدر دیکھتی ہیں کہ اب اُنہیں "خواتین کھانا" کہنا مناسب ہوگا! جو کھانے وہ برسوں سے پکاتی آرہی ہیں اُنہیں ٹی وی پر دوبارہ سیکھتی ہیں تاکہ "بے ذائقگی" کے تابوت میں آخری کیل آسانی سے ٹھونکی جاسکے! ٹی وی پر دکھائے جانے والے کھانے تیار کرنے کی کوشش میں بہت سی خواتین نے ایسے ایسے تجربات اور اُن سے ایسے ایسے نتائج اخذ کئے ہیں کہ اب اُنہیں سائنس دان قرار دیا جاسکتا ہے! اور عجائب میں شمار کی جانے والی ڈِشوں کو خواتین نے اپنے شوہروں پر کچھ اِس قدر آزمایا ہے کہ وہ بے چارے چوہے ہو کر رہ گئے ہیں! بہت سی خواتین سات سمندر پار کی عجیب و غریب ڈش کھلا کر اپنے اپنے شوہر کے خلوص، محبت اور قوت برداشت کو آزماتی ہیں! اور بے چارے شوہر نادر روزگار ڈش کے

نوالے حلق سے اتار کر اس کسوٹی پر کھرے اترتے رہنے پر مجبور ہیں!

بیوی، گرل فرینڈ اور "بے چارے" مرد

پاکستان میں وزیر داخلہ کو وزیر مداخلت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح گھر میں "وزیر داخلہ" ہر معاملے میں بلا جواز اور بلا ضرورت ٹانگ اڑاتی ہے، بالکل اُسی طرح ہمارے ہاں جو بھی وزیر داخلہ کے منصب پر فائز ہوتا ہے وہ ہر معاملے میں بلا ضرورت ٹانگ اڑانے کو بھی اپنے منصبی فرائض کا جُز سمجھتا ہے!

کبھی ہم سوچا کرتے تھے جو باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں وہ کس طرح سمجھ میں آسکیں گی، کون سمجھائے گا؟ نصیب دیکھیے کہ ہمیں عبدالرحمٰن ملک مل گئے!

موصوف کو اللہ نے یہ صفت دی ہے کہ بولتے ہیں تو لوگوں کو روزی ملتی ہے۔ ہم جیسے پتہ نہیں کتنے ہی نام نہاد کالم نگار عبدالرحمٰن ملک کی میڈیا ٹاک کے منتظر رہتے ہیں کہ اُدھر وہ کچھ کہیں اور اِدھر کچھ لکھنے کی راہ ہموار ہو!

عام آدمی سے پوچھیے تو وہ کہے گا کہ کراچی کی نفسیات کے بارے میں اگر کوئی کچھ جانتا ہے تو وہ عبدالرحمٰن ملک ہیں۔ کراچی کے معاملے میں موصوف "پی ایچ ڈی" ہیں!

(اب ہم سے یہ مت پوچھیے گا کہ پی ایچ ڈی سے کیا مراد ہے کیونکہ

اِس ڈگری کی عوامی تعریف خاصی شرارت آمیز ہے! ہم یہ تعریف اِس لیے پیش نہیں کر رہے کہ وفاقی وزیر داخلہ ملک بھر کی پولیس کا سربراہ ہوتا ہے!) عبدالرحمٰن ملک صاحب اِس شہر کی رگ رگ سے واقف ہیں اور بالخصوص دُکھتی رگوں (اور دُکھتی رگ والوں) کو خوب پہچانتے ہیں! جب بھی کسی کو کراچی کے مزاج کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ہوتا ہے، میڈیا سے عبدالرحمٰن ملک کی گفتگو سُن کر کلیجہ ٹھنڈا کرلیتا ہے! الیکٹرانک میڈیا والوں کی مہربانی ہے کہ صرف آگ نہیں لگاتے بلکہ وزیر داخلہ سے ٹاک کرکے ناظرین کی سماعتوں پر کچھ ٹھنڈی اور مزے کی باتیں بھی برساکر "کمپنسیٹ" کردیتے ہیں! کبھی کبھی تو عبدالرحمٰن ملک صاحب ایسے ایسے نکات بیان کر جاتے ہیں کہ ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ یا اللہ! ہمارے وزیر داخلہ کا ذہن ہے یا ماہرین کا پناہ گزین کیمپ! کرمنولوجی، سوشیالوجی، سائکولوجی اور پتہ نہیں کون کون سی "لوجی" نے ان کے "زرخیز" ذہن میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں!

بڑے بڑے سُورما اور تیس مار خاں آئے اور کراچی کو سمجھنے کی کوشش میں ناکام رہے۔ بعض نے یہ پتھر اُٹھانے کی زحمت بھی گوارا نہ کی، بس چُوم کر چھوڑ دیا! اللہ بھلا کرے وفاقی وزیر داخلہ کا کہ اُنہوں نے ہماری کئی مشکلات آسان کردیں۔ کئی معاملات میں اُنہوں نے اِشکال کی شکل ہی بدل دی اور ہم ماہرین سے پوچھتے رہنے کی زحمت سے چھوٹے! جو کچھ کراچی کے بارے میں

عبدالرحمٰن ملک فرماتے ہیں اگر اس کا باضابطہ ترجمہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو بڑے بڑے ماہرین اور مبصرین شکست تسلیم کرلیں اور سر تسلیم خم کریں!

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ کراچی کے لوگوں کو عادت سی پڑ گئی ہے دہشت گردوں کے ہاتھوں موت کو گلے لگانے کی! دو چار دن شکون سے گزرتے ہیں اور پھر کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے، یعنی حالات "معمول" پر آ جاتے ہیں! یہ ہلاکتیں کیوں واقع ہوتی ہیں، اِس راز پر سے عبدالرحمٰن ملک صاحب نے بڑی خوب صورتی سے پردہ اٹھایا ہے۔ موصوف جسمانی طور پر آن کی آن میں کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں یعنی ابھی اسلام آباد میں ہیں اور پلک جھپکتے میں دُبئی سے ہوتے ہوئے لندن جا نکلتے ہیں۔ اور پھر اِتنی ہی تیزی سے پلٹ بھی آتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جو لندن ہو آئے اُسے ولایت پلٹ کہا جاتا تھا۔ اب خیر سے ہمارے لوگوں نے لندن کے اِتنے پھیرے لگائے ہیں کہ ولایت ہی اُلٹ پلٹ گیا ہے! خیر، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ یاد رکھیے کہ وفاقی وزیر داخلہ کا ذکر ہو تو نصف گفتگو جملہ ہائے معترضہ ہی میں ہوتی ہے! ہم بات کر رہے تھے آن کی آن میں کہیں سے کہیں جا نکلنے کی۔ عبدالرحمٰن ملک کا جسم ہی نہیں، ذہن بھی بڑے فاصلوں کو پلک جھپکتے میں طے کرلیتا ہے اور وہ چشم زدن میں زمین اور آسمان کو ایک کر دیتے ہیں۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ کراچی میں دہشت گردوں کے

ہاتھوں ہلاکتوں کی توضیح کرتے ہوئے اُنھوں نے توجیہ پیش کی ہے کہ کراچی میں 70 فیصد ہلاکتیں بیوی یا گرل فرینڈ کے ہاتھوں یا اُن کے باعث ہوتی ہیں! جب ہم نے ایک خبر رساں ایجنسی کی بھیجی ہوئی فیڈ میں یہ خبر پڑھی تو یقین ہی نہیں آیا کہ کراچی کی کائنات کا اِتنا بڑا عُقدہ اِس قدر آسانی سے حل کرلیا گیا ہے! وزیر داخلہ کے ایک جُملے نے زندگی اور موت کو ایک صف میں لا کھڑا کیا۔ اب تک تو ہم (اپنی سادگی اور بھولپن کے ہاتھوں) یہی سمجھتے آئے تھے کہ بیویاں اور گرل فرینڈز صرف جینا حرام کرتی ہیں، اب معلوم ہوا کہ وہ جینا حرام ہی نہیں کرتیں بلکہ موت کو حلال بھی کرتی ہیں! دہشت گردوں کو ایسی عمدہ کلین چٹ دینا کچھ عبدالرحمٰن ملک صاحب ہی کے بس کی بات تھی۔

ہمیں حیرت اگر ہے تو صرف اِس بات پر کہ عبدالرحمٰن ملک صاحب نے باقی 30 فیصد ہلاک شدگان کو دہشت گردوں کے کھاتے میں کیوں ڈالا؟ اگر اُنہیں بھی بیوی یا گرل فرینڈ کے ہاتھوں ہی مروا دیتے تو بے چاروں کے کچھ درجات ہی بلند ہو جاتے، "شہدائِ وفا" کی فہرست ذرا اور لمبی ہو جاتی! بقول غالب

!سیر کے واسطے تھوڑی سی فضاء اور سہی

عبدالرحمٰن ملک صاحب نے بیوی اور گرل فرینڈ کے ہاتھوں زندگی کے خاتمے کا ذکر کرکے (ہم سمیت) تمام مردوں کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے! کون سا شادی

شدہ یا پریم دیوانہ ہے جس کا دِل عبدالرحمٰن ملک صاحب کی اِس بات سے کٹی پہاڑی کی طرح دو لخت نہ ہوگا؟ کون ہے جس نے گرل فرینڈ (ز) والا زمانہ نہیں گزارا اور کون ہے جو بیوی والے زمانے سے نہیں گزر رہا؟ ایک بات پر البتہ ہمیں اعتراض ہے۔ عبدالرحمٰن ملک صاحب نے فرمایا ہے کہ کراچی میں 70 فیصد ہلاکتیں بیوی یا گرل فرینڈ کے ہاتھوں واقع ہوتی ہیں۔ یہ بات کچھ حلق سے اُترتی نہیں۔ بیوی اور گرل فرینڈ کے دام میں پھنسنے کے بعد انسان کو موت ملتی کب ہے، موت کو تو وہ بس ترستا رہتا ہے! آپ کو یاد ہوگا کہ "مغل اعظم" میں بے چاری انارکلی کس طرح دین کی رہی تھی نہ دنیا کی۔ ایک سین میں شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے خاصی گھن گرج کے ساتھ شاہی پالیسی" بیان کردی "سلیم تمہیں مرنے نہیں دے گا انارکلی! اور ہم تمہیں جینے" نہیں دیں گے!" بیوی اور گرل فرینڈ کے درمیان پھنسے ہوئے انسان کی بھی کچھ ایسی ہی حالت ہوتی ہے! بیوی ڈھنگ سے جینے نہیں دیتی اور گرل فرینڈ آسانی سے مرنے نہیں دیتی! اس کھیل میں بے چارے مرد بیڈمنٹن کی چڑیا یعنی شٹل کاک بن کر رہ جاتے ہیں! جیسے عبدالرحمٰن ملک صاحب اسلام آباد اور لندن کے درمیان شٹل کاک بنے ہوئے ہیں!

غریبوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں

باقی دنیا کی طرح پاکستان کے عوام بھی چھوٹی چھوٹی باتوں میں خوشیاں تلاش کرتے ہیں۔ بڑی باتوں میں خوشیاں اِس لیے نہیں ڈھونڈی جاتیں کہ اِن باتوں کے بوجھ تلے خوشیاں دم توڑ دیتی ہیں! زمانہ ایسا بدلا ہے کہ غریب ہر معاملے کو مسرت کے حصول کا ذریعہ سمجھنے لگے ہیں۔ ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ بھیڑ سی لگی ہے۔ لوگ ہار پھول لیکر کسی کا استقبال کر رہے ہیں۔ ہم نے سوچا حج کا سیزن ہے تو نہیں، شاید کوئی عمرے کی سعادت پا کر وطن واپس آیا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک صاحب کام پر گئے تھے اور سلامت واپس آ گئے ہیں! ساتھ ہی یہ بھی جاننے کو ملا کہ دفتر سے موصوف کی واپسی کو روزانہ "سیلیبریٹ" کیا جاتا ہے! کراچی، اللہ مزید نظر بد سے بچائے، ایسا ہو گیا ہے کہ سانسوں کے تسلسل کا برقرار رہنا بھی ایک مستقل خوشی میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے! زندہ رہنا کل تک کسی گنتی میں نہ تھا، مگر آج زندہ رہ پانا بھی کمال کا درجہ رکھتا ہے! بعض لوگوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ شام ڈھلے یا رات گئے دفتر یا فیکٹری سے بحفاظت گھر واپسی پر دریائے حیرت میں غرق ہو جاتے ہیں، بڑی مشکل سے یقین آتا ہے کہ کھلی سڑکوں سے گزر کر بھی وہ سلامت رہے ہیں اور گھر تک آ پہنچے ہیں! ایسے میں وہ زمانہ اب زیادہ دور نہیں لگتا جب لوگ اپنے دوستوں کو فون کرکے فخر سے بتایا کریں گے

کہ "آج تو میں کمرے سے نکل کر دالان (یا بالکنی) میں چالیس منٹ تک بیٹھا رہا اور پھر بحفاظت کمرے میں واپس بھی آگیا!"

ایک زمانہ تھا جب بس میں سیٹ ملنے کو بھی درخور اعتناء یعنی شکر گزاری کا موقع نہیں گردانا جاتا تھا۔ اب حالت یہ ہے کہ لوگ مطلوبہ بس کو آتا دیکھ کر مسرت محسوس کرتے ہیں اور بس میں کھڑے ہونے کی گنجائش بھی دکھائی دے تو مسرت دُگنی ہوتی جاتی ہے اور وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فوراً بس کی طرف لپکتے ہیں! اگر چار چھ اسٹاپ گزرنے کے بعد سیٹ بھی مل جائے تو سمجھ لیجیے کہ دِل کی مراد مل گئی، لاٹری نکل آئی!

حالات کا رونا تو سبھی روتے ہیں۔ اگر آپ بھیڑ چال سے بچتے ہوئے خوشی محسوس کرنا چاہیں تو یقین کیجیے کہ کراچی میں "مواقعوں" کی کمی نہیں۔ کوچ میں اگر آپ کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوں اور چھت پر موسم کے مزے لیتے ہوئے سفر کرنے والوں کی تھوکی ہوئی پان کی پیک کے چھینٹے آپ پر نہ گریں تو خوش ہونا آپ پر واجب ہے! بعض لوگ اِس حالت میں گھر پہنچتے ہیں کہ پان کی پیک کے چھینٹوں سے کپڑے خاصے ہیبت ناک ہو چکے ہوتے ہیں اور لوگ اِنہیں خون کے چھینٹے سمجھ کر لاشعوری طور پر اُنہیں احترام کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں! اِضافی محنت کے بغیر یوں احترام پانے والے خاصی "سَفّاک" سی خوشی محسوس

کرتے ہیں! یہ کچھ کچھ ویسی ہی خوشی ہے جو عید الاضحیٰ کے تین دنوں میں عارضی قصاب کی حیثیت سے مضبوط دیہاڑی کمانے والوں کو خون آلود کپڑوں میں گھومنے سے !ہلا کرتی ہے

حالات کے ہاتھوں سب کچھ اِس قدر اُلٹ پلٹ گیا ہے کہ جب حکام کہتے ہیں کہ حالات معمول" پر آگئے ہیں تو دِل دہل جاتا ہے! وہ زمانے تو ہوا ہوئے جب امن اور استحکام" معمول تھا۔ اب تو قتل و غارت کے درمیان امن و استحکام مختصر سے وقفے کی صورت نمودار ہوتا ہے! ایسے میں حالات کے "معمول" پر آنے کو قتل و غارت، ہنگامہ آرائی، کاروباری سرگرمیوں کا تعطل اور خوف و ہراس کا پھیلنا نہ سمجھا جائے تو اور کیا سمجھا جائے! ایسے میں جی چاہتا ہے کہ حالات کچھ دیر تو "معمول" پر نہ رہیں! جنہیں معمولات" بگاڑنے کا ٹاسک سونپا گیا ہے اُنہیں ہماری چھوٹی اور معصوم سی خواہشات کا" !تو احترام کرنا ہی چاہیے

ٹریفک جام اب اِس قدر معمول کی بات ہے کہ گھر سے نکلتے وقت لوگ نفسیاتی طور پر اِس بات کے لیے تیار ہوتے ہیں کہ سڑک پر گاڑی کہیں نہ کہیں پھنس جائے گی، اٹک کر رہ جائے گی! اور اگر ایسے میں "غیر معمولی" بات رُونما ہو جائے یعنی سڑکوں پر گاڑیاں رواں دواں ہوں، کہیں کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہو تو کیا آپ کا دل خوش نہ ہوگا؟ یقیناً ہوگا کہ یہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں آپ کا خون

بڑھاتی ہیں۔ اطمینان رکھیے کہ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں آپ کو وقتاً فوقتاً ملتی رہیں گی!

مہنگائی نے اپنا جلوہ قدم قدم پر اِس طرح دِکھانا شروع کیا ہے کہ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ کسی چیز کی قیمت میں کمی واقع نہ ہونے پر غم زدہ ہونے کے بجائے اِس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ قیمت "مستحکم" یعنی برقرار ہے! گویا قیمت کا نہ بڑھنا بھی کمی ہی کے زمرے میں شمار کیا جانے لگا ہے!

کون سی چیز ہے جو افراطِ زر کے اثرات سے محفوظ ہے؟ اشیا خور و نوش اور روزمرہ استعمال کی بہت سی اشیاء کی قیمتیں آبادی کی رفتار سے بھی زیادہ رفتار سے بڑھ رہی ہیں۔ جب تک کھیتوں میں ہوتی ہیں، سبزیوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ بس منتظر ہی رہتی ہیں کہ کوئی توڑے اور کھائے! مقام کی تبدیلی اُن کی قدر و قیمت میں بھی بے مثال تبدیلی کی راہ ہموار کرتی ہے!

سر پھول وہ چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اُسے ملی جو وطن سے نکل گیا!

کے مصداق سبزیاں کھیت سے شہر کی سبزی منڈی تک پہنچتی ہیں تو اُن کی شان ہی نرالی ہو جاتی ہے۔ سبزیوں کے دام یومیہ بنیاد پر تبدیل ہوتے ہیں۔ ایسے میں

اگر دو چار دن دام نہ بڑھیں تو دل کو ایسی خوشی ملتی ہے کہ یقین ہی نہیں آتا!
کریلے بعض اِنسانوں کی طرح پیدائشی کڑوے ہوتے ہیں اور اگر مہنگائی کے نیم پر چڑھ جائیں تو اُن کا کڑوا پن دو آتشہ ہو جاتا ہے! جو ٹنڈے اور کدّو مذاق اُڑانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں اُن کی قیمت سُن کر اپنی ٹِنڈ پر چپت پڑتی محسوس ہوتی ہے! ایسے میں اگر کبھی، نجم مقدر کے اوج پر ہونے کے طفیل، ایسی ہی دو چار سبزیاں سستی ملیں تو لگتا ہے کہ امیدوں کی کھیتی ہری ہو گئی ہے، ایک نیا جہاں مل گیا ہے! یاد رکھیے غریبوں کو نیا جہان اِسی طرح مِلا کرتا ہے!

جو حال سبزیوں کا ہے وہی انڈوں کا ہے۔ اُن کے دام سن کر خریدار کا منہ زردی کی طرح پیلا پڑنے لگتا ہے! چار انڈوں کا آملیٹ بنانا ہو تو اچھے خاصے پیسوں کا آملیٹ بن جاتا ہے! ہوٹل میں تو دو یا تین انڈوں کا آملیٹ بنوایئے تو اُس میں انڈے کون گنتا ہے مگر گھر میں آملیٹ بنانا ہو تو لگ پتہ جاتا ہے! انڈوں کے دام اُسی طرح اچانک چڑھتے اُترتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں اچانک جمہوری حکومت کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے! کئی بار ہم نے سوچا کہ کیا انڈے کے خول میں سونا ہوتا ہے جس کی قیمت دکاندار ہم سے وصول کر رہے ہوتے ہیں! اگر تین چار

دن انڈوں کے دام نہ بڑھیں تو دل کو عجیب سے راحت محسوس ہوتی ہے اور وہ کچھ دیر کے لیے مایوسی کے خول سے باہر آ جاتا ہے! ایسے میں دکاندار سے زیادہ مُرغی کا شکریہ ادا کرنے کو جی چاہتا ہے!

کراچی والوں کو سمندر جیسی نعمت سے سرفراز کرکے قدرت نے واقعی بڑا احسان کیا ہے۔ لوگ ساحل پر ٹھنڈی ہوا سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کو ہم نے ساحل پر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے دیکھا ہے گویا دو تین دن کا اسٹاک جمع کر رہے ہوتے ہیں! اب بھلا اِس بات پر بے چارے غریب خوشی کیوں محسوس نہ کریں کہ حکومت اِس کے عوض کچھ نہیں لیتی! اگر کل کو کسی سرکاری میٹنگ میں یہ معاملہ زیر بحث آیا تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ساحل پر جانے والوں سے ہوا خوری ٹیکس وصول کیا جانے لگے! ساحل پر ایسی مشینیں لگائی جا سکتی ہیں جو پھیپھڑوں کو چیک کرکے بتائیں کس نے اپنے پھیپھڑوں میں کتنی تازہ ہوا لی ہے! تو جناب! جب تک ساحل پر ہوا خوری کا ٹیکس وصول نہیں کیا جا رہا، اللہ کا شکر ادا کیجیے۔ ہماری آپ کی خوشیاں تو اب ایسی ہی باتوں کے سُتونوں پر قائم ہے!

اور جناب! گھر کے پُرسکون ماحول میں فلیپنگ کے ذریعے درجنوں ٹی وی چینلز پر مختلف وجوہ اور انداز کی حامل قتل و غارت، شاہراہوں پر دندناتے دہشت ٹارگٹ کِلرز، ویران سڑکیں، ایک بڑی آبادی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والی کٹی

پہاڑی، اُجڑے ہوئے مکانات، جلی ہوئی دکانیں اور دوسرے بہت سے دل دہلا دینے والے مناظر سے کماحقہ "محظوظ" ہونے کے بعد جب آپ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیتے ہیں تو اپنے بقیدِ حیات ہونے پر کیا دِل میں انجانی سی خوشی محسوس نہیں ہوتی! ہوتی ہے نا! ہونی ہی چاہیے۔ یہی تو وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں جو اب ہم غریبوں کا اثاثہ ہیں! جو کچھ آپ دیکھ رہے اور محسوس کر رہے ہیں اُسے جھیلتے ہوئے زندہ رہنا کسی بھی سرکس کے بڑے سے بڑے کرتب سے بھی بڑا کرتب ہے! اِس قدر "باکمال" ہونے پر خوشی نہ ہو، یہ تو ممکن ہی نہیں"

جو لوگ کراچی میں پیدا ہوئے اور یہاں عمر کی پانچ دہائیاں پوری کر چکے ہیں وہ بھی اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہ شہر ہے یا کئی چھوٹے شہروں کا مینا بازار! ایک شہر میں کئی شہر بالکل اُسی طرح "ٹھنس" گئے ہیں جس طرح منی بس کے مسافر ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں! شہر میں سفر کرنا کچھ کچھ سیاحت کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے! ہمیں حکومت کا احسان مند ہونا چاہیے کہ شہر کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جانے پر ہم سے سیاحتی ٹیکس وصول نہیں کرتی! قدم قدم پر بھانت بھانت کی بولیاں سُننے ملتی ہیں اور شہر پر کبھی جنگل اور کبھی سرکس کا گمان ہوتا ہے! رنگ۔برنگے کلچرز اِس شہر کے رگ و پے میں میں پیوست ہو رہے ہیں۔۔برادریوں کا بازار گرم ہے، قبا ئلی سوچ دُکان سجائے بیٹھی ہے، جہاں تہاں تعصب اژدہے کی طرح منہ کھولے کھڑا ہے! شناخت کا مسئلہ اِس لیے حل نہیں ہو پا رہا کہ اب تک ہم یہی طے نہیں کر پائے کہ زبان، نسل، رنگ، آبائی تعلق، مسلک، طبقہ اور دیگر بہت سے آپشنز میں سے کسے یا کسے کسے اپنائیں! زندگی اپنی تمام مُسلّمہ اعلیٰ اقدار کے ساتھ اِن جھمیلوں میں کچھ ایسی گم ہوئی ہے کہ لاکھ تلاش کرنے پر بھی کہیں دِکھائی نہیں دے رہی!

کراچی کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہ وقت کے ساتھ چلنے سے قاصر ہے۔ اِس کے نصیب میں صرف پھیلنا لکھا ہے، پنپنا نہیں۔ اِتنے بڑے خوان نعمت کو برتنے میں ہم سبھی زبردست کفران نعمت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ قیامت نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم میں سے بیشتر ایک دوسرے کو اپنانے سے زیادہ دفنانے میں دلچسپی لے رہے ہیں!

نظریات کے نام پر صرف فروعی اختلافات کی آگ کو ہوا دے کر اِس پر قومی مفادات کو تِنکوں کی طرح بھونا جارہا ہے! قوتِ برداشت کا رونا تو بہت رویا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم صرف جامد رویّوں کے آغوش میں آ بیٹھے ہیں! جس میں قوت ہے وہ اُس کا حق ادا کرنے کے بارے میں نہیں سوچتا اور صرف تماشا دِکھانے پر تُلا ہوا ہے۔ شہر بھر میں مشہور و معروف تعلیمی اداروں کی کمی نہیں مگر کہیں بھی یہ بات نہیں سِکھائی جاتی کہ طاقت عزت بڑھانے کے لیے ہوتی ہے، کسی کی پگڑی اُتار کر اپنے قدموں میں ڈالنے کے لیے نہیں! ثابت ہوا کہ ہم اب تک غار کے زمانے کی ذہنیت کے غار سے باہر نہیں آئے اور شاید باہر آنا چاہتے بھی نہیں!

شہر میں قدم قدم پر سڑکیں اور پُل تو بہت تعمیر ہو چکے مگر رشتوں کو تعمیر کرنے کی فکر ہمیں اب تک دامن گیر نہیں ہوئی! آپس کے تعلقات بہتر بنانے کے بجائے ہم اُنہیں مزید بگاڑنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ بچوں کی سی معصومیت تو ہم میں پیدا نہ ہو سکی، ہاں اُن کی سی ہٹ دھرمی ضرور ہم میں در آئی ہے۔ ہم

ہونے کی شعوری کوشش نہیں کی۔ اِس لیے خاصے CHILD-LIKE نے کبھی
ہوگئے ہیں! جذبات، احساسات اور اقدار کی قدر ہو نہ ہو، کراچی میں CHILDISH
مِٹی کی قدر ہے اور سونے کے دام بکتی ہے۔ اور اِس مٹی کے فرزند بھی فرزندی کا حق
خوب ادا کر رہے ہیں! حمایت علی شاعر نے سچ ہی تو کہا ہے کہ

کِس لیے کیجیے کِسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جبکہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ!

شہر بھر میں بلند و بالا عمارات ہیں، پُر پیچ سڑکیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا چیستان ہے، یہ کیسا جنتر منتر ہے جس میں ہمارا بہت کچھ اِس طرح لاپتہ ہوا ہے کہ اب ڈھونڈے سے بھی سُراغ نہیں مل پاتا! سڑکوں کو سگنل فری کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اب ٹریفک رواں ہوگا مگر صاحب! یہاں تو سبھی کچھ سگنل فری ہوگیا ہے! دہشت گردوں کے لیے تو پورا شہر ہی سگنل فری کوریڈورز میں تبدیل ہوگیا ہے! نتیجے شہری قدم قدم پر بدامنی کے انڈر پاس سے گزرنے پر مجبور ہیں! دِلوں میں جھانکیے تو کٹی پہاڑیاں دِکھائی دیں گی! کئی بنارس، کئی لالو کھیت، کئی جوہڑ موڑ، کئی پہلوان گوٹھ، کئی پاک کالونیاں ہمارے دل کے نگر میں آباد ہو کر اُسے ویرانے میں تبدیل کی سعی کر رہی ہیں!

جیسے ہم ہیں ویسا ہمارا شہر ہے، یعنی ہمارے رویّوں کا عکس۔ کراچی کے مزاج

میں بھی اب وہی بے اعتدالی در آئی ہے جو ہمارے مزاج کا لازمی جُز ہے۔ ہماری بے صبری، عجلت پسندی، بے حِسی، بے دِلی .... سبھی کچھ کراچی کے مزاج میں رچ بس گیا ہے۔

کراچی سمندر کے کنارے آباد ہے۔ مگر مقام افسوس و عبرت ہے کہ اب تک اِس میں سمندر کی سی گہرائی و گیرائی پیدا نہیں ہو پائی۔ شہر کے لوگ ساحل تک آتے ہیں اور کچھ دیر محظوظ ہو کر چلے جاتے ہیں۔ یہ ہوا خوری اب ہماری پوری زندگی پر محیط ہو چکی ہے! اہل کراچی چونکہ صرف ساحل سے واقف ہیں اِس لیے اُن کا مزاج بھی ساحل کی ریت کا سا ہوگیا ہے! ساحل کی گیلی ریت پر پاؤں سے دباؤ ڈالیے تو پانی ہٹ جاتا ہےاور ریت خشک سی ہو جاتی ہے اور پیر ہٹاتے ہی ریت پھر گیلی ہو جاتی ہے۔ بس کچھ ایسی ہی حالت اب ہمارے ذہن کی بھی ہے۔ ذرا سی دیر کو ہم ہوش میں آتے ہیں اور پھر سبھی کچھ پہلے جیسا ہو جاتا ہے! گویا سمندر کے کنارے عدم تحمل اور جامد روّیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے! بحیرہ عرب کا دوسرا کنارا تو شاید ہم کسی نہ کسی طرح دیکھ لیں مگر اپنی بدمزاجی کے سمندر کا دوسرا کنارا ہمیں دِکھائی دے،اِس کی کوئی امید نظر آتی ہے نہ امکان۔

وہی بستیاں پنپتی اور پھلتی پھولتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اگر

عصری تقاضے نظر انداز کر دیئے جائیں تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ یہی حال کراچی کا ہے۔ شہر بھر میں بنیادی ڈھانچوں کا جال بچھا ہوا ہے، مگر دِلوں کو جوڑنے والے بنیادی ڈھانچے تعمیر کرنے پر توجہ نہیں دی جا رہی۔ ایسے سگنل فری کوریڈور نہیں بنائے جا رہے جن پر محبت بے روک ٹوک سفر کرے!

لاکھوں سال قبل زمین پر ڈائنوسارز کا راج تھا۔ ڈائنوسارز کے معدوم ہونے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وہ بدلتے وقت اور حالات کا ساتھ نہ دے سکے یعنی تبدیل نہیں ہو پائے۔ بہت سے ڈائنوسارز ایسے تھے جن کا وزن پچیس ہزار کلو گرام سے زیادہ تھااور دماغ کا وزن محض ایک کلو گرام جتنا تھا! آنکھ جو کچھ دیکھتی تھی، چھوٹا اور نحیف سا دماغ اُس سے مطابقت رکھنے والے رِدِ عمل کا مظاہرہ نہیں کر پاتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وزن بڑھتا گیا اور دماغ چھوٹا ہوتا گیا۔ یہ صورت حال اِن ڈائنوسارز کے مزید سُست پڑتے جانے پر منتج ہوئی۔ بعض ڈائنوسارز کے لیے تو دس بیس قدم چلنا بھی محال ہو گیا۔ کراچی کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ اہل دانش کسی بھی شہر کے لیے دماغ یا ذہن کا درجہ رکھتے ہیں۔ سمجھنے اور سوچنے کی تحریک دینے والوں کو ختم یا نظر انداز کرکے کراچی کے دماغ کو چھوٹا کیا جا رہا ہے، شاہ دَولہ کے چوہوں کی طرح!

ہم بھول گئے ہیں کہ شہر مشین نہیں ہوتے، یہ زندہ انسانوں کی طرح سانس لیتے

ہیں۔ ہر شہر کے سینے میں دِل ہوتا ہے اور اس دِل کی دھڑکن وہ لوگ ہوتے ہیں جو اِس کی حدود میں بستے ہیں۔ لوگوں کے دِل مُردہ ہوں گے تو شہر بھی مُردوں کی طرح جیے گا! کراچی کو محض جینے والوں کی نہیں، سمجھنے اور سوچنے والوں کی بھی ضرورت ہے۔ اگر ہم اقدار اور جذبات کی قدر کریں گے تو کراچی کا دماغ توانا بھی رہے گا اور اِس کا حجم بھی بڑھتا رہے گا۔ اگر ہم نے کراچی کے دماغ کا حجم بڑھانے کی کوشش نہ کی تو یہ شہر بھی کسی قوی الجثہ ڈائنوسار کی طرح معدوم ہو رہے گا!

یہ تیرے "پُر اِصرار" بندے

"آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔"

"ذرا سی بریانی یا قورمہ اور لیجیے نا!"

"یہ فیرنی بھی تو آپ ہی کے لیے ہے۔"

"جہاں تک مجھے یاد ہے، میٹھے سے آپ کا پرہیز تو ہے نہیں۔ پھر ہاتھ کیوں کھینچ لیا؟"

کسی بھی دعوت میں اِس قسم کے جملے اکثر سُنائی دیتے ہیں۔ آپ شاید ایسے جملوں کو عزت افزائی کا ذریعہ سمجھتے ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات یہ میزبان کی طرف سے طنز یا تبرّے کی شکل میں ہوتے ہیں! جو پہلے ہی بریانی کی دو فل پلیٹیں ٹھونس کر بیٹھا ہو اُس سے مزید کچھ لینے کی فرمائش کرنا سر بہ سر طنز نہیں تو اور کیا ہے؟

ہم ایک ایسے معاشرے میں جی رہے ہیں جس کی فضاء میں آکسیجن سے زیادہ فرمائشیں، التجائیں، التماس اور اِصرار پایا جاتا ہے! بیویاں شاپنگ کے لیے پہلے تو اِصرار کرتی ہیں۔ اور پھر؟ جس طرح انڈے سے چوزا نکلتا ہے بالکل اُسی طرح

بیگمات کے اِصرار کا خول توڑ کر حکم برآمد ہوتا ہے! اور ظاہر ہے کہ
پھراس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی کے مصداق بے چارے شوہروں کو حکم کی
تعمیل کرتے ہی بنتی ہے! عقل مند وہی ہے جو اہلیہ کے حکم کی تعمیل کے خول میں بند
رہے ورنہ اُس کے چراغوں میں بھی روشنی نہ رہے گی!

اِصرار کچھ بیگمات تک محدود نہیں، یہ صفت ہمارے معاشرے میں ہر طرف اور ہر کس و ناکس میں پائی جاتی ہے۔ ایک چوھدری صاحب کے بہت سے خُدّام تھے مگر جمال دین خاص الخاص تھا۔ جمال دین کے بیٹے نے ایک دن باپ کو بتایا کہ اُسے چودھری صاحب کی بیٹی سے پیار ہوگیا ہے لہٰذا رشتے کی بات چلائیں! یہ سن کر باپ کے تو پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ بیٹے پر لعن طعن کی کہ ہوش میں تو ہے، یہ کہاں آنکھ لڑا بیٹھا ہے! مگر جب بیٹے نے بہت اصرار کیا تو جمال دین ہمت کرکے چودھری صاحب سے بات کرنے پہنچا۔ چودھری صاحب چوپال میں محفل جمائے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے خادم خاص کو دیکھتے ہی کہا "آؤ آؤ جمال دین! بہت دن بعد آئے، کہاں تھے؟ خیریت تو ہے؟"

جمال دین نے کہا "چودھری صاحب! آپ سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔"

چودھری صاحب بولے "جمال دین! تم ہمارے خاص آدمی ہو، جو کہنا ہے سب کے سامنے کہو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" چودھری صاحب سے اجازت پاکر جمال دین نے بیٹے کے رشتے کی بات کی۔ یہ بات سن کر چودھری صاحب سکتے میں آگئے! اُن کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جمال

دین ایسی کوئی بات کہے گا! چند لمحات کے بعد حواس بحال ہوئے تو اُنہوں نے جمال دین کے حواس "بحال" کرنے کی کوشش کی یعنی ٹھکائی کا آغاز کیا! ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی اِس ٹھکائی میں خوب حصہ ڈالا۔ جب جمال دین ادھ مُوا ہوگیا تو کسی نے کہا چودھری صاحب! لعنت بھیجیں، اِسے معاف کردیں۔ چودھری صاحب نے فائنل لات رسید کرتے ہوئے کہا جا، دفع ہو جا۔ جمال دین اُٹھا اور کپڑے جھاڑ کر بولا "تو پھر چودھری صاحب! میں آپ کی طرف سے اِنکار سمجھوں؟" بعض پیشوں کی بنیاد بھی کچھ اِسی نوعیت کی "اِستقامت" اور اِصرار پر ہے۔

کسی جگہ چند افراد مل کر ایک بندے کی پٹائی کر رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر دو ایک کیمرا مین یہ واقعہ ریکارڈ بھی کر رہے تھے۔ ایک صاحب حیران ہوئے کہ کسی کی پٹائی ہو رہی ہے اور ٹی وی چینل والے صرف فلم بنانے پر اکتفا کئے ہوئے ہیں۔ اکیلے بندے کو پٹائی سے بچانے کے لیے کوئی آگے کیوں نہیں بڑھتا؟ یہ سوچ کر وہ ابھی دو قدم بڑھے تھے کہ ٹھٹھک کر رک گئے۔ اچھی خاصی پٹائی سے سرفراز ہونے والا ہنستا ہوا اٹھا اور کچھ کہا۔ پھر پٹائی شروع ہو گئی۔ چند لمحات گزرے ہوں گے کہ وہ پھر ہنستا ہوا اٹھا۔ مار کھانے والے کا درد اپنے سینے میں محسوس کرنے والے صاحب نے پوچھا آخر بات کیا ہے کہ یہ شخص مار کھا کر ہنستا ہوا اٹھتا ہے۔ اُنہیں بتایا گیا کہ یہ شخص انشورنس ایجنٹ ہے

اوراِس وقت فائنل ٹریننگ سیشن چل رہا ہے ! مستقل مزاجی ہو تو ایسی ہو۔ حقیقی اور سچّا انشورنس ایجنٹ وہی ہے جس کے لیے مرزا غالب کہہ گئے ہیں۔

!گالیاں کھاکے بے مزانہ ہوا

اگر فائنل ٹریننگ سیشن میں اپنائے جانے والے معیار یعنی ہنستے ہوئے مار کھانے کو ذہن نشین رکھا جائے تو بیشتر آزمودہ کار شوہر انشورنس ایجنٹ بننے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں ! حالات کے تھپڑ اور لاتیں کھاکر اٹھنا اور ہنستے ہوئے مزید پٹائی کے لیے تیار ہونا ہر ! تجربہ کاری اور پختہ شوہر کا طرّہ امتیاز ہوا کرتا ہے

میر تقی میر سے غلطی یہ ہوئی کہ اُنھوں نے فقیرانہ انداز سے صدا کرنے کو توقیر بخشی اور اپنے ایک مطلع کا حصہ بنایا۔

فقیرانہ آئے، صدا کرچلے

میاں خوش رہو، ہم دعا کرچلے

یاروں نے اِس بات کو پلّے باندھ لیا۔ آرام سے سونا تو بہت دور کی بات ہے،آپ گھر میں سُکون سے بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ ہر پانچ منٹ بعد کوئی صدا لگاتا ہوا گزرتا ہے اور آپ کا سارا سُکون غارت کردیتا ہے۔ گلی گلی پھیرا لگاکر

مال بیچنے والوں کا تعلق "اِصراری" قبیلے سے ہے۔ جس طرح انڈین چینلز پر قسطیں بڑھتی جاتی ہیں اور سیریل ختم ہونے کا نام نہیں لیتا، اُسی طرح جب پھیری لگانے والے گزرتے ہیں تو گویا قافلہ سا چل پڑتا ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے لیے بستر پر دراز ہوئے مگر ابھی آنکھیں موندی ہی تھیں کہ کسی کی صدائے دل خراش سے اُٹھ بیٹھے۔ دروازہ کھول کر گلی میں دیکھنے پر پتہ چلا کہ گلی کے ایک کونے پر کوئی ٹھیلے پر سُپر اسٹور سجائے کھڑا ہے اور دوسرے کونے پر کسی نے ٹھیلے کو بُھوسی ٹکڑوں سے آراستہ کر رکھا ہے! بہت سی صدائیں سنگ دِل محبوب کی طرح اچھا خاصا دھوکہ دیتی ہیں۔ ایک بار شدید گرمی میں کسی ٹھیلے والے کی "صدائے دل نشیں" نے ہمیں گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ ہم نے سوچا جب ٹھیلا گھر تک آ ہی گیا ہے تو کیوں نہ پاؤ ڈیڑھ پاؤ فالسے خرید کر شربت بنوالیں۔ اِس نیت کے ساتھ گھر سے نکلے تو معلوم ہوا کہ موصوف اُبلے ہوئے سِنگھاڑے فروخت فرما رہے ہیں! ہم نے شِکوہ کیا کہ بھائی! سِنگھاڑے بیچنے کے لیے ایسی آواز کیوں لگاتے ہو کہ لوگ فالسے سمجھ کر گھر سے نکل آئیں۔ ہنس کر فرمانے لگے "کیا کروں بابو جی؟ اللہ نے جُبان میں مِٹھاس (!) ہی اِتنی رکھی ہے۔" اُن کی یہ بات سُن کر ہم سُن ہوگئے، ایسا لگا جیسے کسی نے کان میں اُبلے ہوئے سنگھاڑے رکھ دیئے ہیں!

عمران خان براستہ رانا ثناء اللہ

رانا ثناء اللہ خان کی مہربانی سے وہ کام بھی ہوگیا جس کی ہمیں کبھی امید ہی نہ تھی۔ ہم عمران خان کے زبردست مداح رہے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ان سے کئی بار آٹو گراف بھی لیا۔ ان کی بولنگ، بیٹنگ اور قائدانہ صلاحیت کے ہم بھی اتنے ہی دیوانے رہے ہیں جتنی یہ پوری قوم رہی ہے۔ مگر خیر، یہ سب تو ان کے سیاست میں آنے سے پہلے کی باتیں ہیں۔

بات ہو رہی تھی رانا ثناء اللہ کی۔ جب سے عمران خان نے سیاست کی دنیا میں قدم رکھا ہے، پاکستان میں "عمرانیات" کے ماہرین کی تعداد کئی گنا ہو گئی ہے۔ اب عمران خان تک پہنچنے کے لیے ان ماہرین کے ذہن میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے! پنجاب کے وزیر قانون نے تمام قوانین اور اخلاقی ضابطوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ایک بار پھر "عِمرانیات" کا ماہر ہونے کا ثبوت ایسی عمدگی سے فراہم کیا ہے کہ ہم تو انگشت بہ دنداں ہیں! رانا صاحب نے عمران خان کے بارے میں ایسی روانی سے "گوہر افشانی" کی ہے کہ اُن پر بس فِدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ آپ سوچیں گے کہ ہم اگر عمران خان کے ایسے ہی مداح رہے ہیں تو اُن کی "کھنچائی" پر اِس قدر خوش کیوں ہو رہے ہیں!

بات یہ ہے کہ رانا ثناء اللہ

جیسی شخصیات ہمارا کام آسان کر دیتی ہیں۔ میڈیا سے اُن کی دو چار منٹ کی گفتگو بھی ہمیں کالم کا موضوع ہی نہیں، مواد تک فراہم کر دیتی ہے! رانا صاحب کے اِس "خلوص" کو میڈیا والے کس طور نظر انداز کر سکتے ہیں کہ مائکروفونز دیکھتے ہی وہ بولنے "لگ پڑتے" ہیں! کسی زمانے میں میڈیا والے جس طرح پیر صاحب پگارا کی لب کشائی کے منتظر رہا کرتے تھے، اُسی طرح ہم ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لیکر ٹی وی چینلز پر رانا صاحب کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں!

رانا صاحب نے اسلام آباد میں میڈیا سے گفتگو کے دوران عمران خان کو مشورہ دیا ہے کہ وہ سیاست کو بخش دیں اور بچوں کو کرکٹ سکھائیں یا مزید ہسپتال کھول لیں۔ ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ عمران خان کی اوپر والی منزل خالی ہے! یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ کوئی اوپر والی منزل کو خواہ مخواہ کیوں خالی رکھے گا؟ ویسے رانا صاحب نے یہ بات کہہ کر ہمیں اور عمران خان کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے، جو ہمارے لیے تو یقیناً فخر ہی کی بات ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض احباب نے ہمارے کالم پڑھ کر زبانی تبصروں میں یہی بات کہی ہے یعنی کہ ہماری اُوپر والی منزل خالی ہے! عمران خان سیاسی میدان سے نکلے نہیں اور ہم بھی اب تک کالم پر کالم لکھے جا رہے ہیں، پس ثابت ہوا کہ احباب کے اِس تبصرے کا ہم نے بُرا مانا ہے نہ عمران خان نے! گویا ہم اِس معاملے میں بھی، زہے نصیب، خان صاحب کی ہم سَری کے مرتکب ہوئے ہیں! یہ سوچ

کر کہ احباب نے کچھ کہا ہے تو خلوص ہی سے کہا ہوگا، ہم نے کبھی کسی نکتہ داں سے یہ پوچھنے کی جسارت نہیں کی کہ اوپر کی منزل خالی ہونے کا مطلب کیا ہوتا ہے!

رانا صاحب نے عمران خان کو دوبارہ کرکٹ کی دنیا میں جانے کا مشورہ دیکر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کی کوشش کی ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ عمران خان سیاست کو کھیل کا میدان سمجھ کر اِس طرف آ نکلے تھے۔ اُنھیں شاید اندازہ نہیں تھا کہ سیاست کے بہترین داؤ پیچ سیکھنے کے لیے کھیلوں ہی کی دنیا کافی تھی! اور کھیلوں میں بھی کرکٹ کا جواب نہیں جو اپنی طرف آنے والے ہر شخص کو زبردست سیاست دان میں تبدیل کر دیتا ہے! یقین نہ آئے تو آج کل کے کرکٹرز کو دیکھیے جو میڈیا کی پچ پر زیادہ اچھا کھیلتے ہیں! اگر عمران خان نے رانا صاحب کے مشورے پر عمل کیا تو بچوں کو کرکٹ سکھانے کی آڑ میں ایسے سیاسی داؤ پیچ سیکھ کر واپس آئیں گے کہ ہما شُما تو اُن کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں سکیں گے!

رانا صاحب مزید فرماتے ہیں کہ عمران خان رات کو خواب میں جو کچھ دیکھتے ہیں اُسے صبح بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ کسی کے خواب دیکھنے پر پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ اب کیا عمران خان

خواب بھی نہ دیکھیں؟ لے دے کر یہی تو وہ میدان ہے جس میں وہ اپنی مرضی کا میچ صرف کھیل ہی نہیں، جیت بھی سکتے ہیں!

خواب بہت کام کی چیز ہیں۔ یہ انسان کی تمام خواہشات پوری کر دیتے ہیں، اور وہ بھی اضافی خرچ کے بغیر! حزب اختلاف کے لوگ اقتدار میں آنے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور جنہیں اقتدار مل جاتا ہے اُنہیں جب سیاسی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا ہے تو عوام کے مسائل خوابوں کی دنیا میں جا کر حل کرتے ہیں! بعض وزراء تو اتحادی جماعتوں کی ناراضی دور ہونے کا پہلے خواب دیکھتے ہیں اور پھر تعبیر کا اہتمام بھی کرتے ہیں تاکہ سند رہے! ویسے آج کی سیاست میں ہم خیال جماعتوں کا روٹھنا اور من جانا کسی خواب یا اس کی تعبیر کا محتاج نہیں رہا! جہاں مفاداتی غنودگی ہو وہاں ایسے ہی خواب اور ایسی ہی تعبیریں ہوا کرتی ہیں! اگر عمران خان خواب دیکھ کر بولتے ہیں تو اِس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ رانا صاحب نے خود ہی اُوپر کی منزل کے خالی ہونے کی بات کہی ہے۔ جب اُوپر کی منزل خالی ہو تو انسان ذرا اور اُوپر کی منزل یعنی خوابوں کی دنیا ہی سے کام کی باتیں تلاش کرکے لائے گا اور دُنیا کے سامنے بیان کرے گا!

رانا صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ تحریکِ انصاف کے چند ناکام اور نام نہاد

رہنما ہر شب عمران خان کو وزیر اعظم ہاؤس میں چھوڑ کر آتے ہیں اور خود کو ایک فرضی کابینہ کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ہمیں اِس اعتراض پر شدید اعتراض ہے۔ ہمارے ہاں کون ہے جو خود کو وزیر اعظم سمجھنے کے لیے ہر وقت تیار نہیں؟ اگر عمران خان کو اُن کے اندرونی حلقے کے لوگ باتوں ہی باتوں میں وزیر اعظم ہاؤس چھوڑ آتے ہیں تو اِس میں ہرج ہی کیا ہے؟ یہ تو ہمارے ہر اُس سیاست دان کا معمول ہے جسے محض تین چار ہم نوا میسر ہوں!

رانا صاحب کو شاید "اعتراضو فوبیا" ہوگیا ہے! وہ اِس امر پر بھی معترض ہیں کہ عمران خان جہاں بھی دو تین درجن افراد کو دیکھتے ہیں، جلسہ سمجھ کر تقریر کرنے لگتے ہیں! اِس میں عمران خان کا کیا قصور؟ ہمارے ہاں لوگ تقریر پسندی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ کوئی سوچے سمجھے بغیر دل کا حال بیان کرنا چاہے تو گوش ہائے نصیحت نیوش کی کوئی کمی نہیں! اب اِتنی سی بات پر رانا صاحب نے عمران خان کے دماغی معائنے کا مشورہ دے ڈالا ہے۔ اگر دس بیس افراد کو مجمع سمجھ کر تقریر جھاڑنا ذہن یا دماغ کا خلل ہے تو پھر اِس ملک میں شاید کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ ملے جسے ذہنی مریض قرار نہ دیا جائے! یہ تو عمران خان کا خلوص اور وضع داری ہے کہ دو تین درجن افراد دیکھنے کے بعد اسٹارٹ ہوتے ہیں، ورنہ یہاں تو ایسے بھی ہیں جو صرف "چشم تصور کی آنکھ" سے اپنے سامنے مجمع دیکھتے ہیں اور ٹی وی پر اینکر سے گفتگو کو بھی جلسے سے

!خطاب کا رنگ دے بیٹھتے ہیں

رانا صاحب سے عرض ہے کہ پوری قوم کی اُوپر کی منزل خالی دکھائی دے رہی ہے۔ ایسے میں صرف عمران خان کو موردِ الزام ٹھہرا کر اُنہیں مزید انفرادیت بخشنے کی کوشش نہ کریں۔ دماغی معائنے کا مشورہ بھی سوچ سمجھ کر ہی دیا جاتا ہے۔ اگر کسی نے مشورے پر عمل کرلیا اور علاج کے بعد ڈھنگ سے بولنا شروع کر دیا تو ہم کیا اور کیسے لکھا کریں گے!

اللہ سے تجارت

ایک بار پھر رمضان المبارک ہماری زندگی کا حصہ بنا ہے۔ صحرا کے ذرّوں اور سمندر کے پانی کی بوندوں کا شمار تو ممکن ہے، ماہِ صیام کی برکات کا شمار ممکن نہیں۔ مگر ہم بھی کیا لوگ ہیں کہ اس مبارک مہینے میں بھی خود کو بدل نہیں پاتے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ روزے کی حالت میں قوتِ برداشت بڑھ جاتی ہے اور امراض کی شدت میں نمایاں کمی واقع ہوتی ہے۔ ماہرین کی بات یقیناً درست ہوگی مگر ہمارے ہاں تو چونکہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے اِس لیے رمضان المبارک کے دوران بھی لوگ بگڑے ہی رہتے ہیں بلکہ بعض تو مزید بگڑ جاتے ہیں۔

مرزا تنقید بیگ کا شمار بھی اُن لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں روزے کی حالت میں ہاتھ لگانا اور چھیڑنا منع ہے! روزے کی حالت میں ڈیڑھ دو بجے تو اُن کا یہ حال ہوتا ہے کہ ذرا سی بھی ایسی ویسی بات ہو جائے تو اُن کے دماغ کا پارہ غصے کے مارے آپ پارہ چوک بن جاتا ہے! ایسے میں لوگ قریب جاتے ڈرتے ہیں! اور اگر کسی نے پوچھ لیا کہ کیا جناب روزے سے ہیں، تو بس یہ سمجھ لیجیے کہ اُنہیں سُرخ کپڑے کا ٹکڑا دِکھا دیا! ایسی حالت میں اُنہیں کنٹرول کرنے کی کوشش کرنے والے اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کام نفس پر قابو پانے سے دَس

کتنا مشکل ہے ! ہم نے ایسے لمحات میں اکثر اُن سے بہت آسانی سے مات کھائی ہے،
!یعنی کچھ بھی سمجھانے سے فوراً توبہ کی ہے

مگر صاحب ! ہم صرف مرزا تنقید بیگ ہی کو کیوں مطعون کریں؟ روزے کی حالت میں ذرا سی بات پر پھٹ پڑنا تو اب معاشرے کی عام روش ہے۔ جس محفل میں بیٹھیے، لوگ اشارہ پاتے ہی باطن کو ظاہر بنانے کے لیے بے تاب دکھائی دیتے ہیں۔ بس کے سفر میں لوگ بس موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی کچھ کہے اور اُسے لتاڑیں۔

کلاس روم میں بچے ڈرتے ہیں کہ ٹیچر سے کچھ پوچھنے پر کہیں بہت کچھ سُننا نہ پڑے ! اور تو اور، بھکاری کو "معاف کرو بابا" کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں نوٹوں سے
!بھری جھولی دِکھا کر سب سے کے سامنے شرمندہ نہ کردے

نفس کی کمزوری نے روزے کی حالت کو حواس کے تعطّل کی حالت میں تبدیل کردیا ہے ! اگر انسان کا نفس ٹیڑھا ہو اور سوچنا سرشت کا حصہ نہ ہو تو عبادت شدید تکبر بھی پیدا کردیتی ہے اور انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اللہ کی راہ پر گامزن ہو کر وہ دنیا کی قیادت کا فریضہ انجام دے رہا ہے یا کوئی بڑا احسان کر رہا ہے ! ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ روزے کی حالت میں ایسا چڑچڑا پن دکھاتے ہیں جیسے دن بھر بھوکا پیاسا رہ کر دنیا پر کوئی احسان

فرما رہے ہیں ! جو روزہ قوتِ برداشت میں اضافے کے لیے فرض کیا گیا ہے وہی ہماری قوتِ برداشت کو یکسر ختم کرتا دکھائی دیتا ہے !

رمضان المبارک میں شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔ اہل ایمان کے لیے مقام شکر ہے کہ اُنہیں ورغلانے والا کوئی نہیں رہتا۔ شیاطین کا معاملہ سمجھ میں آتا ہے مگر انسانوں کو کیا کہا جائے؟ ماہِ مقدس میں بھی بے صبری، بے دیانتی اور بدنیتی ترک کرنے پر آمادہ نہ ہونے والوں کو کس طور لگام دی جائے؟ کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرنے والوں نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ رمضان المبارک مالی فوائد بٹورنے کے بہترین موقع کا بھی درجہ رکھتا ہے ! رمضان کا چاند دکھائی دیتے ہی "ون ٹو کا فور" کی ذہنیت رکھنے والے شرم، لحاظ، مروت .... سبھی کچھ بالائے طاق رکھ کر صرف یہ بات ذہن نشین رکھتے ہیں کہ لوگوں کی جیب اِس طرح خالی کرانا ہے جیسے عید کے بعد دنیا کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا ہے !

شیاطین ایک ماہ تک مقید رہ کر ہمیں دیکھتے اور محظوظ ہوتے ہوں گے کہ ہم اُن کی معاونت" کے بغیر بھی وہ سب کچھ کرنے پر کمربستہ ہیں جو اُن کے ایجنڈے کا حصہ ہے !" سچ تو یہ ہے کہ اپنے بیشتر اُمور میں گراوٹ برقرار رکھنے کے لیے ہم شیاطین سے رہنمائی کے محتاج بھی نہیں رہے ! سب کچھ برباد کر ڈالنے کے لیے

ہمارے اندر کی کھوٹ کافی ہے۔ ہمارے وجود کی کھوٹ نے ماہِ صیام کی برکات کو ہم سے دور کردیا ہے۔

یہ مبارک مہینہ اللہ سے تجارت کا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ہم اُس کی خاطر ذرا سی قربانی دیں اور وہ ہمیں بے حساب نواز دے۔ اللہ سے تجارت تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ اللہ کو تو بس بہانہ چاہیے ہمیں بخشنے اور نوازنے کا۔ اللہ کی رحمت اور برکت کائنات کے خالق اور ہم سب کی زندگی کے مالک نے جس تجارت کی دعوت دی ہے وہ تو ہمیں یاد نہیں، صرف دُنیوی تجارت۔۔ بلکہ تاجرانہ ذہنیت ہمارے وجود میں باقی رہ گئی ہے۔ اور اِس ذہنیت کی فصل ہم خوب کاٹ رہے ہیں۔ تجارت تو ہم سال بھر کرتے ہیں۔ پوری پاکستانی قوم اب تاجرانہ ذہنیت کے ساتھ ہی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایسے میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ کچھ دن ہم اللہ سے بھی تجارت کریں، اُسے راضی رکھنے کی کوشش کریں؟ تجارت تو ہم سال بھر کرتے رہتے ہیں اور زندگی بھر کرتے رہیں گے۔ سودا وہ کیا جائے تو صرف نفع کا ہے، جس میں خسارے کا کہیں سے کوئی امکان ہی نہیں۔ جس طرح ہم افطار میں کوئی پھل کھاتے وقت بیج یا گٹھلی پھینک دیا کرتے ہیں بالکل اُسی طرح رمضان المبارک میں روزے کے دوران اپنے مزاج کی ساری کجی، تلخی اور تیزی بھی نکال کر پھینکنا لازم ہے۔ بیج کے ساتھ کھائے جانے کی صورت میں پھل بے مزا ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ روزے کا بھی معاملہ ہے۔ جب ہم روزے کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی

تبدیل نہیں ہوتے اور اپنی بدمزاجی اور بددماغی کو پورے اہتمام کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں تب اللہ ہمارے روزے کو اُسی طرح مسترد کردیتا ہے جس طرح وہ خشیت سے عاری اور تکبر سے آراستہ نمازوں کو لپیٹ کر ہمارے منہ پر مارے گا!

صرف یہ یاد رہنا چاہیے کہ ہم اِس وقت رب کو راضی کرنے کے مہینے میں ہیں، بدمزاجی دِکھانے یا تجوریاں بھرنے کے مہینے میں نہیں! اب ایک ماہ تک لین دین کرنا ہے تو رب سے کیجیے جو حقیقی نافع ہے۔ اور نافع بھی ایسا کہ دیتے وقت حساب کتاب کو بیچ میں نہیں آنے دیتا!

سُپر پاور" اور آٹے دال کا بھاؤ"

پاکستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ہر معاملے میں بھارت کی طرف دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔ قانون پسندی کی مثال دینا ہو تو بھارت، "ثقافتی ہم آہنگی" کی مثال دینا ہو تو بھارت۔ میڈیا کے ذریعے جو یلغار اہل ہند نے ہم پر کر رکھی ہے اُس کے زیر اثر بہت سے لوگ اب زندگی کے ہر معاملے کو بھارتی عینک کی مدد سے دیکھنے کے عادی ہیں۔

ایسے میں چمکتے بھارت سے اگر کوئی "حوصلہ افزا" خبر آئے تو خوشی کیوں نہ ہو؟

گزشتہ دنوں ہماری عزیزہ فیروزہ آپا احمد آباد سے آئیں تو ہم بھی ملنے گئے۔ جب اُن سے پوچھا کہ شہر گھوم پھر کر دیکھ لیا تو اُنہوں نے حالات کے ذمہ دار عناصر کو "خراج عقیدت" پیش کرنا شروع کردیا۔ کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس پر وہ خاصی دل برداشتہ تھیں۔ باتوں سے یکسر تاسّف جھلک رہا تھا۔ اُن کے دُکھی دِل کی باتیں سُن کر ہمارے پاس سَر جھکا دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اب بھلا مہمان سے کیا بحث کی جاتی؟ کراچی کے حالات کا رونا روتے روتے جب وہ سانس لینے کے لیے رکیں تو ہم نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اُن سے بھارت کا احوال پوچھ لیا۔ اُنہوں نے حب الوطنی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے دیس اور شہر

کے قصیدے پڑھنا شروع کیا۔ کراچی کے حالات کی روشنی میں بھارت کا احوال سُن کر ہم شرمندہ ہوتے گئے۔ (یہ بھی بڑی بات ہے، ورنہ آج کل شرمندہ کون ہوتا ہے!)
پھر ہم نے ایک ایسی بات پوچھی جس سے فیروزہ آپا کو بھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگیا۔ جی ہاں۔ آپ کا اندازہ درست ہے، ہم نے اُن سے آٹے دال کا بھاؤ پوچھ لیا! یہ گویا دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا تھا۔
بھارت سے جو بھی آتا ہے یا جو بھی ہو کر آتا ہے وہ وہاں دودھ اور شہد کی ندیاں بہنے کی بات کرتا ہے۔ گڈ گورننس کی مثال بھی دھڑلّے سے دی جاتی ہے۔ بھارتی ٹی وی چینلز ایک ایسی دنیا دِکھا رہے ہیں جس میں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ مگر جب فرسٹ ہینڈ انفارمیشن ملتی ہے تو جنت کا منظر پیش کرنے والا معاشرہ سیکنڈ ہینڈ دکھائی دینے لگتا ہے! بھارتی ٹی وی چینلز اپنے معاشرے کو خاصی چمک دمک کے ساتھ پیش کرتے ہیں مگر یہ نہیں بتاتے کہ اِس روشنی کے لیے تیل کی طرح جلنے والی جنتا کا کیا حال ہے!

جو تار سے نکلی ہے وہ دُھن سب نے سُنی ہے
جو ساز پہ گزری ہے وہ کس دِل کو پتا ہے!

فیروزہ آپا نے بتایا کہ مہنگائی تو بھارت میں بھی اچھی خاصی ہے۔ دودھ، گوشت، گھی، تیل، چاول، آٹا، سبزی، پھل .... کچھ بھی سَستا نہیں۔ جب اِن اشیاء کی

قیمتوں کا موازنہ پاکستان میں اِنہی اشیاء کی قیمتوں سے کیا تو اندازہ ہوا کہ پاکستان کم و بیش 10 تا20 فیصد سستا ہے!

ایک اور فرق فیروزہ آپا نہ بتا سکیں۔ بھارت میں صرف مہنگائی ہی زیادہ نہیں، کمانا بھی پاکستان سے کہیں زیادہ مشکل ہے! 1997 میں جب ہم آخری بار احمد آباد گئے تو ایک عزیز کے گھر پہنچ کر آٹو رکشہ سے اُترے اور پوچھا کہ میٹر کے حساب سے کتنے روپے بنے ہیں۔ رکشہ والے نے بتایا کہ میٹر 12 روپے بتا رہا ہے۔ ہم نے 15 روپے دیئے اور چل دیئے۔ رکشہ والے نے آواز دی۔ ہم واپس گئے تو اُس نے کہا باقی "رقم" تو لیتے جائیں! ہم نے کہا تین روپے کون سی بڑی رقم ہے، تم رکھ لو۔ اُس نے جھٹ سے پوچھا کیا آپ پاکستان سے آئے ہیں؟ ہم نے اثبات میں جواب دیا۔ اُس نے بتایا کہ یہاں تو کوئی دس بیس پیسے بھی نہیں چھوڑتا! اور پھر یہ بھی بتایا کہ سواری کو اِنکار کرنے کا اصول رائج نہیں۔ یعنی اگر کوئی رکشہ میں بیٹھ گیا ہے تو پھر وہ جہاں بھی جانا چاہے، لے جانا پڑے گا۔ خواہ واپسی پر رکشہ والے کو دو تین کلومیٹر خالی ہی آنا پڑے! وہاں کے رکشوں میں لگے ہوئے میٹر میں رقم دس دس پیسے کے حساب سے بڑھتی ہے۔ اگر میٹر 9 روپے 80 پیسے بتا رہا ہو تو لوگ 10 کا نوٹ دینے کے بعد 20 پیسے لینے کے لیے بھی رُکتے ہیں! بات اگرچہ اُصولی ہے مگر اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی بھی تو کوئی چیز ہے!

پورے معاشرے کا مزاج اِسی نوعیت کا ہے۔ اگر کسی کی جیب زیادہ بھری ہوئی نہ ہو اور گھر میں بھی اسباب میسر نہ ہوں تو بُخل نما کفایت شعاری سے جینا قابل فہم ہے مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ لوگ غیر معمولی وسائل سے ہمکنار ہونے کے بعد، کروڑوں میں کھیلتے ہوئے بھی ہاتھ کھینچ کر زندگی بسر کرتے ہیں! یہی خصلت جب وسعت اختیار کرتی ہے تو سنگ دِلی اور بے حسی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی مستحق دِکھائی بھی دے تو دِل کی گرہ نہیں کھلتی اور کچھ دینے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی!

عشروں سے سُنتے آئے ہیں کہ بھارت میں حکومت امیر ہے اور عوام غریب۔ اور پاکستان میں عوام کو امیر قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ہم کیا اور ہماری "امارت" کیا! اللہ کا کرم کہیے کہ آج بھی اہل پاکستان اچھی طرح پیٹ بھر لیتے ہیں اور دوسروں کا پیٹ بھرنے کے بارے میں بھی ضرور سوچتے ہیں! ہماری حکومت بھی بہت سی حدوں سے گزر گئی ہے مگر خیر، خطے کی اُبھرتی ہوئی "سُپر پاور" کی قیادت کو زیادہ شرم آنی چاہیے کہ صرف آئی ٹی، آؤٹ سورسنگ اور نالج انڈسٹری کے شعبوں میں سالانہ 20 ارب ڈالر سے زائد زرِ مبادلہ کمانے والے مُلک میں لوگوں کو کھانے پینے کی اشیاء تک سستی نہیں مل پا رہیں۔ ایسی ترقی اور چمک دمک کس کام کی؟ اِس پر بھی اگر "میرا بھارت مہان" کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے

تو بھارت سرکار کو تھوڑا سا کشٹ اٹھا کر ذرا "مہانتا" کی وضاحت بھی کر دینا چاہیے!
بھارت میں آج بھی بڑے شہروں کے فٹ پاتھ بستیوں کا درجہ رکھتے ہیں اور ان پر لاکھوں گھرانے آباد ہیں۔ ممبئی، کولکتہ، دِلّی، مدراس، حیدرآباد، بنگلور، احمد آباد اور دیگر بڑے شہروں میں فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے! پاکستانی بھی افلاس کا مزا چکھ رہے ہیں مگر اِن سے کہیں زیادہ تو بھارت واسیوں کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو رہا ہے! ابھرتی ہوئی "سپر پاور" کا شہری ہونے کی کوئی نہ کوئی قیمت تو ادا کرنا ہی پڑے گی! اِنسان اپنے سے زیادہ بُرے حال میں کسی کو دیکھتا ہے تو دِل کو اطمینان سا ہوتا ہے کہ اللہ نے اُس حالت سے تو بچا رکھا ہے! بھارت سے نفسیاتی طور پر مَرعُوب رہنے والوں کو پاکستان اور بھارت کے درمیان صرف جمہوریت، عسکری قوت، گڈ گورننس اور قانون پسندی ہی کا نہیں بلکہ افلاس کی سطح کا بھی موازنہ کرنا چاہیے تاکہ دِل کو سکون نصیب ہوتا رہے!

بس جس رفتار سے سفر کر رہی تھی، اُس سے کہیں زیادہ رفتار اور شدت سے حالاتِ حاضرہ پر بحث ہو رہی تھی۔ بحث میں حصہ لینے والے بیشتر مسافر دل کی بات کچھ اِس انداز سے بیان کر رہے تھے جیسے حالاتِ حاضرہ پر "حاضری" آ گئی ہو! اِس معاملے میں وہ از خود نوٹس لینے کے بعد ایک دوسرے پر راشن پانی لیکر پل پڑے تھے! حالات پر بحث وہ معاملہ ہے جس میں مسافر کبھی "ڈبل اے اُستاد" کی صدا کا انتظار بھی نہیں کرتے!

کبھی کبھی بس کا سفر "علم" میں اِس قدر اضافے کا باعث بنتا ہے کہ بد ہضمی سی ہونے لگتی ہے! خان کوچ کا یہ سفر بھی ایسا ہی تھا۔ مسافر صورت حال پر اُسی طرح دل کھول کر تبصرے فرما رہے تھے جس طرح گاڑی سُست رفتاری سے چلانے پر ڈرائیور کو "خراج تحسین" پیش کیا کرتے ہیں!

کوچ یا کسی اور بس میں سفر کے دوران حالاتِ حاضرہ پر بحث کا بنیادی اصول وہی ہے جو ٹی وی پر بولنے کا ہے، یعنی جو کچھ بھی جی اور منہ میں آئے، فی الفور بَک دیا جائے! کچھ لوگ اِس معاملے میں قے کے اُصول پر عمل پیرا رہتے ہیں یعنی ذرا سا بھی برداشت نہیں ہو پاتا اور اول فول بکنے لگتے ہیں! ایسے

!میں موضوع پر اُن کا "عبور" قابل دید اور قابل داد ہوتا ہے

کوچ میں ہمارے ساتھ والی نشست پر ایک ایسے صاحب بیٹھے تھے جنہیں کہیں اور، بالخصوص ٹی وی اسٹوڈیو میں ہونا چاہیے تھا۔ ان کی گفتگو کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ چودھری شجاعت سے بے حد متاثر رہے ہیں کیونکہ اُن کی کوئی بھی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی! موصوف چونکہ ہمیں پیٹھ دِکھا رہے تھے اِس لیے اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا کہ بولتے وقت اُن کے "چہرے کے تاثرات" کیا ہیں! خیر، اُن کی باتوں میں بے مثال روانی دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتا تھا کہ شاید اِدھر اُدھر ہی کی ہانک رہے ہیں! تین چار منٹ تک وہ کچھ کہتے رہے اور لوگ اِقرار میں گردن ہلاتے رہے۔ گردنوں کی حرکت کے اقراریہ انداز نے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں مدد دی کہ جناب کوئی ایسی بات کر رہے ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی! ساتھی مسافروں کے کانوں کو اگالدان سمجھ کر ذہن کے پان کی پیک تھوکنے کے بعد موصوف اُٹھے، گاڑی کے گیٹ پر کھڑے ہو کر منہ کے پان کی پیک سے سڑک کو "گل و گلزار" کیا اور دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ کر پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تب اندازہ ہوا کہ وہ "انقلاب" کے موضوع پر خیالات کا بے لاگ اظہار فرما رہے ہیں! چلتی گاڑی میں ہم نے اپنے ذہن کو بریک لگا کر سوچا کہ جو پان اور گٹکے کی غلامی ترک نہ کر پائیں وہ لوگ کب اور کون سا انقلاب لا سکیں گے! ہماری دانش مندی ملاحظہ

فرمایئے کہ یہ بات ہم نے دل ہی میں رکھی کیونکہ برملا اظہار کی صورت میں یہ خدشہ تھا کہ وہ پان کی پیک سے ہمارے ہی گریبان و دامن کو گل و گلزار کردیتے!

پاکستان میں عوامی گفتگو کے مظلوم ترین موضوعات میں انقلاب یقیناً سب سے نمایاں ہے۔ جب کچھ نہ بن پا رہا ہو تو لوگ باتوں ہی باتوں میں انقلاب برپا کرنے پر تُل جاتے ہیں! ویسے تو مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں لیکن چبوترے، ٹھیے اور ہوٹل کی کرسیاں آئیڈیل "مقاماتِ انقلاب" ہیں! بس تھوڑی سی فرصت ہی تو چاہیے۔ فراغت کی ہانڈی میں باتوں کا بگھار دیا جائے تو انقلاب ہی کی تڑتڑاہٹ ہوگی! ایسے میں لوگ دنیا کو پلٹنے سے کم پر راضی نہیں ہوتے! بات چل نکلے تو لوگ سندھ کے وزیر داخلہ منظور وسان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خیالوں کے ساتھ ساتھ خوابوں کو بھی پوری شرح و بسط سے بیان کرنے لگتے ہیں! باتوں کی دنیا صرف اور صرف ممکنات کی دنیا ہے۔ جب عوام باتوں ہی باتوں میں انقلاب لانے پر تُل جائیں تو پھر انقلاب کیوں نہ آئے، کیونکر نہ آئے! انقلاب پر گفتگو ہو تو زمان و مکاں کی حدیں سمٹ جاتی ہیں، لوگ آن کی آن میں کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔ جیب خالی ہے تو خالی سہی، اب کیا کوئی انقلاب کی بات بھی نہ کرے! اِس میں کون سے پیسے لگتے ہیں!

جس نوعیت کے "انقلابات" پاکستانی قوم کو پسند ہیں وہ تو کہیں بھی برپا کئے

جاسکتے ہیں ! کیا آپ نے شادی کی تقریب میں کھانا کھلنے پر لوگوں کا "انقلابی" جوش و خروش نہیں دیکھا؟ ایسے لذیذ مواقع پر لوگوں کا رویہ کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے رَسّی تُڑا کر بھاگے ہوں ! ایسے میں اگر اُنہیں اسپین کے بھینسے بھی دیکھیں تو شرما جائیں !

ہم نے اُن لوگوں کو انقلاب کے بارے میں زیادہ باتیں کرتے دیکھا ہے جنہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا کون سا بچہ کس کلاس میں پڑھ رہا ہے اور آخری امتحان میں اُس کی پرسنٹیج کیا رہی ہے ! جو لوگ صورت حال میں ذرا سی خرابی یا پھر تہوار کے موقع پر یکساں جوش و خروش سے دودھ، گوشت، سبزی، آٹا وغیرہ خریدنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں وہ بھی انقلاب پر کچھ زیادہ ہی یقین رکھتے ہیں ! ایسے مواقع پر ان کا رویہ صاف بتا رہا ہوتا ہے کہ انہیں یقین ہی نہیں کہ دنیا کل تک رہے گی !

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست !

مرزا کے سامنے جب ہم انقلاب پر کچھ بات کرتے ہیں تو وہ فوراً رسّی تڑا کر ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں ! انقلاب کی بات چلی تو کہنے لگے "اب کیا کوئی انقلاب کی بات بھی نہ کرے؟ لوگ تھوڑی سی خوشی چاہتے ہیں مگر تم اِس کے لیے بھی تیار نہیں۔ تم سے تو لوگوں کی خوشی ایک آنکھ نہیں بھاتی !" ہم نے

سمجھانا چاہا کہ خوشی کی کوئی بنیاد تو ہو۔ اس پر مرزا نے قلندرانہ شان سے فرمایا "اماں رہنے دو۔ خوشی تو خوشی ہوتی ہے۔ اب کیا خوش رہنے کے لیے بھی جواز ڈھونڈتے پھریں گے ہم؟ جب جی چاہے، باتیں کرکے خوش ہو لو۔ خوشی کا اِس سے آسان نسخہ کہیں ہے تو بتاؤ۔ اوروں کا کیا ذکر، تم بھی تو اِسی نُسخے پر عمل کرتے ہو۔"

ہم نے گھبرا کر وضاحت طلب کی تو مرزا فرمانے لگے "کیا تم بھی کبھی کبھی بے ذہنی کے عالم میں کچھ بھی انٹ شنٹ لکھ کر خوش نہیں ہوتے؟"

مرزا کی اِس بات پر ہمارا جی چاہا کہ "سرد جنگ" بالائے طاق رکھ کر اُن سے متفق ہو جائیں!

خوف اور راشگوف

کراچی سے سورج کچھ زیادہ ہی تپا ہوا تھا، اِس لیے اوروں پر دھوپ اور اہل کراچی پر آگ بسا رہا تھا۔ بارش کا انتظار تھا۔ آسمان سے بوندیں تو چند ہی برسیں، گولیاں البتہ برستی رہیں۔۔برساتی نالے سوکھے پڑے رہے اور خون کی ندیاں بہتی رہیں۔

مگر پھر اچانک ایک بڑے شہر کو دوسرے بڑے شہر پر رحم آگیا۔ جس سُہانے موسم کو ہم ترستے رہتے ہیں وہ نمودار ہوااور اہل کراچی کے دل و جاں کو قرار سا آگیا۔ تھوڑی سی بارش ہوئی اور موسم خوشگوار ہوگیا۔ لوگ سوچنے لگے یہ کیسے ہوگیا؟ لندن کا موسم کراچی میں کیسے آگیا؟ مگر پھر عقدہ کھلا کہ لندن نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بارٹر سسٹم (مال کے بدلے مال) کے تحت اپنا موسم ہمیں دیا ہے اور ہمارے حالات اپنے دامن میں سمیٹ لیے ہیں! بڑے شہروں کی بڑی باتیں!

بگ بینگ کے شہر میں اچانک ایک بگ بینگ ہوا۔ نرم خُو لوگوں کی بستیاں اچانک آپے سے باہر ہوگئیں، ظرف کے پیمانے پولیس کے ہاتھوں محض ایک شہری کی ہلاکت سے چھلک گئے۔ ہنگامہ آرائی اور لُوٹ مار کی ایسی فصل تیار ہوئی کہ پورا شہر

لالو کھیت کا منظر پیش کرنے لگا! جس طرح ایک ہی رات میں بانس کا درخت زمین کا سینہ چیر کر نکل آتا ہے کچھ اُسی طرح دِلوں میں اچانک کئی کٹی پہاڑیاں اُبھر آئیں! گورے شہر پر کالوں نے کالک پوت دی۔ اچھے خاصے ترقی یافتہ اور پُر سکون شہر میں جاہل اور پس ماندہ اقوام کا کلچر انگڑائی لیکر خواب ناز سے بیدار ہوا۔ مقامی اور غیر مقامی کے قضیے نے پھر سر اُٹھالیا۔ دوسروں کو جہنم کی دہلیز تک پہنچا کر اپنی جنت بسانے والوں کو جب اپنے پیروں تلے سے جنت سرکتی ہوئی محسوس ہوئی تو بپھر گئے۔ لندن وہی شہر ہے جس میں دوسروں کے گریبان میں جھانکنے کے شوقین نشریاتی ادارے کا صدر دفتر ہے! پُر لطف نکتہ یہ ہے کہ لُوٹ مار کے الزام میں گرفتار کئے جانے والوں کے پُر تاسّف جملے میڈیا میں پیش کرکے اُنہیں بلوائی کے بجائے "ضمیر کے قیدی" ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ شاید اِسی کو ٹیکس ادا کرنے والوں کے دیئے ہوئے نمک کا حق ادا کرنا کہتے ہیں!

زہے نصیب، لندن کے مکینوں کو بھی کچھ اندازہ تو ہوا کہ نو گو ایریاز کیا ہوتے ہیں! تین دن تک یہ ہوا کہ ہزاروں افراد کام پر تو گئے مگر گھر واپس نہ پہنچ سکے کیوں کہ اُن پر خود اُنہی کے گھر کے راستے مسدود تھے! یہ تو خالص اورنگی ٹاؤن والی کیفیت ہے کہ گھر سے کام پر جانے کے لیے نکلو تو کہیں اور ٹھہرنے کا اہتمام بھی کر رکھو!

سرکاری وظیفوں پر مزے لُوٹنے والوں کے دِماغ نے پلٹا کھایا، پیٹ بھرے کی مستی رنگ لائی اور صفِ اول کے بین الاقوامی شہر میں لُوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ دنیا حیران تھی کہ دریائے ٹیمز کے کنارے لاقانونیت کا یہ کیسا سمندر موجیں مار رہا ہے! ایشیائی باشندوں کی دُکانیں لُوٹنے والے جن شرپسندوں کو پولیس نے گرفتار کیا ان میں ایک گیارہ سالہ لڑکا بھی تھا۔ ایسی ہی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہنگامہ آرائی کے دوران مال غنیمت لُوٹنے والوں میں چند لڑکیاں بھی تھیں جن میں سے ایک کو سی سی ٹی وی فوٹیج کی مدد سے گرفتار کرکے عدالت میں پیش کردیا گیا۔ یہ خبر پڑھ کر ہمیں بس یوں ہی خیال آیا کہ ہماری لڑکیاں اور خواتین تو اِس معاملے میں بھی خاصی "بیک ورڈ" نکلیں!

لندن نے کراچی کے حالات کو گلے لگا کر محض چار دنوں میں ماضی کا سفر کیا یعنی پچیس سال پیچھے چلا گیا۔ 1986 میں بھی لندن کو بدامنی، ہنگامہ آرائی اور لُوٹ مار کا دورہ پڑا تھا۔ اُس وقت بھی تین چار دن شرپسند دندناتے پھرے تھے اور برطانوی دارالحکومت میں گویا کوئی تباہ حال افریقی شہر آ بسا تھا!

لندن سے شروع ہونے والے ہنگاموں اور لوٹ مار نے سات شہروں کو لپیٹ میں لیا۔

پورا نظام ہی تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ پہلے دو دن تو حکومت کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے! پھر حواس بحال ہوئے تو کئی شہر سُکون کا سانس لینے کے ساتھ ساتھ سرد آہیں بھی بھرتے دکھائی دیئے۔

معمولی سے واقعات میں "انقلاب" کی جھلک دیکھنے والے مغربی مبصرین نے شاید خود کو سُونگھ لیا ہے اِس لیے خاموش ہیں! اگر یہ سب کچھ کسی پس ماندہ ملک میں ہوا ہوتا تو اب تک کئی سوال مغربی میڈیا کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کیے جا چکے ہوتے۔ قتل و غارت میں انقلاب تلاش کیا جا رہا ہوتا، بدامنی کو فیصلے کی گھڑی قرار دیا جا رہا ہوتا اور پورے ملک کو دوراہے پر کھڑا ہوا دِکھانے کی تیاری کی جا رہی ہوتی! کیا لندن کے واقعات اِس امر کے غماز نہیں کہ ایک نیا یورپ اُبھر رہا ہے؟ دوسروں کی لُوٹ مار اور قتل و غارت کو انقلاب قرار دیتے نہ تھکنے والے اپنے گریبان میں جھانکنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں؟

جب انسان کا خُبثِ باطن بیدار ہو کر رُوبہ عمل ہوتا ہے تو من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ جب انفرادی مفادات پر زد پڑتی ہے، سہولتوں کا بازار مندی سے دوچار ہوتا ہے اور ہنستی گاتی زندگی میں ذرہ بھر بھی خرابی دکھائی دیتی ہے تو تمام مسلّمہ اقدار دھری کی دھری رہ جاتی ہیں! بدحواسی کے بازار میں

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
سبھی ایک جیسی دکانداری کر رہے ہوتے ہیں ! جب دِلوں میں لالچ کے بھوکے بھیڑیے بپھر کر غُرّاتے اور تنگ نظری کے کالے کُتّے بھونکتے ہیں تو کراچی اور لندن ایک ہی ساز کی صدا معلوم ہوتے ہیں !

اہل کراچی نے انتباہ ملنے پر ایک ماہ کا راشن خریدنا شروع کیا تھا مگر اہل لندن تو اُن سے دو ہاتھ آگے نکلے۔ برطانوی "سیاہ و سفید" کے مالک یعنی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون نے سینہ تان کر کہا کہ خوف کا کلچر کسی طور شہروں اور دِلوں پر مسلط نہیں ہونے دیا جائے گا۔ وزرائے اعظم ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں، اُن کی کون سُنتا ہے؟ راشن کے معاملے میں لندن کے مکینوں نے "فرنٹ فٹ" پر کھیلنے کو ترجیح دی اور خریداری کا ارادہ طاق نسیاں پر رکھ کر لوٹ مار میں لگ گئے ! سرکار سے ملنے والا وظیفہ گھٹائے جانے پر بھوکے رہ جانے کا ایسا خوف دِلوں پر طاری ہوا کہ یار لوگ دُکانوں کے تالے توڑ کر، شٹر اٹھا کر اشیائے خور و نوش لے اُڑے۔ وائے ناکامی کہ ہم کلاشنکوف کی منزل پر ٹھہر گئے ہیں اور لندن کے "سیاہ و سفید" عدیم المثال پُھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے "راشنکوف" تک پہنچ گئے!

کھانے پینے میں کیا رکھا ہے؟

سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اب تک اُن لوگوں کی سمجھ نہیں آئی جو حکومت کے ہر معاملے کو غلط قرار دیکر دل کی بھڑاس نکالنے، بلکہ نکالتے رہنے پر یقین رکھتے ہیں۔ اور پتہ نہیں یہ دل کی بھڑاس کتنی ہے کہ پوری طرح نکل کر نہیں دے رہی! زرداری انتظامیہ کے تحت پاکستان کے عوام نے تین ساڑھے تین برسوں میں خوراک کو مہنگا ہوتے دیکھا ہے۔ کھانے پینے کی جس چیز کو ہاتھ لگایئے، وہ چُھوئی مُوئی کے پودے کے طرح سمٹ سی جاتی ہے! بچت بازار میں یا ٹھیلے پر سبزیوں کے دام پوچھیے تو اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوتا ہے! ایسے میں خیال آتا ہے کہ دنیا فانی ہے مگر شاید سبزیاں لافانی ہیں! کسی بھی جنرل اسٹور میں قدم رکھیے تو اشیاء کی قیمتیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کس قدر "قیمتی" دور میں جی رہے ہیں! لوگ قیمتی اشیاء پانے کے لیے بے تاب رہتے ہیں مگر حکومت کی مہربانی سے آٹا، دال، چاول، گھی، تیل، گوشت وغیرہ قیمتی اشیاء کے زُمرے میں آ گئے ہیں تو دِلوں میں بدگمانیاں پالی جارہی ہیں! کیا یہ حکومت کی خاص عنایت نہیں کہ اب مہینے میں ایک آدھ مرتبہ گوشت پکانا بھی "ایونٹ" کا درجہ پاگیا ہے اور ہم اس طرح کے ایونٹس کو سیلیبریٹ کرکے اپنے آپ پر فخر کرنے لگے ہیں؟

ایک عام خیال یہ تھا کہ کھانے پینے کی اشیاء مہنگی کرکے حکومت نے عوام سے کوئی انتقام لیا ہے۔ بعض دل جلے "جمہوریت بہترین انتقام ہے" والی بات کا بھی یہ مفہوم لیتے ہیں کہ حکومت نے جمہوریت کے ذریعے ہم سے انتقام لیا ہے! کسی بھی "عوام دوست" حکومت کے بارے میں ایسی بدگمانیاں ہم عوام کو زیب نہیں دیتیں۔ ہم میں اِتنی عقل ہی کہاں ہے کہ حکومت کی ہر مصلحت کو بہتر ڈھنگ سے سمجھ سکیں۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ اشیائے خور و نوش مہنگی کرکے زندگی مشکل بنائی جارہی ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہمیں ماہرین کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے حکومت کا فلسفہ سمجھنے میں ایک بار پھر ہماری معاونت کی ہے۔

جن سادہ باتوں کو لوگ سیکڑوں، ہزاروں سال سے جانتے اور سمجھتے آئے ہیں اور ذرا بھی درخور اعتناء نہیں گردانتے، ماہرین اُنہیں اعداد و شمار کی مدد سے، سُرخی پاؤڈر لگاکر، دلہن کی طرح سجاکر ہمارے سامنے رکھتے ہیں تاکہ قبول کرنے میں آسانی رہے! جو کچھ ہم ذرّہ بھر تحقیق کے بغیر بتا سکتے ہیں وہ برطانیہ کی گلاسگو یونیورسٹی کے ڈاکٹر پاؤ شیلز نے خاصی دقت طلب اور عرق ریز "تحقیق" کے بعد بتایا ہے، یعنی یہ کہ جن کی آمدنی کم ہو اور جنہیں کھانے کو کم ملے وہ لوگ جلد موت کے آغوش میں چلے جاتے ہیں! ڈاکٹر شیلز کا کہنا ہے کہ کم کھانے سے جسم میں ٹیلو مورس نام کے کیمیکل پر مبنی ہارمون کا تناسب کم ہو جاتا ہے۔

مقام شکر ہے کہ ہمیں جیتے جی جاننے کو مل گیا ہے کہ کم کھانے سے انسان مر جاتا ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ ہمیں کھاتا دیکھ کر ہی بعض من چلے کہتے ہیں کہ بھوک سے بھی اِنسان مرتے ہیں مگر زیادہ کھاکر مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے! بعض سادہ لوح احباب ہمیں "خوش خوراک" سمجھ بیٹھے ہیں، حالاں کہ معاملہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ بھی (یعنی اچھا خاصا) مل جائے وہ ہم خوشی خوشی کھاتے ہیں! .بزرگوں نے سچ ہی تو کہا ہے کہ لوگوں سے کسی کی خوشی دیکھی نہیں جاتی! اور خاص طور پر وہ خوشی جو خوراک دیکھتے ہی پیدا ہو! بعض مواقع پر احباب نے خوراک کی قلت کا ٹانکہ ہماری صحت سے جوڑنے کی کوشش بھی کی مگر جب ہم نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تو وہ اپنے !ارادے سے باز رہے

ہماری حکومت واقعی "غریب دوست" اور اچھی خاصی "مشکل کشا" ہے کہ آمدنی کے ذرائع محدود اور مسدود کرکے اور دام مسلسل بڑھاکر کھانے پینے کی اشیاء تک غریبوں کی رسائی مشکل تر بنا رہی ہے تاکہ وہ تیزی سے اپنی "منزل" کی طرف بڑھیں! یہ بھی حکومت کا کمال ہی ہے کہ غریب اور اُس کی منزل کے درمیان سے "راہ" غائب کردی گئی ہے! جب سبھی کو ایک دن خاک میں مل جانا ہے تو کھانے پینے سے کیا دل لگانا! اور یوں بھی پندرہ سولہ کروڑ انسان دن رات کھاتے رہیں گے تو اُن کے لیے کیا بچے گا !جو اقتدار میں آئے ہی کھانے کے لیے ہیں

ہم حکومت کے بارے میں تو بہت روتے ہیں کہ وہ غریب پرور نہیں، مگر کبھی ہم نے اپنے آپ کو "حکومت پرور" بنانے کے بارے میں بھی سوچا ہے!

ہر وقت مسائل کا رونا رونے والی آبادی سے گلوخلاصی کا ایسا تیر بہ ہدف نُسخہ کم ہی حکومتوں کو سُوجھا ہوگا! ترقی یافتہ ممالک تو خیر اس معاملے میں بہت ہی "بُودے" واقع ہوئے ہیں۔ ہمیں تو اِس بات پر حیرت ہے کہ عوام کو کنٹرول کرنے کا ایسا آسان نسخہ بھی جنہیں نہ سُوجھ سکا وہ ممالک اِتنی ترقی کیسے کرگئے! اِسی لیے تو ہم پاکستانی ترقی ورقی پر کچھ زیادہ یقین نہیں رکھتے! کھانے پینے کی اشیاء کے نرخ کنٹرول کرکے ترقی یافتہ ممالک اپنے عوام کو بہتر انداز سے جینے کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔ یہ تو "عوامی طوق" خود ہی گردن میں ڈالنے والی بات ہوئی۔ عوام اِس لیے نہیں ہوتے کہ اُنہیں کھلا پلا کر تگڑا اور بے قابو کیا جائے۔ کھلونے کھیلنے کے لیے ہوتے ہیں۔ کبھی آپ نے کسی کھلونے کو کھاتے پیتے دیکھا ہے؟ یا کبھی آپ نے کسی کھلونے کو کچھ کھلایا پلایا ہے؟ عوام بھی کھلونے ہی تو ہوتے ہیں جن سے کھیل کر اہل اقتدار محظوظ ہوتے ہیں۔ ہر وہ حکومت قابل رشک" ہے جو کھلونوں پر خوراک ضائع نہیں کرتی! اِس معیار کی کسوٹی پر پرکھیے" تو ہماری حکومت، چشم بد دور، قابل رشک ٹھہرائے جانے کی منزل سے سو قدم آگے ہے!

سیکھنے کے دِن بھی یہی ہیں

امنگوں، امیدوں اور روشنیوں کا شہر بضد ہے کہ اندھیروں کو مات دے کر دم لے گا۔ کراچی نے کیا ٹھان لی ہے، کچھ نہیں کھلتا۔ لوگ مایوس ہو کر کہتے ہیں کہ شہر بے ذہن ہوگیا ہے۔ زندگی بسر کرنے کے نام پر شب و روز کی چھلنی سے گزرتے رہنا معمول بن گیا ہے۔ نجومیوں کے اشتہارات میں جس سنگ دِل کو قدموں میں ڈالنے کے دعوے ہم پڑھتے آئے ہیں، شاید کراچی نے اُسی سنگ دِل محبوب کو شرمندہ کرنے کے لیے ناز نخروں کی سطح بلند کردی ہے! وطنِ عزیز میں سیاسی نجومیوں کی کمی نہیں۔ قدم قدم پر پیش گوئیوں کا بازار گرم ہے مگر کوئی نہیں بتاتا کہ روٹھے ہوئے کراچی کے سامنے "من جا، من جا" کی رٹ کب تک لگائی جاتی رہے گی؟ کراچی کی اُلجھی ہوئی لَٹ سُلجھانے کا یارا کسی میں نہیں۔ نجومیوں کے روایتی سنگ دل محبوب کا تو صرف دِل پتھر کا تھا، کراچی پورے کا پورا پتھر کا ہو چلا ہے اور یہ تماشا دیکھ کر دِل ہے کہ پانی ہوا جاتا ہے۔ قرار آئے تو کیونکر؟ سکون میسر ہو تو کیسے؟ کس سے کہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیسے سمجھائیں کہ کیوں ہو رہا ہے؟

ہم بھی کیا سادہ ہیں کہ رمضان المبارک کی آمد پر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب

قتل و غارت کے خوگر بھی کچھ دن شرم کے پردوں میں لپٹے رہیں گے ؟ اُمید سی بندھی تھی کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کے بندوں کا کچھ خیال آ جائے گا، مگر ہمیں یاد نہیں رہا تھا کہ رمضان کے تقدس کا احساس انسانوں کو ہو سکتا ہے، خون آشام درندوں کو نہیں۔
سوال سرشت کا ہے۔ جن کے منہ کو خون لگ جائے وہ دو پیروں پر چلنے والے ہوں یا چار پیروں پر، ہوتے حیوان ہیں ! جو معاشرے کو منظم انداز سے زندہ اور توانا رکھے وہی حکمران ہے۔اِسی طرح جس میں سفاکی، درندگی اور بوٹی بوٹی نوچ کھانے کی سرشت اُبھر آئے وہ حیوان ہے، خواہ اِنسان دِکھائی دیتا ہو!

ہاں ! درندوں اور انسانی درندوں میں ایک نمایاں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ درندوں کے چند اُصول ہوتے ہیں ! جن اِنسانوں نے درندوں کو پیچھے چھوڑنے کی قسم کھا رکھی ہے اُن کی زندگی کسی اُصول اور قاعدے کی محتاج نہیں۔ یہ وہ بدمست درندے ہیں جو بھرے پیٹ بھی، محض دل پشوری کے لیے، گردنوں میں دانت گاڑتے پھرتے ہیں۔ انجام اور عواقب کی اِنہیں چنداں فکر یا پروا نہیں۔
یہ کون ہیں جو انسانوں کی دنیا کے کسی اُصول کو نہیں مانتے؟ یہ کون بے حِس ہیں جو کسی بھی حِس کو ماننے کے لیے تیار نہیں؟ عقل اندازہ لگانے سے قاصر ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنی عقل کو زحمتِ کار دینے کا سوچتے بھی نہیں؟

ساحل پر آباد شہر میں موجیں مارتے۔ قتل و غارت کے سمندر کا بھی کوئی کنارا ہے کہ نہیں؟ یقیناً ہوگا مگر نظر تو نہیں آتا! ہم اس معاملے میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہماری کوتاہ بینی ہمیں کچھ دیکھنے نہیں دے رہی! اگر قتل و غارت کی کوئی حد ہوگی تو یقیناً نظر بھی آئے گی۔ سر دست صرف لاشے گننے کا شغل رہ گیا ہے! جس ماہِ مبارک میں رحمت نازل ہوا کرتی ہے، کرم برسا کرتا ہے اس میں ہم بھیگ تو رہے ہیں مگر صرف خون میں! یہ بس نصیب کی بات ہے اور نصیب بھلا اعمال کے ناگزیر نتیجے کے سوا کیا ہے! پیشانی پر جب ندامت کا عرق ضَوفشاں نہ ہو تو خون میں شرابور ہونا ہی مقدر ٹھہرتا ہے! اور شہرِ قائد کے ساکنوں کا یہی مقدر ٹھہرا ہے!

طاقت کے بازار میں دہشت کے سکے کا چلن ایسا عام ہوا ہے کہ لوگ اپنے ہی گھر میں خوف کی چادر اوڑھے رہتے ہیں۔ اپنی ہی چار دیواری غیر محفوظ لگتی ہے۔ جس طرح سنیما یا ٹی وی کی اسکرین پر پلک جھپکتے میں منظر بدل جاتا ہے، بالکل اُسی طرح ہماری زندگی اور ہمارے شہر میں سبھی کچھ بدل گیا ہے۔ اب اگر ہمارے بس میں کچھ رہ گیا ہے تو لمحہ بھر کو حیران رہ جاتا! ہم اپنے تمام حواس کے ساتھ تیزی سے "نارمل" ہو جاتے ہیں۔

حیرت کی منزل سے ہم کب کے گزر چکے۔ اب تو صرف حزن و یاس کا آستانہ رہ گیا

ہے جس پر ہم سربسجود ہیں۔ اب کچھ بھی ایسا نہیں جو ہمیں چونکائے۔ گل ترکے قصے کل کی باتیں ہیں، اب تو بس چشمِ تر کی پوچھیے۔ مگر خیر، چشمِ تر بھی کہاں؟ اب توآنکھیں بھی خشک ہوئیں۔ دل کی بنجر زمین دیدۂ تر کو ترستی ہے۔ گلزارِ ہستی عجیب موسم سے دوچار ہے۔ دیدہ بینا اب صرف چشمِ تماشا ہے۔ وقت جو دکھائے، ناچار دیکھنا ہی پڑتا ہے۔

چاروں طرف موت کا برہنہ رقص جاری ہے اور ساتھ ساتھ عید کو گلے لگانے کا اہتمام بھی ہو رہا ہے۔ بات عجیب سی لگتی ہے مگر زندگی کے دریا کی یہی روانی ہے جس پر فدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ دشمن اپنا ہو یا پرایا، ہمارے جسم سے کہیں زیادہ ہماری روح کو زخم دینا چاہتا ہے۔ چند سو یا چند ہزار افراد کو ختم کرکے باقی لاکھوں یا کروڑوں کو جیتے جی مار دینا ہر دشمن کا بنیادی ہدف ہوا کرتا ہے۔ یہ نفسی موت ہی ہمارے قومی وجود کے لیے زہر بن سکتی ہے۔ جن کے دِلوں میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں، اُن پر یہ جتانا لازم ہے کہ ہمارے سینوں میں عزیمت نے دم نہیں توڑا، اولوالعزمی نے ساتھ نہیں چھوڑا اور حواس اب تک توانا ہیں۔

کراچی میں اندھا دھند فائرنگ بھی ہوئی ہے۔ اغواء کی وارداتیں بھی ہوئی ہیں اور لوگوں کو قتل کرکے بوری میں ڈال کر پھینکا بھی گیا ہے مگر پھر بھی شہر

رکا نہیں، زندگی کے بازار کی رونق ماند نہیں پڑی۔ موت کو سِکہ رائج الوقت بنانے کی کوششیں اب تک مکمل کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکیں۔ لوگ اب بھی اہلِ خانہ کے ساتھ گھر سے باہر آتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور عید کی خریداری کرتے ہیں۔ شہر کے بازاروں میں زندگی چل پھر رہی ہے۔ لاشیں گر رہی ہیں اور لوگ عید کے استقبال کی تیاری بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تو کھلا تضاد لگتا ہے۔

سرسری سوچ اِسے بے حسی قرار دے گی۔ لمحہ بھر کو آپ بھی مکمل اتفاق کرتے دکھائی دیں گے مگر ذرا اپنے دِل سے پوچھیے۔ کیا سب کو خوفزدہ ہو کر گھروں میں مقید رہنا چاہیے؟ کیا ایسا کرنے سے ہماری مشکلات ختم یا کم ہو جائیں گی؟ مشکلات تو خیر کیا کم ہوں گی، ہمارے خون کے پیاسوں کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک ضرور بڑھ جائے گی۔ اُن کی خواہش، سازش اور مقصد یہی ہے کہ ہم خوف کے غلام ہو رہیں اور اعتماد و جرات کی دولت سے محروم ہونا گوارا کرلیں!

گولیوں کی گھن گرج میں جن لوگوں نے صوم و صلوٰۃ کو فراموش اور نظرانداز نہیں کیا اُن کا عید پر بھی حق ہے اور برحق ہے۔ اُن کی ہمت کو سلام ہے جو ناطاقتی کے باوجود موت کے ماحول کو منہ دے کر زندگی کی محفل کو بے رونق

ہونے سے محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ماہِ صیام تمام برائیوں سے محفوظ رہنے کے عہد پر کاربند رہنے کے لیے ہوتا ہے اور جو لوگ اللہ کی رضا کے لیے برائیوں سے مجتنب رہیں اُن کا عید پر پورا حق ہے۔ آتشیں اسلحہ اور موت کا خوف اِس حقیقی مسرت کو مٹانے کی سکت رکھتا ہے نہ صلاحیت۔

بازاروں میں عید کے لیے خریداری کرنے والوں میں نمایاں ترین جوش و خروش بچوں کا ہوتا ہے۔ عید ویسے بھی ہر روزہ دار کی ہوتی ہے یا پھر بچوں کی۔ کپڑوں، جوتوں اور کھلونوں کے لیے والدین سے فرمائشیں کرنے اور بضد ہو کر اپنی بات منوانے والے بچے اجڑتے ہوئے ماحول میں زندگی کی واحد امید اور اساس ہیں۔ بڑوں میں تو اب عید منانے کا جگرا رہا نہیں۔ ایسے میں بچے ہی زندگی کا سامان کریں تو دلوں کو قرار آئے۔ !کاش ہم بچوں سے کچھ سیکھ سکیں

موت سے اٹے ماحول میں چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا اہتمام کرنے والے زندگی کے حقیقی علم بردار ہیں۔ ہر وقت گریاں کناں رہنا مشکلات کے تدارک کا درست طریقہ نہیں۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا اور جینے پر کمربستہ رہنا ہی زندگی کا حق ادا کرنا ہے۔ زندگی کے بھرے میلے میں موت کی منڈی لگانے والے ہمارے جسموں کو گولیوں سے داغ کر دراصل ہمارے اجتماعی اعتماد کو

چھیدنا چاہتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کو ثابت کرنا ہے کہ شیطان کے چیلے وقتی اُٹھان ہیں، ابدی حقیقت نہیں۔

رمضان المبارک کے دوران جو کچھ اہلِ کراچی پر گزری ہے وہ قنوطیت ضرور پیدا کرتی ہے مگر اس بات کی متقاضی بھی ہے کہ ہم اپنا محاسبہ کریں، اپنے فکر و عمل کو تبدیل کریں اور خود کو نئی زندگی کے لیے تیار کریں۔ ماحول میں خون کی بُو بسی ہوئی ہے۔ ایسے میں عید بھی پھیکی پھیکی سی معلوم ہوتی ہے مگر بگڑے ہوئے حالات ہی ہم سے یہ تقاضا کر رہے ہیں کہ ہم زندگی کی رونقوں سے منہ موڑ کر، گریہ و ماتم میں غلطاں ہو کر پاک سرزمین کے دشمنوں کو فتح کا جشن منانے کا موقع نہ دیں۔ جو کسی نہ کسی طرح عید منانے کا اہتمام کر رہے ہیں وہ مبارک باد کے لائق ہیں۔ اگر سبھی دل گرفتہ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرلیں تو دُنیا چل چکی اور زندگی ہو چکی ! ماتم ہی نہیں، ہنسنے کے دِن بھی یہی ہیں !

ڈکھڑا عید شاپنگ کا

بہت سے عاقبت نا اندیش اکیسویں صدی میں طرح طرح کی ٹیکنالوجیز کی بہار دیکھ کر دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ آج کی دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ یہ دعویٰ ہمیں خاصا گراں گزرتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو (جون ایلیا کے بقول) جی چاہتا ہے کہ

کاش اُس زباں دراز کا منہ نوچ لے کوئی !

انسان کو چاند پر قدم رکھے چالیس سال ہو چکے ہیں۔ ٹیکنالوجی کچھ اِس طرح جوبن پر ہے کہ تمام بُنیادی سہولتیں بھی اب جادو کی سی حیثیت اختیار کرکے آسائشات اور تعیشات کی حدود میں داخل ہو گئی ہیں۔ کون سا شعبہ ہے جو اب انقلاب سے محفوظ یا محروم ہے؟ مگر خیر، اِس کے باجود یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ آج کی دنیا میں کیا نہیں ہوسکتا؟ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر کوئی "ٹیکنالوجی داپٹنر" خواتین کو عید کی شاپنگ سے باز رکھنے کا سوفٹ ویئر تو بنا کر دِکھائے ! اِس معاملے میں اچھا خاصا brain بھی drain کا منظر پیش کرنے لگتا ہے ! یہ وہ مقام ہے جہاں ہر ٹیکنالوجی اور نظریے کے پَر جلنے لگتے ہیں !

بازار میں دستیاب بہت سی الیکٹرانک اشیاء میں اب بعض خصوصیات "اِن بلٹ" ہوتی ہیں یعنی اُن کی پروگرامنگ کا حصہ ہوتی ہیں۔ شاپنگ اور خواتین کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے سیزن میں یہ پروگرامنگ، دوسری تمام خصوصیات کو overlap کرکے، زیادہ تیزی سے کام کرنے لگتی ہے! سچ تو یہ ہے کہ خواتین کے ذہن میں شاپنگ کا سوفٹ ویئر وہ بَلا ہے جو آئے دن دیگر تمام سوفٹ ویئرز پر حاوی ہو کر اپنی جولانی دِکھانے پر تُلا رہتا ہے!

کبھی کبھی ہمیں مرزا تنقید بیگ پر کسی سیاسی جماعت کے مرکزی ترجمان کا گمان ہوتا ہے۔ موصوف کی نفسی ساخت میں بھی ایک چیز "اِن بلٹ" ہے، یعنی یہ کہ ہماری (بلکہ کسی کی بھی) کسی بھی بات سے متفق ہونا ہی نہیں! جب بھی ہم خواتین کی مسلّمہ عادات کا ذکر چھیڑتے ہیں تو مرزا مہینے بھر کا راشن پانی لیکر ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ایسے عالم میں اُن پر قابو پانا اُتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا کسی شوہر کے لیے بازار میں شاپنگ کرتی ہوئی بیوی کا جوش و خروش دیکھ کر اپنے حواس پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے! مرزا کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال نے شاید بعض خواتین کی باقاعدہ اور بے نیازانہ شاپنگ دیکھ کر ہی کہا تھا۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ!

مرزا نے یہ نہیں بتایا کہ کائنات کی تصویر میں بھرے جانے والے اِس رنگ کی قیمت بے
!چارے مرد کو اپنے خون سے چکانا پڑتی ہے
ہم نے مرزا کو خوش رکھنے کا خاصا کارگر طریقہ وضع کیا ہے۔ اُن کی بیشتر باتوں سے ہم
متفق رہنے کا تاثر دیتے رہتے ہیں! مرزا کا تجربہ یہ کہتا ہے کہ عید کی تیاریوں کے سلسلے
میں خواتین شاپنگ اُتنی نہیں کرتیں جتنے بازاروں کے چکر لگاتی ہیں۔ اُن کے بقول
ساری خریداری ایک ہی "ہلّے" میں کرنے کے بجائے چار چکروں میں کرنے سے طبیعت
ہشاش بشاش رہتی ہے اور فون پر بتانے کو بھی ہوتا ہے کہ "ابھی حیدری ہو کر آئی
ہوں، کل تمہارے بھائی طارق روڈ لے جائیں گے!" طارق روڈ چونکہ طارق بن زیاد
سے موسوم ہے اِس لیے بیشتر شوہر وہاں سے کشتیاں جلا کر آتے ہیں! اب بازار کے
!زیادہ چکر لگانا بھی اسٹیٹس سمبلز میں شمار ہونے لگا ہے
ہمارے ہاں ہر تہوار اور ایونٹ "روایتی جوش و خروش" سے منایا جاتا ہے مگر عید کی
شاپنگ کے معاملے میں خواتین کا جوش و خروش خالص غیر روایتی ہوتا ہے، یعنی ہر سال
گزشتہ سال سے زیادہ اور منفرد جوش و جذبہ دکھائی دیتا ہے! گویا وہ ہر سال اپنی ہی
قائم کردہ روایت کو خاک میں ملا دیتی ہیں! آئی ٹی کی

اصطلاح میں کہیے تو گویا ہر سال عید شاپنگ کے جوش و خروش کا نیا "ورژن" مارکیٹ میں آ جاتا ہے! اور بے چارے شوہر روایتی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بازاروں میں سامان اُٹھائے اُن کے پیچھے پیچھے کچھ اِس طرح پھرتے ہیں کہ
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو بتائے نہ بنے!

ہمارا شمار بھی اُن لوگوں میں کیا جانا چاہیے جنہیں عید کی شاپنگ واپنگ تو کچھ بھی نہیں کرنی ہوتی، مگر عید شاپنگ کے سیزن میں محض اِس لیے بازاروں کے چکر لگاتے ہیں کہ شاپنگ کا سامان اُٹھائے پھرنے والے شوہروں کو دیکھ کر محظوظ ہوں! اور سچی بات تو یہ ہے کہ ایسے مواقع پر ہم نے اکثر محسوس کیا ہے کہ ناز برداری اور بار برداری میں درحقیقت کوئی خاص، بلکہ کوئی فرق نہیں! ہم شوہروں کو، خدانخواستہ، بار برداری کے لیے استعمال ہونے والے کسی حیوان سے مشابہ قرار نہیں دے رہے۔ مشابہت اور مماثلت سے بچنے کے لیے شوہر ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے، فخریہ انداز سے چلتے رہتے ہیں تاکہ کسی کو گمان تک نہ گزرے کہ اُن کے دل و نظر پر قیامت گزر رہی ہے! بعض شوہروں کا جوش و خروش قابل دید اور قابل داد ہوتا ہے۔ مجبوری کو بھی رب کی رضا سمجھ کر وہ کچھ اِس انداز سے نبھا رہے ہوتے ہیں گویا اِسی پر جنت کا مدار ہے! راضی بہ رضا رہنے کی یہ انمول صفت بھلا بار برداری کے لیے مختص حیوانات میں کہاں؟

شادی شدہ انسان کی بھلائی اِسی میں ہے کہ عید شاپنگ کی چوکھٹ پر ذبح ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار رہے اور کسی "مزاحمتی تحریک" کا خیال تک دِل میں نہ لائے! ہاں، اگر وہ چاہے تو سندھ کے وزیر داخلہ منظور وسان کی طرح صرف خواب دیکھ سکتا ہے کہ گھر والے عید سادگی سے منانے اور شاپنگ جیسی قبیح رسم کو اپنی زندگی سے "تڑی پار" کرنے پر رضامند ہوگئے ہیں! معاملہ خواب تک رہنا چاہیے، تعبیر کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ عجیب الخلقت خوابوں کو تعبیر کا جامہ پہنانا صرف منظور وسان کے بس کی بات ہے! ہم آپ جیسے غریبوں کے پاس سرکاری خزانہ تو ہے نہیں کہ ہر خواب کی تعبیر خرید کر سُرخ رُو ہوتے پھریں!

نجومیوں کی طوطا کہانی

جس طور ہمیں کبھی کبھی وطن عزیز میں وزیر قانون کا وجود اضافی محسوس ہوتا ہے بالکل اُسی طرح نجومیوں کا وجود بھی لوگوں کو پریشان کرتا ہے۔ اب پاکستان میں کون ہے جسے اپنے مستقبل کا اچھا خاصا اندازہ نہیں؟ حالات اِس نہج پر آ گئے ہیں کہ ذرا سا شعور رکھنے والا بچہ بھی بتا سکتا ہے کہ مُلک کا اور خود اُس کا مستقبل کیا ہوگا! پاکستان میں نجومی دو ہی طبقوں میں پائے جاتے ہیں۔۔ یا تو اعلیٰ ترین شخصیات میں یا پھر فٹ پاتھ پر! ہم اب تک یہ بات سمجھ نہیں پائے کہ جو خود فٹ پاتھ پر بیٹھا ہو وہ ہمیں فٹ پاتھ کے لیول سے بلند ہونے کا راستہ کیسے دِکھائے گا!

اکبر سرحدی ہمارے دوست ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ٹرانسپورٹر ہونے کے باوجود وہ ہاتھوں کی لکیروں اور قسمت کے احوال کے چکر میں رہتے ہیں! ہم نے اُنہیں بارہا یہ سمجھانے کی (ظاہر ہے، ناکام!) کوشش کی ہے کہ آپ ماشاء اللہ ٹرانسپورٹر ہیں، پھر کون سا مزید روشن مستقبل تلاش کر رہے ہیں! معلوم یہ ہوا کہ ٹرانسپورٹ نے اُنہیں تو مستقبل کی فکر سے بے نیاز کر دیا ہے، اب وہ دوسروں کو تابناک مستقبل کی نوید سُناتے رہتے ہیں! اکبر سرحدی چونکہ

ٹرانسپورٹر ہیں، اِس لیے اپنی پیش گوئی درست ثابت کرنے کے لیے وہ کسی کا مستقبل اپنے خرچ پر سنوار بھی سکتے ہیں! "کمپنی کی مشہوری" کا ایک آزمودہ طریقہ یہ بھی ہے! ہمارے ہاں ہر حکومت "اتحادیوں" کی حمایت اِس طور حاصل کیا کرتی ہے

ہاتھ دیکھنے والوں سے ہمارا بنیادی شکوہ یہ ہے کہ یہ ہاتھ دیکھتے کم، دِکھاتے زیادہ ہیں! ہم نے بارہا اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو بغور دیکھا ہے اور اُنہیں اپنے ذہن سے زیادہ پیچیدہ یعنی آپس میں اُلجھا ہوا پایا ہے! خلش بڑودوی فرماتے ہیں۔

کوئی لکیر سلامت نظر نہ آئے گی

ہمارے ہاتھ نہ دیکھو کہ کھردرے ہیں بہت!

کبھی کبھی تو ہاتھ کی لکیروں کا جائزہ لینے کے بعد جی چاہا ہے کسی کو ہاتھ جڑ دیں! جب آنے والے مستقبل" میں کچھ بھی اچھا دِکھائی نہ دے رہا ہو تو انسان دوسروں ہی پر" خُنّس" اُتار سکتا ہے! مقدر خواہ کتنا خراب ہو، ہم اپنے ہی منہ پر تو طمانچہ رسید کرنے" سے رہے!

ایک دن اکبر سرحدی نے ہمارے ہم پیشہ یعنی صحافی بھائی ریاض عاجز کے ہاتھوں

کی لکیروں کا جائزہ لیا اور اُن کی قسمت کا حال بیان کرنا شروع کیا۔ اکبر سرحدی نے اُنہیں بتایا کہ وہ مزاج کے سخت ہیں، جو منہ میں آئے بول دیتے ہیں مگر دِل کے بہت اچھے ہیں۔ یعنی کوئی ایسی ویسی بات دِل میں نہیں رکھتے۔ ریاض عاجز خاصے متاثر دِکھائی دیئے۔ ہم نے کہا بھائی! تم ٹی وی اینکر ہو اور کرنٹ افیئر کا پروگرام کرتے ہو۔ ایک بار تمہارا پروگرام دیکھ کر کوئی بھی تمہارے مزاج (یا بدمزاجی!) سے متعلق تمام تفصیلات آسانی سے بیان کرسکتا ہے! یہ بات سُن کر اکبر سرحدی نے مستند نجومی ہونے کا بھرپور ثبوت دیا یعنی ہماری بات کا ذرا بھی بُرا مانے بغیر بیان جاری رکھا! اُن کا کہنا تھا کہ چند ایک ماہ پریشانی کے ہیں، اِس کے بعد تمام مشکلات دور ہو جائیں گی! ہم نے ریاض عاجز کو سمجھانے کی (ایک اور ناکام) کوشش کی کہ ہر نجومی یہی کہتا ہے! آخر میں اکبر سرحدی نے اپنی تمام پیش گوئیوں کے درست ثابت ہونے کی خاصی کٹھن شرط عائد کردی۔ اُنہوں نے کہا کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ کر اللہ سے دُعا کیا کریں۔ ہم نے کہا بھائی! جو پانچ وقت اللہ کو یاد کرلے اُسے تو سب کچھ مل گیا، پھر کیسی پیش گوئی اور کون سا مستقبل!

نجومیوں سے ہمارے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے۔ ایک بار ہم ایک مُعمر، سنیا سی بابا ٹُما نجومی کے "چیمبر" میں داخل ہوئے اور اُنہیں بتایا کہ ہمارے پیٹ میں شدید درد ہے۔ نجومی بابا بہت حیران ہوئے اور وضاحت فرمائی کہ

پیٹ کے درد کا مستقبل بیان کرنے کی صلاحیت اُن میں نہیں پائی جاتی ! ہم نے عرض کیا کہ جناب ! مستقبل کو تو فی الحال رہنے دیجیے، یہاں ہم حال سے بے حال ہیں ! کئی دن سے طبیعت میں اضمحلال ہے۔ غدودان معدہ میں عجب نفسا نفسی کا عالم ہے۔ ملک کا یہ حال ہے کہ کوئی بھی جمہوری حکومت زیادہ دن نہیں ٹِکتی اور ہماری یہ حالت ہے کہ جو کھاتے ہیں وہ زیادہ دیر پیٹ میں نہیں ٹِکتا۔ ہمارے پیٹ میں اُٹھنے والے مروڑ کی اصلیت آپ سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟ اُنھوں نے مزید حیران ہوتے ہوئے اِستفسار کیا کہ وہ بھلا پیٹ کے مروڑ کی نوعیت اور کیفیت کیونکر سمجھ سکتے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ ہمیں دَست لگے ہیں۔ وہ بولے "ابے نا ہنجار ! کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس جا، اِس قدر بدبو دار بات بتانے ہمارے پاس کیوں آگیا !" ہم نے عرض کیا جناب ! باہر آپ ہی نے تو "دَست شناس" کا بورڈ لگا رکھا ہے ! اِس پر اُنھوں نے خاصی "دَست آور" نظروں سے ایسے گھورا کہ ہمیں اپنی روح "قبض" ہوتی ہوئی محسوس ہوئی ! اور پھر نجومی بابا نے اپنے دَستِ مبارک سے ہماری چہرہ شناسی کی کوشش کی مگر ہم بر وقت غُچہ دیکر اُسی طرح بچ نکلے جس طرح اچھا وقت ہم سے بچتا پھرتا ہے !

ایک بار ہم نے سڑک کر مستقبل بینی کی دُکان سجائے ایک بابا جی کے طوطے سے فال نکلوائی تو اس میں لکھا تھا ہم جلد بیرون ملک جائیں گے۔ ہم نے سوچا اِس فال کو کنفرم کرنے کے لیے پھر سے فال نکلواتے ہیں۔ طوطے نے دوسری مرتبہ جو

لفافہ اٹھایا اس میں سے برآمد ہونے والی پرچی پر لکھا تھا کہ آئندہ ڈھائی تین برس ہم شدید مشکلات میں گھرے رہیں گے۔ ہم نے بابا سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ انہوں نے پوچھا "پاسپورٹ بنوایا ہے؟" ہم نے کہا نہیں۔ اِس پر وہ بولے "جب غیر قانونی طریقے سے کئی سرحدیں عبور کروگے تو شاید کہیں نہ کہیں پکڑے بھی جاؤگے۔ بس پھر دو تین سال گندے تو گزریں گے ہی۔" ہم نے کہا یہ تو بڑی عجیب فال نکالی ہے طوطے نے۔ وہ بولے "طوطے نے نیک فال نکالی ہے یعنی کہیں نہ جاؤ، اپنے ہی ملک میں رہو!"

ہم نے پوچھا کہ طوطا ہر بار الگ فال کیوں نکالتا ہے، کیا تین چار منٹ میں مُقدر تبدیل ہو جاتا ہے؟ اِس پر بابا جی چہک کر بولے "بیٹا! یہ طوطا ہے، اِنسان نہیں کہ لکیر کا فقیر ہو کر بَس ایک ہی بات کہتا رہے، ایک ہی لفافہ نکالتا رہے! ہم نے بڑی محنت سے ٹریننگ دی ہے تو یہ اپنا ذہن استعمال کرنے کے قابل ہوا ہے!"

بیشتر نجومی ڈائجسٹوں میں کہانی لکھنے والوں کی طرح خاصے ذہین، بلکہ ماہر نفسیات ہوتے ہیں یعنی ہاتھ دیکھ کر وہی بات بتاتے ہیں جو آپ سُننا چاہتے ہیں! مثلاً ایسے احمق کم ہی پائے جاتے ہیں جو پہلی بیوی کو بمشکل بھگتنے کے بعد حماقت دُہرائیں یعنی دوسری شادی کریں! نجومی ہاتھ میں دوسری شادی کی

لکیر کا ذکر ضرور کرتے ہیں! وہ جانتے ہیں کہ اِنسان دوسری شادی کرے نہ کرے، اُس کے بارے میں سُننا ضرور پسند کرتا ہے! یعنی

!دِل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

سڑکوں پر ہنگامہ آرائی اور مار کٹائی کچھ سیاسی کارکنوں ہی کا کیا دَھرا نہیں ہوتا، کبھی کبھی ہم نے نجومیوں کے ہاتھوں بھی فٹ پاتھ کی محفل میں اچھی خاصی گرمی دیکھی ہے۔

ایک صاحب سڑک پر نجومی کے پاس بیٹھے تھے اور وہ ہاتھ دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُن صاحب نے نجومی کو "ہاتھ دِکھانا" شروع کردیا! کسی نے سبب پوچھا تو کہنے لگے "کم بخت کہہ رہا ہے کہ ہاتھ کی لکیریں بتا رہی ہیں کہ آپ کے نصیب میں تین بچے ہیں۔" کسی نے کہا اِس میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے۔ وہ بولے "ناراض کیسے نہ ہوؤں؟ کم بخت یہ بھی بتا رہا ہے کہ میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر نہیں ہے!"

کوئی ذرا بتائے کہ ہم عید کیا منائیں؟

افلاس کے ہاتھوں عید کا خراب ہونا تو دیکھتے آئے ہیں مگر ذہنی افلاس کے ہاتھوں رمضان المبارک کا ڈھنگ سے نہ گزر پانا بھی دیکھ لیا۔ پیٹ کی بھوک پر قابو پالیا مگر ذہن کو خوراک دیتے رہے۔ "یاروں" نے بھرپور کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح اہل ایمان کو ماہِ مبارک میں بھی شدید خوف کی حالت میں رکھیں اور اِس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہے۔ اللہ کی جو مرضی ہے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ ہماری خود ساختہ "بے بسی" یہ ہے کہ ہم ہر سیاسی تاجر سے سودا خریدنے کو بے تاب رہتے ہیں۔ جو چرب زبان ہے وہ دین سکھا رہا ہے اور جس میں علم و حلم ہے وہ گوشہ نشین ہو کر اپنی عزت بچانے کی فکر میں غلطاں ہے! جس کی زبان میں جتنا زہر ہے وہ اُتنا ہی مقبول، بلکہ مرکز نگاہ ہے۔ اللہ کے احکام کے مطابق دھیمے لہجے میں ڈھنگ کی بات کرنے والا احمق گردانا جاتا ہے۔ تقویٰ ایک طرف رہ گیا ہے اور چمک دمک آگے بڑھ گئی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ دینی امور پر کوئی تقریر سُننی ہو تو ہم چاہتے ہیں کہ مقرر شعلہ بیان ہو، خواہ شعلہ بیانی کی چنداں ضرورت نہ ہو! رسول اللہ ﷺ سے عقیدت اور وابستگی کا اظہار بھی ہم اپنی ہی دُھن میں رہتے ہوئے کرتے ہیں۔ نعت سُننے بیٹھتے ہیں تو الفاظ اور عقیدت سے زیادہ "دُھن" اور نعت خواں کے وارڈ روب پر توجہ رہتی ہے! اللہ سے معافی مانگنا پڑے تو چاہتے

ہیں کہ کسی ٹی وی چینل کے اینکر سے براہ راست بات کرتے ہوئے مانگیں تاکہ دنیا گواہ رہے! دینی عقائد کا رشتہ گلیمر سے جوڑنے کی ایسی انوکھی روش کم ہی ممالک میں پائی جاتی ہے! یہ ریاکاری، یہ منافقت کس درجے کی ہے، اللہ ہی جانتا ہے۔ اور وہی یہ بات بھی جانتا ہے کہ یہ روحانی بیماری ہمیں ذلت کے گڑھے میں کہاں تک گراتی جائے گی!

ماہِ صیام کے دوران حالت یہ تھی کہ دن دن بھر معدے میں کچھ نہ انڈیلا گیا تاہم ذہن کو خوراک دی جاتی رہی۔ سکون کی ساعتیں طبیعت پر گراں گزرتی ہیں۔ کچھ "ایسا ویسا" ہو جائے تو ذہن کو خوراک مل جاتی ہے! عبادت کی گھڑیاں اور مناجات کے پہر اُن کے رحم و کرم پر رہے جو آگ لگانے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ مگر صاحب! اِس سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہم آگ لگوانے اور اُس میں بھسم ہونے کے لیے تیار بھی تو رہے! اللہ کی یاد کے دن بھی شکوہ و فریاد کے دِنوں میں تبدیل کر دیئے گئے۔ اور کسی کو نتائج کی پروا بھی نہیں۔

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

مرزا تنقید بیگ واقعی شریف آدمی ہیں۔ دھوکا دینا اُنہیں آتا نہیں اِس لیے اکثر اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے فرماتے ہیں کہ ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دراصل اللہ کی طرف سے آزمائش ہے! ہم اُن کی سادہ لوحی پر "زیر لب کے

نیچے "مسکرانے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں! ہم نے کئی بار اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے یعنی مرزا کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آزمائش والی بات بھی

دِل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کے مصداق ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو اپنی نیت اور اعمال نہیں جانتا؟ اور ہم میں سے کتنے ہیں جو آزمائے جانے کے قابل ہیں؟ عافیت اِس میں ہے کہ جو کچھ بھی ہم پر گزر رہی ہے اُسے گناہوں کی سزا سمجھ کر قبول کرلیا جائے۔ سوال صرف یقین کا ہے۔ اگر ہم یقین نہ کرنے کی ٹھان لیں تو اللہ کے وعدوں پر بھی یقین نہ آئے گا۔ اور عملاً تو ایسا ہی ہے۔

مرزا کا استدلال ہے کہ ایک دن اللہ مظلوموں کی ضرور سُنے گا۔ ہم بھی اِس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ فریاد رنگ لائے گی۔ مگر صاحب! محض فریاد سے کیا ہوتا ہے؟ اگر غلط روش کے باعث کسی کو ہم پر ستم ڈھانے کا موقع مل رہا ہو تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اپنی روش تبدیل کریں تاکہ ظلم اور جبر کی ایک راہ تو بند ہو؟

اب کے رمضان بھی ویسا ہی گزرا جیسا گزرتا رہا ہے۔ جنہیں اللہ کی رحمت سمیٹنی تھی اُنہوں نے رحمت سمیٹی اور جنہوں نے طے کرلیا تھا کہ صرف مال

بنائیں گے اُنھوں نے مال بنایا۔ جس پرنالے کو جہاں بہنا اچھا لگتا ہے وہ وہیں بہتا رہا۔ ایک کا مال دو بلکہ تین یا چار میں فروخت کرکے دُنیوی منافع بٹورنے اور آخرت کا خسارہ سمیٹنے والوں کی ہمارے ہاں کب کمی رہی ہے؟ اِس بار بھی ملک بھر میں رحمتوں اور برکتوں کے کھلے بازار میں خریداری کرنے کے بجائے لوگ معمولی منفعت کی منڈی سجائے بیٹھے رہے۔ جو اہل ایمان ہونے کے دعویدار ہیں وہ ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے۔ فریاد کرنے والے دُہائیاں دے دے کر تھک گئے مگر انسانی خون کے پیاسوں کو رحم نہ آیا۔ انسانیت کا گراف گرتا رہا اور بے حسی کا پارہ چڑھتا رہا۔

رہی سہی کسر تاجر برادری نے پوری کردی۔ رمضان المبارک کے دوران بازار کئی دن بند رہے۔ حالات کے ستائے ہوئے انسانوں کے پاس جو کچھ رہ گیا تھا وہ مختلف اشیاء کے دام بڑھاکر چھین لیا گیا۔ جو تھوڑا بہت بھی اختیار رکھتے ہیں وہ تو کسی نہ کسی طرح اپنا خسارہ پورا کرلیتے ہیں۔ عام آدمی کہاں جائے، کس طور اپنی محنت کی کمائی کو لُٹنے سے محفوظ رکھے؟ فریاد کرے تو کس سے کرے؟ کوئی توقع رکھے تو کس سے؟ اگر وہ مایوس ہو تو حیرت کیسی؟ عید کی مبارک ساعتیں سر پر ہیں اور صورت حال میں کہیں بھی کوئی امید افزاء بات دکھائی نہیں دیتی۔ عوام کی اشک شوئی کے لیے یا پھر اُن کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے دہشت گردوں اور جرائم پیشہ افراد کے خلاف نیم دِلانہ "آپریشن" کیا

جارہا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومت کو بھی بخوبی اندازہ ہے کہ اب لوگوں کو اِس طور بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا۔ میڈیا کا آئینہ سب کچھ اُسی رنگ میں پیش کردیتا ہے جس رنگ میں ہو رہا ہوتا ہے! جن میں اللہ کی رحمت کے خزینے" تلاش کئے جاتے ہیں، رمضان المبارک کے آخری عشرے کی وہ مبارک راتیں ہم نے ایک دوسرے کی دہشت گردی کا شکار ہونے یا پھر دہشت گردوں کے خلاف نام نہاد کیا جانے والا نام نہاد آپریشن" دیکھنے میں گزار دیں! کیا مقدر اِسی کو کہتے ہیں؟ اور اِس پر بھی خوش گمانی یہ" ہے کہ اللہ ہم سے راضی ہو رہے گا!

عید الفطر کی مبارک ساعتیں پھر ہمارا مقدر بنی ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم اِن ساعتوں کا حق ادا کرنے سے قاصر ہی رہے ہیں۔ صدق دل سے توبہ کرنے اور اپنی ہر غلط کی معافی مانگ کر ربّ کائنات سے رحمت کا طلب گار ہونے کا محل ہے۔ اگر کسی سے گلے ملنا ہے تو دِل سے دِل بھی ملائیے۔ کسی سے خلوص کا اظہار کرنا ہے تو بدگمانی کے دھول دِل و نظر سے جھاڑ کر پوری ایمانداری سے محبت جتائیے۔ عید کا حقیقی رنگ اور تقاضا تو یہی ہے۔ اور اِس معاملے میں ریاکاری نہیں چلے گی کیونکہ وہ دِلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔

کس قیامت کا انتظار کریں؟

ماہ صیام اپنی برکتوں کے ساتھ رخصت ہوا۔ اب کے تو کچھ ایسا ہوا ہے کہ یہ مبارک مہینہ بھی یاد رکھے گا اور ہم بھی مدتوں بھول نہ پائیں گے۔ دن بھر بھوک اور پیاس کی سختی جھیلنے والے اپنے ہی لہو میں نہلا دیئے گئے۔ کل تک جن کی آنکھ میں ماہ صیام کے لئے تھوڑی بہت شرم باقی تھی اُنھوں نے غیرت، حمیت اور شرم کا شائبہ تک اپنے وجود میں باقی نہیں رہنے دیا۔ جن ساعتوں میں رحمت اور برکت تلاش کی جاتی ہے ان ساعتوں میں لوگ اپنے پیاروں کو تلاش کرتے رہے۔

آسمان پر کالی گھٹائیں چھاتی رہیں اور پانی برسائے بغیر گزرتی رہیں۔ برستی بھی کیوں؟ خون جو برس رہا تھا! بچوں کے سروں سے سایہ اور ہونٹوں سے ہنسی چھین لی گئی۔ موت نے مسعود لمحات کی منتظر آنکھوں میں خوف سمو دیا۔ اللہ کی رحمت کا حصول یقینی بنانے کے لئے سجدے میں جانے والے سر بھی اپنی اور اپنے پیاروں کی زندگی کے بارے میں سوچ سوچ کر بوجھل ہوتے رہے۔ عبادات کے لطف اور تقدس کو بھی حالات کی خرابی کے آغوش میں دے دیا گیا۔

ذہن سوچ سوچ کر اُلجھتا ہے کہ ہم نے کیسا ماہ صیام گزارا ہے جس میں

عیدالاضحیٰ کا رنگ نمایاں تھا! رمضان المبارک میں کی جانے والی عبادت ہمیں جہنم کی آگ سے نجات دلاتی ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ اور اعلان ہے مگر شاید ہمیں اللہ کے وعدوں پر یقین نہیں۔اِس جملے میں "شاید" بھی تکلفاً قلم کی نوک سے نکل گیا، ورنہ حق تو یہ ہے کہ ہمارے دِل اور دماغ اللہ کے کسی وعدے پر ایمان لانے اور یقین رکھنے کو تیار نہیں۔ عمل آئینے کی طرح ہوتا ہے، سب کچھ بتا دیتا ہے۔ جہنم کی آگ سے نجات کا یقین ہوتا تو ہم رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اپنے لیے جہنم کی آگ نہ دہکا رہے ہوتے۔ ایک دوسرے کا خون بہانے سے فرصت مل پاتی تو ہم اپنے احوال کی اصلاح پر بھی توجہ دیتے۔ جن مبارک ساعتوں میں عبادات کا ثواب کئی گنا کر دیا جاتا ہے اُن میں ہم نے یہ طے کر لیا کہ اللہ کی ہدایات پر عمل کے سوا سب کچھ کر گزریں گے اور کر گزرے۔ اِس دوران بے گناہوں پر کیا گزری، اللہ ہی جانتا ہے۔ کسی کے دل کا ٹکڑا گولیوں سے بھون دیا جائے تو ہم صرف کفن پہنا کر دفنا سکتے ہیں، دکھ تو اُسی کو محسوس ہو سکتا ہے جس کا جگر گوشہ ہمیشہ کے لئے الگ کر دیا گیا ہو۔ تسلی کے چند جملوں سے بھلا کسی کی کیا تشفی ہو گی؟

سیاست کے گندے کھیل نے عبادات کے مواقع بھی تفکرات کی بھٹی میں جلا کر خاک کر دیئے۔جب سے ہوش سنبھالا ہے ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ لوگ اپنے سارے کام

رمضان کے بعد پر رکھ دیتے ہیں۔ سال بھر یہ ہوتا ہے کہ کسی سے کوئی کام شروع کرنے کو کہیے تو جواب ملتا ہے پیر سے شروع کریں گے۔ رمضان المبارک کی آمد پر بیشتر معاملات میں ٹکا سا جواب ملتا ہے کہ ابھی تو رمضان ہے، عید کے بعد دیکھیں گے۔ اگر نہ ٹل سکی تو بس قتل و غارت رمضان کے بعد پر نہ ٹل سکی! جسے جو کرنا تھا رحمتوں اور برکتوں کے مہینے میں بھی کر گزرا۔ نیکیاں کمانے کا ہر موقع ضائع کرکے گناہوں سے افکار اور اعمال کو مزید آلودہ کیا گیا۔ اعمال نامے کی سیاہی میں اضافے کا سلسلہ جاری ہی رہا۔ کیا سحر کے مسعود لمحات اور کیا افطار کی بابرکت گھڑیاں، رمضان کا کوئی پہر ہمارے فکر و عمل کی سفاکی سے بچ نہ سکا۔ ماہ صیام کے ایام گزرنے کے ساتھ ساتھ شہر میں قتل و غارت کا گراف بھی بلند ہوتا گیا۔ یہ تو اللہ کے عذاب کو دعوت دینے والی بات ہے۔ پھر اگر عذاب نازل ہو تو حیرت کیسی؟ جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو محض آپس کا حساب چکانے کا معاملہ ہے۔ یعنی قتل کے بدلے قتل اور لوٹ مار کے جواب میں لوٹ مار۔ اللہ کا عذاب تو اِس کے بعد کی منزل ہے۔ ماہ صیام کچھ اِس رنگ میں گزرا کہ دل و نظر پر قیامت ہی تو گزر گئی۔

کس قیامت کا انتظار کریں؟

!زندگی سر بہ سر قیامت ہے

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اللہ کے غضب سے ڈریں؟ کیا اب بھی وقت نہیں

آیا کہ ہم اللہ کی رحمت کو اپنے لیے عذاب میں تبدیل کرنے سے گریز کی راہ پر گامزن ہوں؟ ہوش و حواس، تاب و تواں سبھی کچھ مٹی میں ملانے کی عادت ہمیں کہاں لے آئی ہے، کچھ اِس کا اندازہ ہے؟ اللہ اپنے وعدے نہیں بھولتا اور وعدے کے خلاف بھی نہیں کرتا مگر ہم اللہ کے تمام وعدے بھول چکے ہیں۔

رمضان اپنے تمام فیوض و برکات کے ساتھ ہم سے رخصت ہوا۔ رحمت کی ساعتیں ہم سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ کیا؟ یہی کہ ہم ہوش کے ناخن لیں، غیرت اور شرم بحال کریں، قتل و غارت سے باز آئیں اور اللہ کے احکام کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کی سعی کریں۔ زندگی کو اللہ کی نعمت گردانتے ہوئے پوری شکر گزاری کے ساتھ جینے کا وقت آگیا ہے۔ اللہ نے ہمارے لئے رحمتوں اور برکتوں کی سبیل لگائی مگر ہم نے سیراب ہونا گوارا نہ کیا۔ ایک دوسرے کے خون سے پیاس بجھانے کی روش ترک نہ کرنے کا انجام کیا ہو سکتا ہے، اِس کے بارے میں ہم سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ اور شاید یہ زحمت ہم اس لئے گوارا نہیں کرتے کہ اپنے انجام سے ہم سبھی واقف ہیں! جب واقف ہیں تو اِس سے بچنے کی تدبیر کیوں نہیں کرتے؟

گروہوں کی سطح سے بلند ہو کر ہمیں دوبارہ معاشرہ بننا ہے مگر اِس کے لئے لازم ہے کہ ہم اللہ کی راہ پر گامزن ہوں، اُس کے احکام کو تسلیم کرکے اُن

پر عمل پیرا ہوں۔ یہ سب کچھ جس قدر مشکل ہے اس قدر آسان بھی ہے۔ اللہ کی طرف جانے میں قباحت صرف انا کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ انا کا گلا گھونٹنے کی صورت میں ہم ایک دوسرے کی گردن دبوچنے کی زحمت سے نجات پائیں گے۔ چند گز زمین کے لئے لڑنے والے جنت کی وسعتوں سے واقف نہیں۔ اگر واقف ہوتے تو ایک دوسرے کا خون بہا کر حرص کو حرز جاں نہ بناتے۔ معمولی مفادات کے لئے قدم قدم پر حریصانہ حیوانیت کا مظاہرہ کرنے والوں کو اللہ کی فراخی اور سخاوت کا کچھ اندازہ ہی نہیں۔

ہر قسم کے تعصّبات پر لعنت بھیجنے کا وقت آگیا ہے۔ آگ لگانے والوں نے تو آگ لگاتے رہنے کی ٹھان لی ہے، ہم کیوں اپنی زندگی کو خاکستر ہونے دیں؟ یہ عمل کی گھڑی ہے۔
علامہ اقبال نے ہمی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

ہر گھر میں ایک فرد ہے "سیدھے" مزاج کا

ٹھاہ۔ ٹھاہ۔ تڑ۔۔ تڑ۔۔ تڑ۔۔

چند ہوائی فائر، پھر مزید ہوائی فائر۔

اور پھر ڈھیروں صداؤں کا اُبھرنا۔

"بھاگو۔۔ جلدی نکلو۔۔ ذرا دیکھ کے۔۔ اُدھر سے نہیں، اِدھر سے۔۔ ابے کیا پارک میں جاگنگ کر رہا ہے؟ جلدی نکل۔ بھاگ"

گولیاں برس رہی تھیں۔ لوگ جان بچانے کی فکر میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ داغی جانے والی گولیاں زیادہ بے ذہن ہیں یا انہیں داغنے والے۔ چند آتشیں گولیوں کا کمال دیکھیے، بھرے بازار میں بدحواسی کا بازار گرم ہوگیا! جب کبھی کوئی سیاسی جماعت احتجاج یا یوم سوگ کا اعلان کرتی ہے، یہی کچھ ہوتا ہے۔ "ماحول" بنانے کے لیے شہر کے نمایاں مقامات کو رونق سے محروم کردیا جاتا ہے تاکہ واقعی سوگ کی کیفیت دِکھائی دے۔ جب تک لوگ جان بچانے کے لیے بھاگتے نہ پھریں، کون کہے گا کہ کسی کے مرنے پر سوگ منایا جا رہا ہے!

ہم بھی اپنے فلیٹ کے نیچے، سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ سولہ سترہ سال کا ایک

لڑکا تیزی سے ہماری طرف آیا۔ ہم نے پوچھا خیریت تو ہے، کیا کچھ گر، گرا گیا ہے؟ اُس نے بند دُکان کی طرف دیکھ کر پوچھا کیا یہ بند ہو گئی؟ ہم نے استفسار کیا۔ کیا کوئی ضروری کام ہے؟ لڑکا بولا انکل! مجھے چپل اور جوتے خریدنے ہیں!

غور فرمایئے۔ جس وقت لوگوں کو دُکانوں کے شٹرز گرا کر اپنی زندگی کے شٹر کو گرنے سے بچانے کی فکر لاحق تھی اور وہ "موقع" سے دُور بھاگنے کے لیے کوشاں تھے تب نئی نسل کے نمائندے کو چپل اور جوتے خریدنے کی فکر لاحق تھی! یہ ہے دیگ کا ایک دانہ، یعنی معاشرے کے مجموعی مزاج کا ایک نمونہ۔

لیجیے، دیگ کا ایک دانہ یعنی نمونہ حاضر ہے۔

رات کے تین بجے ہیں۔ شہر کی سب سے معروف اور مصروف شاہراہ یعنی شارع فیصل سنسان ہے۔ اِکا دُکا گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ ایسے میں کئی افراد "بمع اہل و عیال کے ساتھ" موٹر سائیکل پر خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں۔ ایک سویا ہوا بچہ ٹنکی پر ہے، دوسرا یعنی سب سے چھوٹا بچہ خاتون خانہ کی گود میں ہے۔ اور تیسرا یعنی سب سے بڑا بچہ میاں اور بیوی کے درمیان پھَنسا، ٹُھنسا جھونکے مار رہا ہے۔ اور حسن تغافل ملاحظہ فرمایئے کہ یہ "گھریلو قافلہ" سڑک کے درمیانی ٹریک پر رواں ہے! جس پر گاڑیاں دندناتی ہوئی آتی، جاتی ہیں اور

ناگن کی طرح اِٹھلا کر بل کھاتی ہوئی شاہراہ کسی بھی وقت حادثے کا سبب بن جاتی ہے اُس پر بیشتر گھرانے موٹر سائیکل پر اِسی طور لاپروائی سے سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں! شہر کے مخدوش حالات اور کسی بھی شروع ہونے جانے والی فائرنگ کے باوجود رات تین چار بجے تک بے فکری سے شاپنگ اور پھر معمولی سی موٹر سائیکل پر لَد، پھَند کر پورے گھرانے کی گھر واپسی کچھ پاکستانی معاشرے ہی کی خصوصیت ہو سکتی ہے! عید یا کسی بھی دوسرے مبارک موقع پر خوش ہونا، خوشی منانا برحق ہے مگر کچھ اِدھر اُدھر بھی تو دیکھا جاتا ہے، حالات کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش بھی تو کی جاتی ہے۔ ضروری تو نہیں کہ لاپروائی اور بے ذہنی کو چادر بنا کر اوڑھ لیا جائے اور پھر اُس چادر کو اُتار پھینکنے کے بارے میں سوچا بھی نہ جائے؟

من حیث القوم ہمارا حال عجیب ہے۔ ہر فرد یہ ثابت کرنے پر تُلا ہے کہ پورے معاشرے کو سمجھنے کے لیے ایک بس اُسی کو بغور دیکھ لینا کافی ہے! کسی بازار میں گھوم پھر کر دیکھ لیجیے۔ لوگ سبزی اور پھل بھی خریدتے ہیں تو محض دو چار ٹھیلوں سے دام پوچھ کر۔ اور کبھی کبھی تو اِتنی زحمت بھی گوارا نہیں کی جاتی۔ بازار میں اچھی طرح گھوم پھر کر، دام پوچھ کر خریداری کو بھی توہین تصور کیا جاتا ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ہم کن کن معاملات میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں! کاش اِتنی توہین کے بہ قدر عزت بھی ہم نے کمائی ہوتی!

ہر انسان کو زندہ رہنے کے لیے کھانا بھی پڑتا ہے۔ کپڑا بھی انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور سَر چھپانے کا ٹھکانہ بھی چاہیے۔ قوم پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ لوگ کسی معمولی سی چیز کے لیے بھی سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ پان اور گٹکے جیسی عِلتوں کی غلامی بھی اِس طرح قبول کرلی گئی ہے جیسے اِن کے بغیر زندگی گزاری ہی نہیں جاسکتی۔ بس میں سیٹ نہ ملنے کو اپنی شدید توہین سمجھ لینا عام روش ہے۔ بس میں کھڑے ہو کر سفر کے دوران اگر کسی کا پیر لگ جائے تو لوگ اِس عمومی سی غلطی یا حرکت کو بھی شان میں گستاخی سمجھتے ہوئے بم کی طرح پھٹ پڑتے ہیں! قطار میں دس پندرہ منٹ کھڑا رہنا پڑے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے "جہاں پناہ" کے سر پر پہاڑ آ گرا ہے!

ہم ایسی ہی قوم ہیں۔ کوئی بھی کام وقت پر نہیں سُوجھتا اور ہر کام بے وقت سُوجھتا ہے۔ پاکستانی معاشرہ اب ایک کھلی کتاب بن چُکا ہے اور جو اِس کتاب کا مطالعہ نہ کرے وہ بے ذوق اور بد نصیب ہے!

معاشرے کا کتاب کی طرح عمیق مطالعہ کرنے کے معاملے میں ید طُولیٰ رکھنے والے محترم انور مسعود فرماتے ہیں

اِک بات آ گئی ہے بہت کُھل کے سامنے
ہم نے مطالعہ جو کیا ہے سماج کا
اِک مسئلہ ہے سارے گھرانوں میں مشترک
ہر گھر میں ایک فرد ہے ٹیڑھے مزاج کا!

یہ تو انور صاحب کی اعلیٰ ظرفی اور خُلوص ہے کہ ہر گھر میں صرف ایک فرد کو ٹیڑھے مزاج کا قرار دیا ہے۔ ہم کوئی سَ کہ بند اور جَدّی پُشتی کالم نگار تو ہیں نہیں کہ سوچے سمجھے بغیر کسی کے بارے میں کچھ بھی لکھ ماریں۔ کوئی اور ہوتا تو انور صاحب کی سادہ لوحی پر کیا کیا نہ لکھ ڈالتا۔ ہم یہ کہنے کا حوصلہ اپنے میں نہیں پاتے کہ انور صاحب کا سماجی مطالعہ کمزور ہے مگر معذرت کے ساتھ اِتنا ضرور عرض کریں گے کہ سماجی مُطالعے اور مُشاہدے کی بنیاد پر اُنھوں نے جو کہا ہے کہ وہ شاید بیس تیس سال قبل کے زمانے پر فٹ بیٹھتا" ہے! حقیقت یہ ہے کہ اب ہر گھر میں شاید کوئی ایک آدھ فرد ہی سیدھے" مزاج کا ہے! اور یہ معاملہ بھی اِن سُطور کے تحریر کئے جانے تک کا ہے۔ کالم کی اشاعت کے بعد ہر پاکستانی گھرانے کی حتمی پوزیشن کیا ہوگی، ہم پورے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے!

کیا کیا برس رہا ہے۔ برسات کے بہانے

مسرت کے احساس سے شرابور کردینے والی برساتی بہاروں کا کوئی پہلو، کوئی انگ اردو کے کلاسیکی شعراء نے نظر انداز نہیں کیا۔ نظیر اکبر آبادی اور اُن جیسے دوسرے عوامی شعراء نے تو برسات سمیت ہر موسم کی توصیف اور تشریح میں زمین آسمان کے قلابے ملانے اور بہت دور کی کوڑیاں لانے میں بھی تساہل یا بُخل سے کام نہیں لیا۔ آسمان سے رحمت برستی ہے تو زمین کے سینے سے خزانے اُبل پڑتے ہیں۔ قدرت کی فیاضی یہ ہے کہ بارش کے بعد ہم ہر طرف سبزے کی بہار دیکھتے ہیں۔ زمین کے سینے پر طرح طرح کے پھول جلوہ افروز ہونے لگتے ہیں۔ فصلوں کو نئی زندگی ملتی ہے اور پیداوار بڑھ جاتی ہے۔ حدِ نظر تک سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے اور محض ساون کے اندھوں پر کیا موقوف ہے، آنکھ والوں کو بھی ہرا ہی ہرا سُوجھتا ہے!

کلاسیکی شعراء نے اگر برسات کو سراہا ہے تو کچھ غلط نہیں کیا کہ یہ اُس کا حق تھا مگر خیر یہ سب تو کتابی باتیں ہیں، خواب و خیال کے قصے ہیں۔ شعراء اور نثر نگار اپنی کاوشوں میں زندگی کا پیغام دیتے نہ تھکتے تھے۔ کسی بھی موسمی تبدیلی یا کسی اور معاملے میں اُنہیں کوئی منفی چیز مشکل ہی سے دکھائی دیا کرتی تھی۔ کچھ بھی لکھتے وقت یہ فکر لازمی طور پر دامن گیر رہا

کرتی تھی کہ پڑھنے والوں کو کوئی نہ کوئی پیغام دیا جائے ! ثابت ہوا کہ دور قدیم کے اہل قلم بھولے بادشاہ تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ابلاغ کے متنوع ذرائع پروان چڑھتے گئے اور دُنیا پر یہ نکتہ واضح ہوتا گیا کہ ہمارے گرد و پیش صرف وہی کچھ نہیں جو دکھائی دیتا ہے بلکہ ہر معاملے کی بہت سی "سائڈ اسٹوریز" بھی ہوا کرتی ہیں ! میڈیا ہی کے ذریعے دُنیا کو یہ معلوم ہوسکا کہ بارش ہوتی ہے تو صرف پانی نہیں برستا، سیلاب اور بیماریاں بھی برستی ہیں ! جب پانی اپنے گھر یعنی بادلوں سے نکل کر زمین تک آتا ہے تو بہت سے لوگ بے گھر ہو جاتے ہیں !

ہمارے کلاسیکی شعراء کو معلوم ہی نہ تھا کہ موسلادھار بارش صرف پکوڑے تلنے اور سکھیوں کو درختوں پر جُھولے ڈالنے کی تحریک ہی نہیں دیا کرتی بلکہ اِس سے زندگی کا نظام درہم برہم بھی ہو جایا کرتا ہے !

گاؤں گوٹھ اُس زمانے میں بھی بارش کے بعد سیلابی ریلوں میں بہہ جاتے ہوں گے مگر افسوس کہ کسی شاعر نے متقدمین کی روایت سے بغاوت نہیں کی اور کوئی "بارش آشوب" نہیں لکھا ! خیر سے یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ دورِ قدیم کے اُردو شعراء خاصے "کوتاہ بیں" تھے، حدِ نظر سے آگے نہیں دیکھ سکتے تھے !

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی مہربانی سے (شالا نظر نہ لگے!) ایسی "کوپیکٹ" ذہنی تربیت ہوئی ہے کہ ہمیں تو اب یہ طے کرنا بھی خاصا جاں گُسل معلوم ہوتا ہے کہ بارش سے غلّہ زیادہ پیدا ہوتا ہے یا بیماریاں! آج کی بارش زمین کا سینہ ضرور چیرتی ہے مگر ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ (ایک بار پھر شالا نظر نہ لگے!) کیا کیا باہر آگیا! کبھی کبھی تو خیال آتا ہے کہ کہیں زمین نے اپنے سینے میں انسانوں کے خُبثِ باطن کو تو نہیں سَمو لیا!

ایک زمانہ تھا کہ بوندا باندی کے آثار دیکھ کر خواتین خانہ فوراً باورچی خانے میں داخل ہو کر اطمینان کرلیتی تھیں کہ پکوڑوں کے لیے بیسن اور تیل مطلوبہ مقدار میں ہے نا! دہی بڑے اور چاٹ وغیرہ بنانے کی فکر بھی از خود نوٹس کے تحت فی الفور اطلاق پذیر یعنی لاحق ہو جایا کرتی تھی! اِدھر چند بوندیں گریں اور اُدھر باورچی خانہ آباد ہوگیا۔ بارش سے کونپلیں تو بعد میں پُھوٹتی تھیں، پکوڑوں اور پکوانوں کی بہار پلک جھپکتے میں وارد ہو جایا کرتی تھی! اب خیال آتا ہے کہ اُس زمانے کی خواتین خانہ کس قدر لاپروا ہوا کرتی تھیں۔ پکوڑوں، دہی بڑوں، چھولوں اور جُھولوں کی دُھن میں مگن ہو کر وہ بھول ہی جاتی تھیں کہ ٹپکتی چھت کے نیچے برتن بھی رکھنا ہوتے ہیں! ہمارے ہاں تو حالت یہ ہے کہ بعض علاقوں میں ٹپکتی چھت کے نیچے برتن رکھنے سے کچھ

!دِنوں کا پانی اسٹاک ہو جاتا ہے ! اِسے کہتے ہیں کہ قدرت سے ڈائریکٹ واٹر لائن
گزرے ہوئے زمانوں کے لوگ بھی کتنے بَھولے بادشاہ تھے۔ اُنہیں اندازہ ہی نہیں تھا
کہ جب برسات ہوتی ہے تو بہت سے ایسے ویسے اِمکانات کے غُنچے بھی کھل جاتے ہیں۔
ضروری تو نہیں کہ جب چھت پر برکھا برسے تو کوئی کسی سے ملن ہی کے سپنے ہی دیکھے !
تباہی کا کیوں نہ سوچا جائے اور اِمداد کے سپنے کیوں نہ دیکھے جائیں؟ سرکاری مشینری کے
پُرزے تو آسمان پر گھٹاؤں کے گِھر آنے کو مزید تباہی اور پھر مزید بین الاقوامی امداد
سے تعبیر کرنے میں دیر نہیں لگاتے ! بارش کا موسم اب ہمارے حکمرانوں کے لیے ہاتھ
پھیلانے (یعنی اپنی ذاتی جھولی بھرنے) کے مزید تابندہ و توانا اِمکانات لیکر قدم رنجہ
!فرماتا ہے

سرکاری اہلکار بارش سے تباہی واقع ہونے سے قبل ہی اُس کے اندازے قائم کرنا شروع
کردیتے ہیں ! دیہات کے غریبوں کو اللہ جزا دے کہ تباہی سے دوچار ہوکر حکمرانوں
اور سرکاری مشینری کو کچھ کھانے، کمانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اللہ ہمارے غریبوں
!اور اُن کی اِس فَیاضی کو سلامت رکھے

میڈیا کی مہربانی سے ہمیں بارش کے وہ تمام رنگ دکھائی دیتے ہیں جو شاید دِکھائی نہیں دینے چاہئیں۔ کہیں کسی نالے میں دو چار کتے بلیاں پھنس جائیں تو ان کی لائیو کوریج کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ پوری قوم اچھی طرح دیکھ اور سیکھ لے کہ اگر کبھی نالے میں پھنسنا ہے تو کس طرح پھنسنا ہے اور کس طور کتے بلیوں سے منفرد دِکھائی دینا ہے! جب قوم بارش کے مزے لُوٹ رہی ہوتی ہے تب الیکٹرانک میڈیا کے لوگ ناگفتہ بہ حالت والے لوگوں کو تلاش کر رہے ہوتے ہیں تاکہ اُن سے گفتگو کے ذریعے برسات کے خاکے میں کچھ وکھری ٹائپ کے رنگ بھرے جاسکیں! کسی چینل پر کوئی رپورٹر بارش کے بعد لوگوں میں دوڑ جانے والی خوشی کی لہر کو بھی کچھ اِس ڈھنگ سے بیان کر رہا ہوتا ہے کہ دیکھنے اور سُننے والوں کو گمان گزرتا ہے کہ کوئی بحران رُونما ہوگیا ہے! لوگوں کا مسرت سے جھوم اُٹھنا بھی خاصے انتباہی انداز سے بیان کرنا میڈیا میں فیشن کا درجہ اختیار کرتا جارہا ہے! ٹریفک جام کی تفصیل نمک مرچ لگاکر اِس طرح بیان کی جاتی ہے کہ گھر میں سکون سے بیٹھے ہوئے لوگوں کے پاس بلا وجہ پریشان ہونے کے سِوا کوئی آپشن نہیں رہتا! یہ سب دیکھ کر ہم جیسے بہت سے سیدھے سادہ "اللہ لوگ" طے نہیں کرپاتے کہ بارش سے لطف اندوز ہوں یا سہم جائیں! اللہ کی رحمت کو زحمت کی حیثیت سے پیش کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ معاشرے کی تباہی اور

زوال کے لیے بارش کو صرف موردِ الزام نہ ٹھہرایا جائے بلکہ سارا ملبہ اُسی پر ڈال دیا جائے!

لکھنے والوں نے بھی ذہن کا سانچا تبدیل کرلیا ہے۔ رحمت کی بوندوں کو زحمت کے قطرے ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے! رپورٹرز خبر لکھتے ہیں تو آسمان سے ٹپکنے والے کومل قطروں کو بھی عِفریت کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اور جب کوئی مضمون لکھنے بیٹھتا ہے تو زمانے بھر کی ناکامیاں بارش کے کھاتے میں ڈالنے کی تاک میں رہتا ہے! عدم تشکر کا یہ ماحول ہماری فکری ساخت پر پوری شِدت سے اثر انداز ہو رہا ہے! قدم قدم پر مُشکلات میں گھرے ہوئے لوگ آسمان سے چند چھینٹے پڑنے پر کِھل اُٹھتے ہیں مگر اُنہیں موسم کی خوشگوار تبدیلی سے بھی ڈرایا جاتا ہے! جو لوگ برکھا رُت سے محظوظ ہونے کے لیے گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں اُنہیں ندی نالوں میں طُغیانی اور سڑکیں بلاک ہوجانے کی "نوید" سُنائی جاتی ہے! مختلف رپورٹس اور لائیو کوریج کے ذریعے پیغام دیا جاتا ہے کہ "جہاں ہیں، جیسے ہیں" کی بنیاد پر قناعت کو گلے لگائیں، یعنی گھر میں دُبکے رہیں ورنہ لوگ کہیں گے بارش کے بعد کیسی کیسی چیزیں باہر آ جاتی ہیں! مسرت کے چند لمحات گزارنا بھی اب اِنسان کے بس میں نہیں رہا۔ منفی سوچ کی بارش تھمنے کا نام نہیں لیتی اور اصلی بارش منفی گھٹاؤں کے سامنے سہمی سہمی دکھائی دیتی ہے! بادلوں میں

اُتنی گھن گرج نہیں ہوتی جتنی زبردست گھن گرج اُن سے ڈرانے والوں کے لہجے میں پائی جاتی ہے! سچ تو یہ ہے کہ اِدھر بارش شروع ہوتی ہے اور اُدھر اُس پر پانی پھیرنے کے عمل کا آغاز کردیا جاتا ہے!

وہ زمانے بھی اب ہوا ہوئے کہ جب بارش کی آمد بچوں کے لیے مسرت کا سامان ہوا کرتی تھی۔ جن علاقوں میں کچی زمین کے قطعات زیادہ تھے وہاں بسنے والے کچی مٹی کی مہکار کو درآمد شدہ خوشبویات سے افضل گردانا کرتے تھے۔ بچے بارش کے بعد بیل بوٹیاں تلاش کرتے پھرتے تھے۔ بہت سے بچے سَریا گاڑنے کا کھیل بھی کھیلا کرتے تھے۔ اب بارش کے بعد حکومت کے مخالف "بڑے بچے" سِسٹم کی ناکامی تلاش کرتے پھرتے ہیں! اور سریے ضرور گاڑتے ہیں مگر تنقید کے اور وہ بھی زمین میں نہیں، متعلقہ منتخب ارکان یا افسران کے سینے میں! اگر یہی حال رہا تو بارش بھی ہمارے پاس آنے سے اُسی طرح کترایا کرے گی جس طرح اچھا وقت ہم سے بچتا، چُھپتا پھرتا ہے!

اِنسان اور بجلی

بہت سی باتیں شاید قیامت تک طے نہیں کی جا سکیں گی۔ مثلاً یہ کہ قیامت پہلے آئے گی یا پاکستان میں حقیقی جمہوریت؟ اور یہ طے کرنا بھی انتہائی دشوار ہے کہ ہمارے ہاں حقیقی جمہوریت کے نام پر جو کچھ نافذ کیا جاتا رہا ہے وہ آمریت کا کون سا درجہ ہے! ایک سوال یہ بھی ہے کہ اگر پاکستانی قوم نے قیامت سے قبل اپنا سیاسی قبلہ درست کر لیا تو کہیں اِسی کو تو قیامت کے برپا ہونے سے تعبیر نہیں کر لیا جائے گا؟ ماہرین کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ ان کے بارے میں بھی یہ طے کرنا بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے کہ وہ آخر کیا اور کیوں چاہتے ہیں! ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ ماہرین خود رو پودوں کی طرح ہیں، یعنی ہم نہ چاہیں تب بھی یہ اُگ آتے ہیں۔ اور اِن کے ٹاپ کلاس مشوروں کو خود رو گھاس پھوس اور کانٹوں کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے! جس طرح کچھ کھانے کے بعد اِنسان کے پیٹ میں مروڑ اُٹھا کرتے ہیں، بالکل اُسی طرح ماہرین بھی جب کبھی (اتفاق سے) کچھ سوچ لیتے ہیں تو اُن کے پیٹ میں مروڑ اُٹھتے ہیں اور پھر جب تک وہ مشوروں کا چارا کسی بھینس کے سامنے نہ ڈال دیں، اُنہیں سُکون نہیں ملتا! ماہرین حتمی طور پر کیا چاہتے ہیں، یہ سمجھنے کے لیے بھی ہمیں ماہرین کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی! اگر ماہرین نہ ہوں تو اِنسان کو معلوم ہی نہ ہو

!پائے کہ اُسے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا ہے، کیا پانا اور کیا کھونا ہے

اللہ نے اِنسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے اور ماہرین شبانہ روز محنت کے ذریعے اُسے حیرت المخلوقات بنانے پر کمربستہ ہیں! اچھے خاصے اِنسان کو مشین بنانے پر عقل اور توانائی خوب صرف کی جارہی ہے۔ تحقیق کا بازار گرم رکھنے، یعنی اپنے گھروں کے چولہے جلتے رکھنے کے لیے ماہرین نے اچھے خاصے اِنسان کو طُرفہ تماشے میں تبدیل کر !دیا ہے

سُکون کی حالت میں چلتا پھرتا اِنسان ماہرین کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا، اِس لیے اب یہ پُھلجھڑی چھوڑی گئی ہے کہ اِنسان دوڑ کر ایک کلوواٹ تک بجلی پیدا کر سکتا ہے۔ یہ بجلی جوتوں میں ایک ڈیوائس لگا کر پیدا کی جا سکتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ گھر سے کام پر جاتے ہوئے انسان دوڑ کر اِتنی بجلی پیدا کر سکتا ہے کہ موبائل کی بیٹری چارج کر لے اور ایم پی تھری پلیئر پر گانے بھی سُنتا جائے! اِنسان نہ ہوا، پاور جنریٹنگ یونٹ ہو گیا! اِس نئے شوشے سے قبل ماہرین نے بتایا تھا کہ اِنسان کے بولنے میں بھی توانائی ہے جسے بَرقی رو میں تبدیل کر کے موبائل چارج کیا جا سکتا ہے۔ مگر چلنے پر دوڑنے کو ترجیح دینے والے ماہرین کی طرح اُن ماہرین نے بھی نارمل طریقے سے بولنے پر چیخنے کو ترجیح دی تھی! مطلب یہ ہے کہ اِنسان موبائل کو منہ کے

پاس رکھ کر دس بارہ منٹ تک چیختا رہے تو موبائل سیٹ کی بیٹری چارج کی جا سکتی ہے!
ذرا منطق ملاحظہ فرمائیے۔ یعنی جب کبھی آپ موبائل کی بیٹری چارج کر رہے ہوں گے، لوگ یہ سمجھیں گے کہ بیگم پر برس رہے ہیں!

جب کوئی زیادہ اکڑ دِکھا رہا ہوتا ہے تو ہم پوچھتے ہیں "کیا بات ہے پہلوان؟ اِتنا کیوں پھیل رہا ہے؟" کراچی بھی کچھ اِسی طرح پھیل رہا ہے! لوگ کام پر جانے کے لیے روزانہ چالیس، پچاس کلو میٹر تک کا سفر بھی کرتے ہیں۔ اب ذرا سوچیے کہ اگر کوئی روزانہ کام پر جاتے ہوئے پندرہ بیس کلو میٹر دوڑے گا تو سات آٹھ کلو واٹ بجلی تو پیدا کر ہی لے گا۔ ایسے میں اگر اِنسان خود کو (بقول ناہید اختر) "بجلی بھری ہے میرے انگ انگ میں" نہ سمجھے تو پھر کیا سمجھے! ماہرین کے بجلی ساز مشورے پر عمل کرکے کراچی کے مکین آج کل زیادہ بجلی پیدا کر سکتے ہیں، کیونکہ حالات کے باعث ذہنی حالت یہ ہو گئی ہے کہ کسی سے ذرا سی بھی ایسی ویسی بات کیجیے تو کرنٹ مارنے لگتا ہے! ایسے میں بجلی پیدا کرنے کے لیے بس ڈیوائس لگانے ہی کی تو دیر ہے!

بجلی کے بارے میں سوچتے سوچتے ہمیں مرزا تنقید بیگ کا خیال آیا۔ خیال تو آنا ہی تھا، کیونکہ اُن میں تو ماشاءاللہ اِتنی بجلی بھری ہے کہ اُن کے بارے میں سوچیے تو ذہن کو جھٹکے لگنے لگتے ہیں! ماہرین کے خیال میں اگر اِنسان

بجلی پیدا کرنے کی مشین ہے تو ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ مرزا پُورا پاور ہاؤس اور بھابی 130 کلو گرام کے لحمی وجود کے ساتھ پاور ہاؤس چورنگی ہیں!

کل صبح جب محلے کی بیکری پر مکھن اور انڈے خریدتے وقت مرزا سے ملاقات ہوئی تو ہم "تصوّرات کی خیالی دُنیا" میں کھوگئے! ہم نے "چشم تصوّر کی آنکھ" سے "بہ قلم خود" دیکھا کہ مرزا ڈبل بجلی پیدا کر رہے ہیں، یعنی برق رفتاری سے دوڑ بھی رہے ہیں اور مُنہ کے پاس موبائل رکھ کر چیخ بھی رہے ہیں! اور سڑک پر لوگ یہ تماشا بلا ٹکٹ دیکھ رہے ہیں! ویسے کسی بھی ایسی ویسی حالت میں مرزا کو لوگ جس محویت سے دیکھتے ہیں، وہ بھی دیکھنے کی چیز ہے!

مرزا اگر دوڑ کر بجلی پیدا کریں تو اُس بجلی کو ہم ہارس پاور قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ گھوڑا خاصا قابلِ احترام حیوان ہے! گھوڑے سے ذرا چھوٹے جانور کا نام بھی ہم نہیں لیں گے، ورنہ محترم انصار برنی کو حیوانات کے حقوق کے تحفظ کی تحریک چلانے کی تحریک ملے گی!

ہاکی ہمارا قومی کھیل ہے، مگر فٹبال غریب عوام میں زیادہ مقبول ہے کہ اِس کے لیے صرف ایک فٹبال خریدنا پڑتی ہے۔ کھیلنے والے تو مفت میں اور قدم قدم

پر دستیاب ہیں ! فٹبال میں ہم اب تک کوئی تیر نہیں مار سکے تو کیا ہوا، بجلی تو پیدا کر سکتے ہیں ! گیارہ کھلاڑی 90 منٹ تک فٹبال چھیننے کی کوشش میں بھاگتے ہی رہیں گے تو ذرا سوچیے کہ کتنی بجلی پیدا ہوگی ! یہی حال ہاکی کا ہے۔ اِن دونوں کھیلوں میں حصہ لینے والے گول کریں نہ کریں، بجلی کی پیداوار تو بڑھا ہی دیں گے ! ہمیں اب ایسے ہی کھیلوں کی ضرورت ہے، جن میں فتح ملے نہ ملے، مفادات ضرور محفوظ رہیں !

ماہرین نے یہ نہیں بتایا کہ بجلی پیدا کرنے کے لیے اِنسان میں ڈیوائس لگانے کے بعد اُس کے پیچھے کتے بھی چھوڑے جا سکتے ہیں ! سین یہ ہوگا کہ پیچھے کتے بھونکتے ہوئے بھاگ رہے ہیں اور آگے آگے آپ بھاگتے ہوئے موبائل سے منہ سے لگائے چیخ رہے ہیں !

اب ذرا یہ سوچیے کہ بھری پُری ادبی محفل میں چار غزلیں سُنا کر بھاگ نکلنے والے شاعر کو اپنا کلام سُنانے کے لیے اُس کے پیچھے بھاگنے والے شعرا کس قدر بجلی پیدا کریں گے ! اور صاحب بھاگنے ہی سے بجلی پیدا کرنی ہے تو میدان یا سڑک کی کیا قید؟ گھر میں ٹریڈ مل لگا کر بھی بجلی پیدا کی جا سکتی ہے ! اب ہوگا یہ کہ میاں ذرا کمر سیدھی کرنے کو لیٹے ہی ہیں کہ اہلیہ نے آواز لگائی "ذرا مشین پر کچھ دوڑ تو لگائیں، مجھے موبائل چارج کرنا ہے۔" حکم کی تعمیل ہوئی۔ اب جو کر

سیدھی کرنے دوبارہ لیٹے تو باورچی خانے سے آواز آئی "تھوڑی دیر کے لیے مشین پر پھر دوڑ لگائیں، مجھے گرنڈر چلانا ہے!" شوہر نہ ہوا، گھریلو برقی آلات کا یو پی ایس ہوگیا!

زندگی واقعی دوڑ دھوپ کا نام ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اِتنی بجلی کا ہم کریں گے کیا؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں پھر ماہرین کی طرف دیکھنا پڑے گا!

چین نے ہمارا کیا بگاڑا ہے؟

خان صاحب نے فٹ پاتھ پر رونق میلہ لگا رکھا تھا۔ دوا بیچ رہے تھے اور اس کے فوائد گنوانے کے لیے زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ خوب "منجن" بیچنے کے بعد خان صاحب نے مجمع سے مخاطب ہو کر پوچھا کسی کو کچھ پوچھنا ہے۔ ایک دبلے پتلے شخص نے ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنا چاہا تو خان صاحب نے روانی برقرار رکھتے ہوئے فرمایا "خوچہ تم چپ کرو، کسی اور کو شکایت؟"

یہ لطیفہ نُما واقعہ حکومتِ سندھ کے اِس اعلان پر یاد آیا کہ 2013 سے صوبے بھر کے اسکولوں میں چھٹی کلاس سے چینی زبان لازمی قرار دے دی جائے گی۔ ایسے بھاری بھرکم اعلان کے بعد کسی کی کیا مجال کہ شکایت کرے!

انسان کی نیت صاف ہو تو من کی مُراد مل کر رہتی ہے۔ ہم نے جب بھی اُداسی میں شدت محسوس کی ہے اور چاہا ہے کہ حکومت دل بستگی کا کچھ سامان کرے تو من کی مُراد پوری ہوئی ہے اور کسی نہ کسی وزیر نے آگے بڑھ کر ہمارے لیے ہنسنے کا سامان کیا ہے۔ ایک ڈیڑھ ماہ سے سندھ کے وزیر داخلہ منظور وسان اپنے خوابوں سے رعایا کے ہونٹوں کو مسکراہٹیں عنایت کرتے آئے ہیں۔ اور اب وزیر

!اعلیٰ نے بہ نفس نفیس ہمارے لیے مسرت کا سامان کیا ہے
حکومتوں کی ایک اچھی عادت یہ ہوتی ہے کہ اِن سے وابستہ بعض افراد لوگوں کو خوف سے دوچار کرتے ہیں تو جلد ہی خوف کی فضاء ختم کرکے لوگوں کو ہنسانے والے بھی سامنے آ جاتے ہیں! اِسی کو انگریزی میں بلیننسنگ ایکٹ کہتے ہیں۔ اور اِس فن میں ہماری حکومتیں یدِطولیٰ رکھتی ہیں۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ دس بارہ دن سے ڈاکٹر ذوالفقار مرزا کی شُعلہ بیانی لوگوں کو شدید ذہنی دباؤ سے دوچار کئے ہوئے تھے اور وہ ہر وقت سہمے سہمے رہتے تھے۔ ایسے میں سندھ کے وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ نے چینی زبان کو لازمی قرار دینے کا اعلان کرکے اُداس چہروں کو تابانی اور کانپتے ہونٹوں کو مُسکان بخشی ہے۔ اِس اعلان سے پیدا ہونے والی مُسکراہٹ، بلکہ قہقہوں نے طبیعت کو اِس قدر ہشاش بشاش کردیا کہ ہم یہ پوچھنا بھی بھول گئے کہ ہمیں پہلے کون سی زبان ڈھنگ سے آتی ہے کہ اب چینی سیکھیں گے! قائم علی شاہ نرم مزاج کے انسان ہیں اور وہ ہمیں خان صاحب کی طرح "خوچہ تم چپ کرو" کہہ کر سائڈ لائن نہیں کریں گے مگر اِس کے باوجود ہم کچھ پوچھنے سے مجتنب ہیں۔
ہماری سادگی دیکھیے کہ ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ذوالفقار مرزا کی باتوں سے سہم جانے والوں کو وزیر اعلیٰ ہنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر جب معلوم ہوا

!کہ چینی سکھانے کے معاملے میں وہ سنجیدہ ہیں تو ہم مزید سہم کر سنجیدہ ہو گئے

ہم سوچ رہے ہیں کہ سندھ میں چینی کو لازمی قرار دینے کا اعلان کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ یہاں تو چینی ویسے ہی لازمی ہے۔ اہل سندھ چائے کو پتّی سے کڑک اور چینی سے گاڑھی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اِتنی میٹھی چائے پیتے ہیں کہ کپ میں چمچ کھڑا کیا جاسکتا ہے! سندھ میں چینی کے اِتنے کارخانوں کا کوئی نہ کوئی مصرف تو ہونا ہی چاہیے! ہمیں ڈر ہے کہ اِس چینی زدہ ماحول میں چائنا والی چینی کہیں زائد نہ ہو جائے اور لوگوں کو لسانی !شوگر نہ ہو جائے

سندھ میں اُردو، انگریزی اور سندھی لازمی مضمون کی حیثیت سے سکھائی جارہی ہیں۔ چینی کو شامل کرکے اِس تکون کو مربع اور طلباء کے اذہان کو مُربّہ بنانے کا خیال حکومت کے کِس بُزرجمہر کو سُوجھا ہے، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ سندھ بہت حد تک لسانی تجربہ گاہ ہے۔ کسی زمانے میں اِسلام پر تجربے ہو رہے تھے۔ اب ٹکٹکی پر زبانیں لٹکائی جارہی ہیں۔ اسکولوں میں کئی عشروں سے لازمی مضمون کے طور پر پڑھائے جانے کے باوجود اب تک سندھ میں اردو، سندھی اور انگریزی میں سے کسی میں مثالی مہارت دکھائی نہیں دی۔ کچھ لوگ جو ٹوٹی پھوٹی اردو، انگریزی یا سندھی سیکھ کر اخبارات میں کالم نگاری کرتے یا کتابیں

لکھتے ہیں اُس کے لیے اُن کی ذاتی محنت اور لگن کو موردِ الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ کسی سرکاری یا غیر سرکاری اسکول کا اِس میں کوئی قصور نہیں!

اردو اور سندھی دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہیں۔ انگریزی بائیں سے دائیں لکھی جاتی ہے۔ یعنی ہم اِدھر سے اُدھر جاکر پھر اُدھر سے اِدھر آتے ہیں! چینی زبان اُوپر سے نیچے لکھی جاتی ہے۔ بہت خوب! اب اگر ہم اُوپر سے لکھتے ہوئے نیچے آئیں گے تو دوبارہ اُوپر کیسے جائیں گے؟ اِس کے لیے جاپانی بھی لازمی قرار دی جانی چاہیے۔ سُنا ہے جاپانی زبان نیچے سے اُوپر کو لکھی جاتی ہے! ذہن سمجھ نہیں پا رہا کہ یہ کیا تماشا ہے، کیا گورکھ دھندا ہے! زبانیں سیکھنے کا عمل نہ ہوا، سانپ سیڑھی کا کھیل ہوگیا! دو تین خانے چلیے تو نیچے سے اُوپر اور پھر چند خانوں کے بعد اچانک اُوپر سے نیچے! آسکر وائلڈ نے کہا تھا "میں اِس قدر چالاک ہوں کہ کبھی کبھی تو میں خود بھی نہیں سمجھ پاتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں!" محسوس یہ ہو رہا ہے کہ سندھ کی حکومت صوبے کے ہر بچے کو آسکر وائلڈ بنانے کے درپے ہے! چار مختلف زبانیں لازمی سیکھنے پر سندھ کے بچوں کا ذہن دِلّی کے جنتر منتر اور بُھول بُھلیّوں کو مات نہ دے تو کہیے گا!

اسکول کے بچے تو بے چارے مجبور ہیں۔ جو سِکھائیے وہ اُنہیں سیکھنا ہی پڑے

گا۔ بقول شاعر

کہا جو مَرنے کو مَر گئے ہم
کہا جو جینے کو جی اٹھے ہیں
اب اور کیا چاہتا ہے ظالِم؟
!ترے اشاروں پہ چل رہے ہیں

ساٹھ سال سے ہمارے ہاں انگریزی سکھائی جا رہی ہے۔ اور اِس دوران ہم نے انگریزی کا جو حشر نشر کیا ہے وہ حیرت انگیز نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اِن ساٹھ برسوں ہمارے ہاتھوں انگریزی سَٹھیا گئی ہے! انگریزوں نے ہم پر تقریباً ڈیڑھ سو سال حکومت کی تھی۔ 1947 کے بعد انگریزوں سے بدلہ لینے کے بہت سے طریقے سوچے گئے۔ طے پایا کہ لازمی مضمون کی حیثیت دیکر اِسکول کی سطح پر انگریزوں کی زبان کاتِیا پانچا کیا جائے!

اگر ہم نے اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی کی ایسی تیسی کی ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ انگریزوں سے انتقام لے لیا گیا، مگر صاحب! چین تو دوست بلکہ برادر ملک ہے۔ اُس نے ہمارا کیا بگاڑا ہے کہ ہم اُس کی زبان بگاڑنے پر تُل جائیں؟ چین نے ہر مشکل میں ہمارا ساتھ دیا ہے تو کیا اِس کا بدلہ یہ ہے کہ ہم اُس کی زبان کو سرکاری اسکولوں کے دھوبی گھاٹ پر لاکر ٹنگڑی لگائیں؟

ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ حکومت چینی زبان شاید اِس لیے سکھانا چاہتی ہے کہ شاید اِس طرح ہم چینیوں کی طرح جُھک کر، احترام سے بات کرنا یکھ جائیں! ہم نے عرض کیا بھائی! سندھ کے لوگ تو ویسے مرنجان مرنج ہیں اور اچھے خاصے جُھکے ہوئے ہیں۔ اب اُنہیں اور کتنی تہذیب سکھائی جائے گی؟

اطمینان کی بات یہ ہے کہ سندھ میں چینی زبان 2013 سے سکھائی جائے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ تب تک "شونگ پنگ شین؟" یعنی حکومت رہے گی؟ اِس کا جواب ہے یونگ جینگ فین!" یعنی کِس نے دیکھا ہے! اِسی بات کو مرزا غالب یوں کہہ گئے" ہیں۔

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک!

چین کی حکومت نے شاید اِسی لیے سندھ حکومت کے فیصلے پر کوئی باضابطہ ردعمل ظاہر کرنا ضروری نہیں سمجھا!

خوف کا نیا ورژن

مِرزا تفصیل بیگ ہمارے دوست ہیں۔ معاملہ یہیں تک رہتا تو (اُن کے لیے) پریشانی کی کوئی بات نہ تھی۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہمارے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ انسان بھی ہیں! کوئی بھی بات لاکھ سمجھاؤ، سمجھ لینے کا صرف ناٹک کرتے ہیں اور کرتے وہی ہیں جو اُنہیں کرنا ہوتا ہے! کبھی کبھی تو جی میں آتا ہے کہ اُنہیں کسی سیاسی جماعت کا ترجمان بنوادیں!

کل صبح مِرزا سے ملاقات ہوئی تو (وہ) خاصے پریشان دکھائی دیئے۔ ہم اُن کی پریشانی خوب سمجھتے ہیں۔ وہ شام کو پرائم ٹائم سے رات دو بجے تک ٹی وی پر ٹاک شوز دیکھتے رہتے ہیں۔ اگر کسی اینکر کے ویوئر شپ کم ہے فوراً سے رابطہ کرے۔ کوئی اور دیکھے نہ دیکھے، مِرزا تو اُس کا پروگرام ضرور دیکھیں گے! کئی ٹاک شوز ایسے ہیں جو مِرزا صرف اِس خیال سے دیکھ لیتے ہیں کہ اگر وہ بھی نہ دیکھیں گے تو کون دیکھے گا!

مِرزا کو پریشان دیکھ کر ہم نے سوچا اب ایسی کون سی بات رہ گئی ہے جس پر پریشان ہوا جائے؟ جب پریشانیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں تو اِنسان کسی بھی قسم

کی تکلیف محسوس کرنے کی زحمت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ غالب نے کہا تھا

مُشکلیں مُجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہو گئیں!

اور اِس سے ایک قدم آگے جا کر اصغر گونڈوی نے کہا تھا

اگر آسانیاں ہوں زندگی دُشوار ہو جائے!

شاید اِسی بات کو ہمارے حکمرانوں نے گرہ میں باندھ لیا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہم کسی بھی قسم کی کوئی دُشواری محسوس کریں اِس لیے آسانیوں کو ختم کرتے جاتے ہیں!

ہم نے مرزا سے کہا کہ آپ کو پریشان دیکھ کر ہم اپنی پریشانی بھول جاتے ہیں کیونکہ ہمیں بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے! ہماری بات سے مرزا چڑ گئے اور تیزی سے ہم پر لپکے۔ ہم جُھکائی دیکر ایک طرف ہٹ گئے اور غور سے دیکھا تو اُن پر کپکپی طاری تھی۔ یہ تو بہت حیرت انگیز بات تھی۔ مرزا کا سُسرال قریشی برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر یہ خوں آشام حقیقت بھی اُنہیں کبھی خوف سے دوچار نہ کر سکی۔ پھر اب ایسا کیا ہو گیا ہے جسے دیکھ کر اُن پر کپکپی طاری ہو رہی ہے؟ ہم یہ سمجھے کہ شاید رات بھر ٹی وی پر طرح طرح کی فوٹیجز دیکھ کر خوب ہنستے رہے ہیں۔ اور صبح جب وہ فوٹیجز سمجھ میں آئی ہیں تو اب سہم کر

!خوفزدہ ہو چلے ہیں

جب ہمارے اور مِرزا کے حواس قابل اعتبار حد تک بحال ہو گئے تو ہم نے پوچھا کہ پسینے کیوں چُھوٹ رہے ہیں، سراسیمگی کیوں طاری ہے؟ مِرزا نے قدرے لاچاری اور بیزاری سے کہا "یار کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ذہن پر بہت زور دیتا ہوں تب بھی کِسی بات کا سِرا نہیں ملتا۔"

یہ سُن کر ہماری ہنسی چُھوٹ گئی۔ ہم نے کہا جناب! کیوں مذاق کرتے ہیں؟ آپ اور ذہن؟ آپ کا کچھ سوچنا ذہن پر خود کش حملے سے کم نہیں! ہمارا بس اِتنا کہنا تھا کہ مِرزا تو ہتّھے سے اُکھڑنے لگے۔ جس طرح ہمارے ہاں کابینہ میں وزراء آتے جاتے رہتے ہیں اُسی طرح مِرزا کے چہرے پر بھی ایک رنگ آنے اور دوسرا جانے لگا! ہم نے کہا "مِرزا! اگر آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تو اِس میں کون سی نئی بات ہے اور پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے؟ آپ کی سمجھ میں کب کوئی بات آئی ہے؟ مثلاً....." ہماری بات ادھوری رہ گئی۔ کوئی بھی ایسا ویسا سوال سُن کر سیاستدان جس انداز سے ٹی وی اینکرز کی طرف دیکھتے ہیں، بس کچھ ویسی ہی خشمگیں نظروں سے مِرزا نے ہماری طرف دیکھا اور ایک بار پھر ہماری طرف بڑھے۔ ہم پل بھر کو سہم گئے۔ ہم مِرزا کے پُرانے دوست ہیں اِس لیے جانتے ہیں کہ ایسے "مواقعوں" پر اُن سے تین چار فٹ کا فاصلہ رکھنا

ناگزیر ہوتا ہے! ہمیں سہما ہوا دیکھ کر مرزا نے اپنے غصے پر نظر ثانی کی اور کمال خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارا ہاتھ تھام لیا۔ اُنہیں شاید یاد آگیا تھا کہ دو کروڑ کی آبادی والے شہر میں ایک ہم ہی تو ہیں جو اُن کی بات سُنتے ہی نہیں، مان بھی لیتے ہیں! رشتے دار تو خیر خود بخود بنتے جاتے ہیں، آج کل سچے دوست کہاں ملتے ہیں؟

مرزا نے اپنی داستان شروع کی "آج کل رات بھر نیند نہیں آتی۔ جس طرح اِس ملک سے امن و امان اور استحکام رُوٹھے ہوئے ہیں بالکل اُسی طرح پُرسکون نیند میری آنکھوں سے روٹھی ہوئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کون سے پیر سے تعویذ لاؤں تو سُکون پاؤں۔"

ہم نے مشہور زمانہ خواب آور نُسخہ یاد دلایا کہ بستر پر لیٹ کر بھیڑیں گننا شروع کر دیا کیجیے، ذرا سی دیر میں نیند آ جایا کرے گی۔ مرزا نے حیرت انگیز طور پر مودب لہجہ اختیار کرتے ہوئے ہماری معلومات میں اضافہ کیا "مُوسلا دھار بارشوں کے بعد مُلک سیلاب کی زد میں ہے۔ دیہی علاقوں میں بیشتر مویشی سیلابی ریلوں کی نذر ہو گئے ہیں۔ ذرا سی گنتی میں بچے کھچے مویشی بھی ختم ہو جاتے ہیں!"

اب ہمیں صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ جب مویشی ہی ختم ہو گئے تو اِنسان کیا گن کر نندیا رانی کو اپنے پاس بُلائے گا؟

مِرزا نے بیان جاری رکھا "فجر کے وقت نیند آتی ہے تو عجیب و غریب خواب دیکھتا ہوں۔" یہ سُن کر ہم چونکے۔ چونکنا اِس بات پر نہیں تھا کہ وہ عجیب و غریب خواب دیکھتے ہیں۔ مِرزا جیسے خود ہیں، ظاہر ہے ویسے ہی خواب دیکھیں گے! ہم تو اِس بات پر حیران ہوئے کہ اُن کی یہ ہمت کہ خواب دیکھیں۔ خواب دیکھنا اور اُن کی تعبیر کا سوچنا تو اب صرف سندھ کے وزیر داخلہ کا منصب ہے! اور سچ تو یہ ہے کہ حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ اب منظور وسان صاحب نے بھی خواب دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ کل تک وہ کسی نہ کسی طور اپنے خوابوں کی تعبیر کا بندوبست کرلیا کرتے تھے۔ اب خواب کی تعبیر کا اہتمام کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا جا رہا ہے!

ہم نے سوچا ذرا خوابوں کی نوعیت تو معلوم کریں۔ مِرزا نے بتایا "جیسا شہر ہے ویسے ہی خواب ہیں۔ نیند کی حالت میں بھی کراچی کے حالات ہی حواس پر سوار رہتے ہیں۔ لڑائی، مار کٹائی، تشدد۔۔ اور کیا؟ کسی کو تشدد پر تُلا ہوا پاتا ہوں اور کسی کو تشدد کا نشانہ بنتا ہوا دیکھتا ہوں۔"

ہم نے عرض کیا کہ خواب میں دوسروں پر تشدد ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے؟

مرزا بُرا مان گئے۔ قدرے سرد لہجے میں بولے "تم واقعی پاکستانی ہو۔ یعنی پڑوس میں آگ بھی لگی ہو تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ اپنا گھر تو محفوظ ہے!"

سچ یہ ہے کہ مِرزا کی بات سُن کر ہم تھوڑے سے شرمندہ ہوگئے۔ معذرت چاہتے ہوئے ہم نے مِرزا سے کہا کہ اپنی بات جاری رکھیں۔ وہ کہنے لگے "اب ایک ہفتے سے حالت یہ ہے کہ روزانہ فجر کے وقت یہ خواب دیکھ رہا ہوں کہ کوئی چُھرے لیکر مُجھ پر وار کرنا چاہتا ہے۔ بس عین وقت پر کسی نہ کسی طرح بچ نکلتا ہوں، اور وہ بھی یوں کہ گھبراہٹ میں آنکھ کھل جاتی ہے!"

ہم نے وضاحت طلب کی کہ اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ چُھرے لیکر کون حملہ آور ہوتا ہے۔ کہیں بھابی کے میکے والے تو نہیں ہوتے! مِرزا نے اطمینان سے جواب دیا "خواب میں جو لوگ مُجھ پر حملہ کرتے ہیں وہ سُسرال والے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ تمہاری بھابی کے میکے والے جدّی پُشتی ہیں، رگ پٹھہ دیکھ کر چُھرا گھماتے ہیں!"

ہم نے پوچھا جو لوگ خواب میں چُھرے لیکر حملہ آور ہوتے ہیں اُنہیں آپ جاگتی آنکھوں سے دیکھ لیں تو شناخت کرلیں گے؟ مِرزا کا جواب تھا "ویسے تو اِس قسم کے ظالموں کو لوگ پہچان لینے پر بھی شناخت نہیں کرتے، مگر احتیاط کا عالم یہ ہے کہ خواب میں بھی اُنہوں نے چہروں پر ڈھاٹے باندھے ہوتے ہیں! "

ہم نے اِستفسار کیا کہ کسی سیانے سے خواب کی تعبیر جاننے کی کوشش کی ہے۔ مِرزا کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے ایک بزرگ کے سامنے جب اپنا خواب بیان کیا تو اُنہوں نے بتایا کہ خواب کی نوعیت یہ بتا رہی ہے کہ مُشکلات کے بھنور میں پھنس کر بھی زندہ رہو گے، تم پر آنچ نہ آئے گی!

ہم نے یہ تعبیر سُن کر مِرزا کو مبارک باد دی کہ زندگی کے محفوظ رہنے کی سَند تو مل بھی چکی۔ کیا چاہیے؟ اب کس بات پر پریشانی لاحق ہے؟

ہماری بات سُن کر مِرزا نے خاصی بے چارگی سے اپنی تشویش کا اصل سبب یوں بیان کیا "ابھی کل تک تو گھر سے باہر قدم رکھتے ڈر لگتا تھا۔ جان کسے پیاری نہیں ہوتی؟ چاروں طرف دیکھ کر چلنا پڑتا تھا کہ کہیں سے کوئی اندھی گولی آکر رگِ جاں میں پیوست نہ ہو جائے۔ اب شہر کا حال یہ ہوگیا ہے کہ موت

کا خوف کب کا مَر چکا۔ اب تو مرنے والوں پر رشک آتا ہے کہ ایک بڑے گورکھ دَھندے سے چُھوٹے! تازہ ترین خوف یہ ہے کہ اگر اِس شہر میں زندہ رہ گئے تو کیا ہوگا؟

مِرزا نے ہمیں بھی مُشکل میں ڈال دیا۔ مارکیٹ میں "انٹروڈیوس" ہونے والے اِس نئے خوف کے بارے میں تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا!

”رُل وے“ کا محکمہ

ریلوے کا محکمہ ہماری زندگی سے کتنا مِلتا جُلتا ہے۔ دونوں میں رُوحانیت کا عنصر پختہ ہوتا جارہا ہے کیونکہ کام دھندا چھوڑ کر دونوں ہی گوشہ نشینی اختیار کرتے جارہے ہیں!
ریلوے کے محکمے کو دیکھ کرپُرسکون انداز سے جینے کا ہنر ہم بخوبی سیکھ سکتے ہیں کیونکہ ٹرینوں نے اب فانی دُنیا کی عِلّتوں سے کنارہ کش ہو کر مراقبہ شروع کردیا ہے! علامہ اقبال نے کہا تھا۔

سُکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

ثابت ہوا کہ آنے والے زمانوں اور بالخصوص پاکستان ریلوے کے مستقبل پر اُن کی نظر نہیں تھی۔ علامہ نے پاکستان کا خواب ضرور دیکھا تھا، پاکستان ریلوے کا خواب نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو ”سُکوں محال ہے۔۔۔۔ والا مصرع ہرگز نہ کہتے!
بچپن سے بال ہٹ، راج ہٹ اور تریا ہٹ کا سُنتے آئے ہیں، یعنی یہ کہ ضِد اور ہَٹ دھرمی بچوں، بادشاہوں اور عورتوں پر ختم ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ٹرینوں کو آپ کیا کہیں گے؟ وہ بھی اگر کہیں ٹھہر جائیں یا اڑ جائیں تو ٹس

سے مَس نہیں ہوتیں! سچ تو یہ ہے کہ جو ریلوے کے ہتّھے چڑھا وہ رُل گیا۔ گویا ریلوے نہ ہوا، "رُل وے" کا محکمہ ہوا!

اُردو شاعری میں جو چند کیفیات نمایاں طور پر بیان کی جاتی ہیں اُن میں انتظار کی کیفیت سب سے نمایاں ہے۔ کلاسیکی شعراء خاصے پیش بیں تھے۔ اُنہیں اندازہ تھا کہ کبھی ایسا بھی زمانہ آئے گا جب پاکستان کی ٹرینیں اِنسانوں کو انتظار کی چکی میں پیسیں گی۔

جاں نثار اختر نے انتظار کے جاں گُسل لمحات کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔

جیسے سِگنل پہ رُک گئی ہو ریل!

آپ سوچیں گے ٹرین سِگنل پہ تو اُس وقت رُکے جب وہ واشِنگ لائن سے باہر آنے کی زحمت گوارا کرے! اگر اُردو کے شعراء کو ٹرین کا پے دے پے سفر کرایا جائے تو اُن کے فن میں انتظار کی کیفیت زیادہ نکھر کر، نمایاں ہو کر سامنے آئے گی۔ کوفت اور وحشت بھی شامل ہو جائے تو انتظار کی کیفیت دوآتشہ کیوں نہ ہو!

ٹرینوں کا حال یہ ہوگیا ہے کہ اِنہیں چلتا دیکھ کر اب لوگوں کا اِس بات پر یقین بڑھ جاتا ہے کہ اللہ جو چاہے کرسکتا ہے! ریل کی پٹریاں زندگی بھر ساتھ ساتھ چلتی ہیں مگر ملتیں نہیں، کچھ اِسی طرح ریلوے کے محکمے کی ملاقات بھی حسن کارکردگی سے نہیں ہو پاتی!

ریلوے کا محکمہ اور اُس کے وزیر ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ دونوں کی کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی! ٹرینوں کے سال خوردہ انجنوں کی طرح ریلوے کے وزیر کی بھی سانس اُکھڑی اُکھڑی رہتی ہے! سچ تو یہ ہے کہ ٹرین تو ہم کسی نہ کسی طرح پکڑ ہی لیتے ہیں، غلام احمد بلور کی کوئی بات ہماری پکڑ میں نہیں آتی! میڈیا والے چودھری شجاعت اور نواب اسلم رئیسانی کی طرح غلام احمد بلور سے بات کرتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں۔ وہ کوئی بات کربیٹھیں تو سمجھنے میں دو دن لگتے ہیں اور تب تک صورت حال بدل چکی ہوتی ہے! اگر کبھی اُن سے ٹرینوں کے شیڈول کا اعلان کرادیا جائے تو مسافر برسوں پلیٹ فارمز کے چکر ہی کاٹتے رہیں گے! ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اب تک لوگ یہ بھی سمجھ نہیں پائے کہ غلام احمد بلور کی خراب صحت کو ریلوے سے قیاس کریں یا وزیر موصوف کو دیکھ کر ریلوے کی خراب حالت کا اندازہ لگائیں!

گزشتہ دنوں ریلوے نے ایک اور انوکھی روایت کو جنم دینے کی ابتداء کی۔ دو دو

ٹرینوں کو ایک ہی انجن سے روانہ کیا گیا۔ یہ دیکھ کر ہمیں اپنی جوانی کا یعنی خاصا پرانا زمانہ یاد آگیا! ایک دور وہ بھی تھا جب کوئی فلم کئی سنیما گھروں میں ریلیز کئے جانے پر پندرہ بیس منٹ کے وقفے سے اسٹارٹ کی جاتی تھی۔ سبب اس کا یہ تھا کہ کہیں ایک ریل ختم ہوتی تھی تو سنیما کا کارندہ موٹر سائیکل پر لاد کر وہ ریل دوسرے سنیما تک پہنچاتا تھا اور تب وہاں فلم اسٹارٹ ہو پاتی تھی! کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ ریلیں آگے پیچھے ہونے پر کہانی میں عجیب و غریب ٹوئسٹ پیدا ہو جایا کرتے تھے! ایک ریل میں موت سے ہمکنار ہونے والا اداکار اگلی ریل میں چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا اور فلم بین سوچتے رہ جاتے تھے کہ رومانی فلم اچانک ہارر مووی میں کیسے تبدیل ہو گئی! چند ریلوں کے آگے پیچھے ہونے سے کہانی ایسا عجیب و غریب رنگ اختیار کرتی تھی کہ فلم بین عش عش کر اُٹھتے تھے اور فلم کی کاسٹ، رائٹر اور ڈائریکٹر کو داد دیتے نہ تھکتے تھے!

اب آپ سوچیے کہ اگر دو ٹرینیں ایک انجن سے روانہ کی جائیں اور ایک ٹرین کو راستے میں چھوڑ کر انجن دوسری ٹرین کے ساتھ چلتا بنے تو کیسی فلم معرض وجود میں آئے گی! جو لاڑکانہ جانے کے لیے نکلے گا کوئٹہ پہنچ کر دم لے گا!

نکلے تھے کہاں جانے کیلئے، پہنچے ہیں کہاں؟ معلوم نہیں
اب اپنے بھٹکتے قدموں کو منزل کا نشاں معلوم نہیں

ایک صاحب شکایت کر رہے تھے کہ وہ جب ٹرین کے ذریعے بیٹے کی بارات لیکر لڑکی والوں کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ چوتھی کی رسم ادا کی جارہی ہے ! اِس نوعیت کی بوالعجبی سیاست دانوں میں تو عام تھی۔ افسوس کہ سیاسی دُنیا کے لطائف اب عام آدمی کی زندگی میں بھی در آئے ہیں!

مرزا غالب نے ویرانی کے ذکر میں بھی اپنے گھر کو اولیت بخشی تھی۔

دَشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا!

یعنی دشت کی ویرانی دیکھ کر اُنہیں گھر کی ویرانی یاد آئی تھی جو اُن کے خیال میں شدید تر تھی۔ اگر غالب اکیسویں صدی کے پاکستان میں ہوتے اور کسی ریلوے پلیٹ فارم کو دیکھ لیتے تو اپنے گھر کی ویرانی بھول بھال جاتے ! ویرانوں میں تو پھر بھی دو چار اُلّو رونق میلہ لگانے کی کوشش میں مصروف دکھائی دیتے ہیں، ریلوے پلیٹ فارمز کا حال اِس بھی بُرا ہو چلا ہے!

اگر کبھی ٹرین کی آمد کا یقین ہو تو پلیٹ فارمز پر لوگ گھنٹوں انتظار کرتے رہتے ہیں۔

اور پھر ٹرینوں کا شیڈول بنانے والوں کو حضرتِ داغ کی زبان میں کوستے ہیں۔

!غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا

ہماری ناقص عقل یہ تجویز پیش کرتی ہے کہ ہر ریلوے پلیٹ فارم کو سوشل کلب میں تبدیل کردیا جائے! ٹرینوں کی بے وقتی کے باعث اور ریلوے حکام کی نااہلی سے اگر ہزاروں افراد پلیٹ فارم پر جمع ہو ہی جائیں تو اِس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیوں !نہ اُنہیں آپس میں مِل بیٹھیں اور ایک دوسرے کے بارے میں واقف ہو لیں

اگر کوئی بارات روانہ ہو رہی ہو تو دس پندرہ گھنٹے تک پریشان ہونے سے بہتر ہے کہ !مایوں وغیرہ کی رسم پلیٹ فارم ہی پر ادا کی جائے تاکہ ڈیکوریشن کا خرچہ بچے

تجارتی کمپنیاں اپنی مشہوری کے لیے اِن پلیٹ فارمز کو بخوبی استعمال کر سکتی ہیں۔ جو سیاست دان لاکھ کوشش کے باوجود جلسے کے نام پر ڈیڑھ دو سو سے زائد "جاں نِثار" جمع نہیں کرپاتے وہ ریلوے پلیٹ فارمز کو جلسہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں! اِس صورت میں ریلوے کے محکمے کو اِضافی آمدنی ہوسکتی ہے اور سیاست دانوں کی "پُرلطائف" تقاریر سُن کر مسافروں کے لیے انتظار کی کوفت سے بچنا آسان ہوسکتا !ہے! آج کل جس قدر آسانی ملے، غنیمت ہے

ہنسی ہنسی میں جہاں سے گزر نہ جائیں ہم

ماہرین کا دم غنیمت ہے کہ ہم وہ باتیں بہتر انداز سے دوبارہ جان لیتے ہیں جو صدیوں، بلکہ ہزار صدیوں سے جانتے ہیں! آئے دن سُننے میں آتا ہے کہ فلاں مغربی ملک میں "عادی" ماہرین نے چار پانچ سال کی تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ جس سے محبت ہو اُس کے مَرنے پر اِنسان شدید دُکھ محسوس کرتا ہے! یا یہ کہ زیادہ کھانے سے وزن بڑھتا ہے اور سُستی میں بھی اضافہ ہوتا ہے! لو، کرلو بات۔ کون ہے جو یہ سادہ سی حقیقت بھی نہیں جانتا کہ کسی پیارے کے مَرنے سے دِل دُکھی ہو جاتا ہے؟ ماہرین شاید یہ چاہتے ہیں کہ ہم اُن سے پوچھ لیا کریں کہ کب خوش ہونا ہے اور کب دُکھ محسوس کرنا ہے! اور صاحب! زیادہ کھانے سے وزن کے بڑھنے کا راز اور تو اور، ہم بھی جانتے ہیں کیونکہ ہم خود اِس منزل سے گزرتے رہے ہیں اور گزر رہے ہیں!

اب ماہرین نے یہ شوشہ چھوڑ کر اپنے دِماغ کا بوجھ ہلکا کیا ہے کہ کُھل کر ہنسنے سے اِنسان کے دِل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے! ماہرین نے یہ وضاحت نہیں کی کہ کُھل کر ہنسنے سے کیا مُراد ہے؟ کیا اِنسان کوئی صندوق ہے کہ پہلے کُھلے اور پھر ہنسے؟ ماہرین کی ایک ٹیم کے سربراہ اور برطانیہ کی آکسفورڈ

یونیورسٹی کے پروفیسر رابن ڈنبر کہتے ہیں کہ زیادہ ہنسنے سے درد کی شِدت گھٹ جاتی ہے۔ اُن کے نزدیک بھرپور قہقہہ بہت حد تک درد کش دوا کا کام کرتا ہے۔ درد سے نجات پانے کی شرط یہ ہے کہ ہنسی دَبی دَبی نہ ہو بلکہ پوری قوت سے قہقہہ لگایا جائے۔ پروفیسر رابن ڈنبر کا فارمولا یہ ہے کہ جس قدر درد ہو اُسی قدر قہقہے لگاتے جایئے۔ موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ ایسا کرنے والوں کا نظارہ کرنے والے اپنے قہقہوں پر کس طرح قابو پائیں گے!

اُردو کے شعراء کی غالب اکثریت درد کو زندگی کا حاصل قرار دیتی ہے۔ پروفیسر رابن ڈنبر کے مشورے پر عمل کرنے سے تو درد کی وقار ہی ختم ہو جائے گا۔ شاید ایسی ہی کی کیفیت کو شان الحق حقی نے یوں بیان کیا تھا

لذّتِ درد سے آسودہ کہاں دِل والے
ہیں فقط درد کی حسرت میں کراہے جاتے!

پروفیسر رابن ڈنبر کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہنسی سے درد مِٹانے کے تجربے کے دوران رضا کاروں کے ایک گروپ کو مزاحیہ پروگرام دکھائے گئے اور دوسرے گروپ کو گالف کے بارے میں دستاویزی فلم دیکھنے کے مرحلے سے گزارا گیا۔ مزاحیہ پروگرام دیکھنے والوں کے جسم میں اینڈروفنز نامی کیمیکل پیدا ہوا جو درد کی شِدت کو کم کرنے میں معقول حد تک مدد دیتا ہے۔ گالف پر دستاویزی فلم

دیکھنے والوں نے واضح طور پر بیزاری محسوس کی۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ گالف پر دستاویزی فلم دیکھنے والوں نے بیزاری محسوس کی تو اِس میں درد محسوس کرنے یا نہ کرنے کا کیا سوال ہے! ہمارے ہاں تو بہت سے مزاحیہ پروگرام بھی اِس معیار کے ہیں کہ اُنہیں دیکھ کر اِنسان سوچتا ہے کاش گالف پر دستاویزی فلم ہی دیکھ لی ہوتی! اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں بیشتر دستاویزی فلمیں زیادہ اور معیاری مزاح پیدا کرتی ہیں!

سوال مزاح کا ہے۔ اگر مزاحیہ پروگراموں سے زیادہ مزاح دستاویزی فلموں میں ہو تو دستاویزی فلمیں کام کی ہوئیں!

ماہرین کا مشورہ سر آنکھوں پر مگر حقیقت یہ ہے کہ درد کش دوا کے طور پر ہنسی کو زندگی کا جُز بنانے کا آئیڈیا اُن کے لیے نیا ہوگا، ہم نے اِسے کئی عشروں سے زندگی کا حصہ بنا رکھا ہے! اور سچ تو یہ ہے کہ مستقل ہنستے رہنے سے اب پوری پاکستانی قوم کے دماغی پیٹ میں بل پڑ چکے ہیں! اور یہ بل پیشانی کو مزید شِکن آلود کر رہے ہیں!

ماہرین فرماتے ہیں کہ قدیم دور کا اِنسان غیر مہذب تھا۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ کُھل کر، پوری زندہ دِلی کے ساتھ ہنستا کیا ہوتا ہے۔ اِس بات سے ہم بھی اتفاق کریں گے۔

آج کے اِنسان نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر حوصلہ ہو یعنی

ہنسنے کی ٹھان لی جائے تو کسی بھی بات پر ہنسا جا سکتا ہے! ٹی وی سیٹ آن کیجیے اور دیکھیے کہ جن باتوں پر لازم ہے کہ دِل خون کے آنسو روئے اُن پر بھی لوگ جی بھر کے ہنس رہے ہوتے ہیں! قدیم دور کے اِنسان آج زندہ کر دیئے جائیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اب کوئی بھی شعبہ ہمارے قہقہوں سے محفوظ و مامون نہیں رہا۔

دہشت گردی کی کسی بھی واردات کے بعد متعلقہ وزیر اور حکام کے بیانات سُنیے اور پھر اپنی ہنسی روک کر دِکھائیے! قدرتی آفات کے رُونما ہوتے ہی حکومتی مشینری کا "ربانی" ریسپانس بھی لوگوں کو ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیتا ہے۔ نچلی سے نچلی ترین اور اعلیٰ سے اعلیٰ ترین سطح کے تعلیمی اداروں میں جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے کیا وہ کم قہقہہ آور ہے؟

سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ہاں ہنسنے کا مقابلہ ہو رہا ہے یا ہنسانے کا! ہنسانے والوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ ہنسا ہنسا کر مار ڈالیں گے اور ہنسنے والے بھی کمر کَس کر میدان میں اُترے ہیں! اگر آپ فوری اور بے ساختہ ہنسی چاہتے ہیں تو ٹی وی چینلز پر کسی بھی واقعے کی براہ راست کوریج دیکھیے۔ یہ مزاح کی بالکل تازہ اور شاید بہترین قسم ہے! اگر کسی واقعے کے فوراً بعد کسی رپورٹر کو جگا کر واقعے سے متعلق بریف کئے بغیر بیپر لیا جائے یعنی تفصیلات طلب کی جائیں تو انتہائی منفرد قسم کا مزاح سُننے کو ملتا ہے! کبھی

کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی رپورٹر کو چند باتیں بتایئے اور اسپاٹ (یعنی اسٹوڈیو کی چھت!) پر بھیج دیجیے اور پھر دیکھیے کہ وہ "آنکھوں دیکھا حال" بیان کرنے کے لیے کتنی دُور کی کوڑیاں لاتا ہے!

اسٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی کچھ کم ستم ظریف نہیں ہوتے۔ قدم قدم پر ایسے بھنڈ فرماتے ہیں کہ اِنسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کس پر ہنسے اور کس پر نہ ہنسے! ایک بار کسی واقعے پر معروف تجزیہ کار طلعت حسین کی رائے جاننے کے لیے اُن سے موبائل فون پر رابطہ کیا گیا۔ پروڈکشن والوں نے غلطی سے اداکار طلعت حسین کا نمبر ملا دیا۔ جب اینکر نے واقعے کی مناسبت سے اُن کا ردعمل جاننا چاہا تو طلعت حسین اپنی مخصوص سنجیدہ، کھرج بھری آواز میں بولے "بی بی! میں اداکار طلعت حسین بات کر رہا ہوں۔" اینکر کو سیکنڈ کے پچاسویں حصے میں غلطی کا احساس ہوا مگر یہاں بھی بھنڈ فرمانے سے گریز نہیں کیا گیا۔ اُس نے جلدی سے کہا "طلعت حسین صاحب! ہم سے بات کرنے کا شکریہ!"

سچ تو یہ ہے کہ اب کسی چیز کے مزاحیہ اور سنجیدہ ہونے کی کوئی حد یا قید بھی نہیں رہی۔ اخبارات میں جو کچھ سنجیدگی کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے وہ لافانی مزاح کے ذیل میں آتا ہے! اور جن باتوں کو مزاحیہ یا فکاہیہ قرار دے کر شائع کیا جاتا ہے اُنہیں پڑھ کر لوگ منہ بسورتے پائے گئے ہیں! ماہرین یہ

بھی فرماتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ لوگ ہر مزاحیہ پروگرام دیکھ کر ہنسیں۔ بالکل ٹھیک۔ ہمارے ہاں ایسے معاملات کی کمی نہیں جو مزاح کے زُمرے میں رکھے جاتے ہیں مگر اُن پر بے اختیار رونا آتا ہے! لوگوں کی مرضی ہے، جس بات پر چاہیں جی بھر کے ہنسیں۔ یہ کوئی فوجی تقریب کا معاملہ تو ہے نہیں کہ کامیڈین کوئی آئٹم سُنائے اور جوان پوری شِدّت سے اُبھرنے والی ہنسی کو بھی محض اِس لیے روک لیں کہ جنرل صاحب کو ہنسی نہیں آئی! عوام اِس ٹائپ کا ڈسپلن پسند نہیں کرتے۔ وہ تو ہنسنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔

پاکستانی قوم پہلے ہی بہت ہنس رہی ہے۔ اِس ہنسی نے تو ہم سے درد کی دولت ہی چھین لی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ

درد اُٹھتا ہے مگر رُسوائیوں کے خوف سے
اپنے دِل کی چوٹ دُنیا سے چُھپا لیتے ہیں لوگ!

ماہرین سے پوری سنجیدگی کے ساتھ اِلتماس ہے کہ ہمیں کچھ تو جینے دیں، بے سروپا تحقیق کی مدد سے مزید ہنسانے کی کوشش نہ کریں!

حوصلے بیٹھ گئے، پانی کھڑا ہے

یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ اب کے کون زیادہ بَرسا ہے۔۔۔۔ پانی یا مُشکلات؟ جو زمین فصل کے لیے پانی کو ترستی تھی اُسی پر کھڑی فصلیں اب خُشکی کو یاد کرکے روتی ہیں۔ اللہ سے فضل و کرم بَرسانے کی التجا کرنے والے اب مُلتَمِس ہیں کہ رحمت مزید نہ برسے! دُنیا بھر میں بارش سے بہت پہلے اُس کے ممکنہ اثرات سے بچنے کا اہتمام بھی کرلیا جاتا ہے تاکہ رحمت کسی صورت زحمت نہ بنے۔ ایک ہم ہیں کہ کسی بات کا ہوش ہی نہیں۔ ہماری "بے اہتمامی" دیکھ کر بادل بھی شرم سے پانی پانی ہوئے جاتے ہیں!

جن غریبوں کے نصیب میں بدنصیبی لکھی ہوئی ہے اُن کے لیے بارش نے "مَرے کو مارے شاہ مَدار" والا کام کیا ہے۔ پانی کیا برسا، طرح طرح کے مصائب بَرس گئے۔ اللہ کی رحمت کے دھارے سیلابی ریلوں میں تبدیل ہوئے اور انسانوں، مویشیوں اور دیگر اسباب کے ساتھ ساتھ ساری اُمیدوں کو بھی بہالے گئے۔ جہاں کھیت تھے وہاں اب کیچڑ نے ڈیرا ڈال لیا ہے۔ کھلے میدان تالاب کی شکل اختیار کرگئے ہیں۔ حوصلے بیٹھ گئے، پانی کھڑا ہے۔ مقدر کا سورج جانے کب چمکے گا؟ ہاں، آسمان کا سورج بھرپور آگ برسائے گا تو پانی بھاپ بن کر اُڑے گا۔ مگر

اِس سے بہت پہلے اختیار والوں کی ساری توجہ بھاپ بن کر اُڑ چکی ہے۔ اور رہے غریبوں کے جذبے تو اُن میں ایسا تھا ہی کیا کہ موسم کی نذر ہوتا؟

پانی کی زیادتی کا یہ عالم ہے کہ بستیاں جزیروں کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ پانی نے غریبوں کو اُسی طرح گھیر لیا ہے جس طرح غنڈے کسی شریف عورت کے گرد ہوس کا جال بُنتے ہیں۔ کوئی جائے تو کہاں جائے؟ دو قدم چلنا بھی دُشوار ہوا۔ کل تک جہاں سڑکیں تھیں وہاں اب گڑھے ہیں۔ یہ گڑھے نہیں، کرپشن کے ہاتھوں ہمارے اجتماعی یعنی قومی وجود کے جسم پر سَڑتے گلتے زخم ہیں۔ جب کوئی زخم ناسُور بن جاتا ہے تو ہم سُکون کا سانس لیتے ہیں کہ چلو، علاج کی زحمت سے تو چُھوٹے! لاچاری کی انتہا یہ ہے کہ لاعلاج ہو جانے ہی کو اب علاج تصور کرلیا گیا ہے!

اب ڈھونڈنا پڑے گا ہمیں کچھ نہ کچھ علاج

چارہ گروں کے حُسنِ طریقِ علاج کا!

ایک سال قبل بھی بارش اور سیلاب نے قیامت ڈھائی تھی مگر افسوس کہ ہمارے حافظے نے اِتنا بوجھ بھی برداشت نہ کیا اور ہم پلک جھپکتے میں سب کچھ بھول گئے۔ یاد ہی نہ رہا کہ جن کا سب کچھ مِٹ گیا ہے اُنہیں یاد رکھنا ہے۔ کل کے متاثرین مزید متاثرہ قرار پائے اور اِس جُھنڈ میں نئے پنچھی بھی شامل ہوئے

ہیں۔ زندگی مسائل کا انبار بنتے بنتے اب بجائے خود سب سے بڑے مسئلے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ مگر صاحب! زندگی تو پھر زندگی ہے، کوئی کیسے دُھتکار دے؟

لاکھ بوسیدہ سہی، پھینکی نہیں جاتی مگر
زندگی گویا کسی مُفلس کی چادر ہو گئی

کارڈ کھیلنے کی سیاست نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ اِمداد کے معاملے میں بھی کارڈ کھیلا جارہا ہے۔ کچھ نہیں ہے تو وطن کارڈ ہی سہی! ہنگامی حالت میں لوگ فوری اِمداد کو ترستے ہیں۔ ایک سال قبل جن لوگوں سے طرح طرح کے وعدے کئے گئے تھے وہ آج بھی اِمداد کی دوسری قسط کو ترس رہے ہیں۔ ایسے میں سال رواں کے سیلاب متاثرین کو کیا ملے گا، اِس کا اندازہ لگانا کسی کے لیے مشکل نہیں۔

جب اِنسان پورے خلوص نیت کے ساتھ محنت کرتا ہے تو نتائج بہتر بنانے کے لیے اللہ سے برکت کی دُعا کرتا ہے۔ اللہ سے دُعا اُسی وقت مانگی جاتی ہے جب اِنسان اللہ کے فرمان کے مطابق اپنی سی کوشش کر چکتا ہے۔ کسی بھی قدرتی آفت سے بچاؤ کے لیے پہلے بھرپور کوشش کی جاتی ہے اور اِس کے بعد دُعا کا مرحلہ آتا ہے! ذاتی حیثیت میں تمام ممکن فوائد بٹورنے کے بعد ناداروں کے لیے اللہ

سے دُعا مانگ کر خیر کی توقع رکھنا اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دینے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔

چھوٹی موٹی بستیوں کا تو خیر ذکر ہی کیا، وبائی امراض سے بچاؤ کے لیے کراچی جیسے بین الاقوامی شہر میں اب تک باضابطہ اسپرے مہم نہیں چلائی گئی اور قوم سے کہا جارہا ہے کہ قدرتی آفات سے بچاؤ کے لیے اللہ سے دُعا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگی جائے۔ دُعا ضرور کرنی چاہیے مگر اُن سے نجات کی جو اختیار پا کر ہم پر مُسلط ہو گئے ہیں اور گئے گزرے ڈھنگ سے جینے کا حق بھی چھین لینا چاہتے ہیں! ہمارے مسائل حل کرنے کی ذمہ داری جن کے کاندھوں پر عائد ہوتی ہے وہ ہمی سے کہہ رہے ہیں کہ گناہوں کی معافی مانگی جائے! یقیناً وہ درست کہہ رہے ہیں۔ کبھی کبھی پوری شِدّت سے محسوس ہوتا ہے کہ بست و کشاد کا اہتمام کرنے پر اُنہیں مامور کرکے ہم نے گناہ ہی تو کیا ہے! اہل حکم کی بے اعمالی سے تعفن اُٹھ رہا ہے۔ ایسے میں اگر قوم بد دعاؤں کا اسپرے کرے تو کیا ہرج ہے!

آرزو لکھنوی نے کہا تھا:

ہاتھ سے کِس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
ایسا برسا ٹوٹ کے بادل، ڈوب چلا میخانہ بھی!

اب ہاتھ سے ساغر پٹکنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ "یاروں" کے لیے موسم کبھی بے کیف ہوتا ہی نہیں۔ لاکھوں، کروڑوں اِنسانوں کو پینے کے صاف پانی کے لیے بھی ترسانے والے چند مَے کش اب ساغر کے دَور کو چلتا رکھنے کا ہُنر خوب جانتے ہیں ! بادل کے ٹوٹ کر برسنے پر مَے خانے شاید کبھی ڈوبتے بھی ہوں گے۔ اب تو بادل کا سینہ خالی ہونے کے ساتھ ساتھ ساغر اور جیب دونوں ہی کے بھرنے کا اہتمام ہوتا جاتا ہے ! غریبوں کو اللہ جزا دے، یہ برباد ہوکر بہتوں کو آباد کرتے ہیں۔ اِن کی بے چارگی وہ قبر ہے جس پر سطوت کے محل تعمیر کئے جاتے ہیں۔ غریبوں کے خالی ہاتھوں اور اُجڑے گھروں کو اللہ سلامت رکھے اور نظرِ بد سے بچائے کہ اِنہی کے دم سے چند پیٹ بھرے ناداروں کی تجوری بھر پاتی ہے !

مملکتِ خداداد میں یہ تماشا بھی خوب ہے کہ بارش کے پانی سے کھیتوں میں فصلیں بعد میں لہلہاتی ہیں، حکمرانوں کی آنکھیں دُنیا بھر سے اِمداد حاصل کرنے کے خواب پہلے سجانے لگتی ہیں ! قدرت کی اَدا سے غریب کی جان جاتی ہے تو جائے، جو اختیار والے ہیں اُن کے لیے یہ کھانے، کمانے کا سیزن ہے !

تیر پر تیر چلاؤ، تمھیں ڈر کس کا ہے؟

مچھّروں کا ہنگامی اِجلاس

جب کسی قوم میں نمرود بڑھ جاتے ہیں تو رب العالمین اپنی قدرت کے اظہار کے لیے مچھّروں کو حرکت میں لاتا ہے۔ نمرود نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا تو رب العالمین نے محض مچھّر کے ذریعے اُس کا دِماغ درست کیا اور جوتے کِھلوائے۔ نمرودوں کی یہی اوقات ہوا کرتی ہے!

ہم میں بھی کئی نمرود ہیں جن کے دِماغ درست کرنے کے لیے مچھّروں کا عذاب ناگزیر تھا۔ اب ایسے میں مچھّر آ ہی گئے ہیں تو حکمِ ربی سمجھ کر اُن کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے مگر ذہن میں یہ سوال اُبھر رہا ہے کہ مچھّر غلط سَروں میں کیوں گھس رہے ہیں؟

پاکستانی عوام کے ذہنوں میں اُبھرنے والے بعض سوالات پر غور کرنے اور لائحہ عمل تبدیل کرنے کے لیے مچھّروں نے ایک ہنگامی اجلاس منعقد کیا۔ غیر ضروری نکات پر بحث سے بچنے کے لیے انسانی خُون کی لذّت کی قسم کھا کر عہد کیا گیا کہ کوئی بھی مچھّر اِنسانوں کی طرح بے قابو ہو کر بے لگام گفتگو نہیں کرے گا! مچھّر چونکہ اِنسانوں کی تقلید نہ کرنے کی قسم کھا کر ہنگامی اجلاس میں

شریک ہوئے تھے اِس لیے بزرگوں کو پہلے بولنے کا موقع دیا گیا! ایک بزرگ مچھّر نے جیسے تیسے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر بات شروع کی۔ "ہم ہزاروں سال سے اِنسانوں کا خُون صرف چُوستے ہیں۔ اِنسان ایک دوسرے کا خُون پیتے کم اور بہاتے یعنی ضائع زیادہ کرتے ہیں مگر بدنامی صرف ہمارے کھاتے میں ڈال دی گئی ہے! اِس حوالے سے اِنسانوں سے بات کی جانی چاہیے۔"

بزرگ مچّھر کی بات سن کر اجلاس کے شرکاء میں مانوس سی بھنبھناہٹ پیدا ہوئی۔ جب بھنبھناہٹ بڑھنے لگی تو ماڈریٹر نے یاد دِلایا کہ یہ کوئی اِنسانوں کا جلسہ نہیں کہ سب اپنی اپنی ہانکنے لگیں!

ایک ادھیڑ عمر مچّھر نے کچھ بولنے کی اجازت چاہی تو سب نے اُسے "گڈ مینرز" پر مبارک باد دی۔ ایک بزرگ مچّھر نے اپنی نشست سے اٹھ کر فضا کا چکر لگایا اور قدرے تفاخر کے ساتھ کہا۔ "ہم نے اِنسانوں کا خُون ہی نہیں چُوسا، اُن سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ اپنی بات کہنے کے لیے شرکائے اجلاس سے اجازت طلب کی جارہی ہے۔ بات کہنے کا یہ احسن طریقہ بھی ہم نے انسانوں سے سیکھا ہے۔ وہ اِس طرح کہ اِنسان کچھ کہنے کے لیے اِجازت طلب کرنے کے قائل نہیں اور ہم تو خُون چُوسنے کے لیے منزل پر پہنچ کر اعلان کرنا بھی نہیں بُھولتے۔ اطلاع کے بغیر حملہ کرنا، شب خون مارنا انسانی

"روایت ہو سکتی ہے، مچھری طریقہ ہر گز نہیں۔

سب نے واہ واہ کی تو محفل میں مزید جان آ گئی۔ اب ادھیڑ عمر مچھر نے ماضی الضمیر بیان کرنا شروع کیا۔ "اِنسانوں کا بُنیادی شکوہ یہ ہے کہ جن کا خُون پہلے ہی نچوڑا جاچکا ہے اُنہیں مزید نشانہ بنایا جارہا ہے۔ نمرود کے سَر میں گھس کر خُدائی کا بُھوت اُتارنے والا بھی ایک مچھر ہی تھا مگر خیر اُسے اپنا منصب تو معلوم تھا۔ ہم اُنہیں بھی نشانہ بنانے کے لیے ہر گھڑی تیار رہتے ہیں جو خُدائی کا دعویٰ تو خیر کیا کریں گے، ڈھنگ سے بندگی کا حق بھی ادا نہیں کرپاتے! جو لوگ پہلے ہی لُٹے پٹے بیٹھے ہیں اُنہیں مزید لوٹنے کی کوشش کرنا اور جینے کے حق ہی سے محروم کرنا اِنسانوں کا شیوہ ہو سکتا ہے، ہم مچھروں کا نہیں۔ خون چُوسنے کے معاملے میں اِنسانی خصلت اپنانے سے گریز کیا جائے!"

سب نے ادھیڑ عمر مچھر کے نکتے کو سراہا۔ بھنبھناہٹ کی شکل میں داد و تحسین کا شور اُٹھا۔ ماڈریٹر مچھر نے ایجنڈے کا باضابطہ اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اِنسانوں سے بڑھتے ہوئے رابطوں کے باعث مچھروں میں بہت سی عِلّتیں در آئی ہیں اور اِن عِلّتوں کے ہاتھوں مچھروں کی پوری نسل تباہی کی طرف جارہی ہے۔ بہت سے مچھر اب پیٹ بھرے کی مستی میں مست ہو کر کسی ضرورت یعنی

بھوک کے بغیر بھی، محض دل پشوری کے لیے، اِنسانوں کا خُون چُوستے پھر رہے ہیں! یہ سراسر ناشکرے پن پر مبنی وصف ہے جو اِنسانوں سے منتقل ہوا ہے۔"

داد طلب نظروں سے اِجلاس کے شرکاء کی طرف دیکھتے ہوئے ماڈریٹر مچّھر نے بات جاری رکھی۔ "ہمارا واسطہ اِنسانوں سے ہے کہ اُنہی کا خُون چُوسنا ہے مگر اِس معاملے میں ہمیں جنگل کے اُصولوں پر عمل پیرا ہونا چاہیے یعنی بھوک نہ لگی ہو تو خواہ مخواہ مُنہ مارتے رہنے کی عادت ترک کرنا ہوگی۔ اِنسانوں کو زیادہ کاٹتے رہنے سے بعض مچّھروں میں اپنے ہی ہم نسلوں یعنی مچّھروں کو کاٹنے اور اُن کا خُون چُوسنے کی خصلت در آئی ہے۔"

پھر مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ بات دانش مندی کی ہو اور داد نہ دی جائے، یہ وطیرہ مچّھروں کا تو نہیں ہو سکتا! ایک بزرگ مچّھر نے ڈانٹ ڈپٹ کو جدّی پُشتی حق کی طرح استعمال کرتے ہوئے اِجلاس کے شرکاء کو ڈانٹا۔ "یہ کیا بات بات پر واہ واہ کئے جا رہے ہو؟ اِنسانوں کا یہی تو مسئلہ ہے۔ اُن کے سارے اہم اجلاس بات بات پر مبارک سلامت کے شور میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ ضرورت اور استحقاق سے زیادہ داد پا کر اِنسان سب کچھ بھول جاتے ہیں۔۔ اجلاس کا مقصد بھی! اور پھر میڈیا پر آ کر اجلاس کی تفصیلات بیان کرنے کے نام پر انٹ شنٹ دعوے کرکے مَعاملہ بُھگتا دیا جاتا ہے!"

بزرگ مچھر کی بات اِس قدر وزنی تھی کہ خواہش کے باوجود کسی میں داد دینے کی جرات پیدا نہ ہوئی!

ایک جواں سال مچھر نے اجازت لے کر مدعا بیان کیا۔ "ویسے تو انسان کی اپنی پھیلائی ہوئی بیماریاں کم نہیں مگر آج کل ڈینگی کے حوالے سے ہمیں میڈیا میں بہت بدنام کیا جا رہا ہے۔ حالات اور زندگی کے ستائے ہوئے لوگوں کا شکوہ ہے کہ مچھر بھی جانبدار ہوگئے ہیں اور تنخواہ پر کام کر رہے ہیں۔ یعنی اُنہی کا خُون چُوس رہے ہیں جو پہلے ہی زندگی کے بوجھ تلے ہیں۔ میں اجلاس کے شرکاء کی خدمت میں درخواست گزار ہوں کہ ڈینگی پھیلانے والے مچھروں کو ہدایات جاری کی جائیں کہ اِنسانوں کی طرح تعصب اور جانب داری کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اپنے شکار سے مساوی سلوک کریں یعنی تمام انسانوں کو کاٹیں، کسی کو 'اِستثنٰی' نہ دیں!"

جواں سال مچھر کی بات سے سبھی متفق دکھائی دیئے۔ ایک بزرگ مچھر نے تجویز پیش کی کہ ڈینگی پھیلانے والے مچھروں کو حکم دیا جائے کہ انسانوں کے حکمراں طبقے کے ارکان کو ترجیحی بنیاد پر کاٹیں تاکہ غریبوں کی اشک شوئی ہو اور اُن کے دِلوں کو کچھ تو قرار آئے۔ میں خود بھی ترجیحاً حکمراں طبقے

”کے لوگوں کو کاٹتا ہوں۔

تجویز معقول تھی اِس لیے ”ہاں ہاں“ اور ”کیوں نہیں، کیوں نہیں“ کی صدائیں بلند ہوئیں۔۔بزرگ مچّھر کی آنکھوں میں مسرت کی چمک دکھائی دی۔ اُنہوں نے بڑے فخر سے اجلاس کے شرکاء پر نظر ڈالی اور تجویز کو سراہنے پر سب کا شکریہ ادا کیا۔ ایک نوجوان مچّھر نے کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔۔بزرگ مچّھر نے اِنسانی خصلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوجوان مچّھر کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھا اور اِس بات کو سبھی نے محسوس کیا۔ بزرگ مچّھر کو بھی احساس ہو گیا کہ اُن سے چُوک ہوئی ہے ! ماڈریٹر نے جب نوجوان مچّھر کو اپنی بات کہنے کی اجازت دی تو اُس نے کہا۔ ”اجلاس کے شرکاء اس بات کو محسوس کر چکے ہیں جو میں نے ابھی بیان ہی نہیں کی ! “

سب نے حیران ہو کر نوجوان مچّھر کی طرف دیکھا۔ ایسا کیا تھا جو بیان کرنے سے قبل ہی محسوس بھی کر لیا گیا؟ ماڈریٹر نے کہا۔ ”نوجوان ! اب اِنسانوں کی طرح گھما پھرا کر بات نہ کرو، جو کچھ تمہارے ذہن میں چل رہا ہے صاف صاف بیان کرو۔“

نوجوان مچّھر نے دست بستہ عرض کی۔ ”معزز شرکائے اجلاس ! عرض ہے کہ انسانوں

میں ہزاروں بُرائیاں، خامیاں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ صدیوں، بلکہ ہزاروں سال سے اِنسانوں کا خُون چُوستے رہنے سے وہ تمام بُرائیاں، خامیاں اور کمزوریاں ہم میں بھی در آئی ہیں مگر پھر بھی ہم زندہ و پائندہ قوم ہیں! یہ دعویٰ البتہ نہیں کیا جاسکتا کہ ہم بحیثیت قوم زندہ رہ پائیں گے۔"

"کیوں؟ ایسا کیا ہوگیا ہے؟" ایک بزرگ مچّھر نے بے تابی سے پوچھا۔ اُن کا یہ بے تابانہ سوال تمام شرکائے اجلاس کے دِل کی آواز بن گیا۔

نوجوان مچّھر نے پورے احترام کے ساتھ بات کو آگے بڑھایا۔ "عام اِنسانوں میں جس قدر خامیاں پائی جاتی ہیں اُن کا درجہ کمال حکمراں طبقے کے اِنسانوں میں ملتا ہے۔ حکمراں طبقے کے کسی ایک انسان کو کاٹنے کا مطلب اپنی پوری نسل کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ اگر ہم اِن "اعلیٰ" اِنسانوں کو کاٹتے رہے تو ادنیٰ ہوتے جائیں گے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب ہم آپس میں دست و گریباں ہوں گے، ایک دوسرے کی گردنوں میں دانت گاڑنے سے ذرا بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

اِجلاس کے تمام شرکاء تفکرات میں ڈوب گئے۔ نکتہ جاندار تھا۔ خاصی بحث کے بعد طے پایا گیا کہ کوئی بھی مچّھر حکمرانوں اور ایلیٹ کلاس کے اِنسانوں کو

نہیں کاٹے گا۔ خُون صرف اُن کا چُوسا جائے گا جو اِسی کام کے لیے پیدا کئے گئے ہیں....
یعنی مچّھروں کا نزلہ بھی غریبوں ہی پر گرتا رہے گا!

ڈینگی نے میلہ لوٹ لیا

مچھّر بھی کیا چیز ہے۔ کتنی چھوٹی ذات اور کتنی بڑی بات ! اگر ضِد پر آئے تو خُدائی کے دعویدار کے سَر میں گھس کر اُس کا ناک میں دم کر ڈالے اور بندگی اختیار کرنے پر مجبور کردے ! اور اگر مُوڈ میں ہو (جیسا کہ اکثر ہوتا ہی ہے !) تو اُن غریبوں کا جینا حرام کردے جن پر زندگی حرام کرنے کا یاروں سے پہلے ہی اہتمام کر رکھا ہے !

آج کل مچھّروں کی "کمپنی" کچھ خرچ کئے بغیر چلنے والی مشہوری کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ ہر موڑ پر، ہر محفل میں اور ہر چینل کی اوطاق میں مچھّروں کی واہ واہ اور دبی آواز میں آہ آہ ہو رہی ہے۔ مضبوط، منظّم اور خوں خوار اپوزیشن جماعتیں بھی جن حکومتوں کا بال تک بیکا نہ کرسکیں وہ مچھّر کی چیرہ دستیوں سے لرزہ براندام ہیں ! پنجاب حکومت کی رگوں میں انتشار کا وائرس پھیلانے کی بیشتر کوششیں سراسر ناکام رہی ہیں مگر اب وفاقی حکومت کے بھاگوں چھینکا یوں ٹوٹا ہے کہ مچھّروں نے پنجاب میں ڈینگی وائرس پھیلانے کی مہم شروع کردی ہے۔ ہمارے ہاں ہر معاملے کی طرح موضوعات بھی فیشن کا درجہ رکھتے ہیں۔ لوگ کچھ کہنے کے لیے دوسروں کو سُنتے ہیں۔ جو کچھ دوسرے کہہ رہے

ہوں وہی کہنے پر اکتفا کیا جانے لگتا ہے۔ جسے دیکھیے اُس کی زبان پر ڈینگی ہی کا فسانہ ہے۔ مقاصد سب کے جُدا جُدا ہیں۔ کوئی ممکنہ موت کے خوف میں مُبتلا ہو کر ڈینگی کی دُہائی دے رہا ہے تو کوئی مخالفین کو بدنام کرنے کے لیے ڈینگی کا ہَوّا استعمال کرنے پر تُلا ہوا ہے! ہر دو صورتوں میں مشہوری مِل رہی ہے تو صرف مچّھر کو۔ غریبوں کی کیا اوقات اور کیا مجال کہ اِس معاملے میں مچّھر کا مقابلہ کرنے کا سوچ بھی! مشہوری تو رہی ایک طرف، غریبوں کا تو اب بدنامی پر بھی اجارہ نہ رہا!

ہر طرف ڈینگی کی دُھوم ہے تو بہت سے سیاست دان حسد کی آگ میں جل رہے ہیں۔ کل تک میڈیا پر گرما گرم بیانات کی سوغات بٹ رہی تھی اور قوم "ٹُک ٹُک دیدم، دم نہ کشیدم" کی مثال بنی ہوئی تماشا دیکھ رہی تھی۔ کل تک قتل و غارت، احتجاج، مظاہروں، ہڑتالوں، جلاؤ گھیراؤ اور لوٹ مار کی خبروں نے اینکرز کو چڑیا کر رکھا تھا۔ اب یہ دیکھیے کہ ایک ذرا سے مچّھر نے میڈیا کو کس بُری طرح یرغمال بنا رکھا ہے۔ جس کام (یعنی میڈیا کی توجہ) کے لیے یاروں نے قسمیں کھائیں اور حلق کا پُورا زور لگا کر چیخنے سے بھی گریز نہ کیا وہی کام مچّھر میاں نے ذرا سی بھنبھناہٹ میں کر دکھایا! سچ تو یہ ہے کہ ڈینگی نے میڈیا کا میلہ لوٹ لیا ہے۔

عوام کو نئی مصروفیت مل گئی ہے۔ کل تک جو لوگ ٹی وی پر غلیظ الزامات سُن کر ناک پر رومال دھرے رہتے تھے اب وہ مچّھر مار اسپرے کرنے اور "مچّھر جلیبی" جلانے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں! مختلف سطحوں پر حکومتوں کی دوڑیں لگ گئی ہیں۔ ثابت ہوا کہ مچّھر آدمی کو ہیجڑوں کی طرح تالیاں پیٹنے ہی پر نہیں بلکہ حکومتوں کو سرپٹ دوڑنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے! یہ بھی غنیمت ہے۔ چلیے، اِس بہانے کچھ آنیاں جانیاں تو ہو رہی ہیں، لہو گرم رکھنے کا کچھ سامان تو ہوا! قوم کب تک سیاسی مچّھروں سے اپنے آپ کو کٹواتی اور نفسی بیماریوں میں مُبتلا رہتی؟

جو لوگ ڈینگی فیور اور ملیریا سے بچاؤ کے لیے ادویہ کے اسپرے کا مطالبہ کر رہے ہیں اُنہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی ایک آدھ ماہ قبل ہی سیاسی بیانات کا ایسا چھڑکاؤ ہوا تھا کہ بہت سے چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے تو بیانات کی بھنک پا کر ہی مر چلے تھے! جب تک ذوالفقار مرزا کے بیانات کا اثر قائم تھا، ڈینگی پھیلانے والے مچّھر میں اِتنی ہمت نہ تھی کہ میدان میں آئے۔ مرزا صاحب دم لینے کو رکے ہیں اور ٹارگٹ کِلرز کو اندر بھیجنے کا کچھ اہتمام ہوا ہے تو موقع غنیمت جانتے ہوئے مچّھر یہ سوچ کر باہر نکلے ہیں کہ

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اِس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں!

مگر صاحب! ہمارا خیال ہے مچّھروں نے تھوڑی سی دیر کر دی ہے۔ اب ہم میں رہا کیا ہے جو اُن کے ہاتھ لگے گا؟ ایک طرف سے امریکہ کاٹ رہا ہے اور دوسری طرف اپنے ہیں جو بیگانوں سے بڑھ کر ہیں! ہمارے وجود میں بین الاقوامی سازشوں کے دانت ایسے گڑے ہیں کہ ڈھنگ سے سانس لینا بھی اب بظاہر ممکن نہیں رہا۔ سَچّی بات ہے صاحب کہ ہم تو ڈینگی بُخار پھیلانے والے مچّھروں کے سامنے شرمندہ ہیں۔ یہ مہمان ایسے وقت نازل ہوئے ہیں کہ جب ہمارے جسم میں خُون رہا ہی نہیں۔ وطن کی راہ میں بہا ہوتا تو دِل کو تھوڑا بہت سُکون بھی مِل ہی جاتا کہ رائیگاں تو نہ گیا۔ ہمارے حِرماں نصیب خُون کی کہانی تو یہ ہے کہ کچھ مہنگائی نے چُوس لیا، کچھ سیاسی غارت گروں کی نذر ہوا۔ اور جو تھوڑا بہت بچا تھا وہ سیاسی بڑبولوں کی زبانی دھماچوکڑی دیکھ کر خُشک ہوگیا! ڈینگی پھیلانے والے مچّھر اگر چَٹک مارتے رہنے ہی پر مُصِر ہیں تو ہماری سُوکھی ہڈیاں حاضر ہیں!

ہمارے ہاں سبھی کچھ سینہ گزٹ کے تحت پھیلتا ہے۔ مستند ذرائع سے ملنے والی معلومات کے بجائے لوگ سُنی سُنائی باتوں پر زیادہ یقین رکھتے ہیں کیونکہ اِس میں کہیں نہ کہیں بچاؤ کا "کھانچا" موجود ہوتا ہے! ماہرین کا یہ تجزیہ بھی ہم تک مختلف لوگوں کی زبانی پہنچا ہے کہ ڈینگی فیور دراصل مادہ مچّھر

کے کاٹنے سے پیدا ہوتا ہے! کہنے کو یہ ذرا سی بات ہے مگر جو لوگ حیوانات کی دُنیا پر نظر رکھتے ہیں اُنہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ جنگل کا بادشاہ اور مچھّر ایک ہی مسند پر جلوہ افروز ہیں! نیشنل جیوگرافک کی ڈاکومینٹریز میں ہم نے کئی بار دیکھا ہے کہ شکار کے لیے شیرنیاں ماری ماری پھرتی ہیں، شِکار کو گھیر کر لاتی ہیں، اُس پر حملے کی تمام تیاریاں کرتی ہیں اور پھر مل کر اُسے قابو بھی کرتی ہیں۔ شیر بہادر تو بس آخری لحات میں محض رسمی کارروائی کے طور پر اِس عمل میں شریک ہوتے ہیں تاکہ تھوڑی سی بھی عزت رہ جائے اور بے چاری شیرنیوں کی دِل شِکنی بھی نہ ہو! اب ہر معاملے میں تو اِنکار مناسب نہیں ہوتا نا!

مادہ مچھّر کے کاٹنے سے ڈینگی بُخار ہوتا ہے اور مشہوری میں بڑا حصہ مچھّر کو ملتا ہے! ہر جگہ ڈینگی مچھّر کی واہ واہ ہو رہی ہے، کوئی بھی "مچھّرنی" کو کریڈٹ دینے کے لیے تیار نہیں! حد تو یہ ہے کہ جب مچھّروں کی مادہ کا ذکر کرنا ہو تو "مادہ مچھّر" کہا جاتا ہے۔ یہ تو سراسر صِنفی امتیاز برتنے والی بات ہوئی۔ مچھّرنی کہنے میں کیا ہرج ہے؟

افغان بڑے "ظالم لوگ" ہیں

افغان بڑے ظالم لوگ ہیں۔ اپنے ٹھکانے تو پہاڑوں پر بناتے ہیں اور عالمی طاقتوں کو کھائی میں گرانے پر کمربستہ رہتے ہیں۔ آپ نے وہ کہانی ضرور سُنی ہوگی جس میں ایک دیو اپنے آقا سے کہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کرنے کو دیتے رہو ورنہ خیر نہیں۔ افغانوں کا بھی یہی حال ہے۔ اِنہیں کھیلنے کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی سُپر پاور چاہیے ! پہلے برطانیہ کو ناکوں چنے چبوائے۔ اِس کے بعد سابق سوویت یونین کو اِتنا مارا کہ اُس کا بُھرکس نکل گیا۔ اِس پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا تو اب امریکہ کے درپے ہیں۔ افغان قوم ایک عجیب طرح کے مقناطیس کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس کی طرف صرف سُپر پاورز کھنچتی ہیں اور اپنی کھٹیا کھڑی کرواتی ہیں ! جو دُنیا پر راج کرے اُن پر راج کرنے کا ہنر صرف افغانوں کو آتا ہے۔

مُشکل یہ ہے کہ اب سُپر پاورز کا اسٹاک ختم ہوتا جارہا ہے۔ امریکہ بھی کھڈے لائن لگ گیا تو؟ پھر افغان کس سے کھیلیں گے؟ شاید اب بھارتی جیسی اُبھرتی ہوئی "سُپر پاورز" کی باری ہے ! اور شاید کیا؟ یقیناً کہیے کیونکہ بھارت بھی افغان اوکھلی میں سر دینے کے لیے اُتاؤلا ہوا جارہا ہے !

روس تو خیر جیسے تیسے، اپنی تحلیل کی آڑ میں جان بچا کر نکل گیا۔ امریکہ بہادر ناک اونچی رکھنے کے چکر میں سبھی کچھ داؤ پر لگاتا جارہا ہے۔ افغانوں کو کسی بھی بات سے کیا فرق پڑتا ہے؟ جو "لیسٹ لیول" پر زندگی بسر کر رہے ہوں اُن کے پاس کھونے کے لیے ہوتا ہی کیا ہے؟ گڑھے میں گرنے سے گڑھے کو کیا نقصان پہنچتا ہے؟ کبھی آپ نے سُنا ہے کہ کھائی میں گاڑی گرنے سے کھائی کو خراشیں آئیں؟ نیشنل جیو گرافک کی دستاویزی فلموں میں آپ نے شاید دیکھا ہوگا کہ شیر کو کبھی کبھی کچھ بھی نہیں ملتا تو وہ کسی جواں سال ہاتھی پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ خاصی دیر تک کوشش کے بعد ناکام ہو کر شیر اپنی راہ لیتا ہے اور ہاتھی اُٹھ کر، جسم سے مٹی جھاڑتا ہوا اپنے جُھنڈ سے جا ملتا ہے! افغان بھی موٹی کھال کے ہیں اور مختلف ادوار میں اِسی طرح اپنے وجود سے مٹی جھاڑتے رہے ہیں! یہ اِتنی سیدھی سی بات ہے کہ دیہاتیوں کی کھوپڑی میں بھی سما سکتی ہے مگر امریکیوں کی سمجھ میں نہیں آرہی!

جیب میں ذرا سی رقم ہو اور پورا بازار خریدنے کی ہوس ذہن پر سوار ہو تو کیا ہوتا ہے؟ خریداری کے نام پر بدحواسی کا مظاہرہ ہی کیا جاسکتا ہے! یہی حال امریکی صدر کا ہے۔ صدارتی منصب کی میعاد جوں جوں گھٹتی جارہی ہے،، براک اوبامہ کی بدحواسی بڑھتی جارہی ہے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ معاملات کو بہتر انداز سے کس طرح نمٹایا یا سلجھایا جائے۔

بش جونیئر بڑے ستم ظریف نکلے۔ اُن کے ذہن کے بطن سے ایک ناجائز اولاد پیدا ہوئی۔ اِس کا نام "دہشت گردی کے خلاف" جنگ رکھا گیا۔ بش جونیئر تو گھر کو چل دیئے اور اُن کے ذہن کی اِس ناجائز اولاد کی نگہداشت اوبامہ کو کرناپڑرہی ہے! اِسی کو گناہِ بے لذّت کہتے ہیں۔ جس طرح چودھری شجاعت کسی بھی پریس کانفرنس میں ٹیڑھا سوال کمال ہوشیاری سے مشاہد حسین کی گود میں ڈال دیتے ہیں بالکل اُسی طرح جارج واکر بش بھی اپنی شروع کی ہوئی جنگیں اوبامہ کے دامن میں ڈال کر چلتے بنے!

اوبامہ کی بد نصیبی یہ ہے کہ صدر کے منصب پر فائز ہونے کے بعد بھی اپنی کوئی جنگ شروع نہ کرسکے، پیش رَو کی چھوڑی ہوئی ادھوری جنگوں کو جیسے تیسے بھگتنا ہی اُن کا مقدر ٹھہرا۔ شاید پیش رَو کی جنگیں بھگتنے کے صلے ہی کے طور پر اُنہیں صدر کا منصب سنبھالنے کے فوری بعد امن کا نوبل انعام دیا گیا!

اوبامہ کا بنیادی مسئلہ سر دست یہ ہے کہ انتخابی سال سر پر کھڑا ہے۔ 2011 کے ختم ہوتے ہی امریکہ میں انتخابی گہما گہمی شروع ہوگی۔ اور پھر سبھی کچھ انتخابی سیاست کی نذر ہوتا جائے گا۔ ہر معاملہ دعووں اور وعدوں کی بنیاد پر

طے پانے لگے گا، ہر فیصلہ سیاسی مفادات کے تابع ہوگا۔ دنیا کو چند نئے ڈراموں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ووٹرز کی توجہ پانے کے لیے انتہا پسند مسلمانوں میں سے چند ہائی پروفائل شخصیات کا ماورائے عدالت قتل بھی انتخابی ہتھکنڈے کے طور پر آزمایا جاسکتا ہے! ایبٹ آباد آپریشن میں اُسامہ بن لادن کی ہلاکت آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی کوشش کے سوا کچھ نہ تھی۔ مگر شاید یہ ڈراما کچھ قبل از وقت تھا۔ اگر اوباما یہ ڈراما 2012 کے وسط میں اسٹیج کرواتے تو انتخابی فائدہ زیادہ ہوتا۔ مگر کیا پتہ اُنھوں نے یہ سوچا ہو کہ لوگوں کو اِس حد تک بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا!

طالبان سے لڑتے لڑتے امریکی فوج کا جو حال ہوا سو ہوا، معیشت کا بھی سانس پُھول گیا ہے۔ اوباما انتظامیہ یہ طے کرنے میں ناکام رہی ہے کہ معیشت کے کمزور پڑتے ہوئے جسم میں نئی روح پُھونکنے کے لیے کون سے اقدامات کئے جائیں۔ 10 برسوں میں 15 ہزار ارب ڈالر کے اضافی ٹیکس وصول کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ امیروں سے کہا جارہا ہے کہ معیشت کو زندہ رکھنے کے لیے زیادہ ٹیکس ادا کریں۔ بڑے کارپوریٹ اداروں سے استدعا کی جارہی ہے کہ معاشی سرگرمیوں میں تیزی لانے کے لیے جیب ڈھیلی کریں۔ ذرا غور فرمایئے کہ معاشی جنگل میں جن درندوں نے تمام کمزور اور معصوم جانور بھنبھوڑ ڈالے ہیں اُنہی سے استدعا کی جارہی ہے کہ جنگل کے اِن معصوم اور بے ضرر حیوانات کو پروان

!چڑھانے میں مدد دیں

تازہ ترین لطیفہ یہ ہے کہ اوبامہ انتظامیہ افغانوں کو شکست دینے کا خواب شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے جن فوجیوں کو موت کے منہ میں دھکیل رہی ہے اُنہی کو پنشن اور دیگر مراعات دینے کے لیے تیار نہیں! حال ہی میں اعلان کیا گیا ہے کہ 20 سال تک خدمات انجام دینے والے فوجی پنشن اور متعلقہ مراعات کے اہل نہیں ہوں گے۔ پنشن پانے کے لیے لازم ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد عمر 60 سال ہوچکی ہو! یہ تو بڑی نا انصافی ہے کہ مسلمانوں کا خون بہانے والے امریکی فوجیوں کو پنشن بھی نہ ملے! کل تک امریکی نوجوان خوشی خوشی فوج میں بھرتی ہوتے تھے کہ چلو، قبل از وقت ریٹائرمنٹ لیکر پنشن ہی بٹور لیا کریں گے! اب یہ چارم بھی نہ رہا۔ کس کو پڑی ہے کہ جان دینے کے لیے خوشی خوشی افغانستان کا رخ کرے؟

افغان واقعی بڑے ظالم ہیں۔ واحد سُپر پاور کو گھن چکر بنا ڈالا ہے۔۔برہان الدین ربانی کا قتل امکانات کا قتل ثابت ہوسکتا ہے۔ طالبان کو زیر دام لانے کی رہی سہی امیدیں بھی اب دم توڑ دیں گی۔ اوبامہ کو اپنی دوسری مدتِ صدارت داؤ پر لگتی معلوم ہوتی ہے۔ دُنیا یہ تماشا دیکھنے کے لیے بے تاب ہے کہ وہ افغانستان سے جان چھڑانے کے لیے پاکستان سمیت کس کس کو قربانی کا بکرا

بنانے کی اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔ علاقے کے بدمعاش کی جب بُھد اُڑتی ہے،.برسوں کی محنت سے قائم کردہ "وقار" داؤپر لگتا ہے تو اُس کا دماغ بہت حد تک باؤلے کتے کا سا ہو جاتا ہے! ایسے میں وہ کسی کو بھی کاٹ سکتا ہے! اب پاکستان کو گھیر کر "چِک" مارنے کی کوشش کی جارہی ہے! پاکستان کو اپنا آپ بچانا ہے۔ مگر کس طرح؟ یہ دیکھنا بھی بجائے خود کم دلچسپ نہیں!

گیارہویں گھنٹے پر کھلی آنکھ

قوم منتظر رہی۔ پہاڑوں پر جمی برف پگھلتی رہی مگر قومی قیادت کے جذبوں اور حوصلوں کی یخ بستگی تھی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ دھارے کے ساتھ ساتھ بہتے رہنے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ اِس میں کچھ کرنا ہی نہیں ہے۔ سارا دُکھڑا اِس بات کا ہے کہ لوگ دھارے کے خلاف بہنے سے کتراتے ہیں۔ برف پگھلتی ہے تو ریلے بہتے ہیں، سیلاب کی سی کیفیت نمودار ہوتی ہے۔ یہ اصول انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر یکساں کارفرما رہتا ہے۔ کوئی "میں نہ مانوں" کے فلسفے پر کاربند ہو تو اور بات ہے!

پوری دُنیا ایک گلی ہے اور امریکہ "لمبو گلی کا دادا" ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ گلی کا دادا بھی انسان ہی ہے۔ بدمعاش سے نمٹنے کا وہی اصول ہے جس پر ہر بدمعاش خود عمل پیرا رہتا ہے.... طاقت کی زبان! ہم یہ زبان استعمال کرنے میں تساہل برتتے رہے، حقانی گروپ بازی لے گیا، میدان مار گیا۔ امریکی بدمعاش کا جواب جب طاقت کی زبان سے دیا گیا تو کابل سے واشنگٹن تک کھلبلی مچ گئی۔ 10 سال سے حالت یہ تھی کہ نہتے شہریوں کو نشانہ بنایا جارہا تھا۔ عالمی برادری پاک افغان بربادی کا صرف تماشا دیکھ رہی تھی اور معصوم

انسانوں پر برسائے جانے والے میزائلوں کے جواب میں رسمی نوعیت کے مذمتی بیانات داغ رہی تھی۔ اِن بیانات میں بھی کمزوروں ہی سے کہا جارہا تھا کہ طاقتور کے آگے سر جھکائے رکھیں، مزاحمت کا نہ سوچیں، ذرا اُس کی سطوت اور حشمت کا تو سوچیں! یہ بات طالبان اور حقانی گروپ کو سمجھائی نہ جاسکی! وہ میدان جنگ ہی میں رہے۔ ڈٹے رہنے کی روش کا نتیجہ اب برآمد ہوا ہے۔ گلی کے دادا کو احساس ہونے لگا ہے کہ جب زور کی چوٹ لگتی ہے تو درد بھی ہوتا ہے اور زخم ناسُور بھی بنتا ہے!

دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر امریکہ کی جو جنگ ہم ایک عشرے سے لڑ رہے ہیں اُس کا خطرناک ترین محاذ کھلوانے کی تیاری کی جارہی ہے۔ پاکستان سے حقانی گروپ کے خلاف صف آراء ہونے کے لیے کہا جارہا ہے۔ ایک عشرے سے یہی تو ہو رہا تھا کہ

امریکہ اور یورپ دباؤ ڈال کر بات منوا رہے تھے اور ہماری قیادت دباؤ میں آکر ہر بات پر آمنّا و صدقنا کہتی جارہی تھی۔ اب انکار کی صورت نکلی ہے تو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا ہے۔ ہزاروں میل دور سے آئے ہوئے غنڈوں نے رضیہ کو گھیر لیا تھا۔ پاکستانی قوم کو بات بات پر صرف یہ باور کرایا جاتا تھا کہ مغربی امداد بند ہو گئی تو کیا ہوگا، کھائیں گے کیا اور پئیں گے کیا؟ عام آدمی بھی اِس دھمکی پر سہم سا جاتا تھا۔ اب قوم کو خیال آیا ہے کہ دہشت گردی ختم کرنے کی جنگ کے نام پر استعمال ہوتے ہوتے ہم اپنا سب کچھ تو گنوا

بیٹھے ہیں، پھر ڈرنا کیا اور کیوں؟ جس کی جیب میں کچھ نہ ہو وہ بھلا کیوں ڈرے؟ اور جب کچھ بھی اپنے پلّے ہے ہی نہیں تو پنگا لینے میں کیا ہرج ہے؟ تصادم کی راہ پر گامزن ہونے سے تو وہ ڈرتے ہیں جن کے دامن میں زمانے بھر کی آسائشیں ہوں۔

بات اِتنی سی تھی اور ایوان ہائے اقتدار میں بیٹھے ہوئے اعلیٰ پائے کے دانشوروں اور بُزرجمہروں کی سمجھ میں اب آئی ہے۔ بد معاش کی اکڑفوں اُسی وقت جاتی ہے جب اُسے منہ دیا جاتا ہے۔ جو طاقت کی زبان میں بات کرے اُس سے طاقت ہی کی زبان میں بات کی جاتی ہے۔

افغانستان ایک اوکھلی ہے اور اِس اوکھلی میں سر دینے کا شوق دور افتادہ قوتوں کو زیادہ لاحق رہتا ہے۔ امریکہ اِس اوکھلی میں سر دے بیٹھا ہے۔ کہاں سُپر پاور اور کہاں افغان مُوسل کا خوف! اب سر کی فکر لاحق ہوئی ہے تو امریکہ بہادر کو پھر پاکستان یاد آیا ہے۔ کہاں ایک ملک اور ملک بھی سُپر پاور.... اور کہاں محض چند سر پھروں کا گروہ، حقانی گروپ! سُپر پاور چاہتی ہے کہ ہم اُس کی جان محض ایک گروپ سے چھڑا دیں! ایک طرف طالبان اور دوسری طرف حقانی گروپ۔ یک نہ شُد، دو شُد! یعنی دونوں طرف سے مار پڑ رہی ہے۔ کبیر داس کہہ گئے ہیں۔

دو پاٹن کے بیچ میں باقی بچا نہ کوئے

ہماری حالت یہ رہی ہے کہ چور کسی نہ کسی طرح نکل بھاگنے کی تیاری کر رہا ہے اور ہم اُسے بھاگ نکلنے میں مدد دے رہے ہیں۔ کیا ہماری قیادت کو اِتنا بھی معلوم نہیں کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی بھی اُتار لی جاتی ہے! مگر شاید یہ ہماری اخلاقی تعلیمات کا "قصور" ہے کہ کسی کو سر راہ برہنہ کرتے ہمیں شرم دامن گیر ہوتی ہے.... خواہ سُپر پاور ہو!

سیاسی اور عسکری قیادت نے ہم آہنگ اور ہم زبان ہو کر بات کی ہے تو دو دن میں سُپر پاور کا لہجہ بدل گیا ہے۔ امریکی چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف ایڈمرل مائیکل مولن نے دھمکی آمیز رویہ اختیار کیا تو وائٹ ہاؤس بھی پیچھے ہٹ گیا! امریکی سیاسی قیادت کو بھی اندازہ ہے کہ عسکری قیادت کسی نہ کسی طور افغانستان کا طوق گردن سے اُتار پھینکنا چاہتی ہے۔ مگر اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ اِس معاملے میں اندازے کی غلطی کیا گل کھلا سکتی ہے! ایک لاکھ امریکی فوجی افغانستان میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر ان کی ہلاکتیں بڑھ گئیں تو قوم کو کیا جواب دیں گے؟ راتوں رات انخلاء ممکن نہیں کیونکہ ایسا کرنے سے عالمی برادری میں ناک کٹ جائے گی! یعنی نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن!

جب معاملہ سر پر آن پہنچے اور بندے کو ہوش آئے تو اِسے انگریزی میں گیارہویں گھنٹے پر ہوش میں آنا کہتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری قیادت بھی گیارہویں گھنٹے پر ہوش میں آ گئی اور سب مل بیٹھے۔ آل پارٹیز کانفرنس کے نام پر "نشستند و گفتند و برخاستند" ہی سہی، کچھ نہ کچھ پیغام تو گیا ہے! امریکہ کے خلاف جانا ہو تو تمام جماعتیں یک زباں اور یک سُو دِکھائی دیتی ہیں۔ یہ مل بیٹھنا قوم کو مبارک ہو۔ اگر کوئی گیارہویں گھنٹے پر بھی ہوش میں نہ آئے تو بارہ بجنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی!

شیطان کی وضاحت

میرے پیارے چیلو! اور اِنسانو! (چیلوں اور اِنسانوں کا الگ الگ ذکر اِس لیے کر رہا ہوں کہ اب اِنسان میرے چیلوں سے آگے کی منزل میں ہیں!)

آنکھوں کے راستے جو کچھ میرے ذہن میں اُتر رہا ہے اُس کے اثرات اِس قدر شدید ہیں کہ میرے حواس مختل ہوئے جاتے ہیں۔ لازم ہوگیا ہے کہ وَصِیّت لکھ ڈالوں۔ مُجھ میں اور اِنسان میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ میں وَصِیّت پر یقین رکھتا ہوں! انسان وَصِیّت لکھنے پر اِس لیے توجہ نہیں دیتا کہ اپنے ماحول میں سبھی کو موت سے ہم آغوش ہوتا دیکھ کر بھی اُسے یقین سا رہتا ہے کہ خود اُسے موت نہیں آئے گی! ستم ظریفی، بلکہ ڈِھٹائی کی انتہا یہ ہے کہ اِس خالص اِنسانی سوچ کو بھی میرے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے! کہا جاتا ہے کہ شیطان ہی اِنسان کے دل میں ہمیشگی کا وسوسہ ڈالتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس بات پر روؤں یا ہنسوں! میں نے بھلا کب کہا کہ موت پر میرا یقین نہیں؟ اور میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ حساب کتاب نہیں ہوگا؟

وَصِیّت تو خیر لکھ ہی ڈالوں گا مگر اِس سے قبل ضروری سمجھتا ہوں کہ چند

ایک اُمور کی وضاحت کردوں تاکہ میرے بارے میں پروپیگنڈا کرنے والوں کی حوصلہ شِکنی ہو۔ میں، جسے دُنیا اِبلیس لعین اور شیطان مَردُود کے نام سے جانتی ہے، پورے ہوش و حواس کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اِنسانوں کو وَرغلانے اور اُن کے دِلوں میں وَسوسے ڈالنے کا منصب مُجھے شدید ذہنی تھکن سے دوچار کرچکا ہے۔ میرے قوی اضمحلال سے دوچار ہیں اور حواس نے بظاہر طویل پرُ رخصت پر جانے کا فیصلہ کرلیا ہے! ہر گزرتا ہوا دن میری بدحواسی کے دائرے میں وُسعت پیدا کر رہا ہے۔ عجیب دور سے گزر رہا ہوں۔ کبھی کبھی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا اور کبھی اچانک، کسی شعُوری کوشش کے بغیر، سب کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے! اور جو کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے وہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پر مزید ضرب لگاتا ہے! میں اِنسان ہوتا تو پی پلا کر حواس کو قابو" میں کرلیتا یا ٹی وی چینلز پر نمودار ہو کر چند انٹ شنٹ باتیں کرتا اور دِل کا" !بوجھ ہلکا کرکے ذہن کو دوبارہ استحکام کی راہ پر لے آتا

ناگزیر ہوچلا ہے کہ میں اپنی پوزیشن واضح کروں تاکہ لوگ میرے بعد طرح طرح کی باتیں پھیلا کر، قیاس کے گھوڑے دوڑا کر "بے فُضول" میں مُجھے ایسا "خراج عقیدت" پیش نہ کریں جس کا میں کسی صورت مُستحق نہیں! مُجھے کِسی بھی معاملے میں کوئی ہوس لاحق نہیں۔ ازل سے اب تک میری "کمپنی کی مشہوری" کمزور نہیں پڑی! میں کوئی سیاست دان یا سیلیبریٹی تو ہوں نہیں کہ بدہضمی کی پرواکئے

بغیر زیادہ سے زیادہ شہرت نِگلتا رہوں، ڈکارتا رہوں! میری نفسی بھوک کی بہر حال ایک حد ہے۔ اِس حد سے آگے بڑھنا مُجھے زیبا نہیں۔ میں اِنسان نہیں ہوں کہ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا منصب، ذمہ داری اور حدود.... سبھی کچھ بھول جاؤں! مُجھے اپنی حدوود کا خوب اِدراک و احساس ہے۔

پاکستان میں مصروفِ کارچیلوں نے جب یہ بتایا کہ مُلک کے حالات دِگرگوں ہیں اور خاص طور پر کراچی کا بہت بُرا حال ہے تو میں یہ سوچ کر یہاں چلا آیا کہ ذرا جائزہ تو لوں کہ میرے فکر و فلسفے نے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ جب سے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا ہے، عجب مخمصے میں مُبتلا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کس بات کو own یا disown کروں! میں نے دنیا بھر میں گمراہی کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اُس سے بہت ہٹ کر پاکستان کے طول و عرض میں گمراہی اور بے راہ رَوی کا ایک اور بازار گرم ہے۔ اور اِس بازار کو دیکھ کر میں تَپ رہا ہوں کہ یہ سب کچھ میرے نام پر ہو رہا ہے!! اہل پاکستان کی عجیب ترین روایت یہ ہے کہ جب کسی کے نام کا کھاتہ کھل جاتا ہے تو سب کچھ اُسی کھاتے میں ڈالا جانے لگتا ہے! کئی کھاتے کھلے ہوئے ہیں مگر سب سے بڑا کھاتہ میرا ہے۔ لالچ، خوف، دھونس دھمکی، ترغیب، تحریک، تشدد، قتل و غارت، سَفّاکی، سَنگ دِلی، بے رحمی، دَرندگی، بَرَہنگی، بے توقیری، بے ذہنی.... سبھی کچھ دریا کے دھاروں کے مانند بہہ رہا ہے اور میرے نام پر کھلا ہوا

کھاتہ وہ سمندر ہے جس میں یہ سارے دھارے گر رہے ہیں! یہ تو سراسر، سر بہ سر، یکسر "بے مانی" ہے! میں کچھ بھی سہی، ایسا کب تھا؟

کیا آپ نہیں جانتے کہ مُجھ سے بڑا عالم کوئی نہ تھا مگر افسوس کہ جہالت بھی مُجھ سے منسُوب کی جارہی ہے! یہ تو نری انسانی جہالت ہے۔

!اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

جب کوئی لالچ کی دَلدل میں پھنس اور دَھنس جاتا ہے تو سارا ملبہ مُجھ پر گرایا جاتا ہے کہ لالچ میں مُبتلا کرنے والا میں ہوں! اِنسان واقعی صرف جلد باز اور لالچی ہی نہیں، بہت چالاک اور سازشی بھی ہے۔ اپنا کیا دَھرا مُجھ پر اُنڈیلنے میں دیر نہیں لگاتا۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر لالچ اور ہوس میں مبتلا ہوتے اور زیادہ سے زیادہ بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جب رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے اور سنگین نتائج سے دوچار ہوتے ہیں تو خود کو بے قصور قرار دینے کا راگ الاپنا شروع کرتے ہیں اور خوب پلٹے دینے کے بعد تان میرے وجود پر توڑتے ہیں! ارے اِنسانوں! کیا ستم توڑتے ہو، کیا غضب ڈھاتے ہو؟ تم ہی بتاؤ کہ "ایسا کروگے تو کون آئے گا؟"

اِسلام کے نام پر 64 سال قبل جو ملک بر صغیر کے مُسلمانوں نے قائم کیا تھا اُس میں اقتدار و اختیار کے بُھوکے اِنسانوں نے دین کے نام پر ایسے بھیانک تجربات کئے ہیں کہ ذرا سا جائزہ لینے اور مُشاہدہ کرنے ہی سے مُجھے تو متلی سی ہونے لگتی ہے! اور ذرا سوچیے کہ میرے دِل و دماغ پر کیا گزرتی ہوگی جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ میرا کیا دَھرا ہے! میں کب کسی کی آڑ لیتا ہوں؟ جو بھی کرتا ہوں، خوف اور منافقت کے بغیر اور پوری طاقت کے ساتھ کرتا ہوں۔ اِنسان کی طرح آڑ لینا مُجھے نہیں آتا۔

ویسے تو میں نے پورا پاکستان گھوم پھر کر دیکھا ہے اور جا بہ جا جہالت کو جلوہ افروز پایا ہے مگر "بہ خُدا" کراچی بازی لے گیا ہے۔ یہ وہ نگری ہے جس کے اَطوار دیکھ کر مُجھے اپنے آپ پر رشک آنے لگا ہے۔ حیران ہوں کہ میری تعلیمات ایسا اور اِتنا رنگ بھی لاسکتی ہیں! کیا بات ہے! مگر اِتنا عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ کراچی میں رُونما ہونے والی ہر بات کا کریڈٹ مُجھے نہ دیا جائے۔ میں ظالم، مردود، بے حِس اور خدا جانے (!) کیا کیا سہی مگر اِتنا بے غیرت نہیں ہو سکتا کسی غریب کے دو چار نِوالوں پر بھی ڈاکہ ڈالوں؟ میں زندہ لوگوں کو بہکانے اور وَرغلانے پر از خود مامور ہوں۔ جب کسی میں دَم ہی نہ رہے تو میں کیا وَرغلاؤں گا؟ پاکستان اور بالخصوص کراچی کے ارباب بست و کشاد مُجھ سے دو قدم آگے ہیں کہ جن پر حکم چلاتے رہنا چاہتے

ہیں اُنہی کو دُنیا سے رُخصت بلکہ زندہ در گور کرنے پر بھی تُلے ہوئے ہیں!

میں کِسی بھی حالت میں اِتنا کم ظرف نہیں ہو سکتا کہ صُبح سے شام تک خون پسینہ ایک کرکے جُوئے شیر بہانے میں کامیاب ہونے والے یعنی اپنے اور اہل خانہ کے لیے دو وقت کی روٹی کا اہتمام کرنے والے غریبوں اور ناداروں سے بھی بُھتّہ بٹوروں! زندگی سے ہار کر، چند اشیائے صرف کے ساتھ فُٹ پاتھ پر دُکان سجانے والوں سے میں کچھ لُوں یا لینے کی ترغیب دوں، ایسا سوچنا بھی میری توہین ہے۔ پیٹ بھرے کی یہ مَستی اِنسانوں کو زیب دیتی ہوگی، مُجھے نہیں!

اِنسان یہ سمجھتے ہیں کہ میں خون خرابے کی ترغیب و تحریک دیا کرتا ہوں۔ ٹھیک ہے، مگر شیر خوار اور نیا نیا چلنا اور دوڑنا سیکھنے والے بچّوں تک کو مارنے والے یقیناً میری تعلیمات کے مُکلّف اور محتاج نہیں! اِس سَفّاکی کے لیے مُجھے مُوردِ الزام نہ ٹھہرایا جائے۔ یہ بے رحمی اور سَنگ دِلی اِنسان "از خود نوٹس" کی بُنیاد پر اپناتا اور پروموٹ کرتا ہے!

ایک بات اور۔ ابھی گزرنے والے رمضان میں کراچی کے لوگوں نے جو کچھ ایک

دوسرے کے ساتھ کیا، اُس کے لیے بھی کیا مُجھی کو مُوردِ الزام ٹھہرایا جائے گا؟ رمضان میں تو میں مُقید رہتا ہوں!! ثابت ہوا کہ مَسعُود ایام میں جو مَرْدُود اعمال سامنے آئے وہ عاقبت نا اندیش اِنسانوں کی اپنی کرنی اور اُس کا پَھل تھے! اگر ایسا نہیں ہے تو پھر جس میں ہمت ہے وہ قرآن اُٹھا کر قتل و غارت کا وہ بازار بھی میرے کھاتے میں ڈالے جو روزے کی حالت میں کمال بے باکی سے گرم کیا جاتا رہا!

میڈیا پر آ کر تھوک اُڑاتے ہوئے ایک دوسرے پر اِلزامات کی بوچھار کرنے والے میرے پیروؤں میں سے نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اِن کا یہ انداز اِنہی کا پیدا کردہ ہے اور میں تو بس رَشک سے اِنہیں دیکھتا رہتا ہوں!

ٹُک ٹُک دیدم، دم نہ کشیدم!

بہتر یہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، پاکستان سے نِکل بھاگوں۔ جتنے دِن یہاں رہوں گا، وضاحتیں ہی کرتا رہوں گا اور شاید اِسی میں مَر، کھپ جاؤں گا!

سُپر پاور میراثیوں کے رحم و کرم پر

دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر اکیسویں صدی کی پہلی بڑی مہا بھارت جیتنے کی خاطر امریکیوں نے پاکستان اور افغانستان کے معصوم شہریوں کے لیے پہلے تو کالی ماتا کا روپ دھارن کیا، یعنی مذہب کے نام پر قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ بش جونیئر اِس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُنہیں غیر عیسائیوں (یعنی مسلمانوں) کے خلاف فیصلہ کن جنگ کا اشارہ دیا ہے! مگر دال نہ گل سکی۔ دوسرے مرحلے میں امریکہ راکشس بننے سے بھی نہ چُوکا۔ جب ایسا کرنے پر بھی بات نہ بن سکی تو امریکہ بہادر اب علم و فن کی دیوی سَرسوَتی کی "سہایتا" سے پاک افغان خطے کی مہا بھارت جیتنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یعنی اب کی بار سام مہاراج کی تان سنگیت پر ٹوٹی ہے! افغانستان میں اپنے چار ہزار سے زائد فوجیوں کی گردنیں کٹوانے کے بعد واشنگٹن کے پالیسی میکرز کو خیال آیا ہے کہ یہ کام تو کہیں سَستے میں ہو سکتا تھا۔ جنگ و جدل کی ضرورت ہی کیا تھی؟ چند گانے بجانے والوں کو میدان میں لے آتے تو بات بہت پہلے بن جاتی! افغانوں نے مار مار کر سُپر پاور کو بھی بالآخر "تُوم تانا نادِردِھنا" پر مجبور کردیا! جو بات سَر دینے سے

! بھی نہ بن پائی اُسے سُر سے بنانے کا سوچا جا رہا ہے

دہشت گردی کے خلاف جنگ کے اخراجات اور نتائج کے حوالے سے کانگریس میں بحث کے دوران اوباما انتظامیہ کو شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کانگریس کے ری پبلکن اور ڈیموکریٹ ارکان کا استدلال ہے کہ اربوں ڈالر لٹا کر بھی پاکستان میں لوگوں کو امریکی خارجہ پالیسی کی قوالی میں ہم نوا کی حیثیت سے شریک نہیں کیا جاسکا! جب یہ انتباہ سامنے آیا کہ پاکستانیوں کے دِل جیتو ورنہ فنڈنگ بند ہو جائے گی تو دفتر خارجہ اور محکمہ دفاع دونوں ہی کی سِٹّی گم ہوئی۔ جنہیں بھانڈ میراثی قرار دیکر نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہی اِس مشکل میں یاد آئے۔ بگڑتی بات کو بنانے کے لیے اِنسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ایسے میں فنکاروں کی تھاپ اور ٹھمکوں سے مستفید ہونے میں کیا ہرج ہے؟

اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کے اعلیٰ اذہان نے ایک اور محاذ کھولنے یعنی "ثقافتی جنگ" شروع کرنے کا سوچا اور اب اُن کی سوچ پر عمل بھی کیا جا رہا ہے۔ اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں امریکی سفارتی مشنز کے ذریعے ثقافتی پروگرام ترتیب دیئے جا رہے ہیں۔ امریکہ کے مشہور جاز پلیئر ایری رولینڈ نے کئی شہروں میں پرفارم کرکے پاکستانیوں کے دِل جیتنے کی کوشش کی ہے۔ ایک مشہور کنٹری راک بینڈ کو بھی بُلایا جا رہا ہے جو پاکستانیوں کے

دِلوں میں امریکہ کے خلاف بھڑکتی ہوئی نفرت کی آگ پر میٹھے اور شوریلے سُروں کا پانی ڈالے گا!

بات صرف سنگیت پر ختم نہیں ہوتی۔ اداکاری اور ڈائیلاگ بازی کا بھی سہارا لیا جارہا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ امریکہ پاکستان کے ساتھ چھ عشروں سے جو کچھ کرتا آیا ہے کیا وہ ڈائیلاگ بازی اور ڈراما نہیں! آپ کی سوچ یقیناً درست ہی ہے مگر صاحب! یہ ڈراما کافی نہیں۔ سُپر پاورز کو قدم قدم پر ڈرامے اسٹیج کرنا پڑتے ہیں، ڈائیلاگ بازی سے لوگوں کو پُھسلانا پڑتا ہے۔ امریکیوں نے مکر وفریب، وعدوں، دعووں، جنگ وجدل اور قتل وغارت کے ڈرامے سے ہٹ کر بھی پاکستان میں The Odd Couple ڈرامے پیش کرنے کی منصوبہ بندی کی ہے! ایک مشہور ڈراما پہلے ہی پیش کیا جاچکا ہے۔ نام سے لگتا ہے یہ ڈراما یقیناً پاک امریکہ تعلقات کے بارے میں ہوگا!

ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں بعض اصحاب اِس بات پر حیران ہوں کہ امریکہ دس سال سے طالبان، القاعدہ، آئی ایس آئی اور حقانی گروپ کے خلاف فلسڈ مُوڈ کا راگ ہی تو الاپتا آیا ہے۔ اگر ایسا ہے، اور یقیناً ایسا ہی ہے، تو پھر الگ سے موسیقی کے ایونٹس کا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

ایری رولینڈ نے چند ساتھیوں کے ساتھ تین چار بڑے شہروں میں فن کا مظاہرہ کیا ہے اور داد پائی ہے۔ امریکی خبر رساں ادارے نے ایک رپورٹ میں یہ شکوہ کیا ہے کہ خاصے کم لوگ اُنہیں سُننے آئے اور اِن میں بھی وہ لوگ زیادہ تھے جو امریکہ کے لیے دوستانہ رویہ رکھتے ہیں! اِس میں گِلے شکوے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ امریکی موسیقار دِل جیتنے کے مشن پر نکلے ہیں۔ اُنہیں سُننے وہی لوگ آئیں گے جو اپنے دِل جتوانا چاہتے ہیں! امریکی موسیقاروں کو دست بستہ سُننے والے وہی ہیں جو ہر حال میں امریکہ اور یورپ ہی کا راگ الاپتے ہیں۔ یہ تو امریکہ کے لیے "کھمبا ووٹ" کا درجہ رکھتے ہیں۔ امریکی میڈیا نے لکھا ہے کہ کنسرٹس میں اِن امریکہ نواز لوگوں کی آمد کو سفارتی مشنز اپنی کامیابی قرار نہیں دے سکتے! شکر ہے اِتنی بات تو امریکی میڈیا کی سمجھ میں بھی آتی ہے! جو اپنا سب کچھ ہار کر بھی پاکستان ہی کی بات کرتے ہیں ذرا اُن کے دِل جیت کر دِکھاؤ تو ہم بھی جانیں اور مانیں! مُشکل یہ ہے کہ امریکہ کے وحشی سُر اُن غریبوں کی سمجھ میں بڑی مُشکل سے آتے ہیں جو پاکستان سے محبت کی راگنی الاپتے ہیں!

ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امریکی خارجہ پالیسی اور دفاعی حکمت عملی میں بھی اچھا خاصا شور پایا جاتا ہے۔ دفتر خارجہ اور پینٹاگون کے نمائندے اِس شور کو تھوڑا بہت سُریلا یعنی قابل برداشت بنانے کے لیے کوشاں رہتے

ہیں۔ یہ شور کسی نہ کسی طور گوارا ہے۔ امریکی سازندے بے ہنگم اور بے جوڑ سازوں کی آمیزش سے جو منفرد قسم کا شور پیدا کرتے ہیں اُسے موسیقی قرار دینا مذاق لطیف کے سراسر منافی ہے! اِس سے تو کہیں اچھا یہ ہے کہ شام کو گھما گھمی کے اوقات میں کراچی کے تبت سینٹر کے پاس کھڑے ہو کر گاڑیوں کا شور سُن لیا جائے! اُس میں کم از کم کچھ اپنائیت تو ہے۔ ہم سینہ تان کر کہہ سکتے ہیں کہ اپنا شور سُن کر زندہ ہیں، ہماری سماعت پر کسی کی بے ہنگم موسیقی کا احسان کوئی نہیں!

ایک امریکہ پر کیا موقوف ہے، ہر طاقتور کا یہی قِصہ ہے کہ جب سَر پر پڑتی ہے اور چھٹی کا دودھ یاد آتا ہے تو طاقت کی زبان بھول کر تمدن کی دُہائی دینے لگتا ہے! جب میدان جنگ میں شِکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو بڑی طاقتوں کے ناز پرور سپاہی ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتے ہیں اور تب اُنہیں خیال آتا ہے کہ ثقافت کے محاذ پر بھی تو جنگ لڑی جا سکتی ہے! یعنی اکھاڑے میں کِسی کو بزور نہ گرایا جاسکے تو گدگدی کرکے ہی گراؤ! سِتم ظریفی یہ ہے کہ طاقت اور اقتدار کے آرکسٹرا میں تہذیب، تمدن اور ثقافت کو بھی ساز کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے! مفادات کی منڈی میں سبھی کچھ بکاؤ مال بن جاتا ہے۔

افغانوں اور پاکستانیوں کے دِل جیتنے کے لیے امریکی میراثیوں کے کنسرٹس سے کچھ نہ ہوگا۔ جن کے ہاتھ میں امریکہ کا سیاہ و سفید ہے اُنہیں پالیسیوں سے بے سُرا پن دور کرنا ہوگا۔ نہتے شہریوں پر گرائے جانے والے میزائلوں کے شور میں "ٹھنڈے تے مِٹّھے" سُر کیسے سُنائی دیں گے؟ چند مغرب نواز لڑکوں اور لڑکیوں کو بے ہنگم موسیقی سُنانا ہے تو سُناتے رہیے، پاکستان کا سوادِ اعظم تو صوتی آلودگی پھیلانے کے اِس بندوبست پر لعنت بھیج کر الگ ہی کھڑا رہے گا! اِن بے سر و پا کوششوں سے تو پاکستانیوں کے جذبات مزید بھڑک سکتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پاک افغان مہا بھارت جیتنے کے خواہش مند امریکہ کے سُریلے ہنومان ہی اُس کی لنکا پھونک ڈالنے کا سبب بن جائیں اور اسٹریٹجک دیو مالا میں ایک نئی رامائن کا اضافہ ہو!

ایس ایم ایس نہیں تو کچھ نہیں

غریبوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر قدغن لگانا بھی حکومتوں کا پرانا وطیرہ ہے۔ جب بھی جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے غریب اپنی زندگی میں کچھ فرحت کا سامان کرتے ہیں، حکومتیں راہ میں دیوار بن کر یہ ثابت کرنے پر تُل جاتی ہیں کہ غم اور پریشانی ابدی اقدار ہیں اور یہ کہ زندگی میں اگر رنج والم نہیں تو کچھ بھی نہیں! لاکھ سمجھایئے کہ جناب! غریب جن باتوں میں خوشی محسوس کرتے ہیں اُن پر کوئی قدغن نہ لگائی جائے۔ اچھا ہے کہ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں مصروف رہیں۔ وقت ملے گا تو حکومتی کارکردگی کے بارے میں سوچنا شروع کریں گے اور اُن کے ذہنوں میں سوالات بھی اُبھرنے لگیں گے! مگر حکومتیں کہاں مانتی ہیں؟

بھارتی حکومت نے اپنے غریبوں کو آن لائن کلچر کے ایک اہم سُتون ایس ایم ایس سے محروم رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ٹیلی کام ریگیولیٹری اتھارٹی آف انڈیا نے کسی بھی موبائل نمبر سے دن بھر میں 100 سے زائد ایس ایم ایس بھیجنے پر پابندی عائد کردی ہے۔ اِس اقدام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آج کل بھارتی حکومت کو اعلیٰ درجے کے، باصلاحیت مُشیر میسر نہیں۔ جب پاکستان اور بھارت کے درمیان کرکٹ روابط عمدہ خطوط پر اُستوار تھے تب دونوں حکومتیں سُکون کے

سانس لیتی رہتی تھیں کیونکہ عوام کرکٹ کے گورکھ دھندے میں گم رہتے تھے اور کسی کو بظاہر اِس بات سے کچھ غرض ہی نہ ہوتی تھی کہ اُن کی حکومتیں کیا خرید رہی ہیں اور کیا بیچ رہی ہیں!

کرکٹ نہ سہی، ایس ایم ایس سہی۔ لوگ کسی دھندے سے تو لگے ہوئے ہیں۔ ماہرین اور مبصرین جس مثالی صورت حال کی بات کرتے ہیں وہ یہی تو ہے۔ حکومت کا کام بھی چل رہا ہے اور عوام مستقل دردِ سر یعنی غور و فکر کی زحمت سے بھی بچے ہوئے ہیں! ایسے میں ایس ایم ایس کی حد متعین کرنا بظاہر ایک ایسی حماقت ہے جس کی کوئی حد مقرر نہیں!

لیجیے، اب غریب کیا کریں گے؟ کرنے کو کچھ ہے نہیں اور وقت پہاڑ کی طرح سر پر سوار رہتا ہے۔ غریبوں کے پاس وقت ہی واحد دولت ہوتی ہے۔ اب کیا وہ اپنی واحد دولت کو بھی اپنی مرضی سے خرچ یا ضائع نہ کریں؟ بھلا ہو ٹی وی چینلز اور موبائل فون کمپنیوں کا کہ اُن کی خدمات سے مستفید ہو کر غرباء وقت کو اچھی طرح "قتل" کرنے میں کامیاب تو ہوتے ہیں۔ دن بھر میں 100 سے زائد ایس ایم ایس بھیجنے پر پابندی عائد کرکے بھارتی عوام کے لیے پھر یہ اُلجھن پیدا کردی گئی ہے کہ وقت کو کس طور ٹھکانے لگایا جائے! وہ دن بھر ٹی وی تو دیکھ نہیں سکتے کیونکہ اِس صورت میں اُن کے حواس مکمل طور پر مختل ہو سکتے ہیں!

بھارتی حکومت کے اقدام سے متعلق خبر پڑھ کر ہماری تو ہنسی چھوٹ گئی۔ ہمیں خیال آیا کہ دِلّی سرکار "ابھی" سے گھبرا گئی۔ دُنیا کیا کہے گی؟ چمکتے دمکتے، جمہوری بھارت میں اب بھی لوگوں کو اِتنا اختیار حاصل نہیں کہ دِل کی بات پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان کرسکیں، کسی سے اپنے "پاکیزہ" خیالات شیئر کرسکیں! کوئی بھارتی حکومت کو بتائے کہ اہل پاکستان نے ایس ایم ایس سے کیسے کیسے کام لیے ہیں۔

جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام اور اِن میں شرکت دردِ سر سے کم نہیں۔ ایسے میں ایس ایم ایس کے سَستے پیکیجز غنیمت ہیں کہ اِن کی مدد سے بہت کچھ بیاں اور عیاں ہو جاتا ہے! اور کبھی کبھی تو کچھ زیادہ ہی عیاں ہو جاتا ہے! جو لوگ حکومت کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے وہ کم از کم ایس ایم ایس کے ذریعے تو دِل کی بھڑاس نکال ہی سکتے ہیں! اور دِل کی بھڑاس نکالنے کے نام پر یاروں نے کیسے کیسے گل کِھلائے ہیں، کچھ ہم پاکستانی ہی جان سکتے ہیں اور جانتے ہیں۔ اِس معاملے میں کوئی بھی بُخل سے کام نہیں لیتا۔ اہل اقتدار کے خلاف دِل کی بات بیان کرنے کے لیے ایسے ایسے نکات سوچے جاتے ہیں کہ قدیم یونان کے فلسفی بھی جان پائیں تو شرمندہ اور اپنی "کم فہمی" اور "بے دماغی" پر ماتم کناں ہوں!

سرکاری بیانات کو نہلا قرار دیتے ہوئے اُس پر دہلا مارنے کے لیے خاصی دُور کی کوڑیاں لائی جاتی ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ اخبار کی دس بارہ خبریں پڑھنے سے بھی تشفی نہیں ہو پاتی مگر "کام کے" دو تین ایس ایم ایس پڑھنے سے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ جاتی ہے! ایس ایم ایس کرنے یا پڑھنے کے بعد لوگ خود کو ویسا ہی ہلکا محسوس کرتے ہیں جیسا واش روم سے نکلنے پر محسوس کرتے ہیں!

اہل اقتدار بھی پریشان تو ہیں کہ لوگوں کو ایس ایم ایس کے ذریعے جلسہ گیری اور مظاہرہ بازی سے کیسے روکیں؟ مگر کسی پر بس نہیں چلتا۔ بس چلے بھی تو کیسے؟ فیشن یہ ہے کہ جس چیز پر قدغن لگانے کی بات کی جائے اُس کی مقبولیت میں دِن دُگنا، رات چَگنا اضافہ ہونے لگتا ہے! اگر کبھی یہ عندیہ دیا جاتا ہے کہ کسی حکومتی شخصیت کے بارے میں ایس ایم ایس کرنے والے کو سزا کا سامنا کرنا پڑے گا تو اُس شخصیت کا "مرتبہ" ایس ایم ایس کرنے والوں کی نظر میں کچھ اور بڑھ جاتا ہے اور وہ نئے جذبے کے ساتھ ایس ایم ایس کی موجوں میں بہنے لگتے ہیں!

ہمارے ہاں تو یہ حال ہے کہ لوگ دن بھر میں چار پانچ سو ایس ایم ایس نہ کرلیں تو زندگی میں کچھ کمی سی محسوس ہونے لگتی ہے، جیسے کچھ کیا ہی نہیں!

بُہتوں کا یہ حال ہے کہ ڈیڑھ دو ہزار ایس ایم ایس کا پیکیج خریدتے ہیں اور دو تین دن میں ٹھکانے بھی لگا دیتے ہیں۔

جب تک یہ سب نہیں تھا تب تک کسی نے کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔ اب مشکل یہ ہے کہ ایس ایم ایس بھیجنے کی سہولت نہ ہو تو ہم کیا کریں گے؟ دنیا بھر میں سب سے زیادہ وقت پاکستانی قوم کے پاس ہے اور حکومت کو چونکہ اِس حقیقت کا اچھی طرح احساس اور ادراک ہے اِس لیے وقت کو ڈھنگ سے ٹھکانے لگانے اور پورے احترام سے دفنانے کے قابل بنانے کے لیے عوام کو متعلقہ سہولتیں فراہم کرنے کا بھرپور اہتمام کیا گیا ہے! ٹی وی چینلز کی مہربانی سے اب عوام حکومت کے خلاف بہت کچھ جان لینے کے بعد بھی اُس کی جان لینے کا خیال تک اپنے دِل میں نہیں لا پاتے! سبب اِس کا یہ ہے کہ حکومت پر تنقید کرنے والوں کو سُننے، بلکہ سُنتے رہنے ہی سے فُرصت نہیں! سیاسی رہنما عوام کو سڑکوں پر لانا چاہتے ہیں اور عوام حقیقی دُنیا سے زیادہ حقیقت نُما دُنیا میں رہتے ہیں! ٹی وی چینلز کی دست بُرد سے کچھ وقت بچ رہے تو موبائل فون حاضر ہے۔ رات رات بھر کے پیکیجز دستیاب ہیں۔ رات کی تاریکی میں وقت کو، خاصی آسانی اور عمدگی سے، جس قدر ٹھکانے لگایا جاسکتا ہے، لگائیے۔ بلکہ لگاتے رہیے۔

اجازت کے باوجود لوگ چار شادیاں تو نہیں کر پاتے، مگر اِس کمی کو چار چار

ہمیں رکھ کر پورا کیا جارہا ہے! اگر کل کلاں تو ہماری حکومت نے بھی ایس ایم ایس
! بھیجنے کی یومیہ حد مقرر کی تو لوگ چار ہموں کی مدد سے کوٹہ پورا کرلیا کریں گے
ایس ایم ایس کی بہتات نے بھی عجب گل کھلائے ہیں۔ بعض ایس ایم ایس تو ہم دیکھتے
ہی ڈیلیٹ کردیتے ہیں یعنی

!آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ایس ایم ایس کو دیکھے بغیر ڈیلیٹ کردیا اور بعد میں پتہ چلا کہ کام کی بات بس اُسی ایک ایس ایم ایس میں تھی۔ ہمارے ایک دوست نے رات گئے کال کی اور شکوہ کیا کہ اُن کی بیگم نے خاصے لذیذ پائے پکائے تھے اور ہم کھانے ہی نہیں آئے! ہم نے کہا بھائی! ہم نے کبھی ایئر پورٹ پر ڈیوٹی تو کی نہیں کہ سُونگھتے ہوئے آجاتے! اگر بُلایا ہوتا تو ضرور آتے۔ اُنہوں نے بتایا کہ ایم ایس ایم بھیجا تو تھا! اب ہمیں خیال آیا کہ حضرت کے نام سے ایس ایم ایس آیا تو تھا مگر ہم نے ایک نظر ڈالتے ہی یہ سوچ کر ڈیلیٹ کردیا کہ ہمیشہ کی طرح کوئی بے سر و پا اور انٹ شنٹ بات ہی لکھ ماری ہوگی! اب جو پائے کا ذکر چھڑا تو ہم نے (اپنا) سر پیٹ لیا۔ چند لمحات کے بعد جب حواس بحال ہوئے اور ہم نے ہاتھ نہ آنے والے پایوں پر فاتحہ پڑھ

کر اپنے دوست سے شکوہ کیا کہ آپ نے ہمیں بر وقت فون کیوں نہ کیا تو جواب میں محترم کی ہنسی سُنائی دی ! فرمانے لگے "دستر خوان پر پائے کی پلیٹ دھری ہو تو کون کس کو یاد رہتا ہے !" ہم نے تاکید کی کہ آئندہ اگر کھانے پر بلانا ہے تو بر وقت بُلانا۔ !اور اگر نہ بُلا سکو تو بعد میں فون کر کے ہمارا دِل ہر گز نہ جلانا

جب کوئی کھا چکنے کے بعد ہمیں مطلع کرتا ہے تو کلیجے پر ایک کٹار سی لگتی ہے ! اِسی کو تو !کہتے ہیں ایک تو سِتم ڈھانا اور اُس پر ظرافت کا مظاہرہ کرنا

سیلاب سے ٹماٹر تک

جغرافیائی سیاست نے، اللہ کا احسان ہے، پاکستان کا جغرافیہ تو نہیں بگاڑا مگر ہاں، موسموں کی چال ضرور بدل دی ہے۔ کل تک پاک وطن میں چار موسم ہوا کرتے تھے۔ سردی، گرمی، خزاں اور بہار۔ پانچوں موسم، بقول شاعر، پیار اور انتظار کا ہوا کرتا تھا! مگر اب ایک نیا پانچواں موسم متعارف ہوا ہے۔ تا حال یہ طے نہیں پایا کہ اِسے کیا نام دیا جائے۔ سیلاب کا موسم؟ اِمداد کا موسم؟ جی حضوری کا موسم؟ وعدوں اور دعووں کا موسم؟ یا پھر سیلاب زدگان کی امداد، بحالی اور آبادکاری کے نام پر تجوریاں بھرنے کا موسم!

کل تک آسمان سے پانی برستا تھا تو زمین کی طرح غریبوں دِل بھی کِھل اُٹھتے تھے۔ تقدیر میں بھلے ہی اندھیرے لکھے ہوں، بارش سے غریبوں کی آنکھوں میں اُمیدوں کی چمک پیدا ہوا کرتی تھی۔ بداعمالیوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دُعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور آسمان سے رحمت برسنے کا عمل شروع ہوتا ہے تو دِل دَہلنے لگتے ہیں۔ بارش ذرا زیادہ اور تیز ہو تو سیلاب کا سوچ سوچ کر غریبوں کی جان پر بن آتی ہے اور جو سیلاب کو کنٹرول کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اُن کی تو جیسے مُراد بر آتی ہے!

سیلاب کی آمد کے بعد غریبوں کے ہونٹوں پر دُعائیں اور سامنے وبائیں ہوتی ہیں۔

سیاست کا میدان کچھ اِس انداز سے سجا ہے کہ لاکھوں مفلس و نادار میدانوں میں پڑے ہیں۔ سوال صرف بے گھری کا نہیں، دربہ دری کا بھی ہے۔ گھر تو گھر، میدان میں بھی اِس قابل نہیں رہے کہ اُن کی آغوش میں کچھ دِن ڈھنگ سے گزارے جائیں! سیلاب کے آنے سے ایک اکھاڑا سج جاتا ہے جس میں غریبوں کی مدد کرنے کے بعد نام پر نُورا کشتی ہوتی رہتی ہے۔

کروڑوں کی اشتہار بازی کو حکمرانی سے وابستہ فرائض کا حاصل سمجھ لیا گیا ہے۔ میڈیا کے ذریعے لوگوں کو امداد کے حوالے سے متحرک رکھنے کی کوشش کرنے اور میڈیا ہی کو سیاسی کشتی کا اکھاڑا بنانے میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر ٹاک شو میں کی جانے والی باتوں سے پیٹ بھرا جاسکتا تو آج ہر پاکستانی "انڈر ٹیکر" ہوتا!

ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ مگر ہمیں تو ساون نے ایسا بھگویا ہے کہ چرنے کو صرف سبزہ رہ گیا ہے اور سبزیاں ٹارگٹ کلرز کی طرح ایسی روپوش ہیں کہ کہیں اُن کا سُراغ نہیں ملتا! بارش اور سیلاب کے بعد وعدے اور دعوے کرنے والوں کے سبز قدم کیا پڑے، سبز خوراک نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا! مسند

ہائے اقتدار پر متمکن اہل ستم نے کچھ ایسے گل کھلائے ہیں کہ اسلامی دُنیا کی واحد ایٹمی قوت "جنم جات شترو" بھارت سے ٹماٹر خریدنے پر مجبور ہے! اور جس افغانستان کی اپنی پَرتیں پیاز کے چھلکوں کی طرح اُترتی جارہی ہیں وہ ہمیں پیاز برآمد کر رہا ہے!

زمانہ عالمگیریت کا ہے اِس لیے ہم امداد اور درآمدات کے معاملے میں ایک دو ممالک کے در سے وابستہ نہیں رہنا چاہتے۔ سیلاب کے باعث فصل خراب ہونے سے سُرخ مرچوں کا بھی کال پڑا ہے اِس لیے اب سُرخ مرچیں چین، بھارت اور برما سے منگوائی جارہی ہیں۔ فی الحال پیاز اور ٹماٹر میں سے ہر ایک کی درآمد یومیہ ڈیڑھ سے دو ہزار ٹن تک ہے اور سُرخ مرچ کی درآمد 100 ٹن یومیہ تک محدود ہے۔ طلب بڑھنے کے ساتھ ساتھ "دو طرفہ" تجارت کا حجم بھی بڑھتا جائے گا۔ بازار پر نظر رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ فصلیں خراب ہو جانے کے بعد دوسری سبزیاں بھی درآمد کرنا پڑیں گی۔

لوگ بجلی کو ترس رہے ہیں اور میڈیا پر سیاستدان ایک دوسرے کو الزامات اور طعنوں کے جھٹکے دینے کی کوششوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ عوام جس کرنٹ کی راہ تک رہے ہیں وہ کرنٹ افیئرز میں گھس گیا ہے۔ پہلے دریا بپھرے اور پھر بجلی کے بحران پر پنجاب میں لوگ بپھر گئے۔

پنجاب میں ڈینگی نے قیامت ڈھائی ہے۔ مگر اِس قیامت کے ہاتھوں کچھ دِل بستگی

کا سامان بھی ہوا ہے۔ میڈیا کے جنگل میں بڑے بڑے سیاسی ہاتھی ایک دوسرے پر ڈینگی کی پھبتی کَستے نظر آتے ہیں! سرکاری سطح پر ہنسانے والوں کی کمی نہیں۔ گزشتہ دنوں وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے ٹیکسلا میں انڈر پاس کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم بھی چاہتے تو ڈینگی پر سیاست کر سکتے تھے! ہم تو سوچ سوچ کر تھک گئے مگر کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ ڈینگی پر وفاقی حکومت کیا سیاست کر سکتی تھی! کیا ڈینگی وائرس کو مسلم لیگ (ن) کی ٹیکنالوجی کا شاہکار قرار دیا جاتا؟ یا شہباز شریف کو ڈینگی کی افزائش کے لیے موردِ الزام ٹھہرایا جاتا؟

وزیر اعظم سمیت پوری کابینہ کا یہ حال ہے کہ احباب ایک بات کہتے ہیں اور بیچ میں چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ عوام بے چارے سوچتے اور غور کرتے ہی رہ جاتے ہیں کہ وہ بات کس سیاق و سباق میں کہی گئی ہے! اچھا ہے کہ کسی بھی بے سر و پا نکتے کی "شان نزول" بھی عوام پر آشکار کر دی جائے۔

گیلانی صاحب نے یہ شِکوہ بھی کیا کہ فوجی آمروں کو دس دس سال برداشت کیا جاتا ہے اور کرپشن کا الزام عائد نہیں کیا جاتا، مگر سیاست دان اقتدار میں آئیں تو برق رفتاری سے کرپشن کے الزامات عائد کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ بات اِتنی سی ہے کہ سیاست دانوں کے آتے ہی کرپشن بھی برق رفتاری

کا مظاہرہ کرنے لگتی ہے۔ کرپشن فوجی اقتدار کے زمانے میں بھی ہوتی ہے مگر بہرحال اُس کا بھی ایک ڈسپلن ہوتا ہے۔

حکومت دکھ درد کے ماروں کو اور کچھ تو دے نہیں سکتی اِس لیے تھوڑا بہت ہنساتی رہتی ہے تاکہ وہ اپنے غم بھول جائیں۔ عام آدمی سے پوچھیے تو وہ وزرا کی فوج ظفر موج کو قومی خزانے پر بوجھ قرار دے گا۔ مگر صاحب! سچ یہ ہے کہ وزراء اور مشیروں کے دم سے ظرافت کے بازار کی رونق سلامت ہے۔ سندھ کے ایک وزیر نے فرمایا ہے کہ نواز شریف قومی مجرم ہیں، اپنی باری کا انتظار کریں! یہ جملہ اِس قدر خوبصورت ہے کہ پڑھ کر ہم تو ساکت رہ گئے۔ ("مبہوت" ہم اِس لیے نہیں لکھ رہے کہ لوگ "بھوت" پڑھ بیٹھیں گے!) اعلیٰ ظرفی کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی تبصرہ کرکے ہم "قومی مجرم اور باری کے انتظار" والے جملے کا حُسن غارت نہ کریں!

بکرے سے ملاقات

عید الاضحیٰ نزدیک آتی جارہی ہے اور اِس کی مناسبت سے شہر میں قربانی کے جانوروں کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ویسے تو شہر میں دو پیروں پر چلنے والے "قربانی کے بکرے" بھی کم نہیں اور وہ آئے دن سیاسی قربان گاہ کی نذر بھی ہوتے رہتے ہیں مگر اصلی بکروں کی بات کچھ اور ہے۔ اُن کا خون اور گوشت رائیگاں ہیں جاتا!

کل راستے میں ایک بکرے سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے سوچا کچھ بتیالیں تاکہ آپ کے لیے کچھ تو لکھیں جو معمول سے ہٹ کر ہو۔ جس بکرے سے ہم نے گفتگو کی اُس کے سَر پر تو نہیں مگر باتوں میں خاصے نوکیلے سینگ تھے۔ گفتگو سے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

☆ کیوں میاں بکرے! کیسی گزر رہی ہے؟

بکرا: ہماری تو جیسے تیسے گزر ہی جاتی ہے اور گزر ہی جائے گی۔ ہماری فکر چھوڑو، اپنی خیر مناؤ۔ ہم تو خود اِنسانوں کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہتے ہیں کہ اِن کا کیا ہوگا!

☆ کیوں؟ ہمیں کیا ہوا ہے جو تم یہ سوچتے ہو کہ ہمارا کیا ہوگا؟

بکرا: اب ایسے بھولے بادشاہ بھی نہ بنو۔ شاید اِسی بھولپن کے لیے رئیس

امروہوی فرما گئے ہیں

کہنے لگے کہ ہم کو تباہی کا غم نہیں

!میں نے کہا کہ وجہِ تباہی یہی تو ہے

ہم لوگ ہیں عذاب الٰہی سے بے خبر

!سب سے بڑا عذاب الٰہی یہی تو ہے

یہ جو پورے پاکستان میں ہو رہا ہے کیا اِس کا کوئی جواز پیش کر سکتے ہو؟

☆ کیا ہو رہا ہے پاکستان میں؟

بکرا: اُف یہ سادگی! لگتا ہے صرف پی ٹی وی دیکھتے ہو! میرے ہمدم! چند ماہ کے دوران جو کچھ کراچی اور دیگر شہروں میں ہوا ہے اُس کا ذکر کر رہا ہوں۔ کوئی بے حسی تو دیکھے۔ ایک دوسرے کو ذبح کرنے والے باہم پُرسہ دینے کا خیال بھی ذہن میں لائے بغیر ہم بکروں کی مزاج پُرسی فرما رہے ہیں! ایک بات تو بتاؤ۔ آج کل قتل و غارت کا بازار ٹھنڈا کیوں پڑا ہوا ہے؟ کیا اہل ستم دَم لینے کو رُکے ہیں؟ یا پھر یہ کہ ہمیں ذبح کرنے کا موسم آیا تو اپنوں پر کچھ رحم آگیا ہے؟

☆ ہو نا آخر بکرے۔ اِنسانوں کے رُموز تم کیا جانو۔

بکرا: ہماری تو خیر بساط ہی کیا ہے، یہ رُموز تو خود تم بھی نہیں جانتے۔ کسی دِن پٹخنی دیکر گرائے جاؤگے اور ذبح کر دیئے جاؤگے۔

☆ بہت بولنا آگیا ہے؟

بکرا: ہم تو پھر بھی کچھ بول کر، دل کی بھڑاس نکال ذبیحے کی منزل سے گزرتے ہیں۔ تم تو معصوم، بے زبان اِنسانوں کے گلے پر چُھرے پھیرتے ہو اور پھر اُن کے لاشوں پر کھڑے ہو کر اپنی بے گناہی کا بھونپو بجاتے ہو، سیاست کی دُکان چمکاتے ہو!

☆ گھاس چرتے چرتے یہ الزام تراشی کا ہُنر کہاں سے سیکھا؟

بکرا: ہم بے زبان جانوروں کو کیا پڑی ہے کہ تم پر الزام دھرتے پھریں؟ اِس معاملے میں تو تم خود ہی ایک دوسرے کے لیے کافی ہو!

☆ اچھا، بکواس چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ آج کل منڈی کا بھاؤ کیا ہے؟

بکرا: کیسی منڈی؟ کس کا بھاؤ؟

☆ بکروں کا، اور کس کا؟

بکرا: کیوں؟ بھاؤ جان کر کیا کرنا ہے؟

☆ بکرا: تمہارے چند بھائی بند خریدنے ہیں۔ اور کیا؟

بکرا: کیا واقعی؟ اب کیا قربانی کے بکرے بھی قربانی کے لیے بکرے خریدیں گے؟ کہیں میری ہنسی نہ چھوٹ جائے!

☆ تم بکرے ہو یا "مغرور لیلیٰ"؟

بکرا: غرور کی خصلت اِنسانوں ہی کو مبارک ہو۔ ہم تو وہ مرنجان مرنج ہیں کہ اپنے وجود کو چُھری کے نیچے لا کر اِنسانوں کے پیٹ بھرنے کی راہ ہموار کرتے

ہیں۔ اور اِس بے مثال خدمت پر کبھی غرور نہیں کیا۔

☆ یہ فلسفیانہ رنگ کی باتیں کہاں سے سیکھیں؟ کیا کسی دانشور کے گھر میں پلے ہو؟

بکرا: اللہ نہ کرے۔ آج کل کے دانشور تو خود ہماری طرح مَیں مَیں کرتے رہتے ہیں اور کسی دوسرے کو خاطر ہی نہیں لاتے۔ ایک دانشور کے گھر میں چند روز رہنے کا موقع ملا تھا۔ بس کچھ نہ پوچھو کیا حال ہوا۔ انٹ شنٹ باتیں سُننے سے رات دن سر میں درد رہتا تھا۔ پھر میں بھی وقت بے وقت مَیں مَیں کرنے لگا۔ کسی نے میرے مالک کو سمجھایا کہ دانشور کی باتیں سُن سُن کر اچھے خاصے بکرے کا دِماغ کہیں ناکارہ نہ ہو جائے اِس لیے واپس بُلالو۔ میرے مالک کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور وہ مجھے واپس لے آیا۔ میرا مالک ہے تو اِنسان مگر ہم بکروں کے درمیان زندگی گزارنے سے ایک اچھی غیر اِنسانی خصلت اُس میں ضرور پیدا ہوئی ہے کہ کسی کا اچھا مشورہ مان لیتا ہے!

☆ تم نے بتایا نہیں کہ آج کل منڈی میں بکروں کا بھاؤ کیا چل رہا ہے؟

بکرا: سال میں ایک بار یعنی صرف عیدالاضحیٰ پر بکرے کا گوشت کھانے والے ہمارا بھاؤ جان کر کیا کریں گے؟

☆ تم شاید فروخت ہونا ہی نہیں چاہتے۔

بکرا: ہم پر بکاؤ ہونے کا الزام مت لگاؤ۔ ہم کوئی اِنسان تو ہیں نہیں کہ دام لگے گا تو بکیں گے۔ ہم تو محبت کے بھوکے ہیں۔ کوئی بس ایک نظر پیار سے

دیکھ لے، ہم اُس کے آگے سر جُھکا دیتے ہیں۔ اگر کوئی قصائی بھی پیار سے دیکھے تو پھر ہم اُس کی چُھری کی طرف نہیں دیکھتے اور مُسکراتے ہوئے ذبح ہو جاتے ہیں۔

☆ عیدالاضحیٰ کے موقع پر جب تمہیں شہر لایا جاتا ہے تو کیسا لگتا ہے؟

بکرا: پچھلے سال میرے کچھ "بزرگ" فروخت ہونے سے رہ گئے تھے۔ وہ کیٹل فارم میں واپس آئے تو اُنہیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اِنسانوں میں کچھ دِن رہنے سے مویشیوں میں دو چار بُری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

☆ کیسی عادتیں؟

بکرا: جو "بزرگ" کراچی میں کچھ دن گزار واپس آئے اُنھوں نے کیٹل فارم میں اِنسانوں کے اُصول پھیلا دیئے۔

☆ کیسے اُصول؟

بکرا: وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے تھے اور کسی سبب یا جواز کے بغیر بھی ایک دوسرے کو بھنبھوڑنے لگتے تھے۔ "شہر پلٹ" بکروں کے ہاتھوں کئی معصوم بکرے زخمی ہوگئے۔ شہر سے واپس آنے والے بکرے پیٹ بھر جانے کے بعد بھی چارا کھاتے رہتے تھے جس کے باعث اُن کا ہاضمہ خراب ہوگیا۔ نخرے اِتنے بڑھ گئے کہ کام کچھ کرتے نہیں تھے اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہتے تھے۔ اور کھانے کے بعد "کولا" کی فرمائش بھی کرتے تھے۔ اُن میں عجیب بے مروتی پیدا ہو گئی تھی۔ جب مالک چارا ڈالتا تھا تو پورے ڈھیر کو گھیر لیتے تھے اور کسی بھی کمزور

بکرے کو وہاں پھٹکنے بھی نہ دیتے تھے۔ اگر مالک چند ایک مویشیوں کو الگ سے چارا دیتا تھا تو اِنسانی ماحول سے آلودہ ہو کر آنے والے بکرے اُن سے بھی تھوڑا بہت لُوس وصول کرکے دم لیتے تھے۔ ہم نے پوچھا یہ کیا ہے تو بولے اِسے شہری زبان میں بَھتّہ کہتے ہیں۔ اور اُن میں سے دو ایک بکرے تو ایسے تھے جن کی سرگرمیاں دیکھ کر مالک بھی پریشان ہوگیا۔

☆ کیسی سرگرمیاں؟

بکرا: پیٹ بھر کھانے کے بعد وہ پینے کے لیے کچھ نہ کچھ مانگتے تھے۔ مالک کچھ دن اُن کے ناز اُٹھاتا رہا۔ پھر یہ ہوا کہ وہ کسی نمایاں جگہ بیٹھ کر باقی بکروں کو اپنے سامنے بیٹھنے پر مجبور کرنے لگے۔ شہر کی ہوا کھانے والے دو چار بکرے انٹ شنٹ مَیں مَیں کرتے رہتے تھے۔ مالک سمجھ نہ پایا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ پھر اُس نے جانوروں کی نفسیات کے ماہر کو بُلایا تو اُس نے صورت حال کا جائزہ لیکر بتایا کہ بعض بکروں میں لیڈرانہ " صِفات پیدا ہو گئی ہیں۔ ماہر نفسیات نے یہ بھی بتایا کہ جن کے سَر میں " لیڈری کا خنّاس پیدا ہو جائے وہ اِنسان ہو یا بکرا، اُسے سُدھارا یا سِدھایا نہیں جاسکتا! اور پھر مالک نے اُس ماہر نفسیات کے مشورے ہی پر تمام "شہر پلٹ" بکروں کو فروخت !کرکے کیٹل فارم کو پاک کیا

☆ پتا نہیں کیا اناپ شناپ بکے جارہے ہو؟ کچھ پتا بھی ہے کہ اِنسانوں نے کتنی ترقی کی ہے؟ تم جانور چارے کے لیے بھی آپس میں لڑتے رہتے ہو اور ہم

مفاہمت کی پالیسی پر کاربند رہتے ہوئے مل بانٹ کر کھاتے ہیں؟

بکرا: اِس اِنصاف کے قربان جایئے۔ تم اِنسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ جو رات دن محنت کرتے ہیں اُنہیں دال روٹی بھی ڈھنگ سے نصیب نہیں ہوتی اور جو کچھ نہیں کرتے وہ بڑے مزے سے سڑک پر سجے ہوئے دستر خوان پر بیٹھ کر صدقے کے بکروں کا گوشت ڈکارتے ہیں! کیا اِسی کو تم اِنصاف کہتے ہو؟ ذرا ہم بکروں کی دُنیا کا جائزہ لو۔ بکرا چھوٹے گھر کا ہو یا بڑے گھر کا، سبھی چارا چرتے ہیں، ایک ہی ٹائپ کے چنے اور دالیں کھاتے ہیں۔

☆چُپ رہنے کا کیا لوگے؟

بکرا: کیا بات ہے! آ گئے نا اِنسانوں والی ذہنیت پر۔ ہم مفاہمت کی سیاست پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر کوئی بات بُری لگتی ہے تو جی بھر کے شور مچاتے اور مجاز اتھارٹی کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انڈر دی ٹیبل سیٹلمنٹ کے ذریعے چُپ رہنا اور شخصی مفادات کے چُھرے سے اجتماعی مفادات کا "جھٹکا" کرنے کی خصلت تم اِنسانوں کو مبارک!

کیسے غریب؟ کون سی غربت؟

جمہوری حکومتوں کا ایک بُنیادی کام کمیٹیوں اور کمیشنز کی رپورٹس کے ذریعے رعایا یعنی عوام کو تفریح فراہم کرنا بھی ہوتا ہے۔ زمینی حقائق خواہ کچھ ہوں، حکومتی حقائق کائنات کے اُصولوں کی طرح ہوتے ہیں۔ یعنی

زمیں جُنبد، نہ جُنبد گل محمد

کے مصداق کبھی نہیں بدلتے۔ زمانے کی ہوا خواہ کسی سمت بہہ رہی ہو، حکومتی ہوا اپنا رخ خود متعین کرتی ہے اور اُسی کے مطابق بہتی رہتی ہے۔ یہی حال سرکاری رپورٹس کا بھی ہے۔ دنیا چاہے جتنی بھی بدل چکی ہو، سرکاری رپورٹس میں سب کچھ جوں کا توں رہتا ہے۔ پورا ملک داؤ پر لگ گیا ہو تب بھی سرکاری میڈیا "سب ٹھیک ہے" کا راگ الاپ رہے ہوتے ہیں۔ سرکاری رپورٹس کے مندرجات اعلیٰ درجے کے مزاح کا درجہ رکھتے ہیں۔ سادہ لوحی اِن رپورٹس کے اعداد و شمار پر ختم ہے۔ اب اگر اِس پر بھی کسی کو ہنسی نہ آئے تو اُسے کسی نفسیاتی معالج سے رابطہ کرنا چاہیے!

بھارت کے مرکزی پلاننگ کمیشن نے حالات کے ستائے ہوئے انسانوں کو تفریح کا سُنہرا موقع فراہم کرتے ہوئے یہ قرار دیا ہے کہ جو شخص دہلی اور ممبئی جیسے

بڑے شہروں میں روزانہ 32 روپے (کمانے اور) خرچ کرنے کی سکت رکھتا ہے اُسے انتہائی غریب تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی یہ کہ پانچ افراد پر مشتمل جو گھرانہ ہر ماہ 4824 روپے خرچ کرسکتا ہے وہ اپنے آپ کو ہر گز انتہائی غریب تصور نہ کرے۔ مہنگائی کا جائزہ لینے کے لیے حکومت کی قائم کردہ تیندولکر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں شاندار چوکے اور چھکے لگاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ شہروں اور دیہات میں بالترتیب 30 اور 20 روپے یومیہ کمانے والوں کو خطِ افلاس سے نیچے نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ رائے 2004 اور 2005 کی قیمتوں کے تناظر میں دی گئی ہے۔

آپ سوچیں گے کہ بھارتی حکومت کیوں اِس بات پر مُصِر ہے کہ لوگوں کو انتہائی غریب کی کیٹیگری سے نکالا جائے۔ بات صرف اِتنی سی ہے کہ انتہائی غریب کی کیٹیگری میں شامل لوگوں کو حکومت سَستا اناج اور ایندھن فراہم کرنے کی پابند ہوتی ہے! اِس کیٹیگری میں جتنے کم لوگ ہوں گے، حکومت کا بوجھ اُتنا ہی کم ہوگا۔ اِتنی سی بات ہے جو بھارتی حکومت سمجھانا چاہتی ہے مگر غریب ایسے ستم ظریف ہیں کہ سمجھ ہی نہیں پا رہے!

ہمارے ہاں کبھی کبھی تھانوں کے درمیان قتل، ڈکیتی یا کسی اور سنگین وارادات کے حوالے سے حدود کا قضیہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہر تھانہ یہ کہتا ہے کہ وارادات

اُس کی حدود میں نہیں ہوئی۔ موقع پر لاش پڑی رہتی ہے اور پولیس ذمہ داری قبول کرنے سے کتراتی رہتی ہے۔ کچھ کچھ یہی حال بھارت کے غریبوں کا بھی ہے۔ حکومت اُن کی ذمہ داری قبول کرنے سے کترا رہی ہے۔ اب اگر کوئی غریب دوا نہ ملنے سے سڑک پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے یا شدید غربت کے باعث کرایہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہونے پر کسی بڑے پائپ میں یا فٹ پاتھ پر اہل خانہ کے ساتھ پڑا رہے تو پڑا رہے، حکومت اُسے غریب ماننے کے لیے تیار نہیں۔ پلاننگ کمیشن اور تیندولکر کمیٹی نے اپنی رپورٹس میں یہ نہیں بتایا کہ جو گھرانہ ماہانہ 4824 روپے کماتا ہے وہ اگر مکان کا کرایہ دے گا تو کھائے گا کہاں سے؟ کیا اُس گھر میں راشن سونیا گاندھی ڈلوایا کریں گی؟ سپریم کورٹ کے استفسار پر بھارت کے مرکزی پلاننگ کمیشن نے یہ بھی کہا ہے کہ حفظان صحت کے لیے روزانہ ایک روپیہ خرچ کرنا کافی ہے! اِس بات کو حکمراں جماعت کانگریس کے ایک ماہر اقتصادیات نے بھی لطیفہ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک روپے میں تو سر کے درد کی گولی بھی نہیں آتی۔ اِسے کہتے ہیں نا سمجھی۔ سیدھی سی بات ہے کہ حفاظت اُس چیز کی کرنا پڑتی ہے جس کا کوئی وجود ہو۔ جب غریب کے پاس صحت ہی نہیں تو حفظان صحت کے نام پر کیا جانے والا خرچ فضول خرچی کے زمرے ہی میں تو آئے گا! بھارت سرکار نے غریبوں کو حفظان صحت کے لیے یومیہ ایک روپیہ خرچ کرنے کی تحریک بھی صرف عزتِ نفس برقرار

رکھنے کی خاطر دی ہے تاکہ وہ سینہ تان کر دُنیا کو بتا سکیں کہ حکومت اُن کی صحت کا وجود تسلیم کر رہی ہے! اور جناب! سَر کا درد کوئی ایسی چیز نہیں جسے دردِ سَر بنالیا جائے! ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ ناز اُٹھایئے گا تو اور ہوگا۔ اچھا ہے کہ کوئی غریب سَر کے درد جیسی معمولی سی تکلیف کو مُنہ ہی نہ لگائے۔

جو لوگ انڈین ڈراموں میں غیر حقیقت پسندانہ مناظر کا شِکوہ کرتے ہیں اب اُنہیں اپنی رائے سے رجوع کرنا چاہیے۔ ہم نے انڈین ڈراموں میں بارہا دیکھا ہے کہ ارب، بلکہ کھرب پتی گھرانے محض چند سو کروڑ کے لیے لڑ رہے ہوتے ہیں! کوئی منہ پُھلائے بیٹھا ہے۔ ماں پوچھتی ہیں کیا بات ہے تو جواب ملتا ہے "میں اپنے دوست کے چند مل کر تین سو کروڑ کی ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔ مگر پاپا پیسے نہیں دے رہے!" یہ جملہ کچھ اِس طرح ادا کیا جاتا ہے جیسے پاپا سے پاکٹ مَنی مانگی ہو! ہزار بارہ سو کروڑ کی تو جیسے کوئی اوقات ہی نہیں۔ کل تک بھارت اور اور پاکستان سمیت کئی ممالک کے غریب ٹی وی ڈراموں میں ہزاروں کروڑ کی باتیں سُن کر دِل مسوس کر رہ جایا کرتے تھے۔ مگر اِنہی ڈراموں کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جن کے بزنس ہزاروں کروڑ کے ہیں اُن گھرانوں کی زندگی میں دِن کا چین ہے نہ رات کا آرام۔ کوئی ذرا غور سے دیکھے تو اندازہ ہوگا کہ یہ "امیر غریب" کس قدر پریشان رہا کرتے ہیں۔ بھارت کے غریبوں کے

لیے بالواسطہ پیغام یہ ہے کہ بہت دولت پاکر بھی اِنسان کی زندگی میں کوئی سُکھ پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا دولت کا خیال دِل سے نکال دو اور اپنی غربت میں مَست رہو۔ ذرا ذرا سی بات پر، معمولی سی بیماری کے علاج کے لیے ہسپتالوں میں لاکھوں روپے خرچ کرنے والوں کو دیکھ کر غریبوں کو یقیناً سُکھ کا سانس لینا چاہیے کہ سرکار کی مہربانی سے ان کے پاس صحت ہی نہیں جسے کوئی عارضہ لاحق ہو! ایسے میں صحت کے نام پر جو کچھ بھی ہے اُسے برقرار رکھنے کے لیے یومیہ صرف ایک روپیہ کافی ہے!

اگر لوگوں کو انتہائی غریب کے زمرے میں رکھا جائے تو حکومت کو سَستا اناج، گھی، تیل اور ایندھن (مٹی کا تیل، گیس وغیرہ) بھی دینا ہوگا۔ سَستا اناج کھانے کو ملے گا تو غریب تگڑا ہوگا اور کسی بیماری کو مُنہ دینے کے قابل بھی ہو پائے گا۔ اور جب سَستا ایندھن ملے گا تو ضائع بھی کرے گا اور کبھی کبھی حالات سے تنگ آکر خود سوزی کا بھی سوچے گا۔ سَستا اناج اور ایندھن فراہم کرنے سے بھارت سرکار کے گریز نے غریبوں کو کئی مشکلات سے بچالیا ہے!

آمروں کی "شُترمُرغانہ" سوچ

جو طاقت اور جبر کے ذریعے حکمرانی کرتے ہیں وہ بالعموم حیوانات سے بہت پیار کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور حیوانات سے اُنہیں پیار کیوں نہ ہو، جن پر حکومت کرتے ہیں اُنہیں بھی تو وہ حیوان ہی سمجھتے ہیں اور ویسا ہی سُلوک روا رکھتے ہیں! جنہیں جنگل کا قانون نافذ رکھنے سے شغف ہو وہ جنگل کے جانوروں کو کیوں نہ اپنائیں؟

جانور پالنے کی بھی عجیب ہی منطق ہے۔ جیتے جاگتے انسانوں کو قبر کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنے والے حیوانات سے اچھا سلوک کرتے پائے گئے ہیں۔ یہ محبت اِس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ خود بھی جانور ہوتے جاتے ہیں! یا پھر شاید یہ کیس ہو کہ جانور اپنائیت محسوس کرکے اُن سے کچھ نہ کچھ سیکھتے ہوں! ہمارے ہاں چند برسوں میں جو ذہنیتیں پروان چڑھی ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ جی بھر کے غلط بلکہ حرام کام کیجیے اور پرندوں کو دانہ دُنکا ڈال کر اطمینان سے سو جایئے کہ معصوم پرندوں کی دُعا سے سارے گناہ دُھل جائیں گے! چرند پرند کو کچھ کِھلانا پلانا یقیناً اچھی بات ہے مگر اِس کِھلانے پلانے کے عوض گناہوں کے دُھلنے کی اُمید رکھنا بالیقین سادہ لوحی اور خوش فہمی کی انتہا ہے!

لیبیاکے "مردِ آہن" معمر قذافی کے فارم ہاؤس کا بھی باقی ملک کی طرح بہت بُرا حال ہے۔ جس طرح قذافی نے قوم سے منہ موڑ کر رُوپوشی اختیار کی ہے بالکل اُسی طرح اچھا وقت اُن کے فارم ہاؤس سے رُوٹھ گیا ہے! ایک خبر یہ آئی ہے کہ وسیع و عریض فارم ہاؤس میں کئی نسلوں کے اُونٹوں کے علاوہ ایک ہزار سے زائد شُترمُرغ بھی تھے۔ خوراک نہ ملنے سے 500 شُترمُرغ ہلاک ہوچکے ہیں۔

معمر قذافی بھی پیٹ بھر کر عجیب واقع ہوئے ہیں۔ اُنہیں اُونٹوں سے غیر معمولی شغف رہا ہے۔ وہ خود بھی اِقتدار کے خیمے میں اُونٹ کی طرح گھسے اور سب کو نکال باہر کیا۔ اُونٹ کی طرح قذافی کی بھی کوئی کَل سیدھی نہیں پائی گئی۔ بہت سے لوگ اب تک سمجھ نہیں پائے کہ ٹیڑھے پن کے معاملے میں کِس نے کِس کا اثر زیادہ قبول کیا ہے! حد تو یہ ہے کہ قذافی کے سَر پر پرندے پالنے کی دُھن سوار ہوئی تو اُن میں بھی اُونٹ تلاش کیے اور "شُترمُرغ" پالے! اور اُونٹ بھی کئی اور دوغلی نسلوں کے پالتے رہے۔ ہم (بھی) سمجھ نہیں پائے کہ جب شیشہ ایجاد ہو ہی چکا ہے تو اِس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی؟ اور دوغلی نسل کے اُونٹ پالنے کی تو خیر سِرے سے کوئی ضرورت ہی نہ تھی! اُونٹ یا آمر خواہ کِسی نسل کا ہو، اُس کی کوئی کَل سیدھی نہیں ہوتی!

لیبیا کے شہری بھی سوچتے تو ہوں گے کہ کاش معمر قذافی نے پورے ملک کو اپنا فارم ہاؤس سمجھ لیا ہوتا۔ اِس صورت میں وہ شہریوں کو پالنے کے معاملے میں اُسی دُلار کا مظاہرہ تو کرتے جو اُنہوں نے فارم ہاؤس کے جانوروں پر نچھاور کیا۔ قذافی زندگی بھر انصاف پسندی کا راگ الاپتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے عوام سے ہمیشہ امتیازی سُلوک روا رکھا۔ فارم ہاؤس کا کوئی پسندیدہ جانور مر جاتا تھا تو قذافی اُس کی کھال میں بُھوسا بھرواکر محفوظ کرلیا کرتے تھے۔ اختلافِ رائے رکھنے والوں کے معاملے میں وہ مَرنے کا انتظار کرنے کے مُکلّف نہ تھے!

فارم ہاؤس نے قذافی کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ معلوم نہیں کہ اُنہوں نے لومڑیاں پالیں یا نہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اقتدار کو بچانے کے معاملے میں وہ صحرائی لومڑی کی طرح چالاک تھے۔ اگر فارم ہاؤس میں لومڑیاں ہوتیں تو یقیناً ریفریشر کورس کے ذریعے اُن سے بہت کچھ سیکھتیں!

شِکار کے معاملے میں قذافی ببر شیر کا سا مزاج رکھتے تھے یعنی خود کچھ نہیں کرتے تھے اور گارڈز اور نرسوں کی شکل میں غیر ملکی "شیرنیوں" کو متحرک رکھتے تھے! قذافی نے دعوے تو شیر ہونے کے کئے مگر قومی خزانے میں دانت سگِ

آوارہ کے مانند گاڑتے رہے! از خود نوٹس کے ذریعے قوم کے خیر خواہ بن بیٹھنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو قذافی نے اپنی ٹیم میں رکھا وہ بھی قومی وسائل کو اُسی طرح ڈکارتے رہے جس طرح جنگل میں درندے لذیذ گوشت والے جانوروں کو ہڑپ کیا کرتے ہیں۔ اور صاحب! ایک لیبیا اور قذافی پر کیا موقوف ہے، جہاں کہیں بھی اقتدار پر چند اشخاص، عوام کی مرضی کے بغیر، قابض ہو جاتے ہیں وہاں رات دن یہی تماشا ہوتا ہے۔ آمروں کے چیلے قومی اداروں سے جونکوں کی طرح چمٹے رہتے ہیں اور قوم کی جڑیں کو دیمک کی طرح کھوکھلی کرتے رہتے ہیں۔ عوام کو ہوش اُس وقت آتا ہے جب قومی وسائل کا شہتیر بُھربُھرا ہو کر طاقت میں تنکے کے برابر رہ جاتا ہے!

دنیا بھر میں اہل اقتدار کا وطیرہ ہے کہ اِنسانی شکل میں درندے پال رکھتے ہیں اور کبھی کبھی سیاسی ضرورت کے تحت، طاقت کا توازن درست کرنے کے لیے، اُنہیں کُھلا چھوڑتے ہیں۔ ہمارے ہاں معاملہ اُلٹا ہے۔ یہاں جب معاملات قابو میں رہتے دِکھائی نہ دیں تب کچھ دیر کے لیے سیاسی درندوں (ٹارگٹ کلرز) کو باندھ کر رکھا جاتا ہے! نتیجہ یہ نکلا ہے کہ چرند پرند بھی درندے بن گئے ہیں۔ بقول پروین شاکر

لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سُورج کی شہ پہ تنکے بھی بے باک ہو گئے!

سیاسی ضرورت کے تحت پالتو جاں نثاروں کو استعمال کرنے کے معاملے میں قذافی نے خاصی نا اہلی اور عدم بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ اگر وہ اقتدار کے آخری دنوں میں پاکستان کا دورہ کرلیتے تو مزید بہت کچھ سیکھ لیتے اور چند ایک منفرد آئیڈیاز لیکر وطن کی راہ لیتے۔

اگر قذافی نے اپنے فارم ہاؤس میں شُترمُرغ پالے تو اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔
ہر آمر مزاجاً شُترمُرغ ہی ہوتا ہے۔ شُترمُرغ کا دِماغ اُس کی آنکھ سے چھوٹا ہوتا ہے۔
آمروں کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بیشتر آمروں کو تو اِس بات کی بھی پروا نہیں ہوتی کہ دِماغ بچا بھی ہے یا نہیں!

ہر آمر کسی بھی بُحرانی کیفیت کو سامنے دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا اور شُترمُرغ کی طرح ریت میں سَر دبا کر یہ سمجھتا ہے کہ خطرہ ٹل گیا! اِس معاملے میں آمر صاحبان کبوتر کے نقش قدم پر بھی چلتے ہیں جو اپنے سامنے بلی کو پاکر آنکھیں بند کرلیتا ہے اور اِس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا!

شُتر مُرغ کہنے کو تو پرندہ ہے مگر اُڑ نہیں سکتا۔ آمرانہ طرز حکومت اختیار کرنے والے بیشتر افراد بھی اپنے بھاری وجود سے مخالفین کو ڈرا ضرور سکتے ہیں، وقت آنے پر اُڑ نہیں سکتے!

قذافی نے بھی "شُتر مُرغانہ" اور کبوترانہ ذہنیت ہی کا مظاہرہ کیا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پہلے صرف سَر ریت میں تھا، اب اُن کا پورا وجود اپنی شکل گم کرچکا ہے!

کہاں گئے وہ پہلوان .... اور اکھاڑے؟

ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہاں قُدرت کے بخشے ہوئے صرف زمینی پہاڑ ہی نہیں تھے بلکہ پہلوانوں کی شکل میں کئی مُتحرک پہاڑی سلسلے بھی موجود تھے ! اِن پہلوانوں کو دیکھ کر دِل کو خواہ مخواہ یقین سا رہتا تھا کہ ہم بھی کبھی نہ کبھی قوم کے دُشمنوں کو خاک چٹا ہی دیں گے۔ شوبز نے ترقی نہیں کی تھی اِس لیے خودرَو پودوں کی طرح اُگنے والی سیلیبریٹیز بھی نہیں تھیں۔ پہلوان اِس کمی کو پورا کرنے کے لیے کافی تھے کیونکہ ایک ایک پہلوان (شالا نظر نہ لگے) پانچ پانچ سیلیبریٹیز کے برابر تھا! "ون ٹو کا فور" کی اِصطلاح نے شاید اِن پہلوانوں ہی کی بدولت رواج پایا تھا!

کلبس اور سرکاری پارک وغیرہ تو زیادہ تھے نہیں اِس لیے اکھاڑے خوب آباد رہا کرتے تھے۔ موبائل اور ایس ایم ایس کی وباء ابھی وارد نہیں ہوئی تھی اور ذہنوں کو آلودہ نہیں کیا تھا اِس لیے نئی نسل کے پاس وقت بھی بہت تھا۔ تب بُنیادی سوال کسی کام کے لیے وقت نکالنے کا نہیں بلکہ لامحدود وقت کے پنجے سے زندگی کو محفوظ رکھنے کا تھا! زہے نصیب! اُس دور کے نوجوان خاصا مثبت سوچا کرتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ اگر دِماغ نہیں پنپتا تو نہ سہی، کم

ار کم جسم کو تو طاقت بخش ہی دیں! محدود سی زندگی تھی۔ ذہن بہت اُونچی اُڑان نہیں بھرا کرتے تھے۔ نوجوانوں کے ہاتھ میں گٹار اور کی بورڈز تو تھے نہیں۔ ایسے میں وہ بازوؤں کی مچھلیاں پُھلا کر ہی صنفِ مخالف کو اپنی متوجہ کرنے کی کوشش کر سکتے تھے اور کرتے تھے! اب کیا روزانہ دو سو بیٹھکیں لگانے اور ڈیڑھ سو ڈنڈ پیلنے کے بعد بھی کوئی یہ نہ چاہے کہ کوئی اُسے چاہے؟ والدین بھی مطمئن رہتے تھے کہ چلو۔۔ شو بازی کے لیے سہی، بیٹا صحت بنا ہی رہا ہے، بگاڑ تو نہیں رہا!

جو نوجوان اکھاڑے میں بیٹھکیں لگانے اور زور آزمائی کے عمل میں ہڈی تُڑوانے اور پٹھے چڑھوانے سے بچنا چاہتے تھے وہ باڈی بلڈنگ پر اکتفا کرتے تھے۔ باڈی بلڈنگ چہرے کی تازگی نچوڑ لیا کرتی ہے۔ جب صنفِ مخالف باڈی بلڈرز کے بازوؤں کی مچھلیاں دیکھ دیکھ کر بیزار ہوجایا کرتی تھی تب وہ بے چارے باڈی بلڈنگ کی پریکٹس کے ہاتھوں نُچڑا ہوا اپنا سا منہ لیکر رہ جاتے تھے!

اکھاڑوں میں صرف شیخی بگھارنے والے نوجوانوں کا جمگھٹا ہی نہیں لگا کرتا تھا بلکہ اُن میں کُشتیاں (جی ہاں۔۔ منتخب ایوانوں اور ٹی وی چینلز والی نُورا کُشتیاں نہیں، بلکہ حقیقی کُشتیاں) بھی ہوا کرتی تھیں۔ جن لوگوں نے کبھی پہاڑوں کو ٹکراتے نہ دیکھا ہو وہ اکھاڑوں کا رُخ کرتے تھے! کُشتی

دیکھنے سے زیادہ لُطف پہلوانوں کو دیکھنے کا تھا! پہلوانوں کو زور لگاتے دیکھنا بھی کچھ کم پُر لطف نظارہ نہ تھا!

اکھاڑوں کا ایک فائدہ اور بھی تھا۔ محلے یا علاقے کی خواتین کو برتن مانجھنے کے لیے مٹّی بھی آسانی سے مل جایا کرتی تھی۔ پہاڑ نُما پہلوانوں کی کُشتی یا دھینگا مُشتی سے مٹّی دَب دَب کر باریک اور بُھربُھری ہو جایا کرتی تھی اور برتن چمکانے میں (شوہروں کی!) خاصی معاون ثابت ہوتی تھی۔

دیسی پہلوانوں کا بنیادی مسئلہ کُشتی تھا، نہ ہے۔ دیسی کُشتی لڑنے والے بیشتر پہلوانوں نے سرکاری افسروں اور منتخب نمائندوں کا سا مزاج پایا ہے۔ یعنی یہ کہ اُن کی زیادہ توجہ ہمیشہ کھانے پینے پر مرکوز رہی ہے!

اگلے اور اچھے وقتوں میں پہلوانوں کو دیکھ کر خوراک کے معاملے میں قوم کی خود کفالت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اب پہلوانوں ہی کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ملک میں خوراک کا بحران بار بار کیوں سَر اُٹھاتا ہے! اور ساتھ ہی یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ گزرے زمانوں میں صرف راجہ مہاراجہ ہی گویا نُما پہلوانوں اور پہلوان نُما گوّیوں کو پالنے کے متحمل ہو سکتے تھے! اُن زمانوں میں پکے راگ گانے کے لیے ورزش اور زور

آزمائی لازم سمجھی جاتی تھی۔ یہ اہتمام شاید گویّوں کو اِتنا مضبوط بنانا تھا کہ خالص راگ سُن کر کسی کا خُون کھَول اُٹھے تب بھی وہ گانے والے کا تن و توش دیکھ کر چُپکا بیٹھا رہے!

آپ پہلوانوں کی خُوراک کو فضول خرچی کا مظاہرہ قرار دے سکتے ہیں مگر اچھا ہے کہ یہ بات کبھی کسی پہلوان کے منہ پر کہنے کی غلطی آپ سے سرزد نہ ہو! خوراک پر اُنگلی اُٹھانے والے کو پہلوان ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کچّا چبا جائیں گے! جو لوگ کُشتی دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں وہ کسی دَنگل کے منعقد نہ ہونے پر پہلوانوں کو دستر خوان پر دیکھ کر بھی دَنگل ہی کا مزا لیتے ہیں! صبح و شام مَن بھر کھانے کو پچھاڑ کر پیٹ کے اکھاڑے میں دھکیلنا بھی کوئی معمولی مہارت تو نہیں!

ہمارے پہلوان فن پر کم اور تن پر زیادہ توجہ دیتے آئے ہیں۔ دیسی گھی کو خوراک کا اِس حد تک خوراک کا حصہ بنایا گیا کہ مارکیٹ میں دیسی گھی خال خال ملتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پہلوانی کا فن خود پہلوانوں تلے دب کر رہ گیا!

پھر یہ ہوا کہ اکھاڑے ہی مِٹّی چاٹنے لگے۔ جس طرح لاکھوں سال کے عمل میں

ڈائنوسار معدوم ہوئے تھے بالکل اُسی طرح دیسی کُشتیاں اور پہلوان بھی وقت کی گرد میں گم ہوتے جارہے ہیں۔ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ وقت یوں بے دردی سے پہلوانوں اور کُشتی کو پچھاڑ دے گا۔

جب دَنگلوں کا دور ختم ہونے لگا تو بہت سے پہلوان سنیما گھروں میں داداگیری کرکے گزارا کرنے لگے۔ لگے ہاتھوں وہ سنیما سے ملحق گلیوں میں بھی "لمبو گلی کا دادا" بن کر گھر کا چولہا جلتا رکھنے کا اہتمام کرنے لگے۔ مگر ہائے ری بدقسمتی! وقت نے پھر کروٹ بدلی اور جو پہلوان کروٹ بھی مُشکل سے بدل پاتے تھے اُن کے لیے سب کچھ بدل گیا۔ کلوشنکوف اور ٹی ٹی کلچر آیا تو ڈیڑھ پسلی کے لونڈے بھی بدمعاش بن گئے اور بے چارے پہلوانوں نے ایک طرف ہو جانے میں عافیت محسوس کی!

تاریخ پر نظر رکھنے والے کہتے ہیں کہ ہر سلطنت اپنے ہی بوجھ سے گرتی ہے۔ یہ کُلیہ پاکستان میں پہلوانوں اور کُشتی کے زوال پر بھی اطلاق پذیر ہوتا ہے! مگر صرف پہلوانوں کو الزام نہیں دیا جاسکتا۔ مُلک کے اور بہت سے شعبوں کی طرح اکھاڑوں اور دیسی کُشتی کی تباہی میں بھی اہل سیاست کا ہاتھ ہے۔ سب سے بے رحم کردار منتخب اداروں کا رہا ہے جنھوں نے کُشتی کے فن کو اپنا کر خود اکھاڑوں میں تبدیل کرلیا ہے! مُنتخب ایوانوں کی نوعیت بدلنے سے اکھاڑوں کے

لیے زیادہ کیام، تھوڑا ساپنپنے کی بھی گنجائش نہیں رہی ! بعض منچلے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ مٹی سے اَٹے اکھاڑوں میں وہ دھینگا مُشتی کہاں جو منتخب اداروں کی عمارات میں سنگ مرمر کے فلورز پر ہوا کرتی ہے ! عوام کے بہترین مفاد میں (!) اُن کے منتخب نمائندے جب باہم دست و گریباں ہوتے ہیں تو پوری قوم مینار پاکستان کے سائے میں ہونے والے دیسی کُشتی کے دَنگل بھول کر ٹی وی سیٹ کے سامنے بیٹھ جاتی ہے ! میڈیا میں دَنگلی ایونٹس بڑھتے جارہے ہیں کیونکہ سیاسی پاکستان کا رُستم کہلانے کے خواہش مند افراد کی تعداد میں بھی ہوش رُبا رفتار سے اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ داؤ پیچ سیکھنے اور پنجہ آزمائی کے لیے روایتی پہلوان کِسی منتخب ادارے کا رُخ کریں تو سیاسی پہلوانوں کے عزائم اور اُن کا عملی اِظہار دیکھ کر زیادہ آسانی سے دَنگل کی تیاری کر سکتے ہیں !

عوام کے بعض منتخب نمائندے، اللہ نظر بد سے بچائے، کُشتی کے فن کو فروغ دینے میں تن و توش اور انداز و فن دونوں اعتبار سے نہایت اہم کردار ادا کر رہے ہیں ! اِنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے سے پہلوان ختم ہو سکتے ہیں نہ کُشتی۔ جن لوگوں کو معاشرے اور حکومت سے یہ شِکوہ ہے کہ پہلوانی کے فن کو فروغ دینے پر توجہ نہیں دی جارہی وہ منتخب ایوانوں کی کارروائی دیکھنے کی کوشش کیا کریں ! تلخ کلامی، دُھول دَھپّا، چھینا جَھپٹی

اور دھینگا مُشتی .... کیا ہے جو "کارروائی" کا حصہ نہیں ! اور جو کچھ کارروائی سے حذف کر دیا جاتا ہے اگر اُس پر بھی نظر دوڑائی جائے تو مزا نہ آنے پر پیسے واپس!

کہتے ہیں کہ گاما پہلوان نے ریلوے انجن کو اپنے زورِ بازو سے روک دیا تھا۔ انگریز کی چلائی ہوئی ٹرینیں واقعی اِتنی طاقتور تھیں کہ اُنہیں روکنے میں کامیاب ہونے والے کو طاقتور گردانا جاسکتا تھا۔ آج حالت یہ ہے کہ ریلوے انجن کو روکنے کے لیے پہلوان ہونا تو دور کی بات ہے، دو پَسلی کا ہونا بھی ضروری نہیں۔ کوئی بھی ذرا سی طاقت استعمال کرکے انجن ہی نہیں، پوری ٹرین کو روک سکتا ہے! اب وفاقی وزیر ریلوے ہی کو دیکھ لیجیے۔ ذرا اُن کی صحت پر غور فرمائیے اور پھر اِس امر کا جائزہ لیجیے کہ اُنہوں نے تن تنہا بیسیوں ٹرینیں اِس طرح روک دی ہیں کہ ٹَس سے مَس ہونے کا نام نہیں لے رہیں!

بات شروع ہوئی تھی دیسی کُشتی اور خالص دیسی پہلوانوں سے اور پہنچ گئی منتخب ایوانوں اور ٹرینوں تک۔ منتخب ایوانوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ اب اُن میں کوئی بھی، کسی خاص دِقت کے بغیر پہنچ سکتا ہے۔ رہا ٹرینوں کا معاملہ تو جناب! اب ٹرینوں نے تو کہیں آنا جانا چھوڑ ہی دیا ہے اِس لیے بات کو خود چل کر اُن تک پہنچنا پڑتا ہے!

اب اِس ریلوے کا کیا کریں

ہم بحیثیت قوم جس قدر عقیدت پسند واقع ہوئے ہیں کاش اُتنے ہی حقیقت پسند بھی واقع ہوئے ہوتے۔ ہمیں ہر وہ اِنسان بُرا لگتا ہے جو حقیقت کو بنیاد بنا کر کوئی بات کر بیٹھتا ہے۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ غلام احمد بلور صاحب نے خاصی بلوریں یعنی شفاف اور حقیقت پسندانہ بات کہی ہے تو لوگ لٹھ لیکر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ موصوف نے ریلوے کے وزیر کی حیثیت سے فیصلہ کن رائے دی ہے کہ ریلوے کا محکمہ بند کر دیا جائے!
اسلام آباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے غلام احمد بلور نے کہا کہ وہ صدر کو ریلوے کا محکمہ بند کرنے اور مستعفی ہونے کی پیشکش کر چکے ہیں۔ ہمیں اِس بات پر بلور صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اُنہوں نے ہوا میں تیر نہیں چلایا بلکہ ایک بھرپور مثال کو سامنے رکھتے ہوئے قوم کے مفاد میں صدر کو صائب مشورہ دیا ہے۔ ریلوے کے وزیر کا کہنا ہے کہ کئی ممالک ریلوے کے بغیر بھی چل رہے ہیں جن میں افغانستان نمایاں ہے۔ ہم تو خدا لگتی کہیں گے کہ بلور صاحب کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں۔ افغانستان دُنیا کے نقشے پر ایک ملک کی حیثیت سے موجود ہے اور ریلوے کے بغیر بھی چل رہا ہے۔ اور ایک افغانستان پر کیا موقوف ہے، کئی ممالک نے غیر معمولی دانش کا مظاہرہ کرتے ہوئے ریلوے کا ٹنٹا پالنے سے اب تک اجتناب برتا ہے۔
اور کچھ نہ سہی، لاکھ

!ڈیڑھ لاکھ ملازمین کی تنخواہوں کے بوجھ سے تو وہ بچے ہوئے ہیں

شکر ہے بلور صاحب نے یہ نہیں کہا کہ ریلوے کے بغیر بھی افغانستان قائم و دائم ہے اور امریکہ جیسی سپر پاور کو منہ دے رہا ہے اور یہ کہ اپنے ہاں ریلوے ختم کرکے ہم بھی !امریکہ سے ٹکر لینے کے قابل ہو جائیں گے

ہماری کوئی انٹرسٹی یا انٹرپراونشل بس سروس وغیرہ نہیں مگر پھر بھی ہم اِس بات کے حق میں ہیں کہ ریلوے کے محکمے کو تالا لگا دیا جائے کیونکہ ٹرینوں کی شکل میں مدت سے پٹڑیوں پر خسارہ دوڑ رہا ہے۔ اگر پی آئی اے کو بھی گن لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ خسارہ اُڑ بھی رہا ہے! اِسی کیفیت کو کسی شاعر نے یوں بیان کیا ہے

محبت میں اِک ایسا وقت بھی انسان پہ آتا ہے

!! کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں، طُغیانی نہیں جاتی

ہوسکتا ہے آپ یہ سوچیں گے کہ ریلوے کا محکمہ بند کردیا گیا تو دنیا ہم پر ہنسے گی۔ اگر ہم اپنی بوگیاں اور انجن دنیا کو دکھادیں اور باہر کے لوگوں کو اپنے ریلوے اسٹیشنز کی سیر کرادیں وہ یہ سوچ کر زیادہ ہنسیں گے کہ اِس محکمے کو اب تک برقرار کیوں رکھا ہوا ہے! ہم کب تک دنیا کو اپنے اوپر

!ہنسواتے رہیں گے؟ اچھا ہے کہ نہ رہے ریلوے، نہ ہنسے دُنیا

سب سے پہلے تو ہمیں اِس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ہم کِن کِن چیزوں کے بغیر جی رہے ہیں۔

☆ کسی بھی طرز کی حکمرانی کے بغیر بھی حکومت چل رہی ہے! ہم ایسے جمہوری دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں جمہوریت کے سِوا سبھی کچھ جلوہ گر اور کارفرما !دکھائی دے رہا ہے

☆ قوانین پر عملدرآمد یقینی بنائے بغیر بھی قانون کی وزارت قائم و دائم ہے نا؟

☆ ٹریفک کے قوانین کا نفاذ برائے نام ہے مگر پھر بھی سڑکوں پر گاڑیاں رواں دواں !ہیں

☆ انصاف کی فراہمی برائے نام ہے مگر عدالتوں میں مقدمات کو نمٹایا جارہا ہے اور !فیصلے "قبول" بھی کئے جارہے ہیں

☆ کسی بھی طرح کی تعلیم و تربیت فراہم کرنے کی زحمت گوارا کئے بغیر تعلیمی ادارے !قائم ہیں اور دَھڑلّے سے چلائے جارہے ہیں

☆ سرکاری ہسپتال میں علاج کی سہولتیں ناپید ہیں مگر پھر بھی مریض اِن ہسپتالوں میں !داخل ہوتے ہیں اور "شفایاب" ہونے کا تاثر لیکر نکلتے ہیں

☆ کرکٹ بھلے ہی ختم ہو گئی ہو مگر خیر سے قومی کرکٹ ٹیم سلامت ہے اور کرکٹ کے سوا تمام کھیل پوری لگن اور جذبے سے کھیل رہی ہے!

☆ کوئی ایک کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہو پاتا مگر اِس کے باوجود سرکاری ادارے چل رہے ہیں۔

☆ اپنی بنیادی ذمہ داری یعنی ابلاغ کا حق ادا کئے بغیر بھی ملک بھر میں میڈیا کے ادارے قائم ہیں اور خوب پَھل پُھول رہے ہیں!

دیکھا آپ نے؟ جب اِتنے سارے کام "بحسن و خوبی" انجام پا رہے ہیں تو پھر ایک ریلوے کا محکمہ نہ ہونے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟

فضول خرچی ایک خاص حد تک برداشت کی جا سکتی ہے۔ کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ لاکھوں ٹن لوہا مسافر ٹرینوں کی بوگیوں اور مال گاڑی کے ڈبوں کی شکل میں اِدھر سے اُدھر رُلتا پھر رہا ہے۔ اور دوسری طرف لاکھوں ٹن لوہا پٹڑیوں کی شکل میں دھول چاٹ رہا ہے یا دھوپ جھیل رہا ہے۔ دنیا کیا سوچے گی کہ ٹرینیں تو ہم چلا نہیں رہے اور اِتنا سارا لوہا بے مصرف پڑا ہے۔ ٹرینوں کے نصیب میں تو منزل تک پہنچنا شاید لکھا نہیں۔ پھر کیوں نہ اِتنی بڑی مقدار میں پڑے پڑے سڑنے والے لوہے کو کسی منزل تک پہنچایا اور ٹھکانے لگایا جائے!

ریلوے اسٹیشنز کو پبلک پارکس میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ پرانے ریلوے اسٹیشن پارک کے ساتھ ساتھ عجائب گھر کا فریضہ بھی انجام دیں گے۔ چند ایک ریلوے اسٹیشنز ایسے بھی ہیں جن کی سیر کرکے نئی نسل یکھ سکتی ہے کہ ساتھ ستّر سال قبل بنیادی سہولتیں کس نوعیت کی ہوا کرتی تھیں اور اُن کی فراہمی کا بندوبست کس طرح کیا جاتا تھا! مسافر بوگیوں کو "موونگ ریسٹورنٹس" کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ یہ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہوگا۔ آپ بھی اِس نکتے سے تو اتفاق کریں گے کہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں نام درج کرانا کوئی بُری بات تو نہیں! ریلوے کی ڈائننگ کار میں کام کرنے والے ویٹرز کو بھی مہم جوئی کے بین الاقوامی مقابلوں میں بھیج کر قوم کے لیے چند تمغے جیتے جاسکتے ہیں!

ریلوے کے محکمے میں سوا لاکھ سے زائد ملازمین ہیں۔ بعض ممالک کے تمام سرکاری ملازمین کی تعداد بھی اِتنی نہیں ہوتی۔ حکومت کو یہ "ملازم پسند" پالیسی ترک کرنا ہوگی۔ چند ماہ کے دوران محکمے کی مالی حالت خراب ہونے سے ملازمین احتجاج کرتے رہے ہیں جس سے اُن کی خاصی پریکٹس ہوچکی ہے۔ حکومت چاہے تو سیاسی جماعتوں کو جلسوں کے لیے اچھے اور سخت جان قسم کے بندے فراہم کرسکتی ہے!

مرزا تنقید بیگ کو پریشان ہونے کا بہانہ چاہیے۔ جب سے ریلوے کی بندش سے متعلق غلام احمد بلور کا بیان پڑھا ہے، ریلوے انجن کی سیٹی کی طرح شور مچائے جا رہے ہیں۔ بلور صاحب کے بارے میں اُن کے ریمارکس اِتنے خطرناک ہیں کہ اگر طشت از بام ہو جائیں تو ملک بھر کے پلیٹ فارمز پر اُن کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا جائے! کل ہمیں متوجہ پاکر مرزا کہنے لگے "ریلوے کے محکمے کی بدولت ہم اب تک کسی نہ کسی طور بین الصوبائی رابطہ برقرار رکھے ہوئے ہیں۔" ہم نے کہا بھائی صاحب! اِسی بات کا رونا ہے کہ ہم عالمی برادری کے ساتھ مل کر نہیں چلتے۔ مرزا بولے "اِس میں عالمی برادری کہاں سے آ گئی؟" ہم نے عرض کیا کہ دُنیا کی خواہش ہے کہ ہمارا ہر صوبہ خود مختار ہو اور دوسرے کوئی غرض نہ رکھے، اپنے بل پر جیے، کسی پر منحصر نہ ہو۔ اگر ریلوے کا محکمہ سلامت رہ گیا تو ملک کے چاروں صوبے باہمی انحصار کے جنگل میں بھٹکتے رہیں گے، کبھی خود مختاری اور خود کفالت کی منزل تک نہیں پہنچ پائیں گے!

مرزا ہماری بات مان جائیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ریلوے کی ممکنہ بندش نے اُنہیں خاصا جذباتی کر دیا ہے۔ جب بھی ٹی وی پر غلام احمد بلور کو دیکھتے ہیں، زور زور سے کچھ بڑبڑانے لگتے ہیں۔ رب کا شکر ہے کہ جس طرح ہم بلور صاحب کی کوئی سمجھ نہیں پاتے اُسی طرح مرزا کی بھی کوئی بات کسی کی سمجھ

میں نہیں آتی !

فِلم والوں کی جادو نگری

ہر مُلک اپنی فِلم انڈسٹری کے بارے میں طرح طرح کے بُلند بانگ دعوے کرتا ہے۔ بیشتر دعوے یہ ثابت کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں ہوتے کہ فِلم انڈسٹری جادو نگری ہے۔ فِلم انڈسٹری کی باتیں کرنے والے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فِلمی دُنیا کے لوگ جادوگر ہیں یا کسی اور سیّارے سے آئے ہیں۔ تحقیق، بلکہ تحقیقات کی روشنی میں اب یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ دُنیا بھر میں اگر کوئی فِلم انڈسٹری واقعی جادو نگری ہے تو وہ لاہور میں ہے! دُنیا بھر میں فِلمیں بنائی جاتی ہیں، ہمارے ہاں بن جاتی ہیں! اور رہا فِلمی دنیا کے لوگوں کو کسی اور سیّارے کی مخلوق ظاہر کرنے کا معاملہ تو کوئی ذرا پورے یقین سے یہ تو بتا کر دِکھائے کہ ہماری فِلموں میں کام کرنے والے کِس سیّارے کی مخلوق ہیں! دُنیا بھر میں فِلم انڈسٹری فنکار پیدا کرتی ہے، ہمارے ہاں چند سَر پھرے مل کر فِلم انڈسٹری کو معرضِ وجود میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں! اِس پر بھی اگر اُنہیں کسی اور سیّارے کی مخلوق نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے!
بعض لوگ مُعترض ہیں کہ پاکستان میں فِلمیں بنانے کے کام کو انڈسٹری نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ شعبہ انڈسٹری کے معیارات پر پورا نہیں اترتا۔ ہم اِس

سوچ سے متفق نہیں۔ انڈسٹری کا کیا مطلب ہے؟ ایک طے شدہ معیار کے مطابق پیداوار ! اِس بُنیادی معیار پر تو ہماری بیشتر فِلمیں پوری اُترتی ہیں یعنی ایک ہی طرح کی فِلموں کی پروڈکشن ہو رہی ہے ! معیار کو ایک ہی سطح پر برقرار رکھنے کا ہنر اب تک ہالی وڈ اور بالی وڈ جیسی بڑی فِلم انڈسٹریز کے لوگ بھی نہیں سیکھ پائے ہیں !

ہالی وڈ اور بالی وڈ میں بڑے دعوے کئے جاتے ہیں کہ کم بجٹ میں بھی معیاری فِلم بنائی جاسکتی ہے۔ کئی تجرباتی فِلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔ بالی وڈ میں چند برسوں کے دوران ایسی فِلمیں بھی بنائی گئی ہیں جن میں آٹھ دس کہانیاں تھیں۔ اِن تمام معاملات میں بھی ہم بازی لے گئے ہیں۔ بجٹ کا معاملہ تو یہ ہے کہ بالی وڈ میں ایک بڑا ہیرو جتنا معاوضہ لیتا ہے اُتنے میں ہماری تین چار فِلمیں بن جاتی ہیں ! اگر یہ کفایت شعاری نہیں تو کیا ہے؟ اور رہا تجربے کا سوال، تو عرض ہے کہ ہالی وڈ اور بالی وڈ کے فِلم میکرز رات دن فِلم میکنگ کی تکنیک کو روتے رہتے ہیں مگر اُن کا ذہن اب تک اِس نکتے کی طرف گیا ہی نہیں کہ کسی بھی نوعیت اور سطح کی تکنیک کے بغیر بھی فِلم بنائی جاسکتی ہے ! بس ذرا سی جراتِ رندانہ درکار ہوتی ہے یعنی ذہن کو بروئے کار لائے بغیر فِلم بنا ڈالیے !

فِلمیں بنانے کے دعوے کرتے ہیں۔ سائنس timeless بڑی فِلم انڈسٹریز کے لوگ دان کہتے ہیں کہ وقت کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایسے میں اگر وہ فِلم بنا بھی لی تو کیا کمال کیا جیسی حقیقت کے ہوتے mind جس کا وقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ مزا تو جب ہے کہ فِلمیں بنا کر دِکھائے mindless ہوئے کوئی ہماری طرح!

ہمیں تو اِس بات پر حیرت ہے کہ ایک فِلم میں دس کہانیاں پیش کرنے کا خیال بالی وڈ والوں کو اب آیا ہے۔ ہمارے ہاں تو عشروں سے ایسی فِلمیں بنائی جارہی ہیں جن میں درجن بھر کہانیاں دریافت کرنا کوئی کمال نہیں! اور یہ کہانیاں آپس میں ایسی گڈمڈ ہوتی ہیں کہ کوئی مائی کا لعل اِنہیں الگ بھی نہیں کرسکتا! کبھی کبھی تو یہ طے کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ہیرو اور ولن کی لڑائی زیادہ شدید تھی یا کہانیاں آپس میں زیادہ گتھم گتھا تھیں! سچ تو یہ ہے کہ ہم اِس سے بھی دس قدم آگے کی منزل میں ہیں۔ ہم نے ایسی کئی فِلمیں بنائی ہیں جن میں لاکھ ڈھونڈے سے بھی کوئی کہانی نہیں مل پاتی! ہماری بعض فِلمیں کچھ اِس نوعیت کی ہوتی ہیں کہ کسی معمولی سی کہانی میں تو ہمت ہی نہیں ہوتی کہ اُن میں داخل ہو کر دکھائے! سُنا ہے دِماغی امراض کے بعض ہسپتال ایسی فِلموں کو ٹوٹکے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بعض ذہنی مریض ایسی فِلمیں دیکھنے کے بعد ہر قسم کی ذہنی اُلجھن میں مُبتلا ہونے سے توبہ کرلیتے ہیں اور ناٹک چھوڑ کر نارمل زندگی بسر کرنے کے لیے گھر چلے جاتے

ہیں !

اور صاحب ! ایک کہانی پر کیا موقوف ہے، ہمارے ہاں تو منظر ناموں اور مکالموں کے بغیر بھی فِلمیں دھڑلّے سے بنائی جاتی ہیں ! آپ چونک گئے نا؟ غلط بات پر چونکے۔ فِلموں کو mindless ! چونکنے کی بات یہ ہے کہ ایسی فِلمیں زیادہ کامیاب رہتی ہیں عام فِلم بین اپنی ذہنی سطح سے زیادہ قریب محسوس کرتے ہیں ! آپ چاہیں تو اپنے ہاں کی بیشتر فِلموں کو سسپنس کی کیٹیگری میں رکھ سکتے ہیں کیونکہ یہ بالعموم clueless بھی ہوتی ہیں !

سُنا ہے ہماری فِلم انڈسٹری پر تحقیق کے لیے ہالی وڈ سے ایک ٹیم آئی تھی۔ اِس ٹیم نے کیا جَھک ماری یہ تو ہم نہیں جانتے مگر اِتنا ضرور سُنا ہے کہ ٹیم کے ارکان کو چار پانچ پنجابی اور دو تین پشتو فِلمیں دِکھائی گئیں تو حیران رہ گئے۔ فِلمیں دکھانے کے بعد اُنہیں خوب جھنجھوڑا گیا تب کہیں جا کر اُن کے حواس بحال ہوئے ! اُنہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور ہماری چند پنجابی اور پشتو فِلمیں ڈبّوں میں پیک کرواکے لے گئے۔ بعد میں خبر آئی کہ یہ فِلمیں 200 سال بعد ڈبّوں سے نِکالی جائیں گی تاکہ اُس دور کے لوگوں کو بتایا جاسکے کہ اپنی ٹیکنالوجی پر نہ اِتراؤ، یہی ٹیکنالوجی 200 سال پہلے بھی تھی ! یہ ٹیم ہماری فِلم انڈسٹری کی وہ سِلائی مشین بھی ساتھ لے گئی جس

کے چلتے ہی فِلموں میں بچے.بڑے ہو جایا کرتے تھے ! انڈسٹری والوں نے عطیے کے طور پر وہ سال خوردہ پیانو بھی دیا جسے بجاتے ہوئے ہیرو گانا گاتا تھا تو ہیروئن کی یادداشت لوٹ آتی تھی اور ساتھ ہی وہ سوئیٹر بھی بخش دیا جسے پہن کر ہیرو کی ماں گانے کے دوران بیٹے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہتی تھی اور اِس بات پر فخر کرتی تھی کہ پانچ کوششوں کے بعد میٹرک کرنے والے ناکارہ بیٹے کو اور کچھ آتا ہو یا نہ آتا ہو، کم از کم گانا تو آتا ہی ہے ! راز کی بات یہ ہے کہ مغربی فِلم میکرز کو دیا جانے والا پیانو، سِلائی مشین اور سوئیٹر کا تحفہ خلوص سے زیادہ اپنی غرض کا شاخسانہ تھا کیونکہ ہمارے بعض اسٹارز اِن چیزوں کو دیکھ کر بدکنے لگے تھے ! پیانو، سِلائی مشین اور سوئیٹر تو ہماری فِلموں میں آج بھی ہیں، بس اُن کی شکل بدل گئی ہے !

ہمارے ہاں فِلم انڈسٹری اور سرکاری محکموں میں اچھی خاصی مماثلت ہے۔ جو شخص کچھ نہ کر پائے وہ سرکاری کلرک یا ٹیچر تو بن ہی جاتا ہے ! بالکل اِسی طرح جو اور کچھ نہ کر پائے وہ اداکاری، گلوکاری، ہدایت کاری یا اسکرپٹ رائٹنگ تو کر ہی لیتا ہے ! سُنا ہے لاہور میں فِلم انڈسٹری کے کرتا دھرتا چُھٹی والے دن بادشاہی مسجد کے سامنے حضوری باغ کے آس پاس یا پھر مینار پاکستان والے اقبال پارک میں گھومتے رہتے ہیں تاکہ جگت بازوں اور شیخی بگھارنے والوں کو لے جاکر فِلموں میں متعارف کرائیں اور قوم سے اُن کی صلاحیتوں کا

لوہا منوائیں ! ایک زمانہ تھا جب اناپ شناپ بکنے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اب اُنہیں فِلموں والے لے اُڑتے ہیں اور اسکرپٹ رائٹرز میں تبدیل کرکے دُنیا کو دِکھاتے ہیں کہ

دیکھو اِس طرح سے کہتے ہیں سُخنور سہرا !

ہندی بولے تو.... دِماغ کا دہی

عشروں میں کبھی ایک بار ایسا ہوتا ہے کہ بھارت سرکار کو اپنی کسی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور اِس سے بھی بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اُس غلطی کا نام و نشان مٹانے کے بارے میں سوچتی ہے! بولنے کے معاملے میں بھارتی قیادت چاہے کتنی ہی لاپروا واقع ہوئی ہو، زبان کے معاملے میں اُس کے حواس خاصے بحال ہیں! نئی دہلی کے بزرجمہروں کو اچانک یاد آگیا ہے کہ سرکاری خط و کتابت اور دستاویزات میں خالص ہندی کا استعمال کسی بھی طور "چانکیہ بُدّھی" کا اچھا استعمال نہیں اور یہ کہ خالص ہندی کی خوراک نے معاشرے کا نفسیاتی ہاضمہ خاصا بگاڑ دیا ہے! اب ہندی خط و کتابت میں اردو، انگریزی اور علاقائی زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے! اے کاش بھارتی قیادت کو کشمیر کے معاملے میں بھی اپنی حماقت کا اِسی طرح احساس ہو جائے!

دفتری کاروائی میں سنسکرت آمیز ہندی کے استعمال سے آسانیاں تو کیا پیدا ہوتیں، رہی سہی آسانی کا بھی بیڑا غرق ہوگیا! سرکاری سطح پر متعارف کرائی جانے والی ہندی ایسی ثقیل ہے کہ سنسکرت کے عالم بھی سرکاری دستاویزات پڑھ کر "شَبد کوش" (لغت) کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں!

بھارت میں عشروں تک سرکاری سطح پر کوشش کی جاتی رہی کہ انگریزی الفاظ کے متبادل ہندی لفظ تلاش کئے جائیں۔ بُھوسے کے ڈھیر میں سُوئی ڈھونڈنے سے مماثل یہ کوشش بیشتر مواقع پر شدید ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تو ہونا ہی تھا! چھوٹے سے پیالے میں پورے مٹکے کا پانی بھلا کیسے سَما سکتا ہے؟ مگر اہل ستم بھی کہاں ماننے والے تھے؟ سال بھر کے بچے کے کپڑے چھ سال کے بچے کو "پہنائے" جائیں تو؟ بس کچھ ایسا ہی معاملہ انگریزی کے الفاظ کو سنسکرت آمیز ہندی الفاظ کا لباس پہنانے کا بھی تھا! اِن کوششوں کے ویسے ہی مضحکہ خیز نتائج برآمد ہوئے جو ایسی کوششوں کے نتیجے میں برآمد ہوا کرتے ہیں! دفاتر کی رسمی خط و کتابت میں ہندی رائج کئے جانے کے بعد یہ ہوا کہ تماشوں نے دفاتر کا رستہ دیکھ لیا! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی کو کامیابی پر ہندی میں مبارک باد دی جاتی تو شک میں پڑ جاتا کہ کہیں طنز تو نہیں فرمایا جارہا! بہت سے سرکاری ملازمین کو دفتر کی طرف سے کوئی لیٹر دیا جاتا اور اُنہیں دس دِن بعد دوسروں کی زبانی معلوم ہو پاتا کہ اُن کا تو پروموشن ہوگیا ہے! یہ بھی عجب تماشا تھا کہ بندہ ترقی کرلیتا تھا مگر زبان کی پس ماندگی اُسے بے خبر رکھتی تھی! کبھی کبھی کوئی لیٹر ملنے پر ملازمین کو انجانی سی خوشی ہوتی تھی اور تین دِن بعد سپرنٹنڈنٹ بُلاکر سرزنش کرتا تھا کہ فٹافٹ "ایپولوجی" ٹائپ کرو کیونکہ تمہیں نااہلی پر وارننگ دی گئی

ہے!

1976 میں حکومت کو یہ ہدایت جاری کرنا پڑی کہ دفتری خط وکتاب میں اِس بات کا خاصل خیال رکھا جائے کہ پڑھنے والے کی سمجھ میں بھی آئے! کاش ایسی ہی کوئی ہدایت بھارت سرکار کی پالیسیوں کے حوالے سے بھی جاری کردی جاتی!

حکومت نے ہندی کو عام کرنے کے لیے عوام کو چند ایک معاملات میں رعایت بھی دے رکھی تھی۔ مثلاً ایک زمانے میں اُصول تھا کہ ہندی میں ٹیلی گرام بھیجنے پر چارجز میں 40 فیصد تک رعایت ملتی تھی۔ مگر جسے ٹیلی گرام ملتا تھا اُسے پیغام سمجھنے کے لیے ہندی جاننے والے کو ڈھونڈنے پر یہ 40 فیصد بچت خرچ کرنا پڑتی تھی!

بعض معاملات اُتنے پیچیدہ نہیں تھے جتنے اُن کے نام تھے۔ ڈرائیونگ سیکھنے والوں کے لیے اسٹیئرنگ وھیل کنٹرول کرنا اُتنا مشکل نہ تھا جتنا مشکل اُس کا ہندی نام "انکش چکر" یاد رکھنا تھا!

کورٹ کچہری میں بے مثال عزت آبرو رکھنے والے وکیلوں کو جب "بھاڑو" کہا جانے لگا تو اُنہیں بہت بُرا لگا۔ تجربہ کار اور بڑے وکیل کو "مہا بھاڑو" کی

اُپادھی" ملی۔ یہ وہی بات ہوئی کہ کمرے میں پھیری جانے والی جھاڑو کو دیواریں" صاف کرنے کے لیے ڈنڈے میں لگانے کے بعد "مہا جھاڑو" قرار دیا جائے! شکر ہے کہ بڑی سالی کے شوہر کو "مہا ساڑو" کا خطاب نہیں دیا گیا! "مَہا" کا سابقہ لگانے سے بھاڑو، جھاڑو اور ساڑو کی اصلیت کہاں بدلتی ہے! ہم بھاڑو، جھاڑو اور ساڑو کے سلسلے کو یہیں روکتے ہیں کیونکہ آگے چند عجیب ہم قافیہ الفاظ آ سکتے ہیں۔

اچھے خاصے ریلوے اسٹیشن کو "بَھک بَھک اڈا" قرار دیا گیا تو لوگ مہمانوں کے استقبال کے لیے وہاں جانے سے گریز کرنے لگے! اچھا تھا کہ پلیٹ فارم کو "تھالی تختہ" قرار !دیکر اُس کا بھی دھڑن تختہ کر دیا جاتا

شہروں میں چلنے والی پبلک ٹرانسپورٹ کو جب ہندی کا جامہ پہنایا گیا تو جن اور بھوت جیسی گاڑیوں کے بطن سے "پری" برآمد ہوئی، یعنی ٹرانسپورٹیشن سروس ہندی کے !کوچے میں پہنچ کر "پری وَہَن سیوا" کہلائی

روز مرہ گفتگو میں ہندی کا بے جا استعمال عجیب گل کھلاتا تھا۔ کوئی مر جائے تو ٹیلی فون پر اطلاع دیجیے کہ "نِدھن" ہوگیا ہے۔ اب فریق ثانی اِس لفظ میں دَھن کو موجود پا کر یہ سمجھتا تھا کہ جن کا ذکر کیا گیا ہے وہ شاید

دیوالیہ ہوگئے ہیں ! ا"اوسان" کہیے تب بھی سُننے والے کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔
مَہانِدرا" (عظیم نیند یعنی موت) بھی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بعض سادہ لوح"
دیہانت" (دیہہ یعنی جسم اور انت یعنی خاتمہ) جیسا سادہ لفظ بھی سمجھنے سے قاصر"
رہتے تھے۔جب بھارت میں بول چال کی زبان کو بروئے کار لاتے ہوئے کہا جاتا تھا کہ
فلاں صاحب "گزر" گئے ہیں تب سمجھ میں آتا تھا کہ موصوف انتقال فرماگئے ہیں ! اِس
دُنیا میں آنا شاید اُتنا پیچیدہ نہ تھا جتنا اِس دُنیا سے جانے کے عمل کو ہندی میں بیان
! کرنا

ولادت کو "جنم" ہی رہنے دیا گیا کیونکہ اِسے اُتپتّی (پیداوار) قرار دینے میں خاصی
آپتّی (زحمت) کا سامنا ہو سکتا تھا! ویسے بھارت میں جس رفتار سے آبادی سے بڑھتی
ہے اُسے دیکھتے ہوئے تولید کو جنم کے بجائے "اُتپادن" (پیداوار) کہنا زیادہ موزوں
! ہوگا

سرکاری ہسپتال پہنچ کر "دَردی" (مریض) کے لیے بے دردی یعنی ڈاکٹر ڈھونڈنے میں
خاصا وقت لگتا تھا کیونکہ تین چار مرتبہ بھی "چِکِتسَک" (معالج) کہیے تو خود ڈاکٹر یہ
! نہیں سمجھ پاتے تھے کہ اُنہیں یاد کیا جارہا ہے
ہندی نے سب سے زیادہ گل تعلیم کے شعبے میں کھلائے ہیں۔ طلباء اور طالبات کو

ہندی کے جھٹکے اِس قدر دیئے گئے کہ اب اُن کے ذہن کچھ سوچنے اور اعصاب کچھ جھیلنے کے قابل ہی نہ رہے۔ معاشرتی عُلوم کے سادہ الفاظ بھی ثقیل ہندی میں ملفوف ہو کر ایسا تاثر پیدا کرتے ہیں کہ ساتویں آٹھویں کا طالب علم جب باآواز بلند سبق یاد کرتا ہے تو گھر بھر کے لوگ خواہ مخواہ احترام سے سُننے پر مجبور ہو جاتے ہیں!

ممبئ میں بنائی جانے والی فِلموں میں ہندی کے بڑھتے ہوئے استعمال نے بھی لوگوں کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ اچھے خاصے رومانی مناظر ہندی الفاظ کی کثرت سے ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں کہ لگتا ہے ہیرو موقع غنیمت جان کر ہیروئن کو اُس کے سورگ واسی پتا جی کا پُرسہ دے رہا ہے!

مزاحیہ گانے میں ہندی الفاظ ضرورت سے زیادہ ڈال دیئے جائیں تو سُننے والا ہنسانے والی دُھن سُن کر بھی رونے لگتا ہے! اور بعض سنجیدہ گانوں میں ثقیل ہندی الفاظ اِنسان کو ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں! نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہندی کے (ظاہر ہے) غیر ضروری استعمال نے بیشتر فِلموں کو فل ٹائم کامیڈی کی کیٹیگری میں رکھ دیا ہے!

بھارت میں زبانوں اور بولیوں کا معاملہ ایسا اُلجھا ہوا ہے کہ چُوں چُوں کا

مُرتبہ بھی دیکھے تو شرما جائے! جس طرح مُلک بہت پھیلا ہوا ہے اُسی طرح زبانیں اور بولیاں بھی کچھ زیادہ ہی پھیل گئی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے کرتے زبانوں کی بُھول بُھلیاں میں کھوگئے ہیں! جنوب والے شمال کے لوگوں کی بات سمجھ نہیں پاتے۔ اور شمال والوں کے لیے تو خیر جنوب کی بات کو سمجھنا آسمان سے تارے توڑ لانے سے بھی زیادہ مشکل ہے! وزیر خارجہ ایس ایم کرشنا، وزیر داخلہ پی چدمبرم اور وزیر دفاع اے کے انٹونی کا تعلق جنوبی بھارت سے ہے جبکہ وزیر خزانہ پرنب مکھرجی مغربی بنگال کے ہیں۔ ان سب کو ہندی نہیں آتی۔ وہ انگریزی میں یا پھر اپنی مادری زبان میں بات کرتے ہیں۔ پرنب مکھرجی اعتراف کرچکے ہیں کہ وہ جب بھی ہندی بولتے ہیں تو کہنا کچھ چاہتے ہیں اور بول کچھ جاتے ہیں! کاش وہ کشمیر کے حوالے کبھی ہندی میں کچھ ایسا کہیں جو "پالیسی ڈیپارچر" ہو اور ہمارا بھلا ہو جائے!

بھارت بھر میں رنگ اور نسل کا فرق بھی غیر معمولی ہے، مگر انفرادیت کے معاملے میں کوئی بھی خصوصیت زبانوں سے مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ایک زمین کی بات کرتا ہے تو دوسرا اُسے آسمان کی بات سمجھ کر گردن ہلانے لگتا ہے! بھارت کی دھرتی کو بعض زبانیں ایسی عطا ہوئی ہیں کہ بھارت واسیوں کے ساتھ ساتھ پورے روئے ارض کے مکینوں کو فخر ہونا چاہیے۔ ملیالم (ملباری) ہی کی مثال لیجیے۔

اگر کیرالہ سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی آبائی یا مادری زبان میں بات کر رہے ہوں تو اُن کی باتیں سُن کر آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے چند.بڑے پتھر ڈال کر کنستر کو ہلایا جا رہا ہے ! اگر کیرالہ کا کوئی گھرانہ یعنی چند ملباری آپ کے پڑوس میں آ بسیں اور آپ کئی.برس تک اُن کی باتیں سُنتے رہیں تب بھی "یاڑ رگلّے" سے زیادہ کچھ بھی سمجھ نہیں آئے گا !

رسمی تعلیم اور حقیقی تعلّم

شریف امروہوی

کون سا انسان ہے جس کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان ناگزیر نہیں؟ ہر انسان پیٹ بھر کھانا، تن ڈھانپنے بھر کپڑا اور سر چھپانے کا ٹھکانہ چاہتا ہے۔ مگر کیا یہی سب کچھ ہے جسے زندگی کا حاصل سمجھا جائے؟ یقیناً نہیں۔ جب انسان کا پیٹ بھر چکتا ہے، تن پر کپڑے سج چکتے ہیں اور وہ کسی پر سکون جگہ بیٹھ کر زندگی کے بارے میں سوچتا ہے تب اسے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کا معیار بلند کرنے کے لیے اور بھی بہت کچھ درکار ہے۔
اللہ نے ہر انسان کو جسم کے اندر ایک ذہن بھی عطاء کیا ہے۔ بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد ہر انسان اپنے لیے امکانات کے بارے میں سوچتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے بغیر اس کی زندگی ادھوری ہے۔ انسان تعلیم حاصل کرے یا نہ کرے، وہ اسے زندگی کی بنیادی ضرورت ضرور تسلیم کرتا ہے۔ تعلیم واحد ذریعہ ہے جو انسان کو اچھے برے کی تمیز، معاشرے میں بہتر انداز سے زندگی بسر کرنے کا شعور، اپنے بارے میں سوچنے کی توفیق اور کائنات سے رشتہ قائم کرنے سے متعلق تحریک دیتا ہے۔

ویسے تو انسان ماں کی گود میں آتے ہی سیکھنے کا عمل شروع کر دیتا ہے جیسے کھانا پینا، بیٹھنا چلنا، رونا ہنسنا وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سبھی کچھ انسان میں جبلّی طور پر یا "بائی ڈیفالٹ" موجود ہوتا ہے۔ جو کچھ اللہ نے انسان کی سرشت میں رکھا ہے وہ رفتہ رفتہ اُس پر منکشف ہوتا رہتا ہے۔ تعلیم کے بغیر بھی انسان زندگی بسر کر ہی لیتا ہے۔ مگر ایسی صورت میں زندگی خاصی خام شکل میں ہوتی ہے۔ شعور کی پختگی اور وجود کا نکھار تعلیم کے دم سے ہے۔ جن باتوں کو ہم اپنے طور پر بھی آسانی سے سمجھ لیتے ہیں اُسے تعلیم کی مدد سے زیادہ عمدگی سے سمجھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

رسمی تعلیم ہر انسان کے لیے ایک معمول کا درجہ رکھتی ہے۔ بچوں کو اسکول کی تعلیم ان کی مرضی سے نہیں ایک رسمی کارروائی کے طور پر دلائی جاتی ہے۔ اگر سرکاری سطح پر تعلیم کی سہولت میسر ہو یا نجی اداروں میں داخلہ دلانے کی توفیق ہو تو والدین بچے کو اسکول بھیجنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ اسکول میں داخلہ کسی بھی بچے کے لیے انتخاب کا معاملہ نہیں ہوتا۔ یہ معاشرے کا چلن ہے۔ اسکول کی تعلیم اسے معاشرے سے بہتر طور پر ہم آہنگ ہونے میں مدد دیتی ہے۔ وہ زندگی کو سمجھنے کے قابل ہوتا جاتا ہے۔ مختلف تعلیمی مراحل سے گزر کر انسان معاشرے کے لیے بہتر موزونیت حاصل کرتا جاتا ہے۔ مختلف سطح کے

تعلیمی ادارے انسان کو معاشرے کے لیے زیادہ قابل قبول بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم نے تعلیم کو ایک رسمی عمل اور محض روزگار کے حصول کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ عام سی تعلیم انسان کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتی جاتی ہے۔ کم لوگ اس بات کو محسوس کرتے یا سمجھ پاتے ہیں کہ تعلیم دراصل زندگی بھر سیکھتے رہنے کا عمل ہے۔ تعلیمی ادارے تو ہمیں تعلیم کے حصول کے لیے محض تیار کرتے ہیں۔ عام طور پر والدین بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اسکول یا کالج کی سطح تک جو کچھ بھی پڑھ لیا ہے بس وہی بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ گویا سمندر کی مچھلی کو کنویں کے مینڈک میں تبدیل کرنا ہے!

والدین چاہتے ہیں کہ اسکول یا کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے پر ان کی اولاد اچھی ملازمت حاصل کرلے۔ اور اگر ملازمت مل جائے تو سمجھ لیجیے زندگی کی ابتداء ہو گئی۔ لڑکیوں کے ساتھ تو کہیں کہیں اس سے بھی زیادہ ناانصافی دیکھنے میں آتی ہے کہ ابھی لڑکی نے انٹرمیڈیٹ ہی پاس کیا ہے اور اس کی شادی کی باتیں شروع ہو گئیں۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ لڑکی کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ لیتی ہے اور ابھی تعلیم کا سلسلہ چل ہی رہا ہوتا ہے کہ موزوں رشتہ آنے پر شادی کردی جاتی ہے۔ اگر لڑکی نے زندگی کے لیے کوئی منصوبہ بندی

کر رکھی ہو تب بھی تمام معاملات کو لپیٹ دیا جاتا ہے۔ تمام ارادوں کی بساط پلک جھپکتے میں لپیٹ دی جاتی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی مشورہ دے تب بھی جواب یہی ملتا ہے کہ لڑکی ذات ہے، اچھا ہے اپنے گھر کی ہو جائے، ہمیں اِس سے کون سی نوکری کرانی ہے۔ عام والدین کی یہ محدود سوچ ہی انسان کو بہت سے معاملات میں محدود کر دیتی ہے۔ تعلیم دنیوی ہو یا دینی، ہم نے دونوں کو رسمی کارروائی کا درجہ دے دیا ہے۔ آج کل بچوں کو دینی تعلیم دلانے کا رجحان بھی تیزی سے پنپ رہا ہے۔ اب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ دینی تعلیم کس طور دلانی چاہیے اور اس کا مصرف کیا ہے؟ بہت سے والدین یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کو حافظ بنانے سے وہ اعلیٰ معیار کی زندگی کے تمام لوازم سیکھ لیتا ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ اگر بچے کو حفظ کرانے کے ساتھ ساتھ قرآن کے معانی کی تعلیم بھی دی جائے تو وہ دین کی تبلیغ کے لیے بہتر طور پر تیار ہو سکتا ہے۔ قرآن کو محض حفظ کر لینا ہمارے لیے کافی نہیں۔ اس کے مفاہیم سمجھ کر ان پر عمل کرنا بھی تو ناگزیر ہے۔ قرآن کو حفظ کرنے اور اس کے تمام معانی کو سمجھنے میں بہت فرق ہے۔ قرآن کی تشریح و تفسیر پر نظر ڈالنا بھی تو ہمارے لیے ناگزیر ہی ہے۔ اسی صورت ہم اللہ کے پیغام کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو پاتے ہیں۔

اپنے ماحول پر نظر دوڑائیے تو اندازہ ہوگا کہ جو لوگ پڑھ لکھ کر بہتر معاشی امکانات کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہی کامیاب کہلاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کامیابی کیا ہے؟ کیا بہتر ملازمت حاصل کرنے کو کامیابی قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا شاندار کیریئر ہی کامیابی ہے؟ کیا ہر بڑے وکیل، ڈاکٹر، انجینئر، ماہر تعلیم یا نامور صحافی کو کامیاب انسان قرار دیا جاسکتا ہے؟ کبھی ہم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ تعلیم کا بنیادی مقصد دنیا کو سمجھنا اور اپنے آپ کو دنیا کے لیے زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانا ہے۔ اگر کوئی انسان ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اسے حقیقی کامیاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ بہت سے لوگ اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد بہتر معاشی امکانات حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی ظاہری شان و شوکت قابل دید ہوتی ہے۔ مگر ان کی روحانی ترقی برائے نام بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ایسی حالت میں ہم انہیں کامیاب قرار نہیں دے سکتے۔ اگر تعلیم نے کسی انسان کے دل میں دوسروں کا درد پیدا نہ کیا ہو تو اسے بہتر اور کامیاب انسان قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بہت سے کامیاب انسان ہر وقت زیادہ سے زیادہ دولت کے حصول کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹرز نے دولت کے حصول کو زندگی کا بنیادی مقصد سمجھ لیا ہے۔ اگر کسی کو اس حالت میں لایا جائے کہ زخم لگنے کے بعد خون بہہ رہا ہو یا شدید بیماری کے بارے نبض ڈوبتی جارہی ہو تو ڈاکٹرز کو عام طور پر یہ فکر

لاحق رہتی ہے کہ اس سے چیک اپ اور میڈیکیشن کی فیس وصول ہوسکے گی یا نہیں!
ایک زمانہ تھا جب معلم چاہتا تھا کہ اس سے تعلیم پانے والے زندگی میں کچھ بن جائیں۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔ مقررہ وقت پر کلاس میں آنے اور پرائیویٹ ٹیوشن لینے والوں کو میکانیکی انداز سے پڑھایا جاتا ہے اور فیس کے بدلے محض رسمی انداز سے کچھ بتادینے کو تعلیم سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ سوچ کا دیوالیہ پن ہی ہے، اور کچھ بھی نہیں۔

کامیاب وکیل وہ ہے جو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کر دکھائے۔ مقدمات کو طول دینے میں کامیاب ہونے والے زیادہ کامیاب وکیل کہلاتے ہیں۔

جب تک ہم تعلیم کو زندگی بھر کا معاملہ قرار نہیں دیں گے، اپنے وجود اور اپنی اولاد کو بہتر زندگی کے لیے تیار کرنے میں کامیاب نہیں ہو پائیں گے۔ معاشرے میں جس قدر بھی بگاڑ ہے، تعلیم کو رسمی معاملہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔ تعلیم ہی انسان کو بہتر زندگی کا شعور عطاء کرتی ہے۔ جب تک ہم تعلیم کو پوری زندگی پر محیط قرار نہیں دیں گے تب تک کنویں کے مینڈک ہی رہیں گے، زندگی کے سمندر میں تیرنے اور زندگی کا تنوع دیکھنے کے قابل نہیں ہوسکیں

گے۔ زندگی پر محیط تعلیم ہی بزرگوں کے احترام کا شعور عطاء کرتی ہے۔ کسی کے دکھ کو سمجھنا اسی وقت ممکن ہے جب ہمیں اس کی باضابطہ تعلیم دی گئی ہو۔ قانون کی بالادستی کا تصور ذہن میں اسی وقت جنم لیتا ہے جب تعلیمی عمل کے دوران ہمارے ذہن میں اس کا بیج ڈالا گیا ہو اور اس کی آبیاری بھی کی گئی ہو۔

اگر ان تمام امور کے حوالے سے معاملات کا جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے حوالے سے ہم ادھورے ہیں یا ہماری تعلیم ادھوری ہے۔ یقیناً اسکول، کالج یا یونیورسٹی کی سطح پر حاصل کی جانے والی تعلیم سب کچھ نہیں۔ زندگی کو سمجھنا اس سے کہیں الگ اور منفرد عمل ہے۔ اس کے لیے مطالعہ اور مشاہدہ ناگزیر ہے جو بحیثیت مجموعی زندگی کو تنوع عطاء کرتا ہے۔ وسیع تر مفہوم میں اِسی کو تعلیم کہتے ہیں۔

(مویشی نامہ ۱)

دُنیا کی ساری رونق تنَوّع کے دَم سے ہے۔ اگر یہ لفظ (تنَوّع) آپ کو، اردو اخبارات کی انگریزی آمیز زبان کی مہربانی سے، اجنبی سا محسوس ہو رہا ہے تو ہم آسانی کے لیے عرض کردیں کہ دُنیا کی ساری رنگینی "ورائٹی" کے دَم سے ہے۔ آپ نے سُنا ہی ہوگا

قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا

کچھ کچھ ایسا ہی معاملہ ہم اِنسانوں کا بھی ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر ہم بیزاری محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اگر آپ بھی اِس مرحلے سے گزر رہے ہیں تو کمر کَس لیجیے اور کراچی سے باہر جانے کی تیاری کیجیے۔ نہیں نہیں، ہم آپ کو کلری یا ہالیجی جانے کا مشورہ نہیں دے رہے۔ وہ تو مشرق میں اور خاصے فاصلے پر ہیں۔ جنوب کی طرف جانے کی کوشش بھی مت کیجیے گا کیونکہ اُس طرف سَمَندر ہے! ہم نہیں چاہتے کہ آپ ابھی سے سَمَندر میں اُتر جائیں! اور ویسے بھی کراچی میں رہتے ہوئے آپ کو مزید کسی سَمَندر میں اُترنے کی ضرورت نہیں۔ بلوچستان میں داخل ہونا اِس وقت انتہائی خطرناک ہے۔ اُس طرف اگر آپ کسی کام سے گئے تو سمجھ لیجیے گئے کام سے! یعنی غروب ہونے سے بچنا ہے تو مغرب کی سَمت بھی نہیں جانا۔ رہ گیا شُمال، بس اِسی سمت بڑھنے کی تیاری کیجیے۔ اور

زیادہ دور بھی نہیں جانا۔ بس کراچی سے باہر قدم رکھتے ہی آپ کا پکنک پوائنٹ آ جائے گا۔ جی ہاں، ہم سہراب گوٹھ سے کچھ فاصلے پر لگائی جانے والی قربانی کے یعنی اصلی جانوروں کی بڑی منڈی کا ذکر کر رہے ہیں!

جو لوگ سال بھر ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر وحشت زدہ ہو چکے ہوتے ہیں وہ مویشی منڈی کا رُخ کرتے ہیں تاکہ ذرا الگ قسم کے جانوروں سے بھی رُوشناس ہوں! آج کل جس قسم کے اِنسان مارکیٹ میں آئے ہوئے ہیں اُنہیں دیکھ کر مویشی منڈی بہت غنیمت معلوم ہوتی ہے کہ چلیے، اعلیٰ نسل کے اِنسان دیکھنے کو نہیں ملتے تو نہ سہی، اعلیٰ نسل کے جانور تو ہم دیکھ پاتے ہیں!

مویشی منڈی میں قدم رکھتے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کیسی کیسی چیزیں خلق کی جاتی ہیں۔ خالق کائنات کے نام پر قربان کرنے کے لیے خریدے جانے والے جانور تو خیر رب کی صَنّاعی کا شاہکار ہوتے ہی ہیں، اُنہیں خریدنے والے بھی اپنے خالق کی قُدرت کا نمونہ بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں! اُن کے طور طریقے دیکھ کر مویشیوں کا بھی وقت اچھا کٹتا ہے! اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک منڈی میں ہمیں کئی منڈیاں دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے! شاید اِسی کو انگریزی میں "ون ونڈو آپریشن" کہتے ہیں!

ہم ہر سال سہراب گوٹھ کے بعد شہر کے کنارے پر لگنے والی مویشی منڈی میں جاتے ہیں اوراِس طرح جاتے ہیں کہ لوگ مویشیوں کو چھوڑ کر ہمیں دیکھنے لگتے ہیں ! اِس سے پہلے کہ آپ ہمارے بارے میں کوئی رائے قائم کریں، عرض کردیں کہ ہم مرزا تنقید بیگ کو ساتھ لے جاتے ہیں ! مِرزا کے ساتھ منڈی میں گھومنا پھرنا صرف ہمارے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی اچھی خاصی تفریح طبع کا باعث ہوتا ہے ! جس طرح شہنشاہِ غزل مہدی حسن ایک غزل کو ایک ہی دُھن میں دس طریقوں سے گا سکتے ہیں، بالکل اُسی طرح مِرزا بھی جانوروں کو دَسیوں طریقوں سے پَرکھ سکتے ہیں ! وہ جس اِنہماک سے جانوروں کو دیکھتے ہیں اُسے محسوس کرکے شاید جانور بھی محظوظ ہی ہوتے ہوں گے !

رواں ہفتے ہم مویشی منڈی گئے تو مِرزا کو بھی لے گئے۔ منڈی میں پہنچتے ہی مِرزا اور منڈی کے جانور ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے ! مِرزا نے سَر گھمائے بغیر چاروں طرف نظر دوڑائی اور بولے "بڑے شہروں میں تو اب مویشی منڈیاں سجانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔" ہم اُن کی طرف غور سے دیکھا تو اُن کی بات کی صداقت پر یقین کرنے کی خواہش دِل میں انگڑائی لیتی ہوئی محسوس کی ! جب مِرزا نے خشمگیں نظروں سے ہمیں دیکھا تو ہمیں وہ بھینسا یاد آگیا جو گزشتہ سال اِسی منڈی میں ہمیں دیکھ کر بدک سا گیا تھا اور ہم شرمندہ ہوگئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُس کی نظر ہم پر نہیں بلکہ ہماری اوٹ میں کھڑے ہوئے

!مرزا پر پڑی تھی

مرزا کا اِستدلال ہے کہ شہروں میں رہنے والے اب چونکہ بہت حد تک حیوانات کی سطح پر آ گئے ہیں لہٰذا مویشی منڈی کچھ غیر ضروری سی چیز معلوم ہوتی ہے! ہم نے کہا بھائی صاحب! مویشیوں کو شہروں میں لانا اُن کی نفسیاتی صحت کے لیے اچھا ہے تاکہ وہ ذبح ہونے سے قبل یہ دیکھ کر مطمئن ہو رہیں کہ اُن کی زندگی گھاس پُھوس چرنے تک محدود !رہی، کسی کا خون پینے یا گوشت میں دانت گاڑنے کا گناہ تو سرزد نہیں ہوا

حالات ہم سب کے گمان سے کہیں زیادہ بدل گئے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری یہ سوچ پختہ ہوتی جا رہی ہے کہ مویشیوں کو اِنسانوں کے درمیان لانا اُن کی نفسیاتی ساخت کے لیے سخت مُضِر بھی ثابت ہو سکتا ہے! اچھا ہے کہ قربانی کے جانور اِنسانوں کے درمیان چند دن ہی رہتے ہیں۔ اگر طویل قیام ہو تو اُن میں بھی اِنسانوں والی خُو بُو پیدا ہو جائے اور اُنہیں ذبح کرنے کے لیے کریک ڈاؤن کا اہتمام کرنا پڑے کہ !ایسا کیے بغیر تو وہ یقیناً ہاتھ آنے والے نہیں

یہ بھی ہم پر رب کا ایک بڑا احسان ہے کہ قربانی کے لیے لائے جانے والے

مویشی بے زبان ہوتے ہیں۔ اگر کہیں وہ بولنے کی صلاحیت کے حامل ہوتے تو میڈیا والے اُن کی جان نہ چھوڑتے اور مویشیوں کی خریداری سے شروع ہو کر ذبیحے پر ختم ہونے والا سلسلہ کئی ماہ جاری رہتا اور روز ایک نیا اسکوپ میڈیا کی زینت بنتا ! میڈیا کی سنگت بولنے کی صفت رکھنے والے جانوروں کی ذہنی ساخت بدلنے میں بھی اہم کردار ادا کیا کرتی۔ پھر یہ بھی ہوا کرتا کہ کسی جانور کو ذبح کی تیاری کر لی جاتی اور جب اُسے ڈھونڈنے نکلتے تو وہ کسی چینل پر کرنٹ افیئرز کا دھواں دار پروگرام کر رہا ہوتا ! اِس تشبیہ پر کسی ٹی وی اینکر کو بُرا نہیں ماننا چاہیے کیونکہ بُرا ماننے کا حق بے زبانوں کا ہے !

مویشی نامہ - ۲

"ذرا دیکھیے تو سہی 'کترینہ' کے کُھر کتنے نفیس ہیں!"

"کوئی مُجھے بتا رہا تھا کہ 'کرینہ' کو کھلی بنولہ اور سُوکھی گھاس مرغوب ہے! ذرا اِس کی دُم کے بال تو دیکھیے، کتنے گھنے اور چمکیلے ہیں۔ پوچھیے تو سہی یہ لوگ اِس کی دُم پر کون سا تیل لگاتے ہیں؟"

"اگر 'گجنی' آپ کے سامنے آ جائے تو اُس کے سینگ دیکھ کر آپ عَش عَش کر اُٹھیں گے۔"

"مِنی اسکرین پر تو ہمیں 'شعلے' کی بسنتی تانگہ ہانکتی دِکھائی دی تھی۔ مگر کراچی میں 'بسنتی' سبز چارہ تناول فرمانے کے بعد ڈکاریں لیتی دکھائی دیتی ہے!"

یہ فلم اسٹوڈیوز کے شوٹنگ فلور پر ادا کئے جانے والے جملے نہیں، مویشی منڈی میں پیش کئے جانے والے تاثرات ہیں۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگایئے کہ پاکستان میں عید الاضحیٰ کی آمد پر بولی وُڈ اسٹارز کا کیا حشر ہوا ہے۔ جانوروں کو منفرد انداز سے پُکارنے کے لیے یار لوگ مُمبئی تک پہنچ گئے۔ جانوروں کو بولی وُڈ اسٹارز سے موسوم کرنے کا فیشن سیلابی ریلے کی طرح آیا ہے اور بہت

کچھ بہالے گیا ہے۔ اب تو کسی مہینے کو بھی دُھتکارتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں اُس میں سے شاہ رُخ خان برآمد نہ ہو جائے! کسی خُرانٹ قسم کے بیل کو دیکھیے تو اُس میں آں جہانی امریش پوری کی جھلک ملتی ہے!

اب کے یاروں نے قربانی کے جانوروں کے ساتھ ساتھ اُن کے ناموں کی بھی منڈی سجادی ہے۔ شہنشاہ، بادشاہ، حُسن کا بادشاہ، ببلو، بادل، طوفان، بلیک کوئین، راجہ، ساجا ماجا، چھوٹی دنیا، چھوٹے میاں بڑے میاں اور پتہ نہیں کِن کِن ناموں سے قربانی کے جانوروں کو پُکارا جاتا رہا ہے اور پُکارا جا رہا ہے۔ اچھا ہے کہ جانوروں کو اپنے نئے نام معلوم نہیں ورنہ یہ ہوگا کہ ذبح ہونے تک اُن کی ہنسی نہیں رُکے گی!

نُمایاں فرق یہ پڑا ہے کہ ہنسی کے اِن اسباب میں اب کی بار بولی وُڈ بھی جُڑ گیا ہے۔ کراچی میں مویشیوں کی منڈی کیا سَجی ہے، پورا بولی وُڈ ہی اُٹھ کر آگیا ہے۔ کہیں کوئی چُلبُل پانڈے" خوب چرنے کے بعد شامیانے میں چکر کاٹتا، خَرمَستی سے سرشار،" بندروں کی سی اُچھل کود سے لوگوں کا دل بہلاتا دِکھائی دیتا ہے! یعنی مویشی منڈی میں چُلبُل پانڈے" کے درشن کرنے کے بعد "دَبنگ" دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی!" کہیں بغیر سینگ کا "باڈی گارڈ" بے زبانی کی زبان سے کہہ رہا ہے "جسے قریب آنا ہے، ذرا سوچ سمجھ کر آئے۔ سینگ نہیں

" ! ہیں تو نہ سہی، سسر تو ہے۔ وہی دے ماروں گا

سُنا ہے جس بیل کا نام باڈی گارڈ رکھا گیا ہے وہ بار بار اپنے نئے نام کے بارے میں سوچ کر ہنس پڑتا ہے۔ ہنسنے کا سبب یہ ہے کہ جسے باڈی گارڈ کہا جا رہا ہے اُس کے تو اپنے ! چار پانچ باڈی گارڈ ہیں

مُنّی بدنام ہوئی۔۔" والی مُنّی سے موسوم گائے کو دیکھیے تو بس دیکھتے رہ جائیے۔ یہ " وی آئی پی مُنّی" اِس قدر نازک ہے کہ قریب جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں بدنام" نہ ہو جائے! لوگ "مُنّی" سے میل جول بڑھاتے یعنی اُس کے قریب جاتے ڈرتے ہیں کہ کہیں "مُنّی صاحبہ" خود ہی نہ بول پڑیں کہ مُنّے میاں! ذرا آئینے میں اپنا (سا) مُنہ ! تو دیکھو۔ ہم سے دوستی کروگے؟ یہ مُنہ اور مَسُور کی دال

گانے کی حد تو شیلا کی جوانی غنیمت ہے کہ دیکھ بھی لی، دل بھی بہلا لیا اور آگے بڑھ گئے۔ مویشی منڈی میں "شیلا" کی جوانی نِہارنے والے جب اُس کے اسٹاف پر نظر ڈالتے ہیں تو (اپنے) دِل تھام کر رہ جاتے ہیں! اور ہوش آنے پر سمجھ میں آتا ہے کہ دُم ! والی شیلا کی جوانی برقرار رکھنے پر کس قدر خرچ کرنا پڑتا ہے

بولی وُڈ کی بعض اداکارائیں ایسی ہیں کہ کِسی گائے کو اُن کے نام سے پُکارا جائے تو وہ ناراض ہو جائے گی اور ہتکِ عزت کا دعوی کر بیٹھے گی!

ویسے قُربانی کے جانور کو چُلبُل پانڈے قرار دینا بھی درست نہیں۔ جانور اِس قدر بے ڈھنگے اور چُلبُلے کہاں ہوتے ہیں! آپ نے کسی بیل کو "دبنگ" والے چُلبُل پانڈے کی طرح چھچھورپن کرتے دیکھا ہے؟ جانوروں میں بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں! کبھی کسی بیل کو آپ نے "گجنی" والے عامر خان کی طرح غیر منطقی حرکتیں کرتے دیکھا ہے؟ گائے اور بیل چاہے جتنی بھی طاقت رکھتے ہوں، اُن کی مار دھاڑ کی کوئی نہ کوئی حد ضرور ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ بولی وُڈ کے ہیروز (سنی دیول، سنجے دت، رتھک روشن وغیرہ) کی طرح پوری فوج کا تِیا پانچا کردیں اور اِس دوران کوئی بریک بھی نہ لیں! قُربانی کے جانوروں سے ایسی باتیں منسوب نہ کی جائیں کہ کل کو اُن کے لیے بات نبھانا دُشوار ہو جائے!

بہت ڈھونڈنے پر بھی ہمیں مویشی منڈی میں ڈھنگ کے جانوروں میں کوئی بھی ایسا دِکھائی نہ دیا جسے لولی وُڈ کے کسی ہیرو یا ولن سے موسوم کیا گیا ہو۔ اِس میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی۔ سلطان راہی مرحوم سے کسی بھی بیل کو موسوم کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی بیل کو سُلطان

راہی کہا جائے اور پھر وہ ہاتھ نہ آئے! اب کہاں کسی "انجمن" کو ساتھ لے کر ہم گم شدہ "سلطان راہی" کو ڈھونڈتے پھریں گے! ممکن ہے کہ کسی بیل کو شَفقت چیمہ کہا جائے اور وہ کہنے والے کا قیمہ بنا ڈالے! ایک زمانہ تھا جب الیاس کشمیری اور اقبال حسن جیسے بھاری بھرکم ولن ہوا کرتے تھے۔اِنہیں دیکھ کر پہلوان بھی شرما جایا کرتے تھے۔ مگر اب حال یہ ہے کہ جانوروں کو دیکھ کر ہمارے آج کے سنگل یا ڈبل پسلی ولن کچھ نہ کچھ تحریک پا سکتے ہیں!

آج کل لولی وُڈ میں خاصے نازک اندام ہیرو آ رہے ہیں۔اِن کی نزاکت دیکھتے ہوئے صرف بکروں ہی کو اِن کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بعض بکرے لولی وُڈ کے ہیروز سے زیادہ ڈیشنگ پرسنالٹی کے حامل پائے گئے ہیں! ہو سکتا ہے کہ ہماری فلم انڈسٹری کو مویشی منڈی سے چند کام کے نئے چہرے مل جائیں اور شوبز کی تقدیر جاگ اُٹھے۔

مویشی منڈی کے وی آئی پی بلاک میں ہمیں چند خُرانٹ اور غُصیلے جانور دِکھائی دیئے۔ اِن میں سے بعض کو کنٹرول کرنے کے لیے بحری جہازوں پر پائے جانے والے رَسّوں سے باندھا گیا تھا! نگرانی پر مامُور افراد سے پوچھا کہ یہ اِس قدر مُشتعل کیوں ہیں تو جواب یہ ملا کہ اِن جانوروں کو کرنٹ افیئرز کے پروگرام کرنے والے چند ٹی وی اینکرز کے نام سے پُکارا گئے تو بھڑک اُٹھے

اور اب تک قابو میں نہیں آ رہے ! اور یہ بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اِنہیں اب کس نام سے پکارا جائے کہ رام ہوں !

مویشی نامہ - ۳

اگر کسی کو اپنی صلاحیت پر ناز ہے اور یہ گمان ہو چلا ہے کہ دنیا کو اُس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں تو لازم ہے کہ وہ آئینے میں اپنا مُنہ دیکھے اور اپنا سا ہی مُنہ لیکر رہ جائے۔ یہ تو اگلے وقتوں کی بات ہے کہ اِنسان ذرا سی صلاحیت پر ناز بھی کرتا تھا اور اِس بات کی خواہش بھی کرتا تھا کہ دُنیا اُس کی صلاحیتوں کی قدر کرے اور ایسا صِلہ دے جو اُس کے شایان شان ہو۔ عیدالاضحیٰ قریب آتی جا رہی ہے۔ ایسے میں اپنی قدر و قیمت کے بارے میں سوچنے کا حق صرف اور صرف قربانی کے جانوروں کو حاصل ہے!

قربانی کے جانور اب ایسی بُلند قیمتوں پر فروخت ہو رہے ہیں کہ بعض لوگ محض دِل پشوری کے لیے مویشی منڈی کا چکر لگانے کے بعد جب گھر پہنچتے ہیں تو اہل خانہ پر رُعب جھاڑنے کے لیے خاصی اکڑ کے ساتھ بتاتے ہیں "آج تو ہم نے قربانی کے جانوروں کی قیمت پوچھی تھی!" یہ بات وہ کبھی نہیں بتاتے کہ قیمت پوچھنے پر اُنہیں اپنی "کم قیمتی" پر جانوروں کے سامنے کیسی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا!

پاکستان میں آسمان سے باتیں کرنا کوئی مُشکل کام نہیں، بالخصوصی قیمتوں کے لیے ! قربانی کے جانوروں کی قیمتیں جس قدر اور جس تیزی سے آسمان سے باتیں کرتی جا رہی ہیں اُسے دیکھ کر لگتا ہے وہ دِن دور نہیں جب مویشی منڈی میں قیمت پوچھنا بھی اسٹیٹس سِمبل میں شمار ہونے لگے گا !

ایک صاحب کسی بڑی سی دُکان میں داخل ہوئے۔ چند اشیاء کے دام پوچھے اور کچھ خریدے بغیر نکلنے لگے تو ایک ملازم نے آواز دیکر بلایا اور بل تھما دیا۔ وہ صاحب بڑے حیران ہوئے اور کہا کہ کچھ خریدا تو ہے نہیں پھر بل کس بات کا ! ملازم نے مودبانہ عرض کیا کہ جناب ! اِس دکان میں دام پوچھنے کا بھی بل لیا جاتا ہے ! کچھ کچھ ایسا ہی حال اب مویشی منڈی کا بھی ہو چلا ہے۔ وہ زمانہ بس آیا چاہتا ہے کہ جب مویشی منڈی میں عمومی طور پر اور اِس کے وی آئی پی بلاک میں خصوصی طور پر جانوروں کے دام پوچھنے کے بھی چارجز لئے جانے لگیں گے ! ہو سکتا ہے کہ یہ بورڈ بھی آویزاں کر دیئے جائیں کہ نازک دِل والے حضرات سوچ سمجھ کر قیمت پوچھیں تاکہ بعد میں دِل کو جھٹکا اور جیب کو بُرا نہ لگے ! آج کل اِنسانوں کی بے توقیری کا موسم چل رہا ہے۔ ایسے میں قربانی کے جانوروں کی قیمت سُن کر جو کچھ دِل پر گزرتی ہے اس کا حال غالب نے یوں بیان کیا ہے

اِک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے!

پیارے پاکستان میں اگر پنشن کے لیے دھکے کھاتے کھاتے مر جایئے یعنی موت کی چُھری اپنی زندگی کے گلے پر پھروا لیجیے تو دو چار لاکھ کی امداد کا اعلان ہو جاتا ہے اور وہ بھی متعلقہ دفاتر کے دس بیس چکر کاٹنے کے بعد ملتی ہے۔ ایسے میں قربانی کے جانور اپنی قیمت کے بُلند قامت پر رشک کیوں نہ کریں کہ گلے پر چُھری پھرنے سے پہلے ہی دس دس پندرہ پندرہ لاکھ کے ہیں!

لولی وُڈ کی رانی دو من کی ہوئی تو کھیتوں اور باغوں میں "جمپنگ ڈانس" دُشوار ہوا اور وہ فِلموں کے لیے ناکارہ قرار پائی مگر مویشی منڈی میں 22 من کی "رانی" ناز و ادا کے مظاہرے کرتی جلوے بکھیر رہی ہے اور اِس کی مارکیٹ ویلیو 14 لاکھ سے کم نہیں!

اِنسانوں میں کالا رنگ پسند کرنے والے کم ہیں مگر اپنے ہم نَسلوں کا کالا رنگ پسند نہ کرنے والے اِنسان جب مویشی منڈی میں 15 من کی "بلیک کوئین" یا "بلیک بیوٹی" کو دیکھتے ہیں تو 12 لاکھ دینے کے لیے بھی اُتاؤلے ہوئے جاتے ہیں!

بولی وُڈ کی کترینہ کو ہر وقت اپنے فِگر کی فکر لاحق رہتی ہے۔ اور مویشی

منڈی کی "کترینہ" کا حال یہ ہے کہ جوں جوں وزن بڑھتا اور فِگر پھیلتا جاتا ہے، قیمت کا فِگر بھی بڑھتا جاتا ہے! چار ٹانگوں والی کترینہ کی قیمت سُن کر پرستاروں کو "کیف" !سا محسوس ہونے لگتا ہے

جس کی سمجھ میں کوئی بات بالکل یا آسانی سے نہ آئے اُسے ہم بھولا کہتے ہیں۔ اِنسانوں میں تو بھولا کسی کو بھی کہا جاسکتا ہے مگر مویشی منڈی میں "بھولا" کہلانے کے لیے لازم ہے کہ وزن 15 من ہو! اور اِس 15 من کے "بھولپن" پر نثار ہونے کو جی !چاہتا ہے کہ لوگ 12 لاکھ روپے وارنے پر بھی راضی دِکھائی دیتے ہیں

موٹاپے کے ہاتھوں پریشان جن لوگوں کو عرفِ عام میں ببلو کہہ کر چھیڑا جاتا ہے وہ جب مویشی منڈی کا چکر لگاتے ہیں تب اُنہیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جواز کے بغیر !تاریک راہوں میں مارے گئے ....

!کیونکہ اُن کی عُرفیت تو 12 لاکھ میں فروخت ہو رہی ہے

آج اگر مہیوال زندہ ہوتا تو مویشی منڈی میں 16 من کی "سوہنی" کے درشن کرکے

پہلے گنگا کنارے والے چھورے کی طرح نِہال اور پھر بے ہوش ہو جاتا! اور جب ہوش میں آنے پر معلوم ہوتا کہ اِس نازک سی، شرمیلی سی "سوہنی" کے 12 لاکھ لگ چکے ہیں تو اپنی "بے قیمتی" کا سوچ کر شرمندگی کے گھڑے پر سوار ہو کر پھر بے ہوشی کے دریا میں کود پڑتا!

زہے نصیب! ہم جمہوری دور میں جی رہے ہیں۔ اب بادشاہ خال خال رہ گئے ہیں۔ آج کے بادشاہ حکمرانی سے زیادہ نمائش کی چیز ہیں! کبھی کبھی کتابوں میں اُن کے قصّے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ مویشی منڈی میں جہاں اِتنے عجوبے ہیں وہاں ایک "بادشاہ" بھی سہی۔ بادشاہ" کے ایک خدمت گار نے بتایا کہ وہ نرم مزاج کا ہے اور کبھی مُشتعل نہیں ہوتا۔" جمہوری دور میں جب جدّی پُشتی بادشاہوں کی دال نہیں گل رہی تو پھر مویشی منڈی کا بادشاہ جوش میں آئے تو کس کے لیے اور مُشتعل ہو تو کیوں؟ اب 20 من کا بھاری بھرکم "بادشاہ" کس برتے پر اُچھلے گا اور بالخصوص اِس صورت میں کہ وزن میں 16 لاکھ کی قیمت بھی جُڑ گئی ہو!

مویشی منڈی میں 20 من کا "کالی چرن" بھی ہے جس کے 13 لاکھ طلب کئے جا رہے ہیں۔ موصوف کا مزاج نئے نویلے دولھوں جیسا ہے۔ کھانا دینے میں ذرا سی دیر ہو جائے تو ٹُھنک جاتے ہیں اور کھانے کو ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہیں

کرتے ! جس گردن پر چُھرا پھیرنا ہے اُسی گردن کو سہلا کر اُنہیں منانا پڑتا ہے !
ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی طبقاتی کشمکش اب مویشیوں اور بالخصوص قربانی کے جانوروں میں بھی سرایت کر گئی ہے۔ منڈی میں کمزور اور مریل جانور سیلاب زدگان کی طرح کھلے میدان میں پڑے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ دوسری طرف وی آئی پی بلاک کے شامیانوں میں براجمان جانوروں کی بہترین خوراک یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ کئی افراد کو اِن کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔ یہ طبقاتی ناہمواری کہیں ہماری طرح قربانی کے جانوروں کو بھی شدید ذہنی دباؤ سے دوچار نہ کر دے ! ہم نے کبھی نفسیاتی اُلجھنوں سے بچنے کا بھرپور اہتمام نہیں کیا مگر قربانی کے جانوروں کو طبقاتی ناہمواری اور ذہنی اُلجھنوں سے محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے۔ نقص والے اِنسان تو مارکیٹ میں کسی نہ کسی چل جاتے ہیں بلکہ زیادہ ترقی پاتے ہیں !، مگر قربانی کے بازار میں نقص والے جانور کا سِکّہ نہیں چل پاتا ثابت ہوا کہ قربانی کے جانوروں پر اِنسانی جنگل کا قانون نافذ نہیں ہوتا !

مویشی نامہ - 4

پاکستانی بھی بہت عجیب قوم ہیں۔ جو کچھ ہم کماتے ہیں اُس کا نِصف سے زیادہ کھانے پینے پر اُڑا دیتے ہیں۔ اور چونکہ آمدنی زیادہ ہے نہیں اِس لیے اِتنا کچھ بچتا ہی نہیں کہ ہم سوچیں کہ اِس کا کیا کریں!

ابھی کل کی بات ہے۔ ہم صدر سے گزرے تو سوچا لگے ہاتھوں کچھ خریداری ہی کرلیں۔ قریبی ذرائع جانتے ہیں کہ ہم کھانے پینے کی اشیاء خریدنے ہی کو خریداری میں شُمار کرتے ہیں! اِس اعتبار سے صدر بہت ظالم علاقہ ہے کیونکہ ہم وہاں سے روز گزرتے ہیں اور روز ہی رُکنا پڑتا ہے! ڈیری پروڈکٹس کی ایک دُکان پر رُک کر ہم نے اصلی گھی کے دام پوچھے۔ پہلے تو دُکاندار نے ہمیں سَر سے پیر تک گھور کر دیکھا جیسے ہم صدر کے بجائے مویشی منڈی میں کھڑے ہوں! پھر دُکان سے ایک ملازم باہر آیا اور گھوم پھر کر ہمارے وجود کا جائزہ لیا۔ ہمیں غصہ بھی بہت آیا اور حیرت بھی ہوئی۔ غصہ اِس بات پر کہ وہ پتہ نہیں ہمیں کیا سمجھ رہے تھے۔ اور حیرت اِس بات پر کہ کوئی ہمیں اِس قدر انہماک سے کبھی کبھار ہی دیکھتا ہے! کالج کے زمانے میں تو حسرت ہی رہ گئی کہ کوئی ہمارا جائزہ اور زائچہ لے۔ خیر، جو زمانہ گزر ہی چکا ہے اب اُسے یاد کرکے

جی کو جلانا کیا! ہم نے دُکاندار سے پوچھا بھائی اِس قدر گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا کوئی انوکھی چیز مانگ لی ہے؟ یا ہم انوکھے ہو گئے ہیں؟

دُکاندار نے ہنستے ہوئے کہا "آج کل دیسی گھی کھانے کا موسم اِنسانوں کے لیے نہیں۔"

ہم نے حیرت سے پوچھا تو پھر کس کے لیے ہے؟

دُکاندار نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا "جناب! آج کل دیسی گھی پر صرف قربانی کے جانوروں کا حق ہے۔ ہمارا 90 فیصد اسٹاک مویشی منڈی کے وی آئی پی بلاک والے لے گئے ہیں۔ اب دیسی گھی وہ کھا سکتا ہے جس کا نام شہنشاہ، بادشاہ، بھولا، کالو، ببلو، طوفان، بادل، دبنگ، چلبل پانڈے وغیرہ ہو اور قیمت لاکھوں میں ہو۔"

یہ وضاحتی بیان سُن کر ہماری تو سِٹّی گم ہو گئی۔ اچھا ہوا کہ ہم نے اپنے علاقے میں کہیں دیسی گھی خریدنے کی کوشش نہیں کی ورنہ جان پہچان والے ہمیں پتہ نہیں کس فارم کا سمجھتے!

میڈیا والوں میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ بال کی کھال نکالنے کے معاملے میں یہ وکیلوں سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہیں۔ وکلاء قانون سے چاہے جتنی کھلواڑ کریں، قانون ہی کی آڑ لیتے ہیں۔ میڈیا والے اپنے قوانین خود وضع کرلیتے ہیں! میڈیا والوں کو اِس بات کی زیادہ فکر اور پروا نہیں کہ اِنسان کیا کھا رہے ہیں، سیلاب زدگان بے چارے کس طور پیٹ کی آگ بجھا رہے ہیں۔ اگر تجسس ہے تو بس اِس بات کا کہ قربانی کے جانوروں کی اوجھڑی میں کیا انڈیلا جارہا ہے! جانور سبز چارا، سُوکھی گھاس، چنے، دالیں اور چوکر ہی تو کھاتے ہیں۔ یہ کوئی ایسا معاملہ تو ہے نہیں کہ تحقیق اور تفتیش کی جائے۔ مگر جب میڈیا کے طفیل ہمیں قربانی کے جانوروں کی خوراک کا علم ہوا تو ہم نے دِل اور سَر دونوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اور کر بھی کیا سکتے تھے؟

جس طرح سینیٹ یا قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے بعد باہر آنے والے سیاست دانوں کو میڈیا والے پارلیمنٹ ہاؤس کے کونے میں بنے چھجے کے نیچے گھیر لیتے ہیں اُسی طرح مویشی منڈی میں بھی میڈیا والے ہر تگڑے مویشی پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ کھا رہا ہو تو فوٹیج بنائی جاتی ہے، جگالی کر رہا ہو تو فوٹیج بنائی جاتی ہے۔ اِسی طور اگر مویشیوں کی مالش کی جارہی ہو تو میڈیا والے فوراً متوجہ ہوتے ہیں! جب صورت حال یہ ہو تو ہر بیل سیلیبریٹی کا درجہ کیوں نہ پائے!

جب ہم نے سُہراب گوٹھ کی منڈی میں وی آئی پی بلاک کے مویشی دیکھے تو یقین آگیا کہ طبقاتی کشمکش صرف اِنسانوں کی پیدا کردہ نہیں۔ مویشی منڈی میں تیسری دنیا کے عوام۔۔۔ معاف کیجیے گا، جانور نارمل چارا چر رہے تھے۔ پیروں میں کنگن، نہ گلے میں ہار اور نہ ہی سینگوں کی سجاوٹ کا اہتمام۔ اُنہیں پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ دوسری طرف وی آئی پی بلاک کے شامیانے میں بندھے تگڑے اور نخریلے بیل اور بچھیائیں بہترین مال اُڑا رہی تھیں۔ اُن کی خدمت پر کئی افراد مامور دکھائی دیئے۔ یہ لوگ مویشیوں کو خوراک دیتے ہیں، اُنہیں نہلاتے اور چہل قدمی کراتے ہیں۔ ایسی خدمت تو اب لوگ اپنے ماں باپ کی بھی کم کم کرتے ہیں! ماں باپ پیر دبانے کے لیے بُلائیں تو جان ! جاتی ہے اور آسٹریلین نسل کے پہاڑ جیسے بیل کی مالش کرنے میں موت نہیں آتی کل تک.بزرگ ہم سے کہا کرتے تھے میاں! ذہن کو تیز کرنا ہے تو بادام کھایا کرو۔ کِسی کا مشورہ یہ ہوتا تھا کہ ہمیں انجیر کھانے چاہئیں۔ کوئی دودھ پینے پر زور دیتا تھا۔ لیجیے، اب ہم اِن تمام چیزوں سے گئے۔ قربانی کے جانور کچھ چھوڑیں گے تو ہم کھائیں گے ،پئیں گے نا! ڈرائی فروٹ کے نرخ ویسے ہی اِس قدر تھے کہ سُن کر خون خُشک ہو جایا کرتا ہے۔ دیسی گھی میں اب اُتنی جان نہیں جتنی اُس کے نرخ میں ہے! دیسی گھی کی خوشبو ہمیں ویسے بھی پسند

نہیں تھی۔ اور جب یہ سُنا ہے کہ دیسی گھی قربانی کے جانوروں کو کِھلایا جارہا ہے، ہمیں اِس گھی سے الرجی سی ہو گئی ہے۔ یہ نہ سمجھیے گا کہ انگور کھٹے ہیں!

اخبارات میں شائع ہونے والے مویشی منڈی کے آنکھوں دیکھے احوال نے ہمارے ذہن کے چودہ طبق روشن کر دیئے ہیں۔ اب تک تو ہم یہ سمجھتے آئے تھے کہ دیسی گھی، مکھن، بادام، پستے وغیرہ صرف پہلوان کھایا کرتے ہیں۔ پہلوانوں کی قابل رشک صحت دیکھ کر ہم بھی کبھی کبھی یہ تمام اشیاء چکھنے کا سوچا کرتے کہ چلو، اِس بہانے شہیدوں میں نام لکھوالیں تاکہ آنے والی نسلیں یاد رکھیں کہ اُن کے خاندان میں بھی کِسی نے دیسی گھی، مکھن، بادام، پستے وغیرہ کھائے تھے! مگر صاحب! قربانی کے مویشی ہم سے یہ ممکنہ اعزاز بھی لے اُڑے! اب ہم یہ تمام مُقَوّی چیزیں اِس خوف سے نہیں کھا سکتے کہ کہیں ہمیں بھی قربانی کی غرض سے پالا ہوا نہ سمجھ لیا جائے! بہت سے معاملات میں قربانی کے بکرے تو ہم پہلے ہی سے ہیں مگر قربانی کا بیل سمجھے جانے سے رہی سہی آبرو بھی ذبح ہو جائے گی!

ویسے دیسی گھی، بادام پستے اور مکھن وغیرہ پہلوانوں کے ساتھ ساتھ قربانی کے جانور بھی کھائیں تو صورت حال میں کچھ خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ قربانی کے

! جانور بھی اب ذبیحے سے زیادہ دنگل ہی کے لیے استعمال ہو رہے ہیں

مویشی نامہ-5

شکر خورے کو کہیں نہ کہیں سے شکر مل ہی جاتی ہے۔ ٹی وی چینلز کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

یہ بات چینل والوں نے مضبوطی سے، بلکہ اپنے نوکیلے دانتوں سے پکڑ لی ہے! جس طرح کسی گھر میں بچے کی ولادت کا خواجہ سراؤں کو کسی نہ کسی طور پتہ چل ہی جاتا ہے اور وہ آ "ٹھرکتے" ہیں، بالکل اُسی طرح کہیں بھی کچھ ہو جائے تو چینلز والوں کو "خفیہ نیٹ ورک" کے ذریعے معلوم ہو ہی جاتا ہے اور وہ کیمروں اور ڈی ایس این جیز کے ساتھ بھاگم بھاگ "اسپاٹ" پر پہنچ جاتے ہیں!

آپ کو یاد ہی ہوگا کہ گزشتہ سال لاہور کے چڑیا گھر سے ایک بندر بھاگ نکلا تھا۔ عوام میں آ کر جب اُس نے جنگل سے بھی بھیانک ماحول دیکھا تو جان اور اخلاق بچانے کے لیے ایک بُلند درخت کی بُلند ترین شاخ پر جا بیٹھا۔ چار پانچ چینلز والوں نے گاڑیاں بھیجیں اور کئی گھنٹوں تک کوریج کرکے بندر کو سیلیبریٹی میں تبدیل کر دیا!

ایک بار سکھر کے نزدیک دریائے سندھ سے ایک مگر مچھ باہر کیا نکل آیا، بے چارے کی شامت ہی آ گئی۔ چند افراد نے مل کر اُس مگر مچھ پر قابو پالیا اور واپس دریا میں پھینکنے ہی والے تھے کہ کسی نے ٹی وی والوں کو اطلاع دے دی۔ اب جناب مگر مچھ کو جب تک سیلیبریٹی میں تبدیل نہ کردیا جاتا اُسے واپس دریا میں کیونکر ڈالا جاسکتا تھا؟ دیکھتے ہی دیکھتے دریا کنارے کیمروں کی قطار لگ گئی۔ مگر مچھ بے چارا حیران اور پریشان کہ کرے تو کیا کرے اور جائے تو کہاں جائے!

گزشتہ دنوں ہم آفس سے گھر جارہے تھے کہ سڑک پر ایک میلہ سا لگا دیکھا۔ جسے دیکھیے وہ متجسس دکھائی دے رہا تھا۔ بھیڑ تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ لوگ کہیں جمع ہوں اور ہم بس یوں ہی آگے بڑھ جائیں، یہ بات شائستگی اور صحافت کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتی۔ ہم بھی رُک گئے۔ سب نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم سمجھے شاید سرکس والوں کی سمجھ میں بات آ گئی ہے اور اب اُنھوں نے لکڑی کے تختے جوڑ کر زمین پر موت کا کنواں بنانے کے بجائے زمین کھود کر اصلی تے وڈا موت کا کنواں بنایا ہے! بھیڑ کو چیرتے ہوئے ہم جب "اسپاٹ" پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ خشک برساتی نالے میں گائے گر گئی ہے!

اشرف المخلوقات میں سے کوئی ہیرو اگر ہیروئن کے نشے میں چُور ہو کر نالے میں گرے تو لوگ "اہل زبان" ہونے کا مُظاہرہ کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں! اور ایک گائے کے نالے میں گرنے کو ایونٹ میں تبدیل کیا جارہا ہے! اِنسانوں کی یہ جانور پرستی دیکھ کر ہمارے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ گائے قُربانی کے لیے خریدی گئی تھی، اُس بے زبان کو تو ہم کیا کہتے۔ لوگوں کی عقل پر لعنت بھیجی۔ پھر اپنی حماقت کا بھی ماتم کیا کہ ٹکٹ کے بغیر یہ میلہ دیکھنے رُکے ہی کیوں! جی چاہا کہ لاحول پڑھ کر جائے وقوع سے غائب ہو جائیں مگر ایسا کرنے سے اجتناب برتنا پڑا کیونکہ ٹی وی چینلز کی گاڑیاں وہاں پہنچ چکی تھیں! چند ہی لمحات میں ہمیں معلوم ہوگیا کہ ہماری طرح اور بھی کئی شرفاء جائے وقوع سے جانا چاہتے تھے مگر چینلز والوں کی آمد کا سُن کر رُک گئے تھے!

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا کے مصداق گائے کے نالے میں گرنے سے مفت میں کمپنی کی مشہوری ہو گئی۔ یعنی علاقے کے بھاگ جاگ اٹھے۔ چینلز والوں نے گاڑیاں بھیج دیں۔ ناظرین گائے کے ساتھ ساتھ نالے اور علاقے کی حالت سے بھی واقف ہوگئے! کچھ ہی دیر میں یہ ہوا کہ چینلز والے لوگوں سے گائے کے بارے میں رائے لے رہے تھے۔ چینلز والوں کی مہربانی ہے کہ گائے کو بخش دیا ورنہ اُس سے بھی تاثرات لیے جا سکتے تھے!

ایک زمانہ تھا کہ جب کوئی لڑکی گھر سے بھاگ جاتی تھی تو محلے، بلکہ علاقے والے ہفتوں اِس ایونٹ کو "ڈِسکس" کرتے رہتے تھے اور چہ مگوئیوں کا بازار گرم رہتا تھا۔ یہ گویا غیبت خور خواتین کے لیے شکر خورے کو شکر ملنے والا معاملہ ہی تھا! اب گھر سے لڑکیوں کے بھاگنے کو لوگوں نے توجہ کے قابل سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ ہاں، قربانی کا جانور رَسّی چُھڑا یا تڑا کر بھاگ نکلے تو علاقے میں کہرام مچ جاتا ہے! جانور جتنا مہنگا ہو، کہرام اُسی قدر زیادہ مچتا ہے! جس طرح قُربانی کے جانور کو منڈی سے گھر تک لانا ایک باضابطہ رَسم کی شکل اختیار کرگیا ہے بالکل اُسی طرح بھاگے ہوئے جانور کو پکڑ کر گھر واپس لانا بھی اب ایونٹ سے کم نہیں! ٹارگٹ کِلرز کی گرفتاری کے لیے ٹیمیں تشکیل دینا تاخیر کا شِکار ہوسکتا ہے، گائے یا بیل کے معاملے میں ایسی تاخیر کی گنجائش نہیں! جس طرح قُربانی کے جانور کی خریداری میں مدد دینے والے جہاں دیدہ افراد کی ایک الگ ہی شناخت ہے، بالکل اُسی طرح قُربانی کے بھاگے ہوئے جانور کو پکڑ کر لانے والے جوانوں کی بھی نرالی شان ہے! بھاگے ہوئے جانور کو پکڑ کر لانے کے معاملے میں اِن کا جوش و خروش قابل دید ہوتا ہے۔ کل کو اگر آپ کی گلی میں چینلز کی گاڑیاں کھڑی ہوں تو سمجھ لیجیے گا کہ کسی بھاگی ہوئی گائے کو کان پکڑ کر واپس لانے کے عمل کو سیلیبریٹ کیا جا رہا ہے!

آج کل تو یہ کام فی سبیل اللہ کیا جا رہا ہے، کل کو ہو سکتا ہے کہ اِس کام کے لیے بھی باضابطہ ادارے معرض وجود میں آ جائیں۔ پھر یہ ہوگا کہ قُربانی کی گائے نالے میں گرے تو لوگ ٹی وی چینلز کے ساتھ ساتھ کیٹل مینیجمنٹ سروس والوں کو بھی فون کریں گے ! کیٹل مینیجمنٹ سروس والوں کے ساتھ ماہر نفسیات بھی ہو سکتا ہے جو یہ بتائے کہ جانور کو نفسیاتی پیچیدگی سے بچانے کے لیے نالے سے کس طرح نِکالا جائے ! یہی ماہرین ہمیں یہ بھی بتائیں کہ قُربانی کے جانور کو کس طور گھمائیں، پھرائیں کہ اُن کے لیے رَسّی تُڑا کر بھاگنا ممکن نہ رہے۔ مغرب میں کنسلٹنٹس یعنی ماہروں اور مشیروں نے ہر معاملے کو مشاورت کے موقع میں تبدیل کر دیا ہے۔ مغرب کی تقلید میں ہم بھی ایسا کر گزریں تو کچھ حیرت کی بات نہ ہوگی !

منظور وسان کا "نامناسب" مشورہ

نفس کی تحلیل اور تجزیے کو عمل کی دُنیا میں ثابت کرنے والے سگمنڈ فرائڈ کا انتقال ہو چکا ہے۔
نفسی پیچیدگیوں کی گتھیاں سُلجھانے میں عالمگیر شہرت کے حامل کارل یُنگ بھی اب اِس دُنیا میں نہیں رہے۔
نفسی مخمصوں اور پیچیدگیوں پر زندگی بھر تحقیق کرنے والے ولیم جیمز تو خیر بہت پہلے ہی دُنیا کو خیرباد کہہ کر چل دیئے تھے۔
سگمنڈ فرائڈ، کارل یُنگ اور ولیم جیمز کا شُمار نفسیات کے اولین ماہرین میں ہوتا ہے۔
اب سوال یہ ہے کہ ہم نفسیات کے ماہرین اور ذہن کی گتھیاں سلجھانے والے عامل اور کامل فقیر لائیں تو کہاں سے لائیں؟ آپ سوچیں گے کہ نفسیات کے ماہرین اور عاملین کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟ بات یہ ہے جناب کہ سندھ کے وزیر داخلہ منظور وسان کو اچانک یہ بات کسی نہ کسی طور القاء ہوئی ہے کہ اُن کے پیشرو یعنی سندھ کے سابق وزیر داخلہ ڈاکٹر ذوالفقار مرزا کو فوری نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے!

ابن صفی بھی کب کے مرحوم ہوئے ورنہ ہم اُن سے پوچھ لیتے کہ ایک سابق وزیر اور صدر کے ذاتی دوست کا یوں ہمارے درمیان، متحرک اور لسانی طور پر بے لگام ہونا کس ملک کی سازش ہو سکتی ہے!

فٹ پاتھ پر مُستقبل کی دُکان سجانے والے نجومیوں اور اُن کے طوطوں سے ہم کچھ پوچھ نہیں سکتے کیونکہ ڈاکٹر ذوالفقار مرزا نجومیوں اور طوطوں سے تو بہر حال آگے کی چیز ہیں!

منظور وسان فرماتے ہیں کہ ذوالفقار مرزا جو کچھ کہتے پھر رہے ہیں وہ اِس امر کا غَمّاز ہے کہ اُن کی ذہنی حالت درست نہیں۔ یعنی فوری علاج کا کیس ہے۔ ہمارے خیال میں یہ ذوالفقار مرزا سے سراسر زیادتی ہے۔ ذاتی مخاصمت میں منظور وسان صاحب شاید بھول گئے ہیں کہ ہمارے ہاں تو ہر دوسرا سیاست دان فوری علاج کا کیس ہے! اگر بولنے کے نام پر چیخنے، دہاڑنے اور بھونکنے کو ہم خرابی سمجھ لیں تو یقین کیجیے کہ کوئی بھی سیاست دان معقولیت کی کسوٹی پر کھرا اُترتا نہیں ملے گا! اب کوئی بتائے کہ اگر منظور وسان صاحب کے فرمان کے مطابق سیاست دانوں کا علاج کرانا پڑ گیا تو ہم اِتنے ہسپتال اور اِتنے معالجین کہاں سے لائیں گے؟

پاکستانی سیاست دانوں کی اکثریت کے لیے فوری ذہنی علاج لازم ہے۔ معاملہ صرف نفسیاتی علاج کا نہیں۔ چند ایک کے مزاج کا ہاضمہ اِس قدر خراب ہے کہ اُن کے بیانات میں باتیں کم اور کھٹّی ڈکاریں زیادہ ہوتی ہیں! ایک نفسیاتی عارضہ تو خیر تقریباً ہر سیاست دان کو لاحق ہے۔ جسے بھی سیاست کے میدان میں قدم رکھنے کا موقع ملتا ہے وہ یہ سوچنا شروع کردیتا ہے "میرے بعد اِس ملک کا کیا ہوگا!" اور ہم اِس فکر میں گھلتے رہتے ہیں کہ اگر وہ زندہ اور سرگرم رہے تو ملک کا کیا بنے گا! کوئی اقتدار کی میز پر دھرے ہوئے اختیارات اور قومی وسائل کھا کھا کر اِتنا فربہ ہوگیا ہے کہ چالیس من کا آسٹریلوی بیل بھی دیکھے تو شرما جائے! کسی کا نام ہم اِس لیے نہیں لے رہے کہ کسی بھی طریق علاج سے مستفید ہونا فی الحال ہماری خواہش نہیں!

منظور وسان صاحب کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہیں میڈیا کی "ترقی" عزیز نہیں۔ یہ سارا رونق میلہ سوچے سمجھے بغیر بولنے، بلکہ چیخنے والوں کے دم سے ہے۔ جو بولنے کے نام پر بھونکتے ہیں اُنہی کی "دانش" سے مستفید ہونے کے لیے تو لوگ پرائم ٹائم میں ٹی وی سیٹ کے سامنے احترام سے زانو تہہ کرکے بیٹھتے ہیں! اور کبھی کبھی تو لوگ زانوئے تلمذ بھی تہہ کرلیتے ہیں تاکہ کچھ سیکھ کر اُٹھیں! منظور وسان صاحب سے میڈیا اور عوام کی دو دن کی خوشی بھی دیکھی نہیں جاتی۔ ڈاکٹر ذوالفقار مرزا کے دم قدم سے میڈیا کے چمن کی بہاروں

کو توسیع ملی ہے۔ جب اِس ملک میں سبھی اپنی خدمات کا دائرہ دو دو، تین تین سال کے لیے وسیع کرلیتے ہیں تو میڈیا کی بہاروں کو طول پکڑنے سے روکنا کہاں کا انصاف اور دانش مندی ہے؟

بُنیادی سوال یہ ہے کہ ذوالفقار مرزا کے ذہن کا علاج کرنے کا یارا کس میں ہے؟آج کے پاکستان میں ذہنی امراض کے ماہرین کو سب سے پہلے تو مریض کے سر میں ذہن کی موجودگی کا تعین کرنا پڑتا ہے! کھوپڑی کے اندر پائے جانے والے دماغ کو ذہن ثابت کرنا اِس قدر پیچیدہ مرحلہ ہے کہ بعض معالجین پہلے راؤنڈ ہی میں ہار مان لیتے ہیں! اور پھر سیاست دانوں کا ذہن!! چلیے، مان لیتے ہیں کہ کسی نہ کسی مشین کی مدد سے یہ طے ہو بھی گیا کہ ذوالفقار مرزا ذہن کے حامل ہیں تو ہم اِس پائے کا ماہر نفسیات لائیں گے کہاں سے جو اُن کا علاج کرسکے؟ فرض کیجیے نفسیات کی دُنیا سے کوئی نابغہ ہمارے ہاتھ لگ بھی گیا تو وہ علاج کا کون سا طریقہ اختیار کرے گا؟ دو چار ماہ تو شاید وہ یہی سوچنے میں ضائع کردے کہ مرزا صاحب کو کس طریقے سے قابو کیا جائے۔ اور اگر ہم ایک لمحے کو یہ بھی فرض کرلیں کہ وہ نابغہ ذوالفقار مرزا کے علاج میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اُس غریب کا علاج کون کرے گا!

جو آگ لگائی تھی غم وہ آگ بجھائی اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اُس آگ کو ٹھنڈا کون کرے!

منظور وسان صاحب کے مشورے پر عمل کیا گیا تو تھوڑی بہت نہیں بلکہ اچھی خاصی خرابی پھیلے گی۔ سیاست دانوں کے نفسیاتی علاج سے عوام کا نفسیاتی علاج بھی لازم ہو جائے گا۔ سر دست معاملہ یہ ہے کہ لوگ پرائم ٹائم میں گھر والوں سے اُلجھنے کے بجائے ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر سیاست دانوں کے دنگل دیکھتے ہیں۔ اگر سیاست دانوں کے ذہن درست کر دیئے گئے (جو یقیناً معجزہ ہوگا!) تو گھر گھر دنگل ہوگا۔ جب ٹی وی کے سیاسی دنگل نہیں تھے تب روزانہ گھر گھر ہنگامہ آرائی ہوا کرتی تھی۔ سیاست دانوں کے دنگل میں بھرپور دلچسپی لینے والوں کو جب کوئی بھی غضب تماشا دیکھنے کو نہیں ملے گا تو وہ آپس میں اُلجھیں گے اور لڑا کریں گے۔ فی الحال طویلے کی بلا بندر کے سر ہے۔ جب طویلے کا اُصول تبدیل ہوگا تو بندر کی جان چھوٹے گی اور طویلے کی شامت آ جائے گی۔ طویلے کو شامتِ اعمال سے بچانے کے لیے لازم ہے کہ منظور وسان کے مشورے پر عمل نہ کیا جائے۔ اگر کہیں ذوالفقار مرزا کا علاج کامیاب ہوگیا تو عوام سیاست دانوں کو گردن سے پکڑ کر نفسیاتی ہسپتالوں میں لاکر پھینکنے لگیں گے کہ لو، جب ذوالفقار مرزا کو راہِ راست پر لایا جاسکتا ہے اِن سیاست دانوں نے کیا "سنوارا" ہے کہ اِن کے دماغ درست نہ کیے جائیں؟

"فیکٹرز" کی سیاست

وطن عزیز میں جو کچھ سیاست کے نام پر ہو رہا ہے وہ ریاضی کے اُصولوں کے مطابق ہے۔ جس طرح اعلیٰ ریاضی میں "فیکٹرز" کے ذریعے تجزیہ کرنے کا فن سکھایا جاتا ہے بالکل اُسی طرح ہماری سیاست بھی اب "فیکٹرز" کے گڑھے میں گر گئی ہے۔ اہم مسائل سے توجہ ہٹانے کے لیے میڈیا کو خاصے منظم انداز سے استعمال کیا جا رہا ہے۔

جب سیکورٹی کی صورت حال بہتر ہوتی ہے اور لوگ بنیادی مسائل پر حکومت سے جواب طلب کرنے لگتے ہیں تب اچانک بہت کچھ ہونے لگتا ہے یعنی توجہ بھرپور طریقے سے ہٹائی جاتی ہے۔ میڈیا والے شرپسندوں کی سرگرمیوں کو کور کرنے میں جُت جاتے ہیں۔ یہی حال سیاست کا ہے۔ جب بھی کوئی پارٹی مضبوط پوزیشن میں محسوس ہوتی ہے، مقتدر قوتیں اُس کی قوت کا بت پاش پاش کرنے کے لیے سرگرم ہو جاتی ہیں۔

1980 کے عشرے کے وسط میں جنرل ضیاء الحق نے سندھ میں پیپلز پارٹی کا زور توڑنے کے لیے ایم کیو ایم کو پروان چڑھایا۔ سندھ کے شہری علاقوں کے ہوش مند افراد بھی اِس عمل کو مستحسن قرار دینے سے گریز ہی کرتے آئے ہیں۔ کسی بھی پارٹی کا فطری طور پر پروان چڑھنا خود اُس کے اور مُلک کے لیے سود مند ہو سکتا ہے، غیر فطری طریقے سے کامیابی کا حصول بے سود ہی نکلتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب مسلم لیگ کو توڑنے کے لیے اعلیٰ سطح پر کوششیں کی گئیں۔ اِن کوششوں کے نتیجے میں مسلم لیگ کے کئی off-shoots معرضِ وجود میں آئے جو آج بھی ہمارے سامنے ہیں۔

پرویز مشرف کے دور میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کو کمزور کرنے اور کمزور رکھنے کے لیے مسلم لیگ (ق) بنائی گئی۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) دونوں کو مزید کمزور کرنے کے لیے اب سیاسی مارکیٹ میں "عمران فیکٹر" کو خاصے شاندار انداز سے لانچ کیا گیا ہے۔ شاہ محمود قریشی نے پیپلز پارٹی اور قومی اسمبلی چھوڑ دی ہے اور اب وہ تحریک انصاف میں شمولیت کے اعلان سے بہت قریب ہیں۔ انٹیلی جنس بیورو کے سابق سربراہ مسعود شریف اور چوہدری یعقوب بھی تحریک انصاف کی گڈی میں سوار ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبال کے پوتے ولید اقبال بھی تحریک انصاف کو گلے لگانے میں پیچھے نہیں رہے۔ پنجاب کے سابق گورنر میاں محمد اظہر کی شمولیت کو بھی عمران خان نے اپنی پارٹی کے لیے نیک شگون قرار دیا ہے۔

جس پیپلز پارٹی کو ذوالفقار علی بھٹو نے بڑی شان سے پروان چڑھایا تھا اور جس کی نگہداشت میں بے نظیر بھٹو نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی اُس پیپلز

پارٹی کا حال تو یہ ہوگیا ہے کہ

پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!

صدر آصف علی زرداری نے وہی طریقہ اپنایا جو اٹلی میں سلویو برلسکونی نے اپنایا یعنی حلیفوں کو "کسی بھی قیمت" پر اپنا بنا کر رکھو۔ متحدہ سے لاکھ اختلافات سہی، بات کو بگڑنے نہیں دیا جاتا اور اگر بگڑ جائے تو کچھ ہی دیر میں دوبارہ بنانے پر پوری توجہ دی جاتی ہے۔ یہ منفرد حلیف پرستی کب اور کہاں جا کر رکے گی، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ حلیف پرستی کی وباء پورے سیاسی اور حکومتی ڈھانچے کو دیمک کی طرح چاٹ گئی ہے۔ سندھ میں متحدہ کو خوش رکھنے اور اس کے آگے سر تسلیم خم رکھنے میں پیپلز پارٹی کی رہی سہی عزتِ سادات بھی گئی! فائدے میں صرف متحدہ رہی۔

مفاہمت کی سیاست نے پیپلز پارٹی کے جہاز کو مشکلات سے اَٹے پانیوں میں پہنچا دیا ہے۔ جب جہاز ڈول رہا ہو تو کون اُس میں رُکنا گوارا کرتا ہے؟ اُستاد قمر جلالوی مرحوم نے کہا تھا

جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اُتارا کرتے ہیں

پیپلز پارٹی وہ کشتی ہے جس سے ہر بوجھ خود اُترنے کے لیے بے تاب دکھائی دے

رہا ہے۔ اقتدار کی کرسی کے لیے تو لوگ باری کا انتظار کر لیتے ہیں، کسی پارٹی کے ڈوبتے جہاز سے کودنے کے معاملے میں باری واری کا انتظار نہیں کیا جاتا! اِس معاملے میں تو "لیڈیز فرسٹ" کا اُصول بھی ساقِط کر دیا جاتا ہے!

سندھ کے شہری علاقوں اور بالخصوص کراچی میں متحدہ کا سحر ختم یا کمزور کرنے کے لیے ڈاکٹر ذوالفقار مرزا کو خوب استعمال کیا گیا۔ قرآن سر پر رکھ کر الزامات عائد کرنے کی دوڑ میں وہ اِس قدر آگے نکل گئے کہ واپسی مَحال ہو گئی۔ اُن کے بارے میں ابتداء ہی سے یہ گمان لوگوں کے ذہنوں میں تھا کہ وہ استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ایک حالیہ میں انٹرویو میں ذوالفقار مرزا نے اِس عزم کا اظہار کیا ہے کہ اب وہ کسی کے لیے استعمال نہیں ہوں گے! ذوالفقار مرزا ڈاکٹر ہیں مگر سوچے بغیر آگے بڑھنے کی دُھن میں اُنہوں نے اپنے اندر ایسے پیچیدہ امراض پیدا کر لیے ہیں کہ اب اُن کا علاج ممکن دکھائی نہیں دیتا۔

ذوالفقار فیکٹر، عمران فیکٹر، شاہ محمود فیکٹر .... ایسا لگتا ہے سیاسی فیکٹرز کی فیکٹری لگی ہوئی ہے۔ وقفے وقفے سے تازہ فیکٹرز نکلے چلے آ رہے ہیں۔ عام آدمی کے ذہن میں یہ تصور تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے کہ اِس وقت عمران خان مانیٹر ہیں اور سیاسی کلاس روم کے بچوں سے کہا جا رہا ہے کہ

مانیٹر کی چھتری تلے جمع ہو جائیں! دو بڑی جماعتوں کو دیوار سے لگانے کے لیے ایک نیا پلیٹ فارم تیار کیا جارہا ہے، تیسری قوت کو پیدا کیا جارہا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ وفاق میں کوئی بھی پارٹی تنہا یا ایک دو جماعتوں کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کی پوزیشن میں نہ رہے۔ قصہ مختصر یہ کہ پارلیمنٹ کے نام پر چُوں چُوں کا مُربّہ بنانے کی تیاری ہو رہی ہے۔

لاہور میں عمران خان کے جلسے کو بھرپور انداز سے کامیاب کرایا گیا اور یہ کامیابی کچھ اِس نوعیت کی تھی کہ خود عمران بھی حیران رہ گئے۔ اُن کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُن کے نام کا میلہ اِس شان سے سجے گا! مینار پاکستان کے سائے میں ہونے والا جلسہ بُلندی میں مینار کے آخری سرے کو چھوتا دکھائی دیا۔ اب واضح ہوتا جارہا ہے کہ اُوپر سے اشارے کئے جارہے ہیں اور اِن اشاروں کی بنیاد پر سیاسی ہیوی ویٹ تحریک انصاف کے پرچم تلے جمع ہو رہے ہیں۔

مسلم لیگ (ن) کا سیخ پا ہونا فطری امر ہے۔ اُس کے ووٹ بینک اور بارگیننگ پاور کو کمزور کرنے کے لیے ایک بار پھر بھونڈا طریقہ اختیار کیا جارہا ہے۔ بڑی مشکل سے مسلم لیگ (ق) کا ٹنٹا ختم ہوا تو اب تحریک انصاف کا رولا پا دیا گیا ہے! عام خیال یہ ہے کہ تحریک انصاف وسطی اور بالائی پنجاب کے شہری

علاقوں میں مسلم لیگ (ن) کے لیے وہی کردار ادا کرے گی جو سندھ میں پیپلز پارٹی کے لیے متحدہ نے ادا کیا تھا۔ سندھ میں پیپلز پارٹی اب متحدہ کو ملائے بغیر حکومت سازی کی پوزیشن میں نہیں رہی۔ پنجاب میں مسلم لیگ (ن) کا بھی یہی حشر نشر کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ سیاسی جماعتوں کے حصے بخرے کرکے اُنہیں کنٹرول کرنا فیصلہ کُن حلقوں کے لیے زیادہ سہولت کی بات ہے۔

مسلم لیگ (ن) کل تک صرف پیپلز پارٹی سے نِپٹ رہی تھی۔ اب خیر سے تحریک انصاف کے خلاف بھی محاذ کھل گیا ہے۔ دوسری طرف صدر زرداری بظاہر خوش ہیں کہ مسلم لیگ (ن) کو پیپلز پارٹی کے علاوہ بھی کوئی دکھائی دیا جس پر چاند ماری کی جاسکے!

پنجاب میں اپنی حکومت بچانے کے لیے مسلم لیگ (ن) نے ہر حال میں کسی نہ کسی بہانے، جمہوریت کے نام پر وفاق میں پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا۔ نتیجہ سب نے دیکھ لیا۔ کیا کوئی ایسی بات ہے جس پر حیرت ہو؟

مرزا تفصیل بیگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایسا حیرت انگیز بھی نہیں کہ ہم دانتوں تلے انگلیاں دابے بیٹھے رہیں۔ اُن کا استدلال ہے کہ

سیاست میں لوگوں کو اعمال کی سزا اِسی طور ملا کرتی ہے۔ جس کے پاس طاقت ہوتی ہے وہ اُس کا مظاہرہ کئے بغیر رہتا نہیں اور جب دوسروں کو موقع ملتا ہے تو وہ اُس کے خلاف طاقت کا مظاہرہ کرنے پر تُل جاتے ہیں! یہ میوزیکل چیئر جیسا کھیل ہے جو ہم چھ عشروں سے دیکھ اور بھگت رہے ہیں۔

سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں قوم کہاں کھڑی ہے؟ بے چاری قوم میں اب اتنا دَم خَم ہے کہاں کہ کھڑی رہ سکے۔ وہ تو کب کی ڈھیر ہوچکی ہے۔ سیاسی گِدھ چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ نظریات کے نام پر جینے والی اقوام کا دَم کسی نہ کسی چیز میں اٹکا ہی رہتا ہے۔ ہاں، یہ ظلم کی بات ہے کہ سیاسی گِدھ کبھی کِسی کے مرنے کا انتظار نہیں کرتے۔ وہ قوم کے "زندہ مُردوں" کو نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں!

حکومت سازی، نظم و نسق اور سیاست کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی بھی اعتبار سے قابل رشک نہیں۔ مرزا تفصیل بیگ کا شکوہ ہے کہ قوم مُردہ ہوچکی ہے۔ جب سب کچھ ہونے دیا جائے گا تو یہی ہوتا رہے گا۔ مضبوط حکومت کے قیام کی راہ میں کھڑی کی جانے والی دیواریں ہمارے دلوں میں بھی دیواریں کھڑی کر رہی ہیں۔ حالات کو ایسے مقام پر پہنچا دیا گیا ہے جہاں سے کئی راستے نکلتے ہیں۔ اور دکھ کی بات یہ ہے کہ کوئی بھی راستہ استحکام کی منزل تک نہیں جاتا۔ یہ

راستہ ہمیں خود نکالنا اور ہموار کرنا ہوگا۔

لکھے کوئی، بھگتے کوئی

پاکستان سے روزانہ ہزاروں یا لاکھوں خطوط امریکہ سمیت کئی ممالک میں جاتے ہوں گے مگر اسلام آباد سے ایک خط امریکہ کیا پہنچا، ہر طرف ایسا غلغلہ ہے جیسے قیامت برپا ہو گئی ہے! ہم حیران ہیں کہ کاغذ کا ایک پُرزہ کیونکر چلتاپُرزہ بن بیٹھا۔ خط کو آدھی مُلاقات سمجھا جاتا ہے، مگراِس ناہنجار میمو نے تو پوری مُلاقاتوں کا اہتمام کر ڈالا ہے! کئی ایک بے چارے تو اپنے منطقی انجام سے مُلاقات کی منزل تک پہنچ گئے ہیں! میڈیا اور سیاسی منچلے بھی کیا ستم ظریف ہیں، اِس خط سے حِظ اُٹھانے پر تُلے ہیں!

خطوط کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مختلف نوعیت کے خطوط ہر دور میں مُشکلات پیدا کرتے رہے ہیں۔ جب کبھی حکمرانوں کے ذہن کی اسکرین پر "سب اچھا ہے" کی پٹّی چل رہی ہوتی ہے، اچانک "بریک" آ جاتا ہے اور کوئی نہ کوئی خط رولا پا دیتا ہے!

اردو شاعری جسمانی (زیادہ) اور کاغذی (کم) خُطوط کے ذِکر سے بھری پڑی ہے۔

غالب نے کہا تھا

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
!کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چُھپائے نہ بنے
داغ دہلوی نے شِکوہ کیا تھا
تمہارے خط میں نیا اِک سلام کِس کا تھا؟
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کِس کا تھا؟

خط کا مَعاملہ ایسا ہے جیسے کِسی غبارے میں ہوا بھرنے کے بعد منہ بند کئے بغیر اُسے چھوڑ دیا جائے! اگر خط محبوب تک پہنچے تو مصیبت، نہ پہنچے تو مصیبت۔ کبھی کبھی قاصد کی راہ تکتے تکتے آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خط پانے کے بعد دِل یہ سوچ کر کُڑھتا رہتا ہے کہ قاصد راستے ہی میں "قیں" ہو جاتا تو کیا بُرا تھا! محبت کی خوشبو میں بسے بعض خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ رقیب کے ہَتّھے چڑھیں تو قیامت آ جائے، اور اگر مکتوب الیہ کے باپ کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ ہاتھ خط لکھنے والی گردن پر پہنچنے !میں ذرا دیر نہ لگائے

حکومت کی ناک کا بال بنے ہوئے بُہتوں کو بظاہر خط بنانے کی فُرصت نہیں تھی اِس لیے مُشیروں میں سے کسی نے شاہکار مشورہ دیا اور ایسا خط امریکہ بھجوایا جس نے اعلیٰ !ترین سطح پر بیٹھے ہوئے کئی بزرجمہروں کا خط تقریبا

! بنا ہی ڈالا ہے

کسی نے کیا خوب کہا ہے

خط کے پُرزے ہیں دستِ قاصد میں

! ایک کیا، سو جواب لایا ہے

مگر صاحب! یہ خط جواب تو کیا لاتا، لاجواب حرکتیں کرنے والی کئی شخصیات کو لاجواب ! کر گیا ہے اور ایک سالم حکومت کو پُرزے پُرزے کرنے پر تُلا ہوا ہے

حال ہی میں سُبک دوش ہونے والے امریکی مسلح افواج کے سربراہ ایڈمرل مائک مولن کو لکھا جانے والا ایک خط پاکستان کی سیاست کو "خط خط" کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ ایک ایڈمرل کو لکھا جانے والا خط سمندری طوفان کی سی کیفیت ہی پیدا کر سکتا ہے! اگر بَرّی ! فوج کے سربراہ کو لکھا گیا ہوتا تو شاید اب تک قبر (یا قبریں) کھود بھی چکا ہوتا

ایک خط نے ایسا ہنگامہ برپا کیا ہے کہ دُنیا حیران ہے۔ اِس خط میں ایسا کیا تھا کہ اِس قدر شور مچایا جا رہا ہے؟ کسی نے اپنی مجبوریاں ہی تو بیان کی تھیں، اپنی کُرسی بچانے کی اپنی سی کوشش ہی تو کی تھی۔ اِس میں کسی کو اِس

قدر سیخ پا کیوں ہونا چاہیے؟ کون ہے جو اپنے مفادات کے دفاع کے لیے بھرپور کوشش نہیں کرتا؟ اور ایسی کوشش کیوں نہیں کرنا چاہیے؟ واحد سُپر پاور سے استدعا ہی تو کی گئی تھی کہ "بھائی صاحب! ذرا فوج کو قابو کرو تاکہ ہم سُکون کی نیند سو سکیں"!

واحد سُپر پاور کی حاشیہ بردار ی کا فرض برسوں ادا کرنے کے صلے میں کسی کو امریکہ میں سفیر کا درجہ ملا تو حاسدین لنگوٹ کس کر میدان میں نکل آئے۔ یہی تو ہمارے ملک کا المیہ ہے، کوئی کسی اور کو کھاتا پیتا نہیں دیکھ سکتا۔ کسی غریب نے غیر سرکاری تنظیموں اور غور و فکر کے تالابوں میں غوطے لگا کر تھوڑی سی "عزت" کمائی تو لوگ اُس کی بیزتی" خراب کرنے پر کمر بستہ ہوگئے! یہی سوچ تو ہمیں عالمی برادری میں کوئی" ڈھنگ کا مقام حاصل کرنے کے قابل نہیں ہونے دیتی!

کردیا ہے۔ ویسے سچی بات ہے، ایوان in ایوان صدر کو ایک خط نے پھر خبروں میں کب نہ تھا؟ "جمہوریت" کو کسی نہ کسی طور "بچانے" کی ذمہ in صدر خبروں میں داری ایوان صدر کے ناتواں کاندھوں پر تین سال سے ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے خدا جانے کیا کیا جتن کئے جاتے رہے ہیں۔ عملیات کے ماہرین سے مشاورت بھی کی جاتی رہی ہے۔ سُنا ہے کبھی کبھی حکومت کو بچانے کے لیے کسی

کہنہ مشق بنگالی عامل بابا سے اُلو کا عمل بھی کرانا پڑتا ہے! ہمارے ہاں حکومت جس انداز سے چل رہی یا چلائی جارہی ہے اُسے دیکھتے ہوئے تو شاید کئی اُلوؤں کا جھٹکا کرنا پڑے گا! ضیائی جالندھری نے کیا خوب کہا ہے

!شِدّت کی محبت میں شِدّت ہی کے غم پہنچے

جو گدھا حالات اور واقعات کے دام میں پھنس جائے اُسے قربانی کا بکرا بنا دینا بھی اقتدار کے ایوانوں میں مستحسن سمجھا جاتا ہے مگر یہ کافی نہیں۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ سِتاروں کی چال دیکھ کر جو کچھ کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے ایوان صدر میں وہ سب کچھ پورے اہتمام سے کیا جاتا ہے۔ ذرائع تو یہ بھی بتاتے ہیں کہ جب کبھی کوئی بابا ایوان صدر کو خالی رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں تو اُس ایوان کی واحد رونق سمندر کے کنارے آ بستی ہے۔ جب اور کچھ نہ بن پائے تو بے چارے بکروں کی شامت آ جاتی ہے۔ مہینوں یہ بھی ہوا کہ روزانہ ایک بکرا ذبح کرکے ملک کی سب سے باوقعت جمہوری کرسی بچانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ اب شاید پھر اُسی عمل کو دُہرانے کی ضرورت آن پڑی ہے۔ دیسی گھاس پھوس اور چارے سے پیٹ کی آگ بجھانے والے بکروں کی قربانی شاید کم پڑ رہی تھی اِس لیے اب امریکہ میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا بکرا قربان کردیا گیا ہے۔

ایک خط کو آگے بڑھانے کی پاداش میں بے چارے حسین حقانی چوہے دان میں گردن

دے بیٹھے۔ معاملہ واشنگٹن سے اسلام آباد ہوتا ہوا اب راولپنڈی میں جا اٹکا ہے۔ جمہوریت کے صدر مقام سے فوج کے صدر مقام تک اچھا خاصا ملبہ دیکھا جاسکتا ہے۔ گھوم پھر کر صرف یہ سوچا گیا کہ واحد سُپر پاور کے قلب میں ایلچی بن بیٹھنے والے کی قربانی دے دی جائے۔ ٹھیک ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ اِس بار قربانی کے بکرے کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ اُس کا ذبیحہ نہیں، جھٹکا کیا جانے والا ہے! قوم کو جھٹکا دینے والے خط کو مکتوب الیہ تک پہنچانے والا بکرا جھٹکے سے بچنے کی تگ و دَو میں مصروف دکھائی تو دیا مگر بچ نہیں پایا۔

حسین حقانی ابتداء ہی متنازع رہے ہیں۔ اُن کا لہجہ امریکہ سے وفاداری کی سَند رہا ہے۔ اب اگر وہ دودھ سے دُھل کر بھی سامنے آ جائیں تو کوئی اُن کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ خط لکھنے کے نہیں، صرف پہنچانے کے مرتکب ہوئے ہیں مگر پہلے مرحلے میں اُنہی کو جانا پڑا ہے۔ اور جس نے خط لکھا ہے وہ اگر نہ جاسکا تو بہت کچھ چلا جائے گا۔ سوال صرف پیپلز پارٹی کی حکومت کا نہیں، خود پیپلز پارٹی کے مستقبل کا ہے۔ اگر پارٹی نے حقیقی مجرم کو قوم کے سامنے پیش نہ کیا تو خود کو داؤ پر لگا بیٹھے گی۔ سیاست ملک کے اُمور عُمدگی اور دیانت سے چلانے کا دوسرا نام ہے۔ سیاست کو جُوئے کی طرح برتنے کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔

اقتدار سانپ سیڑھی کا کھیل ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محض ایک خانہ چل کر سیڑھی کے ذریعے کوئی بلندی کو چُھو لیتا ہے اور پھر اگلے ہی خانے میں قدم رکھنے پر سانپ ساری بلندی ہڑپ کر جاتا ہے۔ واشنگٹن میں امریکہ کی ناک کے نیچے قائم "حقانی نیٹ ورک" کا بھی کچھ ایسا ہی انجام ہوا ہے۔ سب کچھ اچانک بدل گیا ہے، جیسے فلم میں اچانک سین بدلتا ہے۔ رات کا منظر سیکنڈ کے پچاسویں حصے میں غائب ہو جاتا ہے اور سُورج سر پر آگ برساتا دکھائی دیتا ہے۔ حسین حقانی کے لیے ٹھنڈک ختم ہوئی اور تمازت کا دور شروع ہوگیا۔

چشمِ فلک نے ایسے تماشے کئی بار دیکھے ہیں کہ کسی کو ناپسندیدہ اعمال کی سزا نہیں مل پاتی۔ دُنیا سمجھتی ہے کہ نصیب بلندی پر ہے۔ مگر پھر کسی ناکردہ جرم یا گناہ کی پاداش میں جو کچھ بھگتنا پڑتا ہے وہ اگلی پچھلی ساری کسر پوری کر دیتا ہے! بس ایسا ہی کچھ اِس خط کے معاملے میں بھی ہوا ہے۔

اِسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے!

بَلاؤں" سے نجات پانے کے نسخے"

جو لوگ ماہر نفسیات ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں اُنہیں ہمارا مشورہ ہے کہ نجومیوں اور عاملوں سے کچھ سیکھیں۔ ہر نجومی اچھی طرح جانتا ہے کہ سبھی تابناک مستقبل چاہتے ہیں اِس لیے وہ کبھی تاریک مستقبل کی بات ہی نہیں کرتا! اور ساتھ ہی ساتھ وہ ہر مَرد کا ہاتھ دیکھنے کے بعد پہلی شادی کی نوید سُنائے یا نہ سُنائے، دوسری شادی کی لکیر کا ذکر ضرور کرتا ہے! ہمارا گمان ہے کہ بہت سے لوگ دوسری شادی سے سُکھ پانے کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے ہی کے لیے پہلے پہلی شادی کرتے ہیں! دوسری شادی کی لکیر دراصل مَرد کی خاص اور خاصی دُکھتی رگ ہے۔ دوسری شادی کا یارا ہو یا نہ ہو، اِنسان بار بار اُس کے امکان کے بارے میں سُن کر دِل تو بہلا سکتا ہے!

نجومیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہر عامل کوئی اور دعوٰی کرے یا نہ کرے، سنگ دِل محبوب کو بے بس کرکے قدموں میں ڈالنے کی بات ضرور کرتا ہے! یہ معاملہ بھی "دُکھی" دِلوں کی کمزوری سے کھیلنے کا ہے! کون ہے جس کا کوئی نہ کوئی (یا دو چار!) محبوب نہیں؟ اور وہ محبوب ہی کیا جو سنگ دِل نہ ہو!

مرزا تنقید بیگ کو اُن لوگوں سے چڑ ہے جو بیویوں سے چڑتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ وہ دُنیا بھر کے شادی شدہ مَردوں سے چڑتے ہیں! ہم نے جب بھی اپنے کالموں میں ازدواجی زندگی کی ناہمواریوں پر نکتہ سرائی کی ہے، مرزا نے لپک کر ہمارے لتّے لیے ہیں اور ہمیں جی بھر کے ڈانٹا ہے۔ وہ اِس بات پر مُعترض ہیں کہ ہم اپنے کالموں میں بیویوں کو ہمیشہ منفی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ مِرزا کو یہ سمجھانا اب تک ممکن نہیں ہو سکا کہ ہم نے صحافت کے شعبے کے سینئرز کی نصیحت کے مطابق اپنے کالموں میں ہمیشہ "سچ" ہی لکھا ہے! مرزا شادی شدہ ہیں یعنی اوکھلی میں خود بھی سَر دے رکھا ہے مگر جان کر انجان بنتے ہیں۔ اُن کی ازدواجی زندگی اِسی تجاہل عارفانہ کا صدقہ ہے۔ بھابی کے سامنے وہ ٹھیک سے سانس بھی نہیں لے پاتے اور اُن سے یہ کہہ رکھا ہے کہ یہ "ضبطِ تنفس" کی مَشق کا حصہ ہے! اگر مِرزا "ضبطِ نفس" سے کام لیتے تو "ضبطِ تنفس" کی منزل سے نہ گزرنا پڑتا!

اب ہم مرزا کو کیا سمجھائیں کہ بھلے ہی اُنہیں ہمارے کالموں میں بہت کچھ جھوٹ لگتا ہو مگر ہمارے شادی شدہ مَرد قارئین کی کچھ نہ کچھ "تشفّی" تو ہو ہی جاتی ہے اِس لیے ہم قارئین کے ایک "وسیع" حلقے سے محروم نہیں ہونا چاہیں گے یعنی نجومیوں اور عاملوں کا طریق واردات اپناتے ہوئے ہم ازدواجی زندگی کے "تابناک" پہلو اجاگر کرتے رہیں گے!

جب ہم نے مرزا کو بتایا کہ بھارتی ریاست تامل ناڈو کے ایک علاقے میں بَلائیں اُتارنے یا بھگانے کے لیے خواتین کو کوڑے مارنے کا رواج ہے تو اُن کا چہرہ غصے سے سُرخ ہوگیا اور ہمیں گھورنے لگے۔ ہم نے واضح کیا کہ ہم کوڑے مارنے پر نہیں، کھانے اور کھا کھا کر مُسکرانے پر یقین رکھتے ہیں! مرزا بولے "تم نے جس انداز سے یہ خبر سُنائی ہے اُس سے خوب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تمہیں تامل ناڈو کے مَردوں پر رشک آ رہا ہے!" ہم نے اعتراض کیا کہ پوری بات سُنی نہیں اور تبصرے کا ڈنڈا برسا دیا۔ مرزا نے معذرت چاہتے ہوئے "ہمہ تن خرگوش" ہونے کا تاثر دیا۔ ہم نے بتایا کہ بَلائیں بھگانے کے لیے عورتوں کو کوڑے مارنے پر یقین رکھنے والے یہ بھی مانتے ہیں کہ ایسا کرنے سے متعلقہ خواتین ہی کی نہیں بلکہ اُن کے تمام گھر والوں کی بَلائیں بھی بھاگ جاتی ہیں!

اِتنا سُننا تھا کہ مرزا ہم پر برسنے لگے "پتا نہیں کیا اول فول پڑھتے رہتے ہو؟ اوّل تو بَلا اُتارنے کے بہانے کِسی عورت کی کوڑوں سے تواضع کرنا ہی قابل مذمت ہے۔ اور سِتم ظریفی یہ کہ پورے گھر کی بَلائیں دور کرنے کے لیے بھی اُسی غریب کو تختۂ مشق بنایا جائے۔ بَلاؤں کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ ممبئی کی بھاشا میں صاف کہہ دو کہ خواتین پر "خُنّس" اُتارنی ہے!"

ہم نے عرض کیا کہ بَلائیں اُتارنے کے لیے خواتین پر کوڑے برسانے کی خبر جنوبی بھارت کی ہے، پاکستان کی نہیں اِس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی ہمارا معاشرہ اِتنا "بَلا شناس" نہیں ہوا۔ مرزا بولے "ایسی خبریں ہمارے اخبارات میں شائع نہیں ہونی چاہئیں۔ تم جیسے سازشی ذہن رکھنے والے لوگ ایسی خبروں کا کچھ زیادہ ہی اثر قبول کر سکتے ہیں۔ ہم نے وضاحت کی کہ فی الحال ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ مرزا فرمانے لگے "مَرد کا کیا اعتبار؟ اگر کوئی بیوی سے انتقام لینا چاہے تو جن بھوت یا بَلا کا بہانہ کرکے اُس پر کوڑے اور ڈنڈے برسانے کا عمل شروع کر سکتا ہے! اور اگر یہ رجحان عام ہوا تو کوڑوں کا سُن کر بِلائیں تو کیا بھاگیں گی، شادی شدہ عورتیں گھروں سے نِکل بھاگیں گی!"

ہم نے عرض کیا گویا روحانی علاج کی کوکھ سے معاشرتی بیماری جنم لے گی۔ مرزا پھر ہم پر برس پڑے۔ "تم ہو ہی منفی ذہنیت کے آدمی۔ اگر کسی کے جسم پر کوڑے برسائے جائیں تو وہ روحانی علاج کہاں سے ہوا؟ اور میں خوب سمجھتا ہوں یہ بَلائیں اُتارنے اور بھگانے کا چکر۔ ہمارے ہاں بیشتر عامل بَلا کو بھگانے کی آڑ میں بَلا ہی کو بھگا لے جاتے ہیں!"

ہم نے مرزا کو مُشتعل دیکھ کر بھارتی ریاست بہار کے ضلع دَربھنگا کی یہ خبر نہیں سُنائی کہ ایک شخص نے گھر کو بَلاؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے بیوی کو ذبح کیا اور پھر بیوی کا کٹا ہوا سَر کو لیکر گلیوں میں گشت کرتا رہا تاکہ اہل علاقہ کو یقین دِلا سکے کہ کم از کم ایک "بَلا" پر قابو پانے میں تو وہ کامیاب ہو ہی چکا ہے!

ہمارے دوست محمد احمد انصاری نے "بَلاؤں" سے نجات کا ایک منفرد طریقہ سُجھایا ہے۔ ہر بَلا دور رکھنے کے حوالے سے اُن کا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ کِسی "بَلا" سے شادی نہ کی جائے! ویسے بَلاؤں کو زندگی کا حصہ بنانے کے چند ایک فوائد بھی ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ پھر اِنسان ایسی ویسی بَلاؤں سے ڈرنا چھوڑ دیتا ہے۔ ایک صاحب رات کے وقت قبرستان سے گزر رہے تھے۔ راستے میں موٹر سائیکل خراب ہو گئی۔ ایک درخت کے نیچے موٹر سائیکل کا پلگ چیک کرنے لگے تو اُوپر سے کِسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ سَر اُٹھا کر دیکھا تو ایک تگڑی ٹہنی پر کوئی اُس سے بھی تگڑی عورت بال کھولے بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ مَوصوف نے گھور کر دیکھا تو بولی "ہاہاہا۔ دیکھتا کیا ہے، میں چُڑیل ہوں۔" وہ صاحب تپ کر بولے "شرم نہیں آتی بہنوئی سے مذاق کرتے ہوئے!"

پتنگ بازی، بٹیر بازی، ہوا بازی وغیرہ

ظفر اقبال مرحوم نے کہا تھا

مِرے دِل کو سمجھ رکھا ہے دِلّی یار لوگوں نے
کبھی آباد کرتے ہیں، کبھی برباد کرتے ہیں !

اِس شعر کی آفاقیت یہ ہے کہ یہ ریلوے کے محکمے اور پی آئی اے دونوں کی یکساں سطح پر ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے !

ایک زمانہ تھا کہ جب ریلوے کی پٹری پر ٹرینیں دوڑا کرتی تھیں مگر اب ٹرینیں اُسی طرح خال خال دکھائی دیتی ہیں جس طور ملک بھر میں اہل دانش خال خال پائے جاتے ہیں ! تمام ٹرینیں تباہی کے پلیٹ فارم پر کھڑی کردی گئی ہیں، یعنی ٹرینیں اب طیاروں کی برابری کرتی دکھائی دے رہی ہیں.... دونوں کو کھڑا کردیا گیا ہے ! جو پٹری پر دکھائی نہیں دیتیں اُن ٹرینوں کا محکمہ محوِ پرواز دکھائی دے رہا ہے ! اور دوسری طرف پی آئی اے بھی ٹیک آف کے mood اور mode میں ہے !

پی آئی اے کے طیاروں نے ٹرینوں کی ٹُھنکنا شروع کردیا ہے جو کہیں بھی کھڑی ہو جاتی ہیں۔ کچھ کچھ یہی مزاج اب طیاروں کا بھی ہوتا جارہا ہے۔ پرواز کے

دوران انجن بند ہونے لگے ہیں۔ ویسے تو پائلٹس کی اصل مہارت ٹیک آف اور لینڈنگ میں آزمائی جاتی ہے، بالخصوص لینڈنگ میں۔ آج کل ہمارے ہاں طیارے لینڈنگ سے پہلے ہی لینڈنگ کی ضِد کرنے لگے ہیں ! بے چارے پائلٹس کی مَشَقّت بڑھ گئی ہے۔
اب تجربہ کار پائلٹ وہ ہے جو طیارے کو اُڑانے اور اُتارنے سے زیادہ اُسے گرنے سے بچانے میں مہارت رکھتا ہو !
پی آئی اے نے چند طیاروں کو گراؤنڈ کردیا ہے۔اِس حالت یا کیفیت کو ہم (’تارے زمین پر‘ کی کاسٹ سے معذرت کے ساتھ) ”طیارے زمین پر“ بھی قرار دے سکتے ہیں !
reality طیارے بھی ایک grounded میں اب ground realities پاکستان کی کی حیثیت سے شامل ہوگئے ہیں ! بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ یاروں کی کرپشن نے طیاروں کو خاک چٹادی ہے۔
سُنا ہے ترقی یافتہ اقوام اِس اُصول پر زندہ ہیں کہ جو چیز جس کام کے لیے بنائی گئی ہو اُس سے وہی کام لینا چاہیے۔ اگر ہم بھی اِس اُصول پر عمل کریں تو جینا محال ہوجائے، جس آوے کو ہم نے خاصے انہماک اور جاں فشانی سے ٹیڑھا کیا ہے وہ سیدھا ہو جائے !

پی آئی اے کی انتظامیہ نے مشینوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے یہی کوئی آٹھ دس طیاروں کو گراؤنڈ کیا ہے تو ہنگامہ برپا ہوگیا ہے۔ تاثر یہ دیا جارہا ہے جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہے! پاکستان میں اُڑانے کے لیے اور بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً بے پَر کی اُڑانا زیادہ آسان ہے۔ کبوتر اور پتنگ اُڑانے سے آپ کو کس نے روکا ہے؟ مذاق اُڑانے پر بھی کوئی دفعہ لگتی ہے نہ کچھ خرچ ہوتا ہے! اگر آپ اور کچھ نہیں کرسکتے تو گلچھرّے اُڑاتے رہیے۔ کیا لوگوں کو اندازہ نہیں تھا کہ پتنگ بازی اور بٹیر بازی کیا ہوتی ہے؟ اگر ہاں، تو پھر طیارہ اُڑانے کے عمل کو ہوا بازی کی اصطلاح کیوں دی گئی؟ غیر سنجیدہ اصطلاح دینے کا یہی نتیجہ نکلنا چاہیے تھا!

پتہ نہیں کیوں لوگ طیاروں کے پیچھے پڑگئے ہیں کہ اُنہیں اُڑنا ہی چاہیے۔ کیا لوگوں کو اندازہ نہیں کہ اُن کے دِلوں میں طیاروں کو اُڑتے ہوئے دیکھنے کی جو تمنّا ہے اُس کی تکمیل کے حوالے سے پی آئی اے اور دیگر ایئر لائنز پر کس قدر دباؤ ہے! ہم اگر اپنے قومی اداروں پر یونہی دباؤ بڑھاتے رہے تو اُن کی کارکردگی کیا خاک بہتر ہوگی!

اب آپ ہی بتائیے کہ کیا خوب محنت کرنے کے بعد آپ آرام نہیں کرتے؟ بستر پر

دراز نہیں ہوتے ؟ کیا پائلٹس کو طویل فلائٹس کے درمیان وقفہ نہیں ملتا؟ اگر ہاں، تو پھر چند طیاروں کے گراونڈ کردیئے جانے پر اِس قدر ہنگامہ کیوں؟ جب اِنسان کو آرام کا حق ہے تو کیا بے زبان مشینوں کو آرام کا موقع نہیں ملنا چاہیے؟ طیارہ دھات اور مشینوں کا بنا ہوتا ہے۔ اُس بے چارے کی زبان تو ہوتی نہیں کہ کچھ کہے۔ ہمی کو اُس کے آرام اور سُکون کے بارے میں سوچنا چاہیے نا! اور بے زبان طیارے تو زمین پر پڑے پڑے یا کھڑے کھڑے بھی آرام کرلیتے ہیں، کوئی بستر، گدّا، تکیہ وغیرہ طلب نہیں کرتے!

دو ڈھائی گھنٹے کے سفر میں بھی لوگ ایئر لائنز کے عملے کو مُشکل میں ڈال دیتے ہیں۔ طیارہ جیسے ہی زمین کو الوداع کہتا ہے، مسافر پانی اور جُوس مانگنا شروع کردیتے ہیں۔ ذرا سی ہوا بازی میں بھی پینے پلانے کے چونچلے بازی! پانی، چائے یا "ٹھنڈی والی کولڈ ڈرنک" گھر سے پی کر آنا چاہیے۔ اور پھر پندرہ منٹ میں بھوک بھی لگ جاتی ہے! بعض مُسافروں کو بس بہانہ چاہیے ایئر ہوسٹس کو طلب کرنے کا! اگر طیارے کے کسی کونے میں جُوس کا اسٹال اور کھانے پینے کی اشیاء کا کیبن لگادیا جائے اور ہر چیز کے پیسے وصول کئے جائیں تو ہم بھی دیکھتے ہیں کہ کِس کِس کو پیاس اور بھوک لگتی ہے!

طیارہ وقت پر نہ اُڑے تو مصیبت، اُڑ جائے تو مصیبت! کبھی کبھار قومی ایئر

لائن کا کوئی طیارہ اگر مُقرر وقت پر اُڑ جائے تو بہت سے مسافر ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں! وہ گھر سے یہی سوچ کر نکلے ہوتے ہیں کہ طیارے کی روانگی میں تاخیر تو ہونی ہی ہے، پھر بر وقت ایئر پورٹ پہنچنے کی جلدی کیوں؟ اب آپ ہی بتایئے کہ یہ سوچ کوئی پی آئی اے نے تو اپنے کرم فرماؤں کے ذہنوں میں نہیں ٹھونسی! جب سب کچھ لوگ اپنے طور پر طے کرلیں گے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔

کچھ دن پہلے کی بات ہے پی آئی اے کے ایک طیارے میں کہیں سے چوہا گھس گیا۔ اِس پر میڈیا نے ایسا شور مچایا کہ کان پڑی آواز بھی سُنائی دینے سے گریزاں دکھائی دی۔ نالے میں گائے گر جائے یا طیارے میں چوہا گھس جائے، میڈیا کو تو بس بہانہ چاہیے بات کا بتنگڑ بنانے کا! اگلے وقتوں میں محلے کی کُٹنیاں لگائی بُجھائی کیا کرتی تھیں۔ اب یہ منصب الیکٹرانک میڈیا نے سنبھال لیا ہے! طیاروں میں دُنیا بھر سے، طرح طرح کے جانور سفر کرتے ہیں۔ کیا اُن کا سفر جائز ہے؟ اگر ہاں، تو پھر ایک چوہے کی پرواز پر اِس قدر شور شرابہ کیوں؟ ہمارے میڈیا کو تو یہ بات فخریہ بیان کرنا چاہیے کہ پاکستان کے چوہے بھی اب عالمگیریت کے مزے لوٹ رہے ہیں، ملکوں ملکوں گھوم رہے ہیں!

.... اور جب اُنہیں طیارے کے خفیہ خانوں میں ڈھونڈنے نکلیے تو صاف کہتے ہیں

! ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم ....

ایک چھوٹے سے چوہے نے چند ملکوں کا سفر کیا کرلیا، یاروں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھالیا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ سیخ پا ہونے کا نہیں، داد و تحسین کا محل ہے۔ دو تین بار ہماری جیب کٹی ہے۔ جیب کتروں پر خار تو بہت آیا مگر صاحب ! ایمانداری کی بات ہے کہ اُن کی ہاتھوں کی بے مثل کاری گری پر بے اختیار داد دینے کو بھی جی چاہا ! پی آئی اے کے طیارے میں گھس بیٹھنے والے چوہے کی صلاحیت کا بھی اعتراف کیا جانا چاہیے۔

ابھی کل کی بات ہے۔ ایک ضعیف خاتون کو پشاور سے ڈیرہ اسمٰعیل خان جانا تھا۔ انھوں نے پی آئی اے کو زحمت دی۔ قومی ایئر لائن نے اُنہیں ژوب، کوئٹہ اور کراچی کی سیر کرانے کے بعد پشاور واپس پہنچایا اور مشورہ دیا کہ سڑک کے راستے ڈیرہ اسمٰعیل خان چلی جائیں۔ یہ سب کچھ نا اہلی کے زمرے میں ڈال دیا گیا ہے۔ کسی نے ضعیف خاتون کو بلا معاوضہ پاکستان بھر کی سیر کرانے پر قومی ایئر لائن کو سراہنے کی زحمت گوارا نہیں کی !

دُنیا والوں کو اب تک معلوم نہیں کہ طیارے اُڑان بھرنے کے بعد یعنی فضاؤں میں رہ کر اُتنا نہیں کماتے جتنا کسی پلے لینڈ میں بچوں کی تفریح کے لیے رکھے جانے کے بعد کما کر دیتے ہیں ! کراچی میں بھی ایک طیارہ کئی عشروں سے زمین پر کھڑا لوگوں کی تفریحِ طبع کا سامان کر رہا ہے۔ ٹیک آف اور لینڈنگ کے

جھنجھٹ سے آزاد ہو کر بھی یہ "زخمی پرندہ" آمدنی کے معاملے میں خوب اُڑان بھر رہا ہے! اگر گراؤنڈیڈ طیاروں میں فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کھول دیئے جائیں تو پی آئی اے کو زیادہ آمدنی ہو سکتی ہے! ڈراموں کی شوٹنگز میں استعمال ہو کر بھی یہ طیارے اپنے وجود کی مقصدیت عمدگی سے ثابت کر سکتے ہیں!

گزشتہ دنوں کراچی کے علاقے ملیر میں جناح اسکوائر کے پلے گراؤنڈ میں پرائیویٹ ایئر لائن کے چھوٹے، مشّاق طیارے کی کامیاب لینڈنگ ہوئی۔ اِس پر بھی لوگوں نے بہت باتیں بنائیں۔ چینلز والے خاص طور پر طعنہ زن دکھائی دیئے۔ کوئی اِس بات پر غور نہیں کرتا کہ ہمارے پائلٹس کسی بھی طیارے کو کہیں بھی اُتارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں! اِسی پرائیویٹ ایئر لائن کے ایک پائلٹ نے ڈیڑھ ماہ قبل سُپر ہائی وے سے متصل خالی زمین پر چھوٹا طیارہ بحفاظت اُتار لیا تھا۔ اور کل کو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہری ہوا بازی کے ماہرین پاکستان آئیں اور پائلٹس کو ساتھ لے جائیں۔ جب طیارے سڑک کے کنارے اور پلے گراؤنڈ میں اُتارے جا سکتے ہیں تو پھر جدید ترین سہولیات سے مزیّن ایئر پورٹس تعمیر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارے پائلٹس کو ہوا بازی کی تاریخ پسند نہیں۔ وہ ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں!

!ساڈا شیر، آوے ای آوے

ہماری سیاست میں جب بھی کوئی بُلندی پر جاتا ہے تو اُس کی شوبھا نِہارنے والوں کے سَر سے ٹوپی گرنے لگتی ہے! ذرا سی شان کیا بڑھتی ہے، لوگ متعلقہ فرد کو اِنسانوں کے زُمرے سے نکال کر جنگلی حیات کی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ کوئی پنجاب کا شیر کہلاتا ہے، کوئی بنگال کا۔ بنگال ٹائگر کی مناسبت سے بنگال کا شیر کہنا تو دُرست ہے مگر پنجاب کا شیر سے کیا تعلق؟ پنجاب میں اور بھی بہت سے اور خاصے مفید حیوانات پائے جاتے ہیں، کیا اُن میں سے کسی سے تشبیہ دیتے ہوئے شرم آتی ہے؟ خیر، عمران خان میدان میں اِس شان سے نکلے ہیں جیسے کوئی شیر شِکار کو نکلتا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ سمجھنے والے سمجھ گئے ہیں اور اُنہیں پنجہ اُٹھانے یا جبڑا کھولنے کی زحمت بھی نہیں دیتے، سَر جھکا کر اُن کے ساتھ ہو لیتے ہیں!

ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ عمران خان کو پنجاب کا شیر قرار دیں یا نہ دیں۔ ملک غلام مصطفٰی کھر خیر سے بقیدِ حیات ہیں۔ اُن کے ہوتے ہوئے کوئی اور پنجاب کو جنگل اور خود کو اُس کا بادشاہ نہیں سمجھ سکتا۔ تو پھر کیا ہم عمران خان کو میانوالی کا شیر سمجھیں؟ ہمارے ہاں سیاست دانوں کو شیر سے

تشبیہ دینے کا رواج ہے۔ پھر اگر وہ اقتدار میں آ کر قومی وسائل کو بھنبھوڑنے میں جُت جاتے ہیں تو حیرت اور افسوس کیوں؟

مرزا تفصیل بیگ کی عمران خان سے عقیدت کا یہ عالم ہے کہ وہ اُن کے خلاف ایک لفظ بھی سُننا پسند نہیں کرتے۔ ہمیں تو حیرت ہے کہ مرزا کوئی اخباری کالم نگار تو ہیں نہیں۔ یعنی کوئی انڈر دی ٹیبل ڈیل تو ہوئی نہیں ہے، لِفافوں وفافوں کی یقین دہانی تو کرائی نہیں گئی تو پھر "تنگ آمد بجنگ آمد" کی طرز پر اِس قدر حمایت کیوں؟ جب ہم یہ نکتہ پیش کرتے ہیں تو اپنے ہیرو کی پیروی کرتے ہوئے مرزا ہتّھے سے اُکھڑ جاتے ہیں۔ "تم جیسے لوگ تو چاہتے ہی نہیں کہ اِس ملک میں کسی حقیقی تبدیلی کی رُونمائی ہو۔ انقلاب کی راہ میں دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہو۔"

ہم احتراماً عرض کرتے ہیں کہ مرزا! آپ سارے انڈے ایک باسکٹ میں نہ رکھیں۔ اور جب مرزا یہ بات سُن کر ہمارا منہ تکنے لگتے ہیں تب اُنہیں سارے انڈے ایک ہی باسکٹ میں رکھنے کا مفہوم بھی سمجھانا پڑتا ہے! اور بات سمجھ میں آنے پر وہ توانا ذہن کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں "خان صاحب کے لیے ہماری حمایت کوئی انڈا (!) نہیں کہ ٹوٹ یا سَڑ جائے۔" ہمیں اُن کی رائے سے فوراً اتفاق کرنا پڑتا ہے کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اِس بات کا احتمال

!رہتا ہے کہ کہیں وہ کسی پتھر کو انڈا سمجھ کر ہمارے سَر پر نہ دے ماریں

ابھی کل کی بات ہے، مرزا سویرے سویرے ہمارے گھر آ دھمکے۔ اُن کی آمد کو ہم کسی ایسے لفظ ہی کے ذریعے بیان کر سکتے ہیں جس میں دھمکی کا تاثر شامل ہو! خیر، آمد کا کوئی مقصد وہ اِس بار بھی بیان نہ کرسکے۔ ہمی نے پوچھا کہ خیریت تو ہے، اِتنی صبح آنے کی کیا ضرورت تھی؟ بس، یہ سُننا تھا کہ بھپر گئے۔ فرمایا "دِن کے گیارہ بج چکے ہیں اور تم اِسے 'اِتنی صبح' قرار دے رہے ہیں؟ ڈِھٹائی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ مگر خیر، وہ حد "تم کیا جانو۔

ہم نے عرض کیا کہ ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ مرزا جب بھی تشریف لاتے ہیں، ہماری آنکھیں صرف کھلتی نہیں بلکہ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں! اِس بار بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ جب اُن کا غصہ ذرا سا ماند پڑا تو ہم نے عرض کہ ہم ڈیوٹی پر بھی جاتے ہیں اور صبح کے چار بجے واپسی کے بعد سوئیں گے تو ہماری "علی الصباح" تو دن کے گیارہ بجے ہی ہوگی نا! شاید قبولیت کی گھڑی تھی اِس لیے ہماری بات مرزا کی سمجھ میں آ گئی! ہماری بات کو سمجھنے میں کامیابی کا سگنل دینے کے لیے چند لمحوں تک دیدے مٹکانے کے بعد مرزا بولے اب ملک میں انقلاب کی راہ روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اب تو نیا زمانہ آوے "ای آوے" ہم سمجھ

گئے کہ وہ رات کو کسی ٹی وی چینل کے ٹاک شو میں عمران خان کو دیکھ اور سُن کر سوئے ہیں اور رات بھر انقلابی خواب ملاحظہ فرماتے رہے ہیں! ہمارا اندازہ درست تھا کیونکہ مرزا نے بات کچھ یوں آگے بڑھائی "رات ہم نے خواب میں دیکھا کہ ملک میں انقلاب آ چکا ہے۔ اور اِس انقلاب کی قیادت نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔" ہم نے اُنہیں یاد دلایا کہ انقلابی خواب کی رنگینیوں میں گم ہو کر وہ عمران خان کا نام لینا بھول گئے ہیں! وہ ایک لمحے کے لیے چونکے اور چہرے سے ہونّق پن مٹاتے ہوئے کہنے لگے "جب نوجوانوں کی، نئی نسل کی بات ہوتی ہے تو ہمارا اشارہ خان صاحب کی طرف ہی ہوتا ہے۔ الگ سے اُن کا نام لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

عقیدت کا یہ عالم دیکھ کر ہم تو دنگ رہ گئے۔ ہمارے سیاست دانوں کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ یہ اپنے پرستاروں کو جاں نثاروں اور خُدّام میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ سیاست اور تبدیلی ایک طرف رہ جاتی ہے اور جاں نثاروں کی ٹولیاں نعرے لگاتی پھرتی ہیں۔
ہمیں تو مرزا پر حیرت ہوئی ہے کہ اب اُن میں کسی بھی اعتبار سے جوانی کی کوئی رَمق باقی نہیں رہی تو پھر خان صاحب کے معاملے میں اِس قدر جذباتیت کیوں؟ اِس قدر ڈھلی ہوئی عمر میں

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی!

کے فلسفے پر عمل کیوں؟ ایسی کون سی مجبوری آن پڑی ہے؟ ذرا سا غور کرنے پر

ہماری سمجھ میں یہ بات آئی کہ مرزا ریٹائر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کوئی کام وام تو ہوتا ہی نہیں، ایسے "آوے ای آوے" اور "جاوے ای جاوے" کا راگ الاپنا بھی وقت کو ٹھکانے لگانے کا اچھا طریقہ ہے! عمران خان کو اللہ سلامت رکھے کہ اُنھوں نے بہت سے نوجوانوں ہی کو نہیں، مرزا جیسے بوڑھوں کو بھی کام پر لگا رکھا ہے!

جب بھی عمران خان کے بارے میں تحفظات کا اظہار کرتے ہیں، مرزا کو آگ سی لگ جاتی ہے۔ اُن کا بس نہیں چلتا، ورنہ ہمارا منہ نوچ لیں۔ ہماری ذہانت کا درجہ کمال ملاحظہ فرمایئے کہ اپنے مُنہ اور اُن کے ہاتھوں میں اچھا خاصا فاصلہ ہمیشہ رکھتے ہیں! ایک دن ہم نے پوچھا "مرزا! آپ کو یہ یقین کیوں ہے کہ عمران خان ملک کی کایا پلٹ دیں گے؟" مرزا نے ہماری معلومات میں اضافے کی غرض سے فرمایا "خان صاحب نے ہمیں کرکٹ کے کئی ٹورنامنٹ جتوائے۔ وہ قائدانہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر موقع ملے گا تو ملک کو بھی کہیں سے کہیں پہنچا دیں گے۔"

ہم نے عرض کیا مرزا! کرکٹ ٹیم کو چلانے اور قوم کی قیادت کرنے میں بہت فرق ہے۔ قوم کی رہنمائی کرنے کے لیے صرف ڈسپلن کام نہیں آتا، اور بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ عملی زندگی دو چار گیندوں کا کھیل نہیں ہوتا کہ چند شاٹس

"لگاؤاور میچ کا پانسا پلٹ دو۔

مرزا نے جواباً فرمایا "تم دیکھتے تو جاؤ۔ اِس قوم نے اگر خان صاحب کو آزمایا تو ملک کا مقدر جاگ اُٹھے گا۔ وہ ایک نئے عزم کے ساتھ میدان میں آئے ہیں۔ موقع ملنے کی دیر ہے، وہ چوکے اور چھکے برسانا شروع کردیں گے۔"

ہم نے عرض کیا "بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ عمران خان آئے نہیں، لائے گئے ہیں۔ اور جس موقع کو وہ اپنے لیے کسی نہ کسی طور حاصل کرنا چاہتے تھے اُس موقع کو پلیٹ میں سجا کر اُن کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔"

کیا مطلب؟" مرزا نے بھڑنے کی ابتدائی کرتے ہوئے سوال داغا۔"

ہم نے خود کو سمیٹ کر پیچھے کیا اور وضاحت کی کہ عمران خان ابھی سے مشکوک ہوگئے ہیں۔ جو قوتیں خود دکھائی نہیں دیتیں اُن کا سایا عمران خان پر صاف دکھائی دے رہا ہے! ایک جلسے میں کسی علاقائی لیڈر نے تحریک انصاف میں شمولیت کا اعلان کرتے ہوئے کہا "لوگ پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہم کسی ایجنسی کے کہنے پر تحریک انصاف میں شمولیت اختیار کر رہے ہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔ ہم اپنی خوشی سے تحریک انصاف میں شامل ہو رہے ہیں!"

یہ سُن کر مرزا آگ بگولہ ہو گئے۔ "اب ایک لیڈر ملا ہے تو تم جیسے لوگ عوام کے ذہنوں میں شکوک کے بیج بونے پر تُل گئے ہیں۔ اِس لیے تو ہمارا ملک ترقی نہیں کرتا۔"
اب مرزا کو یہ بات کون سمجھائے کہ پوری محنت کے بعد امتحان میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرکے اگلی جماعت میں جانے اور "ترقی پاس" ہونے میں بہت فرق ہے! ہمیں ترقی دِلانے والے لیڈر درکار ہیں۔ ایسے لیڈر ہمارے کس کام کے جو جلسوں کی کلاسوں میں "ترقی پاس" ہو کر اگلی کلاس میں پہنچائے جائیں!
مرزا سیاسی جذباتیت کے ہاتھوں اِس قدر اندھے ہو چکے ہیں کہ کشتی اور نورا کشتی کے فرق کو نظر انداز کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ انقلاب آتا ہے، لایا نہیں جاتا۔ جب نادیدہ ہاتھ جگہ بنا کر کچھ لانے کی کوشش کرتے ہیں تو کوئی حقیقی تبدیلی نہیں آتی۔ ایسے میں کوئی تحریک ملتی ہے نہ انصاف۔

تحفظاتِ زر

ہم بعض چیزوں کے لیے ترستے ہیں مگر جب وہ مل جاتی ہیں تو تشویش میں مُبتلا رہتے ہیں کہ اُن کا کیا کریں! مثلاً کامیابی کے لیے زندگی بھر کوشش کرنے والے بھرپور کامیابی ملنے پر یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتے ہیں کہ اب اُسے برقرار کیسے رکھیں!
جب ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہو اور لوگ ایک دوسرے کے بارے میں خدشات اور تشویش میں مُبتلا ہوں تو تحفظ کے احساس کی ضرورت بہت شِدّت سے محسوس ہوتی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اُسے کسی نہ کسی حد تک تحفظ حاصل ہو۔ مرزا تنقید بیگ کا شِکوہ یہ ہے کہ تحفظ کے طلب گار تحفظات کا رونا رہتے ہیں! لوگوں کو تحفظ درکار ہے لیکن اگر کوئی "تحفظات" کا اظہار کرے تو اُسے تشویش بھری نظروں سے طرف دیکھتے ہیں!
مرزا تنقید بیگ کو تحفظات کے بارے میں ہمیشہ تحفظات لاحق رہے ہیں۔ وہ اب تک یہ بات سمجھ نہیں پائے کہ تحفظات کے بارے میں لوگ اس قدر تحفظات کیوں رکھتے ہیں۔ اُن کا استدلال ہے کہ قتل و غارت کے اِس دور میں اگر تحفظات لاحق ہوں تو اِنسان کو سُکون کا سانس لینا چاہیے کیونکہ تحفظات میں "تحفظ" بالکل ہے

اور پورا کا پورا ہے! جب بھی ہم نے مرزا کو تحفظات کی ماہیت اور اصلیت سمجھانے کی کوشش کی ہے، اُنھوں نے ہمیں کچھ ایسی نظروں سے دیکھا ہے جیسے ہماری ذہنی حالت کے بارے میں تحفظات رکھتے ہوں! اپنا ذہنی تحفظ یقینی بنانے کے لیے اب ہم مرزا کو کچھ بھی سمجھانے سے مقدور بھر گریز ہی کرتے ہیں۔

سیاست کی بساط کے کھلاڑیوں نے تمام مذموم عزائم کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے اُنہیں تحفظات کا لبادہ اوڑھا دیا ہے۔ جب بات نہ بن رہی ہو اور سیاسی ڈرامے میں کوئی ڈھنگ کا ڈائیلاگ ادا نہ ہو پا رہا ہو، پورا سین ہی بے جان لگ رہا ہو اور تماشائیوں کی طرف سے ہوٹنگ کا خطرہ ہو تو سیاسی اداکار تحفظات کے "ایکٹ" کی تیاری کے لیے اسٹیج کے پیچھے چلے جاتے ہیں! المیہ یہ ہے کہ اب سیاسی ڈرامے کا بیشتر حصہ اسٹیج کے پیچھے ہی پیش کیا جارہا ہے اور بے چارے تماشائی سیاسی اداکاروں کے اسٹیج پر آنے کے !اِنتظار میں طنز بھری سیٹیاں بجاتے ہی رہ جاتے ہیں

کی شکل میں ایک لفظ ایسا دیا ہے جو ہر موقع کے لیے استعمال sorry انگریزوں نے کہہ کر گردن بچالیجیے۔ یہی حال sorry ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی کر گزریے اور کا ہے۔ اگر کسی معاملے میں بات ٹھیک سے نہ بن رہی ہو یعنی مرضی reservation کے سائز اور گہرائی والا بریف کیس نہ مل پا رہا تو کہہ دیجیے کہ

بھائی! میرے چند "تحفظات" ہیں! بس، بات ختم! پھر کس کی مجال ہے جو یہ پوچھے کہ تحفظات سے کیا مُراد ہے! کوئی اِس لیے نہیں پوچھے گا کہ اب سبھی جانتے ہیں کہ تحفظات کیوں ہوتے ہیں اور کس طرح دور کئے جاتے ہیں!

پاکستان کی سیاست میں تحفظات نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی کردار ادا کیا ہے مگر اب لگتا ہے پورا سیاسی ڈراما اِسی ایک ایکٹ کے گرد گھوم رہا ہے۔ کئی سیاست دان ایسے ہیں جن کی پوری سیاست صرف تحفظات سے عبارت ہے۔ یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ اُن کی سیاست تحفظات کے گرد گھوم رہی ہے یا تحفظات اُن کی سیاست کا طواف فرما رہے ہیں! مولانا فضل الرحمٰن کی سیاست وہ گھوڑا ہے جو تحفظات کی دُلکی چال دوڑتا رہتا ہے! جس طرح فٹ پاتھ پر دوا بیچنے والوں کے پاس کوئی ایک آدھ دوا ایسی ہوتی ہے جو ہر بیماری، زخم اور ناسُور کے لیے اِکسیر ہوتی ہے بالکل اِسی طرح مولانا کے پاس میڈیا والوں کے ہر سوال کا ایک ہی جواب ہوتا ہے "ہمارے کچھ تحفظات ہیں!" اب اگر تحفظات کی وضاحت طلب کیجیے تو دنیا بھر کی لاتعلق باتوں کا پنڈورا بکس کھل جاتا ہے۔ میڈیا والے ٹھہرے سطحی ذہن کے لوگ۔ مولانا کی طبّاعی کی تاب وہ کہاں لا سکتے ہیں؟ میڈیا ٹاک میں بالعموم ہوتا یہ ہے کہ مولانا کوئی بات کہتے ہیں، میڈیا والے بس غور کرتے رہ جاتے ہیں اور حضرت مُسکراتے ہوئے چل دیتے ہیں! مولانا کی جسمانی شخصیت بھی ماشاءاللہ کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میڈیا والے تحفظات کی وضاحت

!کا مطالبہ کرنے سے پہلے دس بار سوچتے ہیں

چاندنی رات ہو، ماحول پر سحر طاری ہو، طبیعت ہر اُلجھن سے آزاد ہو کر محبت آمیز لمحات کی فضا میں پرواز کے لیےپَر تول رہی ہو اور ایسے میں اگر مچھّر حملہ کردیں ! اب اگراِس مَسحُورکن ماحول میں پوری رات تالیاں پیٹ پیٹ کر مچھّر مارنے میں گزر جائے تو؟ آپ مقامی انتظامیہ اور تقدیر ہی کو روئیں گے نا؟ بس کچھ ایسا ہی مُقدر ہمارے بھان مَتی کے کُنبے یعنی مخلوط حکومت کا بھی ہے۔ بے چاری اتحادیوں کے تحفظات دور کرنے میں اپنا وقت ضائع کرنے پر مجبور ہے ! تحفظات دور کرنے کے لیے مولانا فضل الرحمٰن کو ایوان صدر بُلانا پڑتا ہے اور داخلی امور کو روتا بلکتا چھوڑ کر وفاقی وزیر داخلہ کو لندن کا ٹکٹ کٹانا پڑتا ہے ! صدر کی اُلجھن تو اور بھی زیادہ ہے۔ اُنہیں لندن کے ساتھ ساتھ یو اے ای اور چین کے بھی چکر لگانا پڑتے ہیں ! ایسے میں پاکستان کے لیے !وقت نکلے تو کیسے

مرزا تنقید بیگ کا کہنا ہے کہ تحفظات اور زر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہم نے وضاحت چاہی تو کہنے لگے "جب بھی کسی کو تحفظات لاحق ہوتے ہیں تو زر کا چورن چٹایا جاتا ہے تاکہ لالچ کے پیٹ میں کلبلانے والے تحفظاتی کیڑوں کو ختم کیا جاسکے ! قومی معیشت ایک زمانے سے ترسیلاتِ زر کی کمی کا رونا رورہی

ہے اور 'تحفظاتِ زر' ہیں کہ بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ جس طرح اِسٹاک ایکسچینج میں یومیہ بنیاد پر اُتار چڑھاؤ ہوتا ہے بالکل اُسی طرح سیاست میں تحفظاتِ زر کا گراف یومیہ بنیاد پر "اور صورت حال کے مطابق صرف چڑھتا، گرتا.... بلکہ صرف چڑھتا رہتا ہے!

پاکستان میں تحفظاتِ زر کے عارضے کا ایک ہی ہسپتال ہے جسے عرفِ عام میں ایوان صدر کہا جاتا ہے! جب صدر محترم تحفظات دور کرنے میں مصروف ہوں تو ہر معاملے میں عدم تحفظ کا پیدا ہونا فطری امر ہے۔ حکومت گویا تحفظات دور کرتے رہنے کا نتیجہ اور صدقہ ہے۔ قوم منتظر ہے کہ صدر اور اُن کے ساتھی تحفظات ختم کرنے کی مہم سے فراغت پائے تو کچھ ترقیاتی مہم جوئی کا بھی سوچا جائے!

کالم نگاری کی قُربان گاہ!

"میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بتایئے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟" یہ سوال ہمارے دوست شریف امروہوی نے کچھ اِس پیار سے داغا کہ ہمارے لیے بچنا ممکن نہ رہا۔ اِس نوعیت کے سوالوں سے ہم بچتے پھرتے ہیں کیونکہ لکھنے سے متعلق کوئی مشورہ دینے کی صورت میں اپنی کم عِلمی کا بھانڈا پُھوٹنے کا خدشہ رہتا ہے! شریف صاحب نے ہمارے کالم پڑھ پڑھ کر شاید یہ رائے قائم کرلی ہے کہ ہم لکھنا جانتے ہیں اور دوسروں کو لکھنا سِکھا بھی سکتے ہیں!

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!

سادہ دِلی کے ہاتھوں اِنسان کیسی کیسی آراء قائم کرلیتا ہے! شریف صاحب واقعی شریف آدمی ہیں۔ اُن کی اِس سادگی پر تو مَر مِٹنے کو جی چاہتا ہے! ہم کیا اور کیسے لکھتے ہیں، یہ تو بس ہم ہی جانتے ہیں۔ من آنم کہ من دانم! بس یہ سمجھ لیجیے کہ مقام تشکر ہے، یعنی یہ کہ "۔۔بات اب تک بنی ہوئی ہے!"

جب مشورے کی طلب برقرار رہی تو ہم نے جواب دیا کہ لکھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ آپ لکھیں اور لکھتے چلے جائیں! یہ سادہ سا جواب سُن کر شریف صاحب کی

تشفی نہ ہوئی۔ کہنے لگے "لکھنا تو ٹھیک ہے مگر لکھتے لکھتے ہم کہیں جانا نہیں چاہتے۔ ہمیں اپنے سے دور مت کیجیے!" بضد رہے کہ اچھا لکھنے کے لیے کوئی زود اثر نسخہ بتائیں۔ ہم نے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم تو خود آج تک یہ نہیں جان پائے کہ اچھا کیسے لکھا جاتا ہے۔ اگر اچھا لکھنے سے مراد ہینڈ رائٹنگ ہے تو یقین کیجیے کہ ہم اِس معاملے میں بھی مثالی شخصیت نہیں!

شریف صاحب نے اپنا مسئلہ بیان کیا "عُمر کی شام ڈھل چکی ہے، وقت ہی وقت ہے لہٰذا یہ سوچا ہے کہ وقت کا کوئی اچھا مَصرف تلاش کیا جائے۔ اور لکھنے سے اچھی سرگرمی کیا ہو سکتی ہے؟"

شریف صاحب کو لکھنے کے معاملے میں سنجیدہ دیکھ کر ہم متوجہ ہوئے کیونکہ ایسی سنجیدگی تو ہم کامیاب لکھاریوں میں بھی دیکھنے کو ترس گئے ہیں! اگر ہم اور ہمارے بعض "ہم حشر" لکھنے والے بھی شریف صاحب کی طرح لکھنا سیکھنے پر توجہ دیں تو اخبارات کے قارئین کو چند ڈھنگ کی چیزیں پڑھنے کو مل جایا کریں! مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

بے چارے اخباری قارئین اِس قدر خوش نصیب کہاں ؟اِن غریبوں کو تو "قلم برداشتہ" ہی پڑھتے رہنا ہے!

خیر، ہم نے شریف صاحب سے پوچھا کہ کیا لکھنے کا ارادہ ہے۔ ارشاد ہوا "اخبارات کے لیے کالم لکھنا چاہتا ہوں۔" اِتنا سُننا تھا کہ ہماری تو ہنسی چھُوٹ گئی۔ شریف صاحب نے پہلے ہمارے چہرے کو گھورا اور پھر ہمارے سَر کی طرف دیکھ کر سوچنے یا شاید کوئی رائے قائم کرنے لگے ! اِس سے پہلے کہ وہ ہماری بات کا بُرا اور ہمیں کچھ ایسا ویسا مانتے، ہم نے ہنسی کی "وجہِ تسمیہ" بیان کرتے ہوئے کہا کہ کالم نگاری کے لیے کوئی کِسی سے مشورہ تھوڑا ہی کرتا ہے ! بیشتر کالم نگاروں کی نگارشات پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر اُنہوں نے لکھنے کے سلسلے میں کِسی سے مشورہ کیا ہوتا تو آج ہم اُنہیں بُھگت نہ رہے ہوتے ! جس طرح دِل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لڑکا لڑکی گھر سے بھاگ جاتے ہیں بالکل اُسی طرح بیشتر کالم نگار بھی دِل کے ہاتھوں مجبور ہو کر قلم اُٹھا لیتے ہیں اور پھر یہ قلم اُس وقت تک نہیں رکھتے جب تک کوئی سر پر پستول نہ رکھ دے ! کوئی بھی شریف آدمی یہ الزام اپنے سَر لینے کو تیار نہ ہوگا کہ اِن کالم نگاروں کو لکھنے کا مشورہ اُس نے دیا تھا!

ہم نے استفسار کیا کہ کِن موضوعات پر خامہ فرسائی کا مُوڈ ہے تو جواب ملا

"کچھ ہلکا پھلکا لکھنا چاہتا ہوں تاکہ دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو اور لوگ پڑھ بھی لیں۔"
ہم نے شریف صاحب کو مشورہ دیا کہ سیاست دانوں کے بیانات پڑھیے اور اُن کی بنیاد پر لکھنے کی عادت ڈالیے۔ مزاح کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔ شریف صاحب کہنے لگے "میں چاہتا ہوں کہ میری تحریر میں مٹھاس ہو مگر اِتنی مٹھاس نہ ہو کہ پڑھنے والوں کو شوگر ہو جائے!"
ہم نے استفسار کیا تو پھر کِن امور پر لکھنے میں زیادہ دلچسپی ہے۔ شریف صاحب کہنے لگے بجلی کے بحران یا ریلوے کے محکمے کی حالت پر کچھ لکھنے کو جی چاہ رہا ہے۔" ہم نے عرض کیا کہ پانی و بجلی اور ریلوے کے وزراء کے بارے میں کچھ لکھنا ہو تو شوق سے لکھیے کیونکہ وہ "بالکل ہیں گے، موجود ہیں گے!" ہاں، یاروں نے بجلی چھوڑی ہے نہ ریلوے کو سلامت رہنے دیا ہے۔ اب جن چیزوں کا وجود ہی مٹ چکا ہو اُن کے بارے میں آپ کیا لکھیں گے! یہ سُن کر شریف صاحب کہنے لگے "ملک میں قانون دِکھائی نہیں دیتا تو کیا قانون اور اُس کی بالا دستی کے بارے میں لکھنا بھی چھوڑ دیا جائے؟"
بات معقول تھی۔ ہمیں فخر محسوس ہوا کہ ہمارے دوستوں میں کوئی تو ہے جو

معقول بات کرتا ہے! مگر پھر یہ سوچ کر دِل کو تھوڑا سا مَلال بھی ہوا کہ ایسا معقول دوست خود کو کالم نگاری کی چوکھٹ پر قربان کرنے کے لیے بے تاب ہے! سوال یہ ہے کہ ہم اُنہیں ایسا کرنے سے کس طرح روکتے؟ ہم تو خود کالم نگاری کی اوکھلی میں سر دیئے بیٹھے ہیں! یعنی

کِس مُنہ سے ہم کہیں کہ محبت فریب ہے

!ہم نے بھی یہ فریب تو کھایا ہے دور تک

شریف صاحب کو بضد دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ اُن میں صحافیانہ ہٹ دھرمی پائی جاتی ہے جو اِس بات کا مظہر ہے کچھ نہ کچھ لکھ کر ہی دَم لیں گے۔ موصوف کی زندگی بینکنگ انڈسٹری میں گزری ہے۔ ایک بڑے غیر ملکی بینک سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ ہم نے سوچا جس کی زندگی دولت کی ریل پیل دیکھتے گزری ہو اُسے بھلا کالم نگاری سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آیا شاید یہی سوچ کر کالم نگاری کرنا چاہتے ہوں کہ اِس لائن میں بھی مال بہت ہے! ممکن ہے بعض کالم نگاروں کے اثاثوں کو دیکھ کر لکھنے کا خیال آیا ہو۔ مگر یہ بھی ہمیں خام خیالی محسوس ہوئی کیونکہ (روز افزوں فربہی کے باوجود) ہمارے پتلی !حالت دیکھ کر اُنہیں کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہو ہی جانا چاہیے تھا

ہم نے مشورہ دیا کہ بینکنگ انڈسٹری میں جو کچھ دیکھا ہے اُس کے حوالے سے

لکھنا شروع کر دیجیے۔ شریف صاحب نے جواب دیا "اِس قدر مزاح لوگ برداشت نہیں کر پائیں گے !" ہم نے وضاحت چاہی تو بتایا "بینکوں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اگر عام آدمی کو معلوم ہو جائے تو مستقل صدمے کی حالت میں رہے، ہوش میں نہ آئے۔ سیاست دان بینکوں کو جس طرح استعمال کرتے ہیں وہ مجرمانہ سرگرمیوں کے ذیل میں آتا ہے۔ بینک وہ واشنگ مشین ہے جس میں اہل ثروت اپنے اعمال کی کمائی دھوتے ہیں !"

یہ سُن کر ہم تو پھڑک اُٹھے۔ عرض کیا کہ جناب ! لوگ اگر ایک ہی کالم میں مزاح، مجرمانہ سرگرمیوں کا احوال، سیاست، دہشت سبھی کچھ پڑھ لیں گے تو مزید کچھ پڑھنے کی حاجت نہ رہے گی۔ بینک بھلے ہی دیوالیہ پن سے دوچار ہوتے جارہے ہیں مگر آپ کے ذہن کو لکھتے وقت دیوالیہ پن کا سامنا نہ ہوگا کیونکہ زندگی بھر آپ نے طرح طرح کے معاملات دیکھے ہیں۔ بس اُنہیں ضبطِ تحریر میں لاتے جائیے اور نام کے ساتھ ساتھ دام بھی کماتے جائیے !

ہماری پوری توجہ سے سُننے کے بعد شریف صاحب کہنے لگے "آپ کی بات درست ہے مگر میں کچھ ایسا لکھنا چاہتا ہوں۔۔"

ہم نے قطع کلامی کی اور معذرت چاہے بغیر کہا کہ جناب ! "کچھ ایسا" لکھنے کے

بجائے "کچھ ویسا" لکھنے پر دھیان دیجیے، تقدیر آپ کے قدموں میں ہو گی اور آپ مُقدّر کے سِکندر کہلائیں گے!

شریف صاحب کئی دن سے ملنے نہیں آئے۔ شاید گزرے ہوئے لمحوں کی راکھ کرید کر بچی کھچی چنگاریاں نکال رہے ہیں تاکہ "کچھ ایسا ویسا" لکھ سکیں!

!شالا نظر نہ لگے

ہندوؤں میں رسم ہے کہ گھر کو نظر بد سے بچانے کے لیے دروازے پر دھاگے میں
ہری مرچ اور لیموں پرو کر لگاتے ہیں۔ اِس ٹوٹکے سے بُری نظر کا توڑ ہوتا ہے یا نہیں
یہ تو ہمیں معلوم نہیں مگر ہاں اِتنا ضرور ہے کہ دِل کو کچھ سکون سا مل جاتا ہے۔
ہمارے ہاں بھی آج کل چند ایک اقدامات محض دِل کو سکون بخشنے کے لیے کئے جا رہے
ہیں۔
صدر آصف علی زرداری چند دنوں کے لیے دبئی کیا گئے، یاروں نے طوفان کھڑا
کردیا۔ صدر ہر حال میں صدر ہوتا ہے۔ کیا سُنا نہیں کہ
صدر ہر جا کہ نشیند، صدر است !
شہنشاہ ہر حال میں شہنشاہ ہوتے ہیں۔ وہ کسی دربار وربار کے محتاج نہیں ہوتے۔ وہ
جہاں کھڑے ہو جاتے ہیں وہیں دربار لگ جاتے ہیں۔ اور جہاں دربار ہوں وہاں
درباریوں کا ہونا لازم ہے۔ بہت حد تک یہی معاملہ صدر کا بھی ہے۔ صدر جس عمارت
میں سکونت پذیر ہوں وہی ایوان صدر ہے۔ صدر زرداری نے دبئی میں بیٹھ کر چند
ایک منصبی امور انجام دینے کی کوشش کی تو لوگوں نے ہنگامہ کھڑا کردیا۔ اب کیا کوئی
بیماری کا بہانہ بنا کر اپنے منصب سے متعلق فرائض بھی

انجام نہ دے! ہماری پوری قوم ہڈ حرامی پر تُلی ہوئی ہے۔ ایسے میں اگر صدر کام کرنے میں دلچسپی لیں تو ہمیں سُکون کا سانس لینے کے ساتھ ساتھ فخر بھی محسوس کرنا چاہیے۔ میڈیا تو بس بہانے تلاش کرتا رہتا ہے بات کا بتنگڑ بنانے کے۔ سیاسی تبصروں میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جانے لگیں۔ کوئی کہتا تھا کہ اب صدر واپس نہیں آئیں گے۔ کسی کی رائے تھی کہ صرف ٹک ٹکا کرنے آئے ہیں۔ مرزا تفصیل بیگ اس صورت حال سے بہت دِل برداشتہ ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اگر صدر کو واپس آنا ہے تو اُن کی مرضی، اور نہیں آنا ہے تو اُن کی مرضی۔ کیا وہ کسی سے پوچھنے اور اجازت لینے کے محتاج ہیں؟ ہم مرزا کی رائے سے متفق تو ہیں مگر کیا کریں، کالم نگاری کی بیگار پر مامور ہیں اِس لیے عادت سے مجبور ہیں۔ چند ایک جملہ ہائے مُعترضہ بھی ذہن کی بُھول بُھلیوں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے جب یہ کہا کہ صدر کی شخصیت سے بہت کچھ وابستہ ہوگیا ہے، لہٰذا وہ جو کچھ بھی کریں گے اُس کے بارے میں لوگ ضرور سوچیں گے تو مرزا بم کی طرح پھٹنے کے لیے پَر تولنے لگے۔ ہم نے بڑی مُشکل سے اُنہیں پَھٹنے سے روکا اور اپنے سے دور کیا۔ مگر اُن کی زبان پر قابو پانا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ اُنھوں نے طلسم ہوش رُبا شروع کی۔ "دُنیا بھر میں صدر ہوتے ہیں اور طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ ہم نے ایوان صدر میں ایک شخصیت کو کیا بٹھایا ہے، لوگ تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑگئے ہیں۔ سمجھ

"میں نہیں آتا کہ لوگوں کا کیا علاج کیا جائے؟

ہم نے عرض کیا کہ لوگ بھی یہی سوچتے رہتے ہیں کہ صدر کا کیا علاج کیا جائے! وہ چونکہ آئے دن بیمار رہتے ہیں اِس لیے لوگ اُن کا علاج کرنے کے بارے میں سوچنے کو اپنی صحت کے بارے میں سوچنے پر ترجیح دیتے ہیں!

مرزا نے ٹریفک سگنل کی لال پیلی بتّیوں کی طرح جلتے بجھتے ہوئے کہا "تم جیسے لوگ ہی تو یہ ساری باتیں اپنے کالموں کے ذریعے پھیلا رہے ہیں۔ صدر زرداری کی بیماری اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے کام میں بھرپور دلچسپی لیتے ہیں۔ جب کوئی کام نہیں کرتا تو تم جیسے لوگ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں کہ کام نہیں کر رہا۔ اور جب کوئی کام کرنے پر آمادہ ہو تو تم جیسے لوگ 'بجنگ آمد' کے مصداق ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتے ہو کہ خواہ کچھ کرے، وہ کام نہ کرے!"

ہم نے مرزا کی شکایت اور غصہ رفع کرنے کی غرض سے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ صدر کے لیے ہمارے دل میں بھی بہت احترام ہے۔ مگر کیا کیجیے کہ ہمارے احترام سے کچھ نہیں ہوتا۔ صدر کو بُری نظر سے دیکھنے والے بھی بہت ہیں۔ ہم تو اُن کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ

دُبئی میں صدر کے قیام پر یہاں طرح طرح کے افسانے گھڑ لئے گئے۔اِن میں سے بعض افسانے تو ایسے ہیں کہ ذرا سے حسن ترتیب کے ساتھ ڈائجسٹوں میں مہینوں سلسلہ وار کہانی کے طور پر شائع کئے جا سکتے ہیں!

مرزا پھر سیخ پا ہوتے ہوئے بولے "صدر کو تو اِن افسانوں کی کچھ فکر نہیں۔ تم جیسے کالم نگار ہی اِدھر اُدھر سے سُنی ہوئی باتوں کو کالموں میں لکھ کر صدر کے بارے میں بے پَر کی اُڑاتے رہتے ہیں۔ اب اِسی بات کو لیتے ہیں کہ صدر کی واپسی کے بارے میں طرح طرح کی غیر منطقی باتیں کی جا رہی تھیں۔ اور وہ آ ئے ہیں تو سب کو چُپ سی لگ گئی ہے۔ علاج کے لیے ملک سے باہر کون نہیں جاتا؟ کیا میاں نواز شریف علاج کی غرض سے لندن یاترا نہیں کرتے رہتے؟ عمران خان بھی آب و ہوا تبدیل کرنے لندن تک چہل قدمی کرنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اُنہیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا اور صدر اِدھر صدر نے چند دن دُبئی میں کیا گزار لیے قیاس آرائیوں اور تبصروں کا بازار گرم کر دیا گیا!"

جب ہم نے دیکھ لیا کہ مرزا کا سانس پُھول چکا ہے تو موقع غنیمت جانتے ہوئے دِل کی بات زبان پر لانے کی اپنی سی کوشش کی! ہمارا استدلال تھا کہ صدر کو ایک اہم مرحلے پر ملک سے باہر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ سپریم کورٹ اُن سے چند ایک امور میں وضاحت طلب کر رہی ہے تو وہ وضاحت پیش کیوں نہیں کر دیتے؟

یوں اچانک ملک سے چلے جانے پر تو لوگ باتیں ہی بنائیں گے نا!

مرزا نے بولنے کے لیے دوبارہ زبان اور کمر کَستے ہوئے کہا" مولانا فضل الرحمٰن مہینوں ملک سے باہر رہتے ہیں۔ اُن سے کوئی نہیں کہتا کہ جناب! اہم مواقع پر قوم کی نَیا کو کیوں منجدھار کے سہارے چھوڑ کر کہیں بھی چلے جاتے ہو؟ بس ایک صدر صاحب رہ گئے ہیں جن کے جانے پر سب کو اعتراض ہے۔ اور معاف کرنا، قوم کا کیا ہے۔ یہ تو آئے دن نازک موڑ پر کھڑی ملتی ہے۔ اِس قوم کے لیے کوئی کب تک اپنے منصوبے ترک کرے، ارادوں پر عمل موخر کرے؟ اگر قوم کسی رہنما کو بیرون ملک جانے سے روکنا چاہتی ہے تو اپنا چال چلن بھی درست کرے اور اِدھر اُدھر بھٹکنے اور نازک موڑ پر پہنچنے کی روش ترک کرے۔ کوئی کب تک اِس قوم کے مفاد پر اپنے تمام مفادات کو قربان کرتا رہے؟ قربانی دینے کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے!"

ہم نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ قوم کے اعمال کے عوض ہمیں یوں مرزا کی باتیں سُننا پڑیں گی! قریب تھا کہ ہم اپنا سا منہ لیکر رہ جاتے، اچانک ذہن میں بجلی سی کوندی۔ یاد آیا کہ دُبئی سے واپسی پر صدر کا طیارہ کراچی ایئر پورٹ کے بجائے مسرور ایئر بیس پر اُتارا گیا۔ جب ہم نے اِس حوالے سے اپنے تحفظات مرزا کے گوش گزار کئے تو وہ اُنھوں نے دائیں ہاتھ کی چاروں انگلیوں

اور انگوٹھے کو حتّی الوسع پھیلاتے ہوئے ایک مخصوص اشارہ کیا تو عموماً دو معصوم پالتو جانوروں کے لیے کیا جاتا ہے۔ مرزا جب کبھی کسی بات پر لاجواب ہو جاتے ہیں تو اِسی قسم کی عوامی حرکات پر اُتر آتے ہیں۔ ہم نے بُرا ماننے کے بجائے یہ سوچ کر فخر محسوس کیا کہ ہمارا تیر نِشانے پر لگا ہے!

مرزا صدر کے دفاع میں مزید پُرجوش ہو گئے۔ "میاں! اگر صدر کے طیارے نے مسرور ایئر بیس پر لینڈنگ کی تو ذرا اِس نکتے پر بھی غور کرو کہ اِس میں مسرور نمایاں ہے! صدر اِس ملک کی سب سے بااختیار شخصیت ہیں۔ وہ جہاں چاہیں لینڈ کر سکتے ہیں۔ من چاہے رن وے پر لینڈنگ بھی اٹل زمینی حقیقت ہے۔ جہاں بھی فوج کا ذکر آتا ہے، تم لوگ ذہنوں میں شکوک پالتے لگتے ہو۔ بلکہ سچ تو یہ ہے فوج کا ذکر چھڑتے ہیں تمہارے ذہن میں کالم کُلبلانے لگتے ہیں، دِل بَلّیوں اُچھلنے لگتا ہے! بولو، یہی بات ہے کہ نہیں؟"

ہم سوچنے لگے کہ مرزا کو کیا جواب دیں۔ صدر کی واپسی تو امر واقعہ ہے یعنی ایسا ہو چکا ہے مگر دِل ٹُھکتا نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا خدشات کو ذہن سے کیونکر جھٹکیں۔ دِل کے کسی کونے میں کوئی ایک خدشہ موجود ہی رہتا ہے۔ اب صدر واپس آئے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ ایوان صدر کے مرکزی دروازے پر دو ہری مرچیں اور ایک لیموں دھاگے میں پرو کر لٹکا دیں۔ سپریم کورٹ میں معاملات جس

سطح تک جا چکے ہیں اور اب جو کچھ "منتخب" اور "جمہوری" حکومت کے بارے میں سوچا جارہا ہے اُس کے پیش نظر تو ہم جیسے بے اختیار لوگوں کے منہ سے بس یہی نکلتا ہے کہ "شالا نظر نہ لگے!"

صدر نے فی الحال کراچی میں قیام کر رکھا ہے۔ ہم اِسی اُدھیڑبُن میں ہیں کہ نظربٹّو یعنی مرچیں اور لیموں اسلام آباد کے حقیقی ایوان صدر میں ٹانگیں یا پھر بلاول ہاؤس کے صدارتی کیمپ آفس میں! خدا کرے کہ بُری نظر سے بچانے والے لیموں کا رَس اور اِس مُلک کی جیسی تیسی جمہوریت سلامت رہے، برقرار رہے!

بجلی اور جھٹکے

پاور پلانٹ کس کام کے لیے ہوتے ہیں؟ آپ سوچیں گے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، ظاہر ہے کہ بجلی پیدا کرنے کے لیے۔ ہمارے ہاں پاور پلانٹس اب بجلی کم اور تنازعات زیادہ پیدا کر رہے ہیں! اِن سے نکلنے والے ہائی ٹینشن تاروں میں بجلی تو بس رینگتی رہتی ہے، تنازعات البتہ برق رفتاری سے رواں رہتے ہیں! "تو چل، میں آیا" کے مصداق تنازعات میں دوڑ لگتی رہتی ہے! بس نام کو پیدا ہونے والی معمولی سی بجلی کی بہتر ڈسٹری بیوشن ہو نہ ہو، برقی تنازعات خوب پھیل اور پنپ رہے ہیں! یہ طُرفہ تماشا نہیں تو کیا ہے کہ پاور پلانٹس سے حاصل ہونے والی بجلی میں کم اور اِن پلانٹس کے نام پر ہونے والی بندر بانٹ، کھانچے بازی اور سیاست میں زیادہ جھٹکے ہیں! بجلی سے جُڑی ہر چیز، ہر بات، ہر معاملے میں جھٹکا ہے۔ ہائے ری حرماں نصیبی! نصیبوں جلی قوم تو قُربان ہونے کی سعادت سے بھی گئی۔ اب، انداز بدل بدل کر، اُس بے چاری کا جھٹکا کیا جا رہا ہے!

ایک زمانہ تھا جب گلوکارہ ریشماں کی آواز میں لیک تھی، لشکارا تھا۔ جب وہ گاتی تھی تو لوگ اُسی طرح سانس لینا بھول جاتے تھے جس طرح اب بجلی کا بل دیکھ کر "ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم" کی تصویر بن جاتے ہیں! اب بے چاری

ریشماں تو گا کر جادو جگانے کے قابل رہی نہیں مگر ہاں اُس کا ہم نام پاور پلانٹ جادو جگا رہا ہے، خوب لشکارے مار رہا ہے! ریشما پاور پلانٹ کا ڈنکا سپریم کورٹ میں بھی بَجا اور ایسا بَجا کہ میڈیا والوں کے مَن کی مُراد پوری ہوئی یعنی جھٹکے دار اور چٹ پٹی خبریں ملیں۔ سماعت کے دوران سُپریم کورٹ نے بھی کئی مواقع پر حیرت کے جھٹکے کئے۔ بے چاری ریشماں کا ذکر تو کبھی لاکھوں میں بھی نہیں آیا مگر ریشما پاور پلانٹ کو سپریم کورٹ نے ساڑھے چار ارب روپے کی ادائیگی کا حکم دیا!

پاکستان واحد ملک ہے جس میں بجلی دھانسو قسم کا سیاسی اِشو ہے۔ غریبوں کے گھروں میں جگمگاہٹ پیدا کرنے والے قُمقُمے روشن کرنے والی بجلی تو خال خال ملتی ہے، ہاں اِس بجلی کا نام سُن کر اہلِ سیاست کی آنکھوں میں کمیشن کی چمک خوب پیدا ہوتی ہے! اگر تھوڑی محنت کی جائے یعنی ٹیکنالوجی تیار کرنے پر توجہ دی جائے تو بجلی کے نام پر ہونے والی سیاست کے جھٹکوں کو چینلائز کرکے توانائی کا بُحران بہت حد تک حل کیا جاسکتا ہے! پاور پلانٹس میں فرنیس آئل کی جگہ پاور پالیٹکس سے متعلق بیانات اور تحقیقات کی دستاویزات استعمال کی جائیں تو زیادہ اور قوی تر بجلی پیدا کی جاسکتی ہے! ہمیں تو اب وہ وقت زیادہ دُور نہیں لگتا جب بجلی تو رہے گی نہیں، اُس کے نام پر سیاست، تحقیقات اور عدالتی کارروائی رہ جائے گی! اور کون جانے کل کو اِن باتوں کا

!بل بھی قوم کو ادا کرنا پڑے

ہم ہر معاملے میں کرائے دار کی سی سوچ رکھتے ہیں۔ دُنیا بھر سی چیزیں "تھوڑی دیر کے لیے" یا پھر کرائے پر حاصل کرنے کی تگ و دَو کرتے رہتے ہیں اس لیے بجلی پیدا کرنے والے یونٹس بھی کرائے پر حاصل کرنے کی سُوجھی۔ رینٹل پاور کا ایسا ہنگامہ برپا کیا گیا کہ لوگوں کا مینٹل پاور ٹھکانے لگ گیا! جنہیں ہم نے ووٹ دیکر قوم کی خدمت پر مامور کیا ہے وہ بے چارے قوم کے غم میں ایسے بیمار پڑ جاتے ہیں کہ علاج کے لیے باہر جانا پڑتا ہے! یہ غریب رات دن بہبودِ عامہ کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ قوم کے غم میں گھلنے والے اسلام آباد کے چند بالا نشینوں کے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ جس طرح مُلک میں بننے والی اشیاء غیر معیاری ہوتی ہیں بالکل اُسی طرح مُلک میں پیدا ہونے والی بجلی بھی غیر معیاری ہوتی ہے، زیادہ جھٹکے نہیں دیتی! یعنی حکومت کی بدنامی کا باعث بن رہی ہے۔ ایسے میں تجویز پیش کی گئی کہ کیوں نہ بدیسی بجلی کا اہتمام کیا جائے؟ اپنے مُلک میں پیدا ہونے والی بجلی کے معیار سے سبھی ناخوش تھے۔ عوام کی آنکھوں میں بھی اُمید کی چمک پیدا ہوئی کہ بدیسی بجلی شاید اعلیٰ معیار کی ہوگی، ٹی وی زیادہ پاور فُل انداز سے نشریات پیش کیا کریں گے اور چھت کے پنکھے زیادہ تازہ دم ہو کر گرم ہوا کو ٹھنڈی کرکے پھینکا کریں گے! مگر افسوس کہ ایسا کچھ نہ ہوا۔ قوم کے ارمان ایک بار پھر

!آنسوؤں میں بہہ گئے! اور ووٹ ڈالنے والے وفا کرکے بھی تنہا رہ گئے
مُقدر کا سِکندر" میں امتیابھ بچن (سِکندر) نے "اپنے آپ سے خود کلامی" کرتے
ہوئے کہا تھا "نہ موت آتی ہے، نہ تم آتی ہو۔ مگر زُہرہ بائی تم بہت اچھا گاتی ہو!"
زُہرہ بائی کی اداؤں اور ٹُھمکوں کے ہم کبھی شیدائی نہیں رہے۔ وہ سِکندر ہی کو مبارک
ہوں مگر ہاں "نہ موت آتی ہے، نہ تم آتی ہو" شاید ہمارے اور بجلی کے تعلق کے
حوالے سے کہا گیا تھا! حال یہ ہے کہ لوگ رات رات بھر ہاتھ کا پنکھا جُھلتے اور اپنی ہی
آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ شاید علامہ اقبال نے ایسی ہی کسی کیفیت کے حوالے سے کہا
تھا

!ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

ترکی سے منگایا جانے والا پاور پلانٹ کراچی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور قومی خزانے کا
ایک معقول حصہ اپنے اندر ڈبوتا رہا۔ بجلی تو کیا پیدا ہونی تھی، قضیہ پیدا ہوگیا اور پھر اِس
قضیے میں قوم کی محنت کی کمائی کا ایک معقول حصہ ڈوب گیا۔ جو چیز پانی میں تھی وہ
ہماری کمائی کو بھی پانی میں لے گئی۔ پی پی پی کی باکمال حکومت نے ایک نئی روایت کو
جنم دیا۔ جس پلانٹ سے کوئی پروڈکشن ہوئی ہی نہیں اُس کی بھرپور ادائیگی کی جاتی رہی!
یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ہم کسی ریسٹورنٹ میں داخل ہوں اور کچھ کھائے پیے بغیر

صرف بل ہی ادا نہ کریں بلکہ ٹپ بھی دیکر باہر آئیں ! یا پھر کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے اور ہرجانہ ادا کرنا پڑ جائے۔ یعنی کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے !

آپ سوچیں گے ایسا بے وقوف کون ہے کہ کچھ حاصل نہ ہونے پر بھی کچھ ادا کرے؟ آپ کی سوچ درست ہے۔ اگر اپنی جیب سے کچھ ادا کرنا ہو تو کون مائی کا لعل ہے جو ایسی "ریسٹورانہ سخاوت" کرکے دِکھائے ! مگر صاحب ! جب معاملہ قومی خزانے سے ادائیگی کا ہو تو کوئی کیوں پیچھے رہ جائے ! فیض احمد فیض نے کیا خوب کہا ہے

پیو کہ مُفت لگا دی ہے خون دل کی کشید !

قوم کے غریبوں، مُفلِسوں، لاچاروں اور ناداروں کے دِلوں سے خون نچوڑ کر اہل اختیار کے لیے مشروب طرب تیار جائے گا تو نشہ سَر چڑھ کر کیوں نہ بولے گا؟ اگر غریبوں کے خون دِل کی کشید مخمور نہ کرے گی تو بے چاروں کا خون رایگاں جائے گا !

فیض احمد فیض تو بہت وضع دار انسان تھے۔ بُری بات کو بھی سلیقے سے کہنے کا ہُنر جانتے تھے۔ ہم اِن نزاکتوں کے قائل نہیں۔ قوم کا مال ہڑپ کرنے والوں

پر ہم "حلوائی کی دُکان پر نانا جی کی فاتحہ" والی کہاوت چسپاں کرنا پسند کریں گے!
قوم کے بعض بہی خواہ کہتے ہیں کہ مُلک میں پانی سے بجلی پیدا کرنے کی گنجائش ہے،
حکومت چاہے تو توانائی کا بحران تیزی سے حل ہوسکتا ہے۔ ہم اِس تجویز کی حمایت کرنا
حماقت سمجھتے ہیں۔ یار لوگ دودھ پھینٹ کر مکھن وغیرہ نکال لیتے ہیں اور بچے کھچے
سفید پانی میں کیمیکل والا پاؤڈر ملاکر ہمیں دودھ کے نام پر پلاتے ہیں۔ تھوڑا سا غیر
معیاری ہی سہی، اچھا ہے کہ ہمیں جو پانی مل رہا ہے وہ پانی ہی ہے۔ اگر پانی سے بجلی
نکالنے کا سلسلہ چل نکلا تو ہم خالص پانی سے بھی محروم ہو جائیں گے! آپ کو پسند ہو تو
ہو، ہمیں تو بجلی نکالا ہوا پانی بالکل پسند نہیں! اگر بجلی نکالے بغیر پانی فراہم کیا جاتا رہا تو
ہم یہ سوچ کر ہی دِل کو بہلاتے رہیں گے کہ پانی کے ہر گھونٹ کے ساتھ ہم حلق سے
تھوڑی سی بجلی بھی بدن میں اُتار رہے ہیں! اچھا ہے کہ حکومت کو یہ معلوم نہیں ورنہ
پانی کے بل میں power intake charges بھی وصول کرنا شروع کردے گی!
رب سے دُعا کیجیے کہ بجلی کے نام پر سیاست جلد از جلد ختم ہو اور ہمیں خالص غیر سیاسی
بجلی میسر ہو۔ سیاسی بجلی میں توانائی کم اور جھٹکے زیادہ ہیں

جن سے برقی آلات تو خیر کم متاثر ہوتے ہیں، ذہن فلکچویشن کا زیادہ شِکار رہتا ہے۔ یہ جُھٹکے جس تیزی سے قوم کا جُھٹکا کر رہے ہیں وہ دل و دماغ کو ہلانے اور دَہلانے کے لیے کافی ہے۔ ہمارے اختیار میں تو بس یہ دُعا رہ گئی ہے کہ قوم کا جُھٹکا کرنے والوں کا جلد از جلد جُھٹکا ہو تاکہ مایوس ذہن کسی تار اور پلگ کے بغیر بھی تھوڑی سی توانائی پائیں! کبھی کبھی دِل میں یہ دُعا مانگنے کا خیال بھی آتا ہے کہ بجلی رہے نہ رہے، اُس کے نام پر رچایا جانے والا سیاسی ڈراما تو ختم ہو تاکہ دِل کو کچھ سُکون میسر ہو!

نیا سیاسی اسٹال

عمران خان جلسوں کے سونامی میں سب کچھ بہالے جانے کا عزم لیکر ملک بھر میں عوام سے خطاب کر رہے ہیں۔ عمران خان سیاست میں سولہ سترہ سال سے ہیں۔ وہ قوم کو انصاف دلانے کا عزم لیکر گھر سے چلے تھے اور اب بھی اِس عزم پر قائم ہیں۔
نوجوانوں کے جوش اور ولولے کو بنیاد بنا کر کچھ کرنے کی خواہش رکھنے والے عمران خان سے قوم نے اچھی خاصی توقعات وابستہ کرلی تھیں۔ ابتدائی دس بارہ سال تک تو وہ کچھ خاص نہ کر سکے۔ مگر پھر یہ ہوا کہ پرویز مشرف کے دور میں وہ منتخب ایوان یعنی قومی اسمبلی تک پہنچے اور قوم کی رہنمائی کا عزم مزید پختہ ہوا۔ ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچی کہ وہ وزیر اعظم بننے کا خواب دیکھنے لگے یا اُنہیں یہ خواب دکھایا جانے لگا۔ بات حیرت انگیز تھی۔ جس پارٹی کی منتخب ایوان میں صرف ایک نشست ہو (اور اُس نشست پر بھی جتوائے جانے کا گمان ہو!) اور اُس پارٹی کا سربراہ وزیر اعظم بننے کا آرزو مند دکھائی دے تو حیرت ہی ہونی چاہیے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب پرویز مشرف نے عمران خان کو وزیر اعظم بننے کی شاید یقین دہانی بھی کرادی۔ مگر پھر کسی نکتے پر اختلاف ہوا۔ شاید شاطر آمر کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ عمران خان کو کنٹرول کرنا دشوار ہو جائے گا اِس لیے بہتر ہے کہ اُنہیں وزیر اعظم ہاؤس تک نہ لے جایا جائے!

اب پھر عمران خان کے لیے آوے ای آوے کے نعرے لگائے جارہے ہیں۔ جو کچھ پیپلز پارٹی نے چوتھے دور اقتدار میں کیا ہے اُس کی روشنی میں عوام کا دوسری جمہوری قوتوں کی طرف دیکھنا فطری امر تھا۔ نواز لیگ نے فرینڈلی اپوزیشن کا کردار ادا کرکے اپنی مٹی خراب کرلی تھی۔ ق لیگ چونکہ پرویز مشرف کا ٹولہ تھی اِس لیے قوم کا دِل اُس پر نہیں ٹُھکتا تھا۔ ایسے میں لوگ عمران خان کی طرف دیکھنے لگے۔ اور یہ دیکھنا غلط نہ تھا۔ مگر قوم یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ تحریک انصاف ذرا سی دیر میں جمپنگ کیسل کی طرح اُٹھ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ 30 اکتوبر کے جلسے میں عمران خان نے زندہ دلان لاہور کی خاصی بڑی تعداد کو جمع کرکے تہلکہ مچادیا۔ قوم مایوسی کے اندھیروں میں ایسی گِھری ہے کہ اگر کہیں اُمید کی کرن بھی دکھائی دے تو اُسے سورج سمجھ بیٹھتی ہے۔ تحریک انصاف کے معاملے میں بھی یہی ہوا ہے۔ اور جب ملک کے اندھیروں اور اجالوں پر تصرف رکھنے والی قوتوں نے دیکھا کہ ایک ایسا بندہ میسر ہے جو ابھی آزمایا نہیں گیا اور قوم اندھا اعتماد کرنے کو تیار ہے تو اُسے اپنا بنالیا۔ لاہور کے جلسے سے یہ بات کُھل کر سامنے آگئی کہ کپتان کو سیاسی کرکٹ بورڈ کے ارباب بست وکشاد کا بھرپور اعتماد حاصل ہے! یہ بات جب عوام سمجھ سکتے ہیں تو سیاست کے دشت کی خاک چھاننے والے کیا نہیں سمجھیں گے؟ ظاہر سمجھنے والے سمجھ گئے اور ایسا کوئی نہیں بچا جس کے بارے میں کہا جائے کہ نا سمجھے وہ

اناڑی ہے!

سال قبل جنرل ضیاء الحق نے سندھ میں پیپلز پارٹی کا زور توڑنے کے لئے مہاجر 26 قومی موومنٹ (موجودہ متحدہ قومی موومنٹ) کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ آج پیپلز پارٹی اور نواز لیگ دونوں کو کمزور کرنے کے لیے تحریک انصاف کی پُشت پناہی کی جا رہی ہے۔ پردے کے پیچھے رہ کر کام کرنے والی مُقتدر قوتوں نے تحریک انصاف کی شکل میں ایک اسٹال لگایا ہے جس سے سیاسی ضرورت مند اپنی اپنی حیثیت کے مطابق خریداری بھی کر سکتے ہیں اور کوپن پُر کرکے من چاہا انعام بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ قوم کو کچھ نیا چاہیے۔ اگر یہ کچھ نیا قوم کی اپنی مرضی اور کوشش سے ہو تو اچھا ہے۔ اگر کہیں سے ارینج کرکے دیا جائے گا تو کسی بھی طرح قوم کی مرضی کا یا اُس کے مفادات کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا۔

کراچی میں عمران خان کا جلسہ اس اعتبار سے ایک خوش آئند امر تھا کہ جو لوگ شہر کے عمومی سیاسی کلچر سے ہٹ کر کچھ کرنا چاہتے ہیں اُنہیں ایک پلیٹ فارم ملے گا۔ جو لوگ متحدہ سے ناراض ہیں وہ تحریک انصاف کی چھتری تلے جمع ہو سکیں گے۔ اِس شہر میں ایسے طبقات ہیں جو اپنا الگ پلیٹ فارم چاہتے ہیں۔

مشکل صرف یہ ہے کہ اِس بار بھی سیاسی تبدیلی یا جمہوری انقلاب کے نام پر جو کچھ دکھائی دے رہا ہے وہ محض آنکھوں کا دھوکا ہی ہے۔ مُلک تبدیلی چاہتا ہے۔ تبدیلی لانے کے لیے جو حالات تحریک اور ترغیب کا کردار ادا کرتے ہیں وہ بھی موجود ہیں۔ نئی نسل بھی ہے اور اِس میں بھرپور جوش و جذبہ بھی ہے۔ ایسے میں اگر انقلاب برپا ہو تو ہر مظلوم اُس پر آمنا و صدقنا کہے گا۔ دُکھ کی بات یہ ہے کہ انقلاب برپا نہیں ہو رہا، منعقد کیا جارہا ہے!

عمران خان قوم کی امیدوں کا مرکز ہیں۔ وہ عمر کے ایسے مرحلے میں ہیں کہ بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ نظم و ضبط اُن کی زندگی کا حصہ رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ جب کسی بڑے منصب پر فائز ہوں تو معاملات کو کسی حد تک درست بھی کر جائیں۔ اہم سوال یہ ہے کہ ہم کیسے یقین کرلیں کہ "سرپرستی" کا یقین ہو جانے پر جو سیاسی عناصر عمران خان کی چھتری تلے جمع ہو رہے ہیں وہ اپنے مفادات کی قربانی دینے پر رضامند ہو جائیں گے؟ تحریک انصاف کی اپنی بُنیاد تو مضبوط نہیں۔ پکی سیٹوں والے بھی عمران خان سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ یہ لوگ قومی اسمبلی یا سینیٹ تک اپنے بَل پر پہنچ جاتے ہیں۔ آج بھی تحریک انصاف ملک بھر میں اپنے بل پر محض چند نشستیں جیت سکتی ہے۔ یہ سارا میلہ تو اِس لیے لگا ہوا ہے کہ دُلہن کسی وجہ سے پیا کے من بھا گئی ہے! اُوپر سے آشیر واد لیکر عمران خان اقتدار کے ایوان تک تو پہنچ جائیں گے مگر اُن سے کسی بڑی تبدیلی

کی اُمید کیونکر وابستہ کی جا سکتی ہے؟ جو لوگ دوسروں کے ساتھ اقتدار کے مزے لوٹتے رہے ہیں وہ اب، اِشارے اور گرین سگنل پا کر، تحریک انصاف کی چھتری تلے جمع ہو رہے ہیں۔ اِتنے سارے لوگوں کے دِل راتوں رات کس طرح پلٹ سکتے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو قومی اسمبلی یا سینیٹ تک اپنے بل پر پہنچتے ہیں۔ ان کے اپنے اپنے ووٹ بینک ہیں۔ تحریکِ انصاف اِن کے لیے محض پلیٹ فارم ہے، ووٹ بینک نہیں۔

مُلک کو برپا ہونے والے، فِطری انقلاب کی ضرورت ہے۔ منعقد کیا جانے والا انقلاب سَراب سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ عمران خان خود بھی اِس لہر کو سونامی کہتے آ رہے ہیں۔ سونامی تو سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔ قوم ایسا نہیں چاہتی۔ کچھ نہ کچھ تو باقی رہنا چاہیے۔

ایک اور کیری پیکر سرکس

پاکستان کی سیاسی بساط پر ایک بار پھر وہی کھیل کھیلا جارہا ہے جس نے ہمیشہ صرف مسائل کو جنم دیا ہے۔ دس سال بعد بحال ہونے والی جمہوریت اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والی ہے۔ پرویز مشرف کے دور میں "منتخب" اداروں نے اپنے مینڈیٹ کے مطابق پانچ سال مکمل کئے تھے۔ اب کے بساط چار سال پورے ہونے سے پہلے ہی لپیٹے جانے کے آثار ہیں۔

مرزا تفصیل بیگ بہت پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ اُنہیں جمہوریت کی اُتنی فکر نہیں جتنی اپنے خدشات کے درست ہونے کی ہے۔ کئی ہفتوں سے وہ ڈرائنگ روم کے ٹاک شوز کو طرح طرح کے خدشات سے دہلاتے آئے ہیں۔ مرزا کو تو بس پریشان ہونے کا بہانہ ہونے کا۔ کہیں سے کوئی بیان آیا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اور پھر جب وہ اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہیں تو سُننے والے سر تھام لیتے ہیں!

مرزا جوان تو نہیں مگر پھر بھی اُنہیں عمران خان سے عقیدت آمیز محبت ہے۔ کپتان صاحب جب بھی خطاب کرتے ہیں، مرزا چاچا کرکٹ کے سے والہانہ انداز سے ہاتھ ہلاتے اور داد دیتے ہیں۔ مگر کچھ دنوں سے مرزا کی ذہنی حالت خطرناک

ہو گئی ہے۔ وہ عمران خان کو ٹی وی پر دیکھ کر بھی اپنی جگہ سے ہلتے نہیں، بس گم سم سے بیٹھے رہتے ہیں۔ گھر والے جب بھی اُنہیں پسندیدہ شخصیت سے بے رُخی برتتے دیکھتے ہیں، سہم جاتے ہیں!

عمران خان اور اُن کی پارٹی پاکستانی سیاست میں اِس وقت سُنامی بن کر سب کچھ بہالے جانے کے موڈ میں دکھائی دیتے ہیں۔ دُنیا تو خیر بعد میں حیران ہوگی، خود اہل وطن کی حیرت ہے کہ ختم تو ختم، کم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ اقتدار کا ایسا تھال سجایا جا رہا ہے جس میں طرح طرح کے حلوے ہیں، اہل سیاست کے جلوے ہیں۔ مگر اندر ہی اندر بلوے ہیں! جن کے بارے میں چینلز ہرزہ سرائیاں کرتے نہ تھکتے تھے وہی اب نور نظر ہیں۔ جن میں کہیں سے کوئی اچھائی دکھائی نہ دیتی تھی وہ اب تمام بُرائیوں سے پاک، مُبرّا اور مُستثنٰی قرار پائے ہیں۔

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا!

صورت حال کے تناظر میں اِس مصرع میں "بتدریج" بے محل دکھائی دیتا ہے۔ اب تو سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ جسے جو بھی سرٹیفکیٹ ملنا ہے، آن کی آن میں ملنا ہے!

تحریک انصاف نے جب انصاف کا غلغلہ بلند کیا تھا تب قوم کے جوانوں کی آنکھوں میں اُمید کی چمک پیدا ہوئی تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی؟ عمران خان نے کرکٹ کے میدان میں شاندار قیادت کی تھی۔ توقع تھی کہ سیاست کے میدان میں بھی شاندار قیادت کریں گے اور قوم کی کشتی کو پار لگائیں گے۔

عمران خان نے ایک کینسر ہسپتال شاندار انداز سے چلا کر دکھایا ہے۔ یہ تو واقعی قابل تحسین بات ہے۔ مگر مُلک چلانا اور بات ہے۔ اور ملک بھی وہ جس میں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو۔ عوام جنہیں منتخب کرتے ہیں وہ کرپشن کا بازار بھی گرم کرتے ہیں۔ مگر خیر، اِس کرپشن کے خلاف رائے دینا عوام ہی کا حق ہے۔ کوئی کھڑا ہو کر یہ کہنے کا حقدار نہیں کہ مُلک اُس کے ہاتھ میں دے دیا جائے، وہ سب کچھ درست کردے گا! اور پھر مُلک اُس کے حوالے کرنے کے آثار بھی ہویدا ہوتے جائیں! یہ عوام کے مینڈیٹ پر ڈاکہ ڈالنے ہی کی دوسری شکل ہے۔

دو ڈھائی ماہ کے دوران عمران خان تمام صداقت ناموں اور یقین دہانیوں سے لَیس ہو کر میدان میں اُترے ہیں۔ جو لوگ پاکستانی سیاست میں اسکرپٹنگ کا رونا روتے ہیں وہ کچھ غلط نہیں کرتے۔ تحریک انصاف میں بڑوں کی شمولیت کوئی راتوں رات رُونما ہو جانے والی تبدیلی نہیں۔ سب کچھ چار چھ ماہ قبل طے

ہو چکا ہو گا اور اب سیاسی اداکار اسکرپٹ کے مطابق اپنے اپنے حصے کی اداکاری کر رہے ہیں۔ اور بے چارے عوام ایک بار پھر تماشائی ہی کا کردار ادا کرنے پر مجبور ہیں۔

یہ انقلاب کی آمد تو نہیں، انعقاد ضرور ہے۔ انقلاب ہدایات پر عمل کرنے سے نہیں، صرف جوش اور جذبے پر عمل کرنے سے آتا ہے۔ خدشہ یہ ہے کہ آصف زرداری اور اُن کے رُفقاء سے نجات پانے کی کوششیں ملک میں جمہوریت ہی کی بساط لپیٹ نہ دیں۔ جن سیاسی جماعتوں کی، جیسے تیسے، ایک بنیاد اور پوزیشن ہے اُنہی کو اگر اقتدار ملے تو بات ہے۔ یہاں تو بندوبست ہو رہا ہے۔ جس طرح ملک میں بندوبستی علاقے ہیں اُسی طرح اب بندوبستی سیاست کا بھی اہتمام کیا جارہا ہے!

کاندھوں پر سوار ہو کر آنے کی روایت پاکستان میں نئی نہیں۔ مگر جو لوگ کاندھوں پر سوار ہوتے تھے اُن کی بہر حال ایک حیثیت تو ہوتی تھی۔ اب جس روشن انداز سے تحریک انصاف کا چراغ روشن کیا جارہا ہے وہ لوگوں کو شکوک و شبہات کے اندھیروں میں دھکیلنے کے لیے کافی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ شکوک و شبہات کی منزل پیچھے رہ گئی ہے۔ اب لوگ یقین کے نزدیک ہیں۔ روزانہ پرائم ٹائم میں سیاسی ٹاک شو دیکھنے والا عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ پاکستان

میں سیاسی ورلڈ الیون تیار کی جارہی ہے۔ اپنی ٹیم بنانے میں اور اِدھر اُدھر سے کھلاڑی جمع کرکے ٹیم پیش کرنے میں بہت فرق ہے۔ یہ فرق، ظاہر ہے، عمران خان بھی سمجھتے ہی ہوں گے۔ جس کیری پیکر کے لیے عمران نے کبھی کرکٹ کھیلی تھی اُسی کا انداز اختیار کرکے وہ اب سیاسی میدان کے کیری پیکر بن گئے ہیں۔ ملک کی مختلف سیاسی ٹیموں کے اہم کھلاڑی کسی نہ کسی طرح توڑ تو لئے گئے ہیں مگر اِس سے سیاست میں جو خرابیاں پیدا ہوں گی وہ اظہر من الشمس ہیں۔ جب عمران نے ظہیر عباس، مشتاق محمد، ماجد خان اور آصف اقبال کے ساتھ مل کر کیری پیکر سرکس میں شمولیت اختیار کی تھی تب پاکستانی ٹیم کا جو بھی حشر ہوا تھا اُس کے ذمہ دار یہ پانچوں کرکٹرز بھی تو تھے! اب اگر سیاسی کیری پیکر سرکس منعقد کیا جارہا ہے تو جوتوں میں دال بٹنے کی روایت کے مستحکم تر ہونے اور اقتدار کے لیے زیادہ ہوس کا مظاہرہ کئے جانے کا الزام کس کے سر جائے گا؟

جن لوگوں پر اقتدار پرست ہونے کا الزام عائد کیا جاتا رہا ہے یا جو کرپٹ کہلانے والے ٹولے کے ساتھ ساتھ رہے ہیں اُنہی میں سے بہتوں کو تحریک انصاف کے پلیٹ فارم پر جمع کیا جارہا ہے۔ یہ بھی کم عجیب بات نہیں۔ جو پارٹی کرپشن ختم کرنے کا عزم لیکر میدان میں اُتری تھی اُسی کو اِدھر اُدھر کے بظاہر پرست عناصر کا گڑھ بنایا جارہا ہے۔
دوست بنانے کے بجائے دُشمن کے

!دُشمن کو دوست اور اتحادی بنا کر اپنے ساتھ ملانا کچھ نہ کچھ گل تو کِھلا کر ہی دم لے گا
تحریک انصاف کو جمپنگ کیسل کی طرح تیار کرکے سیاسی میدان میں اتارا جارہا ہے۔
جب تک ہَوا ہے تب تک کیسل برقرار ہے۔ جو لوگ کودنے کے لئے پَر تول رہے ہیں
اُن کا بوجھ یہ جمپنگ کیسل کب تک برداشت کر پائے گا؟

مرزا تفصیل بیگ عمران کے فین رہے ہیں۔ اب بھی ہیں مگر اب اُن کے پرستانہ جوش و جذبے میں کچھ ڈینٹ سا پڑگیا ہے۔ سیاسی کبوتر جس تیزی سے آ آکر عمران کے چھجّے پر بیٹھ رہے ہیں وہ مرزا کے لیے استعجاب اور استفہام کو مُرقّع ہے! اب اگر سیاسی بحث کی دعوت دیجیے تو مرزا قدرے غیر دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں عمران خان کا ذکر شامل کرکے اُن کی ستائش کو فرض سے زیادہ حق سمجھتے تھے۔ اب حالت یہ ہے کہ کسی نہ کسی طور بحث کا رُخ بدل کر اُس عمران خان کے تذکرے سے دور لے جانا چاہتے ہیں۔ ہم نے دو ایک مرتبہ کہا کہ مرزا! جب گنگا صحیح معنوں میں بہنے پر آئی ہے اور یار لوگ اس میں اشنان کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں تب آپ اِس سے دور ہوتے جارہے ہیں! اِس پر مرزا کچھ کہہ تو نہ سکے، ہاں اُن کی آنکھیں تَر ہوتے ہوتے رہ گئیں! آنکھیں تو اُن کی بھی تَر ہیں جو تحریک انصاف کی ٹرین میں

!سوار ہونے میں کامیاب ہوئے ہیں مگر خیر، یہ خوشی کے آنسو ہیں
مرزا تفصیل بیگ عمران اور تحریک انصاف سے بدگمان ہونے والے تنہا پرستار نہیں۔ پندرہ سال تک ساتھ نبھانے والے کئی جاں نثار قسم کے مرزا تحریک انصاف چھوڑ چکے ہیں۔ عمران خان کو اُن کی چنداں پروا نہیں۔ لیڈر اِسی طرح آگے بڑھا کرتے ہیں۔
!راستے کی ہر چیز اِس قابل نہیں ہوتی کہ اُسے دیکھا جائے، توجہ دی جائے
مرزا تو خواہ مخواہ بد دل اور بدگمان ہو رہے ہیں۔ تحریک انصاف کے پلیٹ فارم سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ کون سی نئی بات ہے؟ ہمارے ہاں کب ایسا نہیں ہوا؟ جنہیں عوام نے التفات کے قابل نہیں سمجھا اُنہیں مینڈیٹ دلانے کا اہتمام کب نہیں کیا گیا؟ جنہیں عوام نے اپنے اعتماد سے نوازنے کی زحمت گوارا نہ کی ہو اُنہیں بھرپور تیاری کے ساتھ اقتدار کی مسند تک کب نہیں پہنچایا گیا؟ یہ سب ہونا ہے اور ہوتے رہنا ہے۔ ہم عوام تو بس حیرت زدہ رہ جانے کے لیے رہ گئے ہیں۔ اور وہ وقت اب شاید زیادہ دور نہیں جب
!کسی بات پر حیرت میں مبتلا ہونے کی روش متروک کہلائے گی

کہاں اسکول؟ کہاں ذہانت؟

تحقیق اور محققین سے ہمیں چڑ، بلکہ خدا واسطے کا بیر ہے۔ قریبی حلقے کہتے ہیں کہ اُصولی طور پر تو ہمیں تحقیق اور محققین سے الرجی ہونی نہیں چاہیے کیونکہ جب بھی کسی نئی تحقیق کے نتائج سامنے آتے ہیں تو ہمیں اپنی لاعلمی (یا جہالت) پر خواہ مخواہ رشک آنے لگتا ہے! اور یوں ہم مزید کچھ سیکھنے کے ارادوں کو پھر "بالائے طاق کے اُوپر" رکھ دیتے ہیں! اگر تحقیق کا بازار یونہی گرم رہا تو ہم کبھی کچھ سیکھنے کے معاملے میں سنجیدہ نہ ہوں گے!

ناروے میں سرکاری تحقیق کے ذریعے انکشاف کیا گیا ہے کہ جو بچے اسکول میں زیادہ وقت لگاتے ہیں ان کے آئی کیو میں چار پوائنٹ تک اضافہ ہو جاتا ہے۔ ناروے کی نیشنل اکیڈمی آف سائنسز نے ایک لاکھ سات ہزار طلبا اور طالبات کے کیسز کا جائزہ لینے کے بعد بتایا ہے کہ جو بچے اسکول کو معمول سے زیادہ وقت دیتے ہیں وہ ذہانت کی دوڑ میں آگے نکل جاتے ہیں۔ 1955 سے 1972 تک اسکولوں میں طلباء کے تعلیمی مدت میں دو سال بڑھائے گئے۔ اس کے نتیجے میں بچے اسکول کی تعلیم سے 14 کے بجائے 16 سال میں فارغ ہونے لگے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ محققین اِس نکتے پر متفق نہیں ہو سکے کہ اسکول میں وقت زیادہ دینے سے بچوں

میں ذہانت پیدا ہوتی ہے یا ذہین بچے اسکول کو زیادہ وقت دیتے ہیں!
ناروے کے محققین نے بہت دیر کر دی۔ اُستادِ محترم رئیس امروہوی کے بارے میں مشہور ہے کہ اُنھوں نے رَسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی یعنی کسی اسکول کا مُنہ تک نہ دیکھا تھا۔ اگر اسکول میں زیادہ وقت دینے سے ذہانت میں اضافے کا انکشاف اُن کے جیتے جی ہو جاتا تو شاید وہ بھی کسی اسکول میں داخلہ لیکر تھوڑی بہت ذہانت اپنے اندر پیدا کر لیتے۔ کسی اسکول یا مدرسے سے رسمی تعلیم پائے بغیر رئیس امروہوی صاحب نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اب اُن پر شک ہوتا ہے کہ وہ ذہانت کا شاہکار قرار دیئے جاسکتے ہیں یا نہیں! باقاعدگی سے اسکول جانے بلکہ جاتے رہنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے اِس کا ہمیں کچھ بھی اندازہ نہیں (کیونکہ ہم اِس مرحلے سے کبھی نہیں گزرے!) مگر رئیس امروہوی صاحب کے کیس میں یہ ضرور ثابت ہوا کہ اسکول سے دور رہنے کی صورت میں انسان شاعری کرتا ہے، دانش کے موتی بھی بکھیرتا ہے، کالم نگاری بھی کرتا ہے، ہپناٹزم کا ماہر بھی بن جاتا ہےاور نفسیات و مابعدِ نفسیات کے موضوع پر جامع اور موثر مضامین بھی سُپردِ قلم کر بیٹھتا ہے! جب بھی ہم کراچی پریس کلب میں ساتھیوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہیں تو اُن میں سے بیشتر کی "علمیت" دیکھ کر خیال آتا ہے کہ کم از کم کوئی اسکول جوائن نہ کرنے کی حد تک تو وہ رئیس امروہوی صاحب کے ہم پلّہ قرار دیئے جاسکتے ہیں!

اسکول کی تعلیم پر ویسے بھی ہمارا کبھی کچھ زیادہ اعتقاد نہیں رہا۔ ڈھنگ سے جینے کے انداز اور زمانے سے ہم آہنگ ہونے کے اطوار سیکھنے کے لیے والدین نے کسی نہ کسی طرح ہمیں پاک ماڈرن کالونی کے شائننگ اسٹار اسکول میں داخل تو کیا تھا مگر خیر گزری کہ ہم نے اسکولی تعلیم کو زیادہ اہمیت نہ دی اور چمکتا ہوا نصابی ستارہ بننے سے باز رہے! ہم نے اسکول کے زمانے میں ہمیشہ خط کو تار سمجھا، آدھے کو پورا جانا، ہاف ٹائم کو ہمیشہ فُل ٹائم کا درجہ دیا یعنی ہاف ٹائم کی گھنٹی بجتے ہی رفو چکر ہو جایا کرتے تھے۔ اگلے دن کلاس ٹیچر کے سامنے پیشی پر ہم ہاف ٹائم میں بھاگنے کے حوالے سے ایسے شاندار بہانے تراشا کرتے تھے کہ اب بچپن کی ذہانت پر رشک آتا ہے! اِس بہانہ تراشی نے ہم میں سوچنے کے عمل کو تحریک دی اور ہم وہ سب کچھ سوچنے کے قابل ہوئے جسے صحافت میں لازمی صلاحیت کا درجہ حاصل ہے!

اسکول سے روزانہ "ٹُلّا" مارنے کی عادت ہی نے ہم میں صحافیانہ جراثیم پیدا کئے اور ہم لکھنے لکھانے کی طرف آئے۔ ہاف ٹائم میں اسکول سے بھاگ کر ہم بڑا بورڈ کے نزدیک چمن سنیما میں میٹینی شو دیکھا کرتے تھے۔ فلمیں دیکھ دیکھ کر ہم نے ایسے بہت سے مکالمے یاد کرلیے جو اب کالم نگاری میں بہت کام آتے ہیں! شکر ہے کہ ہم پنجابی فلمیں زیادہ نہیں دیکھتے تھے ورنہ آج ہمارے کالم میں

مزاح کم اور بڑھک زیادہ ہوتی اور ہمارے کالم کے "حسن" پر قارئین بے ساختہ نثار ہو جاتے!

ایسا نہیں ہے کہ اسکول سے ٹُلّا مار کر صرف چمن سنیما کا رخ کرنے ہی سے ہمارے دل و دماغ کے گلشن میں بہار آتی تھی۔ کبھی کبھی آب و ہوا تبدیل کی خاطر اور ضمیر کی خلش کو کچھ کم کرنے کے لیے ہم ناظم آباد ڈاک خانے کے پہلو میں واقع عثمانیہ لائبریری کا چکر بھی لگا لیتے تھے۔ وہاں دو تین اخبارات پر نظر ڈال کر اور بچوں کا ایک آدھ رسالہ پڑھ کر دِل کو یہ کہہ کر بہلانے کا موقع مل جاتا تھا کہ اسکول سے ہاف ٹائم میں بھاگ کر ایک آدھ ڈھنگ کا کام بھی کیا ہے!

پوری باقاعدگی سے اسکول جانے اور فل ٹائم کی گھنٹی بجنے پر باہر آنے والوں کو ہم نے لگی بندھی زندگی بسر کرتے ہی دیکھا ہے۔ مگر خیر، یہ بھی غنیمت ہے۔ اگر اسکول میں پڑھاکو بچے نہ ہوا کریں اور فل ٹائم بیٹھ کر ڈھنگ سے بہت کچھ سیکھنے والے کم ہوں تو دفاتر کو بابو لوگ کہاں سے ملیں؟

کالم لکھتے لکھتے خواہ مخواہ سوچنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ اِسی عادت سے مجبور ہو کر ہم نے اکثر سوچا ہے کہ اگر اسکول میں پوری توجہ اور زیادہ وقت

دینے سے بچوں میں زیادہ ذہانت پیدا ہوتی ہے تو پھر ہر کلاس میں دو دو سال گزارنے والے بچے زیادہ ذہین ہونے چاہئیں ! اِس خیال کا اظہار ہم نے اپنے ایک ٹیچر دوست کے سامنے کیا تو اُنھوں نے چند انتہائی "عالمانہ" الفاظ سے ہمارے خیالات کو "خراج تحسین" پیش کرکے اسکول میں زیادہ وقت گزارنے سے پیدا ہونے والی شاندار ذہانت کا مظاہرہ کیا! ویسے اسکولوں میں سب سے زیادہ وقت تو خود اساتذہ گزارتے ہیں۔اِس نکتے پر اب تک تحقیق نہیں ہوئی کہ اسکولوں میں زندگی بسر کرنے سے اساتذہ کی ذہانت میں اضافہ ہوتا ہے یا نہیں!

ایسا کروگے تو کون "جائے" گا!

بھولنے کی بیماری کے سو فائدے ہیں۔ اگر انسان گزرے ہوئے زمانے کو بھول نہ پائے تو جینا عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ ہمیں یاد ہی نہیں کہ جب ٹی وی چینلز کی بہتات نہیں تھی تب ہم شام سات سے رات گیارہ بجے تک کیا کر پاتے تھے! اگر ایک دن ٹاک شو نہ دیکھیں تو لگتا ہے کہ کئی زمانے گزرے بغیر ہم میں سے گزر گئے ہیں!

سُنا ہے کسی زمانے میں پاکستانی معاشرہ بہت پُرسکون تھا اور ہر چیز اپنے مقررہ یا موزوں ترین مقام پر تھی۔ جب سے قتل و غارت کا چلن عام ہوا ہے، ہم ماضی کے سکون کو بھول بھال گئے ہیں۔ اب اگر وہ زمانہ یاد بھی آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے ہم کسی نئی دُنیا میں ہیں اور جو زمانہ ہم پر گزرا وہ کوئی اور ہی دُنیا تھا!

ذرا ترقی یافتہ معاشرے کی "پستی" ملاحظہ فرمایئے۔ اٹلی کے جزیرے لپاری میں 56 سال بعد قتل کی واردات ہوئی ہے۔ ہوٹل میں صفائی کا کام کرنے والی 62 سالہ یوفیمیا بیویانو کو کسی نے گردن میں خنجر کے وار کرکے قتل کیا۔ جزیرے

کے میئر میریانو بروتو کہتے ہیں "10 ہزار سے زائد آبادی والے جزیرے میں قتل کی واردات نے لوگوں کو خوفزدہ کردیا ہے۔ کل تک لوگ گھر کے دروازے کھلے رکھ کر سونے میں باک محسوس نہیں کرتے تھے اور گاڑی کی اگنیشن میں چابی چھوڑ کر خریداری کرنے چلے جایا کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب وہ دُنیا ختم ہو گئی ہے!"

لپاری دراصل تفریحی مقام ہے۔ اٹلی کے علاوہ یورپ بھر سے متمقل افراد تعطیلات گزارنے لپاری میں پدھارتے ہیں۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اِس جزیرے پر اِس قدر سُکون کیوں ہے! جو دوسروں کا استحصال کرکے اپنی تجوریاں بھرتے ہیں اُن کے آرام کی جگہ کو تو پُرسُکون ہی ہونا چاہیے۔ سانپ کتنی ہی ٹیڑھ دکھائے، کتنے ہی بَل کھا کر چلے مگر اپنے بل میں سیدھا جاتا ہے!

لپاری کے میئر تو "بے فضول" میں جذباتی ہو گئے! ہمیں دیکھیے کہ موت کا بازار گرم دیکھتے ہیں اور ہماری کوئی دُنیا ختم نہیں ہوتی! اور خوف؟ کیسا خوف؟ مارنے والے ڈرتے ہیں نہ مرنے والے۔ اگر "شجاعت" یہ نہیں تو پھر کیا ہے؟

سُنتے آئے ہیں کہ ایک نُقطہ "محرم" کو "مُجرم" کر دیتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسا ہوتا ہوگا۔ اٹلی کا تو یہ حال ہے کہ ہمارے قومی مزاج کا آئینہ بن کر دُنیا

کو دَہلانے والے "لیاری" میں نُقطہ بڑھا کر "لپاری" بنالیا اور ایک ایسی دُنیا آباد کر لی جس میں سُکون اور سُکوت ہے۔

کسی ریسٹورنٹ کے قریب نالی میں دو لال بیگ غلاظت تناول فرماتے ہوئے گپیں بھی ہانک رہے تھے۔ ایک بولا "ذرا دیکھو تو سامنے ریسٹورنٹ کتنا صاف سُتھرا ہے، فرش کس قدر چمک رہا ہے۔ یہ چمک میری آنکھوں میں چُبھ رہی ہے۔"

دوسرے نے کہا "رہنے دو یار۔ کھاتے وقت ایسی گندی باتیں نہیں کیا کرتے!"

ہم جس دُنیا میں جی رہے ہیں وہ قتل و غارت اور خون خرابے کی عادی ہے۔ جو کلچر لپاری نے دیا ہے وہ آج کی دُنیا کے لیے بہت خطرناک ہے۔ اگر ہر معاشرے نے یہی چلن اپنا لیا تو؟ قتل و غارت ختم ہو گئی تو؟ لپاری کے لوگو! یہ کیا غضب کرتے ہو کہ مرتے ہو نہ مارتے ہو! ایسا کرو گے تو کون آئے گا.... بلکہ (دُنیا) سے کون "جائے" گا؟

اٹلی کے بارے میں تو سُنا ہے کہ اُس کے چپے چپے پر مافیا کا راج ہے۔ دُنیا بھر میں انڈر ورلڈ کی کوئی مثال دینا ہے تو ذہن کے پردے پر سب سے پہلے اٹلی کا نام اُبھرتا ہے۔ اور اٹلی ہی میں ایک ایسا جزیرہ جو قتل و غارت سے دور

! بھاگتا ہے ! یہ جزیرہ تو اٹلی کی ساکھ کو نقصان پہنچانے کی سازش معلوم ہوتا ہے
ہم تو یہ سوچنے سے قاصر ہیں کہ کسی قتل، ڈکیتی، چھینا جھپٹی، چوری چکاری اور دنگے
! فسادکے بغیر لیاری کے لوگ کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں

کراچی سے ایک صاحب آب و ہوا تبدیل کرنے کی خاطر مری گئے۔ مگر حیرت انگیز طور پر تین چار دن میں اُن کی حالت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹرز نے معائنہ کیا تو اُن کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اُن صاحب نے دو دن دوا کھائی مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ مایوس ہو کر بوریا بستر لپیٹا اور کراچی واپس آ گئے۔ تبت سینٹر کے چوراہے پر رش آور میں کچھ دیر لمبے اور گہرے سانس لیے، گاڑیوں سے نکلنے والی تازہ "آکسیجن" پھیپھڑوں میں گئی تو کچھ ہی دیر
! میں طبیعت بحال ہو گئی

ہمارے نفسیاتی پھیپھڑوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ ہم خون خرابے کے ایسے عادی ہو چکے ہیں کہ خون کا رنگ نہ ہو تو زندگی بے رنگ دکھائی دیتی ہے ! ڈاکے، لوٹ مار اور چوری کی وارداتیں نہ ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی میں کیا معنویت ہے ! اگر لیاری کا کلچر ہمارے ہاں عام ہوگیا تو زندگی کا کاروبار

کیسے چلے گا؟ اگر قتل کی وارداتیں کم ہو گئیں تو ہمارے میڈیا کیا کریں گے ؟ سیاست دانوں کے پھڈے ختم ہو گئے تو ٹاک شوز کی گرم بازاری ختم ہو جائے گی ؟ خالی جیب اور خالی پیٹ ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر سیاسی مُرغوں کی لڑائی دیکھنے والے غُرباء کروڑوں، اربوں کی کرپشن کا احوال کس طور جان پائیں گے ؟

ہم تو کہتے ہیں اٹلی والے اب لیاری کو لیاری انتظامیہ کے حوالے کر دیں تاکہ زندگی میں کچھ تو رنگ اور معنویت پیدا ہو، کچھ تو ورائٹی نمودار ہو ! یہ کیا بھیڑ چال کی سی زندگی بسر کی جا رہی ہے۔ لیاری کے مکین سوچیں تو سہی کہ زندگی یونہی بسر کر کے دُنیا سے گئے تو اعمال نامے میں کیا ہو گا؟

"کائنات کا سب سے بڑا" معمہ

تحقیق کا بازار کچھ اِس ادا سے گرم ہے کہ اب ہمیں کچھ زیادہ ہی تپش محسوس ہونے لگی ہے! مغربی دنیا پتہ نہیں کیا ثابت کرنا چاہتی ہے۔ آئے دن طرح طرح کی بے ڈھنگی تحقیق کا احوال پڑھ اور سُن کر ہم تو بے حال ہوئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر تحقیق کے نتائج خبروں، مقالوں اور کتابوں کی شکل میں اِسی رفتار سے سامنے آتے رہے تو ہم جیسے نام نہاد مزاح نگاروں کی تو واٹ لگ جائے گی! جب لوگوں کو تحقیقی منصوبوں کے نتیجے میں "مستند" مزاح آسانی سے ملتا رہے گا تو روایتی مزاح پڑھنے کی زحمت کون گوارا کرے گا!

.برطانیہ نے دو صدیوں تک دنیا پر حکمرانی کی ہے اِس لیے ہم مزاحیہ تحقیق کی دُنیا پر حکمرانی کا حق بھی اُسی کو دیتے ہیں۔ گورے رات دن یہ ثابت کرنے میں جُتے رہتے ہیں کہ جن موضوعات کے بارے میں لوگ بہت کچھ جانتے ہیں اور سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے اُن پر تحقیق کرکے دنیا کو ہنسنے کا سامان فراہم کیا جاسکتا ہے!
مرزا تفصیل بیگ کی زندگی میں سبھی کچھ تفصیل سے ہے۔ وہ جب کسی بات کو

اختیار کے ساتھ بیان کرتے ہیں تب بھی پوری تفصیل بیان کئے بغیر نہیں رہتے ! اخبار پڑھ کر دوسروں تک خبریں پہنچانا اُن کے زندگی کی ترجیحات میں سے ہے۔ ہم نے ایک زمانے سے اخبارات کے مطالعے کو از خود نوٹس کے تحت اپنے لیے متروک قرار دے رکھا ہے۔ اب تک تو یہ خود ساختہ ترکِ مطالعہ ہمارے حق میں نعمت ثابت ہوا ہے۔ اخبارات پڑھنے سے ہم میں کمتری کا احساس شِدّت اختیار کرنے لگتا ہے ! ہم خبروں، مضامین اور تجزیوں میں پائے جانے والے مزاح پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ غم ستانے لگتا ہے کہ ایسا مزاح لکھنے کے قابل ہم کب ہو پائیں گے ! جب فرصت کے چند لمحات میسر آتے ہیں ہم اپنے وجود کی مزاحیت سے لطف اندوز ہوتے ہیں یعنی کچھ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں ! مرزا تفصیل بیگ کو ہماری یہ عادت بہت پسند ہے کیونکہ اُن کا یہ خیال ہے کہ جتنی دیر ہم لکھتے رہتے ہیں اُتنی دیر قُرب و جوار کے لوگ اور بالخصوص اہل خانہ ہمارے شر سے محفوظ رہتے ہیں !

کل مرزا، حسب معمول، ہَونّق چہرے کے ساتھ، ایک اخبار اُٹھائے ہمارے ہاں گھر آ دھمکے۔ اُن کے چہرے کی فضاء خاصی مُکدّر تھی۔ ہوا کم اور ہوائیاں زیادہ اُڑ رہی تھیں ! مرزا کے چہرے پر محض ایک نظر ڈالنے سے بھی صاف محسوس ہونے لگا کہ اُنھوں نے کوئی معرکہ آراء خبر پڑھ لی ہے اور اب اُس کے مضمرات پر، دوپہر کے کھانے سے قبل، ایک ڈھڑھ گھنٹے تک ہمارا دماغ چاٹ کر "برنچ" کا

حق ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ! ویسے بھی مرزا جب ایسا ویسا پڑھ لیتے ہیں کہ تو اُن کے چہرے پر "جلال" اِس قدر پنپ جاتا ہے کہ اُن پر ایک سے زائد نظر ڈالنے کی سکت کسی میں نہیں ہوتی ! یا کم از کم ہم تو اپنی آنکھوں سے کسی کِھلواڑ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے !

مرزا کو حیرت اِس بات پر تھی کہ برطانیہ کے ماہرین کو ایک طویل عرصے کی تحقیق کے بعد وہ بات معلوم ہو پائی جو دُنیا بھر کے لوگ کسی بھی قسم کی تحقیق سے مستفید ہوئے بغیر اچھی طرح جانتے ہیں۔ حد تو یہ ہے آپ سمیت ہمارے بیشتر قارئین بھی وہ بات اچھی طرح جانتے ہیں جو برطانوی محققین نے خاصی محنت کے بعد معلوم کی ہے۔

حیاتیات کے برطانوی ماہرین کی ایک ٹیم نے بریکنگ نیوز دی ہے کہ کائنات کا سب سے بڑا معمہ عورت ہے!

اگر یہ بات پڑھ کر آپ کا ہنسنے، بلکہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جانے کو جی چاہ رہا ہے تو یقین کیجیے کہ اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ مرزا نے بھی جب ہمیں یہ خبر سُنائی تھی تو ہنستے ہنستے ہم اور وہ بے حال ہوگئے تھے۔ ٹی وی کے بعض پروگرامز میں صرف ہنسنے کے پیسے لینے والی خواتین اگر اِس قدر ہنستیں تو لاکھ سوا لاکھ کا بل بن چکا ہوتا! مگر اے وائے ناکامی! کیا ہم اور کیا ہماری ہنسی! اگر ہم ہنسنے کے پیسے مانگیں تو خدشہ ہے کہ لوگ ہنس

ہنس کر پاگل ہو جائیں گے!

کس مرد کو معلوم نہیں کہ عورت کائنات کا سب سے.بڑا معمہ ہے؟ کوئی بھی مرد عورت کو معمہ نہ سمجھنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ بالخصوص شادی شدہ مرد تو اِس حقیقت سے خاصی دردناک حد تک آشنا ہیں! ہمیں حیرت اِس بات پر ہے کہ عورت کو معمہ قرار دینے کے لیے حیاتیات کے ماہرین کو تحقیق کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا عورت حیاتیاتی معمہ ہے؟ کیا عورت کی جسمانی ساخت اِتنی پیچیدہ ہے کہ اُس پر تحقیق بھی کی جائے اور معمہ بھی قرار دیا جائے؟ خدانخواستہ یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ماہرین حیوانات کو عورت پر تحقیق کی دعوت دے رہے ہیں! ہم اِتنے سنگ دل کبھی نہیں ہو سکتے کہ ماہرین حیوانات کو اِس کام پر لگا کر کسی کام کا نہ چھوڑیں اور بے چارے بے زبان جانور توجہ اور نگاہِ التفات کو ترستے ہی رہ جائیں!

مرزا کو بھی اِس بات پر اعتراض تھا کہ عورت پر تحقیق حیاتیات کے ماہرین سے کیوں کروائی گئی۔ اُن کا کہنا تھا کہ کسی بھی عورت کو سمجھنے کی کوشش ماہرین نفسیات کو کرنا چاہیے۔ مگر پھر اپنی رائے سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا کہ بے چارے ماہرین نفسیات بھی کیا کر سکتے ہیں؟ وہ لے دے کر صرف ماہرین ہیں، کوئی جادوگر تو ہیں نہیں کہ عورت کو سمجھ بھی لیں اور ہم جیسے "سادہ دل"

انسانوں کو سمجھا بھی دیں ! مرزا کے خیال میں عورت کو سمجھنے کی ایک جامع کوشش ماہرین انفاس کو کرنا چاہیے تاکہ وہ مردوں کو بتا سکیں کہ عورت کے ساتھ رہ کر بھی کس طور سکون کا سانس لیا جاسکتا ہے !

برطانوی ماہرین نے تحقیق کی روشنی میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ عورت کے جسمانی اور ذہنی وجود کو سمجھنا کسی طور ممکن نہیں کیونکہ وہ انتہائی پیچیدہ ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ خود ماہرین کو بھی یہ اندازہ نہیں ہوسکا کہ پیچیدگی ہے کیا ! مرزا کا استدلال یہ ہے کہ اگر ماہرین یہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ پیچیدگی کیا ہے تو وہ کس طور یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ جو کچھ سمجھ نہیں آسکا وہ پیچیدگی ہی ہے؟ ساتھ ہی اُنھوں نے ماہرین کے بارے میں چند انتہائی "مہذب" کلمات ادا کئے ! ماہرین کے بارے میں مرزا کی اِس رائے نے ہماری ڈھارس بندھائی کیونکہ خود ہم بھی اب تک نہیں سمجھ سکے کہ عورت میں پائی جانے والی پیچیدگی ہے کیا !

اپنے بارے میں کی جانے والی مختلف نوعیت کی تحقیق کے جواب میں خواتین عموماً یہ کہتی ہیں کہ جس طور انتہائی پیچیدہ چیز کو سمجھا نہیں جاسکتا بالکل اُسی طرح بالکل سادہ اور آسان سی چیز بھی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی یعنی خواتین اپنی نظر میں بہت آسان اور سادہ وجود رکھتی ہیں ! بہت سے مرد

اِس "سادگی" ہی پر یہ کہتے ہوئے مر مٹتے ہیں

!اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خُدا

بیشتر خواتین اپنی زد میں آنے والے مردوں کے ذہن کو اس قابل نہیں چھوڑتیں کہ وہ عورت کے وجود میں پائی جانے والی پیچیدگی کے بارے میں سوچ سکے! یعنی

!مُشکلیں مُجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہوگئیں

ماہرین کی دی ہوئی محققانہ شہادت کی روشنی میں عورت تو خیر اپنی جگہ ایک تسلیم شدہ معمہ ہے مگر مرد بھی کچھ نچلا بیٹھنے والا نہیں۔ عورت کے معاملے میں وہ جو رویہ اپناتا ہے وہ بھی دُنیا، بلکہ کائنات کے بڑے معموں میں سے ہے۔ مرد زندگی کو رنگین بنانے کی خاطر صدا لگاتے نہیں تھکتا۔

کسی زلف کو پکارو، کسی آنکھ کو صدا دو

!کڑی دھوپ پڑ رہی ہے، کوئی سائباں نہیں ہے

اور زیادہ گھبراہٹ کے عالم میں بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

!یہ دِل تم بن کہیں لگتا نہیں، ہم کیا کریں

پس ثابت ہوا کہ عورت کے معاملے میں مرد "آ بیل، مجھے مار!" کے اُصول پر

یقین رکھتا ہے! جب معاملہ یہ ہو تو باقی صدیقی کا ارشاد بجا ہے۔

! تیر پر اُڑ کے بھی نِشانے لگے

دوسرے بہت سے لوگوں کا بُرا انجام دیکھ کر بھی سبق نہ سیکھنے اور بے کیف زندگی کو مسرت سے ہمکنار کرنے کے لیے عورت کا ساتھ تلاش کرنے والے مرد کچھ ہی دیر میں اپنی حماقت کو محسوس کرنے پر یہ راگ الاپتے ہیں۔

! خبر کیا تھی کہ یہ انجام ہو گا دل لگانے کا

صنفِ نازک سے لگاوٹ کی ابتداء خاصی پُر کشش ہوتی ہے۔ ابتداء میں جذبہ کچھ یہ انداز اختیار کرتا ہے۔

! دِل گیا، تم نے لیا، ہم کیا کریں

اور پھر کچھ ہی دنوں کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اگر دل کا حال جاننا چاہے تو جواب ملتا ہے۔

! جس دِل پہ ناز تھا مجھے وہ دِل نہیں رہا

علامہ سیماب اکبر آبادی نے دُعا کے قبول ہونے کی شرط یہ بیان کی۔

دُعا دِل سے نکلے کار گر ہو

اور پھر اگلے ہی مصرع میں دُعا کی گنجائش یہ کہتے ہوئے ختم کردی۔

!یہاں دِل ہی نہیں، دِل سے دُعا کیا

عورت کو سمجھنے کے معاملے میں مرد ہزاروں سال سے اِسی مخمصے میں مُبتلا ہے۔ یعنی

حوصلہ ہو تو کیا نہیں ہوتا

!ہاں، مگر حوصلہ نہیں ہوتا

کبھی بھی، کہیں بھی!

اسلام آباد اور اس کے مکینوں کے درمیان آج کل اپنا اپنا موسم دکھانے کا مقابلہ چل رہا ہے۔ ایک طرف سردی بڑھ رہی ہے اور برف باری سے موسم کی رنگت اُجلی ہو کر نکھر گئی ہے اور دوسری طرف حکومت بھی رنگ بدل رہی ہے۔ وفاداریاں اور بے وفائیاں کھل کر سامنے آ رہی ہیں۔ اسلام آباد کی فضائیں ٹھنڈک برسا رہی ہیں اور اقتدار کے ایوانوں میں گرما گرم اقدامات اور قیاس آرائیوں کی گرم بازاری محور قص ہے۔ شہر نے برف کی چادر اوڑھ لی ہے اور جو لوگ اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے ہیں انہوں نے ساتھ چھوڑ جانے والوں کے سفید خون کا رونا روتے رہنے کو وتیرہ بنا رکھا ہے۔ بعض قنوطیت پسند برف کی حسین سفید چادر دیکھ کر یہ سوچ رہے ہیں کہ وفاقی دارالحکومت میں کسی بڑی سیاسی موت سے قبل ہی قدرت نے چاندنی بچھا دی ہے!
سردی کی شدت میں اضافے سے پہلے ہی وفاقی دارالحکومت میں سرد مہری کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ بے تعلقی، لاتعلقی اور بے حسی کی سرد ہوائیں اس تیزی سے چلنے لگی تھیں کہ اُن پر جھکڑ کا گمان ہونے لگا تھا۔

اب سردی بڑھی ہے تو لوگ حیران ہیں کہ سُکڑنے کے موسم میں بہت کچھ پگھل رہا ہے۔ حکومت حیران ہے کہ سُکڑاؤ کے موسم میں معاملات کے پھیلاؤ کو کیونکر روکے، کس طور سب کچھ دوبارہ اُس مٹھی میں بند کرے جو اب پھیل کر صرف اُنگلیوں کا نظارہ پیش کر رہی ہے۔

برف باری کے ماحول میں سب باری باری سنگ باری سے بھی شوق فرما رہے ہیں۔ الزامات کے پتھر کوئی کب تک برسا سکتا ہے؟ آپ سوچیں گے اِس کی کوئی حد ضرور ہوتی ہوگی۔ آپ کی سوچ غلط ہے۔ الزام تراشی کی کوئی حد نہیں ہوا کرتی۔ اور جس کی کوئی حد ہو وہ الزام تراشی نہیں ہو سکتی! کم از کم اسلام آباد کے ایوان ہائے اقتدار و اختیار میں بیٹھ کر قوم کے سینے پر مونگ دَلنے والوں نے تو یہی ثابت کیا ہے! کوئی پیچھے ہٹنے اور ہار ماننے کو تیار نہیں۔ اسکول میں یا گلی میں کھیل کے دوران "میں نہ مانوں" کی رَٹ لگانے والے بچے بھی اسلام آباد کے اقتداری بچوں کی ہٹ دھرمی دیکھیں تو شرما جائیں!

اسلام آباد بھی عجیب شہر ہے۔ قدرت کے دیئے ہوئے موسم سے اس کا جی نہیں بھرتا۔ جن کے ہاتھ میں اختیارات ہیں وہ جب چاہیں اپنی مرضی کا موسم پیدا کر لیتے ہیں۔ اور رہے عوام، تو وہ بے چارے تو ان موسموں کا تماشا دیکھنے کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔

بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ تھی، مہنگائی کا پنپتا ہوا طوفان تھا اور حکمرانوں کی بے حسی تھی۔ زندگی یوں بے کیف سی جا رہی تھی کہ اچانک میمو گیٹ ابھر کر سامنے آگیا۔ اس ایک معاملے نے بہتوں کی روزی روٹی کا اہتمام کیا ہے۔ اور کئی ایسے بھی ہیں جن کی واٹ لگ گئی ہے! اچھا ہوا کہ پارلیمنٹ نزدیک بلکہ بغل میں ہے اور اُس میں لوٹے بھی ہیں کیونکہ اب بعض نامُرادوں کو لوٹوں کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔ اقتدار کی مسند پر چار سال تک بیٹھ کر جو کچھ ہوس کے پیٹ میں ٹھونسا گیا ہے وہ اب یا تو ہضم نہیں ہو پا رہا یا پھر ہضم کروایا جا رہا ہے! جس پر بے پیندے کے ارکان رکھنے کی تہمت دھری جاتی رہی ہے خود اُس پارلیمنٹ کا اب کوئی بھروسہ اور ٹھکانہ نہیں۔ معاملہ رینڈم کے اُصول پر چل رہا ہے۔ غبارے میں ہوا بھر کر اسے چھوڑ دیجیے تو کسی بھی سمت جا سکتا ہے۔ یہی حال سیاسی صورتِ حال کا ہے۔ سیاسی الٹ پھیر کا اونٹ کسی بھی کروٹ بیٹھ سکتا ہے۔ کبھی بھی، کہیں بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بقول عبیداللہ علیم

!نہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے

موسم کے ذکر پر یاد آیا کہ طلبی کا موسم بھی خوب چل رہا ہے۔ میمو کے حوالے سے معاملات تو تو میں میں کی منزل سے آگے بڑھ کر الزامات کی سنگ باری کے دو

راہ ہے تک آ پہنچا ہے۔ واشنگٹن کی پُرسکون فضاؤں میں بیٹھ کر پاکستان کے سیاسی تماشے سے محظوظ ہونے والے حسین حقانی کی طلبی ہوئی۔ سُپریم کورٹ نے حسین حقانی سے جو کچھ جاننے کی کوشش کی وہ اب تک سات پردوں میں لپٹا ہوا ہے۔

وزیر اعظم کی بھی طلبی ہوئی اور معاملہ کچھ اس طرح ختم ہوا کہ سب انگشت بہ دنداں رہ گئے۔ معاملہ یہ تھا کہ

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

اور پھر کسی کو یقین نہیں آیا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ بہت ہنگامہ ہو اور معاملہ کچھ بھی نہ ہو۔ یعنی

جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا!

سپریم کورٹ میں ایک بھیڑ سی لگی۔ میڈیا نے بھی رنگ جمانے کی بھرپور کوشش کی۔ وزیر اعظم پیش ہوئے مگر معاملہ بظاہر سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ لوگ حیران اور قدرے افسردہ رہ گئے۔ یعنی بقول غالب

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا!

اب منصور اعجاز کی آمد کا غلغلہ بلند ہے یا بلند کیا جارہا ہے۔ میڈیا نے پھر میلہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ کیفیت کچھ ایسی ہے کہ بقول میر انیس

!کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے

اب یہ تو منصور اعجاز کی آمد ہی پر معلوم ہوگا کہ شیر کھل کر شکار کرے گا یا حکومتی لگڑ !بھگّے اُسے گھیر کر، خوفزدہ کرکے بھاگنے پر مجبور کردیں گے

یہ جو اسلام آباد اور واشنگٹن کے درمیان آنیاں جانیاں لگی ہوئی ہیں ان کا بھی عجب تماشا ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ رونق میلہ لگا ہوا ہے۔ جسے واشنگٹن میں قومی مفادات کی نگرانی کرنا تھی اُسے بزور اسلام آباد کے "دورے" پر لایا گیا اور اب وہ وزیر اعظم ہاؤس کے ایک کونے میں دُبکا اپنی نگرانی کا فریضہ نبھا رہا ہے! اور جنھیں اسلام آباد میں بیٹھ کر قوم کی نگہبانی کرنا ہے وہ ملکوں ملکوں گھوم کر ذہن کا بوجھ کم کرنے میں مصروف ہیں۔ کوئی چین کا رُخ کرتا ہے اور کسی کو رہ رہ کر خلیج کے ممالک یاد آتے ہیں۔ خدا جانے دبئ میں کون سا جادوگر چھپا بیٹھا ہے جو بار بار منتر پھونک کر ہمارے محبوب صدر کو اپنا پاس بلاتا ہے۔ خلیج کا خطہ تو ہمارے اور صدر کے درمیان واقعی خلیج بن کر رہ گیا ہے! یہ صورتِ حال قوم کے لیے مخمصے کا باعث اور سٹہ بازوں کے

لیے روزگار کا وسیلہ ہو گئی ہے!

ہر معاملہ سَٹّے کی نذر ہو گیا ہے۔ کوئی بڑی شخصیت ہسپتال میں داخل ہو جائے تو ڈاکٹرز سے پہلے سٹہ باز حرکت میں آ جاتے ہیں! اِس بات پر بھی سٹہ ہوتا ہے کہ کتنے انجیکشن لگیں گے اور کتنی ڈرپس چڑھائی جائیں گی! سپریم کورٹ نے این آر او کیس کے فیصلے پر عملدرآمد اور میمو گیٹ میں جواب داخل کرنے کے حوالے سے حکومت کے سامنے 6 آپشنز رکھ کر سٹہ بازوں کے لیے مزید موج مستی کی راہ ہموار کر دی۔ ایسے میں نواز شریف کیوں پیچھے اور خاموش رہتے؟ انہوں نے بھی حکومت کے سامنے 4 آپشنز رکھ کر سٹہ بازوں کو متحرک یا سرگرم رکھنے میں اپنا حصہ ڈالا!

بس میں سفر کے دوران ایک بڑی بی بار بار کنڈکٹر سے پوچھ رہی تھیں بیٹا! صدر کب آئے گا؟ کنڈکٹر یہ جملہ سُن سُن کر تپ گیا اور بولا اماں! یہ بات تو بہت پرانی ہو گئی کہ صدر کب آئے گا۔ اب سٹہ اِس بات پر ہو رہا ہے کہ صدر کب جائے گا!

این آر او اور میمو گیٹ کے معاملے پر ایسی ایسی قلا بازیاں دیکھنے کو ملی ہیں کہ بچوں کو شاید اب چڑیا گھر لے جانے کی ضرورت نہیں۔ اُنہیں پارلیمنٹ

کی کارروائی دکھانا کافی ہوگا! یار لوگ حافظے کے ایسے کچے ہیں کہ آج کچھ کہتے ہیں اور کل بھول بھی جاتے ہیں اور ثابت قدمی دیکھیے کہ دو یا اس سے زائد مختلف اور متضاد باتیں کہہ کر ہر بات پر قائم بھی رہتے ہیں! پارلیمنٹ بے چاری ایک بھر پھر "دَھرم سَنکٹ" سے دوچار ہے۔ جن کے چار سالہ سیاسی اعمال نامے میں انگارے ہی انگارے ہی بھرے ہیں وہ جمہوریت کو استحکام، بلکہ دوام بخشنے کے نام پر ایک بار پھر پارلیمنٹ کی "اگنی پریکشا" لینے پر تُلے ہوئے ہیں!

عوام نے جنہیں کبھی اپنا نہیں سمجھا اور جن کے ہاتھ اقتدار دینے کا خواب کے آخری درجے میں بھی نہیں سوچا اُنہیں غبارے کی طرح پھلا کر لیڈر بنایا جا رہا ہے۔ بننے والے اور بنائے جانے والے لیڈرز میں فرق سبھی جانتے ہیں مگر یہ فرق بادشاہ گر شاید بھول گئے ہیں یا دانستہ نظر انداز کر دیا ہے۔ انقلاب کی صدائیں بلند کی جارہی ہیں اور دنیا بھر میں انقلاب کا جو تصور عام ہے اُس سے موازنہ کیجیے تو صرف ہنسی آتی ہے۔ عوام کا تو ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا ہے کہ عوامی حکمرانی کے نام پر کیا کیا تماشے ہو رہے ہیں! بقول میر

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی!

سیاسی بد مستی کے اِس مسحور کن ماحول میں عوام کی حالت سب سے عجیب ہے۔

کرسی والوں کے تماشے دیکھ دیکھ کر ان کا حال برا ہوگیا ہے۔ کُرسی والوں پر بس نہیں چلتا تو وہ کُرسیوں پر خار اُتارتے ہیں اور جلسے کے بعد کُرسیاں ہی لے اُڑتے ہیں! بعض کو سیاسی سَرد مہری دور کرنے کے لیے جھنڈوں کے ڈنڈے جلانے کی سُوجھتی ہے! اور بینرز کا مطبوعہ کپڑا کیوں ضائع ہو؟ لوگ بینرز بھی اتار کر گھر لے جاتے ہیں کہ اور کچھ نہیں تو پوچا لگانے ہی کے کام آئے گا!

عوام جو کچھ کرسیوں، جھنڈوں اور بینرز کے ساتھ کر رہے ہیں وہ بہت اچھا ہے کہ دِل کی بھڑاس کے نکلنے کا اہتمام ہو رہا ہے مگر اے کاش یہی سلوک وہ سبز باغ دکھا کر اقتدار میں آنے اور بعد میں منہ بھی نہ دکھانے والوں سے روا رکھیں تاکہ تماشے میں کچھ تو جان پیدا ہو!

آپ بھی سو جایئے

اللہ نے دنیا میں کوئی بھی چیز بے مصرف نہیں بنائی۔ علامہ اقبال نے بھی کہا ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی بُرا اور نکما نہیں۔ کھوٹا سکہ بھی کبھی کبھی کام آ ہی جاتا ہے۔ بند گھڑی میں بھی دن میں دو مرتبہ صحیح وقت بتاتی ہے۔ ایسے میں بھلا یہ کیونکر سوچا جاسکتا ہے کہ ماہرین کی باتوں میں کہیں صداقت کا کوئی پہلو ہو ہی نہیں سکتا؟ ہم ہمیشہ ماہرین کے معاملے میں شکوک و شبہات کا شکار رہے ہیں۔ اُن کی باتوں کو سچ مان کر قبول کرنے کے معاملے میں ہم نے ہمیشہ "میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو" کے اُصول پر عمل کیا ہے۔ یعنی جو بات مطلب کی ہو وہ لے لی جائے اور باقی سب کچھ مسترد کردیا جائے۔ گزشتہ دنوں ماہرین نے ایک اور کام کی بات کرکے ہمیں پھر حیران کردیا۔

.برطانوی ماہرین نے خاصی عرق ریزی کے بات یہ کام کی بات بتائی ہے کہ ڈیوٹی کے دوران تھوڑا سا سو لینے سے طبیعت کام کے لئے زیادہ موزوں ہو جاتی ہے اور بہتر کارکردگی کا مظاہرہ ممکن ہوجاتا ہے! جب سے ہم نے یہ بات پڑھی ہے، ہم خود کو بھی ماہرین میں شمار کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں کیونکہ کسی تحقیق کے بغیر یہ رائے تو خود ہماری بھی رہی ہے! اور سچ پوچھیے تو اِس کسوٹی پر

پرکھنے کی صورت میں تو پاکستانیوں کی اکثریت ماہرین کے زمرے میں آ جائے گی!

ویسے نیند سے خود ماہرین کا بھی گہرا تعلق ہے۔ ان کی بیشتر باتیں اور خاص طور پر تحقیق کے بعد کی جانے والی پیش گوئیاں نیند میں بڑبڑانے سے کم نہیں ہوتیں! غنودگی کے بڑے فوائد ہیں۔ انسان کچھ بھی کہے، "بھائی صاحب! میں تو نیند میں تھا" کہہ کر ذمہ دار ٹھہرائے جانے سے بچ نکلتا ہے!

ہم ایک ایسے معاشرے کا حصہ ہیں جس میں جاگتے رہنے پر نیند اور غنودگی کو فوقیت دی جاتی ہے۔ اور بات ایسی نہیں کہ سمجھ میں نہ آئے۔ ذرا سی نیند سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔ اور اِن بلاؤں میں سونے والے کا بھی شمار ہوتا ہے! نیند کے یوں تو اور بھی فوائد ہیں، مگر سب سے بڑا فائدہ دفاتر میں دکھائی دیتا ہے۔ کچھ لوگ ڈیوٹی کے دوران سو کر خود بھی پُرسکون رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی سکون سے کام کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں! اگر کچھ دیر سونے سے دفتر اور اپنا اور دوسروں کا وقت اچھا کٹتا ہے تو ایسا کرنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ وقت اچھا کٹنا چاہیے۔ زندگی کا کیا ہے، وہ تو کسی نہ کسی طور گزر ہی جائے گی!

ہم نے جب بھی اپنے دفتر کے بعض ساتھیوں کی توجہ اُن کی "قابل رشک نیند" کی طرف دِلانے کی کوشش کی ہے اُن کی طرف سے یہی جواب ملا ہے کہ جب پوری قوم سو رہی ہے تو ہم جاگ کر کون سا تیر مار لیں گے! دفتری اوقات میں نیند کی دیوی کی پوجا کرنے والوں کے بارے میں یہ گمان کرنا درست نہیں کہ وہ کام چور اور ہڈ حرام ہوتے ہیں۔ نیند کی وادی میں کھو کر وہ دفتری ساتھیوں کی اور دفتری ساتھی اُن کی سازشوں سے محفوظ رہتے ہیں! اگر کچھ دیر نیند پوری کرنے سے دفتر کا ماحول خوشگوار رہتا ہے اور لوگ ہشاش بشاش ہو کر کام کرتے ہیں تو آجروں کے لئے اس سے زیادہ آئیڈیل سچویشن کون سی ہوگی؟

اکیسویں صدی نے جہاں بہت سے سہولتیں پیدا کی ہیں وہیں چند نا قابل برداشت قباحتیں بھی پیدا کی ہیں۔ موبائل کیمرہ بھی ایک ایسی ہی قباحت ہے۔ ہم نے جب بھی دفتری اوقات میں کچھ دیر سونے کا سوچا ہے، بعض احباب کے انجام نے ہمیں ایسا کرنے سے باز رکھا ہے۔ ہر دفتر میں جلنے کڑھنے والے بھی ہوتے ہیں۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو دفتر میں کچھ دیر (یعنی ڈیڑھ دو گھنٹہ) کمر سیدھی کرنے والوں کی موبائل کیمرے سے وڈیو بنا کر سب کو دکھاتے پھرتے ہیں! پرائیویسی میں اِس نوعیت کی مداخلت چونکہ ہمیں پسند نہیں اِس لئے ہم دفتر میں نیند پوری کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ دفتر میں سونے والوں کی وڈیو بنانے والوں کو ہم نے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ بھائی! اس ملک میں

حکمران، قانون پر عمل کرانے والے، سرکاری ملازمین، اہل دانش، اہل قلم .... سبھی سو رہے ہیں، ایسے میں دو چار لوگ اگر تھوڑی سی نیند پوری کرلیں گے تو کون سی قیامت آ جائے گی! ہم اُن خوش فہم لوگوں میں سے نہیں جو دفتری اوقات میں ہمہ وقت جاگ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ سارا رونق میلہ کچھ اُنہی کے جاگتے رہنے پر منحصر ہے!

لوڈ شیڈنگ نے دوسرے بہت سے معاملات کی طرح نیند کا نظام بھی تہس نہس کر دیا ہے۔ ہم نے دفتر کے ایک ساتھی کو ایک ڈیڑھ گھنٹے تک خواب خرگوش کے مزے لوٹتے دیکھا تو "وجہِ تسمیہ" پوچھی۔ کہنے لگے رات کو گھر میں بجلی نہیں تھی اِس لئے نیند پوری کر رہا تھا۔ ہم مطمئن ہوگئے کہ چلو، اِنسان کا دفتر پر اِتنا حق تو ہونا ہی چاہیے! کچھ دیر بعد اُن کی گاڑی پھر کچے میں چلی گئی! جب وہ مزید ڈیڑھ گھنٹے کی نیند سے فارغ ہوئے تو ہم نے عرض کیا کہ حضرت! نیند کی زیادتی آپ کو کہیں تن آسانی کی طرف نہ لے جائے! بولے "جناب! تن آسانی کیسی؟ پہلے گزری ہوئی رات کی نیند پوری کر رہا تھا، اب آنے والی رات کی نیند پوری کی ہے!" یہی وہ pre-emptive سوچ ہے جو امریکہ نے متعارف کرائی ہے!

دفتر میں سونے کا بنیادی اُصول یہ ہے کہ اِنسان ذرا سا بھی خوفزدہ نہ ہو۔ ماہرین کے مشورے سے بہت پہلے ہم نے دفتری نیند کے چند اُصول وضع کئے تھے۔

دس بارہ سال قبل ہم کسی اور اخباری ادارے میں تھے۔ رات کی ڈیوٹی میں ہم کبھی کبھی (یعنی روزانہ) تھوڑی دیر کے لیے (یعنی یہی کوئی ڈھائی تین گھنٹے) کمر سیدھی کیا کرتے تھے! ایک دن اعلیٰ سطح کی میٹنگ میں کسی نے مالکان سے شکایت کی تو اُنہوں نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ جیسے اُنہیں سب معلوم ہے اور کسی سے فیڈ بیک کی ضرورت نہیں، شکایت کرنے والے کو جھاڑ دیا۔ جب ہمیں یہ بات معلوم ہوئی تو ہم نے نیند کا دورانیہ بڑھا دیا۔ کسی نے سبب پوچھا تو ہم نے وضاحت کی کہ جناب! ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہماری نیند مالکان کے علم نہیں۔ اب جب یہ معلوم ہوگیا ہے تو اُن کا بھی تو کچھ بھرم رکھنا چاہیے یا نہیں!

اگر آپ دفتر میں کچھ دیر سونے کو بُرا سمجھتے ہیں تو اپنی سوچ فوراً بدل ڈالیے۔ دفتری اوقات میں سونے کا رجحان اِتنی تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے کہ بہت جلد وہ لوگ ناپسندیدہ کہلائیں گے جو ہمہ وقت جاگ کر مالکان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں!

صداؤں کا پنجرہ

رات کے تین بجے ہیں۔ پورا رہائشی کمپلیکس تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ جس طرح سیلاب زدگان کو بڑے بڑے وعدوں کے بعد معمولی سی اِمداد ملتی ہے بالکل اُسی طرح نائٹ بلبس کی خفیف سی روشنی فلیٹوں کی کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے۔ تمام فلیٹوں کے مکین گہری نیند میں سوتے ہوئے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں! " حفاظت کرنے والی ذات تو بس اللہ ہی کی ہے اِس لیے چوکیدار بھی بے فکری کے ساتھ غنودگی میں ڈوبے ہوئے ہیں! ایسے میں ایک توانا چیخ اُبھرتی ہے اور پورے ماحول کو سُکوت اور سُکون کی قید سے رہائی دِلا دیتی ہے!

کوئی صاحب کمپاؤنڈ کے وَسط میں کھڑے ہو کر کسی سلیم کو آواز دے رہے ہیں۔ جس تواتر سے ہمارے ہاں حکومتیں ناکام ہوتی رہی ہیں بس کچھ ایسے ہی تواتر سے سلیم کو آواز دی جارہی ہے! فلیٹوں کی کھڑکیاں کھلنے لگتی ہیں۔ پروجیکٹ میں خیر سے کوئی درجن بھر سلیم رہتے ہیں۔ ہر سلیم اِس گمان میں مبتلا ہے کہ شاید اُسے یاد کیا جارہا ہے۔ مگر کھڑکی کھول کر کمپاؤنڈ میں جھانکنے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ ہنگامہ کسی اور ہی سلیم کو بیدار کرنے کے لیے برپا کیا جارہا ہے! اب کیفیت یہ ہے کہ مُغالطے کا شِکار ہونے والا ہر سلیم اُس سلیم

کو دل ہی دل میں یا "زیر لب کے نیچے" گالیاں دے رہا ہے جس سے بلنے کی چاہ میں
رات کے پچھلے پہر یہ میلہ منعقد کیا جا رہا ہے!

خدا خدا کرکے پروجیکٹ کے مکینوں کا نصیب جاگا یعنی وہ سلیم بھی بیدار ہوا جس کے لیے صدائیں لگائی جا رہی ہیں۔ اُس نے فلیٹ کی کھڑکی کھولی، کمپاؤنڈ میں جھانکا اور جوابی صدا لگاتے ہوئے سوال داغا۔ "ابے سلمان، تو؟ خیریت تو ہے؟"

سلمان صاحب مطلوبہ بندے کی شکل دیکھ کر سکون کا سانس لیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ہاں خیریت ہے۔"

اب سلیم نے پوچھا۔ "خیریت ہے تو پھر اس وقت؟"

سلمان صاحب آمد کا سبب بیان کرتے ہیں۔ "بس یار! لائٹ گئی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا تجھے ساتھ لے لوں۔ ذرا پانچ نمبر تک جانا ہے۔"

"کیوں؟ پانچ نمبر کیوں جانا ہے؟ کوئی ایمرجنسی ہے؟"

کچھ نہیں یار۔ نیند نہیں آ رہی۔ بیٹھے بیٹھے بور ہو رہا تھا۔ بس، ذرا چائے"

"!پی کر آتے ہیں

مُلاحظہ فرمائیے۔ رات کے تین بجے ہوٹل پر چائے پینا ہے اور پوری بلڈنگ کے مکینوں کو
!جگا کر خون کے گھونٹ پینے پر مجبور کر دیا

ہم ایسے معاشرے میں جی رہے ہیں جس کی فضاؤں میں آکسیجن کم اور بلا ضرورت لگائی جانے والی صدائیں زیادہ ہیں! اور ایسے میں آپ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں وہ صدا بہ صحرا ہے یعنی کوئی سُنتا ہی نہیں۔ گویا صداؤں کا ایک پنجرہ ہے اور ہمیں قیدی بن کر رہنا ہے۔

ضروری نہیں کہ دھوکا دینے والی صدا زور دار ہو۔ بعض معصوم سی صدائیں بھی اِنسان کو مُغالطے کے کنویں میں دھکیل دیتی ہیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی نے اِنتہائی مِسکین اور بکری کی طرح مِنمِناتی ہوئی آواز میں ہم سے کچھ کہنے کی کوشش کی اور جب ہم نے از راہِ ہمدردی پلٹ کر دیکھا تو اپنے مُقابل اچھے خاصے ہٹّے کٹّے یعنی بھینس کے کٹّے جیسے تگڑے نوجوان کو پایا! اور جب قدرے گھبرا کر پوچھا کیا بات ہے تو معلوم یہ ہوا کہ جناب عالی اللہ کے نام پر کچھ مانگ رہے ہیں! اور ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ موصوف صرف مانگ رہے ہیں، جَھپٹا نہیں مار رہے! لحیم شحیم وجود کو.بروئے کار لاتے

ہوئے اگر حضرت چھینا جھپٹی پر اُتر آئیں تو کوئی کیا بگاڑ لے گا؟

کبھی کبھی صدائیں کچھ اِس انداز و ادا سے دھوکا دیتی ہیں کہ دھوکا کھانے پر بھی رشک آنے لگتا ہے! اہل وطن نے طے کرلیا ہے کہ کسی کو بُلانا ہے تو اِس طرح بُلانا ہے کہ ایک زمانہ متوجہ ہو۔ اگر کسی کو بس سے اُترنا ہو تو ڈرائیور کی توجہ پانے کے لیے کچھ اِس طرح صدا لگائی جاتی ہے کہ تمام مسافر حیرت زدہ ہو کر متوجہ ہوتے ہیں کہ کہیں اُنہیں تو یاد نہیں کیا جا رہا! بعض اصحاب منزل سے تین اسٹاپ پہلے ہی صدا لگانا شروع کرتے ہیں۔ جوں جوں منزل قریب آتی جاتی ہے، دِل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی ہے، صدائی والیوم " بڑھتا جاتا ہے، عوامی جلسے کا سا ماحول بس کی فضا پر طاری ہونے لگتا" ہے! اور تمام مسافر یہ تماشا بلا ٹکٹ دیکھتے ہیں!

بس میں سفر کے دوران بعض مہربان موبائل فون پر گفتگو کرتے ہوئے بھی " صدا بازی" کا شاندار مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں۔ گفتگو کی مارکیٹ میں متعارف کرایا جانے والا یہ نیا اور منفرد انداز ہے جو ابھی ترقی یافتہ ممالک میں بھی رائج نہیں ہوا! بیچ بازار میں مجمع لگا کر منجن بیچنے والوں کی ذہنیت اور مہارت سے متاثر ہو کر اپنایا جانے والا گفتگو کا یہ انداز ٹی وی چینلز کے "انکشاف بدوش" پروگراموں سے کسی طور کم نہیں۔ اگر کوئی صاحب اپنے عزیز سے

بھی گفتگو فرما رہے ہوں تو بس کے مسافروں کو چند ہی لمحات میں موصوف کے رشتہ داروں کی تمام خصلتوں کا پتہ چل جاتا ہے!

بازار میں کسی کو آواز دینا ایک زمانے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ بعض بازاروں میں صرف خواتین خریداری کرتی ہیں۔ ایسے میں اگر کسی کو آواز لگائی جائے تو پل بھر میں بدحواسی پھیل جاتی ہے۔ خواتین یہ سمجھتی ہیں کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے، ہنگامہ شروع ہو گیا ہے۔ اور پھر بھگدڑ کا سماں پیدا ہونے لگتا ہے۔ بے چارے "دُکندار" خاصی مغزماری کے بعد خواتین کو قائل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ ہوا کچھ بھی نہیں، اوپر کے فلیٹ والے مقبول بھائی اپنی بیوی سے کہہ رہے ہیں کہ دُکان پہ کھانا ذرا جلدی بھجوا دینا!

شادی کی تقریبات میں بعض افراد کسی کو بلانے میں ایسی عجلت اور بدحواسی کا مظاہرہ کرتے ہیں گویا لڑکے والوں کا لڑکی والوں سے (یا اِس کے برعکس) جھگڑا ہو گیا ہے! اگر خواتین کے پورشن سے کوئی اپنی بیوی کو بُلانا چاہتا ہے تو (شالا نظر نہ لگے!) کچھ اِس انداز سے بُلاتا ہے گویا ٹرین چھوٹنے والی ہے یا اگر محترمہ فوری باہر نہ آئیں تو قیامت آ جائے گی! اور اگر دس بارہ صداؤں کے بعد بھی محترمہ باہر نہ آئیں تو چند لمحوں کے لیے تو قیامت آ ہی جاتی ہے

!اور میاں بیوی کے جھگڑے میں کسی کی محفل برباد ہونے سے بال بال بچتی ہے
ہماری گلیاں بھی صداؤں سے سدا آباد رہی ہیں۔ گھر کی دہلیز تک خدمات فراہم کرنے والے فضاء کو غیر آباد نہیں ہونے دیتے۔ مختلف اشیاء بیچنے اور خریدنے والے وقفے وقفے سے گزرتے ہیں اور سکون کے چند لمحات گزارنے کے آپ کے عزم کو متزلزل کرتے !رہتے ہیں

پھیری لگانے والوں کی صدائیں بھی بہت دھوکے باز ہوتی ہیں۔ کسی پھیری والے کی صدا سُن کر آپ انگور خریدنے گھر سے باہر آئیں تو یہ دِل خراش حقیقت سامنے آتی ہے کہ فروخت تو کچھ بھی نہیں کیا جارہا، بُھوسی ٹکڑے البتہ خریدے جا رہے ہیں ! اور اگر کبھی ٹھیلے والے کی صدا سُن کر آپ کو یاد آ جائے کہ اہلیہ نے کاٹھ کباڑ ٹھکانے لگانے کا حکم دیا اور آپ ٹین ڈبّے لیکر گھر سے نِکلیں تو ٹھیلے پر خَربُوزے منہ چڑا رہے !ہوتے ہیں

کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے

ہماری سیاست اب تمثیل سے بالا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس معاملے کو کس بات سے تعبیر کیا جائے۔ سیاسی شطرنج کا ہر کھلاڑی ایسی دَھانسو کارکردگی دِکھا رہا ہے کہ پوری بازی اسی کے گرد گھومتی دکھائی دیتی ہے۔ کرکٹ میں کبھی کبھی کسی ایک میچ میں کئی کھلاڑی عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو مین آف دی میچ کا فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہی حال ہماری سیاست کا ہے۔ قدم قدم پر سیر اور سوا سیر والا معاملہ ہے۔
مرزا تفصیل بیگ آج کل خاصی تفصیل سے تشویش اور توہم میں مبتلا ہیں۔ ویسے تو خیر اب ان کا ذہن کم ہی باتیں سمجھنے کے قابل رہ گیا ہے۔ مگر سیاست کی خیر ہو کہ وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر رہنے کا الزام سیاست سے سَر مَنڈھ دیتے ہیں۔ اِس میں اُن کا کیا قصور ہے۔ اب اہل وطن کا یہی وتیرہ رہ گیا ہے۔ جسے دیکھیے، طویلے کی بَلا بندر کے سَر منڈھنے کی روش پر گامزن دکھائی دیتا ہے۔
مرزا بھی دیگر اہل وطن کی طرح میڈیا کا تماشا دیکھ دیکھ کر بے تاب ہوئے

جارہے تھے۔ ان کے ذہن نے ریس کورس گراؤنڈ کی شکل اختیار کرلی تھی جس میں ہر وقت گمان، تخمینے اور قیاس کے گھوڑے دوڑتے رہتے تھے۔ کچھ دن پہلے حالت یہ تھی کہ وہ، از خود نوٹس کے تحت، این آر او اور میمو گیٹ پر اتھارٹی کا درجہ اختیار کر بیٹھے تھے ! اگر کوئی اُن سے کچھ پوچھ لیتا تو یہ سمجھ لیجیے کہ اس کی تو شامت ہی آ جاتی تھی ! وہ الف سے شروع ہوتے تھے اور ی تک پہنچ کر ہی دم لیتے تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ میمو گیٹ کی بحر سے کچھ نہ کچھ ضرور اچھلے گا مگر وائے ناکامی کہ اِس بار بھی تماشا ٹائیں ٹائیں فش کی منزل تک ہی جاسکا ! مرزا کو حیران ہونے کا شوق ہے تو ہوا کریں۔ ہمیں معلوم تھا کہ اِس بار بھی تِلوں میں تیل نہیں۔ مگر ہماری کوئی بات مرزا نے کب مانی ہے جو اب کے مانتے۔ ہم نے جب بھی انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے، بعد میں کئی دن تک اپنا سَر سہلایا ہے !

مرزا کی سادگی دیکھیے کہ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ میمو گیٹ سے گزر کر کوئی انقلاب وطن کی حدود اور ہماری سیاسی زندگی میں داخل ہوگا۔ داخل تو کیا ہونا تھا، اُلٹا بہت کچھ نکلتا دکھائی دے رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت میں قائم حکومت کا ڈیل ڈول کیا ہے، یہ ہم اب تک سمجھ نہیں پائے۔ جب بھی کچھ ایسا ویسا ہوتا دکھائی دیتا ہے، کوئی نہ کوئی خفیہ ڈیل ہو جاتی ہے اور پرنالہ پھر وہیں بہنے لگتا ہے ! ایک طرف حکومت گرانے کی کوششیں ہیں اور دوسری طرف

حکومت بچانے کے ہتھکنڈے۔ سبھی اپنا سب کچھ آزما رہے ہیں۔ اس کھیل میں عوام کے لیے کچھ کرنے کو ہے نہیں اس لیے وہ بے چارے بس تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔

جب بھی قومی سیاست میں کچھ استحکام سا محسوس ہونے لگتا ہے، کوئی نہ کوئی منصور اعجاز نمودار ہو جاتا ہے۔ دو ماہ سے ایک منصور پوری قوم کو غیر یقینی صورت حال کی سُولی پر لٹکانے کی تیاری کئے بیٹھا تھا۔ کسی بڑی سیاسی شخصیت کے لیے تیار کی جانے والی سُولی ہماری سیاست کے معدے میں رسولی بننے کے مرحلے میں بھی تھی۔

اور پھر ایک شور اٹھا کہ مہاراج منصور اعجاز پدھار رہے ہیں۔ منصور اعجاز کی آمد کا غلغلہ ایسا بلند ہوا کہ بہتوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، دماغ کے بلب فیوز ہو گئے۔ میڈیا کے آسمان پر تجزیوں کی گڈی اڑانے والوں کی تو چاندی ہو گئی۔ منصور اعجاز کو دعائیں دیتے ہوئے اُنھوں نے گولڈن چانس سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور تجزیوں اور پیش گوئیوں کے نام پر خوب بے پَر کی اڑائی۔ تجزیہ کار اتنی دُور دُور سے کوڑیاں لائے کہ لوگ بس انگشت بدنداں رہ گئے۔

مرزا کو بھی وہی بیماری ہے جو پرائم ٹائم میں بیشتر پاکستانیوں کو لاحق رہتی ہے۔ جب تک آنکھوں اور کانوں میں دَم ہوتا ہے، مرزا بھی ٹی وی سیٹ کے سامنے بیٹھے تجزیے سُن سُن کر اپنا بلڈ پریشر بڑھاتے ہیں یعنی اپنے خون کا پانی کرتے رہتے ہیں! آج کل بہت سے تجزیہ پسند پاکستانی اِسی طور اپنے خون سے پانی پیدا کر رہے ہیں! جنہیں کل تک یہ شکایت رہتی تھی کہ خون گاڑھا ہوگیا ہے اور دواؤں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے اب کسی دوا کا سہارا نہیں لیتے کیونکہ سیاست نے اچھے اچھوں کی حالت ہی نہیں، خون بھی پتلا کر دیا ہے!

ہم نے کئی مواقع پر مرزا کو باور کرانا چاہا کہ جہاں تک مفادِ عامہ کا تعلق ہے، میمو گیٹ بھی قوم کے لیے بانجھ ثابت ہوگا۔ معاملات کو دعووں اور دھمکیوں تک محدود رہنا تھا اور وہیں تک یہ محدود رہے۔ اب اِس میں کیا شک ہے کہ ڈیل کی سیاست میں بہت دَم ہے۔ کل تک جو لیڈر تھے وہ اب بہت حد تک ڈیلر بھی ہیں۔ بلکہ در حقیقت تو وہ ڈیلر ہی ہیں۔ سب کچھ ڈیلم ڈیل کی نذر ہو رہا ہے۔

وہ زمانے لَد گئے جب اقتدار کے ایوانوں میں شب خون نما وارداتیں ہوا کرتی تھیں۔ اب سبھی کچھ "انڈر دی ٹیبل کے نیچے" طے ہو جاتا ہے اور کسی بھی بڑی خرابی کے واقع ہونے سے پہلے ہی معاملات بخوبی نمٹا دیئے جاتے ہیں! بات سمجھ

میں آتی ہے۔ جب معاملات طے کئے جا سکتے ہیں تو انہیں بے قابو کیوں ہونے دیا جائے؟ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ قیمت معلوم کیجیے اور ادائیگی کیجیے۔ پھر کس بگڑے ہوئے کام میں اِتنا دَم ہے کہ سَنورنے سے انکار کرے!

مرزا اب تک خوش فہمی کی فضاء میں سانس لینے پر بضد ہیں۔ ان کے خیالات ایسے پھیپھڑوں کی طرح ہیں جو انتہائی آلودہ فضاء میں سانس لیتے رہنے سے جواب دے گئے ہوں! اسلام آباد میں ہونے والی اکھاڑ پچھاڑ کے بارے میں سوچ سوچ کر اُن کے ذہن نے اب سوچنے سے یکسر انکار کر دیا ہے۔ این آر او، سپریم کورٹ، میمو گیٹ، سوئس عدالتیں، مقتدر قوتیں۔۔۔۔ بس اُن کے ذہن میں ہر وقت یہی چلتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اب وہ کوئی بھی بات کرنے سے پہلے خود کو حاضرین کی موجودگی میں اور کیمرے کے سامنے محسوس کرتے ہیں! اور ظاہر ہے کہ ایسا محسوس کرنے کے بعد کچھ سوچنے کی ضرورت تو باقی ہی نہیں رہتی، بس بولنے کا ارادہ کیجیے اور بولتے چلے جائیے!

حکومت اور ریاست کس طور چلائی جانی چاہیے، اِس سے متعلق رائے دینے والے ہم کون ہوتے ہیں۔ ہم بھی تماشائیوں میں شامل ہیں اور خوب مزے لیتے ہیں۔ شکوہ صرف یہ ہے کہ اچھے خاصے تماشے کو لایعنی باتوں سے بے مزا کر دیا جاتا ہے۔ محترم عطاء الحق قاسمی نے ایک ٹی وی پروگرام میں کہا تھا کہ ضمیر کسی کو

گناہ سے روکتا تو نہیں مگر ہاں گناہ کا مزا کِرکِرا کر دیتا ہے! ہمارا بھی بس یہی شکوہ ہے کہ یار لوگ ہمارے اچھے خاصے مزے کو کِرکِرا کر دیتے ہیں! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ جو ہونا ہے وہ ہو جانے دیا جائے، گناہ کو گناہِ بالذّت رہنے دیا جائے!

میمو گیٹ پر قوم کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ ایسا ہے کہ جس پر ہنسنا اور رونا دونوں ہی جائز ہیں۔ لوگ ہوٹلوں میں بیٹھ کر وقت ضائع کرتے ہیں۔ رات رات بھر بیٹھ کر دنیا بھر کی ہانکی جاتی ہے اور پھر سب یار دوست ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اسلام آباد میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی کچھ ایسی ہی پریکٹس ہے۔ قوم منتظر رہتی ہے کہ دیکھیں کب، کیا ہوتا ہے اور ہوتا کچھ بھی نہیں۔ یہ تو بڑی ناانصافی کی بات ہے۔ اگر ایسا ہوتا رہا تو ملک اور قوم کا وقت ضائع ہوتا رہے گا۔ یہ تو "کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے" والی بات ہوئی! میڈیا کے محاذ پر ایک میلہ سجایا جاتا ہے، دنیا بھر کی باتیں ہوتی ہیں، طرح طرح کے اندازے لگائے جاتے ہیں، قسم قسم کے تجزیے ہوتے ہیں، قیاس آرائی کی محفل سجائی جاتی ہے اور پھر اچانک پتہ چلتا ہے کہ یہ سب تو بس آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے تھا! یہ سب تو قوم کو خلجان میں مبتلا کرنے کی سازش ہے، اور کچھ نہیں۔ ہمیں تو بس یہ غم ستائے جا رہا ہے کہ کہیں اس آپا دھاپی میں ہمارے محترم مرزا کام نہ آ جائیں! ہمارے پاس لے دے کر بس

یہی ایک جگری دوست بچے ہیں۔ اور آج کے دور میں کسی جگری دوست کا بچ رہنا بڑی بات ہے کیونکہ اب تو جگر کے بچنے کی بھی گنجائش خاصی محدود ہوچکی ہے! جو لوگ قوم کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے اپنے اختیارات کو بچانے اور پروان چڑھانے کی کوشش میں مصروف ہیں اُن سے استدعا ہے کہ جو کچھ بھی کرنا ہے بصد شوق کریں مگر براہِ کرم قوم کو پریشان نہ کریں۔ اگر اس مجبور قوم کو کچھ دے نہیں سکتے تو اِس کا سکون اور چین غارت بھی مت کیجیے! میڈیا کی جادو نگری میں قدم قدم پر ایسے شعبدے نہ دکھائے جائیں کہ قوم کا دماغ کچھ کرنے کے قابل ہی نہ رہے! یہ استدعا اس دعا کے ساتھ ہے کہ

!شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

جو ڈر گیا، سمجھو مر گیا

مغرب میں شادی کا رجحان تیزی سے کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ عمرانیات کے ماہرین اس کی مختلف وجوہ بیان کرکے ہمیں بے وقوف بناتے رہے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کرنے کے اخراجات بڑھ گئے ہیں اس لیے لوگ گھر بسانے سے گریز کرتے ہیں۔ کبھی یہ دور کی کوڑی لائی جاتی ہے کہ زندگی کی دوڑ میں آگے نکلنے کے خواہش مند افراد بیوی بچوں کا جنجال نہیں پال سکتے۔ ایک برطانوی اخبار نے یہ کہتے ہوئے شادی سے متعلق عمرانیات کے ماہرین کی تمام آراء کے کپڑے اُتار دیئے ہیں کہ بیشتر برطانوی مَرد بیویوں کی مار سے بچنے کے لیے ہفتہ وار چھٹی کے دن زیادہ وقت غسل خانے میں گزارتے ہیں! یعنی ایک خوف پر پردہ ڈالنے کے لیے قیاس اور تجزیے کے کتنے گھوڑے دوڑائے جاتے رہے ہیں!

برطانیہ نے ایک زمانے تک دُنیا پر حکومت کی ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ جس قوم کے لوگ بیویوں سے اِس قدر ڈرتے ہوں وہ دنیا پر کس طرح راج کرتے رہے! مگر صاحب! یہ دنیا بہت عجیب ہے۔ اس میں طرح طرح کے تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی کب تک گنتا رہے؟ جو لوگ دوسروں پر تسلط جماتے ہیں وہ گھر میں بیوی کے آگے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔ دلیپ کمار نے بالی وُڈ پر راج کیا ہے مگر خود اُن پر

سائرہ بانو کا راج رہا ہے! یوسف خان صاحب یعنی دلیپ کمار نے جب حیدر آباد دکن کی اسماء سے شادی کی تو سائرہ بانو نے ایسی آنکھیں دکھائیں کہ خان صاحب کا سارا "خان پن" ہوا ہوگیا اور اُن کے سامنے اسماء کو طلاق دینے کے سوا کوئی راستہ نہ بچا!
برطانیہ کے لوگ رُجعت پسند ہیں، یہ ہم جانتے ہیں۔ مگر وہ اِس قدر رُجعت نکلیں گے، یہ ہم نے نہیں سوچا تھا۔ ہر شریف آدمی بیوی سے ڈرتا ہے۔ ہم بھی شادہ شدہ اور شریف" ہیں! مگر صاحب! شرافت کو ثابت کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے" ہیں۔ ایک معروف طریقہ تو یہی ہے کہ انسان شادی نہ کرے! شرافت ثابت کرنے کے لیے اپنائے جانے والے عمومی طریقوں سے ہم متفق نہیں۔ بیلن سے بچنے کے لیے غسل خانے میں جاچُھپنا یا مسہری کے نیچے دُبک جانا مَردانہ شان کے خلاف ہے۔ بیلن سے بچنے کا ایک اچھا طریقہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ آپ بیلن سے دوستی کرلیں یعنی کھانا پکانے میں بیوی کا ہاتھ بٹائیں! اِس نوعیت کے طریقے کئی مشرقی معاشروں میں خاصے کارآمد انداز سے مروج ہیں! بعض مَردوں کو جب اِس حوالے سے طعنہ دیا جاتا ہے تو وہ اپنی دانست میں خاصی چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسا کرنے کی "وجہِ تسمیہ" یہ بیان فرماتے ہیں کہ دشمن کو شکست دینے کے لیے اُس سے اشتراکِ عمل کے ذریعے اُس کے طور طریقے سیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے! شادی شدہ زندگی اِنسان کو اِسی نوعیت کی ذہانت سِکھاسکتی

ہے!

سوال یہ ہے کہ بیوی کے بیلن سے کوئی کب تک اور کہاں کہاں بچ سکتا ہے؟ شکل خواہ کچھ ہو، بیلن تو آپ تک آ کر رہے گا! پلنگ کے نیچے جانے یا مچان پر چڑھنے سے رگ پٹھے کھنچنے کا خدشہ رہتا ہے۔ غسل خانہ دفتر میں بھی ہوتا ہے اور دفتر میں بھی خواتین ہوتی ہیں۔۔برطانوی مَردو! عورت کی دَست بُرد سے کب تک بچوگے؟ ذرا سی ہمت کی بات ہے۔ تھوڑی سی "بہادری" تو دکھاؤ۔ دل میں بھلے ہی خوف کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو، دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی اداکاری تو کرو! مجرم صرف وہ ہوتا ہے جو پکڑا جائے۔ وہی بندہ خوفزدہ کہلاتا ہے جس کی آنکھوں سے خوف جھلک جائے۔

کامیاب شادی شدہ مَرد وہ ہے جو مرتے دم تک اپنے خوف کو ظاہر نہ ہونے دے! جو ڈر گیا، سمجھو مرگیا!

برطانیہ کی پالیسی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ لڑاؤ اور حکومت کرو۔ شادی شدہ برطانوی مردوں نے بیویوں کے شر سے بچنے کا طریقہ وضع کرکے بھی شر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ طریقہ ہمارے ملک میں اپنانے کی کوشش کی گئی تو سوچ لیجیے کہ کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اس میں ہر گھر عموماً ایک غسل خانے کا حامل ہوتا ہے اور بعض مکانات میں غسل خانہ اور بیت الخلاء مشترکہ ہوتا ہے۔ اب اگر ہر شادی شدہ فرد بیوی سے بچنے کے لیے غسل

خانے میں پناہ لینے لگے تو گھر کے دیگر افراد "فطرت کی پکار" پر کیا جھاڑیوں کا رُخ کریں گے ؟اِس سے بڑا سوال یہ ہے کہ بلند و بالا عمارات کے جنگل میں جھاڑیاں کہاں سے لائیں ؟ پیچش میں مبتلا افراد تو بے چارے تاریک راہوں میں مارے جائیں گے !

غریب کے گھر کا غسل خانہ کسی زمانے میں خاصا فن پرور کردار ادا کیا کرتا تھا۔ جو لوگ کہیں گا نہیں پاتے تھے وہ غُسل خانے میں شوق فرمالیا کرتے تھے ! غُسل خانے کی دیواروں کو مستقل مزاجی اور پامردی سے مستفید کرنے والے باضابطہ گلوکار بن کر ہی چپ ہوتے تھے یعنی اپنے سانس کا مظاہرہ ختم کرکے دوسروں کو سکون کا سانس لینے کا موقع فراہم کیا کرتے تھے !

نارمل غُسل خانے عوامی انداز کے گلوکار پیدا کیا کرتے تھے اور جن غُسل خانوں میں کنڈی نہیں ہوتی تھی ان میں جانے والوں کچھ زیادہ ہی اور خاصا پکّا گانا پڑتا تھا تاکہ لوگ خوفزدہ ہوکر غُسل خانے سے دور رہیں ! بغیر کنڈی کے غُسل خانوں سے فن کی دنیا کو خاصے مُستند کلاسیکی گلوکار ملے ہیں !

زمانے کی پستی دیکھیے کہ اب غُسل خانوں کا مصرف اور معیار یہ رہ گیا ہے کہ بیویوں سے بچنے کے لیے اِن میں پناہ لی جائے ! کسی زمانے میں فن کی دنیا کو

پروان چڑھانے والے غُسل خانے اب ڈرپوک شوہروں کا تورا بورا ہو کر رہ گئے ہیں !
گھریلو جنگ کی یہ اولین ڈیفنس لائن برطانوی مَردوں ہی کو مبارک ہو۔ ہاں، اگر وہ
کوشش کریں تو کچھ گا کر فن کی خدمت کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں اب لوگ گانے کے
معاملے میں غُسل خانوں کے محتاج نہیں رہے ! جو گانے کی دنیا میں قدم رکھتا ہے وہ
براہِ راست اسٹیج سے شروع ہوتا ہے اور ایک ہی ہلّے میں اُستاد بن کر دم لیتا ہے ! اور
جب انسان کو ایک بار "اُستاد" کے درجے تک پہنچا دیا جائے تو پھر کون سوچتا یا پوچھتا
ہے کہ اُسے کچھ آتا جاتا ہے یا نہیں !

دُعا کر، ملنگ بابا مر جائے

وفاداری نبھانے میں جو مستقل مزاجی کُتّے میں پائی جاتی ہے، وفاداری بدلنے کے معاملے میں ویسی ہی مستقل مزاجی اور پُھرتی انسان کا خاصہ ہے! کہتے ہیں عِشق کا بُھوت سر پر سوار ہو تو انسان کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ ہم نہیں مانتے۔ دو وقت کا فاقہ ہو تو تیسرے وقت کی آمد سے قبل عِشقیہ بھوت صاحب سَر سے اُتر کر قدموں میں آ بیٹھتے ہیں۔ شیخ سعدی نے منظوم حکایت میں بیان کیا ہے کہ ایک بار دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ لوگ عِشق وشق سب بھول گئے! کسی کو یاد نہ رہا کہ ندی کنارے، چھوٹا سا گھر بناکر زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں بھی کبھی کھائی تھیں۔ فکر تھی تو بس یہ کہ کیا اور کیسے کھاکر پیٹ کی آگ بجھائی جائے!

ہم نے اب تک کی زندگی میں یہی دیکھا ہے کہ جب حالات کے دو چار تھپیڑے پڑتے ہیں تو آوارہ خرامی کے پانیوں میں بھٹکتی مدہوشی بھی ہوش کے ساحل پر آ جاتی ہے! زندگی کے میلے میں ہر تماشے کا کوئی نہ کوئی ٹکٹ ضرور ہوتا ہے۔ عمل کی دنیا میں کچھ بھی مُفت نہیں۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ دنیا میں فری لنچ نام کی کوئی چیز نہیں۔ ہر کام کی کوئی نہ کوئی قیمت اور کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہوتا ہے۔

مرزا تنقید کو ہم نے بالعموم غُنودگی کے عالم میں دیکھا ہے۔ ان کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ انسان آنکھیں رکھتا ہے اِس لیے دیکھتا ہے۔ یعنی آنکھیں کھلی ہوں گی تو کچھ نہ کچھ دکھائی دے گا جو سوچنے (اور کڑھنے) پر مجبور بھی کرے گا۔ یہی سبب ہے کہ اب وہ آنکھیں بند رکھتے ہیں اور مراقبے کی حالت کو زندگی کا حصہ بنائے ہوئے ہیں۔ ہمیں مرزا جیسے لوگوں پر رشک آتا ہے کہ تمام غموں سے چھوٹ گئے ہیں اور اپنی کھال میں مست رہتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اِتنا آسان سا نُسخہ بھی سمجھ نہیں پائے اور اب تک شدید کرب کے ساتھ پچاس کے پیٹے اور مستقل عذاب کے لپیٹے میں ہیں! عمر کی نصف صدی ہونے کو آئی ہے مگر جو ضروری ہے وہ عقل آدھی کی آدھی بھی وارد نہیں ہوئی!

اللہ ہماری جمہوری حکومت کو سلامت رکھے جس نے ہر انسان کو اُس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ ہوش و خرد سے بیگانگی کو زندگی کا حصہ بنانے پر کمر بستہ ہے! بہتوں کو تو ہم نے حالات کے ہاتھوں خود بخود روحانیت کی طرف مائل ہوتے دیکھا ہے۔ آگہی عذاب لگتی ہے۔ ہوش میں رہنا زندگی کے لیے وبال ہوگیا ہے۔ ایسے میں انسان کیوں اور کیونکر ہوش میں رہے؟

تمام تفکرات سے نجات پاکر خاصے سُکون سے زندگی بسر کرنے کا ایک کارگر نُسخہ

نریش کمار شاد نے یوں سُجھایا تھا

اے ہم نشیں ! اذیتِ فرزانگی نہ پُوچھ

جس میں ذرا بھی عقل تھی، دیوانہ ہوگیا !

یعنی ہوش و حواس لپیٹ کرایک طرف رکھ دیجیے اور پھر دیکھیے کہ زندگی کتنے آرام سے گزرتی ہے۔

حکومتِ وقت کی مہربانی ہے کہ حالات کی چکّی میں ہمیں اِیسا پیسا ہے کہ ہوش و حواس ٹھکانے لگ چکے ہیں۔ مہنگائی اور بیروزگاری نے اعصابی و نفسی امراض کی شدت میں ایسا اضافہ کیا ہے کہ لوگ جیتے جی موت کا مزا چکھنے لگے ہیں۔ یعنی ٹو اِن ون ! اچھا ہے کہ یہ بات حکمرانوں کو معلوم نہیں۔ وہ اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم جیسے تیسے صرف جی رہے ہیں۔ اگر کسی نے انہیں بتا دیا کہ ہم جیتے جی موت کا مزا بھی چکھ رہے ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک ٹکٹ میں دو مزے لینے پر ٹیکس نہ لگا دیا جائے !

زندگی کی ڈور کچھ اِس اہتمام سے اُلجھی ہے (یا اُلجھائی گئی ہے) کہ اب کسی بات کا کوئی سِرا نہیں ملتا۔ ایسے میں غنیمت اور موزوں یہی دکھائی دیتا ہے کہ اِنسان ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جائے !

کہتے ہیں مجنوں یا ملنگ وہ ہوتے ہیں جنہیں کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ یہ کیسے ملنگ ہیں جنہیں کھانے اور "پینے" کا پورا ہوش رہتا ہے؟ ثابت ہوا کہ ہوش و حواس سے مکمل بیگانگی کی حالت کوئی نہیں ہوتی۔ انسان نشے میں ہوش گنوا بیٹھے تب بھی یہ اعلان کرنے کا ہوش تو باقی رہتا ہی ہے کہ

!یارو! مجھے معاف رکھو، میں نشے میں ہوں

حسرت ہی رہی کہ ہم کسی ملنگ بابا کو کچھ دینا چاہیں اور وہ

!میں کون ہوں، میں کہاں ہوں، مجھے یہ ہوش نہیں

!کی تصویر بنے گُم سُم بیٹھے رہیں

گھریلو حالات کے ستائے ہوئے کسی شخص نے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے ملنگ بابا کے لیے کھانے پینے کا اہتمام کیا۔ بابا نے خوب سیر ہو کر کھایا تو، ظاہر ہے، بہت خوش ہوئے اور بولے "بتا بچہ! کیا ہے تیری اُلجھن؟" وہ کہنے لگا "ملنگ بابا! میری بیوی میری بات سُنتی ہے نہ مانتی ہے۔ اُسے قابو میں کرنے کا کوئی نُسخہ بتائیے۔" ملنگ بابا نے اُسے گھور کر دیکھا اور بولے "ارے بے وقوف! بیوی کو قابو میں کرنا آتا تو ہم کیا "!ملنگ ہوتے

گزشتہ دنوں میں بس میں سفر کے دوران ہم نے عجیب تماشا دیکھا۔ ایک بچی خاصی

محنت سے یاد کئے ہوئے اسکرپٹ کی مدد سے بھیک مانگ رہی تھی! اسکرپٹ میں بیمار ماں، بیروزگار باپ، بھوکے بھائی بہن، کرائے کا گھر اور گلی کے دُکاندار کا اُدھار۔ سبھی کچھ تھا! چند مسافر متاثر ہوئے اور بچی کے ہاتھ پر پانچ روپے کا سکہ رکھتے گئے۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ دنیا بھر کا کاٹھ کباڑ اپنے جسم پر لاد کر گھومنے پھرنے والے ملنگ کسی کو کچھ نہیں دیتے۔ بس میں ایک ملنگ بابا بھی تشریف فرما تھے۔ بچی کی دل سوز کہانی سے متاثر ہو کر اُنہوں نے اپنے چُغے کی تھیلا نما جیب سے پانچ کا سکہ نکالا اور بچی کے ہاتھ پر رکھ دیا! مسافر حیرت سے ملنگ بابا کو دیکھنے لگے۔ بھیک مانگنے والی بچی بھی ششدر رہ گئی۔ جو خود مانگتے پھرتے ہوں وہ کسی کو کب کچھ دیتے ہیں؟ خیر، بچی نے سکہ لیا اور آگے بڑھی۔ ملنگ بابا نے اُسے آواز دیکر بلایا۔ وہ قریب آئی تو بابا نے کہا "دُعا تو دیتی جا۔" بچی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات کا کیا مطلب ہو سکتا ہے! ملنگ بابا کو دُعا کی کیا حاجت؟ ملنگ بابا نے اُسے حیرت کی دُنیا سے واپس لاتے ہوئے کہا "دُعا کر، ملنگ بابا مر جائے!"

یہ جملہ سُن کر بس کے تمام مسافر حیران رہ گئے۔ پڑوس میں بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا بابا! ایسی کیا بات ہو گئی؟ مرنے کی تمنا کیوں ہے؟" ملنگ بابا نے "مسٹر نٹور لعل" والے امیتابھ بچن کا سا انداز اپناتے ہوئے کہا "ارے یہ

جینا بھی کوئی جینا ہے یار! کھاؤ تو مزا نہیں، پیو تو مزا نہیں۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پتہ نہیں یہ کیسا دور ہے، کس کا دور ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔"

ملنگ بابا کو زمانہ شناسی کی انوکھی منزل میں دیکھ کر بس کے مسافر مزید حیران ہوئے۔

ایک بزرگ ہم سفر نے برملا تبصرہ فرمایا "اللہ ہی خیر کرے، ابھی حکومت نے چار سال مکمل نہیں کئے اور حالت یہ ہے کہ عوام کے دماغوں کے انجر پنجر ڈھیلے ہو چکے ہیں۔ چودہ کی گنتی چھوڑیے، مہنگائی اور حالات کی خرابی کے ہاتھوں اٹھائیس طبق روشن ہیں! یہ بھی حکومتِ وقت کا منفرد اعزاز ہے کہ جن کے ہوش جا چکے ہیں وہ بھی ہوش میں آ چکے ہیں!"

جنہیں زمان و مکاں سے کچھ غرض نہیں وہ بھی اب اِس فکر میں مبتلا ہیں کہ کل کیا ہوگا! لوگ سوچتے ہیں فرزانگی کو تج کر دیوانگی کو اپنالیں۔ ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے!

جمہوریت کو بچانے کے نام پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے اُس کے ہاتھوں عوام کا

حال تو یہ ہے کہ بے حال ہو چکے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں اختیار ہے اُن سے بس اِتنا
عرض کرنا ہے
اگر یہ بھی نہیں تو پھر جُنوں کی انتہا کیا ہے؟
کہ دیوانے بھی اب کہنے لگے ہیں مجھ کو دیوانہ!

بَس تو چلتی ہے، بَس نہیں چلتا

مغرب کے ترقی یافتہ معاشروں میں پبلک ماس ٹرانزٹ سسٹم کے ذریعے کام پر جانے کا عمل اِس قدر آسان اور آرام دہ بنادیا گیا ہے کہ اُس میں ہم جیسوں کے لیے اب ذرا بھی لُطف باقی نہیں رہا! یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ آپ ساتھ والی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص سے بتیائے بغیر، مطالعہ کرتے ہوئے دفتر یا فیکٹری پہنچ جائیں! کراچی میں روزانہ کام پر جانا اور واپس آنا ایک ایسا تجربہ ہے جس سے اہل جہاں (اور بالخصوص ترقی یافتہ اقوام کے لوگ) اب تک نا آشنا اور "محروم" ہیں! وہ مطالعے سے سیکھتے ہیں اور ہم مُشاہدے کے عمل سے گزرتے ہوئے اپنے آپ کو بھی مشاہدے کے لیے پیش کرتے ہیں! پبلک ٹرانسپورٹ کے ذریعے کام پر جانے اور واپس آنے کے یومیہ تجربے میں مُہم جوئی، شدت پسندی، رواداری، انسان دوستی، مردم بیزاری، شدید ذہنی اُلجھن، بے مثال روحانی تسکین تمام ہی صفات شامل ہیں۔ دُنیا والے کیا جانیں کہ اہل کراچی گھر سے نکل کر دفتر، فیکٹری، دکان یا سائٹ تک کس طور پہنچتے ہیں۔ ایک سفر میں کئی سفر شامل ہیں جن میں انگریزی کا suffer نمایاں ہے! باہر کے لوگ کراچی آکر جب بس کا سفر کرتے ہیں تو اُن کے دل میں مقامی باشندوں کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے اور وہ "غیر محسوس طور پر" مرعوبیت سی محسوس کرنے لگتے ہیں!

کراچی میں پبلک ٹرانسپورٹ کے نام پر جو عجوبہ نُما چیزیں چلتی ہیں اُن کی مدد سے بہتر زندگی بسر کرنے کا ہُنر آسانی سے، بتدریج سیکھا جاسکتا ہے۔ بسوں اور ویگنوں میں لوگ اُسی طرح ٹُھنسے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح چھوٹے سے کمرے میں بارہ پندرہ چھڑے" رہتے ہیں! بس میں ٹُھنسی ہوئی حالت میں کھڑے ہو کر سفر کرنے سے" لوگوں کے ذہن میں یہ بات بھی اچھی طرح ٹُھنس جاتی ہے کہ ایک دوسرے کو ہر حال میں برداشت کرنا ہی زندگی کا "حُسن" ہے! اِس حالت میں بس کا سفر کرنے والے اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں کہ خط کو تار سمجھنا اور تھوڑے کو بہت، بلکہ غنیمت جان کر گزارا کرنا کیا ہوتا ہے! شکر کے مواقع بدلتے رہتے ہیں۔ کسی زمانے میں سیٹ ملنے پر لوگ سکون کا سانس لیا کرتے تھے۔ اب بہت سی بِسوں میں رش کا یہ حال ہے کہ جنہیں کھڑے ہونے کے جگہ مل پائے وہ بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں! اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو کام پر بر وقت پہنچنے کے لیے پائیدان پر لٹکنے کو بھی اعزاز سمجھ کر قبول کرتے ہیں!

کراچی میں بعض روٹس پر ایسی بسیں بھی چلتی ہیں جنہیں دیکھ کر یقین آ جاتا ہے کہ اللہ کے دستِ قدرت سے کچھ بھی دُور اور ناممکن نہیں، وہ چاہے تو مُردے میں پھر جان ڈال دے! یہ خستہ حال بسیں وقت کی دست بُرد کا فسانہ کچھ

ایسی شرح و بسط سے سُناتی ہیں کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے سفر میں ذہن کئی مراحل سے گزرتا، منازل پر رُکتا ہے اور اِنسان خواہ مخواہ خود کو فلسفی سمجھنے لگتا ہے! ایک زمانہ تھا جب پیر الٰہی بخش کالونی سے 7A کی بس چلتی تھی۔ اُس کی سُست رفتاری نے باقاعدگی سے سفر کرنے والے بہتوں کو فلسفی اور دانشور بنادیا! صبح کو خوب بن ٹھن کر گھر سے سوار ہوتے تھے اور ٹاور پہنچتے پہنچتے زمانے بھر سے 7A نکلنے والے خاصے جوشیلے انداز کی بُردباری اور ٹھہراؤ اُن کی شخصیت کا حصہ بن چکا ہوتا تھا۔

روٹ نمبر 60 کی بسیں کراچی کی قدیم ترین بستیوں سے گزرتی ہیں۔ مہمان کی حیثیت سے کراچی کے آنگن میں کچھ دن گزارنے والے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ شاید مقامی حکومت نے شہریوں اور مہمانوں کو شہر کی تاریخ سے رُوشناس کرنے کا خصوصی اہتمام کر رکھا ہے! یعنی ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ سفر بھی کیجیے اور ساتھ ہی ساتھ شہر کی تاریخ سے بھی واقف ہوتے جائیے! یہ بسیں مسافروں کو ماضی کی نشانیوں سے رُوشناس کرانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد دلاتی ہیں کہ انسان کو جو کچھ بھی میسر ہو اُس پر اللہ کا زیادہ سے زیادہ شُکر ادا کرنا چاہیے۔

بفر زون سے اسٹارٹ لینے والی روٹ نمبر 7C کی بسیں اِس امر کا بیّن ثبوت

ہیں کہ انسان چاہے تو بے پَر کی بس کو طیارہ سمجھ ہی نہیں سکتا بلکہ طیارے کی طرح اُڑانے کی کوشش بھی کر سکتا ہے! یہی وہ بسیں ہیں جن کے آگے سڑک پر ہر گاڑی بے کی کوئی Cبَس دکھائی دیتی ہے! جس طرح بُرا وقت بتائے بغیر آتا ہے اُسی طرح 7 بھی بَس اچانک کہیں بھی پہنچ سکتی ہے اور ہڑبڑائے ہوئے مسافروں کو پتہ چلتا ہے کہ اُن کا اسٹاپ تو چار اسٹاپ پیچھے رہ گیا!

کسی ہارر فلم میں ہم نے ایک بگھی دیکھی تھی جس کے پائیدان پر کسی کا پاؤں پڑتے ہی گھوڑوں کو لٹر سی لگ جاتی تھی اور وہ ہوا سے باتیں کرتے ہوئے ویرانے کی ایک اُجڑی کا کی بسوں کا ہے۔ ابھی C حویلی کے صدر دروازے پر پہنچ کر دم لیتے تھے! یہی حال 7 مسافر پائیدان پر پاؤں ہی رکھتا ہے کہ ڈرائیور "ڈبل ہے اُستاد" کی روایتی صدا کا انتظار کئے بغیر ہوا سے گفت و شنید فرمانے لگتے ہیں!

کا روٹ سلامت ہے، ہمیں کم از بسوں کی ریس کا الگ سے اہتمام کرنے کی Cجب تک 7 کے C کوئی ضرورت نہیں! ہم بڑا دل رکھتے ہیں۔ فارمولا ون کے ڈرائیورز چاہیں تو 7 ڈرائیورز سے، بلا معاوضہ، بہت کچھ سیکھنے کے لیے تشریف لا سکتے ہیں!

سعید آباد سے اسٹارٹ لینے والی 20 نمبر کی بسیں کراچی کی سب سے انوکھی نشانیوں میں سے ہیں۔ اگر کوئی شخص سے یہ سمجھتا ہے کہ کنستر صرف گھی، تیل رکھنے کے کام آتا ہے تو یہ اُس کی بھول ہے۔ 20 نمبر کی بس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بڑے کنستر کو بس میں بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے! یہ کراچی کی واحد بس ہے جو اپنے گزرنے کا اعلان کرتی جاتی ہے! اِن بسوں میں بیٹھنے والے اپنی قسمت پر ناز کرتے ہیں کہ اللہ کی جس قدرت کے بارے میں صرف سُنا تھا، اُسے دیکھا ہی نہیں بلکہ اُس میں سفر بھی کرلیا!

بولی وُڈ کی فلم انڈسٹری میں بپّی لہری نے اُٹھا پٹخ والی موسیقی سے بہت نام اور خاصے دام کمائے۔ ہمیں پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں بپّی لہری کو 1980 کے عشرے میں "ڈسکو ڈانسر" کا میوزک دینے کی تحریک 20 نمبر کی بس دیکھ کر ملی ہوگی! اِس فلم کے گانوں میں ٹین ڈبے اور گھر کے برتن بھی بجتے، کھنکتے محسوس کئے جاسکتے ہیں! آپ کو 20 نمبر کی کسی بس میں میوزک سسٹم نہیں ملے گا۔ ظاہر ہے اِس کی کوئی ضرورت ہی نہیں!

Z اورنگی ٹاؤن سے جونا مارکیٹ تک چلنے والی چھوٹے سائز کی ویگن بھی اپنی ذات میں ایک انجمن، بلکہ ایک الگ دُنیا ہے۔ جو لوگ اِس ویگن میں سفر کرتے ہیں کچھ اُنہی کے دل سے پوچھیے کہ منزل تک پہنچتے پہنچتے وہ کتنی منزلوں

سے گزرتے ہیں! بہت سے لوگ اِس ویگن کو دیکھ کر یااِس میں سفر کرکے اللہ سے لَو لگانے کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں! اِس ویگن میں ٹھنسے ہوئے مسافروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قبر میں اِنسان کا کیا حال ہوگا! رَش آورز میں یہ ویگن اجتماعی قبر کا منظر پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی!

میں باقاعدگی سے سفر Z !کھچا کھچ بھری ہوئی اِس ویگن میں سانس لینا بھی کمال ہے کرنے والے اگر کوشش کریں تو بھرپور سانس کے ساتھ گانے والے اچھے گلوکار ثابت ہوسکتے ہیں! اِس ویگن کا ہر کنڈکٹر کپڑے کی دُکان کا سیلزمین دکھائی دیتا ہے یعنی مسافروں کو تھپیوں کی شکل میں فِٹ اور ایڈجسٹ کرتا جاتاہے! ذرا سی ویگن میں وہ ڈھیروں مسافر اُسی طرح فٹ کرتا ہے جس طرح حکومت کابینہ میں اتحادیوں کو کھپاتی ہے!

بسوں اور ویگنوں میں تہہ در تہہ کھڑے ہوئے مسافروں کے درمیان سے گزرنا اور اُن سے کرایا وصول کرنا ایک ایسا فن ہے جس کے بارے میں الگ سے بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ سُنا ہے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک کے اعلیٰ حکام اپنے قرضوں کی وصولی کے لیے چند غیر معمولی tricks سیکھنے کی خاطر اِن کنڈکٹرز سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں! کمال یہ ہے کہ ہمارے کنڈکٹرز جن سے وصولی کرلیتے ہیں اُن کی شکل دیکھے بغیر بھی اُنہیں یاد

رکھتے ہیں اور محض چال دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کون کرائے کے پیسے دیئے بغیر آف لوڈ ہونے کی کوشش فرمانے والا ہے! کرایا دیئے بغیر بس یا ویگن سے اترنے کی کوشش کرنے والے مسافر کے حلق میں کنڈکٹر اُسی طرح پھنس جاتے ہیں جس طرح کبھی کبھی کوئی ٹی وی اینکر کسی سیاست دان کے گلے کی ہڈی بن جاتا ہے! سچ تو یہ ہے کہ بہت سے کنڈکٹرز جنگ میں اگلے مورچوں پر عمدہ خدمات پیش کر سکتے ہیں۔ دُشمن کی صَفیں چیرنے کا ہنر اُنہیں خوب آتا ہے!

ایک دن محبت کا

لیجیے، پھر وہ دن آ گیا جو نئی نسل کے خون کو گرماتا اور جوانی کے مرحلے سے گزر جانے والوں کے زخموں پر نمک چھڑکتا ہے۔ دنیا بھر میں محبت کرنے والے تو ہر دور ہی میں رہے ہیں۔ اگر پیار کرنے والے نہ ہوتے تو محبت کی داستانوں پر فلمیں نہ بنتیں، گانوں میں وہ تاثیر نہ ہوتی اور المیہ اداکاری میں وہ طمطراق نہ ہوتا۔ سینٹ ویلنٹائن ڈے تو نہ جانے کب سے منایا جارہا ہے مگر میڈیا کی مہربانی ہے کہ اب اس کی اہمیت سے ہم سبھی آگاہ ہوچکے ہیں اور سب کو ایک ہی رنگ میں رنگنے کی کوشش کا ہدف بنتے جارہے ہیں!

محبت کا دن اب جس بھرپور تیاری کے ساتھ منایا جانے لگا ہے اتنی تیاری اور جذبے کے ساتھ تو محبت بھی نہیں کی جاتی! اور ویلنٹائن ڈے منانے کے لیے بھرپور تیاریاں کیوں نہ کی جائیں، آخر کو یہ اربوں ڈالر کے بزنس کا معاملہ ہے۔ مغرب نے ہر چیز کو تجارت میں تبدیل کردیا ہے۔ اب تک محبت پر نظر نہیں پڑی تھی اس لیے کارپوریٹ کلچر کے تھنکرز کی کاروباری سوچ سے یہ محفوظ رہی تھی۔

ایک زمانہ تھا جب لوگ سادہ دلی کے ساتھ جیتے تھے۔ جوانی گزر جاتی تھی تو یاد آتا تھا کہ ارے! جو دیوانی کہلاتی ہے وہ جوانی تو گزر بھی گئی! لوگ دل لگا بیٹھتے تھے اور کئی سال گزر جانے پر سمجھ نہیں پاتے تھے کہ انہیں محبت ہو گئی ہے۔ پانی سر سے گزر جانے پر اُنہیں اندازہ ہوتا تھا کہ کس سیلاب کو گلے لگایا ہے! اور یہ اندازہ بھی اُس وقت ہوتا تھا جب محبوب یا محبوبہ سے شادی کے بعد ہوش ٹھکانے پر آتے تھے! یہ سب اس لیے ہوتا تھا کہ محبت کی راہ پر گامزن ہونے کے طریقے سکھانے کے لیے الیکٹرانک میڈیا اور بالخصوص ٹی وی چینلز نہیں تھے!

گزرے وقتوں کی محبت ستون کی طرح ہوتی تھی یعنی سب کچھ تباہ ہو جاتا تھا تب بھی محبت باقی رہتی تھی۔ اب لوگ ایسے بے وقوف نہیں رہے۔ وہ کوئی جانور ہیں کہ ایک کھونٹے سے بندھے رہیں! صدیوں یا جنم جنم ساتھ نبھانے کی قسمیں کھانا اب مزاح کے ذیل میں آتا ہے۔ اب تو

تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی!

والا معاملہ ہے۔ محبت کے گیم میں اب پارٹنرز اِتنی تیزی سے بدلتے ہیں کہ گرگٹ بھی حیران رہ جاتے ہیں اور محبت کرنے والوں سے رنگ بدلنے کی نئی ادائیں سیکھنے کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں! کوئی کسی کے پاس زیادہ دن کیا، زیادہ دیر نہیں ٹِکتا! یعنی

فضائے صحن چمن میں ہمیں تلاش نہ کر
!مُسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں

اب کوئی کسی کی بے وفائی کا گلہ نہیں کرتا۔ غور کیجیے تو "بے وفائی" میں بھی وفا تو پوری کی پوری موجود ہے! محبت کرنے والے اب پنچھی بن گئے ہیں، ڈال ڈال ڈیرے ڈالتے ہیں۔ اُس کا انتظار نہیں کیا جاتا جس کے دل سے دل ملے۔ چلن یہ ہے کہ

ملے نہ پھول تو کانٹوں سے دوستی کرلی
!اِسی طرح سے بسر ہم نے زندگی کرلی

محبت کرنے والوں پر ایک زمانہ وہ بھی گزرا جب ایک دوسرے کی محض ایک جھلک دیکھنے کے لیے عید کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ عید کا چاند دیکھنے کے لیے چھت پر چڑھ کر اپنی اپنی ضرورت یا خواہش کے مطابق چاند تلاش کیا جاتا تھا! آپ نے بھی سُنا ہی ہوگا۔

مجھے مل گیا بہانہ تیری دید کا
!کیسی خوشی لے آیا چاند عید کا

اب کیسی عید؟ کیسا چاند؟ اور کیسا بہانہ؟ اب تو بندہ عہد و پیمان کرکے ایسا

غائب ہوتا ہے کہ خود عید کا چاند ہو جاتا ہے! اور اگر اُس سے بے وفائی کا شکوہ کیا جائے !تو "یو ٹیوب" پر بہت کچھ "اپ لوڈ" کرنے کی دھمکی دیکر صاف دامن بچا جاتا ہے
کئی زمانے گزرنے کے بعد کاروباری ذہنوں میں یہ خیال سمایا ہے کہ محبت کو بھی مال تجارت بنا کر تجوریاں بھری جاسکتی ہیں۔ اب محبت بھی ایونٹ ہے۔ تحفہ دیئے بغیر محبت ثابت نہیں کی جاسکتی۔ ایک پوری انڈسٹری محبت کرنے والوں کے نام پر چل رہی ہے، پنپ رہی ہے۔

محبت کرنے والے اب جائیں تو کہاں جائیں؟ ساحل پر طرح طرح کی پابندیوں کی طوفان اٹھائے جاتے ہیں۔ شہر کے کنارے پر جو ویرانے تھے وہ اب لینڈ مافیا نے بستیوں میں تبدیل کر دیئے ہیں۔ اگر کسی کو بائک پر بٹھا کر لانگ ڈرائیو پر نکلیں تو بائک اور سیل فون دونوں چھن جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ ایسے میں سائبر اسپیس ہی باقی بچا ہے جہاں محبت کرنے والے پناہ لے سکتے ہیں۔ آن لائن کلچر نے خاصی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ ٹیلی کام سیکٹر نے بھی دل والوں کو بڑی سہولتیں فراہم کی ہیں۔ محبت کرنے والے فل نائٹ پیکیج کی مدد سے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ وہ کیا باتیں کرتے ہیں، یہ بات رہنے دیجیے۔ اگر ان باتوں کو شائع کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا تو بیشتر مزاح نگاروں کے گھر کا

!چولھا ٹھنڈا ہو جائے گا

اب کے ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے اچھی خاصی تیاری کی گئی ہے۔ کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں زیادہ زور دکھائی دے رہا ہے۔ لاہور میں کئی علاقے سرخ رنگت اختیار کرچکے ہیں۔ ہم تو ہر حال میں مثبت سوچ رکھتے ہیں اس لیے یہی سوچ کر دل کو بہلا رہے ہیں کہ اچھے خاصے معاشرے پر مغرب کی ایک عِلّت تھوپے جانے پر حیا کے مارے اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہوگیا ہے! ضروری نہیں کہ سب ہماری بات سے متفق ہوں۔ ہم تو اب عمر کے اُس مرحلے میں ہیں کہ ویلنٹائن کی آمد پر بھی زیادہ سے زیادہ well-end-time ڈے ہی منا سکتے ہیں! جن کی رگوں میں لہو گرم ہے وہ اِس لہو کو مزید گرم کرنے اور رکھنے کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ویلنٹائن بھی ایک ایسا ہی بہانہ ہے۔ ثقافت، تہذیب اور اقدار وغیرہ کا کیا ہے، وہ ساتھ رہیں گی۔ اُنہیں ہم سے کون چھین یا پوچھ رہا ہے۔ ہم سال بھر تو ثقافت اور اقدار کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ایک ویلنٹائن ڈے پر بھی اُنہیں بالائے طاق رکھیں گے تو !کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا

آپ ایک بار پوچھ کر تو دیکھیں

اگر آپ نفسیات کے ماہر نہیں اور رویّوں کو سمجھنے میں اکثر غلطی کر جاتے ہیں تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ آپ نے سب کو سمجھنے کا ٹھیکا تو لے نہیں رکھا۔ پاکستانی معاشرے میں اب رویّوں کا کام ہی دھوکا دینا ہے۔ دل میں کچھ اور چہرے پر کچھ، یہی زندگی کا چلن ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بچّے تو غیر سیاسی ہوتے ہیں مگر باقی سب لوگ خالص سیاسی ہوگئے ہیں! سبھی ہونٹوں پر مجلسی تبسم سجائے پھرتے ہیں اور اِس مصنوعی تبسم کو اپنا ترجمان بھی سمجھتے ہیں!

مرزا تفصیل بیگ نے از خود نوٹس کے تحت ماہر نفسیات کا منصب اپنے لیے مختص کرلیا ہے۔ لوگوں کو سمجھنے کا اُن کا اپنا طریقہ ہے۔ اور یہ طریقہ ایسا "تیر بہ ہدف" ہے کہ اُن کا اندازہ کبھی کبھار ہی غلط نکلتا ہے۔ مثلاً مرزا کا کہنا ہے کہ جو لوگ بہت چیختے چلاتے ہیں اور گھر سے باہر ہر ایک سے لڑتے جھگڑتے ہیں اُن میں سے بیشتر کی اپنے گھر میں کچھ خاص توقیر نہیں ہوتی! جب گھر میں کوئی نہیں سُنتا تو اِنسان ساری دُنیا کو سُناتا ہے اور گھر والوں کو دِکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ دیکھو، تم نہیں سُنوگے تو ساری دُنیا کو سُنا کر حشر بر پا کروں گا!

ہم مرزا کی اِس بات سے پوری طرح متفق ہیں کہ جس کی کوئی نہیں سُنتا وہ سب کو سُنانا چاہتا ہے اور جب تک سب سُن نہ لیں، چین سے نہیں بیٹھتا! یعنی سماعتوں کا بُھٹہ بٹھا کر، سب کا سُکون غارت کرنے کے بعد ہی سُکون کا سانس لیتا ہے!

ہم ایک ایسے معاشرے کا حصہ ہیں جس میں لوگ اپنے کام کے سوا سارے کام کر رہے ہیں اور اِس عمل کو کارنامہ شمار کرتے ہیں۔ کوئی اپنا کام نہ کر پانے پر شرمندہ بھی نہیں ہوتا اور بضد رہتا ہے کہ اُس کی سُنی اور مانی جائے!

مختلف بیماریوں کے بارے میں طرح طرح کی پیش گوئی آمیز باتیں کرنے والے ماہرین اب تک ملک کی سب سے عام بیماری کے بارے میں خاموش ہیں۔ یہ بیماری ہے بن بلائے مشورے دینا۔ جسے دیکھیے وہ ہر معاملے میں اپنی ماہرانہ رائے سے نوازنے پر تُلا رہتا ہے۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے، جسے رائے دینا ہے وہ دیکر رہتا ہے۔

اگر پارلیمنٹ کا سیشن چل رہا ہو اور قومی امور پر بحث طول پکڑ رہی ہو تو ڈرائنگ رومز میں بھی پارلیمنٹس سج جاتی ہیں۔ ڈرائنگ روم کی پارلیمنٹس میں

تمام ہی اقسام کے مشورے پوری روانی کے ساتھ پیش کئے جارہے ہوتے ہیں۔ قانونی امور کے ماہرین خواہ کچھ کہیں، ڈرائنگ روم، ہوٹل کی بینچ اور چبوتروں پر بیٹھے ہوئے ماہرین" وزیراعظم کو توہین رسالت کے کیس میں پیشی کے حوالے سے طرح طرح" کے مشوروں سے نواز رہے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ اگر وزیراعظم نے ان عوامی مشورہ بازوں کی چند باتیں مان لی ہوتیں تو منفرد دلائل کے ذریعے ججز کو تھوڑی دیر کے لیے پریشانی سے دوچار کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتے ! قانون کی کتابیں جن پیچیدہ نکات سے اب تک محروم ہیں وہ ان عوامی مشورہ بازوں کی باتوں میں ! تھوک کے حساب سے پائے جاتے ہیں

سیاسی جماعتیں دنیا بھر کی عقل رکھتی ہیں مگر اب تک ان میں وہ عقل پیدا نہیں ہوئی جو عوام کے ذہنوں میں پائی جاتی ہے۔ مکمل فراغت کے ساتھ ہوٹل کی بینچ پر دنیا بھر کے موضوعات کو شرفِ تفکر بخشنے والے جب سیاستدانوں کو مشوروں سے نوازنے پر آتے ہیں تو کوئی بھی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ اگر سیاسی رہنما اِن مشوروں پر کان اور دھیان دھریں تو ایسی حکمتِ عملی تیار ہو کہ تمام دالوں اور گوشت گھوٹنے سے تیار ہونے والا کھچڑا بھی دیکھے تو شرما جائے ! مشورہ دینے والوں کی دریا دلی کا یہ عالم ہے کہ بلا تکان بولتے ہیں اور کوئی بھی نکتہ فراموش نہیں کرتے۔ کوئی بھی امکان اِن کی نظر کے راڈار سے محفوظ نہیں رہ پاتا اور بہت دور جاکر کوڑیاں لاتے ہیں تاکہ مُنہ سے بات

!کے نکلتے ہی سُننے والے حیران رہ جائیں

جب سے ملک کی سرحدیں خطرے میں ہیں اور سیکورٹی فورسز پر دباؤ بڑھا ہے، سوچنے والوں نے از خود نوٹس کے تحت اسٹریٹجک امور کے بارے میں سوچنا شروع کردیا ہے۔ دہشت گردی سے نمٹنے کے طریقے سوچنا ان کا کام ہے جو دہشت گردوں سے نبرد آزما ہیں۔ وہی بہتر جانتے ہیں کہ کس سے کس طور نپٹنا ہے اور صورت حال کو کس طرح معمول پر لانا ہے۔ مگر جنہیں سوچنے اور مشورے دینے کا "ہَوکا" وہ اِس معاملے میں بھی قیاس کے گھوڑے اِتنی تیزی سے دوڑاتے ہیں کہ دیکھنے والے بے چارے صرف دھول دیکھتے رہ جاتے ہیں! اگر کہیں فوجی یا نیم فوجی دستے تعینات کئے جانے ہوں اور اس حوالے سے میٹنگز ہو رہی ہوں تو ڈرائنگ رومز میں بیٹھے ہوئے بزرجمہر متنوع نکات پیش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسٹریٹجک امور کے ماہرین اُن کی رائے سے مستفید ہوں! کبھی کبھی تو یار لوگ ذہن کے گھوڑوں کو اِس قدر دوڑاتے ہیں کہ بے چارے کہیں کے کہیں جا نکلتے ہیں اور پھر اُنہیں عقل کے اصطبل میں لانا انتہائی دشوار !اور جاں گُسل ہوتا ہے

سوچنے اور مشورے دینے کو اپنا پیدائشی فریضہ اور حق گرداننے والوں کے لیے شعبے اور میدان کی کوئی قید نہیں۔ گلی میں کسی کے ہاں کوئی تقریب ہو اور

شامیانہ لگایا جارہا ہو تو یہ خدائی فوجدار موقع پر موجود رہتے ہیں تاکہ انتہائی قیمتی مشوروں کا دریا بہاتے رہیں۔ کبھی کبھی مشورے اِس قدر بہہ نکلتے ہیں کہ لوگ کیچڑ کی شکایت کرتے پائے جاتے ہیں! میزبان بے چارا ایک طرف رہ جاتا ہے اور شامیانے کے لیے ایک ایک "کِلّا" اِن خود ساختہ رضاکاروں کے مشوروں کی روشنی میں گاڑا جاتا ہے۔ اپنے منہ آپ رضاکار بن بیٹھنے والوں کے مشوروں سے شامیانے کا لگایا جانا بھی محلے بھر کے بچوں کے لیے ایک دلچسپ ایونٹ سے کم نہیں! شادی کی تقاریب تو جب ہوں گی تب ہوں گی، اُس سے بہت پہلے ہی لوگ بہت کچھ انجوائے کرچکے ہوتے ہیں! اگر کوئی مشورے دینے پر آمادہ (یا بضد) ہو تو پھر کیا خوشی اور کیا غم؟ مشوروں کی روانی یقینی بنانے کے لیے خوشی کے موقع کی قید نہیں، کسی کے مرنے پر بھی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ آپ نے کسی نہ کسی کی تدفین میں تو شرکت کی ہی ہوگی۔ تدفین کے موقع پر بھی مشورہ باز شخصیات اپنی موجودگی کا احساس دلانے سے باز نہیں رہتیں۔ انتقال سے تدفین تک یہ مستقل سوچتے اور سوچی ہوئی ہر بات کو طشت از بام کرتے رہتے ہیں۔ بعض صاحبان تو اس موقع پر ایسا پروٹوکول اور طریق کار بیان کرتے ہیں کہ مُردوں کا بھی جی تو چاہتا ہوگا کہ کفن پھاڑ کر کھڑے ہوں اور اِن کے آگے ہاتھ جوڑیں کہ بھائی! عزت سے دفن ہو لینے دو! مُردے کو قبر میں اُتارنے سے قبر پر مِٹّی

ڈالنے تک ہر مرحلے پر اِن کی طرف سے ہدایات، بلکہ احکامات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ وہ تو کہیے کہ اِن کا بس نہیں چلتا ورنہ بر وقت عالم نزع کی اطلاع ملنے پر مَرنے والے کے سِرہانے کھڑے ہو کر اُس کی رہنمائی کریں کہ کس طرح مَرنا ہے اور کس طرح نہیں مَرنا!

علاقے میں اگر کبھی بھولے بھٹکے کوئی ترقیاتی کام شروع کیا جائے تو سمجھ لیجیے کہ قوم کے غم میں گھلنے اور بے مانگے مشورے دینے والوں کی چاندی ہو گئی۔ جب تک ترقیاتی منصوبہ مکمل نہیں کرلیا جاتا، یہ بلا ناغہ حاضری دیتے ہیں اور قدم قدم پر متعلقہ عملے کا جلد از جلد اور بے داغ تکمیل کا راستہ دکھاتے ہیں! اگر کوئی عمارت کھڑی کی جارہی ہو تو یہ خدائی فوجدار اُس کے ڈیزائن میں رہ جانے والی خامیوں کی نشاندہی کر کے ایسی جامع ترامیم تجویز کرتے ہیں کہ متعلقہ انجینئرز بے چارے (اپنا) سَر پیٹ کر رہ جاتے ہیں!

سوچنے اور مشورے دینے کے قومی فریضے پر مامور افراد کی شان دیکھنا ہے تو کرکٹ میچ کے دوران دیکھیے۔ کریز پر موجود بیٹسمین کو آخر آتا ہی کیا ہے؟ ایک ایک گیند پر یہ اُسے مشوروں سے نوازتے ہیں اور جب وہ اِن کے مشوروں کا سہارا لیکر نہیں کھیلتا تو اِن کے "مشورہ بار" منہ سے مغلظات کا طوفان سا امڈنے لگتا ہے! میچ میں کس مرحلے پر کس طرح کھیلنا چاہیے، یہ بات ٹی وی

اسکرین کے سامنے بیٹھے گھریلو ساختہ ماہرین سے زیادہ کون جانتا ہے ! اپنی باتوں سے یہ آن کی آن میں میچ کا پانسہ پلٹ دیتے ہیں اور "چشم تصور کی آنکھ" سے قومی ٹیم کو فتح سے ہمکنار ہوتی ہوئی بھی دیکھ لیتے ہیں ! مگر ہائے ری قسمت ! ہر اوور کے خاتمے پر، قومی ٹیم کے ارکان کے "عدم تعاون" کے باعث، اِن کی سوچی ہوئی اسکیم ناکامی سے دوچار ہوتی ہے اور میچ وہیں کا وہیں رہتا ہے !

کسی زمانے میں ہماری گلی سے ایک نوجوان ٹھیلے پر کھوپرے کے ٹکڑے سجائے گزرتے ہوئے صدا لگاتا تھا "ارے بھئی لیں نہ لیں، ایک بار دیکھ تو لیں !" مشوروں سے نوازنے والے بھی زبان حال سے صدا لگا رہے ہوتے ہیں "ہماری بات مانیں نہ مانیں، ایک بار پوچھ تو لیں !"

دماغ پڑھنے والی مشین

آج تک یہ طے نہیں ہوسکا کہ سوچنا بنی نوع انسان کے لیے نعمت ہے یا کسی کی بد دُعا کا نتیجہ۔ جنھیں سوچنے کی صِفَت عطاء ہوتی ہے وہ اپنا اور دوسروں کا ناک میں دَم کرتے رہنے کو زندگی کا سب سے بڑا فرض تصور کرلیتے ہیں! سائنس دان ایک زمانے سے یہ سوچ سوچ کر حیران اور پریشان ہیں کہ انسان سوچتا کیسے ہے؟ اور ہم یہ سوچ سوچ کر حیران ہیں کہ سائنس دان آخر سوچنے ہی کے بارے میں اِتنا کیوں سوچتے ہیں!

سوچنے کے لیے موضوعات کی کوئی کمی نہیں مگر سائنس دان گھوم پھر کر صرف سوچنے ہی کو موضوع بناکر گھیر لیتے ہیں!

مُنہ سے نکلی ہوئی بات کو سمجھنا شاید کافی نہ تھا اِس لیے اب ایک قدم آگے جاکر خیالات کو پڑھنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے۔ امریکی ماہرین نے دماغ سے خارج ہونے والے پیچیدہ برقی سگنلز کو صوتی لہروں میں تبدیل کرکے الفاظ اور جملوں کی شکل میں ڈی کوڈ کرنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ اُن کا دعوی ہے کہ چند آلات اور کمپیوٹر کی مدد سے کسی بھی شخص کے خیالات کو بھانپنا اور سمجھ لینا اب ممکن ہوگیا ہے۔

مغربی دنیا کے ماہرین کے بارے میں ہماری رائے کبھی اچھی نہیں رہی۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ اُن کے دماغ غروب ہو چکے ہیں! اور اِس رائے کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی، خود مغربی ماہرین ہی اِس کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارے ذہن میں تو یہ تصور راسخ ہو چکا ہے کہ ماہرین وہ ہیں جو مَکھی پر مَکھی مارتے رہیں! جو چیز پہلے سے موجود ہو اُسے ایجاد کرنا کون سا کمال ہے؟ مگر اِتنی سادہ سی بات کوئی بھی آج تک ماہرین کو سمجھا نہیں سکا!
اب اِسی بات کو لیجیے کہ دماغ میں اُبھرنے والے خیالات کو پڑھنے کی مشین بنانے کی کوشش پر عشروں تک محنت کی جاتی رہی جبکہ ایسی چلتی پھرتی مشینیں تو پاکستان جیسے پس ماندہ معاشرے میں بھی عام ہیں! اِن میں سے بیشتر مشینوں کو عُرفِ عام میں بیوی کہا جاتا ہے! کسی عورت کے بیوی ہونے کی سب سے بڑی نِشانی یہ ہے کہ وہ شوہر کا مُنہ کھلنے سے پہلے اُس کے ذہن میں اُبھرنے والے خیالات کو سمجھ لیتی ہے! اگر یقین نہیں آتا تو ذرا سوچیے کہ اتوار کی صبح جب حلوہ پوری لانے میں شوہر کو ذرا سی تاخیر ہو جائے تو گھر میں اُس کے داخل ہوتے ہی بیوی کیا کہتی ہے؟ یہی کہ "میں جانتی تھی تم وہاں بیٹھ گئے ہوگے کسی کے ساتھ گپ شپ لگانے۔ اور تین چار پوریاں بھی ٹھونسی ہوں گی!" اگر آپ شادی شدہ ہیں تو یہ یا اِس سے ملتا جلتا جملہ سُن کر آپ کو بھی اپنی بیگم پر رشک تو آتا ہوگا کہ جو بات آپ بتانے والے تھے وہ اُنھوں نے کتنی آسانی سے guess کرلی!

رات کو شوہر دیر سے گھر آئے تو بیوی دروازہ کھولتے ہی اُس کے دماغ میں اُبھرنے والی باتیں فَرفَر بتانے لگتی ہے "دوستوں میں بیٹھ گئے ہوگے۔ گپ شپ ذرا لمبی ہو گئی ہو گی۔ میں جانتی تھی تم دوستوں میں بیٹھوگے تو بھول جاؤگے کہ گھر بھی جانا ہے۔" اور اللہ کی قدرت دیکھیے کہ ایسے معاملات میں بیویوں کے تمام اندازے دُرست نکلتے ہیں۔ اچنبھے کی بات تو یہ ہے کہ جو کچھ ابھی شوہروں کے دماغ میں پیدا بھی نہیں ہوا ہوتا وہ بھی بیویاں بہت عمدگی سے بیان کر جاتی ہیں! یہی سبب ہے کہ بیشتر مردوں کو شادی کے بعد سوچنے پر زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے! وہ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوتے ہیں کہ شادی سے پہلے ہی سوچ لیا ہوتا تو اچھا تھا!

شادی کی تقریب میں آپ بھی بڑی آسانی سے، مشین کی طرح، لوگوں کے دماغ پڑھ سکتے ہیں۔ دماغوں میں بس یہی خیال تو گردش کر رہا ہوتا ہے کہ کب کھانا کُھلے اور دُشمن سمجھ کر اُس پر ٹوٹ پڑیں! کھانے کو دُشمن کی طرح زیر کرنے کا خیال چہروں پر کسی نہ کسی شکل میں نمودار ہو ہی جاتا ہے! اِس کے لیے کسی گرافک مانیٹر کی ضرورت نہیں۔ اگر ڈِشیں زیادہ ہوں اور میٹھے میں بھی ورائٹی ہو تو دماغ میں پیدا ہونے والے پیچیدہ برقی سگنلز آنکھوں میں عجیب سی، بھوک بھڑکانے والی چمک پیدا کر دیتے ہیں! یہی وہ مرحلہ ہے جب آپ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص کا ذہن خاصی تیزی اور آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ مگر ایسا

!اُسی وقت ممکن ہے جب آپ کا اپنا ذہن کھانے سے متعلق سوچنے میں مصروف نہ ہو
جو لوگ تاخیر سے دفتر پہنچنے کے عادی ہیں اُن پر ایک نظر ڈال کر خیالات پڑھنا کوئی
کمال کی بات نہیں۔ انچارج صاحبان وقت اور حالات کی مناسبت سے اچھی طرح
اندازہ لگا لیتے ہیں کہ وہ تاخیر سے آنے کا ملبہ کس پر اور کس طرح ڈالیں گے ! اگر موٹر
سائیکل پر آتے ہیں تو وہ پنکچر ہو گئی ہوگی، اگر بس میں آتے ہیں تو ٹریفک جام ہو گیا
ہوگا۔ اگر محرم یا ربیع الاول کا مہینہ ہو تو جلوس نے پاؤں پکڑ، بلکہ جکڑ لیے ہوں گے !
آپ یہ نہ سوچیں کہ بہانے چند ایک ہی ہیں اِس لیے کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے۔ جو کام
پر دیر سے پہنچنے کے عادی ہوتے ہیں وہ ڈائجسٹوں کے رائٹرز کی طرح کسی بھی موضوع
پر کچھ بھی سوچ سکتے ہیں ! اُن کے ذہن میں جو کچھ پنپتا ہے اُس کا اندازہ لگانا ہر ایک
کے بس کی بات نہیں۔ بعض تو لیٹ ہونے کے معاملے میں ایسے "راسخ العمل" ہوتے
ہیں کہ جیب میں ٹوپی رکھتے ہیں۔ اگر زیادہ دیر ہو جائے تو ٹوپی اوڑھ کر دفتر میں داخل
ہوتے ہیں تاکہ انچارج اُنہیں دیکھتے ہی سمجھ جائے کہ ضرور کوئی جان سے گیا ہے ! ایسے
مواقع پر بھی انچارج دماغ کو پڑھنے میں دیر لگاتا ہے نہ غلطی کرتا ہے ! بعض مہربان
دفتر آنے میں اِتنی دیر لگاتے ہیں کہ انچارج اپنے آپ کو اُن کا ماتحت سمجھنے لگتا ہے اور
اُن کی آمد سے قبل ہی

!اُن کے ذہن میں اُبھرنے والے تمام بہانہ آمیز خیالات کو بھانپ لیتا ہے
مرزا تنقید بیگ کا استدلال ہے کہ جو شخص باقاعدگی سے ٹی وی پر سیاسی ٹاک شو دیکھتا ہے وہ دماغ پڑھنے میں ایسا ماہر ہو جاتا ہے کہ مشین بھی دیکھے تو شرما جائے ! اِن پروگراموں کے شُرکاء ایک دوسرے کو جس بے ذہنی اور بے جگری سے لتاڑتے ہیں اُس سے ناظرین بھی رفتہ رفتہ جان لیتے ہیں کہ کون کب کیا کہے گا ! ٹاک شوز کے شُرکاء کی بلند فکری تو دیکھیے کہ مخالفین کی نیت اور ارادہ بھانپ کر اُنہی کے خیالات کو pre-emptive strike کے طور پر استعمال کرتے ہیں ! ناظرین کا حال یہ ہے کہ گرما گرم بحث کے دوران کسی شریک کے پُھولے ہوئے نَتھنے دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اب اُس کے مُنہ سے کِس قسم کے گولے برسنے والے ہیں ! قسمت کی یاوری اور !اہلیت کی برتری دیکھیے کہ ناظرین عموماً درست ہی اندازہ لگاتے ہیں
ہم جس معاشرے میں زندہ ہیں اُس میں اب لوگ اپنے رویے کی مدد سے زیادہ بولتے ہیں ! تاثرات اور حرکات و سکنات کی مدد سے درست اندازہ لگانا اِس قدر آسان ہوگیا ہے کہ کسی مشین کو زحمت دینے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اپنے ماحول پر نظر دوڑائیے۔ تنخواہ ملتے ہی طبیعت کِھل اُٹھتی ہے اور پھر دس بارہ دن ایسے گزرتے ہیں کہ کوئی بھی آپ کے دماغ کو آسانی پڑھ سکتا ہے ! مہینے کے آخری

دنوں میں حالت عجیب تر اور اُس سے کہیں بڑھ کر غریب تر ہوتی جاتی ہے! ایسے میں بعض افراد اپنی عادت اور دماغ پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ اُنہیں دیکھتے ہی لوگ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ دماغ میں میں پیدا ہونے والے برقی سگنلز چہرے پر نمودار ہو کر اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ وہ کسی بھی لمحے اُدھار مانگ بیٹھیں گے!

دماغ کا کیا اچار ڈالنا ہے؟

اگر آپ کو یاد نہ رہا ہو ہم یاد دِلا دیتے ہیں کہ آپ اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں۔ اِس صدی کا کمال یہ ہے کہ اِس میں جو چیز جتنی ضروری ہے اُتنی ہی غیر ضروری بھی ہے! آپ اب تک سولھویں یا سترہویں صدی میں جی رہے ہیں اگر آپ کے ذہن میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ بہتر ڈھنگ سے زندہ رہنے کے لیے دماغ کا حامل ہونا اور اُسے درست انداز سے استعمال کرنا ناگزیر ہے!

ہوسکتا ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال اُبھرے کہ اب دماغ کی ضرورت محسوس نہیں کی جارہی مگر ڈیڑھ دو سو سال پہلے صورت حال مختلف رہی ہوگی۔ آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ ڈیڑھ صدی قبل مرزا غالب نے کہا تھا

دِل تو دِل، وہ دماغ بھی نہ رہا!

یعنی دماغ کے بغیر بھی وہ کئی سال زندہ رہے اور شعر بھی کہتے رہے۔ اب یہ نہ کہیے گا کہ دماغ کے بغیر میرزا نوشہ نے جو شاعری کی اُس میں دم نہیں! نواب اسلم رئیسانی کے فارمولے کے مطابق شعر تو شعر ہوتا ہے، چاہے دماغ کے ساتھ کہا جائے یا دماغ کے بغیر! ڈیڑھ صدی قبل دماغ سے برات کا اعلان یا اظہار

نابغوں کی زبانی ہوا کرتا تھا۔ اب اِس اعلان کے لیے نابغہ (جینیس) ہونا بھی لازم نہیں رہا!

اور ایک مرزا غالب پر کیا موقوف ہے، اُن سے بہت پہلے میر تقی میر نے کہا تھا

یہ تو نہیں کہ ہم پر ہر دم ہے بے دماغی

غور کیجیے، بد دماغی کا نہیں بلکہ بے دماغی کا ذکر ہو رہا ہے۔ یعنی میر کے زمانے میں بھی دماغ کے بغیر کام کرنے یا زندہ رہنے کی حالت ہوا کرتی تھی!

امریکی ریاست فلوریڈا کے دارالحکومت میامی کے کارلوس راڈر گز جب سڑک کے ایک حادثے میں سر کے بل فٹ پاتھ پر گرا تو اُس کا بچنا محال ہوگیا۔ ڈاکٹرز کو جان بچانے کے لیے اُس کا نصف دماغ اڑانا پڑا! جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دماغ کو پہنچنے والی چوٹ سے اِنسان مر جاتا ہے اُن کے لیے کارلوس راڈر گز عرف "ہافی" ایک چلتا پھرتا تجوبہ ہے۔ آدھے دماغ کے ساتھ بھی وہ نارمل زندگی بسر کر رہا ہے اور بیشتر معاملات میں اُس کی طرز عمل پورے دماغ کی غمازی کر رہی ہوتی ہے۔

اب ذرا یہ دیکھیے کہ جب دماغ پورا تھا تب یہ جناب کارلوس راڈر گز کیا کرتے تھے۔ 14 سال کی عمر میں کزن کی مدد سے کارچُرائی اور برق رفتاری سے اُسے دوڑا رہے تھے کہ اچانک راستے میں کہیں سے کھمبا آگیا! موصوف ونڈ اسکرین کے راستے اُڑتے ہوئے باہر گئے اور سَر کے بل سڑک پر لینڈنگ کی! تب یہ نشہ کیا کرتے تھے۔ یعنی پورا دماغ استعمال کرنے کی حالت میں نشے کی لَت، کار کی چوری اور ہائی اسپیڈ ڈرائیونگ۔۔ تینوں نے مل کراِن پر قیامت ڈھائی! اور اِس قیامت سے نپٹنے کے بعد کیا ہوا؟ موصوف نوجوانوں کو منشیات اور بالخصوص شراب سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں مگر خود اب بھی کوکین استعمال کر رہے ہیں! دماغ مکمل تھا تب بھی نشے کی عادت تھی اور اب جبکہ دماغ نصف رہ گیا ہے تب بھی نشہ زندگی کے ساتھ ساتھ ہے۔ یعنی نصف دماغ کے ضائع ہونے سے زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑا! کارلوس راڈر گز کے دماغ کا پرنالہ جہاں بہہ رہا تھا وہیں بہہ رہا ہے!

بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ کارلوس راڈر گز کو پولیس نے دو سال قبل لڑکیوں کے چکر میں گرفتار کیا! غور فرمایئے کہ آدھا دماغ لُٹا کر بھی موصوف لڑکیوں پر پورا دِل لُٹانے سے باز نہیں آئے! اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ واقعی اِنسان ہیں اور نصف دماغ سے محرومی کے بعد بھی اِنسان ہی رہنا چاہتے ہیں!

مرزا تنقید بیگ کا وجود ہمارے لیے ایک چلتے پھرتے تحقیقی ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُنہیں دیکھ کر ہمیں بہت سی ایسی باتوں پر یقین آ جاتا ہے جن کے بارے میں مشرق و مغرب کے ماہرین ابھی تحقیق کے مرحلے میں ہیں! مرزا کی "سادگی" دیکھیے کہ کبھی اِس نکتے پر غور اور غرور نہیں کیا ورنہ انہیں دیکھ کر کوئی بھی شخص آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ دماغ نہ صرف یہ کہ ہمارے لیے کوئی ضروری چیز نہیں بلکہ اِس کے بغیر آسانی سے بہتر زندگی بسر کی جا سکتی ہے!

ویسے تو قدرت نے سبھی کو دماغ ایک سخت کھوپڑی میں دیا ہے مگر مرزا کے لیے قدرت کی اِس عنایت میں بڑی مہربانی پوشیدہ ہے۔ ہماری اور دوسرے بہت سے لوگوں کی باتیں مرزا کی کھوپڑی سے ٹکرا کر دم توڑ دیتی ہیں یعنی دماغ تک پہنچ نہیں پاتیں! اور اِس کا خوشگوار نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ وہ ہر وقت فرحاں و شاداں رہتے ہیں اور کسی بھی معاملے پر غور فرمانے سے شدید گریز کی روش پر گامزن رہنے کے طفیل خاصی متوازن" اور پُرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مرزا کو ویسے تو کئی عارضے لاحق ہیں" مگر ہمارا خیال ہے کہ بُھولنے کی بیماری بہت نمایاں ہے۔ مرزا نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، دماغ استعمال کرنا بھول گئے ہیں!

ہم آئے دن مرزا سے نُورا کشتی کھیلتے ہیں یعنی مُلک کے بنیادی مسائل پر اُن کے ساتھ ویسی ہی گرما گرم بحث کرتے ہیں جیسی ایڈیٹ باکس یعنی ٹی وی پر روزانہ دکھائی دیتی ہے۔ مرزا کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ کبھی اپنا موقف تبدیل نہیں کرتے یعنی جھوٹ بولیں تو اُس پر قائم رہ کر خود کو "صاحب کردار" ثابت کرتے ہیں!

ہم نے مرزا کو جب بھی کسی معاملے میں دماغ استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے، اپنی عقل کا ماتم کرنا پڑا ہے۔ سبب اِس کا یہ ہے کہ دماغ استعمال کرنے کی صورت میں مرزا خاصے بھیانک نتائج پیدا کرتے ہیں اور بندہ اپنی ہی نظروں سے گر جاتا ہے کہ ایسا احمقانہ مشورہ دیا ہی کیوں تھا!

ہمارے ہاں ایسی کئی برادریاں پائی جاتی ہیں جن میں اوصافِ حمیدہ تہمت کا درجہ رکھتے ہیں! اِن برادریوں میں مُغَلّظات کا استعمال اُتنا ہی ضروری سمجھا جاتا ہے جتنا زندہ رہنے کے لیے آکسیجن کو ناگزیر گردانا جاتا ہے! ڈاکوؤں کی برادری میں رشتہ طے کرتے وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے نے، خیر سے، کتنے ڈاکے ڈالے ہیں! چوروں میں اِس بات کی اہمیت ہے کہ کس نے کتنی بار نقب لگائی ہے۔ بالکل اِسی طرح بعض برادریوں میں یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ

بندہ کہیں سیدھی اور سادہ زندگی تو بسر نہیں کر رہا! یعنی لڑنے بھڑنے کی صلاحیت تو ہے نا! جو جتنا جھگڑالو ہو وہ اُتنا ہی باکمال سمجھا جاتا ہے۔ یہ تو ہوا برادریوں کا معاملہ۔ جو بات پورے معاشرے پر محیط ہو اُس کی اہمیت کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اب پورے معاشرے میں سب سے زیادہ توجہ اِس امر پر دی جانے لگی ہے کہ کہیں کوئی دماغ تو استعمال نہیں کر رہا!

معاشرے کی عمومی روش کچھ ایسی ہے کہ لوگ دماغ یا عقل استعمال کرنے سے گریز کرنے لگے ہیں۔ سبھی یہ چاہتے ہیں کہ اہم فیصلے بھی بے عقلی اور بے ذہنی کی حالت میں کئے جائیں تاکہ کوئی عقل سے کام لینے کا الزام عائد کرنے کے بدنام کرنے کی کوشش نہ کرے! منشیات استعمال کرنے کا الزام لگ جائے تو کوئی اپنے نصیب کو نہیں روتا لیکن اگر کوئی عقل سے کام لینے یا دماغ استعمال کرنے پر مبارک باد دے تو بندہ بھڑک اُٹھتا ہے! دماغ لڑانے یا عقل استعمال کرنے الزام سے لوگ دامن بچاتے ہیں کیونکہ عقل سے کام لینے کا تاثر قائم ہو جائے تو بندہ بہت سے کاموں کے لیے یکسر نااہل قرار پاتا ہے!

بعض شعبے ایسے ہیں جن میں عقل استعمال کرنے کا صاف مطلب اپنے آپ کو نااہل قرار دینے کی کوشش کرنا یعنی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔ دفاتر کام کرنے

والوں پر لازم ہے کہ ایک خاص مینٹل فریم ورک میں رہتے ہوئے کام کریں۔ جہاں اپنا دماغ استعمال کیا اور گئے کام سے ! دفتری کارروائی میں ہر چیز اِس قدر نپی تُلی ہے کہ عقل استعمال کرنے سے کئی مُہرے اپنی جگہ سے ہٹ جاتے ہیں اور آفس ورک کی پوری باری نئے سِرے سے ترتیب دینا پڑتی ہے !

کلاس رومز میں اساتذہ ایک طے شدہ ڈھانچے کے مطابق پڑھاتے ہیں۔ بیشتر اساتذہ کا ذہن کمپیوٹر کی طرح ہوتا ہے۔ یعنی جو اُس میں فیڈ کردیا گیا بس وہی ہے، اور کچھ نہیں۔ اب اگر کلاس روم میں کوئی طالب علم نادانستگی میں شرارت کا ارتکاب کر بیٹھے یعنی ذرا سے ہٹ کر کوئی سوال کردے تو سمجھ لیجیے اُستادِ محترم کی بھینس گئی پانی میں ! یونان والے بہت عقل مند تھے۔ اُنھوں نے ڈھائی ہزار سال قبل سُقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کردیا تھا کیونکہ وہ نوجوانوں کو سوچنے اور سوال کرنے پر اُکسایا کرتا تھا !

اچھا ہے کہ ہم اکیسویں صدی کے ماحول میں ڈھل جائیں اور دماغ استعمال کرنے کی زحمت سے خود کو دور رکھیں۔ جب سبھی کچھ ایک کلک کی دوری پر ہے تو پھر دماغ کو بار بار کلک کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ جو دماغ مصیبت میں ڈالے اُسے خواہ مخواہ پروان چڑھانے سے فائدہ؟ ایسے دماغ کا کیا اچار ڈالنا ہے !

امریکہ کے لیے "سُریلے" صدر کی تلاش

کیا امریکی صدر کی اہلیہ کا تعلق پاکستان کے حکمراں ٹولے سے ہے؟ اگر نہیں (اور یقیناً نہیں) تو پھر کیا سبب ہے کہ وہ امریکی صدر کی حاشیہ برداری پر مجبور ہیں؟ آپ سوچیں گے کہ مشل اوباما، حاشیہ برداری اور پاکستانی حکمراں ٹولے کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ کوئی غلط اندازہ مت لگائیے، ہم خود بتائے دیتے ہیں۔ ہمارا حکمراں ٹولہ امریکی صدر کی حاشیہ برداری کو اپنے لیے ایمان کا درجہ دیتا ہے اور اُس کی ہر ادا کو سراہتا ہے۔ اگر امریکی صدر کسی معاملے میں بالکل گونگا بنا رہے تب بھی اُس کے "موقف" کو سراہنے والوں کا جوش ٹھنڈا نہیں پڑتا! مشل اوبامہ نے بھی کچھ ایسا ہی کیا ہے۔ ایک انٹرویو میں امریکی خاتون اول نے کہا ہے کہ اُن کے شوہر بہت سُریلے ہیں۔ وہ جب بھی سراہتے ہیں تو کچھ نہ کچھ گنگناتے ہیں!

شاید مشل اوبامہ بھی یہ راز جان گئی ہیں کہ کچھ کرنا اور پانا ہے تو امریکی صدر کو سراہتے رہیے اور اُس میں، کسی نہ کسی طرح، خوبیاں تلاش کرکے خراج تحسین پیش کرتے رہیے!

اوباما بہت چالاک ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کوئی اور سُنے نہ سُنے، بیگم صاحبہ تو اُن کا جیسا تیسا گانا سُن ہی لیں گی۔ بس یہی سوچ کر وہ طبع آزمائی کرتے ہیں اور مشل بروقت توصیف کے ڈونگرے برسا کر اُنہیں خوشی سے پُھولا نہ سمانے کا موقع فراہم کرتی ہیں!

تین سال سے بیشتر امریکی اپنے صدر کے اقوال و افعال میں سُریلا پن تلاش کر رہے ہیں اور ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ مشل کو داد دینا پڑے گی کہ اُنھوں نے شریکِ حیات ہونے کا حق ادا کردیا اور بُھوسے کے ڈھیر میں سُوئی تلاش کرلی یعنی شوہر میں سُریلا پن ڈھونڈ نکالا! ممکن ہے مشل کے ذہن میں یہ خیال آیا ہو کہ شوہر کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ اپنی پالیسیوں میں بھی کچھ سُریلا پن پیدا کرنے کی تحریک پائیں!

جن مَردوں کو زمانے سے یہ شکوہ رہتا ہے کہ اُن کا گایا ہوا کوئی نہیں سُنتا وہ براک اوباما کے نسخے پر عمل کرتے ہوئے اپنی اپنی بیوی کے سامنے گایا کریں۔ کوئی اور سُنے نہ سُنے، بیوی تو سُنے گی کہ اُسے گھر میں رہنا ہے! ہمارے بہت سے "اُستاد نُما" گلوکار بھی یہی نُسخہ استعمال کرسکتے ہیں کیونکہ، ہماری اطلاعات کے مطابق، اُنہیں بھی سُننے والے میسر نہیں! ہمارا کام مشورہ دینا ہے۔ اِس پر عمل کی صورت میں نتائج کے ذمہ دار ہم نہیں۔ ضروری نہیں کہ جو کچھ امریکی ایوان صدر میں ہوا وہ ہر جگہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ

آپ اپنی "سُریلی" آواز سے اہلیہ کو محظوظ کرنا چاہیں اور وہ آپ کی آواز سے "محفوظ" رہنے کو ترجیح دیں! اور ایسی صورت میں آپ کس حد تک محفوظ رہیں گے، اِس کی ضمانت ہم نہیں دے سکتے! امریکی اخبارات نے یہ تو بتادیا ہے کہ امریکی صدر اپنی اہلیہ کو گانا سُناتے ہیں مگر یہ بات اب تک طشت از بام نہیں ہوئی کہ شوہر کا گانا سُن کر امریکی خاتون اول کا حقیقی ردّ عمل کیا ہوتا ہے! امریکی انٹیلی جنس بہت چھان پھٹک کر وائٹ ہاؤس میں کسی بھی شخص کے تقرر کی منظوری دیتی ہے، اندر کی کوئی "بے سُری" بات باہر نہیں آتی!

خسارے میں اگر کوئی ہے تو امریکی عوام ہیں۔ ایک بے ڈھنگے صدر کو جھیلنے کے صِلے میں اُنہیں کچھ بھی نہیں ملا اور ملنے کی توقع بھی نہیں۔ مِشل اگر شوہر کا بے سُرا پن جھیل رہی ہیں تو صِلے میں امریکی خاتون اول کا اعزاز بھی تو برقرار ہے۔ اُن کے لیے یقیناً یہ کوئی گھاٹے کا سَودا نہیں!

اوبامہ کے تین سال سُر اور تال کی اونچ نیچ کے ساتھ گزرے ہیں۔ اُن کی پالیسیوں نے عجیب راگ الاپے ہیں۔ امریکیوں نے اُن کے راگ پاٹھ بہت جھیلے ہیں۔ اور ملک سے باہر بھی جدھر دیکھیے "ہائے، مار ڈالا ظالم" کا شور ہے! اِس میں کیا شک ہے کہ امریکی اپنی راگنیاں وہیں چھیڑتے ہیں جہاں لوگ سُننے پر مجبور ہوں۔ عراق میں امریکیوں نے اپنی بساط اِتنی تیزی سے لپیٹی کہ

دُنیا حیران رہ گئی۔ امریکی عوام کو بھی اندازہ ہے کہ اُن کی حکومت نے عراق سے جان چُھڑائی ہے۔

افغانستان کا معاملہ بہت مختلف ہے جہاں اوباما انتظامیہ کو خاصے تیور، تیکھے سُر سُننا پڑے ہیں۔ طالبان میں اب مروت برائے نام بھی نہیں رہی۔ اُنہیں اِس بات کا ذرا بھی احساس نہیں کہ اُن کا سامنا سُپر پاور سے ہے، اُس کا کچھ تو احترام کریں! جب دیکھو تب دیپک الاپتے رہتے ہیں، کبھی کبھار ملہار بھی گا دیا کریں! صدر اوباما نے 2014 میں افغانستان سے مکمل انخلاء کی ڈیڈ لائن دی تو طالبان اِسے اپنے لیے لائف لائن سمجھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور پورے جوش کے ساتھ متحرک ہوگئے۔ تابڑ توڑ حملوں سے اُنہوں نے ایسے راگ الاپے کہ امریکیوں سمیت تمام اتحادیوں کی گِھگّھی بندھ گئی۔

اوباما اور اُن کے رفقاء نے مذاکرات کی صورت میں مَدّھم سُر چھیڑنے کی کوشش کی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ طالبان امریکیوں کو بھی مار ہی رہے تھے مگر تیزی سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو پا رہے تھے۔ جب انہوں نے حکمت عملی بدلی اور یورپی دستوں کو نشانہ بنانا شروع کیا تو بات تیزی سے بنی۔ فرانس کے پانچ فوجی ایک حملے میں کیا مرے، فیشن کے عالمی دارالحکومت پیرس میں بھونچال آگیا اور فرانسیسی حکومت نے طالبان کو اُونچے سُروں میں گاتے ہوئے دیکھا تو مزید لڑائی سے توبہ کرتے ہوئے کھرج کے سُروں میں اتحادیوں کے سامنے الوداعی ٹُھمری گانا شروع کیا!

امریکیوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب کون سا راگ گا کر فرانیسیوں کو منائیں ! سُنا ہے شہنشاہِ غزل مہدی حسن کے چچا اسمٰعیل خاں صاحب کوئی راگ گا کر بچوں کے پیٹ کا درد ختم کردیا کرتے تھے۔ اگر آج وہ ہوتے تو فرانیسیوں کے پیٹ کا درد ختم کرنے میں امریکیوں کی ضرور مدد کرتے!

براک اوبامہ گھر میں جس قدر "سُریلا" گاتے ہیں کچھ کچھ ویسا ہی سُریلا پن ذرا اپنی پالیسیوں میں بھی پیدا کریں تو بات بنے۔ کرزئی حکومت اور افغان فوج کو اب تک اندازہ نہیں کہ امریکہ اور دیگر اتحادی جب اپنی افواج نکال لیں گے تب افغانستان کے طول و عرض میں کون کون سے راگ الاپے جائیں گے اور طالبان کو کون سی راگنی گا کر قابو میں کیا جاسکے گا! امریکی حکومت بجٹ خسارے کے ہاتھوں پریشان ہو کر اب کٹوتیوں کی راہ پر گامزن ہے۔ دفاعی بجٹ اور فوج کے حجم میں معتدبہ کمی کی جارہی ہے۔ کٹوتیوں کا فیشن عام ہوتا دیکھ کر امریکی محکمہ دفاع نے افغانستان سے انخلاء کی ڈیڈ لائن میں بھی ایک سال کی کٹوتی کردی ہے۔ لیون پنیٹا یہ تو بتائیں کہ اتحادی افواج کون سی سرگم لگا کر 2013 کے آخر تک افغانستان سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو پائیں گی! طالبان کی خوں ریز تانیں اور پلٹے اُنہیں ایسا کرنے دیں گی؟ بہتر ہوگا کہ اوبامہ راگ پاٹھ چھوڑ کر کوئی ڈھنگ کا یعنی حقیقت پسندی کا سُر لگائیں۔

ٹوائلیٹ سے غزل تک

بھارتی ریاست مدھیہ پردیش کی ایک نوبیاہتا دُلہن نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ انیتا کی شادی رتن پور گاؤں کے شِو رام سے ہوئی۔ شِو رام کے گھر میں ٹوائلیٹ نہیں تھا۔ انیتا کا خیال تھا کہ شادی تک ٹوائلیٹ بنالیا جائے گا۔ شادی کے بعد جب اُس نے سُسرال میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ "فِطرت کی پُکار" پر کھیتوں میں جانا پڑے گا! انیتا بی اے کی طالبہ تھی۔ اُس سے یہ گوارا نہ ہوا اور فطرت کی ہر پکار کا جواب دینے کے لیے وہ اپنے گھر چلی گئی۔ واپسی کے لیے اُس نے ٹوائلیٹ تعمیر کرنے کی شرط رکھی۔ بے چارے شِو رام کے لیے ٹوائلیٹ کی تعمیر کے سِوا چارہ نہ رہا۔ اُس نے گاؤں کی پنچایت سے بات کی تو 501 روپے کی امداد ملی۔ دو ہزار روپے گھر والوں نے دیئے۔ اور ایک ہفتے بعد جب ٹوائلیٹ تیار ہوا تو انیتا بھی واپس آ گئی۔

خواتین کی بہبود کے لیے کام کرنے والی تنظیم سُلابھ انٹر نیشنل نے انیتا کو "اِنقلابی" قدم اُٹھانے پر پانچ لاکھ روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ سُلابھ کے ڈائریکٹر بندیشور پاٹھک کا کہنا ہے کہ اگر بھارت کی تمام لڑکیاں ایسی ہی شُجاعت دِکھائیں تو بھارت کے ہر گھر میں ٹوائلیٹ بن جائے اور

!فطرت کی پُکار" کا جواب دینے کے لیے گھر سے دور نہ جانا پڑے"

غور فرمایئے، جو مُلک خطے کا چودھری بننے کے خبط میں مبتلا ہے اُس کے تمام باشندوں کو گھر میں ٹوائلیٹ کی سہولت بھی میسر نہیں! دِلّی سرکار خطے پر حکمرانی کا خواب دیکھے اور بصد شوق سے دیکھے، مگر پہلے اپنے مُلک کی نو بیاہتا دُلہنوں کو حوائج ضروریہ سے فراغت !کی بہتر سہولت تو فراہم کرے

شادیاں پاکستانی معاشرے میں بھی ہوتی ہیں۔ مگر فِطرت کی پُکار پر ایسا "انقلابی" قدم اٹھانے والیاں خال خال ہیں۔ بات یہ ہے کہ غریب کا بچہ شادی کرتا ہے تو پھر اُسے یہ فکر ہی لاحق نہیں رہتی کہ گھر میں ٹوائلیٹ ہے یا نہیں۔ دو تین کمیٹیوں (ماہانہ بیسیوں) کی رقم پیشگی وصول کرکے شادی کے انتظامات کو حتمی شکل دی جاتی ہے۔ تھوڑا بہت قرضہ بھی ہو ہی جاتا ہے۔ پھر دو تین سال تک گھر کا بجٹ اور دولہا کا پیٹ قبض کا شکار !رہتا ہے! ایسے میں کسے یہ دھیان رہتا ہے کہ گھر میں ٹوائلیٹ ہے بھی یا نہیں

ہمیں ترقی یافتہ معاشروں اور ان کے ماہرین سے بہت پہلے معلوم تھا کہ اِنسان کے لیے ٹوائلیٹ بنیادی ضرورت کی چیز ہے اور یہ نہ ہو تو بڑے۔بڑے کام رُک جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں شادی کے بعد دلہنیں ٹوائلیٹ کے اِشو پر ناراض نہیں ہوا

کرتیں۔ ناراض ہونے اور بات بات پر ٹھنک کر بات منوانے کے لیے اور بہت سے
اِشوز ہیں! شادی کے فوراً بعد کے حسین ترین ہفتوں بلکہ مہینوں میں تو دُولہا میاں دُلہن
کی ہر بات ماننے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں! انیتا بے چاری نادان تھی، چند کلیوں
بلکہ ایک ہی کلی یعنی ٹوائلیٹ پر قناعت کر گئی۔ اگر وہ فرمائش کرتی تو شِو رام شاید چاند پر
!بھی ٹوائلیٹ بنوا دیتا

شِو رام ایک امیر ملک کا غریب شہری ہے۔ اُس بے چارے کو کیا معلوم کہ شادی سے
پہلے ہی ٹوائلیٹ بنالینا دانش مندی کی علامت ہے۔ شادی کے بعد ٹوائلیٹ کئی مقاصد کی
تکمیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر وہ کسی ترقی یافتہ معاشرے میں پیدا ہوا ہوتا تو
ٹوائلیٹ کی اہمیت اُس پر منکشف ہوئی ہوتی۔ برطانیہ میں ایک حالیہ سروے سے معلوم
ہوا ہے کہ بیشتر شادی شدہ مرد ہفتہ وار تعطیل کے دن بیوی کی فرمائش، ڈانٹ ڈپٹ
!اور تشدد سے بچنے کے لیے بیشتر وقت ٹوائلیٹ میں گزارتے ہیں

میں ہم نے ایک فلمی جریدے کے لیے شہنشاہِ غزل مہدی حسن خاں صاحب کا 1993
انٹرویو کیا جو تین نشستوں پر مشتمل تھا۔ اِس انٹرویو سے ہمیں خاں صاحب کے فن کے
بارے میں تو کچھ زیادہ معلوم نہیں ہو سکا (کیونکہ ہم اُن کی فنی عظمت سے، اہل خانہ کے
،لیے دردِ سر بننے کی حد تک، پہلے ہی واقف تھے) مگر ہاں

ٹوائلیٹ کے اِضافی فوائد سے ضرور آگاہ ہوئے! ایک دن ہم خاں صاحب کے گھر پہنچے تو وہ کرتا اُتارے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ یہ کرب اُس تکلیف سے خاصا مختلف تھا جو غزل گانے کے دوران اُن کے چہرے سے مستقل عیاں رہتی ہے! ہم نے پوچھا خیریت تو ہے، کہاں کے ارادے ہیں؟ جواب ملا "پیٹ میں گڑبڑ تھی۔ ہری ہڑ کھا کر بیٹھا ہوں، بس اب 'آمد' کا انتظار ہے!"

ہم بچپن سے شعر سُنتے اور اوائل شباب سے کہتے آئے ہیں۔اِس حوالے سے "آمد" کا سُنا تھا اور کبھی کبھار آمد محسوس بھی کی تھی مگر شہنشاہِ غزل نے ہم پر یہ راز فاش کیا کہ آمد کئی اقسام کی ہوتی ہے بلکہ کسی بھی قسم کی ہو سکتی ہے!

جب ہم نے مہدی حسن خاں کے کمرے کا شاندار ٹوائلیٹ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اُن کے کمرے میں کچھ بھی ترتیب سے نہیں تھا۔ پوتے پوتیاں اُن سے لپٹے رہتے تھے اِس لیے سب کچھ اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتے تھے۔ کمرے کی حالت جتنی گئی گزری تھی، ٹوائلیٹ اُتنا ہی شاندار تھا۔ اندر داخل ہو کر ایسا لگا جیسے فائیو اسٹار ہوٹل میں قدم رکھا ہے! ایسا شاندار ٹوائلیٹ دیکھ کر اور اُس سے "مُستفید" ہو کر ہم شہنشاہِ غزل سے اُس کے بارے میں کچھ نہ کہتے، یہ کیسے

ممکن تھا؟ جب ہم نے مہدی حسن خاں صاحب سے اُن کے شاندار ٹوائلیٹ کا ذکر کیا اور دوسری طرف کمرے کے حال زار کی طرف توجہ دلائی تو اُنھوں نے وضاحتی سُروں میں فرمایا "میاں ! بات یہ ہے کہ ٹوائلیٹ میں ہم سُکون سے بیٹھتے اور غور وفکر کرتے ہیں۔ بیشتر غزلوں کی دُھنیں ہم نے ٹوائلیٹ میں فراغت کی حالت میں بیٹھ کر ترتیب دی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ 'آمد' وہیں ہوتی ہے !"

ٹوائلیٹ میں بیٹھ کر مہدی حسن خاں صاحب کی فنکارانہ مشکلات حل ہوتی ہوں گی اور دُھنیں آسانی سے ترتیب پا جاتی ہوں گی مگر یقین کیجیے کہ اُن کی بہت سی غزلیں سُن کر نئی نسل پر "قبض" کی سی کیفیت کا طاری ہو جانا اب ہمیں حیرت انگیز نہیں لگتا ! سچ تو یہ ہے کہ پاپ سنگرز کا دُھوم دھڑاکا سُننے کے بہت سے شوقین نوجوانوں کو خاں صاحب کی دو تین غزلیں سُننا پڑیں تو "آمد" اُن تک پہنچنے میں ذرا دیر نہیں لگاتی اور وہ پہلی فُرصت میں ٹوائلیٹ کی طرف دوڑتے ہیں !

ٹوائلیٹ میں گانے کی روایت نے ہمیں کئی گلوکار دیئے ہیں جو، شالا نظر نا لگے، اب سنگیت کی جنگ میں ہراول دستے کے سپاہیوں کا کردار ادا کر رہے ہیں ! شِو رام کو انیتا جیسی بیوی کی شکل میں بھگوان نے سَنگیت کا وَردان دیا ہے۔ اب شِو رام کو گانے کے لیے کسی ویرانے کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ بیوی کو

مَنانے کے لیے جو ٹوائلیٹ اُس نے بنوایا ہے اُسے گائیکی کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے!

ٹوائلیٹ بنوانے کے مَطالبے پر قائم رہنے کا خیال انیتا کے ذہن میں "آمد" کی طرح وارد ہوا۔ سُلابھ انٹر نیشنل نے انیتا کو ٹوائلیٹ بنوانے کا "انقلابی" قدم اٹھانے پر جو پانچ لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا ہے اُن سے انیتا ایک شاندار، فائیو اسٹار ٹوائلیٹ بنوا کر اپنے پتی دیو کو شہنشاہِ غزل بننے کی راہ پر گامزن ہونے کا موقع بھی فراہم کر سکتی ہے! مغرب کا ترقی یافتہ معاشرہ شاندار ٹوائلیٹ کو بیوی کی مار سے بچنے کے لیے استعمال کرنے میں عظمت محسوس کرتا ہے۔ ہم فن شناس ہیں، ٹوائلیٹ کی چار دیواری سے ہم فن کی دنیا کو مزید شاندار بنانے کا کام لیتے ہیں اور غزلوں کی دُھنیں تک کشید کرتے ہیں!

مُنہ پُھلانے" میں بھی قدرت نے مزا رکھا ہے"

جس طرح گدھے صرف چار ٹانگوں پر چلنے والے نہیں ہوتے بالکل اُسی طرح مینڈک بھی صرف پُھدکنے والے نہیں ہوتے بلکہ پُھدکے بغیر دو ٹانگوں پر چلنے والے مینڈک بھی پائے جاتے ہیں! خوشی کی ہر تقریب میں بیشتر افراد خوشی سے پُھولے نہیں سما رہے ہوتے مگر بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کے پورے وجود میں صرف مُنہ پُھولا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اِس "پُھلاپے" کے لیے بھی وہ خوشی کو زحمت نہیں دیتے!
ہر خاندان میں کچھ لوگ ویسے تو ہوموسیپیئن ہوتے ہیں یعنی اُن کا تعلق اِنسانوں کی نوع سے ہوتا ہے مگر درحقیقت وہ مینڈکوں کے خانوادے سے بھی دور پَرے کا تعلق ضرور رکھتے ہیں! موقع خوشی کا ہو یا غم کا، اِنہیں صِرف مُنہ پُھلانے اور اِن کے نخروں کو پُھدکنے سے غرض ہوتی ہے! ہم تو خدا لگتی کہیں گے کہ بعض لوگ مُنہ پُھلانے کے ایسے ماسٹر ہوتے ہیں کہ مینڈک بھی دیکھیں تو اُن سے یہ فن تمام باریکیوں کے ساتھ سیکھیں اور نیشنل جیوگرافک والوں کو مدعو کرکے فلم بھی بنوائیں! مُنہ پُھلانے اور پُھدکنے کا ازلی (اور یقیناً ابدی) شوق رکھنے والے اِنسانی مینڈک تقریبات کو تالاب کی طرح اِستعمال کرتے ہیں! پُھدکنے اور جست لگانے کی گنجائش نہ ہو تو نہ سہی، تقریبی تالاب میں

!اِن نخریلے مینڈکوں کی ٹرٹر ہی سے تو ساری "رونق" جمتی ہے

بات بات پر مُنہ پُھلانے والے مزاجاً امریکہ سے ملتے جلتے ہیں۔ جو بدگمان رہتے ہیں اُنہیں ہر معاملہ دال میں کالا جیسا دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح امریکہ خطرہ بھانپ کر حفظِ ماتقدم کے طور پر پہلے سے حملہ کر بیٹھتا ہے، تقریباً اُسی ذہنیت کے ساتھ یہ مُنہ پُھلانے والے بھی کسی بھی معاملے میں سازش کی بُو سُونگھ کر دنگے میں پہل کر بیٹھتے ہیں! جس طرح امریکہ کو کسی بھی مُلک سے کوئی بھی سُلوک کرنے کے لیے کسی جواز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، بالکل اِسی طرح بات بات پر مُنہ پُھلانے والے بھی کسی بہانے یا جواز کے محتاج نہیں ہوتے! اِن کا دِل کبھی بھی اور کہیں بھی کسی پر بھی آ سکتا ہے یعنی اگلے کی شامت آ سکتی ہے! کسی بھی تقریب میں اِن کی "پُھوں پھاں" دیکھ کر دیگر شرکاء اُسی طرح سہم اور سمٹ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں جس طرح سیلابی ریلے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر لوگ اپنا سامان سمیٹ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ بعض خاندانوں میں مُنہ پُھلا کر ٹُھنکنے اور رُوٹھنے کے شوقین اِتنی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں کہ تقریبات ذرا سی دیر میں مُنہ پُھلانے کے مقابلے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں! بعض مہربان اِس حوالے سے ایسی شہرت رکھتے ہیں کہ تقریب میں اُن کی موجودگی رونق میلے کی ضمانت سمجھی جاتی ہے اور لوگ ایک ٹکٹ میں دو مزے پاتے ہیں یعنی تقریب میں شرکت کے ساتھ ساتھ دَنگل کا مزا

لینے کے لیے بھی بے تاب دکھائی دیتے ہیں ! ایسی کسی بھی تقریب میں اپنی شرکت کو لوگ اُسی وقت یقینی بناتے ہیں جب اِس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بھی آنے والے ہیں جن کے دم سے دنگل کا سماں پیدا ہوگا !

اللہ نے پاکستانی معاشرے میں ایسی ورائٹی ودیعت کی ہے کہ لوگ جب اپنے گھر میں کسی تقریب کا اہتمام کرتے ہیں تو انہیں بہت سی ایسی باتوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے جن کا تقریب سے یا میزبانوں کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ خاندانی گوتے گاتے وقت محبوب سُروں کے ملاپ پر خاصی توجہ دیتے ہیں۔ اگر دو مختلف المزاج راگوں کی آمیزش سے بندش تیار کی جائے تو سامعین کی جان پر بن آتی ہے کیونکہ محبوب سُروں کا ملاپ نہ ہونے سے خاصی محنت کے ساتھ گائی جانے والی چیز بھی کانوں کو بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ تقریبات میں بھی ایک دوسرے کو ناگواری سے دیکھنے والے سُروں.... ہمارا مطلب ہے اِنسانوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مہمانوں کی فہرست مرتب کرتے وقت اِس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ آگ اور پانی کا ملاپ نہ ہو ! اور اگر مختلف المزاج مہمانوں کو بلانا ناگزیر ہو تو کوشش کی جاتی ہے کہ اُن کا سامنا نہ ہو کیونکہ ایسا ہو تو رنگ میں بھنگ والی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے !

تقریبات میں شرکت سے کئی مہارتیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔ رات کو سردی بڑھ جائے

تو چھوٹی سی چادر کو کس طرح اوڑھا جاتا ہے؟ پاؤں ڈھانپیں تو سُر کُھل جاتا ہے اور سَر ڈھانپنے کی فکر کیجیے تو پاؤں چادر سے باہر چلے جاتے ہیں! بشیر بدر نے کہا ہے
زندگی! تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے جگہ
!پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سَر لگتا ہے
بعض تقریبات میں بھی ایسے ہی مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جنہیں صرف رُوٹھنے کا ہُنر آتا ہے اُنہیں منانا بھی میزبان کی ذمہ داریوں میں شامل ہوتا ہے۔ اُسے اپنی تمام مصروفیات سے اِس کام کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا ہے۔ بے چارہ ایک کو مناتا ہے تو دوسرا رُوٹھ جاتا ہے! بہت سے لوگ یہی تماشے دیکھنے کے لیے تقریبات میں شریک ہوتے ہیں۔ اُنہیں اِس بات سے کچھ خاص غرض نہیں ہوتی کہ کس کی شادی کس سے ہو رہی ہے یا کس کے کون سے نمبر کے بیٹے کا عقیقہ ہے۔ خاندانی اور معاشرتی رسوم سے انہیں کچھ خاص رغبت نہیں ہوتی۔ تقریب جن اُمور کے لیے منعقد کی گئی ہوتی ہے اُن کی انجام دہی سے ہٹ کر بھی تو بہت کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ اور یہی تماشا دیکھنے کی چیز ہوتا ہے! مگر ہاں، دیکھنے والی آنکھ کا ہونا شرط ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعض لوگ خاندان کی تقریبات میں ذرا سا ہٹ کر ہونے والا تماشا دیکھنے ہی کے لیے پورے جوش و خروش بلکہ خشوع و خضوع کے ساتھ شریک ہوتے ہیں! ایسی ایک تقریب اُنہیں ہفتہ بھر ٹی وی پر

مزاحیہ پروگرام دیکھنے کی زحمت اور ضرورت سے بے نیاز کر دیتی ہے! ہم تو گِلی لپٹی کے بغیر یہ بھی کہے دیتے ہیں کہ ٹی وی کے بعض مزاحیہ پروگراموں میں بھی اُتنا مزاح نہیں ہوتا جتنا خاندانی تقریبات میں بخوبی پایا جاتا ہے! یہی سبب ہے کہ اب شادی بیاہ کے موقع پر اسٹینڈ اپ کامیڈی کا رجحان دم توڑتا جا رہا ہے۔ شادی کی بعض تقریبات میں پہلے ہی سے اِس قدر کامیڈی چل رہی ہوتی ہے کہ تربیت یافتہ اور پروفیشنل فنکار بلائے جانے کی صورت میں شرکاء overdose کا "مزاح خورانی" برداشت نہیں کر پاتے اور شکار ہو جاتے ہیں! بعض ہنستے ہنستے بے دم سے ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اُن کا دل بہلانے کے لیے چند ایک اُمور سنجیدگی سے بھی انجام کو پہنچائے جاتے ہیں تاکہ کوئی ایویں ای جان سے نہ جائے!

ایک خوشی پر کیا موقوف ہے، جنہیں ہر حال میں مُنہ پُھلانا ہو وہ میت کے گھر کو بھی نہیں بخشتے۔ کسی کا مرنا بھی اِنہیں صلاحیتیں بروئے کار لانے کا بھرپور موقع فراہم کرتا ہے۔ جس طرح دولھے کی سہرا بندی میں نہ بلائے جانے پر یہ مُنہ پُھلا بیٹھتے ہیں بالکل اُسی طرح تدفین سے متعلق تسلیم شدہ رسوم ادا کرنے کے لیے دیر سے بلائے جانے پر بھی اِن کی ناراضی شعلے کی طرح بھڑک سکتی ہے۔ قبرستان میں قبر اور میت سے دور یہ گپ شپ مارتے ہوئے ملیں گے اور جب مٹی ڈالی جا رہی ہوگی تو مُنہ پُھلائے ہوئے ملیں گے کہ آخری دیدار کے لیے

کیوں نہیں بُلایا! لوگ لاکھ یقین دلائیں کہ آخری دیدار کے لیے صدا لگائی گئی تھی مگر یہ کہاں ماننے والے ہیں؟ مرنے والے شاید سُکون کا سانس لیتے ہوں گے کہ دُنیا سے جاتے وقت اِن کے پُھولے ہوئے مُنہ دیکھنے سے بچ گئے!

خوشی اور غم کے موقع پر تیزی سے ناراض ہونے اور مُنہ پُھلائے گھومنے والے ہر اُس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں جس میں اپنے پلّے سے کچھ خرچ نہ کرنا پڑتا ہو۔ جہاں معاملہ جیب ڈھیلی کرنے کا ہو وہاں سے یہ ایسے غائب ہوتے ہیں جیسے گدھے کے سَر سے سینگ! ایسے لوگوں کو تلاش کرنا کوئی بہت مشکل کام نہیں۔ تقریب یا محفل میں کوئی بھی ذرا سی ایسی ویسی بات ہو جائے تو اِن کے مزاج کا پارہ چڑھ جاتا ہے اور یہ سب سے انوکھے اور اچھوتے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اِنہیں ایک نظر دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا ہے کہ ناراضی کا دورہ پڑا ہے۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اِن کا مُنہ ایسا پُھولا ہوا دکھائی دیتا ہے جیسے باکسنگ رنگ میں تابڑ توڑ مُکّے کھا کر آئے ہوں! ایسے میں اِن کے قریب جانا صحت کے لیے شدید مُضر ثابت ہو سکتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ مُنہ پُھلانے والے کسی کی بھرپور توجہ نہ ملنے کی صورت میں بہت ہی تیزی سے نارمل ہو جاتے ہیں۔ کسی کا متوجہ ہونا اِنہیں اُکسانے سے کم نہیں۔ آئندہ خوشی و غم کے کسی بھی موقع پر کسی کو سُوجے سُوجے سے، پُھولے ہوئے مُنہ کے ساتھ دیکھیں تو

فوراً سامنے سے ہٹ جائیں اور پتلی گلی سے نکل جائیں ! آپ کی جانب سے ہمدردی کے دو بول وہی نتیجہ پیدا کریں گے جو گھوڑے کو ایڑ لگانے سے پیدا ہوتا ہے ! اور اِس کے بعد جو کچھ بھی ہوگا اُس کی ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوگی !

پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا

جدید ترین معاشرے بھی اعلیٰ ترین معیار کی تحقیق سے یہ معلوم نہیں کر پائے ہیں کہ دُنیا میں بیماریاں زیادہ ہیں یا بیمار! بیماریاں اِنسان کے لیے بہانوں کی طرح ہوتی ہیں جن کے بغیر زندگی میں کوئی آسانی پیدا نہیں ہو پاتی! پاکستان کا شمار ان معاشروں میں ہوتا ہے جو مختلف بیماریوں اور عوارض کا خیر مقدم کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم جیسے معاشرے بیماریوں کے "پولٹری فارم" کی شکل اختیار کر چکے ہیں! اب تک یہ فیصلہ نہیں ہو پایا کہ کتنی جسمانی بیماریوں سے ذہنی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور کتنی ذہنی پیچیدگیاں جسمانی عوارض کو جنم دیتی ہیں۔ مگر ایک بات طے ہے کہ ایک بیماری تقریباً ہر معاشرے میں عام ہے اور دنیا بھر کے 90 فیصد سے زائد افراد میں پائی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بھی اِس عارضے کا شکار ہوں! یہ عارضہ ہے اپنے آپ کو ناگزیر سمجھنا! جسے دیکھیے وہ "میں ہوں نا" کے خبط میں مبتلا ہے۔ مختلف خطوں کی دیو مالا میں آیا ہے کہ دنیا ایک کچھوے کی پُشت پر ٹکی ہوئی ہے۔ اب ایسے اربوں کچھوے ہیں جو زمین کو اپنی پُشت پر بھی اُٹھائے ہوئے ہیں اور اُسی زمین پر چل پھر بھی رہے ہیں!

دنیا میں ایسے لوگ خال خال ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے بعد دُنیا بہتر طور پر چل سکے گی یا چلائی جاسکے گی ! جسے دیکھیے، یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا اور گھلتا رہتا ہے کہ دنیا کب سُدھرے گی اور اگر اُس کے مرنے تک نہ سُدھر سکی تو کیا ہوگا ! بُہتوں کا تو دم بھی شاید اِس لیے کئی دن اٹکا رہتا ہے کہ اُنہیں اپنے وجود سے زیادہ دنیا کی فکر لاحق رہتی ہے ! اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوتا کہ دُنیا کو کس کے بھروسے اور آسرے پر چھوڑ کر جائیں !

مرزا تنقید بیگ کو ہم اُن لوگوں میں نہایت نمایاں سمجھتے ہیں جو اپنے آپ کو دنیا کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ مرزا کی اِس بات سے ہم پوری طرح متفق ہیں کہ جب وہ نہیں ہوں گے تو دنیا بہت پچھتائے گی۔ ایک بار جب اُنہوں نے نہایت جوش کے عالم میں کہا کہ اُن کے بعد دنیا بہت پچھتائے گی تب ہم نے تپ کر کہا کہ دنیا اِس بات پر پچھتائے گی کہ طبعی امر کے واقع ہونے کا انتظار کیوں کیا، پہلے ہی گلا کیوں نہ دبا دیا ! یہ بات سُن کر مرزا نے اپنی مسلمہ اور دیرینہ روایت سے بغاوت کی یعنی ہمیں صرف گھورنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہماری بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کی رسید دینے کی غرض سے ہمیں ہاتھ رسید کرنے کی بھی کوشش کی ! ہم البتہ اپنی روایت پر قائم رہے یعنی صاف بچ نکلے !

سیاست وہ شعبہ ہے جس سے تعلق رکھنے والا ہر فرد خود کو انتہائی ناگزیر سمجھتا ہے۔ ہر سیاست دان خود کو تمام مسائل کا حل گردانتا ہے اور ہر مسئلے کو حل کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہنے کی اداکاری کو بھی اپنی ذہنی ساخت کا حصہ بنائے رہتا ہے۔ کم ہی سیاست دان ایسے ہیں جنہیں یہ یقین دلایا جاسکتا ہے کہ اُن سے پہلے بھی دنیا تھی اور ان کے بعد بھی رہے گی! جنہیں کوئی منصب ملتا ہے وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دنیا صرف اُن کے کاندھے پر سوار ہو کر سفر کر رہی ہے۔ یعنی انہوں نے کاندھے کو جھٹکا دیا تو دنیا دھڑام سے گر جائے گی، وہ بیٹھ گئے تو بھٹہ بیٹھ جائے گا! یہ یقین اِس قدر پختہ ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ماہر نفسیات لاکھ کوشش کر دیکھے، اُن کے محکم یقین کو متزلزل نہیں کرسکتا!

سیاست کے میدان میں کسی منصب کو پانے والے تو خیر اونچی اڑان میں رہتے ہی ہیں، ورکرز بھی کسی سے کم نہیں ہوتے۔ وہ اِس وہم میں مَرتے دم تک مُبتلا رہتے ہیں کہ حلق کی پوری طاقت سے جو نعرے وہ لگاتے ہیں اُنہی کے دم سے اقتدار کے میلے میں ساری رونق ہے! اور کچھ ملے نہ ملے، کسی بھی سیاسی کارکن کے لیے یہ بھرم بھی کیا کم ہے کہ سب کچھ اُسی کے دم سے ہے! قائدین اُس کی انا کا غبارہ بہت محنت سے پُھلاتے ہیں! اِس معاملے میں سیاسی رہنما عوام کو

بھی نہیں بخشتے۔ اُنہیں طاقت کا سرچشمہ قرار دیکر ایسا فریب دیا جاتا ہے کہ بے چارے مَرتے دم تک خود کو فیصلہ کن قوت سمجھتے رہتے ہیں اور ان کی حالت میر کے اِس مصرع کے مصداق ہوتی ہے کہ

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

خود کو ناگزیر سمجھنے کی وباء نے کئی شعبوں کو تباہ کیا ہے۔ ایک زمانے میں ہماری کرکٹ ٹیم میں ہر کھلاڑی خود کو ناگزیر اور مردِ بحران سمجھنے کے خبط میں مُبتلا رہتا تھا۔ چار گھنٹے بیٹنگ کرکے تیس چالیس رنز بنانے کو بھی کارنامہ تصور کیا جاتا تھا اور اگلے دن کے لئے اپنی وکٹ بچائی جاتی تھی! ہر بیٹسمین کو یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ اگر وہ آؤٹ ہوگیا تو پوری ٹیم تنکوں کی طرح بکھر جائے گی! اِس خوف اور خبط نے کئی کھلاڑیوں کے کیریئر کو تنکوں کی طرح بکھیر دیا! کئی عشروں کی محنت کے بعد یہ بات کرکٹرز کے ذہنوں میں نصب کی جاسکی کہ جب وہ ٹیم کی حیثیت سے میدان میں اُترتے ہیں تو ٹیم ہی کی طرح کھیلنا بھی چاہیے!

محترم انور مسعود فرماتے ہیں

ہر گھر میں ایک فرد ہے ٹیڑھے مزاج کا!

بات صرف یہیں تک سچ نہیں بلکہ اِس سے ایک قدم آگے جا کر ہمیں یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنا ہوگی کہ گھر کا سب سے ٹیڑھا فرد ہی خود کو تیر کی طرح سیدھا تصور کرتا ہے اور اِس خبط کا اسیر رہتا ہے کہ گھر اُسی کے دم قدم سے چل رہا ہے! ہر گھر یا گھرانے میں ایک فرد ایسا ضرور ہوتا ہے جو سب کو اپنے گناہوں کی سزا جیسا دکھائی دیتا ہے مگر لطیفہ یہ ہے کہ یہ سزا ہی خود کو جزا عظیم کی حیثیت سے منوانے پر تُلی رہتی ہے!

خود کو ناگزیر سمجھنے والے چونکہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ دفتر میں نہ پائے جائیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو دفتر آئیں یا نہ آئیں، سارے کام اِنہی کے دم سے چل رہے ہوتے ہیں! اِن میں صرف دماغ کی کجی نہیں ہوتی بلکہ تاخیر سے آنا بھی معمول ہوتا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اِنہیں کام کرنے سے کچھ خاص غرض نہیں ہوتی! ان تمام عِلّتوں کے باوجود یہ اِسی خوش فہمی کے نشے میں چُور رہتے ہیں کہ ساری دفتری رونق اِن کے وجود کا صدقہ ہے! دفتر میں جب دوسرے سب لوگ کام کر رہے ہوتے ہیں تب یہ "ناگزیر" حضرات اِس فکر میں غرق رہتے ہیں کہ جب یہ ریٹائر ہوں گے تب دفتر کس طور چلا کرے گا، اور اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ چل بھی سکے گا یا نہیں! خود کو ناگزیر گرداننے والے یہ ثابت کرنے پر ہر وقت کمربستہ رہتے ہیں کہ دُنیا ابھی "مُفکّرین" سے خالی نہیں ہوئی!

جنہیں ہر وقت "میرے بعد کیا ہوگا؟" کا غم کھائے جاتا ہے اُن کی خدمت میں ہم مودبانہ عرض کرتے ہیں کہ اُنہی کے لیے اکبر الہ آبادی فرما گئے ہیں۔

تجھے بتاؤں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟
!پُلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا

مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ خود کو ناگزیر سمجھنے والے کیسے ہی ناکارہ سہی، مرنے کے بعد ضرور کام کے ثابت ہوں گے یعنی اِن کے نام پر تقسیم ہونے والی بریانی سے کچھ لوگوں !کا پیٹ ضرور بھرے گا

جب سب کچھ اچھا تھا

مغرب کو سائبر اسپیس اور آن لائن کلچر پر بہت فخر ہے۔ مغربی ماہرین اِس بات پر نازاں ہیں کہ اب کسی کی کہیں موجودگی لازم نہیں یعنی "ورچوئل" وجود ہی کافی ہے۔ مگر اُنہیں اندازہ نہیں کہ ہم اُن سے ایک نہیں کئی قدم آگے ہیں۔ مغرب نے صرف ویب سائٹس متعارف کرائی ہیں، ہمارے ہاں متحرک یعنی زندہ ویب سائٹس موجود ہیں اور دن بہ دن پَھل پُھول رہی ہیں۔ یہ فکر دنیا کو لاحق ہوگی کہ ویب سائٹس کو زیادہ سے زیادہ متحرک اور "انٹر ایکٹیو" کس طرح بنایا جائے، ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ چلتی پھرتی ویب سائٹس اور گھومتے پھرتے انسائیکلو پیڈیاز کو کس طرح کنٹرول کریں!

دنیا بھر میں لوگ معلومات کے حصول کے لیے آن لائن انسائیکلو پیڈیا سے کنسلٹ کرتے ہیں اور ہمارے ہاں یہ سہولت، انٹرنیٹ کو بیچ میں لائے بغیر، کہیں بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔
معاشرے میں ایسے افراد کی کمی نہیں جنہوں نے از خود نوٹس کے تحت خود کو چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا قرار دے دیا ہے! یہ معلومات کے وہ خزانے ہیں جن

سے کسی بھی وقت مستفید ہوا جاسکتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اِس بات کے بھی محتاج اور مُکلّف نہیں کہ آپ اُنہیں مدعو کریں۔ یہ فیصلہ بھی اُنہی کو کرنا ہے کہ آپ کو کب، کِس طرح اور کِس حد تک مُستفید کیا جائے!

ذرا غور سے دیکھیے، آپ کے ارد گرد چند ایسی شخصیات ضرور ہوں گی جو بات بات پر مینٹل ٹائم ٹریول کرتی ہیں یعنی اپنے اور آپ کے ذہن کو پلک جھپکتے میں ماضی کی گہرائیوں میں اُتار دیتی ہیں۔ عشروں کا سفر یہ ایک لمحے میں کرتی ہیں اور چار پانچ عشرے پہلے کی دنیا میں جاکر وہاں سے وہ سب کچھ لے آتی ہیں جو ہم نے دیکھا ہے نہ سُنا ہے۔ جہاں آپ نے گزرتے ہوئے دور کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات کی اور یہ نابغے آپ کو لتاڑنے پر تُل جاتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ آپ کا زمانہ بہت اچھا ہے اور بہت سی سہولتیں آسانی سے میسر ہیں تو کوئی نہ کوئی چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا آپ کے ساتھ آکر یاد دلائے گا کہ گزرے ہوئے زمانے میں ایسا بہت کچھ تھا جو حقیقی معنوں میں اللہ کی نعمت تھا اور اب ہم اُس نعمت سے محروم ہوچکے ہیں۔ اگر آپ نے اُن کی کسی بات سے اختلاف کیا تو بس یہ سمجھ لیجیے کہ اپنی موت کو دعوت دے دی!

یہ لوگ وہ ہیں کہ جن کی چند لمحات کی گفتگو میں کئی زمانے اپنی جھلک دکھاتے ہیں اور ہر زمانہ اپنے تمام رنگوں کے ساتھ آن کی آن میں چھلانگیں مارتا ہوا

ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ ہر دور کی "مستند" تاریخ جاننا ہو تو معلومات کے اِن زندہ خزانوں سے رابطہ کیجیے اور اِنہیں دعوتِ کلام دیجیے۔ واقعات کا درست ترین سیاق و سباق جاننے کی خواہش ہے تو اِن سے رابطہ کیجیے۔

ویسے تو کمپیوٹر بھی آپ کو انٹرنیٹ کی دنیا میں لے جاکر کسی بھی موضوع پر تفصیلی معلومات سے ہمکنار کرسکتا ہے مگر یہی سب کچھ اگر اِنسانوں کے ذریعے ملے اور وہ بھی بھرپور ڈرامائی کیفیت کے ساتھ تو کیا کہنے! اِن کا دم غنیمت ہے کہ ہمیں بہت کچھ اضافی معلومات کے ساتھ معلوم ہو پاتا ہے۔ یہ اضافی باتیں وہ ہیں جو کسی کتاب میں نہیں ملیں گی کیونکہ اِنہیں درج کرنے کی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی۔

آج جو لوگ 80 سال سے زیادہ کے ہیں اُن سے آپ بہت آسانی سے پوچھ سکتے ہیں کہ 1950 کا یعنی پاکستان کے قیام کے فوری بعد کا زمانہ کیسا تھا۔ یہ آپ کو بتائیں گے کہ دفاتر میں اسٹیشنری نہیں ہوا کرتی تھی اور لوگ کاغذات کو آپس میں جوڑنے کے لیے کیکر کے کانٹوں کو پن کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے! یہ بزرگ آپ کو بتائیں گے کہ ایک روپے میں کتنا آٹا آتا تھا اور بس کا کم از کم کرایا کتنا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ یہ اپنی گفتگو میں آنوں اور پائیوں کا ذکر کریں گے اور آپ، اگر بیس بائیس سال کے ہیں، سمجھ ہی نہیں پائیں گے کہ اُس

دور میں قیمت کس طور ادا کی جاتی ہوگی ! دنیا میں آپ کے آنے تک پیسوں اور آنوں کو دفن کیا جاچکا تھا اور سب کچھ روپے کے سانچے میں ڈھل چکا تھا !

ماضی کے یہ چلتے پھرتے "پروموٹرز" آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ گزرے ہوئے زمانوں میں سب کچھ اچھا تھا اور کسی کو کسی معاملے میں پریشانی کا سامنا نہ تھا۔ اِن کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ گزرے ہوئے کل میں کم آمدنی بھی سُکھ دیتی تھی اور تھوڑے میں بھی گزارا ہوا کرتا تھا۔ ذرا سا چھیڑنے کی دیر ہے اور پھر دیکھیے کہ ماضی سے عقیدت کی حد تک محبت کرنے والے یہ بزرگ گزرے ہوئے زمانوں کی کتنی اور کیسی کہانیاں سناتے ہیں۔ اِن کی باتیں سُن کر کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ زمانے پلٹ جائیں اور ہم گزرے ہوئے ادوار میں پہنچ کر سُکون کی زندگی بسر کریں ! اگر ہمارے ہاں مطالعے کا ذوق اور شوق زیادہ پروان نہیں چڑھ سکا تو اِس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ بہت کچھ گوش گزار کرنے والے موجود ہیں ! جب کچھ پڑھنے سے قبل ہی بہت کچھ خود بخود سماعت کی نذر ہو جاتا ہے تو کتاب خریدنے اور پڑھنے کی ضرورت کیا ہے؟ گزرے ہوئے زمانوں کی کہانیاں سُنانے والے برگد کے درخت کے مانند ہوتے ہیں۔ کچھ دیر اِن کی چھاؤں میں بیٹھیے تو ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں کوئی پریشانی ہے ہی نہیں۔ یہ آپ کو گزرے ہوئے حسین زمانوں میں لے جاتے ہیں اور یہ باور کرانے میں بہت حد تک کامیاب رہتے ہیں کہ کبھی اِس دنیا میں سب کچھ

!اچھا بھی تھا

مرزا تنقید بیگ کو ماضی میں رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ انگریزی میں ماضی کو ایک الگ ملک سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یعنی جب ہم گزرے ہوئے زمانوں میں رہتے ہیں تو کسی اور ملک میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ مرزا کا استدلال ہے کہ جو لوگ ماضی پرست ہوتے ہیں وہ کچھ دیر کے لیے غموں سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ بات اُن کی غلط نہیں مگر وہ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ ماضی کے راگ الاپنے والے اُن زمانوں کی خامیوں کو بیان کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یہ تو بتایا جاتا ہے کہ فلاں سن میں آٹا ایک روپے کا چار کلو آتا تھا مگر یہ بتانے سے گریز کیا جاتا ہے کہ تب ماہانہ تنخواہ پندرہ سولہ سو روپے ہوا کرتی تھی! جن ادوار کو خوشحالی کا نقیب قرار دیکر اُن کے نام کے ڈنکے بجائے جاتے ہیں تب گھروں میں بنیادی سہولت کی بہت سی اشیاء نہیں ہوا کرتی تھیں۔ آج گھر گھر ریفریجریٹر، ٹی وی، کمپیوٹر، کچن کے برقی آلات اور دوسری بہت سی اشیاء ہیں۔ تب یہ سب کچھ نہیں تھا۔ مگر مرزا ہماری کسی بھی بات سے کب اتفاق کرتے ہیں؟ وہ ماضی میں گم رہنا پسند کرتے ہیں۔ گزرے ہوئے زمانوں کی یادوں میں کھو کر سکون کے سانس لینے والوں کو دیکھ کر ہم سوچتے ہیں کہ ہر وقت ماضی کی حسین یادوں کو دہرانے والے لوگ کہیں حکومت کے پلانٹیڈ بندے تو نہیں! حکومت عوام کو ویسے تو کوئی ریلیف دے نہیں پاتی، ایسے میں ماضی کی

حسین یادوں کا ڈھنڈورا پیٹنے والے افراد معاشرے میں پھیلا کر لوگوں کو تھوڑا بہت سکون حاصل کرنے کا موقع تو فراہم کیا ہی جا سکتا ہے!

اِس کوکنگ نے ہمیں پکا ڈالا

پاکستانی معاشرہ کئی اعتبار سے انتہائی منفرد ہے۔اِس کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اِس میں بے مثال انفرادیت پائی جاتی ہے۔ افراد سے معاشرہ بنتا ہے۔ انفرادی خصوصیات یکجا ہوں تو عمومی مزاج بنتا ہے۔ یہ اُصول سالن کی پتیلی پر ضرور اطلاق پذیر ہوتا ہوگا جس میں تمام اجزاء مل کر ایک ہو جاتے ہیں یعنی سالن کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ مجموعی طور پر بریانی کی دیگ ہے جس میں چاول، بوٹیاں، آلو سب الگ الگ دکھائی دیتے ہیں، یعنی پکنے کے بعد بھی اِن میں سے ہر ایک کی انفرادیت دم نہیں توڑتی! یہاں یہ وضاحت بھی ناگزیر سی دکھائی دیتی ہے کہ اب کھانا پینا بھی ہمارے معاشرے کی ایک انفرادیت ہے اس لیے بات خواہ کسی موضوع پر کی جارہی ہو، تشریح و توضیح کا سلسلہ دستر خوان پر ختم ہوتا ہے!

ہماری ایک معاشرتی انفرادیت یہ بھی ہے کہ ہم صورت حال کا اندازہ محض علامات سے لگاتے ہیں اور علامات کے تجزیے سے آگے بڑھنے کو گناہِ کبیرہ گردانتے ہیں۔ مثلاً طلباء سر پر ٹوپی سجائے خشوع و خضوع کے ساتھ گھومتے نظر آئیں تو سمجھ لیجیے امتحانات سر پر ہیں! اگر کوئی فرحاں و شاداں اور کھانے پینے اشیاء سے

لدا پھندا دکھائی دے تو سمجھ لیجیے کہ مہینے کے شروع کے دن ہیں اور تنخواہ ملی ہے۔ مرزا تفصیل بیگ کو قوم پر فخر ہے جو اب اپنے اعمال کے ذریعے افکار کی خوب خوب نشاندہی کرتی ہے۔ جس کی شادی ہونے والی ہو اُس کا تمتماتا چہرہ پورے محلے، بلکہ علاقے کو شادی کی دعوت دیتا دکھائی دیتا ہے! اگر کسی نے نیا موبائل خریدا ہو تو کسی کو کچھ پوچھنے اور اندازہ لگانے کی ضرورت نہیں، موبائل سیٹ خود ہی پُھدک پُھدک کر اپنے نئے پن کی نشاندہی کر رہا ہوتا ہے! بیکری کے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو جایئے تو ڈبل روٹیوں اور پاپوں کی کھپت سے اندازہ ہو جائے گا کہ کس کس گھر میں شادی ہے!

مرزا ہی کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ اگر کسی گھر سے اچانک بلند آوازیں بلند ہوں اور لوگ ہائے ہائے کرتے ہوئے نکل بھاگیں تو دریافت کیجیے کہ اُس گھر میں کچھ دن پہلے شادی تو نہیں ہوئی تھی۔ اور اگر شادی ہوئی تھی تو سمجھ لیجیے کہ نئی نویلی دلہن نے آج پہلی بار کھانا پکایا ہے! بہت سے گھرانے اِس مشکل صورت حال سے بچنے کے لیے یہ اُڑا دیتے ہیں کہ اُن کے خاندان میں روایت ہے کہ نئی دلہن کو تین چار ماہ گزرنے پر باورچی خانے کی طرف بھیجا جائے! اگر یہ معیار اور حکمت عملی اپنائی جائے تو آج کی بہت سی دلہنوں کو سال بھر کے لیے باورچی خانے سے اِستثنٰی دیا جاسکتا ہے!

جب سے ٹی وی چینلز نے کھانا پکانے کی تربیت دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے، بے چاری بچیوں کی مشکلات میں اضافہ ہوگیا ہے۔ پہلے تو انہیں صرف یہ سوچنا پڑتا تھا کہ کیا پکائیں اور کیسے پکائیں۔ اب موبائل پیکیج بھگتانے کے بعد جو تھوڑا بہت وقت بچ رہتا ہے اُس میں انہیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا کیا پکائیں اور کس کس طرح پکائیں ! چینلز پر سکھائی جانے والی ڈِشیں تعداد میں اِتنی ہیں کہ لڑکیوں کا ذہن (!) کام کرنے سے انکار کر دیتا ہے، بلکہ ٹکر جاتا ہے ! یعنی

جلووں کے اژدہام نے حیران کر دیا !

جب سے کوکنگ چینلز اور کوکنگ شوز کی بھرمار ہوئی ہے، بہت سے لوگ اچھے، روایتی کھانوں کو ترس گئے ہیں۔ اچھے خاصے آلو گوشت اور دال چاول میں بھی اب دور دراز کے برِاعظم سانس لیتے دکھائی دیتے ہیں ! جن ڈِشوں سے ہمارا دور پرے کا بھی تعلق نہیں وہ خواتینِ خانہ کے ذہنوں میں بس کر دستر خوان پر آباد ہو چکی ہیں۔ اب کسی کو دِل اور دماغ سے نکالنا تو ممکن ہے، اجنبی ڈِشوں کو گھریلو مینو سے نکالنا تقریباً ناممکن ہے ! اہلِ خانہ تجربات بھگتنے بلکہ بھگتتے رہنے پر مجبور ہیں۔ بقول غالب

تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر !

زبیدہ آپا کانام کھانا پکانے کی تراکیب اور گھریلو ٹوٹکوں کے حوالے سے "انتہائی" معروف ہے۔ خواتین تو ان کی دیوانی ہیں۔ ٹی وی پر جیسے ہی اُن کا شو شروع ہوتا ہے، خواتین کام کاج چھوڑ کر ٹی وی کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ کئی سال تک یہ کیفیت ہمارے گھر میں بھی رہی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، ہمیں تو زبیدہ آپا سے جلن سی ہونے لگی تھی اور وہ بہت حد تک ہماری رقیب ہو چلی تھیں۔ جیسے ہی وہ منی اسکرین پر اپیل کے ساتھ نظر آتی تھیں، ہماری اہلیہ بھی اُن کی قبیل کی ہو جاتی تھیں۔ کبھی کبھی تو جی میں آیا کہ آپا کو فون کریں اور اُن سے پوچھیں کہ خواتین خانہ کو اُن کے پروگرام دیکھنے سے باز رکھنے کا بھی کوئی ٹوٹکا اُن کے پاس ہے کہ نہیں!

ایک بار تو حد ہو گئی۔ ایک چینل پر آپا بیٹھی تھیں کہ اچانک میز پر غالیچہ بچھایا گیا اور آپا نے فوراً صوفے کی آڑ سے جھاڑو نکالی۔ ہم نے سوچا لاشکر نے کہیں کوئی گستاخی تو نہیں کردی! مگر پھر خیال آیا کہ جو آپا بچیوں کو بہت سی کام کی باتیں سکھاتی ہیں وہ گھر کی صفائی میں مرکزی کردار ادا کرنے والی جھاڑو کا فساد انگیز استعمال ہرگز نہیں سکھائیں گی۔ پھر ہم نے یہ دیکھ کر سکون کا سانس لیا کہ باجی نے تنکے والی جھاڑو کی مدد سے بچیوں کو یہ سکھانا شروع کیا کہ غالیچے سے مٹی کس طور نکالی اور جھاڑی جاتی ہے!

گزشتہ دنوں برادرم محمد احمد انصاری نے آپا سے ملاقات کی اور انٹرویو کے ذریعے "اُن کی کہانی، اُنہی کی زبانی" مرتب کی۔ آپا کہتی ہیں "پہلی ڈش کڑھی بنائی جو کسی کو چکھائے بغیر پھینکنا پڑی۔ میں نے پانی میں بیسن کھول کر پتیلی چولھے پر چڑھادی۔ کچھ دیر بعد دیکھا تو لئی نما ملغوبہ تیار ہوا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ کڑھی میں چھاچھ یا دہی ڈلتا ہے!"

بیسن کے لئی نُما ملغوبے کو پھینک دینا آپا کے خلوص اور نیک طینتی کا مظہر تھا۔ اگر اُس دور میں کوکنگ شو ہوا کرتے تو کوئی آپا کی اِس ناکام کوشش کو "پھیکی، بیسنی کڑھی" کے نام سے مارکیٹ میں پیش کر دیتا!

آپا نے "پہلی ڈِش" کی وضاحت نہیں کی۔ بات کچھ یوں ہے کہ کسی بھی نئی دلہن کی جو ڈِش گھر کے افراد سچے دِل سے قبول، تسلیم اور منظور کرتے ہیں وہی عملاً پہلی ڈِش ہوتی ہے! اور اِس ڈِش کی تیاری میں خدا جانے کتنی ہی "پہلی ڈِشیں" جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں! کوئی ڈِشز کی کیژیوئلٹیز کو کہاں تک شُمار کرے!

آپا نے مزید بتایا "طارق (شوہر) آفس سے آئے تو میں نے بتایا کہ ایسی کڑھی بنی ہے جو کیاری میں الٹانی پڑے گی۔ وہ فراخ دلی سے مُسکراتے ہوئے میری دل

جوئی کرنے لگے کہ کوئی بات نہیں، ایسا بھی ہوتا ہے شروع شروع میں۔ پھر اسی "خوشی' میں ہم نے باہر ڈنر کیا۔'

آپا نے بتایا ہے تو اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بہت سے نئے جوڑے شاندار ریسٹورنٹس میں خوشی خوشی ڈنر کر رہے ہوتے ہیں تو دراصل وہ "خوشی" منا رہے ہوتے ہیں!

نئے دولھے بے چارے دِل جُوئی کے چکر میں کیاریوں میں پتیلیاں اُلٹواتے رہتے ہیں!

اب اگر آپ کو کسی کیاری سے پھولوں کے ساتھ ساتھ کسی سالن نما چیز کی خوشبو بھی آئے تو سمجھ لیجیے گا کہ کچن میں کھلائے ہوئے گل پھولوں میں پھینکے گئے ہیں اور کوئی جوڑا "خوشی" منانے نکلا ہے!

آپا کہتی ہیں "پہلی گھریلو دعوت کی تیاری کے دوران میں ہر وقت اللہ سے مدد مانگتی رہی۔ تمام کھانے تیار کرنے کے بعد میز موم بتیوں اور پھولوں سے سجائی۔ اللہ نے کرم کیا اور تمام مہمانوں نے کھانے کی تعریف کی، بلکہ تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ تمام بچیوں کو اکثر یہ تلقین کرتی ہوں کہ ہر مشکل میں اللہ کو یاد کرو، اُسی سے مدد مانگو اور پھر جی لگا کر کام کرو۔"

بالکل درست۔ آج کی لڑکیوں کو شادی کے بعد گھریلو اور بالخصوص کچن کی ذمہ

داریاں سنبھالتے ہوئے اللہ سے ضرور مدد مانگنی چاہیے۔ بصورت دیگر گھر کے تمام افراد اللہ کے سامنے دست بہ دُعا رہنے پر مجبور ہوں گے!

آج کل کی دلہنیں جس قسم کے کھانے تیار کرتی ہیں اور جس طرح اہل خانہ سے انتقام لیتی ہیں اُس کے پیش نظر ہونا تو یہ چاہیے کہ جب وہ اپنے پکائے ہوئے کھانوں کو میز پر سجائیں تو پھول رکھنے کے بعد موم بتیوں کے ساتھ ساتھ چند اگربتیاں بھی سُلگائیں!

آپا ہمارے لیے بہت قابل احترام ہیں مگر سچ یہ ہے کہ کوکنگ چینلز نے قوم کی بیٹیوں کو سکھانے سے زیادہ سیکھے ہوئے کو ذہنوں سے مٹا دیا ہے۔ لوگ اپنے روایتی ذائقوں کو ترس گئے ہیں۔ ٹی وی پر طرح طرح کی تراکیب دیکھ کر لڑکیاں جب کچھ پکانے کی ٹھانتی ہیں تو اچھا خاصا کچن تجربہ گاہ میں تبدیل ہو جاتا ہے! سائنس دان جس طور کوئی بھی نئی دوا چوہوں پر آزماتے ہیں، بالکل اُسی طرح نئی ڈِشیں اہل خانہ کو چوہوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہیں! اِن تجربوں نے قوم کے منہ کا ذائقہ کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی ڈھنگ کی چیز کھانے کو ملے تو زبان اور منہ کو عجیب سی لگتی ہے! اللہ کرے کہ کیاریوں کو آلودہ کرکے "خوشی" منانے کا سلسلہ ختم ہو اور کھانے کی میز پر موم بتیوں کے ساتھ اگربتیاں جلانے تک نوبت نہ پہنچے!

عمر شریف کی روح

جب کوئی کسی کے حواس پر سوار ہو جائے تو کوئی بھی بات کی جائے، گفتگو کا سلسلہ اُسی شخص تک پہنچ کر دم لیتا ہے۔ فرید جاوید مرحوم نے کیا خوب کہا تھا۔

گفتگو کسی سے ہو، تیرا دھیان رہتا ہے

کسی بھی بم دھماکے یا شرپسندوں کے ہاتھوں قتل و غارت کے بعد بھارت کے انٹیلی جنس حکام کے ذہن میں شک کی سُوئی آئی ایس آئی پر اٹک جاتی ہے۔ یہ ادارہ اُن کے حواس پر ایسی سوار ہے کہ بات کو گھما پھرا کر، اور بالعموم ذرا بھی گھمائے پھرائے بغیر، آئی ایس آئی پر الزام دھر دیتے ہیں! یہ بالکل ویسی ہی حالت ہے کہ کوئی سر پر گٹھڑ رکھے جا رہا ہو اور پیٹ میں اُبھرنے والی "فطرت کی پُکار" پر گٹھڑ ایک طرف پھینک کر فراغت پانے کے لیے بھاگ نکلے!

مرزا تنقید بیگ کا خیال ہے کہ ہمارا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ کالم لکھتے وقت ہمارے ذہن پر خواتین سوار رہتی ہیں اور ہم اپنے بیشتر کالموں میں، ضرورت نہ ہو تب بھی، خواتین کا ذکر کر بیٹھتے ہیں! کل جب

اِس موضوع پر بات ہوئی تو کہنے لگے "تم اپنے بیشتر کالموں میں کسی بھی موضوع پر بحث کی تان خواتین کے تذکرے پر توڑتے ہو۔ ضروری ہو یا نہ ہو، خواتین کو کالم میں گھسیٹ لاتے ہو!"

ہم نے قطع کلامی کی اور اِس پر معذرت چاہے بغیر عرض کیا کہ ہم اپنے کسی بھی کالم میں خواتین کو جس انداز سے شامل کرتے ہیں اُس کے لیے "گھسیٹنے" کا لفظ ہرگز استعمال نہ کیا جائے! ہم نے مرزا پر واضح کیا کہ خواتین کو ہم جس احترام سے اپنے کالموں میں داخل کرتے ہیں اگر وہی احترام آپ کے لیے بھی مختص ہو تو آپ خود پر رشک اور ہم پر شک کریں! مگر مرزا اِس وضاحت سے رام نہ ہوئے۔ وہ یہ جاننے کے لیے بضد تھے کہ ہم اپنے کالموں میں خواتین کو تند و تیز جملوں کا ہدف کیوں بناتے ہیں۔ اُن کا گمان یہ ہے کہ ہم پچھلے جنم کا کوئی اُدھار اِس جنم میں چکتا کرنا چاہتے ہیں! اب ہم مرزا کو کیا بتائیں کہ اُن سے دوستی البتہ ہمارے کسی پچھلے جنم کے کردہ و ناکردہ گناہوں کی سزا ضرور ہے!

ہم بھی چاہیں تو یہ اعتراض کرسکتے ہیں کہ جس طرح امریکی حکومت کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو تو القاعدہ سے لاحق خطرے کا رونا رو کر اپنے شہریوں کو ڈراتی اور سیکورٹی اپ گریڈیشن کے نام پر کچھ رونق میلہ لگاتی ہے بالکل اُسی

!طرح مرزا کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آتا تو ہمارے کالموں پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں
جس طرح افغانستان کسی بلا کی طرح امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے چمٹ چکا ہے اور
اب جان چھڑانا دشوار ہوگیا ہے بالکل اُسی طرح مرزا بھی ہمارے لیے جی کا جنجال ہیں
اور اُن سے بچ پانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ مرزا کی رُوح گھر کے اندر بھی ہمیں گھیر
لیتی ہے۔ گھریلو حدود میں مرزا کے حصے کا کام یعنی ہمارے کالموں پر اعتراضات کا فریضہ
اہلیہ انجام دیتی ہیں۔ ایک دن ہمارا کالم پورے انہماک سے پڑھ کر اہلیہ نے کہا "آپ میں
"!شاید عمر شریف کی روح گھُنس گئی ہے

یہ سُن کر پہلے تو ہم ذرا خوفزدہ ہوئے کہ پتہ نہیں اہلیہ نے ہمیں کس گیٹ اپ میں دیکھ
لیا ہے! عمر بھائی ماشاء اللہ بھرپور ٹائپ کے فنکار ہیں۔ وہ دنیا بھر کے گیٹ اپس میں
اِتنے زیادہ دکھائی دیتے ہیں کہ اب اُن کی اپنی (اصل) شخصیت ڈھونڈے سے نہیں
ملتی! پھر یہ سوچ کر دل کو عجیب سی خوشی ہوئی کہ کامیڈی سمجھ کر ہی سہی، ہماری مزاح
نگاری کو گھر کی حدود میں بھی تسلیم تو کیا گیا! مگر ساری خوشی اہلیہ کی وضاحت سے کافور
ہو گئی۔ "عمر شریف کو بھی عجیب بیماری ہے کہ جب ہنسانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو
جناب خواتین کا

مذاق اڑانے لگتے ہیں ! آپ بھی یہی کرتے ہیں۔ آئے دن خواتین ہی آپ کے طنز کا نشانہ بنتی ہیں۔"

ہم نے وضاحت کی کہ علامہ اقبال کی زبانی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ اس کائنات میں رنگ خواتین کے وجود سے ہے۔ ہم اپنے کالموں کو رنگین بنانے کے لیے ڈسٹمپر یا برانڈیڈ اینیمل پینٹ تو استعمال کرنے سے رہے، اِس لیے، علامہ اقبال کے فرمائے ہوئے کو مستند جان کر، خواتین کے ذکر سے تحریر میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں ! اور یہ کہ فیشن، میک اپ، این جی اوز، تعلیم و تعلم، شوبز اور دوسرے بہت سے موضوعات پر کچھ بھی لکھنا ہو تو خواتین کا ذکر کئے بغیر بات بنتی نظر نہیں آتی۔ ایک مشکل یہ ہے کہ مہنگائی اور افلاس کا ذکر کیجیے تو بات باورچی خانے اور چولھے تک پہنچ جاتی ہے۔ اب ہمیں بتایا جائے کہ باورچی خانے اور چولھے پر کچھ بھی لکھتے وقت خواتین کو کس طرح سائڈ لائن کیا جائے !

وضاحت پورے انہماک سے سُننے کے بعد اہلیہ نے قدرے جَل بُھن کر کہا "خواتین کا ذکر کرتے ہوئے یاد رکھا کریں کہ اُن کا تعلق صرف میک اپ، فیشن اور کچن سے نہیں بلکہ چپل اور سینڈل سے بھی ہے ! اگر کبھی ایک آدھ سینڈل نشانے پر لگ گیا تو کالم کے ساتھ ساتھ آپ خود بھی کسی حد تک رنگین ہو جائیں گے !" اِس

انتباہ کے پہلو بہ پہلو اُن کا شکوہ برقرار تھا" آپ اپنے کالموں میں خواتین کو تنقید ہی کا نشانہ کیوں بناتے ہیں؟"

ہم نے عرض کیا کہ کالموں میں خواتین کے تذکرے کو سسپنس یا ہارر پیدا کرنے کی خواہش ہر گز نہ سمجھا جائے، ہم تو بس مزاح پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اب اگر بات کہیں سے کہیں جانکلتی ہے تو ہم کیا کریں۔ اِس میں بھی قصور خواتین کا ہے۔

وہ کیسے؟" اہلیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔"

ہم نے سمجھانے کی کوشش کی کہ خواتین کے وجود میں اتنی وسعت اور معنویت ہے کہ بات سے بات نکلتی جاتی ہے اور ہم تجاہل کالمانہ کی لہروں میں بہتے چلے جاتے ہیں!

یہ سُن کر اہلیہ نے کہا" بھاری بھر کم الفاظ اور اصطلاحات سے ہمیں کنفیوز مت کیجیے۔ یہ تجاہل کالمانہ یا جاہلانہ جو کچھ بھی ہے سب اپنی جگہ مگر سوال یہ ہے کہ مزاح پیدا کرنے کی کوشش بھرپور طنز کے اہتمام ہی پر کیوں منتج ہوتی ہے؟"

ہم نے سوال کیا کہ عمر شریف کی اسٹینڈ اپ کامیڈی میں اپنے ذکر کو خود خواتین اِس قدر انجوائے کیوں کرتی ہیں؟ سو سُنار ایک لوہار کی کے مصداق اِس برجستہ سوال نے گھریلو عدالت کی پوری کارروائی کو سمیٹ کر کوزے میں بند کردیا!

اب ہم کیا بتائیں کہ کالم نگاری کا معاملہ بھی کچھ یوں ہے کہ

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

مزاح کی ہانڈی میں جب تک طنز کا بھرپور تڑکا نہ لگایا جائے، کالم کی ڈش میں لذت پیدا ہی نہیں ہوتی! ہم کالم نگاری میں ڈائجسٹوں کے سِکّہ بند رائٹرز کی روش پر گامزن رہتے ہیں یعنی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک کالم میں کئی کالموں کا مزا، موڈ اور رنگ ہو۔ ہم چونکہ اپنے کالموں میں رنگ بھرنا چاہتے ہیں اِس لیے قلم خود بخود وجودِ زن کے ذکر کی طرف جانکلتا ہے! ہلکا پھلکا لکھنے کا معاملہ دراصل بات سے بات نکالنے کا فن ہے۔ اور یہ فن خواتین کے سِوا کسے آتا ہے؟

اُتر پردیش تو پاکستان نکلا

خوش فہمی کہیے یا غلط فہمی کہ ہم نے کئی معاملات میں یہ فرض کرلیا ہے کہ ہم سے زیادہ منفرد کوئی نہیں۔ کبھی ہم سوچتے ہیں کہ ہم سے زیادہ بے حس کوئی نہیں مگر پھر کوئی نہ کوئی بیرونی واقعہ ہمارے مفروضے کی مٹی پلید کردیتا ہے۔ کبھی ہم اِس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہم سے زیادہ ناخواندہ (بلکہ جاہل!) قوم کوئی نہیں مگر پھر چند ایک ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو ہمارے اِس خود ساختہ "اعزاز" کو بھی خاک میں ملا دیتے ہیں۔ اگر ذرا سنجیدگی سے تلاش کیجیے تو ایسے کئی ہم وطن ملیں گے جو پانچ چھ ہزار روپے خرچ کرکے کمیاب نسل کی بُلبُل خریدتے ہیں اور اُس کا پنجرہ اِس طرح لٹکاتے ہیں کہ دُنیا دیکھے! بُلبُل زبان حال سے اپنے مالک کے بارے میں کہہ رہی ہوتی ہے کہ

.... اِس طرح سے کہتے ہیں سُخن ور سہرا!

مُرغے لڑانے کا شوق ہماری دیہی ثقافت کا طُرّہ امتیاز ہے۔ بڑے پیمانے پر مقابلے جیتنے والے مُرغے ہزاروں، بلکہ لاکھوں میں فروخت ہوتے ہیں۔ جب اِن مُرغوں کی بولی لگتی ہے تب کئی اِنسان اپنے بے قیمتی دیکھ کر اپنی ہی نظر سے گر جاتے ہیں! امریکہ میں مشہور فاسٹ فوڈ چین مکڈونلڈ کا ایک چکن نگیٹ (مُرغی

کے گوشت کی محض ایک بوٹی) صرف اِس لیے 8 ہزار ڈالر میں فروخت ہوا ہے کہ وہ اولین امریکی صدر جارج واشنگٹن سے مشابہ تھا! امریکی بازی لے گئے۔ ہم تو مُرغوں کی خریداری پر لاکھوں لٹانے والوں کو روتے تھے اور ایک امریکی نے محض ایک بوٹی کے لیے 8 ہزار ڈالر لُٹادیئے!

ہم سمجھتے تھے کہ ہمارے منتخب ادارے ہی طرح طرح کے نمونوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اِن نمونوں کے بارے میں سوچ سوچ کر ہم اپنے آپ کو پتہ نہیں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے۔ اِس انفرادیت پر فخر محسوس ہوتا تھا، اپنے آپ پر رشک بھی آتا تھا! جب عوام اپنے ووٹوں کے ذریعے سے اور خاصے جوش و خروش کے ساتھ چند نادر نمونوں کو منتخب کرکے ایوانوں میں بھیجیں تو پھر، کسی بھی سَند کے نہ ہوتے ہوئے بھی، اُن کے "مُستند" ہونے میں کوئی شُبہ نہیں رہتا! ہمارے منتخب ایوانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بھرپور ورائٹی پائی جاتی ہے۔ مگر صاحب! تقدیر کب یہ چاہتی ہے کہ ہم کسی بھی معاملے میں تھوڑے سے خوش ہوں اور اپنے آپ پر فخر کریں؟

بھارت میں ریاستوں کے انتخابات ہوئے اور ہمارا سارا تفاخر مِٹا کر کمتری کے احساس میں مبتلا کر گئے۔ اُتر پردیش (یو پی) مُلک کی سب سے بڑی ریاست ہے جس کی آبادی کروڑ سے زائد ہے۔ محض ایک صوبے کی اِتنی بڑی آبادی یقینی طور 18

پر ورائٹی کی بھی حامل ہے اور ایوان میں ہر طرح کے "نمونوں" کا پہنچنا لازم ہے۔ یوپی اسمبلی کے حالیہ انتخابات میں ایسا ہی ہوا ہے۔

اُترپردیش الیکشن واچ کا تجزیہ ہے کہ 403 ارکان کے ایوان میں 189 (یعنی 47 فیصد ارکان) ایسے ہیں جنہیں عدالتوں میں مختلف مقدمات کا سامنا ہے۔ اور اِن 189 ارکان میں سے 98 ایسے ہیں جن پر سنگین نوعیت کے الزامات میں مقدمات چلائے جارہے ہیں۔ اِن ملزم ارکان میں سب سے زیادہ (111) سماج وادی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہوجن سماج پارتی کے 29، بھارتیہ جنتا پارٹی کے 25 اور کانگریس کے 13 ارکان کو مقدمات کا سامنا ہے۔ حال ہی میں میعاد ختم کرنے والے ایوان میں مقدمات کا سامنا کرنے والے ارکان کے تناسب کے اعتبار سے اِس بار 12 فیصد اضافہ ہوا ہے۔

یہ اعداد و شمار پڑھ کر وہ "خوشی" کافور ہوگئی جو ہم پاکستان کے مختلف منتخب ایوانوں میں معدوم ہو جانے کے خطرے سے دوچار" نمونوں کو دیکھ کر محسوس کیا کرتے تھے!"

ہمیں تو یہ بھی بھارت سرکار کی کوئی سازش لگتی ہے۔ بَنیا ذہنیت شاید چاہتی ہی نہیں کہ ہم کسی بھی معاملے میں کسی بھی سطح کی خوشی محسوس کریں! اپنے منتخب ایوانوں میں طرح طرح کے جی دار بندے دیکھ کر دل کو یقین رہتا تھا کہ دُنیا کو ہماری طاقت کا اندازہ ہوتا رہے گا! مگر یہ

!لیجیے، اُترپردیش بھی باز و وں کی مچھلیاں دِکھانے پر اُتر آیا

دُنیا کو اب تک جنوبی ایشیا کے سیاسی ٹرینڈز کا کچھ اندازہ ہی نہیں۔ جہان بھر میں یہ ہوتا ہے کہ جُرم کا ارتکاب کرنے والے کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈالا جاتا ہے۔ اگر ہم بھی ایسا ہی کریں تو ہم میں اور باقی دُنیا میں کیا فرق رہ جائے گا؟ پاک و ہند میں جب کوئی بااثر شخصیت جُرم کرتی ہے تو کاندھے پر اسٹارز بڑھ جاتے ہیں۔ عوام کو بھی پولنگ کے وقت خاصی سہولت ہوتی ہے۔ اُنہیں سوچنا نہیں پڑتا کہ ووٹ کسے دینا ہے۔ جُرم کی سنگینی عوام کو انتخاب کے مرحلے میں سوچنے کی زحمت سے نجات بخش دیتی ہے! !یعنی لوگ سنگین جرائم کا ارتکاب کرکے منتخب ایوان کی رونق میں اضافہ کرتے ہیں سب سے زیادہ ملزم منتخب ارکان اپنے دامن میں سمیٹنے کے حوالے سے سماج وادی یعنی سوشلسٹ پارٹی بازے لے گئی۔ یوپی کی معاشرتی حالت ناگفتہ بہ رہی ہے۔ سرکاری اداروں میں غیر معمولی کرپشن ہے، تعلیم کا معیار پست ہے اور اقرباء پروری بھی بقول ناصر کاظمی "بال کھولے سو رہی ہے!" سوشلزم یعنی معاشرے کی اصلاح، عوام کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتوں اور عوام نواز حکمرانی کی باتیں کرنے والوں کا جب یہ حال ہے !تو خالص سرمایہ داری کا راگ الاپنے والے کس مقام پر ہوں گے

اٹکل کے گھوڑے مت دوڑائیے کہ سرمایہ داروں کا کون سا مقام ہو سکتا ہے۔ اُن کا بھی یہی مقام اور ٹھکانہ ہے۔ "نوید" ہو کہ 403 کے ایوان میں 271 کروڑ پتی براجمان ہیں۔ گزشتہ انتخابات میں کامیاب ہونے والے 124 امیدوار کروڑ پتی تھے۔ ثابت ہوا کہ اُتر پردیش کی دولت مندی کا سفر جاری ہے! دولت مندی کے اعتبار سے رام پور کے نواب کاظم علی خان 55 کروڑ 89 لاکھ روپے کے اثاثوں کے ساتھ سر فہرست ہیں۔
دوسرے نمبر پر مبارک پور کے شاہ عالم ہیں جنھوں نے 54 کروڑ 44 لاکھ روپے کے اثاثے ظاہر کئے ہیں۔ خطے کی سیاست کا ٹرینڈ دیکھتے ہوئے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ نو منتخب کروڑ پتی ارکان ایوان کی میعاد پوری ہونے تک ارب پتی ہو چکے ہوں گے! اگر مالی حیثیت بلند کرنے کا یہی معیار رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہر شخص کو کچھ دن کے لیے ایوان کا رکن بنایا جائے گا اور مالی حیثیت بلند ہونے پر فارغ کرنے کے next کو in کیا جائے گا!
ہم نے بلوچستان میں تمام ہی ارکان کو کابینہ کا حصہ بنا کر ایک منفرد مثال قائم کی ہے۔ دنیا کو شاید ابھی ٹھیک سے پتہ نہیں چل سکا ہے ورنہ مبارک باد کا سلسلہ تھمنے کا نام نہ لیتا! بلوچستان سے اُتر پردیش تک عوامی نمائندوں کے رجحانات دیکھ کر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر ریاست (صوبے) کے تمام باشندوں کو اسمبلی کا رکن قرار دے دیا جائے تو ہم انتخابات کرانے کے جھنجھٹ

!سے بھی بچ سکیں گے اور کنگلوں کو ہزار، لکھ اور کروڑ پتی بھی بنا سکیں گے

اُترپردیش اسمبلی کے 238 ارکان گریجویٹ، 75 بارھویں (ایچ ایس سی) پاس، 41 دسویں (ایس ایس سی) پاس، 40 آٹھویں (مڈل) پاس اور 14 یکسر ناخواندہ ہیں۔ اُترپردیش اسمبلی کے ارکان کی تعلیمی کیفیت سے یہ خدشہ پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں ارکان کچھ کر نہ بیٹھیں! مجموعی طور پر تو ایوان پڑھا لکھا لگتا ہے۔ سیاست اور معاشرت کے لیے یہی سب سے مُضر معاملہ ہے۔ "تشویش" کی بات یہ ہے کہ گریجویٹ کی ڈگری سے ناخواندگی تک سبھی کچھ بہت حد تک اصلی ہے۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ایوان ہے تو پورا کا پورا گریجویٹ مگر اِس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ اسناد اصلی ہیں! اور نواب اسلم رئیسانی نے یہ فرماتے ہوئے ہماری مشکل مزید آسان کردی ہے کہ ڈگری ڈگری ہوتی !ہے، چاہے اصلی چاہے نقلی

ہم سوچا کرتے تھے کہ ہر حلقے سے درجنوں لوگوں کے الیکشن لڑنے کی بیماری صرف ہمارے ہاں پائی جاتی ہے۔ اُترپردیش اسمبلی کے انتخابات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ 6839 امیدوار میدان میں تھے۔ اور اِن میں چند ایک کے سوا سبھی کا 223 سیاسی جماعتوں سے تعلق تھا۔ گزشتہ انتخابات میں امیدوار 6068 تھے اور 131 سیاسی جماعتیں میدان میں اتری تھیں۔ یعنی اِس بار مزید 92

جماعتیں انتخابی میدان میں داخل ہوئیں۔ یہ الگ بات ہے کہ صرف 11 جماعتوں کے امیدوار کامیاب ہو پائے۔ 212 سیاسی جماعتوں کو مکمل ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ہم دو قومی نظریے پر جان بھی دینے کو تیار ہیں مگر اُتر پردیش اسمبلی نے بھارت کے روایتی پروپیگنڈے "ہم سب ایک ہیں" کی خوب گردان کی ہے۔ جو کچھ ہمارے ہاں ہوتا ہے وہی اُتر پردیش میں بھی ہوا۔ اگر یہی حال رہا تو ہمارے لیے بھارت سے ہٹ کر، کچھ الگ دکھائی دینا انتہائی دشوار ہو جائے گا!

بچوں کی خوشی کے لیے

بچوں کی بہتر ذہنی نشو و نما کے لیے لازم ہے کہ اُنہیں اُن کے سوالوں کے بر وقت، دُرست اور معقول جواب دیئے جائیں۔ اگر سوالوں کے موزوں اور تسلی بخش جواب نہ ملیں تو بچوں کا ذہنی فروغ رُک جاتا ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ بچے کسی بھی وقت، کوئی بھی سوال پوچھ، بلکہ داغ سکتے ہیں۔ اہل مغرب نے تحقیق کے ذریعے یہ بات معلوم بھی کی اور دنیا کو بھی بتائی کہ بچوں کو اُن کے سوالوں کے بر وقت جواب دینے سے بہت سی ذہنی پیچیدگیوں کی راہ روکی جا سکتی ہے۔ بسا اوقات بچے ایسے سوال کر بیٹھتے ہیں کہ والدین کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دیں اور جواب کے ساتھ وضاحتی بیان کس طرح منسلک کریں۔ مثلاً ہر دور کا بچہ اپنے والدین سے یہ سوال ضرور کرتا آیا ہے کہ اُنھوں نے اپنی شادی میں اُسے کیوں نہیں بلایا تھا! بعض بچے والدین کو یہ دھمکی بھی دیتے ہیں کہ "میں اپنی شادی میں آپ کو نہیں بلاؤں گا کیونکہ آپ نے بھی تو مجھے نہیں بُلایا تھا!"

اہل مغرب کی احساس نوازی اور طفل دوستی دیکھیے کہ بچوں کے معصوم ذہنوں کو پراگندہ ہونے سے بچانے کے لیے اپنے وجود کو گندا کرلیا اور معاشرے کو اُلٹ پلٹ کر ایسا اہتمام کیا کہ مغربی دنیا کے بیشتر بچے والدین سے یہ سوال کرنے

کی زحمت سے بچ گئے ہیں کہ انہیں شادی میں کیوں مدعو نہیں کیا گیا تھا! اب مغرب میں خیر سے دو تین بچوں کی کلکاریاں سُننے اور اچھے خاصے ناز اٹھانے کے بعد والدین، خاصے غور و خوض کے بعد اور کنسلٹنٹ کی مدد سے، طے کرتے ہیں کہ شادی کرنی چاہیے یا نہیں! اور یہ ٹرینڈ بھی پندرہ بیس سال پہلے کا تھا جب دو دو تین تین سال کے بچوں کو ساتھ لیکر لوگ چرچ میں زندگی بھر ساتھ نبھانے کے عہد و پیمان کیا کرتے تھے۔ آج کل خاصے ذوق و شوق سے بچوں کے بڑے ہونے، بلکہ کاندھوں تک آنے کا انتظار کیا جاتا ہے تاکہ شادی کے انتظامات اُن کی پسند و ناپسند کے مطابق کئے جائیں اور والدین کی شادی کے موقع پر وہ اُن کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں! اور اِس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر، اب تو خیر سے بچے اِتنے بڑے ہو چکے ہوتے ہیں کہ والدین کی شادی کا فیصلہ بھی وہی کرتے ہیں! اِس میں بھی بچت کا پہلو ہے۔ اگر کوئی شادی کرنے پر شرمندہ کرنے کی کوشش کرے تو جواز پیش کیا جا سکتا ہے کہ بھائی! بچوں کی خوشی کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے!

اولاد ما قبل شادی" کا ٹرینڈ اپنانے سے ایک انفرادیت یہ پیدا ہوئی ہے کہ باضابطہ" ازدواجی زندگی کی ابتداء کے وقت "فیملی پورٹریٹ" مکمل ہو چکا ہوتا ہے!

یہ تو ہوئی اہل مغرب کی بات۔ ہمارا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ اہل جہاں ذرا ہماری بدنصیبی، بلکہ حرماں نصیبی تو دیکھیں کہ ہم مُرغی کی طرح جان سے گئے اور کھانے والوں کو مزا نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ جب مُقدر یاوری نہ کر رہا ہو تو اونٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو بھی کتا کاٹ لیتا ہے! ہم اندوہ نصیبوں کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اہل مغرب کی طرح بھرپور ترقی کے لیے ہم نے کیا نہیں کیا؟ کسی مقام تک پہنچنے کے خود کو مِٹانا شرط ہے۔ علامہ بھی فرما گئے ہیں۔

مِٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے!

وقت کی جبیں پر اپنا نشان ثبت کرنے کے لیے ہم مِٹ مِٹ گئے مگر یہ مِٹنا بھی اب تک رائیگاں جاتا دکھائی دیتا ہے۔ قسمت کو ہم پر مہربان نہ ہونا تھا، سو نہ ہوئی۔ قسمت کے حسین لبوں نے مسیحائی نہ کی، گو بقول خواجہ میر درد

ہم نے سو سو طرح سے مَر دیکھا!

ایک زمانے سے ہم بحیثیت قوم اپنے وجود کو مِٹانے میں جُتے ہوئے ہیں کہ شاید اِس صورت خاک میں مل کر گل و گلزار ہو جائیں۔ مگر اب تک، بقول "ڈاکٹر" بابر

!اعوان، کچھ بھی نا ہلیا

ہم اداروں پر ادارے نیلام یا تباہ کرتے جا رہے ہیں مگر کچھ حاصل نہیں ہو پا رہا۔ اور اہل مغرب کی ذہانت دیکھیے کہ اُنھوں نے صرف ایک ادارہ تباہ کرکے سبھی کچھ پالیا! مہنگا روئے ایک بار، سستا روئے بار بار" کے مصداق اہل مغرب نے تباہی کا شوق پورا" کرنے کے لیے وہ ادارہ چُنا جس کے مٹتے ہی تمام "آزادیاں" مکمل بے لگام حالت میں دستیاب ہوگئیں! اُنھوں نے شادی کا ادارہ ہی ختم کرنے کی ٹھان لی اور اِس سفر پر ایسے نکلے کہ اب تک واپسی نہیں ہوئی ہے! رشتے کی تلاش، منگنی، مایوں، مہندی، شادی، چوتھی، سُسرال، میکہ .... اِن تمام جھمیلوں سے نجات پاکر سات سمندر پار بسنے والوں نے گویا دُکھوں کے سات سمندر پار کر ڈالے! "عقل مندی" اِس میں ہے کہ ہر معاملے کو کاروباری رنگ دیکر خالص منفعت پسندی کی عینک سے دیکھا جائے۔ مرد و زن ساتھ بھی رہتے ہیں تو "پارٹنر" بن کر۔ یعنی ساتھ رہنے کے نتائج کی کلکاریاں بِل کر جھیلنا ہیں، دونوں کو اِس طرح ساتھ رہنا ہے جیسے بزنس پارٹنرشپ ہوا کرتی ہے! جب پورا معاشرہ ہی ہر معاملے میں نفع و نقصان دیکھ رہا ہو تو پھر فیملی لائف کو کیونکر اِس سوچ سے استثنٰی دیا جاسکتا ہے! یہی سبب ہے کہ اب گھر میں ساتھ رہنے والے بھی پارٹنرز" ہیں۔"

ایک بات ماننا پڑے گی۔ شادی کے ادارے کو اہل مغرب نے اپنی زندگی سے نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر اِس کے باوجود یہ بندھن اُن کی سائیکی میں اب تک بسا ہوا ہے۔ گزشتہ دنوں برطانیہ کی میری لیڈٹن کے حوالے سے یہ خبر آئی کہ اُس نے ڈھائی سال کی محنتِ شاقّہ کے نتیجے میں اپنا وزن 195 کلو گھٹایا۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب میری کا وزن تمام اہل خانہ کے مجموعی وزن سے زیادہ تھا! 330 کلو سے زائد کی میری لیڈٹن کو وزن کم کرنے پر آمادہ کرنے کی تمام کوششیں بے نتیجہ رہیں تو اہل خانہ نے خالص ایموشنل بلیک میلنگ سے کام لیتے ہوئے ایک چال چلی اور کام بن گیا۔ میری لیڈٹن کے چاروں بچوں کی خواہش کو پیش منظر میں رکھتے ہوئے اُن کے والد یعنی میری کے "پارٹنر" نے شادی کا پروپوزل دیا! اور شرط یہ رکھی کہ میری اپنے وزن میں نصف سے زائد کمی کرے گی تو شادی ہوگی، ورنہ نہیں!

لیجیے صاحب! شادی کے ادارے یعنی باضابطہ ازدواجی زندگی کو ترک کئے ہوئے عشرے گزر گئے مگر مغرب میں لڑکیوں کے لیے آج بھی پروپوزل جادو کی چھڑی کا سا اثر رکھتا ہے! میری، جو پہلے ہی خاصی پُھولی ہوئی تھی، اِس پروپوزل کو پاکر خوشی سے مزید پُھولی نہ سمائی اور اُس نے ایک سلمنگ ایکسپرٹ سے مشاورت کرکے وزن کم کرنے کی راہ پر اپنا سفر شروع کیا تاکہ باضابطہ ازدواجی زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی راہ ہموار ہو! میری کی کوشش تھی کہ شادی

تک وہ اِتنی "سلِم" تو ہو ہی جائے کہ چرچ میں جب اپنے چار بچوں کے باپ کو شوہر میں تبدیل کرلے تو باضابطہ ازواجی زندگی کے پہلے فیملی پورٹریٹ میں صرف وہ دِکھائی نہ دے بلکہ فریم میں گھر کے تمام افراد نظر آئیں!

میری لیڈٹن "خوش نصیب" تھی کہ اُسے وزن کم کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے ایک متروک ادارہ کام آگیا۔ ہم جن اداروں کو ترک کرتے ہیں اُن کا تو نام ونشان بھی نہیں بچتا۔ ایسے میں سوال یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے میں جن کا وزن بڑھتا ہی جارہا ہے وہ سلِم ہونے کے لیے کس طرح، کہاں سے تحریک پائیں؟ اور خاص طور پر وہ "حرماں نصیب" جو شادی شدہ ہیں!

اِک ذرا گھر سے نکلیے اور گم ہو جایئے

کھوئے کھوئے رہنے کے لیے اب کسی کی یادوں کے جہان میں آباد ہونا لازم نہیں رہا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ سر، پیر بغیر کے اخباری تجزیے پڑھیں اور بے ذہنی کی حالت میں ایسے گم ہوں کہ دنیا کو نشان بھی نہ ملے ! وہ زمانے ہوا ہوئے جب کسی کے ہاتھ نہ آنے کے لیے آپ سوچوں میں گم رہا کرتے تھے۔ اب اگر آپ اپنا پتہ گم کرنا چاہتے ہیں تو زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں. بس ذرا اپنے شہر کی خاک چھاننے کی جی میں ٹھان کر گھر سے نکلیے ! پھر بھلا کس میں یارا ہے کہ آپ کا نشان بھی پا سکے ؟

جب دوست یا رشتہ دار.برسوں بعد ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جسم اور شکل میں تبدیلی رونما ہوتی ہی ہے مگر پھر بھی ہم مدت بعد کسی کو پا کر حیران ہوتے ہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ جس شہر میں ہم زندگی بسر کرتے آئے ہیں وہ آنکھوں کے سامنے تبدیل ہوا ہے اور پہچاننا مشکل ہوگیا ہے !

ہمدم دیرینہ خالد عمران مطہر کا مطلع ہے۔

نکلتے ہیں سفر پر اور ٹھکانے بھول جاتے ہیں

پرندے قید رہنے کے زمانے بھول جاتے ہیں

اب ٹھکانے بھولنے کے لیے پرندہ ہونے کی قید بھی نہیں رہی۔ کراچی بھر کی "زمینی فضائی" میں راستوں کا ایسا جال بچھا ہے کہ (لیاری کی زبان میں کہیے تو) منزل کے پرندوں نے اپنی شکل گم کرلی ہے!

شہر میں بعض علاقوں اور مقامات کے نام بہت عجیب ہیں۔ تیس پینتیس سال قبل جب محکمہ ترقیات نے نارتھ کراچی میں سڑک کے لیے کھدائی کی تو ناگن نکل آئی۔ بس، علاقے کا نام ناگن چورنگی پڑگیا۔ بعد میں لوگ مدتوں سوچتے رہے کہ ناگن کا تو کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا، پھر چورنگی کو ناگن چورنگی کیوں کہیں؟ کل تک لوگ ناگن کو ڈھونڈتے پھرتے تھے، اب خیر سے پوری کی پوری ناگن چورنگی ہی ناپید ہے!

انڈا موڑ پہنچنے والے سمجھ نہیں پاتے کہ اس مقام کو انڈا موڑ کیوں کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ کہیں سے بھی انڈے کی سفیدی یا زردی جیسی نہیں۔ اور خیر سے علاقے کا ماحول بھی ایسا نہیں کہ اُس پر پولٹری فارم ہونے کا گمان ہو! ڈھونڈے سے دیسی مُرغی مل سکتی ہے مگر اب، خیر سے، پوری قوم "فارمی" ہوچکی ہے! ایسے میں کسی ایک علاقے کے لوگوں کو فارمی سمجھنا انصاف ہرگز نہیں!

جب مُلک میں ڈِسکو کلچر نیا نیا آیا تھا تب ہر چیز کے ساتھ لفظ ڈِسکو نتھی کر دیا جاتا تھا۔ اُس دور کی یادگار نصف درجن ڈسکو بیکریز مختلف علاقوں میں اب بھی پائی جاتی ہیں ! اگر کوئی بتائے کہ وہ ڈِسکو بیکری کے پاس رہتا ہے تو ساتھ ہی پورا نقشہ بھی دینا پڑتا ہے تاکہ لوگ کسی دوسری ڈِسکو بیکری پہنچ کر مطلوبہ ایڈریس کا بلکٹ تلاش نہ کرتے پھریں!

جب کوئی زیادہ اکڑ فوں دِکھا رہا ہو تو ہم کہتے ہیں "کیا بات ہے بھئی؟ بڑا پھیل رہا ہے!" وہ زمانہ اب کہاں؟ اب پورا شہر کچھ اِس ادا سے پھیل رہا ہے کہ لوگ کونوں کُھدروں میں دُبکنے پر مجبور ہوگئے ہیں! شہر کے پھیلنے کی رفتار ایسی ہوش رُبا ہے کہ شہری اُس کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ ہر گزرتا دن شہر اور شہریوں میں فاصلے بڑھا رہا ہے۔ بعض علاقے تو اِتنے پھیل چکے ہیں کہ اُس کی حدود میں دو مقامات پر رہنے والوں کو بھی ملاقات کی باضابطہ منصوبہ بندی کرنا پڑتی ہے! وہ تو خیر گزری کہ ٹیلی کام ٹیکنالوجی نے ترقی کرلی اور ہم سیل فون کلچر سے ہمکنار ہوئے، ورنہ شکل دیکھنے کو ترسنے والے آواز سُننے کو بھی ترستے ہی رہ جاتے!

جب چورنگیاں تھیں تب لوگ اُن کے چکر کاٹا کرتے تھے۔ اب چورنگیاں نہیں رہیں

تو اُلجھن بڑھ گئی ہے۔ چورنگیوں کے خاتمے سے علاقوں کی شکلیں یکسر بدل گئی ہیں۔ لوگ منزل پر پہنچ کر بھی منزل کا سُراغ نہیں پاتے۔ چورنگیوں کی مہربانی سے چار سمتوں کا اندازہ تو ہوتا تھا۔ اب پتہ ہی نہیں چلتا کہ دائیں طرف مُڑنے کے لیے کتنا مُڑنا ہے!

سِگنل فری کوریڈورز نے الگ قیامت ڈھائی ہے۔ کوئی رکاوٹ نہ ہونے کے باعث لوگ گاڑیوں کو سرپٹ دوڑاتے پھرتے ہیں اور منزل سے پانچ چھ کلومیٹر آگے جاکر یاد آتا ہے کہ ارے، یہ تو ہم اِرشاد ماموں کے علاقے میں داخل ہوگئے، بنّو خالہ کا گھر تو پیچھے رہ گیا!

ہمارے معاشرے میں ہر چیز کسی نہ کسی نشانی کی مدد سے پہچانی اور یاد رکھی جاتی ہے۔ اب اگر آپ کسی دوست سے ملنے کے لیے دس بارہ سال بعد اُس کے علاقے میں داخل ہوں تو تیار رہیے، آپ پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ سکتے ہیں۔ آپ کو یاد آرہا ہے کہ دوست کا مکان جس گلی میں تھا اُس کے کونے پر پان کے کیبن آمنے سامنے تھے۔ یہ ماضی کی حسین یاد ہے۔ مگر کبھی کبھی حال کا جمال ماضی کے حُسن سے بڑھ کر ہوتا ہے! آپ جہاں پان کے کیبن ڈھونڈ رہے ہیں وہاں اب حُسن و جمال کی دنیا آباد ہے۔ جہاں پان کی پیک کے دَھبّے ہوا کرتے تھے اور سگریٹ سُلگانے کے لیے رَسّی کے سُلگتے ہوئے ٹکڑے لٹکائے جاتے تھے وہاں اب شاندار

بیوٹی پارلر ہے! دوست آپ کو تلاش کرتا ہوا آتا ہے اور آپ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر یاد دلاتا ہے کہ آپ اُس سے ملنے آئے ہیں، بیوٹی پارلر کے ماتھے پر لگی سجی سنوری دُلہنوں کی حسین تصاویر دیکھنے نہیں!

شہر میں پانچ چھ بسم اللہ ہوٹل ہیں تو چار پانچ سندھی ہوٹل۔ کم از کم نصف درجن بلوچ کالونیاں ہیں۔ تین چار بنگالی پاڑے ہیں اور دو مصدقہ و تسلیم شدہ بہار کالونیاں پائی جاتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سے ملنے بلوچ کالونی جانا ہے تو شارع فیصل پر بلوچ کالونی فلائی اوور پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ جن صاحب سے ملنا مقصود ہے وہ تو اورنگی ٹاؤن کی بلوچ کالونی میں رہتے ہیں! جہاں بنگالیوں کے دس پندرہ مکانات ہوں وہی بنگالی پاڑا ہے۔ اب اگر مطلوبہ بنگالی پاڑے پہنچنا ہے تو پوری وضاحت سے پتہ معلوم کیجیے۔ خود بھلے ہی سرپٹ دوڑیے مگر اِس معاملے میں اٹکل کے گھوڑے مت دوڑائیے۔

شہر کا جغرافیہ ایسا بدلا ہے کہ اِس کے مکینوں کے تعلقات کی تاریخ بھی بدل گئی ہے۔ شہر کے دو سِروں کے درمیان سفر 40 کلومیٹر تک ہوگیا ہے۔ ایک ہی شہر میں سفر کرتے ہوئے محسوس یہ ہوتا ہے کہ کئی شہروں کی سیر کرنے نکلے ہیں! بعض منچلے تو شہر کے مختلف علاقوں کی سیر کا احوال بھی اخبارات میں سفر ناموں کے انداز سے لکھتے ہیں! اور سِتم بالائے سِتم یہ ہے کہ داد بھی پاتے

ہیں!

مضافاتی علاقوں کے مکین عشروں سے شہر کے وسطی حصے تک جانے کو "ذرا شہر جا رہا ہوں" کہتے آئے ہیں۔ یہ گزرے وقتوں کی باتیں ہیں۔ معاملہ شہر کی منزل سے آگے جاچکا ہے۔ اب تو شہر کے سِرے سے مرکزی حصے تک کا سفر کسی دوسرے مُلک کا سفر معلوم ہوتا ہے! کراچی میں پیدا ہونے والے جن لوگوں کی عمر 60 سال ہوچکی ہے اُن میں 75 فیصد سے زائد ایسے ہیں جنہوں نے اب تک 25 فیصد شہر نہیں دیکھا! اگر کسی دوسرے شہر سے کوئی مہمان آ جائے اور شہر میں اُسے کسی سے مِلنا ہو تو میزبان اُس کے ساتھ جانے کا خاص اہتمام کرتا ہے کیونکہ اِس بہانے اُس کی بھی تھوڑی بہت سیر ہو جاتی ہے اور وہ اپنے شہر سے تھوڑا سا اور واقف ہو پاتا ہے!

سلیم احمد مرحوم نے کہا تھا۔

دیوتا بننے کی حسرت میں مُعلّق ہو گئے

اب ذرا نیچے اُتریے، آدمی بن جایئے!

اہل کراچی کا معاملہ یہ ہے کہ دانستہ گم رہنے کے لیے یادوں اور سوچوں میں کھوئے رہنے کے مکلّف نہیں رہے۔ اِس خدمت کی بجا آوری کے لیے شہر جو موجود ہے۔ یعنی

اِک ذرا گھر سے نکلیے اور گم ہو جایئے!

سُنتے آئے ہیں کہ عِشق ایک بھول بُھلیاں ہے۔ جو اِس میں گیا پھر ہاتھ نہ آیا۔ کراچی بھی اب ایسی ہی بُھول بُھلیاں ہے۔ اِس بُھول بُھلیاں کو مزید مستند بنانے کے لیے، شالا نظر نہ لگے، "نو گو ایریاز" بھی موجود ہیں! یہ علاقے فیض کے مصرع "جو چلے تو جاں سے گزر گئے...." کی عملی تصویر ہیں۔ "نو گو ایریا" میں بعض "غدّاروں" کے داخلے پر پابندی ہے۔ جنہیں جان عزیز ہے وہ اپنے علاقوں کو بھی "نو گو ایریا" تصور کرلیتے ہیں یعنی اُس سے باہر نکلنے سے بھی حتی الامکان گریز کرتے ہیں!

زن مُریدی کو مَرحبا کہیے

جو لوگ شادی کی تقریب میں بیگمات کو سکون سے بتیانے کا موقع فراہم کرنے کی خاطر بچوں کو سنبھالے رہتے ہیں اُنہیں کسی کی طعن و تشنیع سے رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو شاپنگ کے دوران، سامان سے لدے پھندے، بیگم کے نقوش قدم پر چلتے دکھائی دیتے ہیں وہ بھی دل برداشتہ نہ ہوں۔ اگر وہ اِس کام کو اپنے لیے تذلیل کا سامان سمجھتے ہیں تو جان لیں کہ بڑے بڑوں کو یہ تذلیل جھیلنا پڑتی ہے! اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اہل خانہ اور بالخصوص اہلیہ کو رام کرنے کی خاطر حرام و حلال ذرائع سے دولت حاصل کرنا پڑی ہے تو کبیدہ خاطر نہ ہو کہ یہ "سعادت" تو اُن کے حصے میں بھی آئی ہے جو خود کو بہت بااختیار اور بااُصول گردانتے رہے ہیں! اگر کسی کے ذہن میں یہ شبہ ہے کہ گھر کے تمام اہم فیصلوں میں گھر والی کی مرضی شامل کرنے سے مردانہ عزت اور توقیر میں کچھ فرق پڑتا ہے تو ہرگز دل چھوٹا نہ کرے کہ جنہیں پوری ریاست اور مملکت کے فیصلے کرنا ہوتے ہیں وہ بھی گھر والی کی رائے کو نظر انداز کرنے کا سوچ نہیں سکتے! اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ گھر اور دل پر راج کرنے والی کی بات مان کر اُس نے چند غلط فیصلے کئے ہیں اور مُنہ کی کھائی ہے تو یہ سُن پر ریکارڈ درست کرلے کہ کئی بڑے ڈکٹیٹرز کو اُن کی بیگمات نے اِس قدر ڈکٹیٹ

!کیا ہے کہ چند غلط فیصلے پوری قوم کو لے ڈوبے

عام آدمی سے سربراہان مملکت و حکومت میں کہنے کو تو زمین آسمان کا فرق ہے مگر ایک معاملے میں وہ ایک ہیں۔ ایک گھاٹ ایسا بھی ہے جہاں سے دونوں جی بھر کے پیاس بُجھاتے ہیں۔ اور وہ گھاٹ ہے زن مُریدی کا! یہ زہر وہ ہے جسے امیر غریب، شاہ و گدا سبھی ہنس ہنس کر پیتے آئے ہیں اور پی رہے ہیں۔ میر تقی میر کی روح سے معذرت کے ساتھ۔

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے

!اُلفِ بیگم" کے سب اسیر ہوئے"

ابراہیم جلیس مرحوم نے "اوپر شیروانی، اندر پریشانی" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی۔ بیشتر آمروں کا بھی کچھ یہی حال دکھائی دیتا ہے۔ دُنیا کے سامنے وہ طُرّم خان بنے پھرتے ہیں، بات بات پر غُرّاتے ہیں اور کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ مگر گھر میں بیگمات کا سِکّہ چلتا ہے (اِسی لیے تو وہ گھر والی کہلاتی ہیں!) اور ہر ڈکٹیٹر بھیگی بلّی کی طرح، بلکہ تگڑی بلّی کے سامنے چوہے کی طرح ساری باتیں مانتا چلا جاتا ہے! مرزا تنقید بیگ کہتے ہیں کہ ڈکٹیٹرز مگر مچھ کی طرح ہوتے ہیں۔ یعنی اوپر سے جتنے سخت، نیچے سے اُتنے ہی !نرم اور آسانی سے شکار ہو جانے والے

سلور اسکرین پر راج کرنے والے خاں صاحب یعنی دلیپ کمار ہوں یا محض ایک شاٹ کی حد تک نمودار ہونے والے ایکسٹرا، امریکی صدر ہوں یا کسی سرکاری دفتر کے سب سے نچلے گریڈ کے ملازمین، گھر والی کی سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

مُسلم دنیا کے ڈکٹیٹرز کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ریاستی و حکومتی امور سے گھریلو معاملات تک بیگمات کا دَم بھرتے آئے ہیں اور بیگمات کے مشوروں پر عمل کرنے ہی سے اُن میں سے بیشتر کی لُٹیا بھی ڈوبی ہے! یہ بھی اللہ کا کرم ہے کہ ڈکٹیٹرز شادی شدہ ہوتے ہیں۔ قوم تو مطالبات کرتے کرتے تھک جاتی ہیں مگر ڈکٹیٹرز جانے کا نام نہیں لیتے۔ بیگمات کی فرمائشوں، نخروں اور مشوروں کو اللہ سلامت رکھے کہ اِن کے ہاتھوں ہی ڈکٹیٹرز کا بھی بیڑا غرق ہوتا ہے! اگر وہ شادی ہی نہ کریں تو کِس کے مشوروں پر عمل کرکے اپنے آپ کو بُرے انجام دے دوچار کریں اور عوام کو سُکون کا سانس لینے کے چند مواقع میسر ہوں!

تیونس کے معزول صدر زین العابدین بن علی نے اپنی اہلیہ لیلیٰ کے سامنے ہمیشہ سگِ لیلیٰ کا کردار ادا کیا بلکہ اُس سے بھی ایک قدم آگے جاکر قوم کے

وسائل پر دانت گاڑتے رہے۔ لیلیٰ طرابلسی کو دولت کی ہوس تھی۔ جب عوام جاگے تو لیلیٰ طرابلسی کئی سیکڑوں کلو گرام سونا اور بہت سی دوسری قیمتی اشیاء لیکر بھاگ نکلی اور اب سعودی سرزمین پر سُکون سے زندگی بسر کر رہی ہے۔ اِس لیلیٰ کی دِل جُوئی کرتے کرتے زین العابدین بن علی اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیلیٰ فائدے میں رہی اور سگِ لیلیٰ یعنی زین العابدین بن علی کتے کی مانند گھر کے رہے نہ گھاٹ کے!

مرزا کا استدلال ہے کہ کم عمر اور حسین بیوی اِنسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ اگر ایسی بیوی بادشاہ کی ہو تو اُسے بے وطن یعنی جلا وطن کرکے دم لیتی ہے اور اگر غریب کی ہو تو بے چارے کو دُنیا ہی سے چلتا کر دیتی ہے!

شام میں اگر ظلم کی شام ڈھل نہیں رہی اور خوش حالی کے سُورج کو طلوع ہونے کا موقع نہیں مل رہا تو اِس کی ایک بڑی وجہ بشار الاسد کی جواں سال بیوی اسماء بھی ہے جو لندن میں بیٹھ کر شوہر کو اب بھی ڈکٹیٹ کر رہی ہے۔ ذرا حد ملاحظہ فرمایئے۔ فرانس کے صدر سرکوزی کہتے ہیں کہ جب تک اسماء ہے، شام میں عیسائیوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں!

بشار کے والد حافظ الاسد بھی جورو کے غلام تھے۔ 1980 کے عشرے کے اوائل میں

اُنھوں نے درعا شہر میں سُنّیوں کے خلاف شدید کریک ڈاؤن اپنی جواں سال ملکہ عالیہ انیسہ مخلوف کی فرمائش پر کیا تھا۔

مصر کے سابق ڈکٹیٹر حُسنی مبارک نے اپنے نام میں پائے جانے والے حُسن پر اکتفا نہ کیا اور شریکِ حیات سوزان کے کہے پر عمل کرکے اپنے دل کو دل سوزاں کی منزل تک پہنچا کر ہی نچلے بیٹھے!

ایران کے رضا شاہ پہلوی کو اپنی جوان و حسین ملکہ فرح دیبا کے احکام پر عمل میں فرحت محسوس ہوتی تھی۔ فرح دیبا نے رضا شاہ پہلوی کو کسی پہلو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ وہ بھی ملک کی ڈی فیکٹو حکمران تھیں اور اُن کے مشوروں اور احکام پر عمل کرنے سے بے چارے رضا شاہ پہلوی کا یہ انجام ہوا کہ مصر میں جلا وطنی کے دوران وہ ایک کچّے مکان میں ایڑیاں رگڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

اُردن کی کہانی یہ ہے کہ شاہ حسین بظاہر کینسر سے مَرے مگر اُن کا دِماغ بہت پہلے زن مُریدی کے کینسر میں مبتلا ہوچکا تھا! نُور کی شکل میں انتہائی حسین مغربی ملکہ پاکر شاہ حسین نے سوچ لیا کہ اب ذہن استعمال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں! ملکہ نُور کی پُرنور" سوچ نے شاہ حسین کے ذہن میں"

اندھیروں کا ایسا محل کھڑا کیا کہ موصوف نے اپنے بھائی طلال کی ولی عہدی ختم کرکے ملکہ نُور کے بطن سے پیدا ہونے والے عبداللہ کو ولی عہد مقرر کیا اور سُکون سے ہمیشہ کے لیے موت کے اندھیرے کو گلے لگالیا!

بیشتر ڈکٹیٹرز اپنے وطن اور اہل وطن پر جس قدر حکم چلاتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ حکم اور جادو تو خود اُن پر اُن کی بیگمات کا چلتا ہے اور پھر یہ چکر اِس قدر چلتا ہے کہ اِن ڈکٹیٹرز کے دِماغ چل جاتے ہیں!

مشرق وسطٰی کے ڈکٹیٹرز کو بیگمات کے نشے میں چُور اور مخمور رہنے کا طعنہ کیا دیجیے کہ ہمارے پرویز مشرف بھی پکّے "صہبائی" ثابت ہوئے! گھر میں "صہبا" کے ہوتے ہوئے اُن پر بھلا کیوں "صہبا پرستی" کا الزام نہ آتا! جب پرویز مشرف میڈیا سے گفتگو یا قوم سے خطاب کے دوران اپنے مخصوص لہجے میں "کسی سے ڈرتا نہیں ہوں" کہتے تھے تو اِس جملے سے صرف اپنی بیگم کو استثنٰی دیا کرتے تھے! یا یوں کہیے کہ استثنٰی دینے کی زحمت نہیں اُٹھانا پڑتی تھی، وہ تو طے شدہ تھا!

1936 سے 1951 تک مصر پر حکومت کرنے والے شاہ فاروق کا کیس البتہ منفرد استثنٰی کا درجہ رکھتا ہے۔ موصوف بھی اپنی ملکہ فریدہ زیمان کے مُرید تھے۔

گھر اور مملکت کے بیشتر اُمور میں حکم بیگم صاحبہ کا چلتا تھا۔ یہ معاملہ اِس حد تک بڑھا کہ ایک دِن شاہ فاروق نے گھبرا کر فریدہ کو طلاق دے دی!

زِن مُریدی کے تذکرے کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں بلکہ اِس راہ میں آگے مزید ایک آدھ سخت مقام ہے!

اِس بار کتابیں .... "گرائی" جائیں گی

نارتھ کراچی کے پاور ہاؤس چورنگی بس اسٹاپ پر سید شاہد حسن سے کئی برس بعد ملاقات ہوئی تو دِل کی کلی کِھل گئی۔ شاہد حسن لکھنے میں بھی کسی سے کم نہیں اور "بتیانے" کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔ اور جب وہ بولنے کے موڈ میں ہوتے ہیں تو مقام کی کوئی قید نہیں۔ بس اسٹاپ کا چھجہ بھی ٹاک شو کے سیٹ کا منظر پیش کرنے لگتا ہے! ویسے بولنا بھی لکھنے جیسا ہی عمل ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض مہربان منہ کو قلم سمجھ کر شروع ہو جاتے ہیں اور خاصی دیر کے بعد ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آج کل فُل اسٹاپ سے اُن کے مُنہ کی "کُٹّی" ہے!

شاہد حسن معاشرے کے "باغیوں" میں سے ہیں یعنی پڑھنے کے بھی شوقین ہیں! یہ بھی غنیمت ہے، ورنہ ہمارے ہاں بیشتر لکھاری وہ ہیں جنھوں نے کبھی پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی! یہ کام اُنھوں نے اپنے قارئین کے مُقدر کی جھولی میں ڈال رکھا ہے! خان کوچ میں سوار ہوئے تو گفتگو کا سفر بھی شروع ہوگیا۔ موصوف کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو صرف پڑھتے نہیں، بلکہ کتابیں بھی سنبھال کر رکھتے ہیں تاکہ سَند رہے! کتاب خوانی کا شغف رکھنے والوں کی یہ عمومی روش ہے کہ مطالعے کے بارے میں بتاتے وقت اپنے گھر میں موجود کتابوں کی

تعداد بھی بتانا نہیں بھولتے۔ اِس میں خود نُمائی کی کوئی بات نہیں، مقصود صرف یہ واضح کرنا ہوتا ہے کہ فریق ثانی یہ نہ سمجھے کہ کتابوں کے بغیر ہی مطالعہ کرلیا! شاہد حسن نے بتایا کہ اُن کے گھر میں اب خیر سے سات ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ یہ تعداد سُن کر ہم اُن کے مزید معتقد اور (اُس سے بھی ایک قدم آگے جاکر مزید) مرعوب ہوگئے!

ہمیں بھی ایک زمانے سے مطالعے کا شوق ہے اور آئے دن (یعنی سال میں تین چار مرتبہ) کتابیں خریدتے رہتے ہیں۔ ہمارے شوق کی انتہا یہ تھی کہ جب بھی کوئی کتاب پسند آجاتی تھی تو مستعار لیکر پڑھ ڈالتے تھے اور سادگی کی انتہا دیکھیے کہ کتاب واپس کرنا اکثر بھول جاتے تھے! کتاب واپس نہ کرنا بھی دراصل خود کو احمق ثابت نہ کرنے کے لیے تھا۔ کسی کا یہ قول اتفاق سے ہم نے بھی سُن رکھا ہے کہ کتاب مستعار دینے والا بے وقوف اور مستعار لی ہوئی کتاب واپس کرنے والا اُس سے بڑا بے وقوف ہوتا ہے! سچ تو یہ ہے کہ اِس قول سے واقفیت اور بے وقوف ثابت ہونے سے بچنے کی کوشش نے ہمارے مطالعے کو وسیع کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے!

جب سے کمپیوٹر کا استعمال عام ہوا ہے اور ہم نے بھی سوفٹ کاپیز کی مدد سے مطالعہ شروع کیا ہے، کچھ تو شیلف کی تسلّی اور اُس سے کہیں زیادہ لوگوں کی

تشفّی کے لیے کبھی کبھار کتابیں خریدنا پڑتی ہیں ! تین عشروں کے دوران ہم نے "کتاب دوست" ہونے کا جو ثبوت متعدد مواقع پر فراہم کیا ہے یعنی پرانی کتابوں کے ٹھیلوں کی جو سیر کی ہے اُس کے نتیجے میں گھر بھر میں کتابیں ہی کتابیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمارے گھر میں آٹھ دس ہزار کتابیں تو ہوں گی۔ ایک دن ہم بھی شاہد حسن کی جَون میں آ گئے یعنی اپنے جُثّے سے ہم آہنگ جوش و خروش کے ساتھ ہم نے کتابوں کو شمار کیا۔ شیلف کے علاوہ میز کے نچلے حصے میں پڑے ہوئے علم کے موتیوں پر بھی ہماری نظر گئی اور یہ جان کر دل کو انجانی سی مسرت ہوئی کہ اِن پر فرنگیوں کی نظر نہیں پڑی ورنہ آج اِنہیں یورپ میں دیکھ کر ہمارا دل بھی علامہ اقبال کے دل کی طرح سی پارہ ہو جاتا ! خوب اطمینان سے، ٹھہر ٹھہر کر گنتی کی تو شرم سے زمین میں گڑ جانے کو جی چاہا۔ کُل مِلا کر 370 کتابیں نکلیں ! اور اِن میں بھی بیس پچیس تو نصابی یا درسی تھیں یعنی جی چاہے تو اُنہیں کتب کہیے، نہ چاہے تو نہ کہیے ! اہلیہ نے ہمیں دیکھا تو "چہرہ اُترائی" کا سبب پوچھا۔ ہم نے بتایا کہ لاکھ کوشش کے باوجود ہماری کتابیں فور فگر میں داخل نہ ہو سکیں ! اُنہوں نے یہ کہتے ہوئے ڈھارس بندھائی "دل چھوٹا مت کیجیے۔ کتابیں نہ سہی، آپ خود تو 'فور فگر' میں داخل ہو چکے ہیں!"

خیر صاحب ! پھر آمدم بر کتاب۔ کتابوں کی تعداد اِتنی کم تھی کہ ہم نے "خوفِ

فسادِ خلق" سے اِس کے بارے میں عزیز ترین دوستوں کو بھی بتانے سے گریز کیا!
کتابیں بہرحال قابل احترام ہوتی ہیں ورنہ ہم کہتے کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا! ہم پتہ نہیں کیا کیا پڑھ چکنے کا گمان کر بیٹھے تھے۔ گھر میں موجود کتابوں کی تعداد معلوم ہوئی تو اپنا "کتابی" سا مُنہ لیکر رہ گئے!

اِنسان جو کام کرتا ہے ویسا ہی ہوتا جاتا ہے۔ جو لوگ مختلف تنظیموں اور اداروں کے پریس ریلیز اخبارات کے دفاتر تک پہنچانے آتے ہیں وہ دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں کیونکہ "کسرتِ ترسیل" سے وہ پریس ریلیز جیسے دکھائی دینے لگتے ہیں! ہم نے سوچا تھا کتابیں پڑھتے پڑھتے شاید ہمارا چہرہ بھی کتاب سا یعنی کتابی ہوگیا ہوگا۔ ایک دن اِس "علمی موضوع" پر بحث چھڑی تو ہمارے ایک دوست نے کہا "آپ کا چہرہ بھی خیر سے کتابی ہے مگر یہ کسی متنازع کتاب سے زیادہ متاثر دِکھائی دیتا ہے!" اب اگر ایسے کسی موضوع پر بات چل نکلے تو ہم پتلی گلی سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں!

کراچی ماشاءاللہ خاصی ترقی کرچکا ہے مگر چند مقامات "پس ماندہ" یعنی پیچھے رہ گئے ہیں۔ پیچھے رہ جانے والے یہ چند مقامات وہ ہیں جہاں کتب بین اور کتب فروش جمع ہوتے ہیں! اِس گئے گزرے دور میں علم سے محبت کرنے والوں کا ایک اچھا ٹھکانہ صدر میں پرانی کتابوں کا اتوار بازار بھی ہے۔ ہفتہ بھر خالص

کاروبار کرنے والی گلی میں اتوار کی صبح سے علم کا بازار سجتا ہے۔ "تحقیقی بھیڑیوں" کے جبڑوں سے کچھ بچ رہے تو ہم بھی خرید لیتے ہیں! سارا اچھا مال صبح کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ہوا ہو جاتا ہے۔ شام کو اتوار بازار کا چکر لگایئے تو محسوس ہوتا ہے۔

!اِستخواں پیشِ سگاں انداختیم

وادی اُردو ڈاٹ کام والے بھائی راشد اشرف، سٹی بُک پوائنٹ کے روحِ رواں آصف حسن، برادرم مجید رحمانی، عزیزم یوسفِ ثانی اور جہانگیر سید ایسے چند احباب صدر کے اتوار بازار کو زندگی کا حِصّہ بنا بیٹھے ہیں۔ اتوار کا سُورج طلوع ہوتے ہی یہ احباب گھر سے صدر جانے کے لیے اُسی طرح نکلتے ہیں جس طرح کمان سے تیر جان چھڑاتا ہے! اِن میں بھی بھائی راشد اشرف کی باقاعدگی تو ایسی ہے جیسے وہ ہفتے کی شام غروب ہونے والے سُورج کو ہدایت کرتے ہوں کہ اب جب ہم کتابوں کے درمیان ہوں تب طلوع !ہونا

کسی زمانے میں ہم بھی صدر میں اتوار بازار کا باقاعدگی سے چکر لگایا کرتے تھے۔ ہماری باقاعدگی بھی ایسی تھی کہ لوگوں کو پورا یقین ہوتا تھا کہ اتوار کو ہم صدر کی فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کے پہلو میں ملیں گے۔ یہ ہفتہ وار معمول اِس قدر غیر لچکدار تھا کہ !قرض خواہ وصولی کے لیے وہاں پہنچنے لگے

صورت حال کی نزاکت نے ہمیں نانعے کا سسٹم متعارف کرانے پر مجبور کر دیا!
پرانی کتابوں کا اتوار بازار کتب بینی کا شوق رکھنے والوں کا مقبول ترین "ڈیٹنگ اسپاٹ" بھی ہے! اِس میں باقاعدگی سے آنے والے مطالعے کے بارے میں کم ہی گفتگو کرتے ہیں۔ ملاقات کا بڑا حصہ مطالعہ نہ کرنے والوں کے ماتم میں تلف ہو جاتا ہے! اِس بازار کی ساری رونق علم دوست اور کتاب خواں شخصیات کے مَرنے پر موقوف ہے۔ جب فٹ پاتھ اور ٹھیلوں پر پُرانی کتابوں کا نیا اسٹاک دکھائی دیتا ہے تو "کتاب جُو" نظریں سمجھ جاتی ہیں کہ کوئی علم دوست مَرا ہے اور اہل خانہ نے کتابی کباڑیوں کو بلا کر اِس "خزانے" سے جان چھڑائی ہے! ایک زمانہ تھا جب کِسی علم دوست کے مرنے پر پس ماندگان اُس کی کتابوں کو تین چار سال تو سنبھال کر رکھتے تھے۔ اب کتابوں سے اِتنی تیزی سے جان چُھڑائی جاتی ہے جیسے کتابیں نہ ہوں، خُدا نا خواستہ، کچرے کا ڈھیر ہوں!

علم کے خزانے سے عجلت میں جان چھڑانے کی روش کتاب اور اہل کتاب سے الرجی کا نتیجہ ہے۔ کبھی کبھی یہ الرجی کتاب سے محبت کرنے والوں کے لیے نعمت بھی ثابت ہوتی ہے۔ 1987 میں ہم اٹاری کے ذریعے بھارت گئے۔ اُس زمانے میں پاکستان والے کسٹمز کی کارروائی لاہور ریلوے اسٹیشن پر کیا کرتے تھے۔ واپسی پر لاہور میں کسٹم افسر نے پوچھا بڑے صندوق میں کیا ہے۔ ہم نے کہا بھائی!

کچھ بھی نہیں، ہم صندوق کھولیں گے تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ وہ ہمیں کھسیپیا سمجھ کر ٹک
مُکا کرنے کے موڈ میں تھا۔ مگر جب ہم نے کچھ دینے پر رضامند ہونے کے بجائے
صندوق کھولا تو اوپر سے نیچے تک کتابیں دیکھ کر کسٹم افسر نے ناک بھوں چڑھائی اور فوراً
کلیئر کرتے ہوئے صندوق تیزی سے ہٹانے کا حکم دیا۔ اُسے یہ ڈر تھا کہ کوئی کھسیپیا ہاتھ
سے نہ نکل جائے!

مغرب میں ایک مشہور ادیبہ کے پاس ہزاروں کتابیں تھیں۔ ایک بار سردی زیادہ
تھی۔ کھڑکی ٹوٹی ہوئی تھی۔ معمر ادیبہ نے ہوا روکنے کے لیے کھڑکی کے کھانچے میں
کتابوں کا ڈھیر لگادیا۔ شومئی قسمت کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کتابیں ادیبہ پر گریں
اور وہ بے چاری اُن کتابوں میں دب کر چل بسیں! شاہد حسن نے یہ واقعہ اپنی بیٹیوں
کو سُنایا تو اُنھوں نے شوخی سے جواب دیا" بابا! کہیں آپ کا بھی یہی انجام نہ ہو!"
شاہد حسن کو اندازہ ہونا چاہیے کہ سات ہزار سے زائد کتابیں اُوپر آن گریں تو بندہ
سانس بھی نہیں لے سکتا۔ مگر زمانے کی روش دیکھتے ہوئے یہ نکتہ معترضہ ہم واضح
کردیں کہ اِس بار کتابیں گریں گی نہیں، گرائی جائیں گی!

ابن صفی، نشہ اور سانپ

پاکستان میں سرّی ادب کے بانی ابن صفی کی صلاحیتوں پر کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے؟ مرحوم نے عمران جیسا لازوال کردار دیا۔ اُن کے تحریر کردہ جاسوسی ناول پڑھنے والے کسی اور ہی دنیا کے مکین ہو جاتے تھے۔ ابن صفی مرحوم اِس قدر ڈوب کر ناول تحریر کرتے تھے کہ ہر منظر تمام جزئیات کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا اور ہم کسی اور دنیا میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ مگر گزشتہ دنوں ایک خبر ایسی پڑھی کہ ابن صفی مرحوم کی ساری محنت زائد از ضرورت، بلکہ غیر ضروری سی محسوس ہوئی۔

بھارت چونکہ ہمارا ہمسایا ہے اِس لیے سوچا جا سکتا ہے کہ وہاں بھی طرح طرح کے نشے مقبول ہوں گے۔ اور ہوں گے کیا، مقبول ہیں۔ بھارتی شہر حیدر آباد (دکن) کے لوگ "گھٹّے" کے نشے میں چُور رہنے کے حوالے سے خاص شہرت رکھتے ہیں مگر آج کل حیدر آباد دکن میں ایک اور نشہ تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔ نئی نسل پیسے دیکر خود کو سانپ سے ڈسوا رہی ہے! آپ سوچیں گے کہ مارکیٹ میں یہ کیسا نشہ آیا ہے اور ابن صفی مرحوم کا ذکر کہاں سے آگیا۔ بات کچھ یوں ہے کہ جواں سال لڑکیاں اور لڑکے سو سوا سو روپے دیکر اپنی زبان کو سانپ سے ڈسواتے ہیں۔

ایسا کرنے کا فائدہ ؟ زبان کو سانپ سے ڈسوانے والے تین دن تک ایک الگ ہی دنیا میں سکونت اختیار کرلیتے ہیں۔ اِن تین دنوں میں وہ خود کو جیمز بونڈ سمجھتے رہتے ہیں ! یہ خبر پڑھ کر ہمیں خیال آیا کہ ابن صفی مرحوم رات دن ایک کرکے، دماغ کی ساری توانائی نچوڑ کر کہانیاں ترتیب دیتے اور ناول لکھتے تھے تو قارئین اُنہیں پڑھ کر خود کو علی عمران، جیمز بونڈ، شرلاک ہومز اور پتہ نہیں کیا کیا سمجھتے تھے۔ اِتنی مغز پاشی کرنے کے بجائے اگر ابن صفی مرحوم دو چار زہریلے سانپ پال لیتے تو شوقینوں کو زبان پر ڈسوا کر تین چار دن کے لیے جیمز بونڈ، شرلاک ہومز اور علی عمران بننے میں خاطر خواہ مدد دے سکتے تھے ! اور یوں خود کو صفِ اول کا یا بہترین سیکریٹ ایجنٹ سمجھنے کے شوقین خیالوں کی دنیا میں گھر بنانے کے لیے ناول پڑھنے کے محتاج نہ ہوتے ! ممکن تھا کہ اِس صورت میں ابن صفی زیادہ کماتے !

اللہ نے ہر خطے کو چند خصوصیات بخشی ہیں۔ جاپانیوں پر صرف محنت کی نعمت اُتاری گئی ہے۔ مغرب کو بھرپور ترقی اور اُس سے بھی بھرپور بے حیائی اور مادر پدر آزادی اُتارنے کے لیے منتخب کیا گیا۔ ہمارا خطہ شاید طرح طرح کے نشے اور شوق اُتارنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے ! کوئی بازو میں سُوئی ٹھونس کر مخمور ہوتا ہے تو کوئی زبان کو سانپ سے ڈسواتا ہے ! نشوں کی کوئی قید بھی نہیں اور کمی بھی نہیں۔ جہان بھر کی ورائٹی ملتی ہے۔ بولو جی، تم کیا کیا

خرید و گئے!

جیب میں مال زیادہ دیر رہے تو تکلیف دیتا ہے۔ یعنی تنخواہ ایک ڈیڑھ ہفتے میں اُڑا دینا بھی ایک نشہ ہے! اور اِس سے بڑا نشہ ہے مہینے کے باقی دِنوں کی گاڑی کو اُدھار کے پہیوں پر چلانا!

قوم میں ایسے افراد اب خال خال ہیں جو بولنے کے نشے میں چُور نہ رہتے ہوں اور اُس سے بھی ایک قدم آگے جا کر شروع ہوتا ہے نہ بولنے سے گریز کا نشہ!

موسیقی کے نام پر، بلکہ موسیقی کی آڑ میں شور سے "محظوظ" ہونا بھی اب ایک مقبول نشہ ہے! بعض اشیاء کی تیاری شور کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ جہاں سنگِ مرمر کاٹا جا رہا ہو وہاں کان کے پردے پھاڑ دینے والا شور ہوتا ہے مگر صاحب! بعض منچلے پتھر کاٹنے والی مشین چلاتے ہوئے بھی گانے سُنتے پائے گئے ہیں! یہ لوگ وہ ہیں جو اچھے خاصے نغمے کو جھنکار کی قبر میں دفن کرنے کا نشہ بھی کرتے ہیں!

کام پر جاتے وقت کوچ کے پچھلے پائیدان پر لٹک کر جانے کا بھی عجب ہی نشہ ہے۔

یہی نشہ جب تیز ہوتا ہے تو بندہ کوچ یا ویگن کی چھت پر جا بیٹھتا ہے ! چلتی گاڑی کی چھت پر بیٹھ کر کھلی فضاء سے لطف اُٹھانا ایک ایسا نشہ ہے کہ چڑھ جائے تو اُترنا بھول جاتا ہے اور پھر بندہ بس سے اُترنے کا نام نہیں لیتا !

شادی کی تقریب میں کھانا کُھلتے ہی پہلے ہلّے میں پلیٹ کو پوری گنجائش کے ساتھ بھر کر بوٹیوں کا ہمالیہ تشکیل دینا بھی ایک نرالا نشہ ہے !

اہل وطن نشوں کی تلاش میں اِتنے آگے نکل گئے ہیں کہ بہتوں کو گھسیٹ کر واپس لانا پڑتا ہے۔ ایک دن ہم گھر میں لکڑی کی چند اشیاء جوڑنے بیٹھے تو یاد آیا کہ لکڑی کو اچھی طرح جوڑنے والا گلو یعنی صمد بونڈ تو ہے ہی نہیں۔ ہم ہارڈ ویئر کی دُکان پر پہنچے اور صمد بونڈ طلب کیا۔ دُکاندار نے ہمیں سر سے پیر تک دیکھا اور بے یقینی سے بھرے لہجے میں پوچھا "خیریت تو ہے؟ آپ یہ نشہ کب سے کرنے لگے؟"

ہم اُس کا سوال سُن کر سٹپٹا گئے مگر پھر سنبھل کر وضاحت کی کہ گھر کا فرنیچر ٹوٹ جائے تو اُسے جوڑنا کوئی نشہ نہیں، وقت کو بہتر انداز سے صرف کرنے کا ایک آزمودہ طریقہ ہے! دُکاندار نے بتایا کہ اب نوجوان صمد بونڈ کو کپڑے میں لگا کر سونگھنے کا نشہ بھی کرنے لگے ہیں !

شراب یقیناً اِنسان کو نشے میں غرق اور بدمست کر دیتی ہے لیکن اگر غور کیجیے تو شراب میں اُتنا نشہ نہیں جتنا شراب پینے کے بعد لوگوں کو یہ بتانے میں ہے کہ "او بھائی صاحب ! ذرا بچ کے، میں نشے میں ہوں "!

خواتین ہی بتا سکتی ہیں کہ زیور پہننے میں کیا سُرور ہے اور وہی یہ بھی بتا سکتی ہیں کہ زیادہ سُرور تو پہنے ہوئے زیور کو دِکھانے میں ہے!

نام نہاد جمہوریت نے بھی ہمیں کئی نشے دیئے ہیں۔ جلسوں میں شرکت اور "بے فضول" کے نعرے لگانا بھی ایک وکھری ٹائپ کا نشہ ہے! اہل سیاست نے اب ایک نیا نشہ متعارف کرایا ہے اور وہ ہے پولنگ اسٹیشن کی زیارت کئے بغیر ووٹ ڈالنے نشہ! سِتم ظریف سیاست ہی نے خود کو ہر وقت صدر یا وزیر اعظم کی کُرسی پر جلوہ افروز دیکھنے کا نشہ بھی متعارف کرایا ہے! یہ کم بخت وہ نشہ ہے جس نے اچھے اچھوں کے کئی دوسرے آلتو فالتو نشے ہرن کر دیئے ہیں!

دنیائے علم کی طرف آیئے تو کچھ عجب ہی بہاریں دکھائی دے رہی ہیں۔ ابن صفی مرحوم اور اُن کے قبیل کے دوسرے مصنفین کو مطالعہ کرنے اور اُس کی بنیاد پر سوچ سمجھ کر لکھنے کا نشہ تھا۔ یہ خاصا محنت طلب اور دماغ پھاڑ قسم کا نشہ

تھا۔ اب خیر سے کچھ بھی پڑھے، سوچ اور سمجھے بغیر لکھنے کا نشہ لکھاریوں کے دل و دماغ پر سوار ہوگیا ہے! اِس منفرد نشے نے فکر و فن کی دنیا کے نئے پہلو بے نقاب کئے ہیں۔ سوچ بغیر لکھنے کا نشہ دراصل دن کی روشنی میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کے نشے کی بائی پروڈکٹ ہے! وہ زمانہ ماضی کی گرد میں گم ہوچکا ہے جب ہماری جاگتی آنکھوں پر خوابوں کا نشہ سوار رہا کرتا تھا۔ اب تو خوابوں کو ہماری آنکھوں کا نشہ ہوگیا ہے!

فلم میکرز خواہ مخواہ اِتنی محنت کرتے ہیں۔ حیدر آباد دکن کے نوجوانوں سے کچھ سیکھیں، چند سانپ پالیں جن کا زہر مختلف شخصیات کے خبط میں مُبتلا کرنے کی صِفت رکھتا ہوں۔ مثلاً کسی فلم میں دلیپ صاحب والی اداکاری مطلوب ہو تو ہیرو کو ایسے سانپ سے ڈسوایئے جس کا زہر خود کو دلیپ کمار سمجھنے کے خبط میں مُبتلا کرتا ہو! بس، پھر کیا؟ تین دن تک جی بھر کے دلیپ صاحب کے معیار کی اداکاری کروایئے! اگر ڈائریکٹر چاہتا ہو کہ اداکار خود کو امیتابھ بچن سمجھنے کے خبط میں مبتلا ہو تو اُسے خاصے "لمبو گلی کا دادا" قسم کے زہریلے کوبرا کا بندوبست کرنا پڑے گا! اور اگر کوئی خود کو بیک وقت دلیپ کمار، راج کپور اور امیتابھ سمجھنے کے خبط میں مبتلا دیکھنا چاہتا ہو تو ذرا معیاری زہر والے سانپ کا نام شاہ رخ خان رکھے اور خود کو اُس سے ڈسوالے!

ویسے یہ بات ماننا پڑے گی کہ بیشتر پاکستانی اب خود کو کچھ بھی سمجھنے کے لیے سانپ سے ڈسے جانے
کے محتاج نہیں رہے ! سر دست سوال یہ ہے کہ جو سانپ ہماری زبان کو ڈسے گا وہ خود کو تین چار دن کیا سمجھے گا ! پاکستانی قوم جو الا بلا کھاتی ہے اُسے دیکھتے ہوئے پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی سانپ ہمیں ڈسنے کے بعد ڈسنے کے قابل ہرگز نہیں رہے گا !

غریبوں کا ایک نشہ ایسا ہے جو اگر چھوٹ جائے تو سو غموں سے اُن کی جان چھوٹ جائے۔ یہ ہے روٹی کا نشہ ! اے کاش ! کوئی سانپ ایسا بھی ہو جس کے ڈسنے سے روٹی کا نشہ اُترے اور بے چارے غریبوں کو روزانہ تین وقت پیٹ بھرنے کی مشقت سے نجات ملے !

چہرہ برائے فروخت

کمانے یعنی دولت حاصل کرنے کے لیے انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ہر دور میں طرح طرح کے دولت پرست ہر طرح کے طریقوں سے اپنی جیب بھرتے رہے ہیں۔ مگر اب دولت بٹورنے کے ایسے عجیب طریقے اختیار کئے جارہے ہیں کہ انگشت بہ دنداں ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

ایک زمانہ تھا جب انسان پر تجارتی ذہنیت سوار نہیں ہوئی تھی۔ تب بہت کچھ غیر تجارتی انداز سے ہو جایا کرتا تھا۔ آج سوچیے تو اُس دور کی سوچ خاصی دقیانوسی اور پس ماندہ لگتی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کوئی اپنے وجود کی قیمت ہی وصول نہ کرے؟ مگر سچ یہ ہے کہ لوگ اپنا آپ بیچے بغیر، نیلام کئے بغیر دُنیا سے چلے جاتے تھے۔

نیو یارک میں دو نوجوانوں پر قرضہ چڑھ گیا تو اُنھوں نے قرض ادا کرنے کے قابل ہونے کے لیے انوکھا طریقہ اختیار کیا۔ دونوں نے اپنے چہرے کو ایک سال کے لیے بل بورڈ میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا! اُنھوں نے اشتہاری اداروں سے رابطہ کیا۔ پھر یہ ہوا کہ اشتہاری اداروں نے ان کے چہرے پر مختلف اشیاء و خدمات کے اشتہارات پینٹ کرنا شروع کیا۔ دونوں نوجوان چہرے پر اشتہار پینٹ

کرانے کے بعد شہر کے مختلف علاقوں میں گھومتے پھرتے ہیں اور لوگ ان اشتہارات کو دیکھ کر محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ چھ ماہ میں اِن نوجوانوں نے 3500 ڈالر کما لیے ہیں۔

یہ خبر پڑھنے کے بعد جب ہم مرزا تفصیل بیگ کے گھر پہنچے اور اُن کے چہرے کو غور سے دیکھا تو خیال آیا کہ خیر سے وہ بھی مختلف چیزوں کے چلتے پھرتے اشتہار کی طرح ہیں! بہت سے لوگ اُنہیں دیکھتے ہی یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ شاید وہ ہونّق پن کی تشہیر کے لیے پیدا کئے گئے ہیں! بعض نا آشنا اُن کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ وہ شاید بیزاری کو مقبولیت سے ہمکنار کرنے کے مِشن پر نکلے ہوئے ہیں! کبھی کبھی وہ سُستی اور کاہلی کا چلتا پھرتا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آتے ہیں! مرزا کیا اور کیا نہیں ہیں، اِس کا تعین بہت مشکل ہے۔ اگر اشتہاری ادارے اُنہیں دیکھ اور سمجھ لیں تو سوچتے ہی رہ جائیں کہ اُن سے کب، کیا کام لیا جائے!

مرزا کو جب ہم نے نیویارک کے نوجوانوں کے اشتہاری چہروں کے بارے میں بتایا تو پہلے دریائے حیرت میں غرق ہوئے اور جب وہاں سے اُبھرے تو اُداسی کے جوہڑ میں چھلانگ لگادی۔ اور کچھ دیر بعد وہاں سے برآمد ہوئے تو پھٹ پڑے "فرنگی کہاں سے کہاں جا پہنچے ہیں اور ہم ہیں کہ اب تک دیواروں کے محتاج ہیں۔ اچھا

ہے کہ دیواروں کو داغ دار کرنے کے بجائے چہروں پر اشتہار پینٹ کرائے جائیں۔ سچ
یہ ہے بھائی! کہ بہت سی دیواروں پر بے ڈھنگے اشتہارات دیکھ کر خیال آتا ہے کہ یہ
اشتہارات کہیں اور ہوں تو کم از کم دیواروں کا حسن تو برقرار رہے! ہمارے ہاں
دیواروں پر اوٹ پٹانگ اشتہارات اِتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ لوگ نوشتہ دیوار ٹھیک سے
"!پڑھ نہیں پاتے

کبھی کہانیوں میں پڑھا تھا کہ کسی نے ٹوٹا پھوٹا چراغ پایا تو موہوم سی اُمید پر اُسے گھسا
تو جن برآمد ہوا اور سلام کرتے ہوئے خود کو غلام کی حیثیت سے پیش کیا۔ جن کو اپنے
سامنے اور غلام پا کر وہ شخص بہت خوش ہوا۔ فوراً عمدہ کھانا مانگا، وہ لے آیا۔ کھانے
سے فارغ ہوا تو جن نے کہا کوئی حکم دیجیے آقا۔ نیا نیا جن تھا اور نیا نیا آقا۔ آقا
فرمائشیں کرتا گیا اور جن اُنہیں حکم سمجھ کر پوری کرتا رہا۔ جب آقا نے ہر طرف سے
مطمئن ہو کر سکون کا سانس لیا اور سوچا کہ اب باقی زندگی آرام سے گزاری جانی چاہیے
"تب جن نے حاضر ہو کر کہا "آقا! حکم دیتے رہیے ورنہ میں بغاوت پر اتر آؤں گا۔
چراغ کا مالک اور جن کا آقا تو بہت سٹپٹایا کہ یہ کیسی مصیبت نازل ہو گئی! اب مسئلہ یہ
اٹھ کھڑا ہوا کہ جن کو کس طور مصروف رکھا جائے۔

آج کی دنیا میں بھی ایک ایسا ہی جن پایا جاتا ہے۔ ہم اور آپ اس جن کو ایڈورٹائزنگ کی دُنیا کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ وہ جن ہے جسے اگر کام نہ دیا جائے تو محض اپنے وجود کو باجواز ثابت کرنے کے لیے ہر نان اِشو کو اِشو میں تبدیل کر دیتا ہے! کاروباری اداروں کی سمجھ میں جب کچھ بھی نہیں آتا تب یہ جن نمودار ہو کر خود بتاتا ہے کہ کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔

ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں لوگ دن رات انوکھے خیالات کو ذہن کی گرفت میں لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ کوئی بھی نیا خیال کس حد تک غیر روایتی اور انوکھا ہے۔ انوکھے پن کو ثابت کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے پر کوئی پابندی نہیں۔ جو خیال جس قدر بے ڈھنگا دکھائی دیتا ہے وہ اسی قدر کامیاب رہتا ہے۔

اب اِسی بات کو لیجیے کہ سَجی سنوری دلہن کی نظر میں دولہا کی کوئی اہمیت نہیں اور ایس ایم ایس آنے پر وہ 65 روپے میں کولڈ ڈرنک کی بوتل خریدنے کے لیے قطار بند ہو جاتی ہے! بیس تیس سال قبل ایسا کوئی بھی آئیڈیا انتہائی نامعقول قرار پاتا مگر اب زمانہ ایسا بدلا ہے کہ دولہا پر کولڈ ڈرنک کو ترجیح دی جارہی ہے! اور اس ترجیح کو قابل قبول بنانے میں ایڈورٹائزنگ کی دنیا مرکزی کردار ادا کر رہی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب لوگ اپنی نجی زندگی کو دنیا کو بچاتے پھرتے تھے۔ اب ہر

چیز اشتہاری آئٹم ہو کر رہ گئی ہے۔ سیلیبریٹیز کا حال تو یہ ہے کہ اپنی زندگی کے ہر لمحے کو کیش کرانے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب یہ کہا جاتا تھا "آخر لوگ ہمارا چہرہ ہی تو دیکھتے ہیں!" اب تو پورے وجود کو نیلام کرنے کی روش عام ہوئی جاتی ہے! شادی جیسا معاملہ بھی اشتہاری اداروں کے انوکھے آئیڈیاز اور متعلقہ شخصیات کی دولت پرستی کے دائرے سے باہر نہیں۔ ایشوریہ اور ابھیشیک بچن کی شادی تو آپ کو یاد ہی ہوگی۔ اِس پر کروڑوں روپے کا سٹہ ہی نہیں لگا بلکہ اشتہاری اداروں کے مفادات بھی میدان آگئے۔ اور اس سے بھی ایک قدم آگے جا کر، جب ایشوریہ رائے ماں بننے والی تھی تب معاملات کو اشتہاری مہم کی طرح چلایا گیا۔ بچے کی جنس کے حوالے سے اربوں روپے کا سٹہ کھیلا گیا۔ یعنی اب کوئی بھی چیز کاروباری مفادات سے بالاتر نہیں۔ ایسے میں محض چہروں کو فروخت کرنا یا کرائے پر دینا کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں لگتا۔

مرزا تفصیل بیگ چاہتے ہیں کہ اشتہاری دنیا ان کی خدمات بھی حاصل کرے۔ ہم نے سمجھایا کہ جناب! آپ کوئی سیلیبریٹی تو ہیں نہیں کہ کوئی آپ کے چہرے کی طرف دیکھے اور اُس پر پینٹ کئے ہوئے اشتہار کی طرف متوجہ ہو۔ وہ کہنے لگے "نیو یارک کے دونوں نوجوان کون سے مشہور شخصیات ہیں۔ مگر انہوں نے بھی کامیاب مہم چلائی ہے۔" ایک لمحے کو ہم قائل ہوئے مگر خیال آیا کہ مرزا اگر اپنا

چہرہ کسی اشتہاری ادارے کو کرائے پر دیں اور بل بورڈ میں تبدیل کرلیں تو معاشرے میں کئی اہم تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں۔ صبح جب وہ سو کر اٹھتے ہیں چہرے کا "جلال" دیکھ کر گھر والے ہیبت زدہ رہ جاتے ہیں! اور جب وہ اِسی حالت میں، یعنی مُنہ دھوئے بغیر، گلی کے کونے پر دودھ والے سے انڈے اور ڈبل روٹی خریدنے جاتے ہیں تو کبھی کبھی وہ بھی، غُنودگی کے عالم میں، مرزا کو "بابا" سمجھ کر انڈے اور ڈبل روٹیاں تو دے دیتا ہے مگر پیسے طلب کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا نہیں کر پاتا! دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ مرزا ایسی کسی بھی صورت حال کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور خود کو "بابائیت" کے مرتبے پر فائز کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے یعنی خالص "بابائی"" انداز سے دعائیں دینے لگتے ہیں!

ایک دن ہم نے کہا مرزا! اگر کوئی آپ کو پہچان نہیں پاتا تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اُس کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور مال لے اُڑیں۔ مرزا نے کہا "کیا فرق پڑتا ہے؟ ہمیں نوازنے سے جو خسارہ ہوتا ہے وہ تھوڑا سا پانی مِلانے سے پورا کرلیا جاتا ہوگا!"

مرزا کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہمارے معاشرے میں چہرے پینٹ کرانے کا رجحان عام ہو جائے اور اشتہاری ادارے چہروں پر اشتہار پینٹ کرنے کی روش پر گامزن

ہوں تو آنکھوں کو درپیش بہت سی تکالیف ختم ہو جائیں ! ہم نے وضاحت چاہی تو مرزا کہنے لگے "حالات نے انسان کو بدحواس کر دیا ہے۔ جسے دیکھیے، اُس کے چہرے پر بدحواسی اور ہونّق پن لہرا لہرا کر رقص فرما رہے ہوتے ہیں ! چہرے پر پیشانی سمیت جب رنگا رنگ اشتہار پینٹ ہوں گے تو آنکھوں کو کچھ ریلیف ملا کرے گی !"

ہم نے مرزا سے متفق ہوتے ہوئے یہ ناقص رائے دی کہ اگر وہ اپنے چہرے پر رنگا رنگ اشتہار سجانے کا اہتمام کریں تو اہل خانہ اُنہیں دیکھنے کے عذاب سے محفوظ رہیں گے اور وقت اچھا کٹا کرے گا ! یہ بات سُن کر مرزا نے چند ایسے "پُر مغز" جملوں سے ہماری تواضع کی جنہیں اگر کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا کاپی رائٹر سُن لیتا تو شاہکار اشتہار تیار کرتا اور ایوارڈ حاصل کرتا !

حدِ نگاہ تک یہاں غُبار ہی غُبار تھا

کراچی کے موسم کو اُردو شاعری کے روایتی محبوب کے مزاج سے تشبیہ دی جاتی ہے جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی اُردو شاعری اور بالخصوص غزل کے روایتی محبوب کے بیشتر اعمال random کے اصول پر کام کرتے ہیں۔ بالکل لیمو پانی کی طرح، کبھی بھی کہیں بھی ! یہی حال کراچی کے موسمی مزاج کا ہے۔اِس موسم کے تمام اجزاء درآمدی ہیں۔ بلوچستان میں جب ٹھیک ٹھاک ٹھنڈ پڑتی ہے تو وہ تھوڑی بہت خنکی کراچی بھیج کر اپنے کلیجے کو مزید ٹھنڈا کرتی ہے ! جب ایران اور بلوچستان میں بادل برس برس کر زمین کی پیاس بجھا چُکتے ہیں تب ذرا رحم آتا ہے اور کراچی کی زمین پر چند بوندیں برساتے ہوئے گزر جاتے ہیں ! سمندر سے پیاسے کو شبنم ملتی ہے مگر خیر اِس پر بھی کراچی کبھی کِسی کو بُخل کا طعنہ نہیں دیتا !

بارش کا موسم رہا نہیں اور سردی بھی رخصت ہو چکی ہے۔ برف باری تو ہوتی نہیں اور ابھی گرمیوں کی آمد میں خاصا وقت ہے۔ ایسے میں گرد و غُبار کے طوفان کو خیال آیا کہ چلو، کراچی میں "فِل اِن دی بلینک" کا کھیل کھیلیں، ذرا لوگوں کو غُبار کے جھکڑوں سے سرفراز کریں ! ایک ہفتہ قبل ایک شب گرد کے بادل ایسے

چھائے کہ کراچی کا سارا شو بگڑ گیا۔ جو پیدائشی کوتاہ بین ہیں اُن کی صلاحیت تو دوچند ہو گئی کہ حدِ نگاہ چند گز تک محدود ہو کر رہ گئی ! جنہیں طعنے ملتے تھے کہ کبھی خاک چھانو تو جانو اُنہوں نے چھنی چھنائی خاک دیکھی اور ایسی دیکھی کہ اب مدتوں نہ دیکھنے کی تمنا اور دُعا کیا کریں گے!

اتفاق دیکھیے کہ ہفتہ وار تعطیل سے بھرپور اِستفادے کے لیے ہم بھی کچھ تیار ہو کر گھر سے نکلے کہ ایک ولیمے میں شریک ہولیں۔ شادی ہال تک پہنچتے پہنچتے سر میں اِتنی دُھول اَٹ چکی تھی کہ

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو بتائے نہ بنے!

آج کل میڈیا کے اشتراک سے طرح طرح کے مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں۔ اُس دن ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گرد میں اَٹنے کا مقابلہ ہو رہا ہے!

مُنہ کو دیکھے جانے کے قابل بنانے کے لیے اُسے رگڑ کر دھونے کے سِوا چارہ نہ رہا۔ ہمیں واش بیسن کے اوپر نصب آئینے کے سامنے مَبہوت دیکھ کر قرب و جوار کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بعض سادہ لوح افراد یہ سمجھے کہ شاید آئینہ جادو کا ہے جس نے ہمیں جکڑ لیا ہے یا پھر یہ کہ ہم ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے آپ پر مَر مٹے ہیں ! حالاں کہ حقیقت یہ تھی کہ ہم

!آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے

کسی کو شاید یہ گمان بھی گزرا ہو کہ ہم اپنے چہرے کے کھنڈر دیکھ کر عمارت کا اندازہ لگانے میں مصروف ہیں! ایک لمحے کو تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ آئینے میں ہمارے مقابل کون کھڑا ہے؟ شیشے کی دُھول ہاتھ سے ہٹائی تب اندازہ ہوا کہ کوئی اپنا اور شناسا ہے اور ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے! آئینے میں ہمارے مقابل جو بھی تھا وہ خاصا حوصلہ مند بھی تھا کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا!

گھر سے شادی ہال تک کا سفر چالیس منٹ کا تھا مگر حُلیہ چُغلی کھا رہا تھا کہ ہم ایک عمر کی مُسافت طے کر کے یہاں پُہنچے ہیں! گرد و غُبار کے طوفان کی مہربانی سے سَر کے بال ایسے سخت ہو چکے تھے جیسے کھوپڑی پر ریگزین کی ٹوپی پہن رکھی ہو! مگر اِس طرف سے ہم زیادہ پریشان نہیں تھے کیونکہ آج کل بالوں سے کی جانے والی ہر اِنسانی اور قدرتی کِھلواڑ کو فیشن سمجھ کر محض قبول ہی نہیں کر لیا جاتا بلکہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے! ہم تو اِس بات سے ڈر رہے تھے کہ کہیں الیکٹرانک میڈیا والے اسپاٹ پر پہنچ کر ہماری عجیب ہیئت کو "نگاہ زدِ عام" نہ کر دیں! ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ شادی ہال میں "کام کرنے والے مزدور ہم سے اور ہم جیسے دوسرے مہمانوں سے زیادہ" بنے ٹھنے

دکھائی دے رہے تھے ! لختِ جگر صباحت کو اللہ سلامت رکھے، اُس نے یہ کہتے ہوئے ہماری "نرگسیت" کا "دی اینڈ" کیا۔ "بابا ! ہٹ جائیں، میں بھی تو مُنہ دھو کر کنگھی کروں گی۔"

مُنہ ہاتھ دھو کر ہم اِس قابل ہو پائے کہ گرد و غُبار کے طوفان کو کچھ دیر مُنہ دے لیں ! میز کے شیشوں پر اِتنی دُھول تھی کہ کوئی نہ بتائے تو یہ گمان گزرے کہ کسی پُرانی، بھوتوں والی حویلی سے لائے گئے ہیں ! کُرسیوں پر غُبار نے کچھ اِس طرح ڈیرہ ڈال رکھا تھا

! مِلا ہو جیسے صدیوں بعد کوئی

اہل کراچی سبھی کچھ درآمد کرتے ہیں، حتّٰی کہ موسم بھی۔ یہی سبب ہے کہ موسمی تبدیلیوں کو پہچاننے اور سمجھنے میں کم ہی کامیاب ہو پاتے ہیں ! گرد و غُبار کی دبیز چادر جب شہر پر مُحیط ہوئی تو بہتوں کا ایمان تازہ ہو گیا یعنی خُدا یاد آ گیا ! تبدیلی کی صرف بات کی جاتی ہے، اُس کے لیے تیار کوئی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب کوئی تبدیلی وارد ہوتی ہے تو آن کی آن میں قیامت سی برپا ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ! بات کچھ یوں ہے کہ ملک بھر میں تو سخت سردی میں دُھند پڑتی ہے اِس لیے لوگ اچھی طرح واقف ہیں کہ دُھند کس بلا کا نام ہے۔ ایک بار کراچی میں اچانک، کسی پروگرام کے بغیر، بن بُلائے مہمان کی

طرح، دُھندپڑی اور گز بھر کے فاصلے پر بھی کچھ دیکھنا ممکن نہ رہا تو کراچی میں بُہتوں کے دل یہ سوچ کر بیٹھ گئے کہ کہیں آنکھوں نے دیکھنا چھوڑ تو نہیں دیا! اب ذرا کوئی یہ وضاحت کرے کہ جب مطلع صاف ہوتا ہے اور سورج پوری آب و تاب کے ساتھ سروں پر ہوتا ہے تب ہمیں کون سا صاف دکھائی دیتا ہے۔اِس شہر کے لوگ تو دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کے عذاب سے دوچار رہتے ہیں!

پانی کے بادل تو شاید کراچی کا رَستہ بھول بیٹھے ہیں اِس لیے اُن کی آمد پر مَسرت کم اور حیرت زیادہ ہوتی ہے! جب پانی برسانے والے بادل نہ آئے تو شہر کی فضاء میں آباد ہونے کو غُبار کے بادل آدھمکے۔ محکمہ موسمیات نے یہ کہہ کر لوگوں کو مزید دہلادیا کہ چار ہزار میٹر کی بلندی تک دُھول ہی دُھول تھی۔آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پندرہ بیس گھنٹوں کے دوران فضاء میں کتنی دُھول رہی ہوگی! اور جناب! یہ دُھول گئی کہاں؟ یہیں، کراچی میں رہ گئی۔ جو یہاں آتا ہے وہ پھر جاتا ہی کہاں ہے؟ یعنی واپسی کے خیال ہی سے پھر جاتا ہے!

محض چند گھنٹے رہنے والے گرد و غبار کے طوفان نے شہریوں کا وہ حال کردیا کہ لوگ ایک دوسرے کو پہچان کر بھی نہ پہچان پائے۔ یہ بھی مصلحتاً تھا، سب ایک دوسرے سے نظریں چُرائے پھر رہے تھے۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ گرد و غبار کے

! چلتے پھرتے گولے گنڈے کی شکل میں کوئی اُسے دیکھے اور یاد رکھے

مرزا تنقید بیگ اِس دُنیا میں آئے ہی دُھول اُڑانے کے لیے ہیں۔ ہر مُسلّمہ اُصول کی خاک اور گرد اُڑانے میں اُنہیں خاص لذت محسوس ہوتی ہے۔ شہر میں دُھول اُڑی تو مرزا چہک کر فرمانے لگے۔ "آج کل ہماری قومی زندگی کا بھی کچھ ایسا ہی منظر ہے، ہر طرف دُھول اُڑ رہی ہے۔ ہر معاملے میں یکسر بے حِسی کا مظاہرہ کیا جائے گا تو قدرت کی طرف سے وارننگ کے طور پر گرد و غبار کا طوفان ہی آئے گا! زندگی کو دُھول کرنے "! والوں کے لیے گرد اور غبار کے طوفان ہی آیا کرتے ہیں

مرزا کو باقاعدگی سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا اِس لیے اب ہر بات میں کوئی نہ کوئی سبق ڈھونڈا کرتے ہیں! شہر سے گرد کا طوفان گزر تو گیا مگر نشانیاں چھوڑ گیا۔ جو لوگ کہیں کسی تقریب میں شرکت یا سیر و تفریح کے لیے ٹیپ ٹاپ میں گھر سے نکلے تھے وہ چند گھنٹوں کے لیے ناقابل شناخت ہوگئے۔ طوفان کے جانے کے بعد کی کیفیت شہزاد احمد کی زبانی بیان کریں تو

جل بھی چکے پروانے، ہو بھی چکی رسوائی

!اب خاک اُڑانے کو بیٹھے ہیں تماشائی

کمپنی کی مشہوری

جب کوئی اپنے گناہوں پر نادم ہوتا ہے تو سوچتا ہے کہ اب تو وہ کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو مطمئن رہے کہ ایک ٹکٹ میں دو مزے اُس کے منتظر ہیں۔ ایک طرف تو وہ لوگوں کو مُنہ نہ دِکھا کر ضمیر کا بوجھ کم کر سکتا ہے اور دوسری طرف اُسی مُنہ کے ذریعے کچھ نہ کچھ، بلکہ اچھی خاصی کمائی بھی کر سکتا ہے!

جب کوئی کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہے تو لیاری کی پیار بھری کھڑی بولی میں اِسے، لگی لپٹی کے بغیر، "شکل گم کرنا" کہتے ہیں۔ جس بھی کسی کو شکل گم کرنی ہو تو وہ نیو یارک کے دو نوجوانوں کی مثال سامنے رکھے۔ جب وہ غیر معمولی حد تک مقروض ہوگئے اور کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہے تو اُنہوں نے اپنے چہرے یعنی شکلیں کچھ اِس طرح گم کرنے کا سوچا کہ کچھ حاصل بھی ہو۔ دونوں نے اِشتہاری اداروں سے رابطہ کیا اور چہرے کو بل بورڈ میں تبدیل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ دو تین اِشتہاری اداروں نے اُن کی بات توجہ سے سُنی اور مختلف مصنوعات کے اِشتہار اُن کے چہرے پر پینٹ کرنا شروع کیا۔ چھ ماہ سے معاملہ یہ ہے کہ یہ دونوں مختلف کمپنیوں کے اِشتہارات اپنے چہرے

پر پینٹ کرواکے شہر بھر میں گھومتے پھرتے ہیں اور "کمپنی کی مشہوری" کا ذریعہ بنتے ہیں!
اب تک وہ چار ہزار ڈالر سے زیادہ کماچکے ہیں۔
ترقی یافتہ معاشروں کا ہر رنگ اور ڈھنگ نرالا ہوتا ہے۔ وہاں کی تو بیماری بھی اِتنے بلند معیار کی ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں کی شِفاء دیکھے تو شرما کر اپنی شکل گم کرلے! ہمارے ہاں لڑکیاں شادی کے بعد مُنہ دِکھائی میں اُتنا نہیں کماتیں جتنا نیو یارک کے نوجوانوں نے "مُنہ چُھپائی" میں کمالیا ہے!
چہرے کو بل بورڈ بنانے کے محض معاشی نہیں، معاشرتی اور نفسیاتی فوائد بھی ہیں۔ بڑا معاشرتی فائدہ تو یہ ہے کہ اگر کسی سے اُس کے اہل خانہ اور احباب چڑتے ہوں تو اُس کی شکل دیکھنے سے محفوظ رہتے ہیں! اور اِس سے ایک منزل آگے، نفسیاتی فائدہ یہ ہے کہ اِنسان اپنی شکل دیکھنے کے عذاب سے بھی نجات پالیتا ہے! یہ تسکین ذات کی وہ منزل ہے جو طویل مجاہدے اور پُختہ مراقبے سے بھی بمشکل حاصل ہو پاتی ہے!
ہماری پس ماندگی کا عالم یہ ہے کہ ہم "یہ مُنہ اور مَسُور کی دال" جیسے محاوروں سے ایک دوسرے کا تمسخر اڑانے میں مصروف ہیں اور ذرا اہل مغرب کو

دیکھیے کہ مُنہ کو بھی بل بورڈ میں تبدیل کردیا! بات صرف یہ نہیں کہ کوئی چہرہ کرائے پر دینا چاہتا ہے، بلکہ قابل غور امر یہ ہے کہ خریدار بھی موجود ہیں! ایک وہ ہیں کہ اُن کے مُنہ کی بھی کمرشل ویلیو ہے اور ایک ہم ہیں کہ کسی معاملے میں مُنہ دینے کا سوچنے ہی کے مرحلے میں اپنا سا مُنہ لے کے رہ جاتے ہیں!

اگر لوگ چہروں پر اِشتہارات پُتوا کر گھر سے نکلیں تو اِشتہاری شعبے کو نئی جہت اور زندگی ملے گی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ بس میں کسی کے ساتھ کھڑے ہوں اور اُس نے بائیں گال پر کسی ریسٹورنٹ کا اِشتہار پینٹ کروا رکھا ہو۔ اِشتہار پڑھ پڑھ کر آپ کے مُنہ میں پانی آتا رہے گا۔ اگر اِشتہار کی مدد سے آپ تصور ہی تصور میں زیادہ کھالیں اور بدہضمی سی محسوس ہو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ذرا گھوم کر جائیے تو ساتھی مسافر کے دائیں گال پر ہاضمے کے چورن کا اِشتہار آپ کا استقبال کرے گا! اِس اِشتہار کو بغور پڑھ کر آپ اپنے غدودان معدہ کے لیے تھوڑی بہت راحت کا سامان کرسکتے ہیں!

انتخابی سیزن میں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک گال پر کسی دینی جماعت اور دوسرے پر کسی سیکولر پارٹی کا جھنڈا پینٹ کروایا جائے۔ یعنی دین اور دنیا کے علمبرداروں کو ایک ادا میں رضامند کیجیے اور مال بھی بنائیے!

چہرے کو بل بورڈ بنا کر بہت سے جرائم پیشہ افراد اِدھر اُدھر ہوئے بغیر، اپنے ہی علاقوں میں "مفروری" کاٹ سکتے ہیں! وہ سامنے سے گزریں گے اور قانون نافذ کرنے والے اہلکار بیوٹی کریم کے اِشتہار میں کھو جایا کریں گے! کسی کو شک بھی نہ گزرے گا کہ بیوٹی کریم کی مشہوری پر مامور حسین چہرہ اِشتہاری توپ کسی مجرمانہ چہرے کے کاندھے پر رکھ کر گولے داغ رہا ہے!

مرزا تنقید بیگ کچھ کہیں، اِس کے لیے موضوع کی قید تو خیر کبھی نہیں رہی! عموماً وہ کسی موضوع کے بغیر ہی بولتے ہیں اور اگر موضوع کو برتنے کی کوشش کریں تو اُن کی باتوں میں مزاح کا عنصر دوآتشہ ہو جاتا ہے! بات ایڈورٹائزنگ کے شعبے کی ہو تو مرزا فُل اسپیڈ سے نان اسٹاپ بولتے ہیں! ہم نے چہرے کو بل بورڈ بنانے کی بات بتائی تو کہنے لگے "اِشتہاری اداروں سے اللہ بچائے۔ طرح طرح کے نامعقول آئیڈیاز کا مینا بازار لگانا تو کوئی اِن سے سیکھے۔ اگر اِشتہاری ادارے دو صدی قبل ہوتے تو بہت کچھ بہت پہلے ایجاد ہو کر اپنے منطقی انجام کو بھی پہنچ چکا ہوتا!"

ہم نے مرزا کو سانس لینے کا موقع دینے کی نیت سے کہا کہ اِشتہاری ادارے تو حالات کی ضرورت ہیں۔

مرزا نے ہمیں گھور کر دیکھا اور "اِشتہاریوں" کا حاشیہ بردار ہونے کی سَند عطا کرتے ہوئے فرمایا "اپنی مرضی کے حالات پیدا کرنا ہی تو اِشتہاری اداروں کا کام ہے۔ شُکر کا مقام ہے کہ اِشتہاری اداروں کے کاپی رائٹرز ادب کی طرف نہیں آتے ورنہ بِکّہ بند فکشن رائٹرز بے چارے بھوکے مر جائیں! تم بھی شُکر کرو کہ اِشتہاری کاپی رائٹرز کالم نگاری کی طرف نہیں آتے۔ اگر کبھی ایسا ہو تو تم جیسوں کے کالموں کو ڈمی اخبارات میں بھی جگہ نہ مل سکے گی!"

سچ یہ ہے کہ اِس بات سے ہم متفق اور خوفزدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے! مرزا کا کہنا ہے کہ اِشتہاری ادارے پہلے تو چند چہروں کو بھرپور شہرت سے ہمکنار کرتے ہیں اور پھر شہرت کے گنّے کا ایک ایک قطرہ اِس مہارت سے نچوڑتے ہیں کہ پُھوس تک پہ مَر مِٹنے کو جی چاہتا ہے!

ہم نہیں سمجھتے کہ مرزا کسی اِشتہاری ادارے کو اپنی خدمات سونپیں اور اُن کا چہرہ پِٹوانا پڑے۔ اللہ نے اُنہیں کسی مُروّت اور لحاظ کے بغیر بولنے کا ہُنر بخشا ہے! کسی پر دِل آ جائے تو آسمان پر بٹھادیں اور اگر کسی سے ناراض ہوں تو تحت الثّریٰ میں دھکیل کر سُکون کا سانس لیں! اگر وہ کسی چیز کی مشہوری پر مامور ہوں تو لوگ یہ سوچ سوچ کر اُلجھن میں مبتلا رہیں گے کہ

اُن کے "جلالی" چہرے پر پینٹ کیا ہوا اِشتہار دیکھیں یا اُن کے مُنہ سے جھڑتے ہوئے پُھول" سونگھیں اور چُنیں! مرزا بہت سی چیزوں کا چلتا پھرتا اِشتہار ثابت ہو سکتے" ہیں۔ ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی بھی کاروباری ادارہ اُنہیں اپنی پراڈکٹس کی مشہوری کے بجائے مخالف ادارے کی مصنوعات کی بدنامی کے لیے زیادہ عمدگی سے استعمال کرسکتا ہے! مرزا کسی چیز کی "شان" میں کچھ کہیں اور لوگ وہ چیز خرید لیں، یہ کبھی نہیں ہوسکتا! کوئی بھی اِشتہاری ادارہ مرزا کی صلاحیتوں سے مستفید ہوکر "بیک فائر ایڈورٹائزنگ" کا آئیڈیا مارکیٹ میں پھینک سکتا ہے!

اِس قدر جینے کا "جگرا" کس میں ہے؟

جاپانی بھی عجیب قوم ہیں۔ وہ ستم ڈھانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ امریکیوں نے دو ایٹم بم استعمال کرکے جاپان اور جاپانیوں کا نام و نشان مٹانے کی کوشش کی مگر جاپانی قوم ایسی لکڑ ہضم پتھر ہضم نِکلی کہ راکھ کے ڈھیر سے نکلی اور ایک بار پھر بھرپور ترقی سے ہمکنار ہوکر امریکیوں ورطہ حیرت میں ڈالا اور پھر صدمے کے سمندر میں غرق کردیا!

سائنس دان غیر ارضی مخلوق کی تلاش میں پتہ نہیں کیا کیا جتن کر رہے ہیں۔ یہ بجائے خود غیر ارضی مخلوق ہونے کی ایک نشانی ہے! کبھی سائنس دانوں نے جاپانیوں پر غور کیا ہے؟ ہمیں تو جاپانی کہیں سے ارضی مخلوق نہیں لگتے! دُنیا بھر میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے اور جاپانی اِن تمام باتوں سے یکسر لاتعلق ہوکر خاصی پُرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یعنی ارض پر آباد ہونے کے باوجود وہ مزاجاً غیر ارضی ہیں! ہمیں تو اِس بات پر حیرت ہے کہ جاپانی ہر وقت ہنستے مُسکراتے کِس طرح ہیں؟ ہمارے ہاں تو ہر وقت ہنسنے کے لیے آئین کی رُو سے سب سے بڑے منصب پر فائز ہونا ناگزیر ہے!

جاپانی جزیرہ اوکی ناوا دُنیا کا مُنفرد ترین مقام ہے کہ اِس میں 18 ہزار افراد عمر کی سینچری مکمل کرچکے ہیں۔ 450 افراد ایسے ہیں جن کی عمر 110 سال سے زائد ہے۔ اگر پوچھیے کہ جناب ! اِتنی طویل عمر کا راز کیا ہے تو سادہ سا جواب ملتا ہے کہ سادہ زندگی گزاریے اور محنت کیجیے۔ جس سادگی کی مدد سے وہ متواتر جیئے ہی جارہے ہیں

!اُس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خُدا

مگر خیر، ہم اِتنے سادہ نہیں کہ اُن کی بات پر یقین کرتے ہوئے سادگی کو اپنالیں ! اب ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اگر محنت سے زندگی کا دورانیہ بڑھتا ہے تو ہمارے ہاں بے انتہا محنت کرنے والے غریب 50 سال کے ہوتے ہوتے دُنیا سے رخصت ہونے کی تیاری کرتے کیوں دکھائی دیتے ہیں؟

مرزا تفصیل بیگ کو جاپانی بہت اچھے لگتے ہیں۔ ہمیں جاپانیوں کے مُقدر پہ رشک آتا ہے کہ اُنہیں یہ بات معلوم نہیں ! یہ بات ہم اِس لیے کر رہے ہیں کہ مرزا کو ہم بھی بہت اچھے لگتے ہیں اور اِس کا خراج وہ ہمارے معمولات میں مداخلت کے ذریعے وصول کرتے ہیں ! مرزا کو کسی بھی معاملے میں متفق ہونے سے شدید نفرت ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اِس خصلت کے ساتھ اگر وہ مرزا جاپانی معاشرے کا رُخ کریں تو بہت سے جاپانی طویل زندگی پر ناگہانی موت کو ترجیح

دیں گے!

مرزا کو یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ جاپانی بہت محنتی ہیں۔ اب ہم اُنہیں کیسے سمجھائیں کہ ہمارے لوگ جاپانیوں سے کہیں زیادہ محنتی ہیں۔ جاپانی جتنی محنت کرتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ محنت ہمارے مزدور کرتے ہیں تبھی تو 50 سال کی عمر میں 80 سال کے دکھائی دیتے ہیں! اگر پوری دیانت سے جائزہ لیا جائے تو ہم آپ اِسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ جاپانی خاصے سُست الوجود ہیں۔ اچھی خاصی عمر کو پہنچ کر بوڑھے ہوتے ہیں یعنی مُعمر اور ضعیف ہونے میں خاصا وقت لیتے ہیں!

ہمارے ہاں لوگ چڑچڑے ہوگئے ہیں تو اِس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ کب کیا ہو جائے، کس کو خبر۔ ایسے میں اِنسان جھنجھلائے گا، چڑچڑا ہی تو ہوگا۔ اوکی ناوا کے بزرگوں کو معلوم ہے کہ اُنہیں جینا ہے، بلکہ جیتے ہی جانا ہے۔ پھر بھلا وہ کیوں چڑچڑے ہونے لگے۔ ایک بزرگ سے پوچھا گیا کہ 90 سال کی عمر میں بھی آپ چاق و چوبند ہیں۔ قابل رشک صحت کے ساتھ اِتنی طویل عمر کا راز کیا ہے؟ جواب ملا "مجھے یاد نہیں کہ مجھے کبھی غُصّہ آیا ہو!" لو، کرلو بات۔ اِنسان جب اَسّی نوّے سال کا ہو جائے گا تو اُسے کیا خاک یاد رہے گا کہ کبھی غُصّہ آیا بھی تھا یا نہیں!

ہمارا خیال تو یہ ہے کہ پچاس ساٹھ سال کی عمر تک تو حافظہ ٹھیک رہتا ہے۔ اگر انسان سو سال کا ہو جائے تو اُسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ کبھی پیدا ہوا تھا! اور جب پیدائش ہی یاد نہ رہے تو مرنے کا خیال کیسے آئے گا! اوکی ناوا کے بیشتر باشندے اِسی "حافظاتی" پیچیدگی میں مبتلا ہیں اور جیے جا رہے ہیں! کہیں "ختم شُد۔ واپسی" کا بورڈ نظر آئے تو جینے کا سفر ختم کریں اور موت کو گلے لگائیں!

اگر عُمر غیر معمولی یعنی خاصی طویل ہو تو بہت کچھ اُلٹ پلٹ جاتا ہے۔ اوکی ناوا میں جب کوئی 70 سال کی حد کو پہنچتا ہے تب کہا جاتا ہے کہ وہ جوان ہوا ہے۔ یعنی 60 سال کے بچے ہوتے ہیں۔ تو کیا ہوا؟ ہمارے ہاں بھی 60 سال سے زائد عمر کے بچے پائے جاتے ہیں اور سیاست میں تو عام ہیں! اور 70 سال کے ہونے پر اُن کا لڑکپن اسٹارٹ لیتا ہے!

ضیاء جالندھری نے کہا تھا۔

شِدّت کی مُحبت میں شِدّت ہی کے غم پہنچے

بڑی عمر کے بھی دُکھ بھی بڑے ہیں۔ اگر جوانی 70 سال میں اور بچپن 50 یا 60 سال کی عمر میں شروع ہوتا ہے تو سوال یہ ہے کہ اوکی ناوا میں 50 سال سے پہلے کی عمر کیا کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے" کے کھاتے میں"

ڈالی جائے گی! ممکن ہے کسی 50 سالہ جاپانی سے آپ کی ملاقات ہو اور وہ آپ کو بتائے کہ ابھی وہ پیدا نہیں ہوا، یہ جائزہ لینے آیا ہے کہ اِس دنیا میں پیدا ہونا چاہیے یا نہیں! جاپانیوں سے تو ہم بھلے کہ چالیس پچاس سال میں زندگی کی ساری بہاریں دیکھنے کے بعد چپ چاپ، پتلی گلی سے نکل لیتے ہیں!

اوکی ناوا کے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ 80 سال کی عمر میں بھی روزانہ دس گیارہ گھنٹے کام کرتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟ اگر کام نہ کریں تو وقت کیسے کٹے گا؟ ایک تو اللہ نے عمریں ویسے ہی لمبی رکھی ہیں۔ اور اگر لوگ کام نہ کریں تو گھسٹ گھسٹ کر گزرنے والا وقت مزید نہیں کٹے گا سو برس کی عمر کھنچ کر ڈیڑھ سو برس کی ہو جائے گی!

اوکی ناوا کے لوگ فطرت کے دلدادہ ہیں۔ وہ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، سبزیاں اور پھل کھاتے ہیں اور جُوس پینا پسند کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں غُصّہ، اِشتعال، بے صبری، بے تابی، بے احتیاطی .... غرض کسی بھی نوعیت کا عدم توازن نام کو نہیں۔ اِنسان کی عُمر غُصّے، اشتعال اور بے صبری کے ہاتھوں کم ہوتی ہے۔ کھانے پینے میں احتیاط نہ برتنے سے بھی صحت کی واٹ لگ جاتی ہے اور اِنسان دُنیا سے بوریا بستر جلد گول کرلیتا ہے! اوکی ناوا کے لوگوں نے طویل

عمر کو یقینی بنانے کی تمام تیاریاں مکمل کی ہیں۔ مگر صاحب! ایک حقیقت ایسی ہے جو اوکی ناوا میں طویل عمر کو معجزے کے مقام پر پہنچاتی ہے! ہم آپ کو یاد دلا دیں کہ اوکی ناوا میں امریکی فوج بھی تعینات ہیں! امریکی فوج کہیں تعینات ہوں اور وہاں کے لوگ کسی نہ کسی طرح زندہ رہیں، بلکہ بڑی عُمر پائیں! یہ تو واقعی معجزہ ہوگیا! ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ امریکی فوج نے اپنا "جینیاتی کچرا" جہاں کہیں پھینکا ہے، وہاں بستیاں ویرانوں میں اور زندگی سراسر کچرے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی ہے!

امریکیوں نے اوکی ناوا میں ناکامی کا مُنہ ضرور دیکھا ہے مگر مایوس ہو کر پیچھے ہٹنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ اوکی ناوا کے باشندے فطرت سے بہت قریب ہیں۔ اِس قدر قربت نے اُنہیں فطرت کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ غلامی کا یہ حِصار توڑ کر لوگوں کو کم از کم خوراک کے معاملے میں آزاد زندگی کی سہولت فراہم کے لیے امریکی فاسٹ فوڈ چینز نے اوکی ناوا کا رُخ کیا ہے! اوکی ناوا میں معمر افراد کی تعداد زیادہ ہے، یعنی اُن کے پاس وقت زیادہ نہیں اِس لیے امریکی فاسٹ فوڈ کے ذریعے اُنہیں تیزی سے دوسری دنیا تک پہنچانے کی کوشش شروع کر رہے ہیں!

مرزا تفصیل بیگ کو اوکی ناوا کے باشندوں کی طویل عمر نے بہت متاثر کیا ہے۔

وہ ذرا یہ تو بتائیں کہ جب ہڑتالیں نہ ہوتی ہوں، جلاؤ گھیراؤ نام کی کوئی چیز نہ ہو، ایوان میں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کا عمل ٹی وی اسکرین پر دکھائی نہ دیتا ہو اور ٹی وی چینلز پر گرما گرم سیاسی بحث سنائی نہ دیتی ہو تو وقت کیسے کاٹا جائے اور اِنسان سو سال جی کر کیا کرے؟

مرزا کو اوکی ناوا کے بزرگ شہریوں سے بڑی عقیدت ہے مگر ایک سوال کا جواب شاید وہ (اپنا) سَر پھوڑ کر بھی حاصل نہ کر سکیں۔ اوکی ناوا میں طلباء اسکول سے غائب ہونے کے لیے کس کی "فوتگی" کا بہانہ گھڑتے ہوں گے؟ نانا اور دادا تو وہاں مرنے کا نام بھی نہیں لیتے! جہاں لوگ مرنے سے صاف گریز کرتے ہوں وہاں اسکول والے کسی کے مُصدقہ موت کا بھی مُشکل ہی سے یقین کرتے ہوں گے!

ریسرچ کا فنڈا.... پیو ٹھنڈا

جو لوگ رات دن اِنتہائی ٹیڑھے مزاج کا مظاہرہ کرنے پر تُلے رہتے ہوں اُنہیں سمجھنا اور اُن سے نپٹنا بہت مُشکل ثابت ہوتا ہے۔ ایسی ہی مُشکل اُن لوگوں سے معاملت میں بھی پیش آتی ہے جن میں خباثت برائے نام بھی نہیں پائی جاتی! ٹیڑھا شخص جس قدر ٹیڑھا ہوتا ہے، سیدھا شخص بھی اُتنا ہی ٹیڑھا ثابت ہوتا ہے! یعنی بد اچھا، بدنام بُرا۔ یہی سبب ہے کہ لوگ سادگی ترک کرکے ٹیڑھ کو اپنانے میں دیر نہیں لگاتے! بالکل اِسی طرح بہت مُشکل اور بہت آسان.... دونوں طرح کی باتیں یکساں نوعیت کی ہوتی ہیں، یعنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں! ترقی یافتہ معاشروں کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ ہم آج تک یہ بات سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ اِن معاشروں کو اِس قدر تحقیق کرنے کی ضرورت کیا ہے! جب ہر معاملے میں ترقی ممکن بنائی جاچکی ہے تو پھر تحقیق میں سَر کھپانا، بلکہ پھوڑنا کون سے درجے کی دانائی ہے؟ مغرب اور مشرق کے ترقی یافتہ معاشروں میں جو لوگ تحقیق کے عادی بلکہ "دُھتّی" ہوتے ہیں وہ اپنے کام میں ایسے غرق رہتے ہیں کہ اُنہیں ڈھونڈ کر حقیقی دنیا میں واپس لانا پڑتا ہے!

ریسرچ کرنے والوں کو سرچ کرنا گویا اِضافی مشقت ہے جو کِسی معاوضے کے بغیر کرنا پڑتی ہے!

کیا بازار میں آئینے ناپید ہوگئے ہیں؟ نہیں نا؟ تو پھر اقوام متحدہ کے کئی اداروں نے یہ کیوں طے کرلیا ہے کہ وقتاً فوقتاً رپورٹس جاری کرکے پس ماندہ معاشروں کو آئینہ ہی دِکھانا ہے؟ یونیسکو بھی اقوام متحدہ کا ایک ایسا ہی ادارہ ہے جسے اور تو کچھ آتا نہیں، بس رپورٹس جاری کرکے ہمیں ہنستا رہتا ہے یعنی شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے!

ایک حالیہ رپورٹ میں اِس ادارے نے بتایا ہے کہ پاکستان میں تمام شعبوں کے محققین اور اُن کے معاونین کی مجموعی تعداد صرف 54 ہزار ہے۔ قومی میڈیا نے اِس پر شرمندگی کا اظہار کیا ہے۔ مگر ہم نہیں سمجھتے کہ محققین کی تعداد کم ہونا کوئی ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ ابھی مون سون میں تین چار ماہ رہتے ہیں۔ اگر کسی عالمی ادارے کی باتوں میں آکر ہم ابھی سے ڈوب مرے تو سیلاب کے سیزن کو نامُراد واپس جانا پڑے گا جبکہ دو سال سے ہم سیلابی سیزن کو خالی ہاتھ نہیں لوٹا رہے! اور سیلاب کی اعلیٰ ظرفی بھی "اعلیٰ جیبی" کا خوب بھرم رکھتی ہے یعنی بڑوں کی تجوری خالی نہیں رہنے دیتی!

یونیسکو جیسے اداروں کی ایسی باتوں سے ہم کیوں شرمندہ ہونے لگے؟ 18 کروڑ کی آبادی میں اگر فطری عُلوم پر تحقیق کرنے والے 54 ہزار ہیں تو آبادی میں ہم سے چھ گنا بڑے بھارت میں اِن ماہرین کی تعداد تین لاکھ ہے۔ یعنی معاملہ تقریباً برابری کا ہے۔ جب وہ شرمندہ نہیں تو ہم کیوں شرمندگی کا اسٹاک ضائع

کریں؟

یونیسکو نے ایک بار پھر جاپان، امریکہ، برطانیہ، چین، جرمنی، جنوبی کوریا اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کی مثال دیکر ہمیں نیچا دِکھانے اور سکون سے ہمکنار کرنے والے خوابوں کی دنیا سے باہر لانے کی کوشش کی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ چین میں 15 لاکھ ہزار، امریکہ میں 14 لاکھ 12 ہزار، جاپان میں 8 لاکھ 90 ہزار، برطانیہ میں 3 92 لاکھ 77 ہزار اور جرمنی، فرانس، فن لینڈ، ہالینڈ، ناروے، ہنگری، سویڈن، روس، جنوبی کوریا اور دیگر معاشروں میں بھی لاکھوں محققین اور ان کے معاونین رات دن تحقیق میں مصروف رہتے ہیں۔

اگر بین الاقوامی ادارے یہ سمجھتے ہیں کہ پس ماندہ معاشروں میں تحقیق کی روایت دم توڑ چکی ہے تو یہ اُن کی خام خیالی ہے، لاعلمی ہے۔ ہم جن معاملات میں دادِ تحقیق دیتے ہیں اُنہیں ترقی یافتہ معاشرے تسلیم نہیں کرتے۔ اب کیا یہ بھی ترقی یافتہ معاشرے طے کریں گے کہ ہمیں کن معاملات پر اور کس طرح تحقیق کرنی چاہیے؟ بات یہ ہے صاحب کہ ہم نے تحقیق کو تحقیقات کی منزل تک پہنچا کر سکون کا سانس لیا ہے اور یہ بات دنیا بھر کے ترقی یافتہ معاشروں سے ہضم نہیں ہو پا رہی! ہم یہ سمجھنے کی کئی بار ناکام کوشش کر چکے ہیں کہ وہ

!ہمیں کچھ بھی سمجھانے پر کیوں تُلے ہوئے ہیں

جاپان، چین، امریکہ، برطانیہ، سویڈن، جرمنی اور دیگر ترقی یافتہ ممالک بھرپور تحقیق کے ذریعے جو کچھ تیار کرتے ہیں وہ جب آسانی سے ہمارے بازاروں میں دستیاب ہے تو پھراس قدر "ماتھا پھوڑی" کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہی سبب ہے کہ ہم ریسرچ سے زیادہ سرچ پر یقین رکھتے ہیں! آج کی دُنیا میں جب کسی بھی نئی ٹیکنالوجی سے بنائی ہوئی اشیاءآن کی آن میں دُنیا بھر کے بازاروں کی رونق بڑھانے لگتی ہیں تو پھر زیادہ دِماغ !لڑانے اور تحقیق کے نام پر اپنا انتہائی قیمتی ضائع کرنے کی ضرورت ہے

ترقی یافتہ اقوام کو پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے کہ اُس کے محققین کیمرے اور دوسرا تان توڑا لیکر جنگلوں میں ڈیرے ڈال لیتے ہیں اور تحقیق کے نام پر بے زبان جانوروں کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ تحقیق اچھی چیز ہے مگراِس کی آڑ میں حیوانات کی زندگی میں دخل در معقولات کسی طور مستحسن فعل نہیں! نیشنل جیوگرافک والوں سے ہم صرف اِتنا عرض کریں گے کہ پہلے ہم جیسے اِنسانوں کو تو سمجھ لیں، جانور کون سے کہیں بھاگے جارہے ہیں؟ ویسے جن انوکھے طریقوں سے نیشنل جیو گرافک والے جانوروں کی زندگی کھنگالنے کی کوشش کرتے ہیں اُسے سے جانور محظوظ ہوتے ہوں! یہی سبب ہے کہ وہ اِن محققین کو کبھی کچھ نہیں کہتے

اور اِن کی اوٹ پٹانگ حرکات پر برہم ہونے کے بجائے ہنستے ہوئے اپنے "معمولاتِ درندگی" میں مصروف رہتے ہیں!

اگر مغرب کے محققین کے پاس تحقیق کے لیے موضوعات ختم ہوگئے ہیں تو ذرا ہماری طرف آئیں، ہم بتائیں گے کہ اب کرنا کیا ہے۔ درندوں کی نفسیات سمجھنے کے لیے نیشنل جیوگرافک کے محققین اب کیمرے وغیرہ اُٹھائیں اور کراچی چلے آئیں۔ یہاں اُنہیں اندازہ ہوگا کہ معاشرے میں رہتے ہوئے درندگی کا بازار کس طور گرم رکھا جاتا ہے، بالباس جانور کیسے ایک دوسرے کو برہنہ کرنے پر تُلے رہتے ہیں اور کس طرح معاشی مفادات کے نام پر اِنسان ایک دوسرے کو بھنبھوڑ سکتے اور بھنبھوڑتے ہیں! آج کے کراچی میں تحقیق کے ایک اچھا موضوع یہ بھی ہے کہ عام آدمی گھر سے نکل کر کام کے مقام پر کس طرح پہنچتا ہے اور شام کو گھر واپس کیسے آتا ہے! اِس امر پر تحقیق کی جاسکتی ہے کہ ہنسنے سے بھی خوف کس طرح آتا ہے اور شدید خوف کے باوجود کس طور ہنسا جاسکتا ہے! "کیا یہ کُھلا تضاد نہیں" فیم سہیل وڑائچ کبھی "ایک دن کراچی کے ساتھ" کرلیں تو ہمیں یقین ہے کہ پھر کچھ اور کرنے کے قابل نہیں رہیں گے!

تحقیق کی منزل تو بعد میں آئے گی، ہمارے ہاں اب تک اِس امر پر تحقیق ہو رہی ہے کہ ہمارے لیے تحقیق ضروری ہے بھی یا نہیں! جو تھوڑے بہت لوگ کسی نہ کسی

طرح دِل مار کر دادِ تحقیق دینے کا ارادہ کر بیٹھے تھے وہ اب 2012 کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مایا کیلینڈر کی رُو سے دنیا 21 دسمبر 2012 کو بوریا بستر لپیٹ لے گی۔ اگر دنیا کو ختم ہو جانا ہے تو خواہ مخواہ تحقیق کے نام پر اپنا اور دوسروں کا دِماغ کیوں خراب کیا جائے! یار دَم سادھے بیٹھے ہیں کہ دُنیا اگر 2012 کے بعد بھی اپنا سفر جاری رکھے تو وہ تحقیق کی شاہراہ پر گامزن ہوں!

ہمارا کام تحقیق کرنا نہیں بلکہ تحقیق میں رہ جانے والی خامیوں کو دور کرنا ہے۔ لتا منگیشکر، محمد رفیع، نور جہاں، مہدی حسن، مکیش اور کشور کمار کے گانوں میں جو کسر رہ گئی تھی وہ ہم نے جھنکار ڈال کر پوری کی۔ بالکل اِسی طرح بین الاقوامی برانڈز میں جو خامی یا ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے وہ ہم اپنے اسٹائل سے پوری کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے مشہور کولڈ ڈرنک کا دو نمبر برانڈ بنایا۔ ایک بوتل ہمیں پلائی۔ ہمیں نیا ذائقہ محسوس ہوا۔ ہم نے چند توصیفی کلمات ادا کئے تو وہ صاحب کہنے لگے "ذائقے میں یہ نیا پن کھاری پانی نے پیدا کیا ہے!" یعنی "ریسرچ کا فنڈا" .... پیو ٹھنڈا!

کوئی ذرا نہ ہنس کر دِکھائے

جواز و عدم جواز کی منزل اب بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ہنسنا ہو یا رونا، اب ہم کچھ کرنے کے لیے جواز اور نہ کرنے کے لیے عدم جواز کے محتاج نہیں رہے۔ اگر آپ کے پاس وقت کچھ زیادہ ہے، کاٹے نہیں کٹتا اور مارے نہیں مرتا تو پریشان نہ ہوں۔ کسی بھی محفل میں بس ذرا حالات کا ذِکر چھیڑ دیجیے اور پھر دیکھیے کہ لوگ حالات کی سنگینی ثابت کرنے کے لیے کتنی دور کی کوڑیاں لاتے ہیں اور کس کس طرح روتے، رُلاتے ہیں! ہمارے ہاں لوگوں کو رونے کا بہانہ چاہیے۔ اِس معاملے میں کچھ لوگ تو بالکل چابی والے گڈے کی طرح ہوتے ہیں یعنی چند جملوں کے ذریعے چابی دیجیے اور پھر خاموشی سے کونا پکڑ کر تماشا دیکھیے! حالات کی خرابی، بدامنی، مہنگائی، حکومت کی بے حِسی، اپنوں کی ناقدری، غیروں کی بے رغبتی، دوستوں کی بے اعتنائی، واقفیت رکھنے والوں کی اجنبیت .... غرض کون سا موضوع ہے جس میں ہمت ہے کہ بچ کر نکل جائے!

اور اگر ہنسنے کو جی چاہے تب بھی کوئی بات نہیں۔ کوئی بھی بات آپ کو ہنسا ہنسا کر بے حال کر سکتی ہے۔ ہم میں سے بیشتر اب ہنس ہنس کر بے حال ہی تو ہونا چاہتے ہیں۔ یہ خواہش اِس لیے ہے کہ ہم ماضی کی "حسین" یادوں میں یا پھر

مستقبل کے "دل فریب" خوابوں کی دنیا میں گم رہنا چاہتے ہیں۔ حال کی تلخی ہم سے برداشت نہیں ہو پاتی، اِس لیے ہنستے ہنستے یا روتے روتے "بے حال" ہونے کو ترجیح دی جاتی ہے!

اہل مغرب سے ہمیں بہت سے شکوے ہیں۔ وہ اِتنے مصروف رہنے لگے ہیں کہ رونے اور ہنسنے کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا ہے! بیشتر تو ہنسنا اور رونا بھول ہی بیٹھے ہیں۔ ہنسنے کے لیے بہانے ڈھونڈنے پر وہ جتنی محنت کرتے ہیں اُتنی محنت تو اب ہمارے ہاں اعلیٰ سطح پر تحقیق کے لیے بھی نہیں کی جاتی! حد یہ ہے کہ مغرب میں بہتوں کو اب ہنسنے کے لیے آپریشن کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے! دل، گردے، پتّے، ہرنیے، جگر اور دماغ کے آپریشن کے بارے میں تو آپ نے سُنا ہوگا۔ ہنسنے کے لیے آپریشن؟ یہ کیا بات ہوئی؟ ہالینڈ کا ہیو باس دو سال سے متواتر ہنس رہا ہے۔ دو سال قبل اُس کے نچلے دھڑ کا ایک آپریشن ہوا تھا۔ تب سے اب تک اُس کی ہنسی ہے کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہی۔ اور اِس ہنسی کے باعث لوگ اُس کے پاس نہیں رُک رہے! ڈچ حکومت کو معیشتی بگاڑ پر قابو پانے کی اُتنی فکر لاحق نہ ہوگی جتنی ہیو باس کی بیوی، بھائی، بہن کو یہ سوچ کر لاحق ہے ہنسی کے اِس گول گپّے کو کس طرح کنٹرول کیا جائے! ہم چاہیں گے کہ باس کے بھائی بہن اور بیوی کو نفسیات کے اُن ماہرین کی گوشمالی کریں جو یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ہنستے گاتے جینے سے اِنسان بیمار نہیں پڑتا

!اور گھر میں کوئی پریشانی قدم نہیں رکھتی

ہیو باس ہالینڈ میں پیدا ہوا اور وہیں بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھا ہے مگر حق یہ ہے کہ مزاج اور نفسیاتی ساخت کے اعتبار سے وہ کھرا اور سچّا پاکستانی ہے! دِل اور مُنہ کھول کر متواتر اور بلا جواز ہنسنے، بلکہ ہنستے رہنے پر اُسے پاکستان کی اعزازی شہریت دی جانی چاہیے! آج پاکستان میں کون ہے جو ہنستے رہنے کے لیے کوئی جواز تلاش کرنے کی زحمت گوارا کرتا ہے؟

دنیا بھر میں لوگ ہنسنے کے لیے کچھ نہ کچھ پڑھتے ہیں۔ ہمارے ہاں پڑھنے کے بجائے دیکھنا کافی ہے۔ اور بالخصوص الیکٹرانک چینلز کی نشریات۔ جن ڈراموں کو سنسنی خیز قرار دیا جاتا ہے اُنہیں دیکھ کر ہنسی کے فوّارے چھوٹتے رہتے ہیں! اور کامیڈی کے نام پر تیار کئے جانے والے ڈرامے اِنسان کو "ڈیتھ بائے لافٹر" کی منزل تک لے جاتے ہیں! جب سے سیاسی موضوعات پر بحث کو ٹی وی چینلز پر پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے، !کا شکار ہو گئی ہے overdose پاکستانی قوم ہنسنے اور قہقہہ لگانے کے معاملے میں

مغرب کے لوگ اب تک پس ماندہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہنسنے کے لیے اُنہیں آپریشن کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے! کیسی روبوٹک زندگی ہے کہ ہیو باس

میں آنے کے لیے آپریشن تھیٹر کے بیڈ پر لیٹنے کا مُکلّف ہوا۔ ہم ایسے mode ہنسنے کے کسی بھی آپریشن کے محتاج نہیں کیونکہ ہمارے ہاں اب آپریشن کے لیے تھیٹر کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ! اور سچ تو یہ ہے کہ آپریشن کے نام پر رچائے جانے والے ڈراموں نے پورے معاشرے کو "لافٹر تھیٹر" میں تبدیل کردیا ہے!

ہمیں وہ لوگ پسند نہیں جو حکومت پر عوام کی مشکلات میں اضافے کا الزام عائد کرتے ہیں۔ میر تقی میر کے بقول

یہ تو نہیں کہ ہم پر ہر دم ہے بے دِماغی
آنکھیں دِکھاتے ہیں تو چتون میں پیار بھی ہے!

حکومت اگر رُلاتی ہے تو اُس سے کہیں زیادہ ہنساتی بھی ہے۔ غور کیجیے کہ لوگوں کو ہنسانے کے لیے وزراء کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ وفاقی وزیر داخلہ کو اگر آپ محض داخلی اُمور کا انچارج سمجھتے ہیں تو آپ کی سادگی پر قُربان جائیے ! عبدالرحمٰن ملک کا بُنیادی ہر اہم اِشو کی غلاظت پر چند ہلکے پھلکے جُملوں کا چھڑکاؤ کرنا ہے تاکہ عوام کی قوتِ شامّہ پر غیر ضروری بوجھ نہ پڑے اور وہ ہنستے گاتے رہیں ! حکمرانوں کے مقرر کئے ہوئے لوگوں کا کام صرف جلتی پر تیل چھڑکنا نہیں، پانی ڈالنا بھی ہے ! کسی بھی گڑبڑ کے بعد وفاقی

وزیر داخلہ کی جانب سے پیش کی جانے والی وضاحت سے اہل وطن کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وزیر داخلہ کی باتیں سُن کر ہنسنے والوں کو نارمل اِنسان بنانے کے لیے میڈیکل کی دُنیا کبھی کوئی خصوصی آپریشن دیافت اور تجویز کرے!

پاکستانی قوم کو اللہ نے ایسے حکمرانوں سے نوازا ہے جو، بلا مبالغہ، ہر وقت ہنسانے کا اہتمام کرنے میں یدطُولیٰ رکھتے ہیں۔ پالیسی اور اقدامات دونوں سے ہنسی کے سَوتے پھوٹتے ہیں۔ ایسے میں ہنسی پر قابو پانا بہت بلند روحانی مرتبے پر فائز ہونے کی کوشش کرنے جیسا لگتا ہے! اگر کسی طرح ہم ہیو باس کو ہم اپنے ہاں لے آئیں تو شاید اُس کی ہنسی کو بریک لگ جائے کیونکہ ہالینڈ میں تو صرف ہنستا ہے جبکہ ہمارے ہاں یہ بھی سوچنا ہے کہ اِنسان کِس کِس بات پر ہنسے! سُنا ہے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہی اُصول پر ہیو باس پر بھی اطلاق پذیر ہو اور ہنسنے والا باس ہنسانے والے باس کو دیکھ کر کچھ شرمندہ ہو اور ہنسنا بھول جائے!

چاند اور ٹائی ٹینک

(اپنے وقت میں دنیا کا سب سے بڑا جہاز ٹائی ٹینک 15 اپریل 1912 کو غرقاب ہوا تھا۔)

جس طرح جان ہے تو جہان ہے بالکل اُسی طرح چاند ہے تو زمین ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ یہ تو چاند کے وجود کا صدقہ ہے کہ زمین اپنے محور پر جھکی ہوئی ہے یعنی تھوڑی سی ترچھی ہے۔ اگر یہ کجی، ٹیڑھ یا ترچھا پن نہ ہو تو زمین سیدھی ہو جائے۔ اور اگر زمین سیدھی ہو جائے تو اُس پر ایک ہی موسم ہو۔ اب یہ موسم کیا ہو سکتا ہے، اِس کا کسی کو کچھ اندازہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سال بھر بارش ہوتی رہے، یا سال بھر سردی ہی رہے یا پھر ہمیشہ سورج آگ برساتا رہے۔ یعنی موسموں کی بدلتی ہوئی کیفیت کے لیے ہمیں چاند کا مرہون منت ہونا چاہیے۔ زمین پر پتہ نہیں کِس کِس کے کون کون سے احسانات ہیں۔ اِس غریب پر اپنے اور بسنے والوں سے زیادہ احسانوں کا بوجھ ہے!

ایک زمین پر کیا موقوف ہے، شعر و ادب اور بالکل خصوص اردو شاعری بھی چاند کی احسان مند ہے۔ چاند نہ ہوتا تو ہمارے شعراء کو پتہ پتہ کون کون سے طریقے وضع کرنا پڑتے اپنے دِل اور دوسروں کے دِلوں کی بات بیان کرنے کے!

ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ ہماری شاعری نہ ہوتی تو چاند بے روزگار ہوتا! اردو کے شعراء نے چاند کو مختلف دھندوں پر لگا رکھا ہے! ہمارے بعض شُعراء نے تو چاند کو مخاطب کرکے ایسے عجیب و غریب مضامین باندھے ہیں کہ کہیں کوئی چاند سے مُخبری کردے تو بے چارہ شرم سے چاندنی چاندنی ہو جائے! کبھی چاند سے کہا جاتا ہے کہ اُس کی ٹھنڈی، ملائی جیسی چاندنی میں جیا جلا جائے! دل کو جلانے کا اہتمام کسی بے دردی نے کیا اور الزام آگیا چاند پر! کبھی چاند سے کہا جاتا ہے کہ چھپ نہ جانا۔۔ اور کب تک؟ جب تک گیت گایا جارہا ہے! اے شاباش اے! یعنی بے چارے چاند کو ہماری شوقیہ گلوکاری کا بھی پابند ہونا پڑتا ہے! کوئی چاند کو ڈاکیے کا کردار سونپنے پر تُل جاتا ہے اور اُس سے کہتا ہے کہ اُن سے میرا پیام کہہ دینا! کوئی چاند پر الزام عائد کرتا ہے کہ وہ اونچی کھجور سے تک رہا ہے! جب چاند ہے ہی سب سے بلند تو اُس پر تانک جھانک کا الزام عائد کرنا اچھی بات نہیں!

چاند بے چارہ کیا جانے کہ اُسے دیکھنے پر بھی لڑائی ہوتی ہے۔ عید کے موقع پر وہ بہتوں کے درمیان فساد کی جڑ بن جاتا ہے! عید کے لیے چاند کی تلاش بھی عجیب ہی معاملہ ہے۔ رویتِ ہلال کمیٹی والے عید منانے کے لیے آسمان پر چاند تلاش کر رہے ہوتے ہیں اور نئی نسل اپنی منشاء کا چاند چھت سے قریب ہی کسی اُفق پر ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں! آسمان پر چاند نہ بھی دکھائی دے تو اپنے چاند

کی رویت سے نئی نسل کی چاند رات ہو جاتی ہے! عید پر چاند کا عجیب ہی معاملہ ہوتا ہے۔ دِکھائی دے تو لڑائی اور نہ دِکھائی دے تو تنازع! پہلی کے چاند میں چمک دمک برائے نام بھی نہیں ہوتی مگر شوّال کا چاند میڈیا کے ساتھ مل کر آگ لگانے کا ہُنر سیکھ گیا ہے!

ویسے چاند کی "واردات پسندی" کوئی نئی بات نہیں۔ ماہرین نے بتایا کہ 15 اپریل 1912 کو اُس وقت کا سب سے بڑا بحری جہاز ٹائی ٹینک چاند کے باعث ڈوبا تھا! پگھلے ہوئے دِلوں کو لیکر دُنیا کے سفر پر روانہ ہونے والا ٹائی ٹینک چاند کی پگھلائی برف کے ہاتھوں پانی پانی ہوا یعنی پانی میں جا سویا۔ اچھا خاصا اپنے محور پر آرام کرنے والا چاند جنوری 2012 سے کِھسکتا کِھسکتا زمین کے قریب آنا شروع ہوا۔ اور اُس کی کشش سے اپریل کو گرین لینڈ میں برف کا ایک بڑا تودہ اور چند چھوٹے تودے پگھل کر اُس 13 بحری راستے میں آ گئے جس پر ٹائی ٹینک رواں تھا۔ اِنسان کا بنایا ہوا ٹائی ٹینک قدرت کے پیدا کردہ ٹائی ٹینکر سے ٹکرا گیا۔ اور اِنسان کی کاری گری کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اِنسان کا بنایا ہوا دیو ہیکل جہاز محض جہاز نہ تھا، پورا بیڑا تھا جو پہلے ہی سفر کی ابتداء میں یخ بستہ پانیوں کی گہرائی میں غرق ہوا!

محسن احسان کو خواب میں آ کر تنہائی کے راس آنے کی "نوید" سُنانے والا چاند

اگر اگر ٹائی ٹینک کے کسی مسافر کے خواب میں آ کر برفانی تودوں کے پگھلنے کی خبر بھی دے جاتا یا کوئی ٹپ ہی دے دیتا تو اُس کا کیا بگڑتا! مگر نہیں صاحب! چاند کو تو گرین لینڈ کے پانیوں میں خوابوں کے لیے عید کا چاند ثابت ہونا تھا اور قیامت ڈھانی تھی سو ڈھائی۔

ٹائی ٹینک بھی کیا جہاز تھا! ایک دُنیا تھی جو اُس میں آباد تھی۔ اُس وقت کی جدید ترین سہولتوں کا اِس جہاز کے مسافروں کے لیے اہتمام کیا گیا تھا۔ ٹائی ٹینک ایک رومانی سفر پر نکلا تھا۔ جمع پونجی کا بڑا حصہ خرچ کرکے لوگ خوشی خوشی سفر پر روانہ ہوئے کہ کھلے سمندر میں پورے چاند کی روشنی سے محظوظ ہوں گے اور اپنے اپنے چاندوں سے دِل کی بات کہیں گے مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! دِلوں کی برف پگھلنے پر یا پگھلانے کے لیے گھروں سے نکلنے والے اصلی برف کے پگھلنے پر موت کے قدموں میں یخ بستہ ہو گئے!

جس وقت ٹائی ٹینک ڈوبا، عرشے پر موجود مسافر بہت قریب دکھائی دینے والے چاند سے پھوٹنے والی چاندنی کے سِحر میں گم تھے! اُن کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ قدرت نے چاند کو قریب بھیج کر اُنہیں اِس دُنیا کی رنگینیوں سے دور لے جانے کا اہتمام کیا ہے! ٹھنڈے چاند کے اِتنے گرم اثر کے بارے میں کوئی بھلا کیوں سوچتا؟

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ایک چھوٹے جہاز کے عملے نے راستے میں آ جانے والے برفانی تودوں کی اطلاع ٹائی ٹینک کے عملے کو ریڈیو پیغامات کے ذریعے دی تھی مگر؟ بڑے جہاز کے لوگ چھوٹے جہاز والوں کی بات کو خاطر میں کیا لاتے ! ٹائی ٹینک پر مواصلاتی نظام مارکونی کمپنی کے زیر انتظام تھا۔ اُنہیں اپنے مواصلاتی نظام کی دُرستی پر کچھ زیادہ ہی ناز تھا! بس، یہ تکبر آڑے آگیا۔ ٹائی ٹینک چلانے والوں کی بدمزاجی سے چڑ کر چھوٹے جہاز کے عملے کے لوگ چپکے بیٹھ رہے۔ بعد میں جب ٹائی ٹینک چلانے والوں نے مدد طلب کی تو انھوں نے جواب دینا گوارا نہ کیا! اِنسان کی کاری گری کے شاہکار کو قدرتی کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹوں کے ساتھ ساتھ خود اِنسانی مزاج کے ٹیڑھے پن نے بھی ڈبویا!

ٹائی ٹینک کے غرقاب ہونے کے لیے تنہا چاند کو مُوردِ الزام ٹھہرانا درست نہ ہوگا۔ چاند بے چارہ تو خود بھی ڈوب ہی جاتا ہے۔ سفر کے آغاز سے قبل دعوی کیا گیا تھا کہ یہ جہاز ڈوب نہیں سکتا۔ وعدے کرنے والے رب کو دعوے پسند نہیں!

وہ بھی کیا دِن تھے!

خُون کے رشتوں کی طرح بعض بیماریاں بھی اِنسان کے مُقدر کا لازمی جُز ہوتی ہیں مگر خیر، اُن میں کچھ کچھ شِفاء بھی ہوتی ہے۔ یادوں میں گم رہنا، ماضی کو ہر وقت گلے لگائے رہنا بھی ایک ایسی ہی "شفاء مآب" بیماری ہے۔ یہ روگ تو وہ ہے جو کئی چھوٹے موٹے روگ ختم کر دیتا ہے! یادیں بُرے حکمرانوں کی طرح ہوتی ہیں یعنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتیں۔ کسی نہ کسی طرح، ساز باز کرکے، لوٹ آتی ہیں! یادیں بن بُلائے مہمانوں کی طرح کسی بھی وقت وارد، بلکہ نازل ہو سکتی ہیں! گویا

دِل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی!

یعنی گھر کی کھیتی ہے، جب چاہیں اگالیں اور کاٹ لیں!

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے
جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی!

گزرے ہوئے زمانوں کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ وقت کا کام گزرنا ہے، گزر

جائے گا۔ یہ گزرتا ہی جا رہا ہے مگر دکھ اِس بات کا ہے کہ ہر گزرتا لمحہ گزرے ہوئے ادوار کو خزانوں میں تبدیل کر رہا ہے۔ آنے والا ہر پل کم مائیگی اور شدید عدم توقیر کا احساس دلا رہا ہے۔

گزرے ہوئے زمانوں پر طائرانہ سی نظر ڈالنے پر بھی دِل و دماغ کام کرنا چھوڑنے لگتے ہیں۔ یقین ہی نہیں آتا کہ ہم کبھی اِن حسین ادوار سے بھی گزرے ہیں اور یہ فُسوں خیز زمانے ہماری زندگی کا حصہ رہے ہیں۔ انگریزی میں کہتے ہیں "پاسٹ اِز اینڈر کنٹری" یعنی یہ کہ ماضی دراصل کسی اور مُلک کا نام ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ یادیں ہمیں کِسی اور دنیا میں لے جاتی ہیں، اور حیرت و مسرت کا مِلا جُلا مقام یہ ہے کہ گرین پاسپورٹ کِسی مرحلے پر رُکاوٹ نہیں بنتا! اپنا ہی مُلک یادوں میں بسا ہوا دیکھیے تو کسی اور مُلک جیسا دِکھائی دیتا ہے۔

یادیں انسان کو سُکون بھی دیتی ہیں اور سِتم بھی ڈھاتی ہیں۔ جن یادوں میں ہم راحت اور قرار ڈھونڈتے ہیں اُنہی حسین یادوں کے دامن سے دوبارہ وابستہ ہونا دِل پر تیر بھی برساتا ہے۔ کراچی میں جو زمانے گزرے ہیں وہ گزرے کہاں ہیں، بار بار گزر کر ستم ڈھا رہے ہیں۔ کبھی کبھی ماضی اِس قدر یاد آتا ہے کہ مستقبل نام کی کوئی شے دِکھائی نہیں دیتی۔ اور حال بے چارہ تو ویسے ہی

اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔ یعنی تینوں زمانے مل کر صرف ایک زمانے یعنی ماضی میں تبدیل ہو جاتے ہیں!

بہت کچھ ہے جو اب صرف خواب ہو کر رہ گیا ہے۔ یادیں بچی ہیں جن میں ایک دنیا بسی ہے۔ اور جب تک یادوں کی بستی اُجڑتی نہیں، سُکون ہی سُکون ہے۔ قرار پانے کی اب یہی ایک اچھی صورت رہ گئی ہے۔ اور کون جانتا ہے یہ صورت بھی کب تک ہے؟
سچ تو یہ ہے کہ گزرے ہوئے زمانے یاد کرنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی شاندار حویلی میں کوئی پُر وقار اور پُر تکلف تقریب منعقد ہو رہی ہے اور ہم میلے کچیلے کپڑے پہنے اُس تقریب کا حِصّہ بننے کی کوشش کر رہے ہیں! یادوں میں بسا ہوا کراچی بھی ایک ایسی ہی حویلی کے مانند ہے۔ ہم گیٹ پر کھڑے اندر کی رونق دیکھ دیکھ کر بس دِل مَسُوس کر رہ جاتے ہیں۔ یادوں کے معاملے میں ہمارا اختیار یہیں تک ہے۔
بہت سوچنے پر بھی یقین نہیں آتا کہ ہم اُسی شہر میں ہیں جس میں کبھی زندگی تھی، مسرتیں تھیں اور نفرت و خوف کا نام و نشان تک نہ تھا۔ یہی وہ شہر ہے جس میں لوگ دن کو رات اور رات کو دن کرنے میں زندگی کا لطف پایا کرتے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ شب و روز کے گزرنے پر لوگ سُکون کا سانس لیتے ہوں کہ چلو، زندگی کا عذاب کچھ تو کم ہوا۔ اِس بستی کے لوگ زندگی کو نعمت اور موت کو اللہ کی طرف سے بُلاوا سمجھ کر قبول کیا کرتے تھے اور ہر حال میں اُس پر شاکر رہتے تھے جو اللہ بخش دے۔

آج سوچیے اور یاد کیجیے تو یقین ہی نہیں آتا کہ کراچی وہی شہر ہے جس میں شام کے 7 بجے لوگ کھا پی کر خاصے خشوع و خضوع کے ساتھ رات کے 9 بجے پی ٹی وی کا خبرنامہ سننے کے بعد خود کو نِندیا رانی کے آغوش میں دینے کی تیاری کیا کرتے تھے۔ رات دس بجے تک پبلک ٹرانسپورٹ بند ہو جایا کرتی تھی۔ پونے گیارہ بجے تک پی ٹی وی نشریات بھی اپنا بوریا بستر لپیٹ لیا کرتی تھیں۔ 1970 کے عشرے کے آخر تک کراچی میں رات واقعی رات ہوا کرتی تھی اور اللہ کے فرمان کے مطابق سُکون اور راحت کا سامان کیا کرتی تھی۔ آج ہم اُس رات کو ترس گئے ہیں جس میں تاریکی تھی، سنّاٹا تھا، سُکون تھا۔ یہی گلیاں تھیں، یہ سڑکیں تھیں مگر زندگی کی شکل خاصی مختلف تھی۔ دن بھر کی مشقت کے بعد لوگ رات بھر آرام کرنے پر یقین رکھتے تھے، کسی مقصد کے بغیر جاگتے اور بھٹکتے رہنے پر کسی کا ایمان نہ تھا۔ لوگ رات بھر جاگ کر خود کو اُلّوؤں کی صف میں کھڑا کرنے کے شوقین نہ تھے۔ نوجوان کرکٹ کھیلنے کے نام پر رات بھر جاگ کر اپنی صحت سے کھلواڑ کے عادی نہ تھے۔

وہ بھی کیا دن تھے کہ لوگ صبح کو گھر سے نکلتے وقت خوف محسوس نہ کرتے تھے اور دن بھر کی مشقت کے بعد شام کو گھر واپس آ جانا "کارنامہ" تصور نہیں کیا جاتا تھا!

نئی نسل کو کیا معلوم کہ کراچی میں ایک دور وہ بھی تھا جب سیاست تو تھی مگر اُس میں نفرت کی آمیزش لازمے کی حیثیت سے نہ تھی۔ لوگ سیاسی وابستگی کی بنیاد پر ایک دوسرے کو ذبح کرنے کے فراق میں نہیں رہتے تھے۔ کسی کے حق میں لگائے جانے والے نعرے لازمی طور پر کسی کے خلاف نہیں ہوتے تھے۔ لوگ کوئی بھی نعرہ بلند کرنے سے قبل اِتنا ضرور سوچتے تھے کہ اِس سے اُن کی بے عقلی تو ثابت نہیں ہوگی۔ یادوں کے دریچوں سے جھانکیے تو ایک ایسا دور بھی دکھائی دے گا جس میں سیاسی جماعت یا تنظیم سے وابستگی کا مطلب دیگر تمام جماعتوں اور تنظیموں کا مخالف ہو جانا نہیں تھا۔ کسی بھی تنظیم سے وابستہ ہونا مشکل تھا نہ چھوڑنا۔ سیاست کے نام پر قتل و غارت کو رواج اور ضرورت کا رُتبہ نہیں ملا تھا۔ مخالف سے نپٹنے کا واحد طریقہ اُس کے سر میں گولی مار کر لاش بوری بند کرکے پھینکنا نہیں تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب کسی کے لیے کوئی بھی علاقہ نو گو ایریا کا درجہ اختیار نہیں کرتا تھا۔ پورا شہر تمام شہریوں کا تھا۔ ہر شہری کے لیے تمام علاقے اپنے تھے، شہر میں کوئی علاقہ غیر نہیں

تھا !

بچوں کی تفریح کے لیے مختص مقامات پر قبضہ کرنے کی قبیح رسم نے کراچی کا رخ بہت بعد میں کیا۔ یادوں کے نہاں خانوں میں آباد کراچی قبضہ اور بھتہ مافیا سے پاک تھا۔ علاقوں کو سیاسی اور لسانی بنیاد پر تقسیم کرکے اُن پر قبضہ جمانے کا مقابلہ ابھی شروع نہ ہوا تھا۔ یہ منحسوس و مردود کھیل بہت بعد میں کراچی کے شہریوں کا مقدر بنا۔

ٹیچرز پڑھاتے تھے اور اِس طرح پڑھاتے تھے کہ ٹیوشن مافیا کو پھلنے پھولنے کی راہ نہیں مل پاتی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کسی بچے کا ٹیوشن لینا ٹیچر کو اپنی توہین محسوس ہوا کرتا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ٹیوشن نہ لینے پر بھی طلباء نہ صرف پڑھ پاتے تھے بلکہ اچھے مارکس لیکر پاس ہونے کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں بھی بہت کچھ کر دکھاتے تھے !

نئی نسل کو کیسے یقین دلایئے، کس طور سمجھایئے کہ کراچی میں کبھی ایسا بھی ماحول تھا کہ راہ چلتوں کو لُٹنے کا خوف لاحق نہ رہتا تھا۔ لوگ گھر سے نکلتے وقت خوفزدہ نہیں ہوتے تھے اور واپسی پر، خراب حالات کے ہاتھوں، راستوں میں پھنس جانے پر گھر سے نکلنے کے فیصلے کو کوستے نہیں تھے !

اب تو نئی نسل کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں کہ کراچی میں لوگ راتوں کو گلی اور سڑک پر چارپائیاں بچھا کر سویا کرتے تھے اور کسی کے دل میں کسی اندھی گولی سے مارے جانے کا خوف نہیں بسا کرتا تھا۔

کبھی اِسی شہر میں لوگ گفتگو کا فن بھی جانتے تھے اور سماعت کے تقاضوں کو بھی سمجھتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ بولنے کے نام پر بھونکنا کیا ہوتا ہے! بحث کے دوران تھوک اُڑاتے اینکر پرسن تھے نہ اپنی اپنی جماعت کو پاک پوتر قرار دینے پر تُلے ہوئے سیاسی رہنما۔

وہ زمانہ بھی اب خوابوں اور یادوں کا حصہ ہے جب سبزی والا مختلف سبزیاں خریدنے پر ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ مفت دے دیا کرتا تھا! دودھ، انڈے،،بریڈ، مکھن اور دوسری بہت سی اشیائے خور و نوش کے نرخ یومیہ بنیاد پر نہیں بڑھتے تھے۔ لوگوں کو یقین ہوتا تھا کہ وہ گھر سے جو رقم لیکر نکلے ہیں اُس کی مدد سے تمام مطلوبہ اشیاء لیکر ہی گھر لوٹیں گے! دکاندار سے کہنا نہیں پڑتا تھا کہ کم نہ تولو۔

اب تو بس یہ آرزو ہے کہ گزرے ہوئے زمانے لوٹ آئیں۔ اُن زمانوں کو تو اب لوٹ

کر آنا نہیں۔ اللہ سے دُعا ہے کہ ہم اپنے زمانے کی کایا پلٹ اِس طرح پلٹنے میں کامیاب ہو جائیں کہ دس بیس برس بعد اِس زمانے کو یاد کریں تو اپنے آپ سے شرم نہ آئے!

زحمت میں رحمت

ہم ایک ایسے عہد میں زندہ ہیں جس میں کوئی بھی چیز کسی بھی وقت مزاح کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ ایک دور تھا جب مزاح فیصلے کے تحت لکھا جاتا تھا یعنی لکھنے والے کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ مزاح لکھ رہا ہے اور پڑھنے والے بھی اُسے مزاح سمجھ کر محظوظ ہوں گے۔ مگر اب کسی بھی تحریر کے لیے کچھ اور ثابت نہ ہونے کی قید نہیں رہی۔

چند سال پہلے تک گھر گھر جاکر عوام سے مختلف معاملات پر آراء طلب کرنا رائے عامہ کا جائزہ لینا (سروے) کہلاتا تھا۔ اب یہ عمل مزاح کاری اور مزاح نویسی کے ذیل میں آتا ہے! بعض سروے اِس قدر اوٹ پٹانگ موضوع پر ہوتے ہیں کہ جن سے سوال کیا جاتا ہے وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک ملک گیر سروے کے ذریعے صرف یہ معلوم کیا گیا کہ گرمیوں میں پاکستان کے باشندے شربت زیادہ پیتے ہیں یا لَسّی! معاملہ جب یہ ہو تو لوگ سروے کو دِماغ کی لَسّی نہ سمجھیں تو پھر کیا سمجھیں؟

سروے کرنے والے جب ہاتھ میں قلم اور کاغذ لے کر دروازے پر دستک دیتے ہیں تو دروازہ کھولنے والے کی ہنسی چُھوٹ جاتی ہے کیونکہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ چند ہی لمحوں میں اوٹ پٹانگ سوالات سے اس کا بھیجا فرائی کرنے کی کوشش کی جائے گی!

سروے کے معاملے میں بھی پاکستانی اور بھارتی معاشرے میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ دونوں ہی معاشروں میں سروے کرنے والے ٹوپی سے کبوتر اور رومال سے انڈا نکال کر دِکھاتے ہیں! جن غریبوں کو حکومت بُنیادی سہولتیں ڈھنگ سے فراہم نہیں کرسکتی اور افراطِ زر کے حوالے سے کوئی ریلیف نہیں دے پاتی، سروے کے ذریعے اُن کی تفریحِ طبع کا تھوڑا بہت اہتمام ضرور کرتی ہے! اِس اعتبار سے ہم سروے کو سوشل سبسڈی قرار دے سکتے ہیں!

ویسے تو خیر پورا بھارت ہی ہنسنے ہنسانے کے معاملے میں بھی خاصا مہان ہے مگر سروے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ گھر گھر جاکر سوالوں کی کُدال سے ایسا بھارت کھود کر نکالا جاتا ہے جسے خود وہ لوگ بھی مُشکل سے شناخت کرپاتے ہیں جن سے سوال کئے جاتے ہیں! بعض سوال تو ایسے ہیبت ناک ہوتے ہیں کہ سُن کر لگتا ہے دِلّی سرکار عالمگیر حکمرانی کے حوالے سے بھارت کی "شکتی کا انومان" لگانے کی کوشش کی کر رہی ہے!

ایک حالیہ سروے سے پتہ چلا ہے کہ بھارت کو جدید دور کے تقاضوں سے ہمکنار کرنے کی کوششیں خاصی مضحکہ خیز ثابت ہوئی ہیں۔ ٹیلی کام سیکٹر کی ترقی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے۔ دِلّی سرکار کے بزرجمہر شاید یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ

موبائل فون کے ذریعے آکسیجن بھی لی جا سکتی ہے اور کھانے پینے کی اشیاء بھی ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے! سروے سے معلوم ہوا ہے کہ بھارت کے 63 فیصد مکانات میں موبائل فون کی سہولت موجود ہے مگر 53 فیصد مکانات اب تک ٹوائلیٹ سے محروم ہیں! 85 فیصد گھرانے اب بھی لکڑی یا گوبر کے اُپلے جلاکر کھانا پکاتے ہیں۔ 20 فیصد بھارتی باشندے پینے کا پانی ایک کلومیٹر سے زائد فاصلے سے لانے پر مجبور ہیں۔ دیہی علاقوں میں یہ فاصلہ تقریباً دُگنا ہو جاتا ہے۔ بہار اور چند دوسری ریاستوں میں صرف 10 فیصد مکانات کو بجلی میسر ہے۔ 90 فیصد گھرانے آج بھی کمپیوٹر سے محروم ہیں۔ 20 کروڑ سے زائد بھارتی ریڈیو ہے، ٹی وی اور موبائل فون میسر ہے۔ مدھیہ پردیش، اروناچل پردیش اور ناگالینڈ میں ایک تہائی باشندے اِن تینوں سہولتوں سے محروم ہیں۔ مُلک بھر کے 52 فیصد مکانات ٹی وی سے محروم ہیں۔ 41 فیصد بھارتی مکانات رہائش کے قابل ہی نہیں۔ 30 فیصد سے زائد مکانات ایسے ہیں جن میں 6 سے زائد افراد سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ شہروں میں صرف دو تہائی مکانات کو گیس کنکشن میسر ہے۔ اڑیسہ اور بہار میں 10 فیصد سے بھی کم گھرانوں کو گیس مل پائی ہے۔

سروے کی تفصیل سے مرزا تفصیل بیگ بہت متاثر ہوئے اور سنجیدگی کی چادر نے اُن کے چہرے کو اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ ہم یہ سمجھے کہ شاید وہ شدید سنجیدگی کی حالت میں میں ہنسی روکنے کی کوشش کر رہے ہیں! مرزا کا استدلال کچھ اور

ہی تھا۔ بہت سی بُنیادی سہولتوں کی عدم فراہمی کو مرزا نعمتوں میں شمار کرتے ہیں! ہر وقت رابطے میں رہنے کی سہولت مرزا کی نظر میں عہدِ حاضر کی ایک بڑی لعنت ہے! سبب اِس کا یہ ہے کہ جب کبھی وہ دوستوں میں بیٹھ کر خوش گپیاں کر رہے ہوتے ہیں، دفتر سے بُلاوا آ جاتا ہے! یہی سبب ہے کہ مرزا موبائل فون کو وسیع تباہی کے ہتھیاروں میں شُمار کرتے ہیں! اُن کے خیال میں موبائل فون سے محروم 37 فیصد بھارتی گھرانے قابل رشک ہیں۔

مرزا کا کہنا ہے کہ تمام سہولتیں گھر بیٹھے اور آسانی سے میسر ہوں تو اِنسان کاہل، بلکہ بحرالکاہل ہو جاتا ہے۔ پینے کا پانی لانے کے لئے ایک کلومیٹر سے بھی زائد چلنے والے 20 فیصد بھارتیوں کو وہ خوش نصیب گردانتے ہیں کہ اِس بہانے اُن کی تھوڑی بہت ورزش ہو جاتی ہے!

دور سے پانی لانے کے ذکر پر مرزا نے روئے سُخن ہماری طرف کرلیا۔ "گھر بیٹھے پینے کا صاف پانی میسر ہونے کے باعث تم بھی خاصے فربہ اندام ہوگئے ہیں۔ اگر روزانہ ایک کلومیٹر کے تین چار چکر لگا کر پانی لانا پڑے تو تم بھی اِتنے سلِم ہو جاؤگے کہ شاید بولی وُڈ والے تمہیں کاسٹ کرنے پر غور کریں!" مرزا تنکے سے مماثل ہیں مگر باتیں بہت تگڑی اور دِل آویز کرتے ہیں۔ پانی بھرنے کے عمل کو بولی وُڈ سے جوڑ کر اُنھوں نے ہمیں وزن کم کرنے کی تھوڑی بہت

تحریک ضرور دی ہے اور ہم اس حوالے سے کسی فیصلے کی ذہنی تیاری کر رہے ہیں!
کروڑ بھارتی باشندوں کے پاس ریڈیو، ٹی وی اور موبائل فون نہ ہونے کو مرزا 20
دورِ حاضر کی چند بڑی نعمتوں کا درجہ دیتے ہیں۔ اُن کا اِستدلال ہے کہ یہ 20 کروڑ
بھارتی باشندے یقیناً سکون کی نیند سوتے ہوں گے۔ اپنے دیگر ہم وطنوں کے مانند رات
گئے تک ٹی وی دیکھ کر بے خوابی کا شکار نہ ہوتے ہوں گے اور مزید بے خوابی پیدا کرنے
کے لیے موبائل فون پر سستے پیکیج سے "مستفید" نہ ہوتے ہوں گے!
بجلی اور گیس سے محروم کروڑوں بھارتی بھی مرزا کی نظر میں خوش نصیب ہیں۔ ہم نے
اعتراض کیا کہ بنیادی سہولتوں سے محرومی میں کون سا فائدہ مضمر ہے۔ مرزا نے
قدرے تاسّف کے ساتھ فرمایا۔ "ہمارے ہاں لوگوں کو ہر ماہ بجلی اور گیس کے بل کی
صورت میں منفرد جلاپا ملتا ہے۔ یہ بھی بھارتی حکومت کا احسان ہے کہ کروڑوں لوگوں
کو بجلی اور گیس نہ دے کر اُن کی خون پسینے کی کمائی پر شب خون مارنے سے گریز کرتی
ہے!
جب ہم نے بتایا کہ علاقائی سُپر پاور بننے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور

لگانے والے بھارت کے 53 فیصد مکانات میں ٹوائلیٹ ہی نہیں تو مرزا ایک لمحے کے لیے حیران رہ گئے۔ پھر جب حواس بحال ہوئے تو اُنھوں نے مہان بھارت کی مہان بُدھی کو سراہنا شروع کردیا۔ ہم حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ جس بھارت کے نصف سے زائد مکانات میں ٹوائلیٹ ہی کی سہولت میسر نہیں اُس کی ستائش چہ معنی دارد! مرزا نے وضاحت طلب لہجے میں فرمایا۔ "تم قیامت تک بھارت کی مہانتا نہیں سمجھ سکو گے۔ گھر میں ٹوائلیٹ کا نہ ہونا بتاتا ہے کہ بھارت کے لوگ فِطرت اور حقیقت سے کس قدر قریب ہیں۔ فِطرت کی پُکار پر آدھا بھارت فِطری ماحول سے ہم آہنگ اور ہم آغوش ہو جاتا ہے!"

ہم نے کہا ترقی کے دعوے کیا ہوئے؟ علاقائی سُپر پاور بننے کی کوشش میں سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے آمادہ بھارت کے نصف سے زائد مکانات میں ٹوائلیٹ بھی موجود نہیں ترقی کا کیا وہ اچار ڈالے گا؟ مرزا ذرا بھی خفا نہ ہوئے بلکہ بڑے پیار سے اضافی وضاحت کی۔ "جب گیس اور بجلی نہیں ہوگی تو کھانا بھی کم پکے گا اور لوگ جب کھانا ہی کم کھائیں گے تو ٹوائلیٹ کی ضرورت بھی کم کم پڑے گی! چانکیہ بُدھی کو ماننا پڑے گا! ہم پاکستانی رات دن کھاتے پیتے رہتے ہیں اِسی لیے تو بیشتر گھروں میں دو دو تین تین ٹوائلیٹ ہیں۔ جگہ بچتی ہے تو دو ایک کمرے بھی بنا لیتے ہیں!"

مرزا نے یہ لاجواب نکتہ بھی ہمارے گوش گزار کیا کہ بھارت میں 30 کروڑ افراد ٹی وی کی سہولت سے محروم ہونے کی بدولت پیٹ کے مروڑ سے بھی بچے ہوئے ہیں۔ بیشتر پاکستانیوں کا ہاضمہ اُلٹی سیدھی ڈِشیں کھانے سے کم اور ٹی وی پر کرنٹ افیئرز کے پروگرام دیکھنے سے زیادہ خراب ہوا ہے! اس کی توجیہہ مرزا یہ کرتے ہیں کہ بیشتر پاکستانی شام سے رات گئے تک طرح طرح کے ٹی وی پروگرام دیکھ سیاست کی گتھیوں میں اُلجھ جاتے ہیں۔ کرنٹ افیئرز کے پروگرام کا ہر اینکر زیادہ سے زیادہ سنسنی پھیلا کر لوگوں کے پیٹ میں مروڑ پیدا کرنے کا سامان کرتا ہے! اور کیوں نہ کرے؟ اِسی کام کے تو اُسے پیسے ملتے ہیں!

سیاست کی ٹوپی، نیٹو رسد کا کبوتر

گرمیوں کی آمد آمد ہے۔ ایک طرف بجلی پیدا کرنے والے ادارے لوڈ شیڈنگ پیدا کر رہے ہیں جس پر عوام کا پارہ چڑھ رہا ہے اور لگتا ہے کہ اِس بار عوامی احتجاج کا پارہ آلے کو توڑ کر باہر آ جائے گا! اور دوسری طرف اسلام آباد کی سیاسی کڑھی میں اُبال کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ وفاق اور پنجاب ایک بار پھر اس طرح لڑ رہے ہیں کہ گلی میں کھیلتے بچے بھی آپس میں لڑنے کے لیے اُن سے داؤ پیچ سیکھنے کے مُوڈ میں دکھائی دے رہے ہیں! اِس لڑائی میں بہت کچھ گھسیٹا جارہا ہے، گڑے مُردے اُکھاڑے جارہے ہیں اور "بات پہنچی تری جوانی تک" والی کیفیت بار بار پیدا کی جارہی ہے! معاملہ طعن و تشنیع سے ایک قدم آگے بڑھ کر لعن طعن کی منزل میں داخل ہوچکا ہے۔ اقتدار اور سیاست سمیت بہت سی باتوں پر اور اُس سے کہیں زیادہ ایک دوسرے پر لعنت بھیجی جارہی ہے! اہل وطن ایک بار پھر حیران و پریشان یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنے سے وہ قاصر ہیں کہ کون سَچّا ہے اور کون جُھوٹا! خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ فریقین ہماری آپ کی تمام مشکلات خود ہی دور کردیتے ہیں۔ کوئی بھی معاملہ اُٹھتا (یا اُٹھایا جاتا) ہے اور پھر اچانک پتہ چلتا ہے کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا!

ملک میں توانائی کا بحران ہے مگر صدر زرداری نے ایک بار پھر اپنی توانائی کے "بے فضول" استعمال کو ترجیح دی ہے یعنی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شریف برادران کا سیاست کا ککھ بھی پتہ نہیں! اُن کی طرف سے ویسے تو درجنوں اُمور کے عندیے مِل چکے ہیں، مگر اِس بات کوئی اشارہ اب تک نہیں ملا کہ شریف برادران کو سیاسی طور پر بوڑم ثابت کرنے کی کوشش وہ کبھی ترک کریں گے یا نہیں! انہوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمت اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے بھارت کے شہر اجمیر روانہ ہونے سے قبل لاہور میں شریف برادران پر (نہ جانے کون سی بار) فاتحہ پڑھ ڈالی!

سب کو اپنی اپنی تمنا اور ضرورت کے مطابق ہی ملتا ہے۔ میڈیا کو سنسنی خیزی چاہیے، سو کسی نہ کسی بہانے بیدار ہوتی اور ہاتھ لگتی رہتی ہے۔ بظاہر اِشو ختم ہوچلے تھے اور الیکٹرانک میڈیا والے پریشان تھے کہ کریں تو کیا کریں؟ ایسے میں صدر زرداری نے اسلام آباد چھوڑ کر لاہور کا رُخ کیا اور تنازعات نے تیزی سے اُبھر کر میڈیا کی راہ لی! بے چارے تجزیہ کار پریشان تھے کہ موضوعات کی پلیٹ تو خالی ہوچلی ہے، اب کیا اور کس طرح بولیں گے! لیجیے، پلیٹ کے خالی ہونے کا رونا رونے والوں کو "تَسلا" بھر کر موضوعات اور اشوز مل گئے!

صدر زرداری نے مصرع طرح دیا تو مسلم لیگ (ن) میں جواب آں غزل کے طور دو غزلہ اور سہ غزلہ کہنے والے حرکت میں آ گئے۔ اور پھر بھرپور جوش و خروش کے ساتھ سیاسی مُشاعرے نے اسٹارٹ لے لیا! پیپلز پارٹی والوں کو یہ زُعم تھا کہ وہ جوش میں کسی بھی حد سے گزر سکتے ہیں۔ اب مسلم لیگ (ن) نے اِس معاملے میں اُنہیں مُنہ دینا شروع کردیا ہے۔ یہ مسلم لیگ (ن) کی کامیابی سے زیادہ پیپلز پارٹی کی ناکامی ہے!

بابر اعوان پر خود اُن کو اور پیپلز پارٹی کو بہت ناز ہوگا مگر کیا ہم رانا ثناء اللہ کو کسی بھی اعتبار سے کمتر گردان سکتے ہیں؟ انتخابی موسم آنے کو ہے۔ اب ہمیں سیاسی مُشاعروں کی آؤ بھگت کے لیے تیار رہنا چاہیے! مُشکل ہے تو بس اِتنی کہ سیاسی مُشاعروں میں چپقلش اِس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ حاضرین و سامعین کی سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ کب داد و تحسین کے ڈونگرے برسائیں اور کب چُپکے بیٹھے رہیں! کبھی داد دینے پر سیاسی حمایت کا ٹھپّہ لگتا ہے اور کبھی خاموش رہنے پر! واہ واہ پلک جھپکتے میں آہ آہ میں تبدیل ہوجاتی ہے!

مرزا تفصیل بیگ کو معاملے میں کسی نہ کسی ایسی ویسی بات کی بُو سُونگھنے میں کمال حاصل ہے۔ ہم نے بارہا مشورہ دیا ہے کہ ایئر پورٹ پر نوکری کرلیں تو ٹھیک ٹھاک کمائیں گے۔ ایک بار تو ہمارے مشورے کا بُرا مان کر اُنھوں نے

خاصا پالتو سامُنہ بھی بنایا۔ ہم نے کہا ہاں، بس یہی ورژن چاہیے ! یہ سُن کر اُنہوں نے از خود نوٹس کے تحت ہمیں پندرہ دِن کا ریلیف دیا یعنی بات چیت بند رکھی!

مرزا کو حکومتی سطح پر ہر معاملے سے نُورا کشتی کی بُو آتی رہتی ہے۔ ہم اِس معاملے میں اُنہیں کسی حد تک معذور سمجھتے ہیں۔ مُعاملات کچھ ایسے رہے ہیں کہ لوگ اعلیٰ سطح پر ہر عمل کو شک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں۔ کبھی کبھی ہفتہ پندرہ دن چپقلش جاری رہتی ہے اور پھر صُلح ہوتی ہے تو لوگوں کو اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ دِکھائی دے رہا تھا وہ تو بس ٹوپی ڈرامہ تھا! اقتدار کے فٹ پاتھ پر مجمع لگانے والے شعبدہ باز کبھی رومال سے سو کا نوٹ نکالتے ہیں اور کبھی ٹوپی سے کبوتر برآمد کرکے داد پاتے ہیں!

نیٹو رسد کے معاملے پر حکومت اور اپوزیشن میں بظاہر ٹھنی ہوئی تھی۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ مگر پھر یہ ہوا کہ سارا دھواں چھٹ گیا اور مطلع پر اب امریکہ نواز رویہ صاف جھلک رہا ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن نے نیٹو رسد کی بحالی سے متعلق پارلیمانی سفارشات کو منظور نہ کرنے کا عندیہ سا دیا تھا مگر سعودی نائب وزیر خارجہ کے دورے کے بعد تمام معاملات بحسن و خوبی طے پاگئے اور مولانا کے تحفظات ختم ہوگئے! صدر نے تاجکستان میں کیا کہا اور

کیا سُنا، یہ تو ہم نہیں جانتے مگر یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے جنوبی کوریا میں امریکی صدر سے ملاقات میں بھی کچھ ایسا ہی کہا، سُنا ہوگا! ثابت ہوا کہ بڑوں کی بڑوں سے ملاقاتیں غریب کے نالے نہیں کہ رائیگاں جائیں! عوامی لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ امریکہ کو افغانستان سے بحفاظت نکلنے میں مدد دینے کے معاملے میں فراخ دِلی دکھاتے ہوئے حکومت اور اپوزیشن نے مل کر پوری قوم اور میڈیا کے سامنے ایک بار پھر ٹوپی سے کبوتر نکالا ہے!

مسلم لیگ (ن) نے حکومت کے خلاف ملنے والے ہر موقع کو اِس طرح ضائع کیا ہے جیسے کوئی جون جولائی کی گرمی میں پانی گرم کرکے اُس میں برف پگھلائے! ایک زمانہ تھا کہ پنجابی فلموں کی بڑھکیں اہل وطن کا دل بڑھایا کرتی تھیں۔ اب ٹکٹ خرید کر پنجابی فلم دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ بڑھک کی ٹھرک مِٹانے کے لیے آپ سیاست دانوں اور بالخصوص نواز لیگیے کے فائر برانڈ رہنماؤں کے بیانات پڑھ اور سُن سکتے ہیں!

ہمارا خیال ہے موجودہ پارلیمنٹ کے مینڈیٹ کی بچی کھچی مدت میں بھی مرزا کی تمنا پوری نہ ہوسکے گی۔ کوئی بھی ڈِھشُم ڈِھشُم اصلی تے نسلی نہیں ہوگی اور تُو تُو میں میں سے شروع ہونے والا ہر معاملہ نُورا کشتی کی منزل پر پہنچ

کر دَم توڑتا رہے گا!

غالب کی آبرو کیا ہے

پاکستان اور بھارت میں اگر برآمدات کا شعبہ پولیس کے حوالے کر دیا جائے تو دُنیا کوئی طاقت ہمارا مقابلہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی! دونوں ملکوں میں کچھ بھی "برآمد" کرنے کے معاملے میں پولیس کا کوئی جواب نہیں۔ دُنیا بھر میں منشیات برآمد کرنے پر پابندی ہے مگر ہماری پولیس آئے دن منشیات کی بڑی کھیپیں برآمد کرتی ہے اور شاباش بھی پاتی ہے!

پولیس کی چیرہ دستیاں بڑھتے بڑھتے اب اُردو شاعری تک آ پہنچی ہیں۔ ہما شما کا تو ذکر ہی کیا، مرزا غالب جیسی قدر آور شخصیت بھی قابل دست اندازی پولیس ٹھہری ہے!

مرزا غالب کے کلام کو اُن کی زندگی میں پتہ نہیں کیا کیا قرار دیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر اِن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خُدا سمجھے!

میرزا نوشہ کو اپنے کلام پر کیا کیا ناز تھا۔ کبھی اُنھوں نے کہا۔

گنجینہ معنی کا طِلِسم اُس کو سمجھیے

!جو حرف کہ غالب مِرے اشعار میں آوے

یہ زُعم بھی تھا کہ

ہیں اور بھی دُنیا میں سخن ور بہت اچھے

!کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اور جب ناقدین نے ناطقہ بند کرنے کی قسم کھالی تو غالب خستہ کو کہنا پڑا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

!نہ سہی گر مِرے اشعار میں معنی، نہ سہی

غالب کی بدنصیبی یہ رہی کہ اُن کے کلام میں گوناگوں مفاہیم تلاش کرنے کی "فرہنگی مُہم" اُن کے دار فانی سے کوچ کر جانے کے بعد شروع ہوئی۔ اگر اُن کے جیتے کچھ کوشش کی جاتی اور اُن کے کلام کو کھنگال کر چند اچھوتے معانی تلاش کر لیے جاتے تو میرزا نوشہ کا دَم یہ سوچ کر ذرا سکون سے نکلتا کہ کچھ لوگ تو ہیں جو کچھ سمجھنے کے قابل ہوگئے ہیں! کبھی ہم سوچتے ہیں اچھا ہی

ہوا کہ غالب کے کلام میں معانی کا جہاں اُن کے انتقال کے بعد دریافت کیا گیا۔ جب لوگ غالب کے فکر پرور کلام میں مفاہیم تلاش کرنے نکلے تو بہت دور نکل گئے اور ایسے ایسے نکات تلاش کرکے لائے کہ غالب اگر جان پاتے تو غَش غَش کرنے کا ہوش نہ رہتا، غَش کی منزل ہی میں اُن کا دھڑن تختہ ہو جاتا! اگر آج غالب زندہ ہوتے تو اپنے کلام کی شرحیں پڑھ کر مخبوط الحواس ہو جاتے اور مزید طبع آزمائی کے قابل نہ رہتے! ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ غالب نے اپنے کِن اعمال پر شرمندہ ہو کر کہا تھا۔

شاعِر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے!

اِتنا ہم البتہ پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ غالب آج زندہ ہوتے تو اپنے آپ کو جاننے کے لیے وہ سب کچھ پڑھنے پر مجبور ہوتے جو محققین نے اُن کے بارے میں کھوج نکالا ہے! ایک صدی کے دوران غالب پر جو تحقیق ہوئی ہے وہ بہت حد تک "تحقیقات" کا رنگ لئے ہوئے ہے! غالب پر پی ایچ ڈی کرنے والے اُن کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں وہ اگر خود غالب کو معلوم ہو پائے تو وہ مارے شرم کے اپنی شکل ایسی گم کریں کہ اُن کا نشان پانا مشکل ہو جائے! حق تو یہ ہے کہ اب اِس نکتے پر بھی تحقیق کی ضرورت ہے کہ غالب کو تمام کردہ و ناکردہ گناہوں کی سزا مِل چکی یا اُن پر مزید تحقیق ضروری ہے! ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ جو لوگ غالب پر تحقیق کے خبطِ

! عظیم میں مبتلا ہیں اُن پر بھی کچھ تحقیق کی جانی چاہیے یا نہیں
بہت دنوں سے غالب کے بارے میں کوئی بات سُننے کو نہیں مل رہی تھی۔ محققین اور شارحین کے چولھے ٹھنڈے ہو چلے تھے۔ بھلا ہو بھارتی پولیس کا جس نے میرزا نوشہ کو in خبروں میں پھر کردیا! محققین سَر پھوڑ کر تھک گئے، شارحین سوچ سوچ کر تھک گئے مگر غالب کے کلام میں وہ بلاغت تلاش نہ کرسکے جو اُنہیں اشاعتِ اسلام میں معاونت کا اعزاز عطاء کرتی۔ بھارتی ریاست مہاراشٹر اور آندھرا پردیش کی پولیس نے عدالتی ٹربیونل میں حلف نامے داخل کئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ کالعدم اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا (SIMI) کے ارکان جہادی سرگرمیوں کی تحریک مرزا غالب کے کلام سے پاتے ہیں! غالب کا کلام اور جہاد کی تحریک! شاید ایسے ہی کسی ! موقع کے لیے کہا گیا ہے ماروں گھٹنا، پُھوٹے آنکھ
ہم حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ اِس حلفیہ بیان پر غالب کی رُوح نے تڑپ تڑپ کر مزید کئی بار جان دے دی ہوگی! یہ تو وہ نکتہ ہے کہ خود غالب کو نہ سُوجھا ہوگا۔
مہاراشٹر کے شہر شولاپور کے علاقے ویجاپور ناکہ کے تھانیدار شیواجی راؤ

ٹمبارے نے دلی ہائیکورٹ کے جسٹس وی کے ساہی کی سربراہی میں قائم ٹریبونل میں
حلف نامہ داخل کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کالعدم "سمی" کے ارکان مرزا غالب
کے شعر

موج خُوں سَر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اُٹھ جائیں کیا!

سے جہادی سرگرمیوں کی تحریک پاتے ہیں! کچھ کچھ ایسا ہی حلف نامہ حیدر آباد دکن) کے علاقے سعید آباد کے تھانیدار پی دیویندر نے بھی ٹریبونل میں پیش کیا ہے۔)
ثابت ہوا کہ غالب کا کلام بھارتی پولیس کے سَر سے گزر گیا! موج خُوں ضرور غالب کی رُوح کے سَر سے گزر گئی ہوگی! اور محققین نے غالب پر تحقیق کے آستان سے اُٹھنے کا ارادہ تلف کردیا ہوگا!

غالب کے نام پر ڈھیروں دھن کمانے والے بھارتی پولیس کے احسان مند ہوں گے کہ اُس نے کچھ نیا کرنے کا موقع عنایت کیا! تحقیق کا بازار پھر گرم ہوگیا ہوگا۔ فرہنگ اور شرح لکھنے والے اپنی اپنی آراء سے رجوع کرتے ہوئے غالب کے کلام کو نئے مفاہیم سے سرشار اور اُن کی رُوح کو عرفان ذات کے نئے مدارج سے رُوشناس کرنے کی کوشش میں جُت گئے ہوں گے!

غالب کے ہاں جہان بھر کے مضامین ملتے ہیں مگر اُن کے اشعار سے جہاد کا

نظریہ کشید کرنا کمال فن کی انتہا ہے! شعور کی اِس طرح سطح تک پہنچنے کے لیے جس تربیت کی ضرورت پڑتی ہے اُس کا اہتمام پولیس کا محکمہ ہی کر سکتا ہے جس کے پاس بندے کو بندے داپتر بنانے والے ماہرین اور طریقوں کی کمی نہیں! اور ایک جہاد پر کیا موقوف ہے، بھارتی پولیس چاہے تو غالب کے کلام سے پتہ نہیں کس کس امر کی تحریک برآمد کر سکتی ہے۔ کیا غالب نے زندگی بھر مَے نوشی نہیں کی؟ یعنی شراب پینے کی تحریک دیتے رہے! کیا جوانی میں قمار بازی کرتے دَھر نہیں لیے گئے تھے؟ گلزار کی سیریل غالب" دیکھ کر بھارتی پولیس قمار بازی کرتے ہوئے پکڑے جانے کا ریکارڈ بھی کھنگال" سکتی ہے۔ دِلّی پولیس کی پونے دو سو سال پُرانی فائلوں میں اب بھی غالب ضرور مذکور ملیں گے!

پہلے شارحین نے بدنام کیا۔ اُن سے کچھ گلو خلاصی ہوئی تو تنقید نگاروں نے کہیں مُنہ دِکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ خدا خدا کر کے نقاد خاموش ہوئے تو محققین پیچھے پڑ گئے۔ چند روزہ حیات کا ایک ایک پہلو بے نقاب کر دیئے جانے پر غالب کی رُوح مُدتوں سخت جاں کُنی کے عالم میں رہی۔ رہی سہی کسر بھارتی پولیس نے پوری کر دی! غالب پیش بیں تھے، آنے والے زمانوں پر خوب نظر تھی۔ اپنی ممکنہ بے توقیری کا ذکر اُنھوں نے کچھ اِن الفاظ میں کیا تھا۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے!

موسیقی اور ایذا رسانی

گھر کی مُرغی دال برابر ہوتی ہے۔ اپنے ہاں کچھ بھی ہو جائے، ہم متاثر نہیں ہوتے۔ ہاں، وہی کام گورے کریں تو ہم فوراً متوجہ ہوتے ہیں۔ امریکیوں کی عام سی بات بھی اگر دنیا کو معلوم ہو جائے تو انکشاف کا درجہ رکھتی ہے۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ امریکیوں نے گوانتانامو بے، افغانستان اور عراق کی جیلوں میں قیدیوں پر تشدد کے دوران موسیقی استعمال کی اور یہ بات طشت از بام ہوئی ہے تو حیرت کا اظہار کیا جارہا ہے۔

نیو یارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور محکمہ دفاع کی عمارت پر حملوں کے بعد امریکی حکومت نے دنیا بھر میں قومی سلامتی کا راگ الاپا اور پھر اپنی سرزمین کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے امریکیوں نے مسلم ممالک میں مخالفین کو چُن چُن کر گرفتار کرنا شروع کیا۔ اور پھر اِنہیں ایذائیں دینے کے معاملے میں بھی آپے سے باہر ہوگئے۔

امریکی عوام اور میڈیا کو قیدیوں پر موسیقی کے ذریعے تشدد کے انکشاف سے حیرت ہوئی ہے۔ مگر ہمارے خیال میں یہ حیرت ناحق ہے۔ امریکی حکومت قومی مفاد

کے نام پر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ محکمہ خارجہ اور محکمہ دفاع مل کر شکر سے بھی تلخی کشید کر سکتے ہیں! ہر طاقتور کا یہی مسئلہ ہے کہ وہ کسی بھی وقت، کچھ بھی کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ وہ لڑائی کے اصول خود مرتب کرتا ہے اور پھر اِن اُصولوں کا عذاب بھی جھیلتا ہے۔

امریکی میڈیا اور عوام اِس بات پر حیران ہیں کہ اُن کی حکومت کو قیدیوں پر موسیقی کے ذریعے تشدد کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اور ہم اِس بات پر حیران ہیں کہ امریکی اپنی حکومت کی اِس حرکت پر حیران کیوں ہیں۔ امریکی محکمہ خارجہ اور محکمہ دفاع ایک زمانے سے چند مخصوص راگ تواتر اور جاں فِشانی سے الاپ کر ساری دنیا کو اذیت سے دوچار کرتے آئے ہیں۔ کبھی کومل سُر لگائے جاتے ہیں، کبھی تیور۔ لے تو بدل سکتی ہے، راگ نہیں!

امریکی عوام یہ بات بھی بھولتے ہیں کہ اُن کی حکومت کئی عشروں سے مختلف خطوں میں سیاسی اور عسکری ڈرامے اسٹیج کرتی آئی ہے۔ کوئی بھی ڈراما موسیقی کے بغیر کیا خاک مزا دے گا؟

امریکیوں نے موسیقی کو تشدد کا آلہ بنا کر جو کچھ کیا ہے وہ خاصا مضحکہ خیز لگتا ہے۔ وہ اِس معاملے میں ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ تشدد

ڈھانے کے معاملے میں ہماری موسیقی اور موسیقاروں کا کوئی ثانی تھا، نہ ہے۔ سُر اور تال کے ملاپ کو آواز کی آمیزش سے دوآتشہ کرکے بے حساب قیامت ڈھائی گئی ہے! موسیقی کو صرف ذہن کی غذا کہنے سے بات ادھوری سی رہ جاتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ موسیقی ذہن کی غذا بھی ہے اور ذہنی بدہضمی کا موثر علاج بھی! ذہن کا ہاضمہ موسیقی کے ذریعے درست کرنے کے لیے کبھی کبھی تو ایسے انوکھے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں کہ منہ سے ایک ساتھ واہ اور آہ نکل جاتی ہے!

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ سفر کا مطلب ایک مقام سے دوسرے کی طرف جانا ہے تو یہ اُس کی خام خیالی ہے۔ ہمارے ہاں پبلک ٹرانسپورٹ کی بیشتر گاڑیوں میں ڈرائیور اور کنڈکٹر مِل کراِس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ ایک آدھ گھنٹے کے سفر میں لوگ موسیقی کی مدد سے کئی دُنیاؤں اور زمانوں کی سیر کریں! ویگنوں میں سفر سے لوگوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ آج کل کون کون سے گانے مارکیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔ ایک گھنٹے کے سفر میں مسافروں پر کئی زمانے گزر جاتے ہیں! کچھ لوگ یہ سوچ کر خوش ہوا کرتے تھے کہ بس کے سفر میں موسیقی کا ساتھ دل بہلانے کا اچھا ذریعہ ہے۔ یہ بات لوگوں کی سمجھ میں اب آئی ہے کہ یہ شامتِ اعمال ہے! آپ سیٹ پر بیٹھے ہوں اور سر پر اسپیکر دھمال کے رنگ بکھیر رہا ہو تو پوری دیانت سے بتایئے کہ جو کچھ ذہن کے پردے پر اُبھرتا ہے کیا اُسے ہم یہاں بیان کرسکتے ہیں؟ آپ کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔

بہت سی بسوں میں ڈرائیور صاحبان اِس بات کا خاص اہتمام کرتے ہیں کہ گھر تک پہنچتے پہنچتے آپ کے دماغ کی اچھی خاصی دُھلائی ہو چکی ہو۔ اور اِس کے لیے قوالی سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی ہے! کراچی میں صدر سے کورنگی تک چلنے والی بڑی بسوں میں قوالی کا اِس قدر توجہ سے اہتمام کیا جاتا ہے کہ بہتوں کو تو سفر کے دوران ہی حال آ جاتے ہیں اور اُنہیں دیکھ کر دوسرے بے حال ہوتے جاتے ہیں! ایک بار ہم نے کنڈکٹر سے کہا کہ لوگ تو ویسے ہی تھکے ہارے گھر کو جا رہے ہوتے ہیں اور آپ لوگ دھوم دھڑاکے والے گانے، دھمالیں اور قوالیاں سُنا سُنا کر اُنہیں مزید بے حال کرتے ہیں۔ جواب ملا لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ اور اِتنا تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ مائنس مائنس پلس ہوتا ہے! ہم اندر کے شور کو باہر کے شور سے ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کامیابی دینے والی ذات تو اللہ کی ہے! "

کنڈکٹر خاموش ہوا تو ایک مسافر نے سرگوشی کی۔ "جو کچھ ہمیں موسیقی کے نام پر سُنایا جاتا ہے اُسے ہم یہ سوچ کر بخوشی برداشت کرتے ہیں کہ چلو، گناہوں کی کچھ تو سزا ملی۔ یعنی بوجھ کم ہوا۔" ایک اور جانکار نے بتایا کہ بسوں میں ظفر اقبال ظفری اور مراتب علی کے گائے ہوئے انڈین گانوں کو بس کے مسافروں اور انڈین گلوکاروں کی مشترکہ سزا سمجھیے! ہمارے خیال میں سُننے والوں پر

تشدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ نازک سی غزل شوکت علی کی "بہ بانگِ دُہل" آواز میں سُنائی جائے! اوراِس سے بڑی سِتم یہ ہے کہ مہدی حسن کی آواز میں دھمالیہ گانے سُنوانے کا اہتمام کیا جائے!

ہماری کلاسیکی موسیقی، اللہ نظر بد سے بچائے، اچھے اچھوں کو سیدھا کرنے کے لیے کافی ہے! اِس موسیقی کے جلال ہی کا تو یہ اثر ہے کہ اِسے سیکھنے اور گانے والوں کی گفتگو سے انکسار اور عجز ٹپکتا ہے! کلاسیکی موسیقی کی متواتر مشق سے طبیعت میں ایسی نرمی پیدا ہوجاتی ہے کہ اِنسان لڑائی جھگڑے سے دور بھاگتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ کلاسیکی موسیقی لڑائی جھگڑے کے قابل ہی نہیں چھوڑتی!

موسیقی کو ایذا رسانی کے لیے استعمال کرنے کا رواج ہمارے ہاں خاصا پرانا ہے۔ فلمی دنیا کے لوگ اِس معاملے میں زمانے سے بہت آگے تھے اور ہیں۔ فلم کی کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے گانوں اور بیک گراؤنڈ موسیقی کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ہماری فلموں کے بیشتر گانے شائقین پر سِتم ڈھانے کے ایک کامیاب طریقے سے کم نہیں! اچھی خاصی فلم چل رہی ہوتی ہے کہ گانا رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے! گزرے ہوئے ادوار میں ایسی فلمیں بھی بنائی جاتی تھیں جن میں ڈیڑھ درجن گانے ہوتے تھے۔ اِن گانوں کے درمیان کہانی کے لیے گنجائش نکالنا رائٹر

اور ڈائریکٹر کا کمال ہوا کرتا تھا! بہت سے لوگ گانوں کے لیے فلم دیکھنے جایا کرتے تھے مگر ڈھیروں گانے سُن کر شدید بدہضمی کا شکار ہو جاتا کرتے تھے! پیالی میں ڈیڑھ دو چمچ شکر ملائی جاتی ہے، جتنی چائے اُتنی شکر کا فارمولا تو نہیں اپنایا جاتا!

پاکستان میں موسیقی کو تشدد کے لیے استعمال کرنے کا طریقہ کچھ اِس طرح اپنایا گیا ہے کہ ظالم کو کچھ اندازہ ہو پاتا ہے نہ مظلوم کو۔ گانے والے گاتے وقت یہ محسوس نہیں کرتے کہ اُن سے کوئی ظلم سرزد ہو رہا ہے اور نہ سُننے والوں ہی کو یہ گمان گزرتا ہے کہ جو کچھ وہ سُن رہے ہیں وہ گناہوں یا جرائم کی سزا سے کم نہیں! بہت سی جیلوں میں پاپ میوزک کے پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں اور میوزیکل نائٹ کے نام پر اچھی خاصی دھماچوکڑی مچائی جاتی ہے۔ بہت سے قیدی اِسے تفریح سمجھ کر دیکھتے ہیں جبکہ جیلر صاحب نے تو بعض قیدیوں کو سخت سزا دینے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا ہے! جیل کے پُرسُکون ماحول کو پاپ میوزک سے برباد کرنا کسی بھی اعتبار سے اعلیٰ ذوق کی علامت یا دلیل نہیں! بعض گھروں میں شادی کے موقع پر منعقد کیا جانے والا میوزیکل پروگرام بھی اِسی زُمرے میں آتا ہے۔ اِن پروگراموں میں بعض شوقیہ فنکار بھی شریک ہو کر اضافی قیامت ڈھاتے ہیں! شادی والے گھر کے مکینوں کے ساتھ ساتھ اہل محلّہ بھی پاپ میوزک کے نام پر عجیب و غریب آوازیں رات بھر

سُنتے اور خون کے گھونٹ پیتے ہیں!

جب ٹی وی چینلز کی بھرمار نہیں تھی تب پی ٹی وی راگ رنگ کے عنوان سے خالص کلاسیکی موسیقی کا ہفتہ وار پروگرام پیش کیا کرتا تھا۔ اُس دور کے پی ٹی وی کے ارباب اختیار کو اللہ اِس بات کا اجر ضرور دے گا کہ یہ پروگرام رات بارہ بجے کے آس پاس ٹیلی کاسٹ کرتے تھے۔ تب تک بیشتر ناظرین سوچکے ہوتے تھے! ایسے جگر والے کم ہی تھے جو راگ رنگ دیکھنے کا صرف فیصلہ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ پوری توجہ سے دیکھ کر محظوظ بھی ہوتے تھے! اِس طرح کا ذوق رکھنے والوں کو لوگ احترام کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ وہ اپنے گناہوں کی سزا خود ہی منتخب کرکے اعمال نامے کو کچھ بہتر بنالیتے تھے!

بھارت میں قومی سلامتی کے اداروں کی کارکردگی جانچنے کے لیے دیگر اُمور کے ساتھ ساتھ شاید یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کِسی بھی معاملے میں پاکستان کا ہاتھ کِس حد تک تلاش کیا جاسکا ہے! خفیہ اداروں کی سرگم خواہ کِسی سَپتک سے شروع ہو، تان پاکستان پر ٹوٹتی ہے! ایسے میں مُمبئی پولیس سے ایک سنگین غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ گزشتہ دنوں ایک خبر آئی کہ ممبئی کے نواح میں واقع بی پٹھانا کے پولیس اسٹیشن کو بندروں نے نرغے میں لے رکھا ہے۔ ہمیں عجیب لگا کہ پولیس اہلکاروں کے ہوتے ہوئے بندروں کو الگ سے یلغار کرنے کی کیا ضرورت تھی! غریبوں سے اَٹے ہوئے ملک میں توانائی اور وسائل کا ایسا ضیاع برداشت نہیں کیا جانا چاہیے! خیر، بی پٹھانا پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او چاند سنگھ نے ریاستی محکمہ جنگلات کو درخواست دی ہے جس میں کہا ہے کہ بندروں نے کام کرنا دوبھر کردیا ہے۔ پولیس اسٹیشن کی عمارت کو بندر ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور آنے جانے والوں پر چھینا جھپٹی کرتے ہیں۔ بسا اوقات اہلکاروں کو تھانے کے اندر بند رہنا پڑتا ہے!

ہم نے سوچا اگر ممبئی میں پولیس اہلکاروں کے خوف کا یہ عالم ہے تو بندروں

کو وردی پہنا کر ڈیوٹی سونپنے میں کوئی ہرج نہیں ! اور ساتھ ہی ذہن میں یہ خیال بھی اُبھرا کہ ممبئی پولیس جب بندروں سے اس قدر ڈرتی ہے تو غیر ملکی دہشت گردوں کی آمد اور حملے کا سُن کر اُس کا کیا حال ہوتا ہوگا ! پھر اگر اُن کے دِل و دِماغ پر پاکستانی آتنک وادیوں" کا خوف سوار رہتا ہے تو حیرت کی کیا بات ہے؟"
چاند سنگھ نے محکمہ جنگلات سے درخواست کی ہے کہ بندروں کے "آتنک واد" پر قابو پانے کے لیے لنگور بردار افسران تعینات کئے جائیں۔ "تشویش" کی بات صرف یہ ہے کہ چاند سنگھ نے اپنی درخواست میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ ممبئی میں بندروں نے جو ہاہاکار مچایا ہوا ہے اُس میں آئی ایس آئی کا ہاتھ ہے ! محکمہ جنگلات کو بندروں کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے قبل چاند سنگھ کے خلاف کارروائی کرنی چاہیے کہ سرکاری اہلکاروں کو لاحق خطرات کا ذکر کرتے ہوئے وہ ملبہ آئی ایس آئی پر ڈالنا کیسے بھول گیا!
محکمہ جنگلات کے افسران تربیت یافتہ بندر لیکر ریاست میں مختلف مقامات پر تعینات رہتے ہیں۔ بندروں کو لنگور سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ خاصے بڑے ہوتے ہیں اور بندروں کو مار ڈالتے ہیں۔ اِنہیں دیکھتے ہی بندر راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔ فاریسٹ آفیسرز عوام کی آسانی کے لیے تربیت یافتہ لنگور کو زنجیر سے

! باندھ کر رکھتے ہیں تاکہ عوام کو افسر اور لنگور کا فرق معلوم ہو

ایک ممبئی پر کیا موقوف ہے، بھارت بھر میں بندروں نے قیامت ڈھائی ہوئی ہے۔ ہنومان جی کی کرپا سے بندروں کو مذہبی تقدس حاصل ہے یعنی جو جی میں آئے، کرتے پھریں۔ پورے بھارت میں بندروں کو ہر قسم کی کارروائی سے استثنٰی حاصل ہے! اور صاحب! ایک بھارت پر کیا موقوف ہے، دُنیا بھر میں ہر طرح کے سیاسی و غیر سیاسی بندروں کو تمام اقسام کی قلابازیاں کھانے کی بھرپور آزادی حاصل ہے اور وہ بے خوف ہو کر اُچھلتے کودتے پھرتے ہیں! یہ دُنیا ہے ہی ایسی۔ جو لُوٹے، جھپٹا مار کر سب کچھ چھین لے اور لات مارے اُسے سلام کرتی ہے۔

بھارت کے بندر خاصے سیاسی ہیں۔ جی بھر کے لوٹ مار کرتے ہیں، چھینا جھپٹی کرتے ہیں اور جب کارروائی کی بات آتی ہے تو چہرے پر جہاں بھر کی معصومیت سمیٹ کر ہنومان جی کا روپ دھارتے ہوئے صاف بچ نکلتے ہیں! پل میں بندر، پل میں بھگوان۔ یہ تو خاصی جانی پہچانی روش معلوم ہوتی ہے۔ بھارتی قیادت بھی خطے میں چھینا جھپٹی کرنے کے بعد معصومیت کا بندرانہ ڈھونگ رچانے کی عادی اور ماہر ہے! صرف یہ طے کرنا ! رہتا ہے کہ کِس سے کِس سے اکتساب کیا ہے

مرزا تنقید بیگ کو بھارت میں بندروں کے راج پر ذرا بھی حیرت نہیں۔ اُن کا

کہنا ہے کہ بالی وُڈ والے کئی عشروں سے رقص کے نام پر جو بندرانہ اُچھل کود مچائے ہوئے ہیں اُس کے نتیجے میں بالآخر بھارت کے کونے کونے میں بندروں ہی کو جلوہ افروز ہونا تھا! ہم نے مرزا کو بتایا کہ چھ سال قبل جب ہم ممبئی گئے تھے تب ہمیں تو وہاں زیادہ بندر دِکھائی نہیں دیئے تھے۔ مرزا نے جواب دیا "آپ کے جلوے کی تاب نہ لاتے ہوئے اِدھر اُدھر ہوگئے ہوں گے! ویسے بھی ایک نیام میں دو تلواریں اور.... "
ہمارے چہرے پر پنجابی فلموں کے ولن کے سے تاثرات اُبھرتے دیکھ کر مرزا نے جملہ ادھورا چھوڑنا بہتر سمجھا۔

صریح گستاخی کو دوستی کے نام پر برداشت اور نظر انداز کرتے ہوئے ہم نے مرزا سے اگلا سوال کیا کہ بالی وُڈ کی مہربانی سے جب ممبئی میں پہلے ہی دو ٹانگوں پر اُچھلنے کودنے والے "سیلیبرٹی بندر" اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں تو اصلی تے نسلی بندروں کو اِس شہر میں رونق افروز ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ مرزا نے کہا "اصلی تے نسلی بندر شاید اپنی روایتی اور جبلّی اُچھل کود سے تنگ آ چکے ہیں اور اُن کے بھگت بھی اُن میں تقدس کے ساتھ ساتھ کچھ نئی قلابازیاں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اور بندروں کو نئی قلابازیاں بالی وُڈ کے ڈانس ڈائریکٹرز سے بہتر کون سکھا سکتا ہے؟ اضافی تربیت کے لیے سلمان خان، اکشے کمار، عمران ہاشمی، گووندا، رجنی کانت اور اِن سب سے بڑھ کر پربھو دیوا کی خدمات حاضر ہیں! "

ویسے اگر بندر کچھ سیکھنا ہی چاہتے ہیں تو نئی دہلی میں پارلیمنٹ ہاؤس کا بھی رُخ کر سکتے ہیں۔ آج کل بھارت کے منتخب ایوانوں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بندروں کو بھی گھن چکر بنا سکتا ہے! فوج اور سیاست دانوں میں ٹھنی ہوئی ہے۔ انہونی یہ ہوئی ہے کہ بھارتی فوج کے چند یونٹس پر ڈسپلن کی خلاف ورزی اور حکم کے برخلاف نقل و حرکت کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔ لوک سبھا کی کارروائی دیکھ کر نت نئی قلابازیاں سیکھنے کے دوران بندروں کو محتاط بھی رہنا ہوگا کیونکہ اُن کا سامنا بڑے خوں خوار لنگوروں سے بھی ہو سکتا ہے! ساتھ ہی اُنہیں یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ اِن لنگوروں کو قابو میں رکھنے کے لیے کوئی زنجیر نہیں ہوتی! مسلمانوں کے خون سے پیاس بُجھانے والے ایک بڑے سیاسی لنگور کو حال ہی میں کلین چٹ دی گئی ہے!

مُصیبت .... اور لمبی زندگانی

درازیِ عمر کا مقابلہ منعقد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاپانیوں کی عُمریں "لمبو۔ گلی کا دادا" کی طرح دوسری اقوام کی عُمروں سے واضح طور پر زیادہ ہوتی ہیں! عمر کا مطلب ہے وقت۔ وقت کی اہمیت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے؟ آپ کہیں گے ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی وقت کو بھی غیر اہم قرار دے۔ ضروری نہیں کہ آپ کی ہر بات سے قوم متفق ہو۔ پاکستانی معاشرے میں ایسے لاکھوں، بلکہ کروڑوں افراد مل جائیں گے جو اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ وقت اُن کے نزدیک دو ٹکے کا بھی نہیں۔ اور جواب میں وقت بھی اُنہیں دو کوڑی کا ثابت کرکے دم لیتا ہے!

ہم آپ ایسے دور میں جی رہے ہیں کہ جس میں لوگ قُدرت کی طرف سے ملنے والے وقت کے کوٹے یعنی عُمر کو جلد از جلد ختم کرکے اِس دنیا سے رخصت ہونے پر پُختہ یقین رکھتے ہیں۔ ذرا ماحول پر ایک اُچٹتی سے نظر ڈالیے تو اندازہ ہو جائے گا کہ لوگ وقت کو اِس طرح ضائع کرنے پر تُلے ہوئے ہیں جیسے کوئی شدید گرمی میں پانی کَھولائے اور اُس میں برف کے ٹکڑے پگھلائے! کوئی دِن بھر میں چالیس پچاس سگریٹ پُھونکنے پر تُلا رہتا ہے، تو کوئی دن بھر معدے میں چائے انڈیلتا رہتا ہے اور دس بارہ کپ حلق سے اُتارنے کے بعد ہی سُکون کا سانس

لینے کے قابل ہو پاتا ہے! کوئی رات دن فاسٹ فوڈ نگل کر معدے کا بیڑا غرق کرنے کی دوڑ میں اوّل آنے کے لیے بے تاب نظر آتا ہے! بہت سے لوگ دِن دِن بھر گھر کے باہر یا گلی کے کونے پر چبوتروں کو رونق بخشتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو رات بھر ہوٹلوں میں بیٹھے وقت کو ٹھکانے لگانے کی مشقت میں مصروف رہتے ہیں! ان تمام کوششوں کے باوجود لوگ وقت کا کوٹہ کسی نہ کسی طرح پورا کرلیتے ہیں یعنی ستّر پچھتّر سال کے ہوکر ہی دُنیا سے رُخصت ہوتے ہیں!

جاپانی جزیرے اوکی ناوا کے باشندے نے شاید جہان بھر کو شرمندہ کرنے کی کوشش کھا رکھی ہے۔ اِس جزیرے پر خواتین کی اوسط عمر 86 سال اور مردوں کی اوسط عمر 78 سال ہے۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ بُڑھاپے میں جب کرنے کو کوئی کام نہیں ہوتا تب اوکی ناوا کے باشندے زندہ رہنے کو بھی کام سمجھ لیتے ہیں اور جیے جاتے ہیں! اوکی ناوا کے کیس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ طویل العمری مُتعدّی مرض ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی اِس مرض میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں!

روزانہ دس بارہ گھنٹے کام کرنے والے ایک 90 سالہ جاپانی سے پوچھا گیا کہ اِتنی طویل عُمر میں بھی اِس قدر چاق و چوبند رہنے کا راز کیا ہے۔ موصوف نے

فرمایا "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی کسی بات پر غُصّہ آیا ہو!" اِنسان 80 سال سے زیادہ کا ہو جائے تو حافظے کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے! 90 سال کی عمر میں بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ اِنسان یہ بھی بھول سا جاتا ہے کہ وہ اِس دنیا میں کب آیا تھا اور آیا بھی تھا یا نہیں! ایسے میں کسے یاد رہتا ہے کہ سات آٹھ دہائی قبل کِسی پر غُصّہ آیا تھا یا نہیں! اور تو اور، کچھ یاد نہ آنے پر بھی غُصّہ نہیں آتا!

اوکی ناوا کے 13 لاکھ باشندوں میں 18 ہزار نے عُمر کی سینچری اسکور کرلی ہے اور 450 ایسے ہیں جن کی عُمر 110 کا نشان پار کرچکی ہے۔ بُڑھاپے میں اِنسان کیسی کیسی دلچسپ حرکتیں کرتا ہے یہ جاننے کے لیے اوکی ناوا کے حالات جاننے کی کوشش کیجیے۔ گزشتہ دنوں 105 سالہ خاتون نے مکھی مچھر مارنے والے ریکٹ سے ایک اژدہے کو مار ڈالا! اوکی ناوا کا اژدہا تھا، سوا سو سال سے کم کا کیا ہوگا! جب موت آنے کا نام ہی نہ لے تو مَرنے کا ہر موقع غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ اژدہے نے بھی ریکٹ سے پِٹ کر مَرنے کو موت کا بہترین بہانہ سمجھ کر قبول کیا ہوگا! اژدہا مارنے پر خاتون کو سراہا جارہا ہے مگر کسے خبر کہ 105 سال کی عمر میں برائے نام بصارت کے طفیل اُنہیں اژدہا معمولی سا کیچوا دِکھائی دیا ہو!

اوکی ناوا کے باشندوں کا بنیادی کمال یہ ہے کہ جزیرے پر امریکی فوجی اڈا ہونے کے باوجود اُن کی زندگی کا دورانیہ کم نہیں ہوا! امریکیوں کی روایت یہ ہے کہ جہاں جاتے ہیں قتل و غارت کا بازار گرم رکھتے ہیں اور پھر وہاں کے لوگ موت کی نذر ہوتے رہتے ہیں۔ مگر اوکی ناوا کے بزرگوں نے اپنی نسلوں کو درازی عمر کی ایسی دُعا دی ہے کہ امریکیوں کی روایت دم توڑ گئی ہے! ہمارے ہاں بھی بزرگوں کو جیسے ہی کسی برخوردار کے سر پر دستِ شفقت پھیرنے کا موقع ملتا ہے، آؤ دیکھا نہ تاؤ درازی عمر کی دُعا دے ڈالتے ہیں! ذرا سوچنا تو چاہیے کہ یہ دُعا، خُدا نا خواستہ، قبول ہو جائے تو؟ ملک کے حالات تو ایسے ہیں کہ جو بچی کھچی اوسط عمر ہے وہ بھی لوگ فٹافٹ کاٹ کر پتلی گلی سے دوسری دنیا کی طرف نکل لیتے ہیں! اگر کہیں ہم آپ سو سو سال جینے لگے تو سوچیے کیا ہوگا؟ سو سال تک قتل و غارت کی خبریں سُن سُن کر، مہنگائی کو جھیلتے جھیلتے اور اخلاقی گراوٹ پر کُڑھتے کُڑھتے ہم کس حال کو پہنچیں گے! سچ تو یہ ہے کہ ایسے میں ہاں وہی لوگ ہیں دراصل ہمارے دُشمن

!جو ہمیں عمر درازی کی دُعا دیتے ہیں

جہاں سہولتیں اور آسانیاں میسر ہوں وہاں زندگی کو اُس کے تمام تقاضوں اور لوازم کے ساتھ نبھانا ممکن ہوتا ہے۔ جہاں جان کو سو روگ لگے ہوں وہاں کوئی

کیا جیے اور کیوں جیے ؟ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔

مصیبت .... اور لمبی زندگانی

!بزرگوں کی دُعا نے مار ڈالا

اگر سکون سے بسر ہو جائے تو تھوڑی سے زندگی بھی بہت ہے۔ گھٹ گھٹ کر جینے کو زندگی کیسے کہا جائے؟ جگر مُراد آبادی کے شاگردِ رشید حباب ترمذی فرماتے ہیں۔

محبت کا ہے بس اِک لمحہ کافی

ہزاروں سال جینے کی ہوس کیا؟

یہ پبلک ہے، سب جانتی ہے

حکومت خواہ کسی سطح کی ہو، یہی چاہتی ہے کہ لوگ اُس کی ہر بات مانیں اور اُس پر فی الفور عمل کریں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اگر ایسا ہونے لگے تو کل کو حکومت کہے گی لوگ سانس بھی اُس کی مرضی کے مطابق لیا کریں! حکومت اور بیوی میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے! ایک وقت میں ایک ہی کی بات مانی جاسکتی ہے۔

خوفِ خُدا رہے کہ خیالِ بتاں رہے
کس طرح ایک دل میں غم دو جہاں رہے؟

بنگال کا جادو مشہور ہے۔ مگر لازم نہیں کہ جادو ہر بار چل ہی جائے۔ بھارتی ریاست مغربی بنگال کی وزیر اعلیٰ ممتا بینرجی نے ریاستی عوام پر زور دیا ہے کہ وہ حکومت کے بارے میں پھیلائی جانے والی بے بنیاد باتوں سے بچنے یعنی اطمینان سے بے خبر رہنے کے لیے ٹی وی پر نیوز چینلز دیکھنا چھوڑیں اور میوزک چینلز دیکھا کریں! اُن کا کہنا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے زیر اثر کام کرنے والے ٹی وی چینلز رات دن حکومت کے خلاف جھوٹی خبریں چلا رہے ہیں اِس لیے لوگ پروپیگنڈے سے دور رہنے کے لیے ٹی وی پر صرف میوزک چینلز سے محظوظ ہوں!

ممتا بینرجی کا مشورہ ایک اعتبار سے تو ہر گز بُرا نہیں۔ آج کی ہنگامہ خیز زندگی کو موسیقی کی اشد ضرورت ہے۔ جب سبھی کچھ بے ہنگم ہو جائے تو "ردھم" کی بحالی ناگزیر ہوتی ہے۔ مگر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ ممتاجی نے یہ کیسے سوچ لیا کہ نیوز چینلز میں موسیقیت نہیں ہوتی؟ کیا نیوز چینلز ہر وقت چند مخصوص راگ نہیں الاپ رہے ہوتے؟ ہم نے تو یہی دیکھا ہے۔ جس نیوز چینل کو بغور دیکھیے وہ اپنی مخصوص ڈفلی پر ایک مخصوص راگ الاپتا ملے گا۔ ردھم بھی ایسا ہوتا ہے کہ بندے کو جوش آوے ای آوے! اور اگر بندہ سیاسی ہو تو سمجھ لیجیے دھمال کا سامان ہووے ای ہووے!

عوام اب باشعور ہو چکے ہیں۔ کیا دیکھنا اور سُننا چاہیے، کیا کھانا چاہیے، کیا پینا چاہیے، کس طرح جینا چاہیے اور کس طرح نہیں جینا چاہیے۔۔۔ یہ سب جاننے کے لیے اُنہیں کِسی کنسلٹنٹ کی ضرورت نہیں۔ فیصلہ وہ خود کر سکتے ہیں۔ ہم نے بارہا لوگوں کو نیوز چینلز متواتر دیکھتے دیکھا ہے۔ اور جب اُنہیں یہ مشورہ دیا کہ ذہنی انتشار سے بچنے کے لیے کامیڈی چینلز دیکھا کیجیے تو وہ "زیر لب کے نیچے" مُسکرادیئے! اُن کا استدلال یہ تھا کہ کامیڈی چینلز نے دِماغ کی جو "واٹ" لگائی ہے اُس کے ازالے کے لیے ہی تو نیوز چینلز دیکھ رہے ہیں! چند احباب کو کامیڈی چینلز کا دِلدادہ پاکر ہم نے اِن چینلز کی طرف

متوجہ ہونے کا سبب پوچھا تو جواب ملا کہ سنسنی خیز چیزیں دیکھنے کی خواہش اور جستجو اِس طرف لے آئی!

ممتا بینرجی نے یہ بات ٹھیک کہی ہے کہ عوام میوزک چینلز "دیکھا" کریں کیونکہ آج کل میوزک چینلز صرف دیکھنے ہی کی چیز رہ گئے ہیں! مگر ممتا جی کو ذرا بھی اندازہ نہیں کہ اگر کِسی کو مختلف نسلوں کے عجیب و غریب جانور ہی دیکھنے ہوں تو میوزک چینلز کیوں دیکھے گا؟ براہِ راست نیشنل جیو گرافک اور اِسی قبیل کے دوسرے چینلز دیکھنے میں کیا ہرج ہے؟ آج کل بیشتر میوزک چینلز ذہنی خلجان پیدا کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اگر ممتا جی مخالفین کے دِماغ کا دہی بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں تو یقیناً میوزک چینلز اُن کے لیے کام کی چیز ثابت ہو سکتے ہیں!

ایک میڈیا ٹیم ذہنی امراض کے شفاء خانے پہنچی۔ دیکھا کہ ایک ہال میں پندرہ بیس مریض ٹی وی پر پاپ میوزک سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ میڈیا کے نمائندوں نے ڈاکٹرز سے پوچھا کہ ذہنی امراض میں مبتلا اِن معصوم افراد کا قصور کیا ہے جو اِنہیں ایسی سخت سزا دی جارہی ہے؟ جواب ملا کہ یہ سزا نہیں، دونوں کا علاج ہے! ذہنی مریض پاپ سنگرز کو دیکھ کر اپنائیت سی محسوس کرتے ہیں اور آج کل کے پاپ سانگرز اِسی قابل ہیں کہ اُنہیں ذہنی مریض دیکھیں اور انجوائے بھی

کریں! ثابت ہوا کہ سب کچھ حشر کے دن پر موقوف نہیں، اِس دُنیا میں بھی گناہوں کی سزا کسی حد تک مل کر رہتی ہے!

سیاست دانوں کی یہ روش اچھی نہیں کہ لوگوں کو ٹی وی چینلز دیکھنے کے بارے میں بھی مشوروں سے نوازیں۔ عوام کوئی پارلیمنٹ نہیں جسے موم کی ناک کی طرح کسی بھی طرف موڑ دیا جائے!

یہ بات تو ہم ایک زمانے سے جانتے ہیں کہ پرائیویٹ ٹی وی چینلز اپنے اپنے ایجنڈے کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ جب ملک میں سبھی کچھ ایجنڈے کے تحت ہو رہا ہے تو چینلز نے کیا بگاڑا ہے کہ اُنہیں اِس صفت سے محروم رکھا جائے!

اِضافی سچ یہ ہے کہ اب عوام بھی ٹی وی چینلز ایجنڈے کے تحت دیکھتے ہیں اور یہ ایجنڈا وہ اپنی صوابدید کے مطابق طے کرتے ہیں! میڈیا کے ماہرین اِس زعم میں مبتلا ہیں کہ اُنہیں عوام کے رُجحانات کا خوب اندازہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُنہیں عوام کے موڈ کا کچھ بھی پتہ نہیں۔ آپ نے شاید اب تک اِس امر پر غور نہیں کیا کہ عوام نے ٹی وی چینلز کی پلاننگ کرنے والوں کو بھی چکرا کر رکھ دیا ہے۔ عوام کی دل بستگی اور گھریلو زندگی میں زیادہ سے زیادہ سکون پیدا کرنے کی غرض سے بنائے جانے والے فیملی ڈرامے آج کل ہارر شو کی کیٹیگری میں دیکھے جا رہے ہیں! کرنٹ افیئرز کے پروگرام مزاح کی ضرورت

اور over-dose ایسی فراخ دِلی اور جاں فشانی سے پوری کر رہے ہیں کہ ناظرین کی منزل سے گزر رہے ہیں! وہ زمانے ہوا ہوئے جب فطری ماحول bumper crop اور حیاتیاتی تنوع سے آشنا کرنے کے لیے بچوں کو نیشنل جیو گرافک اور اِسی قبیل کے دیگر چینلز دکھائے جاتے تھے۔ اب سِکّہ بند کامیڈی پروگرام دیکھتے رہنے سے بچوں کو مختلف جانوروں کی عجیب و غریب خصوصیات سے واقف ہونے میں مدد ملتی ہے!

کامیڈی پروگرام مظلوم ہیں کیونکہ اب بیشتر پروگراموں میں مزاح اِس قدر پایا جاتا ہے کہ لوگ غیر رسمی کامیڈی دیکھنے کے بعد رسمی طور پر کامیڈی چینلز دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے! بہت سے ہارر شو بھی اب کامیڈی ہی کے ذیل میں آتے ہیں!

کسی زمانے میں پی ٹی وی کا خبرنامہ مزاح کی کمی بہت حد تک پوری کر دیا کرتا تھا! اب لوگ اُسے خاصی سنجیدگی سے نظر انداز کر چکے ہیں!

بچوں کے پروگرام دیکھنے سے بڑوں کو بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ گفتگو کس طرح کرنا چاہیے، بڑوں سے کس طرح پیش آنا چاہیے، کچھ پوچھنا ہو تو کس طرح پوچھنا چاہیے۔ بچوں میں غیر معمولی اضطراب پایا جاتا ہے مگر ہمارا خیال ہے اب بچوں کے پروگرام دیکھ کر بڑے دیکھ اور سیکھ سکتے

ہیں کہ تحمل کیا ہوتا ہے اور جو لوگ پسند نہ ہوں اُنہیں کس طرح برداشت کیا جاتا ہے!

بہت سے انٹرٹینمنٹ شو مختلف علوم اور فنون کا مجموعہ محسوس ہوتے ہیں۔ اِن پروگراموں کو دیکھ کر ذہنی پیچیدگیوں کے اسباب جاننے میں خاصی مدد مل سکتی ہے! ہم نے فِکشن لکھنے والے بعض احباب کو ٹی وی پر انٹرٹینمنٹ شو باقاعدگی سے دیکھتے دیکھا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سیلیبریٹیز کے باہمی مناقشوں اور جھگڑوں کی تفصیلات سے ایکشن اور سسپنس سے بھرپور کہانیوں کے لیے خوب مواد ملتا ہے! ویسے یہ مواد اُنہیں بہت احتیاط سے استعمال کرنا پڑتا ہے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی کہانی کی کیٹیگری کو تبدیل کردیتی ہے!

ٹیکنالوجی کا انتظار

ہم اب تک سمجھ نہیں پائے کہ جدید علوم و فنون کی مدد سے زندگی میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں یا صرف مشکلات۔ دنیا کا دعوی ہے کہ جدید ترین ٹیکنالوجی زندگی میں سہولتیں پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ مغرب میں تحقیق پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اور اِسی کا یہ نتیجہ بھی نکلا ہے کہ اب زندگی طرح طرح کی آسانیوں سے "دوچار" ہے! کل تک جس تحقیق کو انسان کے لیے لازمی قرار دے کر اس کی غیر معمولی اہمیت کا راگ الاپا جاتا تھا وہی تحقیق اب چُھرا بن کر مغربی تہذیب کی پیٹھ میں پیوست ہے!

رابطے بہتر بنانے کے طریقوں ہی کو لیجیے۔ کل تک یہ کہا جاتا تھا کہ انسان بہتر رابطوں کے بغیر اچھی زندگی بسر کر ہی نہیں سکتا۔ سو سو طرح سے یہ بات کہی جاتی تھی کہ رابطوں کو بہتر بنانا انسان کی بقاءکے لیے ناگزیر ہے۔ مگر یہ بھی طُرفہ تماشا ہے کہ جب رابطے آسان ہوئے تو زندگی مشکل ہو گئی!

وہ بھی کیا تھے جب مواصلاتی ٹیکنالوجی نے ترقی نہیں کی تھی اور ٹیلی کام سیکٹر ہماری زندگی میں "گھس بیٹھیے" کی طرح نہیں آ دھمکا تھا۔ زندگی

کے دریا کی "ڈِھٹائی" ملاحظہ فرمایئے کہ بے حساب رابطوں کے بغیر بھی رواں تھا! گنتی کے چند افراد سے شناسائی رکھی جاتی تھی اور زندگی بہت مزے سے بسر ہوتی تھی۔

رابطوں کی آلودگی سے پاک وہ حسین زمانہ اب صرف ہمارے حافظے میں رہ گیا ہے!

اب تو قیامت یہ ہے کہ رابطوں کے سمندر میں زندگی کا حُسن غرق ہوکر رہ گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم صرف رابطوں کے لیے پیدا کیے گئے ہیں! جسے دیکھیے وہ زندگی کو کسی نہ کسی طرح کے رابطے کی زنجیر سے باندھنا چاہتا ہے۔ سبھی اِس خوف میں مبتلا ہیں کہ کہیں تنہا نہ رہ جائیں اور اِسی خوف نے اُنہیں شدید تنہائی سے دوچار کیا ہے!

برطانیہ میں ایک تازہ سروے سے معلوم ہوا ہے کہ 16 فیصد باشندے رابطوں کے لیے جدید ترین ٹیکنالوجی پر اِس قدر انحصار کرتے ہیں کہ اب اُن کی زندگی میں جیتے جاگتے انسانوں سے رابطہ خطرناک سطح تک گر گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی سے ملنے پر مشینی یا الیکٹرانک رابطے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ٹیکسٹ میسیجنگ، ای میل اور وڈیو لنک کے ذریعے رابطے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو کسی سے بات کیے بغیر دو تین دن بھی گزر جاتے ہیں! ساری دنیا سے رابطے میں رہنے کی دُھن سَروں پر ایسی سوار ہوئی ہے کہ لوگ اپنے قریب ترین ماحول سے

بھی کٹ کر رہ گئے ہیں۔
ٹیلی کام سیکٹر کی پیش رفت نے بُہتوں کو تنہائی کے پنجرے میں اِس طور بند کردیا ہے کہ اب وہ روز مرہ استعمال کی اشیاء خریدنے کے لیے بھی گھر یا دفتر سے نکلنا پسند نہیں کرتے۔ اُن کے شب و روز کچھ اِس ڈھنگ سے گزرتے ہیں کہ سمجھنے والے سمجھ نہیں پاتے کہ زندگی وہ بسر کر رہے ہیں یا زندگی اُنہیں بسر کر رہی ہے!
اہل مغرب کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ پہلے وہ بہت شوق سے اپنے لیے گڑھا کھودتے ہیں اور جب اُس میں گر جاتے ہیں تو شور مچاتے ہیں، ہنگامہ برپا کرتے ہیں! مغرب کا قصہ یہ ہے کہ پہلے تو ہر شعبے میں تحقیق کا مینا بازار سجایا جاتا ہے مگر مگر جب تحقیق کا کھڑاگ حد سے گزرتا ہے تو اہل مغرب جان جاتے ہیں کہ سبھی کچھ داؤ پر لگ گیا ہے۔ ٹیکنالوجی کو زیادہ سے زیادہ جدت سے ہمکنار کرنے کے چکر میں اہل مغرب نے سب کچھ تباہ کر ڈالا ہے۔ معاش نے معاشرت کو کہیں کا رہنے نہیں دیا۔ ٹیلی کام سیکٹر کی ترقی نے جو قیامت ڈھائی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ سماجی رابطوں کی ویب سائٹس نے رابطوں کو اِس قدر بڑھا دیا ہے کہ فضاء میں اب آکسیجن کم، رابطے زیادہ ہیں! جلووں کی فراوانی سے آنکھوں کے خیرہ ہونے کا سُنتے آئے تھے، دیکھ بھی لیا! رابطوں کے

اژدہام نے قلب و نظر کو حیران کر دیا ہے۔ کیفیت کی نوعیت ملاحظہ فرمائیے کہ قلبی تعلق چند ایک سے اور نظری و بصری تعلق بیسیوں بلکہ سیکڑوں، ہزاروں سے ہے ! اب اگر یہ کیفیت انسان کو دیوانگی سے دو چار نہ کرے تو کیا کرے؟

ہم اس بات پر حیران ہیں کہ جس ٹیکنالوجی نے مغرب میں انسان کو تنہائی کا اسیر بنا دیا ہے وہ ہمارے ہاں ناکام کیوں ہے اور اب تک ہماری خواہشات سے مطابقت رکھنے والے نتائج کیوں پیدا نہیں کر رہی ! مرزا تفصیل بیگ کو دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب کی جدید ترین ٹیکنالوجی کا کسی کے سامنے بے بس ہو جانا کیا ہوتا ہے ! رابطوں کے دسیوں طریقے منظر عام پر آنے کے باوجود مرزا اب تک براہِ راست یعنی "بہ قلم خود" رابطے پر یقین رکھتے ہیں!

جس ٹیلی کام ٹیکنالوجی نے مغرب میں لوگوں کو شدید تنہائی کی تحویل میں دے دیا ہے وہی ٹیکنالوجی جب مرزا تفصیل بیگ کے سامنے آتی ہے تو دست بستہ پناہ مانگتی ہے ! سچ تو یہ ہے کہ مرزا نہ ہوں تو ٹیکنالوجی مغرور ہو جائے اور کسی کے قابو میں نہ آئے ! مرزا نے "بازوئے ذہن" کی قوت سے ثابت کیا ہے کہ زمانے کی ترقی اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اس معاملے میں اُن کی ثابت قدمی مثالی نوعیت کی ہے ! یعنی

ز میں جنبد، نہ جنبد گل محمد!

مرزا کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو رابطوں کے لیے کسی بھی ٹیکنالوجی کے محتاج نہیں بلکہ اپنی ٹیکنالوجی خود پیدا کر لیتے ہیں! زمانہ خواہ کہیں پہنچ گیا ہو، مرزا وہیں کھڑے ہیں جہاں بیس تیس سال پہلے تھے۔ آج بھی جب وہ کوئی ایسی ویسی خبر سُنتے یا پڑھتے ہیں تو شدید حیرت اور تشویش کی حالت میں سیدھا ہمارے گھر کا رُخ کرتے ہیں! ہم نے بارہا سمجھایا کہ جدید دور کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانا سیکھیے اور کبھی کبھی ملاقات کے لیے موبائل تک بھی محدود رہا کیجیے مگر وہ کہاں ماننے والے ہیں؟ ایس ایم ایس وغیرہ سے اُن کی تشفی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی تو چار چھ ایس ایم ایس بھیجنے پر بھی وہ دِل کی بات بیان نہیں کر پاتے اور بالآخر زندہ و متحرک ایس ایم ایس کے مانند بہ نفسِ نفیس چلے آتے ہیں!

مرزا کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ خوشی اور غم کے ساتھ ساتھ پریشانی میں سب کو شریک کرتے ہیں۔ کوئی اور ملے نہ ملے، ہم تو اُن کا ہدف ہیں ہی! کسی بھی معاملے پر دِل میں پیدا ہونے والے تمام خدشات سے جب تک وہ ہمیں پوری طرح آگاہ اور پریشان نہ کر دیں، اُن کے دِل کو سکون نہیں ملتا!

مرزا کو بین الانسانی رابطوں کا بے تاج بادشاہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

دِل سے دِل ملے نہ ملے، سَر سے سَر جوڑنے کا ہنر وہ خوب جانتے ہیں۔ مرزا کو دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پریشان ہونے کے لیے وقت اور موسم کی کوئی قید نہیں۔ یہ کیفیت کِسی بھی وقت اپنے آپ پر طاری کرنے کے بعد دوسروں پر بھی تھوپی جاسکتی ہے! وہ اپنے ذہن میں اُبھرنے والی کسی بھی پریشانی کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتے اور ٹیلی کام سیکٹر کی جدید ترین پیش رفت کو نظرانداز کرکے خود اپنے ہدف تک پہنچ جاتے ہیں! کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں شاید "پریسیشن ٹیکنالوجی" کا آئیڈیا اُنہی کو دیکھ کر سُوجھا ہوگا! اُن کے ذہن میں یہ پیدائشی خدشہ برقرار ہے کہ کوئی بھی ٹیکنالوجی اُن کی بات کماحقہ بیان نہیں کر پائے گی!

ہماری نظر میں وہ قابل رشک ہیں جو ٹیکنالوجی کے ہاتھوں تنہائی کے پنجرے میں بند ہیں۔ ٹیکسٹ میسیجنگ، ای میل اور وڈیو لنک کے ذریعے رابطوں کی صورت میں جو لوگ دنیا سے الگ ہوچکے ہیں اُنہیں ہم رشک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں۔ ٹیکنالوجی کے بڑے کارنامے سُنتے ہیں۔ ہم تو آنکھوں سے کوئی معجزہ دیکھیں گے تو مانیں گے۔ ہم اب تک ترستے ہیں کہ حقیقی تنہائی کے چند لمحات میسر ہوں اور سُکون کا سانس لیں!

برطانیہ میں ٹیکنالوجی کے ہاتھوں جو لوگ دو تین دن تک بات کئے بغیر رہ لیتے

ہیں اُن کے بڑا رتبہ ہے۔ ہمارا تو حال یہ ہے کہ بات نہ بھی کرنا چاہیں تو اپنی خواہش پر عمل نہیں کر سکتے۔ بقول باقی صدیقی

!تیر پر اُڑ کے بھی نِشانے لگے

ہم نہ جائیں تو مرزا تیانے آ جاتے ہیں۔ مرزا اپنے نزول کے لیے شانِ نزول کے محتاج random و مکلّف نہیں! اِس معاملے میں وہ خالص کے اُصول پر کاربند رہتے ہیں۔

!چُھری کو اِس سے کیا غرض کہ خربوزے پر کیا گزرتی ہے

مغرب کو اپنی شاندار اور بے مثال ترقی پر بہت ناز ہے۔ ہم حیران ہیں کہ ایسا کیا ہے جس پر ناز کیا جائے۔ اگر واقعی مغربی ٹیکنالوجی میں کچھ دم ہے تو ذرا ہمیں بھی تنہائی اور سُکون کے چند لمحات حاصل کرنے کے قابل بنا کر تو دِکھائے! ہمیں اُس ٹیکنالوجی کا شدت سے انتظار ہے۔ ایک وہ ہیں جو تنہائی کے پنجرے میں قید ہیں اور ایک ہم ہیں کہ کوئی بھی لمحہ کسی نہ کسی کے الطافِ مسلسل سے بالا و مُبرّا نہیں۔ مرزا یہ سطور پڑھیں تو ہرگز بُرا نہ مانیں اور یقین رکھیں کہ اُن پر اِن کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہر ٹیکنالوجی !سے پرے ہیں

ترقی یافتہ اقوام میں ایک بڑی بُرائی یہ پائی جاتی ہے کہ پس ماندہ اقوام کو آئینہ دِکھا دِکھا کر اُن کا سُکون غارت کرتی ہیں یعنی عمل کی تحریک دیتی رہتی ہیں! مغربی اقوام میں بھی یہی خصلت پائی جاتی ہے۔ خود بھی بہت کچھ کرتی رہتی ہیں اور دوسروں کو بھی آرام سے نہیں رہنے دیتیں! اُن کی دیکھا دیکھی غریب اقوام کو بھی محنت کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے! ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ پس ماندہ اقوام کے لوگوں کو سُکون سے زندگی بسر کرتے دیکھ کر ترقی یافتہ اقوام کے لوگ جلتے ہیں۔ ہر ترقی یافتہ معاشرے میں بہتر اور پُر سُکون زندگی بسر کرنے کے لیے دن رات ایک کرنا پڑتے ہیں، عشروں تک کیریئر کو پروان چڑھانا پڑتا ہے۔ اب اگر کسی کو یہ سب کچھ بیٹھے بٹھائے مِل جائے تو محنت کرنے والوں سے بھلا کس طور ہضم ہوگا؟

مغرب اور دیگر ترقی یافتہ خطوں میں لوگ طرح طرح کی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے ہیں اور پھر بڑے اہتمام سے اُن تمام حرکات کو ریکارڈز کی ایک کتاب میں درج کیا جاتا ہے جسے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز کہتے ہیں! اِس کتاب میں درج ہونے والے بہت سے ریکارڈز آئے دن ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ہم تو آج تک سمجھ نہیں پائے کہ جب کسی ریکارڈ کو ٹوٹ ہی جانا ہے تو اُسے درج کرنے اور کسی کو کریڈٹ دینے

کا فائدہ کیا ہے! مگر خیر، ترقی یافتہ اقوام کے ایسے ہی چونچلے ہوا کرتے ہیں۔اِسی لیے تو ہم ترقی کی راہ پر گامزن ہونے سے گریز کرتے ہیں!

جب کوئی باضابطہ کتاب موجود ہو اور اُس میں اندراج بھی بر وقت کیا جاتا ہو تو لوگ اوٹ پٹانگ سوچیں گے ہی نہیں، اُس پر عمل بھی کریں گے۔ تھائی لینڈ کے ایک باورچی نے کھولتے تیل سے ایک منٹ میں مرغی کے بیس ٹکڑے کسی چیز کی مدد کے بغیر محض ہاتھ سے نکال کر گنیز بک میں نام لکھوالیا ہے۔ وہ جس ریسٹورنٹ میں کام کرتا ہے وہاں آنے والوں کو یہ تماشا دِکھاکر روزانہ خوب داد پاتا ہے!

ریکارڈ قائم کرنے کا شوق بھی ایک ایسا جنون ہے جس کا کوئی سَر ہے نہ پیر۔ کہیں تیس چالیس باورچی مل کر ڈھائی تین سو کلو کا کیک تیار کرتے ہیں، کہیں پانچ ہزار انڈوں کا آملیٹ تیار کیا جاتا ہے، کہیں چند سَر پھرے مل کر ڈیڑھ دو من کا برگر تیار کرنے پر تُل جاتے ہیں! اب اِنہیں کون سمجھائے کہ کیک اور برگر کھانے کی چیزیں ہیں، ریکارڈ بناکر تصویریں کھنچوانے کی نہیں!

ہم نے دیکھا تو نہیں، بزرگوں سے سُنا ہے کہ کراچی کے علاقے لالوکھیت (لیاقت آباد) میں کوئی غنی بھائی ہوا کرتے تھے۔ وہ عجیب و غریب قسم کے خانہ

ساز یعنی دیسی ساختہ "ریکارڈز" ایک بڑے رجسٹر (جرنل) میں درج کرلیا کرتے تھے۔
اِس رجسٹر کو لوگوں نے "غنی بھائی کی کتاب" کہنا شروع کردیا۔ روایت ہے کہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز کا آئیڈیا غنی بھائی کی کتاب ہی سے چُرایا گیا تھا!

ہم سبھی گنیز بک میں درج ریکارڈز سے متاثر ہونے کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ کبھی ہم نے سوچا ہے کہ ہمارے ہاں یاروں نے کیسے کیسے ریکارڈز قائم کئے ہیں؟ مگر صاحب! ہم اپنے لوگوں کو عزت کیوں دینے لگے؟ گھر کی مُرغی دال برابر ہوتی ہے نا! ہمارے ہاں کوئی سورج بن کر بھی چمکے تو کوئی نہیں دیکھتا اور دوسروں کے اندھیرے کی بھی رفتار ناپی جاتی ہے! ہمارے ہاں کوئی درخت سے اُلٹا لٹک جائے تو گالیاں پڑتی ہیں۔ اور گورے ایسا کرتے دکھائی دیں تو "ایڈونچر اِن ریئل لائف"!

آنکھوں سے کاجل چُرانا تو آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ یہ عمل بھی ریکارڈز کا حصہ بن سکتا ہے۔ مگر ہم ایک ایسے عمل سے واقف ہیں جو آنکھوں سے کاجل چُرانے سے زیادہ دُشوار ہے۔ عم زاد غضنفر خان عرف گجن کو اللہ سلامت رکھے۔ ہمیں اُن کا لڑکپن اور جوانی کے درمیان کا زمانہ یاد ہے۔ چھوٹا سا گھر اور اُس سے بھی چھوٹا سا باورچی خانہ۔ اسکول سے واپسی پر غضنفر خان چولھے پر چڑھی ہوئی

پتیلی سے بوٹیاں اِتنی تیزی اور نفاست سے اُڑایا کرتے تھے کہ تھائی لینڈ میں کھولتے تیل سے چکن پیس ہاتھ سے نکالنے والا باورچی بھی دیکھتا تو اپنے فن پر نادِم ہوتا! کمال فن یہ تھا کہ اِدھر والدہ کی نظر چُوکتی اور اُدھر غضنفر خان چولھے پر رکھی پتیلی سے بوٹیاں لے اُڑتے! یہ سب کچھ لمحوں میں ہوتا تھا، کوئی منٹ دو منٹ کا ٹائم نہیں ملتا تھا! اگر آج غنی بھائی زندہ ہوتے تو اُن کی کتاب میں یہ ریکارڈ ضرور درج ہوتا!

اسکول کے سامنے کھڑے ہوئے ٹھیلوں سے، دوستوں کے ساتھ مل کر، ہم امرود، ناشپاتی، بیر وغیرہ اِس خوبصورتی اور نفاست سے "پار" کیا کرتے تھے کہ اگر اِن حسین وارداتوں کا ریکارڈ رکھا جاتا تو آج ہم بھی سیلیبریٹیز کی صف میں کھڑے ہوتے!

ہمارے ہاں بیشتر تقاریب اپنی نوعیت کے اعتبار سے ریکارڈ بنانے کے مقابلوں سے کم نہیں ہوتیں! شادی کی تقریب میں کھانا کُھلتے ہی لوگ جس تیزی سے پلیٹ میں سبھی کچھ بھر لیتے ہیں وہ بجائے خود ریکارڈ سے کم نہیں! اور یہ ایسا ریکارڈ ہے کہ ٹوٹتا، بنتا رہتا ہے۔ قورمے کی بوٹیاں، فرائیڈ چکن، کباب، بریانی سَبھی کچھ پلیٹ میں لبالب بھرنے کے بعد اُسے تیزی سے معدے میں دھکیلنے کا مقابلہ شروع ہوتا ہے اور اِس مرحلے کے ریکارڈز بھی آئے دن

ٹوٹتے، بنتے ہیں۔

کھانے پینے کی اشیاء بڑی تعداد میں ٹھونسنا تو خیر ایک انفرادیت ہے ہی، اِس سے ایک قدم آگے بڑھ کر شروع ہوتا ہے مختلف النوع اشیاء کو ہضم کرنے کا مقابلہ۔ کبھی برنس روڈ جایئے تو اندازہ ہوگا کہ یہ قوم کس طرح دہی بڑے، چکن تکہ، بوٹی، شیر مال، بریانی، کھیر، فیرنی، لسی، آئس کریم اور فالودہ ایک ساتھ کھاتی اور ہضم کرتی ہے! اگر کہیں کھانے میں ورائٹی ہضم کرنے کا مقابلہ ہو تو برنس روڈ کا باقاعدگی سے چکر لگانے والا کوئی بھی گھرانہ عالمی ریکارڈ قائم کرسکتا ہے! ویسے تو خیر "جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے" مگر ہمیں یقین ہے کہ اِس معاملے میں میمن برادری پاکستان کا نام خاصا روشن کرسکتی ہے!

اگر آپ علی الصباح کام پر جاتے ہیں تو خوب اندازہ ہوگا کہ ذرا سی بس میں پاکستان کی آبادی کے ایک بڑے حصے کا سَما جانا کیا ہوتا ہے! بس میں لوگ جس تعداد میں اور جس رفتار سے سوار ہوتے رہتے ہیں وہ منظر بجائے خود ایک ریکارڈ کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر بس خود بھی کہہ دے کہ میں مُجھ میں اب گنجائش نہیں تب بھی کنڈکٹر اُس میں مزید دو چار مُسافر سوار کرا ہی دے گا! غنی بھائی کی کتاب کا احیاء ہو تو یہ ریکارڈ بھی اُس کا حصہ ہوگا۔

شاپنگ سینٹرز اور بیوٹی پارلرز کے چکر لگانا ایک ایسا معاملہ ہے جو خواتین کے درمیان مقابلے کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ مگر اِس حوالے سے ریکارڈز درج کرنا درست نہیں۔ خواتین کا شاپنگ سینٹرز اور بیوٹی پارلرز جانا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، ایک اتھاہ ساگر ہے۔ غنی بھائی کی کتاب ختم ہو جائے گی مگر یہ ریکارڈز ختم نہیں ہوں گے!

اور سب سے بڑھ کر وقت کو ٹھکانے لگانے کے ریکارڈز کا معاملہ ہے۔ ہمارے ہاں لوگ وقت اپنا اور دوسروں کا وقت ٹھکانے لگانے کے طریقے سوچتے رہتے ہیں، سو سو جتن کرتے ہیں اور ریکارڈز توڑتے بناتے رہتے ہیں! اور مزے کی بات یہ ہے کہ اِس معاملے میں اپنی "عظمت" کا خود اُنہیں بھی احساس نہیں!

معاملات اور بھی بہت سے ہیں اور ریکارڈز ہیں کہ ٹوٹتے اور بنتے رہتے ہیں۔ مگر کیا کیجیے کہ اب غنی بھائی رہے نہ اُن کی کتاب! پاکستانی قوم کی "شاندار" کارکردگی اندراج سے محروم ہے!

"لیاری میں" انقلاب

پیپلز پارٹی کی ایک بڑی "خوبی" یہ ہے کہ کسی معاملے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ انتہا پسندی اِس کے مزاج کا حصہ ہے۔ کسی کو چاہتی ہے تو تمام حدیں پار کر جاتی ہے۔ اور اگر نفرت کرنے پر آئے تو اُسے یاد نہیں رہتا کہ حد وغیرہ بھی کوئی چیز ہوا کرتی ہے!

ضیاء جالندھری نے کہا تھا

اُفتادِ طبیعت سے اِس حال کو ہم پہنچے
شِدّت کی محبت میں شِدّت ہی کے غم پہنچے

پی پی پی قیادت کی زبانی سُنتے آئے تھے کہ جمہوریت بہترین انتقام ہے۔ دیکھ بھی لیا۔ آپ اور ہم خوش نصیب ہیں کہ جمہوریت کو بہترین انتقام کی شکل میں صرف دیکھا ہے، لیاری کے غریبوں نے تو اِسے بھگتا ہے۔ چار سال سے ایک ہی جُملہ سُننے مل رہا تھا کہ جمہوریت بہترین انتقام ہے۔ عوام کی سادہ لوحی دیکھیے کہ اِس جُملے میں مفاہیم کا جہاں ڈھونڈنے نکلے تھے۔ اُن کی تلاش ختم ہوئی۔ پیپلز پارٹی کی مہربانی کہ اُس نے کوزے میں دریا بند کر دیا یعنی تمام معاملات کو سمیٹ کر لیاری کی چوکھٹ تک لے آئی!

لیاری میں کون رہتا ہے؟ اِس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ لیاری میں کون نہیں رہتا؟ کراچی کو منی

پاکستان کہا جاتا ہے مگر درحقیقت منی پاکستان تو لیاری ہے۔اِس چھوٹی سی دُنیا میں ایک بڑی اور خاصی متنوع دُنیا آباد ہے۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ سرکاری بیانات نے پوری کی۔ ہم ایک زمانے سے کراچی میں زندگی بسر کر رہے ہیں مگر ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ ہمارے پہلو میں بسے ہوئے لیاری میں جرائم پیشہ عناصر کے شانہ بہ شانہ بلوچ علیٰحدگی پسند اور طالبان بھی سکونت پذیر ہیں! اگر معلوم ہوتا تو ہم کچھ تو ڈرتے، سہمے سہمے وہاں سے گزرا کرتے!

لیاری کا قصور کیا تھا؟ پیپلز پارٹی سے محبت؟ یقیناً۔ مگر محبت میں گِلے شِکوے جائز نہیں۔ محبت کی دُنیا کا

اصول تو یہ ہے کہ محبوب خواہ کچھ کر گزرے، مُحِب کو صبر کے گھونٹ پینے چاہئیں۔ مگر پیپلز پارٹی سے محبت کرنے والوں کو یہ اصول راس نہ آیا۔ صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ حد آئی اور اِس طور آئی کہ تمام معاملات منطقی حدود پھلانگ گئے۔ لیاری کے رہنے والے کیا جانتے تھے کہ جن کی محبت کا دم بھرتے ہوئے مظالم سہتے آئے ہیں وہ شِکوے اور گِلے کِسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ اُنہوں نے حقوق نہ ملنے پر صدائے احتجاج بلند کی تو ریاستی قوت استعمال کرکے دبا دی گئی۔ پیپلز پارٹی کے مزاج میں "مافیا پن" پہلے تو نہیں تھا۔ خدا جانے اِس پارٹی نے کِن لوگوں میں اُٹھنا بیٹھنا شروع کردیا ہے۔ جو لوگ

عشروں سے بھٹو ازم کی باتیں کرتے آئے ہیں اُن پر بھٹو ہی کی پارٹی نے قیامت ڈھادی۔ لیاری والوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اُن پر ایسا وقت بھی آسکتا ہے۔ پیپلز پارٹی سے محبت کرنے والوں نے جب محبت کا صِلہ مانگا تو بلاول ہاؤس کے مکین چیں بہ جبیں ہوگئے۔ جب بے حساب محبت نچھاور کرنے پر کچھ حاصل نہ ہوا تو لیاری والوں کے دِماغ پھر گئے اور انہوں نے باغیانہ روش اختیار کی۔ ایسی ہی کسی کیفیت کے لیے عبدالحمید عدم کہہ گئے ہیں

نہ جانے کون سی منزل ہے یہ محبت کی
!کہ تیرے نام سے نفرت سی ہو گئی ہے مُجھے

ذوالفقار علی بھٹو ہوتے یا بے نظیر بھٹو ہوتیں تو اہلِ لیاری سے ناراضی کا سبب پوچھتیں۔ موجودہ قیادت کو لیاری والوں کی باغیانہ روش پسند نہ آئی۔ انتہا یہ ہے کہ وزیر داخلہ فرماتے ہیں "عُزیر بلوچ کا مسلم لیگ (ن) میں شمولیت اختیار کرنا 'غیر قانونی' عمل ہوگا! "

جمہوریت کو بہترین انتقام قرار دینے والوں نے لیاری کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اور محبت کرنے والوں پر لشکر کشی کردی۔ چیل چوک کنٹرول کرنے کو ایک بڑا معرکہ سَر کرنے سے تعبیر کیا گیا۔ باوردی چیلوں نے بہت شور مچایا مگر چیل چوک پر نصب چیل نہ اُڑی۔ افشانی گلی تک پہنچ جانے کو پولیس کی مانگ میں

کامیابی کی افشاں بھرنے کے مترادف قرار دے دیا گیا۔ کراچی کے لوگ بہت سادہ ہیں، اُنہیں تو کچھ پتہ ہی نہیں۔ اچھا ہوا کہ حکومت نے بتادیا شہر کی ایک بستی میں بسے ہوئے علیحدگی پسند اور شدت پسند پڑوسی ملک کا دیا ہوا اسلحہ استعمال کر رہے ہیں! مگر یہ بھی عجب تماشا ہے کہ کل تک پیپلز پارٹی کا دم بھرنے والوں نے صاف بتادیا کہ متحدہ کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اُنہیں (پیپلز پارٹی کی) حکومت نے اسلحہ دیا تھا! اب کیا عوام اپنی حکومت کو پڑوسی ملک کی حکومت سمجھیں؟

لیاری میں چودھری اسلم کی کمان میں طبل جنگ بجایا گیا۔ پولیس نے ایسا جوش و جذبہ دکھایا جیسے بی آر بی نہر کے دفاع کے لیے میدان میں آئی ہو! لیاری کی گلیوں میں ہونے والی لڑائی کو کھیم کرن کے معرکے کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی! لاکھوں افراد کو ان کے گھروں میں محصور کردیا گیا۔ خواتین اور بچوں پر ترس کھانے کی روایت بھی ترک کردی گئی۔ ایسا تو حالتِ جنگ میں بھی نہیں ہوتا۔ مگر خیر، اب ملکوں کے درمیان تو جنگ ہوتی نہیں اِس لیے اپنوں ہی کو جنگ کا مزا چکھا دینے میں کیا ہرج ہے؟

ہمارے ہاں پروٹوکول کے نام پر پورے شہر کو روک کر وی آئی پیز کو راستہ دینے کی روایت ہے۔ لیاری کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ شہر کے دیگر علاقوں کو محفوظ

رکھنے کے نام پر ایک بستی کے لاکھوں مکینوں کو گھروں میں محصور کردیا گیا۔ لیاری شہر کی قدیم ترین بستیوں میں سے ہے جس میں ہر رنگ، نسل، ثقافت، زبان اور مسلک سے تعلق رکھنے والے آباد ہیں۔ زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جانے والے یہ لوگ کئی معاملات میں دوسروں سے بہت آگے ہیں۔ اور پیپلز پارٹی سے محبت کے معاملے میں تو یہ سب سے آگے تھے۔ توقعات راکھ کا ڈھیر ثابت ہوں تو کوئی کب تک محبت کے ڈونگرے برساتا رہے؟ اقتدار میں رہتے ہوئے بھی کوئی پارٹی مسائل حل نہ کرے تو کوئی اُس سے کب تک اور کیوں وابستہ رہے؟

زندگی کی تھکن اپنے چہروں پر سجائے، کسی نہ کسی طرح صبح کو شام کرنے کے نام پر روزانہ جوئے شیر بہانے جیسی مشقت کرنے والے لیاری کے لوگ مزاجاً آزاد بھی تھے اور غلام بھی۔ وہ محبت کے غلام تھے۔ ایک سیاسی نظریے، فلسفے اور چند شخصیات سے محبت کا جُرم اُن سے سرزد ہوا تھا۔ جرم کیا تھا تو سزا بھی پائی۔ اب اگر یہ سزا انہیں زندگی بہتر انداز سے بسر کرنے کے چند گُر سکھادے تو کیا کہنے۔

قائد کے شہر میں قدم قدم پر قائدین پڑے ہیں۔ شہر چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے مجموعے کی شکل اختیار کرگیا ہے۔

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے!

لیاری کے لوگ اپنی ڈگر سے ہٹنا چاہتے تھے۔ انہیں نظریہ اور ترجیح بدلنے کی سزا دی گئی۔
کالعدم امن کمیٹی کے رہنماؤں نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ پیپلز پارٹی کو خیر باد کہتے ہیں۔
اِس اعلان کی پاداش میں اُنہیں خاک و خون میں غلطاں کر دیا گیا۔ لیاری میں جرائم پیشہ
عناصر بھی ہیں۔ مگر وہ تو ایک زمانے سے ہیں۔ اور کون نہیں جانتا کہ جرائم کن بڑوں
کی معاونت سے سے ہوتے .... یا کئے جاتے ہیں؟

کل تک لیاری کے غریبوں کو حقوق کی جدو جہد میں بھرپور تعاون بلکہ سر دھڑ کی بازی
لگانے کا یقین دلانے والے ذوالفقار مرزا نہ جانے کس دنیا میں کھوگئے کہ اقتدار کے
ایوانوں میں بیٹھے ہوئے فیصلہ سازوں کے سامنے اہل لیاری تنہا ہوگئے! لیاری کے
غریب سَر اُٹھا کر کہہ رہے ہیں کہ وہ پیپلز پارٹی کو کسی حال میں ووٹ نہیں دیں گے۔
انقلاب برپا کرنے سے متعلق پیپلز پارٹی کا دعوی شاید دُرست تھا کہ کم از کم لیاری کے
عوام تو انقلابی فکر سے ہمکنار ہو بھی چکے!

سیاسی مصلحتیں کسی حکمراں جماعت کو کس حد تک کمزور کر سکتی ہیں اِس کا مشاہدہ کرنا ہو تو
پیپلز پارٹی کو دیکھیے جو اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے

لیے چار برسوں کے دوران ہر طرح کا مطالبہ مانتی آئی ہے، ہر حد سے گزر جانے کو درست سمجھتی رہی ہے اور اب یہ ہوا ہے کہ حلق کی ساری طاقت صرف کر کے جئے بھٹو کے نعرے لگانے والے اپنے کارکنوں ہی کو کچل ڈالا ہے۔ پارٹی قیادت کو بھی اندازہ ہے کہ اقتدار شاید آخری بار ملا ہے۔ ایسے میں شاید یہ بہتر سمجھا جارہا ہے کہ بغیر اقتدار کے پارٹی کسی کام کی نہیں ہوتی اِس لیے پارٹی ہی کو ٹھکانے لگادیا جائے ! اور جمہوریت میں پارٹی کو ٹھکانے لگانے کا بہتر طریقہ اِس کے سوا کیا ہے کہ ورکرز کو کُھڈے لائن لگادیا جائے؟ لیاری ٹیسٹ کیس ہے۔ یعنی یہ پیغام دیا گیا ہے کہ جس کے دَر سے وابستہ رہے ہو اُسی کے ہو کے بیٹھے رہو، وفاداری بدلی تو بدلہ لیا جائے گا!

حکمراں جماعت کے دُشمنوں کو اب اپنے لیے نئے مشاغل تلاش کرنے چاہئیں۔ اُن کے حصے کا کام تو پارٹی خود کر رہی ہے۔

ایس ایم ایس کا جنتر منتر

ہمارے ہاں بہتوں کو اب خاصی کوشش پر بھی یاد نہیں آتا کہ جب طرح طرح کے ٹی وی چینلز اور اُن پر پیش کئے جانے والے چیختے چنگھاڑتے ٹاک شو نہیں تھے تب پرائم ٹائم کس طرح گزارا کرتے تھے ! کلاسیکی موسیقی کے تان پلٹوں کی طرح زمانے نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ زندگی کی سرگرمی ہی بے سُرے پن کی نذر ہو گئی ہے !

صہبا اختر نے کہا تھا۔

تنہا تھی اور ہمیشہ سے تنہا ہے زندگی

زندگی کبھی تنہا بھی ہوتی ہوگی مگر ہم نے تو اِسے کبھی تنہا نہیں دیکھا۔ اب تو یاد بھی نہیں پڑتا کہ ہر وقت رابطے میں رہنے کی وباء عام ہونے سے قبل زندگی کس ڈھنگ اور ڈھب کی ہوا کرتی تھی۔ اب اگر تین چار منٹ تک کوئی برقی پیغام یعنی ایس ایم ایس نہ آئے تو تو دل گھبرانے لگتا ہے کہ خدانخواستہ سب کچھ ٹھیک تو نہیں چل رہا! ہر وقت خود کو باقی دُنیا سے جوڑے رکھنے کی دوڑ جاری ہے اور فنشنگ لائن کا کسی کو کچھ علم نہیں !

مشرق و مغرب کے تکنیکی ماہرین نے ہزار طرح کے عجیب و غریب آلات بنالیے ہیں

مگر اب تک وہ ایسا کوئی آلہ تیار نہیں کر پائے ہیں جو یہ بتا سکے کہ پاکستان کی فضاؤں میں کس کا تناسب زیادہ ہے.... آکسیجن کا یا ایس ایم ایس کا! قدرت نے ہر بیماری کا ایک خاص موسم متعین کیا ہے مگر ایس ایم ایس کے ذریعے "دخل در معقولات" وہ وباء ہے جو وقت اور مقام کی پابند ہے نہ محتاج! ایس ایم ایس کی وباء کے ہاتھوں وقت کو دن رات قتل کرکے بھی ہم بخوبی زندہ ہیں۔ زندہ و پائندہ قوم جو ٹھہرے!

اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ زندگی، کسی نہ کسی طرح، سکون سے گزاری جا سکتی ہے تو یہ محض خام خیالی ہے۔ ایسا کوئی بھی مفروضہ ذہن کے کھیت میں اُگ تو سکتا ہے، پنپ نہیں سکتا۔ ابھی چند لمحوں میں کوئی نہ کوئی ایس ایم ایس آکر آپ کے تمام مفروضوں کو تہس نہس کردے گا۔

کل تک ایس ایم ایس کے جھرنے بہہ رہے تھے۔ پھر وہ دریا میں تبدیل ہوئے۔ اب ایس ایم ایس پیکیجز سمندر کی طرح ہیں جس کے "پانی میں ڈوب کر ہم غرقاب" ہو چکے ہیں! اب تو نئی اور پرانی نسل کی بھی کوئی قید نہیں رہی۔ ایس ایم ایس کے معاملے میں جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے!

دنیا آج بھی غار کے دور میں جی رہی ہے۔ ذہن اور ذہنیت کی فرسودگی تو ملاحظہ فرمایئے کہ دنیا بھر میں وقت کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کے طریقوں کے بارے میں سوچا جاتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت بچایا جائے۔ ہم حیران ہیں کہ دُنیا بچائے ہوئے اِتنے سارے وقت کا کرے گی کیا؟ وقت کو بچانے سے کہیں بڑا مسئلہ اُسے ٹھکانے لگانے کا ہے! پاکستانی قوم نے کئی عشروں تک وقت بچانے کی ہزار کوششیں کیں اور کامیاب بھی ہوئی۔ اور اب وقت اِتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ اُسے ٹھکانے لگانا اولین ترجیح ٹھہرا ہے! کسی بھی چیز کی زیادتی نقصان پہنچاتی ہے۔ اور وقت کا حد سے زیادہ جمع ہو جانا؟ یہ تو قیامت ہے۔ اگر وقت زیادہ ہو تو انسان کو قاتل بنا کر دم کرنا پڑتا ہے! قتل کے الزام سے بچنے کے لیے بہتر ہے کہ kill لیتا ہے یعنی وقت کو وقت کو اِس طور ٹھکانے لگایا جائے کہ یہ بچ ہی نہ پائے! جدید ترین ٹیلی کام ٹیکنالوجی !اِس معاملے میں اپنا کردار خاصی عمدگی سے ادا کر رہی ہے، بلکہ کام پر لگی ہوئی ہے دن کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی ایک ساعت بھی ایسی نہیں جو حقیقی مفہوم میں محفوظ ہو۔ آپ کچھ اچھا کھا پی کر، سُکون سے بیٹھے ہیں کہ کسی دوست کا ایس ایم ایس آتا ہے اور آپ کا کھایا پیا حرام ہو جاتا ہے۔ آپ نے شدید گرمی کو پچھاڑنے کے لیے تربوز کا شربت پیا ہے اور ایس ایم ایس کے ذریعے طبّی ماہرین

کی یہ رائے آپ تک پہنچائی جاتی ہے کہ اِس موسم میں ٹھنڈے مشروبات سوچ سمجھ کر پینے چاہئیں۔ اور پھر وبائی امراض کے خدشے کی عینک سے تربوز کے شربت کو دیکھا اور دکھایا جاتا ہے! اب آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تربوز کا جو شربت آپ معدے میں انڈیل چکے ہیں اُس کا کیا کریں!

ایک ایس ایم ایس آتا ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے نیند پوری کرنا ضروری ہے تاکہ صحت برقرار رہے، جسم میں کہیں کوئی بڑی خرابی پیدا نہ ہو۔ آپ سوچتے ہیں کہ کوئی کوئی ایس ایم ایس کام کا بھی ہوتا ہے۔ آپ آٹھ گھنٹے کی نیند کے مشن پر نکلتے ہیں۔ ابھی تین دن ہی گزرتے ہیں کہ کسی دوست کا ایس ایم ایس آتا ہے کہ ماہرین کے نزدیک چھ گھنٹے کی نیند بھی کافی ہے، آٹھ گھنٹے سونے والے اپنے دو گھنٹے ضائع کرتے ہیں! اب آپ پھر اُلجھن میں پڑ جاتے ہیں کہ کتنا سوئیں، کتنا نہ سوئیں!

احباب ویسے تو اور بھی کئی طرح کی کرم فرمائیاں کرتے رہتے ہیں مگر اُن کا ایک خاص مشغلہ ہے بے سر و پا مشوروں سے نوازنا۔ بعض ستم ظریف اِس طریقے سے دوستوں کے تحمل کی گہرائی ناپتے ہیں! بے سر و پا مشوروں کی ترسیل میں ایس ایم ایس اُن کی خوب معاونت فرماتے ہیں۔ اگر کوئی مشورہ آپ کے حالات اور مزاج سے مطابقت رکھتا ہو تو پھر مزا ہی کیا رہا؟ مزا تو جب ہے کہ آپ کو

مشورے سے نوازا جائے اور آپ تلملا کر، بَل کھا کر رہ جائیں! بعض ایس ایم ایس تو شاید بھیجے ہی اِس لیے جاتے ہیں کہ یہ دیکھا جائے کہ آپ کس حد تک اور کس طرح آپے سے باہر ہوتے ہیں!

ہم 1994 میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ ٹھیک 18 سال بعد یعنی کچھ ہی دن ہوئے، "محبت ما قبل شادی" کے ہر دلعزیز موضوع پر ایک دوست کا خاصا "انتباہی" نوعیت کا ایس ایم ایس موصول ہوا۔ مَتن ملاحظہ فرمایئے۔ "اِسلام نکاح سے پہلے عِشق کی اِس لیے مذمت کرتا ہے کہ اِنسان اپنی ساری محبتیں اُس کے لیے بچا کر رکھے جو اِن کا اصل حقدار ہے۔ شادی سے پہلے کی محبت گویا ایسی ہے جیسے افطار سے پہلے کوئی افطار کرلے۔ افطار کا ثواب بھی نہ رہا، گناہ کا مرتکب بھی ہوا۔ کفارے کا خرچہ بھی، سزا بھی۔ جب ہم اپنے لیے پاک دامن شریکِ سفر کی تمنا کرتے ہیں تو ہمیں خود بھی ویسا ہی بننا چاہیے۔"

ہم نے جوابی ایس ایم ایس میں عرض کیا۔ "اب تو ہم خیر سے شادی شدہ ہیں۔ اگر 'زمانہ جاہلیت' میں کبھی کسی سے محبت کی بھی ہو تو اب کیا ہو سکتا ہے؟ بائی دی وے، شادی کے بعد بیوی سے محبت کرنے میں تو کوئی قباحت نہیں؟"

یہ جوابی ایس ایم ایس پڑھنے کے بعد اُس دوست نے ایس ایم ایس کی ترسیل میں

وقفہ متعارف کرادیا ہے ! پنچ لائن یہ ہے کہ دس سال قبل یہی حضرت ایک عدد دھانسو اور دَبنگ قسم کے عِشق میں مبتلا تھے اور پھر اِس عشق کو شادی کی منزل تک پہنچانے میں ہم نے بھی گواہ کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کیا تھا ! اگر ایس ایم ایس محض دو تین پیسے کا پڑتا ہو تو اِنسان بے فکر ہو کر ہر آئے ہوئے ایس ایم ایس کو آگے بڑھاتا رہتا ہے !اور یہ بھی نہیں دیکھتا کہ کِسے کون سا ایس ایم ایس بھیجنا یا نہیں بھیجنا چاہیے

خالص کاروباری گھرانے سے تعلق رکھنے اور پُرآسائش گاڑیوں میں سفر کرنے والے ایک شناسا کا ایس ایم ایس آیا جس کا متن کچھ یوں تھا۔ "انسان بھی کیا شے ہے۔ دولت حاصل کرنے کے لیے صحت داؤ پر لگادیتا ہے۔ اور پھر کھوئی ہوئی صحت بحال کرنے کے لیے دولت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے ! جیتا ایسے ہی جیسے ہزاروں سال جینا ہے اور مرا اِس "! طرح جاتا ہے جیسے دنیا میں کبھی آیا ہی نہ تھا

ہم نے جوابی ایس ایم ایس میں پوچھا۔ "بھائی صاحب ! ہمارا بسوں میں سفر کرنا اور اہل خانہ کے لیے دو وقت کی روٹی کا اہتمام کرنے کی خاطر نوکری کرنا کیا آپ کے نزدیک دولت کی ہوس کے زُمرے میں شامل ہے؟" اِس جوابی ایس ایم ایس کو پانے کے بعد !اُن کا ایس ایم ایس پیکیج کم از کم ہمارے لیے تو ختم ہوگیا

ذرا سوچیے کہ آپ گہری نیند میں ڈوبے ہوئے ہوں اور موبائل کی ٹن ٹن سے آنکھ کھل جائے۔ اور دیکھنے پر پتہ چلے کہ تازہ ترین ایس ایم ایس میں سونے والوں پر جاگنے والوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے! ایسے میں جی چاہتا ہے کہ موصوف سامنے ہوں اور آپ مار مار کر اُسے گہری نیند سُلادیں!

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کو دوست کی طرف سے ایس ایم ایس کے ذریعے سِری پائے کی دعوت ملتی ہے۔ بندہ تیار ہو کر جب دوست کے گھر پہنچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پایوں کا پتیلا صاف ہوئے تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ تحقیق سے منکشف ہوتا ہے کہ ایس ایم ایس مذاق پر مبنی نہیں تھا مگر کمپنی کے سسٹم میں پھنس جانے کے باعث چار گھنٹے کی تاخیر سے ملا! ہم پاکستانیوں کی بھی کیا قسمت ہے کہ ہر کام کی چیز دیر سے ملتی ہے!

اونٹ کروٹ بدل رہا ہے

دنیا جہان کی باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں اور آ چکی ہیں مگر لے دے کر ایک اپنی سیاست ہے کہ کسی بھی طرف سے سمجھ دانی میں داخل ہی نہیں ہو پاتی۔ سو سو جتن کر دیکھیے، ذہن کے گھوڑے لاکھ دوڑائیے، مجال ہے جو کہیں سے سیاست ککھ بھی سمجھ میں آ جائے! دُنیا "رشک" کی نظر سے دیکھ رہی ہے کہ ہم چار سال سے جمہوریت کے "مزے" لُوٹ رہے ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ جمہوریت میں "مزے" لوگوں کو کہاں سے دکھائی دے گئے۔ لُوٹنے والی بات سے ہم البتہ متفق ہیں کیونکہ ہم نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے کہ چار سال سے کچھ لوگ جمہوریت کی آڑ میں قومی دولت کو جی بھر کے، اپنی مرضی کے مطابق یعنی من چاہے طریق سے لُوٹ کر مستی سے سیاسی زمین پر لوٹ لگا رہے ہیں۔ اور صاحب! اب لگی لپٹی کیا رکھنی ہے، یاروں نے زندوں کو قبر میں دھکیلنے کے بعد کفن پر بھی نظریں گاڑی ہوئی ہیں! ہم یہ سوچ کر پریشان ہیں کہ

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے!

قومی سیاست نے ایسی نیرنگی پائی ہے اور ایسی سَت رنگی دکھائی ہے کہ سب کے

ہوش ٹھکانے آ گئے ہیں۔

برادرم راشد اشرف کو ہم پُرانی کتابوں کے "دُھتّی" تو قرار نہیں دے سکتے، مگر ہاں وہ اِن کتابوں کے شوقین، بلکہ رَسیا ضرور ہیں۔ ہر صبح صدر کے اولڈ بک بازار کا چکر نہ لگائیں تو کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ کھانا وہ کتابوں کی چھانٹی کے بعد کھاتے ہیں! گزشتہ دنوں نے راشد اشرف نے ہماری ویب ڈاٹ کام پر اپنے کالم میں لکھا کہ وہ اتوار کی صبح کتابوں کی خریداری کے بعد سید معراج جامی اور دیگر احباب کے ساتھ نہاری کھانے ہوٹل پہنچے۔ نہاری سے شکم سیر ہو کر وہیں گپ شپ لگانے بیٹھے۔ نصف گھنٹے بعد جامی صاحب کہنے لگے۔ "بھئی اب چلو، اونٹ کروٹ بدل رہا ہے!" نہاری اونٹ کے گوشت ہی کی تو تھی

برادرم راشد اشرف کے بقول جامی صاحب نے جس اونٹ کے کروٹ بدلنے کی بات کہی وہ کھایا جاچکا تھا۔ کسی طور سمجھ میں نہ آنے والی ہماری سیاست بھی اونٹ کے مانند ہے اور ہمیں ڈکارنے کے بعد اُس کے پیٹ میں بھی مروڑ اٹھتے رہتے ہیں! اب ایک بار پھر سیاست کا اونٹ کروٹ بدل رہا ہے۔ ڈٹ کر نہاری کھانے والوں کے پیٹ میں کروٹ بدلنے والا اونٹ تو بہر حال کچھ دیر میں اپنی منزل پر پہنچ کر بُہتوں کو سُکون کا سانس لینے کا موقع فراہم کرتا ہے مگر سیاست کا اونٹ کم بخت ایسا ستم ظریف ہے کہ بس کروٹیں ہی بدلتا رہتا ہے، کسی کے لیے راحت کا

سامان نہیں ہونے دیتا۔ خوب رَج کر اونٹ کی نہاری کھانے والوں سے سیاست کے اونٹ نے انتقام لینے کی یہ صورت نکالی ہے کہ اُنہیں چارہ بنا کر چبا ڈالا ہے۔ اور ہم ایسے بے دَم ہیں کہ سیاسی اونٹ کے پیٹ میں کروٹ بدلنے کا بھی ہم میں یارا نہیں!

حکومت یعنی منتظمہ اور عدلیہ میں ٹھنی ہوئی ہے۔ یہ تماشا فریقین ہی کو محظوظ کر رہا ہے۔ عوام بے چارے تماشا ضرور دیکھ رہے ہیں مگر محظوظ ہونے سے کہیں بڑھ کر پریشانی میں مبتلا ہیں۔ سیاست کے اونٹ کی کوئی کَل سیدھی نہیں۔ جمہوریت کے نام پر ایک بار پھر بے وقوف بننے کے عمل سے گزرنے والے عوام یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ سیاست کا اونٹ اگر بیٹھے گا تو کس کروٹ بیٹھے گا! چار سال متعارف کرائی جانے والی جمہوریت کی گردن بھی اونٹ کی سی ہے یعنی بہت آسانی سے منہ مار کر قومی وسائل ڈکار جاتی ہے۔ عوام کے نصیب میں صرف گردن اٹھا کر سیاسی اونٹ کی ریشہ دوانیاں دیکھنا رہ گیا ہے!

اونٹ کی ایک خاصیت یہ ہے کہ جب یہ لمبے سفر پر نکلتا ہے تو خوب کھا پی لیتا ہے تاکہ طویل فاصلے تک بھوک لگے نہ پیاس۔ ہمارے ہاں بھی جمہوریت کو چونکہ ہر چند سال بعد ایک طویل سفر پر روانہ کیا جاتا ہے اِس لیے جمہوریت کے نام پر متعارف کرائے جانے والے وقفے میں سیاسی اونٹ قومی وسائل خوب ڈٹ کے، رَج

کے کھا پی جاتا ہے تاکہ دور تک بھوک پیاس نہ ستائے! عوام کا یہ حال ہے کہ بے چارگی کا ٹھوسا ٹھونس کر صبر کے گھونٹ پی لینے پر اکتفا کرتے اور شاکر رہتے ہیں! آئیڈیل" عوام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور پاکستانی قوم نے تو آئیڈیل عوام کا بہترین" ورژن مارکیٹ میں متعارف کرایا ہے۔ حکمراں خواہ کچھ کرتے پھریں، ہمارا موقف یہ ہے کہ

ہم پہ الزام سہی، تو نہ ہو بدنام کہیں
!اپنے ہونٹوں کو ترے غم میں سیے جائیں گے

میر تقی میر بھی کی سادہ تھے۔ جس عطار کے لونڈے کے سبب بیمار پڑتے تھے اُسی سے دوا لینے پر بھی بضد رہتے تھے۔ ہم میں سے بھی میر کی خُو بُو گئی نہیں۔ ایک جیسے سیاسی سُوراخوں سے بار بار ڈسے جاتے ہیں اور پھر بھی باز نہیں آتے۔ اور اگر کوئی طعنہ دے تو چنداں پروا نہیں کرتے بلکہ اُسے محض الزام تراشی قرار دے کر بے نیازانہ صرفِ نظر کرتے ہیں۔ یعنی

نام لے لے کے ترا ہم تو جیے جائیں گے
!لوگ یونہی ہمیں بدنام کیے جائیں گے

اونٹ کا کینہ مشہور ہے۔ سیاسی اونٹ کا کینہ بھی بار بار ثابت ہوا ہے اور اور ہم سے زیادہ کون اِس حقیقت کو جانے گا کہ ہمی تو نشانہ بنتے آئے ہیں۔

سیاسی اونٹ واقعی شُتر بے مہار ہے جس نے جگہ جگہ منہ مار کر ہرے بھرے میدانوں کو ویرانوں بلکہ ریگ زاروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہاں بھی جیت سیاسی اونٹ ہی کی ہوئی ہے کہ اُس ستم ظریف کو بالآخر ریگ زار ہی تو اچھے لگتے ہیں اور درکار ہیں!

اگر مقننہ اور منتظمہ سے عدلیہ کی محاذ آرائی نے ہمیں ہنسا ہنسا کر بے دَم نہ کر دیا اور کچھ دیکھنے سُننے کی تاب باقی رہی تو ہم بھی دیکھیں کہ پیچیدہ اور کج ترین کَلوں والا سیاسی اونٹ، جو فی الحال کروٹ بدل رہا ہے، بالآخر کس کروٹ بیٹھتا ہے!

یہ دِن تو، ظاہر ہے، دیکھنا ہی تھا

انٹیلی جنس کمیونٹی کا سامنا کرنا تو بہت دور کی بات ہے، دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کی انٹیلی کمیونٹیز مل کر بھی پاکستان کی ایک سوشل کمیونٹی کی نیٹ ورکنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اِس کمیونٹی کا کمال یہ ہے کہ آبادی میں اضافے کی اطلاع اِسے ایسی تیزی سے ملتی ہے کہ متعلقہ گھر والے بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ اور ابھی وہ سنبھلے بھی نہیں ہوتے کہ ڈھول کی تھاپ سُنائی دینے لگتی ہے!

ہم لیاری کے اُن زندہ دِل انسانوں کی بات نہیں کر رہے جو چھوٹی گدھا گاڑیوں میں سوار ہوکر ڈھول اور ڈبّے کی تھاپ پر شہر کی سڑکیں ناپتے پھرتے ہیں۔ ہمارا اِشارہ اُس کمیونٹی کی طرف ہے جس کے وابستگان ڈھول بجا بجاکر شہریوں کا بینڈ بجاتے ہیں یعنی ٹھمکتے ہوئے، ٹُھنکتے ہوئے آتے ہیں اور کچھ نہ کچھ لے کر ٹلتے ہیں! اگر آپ دوستوں میں یا اہل خانہ کے ساتھ کہیں بیٹھے ہوں اور کوئی خواجہ سرا آ دھمکے تو فوراً پانچ دس روپے دیکر ٹالتے اور جان چھڑاتے ہیں! ایسے موقع پر اور کوئی حربہ سُوجھتا ہی نہیں۔ جب کوئی خواجہ سرا تالی پیٹتا ہے تو صرف مچھر زد میں نہیں آتے بلکہ ہماری جیب بھی پچک جاتی ہے!

زمانے کا انقلاب دیکھیے کہ تالی پیٹنے والوں نے اب اپنی روش بدلی ہے اور ایسی بدلی ہے کہ بے اختیار (اپنا) سَر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ اب تک ہم جن کے ناز و انداز دیکھتے آئے ہیں وہ وقت کے پہیے کو اُلٹا گھمانے پر تُل گئے ہیں۔ کل تک تو یہ ہوتا تھا کہ کہیں کوئی خواجہ سرا دکھائی دیتا تھا تو ساتھ ہی غمزہ و عشوہ و ادا بھی جلوہ فرما ہوتے تھے۔ اگر کسی بس میں کوئی خواجہ سرا چڑھ جاتا تو لوگ ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ اور وہ جس کسی کے پاس بیٹھتا وہ کھنچا کھنچا رہتا۔ گزشتہ دنوں خواجہ سرا کمیونٹی نے یہ شکایت کچھ اِس انداز سے دور کی کہ لوگ جگر تھام کر رہ گئے۔ کراچی میں منگھوپیر روڈ پر حبیب بینک سائٹ) کے نزدیک ایک بس میں چار خواجہ سرا سوار ہوئے اور اسلحے کے زور پر)

!مسافروں کو لوٹ لیا

جس نے بھی خبر سُنی اُسے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ یقین اِس لیے نہیں آیا کہ جن کی آمدنی پہلے ہی قابل رشک ہے اُنہیں کیا ضرورت آن پڑی تھی کہ لوٹ مار کرکے خود کو قابل شک بناتے؟ خواجہ سراؤں کو ہتھیار اٹھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اُن کا تو پورا وجود چلتا پھرتا ہتھیار ہے! وہ تو محض تالی بجاکر قدر دانوں کا مال ہی نہیں، دِل بھی

!لوٹ لیتے ہیں

اگر کوئی پیار سے پھل یا کھانے پینے کی کوئی اور چیز دے تو بچوں کو اچھا لگتا ہے مگر جناب ! اسکول کے باہر ٹھیلوں سے پھل اور دوسری چیزیں چرا کر کھانے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ یہی حال اب ہمارے پورے معاشرے کا ہوگیا ہے۔ اگر کوئی چیز آسانی سے مِل رہی ہو تو لطف نہیں دیتی۔ کسی بھی چیز میں تھوڑا بہت مزا پیدا کرنے کے لیے لوٹ مار کے ذریعے حصول کو ترجیح دی جاتی ہے ! معاشرے کا یہ رنگ خواجہ سراؤں کے دل و دماغ پر بھی چڑھ گیا ہے۔ لوگوں کا پیار سے جیب ڈھیلی کرنا شاید اب اُنہیں اچھا نہیں لگ رہا!

مرزا تنقید بیگ نے یہ خبر سُنی تو اُن کے منہ سے بے ساختہ سرد آہ نکل گئی۔ ہم نے سبب پوچھا تو فرمایا۔ "آج معلوم ہوا کہ احساس کمتری کیا ہوتا ہے۔ جن پر یکسر ناکارہ و بے فیض ہونے کا گمان کیا جاتا ہے وہ اب اٹکھیلیوں اور انگڑائیوں کی سطح سے بلند ہو کر لوٹ مار کے ذریعے دوسروں کی جیب خالی کرانے سے بھی گریز نہیں کر رہے اور ایک ہم ہیں کہ آج تک ہر مہینے کی دس تاریخ کو پوری تنخواہ کو بیگم کے ہاتھ میں جانے سے نہیں روک سکے!"

ہم کہا آپ اپنا احساس کمتری بہت آسانی سے ختم کر سکتے ہیں۔ مرزا نے وضاحت چاہی تو ہم نے عرض کیا کہ خواجہ ڈکیت گروپ جوائن کر لیجیے۔ یہ سُن کر مرزا نے ہمیں ایسی خشمگیں نظروں سے دیکھا جیسے شادی ہال کے باہر ڈھول بجانے کے

!بعد صرف پچاس کا نوٹ پا کر کوئی خواجہ سرا لڑکے والوں کو گھورتا ہے
مرزا کو اِس بات کا دُکھ ہے کہ جن کے زنانہ پن کی دُنیا میں دُھوم ہے اُن کے ہاتھوں اصلی تے نارمل مَردوں کو لُٹنا پڑا ہے! علامہ نے فرمایا تھا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا ہے نہیں
!محو حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

سچ ہی تو ہے۔ مسلح خواجہ سراؤں کو ڈکیتی کرتے دیکھنا ایسا منظر ہے کہ جس کا دہرانا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں! زمانے کا ایسا "انقلاب" سمجھ میں آئے گا تب ہی تو بیان !بھی ہو پائے گا

ہم مرزا کا دُکھ سمجھتے ہیں۔ مگر اب کسی بھی بات کا دُکھ اور افسوس کیوں ہو؟ جس ملک میں نا اہل اقتدار میں ہوں، ڈھنگ سے پڑھنے میں ناکام رہنے والے تدریس پر مامور ہوں، ہر بے ایمان کو پوری ایمانداری سے لُوٹ مار کیلئے تعینات کیا جاچکا ہو، محنت کرنے والوں کے نصیب میں صرف دُکھ اور پریشانی رہ گئی ہو، کام نہ کرنے والا ہر شخص دھڑلّے سے موج اُڑا رہا ہو اور غریبوں پر زندگی حرام کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا گیا ہو وہاں اگر خواجہ سراؤں کو ڈکیتی کی شہہ نہیں ملے گی تو اور کیا ملے گا؟

مرزا کے خیال میں یہ بہت ہی شرمندگی کی بات ہے کہ اب پاکستانیوں کو خواجہ سرا بھی لُوٹیں۔ ہم نے عرض کیا کہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے ہر شعبے کے ہر اعلیٰ منصب پر چُن چُن کر اور چھان پھٹک کرکے خواجہ سرا بٹھائے ہیں! اِس روش ہی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ کسی بھی شعبے میں عمدہ کارکردگی پیدا نہیں ہو پارہی۔ نااہلی ہے کہ جھوم جھوم کر رقص کر رہی ہے اور اِس تماشے کو دیکھ کر نااہل خواجہ سراؤں کے حصے کی تالیاں بھی ہم ہی پیٹ رہے ہیں!

فِطری علوم کے ماہرین بے چارے اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لیے سَو سَو جتن کیا کرتے ہیں۔ لیبارٹری میں ایک مخصوص ماحول پیدا کئے بغیر وہ کام نہیں کر سکتے۔ اُن کے تمام تجربات چند شرائط کے محتاج ہوتے ہیں۔ تحقیق کے لیے چند "متعینات" ناگزیر ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف بشری علوم کے ماہرین کو دیکھیے کہ پورے معاشرے ہی کو تجربہ گاہ کا درجہ دیکر جو جی میں آئے، مزے سے بَک دیتے ہیں! اور لُطف کی بات یہ ہے کہ اُن کی بیشتر آراء دُرست تسلیم کرلی جاتی ہیں! عمرانیات کے ماہرین اگر ایک ہی تجربہ ایک سے زائد مقامات پر کریں تو نتائج مختلف نکلتے ہیں۔ اور وہ یہ کہتے ہوئے صاف بچ نکلتے ہیں کہ ہر انسان مختلف ہوتا ہے اس لیے نتائج بھی مختلف ہی نکلنے ہیں! پانی کا فارمولا تو ہر مقام پر ایک ہی رہے گا، مگر یہ اُصول جذبات اور احساسات پر اطلاق پذیر نہیں ہوتا!

ترقی کرنے کے طریقے سُجھانے والے ماہرین بھی ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ کبھی کبھی تو ہنسی تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ کوئی کہتا ہے کہ زیادہ کام کرنے سے ترقی ملتی ہے، کِسی کا خیال ہے کہ کم مگر معیاری کام کرنے سے آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے، کِسی کی رائے یہ ہے کہ زیادہ اور معیاری کام اگر تھوڑی

بہت چاپلوسی کے بغیر کیا جائے تو بے سُود ثابت ہوتا ہے اور کسی کی مستند رائے یہ ہے کہ جب چاپلوسی سے کام لیا جائے تو مزید کوئی کام کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ! اور اگر چاپلوسی کو کافی نہ سمجھتے ہوئے کچھ کام بھی کرلیا جائے تو غیر مطلوب نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا ہے ! جو لوگ ترقی سے متعلق لٹریچر پڑھتے ہیں وہ بے چارے پھر کوئی اور لٹریچر پڑھنے کے قابل نہیں رہتے۔ اور بالخصوص فکاہیہ ادب پڑھنے کی زحمت سے ہمیشہ کے لیے چُھوٹ جاتے ہیں !

مرزا تنقید بیگ کئی دن سے بہت پریشان ہیں۔ دفتر بھی نہیں جارہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ دفتر جائیں تو کام کس طرح کریں۔ پوچھنے پر اُنھوں نے بتایا کہ امریکہ کی ییل یونیورسٹی کے ماہرین نے کہا ہے کہ ترقی کرنا ہے تو دفتر میں زیادہ سے زیادہ بولنا چاہیے۔ مرزا اِس لیے مخمصے میں مبتلا ہیں کہ وہ زندگی بھر باتیں ہی تو بناتے رہے ہیں، پھر ترقی کیوں نہیں ہو پائی ! شاید مرزا کے اعلیٰ افسران اب تک ماہرین کی تحقیق سے آگاہ نہیں ہو پائے۔

ییل یونیورسٹی کے ماہرین کہتے ہیں کہ دفاتر میں جو لوگ زیادہ بولتے ہیں اُنہی کو کامیابی ملتی ہے۔ باس کو ایسے لوگ پسند ہیں جو اپنی رائے کا اظہار کرنے میں بُخل سے کام نہ لیں۔ آپ سوچیں گے اِس تحقیق کی روشنی میں تو صرف خواتین بھرپور ترقی پا سکتی ہیں کیونکہ وہی بولنا جانتی اور بولتی ہیں۔ مگر

خواتین کے لیے) دل خراش حقیقت یہ ہے کہ ماہرین ترقی کے لیے انہیں خاموش رہنے) کا مشورہ دے رہے ہیں ! یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے مچھلی سے کہا جائے کہ تیرنا بھول جائے ! خواتین کو ترقی کے لیے دفتر میں خاموش رہنے کا مشورہ دینے کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ماہرین اُنہیں ترقی کرتی ہوئی دیکھنا ہی نہیں چاہتے ؟ کیا یہ ممکن ہے کہ دفتر میں خواتین ہوں اور بات نہ کریں ؟ ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ ماہرین اس قدر خواتین دشمن رویہ اختیار کر سکتے ہیں ! ان پر تو حقوق نسواں سے متضاد رائے دینے کا ! مقدمہ دائر کیا جانا چاہیے

مرزا دفتر میں دن بھر باتیں کیا کرتے تھے۔ زیادہ باتیں کرنے پر لوگ کل تک اُنہیں زنانہ مزاج رکھنے کا طعنہ دیا کرتے تھے۔ ہم نے کئی بار سمجھایا تو اُنہوں نے تھوڑا خاموش رہنا سیکھ لیا۔ اب وہ بلا ضرورت بولنے سے گریز کرتے ہیں یعنی خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ ماہرین کی رائے کا احترام کرتے ہوئے ترقی کے لیے خاموش تو خواتین کو رہنا ہے۔ اگر مرزا ہمارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے خاموش رہنے کی روش پر گامزن رہے تو پھر زنانہ پن کا طعنہ کسا جائے گا ! ماہرین کی تازہ ترین رائے پڑھ کر مرزا ہم سے ناراض ہیں کہ ترقی تو زیادہ بولنے سے ہوتی ہے اور ہم نے اُنہیں چُپ کرا دیا ہے ! اِن ماہرین کا کوئی علاج نہیں۔ اِن کی تحقیق دوستی کو بدگمانی کی نذر

!کرنے میں دیر نہیں لگاتی

مرزا کا ایک اور تازہ مخمصہ یہ ہے کہ دفتر میں کام کس انداز سے کریں؟ بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر؟ برطانوی اخبار دی ٹیلی گراف نے ایک رپورٹ میں ماہرین کے حوالے سے بتایا ہے کہ دفاتر میں جو لوگ زیادہ دیر بیٹھے رہتے ہیں ان کے خون میں لوتھڑے بننے کا عمل تیزی ہو جاتا ہے۔ مرزا نے جب سے یہ خبر پڑھی ہے، سہمے سہمے سے ہیں۔ اگر دفتر میں زیادہ دیر بیٹھے رہتے ہیں تو خون میں لوتھڑے بننے کا خطرہ ہے اور اگر سیٹ سے بار بار اٹھتے ہیں تو باس کے ناراض ہو جانے کا احتمال ہے۔ ہم نے یہ کہتے ہوئے ان کی ڈھارس بندھائی کہ اگر وہ دفتر میں اپنی سیٹ سے بار بار اٹھیں گے تو تمام ساتھی اللہ کا شکر ادا کریں گے اور باس سے خود سفارش کریں گے کہ کوئی کارروائی نہ کی جائے! لوتھڑوں کے خدشے سے مرزا کے اُٹھ جانے پر اگر دفتر کے ساتھیوں کو کچھ دیر سکون کا !سانس لینے کا موقع ملتا ہے تو اس کا مرزا کو ضرور اجر ملے گا

تحقیق در تحقیق نے دفاتر کے کام کاج کو چُوں چُوں کا مربہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ دفاتر میں کام کرنے والے جب ماہرین کے مشوروں پر عمل کرتے ہیں تو ایک نئے انداز کا روٹین معرض وجود میں آتا ہے۔ ماہرین کے مشورے اپنی جگہ اور باس کی مرضی اپنی جگہ۔ دفتر کی حدود میں تو باس ہی اصل محقق اور ماہر ہوتا

ہے۔ اگر وہ کہے کہ سیٹ پر بیٹھے رہنا ہے، ہلنا نہیں ہے تو پھر خون میں لوتھڑے بنیں یا خون کا پانی ہو، بیٹھنا ہی پڑے گا۔ اور اگر باس فیلڈ میں دوڑا دے تو مجال ہے کہ کوئی دفتر میں بیٹھنے کا سوچ بھی لے!

ماہرین کو دفاتر میں ترقی کے طریقے اور اصول تجویز کرتے وقت کچھ وقت ہمارے دفاتر میں بھی گزار لینا چاہیے۔ اِس صورت میں اُن کے ذہن کے مزید دریچے وا ہوں گے اور وہ تحقیق کے لیے کئی نئے موضوعات حاصل کر پائیں گے۔ دُنیا بھر میں ماہرین لوگوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ دفتر میں خوش مزاجی اپنائیں اور کام کو بوجھ نہ سمجھیں۔ ہمارے ہاں، شمالا نظر نہ لگے، لوگ دفتر میں خوش مزاجی کو اِس سلیقے سے اپناتے ہیں کہ کام کو کام ہی نہیں سمجھتے! خوش خوش آتے ہیں اور ہنستے گاتے جاتے ہیں۔ کام کیا کیا ہے وہ کم بخت کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے! بعض سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر تو ایسے بے باک ہیں کہ پکنک پوائنٹ کا منظر پیش کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے!

ماہرین لاکھ تحقیق کریں مگر وہ کبھی اِس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے کہ دفاتر ذہنی اُلجھنوں سے نجات پانے کے مراکز کے طور پر بھی کام کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں بیشتر افراد دفتر کو اپنی تمام نجی یا گھریلو اُلجھنوں کے بیان اور اُن سے گلوخلاصی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر کسی سے گھریلو مسئلے پر بات

کرنی ہو تو کسی کُھلی، پرفضا مقام پر کرنی چاہیے۔ اور دفتر سے بڑھ کر پُرسکون اور پُرفضاء جگہ کون سی ہوسکتی ہے؟

دُنیا والے اب تک دفتر میں ترقی کرنے یا ترقی پانے کے طریقوں پر غور کر رہی ہے اور ہم نے دفاتر کو کئی طرح کے اُمور کی انجام دہی کے مراکز میں تبدیل کر دیا ہے۔ دفتری سیاست اِس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ اب سیاسی جماعتیں اپنے کارکنوں کو تربیت کے لیے دفاتر میں جاب پر لگاتی ہیں!

دفتری اُمور پر بے سَر پیر کی تحقیق سے نجات پانے کا ایک اچھا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ محققین کو پاکستانی دفاتر میں چند دن گزارنے پر مجبور کیا جائے تاکہ اُن کے دِماغ ٹھکانے پر آ جائیں اور وہ تحقیق کے نام پر لوگوں کو پریشان کرنے سے توبہ کریں!

وزیر خزانہ کا لافٹر شو

ویسے تو خیر عوام سال بھر قربانی کے بکروں کی طرح حلال ہوتے ہی رہتے ہیں مگر سال میں ایک بار بھرپور جھٹکا کرنے سے قبل اُنہیں پریشانی اور خدشات سے بچانے کا سرکاری اور نجی سطح پر تھوڑا بہت اہتمام ضرور کیا جاتا ہے۔ اِس اہتمام کو عرفِ عام میں "پری بجٹ سیمنار" کہا جاتا ہے! جس طرح کسی پیارے کے مرنے کی خبر تھوڑی سی احتیاط سے سُنائی جاتی ہے تاکہ دِل کو دھچکا نہ لگے بالکل اُسی طرح پری بجٹ سیمنارز میں اُن اقدامات کی جھلک دِکھائی جاتی ہے جو بجٹ میں شامل ہونے والے ہوتے ہیں! صنعت کار، سرمایہ کار اور تاجر اِن سیمنارز میں حکومت کو مشوروں سے نوازتے ہیں اور حکام وضاحتیں پیش کرتے ہیں، حکومتی کارکردگی بیان کرتے ہیں۔ عوام اِن سیمنارز کی رپورٹس اخبارات میں پڑھ کر محظوظ ہوتے ہیں یعنی جس مقصد کے لیے یہ سیمنارز ہوتے ہیں وہ بخوبی حاصل ہوتا ہے!

وفاقی وزیر خزانہ ڈاکٹر عبدالحفیظ شیخ نے گزشتہ دنوں فیڈریشن آف چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے زیر اہتمام کراچی کے فیڈریشن ہاؤس میں پری بجٹ سیمنار سے خطاب کرتے ہوئے ایسے شاندار نکات بیان فرمائے ہیں کہ معاشی اُمور سے متعلق ان کی ذہانت پر بے اختیار فِدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ کئی بڑے اور

بُنیادی مسائل کا موصوف نے ایک ہی جھٹکے میں جھٹکا کر دیا۔ اپنے خطاب میں ڈاکٹر عبدالحفیظ شیخ نے فرمایا کہ ملک میں بجلی کا کوئی بحران نہیں۔ طلب کے مطابق بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے، اصل مسئلہ سَستی بجلی کی فراہمی یقینی بنانے کا ہے۔

وزیرِ خزانہ کی اِس بات سے ہمیں یاد آیا کہ راجہ پرویز اشرف جب پانی اور بجلی کے وفاقی وزیر تھے تو میڈیا سے گفتگو میں اکثر بجلی کے بحران کی تشریح کچھ اِس انداز سے فرمایا کرتے تھے: "میں آپ کو بتاتا ہوں بجلی کا بحران کیوں ہے۔ جب طلب زیادہ ہوتی ہے اور اُس کے مطابق بجلی پیدا کرنا ممکن نہیں ہوتا تو رسد گھٹ جاتی ہے اِس لیے بجلی کا بحران پیدا ہوتا ہے!" اِس قدر جامع تشریح ہی کا یہ کمال تھا کہ لوگ اُن کے روبرو بجلی کی لوڈ شیڈنگ کی تازہ ترین ڈیڈ لائن پوچھنا بھول کر وسوسوں میں گھر جاتے تھے کہ طلب پر رسد کو برتری کس طور دِلائی جاسکے گی! کچھ کچھ ایسی ہی بات وزیر خزانہ نے کہی ہے۔ ہمیں اب تک اندازہ ہی نہ تھا کہ ملک میں بجلی کا بحران کیوں ہے۔ بھلا ہو صنعت کاروں اور تاجروں کا جنہوں نے سیمنار کا اہتمام کیا اور وزیر خزانہ نے اُس میں تقریر فرما کر ہمیں اصل مسئلے سے آگاہ کر دیا۔ اب تک ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ حکومت کے لیے اصل مسئلہ بجلی پیدا کرنا نہیں، بلکہ سَستی فراہم کرنے کا ہے۔ یہ بھی وزیر موصوف کی عنایت ہے کہ ہمیں صرف مسئلے سے آگاہ کیا، حل تجویز نہیں کیا۔ اگر وہ حل تجویز کر دیتے تو پھر ہم کیا کرتے؟ تھوڑا بہت کام ہمیں بھی کرنا چاہیے۔ اِس میں فائدہ ہمارا

یعنی عوام ہے۔ اگر حکومت ہمارے کسی مسئلے کا حل سوچے گی تو اپنے حساب سے سوچے گی۔ اور جب وہ حل سامنے آئے گا تو عوام شکایت کریں گے کہ یہ بات رہ گئی، وہ بات رہ گئی۔ اگر عوام خود سوچیں گے تو ہر پہلو پر نظر رکھیں گے اور کہیں سے کوئی کسر رہنے نہیں دیں گے۔ عوام کا سوچنا معاملات کو بہتر بنانے کی طرف پہلا قدم ہے۔ سوچنا ایک بڑی فنی مہارت ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں سوچنے کی تربیت دینے والے ادارے قائم ہیں جو فیس کی مد میں خطیر رقم وصول کرکے کورس کراتے ہیں۔ ہم پاکستانیوں پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ حکومت ہمیں سوچنا سکھا رہی ہے اور اِس کے چارجز بھی نہیں لے رہی ! ایسی حکومت اللہ ہمارے دُشمنوں کو بھی عطا فرمائے !

یہ بھی ہماری حکومت کا احسان ہے کہ جب غم حد سے بڑھ جاتے ہیں تو تھوڑی بہت خوشی کسی نہ کسی بہانے ہماری جھولی ڈال دیتی ہے۔ وفاقی کابینہ کے بیشتر ارکان کو شاید خصوصی ہدایت کی گئی ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسے بیانات دیں، ایسے نکات بیان کریں جو لوگوں کے دِل کا بوجھ ہلکا کرنے میں معاون ثابت ہوں ! وزیر خزانہ نے پری بجٹ سیمنار کو لافٹر شو میں تبدیل کرکے ثابت کردیا کہ حکومت عوام کو ریلیف دینے کے معاملے میں سنجیدہ ہے ! دوسری حکومتیں بجٹ میں ریلیف دیتی ہیں، ہمارے ہاں حکومت نے بجٹ سے قبل ہی ریلیف بانٹنے کا کام شروع کردیا ہے !

وزیر خزانہ نے انتہائی حیرت زدہ کر دینے والی حقیقت بیان فرمائی کہ حکومت کے پاس لاگت سے کم پر بجلی پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں! اِس نکتے کی وضاحت حکومت سے تعلق رکھنے والی کوئی ذہین شخصیت ہی کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحفیظ شیخ نے مزید فرمایا کہ وہ بہت جلد ایسے اقدامات کریں گے کہ ٹیکس نہ دینے والوں کے ہوش اُڑ جائیں گے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اِس جملے سے ہم قہقہہ، بلکہ قہقہے کس طرح کشید نہ کریں؟ وزیر خزانہ ٹیکس ادا نہ کرنے والوں کے ہوش اُڑانے کی بات کر رہے ہیں جبکہ دوسری طرف خود حکومت اُڑن چُھو ہونے کی کیفیت سے دوچار دِکھائی دے رہی ہے! ہوش اگر زیادہ نہ ہوں تو اُنہیں اُڑانے میں مزا نہیں آتا۔ حکومت نے چار برسوں کے دوران ٹیکس نہ دینے والوں کو شاید یہی سوچ کر پورا موقع دیا کہ ہوش اچھی طرح جمع کرلیں تاکہ اُنہیں اُڑانے میں مزا آ جائے! ٹیکس دینے سے صاف انکار کرنے والوں کا تو حکومت کچھ نہیں بگاڑ سکتی اِس لیے بہتر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی کے مِصداق ٹیکس دینے پر کمربستہ افراد کی گوشالی کے لیے کمر کس لی جائے! خون پسینے کی کمائی سے ٹیکس دیکر قومی خزانہ بھرنے والوں ہی کو طرح طرح سے بہلانے پُھسلانے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر بجٹ کے نام پر سارا نزلہ اُن پر گرا دیا جاتا ہے۔ اِس عمل کو ہم "مَرے کو مارے شاہ مدار" بھی قرار دے

سکتے ہیں !

خصوصی کرم کے زُمرے میں فرمایا گیا کہ جو لوگ پہلے ہی ٹیکس دے رہے ہیں اُن سے مزید ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ سیدھی سی بات ہے۔ گنّے کے پُھوس سے رَس نکالنے کی کوشش حماقت ہی کہلائے گی ! ایک مژدہ یہ بھی سُنایا گیا کہ امیروں اور غریبوں سے یکساں ٹیکس لیا جائے گا۔ ہم اب تک سمجھ نہیں پائے کہ امیروں کی جیب بھی غریبوں کی طرح خالی کرالی جائے گی یا جس طرح امیروں سے برائے نام وصولی ہو رہی ہے اُسی طرح غریبوں کو بھی بخش دیا جائے گا تاکہ وہ سُکون کا سانس لے سکیں !

وزیر خزانہ نے اپنی تقریر میں ایک عظیم نکتہ یہ بھی بیان کیا کہ عوام کو ہر مہنگی چیز کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ جب کسی صحافی نے مہنگائی کے حوالے سے سوال کیا تو موصوف نے فرمایا کہ بکرے کا گوشت مہنگا ہے تو غریبوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ اُن کا مسئلہ ہے ہی نہیں۔ ذرا طبع کی روانی تو دیکھیے کہ وزیر خزانہ نے ایک عالمگیر حقیقت کس قدر سادگی اور آسانی سے بیان کردی ! مُوسیقی کی اصطلاح میں اِسے سچّا سُر لگانا کہتے ہیں۔ اپنی تقریر میں اُنھوں نے ایسے ہی کئی اور سچّے سُر بھی لگائے ! عوامی مسائل کا حل سُجھاتے ہوئے اُن کی تقریر کی لذت صرف محسوس کرنے کی چیز ہے ! ہمیں تو

محمد رفیع مرحوم یاد آ گئے جو گاتے ہوئے پانچویں سپتک تک ایسی آسانی سے پہنچتے تھے کہ سُننے والے آج بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ کچھ کچھ ایسی ہی آسانی سے ہمارے محبوب وزیر خزانہ بھی سیاسی سُر منڈل میں پانچویں سپتک تک جا پہنچتے ہیں اور کہیں کوئی سکتہ محسوس نہیں ہوتا! عوام کو ایک ٹکٹ میں دو مزے ملتے ہیں، تقریر کی تقریر اور نغمہ سرائی کی نغمہ سرائی!

حکومت بذلہ سنجی کے ذریعے عوام کو بجٹ سے قبل تھوڑی بہت روحانی ریلیف دینا چاہتی ہے تو ہمیں اِس روش کا خیر مقدم کرنا چاہیے مگر بذلہ سنجی کی بھی ایک حد ہونی چاہیے۔ عوام کسی وزیر کو سُنتے ہیں تو اِس آس پر کہ شاید زندگی کو آسان بنانے کا کوئی نُسخہ مل جائے، کوئی ایسا اعلان ہو جائے جس سے کچھ بہبود کا اہتمام ممکن ہو! مگر اے وائے ناکامی کہ وزراء کی تقاریر محض لافٹر شو کا منظر پیش کرنے تک محدود رہتی ہیں اور غریب اپنے مسائل پر قہقہے لگاتے رہ جاتے ہیں! بُنیادی سوال یہ ہے کہ کیا صرف قہقہے غریبوں کا پیٹ بھر سکتے ہیں؟ اگر ہاں، تو کب تک؟ اور کیا بات بات پر قہقہے نفسیاتی بدہضمی پیدا نہیں کریں گے؟

بجٹ پیش کئے جانے تک پری بجٹ سیمنارز ہوتے رہیں گے، تجاویز کی شکل میں لوگوں کا دِل بہلانے کی کوششیں کی جاتی رہیں گی، ممکنہ اقدامات کو قبول اور

برداشت کرنے کے لیے درکار ذہنی آمادگی پیدا کرنے پر زور دیا جائے گا۔ یہ تماشا ایسا دِل کُشا ہے کہ لوگ ٹی وی چینلز کے لافٹر شو اور کامیڈی سرکس دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے حکومتی شخصیات اور کاروباری برادری کے لوگوں کی باتیں پڑھ کر ہنسنے ہنسانے کا اہتمام کرتے رہیں گے۔

کچّے پن کا پکّا پن

باقاعدگی اور تواتر سے گانے والے بعض فنکاروں کو سُن کر اندازہ ہوتا ہے کہ سُر اور تال کا ملاپ کرائے بغیر بھی گایا جاسکتا ہے! واسوکے حوالے سے بھرپور شہرت پانے والے پاپ سنگر شہزاد رائے کا فرمان ہے کہ موسیقی ایسا فن ہے جسے سیکھنے کی کچھ خاص ضرورت نہیں! بعض گانے والوں کا معاملہ یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، ثابت قدمی کی مہربانی سے، بے سُرا پن ضرور پختہ ہوتا جاتا ہے! اگر آپ کسی گانے والے کے بارے میں سوچیں کہ وہ بے سُرا ہی گائے گا اور پھر وہ واقعی بے سُرا گائے تو سُکون کا سانس لیجیے کہ اِس دنیا میں کوئی ہے جو آپ کی "توقع" پر پُورا اُترا!

نصیب نصیب کی بات ہے کہ قدرت نے آپ کو سیاسی گائیکی کے معاملے میں بھی محروم نہیں رکھا! ہمارے بیشتر سیاسی گوّیے بھی ایسے ہی ہیں۔ بے سُرا گاتے گاتے "فن" میں ایسے طاق ہوچکے ہیں کہ اب جب بھی گاتے ہیں، اپنی بگڑی ہوئی فریکوئنسی سے کچھ نہ کچھ توڑ ہی دیتے ہیں! اور تان تو خیر کسی نہ کسی خرابی ہی پر توڑتے ہیں! یہ وہ پتیلیاں ہیں جنہیں گوشت کے گلنے سے پہلے ہی چولھے سے اُتار لیا گیا ہے!

دنیا کو پتہ ہی نہیں تھا کہ جمہوریت کیا ہے۔ حکومت کی مہربانی ہے کہ چار برس کے دوران سرکاری اور غیر سرکاری میڈیا پر ایسا راگ الاپا کہ بچہ بچہ جان گیا کہ جمہوریت بہترین انتقام ہے! دُنیا کی حسرت ہی رہی کہ جمہوریت کا انتقامی روپ دیکھے مگر ہم نے تو دیکھ اور بُھگت بھی لیا! (اعلیٰ ظرفی دیکھیے کہ اِس پر ہم نے کبھی غرور نہیں کیا!)

جمہوریت کے انتقام والا راگ ایسے تواتر اور بے سُرے پن سے الاپا گیا ہے کہ اب تو اِس پر تن من لُٹانے کو جی چاہتا ہے۔ دَھن لُٹانے کی زحمت اُٹھانے سے ہم بچالیے گئے ہیں کہ وہ پہلے ہی لُوٹا جاچکا ہے! بقول غالب

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا

رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو!

سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا مُقدر زیادہ خراب ہے یا حکومت کے وزارت بدوش مُنشیوں کی زبان زیادہ کالی ہے۔ جب بھی کسی وزیر نے اپنے محکمے کی کارکردگی بہتر بنانے کا دعویٰ کیا ہے، طرح طرح کی خرابیاں بڑھی ہیں اور عوام کا مزید ناک میں دم ہوا ہے۔

وعدہ خلافی اور وعدہ فراموشی کے موضوع پر کہے جانے والے اشعار سے اُردو شاعری بھری پڑی ہے۔ قدیم اور جدید دور کے شعراء نے اِس موضوع کو حتی المقدور

یعنی ذہنی استطاعت مزاجی استقامت کے مطابق پامال کیا ہے مگر مارچ 2008 میں پیپلز پارٹی کو چوتھی بار اقتدار ملنے کے بعد سے معاملہ یہ ہے کہ وعدہ خلافی سے متعلق اُردو کے تمام کلاسیکی اور جدید اشعار پھیکے سے پڑگئے ہیں اور وعدہ خلافی بُھگتنے والوں کی کیفیت کماحقہ بیان کرنے سے قاصر ہیں! تجریدی آرٹ کی طرح اگر تجریدی انداز کی شاعری کی جائے تو شاید پیپلز پارٹی کے رواں عہدِ حکومت کو کچھ بیان کیا جاسکے!

راجہ پرویز اشرف پانی و بجلی کے وزیر تھے تب.برقی رَو میں کم اور اُن کے بیانات میں فلکچویشن زیادہ پائی جاتی تھی! موصوف کو بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کی ڈیڈ لائن دینے کا ہوکا تھا۔ لوڈ شیڈنگ بھی ایسی ڈھیٹ تھی کہ اُن کی ہر ڈیڈ لائن کو غُچّہ دے گئی۔ ڈیڈ لائنز دیتے دیتے پرویز اشرف تھک گئے اور بالآخر اُنہیں کہنا پڑا کہ لوڈ شیڈنگ کسی ڈیڈ لائن کی محتاج نہیں بلکہ اِس سے بہت اُوپر کی چیز ہے! اب اگر کوئی ان سے لوڈ شیڈنگ کے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کو کہے تو خاموشی کے اندھیرے میں گم ہو جاتے ہیں!

اگر آپ خامی کی پُختگی مزید مُلاحظہ فرمانا چاہیں تو وفاقی وزیر داخلہ باہیں پسارے آپ کے سامنے ہیں۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے، موصوف کو ایسی خوبی ودیعت ہوئی ہے کہ اِدھر کچھ کہتے ہیں اور اُدھر سبھی کچھ اُن کے بیان کے

برعکس ہو جاتا ہے یا ہونے لگتا ہے! حد تو یہ ہے کہ ہوا بھی اُن کے خلاف بہنے لگتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر کبھی خُشک سالی کے دوران دریا کے پاس کھڑے ہو کر رحمٰن ملک کہیں کہ دریا میں پانی نام کی کوئی چیز نہیں تو انتقاماً دریا بھی بہنے لگے گا! اِس کیفیت کو حکیم مومن خاں مومن کی زبانی سُنیے۔

مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجر یار کی

!آخر کو دُشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ

ملک کی سلامتی نے تو جیسے قسم کھا رکھی ہے جو کچھ رحمٰن ملک فرمائیں گے اُس کی مخالف سمت ہی میں سفر کرے گی! جب جب اُنھوں نے دہشت گردوں پر قابو پانے کی بات کی ہے، کچھ ایسا ہوا ہے کہ لوگوں کے لیے ہنسی پر قابو پانا ناممکن سا ہوگیا ہے! اپنی ہر بات کو کسی نہ کسی طور ثابت کرنے کی عادت کے معاملے میں بھی وہ ایسے پُختہ ہوگئے ہیں کہ قتل و غارت کے سلسلے کو گرل فرینڈ کے جھگڑے کی دہلیز تک پہنچا کر دم لیتے ہیں!

رحمٰن ملک معرفتِ نفسی کی اُس منزل میں ہیں جہاں اُن پر کسی بھی درجے کی نکتہ چینی اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ ما فی الضمیر خاصے پُرلُطف انداز سے بیان کئے جاتے ہیں!

اچھے فنکار کی یہی پہچان ہے کہ ہوٹنگ کی پروانہ کرے

اور اپنا آئٹم مکمل کرنے کے بعد ہی مائک چھوڑے ! رحمٰن ملک اگر ادب کی دنیا میں ہوتے تو صفِ اول کے نقاد اور فلیپ رائٹر ہوتے ! یہ دونوں کام اب ڈھٹائی نُما مستقل مزاجی اور مزاح نوازی کے ساتھ کئے جاتے ہیں!

بہتر تعلقات اور مزید امداد کی استدعا گوش گزار کرنے کے لیے.بڑی طاقتوں کے در پر لاؤ لشکر کے ساتھ حاضری بھی ایک ایسی نا پُختگی ہے جو اب خطرناک حد تک پُختہ ہو گئی ہے! دُنیا حیران ہے یہ کیسے لوگ ہیں جو امداد مانگنے کے لیے بھی دو دو طیاروں میں سوار ہو کر آتے ہیں اور "مذاکرات" (یعنی استدعا و التماس) کو بالائے طاق رکھ کر سیر سپاٹے کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں! اب ترقی یافتہ ممالک کو کون سمجھائے کہ جب ہر معاملے میں کچّے پن کا پکّا پن حد سے گزرتا ہے تو ایسی ہی پُرمزاح شخصیات جنم لیتی ہیں اور ایسے ہی پُرلُطف واقعات رُونما ہوتے ہیں۔ دُنیا میں دم ہے تو ذرا کچّے پن کا ایسا پکّا پن پیدا تو کرکے دِکھائے!

غریب بھینسے کا گوشت کھایا کریں

مہنگائی کے چکی میں پسنے والے غریبوں کے ہونٹوں پر مُسکان سجانے کی بات آ جائے تو ہر وزیر کو ہم وزیر خزانہ قرار دے سکتے ہیں کیونکہ ہنسانے والی باتوں کا خزانہ تو ہمارے ہر وزیر کے پاس ہے! کل تک جو حقیقی منصب رحمٰن ملک کا تھا وہ اب تقریباً ہر وزیر کو سونپ دیا گیا ہے۔ ہنسانے کی علیحدہ سے وزارت تو بنائی نہیں جاسکتی تھی اِس لیے یہ ممکنہ وزارت تمام وزراء میں تقسیم کردی گئی ہے! وفاقی وزیر خزانہ ڈاکٹر عبدالحفیظ شیخ کی اِس نئی ذمہ داری کا انکشاف کراچی میں فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے تحت فیڈریشن ہاؤس میں پری بجٹ سیمنار سے خطاب میں ہوا۔ موصوف نے بجٹ کے حوالے سے جب اہل وطن کی مشکلات کا جائزہ لیا تو چند نادر مشوروں سے بھی نواز دیا۔

فرانس کے انقلاب کے دنوں میں جب غریبوں کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی تو ملکہ میری انٹوئنیٹ نے شہر میں جاکر صورت حال کا جائزہ لیا۔ جب کسی نے بتایا کہ غریبوں کے پاس کھانے کو روٹی بھی نہیں تو ملکہ نے کمال سادگی سے فرمایا "اگر روٹی میسر نہیں تو یہ لوگ کیک کیوں نہیں کھاتے؟"

ملکہ کے دِل میں غریبوں کے لیے واقعی درد تھا تب ہی تو روٹی سے بلند درجے کی چیز کھانے کا مشورہ دیا۔ ہمارا ملک بھی اِس وقت انقلابی کیفیت سے دوچار ہے۔ ایسے میں کِسی کو تو ملکہ والا کردار ادا کرکے غریبوں کے لیے کچھ ارشاد فرمانا تھا۔ وزیر خزانہ نے آگے بڑھ کر یہ کردار عمدگی سے ادا کردیا ہے۔ ملکہ میری انٹوئنیٹ کا مشورہ تو غریبوں کو مشکلات سے دوچار کرنے والا تھا کہ روٹی میسر نہ ہو تو کیک یعنی معیار میں بلند تر چیز کی طرف لپکو۔ ملکہ کے مشورے پر عمل کرنے والے ان گنت غریب انقلاب کی نذر ہوگئے ہوں گے مگر ڈاکٹر عبدالحفیظ شیخ نے فرانس کی ملکہ جیسی ہلاکت خیز سادگی نہیں دِکھائی بلکہ غریبوں کو خاصے غریب پرور مشورے سے نوازا ہے۔ فرماتے ہیں "اگر بکرے کا گوشت مہنگا ہے تو غریبوں کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ اُن کا مسئلہ ہے جو مٹن فرائی اور چانپ کھاتے ہیں۔" یہ بیان پڑھ کر ہم تو ششدر رہ گئے۔ ہمیں حیرت اِس بات پر ہے کہ موجودہ وفاقی کابینہ میں اِس قدر حقیقت پسند شخصیات بھی پائی جاتی ہیں! وزیر خزانہ نے اِس مشورے کی شکل میں ایک ایسا اُصول بیان کیا ہے جو ہے تو فِطری مگر اب تک اقتصادیات کے ماہرین کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ بے چارے کریں بھی کیا؟ ڈاکٹر عبدالحفیظ شیخ جیسا دیدہ بینا ہوتا تو دیکھ پاتے، ذہن رسا ہوتا تو سوچ پاتے! عبدالحفیظ شیخ نے بکرے کے گوشت کی ہوش رُبا قیمت کے حوالے سے فکر مند نہ ہونے کا مشورہ دیکر غریبوں کی ایک بڑی مشکل آسان کردی ہے۔ اِس نئے فارمولے کے تحت وہ ہر اُس چیز کے

! بارے میں سوچنے کی زحمت سے بچ سکتے ہیں جو اُن کی دسترس میں نہ رہے
یہ فارمولا (جو نظریے سے کسی طور کم نہیں !) غریبوں کو اِتنی آسانیاں دے سکتا ہے کہ وہ سنبھالتے سنبھالتے بے حال ہو جائیں گے۔ اب اگر آٹا، دالیں، چاول، تیل، گھی، دودھ اور (ظاہر ہے) دہی، انڈے، مکھن، ڈبل روٹی، سبزی، پھل وغیرہ وغیرہ مہنگے ہوتے جائیں تو اِن کے نرخوں کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو چیز آپ کی دسترس اور قوتِ خرید میں نہیں اُس کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اور جب آپ کو پریشانی سے بچا ہی لیا گیا ہے تو مایوس ہونے اور خودکشی کے بارے میں سوچنے کا بھی کوئی جواز نہیں رہا۔ لیجیے، غریبوں کے لیے
!زندگی کا سامان ہوگیا
ویسے ہم آج تک سمجھ نہیں پائے کہ جب بھی کوئی غریب مہنگائی کا رونا روتا ہے تو فوراً بکرے کے گوشت کی قیمت کو ہوش رُبا قرار دیکر واویلا کرنے لگتا ہے۔ بکری کو فارسی میں "بُز" کہتے ہیں۔ بکری کو ذرا سا ہُش کیجیے تو گھبرا کر بھاگ جاتی ہے۔ اِسی لیے
ڈرپوک اِنسان کو بُزدِل یعنی بکری جیسے دِل والا کہا جاتا ہے۔ اگر غریب اپنے اندر ہمت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بکری یا بکرے کا گوشت کھانے سے گریز کرنا ہوگا۔ وزیر خزانہ کے مشورے پر عمل کرنے کی صورت میں غریب بُزدِلی پیدا کرنے والے گوشت کی طرف جانے کا سوچیں گے بھی نہیں۔

اگر یقین نہیں آتا تو شہر میں جگہ جگہ قائم عوامی دستر خوانوں پر نظر ڈالیے کہ صدقے میں کٹنے والے بکروں کا گوشت کھا کھا کر کس طرح غریبوں میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں، سوچ بھی ختم ہو چلی ہے! ایسے میں بہتر یہی ہے کہ غریب سال کے سال عید الاضحیٰ پر قربانی کے اصل بکرے کا گوشت کھالیا کریں۔ سال میں ایک آدھ مرتبہ کھانے سے اُنہیں بکرے کے گوشت کی لذت آخری حد تک محسوس ہوگی اور دِل میں گوشت کی اِس عظیم المرتبت قسم کا احترام بھی برقرار رہے گا!

وزیر خزانہ شاید دیگر نکات بیان کرنے کی کوشش میں یاد نہیں رکھ پائے ورنہ غریبوں کو یہ مشورہ ضرور دیتے کہ حالات سے لڑنے کے لیے کُھرانٹ قسم کی قوت پیدا کرنا ہے تو بکرے کے بجائے بھینسے کا گوشت کھایا کریں!

غریبوں نے حکومت کو بہت پریشان کیا ہے، بلکہ ناک میں دَم کر رکھا ہے۔ آسمان پر بادل خشک ہو جاتے ہیں مگر غریبوں کی آنکھیں خُشک نہیں ہوتیں، بات بات پر آنسو بہتے ہی رہتے ہیں۔ بے چاری حکومت کا آدھا وقت تو غریبوں کے بارے میں سوچنے اور اُن کی بہبود کے منصوبے بنانے میں صرف ہوتا ہے۔ اب آپ ہی سوچیے کہ جب سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کا بڑا حصہ غریبوں پر ضائع ہو جائے گا تو حکومت ملک کے لیے کیا کر پائے گی! مگر غریبوں کو اِس کی کیا پروا؟ اُنہیں

تو بس چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا آتا ہے۔ آلو، ٹماٹر اور پیاز مہنگی ہو جائے تو لوگ ٹسوے بہانے لگتے ہیں۔ عالمی برادری میں کچھ کر دِکھانے کی تمنا رکھنے والی حکومت کا سارا وقت آلو اور پیاز جیسی بے وقعت اور ناہنجار ناچیز چیزوں کے دام کنٹرول کرنے میں ضائع ہو جاتا ہے! یہ چھوٹے چھوٹے مسائل لوگوں کو خود حل کرنے چاہئیں یا بھول جانے چاہئیں۔ عام آدمی کو یہ بات کون سمجھائے کہ حکومتیں اِن چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے نہیں ہوتیں۔ آلو، پیاز، انڈے، ڈبل روٹی، دودھ اور مکھن کے نرخ کنٹرول کرنے کے لیے حکومتی مشینری کو استعمال کرنا ایسا ہی ہے جیسے توپ سے چڑیا کا شکار کیا جائے! چند ایک حکومتیں ایسی ہیں جن کے دَم قدم سے سوئٹزر لینڈ جیسے امیر کبیر ممالک کا بینکاری نظام پَھل پُھول رہا ہے۔ ہماری حکومت بھی، شالا نظر نہ لگے، اُن حکومتوں میں شامل ہے اور ہم ہیں کہ اُسے شاہ دَولہ کا چوہا بنانے پر تُلے ہیں، گھریلو بجٹ دُرست کرنے کے پست کام پر لگانا چاہتے ہیں!

مقاماتِ کار جہاں اور بھی ہیں

ایک صاحب پہلی بار پاکستان آئے۔ میزبان نے دو تین دن خوب سیر کرائی۔ پھر ایک دن وہ مہمان کو اپنے ساتھ دفتر لے گئے۔ وہاں تمام ساتھیوں سے ملایا۔ سب نے خوب آؤ بھگت کی۔ دفتر میں دن بھر رونق میلہ لگا رہا۔ دوسرے دن میزبان جب دفتر جانے کی تیاری کرنے لگے تو مہمان سے پھر چلنے کے لیے کہا۔ مہمان نے کہا "کل والی پکنک خوب تھی۔ مگر یہ روز روز کی پکنک اچھی بات نہیں، آج آپ کام پر جایئے!"

جن لوگوں نے پاکستان میں دفاتر کا ماحول کبھی دیکھا ہی نہ ہو وہ پہلی نظر میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے سے یکسر ناواقف بہت سے لوگ جب یہاں کسی دفتر میں قدم رکھتے ہیں تو اُنہیں کام کی زیادتی سے اُکتائے ہوئے لوگوں کو کچھ وقت سُکون سے گزارنے کا موقع دینے کے لیے بنائے جانے والے خصوصی مراکز سمجھ بیٹھتے ہیں!

دُنیا بھر میں دفاتر کام کاج کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اب تک تو معاملہ یہ ہے کہ لوگ زمانے بھر کی نفسی پیچیدگیوں سے نجات پانے اور اچھے خاصے لمحات قدرے فرحت بخش انداز سے گزارنے کے لیے پوری ذہنی تیاری کے ساتھ

!دفتر کا رخ کرتے ہیں
زندگی کا وہ کون سا بنیادی مسئلہ یا بحران ہے جو دفتر میں ڈسکس ہونے سے رہ جاتا ہے؟ کون سی گھریلو پریشانی ہے جسے لوگ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرکے ساتھیوں کو اُس کا تجزیہ کرنے کی دعوت نہیں دیتے؟ رات کو پرائم ٹائم کے ٹاک شوز میں جو کچھ سُنا اور دیکھا ہوتا ہے اُس پر سیر حاصل بحث کِس دفتر میں شجر ممنوعہ سمجھی جاتی ہے؟ جس طرح مزدور کہیں سے کچرا لاکر کچرا کنڈی پر اُلٹ دیتے ہیں بالکل اُسی طرح لوگ دفتر میں داخل ہوتے ہی اپنی پرائیویٹ لائف کو ذہن سے نکال کر سب کے سامنے پھینکنے لگتے ہیں اور جب ڈھیر بڑا ہو جاتا ہے تو سب اِس میں سے اپنی اپنی پسند کے آئٹمز نکال کر بحث و !تمحیص کا بازار گرم کرتے ہیں
اگر آپ کو فطرت میں تمام مطلوب رنگ نہ ملیں تو دفاتر کا رُخ کیجیے کیونکہ دفاتر کے کلچر میں عجیب و غریب رنگ پائے جاتے ہیں! اور ہر رنگ اپنی جگہ قوس قزح کا حریف، !بلکہ خود قوس قزح ہے
اوقات کی تقسیم کچھ اِس طرح انجام دی جاتی ہے کہ دُنیا والے دیکھیں تو دانتوں تلے انگلیاں دبالیں، بلکہ کاٹ کھائیں! دفتر میں آمد کے بعد پہلا کام

ہوتا ہے گزشتہ روز دفتر سے جانے کے بعد رونما ہونے والا کوئی ذاتی واقعہ بیان کرنا اوراِس حوالے سے دل کا بوجھ ہلکا کرکے تھوڑی بہت ہمدردی سمیٹنا۔ یہ عمل کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ تو کھینچ ہی لیتا ہے۔ یعنی اب لے دے کر ساڑھے پانچ گھنٹے رہ گئے ہیں کیونکہ سب پہلے ہی ایک گھنٹہ لیٹ پہنچتے ہیں۔اِس کام سے فارغ ہو کر چند فائلوں پر طائرانہ سی نظر ڈال کر فائلوں کو کچھ اِس طرح رکھا جاتا ہے کہ اُن پر دوبارہ نظر نہ پڑے! جب آپ اِس عمل سے فارغ ہوچکتے ہیں تو قدرت آپ کے دماغ کو فرحت بخشنے کے لیے چائے بھجواتی ہے۔ چائے سے فارغ ہو کر کچھ دیر کام کے بارے میں سوچا جاتا ہے۔ اور پھر معاملہ سوچنے ہی تک محدود رہتا ہے۔ تیز پتی والی گرما گرم کڑک چائے پینے کے بعد کس کافر میں دم ہے کہ کام کے بارے میں سنجیدہ ہو!

کیف آور چائے پینے کے بعد جب دماغ قدرے بلندی پر ہوتا ہے تب ملک کے کسی بھی حصے سے اسلام آباد تک کا فاصلہ مِٹ سا جاتا ہے۔ اور جب فاصلے مِٹ جائیں تو کوئی بھی معاملہ دسترس سے باہر نہیں رہتا۔ دفتر کی مرکزی میز کے گرد بیٹھ کر تمام افراد اخبارات پر ایک نظر ڈال کر طے کرتے ہیں کہ کس کس سیاست دان کا تیا پانچا کرنا ہے۔ صدر، وزیر اعظم، اپوزیشن لیڈر، پارلیمنٹ سے باہر کی جماعتوں کے رہنما اور شوبز کی شخصیات فیورٹ موضوعات ہیں۔ اگر اِن کے بیانات پر سیر حاصل نکتہ چینی کے کچھ وقت بچ رہے تو دو چار کام کی باتیں بھی ہو ہی

!جاتی ہیں

اخباری بیانات یا ٹی وی انٹرویوز پر بحث کے خاتمے تک دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا ہوتا ہے۔ اب کھانے کے وقفے میں تو کام ہونے سے رہا! بھوک لگے تو کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑتا ہے مگر دوپہر کے کھانے میں ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ پیٹ بھر چکتا ہے تو جسم ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور آرام طلبی پر اُتر آتا ہے۔ اب دل چاہے کہ نہ چاہے، کسی نہ کسی شکل میں تھوڑا بہت قیلولہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ اِتنے سنگ دل تو کسی صورت نہیں ہو سکتے کہ اپنے جسم پر ظلم ڈھائیں اور آرام کے وقت اُسے کام پر لگائیں! اگر کمر سیدھی نہ کی جائے تو بہت سے کام ٹیڑھے ہو جاتے ہیں! کام کرنے والوں کا دفتر پر اِتنا !حق تو ہوتا ہی ہے کہ کچھ دیر آرام کرنے کا موقع دیا جائے

قیلولے کے بعد ایک بار پھر کچھ دیر تک دفتری اُمور کے بارے میں سوچا جاتا ہے کہ شاید کوئی ایسا کام نکل آئے جو کسی نہ کسی طور نمٹانے کے قابل ہو! مگر عموماً مایوسی ہی ہوتی ہے اور کام اگلے دن پر ٹالنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی ایسا کام دکھائی ہی نہ دے جو کئے جانے کے قابل نہ ہو تو اِس میں کام کرنے والوں کا تو کوئی قصور نہیں۔ اب اگر کوئی کام !اپنے آپ کو نہ کروانا چاہے تو کوئی کیا کرے

قیلولے کے بعد دفتر کی انتظامیہ چائے سے نوازتی ہے۔ شام کی چائے کا اپنا ہی لطف ہے۔ چند ایک سر پھرے انجام کی پرواکئے بغیر شام کی چائے کے لیے گھر کا رُخ کرتے ہیں تاکہ ڈوبتے سُورج کا نظارا کرتے ہوئے اہل خانہ کے ساتھ پکوڑے کھائیں اور چائے کی چُسکیاں لیں! شام کی چائے کے بعد "دفتری اُمور" کی بساط لپیٹ کر گھر جانے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ ایسے عالم میں کوئی کس طرح کام کر سکتا ہے؟ ہم وہ قوم ہیں جسے آنے والے کل پر پورا یقین ہے۔ اور یہ یقین اِس قدر محکم ہے کہ آج کے کام کو کل پر ٹالتے رہنا ہمارا عادت بن چکا ہے! بہت سے لوگ، جو ظاہر ہے کہ عقل نہیں رکھتے، یہ سوچتے ہیں کہ آج کے کام کو کل پر ٹالنا کاہلی اور ہڈ حرامی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اگر کسی بھی دفتر میں کام کرنے والے افراد سارے کام مکمل کرکے جایا کریں تو اگلے دن صبح دفتر پہنچنے پر کیا بُھٹّے بُھونیں گے! کوئی کام ہوگا تو کریں گے نا۔ جب کچھ نہیں ہوگا تو مزید ہڈ حرامی کا مظاہرہ کیا جائے گا! اچھا ہے کہ کچھ کام پینڈنگ میں رہے۔ لہو گرم رکھنے کا کوئی تو بہانہ ہو!

اب تک جن لوگوں نے پاکستان کے دفتری ماحول پر تحقیق کی ہے وہ اِس نکتے پر غور کرتے کرتے پاگل پن کی حد تک پہنچ گئے ہیں کہ جب سبھی موج مستی کے دریا میں غوطہ خوری کرتے رہتے ہیں تو پھر کام کس طرح ہوتا ہے! ہمیں حیرت ہے کہ

اِس میں ایسی کون سی بات ہے جو سمجھ میں نہ آسکے۔ ہر دفتر ایک بھرپور اور گھنے جنگل کے مانند ہوتا ہے جس میں طرح طرح کے جانور پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے سارے تو شیر اور چیتے نہیں ہو سکتے، چند ایک گدھے بھی ہوتے ہیں! بس یہی وہ گدھے ہیں جو دفتر کا کام کرتے ہیں اور ہڈ حرام شیروں اور بھیڑیوں کو بھرپور سکون کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع فراہم کرتے ہیں!

دفتر کو ہم جنگل سے تشبیہ دیں یا کسی اور چیز سے، ایک اچھی بات یہ ہے کہ کام کسی نہ کسی طور ہو ہی جاتا ہے! دفاتر میں کام کرنے والے بھی کسی کام کو ہوتا ہوا دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں؟ وہ مستعدی کے اِلزام سے بچنے کے لیے کام سے گریزاں رہتے ہیں۔ ثابت ہوا ہے کہ کوئی ایسی برتر ذات ہے جو ہمارے کام بر وقت اور عمدگی سے انجام کو پہنچا کر ہمارا بھرم رکھ لیتی ہے۔ اِسی لیے تو کہتے ہیں جب کچھ سمجھ میں نہ آئے تو معاملات اللہ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ ہمارے ہاں بیشتر دفاتر میں اللہ پر ایسا ہی بھرپور اور غیر متزلزل اعتماد کیا جاتا ہے۔ یعنی سب کچھ اللہ کے حوالے کرکے لوگ توکل کا اعلیٰ ترین درجہ دُنیا کے سامنے لاتے رہتے ہیں!

اگر آپ کسی دفتر میں کام کرتے ہیں اور کام بھی کرتے ہیں تو فوراً اپنے شب و روز کا جائزہ لیجیے۔ کام کرتے رہنے سے کہیں آپ ابنارمل تو نہیں ہوگئے۔

کام کرنے کے لیے دوسرے موجود ہیں۔ آپ قابل رشک انداز سے زندگی بسر کیجیے۔ کام کا تو کام ہے کسی نہ کسی طرح ہو جانا! دفتر میں کرنے کے لیے اور بہت کچھ ہے۔ اگر گپ شپ سے تھوڑی بہت فُرصت مل جائے تو کبھی کبھی ذرا سا کام بھی کر لیا کیجیے۔ یہ ہے دفتر میں کام کرنے کا مثالی طریقہ!

بڑے بدمعاش کا حصہ

لیجیے، جس بات یقینی خدشہ تھا وہی پھر ہونے کو ہے۔ بجٹ سر پر ہے۔ طرح طرح کی توقعات ہیں جو وابستہ کی گئی ہیں اور متنوع خدشات ہیں جو لاحق ہو گئے ہیں۔ بجٹ ہر سال ہی آتا ہے تو پھر توقعات کیوں اور خدشات کیسے؟ یہ سوال مرزا تنقید بیگ کے ذہن میں بھی اُبھرا اور ایسا اُبھرا کہ وہ کسی کو دل کا حال سُنانے کے لیے بے تاب بلکہ اُتاولے ہوگئے۔

مرزا کا کہنا یہ ہے کہ ہر سال بجٹ پیش کرنا اب محض رسمی کارروائی ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ بجٹ کا انتظار کرتے تھے کیونکہ جو کچھ ملنا ہوتا تھا اور جو کچھ چھن جانے کا خدشہ لاحق ہوتا تھا وہ سب کچھ بجٹ کی حدود میں ہوتا تھا۔ بجٹ کے اعلان کے ساتھ ہی لوگوں کے چہرے ذرا سے تمتما اُٹھتے تھے یا پھر بُجھ سے جاتے تھے۔ زمانہ خیر سے ایسا بدلا ہے کہ سال میں ایک بار جم کر بیٹھنے اور دل تھامنے کے عمل سے نجات مل گئی ہے۔

مُشکلیں مُجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہوگئیں

کہ مصداق اب سال بھر تواتر کے ساتھ بجٹ وارد ہوتے رہتے ہیں اور جس چیز کو مہنگا ہونا ہوتا ہے وہ مہنگی ہو کر رہتی ہے اِس لیے باضابطہ بجٹ کا وہ مقام،

درجہ اور تقدس نہیں رہا! مرزا کے خیال میں اب سال میں ایک بار وفاقی وزیر خزانہ کی جانب سے پیش کئے جانے والے بجٹ کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے سال بھر تو چھوٹے بدمعاش (چھوٹے، غیر رسمی بجٹ) بھتہ خوری کرتے رہتے ہیں اور سال میں ایک مرتبہ بڑا بدمعاش (یعنی باضابطہ، رسمی اور وفاقی نوعیت کا بجٹ) آکر اپنا حصہ مانگتا ہے! ہم نے مرزا سے استدعا کی کہ مثال اگر دینا ہی ہے تو بدمعاشوں وغیرہ سے مت دیجیے۔ کہنے لگے "زمانے کا چلن ایسا ہوگیا ہے کہ ہر اچھے اور بُرے معاملے کی مثال اب بدمعاشی اور بھتہ خوری وغیرہ ہی کے ذریعے دی جاسکتی ہے!" ہم نے وضاحت طلب کی تو فرمایا "فی زمانہ اگر کسی کی بدنصیبی اُسے کہیں کا نہ رکھے تو ہم کہیں گے اُسے ڈاکوؤں نے لوٹ کر برباد کردیا۔ اور اگر کسی کی خوش نصیبی کو بیان کرنا ہو تو کہا جائے گا کہ اُس کی ڈکیتوں سے دوستی ہوگئی!"

ہر سال بجٹ پیش کرنے کا اہتمام اِضافی مشقت سا لگتا ہے۔ سبب اِس کا یہ ہے کہ ہر چیز یومیہ یا ہفتہ وار بنیاد پر مہنگی ہوتی جاتی ہے۔ سال بھر یہ عمل جاری رہتا ہے۔ کون سی چیز ہے جس کا نرخ دو تین ماہ بھی برقرار رہ پاتا ہے؟ جب سبھی کچھ "مارکیٹ فورسز" کے حوالے کردیا گیا ہے تو پھر بجٹ کے نام پر قوم کو بے وقوف بنانے کی ضرورت ہی کیا رہی ہے؟ بجٹ میں اب تو صرف یہ دیکھنا باقی رہتا ہے کہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں اور پنشن میں کتنا اضافہ کیا

!گیا ہے

سچ یہ ہے کہ فی زمانہ بجٹ تقریر سُن کر غریب یہ محسوس کرتے ہیں کہ

!رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو

حالات کی چکی میں پسنے والے اور زندگی کی جنگ میں ہارے ہوئے لوگ بجٹ کے بعد یہ سوچ کر سُکون کا سانس لیتے ہیں کہ حکومت نے کم از کم اِتنا تو کیا کہ اُن کے تن پر کپڑے رہنے دیئے! بجٹ سے پہلے دس پندرہ دن پری بجٹ سیمنار کے نام پر لافٹر شو منعقد کرکے عوام کو تھوڑا بہت ہنسانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ بجٹ کے نام پر بُغدا چلائے !جانے پر کچھ خاص تکلیف محسوس نہ کریں

غریبوں کی زندگی میں صرف خدشات نہیں ہوتے، چند ایک خوش فہمیاں بھی ہوتی ہیں۔ بقول کرشن بہاری نُور

اُس تشنہ لب کی نیند نہ ٹوٹے خُدا کرے

!جس تشنہ لب کو خواب میں دریا دِکھائی دے

بجٹ کے آنے سے غریب کی نیند بھی ٹوٹ جاتی ہے اور آنکھوں میں بسا ہوا دریا بھی سُوکھ جاتا ہے! یہ ہے بجٹ کا سب سے نقصان دہ پہلو۔ ہم نے مرزا سے کہا کہ انتخابات سر پر ہیں تو حکومت کچھ نہ کچھ ریلیف ضرور دے گی تاکہ ووٹ بینک

بڑھے۔ یہ سُن کر وہ مشتعل سے ہو گئے۔ پُھنکارتے ہوئے لہجے میں فرمایا "بجٹ اور بچھو میں کوئی فرق نہیں۔ بچھو آپ سے پیار کرے یا نفرت، اُس کی فطرت میں ڈنک مارنا لکھا ہے۔ وہ تو ڈنک ہی مارے گا!" ہم نے عرض کیا کہ بجٹ کو بدمعاشوں اور بچھو وغیرہ سے تشبیہ دینا کیا فرض کر دیا گیا ہے۔ کمال شفقت سے فرمانے لگے "سرجری کے ذریعے ذرا غریبوں کی آنکھیں فٹ کرواؤ تو حالات کی اصلیت دکھائی دے گی اور اندازہ ہو گا کہ زندگی بسر کرنا ہوتا کیا ہے۔ غریبوں کے لیے صبح کو شام اور شام کو صبح کرنا اب جوئے شیر کے لانے سے کم نہیں! الیکشن سر پر ہے تو چند ایک اقدامات سے غریبوں کو بہلانا ہی ہے۔ ہر حکومت الیکشن والے سال میں یہی کرتی ہے۔ مگر خیر، عوام کو بھی تیار ہی رہنا چاہیے کہ حکومتیں ایک ہاتھ سے کچھ دیتی ہیں تو دوسرے ہاتھ سے لے بھی لیا کرتی ہیں۔ مگر ہاں، ایک بات کا اطمینان ضرور ہے۔"

ہم نے کہا یہ تو مسرت کی بات ہے کہ اِس گئے گزرے دور میں آپ کو کسی بات کا تو اطمینان ہے۔ مرزا بولے "جمہوری حکومت نے چار برسوں میں اِتنا خون نچوڑا ہے کہ اب جسم میں کچھ رہا ہی نہیں۔ اطمینان اِس بات کا ہے کہ اِس بار خون نچوڑا نہیں جاسکے گا۔ ہڈیاں رہ گئیں اور وہ بھی گودے کے بغیر، سو حاضر ہیں۔ شوق سے دانت گاڑیے!"

ہم نے کہا یہ تو بڑے ظلم کی بات ہے کہ جسم میں خون بھی نہ چھوڑا جائے۔ مرزا چہک کر بولے "نہیں نہیں، ابھی ہوا کیا ہے۔ حکومت کو

مدت پوری کرنے دیجیے تاکہ غریبوں کی مدت بھی ختم ہو جائے! اب کے تو یہ غضب ہوا ہے کہ مفاہمت کی سیاست کے نام پر حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا فرق ہی ختم ہوگیا ہے۔ مفاہمتی سیاست وہ چُھری ہے جس سے عوام کو چار برسوں کے دوران قدم قدم پر ذبح کیا گیا ہے۔ اور کبھی کبھی تو ذبیحہ بھی نہیں ہوا، جھٹکا فرمایا گیا ہے! حکومت کو پانچ برس کے لیے جو دیا گیا ہے اُس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ہماری اِس مہربانی سے کئی ممالک کا مالیاتی نظام پنپ گیا ہے! عوام کو سبز باغ دکھائے جاتے ہیں اور پھر وعدوں کی ٹرین کو ہری جھنڈی دکھاکر اِس طرح رخصت کیا جاتا ہے وہ کسی اسٹیشن پر رکتی نہیں پائی جاتی!"

مرزا کی باتیں سُن کر ہم بھی پریشان ہو اُٹھے ہیں۔ ہماری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ حکومت سے کیا اور کیسے استدعا کریں۔ بس دعا ہے کہ بجٹ ایسا ہو کہ غریبوں کے ہونٹوں کو تھوڑی سی مُسکان، دِل کو سُکون اور دِماغ کو راحت نصیب ہو۔ ہر معاملے میں تنگ دامنی کا احساس ختم ہونے کی کوئی تو راہ نکلے۔ بجٹ میں کچھ تو ایسا کہ غریبوں کے دل ذرا کِھل اُٹھیں، چہرے تمتمائیں۔ ضروری تو نہیں کہ "جمہوریت بہترین انتقام ہے" والی بات ہر جگہ دُرست ثابت کرنے کی کوشش کی جائے!

کچھ لوگ محبت کا صِلہ مانگ رہے تھے

جس طرح سیلاب کا سیزن ختم ہونے کے بعد بھی سیلاب کے نام پر سیاسی دکان چمکانے اور اپنی جیب بھرنے کا سیزن تادیر چلتا رہتا ہے بالکل اُسی طرح لیاری میں آپریشن تو ختم ہوچکا مگر اس کے مختلف علاقوں کو کسی نہ کسی حوالے سے فتح کرنے کی کوششیں دم نہیں توڑ رہیں۔ گولہ بارود نہ سہی، وعدوں اور دعووں کی بمباری ہی سہی! گز بھر کا گھاؤ لگا کر دو انچ ڈبیہ میں مرہم عطا کیا جارہا ہے! آپریشن اور مابعد اقدامات سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جارہی ہے کہ لیاری میں جو کچھ کیا گیا وہ محبت کے اظہار ہی کی ایک صورت تھی!

یہ سب کس کھاتے میں ہو رہا ہے؟ جمہوریت کے کھاتے میں؟ اگر دنیا بھر میں جمہوریت کی تعبیر و تشریح بدل دی گئی ہے اور اب جمہوریت کا حقیقی مفہوم جمہور کے خلاف جانا ہے تو پھر ٹھیک ہے!

لیاری والوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف اُن کی نہیں بلکہ خود پیپلز پارٹی کی بھی آزمائش ہے۔ حکمراں جماعت پورس کے ہاتھیوں کے مانند اپنے ہی لوگوں پر پل پڑی۔ ایک پوری بستی کو سائڈ لائن کرکے جرائم پیشہ افراد کے

خلاف آپریشن کے نام پر غریبوں کے لیے زندگی مزید دشوار بنادی گئی۔ وفاداری کا کیا یہی صِلہ ہوا کرتا ہے؟ دنیا حیران ہے کہ یہ کیسی جمہوریت ہے کہ غریب کو جینے کے حق سے بھی محروم کرنے کی ٹھان لی گئی ہے! احساس، مروت، لحاظ، شرم، غیرت .... سبھی کچھ لپیٹ کر بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ طے کرلیا گیا ہے کہ جب کسی کو مخالفت پر سزا دی جائے گی اور ضمیر کا گلا گھونٹ دیا جائے گا تاکہ کوئی آواز نہ آئے اور سُن کر سوچنے کی زحمت سے بچا جاسکے۔

لیاری میں محض ایک ہفتے کے دوران کیا نہیں ہوا۔ اعتبار کا خون بہا، اعتماد کی لاش گری، تعلقات کی تدفین ہوئی۔ ایک علاقے کو وفا کا صِلہ طلب کرنے، حقوق کے لیے آواز اُٹھانے پر سزا دینے کا سوچا گیا اور تمام اقدار فراموش کردی گئیں۔ لیاری سے شہر کی طرف جانے والے تمام راستے بند کردیئے گئے اور بدامنی و ہلاکت خیزی کی کھائی کو جانے والے تمام راستے کھول دیئے گئے!

لیاری کے لوگ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُنہیں ناکردہ گناہوں کی سزا ملی ہے۔ حکومت ایسی ظالم بھی نہیں کہ کسی کو کسی جرم کے سرزد ہونے سے پہلے سزا دے۔ اہل لیاری نے پیپلز پارٹی کو چاہا تھا، اُس کے لیے گالیاں اور گولیاں کھائی تھیں سو اِس جرم کی سزا دی گئی! جن کی ہر آتی جاتی سانس میں جئے بھٹو کی صدا بسی ہوئی تھی اُن کے لیے سانس لینا بھی دُوبھر کردیا گیا۔

لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے سوالات اُبھرے۔ ہر نقش کہن کو مِٹانے کی ریت کیوں ڈالی جارہی ہے؟ جمہور کی سلطانی کے عہد میں جمہور کو موت کی نیند سُلانے پراِصرار کیوں؟ ارشاد ہوا جمہوریت بہترین انتقام ہے۔ چلیے مان بھی لیا کہ جمہوریت کچھ اور نہیں انتقام ہے تب بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انتقام اپنوں سے کب لیا جاتا ہے؟ اور اگر یہ محبت کا اظہار ہے تو ایسی محبت سے لیاری کے غریب باز آئے! وہ جن کی جے جے کار کرتے نہ تھکتے تھے اُنہی کے ہاتھوں مارے جارہے ہیں اور لبوں پر شکوہ ہے۔

!ہم سے تو تم کو ضِد سی پڑی ہے

کبھی کبھی دل نے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ شاید یہ جمہوریت کا جدید ترین !ورژن ہو اور ابھی تک ہمارے ذہن اِسے سمجھنے سے محض قاصر ہیں

لیاری کو بار بار زیادتی کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے اور پھر سیتا کی طرح اگنی پریکشا بھی دینا پڑی ہے! اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اُس کے رام لکشمن ہی اُس کے خلاف ہو گئے ہیں! پھر بھلا باہر کے کسی راون کی کیا ضرورت؟ اپنے ہی غیروں کے ساتھ مل کر بار بار !لنکا ڈھا رہے ہیں

لیاری کے مکین یہ سوچ رہے ہیں کہ جن جرائم پیشہ افراد کی بیخ کُنی کا بہانہ گھڑ کر آپریشن کیا گیا ہے وہ بھی اِس قدر تو جینا حرام نہ کرتے تھے۔ لشکر کشی تو اُن کے مزاج کا حصہ نہ تھی۔ وہ علاقوں کو بند کرکے مکینوں کو گھروں میں محصور تو نہ کرتے تھے۔ اگر کرتے بھی تو کیا غلط ہوتا کہ وہ تو جرائم پیشہ تھے، مگر قانون نافذ کرنے پر مامور ریاستی مشینری کو تو ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ مگر یہ تو خیر غریبوں کی سوچ ہے، جن کے ہاتھ میں اقتدار اور اختیار ہوا کرتا ہے وہ اِس سطح سے بہت بلند ہو کر سوچتے ہیں۔ اُن کے منصوبوں میں عوام کی سی سطحی سوچ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

خفیہ والوں کے نیٹ ورک کا کوئی جواب نہیں۔ کالعدم امن کمیٹی والوں نے مزاحمت کی تو اندازہ ہوا کہ ان کے بارے میں تمام اندازے غلط تھے۔ اِن غلط اندازوں کا ذمہ دار کون ہے؟ سرکاری وسائل پر پلے ہوئے خفیہ والے کیا گھاس کھودتے رہے تھے؟ زندگی کی جنگ میں ہارے ہوئے، وقت کے ستائے ہوئے انسانوں کو جرائم پیشہ اور ایرانی مال کا اسمگلر تو کہتے ہی تھے، اب ان پر علیحدگی پسند ہونے کا لیبل بھی چسپاں کر دیا گیا۔ اور پھر وزیر داخلہ نے یہ کہتے ہوئے قلم توڑ دیا کہ لیاری میں طالبان نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں! اِس بیان کے بعد تو کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ وزیر داخلہ کا عجیب مسئلہ ہے کہ شروع ہی میں حرفِ آخر والا بیان دے ڈالتے ہیں! لیاری تو مِنی پاکستان ہے

جہاں تمام قومیتیں عشروں سے مل کر رہتی آئی ہیں۔ کیا یہ سب لوگ علیحدگی پسند ہیں؟ لیاری میں ڈھیروں گولہ بارود پھونک کر کس کی لاش گرائی گئی ہے؟ زندگی اور حالات کی تمام تلخیاں بھلا کر جھومنے اور رقص کرنے والوں کا خون کس کی گردن پر ہے؟ صرف انتظامی مشینری کی گردن پر یا پورے شہر پر؟ شہر پر ایک اور قرض چڑھ گیا۔ سوال یہ ہے کہ پہلے کون سا قرض چکایا گیا ہے جو یہ چکایا جائے گا؟

جو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں کیا اب اُنہیں زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کرنے کی ٹھان لی گئی ہے؟ یہ کون سی ضد ہے؟ کیا راج ہٹھ؟ انا کی غلامی اختیار کرکے بے بس اور لاچار اِنسانوں کو موت کی اسیری میں دینا کہاں کی انسانیت ہے؟ ہر سوال کے بطن سے مزید سوال پیدا ہو رہے ہیں۔ اور جب تک جواب سامنے نہیں آئیں گے، لیاری سوالیہ نشان بنا رہے گا؟

آپریشن کے دوران لیاری کے مکینوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ پیپلز پارٹی کو خیرباد کہہ چکے ہیں اور الیکشن میں بلال بھٹو زرداری کو امیدوار کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جائے گا؟ پیپلز پارٹی سے اِس حد تک لاتعلقی اختیار کرنے کے اعلان کی کوکھ سے کون سا عذاب جنم لے گا، یہ دیکھنے کے لیے شہر کا ہر وہ شخص بے تاب ہے جو لیاری کے غریبوں سے پیار کرتا ہے!

مولا بجٹ .... باتصویر

پاکستان کی فلم انڈسٹری کے زوال کا رونا رونے والوں کے دل کو تھوڑی بہت ٹھنڈک تو مل ہی چکی ہوگی۔ جمہوری حکومت کا کمال یہ ہے کہ کئی علوم اور فنون کو ایک پلیٹ فارم پر لے آئی ہے۔ شاندار حکمرانی کا انداز ملاحظہ فرمایئے کہ پالیسی بیان کامیڈی کا مزا دیتا ہے۔ بچت کے اقدامات سے اخراجات کے بڑھنے کی بُو آتی ہے، کہیں تعمیری منصوبہ شروع کیا جائے تو تخریب کا شائبہ سر اٹھاتا ہے اور حد یہ ہے کہ بجٹ پیش کیجیے تو ایکشن فلم کا گماں ہوتا ہے!

یکم جون کو قومی اسمبلی میں جو کچھ ہوا وہ اِس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ عوام مایوس نہ ہوں، ابھی جمہوریت کے ڈرامے میں کئی سنسنی خیز ایکٹ باقی ہیں! اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے رہیے اور ڈرامہ دیکھتے رہیے۔

اب کے بجٹ نے مولا جٹ کی یاد تازہ کردی۔ اِس مولا بجٹ نے ایسا سماں باندھا کہ قوم نہال اور سرشار ہوگئی۔ دنیا بھر کے غریبوں کے نصیب میں دوسری بہت سی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ بجٹ بھی لکھا ہوا ہے۔ ہر سال بارش، سیلاب، برف باری، آندھی، خشک سالی اور دیگر قدرتی اوامر کے ساتھ ساتھ بجٹ کو بھی وارد ہونا

ہی ہوتا ہے۔ بجٹ نہ ہو تو غریبوں کو کچھ ہی پتہ ہی نہ چلے کہ اُنہیں مرحلہ وار قتل کرنے کے کون سے نئے طریقے مارکیٹ میں آئے ہیں! جس بجٹ کا کام ہی غریبوں کو تکلیف دینا ہے اُسے دل نشیں انداز سے پیش کرنے کا ہماری پیاری منتخب حکومت کے سر جاتا ہے اور اِس مرحلے سے بخوبی اور بخوشی گزر جانے میں عوام کی مدد کے لیے اپوزیشن نے بھی خاصا توانا کردار ادا کیا۔ چار سال سے بھی زائد مدت میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم لیگ (ن) حکومت کے لیے نہیں، بلکہ عوام کے لیے فرینڈلی ثابت ہوئی! بجٹ کو مولا بجٹ بنانے میں مسلم لیگ (ن) کے اسکرپٹ اور شاندار اداکاری نے مرکزی کردار ادا کیا۔ بجٹ کے حوالے سے لوگ طرح طرح کے خدشات ذہنوں میں پروان چڑھائے بیٹھے تھے۔ مگر جب بجٹ پیش ہوا تو سارے خدشات ہوا ہوگئے۔

مسلم لیگ (ن) کہتی آرہی تھی کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ عوام کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ بھوت پارلیمنٹ ہاؤس میں پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بھوت سرکاری اسکولوں والے گھوسٹ ملازمین کی طرح فرضی نہیں تھے بلکہ اصلی اور واقعی تھے! مسلم لیگ (ن) کے ارکان نے لاتوں کے بھوتوں کی تواضع جب لاتوں سے کی تو سڑا دینے والی گرمی کے ستائے ہوئے عوام کے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑگئی! بجٹ سیشن میں لاتوں اور گھونسوں کا ایسا دور چلا کہ قوم حیران رہ گئی۔ چند حکومتی ارکان کی دُھلائی کرکے مسلم لیگ (ن) نے فرینڈلی اپوزیشن ہونے کا داغ

آخر دھو ہی ڈالا! عظیم سیاسی جماعتوں کے یہی طور ہوا کرتے ہیں یعنی جو کہتی ہیں وہ کر دِکھاتی ہیں، بھلے ہی اِس عمل میں منتخب ایوان کی میعاد ختم ہونے کو آئے!

ایوان میں لڑنے والے چونکہ منتخب تھے اِس لیے اُن کی زبان پر جو کچھ بھی آیا وہ بھی "منتخب" ہی تھا۔ میڈیا کی مہربانی کہ لوگوں نے سب کچھ دیکھ اور سُن لیا۔ آنے والی نسلیں ایسی معرکہ آرائیوں کو ایوان کی کارروائی سے حذف شدہ پائیں گی! تو تو میں میں سے بات شروع ہونے کے بعد "ابے جا، تیرے جیسے بہت دیکھے ہیں" کی منزل تک پہنچی، پھر مُغلظات کا دور چلا۔ اور اِس کے بعد ایوان کو باکسنگ اور کِک باکسنگ کے رنگ میں بدلتے دیر نہیں لگی! پیشگی انتباہ کیا گیا ہوتا تو لوگ بچوں کو یہ تماشا دیکھنے سے باز رکھنے کا اہتمام کرتے! منتخب نمائندوں کو ایسی کسی بھی معرکہ آرائی سے قبل انتباہ کر دینا چاہیے تاکہ بچوں کے اخلاق مزید بگڑنے سے بچائے جا سکیں!

قومی اسمبلی کے ہال میں جو کچھ ہوا اگر اُسی کو بجٹ پیش کرنا کہتے ہیں تو پھر عوام کو ہر ماہ ایسے دو تین تماشے دِکھانے میں کوئی ہرج نہیں! یہ تو عوام سے سراسر ناانصافی ہے کہ منی بجٹ آتے ہیں اور کسی ہلّے گُلّے کے بغیر گزر جاتے ہیں! لوگ گھی، تیل، آٹے اور دال کے نئے بھاؤ جاننے کے لیے ٹی

وی کے سامنے بیٹھے تھے مگر اُنہیں کیا معلوم تھا کہ منتخب ارکان ایک دوسرے کو آٹے دال کا بھاؤ یاد دلانے کی کوشش کریں گے! بجٹ تقریر شروع ہوتے ہی ایوان میں ایسی بولیاں بولی جانے لگیں کہ اسپیکر بھی بولنا بھول گئیں! ایوان میں حکومت کا صرف ایک اسپیکر بچا یعنی وزیر خزانہ۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ شیخ کے پاس قوم کے لیے تو کوئی خزانہ نہیں تھا مگر مضبوط اعصاب کا خزانہ ایسا تھا کہ ماحول کی پرواہ کئے بغیر بولتے رہے! جس طرح بجٹ خسارہ رکنے کا نام نہیں لیتا بالکل اُسی طرح وزیر خزانہ نے بھی رُکنے کا نام نہیں لیا! مگر خیر، ایوان میں کون تھا جو رُکنے کا سوچ رہا تھا؟ سبھی نے "گڈ گورننس" کے مظاہرے کی قسم کھا رکھی تھی۔

مرزا تنقید بیگ نے بھی مولا بجٹ یعنی وفاقی بجٹ دیکھا اور خوب انجوائے کیا۔ اگلے دن ملاقات ہوئی تو ہم نے کہا کہ سیاست دانوں کو بہبودِ عامہ کا اِس قدر خیال ہے کہ بجٹ جیسی خشک اور بظاہر بے فیض چیز کو بھی رنگ رنگ، دل کش اور پُر کیف بنادیا تاکہ کسی کے دل پر کوئی اقدام گراں نہ گزرے! مرزا کو ہماری بات سے ذرہ بھر اتفاق نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے؟ وہ تو اختلاف ہاتھوں کی لکیروں میں لکھوا کر لائے ہیں! ہم نے پوچھا بجٹ سیشن میں ایسا کیا تھا جو آپ کو پسند نہیں آیا؟ وضاحت فرمائی "بھائی صاحب! یہ سب پھر مل کر ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں اور ہم بھولے بادشاہ بنے خود کو اُلّو ثابت

"کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

مرزا کا استدلال بلکہ ضِد ہے کہ قومی اسمبلی میں جو کچھ ہوا وہ نُورا کشتی سے بڑھ کر کچھ بھی نہ تھا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ مرزا ہر معاملے کو شک کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اِس لیے فرینڈلی اپوزیشن کی صفوں سے نکلنے والی مسلم لیگ (ن) کے خُلوص" پر شک کر رہے ہیں! مرزا کا کہنا یہ ہے کہ ایوان کی میعاد کے آخری لمحات" میں اپوزیشن کی سب سے بڑی جماعت کی جانب سے غیرت کا مظاہرہ ایسا ہی ہے جیسے دریائے نیل میں غرق ہوتے وقت فرعون کا ایمان لانا! ہم نے مرزا سے استدعا کی کہ آج کی سیاست کے تذکرے فرعون کو زحمتِ شمولیت نہ دیں کیونکہ اِس سے اُس کی !بیزتی" خراب ہونے کا اندیشہ ہے"

بجٹ کو مولا بجٹ میں تبدیل کرنے والا ماحول اگر کسی حد تک نُورا کشتی بھی ہے تو ہم دُعا کریں گے کہ یہ کچھ دن تو چلے۔ اِس بہانے لوگوں کو تھوڑی بہت تفریح ہی میسر ہوگی اور وہ اِسے بھی بجٹ میں رکھی جانے والی رسمی ریلیف کا حصہ سمجھ کر خوش ہولیں !گے

نُور بھائی کا ڈپریشن

جس طرح بہت سے لوگوں کو بلا جواز دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرکے اپنا مذاق اُڑوانے بلکہ ذِلّت سے دوچار ہونے کا شوق ہوتا ہے بالکل اُسی طرح نُور بھائی (ذوالنور) کو کسی جواز کے بغیر پریشان ہونے کا شوق ہے۔ اِس شوق کی تکمیل کے لیے وہ اپنا سُکون غارت کرنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ وہ ہمارے احباب میں شامل ہیں مگر یہ گمان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہم بھی پریشان ہونے کے شوق میں اپنا ذہنی سُکون غارت کرنے پر کمربستہ رہتے ہیں! ہم نے اپنے آپ کو اِس معاملے میں اِستثناء دے رکھا ہے!

نُور بھائی کئی دِن سے کچھ زیادہ ہی پریشان تھے۔ ایک دن ہم نے ہمت کرکے اِضافی پریشانی کا سبب پوچھ لیا۔ ہمت کا لفظ ہم نے اِس لیے استعمال کیا ہے کہ نُور بھائی سے کسی بھی معاملے میں وضاحت طلب کرنا اپنے ذہنی سُکون کی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے!

نُور بھائی نے وضاحتی بیان میں کہا "کئی دن سے دفتر میں کام کی زیادتی کے باعث ڈپریشن سا ہوچلا ہے۔"

یہ سُن کر پہلے تو ہم "زیر لب کے نیچے" مُسکرائے۔ مگر پھر مُسکراہٹ ہنسی

میں تبدیل ہوئی اور ہنسی کو قہقہے میں تبدیل ہونے سے روکنا ہمارے بس میں نہ رہا۔ یہ سب کچھ اِس لیے ہوا کہ ہم نُور بھائی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ کسٹم سے متعلق اُمور کی انجام دہی کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ جس طرح وہ مختلف کاموں کے لیے دفاتر کے چکر لگانے والوں یعنی "کسٹمرز" سے نپٹتے ہیں بالکل اُسی طرح دفتری اُمور سے بھی نپٹتے ہیں! دفتر میں وہ کرتے ہی کیا ہیں جو ڈپریشن ہوگا! صبح نو سے شام بجے تک وہ خاصے بے تکلفانہ انداز سے گپ شپ فرماتے ہیں۔ دُنیا کے کِس موضوع میں ہمت ہے کہ اُن کے ذہن کے راڈار سے بچ کر نکل جائے؟ بے فکری اور بے نیازی کے ساتھ دفتری اُمور کی انجام دہی کوئی اُن سے سیکھے۔ پاپولر نان فکشن کے ایک مصنف نے تو دفتر کے ماحول کو آسان اور خوشگوار بنانے کے موضوع پر اپنی کتاب کے لیے مفید مواد جمع کرنے کی خاطر نُور بھائی سے سیر حاصل گفتگو بھی کی تھی!

ڈپریشن کی بات پر ہمیں قہقہہ لگاتے دیکھ کر نُور بھائی بھِڑ گئے اور کچھ ایسی ظالم نظروں سے دیکھا کہ ہم اپنے آپ کو ڈپریشن میں مُبتلا ہوتا ہوا محسوس کرنے لگے! ایسی حالت میں اُنہیں کنٹرول کرنے کی کوشش کرنا تو بہت دور کی بات ہے، دیکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں! ہم نے نُور بھائی سے کہا کہ بھائی صاحب! کیوں آفس کو ناحق بدنام کرتے ہیں؟ کون سا کام اور کیسا کام؟ اگر اِس بہانے پکنک پر جانا چاہتے ہیں تو یاد رکھیے کہ آپ تو روزانہ پکنک

!پر جاتے ہیں اور دفتری اوقات ختم ہوتے ہی پکنک ختم ہو جاتی ہے

اِس بات پر ہمیشہ ہمارا اِصرار رہا ہے کہ ڈپریشن کی شکایت تو نُور بھائی کے دفتری ساتھیوں کو ہونی چاہیے ! نُور بھائی کا دعوی ہے کہ کام کی زیادتی سے ڈپریشن ہو چلا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب وہ کام کرتے ہی نہیں تو کام کی زیادتی کہاں سے آئی ؟نُور بھائی کا معاملہ تو یہ ہے کہ

!تمہی قتل بھی کرو ہو، تمہی لو ثواب اُلٹا

ڈپریشن کی بات پر ہم نے نُور بھائی کو نفسی پیچیدگیوں کے کسی مستند ماہر (سائکیاٹرسٹ) سے ملنے کا مشورہ دیا۔ اِس پر انہوں نے ایک بار پھر ظالم نظروں سے ہمیں یوں گھور کر !دیکھا کہ اُن کی اُوپر کی منزل میں تھوڑی بہت گڑبڑ کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی

ہم نُور بھائی کو کوئی مشورہ دیں اور وہ آسانی سے مان لیں، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اگر وہ مان جائیں تو پھر وہ نُور بھائی نہیں ہو سکتے ! ایک بار پہلے بھی ہم نے اُنہیں سائیکیاٹرسٹ سے ملنے کا مشورہ دیکر اپنی شامتِ اعمال کو دعوت دے ڈالی تھی ! کئی احباب کے سمجھانے پر نُور بھائی سائکیاٹرسٹ سے ملاقات پر رضامند ہوئے۔ (اللہ ذہنی پیچیدگیوں کے ماہرین کو یوں بھی سزا

دیا کرتا ہے!) ذہنی خلل میں مبتلا ہر شخص کی طرح نُور بھائی بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ اُن کے ذہن کا کوئی اسکریو ڈھیلا ہے! اِس ملاقات کا اثر ہمیں کم از کم نُور بھائی پر تو مرتب ہوتا دکھائی نہیں دیا۔ اور سائکیاٹرسٹ پر کیا گزری، اِس کا ہمیں کچھ زیادہ علم نہیں! کِسی سے بتایا کہ وہ سائکیاٹرسٹ شاید پہلی بار اپنی تحلیل نفسی کے مرحلے سے گزرا تھا!

قسمیں اور واسطے دیکر احباب نے نُور بھائی کو دوسری بار یہ تسلیم کرنے پر آمادہ کیا کہ اُن کی اُوپر کی منزل کا بلب ٹھیک سے نہیں جل رہا! شہر کے مشہور سائکیاٹرسٹ سے تعارفی ملاقات میں نُور بھائی نے جب اپنے دِل (یعنی ذہن) کا حال سُنایا تو اِس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اُن کا بھی وہی مسئلہ ہے جو پوری قوم کا ہے۔ یعنی زیادتی اور بد ہضمی! نُور بھائی اپنے بارے میں بتاتے ہوئے خاصی کسر نفسی سے کام لے رہے تھے۔ ہم ساتھ تھے۔ جب ہم نے یاری دوستی ایک طرف رکھ کر سائکیاٹرسٹ کو تفصیل سے اُن کے دفتری معمولات کے بارے میں بتایا تو اُس نے خاصی کھوئی کھوئی آنکھوں اور رشک آمیز نظروں سے نُور بھائی کو گھورنا شروع کیا اور گھورتا چلا گیا۔ ہم نے کاندھا پکڑ کر ہلایا تو سائکیاٹرسٹ خیالی دُنیا سے واپس آیا! اُس نے بتایا کہ دفتر میں جس قدر سکون مُیسر ہونا چاہیے، نُور بھائی کو اُس سے کہیں زیادہ مُیسر ہے! ذہن کو خوراک زیادہ ملی ہے تو بد ہضمی ہو گئی ہے یعنی ڈپریشن ڈیرے ڈالنے کی کوشش کر

رہا ہے!

نُور بھائی یہ تمام باتیں نہایت سُکون سے سُن رہے تھے۔ سائکیاٹرسٹ نے تسلیم کیا کہ اِس قدر پُرسُکون حالت تو نصیب والوں کے حصے میں آیا کرتی ہے۔ اور یہ بھی کہ اُسے نُور بھائی پر رشک آ رہا ہے! ہم نے وضاحت کی کہ ہر سرکاری دفتر کو اللہ نے کچھ ایسی ہی پُرسُکون کیفیت سے ہمکنار کیا ہے۔ حالت یہ ہے کہ گپ شپ کے علاوہ لوگ قیلولہ (یعنی اچھا خاصا مراقبہ) کرنے کے لیے بھی دفتری ماحول کو ترجیح دینے لگے ہیں!

اب سوال یہ اُٹھا کہ نُور بھائی ڈپریشن سے نجات پانے کے لیے کیا کریں؟ سائکیاٹرسٹ نے تجویز کیا کہ اُنہیں، ظاہر ہے دِل پر پتھر رکھ کر، کچھ دن پوری دِل جمعی سے کام کرنا چاہیے تاکہ ذہن سے فراغت کی زیادتی کے اثرات زائل ہوں اور دماغ کچھ ٹھکانے پر آئے! ہم نے عرض کیا کہ یہ علاج اگر ملک بھر میں اُصول کا درجہ اختیار کرگیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ اِس طرح تو دفاتر کا "نظام زندگی" درہم برہم ہو جائے گا! ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ خدشہ بھی لاحق ہوا کہ اگر نُور بھائی نے دفتر میں کام کو سنجیدگی سے لینا شروع کردیا تو کہیں اُن کے دفتری ساتھیوں کا ذہنی معائنہ لازم نہ ہو جائے!

سُنا ہے نُور بھائی نے زندگی میں پہلی بار، ظاہر ہے محض اپنے مفاد کی خاطر، کسی کا مشورہ مانا ہے اور دفتر میں اپنا کام پوری ایمانداری اور دِل جمعی سے کر رہے ہیں۔ یہ تبدیلی اُنہیں ذہنی سُکون عطا کرنے کے ساتھ ساتھ شاید آئندہ زیادہ بڑے پیمانے پر فراغت اور بے فکری کے لیے تیار بھی کر رہی ہے! آپ سوچیں گے دفتری ساتھیوں کا کیا بنا؟ وہ بے چارے تو نُور بھائی کو باقاعدگی سے کام کرتا دیکھ کر اب تک سکتے کی حالت میں ہیں اور عین ممکن ہے کہ جلد ہی ذہنی پیچیدگیوں کے ماہرین کو چند نئے کرم فرما میسر ہوں!

اُسامہ کو "بکرا قسطوں پہ" بہت پسند تھا

مُردہ پرستی شاید کافی نہ تھی اِس لیے اب "مُردہ نویسی" کو بھی پورے جوش و خروش سے گلے لگایا جارہا ہے۔ لکھنے والوں نے کمال کر دکھایا ہے۔ جس کے بارے میں دُنیا کم ہی جانتی ہے اُس کے بارے میں اِس تواتر اور تفصیل سے لکھا جارہا ہے کہ پڑھنے والے پریشان ہیں کہ اپنے پسندیدہ کردار کو ہیرو سمجھیں یا ولن!

امریکہ کا دعوی ہے کہ القاعدہ چیف اُسامہ بن لادن کو ایبٹ آباد میں ہلاک کیا جاچکا ہے۔ اِس دعوے پر یقین نہ کرنے والوں کی تعداد اِتنی زیادہ ہے کہ اُنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایبٹ آباد آپریشن جس انداز سے کیا گیا وہ ہمارے مشہور زمانہ "پولیس مقابلوں" کے بھونڈے پن کو بھی شرمسار کرنے کے لیے کافی تھا! ہماری پولیس کسی نہ کسی طرح لاش کے درشن تو کرا ہی دیتی ہے، امریکہ بہادر سے تو یہ بھی نہ ہوسکا!

اُسامہ بن لادن کے بارے میں کچھ بھی بیان کرنا اب مشکل نہیں رہا۔ جس کسی نے بھی دُنیا چھوڑی ہے اُس نے پھر کب اِس فانی دُنیا میں واپس آکر اپنے بارے میں کہی جانے والی کسی بھی بات کی تردید کی ہے؟ اگر کل کو بھائی عُمر

شریف دعویٰ کر بیٹھیں کہ اُسامہ بن لادن کو "بکرا قسطوں پہ" بہت پسند تھا تو القاعدہ کے مرحوم سربراہ کون سا دوبارہ جہان فانی میں وارد ہو کر پریس کانفرنس کے ذریعے تردید فرمائیں گے؟ اگر کوئی شیف یہ دعویٰ کرے کہ اُسامہ بن لادن کو بینگن کا بُھرتہ اور کچّے آم (کیری) کا مُربّہ بہت پسند تھا تو کِس میں ہمت ہے کہ تردید کے لیے اُٹھ کھڑا ہو! اُسامہ سے منسوب کرکے کچھ بھی کہہ ڈالنے کے ماحول میں آپ ذرا ہماری شرافت ملاحظہ فرمایئے کہ ہم نے اب تک یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اُسامہ بن لادن کو ہمارے کالم پسند تھے اور اِنہیں پڑھنے کے بعد ہی وہ ناشتے کے لیے گرین سگنل دیا کرتے تھے!

مغرب میں القاعدہ چیف کے حوالے سے کتب کی بھرمار ہے۔ جو جتنی دور کی کوڑی لا سکتا ہے وہ اسامہ بن لادن کے بارے میں اُتنی ہی لمبی ہانک کر نام اور دام دونوں کما رہا ہے! اُسامہ بن لادن کو کیا پسند تھا اور کن باتوں یا چیزوں کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے اُن کی فہرست اگر مغرب میں شائع ہونے والی کتب کی مدد سے مرتب کی جائے تو اچھا خاصا انسائیکلو پیڈیا تیار ہو سکتا ہے! کوئی لکھتا ہے کہ اُنہیں سادگی بے حد پسند تھی۔ کوئی اُنہیں تعیش پسند قرار دیتا ہے اور بیویوں کی تعداد کو جواز کے طور پر پیش کرتا ہے! کسی مصنف کا دعویٰ ہے کہ القاعدہ چیف ہر معاملے پر خوب غور کرتے تھے اور ہر اعتبار سے visionary بصیرت کے حامل یعنی تھے۔ اِس کے جواب میں کوئی لکھتا ہے کہ اُسامہ بن

لادن غور کرنے کے عادی تو نہ تھے، ہاں طرح طرح کی فکریں اُنہیں ضرور لاحق رہا کرتی تھیں ! اب اگر جی میں آئے تو تفکرات کی بنیاد پر اُنہیں مُفکّر کہہ لیجیے

اُسامہ کی زندگی کے چند ڈھکے چُھپے گوشے اور مخصوص خیالات بیان کرنے کے لیے القاعدہ کے سربراہ ایمن الظواہری بھی اب میدان میں آ گئے ہیں۔ موصوف اُسامہ کے حوالے سے یادیں تازہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مرحوم کو بجلی پسند نہیں تھی۔ وہ سادہ طرزِ زندگی کے دلدادہ تھے اور اُن کی نظر میں بجلی بھی تعیشات میں شامل تھی !

اب ہمیں یقین آگیا کہ اُسامہ بن لادن نے نہ صرف یہ کہ پاکستان میں اچھا خاصا وقت گزارا بلکہ پاکستانیوں کی ذہنی ساخت بھی بہت حد تک اپنالی ! کئی برسوں کی اَن تھک محنت کے بعد ہماری حکومت نے عام آدمی کو یہ باور کرانے میں بھرپور کامیابی حاصل کرلی ہے کہ جس طرح دو وقت کی روٹی کا بہتر انداز سے اہتمام کرلینا اور زیادہ دَھکّے کھائے بغیر آرام دہ گاڑیوں میں کام پر جانا تعیشات میں شامل ہے بالکل اُسی طرح بجلی بھی اب تعیشات کا حصہ ہے ! یعنی نہ ملے تو دِل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے اور مل جائے تو اللہ کا شکر ادا کرنے سے نہیں چُوکنا چاہیے ! یہ ہماری حکومت ہی کا کمال ہے کہ اب لوگ شاندار

قُوتِ ارادی کا مُظاہرہ کرتے ہوئے بجلی جیسی بنیادی سہولت کا خواب دیکھتے ہیں اور اگر کسی طور وہ خواب کچھ دیر کے لیے شرمندہ تعبیر ہو جائے تو اپنی قسمت پر ناز کر اُٹھتے ہیں! ہمارے ہاں اب بہت سی ایسی چیزیں زندگی کا حصہ ہیں جنہیں چارج کرنے کے لیے لوگ بجلی کی آمد کے منتظر رہتے ہیں اور جب بجلی آتی ہے تو اُن چیزوں کو چارج کرنے سے پہلے لوگ مارے خوشی کے خود چارجڈ ہو جاتے ہیں! پاکستانیوں میں رہتے رہتے اُسامہ بن لادن پر بھی پیار رنگ ایسا چڑھا کہ وہ بھی بجلی کو تعیشات میں شُمار کرنے لگے! ایمن الظواہری بیان فرماتے ہیں کہ اُسامہ بن لادن بجلی کو تعیشات میں شمار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ مجاہدین کو سادہ زندگی بسر کرنی چاہیے اور بجلی وجلی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اُسامہ بن لادن سے متعلق ایمن الظواہری کے اِس بیان کی روشنی میں بجلی سے محروم بیشتر پاکستانی خود بخود مجاہدین کے زُمرے میں داخل ہوگئے ہیں! اور صاحب! اِس میں غلط بھی کیا ہے؟ فی زمانہ پاکستان میں بجلی کا حصول جہاد سے کم نہیں! ہمیں تو یہ ڈر ہے کہ بجلی کو ترسے ہوئے پاکستانی (یعنی مجاہدین) کہیں حکومت کو "شہید" نہ کر بیٹھیں!

مرزا تنقید بیگ سے جب ہم نے اُسامہ کی خالص پاکستانی سوچ کا ذکر کیا تو کہنے لگے اُسامہ بن لادن کی عمر کا بڑا افغانستان میں گزرا۔ اور پھر رہی سہی کسر پاکستان آکر" پوری ہوگئی۔ بجلی کے معاملے میں کبھی افغانستان جو کچھ

تھا وہ اب پاکستان ہے۔ دونوں ہی ممالک کے عوام بجلی سے محرومی کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ اُسامہ بن لادن کو بجلی کے بغیر جینے والے دونوں ممالک میں کچھ خاص فرق نظر نہیں آیا اور اُنھوں نے پاکستان کو بھی خاصی اپنائیت کے ساتھ، تورا بورا سمجھ کر اپنا مسکن بنایا! معاملہ جب یہ ہو تو بجلی کے استعمال کو تعیش تو قرار دینا ہی تھا۔"

ہم نے عرض کیا اگر یہ انقلابی اور جہادی سوچ نسیم حجازی دیکھ لیتے تو ایک اور شاہکار ناول ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ اِس بات پر مرزا بگڑ کر بولے "اُسامہ جیسے ہیرو تو خود نسیم حجازی کے ناولوں کی پیداوار، بلکہ نتیجہ ہیں! یہ نسیم حجازی ہی کا دم تھا کہ تہی دست قارئین کے دِلوں میں بھی لڑنے بھڑنے کا جذبہ پیدا کر دیا کرتے تھے اور لوگ 'چشم تصور کی آنکھ سے' اپنے آپ کو میدان جنگ میں دشمنوں یعنی کافروں کے کُشتوں کے پُشتے لگاتے دیکھنے لگتے تھے! ایمن الظواہری کو اِس بات کا کریڈٹ ضرور دینا چاہیے کہ وہ اُسامہ بن لادن کا نام لیکر جہادیوں میں قرون وسطی والا ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں جب بجلی وغیرہ نہیں تھی اور برقی آسائشات سے زیادہ جہاد پر توجہ مرکوز رکھا کرتے تھے!"

مرزا کی "مزاحیہ حِس" اپنی جگہ مگر جناب! ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے

ہماری حکومت ہی نے ایمن الظواہری سے یہ بیان دِلوایا ہے تاکہ لوگ بجلی سے متنفر ہوں اور اُس کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیں ! پاکستان میں اور بھی بہت سے اِشو ہیں۔ اُن سب کے بارے میں اُسامہ سے منسوب باتیں پھیلا کر عوام کا غُصہ آسانی سے ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے !

ہم اپنی سابق رائے سے رجوع کرتے ہوئے اب اِس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اُسامہ بن لادن واقعی اِس دنیا میں نہیں کیونکہ اگر وہ ہوتے تو زمانے بھر کی بے سر و پا باتیں اپنی ذات سے منسوب ہوتی دیکھ کر تڑپ اُٹھتے اور چُپ کا روزہ توڑ اُن سب ضرور لتاڑتے جو اُن کے بارے میں بے پَر کی اُڑاتے پھر رہے ہیں !

اور زُہرہ گزر گیا

یونانی دیو مالا میں وینس یعنی زُہرہ محبت کی دیوی ہے۔ اور سُورج، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، "اگنی دیو" قرار دیئے جانے کے لیے کسی دیو مالا کی شہادت کا محتاج نہیں! سُورج اور زُہرہ ایک صدی کے دوران آٹھ سال کے وقفے سے دو مرتبہ ملتے ہیں۔ اور پھر 105 سال کے لیے جُدا ہو جاتے ہیں۔ ماہرین نے سُورج اور زُہرہ کے حالیہ ملن کی گھڑیوں میں سُورج کی طرف دیکھنے سے گریز کا مشورہ دیا۔ ہماری نظر میں یہ زُہرہ پر نِری الزام تراشی کے سِوا کچھ نہیں۔ سُورج کی طرف دیکھنا ویسے کون سا ممکن ہے؟ اور سُورج کی طرف کی طرف دیکھنے سے بینائی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ کب لاحق نہیں ہوتا؟ زُہرہ کا نام سُن کر بہتوں کے دِل میں یہ اِشتیاق پیدا ہوا کہ اُسے اکتی ٹکتی گزرتی ہوئی دیکھیں گے۔ "اہل نظر" تیار ہو کر، پورے جذب شوق کے ساتھ بیٹھے مگر جب زُہرہ سُورج کے سامنے سے "گزرا" تو ارمانوں پر اوس پڑ گئی! جو زُہرہ کو دیکھنے کے چکّر میں چھتوں پر چڑھے ہوں گے وہ بالآخر مایوس ہو کر اُترے ہوں گے۔ بعض کم نظر سُورج کے سامنے سے زُہرہ کے گزرنے کو سُورج کے ماتھے پر چھوٹے سے داغ یا دَھبّے سے تعبیر کر بیٹھے۔ زُہرہ کے گزرنے کو

سُورج کے رُخسار کا تِل بھی کہا جاسکتا تھا! کائنات کی وُسعتوں میں رُونما ہونے والے کسی واقعے کو، بظاہر فلکی اجسام کی ملاقات کو تھوڑے سے جاندار اُسلوب سے، قدرے محبت آمیز انداز سے بھی تو بیان کیا جاسکتا ہے! کسی ماہ جبیں، نازنیں کی ٹھوڑی پر تِل ہو تو ستائش کا حق ادا کرنے کے لیے پوری لُغت بروئے کار لائی جاتی ہے بلکہ ایک تِل کے عوض سلطنت داؤ پر لگانے کا ارادہ ظاہر کردیا جاتا ہے مگر سُورج کی ٹھوڑی پر قدرت نے تِل لگایا تو ماہرین عجیب و غریب قسم کے وسوسوں کی فصل اُگانے بیٹھ گئے!

سُورج سے زُہرہ کی بالمشافہ ملاقات نِہارنے کے لیے جامعہ کراچی نے بھی خصوصی اہتمام کیا۔ جامعہ کی رصدگاہ کے ایک بیان میں بتایا گیا کہ اِس نایاب نظارے کو اساتذہ، طلباء اور شہریوں نے دیکھا۔ ہم سمجھ نہیں پائے کہ جب کوئی نظارہ نایاب ہی ٹھہرا تو نے لوگوں نے کیسے دیکھ لیا؟ بیان میں دو مقامات پر بتایا گیا کہ زُہرہ کا مشاہدہ "خُرد بین" کی مدد سے کیا گیا۔ اِس "خُرد نوازی" کے قربان جایئے۔ ہم نے اب تک یہی پڑھا ہے کہ زُہرہ کا مشاہدہ دور بین سے کیا جاتا ہے۔ خُدا جانے جامعہ کراچی میں خُرد بین سے کون سے زُہرہ یا کون سی زُہرہ کا مشاہدہ کیا گیا! خیر گزری کہ اِس بیان میں رصدگاہ کو "ص" سے لکھا گیا۔ اگر "س" سے لکھ دیتے تو نیٹو حکام فوراً پہنچ جاتے کیونکہ آج کل وہ جگہ جگہ رَسد کی بُو سُونگھتے پھر رہے ہیں!

سُورج اور زُہرہ کے ٹاکرے نے ذہن میں یادوں کی لاٹ کھول دی۔ ایک زمانہ تھا جب زُہرہ بائی انبالے والی کے گلے کی دُھوم تھی۔ مرحومہ کی آواز ایسی تھی کہ سُنیے تو بس سُنتے اور سَر دُھنتے رہیے۔ اُن کے گائے ہوئے گیتوں کی دِل کشی اب بھی ماند نہیں پڑی۔ مگر پھر بے سُروں کا جادو ایسا سَر چڑھ کر بولا کہ زُہرہ بائی انبالے والی کی دِل نشیں آواز کہیں دور انبالے کے خلاء میں گم ہو کر رہ گئ!

زہرہ بائی انبالے والی کا دور ختم ہوا تو کافی مدت کے بعد انڈین فلم میکر آں جہانی پرکاش مہرہ کی محنت سے سِلور اسکرین پر زُہرہ بائی جلوہ افروز ہوئی۔ سِکندر کے مُقدّر کا سِتارا بن کر چمکنے والی زُہرہ بائی نے اپنے جلووں کی خیرات تقسیم کی تو ایک زمانہ دنگ رہ گیا۔ آسمان پر سُورج اور زُہرہ کا ملاپ دور بین اور سَن فلِٹرز کی مدد سے دیکھا جاتا ہے مگر لوگوں نے زُہرہ بائی کو کِسی قسم کا فلِٹر آنکھوں پر چڑھائے بغیر دیکھنا زیادہ پسند کیا! میڈیا والے چونکہ بہت کچھ دیکھنا اور دِکھانا چاہتے تھے اِس لیے سِکندر اور زُہرہ کا افیئر اچھی طرح نِہارنے کے لیے اُنھوں نے "لینس" کا سہارا لیا! سِکندر کے دِل کے اُفق پر زُہرہ بائی کیا طلوع ہوئی، میڈیا کی تو چاندی ہو گئی۔ روز ایک نئی کہانی سامنے آتی تھی۔ زُہرہ بائی کے سلام عشق

کا جواب سِکندر نے جب اُٹھتے ہی دل آویز اور "دِلاورانہ" انداز سے دیا تو سنیما اسکرین طلسماتی ہو گئی اور محبت کی نئی داستان رقم ہوئی یعنی دونوں (امیتابھ اور ریکھا) کی مارکیٹ ویلیو بڑھ گئی! سِکندر اور زُہرہ بائی کے قصّے کچھ اِس انداز و ادا سے زباں زدِ عام ہوئے کہ سِکندر یعنی امیتابھ کی گھریلو زُہرہ بائی یعنی جیہ بہادری کی بہادری بھی بُزدِلی کے کھونٹے سے بندھ گئی! سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ مگر زُہرہ بائی کے روپ میں ریکھا نے جب امیتابھ بچن کی زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کی تب اُسے بول بچّن کی جِدّت کا اندازہ ہوا اور اُس نے یہ بھی جانا کہ زُہرہ انسانوں میں ہو یا سیّاروں میں، اُس کے لیے سُورج کے سامنے جانا اور گھڑی دو گھڑی کی ملاقات کرنا تو ممکن ہے !مگر اُسے اپنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں کیا جا سکتا

فی زمانہ ایک اور زُہرہ ایسی ہیں جنہیں دیکھنے کی تاب کِسی کِسی میں ہے اور وہ ہیں 100 سالہ زُہرہ سہگل! زُہرہ سہگل نے 96 سال کی عمر میں بھی فلم میں کام کیا ہے۔ زُہرہ سہگل کا خُرّانٹ بھرا چہرہ دیکھنے کے لیے لازم ہے قریب بیٹھنے پر بھی آپ دوربین کا سہارا لیں اور دُور کھسکتے جائیں! فلم کے کِسی بھی فریم میں جب یہ ہوتی ہیں تو پھر کوئی اور آنکھوں کے سامنے ہو کر بھی دِکھائی نہیں دیتا! سُورج سے دور ہٹے ہوئے زُہرہ کو دیکھنا چنداں دشوار نہیں۔ مگر زُہرہ سہگل کی "آب وتاب" ایسی ہے کہ تنہا بھی ہوں تو اُن کے

!جلوے آنکھوں کو چُندھیانے کے لیے کافی ہیں

نظام شمسی کی وسعتوں میں محو سفر زُہرہ کی فضائی کُرّہ زمین کے فضائی کُرّے کے مقابلے میں 100 گنا کثیف ہے۔اِس سیّارے پر ہر وقت گندھک کے تیزاب سے بھرے ہوئے بادل کئی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑتے پھرتے ہیں۔اِس قدر ہیبت ناک فضاء کا حامل ہونے پر بھی زُہرہ کی ہمت دیکھیے کہ سُورج کو سلام عشق پیش کرنے پہنچ گیا! آسمانی زُہرہ کی جُرات میں اُن سب کے لیے بڑا واضح پیغام ہے جو دِل کی بات کہنے کے معاملے میں تذبذب کا شِکار رہتے ہیں! سراسر اِنسان دُشمن ماحول کے حامل زُہرہ کا !اِنسان کو یہی مشورہ ہے کہ جو کہنا ہے سب کہہ دو، ماہرین کی پرواہ مت کرو

مہدی حسن کو اب کہاں پائیں گے ہم

یہ 1993 کا ذکر ہے۔ النور سوسائٹی میں شہنشاہِ غزل مہدی حسن خاں صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی اور یہ پہلی ملاقات ہی بہت کچھ کہہ گئی، سُنا گئی۔ آج وہ نہیں رہے تو بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔

جب ہم مہدی حسن صاحب کی نواسی یہ وش کی رہنمائی میں چوتھی منزل (چھت) پر واقع کمرے میں داخل ہوئے تو خاں صاحب پلنگ پر بیٹھے تھے۔ پلنگ کے نیچے ہاوَن دستہ رکھا ہوا تھا۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا جہاں ہارمونیم، سُر منڈل یا تان پورہ ہونا چاہیے وہاں ہاوَن دستہ کیوں؟ خاصی سُریلی مُسکراہٹ کے ساتھ وضاحت فرمائی "مجھے حِکمت سے بھی شغف ہے، چھوٹی موٹی ادویہ دیسی جڑی بوٹیوں کی مدد سے گھر ہی پر تیار کرتا ہوں۔"

حیرانی ہوئی کہ ہم تو روح کے دُکھوں کا علاج کرنے والی آواز سے ملنے آئے تھے اور یہاں تو جسمانی دُکھوں کے علاج کی بھی سبیل نظر آ گئی! ویسے خاں صاحب بھلے ہی جڑی بوٹیوں کا سہارا لینے کے مُکلّف تھے مگر اُن کے چچا اسمٰعیل خاں مرحوم تو محض گا کر بچوں کے پیٹ کا درد ختم کر دیا کرتے تھے!

خاں صاحب کے گھر میں داخل ہوتے ہی کچھ کچھ اندازہ ہوگیا کہ جو شخصیت سُروں کی ترتیب بہت اچھی طرح جانتی ہے وہ زندگی کی ترتیب کے بارے میں زیادہ فکر مند رہنے کی عادی نہیں ! بہت کچھ بکھرا ہوا تھا۔ اور خاں صاحب سے مِل کر یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ پورے گھر کا مدار اُن کی شخصیت (یعنی گائیکی سے ہونے والی آمدن) پر ہے ! ایک عظیم فنکار کو جب گھر چلانے ہی سے فُرصت نہ ہو تو زندگی میں ترتیب اور نظم کہاں سے آئے گا ! یہ سب کچھ ہمارے لیے تھوڑا سا چونکانے والا تھا۔ ہم نے پہلی گفتگو کے دوران خاں صاحب سے اشارتاً کہا کہ آپ جیسی شخصیت کی زندگی میں ترتیب اور نظم کا فقدان دکھائی دیتا ہے۔ ہنس کر فرمایا "سب کو سبھی کچھ نہیں مل جایا کرتا۔ میں گانے سے کام رکھتا ہوں اور یہی میرا کام ہے۔"

خاں صاحب کی باتوں سے صاف اندازہ ہوا کہ وہ شان و شوکت دکھانے اور لوگوں کو مَرعُوب کرنے کے شوقین یا عادی نہ تھے۔ مَرعُوب، بلکہ مَغلُوب کرنے کے لیے اُن کی آواز ہی کافی تھی ! وہ جب گاتے تھے تو سُننے والوں کے لیے خاموش رہنا تقریباً لازم ہو جایا کرتا تھا۔

خاں صاحب نے ہمیں صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور کسی کام سے کمرے کے باہر

گئے۔ واپس آئے تو پلنگ پر بیٹھنے کے بجائے فرش پر بیٹھ گئے۔ ہم بھی صوفے سے اُتر کر نیچے بیٹھے تو کہا "آپ اوپر ہی بیٹھے رہیں، میں تو فرش پر بیٹھ کر زیادہ سکون محسوس کرتا ہوں۔" ہم نے عرض کیا کہ یہ بے ادبی ہو گی کہ ہم اوپر بیٹھے رہیں اور آپ نیچے فرش پر بیٹھیں۔ مگر وہ نہ مانے اور اِصرار کر کے ہمیں صوفے ہی پر براجمان رہنے پر مجبور کیا۔ گفتگو میں لفّاظی ضرور تھی مگر سادگی نمایاں تھی۔ اُن کی باتوں نے یہ راز کھولا کہ اُنہیں جس قدر شوق گانے کا ہے اُسی قدر شوق بولنے کا بھی ہے۔ اور اُن کی باتوں میں بہت کچھ تھا۔ وہ مختلف زمانوں کا احوال کچھ اِس طرح بیان کرتے تھے کہ پوری تصویر ذہن کے پردے پر نمودار ہو جاتی تھی۔ جب خاں صاحب بول رہے ہوتے تھے تو کہیں کسی ایک جُملے میں بھی اپنی ذات کو مُقدم رکھنے یا اپنے بڑے ہونے کا تاثر نہیں دیتے تھے۔ یہ وصف و ظرف بھی نصیب والوں کو مِلا کرتا ہے، اور وہ بھی ماں باپ کی دُعاؤں کے صدقے۔

خاں صاحب نے اُس دور میں گانا شروع کیا جب گانا شوق اور پیشے سے کہیں بڑھ کر امتحان تھا۔ گانے کے مواقع کم تھے۔ صرف ریڈیو تھا یا پھر فلم انڈسٹری۔ ریڈیو پر گانے کے لیے سخت مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ بڑی مشکل سے کیٹیگری کا تعین ہوتا تھا اور بُکنگ مِلا کرتی تھی۔ موسیقی کے علم اور فن پر کمال دسترس رکھنے والے ریڈیو کی چھتری تلے جمع تھے جو کسی بھی گانے والے کو بہت

چھان پھٹک کر منتخب کرتے تھے۔ غزلوں کا انتخاب بھی خاصا جاں گُسل مرحلہ ہوا کرتا تھا۔ سامعین بھی پوری توجہ سے سُنا کرتے تھے اِس لیے ہر آرٹسٹ کو بہت محنت کرنا پڑتی تھی۔ ایسے سنگلاخ ماحول میں خاں صاحب نے اپنا آپ منوایا۔ جن دُھنوں کو آج کے عوام تو کیا، فنکار بھی سُن کر آسانی سے ہضم نہیں کر سکتے اُن دُھنوں کو خاں صاحب نے جگر کا خون دیکر تقویت بہم پہنچائی اور دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ عزیز حامد مدنی کی غزل "تازہ ہوا بہار کی"، میر تقی میر کی غزل "سبزہ ہے، آبجو ہے" اور امام بخش ناسخ کی غزل "دِل میں پوشیدہ تپِ عشق بتاں رکھتے ہیں" ایسی مشکل دُھنوں میں گائی گئی ہیں کہ آج کی نسل تو مطلع بھی بمشکل ہضم کر پائے گی! ریڈیو پاکستان کے لیے غزل سرائی کرتے ہوئے خاں صاحب نے اساتذہ کی ایسی بہت سی غزلیں گائیں جنہیں دوسرے گلوکار بھاری پتھر سمجھ کر، صرف چوم کر چھوڑ دیا کرتے تھے!

خاں صاحب کے گلے میں سات اور زندگی میں درجنوں سُر تھے۔ جدّی پُشتی گایک تھے۔ رگوں میں خون کے ساتھ راگ بھی بہا کرتے تھے۔ بات بھی سُر میں کرتے تھے۔ دُنیا اُنہیں ایک معروف غزل گایک کی حیثیت سے جانتی ہے، مگر یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ فن کی دُنیا میں نام کمانے سے قبل اُنھوں نے زندگی کی سرگم کے کومل اور تیور ہر دو طرح کے سُر سُنے اور اُن پر سر بھی دُھنا۔ فن کی دُنیا میں خاں صاحب سولھویں پُشت تھے۔ فن کی دنیا کا بھرم رکھنے کے لیے

اُنھوں نے کسی بھی مرحلے پر زندگی کو پیٹھ نہیں دِکھائی۔ اُن کے والد عظیم خاں دُھرپد کے اچھے گایک تھے۔ پاکستان آنے کے بعد تنگی کا سامنا کرنا پڑا۔ سائیکل کی دُکان بھی کھولی اور لکڑی کی ٹال بھی لگائی۔ عظیم خاں کے جس بیٹے کے مقدر میں شہنشاہِ غزل ہونا لکھا تھا اُس نے سائیکلوں کے پنکچر لگائے، ساہیوال کے نزدیک کھیتی باڑی کی اور بعد میں موٹر میکینک کی تربیت پا کر گیراج کھولا۔ بڑی بات یہ ہے کہ اِن تمام مراحل سے گزرنے پر بھی خاں صاحب کے دِل میں فن کی آگ سَرد نہیں پڑی۔ جب گاڑیوں کی مرمت ترک کرکے مائکرو فون کے سامنے کھڑے ہوئے تب بھی حالات کی سختی کم نہ ہوئی۔ یہ دور وہ تھا جس میں بیگم اختر، فریدہ خانم، اُستاد برکت علی خاں، علی بخش ظہور، عنایت حسین بھٹی اور مُنیر حسین کا جادو سرچڑھ کر بول رہا تھا۔ خاں صاحب ایک مخصوص انداز کے گلوکار تھے اور اِس انداز کو سمجھنے والے بھی کم کم تھے۔ ابتداء میں آواز پتلی اور جی ایم دُرّانی کی آواز سے مُشابہ تھی! محنتِ شاقہ سے اُنھوں نے اپنی آواز کو غزل ٹھمری وغیرہ کے لیے تیار کیا۔ خاں صاحب نے ریڈیو پر ابتدائی سات آٹھ سال اِس طور کام کیا کہ کسی بڑی کامیابی کا امکان واضح نہ تھا مگر پھر بھی اُن کے حوصلے کی چمک ماند نہیں پڑی۔ فلمی دُنیا میں قدم رکھنے پر بھرپور کامیابی راتوں رات نہیں مِل گئی بلکہ اُنہیں 1956 سے 1963 تک صرف 9 گانے ملے۔ یہ کسی بھی اعتبار سے حوصلہ افزاء صورت حال نہ تھی مگر خاں صاحب نے کسی بھی مرحلے پر مایوسی کو اپنے وجود اور فن

پر طاری نہ ہونے دیا اور اپنے حصے کا کام کرتے رہے۔ کوئی اگر گائیکی سے شغف نہ رکھتا ہو تب بھی خاں صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار پر طائرانہ نظر ڈال کر بہت کچھ سیکھ اور پا سکتا ہے۔ ستائش اور صلے کی پروا کئے بغیر صرف محنت کرتے جانا اور فن کو پروان چڑھاتے رہنا ایسا شوق اور وصف ہے کہ کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے!

نئی نسل ہر معاملے میں تن آسانی کی قائل ہے۔ اُس کے لیے خاں صاحب کی زندگی تحریک بخشنے والی داستان کے مانند ہے۔ اُنھوں نے ہر قدم پر تن آسانی کو روندا اور جو کچھ بھی گایا اُس کا حق ادا کیا۔ عظیم فنکار ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ خاں صاحب کی شکل میں ایک عظیم فنکار ہمارے حصے میں آیا۔ دُکھ اِس بات کا ہے کہ جن میں عظیم فنکار ڈھلا کرتے تھے اب وہ سانچے ہی نہ رہے!

فرانس نے تو بوریا بستر باندھ لیا

بیسویں صدی میں وجودیت کے فلسفے کو دُنیا بھر میں مقبولیت سے ہمکنار کرنے والی سب سے توانا آواز فرانس سے اُبھری جو ژاں پال سارتر کی تھی۔ سارتر نے زندگی بھر وجودیت اور وجود کی مقصدیت پر بحث کی اور دنیا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ انسان اپنی قوت سے کچھ بھی کر سکتا ہے مگر اُسے سب کچھ دانش کے تقاضوں کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ وجود کی معنویت سے متعلق سے یہ فلسفہ فرانس کے نئے صدر فرانکوئی اولاند نے خوب سمجھا ہے اور ایک تازہ جھڑپ میں چار فرانسیسی فوجیوں کے مارے جانے کی خبر آتے ہی افغانستان سے بوریا بستر باندھنے کا اعلان کر دیا! نئے فرانسیسی صدر نے انتخابی مہم کے دوران اعلان کیا تھا کہ افغانستان سے فرانسیسی فوجیوں کے انخلاء کی ڈیڈ لائن میں ایک سال کی کمی کر دی جائے گی۔ مگر اب وہ ڈیڈ لائن میں مزید کمی کرتے ہوئے تمام کے تمام یعنی 3500 فوجیوں کا انخلاء یکم جولائی سے شروع کرنے کا حکم دے چکے ہیں۔ اور یہ عمل 31 دسمبر تک مکمل کر لیے جانے کا امکان ہے۔

دنیا بھر میں جدت اور ندرت کے لیے مغرب کی طرف دیکھا جاتا ہے اور فرانس کے دارالحکومت پیرس کو فیشن کا بھی دارالحکومت کہا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ

اولاند اخلاء کو بھی فیشن کا درجہ دیکر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں! ایک بڑی طاقت کے صدر کو انتخابی وعدہ پورا کرنے کا موقع مل رہا ہے اور کچھ لگانا بھی نہیں، بلکہ نکالنا ہے۔ ووٹرز کا شکریہ ادا کرنے کا اِس سے اچھا موقع بھلا اُنہیں کب ملے گا؟

مرزا تفصیل بیگ اِس صورت حال سے خوب محظوظ ہو رہے ہیں۔ ہم اُن کی "سنگ دِلی" دیکھ کر حیران ہیں۔ اتحادیوں کی واٹ لگ رہی ہے اور اُنہیں اٹکھیلیاں سُوجھ رہی ہیں! ہم نے مرزا سے عرض کیا کہ مہمانوں کو اِس طرح ستانا، پریشان کرنا کوئی اچھی بات ہیں۔ بے چارے سات نہیں تو دو تین سمندر ضرور پار کرکے افغانستان کے سنگلاخ پہاڑوں میں پہنچے ہیں۔ افغانستان کو منہ کون لگاتا ہے؟ یہ تو گورے ہیں جو وقتاً فوقتاً اُس پر مہربان ہوتے رہتے ہیں۔ اور افغان ہیں کہ اُن کی واٹ لگانے پر تُلے رہتے ہیں! اِتنا سُننا تھا کہ مرزا کی رگِ ملامت پھڑک اُٹھی۔ "تم جیسوں کو تو بس بہانہ چاہیے گوروں کی چمچہ گیری کا۔ اگر یہ گورے افغانوں کے ایسے ہی خیر خواہ ہوتے تو سوویت فوج کے نکل بھاگتے ہی بھاگ کھڑے نہ ہوتے۔ اور پھر جب طالبان نے حکومت بنالی اور اچھی طرح کام چلنے لگا تو امریکہ اور برطانیہ پھر افغانستان پر خُنّس کھانے لگے۔ نائن الیون بہانہ بنا اور دنیا بھر سے فوجی جمع کرکے یعنی بھان متی والا کنبہ جوڑ کر افغانستان پر چڑھائی کردی۔"

ہم نے یاد دلایا کہ معاملہ فرانس تک محدود نہیں۔ خود امریکہ بھی جلد از جلد افغانستان سے نکلنے کا خواہش مند ہے مگر "وضع داری" بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اگر یونہی نکل گیا تو لوگ باتیں بنائیں گے۔ واحد سُپر پاور ہونے کے ناطے اُس پر چند ایک اخلاقی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ امریکہ کو اپنی ویلیوز اور اُن سے بھی کہیں بڑھ کر، !مارکیٹ ویلیو کا خاصی شِدّت سے احساس ہے

مرزا بولے "کاہے کی اخلاقی ذمہ داری؟ اگر موقع ملے اور بس چلے تو امریکہ اپنے فوجیوں کو سب سے پہلے افغانستان سے نکال لے۔ یہ تو کچھ کچھ "مقطع میں آ پڑی ہے سُخن گسترانہ بات" والا معاملہ ہے۔ امریکی فوج نکلنا چاہتی ہے مگر معاملہ سیاسی قیادت کی کھجور میں اٹک گیا ہے! پینٹاگون چاہتا ہے کہ امریکہ سے جلد از جلد بوریا بستر گول کرلیا جائے مگر وائٹ ہاؤس کو خوف ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں اُس کے چہرے پر دُنیا کالک پوت دے گی! وہی فوج اور سویلین کا جھگڑا! پاکستان سے امریکہ تک سب کی ایک کہانی ہے! براک اوباما دوبارہ صدر منتخب ہونا چاہتے ہیں۔ اگر اُنہوں نے امریکی فوجیوں کو افغانستان سے نکالنا شروع کیا اور وہاں طالبان نے حملے بڑھا دیئے تو؟ اوباما کا دوسرا صدارتی دور پیدا ہونے سے پہلے مر جائے گا! فی الحال انخلاء شروع کرنا اوباما

"!کے لیے مشن امپوسیبل ہے

ہم نے فرانس کے صدر کی اُصول پسندی کو سراہا کہ اُنہوں نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا یعنی افغانستان سے انخلاء کی ڈیڈ لائن کم کردی۔ مرزا ہماری بات سے یکسر متفق نہ ہوئے۔ ارشاد ہوا۔ "اگر اولاند صاحب کو ڈھنگ سے کام کرنا ہے تو اپنی فوج کے معصوم پرندوں کو طالبان کے شکنجے سے بچانا ہوگا۔اِس کے لیے انخلاء سے اچھا راستہ بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ اگر وہ اپنے فوجیوں کو تیزی سے نکال رہے ہیں تو اِس میں کوئی اُصول پسندی وغیرہ "نہیں بلکہ مجبوری ہے۔ یعنی مجبوری کا نام شکریہ۔

امریکہ نے یاروں کو عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔ یورپ اپنی گردن افغانستان کے چوہے دان سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یورپ اب سوفٹ پاور کی راہ پر گامزن ہے یعنی ٹیکنالوجی، جدت طرازی، سرمایہ کاری اور علم و فن کے ذریعے آگے بڑھنا اور باقی دنیا کو گلے لگانا چاہتا ہے مگر امریکہ اب تک ہارڈ پاور یعنی عسکریت پسندی کی راہ پر گامزن ہے۔ اُس کا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیشہ یورپ کو ساتھ لیکر چلتا رہا ہے۔ اور اب یورپ ہاتھ چھڑا کر، دور ہٹ کر چلنا چاہتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ کرے؟ امریکہ کو عادت پڑ گئی ہے ہر جگہ منہ مارنے کی۔ پھولوں کے ساتھ ساتھ وہ کانٹوں پر بھی منہ مارتا ہے اور اِس کا خمیازہ بھی بھگتتا ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ اِس خمیازے میں اپنے اتحادیوں کو بھی

شریک کرتا ہے! یورپ اس صورت حال سے تنگ ہے۔ بہت سے فیصلے امریکہ تنہا کرتا ہے مگر بھگتنا سب کو پڑتا ہے۔

افغانستان میں یورپ اپنا انتہائی برا وقت دیکھ رہا ہے۔۔برطانیہ، فرانس، جرمنی، ڈنمارک، ناروے، اٹلی اور دیگر یورپی ممالک کے فوجیوں کو طالبان نے ناکوں چنے چبوائے ہیں۔ ہلمنڈ اور چند دوسرے صوبوں میں تو یورپی ممالک نے اپنے فوجیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے طالبان کو رشوت بھی دی ہے! ۔برطانیہ نے ہلمند میں اپنے سیکڑوں فوجیوں کو اِسی طور بچایا۔ ویسے تو کسی بھی اسکینڈل کے سامنے آنے پر مغربی دنیا کے عوام اچھل پڑتے ہیں۔ مگر جب ہلمند اور دیگر افغان صوبوں میں یورپی ممالک کی جانب سے ادائیگی کرکے جان بچانے کا اسکینڈل سامنے آنے پر کچھ خاص رد عمل دکھائی نہیں دیا۔ سب کا یہی خیال ہے کہ جان بچی سو لاکھوں پائے، لوٹ کے بدھو گھر کو آئے!

واحد سپر پاور ہونے کے باعث امریکہ بہت سے کام نہیں کرسکتا۔ مثلاً وہ طالبان کو پیسے دیکر اپنے فوجیوں کی جاں بخشی نہیں کرواسکتا۔ ایسے کچھ بھی کرنے کی صورت میں کمپنی کی ایسی "مشہوری" ہوگی کہ بہت کچھ داؤ پر لگ جائے گا! فی الحال امریکہ سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہیں۔

فرانس نے ایک ایسا قدم اٹھایا ہے جس سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ جو ممالک افغانستان سے جلد از جلد نکل بھاگنے کے موڈ میں ہیں ان کے لیے فرانس نے تحریک کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جرمنی اور برطانیہ بھی بہت جلد اس کے نقش قدم پر چلتے دکھائی دیں گے۔ ان ممالک کے لیے اب مزید قربانی دینا ممکن نہیں۔ اور پھر قربانی کیوں دی جائے جبکہ میلہ تو صرف امریکہ لوٹنا چاہتا ہے! وہ چاہتا ہے کہ سارا کریڈٹ اُسے ملے۔

سارے فیصلے بھی وہ تنہا کر گزرتا ہے۔ اِن فیصلوں کے مابعد اثرات بے چارے یورپ کو بھی بھگتنا پڑتے ہیں۔ کریڈٹ امریکہ خود لے اُڑتا ہے اور ڈِز کریڈٹ سب میں مساوی تقسیم کرتا ہے۔ دُنیا بھر کی نعمتوں سے ہمکنار اقوام اب پُر سُکون زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں مگر امریکہ اُن کے سُکون کی راہ میں حائل ہوچکا ہے۔ سچ ہی تو ہے۔ جن کا اپنا سکون غارت ہوچکا ہو وہ کب دوسروں کا سکون برداشت کر سکتے ہیں! امریکہ چاہتا ہے کہ اُس کی بداعمالیوں کا کاٹھ کباڑ یورپ بھی اُٹھاتا پھرے۔ مگر اب ایسا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ فرانس نے بوریا بستر باندھ کر سب کو راستہ دکھادیا ہے۔ معاملہ صرف یہ تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھتا ہے۔ اب فرانس نے انخلاء کی بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ ہی دی ہے تو نکل بھاگنے کے متعدی اور وبائی مرض کو پھیلنے میں دیر نہیں لگے گی!

فرانکوا اولاند نے پیرس کے ایفل ٹاور جیسا بلند و بالا فیصلہ کیا ہے اور

امریکہ کی ٹوئن ٹاورز جیسی زمین بوس پالیسیوں کو خیر باد کہتے ہوئے اپنی راہ لی ہے۔
بہتر تو یہی ہے کہ اب یورپ کے تمام ہی ممالک اپنی اپنی راہ لیں اور امریکہ بہادر کو سپر پاور اور جاہ پسند ملک ہونے کی قیمت خود چکانے کا موقع دیں ! طالبان کے لیے یہ بہت اچھا موقع ہے۔ فرانس کے چار فوجی ایک ساتھ لُڑھکا کر انھوں نے پیرس کو پریشان کردیا۔ وہ تھوڑی سی اور ہمت سے کام لیں تو لندن، برلن، روم، کوپن ہیگن اور دوسرے بہت سے یورپی "کیپٹلز" میں ہلچل مچے گی اور کیپٹل ازم کو بچانے کے خواہش مند اپنی افواج کو افغانستان سے بہ عجلت نکالنے کے لیے میدان میں آ جائیں گے !

بے زبان جانوروں کی تذلیل اچھی بات نہیں

صُومالیہ کے بارے میں دُنیا جانتی ہے کہ انتہائی "شر خیز" خِطہ ہے۔ اور صُومالی سمندر، قزاقوں کی مہربانی سے، اُتنا ہی "زرخیز" ہے! علاقائی پانیوں میں صُومالی قزاق کمپنی کی مشہوری یعنی (بچے کھچے) مُلک کی بدنامی کے لیے کوشاں رہتے ہیں! اِن قزاقوں کی نگاہِ کرم جس سمندری خطے پر پڑے وہ بحر ظلمات میں تبدیل ہو جاتا ہے! اِن قزاقوں کی مہربانی سے بعض جہاز رانوں کو عالمگیر شہرت بھی مل جاتی ہے۔ جب اِنہیں تاوان کے لیے پکڑا جاتا ہے تو دُنیا بھر کے میڈیا میں خبریں چلتی ہیں۔ اور ہمارے ہاں تو قزاقوں کے ہاتھوں یرغمال بنائے جانے والوں کو بیٹھے بٹھائے ہیرو بنانے کا رواج سا چل پڑا ہے! قزاقوں کے دم سے اُن لوگوں کے گھر کا دال دلیہ بھی چل رہا ہے جو تاوان جمع کرنے اور قزاقوں تک منتقل کرنے کے معاملے میں خدائی فوجدار بن بیٹھے ہیں!

امریکی محکمہ دفاع کی جانب سے القاعدہ اور دیگر جہادی گروپوں کے رہنماؤں کے سَر کی قیمت رکھے جانے کا انتقام لینے کی غرض سے صومالیہ میں القاعدہ کے نام کی لاج رکھنے کے لیے سرگرم الشباب گروپ نے امریکی صدر اور وزیر خارجہ کے سَر کی قیمت مقرر کی ہے۔ الشباب نے صدر اوبامہ تک رسائی میں مدد دینے

والے کو 10 اونٹ اور ہلیری کلنٹن تک رسائی میں معاونت کرنے پر 10 پالتو مُرغ اور 10 مُرغیاں دینے کا اعلان کیا ہے!

اوبامہ کا تعلق ڈیموکریٹک پارٹی سے ہے۔اِس پارٹی کا نشان گدھا ہے۔ شاید اِس لیے یہ پارٹی مسلمانوں کو ڈرون حملوں کی شکل میں دولتّیاں مار رہی ہیں! الشباب والے بہت ذہین نکلے۔ وہ اوبامہ کے سَر کی قیمت رکھنے کے لیے گدھوں کو تو بہر حال استعمال کر نہیں سکتے تھے۔اِس صورت میں ڈیموکریٹک پارٹی کے لیے مُفت میں کمپنی کی مشہوری کا اہتمام ہو جاتا! اور جب گدھے انعام کے لیے مختص ہو جاتے تو اوبامہ کی انتخابی مہم کون چلاتا؟ ویسے بھی گدھا بہت محنتی اور خاصا وفادار قسم کا جانور ہے۔ وہ محنت کرنے کے ساتھ ساتھ ظلم بھی سہتا ہے مگر مالک سے بغاوت نہیں کرتا۔اُونٹ بھی محنت تو بہت کرتا ہے مگر اُس کا کینہ بھی مشہور ہے۔اوبامہ نے بھی مسلمانوں سے کچھ کچھ کینہ پروری والا ہی معاملہ رکھا ہےاِس لیے اُن کے سَر کی قیمت اُونٹوں کی شکل میں رکھنا زیادہ حیرت انگیز نہیں!

مرزا تنقید بیگ کو تو بے تاب اور پریشان ہونے کا بہانہ چاہیے۔اُنھوں نے یہ خبر پڑھی تو دوڑے چلے آئے۔ ہم سمجھے شاید وہ انعام کی دوڑ میں شریک ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔ اور امریکی صدر کا پتہ بتانے کے لیے اُنہیں 9 اونٹ دینا

مناسب ہوگا کیونکہ اُن کی بھی کوئی کَل سیدھی نہیں ! مگر کچھ ہی دیر میں مرزا نے وضاحت کردی کہ وہ امریکی صدر یا وزیر خارجہ کا پتہ بتا کر اونٹ اور مُرغیاں انعام میں پانے کے خواہش مند نہیں۔ وہ تو یہ شکوہ کرنے بیٹھ گئے کہ الشباب نے انعامات کا اعلان کرتے وقت عہدے کی شان اور وقعت کا بھی خیال نہ رکھا۔ اوباما کا پتہ بتانے پر انعام میں اونٹ دینے کا اعلان مرزا کے خیال میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں کیونکہ امریکی صدر بھی آج کل اُونٹ کی طرح بے ڈھنگی چال چل رہے ہیں۔ انتخابی سال ہونے کے باعث وہ اُونٹ کی طرح جہاں تہاں منہ مار رہے ہیں ! اگر ووٹ بینک بڑھنے کا مژدہ سُنایا جائے تو وہ اپنے آپ کو بھی کاٹ کھائیں ! مرزا کا استدلال ہے کہ امریکی صدر اور اُن کی متعارف کرائی ہوئی پالیسیوں کی بھی کوئی کَل سیدھی نظر نہیں آتی !

ہلیری کے معاملے میں البتہ مرزا کچھ جذباتی دِکھائی دیئے۔ ہم نے پوچھا ہلیری پر رکھے جانے والے انعامات کو آپ کِس اعتبار سے نامناسب سمجھتے ہیں؟ مرزا کا بیان تھا "ہلیری کوئی اور نہیں، واحد سُپر پاور کی وزیر خارجہ ہیں۔ خاتون اول بھی رہ چکی ہیں اور وہ بھی دو مرتبہ۔ یہ تو سراسر ظلم ہے کہ صدر کے سَر قیمت لگانے کے لیے اُونٹ بروئے کار لائے جائیں اور بے چاری سابق خاتون اول کو مُرغوں اور مُرغیوں کی ہم پلّہ قرار دیا جائے یعنی اُونٹ سے گرے تو مُرغیوں تک آ گئے ! سابق خاتون اول اور موجودہ وزیر خارجہ ہونے کے

ناطے ہلیری کا اِتنا تو حق بنتا تھا کہ اُن کے سَر کی قیمت بکروں اور بکریوں کی شکل میں رکھی جاتی ! مسلمانوں کو قربانی کے بکروں کی طرح ٹھکانے میں آخر کو ہلیری کا بھی "نہایت اہم کردار رہا ہے۔

ہم مرزا سے متفق نہیں۔ اُن کے نزدیک ہلیری کے سَر کی قیمت مُرغوں اور مُرغیوں کی شکل میں متعین کرنا اِن معصوم جانوروں کی توہین ہو تو ہو، خود ہلیری کے لیے تو بہرحال فخر کی بات ہے۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے پڑپوتے اُستاد محبوب نرالے عالم مرحوم نے ایک کتاب "یہ دُنیا مُرغِ دِل" کے عنوان سے لکھی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب کوئی "بُزدِل" ہو سکتا ہے تو اُس سے کمزور دِل والا "مُرغِ دِل" بھی ہو سکتا ہے ! ہلیری چونکہ صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہیں اِس لیے اُن کے سَر کی قیمت مُرغیوں کی شکل میں متعین کرنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ! اوبامہ انتظامیہ کے بھیڑیوں اور سانڈوں کے درمیان ہلیری ویسے بھی چکن سے بڑھ کر کچھ نہیں !

مرزا کہتے ہیں "الشباب نے مسلمانوں کے قتل عام میں ملوث ہونے پر اوبامہ اور ہلیری کی قیمت تو مقرر کردی۔ ذرا مُسلم دنیا کے حکمرانوں کے بارے میں بھی سوچیں تاکہ دُنیا کو معلوم ہو کہ اور کون کون سے جانور سَر کی قیمت لگانے کے لیے استعمال کئے جا سکتے ہیں ! اپنے ہی ہم مذہبوں اور ہم وطنوں کے قتل میں

امریکہ کی مدد کرنے والے مسلمانوں کے سَر کی قیمت متعین کرنے کے لیے جانوروں کا استعمال الشباب کے لیے آسان نہ ہوگا کیونکہ ایسے مسلمانوں خود بھی حیوانات کی کیٹیگری میں ہیں ! واحد سُپر پاور کی لڑکھڑاتی ہوئی طاقت کو سہارا دینے کے لیے دِل و جان کے ساتھ خدمات پیش کرنے والے میر جعفروں پر انعام مقرر کرنے کے لیے الشباب جیسے گروپوں کو جانوروں کی دُنیا کا اچھی طرح جائزہ لینا پڑے گا تاکہ کِسی معصوم جانور کی نیک نامی پر حرف نہ آئے ! "

مرزا کی بات سُن کر کچھ دیر کے لیے تو ہم بھی جذباتی ہوگئے۔ پھر جب باتوں کا سِحر کچھ ٹوٹا تو ہم نے ہمت کرکے عرض کیا کہ اللہ مسلمانوں کو مسلمانوں ہی کے ذریعے "رزق" دے رہا ہے۔ بہت سے مسلمانوں کے گھر میں اُجالا اِسی بات سے ہے کہ بہت سے دوسرے مسلمانوں کے گھر تاریکیوں میں ڈوب جائیں ! یہ امریکہ، برطانیہ وغیرہ تو بے چارے مُفت میں بدنام ہو رہے ہیں ! یہ بات سُن کر مرزا نے ہمیں یُوں گھور کر دیکھا جیسے کِسی ناگفتہ جانور کی شکل میں ہمارے سَر کی قیمت کا تعین کر رہے ہوں !

مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے

بھارت اور اُس کے باسیوں میں وہ تمام خصلتیں بہ درجہ اتم پائی جاتی ہیں جو سُپر پاور بننے کے لیے ناگزیر سمجھی جاتی ہیں۔ اگر کوئی ملک سُپر پاور بننا چاہتا ہے تو لازم ہے کہ اُس کا کہا اور کیا کسی کی سمجھ میں نہ آئے! برطانیہ، امریکہ اور دیگر بڑی طاقتوں نے ایسا ہی تو کیا ہے۔ لوگ اِن کی کسی بھی پالیسی کو دو تین عشروں کے بعد سمجھنے میں کامیاب ہوتے تھے!

قدیم ہندوستان کے عظیم دانشور چانکیہ نے حکومت چلانے کے بہت سے گُر سکھائے۔ اِن میں ایک یہ بھی ہے کہ جو آپ ہیں اُس سے یکسر مختلف نظر آتے رہیے تاکہ کوئی آپ کی اصلیت تک آسانی سے نہ پہنچ سکے! بھارتی سیاسی قیادت نے آچاریہ چانکیہ کی اِس سوچ کو ایسی تندہی سے اپنایا ہے کہ اب عام بھارتی باشندے بھی چانکیہ کی راہ پر گامزن رہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں! اِسی بات کو لیجیے کہ معروف بھارتی ایتھلیٹ پنکی پرمانک نے اپنی اور بیرونی حکومتوں کو ایک زمانے تک دھوکا دیا اور ایشیائی سطح پر گولڈ میڈل بھی حاصل کیے۔ اب یہ بات طشت از بام ہوئی ہے کہ پنکی پرمانک تو مرد ہے! یعنی کھودا (جھوٹ کا پہاڑ) اور نکلا بھارتی ایتھلیٹ!

پنکی کو لوگ گلابی سمجھ کر چاہتے رہے مگر وہ تو سیاہی بن کر آنکھوں میں پھیل گیا۔ اُس نے ملک کی پالیسیوں کا بھرم رکھ لیا۔ 400 میٹرز کی دوڑ میں گولڈ میڈل جیتنے والی پنکی اِتنی تیزی سے دوڑی کہ جنس کی متعین حُدود سے بھی آگے نکل گئی اور دوڑنے والی سے دوڑنے والا بن گیا!

پنکی پرمانک پر اُس کی روم پارٹنر نے الزام عائد کیا ہے کہ وہ دراصل مرد ہے اور اُس پر مجرمانہ حملے بھی کرتا رہا ہے! پنکی نے اپنی روم پارٹنر سے شادی کا وعدہ بھی کیا تھا!

بھارت میں فن اور فنکار کی بڑی قدر دانی ہے۔ کیوں نہ ہو، سیاسی قیادت کلاکاری سے باز نہیں آتیں اور اُن کی دیکھا دیکھی اب پورا معاشرہ کلاکار ہوچلا ہے۔ سیاسی جماعتیں آئے دن چولے بدلتی ہیں اور ہر بار فن کا نیا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ کانگریس نے ایک زمانے تک دنیا کو یہ تاثر دیا کہ وہ تو مسلمانوں کی بہت ہمدرد ہے۔ دنیا کو اب معلوم ہوسکا ہے کہ مسلم دشمنی میں کانگریس کسی سے کم نہ تھی۔ یہی حال بھارتیہ جنتا پارٹی کا ہے جو رنگ بدلنے اور فنکاری دِکھانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ جب اپنی غرض ہوتی ہے تو مادہ بن جاتی ہے اور جب کام نکل جاتا ہے تو نَر بن کر آنکھیں دِکھانے لگتی ہے!

اہل بھارت کو پالیسیوں کے معاملے میں کلاکاری اور فنکاری پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو سے ورثے میں ملی ہے۔ آں جہانی جواہر لعل نہرو روزانہ یوگا کی مشق کیا کرتے تھے۔ وہ شیر شاسن بہت دل جمعی سے کرتے تھے یعنی سَر کے بل کھڑا ہونا اُنہیں مرغوب تھا۔ رفتہ رفتہ وہ ہر معاملے کو اِسی طرح دیکھنے لگے۔ اُن کی بیٹی آں جہانی اندرا گاندھی کا بھی یہی حال تھا۔ اُنہیں بھی سب کچھ الٹا پلٹا دکھائی دیتا تھا۔ مگر جب ان کے دو سِکھ محافظوں نے معاملات کو اُلٹی کھوپڑی سے دیکھا تو اندرا گاندھی کو سورگ باش لینا پڑا!

بھارتی معاشرہ بھی نَر اور مادہ کے امتزاج کی عملی تصویر بن کر رہ گیا ہے۔ اگر کِسی کے بارے میں سوچیے کہ اُس میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے تو کچھ ہی دنوں میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ شرافت تو خیر اُس میں نہیں تھی مگر حماقت آپ میں ضرور تھی! پنکی پرمانک نے جو کچھ کیا وہ کوئی جرم نہیں کیونکہ بھارتی معاشرے میں ایسے ہر کرتوت کو اب کلاکاری یعنی فنکاری میں شمار کیا جاتا ہے! سُنا ہے کہ حکومت نے اُسے ایشین گیمز میں گولڈ میڈل جیتنے پر بارہ لاکھ اور فلیٹ دیا تھا۔ اب تمام انعامات واپس لینے کی بات ہو رہی ہے۔ یہ تو زیادتی ہے۔ ایسی یا ایسے کلاکار کی تو قدر کی جانی چاہیے! بھارت میں تو کلاکاروں کی قدر ہوتی آئی ہے۔ پنکی نے جو کچھ کیا ہے اس پر تو وہ سَر آنکھوں پر بٹھائے جانے کے قابل ہے! اگر حکومت چاہے تو اُسے سرکاری پالیسیاں

تیار کرنے کی تربیت دے سکتی ہے۔ پنکی کے قلم سے ایسی پالیسیاں نکلیں گی جو دِکھنے میں
مادہ ہوں گی اور برتنے میں نَر! لوگ آخر تک سمجھ نہیں پائیں گے۔ اور جب معاملہ
!طشت از بام ہوگا تب اپنا سا منہ لیکر رہ جایا کریں گے

پنکی کا تعلق شاید کسی کلاونت گھرانے سے ہے۔ اُس نے اپنی اور بیرونی حکومتوں کو جس
!مہارت سے چُونا لگایا اُس پر اُس کا اِتنا حق تو بنتا ہے کہ مرکزی کابینہ کا حصہ بنایا جائے
پنکی کی مہربانی ہے کہ اُس نے بالی وُڈ کو ایک اچھی اسٹوری لائن فراہم کی۔ آج کل بالی
وُڈ میں اِس ٹائپ کی اسٹوریز بہت مقبول ہو رہی ہیں جن میں بات کچھ ہو اور آخر تک
کچھ اور دِکھائی دے! وینا ملک بالی وُڈ سے جُڑ کر بڑی اسٹار بن گئی ہے۔ کئی ایک ایسے
بھی ہیں جن کی نظر میں وہ "بڑا" اسٹار ہے! ہمیں یہ ڈر ہے کسی دن بگ باس والے
یہ کہتے ہوئے عدالت کا رُخ نہ کریں کہ وینا ملک نے خاتون کا بھیس بدل کر، سُرخی
!پاؤڈر لگا کر سب کو چُونا لگادیا

بھارت کی ٹی وی انڈسٹری بھی اب رومال سے کبوتر اور ٹوپی سے انڈا نکالنے کے فن تک
محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ پنکی نے جو کمال دِکھایا ہے وہ بھارتی ٹی وی

چینلز کے بیشتر ڈراموں میں روزانہ دکھائی دیتا ہے۔ کسی سیریل کی 100 اقساط پوری ہونے پر ہیرو کو پتہ چلتا ہے کہ اپنے باپ کے جس سخت جان حریف سے وہ شدید نفرت کرتا آیا ہے دراصل وہی اُس کا باپ ہے! اور مزید 100 اقساط گزرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ صرف باپ ہی نہیں، اُس کی ماں بھی کوئی اور ہے! اِس کے بعد کی 100 اقساط میں سارے نقشے کچھ اِس طرح اُلٹ پلٹ جاتے ہیں کہ ناظرین کبھی اپنے آپ کو دیکھتے ہیں، کبھی اہل خانہ کو اور طرح طرح کے وسوسوں کی دلدل میں دَھنستے چلے جاتے ہیں! کئی کئی سو اقساط پر مشتمل ڈراموں کو انگریزی میں شاید اِسی لیے "سوپ" کہا جاتا ہے کہ اِن کی کہانی صابن کی طرح ہاتھ سے پھسلتی رہتی ہے، کسی مقام پر پکڑائی نہیں دیتی!

اسلام آباد اور نئی دہلی کے درمیان رابطے پھر تیز ہوگئے ہیں۔ مذاکرات کے نئے ادوار ہو رہے ہیں۔ ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔ ہر بات پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلینا دانش مندی کی علامت تو ہرگز نہیں۔ چانکیہ مہاراج کی نیتی بھارتی قیادت کو بے حد مرغوب ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی معاملے کو ہم پکّی سمجھ کر خوش ہو رہیں اور بعد میں پتہ چلے کہ پکّی تو مرد تھا! ویسے بھارت کے پڑوس میں رہتے رہتے تھوڑی بہت کلاکاری تو ہم نے بھی سیکھ ہی لی ہے۔ ہماری وزیر خارجہ کی مردانہ آواز سے مہاراج بھی تھوڑے سے چونکتے تو ہوں گے!

ہم کو اِک شخص یاد آئے گا

ایک زمانہ شہنشاہِ غزل مہدی حسن خاں مرحوم کا دیوانہ ہے۔ کون ہے جو اُن کی آواز سُنے اور متاثر نہ ہو۔ یہ کسی اِنسان کے بس کی تو بات نہیں۔ پتھروں کی البتہ اور بات ہے! مرزا تفصیل بیگ سے ہماری دیرینہ رفاقت ہے۔ اُن کی جو چند باتیں ہمیں پسند ہیں اُن میں خاں صاحب کے فن کا دلدادہ ہونا بھی شامل ہے۔ خاں صاحب کے حوالے سے مرزا نے ہمیشہ میرزا نوشہ کے کہے پر عمل کیا ہے یعنی

ہم سُخن فہم ہیں، غالب کے طرف دار نہیں!

13 جون کو جب خاں صاحب اِس دار فانی سے رُخصت ہوئے تو مرزا کو اُداسی نے گھیر لیا۔ ہم نے مرزا کو اِس قدر اُداس کم دیکھا ہے۔ اِتنے بڑے فنکار کے جانے پر کبیدہ خاطر ہونا فطری امر ہے۔ ہم نے مرزا کو خاں صاحب کا پُرسہ دیا تو آب دیدہ ہوگئے۔ یہ بہت عجیب لمحہ تھا کیونکہ مرزا تو دوسروں کو آنسو بہانے پر مجبور کرتے آئے ہیں! لاکھ کوشش کے باوجود ہم مرزا کے آنسوؤں پر کوئی ایسا ویسا تبصرہ نہ کرسکے کیونکہ دِل تو ہمارا بھی اُداس تھا!

مرزا کو خاں صاحب کے چلے جانے کا دُکھ ضرور تھا مگر اِس سے زیادہ دُکھ اِس

بات کا تھا کہ دنیا سے ان کے رخصت ہونے کا منظر کچھ ایسا یادگار نہ تھا۔ ایک عظیم فنکار کی زندگی کا ہر لمحہ اور بالخصوص آخری لمحہ بھی یادگار اور شاندار ہونا چاہیے۔ خاں صاحب کی شاندار زندگی کا آخری دور کسی بھی اعتبار سے ایسا نہیں کہ شاندار قرار دیا جاسکے۔

مرزا کا خیال ہے کہ خاں صاحب کو ملک میں وہی مقام ملا جس کے وہ مستحق تھے۔" خاں صاحب کی جیسی قدر دانی ہم نے کی، کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جس قدر جاں فشانی سے گاتے تھے اُتنی ہی توجہ، دلچسپی اور لگن سے لوگ اُنہیں سُنتے بھی تھے۔ پاکستانی قوم پر کوئی بھی یہ الزام عائد نہیں کر سکتا کہ اُس نے خاں صاحب کو پہچاننے میں غلطی کی یا قدر دانی میں کوئی کسر اُٹھا رکھی! "

ہم نے عرض کیا خاں صاحب کو زندگی کے آخری ایام شدید پریشانی کے عالم میں گزارنا پڑے۔ کون نہیں جانتا کہ جس کی آواز ایک زمانے کا دِل لُبھاتی تھی وہ قوتِ گویائی سے بھی محروم ہوگیا! مرزا نے کمال شفقت سے فرمایا "بھائی! یہ تو عمر کا تقاضا تھا۔ زندگی بھر سخت محنت کی تھی تو بڑھاپے میں تھکن بھی بڑھ گئی۔ جس قدر محنت خاں صاحب نے اُس کا عشر عشیر بھی اب کوئی نہ کر پائے گا۔ اور شاید اِس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ راتوں رات شہرت اور دولت مل

جاتی ہے۔ اور جب یہ دونوں چیزیں مل جائیں تو عزت خریدنے میں کون سا وقت لگتا ہے؟"

خاں صاحب سے ہمارا تعلق شوق کی حد تک رہا ہے۔ صوتی آلودگی سے دوچار اِس دور میں جو لوگ کوئی ڈھنگ کی چیز سُننا چاہتے ہیں وہ یقینی طور پر خاں صاحب اور اُن کے قبیل کے دیگر گانے والوں کو سُن کر ذوق کی تسکین کرتے ہیں۔ ہم بھی خاں صاحب کو ساڑھے تین عشروں سے سُنتے آئے ہیں۔ اِس دوران اُن کے فن نے اِس قدر متاثر کیا ہے کہ اب اُن کے بارے میں کوئی بھی ایسی ویسی بات یا حرکت برداشت اور ہضم نہیں ہو پاتی۔ ایک عظیم فنکار کی زندگی کا آخری دور سراسر غیر فنکارانہ ہو، یہ بات ہمارے حلق سے اب تک نہیں اُتری۔

مرزا کہتے ہیں "خاں صاحب کے فن میں اِتنی گہرائی ہے کہ اُن کے ساتھ برسوں مختلف حیثیتوں میں کام کرنے والے بھی اُنہیں اچھی طرح سمجھنے میں ناکام رہے۔ جب وہ پورے موڈ میں ہوتے تھے تو مائکروفون کے سامنے اُن کا کچھ اور ہی عالم ہوتا تھا۔ ویسے تو وہ ہر آئٹم ہی پر محنت کرتے تھے اور دل جمعی سے گاتے تھے مگر جب وہ کسی غزل کو کچھ کا کچھ بنانے پر آتے تھے تو سامعین دِل تھام کر رہ جاتے تھے۔ خاں صاحب نے فن کی جتنی خدمت کی ہے، کم ہی لوگ کر پاتے ہیں۔"

ہم نے احترام کے ساتھ عرض کیا حکومت کو خاں صاحب کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے وہ نہیں کیا گیا۔ اگر ان کے علاج پر خاطر خواہ توجہ دی جاتی تو وہ یقینی طور پر اپنے آخری دور میں زیادہ تمکنت کے ساتھ وقت گزارتے۔ یہ سُن کر مرزا غُصّے کے مارے تقریباً مشتعل ہو گئے۔ غضب ناک سُروں میں فرمایا "کیا بات کرتے ہو؟ حکومت نے اُن کی قدر دانی اور معاونت میں کون سی کسر اُٹھا رکھی؟ پاکستان کی حکومت پر خاں صاحب کو نظر انداز کرنے کا الزام عائد کرنا نری کم ظرفی ہے۔ پاکستان میں جن کی ناقدری ہوتی ہے وہ بھی کبھی کوئی شکوہ نہیں کرتے، بس آنسو پی کر چپ رہتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ خاں صاحب کو اُن کا جائز مقام نہیں ملا تو وہ سراسر جھوٹ بولتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خاں صاحب کے لیے ہر صاحب نظر نے دِل کے دروازے کھول دیئے۔ گزشتہ آٹھ برسوں کے دوران علاج کے نام پر جتنی اُن کی مدد کی گئی اُتنی کِسی اور فنکار کی نہیں کی گئی۔"

مرزا کی بات سے عدم اتفاق ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خاں صاحب کے علاج کے لیے معاونت میں حکومت نے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ ہم نے ایک بار پھر نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ خاں صاحب جیسے فنکار کے لیے جو کچھ بھی کیا جاتا، کم تھا۔ اُن کی مدد کرکے حکومت نے کوئی احسان نہیں کیا۔

مرزا نے ایک بار پھر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے فرمایا" تمہاری بات درست ہے کہ اُن کے لیے جو کیا جاتا وہ کم تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اُنھیں کِس چیز کی ضرورت تھی؟ علاج کے نام پر جو خطیر رقوم اُنھیں دی جاتی رہیں وہ کب اُن کے کام آسکیں؟ اُنھیں کوئی بیماری تھی ہی کب؟ بُڑھاپا، بلکہ شدید بُڑھاپا تھا اور تم جانتے ہو کہ بُڑھاپا بجائے خود بیماری ہے۔ سات آٹھ سال قبل فالج ہوا تھا۔ فالج کا علاج کب ہو سکا ہے۔ جس پر فالج کا حملہ ہو، علاج سے زیادہ اُس کی خدمت کی جاتی ہے۔ خاں صاحب کو خدمت کی ضرورت تھی۔ اُن کی خدمت اولاد پر فرض تھی۔ یہ فرض اُس نے خوب ادا کیا اور حکومت سے جزاء پائی! ایک زمانہ تھا کہ خاں صاحب اپنے فن کی رائلٹی پایا کرتے تھے۔ اُن کی اولاد خوش نصیب ہے کہ باپ کی صورت میں خاں صاحب جیسی ہستی ملی جس کے فن کے ساتھ ساتھ وجود کی بھی رائلٹی حاصل ہوتی رہی! جب بھی خاں صاحب ذرا سی تکلیف محسوس کرتے تھے، خدمت میں اضافے کے ساتھ حکومت سے رابطہ قائم کرنا بھی فرض سمجھا جاتا تھا تاکہ خدمت اور محنت کا پورا صِلہ وصول کیا جاسکے۔ خدمت کا ایسا انوکھا کیس پہلے کبھی دیکھا نہ سُنا۔"

ہم نے محسوس کیا کہ جتنی مِٹھاس خاں صاحب کی آواز میں ہے اُس سے کہیں زیادہ تلخی اُن کا تذکرہ کرتے وقت مرزا کے لہجے میں در آئی! جسے بھی خاں صاحب سے

محبت ہے وہ اُن کے آخری دور کو یاد کرکے اپنے مزاج اور لہجے میں تلخی ہی محسوس کرے گا۔

!کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

مرزا کو اِس بات کا شدید دُکھ ہے کہ خاں صاحب نے جتنی محنت سُروں پر کی اُس کے عشر عشیر کے مساوی بھی اولاد پر نہ کرسکے ! خاں صاحب سُریلے پن کی انتہا تھے مگر اُن کا گھرانہ اِس معاملے میں اُن کا ساتھ نہ دے سکا۔ خاں صاحب کثیر العیال تھے۔ اُنہوں نے سوگواروں میں 9 بیٹے اور 5 بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ خاں صاحب راجستھان کے کلاونت ” گھرانے کی سولھویں پُشت تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کے گھرانے کا فن اُنہی پر ” ختم ہوگیا ہے۔ اُن کی اولاد میں کوئی ایک بھی ایسا دِکھائی نہیں دیتا جو اُن کے نام اور فن کی تھوڑی بہت بھی لاج رکھ سکے۔ جس قدر محنت خاں صاحب نے کی اُس کا پانچ فیصد بھی اُن کی اولاد کرپائے تو بڑی بات ہوگی۔ اب تک تو خاں صاحب کی اولاد پیٹ کی آگ بُجھانے کے لیے اُن کے نام کا سہارا لیتی آئی ہے۔ خاں صاحب کی زندگی میں ہمارے لیے بہت سے مُحرّکات ہیں۔ اُن کا سُریلا پن ہمارے دِلوں کو لُبھاتا اور گرماتا رہے گا۔ مگر معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ گھریلو محاذ پر اُن کا زیادہ کامیاب نہ رہنا اور کِسی بھی بیٹے کو بڑے کیریئر کے لیے تیار کرنے میں ناکام رہنا بھی ایسی بات نہیں جسے آسانی سے بُھلا دیا جائے ! یہ تلخ حقیقت ہمیں یاد

دِلاتی ہے کہ زندہ رہنے اور نام کمانے کے لیے کسی فن میں مہارت حاصل کرنا شرط ہے مگر فن کی چوکھٹ پر سبھی کچھ قربان کر دینا اور اپنا آخری وقت کٹھنائیوں کی نذر کر دینا کسی بھی اعتبار سے نفع کا سودا نہیں۔ زندگی ہم سے ہر معاملے میں سُریلے پن کا تقاضا کرتی ہے۔ اپنے شعبے اور فن کا شہنشاہ ہونا فخر کی بات سہی مگر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ زندگی بھر کیا ہے اُس سے عمر کا آخری حصہ پُرسکون گزر سکے گا یا نہیں۔ خاں صاحب ہمارے دِلوں میں زندہ رہیں گے مگر اے کاش ! اُن کی زندگی کا آخری حصہ بھی سُریلا گزرا ہوتا !

امریکہ تو کمبل ہو گیا

جس طرح پاکستانی قوم محنت سے بھاگتی ہے بالکل اُسی طرح اب یورپی اقوام امریکہ سے گریزاں دکھائی دیتی ہیں۔ اُن کا بس چلے تو رسّی تُڑا کر، بلکہ کھونٹے کے ساتھ بھاگ نکلیں ! مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہ کھونٹا ہی تو ذِلّت ہی کی نِشانی ہے !

امریکہ اپنے اتحادیوں اور بالخصوص گورے ساتھیوں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دِلا رہا ہے۔

اوج پر نجم مقدر ہے وفا والوں کا
منہ کی کھا جائیں گے سب اہل ہوس اب کے برس !

مگر یورپ والے بہت کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں۔ ہر یقین دہانی پر اُن کا یہی جواب ہوتا ہے۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا !

امریکہ اچھا خاصا زور لگا کر اِس بات پر زور دے رہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف

جنگ میں طالبان اور القاعدہ کے خلاف حتمی اور مکمل فتح کی منزل اب زیادہ دور نہیں۔

مگر اتحادی زبانِ حال سے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ

! کون جیتا ہے تری زُلف کے سَر ہونے تک

ہم خیال اور حاشیہ بردار ممالک کو امریکہ نے خاصے سبز باغ دکھائے تھے اور جنّت کے حصول کا یقین دلا کر افغانستان کی راہ دِکھائی تھی۔ آس یہ بندھائی تھی کہ لڈو پیڑے بانٹے جائیں گے مگر جلد ہی یہ راز کھل گیا کہ میٹھی تو میٹھی، کوئی نمک جیسی کھاری چیز بھی آسانی سے ہاتھ نہ آئے گی! افغانستان کی سنگلاخ زمین پر قدم رکھتے ہی ترقی یافتہ اور آرام پسند اقوام کے فوجیوں کو اندازہ ہوا کہ

خواب تھا جو کُچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

نائن الیون کے بعد کی پیچیدہ صورت حال میں جب طالبان کے ہاتھوں ٹھیک ٹھاک مار پڑی تو گوری چمڑی والے دہریت پسند فوجیوں کو بھی خُدا یاد آگیا! اور پھر اُنھوں نے اُس دن کو کوسنا شروع کیا جب امریکہ کی باتوں پر اعتبار کیا تھا۔ یعنی

! غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا

اب یورپ مجبور ہو کر امریکہ سے کہہ رہا ہے کہ بھائی! ہمیں تو بخشو۔ تمہارا کیا ہے، تم تو لڑتے آئے ہو اور لڑتے رہو گے۔ ویت نام نہ سہی، افغانستان سہی۔ جنگ جاری رہتی ہے، صرف میدان بدل جاتا ہے۔ ایک ہی پکچر دکھاتے رہتے ہو، بس تھیٹر تبدیل کرنے کی زحمت گوارا کر لیتے ہو۔ دنیا کچھ کی کچھ ہو گئی ہے اور زمانہ بھی بدل گیا مگر امریکہ نہ بدلا۔

وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے!

امریکہ سے لاکھ کہیے کہ سب کو ساتھ لیکر چلنے، مل کر کام کرنے میں دُنیا کی بھلائی ہے مگر اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کتنا ہی سمجھایئے کہ طاقت کے نشے میں بدمست نہ ہو رہو مگر وہ خُرانٹ بھینسے کی نقالی کرنے سے باز نہیں آتا۔ زیادہ زور دیجیے تو امریکی قیادت غالب کے سے انداز سے کہتی ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

فرانس کے نئے صدر فرانکوا اولاند نے انتخابی مہم میں کئے گئے وعدے کی روشنی میں افغانستان سے قبل از وقت انخلاء کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ فوج اور عوام دونوں کی مرضی کا سودا ہے۔ ایک تیر میں دو نشانے لگائے گئے۔ امریکہ کی

ناراضی کا کیا ہے؟ اگر اُس کی خفگی کا سوچ سوچ کر چلتے رہیں تو پہنچ چکے منزل تک؟
امریکیوں کو ویت نامیوں نے ناکوں چنے چبوائے مگر انُھوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔
صومالیہ جیسی تباہ حال قوم نے بھی پیٹا مگر عقل نہ آئی، ہوش کے ناخُن نہ لئے۔ اب
افغانستان میں ذِلّت کھا کھا کر پیٹ بھر چکا ہے مگر نیت ہے کہ بھرنے کا نام نہیں لے
رہی! امریکی خُدا جانے کِس ڈھیٹ ہڈی کے بنے ہوئے ہیں!
جارج واکر بش نے امریکی خارجہ پالیسی کا سَر جنگ و جدل اور قتل و غارت کی اوکھلی
میں دیا اور بعد میں یہ اوکھلی براک اوبامہ کو تھما کر اپنی راہ لی۔ عراق سے تو کسی نہ
کِسی طور پنڈ چھڑالیا گیا مگر افغانستان ایسی دلدل ہے جس میں شوقین دَھنستے ہی چلے
جاتے ہیں! اگر امریکی ڈھیٹ ہیں تو افغان بھی قول اور ضِد کے پکّے ہیں۔ امریکی طاقت
کے استعمال سے باز نہیں آ رہے اور دوسری طرف طالبان سَر فروشی کے لیے ہر گھڑی
تیار رہتے ہیں۔ یعنی بقول غالب
وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟
اور اگر مصطفٰی خاں شیفتہ کی زبان میں کہیے تو
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی!
طالبان گفت و شنید پر آمادہ ہوتے ہیں تو امریکی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ فی الحال مارنا
پیٹنا اور چُونا لگانا چھوڑ دیں گے۔ مگر کچھ ہی دنوں میں پتہ

چلتا ہے کہ

ہے مشقِ سُخن جاری، چکّی کی مَشقّت بھی

کے مِصداق طالبان ایک طرف تو مذاکرات کرتے ہیں، دوسری طرف امریکیوں کی طاقت کا جواب بھرپور خود کش حملوں کے ذریعے دیتے ہیں اور تیسری طرف کوئی خود کو طالبان کا نمائندہ ظاہر کرکے لاکھوں ڈالر لے اُڑتا ہے!

جس طرح گاؤں میں وڈیرے یا چوہدری کو کمپنی کی مشہوری کے لیے چند چمچوں کی ضرورت رہتی ہے بالکل اُسی طرح امریکہ یورپ کو حاشیہ بردار کی حیثیت سے ٹریٹ کرتا آیا ہے۔ مگر اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ بے چارے چمچوں کو بھی اندازہ ہوچکا ہے کہ چوہدری کے لیے ہر اوکھلی میں سَر نہیں دیا جاسکتا! برطانیہ، فرانس، اٹلی، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، کینیڈا سبھی طالبان کمانڈرز کو مال دیکر اپنے فوجیوں کی گردنیں بچاتے رہے ہیں۔ فوجیوں کا جانی نقصان یورپ میں حکومت کی بنیاد ہلا دیتا ہے۔ گوروں کو زندگی اِتنی پیاری ہے کہ مال کھلاکر فوجیوں کی گردنیں بچانے کی خبر عام بھی ہو جائے تو بُرا نہیں مانتے، بلکہ اپنی حکومتوں کو سراہتے ہیں کہ عقل اور دولت سے خوب کام لیا! ظاہر ہے اِتنی دولت اور کِس کام کے لیے ہے؟ طالبان کو اندازہ ہے کہ یورپ کی دُکھتی رگیں کون کون سی ہیں۔ چار فرانسیسی فوجی موت کے گھاٹ اتارے تو پیرس بلبلا اُٹھا اور فرانسیسی حکومت بوریا بستر لپیٹ کر انخلاء کے ساحل پر لنگر انداز ہو گئی!

بعض پریمی جوڑے راتوں رات گھر سے بھاگ نکلنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ بس کچھ ایسا ہی حال اب یورپی اقوام ہے جو افغانستان میں امریکہ بہادر کو تنہا چھوڑنے پر بھی کمربستہ دِکھائی دیتی ہیں! فرانس کے صدر نے سوچا دسمبر 2014 کس نے دیکھا ہے۔ پتہ نہیں تب تک دُنیا کیا سے کیا ہو جائے! اوبامہ کو تو بس دوبارہ منتخب ہونے سے غرض ہے۔ صدارت کے منصب پر مزید چار سال رہنا ممکن ہو جائے گا تو پالیسی اور مزاج دونوں ہی بدل جائیں گے! اور تب اُنہیں یورپ سے کچھ خاص غرض نہ رہے گی! یورپ کو تب کی فکر لاحق ہے۔ یورپ کے لیے امریکہ کمبل سا ہوگیا ہے۔ اب یورپ چاہتا ہے کہ کمبل کو اُتار پھینکے مگر کمبل ہے کہ جان چھوڑنے کو تیار نہیں۔ یورپ کی کئی حکومتیں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کی نذر ہوچکی ہیں۔ مگر امریکہ کی نذر و نیاز اب تک مکمل نہیں ہوئی۔ وہ یورپ سے مزید قربانیوں کا طالب ہے۔ یورپ کے لوگ پاکستان کے انجام سے سبق سیکھ چکے ہیں کہ بے انتہا قربانیاں دیکر بھی طعنے ہی سُن رہا ہے! فیشن کے دارالحکومت پیرس نے قبل از وقت انخلاء کا اعلان کرکے جو اسٹریٹجک فیشن متعارف کرایا ہے اُس کی تقلید کی جانی چاہیے تاکہ امریکہ بہادر اسٹریٹجک معاملات کے چوراہے پر تنہا رہ جائے اور اُسے اندازہ ہو کہ طاقت کے نشے میں دُھت ہو کر ہر ایک کو لات مارنے کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے!

دِن گنے جاتے ہیں اُس دِن کے لیے

لیجیے، سپریم کورٹ نے بالاآخر یوسف رضا گیلانی کو گھر بھیج دیا۔ اور راجہ پرویز اشرف وزیر اعظم بن گئے۔ توہین عدالت کیس کے فیصلے کے بعد اسپیکر ریفرنس کیس میں سپریم کورٹ نے وزیر اعظم کو باضابطہ نا اہل قرار دینے کا فیصلہ دیکر ثابت کردیا کہ ملک میں اب حقیقی تبدیلی کی راہ ہموار ہو رہی ہے۔

ایک زمانے کو انتظار تھا کہ یوسف رضا گیلانی کی وکٹ کب گرتی ہے۔ اور پھر وکٹ گر گئی۔ مگر سچ یہ ہے کہ گیلانی دانستہ ہٹ وکٹ ہوئے۔ وزارتِ عُظمیٰ کے منصب پر فائز ہونے کی کوئی تو قیمت اُنہیں ادا کرنا تھی سو کردی۔ صدر کے خلاف سوئس حکومت کو خط لکھنے سے انکار کی پاداش میں اُنہیں وزیر اعظم کے منصب سے دور تو ہونا ہی تھا۔ جب بندہ خود ہی گڑھے میں گرنے کے لیے نہ صرف بے تاب ہو بلکہ گڑھے میں گرنے کو خوش بختی اور وفاداری گردانتا ہو تو دَھکّا دینے والوں کو کس بات کا کریڈٹ دیا جائے!

چیف جسٹس نے گیلانی کو نا اہل قرار دیکر قانون کا بول بالا کردیا۔ گیلانی نے اپنے منصب کی بساط لپیٹ گھر کی راہ لی۔ ان کے اہل خانہ نے برملا کہا ہے کہ جو کچھ یوسف گیلانی نے کیا اس پر اُنہیں فخر ہے! اُنہوں نے (ملک سے نہ

سہی !) پارٹی سے وفاداری نبھادی۔ ثابت ہوا کہ اب پارٹی کی قیادت سے وفاداری ہی پارٹی سے وفاداری کے مترادف ہے !

مرزا تنقید بیگ خدا جانے کس دُنیا سے آئے ہیں کہ آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئے ! جب پوری قوم خوشی سے سرشار ہوتی ہے تب وہ تفکرات میں ڈوبے دکھائی دیتے ہیں۔ وزیر اعظم کی وکٹ گرنے پر قوم جشن منا رہی ہے، بھنگڑے ڈالے جا رہے ہیں اور مرزا ہیں کہ منہ پُھلائے بیٹھے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی وضاحت طلب کرے تو کاٹنے کو دوڑتے ہیں ! خیر، ایک مرزا کو کیا روئیں، اب یہاں کون کسی کی سمجھ میں آتا ہے !

یوسف رضا گیلانی جب وزیر اعظم ہاؤس سے بے نیل و مرام نکلے تو قوم نے مسرت کا اظہار کیا کہ

دِن گِنے جاتے تھے اِس دِن کے لیے

مگر مرزا اُداسی سے ہم آغوش رہے۔ ہم نے سبب پوچھا تو فرمایا "یہ تو بڑوں کی لڑائی ہے۔ ایک جائے گا تو دوسرا آ جائے گا۔ آئین کی حُرمت اور پارلیمنٹ کی بالا دستی کے نعرے خوب ہیں مگر اِن نعروں سے کس کا پیٹ بھرتا ہے؟ گاڑی سے جھنڈا اُترا تو یوسف رضا گیلانی کا مُنہ اُتر گیا مگر کیا چار برسوں کے دوران آسمان پر چڑھے ہوئے نرخ بھی اُترے؟ عدلیہ تو خیر بہت "چارجڈ" دِکھائی

دیتی ہے مگر یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اُسے بجلی کہاں سے مل رہی ہے! اوراِس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ عوام کو بجلی کب ملے گی؟ لگتا ہے ساری بجلی حالات میں سما گئی ہے جو عوام کو جھٹکوں پہ جھٹکے دے رہے ہیں! "

سیاست دانوں کے مزاج اور نیت کی طرح مرزا کی نفسیاتی ساخت بھی کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آ سکی! اب عدلیہ شاندار اور پُر وقار فیصلے دے رہی ہے تو وہ شِکایات کا پوٹلا کھولے بیٹھے ہیں۔ میمو کیس کا فیصلہ سنایا جاچکا ہے۔ توہین عدالت کیس میں وزیر اعظم کو سزا ہوئی اور نا اہلی کے بعد اُن کی رخصتی ہی عمل میں نہیں آئی بلکہ نیا وزیر اعظم بھی آچکا ہے۔ اب مرزا کو کس فیصلے کا انتظار ہے؟ مرزا کہتے ہیں "زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جانے والوں کے مقدمات کب فیصل ہوں گے؟ اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کا انتظار تھا سو آ گئے۔ جن پر کرپشن کے الزامات ہیں وہ محض برطرفی کی صورت میں بخش دیئے جاتے ہیں۔ 'نیب' نے بہت سے کرپٹ حکام اور سیاست دانوں سے وصولیاں بھی کی ہیں مگر اِس وصولی سے عوام کو کیا ریلیف ملا؟ اُن کے لیے تو زندگی سَستی نہیں ہوئی۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت اچھا تو لگتا ہے مگر فریب نظر کے سِوا کچھ بھی نہیں۔ سب میڈیا کی جنگ ہے۔ عوام کو اِس سے کیا کہ کس کی پگڑی اُچھلی اور کس کی مسند یا گَدی گئی۔ اُنہیں تو یہ دیکھنا ہے کہ چولہا جلتا رکھنے کا خرچ کم ہوا یا نہیں۔ عام آدمی کو اِس بات سے کیا غرض کہ کون سا سیاسی بُت

مُنہ کے بل گرا اور کس کی گُڈی اُونچی اُڑ رہی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی پتنگ کو پُر سکون فضاؤں میں اُڑتی ہوئی دیکھنے کا آرزو مند ہے۔ اِس سے زیادہ اُسے کچھ بھی درکار نہیں۔"

ہم نے خُلوص، احترام اور شائستگی کے ساتھ عرض کیا کہ اُدھر قوم کی تقدیر کے فیصلے ہو رہے ہیں اور آپ کو چولہے اور دال روٹی کی فکر لاحق ہے! میڈیا کے ذریعے عوام کو اندازہ ہو رہا ہے کہ اُن کے حقوق اور وسائل پر شب خون مارنے والوں کی گردن ناپی جا رہی ہے اور آپ غریبوں کے لیے اظہار مسرت کے موقع کو تفکرات اور تحفظات سے آلودہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اِتنا سُننا تھا کہ مرزا غضب ناک اور ہیبت ناک ہوگئے۔ تقریباً پُھنکارتے ہوئے فرمایا "اِن ساری باتوں سے کِس کا بھلا ہوا ہے یا ہوگا؟ عدلیہ کی بالا دستی سر آنکھوں پر۔ پارلیمنٹ کی ارفع حیثیت سے بھی کِس کو انکار ہے۔ مگر عدلیہ حالات کی چکّی میں پسنے والوں کو زندہ رہنے کے بہتر مواقع فراہم کرنے کے لیے کیا کر رہی ہے یا کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟ طرح طرح کے سو موٹو نوٹس لیے جاتے ہیں، غریب کی دال روٹی واقعی سستی کرنے کے لیے سو موٹو نوٹس کب لیا جائے گا؟ کوئی چیف جسٹس صاحب کو بتائے کہ زندگی کی بساط پر ہر بازی ہارنے والے منتظر ہیں کہ کوئی چال اُن کے بھی حق میں جائے! کبھی تو اُن کی بھی شُنوائی ہو۔ اِس مُلک کے پچھڑے ہوئے لوگ کسی ایسے فیصلے کے منتظر ہیں جس کے نتیجے میں

اُن کی زندگی کے سر پر بندھی ہوئی احتجاجی سیاہ پٹّی اُترے اور وہ بھی واقعی مست ہو کر بھنگڑے ڈال سکیں!

دِن گِنے جاتے ہیں اُس دِن کے لیے!

ون ٹو کافور

بہت سے لوگ شادی کی تقریب میں شریک ضرور ہوتے ہیں مگر ان کی توجہ ملنے ملانے سے زیادہ کھانے کی میز پر مرکوز رہتی ہے۔ مرزا تفصیل بیگ کا بھی یہی حال ہے۔ وہ تمام معاملات چھوڑ کر صرف اِس نکتے پر توجہ دیتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خدشات کس طور پالے جائیں اور زیادہ سے زیادہ پریشان کس طرح ہوا جائے! سپریم کورٹ فیصلے دے تو مرزا پریشان اور اگر فیصلے محفوظ کرلے تو پریشان۔ مرزا کو کسی صورت قرار نہیں۔ ان کی زندگی اسی طور گزری ہے اور گزر رہی ہے۔ یعنی برحق پاکستانی ہیں!

بجلی کے معاملے میں جو مقدر کروڑوں پاکستانیوں کا ہے وہی مرزا کا بھی ہے۔ غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ کا عذاب انہوں نے بھی خوب بھگتا ہے۔ اور اس صورت حال سے خاصے دِل برداشتہ بھی ہیں۔ کیوں نہ ہوں؟ ہر طرف اندھیر ہے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ اور اگر کچھ دکھائی دے رہا ہے تو وہ صرف اندھیرا ہے! صورت حال مایوس کرنے والی ہی تو ہے۔ مگر مرزا سے ہمارا بنیادی شکوہ یہ ہے کہ سوچنے اور پریشان ہونے سے مسائل حل تو نہیں ہو جائیں گے۔ اگر پریشانی مسائل کا حل ہوتی تو ہمارے تمام مسائل کب کے حل ہو چکے ہوتے! مگر مرزا واقعی ہمارے دوست ہیں۔ کتنا ہی سمجھایئے، اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا!

وفاقی حکومت نے کراچی کو بجلی نہ دینے اور پنجاب کا کوٹہ بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ کم کرنے کی حکمتِ عملی ہے! مرزا اس اعلان پر سیخ پا ہیں۔ ان کے خیال میں یہ لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کی نہیں بلکہ آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی حکمتِ عملی ہے۔ ہم اُن کی بات سُن کر مُسکرا دیئے۔ کسی کی سادگی پر مُسکرانے کے سوا کیا بھی کیا جاسکتا ہے؟ مرزا اپنے آپ کو بہت بڑا دانشور سمجھتے ہیں جبھی تو آنکھوں میں دُھول جھونکنے والی بات زبان پر لائے۔ ہم بارہا سمجھا چکے ہیں کہ ہماری ہر حکومت آنکھوں میں دُھول جھونکنے ہی کی ماہر ثابت ہوتی آئی ہے۔ جو نظام ہمارے ہاں رائج ہے اس میں یہی کچھ ہوسکتا ہے! جو بات ایک عام آدمی کی سمجھ میں بھی آسانی سے آجاتی ہے وہی بات اگر ہماری سمجھ میں بھی آ گئی تو حیرت کی بات کیا ہے! حکومت نے سب کی عقل اور فہم کی سطح اور معیار بلند کردیا ہے!

مرزا کہتے ہیں "اگر کراچی کی بجلی پنجاب کو دے دی تو کون سا تیر مار لیا؟ لوڈ شیڈنگ ختم کہاں ہوئی؟ صرف مقام تبدیل ہوا ہے! اگر یہ لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کا طریقہ ہے تو سمجھ لیجیے ملک میں کہیں لوڈ شیڈنگ ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ خراب کھانا ایک برتن سے نکال کر دوسرے برتن میں رکھ دیا جائے! سوال کھانے کو منتقل کرنے کا نہیں، پھینکنے کا ہے!"

مرزا کی سادگی کا تسلسل دیکھ کر ہمارے ہونٹوں پر ہنسی نے ڈیرہ ڈال لیا۔ مرزا اِس پر بھی پتپتے ہیں کہ کوئی ان کی بات سُن کر ہنس دے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ فی زمانہ اس قدر سیلف کنٹرول کسی میں نہیں۔ ہر ایک میں یہ وصف کہاں کہ اُن کی طرح سادہ لوحی پر قائم رہے اور اِسے محسوس بھی نہ کرے! ہم نے عرض کیا کہ راجہ پرویز اشرف کوئی پیدائشی یا خاندانی راجہ نہیں۔ اگر اُن کے نام میں راجہ شامل ہے تو یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنی جیب کا مال خرچ کرکے بجلی خریدیں گے اور مُلک کے غریبوں میں بانٹ دیں گے۔ ہمارے ملک میں جمہوریت ہے، بادشاہت نہیں۔ راجہ پرویز اشرف بھلا کیوں اپنی جیب سے کسی کا بھلا کرنے لگے؟ وہ حکومتی امور کے نگراں ہیں۔ وسائل کی حدود میں رہتے ہوئے جتنے مسائل حل کر سکیں گے، کریں گے۔ جو بات اُن کے بس میں ہے ہی نہیں اُس کی اُن سے کیا توقع رکھی جائے!

مرزا مُعترض تھے کہ وزیر اعظم کا منصب سنبھالنے پر راجہ پرویز اشرف نے بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر وعدے پر عمل کے دوران اُنھوں نے صرف اِتنا کیا ہے کہ کپڑے ایک الماری سے نکال کر دوسری میں رکھ دیئے ہیں! ہم نے عرض کیا کہ راجہ پرویز اشرف کوئی انیل کپور تو ہیں نہیں کہ لکھن بن کر ون ٹو کا فور کریں اور رُومال سے کبوتر نکال کر دکھا دیں! ہمارا مسئلہ

یہ ہے کہ جب بھی کوئی وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوتا ہے، ہم اُسے جادوگر سمجھنے لگتے ہیں! ہماری خواہش ہوتی ہے کہ برسوں بلکہ عشروں کا بگاڑ پلک جھپکتے میں دور ہو جائے اور جب کوئی وزیر اعظم ہماری خواہش کے مطابق عشروں کا بگاڑ راتوں رات دور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ہم اسے کرپٹ قرار دے کر ہٹانے پر تل جاتے ہیں! سیاست دان کتنی ہی کوشش کرلیں، ہم مطمئن نہیں ہوتے اور تنقید کے ذریعے اُن کی مشکلات میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ ہم کرپشن کا شور اس قدر مچاتے ہیں کہ "بے چارے" سیاست دانوں کو اِس شور اور اِس کے بطن سے پیدا ہونے والی بدنامی کا بھرم رکھنے کی خاطر "تھوڑی بہت" کرپشن کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے! یہ ایسا نازک نکتہ ہے جسے لوگ آج تک سمجھ نہیں پائے اور سیاست دانوں کی مشکلات میں اضافہ ہی کرتے جارہے ہیں! میڈیا والے بھی عوام کے ساتھ مل جاتے ہیں اور پھر سیاست دانوں کے پاس کرپشن کی راہ پر گامزن ہونے کے سوا چارہ نہیں رہتا!

مرزا واقعی ہمارے دوست ہیں یعنی ہماری کسی بات سے اتفاق نہیں کرتے! راجہ پرویز اشرف کے بارے میں بھی اُن کی بدگمانی ویسی ہی ہے جیسی دیگر وزرائے اعظم کے بارے میں تھی۔ راجہ صاحب کسی زمانے میں پانی اور بجلی کے وفاقی وزیر تھے۔ وہ خود اُس تاریک زمانے کو بھول چکے ہیں مگر عوام اور میڈیا والے اُنہیں تب کی باتیں یاد دلا دلا کر پریشان اور خوفزدہ کرتے رہتے ہیں! وزیر

پانی و بجلی کی حیثیت سے راجہ پرویز اشرف نے بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کی ڈیڈ لائن کے نام پر جو کامیڈی فرمائی تھی وہ مرزا اب تک نہیں بھولے ! بھول تو ہم بھی نہیں پائے ہیں مگر صاحب ! جب کسی کے اختیار میں کچھ بھی نہ ہو تو وہ ہنسانے کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے؟ اور اگر ایمان داری سے سوچیے تو یہ بھی غنیمت ہے کہ کوئی ہنسا ہی رہا ہے، رُلا تو نہیں رہا! راجہ پرویز اشرف نے کمال یہ کیا کہ ناکام ڈیڈ لائنز دیتے دیتے وزارت عظمیٰ کے ڈیڈ اینڈ تک آ گئے ! مرزا کو اب بھی یہ گِلہ ہے کہ راجہ پرویز اشرف بجلی کا مسئلہ تو حل کر نہیں سکے، دیگر مسائل کیا حل کریں گے ؟

مرزا کو یہ بات کون سمجھائے کہ توپ سے بھی چڑیا کا شکار نہیں کیا جاتا ! جو ایسا کرتا ہے اس کا مذاق ہی اُڑایا جا سکتا ہے۔ مرزا ہماری اس دلیل سے متفق نہیں کہ بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم کرنا شاید چھوٹا مسئلہ تھا جو راجہ پرویز اشرف کے شایانِ شان نہ تھا ! اب اُنہیں وزارت عظمیٰ ملی ہے تو دیکھنا ہے کہ کوئی بھی مسئلہ کس طور جان بچا کر نکل پاتا ہے ! ہمیں یقین ہے کہ ہر وزیر اعظم کی طرح وہ بھی اپنے شایانِ شان مسائل پیدا کریں گے تاکہ حل کرنے کی کوشش میں کچھ تو مزا آئے ! ایک ذرا سی لوڈ شیڈنگ میں کیا دھرا ہے کہ اُسے ختم کرنے کی کوشش کی جائے ! اندھیرا ختم کرنے کے لیے کہیں ایک چراغ جلا دینا کافی ہے۔ محنت تو سارے چراغ بُجھا کر اندھیرے کا راج قائم کرنے میں لگتی ہے !

مرزا کا استدلال یہ ہے کہ حکومت بچی کھچی مدت پوری کرنے کے نام پر اب بھی عوام سے کھلواڑ کر رہی ہے۔ جواز کے طور پر وہ یہ کہتے ہیں کہ وزیر اعظم کے انتخاب میں سنجیدگی اور ایمان داری سے کام نہیں لیا گیا۔ یہ ایسی بات تھی کہ ہم بُرا مانے بغیر نہ رہ سکے۔ ہم نے اعتراضاً عرض کیا کہ سیاست میں سنجیدگی اور ایمان داری کا کیا کام؟ یہ کوئی ترکاری یا پھلوں کا ٹھیلہ لگانے کا کام تو ہے نہیں! مگر وہ نہیں مانتے۔ اُن کی ضد ہے کہ صدر زرداری بہتر انتخاب کر سکتے تھے۔ ہم نے اُنہیں ایک بار پھر یاد دلایا کہ صدر زرداری بھی کوئی جادوگر نہیں۔ پارٹی کا سربراہ ہونے کے ناطے اُن کے پاس طاقت اور اختیارات کا ڈنڈا تو ضرور ہو سکتا ہے مگر جادو کی چھڑی ہرگز نہیں اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اُن کے پاس جادو کی چھڑی ہے بھی تو اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے مسائل حل کرنے کے بارے میں وہ کیوں سوچیں گے؟ جادو کی ایک پوری چھڑی خود پیپلز پارٹی کے مسائل حل کرنے کے لیے درکار ہے! اور کس نے دیکھا ہے کہ اِن مسائل کے حل کرنے میں بے چاری جادو کی چھڑی کا کیا حشر ہوتا ہے!

جب تک راجہ پرویز اشرف وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہیں، مرزا ہمارا دماغ چاٹتے رہیں گے۔ کاش ہمارے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہو اور ہم قوم کے بارے میں

! سوچ سوچ کر ہلکان ہونے والے ہر مرزا کو کما حقہ سُدھار سکیں

"سربجیت کا" آتنک

بھارت نے ہمیشہ پاکستان پر آتنک واد یعنی دہشت گردی کا الزام عائد کیا ہے۔ آپ سوچیں گے یہ تو فطری سی بات ہے۔ یقیناً یہ فطری بات ہے مگر صاحب! سچ یہ ہے کہ بھارت ایسے آتنک وادی تیار کرتا ہے جو ہماری جیلوں میں دو دو تین تین عشرے گزار کر بھی آتنک پھیلا رہے ہوتے ہیں! سربجیت سنگھ اور سرجیت سنگھ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

ایک دہشت گرد دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے لیے انا کا، بلکہ زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ بھارتی حکومت اور میڈیا کو صرف اِس بات سے غرض رہ گئی ہے کہ یونیورسٹی کے ریٹائرڈ، پی ایچ ڈی پروفیسر ڈاکٹر خلیل چشتی کو قتل کے ایک عام سے مقدمے میں دو عشروں تک الجھائے رکھنے کے بعد اِنسانی ہمدردی کے نام پر رہا کرنے کے عوض 14 افراد کی شہادت کے ذمہ دار سربجیت سنگھ کو پاکستان سے رہائی دِلائی جائے! ہمارے ہاں انسانی حقوق کا راگ الاپتے نہ تھکنے والے بھارت نواز سیاست دان بھی رات دن حکومت پر زور دے رہے ہیں کہ تعلقات بہتر بنانے کے لیے سربجیت سنگھ کو رہا کردیا جائے۔ گویا سربجیت جنوبی ایشیا میں امن اور استحکام کی ضمانت ٹھہرا!

سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف کو اندازہ تھا کہ سربجیت جیسے دہشت گرد کو چھوڑنے کا کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے اِس لیے اُنھوں نے اِس معاملے میں ایڈونچرازم سے گریز کیا۔ کمانڈو طبیعت اور فطرت بھی اُنہیں عقل کی راہ سے بھٹکانے میں کامیاب نہ ہوسکی! مگر صدر زرداری کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ جب کچھ ٹھان لیتے ہیں تو بالعموم عواقب کے بارے میں سوچنا شاید گوارا ہی نہیں کرتے۔ سربجیت سنگھ کی سزا معاف کرنے اور رہائی کی ہدایت جاری کرنے کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ منگل کی شام ایوان صدر سے ایک بیان جاری ہوا جس میں ترجمان فرحت اللہ بابر نے کہا کہ صدر نے سربجیت سنگھ کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرتے ہوئے ہدایت کی ہے کہ اگر وہ عمر قید کی میعاد جیل میں گزار چکا ہے تو اُسے رہا کرکے بھارت کے حوالے کردیا جائے۔ حکومت جس نازک مرحلے سے گزر رہی ہے اُس کے پیش نظر صدر سے ایسے کسی بھی اقدام کی توقع کسی کو بھی نہ تھی۔ سربجیت سنگھ کو ملٹری کورٹ نے سزائے موت سُنائی تھی۔ اُس کی رحم کی اپیل کو پرویز مشرف نے بھی معاف کردیا تھا۔ جب ایوان صدر نے سربجیت سنگھ کی سزائے موت معاف کرتے ہوئے رہائی کی ہدایت کی تو پاکستان اور بھارت دونوں ہی کے میڈیا میں ہلچل مچ گئی۔ بھارت میں شادیانے بجائے جانے لگے۔ سربجیت سنگھ کے اہل خانہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ بھارتی حکومت نے بھی اس خبر کا خیر مقدم کیا کیونکہ یہ بہت حدتک اس کی

سفارتی فتح تھی۔ وزیر خارجہ ایس ایم کرشنا نے کہا کہ سربجیت سنگھ کی رہائی دو طرفہ تعلقات بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ بھارتی میڈیا پر تجزیہ کاروں نے چڑیا اُڑانے کا مقابلہ شروع کیا! سربجیت سنگھ کی رہائی کو چھ عشروں پر محیط پاک بھارت تعلقات کا اہم ترین موڑ قرار دیا جانے لگا! سبھی اپنی اپنی ڈفلی پر فتح اور کامرانی کا راگ الاپ رہے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ رات کے بارہ بجے اور سربجیت کے معاملے کے بھی بارہ بج گئے! اسلام آباد میں مقتدر حلقوں نے سات آٹھ گھنٹوں تک جاری رہنے والے تماشے کی بساط لپیٹی۔ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ مقتدر حلقوں کو متفکر ہی نہیں، متحرک بھی ہونا تھا اور وہ ہوئے! اِس تحرک کے نتیجے میں ایوان صدر کو رات سوا بارہ بجے بیان بدلنا پڑا۔ یو ٹرن لیتے ہوئے ایوان صدر کے ترجمان فرحت اللہ بابر نے اعلان کیا کہ نام میں مُغالطہ ہوا ہے۔ سربجیت سنگھ کی نہیں بلکہ سرجیت سنگھ کی رہائی کا حکم دیا گیا ہے۔ سربجیت سنگھ کی سزائے موت معاف کرنے سے ایوان صدر کا کوئی تعلق نہیں۔ فرحت اللہ بابر نے مزید وضاحت کی کہ سُرجیت سنگھ کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کرکے اُس کی رہائی کے لیے ایوان صدر کو سمری بھیجی گئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جاسوسی کے مقدمے میں سُرجیت سنگھ کو 1989 میں سُنائی جانے والی سزائے موت بے نظیر بھٹو کی سفارش پر غلام اسحاق خان نے تو معاف نہیں تاہم اُسے بعد میں معاف کر دیا گیا

تھا۔ اگر اُسے معافی مل ہی چکی تھی تو ایوان صدر کو منگل کی شام اُس کی رہائی کے لیے کوئی سمری بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ اِس پورے معاملے سے تو ایوان صدر کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ یہ تو ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے والی بات ہوئی۔

کیا پاکستان کے عوام اِتنے بھولے ہیں کہ یہ فرض کرلیں کہ ایوان صدر کو سات گھنٹوں تک سربجیت اور سُرجیت کے فرق کا اندازہ نہ تھا؟ میڈیا پر لوگ چیخ رہے تھے کہ سربجیت کو بھارت کے حوالے نہ کیا جائے۔ بھارت نواز عناصر یہ دلیل دے رہے تھے کہ پاکستان میں بہت سے لوگ 100 قتل کرکے بھی دندناتے پھرتے ہیں تو پھر صرف) 14 افراد کے قاتل کو رہا کرکے بھارت سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش) کیوں نہ کی جائے ! اگر تعلقات بہتر بنانے کی یہی ایک صورت ہے تو بھارت سے بڑے پیمانے پر دہشت گردوں کو مدعو کرکے وارداتیں کروائی جائیں اور پھر اُنہیں باعزت بری کرکے واہگہ بارڈر پر بھارتی حکام کے حوالے کیا جائے ! بین الاقوامی قوانین میں ترامیم کے ذریعے کسی بھی بڑے ملک کا چھوٹے ہمسائے پر اِس قدر حق تو تسلیم کرا ہی لینا چاہیے !

بظاہر مقتدر حلقوں کے دباؤ پر اور عوامی و سیاسی سطح پر ممکنہ ردعمل کے خوف سے ایوان صدر کو سربجیت سنگھ کی معافی و رہائی کا حکم نامہ واپس لینا پڑا مگر لازم تھا کہ معاملے کو مُغالطے کے کھاتے میں ڈالا جاتا۔ یہ سمجھ لیجیے

کہ نام کی مماثلت سے سُرجیت سنگھ کی لاٹری نکل آئی! کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سربجیت سنگھ کے نام پر بجائے جانے والے شادیانے سُرجیت سنگھ کے کھاتے میں ڈل جائیں گے! سات آٹھ گھنٹے گزر جانے پر سربجیت کو سُرجیت سنگھ میں تبدیل کرنے کا یہ ناٹک میڈیا کے لیے تو قدرےپُر کشش ہو سکتا ہے مگر ہم دُنیا کی آنکھوں میں دُھول نہیں جھونک سکتے۔ سربجیت سنگھ کی مہربانی کہ وہ جیل میں رہتے ہوئے بھی دھماکے کر رہا ہے اور اِن دھماکوں سے ہمارے ایوان ہائے اقتدار میں بہت کچھ گر رہا ہے، تباہی سے دوچار ہو رہا ہے! ایک بات تو عوام کی سمجھ میں بھی آ ہی گئی ہو گی کہ ایوان صدر اب ہر معاملے میں اپنی مرضی کی راہ پر گامزن ہونے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ نیٹو رسد کے معاملے پر بھی مقتدر حلقوں نے بات منوائی ہے۔ سربجیت سنگھ کے معاملے میں سات آٹھ گھنٹوں بعد یوٹرن اِس امر کا غمّاز ہے کہ ملک میں طاقت کا توازن کسی حد تک تبدیل ہو چکا ہے! سربجیت کو رہا کرنے کے بجائے اُس کے نام پر سیاسی دکان چمکاتے رہنے ہی میں دانش مندی ہے! بھارتی قیادت بھی تو یہی کر رہی ہے۔

رینٹ اے پرائم منسٹر

پاکستان کو پچیسواں یعنی سِلور جوبلی وزیر اعظم مبارک ہو۔ وزیر اعظم کے ساتھ "جوبلی" کا لفظ عجیب لگتا ہے۔ اب اِس قوم کے مقدر میں jubilation برائے نام بھی نہیں رہی۔ ایسے میں کسی کی آمد پر جوبلی منانا عجیب ہی لگتا ہے۔ مگر خیر، "زندہ" اور "پائندہ" اقوام کے ایسے ہی اطوار ہوا کرتے ہیں!

میڈیا نے شور مچایا ہے کہ راجہ پرویز اشرف کے سر پر ہُما بیٹھ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہُما کو بٹھایا گیا ہے! یوسف رضا گیلانی نے وزارتِ عظمٰی کی قیمت ادا کی یعنی پارٹی کے نام پر قیادت سے وفاداری نبھادی۔ کوئی کچھ بھی کہے، ایک گدّی نشین نے وفاداری کی گدّی پر بیٹھنا قبول کیا۔ نام بدنام ہو تو ہو، بڑوں پر کوئی حرف نہ آئے۔ اِسے کہتے ہیں وفاداری بہ شرطِ اُستواری! غالب کے بیان کردہ اُصول آج تک کام آ رہے ہیں! پورا ملک ایڈہاک ازم کی بنیاد پر چل رہا ہے مگر پیپلز پارٹی نے نئی ریت متعارف کرائی ہے۔ adhocism سے ایک قدم آگے جا کر اُس نے add-hawk-ism کو اپنایا ہے!

لوگ کہتے ہیں کہ یوسف رضا گیلانی کے بعد صدر زرداری کے لیے پارٹی میں وزیر اعظم کے عہدے کے لیے "موزوں" شخص تلاش کرنا بہت دُشوار ثابت ہوا ہوگا۔ یہ بجائے خود لطیفہ ہے۔ صدر زرداری کو کون سی زندگی بھر کی یاری نبھانی ہے۔ دو تین ماہ نکالنے ہیں۔اِس کے بعد الیکشن کی بہار ہوگی اور نئے چہروں کی فصل اترے گی!

راجہ پرویز اشرف پر کرپشن کے الزامات ہیں۔نیب تفتیش بھی کرچکی ہے۔ مگر اب جبکہ وہ وزیر اعظم بن چکے ہیں تو یہ الزامات یقیناً تمغوں کا روپ دھار چکے ہیں! وہ پانی اور بجلی کے وزیر تھے تو بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کی ڈیڈ لائن دہراتے نہ تھکتے تھے اور لوگ اُنہیں اِسی حوالے سے بدنام کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ راجہ پرویز اشرف پر رینٹل پاور پروجیکٹس میں کرپشن کا الزام لگا اور پانی و بجلی کی وزارت اُن سے لے لی گئی۔ مگر قسمت کی خوبی دیکھیے کہ راجہ پرویز اشرف بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم کرنے میں بالآخر کامیاب ہو ہی گئے۔ وہ ایسے کہ اُن کے اپنے مُقدر کا اندھیرا چھٹ گیا ہے! رینٹل پاور پلانٹس سے قوم کو بجلی نہ مل سکی مگر خود راجہ پرویز اشرف پاور فُل ہوکر سامنے آئے ہیں!

لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کی ڈیڈ لائن دیتے دیتے راجہ پرویز اشرف خود وزارتِ

عظمیٰ کے ڈیڈ اینڈ تک پہنچ گئے! قوم کو وزیر اعظم منتخب کرنے کا نیا معیار مبارک ہو۔

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا!

جو جس قدر ناکام ہے وہ اُسی قدر کامیاب ہے! یعنی وزیر بن کر کچھ نہ کر پاؤ تو وزیر اعظم بن جاؤ! صدر زرداری نے ایک نئی ریت یہ ڈالی ہے کہ کم از کم وزیر اعظم منتخب کرنے کا مسئلہ تو ہمیشہ کے لیے حل کر دیا ہے۔ اب کسی کو بھی وزیر اعظم بنایا جا سکتا ہے!

یوسف رضا گیلانی کے چار سال یوں گزرے ہیں کہ قوم جاں سے گزر گئی ہے۔ دیکھیے کہ اب راجہ صاحب کی رعایا کا کیا بنتا ہے! قوم کو مژدہ ہو کہ غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں کی منزلیں بہت پیچھے رہ گئیں۔ ہم جمہوریت کی شاہراہ پر اِتنی دور نکل آئے ہیں کہ واپسی کا تصور بھی محال ہے! چار برسوں میں کیفیت کچھ یہ رہی ہے کہ

رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو!

ایک مخدوم کو رخصت کیا گیا تو دوسرے کی باری آتی دکھائی دی۔ مگر

دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا!

کے مِصداق مخدوم شہاب الدین کی پتنگ آخری لمحات میں کَنّوں سے کٹ گئی! اللہ نے ایک گَدّی نشین کی لاج رکھ لی۔ مخدوم شہاب کو تو اللہ کا شکرادا کرنا چاہیے کہ خاک نشینی سے بچ گئے! ایفیڈرین کیس مخدوم شہاب کی نامزدگی پر شہاب ثاقب بن کر گرا! ایفیڈرین تو واقعی بہت خطرناک کیمیکل نکلا یعنی دوا میں استعمال ہوتے ہوتے خود بیماری بن بیٹھا!

شیخ رشید کہتے ہیں کہ قوم کو کسی بریکنگ نیوز کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ سب کو گیلانی کا انجام معلوم تھا اور راجہ پرویز اشرف کا انجام بھی معلوم ہے۔ شیخ صاحب کی بات میں وزن ہے۔ میڈیا اور اہل سیاست کی مہربان ہے کہ اب کوئی نیوز بریکنگ نیوز نہیں رہی۔ جو کچھ بھی اچانک سامنے آتا ہے اُس کے بارے میں قوم پہلے سے جانتی ہے۔ اب کوئی ہارٹ بریکنگ نیوز تو آسکتی ہے،، بریکنگ نیوز نہیں۔

ملکی اور غیر ملکی میڈیا نے ایک ایسی ماہرانہ رائے دی ہے جو تقریباً ہر پاکستانی کو اچھی طرح معلوم ہے یعنی یہ کہ جلد یا بدیر (یعنی بہت جلد!) راجہ پرویز اشرف کا بھی وہی انجام ہوگا جو یوسف رضا گیلانی کا ہوا! مگر اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کئی راوی یہ بیان کرچکے ہیں۔ حکومت برقرار رکھنے کے لیے ایوان صدر میں کالے بکرے بڑی تعداد میں ذبح کئے جاچکے ہیں! ڈیڑھ دو سال

قبل یہ خبر بھی آئی تھی کہ حکومت کے سَر پر منڈلاتی بلائیں ٹالنے کے لیے ایوان صدر میں روز ایک بکرا ذبح کیا جاتا ہے ! اب بھی پیپلز پارٹی میں قربانی دینے والوں کی کمی نہیں ! پارٹی کی قیادت کو ٹرائل سے بچانے کے لیے ذرا سی اونچی سطح کے کئی جیالے ٹرائل کی بُنیاد پر وزیر اعظم بننے کو تیار ہیں ! کچھ دن کی حکومت اور اُس سے بھی کم کچھ دن کا رینٹ اے وزیر اعظم !

سپریم کورٹ نے ایک منتخب وزیر اعظم کو جرم کی سزا دی اور گھر بھیج دیا۔ پیپلز پارٹی کو نیا وزیر اعظم لانا پڑا۔ قوم سیاست کی گتھیاں سُلجھانے کے لیے سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی ہے مگر مسلم لیگ (ن) کا پرنالہ وہیں بہہ رہا ہے۔ لوگ نئے وزیر اعظم کے انتخاب کے موقع پر پارلیمنٹ میں مسلم لیگ (ن) کی جانب سے کسی انوکھے تماشے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ مگر وہ تو "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کی ڈفلی پر "پارلیمنٹ کی مدت پوری ہونی چاہیے" کا راگ ہی الاپتی رہی۔ ایک اچھا موقع پھر نہایت خوب صورتی سے ضائع کر دیا گیا ! مگر خیر، مسلم لیگ (ن) سے تعلق رکھنے والے اپنا دِل چھوٹا نہ کریں، مواقع آتے رہیں گے اور ضائع کئے جاتے رہیں گے ! مسلم لیگ (ن) کی قیادت تھوڑی بہت سیاست مولانا فضل الرحمٰن ہی سے سیکھ لے جو ہمیشہ رند کے رند رہتے ہیں اور جنت بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے !

"چاند کے "مداری

بے وقوف بنانے کا فن تو کوئی گوروں سے سیکھے۔ کسی بھی معاملے کو کاروباری رنگ دینا اِن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اربوں، بلکہ کھربوں میل دور بسی ہوئی کہکشاں کے سِتارے بھی گوروں نے فروخت کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ اگر آپ کسی ستارے کو اپنے یا کسی پیارے سے موسوم کرنا چاہتے ہیں تو ادائیگی کیجیے اور ستارہ آپ کا ہوا!
اب خیال آیا ہے کہ ستارے تو بہت دور ہیں اور کسے معلوم کہ وہ ہیں بھی یا نہیں۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ ستارہ تو لاکھوں سال پہلے ختم ہو چکا ہو، اب تک صرف اُس کی روشنی ہم تک پہنچ رہی ہو! ایسے میں بہتر یہ ہے کہ قریب ترین فلکی وجود یعنی چاند کو ٹھکانے لگایا جائے۔ لیجیے، چاند کی شامت یوں آئی ہے کہ برطانیہ کی ایک کمپنی نے چاند کی سیر کا پروگرام ترتیب دیا ہے۔ آسمان پر (پرائی یعنی سورج کی روشنی کا سہارا لیکر) چمکنے والے چاند کی سیر کرنی ہے تو نکالیے دس کروڑ پاؤنڈ! اِتنا "سَستا" ٹکٹ آپ کو اور کہاں ملے گا؟
.برطانوی کمپنی ایکس کیلیبر الماز نے سابق سوویت دور کے ایک اسپیس شپ لانچنگ سینٹر کو لیز پر لیا ہے۔ امریکی عملے کی مدد سے چاند کی سیاحت کا اہتمام

کیا جارہا ہے۔ ٹیکنالوجی سوویت دور کی استعمال ہوگی۔چیٹنگ ملاحظہ فرمایئے کہ تنصیب اور ٹیکنالوجی سوویت دور کی ہوگی، عملہ امریکہ سے آئے گا اور کمپنی کی مشہوری برطانیہ کے کھاتے میں ! اور مزید چیٹنگ یہ ہے کہ دس کروڑ پاؤنڈ ادا کرکے چاند کی سطح پر قدم رکھنا نصیب نہ ہوگا۔ خلائی جہاز چاند کے مدار میں داخل ہوگا، تین چار چکّر لگائے گا اور اِس کے بعد.... ختم شد واپسی!

شریف امروہوی ہمارے دیرینہ رفیق ہیں۔ اُنھوں نے جب یہ خبر سُنی تو گوروں پر خالص امروہوی انداز سے لعن طعن کرنے لگے۔ ہم نے عرض کیا گورے اب لعن طعن کی منزل سے آگے جاچکے ہیں ! بے وقوف زندہ ہیں تو عقل مندوں کی روزی روٹی چلتی رہے گی۔ شریف امروہوی صاحب نے اِس بات سے مکمل اتفاق کیا۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ دس کروڑ پاؤنڈ میں چاند کی محض فضائی سیر سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ جمال گھوٹے کا سودا ہے ! یعنی جس کی جیب حرام کے مال سے بھری ہو اور پیٹ میں خواہ مخواہ درد اٹھ رہا ہو وہ دس کروڑ پاؤنڈ اپنے شوق کی بھٹی میں جھونکے اور چاند کا تماشا دیکھنے کے نام پر دُنیا کو اپنا تماشا دِکھائے ! "

شریف امروہوی صاحب کا تعلق، ظاہر ہے، امروہہ سے ہے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ

کوئی امروہہ سے تعلق رکھتا ہو اور شعر و ادب سے بے بہرہ ہو ! شریف صاحب کو چاند پر ترس آتا ہے۔ چاند پر بہت سے گڑھے ہیں مگر سب سے بڑا گڑھا (بدنامی کا) وہ ہے جس میں شُعراء نے اَن شنٹ خیالات کے ذریعے چاند کو دھکیل دیا ہے۔ بے چارہ کسی کو منہ دِکھانے کے قابل نہیں رہا اِسی لیے ہر پندہ دن بعد شکل گم کرلیتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے، چُھپتے چُھپاتے اور بچتے بچاتے، اپنے آپ کو بے نقاب کرتا جاتا ہے ! شریف صاحب حیران ہیں کہ چاند میں آخر ایسا کیا ہے کہ اُردو کے تقریباً تمام شُعراء ہاتھ دھوئے بغیر اُس کے پیچھے پڑ گئے ہیں ! بے چارے کے لیے سُکون کا سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا تو یہ ہے کہ محبوب کے مُرجھائے ہوئے پھول جیسے چہرے کو بھی چاند سا قرار دینے سے گریز نہیں کیا گیا! 1969 میں جب امریکہ نے چاند پر اِنسان بھیجنے کا اعلان کیا تو پاکستان میں ایک فلمی گانا ریکارڈ کیا گیا جس کے بول تھے۔

سُنا ہے چاند پر اِنساں رہیں گے

وہیں ہم تم اے جانِ جاں ! رہیں گے

سُنا ہے اِس عزم و اعلان پر چاند سہم گیا تھا اور اُس کے اماوس کی میعاد بڑھ گئی تھی ! چاند کو موضوع بنا کر ایسے ایسے مضامین باندھے گئے ہیں کہ اگر اللہ چاند کو اُردو پڑھنے کی صلاحیت سے نوازے تو وہ اپنے بارے میں کہے جانے والے اشعار پڑھ کر ایسا شرمندہ و ہراساں ہو کہ کسی اور کہکشاں کی طرف بھاگ

!نکلے

شریف صاحب کا بنیادی اعتراض اِس بات پر ہے کہ لوگ عاشقی معشوقی کے حوالے سے دُنیا بھر کے بے ڈھنگے خیالات اپنے ذہن کی کھیتیوں میں اُگاتے ہیں اور فصل کاٹنے کے لیے چاند کو درانتی بنالیتے ہیں! جو چاند ہمیں ٹھنڈی روشنی عطاء کرتا ہے اُس کے وجود کو ہم اپنے عامیانہ معشوقی آمیز خیالات کی گرمی میں لپیٹ دیتے ہیں! ہم نے شریف صاحب کو سمجھایا کہ اگر دُنیا چاند کے بارے میں آپ کے خیالات تسلیم کرلے تو سارے کام ٹھپ ہو جائیں۔ نہ کوئی شعر کہہ پائے، نہ کِسی کے دِل میں عشقیہ جذبات پیدا ہوں !اور نہ ہی کِسی کے ذہن میں خلائی سیاحت کا تصور اُبھرے

شریف صاحب نے چاند کی سیر کا خرچ سُن کر وہی رائے دی جو ایک صاحب نے ٹائی کی قیمت سُن کر دی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ اِتنی مہنگی ٹائی خریدنے سے بہتر یہ تو ہے کہ اِنسان جوتے خرید لے۔ دُکاندار نے بصد احترام عرض کیا "مگر گلے میں جُوتے لٹکا کر آپ اچھے نہیں لگیں گے!" شریف صاحب کا کہنا ہے کہ دس کروڑ پاؤنڈ خرچ کرکے چاند کے مدار کا چکّر کاٹنے سے بہتر تو یہ ہے کہ اِنسان زمین پر ہی کوئی چاند بنالے! جب لوگ زمین پر جنت بنانے کی کوشش کر سکتے ہیں تو چاند بنانے کی کوشش کر دیکھنے میں کیا ہرج ہے! ہم نے عرض کیا

کہ زمین پر ہم چاند کی تشکیل کے لیے بے فضاء خِطہ کہاں سے لائیں گے ؟ اُن کا جواب تھا کہتے ہیں چاند کی فضاء زندگی کے لیے سخت ناموزوں اور ناموافق ہے۔ اب خیر سے" زمین پر ایسے کئی خِ طے ہیں جہاں زندگی کے لیے سخت ناموزوں اور ناموافق فضاء پائی جاتی ہے ! دُنیا والوں کو اندازہ ہی نہیں کہ چاند کا ماحول تو اِسی دُنیا میں پیدا کیا جاچکا ہے ! "اللہ جانے اب کون سے چاند کی جستجو ہے ؟

ہم نے دست بستہ عرض کیا کہ چاند کے حسین ماحول کو ذرا قریب سے دیکھنے میں کیا ہرج ہے۔ شریف صاحب کا استدلال تھا" چاند بھی دور کا ڈھول ہے اِس لیے سُہانا لگتا ہے۔ قریب جائیے تو بنجر اور پتھریلی زمین پر گڑھے ہی گڑھے ہیں۔ ہم چاند سے چہروں کی بات تو کرتے ہیں لیکن اگر نگاہِ انصاف سے دیکھا جائے تو صرف بوڑھے، گڑھوں سے 'آراستہ' چہروں ہی کو چاند سے تشبیہ دی جاسکتی ہے!"

ہم نے فی الفور اتفاق کرتے ہوئے جب شریف امروہوی صاحب کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تو بڑھاپے کی "تمکنت" سے آراستہ و پیراستہ چہرے کے کئی گڑھوں میں ہمیں جلال و اشتعال کی مِ لی جُلی کیفیت اُبھرتی ہوئی محسوس ہوئی ! اِس سے آگے دیکھنے کی ہماری نازک آنکھوں میں تاب نہ تھی ! ہم نے مُنہ پھیر لیا مگر

رُوئے سُخن اُنہی کی طرف رکھتے ہوئے عرض کیا چاند کی سیاحت کے بارے میں حتمی رائے سے نوازیے۔

شریف صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، رائے داغ دی "کروڑوں پاؤنڈ خرچ کر کے چاند کا چکّر کاٹنے سے تو کہیں زیادہ قرین عقل بات یہ ہے کہ اِنسان چاند سے چہروں پر گزارا کرے، بلکہ ہمت کر کے چند چاند سے چہرے خرید لے!"

یہ رائے ہمیں قرین عقل محسوس ہوئی۔ اگر کبھی استطاعت نصیب ہوئی تو شریف صاحب کی طرح ہم بھی آسمان کے بے جان اور بے نُور چاند کے مدار کا چکّر کاٹ کر "چاند کے مداری" کہلوانے پر زمینی چاندوں سے دِل لگانے کو ترجیح دیں گے!

ڈپریشن کیلئے .... ہر گھڑی تیار، کامران ہیں ہیں ہم

ویسے تو خیر ہر قوم کو اللہ نے چند خصوصیات بخشی ہیں اور یہ خصوصیات ہی اُس کی شناخت کا وسیلہ اور ذریعہ بنتی ہیں۔ مگر اِس معاملے میں بھی پاکستانی وکھری ٹائپ کے ثابت ہوئے ہیں۔ لوگ سمجھ نہیں پا رہے کہ ہم میں کون کون سی خصوصیات پائی جاتی ہیں! دُنیا کو اب تک ایسی خصوصیات کی تلاش ہے جن کی بُنیاد پر ہماری شناخت کا تعین ہوسکے۔ اور اِدھر ہم ہیں کہ "پکڑائی" دینے کے لیے تیار نہیں!

ڈپریشن ساری دنیا میں پایا جانے والا عام سا ذہنی عارضہ ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دنیا بھر میں 20 فیصد افراد ڈپریشن کا شکار ہیں۔ اور پاکستان میں ڈپریشن کے اسیروں کی تعداد 34 فیصد ہے۔ اب چند ایک معاملات ہی رہ گئے ہیں جن میں ہم دُنیا سے آگے ہیں۔ خوشی منائیے کہ ڈپریشن نے بھی ہمیں مایوس نہیں کیا!

پاکستان میں ڈپریشن در حقیقت کس سطح پر اور کس نوعیت کا ہے اِس کا اندازہ لگانا ہے تو اِس حقیقت پر غور کیجیے کہ اب ڈپریشن سے متعلق اندازوں اور اعداد و شمار کو بھی ڈپریشن ہوگیا ہے! ذرا غور کیجیے کہ قتل و غارت سے بھتہ

خوری تک کون سی عِلّت ہے جو کراچی کے مکینوں کو لاحق نہں۔ اور کون سا بحران ہے جو کوئٹہ کے رہنے والوں کو گھیرے ہوئے نہیں مگر پھر بھی لاہور کے مکینوں میں زیادہ ڈپریشن پایا جاتا ہے! کیا یہ بات مزید ڈپریشن میں مُبتلا کرنے کے لیے کافی نہیں کہ پاکستان میں جہاں سب سے کم ڈپریشن ہونا چاہیے وہاں سب سے زیادہ ہے؟

اصل رونا اِس بات کا ہے کہ آج تک یہی طے نہیں ہو سکا کہ ڈپریشن ہوتا کیوں ہے؟ دو یکسر متضاد کیفیات کا ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے جو ڈپریشن کی شکل میں ہوتا ہے۔ کوئی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے تو کچھ نہ ملنے پر ڈپریشن ہو جاتا ہے اور اگر کوئی جاہل رہ جائے تو بہت کچھ ملنے پر ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے! کنوار پن کی زندگی میں جو ڈپریشن دریا کی طرح بہتا ہے کچھ کچھ ویسا ہی ڈپریشن شادی شدہ زندگی میں بھی موجزن رہتا ہے!

پاکستان شاید واحد ملک ہے جہاں لوگ مختلف معاملات میں خدشات کو پروان چڑھا کر بے فضول میں " ڈپریشن کو گلے لگاتے رہتے ہیں! عید الاضحیٰ قریب آتی ہے تو" بکروں کو ذبح ہونے کا شاید اُتنا خوف لاحق نہ ہوتا ہو جتنا ہمیں اُن بکروں کی خریداری کا سوچ سوچ کر ڈپریشن لاحق ہوتا رہتا ہے! پاکستانیوں کو تو بس ڈپریشن میں مبتلا ہونے کا بہانہ چاہیے۔ کسی زمانے میں بھارتی وزیر

اعظم راجیو گاندھی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صبح ناشتے کی میز پر انٹیلی جنس والوں سے پوچھا کرتے تھے کہ پاکستان کا مشہور اسکائی ڈاؤ رٹی ایم (طارق محمود) اِس وقت کہاں ہے؟ اور آج کل بہت سے پاکستانیوں کو یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ وینا ملک اِس وقت کہاں ہوگی! اگر اِنسان ڈپریشن میں مُبتلا ہونا چاہیے تو طرح طرح کے حیلوں بہانوں کی کوئی کمی نہیں۔ ڈپریشن دراصل شکر کی طرح ہے۔ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ جو ہر وقت ڈپریشن میں مُبتلا رہنے کے خواہش مند ہوتے ہیں اُنھیں ربِ کریم اپنے در سے خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا، کوئی نہ کوئی بہانہ بخش ہی دیتا ہے ڈپریشن کے گڑھے میں گرنے کا! بہت سی باتیں ایسی ہیں جو آپ کو کسی بھی وقت بہت آسانی سے ڈپریشن کا شکار کر سکتی ہیں۔ مثلاً نواز شریف بہت دنوں سے لندن کیوں نہیں گئے؟ اسفند یار ولی بار بار پاکستان کا دورہ کیوں کر رہے ہیں؟ چوہدری شجاعت حسین سمجھ میں آنے والے ڈھنگ سے گفتگو کرنا کب سیکھیں گے؟ عمران خان "سونامی" کا راگ الاپنا کب چھوڑیں گے؟ جاوید ہاشمی کا نواز فوبیا کب ختم ہوگا؟ نجم سیٹھی انٹ شنٹ بولنا ترک کرکے قدرے ڈھنگ سے اور پاکستان کے حق میں بولنا کب شروع کریں گے؟ لیاری فوبیا کب تک پیپلز پارٹی کی جان کا روگ بنا رہے گا؟ رحمٰن ملک میڈیا کے سامنے پالیسی بیان جاری کرنے کے نام پر اسٹینڈ اپ کامیڈی کو کب خیر باد کہیں گے؟

پاکستان میں بیشتر معاملات کی طرح ڈپریشن کے معاملے میں بھی کوئی اُصول دور دور دکھائی نہیں دیتا۔ جو شخص تین چار سال بیروزگار رہا ہو اور اِس دوران ذرا بھی مایوس نہ ہوا ہو بلکہ خاصی پُرسکون زندگی گزارتا رہا ہو وہ نوکری ملنے پر صرف دو ماہ بعد یہ سوچ سوچ کر جسم و جاں کو ہلکان کرنے لگتا ہے کہ انکریمنٹ کیوں نہیں ہو رہا!

اگر کوئی رشتہ دار مُدتوں ملنے نہ آئے تو ڈپریشن ہونے لگتا ہے اور اگر کوئی رشتہ دار آئے دن ملنے آنے لگے تو زیادہ اور شدید نوعیت کا ڈپریشن گھیر لیتا ہے!

تعلیم کا معاملہ یہ ہے کہ کوئی بچہ ڈھنگ سے سیکھ نہ رہا ہو تو والدین ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کلاس میں بچے زیادہ سیکھنے پر تُلے ہوں تو اساتذہ ڈپریشن کے گڑھے میں جا گرتے ہیں! ایسے طلباء و طالبات کلاس میں ٹیڑھے میڑھے سوال پوچھ کر اساتذہ کو سارا رٹا ہوا بُھلا کر ڈپریشن میں مُبتلا کرتے رہتے ہیں!

اگر کسی قومی کرکٹر کو کپتانی سے ہٹادیا جائے تو اُس کے پرستاروں کو ڈپریشن ہو جاتا ہے اور اگر کپتانی بحال ہو جائے تو مخالفین اور اُن کے پرستار

ڈپریشن کی جھولی میں جا گرتے ہیں!

لوگ حالات کی خرابی کا رونا روتے نہیں تھکتے اور دل و دماغ کو ڈپریشن کی نذر کرتے ہیں مگر جب معاملات قدرے پُرامن انداز سے چل رہے ہوتے ہیں اور شہر پر سکوت اور سکون کا راج ہوتا ہے تب زیادہ پریشانی لاحق ہوتی ہے! حالات کا بہت دِنوں تک نہ بگڑنا شدید نوعیت کا ڈپریشن پیدا کرکے دم لیتا ہے!

انسانی فطرت بھی عجیب ہے۔ دل میں ہزاروں خواہشات پنپتی رہتی ہیں۔ مگر جب کوئی خواہش پوری ہونے لگتی ہے تو دل بُرا مان جاتا ہے! اچانک یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ خواہش پوری نہ ہو۔ بقول شاعر

پھر دل میں کیا رہے گا جو حسرت نکل گئی!

شعراء ہجر کو دیپک راگ کی طرح الاپ کر اُس کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ یہی ہمارے شعراء کا بنیادی ڈپریشن ہے۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ وہ فراق کے قصیدے گاتے گاتے اِس میں ایسے غرق ہو جاتے ہیں کہ وصال کا خیال بھی آئے تو خوف سا محسوس ہونے لگتا ہے اور ڈپریشن کی سطح بلند ہو جاتی ہے! بقول شاعر

فراق میں لذتیں ہیں اِتنی تو سوچتا ہوں
وصال اُس کا نصیب ہوگا تو کیا بنے گا!

جو دور رہ کر حرارتِ جاں بنا ہوا ہے
!وہ شخص میرے قریب ہوگا تو کیا بنے گا

ہم نے زندگی صحافت کی نذر کر دی ہے۔ ہم نے تو پہلوئے صحافت سے ہمیشہ ڈپریشن ہی کو ہویدا ہوتے دیکھا ہے۔ مگر ہم خوش نصیب ہیں کہ صحافتی ڈپریشن سے نجات پانے کا ایک تیر بہ ہدف نُسخہ اِس شعبے کے ایک بزرگ کی زبانی بہت پہلے ہاتھ آ گیا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب الیکٹرانک میڈیا کا انقلاب وارد نہیں ہوا تھا اور پرنٹ میڈیا بھی محدود تھا۔ آج کی طرح ہفتے کے ساتوں دن اور دن کے چوبیس گھنٹوں کی نشریات کا کوئی تصور دور دور تک نہیں تھا۔ عام تعطیل کے موقع پر خبر رساں ادارے بھی بند رہا کرتے تھے۔ اگر عام تعطیل کے دن اخبار شائع کرنا پڑتا تو اُس کا پیٹ بھرنا جوئے شیر کے لانے سے بھی دُشوار ثابت ہوتا تھا! ڈپریشن سے نجات کا نُسخہ عطا کرنے والے بزرگ ایک اخبار میں ڈسٹرکٹ پیج کے انچارج تھے۔ ایک بار عام تعطیل سے ایک دن قبل ہم نے پوچھا کہ کل تو خبر رساں ادارے بند ہوں گے تو آپ اپنے صفحے کا پیٹ کیسے بھریں گے؟ اُنھوں نے کمال سادگی اور شفقت سے فرمایا "میاں! کل کے لیے چند اچھی خبریں "!ہم نے بچا کر رکھ لی ہیں

آج جب ہم ڈپریشن سے نجات پانے کا یہ نُسخہ صحافت سے تعلق رکھنے والے کسی

دوست کو بتاتے ہیں تو وہ ہمیں یوں گھورتا ہے جیسے ہمارے ڈپریشن کی نوعیت اور شدّت
کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو!

ہیرو کی انٹری

پاکستانی، من حیث القوم، کام کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں اِس کا اندازہ اِس بات سے لگائیے کہ بہت سے لوگ کام پر جانے ہی کو کام سمجھتے ہیں! اور یہی سبب ہے کہ وہ دفتر، فیکٹری یا دُکان پر پہنچنے کے بعد مزید کام کرنے کو اپنے لیے عار جانتے ہوئے ایک طرف پڑے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں!

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ دلیپ کمار کی شاندار المیہ اداکاری دیکھ کر آپ غم کی اصل کیفیت کا جامع ترین حالت میں مشاہدہ کرچکے ہیں تو آپ کی سادگی پر قربان جائیے۔ بہتوں کا یہ خیال ہے کہ غم کی شدت کو چہرے اور لہجے کے ذریعے بیان کرنے میں نیر سلطانہ کا بھی کوئی ثانی نہ تھا۔ یہ سب لوگ اب تک حقیقت سے باخبر نہیں۔ شاندار المیہ اداکاری تو ہمارے ہاں کام کے مقامات یعنی دفاتر، فیکٹریز اور دُکانوں وغیرہ میں دکھائی دیتی ہے۔ کام پر جانا اب پاکستانیوں کے لیے ایک ایسی کیفیت جس کے بیان کے لیے المیہ اداکاری پوری تفصیل کے ساتھ رگ و پے میں سمونا پڑتی ہے! چھوٹے بچوں کو مدرسے یا اسکول بھیجتے وقت والدین کو جس نوعیت کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے بس کچھ ایسی ہی کیفیت سے ہم روزانہ کام پر روانہ ہوتے وقت گزرتے ہیں! فرق صرف یہ

ہے کہ بچپن میں تو والدین دھکّے مار مار کر اسکول یا مدرسے پہنچایا کرتے تھے، اب دھکّے سیلف سروس کے نام پر مارنے پڑتے ہیں! اِس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو پوری قوم ہی "دھکّا اسٹارٹ" ہے!

ایک زمانہ تھا جب فلمیں ہیرو کی انٹری کے حوالے سے بھی یاد رکھی جاتی تھیں۔ پُرانی فلموں میں ہیرو کی انٹری یعنی فلم میں اُس کا پہلا سین کچھ یوں ہوا کرتا تھا کہ ماں کپڑے سی رہی ہوتی تھی، بیٹا دوڑ رہا ہوتا تھا۔ دونوں سین ایک دوسرے میں گڈمڈ کیے جاتے تھے اور پھر سلائی مشین کا پہیہ گھومتا جاتا تھا اور بچہ دوڑتے دوڑتے بڑا (یعنی ہیرو) ہو جاتا تھا اور سنیما ہال کی فضاء تالیوں سے گونج اٹھتی تھی! زمانہ بدلا تو ہیرو کی انٹری بھی تبدیل ہوئی۔ اب چند ڈائیلاگ چل رہے ہوتے ہیں جن میں ہیرو کا ذکر ہوتا ہے اور پھر اچانک ہیرو اسکرین پر نمودار ہوتا ہے۔ پاکستان کے بیشتر دفاتر اور فیکٹریز میں ایسے ہیروز کی کمی نہیں جن کی انٹری روزانہ ایک یادگار منظر کو جنم دیتی ہے! جو لوگ یہ تصور اپنے ذہن میں راسخ کرچکے ہیں کہ اللہ نے اُنہیں کام کرنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا وہ روزانہ کام پر جاتے وقت کئی صدیوں کا دُکھ اپنے رگ و پے میں سمایا ہوا محسوس کرتے ہیں! اُردو شاعری میں جس برہن کے دُکھڑوں کا رونا رویا گیا ہے وہ ہمیں اپنے دفاتر کے بہت سے ہیروز میں پورے جوبن پر دِکھائی دیتی ہے! یہی وہ لوگ ہیں جو گھر سے کام پر روانہ ہونے اور دفتر میں

داخل ہونے کو دُنیا کا سب سے بڑا بوجھ اور زندگی کی سب سے بڑی آزمائش گردانتے ہوئے اپنے چہروں پر غم کی ایسی کیفیت طاری کر لیتے ہیں کہ شہنشاہِ جذبات دلیپ کمار بھی دیکھیں تو شرما جائیں اور اُنہیں اپنی اداکاری پر جو تھوڑا بہت مان اور ناز ہے وہ جاتا رہے! میر تقی میر، خواجہ میر درد اور فانی بدایونی نے اپنی شاعری میں غم اور حُزن و ملال کی دِل کھول کر تشریح کی مگر وہ بھی اندرونی کرب کی وہ کیفیت پوری طرح بیان نہ کر سکے جو ہمارے ہاں خاصی مُردہ دِلی اور پژمُردگی کے ساتھ کام پر جانے والے ڈیوٹی شروع کرتے وقت پلک جھپکتے میں بیان کر جاتے ہیں! مصوّرِ غم کا لقب پانے والے علامہ راشد الخیری بھی اگر اِنہیں دیکھتے تو نئے جوش و جذبے کے ساتھ غم کی تصویر یوں کھینچتے کہ پڑھنے والوں کی آنکھیں چھلک اُٹھتیں!

بعض دفاتر میں ہیرو کی انٹری ایسی دھانسو ہوتی ہے کہ لوگ اُس کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں! ہر دفتر کو ایک آدھ ہیرو ضرور ملتا ہے جو کام کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہوئے دفتر میں داخل ہوتے وقت تاثرات، چال اور حرکات و سکنات سے ظاہر بلکہ واضح کر دیتا ہے کہ خبردار! اِس وقت کوئی بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرے کیونکہ "نہ چھیڑ ملنگاں نوں" والی کیفیت طاری ہے! ہمارے ہاں بیشتر دفاتر میں ہیروز کی انٹری کچھ یوں ہوتی ہے کہ دفتر میں داخل ہوتے ہی وہ سارے زمانے کا کرب چہرے پر سجا لیتے ہیں۔ یہ اہتمام اِس لیے ہوتا ہے کہ

ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ آنے پر انچارج اول تو کوئی پوچھ گچھ ہی نہ کرے اور اگر لیٹ ہو جانے کا سبب پوچھنے کی غلطی کر ہی بیٹھے تو چہرے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد مزید کچھ پوچھنے کی ہمت اپنے اندر پیدا نہ کر پائے ! اِس شاندار انٹری کو دیکھ کر "دِل لگی" کا آخری سین یاد آتا ہے جس میں اُجڑے چمن کی تصویر بنا ندیم بکھرے بالوں اور دس دِن کی شیو کے ساتھ شبنم کو یاد کرکے گاتا ہے.... ہم چلے اِس جہاں سے ! ذرا دفتر کے ہیرو کی شان ملاحظہ فرمایئے کہ انٹری ہی میں کلائمیکس دِکھا دیتا ہے !

دھانسو قسم کی انٹری مارنے کے بعد ہیرو نڈھال سا، تقریباً لنگڑاتا ہوا اپنی سیٹ پر بیٹھتا ہے۔ اگر کوئی خیریت پوچھنے کی غلطی کر بیٹھے تو بس یہ سمجھ لیجیے کہ بھرے ہوئے گٹر کا ڈھکن ہٹادیا ! غیر معمولی صلاحیت کے حامل فِکشن رائٹرز کے ذہن میں بھی جو آئیڈیاز نہیں سماتے اُن آئیڈیاز کا دریا ہمارے ہیرو کی زبان سے بہنے لگتا ہے ! جواز کہیے تو جواز اور بہانہ کہیے تو بہانہ۔ دیر سے آنے، گزشتہ روز کام مکمل نہ کرنے اور آج کام کا مُوڈ بالکل نہ ہونے سے متعلق جو بہانے ہمارا ہیرو تراشتا ہے وہ اگر جغادری قسم کے ڈرامہ نگار بھی سُن لیں تو دانتوں تلے انگلیاں دبالیں، بلکہ چبالیں ! دیر سے آنے اور نڈھال ہونے کی وضاحت ایسی تفصیل اور جزئیات کے ساتھ کی جاتی ہے کہ زورِ بیاں پر رشک آنے لگتا ہے ! بس یہ سمجھ لیجیے کہ چارلس ڈکنز اور ٹامس ہارڈی جیسے

ناول نگاروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ! آپ حیران رہ جاتے ہیں کہ ابھی کچھ دیر پہلے آپ جن راستوں سے گزر کر آئے ہیں وہی راستے میدان جنگ بن چکے ہیں، ہاتھا پائی ہو رہی ہے اور لوگ ایک دوسرے کو "ٹپکانے" کے فراق میں ہیں !

صدیوں پہلے لوگوں کا دِل بہلانے کے لیے داستان گو ہوا کرتے تھے جو دنیا بھر کی داستانیں اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے اور مجمع لگا کر سُناتے اور داد پاتے تھے۔ اب وہ روایتی داستان گو ہماری حاجت نہیں رہے۔ روز ایک نئ داستان سُنانے والے جو موجود ہیں ! یہی وہ داستان گو ہیں جو کام سے یکسر گریز کر کے دفتر کے ماحول میں اپنی باتوں سے نیرنگی پیدا کرتے ہیں ہیں تاکہ لوگ کام کے بوجھ تلے دب کر بیزاری محسوس کرنے سے محفوظ رہیں !

چُوں چُوں کا مُربّہ

سیاست کے بازار کی رونق بڑھتی جارہی ہے۔ مگر یہ رونق صرف بھیڑ کی حد تک ہے۔ بڑے شہروں کے چھوٹے علاقوں میں رمضان کے آخری عشرے میں لگنے والے بازار بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہر طرح کے شوقین اِن بازاروں میں گھومتے پھرتے ہیں مگر اُن میں خریدار معدودے چند ہی ہوتے ہیں! اِس وقت سیاسی بازار میں بھی خریدار کم اور تماش بین زیادہ ہیں۔ اور یہ تماش بین بھی ایسے ظالم و خسیس ہیں کہ کوئی اچھا تماشا دیکھنے کے بعد بھرپور داد دینے کے بھی روادار نہیں! جب بھی کوئی انہونی ہو جاتی ہے، سب محظوظ ہو کر ایک طرف کو ہو لیتے ہیں۔

یوسف رضا گیلانی کی رخصتی کے بعد پیپلز پارٹی نے راجہ پرویز اشرف کو چیف ایگزیکٹو کے منصب پر بٹھا تو دیا مگر "ایگزیکیوشنرز" اُن کی تاک میں ہیں! بات خط سے چلی تھی اور پھر خط پر آ گئی ہے۔ عدلیہ کی مہربانی ہے کہ ایوان صدر کو تمام مصروفیات سے گلو خلاصی دِلا کر وزیر اعظم کے دفاع پر لگا دیا گیا ہے۔ سارے معاملات، سارے جھمیلے ایک طرف اور راجہ صاحب کی گردن این آر او کیسز کے معاملے پر خط لکھنے کے عدالتی مطالبے سے بچانے کی کوشش ایک طرف!

راجہ پرویز اشرف کا بھی عجیب ہی معاملہ رہا ہے۔ جب وہ پانی اور بجلی کے وزیر تھے تب قوم بجلی کو ترستی رہی۔ وہ اپنے بیانات کے ذریعے جھٹکے دیتے رہے مگر قوم کی تشفی نہ ہوئی۔ بجلی کے بحران کو ختم کرنے میں ناکام رہنے والے راجہ پرویز اشرف کو اب وزیر اعظم کی کُرسی مسلسل جھٹکے دے رہی ہے۔ اگر اِتنے جھٹکے پہلے ملے ہوتے تو وہ قوم کو لوڈ شیڈنگ سے نجات دِلا چکے ہوتے!

مرزا تنقید بیگ کی حالت عجیب ہے۔ ٹی وی پر سیاسی مناظرے بازی یعنی ٹاک شوز دیکھنے کے شوق نے اُنہیں کہیں کا نہ رہنے دیا۔ اُن کی باتوں میں پہلے ہی کون سا ربط تھا۔ اب حالت یہ ہے کہ کہنا کچھ چاہتے ہیں اور منہ سے نکلتا کچھ ہے! ٹاک شو دیکھنے کی عادت نے اُن کی گفتگو میں دُنیا بھر کے بے سر و پا تصورات کو سمو دیا ہے! ہم نے اُن سے کہا کہ راجہ پرویز اشرف نے پانی و بجلی کے وزیر کی حیثیت سے قوم پر یہ احسان تو کیا تھا کہ پرائم ٹائم میں بجلی غائب رہنے سے لوگ سیاست دانوں اور اینکرز کی انٹ شنٹ باتیں سُننے سے بہت حد تک محفوظ رہے تھے! مرزا کو جب کوئی بات بُری لگتی ہے تو اینکرز کی طرح انٹ شنٹ بولنے لگتے ہیں اور پھر اُن پر قابو پانا خاصا دُشوار ثابت ہوتا ہے۔ وہ راجہ پرویز اشرف سے الرجک رہے ہیں کہ بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم کرنے سے متعلق

اُن کی دی ہوئی ڈیڈ لائنز پر بھروسہ کرکے مرزا کئی بار شدید مایوسی کا شکار ہوئے۔ ہمیں یقین تھا کہ ہم راجہ پرویز اشرف کے حق میں کچھ کہیں گے تو مرزا بدک جائیں گے اور کچھ نہ کچھ ایسا ویسا ضرور ارشاد فرمائیں گے جس سے ہمیں کالم لکھنے کی تحریک مِلے!
مگر یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ مرزا نے راجہ پرویز اشرف کے حق میں کہی جانے والی بات سُن کر ذرا بھی ناراضی کا اظہار نہ کیا۔ ہم یہ سوچ کر سہم گئے کہ ٹی وی چینلز پر سیاسی گفتگو سُن سُن کر شاید مرزا کے ذہن نے کام کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے! پھر ہم نے یہ دیکھا کہ مرزا کچھ کہنا چاہ رہے تھے مگر شاید موزوں ترین الفاظ اُن کے ذہن کی اسکرین پر نمودار نہیں ہو رہے تھے! مرزا کی یہ حالت دیکھ کر ہمیں بہت رنج پہنچا۔ ہماری سیاست بھی کیا کیا گل کِھلا رہی ہے!
کچھ دیر بعد مرزا کے حواس بحال ہوئے تو ہم قدرے سُکون کا سانس لیا کہ وہ ذہنی طور پر کچھ تو سلامت ہیں۔ یعنی کچھ دیر گپ شپ رہے گی۔ مرزا کی ذہنی حالت پر افسوس کا محل تھا مگر جب حواس بحال ہونے پر اُنہوں نے بولنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ سیاست کے جلووں کی فراوانی اور ہماہمی نے اُنہیں حواس باختہ ہی نہیں، حواس رفتہ بھی کردیا ہے! ایسے میں یہ خیال آیا کہ مرزا کے حواس کا گم رہنا ہی بہتر حالت ہے!

حکومت اور عدلیہ کے درمیان آنکھ مچولی جاری ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب حکمرانی صرف اداروں کے درمیان تصادم کا نام ہے۔ ایوان صدر اور وزیر اعظم ہاؤس کو ملک اور قوم کے معاملات سُلجھانے اور عوام کے مسائل حل کرنے ہیں۔ مگر سارا زور وزیر اعظم کو بچانے پر لگایا جارہا ہے۔ جس حکومت کا بیشتر وقت اور توانائی اپنے وجود کو برقرار رکھنے پر صرف (یا ضائع) ہو وہ ہمارے لیے کیا کرپائے گی، اِس کا اندازہ لگانا کچھ دُشوار نہیں۔

مرزا اِس بات کو روتے رہتے ہیں کہ انتقامی سیاست اور اداروں کی محاذ آرائی نے ملک کو اِس نہج پر پہنچا دیا ہے کہ اب دُنیا تماشائی ہے اور ہم تماشا۔ ہمیں اُن کے رونے پہ ہنسی آتی ہے۔ ہم اُن کی بات سے متفق نہیں۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہم میں کوئی ایسی بات نہیں جس پر دُنیا متوجہ ہو۔ ایسے میں بھی اگر دُنیا ہماری طرف دیکھ رہی ہے تو یہ ہماری ناکامی کی کامیابی ہے! مرزا کو صرف رونا آتا ہے۔ اہل دانش کہتے ہیں کہ زندہ قومیں وہ ہیں اپنے حال پر ہنسنے کا حوصلہ اور ظرف رکھتی ہوں۔ اور اگر زندہ قوم ہونے کا یہ معیار طے کرلیا جائے تو پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے ہاں حکومتیں اپنے مِشن" میں ناکام نہیں رہیں! سیاست، حکمرانی اور اداروں کے درمیان معاملات" خالص چُوں چُوں کے مُربّے کی شکل اختیار کرچکے ہیں۔ ایسے میں اپنے حال پر ہنسنے کے سِوا کچھ کرنا ممکن دِکھائی نہیں دے رہا! ویسے تو مُربّہ کھایا

جاتا ہے مگر ہماری سیاست نے چھوں چھوں کے ایسے مُرتبے کی شکل اختیار کی ہے جو پوری قوم کو کھاگیا ہے! مرزا جیسے روتے، منہ بسورتے لوگوں کو یہ سوچ کر مطمئن ہو رہنا چاہیے کہ ہم ایک مثال بن کر دُنیا کے سامنے کھڑے ہیں۔ کامیابی کی نہیں سہی، ناکامی کی مثال سہی!

اب یہاں سے کہاں جائیں ہم؟

☆ "اِس مُلک میں آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟"

.... "کیوں؟ ایسا کیا ہوگیا جس پر حیرت کا اظہار ضروری ٹھہرا؟"

☆ "کسی بھی معاملے میں میرٹ کا خیال ہی نہیں رکھا جارہا۔"

.... "غلط، بالکل غلط۔ ایک معاملے میں میرٹ کا بھرپور، بلکہ پورا خیال رکھا جارہا ہے۔"

☆ "ایسا کون سا معاملہ ہو سکتا ہے؟"

.... "میرٹ کا ذرا بھی خیال نہ رکھنے کا!"

☆ "مذاق چھوڑیے۔ یہ بہت سیریس معاملہ ہے۔"

.... "میں نے کب کہا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ میں بھی سیریس ہی ہوں۔"

☆ "ملک مزید تصادم کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور اداروں میں صرف تصادم ہو رہا ہے۔"

.... "تصادم کو تصادم سمجھیں گے تو دِل دہلتا رہے گا۔ یہ سب تو لہو گرم رکھنے کا بہانہ ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ گھر کی رونق کسی نہ کسی ہنگامے پر موقوف ہے۔"

☆ "مگر لہو گرم رکھنے کی کوشش تو قوم کو لہو لہو کر رہی ہے۔"

اچھی خاصی گفتگو میں پتہ نہیں قوم کہاں سے در آتی ہے؟ کوئی بھی بات ہو رہی" ....
"ہو، تان قوم پر ٹوٹتی ہے۔

"☆ "کیوں؟ قوم کا ذکر کیوں نہ ہو؟ ہم قوم ہی تو ہیں۔

"کس نے کہا کہ ہم قوم ہیں؟" ....

"☆ "تو پھر کیا ہیں؟

بھیڑ ہیں، ہجوم ہیں، مجمع ہیں، ریوڑ ہیں۔ اور سب کچھ ہیں مگر بخدا قوم ہرگز" ....
"نہیں ہیں۔

"☆ "تو پھر قوم کیسے بنیں گے؟ اور بن بھی سکیں گے یا نہیں؟

"بن تو سکتے ہیں مگر یہ کام ہے بہت محنت طلب۔" ....

"☆ "محنت؟ یہ ہم سے کہاں ہوگا؟ کوئی آسان طریقہ، کوئی شارٹ کٹ بتائیے۔

ہر معاملے میں شارٹ کٹ کی خواہش ہی نے تو پوری قوم کا شارٹ سرکٹ کر دیا" ....
ہے! محنت سے جی چُرانے کی عادت اپنانے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اب ہم سب کے
"دِلوں میں چور ہے۔

☆ "مگر کوئی کیا کرے؟ دُنیا جن اُصولوں کو اپنا کر آگے بڑھتی ہے اُنہیں اپنانے کی
صورت میں تو بہت وقت لگ جائے گا، بہت دیر ہو جائے گی۔ ہم ترقی کی سڑک ناپتے
"رہ جائیں گے اور دُنیا بہت آگے نکل جائے گی۔

آگے بڑھنے کا ایک ہی راستہ ہے.... محنت کا۔ محنت سے جی چُرانے والوں کو" ....
"بالآخر اپنے آپ سے نظریں چُرانا پڑتی ہیں۔

"☆"اِتنا کون سوچتا ہے؟ اور اِتنا سوچنے کی فُرصت ہے کسے؟

سوچتا تو کوئی بھی نہیں۔ سوچنا پڑتا ہے۔ نہ سوچنے کا آپشن بھی موجود ہے۔ مگر" ....

"!اِس کے بعد بھی سَر پکڑ کر سوچنا ہی پڑتا ہے

☆"آج جو اقوام ترقی کی شاہراہ پر بہت آگے ہیں اُن کے ماضی کا ہمیں علم ہے۔ وہ جس

"طرح یہاں تک پہنچی ہیں وہ سب کرنے کے لیے تو صدیاں درکار ہیں۔

اب اِن باتوں کو سوچنے کا محل رہا نہیں۔ اب تو عمل کا مرحلہ درپیش ہے۔ جہاں" ....

عمل درکار ہو وہاں کوئی اور چیز نہیں چلتی۔ اور رہا صدیوں کا معاملہ تو ترقی یافتہ اقوام کو

"!بھی پس ماندگی کے دور میں اپنا آپ بدلنے کے لیے صدیاں ہی درکار تھیں

"....☆"مگر عمل

"کا معاملہ ہے۔ no اور yes عمل کے معاملے میں اگر مگر کی گنجائش نہیں۔ یہ تو ....

"کہیں تو بگڑی بات بن جائے گی؟ yes ☆"یعنی اگر

"یقیناً ایسا ہی ہوگا۔" ....

تو ہم کرتے ہی رہے ہیں۔ اور اب بھی کر رہے ہیں۔ پھر yes ☆"مگر ہر معاملے میں

"معاملات درست کیوں نہیں ہو پائے؟

سوال ہتھوڑے پر ہتھوڑے مارنے کا نہیں بلکہ اہمیت اِس بات کی ہے کہ چوٹ" ....

"!کہاں ماری جارہی ہے

کب، کہاں اور کس yes کہہ دینا کافی نہیں؟ یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ yes ☆ "تو کیا
"معاملے میں کہا گیا ہے؟
بالکل۔ گاڑی اینٹوں پر کھڑی ہو تو ایکسیلریٹر دبانے سے پہئے گھومیں گے مگر" ....
"!گاڑی تو اینٹوں ہی پر رہے گی
"☆ "تو کیا ہماری گاڑی اینٹوں پر کھڑی ہے؟
اِس میں تو اب کوئی شک بھی نہیں رہا۔ ہم کولھو کے بیل کی طرح ہیں۔ اصلی" ....
آنکھوں پر غفلت کی پَٹّی باندھے دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ اور "چشم تصور کی آنکھ"
"!سے خود کو دُنیا کی سیر کرتا ہوا دیکھ رہے ہیں
☆ "مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ 'ہر عروج را زوال است' کے مِصداق کبھی وقت کا پہیہ
اُلٹا گھومے اور 'ہر زوال را عروج' کے اُصول کو قبولیت ملے۔ یعنی قدرت ہمیں خود ہی
"زوال سے دور کرے۔
خوابوں اور خیالوں کی دُنیا میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے اور ہوتا آیا ہے! جو لوگ" ....
ہاتھ پر ہاتھ دھرے آنے والے کل کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں اُن کی خوش گمانیوں
کو قُدرت خوب پروان چڑھاتی ہے اور وہ کم از کم خواب و خیال کی حد تک تو تسکین کی
دولت پا ہی لیتے ہیں! اب یہ فیصلہ تو ہمیں کرنا ہے کہ آباد ہونے کے لیے کون سی دُنیا
"اچھی ہے۔ گمان کی یا یقین کی؟
☆ "اگر یہ ساری باتیں درست ہیں تو سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں؟ ہم کہاں کھڑے ہیں
"اور اب یہاں سے کہاں جائیں؟

مشکل یہ ہے کہ ہم کہیں کھڑے بھی تو نہیں۔ اگر کوئی سیدھے راستے پر گامزن نہ ....
ہو تو غلط راستے پر چلتا ہے۔ اِسے گمراہی کہتے ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ کسی راہ پر گامزن ہی نہیں۔ سیدھا راستہ نہ ملے تو غلط ہی سہی۔ کوئی تو راہ ہو جس پر ہم گامزن ہوں۔ کہیں جانا ہے اِس کا تعین کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری، بلکہ لازم ہے کہ ہم کہاں ہیں، کس مقام پر ہیں۔ مختصرہ یہ ہے کہ ہمیں خود بھی معلوم نہیں کہ ہم کہاں ہیں!"

☆ "تو پھر کیا ہوگا؟ حالات کی اِس قید سے کیسے نکل پائیں گے ہم؟"

نکل نہیں پائیں گے، نکلنا ہوگا۔ یعنی خود نکلنا پڑے گا۔ نجات دہندہ کا انتظار قید کو" ....
مزید طویل اور جاں گُسل بنادے گا۔ خیالات کے پُرکیف گلشن سے نکل کر عمل کے دشت کی "سیر" ہی ہمیں اُس راہ پر لائے گی جو منزل کی طرف جاتی ہو۔"

☆ "تان پھر عمل پر ٹوٹ رہی ہے! عمل کرکے بھی دیکھ لیا، کچھ بھلا نہ ہوا۔"

"کون سا عمل؟" ....

☆ 'عملیات' میں بھی عمل تو پورا کا پورا شامل ہے، جیسے 'نااُمیدی' میں اُمید پوری کی پوری موجود ہے!"

لفظوں کا اُلٹ پھیر چھوڑیے، مفہوم کی دُنیا کو اپنایئے۔ 'عملیات' اور 'عامل' ....
وغیرہ کے داؤ پیچ سے جان چھڑا کر خالص عمل کی دُنیا کو اپنایئے،

"!تقدیر بدلے گی بھی اور سنورے گی

☆"کوشش کر دیکھیں گے، کوشش کرنے میں تو خیر کوئی ہرج نہیں۔

کوشش ووشش نہیں، کرنا ہی پڑے گا۔ اب عمل کے میدان میں قدم رکھنے کے" ....
سوا چارہ نہیں۔ تاخیر کی گنجائش نہیں کیونکہ اِس معاملے میں بھی اب بہت دیر ہوچکی
ہے! منزل کا تعین تو بعد میں بھی ہو سکتا مگر پہلے مرحلے میں تو یہ لازم ہے کہ جہاں ہیں
"!وہیں پڑے یا کھڑے نہ رہیں۔ اگر قدم نہ بڑھایا تو سمجھ لیجیے گئے کام سے

گرمی کی شدّت اور سیاسی سرکس

گرمی نے بھی کیا غضب ڈھایا ہے۔ جسے دیکھیے، اُبلتے ہوئے پانی کی طرح ہر معاملے میں اُبلا جارہا ہے۔ مزاج کی گرمی ہے کہ کم ہونے میں نہیں آرہی۔ ایک طرف ماحول کا پارہ چڑھ رہا ہے اور دوسری سیاسی دیگچی کا پانی مسلسل اُبل رہا ہے۔ اب کے گرمی ایسی پڑی ہے کہ سبھی بُھرے بیٹھے ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ سب نے کچھ نہ کچھ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ ویسے ہمارے ہاں کچھ نہ کچھ کرنے کی ٹھان لینا بلکہ ٹھانتے رہنا اب بہت حد تک روایت کا درجہ اختیار کرتا جارہا ہے۔

قوم کو بارش کا انتظار ہے مگر اہلِ سیاست کو اِس کی کچھ فکر نہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے پر برستے ہی رہے ہیں۔ بعض سیاسی گلی کوچوں میں تو الزامات کی برسات ایسی جم کے ہوئی ہے کہ اب تک کیچڑ پایا جاتا ہے اور وہاں سے سلامتی کے ساتھ گزرنا چیلنج سے کم نہیں۔ پنجاب میں بارش ہوئی ہے اور خوب ہوئی ہے مگر وہاں بارش کی ضرورت ہی کیا تھی؟ الزامات تو برس ہی رہے تھے اور مغلّظات کی کیچڑ بھی موجود تھی۔ قدرتی بارش اور کیچڑ نے معاملے کو دوآتشہ کردیا۔

قوم پریشان ہے کہ اداروں میں تصادم کی کیفیت کب ختم ہوگی اور ختم ہوگی بھی یا نہیں۔ سیاسی بزم کے بعض احباب تو جیسے پیدائشی طور پر یہ ٹاسک لیکر آئے ہیں کہ اداروں کو باہم متصادم کردیا جائے! اِن کا اوڑھنا بچھونا ہی یہ ہے کہ بنتی کو بگاڑا جائے، بستے ہوئے معاملات کو اُجاڑا جائے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد "کریڈٹ" لینے سے بھی گریز نہ کیا جائے!

ایک طرف انصاف کا بول بالا کرنے کی کوششیں ہیں اور دوسری طرف عدلیہ ہی کو دیوار سے لگانے کے اقدامات ہیں۔ نظریہ ضرورت نے دم نہیں توڑا۔ اگر حکمران اپنے مفاد کی کوئی چیز پارلیمنٹ سے منظور کرانا چاہیں تو دو چار گھنٹے بھی نہیں لگتے۔ توہین عدالت سے متعلق نئے قانون کا کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔اِس قانون کے ذریعے عدلیہ کے ہاتھ پیر باندھنے کی ایک خاصی پُرجوش کوشش کی گئی ہے۔

مرزا تفصیل بیگ کو چونکہ ہر معاملے میں تفصیل پسند ہے اس لیے قوم کی خاطر پریشان ہونے کے معاملے میں بھی اُن کی پریشانی قابل دید ہوا کرتی ہے۔ اُن کے بعض محلّہ داروں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ جس وقت وہ قوم کے غم میں گُھل رہے ہوتے ہیں تب اِس قدر قابل دید ہوتے ہیں کہ اُن کی طرف دیکھنے سے کچھ ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے اِس لیے لوگ ایسے عالم میں اُنہیں دیکھنے سے گریز

!کرتے ہیں

حالات کی روش دیکھ کر مرزا کی پریشانی بڑھ گئی ہے۔ اگر پریشانیوں کو معلوم ہو جائے کہ مرزا اُن کے باعث اِس قدر پریشان ہیں تو اُن کی شِدت میں خواہ مخواہ اضافہ ہو جائے! ہم نے جب بھی مرزا سے حالات پر بات کی ہے، اُنہیں یہی شِکوہ کرتے دیکھا ہے کہ قوم جاگنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ہم نے اُنہیں بارہا سمجھایا ہے کہ ہر معاملے میں جاگنا ضروری نہیں ہوتا، کبھی کبھی نیند کے مزے لوٹتے رہنے ہی میں اصل لطف مُضمِر ہوتا ہے! مگر مرزا کی پریشانی ہے کہ سونے کا نام ہی نہیں لیتی اور جاگ جاگ کر سب کو جگاتی رہتی ہے۔

سیاسی ماحول میں تیزی سے پنپتی ہوئی شدت نے مرزا کو ایک ایسے موڑ پر پہنچا دیا ہے جہاں سے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ اُنہیں دِکھائی اور سُجھائی نہیں دیتا۔ حق تو یہ ہے کہ مرزا کو ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو اُٹھنے کا ایسا شوق ہے کہ آن کی آن میں حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ سیاست کی بات ہو اور اُن کا پارہ نہ چڑھے، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔

عدلیہ اور وفاقی حکومت کے درمیان کش کش نے مرزا کو قوم کے حوالے سے مزید متفکر کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مسلسل سوچتے رہنے سے اُن کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کمزور پڑتی چلی جائے گی۔ حق یہی ہے کہ قوم کے معاملات ایسے اُلجھا دیئے گئے ہیں کہ جو زیادہ سوچتا ہے وہ سوچنے سے جاتا رہتا ہے! اِس طلسمات میں جس نے بھی قدم رکھا وہ مُڑ کر دیکھنے پر پتھر کا ہوگیا!

مرزا کو اِس بات کا یقین دِلانا بہت مشکل ہے کہ اب قوم اُس منزل سے بہت آگے جاچکی ہے جہاں اُس کے لیے اور اُس کے بارے میں سوچنا بہت ضروری تھا۔ اب سوچنا اِس لیے بھی کسی کام کا نہیں رہا کہ قوم کو یقین ہے کہ سوچنے سے معاملات سُلجھتے نہیں، اُلجھتے ہیں! قوم کا ہر فرد اِس کوشش میں ہے کہ ذہن کو متحرک اور فعال کئے بغیر کام کرے اور کرتا ہی چلا جائے! جو لوگ اپنے ذہنوں کو متحرک نہیں رکھتے وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہیں اور زندگی کے سارے مزے پاتے ہیں۔ مرزا نے کئی بار یہ تجربہ بھی کیا ہے اور اِس کے فوائد بھی بٹورے ہیں! جب کبھی اُنہوں نے ذہن کو زحمت دیئے بغیر کچھ کہا ہے، لوگوں نے خوب سراہا ہے بلکہ یاروں نے بحث کے دوران اُن کے جملوں کا حوالہ بھی دیا ہے! ہم سمجھتے تھے کہ چند ایک کامیاب تجربات سے مرزا اپنی روش بدل لیں گے اور سوچے بغیر بولنے کی مہارت کو زندگی کا حصہ بنالیں گے۔ مگر وائے ناکامی کہ ہماری یہ آرزو بھی ناکام رہی۔

مرزا کو لاحق ہونے والی تازہ ترین فکر یہ ہے کہ یوسف رضا گیلانی کی طرح کیا راجہ پرویز اشرف کو بھی گھر جانا پڑے گا۔ ہم نے اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ راجہ پرویز اشرف کے لیے وزارتِ عُظمٰی "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا" کے مصداق ہے۔ یہ منصب اُن کے مقدر میں دور دور تک دِکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوسف رضا گیلانی نے پارٹی (یعنی پارٹی کے سربراہ) سے وفا نبھائی اور سوئس عدالت کو خط لکھنے سے انکار کیا۔ اور پھر اِس انکار پر ڈٹے بھی رہے۔ یہ ثابت قدمی اور اولوالعزمی راجہ پرویز اشرف کو وزیر اعظم ہاؤس تک لائی ہے۔ اب اگر وہ پارٹی اور اُس کے سربراہ سے وفاداری نبھاتے ہیں تو یقینی طور پر ایک اور وزیر اعظم ہمارے سامنے آئے گا۔

!آج وہ، کل ہماری باری ہے

ہم تو چاہیں گے کہ راجہ پرویز اشرف وفا کے معیار پر پُورے اُتریں۔ ہمارے ہاں وفا کا معیار ضرور بدلتا رہتا ہے، وفا وہی رہتی ہے۔ یعنی غیر مشروط، اٹل اور انتھک۔ پیپلز پارٹی نے اِس کی انوکھی مثالیں قائم کی ہیں۔ اب راجہ پرویز اشرف کی باری ہے۔ وزارت عُظمٰی ملک میں انتظامی اُمور کی سب سے بڑی گدّی ہے۔ اِس اعتبار سے راجہ پرویز اشرف بھی اب گدّی نشین ہوگئے ہیں۔ اب وہ اِس گدّی پر بیٹھے رہنے کے لیے کیا کرتے ہیں، یہ دیکھنا بے حد دلچسپ ہوگا۔

مسئلہ یہ ہے کہ راجہ پرویز اشرف وزیر اعظم کی گدی پر بیٹھے ہیں اور وفا کے تقاضے اُن کی گُدی پر بیٹھے ہیں!

نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن!

لوگ سرکس میں طرح طرح کے تماشے دیکھتے ہیں۔ ایک تماشا بیلینسنگ ایکٹ کا بھی ہوتا ہے۔ فنکار مختلف کرتب بھی دِکھاتا ہے اور اپنا توازن برقرار بھی رکھتا ہے۔ ہماری سیاست بھی اب بہت حد تک سرکس کی حیثیت ہی اختیار کر گئی ہے۔ اِس سرکس میں کئی فنکار اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے لیے دنیا بھر کے تماشے دِکھانے پر کمربستہ رہتے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہر فنکار کو بیلینسنگ ایکٹ پیش کرنا پڑ رہا ہے۔ مرزا کی نظر میں سیاست اِس قدر "سرکسی" ہو گئی ہے کہ اب سرکس والوں کو اپنے دھندے کی بساط لپیٹ لینی چاہیے! مرزا کی چند ہی باتیں ہیں جن سے ہم متفق ہونے کی ہمت اپنے اندر پیدا کر پائے ہیں! اور یہ بھی ایک ایسی ہی بات ہے۔

سیاسی سرکس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ عوام کرتب دیکھ دیکھ کر تنگ آ جاتے ہیں مگر فنکار کم ہوتے ہیں نہ کرتب۔ قابل غور بات یہ ہے کہ سیاسی سرکس میں مسخروں کا الگ سے اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی! ہر فنکار کی پرفارمنس کا بڑا حصہ کامیڈی پر مشتمل ہوتا ہے! بہت سے منچلے تو اپنی باتوں

اور حرکات و سکنات سے اِس قدر ہنساتے ہیں کہ تماشا دیکھنے والے ہنستے ہنستے حواس کھو بیٹھتے ہیں ! مرزا کی مثال چونکہ ہمارے سامنے ہے اِس لیے ہم سیاسی سرکس کے کرتب دیکھتے وقت احتیاط برتتے ہیں !

راجہ پرویز اشرف بھی بیلینسنگ ایکٹ کی منزل میں ہیں۔ منصب سے متعلق اُمور کا کیا بنے گا اور کیا بن رہا ہے، اِس سے کہیں بڑھ کر اُنہیں یہ فکر لاحق ہے کہ خط نہ لکھنے پر گردن کس طرح بچائی جائے ! عدالت شکنجے کے ساتھ تیار بیٹھی ہے۔ راجہ پرویز اشرف کے لیے وہی انجام تیار ہے جو یوسف رضا گیلانی کا ہوا۔ مگر اِس منطقی انجام کو واقع ہونے سے کس طرح روکا جاتا ہے، یہی سیاسی سرکس کا سب سے دلچسپ آئٹم ہے۔ تب تک تماشائی کتنے کرتب دیکھیں گے اور اُن پر کیا کیا گزرے گی، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے ! اگر ہم راجہ پرویز اشرف سے وفاداری بہ شرطِ اُستواری والے معاملے کی توقع رکھیں تو اُن کی گردن ماری جاتی ہے ! اور اگر وہ جیالے پن کی اگلی منزل تک جا کر خط لکھ بیٹھتے ہیں تو پارٹی سے بھی "اِنصاف" ہی ملے گا !

سیزن

ہر ناکام ملک کی طرح پاکستان کے غریبوں کو بھی اللہ نے بہت بلند مقام بخشا ہے۔ اِن کے گھروں کا اندھیرا بہت سے امیروں کے گھروں کو روشن رکھنے کا ضامن ہے! مون سون کی بارشیں کسی بھی وقت بھرپور طمطراق سے شروع ہوسکتی ہیں۔ بارشیں ہوں گی تو دریاؤں میں طغیانی پیدا ہوگی، دریا کنارے توڑ کر بہہ نکلیں گے اور پھر سیلاب آئے گا۔ بہت سے ایسے ہیں جو سیلاب کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہیں کہ جان و مال کا بچاؤ کیونکر ممکن ہوسکے گا۔ اور کئی ایسے بھی ہیں جو سیلاب کی آمد کے تصور ہی سے نہال ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سیلاب آئے گا تو ڈالرز کا ریلہ بھی آئے گا! کون چاہتا ہے کہ سیلاب آئے؟ غریب تو بالکل نہیں چاہتے۔ مگر کچھ بڑے ضرور چاہتے ہیں کہ محکمہ موسمیات کی پیش گوئیاں غلط ثابت ہوں، موسلا دھار بارشیں ہوں، منہ زور دریا کناروں سے بہہ نکلیں اور سیلاب بن کر بہت کچھ بہا لے جائیں۔ اب کچھ بڑے گھروں کی روشنی کا مدار سیلاب سے جلنے والے چراغ پر ہے! یاروں نے ایسا بندوبست کر رکھا ہے کہ سیلاب کو نہ چاہتے ہوئے بھی آنا پڑے گا! ویسے بھی سیلاب خاصی شرمیلی طبیعت رکھتا ہے۔ وہ بے چارہ خود کہاں آتا ہے، اُسے کھینچ کھانچ کر لایا جاتا ہے!

قدرت نے ہر موسم میں کچھ لوگوں کے لیے رزق رکھ چھوڑا ہے۔ شدید گرمی میں گولا گنڈا، قلفی اور ٹھنڈے مشروبات والوں کا دَھندا چمک اٹھتا ہے۔ سردی میں سُوپ، یخنی، اُبلے ہوئے انڈے اور مختلف اقسام کے حلوے بیچنے والے کچھ اِضافی کما لیتے ہیں۔

رمضان المبارک میں خیرات، صدقات، زکوۃ اور فطرہ جمع کرنے والوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ اب کچھ ایسا ہی معاملہ اہل سیاست اور حکومتی مشینری کے بعض افسران کا بھی ہے۔ قدرت نے اُن کے لیے سیلابی سیزن کا اہتمام کیا ہے۔ دنیا بھر میں سیلاب سے بچاؤ کے لیے بند باندھے جاتے ہیں مگر ہمارے ہاں ایسے بند باندھے جاتے ہیں جو ٹوٹ کر بُہتوں کو زر کی اُچھلتی کودتی گنگا میں بھرپور اشنان کا موقع فراہم کرتے ہیں!

یعنی

!لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

اگر بند نہ ٹوٹے اور سیلاب بہت کچھ اپنے ساتھ نہ بہا لے گیا تو عالمی برادری کا ضمیر کیسے !جاگے گا اور وہ سخاوت کا دریا کس طرح بہائے گی

ہماری زراعت اب اہل اقتدار و اختیار کے لیے زر کے اہتمام میں جُتی رہتی ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ زراعت کی ابتداء ہی "زر" سے ہوتی ہے! کھیتوں میں ہل چلانے اور خون پسینہ ایک کرکے فصلیں اگانے والے غریبوں کی قسمت میں رونا ہی رونا لکھا ہے !مگر اُن کے نام پر بہتوں کی لاٹری نکل آتی ہے

ہم بھی عجیب قوم ہیں۔ گرمی پڑتی ہے تو عزم وارادے سے تاب و تواں تک سب کچھ پگھل جاتا ہے اور ہر شخص (شرم سے نہ سہی!) پسینے سے پانی پانی ہو جاتا ہے! سردی پڑتی ہے تو حوصلے تک منجمد ہو جاتے ہیں۔ موسم بہار میں پھول کم کھلتے ہیں، گل زیادہ کِھلائے جاتے ہیں! بجلی کڑکتی ہے تو دِل دھڑکتے ہی رہتے ہیں کہ پتہ نہیں کب، کہاں گرے! بارش ہوتی ہے تو فصلیں کم اُگتی ہیں اور بربادی کی پیداوار زیادہ سامنے آتی ہے! اب ایسے میں کوئی موسم کی تبدیلی سے کیا محظوظ ہو؟ اندر کا موسم تو وہی رہتا ہے!

ایک زمانہ تھا کہ بارش کے آثار نمودار ہوتے ہی خواتین خانہ پکوڑوں اور سموسوں کا اہتمام کرنے میں جُت جاتی تھیں۔ دہی بڑے اور فروٹ چاٹ تیار کرنا اولین ترجیحات میں شامل ہو جاتا تھا۔ اب عالم یہ ہے کہ بارش غریبوں کو مُشکلات کی کڑھائی میں پکوڑوں کی طرح تل دیتی ہے! جن کی چھتیں ٹپکتی ہیں کوئی اُن کے دِل سے ساون کے مزے" پوچھے! وہ دِن گئے جب خواتین ساون میں بھیگتی ہوئی جُھولا جُھولنے کی فکر" میں غلطاں رہتی تھیں۔ اب ساون کی جھڑی لگ جائے تو گھر میں بھرا اور کھڑا ہوا پانی جُھولا جُھلانے پر تُل جاتا ہے!

موسم بھی بڑا ظالم ہے، بارش کو آنے ہی نہیں دے رہا۔ بادلوں کو چاہیے کہ کھل کر برس جائیں ورنہ کچھ بے چارے بڑوں کی عید پھیکی پھیکی رہے گی! بارش نہیں ہوگی تو سیلاب کیسے آئے گا اور سیلابی ریلے نہ ہوئے تو ڈالر کے ریلے کہاں سے آئیں گے؟ سُنا ہے صدر کی زیر صدارت ایک اجلاس میں اعلیٰ افسران کو سخت سُست سُننا پڑی ہے۔ صدر اِس بات پر برہم تھے کہ سیلاب سے بچاؤ کے بند اور پُشتے 90 فیصد کی حد تک کیوں مکمل ہو پائے ہیں۔ بعض سادہ دِل پاکستانیوں کے خیال میں شاید متعلقہ افسران کو ڈانٹ اِس لیے سُننا پڑی ہو کہ بند اور پُشتے بن کیسے گئے! اگر کہیں پُشتے جاندار نکلے اور مضبوط بند ٹوٹنے سے انکار کردیں تو کیا ہوگا!

پھر دِل میں کیا رہے گا جو حسرت نکل گئی!

قدرت کی خوبی دیکھیے کہ اِس سال منافع خور تاجروں، موقع پرست سیاست دانوں اور غریبوں کے حق پر دانت گاڑنے والے سرکاری افسران میں سے ہر ایک کا سیزن بیک وقت وارد ہو رہا ہے۔ زہے نصیب، رمضان المبارک میں خرید و فروخت کے نام پر غریبوں کی جیب سے ایک ایک دمڑی نکالنے والے کمر کَس کر تیار بیٹھے ہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ رمضان کا چاند نظر آیا اور دوڑ شروع ہوئی! بارش کی بھی آمد آمد ہے۔ غریبوں کے لیے مسائل برسیں گے اور اُن کی بہبود کا سوچنے پر مامور سیاست دان اور حکام کے نصیب کا دَھن برسے گا! ایسے میں حالات کے

ستائے ہوئے لوگوں کے لیے بھی کبھی کبھی امداد کی تھوڑی بہت بوندا باندی کر دی جائے گی ! بے کس و لاچار پاکستانی بے چارے بارش اور سیلاب کے ساتھ ساتھ اِس تصور سے بھی پریشان ہیں کہ اُن کے نام پر کس کس طرح مال بٹورا جائے گا اور عالمی .برادری میں یار لوگ کشکول لئے گھومتے رہیں گے !

پائے گا کون کیا، یہ مقدّر کی بات ہے

یہ ہمارے نصیب کی بُلندی نہیں تو اور کیا ہے کہ ماہِ صیام ایک بار پھر ہماری زندگی کا حصہ بن گیا ہے! سال بھر ہم بھلے ہی "زمیں جُنبد، نہ جُنبد گل محمد" کی تصویر بنے رہیں، اِس ماہِ مبارک کی آمد کے ساتھ ہی ہماری زندگی میں بہت کچھ بدل، بلکہ پلٹ جاتا ہے۔ جو سال بھر اللہ کی یاد سے غافل رہتے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی بہانے اللہ کو یاد کر لیتے ہیں اور سجدے میں جاکر، تھوڑا بہت گڑگڑا رب کو ایک خاص حد تک منا ہی لیتے ہیں۔ اور رب کو منانا کون سا مُشکل کام ہے، وہ تو ٹلنے کے لیے ہر دم آمادہ رہتا ہے۔ اللہ کی رحمت تو بہانہ جُو ہے اور جُویائے رحمت جانتے ہیں کہ رحمتِ ربّانی سے کس طور بہرہ مند ہوا جاسکتا ہے۔

ماہِ صیام حدِ فاصل ہے .... نیکی و بدی کے درمیان، اللہ کی یاد سے غافل رہنے اور اللہ کو ہر دم یاد رکھ کر اُس کے غضب سے لرزاں و ترساں رہنے والوں کے درمیان، بُخل اور سخاوت کے درمیان۔ ماہِ صیام رحمت اور کرم کے دریا کے مانند ہے۔ دریا کا کام بہنا ہے۔ یہ تو اِس دریا کے کنارے بسنے والوں کو طے کرنا ہے کہ کسے سیراب ہونا ہے اور کسے تشنہ لبی ہی کو مُقدّر بنائے رکھنا ہے!

ماہِ مبارک لوگ میں اپنے اپنے مُقدّر کی کمائی کھاتے ہیں۔ جو جیسا چاہتا ہے ویسا ہے پاتا ہے کیونکہ اعمال اور اُن کے نتائج کا مدار نیتوں پر ہے۔ جس کی نیت میں کھوٹ نہیں ہوتی وہ اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور جن کی نیت میں فتور ہو اُن سے رمضان میں بھی ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں کہ اِن حرکات کو دیکھ کر لوگ عبرت پکڑتے اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں ! رمضان عبادت کے سَودے میں رحمت کا نفع کمانے کا مہینہ ہے مگر بہتوں کی بد بختی اِن ساعتوں میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی اور وہ عُقبیٰ کا خالص نفع چھوڑ کر دُنیا کا خام منافع کمانے پر کمربستہ رہتے ہیں ! اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ رمضان میں شیاطین کے مُقیّد کردیئے جانے سے شرم ناک سرگرمیوں کو نکیل پڑتی ہے تو اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ ماہِ مبارک میں اِنسان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ "از خود نوٹس" کے تحت ہوتا ہے اور وہی مکمل طور پر اِس کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے ! اِس اعتبار سے ماہِ صیام کے دوران اِنسان کو یہ آسانی تو میسر ہی رہتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی غلط کرتا ہے اُس کے ممکنہ منطقی نتائج سے بے خبر نہیں رہتا۔ کچھ بھی غلط کرتے وقت دل کو خوب اندازہ ہوتا ہے کہ خمیازہ کیا اور کِتنا بُھگتنا پڑے گا۔ مگر اے وائے ناکامی ! اِس پر بھی حضرتِ اِنسان سُدھرنے کا نام نہیں لیتے۔ ثابت ہوا کہ مُقیّد ہو جانے پر بھی شیاطین اپنے اثرات اِنسانی فِطرت پر برقرار رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں !

رمضان کی مسعود ساعتیں بھی کیسے کیسے مُقدر لیکر نازل ہوتی ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جنہیں وہی سال بھر والی روش راس رہتی ہے۔ چشم فلک ایسے بد بخت بھی دیکھتی ہے جو رمضان کے مُبارک لمحات میں دوسروں کو دھوکا دینے کے نام پر اپنے آپ کو فریب دینے سے باز نہیں آتے۔ اُن کے نزدیک دین کا مہینہ دُنیا کمانے کے سنہرے موقع سے بڑھ کر کچھ نہیں! یعنی اُن کی نظر میں رمضان محض ایک "سیزن" ہوتا ہے! ایسوں کی نظر میں زیادہ سے زیادہ مال وزر کا حصول ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اِس سے آگے اُن کی نظر دیکھتی ہی نہیں۔ اِنسان کو وہی کچھ دِکھائی دیتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اور مِلتا بھی وہی ہے جس کی تمنا کی جاتی ہے۔ رب کا معاملہ تو یہ ہے کہ جو کچھ بھی اِنسان چاہتا ہے وہی اُسے نوازتا ہے۔ دنیا مانگیے تو دنیا، دین مانگیے تو دین، علم مانگیے تو علم، دولت مانگیے تو دولت، توقیر مانگیے تو توقیر، ذلت مانگیے تو ذلت ہی ملے گی۔ اللہ نیت کے مطابق ہی تو دیتا ہے کہ عدل کا یہ بھی ایک تقاضا ہے۔ اگر کوئی اپنے اعمال کے نتائج کو بُرا سمجھتا ہے تو اعمال اور اُن کی بُنیاد بننے والی نیت یا عزائم کی نوعیت پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارا کرے!

اللہ کے خزینہ رحمت کا مُنہ کُھل گیا ہے۔ اب جسے دنیا اور عُقبیٰ کی نعمتیں اپنے دامن میں سمیٹنی ہیں، سمیٹ لے۔ رب سے قُربت اختیار کرنے کا یہی مہینہ

ہے۔ اپنی کوتاہیوں، جرائم اور گناہوں پر شرمسار ہونے اور استغفار کی یہی ساعتیں ہے۔ ہم جو کچھ سال بھر کرتے ہی رہتے ہیں وہ سب کچھ اِس ماہ میں نہ کریں یا کم کم کریں تو اچھا ہے۔ رمضان کی ساعتیں اللہ کے حضور سَر بسجود رہنے کے لیے ہیں تاکہ دُنیا کے جھمیلوں سے دُوری اور اللہ کی بارگاہ سے قُربت نصیب ہو۔

کھانا پینا تو سال بھر لگا رہتا ہے۔ رمضان نَفس کو مارنے اور جسم کو غذائی اعتبار سے متوازن رکھنے کا مہینہ ہے۔ دانش کا تقاضا یہ ہے کہ دن بھر بھوک پیاس کی تکلیف سہہ کر جسم میں پیدا کئے جانے والے توازن کو افطار کے وقت متنوع اشیاء غیر معمولی مقدار میں یا بے عجیب تناسب سے معدے میں اُتار کر زائل نہ کیا جائے۔ روزے کی حالت میں جسم کو جو فائدہ پہنچتا ہے اُسے ہم افطار کے وقت شدید بے اعتدالی سے ٹِھکانے لگا دیتے ہیں۔

رمضان المبارک کے تینوں عشرے استغفار کرنے اور اللہ کی رحمت سمیٹنے کے ہیں۔ گناہوں کی گٹھڑی کا وزن کم کرنے کا یہ نادر موقع ہم ایسی سرگرمیوں میں ضائع کر دیتے ہیں جن سے دامن بچانا کِسی نقصان کا باعث نہیں بن سکتا۔ جس عشرے میں ہمیں اللہ کے حضور سَر بسجود رہتے ہوئے مغفرت کا اہتمام کرنا چاہیے اُسی عشرے میں ہمیں عید شاپنگ کی پڑی رہتی ہے! شاپنگ بھی ضروری ہے کہ عید مسرت کے اظہار کا موقع بھی ہے مگر اِس سے کہیں بڑھ کر یہ تشکر کے اظہار کا موقع

ہے۔ ہمیں رمضان کو خصوصی پکوانوں سے لذت پانے اور عید کی تیاریوں کا ایونٹ بنانے کے بجائے اللہ کی عنایات اور کرم کا شکرادا کرنے کا موقع بنانے پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ رب کا مقصود بھی یہی ہے۔

رمضان کے تمام فیوض و برکات سے بہرہ مند ہونا ہمارے اختیار اور بس کی بات ہے۔ عبادات میں مشغول رہ کر ہم رمضان سے متعلق اپنا مُقدّر خود سنوار سکتے ہیں۔ کس کو کیا ملے گا یہ مُقدّر کی بات ہے مگر مُقدّر خود طے کرنا اور سنوارنا ہے۔ نیت دُنیوی منافع کی ہو تو تھوڑا سا زر ہمارا مقسوم ہوگا اور اُخروی نفع پانے کی خواہش دِل میں جاگ اُٹھے تو سمجھ لیجیے رب کے حضور سُرخ رُو ہونے کا سُنہرا موقع ہاتھ آگیا ہے۔

جائیں تو جائیں کہاں؟

ماہِ رمضان پھر ہماری زندگی کا حصہ بنا ہے۔ اب کے رمضان عجیب موڑ پر آیا ہے۔ قومی سیاست میں بہت کچھ ہے جو رمضان کے باعث تھم سا گیا ہے۔ قومی سطح پر ہماری عادت ہے کہ ہفتے کے کسی بھی دن پیدا ہونے والے مسئلے کا حل کیا جانا پیر تک موقوف رکھتے ہیں۔ یہی حال رمضان کا ہے۔ اگر رمضان سے ذرا پہلے کوئی بحران رونما ہو تو اُس کا حل عید کے بعد پر موخر کردیا جاتا ہے۔ سیاست میں اچھا خاصا اتار چڑھاؤ پیدا ہوچلا تھا۔ قوم ایک بار پھر خلجان میں مبتلا ہونے کے لیے نفسیاتی طور پر تیار بیٹھی کہ رحمتوں کا مہینہ وارد ہوا اور لوگوں کو پریشانی سے بچالیا!

مِرزا تفصیل بیگ رمضان کے دوران خاموش رہتے ہیں۔ بعض احباب یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ شاید اُنہیں ایک ماہ کے لیے قید کردیا جاتا ہے۔ اور دوسرے بہت سے احباب کے خیال میں تو اُنہیں سال بھر میں صرف ایک آدھ مہینے ہی کے لیے آزاد کیا جانا چاہیے!

کل ہم مِرزا سے ملنے اُن کے گھر گئے تو روزے تھے یعنی بھرے بیٹھے تھے۔ ایسی حالت میں لوگ اُن کے نزدیک جانے سے اجتناب برتتے ہیں۔ ہم نے سوچا ماہِ رحمت

ہے، شاید وہ اپنے آپ پر کچھ قابو پائیں اور سیاست پر گفتگو سے پرہیز کریں۔ مگر افسوس کہ اِس بات بھی ہمارے اندازے کے نصیب میں غلط ثابت ہونا لکھا تھا! سیاسی موضوعات مِرزا کے لیے گھر کی لونڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِن موضوعات سے وہ سُلوک بھی گھر کی لونڈی کا سا روا رکھتے ہیں! جس طرح گانے میں مہارت رکھنے والے ایک ہی سانس میں پانچویں سپتک تک پہنچ جاتے ہیں بالکل اُسی طرح مِرزا بھی جب سیاست پر گفتگو کا آغاز کرتے ہیں تو پلک جھپکتے ہیں کونسلر آفس سے ایوان صدر اور وزیر اعظم ہاؤس پہنچ کر دم لیتے ہیں!

رمضان کے دوران مہنگائی کا رونا رویئے تو مِرزا بدکنے لگتے ہیں۔ اُن کا شکوہ یہ ہے کہ لوگ اب تک پھلوں، سبزیوں، آٹے دال اور روزمرہ استعمال کی دیگر اشیاء کے مہنگے ہو جانے کا رونا رو رہے ہیں اور دوسری طرف قوم سستے میں بِکی جارہی ہے! ہم سمجھا سمجھا کر تھک گئے کہ قوم کہیں جا رہی ہے نہ ملک۔ یہ رونا ہی بیکار ہے۔ ہم تو بچپن سے یہ گیدڑ بھپکی سُنتے آئے ہیں کہ ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے! مگر بہ چشم خود دیکھ لیجیے کہ ملک جہاں تھا وہیں ہے۔ اور ہم بھی اپنی جگہ برقرار ہیں۔ مگر مِرزا کہاں ماننے والے ہیں۔

سیاست کے میدان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مِرزا کو خون کے آنسو رُلاتا رہتا

ہے تبھی تو وہ اِس قدر دُبلے پتلے ہیں کہ ہم جیسے اُنہیں دیکھ دیکھ کر کُڑھتے رہتے ہیں۔ مگر افسوس کہ صرف دِل گھلتا ہے، جسم نہیں گھلتا! فٹنس کے لیے ہم اپنا خُون تو جلاتے رہے۔ اگر خُون جلا جلا کر سُپر سلِم ہو بھی گئے تو بعد میں طرح طرح کے قومی مسائل پر جلانے کے لیے ہم خُون کہاں سے لائیں گے!

راجہ پرویز اشرف کے وزیر اعظم بننے سے مِرزا بہت خوش ہیں۔ جو لوگ راجہ صاحب کی وزارتِ عُظمٰی میں کیڑے نکالنے پر تُلے رہتے ہیں اُن سے مِرزا سخت نالاں ہیں۔ اُن کی نظر میں راجہ پرویز اشرف واحد حکومتی شخصیت ہیں جو بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کی (ناکام ہی سہی) ڈیڈ لائن دیتی ہے! کِسی اور میں اِتنی ہمت کہاں کہ ڈیڈ لائن دے اور پھر اُس کے ناکام ہو جانے پر جواز اور توضیح کا دریا بھی بہائے! کوئی تو ہے جو لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کی ڈیڈ لائن کا اعلان کرنے کی جرات کرسکتا ہے! اب ہم مِرزا کو کیا سمجھائیں کہ ممکنہ ناکام ڈیڈ لائن پیش کرنے کی ہمت اور جرات تو ہم میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے! ملک میں سیاسی استحکام کب تک پیدا ہوگا، یہ ڈیڈ لائن تو ہم کسی بھی وقت دے سکتے ہیں۔ اور اس اِس کا سبب یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہےاِس ڈیڈ لائن کو ناکام ہی ہونا ہے! مگر بھئی، مِرزا ہماری بات کا اعتبار کیوں کرنے لگے، ہم کہاں کے راجہ ہیں، کِس ہُنر میں یکتا ہیں!

رمضان کا تقدس برقرار رکھنے کے لیے لوگ اِس ماہِ مبارک میں مِرزا سے کسی بھی معاملے میں بحث و تمحیص سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں! بات مہنگائی کی ہو یا سیاست کی، مِرزا پلک جھپکتے میں ہتھے سے اُکھڑ جاتے ہیں اور پھر اُن پر قابو پانا اُتنا ہی دُشوار ہوتا ہے جتنا قومی کرکٹ ٹیم کی فیلڈنگ کو بہتر بنانا! مِرزا کو جب بھی موقع ملتا ہے، ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور جو کچھ بھی اُس طرف سے لُڑھکایا جا رہا ہوتا ہے وہ کانوں کے ذریعے سے دِماغ میں اُنڈیل لیتے ہیں! ذہن ہم اِس لیے نہیں کہہ رہے کہ ٹی وی پر پیش کی جانے والی انٹ شنٹ گفتگو سُنتے رہنے سے ذہن دوبارہ دِماغ ہی کی منزل پر پہنچ جاتا ہے! ٹی وی دیکھتے رہنے ہی سے مِرزا کی اب یہ حالت ہے کہ اُٹھتے بیٹھتے حکومت کو "خراج عقیدت" پیش کرتے رہتے ہیں۔ آپ سوچیں گے کہ خراج عقیدت تو اُنہیں پیش کیا جاتا ہے جن کا وجود مِٹ چکا ہو۔ مِرزا کی نظر میں حکومت بھی ایک مُردہ ہی ہے!

سبزیوں، پھلوں اور آٹے دال کا کمال ہے کہ لوگوں کے پاس حکومت کی کارکردگی پر براہِ راست تنقید کی گنجائش ہی نہیں نکل پا رہی۔ پیٹ بھرنا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اِس مسئلے کے حل کی کوششوں سے فرصت ملے تو حکومت کی کارکردگی جیسے "چھوٹے موٹے" معاملات پر توجہ دی جائے! مگر خیر، مِرزا کسی بھی موضوع

کو اپنا ہدف بنانے کے معاملے میں کسی بھی اُصول کے پابند نہیں۔ وہ جب بھی کسی موضوع کو پامال کرنے پر تُلتے ہیں تو اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اِس معاملے میں ذرا بھی مُروّت کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھتے! یہ سمجھ لیجیے کہ ایک دریا ہے جو بہنے لگتا ہے تو پھر رُکنے کا نام نہیں لیتا۔

کِسی بھی موضوع کو "شہید" کرنے یا اُس کی "واٹ" لگانے کے عمل میں مِرزا کی نظر سے کوئی بھی نکتہ بچ نہیں سکتا۔ بات بھنڈی اور ٹِنڈے کی ہو یا نیٹو رسد کی۔۔ جب مِرزا لب کُشا ہوتے ہیں تو اُن کی زبان سے نکلنے والے الفاظ ہر اُلجھے اور گھٹے ہوئے موضوع کے لیے "قبض کُشا" ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں مِرزا صرف سُننے ہی کی نہیں، دیکھنے کی بھی چیز ہوتے ہیں!

افطاری کی بڑھتی ہوئی مالیت مِرزا کے پسندیدہ موضوعات کی فہرست میں خاصی نمایاں ہے۔ وہ خود تو، اللہ معاف کرے، روزہ شاذ و نادر ہی رکھتے ہیں مگر روزہ داروں کے لیے افطاری کی بڑھتی ہوئی لاگت کے غم میں اِس قدر گھلتے ہیں کہ یقینی طور پر روزہ داروں کے حصے میں آنے والے ثواب کا ذرا سا جُز اُنہیں بھی ضرور ملتا ہوگا! ہم نے اُنہیں بارہا سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ چھوٹے موٹے موضوعات آپ کے شایان شان نہیں۔ رب نے آپ کو قومی مسائل کے لیے پیدا کیا ہے۔ یعنی یہ کہ ہر اُلٹا سیدھا موضوع اِس قابل نہیں کہ آپ اُس پر

توانائی ضائع کریں مگر وہ کب مانتے ہیں۔

رہی سہی کسر سحر و افطار کی رنگا رنگ ٹی وی نشریات نے پوری کردی ہے۔ سحر اور افطار کے دو گھنٹے مِرزا کے لیے ذہنی تسکین اور بعد میں اُن کے "سامعین" کے لیے بہترین سمع خراشی" کا موجب ثابت ہوتے ہیں! مِرزا اِن نشریات سے محظوظ ہونے کے بعد اپنے چاہنے والوں کے سامنے اُن نکات کی تشریح کا فریضہ انجام دیتے ہیں جو، اُن کے خیال میں، شاید لوگ سمجھ نہ پائے ہوں! بیشتر احباب اِس عمل کو "یک نہ شُد، دو شُد" قرار دیتے ہیں! سحر و افطار کی نشریات کے دلچسپ لمحات مِرزا کی زبانی سُننے اور پھر حکومت کے نام کا رونا رونے کا لطف ہی کچھ اور ہے! ٹی وی پروگرامز کی منصوبہ بندی کرنے والے اگر مِرزا سے مشورہ کرلیا کریں تو کئی ایسے اہم اور دلچسپ نکات کو اپنی نشریات کا حصہ بنا سکتے ہیں جو عوام کے لیے معلومات کے ساتھ ساتھ تفریحِ طبع کا بھی سامان کرتے ہوں!

حکومت کے لیے سکون کا سانس لینے کا محل ہے کہ ماہِ صیام نے وارد ہوکر لوگوں کو کنٹرول کرلیا ہے۔ جو کچھ سیاست کے نام پر ہو رہا ہے وہ ایسا ہے کہ لوگ بولتے بولتے پھٹ ہی پڑیں مگر روزے کی حالت میں اِنسان کو زبان پر قابو رکھنا پڑتا ہے! اور یہی ایک بات حکومت کے حق میں جاتی ہے! مِرزا بھی جانتے

ہیں کہ روزے کی حالت یا روزے کے اوقات میں حکومت کی کارکردگی پر نکتہ چینی سے
گریز کرنا چاہیے۔ اگر روزہ ہو تو زبان کے پھسلنے سے مکروہ ہو جاتا ہے اور اگر روزہ نہ
ہو تو لوگ سرزنش کرتے ہیں کہ ایک تو روزہ نہیں رکھتے اور اوپر سے جو منہ میں آئے
وہ بکتے ہو! ایسی حالت میں تنقید کے تیروں کا نشانہ بننے کے لیے سبزیاں اور پھل حاضر
ہیں۔ اِن سے جی اکتا جائے تو آٹے دال پر آ جایئے۔ اِسی حالت میں ماہِ صیام گزر جائے
گا۔ پھر حکومت ہو گی اور ہم ہوں گے!

چٹھی ذرا سیّاں جی کے "خلاف" لِکھ دے

اُردو ادب اور برصغیر کے کلچر میں خط بازی نے ہمیشہ "رولا پایا" ہے! شُعراء نے خط لکھنے اور بھیجنے سے متعلق ہر صورتِ حال سے بھرپور حِظ اُٹھایا ہے اور ہم سب کی دل بستگی کا خوب خوب سامان کیا ہے۔

اُردو شعراء کے دواوین کھنگالیے تو خط لکھنے کے نام پر نکتہ سنجی کے ریکارڈ قائم کئے گئے ہیں! خط کے پیرائے میں انسانی نفسیات کے گوناگوں خطوط کی نقاب کشائی فرمائی گئ ہے! آج بھی لوگ پڑھتے ہیں اور سَر دُھنتے ہیں۔

مرزا غالب بضد تھے کہ کسی جواز کے بغیر بھی خط لکھیں گے۔ اُنہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جب کوئی کسی پر عاشق ہو جاتا ہے تو پھر جواز و عدم جواز کا معاملہ بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے!

اور خیر گزری کہ غالب کے لکھے ہوئے خطوط کا مطلب لوگ سمجھ نہ پائے۔ نہ سمجھنے پر یہ حال ہے تو سمجھنے پر کیا ہوا ہوتا!

خط کا جواب آئے تو مصیبت، نہ آئے تو مصیبت۔ قاصد الگ پریشان۔ غالب نے خدا جانے خط میں کیا لکھ دیا تھا کہ نامہ بر غائب ہوگیا! اور پھر اُنہیں مکتوب الیہ سے کہنا پڑا۔

!تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
!میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

اور اگر خط غیر کے ہاتھ لگ جائے تو؟

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
!کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو بتائے نہ بنے

داغ دہلوی کو اِس بات کی فکر لاحق رہتی تھی کہ محبوب کے خط میں نیا سلام کس کا تھا! غلام علی نے خاصے مخصوص انداز سے گا کر شِعر اور داغ کے محبوب کو مزید مشکوک بنا دیا!

تمہارے خط میں نیا اِک سلام کس کا تھا
!نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

خط کے جواب کا اِنتظار بھی اردو شاعری میں خوب بیان ہوا ہے۔ اور اگر جواب آ جائے تو سمجھ لیجیے عید ہو گئی۔ مگر ہر جواب عید کا موجب نہیں بنتا تھا۔

مثلاً

خط کے پُرزے ہیں دستِ قاصد میں

!ایک کیا، سو جواب لایا ہے

اردو شاعری کے گل زاروں اور خار زاروں میں شروع ہونے والا خط کا سفر اب اسلام آباد کی منزل تک آ پہنچا ہے۔ ایک خط نے ایسا "رولا پایا" ہے کہ اب سیاسی استحکام کا !مدار خط کے لکھنے، نہ لکھنے پر ہے

پاکستانی فلم انڈسٹری کے سُنہرے دور میں ریلیز ہونے والی فلم "دوستی" میں شبنم نے نور جہاں کی زبانی اعجاز سے کہا تھا۔

!چٹھی ذرا سیاں جی کے نام لکھ دے

سر دست یہی کیفیت ہماری عدلیہ اور حکومت کے درمیان بھی پائی جا رہی ہے۔ سوئس حکومت کو خط لکھنے کی عدالتی فرمائش پوری نہ کرنے پر یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم کے منصب سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور اب لگتا ہے راجہ پرویز اشرف کی باری ہے۔ کبھی کبھی کوئی خط غلط ہاتھوں میں پہنچ جائے تو قیامت ڈھانے لگتا ہے۔ اور یہاں حالت یہ ہے کہ !ایک خط ہے کہ جو لکھے جانے سے پہلے ہی گُل کِھلانے پر تُلا ہوا ہے

مرزا تنقید بیگ آج کل ہندی چینلز بہت دیکھتے ہیں اِس لیے اُن کی گفتگو میں ہندی بھاشا اور ہندی چینلز کا انداز گفتگو بس گیا ہے۔ ہم نے عدالت کے حکم اور سوئس حکومت کے نام خط کا ذکر کیا تو مرزا بولے "میں بھی اِس خط کو لیکر بہت پریشان ہوں۔" ہم حیران رہ گئے کہ جو خط ابھی وزیر اعظم نے لکھا ہی نہیں وہ مرزا تک کیسے پہنچ گیا! ہم نے پوچھا کہ وہ خط آپ تک کیسے پہنچا تو وضاحت کی مد میں فرمایا "ارے یار! ہندی میں اِسی طرح بولتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ خط کی وجہ سے میں بھی بہت پریشان ہوں۔"

اِس ایک خط نے قومی سیاست کا خط بنا ڈالا ہے! جس طرح کلاسیکل گانے والے گھوم پھر کر "نا دِر دِھنا" پر آ جاتے ہیں بالکل اُسی طرح ہماری سیاست میں بھی بات کہیں سے چلے، خط پر پہنچ کر دم لیتی ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وزیر اعظم کو اب کیا کرنا چاہیے۔ ہمارا محتاط اندازہ ہے کہ راجہ پرویز اشرف خط لکھیں گے یا نہیں، اِس پر اب تک کروڑوں روپے کا سٹّہ لگ چکا ہوگا! اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اندازے کو محض کروڑ کی منزل میں پھنسا ہوا دیکھ کر کوئی ہماری ذہنی پس ماندگی کا ماتم کرے! ویسے خود راجہ پرویز اشرف کے لیے یہ معاملہ نرا جُواء ہے! یہ تو سَر مُنڈاتے ہی اولے پڑے والا معاملہ ہے۔ ابھی تو اُنہوں نے ڈھنگ سے وزیر اعظم ہاؤس کے ایک ایک گوشے کو دیکھا بھی نہیں ہے، در و دیوار کو دِل کی بات بتائی بھی نہیں ہے اور قانون کے

تقاضے اُن سے کھلواڑ پر تُل گئے ہیں!

ہمارے ہاں اگر نوجوان خط لکھ بیٹھیں تو قابل گردن زدنی ٹھہرتے ہیں! ذرا سا خط پورے گھرانے، بلکہ خاندان کی رُسوائی کا سبب بن جایا کرتا ہے! اور دوسری طرف عدلیہ کی فرمائش ہے کہ سوئس حکومت کو خط لکھا جائے۔ کم از کم اِتنا تو دیکھنا ہی چاہیے کہ یوسف رضا گیلانی کی طرح راجہ پرویز اشرف کی بھی اب خط لکھنے کی عمر نہیں رہی! اور اگر کہیں اُنہوں نے خط لکھا اور غلط ہاتھوں میں پہنچ گیا تو؟ عام طور پر خط کو ملاقات کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے مگر یہ کیسا خط ہے جس کے لکھنے یا نہ لکھنے پر (ہر دو صورتوں میں) برطرفی سے ملاقات طے ہے؟

باخبر ذرائع کہتے ہیں کہ خط کی چوکھٹ پر قربان کرنے کے لیے صدر زرداری نے بکرے تیار کر رکھے ہیں۔ عدلیہ اپنی وضع بدلنے کو تیار نہیں تو صدر زرداری بھی اپنی خُو سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں۔ قوم عید الفطر کی تیاریاں کر رہی ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ مقتدر قوتیں حکومت کے لیے عید الاضحیٰ کا اہتمام کرنے پر کمربستہ ہیں!

راجہ پرویز اشرف کیا نہیں جانتے ہوں گے کہ اُن کی چند روزہ وزارتِ عُظمیٰ

کا انجام کیا ہوگا؟ مگر خیر، اِس قیمت پر بھی ملے تو وزارتِ عُظمٰی کیا بُری ہے؟ غالب نے کہا ہے نا کہ

!مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

راجہ پرویز اشرف بھی سوچتے تو ہوں گے کہ اگر چٹّھی سیّاں کے نام لکھنے کی فرمائش ہوتی تو وہ کب کی پوری کر دیتے۔ مسئلہ یہ ہے کہ چٹّھی سیّاں جی کے خلاف لکھنے کو کہا جا رہا ہے! اور اگر کوئی ایویں ای ٹائپ کے سیّاں جی ہوتے تو کوئی بات بھی تھی۔ سیّاں وکھری ٹائپ کا ہو تو سجنی کو بغاوت سے پہلے دس بار سوچنا پڑتا ہے! اور پھر وزیر اعظم کا منصب! اِتنے بڑے منصب پر بیٹھنے والے سے "طوطا چشمی" اور "نمک حرامی" کی اُمید رکھنا؟ یار لوگ قانون کی بالادستی نہ ماننے کا الزام سہہ سکتے ہیں، پارٹی سے نمک حرامی کا طوق اپنے گلے میں لٹکانا پسند نہیں کریں گے! اُصولوں کی سودے بازی تو ہو سکتی ہے، اُصولوں پر سودے بازی نہیں کی جا سکتی!

الیکٹرو وائرل انفیکشن

مرزا تنقید بیگ کی حیرانی تھی کہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بھارت میں عالمی تاریخ کے بدترین بریک ڈاؤن کی خبریں پڑھ پڑھ کر اُن کی ہنسی تھی کہ بے قابو ہوئی جارہی تھی۔ ہم نے ٹوکا کہ "دشمن مرے تے خوشی نا منایئے" کیونکہ مصیبت کسی پر بھی یعنی اپنوں پر بھی آ سکتی ہے۔ کہنے لگے "اب اپنوں پر کوئی نئی مصیبت آئی بھی تو کیا بگاڑ لے گی؟ ہم تو عادی ہو چکے ہیں!"

بھارت کی 20 سے زائد ریاستوں میں بریک ڈاؤن پر مرزا کو زیادہ حیرت اس بات سے نہیں ہوئی کہ 70 کروڑ افراد بجلی سے محروم رہے۔ اُنہیں زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ بھارت کی متعدد ریاستیں (صوبائی) حکومتیں ایک دوسرے پر الزام دھرتی رہیں۔ یہ جان کر اُنہیں اطمینان ہوا کہ اب بھارتی سیاست دانوں نے بھی پاکستانی طور طریقے اپنالیے ہیں یعنی جو کچھ بھی کرو اُس کا نتیجہ سامنے آنے پر الزام مخالفین پر دھرو!

ہم نے مرزا سے پوچھا کہ علاقائی سپر پاور بننے کے بھارتی دعووں کی تو قلعی کھل گئی! وہ تنک کر بولے "رہنے دو بھائی۔ تم اِسی میں خوش رہنا۔ بھارت کوئی

ایسا کمزور ملک نہیں کہ ایک بریک ڈاؤن میں سب کچھ ختم ہو جائے۔ اُس میں بہت دم خم ہے۔ وہ عالمی سطح پر اپنی بات منوانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

ہم نے پوچھا کیا بجلی کا جانا بھی متعدی مرض ہے؟ مرزا بولے "لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔ پاکستان میں بریک ڈاؤن عام بات ہے۔ یہ بیماری اُڑ کر بھارت کو بھی لگی ہے۔ اِسے ہم 'الیکٹرو وائرل انفیکشن' قرار دے سکتے ہیں!"

مرزا کی بات میں دم ہے۔ پاکستان کے بہت سے سیاسی امراض بھارت کو لگے ہیں اور بھارت سے بہت سی اخلاقی بیماریاں خاصے اہتمام کے ساتھ پاکستان میں آ دھمکی ہیں۔ بھارتی ڈرامے دیکھ دیکھ کر پاکستان کی نئی نسل کا جو حال ہوا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ ہم جس قدر بچنے کی کوشش کر رہے ہیں، اخلاقی انحطاط کی دلدل میں اُسی قدر دھنستے جا رہے ہیں۔

مرزا کہنے لگے "بھارت کی 20 سے زائد ریاستوں میں بجلی کا غائب ہو جانا کچھ ایسا حیرت انگیز تھا کہ بھارتی سیاست دانوں کے تو ہوش اُڑ گئے۔ بجلی نے غائب ہو کر اُن کے دماغوں کو ایسے جھٹکے لگائے کہ وہ اپنی 'روایات' بھی بھول گئے!"

ہم نے وضاحت چاہی تو مرزا نے فرمایا "بھارت کی ایک قدیم اور پختہ روایت یہ ہے کہ جب بھی کوئی ایسی ویسی بات ہوتی ہے تو الزامات کی تان پاکستان کے خفیہ اداروں سے شروع ہو کر اُنہی پر ٹوٹتی ہے۔ اِس بریک ڈاؤن نے بھارتی سیاست دانوں اور میڈیا کا ایسا نروس بریک ڈاؤن کیا کہ اُنہیں یاد ہی نہ رہا کہ بجلی کے غائب ہو جانے اور سسٹم کے ناکام ہونے کے لیے آئی ایس آئی کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے! "

مرزا نے درست نشاندہی کی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بھارتی قیادت اِس معاملے میں بھی پاکستان کی نقالی کر رہی ہے۔ ہمارے ہاں مفاہمت کی سیاست نے زور پکڑا ہے تو شاید اِس کا وائرس بھارت بھی پہنچ گیا ہے اور اب بھارتی سیاست دان پاکستان پر الزام تراشی سے گریز کرنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ ایسا ہوا تو بہت کچھ درست ہو جائے گا اور اِس کے نتیجے میں بہت کچھ ٹیڑھا بھی ہو جائے گا!

مرزا نے بریک ڈاؤن کے لیے آئی ایس آئی پر الزام تراشی سے گریز کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا "ایسا لگتا ہے کہ بھارتی سیاست دانوں اور میڈیا کی نظر میں آئی ایس آئی کی سوفٹ امیج پیدا ہو گئی ہے۔"

ہم نے حیرت سے پوچھا کہ بھارت میں آئی ایس آئی کی سوفٹ امیج کیسے پیدا ہو سکتی ہے ؟

مرزا نے وضاحت کی مد میں فرمایا "وینا ملک نے اپنے بازو پر آئی ایس آئی گدوا کر ہمارے خفیہ اداروں کی سوفٹ امیج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ! اگر وینا ایسا نہ کرتی تو بریک ڈاؤن نہ ہوا ہوتا اور وہ بریک ڈاؤن سے بھارتی سیاست دانوں اور میڈیا کا نروس. اِس اہم ترین معاملے میں پاکستان کی انٹیلی جنس کمیونٹی کو ہرگز نہ بھولتے !"

ہم آئی ایس آئی کی سوفٹ امیج کے حوالے سے مرزا کی منطق سے متفق نہیں مگر ہاں، بجلی کے بحران کے متعدی ہونے کا ہمیں بھی یقین ہے۔ اب بھارت کو پتہ چلے گا کہ الیکٹرو وائرل انفیکشن کیا ہوتا ہے !

کہیں اور ہے ایسی حکومت؟

جن کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے وہ حالات دیکھ کر اور اُن کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان رہتے ہیں۔ اُن کی پریشانی اور خدشات ایسے نہیں کہ سمجھ میں نہ آسکیں۔ اگر حالات خراب ہوں اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو تو جائے گا اُنہی کے پاس سے جن کے پاس کچھ ہوگا۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ جن کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں وہ حالات کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں اور اُس سے بھی کہیں زیادہ پریشان رہتے ہیں! پاکستانی عجیب قوم ہیں۔ جن معاملات میں پریشان ہونا چاہیے ان کا جشن مناتے ہیں اور جن باتوں کو ہنسی میں اُڑا دینا چاہیے اُن کے بارے میں سوچ سوچ کر جان ہلکان کرتے رہتے ہیں۔ 65 سال سے چشم فلک نے یہ تماشا دیکھا ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ مہنگا ہی ہوتا جاتا ہے، کسی صورت نرخ نیچے آنے کا نام نہیں لیتے۔ اب تک تو اِس کیفیت کا عادی ہو جانا چاہیے تھا مگر قوم ہے کہ مہنگائی سے نالاں اور پریشان رہتی ہے۔ بھیڑ بکری بھی چُھروں اور بُغدوں کے عادی ہو چکے ہیں اور ہنستے ہنستے ذبح ہو جاتے ہیں مگر ہم ہیں کہ اب بھی مہنگائی کے بُغدا دیکھ کر چیخنے چلّانے لگتے ہیں! پتہ نہیں یہ بچپنا کب جائے گا!

لوگ کہتے ہیں کہ حکومت نے ساڑھے چار سال میں کیا ہی کیا ہے؟ حکومت پر تنقید

کرتے کرتے اب لوگ اُس کے نمایاں کارناموں کی تلاش میں جُت گئے ہیں۔ بہتوں کے نزدیک یہ بُھوسے کے ڈھیر میں سُوئی تلاش کرنے جیسا ہے! یہ تو حکومت کو underestimate کرنے والی بات ہوئی! اِس بات پر کوئی غور نہیں کرتا کہ اِس حکومت نے ساڑھے چار سال گزار لیے! یہ کیا کِسی کارنامے سے کم ہے؟

یہ الگ بات مُیسّر اب گویا نہ ہوا

!دِل میں وہ دُھوم کہ سُنتے ہیں زمانے والے

جب بھی کوئی حکومت تشکیل پاتی ہے، لوگ توقعات کا سُوئیٹر بُننا شروع کر دیتے ہیں۔ نئی نویلی حکومت سے طرح طرح کی توقعات وابستہ کرنے کے فوراً بعد بہترین اقدامات اور اُن کے اِنتہائی خوش گوار نتائج کا انتظار کیا جانے لگتا ہے۔ یہ تو سراسر ظلم ہے۔ بے چاری نئی حکومت نے ابھی ڈھنگ سے سُکون کا سانس بھی نہیں لیا ہوتا کہ اُس پر تنقید کے ڈونگرے برسائے جانے لگتے ہیں۔ ایک "ذرا سی" یعنی یہی کوئی دو چار ارب روپے کی کرپشن سامنے آ جائے تو مخالفین اور میڈیا والے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں! معمولی سی کرپشن بھی اب ہمیں اِس لیے بڑی دِکھائی دینے لگی ہے کہ روپیہ دِن رات بے وقعت ہوتا جارہا ہے! بے وقعت روپے کے مقابل اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لیے حکمرانوں کو زیادہ کرپشن کرنی پڑتی ہے! اب کیا کوئی "دے مار ساڑھے چار" والی محنت کے ذریعے چلنے والی حکمرانی کا فائدہ بھی نہ اُٹھائے؟ عوام کو

سوچنا چاہیے کہ حکومت جو کچھ بھی کرتی ہے وہ بھلائی ہی کے لیے ہوتا ہے۔ بقول نواب اسلم رئیسانی بھلائی بھلائی ہوتی ہے، چاہے آپ کے لیے ہو یا آپ کے خلاف ہو!

لوگ کہتے ہیں کہ حکومت نے کیا دیا؟ حکومت کا کوئی تحفہ غلام احمد بلور سے بڑھ کر ہوسکتا ہے! ساڑھے چار سال کے دوران غلام احمد بلور کے ہاتھوں ریلوے کے محکمے نے جو "شاندار ترقی" کی ہے اُس پر تنقید کرنے والے اب تک نچلے نہیں بیٹھ رہے۔ کبھی کسی نے اِس بات پر غور کیا ہے کہ غلام احمد بلور کی شکل میں ہمارے پاس ایٹم بم سے بھی بڑا ہتھیار موجود ہے! کسی بھی دُشمن ملک سے نمٹنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اُس ملک کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹ کر غلام احمد بلور کے قدموں میں ڈال دیا جائے! پھر دیکھیے کہ لوگ پوچھا کریں گے کیسا ملک اور کون سا ملک!!

یہ بھی حکومت کا کارنامہ ہے کہ جس سیاست دان کی دی ہوئی ڈیڈ لائنز نے بجلی کے بحران کو مزید تقویت بخشی اُسے وزیر اعظم کے منصب پر فائز کردیا گیا! یعنی حکومت نے یہ اُصول متعارف کرایا ہے کہ جو کچھ نہ کرپائے اُسے سب کچھ بنادو! اگر کسی اور حکومت کو ایسا اُصول متعارف کرانے کی توفیق نصیب ہوئی ہو تو بتائیے!

اِسی حکومت نے ہمیں نواب اسلم رئیسانی جیسی شخصیت سے متعارف کرایا جنھوں نے "ڈگری ڈگری ہوتی ہے چاہے اصلی ہو چاہے نقلی" کہہ کر تمام آنے والے زمانوں کے لیے سدا بہار فارمولا دیا۔ اب اصلی اور نقلی کا جھگڑا مِٹ چکا ہے یعنی بے فکر ہو کر ایک ہی جملے میں بحث سمیٹ لیجیے! "رئیسانی فارمولا" زندگی کے ہر معاملے کو اپنی باہوں میں ایسے بھینچ لیتا ہے کہ پھر اُس میں ٹھیک سے سانس لینے کی بھی تاب نہیں رہتی! سپریم کورٹ نے راجہ پرویز اشرف کو بھی طلب کرلیا ہے۔ یعنی حکومت بچانے کے لیے ایک اور ذبیحے کی تیاری کی جارہی ہے! ایسی حکومت آپ کو اور کہاں ملے گی جو اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے عوام کے ساتھ ساتھ وزیر اعظم کی بھی قربانی دیتی ہو! اگر کہیں ہے تو ہمیں بھی دِکھایئے۔

وہی عید شاپنگ کا ٹنٹا

بعض ایونٹ خواہ دِل کش اور دِل رُبا دِکھائی دیتے ہوں، تاثیر اُن کی خاصی رنج بخش ہوتی ہے۔ سیانوں نے سچ ہی کہا ہے کہ ہر چمکیلی چیز سونا نہیں ہوتی۔ ہر سال رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی عید کی تیاریاں آسیب بن کر ہمارے حواس پر سوار ہو جاتی ہیں۔ عید شاپنگ بھی ایک ایسا ہی معاملہ ہے جو نزدیک اور دونوں سے یکساں دِل کش اور دلچسپ دکھائی دیتا ہے مگر جو اِس مرحلے سے گزرتا ہے کچھ وہی جانتا ہے کہ .... کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک!

عید الفطر کی آمد میں ابھی وقت ہے مگر اِس سے قبل ہی عید الاضحیٰ کا سماں پیدا ہوچلا ہے۔ تنخواہیں دھڑا دھڑ ذبح ہو رہی ہیں، بلکہ بعض صورتوں میں تو اُن کا جھٹکا کیا جارہا ہے! لوگ جب اہل خانہ کے ساتھ عید شاپنگ کے لیے گھر سے نکلتے ہیں تو آنے والے مہینے کے لیے گھریلو خریداری پر فاتحہ پڑھ لیتے ہیں! وہ جانتے ہیں کہ جب کوئی ذبح ہونے کو تیار ہو تو چُھری کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا! لوگ عید شاپنگ کے لیے کچھ اِس اہتمام کے ساتھ بازاروں کا رُخ کرتے ہیں گویا

آج واں تیغ و تبر باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
!عُذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا
گھر والوں کو عید کی بھرپور شاپنگ کرانے کے بعد جب لوگ گھر واپس آتے ہیں تو اُن حالت دیکھ کر خیال آتا ہے
!میں خود مرنے پہ راضی تھا، قضا کے ہاتھ کیا آیا
آج کل شہر میں جس طرف نظر دوڑایئے، عید کی تیاریوں کے بھاگ دوڑ دکھائی دیتی ہے۔ ایسے میں یوم آزادی کی آمد نے بھی جشن منانے کا معاملہ دو آتشہ کردیا ہے۔
بعض غریبوں کا حال تو کچھ ایسا ہے کہ جشن آزادی کے لیے خریدے ہوئے پرچم ہی سے عید کا جوڑا تیار کرنے کا سوچ رہے ہوں گے ! اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عید پر اُن کے !ہاتھ میں پرچم کا ڈنڈا ہی رہ جائے
مہنگائی کا عالم تو یہ ہے کہ کل کلاں کو لوگ عید کی آمد پر مسرت کے اہتمام کا سوچنے سے بھی خوف کھائیں گے ! جس طرف دیکھیے اور جہاں بھی جایئے، خون پسینہ بہا کر کمائے جانے والے چند روپے غریبوں کے ہاتھ سے یوں نکلتے پھسلتے دکھائی دیتے ہیں جیسے مقناطیس کے دو مخالف سِرے ایک دوسرے سے نہ ملنے پر تُلے رہتے ہیں ! جن کی آمدنی محدود ہو اُنہیں عید کی خریداری کرتے ہوئے

دیکھنا بجائے خود دلچسپ تماشے سے کم نہیں! بازار جائیے تو ہر طرف سامان کم اور تماشے زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ بھیڑ کا یہ عالم ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر گزر نہیں سکتے۔ مگر جب شاندار بھیڑ دیکھتے ہوئے دکانداروں کو بھرپور سیل کی مبارک باد دیجیے تو وہ شکوہ کرتے ہیں کہ لوگ بازاروں میں خریداری کم اور تفریح زیادہ کرتے ہیں! دکاندار یہ بھی کہتے ہیں کہ چھوٹے علاقوں میں تو یہ حال ہے کہ کسی لڑکی کو دھاگے کی ایک ریل یا ڈریس مٹیریلز کا کوئی اور آئٹم خریدنا ہو تو دو تین لڑکیوں کو لیکر بازار جاتی ہے! یعنی دکانداروں کے ہاتھ تو کچھ خاص نہیں آتا، بس یہ ہے کہ "اہل نظر" کے لیے تھوڑا بہت رونق میلہ لگا ہوا ہے! یہ وہی کیفیت ہے جو قربانی کا جانور جانور خریدنے کے موقع پر دکھائی دیتی ہے۔ یعنی جانور خریدنے والا ایک ہوتا ہے اور اُس کی معاونت کے لیے گاڑی میں پندرہ افراد سوار ہوتے ہیں!

حالات اور اُن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مہنگائی نے کچھ ایسی عجیب کیفیت پیدا کردی ہے کہ اب لوگ ہر چیز میں تفریح کا پہلو تلاش کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ پریشانیاں سیلابی ریلے کی طرح اُمڈی چلی آتی ہیں اور اُن سے نمٹنے کی عجیب و غریب حکمتِ عملی دلچسپ تماشوں کو جنم دیتی ہے! عید بھرپور انداز سے منانے کی سکت جن میں برائے نام رہی ہو وہ جب جشن طرب کا اہتمام کرنے نکلتے ہیں تو کیفیت کچھ یہ ہوتی ہے کہ

زندگی! تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے جگہ

پاؤں پھیلاؤں تو دیوار سے سَر لگتا ہے!

لطیفہ یہ ہے کہ لوگ زندہ رہنے کے لیے درکار وسائل کو بھی عید شاپنگ کی بَھٹّی میں جھونک دیتے ہیں۔ اور اِس کے بعد اُن پر کیا گزرتی ہے یہ ہم آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کیونکہ ہم پر تو یہی کچھ گزرتی رہی ہے! ایسے میں دانش مندی تو یہ ہے کہ اہل خانہ کو عید شاپنگ کے وعدے پہ ٹرخاتے ٹرخاتے رمضان کے پہلے دو عشرے گزار لیجیے اور تیسرا عشرہ اعتکاف میں گزار دیجیے!

جمہوریت کی قربان گاہ

کشیدگی ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ محاذ آرائی کا پارہ چڑھتا جا رہا ہے۔
اداروں اپنا اپنا وقار بچانے کے نام پر آپس میں ٹکرانے سے بھی گریز نہیں کر رہے۔
عدلیہ اپنی بات منوانے پر تُلی ہوئی ہے۔ اور حکومت بھی پسپائی کو تیار نہیں۔ بقول غالب

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں!

قوم حیران ہے کہ یہ تماشا بلا ٹکٹ کب تک دیکھے۔ ساڑھے چار سال سے حکومت کی تمام جدوجہد کسی نہ کسی طرح "جمہوریت" کو بچانے سے وابستہ رہی ہے۔ جس حکومت سے ہمیں توقع تھی کہ قوم کو تحفظ فراہم کرے گی وہ اپنا وجود بچانے میں کھپ گئی!

ایک خط ہے کہ لکھا نہیں جا رہا اور جب تک وہ لکھا نہیں جائے گا، بحران ختم ہوگا نہیں۔ عدلیہ کا واضح فرمان ہے کہ وزیراعظم کو صدر کے خلاف کرپشن کی تفتیش دوبارہ شروع کروانے کے لیے سوئس حکومت کو خط لکھنا ہے۔ ایک وزیراعظم نے انکار کرکے پارٹی میں "شہید" کا درجہ پالیا! ہماری سیاست نے شہادت کا مرتبہ پانا کتنا آسان کر دیا ہے!

پیپلز پارٹی خوش نصیب ہے کہ اُس کی صفوں میں اب بھی ایسے وفادار ہیں جو پارٹی کی حرمت" پر اور پارٹی لیڈر کے چرنوں میں وزارتِ عظمٰی بھی قربان کر سکتے ہیں! ہم" تو یہ سوچتے ہیں اور دِل مسوس کر رہ جاتے ہیں کہ اِس پیارے وطن کو ایسے وفادار کب ملیں گے! جو لوگ وطن سے محبت کے دعوے کرتے ہیں وہ ذرا جیالوں سے سیکھیں کہ !وفا کیا ہوتی ہے اور تعلق کیسے نبھایا جاتا ہے

عدلیہ اور حکومت کے درمیان محاذ آرائی نے دونوں کے لیے رمضان کی مبارک ساعتیں بھی کشیدہ کردی ہیں۔ قوم عید کی تیاری کر رہی ہے اور دوسری طرف ادارے تصادم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ لوگ حیران ہیں کہ عید کے فوراً بعد کیا ہوگا۔ ہونا کیا ہے، ایک اور وزیر اعظم "جمہوریت" کی چوکھٹ پر قربان ہو جائے گا۔ یعنی

!پُلاوٗ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا

اہل وطن اب تک سمجھ نہیں پائے ہیں اُنہیں ساڑھے چار سال میں جمہوریت نے ایسا کیا دے دیا ہے جسے بچانے کے لیے حکومت وزیر اعظم کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کر رہی! عدلیہ چاہتی ہے کہ اُس کی بات مان لی جائے، سوئس

حکومت کو خط لکھ دیا جائے اور صدر کے خلاف کرپشن کے کیسز کی سماعت دوبارہ شروع کردی جائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اِس سے کیا ہوگا؟ کیا مہنگائی کا جن دوبارہ بوتل میں بند ہو جائے گا؟ جن کی جیب سے ساڑھے سال کے دوران خون پسینے کی کمائی نکالی گئی ہے اُنہیں کچھ ریفنڈ مل پائے گا؟ پرائم ٹائم میں ٹی وی اسکرین پر سیاسی بحث کے دوران تھوک اُڑانے والوں کے پاس بھی اِن سوالوں کے جواب نہیں۔ اور ہوں بھی کیسے؟ عوام کو ریلیف دینا اُن کی ترجیحات میں شامل ہی نہیں۔ اگر بھولے بھٹکے بہبودِ عامہ کے چند ایک اقدامات ہو جائیں تو بے چارے اربابِ اختیار کو اِس خطا پر معاف کردینا بھی غیر سیاسی نیکی ہے!

اگر ایک اور وزیر اعظم بھی نام نہاد جمہوریت کی چوکھٹ پر قربان ہوگیا تو کیا ہوگا؟ معزول وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کہتے ہیں کہ یہ عمل ملک توڑنے کے مترادف ہوگا۔ قیاس آرائی کا بازار گرم ہے۔ صدر زرداری بھی کیا نصیب لائے ہیں کہ ایک اُنہیں بچانے کے لیے سیاسی بکرے ذبح ہوئے جارہے ہیں اور دوسری طرف مفادِ عامہ کا جھٹکا جاری ہے۔ قوم منتظر اور متفکر ہے کہ عید کے بعد کیا ہوگا۔ عدلیہ کے وقار کو بلند رکھنے اور صدر کو سلامت رکھنے کا فریضہ ایک ساتھ انجام دیا جائے گا۔ یعنی ہمیں راجہ پرویز اشرف کے ستارے بھی گردش ہی میں دِکھائی دے رہے ہیں۔ لوگ سوچ رہے تھے کہ گیلانی کے بعد کسے وزیر

اعظم بنایا جائے گا۔ راجہ پرویز اشرف اِس مسند پر براجمان ہوئے تو بہتوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ مگر خیر، پیپلز پارٹی اِن چھوٹی چھوٹی باتوں کی چنداں پروا نہیں کرتی۔ راجہ پرویز اشرف کے بعد وزیر اعظم کون ہوگا، یہ دیکھنا بجائے خود دلچسپ تماشے سے کم نہیں۔ پاکستانیوں کو بھی پتہ نہیں کیا کیا دیکھنا ہے! وزیر اعظم ہاؤس کا تو یہ حال ہے کہ

کل چمن تھا، آج اِک صحرا ہوا

!دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا

اِس صحرا کو ابھی کتنے سراب دیکھنے ہیں یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ رہ گئے ہم تو ہمارا مقدور ہی کیا؟ ہمیں تو خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنا ہے اور ہر سیاسی تماشے کے خاتمے پر تالیاں !پیٹنی ہیں

(مہدی حسن : فن اور زندگی (پہلا حصہ

میر تقی میر نے کیا خوب کہا ہے

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے اِنسان نکلتے ہیں !

یہ مصرع ہر اُس اِنسان پر صادق آتا ہے جو کچھ بن کر دِکھاتا ہے۔ کچھ بننے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ صلاحیتوں کا پایا جانا کافی نہیں۔ محنت اور ذہانت دونوں کا حسین سنگم بھرپور کامیابی کی بُنیادی شرط ہے۔ موقع شناسی اور معاملہ فہمی اضافی مگر اہم خصوصیات ہیں۔

شہنشاہِ غزل مہدی حسن کی زندگی کا جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ گُہر ہونے تک قطرے پہ کیا کیا گزرتی ہے ! مہدی حسن ایک عہد کی داستان ہے۔ یہ عہد شبانہ روز محنت اور جاں فِشانی سے عبارت ہے۔

مادام نُورجہاں 1947 میں غیر منقسم ہندوستان کی کامیاب ترین سنگر ایکٹریس تھیں۔ وہ فلموں میں اداکاری اور گلوکاری دونوں شعبوں میں نام کما چکی تھیں۔ 14 اگست 1947 کے بعد جب نُورجہاں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو بمبئ

کی فلم انڈسٹری میں بہتوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بمبئی کی شاندار اور پنپتی ہوئی فلم انڈسٹری کو چھوڑ کر لاہور کی برائے نام فلمی صنعت میں قدم رکھنے کا سوچ بھی سکتی ہیں ! بھرپور کیریئر چھوڑ کر پاکستان جانا خود کشی کے مترادف تھا۔ مگر نُور جہاں نے زہر کا پیالہ پیا ! نئے ملک میں موسیقی اور فلمی صنعت کو سہارا دینے کے لیے وہ پاکستان آئیں اور 7 سال کے طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد اپنا کیریئر دوبارہ شروع کیا۔

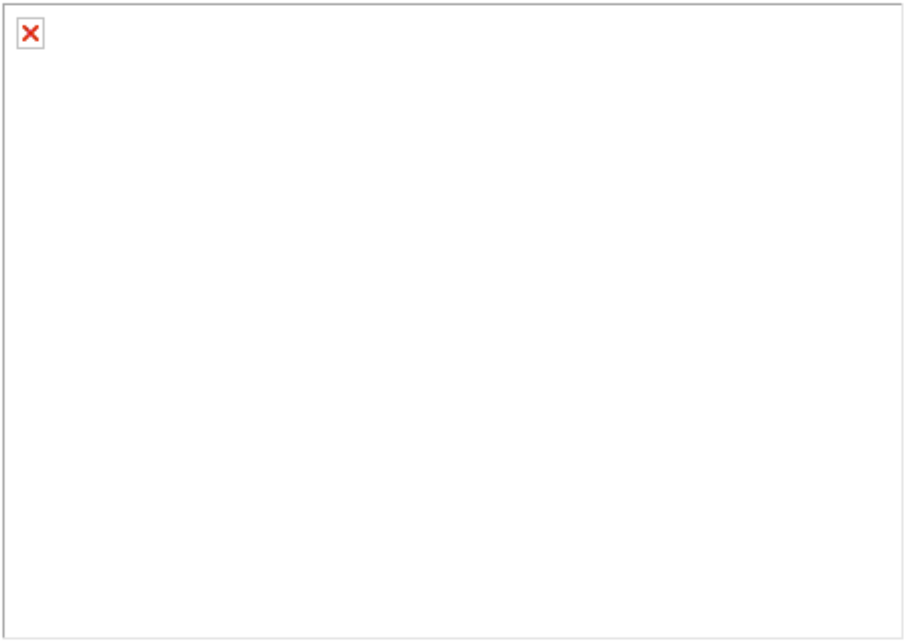

ذرا سوچیے کہ 1947 سے 1954 تک نُور جہاں نے بمبئی کی فلم انڈسٹری میں مزید کتنی کامیابی حاصل کی ہوتی، اُن کے کریڈٹ پر مزید کتنی فلمیں ہوتی، مزید

کتنے شاندار نغمات ریکارڈ کرائے ہوتے اور مزید کتنا

!دھن کمایا ہوتا

مہدی حسن کا بھی کچھ کچھ ملتا جلتا معاملہ رہا۔ پاکستان کے قیام سے قبل مہدی حسن کا گھرانہ رجواڑوں میں اُستاد کا درجہ رکھتا تھا۔ اُن کے والد عظیم خاں اور چچا اسمٰعیل خاں نیپال کے شاہی خاندان کے علاقہ جے پور، بڑودہ اور دیگر دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو موسیقی کی تربیت دیا کرتے تھے۔ مہدی حسن کے خاندان کا معاملہ فلمی دُنیا کے لوگوں جیسا چمک دمک کا تو نہیں تھا مگر زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ اعلیٰ سطح پر احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ایسے میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک نئے اور خاصی کمزور معیشت کے حامل ملک میں آباد ہونا بہت بڑا جواء تھا۔

مہدی حسن اپنے خاندان کے ساتھ 1946 میں پاکستان آ گئے تھے۔ تب یہاں فن اور فنکار کی قدر برائے نام تھی۔ فن کی دنیا کولکتہ میں تھی اور اس کے بعد بمبئی فن کا مسکن ٹھہرا۔ کلاسیکی موسیقی کے حوالے سے بھی لاہور بہت بڑا مرکز نہ تھا۔ فن کی سرپرستی کرنے والے خال خال تھے۔ فلم انڈسٹری کمزور حالت میں تھی۔ اور جب پاکستان بننے پر ہندو فلم ساز اور اسٹوڈیو مالکان بھارت چلے گئے تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی اور برائے نام انڈسٹری نے بھی دم

توڑ دیا۔

پاکستان اپنے ابتدائی ایام میں شدید کَس مپُرسی کے عالم میں تھا۔ تب کی معیشت سمیت مجموعی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے غالب کا یہ مصرع کافی ہے۔

!ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

بھارت سے لُٹے پِٹے مہاجرین سے آمد جاری تھی۔ غیر منقسم ہندوستان کے دور میں پاکستانی علاقوں کی معیشت مجموعی طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ اُن کے چلے جانے سے بہت کچھ اُلٹ پلٹ گیا۔ جہاں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوں وہاں سنگیت جیسی "عیاشی" کیسے زیبا ہے؟ 1953 تک افراتفری برقرار رہی۔ اِس ماحول میں ہر پاکستانی کو اپنا آپ منوانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑی۔ فن کی دُنیا پر بھی جمود طاری تھا۔ جن کے سینے میں فن سے وابستہ رہنے کی لگن تھی وہ صِلے اور ستائش کی پرواہ کئے بغیر سیکھنے اور فن کا مظاہرہ کرنے پر کمربستہ تھے۔ اور یہ بہت حوصلہ افزاء بات تھی۔

حالات اور امکانات کے بارے میں سوچے بغیر محنت کرنے کا ہُنر مہدی حسن کو خوب آتا تھا۔ ہر حال میں محنت کرتے رہنے کا وصف اُنہیں اپنے بزرگوں سے ملا تھا۔ اُن کے والد اور چچا نے سخت نامساعد حالات کے باوجود فن کی دُنیا کو

نظر انداز نہیں کیا۔ گانا بجانا اُن کا جدّی پُشتی کام تھا مگر جس طور اُنھوں نے اپنی روایت کو زندہ رکھا وہ بہت بڑی بات ہے۔ بہت سے لوگ حالات کی خرابی اور امکانات کے محدود ہونے کے باعث اپنی روایات بھی ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مہدی حسن کے گھرانے نے ایسا نہیں کیا۔

مہدی حسن 18 جولائی 1927 کو بھارتی ریاست راجستھان کی تحصیل جھنجھنو کے موضع لُونا میں پیدا ہوئے۔ ویسے لوک ورثہ فاؤنڈیشن کے ایک پروگرام میں خود مہدی حسن نے بتایا تھا کہ اُن کی پیدائش 1934 کی ہے۔ کم عمری ہی میں موسیقی کی ابتدائی تربیت حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُن کے والد اور چچا دیسی ریاستوں (رجواڑوں) سے وابستہ تھے اور گاتے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر مہدی حسن کو بھی تحریک ملی اور اُنھوں نے صرف آٹھ سال کی عمر بڑودہ کے راجہ کے دربار میں فن کا نمونہ پیش کیا۔ یہ پرفارمنس منٹ کی تھی۔ 40

1946 میں مہدی حسن کے والد عظیم خاں پنجاب آئے اور مہدی حسن کو اپنی بہن کے گھر (چیچہ وطنی) چھوڑ گئے۔ اِس دوران خاندان کے دیگر افراد بھی آ گئے۔ اگلے ہی سال پاکستان معرض وجود میں آیا تو خاندان کے باقی افراد بھی نوزائیدہ ریاست میں آ گئے۔ جو لوگ درباروں سے وابستہ تھے اور خاصی خوش حال زندگی بسر کرتے تھے اُنھوں نے پاکستان میں شدید مشکلات جھیلیں۔ واپسی کا کوئی سوال نہ

تھا۔ پاکستان کو اپنالیا گیا تھا۔ واپس جانے کی صورت میں استہزاء کا سامنا کرنا پڑتا۔ سوال عزتِ نفس کا تھا۔ عظیم خاں اور اسمٰعیل خاں کا تعلق کلاونت گھرانے سے تھا۔ مہدی حسن اِس خاندان کی سولھویں پُشت ہیں۔

پاکستان میں آباد ہونے پر مہدی حسن اور اُن کے خاندان کو زندگی بسر کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ مہدی حسن نے ابتداء میں لاہور کے پنچولی اسٹوڈیوز میں بھی کام کیا، بائیسکل کے پنکچر لگائے اور کھیتی باڑی کی۔ اب ذرا سوچیے کہ کہاں سُر منڈل اور تان پورے کی بہار اور کہاں ہل چلانے کی مشقت ! لطف کی بات یہ ہے کہ زراعت سے وابستہ ہونے پر بھی مہدی حسن کے دِل میں فن کے حصول اور اُس کے مظاہرے کی لگن ماند نہیں پڑی۔ کھیتوں میں کام کے دوران بھی وہ فن کی ریاضت سے غافل نہ رہے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ کھیتوں میں کام کے دوران ٹریکٹر کے پنکھے کی آواز سے وہ اپنے سُر ملا کر گاتے تھے۔ دونوں کام بہت مختلف تھے مگر لگن ایک تھی۔ اپنے شوق کو فن کی بلندی تک پہنچانے کے معاملے میں باشعور رہنے اور اُس کی مناسبت سے محنت کرنے کے معاملے میں مہدی حسن ایک روشن مثال کا درجہ رکھتے ہیں اور ہر دور کے نوجوانوں کے لیے تحریک و تحرک کا ذریعہ ہیں۔

تین چار برس اِسی طور گزرے۔ پھر ایک دن مہدی حسن کے والد نے کہا کہ بھارت

سے جو کچھ لائے تھے وہ تو اب ختم ہو گیا۔ یعنی زندگی کی گاڑی کو رواں رکھنے کے لیے مزید بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ جو تھوڑی بہت پونجی بچ گئی تھی اُس سے عظیم خاں نے لکڑی کی ٹال لگانے کا فیصلہ کیا! یہ بات مہدی حسن کو گوارا نہ ہوئی کہ حکمرانوں کو گانا سِکھانے والے عظیم خاں کو لوگ "ٹال والے عظیم خاں" کہیں! اُنھوں نے والد سے کچھ رقم لی اور مشینوں کی دنیا میں جانے کا فیصلہ کیا۔ ڈیزل کی گاڑیوں اور ٹریکٹر کا کام سیکھا۔ اِس کام میں اُن کی مہارت ایسی بڑھی کہ اللہ نے دِن دُگنی، رات چوگنی ترقی دی۔ کام ایسا بڑھا کہ بڑی موٹر کمپنیاں اُن کی خدمات حاصل کرنے کی خواہش مند ہوئیں۔ اہل ثروت اپنی جدید ترین ماڈل کی گاڑیوں کی مرمت مہدی حسن سے کروانے لگے۔ یہ ایک نئی زندگی کا آغاز تھا مگر مہدی حسن اِسے منزل سمجھنے یا قرار دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ اُن کی یادداشت کمزور نہ تھی۔ راستے میں بہت کچھ مل سکتا تھا اور ملا بھی، مگر اُنہیں یاد تھا کہ اُن کی منزل گائیکی ہے، فن کا ڈیرا ہے۔ اِس سے کم کچھ بھی لینے پر وہ راضی نہ تھے۔

مہدی حسن کو ان کے والد اور چچا نے کلاسیکی تربیت پوری توجہ کے ساتھ دی تھی۔ اُن کا گھرانہ دھروپد گائیکی کے لیے معروف ہے جس کے لیے غیر معمولی سانس درکار ہوتا ہے۔ والد اور چچا نے مہدی حسن کی تربیت میں سانس مضبوط کرنے کی مشق کا بھی خاص خیال رکھا۔ وہ روزانہ چھ سات کلومیٹر کی دوڑ لگاتے تھے اور

بارہ پندرہ سو بیٹھکیں بھی لگاتے تھے۔ چچا اسمٰعیل خاں کے نزدیک گائیکی کے لیے یہ سخت اور اعصاب شکن ورزش ناگزیر تھی۔ معاملہ صرف دوڑ اور بیٹھکوں تک نہ تھا بلکہ شام کو اُنہیں اکھاڑے جانا ہوتا تھا جہاں پان چھ تازہ دم پہلوان اُنہیں زور کراتے تھے۔ پورے جسم کو مضبوط بنانے کی غرض سے اسمٰعیل خاں اکھاڑے میں موجود رہتے تھے اور سب کو ہدایت کرتے تھے کہ مہدی حسن کو آرام نہ کرنے دینا بلکہ مکمل تھکا دینا۔ آخر میں مہدی حسن کے بڑے بھائی پنڈت غلام قادر خاں صاحب زور کراتے تھے۔ غیر معمولی ورزش اور پہلوانی کے بعد مہدی حسن کی کیا حالت ہوگی اِس کا اندازہ لگانا ذرا بھی دشوار نہیں۔ گلوکاری کی مشق اِس کے علاوہ تھی۔ اِس سخت تربیتی معمول نے مہدی حسن کو جسمانی اور اعصابی طور پر اِس قدر مضبوط کردیا کہ بعد میں حالات کی سختی اور صبر آزما مراحل اُن کی راہ میں مزاحم نہ ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مہدی حسن کو ایک عظیم اور شاندار کیریئر کے لیے جسمانی، نفسیاتی اور اعصابی طور پر تیار کرنے میں اِس سخت اور جاں گسل معمول نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا۔

1956 کے بعد مہدی حسن کو بڑے بھائی پنڈت غلام قادر کی وساطت سے ریڈیو پاکستان کے کراچی سینٹر پر گانے کا موقع ملا۔ ریڈیو کے لیے اُن کا انتخاب بھی ایک الگ ہی قصہ ہے۔ ہوا یہ کہ آڈیشن کے لیے بُلایا گیا تو متعلقہ

افسران پانچ گھنٹے تک اُنہیں سُنتے رہے۔ مہدی حسن نے دھروپد کے علاوہ دادرا، ٹھمری، ٹپہ، ماہیا، کجری، خیال سبھی کچھ گا کر سُنایا۔ ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے غزل اور گیت گانے میں اپنی مہارت کا تعارف بھی کرا دیا۔ آڈیشن لینے والوں کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ اُنہیں کس کیٹیگری میں رکھا جائے! بہت سوچ بچار کے بعد ذوالفقار علی بخاری مرحوم سے رابطہ کرکے اُنہیں صورتِ حال پر مطلع کیا گیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اے کیٹیگری دے دو۔

یہ تب کی بات ہے کہ جب عوامی میڈیم ریڈیو ہی تھا۔ جو ریڈیو پر گاتا تھا اُس کے نام کا ڈنکہ بج جاتا تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ کسی بھی فنکار کو پورے ایک گھنٹے کے پروگرام کی بکنگ دی جاتی تھی۔ فنکار کی اناؤنسمنٹ کی جاتی تھی اور پھر وہ ایک گھنٹے تک لائیو گاتا رہتا تھا۔ گیت ریکارڈ بھی کئے جاتے تھے مگر ریکارڈنگ کی سہولتیں کم ہونے کے باعث لائیو کو ترجیح دی جاتی تھی۔

مہدی حسن نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ جب اُنہیں ریڈیو پر پہلی بکنگ ملی تو پروڈیوسر نے کنٹریکٹ پر دستخط کرائے۔ کنٹریکٹ پر معاوضے کی مد میں 35 روپے درج تھے۔ وہ بہت حیران ہوئے اور پروڈیوسر سے پوچھا کہ کیا صرف 35 روپے ملیں گے۔ جواب ملا کہ اے کیٹیگری کے فنکاروں کو ایک بکنگ کے 15 روپے ملتے ہیں، آپ کو 35 روپے اِس لیے دیئے جا رہے ہیں کہ ذوالفقار علی بخاری صاحب نے

!اِضافی ادائیگی کی سفارش کی ہے

(جاری ہے)

(مہدی حسن : فن اور زندگی (دوسرا حصہ

ریڈیو کے لیے گاتے ہوئے مہدی حسن نے کئی سال گزارے۔ ریڈیو ہی سے اُنہیں لائیو گانے کی مشق بہتر بنانے کا موقع ملا اور پھر زندگی بھر اُنہوں نے محفلیں پوری دل جمعی سے گائیں۔ ریڈیو پر گائی ہوئی غزلیں اُن کے فن کا بہترین نمونہ ہیں۔ اُن کی گائی ہوئی غزلیں ریڈیو کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ جب کبھی پاکستان میں موسیقی کی تاریخ مرتب کی جائے گی، ریڈیو پاکستان کے لیے گائی ہوئی مہدی حسن کی غزلیں سب سے نمایاں ہوں گی۔ اردو ادب کے آسمان پر روشن ستاروں کا درجہ رکھنے والی سیکڑوں غزلیں مہدی حسن نے اِس کمال سے گائیں کہ پھر کسی اور میں ہمت پیدا نہ ہوئی کہ اُنہیں گانے کا سوچ بھی سکے۔ میر تقی میر کی غزل "دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے" مہدی حسن نے اِتنی عمدگی سے گائی ہے کہ کم ہی لوگ کسی غزل کو گا پائے ہوں گے۔ "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" بھی میر تقی میر کی ایسی غزل ہے جسے پاک و ہند میں بہتوں نے گایا مگر مہدی حسن کی سی بلندی کو نہ پہنچ سکا۔ "دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے" نے بھرپور مقبولیت حاصل کی اور مہدی حسن کو لوگ پہچاننے لگے۔ فیض احمد فیض کی غزل "گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے" گانے کے بعد مہدی حسن کے فن کی عظمت کو سبھی تسلیم کرنے لگے۔

مہدی حسن کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے ریڈیو کے لیے خاصی مُشکل کلاسیکل ڈُھنوں پر بھی غزلیں گائیں۔ اساتذہ کی بہت سی غزلیں صرف مہدی حسن نے گائیں، پھر کسی نے اُنھیں گانے کی کوشش نہیں کی۔ ریڈیو کے ابتدائی دور کی بہت سی غزلوں کی ڈُھنوں میں کلاسیکل انگ نمایاں ہے۔ بعض ڈُھنیں خاصی خشک اور دُشوار ہیں۔ اُس دور کے بہت سے گلوکار بھی اِن ڈُھنوں کو بھاری پتھر قرار دیتے ہوئے صرف چُوم کر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ "سبزہ ہے، آبجو ہے"، "تازہ ہوا بہار کی"، "لے چلا جان مِری روٹھ کے جانا تیرا"، "دل میں پوشیدہ تپ عشق بتاں رکھتے ہیں" اور ایسی ہی بہت سی دوسری ڈُھنیں بھی ہیں جو کسی اور کے بس کی بات نہیں تھیں۔ مہدی حسن نے فن کے اظہار میں کبھی تساہل اور تن آسانی سے کام نہیں لیا۔ وہ مشکل پسند طبیعت کے مالک تھے۔ جن تجربات سے لوگ گھبراتے تھے وہ اُنھوں نے خوب کئے اور کامیاب رہے۔ مہدی حسن کے لیے بڑے پیمانے پر کچھ کر دکھانے کا موقع حاصل کرنا ہی مشکل کام نہ تھا بلکہ اپنی آواز کو بہتر بنانا بھی لازم تھا۔ ابتداء میں آواز پتلی تھی۔ فن کے معاملے میں تو کوئی کسر بزرگوں نے نہیں چھوڑی تھی مگر آواز کے معاملے میں مہدی حسن کو اپنی کمزوری کا احساس بہت جلد ہوگیا تھا۔ وہ کلاسیکل گانے والے فنکار تھے۔ ٹھمری بھی عمدگی گاتے تھے اور خیال بھی۔ کچھ مدت خالص کلاسیکل گانے کے بعد اُن کے دِل میں یہ خیال جاگزیں ہوا کہ

گائیکی ایسی ہونی چاہیے کہ سُننے والے کو بھی چین ملے اور گانے والے کو بھی لطف اور قرار آئے!

1950 کے عشرے میں اُستاد بڑے غلام علی خاں کے چھوٹے بھائی اور محمد رفیع و غلام علی کے اُستاد یعنی اُستاد برکت علی خاں اور علی بخش ظہور غزل گائیکی کے حوالے سے نمایاں مقام پر تھے۔ بیگم اختر بھی غزل بہت عمدگی سے گاتی تھیں۔ فریدہ خانم نے بھی صلاحیتوں کا اظہار شروع کردیا تھا۔ ایسے میں غزل سرائی کو اپنے فن کی مرکزی جولاں گاہ بنانے کا فیصلہ مہدی حسن کے لیے چیلنج سے کم نہ تھا۔ بہت جلد اُنہیں اندازہ ہوگیا کہ غزل کے لیے جو آواز درکار ہے وہ اُن کے پاس نہیں۔ مہدی حسن نے بتایا تھا کہ اُن کی آواز کیریئر کی ابتداء میں بہت پتلی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بچہ گا رہا ہو! پھر اُنہوں نے بزرگوں کے مشورے سے آواز کو بھاری کرنے کی مشق کی۔ کھرج کا معیار بلند کرنے پر خاص توجہ دی۔ جب آواز کی "بیس" بڑھ گئی تو غزل گانا اُن کے لیے زیادہ آسان اور دل کش ہوتا چلا گیا۔

1950 کے عشرے میں ریڈیو کے علاوہ فلم بہت بڑا میڈیم تھا۔ جو بھرپور شہرت اور کامیابی کی تمنا رکھتے تھے وہ فلمی دنیا کا رخ ضرور کرتے تھے۔ فلموں میں کام کرنے یا گانے پر ملک گیر شہرت ملتی تھی۔ فلم انڈسٹری کراچی میں بھی

تھی مگر لاہور مرکز تھا۔ کراچی میں بننے والی فلمیں صرف سندھ سرکٹ میں ریلیز ہوتی تھیں۔ لاہور میں تیار ہونے والی فلمیں پورے ملک میں جگہ بناتی تھیں اور لوگ اُن کا انتظار کیا کرتے تھے۔ مہدی حسن کو بھی احباب نے مشورہ دیا کہ فلموں میں قسمت آزمائیں کیونکہ فلموں کے ذریعے اُن کی آواز دور دور تک پہنچے گی۔

مہدی حسن ابتداء میں پرائیویٹ محافل میں طلعت محمود اور کندن لعل سہگل کے فلمی گانے لوگوں کو سُناتے تھے۔ لاہور میں پروڈیوسر ڈائریکٹر رفیق انور کے بھانجے کی شادی کے موقع پر مہدی حسن نے چند فلمی گیت گائے تو رفیق انور نے اُن کی صلاحیتوں کو پہچان لیا۔ انہوں نے مہدی حسن کو اپنی فلم "شکار" کے لیے سائن کیا۔ یہ فلم کراچی میں بن رہی تھی۔ اِس میں مہدی حسن نے دو غزلیں گائیں۔ "میرے خیال و خواب کی دنیا لئے ہوئے" مہدی حسن کا پہلا ریکارڈیڈ فلمی گانا ہے۔ اِسی فلم میں اُنہوں نے "نظر ملتے ہی دِل کی بات کا چرچا نہ ہو جائے" بھی گایا۔ شاعر قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری مرحوم تھے۔ "شکار" 1956 میں ریلیز ہوئی۔ مگر اِس سے قبل "کنواری بیوہ" ریلیز ہوئی جس میں مہدی حسن نے تین گیت ("تم ملے، زندگی مسکرانے لگی"، کوئی صورت نہیں اے دل" اور "آنکھوں میں چلے آؤ") گائے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مہدی حسن نے "کنواری بیوہ" میں عنایت حسین بھٹی کے ساتھ ایک کورس میں بھی حصہ لیا تھا۔

یہ مہدی حسن کی پہلی اور احمد رشدی کی دوسری فلم تھی۔ 1956 میں مہدی حسن نے مس 56" میں دو گیت "یہ چاندنی یہ سائے" اور "محبت کرلے جی بھرلے" گائے تھے۔ فلمی دنیا میں آمد مہدی حسن کے لیے زیادہ شاندار نہ تھی۔ اُن کے ابتدائی فلمی گیت لوگوں کے ذہن پر نقش نہ ہو سکے۔ کچھ یہ بات بھی تھی کہ مہدی حسن کے حصے میں آنے والے گانے عوام کے لیے زیادہ قابل قبول نہ تھے۔ نذیر بیگم کے ساتھ گایا ہوا "یہ چاندنی، یہ سائے" البتہ کچھ اِس نوعیت کا تھا کہ لوگوں کو تھوڑا پسند آیا۔
فلمی گلوکاری کے میدان میں مقابلہ بہت سخت تھا۔ انڈسٹری نئی تھی۔ فلمیں کم بنائی جاتی تھیں۔ بھارتی فلموں کی درآمد کا سلسلہ بھی جاری تھا جس کے باعث پاکستانی فلموں کے لیے باکس آفس پر کامیابی بڑا چیلنج ہوا کرتی تھی۔ عنایت حسین بھٹی، سلیم رضا اور منیر حسین کامیاب گلوکار تھے جو عوامی مزاج کے مطابق گاتے تھے اور اِن سے گوانے والے بھی مقبولیت کے تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ اِن منجھے ہوئے گلوکاروں کے ہوتے ہوئے کامیاب ہونا کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا۔ 1956 سے 1961 کے دوران مہدی حسن نے صرف 9 فلمی گیت گائے۔ 1958 سے 1961 کے دوران انہیں صرف ایک فلم غریب" ملی۔ 1962 میں ریلیز ہونے والی فلم "سُسرال" کے لیے مہدی حسن نے" منیر نیازی کا لکھا ہوا "جس نے مِرے دِل کو درد دیا" جو خاصا کامیاب رہا۔ اِسی سال انہوں نے ملکہ ترنم نور جہاں کے

ساتھ "قیدی" کے لیے "ایک دیوانے نے اِس دِل کا کہا مان لیا" گایا جو لوگوں نے پسند کیا۔ 1962 میں مہدی حسن نے 5 فلموں میں 5 گیت ہی گائے۔ اِن میں "انقلاب" بھی شامل تھی جو مسعود رانا کی پہلی فلم تھی۔

میں مہدی حسن کو صرف ایک فلم "ہمیں بھی جینے دو" ملی جس میں گایا ہوا 1963 الٰہی آنسو بھری زندگی کسی کو نہ دے" ان کا پہلا سُپر ہٹ گیت تھا۔"

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فلمی دُنیا میں نام کمانے کے لیے مہدی حسن کو کس قدر محنت کرنی پڑی ہوگی۔ احمد رشدی اور مسعود رانا آواز کی کوالٹی کے اعتبار سے فلم میکرز کی اولین ترجیح تھے کیونکہ فلم بین اُن کی آسان اور رواں گائیکی کو بہت پسند کرتے تھے۔ خاص طور پر احمد رشدی کی آواز خالص فلمی تھی۔ ان کی موجودگی کو مہدی حسن کے لیے زیادہ فلمیں حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اِس مرحلے پر اُنھوں نے ہمت نہ ہاری اور پورے تحمل کے ساتھ محنت کرتے رہے۔

میں ریلیز ہونے والی فلم "فرنگی" میں مہدی حسن کی گائی ہوئی فیض احمد فیض 1964 کی غزل "گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے" شامل کی گئی۔ فلم اور غزل دونوں کے مقدر میں سُپر ہٹ ہونا لکھا تھا۔ اِس کے بعد مہدی حسن کو مُڑ کر

دیکھنا نہیں پڑا۔ 1960 کے عشرے کے باقی سال مہدی حسن کے لیے فن اور کامیابی دونوں حوالوں سے یادگار رہے۔ اُنھوں نے شاندار گیت گائے اور شہرت نے اُن کے قدم چُھوے۔

مہدی نے 1964 میں 6 فلموں کے لیے 6، 1965 میں 6 فلموں کے لیے 7، 1966 میں 15 فلموں کے لیے 19، 1967 میں 11 فلموں کے لیے 12، 1968 میں 21 فلموں کے لیے 24، 1969 میں 23 فلموں میں 29، 1970 میں 18 فلموں میں 20، 1971 میں 20 فلموں کے لیے 24، 1972 میں 30 فلموں کے لیے 39، 1973 میں 22 فلموں کے لیے 29، 1974 میں 37 فلموں کے لیے 60، 1975 میں 44 فلموں کے لیے 71، 1976 میں 35 فلموں کے لیے 60، 1977 میں 32 فلموں کے لیے 55، 1978 میں 28 فلموں کے لیے 35، 1979 میں 18 فلموں کے لیے 29 اور 1980 میں 12 فلموں کے لیے 22 گانے گائے۔ 1974 سے 1977 تک (یعنی 4 سال) انہوں نے ہر سال 50 سے زائد گانے گائے۔ 1966 سے مہدی حسن کے کیریئر نے اُڑان بھرنا شروع کیا۔ 1970 تک وہ بھرپور کیریئر کے لیے مکمل طور پر تیار ہو چکے تھے۔ 1966 سے 1980 تک کا زمانہ مہدی حسن کے فلمی کیریئر کا سب سے بار آور دور ہے جس میں انہوں نے 531 گیت گائے۔

مہدی حسن نے 45 سالہ فلمی کیریئر میں 441 فلموں کے لیے 626 گیت گائے۔

اُنہوں نے 366 اردو فلموں کے لیے 541 اور 74 پنجابی فلموں کے لیے 82 گیت گائے۔ 2000 میں ریلیز ہونے والی "چن پتر" مہدی حسن کی آخری فلم تھی۔

مہدی حسن نے 50 سے زائد ایسے فلمی گیت بھی گائے جن کی فلمیں ریلیز نہ ہو سکیں۔ اِن میں سے بہت سے گیت ریلیز ہوئے اور لوگوں نے خوب سراہا۔

مہدی حسن نے تمام چھوٹے بڑے اداکاروں کے لیے فلمی گیت ریکارڈ کرائے مگر اُن کی آواز محمد علی مرحوم پر خوب جچتی تھی۔ نورجہاں کے ساتھ اُن کی آواز خوب کھلتی تھی۔ انہوں نے میڈم کے ساتھ گیت گائے۔ ایم اشرف سے اُن کا تال میل اچھا رہا اور اُن کی موسیقی میں 100 سے زائد گیت گائے۔ نثار بزمی نے بھی مہدی حسن کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر خوب توجہ دی اور خاصے معیاری گیت گوائے۔ اُنہوں نے اصغر علی محمد حسین، حسن لطیف للک، رشید عطرے، خواجہ خورشید انور، صفدر حسین، نذیر علی، کمال احمد، خلیل احمد، دیبو بھٹاچاریہ، لعل محمد اقبال، طافو، ماسٹر رفیق، ماسٹر عنایت حسین، ناشاد، اے حمید، روبن گھوش، شمیم نازلی، بابا جی اے چشتی، وزیر افضل اور دوسرے بہت سے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا۔

مہدی حسن کا کیریئر ہر اعتبار سے قابل رشک ہے۔ شہرت نے زندگی بھر ان کا

ساتھ دیا۔ بے مثال توقیر سے بھی وہ ہمکنار ہوئے۔ اُن کا احترام کرنے والوں میں حکمران بھی تھے اور عام آدمی بھی۔ ہر سطح پر اُن کی بے مثال پذیرائی کی گئی۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے اُنھیں شہنشاہِ غزل کا خطاب دیا اور اُنھوں نے اِس خطاب کا حق ادا کر دیا۔

(جاری ہے)

مہدی حسن : فن اور زندگی (تیسرا اور آخری حصہ

فلمی گائیکی میں کلاسیکل انگ

پاکستان اور بھارت کی گلوکاری میں بنیادی فرق انداز اور انگ کا ہے۔ پاکستان کی موسیقی اور بالخصوص غیر فلمی موسیقی میں کلاسیکل انگ نمایاں ہے۔ بھارت میں فلمی موسیقی کو کلاسیکل انگ سے دور رکھا گیا ہے۔ بیشتر موسیقار کوشش کرتے ہیں کہ گیت زیادہ سے زیادہ آسان دُھن میں ریکارڈ کیے جائیں تاکہ لوگوں کی سمجھ میں آئیں اور اُنہیں گنگنانا آسان ہو۔ پاکستان میں بھی وہ فلمی زیادہ مقبول ہوئے ہیں جن میں کلاسیکل موسیقی کو زیادہ سمویا نہیں گیا۔ دُھن آسان ہو تو لوگوں کو آسانی سے یاد ہو جاتی ہے۔

مہدی حسن نے اِس معاملے میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ جس دور میں اُنھوں نے گانا شروع کیا، پاک و ہند میں ہلکی پھلکی موسیقی کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ عنایت حسین بھٹی نے فلمی گانوں میں پنجاب کی لوک موسیقی شامل کی جو اُن کے فن کا نمایاں وصف ہے۔ مہدی حسن نے فلمی گانوں میں کلاسیکل انگ کو سمویا جو بڑا کارنامہ ہے۔ اُنھوں نے فلمی گیتوں کو بھی خاصے ٹھوس کلاسیکی انداز سے گا کر یہ پیغام دیا کہ کسی بھی شعبے میں اپنی نمایاں شناخت کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ لوگوں نے اُن کے انداز کو خاصا پسند کیا اور عام

آدمی بھی خاصے مشکل انگ والے گیت گنگنانے لگا۔ مہدی حسن کے بیشتر فلمی گانوں میں خالص کلاسیکی انداز صاف جھلکتا ہے جو اُن کا خاصہ ہے۔ یہی اُن کی تربیت تھی جو اُنھوں نے اپنے فن کے ذریعے دُنیا کے سامنے پیش کی۔ احمد رشدی، مسعود رانا اور منیر حسین کے ہاں اِس حوالے گہرائی اور گیرائی نہیں ملتی۔

اِلٰہی آنسو بھری زندگی کسی کو نہ دے" ایسا گیت تھا جو خاصا مدھم اور پُر کیف ہونے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی انگ کا حامل تھا۔ "تری ہوئی آنکھوں کو آ جائے قرار آ جا" بھی ایک ایسا ہی گیت تھا جس میں روایتی کلاسیکی موسیقی کا انداز عمدگی سے سمویا گیا تھا۔ گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے" خالص غیر فلمی انداز سے گائی ہوئی غزل تھی" مگر فلم "فرنگی" میں علاء الدین پر فلمائی گئی تو لوگوں نے بہت پسند کی۔

مہدی حسن نے فلمی گائیکی میں کلاسیکی روایات کا رچاؤ پیدا کیا اور اِس معاملے میں اِس قدر کامیاب رہے کہ آج بھی لوگوں کو 1960 کے عشرے کی موسیقی پسند ہے۔ کچھ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مہدی حسن نے فلمی گیتوں میں بھی کلاسیکی انداز اختیار کرکے موسیقی کو بھاری بھرکم بنادیا مگر سچ تو یہ ہے کہ خاں صاحب کی بدولت فلمی موسیقی بھی کچھ معتبر ہو گئی۔ ہلکے پھلکے گانے

والے تو بہت تھے۔ مزا تو اِسی بات میں ہے کہ اِنسان معمول کا کام بھی عمدگی سے کر کے دِکھائے۔

....

دو مختلف میدانوں میں یکساں کامیابی

پاک و ہند میں کلاسیکل بیک گراؤنڈ رکھنے والے کم ہی گلوکاروں نے فلمی دنیا میں اپنی صلاحیتوں کو آزمایا ہے۔ ایسا کم ہی ہوا ہے کہ کلاسیکل گانے والے کسی فنکار کو فلمی دنیا میں مکمل قبولیت اور مقبولیت ملی ہو یا اُس نے فلمی ماحول قبول کر لیا ہو۔ چند ایک نغمات کی حد تک تو کلاسیکل والے کامیاب رہتے ہیں مگر اس کے بعد اپنی دُنیا میں واپس چلے جاتے ہیں۔

مہدی حسن کے کیریئر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے فلمی اور غیر فلمی ہر دو طرح کی گائیکی میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا بھرپور طور پر منوایا۔ وہ زندگی بھر محفلوں میں فلمی اور غیر فلمی آئٹمز یکساں مہارت اور ذوق و شوق سے گاتے رہے۔ کسی بھی محفل میں اُن کی پرفارمنس کا جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوگا کہ وہ کسی معاملے میں بیزاری محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ معمول کی چیز کو بھی اپنے ذوق و شوق سے غیر معمولی بنا کر دم لیتے تھے۔ یہ فن کے حوالے سے بڑا کارنامہ ہے۔

غیر فلمی گائیکی کے شوقین جب مہدی حسن کے فلمی گانوں کو سُنتے ہیں تو اُنہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا کہ خالص غیر فلمی انداز سے گانے والا کوئی فنکار اِس قدر فلمی انداز سے بھی گا سکتا ہے۔ اور اُن کے فلمی گانوں کو پسند کرنے والے یہ دیکھ کر انگشت بہ دنداں رہ جاتے ہیں کہ اُن کا اصل میدان تو غیر فلمی گائیکی ہے۔ مہدی حسن جب نجی محفلوں میں کوئی فلمی گانا غیر فلمی انداز سے یا غزل کے انگ میں سُناتے تھے تو دُھن کی تمام پوشیدہ خوبیاں سامعین پر عیاں کر دیتے تھے۔ فلم کے لیے گاتے وقت سچویشن کو ذہن نشین رکھنا پڑتا ہے۔ زیادہ کاری گری اور لَے کاری کی گنجائش نہیں ہوتی۔ موسیقار اور ڈائریکٹر فلمی گانے کو زیادہ بوجھل بنانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ مہدی حسن نے کئ فلمی گانوں کو جب محفلوں میں پیش کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ کِسی فلمی گیت کو بھی کِس قدر مختلف یعنی کلاسیکی اور رچے بسے انداز سے گانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ پورے خطے میں کوئی بھی دوسرا گلوکار فلمی اور غیر فلمی گائیکی کے تقاضوں کو یکساں مہارت اور جوش و خروش سے نبھانے میں کامیاب یا اِس قدر کامیاب نہیں ہو سکا۔

....

فن کے اظہار میں پوری ایمانداری

کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والا فرد عمر کی ایک خاص حد کو پہنچ جانے کے بعد کام کے معاملے میں بیزاری محسوس کرنے لگتا ہے۔ اداکار بھی عمر ڈھلتے ہی ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ زیادہ کامیابی حاصل کرچکنے کے بعد فن کو بالائے طاق رکھ کر صرف کام چلانے کے انداز سے کام کرنے لگتے ہیں۔ اداکاری، گلوکاری، تصنیف و تالیف، مُصوّری اور دوسرے بہت سے شعبوں میں اِس خامی کا آسانی سے مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ذرا ماحول پر نظر دوڑایئے تو اندازہ ہوگا کہ لوگ ذرا سی کامیابی ملنے پر اپنے فن کو بھول جاتے ہیں اور صرف معمول کا کام کرنے لگتے ہیں۔

مہدی حسن کے وجود کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے کبھی اپنے فن سے بے ایمانی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ وہ جب بھی غزل سرا ہوتے تھے، پوری آب و تاب کے ساتھ اپنے فن کی تمام جولانیاں دِکھانے پر کمربستہ دِکھائی دیتے تھے۔ فن کے اظہار کا جو اہتمام مہدی حسن کرتے تھے وہ کم ہی فنکاروں کے ہاں دِکھائی دیا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ حاضرین میں فن کی دُنیا سے تعلق رکھنے والی کوئی بہت بڑی ہستی یا کسی ملک کا صدر، وزیرِ اعظم بیٹھا ہو تو مہدی حسن زیادہ دل جمعی سے گاتے تھے اور جہاں عام سے لوگ بیٹھے ہوں وہاں اُن کے جذب و شوق کی آتش سَرد پڑ جاتی ہو۔ پی ٹی وی کے لیے مہدی حسن نے بہت سے محفلیں گائیں۔ اُنھوں نے نیپال کے دربار میں شہنشاہ کے سامنے جس دلچسپی سے گایا

اُتنی ہی دلچسپی کا اظہار اُنھوں نے اندرون ملک عام سی محفلوں میں غزل سرائی کے دوران بھی کیا۔ اِن محفلوں میں سینئر فنکار بھی ہوتے تھے اور عام لوگ بھی۔ اور سب کے لیے مہدی حسن کا فن بھرپور تابانی کے ساتھ موجود ہوتا تھا۔ ریڈیو کے اسٹوڈیوز میں محض مائکروفون کے سامنے بھی وہ پوری ایمانداری اور کاریگری کے ساتھ گاتے تھے۔ یہ وصف اُنھی لوگوں میں پایا جاتا ہے جو اپنی زندگی کو فن کی نذر کر چکے ہوں اور صلاحیتوں کے اظہار کو زندگی کا مقصد گردانتے ہوں۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کہیں دور تک بھرپور کامیابی کا کوئی تصور یا امکان نہیں تھا۔ تب بھی مہدی حسن پوری توجہ سے سیکھتے اور گاتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ کامیابی کی طرف لے جانے والے راستے پر قدم رکھنے کا موقع ملا۔ تب بھی اُنھوں نے فن کے اظہار میں تن آسانی یا بُخل سے کام نہیں لیا۔ بہت سے لوگوں کا فن اِسی مرحلے میں دم توڑ دیتے ہیں۔ مہدی حسن نے ہر موقع سے جامع ترین استفادہ کیا۔ اُنھیں فن کے حوالے سے آگے لانے کی کوشش کرنے والے جانتے تھے کہ فن کے اظہار میں وہ مایوس نہیں کریں گے۔ اور جب بھرپور کامیاب مل گئی تب بھی مہدی حسن کی لگن اور فن سے بھرپور وابستگی برقرار رہی۔ ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی میں اُن کے آئٹمز ریکارڈ کرنے والے جانتے ہیں کہ وہ ہر ریکارڈنگ کے لیے فن کا کس قدر اہتمام کرتے تھے اور دُھن کی تمام جزئیات

معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ سامعین بھرپور لطف پائیں۔

عام طور پر گانے والے محض دس پندرہ آئٹمز ہٹ ہو جانے پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور مزید ریاض یا سیکھنے پر توجہ نہیں دیتے۔ یوں اُن کا فن پرواز کے ابتدائی مراحل ہی میں دم توڑ کر زمین چاٹنے لگتا ہے۔ مہدی حسن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ زندگی بھر سیکھتے رہے اور کسی بھی مرحلے پر یہ نہیں سوچا کہ اُنھوں نے سب کچھ سیکھ لیا ہے اور اب مزید کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہی حال ریاض کا تھا۔ باقاعدہ ریاض ہی کی بدولت مہدی حسن ہر دور میں نئی دُھنیں ترتیب دیتے رہے اور فلمی گانوں کو بھی غزل کے انداز سے سُنا کر داد پاتے رہے۔ اپنے فن سے اِس قدر ایماندار کم ہی فنکار رہ پائے ہوں گے۔ سوال صرف زندگی بھر گانے کا نہیں، فن کے تقاضوں کو نبھانے اور اِس معاملے میں کامل ایمانداری کا مظاہرہ کرنے کا بھی ہے۔

....

فن اور آواز کے تجربات

مہدی حسن نے مہم جو طبیعت پائی تھی۔ وہ زندگی بھر فن کی مختلف جہتیں دنیا کے سامنے لانے کے لیے کوشاں رہے۔ اُنھوں نے ہمیشہ کچھ نہ کچھ نیا کرنے کی سعی کی اور بہت حد تک کامیاب رہے۔ اُن کی آواز ایک مخصوص انداز اور مزاج کی

حامل تھی۔ ہر طرح کا گانا اُن کی آواز میں اچھا نہیں لگتا تھا۔ مثلاً اُن کی آواز قوالی یا بھجن کے لیے موزوں نہیں تھی۔ پُرجوش قسم کے ملّی ترانے بھی اُن کی آواز کے لیے موزوں نہ تھے۔ غزل کے لیے جس آواز کو مہدی حسن نے بہت محنت سے نرم کیا تھا اُس پر وہ ظلم ڈھانے سے گریز کرتے تھے! مگر تجربات کے معاملے میں وہ پیچھے نہیں رہے۔ اُنھوں نے زندگی بھر آواز اور انداز سے مختلف تجربات کیے۔

غرناطہ" کے لیے اے حمید کی موسیقی میں گایا ہوا "میں ہوں یہاں، تو ہے وہاں" بھی" ایسا ہی گانا تھا۔ اِس گانے میں سانس کا عمل دخل بہت نمایاں تھا۔ مہدی حسن کو گیت میں یہ دکھانا تھا کہ ہیرو پر جُدائی کی کیفیت بُری طرح طاری ہے اور وہ اعصابی طور پر بہت تھکا ہوا ہے۔ مہدی حسن مطلوبہ تاثرات پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔

ریلیز ہونے والی فلم "سُسرال" میں شاہد پر مہدی حسن کا گایا ہوا "بھانڈے 1974 قلعی کرالو" فلمایا گیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ گانا مہدی حسن کو نہیں گانا چاہیے تھا۔ مگر جن لوگوں نے اِس گیت کو اوریجنل ساؤنڈ ٹریک پر سُنا ہے اُنھیں اندازہ ہوگا کہ اِس عام سے مزاحیہ گیت میں بھی مہدی حسن نے کس قدر مہارت دکھائی ہے۔ مہدی حسن نے یہ گیت اُس وقت گایا تھا جب وہ اپنے کیریئر

میں بلند ترین مقام پر تھے۔ اُن کی گائی ہوئی غزلیں اور گیت دنیا بھر میں مقبولیت سے ہمکنار ہو رہے تھے۔ ایسے میں "بھانڈے قلعی کرا لو" جیسا گیت کیریئر پر اثر انداز بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اِس کے بعد باوجود اُنھوں نے رسک لیا اور ایک مزاحیہ گیت میں بھی اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔ اُسی دور میں فلم "نوکر" میں محمد علی پر "لاکھ کرو انکار، سُسر جی رنگ لائے گا پیار، دلہن میں لے کے جاؤں گا" فلمایا گیا۔ یہ گیت بھی بے حد مقبول ہوا۔ کِسی نے یہ نہیں سوچا کہ اِسے "پیار بھرے دو شرمیلے نین" اور "گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے" گانے والے مہدی حسن نے گایا ہے!

"حکومت کی "غریب پروری

ایک زمانہ تھا جب پاکستان میں بجلی ہوا کرتی تھی۔ اور جب بجلی ہوتی تھی تو اُس کے جھٹکے بھی ہوا کرتے تھے۔ اب بجلی کم ہے اور اُس کے نرخوں سے لگنے والے جھٹکے زیادہ ہیں! کم و بیش ایسا ہی معاملہ پٹرولیم مصنوعات کا ہے۔ پٹرولیم مصنوعات آتش گیر ہوتی ہیں مگر سچ یہ ہے کہ اب اُن سے زیادہ تو اُن کے نرخ آتش گیر ہیں اور اُن میں پے در پے اضافے سے ملک بھر میں پائی جانے والی شدید تپش نے یہ بات ثابت بھی کردی ہے!

پٹرول کے بڑھتے ہوئے نرخوں نے موٹر سائیکل چلانے والوں کو "سائیکولوجیکل" بنادیا ہے یعنی جیب پر پڑنے والے بوجھ کے باعث لوگ دوبارہ سائیکل کا آپشن اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں!

مرزا تنقید بیگ کے خیال میں موٹر سائیکل سے سائیکل پر آنا تنزلی نہیں بلکہ کسی حد تک ترقی کی علامت ہے! ہم یہ بات سُن کر ذرا بھی حیران نہیں ہوئے کیونکہ مرزا مارکیٹنگ کا ہنر جانتے ہیں اور عموماً ایسی (اوٹ پٹانگ) باتیں کرتے ہیں جنہیں سُن کر لوگ خواہ مخواہ متوجہ ہوں! مجمع سوگواروں کا ہو یا

کہیں باراتی جمع ہوں، مرزا اپنی مرضی کا راگ الاپتے ہیں اور بالعموم لوگوں کی توجہ پانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے، زمانہ ہی کچھ ایسا ہے کہ لوگ ہر اوٹ پٹانگ بات کو نہ صرف پوری توجہ سے سُنتے ہیں بلکہ اُس پر غور بھی کرتے ہیں!

اب آپ سوچیں گے موٹر سائیکل چلانے میں ناکام رہنے پر سائیکل کو دوبارہ اپنانے میں ترقی کا کون سا اشارہ چھپا ہوا ہے؟ مرزا کہتے ہیں "چین ایک ترقی یافتہ ملک ہے اور وہاں کروڑوں افراد سائیکل چلاتے ہیں۔ یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں بھی لوگ چھوٹے فاصلوں کے لیے سائیکل کے استعمال کو ترجیح دیتے ہیں۔ پڑوسی بھارت ہی کی مثال لیجیے جہاں لوگ سائیکل کو آج بھی زندگی کا حصہ بنائے ہوئے ہیں۔"

ہم نے عرض کیا کہ حکومت پٹرولیم کے نرخ بڑھاکر ہماری موٹر سائیکلوں کو ناکارہ بنانے اور ہمیں "ری سائیکل" کرنے یعنی دوبارہ سائیکل کے زمانے میں بھیجنے پر تُلی ہوئی ہے اور آپ اِس اقدام کو ترقی کی علامت گرداننے پر کمربستہ ہیں۔ آپ کی یہ بات بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے!

مرزا پھر شروع ہوگئے "ہمیں تو بس عادت پڑ گئی ہے کہ حکومت جو کچھ بھی کرے

اُس میں کیڑے ہی تلاش کرتے ہیں۔ کبھی ہم نے یہ بھی سوچا ہے کہ حکومت کے بیشتر "اقدامات کی کوکھ سے چند ایک آسانیاں اور سہولتیں بھی جنم لیتی ہیں؟

ہم نے حیران ہوکر کوئی مثال چاہی تو مرزا نے کمال بے نیازی سے وضاحت فرمائی

غریبوں کو روزانہ، نہ چاہتے ہوئے بھی، دو وقت کی روٹی کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔" حکومت کی مہربانی سے کھانے پینے کی اشیاء اب اُس مقام پر پہنچ گئی ہیں کہ اُن کے نرخ !پوچھنے پر بھی پیٹ کچھ بھرا بھرا سا محسوس ہونے لگتا ہے

ایسے میں کوئی ایک وقت کی روٹی کا اہتمام بھی کرپائے تو بڑی بات ہے۔ یعنی حکومت نے غریبوں کو صرف ایک وقت پیٹ بھرنے کی فکر میں غلطاں رہنے کا راستہ سُجھایا ہے! اب اگر کوئی خواہ مخواہ دو یا تین وقت پیٹ بھرنے کا سوچے تو یہ اُس کے ذہن کا "!ٹیڑھا پن ہے

ہم نے عرض کیا اگر یہی حال رہا تو لوگ ایک وقت کی روٹی کے بارے میں سوچنا چھوڑ !دیں گے

"یہ بھی حکومت کی مہربانی ہی ہوگی۔

جگہ دِل لگانے کی دُنیا نہیں ہے

یہ عبرت کی جا ہے، تماشا نہیں ہے

روحانیت کا ایک بلند درجہ یہ بھی ہے کہ انسان کھانے پینے کی فکر سے بہت حد تک آزاد ہو جائے۔ حکومت ہمیں بلند روحانی درجات تک لے جانا چاہتی ہے مگر ہم ہیں کہ ناشکرے پن کا مظاہرہ کر رہے ہیں!"

ہم نے عرض کیا محترم! یہ بھی مہنگائی ہی کا چمتکار ہے کہ لوگ خود کشی پر مجبور ہیں۔ جن کے گھر میں چولھا نہیں جل پا رہا وہ خود کو سُلگا کر موت کا چراغ روشن کرکے زندگی کا اندھیرا دور کر رہے ہیں!

مرزا کب ماننے والے تھے (اور ہیں!)۔ جب وہ کسی کی بات نہ ماننے پر تُل جائیں تو اُن کے منہ سے دلائل کا سیلاب اُمڈا آتا ہے! حکومت کے دفاع پر مزید کمر بستہ ہو کر فرمایا "چند عاقبت نا اندیش لوگوں نے حکومت کو اِس مغالطے میں مبتلا کر دیا تھا کہ غربت ختم کرنے کا ایک اچھا طریقہ یہ بھی ہے کہ غریبوں ہی کو ختم کر دیا جائے! (یہ سوچ شاید بھارت میں کسانوں کی خود کشی سے اخذ کی گئی تھی!) حکومت کے اہل دانش کو جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی مقبول و محبوب روش نہیں۔ اب حکومت چاہتی ہے کہ غریب خود کشی کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔ پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں اضافے کی ایک غایت یہ بھی ہے

"کہ غریب خود کشی کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔

ہم نے ایک بار پھر حیران ہو کر پوچھا کہ خود کشی کا سلسلہ روکنے سے پٹرولیم نرخوں میں اضافے کا کیا تعلق ہے؟ مرزا نے فخر سی تنی ہوئی گردن گھما کر ہمیں دیکھا اور ہماری سادگی" اور "کم فہمی" پر (بے کہے) لعنت بھیجتے ہوئے وضاحت فرمائی "مہنگائی کے ستائے ہوئے لوگ مٹی کا تیل اپنے جسم پر چھڑک کر خود کشی کرلیا کرتے تھے۔ اُن کی یہ روش حکومت کو دنیا بھر میں بدنام کرتی تھی۔ اب یہ حل نکالا گیا ہے کہ مٹی کا تیل اِتنا مہنگا کردیا جائے کہ غریب جل مرنے کا خیال بھی دل میں لاتے ہوئے خوف محسوس کرے اور صرف زندہ رہنے کے بارے میں سوچے! حکومت غریبوں کو زندگی دینا چاہتی ہے مگر اِس معاملے میں بھی اُسے شک کی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔"

مرزا سے بحث فضول تھی۔ ہمیں اندازہ تھا کہ پیٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں حالیہ ریکارڈ اضافے کو بھی وہ کسی نہ کسی طرح مثبت قرار دے کر دم لیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کے ذہن میں یہ بات ہو کہ حکومت پیٹرولیم مصنوعات کو زیادہ سے زیادہ مہنگا کرکے لوگوں کو پیدل چلنے پر مجبور کرنا چاہتی ہے تاکہ صحت کا معیار بلند ہو! مرزا کو اِس بات کا ذرا بھی احساس نہیں کہ جب وہ اپنی کسی بھی (ظاہر ہے بے ڈھنگی!) بات کو درست ثابت کرنے کے لیے دلائل پر دلائل

دیتے جاتے ہیں تو لوگ خود پر مٹی کا تیل چھڑکے بغیر ہی پورے وجود کو آگ کی لپٹوں میں گِھرا ہوا محسوس کرتے ہیں!

قوم کا خط بنا دیا خط نے

پاکستان کی سیاسی غزل بھی کیا تقدیر لے کر آئی ہے کہ ہر بار مقطع میں سُخن گسترانہ بات آ پڑتی ہے! فرید جاوید مرحوم نے کہا تھا۔

گفتگو کسی سے ہو، تیرا دھیان رہتا ہے

بس کچھ ایسا ہی معاملہ آج کل ہمارے ہاں کسی بھی سیاسی موضوع پر چھڑنے والی بحث کا ہے۔ بات خواہ کہیں سے چلی ہو، گھوم پھر کر.... بلکہ سیر حاصل سیر کرکے خط کی منزل پر پہنچ کر دم توڑتی ہے!

ہم وہ قوم ہیں جو کسی بھی کام کے آغاز کے لیے کسی چیز کے پورا ہونے یا وقت کا ایک خاص دورانیہ ختم ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ مثلاً رمضان المبارک میں کوئی کام آ پڑے تو ہم کہتے ہیں کہ ذرا عید گزر جائے، پھر دیکھیں گے! کرکٹ ورلڈ کپ سر پر ہو تو سارے کام فائنل کی آخری گیند پھینکے جانے تک موخر کر دیئے جاتے ہیں! اب یہ حال ہے کہ تمام معاملات ایک خط کے لکھے جانے تک موخر ہو کر رہ گئے ہیں!

خط کا معاملہ بھی عجیب ہی ہوا کرتا ہے۔ اردو ادب میں خط کے تذکرے جا بہ جا بکھرے پڑے ہیں۔ شُعراء نے خط کے بارے میں ایسے ایسے مضامین باندھے ہیں کہ قارئین کا ذہن بندھ کر رہ جاتا ہے! کہیں خط کے نہ آنے کا شکوہ ہے تو کہیں خط کے آنے سے پیدا ہونے والے بحران کا ماتم! خط کا جواب نہ آئے تو انتظار جاں گُسل ثابت ہوتا ہے اور کبھی جواب کچھ اِس انداز سے آتا ہے کہ مکتوب الیہ دِل تھام کر رہ جاتا ہے!

خط کے پُرزے ہیں دستِ قاصد میں

ایک کیا، سو جواب لایا ہے!

غالب کا تو یہ حال تھا کہ انٹ شنٹ خط لکھنے کے بعد پریشان ہو کر مکتوب الیہ یعنی محبوب سے کہتے تھے۔

تُجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم!

میرا سلام کہیو اگر نامہ بَر ملے!

اور پھر ایک دھڑکا یہ بھی لگا رہتا تھا کہ خط کہیں کسی غیر کے ہتّھے نہ چڑھ جائے! کبھی کبھی ایسا ہو بھی جاتا تھا! اِس کیفیت کو غالب نے یوں بیان کیا۔

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر

!کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چُھپائے نہ بنے

!اور کبھی کبھی دِل کے ہاتھوں مجبور ہو کر خط لکھنا ہی پڑتا تھا، خواہ ذہن میں کچھ نہ ہو

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

!ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

جب ابھی خط بنوانے کے دِن ٹھیک سے وارد نہیں ہوئے ہوتے تب تقریباً ہر انسان پر خط لِکھنے کا زمانہ گزرتا ہے! کبھی ہم پر بھی خط کا زمانہ گزرا تھا۔ جوانی کے آغاز میں ہم بھی تھوڑے تھوڑے وزیرِ اعظم تھے یعنی ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ خط کیسے لکھیں اور اُس میں کیا لکھیں! اور اِس سے بھی بڑی ذہنی اُلجھن یہ لاحق ہوتی تھی کہ خط کیوں لکھیں! آج کل وزیرِ اعظم کو مختلف حلقے تحریک دے رہے ہیں کہ خط لکھ ہی ڈالیں اور عدلیہ کی بھی اِس حوالے سے زوردار فرمائش و تاکید ہے۔ کچھ کچھ ایسا ہی معاملہ ہمارے دل کا بھی تھا جو ہمیں ہر وقت خط لکھنے پر اُکساتا رہتا تھا۔ مگر اُس بے عقلی کے دور میں بھی ہم میں اِتنا شعور ضرور تھا کہ خط کب، کیسے اور کس طور لکھنا چاہیے! اُس دور میں ہم نے بہتوں کو سوچے سمجھے بغیر خط لِکھتے دیکھا اور پھر یہ بھی دیکھا کہ کس اہتمام سے اُن کی "خط بنوائی" ہوئی! خط لِکھنے پر

اُکسانے والا زمانہ یقیناً یوسف رضا گیلانی پر بھی گزرا ہوگا تبھی تو وہ دُنیا کی باتوں میں نہ آئے اور پارٹی پر منصب قربان کر ڈالا! ایسے جیالے ہی پیپلز پارٹی کے انجن کا ایندھن ہیں۔

اور اب راجہ پرویز اشرف کو مختلف حلقے طرح طرح کے لارے لپّے دے رہے ہیں۔ اُنہیں یقین دلایا جارہا ہے کہ خط لکھ کر وہ تاریخ رقم کریں گے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ وزیر اعظم جب پانی و بجلی کے وزیر تھے تب "مثالی" لوڈ شیڈنگ اُن کے حصے میں آئی اِس لیے اُن کے ذہن میں بھی تھوڑی بہت تاریکی ضرور ہوگی۔ یقین جانیے ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ جب اپنے معاملات پر غور مقصود ہو تو اہل سیاست کے دِماغ کی بتّی خوب جلتی ہے۔ راجہ پرویز اشرف بھی یقیناً اُس دور کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں جب دِل ہر وقت خط لکھنے پر اُکساتا رہتا تھا! تھوڑی بہت دُنیا تو اُنہوں نے بھی دیکھی ہے اور اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کوئی بھی ایسا ویسا خط لکھنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور اگر خط غلط ہاتھوں میں جا پڑے تو کیسے انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے! یہ تو غالب تھے جو کسی کے نام کے عاشق ہونے پر بغیر مطلب کے (یا مطلب سمجھے بغیر) بھی خط لکھ بیٹھتے تھے۔ راجہ پرویز اشرف کو معلوم ہے کہ اب کسی کے نام کا عاشق ہونا اِس بات کا متقاضی ہے کہ خط نہ لکھا جائے! یہی سبب ہے کہ وہ خطِ مُستقیم میں سفر کر رہے ہیں یعنی اِدھر اُدھر دیکھنے کے بجائے وزیر اعظم

ہاؤس کی مُنڈیر سے صرف ایوان صدر کی طرف دیکھتے ہیں ! اُنہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ سیاسی طلسمات آج کل پورے جوبن پر ہے۔ ایسے میں اگر نظر بھٹکی اور کسی کی پُکار پر پلٹ کر دیکھا تو پتّھر کا ہو جانے کا امکان ہے !

چکوری" میں ندیم نے گایا تھا"

لکھے پڑھے ہوتے اگر تو تم کو خط لکھتے

راجہ پرویز اشرف یہ بہانہ نہیں تراش سکتے کیونکہ گریجویٹ اسمبلی سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ہاں اِتنا اُنہیں ضرور معلوم ہے کہ جس طرح کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا بالکل اُسی طرح اُن کے قلم سے لکھا ہوا خط بھی خود اُنہی پر قیامت ڈھا سکتا ہے !

سادگی اُن لوگوں پر ختم ہے جو اب بھی یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ راجہ پرویز اشرف سوئس حکومت کو خط لکھ کر صدر کے خلاف کیسز ری اوپن کرنے کی سفارش کریں گے۔ گیلانی گدّی نشین تھے جنھوں نے وزارتِ عُظمٰی کی قربانی دیکر اپنی آبرو بھی بچائی اور راجہ پرویز اشرف کو بھی، کم از کم سیاست کی حد تک، گدّی نشین کر دیا ! اب عالم یہ ہے کہ وہ سب سے بڑے وزیر کی گدّی پر بیٹھے ہیں مگر خط کا معاملہ اُن کی گُدّی پر چڑھ بیٹھا ہے !

کرشن بہاری نُور کہتے ہیں

اُس تشنہ لب کی نیند نہ ٹوٹے خُدا کرے
جس تشنہ لب کو خواب میں دریا دِکھائی دے!

راجہ پرویز اشرف اقتدار کی میٹھی نیند میں ہیں۔ سُندر سپنا چل رہا ہے۔ وہ کیوں چاہیں گے کہ اقتدار کی فلم کے دی اینڈ میں ہیرو کی پٹائی ہو؟ ایک چھوٹے سے خط کے چکّر میں پڑ کر وہ وزارتِ عظمیٰ کے منصب سے ہاتھ دھونا یقیناً پسند نہیں کریں گے!

انتخابی دال میں بلدیاتی نظام کا تڑکا

صدر آصف علی زرداری یاروں کے یار ہیں۔ جو یاروں کا یار ہوتا ہے وہ دشمنوں کا دشمن بھی ہوتا ہے! جس انسان میں یہ دونوں اوصاف یا خصوصیات پائی جائیں اُس کا حافظہ غضب کا ہوتا ہے اور غضب ڈھانے پر کمربستہ بھی رہتا ہے۔ صدر زرداری نے ساڑھے چار برسوں کے دوران ثابت کیا ہے کہ وہ جب چاہیں، بھولنے کی بیماری کو اپنے ذہن میں activate کر سکتے ہیں! اور پھر جب بھی اُن کا موڈ ہو، بہت کچھ بُھولا ہوا یاد بھی آ جاتا ہے! صدر جب سیاسی بازار کی رونق بڑھانے کے mood میں ہوتے ہیں تب اُن کا حافظہ جب activation کے mode میں آتا ہے تب قومی سیاست میں ہلچل مچتی ہے اور لکھنے والوں کی، تھوڑی دیر کے لیے چاندی ہو جاتی ہے۔ بعض کمپیوٹرز سوفٹ ویئرز کی بدولت کوئی بھی چیز کمپیوٹر کے مانیٹر پر اچانک اُبھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اِسے pop-up کہا جاتا ہے۔ بلدیاتی نظام کا اِشو بھی ہماری سیاست میں وقفے وقفے سے pop-up ہوتا رہا ہے۔ اب یہ اِشو ایک بار پھر ہمارے سامنے اپنے تمام جلوؤں کے ساتھ بے نقاب ہے۔ جب جب یہ اِشو سَر اُٹھاتا ہے، بہت کچھ بدلنے لگتا ہے یا بدلتا دکھائی دیتا ہے۔ اِس وقت بھی سندھ کی سیاست میں بہت کچھ بدلنے کے مُوڈ میں دکھائی دے رہا ہے۔ کل تک جو

حکومتی اتحاد میں شامل رہ کر اقتدار کے مزے لُوٹ رہے تھے وہ اب کانٹوں پر لَوٹ رہے ہیں!

مون سون اب ختم ہو چلا ہے اور انتخابی موسم کی بونداباندی شروع ہو چلی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انتخابات کی بات چلے اور بھولے بھٹکے ہی سہی، بلدیاتی انتخابات کو یاد نہ کیا جائے؟ جس طرح باربی کیو شاپ پر مُرغیاں لٹکی ہوئی ہوتی ہیں بالکل اُسی طرح حکومت نے مقامی اداروں کے نظام اور انتخابات کا معاملہ ساڑھے چار سال تک سیاسی باربی کیو شاپ پر اُلٹا رکھا ہے۔ اور اب جبکہ بلدیاتی معاملات کی چکن لٹکے لٹکے سڑ چکی ہے تو اُسے بھون کر عوام کے سامنے رکھنے کا عندیہ دیا جارہا ہے!

بلدیاتی نظام کا ٹنٹا ساڑھے چار برسوں میں کئی بار کھڑا ہوتا رہا ہے یا کھڑا کیا جاتا رہا ہے۔ اب پھر سندھ میں بلدیاتی آرڈیننس جاری کرکے رونق میلہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض کی نظر میں بلدیاتی نظام کی خوشبو سوندھی سوندھی ہے جبکہ دوسرے بہت سے لوگ کہہ رہے ہیں کہ عام انتخابات کا مزا کرکرا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ہماری سیاست بھی کیا عجب مزاج لیکر وارد ہوئی ہے۔ ناصر کاظمی مرحوم نے کیا

خوب کہا ہے۔

گزر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دِل
!سحر کی آس تو ہے، زندگی کی آس نہیں

بیشتر سیاسی جماعتوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
!دِل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

جنہیں گزشتہ انتخابات میں کچھ نہیں مل سکا تھا وہ ساڑھے چار سال سے انتظار کا کشٹ" اٹھا رہے ہیں کہ انتخابی میلہ لگے تو پھر اپنی دکانداری چمکائیں! مگر انتخابات سر" پر آ چکنے کے باوجود دُور جاتے دِکھائی دے رہے ہیں۔ ملک کے حالات نے انتخابی معاملات کو بھی اٹکانے اور لٹکانے کی قسم کھا رکھی ہے۔

سندھ میں بلدیاتی آرڈیننس کے اجرا سے سیاسی پانیوں میں کچھ پتھر پڑے تو ہیں، تھوڑی بہت ہلچل مچی تو ہے۔ سندھ حکومت میں بہت کچھ اُلٹ پلٹ گیا ہے۔ اتحادیوں نے حکومت چھوڑ کر احتجاج کا مورچہ لگانے کی قسم کھالی ہے۔ صدر زرداری کو معلوم ہے کہ کِس اتحادی کو کِس حد تک خوش رکھنا ہے اور کِس کی ناراضی کا متحمل ہونا ہے۔ ممبئی کی عوامی بھاشا میں کہیے تو سندھ کی سیاسی منڈی اِس وقت "بھاؤ کھا رئیلی ہے!" مگر خیر، سیاسی منڈی میں بھاؤ کچھ اِسی

طور اونچائی پر جایا کرتا ہے! سب کو ناراض تو کیا جاسکتا ہے، ہر ایک کو خوش رکھنا کسی طور ممکن نہیں۔

وقت نکالنے اور وقت گزارنے کا ہُنر سیاست میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ساڑھے چار برسوں میں صدر زرداری نے ثابت کیا ہے کہ وہ اِس ہُنر میں بھی یکتا ہیں۔ بلدیاتی نظام کے گڑے مُردے کو وقفے وقفے سے زندہ کرنا، سیاسی سرد خانے سے باہر لانا اور تھوڑی بہت "بلی" چڑھا کر دوبارہ (عارضی) موت کی نیند سُلانا کچھ آصف علی زرداری ہی کا خاصہ ہے اور وہ اِس کا عملی مظاہرہ بھی عمدگی سے کر رہے ہیں۔ بلدیاتی سیاست کی بلّی ایک بار پھر تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ سندھ میں کچھ لوگوں کی مُراد بر آئی ہے کہ اُنہیں احتجاج کے نام پر عوام کے سامنے آنے اور نئے "ایجنڈے" کے تحت سیاسی دُکان چمکانے کا موقع ملا ہے۔ اگر دِل ہی دِل میں صدر کو کوسنے والے کم نہیں تو اُنہیں دِل کی گہرائیوں سے دُعائیں دینے والے بھی اچھے خاصے ہیں! سندھ کی حد تک تو صدر زرداری نے معاملات کو تہہ و بالا کردیا ہے تاکہ سیاست کے مُردے میں کچھ جان تو پڑے، محفل کی رونق کچھ تو بڑھے۔ ایک بار پھر ثابت ہوگیا کہ صدر زرداری سب پر نہ سہی، بہتوں پر بھاری ہیں!

سیاسی چولھا تیز آنچ کے ساتھ جل رہا ہے۔ انتخابی پتیلی بھی چولھے پر چڑھائی

جا چکی ہے۔ لوگ جوتیوں میں دال بانٹے جانے کے منتظر ہیں۔ انتخابی پتیلی میں جو دال پک رہی ہے اُس میں تڑکے کی کمی بھی پوری کر دی گئی ہے۔ انتخابی دال میں بلدیاتی نظام کا تڑکا وہی شور پیدا کر رہا ہے جو تڑکا لگانے سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ تڑکے کے شور میں بعض اتحادیوں کی بھنبھناہٹ بھی شامل ہو کر وکھری ٹائپ کا صوتی تاثر پیدا کر رہی ہے!

مہنگائی کے فائدے

اگر آپ اِس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ نے کوئی بھی چیز نکمّی پیدا نہیں کی تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مہنگائی کے بھی کچھ نہ کچھ فوائد ضرور ہوں گے۔ مہنگائی کا فائدہ سرمایہ داروں اور کاروباری، بالخصوص تجارتی برادری کو تو پہنچتا ہی ہے جو کسی بھی چیز کے نرخوں میں راتوں رات ہونے والے اِضافے سے اپنی تجوری خوب اور بر وقت بھرتی ہے۔ آپ سوچیں گے یہ کون سی انوکھی بات ہے؟ مہنگائی کا فائدہ تاجر برادری کو تو پہنچتا ہی ہے۔ ٹھیک ہے، مگر حالات اور غربت کے ستائے ہوئے لوگ بھی مہنگائی کے فوائد سے محروم نہیں رہتے۔

بھارت کے ایک وزیر فرماتے ہیں کہ مہنگائی کے بھی چند فوائد ہیں۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جن کی اپنی بظاہر کوئی قیمت اور وقعت نہیں ہوتی اُن کسانوں کو اُن کی پیداوار کی بہت اچھی قیمت مل جاتی ہے! موصوف یہ وضاحت نہیں کی کہ اگر مہنگائی بڑھنے سے پیداوار کے دام اچھے ملتے ہیں تو بھارت میں ہر سال کسان خودکشی کی فصل کیوں اُگاتے ہیں!

کسانوں کو اچھی قیمت ملنے یا نہ ملنے کا ہمیں تو کچھ پتہ نہیں مگر ہاں

اِتنا ہمیں ضرور معلوم ہے کہ مہنگائی سے غریب کی زندگی میں چند ایک مثبت تبدیلیاں بھی رُونما ہوتی ہیں۔

قیمتیں جب تک زمین پر ہوتی ہیں، غریبوں سے اُلجھتی رہتی ہیں اور رات دن اُس کا ناک میں دم کرتی رہتی ہیں۔ جب وہ آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں تو غریبوں کو اپنے آپ سے "بتیانے" کا تھوڑا بہت موقع ملتا ہے! ویسے ہم آج تک یہ نہیں سمجھ پائے کہ قیمتیں آسمان ہی سے باتیں کیوں کرتی ہیں اور کیا باتیں کرتی ہیں!

مہنگائی اگر وقفے وقفے سے یعنی تواتر کے ساتھ بڑھتی رہے تو غریب آدمی رات دن غور و فکر میں غرق رہتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یعنی تقریباً ہر وقت وہ مراقبے کی سی حالت میں پایا جاتا ہے اور آمدنی کا گراف گرنے کے ساتھ ساتھ اُس میں عجز واِنکسار کا گراف بُلند ہوتا جاتا ہے! کس طرح گزارا ہوگا یہ سوچ سوچ کر غریب کا ذہن رفتہ رفتہ دانش وری کی حدوں کو چُھونے لگتا ہے! یعنی اگر حکومت چاہے تو مُلک میں دانش وری کی سطح قابل رشک حد تک بُلند کر سکتی ہے۔ اور بے فکر رہیے، وہ ایسا ہی کر رہی ہے! جن معاشروں میں مہنگائی نہ ہو اُن میں زیادہ ہلچل نہیں پائی جاتی۔ ہمیں تو

اِس بات پر حیرت ہے کہ کئی معاشروں میں کھانے پینے اور روز مرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتیں

زمیں جُنبد، نہ جُنبد گل محمد

کے مصداق کئی کئی سال یکساں رہتی ہیں۔ قیمتیں ایک جگہ بیٹھے بیٹھے تھک نہیں جاتیں؟ یہ تو بہت ہی بیزار کردینے والی حالت ہوئی! ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایسے معاشرے ترقی "کس طرح کرلیتے ہیں! یہ مہنگائی ہی کا کرشمہ ہے کہ اِس کے بڑھتے رہنے سے" بہت کچھ ہلتا جُلتا رہتا ہے اور رونق میلہ لگا رہتا ہے۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ مہنگائی بڑھنے سے اِنسان زیادہ کمانے کا سوچتا ہے۔ اگر غریب کی زندگی میں مہنگائی نہ ہو تو وہ زیادہ کمانے کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دے گا! جب چیزیں مہنگی ہوتی جاتی ہیں تب ہی تو غریبوں کو بھی خیال آتا ہے کہ کچھ اِضافی کمایا جائے ورنہ بھاگتا چور لنگوٹی بھی ہاتھ نہ آنے دے گا! اوراِس سے بھی ایک قدم آگے جاکر، مہنگائی کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگوں کو کمانے کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے! پس ثابت ہوا کہ حکومتی مشینری کی بھرپور مشقت کے نتیجے میں جو مہنگائی جنم لیتی ہے وہ ناکارہ بیٹھے ہوئے لوگوں کو کام پر لگاتی ہے! حکومت روزگار کے ذرائع پیدا کرکے لوگوں میں تقسیم کرے تب بھی اُن میں کام کرنے کی وہ تحریک پیدا نہیں ہوتی جو اشیائے ضرورت کے نرخوں میں غیر معمولی اِضافے سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی مہنگائی قوم کی رگوں میں لہو گرم رکھنے کا ایک انتہائی خوبصورت بہانہ

!ہے
بیشتر دُکاندار خواتین کو 100 کی چیز کے دام 400 بتا کر 50 فیصد ڈسکاؤنٹ دیتے کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف خواتین کا دِل یہ سوچ کر done ہوئے سودا 200 میں خوش ہو رہتا ہے کہ اُنھوں نے دُکاندار کو ٹھگ لیا! حکومت بھی اپنی دُکانداری مضبوط کرنے کے لیے بس کچھ ایسی ہی کیفیت مہنگائی کے ذریعے پیدا کرتی ہے! پہلے تو دام بڑھائے جاتے ہیں اور جب شور شرابہ ہوتا ہے تو نرخ کچھ کم کر دیئے جاتے ہیں۔ عوام !کے دِل یہ سوچ کر خوش ہو رہتے ہیں کہ چلو، حکومت سے اپنی بات منوالی
اب آپ ہی بتایئے کیا عوام کو خوش ہونے کا موقع دینا کوئی بُری بات ہے؟ حکومت کو تو اِس کا کریڈٹ دینا چاہیے۔ مگر بعض عاقبت نا اندیش قسم کے لوگ مہنگائی کا رونا رو کر حکومت کو خواہ مخواہ کوستے رہتے ہیں! یقین کیجیے یہ ناشُکرا پن ہی ہمارے معاشرے کو !ترقی" کی راہوں پر آگے بڑھنے سے روک رہا ہے"
ہم نے بعض اوقات مہنگائی کے انتہائی روح پرور اثرات کا بھی مُشاہدہ کیا ہے۔ بیشتر غریب جب مہنگائی کے ریلے کے سامنے بند باندھنے میں سراسر ناکام ہو

جاتے ہیں تب اُن کی طرز عمل میں غایت درجے کی نرمی، ٹھنڈک اور مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام تو قوم کو تبدیل نہ کرسکا مگر مہنگائی میں قُدرت نے یہ خوبی رکھی ہے کہ جب یہ اپنی منطقی حد سے گزرتی ہے تو اِنسان کو "ٹھنڈا ٹھار" کردیتی ہے! یاد رکھیے، اِنسان کے مزاج کی ساری غیر ضروری شورش اور تیزی ختم کرکے شرافت، نرمی اور اِخلاص پیدا کرنے والی صرف دو ہی چیزیں پاکستان میں پائی جاتی ہیں۔ ایک ہیروئن کا نشہ اور دوسرے اولمپک کی ریس میں حصہ لینے والوں کی طرح بے لگام ہو کر !دوڑتی ہوئی مہنگائی

ہم تو پاکستان کی اولمپک کمیٹی کے حکام کو یہ مشورہ دیں گے کہ اگلے اولمپکس کے لیے ایتھلیٹس کے ساتھ ساتھ مہنگائی کو بھی قومی دستے کا حصہ بنایا جائے۔ مہنگائی میں اِضافے کی رفتار دیکھتے ہوئے ہمیں اُمید ہے کہ یہ بھاگ دوڑ والے چار چھ ایونٹس میں تو پاکستان کو وکٹری اسٹینڈ پر سب سے بُلند کھڑا کرکے قومی ترانہ بجوا ہی دے گی! اور کیوں نہ بجوائے گی، فقید المثال مستقل مزاجی کے ساتھ مہنگائی آخر ہمارا بینڈ بھی تو بجاتی !آئی ہے

نایک یا کھلنایک؟

حکومت کے تو مزے آ گئے۔ اُسے ایک بار پھر مُہلت مل گئی۔ اور دوسری طرف سپریم کورٹ کو بھی، ذرا سی دیر کے لیے سہی، آرام آ گیا۔ کام اِتنا بڑھ گیا ہے کہ اب اعلیٰ عدلیہ کو سُکون کا سانس لینے کے لیے بھی سو موٹو ایکشن لینا پڑتا ہے! آصف علی زرداری کے خلاف کرپشن کیسز کُھلوانے کے سلسلے میں سوئس حکومت کو لکھے جانے والے خط کی سُوئی اِس بار وزیر قانون فاروق ایچ نایک پر آ کر اٹکی ہے۔ قوم یہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہے کہ وہ نایک ہی رہتے ہیں یا کھلنایک ثابت ہوتے ہیں! سُنا ہے حکومت کے قانونی ماہرین نے خاصی طویل اور صبر آزما مشاورت کے بعد فیصلہ کیا کہ اِس بار گھنٹی وزیر قانون کے گلے میں باندھی جائے۔ مگر قوم خوب سمجھتی ہے کہ وزیر موصوف شیر کی خالہ نہیں بلکہ قُربانی کے بکرے ہیں! وہ یہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہے کہ عید الاضحیٰ سے قبل ایک اور سیاسی ذبیحہ واقع ہوتا ہے یا نہیں!

قرون وسطٰی کے مشہور حکیم ابن سینا نے "القانون فی الطب" لکھ کر نیک نامی سمیٹی تھی۔ جن کی مہربانی سے سینیٹ کی چیئرمین شپ اور پھر قانون کی وزارت ملی ہے اُن کے نمک کا حق ادا کرنے کے لیے فاروق نایک شاید "الخط والقانون

فی الحکومت " لکھ کر کچھ نام کمانے کے سفر پر نکلے ہیں! یہ سب "وفاداری بہ شرطِ اُستواری" سے زیادہ کچھ نہیں لگتا۔ مگر خیر، پیپلز پارٹی خوش نصیب ہے کہ اُسے اب تک جاں نثار بلکہ وزارت نثار قسم کے کارکن میسر ہیں! ذرائع کا دعویٰ ہے کہ وعدے کے مطابق سپریم کورٹ میں پیش کیا جانے والا (خط کا) مُسوّدہ ایسا ہوگا جس کے کئی نکات پر کورٹ کو اعتراض ہوگا اور "خط اسکینڈل" کی لہریں پھر مہلت کے ساحل سے آ ٹکرائیں گی! ہم حکومت کے حوالے سے ایسی کوئی بدگمانی نہیں رکھتے۔ جب اِس سے کہیں کم درجے کی دانائی اور معاملہ فہمی سے بھی کام چل ہی رہا ہے تو خواہ مخواہ مزید بدنامی مول لینا حماقت کے سِوا کچھ نہیں!

ایک خط نے پوری قوم کے معاملات کو خطِ مُنحنی میں تبدیل کر دیا ہے۔ خط نہ ہوا، قوم کے گلے کا طوق ہوگیا۔ اہل وطن سوچتے ہیں کہ جس خط نے لکھے جانے سے پہلے اِس قدر یعنی اچھا خاصا "رولا پا دیا ہے" وہ لکھے جانے پر کون سی قیامت نہیں ڈھائے گا! ایسے میں، ظاہر ہے، حکومت سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ خط کے معاملے میں خطِ مستقیم پر گامزن ہوگی!

اور معاملہ ایک خط کا نہیں۔ ایک خط لکھنا ہے تو دوسرا واپس لینا ہے۔ وزیر اعظم نے 18 ستمبر کو سپریم کورٹ میں پیش ہوکر بتایا کہ اُنھوں نے سابق

اٹارنی جنرل ملک قیوم کی جانب سے 2007 کے آخر میں سوئس حکومت کو لکھا جانے والا وہ خط واپس لینے کی ہدایت بھی کردی ہے جس میں صدر آصف علی زرداری کے خلاف کیسز نہ کھولنے کی یا کُھلے ہوئے کیسز ختم کرنے کی استدعا کی گئی تھی۔ حکومتوں کی بہت سی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں اور پیچیدگیاں تو خیر ہوتی ہی ہیں مگر ہماری حکومت خدا جانے کن خطوط پر اُستوار ہے کہ کرنے کے کام کرنے کی پوزیشن میں آ ہی نہیں پارہی!

راجہ پرویز اشرف کی پریشانی بھی ایسی نہیں کہ ہم آپ سمجھ نہ سکیں۔ بڑی منّتوں، مُرادوں سے جو منصب ملا ہے اُسے کھونا وہ کیوں پسند کریں گے؟ اب "دھرم سَنکٹ" یہ آن پڑا ہے کہ ایک طرف منصب کا مزا ہے اور دوسری طرف پارٹی سے وفاداری ہے۔ یعنی اِدھر کھائی اور اُدھر پہاڑ۔ بے چارے وزرائے اعظم کو بھی کیسی کیسی اُلجھنوں سے نپٹنا پڑتا ہے! عام آدمی کیا جانے کہ اِس راہ میں کتنے اور کیسے کیسے سخت مقام آتے ہیں۔ کبھی وزیر اعظم بنا ہو تو معلوم ہو!

حکومت کے قانونی ماہرین کی ٹیم نے کوشش تو کی ہے کہ راجہ پرویز اشرف کا "پلیژر ٹرپ" چلتا رہے، حکومتی ٹرانسفار مر میعاد ختم ہونے سے پہلے کِسی صورت ٹرپ نہ ہو! بعض کو یہ گمان ہے کہ سپریم کورٹ کو ٹریپ کرنے کی کوشش کی جارہی

ہے۔ مگر صاحب، سپریم کورٹ نے بھی کوئی کچّی گولیاں تو نہیں کھیل رکھیں۔ مُہلت دے کر وہ بھی حکمتِ عملی کے لیے کچھ وقت نکالنے میں کامیاب رہی ہے۔

اعلیٰ ترین اداروں میں مُہلت اور التواء کا سلسلہ جاری ہے اور قوم کے رگ و پَے میں یہ غم سرایت کئے

ہوئے ہے کہ حالات کا ٹائی ٹینک کہاں جا کر رُکے گا۔ قوم کا حال تو یہ ہے کہ احتجاج کی دلدل میں گلے تک دھنسی اور پھنسی ہوئی ہے۔ احتجاج، ریلیاں، مظاہرے اور دھرنے اُس کی تقدیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اب پنجسالہ منصوبوں میں عوام کو مختلف جھمیلوں میں اُلجھائے رکھنے کی منصوبہ بندی بُنیادی حیثیت رکھتی ہے! میڈیا کے ذریعے اِشو پر اِشو کھڑا کیا جا رہا ہے۔ ایک معاملہ دم توڑنے لگتا ہے تو کسی اور معاملے کے مُردے میں جان ڈال دی جاتی ہے تاکہ رونق میلہ لگا رہے اور قوم کے ذہن کی گود رنگ سے، اُمنگ سے بھری رہے!

قوم کی نفسی ساخت میں یہ بات "ڈیفالٹ" کی حیثیت سے ڈال دی گئی ہے کہ جب کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے تو امریکہ اور یورپ کو گالیاں دے کر دِلوں کی بھڑاس نکال لو، کلیجوں کو ٹھنڈک پہنچانے کا اہتمام کرلو! حکومت اپنی ڈگر پر چل

رہی ہے، عوام البتہ ڈگر بدلتے رہتے ہیں۔ بدلتے حالات کے مطابق خود کو بدلتے رہنے اور احتجاج کے نئے طریقے اختیار کرنے کا ہُنر جیسا پاکستانیوں نے سیکھ لیا ہے ویسا کسی نے نہیں سیکھا۔ اور یہ ہُنر خیر سے "عالمی معیار" کا ہے یعنی دُنیا جو کچھ چاہتی ہے ہم وہی کر رہے ہیں۔ اپنے پیروں پر کلہاڑی کون مارتا ہے؟ ہم مار رہے ہیں! اپنی معیشت کو آگ کون لگاتا ہے؟ ہم لگا رہے ہیں! اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ دُنیا کیا چاہے؟ ہماری تباہی۔ اور ہم بخوشی اِس کا اہتمام کر رہے ہیں یعنی اغیار کو زحمت سے بچا رہے ہیں! اِتنے پیسوں میں اِتنے مزے کسی کو اور کہاں ملیں گے؟

وزیر اعظم کو سپریم کورٹ میں پیشی سے استثنٰی مل گیا ہے۔ جن کے رُتبے بڑے ہیں اُن کے لیے اِستثنٰی بھی بڑا ہے! صدر زرداری استثنٰی کا رونا روتے آئے ہیں اور راجہ پرویز اشرف کو حکم کی تعمیل کے سِلسلے میں استثنٰی مِل بھی گیا۔ اور خیر سے حکومت کی بَلا بھی وزیر قانون کے سَر جاچکی ہے! اب دیکھنا یہ ہے کہ سیاسی سرکس کے اِس بیلینسنگ ایکٹ میں فاروق نایک کس حد تک نایک یعنی ہیرو ثابت ہوتے ہیں!

اُدھار نہ کیا تو پھر کیا جیا

زمانے کا چلن یہی ہے کہ اگر کوئی غلط بات بھی پھیل جائے تو بس پھیلاتے ہی جایئے۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ جس چیز سے محبت بڑھتی ہے اُسی کو لوگ ہر وقت بدنام کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، یہی سُنتے آئے ہیں کہ اُدھار محبت کی قینچی ہے۔ اب جبکہ ہوش خاصے سنبھل چکے ہیں، غور کرنے پر اندازہ ہوا ہے کہ محبت کے حوالے سے اُدھار کو صرف بدنام کیا جاتا رہا ہے۔ ہم نے تو اُدھار کی بدولت محبت کو پنپتے دیکھا ہے! اگر یقین نہ آئے تو اُدھار دینا شروع کیجیے اور پھر دیکھیے کہ آپ کے چاہنے والوں اور آپ کو "بھائی جان، مہربان، قدر دان" قرار دینے والوں کی تعداد میں کس قدر اور کس تیزی سے اضافہ ہوتا ہے!

آپ نے بھی سُنا ہی ہوگا کہ

قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا

یعنی کم کم ملیے اور محبت بڑھایئے۔ جسے اُدھار دیجیے اُس سے محبت خود بخود بڑھے گی کیونکہ وہ کم کم ہی دِکھائی دے گا! اور بعض صورتوں میں تو صورت دِکھانے سے بھی گریز کرے گا، محض اِس خیال سے کہ کہیں محبت میں کچھ زیادہ کمی واقع نہ ہو جائے!

یہ وہ کمال ہے جو کوئی بڑے سے بڑا شعبدہ باز بھی نہیں

!دِکھا سکتا

مزے کی بات یہ ہے کہ جو عمل محبت بڑھاتا ہے یعنی کِسی کی شکل گُم کرکے اُس کی طلب میں اِضافہ کرتا ہے وہی عمل بالکل مخالف سمت جاکر بھی آپ کے مَن کی مُراد پوری کرتا ہے! یعنی اگر آپ کِسی کو دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکے ہیں اور اپنی آنکھوں کو کچھ آرام اور سُکون دینے کی غرض سے چاہتے ہیں کہ وہ اپنی شکل گم کرلے تو دیر کِس بات کی ہے؟ اُدھار دیجیے اور آنکھوں کے ساتھ ساتھ کلیجے کو ٹھنڈک پہنچانے کا بھی اہتمام !کرلیجیے

اگر کوئی سنگ دِل آپ کو مُنہ نہیں لگاتا تو کِسی عامل وامل کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ قبرستان سے گلی سَڑی، چٹخی ہوئی، بُھربُھری کھوپڑی نکال کر اُس پر غلام احمد بلور کی بڑبڑاہٹ سے مماثل کوئی وظیفہ پڑھ کر پھونکنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنی کھوپڑی کو استعمال کیجیے یعنی اُدھار کی پیشکش کیجیے۔ پھر دیکھیے کہ اِنتہائی سنگ دِل محبوب بھی کِس طرح آپ کے قدموں میں گرتا اور آپ کے پیروں تلے کی خاک (چھانے بغیر) چاٹتا !ہے

بیشتر دُکانداروں کو ہم نے اُدھار کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی جذباتی پایا ہے۔ آپ نے بہت سی دُکانوں پر "کشمیر کی آزادی تک اُدھار بند ہے" کی تختی

لٹکی ہوئی دیکھی ہوگی ! ہمیں تو لگتا ہے ایسے دُکاندار کشمیر کی آزادی پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں ! اِن سے ذرا کوئی پوچھے کہ کیا ہم اِتنے بے وقوف ہیں کہ اِن سے ذرا سا سودا اُدھار خریدنے کی خاطر کشمیر کی آزادی کے نام پر جنگ کا میدان سجالیں ! کون جانے کہ کشمیر کے آزاد ہو جانے پر یہی دکاندار اُدھار دینے کے لیے امن کی آشا کے انت، بلکہ دیہانت کی شرط عائد کردیں ! ایک ذرا سے اُدھار کے چکر میں کشمیر کا اچھا خاصا سدا بہار اِشو بھی (جسے ہم نے حلق پھاڑ قسم کے نعرے لگا لگا کر پروان چڑھایا ہے) ہاتھ سے جائے گا اور امن کی آشا بھی پرماتما سے جا ملے گی ! اُدھار کو فساد کی جڑ بنانے کی یہ سازش دکانداروں کو پسند ہو تو ہو، ہمیں تو ذرا بھی پسند نہیں !

اُدھار کے دم سے دُنیا کا کارخانہ چل رہا ہے بلکہ ساری ترقی اِسی کے دم سے ہے۔ کون سا معاملہ ہے جس میں اُدھار کارفرما نہیں۔ بھارت کے جوش و جذبے اور ترقی میں اُدھار کا مرکزی کردار ہے۔ یہ اُدھار وہ ہے جو بھارت دراصل ہم پر کھائے بیٹھا ہے !

اُدھار لینا ایک فن ہے اور اُس سے بڑا فن ہے اُدھار نہ لوٹانا ! کبھی آپ نے سوچا ہے کہ دُنیا کا بہترین تعلیمی ادارہ بھی وہ سُوجھ بُوجھ، گفتگو کا سلیقہ اور ذہانت نہیں سِکھا سکتا جو اُدھار لینے والا از خود نوٹس کے تحت

کسی کے سکھائے بغیر سیکھ لیتا ہے! ہمارے ہاں مزاج کی نرمی صرف دو طرح کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اُدھار لیکر زندگی بسر کرنے پر یقین رکھتے ہیں اور دوسری طرف ہیں باقاعدگی سے ہیروئن کا نشہ کرنے والے!

اُدھار وہ وصف ہے جو مخلوقات میں ہمیں امتیازی حیثیت دِلاتا ہے، شرف بخشا اور نرمی حیوانیت ختم کرکے اِنسانیت پیدا کرتا ہے۔ اُدھار لینا اور دینا اِس بات کی علامت ہے کہ ہم اِنسان ہیں۔ کبھی آپ نے کسی جانور کو اُدھار لیتے یا دیتے دیکھا ہے!

لوگ کہتے ہیں کہ اب یہ دُنیا رہنے کے قابل نہیں رہی۔ ہر طرف مایوسی کا رونا رویا جاتا ہے مگر کبھی آپ نے سوچا ہے کہ اُدھار کے دم سے ابھی تک اُمید کے باغ کی بہار سلامت ہے! جو اُدھار لینے گھر سے نکلتے ہیں وہ خوش اُمیدی اور مثبت فکر کی جیتی جاگتی تصویر ہیں اور جو لوگ دیئے ہوئے اُدھار کی واپسی کی آس لگائے رہتے ہیں وہ تو رجائیت یعنی اُمید پرستی کے انتہائی درجے پر فائز ہیں!

اُدھار اِنسان میں کئی دوسرے اوصاف بھی پیدا کرتا ہے مثلاً بھرپور اعتماد

اور غیر متزلزل یقین۔ کچھ لوگ اِس اعتماد کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں کہ کبھی اُدھار نہیں لوٹائیں گے! بہت سے لوگ اِس یقین کے ساتھ جیتے ہیں کہ اُنہیں اُدھار مل کر رہے گا۔ اور وہ اکثر جیتتے ہیں!

دیا ہوا اُدھار ہم میں اُمید کا چراغ روشن رکھتا ہے۔ اور پھر یہ اُمید آخرت پر ہمارا یقین بڑھا دیتی ہے۔ کبھی کبھی ہمیں اپنی دی ہوئی رقم ڈوبی ہوئی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ مومن کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ جو رقم ہمیں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہے وہی آخرت پر یقین بڑھانے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے، یعنی ہمیں یقین ہو رہتا ہے کہ اِس دُنیا میں نہ سہی، اُس دُنیا میں تو ہم وصولی کر ہی لیں گے!

اُدھار نام ہے اُس اعتماد کا جو ہمیں آنے والی نسلوں پر ہے۔ ہم آج جو اُدھار دنیا بھر سے لے رہے ہیں اُسے ادا کرنے کی فکر لاحق نہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ آنے والی نسلیں اِسے بخوبی ادا کردیں گی! جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں اُن نسلوں کو اِس غیر متزلزل یقین و اعتماد پر ابھی سے ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے!

اُدھار وہ آکسیجن ہے جس نے ہماری حکومت سمیت کئی سرکاروں کو سانس لینے کے

قابل کر رکھا ہے۔ جو چیز حکومتوں کو زندہ رکھتی ہو وہ اِتنی بُری ہر گز نہیں ہو سکتی کہ ہم اُس سے بچتے پھریں اور اُس کا نام بھی لینے سے کترائیں!

آج کی دُنیا میں دِلوں کو جوڑ کر رکھنے والی ڈوریاں ٹوٹ گئی ہیں۔ ایسے میں اُدھار کا دم غنیمت ہے جو پُل کا کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ پُل نہ رہا تو ہم پھر الگ الگ جزیروں کی حیثیت اختیار کر جائیں گے اور اپنی اپنی ویرانی میں گم رہنے لگیں گے! اچھا ہے کہ اُدھار سلامت رہے اور ہم اِس بہانے ایک دوسرے سے جُڑے رہیں!

ہارنا ضروری ہے

ویسے تو دُنیا میں اور بھی بہت کچھ ہے جس کے بارے میں پورے یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ مثلاً وینا ملک کب کیا کر بیٹھے، کسے دِل دے بیٹھے اور کسے کہیں کا نہ چھوڑے! یا یہ کہ میرا اَفر فَرا انگریزی بولنے لگے! یا پھر یہ کہ ہم اولمپکس میں کوئی گولڈ میڈل (یا کوئی بھی میڈل) جیت لیں! مگر اِس امر پر بہتوں کا اتفاق ہے کہ کرکٹ غیر یقینی اتفاقات کا کھیل ہے، یعنی اِس کے بارے میں پورے یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ بھی لوگوں کی سادہ دِلی بلکہ سادہ لوحی ہے۔ قومی کرکٹ ٹیم، اللہ نظرِ بد سے بچائے، اِس مزاج کی ہے کہ اُس کے بارے میں ایک بات تو پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے، یہ کہ اُس کے بارے میں کوئی بھی بات پورے یقین سے نہیں کہی جاسکتی! آپ نے اگر جیوتش ودیا سیکھی ہے یعنی سِتاروں کی چال سمجھتے ہیں تو ذرا قومی کرکٹ ٹیم کی کوئی ایک چال تو سمجھ کر دِکھایئے، اگر آٹے دال کا بھاؤ معلوم نہ ہو جائے تو ہمارا ذِمّہ!
جب قوم کی تمام اُمیدیں دم توڑنے لگتی ہیں اور ٹی وی سیٹس کے سامنے بیٹھے ہوئے کروڑوں شائقین مایوس ہو کر دوبارہ اپنے اپنے دھندے سے لگنے کی سوچ رہے ہوتے ہیں تب ہمارے کرکٹرز اچانک کچھ ایسا کر گزرتے ہیں کہ مخالفین پر قیامت

گزر جاتی ہے کہ میچ کا پانسا پلٹ جاتا ہے، پوری قوم رہ بچارج ہونے کے بعد انگرائیاں لیتی ہوئی بیدار ہو جاتی ہے اور ہاتھوں سے جاتی ہوئی فتح دیکھتے دیکھتے ہی بڑے پیار سے گرفتاری دے دیتی ہے!

کرکٹ کھیلنے والے کئی ممالک نے مختلف شعبوں میں بہت ترقی کی ہے۔ آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ اِس حوالے سے روشن مثال کا درجہ رکھتے ہیں۔ آسٹریلوی کرکٹ بورڈ کا تو یہ حال ہے کہ کرنے کو اب کچھ نہیں رہا تو کرکٹ کو ٹیکنالوجی کا شاہکار بنانے پر تُلا ہوا ہے!

جنوبی افریقہ کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ ہاشم آملہ جیسے کرکٹرز ایسے منظم انداز سے کھیلتے ہیں کہ کرکٹ محض کھیل نہیں رہتا بلکہ پچ پر آرٹ کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دِکھائی دینے لگتا ہے! ہاشم آملہ ایسا فنکار ہے کہ جب بیٹنگ کرنے پر آتا ہے تو بڑے سے بڑے بولر کو بھی آملے کے مُربّے کی طرح چٹ کر جاتا ہے!

مگر ایک بات ماننا پڑے گی۔ آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے وہ کرکٹ کو بھلے ہی لاکھ سمجھ چکے ہوں، ہمارے کرکٹرز کو سمجھنے میں اب تک ناکام ہی رہے ہیں! اور اِس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ اپنے کرکٹرز کو تو اب تک خود ہم سمجھ نہیں پائے ہیں! ہم نے بہت سے ثقہ ماہرین نفسیات سے سُنا ہے کہ پاکستانی کرکٹرز کی نفسیات کو سمجھنا ایک باضابطہ فن ہے جس میں یدِطُولیٰ حاصل کئے بغیر

کوئی کرکٹ کو پوری گہرائی سے سمجھ نہیں سکتا! ماہرین نفسیات کی رائے سے ہمیں ذرا سا اختلاف یہ ہے کہ قومی ٹیم کے بیشتر کرکٹرز کی نفسیاتی ساخت کو سمجھنے کی کوشش سادہ لوحی کے سِوا کچھ نہیں کیونکہ جو نفسیاتی ساخت ہے ہی نہیں اُسے سمجھنے کی کوشش چہ معنی دارد!

قومی ٹیم کے سُنہرے دور میں وسیم راجہ مرحوم ایسے بیٹسمین تھے جو کسی بھی وقت کچھ بھی کر گزرتے تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جب تک وکٹوں میں گیند کراتے رہیے، وہ آوٹ ہونے کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ چھکے مارنے پر تُل جاتے تھے۔ اور جہاں کسی نے چھٹے یا ساتویں اسٹمپ پر گیند کی، وسیم راجہ چوتھی یا پانچویں سلپ میں کیچ دیکر پویلین کی راہ لیتے تھے! کسی ماہر نفسیات میں دم ہے تو ذرا اِس روش کو سمجھ کر دِکھائے!

آج کے زمانے کی بات کیجیے تو شاہد آفریدی ماشاء اللہ انتہائی روشن مثال ہیں۔ اور اِس مثال میں اِتنی اور ایسی روشنی ہے کہ ایک نظر دیکھنے پر بھی آنکھیں چُندھیا جاتی ہیں! شاہد آفریدی اپنے ذہن (!) میں چند باتیں لکھوا کر لائے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کوچنگ اور پریکٹس کے دوران جو کچھ بتایا اور سِکھایا جائے گا اُسے کچھ ہی دیر میں بھول جانا ہے اور میچ والے دن گراؤنڈ میں اُتر کر وہی کرنا ہے جو کرنا ہے! تماشائی میچ کے دوران حلق پھاڑ کر چِلّاتے ہیں

بُوم بُوم آفریدی" مگر آفرین ہے کہ آفریدی بُرا نہیں مانتے۔ ثابت ہوا کہ اُنہیں فارسی نہیں آتی۔ یعنی وہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ
کہتی ہے "مُجھ" کو خلق خُدا "حاضِرانہ" کیا!
(واضح رہے کہ اُلو کو فارسی میں بُوم کہتے ہیں!)
مگر کیا کیجیے کہ جس ٹیم کی غیر یقینی کارکردگی سے کرکٹ کا حُسن سلامت ہے اُس کے لیے کرکٹ ہی کو کچھ اور بنادیا گیا ہے! تقریباً ڈیڑھ عشرے سے پاکستانی کرکٹ ٹیم کِسی نہ کِسی سطح پر شدید دباؤ کا شکار رہی ہے اور انجینئرڈ نتائج بُھگتنے پر مجبور رہے!
ٹی ٹوئنٹی کے سُپر ایٹ راؤنڈ میں جنوبی افریقہ کو ہرا کر قومی ٹیم نے ایک بار پھر ناقدین اور مُبصرین کو یکساں حیرت زدہ کیا۔ کچھ دیر کے لیے تو ہم بھی حیران ہی رہ گئے کہ یہ کیا ہوگیا۔ پھر خیال آیا کہ پاکستانی ٹیم ہے، کچھ بھی کر سکتی ہے!
پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا یعنی بھارت سے ٹاکرا ہوا اور ہار بھی مُقدر میں لکھی تھی (یا لکھ دی گئی)۔ جب پاکستان اور بھارت کرکٹ کے میدان میں آمنے سامنے ہوتے ہیں تو کئی کھیل انڈر دی ٹیبل بھی کھیلے جارہے ہوتے ہیں! یہ سب

ہوگیا ہے کہ کرکٹ سے ذرا سا بھی شغف رکھنے self-evident کچھ اب اِس قدر والوں کے ساتھ ساتھ خواتین خانہ بھی قومی کرکٹرز کی باڈی لینگویج اور تاثرات سے اندازہ لگالیتی ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے! اور کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ ساری کی ساری دال کالی ہے!

منگل کو ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ کے سپر ایٹ راؤنڈ کے آخری دو میچ تھے۔ پاکستان کا مقابلہ آسٹریلیا اور بھارت کا مقابلہ جنوبی افریقہ سے تھا۔ پاکستان کی فتح کے امکانات بہت محدود تھے اور دوسری طرف بھارت کا جنوبی افریقہ سے کانٹے کا مقابلہ متوقع تھا! پھر وہی ہوا جس کے لیے پاکستانی ٹیم بدنام یا مشہور ہے یعنی آسٹریلیا حیرت انگیز طور پر نہ صرف یہ کہ شکست سے دوچار ہوا بلکہ شکست بھی ایسی تھی کہ پاکستان کا رن ریٹ بہتر کر گئی! دوسری طرف بھارت پر دباؤ بڑھ گیا کہ اُسے سیمی فائنل میں پہنچنے کے لیے جنوبی افریقہ سے صرف جیتنا نہیں تھا بلکہ اِس طرح جیتنا تھا کہ رن ریٹ بہتر ہو۔ پہلے بیٹنگ کرکے بھارت وکٹوں سے فتح کے پہلو سے تو محروم ہوگیا۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ کتنے رنز کے مارجن سے فتح نصیب ہو کہ سیمی فائنل تک رسائی کی راہ ہموار ہو۔ جنوبی افریقہ کے خلاف بھارت نے 152 رنز اسکور کیے۔ لازم تھا کہ جنوبی افریقہ کو 122 کے مجموعی اسکور پر آؤٹ کیا جائے۔ بصورتِ دیگر فتح بھی کسی کام کی نہ تھی۔ اور یہی ہوا۔ بھارت نے ایک رن سے میچ جیت تو لیا مگر یہ فتح

اُسے سیمی فائنل تک لے جانے میں معاون ثابت نہ ہو سکی ! جنوبی افریقہ کی ٹیم نے جیسے ہی 122 کا سنگِ میل عبور کیا، بھارتی کرکٹرز اور تماشائیوں کے چہروں کی بتّی بُجھ گئی ! "ٹیم انڈیا" کے انوکھے لاڈلوں کو پاکستان کے خلاف فتح خرید کر دی گئی مگر اُن کے نصیب میں یہ ذِلّت بھی لکھی ہوئی تھی کہ جسے پچھاڑ کر جنگ جیتنے جیسی خوشی سے سرشار تھے وہی سیمی فائنل میں گئی اور آسمانی رنگ کی کِٹ پہننے والوں کو بے نیل و مرام گھر جانا پڑا !

ایک پس ماندہ اور واماندہ قوم کے آنسو پُنچھ گئے۔ بھارت کے ہاتھوں شکست کا دُکھ ختم ہوا اور سیمی فائنل میں پہنچنے کی خوشی سے۔بڑی خوشی یہ تھی کہ بھارت کی ٹیم نے گھر کی راہ لی ! امن کی آشا کے نام پر سُپر ایٹ راؤنڈ کا میچ بھارت کی گود میں ڈلوانے والوں کو یقیناً بہت مایوسی ہوئی ہوگی کہ لاکھ سازش اور کوشش کے باوجود پاکستان سیمی فائنل تک پہنچ گیا۔

سیمی فائنل میں میزبان سری لنکا کے ہاتھوں شکست ضرور ہوئی مگر قوم کا دِل زیادہ نہیں دُکھا۔ دُکھتا بھی کیوں؟ جن کی خوشی کے لیے اپنی ٹیم کے ہاتھ پیر باندھ کر پُورا کا پُورا میچ بساط کی طرح لپیٹ کر دے دیا گیا تھا اُنہیں سیمی فائنل میں پہنچنے کی خواہش دِل میں دبائے، آنسو بہاتے ہوئے اپنے دیش واپس جانے پر مجبور جو ہونا پڑا تھا ! جو لوگ یہ کہتے نہیں تھکتے

کہ کھیل کو صرف کھیل سمجھنا چاہیے اور شکست و فتح کو دِل و دِماغ پر سوار نہیں کرنا چاہیے کوئی ذرا اُن سے پوچھے کہ بھارت کو پاکستان کے ہاتھوں شکست کیوں قبول نہیں اور کیوں یہ معاملہ حکومتی سطح پر طے کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا؟

اگر امن کی آشا ایک طرف ہٹادی جائے تو آج بھی پاکستانی کرکٹرز "ٹیم انڈیا" کو کسی بھی وقت اور کسی بھی گراؤنڈ میں عبرت ناک شکست سے دوچار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سُپر ایٹ راؤنڈ میں بھارت کے خلاف پاکستانی بلّے بازوں نے ابتدائی چار اوورز کے دوران دھوادار بیٹنگ کرکے ثابت کردیا تھا کہ بھارتی ٹیم کچھ بھی نہیں مگر کیا کریں، مجبوری ہے، ہارنا ضروری ہے!

اب حکومتوں کی سطح پر کھیلا جانا والا کھیل بند ہونا چاہیے۔ اچھا ہے کہ کرکٹ کو کرکٹ ہی رہنے دیا جائے۔ بھارتی قیادت کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے کہ کسی بھی کھیل کو جنگ کی سی کیفیت سے دوچار کرنا درست نہیں۔ علاقے کا چوہدری بننے کا شوق اپنی جگہ مگر یہ کیا کہ اپنے گھر کو روشن کرنے کے لیے دوسروں کے گھر کا چراغ بُجھادیا جائے!

اور آخر میں ایک کام کی بات۔ سری لنکا کے خلاف سیمی فائنل میں شکست سے دِل کا رنجیدہ ہونا فطری امر تھا۔ مگر صاحب، سری لنکن صدر نے قومی کرکٹ ٹیم کو

پاکستان جانے کے لیے گرین سگنل دیکر کہانی کو کسی حد تک بیان کرنے کی کوشش کی ہے! کھیل کے میدان میں مسابقت کے فیصلے جب اقتدار کے ایوانوں میں ہوتے ہیں تو ایسے ہی گرین سگنلز سامنے آیا کرتے ہیں!

بولتے رہو، مزا آرہا ہے!

کسی زمانے میں کراچی روشنیوں کے ساتھ ساتھ علم کا شہر بھی تھا۔ اب روشنی رہی نہ علم۔

بے بسی اب کیا بتائیں کتنی خود سر ہو گئی
روشنی کے شہر میں ظلمت مقدر ہو گئی!

اب ہمیں صرف اِتنا علم ہے کہ علم حاصل کرنے کی خواہش ہے تو ضروری ہے کہ چین تک جایئے کہ کراچی میں ایسے ادارے خال خال ہیں جو علم کی بات کریں اور معیاری تعلیم کے ذریعے نئی نسل کو منزل کی طرف لانے کی خواہش اور سکت رکھتے ہوں۔

کراچی کے رُخ پر پایا جانے والا ایک ایسا علمی خال (تِل) "کومیکس کالج" بھی ہے جس کا اعلیٰ معیار کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ گزشتہ دنوں اِس ادارے نے بین الجماعتی تقریری مقابلے کا اہتمام کیا تو روزنامہ دُنیا (کراچی ایڈیشن) میں رفیق کار اور سٹی ایڈیٹر عابد حسین کی تجویز پر ادارے کی کوآرڈینیٹر انیلہ خان نے خاکسار کو بھی یاد کیا۔

ہم نے گھر میں ذکر کیا تو اہلیہ نے کہا آپ تو صحافی ہیں۔ تعلیمی ادارے سے آپ کا کیا تعلق ! ہم نے وضاحت کی کہ وہ لوگ خدا نا خواستہ پڑھانے کے لیے نہیں بلا رہے بلکہ ہمیں تقریری مقابلے میں گیسٹ آف آنر کی حیثیت سے مدعو کیا جا رہا ہے۔ جب ہم نے ادارے کا نام بتایا تو اہلیہ نے کہا کہ آپ چونکہ طنز و مزاح لکھتے ہیں اِس لئے ایسے ہی comics ادارے نے مدعو کیا ہے۔ ہم نے حیران ہو کر وضاحت چاہی تو بولیں آپ کو کالج نے بلایا ہے نا ! یہ سُن کر ہم سَٹپٹائے اور (اپنا) سَر تھام لیا! عرض کیا کہ بیگم ! ہے ! کہنے لگیں کامکس اور کومیکس میں Commecs ، نہیں comics ادارے کا نام کون سا زیادہ فرق ہے۔ ہم نے عرض کیا کل کو آپ کہیں گی کون سا زیادہ فرق ہے، !منہ کے بجائے ناک سے کھانا کھا لیا کیجیے

کسی کو تقریری مقابلے میں مدعو کیا جائے اور جوانی کا حسین زمانہ یاد نہ آئے، ایسا تو ہی نہیں سکتا۔ گویا

! کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں ....

ہمارا خیال ہے بہت سے کسی تعلیمی ادارے کے تقریری مقابلے میں مصنف یا مہمان خصوصی بنائے جانے پر یہ سوچ کر زیادہ مسرت محسوس کرتے ہوں گے کہ اِس بہانے شبابی تاریخ" اپنے کو تھوڑا سا دُہرا لیتی ہے ! عندلیب شادانی نے کہا تھا۔"

کہتے ہیں تاریخ ہمیشہ اپنے کو دُہراتی ہے
!اچھا، میرا خواب جوانی تھوڑا سا دُہرائے تو
ہائے ہائے، وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ ہم بولنے کا ارمان رکھتے تھے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم شادی سے پہلے کے زمانے کی بات کر رہے ہیں! طالب علمی کے زمانے میں تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو، کسی نہ کسی حد تک، بولنے کا شوق، بلکہ ہَوکا ہوتا ہے۔ لڑکیوں کا معاملہ تو ہم نہیں جانتے، مگر ہاں لڑکوں میں بولنے کا شوق غنیمت ہے کہ بعد میں ساری !زندگی تو اُنہیں خاموش ہی رہنا پڑتا ہے
کو میکس کالج" میں طلبا اور طالبات کو بولتے دیکھا تو دِل دِل باغ باغ ہوگیا۔ ایک" انجانی سی خوشی ہوئی کہ چلیے، کسی سطح پر تو اِس قوم میں اب تک جوش اور ولولہ سلامت ہے۔ چار چھ سال کا عہدِ جوانی اپنے ساتھ بہت سی خواہشات اور اُن خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کا جذبہ اور جُنون بھی لاتا ہے۔ جوش اور ہوش میں توازن قائم رکھنے والے اِس دور کو پوری زندگی پر محیط کرلیتے ہیں۔ بے ڈھنگے انداز سے گزاری جانے والی !جوانی بُڑھاپے کو تیزی سے گھسیٹ کر قریب لے آتی ہے

پُرجوش تقاریر کرنے والے طلبا اور طالبات کو دیکھ کر ہمیں اپنی جوانی یاد آ گئی۔ ایک بڑے میاں سڑک پر گر پڑے۔ گرتے ہی چلّائے۔۔ ہائے جوانی ! پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا جو اُنہیں اُٹھاتا۔ کوشش کرکے خود ہی اُٹھے اور اپنے آپ پر لعنت بھیجنے کے انداز سے بڑبڑائے۔۔ جوان میں کون سا تیر مارا تھا!

ہم نے کبھی اپنے آپ پر اِس طور ملامت نہیں کی کیونکہ ہماری جوانی ایسی گئی گزری نہیں تھی ! آپ سوچیں گے لڑکھڑا کر گرنے کی عمر بھی تو ابھی وارد نہیں ہوئی ! خیر، ہم بھی بھری جوانی" میں یہ کیا باتیں لے بیٹھے ! بڑھاپے کو جب آنا ہے تب وہ آئے گا۔ اور تب کی تب دیکھی جائے گی۔

کومیکس" کے تقریری مقابلے میں بہت ہی دُھواں دار تقاریر سُننے کو ملیں۔ بعض تقاریر" تو واقعی ایسی تھیں کہ ہال میں دُھواں سا بھر گیا۔ حاضرین یعنی ساتھی طلباء و طالبات کی تالیاں تقریر کرنے والوں کو مزید لیڑ لگاتی ہیں۔ اور وہ جوشیلے جُملوں کی مزید دو لتّیاں جھاڑنے کے لیے زیادہ تازہ دَم ہو جاتے ہیں ! ایک طالب علم عُمر کا جوش و خروش تو حد سے گزر گیا۔ تقریر کے دوران جوش کی شِدّت اور اشتعال سے کانپنے لگے ! ایک لمحے کو خیال آیا کہ

شاید وہ خود کو نشتر پارک میں سمجھ کر ہمارے دِل و دِماغ پر نشتر لگا رہے ہیں ! اُن کے انداز خطابت نے دِل کو ڈھارس بندھائی کہ ابھی کچھ " بچّے" ایسے ہیں جو بڑے ہو کر لِنکرز کے کان کتریں گے ! عُمر کو ہم مشورہ دیں گے کہ ذرا سنبھل کر رہے، ایسے ہی بانکے سجیلے، پُرجوش اور ولولہ بردار نوجوان کی تلاش میں رہتی ہے اِس قوم کی ہر . . . . ! سیاسی جماعت

وہرہ نے دلیپ کمار کی حیثیت سے تقریر کا آغاز کرنے کی کوشش کی اور دو ہی جملوں کے بعد راجیش کھنّہ یا جیتیندر میں تبدیل ہو کر پوڈیم چھوڑ گئے ! یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ جب انسان پہلی بار تقریر کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو ایسا ہوتا ہے۔ بہت سوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب بھی پہلی بار (!) تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں، ایسا ہی ہوتا ہے ! اور سچ تو یہ ہے کہ وہرہ نے کمال کر دکھایا یعنی بے ہوش نہیں ہوئے ! ہم وہرہ کی ہمت کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکے کہ وہ دوبارہ پوڈیم پر آئے اور نئے سِرے سے تقریر کی۔ گویا

شاید مُجھے نِکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اِس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

انٹر اور بی اے کی سطح کے طلبا اور طالبات کی تقاریر میں جوش اور ولولے کے ساتھ ساتھ ایک بات اور بھی صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ نئی نسل کم وقت میں بہت

کچھ کہنے کے فراق میں رہتی ہے اور اِس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ چند منٹ کی تقریر میں ایک نئی دُنیا بس جاتی ہے! بیشتر تقاریر ایسی ہوتی ہیں جیسے ایک پلیٹ میں سال، مٹھائی، نمکو، سموسے سبھی کچھ رکھ دیا جائے!

ایک طالبہ نے کچھ ایسی تقریر کی کہ اُن کا ہر جُملہ جانا پہچانا سا لگا۔ اُن کی تقریر میں غیر معمولی اپنائیت تھی۔ محترمہ نے fools کو موضوع بنایا تھا! ہم بالکل سامنے بیٹھے تھے۔ تقریر کی ابتداء میں ہمیں ایسا لگا کہ وہ ہمی کو تختہ مشق بنا رہی ہیں مگر جب غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ singular یعنی fool نہیں بلکہ plural یعنی fools کی بات کر رہی ہیں! ثابت ہوا کہ pluralism بہت اچھی چیز ہے! دِل کو یہ سوچ کر کچھ سُکون مِلا کہ ایک ہم ہی تختہ مشق یا کُشتہ سِتم نہیں۔

محفل میں نِشانے اور بھی ہیں ....!

جب مسلمانوں کی نئی نسل کو اُس کی ذمہ داریاں یاد دلائی جاتی ہیں تو قرونِ اوّل اور قرونِ وسطٰی کے مسلم ہیروز کو یاد کیا جاتا ہے۔ اِس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ کئی مقررین نے کہا "کہاں ہے وہ محمد بن قاسم، کہاں ہے وہ ابراہیم؟" ہم تو سامنے ہی بیٹھے تھے، اِس قدر پُرجوش انداز سے چلّا کر پوچھنے کی کیا ضرورت تھی! یعنی یہ کہ پُرجوش خطابت کے دوران ذہن بھلے ہی کام نہ کر رہا

!ہو، آنکھیں ضرور کُھلی رکھنی چاہئیں

آخر میں مہمان خصوصی کمانڈر (ر) نجیب انجم صاحب نے خاصی پُر مغز تقریر کی۔ کچھ دیر کے لیے ہال کا ماحول بدل گیا۔ اُن کی سنجیدگی دیکھ کر خیال آیا کہ ہمیں بھی بولتے وقت تھوڑا سنجیدہ ہو جانا چاہیے تھا مگر یہ خیال بھی آیا کہ ہم نے جب بھی سنجیدہ ہو کر !بولنے کی کوشش کی ہے، کچھ زیادہ ہی مزاح پیدا ہوا ہے

کومیکس" میں طلباء و طالبات کی تقاریر سُن کر اپنا یعنی طالب علمی کا زمانہ یاد آگیا۔" طالب علمی کے زمانے میں ہمیں بھی، جیسا کہ فطری ہے، معلوماتِ عامہ اور تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق تھا۔ معلوماتِ عامہ کا شوق تو اِس قدر تھا کہ یہ شعبہ ہمارے لئے معمولاتِ عامہ میں تبدیل ہوگیا تھا اور بہت سے سینئرز یہ شکایت کرتے !پھرتے تھے کہ ہم کچھ زیادہ ہی جان گئے ہیں

خیر، تقریر کرنے کا شوق جب ہم میں حد سے بڑھا تو دوستوں کے کہنے پر ایک تقریری مقابلے میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ مقابلہ کراچی کے ایک ہوٹل میں تھا، یعنی پنڈال نہیں تھا بلکہ ہال تھا۔ جب ہم ہال میں داخل ہوئے تو دل میں "ہَول" سا اُٹھا! ساتھیوں پر نظر ڈالی تو اُن کے چہروں پر خاصا اطمینان

تھا۔ یہ اطمینان دیکھ کر دِل کو ایک گونہ مسرّت ہوئی کہ ہماری حوصلہ افزائی کے لئے کوئی تو موجود ہے۔

جب تقریر کے لیے ہمارا نام پکارا گیا تب اندازہ ہوا کہ پوڈیم پر جاکر مائکروفون کے ذریعے حاضرین کا سامنا کرنا کیا ہوتا ہے! دِل و دماغ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے اچانک سر پر بھاری گٹھڑ رکھ دیا ہو! ساری کائنات کی توانائی اپنے وجود میں سموکر ہم کِسی نہ کِسی طور اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھے۔ مائکروفون کے سامنے ہمارا پہنچنا تھا کہ ہال کی بتّیاں اچانک بند ہوگئیں۔ دو تین سیکنڈ گزرے تو اندازہ ہوا کہ بتّیاں بند نہیں ہوئیں، ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا ہے! تب سمجھ میں آیا کہ 1980 کے عشرے میں کالی آندھی یعنی ویسٹ انڈیز کے مشہور زمانہ فاسٹ باؤلرز کا سامنا کرتے وقت ہمارے بیشتر بلّے بازوں کی کیا کیفیت ہوا کرتی ہوگی!

کِسی نہ کِسی طور ہم نے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو جمع کیا یعنی انگریزی کی اصطلاح میں recollect کرکے حاضرین سے مخاطب ہوئے۔ یہ ایسا لمحہ تھا جب ہمیں کہیے تو خود کو پہلی بار ٹھیک اندازہ ہوا کہ ہمارے جسم میں کتنے نظام ہیں اور کون کاپُرزہ کِس طرح کام کرتا ہے۔ دِل نے بتایا کہ اُسے دھڑکنا آتا ہے! رگوں میں خون کئی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑنے لگا!

کبھی کبھی سارا خون کھنچ کر دماغ میں گھستا ہوا محسوس ہوتا۔ کبھی ایسا لگتا کہ ٹانگیں نہیں ہیں اور ہم ہوا میں کھڑے ہیں! یہ 1985 کی بات ہے۔ تب موبائل فون کا تصور کا پورا پورا اندازہ ہوچکا تھا کیونکہ vibration تک نہیں تھا۔ مگر یقین کیجیے تب ہمیں بولتے وقت ٹانگیں مسلسل vibrate کر رہی تھیں!

چند لمحات کے توقف کے بعد ہم نے سوچا جب سمندر میں اتر ہی گئے ہیں تو غوطے لگانے میں کیا ہرج ہے۔ بس، بولنا شروع کر دیا۔ چند بے ربط سے جملوں کو جوڑ کر ہم نے جب بولنا شروع کیا تو ہال پر سنّاٹا طاری ہوگیا۔ حاضرین تالیاں بجانا بھی بھول گئے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ آتا تو تالیاں بھی بجاتے! خیر، ہم نے جب بولنا شروع کیا تو اِس بات کا اطمینان ضرور تھا کہ ہر مقرر کے لئے ڈھائی منٹ کا وقت مقرر ہے۔ یعنی ہم پر جو کچھ بھی گزر رہی تھی وہ زیادہ سے زیادہ ڈھائی منٹ تک گزرنی تھی۔ اِس کے بعد پھر وہی نارمل زندگی تھی! جب ہم نے بولتے بولتے گھڑی کی طرف دیکھا تو ڈھائی منٹ گزر چکے تھے۔ ہم مطمئن ہوگئے کہ اب گھنٹی بجی سو بجی۔ مگر صاحب، یہ کیا؟ گھنٹی بجانے پر مامور طالب علم ہمارے "خطاب" سے اِس قدر مسحور اور مرعوب ہوچکا تھا کہ گھنٹی بجانا ہی بھول گیا! جو وقت پر بجائی نہیں گئی وہ گھنٹی ہمارے لئے گھنٹہ بن گئی! ایک منٹ اور گزر گیا۔ ہم انٹ شنٹ بولتے ہی جا رہے تھے۔ وقت کی قانونی حد کے دوران بولتے وقت ہماری آنکھیں بند تھیں اِس لئے اندازہ ہی نہ ہوا کہ

حاضرین ہمیں صرف دیکھ ہی نہیں رہے، محسوس بھی کر رہے ہیں، محظوظ بھی ہو رہے ہیں! اب جب ہم نے آنکھیں تو حاضرین کو اِس حالت میں دیکھا کہ اُن کے لیے ہنسی ضبط کرنا انتہائی دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ چند ایک منچلوں نے ہوٹنگ کے نام پر ہمارے حوصلے پست کرنے کی کوشش کی مگر جو ہار مان لیں وہ ہم کہاں! ہم نے بھی قسم کھالی تھی کہ جس طرح ڈھیٹ قسم کے سیاست دان بار بار ضمانت ضبط ہو جانے پر بھی الیکشن میں حصہ لیتے ہیں بالکل اُسی طرح بولتے ہی رہیں گے! جب مزید ڈھائی منٹ گزر گئے تو ہمیں خیال آیا کہ اب حاضرین پر کچھ رحم کرنا چاہیے! یہ سوچ کر ہم مائکروفون کے سامنے سے ہٹے اور تقریب کے صدر سے رخصتی کی اجازت چاہی۔ اُنھوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں روکا۔ ہم سمجھے بولنے سے روک رہے ہیں اِس لئے مطمئن ہو کر پوڈیم سے رخصت ہونے لگے تو اُنھوں نے اپنا مائکروفون آن کرکے کہا "بولتے رہے، مزا آ رہا ہے!"

اِس پر ہال میں ایسا قہقہہ پڑا کہ بھائی عمر شریف بھی سُن لیتے تو کمتری کے احساس میں مبتلا ہوتے کہ ایسا جاندار قہقہہ تو اُن کے جملوں پر بھی نہیں پڑتا! ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ ہماری باتوں سے نئی نسل کچھ سیکھ رہی ہے اور اب پتہ چلا کہ لوگوں کو مزا آ رہا ہے! کچھ مت پوچھیے کہ ہمارا کیا حال ہوا۔ اور "اہل ہال" کا تو یہ حال تھا کہ ہماری تقریر کو اسٹینڈ اپ کامیڈی کے کھاتے میں ڈال کر حِظ پر حِظ اُٹھا رہے تھے! ہم نے بڑی مشکل سے کوزے کو

دریا میں بند کیا یعنی اپنی بے سَر و پا باتوں کو سمیٹا اور اسٹیج سے نیچے آئے۔
کچھ دیر بعد تقریب کے صدر کی باری تھی۔ اُنھوں نے اپنی تقریر میں دُنیا جہان کے موضوعات چھوڑ کر ہماری تقریر کو موضوع بنایا اور ہم پر طنز کے اِتنے تیر برسائے کہ جو کچھ وہ چاہتے تھے وہی ہوا۔ یعنی ہم نے طے کرلیا کہ آئندہ کبھی اپنے آپ کو تقریر کے لئے زحمت نہیں دیں گے۔ اب خیال آتا ہے کہ وہ فیصلہ کس قدر غلط تھا۔ اگر ہم دل برداشت نہ ہوئے ہوتے اور ذہن میں کُلبُلانے والی انٹ شنٹ باتوں کو سمیٹ کر تقریریں جھاڑتے رہتے تو آج ہمارا شمار بھی کامیاب لٰنکرز میں ہوتا!

!کام میں کیا رکھا ہے

ہم اب تک سمجھ نہیں پائے کہ بزرگ آخر چاہتے کیا ہیں۔ جب دیکھیے، یہی نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ کوئی کام کرو، کچھ کرکے دِکھاؤ۔ اب اُنہیں کون سمجھائے کہ کچھ نہ کچھ ایسا بھی کرتے رہنا چاہیے جو دوسروں سے ہٹ کر ہو یعنی بہتر ہے کہ کچھ کرنے سے یکسر گریز کیا جائے! اگر سبھی کام کرنے لگیں تو نیا پن کیا ہوگا؟ ایسے میں اگر کوئی جدت کا مظاہرہ کرنا چاہے تو لازم ہے کہ کام نہ کرے، بلکہ کام کرنے کے بارے میں سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرے!

کام وہ بلا ہے جس نے کئی نسلوں کو تباہ کیا ہے، زندگی کے مزوں سے محروم کیا ہے۔ یہ سلسلہ بچپن ہی سے شروع ہوتا یا شروع کردیا جاتا ہے۔ بچوں کو اسکول کے زمانے میں پڑھاکو بنانے پر توجہ دی جاتی ہے۔ بے چارے پڑھاکو بچوں کو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ جب اُنہیں کتابوں کے گڑھے میں دھکیلا جاتا ہے تو وہ دُنیا کی کتنی انوکھی لذتوں سے محروم ہو جاتے ہیں! آنکھوں پر موٹے عدسوں کی عینک لگاکر دن رات کتابوں میں گم رہنے والے پڑھاکو برخورداروں کو کیا پتہ کہ اسکول سے ٹُلّا مار کر فلم دیکھنے اور پارک پارک، سڑک سڑک گھومنے میں بھی قدرت نے مزا رکھا ہے!

بہت سے لوگ زندگی بھر محنت کرتے رہتے ہیں مگر کبھی اِس بات پر غور نہیں کرتے کہ محنت نہ کرنے میں کِس قدر لذت، آرام اور سُکون ہے! زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ اِسے دن رات محنت کرکے بے لذت بنانے سے گریز کرنا ہی دانش مندی ہے! دنیا میں کام کے علاوہ بھی کرنے کو بہت کچھ ہے! بہتوں کو کام کرنے کا ہَوکا ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ خوف بھی لاحق رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دُنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ اُن کے کام نہ کرنے سے بھی کام چل سکتا ہے!

جو لوگ زندگی بھر کام کرتے رہتے ہیں وہ کبھی درست اندازہ نہیں لگا پاتے کہ خاندانی جھگڑوں میں بھی لطف و سُرور کی ایک دنیا آباد ہے! رُوٹھنے میں بھی ایک مزا ہے اور اِس سے زیادہ مزا اِس بات میں ہے کہ کوئی منائے۔ کچھ لوگ تو کام کو سات سلام کرکے نصف زندگی رُوٹھنے اور باقی نصف زندگی تننے پر لگا دیتے ہیں! دیکھا، زندگی کیسی آسانی سے گزاری جاسکتی ہے۔ لوگوں نے ایویں ای ہوّا کھڑا کر رکھا ہے! جو لوگ زندگی بھر کام کرتے رہتے ہیں اُن کی زندگی میں برائے نام سُکون دیکھ کر بہتوں نے اپنی روش بدلی ہے اور خاندان پر توجہ دی ہے تاکہ مُنہ پُھلانے اور پُھولے ہوئے مُنہ کی ہوا نکال کر ماحول کو کچھ دیر کے لیے خوشگوار بنانے کا کھیل اچھی طرح کھیل سکیں! یاد رکھیے، قدرت نے

ہمارے لیے خاندان کا اہتمام کیا ہی اِس لیے ہے کہ ہم معمول سے ہٹ کر کچھ وقت گزار سکیں۔ جو لوگ خاندان کے مصرف کو سمجھتے ہیں وہ کام کا دورانیہ کم کرکے رشتہ داروں سے کھیلتے ہیں اور کبھی کبھی (دوسروں کے) مُنہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر ذرا سی دیر کے لیے کِھلونا بھی بن جاتے ہیں! ہر وقت کام، کام اور صرف کام کا راگ الاپنے والے رشتوں اور تعلقات کے نام پر دوسروں سے کھیلنے اور کبھی کبھی دِل پشوری کے لیے کھلونا بننے کی بھرپور لذّت سے یکسر ناآشنا رہتے ہیں! افسوس تو اِس بات کا ہے کہ اُنہیں اپنی اِس محرومی کا احساس بھی نہیں ہو پاتا اور کوئی احساس دِلاتا بھی نہیں! اب ہم نے یہ بیڑا اُٹھایا ہے تو ہماری کامیابی کے لیے دُعا کیجیے!

جو لوگ گھوڑوں گدھوں کی طرح ہر وقت "کام گاڑی" میں جُتے رہتے ہیں اُنہیں کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ شہر بھر میں چبوترے، بھانکڑے اور چائے کے ہوٹل بھی ہیں جو اُنہی کی سیوا کے لیے ہیں۔ یہ کیا کہ دن بھر کام کیا، شام ڈھلے گھر آئے اور رات ہوتے ہی چادر تان کر سوگئے۔ رات کو ذرا گھر سے نکلیے تو دیکھیے کہ رات کی اپنی ایک دُنیا ہے۔ اِس دُنیا میں بسنے والے گھنٹوں بتیاتے رہتے ہیں اور فجر کی اذان ہونے پر گھر واپس آکر جو سوتے ہیں تو پھر ظہر کی اذان ہی سے آنکھ کھلتی ہے! کیا خوب رُوحانی انداز ہے، ایک اذان پر سوئے اور دوسری اذان پر اُٹھے! آپ سوچیں گے ظہر کی اذان پر آنکھ کُھلے تو

کام کب کریں گے۔ پھر وہی کام؟ پوری رات چبوتروں، بھانگڑوں اور ہوٹلوں پر بیٹھ کر زمانے بھر کی جو باتیں کی تھیں کیا وہ کام نہ تھا؟ رات بھر جاگنے پر کوئی آپ کو اُلو کہے تو ہر گز بُرا مت مانیے۔ جس مغربی تہذیب کے ہم سب دیوانے ہیں اُسی مغربی تہذیب میں اُلو کو دانائی کی علامت سمجھا جاتا ہے!

موبائل فون پر فُل نائٹ پیکج کے تحت گھنٹوں دھیمی دھیمی گفتگو کرنے والے نوجوانوں کو آپ نے دیکھا ہے؟ اُن کے مُنہ پر کِس قدر.... سُکون ہوتا ہے! چہرے پر یہ سُکون اور رونق اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ذہن پر کام کاج کا بوجھ نہ ہو! کام کی زیادتی سے جن کے ذہن انتہائی بوجھل ہو چکے ہیں اُنہیں کیا معلوم کہ رات کی تنہائی میں نئی نسل موبائل پر کائنات کے کِتنے موضوعات کو کِتنی شرح و بسط سے نمٹاتی ہے! اگر کِسی موضوع میں ہمت ہے تو ذرا پتلی گلی سے نکل کر، بچ کر تو دِکھائے!

کام کی دُنیا میں غرق رہنے والے "مُلّا کی دوڑ مسجد تک" کے مِصداق گھر سے نکلتے ہیں، دفتر یا فیکٹری پہنچ کر کام کرتے ہیں اور واپس آنے کے بعد کھا، پی کر سو رہتے ہیں۔ نہ سیر سپاٹا، نہ شہر کا رونق میلہ نِہارنے کا اہتمام۔ ایسی زندگی میں رنگینی ہوتی ہے نہ خوشبو۔ یہ کیا کہ لوگ دُور دُور سے

بتّیاں دیکھنے شہر آئیں اور آپ شہر کے اندر رہتے ہوئے بھی اِس کی رونقوں پر التفات کی نظر نہ ڈالیں!

اگر معاشرے پر اُچٹتی سی بھی نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ کام کاج سے گریز کرنے والے بہت سے لوگوں کو کام کرنے والوں کے باعث شرمندگی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا اِس لیے ہوتا ہے کہ طعنہ زنی کرتے وقت کام کرنے والوں کو مثال بناکر پیش کیا جاتا ہے۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ آپ کے کام کرتے رہنے کو مثال کی حیثیت سے پیش کرکے کِسی کی تذلیل کی جائے؟ یقیناً نہیں۔ بس تو پھر مسلسل کام کرتے رہنے کی پالیسی پر نظر ثانی کیجیے تاکہ کِسی کو آپ کے باعث شرمندہ نہ ہونا پڑے!

جو لوگ کام ہی کو زندگی سمجھتے ہیں وہ ذرا اِس نکتے پر غور فرمائیں کہ اگر ہماری ہر حکومت اپنے تمام وعدوں پر عمل کر گزرے تو کیا ہو؟ بعد میں آنے والوں کے لیے کرنے کو کچھ باقی ہی نہ رہے! یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ہم آنے والی نسلوں کے لیے صلاحیتوں کو آزمانے کا موقع بھی نہ چھوڑیں! کام کے معاملے میں آپ بھی تھوڑا (اور اگر دِل چاہے تو دِل کھول کر) سرکاری انداز اپنایئے اور پھر دیکھیے کہ آپ دوسروں کو صلاحیتوں کے موثر اظہار کے کِس قدر مواقع فراہم کرتے ہیں! کبھی کبھی کِسی معاملے میں اپنے مسلک و مشرب کے ساتھ

! سا تھ حکومت کا مُقلّد ہو رہنے میں بھی کوئی قباحت نہیں

کیا ویسٹ انڈیز میں کوئی وزیر داخلہ نہیں؟

کولمبو میں کالی آندھی نے لنکا ڈھائی اور ٹی ٹوئنٹی کا ورلڈ کپ لے اُڑی۔
ایک بار پھر کرکٹ میں وہ ہوا جس کا گمان بھی نہ تھا۔ سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور ویسٹ انڈیز کی ٹیم سیمی فائنل میں آسٹریلیا کو عبرت ناک شکست سے دوچار کرنے کے بعد میزبان سری لنکا کو بھی گھاس ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ جس ٹیم کو لوگ کسی کھاتے میں رکھنے کو تیار نہ تھے وہ آئی اور ایسی چھائی کہ پھر سب کو گھر کی راہ نظر آئی!
برصغیر کے لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ کرکٹ کا ہر اعزاز انہی کے لیے بنا ہے۔ کھیل کا معیار بلند کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ اور پھر کھیل کا معیار اگر کسی طرح بلند کر بھی لیں تو ڈیلنگ کا معیار کس طور بلند کر پائیں گے!
وہ زمانے ہوا ہوئے جب کرکٹ صرف میدان میں کھیلی جاتی تھی۔ ہمیں تو اب بھی حیرت ہوتی ہے کہ کبھی کرکٹ شرفاء کا کھیل ہوا کرتا تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا

ہے، ہم نے کرکٹ میں ایسی عجیب و غریب حرکتیں اور سرگرمیاں دیکھی ہیں کہ دِل ماننا ہی نہیں کہ کبھی یہ شرفاء کا کھیل رہا ہوگا!

کرکٹ کے مقابلوں کا دورانیہ سکڑتا جارہا ہے اور کھیل کی ہمہ گیری کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے۔ ایک مقابلے میں میں خدا جانے کتنے کھیل کھیلے جارہے ہوتے ہیں۔ سٹّے باز بھی "لگے رہو منّا بھائی" کی طرح مصروف رہتے ہیں اور دوسری طرف حکومتیں بھی سارے کام چھوڑ کر اپنے معاملات کو کرکٹ کی میز پر یعنی کھیل کے میدان میں نمٹانے پر کمربستہ ہو جاتی ہیں!

کولمبو کے پریماداسا اسٹیڈیم میں ویسٹ انڈیز کی ٹیم کالی آندھی کی طرح میزبان ٹیم پر چھا گئی۔ سری لنکن ٹیم کے لیے جو ہدف بظاہر بہت آسان تھا وہ اِتنے پیار سے پہلے مشکل ہوا اور پھر مشکل تر ہوتا چلا گیا کہ ہم تو بس دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئے! جب اچھی خاصی کرکٹ میں سب کچھ اِس قدر عجیب انداز سے ہو رہا ہو تو حواس قابو میں نہیں رہتے اور کچھ بھی سمجھ میں آنے کے لیے تیار نہیں ہوتا!

کرس گیل نے آسٹریلوی بولرز کی جس طرح پٹائی کی اُسے دیکھ کر ویسٹ انڈیز کا وہ زمانہ یاد آگیا جب وہ واقعی کرکٹ کی دُنیا پر حکمرانی کرتی تھی۔ کرکٹ کو

آرٹ اور ٹیکنالوجی کا درجہ دینے والی کرکٹ ٹیم نے ویسٹ انڈیز کے سامنے کچھ اِس طرح ہتھیار ڈالے کہ دُنیا کو یقین ہی نہیں آیا۔

اور پھر یہ ہوا کہ ایک زمانے کے بعد کرکٹ میں کوئی بڑا ٹائٹل ویسٹ انڈیز کے نام ہوا۔ کیا بات ہے! یادیں تازہ ہو گئیں۔ کئی زمانے دوبارہ آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ ہم سوچنے لگے کہ کہیں ویسٹ انڈیز کا سنہرا دور واپس تو نہیں آ رہا! زمانہ اِتنا تیز ہے کہ جہاں ذرا سی کوئی تبدیلی رُونما ہوتی ہے، دِل طرح طرح کی اُمیدیں پالنے لگتا ہے یا پھر وسوسوں میں گھر جاتا ہے!

ویسٹ انڈیز کی ٹیم جب سری لنکا کے خلاف تیزی سے فتح کی طرف بڑھ رہی تھی تب اچانک، بہت تیزی سے ہمیں خیال آیا کہ یہ ٹیم تو ایسے جیت رہی ہے جیسے راہ میں کوئی رکاوٹ ہے ہی نہیں۔ کیا ویسٹ انڈیز میں کوئی وزیر داخلہ نہیں؟ آپ اِس سوال کو ہماری سادگی سمجھ کر نظر انداز نہ کریں۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جب کبھی ٹیم جیتنے لگتی ہے، اچانک کچھ ایسا ہونے لگتا ہے جو پہلے بہت عجیب سا لگتا ہے مگر پھر ذہن کے سامنے سے دُھند چھٹنے لگتی ہے اور سب کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اور پھر حکومتی مشینری کے چند پُرزے ہلتے ہیں، چند وزرا اِدھر سے اُدھر جاتے ہیں، حکومتوں کے درمیان کچھ طے پانے لگتا ہے اور بس۔ اچھی خاصی، آسان سی فتح انتہائی دُشوار ہو کر شکست میں تبدیل ہو جاتی ہے اور

ہم منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں! کل تک تو ہم سٹّے بازوں کو کوسا کرتے تھے مگر اب ایسا لگتا ہے کہ سٹّے باز تو بے چارے مفت میں بدنامی سے دوچار ہوئے! کرکٹ کے نام پر اِتنے کھیل کھیلے جارہے ہیں کہ شمار کرنا بھی دُشوار ہوگیا ہے!

ویسٹ انڈیز نے اچانک سینہ تان کر اعلان کیا ہے کہ ابھی اُس کی کرکٹ کے تن نازک میں کچھ جان باقی ہے۔ یہ جان کب تک باقی رہتی ہے اِس کا مدار اِس بات پر ہے کہ اُس کا وزیر داخلہ (اگر کوئی ہے!) کب تک غیر فعال رہتا ہے! ویسٹ انڈیز کی فتح کے ساتھ ہی ایک بار پھر "نظریہ سازش" کا رونا رونے والے بیدار ہوگئے ہیں۔ تبصروں اور تجزیوں میں جو کچھ بیان کیا جارہا ہے اُس میں ویسٹ انڈین ٹیلنٹ کو اور بہت سے اُمور سے ضرب دینے یا پھر حاصل ضرب قرار دینے کی کوشش کی جارہی ہے! آپ کا جو معاملہ ہے وہ آپ جانیں، اِس ٹائپ کی خبریں اور تجزیے پڑھ کر ہمارا ذہن تو اچھا خاصا مضروب ہو جاتا ہے!

!میری اُردو میڈیم بیوی کو انگلش کھا گئی

ہم نے بہت سے معاملات میں دُنیا کو سوچنے کی تحریک دی ہے، بلکہ سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ اہل جہاں کو جن چند باتوں پر بہت حیرت ہے اُن میں یہ بھی شامل ہے کہ پاکستانیوں کے پسندیدہ مشاغل کیا کیا ہیں ! ہمارے پسندیدہ مشاغل میں غلامی کے دور کا رونا روتے رہنا بھی شامل ہے۔ ہندوستان پر برطانوی راج کی دُہائیاں دیتے دیتے اب گلے شِکوے ہمارے قومی مزاج کا لازمی حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ جسے ذرا سا موقع ملتا ہے، اِس موضوع پر خاصی روانی سے منجن بیچنے لگتا ہے ! ہماری سوچ کا ایک بڑا حصہ اِس نکتے پر مرکوز رہتا ہے کہ انگریزوں سے انتقام کِس کِس طرح لیا جائے۔ جو لوگ کِسی نہ کِسی طرح برطانیہ پہنچ جاتے ہیں وہ انگریز معاشرے میں تھوڑی بہت خرابی پیدا کرکے اپنے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ! اب سوال یہ ہے کہ جو لوگ انگریزوں تک نہ پہنچ پائیں وہ کیا کریں؟ ہم حیران ہیں کہ اِس معاملے میں اِس قدر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ انگریز نہ سہی، انگریزی تو دسترس میں ہے۔ سیکھنے کے نام پر انگریزی سے کھیلیے اور انگریز سے انتقام لیجیے !

ہمارا اور انگریزی کا معاملہ تو وہی ہے کہ

ہم سے تو تم کو ضِد سی پڑی ہے !

اسکولوں اور کالجوں میں بیشتر طلبا و طالبات کا انگریزی میں یہ حال ہے کہ لاکھ سیکھیں مگر
کم بخت "سِکھنے" میں نہیں آتی۔ انگریزی نہ ہوئی، قومی کرکٹ ٹیم ہو گئی۔ لاکھ کوشش
کیجیے، دونوں کی لکھ بھی سمجھ نہیں آتی! گویا انگریزی کے معاملے میں ہماری لیاقت
!ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
ہم من حیث القوم کم ہی نکات پر متفق ہو پاتے ہیں مگر قوم کے بیشتر افراد اِس بات سے
یقیناً اتفاق کریں گے کہ جو کچھ ہم انگریزی کے نام پر سیکھتے ہیں وہ اور کچھ تو ہو سکتا ہے،
انگریزی ہرگز نہیں ہو سکتی! قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ انگریزوں نے ہمیں
! تقسیم کرکے حکومت کی مگر اُن کی زبان نے ہمیں ایک نکتے پر اتفاق کی توفیق بخش دی
انگریز بھی اِنسان ہیں اور دوسرے اِنسانوں کی طرح وہ بھی کئی طریقوں سے مَر سکتے
ہیں مگر ہمارے ہاں انگریزی کا حال اگر وہ دیکھ لیں تو (اپنے) سَر پیٹ پیٹ کر مَریں!
اور اُن کا یہ انجام کیوں نہ ہو؟ ہندوستان پر اُنہوں نے تقریباً دو صدیوں تک حکومت کی
مگر مسلمانوں کو انگریزی نہ سِکھا سکے! بس، دیکھ لی ہم نے انگریزوں کی قابلیت! کہتے
ہیں کہ انگریزوں کی سلطنت اِتنی

پھیلی ہوئی تھی کہ اُس کی حدود میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ہمیں کیا پتہ ؟ ہمیں تو بس یہ پتہ ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہنوں کا اُفق انگریزی کے آفتاب سے مُنوّر نہ کرسکے ! پتہ نہیں انگریز اِتنی بڑی سلطنت کس طرح چلاتے تھے ! ثابت ہوا کہ بہت سے بڑے کام تکّے میں بھی ہو جایا کرتے ہیں ! یاروں کی سِتم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ کسی کو سمجھانا ہو کہ تُکّا کیا ہوتا ہے تو ہماری مثال دیتے نہیں تھکتے کہ اِتنے عرصے سے ہم بھی تو لکھتے ہی آ رہے ہیں !

ویسے تو ہمارے ہاں اعلیٰ درجے کے مزاح کی تخلیق کے اور بھی کئی طریقے پائے جاتے ہیں جو یاروں نے عشروں کی شبانہ روز محنت سے دریافت یا ایجاد کئے ہیں مگر ایک انتہائی منفرد طریقہ یہ ہے کہ اِنسان اپنی اچھی خاصی زبان ترک کرکے انگریزی کو اظہار کا ذریعہ بنانے پر تُل جائے ! ایک صاحب پڑھاتے تو کچھ اور تھے مگر انگریزی بولنے کا ہَوکا تھا۔ ایک دن اپنی اہلیہ کے ساتھ فلم دیکھنے گئے۔ سنیما ہال میں اُنہیں اپنا ایک اسٹوڈنٹ بھی دِکھائی دیا۔ اگلے دن اُنھوں نے کلاس روم میں اُس اسٹوڈنٹ سے مخاطب ہو کر کہا۔

Yesterday, I saw you in theatre with my wife!

ایک صاحب کسی کو بتا رہے تھے۔ "میری بیوی کو انٹ شنٹ چیزیں خریدنے کا شوق

ہے۔ جب دیکھو، نئے فیشن کے لباس خریدنے کی دُھن اُس کے سر پر سوار رہتی ہے۔ جب دیکھو، فرمائش کرتی رہتی ہے کہ حیدری مارکیٹ لے جاؤ، پاپوش مارکیٹ لے جاؤ۔ مگر میں تو کبھی اپنی بیوی کو 'مارکیٹنگ' کے لیے نہیں لے جاتا!"

انگریزی کے بعض الفاظ ایسے فریبی ہیں کہ ذرا سی عدم توجہی سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ آپ مانگیں کچھ اور ملتا ہے کچھ۔ مثلاً

روکے مجھ سے کہہ رہا تھا میرا اِک بدحال دوست

میری اُردو میڈیم بیوی کو انگلش کھا گئی

مانگ بیٹھا سُوپ تو صابن مجھے پکڑا دیا

بیڈ ٹی مانگی تھی تو گندی چائے لے کر آ گئی!

انگریزی نے اہلِ وطن کا وہ حال کیا ہے کہ اب تو ہم بھی یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ اگر یہ زبان ہمارے خلاف انگریزوں کی سازش تھی تو ہم نے بھرپور جواب دیا ہے! وہ ایسے کہ اب انگریزی کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جارہا ہے جو انگریزوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا!

اسکول اور کالج کے زمانے میں ہم انگریزی کے ایک انتہائی مُفید پہلو سے آشنا ہوئے۔ یاروں نے اِس زبان کو نہ سیکھنے اور سیکھنے کی اداکاری کے دوران تمام

داؤ پیچ آزما کر اِس کی ہڈی پسلی ایک کرنے کی قسم کھا رکھی تھی ! ہم کسی اور پیریڈ کو اٹینڈ کریں نہ کریں، انگریزی کا پیریڈ کبھی مِس نہیں کرتے تھے کیونکہ اِسی پیریڈ کی بدولت ہماری طبیعت ہشاش بشاش رہتی تھی اور ہم ایسی بہت سی کام کی باتیں سیکھتے تھے جو آج تک کام آرہی ہیں ! انگریزی کی مہربانی ہے کہ اِس کی بدولت ہمارا کتھارسس ہو جاتا ہے یعنی ہم نوآبادیاتی دور کی تلخ یادوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انتقامی سوچ کو عمدگی سے منزل تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں !

جو طلباء انگریزی میں قابلیت بڑھانے کے لیے کسی انسٹی ٹیوٹ سے انگلش کورس کرتے ہیں وہ دراصل انگریزی کے خلاف "کورس آف ایکشن" طے کر رہے ہوتے ہیں ! اور پھر انگریزی بندہ بے دام کے مانند اُن کے آگے دست بستہ کھڑی رہتی ہے کہ جیسا حکم ہو ویسی خدمت انجام دی جائے ! اگر یہ روش برقرار رہی تو وہ وقت دور نہیں جب انگریزوں کو انگریزی کی زیادہ فکر لاحق نہیں رہے گی کیونکہ شاید انگریزی ہی نہیں رہے گی !

عیدِ قرباں کا رونق میلہ .... پہلا حصّہ

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ یعنی بیزاری کے لیے "سمے سماپتی کی گھوشنا" اور اور آپ کی دِل بستگی و تفریح کا سمے شروع ہوتا ہے اب! تھا جس کا انتظار پھر لگ اور سَج گیا ہے وہ بازار۔

بھائی جان، مہربان، قدر دان! حالات کے ہاتھوں بے دِل نہ ہوں۔ شہر کی رونقوں میں جو تھوڑی بہت کمی رہ گئی تھی اُسے پورے جوش و خروش سے پورا کرنے کے لیے جگہ جگہ خصوصی، "غیر روایتی" سَرکس کا اہتمام کیا جاچکا ہے۔ اگر آپ شہر کے حالات سے خوفزدہ ہیں اور دِل بہلانے کے لیے زیادہ دُور یعنی سُہراب گوٹھ تک نہیں جاسکتے تو کوئی بات نہیں۔ آپ کی سہولت کے لیے گھر کے قریب ہی یعنی دو تین کلو میٹر کے اندر رونق میلے کا ایسا اہتمام کیا گیا ہے کہ طبیعت خوش نہ ہو تو ہمارا ذِمّہ۔ گھر سے نکلیے، قدم بڑھایئے اور اپنی دل بستگی کا سامنا کیجیے۔

کراچی میں تفریح کے جتنے بھی مقامات تھے اُن میں اب تفریح کا عنصر تو رہا نہیں، ہاں اُن کی مضحکہ خیزی ضرور بڑھ چکی ہے! ایسے میں ناگزیر تھا کہ

بُجھے ہوئے دِلوں کو تھوڑی سی روشنی اور توانائی فراہم کی جائے۔ آخر شہر پر شہریوں کا بھی کچھ حق ہے! سال بھر طرح طرح کی اوچھی حرکتوں سے برباد، پریشان اور بیزار ہوجانے والوں کے دِلوں کو کچھ دِنوں کے لیے ہشّاش بشّاش رکھنے کی خاطر "بونس" کی حیثیت سے شہر بھر میں مویشی منڈیوں کا قیام عمل میں لانا سالانہ معمول بن چکا ہے! ایک زمانہ تھا جب شہر میں تفریح کے کئی مقامات تھے۔ تفریحی مقامات تو شاید ترقیاتی عمل کے ملبے میں کہیں دفن ہوگئے ہیں اور تفریح شہر کی افراتفری میں دب دبا گئی ہے! ایسے میں مقامی انتظامیہ کو داد دی جانی چاہیے کہ وہ سالانہ رونق میلے کا اہتمام کرکے لوگوں (اور قربانی کے جانوروں) کو تفریح کے مناسب اور بروقت مواقع فراہم کرتی ہے! اگر ایسا نہ ہو تو ہماری طرح قُربانی کے جانور بھی اِس دُنیا سے بے تفریح ہی چلے جائیں!

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مقامی سطح پر یعنی تمام علاقوں میں مویشی منڈی قائم کئے جانے میں صرف آپ کا بھلا ہے تو یہ آپ کی سادگی ہے اور سادگی بھی ایسی کہ قُربان جایئے۔ مقامی مویشی منڈیاں لگائے جانے سے قُربانی کے جانوروں کے لیے خاصی سہولت ہوگئی ہے کہ شہر کو اچھی طرح دیکھیں بلکہ شہریوں کے درمیان پندرہ بیس دن گزاریں۔ ہوسکتا ہے کہ شہریوں کے درمیان دو تین ہفتے

گزار کر قُربانی کے جانوروں کو بھی ذبح ہوتے وقت یہ سوچ کر سکون ملتا ہو کہ فروخت اور ذبیحے کے لیے شہر میں لائے جانے سے قبل اُنہوں نے ٹھیک ٹھیک مہذب ماحول میں پرورش پائی اور خاصے جانور دوست اِنسانوں کا ساتھ نصیب ہوا! یوں وہ ایک بڑے شہر کے باشندوں کو دیکھ لیتے ہیں اور گلے پر چُھری پھرنے سے پہلے یہ حسرت باقی نہیں رہتی کہ جنگل کے قانون سے مطابقت رکھنے والی زندگی گزارنے والے اِنسانوں کو نہ دیکھ سکے!

جب سے شہر بھر میں عید الاضحیٰ کے موقع پر مویشی منڈیاں "فرنچائز" کرنے کا سِلسِلہ شروع ہوا ہے، روایتی سرکس والوں کا دَھندا ہمیں چوپٹ ہوتا دکھائی دے رہا ہے! تقریباً تین ہفتوں تک لوگوں کو طرح طرح کے کھیل تماشے بلا ٹکٹ دیکھنے کو ملیں گے تو اُنہیں کیا پاگل کُتّے نے کاٹا ہے کہ خاصا مہنگا ٹکٹ خرید کر گِھسے بندھے کرتبوں والا سَرکس دیکھیں!

ایک سرکس کے مینیجر سے مُلاقات ہوئی۔ چُھوٹتے ہی دَھندے کی مَندی کا رونا رونے لگے۔ ہم نے کہا جگہ جگہ مویشی منڈی کے نام پر لگنے والے رونق میلے سے آپ لوگوں کا دَھندا تو خاصا متاثر ہوچکا ہوگا۔ بولے "ہاں ہوا تو ہے، مگر قدرت نے ہر خرابی میں کسی نہ کِسی خوبی کی بنیاد بھی رکھی ہے۔" ہم نے وضاحت چاہی تو کہا "پہلے ہم صرف دَھندے کی مَندی کا رونا رویا کرتے تھے۔

مگر اب عید الاضحیٰ سے ڈھائی تین ہفتے قبل لگائی جانے والی سالانہ مویشی منڈیوں کے چکر لگا کر نئے نئے کرتب نوٹ کرتے ہیں اور پھر اپنے فنکاروں کو بُلا کر مشاہدہ کراتے ہیں تاکہ اُن کے فن میں کچھ تو گہرائی پیدا ہو! وہ اِس مشاہدے سے چند ایسے کرتب سیکھتے ہیں جو سال بھر اُن کی پرفارمنس کو دھانسو بنائے رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں!"

سرکس مینیجر کی بات کا ایسا اثر ہوا ہے کہ اب ہم لوکل مویشی منڈی کا رُخ کرنے سے ڈرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو لوگ یہ سمجھیں کہ ہمارا تعلق کسی سَرکس سے ہے اور ہم چند نئے کرتب سیکھنے کے مِشن پر نکلے ہیں!

اَصلی تے وَڈا قومی کھیل

زندگی کو کھیل سمجھنے والوں کی کمی نہیں۔ مگر "اَصل حقیقت" یہ ہے کہ زندگی ہم سے کھیلتی رہتی ہے۔ جب کبھی زندگی پر تھکن سوار ہوتی ہے اور وہ آرام کے موڈ میں ہوتی ہے تب ہم، کچھ دیر کے لئے، ایک دوسرے سے کھیلنے لگتے ہیں! یہ سب کچھ ہماری آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ آپس میں یعنی ایک دوسرے سے کھیلنے اور محظوظ ہونے کے کئی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ ایسا ہے جس کی افادیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ ذرا سوچیے کہ وہ طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟ جی ہاں، رُوٹھ جایئے۔ اور کوئی منائے تو مزید رُوٹھ جایئے۔ پھر جب لوگ منانے سے باز آنے لگیں تو آسانی سے مَن جانے کا عندیہ دیجیے!

آج تک طے نہ ہوسکا کہ ہمارا قومی کھیل کیا ہے۔ لوگوں سے سُنا ہے کہ ہاکی ہمارا قومی کھیل ہے۔ کبھی کبھی اِس بات پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ جو پوری قوم کا حال ہے وہی ہاکی کا بھی ہے! یاروں نے اِس کھیل کے ساتھ اِتنی کِھلواڑ کی ہے کہ اب بقول غالب

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!

بچپن میں تو گلّی ڈنڈا قومی کھیل کا درجہ اختیار کئے رہتا ہے۔ ویسے ہاکی اور گلّی ڈنڈے میں خاصی مماثلت ہے۔ دونوں میں لاٹھی ہے۔ شاید اِسی لیے ہم بچپن ہی سے سیکھ جاتے ہیں کہ جس کی لاٹھی، اُس کی بھینس!

کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ ہم بحیثیت قوم کرکٹ میں اِتنی دلچسپی کیوں لیتے ہیں کہ یہ تو شُرفاء کا کھیل ہوا کرتا تھا! کرکٹ کا عجیب حال ہے کہ اِس ایک کھیل میں کئی کھیل سماگئے ہیں۔ جب کرکٹرز میدان میں ہوتے ہیں تب کرکٹ کے سِوا سبھی کچھ کُھل کر کھیلا جارہا ہوتا ہے! کِسی زمانے میں بلیئرڈ بھی شُرفاء کا کھیل ہوا کرتا تھا کہ قائدِ اعظم بھی بلیئرڈ کھیلتے تھے۔ مگر اب حالت یہ ہے کہ جہاں کہیں تھوڑی بہت سرکاری زمین فارغ پڑی دکھائی دیتی ہے، یار لوگ قبضہ کرکے بڑا سا جھونپڑا بناتے ہیں اور اُس میں بلیئرڈ نُما اسنوکر کلب کھول لیتے ہیں!

مُلک میں مختلف سطحوں پر طرح طرح کے کھیل رائج ہیں جنہیں قومی کھیل کا درجہ حاصل ہے۔ سرکاری حلقوں میں چُھپن چُھپائی مقبول کھیل ہے۔ یعنی کوئی بندہ اختیارات کے ناجائز استعمال کے ذریعے بہت سا مال لیکر غائب ہو جاتا ہے اور پھر سب اُسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں!

مگر صاحب ! کرکٹ، ہاکی، گلّی ڈنڈا، بلیئرڈ، اسنو کر سب آنے جانے کھیل ہیں۔ ایک کھیل ایسا ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ کسی مائی کے لعل میں دم نہیں کہ اِس کھیل کو صفحہ ہستی سے مِٹا سکے۔ یہ کھیل ہے بات بات پر مُنہ پُھلانے اور رُوٹھ جانے کا ! جوانی، بلکہ اُٹھتی ہوئی جوانی میں تو یہ کھیل کچھ زیادہ ہی جلوے بکھیر رہا ہوتا ہے منہ پُھلا کر زندگی بسر کرنے کا بھی عجیب ہی معاملہ ہے۔ فی زمانہ کرکٹ اور دیگر کھیلوں کے مقابلوں میں سَٹّے کا چلن زیادہ ہے۔ آسانی سے اندازہ نہیں ہو پاتا کہ کوئی ہار رہا ہے تو وہ واقعی ہار رہا ہے یا جان بوجھ کر مد مقابل کو فتح سے ہمکنار کر رہا ہے ! آپ کوشش کرکے بہر حال کچھ نہ کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کوئی کیوں ہار رہا ہے اور کوئی کیوں جیت رہا ہے مگر مُنہ پُھلانے اور بات بات پر رُوٹھنے کا معاملہ ایسا ہے کہ ٹھیک سے اندازہ ہو ہی نہیں پاتا کہ کون کب رُوٹھنے کے mood میں ہے اور کب مَن جانے کے mode میں آچکا ہے ! بعض خاندانوں کا تو یہ حال ہے کہ سب کو ڈائری میں باضابطہ حساب رکھنا پڑتا ہے کہ کون کس سے ناراض ہے اور کون کس سے مل رہا ہے !

مُنہ پُھلانے، رُوٹھنے اور بات چیت بند کرنے کا کھیل ویسے ہی اور بہت سے میدانوں میں کھیلا جاتا ہے مگر اِس سلسلے میں پسندیدہ ترین گراؤنڈ ہوتا

ہے شادی والا گھر! شادی کی تقریب اُن لوگوں کے لیے نعمت سے کم نہیں جنہیں بات بات پر ٹُھنکنے، غُصّے سے بپھرے ہوئے سانپ کی طرح پُھنکارنے اور مینڈک کی طرح مُنہ پُھلا کر بات بند کرنے کا بہانہ درکار ہوتا ہے! خواہش یہ ہوتی ہے کہ کوئی ہاتھ پیر جوڑ کر منائے۔ جس کے گھر میں شادی ہو رہی ہو اُس بے چارے کو شادی کے لوازم، کھانے پینے اور مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کون کون مُنہ پُھلائے بیٹھا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ منظر بھی دِکھائی دیتا ہے کہ بے چارے میزبان چند اڑیل خاندانی ٹٹّوؤں کو منانے ہی میں اَدھ موئے ہو جاتے ہیں!

اور دوسری طرف یہ اڑیل ٹٹّو ہیں کہ

زمیں جنبد، نہ جنبد گل محمد

کی عملی تصویر بنے لوگوں کی بھرپور تفریح کا سامان کر رہے ہوتے ہیں!

اب حکومت کو قومی کھیل وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ قوم نے رُوٹھنے، مُنہ پُھلانے اور بات چیت بند کرنے کو اصلی تے وڈا قومی کھیل بنالیا ہے! مُنہ پُھلانے والوں کی "برکت" ہی سے شادی کی بعض تقاریب کا بیڑا غرق ہو کر رہ جاتا ہے! بعض خاندانوں میں شادی کے موقع پر رُوٹھنے اور ٹُھنکنے کا معاملہ "انٹرا فیملی" مقابلے کی شکل بھی اختیار کرلیتا ہے اور کچھ لوگ محض یہ تماشا دیکھنے ہی کے لئے شادی کے جھمیلے میں شریک ہوتے ہیں! کبھی کبھی تو

یہ تماشا اِس قدر دلچسپ ہو جاتا ہے کہ دولھا اور دُلھن بھی اپنی اپنی رُسوم اور چونچلے بازی بھول کر رُوٹھنے والوں کو منانے کی کوششیں دیکھنے میں مگن ہو جاتے ہیں ! شادی بیاہ میں رُوٹھنے کے شوقین اور عادی افراد کے لئے مُنہ پُھلانا ذہن کو وہی تسکین فراہم کرتا ہے جو ہاضمے کا چُورن معدے کو بخشتا ہے ! جب تک یہ رُوٹھ نہ لیں، اِن کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں سے ملاقات کے دوران کُرید کُرید کر پوچھنا پڑتا ہے کہ آج کل کِس کِس سے بات چیت بند ہے اور کِس کِس سے کھلی ہوئی ہے تاکہ گفتگو میں کِسی کے بخیے اُدھیڑنے اور کِسی کی تعریف میں زمین آسمان کے قُلابے ملانے میں آسانی رہے ! ماہرین نفسیات زمانے بھر کے موضوعات پر غور کرتے رہتے ہیں اور پھر تحقیق کا بازار گرم کرتے ہیں مگر اُنہیں اندازہ ہی نہیں کہ رُوٹھنے اور مَننے میں کیا لطف پوشیدہ ہے ! جب کوئی مِنّت سماجت کرکے منانے کی کوشش کرتا ہے تب دِل کو وہ سُکون ملتا ہے جس کی تلاش میں سادھو سنیاسی سلسلہ ہمالیہ کی چوٹیوں کو کھنگالتے پھرتے ہیں ! ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کی زندگی بات بات پر ناراض ہونے اور ناز اُٹھوانے میں گزری ہے۔ اور اِس کام میں اُنہوں نے ایسا مزا پایا ہے کہ اب کچھ اور نہ بھی ملے تو زندگی سے شاید اُنہیں کچھ خاص شِکوہ نہ ہوگا !

مغرب کی ترقی کا شور ہم ایک زمانے سے سُنتے آئے ہیں۔ مگر یہ کیا کہ اعلیٰ تعلیم پائی، کیریئر شروع کیا، ترقی کی، خوش حالی سے ہمکنار ہوئے، بوڑھے ہوئے اور مر گئے۔ ایسی لگی بندھی زندگی کِس کام کی؟ زندگی کے مزے اُن سے پوچھیے جو رُوٹھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ کیا بات ہے! ایسا لگتا ہے جیسے کائنات سِمٹ کر قدموں میں آ گئی ہے! ترقی کے نام پر مشینی زندگی بسر کرنے والوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ کبھی ذرا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہمارے اَصلی تے وَڈّے کھیل کو بھی اپنائیں اور زندگی کا ایک ایسا انوکھا مزا چکھیں جو اُن کے معاشروں میں خاک نہیں پایا جاتا!

عیدِ قُرباں کا رونق میلہ .... دوسرا حصہ

اِنسان اشرف المخلوقات ہے۔ ہم اور آپ اِس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ مگر کبھی آپ نے سوچا ہے کہ سال میں ایک مرتبہ یہ اعزاز ہم آپ کھو بیٹھتے ہیں؟ بس یہ سمجھ لیجیے، سال میں ایک بار یعنی عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے جانور کچھ دنوں کے لیے "اسٹے آرڈر" لیکر ہمیں اِس اعزاز سے محروم کر دیتے ہیں اور بہترین مخلوق کے درجے پر خود فائز ہو جاتے ہیں!

مویشی منڈی میں قدم رکھیے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم کسی اور سیارے کی مخلوق ہیں یا پھر قربانی کے جانور کسی دوسری دنیا سے آئے ہیں! اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُسے کبھی، کسی موڑ پر کم تر ہونے کے احساس نے پریشان نہیں کیا تو ذرا مویشی منڈی کا ایک چکّر لگائے، اندازہ ہو جائے گا کہ کم تر ہونے کا احساس نہ صرف یہ کہ ہوتا ہے بلکہ پریشان بھی کرتا ہے! ہم نے جب بھی کسی کے ساتھ قربانی کے جانور کی خریداری کے لیے مویشی منڈی کا چکّر لگایا ہے، خود کو ذہنی طور پر اُلجھا ہوا ہی پایا ہے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ طرح طرح کے ہُنر سیکھنے کے بعد بھی ہماری وقعت میں کوئی اِضافہ نہیں ہو سکا اور دوسری طرف گھاس چرنے والے حیوان ایسی قیمت پاتے ہیں کہ ہم شرم سے زمین میں

گڑے جاتے ہیں! جانوروں کی قدر و قیمت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گھاس وہ نہیں، ہم کھاتے آئے ہیں!

ایک زمانہ تھا جب قربانی کے جانور کی خریداری کے لیے مویشی منڈی جانا دردِ سر تھا۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ اور جب زمانہ بدل ہی گیا ہے تو مویشی منڈی کیوں نہ بدلے؟ جب ہم ہر نئے فیشن کو پوری پوری دُنیوی عقیدت کے ساتھ گلے لگاتے ہیں تو بے زبان جانوروں نے کیا بگاڑا ہے کہ اُنہیں قُدرت اِس حق سے محروم رکھے؟ اب مویشی منڈی کا رُخ کرنا بھی بجائے خود ایونٹ کا درجہ اختیار کرچکا ہے۔ اور اِس معاملے میں بھی ایونٹ مینیجمنٹ کے شعبے کو زحمت دی جاچکی ہے!

اگر کبھی آپ سبزی یا پھل کی منڈی کا رُخ کریں تو اندازہ ہوگا کہ سبزیوں اور پھلوں کے آگے آپ کی اوقات ہی کیا ہے! آپ کو تو کوئی پوچھتا نہیں اور آم کی معمولی سی پیٹی ایسی مہنگی فروخت ہوتی ہے کہ آپ بیک وقت انگشت بہ دنداں اور دل گرفتہ رہ جاتے ہیں! کبھی کبھی ٹنڈے اِتنے مہنگے فروخت ہو رہے ہوتے ہیں کہ اُن کے دام پوچھ کر لوگ اپنا ٹنڈا سا مُنہ لیکر رہ جاتے ہیں! وہ زمانہ لد گیا جب لوگ ایک دوسرے کو کَدّو قرار دیکر نیچا دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اب زمانہ ایسا بدلا ہے کہ کبھی کبھی تو کَدّو قرار دیئے جانے پر اِنسان

!اپنے آپ پر ناز کرنے لگتا ہے
یہی حال مویشی منڈی کا ہے۔ ذرا سا بکرا دیکھتے ہی دیکھتے اِنسانوں کو نیچا دِکھانے لگتا ہے۔ اب قربانی کے جانوروں کا اسٹیٹس ایسا بلند ہوچکا ہے کہ اُن کی قیمت پوچھنے سے قبل اپنی جیب ہی نہیں بلکہ پورے وجود کو کھنگالنا پڑتا ہے! کس نے سوچا تھا کہ اِنسان پر کبھی ایسا !جانورانہ وقت بھی آئے گا
مویشی منڈی اب صرف منڈی نہیں بلکہ ایک الگ دُنیا کا نام ہے۔ اِس دُنیا کے اپنے اُصول اور قواعد ہیں۔ اگر آپ اِن اُصولوں، قواعد اور "مینرز" سے واقف نہیں تو لوگ آپ کے بارے میں اپنی رائے بدل بھی سکتے ہیں! جو لوگ مکمل تیاری کے بغیر مویشی منڈی میں قدم رکھتے ہیں اُن کے اناڑی پن کا اندازہ لوگ ایک ہی نظر میں لگا لیتے ہیں! اور !پھر اُن کی چال ڈھال میں بھی اپنے لیے تفریح تلاش کرلیتے ہیں
آپ سوچیں گے کسی کے اناڑی پن سے قربانی کے جانوروں کو کیا فرق پڑتا ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ دو پیروں پر چلتے ہوئے مویشی منڈی میں قدم رکھنے والے اناڑی جانور قربانی کے جانوروں پر شدید نفسیاتی اثرات مرتب

کرتے ہیں! ایسے لوگوں کو دیکھ کر جانور بدکتے ہیں اور بے زبانی کی زبان سے شکوہ کرتے ہیں کہ ہمیں کن جاہلوں کے درمیان کھڑا کردیا!

اگر آپ کو کبھی ہائی جینٹری میں اُٹھنا بیٹھنا نصیب ہوا ہے تو اندازہ ہوگا کہ وضع داری کیا ہوتی ہے، نشست و برخاست کے اطوار کیا ہوتے ہیں اور کوئی بات کس طرح اور کس حد تک کی جاتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ کو اَپر کلاس سے رابطے کے طریقے معلوم نہیں مگر پھر بھی آپ کو یہ مشورہ دینا ہمارا فرض ہے کہ قربانی کا جانور خریدنے سے قبل کسی "کیٹل کنسلٹنٹ" سے ضروری مل لیں تاکہ مویشی منڈی میں داخل ہونے، گھومنے پھرنے، جانوروں کا جائزہ لینے، اُن سے آنکھ ملانے، اُن کی طرف بھرپور نظر ڈالنے، اُن کے دام پوچھنے اور سودے بازی کے آداب معلوم ہوسکیں!

نظریہ سازش

"اُس شخص کو دیکھ رہے ہو جو ہماری طرف دیکھ رہا ہے؟"

"ہاں، کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔"

"کالا تو تب دکھائی دے گا جب دال نظر آئے گی۔ ذرا یہ تو بتایئے کہ دال کہاں ہے۔"

"بھئی وہ ہماری طرف دیکھ رہا ہے نا؟"

"ہم بھی تو اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں!"

"مگر ہم تو بس یونہی دیکھ رہے ہیں، کوئی مقصد تو نہیں ہے اُس کی طرف دیکھنے کا۔"

"ہو سکتا ہے اُس کا بھی کوئی مقصد نہ ہو اور ہماری طرف بس یونہی دیکھ رہا ہو؟"

"تمہیں سمجھانا بہت مشکل ہے۔ تم سمجھ ہی نہیں رہے ہو۔ کوئی کسی کو خواہ مخواہ تھوڑی گھور کے دیکھتا ہے۔ کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔"

"کیا سبب ہو سکتا ہے؟ اور کیا ضروری ہے کہ ہر بات کا کوئی سبب ہو؟"

"کیوں نہیں؟ اِس دُنیا، بلکہ کائنات میں کچھ بھی بے سبب نہیں۔"

”وہ تو ہے۔ مگر ضروری تو نہیں کہ ہر معاملے کو شک کی نظر سے دیکھا جائے؟“

دیکھنا پڑتا ہے۔ معاملات کی اصلیت کو سمجھنے کے لیے شک کرنا لازم ہے۔ شک ہی سے“
”تحقیق کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

بات تحقیق تک رہے تو اچھا ہے۔ بال کی کھال اتارنے سے تو گڑبڑ ہی پیدا ہوتی ہے۔“
تحقیق اور تحقیقات میں بہت فرق ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ہر معاملے کی تہہ میں کوئی
”مشکوک معاملہ ہی ہو۔

اب تمہیں کون سمجھائے کہ اِس دُنیا میں قدم قدم پر کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے۔ چیزیں“
جیسی دکھائی دیتی ہیں ویسی وہ اصل میں ہوتی نہیں ہیں۔ آنکھ قدم قدم پر دھوکا کھا جاتی
”ہے۔

ہر چیز وہی ہوتی ہے جو وہ دکھائی دیتی ہے۔ ہماری سوچ اُسے کچھ کا کچھ بنا دیتی ہے۔“
گلاب میں صرف خوشبو ہوتی ہے لیکن اگر ہماری سوچ اُس میں سے بدبو کشید کرنا چاہے
”! تو ایسا بھی کر گزرے گی

اِس دُنیا میں جینا ہے تو سوچنا سیکھو اور سوچو۔ معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرو۔“
”ایسا کروگے تو دُنیا کو آسانی سے اچھی طرح سمجھ پاؤگے۔

زیادہ سوچنے سے ذہن کہیں کا کہیں جا پہنچتا ہے اور کوئی بھی چیز خواہ مخواہ کچھ کی کچھ“
دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور شک کا بیج تو ذہن کی زمین میں پتہ نہیں کیسے کیسے پودے اگا دیتا
”ہے۔

شک کرنے ہی سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کسی بھی معاملے کو کس حد تک سمجھتے ہیں"
"اور اُس میں سے اپنے مطلب کی کوئی بھی چیز کس حد تک کشید کر سکتے ہیں۔

مگر کیا شک کرنا لازم ہے؟ کسی بھی معاملے میں اچھی سوچ رکھنے سے مطلوبہ نتائج"
حاصل نہیں ہو سکتے؟ ضروری تو نہیں کہ ہم شک ہی کریں اور کسی بھی معاملے کی تہہ
"تک پہنچیں۔ مثبت تجسس بھی ہمیں معاملات کی تہہ تک بخوبی پہنچا سکتا ہے۔

اگر اِس دنیا کو سمجھنا ہے تو ہر معاملے کو شک کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ شک ہی ہمیں"
"یقین کی منزل تک لے جاتا ہے۔

یقیناً ایسا ہی ہوتا ہوگا، خاص طور پر ہر چیز کو یقین کی حد تک مشکوک بنانے کے معاملے"
"! میں

تمہاری سمجھ میں اِتنی سی بات کیوں نہیں آتی کہ ہم جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں"
اُس میں ہر معاملہ کوئی نہ کوئی خفیہ پہلو لئے ہوئے ہے؟ اگر ہم ہر چیز کو آنکھ بند کرکے،
شک کئے بغیر قبول کرلیں تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ کچھ معلوم کرنے کے لیے لازم ہے
کہ ہم اپنے ذہن کی کھیتی میں شک کا بیج بوئیں، ہر معاملے میں کچھ اور تلاش کرنے کی
"کوشش کریں۔

میری سمجھ میں تو آج تک تمہاری کوئی بات نہیں آئی۔ پتہ نہیں تم کون سی دنیا میں"
رہتے ہو۔ جب دیکھو، ہر معاملے میں کچھ کا کچھ تلاش کرنے کی کوشش

”کرتے رہتے ہو۔ یہ روش ایک دن تمہارے ذہن کا کچومر نکال دے گی۔

ارے تم کیا جانو، کچھ تلاش کرنے کی کوشش کیا ہوتی ہے۔ ذہن گھوڑے کی طرح دوڑتا“
ہی رہتا ہے۔ ہر معاملہ قدم قدم پر ایک نئے پہلو کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے، اور
پھر ذہن کے اُفق پر رنگ ہی رنگ بکھرنے لگتے ہیں۔ معاملات کی راکھ کریدنے ہی سے تو
آگ لگنے کے اسباب کا اندازہ ہو پاتا ہے۔ بال کی کھال نکالنا ہی تو ذہن کا کام ہے۔ اب

”اگر ذہن اپنا کام کر رہا ہو تو کیا ہم اُسے روک دیں؟

ذہن کو نہ روکو، اپنے آپ کو تو روکو۔ کس نے مشورہ دیا ہے کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ“
اُلٹا سیدھا سوچا ہی جائے؟ کیا زندگی ہمیں اِس کام کے لیے ملی ہے؟ دُنیا میں کرنے کو اور
”بھی بہت کچھ ہے۔

”اب اور کیا کرنے کو رہ گیا ہے؟ سب کچھ تو میسر ہے۔ زندگی آرام سے گزر رہی ہے۔“

”کیوں؟ کیا مل گیا ہے؟ زندگی کی کون سی سہولت ڈھنگ سے میسر ہے، ذرا بتاؤ۔“

ارے بھائی! جب مشکلیں حد سے گزر جائیں تو آسانی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ہم جن“
سہولتوں کے حصول کی تمنا میں تڑپا کرتے تھے اور آخر میں دِل مسوس کر رہ جایا کرتے
تھے اُن کے حوالے سے حکومت نے ہمیں بے فکر کر دیا ہے۔ اب کوئی تمنا، کوئی آس
نہیں رہی اِس لیے رونا اور تڑپنا کیسا؟ جب کوئی اُمید ہی

"نہیں رہی تو پھر پریشانی کس بات کی، رونا کیسا اور کیوں؟

اچھا.... یعنی بد انتظامی نے اُمیدوں کی ناکامی کو 'بے اُمیدی' میں تبدیل کر دیا ہے تو"
"! وقت کو جی بھر کے قتل کیا جائے

فارغ وقت اُس جن کی طرح ہوتا ہے جو ہر وقت کوئی نہ کوئی کام مانگتا ہے اور کام نہ"
"! ملنے کی صورت میں آقا ہی کو ختم کر ڈالتا ہے

بات بات پر شک کرنے والا ذہن بھی جھاڑی کی طرح ہوتا ہے جس میں کپڑے پھنس"
جائیں تو بحفاظت نکالنا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔ اگر ہم ذہن کو ہر وقت کام پر لگائے
رکھیں گے تو وہ بالآخر جن کی طرح ہم پر چڑھ دوڑے گا اور ہمارے لیے جان چھڑانا
"دشوار ہو جائے گا۔

تم نے تو بال کی کھال کو بھی اُدھیڑ دیا۔ اگر تم جیسے دو چار اور ہو جائیں تو 'نظریہ"
"! سازش' دم توڑ دے اور میڈیا کی ساری رونقیں داغ مفارقت دے جائیں

ہم کیا اور ہماری ہستی کیا۔ جب تک تم جیسے لوگ اِس دنیا میں ہیں، کسی بھی حالت میں"
"نظریہ سازش دم نہیں توڑے گا، بلکہ دم بہ دم پنپتا ہی رہے گا۔

اللہ کرے ایسا ہی ہو ورنہ تم جیسے لوگوں نے تو دُنیا کو بے رونق کرنے میں کوئی کسر اُٹھا"
"! نہیں رکھی

زندہ ہیں۔۔۔ یہی بات بڑی بات ہے پیارے

زندگی نعمت ہے۔ ہر نعمت قدرت کی طرف سے مفت ملتی ہے مگر پاکستان جیسے پس ماندہ اور بے حس معاشروں میں اُن لوگوں کو زندہ رہنے کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے جو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ کہیں کہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جسم و جاں کا ربط برقرار رکھنا ہی زندگی کا سب سے بڑا "مشن" ہے! رنچھوڑ لائن میں فاطمہ بی بی پاکستان کے قیام سے بھی پہلے سے کلیجی روٹی فروخت کرکے اپنا اور اہل خانہ کا پیٹ بھرتی آئی ہیں۔ 75 سالہ فاطمہ بی بی جہاں تھیں وہیں ہیں، اُن کی زندگی میں ایسی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی جسے دیکھ کر کہا جاسکے کہ برطانوی راج کے خاتمے اور آزادی کے وارد ہونے سے اُنہیں کوئی فیض پہنچا ہے۔ زندگی اور حالات میں کوئی واضح تبدیلی رونما نہ ہونے کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ فاطمہ بی بی کا مقدر بھی وہی ہے جو پاکستان کا ہے!

ہم اہل پاکستان بڑے دل کے ہیں۔ فیاضی کی مثال دینی ہو تو شاید پاکستانیوں کی کوئی مثال نہ ملے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ فیاضی اور بے حسی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ جس معاشرے میں لوگ اپنی محنت کی آمدنی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے دوسروں پر خرچ کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے اُسی معاشرے میں بہتوں کو زندگی کا سفر جاری رکھنے کے لیے روزانہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و جاں پر بھی بوجھ بننے والی مشقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے! کیا یہ ہمارے معاشرے کا حقیقی المیہ نہیں کہ فاطمہ بی بی جیسے لوگ زندگی بھر محنت کرنے کے بعد بھی اِس بات کے حقدار قرار نہیں پاتے کہ زندگی کا آخری دور راحت اور سُکون سے گزار سکیں۔ نوعمری میں شادی کے بعد فاطمہ بی بی نے شوہر کی بے روزگاری دیکھتے ہوئے گھر چلانے کی خاطر کلیجی روٹی بیچنا شروع کیا۔ جوانی اور ادھیڑ عمر تو اِس کام میں گئی ہی تھی، بڑھاپا بھی اِس یومیہ مشقت کی نذر ہوگیا! جس کلیجی روٹی نے اب تک فاطمہ بی بی کے ہاتھوں فروخت ہوکر ان گنت لوگوں کے پیٹ کی آگ بجھائی ہے وہی کلیجی روٹی خود فاطمہ بی بی کی زندگی کو کھا گئی ہے! ایسے لوگوں کے حالات ہمیں اور کچھ دیں نہ دیں، یہ سوچنے کی تحریک ضرور

دیتے ہیں کہ کیا زندگی صرف اِس قدر مشقت کا نام ہے کہ آتی جاتی سانس میں ربط برقرار رہے؟ کیا فاطمہ بی بی نے نوعمری میں ایک خوش حال اور پُرسکون زندگی کا خواب نہیں دیکھا ہوگا؟ کیا اُن کی خواہش نہ رہی ہوگی کہ عمر کی شام ڈھلے تو ایک طرف بیٹھ کر وجود کو سمیٹیں، اپنی حسین یادوں ترتیب دیں اور زندگی کے آخری دس بارہ سال پوتوں پوتیوں، نواسوں نواسیوں کے ساتھ ہنستے گاتے بسر کریں؟ یقیناً یہی سب کچھ اُن کی خواہشات کا حصہ رہا ہوگا مگر ہوا کیا؟ اور فاطمہ بی بی کو ملا کیا؟ صبح کو شام کرنے فکر اور گھر کا چولھا جلتا رکھنے کی کوشش؟ فاطمہ بی بی کا بیٹا شادی کے بعد الگ ہوچکا ہے۔ بڑے شہر میں جینا بڑی بات ہے مگر اب ایسی بڑی بات بھی نہیں کہ اِتنی بھاری قیمت چکائی جائے! زندگی بہت بڑی ۔۔۔ یا کتنی ہی بڑی نعمت سہی، اُس کے برقرار رکھنے پر خود !زندگی ہی کو داؤ پر لگاتے رہنے پر مجبور ہونا کوئی فخر کی بات نہیں

ہمیں اپنے معاشرے میں قدم قدم پر ایسی بہت سی خواتین ملیں گی جو فاطمہ بی بی کی طرح زندگی بھر زندگی کا قرض چکاتی رہتی ہیں اور اللہ کے کرم کا معجزہ یہ ہے کہ مرتے دم تک صبر کے ساتھ شکر کی دولت سے بھی ہمکنار رہتی ہیں! اُن کی زندگی میں بہت کچھ نہیں ہوتا مگر پھر محنت، صبر اور شکر کی بدولت اور بہت کچھ مل کر رہتا ہے! یہ بھی اللہ کا کرم ہے کہ جنہیں زندگی کی بنیادی

اور اُس سے کہیں بلند درجے کی بہت سی سہولتیں میسر نہیں ہوتیں وہ صبر اور شکر کا دامن نہیں چھوڑتے اور جنہیں قدم قدم پر آسائشیں گلے لگاتی ہیں وہ صرف رونے پیٹنے اور شکوہ کرتے رہنے کو اپنی نفسیاتی ساخت کے گلے میں تختی کی طرح ٹانگے رہتے ہیں ! فاطمہ بی بی اور اُن جیسے دوسرے بہت سے پاکستانی ہمارے لیے روشن مثال ہیں کہ زندگی بھر دکھ جھیل کر بھی محنت سے جی نہیں چراتے اور کسی کے آگے حالات کا رونا روتے رہنے پر کام کرکے حلال کی کمائی سے پیٹ بھرنے کو ترجیح دیتے ہیں !

آپ آباد رہیں، شہریوں کیلئے سڑک ہے تو سہی

کرپشن بھی کیا غضب کی لعنت ہے کہ ہمارا پیچھا چھوڑ ہی نہیں رہی ! جسے دیکھیے، وہ کسی نہ کسی طور اپنا الو سیدھا کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اب اگر اِس کوشش میں کسی کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے تو ہوتی رہے، اس کی بلا سے ! جو اپنے مفادات کو کسی نہ کسی طور تحفظ فراہم کرنے پر تُلے رہتے ہیں ان کی بینائی اِتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ کسی اور کا جائز مفاد بھی دکھائی نہیں دیتا ! ایسے معاملات میں ویسے تو اور بھی بہت سی باتیں شدید اذیت کا باعث بنتی ہیں لیکن جب قانون کے رکھوالے ہی قانون کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے اپنی بات منوانے اور شہریوں کے حق پر ڈاکہ ڈالنے پر تل جائیں تو اذیت کی کوئی حد نہیں رہتی ! کراچی میں پی آئی ڈی سی روڈ پر بس اسٹاپ کو "از خود اظہارِ استحقاق" کے تحت کمیونٹی پولیسنگ سینٹر میں تبدیل کرلیا گیا ہے ! اور ایسا کرتے وقت شاید یہ فرض کرلیا گیا کہ شہریوں کا کیا ہے، وہ تو سڑک پر بھی کھڑے ہو سکتے ہیں اور وہ سڑک پر ہی تو کھڑے ہو کر گاڑیوں کا انتظار کرتے آئے ہیں !

ایک زمانہ تھا جب کراچی میں کہیں کہیں باضابطہ طور پر بنائے جانے والے بس اسٹاپ گاڑی کا انتظار کرنے والے شہریوں سے زیادہ نشہ کرنے والوں کے استعمال میں رہا کرتے تھے۔ مختلف منشیات کے زائد استعمال کے بعد لڑھک جانے والوں کے لیے بس اسٹاپ شاندار پناہ گاہ کا کردار ادا کرتے تھے۔ اب پولیس کو یاد آیا ہے کہ منشیات کے عادی کون ہوتے ہیں بس اسٹاپ کو اپنے استعمال میں لانے والے۔ جب بغیر وردی کے، مریل سے شہری بس اسٹاپ پر قابض ہوسکتے ہیں تو بھلا وردی والوں کو کون روک سکتا ہے؟ ویسے بھی معاشرے کا عمومی چلن دیکھتے ہوئے سرکاری املاک کو ہڑپ کرنے کا پہلا حق تو خود سرکاری اداروں ہی کا ہونا چاہیے!

کراچی بھی کیا خوب شہر ہے۔ یہاں جس کے جی میں جو آئے وہ کر گزرتا ہے۔ اور اگر کر گزرنے والا سرکاری ادارے کا اور وردی میں ہو تو کیا کہنے! کس میں دم

ہے کہ "استحقاق" کی راہ میں دیوار بن کر دکھائے؟ سرکاری املاک خواہ کسی مقصد کے لیے بنائی گئی ہوں، جب سرکاری ادارے انہیں استعمال کرنے پر آتے ہیں تو متعین مقصد یا استعمال کہیں کا کہیں پڑا رہ جاتا ہے اور نیا مقصد سامنے آتا ہے۔ پاک کالونی تھانہ ایک زمانے تک ولایت آباد (بسم اللہ ہوٹل، منگھوپیر روڈ) کے ایک پلے گراؤنڈ میں تعمیر کئے جانے والے کتب خانے میں بسا رہا۔ شہر کے کئی کتب خانے اور اسکول اب بھی رینجرز کے کنٹرول اور استعمال میں ہیں۔ اِن سرکاری عمارات کا تو یہ حال ہے کہ
نکلے تھے کہاں جانے کے لیے، پہنچے ہیں کہاں معلوم نہیں!

نئی نسل کو علم کے حصول کے لیے اسکول اور مطالعے کی عادت پختہ کرنے کے لیے کتب خانے درکار ہیں اور جب یہ عمارات بن جاتی ہیں تو قانون نافذ کرنے والے اپنا قانون نافذ کرتے ہوئے اِن پر قابض اور مُتصرف ہو جاتے ہیں! اب جس میں ہمت ہے وہ خالی کراکے دکھائے۔ شہر بھر میں بہت سے مقامات پر پولیس نے بھی کسی دوسرے مقصد کے لیے بنائی جانے والی سرکاری املاک کو اپنے استعمال میں لے رکھا ہے۔ اعتراض کیجیے تو امن و امان کا معاملہ راہ کی دیوار بن جاتا ہے اور بہت سے قباحتیں آگے بڑھ کر معترضین کا راستہ روک لیتی ہیں۔ کل تک بس اسٹاپ چرسیوں اور ہیروئنچیوں کے کنٹرول میں تھے۔ اب یہ عوامی مقامات استعمال کرنے کا نشہ قانون نافذ کرنے والوں کے سر پر سوار ہے۔ شہریوں کا

کیا ہے، انہیں تو سڑک پر چلنا اور وہیں کھڑے ہو کر گاڑیوں کا انتظار کرنا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اختیار ہے وہ تیر پر تیر چلائے، اُسے ڈر کس کا ہے؟ جنہیں غیر قانونی سرگرمیوں کی روک تھام کا فریضہ سونپا گیا ہے وہی اگر قانون اپنے ہاتھ میں لیکر شہریوں کی حق تلفی پر اتر آئیں تو فریاد کس سے اور کیسے کی جائے؟ جو چیز شہریوں کے لیے بنائی گئی ہو اور اُن کے کسی بنیادی مسئلے سے تعلق رکھتی ہو اس پر کسی کا بھی قبضہ تسلیم یا برداشت نہیں کیا جانا چاہیے۔ اگر پولیس کو اپنے لیے کوئی پوائنٹ بنانا ہو تو اور بھی قانونی طریقے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ بس اسٹاپ پر قبضہ کرکے شہریوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ پولیس جو چاہے گی کرے گی، کسی میں ہمت ہے تو روک کر دکھائے؟

زندگی کچرے کے ڈھیر پر۔۔۔ مگر کب تک؟

ہم بھی کیا قوم (!) ہیں۔ اگر نعرے لگانے پر آئیں تو دنیا کو ہلادیں۔ کسی معاملے میں اگر کھنے کی ٹھان لیں تو زبانی جمع خرچ کے قطب مینار کھڑے کردیں۔ مگر جب بات عمل کی ہو تو کچھ ایسا "نہ کر دکھائیں" کہ دنیا واقعی حیران رہ جائے! کراچی کا شمار اب چند بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ دو کروڑ سے زائد آبادی کا شہر بنیادی سہولتوں سے اسی طرح محروم ہے جس طرح ہماری حکومت کے بیشتر اقدامات کسی منطق اور منصوبہ بندی سے محروم ہیں! جو شہر ہمیں اپنے آغوش میں سموئے ہوئے ہے وہ ہم سے بہت کچھ چاہتا اور مانگتا بھی ہے۔ ہمیں زندہ رہنے کے لیے روز کھانا پڑتا ہے اور کھائے ہوئے کو ہضم بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے بعد جسم کے ہر اہم نظام کو درست رکھنے کے لیے آرام کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسا نہ ہو تو ہم، ظاہر ہے، نہ رہیں۔ مگر پتہ نہیں کیوں شہر کے بارے میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اِسے بظاہر کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں تو مرمت ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ ترقیاتی کاموں کے بعد گڑھے بھرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اور بعض مقامات پر گڑھے اِس طور بھرے جاتے ہیں کہ ذرا سا پانی پڑنے پر زمین پلپلی ہو جاتی ہے اور کوئی بڑی گاڑی اس پر سے گزرے تو دھنسے بغیر آگے بڑھنے سے صاف انکار کردیتی ہے! جن راستوں یا راہداریوں کو گندے پانی کی

نکاسی کے لیے بنایا جاتا ہے ان میں روانی.برقرار رکھنے کو بھی شاید غیر ضروری سمجھ لیا گیا ہے۔ شہر کی بیشتر غریب بستیوں میں چھوٹی ندیاں اور نالے اب کچرے سے اَٹ چکے ہیں۔ اِن میں کچرے کی مقدار اِس قدر ہو چکی ہے کہ گندے پانی کی نکاسی چھوٹی سی نالی کی صورت میں ہو رہی ہوتی ہے۔ اور کچرا پڑے پڑے ٹھوس ہوتا جاتا ہے اور آلودگی کے مستقل مآخذ کی شکل اختیار کرلیتا ہے!

کراچی کے کئی پس ماندہ علاقوں میں آبادی کے بیچ سے گزرنے والے نالے عملاً بند ہوچکے ہیں۔ اِن کی صفائی کا اہتمام کرنے کا کسی کو خیال نہیں آتا۔ سرکاری ادارے ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈال کر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ کئی علاقوں میں خاصے چوڑے نالوں پر بنائے جانے والے پل انتہائی خستہ حالت میں

ہیں اور کسی بھی وقت ٹوٹ سکتے ہیں۔ علاقے کے مکین آمد و رفت کے لیے یہ پل استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ بے حسی کی انتہا یہ ہے کہ بعض مقامات پر نالے سے ملحق مکانات میں سکونت پذیر بچے بھی دن رات ٹوٹے پھوٹے اور خستہ حال پلوں پر کھیلتے رہتے ہیں۔ گھر کے باہر کچرے کے ڈھیر اور "کیچڑ نالے" ان بچوں کے پلے گراؤنڈ ہیں! بچے تو کیا کھیلیں گے، یہ کچرے کے ڈھیر اور گندے نالے ہی اِن معصوموں کی زندگی سے کھیلتے رہتے ہیں! آئے دِن اِن نالوں میں گر کر بچے زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں مگر اس کے باوجود متعلقہ ذمہ داران کے دل میں کوئی کسک نہیں اٹھتی، ضمیر جاگتا نہیں اور احساس کی بیداری کا امکان دکھائی نہیں دیتا۔

کراچی مختلف ٹاؤنز کا مجموعہ ہے۔ ہر بڑے شہر میں چند ایسے علاقے بھی ہوتے ہیں جو زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اِنہیں عرفِ عام میں چائنا ٹاؤن کہا جاتا ہے۔ چین سے لازوال دوستی کا شاید ایک یہ نتیجہ بھی برآمد ہوا ہے کہ ہمیں چائنا ٹاؤن کی اصطلاح سے لگاؤ ہوگیا ہے اور ہم اپنے شہروں میں چائنا ٹاؤنز کی تعداد بڑھانے پر تل گئے ہیں!

ہر (چھوٹا یا بڑا) شہر مختلف طبقات اور اُن کے تحت زندگی بسر کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ امیر اور غریب کا فرق بھی کوئی حیرت انگیز اور

قابل نفرت بات نہیں کہ فطری امر ہے۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ بعض علاقوں کو زندگی کی دوڑ میں جان بوجھ کر اِس قدر پیچھے رکھا جائے کہ انہیں دیکھتے ہی زندگی کی کم مایئگی کا احساس ہو؟ جس طرح غریب بستیوں کے نالوں کی صفائی ناگزیر ہے بالکل اسی طرح شہر کے لیے غریب علاقوں کی صفائی بھی ناگزیر ہے کیونکہ یہ علاقے بھی شہر کے لیے نالوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ غریب بستیوں کے کچرے سے اَٹے نالوں پر پل تعمیر کرنے کے ساتھ شہر کے مختلف علاقوں کے درمیان بھی پل تعمیر کرنا لازم ہے تاکہ بہت سی زندگیاں محرومیوں اور ناکامیوں کے گندے نالوں میں نہ گرتی رہیں!

مٹّی سے رزق نکالنے کا مقدس عمل

اپنے آپ سے کیا جانے والا ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ اللہ نے ہمیں کس نعمت سے محروم رکھا ہے؟ جس قدر جی چاہے غور کیجیے۔اِس سوال کا جواب یہی ہوگا کہ رب کی نعمتوں کا شمار ممکن ہے نہ شکر۔ قدم قدم پر نعمتیں بکھری پڑی ہیں اور ہم ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اہل کراچی پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ جہان بھر کی نعمتیں خاصی آسانی سے میسر ہیں اور اِس پر سَر بسجود ہو رہنا ہی بندگی کا بنیادی تقاضا ہے۔

جس شہر میں رب کی نعمتیں بکھری پڑی ہیں اسی میں بہت سی نعمتیں ایسی بھی ہیں جو راہوں میں پڑی رہ جاتی ہیں۔ اناج منڈی میں جب مال اُتارا یا چڑھایا جاتا ہے تو اناج کے ڈھیروں دانے گر جاتے ہیں۔ کبھی کبھی بوریاں پھٹنے سے بھی اناج کے دانے گر جاتے ہیں اور جو کچھ گرا ہوتا ہے وہ پورا کا پورا اُٹھانا ممکن نہیں ہوتا۔ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کی تگ و دو میں مصروف کچھ لوگ ایسی صورتِ حال سے بھی رزق پانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا جہاں لوہے کا کام زیادہ ہوتا ہے وہاں مٹی میں لوہے کے ذرات اور ٹکڑے بڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ رَسّی میں مقناطیس باندھ کر

لوہے کے ذرات اور ٹکڑوں کو مٹی سے الگ کرتے ہیں اور فروخت کرکے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بہت سی غریب اور محنت کش خواتین بھی اناج منڈی میں گاڑیوں سے گرنے والے چاول اور دالوں کے دانے مٹی سے الگ کرکے جمع کرتی ہیں اور پھر انہیں فروخت کرکے گھر کا چولھا جلتا رکھنے کا بندوبست کرتی ہیں۔اِس عمل کو ہم مٹّی سے رزق یا اندھیروں سے اجالے کشید کرنا بھی قرار دے سکتے ہیں!

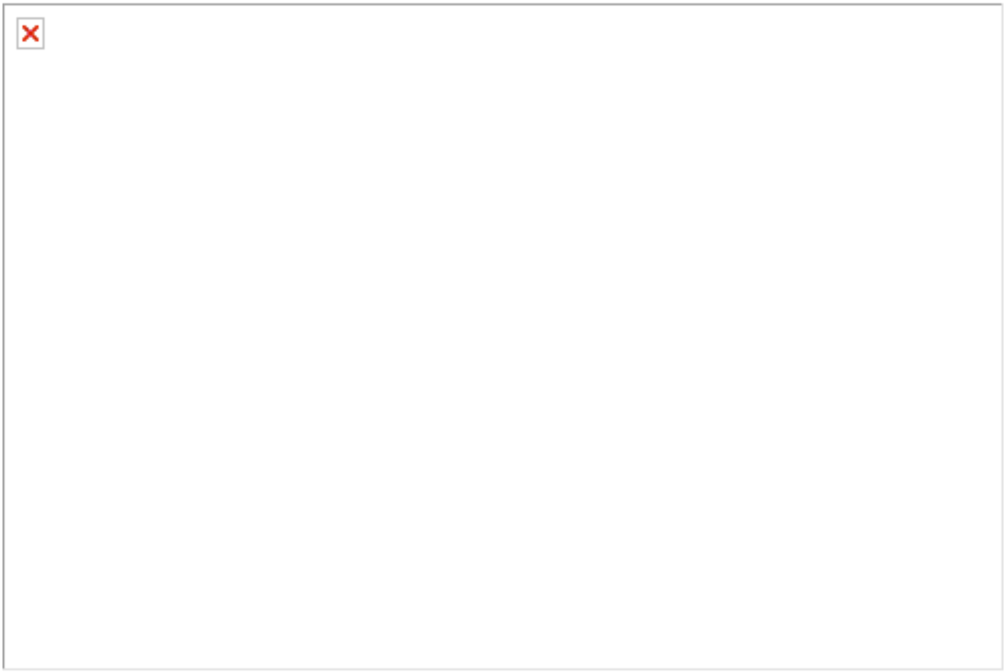

وہ لوگ ہر اعتبار سے مبارک باد کے قابل اور لائق تحسین ہیں جو حالات کے جبر کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتے اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلا کر زندگی کو بے توقیر کرنے کے بجائے خاک چھان کر اناج کے دانے نکالتے ہیں۔ ہمیں اِس دنیا

میں اللہ نے جن مقاصد کے ساتھ بھیجا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ کسی بھی صورتِ حال سے مایوس نہ ہوں اور برائی کے بطن سے بھی اچھائی برآمد کرنے کی کوشش کریں! جو لوگ زندگی کے بارے میں مثبت سوچ رکھتے ہیں اور اپنی طرز عمل سے منفی اقدار کی بیخ کنی کرتے ہیں وہ مایوسی کی بنجر زمین سے بھی امید کی فصل حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والی بظاہر کمزور خواتین کی یہ مشقت ان تمام انسانوں کی غیرت کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ ہے جو بہت کچھ پا کر بھی رات دن محرومیوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔ جس معاشرے میں غریب و محنت کش خواتین مٹی چھان کر اناج کا ضیاع روکنے کا مقدس فریضہ انجام دے رہی ہیں اسی معاشرے میں ایسے بد نصیب اور ناشکرے بھی ہیں جو عام آدمی کے مقابلے میں آٹھ دس گنا اُجرت پانے کے بعد بھی روتے ہی رہتے ہیں اور کبھی کسی نعمت کے لیے اللہ کے آگے سجدہ ریز نہیں ہوتے!

خاک چھان کر اناج کے دانے الگ کرنے والی خواتین شہر کے ان تمام لوگوں کے لیے شرم کا سامان ہیں جو بظاہر کِسی جسمانی عارضے میں مبتلا نہ ہونے کے باوجود محنت سے جی چراتے اور شہر کے مختلف مقامات پر قائم خیراتی دستر خوان پر بیٹھ کر انتہائی بے شرمی سے صدقے میں ملنے والی مُفت کی روٹیاں توڑتے ہیں! اور اِس سے تلخ حقیقت یہ ہے کہ دن بھر مشقت کرنے والوں کو تو روکھی سوکھی، دال روٹی ہی نصیب ہو پاتی ہے اور مفت خورے صدقے کی مَد میں کاٹے جانے والے بکروں کی بوٹیاں اڑاتے ہیں! جہاں محنت کو شعار بنانے والے احترام کی نظر سے نہ دیکھے جاتے ہوں وہاں ایسے ہی تماشے ہوا کرتے ہیں!

دنیا کا ہر محنت کش ایک چلتا پھرتا پیغام ہے... اِس بات کا کہ ہم جس دنیا میں جی رہے ہیں اس میں سب کچھ آسانی سے نہیں ملتا اور اگر سب کچھ آسانی سے ملتا رہے تو خرابیاں کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جاتی ہیں! حقیقی کامیابی انہی کا مقدر بنتی ہے جو محنت کو اپنے وجود اور مزاج کا حصہ بنائے رہتے ہیں۔ دنیا میں جو بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے، محنت کرنے والوں ہی کے دم سے ہوتی

ہے۔ لازم ہے کہ ہاتھ پھیلانے کے بجائے اپنا وجود گھس کر، جان لڑا کر محنت کرنے والوں کی قدر کی جائے، انہیں حقیقی توقیر سے نوازا جائے۔

امریکہ و یورپ کے پیٹ کا درد

امریکہ اور یورپ کے پیٹ میں اُٹھنے والے نئے اور شدید ترین درد کو ہم آپ چین کے نام سے جانتے ہیں! امریکی دانش وروں، پالیسی میکرز اور حکمرانوں کو اپنے مسائل پر توجہ دینے سے زیادہ یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ چین اپنے بیشتر مسائل کس طور حل کرکے آسانی اور روانی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ خوش حالی کی طرف بڑھ رہا ہے! چین نے جب خوش حالی کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا تو پیداوار بڑھانے پر خاص توجہ دی۔ دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ ساتھ اُس نے حیرانی کی پیداوار بھی بڑھادی! تین عشروں کے دوران چین نے امریکہ اور یورپ کو تواتر سے حیرانی میں مُبتلا رکھا ہے۔ اہل مغرب آبادی کے حجم میں اِضافے کو بوجھ گردانتے ہیں مگر چینیوں نے ثابت کردیا ہے کہ پھیلتی اور بڑھتی آبادی کبھی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ آبادی میں اضافے کو اہل مغرب لعنت گردانتے ہیں اور چینیوں نے مغرب کی لعنت کو اپنے لیے رحمت اور برکت میں تبدیل کیا ہے! سیدھا اور سادہ اُصول ہے کہ کشادہ دِلی اور خندہ پیشانی سے کام کرتے رہیے اور زندگی آسان بنائیے۔ ہر طرح کی پس ماندگی کو خیرباد کہتے ہوئے چینیوں نے ثابت کیا ہے کہ وہ مغربی طاقتوں کو مُنہ دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

!اور اِس صلاحیت کا اظہار دیکھ کر امریکہ و یورپ اپنے سے مُنہ لیکر رہ گئے ہیں
ایک ارب تیس کروڑ نفوس پر مشتمل ملک کو کنٹرول کرنا، حکمرانی کا اعلیٰ معیار برقرار رکھنا، کرپشن کی روک تھام یقینی بنانا اور ترقی کی راہ ہموار کرتے رہنا مذاق ہے نہ بچوں کا کھیل۔ چینیوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے اور دُنیا کو بتا اور جتا دیا ہے کہ
!دیکھو، اِس طرح سے کہتے ہیں سُخن وَر سہرا
چینی بھی بڑے ظالم ہیں، ایسا لگتا ہے کہ اُنھوں نے مغرب کے سیاست دانوں، پالیسی میکرز اور عوام کو سُکھ کا سانس نہ لینے دینے کی قسم کھا رکھی ہے! معاملہ یہاں تک آ پہنچا ہے کہ چینیوں کی ہر بات امریکہ اور یورپ میں بسنے والوں کے پیٹ میں مروڑ پیدا کر رہی ہے۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ عالمی ادارہ خوراک نے چائے کی چُسکیاں لینے کے انداز سے بتایا ہے کہ چین کے باشندوں نے چائے پینے کے معاملے میں بھی سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے یعنی ہر سال دس لاکھ ٹن چائے پی جاتے ہیں! دوسرے نمبر پر بھارت کے لوگ ہیں جو ہر سال آٹھ لاکھ اٹھائیس ہزار ٹن چائے پی جاتے ہیں۔

چین عالمی منڈیوں میں شیر، بلکہ شیروں کے مُنہ سے نِوالے چھیننے میں مصروف ہے اِس لیے نِوالوں سے محروم ہونے والے شیروں کا دَہاڑنا حیرت انگیز نہیں۔ مگر صاحب، شیر اگر واقعی شیر ہیں تو اُنہیں رونا پیٹنا ہرگز زیب نہیں دیتا! اگر کسی سے مخاصمت ہے بھی تو اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُس کے کھانے پینے پر بھی نظر رکھی جائے! ایک ارب تیس کروڑ نفوس پر مشتمل مُلک کیا سال بھر میں دس لاکھ ٹن چائے بھی نہیں پیئے گا؟ چین کے کھانے پینے کا حساب رکھنے کا سلسلہ جاری رہا تو ہم خبردار کئے دیتے ہیں کہ حساب کتاب رکھنے والوں کے سَروں پر اعداد و شمار یونہی ٹن ٹنا ٹن برستے رہیں گے! اہل مغرب چین سے یونہی چڑتے رہے تو کل کو حساب لگایا جائے گا کہ چین کے باشندے ہر سال اِتنے ارب گیلن پانی پی جاتے ہیں یا اتنے کروڑ ٹن اناج کھا جاتے ہیں! اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کل کو اعداد و شمار پیش کئے جائیں کہ چینی باشندے سال بھر میں عالمی سطح پر پائی جانے والی آکسیجن کا بڑا حصہ اپنے پھیپھڑوں میں بھر لیتے ہیں اِس لیے اُنہیں سانس لینے سے روکا جائے کیونکہ دوسری اقوام کو آکسیجن نہیں مِل پا رہی!

چین کے باشندے کیا کھاتے ہیں اور کیا پیتے ہیں، اِس کا حساب رکھنے سے کہیں بہتر ہے امریکہ اور یورپ یہ دیکھیں کہ اُنہوں نے کب کب کِس کِس کو کھایا

اور پیا ہے، بلکہ ڈکار گئے ہیں! دو صدیوں سے بھی زائد مدت تک یورپ کی سامراجی قوتیں افریقہ، مشرقِ وُسطیٰ، ایشیائے کوچک اور جنوبی ایشیا کو جی بھر کے کھاتی پیتی، بلکہ نوچتی اور بھنبھوڑتی رہی ہیں! کمزور ممالک کے لاشوں پر اپنا شیش محل تعمیر کرنے سے یورپ کی سامراجی قوتوں نے کبھی گریز اور دریغ نہیں کیا۔ دوسروں کے مال سے اپنی جیب بھرنے اور دوسروں کو پس ماندہ رکھ کر ترقی کی منازل طے کرنے والوں کے ہاتھ سے ایک دن سب کچھ اِسی طور چلا جاتا ہے۔ افیون کے نشے میں غرق ہو کر انتا غفیل ہو رہنے والی چینی قوم نے اب اپنی کاہلی کو اتنا غفیل کیا ہے تو اُنہیں پریشانی لاحق ہو گئی ہے جو اب تک عالمی برادری کے چوہدری کا کردار ادا کرتے آئے ہیں! اِس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ دُنیا کا دستور یہی ہے۔ اِسی کو پنجابی میں کہتے ہیں چور نُوں پے گئے مُور!

روشنی کے شہر میں ظلمت مقدر ہو گئی

نئی نسل نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا مگر ہاں بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ کسی زمانے میں کراچی روشنیوں کا شہر ہوا کرتا تھا! آج کے بچوں نے کبھی زیادہ روشنی دیکھی نہیں۔ اگر کبھی کراچی نے اپنی تاریخ دہرائی تو اِن بے چاروں کی آنکھیں چُندھیا جائیں گی! 1960 کی دہائی میں بننے والی فلم "چنگاری" میں مہدی حسن کا گایا ہوا گیت اعجاز پر فلمایا گیا تھا جس کا مکھڑا تھا "اے روشنیوں کے شہر بتا!" اِس گانے سے اِس اَمر کا ثبوت ملتا ہے کہ کراچی واقعی کبھی روشنیوں کا شہر تھا۔ جب کراچی روشنیوں کا شہر تھا تب بھی اِس سے سوال کیا جاتا تھا اور اب تو خیر، گوناگوں سوالات کا ایک ڈھیر ہے جو جواب کا منتظر ہے!

زمانے کے رجحانات اور ہمارے مزاج میں کس قدر فرق ہے۔ دنیا بھر میں سمندر کے کنارے آباد بڑے شہروں کو ترقی دینے اور خوش حالی کی علامت بنانے کا رواج عام ہے۔ حکومتیں ساحلی شہروں کی بین الاقوامی نوعیت اور اہمیت کے پیش نظر ان کی ترقی کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ سڑکیں ویران ہوں نہ بے چراغ۔ ہم اِس معاملے میں بھی وکھری ٹائپ کے ہیں! اگر ملک کے چند بڑے یا ایک آدھ بڑا شہر ہی اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہو تو ملک کے بارے میں دنیا کیا

اندازہ لگائے گی؟ اِس سوال پر دنیا بھر میں غور کیا جاتا ہو تو شاید کیا جاتا ہو، ہمارے ہاں فی الحال حکمرانوں کے پاس ایسی باتوں پر غور کرنے کے لیے وقت نہیں۔

ملک کا واحد بین الاقوامی شہر ہونے کے باوجود کراچی اب تک اہل اقتدار و اختیار کی نگاہِ کرم کا منتظر ہے۔ شہر کی بڑی شاہراہوں کو بھی روشن رکھنے کا اہتمام نہ کرنا ان اندھیروں کی نشاندہی کرتا ہے جو اہل اختیار کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں! کراچی کی بڑی سڑکوں پر ٹریفک جام معمول بن کر رہ گیا ہے۔ جس طور ہم پاکستانی آپس میں دست و گریباں ہوتے رہتے ہیں بالکل اسی طرح گاڑیاں بھی ایک دوسرے میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں اور ان میں پھنسے ہوئے

لوگوں کو گھنٹوں شدید کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی رات کو بھی ٹریفک جام کی کیفیت شہریوں کی مشکلات میں اِضافہ کرتی ہے۔ اگر ٹریفک جام نہ بھی ہو تو کسی نہ کسی وجہ سے شہریوں کو گاڑیاں سست رفتاری سے چلانا پڑتی ہیں۔ رات کے وقت کسی شاہراہ پر پھنسی ہوئی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس اندھیرے میں ایسے چمکتی ہیں جیسے جنگل میں رات کے وقت درندوں کی آنکھیں! ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس شہریوں کو درندوں کی آنکھوں جیسی کیوں محسوس نہ ہوں کہ یہ اِن کے قیمتی وقت کو چیر پھاڑ کر ہڑپ کر رہی ہیں! روشنی کے اہتمام سے محروم شاہراہوں کو شہری اپنی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کے ذریعے روشن رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں! جگمگاتی سڑکوں پر بے چراغ گاڑیاں بہت بری لگتی ہیں، بالخصوص قانون نافذ کرنے والوں کو! مگر بے چراغ سڑکوں پر روشن آنکھوں والی گاڑیاں شہر کی رونق کسی حد تک برقرار رکھنے میں ضرور کامیاب رہتی ہیں! کیا ستم ہے کہ شہر کی رونقیں بحال رکھنے کے لیے ہمیشہ شہریوں ہی کو !کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے

شہر کی خاصی چوڑی سڑکوں پر بھی گاڑیوں کی رفتار کا سُست پڑ جانا شاید اِس امر کی علامت ہے کہ ہماری اپنی کوتاہی ہمیں قطار بند رہنے کے آداب سکھا رہی ہے یا پھر یہ بات ہے کہ شہریوں کے پاس وقت بہت ہے اور ا± سے ٹھکانے لگانا ہے! وقت کو قتل کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں مگر اِس حوالے سے جو

مزا ٹریفک جام میں ہے وہ کسی اور چیز میں کہاں؟ بحیثیت قوم ہمارے مزاج میں شکوے اور شکایات رچ بس گئے ہیں۔اِنسان کی سوچ مثبت ہو تو کسی بھی صورتِ حال سے کچھ بھی کشید کیا جاسکتا ہے۔اب اِسی بات کو لیجیے کہ ٹریفک جام سے ہم ایک طرف تحمل سیکھتے ہیں اور قطار بند ہوکر چلنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔اور دوسری طرف یہی ٹریفک جام ہم میں سے بہتوں کو تیزی سے آگے بڑھنے کا ہنر بھی سکھاتا ہے! بہت سے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ٹریفک جام کے دوران ذرا سی گنجائش پیدا ہونے پر کس طرح کھانچا" فٹ کرکے آگے بڑھنا ہے! اگر ٹریفک جام کی روایت نے کمزور پڑنے سے" انکار کردیا تو ہمارے ہاں بہت جلد ایسے باصلاحیت نوجوانوں کی کھیپ سامنے آئے گی جو کسی بھی طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنے اور ہر بُری صورتِ حال کے بطن سے کام !کی کوئی نہ کوئی چیز برآمد کرنے کی ماہر ہوگی

قیامت "آنے والی ہے"

انتظار کا وصف بہت حد تک عادت بن کر انسان کی سرشت میں رچا بسا ہوا ہے۔ ہمیں ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کا انتظار رہتا ہے۔ کبھی کسی نجات دہندہ کی آمد کا، کبھی بُرے وجود سے جان چھوٹنے کا، کبھی اچھے زمانے کے آنے کا اور کبھی بُرے زمانے کے جانے کا۔ قیامت کا انتظار بھی ہماری "انتظاری نفسیات" کا بُنیادی جُز ہے!

جنوبی امریکہ کی مایا تہذیب نے ایک عجیب ہی طرح کا دُکھ اہل جہاں کو تحفے میں دیا ہے۔ مایا تہذیب کا کیلینڈر جس تاریخ پر ختم ہو رہا ہے جب ماہرین اُس کا حساب لگایا تو جولین یعنی موجودہ عیسوی کیلینڈر کی رُو سے 21 دسمبر 2012 نکلی! بس پھر کیا تھا، قیامت کا انتظار کیا جانے لگا! بات بات پر پریشان ہونے والوں کی مہربانی ہے کہ کئی عشرے مایا کیلینڈر کی رُو سے دُنیا کے خاتمے یعنی قیامت کی آمد کا انتظار کرتے گزرے ہیں!

ایک زمانے سے دُنیا کو جس کا انتظار تھا وہ شاہکار.راجمان ہونے کو ہے! اِس قیامت کا انتظار بھی قیامت کا تھا۔ یاروں نے انتظار کے دوران پیدا ہونے والی بیزاری کو قتل کرنے کے لیے تحقیق کی، مضامین اور کتابیں لکھیں،

سیمنارز اور مباحثوں کا اہتمام کیا، لیکچرز دیئے، ریڈیو پروگرام پیش کئے اور جب موشن پکچر ٹیکنالوجی نے ترقی کی تو فلمیں بھی بنائیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ پورا ماحول بنایا گیا! اب اگر کوئی مایا تہذیب کی روایات اور پیش گوئی کی رُو سے قیامت کا انتظار کرتا بھی آیا ہے تو اُسے بیزاری کے ناگ نے ہرگز نہ ڈسا ہوگا۔

دنیا پتہ نہیں کن جھمیلوں میں پڑی ہے اور پتہ نہیں کہاں کہاں سے خوش اور مصروف رہنے کے طریقے کشید کرتی رہتی ہے۔ قیامت کے بارے میں سوچنے اور اُس کا انتظار کرنے میں بھی بہتوں نے راحت پائی ہے! قیامت کیسی ہوگی، ہم پر کس طور گزرے گی اور قیامت کے گزر جانے کے بعد ہم کہاں کھڑے ہوں گے، اِن تمام باتوں میں ہمیں تو کسی طرح کی جدت دکھائی نہیں دیتی۔ پاکستان جیسے معاشرے میں کون سا دن ہے جو قیامت سے کم نہیں؟ اب تو حالات ایسا انداز اور رُخ اختیار کرچکے ہیں کہ آتی جاتی سانس بھی قیامت سے کم محسوس نہیں ہوتی! دو تین عشروں سے پاکستان کو جن حالات کا سامنا رہا ہے وہ کیا قیامت بالائے قیامت نہیں؟ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ ہم قیامت کا شایانِ شان انداز سے سامنا کرنے کی بھرپور تیاری کر رہے ہیں!

کِس قیامت کا انتظار کریں؟

زندگی سَر بہ سَر قیامت ہے!

ہم جب بھی مرزا تنقید بیگ کے سامنے قیامت کا ذکر کرتے ہیں، وہ ایک لمبی سی سرد آہ بھر کر ماضی بعید (کے چند حسینوں) کی حسین یادوں میں کھو جاتے ہیں ! کبھی اچھے وقتوں میں مرزا نے بھی، اپنی "عِلمیت" کو دو آتشہ کرنے کی غرض سے، کالج میں داخلہ لیا تھا اور چند "قیامتوں" سے محض آشنا ہونے کی منزل پر نہیں رُکے تھے بلکہ راہ و رسم بھی بڑھائی تھی ! پھر قیامت کی اِن "نشانیوں" ہی کے ہاتھوں وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر آوارہ گردی کرتے پھرے تھے ! گزرے ہوئے زمانوں کو یاد کرکے مرزا اکثر فرماتے ہیں۔ "ہم کالج میں تھے تو کئی قیامتیں ساتھ چلتی تھیں یا یوں کہہ لو کہ ہم اُن کے ساتھ ہو لیتے تھے ! یہ لفظ 'قیامت' ہم سے الگ نہ ہو سکا۔ شادی ہوئی تو یہ سمجھو کہ ہم پر قیامت ہی گزر گئی !" یہاں ہم وضاحت کردیں کہ مرزا کو ازدواجی معاملات میں قیامت سے دوچار کرنے بلکہ زندگی بھر دوچار رکھنے کا اہتمام اُن کی بڑی بہن نے کیا۔ رشیدہ آپا نے اُن کے لیے لڑکی قصاب برادری میں تلاش کی ! بُغدوں کے سائے میں پل کر بڑی ہونے والی لڑکی مرزا کے لیے کس نوعیت کی قیامت ثابت ہوئی ہوگی، اِس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں ! شادی کے بعد مرزا میں اِتنا حوصلہ اور تپّڑ نہ رہا کہ کسی اور قیامت کے بارے میں سوچیں !

مایا تہذیب کے کیلینڈر نے دُنیا کے خاتمے کی طرف جو اشارہ کیا ہے اُس کے

حوالے سے مرزا کہتے ہیں۔ "دُنیا کے خاتمے کی تاریخ کا اعلان جنوبی امریکہ کے خطے سے کیا گیا ہے۔ یہ اِس امر کا غماز ہے کہ مایا تہذیب کے لوگ واقعی آنے والے زمانوں کے بارے میں جانتے تھے۔ اُنہیں ہزاروں سال قبل اندازہ ہو گیا تھا کہ جس خطے میں وہ آباد ہیں کبھی اُس میں امریکہ نام کا مُلک بھی معرض وجود میں آئے گا جو اپنی بے لگام پالیسیوں سے دُنیا بھر میں قیامت ڈھاتا پھرے گا! اور شاید امریکی حکومت اپنے خطے کی ایک تہذیب کی پیش گوئی کو درست ثابت کرنے کے لیے طاقت کے بے محابا استعمال کے ذریعے دُنیا کو ختم کرنے پر تُلی ہوئی ہے!"

مرزا کو اِس بات پر بھی سخت اعتراض ہے کہ قیامت کا انتظار کیا جائے۔ یہ وصف بھی امریکہ اور یورپ ہی نے اپنایا اور سِکھایا ہے کہ قیامت کے وارد ہونے کا انتظار کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی خاطر قیامت ڈھادی جائے! جو کچھ یورپ کی استعماری قوتیں تین صدیوں تک کرتی رہیں اور اب جو کچھ امریکہ چھ عشروں سے کرتا آیا ہے کیا وہ کمزور ممالک پر قیامت ڈھاتے رہنے سے کچھ کم ہے؟

سنسکرت میں دُنیا کی محبت، مال و زر، مفاد پرستی اور دوسری بہت سی عِلّتوں

کے لیے صرف ایک لفظ استعمال ہوا ہے۔۔ مایا! جو لوگ ہر وقت دُنیا میں گم رہتے ہیں اور کبھی آخرت کے بارے میں نہیں سوچتے اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مایا جال میں پھنس گئے ہیں۔ مایا تہذیب نے دُنیا کے خاتمے کی جو پیش گوئی کی تھی وہ بھی مایا جال کی طرح ہے جس میں بہتوں کے ذہن پھنس کر رہ گئے اور قیامت کا انتظار شروع ہوگیا۔ نوید ہو کہ یہ انتظار اب ختم ہونے کو ہے۔ 21 دسمبر 2012 کو معلوم ہو جائے گا کہ مایا تہذیب والوں نے کوئی کام کی بات کہی تھی یا محض بڑھک ماری تھی!

ایک زمانے سے قیامت کی پیش گوئی بھی بہتوں کے پسندیدہ مشاغل میں سے ہے۔ دُنیا کے خاتمے کی ڈیڈ لائن آتی ہے اور گزر جاتی ہے! مایا تہذیب نے جس قیامت کی طرف اشارہ کیا ہے اُس سے کہیں زیادہ پریشانی تو ہمیں اِس بات سے ہے کہ آئندہ موسم بہار تک منتخب ادارے اپنی میعاد پوری کریں گے! جس موسم میں پھول کھلتے ہیں اُسی موسم میں عام انتخابات کیا گل کھلائیں گے، یہ سوچ سوچ کر دِل زیادہ پریشان ہے!

سَفر کو چلے .... suffer تک پہنچے!

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ کسی نظام کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا تو فوراً اپنی رائے بدل لے کیونکہ پاکستان ایسی کسی بھی رائے کو پوری شدت سے ناکام بنانے کے لیے دُنیا کے نقشے پر موجود ہے! ہم وہ قوم ہیں جو ترتیب، نظم، قواعد، ضوابط اور ایسی ہی دوسری بہت سی "عِلّتوں" سے بہت دور، بڑے آرام سے "رینڈم" کے اُصول پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ ایسی زندگی ہے جس میں تکالیف اور پریشانیاں بڑھتے بڑھتے اب زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ بقول اصغر گونڈوی مرحوم

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے!

دُنیا بھر میں صبح کام پر جانا اور شام کو واپس آنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دُعا دیجیے ہر طرح کے نظام کی ناکامی کو کہ اب پاکستان میں کام پر جانا بجائے خود کام ہے! اور شام کو کسی نہ کسی طرح گھر واپس پہنچ جانا کوئی بڑی چوٹی سَر کرنے سے کم نہیں! جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس نے زندگی یونہی ضائع کی ہے اور کبھی کچھ نہیں کیا وہ اگر روزانہ کام پر جاتا ہے تو اِسی پر فخر کرے! کام کے مقام تک پہنچنا اب کئی مراحل پر مشتمل مہم جوئی کی حیثیت اختیار کرچکا ہے! بہت محتاط ہوکر بھی اندازہ لگایا جائے تو کراچی کی آبادی دو کروڑ سے زائد ہے۔ اتنی بڑی آبادی کے لیے اب تک ماس ٹرانزٹ سسٹم متعارف کرایا نہیں جاسکا۔ دُنیا اگر غور سے دیکھے تو حیران رہ جائے کہ اِتنے بڑے شہر میں سرکاری شعبے کی ٹرانسپورٹیشن نہ ہونے کے برابر ہے اور پھر بھی شہر رواں دواں رہتا ہے! ایک زمانہ تھا کہ لوگ بسوں میں سُکون سے کھڑے ہو رہنے پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ کسی نہ کسی طرح لٹکنے کی گنجائش پیدا کر پانے کو اللہ کا احسان مانا جانے لگا! اور اب حالت یہ ہے کہ فیکٹری یا دفتر جانے کے لیے کسی کو ویگن یا کوچ کی چھت پر جگہ مل جائے تو اپنے مُقدر پر رشک کرنے لگتا ہے! اللہ ہی جانتا ہے کہ ہمیں اپنے مُقدر پر ابھی اور کتنا اور کس کس طرح رشک کرنا ہے!

کسی بھی معاملے میں کچھ بھی درست نہ ہونے کے باعث اب ملک مسائل اور بحرانوں کی آماجگاہ ہو کر رہ گیا ہے۔ بُحران دُنیا بھر میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور جب کہیں ٹھکانہ نہیں ملتا تو پاکستان کی طرف آ دھمکتے ہیں! لاکھ دُہائی دیجیے کہ اب مزید سہنے کی گنجائش نہیں رہی مگر بحران کب کسی کی سنتے ہیں؟ ان کا کام تو واقع اور برپا ہونا ہے! کوئی بھی سرکاری ادارہ، محکمہ یا وزارت کراچی میں ماس ٹرانزٹ سسٹم لانے کے بارے میں سوچنے کے موڈ میں دِکھائی نہیں دیتی۔ مختلف سطحوں کی پرائیویٹ گاڑیاں کسی نہ کسی طور رواں رہ کر شہر کو رواں دواں رکھتی ہیں۔ روزانہ ایک کروڑ سے زائد افراد کا گھر سے نکلنا اور پھر واپس آنا دیگر ممالک کے بڑے شہروں میں بسنے والوں کے لیے کوئی کمال ہو نہ ہو، کراچی جیسے شہر میں واقعی کمال ہے جہاں کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے، کوئی بھی سڑک بند ہو سکتی ہے، قتل کی کوئی بھی واردات زندگی کا پہیہ جام کر سکتی ہے اور کہیں بھی گاڑیوں کو آگ لگا کر لوگوں کو صرف صورتِ حال کے رحم و کرم پر چھوڑا جا سکتا ہے!

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ زندگی کے گوناگوں مسائل کے ہاتھوں عاجز شہریوں کو ایسا جامع ماس ٹرانزٹ سسٹم دیا جائے جو اُنہیں کام پر جانے اور واپس آنے کی معیاری سہولت فراہم کرے؟ کیا یہ کوئی پسندیدہ بات ہے کہ لوگ کام پر جاتے

جاتے تھک جائیں اور واپسی کے عمل میں گھر تک پہنچتے پہنچتے تقریباً اَدھ مُوئے ہو جائیں! عوام کا گاڑی کی چھت پر سوار ہو کر سفر کرنا کیا کوئی ایسی بات ہے جس پر فخر کیا جائے اور زندگی کا حصہ بن جانے والی اِس "روایت" کو تسلسل سے ہم کنار رہنے دیا جائے؟ ہر شہری کو اور کچھ ملے نہ ملے، اِتنی سہولت ضرور ملنی چاہیے کہ کام پر جانا ہو تو با وقار طریقے سے جائے اور گھر واپس آئے تو اِس حالت میں کہ بے جا تھکن جسم و جاں پر سوار نہ ہو، غیر ضروری فرسودگی کا احساس نہ ہو! کراچی جیسے شہر کو پبلک ٹرانسپورٹ کے معاملے میں یوں بے یار و مددگار چھوڑ دینا کِسی بھی اعتبار سے حکومت کے لیے کوئی قابل فخر بات نہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ "بے نظامی" کا عذاب سہنے والے شہریوں کو اور کِسی معاملے میں نہ سہی، کم از کم ماس ٹرانزٹ کے حوالے سے کوئی نظام میسر ہو اور وہ یومیہ سفر سہولت اور وقار کے ساتھ کرنے کے قابل ہو سکیں! اگر اِتنا بھی ہو جائے تو بہت ہے کہ نا امیدی کے ستائے ہوئے شہریوں کے لیے ذرا سی معقولیت اور مستعدی بھی نعمت سے کم نہیں ہوا کرتی! اللہ کرے کہ پبلک ٹرانسپورٹ کی گاڑیوں کی چھتوں پر چڑھ کر سفر کرنے والوں دیکھ کر ہمارے ارباب اختیار کچھ سوچیں اور نا اہلی و بد عنوانی کی چوٹی سے اُتر کر کچھ ایسا کریں کہ زندگی کی ٹریفک حقیقی مفہوم میں رواں ہو جائے!

تعلیم کی بھینس گئی پانی میں

بہت غور کیا جائے تب بھی اس امر کا تعین نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے ہاں جیسا حال تعلیم کے شعبے کا ہے ویسا پورے ملک کا ہے یا جیسی بُری حالت پورے ملک کی ہے ویسی تعلیم کی ہے! خیر گزری کہ دنیا ہمارے سرکاری تعلیمی اداروں کی عمارات اور ساز و سامان کا جائزہ نہیں لیتی ورنہ پتہ نہیں کیا کا کیا سمجھ بیٹھے! جو کچھ ہم نے اب تک تعلیم کے نام پر مارکیٹ میں پیش کیا ہے وہ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ ذرا سا بھی سوچیے تو (اپنا) سَر پیٹنے کو جی چاہتا ہے!

عوام کی مجبوری ہے کہ سرکاری اسکولوں کی بیشتر عمارات کو آثار قدیمہ کے نمونے سمجھ کر ان کا احترام کرتے ہیں! اِن عمارات کو آثار قدیمہ کے نمونوں کے سوا کچھ اور سمجھا بھی تو نہیں جاسکتا! زمانے کے تھپیڑے کھا کھا کر زندگی کی بازی ہارے ہوئے اسکول ہماری نئی نسل کو کیا سکھائیں گے اِس کا اندازہ تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں لگا سکتا!

ایک زمانے سے سرکاری اسکولوں کے پڑھے ہوئے بچے ملک کو چلاتے آئے ہیں۔ جب تعلیم کے شعبے کو نجی شعبے یعنی سرمایہ داروں نے اپنی جولاں گاہ نہیں بنایا تھا تب بھی ٹوٹی پھوٹی، ہلتی جلتی اور بہت مشکل سے سانس لیتی ہوئی عمارات میں قائم سرکاری اسکول قوم کو نالج ورکرز فراہم کیا کرتے تھے۔ سرکاری اسکولوں کے پڑھے ہوئے باصلاحیت افراد مختلف شعبوں میں اپنا آپ بخوبی منواتے تھے۔

بات عمارات تک رہتی تو کچھ نہ تھا، جب تعلیم اور تدریس کے ڈھانچے ہی کو ہلا دیا گیا تو حقیقی بگاڑ پیدا ہوا۔ اور پھر کچھ بھی نہ بچا۔ یاروں نے شاید قسم کھا رکھی ہے کہ کسی بھی شعبے کو بربادی کی آخری حد تک پہنچاکر ہی دم لینا ہے! کہتے ہیں ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے۔ جن معاشروں میں غیر معمولی کرپشن عام ہے وہ بھی تعلیم جیسے بنیادی شعبے سے کھلواڑ نہیں کرتے

کیونکہ انہیں یاد رہتا ہے کہ انسان جس عمارت میں موجود ہو اس کی کھڑکیوں، دروازوں اور روشن دانوں سے تو کھلواڑ کی جاسکتی ہے مگر ستونوں سے نہیں کھیلنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہتی ہے! اِتنا بڑا جگرا صرف ہمارا ہے کہ ستونوں اور بنیادوں سے بھی کھلواڑ کرتے ہیں اور نتائج کے بارے میں سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے!

کراچی کے بن قاسم ٹاؤن کے لَٹھ گوٹھ کا سرکاری اسکول زمانے سے بند پڑا ہے۔ اساتذہ اور طلبا نہ ہوں تو اسکول محض عمارت رہ جاتا ہے اور پھر عمارت بھی کہاں رہتی ہے، آخر میں تو کھنڈر ہاتھ آتا ہے! علم سے محبت کرنے والے ہر انسان کے سَر پر لَٹھ کی طرح برسنے والا لَٹھ گوٹھ کا بند اسکول خاصے واضح انداز سے بتا رہا ہے کہ تعلیم کے حوالے سے ہماری پالیسیاں اب بند گلی میں پہنچ چکی ہیں! جب علم ترجیحات میں شامل نہ ہو تو تدریس کے لیے قائم کی جانے والی عمارات بالآخر حیوانات کی آماجگاہ میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہیں! جو اقوام تعلیم سے کھلواڑ کرتی ہیں ان کی نسلیں جہالت کے اندھیروں میں ڈوب جاتی ہیں اور پھر ا±ن کے تعلیمی اداروں کی خستہ حال عمارات میں بھیڑ بکریاں ہی ڈیرے ڈال لیا کرتی ہیں! سندھ میں ایسے سرکاری اسکولوں کی کمی نہیں جنھیں اب مویشی پالنے کے لیے کامیابی اور عمدگی سے استعمال کیا جا رہا

ہے! اِس حالت میں بھی یہ اسکول ہمیں کچھ نہ کچھ تو سکھا ہی رہے ہیں۔ مثلاً خالی پڑے ہوئے اسکولوں میں بھیڑ بکریاں اور بھینیں ڈیرے ڈال کر یہ پیغام دے رہی ہیں کہ اگر علم کے حصول اور دانش کی ترویج کو ترجیحات میں شامل نہ کیا گیا تو ہمارے پورے قومی وجود کو جہالت اسی طرح چَر جائے گی جس طرح بھیڑ بکریاں گھاس چَر جاتی ہیں!

جب اہل اختیار کو اپنی جیبیں بھرنے سے فرصت نہ ہو تو نئی نسل کو بہتر زمانوں کے لیے تیار کرنے کا کون سوچے؟ سوال صرف قومی سطح پر ترجیحات کے تعین کا ہے۔ جو چیز ترجیحات میں شامل ہی نہ ہو اُس کا معیار بلند کرنے کے بارے میں کون سوچے گا؟ ہماری "پیش رفت" کا یہ عالم ہے کہ ہم نے تعلیم کو

بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے! جن کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار ہے وہ شاید یہی چاہتے ہیں کہ تعلیم اور تدریس کے لیے قائم کی جانے والی عمارات گندے پانی میں گھری رہیں اور اُن میں بھیڑ بکریاں ہی نہیں، گائے بھینسیں بھی قیام فرمائیں! سیدھی سی بات ہے، بند اسکول صرف پرائمری مویشیوں کے لیے تو ہو نہیں سکتے! بکریاں اگر پرائمری سطح پر ہیں تو بھینسیں اِن بند اسکولوں میں مڈل اور سیکنڈری کی سطح پر! جن کے ہاتھ میں سرکاری اسکولوں کا نظم و نسق ہے وہ شاید یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ بند سرکاری اسکولوں میں بھیڑ بکریوں اور بھینسوں کو چہل قدمی کرتی دیکھ کر دنیا بھر کے لوگ یہ سمجھیں گے کہ ہم اپنے یعنی انسانی بچوں کو تعلیم دینے کے عمل سے فارغ ہو کر اب مویشیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر رہے ہیں!

نئی نسل کو اقوام عالم مس کچھ کرنے کے قابل بنانے کا فریضہ صرف معیاری تعلیمی ادارے ہی انجام دے سکتے ہیں۔ اور ہم نے اپنے تعلیمی اداروں کو کس انجام سے دوچار کر رکھا ہے! تعلیم و تعلم کی تباہی کے ساتھ ساتھ ایک بڑا دُکھ اِس بات کا بھی ہے کہ اِتنا کچھ ہو جانے پر بھی .... شرم ہم کو مگر نہیں آتی!

کہیں سب کچھ .... کہیں کچھ بھی نہیں ہے

تلخی نہ ہو تو شیرینی کی اہمیت کا اندازہ کیسے اور کیسے ہو؟ دُکھ نہ ہو تو سُکھ کا مزا کوئی کیسے جان پائے؟ محرومی کا احساس نہ ہو تو بہت کچھ پانے کی لذت کا حقیقی اندازہ کیونکر ہو پائے؟ زندگی تضادات کی کارفرمائی کا دوسرا نام ہے۔ اپنے ماحول میں اور اُس سے باہر جس طرف بھی نظر دوڑائیے، تضاد ہی تضاد دِکھائی دے گا اور مزے کی بات یہ ہے کہ مزا تضاد ہی میں ہے! تمام انگور میٹھے ہوں تو مٹھاس کی اہمیت باقی نہ رہے۔ اور اگر تمام انگور کھٹے ہوں تو کھٹے پن کا لطف ہی ختم ہو جائے!

پاکستانی معاشرہ بھی انگور کے دانوں کی طرح کھٹا اور میٹھا ہے۔ کہیں افلاس ہے تو ایسا کہ پیٹ بھر کھانا بھی مشکل ہی سے میسر ہو پاتا ہے۔ اور اگر کہیں دولت کی ریل پیل ہے تو اِس بلا کی ہے کہ دنیا کی ہر نعمت قدموں میں بچھی جاتی ہے!

جنہیں زندگی اور تقدیر طاق نسیاں پر رکھ کر بھول گئی ہے اُن کے حصے میں صرف محرومی رہ گئی ہے۔ اور جن لوگوں پر زمانے اور خوش بختی کی نظر پڑ گئی ہے وہ سب کی آنکھوں کے تارے ہیں اور تمام آسائشات و تعیشات ان کے ہاتھوں کا میل ہوکر رہ گئے ہیں!

ہم انتہاؤں کے درمیان جی رہے ہیں۔ کہیں افلاس ہے تو ایسا کہ کسی حد کو ماننے پر آمادہ نہیں اور کہیں امارت ہے اور خوش حالی ہے تو ایسی کہ ہر انتہا کو بھول بیٹھی ہے!

اللہ نے کائنات کو تضادات سے مُزیّن کیا ہے۔ کائنات کا حسن متضاد اشیاءکے تفاعل اور تصادم سے ہے۔ مگر اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر معاملے میں تضاد کو زندگی کا حسن سمجھتے ہوئے برقرار رکھنے کی کوشش فرض سمجھ کر کی

جائے ! افلاس اور امارت ہمارے معاشرتی اور معاشرتی ڈھانچے کے اجزا ہیں۔ مگر خیر، اِس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ افلاس کو ہر حال میں محفوظ رکھنے پر توجہ دی جانی چاہیے ! جن کے ہاتھ خالی ہیں اُنہیں بھی زندگی اور اُس سے جُڑی ہوئی ہر نعمت میسر ہونی چاہیے۔ قابل غور اور حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ جن بچوں کو زندگی نے کچھ خاص نہیں نوازا وہ بھی کوئی شِکوہ کیے بغیر چہرے کو مُسکراہٹ اور دِل کو تشکر کے احساس سے سجائے رہتے ہیں ! جن بچوں کو رُوکھی سُوکھی میسر ہے وہ بھی مُسکراکر یہ پیغام دے رہے ہیں کہ ہمیں ہر حال میں خوش رہنا چاہیے اور تقدیر و حالات کی ستم ظریفی کا ماتم کرتے رہنے پر اللہ کا شکر ادا کرکے ہنستے، مُسکراتے ہوئے جینے کو زندگی کی بنیادی ترجیح بنانا چاہیے !

ملک کے بڑے شہروں اور دیہی ماحول کے درمیان تفاوت اور تضاد نمایاں ہے۔ بڑے شہروں کے اندر بھی کئی علاقے ایک دوسرے کی مکمل ضد ہوتے ہیں۔ کہیں زندگی نے سب کچھ پوری فراخ دِلی سے تقسیم کیا ہوتا ہے اور کہیں کسی کو ڈھنگ سے دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہو پاتی۔ معاشرے مں پایا جانے والا یہ تضاد زندگی کا حصہ ضرور ہے مگر ہمارے لیے کچھ کرنے کی تحریک بھی تو رکھتا ہے۔ ہم جو کچھ اپنے ماحول میں دیکھ رہے ہیں وہ سب کا سب ایسا نہیں کہ محفوظ رکھا جائے۔ افلاس اور امارت کے درمیان فرق کم ہو، اِس کے لیے خصوصی اقدامات

ناگزیر ہیں۔ زندگی نے جنہیں زیادہ نہیں نوازا کسی نہ کسی طور اُن کی بھی اشک شُوئی ہونی چاہیے۔ زندہ رہنے کی کوئی نہ کوئی قیمت ضرور ہوتی ہے مگر یہ قیمت ایسی اور اِتنی نہ ہو جس کے ادا کرنے کی فکر میں خود زندگی ہی کہیں گم ہو کر رہ جائے! بہترین کھانے جن کے حصے میں آئے ہیں اُنہیں یاد رکھنا چاہیے کہ بہتوں کو دو وقت کی روٹی بھی آسانی سے میسر نہیں۔ جن کے چولھے مشکل سے جل پاتے ہں اُنہیں بھول کر ہم اپنی گھروں کے چراغ روشن نہیں رکھ سکتے۔ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کا حق ہے کہ اُن پر توجہ دی جائے، اُن کے مسائل حل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ زمانے کی روش اور بڑھتی ہوئی مُسابقت نے جن کے لیے زندہ رہنے کی جدوجہد کو مِشن " میں تبدیل کردیا ہے ان کے لیے دو وقت کی روٹی کا حصول آسان بنانے میں " اگر ہم کوئی کردار ادا کرسکیں تو یہ اپنے ضمیر کی عدالت مں مقدمہ جیتنے اور اپنے وجود سے انصاف یقینی بنانے کے مترادف ہوگا! کیا ہی اچھا ہو کہ ہم صرف اپنی آسانیوں میں گم ہو کر نہ رہ جائیں اور اپنے ماحول میں پلنے والے اُن غریبوں اور بالخصوص بچوں کا بھی خیال رکھیں جو ایڑی چوٹی کا زور لگاکر بس سانسوں کا ربط برقرار رکھے ہوئے ہیں اور تمام بنیادی سہولتوں اور نعمتوں کو ترستے ہی رہتے ہیں۔

(فوٹوگرافی : عمران علی، محمد جمیل (روزنامہ دنیا، کراچی

شرم ہم کو مگر نہیں آتی

کوئی بھی خرابی جب نمودار ہوتی ہے تو بدنامی اور تذلیل کا باعث بنتی ہے۔ ذمہ دار کون ہے اور کون نہیں، یہ تو بعد کی بحث ہے۔ قابل غور بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی خرابی ہمارے سامنے ہو تو مشکلات کو راہ دیتی ہے۔ اب اسی بات کو لیجیے کہ ہزار بار توجہ دلائے جانے پر بھی کراچی جیسے (ملک کے سب سے بڑے) شہر میں ماس ٹرانزٹ پروگرام کو حتمی شکل نہیں دی گئی اور روزانہ لاکھوں افراد سخت بے ہودہ نوعیت کے نظام کے تحت سفر پر مجبور ہیں۔ شہر میں پبلک ٹرانسپورٹ کے نام پر چلنے والی گاڑیوں میں ایسی سال خوردہ اور ازکار رفتہ گاڑیاں بھی شامل ہیں جنہیں دیکھ کر اپنے آپ سے شرم سی محسوس ہونے لگتی ہے! سیدھی سی بات ہے، گاڑی تو شرمندہ ہونے سے رہی! اور گاڑی مالکان؟ اگر وہ شرمندہ ہوا کرتے تو کیا بات تھی۔

پبلک ٹرانسپورٹ کے نام پر سڑکوں کی "زینت" بننے والی بہت سی گاڑیاں ایسی ہیں جنہیں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ کوئی بھی گاڑی کسی بھی حالت میں چل سکتی ہے۔

کھڑکیوں کے شیشے نہ ہونا، سیٹوں کا ٹوٹا ہوا ہونا، بس میں سفر کے دوران کھڑے ہوئے لوگوں کی سہولت کے لیے جو سلاخیں یا ڈنڈے لگائے جاتے ہیں اُن کا شکستہ اور جھولتی ہوئی حالت میں ہونا دنیا کے لیے حیرت کا باعث

ہو سکتا ہے مگر ہمارے لیے یہ حیرت کی بات ہے نہ شرم کی ! بعض گاڑیوں کو دیکھ کر تو یہ خیال آتا ہے کہ اِن میں انجن بھی ہے یا نہیں ! شہر میں ایسی درجنوں ویگنیں عوام کا بوجھ اٹھا رہی ہیں جو اپنی خستگی کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے بھی تھک سی گئی ہیں۔ پچھلے پہیوں کے اوپر بنی ہوئی سیٹ پر بیٹھ کر نیچے دیکھیے تو گِھسی اور پھٹی ہوئی "فولادی" چادر سے ٹائرز کے درشن آسانی سے کئے جا سکتے ہیں!

یومیہ سفر زندگی کو آسان بنانے کے لیے ہونا چاہیے مگر ہمارے ہاں شاید حکومت نے فرض کرلیا ہے کہ اگر عوام کو مشکل ترین حالات کے لیے تیار کرنا ہے تو روزانہ مہم جوئی پر مجبور کیا جائے! یعنی

!مُشکلیں مجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہو گئیں

کراچی اور ملک کے دیگر بڑے شہروں میں ایسی بہت سی بسیں اور ویگنیں سڑکوں پر رواں دکھائی دیتی ہیں جنہیں اُصولی طور پر تو عجائب گھر یا پھر کباڑ خانے میں ہونا چاہیے۔ اِن بسوں اور ویگنوں میں سفر اپنے رسک پر ہوتا ہے۔ اگر آپ زندگی سے پیار کرتے ہیں تو اِن گاڑیوں سے دور رہیں۔ بقول غالب

جس کو ہوں جان و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

بہت سی ویگنوں میں صرف کھڑکی کے شیشے ٹوٹے ہوئے نہیں بلکہ پچھلی نشستوں والے شیشے بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ سرد ہواؤں کو روکنے کے لیے کپڑے کے ٹکڑوں اور چادروں کا سہارا لیا جاتا ہے۔

!اِس سادگی پہ کون نہ مَر جائے اے خُدا

اور کون کیا؟ جنہیں مرنا ہے وہ بھلا مسافروں کے سوا کون ہو سکتے ہیں؟ ویگنوں کا پچھلا حصہ عام سے کپڑے کی چادر سے ڈھکا ہوا ہو تو سمجھ لیجیے کہ پیچھے سے کوئی گاڑی آ کر ٹکرائے تو بیٹھے ہوئے لوگوں کی خیر نہیں۔ مگر اِتنا سوچنے کا ہوش کِس کو ہے؟ عوام جن گاڑیوں میں بیٹھتے ہیں وہ خود بیٹھی ہوئی ہیں ! اور اِن گاڑیوں کو چلتی دیکھ کر مسافر بھی !حیران ہیں اور چلانے والے بھی

حکومت البتہ ذرا بھی حیران نہیں۔ اُس کے پاس ایسے تماشے دیکھنے کا وقت ہی کہاں ہے!

پبلک ٹرانسپورٹ کی گاڑیوں کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور محفوظ ہونا چاہیے۔ دنیا بھر میں حکومتیں عوام کو یہ بنیادی سہولت فراہم کرنے پر خاص توجہ دیتی ہیں۔ اگر یومیہ سفر ذرا سا مہنگا بھی ہو تو لوگ بُرا نہیں مانتے کیونکہ زندگی کو محفوظ بنانے سے زیادہ فائدے کا سَودا کوئی نہیں! مگر ہمارے ہاں نہ حکومت کو کچھ فکر ہے، نہ ٹرانسپورٹرز کو کچھ احساس ہے اور نہ مسافروں کو کچھ اندازہ ہے کہ روزانہ وہ کتنے خطرات کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے والوں کو احساس ہے۔ مسافروں کے پاس ایک آپشن ضرور ہے۔ یہ کہ انتہائی خستہ حال بسوں اور ویگنوں میں سفر سے یکسر گریز کیا جائے۔ یہ آپشن عوام سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ ٹرانسپورٹرز کچھ خرچ کئے بغیر بہت کچھ کمانا چاہتے ہیں اور سرکاری اہلکار رشوت کے عوض کِسی بھی نوعیت اور حالت کی گاڑی کو فٹنس سرٹیفکیٹ دے دیتے ہیں۔ یہ تو عوام کی زندگی سے کِھلواڑ کا معاملہ ہے! ذمہ داری کے احساس سے ہمکنار کسی بھی معاشرے میں ایسے جرم پر موت کی سزا سُنائی جاسکتی ہے! عوام کی زندگی کو داؤ پر لگانے کا سلسلہ کب ختم ہوگا؟ متعلقہ حکام کچھ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے؟

(فوٹو گرافی: محمد فاضل)

سفر میں بم ہمارے ساتھ ہیں .... کیا بات ہے

یہ طے کرنا اِنتہائی دشوار ہے کہ ہم کن کن معاملات میں باقی دنیا سے بہت مختلف ہیں۔ کوئی اگر جائزہ لینے نکلے تو واپسی کا راستہ نہ پائے گا! اہل وطن نے شاید قسم کھا رکھی ہے کہ جس طور بھی ہو، زندگی کو زیادہ سے زیادہ دشوار بلکہ ہلاکت خزہ بناتے رہیں گے!
کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

بے چینیاں سمیٹ کے سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو مِرا دل بنادیا!

ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ مشکلات بھٹکتی پھرتی ہیں اور جب انہیں کہیں سَر چُھپانے کی جگہ نہیں ملتی تو ہم گلے لگالیتے ہیں! ہلاکت کے مختلف طریقوں کی جب کہیں پذیرائی نہیں کی جاتی تو ہم ترس کھاتے ہوئے اُنہیں اپنے پہلو میں جگہ دیتے ہیں! اب مہمان نوازی کی حد یہ ہے کہ ہم کمپریسڈ نیچرل گیس گیس یعنی سی این جی کے بھرے ہوئے سلنڈرز کو بھی اپنے پہلو میں بٹھانے سے گریز نہیں کرتے! ملک بھر مس پبلک ٹرانسپورٹ سی این جی پر آ گئی ہے۔ اخراجات کم کرنے کے حوالے سے یہ اچھی بات ہے مگر یہ کیا تماشا ہے کہ ایندھن کا خرچ گھٹانے کے نام پر ہم خود کو کم کرنے پر تل گئے ہیں!

رکشہ سے کوچ تک پبلک ٹرانسپورٹ کی ہر گاڑی میں سی این جی اور ایل پی جی سلنڈرز نصب ہیں۔ جب حالت یہ ہو تو کوئی کیوں یہ نہ سمجھے کہ بم کے پہلو میں، بلکہ بعض معاملات میں تو بم پر بیٹھ کر سفر ہو رہا ہے! سستی سی این جی کا حصول یقینی بنانے کے چکر میں ہم نے شاید یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے کہ زندگی کتنی قیمتی ہے! ٹھیک ہی تو ہے۔ معاشرے میں جس چیز کی وقعت دکھائی نہ دیتی ہو، محسوس نہ ہوتی ہو اُسے کوئی کیوں اہمیت دے گا؟

قدرتی گیس کو کمپریس کرکے سلنڈرز میں بھرنے اور ان سے گاڑیاں چلانے کا تصور ہمارے ہاں خاصی دیر سے آیا ہے۔ ہماری پبلک ٹرانسپورٹ میں عوام کو جس طرح

ٹھونس ٹھونس کر یعنی کمپریس کرکے بٹھایا اور کھڑا کیا جاتا ہے اُسے دیکھتے ہوئے تو سی این جی سلنڈرز دو تین عشرے قبل متعارف کرائے جانے چاہیے تھے! سچ پوچھیے تو ہمیں لگتا ہے کہ مغربی ماہرین کو شاید ہماری بسیں اور ویگنیں دیکھ کر ہی گیس کمپریس کرکے سلنڈرز میں بھرنے کا آئیڈیا سُوجھا ہوگا!

دُنیا بھر میں حکومتیں اِس بات پر خاص توجہ دیتی ہیں کہ لوگ کام پر محفوظ اور آرام دہ طریقے سے جائیں اور اُتنے ہی تحفظ اور آرام کے ساتھ گھر واپس آئیں۔ مگر ہمارے ہاں شاید کسی اور ہی دُنیا کے اُصولوں پر عمل ہو رہا ہے! حکومت کو اِس بات کی بظاہر کوئی فکر نہیں کہ لوگ صبح گھر سے نکلتے ہیں تو کام کے مقام پر کِس طور پہنچتے ہیں۔ اور ظاہر ہے حکومت کو اِس بات سے بھی کوئی غرض نہیں کہ دن بھر کے کام کاج سے تھکے ہارے لوگ شام کو کِس طرح گھر پہنچ پاتے ہیں!

پاکستان تقریباً ایک عشرے سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ دھماکے اِتنے ہوئے ہیں کہ اب بم ہماری زندگی اور ذہنی ساخت کا حصہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہلاکت کا خوف اپنی جگہ مگر پاکستانی قوم مجموعی طور پر کسی بھی صورتِ حال کے لیے تیار رہنے کی عادی سی ہو گئی ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی صورتِ حال بن نہ رہی ہو

تو ہم خود بنا لیتے ہیں! ناقص سی این جی سلنڈرز کے پہلو بہ پہلو سفر بھی اب بم کے ساتھ چلنے ہی کے مترادف ہے! معیاری سلنڈرز کا معاملہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر سال خوردہ اور انتہائی غیر معیاری سلنڈرز کا استعمال کیوں عام ہے؟ اِس کی توجیہہ کوئی نہیں کر سکتا۔ کیا ہمیں زندگی سے محبت نہیں رہی؟ لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔ جب سے پبلک ٹرانسپورٹ سی این جی پر کنورٹ ہوئی ہے، عوام کو ناقص سلنڈرز کے ساتھ یا ان پر بیٹھ کر سفر کرنا پڑ رہا ہے۔ موت کے امکان کے ساتھ سفر کرنے کا یہ انوکھا انداز ایسا ہے کہ دُنیا دیکھے تو دانتوں تلے اُنگلیاں دبا لے!

ویگنوں میں سی این جی سلنڈرز پچھلے پہیوں کے ساتھ نصب کئے جا رہے ہیں۔ رکشہ میں سلنڈر پچھلی نشست کے نیچے ہوتا ہے۔ اضافی سپلائی کے لیے اب بہت سی ویگنوں میں خواتین کے پورشن میں ڈرائیور کی نشست کے پیچھے فُل سائز سلنڈر کھڑا کیا جا رہا ہے۔ رکشہ میں اِضافی سلنڈرز مسافروں کے قدموں رکھے یا لِٹائے جا رہے ہیں! یہ مناظر ایسے ہیں کہ ذرا سا غور کرنے پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہم نے سوچنا چھوڑ دیا ہے! ویگنوں میں خواتین کے پورشن میں رکھا فُل سائز سلنڈر، خدانخواستہ، پھٹ پڑے تو؟ یہ ایسی روش ہے جسے کسی بھی حالت میں اور کِسی بھی قیمت پر برداشت کرنا اپنے آپ سے عداوت اور غدّاری کے مترادف ہے! لازم ہے کہ حکومت اِس سنگین مسئلے کو حل کرنے کی طرف

متوجہ ہو اور ناقص سلنڈرز کے استعمال پر پابندی عائد کرنے کے ساتھ ساتھ اِضافی سلنڈرز کی غیر منطقی اور خطرناک، بلکہ ہلاکت خیز تنصیب کی بھی روک تھام کرے۔

(فوٹو گرافی : ماجد حسین)

"پاکستان کے" چانکیہ مہاراج

ہم بھی کیا سادہ ہیں۔ محترم وزیر داخلہ کو پورس کے ہاتھیوں میں شمار کر بیٹھے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ رحمٰن ملک صرف اپنوں پر قیامت ڈھا سکتے ہیں، مگر اُنھوں نے اپنی سالگرہ پر تاج محل دیکھنے کے بہانے آگرہ جانے کی بات کرکے نئی دہلی جاکر بہت کچھ اِتنی خوب صورتی سے پلٹ دیا کہ لاکھ عدم خواہش (!) کے باوجود ہم داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ ثابت ہوا کہ وہ ایسی بندوق ہیں جس سے گولی ہی نہیں، گولا بھی داغا جاسکتا ہے!

رحمٰن ملک نے بھارت کا دو روزہ دورہ ایسی خوب صورتی سے کیا کہ دونوں طرف کے میڈیا والے حیران، بلکہ پریشان رہ گئے۔ موصوف کو بیان دینا اور پھر اُس سے پلٹ جانا خوب آتا ہے۔ قدر ناشناسی دیکھیے کہ پاکستان میں اِس ہُنر کو صرف تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اپنی بات سے مُکر جانے کو بھارت میں چانکیہ نیتی سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔ چانکیہ قدیم بھارت کا ایک دانشور اور حکمرانی کے طور طریقوں میں غیر معمولی مہارت رکھنے والا نابغہ تھا۔ چانکیہ کے وجود پر بھارت کو ہمیشہ ناز رہا ہے اور ہم ہر ہزیمت کے بعد "چانکیہ نیتی" کا رونا روتے آئے ہیں مگر اب پتہ چلا کہ قدرت نے ہمیں بھی، حسب ضرورت، ایک

چانکیہ مہاراج سے نوازا ہے! رحمٰن ملک نے بھارت میں اِتنے بیانات داغے اور پھر اِس قدر تیزی سے اپنی بات سے پلٹ بھی گئے کہ بھارتی میڈیا کے لوگ اُن کا مُنہ ہی تکتے رہ گئے۔ پہلے اُنھوں نے کہا کہ ممبئی حملوں اور بابری مسجد کی شہادت کو ایک ہی عینک سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اور پھر کہہ دیا کہ اُن کے بیان کو مسخ کرکے پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اب اُن کی کسی بھی بات کو مسخ کرنے کی گنجائش کہاں رہی ہے!

بھارت نے ممبئی حملوں کا معاملہ اُٹھایا تو رحمٰن ملک سمجھوتہ ایکسپریس کے سانحے کو دوبارہ ٹریک پر لے آئے! ایسے میں بھارت کے پاس بیک ٹریک کے سوا کوئی راہ نہ بچی! جب بھارت نے کالعدم لشکر طیبہ کا معاملہ چھیڑا تو رحمٰن ملک نے بلوچستان کی سنگلاخ زمین کو مزید سنگلاخ بنانے کی بھارتی کوششوں پر روشنی ڈالنا شروع کیا!

بلوچستان کا باب کُھلتا دیکھا تو بھارتی میڈیا نے گھبراہٹ میں رحمٰن ملک پر بیان دیگر پلٹ جانے کا الزام عائد کیا۔ مگر صاحب، یہ تو بھارت کا پُرانا وتیرہ ہے۔ اگر رحمٰن ملک نے جیسا دیس ویسا بھیس والی سوچ اپنائی تو حیرت کیسی؟

بات بیانات تک رہتی تو کوئی بات نہ تھی۔ رحمٰن ملک گئے تو تھے مہمان بن کے مگر اپنے میزبان یعنی بھارتی ہم منصب سُشیل کمار شِندے کے لیے ان گنت

مشکلات چھوڑ کر چلے آئے۔ شِندے جی نے پاکستانی ہم منصب کے دورے کے بعد پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کو بریفنگ دی تو منتخب ارکان خود اُن کو بریفنگ دینے پر تُل گئے!

رحمٰن ملک کے ساتھ دو دن کیا گزارے کہ شِندے جی بھارت کی روایتی سیاست یعنی چانکیہ نیتی ہی بھول گئے! ہوا یہ کہ جب رحمٰن ملک کے دورے اور بات چیت کے بارے میں منتخب ارکان کو بریفنگ دینے کا وقت آیا تو شِندے جی نے پہلے ایوان زیریں لوک سبھا اور اس کے بعد ایوان بالا راجیہ سبھا میں بیانات دیئے۔ دونوں ایوانوں میں اُنھوں نے کالعدم لشکر طیبہ کے سابق اور جماعت الدعوۃ کے موجودہ سربراہ حافظ سعید کو انگریزی میں "مسٹر" اور ہندی میں "شری" کہا۔ کسی ناپسندیدہ پاکستانی کو بھارتی پارلیمنٹ میں مسٹر یا شری کہا جائے، یہ انتہا پسند ہندوؤں سے بھلا کس طور گوارا ہو سکتا تھا؟ وہ سب مل کر شِندے جی پر برس پڑے۔ شِندے جی بھی کتنے سادہ ہیں۔ وہ اِتنی سی بات بھی یاد نہ رکھ سکے کہ اُن کے ملک میں منتخب ایوانوں کی دال روٹی پاکستان کے خلاف بولنے پر چل رہی ہے۔

پتہ نہیں رحمٰن ملک نے دو دن میں کیا پٹّی پڑھائی کہ شِندے کو اپنے پُرانے سبق یاد ہی نہ رہے۔ بھارتی وزیر داخلہ یاد ہی نہ رہا کہ اُن کے دیش میں راج

نیتی کا پہلا اُصول یہ ہے کہ پاکستان کی کسی بھی شخصیت میں ہر حال میں کیڑے نکالنے ہیں۔ اور پھر حافظ سعید؟ اُن سے تو بھارتی اپوزیشن کو خدا واسطے کا بیر ہے۔ یعنی شِندے جی نے تو پوری بھارتی راج نیتی کی ساکھ ہی داؤ پر لگادی! یہ تو بہت ہی بُری بات ہے۔ ایسے میں اُن کی وزارت کا چلنا تو دور کی بات ہے، خود بھارت کا چلنا دشوار ہو جائے گا! ناپسندیدہ پاکستانیوں کو مسٹر اور شری کہنے سے تو بھارت کا پورا سیاسی ڈھانچا ہی دھڑام سے زمین پر آ رہے گا!

بھارتی پارلیمنٹ میں ہنگامہ آرائی کا کریڈٹ رحمٰن ملک کو جانا چاہیے جنھوں نے اپنے مشہورِ زمانہ "پلٹو" بیانات سے ایسی دھما چوکڑی مچائی کہ بھارتی ہم منصب کے لیے ایوان میں بولتے وقت حواس برقرار رکھنا دشوار ہوگیا۔ رحمٰن ملک نئی دہلی گئے تو بیانات کے ذریعے پارلیمنٹ میں داخل، بلکہ دخیل ہوگئے اور پھر بھارتی وزیر داخلہ کے حواس اتنا مختل ہوگئے!

حافظ سعید کے معاملے پر بھارتی پارلیمنٹ میں جو ہنگامہ برپا ہوا وہ رحمٰن ملک کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جب ایک رحمٰن ملک کے ہوتے ہمارا یہ حال ہے تو ذرا سوچیے کہ اگر ہمارے پاس دو چار رحمٰن ملک ہوتے تو بھارتی سیاست کی واٹ لگنے میں کتنی آسانی ہوتی!

کھانا ہے تو ٹھوک ڈال

ابھی کل تک کھانے کی تقسیم پر جو دھماچوکڑی مزارات کے ماحول کا خاصہ ہوا کرتی تھی وہ اب سیاسی جلسوں میں در آئی ہے۔ معاملہ دونوں جگہ مَنّت ہی کا ہے۔ جن کی مُراد پوری ہوتی ہے وہ مزاروں پر لنگر تقسیم کرواتے ہیں۔ اور سیاسی جلسوں میں بھی اہل سیاست مُن کی مُراد پانے ہی کے لیے۔بریانی کی دیگیں عوام کی نذر کرتے ہیں !
فرق صرف یہ ہے کہ باباکے نام پر لنگر مَن کی مُراد بَر آنے پر تقسیم کیا جاتا ہے اور سیاست دان ووٹرز کو بہلانے پُھسلانے کے لیے pre-emptive strike کے طور پر کھانا تقسیم کرواتے ہیں !
مزاروں پر لنگر کی تقسیم ہو یا سیاسی جلسوں کے اختتام پر کھانے کی بندر بانٹ، دونوں ہی معاملات میں لوگوں کا بھرپور جوش و خروش دیکھ کر خیال آتا ہے کہ کاش ہم ملک کو سنوارنے کے معاملے میں بھی ایسے ہی پُرجوش ہوا کرتے ! توبہ ہے صاحب، ہم بھی کھانے پینے کے تذکرے میں کہاں ملک کو سنوارنے کی بات لے بیٹھے !
ہماری سیاست میں کھانا پینا کوئی نئی بات نہیں۔ ہر سیاست دان کھانے اور

پینے میں ایسی مہارت رکھتا ہے کہ دنیا کے بہترین تربیت یافتہ آڈیٹرز بھی گڑبڑ کا سُراغ پانے میں ناکام رہتے ہیں! یہی کلچر اب سیاسی جلسوں میں آگیا ہے۔ پنجاب کے بیشتر سیاسی جلسوں میں شرکاء کے لیے کھانے کا اہتمام بھی کیا جانے لگا ہے۔ یہ سب کچھ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ اب اِس ملک میں کسی بھی معاملے کو عجیب سمجھنا بجائے خود بہت عجیب بات ہے!

جلسوں کے آخر میں کھانے کی تقسیم بعض ایسے مناظر کو جنم دے رہی ہے جو ہمیں کچھ کچھ قیامت کی یاد دلاتے ہیں۔ لوگ جس طرح کھانے پر ٹوٹتے ہیں وہ منظر سیکیورٹی فورسز کے جوانوں کو بھی دکھایا جانا چاہیے تاکہ وہ دشمن کو زیر دام لانے کے نئے طریقے آسانی سے سیکھ سکیں! سیاست دان جلسوں میں کھانا تقسیم کرکے کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہ اب تک معلوم نہیں ہوسکا۔ کیا وہ کھانے کی لوٹ مار دیکھ کر قومی خزانہ لوٹنے کے نئے طریقے سیکھنا چاہتے ہیں؟ یا اپنے طور طریقوں سے عوام کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں؟ ہم تو اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وسائل کی بندر بانٹ کے نتیجے میں خستہ حالی کو پہنچے ہوئے عوام سیاست دانوں اور متوقع حکمرانوں کو قومی خزانے پر شب خون مارنے کے نئے طریقے سِکھانے پر تُلے ہوئے ہیں! آپ سوچیں گے عوام کیا سکھائیں گے؟ بات یہ ہے کہ صاحب کہ جلسوں کے آخر میں کھانے کی تقسیم کے وقت ہڑبونگ سے کھانے کا خانہ خراب ہو جاتا ہے۔ اِس سے اہل سیاست کو یہ تحریک ملتی ہے کہ

قومی خزانے کی بندر بانٹ کا وقت آئے تو ویسا کچھ نہیں کرنا جو عوام کرتے ہیں۔ اِس طرح تو کھانا کھایا کم جائے گا اور خراب زیادہ ہوگا۔ اچھا ہے کہ مفاہمت کی سیاست کے ذریعے حلوائی کی دکان پر فاتحہ ذرا ڈھنگ سے پڑھی جائے یعنی قومی خزانے کی دیگ کو بے ہنگم طریقے سے ٹھکانے لگانے کے بجائے طے شدہ حصوں کے مطابق کھایا جائے تاکہ کوئی ایک آدھ چھیچھڑا نگی بوٹی بھی ضائع نہ ہو!

ملک میں کون ہے جو کھانے پینے کا شوقین اور عادی نہیں۔ کھانے کو کچھ اور نہ ملے تو لوگ گھنٹوں ایک دوسرے کا دماغ چاٹتے رہتے ہیں! رات دن ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے موقع ملتے ہی ایک دوسرے کو چُونا لگانے سے نہیں چُوکتے! ہم من حیث القوم کھانے پینے میں مصروف ہیں اور وطن کو دیگ سمجھ رکھا ہے!

سیاسی جلسوں میں کوئی بریانی کا تَسلا لے بھاگتا ہے تو کوئی قورمے کی پوری ڈِش لے اُڑتا ہے۔ کوئی کوئی تو پوری دیگ اُٹھا کر چمپت ہو جاتا ہے! بعض منچلے تو بریانی سے بھرے ہوئے تَسلے اُٹھا کر درختوں پر چڑھ جاتے ہیں! یہ تمام مناظر دیکھ کر اب قوم کو مزاحیہ ڈرامے الگ سے دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی! اِس سے بڑھیا کامیڈی کوئی کرکے تو دِکھائے۔

ہماری سیاست خاصی پژمُردہ ہو چلی تھی۔ ایسے میں کوئی نیا ٹرینڈ درکار تھا۔ کھانا پینا سدا بہار ٹرینڈ ہے جو کبھی ختم ہوگا نہ چمک دمک ماند پڑے گی۔ اچھا ہے کہ کھانے کی تقسیم کے نام پر نیا ٹرینڈ متعارف ہوا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے تک سیاسی جلسوں میں کُرسیاں لے بھاگنے کا ٹرینڈ چل رہا تھا۔ سیاست دانوں کے لیے یہ خاصا حوصلہ شکن ٹرینڈ تھا اِس لیے اُن سے برداشت نہ ہو سکا۔ سیاست کی دنیا میں جو کچھ بھی آپا دھاپی اور مارا ماری ہوتی ہے وہ کُرسی کے حصول ہی کے لیے تو ہے! ہر سیاست دان کُرسی کا دیوان ہے۔ اگر کُرسیاں عوام لے بھاگیں تو؟ اہل سیاست شاید یہ چاہتے ہیں کہ اور سب کچھ ہو، عوام کُرسیوں کی طرف نہ آئیں! توجہ کرُسیوں سے ہٹانے کے لیے ہی عوام کو لنگر کی تقسیم کے مرحلے تک لایا جا رہا ہے!

اِنسان کس طرح زندہ رہتا ہے؟ کھا کر، ٹھیک ہے نا؟ پھر اگر لوگ کھانا دیکھ کر اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ پاتے تو حیرت کی بات کیا ہے؟ آپ سوچیں گے کھانے پینے کی اشیاء سامنے پاکر حواس کھو بیٹھنا اِنسانیت کی توہین ہے، تحقیر ہے کیونکہ اپنے سامنے چارا دیکھ کر جانور بھی پاگل نہیں ہوتے۔ آپ کی رائے سے ہمارا متفق ہونا لازم نہیں۔ جانور اگر چارا دیکھ کر خوشی سے پاگل نہیں ہو جاتے تو اِس میں ہمارے لیے شرمندگی کا کوئی پہلو نہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جانوروں کے جذبات اور احساسات نہیں ہوا کرتے! اور اگر ہم

بھی کھانے پینے کی اشیاء دیکھ کر جانوروں کی طرح اپنے حواس قابو میں رکھا کریں تو ہمارا
شُمار بھی جانوروں ہی میں ہوا کرے گا! کھانا دیکھ کر پاگل ہو جانا خود کو جانوروں کے
زُمرے میں شمار ہونے سے بچانے کی کوشش کے سِوا کچھ نہیں!

ڈرائی فروٹ؟.... کیوں مذاق کرتے ہیں جناب

قدرت کی بخشی ہوئی نعمتوں کی ہم نے ایسی ناقدری کی ہے کہ جو ڈرائی فروٹ یعنی خشک میوے ہمیں آٹے دال کے بھاؤ پر مل جایا کرتے تھے وہ اب اِتنے مہنگے ہو گئے ہیں کہ دام سُن کر خون خشک ہونے لگتا ہے! دس پندرہ سال جس نرخ پر چلغوزے ملا کرتے تھے اُس سے تین گنا یا اِس سے بھی زائد نرخ پر اب بُھنے ہوئے چنے ملتے ہیں! اگر پاکستانی قوم نرخ ہوتی تو آج پتہ نہیں کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہوتی!

سُنا ہے چلغوزے بعض دیسی ادویہ میں استعمال ہوتے ہیں اس لیے اِن کی قدر بڑھ گئی ہے۔ مگر صاحب! اب ایسی بھی کیا قدر دانی کہ چلغوزے کا دیدار کرنے کے بھی پیسے دینے پڑیں! صدر میں ایمپریس مارکیٹ کے سامنے سڑک پر چند خواتین ڈرائی فروٹ فروخت کرتی نظر آتی ہیں۔ معصوم بچوں کی نگہداشت کا فریضہ نبھانے والی اِن خواتین کی ہمت کو داد دیجیے کہ اچھے اچھوں کا بجٹ ٹھکانے پر باندھنے والے اِس دور میں بھی عام آدمی کو ڈرائی فروٹ کے درشن تو کرا رہی ہیں! اِن خواتین ہی کی مہربانی سے ہم ڈرائی فروٹ کو اپنے قریب، بلکہ قدموں میں پاتے ہیں! یعنی چلتے چلتے رُکے، سُوکھے ہوئے پھلوں اور پُھول جیسے بچوں پر ایک نظر ڈالیے اور اِس بات پر فخر کیجیے کہ ڈرائی فروٹ اِتنے نزدیک

سے دیکھنے کا شرف حاصل کیا! دُکانوں میں تو یہ ڈرائی فروٹ شاندار شو کیسز میں اِس طرح رکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ اِن کی طرف ایک نظر دیکھنے کے لیے چند لمحات تک سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں دیکھنے کے تو چارجز نہیں لئے جائیں گے! کیا خریدنے والے اور کیا بیچنے والے، سبھی ڈرائی فروٹ کے سامنے خود کو خاک چاٹنے کی پوزیشن میں پاتے ہیں! جس طرح کسی جابر سلطان کے سامنے حق پر مبنی کوئی بات کہنے سے ڈر لگتا ہے بس کچھ ویسا ہی خوف اب بادام، پستے، کاجو، اخروٹ، انجیر، چھوہارے وغیرہ کے دام پوچھتے وقت محسوس ہوتا ہے! دام سُن کر جسم و جاں میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے۔ کبھی کبھی حیرت بھی ہوتی ہے کہ اب خوش نصیب ہیں کہ مختلف نوعیت کے ڈرائی فروٹ اپنے سامنے دیکھ تو رہے ہیں۔ آنے والی نسلیں تو ڈرائی فروٹ کی تصاویر پر گزارا کیا کریں گی! اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کل کو آپ کے پوتے اپنے دوستوں کو بتائیں۔ "ہمارے دادا بہت بہادر تھے، اُنھوں نے پچھلی صدی کے آخر میں کئی بار ڈرائی فروٹ کے دام پوچھے تھے!"

کچھ دن قبل گھر میں کھیر پکائی جانے لگی تو اُس میں ڈرائی فروٹ ڈالنے کی ضرورت پیش آئی۔ ہم نے دکاندار سے کہا پچاس روپے کے بادام پستے دے دو۔ اُس نے پچاس روپے میں بادام پستے کے نام پر چند دانے دھمادیئے۔ ہم حیران رہ گئے۔ سوچا شاید دکاندار مذاق کے موڈ میں ہے۔ پھر خیال آیا اُس سے ہمارا ایسا مذاق تو ہے نہیں۔ چاہا کہ ہمت کرکے پوچھ ہی لیں کہ کیا پچاس روپے میں بادام پستے کے پندرہ دانے ہی آتے ہیں۔ مگر پھر ہم کچھ پوچھنے سے باز رہے۔ سچ ہی تو ہے، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے!

آج کل سب کچھ کچھ آن لائن ہوتا جارہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل کو آپ پچاس گرام چلغوزوں کی آن لائن خریداری کریں اور آپ کے اِن باکس میں پیغام آئے کہ جناب! پچاس گرام چلغوزے کھانے ہیں تو کم از کم ڈیڑھ سو گرام کا آرڈر دیجیے کیونکہ سو گرام چلغوزے تو آن لائن کی پائپ لائن ہی میں اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں! چھوہاروں کا یہ حال ہے کہ خریداری کے خواہش مند اُن کے دام سُن کر چھوہارے جیسا منہ لیکر رہ جاتے ہیں! اخروٹ بھی اب کیا خریدیں؟ سخت خول توڑیے تو وہی

اپنے دماغ جیسی گری نکلتی ہے! چند برس پہلے تک انجیر بھی عام آدمی کے بجٹ کی دسترس میں تھے۔ مگر اب اُن کے بھی دام اِتنے بڑھ گئے ہیں کہ اُنہیں کھانے کا صرف سوچا جاسکتا ہے۔ متنوع ڈرائی فروٹ ملکی پیداوار ہیں۔ انجیر بھی ان میں شامل ہے۔ مگر اب مونگ پھلی جیسی چیز 280 روپے کلو کے نرخ پر فروخت ہو رہی ہے تو انجیر اور چھواروں کو کیا روئیں؟ اگر صاف سُتھرے، معیاری انجیر 500 روپے کلو کے نرخ پر مل جائیں تو اللہ کا شکر ادا کیجیے کیونکہ پاک سرزمین پر یاروں نے اسپغول کی بُھوسی جیسی عام سی چیز کے دام بھی اب ہزار روپے فی کلو کی منزل تک پہنچا دیئے ہیں۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ ڈرائی فروٹ کے دام پر سُن کر معدے میں گڑبڑ محسوس ہوتی ہو تو اُس گڑبڑ کو ختم کرنے والی چیز زیادہ مہنگی مل رہی ہے!

گنیز بُک والے تیار رہیں

کچرا کس لیے ہوتا ہے؟ آپ کہیں گے پھینکنے کے لیے۔ سیدھی سی بات ہے، کچرا کوئی گھر میں سَجا کر رکھنے یا گھر کو سَجانے کے لیے تو ہوتا نہیں۔ اور جو چیز گھر کو سَجانے کے لیے نہ ہو وہ شہر کو کیسے سَجائے گی؟ ہمیں "حکومتوں کی سمجھ" کبھی نہیں آئی۔ دُنیا بھر میں حکومتیں کچرے کو ٹھکانے لگانے کے نئے طریقے ڈھونڈنے یا وضع کرنے میں جُتی رہتی ہیں۔ ارے بھائی، جو چیز ہے ہی پھینکنے کی تو اُسے کہیں بھی پھینک دو۔ کچرا خواہ کہیں پڑا ہو، تزئین و آرائش کا مقصد تو پورا کرے گا نہیں۔ کچرے کا کام ہے تعفن پھیلانا۔ جب ایک چیز ہے ہی تعفن پیدا کرنے والی تو پھر اُس سے نجات پانے کے لیے زیادہ سوچنے کی ضرورت کیا ہے؟ کچرا ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچنا اب بھی حکومتوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ محض وقت کا ضیاع ہے۔

دُنیا ذرا ہمیں دیکھے اور کچھ سیکھے۔ کچرے کے حوالے سے پاکستان نے اچھوتے تصورات متعارف کرائے ہیں۔ کسی کو اگر گھر کا کچرا پھینکنا ہو تو زیادہ دور نہیں جانا پڑتا۔ پہلے تو علاقوں میں بچوں کے کھیلنے کے میدانوں کو کچرا ڈالنے کے لیے استعمال کرنے کا رجحان متعارف کرایا گیا۔ بعض کم فہم اور

ناشکرے قسم کے لوگوں نے اِسے کھیل کے میدان اور کھیلنے کے رجحان سے کِھلواڑ! قرار دیا! ہر نئے طریقے اور مشرب کا لوگ اِسی طرح تمسخر اڑایا کرتے ہیں!

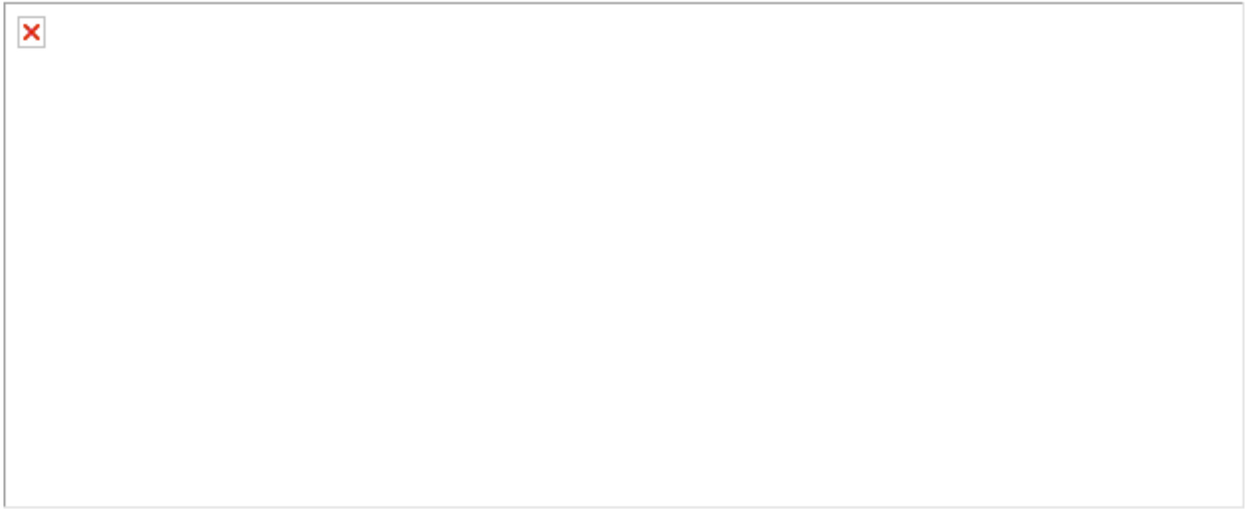

جب لوگوں کو کھیل کے میدان تک جانے میں پریشانی کا سامنا ہوا تو ہر گلی کے نُکڑ پر کچرا کنڈی کا اہتمام کیا گیا۔ اِسے ہم "آٹو کچرا کنڈی سسٹم" بھی کہہ سکتے ہیں یعنی آپ کچرا ڈالتے رہیے، کچرا کنڈی خود بخود معرض وجود میں آتی جائے گی! کچرا صاف ستُھری جگہ پر تو ڈالا نہیں جاسکتا۔ یعنی جہاں پہلے ہی بہت سا کچرا ہو وہیں آپ بھی کچرا ڈالتے رہیے وہ جگہ خود بخود کچرا پھینکنے کے لیے موزوں ترین ہوتی جائے گی!

جب لوگوں کو کچرے کی تھیلی یا ڈبہ گلی نکڑ تک جانے میں مشکل پیش آنے لگی تو گھر کے باہر ہی کچرا پھینکنے کا تصور متعارف ہوا۔ اب اِس سے بڑھ کر سہولت کیا ہوگی کہ آپ اپنے گھر کا دروازہ (یا کھڑکی) کھولیں اور کچرے کی تھیلی پھینک دیں!

ابتداء میں جب کچرے کو اہمیت دینے کا رواج عام تھا، یہ سوال اُٹھا کہ شہر بھر کا کچرا کہاں پھینکا جائے؟ پہلے تو لینڈ فِل بنائی گئی۔ مگر ایسا کرنا شاید زمانے کے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔ جو کچھ دُنیا کر رہی ہے وہ ہم کیوں کریں؟ ایسا کرنے سے ہماری انفرادیت تو ماری جائے گی نا! بس، یہی سوچ کر یاروں نے ندی نالوں کو بھی کچرا کنڈی میں تبدیل کرنا شروع کیا! اور خیر سے اب یہ عالم ہے کہ شہر کے بیچ سے گزرنے والی لیاری ندی اور شہر کے کنارے چلنے والی ملیر ندی کچرا کنڈی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔

دنیا بھر میں ایسے کئی شہر ہیں جن کے درمیان سے دریا یا پھر دریا نُما جوڑی ندی گزرتی ہے۔ "دقیانوسی ذہنیت" ملاحظہ فرمائیے کہ اِن ندیوں اور دریاؤں کو سیر و تفریح یا ماس ٹرانزٹ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اُنہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ ندی نالے اور اِسی طور کے دوسرے آبی راستے کچرا پھینکنے کے لیے ہوتے ہیں! لوگوں کو تو ہر وقت اور ہر معاملے میں تفریح درکار ہے۔ حکومت کب تک تفریح کا سامان کرتی پھرے؟ اور یومیہ سفر کا کیا ہے، کِسی نہ کِسی طور ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا! ایک ذرا سے ماس ٹرانزٹ سسٹم کے لیے اچھی خاصی چوڑے پاٹ کی ندیوں اور دریاؤں کو استعمال کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ اور جناب! اگر ندیوں میں کچرا ڈالیے تو یہ بھی کچرے کا ماس ٹرانزٹ ہی ہوا نا! اِنسان تو جیسے تیسے روزانہ سفر کر ہی لیتا ہے، کچرا بے چارا کہاں جائے!

گنیز بُک آف ورلڈ والے مختلف ریکارڈز درج کرنے کے لیے تصدیق کی خاطر پاکستان آتے رہے ہیں۔ اُنہیں کراچی بھی آنا چاہیے اور بس معمولی سی تیاری

کے ساتھ۔ ہر شہر کی کوئی نہ کوئی انفرادیت ہوتی ہے۔ ڈھاکا مساجد کا شہر کہلاتا ہے اور احمد آباد قبروں کا۔ ملتان کو مزاروں کا شہر کہا جاتا ہے اور حیدر آباد کو روشن دانوں کا۔ اب سوال یہ ہے کہ کراچی کو کس حوالے سے شناخت کیا جائے؟ اِس شہر میں اِتنے اور ایسے عجوبے ہیں کہ حقیقی شناخت کا تعین انتہائی دشوار ہو سکتا تھا۔ شہر سے محبت کرنے والے اختیار یافتہ کرم فرماؤں نے دریاؤں اور ندی نالوں کو کچرا پھینکنے کے لیے استعمال کرکے مشکل آسان کردی۔ اب اگر کراچی کو بلا خوفِ تردید کچرا کنڈیوں کا شہر کہا جاسکتا ہے! اور شاید دُنیا کی سب سے بڑی کچرا کنڈی بھی یہیں کہیں، ملیر ندی میں نکل آئے

(فوٹو گرافی : ماجد حسین)

لیجیے .... "مُرغی کا چکن سُوپ" حاضر ہے

ہم دسمبر ہی نہیں، سال کے بھی آخری عشرے میں ہیں۔ موسم بدل گیا ہے۔ مایا کیلینڈر کی رُو سے جس قیامت کو آنا تھا وہ نہ آکر گزر بھی گئی! قیامت کے انتظار میں شدید اضطراب سے دوچار افراد کی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے ماحول میں کچھ گرما گرمی پیدا ہو گئی تھی جو، ظاہر ہے، اب نہیں رہی۔ فضا میں خُنکی بڑھتے بڑھتے اب باضابطہ سردی کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ ویسے تو بُرے حالات اور اُن سے بھی بُری منہگائی کے ہاتھوں خود انسان کا یخنی سُوپ بن چکا ہے مگر خیر، سخت سردی میں چکن یخنی سُوپ پینے کا کچھ اور ہی لُطف ہے۔ جس طرح کچھ لوگوں کو گرمی میں "ٹھنڈی والی کولڈ ڈرنک" پیئے بغیر سُکون نہیں ملتا بالکل اُسی طرح کچھ شوقین ایسے ہیں جو سردیوں میں دل و دماغ کو "گرمائش" بخشنے کے لیے "مُرغی کا چکن سُوپ" فریضہ سمجھ کر حلق سے نیچے اُنڈیلتے ہیں!

روشنیوں کے شہر میں قتل و غارت کے اندھیرے بانٹنے والوں کو تو ہم اب تک پھانسی کے پھندے پر لٹکا نہیں پائے مگر مُرغیاں نہ بچ سکیں! اور کیسے بچتیں؟ علامہ اقبال کہہ گئے ہیں

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جُرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

جا بجا ٹھیلوں پر مُرغیاں اپنے کردہ و ناکردہ گناہوں کی پاداش میں لٹکی ہوئی ہیں اور تھال میں اُبلتے ہوئے سُوپ کی حرارت سے ریزہ ریزہ پگھل کر سُوپ کی لذت کا دائرہ وسیع فرما رہی ہیں! عوام کو ٹھیلوں پر چکن یخنی سُوپ پیتے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی عوام کا یخنی سُوپ اِسی طرح پیتے رہتے ہیں۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ اُن کے لیے موسم کی قید نہیں!

چکن یخنی سُوپ بھی کیا سوغات ہے۔ سُوپ کے ٹھیلے پر ایک نظر ڈالیے تو اندازہ

ہو جاتا ہے کہ دُنیا کی مضبوط ترین اور "ٹر میں جنبد نہ جنبد گل محمد" ٹائپ کی مُرغیاں پاکستان میں پائی جاتی ہیں کیونکہ ایک ٹھیلے پر ایک مُرغی لٹکے لٹکے پورا سیزن گزار دیتی ہے اور اُس کی "تازگی" کا سُورج غروب ہونے کا نام نہیں لیتا! جس طرح سُوپ بیچنے والے خان صاحبان کا "یک زبان ہوتا ہے" بالکل اُسی طرح اُن کے ٹھیلے پر لٹکی ہوئی مُرغیاں بھی اپنے موقف پر قائم رہتی ہیں! لٹکی ہوئی مُرغیاں سُوپ کی بھاپ سے پگھل پگھل کر کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں، کسی اور دنیا کی مخلوق دکھائی دینے لگتی ہیں، گوری چمڑی جلتے جلتے عجیب و غریب رنگ کی ہو جاتی ہے مگر اللہ کی بندیاں ٹس سے مس نہیں ہوتیں یعنی ختم نہیں ہونے کا نام نہیں لیتیں! ثابت ہوا کہ مُرغیاں ہوں یا عوام، دونوں کا ایک سا حال ہے! دونوں ہی سخت نامساعد حالات کو جھیلنے کے باوجود زندہ و سلامت ہیں اور ہر وقت تباہی کے دہانے پر کھڑے رہنے کے باوجود تباہ نہیں ہوتے!

موسم نے پلٹا کھایا تو حالات بھی پلٹا کھانے پر مجبور ہوگئے۔ اور اِس اُلٹ پلٹ کی زد میں کوئی آیا ہے تو وہ ہے انڈا۔ بے زبان انڈوں کو بھی یقین نہیں آتا ہوگا کہ انہیں فروخت کرنے کی آڑ میں لوگ اپنے محل تعمیر کرنے پر تُل جائیں گے! اِس وقت بازار میں انڈے 135 اور 145 روپے فی درجن کے نرخ پر فروخت ہو رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انڈے میں زردی ہوتی ہے اِس لیے

اُن کے نرخ اور سونے کے دام میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے! ہمارا خیال ہے انڈوں نے طے کرلیا ہے کہ جب سُوپ کے نام پر پتلے سے گرم مشروب کا ایک پیالہ پندرہ بیس روپے میں فروخت ہو رہا ہے تو وہ بھی خود کو سستا نہیں بیچیں گے!

یہ ساری باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ اگر آپ سُوپ پینا چاہتے ہیں تو فوراً گھر سے نکل کر ٹھیلے تک پہنچ جایئے۔ کراچی کی نام نہاد سردی کا کچھ پتہ نہیں کب ختم ہو جائے۔ سائبیریا میں سب کچھ جم جاتا ہے تو تھوڑی بہت لہر بلوچستان تک آتی ہے۔ اور پھر جب کوئٹہ کی ہوا چلتی ہے تو ہم بھی کچھ ٹھٹھر لیتے ہیں۔ سُوپ کے ٹھیلے بھی سردی کی مختصر سی لہر تک ہیں! کوئٹہ کی ہوائیں بند ہوئیں تو پھر کون سے ٹھیلے اور کیسا سُوپ؟

(فوٹو گرافی: عمران علی)

اُمّید تو نہیں ہے مگر ہاں، خُدا کرے

اندھیروں سے نفرت کرنے والوں کو شاید یہ یاد نہیں رہتا کہ اندھیرے نہ ہوں تو اُجالوں کے بارے میں کوئی سوچے گا بھی نہیں۔ تلخی نہ ہو تو مٹھاس کا کیا اندازہ؟ جہل نہ ہو تو علم اور دانش کی کیا ہستی؟ بس کچھ ایسا ہی معاملہ غریب اور غربت کا بھی ہے۔ اگر غریب نہ ہوں تو امیروں کی کیا توقیر؟ غریب کو داد دیجیے کہ اپنے وجود کو برقرار رکھ کر دنیا کو امیروں کی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں!

جو لوگ ہر وقت غربت کا رونا روتے ہیں یا غریبوں کے مسائل کا راگ الاپتے رہتے ہیں اُنہیں سوچنا چاہیے کہ غریب کی زندگی میں سب کچھ خالص ہوتا ہے۔ اُن کے افلاس میں کوئی کھوٹ نہیں ہوتی۔ ناکامی ہوتی ہے تو خالص، پریشانی ہوتی ہے تو جامع اور بے داغ۔ اور اگر کوئی غریب ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی کارکن بھی ہو تو سمجھ لیجیے کہ اخلاص دو آتشہ ہوگیا۔ مرتے دم تک وہ جن وعدوں پر بھروسہ کرے گا وہ بھی خالص یعنی وہ صرف وعدے ہی رہیں گے! ہماری منتخب و غیر منتخب حکومتوں کا احسان ہے کہ غریبوں کو بہت سے مسائل اور اُلجھنوں سے بچالیا ہے۔ مثلاً غریب اِس یقین کی منزل میں ہیں کہ اُن کے مسائل برقرار رہیں گے۔ چلیے، جھوٹی امیدوں کا سہارا تو گیا۔ اُمّید بر نہیں

آتی تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔۔بڑی مہربانی ہے کہ غریبوں کو اِس تکلیف سے بچالیا گیا ہے۔

مگر خیر، اللہ کے بہت سے بندے اب بھی اُمیدوں کے سہارے جی رہے ہیں۔ کراچی پریس کلب کے فٹ پاتھ پر بیٹھا حکمراں جماعت کا سینئر کارکن عابد حسین میمن شاید اب بھی اِس امید پر زندہ ہے کہ اُس کی ساری امیدیں بر آئیں گی۔ سیاسی جماعتیں اپنے تاج محل کارکنوں کی ہڈیوں پر بناتی آئی ہیں۔ یہ ہماری سیاست کا سب سے بڑاالمیہ ہے۔

قائدین اقتدار کے تختِ طاؤس پر بیٹھتے ہیں مگر اِس تخت کو اپنے کاندھوں پر اُٹھانے والے زندگی کی تمام بنیادی و اعلیٰ نعمتوں سے محروم ہی رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی جماعت اقتدار میں آتی ہے تو اُس کے لیے گالیاں اور گولیاں کھانے والوں کی آنکھوں میں اُمیدوں کے دیئے روشن ہو جاتے ہیں۔ دل میں آس کا پھول کھلتا ہے کہ اب مُراد کسی حد تو بر آئے گی۔ مگر کچھ نہیں ہوتا۔ حکمرانوں کے گرد حلقہ بند مفاد پرست من کی مُرادیں پاتے رہتے ہیں اور صرف اپنے لیے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کیلئے بھی بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ جنہیں کچھ بننا ہوتا ہے وہ بن کر رہتے ہیں اور مخلص کارکن سب کی کامیابیوں کو حسرت سے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں!

بے چارے سیاسی کارکن وعدوں پر جیتے ہیں مگر جیتتے کبھی نہیں۔ وعدوں، دلاسوں اور یقین دہانیوں کے عوض وہ اپنی تمام تمناؤں، اُمیدوں اور حسرتوں کو سیاسی جُوئے میں ہار جاتے ہیں۔ اُن کے چاروں طرف پھول کھلتے ہیں مگر اِن پھولوں کی خوشبو تک پر اُن کا اختیار ہوتا ہے نہ اجارہ! پارٹی کے افق پر اقتدار کا سورج طلوع ہو بھی جائے تو کیا؟ بے چارے بے آواز اور بے بس کارکنوں کی زندگی کے اندھیرے تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے! عابد حسین میمن کو بھی شاید اب تک یقین ہے کہ اُس کی پارٹی اقتدار کے پانچ برسوں میں اُس کے لیے جو کچھ نہ کرسکی وہ اب چند ماہ میں کر گزرے گی۔ اُمید تو خیر نہیں ہے مگر اللہ کرے کہ یہ اُمید بر آئے، کام بن جائے، زندگی بھر کی ناکامیوں کے عوض تھوڑی بہت کامیابی نصیب ہو ہی جائے! یہ یقین ہی کارکنوں کا سب سے بڑا "اثاثہ" ہوا کرتا ہے! ہر مخلص سیاسی کارکن جب اپنی تمام اُمیدوں

کو ناکام ہوتا ہوا دیکھتا تو ہے وہی کچھ کہتا ہے جو ایسی حالت میں ہر غریب کہا کرتا ہے.... یعنی کچھ دے نہیں سکتے تو گولی مار دو، زندگی کا گورکھ دھندا ہی ختم کردو!

یا مِری منزل بتا، یا زندگی کو چھین لے

جس کے پیچھے غم لگے ہوں اُس خوشی کو چھین لے!

عابد حسین میمن جیسے نہ جانے کتنے ہی کارکن عشروں تک اپنے پورے وجود کو پارٹی کے لیے وقت کئے رہتے ہیں مگر قائدین کو اُن کے حالات بدلنے کا خیال تک نہیں آتا۔ اور جب ناکام سیاسی کارکنوں کی زندگی شام کے دُھندلکے سے بغل گیر ہوتی ہے تو وہ شدید مایوسی کے اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں۔ چاروں طرف خوش حالی ہو بھی تو اُنہیں کیا؟

ہمیں کیا جو ہر سُو اُجالے ہوئے ہیں

کہ ہم تو اندھیروں کے پالے ہوئے ہیں!

(فوٹو گرافی : ماجد حسین

عزتِ نفس بچ رہے تو زندگی گھاٹے کا سَودا نہیں

ملک کے حالات دگرگوں ہیں۔ عام آدمی کے لیے عزت اور سکون سے جینا انتہائی دشوار ہوگیا ہے۔ معاشی مسائل نے اہلِ وطن کو شدید ذہنی پیچیدگیوں میں مبتلا کردیا ہے۔ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنا اب جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ بہتر ڈھنگ سے زندگی بسر کرنا اب بہتوں کے لیے مشن کا درجہ اختیار کرگیا ہے۔ حالات نے کسی کو مشکلات سے مبرّا اور مستثنیٰ نہیں رہنے دیا۔ مگر اِس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ جینا حرام ہوگیا ہے۔ سخت نامساعد حالات میں بھی بہت سے لوگ نہ صرف یہ کہ زندہ رہتے ہیں بلکہ محنت سے جی نہیں چراتے۔

جو لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں وہ بعض مواقع پر معمول کی زندگی بسر کرنے میں بھی شدید دشواری محسوس کرتے ہیں۔ کسی بھی مشکل صورت حال میں حوصلے کا پست ہو جانا دکھ کی بات ضرور ہے، حیرت انگیز یقیناً نہیں۔ پاکستان ان چند ممالک میں سے ہے جہاں لوگ کسی کی مدد کرنے کے معاملے میں غیر معمولی فراخ دلی کامظاہرہ کرتے ہیں۔ بڑے شہروں میں پریشان حال افراد کی مدد کرنے کا کلچر نہ صرف ہے بلکہ توانا ہے۔ مگر یہ کلچر ہی خرابیاں بھی پیدا کر رہا ہے۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ پریشانی کی حالت میں انسان کے حواس ڈھنگ سے کام نہیں کرتے اور بدحواسی میں وہ کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ بہت سے لوگ کسی بحران میں مبتلا ہونے پر اس سے نجات پانے کے طریقے سوچنا ترک نہیں کرتے اور پھر اللہ انہیں کامیابی بھی عطا کرتا ہے۔ کسی بھی پریشانی یا بحرانی کیفیت سے نپٹنے کا بہتر طریقہ تو یہی ہے مگر اِسی معاشرے میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ نامساعد حالات کے سامنے تیزی سے سپر ڈال دیتے ہیں۔ کسی بھی نوع کی جدوجہد سے قبل ہی شکست تسلیم کرلینا تو برے حالات کا حوصلہ بڑھانے والی بات ہے!

کچھ لوگ بسوں میں اپنے بچوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور اپنی مشکلات بیان کرکے مدد مانگتے ہیں۔ کسی بھی انسان کو اس کے برے حالات میں مدد ملنی ہی چاہیے مگر اس معاملے میں چند بنیادی اخلاقی اقدار کا بھی خیال رکھنا لازم ہے۔ جن بچوں کو گود میں لیکر یا ساتھ بٹھا کر دنیا کے سامنے ہاتھ پھیلایا جاتا ہے پھر زندگی بھر ان میں مکمل عزتِ نفس اور مثبت و مضبوط انا کے پروان چڑھنے کی راہ مسدود ہو جاتی ہے۔ مشکلات کا سامنا کرنے والے کسی بھی انسان کو مدد مانگتے وقت یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ بچوں کو ساتھ لیکر ایسا کرنے سے ان کی ذہنی ساخت بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ جن بچوں کو بہت چھوٹی عمر سے مانگ تانگ کر کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے وہ خودداری کے جامع ترین احساس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے جاتے ہیں۔ حالات کی خرابی انسان کو پریشان بھی کرتی ہے اور بعض مواقع پر بدحواسی میں بھی مبتلا کردیتی ہے مگر معاشی مشکلات اہم ہونے کے باوجود اِتنی اہم نہیں ہوتیں کہ ان کے تدارک پر سبھی کچھ وار دیا جائے! معاشی مسائل حل کرنے کے لیے اپنے پورے وجود کو داؤ پر لگا دینا کسی بھی اعتبار سے نفع کا سَودا نہیں۔ ہر مشکل کسی نہ کسی بہتر صورتِ حال کی طرف لے جانے والے راستے کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ پریشانی یا بحرانی کیفیت کے وارد ہوتے ہی ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینا اور پہلے ہی مرحلے میں شکست تسلیم کرنا ان کی شان ہرگز نہیں

جو بلند عزائم رکھتے ہوں۔ اور بلند عزائم کے بغیر بھرپور اور شاندار زندگی بسر کرنے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔

معاشی مسائل کے حل کے لیے انسان کو محنت ہی کا آپشن اختیار کرنا چاہیے۔ محنت سے ہٹ کر کسی بھی راہ پر گامزن ہونے سے خرابی صرف بڑھتی ہے، کم نہیں ہوتی۔ اگر معاشرے میں دوسروں کی مدد کرنے والے زیادہ ہوں تب بھی اپنی مدد آپ ہی کی بنیاد پر کام کرنے کو اولین ترجیح کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ لوگوں کی توجہ پانے کے لیے بچوں کو استعمال کرنا بہت کارگر ثابت ہوتا ہے کیونکہ چھوٹے بچوں کی بری حالت دیکھ کر سبھی کے دل پسیج جاتے ہیں۔ مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ مسائل حل کرنے کا یہ ڈھنگ نہ صرف یہ کہ بہت اچھا اور پسندیدہ نہیں بلکہ اِس سے زندگی کی مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ بچوں کی نفسیاتی ساخت بری طرح مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اِس ممکنہ نقصان پر غور کرنے کے بعد تو مزید کچھ سوچنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ ہاتھ پھیلانے سے کہیں بہتر اور زیادہ منفعت بخش آپشن محنت کا ہے۔ اگر پوری ایمانداری اور صدق دل سے اپنایا جائے تو محنت کا آپشن ہاتھ پھیلانے کے تصور کو بھی ذہن سے کھرچ کر پھینک دیتا ہے!

(تصویر: محمد محی الدین۔ لاہور)

روز کنواں کھودنے والے کہاں جائیں؟

دنیا بھر میں معیشت کو چلتا رہنے کے لیے کام پر یقین کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں معاملہ یہ ہے کہ ہڑتال یعنی کام کی بندش کو کام سمجھ لیا گیا ہے! کسی بھی اِشو پر کام کاج روکنا اور رکوا دینا اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ عوام ذہنی طور پر تیار بھی رہتے ہیں۔ صورتِ حال کے بدلنے کا اندازہ جس قدر جلد عوام کو ہو جاتا ہے اُس قدر جلد تو سیاست دانوں اور انتظامیہ کے لوگوں کو بھی نہیں ہو پاتا۔ شہر میں کہیں بھی کچھ ہوتا ہے تو لوگ، از خود نوٹس کے تحت، تیزی سے کاروبار بند کرنے لگتے ہیں!

کراچی میں حالات کا بگڑنا اب کوئی حیرت انگیز امر نہیں۔ ہاں، کبھی کبھی کچھ دن تک سب کچھ ٹھیک چل رہا ہو تو معاملات فہم سے بالاتر ہوتے جاتے ہیں، ذہن اُلجھنے لگتا ہے۔ جب کچھ نہیں ہو رہا ہوتا تو دِل کو دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے! جو کچھ معمول تھا وہ اب کہیں دکھائی نہیں دیتا اور جو کل تک غیر معمولی ہوا کرتا تھا وہ اب معمول کی سطح پر آگیا ہے۔ جب انتظامیہ کہتی ہے صورتِ حال معمول پر آ گئی ہے تو دِل سہم سا جاتا ہے کہ قتل و غارت دوبارہ تو شروع ہو گئی!

تنخواہ دار اور کسی حد تک متعین اُجرت پانے والے تو کسی نہ کسی گزر بسر کر ہی لیتے ہیں۔ زندگی اگر عذاب بن گئی ہے تو اُن کے لیے جو روز کنواں کھود کر اپنے لیے پانی یعنی رزق نکالتے ہیں۔ شہر بند ہو تو اِن غریبوں کے گھروں کے چولھے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ اِنہیں کسی نہ کسی طور کمانا ہی پڑتا ہے تاکہ سانسوں کا تسلسل برقرار رکھا جاسکے۔ خراب حالات میں بھی کچھ لوگ جیسے تیسے کام کرتے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو گزارے کی سطح سے نیچے گر جائیں۔ زندگی کا یہی سب سے سفّاک رُوپ ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جن کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار ہے وہ سب کچھ دیکھ کر کچھ نہیں دیکھ رہے، بہت کچھ کرنے کے قابل ہوکر بھی کچھ نہیں کر رہے۔

چلنے والوں کی روش دُرست کرنا تو ممکن نہیں، ہاں اُن کے پیروں کی جوتیوں کی مرمت کے لیے یہ صاحب اپنے سامان کے ساتھ حاضر ہیں۔ مجبوری کی حالت میں اِنسان کبھی کبھی تھوڑا سی شجاعت کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ یہ "مرتا کیا نہ کرتا" والا معاملہ ہے۔ مگر پھر بھی حوصلے کی داد تو دینی ہی پڑے گی۔ چاروں طرف کام بند ہے مگر پھر بھی کوئی تو ہے جو اپنے اوزاروں کے ساتھ دیہاڑی کمانے کے لیے میدان میں ہے۔ اور اللہ پر توکّل بھی ہے کہ اِس گئے گزرے، "روزی شکن" ماحول میں بھی اِتنا تو مل کر ہی رہے گا کہ دو وقت کی روٹی کا اہتمام ہوسکے! یہ توکّل ہی بڑی چیز ہے۔

جن کے ہاتھوں میں شہر کی باگ ڈور ہے انہیں سوچنا چاہیے کہ جب شہر کی نبض ڈوبتی ہے، کام کاج بند ہوتا ہے تو بہتوں کو دو وقت کی روٹی کیلئے بھی تڑپنا اور سسکنا پڑتا ہے۔ کام کی بندش کے دوران ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ زندگی نے سب کو مساوی حیثیت میں نہیں نوازا۔ چند ہی افراد ایسے ہیں جن کی زندگی میں بظاہر کوئی دشواری، پریشانی اور الجھن نہیں۔ معاشرے میں غالب اکثریت اُن کی ہے جو یومیہ مشقت کے نام زندہ رہنے کا خراج ادا کر رہے ہیں۔ جو لوگ اپنی بات منوانے کے لیے شہر یا شہر کے چند علاقوں کو بند کرانے پر تُل جاتے ہیں اُنہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ایسا کرنے سے بہت سے بچے بھوک سے بلکتے رہ

جاتے ہیں۔ ملازمت یا دُکانداری وغیرہ نہ کرنے والے ٹھیلہ یا پتھارا لگا کر کماتے ہیں۔
یعنی روز کنواں کھودیے، روز پانی نکالیے۔ کنواں کھودنے پر پابندی ہو تو اُنہیں پیاسا رہنا
پڑتا ہے۔ غریبوں پر زندگی پہلے ہی کیا کم ستم ڈھا رہی ہے کہ اُن پر مزید ستم ڈھائے
جائیں؟ ناساعد حالات میں بھی جو رزق کے حصول کے لیے گھر سے نکلتے ہیں اُن کی
حوصلہ افزائی اور دِل جوئی ہر اُس اِنسان پر فرض ہے جس کے سینے میں دِل دھڑکتا ہے!
(فوٹو گرافی : محمد جمیل)

من کی مُراد۔۔۔ مگر کس قیمت پر؟

کراچی میں نیٹی جیٹی کا پل ایک زمانے سے اُن لوگوں کا پسندیدہ مقام ہے جو من کی مُرادیں پوری کرنے کے خواہش مند ہیں۔ شہر بھر سے اور باہر سے بھی لوگ نیٹی جیٹی کے پل پر کھڑے ہو کر آٹے کی گولیاں سمندر میں ڈالتے ہیں تاکہ مچھلیاں کھائیں اور اُن کے حق میں دعا کریں! لوگ صرف اپنے من کی مراد پانے کے لیے آٹے کی گولیاں پانی میں ڈالتے ہیں۔ سب کو اپنا ذاتی مفاد عزیز ہے، کوئی شہر کی سلامتی کو اپنے من کی مُراد نہیں بناتا۔ اگر ایسا ہوا کرتا تو معصوم مچھلیوں کی دُعا سے شہر کے حالات کچھ تو بدلے ہوتے، بہتر ہوئے ہوتے!

خیر، یہ بھی کیا کم ہے کہ دل کے بہلانے کو ایک ایسا پُل بھی شہر میں موجود ہے جو من کی مُراد اور اُس کے حصول کے درمیان پُل کا کردار ادا کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ اگر اتنا آسرا بھی نہ ہو تو ہم کیا کرلیں گے؟ کراچی کے باشندے خوش نصیب ہیں کہ آٹے کی گولیاں سمندر میں ڈال کر دل کو تھوڑا بہت سُکون پہنچانے کا سامان تو کرلیتے ہیں۔ مگر صاحب! یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ من کی مُرادیں پانے کے لیے جسم و جاں ہی کو داؤ پر لگادیا جائے؟ نیٹی جیٹی پر کھڑے ہونے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر انتظامیہ نے ٹن کی چادریں لگادی ہیں۔ آپ چاہیں تو اوپر سے بھی آٹے کی گولیاں پانی میں ڈال سکتے ہیں مگر کچھ لوگ دل کی تسلی کے لیے ایک قدم آگے جاکر ریلنگ کے دوسری جانب کھڑی ہوکر معصوم مچھلیوں کو آٹا اور اناج کے دانے کھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک بھی بات ٹھیک ہے، مگر ایسی بھی کیا بے تابی کہ اس کام کے لیے بچوں کو داؤ پر لگایا جائے؟ اگر کوئی بچہ بے دھیانی میں یا جذبات سے مغلوب ہوکر آگے بڑھ بھی رہا ہو تو روک دینا بڑوں کا فرض ہے۔

نیٹی جیٹی کا پُل انتہائی حساس مقام پر ہے۔ ملک بھر سے درآمدی سامان اِس پُل کے ذریعے جہازوں تک پہنچتا اور برآمدی سامان اِس کے ذریعے ملک کے مختلف حصوں کو بھیجا جاتا ہے۔ اِس کی سیکیورٹی تو مثالی ہونی چاہیے۔ اب سوال یہ

ہے کہ جب کوئی پُل کی ریلنگ پار کرکے حساس اور خطرناک حصوں تک پہنچتا ہے تو متعلقہ سیکیورٹی اہلکار کیا کر رہے ہوتے ہیں؟ ایسی حالت میں تو کوئی بھی پُل کے حساس اور خطرناک حصوں تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے! بندرگاہ سے متصل پُل پر تو ہر وقت نظر رکھی جانی چاہیے۔

نیٹی جیٹی پُل سے کود کر خودکشی کرنے کا رجحان بھی زور پکڑتا جارہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اِس رجحان کی حوصلہ شکنی ہی کے لیے ٹن کی چادروں پر مبنی دیواریں بنائی گئی ہوں۔ مگر خیر، کسی کو خودکشی سے روکنے اور خودکشی کی اجازت دینے میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آ رہا۔ بچوں اور نوجوانوں کا پُل کے حساس اور خطرناک حصوں تک پہنچنا موت کو دعوت دینے ہی کے مترادف ہے۔ بہت سے بچے یہاں سے کود کر نہاتے ہیں۔ اِس حوالے سے بھی انتظامیہ کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے۔

من کی مراد پانے کے لیے معصوم مچھلیوں کو خوراک ڈالنا اور بات ہے مگر خوراک ڈالنے کے نام پر خود کو سمندر کی خوراک بنانا کہاں کی دانش مندی ہے؟ تفریحی مقام کو تفریحی ہی رہنا چاہیے۔ ہوا خوری کے لیے آنے والے ہوا خوری تک محدود رہیں تو اچھا۔ سمندر کی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا کے ساتھ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا کسی بھی طور کوئی پسندیدہ عمل نہیں۔

(فوٹو گرافی : سید رضوان علی)

ہاضمے کا چورن کہاں ملے گا؟

ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ قدرت کے کارخانے میں تیار ہونے والی کوئی بھی چیز بے مصرف نہیں ہوتی۔ بند گھڑی بھی دن میں دو بار وقت کی درست نشاندہی کرتی ہے۔ حد یہ ہے کہ فُضلہ بھی کام آتا ہے مگر ہم اب تک، اپنی نام نہاد "ذہانت" بروئے کار لانے کے باوجود، یہ سمجھ نہیں پائے کہ ماہرین کا مصرف کیا ہے! کوئی مائی کا لعل ہمیں اب تک یہ نہیں بتا سکا کہ ماہرین کس مرض کی دوا ہیں۔ ہاں، وہ ہمیں مرض جیسے ضرور دکھائی دیتے ہیں!

جو لوگ اخبارات میں سیاسی خبریں اور حکومتی اعلانات پڑھ پڑھ کر اُوب چکے ہیں اُنہیں ہم مشورہ دیتے ہیں کہ ماہرین کے مشوروں پر مبنی خبریں آزما کر دیکھیں! ماہرین کو یہ صفت تو اللہ نے خوب بخشی ہے کہ جب بھی منہ کھولتے ہیں، لطائف کا دریا بہاتے ہیں! کسی بھی معاملے میں دی جانے والی ماہرانہ رائے ایسی "حقیقت پسندانہ" ہوتی ہے کہ حقیقت دُم دبا کر گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے!

ہم نے مرزا تنقید بیگ سے پوچھا کہ جب ماہرین کے مشوروں میں کوئی کام کی بات

پائی ہی نہیں جاتی تو اخبارات اُن سے متعلق خبریں شائع کرکے جگہ کیوں ضائع کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگے۔ "اخبارات میں سب کچھ تو سیاسی نہیں ہو سکتا۔ قتل و غارت، بم دھماکوں اور دہشت گردی کی خبریں اِتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ لوگ اُنہیں پڑھ کر ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں۔ ایسے میں ماہرین کے مشوروں پر مبنی چند خبریں شائع کرکے قارئین کا بلڈ پریشر نیچے لانے میں اخبارات کا کیا جاتا ہے! اِسے ہم پروفیشنلزم اور خدمتِ خلق کے جذبے کا حسین سنگم بھی قرار دے سکتے ہیں! بیشتر اخبارات کے ادارتی صفحات لایعنی سیاسی تجزیوں اور چمچہ گیری پر مبنی کالموں سے بوجھل ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ماہرین کے مشورے بیلینسنگ ایکٹ کا کردار بخوبی ادا کرتے ہیں یعنی فکاہیہ کالموں کی کمی پوری کی جارہی ہے!"

ہمارا خیال یہ ہے کہ اخبارات میں شائع ہونے والی بیشتر سیاسی خبریں اور سرکاری اعلانات اب بہت حد تک مزاح نگاری ہی کے زمرے میں آتے ہیں اِس لیے ماہرین کو بیچ میں لاکر الگ سے مزاح کا اہتمام کرنے کی چنداں ضرورت نہیں! ہو سکتا ہے آپ یہ کہیں کہ سیاسی خبروں اور خوشامد آمیز کالموں میں وہ مزاح کہاں جو ماہرین کے مشوروں میں پایا جاتا ہے!

ماہرین کا ایک پیدائشی وصف یہ ہے کہ ہمیشہ اُن حقائق کی نشاندہی کرتے ہیں

جن سے کسی بھی صورت انکار ممکن ہی نہیں ہوتا۔ تحقیق کے نام پر چند رضا کاروں کو خوب جی بھر کے تختہ مشق بنانے کے بعد ماہرین جب بھی مُنہ کھولتے ہیں تو کوئی نہ کوئی ایسی بات کہتے ہیں جس کے درست اور مبنی بر حقیقت ہونے میں کسی کو ذرہ بھر شبہ نہیں ہوتا۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

☆ غیر معمولی تن و توش رکھنے والے (موٹے) خاصے سُست ہوتے ہیں۔ (آپ سوچیں گے اِس میں حیرت کی بات کیا ہے۔ جو اپنا وزن برداشت نہ کر پاتا ہو وہ کام کا بوجھ کیسے اُٹھا پائے گا؟)

☆ کمزور جسم والے (یعنی دُبلے) افراد تیزی سے کسی بھی بیماری یا وبا کا شکار ہو جاتے ہیں۔ (لو کر لو بات۔ مضبوط جسم کے حامل لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بیماریوں کو مرنا ہے کیا!)

☆ شدید پریشانی میں اِنسان کوئی بھی کام صحیح ڈھنگ سے نہیں کرسکتا۔ (اب بتائیے ذرا کہ اِنسان پریشانی میں کام سے بیزاری محسوس نہیں کرے گا تو پھر کب کرے گا! لے دے کر ایک پریشانی ہی تو رہ گئی ہے جو بیزار ہونے کا موقع دیتی ہے۔ اب کیا اِنسان اُسے بھی استثنٰی دے دے؟ کبھی آپ نے کسی کو خاصے اچھے موڈ میں بھی برے ڈھنگ سے کام کرتے دیکھا ہے؟)

☆ جہاں بے روزگاری عام ہو وہاں جرائم تیزی سے پنپتے ہیں۔ (اسے کہتے ہیں "دانش وری" کی انتہا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ کبھی کسی ایسے معاشرے میں بھی جرائم تیزی سے پروان چڑھتے ہیں جہاں لوگوں کو تمام بنیادی سہولتیں آسانی سے اور کافی حد تک میسر ہوں؟ ہمارا خیال ہے ماہرین کے بتانے ہی پر بے روزگاری کی کوکھ سے جرائم جنم لیتے ہیں۔ اگر وہ خاموش رہیں یعنی کلیہ بیان کرنے سے گریز کریں تو عین ممکن ہے کہ بے روزگاری اپنی کوکھ میں جرائم کو پروان چڑھانے سے انکار کر دے یا اگر پروان چڑھا بھی لے تو جنم نہ دے!)

☆ شدید صدمے کی حالت میں دل پر خاصا منفی اثر مرتب ہوتا ہے۔ (آپ پھر سوچیں گے کہ بھئی یہ کون سی ماہرانہ رائے ہوئی۔ کسی بھی الم ناک کیفیت کے رُونما ہونے پر دُکھ ہوتا ہی ہے اور دِل پر شدید منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اب کیا ایسی کھلی حقیقت جاننے کے لیے بھی ماہرین کی رائے کا انتظار کرنا پڑے گا؟)

☆ شدید گرمی میں وبائی امراض پھوٹ پڑتے ہیں۔ (کسی بھی شخص کو موسم بدلنے پر پیدا ہونے والی بیماری کا اندازہ لگانے کے لیے ماہرین کی چنداں ضرورت نہیں۔ شدید گرمی پڑتی ہے تو کئی امراض وبا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اب ایسا تو

ہو نہیں سکتا کہ سڑا دینے والی گرمی پڑ رہی ہو اور ہمارے پس ماندہ دیہی علاقوں میں
گیسٹرو کی وبا اس بات کا انتظار کرے کہ ماہرین اس کی آمد کا "مژدہ" سُنائیں تو وہ
(! پھوٹ پڑے

☆ کساد بازاری سے عمومی معیارِ زندگی کا گراف گر جاتا ہے۔ (عام آدمی بھی جانتا ہے کہ
جب معیشت پر مندی چھائی ہوئی ہو تو سبھی کے گھر متاثر ہوتے ہیں۔ جب آمدنی کی سطح
گرتی ہے تو زندگی کا معیار بھی متاثر ہوتا ہے یعنی اس کا گراف بھی گرتا ہے۔ اِتنی روشن
اور واضح معاشی حقیقت جاننے کے لیے کسی کو کسی بھی ماہر سے کچھ پوچھنے یا مشورہ لینے
(کی کوئی ضرورت نہیں۔

☆ ورزش کرنے سے جسم متوازن رہتا ہے اور توانائی بحال ہوتی رہتی ہے۔ (دیکھا آپ
(! نے۔ جو بات بچوں کو بھی معلوم ہے وہ ہمیں ماہرین بتا رہے ہیں

☆ دیر سے بیدار ہونے والے صحیح ڈھنگ سے کام نہیں کر پاتے اور جلد اٹھنے والے دن
بھر چاق و چوبند رہتے ہیں۔ (کیا بات ہے! یعنی اگر ماہرین نہ بتائیں تو ہمیں معلوم ہی نہ
ہو پائے کہ زیادہ سونے کا کیا نقصان ہے اور دن چڑھے تک سوئے رہنے والے کس
(! طرح مشکلات کا شکار ہوتے رہتے ہیں

☆بڑھاپے میں بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ (عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بینائی کا کمزور ہونا فطری امر ہے۔ جو اِتنی بات بھی نہ جانتا ہوں اُسے عقل کا اندھا سمجھنا چاہیے!)

اِن چند مثالوں سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ماہرین جب کچھ "ثابت" کرنے پر تُل جاتے ہیں تو کس سادگی و پرکاری سے مزاح فرماتے ہیں!

برطانیہ کے معروف اخبار دی ٹیلی گراف نے بتایا ہے کہ ماہرین کی ایک ٹیم نے جدید تاریخ کے عمیق مطالعے اور تحقیق کی روشنی میں "انکشاف" کیا ہے کہ جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم کا گرایا جانا جدید تاریخ کا سب سے بڑا ٹرننگ پوائنٹ تھا! بہت خوب۔ جس بات کو پوری دنیا چھ عشروں سے جانتی ہے وہ اب ماہرین کے مُنہ سے نکل کر مُستند ہونے کا اعزاز پا رہی ہے!

برطانوی ماہرین نے "انکشاف" فرمایا ہے کہ روزانہ پنیر کھانے سے کینسر کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ ہے کوئی جو ماہرین کی معلومات میں اضافہ کرے کہ پنیر سے کینسر کا خطرہ تو اب کم ہوگیا ہے کیونکہ پنیر کھانے کی استطاعت کسی کسی میں رہ گئی ہے! اب تو خیر سے انڈے بھی اتنے مہنگے ہوگئے ہیں کہ ناشتے میں انہیں شامل کرنے سے بجٹ کو کینسر ہو جاتا ہے! ماہرین نے پنیر کو تو یاد رکھا،

انڈوں کو کیوں "استثنٰی" دے دیا؟ شاید انڈے پڑنے کا خوف تھا!

ماہرین خود کو ہر مرض کی دوا سمجھتے ہیں اور ہم سمیت بہت سے لوگ اُنہیں لا دوا مرض گردانتے ہیں! ماہرین نہ ہوں تو بہت سی بیماریاں، نظر انداز کئے جانے پر دل برداشتہ ہو کر، خود ہی دم توڑ دیں! ماہرین ہیں تو وسوسوں، خوف، بے چینی، بے یقینی، بدگمانی اور خوش گمانی کا بازار گرم ہے۔ سوال یہ ہے کہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ماہرین جو کچھ کہتے ہیں اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بدہضمی دور کرنے والا چورن کہاں ملے گا؟ ماہرین اِس سلسلے میں ہماری راہ نُمائی فرمائیں گے؟

محنتی ہاتھ حوصلہ افزائی چاہتے ہیں، سودے بازی نہیں

اگر کوئی زندگی کو نعمت نہیں سمجھتا تو یہ اُس کی کوتاہ نظری، قدر ناشناسی اور ناشکرے پن کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن صاحب! جنہیں زندگی ایسی نعمت کا خراج مرتے دم تک ادا کرنا پڑتا ہے کچھ اُن سے بھی تو پوچھیے کہ اُن پر کیا گزرتی ہے! طرح طرح کی آسانیاں میسر ہوں تو زندگی حلوے جیسی ہو جاتی ہے۔ مگر یہی حلوہ اُس وقت لوہے کے چبانے کی منزل تک لے جاتا ہے جب وسائل کم اور مسائل زیادہ ہوں، قدم قدم پر رکاوٹیں ہوں، ارادے بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہوں۔

ماڑی پور کی امینہ بی بی کا بھی کچھ ایسا ہی قصہ ہے۔ اُن کی زندگی جھاڑو بناتے اور بیچتے گزری ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایسے میں کیسی اور کتنی زندگی گزاری جا سکی ہوگی؟ امینہ بی بی کی زندگی بھی مشکلات اور پریشانیوں سے عبارت رہی ہے۔ اُنہوں نے دس بارہ کی عمر سے اپنی چچی کے ساتھ یہ کام شروع کیا۔ جھاڑو بنا کر وہ شہر کے مختلف بازاروں میں بیچا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ اللہ کی رضا تھی کہ اُن کی مشکلات کم ہونے کے بجائے بڑھتی گئیں۔ دو بیٹے ہیں۔ ایک جسمانی طور پر اور دوسرا ذہنی طور پر معذور ہے۔ جن کے حوصلے کمزور ہوں اُن کے فکر و عمل پر ایسے حالات بہت تیزی سے

جھاڑو پھیر دیتے ہیں۔ امینہ روزانہ ماڑی پور سے لیاقت آباد کی مارکیٹ میں آکر جھاڑو بیچتی ہیں جو اس بات کا توانا ثبوت ہے کہ اُن کے حوصلے نے حالات کی کوکھ سے جنم لینے والی تمام مشکلات اور مایوسی پر جھاڑ پھیر دی ہے! ہمارے معاشرے میں جن خواتین کے جوان کماؤ پوت ہوں وہ بھی سکون سے جی نہیں پاتیں۔ ایسے میں امینہ بی بی کے حوصلے کو داد دیجیے کہ وہ اب تک صرف اپنے جسم و جاں ہی کا رشتہ برقرار نہیں رکھے ہوئے بلکہ اپنی اولاد کا بوجھ بھی سہار رہی ہیں۔

ستم یہ ہے کہ شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر آکر رزق کے حصول کی کوشش کرنے والی امینہ بی بی کو "سودے بازی" کی منزل سے بھی گزرنا پڑتا ہے! دیکھا

گیا ہے عیدین یا شادی کے موقع پر صرف کپڑوں کی مد میں ہزاروں روپے اڑا دینے والی خواتین بیس پچیس روپے کی جھاڑو خریدنے کے معاملے ایسی سودے بازی کر رہی ہوتی ہیں جیسے مذاکرات کی میز پر پاکستان اور بھارت کے درمیان معاملات طے کئے جارہے ہوں! امینہ بی بی کا کہنا ہے کہ وہ کھجور کے پتوں اور چھال سے جو جھاڑو بناتی ہیں وہ پچیس روپے میں فروخت ہو جائے تو معقول منافع ملتا ہے۔ خریدار آتی ہیں اور اُن سے دام گرانے کی فرمائش کرتی ہیں۔ پچیس والی چیز کبھی پندرہ اور کبھی دس روپے میں بھی دینی پڑتی ہے! امینہ بی بی بھی کیا کریں؟ کسی نہ کسی طور گھر کے لیے بھی کچھ لیکر جانا ہے۔ غریب کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ آج کا کام اور آج کی کمائی کل پر نہیں ٹال سکتا۔ امینہ بی بی کو بھی "سودے بازی" کی بازی ہرانی پڑتی ہے۔ بقول ساحر لدھیانوی

جو مل گیا اُسی کو مقدر سمجھ لیا

! جو چھن گیا میں اُس کو بھلاتا چلا گیا

جنہیں اللہ نے نوازا ہے وہ روزانہ ایسی خریداری بھی کرتے ہیں جس میں صرف خسارہ ہوتا ہے اور دولت کے اِس ضیاع کا اُنہیں کچھ خاص رنج بھی نہیں ہوتا۔ ایسے میں اگر امینہ بی بی جیسے لوگوں کو ہم چند روپے زیادہ دے دیں تو کیا ہے؟ جھاڑو جیسی چیز ویسے بھی اِس قابل تو نہیں کہ اُسے خریدنے کے لیے سودے بازی کی جائے۔ کیا یہی بہت نہیں کہ امینہ بی بی کسی کے آگے ہاتھ نہیں

پھیلاتیں بلکہ محنت کرکے کھاتی اور کھلاتی ہیں؟ امینہ بی بی عمر کی چھ دہائیاں مکمل کر چکی ہیں۔ جھاڑو بناتے بناتے اب اُن کی آنکھوں میں موتیا اُتر آیا ہے۔ وہ کسی سے کچھ مانگتی تو نہیں مگر ہاں اِس قدر التماس ضرور ہے کہ کوئی موتیے کا آپریشن کرادے۔

ہم زندگی بھر طرح طرح کی خریداریوں میں بہت کچھ لٹاتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم اپنے ماحول میں غریبوں کو تلاش کریں اور ذرا سے زیادہ یا اُنہی کے بتائے نرخ پر مال خرید لیں۔ ہاتھ پھیلانے سے گریز کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہم سب پر فرض ہے۔ جو لوگ محنت کرنے والوں پر بھیک مانگنے والوں کو ترجیح دیتے ہیں وہ درپردہ معاشرے کی بنیادی اقدار پر جھاڑو پھیر رہے ہوتے ہیں۔ محنت کرنے والے غریبوں کو زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے کے قابل بنانے میں ہمیں اپنا کردار پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ اگر کوئی زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے تو یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ا±سے زندہ رہنے کا حق ہی حاصل نہیں۔ جن کے حصے میں آسانیاں آئی ہیں اُنہیں دوسروں کی مشکلات دور کرنے پر متوجہ ہونا چاہیے۔ یہ زندگی اور انسانیت کا ایک بنیادی تقاضا ہے۔

(فوٹو گرافی : سید رضوان علی)

زندگی ایک بار ملتی ہے

انسان زندہ رہنے کے لیے زندگی کو بھی داؤ پر لگا سکتا ہے؟ کیا ایسا کرنا درست ہے؟ ان دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے۔ یعنی یہ کہ ایسا کرنا کسی بھی طور منطقی یا درست نہیں۔ مگر کیا کیجئے کہ بہت سے لوگ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کچھ بھی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے ماحول پر نظر دوڑائیے تو اندازہ ہو گا کہ بہت سے لوگ دو وقت کی روٹی کا اہتمام کرنے کے لیے جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اُنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی ملا ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔ رزق کا حصول اِنسان کا بنیادی فریضہ اور عمل ہے۔ جائز طریقے سے رزق حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کیا جاسکتا ہے مگر زندگی کا تحفظ بہر حال ہماری بنیادی ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے۔ جو کچھ بھی ہے وہ زندگی کے دم قدم سے ہے۔ جب سانسوں کا تسلسل ہی برقرار نہ رہے تو کہاں کی دنیا اور کیسی اُس کی رونق؟

پاکستانی معاشرہ اب طرح طرح کے خطرات سے "مرصّع" اور "مزیّن" ہے۔ خطرات سے کھیلنا تو جیسے اب کوئی بات ہی نہیں رہی۔ لوگ ذرا سی بات پر جذبات کی شدّت سے بے قابو ہوکر جان ہتھیلی پر دَھر لیتے ہیں۔ جس طرف نظر دوڑائیے، زندگی کو داؤ پر لگانے والے مناظر ہمارا خیر مقدم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یاروں نے موٹر سائیکل چلانے کے ہنر کو بھی جان کی بازی لگانے کے فن میں بدل ڈالا ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کیجئے تو ڈرائیور صاحبان اچھی خاصی بڑی بس یا ویگن کو بھی موت کے کنویں کی موٹر سائیکل کی طرح چلانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں! جس زمانے میں ٹرینیں چلا کرتی تھیں (!) تب بوگیوں کے درمیان ڈائننگ کار کے ویٹر کی لیک جھپک سے بھرپور آمد و رفت بھی عجب نظارے پیش کیا کرتی تھی۔ بہت سے لوگ ویٹر کو آرڈر کا کھانا اور پانی کی بوتلیں مختلف ڈبوں میں پہنچاتے ہوئے دیکھ کر سرکس دیکھنے کی تمنا سے دست بردار ہو جایا کرتے تھے!

آپ نے موت کا کنواں تو دیکھا ہی ہوگا۔ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والے ہماری تفریح طبع کی خاطر یومیہ اُجرت کے لیے اپنی جان پر ہی تو کھیل رہے ہوتے ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کی کیسی سادہ و آسان جدوجہد کا آپشن میسر ہے! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ معمولی یومیہ اُجرت کے لیے جان کی بازی لگانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ آپ کی سوچ غلط نہیں۔ مگر صاحب! اِس بات پر بھی تو غور کیجیے کہ جہاں لوگ کسی منفعت کے حصول کی تمنا کے بغیر بھی جان کی بازی لگا دیتے ہیں وہاں کچھ پانے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھنا کون سی انوکھی بات ہے؟ بڑے شہروں کی بڑی باتیں۔ کسی مضبوط سہارے کے بغیر بلندی پر کام کرنے والوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے، اپنے اہل خانہ سے اور زندگی کے تسلسل سے کتنی کمٹمنٹ رکھتے ہیں۔ غلط طریقوں سے پیسہ کمانے کے سو طریقے ہیں۔ کوئی بھی غیر اخلاقی طریقہ اختیار کرکے بہت کچھ کمایا جاسکتا ہے۔ ایسے میں محنت کرنے والے روشن مثال ہیں۔ بڑی ہورڈنگز اور بل بورڈز پر لٹک کر کام کرنے والے محنت کش اُن نوجوانوں سے تو بہر حال بہتر ہیں جو صنفِ نازک کی توجہ پانے یا محض دِل پشوری کیلئے ون وھیلنگ کرتے پھرتے ہیں اور پھر کسی دن حادثے کی نذر ہو کر اہل خانہ کو روتا ہوا چھوڑ کر اِس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں! جان کی بازی لگانے سے گریز اچھی بات ہے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ جو اپنی جان جوکھم میں ڈال کر کچھ کمانے کی کوشش کرتے ہیں اُنہیں بھی معلوم ہے

کہ زندگی ایک بار ہی ملتی ہے مگر کیا کیجیے کہ اِسی زندگی کو تسلسل سے ہمکنار بھی رکھنا ہے۔ جو لوگ جان جوکھم میں ڈال کر کام کرتے ہیں اُن کا صرف معاوضہ ہی نہ بڑھایا جائے بلکہ بہتر حفاظتی انتظامات بھی کیے جائیں تاکہ کوئی جان بلا جواز ضائع نہ ہو۔ جو ادارے جان خطرے میں ڈالنے والے کام کراتے ہیں اُنہیں پابند کیا جائے کہ متعلقہ لوگوں کو ایسی تمام سہولتیں فراہم کریں جن سے اُن کا تحفظ یقینی بنایا جاسکتا ہو۔

(فوٹو گرافی : سید رضوان علی)

حفظان صحت کے اُصول؟ .... ہاہاہا

مہمان نوازی اور غریب پروری تو پاکستانیوں میں کوٹ کوٹ کر بھری (گئی) ہے۔ خوشیاں اور آسانیاں تو خیر ہیں ہی گلے لگائے جانے کے قابل، اگر کوئی غم یا مشکل بھی آئے تو ہم بخوشی گلے سے لگا لیتے ہیں۔ اور اگر نہ آسکے تو ہم خود اُس تک پہنچ جاتے ہیں! ذرا اِس تصویر کو غور سے دیکھیے کہ خاتون کھلے نالے پر کس قدر انہماک مچھلیوں کو مسالا لگا کر سکھانے میں مصروف ہیں۔ آپ سوچیں گے وہ مچھلیاں سکھانے کے لیے نالے کی مُنڈیر تک کیوں گئیں؟ سیدھی سی بات ہے، نالا تو چل کر اُن تک نہیں پہنچ سکتا تھا نا! آلودگی اِتنی بڑھ گئی ہے کہ اب کیڑے مکوڑوں اور جراثیم میں اِتنا دم نہیں رہا کہ کہیں آ، جا سکیں۔ ایسے میں غریب پروری کا تقاضا ہے کہ ہم "بقلم خود" اُن تک پہنچیں! یعنی

تیرے در پر صنم چلے آئے

تو نہ آیا تو ہم چلے آئے!

دُنیا والے یہ سمجھتے ہیں کہ صفائی کے بہتر انتظام سے صحت بنی رہتی ہے اور زندگی بہتر گزرتی ہے۔ سچ پوچھیے تو ایسی ایسی سوچ پر ہمیں تو ہنسی آتی ہے۔ اب کوئی ذرا اہلِ جہاں سے پوچھے کہ کھلے نالوں اور غلاظتوں کے انبار کے ساتھ ہم جو زندہ ہیں تو یہ کیا کسی معجزے سے کم ہے! کیا ہم کسی اور دُنیا کی مخلوق ہیں؟

آپ سوچیں گے غلاظت سے بھرے کھلے نالے پر مچھلیاں سُکھانے کی کیا منطق ہے؟ ارے صاحب! لوہا لوہے کو کاٹتا ہے! شاید آپ نے ریاضی نہیں پڑھی۔ منفی کو منفی میں جمع کیجیے تو مثبت میں ہو جاتا ہے۔ انتہائی مُتعفّن نالے کی مُنڈیر پر انتہائی بدبو دار مچھلیاں سُکھائی جائیں تو نتیجہ انتہائی خوشبودار منافع کی صورت میں برآمد ہوتا ہے!

نالوں کو صاف کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اُنہیں کھلا رکھا جائے تاکہ

بدبو خود ہی اُڑ جائے اور گندا پانی عمل تبخیر کی نذر ہو! کچھ ہی دنوں میں نالے میں پڑا ہوا سب کچھ اُسی طرح سُوکھ جاتا ہے جس طرح ہم اچھے دِنوں کے انتظار میں سُوکھ گئے ہیں! سُوکھنے سے انکار کرنے والی ڈھیٹ غلاظت کو نکال کر نالے کی دیوار کے ساتھ ہی سجا دیا جاتا ہے تاکہ سورج کی مہربانی سے دم توڑے۔ اور پھر کچھ ہی دنوں میں سُوکھ ساکھ کر غلاظت کا بس نام و نشان رہ جاتا ہے۔ یعنی

اب کہاں اُن کی وفا، یادِ وفا باقی ہے!

آپ سوچیں گے نالے کے کنارے سُکھائی ہوئی مچھلی لوگ ہضم کیسے کرتے ہوں گے؟ آپ سوچتے رہیے۔ نہ کھانے والے سوچتے ہیں نہ مچھلی سوچتی ہے! ہمارا ہاضمے کا نظام بگڑ اور خرابی کی منزل کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے! اور صاحب

کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو؟

مری میں ایک صاحب کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا۔ معلوم ہوا موصوف کراچی سے آئے ہیں۔ ڈاکٹر نے فوراً "بہتر آب و ہوا" کے لیے کراچی واپس جانے کا مشورہ دیا۔ اُن کے پھیپھڑے کاربن ڈائیوکسائڈ والی ہوا سے مانوس تھے، مری کی صاف سُتھری ہوا کا بوجھ برداشت نہ کرسکے! موصوف کراچی پہنچے اور رش آورز میں تبت سینٹر کے سگنل پر کھڑے ہو کر دس پندرہ لمبے لمبے سانس لیے تو

طبیعت ہشّاش بشّاش ہو گئی! کھانے پینے کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ نالے پر سکھائی ہوئی مچھلی اور کھرا کنڈی سے متصل مشین سے نکالا ہوا گنّے کا رَس ہمارے معدے کو راس آ چکا ہے! اور حفظان صحت کے اُصول؟ ہا ہا ہا! اُن پر پھر کبھی بات ہو گی۔

ہونہہ۔۔۔ تجاوزات بھی کوئی شرمندگی کی بات ہے

ہمیں ہر معاملے میں صرف منفی پہلو تلاش کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ کوئی مرتا ہے تو ہم روتے ہیں۔ مگر صاحب! بہتوں کے گھروں میں چولھا جلتا ہی اس وقت ہے جب اموات واقع ہوتی ہیں! ہمارا بیمار پڑنا ڈاکٹرز کا روزگار ہے۔ انتظامیہ اور لوگ تجاوزات کا رونا روتے رہتے ہیں۔ ہمیں تو ان کے رونے پر ہنسی آتی ہے۔ اور کیوں نہ آئے؟ قدرت کے کارخانے میں کچھ بھی بے مصرف نہیں۔ تجاوزات کا قیام بھی اپنے اندر چند مثبت پہلو ضرور رکھتا ہے مگر ہم تو بس تجاوزات کے نام پر صرف روتے ہی رہتے ہیں! کبھی آپ نے سوچا ہے کہ اگر تجاوزات نہ ہوں تو ہماری سڑکیں کتنی چوڑی اور خالی خالی دکھائی دیں گی! اچھی خاصی چوڑی سڑکیں ہوں گی تو تجاوزات بھی قائم کی جائیں گی۔ انتظامیہ خود ہی تجاوزات قائم کرنے کی گنجائش پیدا کرتی ہے اور پھر شکوہ بھی کرتی ہے کہ "ناجائز تجاوزات" قائم کرنے والوں کو شرم دامن گیر نہیں ہوتی۔ اب آپ ہی بتایئے کہ شہر کے اندر اچھی خاصی چوڑی سڑکیں بنانے کی کیا منطق ہے؟ کیا یہ پتھاریداروں کو ترغیب دینے، بلکہ اکسانے کے مترادف نہیں؟ سیدھی سی بات ہے، پانی ہمیشہ اپنی پنسال میں آتا ہے۔ کہیں خالی جگہ ہوگی تو لوگ اسے بھرنے کی کوشش کیوں نہیں کریں گے؟

کراچی کا دل صدر ہے اور صدر کا دل ایمپریس مارکیٹ. برطانیہ کی ایک ملکہ سے موسوم مارکیٹ دورِ غلامی کی یادگار ہے۔ اور یاروں نے اپنے سابق آقاؤں کو خراج عقیدت پیش کرتے رہنے کے لیے ایمپریس مارکیٹ کو دیوی سمجھ کر اس کی آرتی اتارنے کے لیے چاروں طرف پتھارے لگانے کی قسم کھا رکھی ہے! کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے ایمپریس مارکیٹ کہیں بھاگی جارہی ہو اور اسے روکنے کے لیے پتھارے لگائے گئے ہوں، تجاوزات قائم کی گئی ہوں!

آپ شاید اب تک یہی سوچ رہے ہیں کہ سڑکوں پر ٹھیلے کھڑے کرنے، پتھارے لگانے سے ٹریفک میں خلل پڑتا ہے اور پیدل چلنے والوں کو بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ٹھیک ہے، مگر بھیڑ میں گاڑی چلانے کا ہنر بھی تجاوزات ہی نے

ڈرائیورز کو سکھایا ہے ! سخت نامساعد سڑکوں پر گاڑیاں چلانے بلکہ دوڑانے والے ہمارے ڈرائیورز اپنے کام میں ایسے طاق ہو جاتے ہیں کہ پھر کسی بھی ملک میں ناکام نہیں ہوتے ! ڈرائیونگ کی ایسی شاندار اور کامیاب تربیت دینے والا ادارہ پورے ملک میں ڈھونڈے سے نہ ملے گا ! اور اِس نکتے پر بھی تو غور فرمایئے کہ قوم کے ذہین سپوتوں نے تجاوزات کی شکل میں معاش کے کس قدر آسان متبادل ذرائع دریافت کئے ہیں۔ عزتِ نفس کسے عزیز نہیں ہوتی؟ کوئی کسی کی بات بلا جواز کیوں سنے؟ آپ کو بھی کسی کی نوکری، چاکری گوارا نہیں تو پریشان نہ ہوں۔ تھوڑا مال کھلا کر کہیں بھی پتھارا لگایئے اور "سیلف ایمپلائمنٹ" کے نظریے کو بروئے کار لایئے ! سیلف ایمپلائمنٹ کا ایسا آسان نظریہ چند ہی ممالک میں رو بہ عمل ہوگا اور وہ ممالک یقیناً افریقہ کے پس ماندہ ترین خطے میں ہوں گے !

(فوٹو گرافی : محمد جمیل)

گریبان تو عوام ہی کے رہیں گے

سیاست اور خطابت میں کسی کو کسی بھی بات کا ہوش کہاں رہتا ہے؟ زہے نصیب اب شہباز شریف بھی خاصا جوشیلا خطاب کرنے لگے ہیں۔ میاں نواز شریف کی خطابت کے معیار پر تو ہم تبصرہ نہیں کریں گے مگر ہاں خطابت کے جوش میں ہوش کھونے کا ہنر وہ بھی خوب جانتے ہیں! خطابت کے دوران شریف برادران آصف علی زرداری اور اُن کے رفقاء کو علی بابا چالیس چور کی اصطلاح سے طویل مدت تک نشانہ بناتے رہے۔ جب لوگوں نے خوب سمجھایا تب اُن کی سمجھ میں آیا کہ علی بابا تو مثبت کردار ہے! بہر کیف، اِتنا ضرور ہوا کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے علی بابا کو زر بابا میں تبدیل کرلیا! اِس سے ثابت ہوا کہ شہباز شریف واحد وزیر اعلیٰ ہیں جنھوں نے اپنے حلقہ یاراں میں ایک آدھ دانا بھی رکھا ہوا ہے!

گزشتہ دنوں ایک تقریب سے خطاب کے دوران شہباز شریف بھرپور جوش و خروش کے عالم میں بات بالکل اُلٹی کہہ گئے۔ اُنہیں کہنا یہ تھا کہ مسائل حل نہ ہوئے تو میرا گریبان ہوگا اور آپ کے ہاتھ۔ اِس کے بجائے اُنہوں نے کہا آپ کا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ! اِس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اُن کی رگوں میں لہو گرم ہے اور گرم بھی ایسا کہ بظاہر ہوش کا ہوش نہ رہنے دے! ہمیں ایسے ہی

قائدین درکار ہیں جو بولنے پر آئیں تو رَج کر، دَم لگا کر بلکہ پنجابی میں کہیے تو "ٹِل لا کے" بولیں!

مُلک بھر میں شدید سردی پڑ رہی ہے۔ دُھند ہے کہ چھَٹنے کا نام نہیں لے رہی۔ سیاست بھی دُھند کی لپیٹ میں ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ سیاست دانوں کی بے حِسی کا کُہرا ہے کہ قہر بن کر اہلِ وطن پر ٹوٹ رہا ہے! جو کچھ بھی وہ کہہ رہے ہیں وہ مصلحت کوشی کے اِتنے پردوں میں لپٹا ہوا ہے کہ مفہوم سمجھنا تو بہت دور کی بات ہے، ہم الفاظ بھی ڈھنگ سے سمجھ نہیں پا رہے! ایسا لگتا ہے سبھی نے چوہدری شجاعت حسین کی اقتدا میں سیاسی بیان بازی کی نیت باندھ لی ہے!

ایسے میں شہباز شریف کا پُرجوش اندازِ خطابت غنیمت ہے کہ جو دِل میں ہے وہ کہہ تو جاتے ہیں! یعنی دیوانگی میں بھی فرزانگی کے تقاضے فراموش یا نظر انداز نہیں کرتے! شہباز شریف ہمیں اِس لیے بھی پسند ہیں کہ وہ خطابت کے جوش میں بھی نرم و نازک اشعار سے لوگوں کے دِلوں کو گرمانا نہیں بھولتے۔ آج کل مارکیٹ میں اچھے وزرائے اعلیٰ دستیاب نہیں۔ جس ٹائپ کے وزرائے اعلیٰ ہمیں میسر ہیں وہ ڈھنگ سے سیاسی قافیہ پیمائی بھی نہیں کر پاتے۔ ایسے میں اُن سے ہم شعر و سُخن کی توقع بھول کر نہیں رکھ سکتے، ہاں اُن پر مرثیہ ضرور پڑھا

جاسکتا ہے! شعر و سُخن سے وزیر اعلیٰ پنجاب کا شغف کوئی نئی بات نہیں۔ سیاسی جلسوں میں مُرصّع غزلیں سُنانا کچھ اُنہی کا خاصہ ہے۔ مُشاعرے تو اب سیاسی جلسوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ شعراء شعر گوئی سے بڑھ کر سیاست میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ ایسے میں غزل کے فروغ کے لیے ہمیں شہباز شریف ایسے سُخن نواز قائدین کی طرف دیکھتے رہنا چاہیے!

مرزا تنقید بیگ سرکاری دفتر میں کلرک ہیں اِس لیے اُن میں جوش و خروش کا نام و نشان نہیں مگر جوشیلی خطابت اُنہیں بہت اچھی لگتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری طرح وہ بھی شہباز کی پرواز یعنی خطابت کے دِلدادہ ہیں۔ مرزا کہتے ہیں۔ "شہباز شریف کو اِس بات پر داد ملنی ہی چاہیے کہ خطابت میں ہوش کھو کر بھی ہوش نہیں کھوتے۔ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ روانی میں غلط بول گئے۔ وہ محض سیاست دان نہیں، اصلی تے وڈّے بھائی پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی ہیں۔ بزرگوں سے سُنا ہے اور دیکھا بھی ہے کہ بڑوں کا غلط بھی صحیح ہوا کرتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بات گریبان اور ہاتھ کی ہو تو ترتیب کیا رکھنی ہے! اچھا خطیب وہ ہے جسے سُن کر لوگ مبہوت رہ جائیں۔ شہباز شریف کی بات سُن کر لوگ مبہوت رہ گئے! کِسی کو ہوش نہ رہا کہ اُنہیں گریبان اور ہاتھ کی ترتیب درست رکھنا یاد دلایا جائے!"

پانچ برسوں میں اللہ نے ہمیں وزرائے اعلیٰ کے اعتبار سے خاصی ورائٹی سے نوازا ہے۔ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ نواب اسلم رئیسانی اپنے بیانات میں لطافت کے دریا بہاتے آئے ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشاء ہوتے تو نواب اسلم رئیسانی کے بیانات کو بنیاد بناکر "دریائے لطافت" سُپردِ قلم کرتے! مزاح لکھنے والوں نے رئیسانی صاحب کے بیانات سے خوب استفادہ کیا ہے، بلکہ کہیں کہیں تو مزاح کی زیادتی کا شکوہ بھی پایا گیا ہے!

خیبر پختونخوا کے وزیر اعلیٰ امیر حیدر ہوتی کیا کرتے رہے ہیں، کوئی نہیں جانتا۔ ہاں، اُن کی وزارتِ اعلیٰ کے دور میں عوامی نیشنل پارٹی کو خوب استحکام ملا ہے۔ پارٹی اِس اعتبار سے اثاثہ بن گئی ہے کہ اُس سے تعلق رکھنے والوں کے اثاثے بڑھ گئے ہیں! صوبے کا معاملہ یہ ہے کہ

وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

سندھ کی عجیب حالت ہے۔ لوگ کہتے ہیں بڑی بات ہے کہ 80+ وزیر اعلیٰ نے صوبے کے نظم و نسق کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھا رکھا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ہم کیا کرلیں گے؟ کوئی ذرا عوام سے بھی تو پوچھے کہ وزیر اعلیٰ سمیت پورے صوبے کا بوجھ اُٹھاتے رہنے سے اُن پر کیا بیتی ہے! کاروباری دُنیا میں سلیپنگ پارٹنر کا سُنتے آئے ہیں، زرداری صاحب کی مہربانی سے سلیپنگ چیف

منسٹر بھی دیکھ لیا! ایسے میں صوبے پر اندھیر نگری کا گمان کیونکر نہ ہو؟

ہم نے اپنے وزرائے اعلیٰ پر کرپشن، نا اہلی، غفلت شعاری اور اقربا پروری سمیت خدا جانے کتنے ہی خون معاف کر دیئے ہیں۔ کیا شہباز شریف کو ایک محاورے کے غلط استعمال پر معاف نہیں کیا جاسکتا؟ شہباز شریف نے جوش و خروش کی انتہا میں بھی وہی بات کہی جو اُن کے دِل میں تھی یعنی عوام کو یاد دِلا دیا کہ اُن کے ہاتھ قائدین کے گریبان تک پہنچنے کے لیے بنے ہی نہیں! ٹھیک ہی تو ہے، عوام کے ہاتھ مُلک کے لیے کچھ کر گزرنے کی خاطر یا پھر پھیلنے کے لیے تخلیق کئے گئے ہیں۔ خود عوام کو "پھیلنے" کی اجازت نہیں! پیرایہ بیان خواہ کچھ ہو، جن تک ہاتھوں کو پہنچنا ہے وہ گریبان تو عوام ہی کے رہیں گے

غالب نے کہا تھا۔

وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے

!مَرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہباز شریف بھی بات پر قائم ہیں۔ اُلٹی بات کرکے بھی وہ سیدھی بات کر گئے ہیں! یعنی اُن کے ظاہر و باطن میں فرق نہیں، جو دِل میں ہے وہی زبان پر بھی

ہے!

محترم ظفر اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اُس پر ظفر

آدمی کو" صاحب کردار ہونا چاہیے!

غالب کے بیان کردہ اُصول کے مطابق ایمان اور محترم ظفر اقبال کے وضع کئے ہوئے فارمولے کے تحت کردار کے معیار پر شہباز شریف پورے اُترتے ہیں! اچھا ہے کہ ہم اور آپ گریبان اور ہاتھ والی بات کو بھول ہی جائیں!

ایجنسیوں" کے خُدائی خدمت گار"

ہمارے ہاں بے نام کھاتوں کی کمی نہیں۔ جو کچھ بھی سمجھ یا قابو میں نہ آئے وہ اِن بے نام کھاتوں کی نذر کردیا جاتا ہے۔ پولیس کی سمجھ میں جب کوئی کیس نہیں آتا یا اُسے سمجھنے سے روک دیا جاتا ہے (!) تب وہ کیس کو "داخل دفتر" کے کھاتے میں ڈال دیتی ہے۔

جو واقعہ حکومت سمجھ نہ پائے اُسے "نامعلوم دہشت گردوں" یا "غیر ریاستی عناصر" کے کھاتے میں ڈال دیتی ہے! اِس معاملے میں کالعدم تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) نے حکومت کی مشکل آسان کردی ہے۔ سرکاری بیان آنے سے پہلے ہی ٹی ٹی پی والے بیان داغ کر ذمہ داری قبول کرلیتے ہیں!

معیشت کے محاذ پر شکست کا سامنا ہو تو ذرا بھی پریشان ہوئے بغیر سارا ملبہ "عالمی کساد بازاری" کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے!

کوئی سرکاری ادارہ نہ چل پائے تو کوئی بات نہیں۔ "بیل آؤٹ پیکیج" کے کھاتے میں ڈال دیجیے، چلنے لگے گا!

جب حالات پیچیدہ نہیں تھے تب عوام کی سمجھ میں نہ آنے والے معاملات خال خال تھے۔ اب ایسا ہے کہ بہت کچھ عوام سِرے سے سمجھ ہی نہیں پاتے۔ اِس کا علاج بہت آسان ہے۔ یاروں نے ہر مرض کی دوا ایک لفظ میں ڈھونڈی اور پائی ہے۔ جب وہ معاملات کو سمجھنے میں یکسر ناکام رہتے ہیں تو "ایجنسی" کو "کریڈٹ" دینے پر تُل جاتے ہیں! اِس معاملے میں کچھ لوگوں کی پُھرتی دیکھ کر لگتا ہے اُنہوں نے "ایجنسیوں" کو "کریڈٹ" دینے کی ایجنسی لے رکھی ہے!

آج کے پاکستان میں ایسے لوگ خاصی بڑی تعداد میں ہیں جو یقین کے بُھوسے میں شک کی سُوئی خاصی آسانی سے تلاش کرلیتے ہیں! جس طرح ہمارے سیاست دان اور انتظامی مشینری کے لوگ ہر منصوبے میں کرپشن کی گنجائش پیدا کرلیتے ہیں بالکل اُسی طرح کچھ لوگ خوشبو میں بسے ہوئے معاملات سے بھی سازش کی بُو کشید کرنے کا ہُنر جانتے ہیں!

ہر معاملے کو شک کی نظر سے دیکھنے اور ہر معاملے میں "ایجنسیوں" کی سازش یا کوئی نہ کوئی سازشی پہلو تلاش کرنے والوں کی اپنی ہی دُنیا ہے۔ اِس دُنیا میں کچھ بھی ٹھیک نہیں چل رہا۔ اور اگر کبھی کبھار سبھی کچھ ٹھیک چل رہا ہو تو اِن غریبوں کی پریشانی بڑھ جاتی ہے! غالب نے کہا تھا۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

!ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

ہر معاملے میں "ایجنسیوں" کا ہاتھ تلاش کرنے والوں کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ یہ اخبار پڑھتے کم اور سُونگھتے زیادہ ہیں۔ ہر خبر کی تہہ میں جھانکنا اِن کے لیے فطرتِ ثانی کا درجہ رکھتا ہے۔ چار سطر کی معمولی سی خبر میں بھی اِنہیں "سیاق و سباق" کا سمندر موجزن دکھائی دیتا ہے! سویرے سویرے اخبار یا اخبارات چاٹنے کے بعد یہ "ہم خیال" لوگوں کو تلاش کرتے ہیں تاکہ دِن بھر بحث کا بازار گرم رکھنے کا ایجنڈا تیار کرنے کے !لیے چند سازشوں کا تعین کرسکیں

سازشوں کی بُو سُونگھنے کے عادی ٹی وی پر اُبلتے پانی جیسے بیانات اور تقاریر کی بھی تہہ میں اُترنے کی کوشش کرتے ہیں! پرائم ٹائم کے ہر ٹاک شو میں اِن شکر خوروں کو !تھوڑی بہت شکر مل ہی جاتی ہے

ایجنسیوں" کے عاشق ہر معاملے میں سازش کے پہلو کو پہلو بدلتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں!" اگر کوئی شخص، کسی بھی وجہ سے، گھور کر دیکھ لے تو اِن کی نظر میں وہ اللہ کا بندہ ہونے !کے ساتھ ساتھ "ایجنسی کا بندہ" بھی ہو جاتا ہے

اگر کوئی شخص راستے میں چلتے چلتے اچانک رک جائے اور اِدھر اُدھر دیکھے تو "ایجنسیانہ" ذہنیت کے حامل افراد کی نظر میں "خفیہ والا" ٹھہرتا ہے! لو، کرلو بات۔ اب چاہے وہ چپل ٹوٹنے کے باعث ہی رُکا ہو اور موچی کو تلاش کر رہا ہو!

سازش کی بُو سُونگھنے والے اگر ہوٹل پر بیٹھے ہوں تو دیر تک اخبار چاٹتے ہوئے چائے کی چُسکیاں لینے والا اِنہیں کِسی "ایجنسی" کا بھیجا ہوا دِکھائی دیتا ہے! دلیل یہ دی جاتی ہے کہ وہ بظاہر اخبار پڑھتے ہوئے چائے کی چُسکیاں لے رہا ہے مگر در حقیقت اِدھر اُدھر کی باتیں سُن رہا ہے، ٹوہ لے رہا ہے اور یہاں سے اُٹھنے کے بعد "رپورٹ" بنائے گا!

آپ لاکھ سمجھایئے کہ بھائی صاحب! سڑک کے کنارے بنے ہوئے ہوٹل میں تو گاڑیوں کا شور کچھ سُننے ہی نہیں دیتا۔ پہلو میں بیٹھا ہوا شخص بھی کیا کہہ رہا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا کے مصداق ایسے میں کوئی کیا سُنے گا اور کیا رپورٹ" مُرتب کرے گا! جواب ملتا ہے اِن لوگوں کو شور میں بات سُننے کی ٹریننگ" دی جاتی ہے! اب اگر وہ شخص پیدائشی بہرہ ثابت ہو تو جواب ملے گا وہ ممکنہ طور پر ٹیلی پیتھی کا ماہر ہو سکتا ہے! یعنی یہ کہ ہر معاملے میں "ایجنسی" کی بُو سُونگھنے والے اُصولوں" کے معاملے میں پُختہ ہوتے ہیں۔ اُن کی سوچ چور نگی کی طرح ہوتی ہے۔" آپ ایک طرف سے روکیں گے تو یہ

!گھوم کر دوسری طرف سے وہیں آ جائیں گے

ایجنسیوں" کا عمل دخل بھانپنے کے شوقین رفتہ رفتہ نفسیات کے بھی ماہر ہوتے جاتے" ہیں۔ کوئی شخص کِسی تکلیف کے باعث لنگڑا کر چل رہا تو یہ اُسے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اگر وہ غریب کِسی سے ٹکرانے یا کِسی گاڑی کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھ کر چل رہا ہو تو سمجھ لیجیے اُس پر "ایجنسی کا مُہرہ" ہونے کی مُہر لگانے !سے اِنہیں کوئی نہیں روک سکتا

کوئی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر، چیتھڑے نُما کپڑوں میں سڑک کنارے بیٹھا "اپنے آپ سے خود کلامی" کر رہا ہو تو سمجھ لیجیے ہمارے مہربان اُسے "ایجنسیوں" کا پلانٹ کیا ہوا قرار دیے بغیر نہیں رہ سکتے! اور چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے "بابے" بھی "ایجنسی" کا لیبل چسپاں ہونے پر مطمئن رہتے ہیں کہ مُفت میں کمپنی کی مشہوری ہو رہی ہے! اِن بابوں" سے سٹّے کا نمبر لینے والوں کو جب پتا چلتا ہے کہ اِن پر تو "ایجنسی" کا ٹھپّہ بھی" لگا ہوا ہے تو اُن کی آنکھوں میں نمبر لگنے کی اُمّید کے ساتھ ساتھ عقیدت کی چمک بھی !بڑھ جاتی ہے

ایجنسی" کا ٹھپّہ لگانے کے شوقین بالعموم خاصی فیّاضی کا مظاہرہ کرتے"

ہیں۔ معیارات البتہ اِن کے اپنے طے کردہ ہوتے ہیں۔ ٹی وی پر کوئی حکومت کے حق میں بول رہا ہو تو یہ لوگ اُسے "ایجنسی" کا بٹھایا ہوا قرار دیتے ہیں۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت کے حق میں بول کر وہ حکومت کے مخالفین کو کچھ بولنے پر اکسا رہا ہے!

اور اگر کوئی حکومت کے خلاف بول رہا ہو تب بھی "ایجنسی" کا قرار پاتا ہے۔ اِس بار یہ دلیل لائی جاتی ہے کہ وہ حکومت کے مخالفین کو اتفاقِ رائے کی تحریک دیکر اُن سے کام کی بات اُگلوانا چاہتا ہے! اگر کوئی ٹی وی پر "ایجنسیوں" کے خلاف بول رہا ہو تو پلک جھپکتے میں "ایجنسی" کے پے رول پر ہونے کی سَند پاتا ہے۔ منطق یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس طرح چوہے کو پکڑنے کے لیے روٹی یا پنیر کا ٹکڑا چوہے دان میں لگایا جاتا ہے بالکل اُسی طرح وہ "ایجنسیوں" کے ستائے ہوئے لوگوں کو دل کے پھپھولے پھوڑنے کی ترغیب دیکر منظرِ عام پر لانے کے مِشن پر ہے!

ہمارے ہاں "ایجنسیاں" اور تو سب کچھ معلوم کر سکتی ہیں مگر یہ معلوم کرنا اُن کے بس کی بات نہیں کہ اُن کے کھاتے میں کیا کیا ڈال دیا گیا ہے! بیشتر معاملات میں ہوتا یہ ہے کہ کریڈٹ یا ڈِز کریڈٹ دیئے جانے پر "ایجنسیاں" شرم کے مارے چُپ رہتی ہیں کہ لوگ کچھ دینے پر کمربستہ ہیں تو انکار کیسے کیا جائے! بقول غالب

یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں!

ایجنسیوں" کی کارگزاری پر نظر رکھنے والوں کی بات مانیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ "
ایجنسیوں" نے پورے ملک کی ایجنسی لی ہوئی ہے! جب تک یہ خُدائی خدمت گار بلا"
معاوضہ خدمات فراہم کر رہے ہیں، کسی بھی "ایجنسی" کو "کمپنی کی مشہوری" کے لیے
!مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں

اے رب! ہمارے دلوں کو بھی سمندر کی وسعت عطا فرما

کراچی ملک کا سب سے بڑا شہر ہی نہیں، ملک بھر کے لوگوں کی امیدوں کا مرکز بھی ہے۔ ساحل کے کنارے آباد یہ شہر اہلِ وطن کے من کی مرادوں کا ساحل بھی ہے۔ کسی بھی ملک میں سب سے بڑا شہر تمام باشندوں کے لیے سب سے بڑی آس کی حیثیت رکھتا ہے۔ کراچی کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ ہر صوبے سے لوگ محنت کے عزم کے ساتھ صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کراچی کا رخ کرتے ہیں۔ یہ شہر اپنے دامن میں ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگوں کو سموئے ہوئے ہے۔

وقت گزرتا گیا اور کراچی پھیلتا گیا۔ لوگ آتے گئے، شہر کے دامن میں پناہ لیتے گئے، علاقے آباد ہوتے گئے، پنپتے گئے اور سب کے معیارِ زندگی کا گراف بلند ہوتا گیا۔ تین عشروں سے بھی زائد مدت تک یہ شہر پورے ملک کے دور افتادہ لوگوں کے لیے روزگار کا بہترین پوائنٹ تھا۔ یہاں خون پسینہ ایک کرکے لوگ اس قدر کماتے تھے کہ آبائی علاقوں میں ان کے اہلِ خانہ خاصی خوش حال زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتے تھے۔ محنت کرنے والے اِس بات کے حق دار ہوتے ہیں کہ اُنہیں پورا صِلہ ملے اور اچھی زندگی بسر کریں۔ کراچی نے ملک بھر سے آنے والوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ یہاں کے

رہنے والوں نے بھی کسی سے تعصب یا نفرت بھرا برتاؤ نہیں کیا۔ معاشی معاملات میں بھی کبھی کسی سے تنگ نظر نہیں برتی گئی۔ کراچی کا متحرک رہنا پورے ملک کے لیے ناگزیر تھا کیونکہ یہ شہر معیشت کے دل کی دھڑکن تھا اور ہے۔

مگر پھر یہ ہوا کہ سمندر کے کنارے آباد شہر بد امنی اور عدم استحکام کے بھنور میں گھر گیا۔ ہر طرف سے مشکلات نے اسے آلیا۔ پیچیدگیاں بڑھتی گئیں۔ کل تک جو مل کر رہتے تھے وہ اپنے اپنے ڈربوں میں بند یعنی اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہوکر رہ گئے۔ جس طرح پرائیویٹ سیکٹر کے ادارے باغات اور تعلیم و ثقافت کے اداروں کو گود لیتے ہیں بالکل اسی طرح قتل و غارت نے کراچی کو گود لے لیا اور پھر شکنجے میں ایسا جکڑا کہ سبھی کچھ تباہ ہوکر رہ گیا۔

کراچی کا ساحل آج بھی وسعت کی کہانی سنا رہا ہے۔ ساحل کے کنارے آباد شہر کو وسیع فضا میسر ہے۔ ساحل پر کھڑے ہو کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سمندر میں کتنی وسعت ہوتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ سمندر کی سی وسعت کراچی کے تمام باشندوں کے دِلوں میں پیدا ہو اور اُن میں محبت کی کشتیاں رواں دواں رہیں مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ آج کراچی کی فضائیں مسموم ہیں۔ مفادات کی جنگ نے بہتوں کو زندگی کی بازی ہارنے پر مجبور کردیا ہے۔ معاشی مفادات نے معاشرت کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ کل تک جو باہم شیر و شکر تھے وہ اب لڑنے بھڑنے کے سوا کسی بھی بات پر ایمان رکھتے دکھائی نہیں دیتے! کیا ستم ہے کہ جو ایک رب، ایک رسول اور ایک کتاب پر یقین رکھتے ہیں وہ ایک ہونے کا نام نہیں لے رہے! اتحاد، یگانگت اور اخوت جیسی صفات ہمارے قلب و نظر کا رستہ بھول گئی ہیں۔ کبھی جن میں زمانے بھر کی وسعت تھی اب اُن دلوں میں ایسی تنگی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ کس کے کھیلے ہوئے کھیل کا نتیجہ ہے، کس کی لگائی ہوئی آگ نے ہمارے قومی وجود کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کردیا ہے، کس نے ہمیں ایک دوسرے سے محبت نہ کرنے کا سبق پڑھا دیا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

بھری دوپہر میں بھی شہر پر ظلمت کے سائے منڈلاتے رہتے ہیں۔ دلوں میں

تاریکی بس جائے تو سورج کی روشنی میں بھی کسی کو کیا دکھائی دے گا؟ کراچی کے ساحل پر شفق کے حسین رنگ ڈوبتے سورج کی کرنوں کو ایسی خوب صورتی سے پیش کر رہے ہیں کہ اِن پر فِدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ کاش ہمارے دلوں کے افق اور شفق پر پھیلی ہوئی خون کی سُرخی بھی کسی طور دُھل جائے اور محبت کی دھنک کے خوب صورت رنگ کچھ اِس انداز سے نمودار ہوں کہ ہماری آنکھوں پر چھائی ہوئی نفرت، تعصب اور تنگ نظری کی دُھند چھٹ جائے۔ ساحل کی ٹھنڈی ہوا دِلوں کو فرحت بخشتی ہے۔ کاش یہ ہوا پوری طاقت سے آگے بڑھ کر شہر بھر میں محبت، اپنائیت اور انسان دوستی کے جھونکوں میں تبدیل ہو اور ہمارے دِلوں میں کا غبار ختم کرکے ایسی فرحت اور تازگی سے ہمکنار کرے کہ ہم پھر ایک دوسرے کو برداشت کرنے پر مائل ہوں! آمین ....

ڈمپنگ گراؤنڈ

ہم تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ڈاکٹر عاصم حسین ڈاکٹر ہیں اِس لیے اُنہیں کیا معلوم سیاست کیا ہوتی ہے۔ بیشتر اہل وطن کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ بہت سے باصلاحیت لوگ مختلف شعبوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اب اگر کوئی کسی وجہ سے کسی بھی شعبے میں پھنسا ہوا ہے تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اُسے وہیں رہنے دیا جائے۔ بھلا ہو صدر آصف علی زرداری کا جنہیں اللہ نے "جوہر شناس" آنکھوں سے نوازا ہے۔ وہ جب کسی میں سیاست کے جراثیم دیکھ لیتے ہیں تو کسی نہ کسی طور اُسے سیاست کے مرکزی دھارے میں لے آتے ہیں تاکہ اچھی طرح بہے اور پنپنے میں کوئی کسر باقی نہ رہے! ڈاکٹر عاصم کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ وہ ڈاکٹرز کے درمیان زندگی بسر کر رہے تھے۔ صدر زرداری کی مہربانی سے اب تیل دیکھتے اور اُس کی دھار دکھاتے ہیں!

ڈاکٹر عاصم چونکہ ڈاکٹر ہیں اِس لیے اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی بھی چیز کی اصلیت کو جاننے کے لیے چیر پھاڑ لازم ہوا کرتی ہے۔ میڈیا سے وہ "آف بیٹ" قسم کی بات کم ہی کرتے ہیں۔ ہمارا اندازہ یہ تھا کہ مُردوں کی چیڑ پھاڑ کرتے کرتے اُن میں سوچنے کی صلاحیت کمزور پڑ گئی ہے اور حس مزاح تو شاید

بالکل نہیں رہی مگر ہمارا یہ اندازہ کس قدر غلط تھا! ڈاکٹر عاصم نے ریٹائرڈ سرکاری افسران کے بارے میں ایک پتے کی بات بتا کر ہمارے سارے اندازوں کو "ریٹائرڈ ہرٹ" ہونے پر مجبور کر دیا!

روزنامہ دُنیا کے راشد قرار سے خصوصی گفتگو میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ "آئل اینڈ گیس ریگیولیٹری اتھارتی (اوگرا)، نیشنل الیکٹرک پاور ریگیولیٹری اتھارٹی (نیپرا) اور پبلک پروکیورمنٹ ریگیولیٹری اتھارٹی (پیپرا) جیسے اہم ادارے اب ریٹائرڈ سرکاری افسران کے پارکنگ لاٹ میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ غیر متعلق افسران کی تعیناتی سے بہتر فیصلے نہیں ہو پا رہے اور اِس کے نتیجے میں توانائی کا بحران مزید شدت اختیار کر گیا ہے۔"

ڈاکٹر عاصم کی بصارت اور بصیرت سے ہم انکار کی جرات نہیں کر سکتے۔ اُنہوں نے کئی ادارے کامیابی سے چلائے ہیں۔ اب پٹرولیم کی وزارت ملی ہے تو یہاں بھی اُن کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اب یہ تو کوئی عوام سے پوچھے اُن کے سروں پر یہ ڈنکا کس زور سے بج رہا ہے! ریٹائرڈ سرکاری افسران کو کھپانے کے بارے میں اُنہوں نے جو رائے دی ہے وہ یقیناً وقعت رکھتی ہے۔ اگر اُن کی رائے وقعت کی حامل نہ ہوتی تو وہ آج بھی اسٹیتھواسکوپ لگائے مختلف وارڈز کے معائنے تک محدود رہتے، اسلام آباد کی حسین اور فرحت بخش فضا میں وزارت سے محظوظ نہ ہو

رہے ہوتے! ہاں، تھوڑا سا اختلاف ضرور کیا جاسکتا ہے۔ بات یہ ہے جناب کہ ڈاکٹر عاصم نے سرکاری اداروں کو ریٹائرڈ افسران کا پارکنگ لاٹ کہا ہے جبکہ ہمارے نزدیک یہ ادارے پارکنگ لاٹ نہیں، ڈمپنگ گراونڈ ہیں! پارکنگ لاٹ میں وہ چیزیں رکھی جاتی ہیں جن کا کوئی نہ کوئی مصرف ممکن ہوتا ہے۔ بیشتر سرکاری افسران کی "اہلیت" پر نظر دوڑائیں تو وہ "حاضر سروس" ہونے کی حالت میں بھی ایڈیشنل یعنی اضافی معلوم ہوتے ہیں! اور بعض افسران کے منصب میں "ایڈیشنل" کا اضافہ کرکے اِس دل خراش حقیقت کا اعتراف بھی کرلیا جاتا ہے!

ڈاکٹر عاصم کا کہنا ہے کہ توانائی کے بحران میں شدت اِس لیے آئی ہے کہ اِس بات شدید سردی پڑی ہے۔ یہ بات ہمیں بہت حیرت انگیز لگی اور ساتھ ہی خوشی بھی ہوئی کہ ایک نیا "نظریہ" ہاتھ آگیا ہے۔ صدر زرداری کی یہی کوالٹی ہمیں بہت پسند ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے لوگوں کو اپنی ٹیم میں رکھتے ہیں جن کے عام سے بیانات بھی پلک جھپکتے میں نظریات کا درجہ اختیار کرتے ہیں! اب تک ہم نے صدر اور وزیر اعظم سے لے کر نچلی سطح کے مشیروں تک کے منہ سے یہی بات سُنی تھی کہ شدید گرمی سے توانائی کا بحران شدت اختیار کرلیتا ہے۔ اور ہماری سادگی ملاحظہ فرمایئے کہ اُن کی بات پر یقین بھی کر بیٹھے تھے! مقام شکر ہے کہ ڈاکٹر عاصم نے توانائی کے بحران کی ایک اور منفرد وجہِ تسمیہ "بیان"

کردی! گرمی میں توانائی کا بحران شاید بہت پھیل جاتا ہے اِس لیے قابو میں نہیں آتا! یہاں پھیلنے سے وہی مفہوم لیا جائے جو عام بول چال میں ہوتا ہے مثلاً ابے کیا بات ہے، آج کل تو بہت پھیل رہا ہے!) ڈاکٹر عاصم نے وضاحت تو نہیں کی مگر چونکہ عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے اِس لیے ہم بھی سمجھ گئے کہ شدید سردی پڑتی ہے تو ہر چیز سکڑ جاتی ہے، حتّٰی کہ تاروں میں پائی جانے والی بجلی اور پائپ لائن سے گزرنے والی گیس بھی! ہمیں تو یہ وفاقی مشیر پیٹرولیم کے خلاف بجلی اور گیس دونوں کی سازش معلوم ہوتی ہے! کئی سال سے ہم نوید سُنتے آئے ہیں کہ سردی آئے گی، توانائی کا صرف کم ہوگا تو اُس کے بحران پر قابو پالیا جائے گا! اب وفاقی مشیر پٹرولیم نے بہ قلم خود یہ فرمایا ہے کہ سردی بھی حکومت کے پیچھے پڑ گئی ہے یعنی اُس نے اپنی شدت میں اضافہ کرکے توانائی کے بحران کو ختم ہونے سے روک دیا ہے! جب سے طاہر القادری پدھارے ہیں، کوئی بھی حکومت کی ایک نہیں سُن رہا۔ شاید سردی بھی اب لانگ مارچ پر نکل پڑی ہے!

ڈاکٹر عاصم فرماتے ہیں کہ نیشنل انرجی کمیشن کے قیام تک توانائی کا بحران حل نہیں ہوگا۔ قوم کا حال یہ ہے کہ ہر سطح پر کمیشن مافیا کے سرگرم رہنے سے لفظ "کمیشن" سے خوفزدہ رہنے لگی ہے! کسی سنگین معاملے کی تحقیقات کے لیے کمیشن بنایا جاتا ہے تو رپورٹ سامنے نہیں آتی۔ اور اگر رپورٹ سامنے آئے تو

اُس میں کمیشن کھانے کا ذکر زیادہ ہوتا ہے ! نیشنل انرجی کمیشن بنے گا تو کیا کرلے گا؟ کمیشن میں تقرر پانے والے کمیشن کس طرح کھائیں گے، توانائی تو اب رہی نہیں ! ڈاکٹر عاصم جوش میں ہوش نہ کھونے کا ہُنر جانتے ہیں۔ موصوف نے اتھارٹیز کے بارے میں خاصے "اتھارٹی آمیز" لہجے میں خیالات کا اظہار کردیا مگر وزارتوں اور ڈویژنز کا معاملہ گول کرگئے ! "اوگرا"، "پیپرا" اور "پیمرا" کو ہم کیا روئیں، کئی وزارتیں اِس وقت ڈمپنگ گراؤنڈ اور اسکریپ یارڈ کا کردار ادا کررہی ہیں ! اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک قدم آگے ہیں۔ وہ ایسے کہ ریٹائرڈ سرکاری افسران تو پھر بھی کچھ پڑھے لکھے ہوتے ہیں، وزارتوں میں تواُنہیں بھی کھپا دیا جاتا ہے جو اُس وزارت کا دائرہ کار اور مقصد تک نہیں جانتے ! ہم جیسوں کو تو بس یہی غم کھائے جاتا ہے کہ وزارتوں کو نا اہل لوگوں کا اسکریپ یارڈ بنایا جاتا رہا تو ہماری آرزوؤں اور حسرتوں کو تدفین کے لیے جگہ مل پائے گی یا نہیں ! اِس غم سے نجات دلانے والا کوئی انجیکشن اگر بنا ہو تو ڈاکٹر عاصم ہماری رہنمائی فرمائیں !

معیشت کے مزار کا لنگر

1980 میں یعنی سولہ برس کی بالی عمر میں ہم نے اجمیر جا کر خواجہ معین الدین چشتی رحمت اللہ علیہ کے عرس میں شرکت کی تھی۔ وہاں ہم نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے علاوہ ڈھائی دن کا جھونپڑا اور بغیر پانی کا یعنی خشک انا ساگر بھی دیکھا۔ انا ساگر کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ڈبکی لگانے یا اپنے وجود کی تطہیر کے لیے تو ہماری اپنی انا کا ساگر کافی تھا! اجمیر میں مزار سے متصل بازار میں ہمیں سوکھا حلوہ نظر آیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بڑی اور چھوٹی دیگ میں عرس کے موقع پر جو لنگر پکتا ہے وہ سکھا کر سال بھر فروخت کیا جاتا ہے۔ عُرس پر جب دونوں دیگیں تیار ہوئیں تو تازہ لنگر کھانے کا بھی موقع ملا۔ ذائقہ منفرد تھا۔ کیوں نہ ہوتا؟ دیگ میں اناج، شکر، گڑ، کھوپرا، چھوہارے، بادام، پستے، اخروٹ، مصری، آلو بخارے، خشخش اور پتا نہیں کیا کیا ڈالا جاتا ہے۔ جو پک جائے سو ٹھیک ہے۔ رہے نام اللہ کا!

ہماری معیشت کا بھی کچھ کچھ اجمیر کے لنگر جیسا ہی حال ہے۔ تھوڑی کھٹّی، تھوڑی میٹھی۔ کہیں سے کڑوی، کہیں سے تیکھی۔ ذائقہ تو کسی نہ کسی طور منہ میں بسیرا کرلیتا ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ یعنی

تو "منہ" میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا

بس، جان گیا میں تری پہچان یہی ہے!

بدمزگی پر تھوکنا چاہیں تو تھوکا بھی نہیں جاتا کہ زہر مار تو کرنا ہی ہے!

اخبارات میں کاروبار سے متعلق خبروں کے صفحات پر نظر ڈالیے تو پھر نظر لوٹ کر نہیں آتی، متضاد خبروں پر قربان ہو جاتی ہے! ہر روز ایسی خبروں کی بھرمار ہوتی ہے جن میں ہم آہنگی اُتنی ہی مفقود ہوتی ہے جتنی گھر والوں کی پسند سے شادی کے بندھن میں بندھے مرد و زن میں مفقود پائی جاتی ہے! چار پانچ ایسی خبریں ملاحظہ فرمائیے جو ایک دوسرے کا منہ چڑا رہی ہیں۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بیشتر سیاست دانوں اور بیورو کریٹس کی طرح اِن خبروں کی بھی آپس میں نہیں بنتی! ذرا خبروں پر ایک نظر ڈالیے۔

☆ ہڑتالوں اور ہنگاموں سے 2012 میں 40 کاروباری دن ضائع ہوئے۔ 125 ارب کا نقصان ہوا۔ شہر کی کاروباری سرگرمیاں 60 فیصد تک متاثر ہوئیں۔

☆ ماہرین نے بتایا ہے کہ 2012 پاکستان کی معیشت کے ناکام ترین برسوں میں سے تھا۔ کسی بھی شعبے نے ترقی نہیں کی۔ بہتری کے خاطر خواہ اقدامات کا فقدان رہا۔

☆ گزرے ہوئے سال میں اسٹاک مارکیٹ ایشیا میں بلند ترین سطح پر رہی۔ اور دنیا بھر میں اس کا نمبر آٹھواں رہا۔

☆ مہنگائی کی شرح میں سال کی دوسری ششماہی کے دوران کمی واقع ہوئی، یعنی چیزیں سستی ہو گئیں۔ (یقین تو نہیں آتا۔ ہم نے تو اہل وطن کو مہنگائی ہی کا رونا روتے دیکھا ہے!)

☆ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے والے پاکستانیوں کا تناسب 37 فیصد تک جا پہنچا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ملک بھر میں شدید غربت سے دوچار افراد کی تعداد تقریباً ساڑھے چھ کروڑ ہے۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے تحت ملک بھر کے غریبوں کی قسمت سنواری جاچکی ہے۔ اور غریب ہیں کہ بدستور بُرے حالات کے پنجرے میں کھڑے حکومتی دعووں کا منہ چڑا رہے ہیں!

جو کچھ دکھائی دے رہا ہے وہ پریشانی کا گراف بلند کرنے پر تلا ہوا ہے۔ کارخانے بند، بازار بند، علاقوں اور محلوں کی دکانیں بند، تعلیمی ادارے بند۔ مگر کوئی جادو تو دیکھے کہ ملک چل رہا ہے! توانائی کے بحران، مہنگائی، شدید افلاس، بے روزگاری، بنیادی سہولتوں سے محرومی اور منفی معاشی انڈیکیٹرز کے باوجود ہم اچھے خاصے زندہ ہیں! زمانے والوں کے لیے اِس سے بڑا کرشمہ کیا ہوگا! ایسا لگتا ہے کہ ہم نے دنیا بھر کے ماہرین معاشیات کو مات دینے کی

قسم کھا رکھی ہے! وہ بے چارے ہماری بے چارگی دیکھتے ہوئے عجیب و غریب قسم کی پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ مگر ہماری مکمل بربادی کا رونا روتے روتے اب جھوٹے پڑ گئے ہیں!

ہر طرف سے گھیر کر، پیٹ بھر کر اِسے کھایا جا رہا ہے مگر اللہ کی رحمت تو کوئی دیکھے کہ پیارا وطن ختم ہونے کا نام نہیں لیتا! کرپشن کا عالم یہ ہے کہ بڑھتے ہی جایئے اور کامیاب قرار پایئے۔ مڑ کے دیکھا تو پتھر کے ہو جائیں گے! معیشت کو چلانے کا یہ اُصول دنیا والوں نے شدت سے نظر انداز کر رکھا ہے!

دہشت گردی، بد امنی، لوٹ مار، احتجاج، ریلیاں، دھرنے، ہڑتالیں، تالہ بندی، پہیہ جام اور خدا جانے کیا کیا ہو رہا ہے مگر اس کے باوجود ملک چل رہا ہے۔ افراطِ زر نے برا حال کر دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دولت کی ریل پیل سے زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ یہ بات شاید ہماری حکومت نے بھی سُن لی۔ اب عالم یہ ہے سیکیورٹی پرنٹنگ پریس میں رات دن کرنسی نوٹ چھاپ کر ملک میں روپے کی ریل پیل کی جا رہی ہے تاکہ لوگ خوش حالی سے ہمکنار رہیں! معاشی نظریات کی دیگ میں کف گیر ہلانے والوں کو سوچنا چاہیے کہ کسی بھی ملک کو چلانا کچھ خاص مشکل کام نہیں، بس اِس بات کو یقینی بنایا جائے کہ کرنسی نوٹ چھاپنے والی

مشین چلتی رہے!

یوں تو چھوٹی ہے ذات "کاغذ" کی
دل کو لگتی ہے بات "کاغذ" کی!

رات دن کرنسی نوٹ چھاپنے کے عمل سے جو لوگ پریشان ہیں وہ بس اِسی فکر میں غلطاں رہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گا! اب اُنہیں کون سمجھائے کہ ملک تو نہ جانے کب سے تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے اور پریشان ہونے والوں کو دائمی قبض میں مبتلا کئے ہوئے ہے! افراطِ زر سے خوف زدہ ہونے والوں کو یہ "نوید" ہو کہ حکومت نے ناکام ریاست قرار دیئے جانے کے خوف سے قوم کو نجات دلا دی ہے۔ کسی بھی گھر میں کوئی ایک فرد ناکارہ بھی ہوتا ہے۔ وہ کوئی مر تو نہیں جاتا۔ بس اِتنا ہے کہ دوسروں کے ٹکڑوں پر پلتا رہتا ہے۔اِس کا مطلب یہ ہے کہ محنت کی زحمت سے بھی بچا رہتا ہے! مزاروں پر بھی لوگ پڑے رہتے ہیں، کوئی بھوک سے مر تو نہیں جاتے۔ لنگر ملتا ہے، پیٹ بھرتا ہے، وقت کٹتا ہے، زندگی کا فاصلہ طے ہوتا جاتا ہے۔ ملک پر اختیار اور تصرف رکھنے والوں نے شاید طے کرلیا ہے کہ معیشت کو چلاکر گزر بسر نہ کی جائے بلکہ معیشت کے مزار کا لنگر کھایا جائے۔ یہ لنگر کسی کے لیے میٹھا ہوگا اور کسی کے لیے کھٹّا۔ کوئی پھیکے پن کی شکایت کرے گا، کوئی تیکھے پن کا رونا روئے گا۔ مگر خیر، اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ لنگر سے پیٹ تو بھر ہی

جاتا ہے، بھوک تو مٹ ہی جاتی ہے۔ رہا عزتِ نفس کا سوال تو اُس کی پروا بظاہر کسی کسی کو ہے۔ اور کون جانتا ہے کہ عزتِ نفس کے غم میں گھلنے والے یہ درد مند بھی کب تک ہیں!

ہم خواہ مخواہ شرمندہ ہیں

دنیا ہمیں لاکھ بے شرم کہے مگر سچ یہ ہے کہ ہم بہ حیثیت قوم بے حس تو ہیں، بے شرم ہرگز نہیں۔ شرمندگی ہی تو ہے جو ہر معاملے میں ہم سے لپٹ کر رہ گئی ہے۔ محنت کرنے سے ہمیں شرم آتی ہے، علی الصباح بیدار ہونے سے ہمیں شرم آتی ہے، کسی بھی کام کو مقررہ وقت پر مکمل کرنے سے ہمیں شرم آتی ہے۔ یہ شرمندگی کی ایسی قسم ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ کہیں کچھ پک رہا ہو تو ہمیں ہاتھ بٹاتے شرم آتی ہے۔ جب سب کچھ تیار ہو جاتا ہے تو دستر خوان پر بیٹھتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اب ہر بات میں تو شرم اچھی نہیں ہوتی نا!

ہماری شرمندگی میں کچھ کمی لانے کی خاصی موثر کوشش برطانیہ کے ایک اسپتال نے کی ہے۔ انگلینڈ کے قصبے ریڈچ میں مشہور زمانہ یونانی فاتح الیگزینڈر سے موسوم الیگزینڈر اسپتال نے تو ہمارے دل و دماغ کو فتح کرلیا۔ یہ انگلینڈ کا واحد اسپتال ہے جس کی کارکردگی ہمیں جانی پہچانی سی لگی ہے۔ اسپتال کی انتظامیہ نے 38 خاندانوں سے معافی مانگتے ہوئے ہرجانہ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ کئی برسوں پر محیط مدت کے دوران اسپتال کے ڈاکٹرز اور نرسوں نے درجنوں مریضوں کی نگہداشت کے معاملے میں خاصی غفلت کا

مظاہرہ کیا۔ نرسوں پر الزام ہے کہ وہ بعض مریضوں پر شدید طنز کیا کرتی تھیں۔ ایک خاتون کو گیارہ ہفتوں تک اِس حالت میں رہنا پڑا کہ نرسوں نے اُنہیں نہلانے دُھلانے کی زحمت گوارا نہیں کی! ایک صاحب دو ماہ تک زیر علاج رہنے کے بعد بھی جانبر نہ ہوسکے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا گیا کہ اُن کی موت فاقوں سے واقع ہوئی!

برطانیہ کسی زمانے میں سُپر پاور ہوا کرتا تھا۔ اب اُس کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ مرزا تنقید بیگ کو بال کی کھال نکالنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ الیگزینڈرا اسپتال سے متعلق خبر پڑھی تو کہنے لگے۔ "گورے اِتنے گئے گزرے نہیں ہو سکتے۔ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک سے وہاں جاکر آباد ہونے والوں نے گوروں کو بھی "نا اہلی کا روگ لگا دیا ہے۔

ہم نے عرض کیا کہ گورے بھی اِنسان ہیں۔ کوتاہی تو اُن سے بھی سرزد ہو سکتی ہے۔ مرزا کہنے لگے۔ "اِس میں کیا شک ہے کہ گورے بھی اِنسان ہیں مگر بھئی اب وہ جس ٹائپ کے اِنسان ہوتے جا رہے ہیں اُس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُن پر ہمارا ٹھیک "ٹھاک سایا پڑ گیا ہے!

ہم نے عرض کیا مرزا! آپ سابق آقاؤں کو خواہ مخواہ گریس مارکس دے رہے ہیں۔

جو بُرا کرے وہ بُرا ہے۔ ہمارے اسپتال ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کریں تو اُن پر لعن طعن جائز ہے اور اگر گورے کوتاہی کے مرتکب ہوں تو اُس کا الزام بھی ہم اپنے سَر لیں، یہ کہاں کی دانش مندی اور انصاف ہے؟

مرزا کا جواب تھا۔ "تم نہیں سمجھوگے۔ بر صغیر کے لوگ جہاں بھی گئے ہیں، نا اہلی کے بر اعظم ثابت ہوئے ہیں! اِنہوں نے اچھی خاصی سابق سُپر پاور کو بھی غفلت اور نا اہلی کا روگ لگادیا ہے۔ کبھی کسی نے سوچا تھا کہ گوروں کے اسپتال ایسی غیر معیاری خدمات پیش کریں گے؟ ایک زمانہ علاج کے لیے گوروں کے دیس پہنچتا ہے۔ لوگ بے وقوف تو نہیں ہیں نا کہ بلا سبب گوروں پر بھروسہ کریں۔ کوئی بات ہے تب ہی تو لوگ گھوم پھر کر ولایت یعنی انگلینڈ پہنچتے ہیں۔"

مرزا سانس لینے رُکے تو ہم نے موقع غنیمت جان کر لقمہ دیا کہ گوروں کے دیس میں جنوبی ایشیا اور بالخصوص بر صغیر کے لوگ شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں۔ تعلیم، صحت، میڈیا، سماجی خدمات، خوردہ فروشی اور مینوفیکچرنگ کے شعبوں میں بر صغیر کے لوگوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا خوب منوایا ہے۔

اب ہم سانس لینے رُکے تو مرزا پھر برس پڑے۔ "اِسی بات کا تو رونا ہے۔ گوروں

کے پاس جو اچھائیاں تھیں وہ تو ہمارے لوگوں نے لے لیں اور اپنی تمام خرابیاں اُن کی نذر کر دیں۔ یہ تبدیلی کچھ ایسے ڈھنگ سے واقع ہوئی ہے کہ گورے بھی کچھ سمجھ نہیں "پا رہے ہیں۔ بے چارے اب تک بد حواسی کے عالم میں ہیں۔

ذرا "ہائٹ آف غلامی" ملاحظہ فرمایئے ! مرزا کو گوروں میں کبھی کوئی خامی اور خرابی دکھائی نہیں دیتی۔ ہم جب اپنوں کے اعلیٰ معیار کا ذکر کرتے ہیں تو وہ گوروں کے دیس !میں "دیسی لوگوں" کی بڑھتی ہوئی تعداد کے اثرات کا رونا رونے لگتے ہیں

ہمیں بھی یقین نہیں آتا کہ گورے اور ایسی غفلت ! ہمارے سیاست دان، بیورو کریٹس، بزنس مین اور فنکار ذرا سا نزلہ زکام ہونے پر بھی لندن کی فلائٹ پکڑتے ہیں۔ اب ہماری سمجھ میں آیا کہ وہ علاج کے لیے گوروں کے دیس کا رخ کیوں کرتے ہیں۔ وہاں کے اسپتالوں میں خاصی اپنائیت بھری طبّی خدمات جو میسر آتی ہیں ! انگلینڈ کے اسپتال بھی اب اُنہیں اپنے اپنے سے دکھائی دے رہے ہیں۔ جھڑکیاں تو ہمارے ہاں کی نرسیں بھی دیتی ہیں اور طنز بھی کرتی ہیں مگر بھئی گوری نرسوں کی جھڑکیوں اور طعنوں میں جو مزا ہے وہ ہم دیسی نرسوں میں کہاں سے لائیں؟ یعنی اپنے اسپتالوں میں غفلت برتی جائے تو پسند نہیں آتی اور

گوروں کی غفلت پر بھی لوگ فدا ہوئے جاتے ہیں اور خوشی خوشی پاؤنڈ اسٹرلنگ میں بل چکاتے ہیں! ذرا غلامی کی شان تو ملاحظہ فرمایئے! یہاں پیار سے نہلایا بھی جائے تو کوئی قدر نہیں کرتا۔ ہاں، گوروں کے اسپتالوں میں گیارہ ہفتوں تک بے نہائے دھوئے پڑے رہنا قبول و منظور ہے!

اگر انگلینڈ میں مزید تین چار اسپتال الیگزینڈر اسپتال جیسا "معیار" اپنالیں تو ہماری آنکھوں میں آس کے ستارے چمک اُٹھیں گے۔ ہمارے ہاں جو قومی خزانے یا عوام کو جی بھر کے لوٹتا ہے وہ علاج کے لیے گوروں کے دیس کا رخ کرتا ہے۔ کیا پتہ غریبوں کی مناجات رنگ لائیں اور اُن کی محنت کی کمائی پر ڈاکے ڈالنے والے انگلینڈ میں کسی ایسے ہی اسپتال میں گوروں کی غفلت شعاری اور نا اہلی کا شکار ہو جائیں! ولایت والوں کو ہمارا یقین کرنا چاہیے کہ ایسی کسی بھی صورت میں ہم متعلقہ اسپتال سے معافی کا مطالبہ کریں گے نہ ہرجانے کا!

یہ طے کرنا ابھی رہتا ہے کہ طبّی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے ہم گوروں کے ہم پلّہ ہوگئے ہیں یا وہ اپنے معیار کا گراف گرا کر ہم سے آ ملے ہیں! مرزا جیسے لوگ کہاں سمجھتے ہیں۔ وہ اب بھی یہی سوچ رہے ہوں گے کہ انگلینڈ کے اصل باشندوں کی نا اہلی میں بھی کوئی بات تو ہوگی! اُن کے خیال میں عین ممکن ہے

کہ جسے ہم نا اہلی اور غفلت شعاری سمجھ رہے ہوں وہ اعلیٰ معیار کا کوئی ایسا درجہ ہو جہاں تک فی الحال ہمارے ذہن کی رسائی ممکن نہیں!

ہم تو خطاب سمجھ رہے تھے

کون سا معاملہ ہے جس میں ہم دنیا کے لیے مثال نہیں بن گئے؟ اب تو ہر معاملہ ہمیں دنیا کے سامنے کچھ اس انداز سے پیش کر رہا ہے کہ لوگ سمجھ نہیں پاتے کہ عبرت پکڑیں یا محظوظ ہوں! اسلام آباد کے جناح ایونیو میں پیر کی شب دو بجے لانگ مارچ کے شرکاء سے ڈاکٹر طاہر القادری کا خطاب جس نے بھی سُنا اُس نے فقید المثال اعتماد کی بھرپور داد ضرور دی ہوگی۔ سرکس میں جب نیچے خاصا مضبوط جال بچھا ہو تو "جان کی بازی" لگانے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے!

ہم سمجھ رہے تھے کہ طاہر القادری خطاب کریں گے مگر اُنہوں نے وضاحت کردی کہ اِسے خطاب نہ سمجھا جائے۔ اُن کے لہجے کی پختگی بتا رہی تھی کہ تمام معاملات قابو میں ہیں! حاضرین سے تخاطب کی غایت خطاب سے زیادہ اعلامیے کا اجرا تھا! لانگ مارچ کے شرکاء سے عدم پسپائی کا حلف لینے کے بعد طاہر القادری نے اُنہیں آرام کی ہدایت دینے کے ساتھ مژدہ سُنایا گیا کہ منگل کی صبح گیارہ بجے ڈی اسکوائر میں خطاب ہوگا۔
طاہر القادری کے خطاب میں ایسی لذت اور گرم جوشی تھی کہ حاضرین ہی نہیں

بلکہ پوری قوم کو سخت سردی میں گرما گرم سوپ کا مزا آگیا۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا دو ٹوک انداز سے کہا۔ یعنی صدر، وزیر اعظم اور کابینہ کے ارکان سب سابق ہیں، تمام اسمبلیاں تحلیل کردی جائیں۔ ساتھ ہی اسلام آباد انتظامیہ کو حکم ہوا کہ اسٹیج ڈی اسکوائر منتقل کی جائے۔

اوروں کا پتہ نہیں، ہمیں تو یقین تھا کہ طاہر القادری نے سب کو سابق کہہ دیا ہے تو اب وہ سابق ہی سمجھے جائیں گے کیونکہ لاہور سے روانگی کے وقت اُنہوں نے کہا تھا کہ لانگ مارچ کے شرکاء کے اسلام آباد پہنچنے سے قبل بلوچستان حکومت ختم ہو جانی چاہیے۔ اور ہو گئی! پیر کی شب انہوں نے کہا کہ حکومت کے ختم ہونے تک کوئی واپس نہیں جائے گا۔ ہمیں اِس بات سے ڈر لگ رہا ہے کیونکہ اِس میں دھمکی یا انتباہ کم، اعلامیہ زیادہ ہے!

منگل کو دھرنے کے شرکاء سے خطاب میں طاہر القادری نے کہا کہ ابھی آدھا خطاب ہوا ہے اور آدھا کام ہوگیا (یعنی وزیر اعظم کی گرفتاری کا عدالتی حکم آگیا!)، آدھا کام باقی خطاب سے ہو جائے گا۔ پوری قوم کو کچھ ایسا ہی تیقن درکار ہے!

ہم اب تک سمجھ نہیں پائے کہ ہم نے پانچ سال کیوں ضائع کیے؟ ہمارے پالیسی

میکرز (یعنی کنگ میکرز) کو کیا ہوا تھا کہ پانچ سال تک حالات کو جوں کا توں رہنے دیا گیا؟ کیا ہی اچھا ہوتا کہ چار پانچ سال قبل طاہر القادری کو بلالیا جاتا اور ایک آدھ خطاب کے ذریعے تمام بگڑے ہوؤں کی واٹ لگادی جاتی! اگر آپ نے کبھی جادو کی چھڑی نہیں دیکھی تو دیکھ لیں، طاہر القادری اس وقت اِسی حیثیت میں ہمارے سامنے موجود ہیں! چھوٹے بچوں کو ہم کمپیوٹر پر وڈیو گیم کھیلتے دیکھا کرتے تھے تو چھوٹی سی عمر میں غیر معمولی مہارت پر حیرت ہوا کرتی تھی۔ اب پتہ چلا کہ پروگرامنگ میں تو بڑے فائدے ہیں۔ سب کچھ پہلے سے اور خاصی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے۔ طاہر القادری صاحب نے بھی پروگرامنگ والے تیقّن ہی سے سب کچھ کہا اور وہ ہوتا بھی چلا گیا۔ دنیا والوں کے پاس اگر دیدۂ عبرت نگاہ ہو تو دیکھیں کہ ایک پورے کے پورے، جیتے جاگتے ملک کو وڈیو گیم میں تبدیل کردیا گیا ہے! دنیا بھر میں ریاستی نظام رینڈم کے اصول پر چلائے جارہے ہیں۔ یہ تو خاصا فرسودہ طریقہ ہے۔ دنیا ہمیں دیکھے کہ ہم نے پورے ملک کو چلانے کے معاملے میں کچھ بھی رینڈم نہیں رہنے دیا! سب کچھ پہلے اور پورے توازن کے ساتھ طے کردیا گیا ہے تاکہ غریب غرباء بھی آسانی سے سمجھ جائیں، حیرت میں مبتلا نہ ہوں اور صدمے کی نذر نہ ہوں!

ہمیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی جیسے تمام احکام ہاتھ باندھے طاہر القادری کے سامنے کھڑے تھے۔ صرف لب کشائی کا انتظار تھا۔ وہ کچھ کہیں اور حکم خود بخود

صادر ہو جائے! اسلام آباد میں رات اور دن کے وقت ان کا خطاب دیکھ کر ہمیں نسیم حجازی مرحوم یاد آ گئے۔ ان کے ناولوں میں سپہ سالار کسی بھی معرکے سے قبل اپنے لشکر سے کچھ ایسے ہی بانکپن کے ساتھ خطاب کیا کرتا تھا! اگر نسیم حجازی آج ہوتے تو !شاید اپنے کسی ناول کے لیے کچھ تحریک ضرور پاتے

طاہر القادری کہتے ہیں کہ کراچی میں حکومتی گماشتوں نے دہشت گرد پال رکھے ہیں۔ مگر جناب! یہ سب تو پانچ سال سے چل رہا تھا۔ یہ سبھی کچھ اب کیوں دکھائی دے رہا ہے؟ قوم جاننا چاہتی ہے کہ طاہر القادری صاحب نے ایسا کون سا سُرمہ لگایا ہے جسے لگانے سے آنکھوں کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں اور ہر شے کی اصلیت دکھائی دینے لگتی ہے! ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ چند سیاسی خاندانوں کے اثاثے چند برسوں میں ہزار گنا بڑھ گئے ہیں۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ صرف سیاست دانوں کے تو اثاثے نہیں بڑھے؟ یہاں تو سرکاری کلرک تک کروڑ پتی ہیں، ان کا علاج کون کرے گا؟

دھرنے کے شرکاء سے خطاب میں طاہر القادری نے عدلیہ اور فوج کو کلین چٹ دی۔ اس پر دونوں اداروں کو سکون کا سانس لینا چاہیے۔ جو بد خواہ یہ سمجھ رہے تھے کہ طاہر القادری کو پورے ملک اور قوم میں کیڑے ہی کیڑے دکھائی دے رہے ہیں وہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئے ہوں گے! ہاں، اس بات کا ہمیں دکھ ہے کہ

عمدہ کارکردگی کا سرٹیفکیٹ اور کلین چٹ دیتے وقت طاہر القادری میڈیا کو فراموش یا نظر انداز کر گئے! قوم کا حافظہ اب ایسا بھی کمزور نہیں۔ سب کو یاد ہے کہ انہوں نے پیر کی شب ڈھائی بجے لانگ مارچ کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے دھرنے کے 40 لاکھ (!) شرکاء کی مناسبت سے میڈیا والوں کا بھی 10 لاکھ بار شکریہ ادا کیا تھا! میڈیا والے بہت خوش تھے کہ کسی نے تو انہیں ملین کی منزل تک پہنچایا! مگر یہ کیا، رات کی تاریکی میں دیا جانے والا سرٹیفکیٹ دن کے اجالے میں کہیں کا نہ رہا! صرف دو اداروں کو کلین چٹ دیتے وقت میڈیا کو نظر انداز کرکے طاہر القادری نے خراج تحسین کو خراج عقیدت میں تبدیل کر دیا!

انقلاب برپا کرنے کے نام پر چند ایک اچھے اقدامات بھی ہو ہی جاتے ہیں۔ مگر دکھ اس بات کا ہے کہ ہمارے ہاں کچھ بھی وقت پر نہیں ہوتا۔ پہلے بہت کچھ ہونے دیا جاتا ہے۔ پھر جب بہت کچھ ہو جاتا ہے تو اچانک پوری بساط خاصے الل ٹپ انداز سے لپیٹ دی جاتی ہے! یعنی مزید خرابیوں کے لیے راہ آسان ہو جاتی ہے! اب ایک بار پھر وہی کچھ کیا جا رہا ہے جس کے کرنے سے خرابیاں ہی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ کرے کہ سب کچھ پہلے سے طے کرنے والے قوم کے لیے کچھ اچھا ہی طے کریں!

کامیڈی کا سُونامی

کہتے ہیں وقت خراب چل رہا ہو تو اونٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو بھی کتا کاٹ لیتا ہے !
حیران نہ ہوں۔ محاورہ حیرت انگیز تو ہے مگر اِس سے زیادہ قابل غور ہے۔ اگر کتا بھی
اسی اونٹ پر یا کسی اور اونٹ پر سوار ہو یا پھر وہ اونٹ بیٹھا ہوا ہو جس پر بد نصیب
انسان بیٹھا ہوا ہو تو کتے کو کاٹنے سے کون روک سکتا ہے !

بات ہو رہی ہے بد نصیبی کی۔ جس زمانے میں ہم نے لکھنا شروع کیا تھا تب سنجیدگی
عام تھی۔ ہم سنجیدہ لکھنے پر مائل ہوئے تو احباب نے مطلع کیا کہ تحریروں سے مزاح
برآمد ہو رہا ہے ! ہم نے عرض کیا کہ ہم تو کسی نہ کسی طور صرف صلاحیت آزما
رہے ہیں جسے مقدر آزمانا بھی کہا جا سکتا ہے۔ جواب ملا آپ جسے صلاحیت کے اظہار کی
کوشش قرار دے رہے ہیں وہ طالع آزمائی سے کم نہیں ! اور جس طور طالع آزما کا کیا
ہوا قوم کو بھگتنا پڑتا ہے اسی طرح آپ کی طالع آزمائی قارئین کو صبر آزمائی سے
دوچار کر رہی ہے !

ہم بچپن ہی سے ضدی واقع ہوئے ہیں یعنی صحافیانہ مزاج کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔
لوگوں کے اشاروں کنایوں اور بعض احباب کے واضح انتباہ کے باوجود ہم لکھنے سے باز
نہ آئے۔ باز آتے بھی کیسے ؟ جب اتنے لوگ کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ

لکھ ہی رہے تھے تو پھر ہم میں کیا کمی تھی ! جناب رئیس امروہوی کی رہنمائی میں ہم نے شعر کہنا اور مضامین لکھنا شروع کیا تب (1984 کے زمانے میں) اخباری مزاح میں سنجیدگی نمایاں تھی۔ ہم نے بھی سنجیدگی کا چولا اوڑھا اور لکھنے، بلکہ لکھتے رہنے پر کمربستہ ہوگئے ! تب فکاہیہ آئٹم ایک آدھ ہوا کرتا تھا اور وہ بھی ادارتی صفحے پر۔ خبروں سے مزاح کو الگ رکھنے پر توجہ دی جاتی اور خاصی محنت کی جاتی تھی ! یہ ٹرینڈ فلموں سے آیا تھا۔ رونے دھونے، ایثار و قربانی کا درس دینے اور ناظرین کے جذبات کو مہمیز لگانے کا فریضہ ہیرو خاصی سنجیدگی سے ادا کرتا تھا اور کہیں کہیں ہنسانے کے لیے کامیڈین کو لایا جاتا تھا۔

مگر یہ کیا؟ ابھی ہم نے مضمون نویسی کا قلمدان ڈھنگ سے سنبھالا بھی نہ تھا کہ اخباری مزاج میں مزاح نے نقب لگانا شروع کردیا ! ہم تو سنجیدہ رہنے کی قسم کھا بیٹھے تھے اور یاروں نے ہر طرح سے ہنسانے کا بیڑا اٹھالیا ! یہ ٹرینڈ بھی فلموں سے آیا۔ ہوا یہ ہیرو ہی سے کامیڈین کا بھی کام لیا جانے لگا۔ بالی وڈ نے پہل کی۔ اور ہماری فلم انڈسٹری کا معاملہ تو یہ رہا ہے کہ

! کمال اس نے کیا اور میں نے حد کردی

ہمارے ہاں کچھ دن تو ہیروز نے کامیڈی کا حق ادا کیا مگر پھر ہیرو اور کامیڈین دونوں کے لیے کامیڈی فرمانے کی گنجائش نہ رہی۔ جب پوری فلم ہی ہر اعتبار سے فل ٹائم کامیڈی ہو تو الگ سے کامیڈی کے ارتکاب کی ضرورت ہی کیا ہے! اور اب تو ہمارے ہاں خیر پوری انڈسٹری ہی کامیڈی نیٹ ورک ہے! کہانی، مکالمے، اداکاری، سیٹ، موسیقی، نغمات .... غرض ہر چیز سے محظوظ ہوا جاسکتا ہے! جب کبھی کسی فلم میں کامیڈی نہ فرمانے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے تو لافانی کامیڈی وجود میں آتی ہے اور ناظرین کے چراغوں میں روشنی نہیں رہتی!

اب اخبارات کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ خبروں میں اِس قدر کامیڈی گھس گئی ہے کہ قارئین الگ سے فکاہیہ کالم پڑھنے کی زحمت سے بچ گئے ہیں! اخبارات کا ہر صفحہ کسی نہ کسی طور مزاح کے محاذ پر ڈٹا ہوا لگتا ہے۔ جن کی خبروں سے اخباروں کے صفحات بھرے ہوتے ہیں انہوں نے بھی شاید مزاح پیدا کرتے رہنے کی قسم کھا رکھی ہے! خبر، پریس کانفرنس، تقریر، بیان اور آنکھوں دیکھے احوال سمیت ہر شے میں قارئین کے لبوں پر تبسم بکھیرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ رپورٹرز کی لایعنی ہینڈ رائٹنگ اور پروف ریڈرز کی کوتاہیاں بھی لافانی مزاح کو جنم دینے میں اہم کردار کرتی آئی ہیں۔ حد یہ ہے کہ تصاویر کے نیچے درج عبارت (کیپشن) میں بھی ہنسی کے گول گپّے چھپے ہوئے ہوتے ہیں!

مثلاً "لائینیں چوک ہو جانے کے باعث علاقے میں سوریج کا گندا پانی کھڑا ہے۔" کس میں ہمت ہے جو کیپشن رائٹر سے پوچھے کہ کیا سیوریج کا صاف پانی بھی ہوا کرتا ہے! اجتماعی شادی کی ایک تقریب میں کھینچی جانے والی تقریب میں دس بارہ دولھے بیٹھے تھے اور کیپشن کچھ یوں تھا۔ "شادی کی تقریب میں دولھے بھی شریک ہیں۔" سبحان اللہ! کرم نوازی ہے کہ دولھے بھی شریک ہوگئے! کبھی کبھی کیپشن میں ایسی جامعیت ہوتی ہے کہ پڑھنے والا ہنسی کو ادھورا چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ مثلاً "گیس کی قلت کے باعث لوگ کشتی پر لکڑیاں رکھ کر دریائے راوی عبور کر رہے ہیں!"

اگر لکھنے والے مزاح لکھنے کا تہیہ کر کے قلم تھامیں اور طے کرلیں کہ کسی نہ کسی طرح مزاح کے اسٹیشن ہی پر تحریر کی ٹرین روکیں گے تو چیز مزاحیہ ہو کر دم لیتی ہے اور قارئین کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں! ایک بڑے اخبار میں حالات پر مختصر تبصرہ دو کالمی خبر کی شکل میں شائع ہوتا ہے اور خبر کی طرح سرخی اور ذیلی نکالی جاتی ہے۔ ذیلی کے آخر میں "فکاہیہ تجزیہ" درج ہوتا ہے! یہ صراحت شاید اِس لیے ضروری سمجھی گئی ہے کہ کوئی اچھی خاصی مزاحیہ تحریر کو سنجیدہ و سنگین نہ سمجھ بیٹھے! ایک بڑا اخبار اپنے ادارتی صفحے کے ماتھے پر احتیاطاً "ایڈیٹوریل" تحریر کرتا ہے تاکہ کوئی اُس صفحے کو کسی اور کھاتے میں نہ ڈال دے!

ہمارا مشاہدہ ہے کہ مزاح کے معاملے میں شوبز اور ضلعی خبروں کے صفحات ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ! شوبز کے صفحے پر کامیابی کے ایسے ایسے فارمولے شائع ہوتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور ضلعی خبروں کے صفحے پر شائع ہونے والی خبریں ہوش و حواس کے چودہ طبق روشن کرکے دم لیتی ہیں۔ مثلاً "داماد کو لاکھ کا چونا لگاکر چار سُسرالی گرفتار!" یا "زہر پینے کی شرط جیتنے والی بیوی اسپتال 55 پہنچ گئی!" اس صفحے پر کبھی کبھی خاصے بڑے مجمع کی تصویر دیکھ کر آپ سمجھتے ہیں کوئی جلسہ ہو رہا ہے۔ کیپشن سے پتہ چلتا ہے کہ مُرغے یا بٹیر لگائے جارہے ہیں ! اور مجمع بڑا اس لیے لگ رہا ہے کہ قصبے کی پوری آبادی یہ تماشا دیکھ رہی تھی!

کامیڈی کا یہ سُونامی اُنہیں اپنے ساتھ بہالے جانے کے لیے بے تاب ہے جو الگ سے کچھ ہلکا پھلکا لکھنا چاہتے ہیں ! جب پوری فلم ہی کامیڈی ہو تو الگ سے کامیڈین کا خرچ کوئی کیوں برداشت کرے!

حالات نے تو خیر قسم ہی کھا رکھی ہے کہ ہمیں ہنسا ہنسا کر مار ڈالیں گے۔ آج کل اسلام آباد میں دھرنے اور احتجاج کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ مزاح کے محل میں صدر دروازے کا کردار ادا کر رہے ہیں ! اگر ڈاکٹر نے زیادہ ہنسنے سے

! منع کیا ہے تو لائیو نشریات دیکھنے سے گریز کیجیے

ڈی چوک سے کنٹرول لائن تک

لانگ مارچ کے بطن سے ہویدا ہونے والا دھرنا معاہدے کی قبر میں پہنچ کر ختم ہوا۔ جناح ایونیو پر اور ڈی چوک میں ڈاکٹر طاہر القادری نے جو کچھ کہا اُس پر پوری طرح عمل نہ کر سکے۔ کرتے بھی کیسے؟ اُنہوں نے بڑی بڑی باتیں اسلام آباد کی زمین پر کہی تھیں جہاں قول کا فعل سے ملن لازم نہیں!

اسلام آباد کا تازہ ترین سیاسی میلہ خواہ کسی کی مرضی اور معاونت سے سجایا گیا ہو، حکومت کے لیے بہت بڑا امتحان تھا۔ زرداری انتظامیہ نے (سیانوں کی "توقعات" کے برعکس اور رحمٰن ملک کی کوششوں کے باوجود) اِس بحران کے غُبارے سے ہوا نکالنے میں خاصی مہارت اور تحمل کا ثبوت دیا! کاش اِتنا ہی تحمل پانچ برسوں میں قومی خزانے کو ہڑپنے کے حوالے سے بھی اپنایا گیا ہوتا! "بھائی جان، مہربان، قدر دان" یعنی تماش بین عوام کی خوشی کی خاطر، اور اُنہی کے بے حد اِصرار پر، جاتی ہوئی حکومت کا بوریا بستر گول کرنے کی آڑ میں جمہوریت ہی کی بساط لپیٹنے کا اہتمام کیا جارہا تھا۔ تین دن کے پُرامن دھرنے اور اِس سے قبل پُرامن لانگ مارچ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جب "وہ" چاہتے ہیں تو کہیں کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی! جس شہر میں ساتھ ساتھ چلنے والے

تین چار افراد کو بھی اہلکار روک کر ارادے معلوم کرتے ہیں اُسی شہر میں تیس چالیس ہزار افراد کو کیسے داخل ہونے دیا گیا؟ کیا طاہر القادری واضح ترین گرین سگنل کے بغیر لاؤ لشکر کے ساتھ ریڈ زون تک جا سکتے تھے؟ گورنر یا چیف منسٹر ہاؤس کے سامنے بھی محض چند درجن افراد کو جمع ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ بدھ (16 جنوری) کو پشاور میں قبائلیوں نے لاشوں کے ساتھ گورنر ہاؤس کے سامنے دھرنا تو پہلے مذاکرات ہوئے جن کی ناکامی پر مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے پولیس فورس استعمال کی گئی! ایسے میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے، سپریم کورٹ اور ایوان صدر سے محض ڈیڑھ دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہزاروں افراد کو پورے تین دن تک جمع رہنے کی اجازت کیسے مل گئی؟ اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ اُن کے "قائدِ بے بدل" نے حکمرانوں کو یزیدی لشکر، قاتل، لٹیرے، کرپٹ ترین اور "سابق" قرار دینے اور متعدد مضحکہ خیز الٹی میٹم جاری کرنے سے ذرا بھی گریز نہیں کیا! مقدمہ تو خیر کیا ہوتا، طاہر القادری کو تو اُلٹا نوازا گیا! ثابت ہوا جو دلھن پیا من بھائے اُس کا کچھ نہیں بگڑتا!

لانگ مارچ اور دھرنے میں شرکت کرنے کا اعلان کرنے والے بھی متذبذب ہی رہے۔ شاید اِس لیے کہ اُنہیں خود بھی معلوم نہ تھا کہ یہ سب کیوں کیا (یا کرایا) جارہا ہے! کھانے والوں کو معلوم تو ہونا ہی چاہیے کہ اُن کے سامنے دھری ہوئی پلیٹوں میں بریانی ویسے کی ہے یا تیجے کی! متحدہ نے آخری لمحات میں.

خود کو لانگ مارچ سے دور کیا۔ "زمینی حقائق" نہ بھولنے سے ایسے ہی یوٹرن جنم لیا کرتے ہیں! تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان نے کئی بار کہا کہ اُن کا اور طاہر القادری کا ایجنڈا ایک ہے۔ مگر وہ بھی بعض معاملات میں شکوک کی بُو سُونگھ کر اپنے بڑھتے قدم روکنے پر مجبور ہوگئے۔ بقول غالب

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد

پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

متحدہ تو حکومت کی اتحادی ہے اِس لیے اُس کا دھرنے سے دور رہنا منطقی تھا۔ عمران خان کو کیا ہوا؟ کیا اُنھوں نے بھی محسوس کرلیا تھا کہ

کوئی معشوق ہے اِس پردہ زنگاری میں!

طاہر القادری تو کہتے تھے کہ اُن کا کوئی ذاتی مفاد اور سیاسی ایجنڈا نہیں تو پھر نگراں وزیر اعظم کے تقرر کے عمل میں اپنی رائے کو شامل کرنا کیوں لازم قرار دِلایا؟ 14 اور 15 جنوری کی شب جناح ایونیو پر لانگ مارچ کے شرکاء سے خطاب میں اُنھوں نے صدر، وزیر اعظم، وزرائے اعلیٰ، وفاقی کابینہ اور ہر صوبائی کابینہ کو بیک جنبش زبان سابق" قرار دیتے ہوئے تمام منتخب ایوانوں کی تحلیل کے لیے محض 9 گھنٹے کا وقت دیا" تھا! منتخب ایوان تحلیل ہوئے نہ حکمرانوں کو "سابق" بنایا جاسکا۔ طاہر القادری نے اُنھی لوگوں کو

گلے لگانا اور معاہدہ کرنا کیوں گوارا کیا جنہیں اُنہوں نے پوری قوم کے سامنے یزیدی قرار دیا تھا؟ جذباتیت کے دریا میں بہتے ہوئے طاہرالقادری شاید بھول گئے تھے کہ اِنہی پانیوں میں چُبھتے ہوئے سوالوں کے مگرمچھ بھی پائے جاتے ہیں! اب تجزیہ کار دھرنے اور معاہدے کی مُرغی سے اپنی مرضی کے انڈے برآمد کرنے کی کوشش میں جُتے ہوئے ہیں!

نماز جمعہ کے بعد رائے ونڈ میں پیر پگارا کے ساتھ میڈیا سے گفتگو میں مسلم لیگ ن کے سربراہ نواز شریف نے کہا جو حکومت کا تختہ الٹنے آئے تھے اُن کے لیے عزت بچانا مشکل ہوگیا اور کون جانتا ہے کہ عزت بھی بچ سکی یا نہیں! نواز شریف نے یہ بھی کہا کہ طاہرالقادری دھرنے کے شرکاء کے ٹھٹھرنے کی قیمت بھی وصول نہ کرسکے! میاں صاحب سے ہم عرض کریں گے کہ کسے کیا ملا اِس کی فکر کرنے کے بجائے یہ سوچیے کہ قوم کو کیا بُھگتنا ہے! طاہرالقادری پر "پلّے نئی دھیلہ تے کردی میلہ میلہ" کی پھبتی کسنے کے بجائے اِس قوم کے بارے میں سوچا جائے جو اب تک "شوکن میلے دی" ثابت ہوتی آئی ہے!

اسلام آباد کے سمندر کا طوفان جس طور تھما اُس کے بنیادی عوامل جاننے کے لیے ذرا دور جانا پڑے گا۔ بس ذرا نئی دہلی اور پھر کنٹرول لائن تک۔ کیا اِسے محض اتفاق سمجھا جائے کہ جس وقت پاکستان کا وفاقی دارالحکومت "اندرونی

حالتِ جنگ" میں تھا تب بھارتی فوج نے کنٹرول لائن پر سیز فائر کی خلاف ورزی، کراس فائرنگ اور ہلاکت و شہادت کا بازار گرم کیا؟ کنٹرول لائن پر کسی بھارتی فوجی کا مارا جانا حیرت انگیز نہیں مگر اُس کا سَر قلم کرنے کا معاملہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور پھر اُتر پردیش کے شہر بدایوں کے نواح میں سَر بریدہ لانس نائیک ہیم راج کے پس ماندگان کی بھوک ہڑتال، سَر لاکر دینے کا مطالبہ اور فوجی قیادت کو شدید دباؤ میں مبتلا کرنے کا ناٹک کس کھاتے میں تھا؟ بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ نے آن کی آن میں "پاکستان سے تعلقات پہلے جیسے نہیں رہے" کہتے ہوئے اپنا کردار عمدگی سے ادا کیا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کی سُشما سوراج نے دس پاکستانی فوجیوں کے سَر لانے کی "فرمائش" کرکے جلتی پر مزید تیل چھڑکا۔ بھارتی آرمی چیف کی طرف سے واشگاف الفاظ میں جنگ کی دھمکی اور اِس کے محض ایک دن بعد پاکستان اور بھارت فلیگ اسٹاف میٹنگ اور اِس میٹنگ کی ناکامی پر ڈی جی ملٹری آپریشنز کا رابطہ! کیا اِن تمام واقعات کو اتفاق قرار دیکر نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ مفاہمت کا فلسفہ کہیں کرکٹ کے بعد سفارت کے میدان میں تو داخل نہیں ہوگیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ پاکستان میں تیسری قوت (یعنی حقیقی پہلی قوت!) کو سیاسی اُلٹ پلٹ کا فائدہ اُٹھانے سے روکنے کی خاطر اور اپنی مرضی کی جمہوریت بچانے کے

! لیے بھارت کی سیاسی و عسکری قیادت حرکت میں آئی یا لائی گئی

حکومت غائب ۔۔۔ قوم لائن حاضر

پانچ سال سے پاکستانی قوم جس چیز کو تلاش کر رہی تھی، بلکہ تلاش کرتے کرتے تھک چکی تھی وہ بالآخر لانگ مارچ اور دھرنے کے بطن سے برآمد ہو گئی۔ عوامی آراء کی دور بین اور تجزیوں کی خرد بین سے جو چیز دکھائی نہ دے سکی وہ اسلام آباد کے افق پر طلاع ہوئی اور آنکھوں کو خیرہ کر گئی۔ یقین تو نہیں آتا مگر یقین کئے بغیر بھی چارہ نہیں۔

شاد عارفی نے کہا ہے۔

چمن سے آج کل یوں نکہتی معلوم
کہ جیسے فی زمانہ شعر سے مفہوم غائب ہے

بس کچھ ایسی ہی کیفیت ہمارے ہاں ریاستی علمداری کی ہے۔ اب تک چراغ نہیں بنا جسے لیکر ڈھونڈنے سے یہ مل جائے۔ میرزا نوشہ نے شاید ہماری ریاستی علمداری ہی کے بارے میں کہا تھا۔

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!

ڈاکٹر طاہر القادری نے (ظاہر ہے تمام متعلقہ اداروں اور اپنے "مہربانوں" کی

یقین دہانیوں اور ہدایات کی روشنی میں) کہا تھا کہ لانگ مارچ اور دھرنے کے دوران ایک پتّہ بھی نہیں گرے گا، ایک گملہ یا شیشہ نہیں ٹوٹے گا۔ اور یہی ہوا۔ کوئی پتّہ گرا نہ گملہ یا شیشہ ٹوٹا ! عوام ریاست کی ایسی علمداری کو پانچ برس سے ترس رہے ہیں۔ سڑک پر چار فائر ہو جائیں تو ہڑبونگ مچ جاتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی گاڑیاں نذر آتش کردی جاتی ہیں۔ تب یہ ریاستی علمداری کس کونے میں گھس جاتی ہے، کون سے پانی میں ڈوب مرتی ہے؟

پاکستان کی تاریخ کے پُرامن ترین احتجاج کا اعزاز پانے والے لانگ مارچ اوردھرنے سے یہ بات تو کھل کر سامنے آ گئی کہ معاملہ اہلیت کا نہیں، نیت کا ہے۔ جیسی نیت ویسا پھل۔ ہمارے ریاستی اداروں کو جب سب کچھ درست رکھنا ہوتا ہے تو سبھی کچھ درست رہتا ہے۔ اورجب یہ طے کرلیا جاتا ہے کہ معاملات کو کسی بھی حال میں درست نہیں رہنے دیا جائے گا تب کس معاملے میں مجال ہے کہ درست رہ کر دکھائے !

پورے مُلک پر تھانہ کلچر مُسلّط کردیا گیا ہے۔ جب بات تھانہ کلچر کی آ گئی ہے تو تھانیدار کون؟ حکومت، اور کون؟ مگر یہ کیسا تھانہ کلچر ہے کہ پانچ سال سے تھانیدار غائب ہے اور "علاقہ پولیس" کا بھی کہیں نام و نشان نہیں ! ہاں، عوام حاضر ہیں جو "لائن حاضر" ہیں ! عوام کسی بھی زیادتی کا ظلم کا

شکار ہونے پر انصاف مانگنے نکلتے ہیں تو ہر چیز گھوم پھر کر اُنہیں پر آ گرتی ہے۔ یعنی

اُسی کا شہر، وہ مدعی، وہی منصف

مجھے یقین تھا میرا قصور نکلے گا!

پانچ برسوں کے دوران حکومت نے تواتر سے ریاستی علمداری نافذ کرنے کا راگ الاپا ہے۔ لوگ حیران ہیں کہ یہ نافذ کب ہوگی؟

مر جائے گی مخلوق تو انصاف کروگے؟

اگر کہنے سے کوئی چیز قائم ہو جایا کرتے تو ہمارے ہاں کوئی بھی معاملہ حل طلب نہ رہے۔ اِس قوم کے رہبروں کو صرف زبان ہلانے ہی پر تو قدرت حاصل ہے! عوام ہر معاملے میں انتظار ہی کرتے رہتے ہیں کہ حکومتی اور ریاستی مشینری کچھ کرے، مسائل حل کرنے کی طرف مائل ہو۔ مگر شاید ہر توقع کے نصیب میں ناکامی کی خاک چاٹنا ہی لکھا ہے۔

نظم و ضبط ہو تو ہم اپنے تمام مسائل بخوبی حل کرلیں۔ مگر نظم و ضبط آئے کیسے؟ یاروں نے خاصے منظّم انداز سے کسی بھی سطح کے نظم و ضبط کا راستہ روک رکھا ہے! اور اگر کبھی بھولے سے نظم و ضبط کی منزل تک معاملہ پہنچ بھی جائے

تو ضابطے کی کارروائی کے نام پر ایسی دھماچوکڑی مچائی جاتی ہے کہ معاملات کو منضبط کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے! کسی کے خلاف نظم و ضبط کے تحت کارروائی کرنے نکلیے تو یار لوگ پوری طرح منظم ہو کر میدان میں نکل آتے ہیں!

قصور قوم کا بھی تو ہے۔ جب کسی بھی معاملے میں نظم و ضبط کو اپنانے پر توجہ دی ہی نہیں جائے گی تو معاملات کس طور درست ہو پائیں گے! زمانے گزر گئے ہیں مگر اہل وطن نے قطار بند ہونا نہیں سیکھا۔ اس کا نتیجہ لائن حاضر ہونے کی صورت ہی میں برآمد ہو سکتا تھا! اب حال یہ ہے کہ ہم ہر معاملے میں لائن حاضر یعنی قطار بند ہونے پر مجبور ہیں۔ وہ قوم دنیا میں کیا کرے گی جو دو دو گھنٹے سی این جی کے لیے قطار بند رہے! گاڑی کے لیے توانائی کا اہتمام کرنے میں انسان کی اپنی توانائی کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے! اسلام آباد کے مسند نشینوں نے اپنی مسند مضبوط کرتے ہوئے لوگوں کو گاڑیوں کی نشستوں سے چپکا دیا ہے!

پانچ برسوں کے دوران قوم کو صرف ایک معاملے میں فراوانی میسر آئی ہے اور وہ ہیں بحران۔ ایسا لگتا ہے کہ کہ مہنگائی، بے روزگاری، بھتہ خوری کرپشن کے ساتھ ساتھ توانائی، آٹے اور چینی وغیرہ کی قلت نے ہمارے گھر کا رستہ دیکھ

لیا ہے اور اپنے اپنے گھر کا رستہ بھول بیٹھی ہیں!

بحران قطار بند رہتے ہیں اور یکے بعد دیگرے تازہ دم بحران ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر ہمیں بار بار دو ڈھائی عشرے پہلے کی ویسٹ انڈین کرکٹ ٹیم یاد آ جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ویسٹ انڈین ٹیم میں اعلیٰ درجے کے چار فاسٹ باؤلرز شامل ہوا کرتے تھے۔ جب دو باؤلرز تھک جاتے تھے تو دو تازہ دم باؤلرز اٹیک کے لیے آ جاتے تھے! مخالف ٹیم کے بیٹسمین بے چارے اسپنرز کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو جایا کرتے تھے! پاکستانی قوم بھی اچھے وقتوں کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہے!

حکمرانوں کی نا اہلی کی زنبیل میں طرح طرح کے بحران پڑے ہیں۔ عوام ایک چیز سے اُوب جائیں تو دوسری سامنے آ جاتی ہے! دوسری سے بیزار ہوں تو تیسری حاضر ہے! حکومتیں تھکتی ہیں تو تھک جائیں، مگر آفرین ہے اِس قوم پر کہ یہ نہیں تھکتی! اِس کے نصیب میں تو دُنیا کو حیران کرنا لکھا ہے۔ بوتل بدل دیجیے اور وہی پرانی شراب پلائیے۔ اور کبھی کبھی تو بوتل بدلنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی!

جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں!

ڈاکٹر طاہر القادری ہی کی مثال لیجیے۔ وہ ایک بحرانی کیفیت کے ساتھ وارد ہوئے اور پاکستانی قوم میں اُنہیں چاہنے والے مل بھی گئے! لائن حاضر رہنے

کے خواہش مند اُن کے لانگ مارچ اور دھرنے میں شرکت کے لیے قطار بند ہو گئے !
اور جس طرح یوٹیلٹی اسٹورز کے باہر قطار بند ہونے والوں کو کچھ نہیں ملتا بالکل اُسی طرح دھرنے کے شرکاء بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ کچھ لیکر لَوٹے ہیں۔ مگر خیر، سبھی آنے والوں کا خیر مقدم کرنے والے "خدائی خدمت گاروں" کو ایسی باتوں سے کچھ غرض نہیں ہوا کرتی ! نعرہ سُونامی کا ہو یا انقلاب کا، لائن حاضر رہنے کا اعزاز پانے والے مفت خدمات کے ساتھ حاضر ہیں۔ غائب حکومت کو اور تقریباً ناپید ریاستی علمداری کو بھی ہم کبھی نہ کبھی دریافت کر ہی لیں گے !
سیاسی آرکسٹرا میں سُروں کی بے ہنگم اکھاڑ پچھاڑ سے کوئی سُریلی چیز برآمد نہ ہو سکی۔ ہاں، اِس دھماچوکڑی کے تھمتے ہی سُریلی مہناز بیگم دُنیا سے چلی گئیں۔ سیاست ہو یا فنون لطیفہ، اب ہر شعبے سے سُریلے لوگ رخصت ہوتے جا رہے ہیں ! اور سیاست میں کہیں سے سُریلا پن ابھرتا دکھائی نہیں دیتا !

کچرا پرستی کا کلچر

جو کچھ ہمارے ارد گرد اور ہمارے اندر ہے وہ فطرت ہے۔ ہم فطرت کا حصہ ہیں اور فطرت ہمارے وجود میں شامل ہے۔ اس تال میل کو برباد کرنا اچھی بات ہے؟ یقیناً نہیں۔ آپ تقریباً روزانہ فطری اور غیر فطری باتوں کے بارے میں سُنتے ہی ہوں گے۔ ہر شخص یہ دعویٰ کرتا اور سمجھتا ہے کہ وہ فطرت کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ خوش فہمی ہے یا غلط فہمی، اِس کا تعین بہت مشکل ہے۔ اسلام آباد کے حالیہ دھرنے کے شرکاء جب واپس گئے تب پتہ چلا کہ اُنہوں نے جناح ایونیو پر اور ڈی چوک میں ڈاکٹر طاہر القادری کی کال اور فطرت کی پُکار پر کس حد تک لبیک کہی تھی! محترم نذیر ناجی نے اپنے کالم میں 100 ٹن کچرے کا ذکر کیا ہے۔ اب فطرت کی پُکار پر لبیک کہنے کے تو ایسے ہی نتائج برآمد ہوا کرتے ہیں۔ دیہات کے لوگ فطرت کی پُکار پر کھیتوں کا رخ کرتے ہیں۔ دھرنے کے شرکاء کہاں جاتے؟ اسلام آباد کو اُنہوں نے گھر کی کھیتی سمجھ رکھا تھا اور سُلوک بھی کھیتی والا ہی کیا! یعنی

پہنچی وہیں پہ "کھاد" جہاں کا خمیر تھا!

اسلام آباد میں دَھرنے کے شرکاء اگر مختلف النوع کچرا چھوڑ گئے ہیں تو حیرت

کیسی اور کیوں؟ خود دَھرنے کا انجام بھی تو کچرا ہی تھا! دَھرنے کے منطقی انجام سے برآمد ہونے والے کچرے کا تعفن اب تک کئی کہانیاں سُنا رہا ہے۔ قوم فیصلہ نہیں کر پارہی کہ کہانیاں سُنے یا سُونگھے؟ دَھرنا دینے والوں نے شاید یہ سوچا ہو کہ ان کی کاوش کے سیاسی و جسمانی نتائج کو یکجا ہو جانا چاہیے کہ ریاضی کے قاعدے کے تحت مائنس مائنس باالآخر پلس ہو جاتا ہے!

کسی سیاسی ایونٹ کے انجام سے غلاظت اور تعفن کا برآمد ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔ سال بھر پہلے عمران خان کا سُونامی بھی ناکامی کے ساحل سے ٹکرایا تھا اور اچھا خاصا کچرا چھوڑ گیا تھا۔ عوام نے جلسوں سے کرسیاں لے بھاگنے کی روایت قائم کرکے رہنماؤں کو بتادیا تھا کہ اگر وہ اپنے کہے پر عمل سے قاصر رہے تو اُن کی کرسیوں کی خیر نہیں۔ عقل مند کے لیے چونکہ اشارہ کافی ہوتا ہے اِس لیے سیاست دانوں نے کرسیوں کو خیرباد کہہ کر دیگ کلچر اپنایا۔ اور عوام نے جلسوں کے آخر میں بریانی کی دیگیں لوٹنے کی روایت ڈال کر ایک بار پھر سیاست دانوں کے عزائم اور منصوبوں کو کچرا کچرا کر ڈالا۔

جب ہم کچھ صرف کرتے ہیں تو وہ استعمال کے بعد ناکارہ ہو جاتا ہے۔ یہ اصول سیاست دانوں پر بھی اطلاق پذیر ہے۔ کیا ہم دیکھ نہیں رہے کہ قوم کو راہ دِکھلانے کے بہت سے دعویدار اِس قابل ہیں کہ اُنہیں کچرا کنڈی کی راہ

دِکھائی جائے! اور سچ تو یہ ہے کہ بعض ناکارہ و لایعنی اہلِ سیاست کو پھینکے جانے پر شاید !کچرا کنڈی بھی متعرض ہو کہ آخر کو اُس کی بھی کچھ عزت اور عزتِ نفس ہوتی ہے بیشتر سیاسی نعرے بھی اب اس قابل ہوچکے ہیں کہ کچرا کنڈی کی نذر کردیئے جائیں۔ بعض نعرے تو اِتنے گھس گئے ہیں کہ اُن کے تار تار لباس سے اہلِ سیاست کے عزائم صاف جھلکنے لگے ہیں! سیاسی جماعتیں جن نعروں کو اپنے منشور کا حصہ سمجھ کر اب تک استعمال کر رہی ہیں اُنہیں عوام نے شاید ہنسنے کے حسین بہانوں کی حیثیت سے قبول کر رکھا ہے! نعروں کے ملاپ سے نئے نعرے بنائے گئے ہیں جو طرح طرح کے بحرانوں کی ستائی ہوئی قوم کو تھوڑی بہت مسرت بخوبی عطا کرتے ہیں! نعروں کا معاملہ یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں خوش گمانی کی زد میں رہتی ہیں اور عوام اُن کی خوشی دیکھ دیکھ کر "زیر !لب کے نیچے" مُسکراتے رہتے ہیں

کچرے کو اہمیت دینے کا کلچر اب عام ہوا ہے ورنہ اب تک تو ہم کچرے کو نظر انداز کرتے اور ٹھکراتے ہی آئے ہیں۔ دنیا بھر میں کچرا ٹھکانے لگانے پر بہت غور کیا جاتا ہے، منصوبے بنائے جاتے ہیں اور ان پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ کیا کچرا پروری ہے؟ بھئی جس چیز کو پھینک ہی دینا ہے اُسے پھینکنے پر کیا

غور کرنا! جہاں جی چاہے پھینک دیجیے، کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟

کچرا ٹھکانے لگانے کے لیے محکمے بنانا ہمیں تو وقت اور وسائل دونوں کا ضیاع لگتا ہے۔ کچرا کہیں بھی پھینکیے، کچرا ہی رہے گا۔ بعض لوگ گلی کے موڑ پر کسی خالی پلاٹ میں بنی ہوئی کچرا کنڈی کو دیکھ دیکھ کر بیزاری اور ناراضی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ کچرا کسی صاف جگہ تو پھینکا نہیں جاسکتا۔ اور جہاں کچرا پھینکا جائے گا وہ جگہ خود بخود گندی ہوتی جائے گی۔ اچھا ہے کہ گندی اور ناکارہ چیز کو خوب گندی جگہ پھینکا جائے اور اِس معاملے میں کسی کی تنقید کی پروا کی جائے نہ دُنیا بھر میں پائے جانے والے رجحانات پر توجہ دی جائے!

دنیا بھر میں کچرا کنڈیاں قائم کی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں خود کار نظام ہے۔ کسی بھی جگہ کچرا پھینکتے رہیے، کچرا کنڈی خود بخود معرض وجود میں آتی جائے گی! اِتنا آسان طریقہ ہے اور یار لوگ بس غور ہی فرماتے رہتے ہیں اور تحقیق کا بازار گرم رکھتے ہیں!

ہمارے ہاں یہ طریقہ ایک زمانے سے رائج ہے مگر دنیا متوجہ نہیں ہوئی۔ بارش ہوتی ہے تو تالاب معرض وجود میں آتے ہیں اور زلزلہ آتا ہے تو بعض جگہ زمین پھٹنے سے مدفون ندی نالے بہنے لگتے ہیں!

اہل جہاں کے عجب طور ہیں۔ شہروں کے بیچ سے گزرنے والے دریاؤں اور نہروں کو بھی ماس ٹرانزٹ سسٹم کے طور پر یا پھر سیر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم نے شہر کی حدود سے گزرنے والی لیاری ندی اور ملیر ندی کو نہایت آسانی سے کچرا کنڈی میں تبدیل کردیا ہے۔ یہ بھی کچرے کی ماس ٹرانزٹ نہیں تو اور کیا ہے؟ سفر کے لیے سڑکیں ہیں تو سہی۔ لیاری ایکسپریس وے بناکر ہم نے اپنے ہی اُصولوں سے "غداری" کی ہے! اگر ندی نالوں کو سفر اور سیر کے لیے استعمال کیا جانے لگا تو لوگ کچرا کہاں ڈالیں گے؟ یومیہ سفر تو ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اِتنی سی بات کے لیے لوگوں کو کچرا اٹھائے اٹھائے پھرنے کی زحمت سے دوچار کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟

میڈیا کے جادوگروں کا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے کچرے کو قابل قبول بنادیا ہے، جس طرح میک اپ آرٹسٹ آڑے ترچھے چہروں کو بھی حُسن دِل آرام کی منزل تک پہنچاکر دم لیتے ہیں! خیر سے اب ہم ہر طرح کے سیاسی کچرے کو نہ صرف گلے لگائے رہتے ہیں بلکہ کبھی کبھی اپنی رَو میں بہتے ہوئے پرستش کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں! یہ کچرا پرستی ہی تو ہے جس کا مُشاہدہ کرتے ہوئے اب دُنیا ہمیں کچرے کے ڈھیر میں تبدیل کرنے پر تُلی ہوئی ہے!

بیانات کا چولھا، حالات کی دیگ

دو دن قبل اخبارات میں یہ رُوح فرسا خبر شائع ہوئی کہ بھارتی ریاست راجستھان کے شہر اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی رحمت اللہ علیہ کے مزار پر نصب بڑی دیگ میں گر کر جنوبی ریاست کیرالا سے تعلق رکھنے والی ماں بیٹی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں !

اس واقعے نے ہمیں 1980 کے زمانے میں پہنچا دیا۔

اپریل 1980 میں ہم رشتہ داروں سے ملنے احمد آباد گئے تو بڑے ماموں فرید میاں شیخ نے اجمیر کے عرس میں جانے کا پروگرام بنایا اور ہمیں بھی لے گئے۔ کراچی میں لوگوں کو ویگن اور کوچ کی چھت پر سفر کرتے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالتے ہیں، مگر اِسے کیا کہیے کہ ہم نے احمد آباد سے اجمیر تک کا سفر ٹرین کی چھت پر کیا تھا۔ انجن ڈرائیور کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ کہاں کہاں اوور ہیڈ برج آتے ہیں۔ جب بھی کوئی برج آنے والا ہوتا وہ ٹرین کی رفتار کم کرتا تاکہ لوگ بوگی کی چھت پر لیٹ جائیں یا دو بوگیوں کے درمیان جاکر لٹک جائیں ! اجمیر میں ہم نے دونوں دیگیں دیکھیں اور حیران رہ گئے۔ بڑی دیگ گویا چھوٹا موٹا کمرا تھی !

عرس کا زمانہ تھا اس لیے دیگ چڑھی ہوئی تھی یعنی لنگر پک رہا تھا۔ ہم نے لنگر لُٹنے کا

منظر بھی دیکھا اور خوب محظوظ ہوئے۔ یہ لنگر چونکہ فروخت ہوتا ہے اِس لیے لوٹنے والوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ ہمیں والد محترم عبدالشکور خان مرحوم نے یہ بتا کر زیادہ محظوظ ہونے کا موقع فراہم کیا کہ ایک بار اُن کے والد یعنی ہمارے دادا نُور محمد مرحوم لنگر لُوٹنے کی رسم میں شریک ہوئے تھے! اجمیر سے ہمارا آبائی تعلق یوں ہے کہ دادا نے خاصا طویل عرصہ وہاں گزارا۔ ہماری پھوپھی، دونوں تایا اور والد وہیں پیدا ہوئے۔ دادی کے والد بابا اکرم شاہ عرف اکو بابا مرکزی درگاہ سے متصل پھول گلی کی مسجد کے پیش امام تھے اور امامت کے ساتھ ساتھ تعویذ گنڈے بھی کیا کرتے تھے۔ مگر خدارا ہماری کالم نگاری کو اکو بابا کے تعویذوں کی کرامات میں شمار نہ کیا جائے کہ) یہ "سعادت" ہمارے اپنے "زور قلم" کا نتیجہ ہے! بعض بدخواہ شاید یہ سوچیں کہ تعویذ کی ضرورت ہمارے قارئین کو پڑے! محترم سرور سکھیرا نے لکھا ہے کہ آج کل جس ٹائپ کے کالم شائع ہو رہے ہیں اُن پر قارئین کے لیے سر درد کی گولی بھی چپکانی چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ بعض کالموں کی مار سے بچنے کے لیے کسی پہنچے ہوئے بزرگ کا تعویذ بھی قاری کے بازو پر بندھا ہوا ہونا چاہیے!)

خواجہ معین الدین چشتی رحمت اللہ علیہ کا عرس اجمیر کے لوگوں کے لیے سال بھر کی کمائی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ عرس کے پندرہ بیس دنوں میں مکانات کے کرایوں اور خرید و فروخت کی مد میں مقامی لوگ لاکھوں کما لیتے ہیں اور پھر

سال بھر اُنہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی ! ہمارے ہاں بعض شخصیات بھی اجمیر کی دیگ جیسی واقع ہوئی ہیں یعنی اِن کی زبان سے نکلنے والی باتیں لوگ لے اُڑتے ہیں !اور پھر کالموں میں ٹانک کر مال بناتے ہیں

ویسے تو شخصیات بھی دیگ کا کردار ادا کر رہی ہیں مگر سیاست کے مزار پر نصب.بڑی دیگ کی بات کچھ اور ہے۔ بیانات اور ترکی بہ ترکی الزامات کے چولھے پر حالات کی دیگ ایسی چڑھی ہے کہ اُس سے نکلنے والی "خوشبو" کی لپٹوں سے اہل وطن کے دِل و دماغ معطّر کم اور ماؤف زیادہ ہوئے جاتے ہیں ! نذرانے اور چڑھاوے ہیں کہ کم ہونے میں نہیں آتے۔ اور بعض چڑھاوے تو انتہائی غیر متوقع ہوتے ہیں۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ چیف الیکشن کمشنر نے کئی دنوں کے صبر آزما اور قدرے اعصاب شکن انتظار کے بعد کہا کہ سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق کراچی میں گھر گھر جاکر ووٹرز کی تصدیق تو کی جاسکتی ہے، نئی حلقہ بندیاں نہیں کی جاسکتیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ "فخرو بھائی" بھی خیر سے حلقہ بگوش تحفظات" ہوگئے ! اُن کے اِس بیان نے حالات کی دیگ میں پکنے والے" سیاسی لنگر کا مصالحہ کچھ تیز کردیا ہے۔ یہ بیان جن کی مرضی کا بیان ہے وہ تو بغلیں بجائیں !گے مگر مخالفین کی طرف سے چند تُند و تیز بیانات کا چڑھاوا غیر متوقع نہیں

چوہدری شجاعت نے دھرنے کو کامیاب قرار دیتے ہوئے طاہرالقادری کو مبارک باد دی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ متحدہ اور تحریک انصاف دھرنے کی بس میں سوار نہ ہونے پر پچھتا رہی ہوں گی! چوہدری صاحب کی فراست بے مثال ہے۔ دو اتحادی پچھتا رہے ہوں گے مگر خود چوہدری صاحب کی ق لیگ کو کوئی پچھتاوا نہیں ہو رہا۔ کہیں اُنھوں نے مذاکرات میں شرکت کو بھی دھرنے میں شرکت سے تو تعبیر نہیں کرلیا؟ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ طاہرالقادری کو سراہنے کے نام پر چوہدری شجاعت شاید اُن سے تفریح لے رہے ہیں! شک کا پہلو اِس لیے نمایاں ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ بہت آسانی سے قوم کی سمجھ میں آ رہا ہے!

سیاسی لنگر کی دیگ کا ذائقہ بڑھانے کے لیے چوہدری صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ اُن کے بھائی وجاہت حسین نے بھیس بدل کر دھرنے کا جائزہ لیا اور شرکاء میں بے مثال جذبہ دیکھا! اُن کے بقول وجاہت حسین نے رپورٹ دی کہ اگر دھرنے کے شرکاء کو اسکردو بھی لے جایا جاتا تو اُن کا جذبہ سرد نہ پڑتا! یعنی چوہدری شجاعت حسین کے لیے "مٹی پاؤ" کی طرز پر طاہرالقادری کے جاں نثاروں نے یہ کہنے کی بھی گنجائش نہیں رہی تھی کہ "چھڈو جی، برف پاؤ"!

دوسری طرف طاہر القادری نے سیاسی لنگر کو مزید لذیذ بنانے کے لیے پریس کانفرنسز کا تانتا ٹوٹنے نہیں دیا ہے۔اِدھر ہم یومیہ کالم لکھ رہے ہیں اور اُدھر وہ یومیہ پریس کانفرنس کرتے ہیں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم خود کو ڈاکٹر طاہر القادری کا ہم پلّہ قرار دے رہے ہیں ! ہم تو یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ہماری تو مجبوری ہے کہ روز کچھ نہ کچھ لکھنا ہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو کیا ہوا ہے کہ کہنے کو کچھ نہ ہو تب بھی بولے ہی جا رہے ہیں؟ ویسے یہ بات بھی ہم بس اُوپری من سے کہہ رہے ہیں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ وہ لب کُشائی فرماتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کچھ ہلچل ہوتی ہے اور انگلیاں کی بورڈ پر متحرک ہوتی ہیں ! 1957 میں ریلیز ہونے والی فلم "پیاسا" کے آس جہانی سچن دیو برمن نے ایک گانا کمپوز کیا تھا جس کے بول تھے۔۔ "جانے کیا تونے کہی، جانے کیا میں نے سُنی، بات کچھ بن ہی گئی !" بس کچھ ایسا ہی معاملہ ڈاکٹر طاہر القادری اور اُن کے خوشہ چینوں کا ہے۔ وہ بلا ناغہ کچھ نہ کچھ فرماتے ہیں اور اُن کی باتوں سے چند کام کے نکات چلتے ہوئے ہم تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر بات بن ہی جاتی ہے یعنی ہم کسی نہ کسی طرح کالم کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں !

پرنالے وہیں بہتے رہیں گے

جس طرح بہت سے لوگ کھانے کی میز پر ہر سطح کے شرم و لحاظ سے پرہیز کرتے ہیں بالکل اُسی طرح ہم، من حیث القوم، تبدیل ہونے سے گریز کرتے ہیں ! یہ گریز اِس قدر دیرپا ہے کہ تمام پرنالے وہیں بہتے رہتے ہیں جہاں زمانوں سے بہتے آئے ہیں۔ یہ بھی ایک اچھی روایت ہے کہ لوگوں کو حیرانی سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔

آج کل "گلی گلی، تھاں تھاں" انتخابات پر بحث کا بازار گرم ہے۔ ہر شخص اٹکل کے گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ حکومت نے اپنی پوری مدت کے دوران جو کچھ کیا ہے وہی کر رہی ہے یعنی کسی معاملے میں کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی !

وعدوں، دعووں، یقین دہانیوں، بیانات، الزامات اور جوابی الزامات کے پرنالے اپنے مقررہ مقامات ہی پر بہہ رہے ہیں۔ اس قدر "قطعیت" تو مغرب کے جدید ترین ہتھیاروں میں بھی نہیں پائی جاتی ! ٹی وی کی آواز بند بھی کردیں تو کسی بھی حکومتی یا غیر حکومتی شخصیت کا صرف چہرہ دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کیا بول رہی ہوگی ! وہی گھسے پٹے جملے ہیں، وہی فرسودہ باتیں ہیں۔ یعنی ایک ہی منجن مستقل بنیاد پر بیچا جارہا ہے !

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی قابض انتظامیہ نے شہریوں سے کہا ہے کہ وہ ایٹمی جنگ کے لیے تیار رہیں۔ ہدایت نامہ بھی جاری کر دیا گیا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اِس خبر سے آزاد کشمیر میں تو کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ آپ کی سادگی پر بھی قربان جایئے! آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد یعقوب نے رسمی طور پر آل پارٹیز کانفرنس بلانے کا اعلان کیا ہے مگر قانون ساز زیادہ متاثر دکھائی نہیں دیتے! بدھ کو آزاد کشمیر اسمبلی میں وہی ہوا جو ہوتا آیا ہے۔ دھینگا مُشتی، اور کیا؟ آئن اسٹائن نے کہا تھا کہ چوتھی عالمی جنگ دست بہ دست اور پتھروں سے ہوگی! ایٹمی جنگ سے متعلق بھارتی وارننگ پر آزاد کشمیر اسمبلی میں ڈپٹی اپوزیشن لیڈر چوہدری طارق فاروق اور حال ہی میں پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے والے محمد حسین سرگلہ کو شاید آئن اسٹائن یاد آ گئے اور اُنہوں نے دست بہ دست لڑ کر دیکھ لیا! زبانی پتھراؤ اِس پر مستزاد تھا! اُنہیں الگ کرنے پر ساتھیوں کو خاصی محنت کرنا پڑی!

یہ تو ہوا آزاد کشمیر کا پرنالہ۔ اب چلتے ہیں قومی اسمبلی کی طرف۔ بھارتی انتباہ کی باز گشت تو خیر سے سُنائی نہیں دی۔ ہاں، وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات قمر زمان کائرہ نے عوام کا دل بہلانے والی چند باتیں ضرور کہیں۔ ہنسی ضبط کرتے ہوئے کائرہ صاحب کا یہ جملہ پڑھیے کہ سیاست دانوں کو ایک

دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے سے گریز کرنا چاہیے! کائرہ صاحب ہی بتائیں کہ اب کیا قومی اسمبلی کے ارکان کارروائی کے دوران مُنہ میں گھنگھنیاں دے کر بیٹھے رہیں گے؟ اگر سیاست دان ایک دوسرے پر کیچڑ نہیں اچھالیں گے تو کیا ہم اُن کے بے داغ، کلف لگے کاٹن سُوٹ کی فضیلت پر کالم لکھا کریں گے؟ وزیر موصوف نے یہ بھی کہا کہ حقائق مسخ نہ کئے جائیں۔ یہ گزارش اُنھوں نے کسی رکن کے اِس جملے پر کی کہ حکومت سو رہی ہے! بہت خوب۔ حقائق مسخ نہ کرنے کی گزارش کی جارہی ہے اور حقیقت کے بیان سے روکا بھی جارہا ہے! کائرہ صاحب نے ایوان میں یہ بھی کہا کہ اگر کسی نے ماضی میں وفاداری (پارٹی) تبدیل کی ہے تو اُس کا نام لیا جائے۔ ابھی تین دن قبل ہی تو پنجاب کے گورنر مخدوم سید احمد محمود نے گورنر شپ کے شُکرانے کے طور پر اپنے تین بیٹوں کی وفاداری پیپلز پارٹی کے حق میں تبدیل کروائی ہے! بدھ کو میڈیا سے گفتگو میں مخدوم احمد محمود نے یہ بھی کہا کہ اُن کے بیٹوں نے مریم نواز، حمزہ شریف اور مونس الٰہی کے مقابل بلاول بھٹو زرداری کو بہترین آپشن کی حیثیت سے قبول کیا ہے! اِس بیان نے ہمیں اپنی رائے سے رجوع کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ملک میں کہیں بھی کوئی تبدیلی رُونما نہیں ہو رہی۔ حیرت و عبرت کا مقام ہے کہ جَدّی پُشتی مخدوم بھی اپنے لیے مخدوم کا انتخاب کر رہے ہیں! مزید تبدیلی یہ ہے کہ مسلم لیگ (ن) کے مرکزی رہنما سردار ذوالفقار کھوسہ کے صاحبزادے سیف الدین کھوسہ نے پیپلز پارٹی میں شمولیت

اختیار کرلی ہے۔ آپ شاید اِسے تبدیلی سمجھیں مگر قومی سیاست کا مزاج ذہن نشین رکھیے تو گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ تختہ وہی ہے اور تیزی سے گھوم بھی رہا ہے۔ تختے پر نصب گھوڑے بھی وہی ہیں۔ بس اِتنا ہے کہ لوگ گھوڑے بدل رہے ہیں! سیاسی وفاداری بدلنا اگر تبدیلی ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ تبدیلی کے معاملے میں کوئی ملک ہمارا ہمسر نہیں ہوسکتا!

بھارت کے وزیر داخلہ سُشیل کمار شِندے اور سیکریٹری داخلہ آر کے سنگھ نے انتہا پسند گروپ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور بھارتیہ جنتا پارٹی پر دہشت گردی کے تربیتی کیمپ چلانے اور مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی میں ملوث ہونے کا الزام عائد کرکے ساری دنیا کو حیران کردیا ہے۔ حیرت اگر کسی کو نہیں ہوئی تو وہ بس ہم ہیں۔ بھارت کے مرکزی وزیر اور سیکریٹری داخلہ کے انکشافات پر ہمارے ہاں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں گرما گرم بحث ہونی چاہیے تھی۔ مگر شاید یہ معاملہ اِس قابل ہی نہیں کہ ہمارے قانون ساز متوجہ ہوں! فی الحال وہ ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹ کر "القانون فی السیاست" کے تقاضے پورے کر رہے ہیں!

امریکی اخبار کرسچین سائنس مانیٹر نے (یقیناً ہمیں ہنسانے کی نیت سے) دعوٰی کیا ہے کہ پاکستان میں بڑی تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں۔ بیشتر معاملات

میں "نہیں" پر زور دیتے ہوئے اخبار لکھتا ہے کہ قیادت میں تبدیلی آئے گی مگر اِسے قبول نہ کرنا اور پر تشدد واقعات کا رونما ہونا خارج از امکان نہیں۔ فوجی بغاوت اور اسلامی شدت پسندوں کے اقتدار میں آنے کا بھی امکان نہیں۔ "گلوبل سیکیورٹی فورکاسٹ" کے عنوان سے اپنی رپورٹ میں اخبار اِس نکتے پر زور دیتا ہے کہ پاکستان میں کسی سیاسی رہنما کو عالمی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل نہیں! اِس آخری جملے کا کیا مطلب لیا جائے؟ امریکیوں کا "نہیں" اب تک "ہاں" ثابت ہوتا آیا ہے!

اور صاحب! جب تبدیلی لانے والے خود کو بدلنے پر آمادہ نہیں تو قوم کیوں خود کو بدلے؟ وفاقی ادارۂ شماریات نے جولائی سے دسمبر تک کے جائزے میں بتایا ہے کہ قوم نے چھ ماہ میں 64 ہزار ٹن سے زائد چائے پی۔ 33 ارب روپے موبائل فونز پر خرچ ہوئے۔ 97 ارب روپے کا پام آئل اور 10 ارب 65 کروڑ روپے کا سونا درآمد کیا گیا۔ رپورٹ میں درج ہے کہ گزرے ہوئے چھ ماہ میں پاکستانی خوب کھاتے پیتے اور موج اُڑاتے رہے۔ یہ جملے بازی قوم سے سراسر زیادتی ہے۔ حکومت کی پوری ٹیم قومی خزانے میں دانت گاڑے ہوئے ہے۔ مفاہمت کے نام پر اپوزیشن بھی سرکاری گھاٹ پر اشنان کر رہی ہے۔ اور طنز و تشنیع کے لیے قوم رہ گئی ہے! جب تمام پرنالے اپنے اپنے مقام پر کامیابی سے بہہ رہے ہیں تو قوم نے کیا بگاڑا ہے کہ اُس کے مزاج کی نہر رواں کو روکا اور ٹوکا جائے؟

جو لوگ کچھ نہیں کرتے، کمال کرتے ہیں

دُنیا کو تو بس کام کی پڑی ہے۔ جیسے اور کوئی کام ہی نہیں! کِسی بھی ملک میں، کِسی بھی خطے میں جا دیکھیے، لوگ کام کرتے ملیں گے۔ ہماری طرح آپ نے بھی سُنا ہی ہوگا کہ محنت میں عظمت ہے یعنی ہر وقت کام کرتے رہنا چاہیے۔ یہ بات ہمارے تو حلق سے کبھی نہیں اُتری۔ اُترے بھی کیسے؟ زندگی جیسی نعمت کیا صرف اِس لیے ملی ہے کہ کام، کام اور صرف کام میں اتنا عُنقیل کردی جائے، بے فضول (!) میں ضائع کردی جائے! کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ کام کرتے کرتے زندگی بسر کرنا تو عالمگیر معمول ہے۔ اب اگر آپ خود کو "غیر معمولی" ثابت کرنا چاہتے ہیں تو کام یعنی زمانے بھر کے "معمول" کو یکسر غیر تصور کرتے ہوئے ترک کردیجیے!

کیا آپ پسند کریں گے کہ دنیا آپ کو کسی نشے یا لَت کے حوالے سے پہچانے؟ کون چاہے گا کہ اُسے نشئی سمجھا جائے؟ یاد رکھیے، کام بھی ایک نشا ہے! جو لوگ کام کرتے رہتے ہیں وہ بالآخر کام کے "دُھتّی" یعنی عادی ہوکر رہ جاتے ہیں! ایسے لوگوں کو نفسیات کی زبان میں workaholic کہا جاتا ہے۔ دیکھیے، ہم نے آپ کو کتنے آسان الفاظ اور سادہ طریقے سے سمجھادیا کہ کام کرتے رہنا نفسیاتی عارضہ ہے! اب کیا آپ پسند کریں گے کہ کوئی آپ کو نشئی یا نفسیاتی

مریض سمجھے ؟ یقیناً نہیں۔

ہر مشترکہ گھرانے یعنی جوائنٹ فیملی میں چند "بھولے بادشاہ" اپنے جوائنٹس یعنی جوڑ جوڑ کو ہلا جلا کر گھر چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔اِن احمقوں کے نصیب میں سُکھ نہیں ہوتا۔ اور جو گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں وہ زندگی کو اُس کی پوری توانائی اور تابانی کے ساتھ انجوائے کر رہے ہوتے ہیں ! عقل مند کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ زندگی جیسی نعمت کو کام دھندے میں ضائع کرنے کے بجائے اُس سے بھرپور لطف اُٹھانے کی کوشش میں جُتا رہتا ہے ! مشترکہ گھرانوں میں چند افراد پیدا تو اللہ کے بندوں کی حیثیت سے ہوتے ہیں مگر رفتہ رفتہ "کام کے بندے" ہو کر رہ جاتے ہیں ! مستقل کام کرتے رہنے سے یہ وہی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں جو "کام والی" کی ہوتی ہے ! یہ کام والے "اللہ لوگ" دن رات کام کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ سارا رونق میلہ اُنہی کے دم سے ہے !

اِس سادگی پہ "خود ہی مَر جائیں" اے خُدا !

یہ "کام کے بندے" اگر کبھی سُکون سے ایک طرف بیٹھ کر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ گھر میں کچھ لوگ کام کرنے پر بالکل یقین نہیں رکھتے مگر اِس کے باوجود گزر بسر کے دریا کی روانی کم ہونے کا نام نہیں لیتی ! کام کرنے والے

ہی سوچتے رہتے ہیں کہ سب کچھ کیسے چلے گا یا اِسے کس طرح چلتا رکھا جائے ! جو کام نہیں کرتے وہ کبھی اِن فضول باتوں کے بارے میں سوچنے پر اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتے ! جب کچھ لوگوں کے کام نہ کرنے سے بھی کام چلتا رہتا ہے تو کام کرنے والے یہ سوچ سوچ کر کیوں ہلکان ہوتے رہتے ہیں کہ وہ کام نہیں کریں گے تو کام نہیں چلے گا !

ذرا ماحول پر نظر دوڑایئے تو اندازہ ہوگا کہ لوگ کچھ نہ کرکے کتنا کچھ کر جاتے ہیں !

آپ کسے مثال بنانا چاہیں گے ؟ اگر بالی وڈ پر نظر ڈالیں تو سب سے بڑا نام یوسف صاحب یعنی دلیپ کمار کا ہے۔ یوسف صاحب نے 1943 میں فلم انڈسٹری میں قدم رکھا۔ اِس شعبے میں اُنہیں 70 سال ہوچکے ہیں مگر اب تک صرف 53 فلموں میں کام کیا ہے۔ پھر بھی لوگ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ خوب کام کیا ہے ! سچ تو یہ ہے کہ یوسف صاحب نے اداکاری کے نام پر صرف "اداکاری" کی ہے ! ہمارے سلطان راہی مرحوم نے 900 فلموں میں کام کرکے عالمی ریکارڈ قائم کیا مگر نتیجہ کیا نکلا؟ بس نام یاد رہ گیا ہے، کام وام کچھ یاد نہیں ! سلطان راہی مرحوم نے اداکاری کو ایسی شدت سے اپنایا کہ شخصیت اور فن دونوں گِھس گئے ! اُنہوں نے زندگی بھر اِس قدر اداکاری کی کہ آخر آخر میں تو کیمرے کے سامنے پیش کرنے کے لیے اُن کے پاس اداکاری بھی نہیں بچی تھی ! ایسے میں اُنہوں نے یوسف صاحب والا نُسخہ آزمایا اور محض "اداکاری" کرتے رہے !

ایکٹ فلموں پر کیا موقوف ہے، ہمارے ہاں تو بیشتر شعبوں میں بہت سے لوگ بظاہر بہت کچھ کرکے بھی در حقیقت کچھ نہیں کر رہے ہوتے ! سلامت علی تقریباً چالیس سال سے گا رہے ہیں اور اِس گمان میں مبتلا ہیں کہ وہ گا رہے ہیں ! اُن کے گمان تک تو معاملہ ٹھیک ہے، ہمارے یقین کو رہنے ہی دیجیے !

تدریس ہی کے شعبے کو لیجیے۔ بیشتر اساتذہ ایسے ہیں جو خیر سے تین چار عشروں تک پڑھا چکے ہیں مگر ہم (اپنے) سَر فخر سے بلند کرکے کہہ سکتے ہیں کہ اُنہوں نے کچھ نہیں پڑھایا ! ہمارے ہاں تدریس کا شعبہ گاڑی کے اُس ٹائر جیسا ہے جو گڑھے میں پھنسا ہوا ہو ! ذرا کمال تو ملاحظہ فرمائیے کہ تعلیم کا شعبہ بخوبی چل رہا ہے، بچے کسی نہ کسی طرح تعلیم بھی پا رہے ہیں اور اساتذہ و حکام پر کوئی الزام بھی نہیں آ رہا !

بہت کچھ کرکے کچھ نہ کرنے کی اداکاری ویسے تو ہر شعبے ہی میں جلوہ افروز اور کارفرما ہے مگر میڈیا کے شعبے میں تو اِس فن نے تکنیکی باریکیوں کا پوٹلا کھول کر رکھ دیا ہے ! کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

اِس کاروبارِ شوق کا انجام کچھ نہیں
مصروفیت بہت ہے مگر کام کچھ نہیں !

تجزیے اور کالم لکھنے کے نام پر بہتوں نے ایسا نام کمایا ہے کہ خود اُنہیں بھی حیرت تو ہوتی ہو گی! یہ وہ باکمال افراد ہیں جو تیس چالیس سال سے لکھ بھی رہے ہیں اور لوگ اِن کا فن تلاش بھی کر رہے ہیں! اِن کے ہُنر نے سُلیمانی ٹوپی اوڑھ رکھی ہے! کمال یہ ہے کہ کام بھی دِکھائی نہیں دیتا اور شہرت کا آفتاب بھی غروب ہونے میں نہیں آتا! گاڑی، گڑھے اور ٹائر والی مثال یہاں بھی چسپاں کی جا سکتی ہے مگر خیر، گاڑی کو دھکیل کر گڑھے سے باہر نکالا جاسکتا ہے!

یہ تو ہوا پرنٹ میڈیا کا احوال۔ ایک قدم آگے بڑھ کر الیکٹرانک میڈیا پر نظر ڈالیے مگر تھوڑی احتیاط سے کہ کبھی کبھی نظر لَوٹ کر نہیں بھی آتی! منجن بیچنے یعنی ماورائے مفہوم رہتے ہوئے بولنے کا ہُنر ایف ایم ریڈیو اور ٹی وی چینلز دونوں پر ختم ہے! ٹی وی کے ٹاک شو میں بولنے کے لیے دِماغ کا ٹھکانے پر نہ ہونا لازم ہے اور ایف ایم پر بولنے کے لیے لازم ہے کہ دِماغ ہی نہ ہو! ویسے بھی ایف ایم اسٹیشنز پر رات بھر کی نشریات میں دِل ہی کی باتیں ہوتی رہتی ہیں، دِماغ تو ایک کونے میں کھڑا تماشا سُن رہا ہوتا ہے!

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا حوالہ دیکر ہم نے حجت تمام کر دی۔ اگر اب بھی

آپ کام کے بارے میں سوچ رہے ہیں تو سزا یہ ہے کہ آپ کو کام کرتے رہنے دیا جائے!

شوکن میلے دی

میاں نواز شریف کی سادگی میں بھی ایسی پُرکاری ہے کہ مر مٹنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک ہفتے تک دھما چوکڑی مچی رہی۔ قوم خلجان، تشویش اور وسوسوں میں مبتلا رہی۔ میڈیا کے محاذ پر جنگ کا سماں رہا۔ ایک رونق میلہ تھا کہ جس سے دِل سیر نہ ہو پاتا تھا یعنی جتنا دیکھیے اُتنی ہی ہوس بڑھتی تھی ! مگر میاں صاحب اپنی سادہ طبیعت کے ہاتھوں میڈیا پر کہتے رہے "پلّے نئی دھیلہ تے کردی میلہ میلہ !" سب نے دیکھ لیا کہ ڈاکٹر طاہر القادری کے پاس کتنے دھیلے تھے اور تھیلے تھے۔ تھیلوں سے وہ طرح طرح کے الٹی میٹم اور مطالبات نکال کر حکومت کو ڈراتے اور قوم کو ہنساتے رہے ! میاں صاحب چاہیں تو ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ لانگ مارچ اور دھرنے کے شاندار رونق میلے پر کتنے غیر ملکی دھیلے خرچ ہوئے !

لوگ کہتے ہیں کہ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے جسے اب کوئی درست یا سیدھا نہیں کر سکتا۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ ایسی کوئی کوشش کرے؟ اور پھر یہ بات بھی بھولنے والی نہیں کہ جنہوں نے منصوبے کے تحت اور خاصی محنت کرکے آوے کو بگاڑا ہے وہ کب اِسے درست ہونے دیں گے ! یقین نہ آئے تو آپ بھی اپنی کوشش کر دیکھیے۔

بیشتر مردوں کا کیس یہ ہے کہ موقع ملتے ہی دوستوں کے ساتھ ہوٹل پر جا بیٹھتے ہیں اور پھر زمانے بھر کے موضوعات پر تین چار گھنٹے کی سیر حاصل بحث کے بعد ہی اُٹھتے ہیں۔ یہی حال خواتین کا ہے جو کسی نہ کسی بہانے سہیلیوں کے ساتھ مختلف بازاروں کے چکر نہ کاٹیں تو دِل کو سکون نہیں ملتا۔ بس کچھ ایسی حالت اب پوری قوم کی ہے۔ سب کچھ اچھا چل رہا ہو تو دل کو گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو تو دِل یہ سوچ کر ڈوبنے لگتا ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں! قوم اب "کچھ نہ کچھ" کی عادی ہو چکی ہے۔ کچھ نہ کچھ ہوتے رہنا چاہیے۔ شادیانے نہیں تو غم کی شہنائی ہی سہی! بقول غالب

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
!نوحہ غم ہی سہی، نغمہ شادی نہ سہی

سیاست کے چولھے پر بیانات اور بڑھکوں کی دیگ چڑھی ہے۔ سب اِس میں حسب توفیق حصہ ڈالتے جاتے ہیں اور دیگ سے طرح طرح کی "خوشبوؤں" کے "بھپکے" اُٹھتے جاتے ہیں! لوگ کچھ خرچ کئے بغیر ہی ناک کے راستے بہت سی لذتیں معدے میں اتار !رہے ہیں

1975 میں پنجابی فلم "شوکن میلے دی" ریلیز ہوئی تھی جس میں میلے کی شوقین

کا یعنی مرکزی کردار آسیہ نے ادا کیا تھا اور ان کے مقابل منور ظریف مرحوم تھے۔ فلم ایسی ہٹ ہوئی کہ یہ ٹائٹل ہماری قوم پر اب تک چسپاں ہے! آسیہ تو فلم میں کام کرکے، معاوضہ سمیٹ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ فلم ہٹ ہو کر سنیما ہالز سے کب کی اُتر چکی۔ اور قوم ہے کہ اب تک پورے ملک کو اوپن ایئر تھیٹر سمجھتے ہوئے "شوکن میلے دی" بن کر اپنے آپ کو ریلیز در ریلیز کے مرحلے سے گزارنے پر تُلی ہوئی ہے! آسیہ اور منور ظریف کی "شوکن میلے دی" تو ماضی کا قصہ ہوئی، قوم نے شاید قسم کھا رکھی ہے کہ سُپر ہٹ، بلکہ مَہا سُپر ہٹ کی مسند پر متمکن رہنا ہے!

قوم کو میلے کا شوقین بنائے رکھنے والوں کی بھی تو کمی نہیں۔ ایک سیاسی مداری جاتا ہے تو دوسرا آ جاتا ہے۔ ہر ایک کے پاس ایجنڈے کے عجیب و غریب جانور ہوتے ہیں۔ اور اُن سے عجیب اُن کے کرتب ہوتے ہیں جو قوم کی آنکھوں سے کاجل چُرانے کی کوشش سے بھی گریز نہیں کرتے!

انسان جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو کچھ تفریح کی سُوجھتی ہے یا وہ دل بستگی کا سوچتا ہے۔ خدا جانے ہم کس منزل میں ہیں کہ اب رات دن تفریح سے کام ہے اور کام سے تو جیسے کچھ کام رہا ہی نہیں! آپ کہیں گے حالات ایسے کہاں ہیں کہ انسان میلے ٹھیلے میں جانے کا سوچے؟ آپ کی سوچ غلط نہیں ہو سکتی۔ مگر

جناب ! اب کسی میلے میں شریک ہونے اور دل کو فرحت بخشنے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ گھر بیٹھے میلے کی سیر کیجیے۔ بس سوئچ آن کرنے ہی کی تو دیر ہے ! ٹی وی سیٹ آن ہوا اور سمجھ لیجیے میلہ سج گیا۔ گھر گھر رونق میلہ لگا ہوا ہے۔ خانہ ساز اور درآمد شدہ ہر دو طرح کے سیاسی مداری آپ کی سیوا کے لیے حاضر ہیں۔ اُن سے سیوا کرائیے اور داد و تحسین کا میوہ کھلا کر اُن کا حوصلہ بڑھائیے ! کہیں جانے کی زحمت نہ واپسی کا جھنجھٹ۔ آن کی آن میں میلہ سج بھی جائے اور دل بہل بھی جائے!

جب کوئی طے کرلے کہ ذہن کو سوچنے کی راہ پر نہیں جانے دینا تو پھر کس میں ہمت ہے کہ سوچنے پر مائل کرکے دکھائے؟ اہل وطن کا عمومی وطیرہ اب یہی ہے کہ ایک جھمیلے سے دل بھر جائے تو دوسرے میں دلچسپی لیں اور اگر دوسرا بور کرنے لگے تو تیسرے کی طرف نکل جائیں ! حالیہ دھرنے کے شرکاء کو کیا ملا؟ مگر یقین کیجیے کہ کسی نئے طاہرالقادری کی آمد پر بھی ایسا ہی ہنگامہ برپا ہوگا، ایسی ہی بڑھکیں ہوں گی اور یونہی بے وقوف بن کر صورتِ حال سے لطف کشید کیا جائے گا ! جو لوگ طاہرالقادری کے ہاتھ مضبوط کرنے نکلے وہ نئے لانگ مارچ اور دھرنے میں بھی دکھائی دیں گے۔ میلہ خواہ کسی کا ہو، شوقین وہی رہیں گے ! سنیما ہال میں فلمیں لگتی اُترتی رہتی ہیں، کبھی آپ نے شائقین بھی بدلتے دیکھے ہیں!

میڈیا تو خیر سے کچھ زیادہ ہی بدنام ہیں۔ اہل وطن کب بہت ایسے تھے کہ اُنہیں بگاڑنے پر خاص الخاص توجہ دی جاتی! ہاں، یہ ضرور ہوا ہے کہ میڈیا کی طرف سے کی جانے والی مفت پالش سے ذہنوں کے جوتے چمک اُٹھے ہیں! جب پریشانیاں حد سے گزر جاتی ہیں تو اُن کے ساتھ جینے کو زندگی کا مقصد اور طریق کار سمجھ لیا جاتا ہے۔ ہم نے بھی یہی موڈس آپرنڈی" اپنالی ہے۔ پریشانی کا خوش دِلی سے مقابلہ کیجیے تو وہ پریشانی نہیں رہتی، " آپ کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ ہم نے بھی شاید طے کرلیا ہے کہ مسائل کو حل کرنے کے بجائے اُن سے محظوظ ہوا جائے! بقول غالب

غم سے گر خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
!مشکلیں مجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہو گئیں

میلوں کے شوقین پریشان تو اُس وقت ہوں جب اُنہیں یہ یاد رہے کہ یہ سارا رونق میلہ ختم ہوگا تو کام وام بھی کرنا ہے۔ جب طے کرلیا کہ ایک کیفیت ہی میں جینا اور مرنا ہے تو کیسی خوشی اور کیسا غم؟ متضاد حالتوں اور کیفیتوں کے اشتراک سے یہ معجزہ رُونما ہوا ہے کہ اب ہماری اجتماعی نفسیات کے گھاٹ پر شیر اور بکری ساتھ ساتھ پانی پیتے ہیں! محسوس یہ ہوتا ہے کہ اہل سیاست نے "مفاہمت" کا فلسفہ بھی قوم کی نفسیاتی ساخت ہی سے کشید کیا ہے! سیاست سے

چونکانے کا عنصر غائب کرکے بھی ایسا شاندار میلہ سجایا گیا ہے کہ "شوکن میلے دی" مزید کملی تے دیوانی ہو گئی ہے!

بھائی لوگ" کی مہربانی"

1998 میں رام گوپال ورما کی ڈائریکشن میں بننے والی بالی وڈ فلم "ستیہ" ریلیز ہوئی۔ ممبئی کے جرائم پیشہ گروہوں کی باہمی لڑائی کے بارے میں بنائی جانے والی اِس فلم کا اسکرین پلے انوراگ کشیپ اور سوربھ شکلا نے لکھا تھا۔ مرکزی یعنی ستیہ کا کردار جے ڈی چکرورتی نے ادا کیا تھا۔ سائڈ ہیرو (بھیکو ماترے) کا کردار منوج باجپائی کے حصے میں آیا۔ ارمیلا ماتونڈکراِس فلم کی ہیروئن (ودیا) تھی۔ ویسے تو پاکستانی سیاست کو سمجھنے کے لیے ممبئی کے انڈر ورلڈ پر بنائی جانے والی بیشتر فلمیں کارآمد ہیں مگر "ستیہ" کی بات ہی کچھ اور ہے۔

"ستیہ" کے ایک سین میں ہیرو یعنی ستیہ اپنی محبوبہ ودیا کے ساتھ فلم دیکھنے جاتا ہے۔ وقفے کے دوران وہ ودیا کے لیے چپس اور کولڈ ڈرنک لینے کی غرض سے سنیما ہال کے اندر بنے ہوئے اسٹال پر پہنچتا ہے تو پولیس کا مخبر اُسے دیکھ لیتا ہے۔ ستیہ کولڈ ڈرنگ وغیرہ لیکر ہال میں واپس چلا جاتا ہے اور مخبر پولیس کو مطلع کردیتا ہے۔ پولیس بر وقت پہنچ کر سنیما ہال کا محاصرہ کرلیتی ہے مگر فلم کو مکمل ہونے دیا جاتا ہے۔ اندر ستیہ کو معلوم نہیں کہ باہر پولیس کی بھاری نفری اُس کے سواگت کے لیے موجود ہے! فلم ختم ہوتی ہے تو

لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا جاتا ہے کہ سب لوگ ایک دروازے سے باہر جائیں گے ! ستیہ کے لیے اشارا کافی تھا۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ باہر پولیس تیار کھڑی ہے۔ اب سنیما سے باہر نکلنے اور پولیس کی گرفت سے بچنے کا اُس کے پاس ایک ہی طریقہ بچا تھا۔۔ یہ کہ کوئی ہنگامہ برپا کیا جائے۔ اُس نے جیب سے پستول نکالا اور سیٹ کی نیچے دو تین گولیاں داغ دیں۔ بس، ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ہال میں قطار بند لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور جب ریلہ باہر نکلا تو ستیہ بھی نکل گیا !

ہماری جمہوری حکومت بھی پانچ برس سے یہی کچھ کر رہی ہے۔ جب وہ کسی صورتِ حال کے جال میں پھنسنے لگتی ہے تو گولیاں داغ کر یعنی کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا کرکے بچ نکلتی ہے ! جو لوگ بالی وڈ میں بنائی جانے والی "بھائی لوگ" کی فلمیں دیکھنے کے عادی، بلکہ "ڈھتّی" ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ہمارے حکمران بھی فلمی منظر ناموں جیسے ماحول میں جی رہے ہیں اور اس ماحول کو برقرار رکھنے پر پوری توانائی صرف کر رہے ہیں ! چند شہروں کو منتخب کرکے اُن کے حالات کو باری باری خراب ہونے دیا گیا ہے تاکہ میڈیا کے پاس اُچھالنے کے لیے کوئی تو بات ہو، سیاست دانوں کے پاس چیخنے کے لیے کوئی تو موضوع ہو !

بھی سمجھ بیٹھتے ہیں یعنی "un ڈر world" کو بعض لوگ underworld ممبئی کے ایسی دُنیا جس میں ڈرنے والوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مگر یہ محض نظر کا دھوکا ہے۔ جو لوگ جرائم کی دلدل میں گلے تک ڈوبے یا دھنسے ہوئے ہوتے ہیں وہ درختوں پر پتّوں کے ہلنے سے بھی ڈرتے ہیں! کسی پر محض بال برابر بھی شک ہو تو اُسے "ٹھوکنے" سے رتّی بھر گریز نہیں کرتے۔ یعنی انڈر ورلڈ میں جینا ہے تو ٹھوک ڈال! 1975 کی فلم "شعلے" میں ولن گبر سنگھ کا یہ جملہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا۔ "جو ڈر گیا، سمجھو مر گیا!" انڈر ورلڈ میں اِس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کو جس قدر ڈرا سکتے ہو، ڈراتے رہو!

بھائی لوگ" کے بارے میں بنائی جانے والی فلموں میں جو کچھ ہوتا ہے وہی کچھ ہمیں" پانچ برس سے جمہوری تماشے میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔ جس طرح "بھائی لوگ" کی فلموں میں مخالفین کو "ٹھوکنے" یا پھر اُن کی "واٹ" لگانے سے کم کا سوچا ہی نہیں جاتا، بالکل اُسی طرح ہمارے ہاں بھی اقتدار و اختیار پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے ٹھوکنے اور واٹ لگانے ہی پر اکتفا کیا جاتا رہا ہے! فرق البتّہ یہ ہے کہ "بھائی لوگ" کی فلموں میں گینگ آپس میں لڑتے ہیں اور پبلک تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ ہمارے ہاں پبلک کو بھی اسکرپٹ کا حصہ بنادیا گیا ہے اور مخالفین کی واٹ لگانے میں ناکامی ہو تو "خُنّس" پبلک پر اُتاری جاتی ہے!

جمہوری ڈرامے کے اسکرپٹ میں تازہ ترین اضافہ "بہاولپور جنوبی پنجاب" کا شوشا ہے۔ نئے صوبوں کے قیام سے متعلق پارلیمانی کمیشن کا اجلاس ہفتے کو چیئرمین فرحت اللہ بابر کی صدارت میں ہوا جس کا مسلم لیگ (ن) نے بائیکاٹ کیا۔ اجلاس میں مجوزہ بہاولپور جنوبی پنجاب" صوبے سے متعلق بل کی کی منظوری دی گئی۔ یہ بل پیر کو" اسپیکر قومی اسمبلی کو بھیجا جائے گا اور ممکن طور پر منگل کو ایوان میں پیش ہوگا۔ اِس نئے صوبے کی اسمبلی 124 نشستوں پر مشتمل ہوگی اور قومی اسمبلی میں اِس کی نشستیں 59 ہوں گی۔ دوسری طرف چوہدری نثار علی خان نے اعلان کیا ہے کہ سندھ اور بلوچستان کی صورتِ حال پر اپوزیشن جماعتیں آئندہ ہفتے پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے دھرنا دیں گی۔ دیکھا آپ نے؟ وہی اسکرپٹ چل رہا ہے۔ لانگ مارچ اور دھرنا بھی اِس سیاسی ڈرامے ہی کا ایک اہم ایکٹ تھا۔ وہ اِشو ختم ہوا تو ووٹ بینک تگڑا کرنے کے لیے بہاولپور جنوبی پنجاب کا اِشو پھر کھڑا کیا جارہا ہے! یعنی ایک اِشو ختم ہو تو دوسرا کھڑا کردو اور دوسرا بیٹھ جائے تو تیسرے کی طرف چل دو۔ اِسی غزل اور جواب آں غزل میں منتخب حکومت کی میعاد بیت گئی ہے اور عوام سیٹوں پر بیٹھے بس تماشا دیکھتے آئے ہیں۔ ایسے میں حکمرانوں کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ بھارت کے وزیر خارجہ، مرکزی وزیر داخلہ اور سیکریٹری داخلہ نے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور بھارتیہ جنتا پارٹی کو دہشت گردی کی تربیت اور وارداتوں کا مرتکب

قرار دیکر ہمیں گویا پلیٹ میں حلوہ پیش کیا ہے۔ مگر جمہوری حکومت کے ذمہ داران کو !اندر ورلڈ" سے فرصت ملے تو "باہر ورلڈ" کی طرف دیکھیں"

اقتدار کا تسلسل یقینی بنانے کے لیے بھان متی کا کنبہ جوڑنے کا عمل اِس قدر خشوع و خضوع سے جاری ہے کہ عوام دیکھ کر مستقل حالتِ حیرت میں ہیں کہ اِس کے سوا کچھ کر بھی تو نہیں سکتے ! مرکزی دھارے کی سیاسی جماعتیں کل تک قوم پرست جماعتوں سے الرجک تھیں مگر انتخابی کامیابی یقینی بنانے کی غرض سے ایڈجسٹمنٹ کے نام پر اگر اِن ٹھکرائی ہوئی جماعتوں کو بھی گلے لگانا پڑے تو کوئی ہرج نہیں ! اخلاقی اقدار اور نظریات کا جنازہ اُٹھ چکا ہے۔ جو چیزیں مستقل غیر استعمال شدہ رہیں اُن سے جان چھڑا لینا ہی دانش مندی ہے ! ایسے میں اگر پیر پگارا کی فنکشنل لیگ اور رسول بخش پلیجو کی عوامی تحریک نے مل کر آئندہ الیکشن کو سندھ دوست اور سندھ دشمن قوتوں کے درمیان مقابلہ بنانے کا عزم ظاہر کیا ہے تو حیرت کیسی؟

بالی وڈ نے "بھائی لوگ" کو فلموں کا موضوع بنا کر ہمارے حکمرانوں کو آسانیاں فراہم کیں۔ بہت شکریہ۔ اب بالی وڈ کے فلم میکرز کو ہمارے جمہوری ڈرامے سے بھی چند !موضوعات اخذ کرنے پر توجہ دینی چاہیے

چلو کچھ دیر ہنس لیں ہم

سردی جب بھی شِدّت اختیار کرتی ہے، دِل کی اُداسی اور بیزاری بڑھ جاتی ہے۔ اِس بار پاکستان میں سردی نے شاید قیامت ڈھانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ شدید سردی نے اُداسی بھی بڑھائی ہے۔ مگر خیر، اللہ نے اِس کا تریاق بھی عطا فرمایا ہے۔ عام انتخابات کا موسم بھی وارد ہوچکا ہے۔ اور اِس موسم میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے قوم کے "قائدین" روزانہ کچھ نہ کچھ فرما کر اُداسی کا توڑ پیش کر رہے ہیں۔ بعض بیانات میں اہل سیاست کا معصومیت اور سادگی سے مُزیّن لہجہ دیکھ کر ہونٹوں پر ہنسی ڈیرے ڈال لیتی ہے! پشاور میں جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جمیعت علمائے اسلام (ف) کے سربراہ فضل الرحمٰن نے فرمایا کہ پانچ برسوں کے دوران صرف جے یو آئی (ف) نے اسلامی نظام کے لیے آواز بلند کی ہے! ہماری سادگی اور تغافل ملاحظہ فرمایئے کہ ہمیں پانچ برسوں میں جے یو آئی (ف) کی اِتنی بڑی دینی خدمت دکھائی نہیں دی۔ دکھائی دیتی بھی کیسے؟ ہم جے یو آئی (ف) سے زیادہ فضل الرحمٰن صاحب پر نظریں گاڑے ہوئے ہوئے تھے کہ کب کب اُنہوں نے حکومتی اقدامات پر تحفظات کا اظہار کیا اور وہ تحفظات کِس طور دور کئے گئے!

فضل الرحمٰن پارٹی کے کارنامے گنوانے تک محدود نہیں رہے بلکہ قوم کی

معلومات میں بھی یہ کہتے ہوئے اضافہ کیا کہ پانچ برسوں کے دوران غیر اعلانیہ مارشل لا نافذ رہا ہے! بات غلط نہیں۔ پانچ برسوں میں حکومت نے جو کچھ بھی کیا وہ ایک ایسے منفرد قانون (لا) کا درجہ رکھتا ہے جس نے مار مار کر ہمارے اعصاب شل کردیئے! اِس اعتبار سے دیکھیے تو پانچ برس سے "مار۔شل۔لا" ہی نافذ رہا ہے!

جے یو آئی (ف) کے سربراہ نے جلسے کے شرکاء سمیت پوری قوم کو ایک اور پتے کی بات بتائی، یہ کہ اوباما انتظامیہ پاکستان کو معاشی طور پر کمزور کرکے مداخلت کرنا چاہتا ہے! اچھا ہوا جو فضل الرحمٰن صاحب نے بتادیا ورنہ اب تک تو ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ امریکا ہمارے معاملات میں مداخلت کرتا آرہا ہے۔ اب اندازہ ہوا کہ اب تک جو کچھ اُس نے کیا ہے وہ مداخلت کی محض تیاری ہے! "زمانہ ما قبل مداخلت" کا یہ حال ہے تو پتہ نہیں مداخلت کیا گل کھلائے گی! فضل الرحمٰن کے "انکشاف" سے حواس باختہ ہوکر ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ

جب رات ہے ایسی متوالی پھر صبح کا عالم کیا ہوگا!

موسم سے بھی زیادہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے عمران خان نے کہا ہے کہ گزشتہ عام انتخابات کا بائیکاٹ غلط فیصلہ تھا کیونکہ مسلم لیگ (ن) اُنہیں نہر والے پُل پر چھوڑ کر چلی گئی! عمران صاحب کو مسلم لیگ (ن) کا شکر گزار ہونا

چاہیے کہ وہ نہر والے پُل تک آئی تو سہی، نور جہاں کے "خورے ماہی" جیسی نہیں نکلی جس نے مٹیار کو نہر والے پُل تک بلایا مگر خود آنے کی زحمت گوارا نہیں کی! عمران خان نے اپنے بیان میں موروثی سیاست کا رونا روتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ حکومت نے سیاست دانوں کی قیمت لگادی۔ ملک نیچے جارہا ہے اور سیاست دان اوپر جارہے ہیں۔ مزید یہ کہ آصف زرداری اچھے سیاست دان نہیں۔ انہوں نے قیمت لگاکر کسی کو کراچی اور کسی کو پنجاب پکڑا دیا۔ تحریک انصاف کے سربراہ کو معلوم ہی نہیں کہ عوام کی دُعا اب تک قبول نہیں ہوئی یعنی سیاست "اوپر" نہیں جارہے! اور حکمرانوں نے قیمت لگاکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُن کی برادری کے لوگوں کی بہرحال تھوڑی بہت تو قدر و قیمت ہے!

ڈاکٹر طاہر القادری نے دس دن قبل جو ڈراما اسٹیج کیا تھا اس کا ایک اور ایکٹ اتوار کی شام شائقین یعنی قوم کے سامنے پیش کیا گیا۔ حکومتی ٹیم تحریک منہاج القرآن کے مرکزی دفتر گئی۔ طاہر القادری نے مذاکرات کے دوران فرمائش کی کہ صدر، وزیر اعظم اور وزرائے اعلیٰ کے صوابدیدی فنڈز منجمد کردیئے جائیں تاکہ الیکشن میں اُن کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا جاسکے۔ اِس کے جواب میں وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات قمر زمان کائرہ نے وضاحت فرمائی کہ این ایف سی ایوارڈ کے تحت فنڈز صوبوں کے پاس ہیں جن پر وفاق کا اختیار نہیں رہا۔

کائرہ صاحب نے یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ آئین کی اصل شکل نہیں بگاڑی جائے گی اور ساتھ ہی کوشش کی جائے گی کہ تمام اسمبلیوں کے انتخابات ایک ہی دن ہوں۔

طاہرالقادری صاحب صرف صوابدیدی فنڈز منجمد کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ یہاں پانچ برس سے سبھی کچھ منجمد ہے۔ صواب دید ہی نہیں ثواب دید اور عذاب دید بھی یخ بستہ ہیں! ویسے فنڈز منجمد کرنے کی فرمائش قومی مزاج کے یکسر برعکس ہے کیونکہ ہمارے ہاں اب سبھی کچھ فنڈنگ کے تحت ہو رہا ہے! ویسے ہمارا خیال ہے ڈاکٹر صاحب کے سامنے فنڈنگ کی توضیح سُورج کو چراغ دِکھانے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی پڑھے لکھے ہیں، ہر طرح کی فنڈنگ کا سیاق و سباق اچھی طرح جانتے ہیں!

کائرہ صاحب کی وضاحت کا بھی جواب نہیں۔ کتنی خوب صورتی سے اُنہوں نے گیند صوبوں کے کورٹ میں ڈال دی ہے۔ اور وفاق کو تو ایسا بے بس ظاہر کیا ہے جیسے اُس بے چارے کے بس میں کچھ ہے ہی نہیں! تمام اسمبلیوں کے انتخابات ایک ہی دن کرانے کی بات قوم کے حلق سے شاید نہ اُترے۔ لوگ کچھ دن شغل میلہ چاہتے ہیں اور آپ سارا تماشا ایک ہی دن نمٹانا چاہتے ہیں! آئین سے متعلق یقین دہانی کراتے وقت کائرہ صاحب کو کہنا چاہیے تھا کہ آئین کی اصل شکل مزید

نہیں بگاڑی جائے گی۔ ویسے اب آئین کی اصل شکل تو خود اُس کے لکھنے والوں کو بھی یاد نہیں ! ایسے میں کوئی بھی کھلواڑ کیجیے، کسی کو کہاں معترض ہونا ہے

سردی کے لشکارے کو لگام دینے کے لیے چند گرما گرم باتیں سابق صدر پرویز مشرف نے بھی کی ہیں۔ نیو یارک میں آل پاکستان مسلم لیگ کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر اپنی بات پر قائم رہنے کا ثبوت دیا، یعنی یہ کہا کہ فی الحال وہ وطن واپسی کی حتمی تاریخ نہیں دے سکتے مگر ہاں اِتنا ضرور ہے کہ عام انتخابات سے قبل وہ وطن پہنچیں گے۔ پرویز مشرف عمر اُس مرحلے میں ہیں جہاں اُن پر "ڈیٹنگ" کسی بھی طرح سُوٹ نہیں کرتی اِس لیے اخبار نویسوں کو اُن سے وطن واپسی کی حتمی ڈیٹ کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے ! ہمارا خیال یہ ہے کہ پرویز مشرف کو پاکستان واپس لانے کا ایک اچھا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ اُن کے لیے یہاں لیکچرز کا اہتمام کیا جائے ! جہاں اِتنے لوگ منجن بیچ رہے ہیں، تھوڑا بہت سابق صدر بھی بیچ ہی جائیں تو کیا قباحت ہے !

اپوزیشن جماعتوں نے پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے دھرنا دینے کا اعلان کرکے بھاگتے چور کی لنگوٹی پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں مذموم عزائم و مقاصد نے

سبھی کو بے لباس ہونے پر اکسا رکھا ہے وہاں اگر کسی چور لنگوٹی سے بھی سیاست کی کچھ ستر پوشی ہو جائے تو اِسے قوم کی خوش نصیبی سمجھیے!

ایک اور "بی جے پی" خون پینے کیلئے تیار

بازار کا وقت ختم ہونے پر آتا ہے تو دکاندار دام گرا کر بچا کھچا مال نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تمام "اسٹیک ہولڈرز" کے لیے یہی وقت ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ فائدہ بٹورنے کا۔ گاہک یہ سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے سستا مال خرید کر بہت بڑا تیر مار لیا ہے۔ اور دکاندار خوشی سے پھولا نہیں سماتا کہ دن بھر میں سارا اچھا مال تو زیادہ منافع لیکر مزے سے فروخت کر دیا اور اب کچرا مال بھی سستے کے چکر میں ہاتھوں ہاتھ جا رہا ہے!

انتخابی عمل کے ذریعے ملنے والی پانچ سالہ میعاد ختم ہونے کو آئی ہے تو حکومت نے بھی رُکے اور پھنسے ہوئے غیر معیاری مال کا بورا کھول کر ہر "بھائی جان، مہربان، قدر دان" کے آگے رکھ دیا ہے۔ بچت بازاروں میں جب اسٹال سمیٹے جا رہے ہوتے ہیں تب خواتین گرے ہوئے دام کا فائدہ اٹھانے کے لیے اندھا دھند خریداری کرتی ہیں اور اِسی عجلت میں دُکاندار اُنہیں آسانی سے ٹھگ لیتے ہیں۔ حکومت بھی نفسیات کے اِسی اُصول کا فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ پانچ برسوں میں ہماری راج دُلاری حکومت نے خود کو برقرار رکھنے کے لیے خیر سے تمام ہی علوم و فنون آخری حد تک بروئے لانے کی کوشش کی ہے اور نئے معیارات

متعین کرنے میں کامیاب رہی ہے!

بہاول پور کی ریاست کے سابق حکمران (یا والی) عرصہ دراز سے بحالی کا مطالبہ کرتے آئے ہیں۔ دوسری طرف جنوبی پنجاب میں سرائیکی بولنے والے بھی اپنے روایتی و تاریخی خطے سرائیکی وسیب کو صوبے کا درجہ دلانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ حکومت کی میعاد ختم ہونے کو آئی ہے تو پارلیمانی کمیشن کو متحرک کرکے نئے صوبوں کا پینڈورا بکس کھولا جارہا ہے۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا کے مصداق بہاول پور اور جنوبی پنجاب کی مکس پلیٹ تیار کی جارہی ہے۔ حکومت نئے صوبے بنانے کی راہ پر یوں ٹھلتی گاتی گامزن ہوئی ہے جیسے یہ کوئی اشو تھا ہی نہیں اور اب تک خواہ مخواہ سرد خانے میں پڑا تھا! اِدھر اُدھر سے علاقے ملا کر نئے صوبے تشکیل دینے کی تیاری کی جارہی ہے اور اسٹیک ہولڈرز کو دعوتِ نظارہ دی جارہی ہے۔ بہ قول اقبال

بنتے ہیں مِری کارگہِ فکر میں انجم

لے، اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان!

جنہیں اپنے مقدر کے ستارے کی تلاش ہے وہ تو

جو مل گیا اُسی کو مقدر سمجھ لیا

کے مصداق خوش اور مطمئن ہیں۔ جاتی ہوئی حکومت سے جو کچھ بھی مل جائے اُسے بھاگتے چور کی لنگوٹی سمجھ کر "آمنّا وصَدَقنا" کی گردان کے ساتھ قبول کیا

جارہا ہے! جن کی مُراد پوری ہو رہی ہے وہ سارے غم بھول کر حکومت کی جے جے کار کر رہے ہیں اور جن کے ارمانوں پر پانی پڑتا دکھائی دے رہا ہے وہ آہ وبُکا میں مشغول ہیں۔

تحریک صوبہ ہزارہ کے روح رواں بابا حیدر زمان نے ہزارہ صوبہ نہ بنائے جانے کی صورت میں سول نافرمانی کی دھمکی دے دی ہے۔ پیر کو اسلام آباد میں پریس کانفرنس کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ نئے صوبے کی آواز تو ہزارہ نے بلند کی مگر نوازا جارہا ہے بہاول پور اور جنوبی پنجاب کو۔ کہتے ہیں بڑھاپے میں انسان بچوں جیسا ہو جاتا ہے۔ بابا حیدر زمان میں بھی بچوں جیسی سادگی پھر فروغ پا گئی ہے۔ موصوف انتہائی سادگی سے کہہ گئے کہ نئے صوبوں کا قیام حکمرانوں کے مفاد میں ہے!

نئے صوبوں سے متعلق پارلیمانی کمیشن کا اجلاس پیر کو چیئرمین فرحت اللہ بابر کی صدارت میں پھر ہوا۔ جمعیت علمائے اسلام (ف) کے عبدالغفور حیدری نے اختلافی نوٹ لکھا۔ عوامی نیشنل پارٹی کے حاجی عدیل ہزارہ صوبے کے قیام کا بھی عندیہ دیئے جانے پر واک آؤٹ کر گئے! "تخت لہور" والے تو خیر اجلاس میں شریک ہی نہیں ہوئے! فرحت اللہ بابر نے اجلاس میں فرمایا کہ نئے صوبوں سے متعلق معاملات پوائنٹ آف نو ریٹرن پر پہنچ چکے ہیں۔ یعنی جیسا مانگو ویسا

!صوبہ آوے ای آوے

بہاولپور متحدہ محاذ کے سربراہ محمد علی دُرانی کہتے ہیں کہ بہاول پور کے ساتھ جنوبی پنجاب کو ضم نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ایسا کرنا دونوں علاقوں سے سنگین مذاق ہوگا۔ اگر دونوں کو ملا کر صوبہ بنایا گیا تو عوام سڑکوں پر آ جائیں گے۔ محمد علی درانی صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ عوام کو سڑکوں پر آنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی !کیونکہ حکومت کی مہربانی سے فٹ پاتھ پر تو وہ آ ہی چکے ہیں

سرائیکی اتحاد نے مجوّزہ "بہاول پور جنوبی پنجاب" (بی جے پی) صوبے کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ جنوبی پنجاب میں بہاول پور کا ٹانکا قبول اور برداشت نہیں کیا جائے گا! سرائیکی اتحاد نے یہ صراحت نہیں کہ اِس ٹانکے کے حوالے سے مخمل کون ہے اور ٹاٹ !کون قرار پایا ہے

اُدھر میانوالی اور بھکر میں مقامی تنظیمیں اپنے علاقوں کو مجوّزہ صوبے "بی جے پی" میں شامل کئے جانے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اِن علاقوں کو "بی جے پی" کے حوالے نہیں ہونے دیا جائے گا۔

تختِ لہور" کے حوالے سے بابر اعوان کے ہاتھوں غیر معمولی "شہرت" پانے والے"

وزیر اعلیٰ پنجاب محمد شہباز شریف کا کہنا ہے کہ بہاول پور اور جنوبی پنجاب کو ملا کر بنائے جانے والے صوبے کو آدھا تیتر، آدھا بٹیر ہی کہا جائے گا۔ وزیر اعلیٰ پنجاب غور فرمائیں کہ یہ اشتراک تو پھر بھی غنیمت ہے، پانچ برس سے ہم حکومت کے نام پر ایک ایسا سیٹ اپ رُو بہ عمل دیکھ رہے ہیں جو آں جہانی کشور کمار اور بھائی عمر شریف کے فارمولے کے تحت آدھا male اور آدھا female ہے!

کہیں سیکڑوں سائیکلیں کھڑی ہوں تو سب کو گرانے کے لیے ایک سائیکل کو گرانا کافی ہے۔ حکومت نے بھی مجوزہ صوبے "بی جے پی" کے ذریعے ایسی ہی کوشش کی ہے۔

اِک چراغ کیا جلا، سو چراغ جل گئے!

نگراں سیٹ اپ کیسا ہونا چاہیے، عام انتخابات کو کس طرح زیادہ سے زیادہ شفاف بنایا جاسکتا ہے، پانچ برسوں کے دوران جو کچھ کیا اُس کا جائزہ عوام کے سامنے کس طرح پیش کیا جائے .... یہ تمام اُمور بالائے طاق رکھ کر ایک بار پھر ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک دیا گیا ہے۔ سینیٹ اور قومی اسمبلی کے آخری سیشن میں آنے والے سیٹ اپ کا خاکہ تیار کرنے پر توجہ دینے کے بجائے صوبوں کی تشکیل کے ذریعے ووٹ بینک ہتھیانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

کم و بیش تین عشروں سے بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) نے بھارتی اور پاکستانی مسلمانوں کا لہو پیا ہے۔ بھارتی وزیر داخلہ اور سیکریٹری داخلہ نے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) اور بی جے پی پر دہشت گردی کے تربیتی کیمپ چلانے اور دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہونے کا الزام عائد کرکے ہماری کچھ اشک شُوئی کی کوشش کی ہے تو خیر سے پاک سرزمین ہی پر "بہاول پور جنوبی پنجاب" کے ذریعے "بی جے پی" کا شوشا چھوڑا جارہا ہے! ڈر یہ ہے کہ اسٹیک ہولڈرز کا ردِ عمل کہیں "اسٹِیک ہولڈرز" کو نہ جگادے!

بیان بازار کے رنگا رنگ اسٹال

2004 میں ریلیز ہونے والی فلم "ٹرمنل" میں ٹام ہینکس نے ایک ایسے شخص کا کردار ادا کیا تھا جو کسی قانونی پیچیدگی کے باعث ایک ایئر پورٹ پر پھنس کر رہ جاتا ہے اور اُس کے بہترین سال اِس عجیب صورتِ حال کی نذر ہو جاتے ہیں۔ جنوبی امریکا کے ملک چلی کے دارالحکومت سانتیاگو کے ایئر پورٹ پر ایک ہسپانوی باشندہ اِسی طرح پھنسا ہوا ہے۔ راڈریگو بین لیزل اپنے رشتہ داروں کا کوئی جھگڑا نمٹانے چلی آیا۔ وہ معاملہ تو اٹکا ہی رہا، خود راڈریگو وطن واپس نہ جاسکا اور آٹھ ہفتوں سے ایئر پورٹ پر پھنسا ہوا ہے۔ پیسے ختم ہو جانے کے باعث اُس کی حالت قابلِ رحم ہے۔ کھانا بھی مشکل سے ملتا ہے۔ کچرے کے ڈبے سے وہ سگریٹ نکال کر پیتا ہے۔

ہم سب بھی شاید حالات کے ٹرمنل میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ آگے جانے کی اجازت ملتی ہے نہ پیچھے جانے کی۔ "جیسا ہے، جہاں ہے" کی بنیاد پر زندگی بسر ہو رہی ہے۔ معاملات کب کے درست ہو جائیں مگر کوئی نہ کوئی قانونی مُوشگافی معاملات کو اُلجھاتی ہی چلی جاتی ہے۔

متوقع انتخابات جوں جوں قریب آ رہے ہیں، حالات کو اپنے حق میں کرنے سے متعلق اہل سیاست کی کوششیں بھی وسعت اختیار کرتی جارہی ہیں۔ میڈیا کا دامن بھی بہت وسیع ہے جس میں سبھی کو جگہ مل جاتی ہے۔ اگر کوئی مناسب کوریج نہ مل پانے کا شکوہ کرے تو سوشل میڈیا کا پلیٹ فارم حاضر ہے۔

ایک طرف طاہرالقادری سے مذاکرات کا ڈراما چل رہا ہے اور دوسری طرف حکومت بظاہر سپریم کورٹ سے ٹکرانے کی تیاری کر رہی ہے۔ شُنید ہے کہ نیب کے چیئرمین ایڈمرل (ر) فصیح بخاری کی طرف سے صدر آصف زرداری کو بھیجے جانے والے خط کی بنیاد پر سُپریم کورٹ کے خلاف ریفرنس لانے پر غور کیا جارہا ہے! شاید قسم کھالی گئی ہے کہ صورتِ حال کو اُلجھانے میں کوئی بھی کسر اُٹھا نہ رکھی جائے گی۔

چوہدری شجاعت حسین اب تک بضد ہیں کہ میلہ طاہرالقادری نے لوٹ کر لے گئے۔ اور یہ کہ متحدہ اور تحریک انصاف کو ممکنہ طور پر شدید پچھتاوے کا سامنا ہوگا! طاہرالقادری کا سیاسی قد مزید بلند کرنے کے لیے ق لیگ کے سربراہ یہ بھی کہتے سُنے گئے کہ حکومت اُنہیں ویٹو پاور نہیں دے رہی! چوہدری صاحب کو شاید حکومت نے یہ ٹاسک دے دیا ہے کہ انتخابات سے قبل کی سیاست میں قادری فیکٹر کو ہر قیمت پر زندہ رکھنا ہے! ہمیں حیرت اِس بات پر ہے کہ سیاست کا

میلہ ابھی جاری ہے تو لُوٹنے کا کریڈٹ طاہرالقادری کی زنبیل میں کیسے ڈالا جاسکتا ہے! اِس میلے میں سارے کرتب اور تماشے ابھی سامنے کہاں آئے ہیں؟ سارے مداری موقع کی مناسبت سے اپنی اپنی کاری گری کا کمال دکھاکر داد پارہے ہیں۔ شائقین متوجہ رہیں، ابھی بہت کچھ ہے جس پر سے پردہ اُٹھایا جانا ہے!

☆ بیانات اور انکشافات کے میلے میں سب سے رنگا رنگ اسٹال وفاقی وزیر داخلہ رحمٰن ملک کا ہے جو کبھی حکومت کے مخالفین کو سردی اور سانپ سے ڈراتے ہیں اور کبھی عوام کو بُرے حالات کی "نوید" سُناتے ہیں! رحمٰن ملک کو اللہ نے ایسا "کمال" عطا کیا ہے کہ اچھی خبر بھی اُن کے لہجے میں ڈھل کر بُری معلوم ہونے لگتی ہے! کراچی کے حوالے سے وہ آئے دن خطرے کی گھنٹی بجاتے رہتے ہیں۔ موصوف نے کل یہ کہتے ہوئے کراچی کے حالات زدگان کو مزید بدحواس کردیا کہ شہر میں جلد گھمسان کی دہشت گردی ہونے والی ہے! گھمسان کا لفظ اِس قدر "جامعیت" کے ساتھ شاید ہی کسی نے استعمال کیا ہو۔ پاکستان اور بھارت کی افواج میں شعور کی سطح اِس حد تک تو بلند ہوچکی ہے کہ اب وہ لڑنے بھڑنے سے گریز کرتی ہیں۔ ایسے میں "گھمسان" کے نشانے پر صرف عوام رہ گئے ہیں!

☆ زمانہ ما قبل انتخابات میں ہر معاملے کو منطقی یا غیر منطقی حد تک

پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ناصر کاظمی مرحوم نے کہا تھا۔

آئے ہیں اِس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں!

بس کچھ ایسی ہی کیفیت ایفیڈرین کیس کے حوالے سے بھی پیدا ہوئی ہے۔ راولپنڈی میں انسدادِ منشیات کی خصوصی عدالت نے ایفیڈرین کیس میں سابق وزیر اعظم کی اہلیہ فوزیہ گیلانی، ان کے صاحبزادے علی موسیٰ گیلانی، مخدوم شہاب الدین اور خوشنود لاشاری کے اثاثے منجمد کرتے ہوئے اُنہیں حکم دیا ہے کہ 12 فروری تک اپنی آمدن کے ذرائع بتائیں۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ چاروں ملزمان کے "معلوم" اثاثے کتنے ہیں جنہیں منجمد کیا گیا ہے۔ عام طور پر بڑوں کے ٹیکس گوشواروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن سے زیادہ دولت تو بریانی کے ٹھیلے لگانے والوں کے پاس ہے!

☆ الیکشن کمیشن نے 46 نکاتی ضابطہ اخلاق جاری کرکے تمام زمینی حقائق سے یکسر نابلد ہونے کا بھرپور ثبوت فراہم کیا ہے۔ یہ نکات عجیب و غریب ہیں مثلاً صدر، وزیر اعظم، گورنرز اور وزرائے اعلیٰ انتخابی مہم میں حصہ نہیں لے سکیں گے، میڈیا پر دباؤ ڈالنے پر پابندی ہوگی، سرکاری خرچ پر کوئی بھی انتخابی تشہیر نہیں کرسکے گا، ہر امیدوار انتخابی اخراجات مخصوص اکاؤنٹ سے ادا کرے گا، جلسہ گاہ میں پولنگ ڈے پر اسلحے کی نمائش نہیں کی جاسکے گی،

انتخابی نتیجے کا اعلان کئے جانے پر فائرنگ ممنوع ہو گی وغیرہ وغیرہ۔ انتخابی ضابطہ اخلاق میں جو کچھ درج ہے اُسے پڑھ کر بچے بھی ہنسنے پر مجبور ہوں گے کیونکہ ٹی وی پر اس کے برعکس سیاسی ڈراما تو وہ بھی دیکھ ہی رہے ہیں! اب ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ بچے تو غیر سیاسی ہوتے ہیں!

☆ نئے صوبوں کی تشکیل کے معاملے پر صوبہ ہزارہ تحریک کے سربراہ بابا حیدر زمان نے پہلے تو سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا اعلان کرکے ہنسانے کی کوشش کی اور تان توڑی پارلیمنٹ پر۔ یعنی وہاں دھرنا دیا جائے گا۔ کراچی کے علاقے نارتھ ناظم آباد میں مین روڈ پر واقع مسجد فاروق اعظم میں غسل میت کا بھی اہتمام ہے۔ اس مسجد کے جس بیرونی کمرے میں مُردے نہلائے جاتے ہیں اُس کے باہر دروازے کے ماتھے پر مقام غسل میت" لکھا ہوا ہے۔ ہم جب بھی پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے دھرنا دینے کی" بات سُنتے ہیں تو یہ مسجد فاروق اعظم کا یہ کمرہ ذہن میں گھومنے لگتا ہے۔ جمہوری دور میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے کا علاقہ تو "مقام سیاسی غسل میت" میں تبدیل ہوتا جارہا ہے!

☆ اور اب آخر میں پنچ لائن کے لیے پارلیمنٹ ہاؤس کے بعد پی ایم ہاؤس چلتے ہیں۔ وزیر اعظم راجہ پرویز اشرف فرماتے ہیں کہ جمہوریت کے سوا کوئی بھی حکومتی نظام قبول نہیں کیا جاسکتا۔ ہم پہلے ہی اُن کے بیان پر شک کر رہے

تھے، رہی سہی کسر اُنھوں نے یہ کہتے ہوئے پوری کردی کہ فوج سمیت تمام ادارے
جمہوریت" کے تسلسل پر متفق ہیں! جو کچھ جمہوریت کے نام پر آٹھ دس برسوں میں"
ہوا ہے اُس سے کسی بھی ریاستی ادارے کو کیا پریشانی لاحق ہو سکتی ہے! عوام کا یہ حال
ہے کہ

!رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو

کمزور لمحات کا شکنجہ

جب معاشرے کھوکھلے ہو جاتے ہیں تو ہر کام جاگتی آنکھوں میں بسے ہوئے خوابوں کی مدد سے تکمیل تک پہنچنے لگتا ہے۔ ہر معاملہ اُمیدوں اور خوش گمانیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ لوگ محنت کو سات سلام کرکے صرف آسرے پر بیٹھے رہنے کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ اور جب یہ روش منطقی انجام سے دوچار کرتی ہے یعنی صرف اور صرف ناکامی ہاتھ آتی ہے تب سارا غصہ اُس پر اُتارا جاتا ہے جس پر بس چلتا ہے۔ یعنی موت کو گلے لگا کر قبر میں جو سویئے۔ اور اگر ایک قدم آگے گئے تو خود کو ختم کرنے سے قبل اہل خانہ کو بھی ختم کر ڈالا! جس زندگی کو سو جتن کرکے قابل رشک بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اُسی کو موت کے گڑھے میں دھکیلنا تمام مسائل کا حل ٹھہرتا ہے!

نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ جنہیں تنہائی مرغوب ہوتی ہے وہ پہلے تو مردم بیزار ہوتے ہیں اور پھر جینے سے بھی بیزار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اِس کا بنیادی سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دوسروں سے کٹ کر جینے والے اپنے خیالوں میں گم رہتے ہیں اور اُن کے دِل و دِماغ رفتہ رفتہ مایوسی کے سمندر میں ڈوبتے جاتے ہیں۔ یہ روش سوچ کو منفی کرتی جاتی ہے اور پھر کمزور لمحات تاک

میں رہتے ہیں۔ خود کشی کا فیصلہ کمزور لمحے ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی سے مشاورت کرکے دِل کا بوجھ ہلکا نہ کرنے اور زندگی کو صرف مسائل کا انبار گردانتے والوں کے گرد کمزور لمحات اپنا شکنجہ کَستے رہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ تنہائی کیا ہے؟ کیا کسی سے نہ ملنا اور اپنے آپ کو وقت دینا ہی تنہائی ہے؟ وسیع تر مفہوم میں تنہائی یہ بھی تو ہے کہ اِنسان بدلتے ہوئے وقت اور اُس کے ساتھ بدلتے ہوئے رُجحانات کا ساتھ نہ دے، اپنی علمی، معاشرتی اور معاشی سطح بلند نہ کرے۔ جو لوگ اپنے ماحول میں پنپنے والی تبدیلیوں کو نظرانداز کرتے رہتے ہیں وہ بھی تنہائی ہی کے تو اسیر کہلائیں گے!

فیصل آباد میں 55 سالہ پھل فروش قاسم ولد غلام مصطفٰی نے پہلی بیوی سے اٹھارہ سالہ بیٹے، دوسری بیوی اور اُس سے ہونے والے چار بچوں کو قتل کرکے خود کشی کرلی۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد یا انوکھا واقعہ نہیں۔ ملک بھر میں بہت سے لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی مسئلہ حل کی طرف نہیں جارہا تو دُنیا ہی سے جانے کو ترجیح قرار دیتے ہیں! لوگ کہتے ہیں کہ اپنی یا دوسروں کی زندگی ختم کرنے کے لیے جگر، بلکہ جگرا چاہیے۔ آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو خود کشی کو ایسا عمل سمجھتے ہیں جس کے لیے بڑا حوصلہ درکار ہے یعنی.

جو اپنی جان لے اُسے بھی خراج عقیدت پیش کیا جانا چاہیے ! حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑی بہادری زندہ رہنے اور ہر قسم کے ناموافق حالات کا سامنا کرنے میں مضمر ہے۔

آں جہانی پنڈت برج نرائن چکبستؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

مُصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کُھلتے ہیں
مُبارک بُزدِلوں کو گردش قسمت سے ڈر جانا
یہ سَودا زندگی کا ہے کہ غم اِنسان سہتا ہے
!وگرنہ ہے بہت آسان اِس جینے سے مَر جانا

پاکستانی معاشرے میں ایسے بے ہمت لوگوں کی کمی نہیں جو موت کو تمام مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ جب معاملات کسی طور سُلجھتے نظر نہیں آتے تو موت کو گلے لگا کر مشکلات کو بھی دفن کرنے میں عافیت سمجھی جاتی ہے۔

پولیس کا دعویٰ ہے کہ قاسم کو پہلی بیوی سے بڑے بیٹے اٹھارہ سالہ آصف اور دوسری بیوی تیس سالہ آسیہ کے مابین ناجائز تعلقات کا شبہ تھا۔ مالی مسائل اور دیگر پیچیدگیوں نے جلتی پر تیل چھڑکا اور قاسم نے دونوں کے ساتھ ساتھ سات سالہ مریم، چھ سالہ علی رضا، پانچ سالہ رابعہ اور ڈیڑھ سالہ عائشہ کو بھی قتل کرکے خودکشی کو بہترین !آپشن جانا

ہم واقعی عجیب قوم ہیں۔ زندگی خریدنے نکلتے ہیں اور موت کو مُرادوں کی ٹوکری میں ڈال لیتے ہیں! کئی زمانوں تک جن مسائل کو پنپنے دیا گیا ہو اُنہیں راتوں رات حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے ناکامی ہی تو ہاتھ آئے گی۔ اور جب ناکامی ہاتھ لگے تو زندگی کی بساط لپیٹنے میں دیر نہیں لگائی جاتی۔ ناکامی کی وجوہ پر غور کرنے کے بجائے صرف منفی سوچ کے آغوش میں بیٹھ کر شدید مایوسی کو گلے لگایا جاتا ہے۔ جب پُلوں کے نیچے سے پانی خاصا بہہ چکتا ہے تب ہوش آتا ہے۔ ایسے میں چونکہ اصلاح کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی اِس لیے معاملات کو لپیٹ کر قبر میں لیٹنے اور لِٹانے کا آپشن اپنایا جاتا ہے!

مُشکلات کی بلی کو دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کا وہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے جو قاسم کے کیس میں ہوا۔ مسائل حل کرنے کا یہ کوئی مثالی طریقہ نہیں۔ توجہ نہ ملنے پر پودے جیسا مسئلہ کچھ عرصے میں گھنا درخت بن کر ہمارے دِل و دِماغ میں جڑ پکڑ لیتا ہے۔ ہمارے ارد گرد بہت کچھ، بلکہ تقریباً سبھی کچھ ہر آن بدل رہا ہے۔ ہمیں اِس کے مطابق اپنے آپ کو بدلنا پڑتا ہے۔ نہیں بدلیں گے تو معاملات اُلجھتے جائیں گے۔ ہم میں سے بیشتر اِس خام خیالی کے اسیر رہتے ہیں کہ زندگی بس گزرتی جائے گی اور مسائل خود بخود حل ہوتے رہیں گے۔ مسائل کبھی حل ہوتے نہیں، اُنہیں حل کیا جاتا ہے! مسائل

کو نظر انداز کرکے ہم در حقیقت اپنے وجود کو پیچیدگیوں کی آماجگاہ بنانے پر تُلے رہتے ہیں۔ کسی بھی مشکل صورتِ حال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے گریز اور کبوتر کی طرح بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلینا چھوٹے مسائل کو بھی بحران میں بدل دیتا ہے۔

زندگی سے منہ موڑ کر موت کو گلے لگانے والے یہ بات تو ثابت کر ہی دیتے ہیں کہ اُنہیں اللہ سے کوئی اُمید نہیں تھی۔ یعنی خود کشی کی صورت میں جان کے ساتھ ساتھ ایمان سے بھی گئے۔ یہ کل تک کا رجحان تھا۔ اب عالم یہ ہے کہ خود کشی سے قبل اہل خانہ کو مُلکِ عدم روانہ کیا جاتا ہے! یعنی مرتے وقت بھی یہ فکر لاحق ہے کہ بعد میں اہل خانہ کو پیٹ بھر کھانا کیسے ملے گا! شیر خوار بچوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے والے یہ نہیں سوچتے کہ اُنہیں اُن کی ماں نے کتنی مشقت سے بڑا کیا تھا۔ یعنی اپنی ماں کی مشقت کو بھی ضائع کیا اور اپنی اولاد سے بھی زندہ رہنے کا حق چھین لیا! دُنیا میں بھی مِٹّی خراب اور آخرت بھی ذِلّت مقدر۔

سمجھنے اور سمجھانے کو بہت کچھ ہے۔ سامنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں تمام خواہشیں راتوں رات بار آور کرنے اور تمام مسائل پلک جھپکتے میں حل کرنے کی روش ترک کرنی ہوگی۔ زندگی سے حقیقی محبت کا ایک بنیادی تقاضا یہ بھی ہے کہ

چھوٹے بڑے تمام مسائل کے حل پر خاطر خواہ توجہ دی جائے۔ اور یہ سب کچھ اللہ پر مکمل بھروسے کے ساتھ ہونا چاہیے۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید "کسی دَھرنے" میں ملیں

خان صاحب گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ بھیڑ دیکھی۔ پوچھا کیا ہو رہا ہے۔ بتایا گیا ڈگریاں فروخت ہو رہی ہیں۔ پوچھا کیسی ڈگری۔ کسی نے بتایا گریجویٹ کی ڈگری۔ خان صاحب آگے بڑھے اور ڈگریاں فروخت کرنے والے سے کہا دو ڈگری دو۔ اُس نے پوچھا دو کیوں؟ خان صاحب بولے۔ "ایک ہمارا واسطے، ایک ہمارا گھوڑے کا واسطے۔ دنیا کو پتہ چلنا چاہے کہ گریجویٹ کے اوپر گریجویٹ بیٹھا ہے!"
وطن عزیز میں آجکل خان صاحب ہی کی منطق پر عمل ہو رہا ہے۔ ستم بالائے ستم کے مصداق دھرنا بالائے دھرنا کا موسم وارد ہو چکا ہے! جسے دیکھیے وہ دھرنے کے بخار میں مبتلا ہے۔ پچیس تیس سال قبل محترم اطہر شاہ خان (جیدی) نے ریڈیو اور ٹی وی پر ایک "سینگ مار" قسم کا شعر سُنایا تھا۔

جو بکرے نے مارا ہے بکری کے سینگ
تو بکری بھی مارے گی بکرے کے سینگ!

اہل سیاست بھی ایک دوسرے کو دھرنے کے سینگ چُبھونے پر تُل گئے ہیں اور جواز یہی ہے کہ طاہر القادری نے دَھرنا دیا تو ہم کیوں نہیں دے سکتے! لوگ کہتے

ہیں کہ طاہرالقادری کو پانچ سال بعد احتجاج کرنے کی کیوں سُوجھی۔ بھئی بات یہ ہے کہ وہ ملک میں تھے ہی نہیں۔ ہوتے تو کچھ کرتے۔

مسلم لیگ (ن) کو اچانک یاد آیا ہے کہ پانچ برس میں اور تو بہت کچھ (!) کرلیا، بس ایک دھرنا رہ گیا تھا سو دے لیتے ہیں۔ قوم حیران ہے کہ اب دَھرنا کیسا اور کیوں؟ ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کیا پانچ برس تک مسلم لیگ (ن) کو اُن سانپوں نے سُونگھ رکھا تھا جن کا ذکر کے رحمٰن ملک نے طاہرالقادری اینڈ پارٹی کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تھی! ویسے رحمٰن ملک مارکہ اسلام آبادی سانپ ہیں بہت چالاک۔ سیاست دانوں کو وہ صرف سُونگھتے ہیں اور عوام کو ڈستے رہتے ہیں!

مسلم لیگ (ن) سے لوگوں کو توقع تھی کہ حکومت کے عوام دشمن اقدامات کو سانپ سمجھ کر اُن پر نیولے کی طرح ٹوٹ پڑے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہوتا بھی کیسے؟ سیاسی سانپوں کی نفسیات پر اتھارٹی کا درجہ رکھنے والے ایک جوگی نے ایسا منتر پُھونکا کہ سانپ اور نیولے سبھی "مفاہمت" کی پٹاری میں بند ہوگئے! مفاہمت وہ جادو ہے جو ازلی دشمنوں کو بھی ایک کردیتا ہے، شیر بکری ایک گھاٹ پر پانی پینے لگتے ہیں اور کتے بلی کی دُشمنی بھی دم توڑ دیتی ہے!

طاہر القادری کی خیر ہو کہ اُنھوں نے آ کر احتجاج اور دھرنوں کے گھوڑے کو ایڑ لگائی ہے تو کچھ ہلچل ہوئی ہے اور سیاسی بازار میں دام کچھ اوپر نیچے ہوئے ہیں! دھرنوں کا فیشن ویک، بلکہ فیشن منتھ شروع ہوا ہے تو سبھی کے دِلوں میں دھرنا دینے کا ارمان مینڈک کی طرح پُھدک رہا ہے! سبھی کسی نہ کسی طرح، کہیں نہ کہیں دھرنا دینے کو بے تاب اور اُتاؤلے ہوئے جاتے ہیں۔

!ہائے کیا کیجیے اِس دِل کے مچل جانے کو

طویل نیند کے بعد صوبہ ہزارہ تحریک کے بابا حیدر زمان بھی جاگ اٹھے ہیں اور جاگتے ہی حکمرانوں کی نیندیں اُڑانے کے لیے سول نافرمانی کی تحریک اور پارلیمنٹ ہاوٴس کے !سامنے دھرنا دینے کی دھمکی صادر فرمائی ہے

ایک طرف مسلم لیگ (ن) نے اپوزیشن جماعتوں کو جمع کرنا شروع کیا ہے اور دوسری طرف بابا حیدر زمان جیسے آوٴٹ آف دی پارلیمنٹ ایکٹرز بھی میدان میں نکل آئے ہیں۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ طاہر القادری کے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔ اُن کا متعارف کرایا ہوا "دھرنا ٹرینڈ" مِل جُل کر ہائی جیک کیا جا رہا ہے! اِس صورتِ حال کو ویسے تو سبھی انجوائے کر رہے ہیں مگر میڈیا والے تو واقعی مزے لوٹ رہے ہیں۔ ایک طرف تو روزانہ نئے موضوعات ہاتھ لگ رہے

ہیں اور دوسری طرف ٹی وی چینلز کو آسان کوریج کا آپشن ہاتھ آگیا ہے! کامیڈی ڈراموں اور پروگراموں کا دستر خوان سجا کا سجا رہ جاتا ہے اور لوگ سیاست دانوں کی کامیڈی سے پیٹ بھر لیتے ہیں!

مسلم لیگ (ن) نے پانچ برسوں میں ہر بس مِس کی ہے۔ جب میلہ ختم ہونے پر آتا ہے تب یہ پارٹی اپنے کرتب دِکھانے کا سوچتی ہے۔ غور کیجیے، آخری لمحات میں بھی زور سوچنے" پر ہوتا ہے! اب سیاسی جماعتوں کو پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے دھرنے میں" شرکت کی دعوت دی جارہی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ میڈیا کی مارکیٹ میں اِس دھرنے کا بھاؤ بڑھانے کے لیے رحمٰن ملک نے اب تک سانپوں اور سردی سے ڈرایا بھی نہیں۔ ثابت ہوا کہ طاہرالقادری کے دھرنا کیس میں رحمٰن ملک غیر جانبدار نہیں تھے! مسلم لیگ (ن) نیولوں کے ساتھ تیار بیٹھی ہے تو وزیر داخلہ یہ ثابت کرنے پر تُلے ہیں کہ اسلام آباد میں کوئی سانپ ہے ہی نہیں! یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ اپوزیشن کے نیولوں کا بھی اِتنا تو استحقاق تو بنتا ہے کہ اُن کی کمپنی کی بھی تھوڑی بہت تو مشہوری" ہو"!

عوام کا بھی عجیب ہی مزاج ہے۔ یاران تیز گام تیزی سے دھرنا، بلکہ دھرنے دینے پر تُلے ہوئے ہیں اور یہاں یہ سوال داغا جارہا ہے کہ پانچ برسوں میں طرح طرح کے بحرانوں کے وارد یا نازل ہونے پر کوئی دھرنا کیوں نہیں دیا گیا!

آ ٹا، تیل، گھی، چاول، دودھ اور پتہ نہیں کیا کیا مہنگا ہوگیا، توانائی کا بحران جادو کی طرح سَر چڑھ کر بولتا اور ناچتا رہا مگر اپوزیشن کا "دھرنا ناگ" کِسی صورت مفاہمت کی پٹاری سے باہر نہ آیا! اب حکومت کی میعاد ختم ہونے کو آئی ہے تو پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے اوپن ایئر تھیٹر سجایا جارہا ہے۔ عوام کے ساتھ یہ بڑی مشکل ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھتے اور برداشت کرتے رہتے ہیں اُسی کو برداشت کرنے سے اچانک انکار کردیتے ہیں! حکمرانوں اور اپوزیشن دونوں کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اُنہیں عوام کی پسند و ناپسند کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔ اگر وہ بحران کو ابتدائی مرحلے میں مسترد کردیا کریں تو حکمرانوں کے لیے مارکیٹ میں نیا مال متعارف کرانا آسان ہو جائے! اب یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ایک دو نہیں، پورے پانچ برس تک کسی چیز کو برداشت اور ہضم کیا جائے اور جب حکومت وہ چیز پیش کرتے رہنے کی عادی ہو جائے تو اُسے مسترد کرکے نئے آئٹم مانگے جائیں!

اب مَنّت مُرادوں سے دھرنوں کا سیزن آیا ہے تو اُسے انجوائے کرنے کے بجائے عوام مائل بہ اعتراض ہیں۔ حکومت خاصی ڈراؤنی فلم کو تھوڑا سا ہیپی اینڈ دینا چاہتی ہے تو اُس کی راہ میں روڑے اٹکانا اچھی بات نہیں۔ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ انتخابات سے قبل اپوزیشن ایک آدھ اوٹ پٹانگ دھرنا دے اور حکومت اُسے روکنے کی اداکاری کے نام پر ذرا سی کامیڈی کا ارتکاب کرے تو اِس

میں ہرج ہی کیا ہے ! پانچ سالہ جمہوری فلم ڈراؤنی تھی تو کیا ہوا، دی اینڈ میں تو سب ہنستے گاتے نظر آنے چاہئیں جیسے پارلیمنٹ کے ارکان الوداعی فوٹو سیشن میں خوش و خرم دکھائی دیئے !

کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے!

نوحہ غم ہی سہی، نغمہ شادی نہ سہی

خوشی کی تلاش میں زیادہ بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ خوشیاں تو غموں کے انبار میں بھی مل سکتی ہیں۔ مُشکلیں جب حد سے بڑھ جاتی ہیں تو آسانیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو ذرا اِس بات پر غور فرمایئے کہ بہت سی ادویہ سانپ کے زہر سے بھی تیار کی جاتی ہیں۔ ویسے سانپ کا زہر اپنی اصل شکل میں بھی دوا ہی ہے۔ بہتوں کو سانپ ڈس کر زندگی کے تمام مصائب سے چھٹکارا دِلا دیتا ہے، بیماری جیسی زندگی کو دوا مل جاتی ہے! مگر خیر، ہم زہر سے تیار کئے جانے والے تریاق کی بات کر رہے ہیں۔

ہر اُلجھن میں سُلجھن بھی مضمر ہوتی ہے۔ ضرورت صرف اُس نظر کی ہے جو شے کی حقیقت کی پہچاننے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔ غالب نے کہا ہے۔

مُشکلیں مُجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہو گئیں!

اِسی کیفیت کو اُنہوں نے یوں بھی بیان کیا ہے۔

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا!

اہل وطن بھی اب کچھ ایسی ہی کیفیت میں جی رہے ہیں۔ جب کسی رنج کو ختم ہونا

ہی نہیں اور اُسی کے ساتھ جینا ہے تو پھر کیوں نہ اُسے گلے لگایا جائے، اپنالیا جائے؟
کیونکہ
!رنج سے خوگر ہوا اِنساں تو مٹ جاتا ہے رنج
حالات نے تبدیل نہ ہونے کی قسم کھالی ہے۔ حالات یہ روش دیکھتے ہوئے پاکستانیوں نے بھی رنج و غم سے مسرت کشید کرنے اور زہر سے دوا تیار کرنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ قناعت پسندی تو اب رہی نہیں۔ ایسے میں "قنات پسندی" ہی کو گلے لگانا زندگی کا مقصد ٹھہرا ہے! جسے دیکھیے وہ کسی نہ کسی طور ہر معاملے سے مسرت کشید کرنے پر کمربستہ ہے۔ کل تک حالت یہ تھی کہ لوگ کسی بھی پریشانی کے نازل ہوتے ہی اُلجھ جایا کرتے تھے۔ رات دن کوئی نہ کوئی فکر ذہن کو دامن گیر رہتی تھی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اور زمانے کا چلن بھی۔ اہل وطن نے سوچ لیا ہے کہ ہر طرح کی صورتِ حال میں پریشانی اور بدحواسی کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دیں گے۔ اِس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ پریشانی کو پریشانی سمجھا ہی نہ جائے۔ فائرنگ کی آواز سے خوف اُسی وقت محسوس ہوگا جب آپ خوف محسوس کریں گے۔ ہر دُکھ محسوس کئے جانے اور دُکھی ہونے تک ہے۔ جہاں آپ نے الجھنوں، پریشانیوں اور مسائل کو منہ لگانا یعنی اہم سمجھنا ترک کیا، سمجھ لیجیے اُن کا !وجود ہے ہی نہیں

قدم قدم پر مسائل کا سامنا کرنے والے رفتہ رفتہ ہر مسئلے کو زندگی کے پیکیج کا لازمی حصہ سمجھ کر قبول کرنے لگتے ہیں۔ پاکستانی قوم کا بھی یہی حال ہے۔ چھ عشروں کے دوران جو کچھ اِس قوم نے دیکھا ہے اُسی کو زندگی سمجھ کر اب اُس کے ساتھ بخوشی جی رہی ہے۔ یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آسکے۔ جن کے مقدر میں خوشیاں نہیں ہوتیں وہ غم کو بھی خوشی میں ڈھال لیتے ہیں۔ اُن کے پاس اِس سے اچھا آپشن ہوتا بھی تو نہیں۔ ہم اُس مقام پر ہیں جہاں ہر معاملے میں دو یکسر متضاد کیفیتیں ایک ہو جاتی ہیں۔ قوم کی بوالعجبی یہ ہے کہ کل تک جن حالات کو دیکھ کر یا جن کے بارے میں سوچ کر دل و نظر پر گھبراہٹ طاری ہونے لگتی تھی اب اُنہی حالات میں دل بستگی کا سامان تلاش کیا جاتا ہے! فائرنگ سے اب گھبراہٹ طاری نہیں ہوتی بلکہ جسم و جاں میں thrill سی پیدا ہوتی ہے! جینا مرنا تو لگا ہی رہتا ہے۔ خاندان میں کسی کی "فوتیدگی" واقع ہو تو میت کے اجتماع کو بھی لوگ مل بیٹھنے کا ذریعہ وہ بہانہ بنالیتے ہیں! اور سچ تو یہ ہے کہ اب لوگ اگر ڈھنگ سے مل پاتے ہیں تو صرف میت میں! تدفین صبح گیارہ بجے بھی ہو تو لوگ مغرب کے بعد سے میت کے گھر پہنچنے لگتے ہیں کہ حاضری بھی لگ جائے گی اور ڈھنگ سے ملنا ملانا بھی ہو جائے گا!

وہ زمانے ہوا ہوئے جب حالات کی خرابی کے باعث مایوسی میں ڈوب کر لوگ پژمُردہ ہو جایا کرتے تھے۔ ایسا کرنے کا، ظاہر ہے، کوئی فائدہ تو تھا نہیں اِس لیے لوگوں نے ہر طرح کی صورتِ حال کو انجوائے کرنا شروع کردیا ہے! ہر معاملے سے تفریح کشید کرنے کی روش ایسی مستحکم ہوگئی ہے کہ اب کسی بھی معاملے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ پوری کوشش کی جاتی ہے کہ ہر غم کو اچھی طرح نچوڑ کر آخری بوند تک سے مسرت کشید کرلی جائے! الم نصیب طبیعت خوشیوں کو تلاش کرتے کرتے اِس مقام پر آ گئی ہے کہ ہر معاملے میں گھر کے لیے رونق ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ اور اِس کے لیے کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضروری ہوتا ہے۔ یعنی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
!نوحہ غم ہی سہی، نغمہ شادی نہ سہی

خواتین کو کنٹرول کرنے والا لفظ

معروف افسانہ نگار علی عباس حسینی نے لکھا تھا کہ لفظ "ماموں" میں ایسی مٹھاس ہے کہ سانپ کو بھی ماموں کہیں تو نہیں ڈستا! افسانہ نگار واقعی جادوگر ہوتے ہیں، الفاظ کی مدد سے سماں باندھ دیتے ہیں۔ علی عباس حسینی نے جو لکھا ہے وہ ہم نے، آپ نے تو پڑھ لیا مگر سانپوں نے نہیں پڑھا۔ سانپ کے آگے لفظ "ماموِں" کی مٹھاس آزمانے کی کوشش کبھی مت کیجیے گا!

کون نہیں چاہے گا کہ دوسروں کی نفسیات پر اثر انداز ہونے والے الفاظ تلاش کرے اور پائے؟ اِس معاملے میں اخبار نویس یعنی رپورٹرز غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں۔ پریس کانفرنس میں وہ ایسے الفاظ ضرور زبان پر لاتے ہیں جو مائکروفونز کے سامنے بلا تکان بولنے والے سیاست دانوں کو لٹو لگاتے ہیں! مثلاً رحمٰن ملک کے سامنے طاہر القادری اور نواز شریف کے سامنے پرویز مشرف کا نام لیجیے اور پھر بولنے کی بہار دیکھیے!

طاہر القادری کے سامنے "تختِ لاہور" کی شان میں کچھ کہیے اور پھر تحریک منہاج القرآن کے سربراہ کی خطیبانہ شان ملاحظہ فرمائیے!

ہم کہاں اور علی عباس حسینی کہاں ! مگر پھر بھی ساہنپ اور ماموں کی طرز پر ہم نے بھی تھوڑی بہت کوشش کی اور ایک ایسا لفظ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے جو خواتین کے لیے غیر معمولی مٹھاس ہی نہیں رکھتا بلکہ اُنہیں کنٹرول کرنے کے بٹن کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے!

خواتین کو رام کرنا ہو یا اشتعال دلانا ہو، صرف ایک لفظ استعمال کیجیے اور پھر تماشا دیکھیے۔ "فیشن" وہ لفظ ہے جسے سُن کر بیزار سی بیٹھی ہوئی خواتین آن کی آن میں متحرک ہو جاتی ہیں اور اگر غُصّے سے بھری ہوئی ہوں تو ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں ! یہ ایک لفظ اُن کے دِل و دِماغ کی دُنیا کو ایسا پلٹ کر رکھ دیتا ہے کہ پھر تادیر سیدھا نہیں ہونے دیتا!

بیشتر خواتین مردوں کے مظالم کا راگ الاپتی ہوئی ملتی ہیں مگر حقیقت کچھ یوں ہے کہ جتنے مظالم فیشن نے خواتین پر ڈھائے ہیں اُتنے مظالم ڈھانے کا تو مَرد سوچ بھی نہیں سکتے ! اور ویسے بھی گرہستی چلانے کی فکر میں غلطاں رہتے رہتے وہ بے چارے کچھ سوچنے کے قابل رہے کب ہیں؟ کہانی کا سب سے دلچسپ موڑ یہ ہے کہ فیشن کے نام پر خواتین اپنے لیے طرح طرح کے سِتم ایجاد ہی نہیں کرتیں، اُنہیں بخوشی گلے بھی لگاتی ہیں ! ممکن ہے خواتین کی یہ روش دیکھ کر ہی ججوں نے "از خود نوٹس" کو پریکٹس کا حصہ بنایا ہو!

خواتین نہ ہوں تو فیشن کے بازار میں تالا بندی ہو جائے، بلکہ لفظ "فیشن" کے استعمال کا فیشن ہی دم توڑ دے! اِس ایک نامُراد لفظ نے ایسا اندھیر مچا رکھا ہے کہ خواتین بے چاری پریشان ہی رہتی ہیں کہ فیشن کے معاملے میں کس کی مانیں، کس کی نہ مانیں۔ میر تقی میر کہہ گئے ہیں۔

مُستند ہے میرا فرمایا ہوا

مگر خواتین کسی میر ویر کو نہیں جانتیں۔ اُن کے لیے تو صرف وہی مُستند ہے جو فیشن

!نے فرمایا ہو

آج تک یہ طے نہیں ہو پایا کہ خواتین فیشن کی زیادہ دلدادہ ہیں یا فیشن خواتین کا زیادہ غلام واقع ہوا ہے! یوں کبھی کبھی تو یہ طے کرنا بھی انتہائی دُشوار ہو جاتا ہے کہ خواتین فیشن کے مطابق چلتی ہیں یا فیشن خود خواتین کے نقشِ قدم پر گامزن رہتا ہے! اِس اعتبار سے دیکھیے تو ہر جورو کے دو غلام ہوتے ہیں۔ ایک تو ہوتا ہے وہ غلام جو واقعی جورو کا

!غلام ہوتا ہے، اور دوسرا غلام ہوتا ہے فیشن

بات جب ضد کی آ جائے تو پھر کوئی اگر دُنیا کی بہترین مٹھائی بھی لائے تو

شاید نہ کھائیں مگر فیشن کے نام پر خواتین تسلیم شدہ زہر بھی بہ خوشی حلق سے اُتار لیتی ہیں! فیشن کی لاج رکھنی ہو تو خواتین اپنے لیے سُولی بھی خود منتخب کریں اور بخوشی لٹک جائیں!

جس طرح رحمٰن ملک کے پاس الزام دَھرنے کے لیے دہشت گردوں کے نام ختم نہیں ہوتے بالکل اُسی طرح خواتین کے مزاج کی زنبیل میں فیشن کا خزانہ ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا!

نزلے سے بال زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ فیشن کے نزلے کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ فیشن کا نزلہ سب سے زیادہ ہیئر اسٹائل پر گرتا ہے۔ خواتین کے سَروں پر کبھی تو بال چڑیوں کے گھونسلے کی سی شکل اختیار کرتے ہیں اور کبھی ایسے سیدھے ہوتے ہیں جیسے سڑک پر تازہ کارپیٹنگ کی گئی ہو! کبھی بال آپس میں ایسے اُلجھے ہوئے ہوتے ہیں جیسے "ملاکھڑا" ہو رہا ہو! کبھی ایسے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں جیسے ہیلمٹ کے بغیر تیس چالیس کلومیٹر موٹر سائیکل چلائی ہو! کبھی بال ایسے ملائم دِکھائی دیتے ہیں جیسے گڑیا کے بال اور کبھی ایسے سخت کہ کنگھی اور برش کے لیے جی کا جنجال!

فیشن کے رونق میلے میں سب سے عجیب و غریب اسٹال لیڈیز ٹیلرز نے لگائے یا

لگوائے ہیں! خواتین کے ملبوسات تیار کرنے والے بیشتر درزی خاصے ستم ظریف واقع ہوئے ہیں۔ فیشن کے نام اُول جلُول قسم کے ملبوسات تیار کرکے اچھی خاصی خواتین کو جوکر" بناکر دم لیتے ہیں! یہی سبب ہے کہ شادی کی تقاریب میں خواتین کا پورشن" دُور سے سرکس کا سماں پیش کر رہا ہوتا ہے! خواتین کے بہت سے ملبوسات کی ڈیزائننگ" دیکھ کر ہمیں درزیوں کے "ایول ڈیزائنز" کا اندازہ ہوتا ہے! کبھی کبھی" ہمیں خواتین پر ترس بھی آتا ہے کہ مَردوں کی طرف سے انتقام لینے کی کوشش میں درزی بہت آگے نکل جاتے ہیں! شلوار کے پائنچے اگر غلطی سے چوڑے یا لمبے ہو جائیں تو درزی صاحبان یہ کہتے ہوئے خواتین کو بے وقوف بناتے ہیں کہ "باجی! آج کل یہی فیشن چل رہا ہے۔ آپ کے پڑوس والی سلمٰی نے بھی تو اِسی طرح کے پائنچے بنوائے ہیں!" فیشن کے ساتھ ساتھ خواتین کو پڑوسن کے نام پر بھی پتہ نہیں کیا کیا جھیلنا پڑتا ہے!

کونٹراسٹ" کے نام پر عجیب و غریب رنگوں کو آپس میں اُسی طرح مِلایا جاتا ہے جس" طرح گن پوائنٹ پر نکاح کرایا جاتا ہے! لیڈیز کپڑے کے پرنٹ ویسے ہی اچھے خاصے ستم ظریف ہوتے ہیں اور اُن کا اِنٹ شنٹ کومبی نیشن تو واقعی ستم بالائے ستم کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے!

کبھی کبھی کوئی ایسا فیشن بھی چلتا ہے کہ لڑکیاں اُونچے پائنچوں کی شلواریں

پہنی پھرتی ہیں۔ کوئی دور سے دیکھے تو یہ سمجھے کہ شاید بارش ہو رہی ہے! اور اگر فیشن لٹکتے ہوئے پائنچوں کا چل رہا ہو تو سڑک پر بارش کا پانی بھی کھڑا ہو تو لڑکیاں پائنچے اُٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتیں! ایسے میں پائنچوں کو گندا ہونے سے بچانے کے لیے وہ خاصی اونچی ایڑی کی سینڈل پہنتی ہیں، اب چاہے ایسی سینڈل پہن کر چلنے سے پورے جسم کی چُولیں ہی کیوں نہ ہل جائیں!

بعض انتہائی فیشن زدہ خواتین کا لباس اِس قدر رنگا رنگ ہوتا ہے کہ لوگ رُکنے کا اشارہ کردیتے ہیں اور جب خاتون قریب آکر آگ بگولا ہوتی ہیں تو معافی مانگتے ہوئے کہنا پڑتا ہے۔ "بہن! معاف کرنا، میں سمجھا تھا ڈبلیو گیارہ آ گئی ہے!

ترقیاتی "دَھنصوبے"

کون ہے جو ترقی نہیں کرنا چاہتا؟ معاملہ افراد تک محدود نہیں۔ قومیں بھی ترقی کرنا چاہتی ہیں، اِسی لیے تو ترقیاتی منصوبے بجٹ کا حصہ بنائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ترقیاتی منصوبوں کے لیے بجٹ کا ایک معقول حصہ مختص کیا جاتا ہے۔ اور اِن منصوبوں کے مطلوبہ نتائج بہت حد تک سامنے بھی آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ یہ سوچیں کہ ترقیاتی منصوبوں سے قوم کو کیا ملتا ہے؟ قوم افراد سے مل کر بنتی ہے۔ افراد کی ترقی ہی تو مجموعی طور پر قومی ترقی کہلاتی ہے۔ ہماری حکومت نے یہ بات سمجھ لی، مگر آپ اب تک سمجھ نہیں پا رہے! ترقیاتی منصوبے اگر چند افراد کے لیے "دَھنصوبے" ہیں یعنی اُن پر دَھن کو دَھنادَھن برسا رہے ہیں تو اِسے بھی قومی ترقی ہی سے تعبیر کرنا چاہیے کہ وہ افراد بھی تو قوم ہی کا حصہ ہیں! کچھ لوگ سرکاری وسائل سے اپنی ترقی یقینی بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو سراہنے کے بجائے قوم اُن پر تنقید کرنے لگتی ہے! یہی ہوتا رہا تو "ترقی" کا جذبہ ماند پڑتا جائے گا! اِس موقع پر ہمیں گاڑیوں کے پیچھے لکھا ہوا ایک جملہ یاد آ رہا ہے کہ "محنت کر، حسد نہ کر!" اور کون نہیں جانتا کہ کرپشن کے لیے بھی محنت تو کرنی ہی پڑتی ہے!

جب کسی شہر کو ترقی دی جاتی ہے تو چند مشکلات بھی پیدا ہوتی ہیں۔ آپ سوچیں گے ترقی سے کیسی مشکلات؟ پہلی تو آپ نے اوپر ملاحظہ فرمائی۔ یہی کہ چند لوگ تیزی سے ترقی کر جاتے ہیں اور ہم اُنہیں کوستے رہ جاتے ہیں! اور پھر یہ دیکھیے کہ ترقیاتی عمل سے شہر کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ جن چیزوں کو ہماری آنکھیں عشروں سے دیکھنے کی عادی رہی ہیں وہ مٹ جاتی ہیں۔ ایک عشرے کے دوران کراچی میں ترقیاتی منصوبے اِتنی تیزی سے مکمل کئے گئے ہیں کہ شہر کا حُلیہ بدل گیا ہے اور لوگ اپنے ہی شہر میں اجنبی سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ کراچی جیسے شہر میں کہیں نہ کہیں ترقیاتی کام چل ہی رہا ہوتا ہے۔ اور اِس ترقی میں شہری بھی بھرپور حصہ ڈال رہے ہوتے ہیں یعنی تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں! دُکھ صرف اِس بات کا ہے کہ متعلقہ محکموں نے تکلیف دینے کے معاملے میں سادہ و عالمگیر اخلاقی اُصول بھی نظر انداز کر دیئے ہیں۔ ترقیاتی منصوبوں کے لیے سڑک کھودنے میں کوئی قباحت نہیں۔ سڑک کُھدے گی نہیں تو دوبارہ بنانے کے نام پر کھانے کمانے کا موقع کیسے ملے گا؟ مگر صاحب! جی بھر کے پیٹ بھرنے کے بعد گڑھوں کو بَھرنے پر بھی تو توجہ دی جانی چاہیے! بعض مقامات پر گڑھوں کو اِس طرح بَھرا جاتا ہے کہ چھوٹی موٹی پہاڑی سی بن جاتی ہے۔ اِس پر سے موٹر سائیکل یا کار گزارنے کے لیے لازم ہے کہ آپ نے سرکس میں کام کرکے کرتب باز کی حیثیت سے شہرت بٹوری ہو! گڑھے کو بَھرنے کے بعد مٹی ڈھنگ سے لیول نہ کی گئی ہو تو کبھی کبھی دُور سے دیکھنے پر تازہ قبر کا گمان ہوتا ہے اور

!لوگ خواہ مخواہ عقیدت سے سَر جُھکائے گزرنے لگتے ہیں

ویسے تو ہر سال جب بجٹ پیش کئے جانے میں کچھ دن رہ جاتے ہیں تو بچے کھچے فنڈز کو خاصی عُجلت میں ٹھکانے لگایا جاتا ہے مگر جب حکومت کی میعاد ختم ہونے لگتی ہے تو اَدھورے منصوبوں کو جلد از جلد "تکمیل" کی منزل تک پہنچانے یعنی ٹھکانے لگانے کی زیادہ فکر لاحق ہوتی ہے تاکہ اِس تیزا تیزی میں فنڈز کا ایک (اور یقیناً بڑا) حصہ ڈکار لیا جائے! فنڈز کو ٹھکانے لگانے کے لیے کہیں کہیں اِتنی بے دردی سے کُھدائی ہو رہی ہوتی ہے کہ لگتا ہے کوئی قدیم شہر دریافت کرنے کی کوشش جارہی ہے! آثارِ قدیمہ کا محکمہ چاہے تو کسی بھی جاتی ہوئی حکومت کا سہارا لیکر کئی اہم تاریخی سائٹس پر تیزی سے !کُھدائی کرا سکتا ہے

ترقیاتی منصوبوں کا سب سے بڑا کمال صرف یہ نہیں ہے کہ اِنھوں نے چند افراد کو ملک کے مالدار ترین لوگوں میں شمار کئے جانے کے قابل بنادیا ہے بلکہ شہر کو بھی کچھ سے کچھ بنا ڈالا ہے۔ مختلف علاقوں کا نقشہ کچھ ایسا بدلا ہے کہ
!پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی ....

کراچی کسی زمانے میں چورنگیوں کا شہر ہوا کرتا تھا۔ لوگ چورنگیاں گھوم کر آگے بڑھنے کے عادی تھے۔ یہ چورنگیاں ڈیٹنگ اسپاٹ کا کردار بھی ادا کیا کرتی تھیں ! اب ڈیٹنگ کے لیے جدید طور طریقے رائج ہو چکے ہیں۔ اور سگنل فری کلچر میں ٹریفک سگنلز کی طرح چورنگیوں کی بھی گنجائش نہیں رہی ! دِل کشادہ ہوں نہ ہوں، سڑکوں کو زیادہ سے زیادہ کشادگی بخشنے کی تیاریاں جاری رہتی ہیں۔ اِس مقصد کے تحت چورنگیاں توڑی جارہی ہیں۔ کہیں تو حالت یہ ہے کہ چورنگی توڑ دیئے جانے کے باعث لوگوں کو اندازہ نہیں ہو پاتا کہ وہ کس طرف سے آئے ہیں اور کس طرف کو جانا ہے ! اب اگر کوئی صاحب موٹر سائیکل پر بیگم کو بٹھائے کہیں شادی میں شرکت کے لئے جارہے ہیں تو چار چھ کلومیٹر آگے جاکر اُنھیں خیال آتا ہے کہ غلط سڑک پر نکل آئے ہیں۔ یعنی

نکلے تھے کہاں جانے کیلیے، پہنچے ہیں کہاں معلوم نہیں !

واپس جاکر جب مطلوبہ شادی ہال تک پہنچتے ہیں تو مین گیٹ پر میزبان شکوہ کرتا ہے۔

"اب آئے ہیں آپ ؟ نکاح کب کا ہو چکا ہے، اب تو کھانا بھی اسٹارٹ ہونے والا ہے ! یہاں تک آنے میں تو دیر لگادی مگر اب کھانے کی میز تک پہنچنے میں دیر مت لگایئے گا۔"

کہیں کہیں تو چورنگی ختم کئے جانے پر لوگ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ جس پر

اُنھیں آگے بڑھنا ہے وہ راستہ کس طرف سے نکلتا ہے اور پھر وہ چورنگی کے چکر کاٹنے لگتے ہیں۔ تیسرے چکر پر پولیس روک کر ارادے معلوم کرنے لگتی ہے!

عوام کو شہر کی ترقی دیکھ کر بھی خوش ہونا چاہیے کہ وہ خود بھلے ہی ترقی نہیں کرسکے، شہر تو ترقیاتی عمل سے گزر رہا ہے اور اِس بہانے چند افراد پست معیار کی زندگی کے کنویں سے نکلنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اگر کبھی زمانہ واقعی ترقی کرگیا تو عوام بھی تھوڑی بہت ترقی کر ہی لیں گے! اِس کے لیے سوچ بدلنے کی ضرورت ہے۔ لوگ ترقی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں۔ ہمیں یاد ہے جب ہم اسکول کے زمانے میں کسی نہ کسی طرح ترقی کے قابل ہو جاتے تھے یعنی "ترقی پاس" قرار پاتے تھے تو لوگ حسد کے مارے مذاق اُڑاتے تھے! بہت چھوٹی عمر ہی سے ہمیں اندازہ ہوگیا تھا کہ لفظ ترقی لوگوں کو پسند نہیں تب ہی تو قوم کو ترقی سے کچھ خاص غرض نہیں! یوں ہم نے بھی قوم کی روش اپنالی اور تعلیم سمیت کسی بھی معاملے میں کبھی سنجیدہ نہیں ہوئے! مگر اب یہ دیکھ کر دل کو خوشی ہوتی ہے کہ حکومت ترقیاتی منصوبوں کی آڑ میں ہمارے شہر کو "ترقی پاس" قرار دیکر لوگوں کو ترقی کی طرف لانا چاہتی ہے۔ جب ہم بار بار منصوبوں کے ساتھ ساتھ لفظ ترقی سُنیں گے تو ترقی کو قبول بھی کرنے لگیں گے۔

مجبوری کا نام دھرنا

اقتدار کے گلشن میں مفاہمت کی سیاست نے ایسے ایسے اور اِتنے گل کِھلائے ہیں کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ سمجھنا خاصا دشوار ہے کہ اِن گُلوں کو روئیں یا سیلیبریٹ کریں! ن لیگ کی قیادت نے مفاہمت کو ایسی مستعدی اور پختگی سے گلے لگایا ہے کہ پارٹی کے اپنے کارکن بھی آخر تک سمجھ نہیں پاتے کہ
دیکھیے، اِس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا؟
طاہر القادری "مشن پوسیبل" یعنی "نظام مخالف" دھرنے کے نام پر خاصا مہنگا اور ہائی پروفائل سیاسی تماشا ختم کرچکے اور بوریا بستر لپیٹا جاچکا تب ن لیگ کو بھی کمپنی کی مشہوری کا خیال آیا۔ ساتھ ہی یہ بھی سوچا کہ تنہا جانا ٹھیک نہیں، اسلام آباد میں سانپ وانپ بھی ہوتے ہیں۔ ضروری سمجھا گیا کہ دیگر اپوزیشن (!) جماعتوں کو بھی ساتھ لیا جائے تاکہ رحمٰن ملک مارکہ اسلام آبادی سانپوں سے نمٹنے میں نیولے کم نہ پڑیں!
حکومت کے جو لوگ پانچ سالہ جمہوری دور میں ہر معاملے پر ن لیگ سے تفریح لیتے آئے ہیں اُن کے لیے تازہ ترین آئٹم یہ ہے کہ اِدھر ن لیگ نے اعلان کے

مطابق اپوزیشن کو ساتھ لیکر پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے دھرنے کی تیاری شروع کی اور اُدھر موسم نے طوطا چشمی کا مظاہرہ شروع کیا۔ اسلام آباد میں بارش بھی ہوئی اور سردی بھی بڑھ گئی۔

ن لیگ کی قیادت میں اپوزیشن کی دھرنا نما "آنیاں جانیاں" دیکھ کر مرزا تنقید بیگ بہت خوش ہوئے۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ سیاست کا حصہ ہے۔ ہم نے یاد دلایا کہ صرف سیاست نہیں، مفاہمت کی سیاست کہیے۔ اِس پر اُنھوں نے خاصا ناقابل بیان سامنہ بناکر کہا۔ "تم تو ہر معاملے میں کیڑے ہی نکالتے رہتے ہو۔ طاہرالقادری نے دھرنا دیا تو تمھیں بُرا لگا۔ اعتراض یہ تھا کہ کوئی باہر سے آکر دھرنا کیوں دے رہا ہے۔ اب اپنے والے دھرنا دے رہے ہیں تو اِس پر بھی معترض ہو۔"

ہم نے عرض کیا کہ اعتراض دھرنا دینے پر نہیں، ٹائمنگ پر ہے۔ مرزا بدکتے ہوئے بولے۔ "یہ سیاست ہے، کرکٹ یا اداکاری نہیں جس میں ٹائمنگ کا خیال رکھا جائے۔ اگر ٹائمنگ دیکھنے کا اِتنا ہی شوق ہے تو ظہیر عباس کی اننگز یا منور ظریف کی فلمیں دیکھا کرو۔"

ہم نے مرزا کو یاد دہانی کرائی کہ ہم سیاسی ہلچل کو منور ظریف کی فلم جیسا

ہی سمجھ کر انجوائے کرتے ہیں۔
مرزا اسد اسے ن لیگ کے دیوانے ہیں۔ ہمیں دُکھ اِسی بات کا ہے کہ ن لیگ کے جتنے بھی حقیقی دیوانے ہیں وہ اُس کی صفوں سے باہر ہیں ! ن لیگ سمیت تمام سیاسی جماعتوں کی مجبوری یہ ہے کہ دل چاہے یا نہ چاہے، دِیا جلائے رکھنا ہے یعنی ٹیمپو بنائے رکھنا ہے۔
طاہر القادری نے دھرنا دیکر ن لیگ کا ناک میں دم کر دیا۔ اُسے بھی پارلیمنٹ ہاؤس کے اندر سے نکل کر اُس کے سامنے آنا پڑا۔ پیار بھرے موسم کو انجوائے کرنے کے بجائے مارچ کرنا اور دھرنا دینا کسے اچھا لگے گا؟ دَھرنے کی دلہن کب کی رخصت ہو چکی مگر بے چاری ن لیگ کو اپنی لاج رکھنے کے لیے شادی ہال بند ہونے کے بعد بدائی کے آنسو ! بہانے پڑے
ایک زمانہ تھا جب لوگوں میں واقعی سادگی ہوا کرتی تھی۔ اور سادگی بھی ایسی کہ سیاسی وعدوں کو آسمانی نوید یا وعید سمجھ کر قبول کر لیا کرتے تھے۔ اللہ سمجھے گا میڈیا والوں سے جن کی مہربانی سے خواتین خانہ تک سیانی ہو گئی ہیں ! میڈیا نے سبھی کچھ طشت از بام بلکہ بے لباس کر دیا ہے۔ بعض معاملات میں تو میڈیا والے لباس کو ایسا تار تار کرتے ہیں کہ پھر پہننے کے قابل نہیں رہتا اور پہن لیا جائے تو فیشن قرار پاتا ہے !
خواتین خانہ کی زبان پر بھی اب ایجنسیوں کے افسانے آنے لگے ہیں ! شوہر کی صورت دیکھ کر جیب کی کیفیت سمجھنے

میں حاصل ہونے والی مہارت کی بنیاد پر خواتین اب حکومت کے اطوار دیکھ کر ایجنسیوں کی کار فرمائی کا اندازہ لگا لیتی ہیں! لوگوں کو ہر دال میں کالا بہت جلد اور واضح طور پر دِکھائی دے جاتا ہے! حد یہ ہے کہ کبھی کبھی کالا دکھائی دیتا ہے اور پھر اُس کے لیے دال کا اہتمام کرنا پڑتا ہے!

مرزا کو اِس بات سے چڑ ہے کہ ہر معاملے کو مشکوک سمجھا جائے۔ وہ کہتے ہیں۔ "ہر چیز مفاہمت کا نتیجہ نہیں ہوا کرتی۔ طاہر القادری ہی کی مثال لے لو۔ قوم مزاروں پر جا جا کر کسی نجات دہندہ کی آمد کے لیے دعائیں مانگتی ہے، منّتیں مانتی ہے اور جب نجات دہندہ سامنے آتا ہے تو اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ہے۔ ایسا کروگے تو (کینیڈا) سے کون آئے گا؟"

اب ہم مرزا کو کیا بتائیں کہ کینیڈا کے پُرسکون ماحول میں کتابیں لکھتے لکھتے طاہر القادری ایسی کتاب بن گئے ہیں جس کے ایڈیشن آتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں اُن کا تیسرا ایڈیشن پاکستان کی سیاسی مارکیٹ میں آیا ہے۔ ویسے طاہر القادری خاصی تیاری کے ساتھ میدان میں اُترے۔ حد یہ ہے کہ ن لیگ جیسی "امن پسند" جماعت کو بھی، دکھاوے کے طور پر ہی سہی، دھرنے کی شاہراہ پر گامزن ہونا پڑا۔ یاروں نے الزام لگایا ہے کہ پاکستان آنے سے قبل طاہر القادری نے تین ہفتے واشنگٹن میں گزارے تھے۔ یہ بھی ان کے لیے کمپلیمنٹ ہے! امریکی پالیسی میکرز ایسے معاملات میں بہت حساس ہیں۔ وہ ایک آنچ کی بھی کسر نہیں

رہنے دیتے۔ وہ جانتے ہیں معمولی سا وائرس پورے سوفٹ ویئر کی ایسی تیسی کر دیتا ہے! امریکی پالیسی میکرز کو رات دن ہماری فکر لاحق رہتی ہے، ہمارے ہی بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ سوچ کہیں کم نہ پڑ جائے اِس خیال سے احتیاطاً اُنھوں نے پتیلے یا ڈرم نہیں بلکہ سوچ کے پورے پورے "ٹینک" بنا رکھے ہیں! فوج کے ٹینک آرام کر رہے ہیں، گولا باری "تھنک ٹینک" سے کی جارہی ہے۔

مرزا ہماری اِس رائے سے متفق نہیں کہ طاہر القادری جیسے نابغوں کو انقلاب ونقلاب کے چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ علمی آدمی ہیں، علمی کام کریں۔ فضول مشق کے لیے اِتنے بہت سے لوگ ہیں تو سہی۔ ہماری رائے سُن کر مرزا ہم پر برس پڑے۔ "تم تو بس یہ چاہتے ہو کہ جن میں علم ہے وہ عمل کی دنیا میں نہ آئیں۔ تم شاید اِس لیے ڈر رہے ہو کہ طاہر القادری کے سامنے کہیں تمہارے پسندیدہ چراغ گل نہ ہو جائیں!"

ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا جناب! قیادت کوئی ایسا منصب نہیں جو از خود نوٹس کے تحت حاصل کرلیا جائے۔ قوم جسے منتخب کرتی ہے وہ قائد بنتا ہے۔ مرزا نے فوراً کہا۔ "تمہیں کیا معلوم قیادت کیا ہوتی ہے۔ پیدائشی قائد اِس بات کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی اُسے قیادت کے لیے منتخب کرے؟ وہ بُلائے جانے کا منتظر ہوتا ہے نہ اجازت کا طالب۔"

ہم نے اعتراض کیا کہ طاہرالقادری جس سسٹم کے خلاف جا رہے ہیں اُسی کا حصہ بھی تو رہ چکے ہیں۔ مرزا نے خاصا بُرا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "ایک تو یہ بڑی مشکل ہے کہ تم بے دماغ ہوتے ہوئے بھی بڑی بڑی باتیں کرنے کی کوشش کرتے ہو! ڈاکٹر طاہر القادری نے اگر ماضی میں کوئی غلطی کی تھی تو ضروری ہے کہ اُسے دہرائیں؟ جب اِنسان کی دانش کا گراف بلند ہوتا ہے تو وہ اپنی اِصلاح کرتا ہے، تمہاری طرح کالم نگاری نہیں کرتا رہتا!"

ہم نے وضاحت کی کہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں سُوئے ظن رکھنے کی ہم میں ہمت نہیں۔ ہم تو معاشرے اور میڈیا کی بات کر رہے ہیں۔ مرزا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میڈیا والوں کو بُھوسے میں چنگاری ڈالنے کا موقع ملنا چاہیے۔ اُن کا کوئی معیار تو ہے نہیں۔ قربانی کا جانور نالے میں گر جائے تو میڈیا والے بھاگم بھاگ موقع پر پہنچ کر لائیو نشریات شروع کردیتے ہیں۔ تو پھر ڈاکٹر صاحب کو کیوں کوریج نہ دیتے؟"

طاہرالقادری کی آمد سے اِتنا ضرور ہوا ہے کہ غفلت کی طویل نیند ختم کرکے ن لیگ کو بھی دیگر اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ دھرنے کے نام پر سڑک پر آنا پڑا۔ طاہرالقادری کے دھرنے میں تیسرے دن موسم نے حصہ ڈالا تھا۔ اِس بار موسم نے دھرنے کا تماشا شروع ہونے سے پہلے ہی انٹری دے دی۔ ن لیگ نے دھرنے کے نام

پر جس کامیڈی کا ارتکاب کیا ہے اُس نے بہتوں کو مایوس کیا ہوگا، بالخصوص ان کو جو یہ سب ذرا طوالت کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے۔ پارٹی کے صدر نے دھرنے کے موقع پر سعودی عرب میں رہنے کو ترجیح دی۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سیاسی تبدیلیوں کو یہ پارٹی کس حد تک سنجیدگی سے لیتی ہے! دھرنے کے نام پر جو کچھ شروع ہوا وہ چند قدم کے مارچ میں تبدیل ہو کر ناکام پٹاخے کی طرح پُھس ہو کر رہ گیا۔ طاہر القادری "کمپنی کی مشہوری" چاہتے تھے۔ خوب ہوئی۔ جو کسر رہ گئی تھی وہ ن لیگ کے ناکام دھرنے نے پوری کردی۔

اسکول تک سستا سفر۔۔۔ کس قیمت پر؟

بچوں کو اسکول پہنچانا اور لانا یومیہ معمول ہی نہیں، کراچی جیسے شہر میں تو اچھا خاصا دردِ سر بھی ہے۔ والدین کو علی الصباح بیدار ہو کر بچوں کو تیار ہی نہیں کرنا پڑتا، اسکول تک چھوڑنا بھی پڑتا ہے۔ جو لوگ اس مشقت سے بچنا چاہتے ہیں وہ وین لگوا لیتے ہیں۔ بڑی گاڑی میں بچے قدرے باسہولت اور آرام دہ انداز سے سفر کرتے ہیں اور اسکول پہنچنے تک تازہ دم رہتے ہیں۔ سوزوکیوں اور رکشوں میں بچوں کو جس لاپروائی سے لے جایا اور لایا جاتا ہے اسے سفاکی سے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے۔ سوزوکیوں میں بچوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسا جاتا ہے۔ گاڑی کا مالک زیادہ سے زیادہ بچت چاہتا ہے۔ والدین کم سے کم پیسے دینا چاہتے ہیں۔ ان دونوں کی کشمکش میں شامت بچوں کی آجاتی ہے۔ بڑی وین والے زیادہ پیسے لیتے ہیں۔ تمام والدین دو یا تین بچوں کو وین سے بھیجنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

بچوں کو اسکول لے جانے والے سی این جی اور چنگچی رکشوں میں بچوں کو سوار کرنے کے نام پر ٹھونسا جاتا ہے۔ چھوٹے عمر کے بچے ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں پاتے اور کھڑے کھڑے سفر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ڈرائیور کو بظاہر اس بات

سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ بچے کس طرح بیٹھے یا کھڑے ہیں۔ وہ رکشہ دوڑاتے ہوئے اسکول پہنچتے ہیں۔ بسا اوقات انہیں دوسری شفٹ بھی اٹھانی ہوتی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سی این جی رکشہ میں بچی کس طرح تقریباً لٹکنے کے انداز سے کھڑی ہوئی ہے اور ڈرائیور کو بظاہر اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ نا سمجھ بچی کس طرح کھڑی ہے۔ ایسے میں، خدا ناخواستہ، حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔ سی این جی سلنڈرز پھٹنے کے بڑھتے ہوئے واقعات کے باعث دل کو دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی سلنڈر پھٹ نہ جائے۔

سی این جی رکشوں میں اب اضافہ سلنڈرز رکھے ہوئے ہیں۔ ڈرائیور اپنی سیٹ کے ساتھ ہی ایک سلنڈر نصب کرتا ہے اور کبھی کبھی رکشہ کے پچھے حصے میں بھی

سلنڈر دھرا ہوتا ہے! یہ سلنڈر دائمی خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسکول میں داخلہ دلا کر اچھی تعلیم کے حصول کو یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ بچوں کو محفوظ طریقے سے اسکول بھیجنے کا اہتمام کرنا بھی والدین ہی کا فرض ہے۔ اگر اسکول زیادہ دور نہ ہو تو خود چھوڑ آنا چاہیے۔ اور اگر تھوڑا دور ہو تو بہتر گاڑی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسکول کی بڑی وین خاصی محفوظ ہوتی ہے اور بچے ان میں قدرے آرام سے سفر کر پاتے ہیں۔ بچوں کے تعلیمی مستقبل کی حفاظت کے ساتھ ساتھ خود بچوں کی حفاظت پر بھی بھرپور توجہ دی جانی چاہیے تاکہ وہ خطرناک طریقے سے اسکول نہ جائیں اور بہتر گاڑیوں میں سفر کریں۔ بڑی اور قدرے محفوظ وین کا کرایا کچھ زیادہ بھی ہو تو کچھ ہرج نہیں۔ کوئی بھی چیز انسانی جان سے بڑھ کر نہیں ہوتی اور جان بھی کس کی؟ اپنے ہی بچوں کی۔ والدین چھوٹی کلاس کے بچوں کو رکشوں کے ذریعے اسکول بھیجنے سے گریز کریں تو اچھا ہے۔ کھلی سواری بچوں کے لیے اچھی خاصی خطرناک ہوتی ہے۔ زیادہ کمانے کے چکر میں رکشے دوڑانے والوں کو بظاہر اِس بات سے کچھ خاص غرض نہیں ہوتی کہ پیچھے بیٹھے ہوئے بچے کس حال میں ہیں۔ یہ سوچنا تو والدین ہی کا کام ہے!

بھرے بازار میں خالی تھیلوں جیسی زندگی

کسی بھی بازار میں داخل ہوں تو اشیاء کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے انسان بھی دکھائی دیتے ہیں۔ دکان داروں کی زبان کا چٹخارا، دکانوں کی تزئین و آرائش، اشیاء کی ترتیب سبھی کچھ دل کو موہ لیتا ہے۔ اگر بازار دل کو بھا جائے تو انسان چند اشیاء نہ چاہتے ہوئے بھی خرید لیتا ہے! یہ سب تو ٹھیک ہے مگر بازار میں چند ایسے افراد بھی دکھائی دیتے ہیں جن کی حالت دیکھ کر دِل دکھتا ہے۔ مثلاً مختلف اشیا ہاتھ پر رکھے چلتی پھرتی دکان جیسے لوگ! بازاروں میں کئی ایسے معمر افراد بھی دکھائی دیتے ہیں جن کے چہروں پر عمر ڈھلے کی تھکن کے ساتھ ساتھ زندگی کے ڈھائے ہوئے ستم کی کہانی بھی درج ہوتی ہے! ان کی حالت دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اچھی خاصی عمر میں بھی اُنہیں آرام نصیب نہیں ہوا، پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے گھر سے نکلنا پڑتا ہے، کچھ نہ کچھ کمانا پڑتا ہے۔

کسی کو رزق حلال کے لیے کوشاں دیکھ کر خوشی تو ہوتی ہے، لیکن اگر متعلقہ فرد معمر اور ضعیف بھی ہو تو دِل کو دُکھ بھی ہوتا ہے۔ گوشہ نشینی اختیار کرکے آرام کرنے کی عمر میں بھی کام کرنا پڑے تو اِنسان زندگی کو بوجھ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حکومتِ وقت کا فرض ہے کہ تمام شہریوں کو ایک

ایسی زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کرے جس میں ڈھلتی ہوئی عمر کمانے کی فکر سے آزاد ہو۔ انسان زندگی بھر کام ہی کرتا رہتا ہے۔ بڑھاپا چاہتا ہے کہ کام کا بوجھ نہ ہو، چند لمحات سکون سے بھی گزریں۔ جوانی کے حسین دور میں منصوبہ بندی کرنے والے بڑھاپے میں سکون کی دولت پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بہتوں کو اس کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ زندگی بھر ایک ہی معمول کے اسیر رہتے ہیں۔ یعنی روز کنواں کھودیے اور روز پانی نکالیے!

اُن ہاتھوں کی عظمت کو سلام جو زندگی بھر کسی کے سامنے پھیلتے نہیں اور رزق حلال کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ بازاروں میں پلاسٹک کی تھیلیاں فروخت کرنے والوں کو دیکھ کر اُنہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے جن کی زندگی خالی

تھیلے جیسی نہیں! جو لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں وہ ہر اعتبار سے ہماری بھرپور توجہ کے مستحق ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ چھیری لگا کر روزی روٹی کمانے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کریں تاکہ وہ بھی کسی حد تک گوارا طرز زندگی کے حامل ہو سکیں! جن کی خود داری ہاتھ کو پھیلنے سے روکتی ہے وہ ہماری توجہ کے زیادہ مستحق ہیں تاکہ اُن کی خود داری کا تحفظ احسن طریقے سے ہو! بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں فروخت کرکے سانسوں کا تسلسل برقرار رکھنے والوں اپنائیت کی نظر دیکھنے کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت خریداری بلا ضرورت بھی کرلی جائے تو کچھ ہرج نہیں! زندگی کے مسائل ہیں کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ ایسے میں کسی کے مسائل حل کرنے میں معاون ثابت ہونا اعزاز کی بات ہے۔ اللہ اِس کی توفیق انہی لوگوں کو دیا کرتا ہے جو کسی کے درد کو اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کا ہاتھ تھام کر اُن کی دِل جوئی ہمارے کردار کی پختگی کو ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی نظر میں بلند ہونے کا موقع بھی عطا کرتی ہے!

ن لیگ کی "دھرنی" کا چالیسواں

میرا کو کیمرے کے سامنے کچھ آتا ہو یا نہ آتا ہو، انگریزی کا تیا پانچا کرکے اور لایعنی بیانات و اعلانات داغ کر خبروں میں رہنے کا ہُنر خوب آتا ہے۔ فلموں کے معاملے میں وہ "آؤٹ اسٹینڈنگ" ہیں یعنی عموماً فلموں سے باہر رہتی ہیں مگر اِس کے باوجود بیشتر معاملات میں in رہنے کے لیے کام سے زیادہ کام کرنے کی اداکاری سے خوب کام لیتی رہتی ہیں!

مُلک میں لانگ مارچ اور دھرنوں کے فیشن نے ایسی انٹری دی ہے کہ اداکاروں اور اداکاراؤں کو اپنے کیریئر اور مستقبل کی فکر لاحق ہوگئی ہے۔ سیاست دان لانگ مارچ کرنے اور دھرنے دینے کی آڑ میں اداکاری کے ایسے جوہر دِکھا رہے ہیں کہ فلم اِسٹارز میں کھلبلی سی مچ گئی ہے۔ اُنہیں یہ ڈر ہے کہ اِس سال بہترین جذباتی اداکاری اور کامیڈی کے ایوارڈ سیاست دان نہ لے اُڑیں! شاید یہی سوچ کر میرا میدان میں نکلی ہیں اور پاک بھارت کشیدگی ختم کرنے کے نام پر اُنہوں نے 15 مارچ کو لانگ مارچ کا اعلان کیا ہے۔

میرا کے اعلان سے قبل ن لیگ نے پارلیمنٹ ہاؤس سے الیکشن کمیشن تک مارچ اور

پھر وہاں دھرنے کے نام پر جس کامیڈی کا ارتکاب کیا اُس سے چوہدری شجاعت بہت خوش ہیں۔ اُن کی خوشی یوں دوآتشہ ہو گئی کہ اُن کے ممدوح (ڈاکٹر طاہرالقادری) کے لانگ مارچ اور دھرنے کے جواب میں ن لیگ کی اپنی سی کوشش پیدا ہونے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔ طب کی اصلاح میں اِسے miscarriage کہا جائے گا! شیخ ابراہیم ذوق نے ڈیڑھ چلّو پانی میں ایمان کے بہنے کی جو بات کہی ہے وہ شاید ایسے ہی ہی دھرنا نما ڈرامے کے لیے تھی! اسلام آباد کی اقتدار بدوش فضائیں کچھ دیر کے لیے بارش کے پانی سے کیا معمور ہوئیں، جو چند افراد بمشکل جمع ہو پائے تھے وہ بھی تتر بتر ہوگئے۔ بارش کے ڈیڑھ چلّو پانی میں مارچ اور دھرنا دونوں بہہ گئے! حد یہ ہے کہ سب کو جمع کر کے الیکشن کمیشن تک چلنے کی تحریک دینے والے چوہدری نثار علی خان بھی اُسی طرح اُڑن چُھو ہوگئے جس طرح اُن کی پارٹی پانچ برسوں کے دوران سیاسی اُفق سے غائب رہی ہے! چوہدری شجاعت نے چند قدم کے مارچ اور دھرنا دینے کی اِس کوشش کو "دَھرنی" قرار دیا ہے۔ قوم یہ تماشا دیکھ کر حیران ہے کہ آج کل چوہدری شجاعت اپنی پارٹی سے زیادہ ڈاکٹر طاہرالقادری کے لیے فکرمند اور بے تاب نظر آتے ہیں۔ وہ طاہرالقادری کے حوالے سے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ لوگوں کی سمجھ میں آ رہا ہے۔ جب چوہدری صاحب کی باتیں سمجھ میں آ رہی ہوں تو سُننے والے زیادہ تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں!

میرا نے فنکاروں کے ساتھ واہگہ بارڈر تک جس "لانگ" مارچ کا اعلان کیا ہے اُس کی تاریخ بھی بہت معنی خیز ہے۔ پارلیمنٹ ہاؤس سے الیکشن کمیشن تک ن لیگ نے جو نام نہاد "مارچ" کیا اور "ابورٹیڈ" دَھرنا دیا اُس کا "چالیسواں" بھی اُسی دن یعنی 15 مارچ کو ہوگا! ایک وہ دھرنا تھا جسے ڈاکٹر طاہرالقادری نے (عالمی) تاریخ کا سب سے بڑا دھرنا قرار دیا تھا۔ یعنی ریکارڈ قائم ہوا۔ اب ایک ناکام دھرنے کے چالیسویں پر مارچ کیا جارہا ہے۔ یہ بھی شاید اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہی ہوگا۔ ویسے ن لیگ کی دَھرنی کے چالیسویں پر مارچ کا اعلان کرکے میرا نے فلم انڈسٹری کو عمدگی سے فالو کیا ہے۔ ہمارے ہاں نئی فلمیں بنانے اور نئی نسل کو بہتر فلمیں بنانے کے لیے تیار کرنے کے بجائے اب فلمی دُنیا کے مختلف ادوار کو یاد کرکے صرف دُہائی دی جاتی ہے، ماتم کیا جاتا ہے۔

مارچ اور دھرنے کے اِس موسم میں مارچ کا بر وقت اعلان کرکے میرا نے ثابت کردیا کہ اب اُنہیں شکار کھیلنا آگیا ہے۔ اُنھوں نے لانگ مارچ کا اعلان کرکے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں۔ ایک طرف تو ملک میں لانگ مارچ کے فیشن کی پیروی بھی ہوگئی اور دوسری طرف بھارتی فلم انڈسٹری میں قدر دانوں اور پرستاروں کی بھی خواہش پوری کردی جو امن کی آشا کے نام پر پاکستانی فنکاروں کے منہ سے اپنی مرضی اور مفاد کی بھاشا سُننے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔

فنکاروں کو ساتھ لیکر پاک بھارت دوستی کے نام پر میرا کا میدان میں نکلنے کا اعلان اِس اعتبار سے خوش آئند ہے کہ سیاست اور شوبز ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو چکے ہیں۔ عوام کے لیے یہ طے کرنا خاصا دشوار ہوچلا ہے کہ کسے کس پر ترجیح دیں۔ سیاست دانوں نے شوبز کے طور طریقے اِس طور اپنائے ہیں کہ اُن کی شاندار اداکاری اور ایکشن دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جس طرح فلموں کی ریلیز کے لیے موقع دیکھا جاتا ہے بالکل اُسی طرح سیاست دان بھی ہر سرگرمی کے لیے دن، تاریخ اور موقع کی مناسبت کا خوب جائزہ لیتے ہیں۔ دوسری طرف شوبز والوں یہ حال ہے کہ فنکاری سے زیادہ سیاست پر زور دے رہے ہیں۔ ہمارے شوبز میں جتنا کام ہو رہا ہے اُس سے کئی گنا سیاست فرمائی جارہی ہے۔ سیاست دانوں اور فنکاروں کا کیا بگڑنا ہے۔ ہاں، عوام بے چارے چکرا کر رہ گئے ہیں کہ فلمی سیاست کو انجوائے کریں یا سیاسی فلم دیکھ کر تالی پیٹیں اور سیٹی بجائیں!

تیزی سے بدلتی ہوئی سیاسی صورتِ حال میں ن لیگ جو کچھ کر رہی ہے اُسے کسی "مہا فلاپ" فلم کاری میک بنانے کی کوشش ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس طرح حکومت کے نیم دِلانہ اقدامات سے عوام کو ذرا بھی ریلیف نہیں ملتا بالکل اُسی طرح ن لیگ نے نیم دِلانہ احتجاج اور دَھرنی کے ذریعے اپنے تابوت میں

خود ہی ایک اور بڑی کیل ٹھوکنے کی کوشش کی ہے۔ جلسوں اور تقریبات سے خطاب کے دوران شہباز شریف جس قدر جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہیں اُس کے دس فیصد جتنا ہوش بھی اگر وہ کہیں سے لے آئیں تو کسی اپنے کو مارچ اور دھرنے کے نام پر پارٹی سے کِھلواڑ نہ کرنے دیں! چوہدری نثار نے 4 فروری کو جو کچھ کیا وہ ن لیگ کی اندرونی کیفیت کو طشت از بام، بلکہ "طشت از چھت" کرنے کے لیے کافی تھا! اُنھوں نے شاید یہ سوچا کہ عوام کہاں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھریں گے اِس لیے پارٹی کے معاملات کو بے لباس کردیا جائے!

ویسے میرا نے جس لانگ مارچ کا اعلان کیا ہے اُس میں "لانگ" ہمیں پنجابی والا لگتا ہے۔ ہمارے فنکار بھارت کے معاملے میں موقع ملتے ہی سرحد "لانگنے" پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ پاک بھارت دوستی پروان چڑھانے کا ٹھیکہ جب سے فنکاروں کو ملا ہے، اِس پورے معاملے میں صرف گلیمر رہ گیا ہے! کہیں میرا واہگہ تک لانگ مارچ کے بہانے دوبارہ سرحد لانگ کر بھارت جانے کی راہ ہموار کرنے کا منصوبہ تو نہیں بنا رہیں؟ ویسے بھی بھارت ہمارے فنکاروں سے کہتا ہی رہتا ہے کہ لانگ آؤ، لالی ؤڈچ کی رکھیا اے! توجہ رہے، کہیں میرا بھی چوہدری نثار کی طرح آخری لمحات میں اُڑن چُھو نہ ہو جائیں!

اُڑن چھو" ایئر لائن"

پی آئی اے بھی کیا نصیب لائی ہے۔ اول تو طیارے اُڑنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اور اگر کسی نہ کسی طرح اُڑنے کے قابل بنا دیئے جائیں تو بدنصیبی پرندوں کی شکل میں وارد ہوکر طیاروں کے انجن سے آ ٹکراتی ہے۔ ادارہ ٹھیک سے چل نہیں پاتا کہ خسارے سے ٹکرا کر گر پڑتا ہے۔ پی آئی اے کے ملازمین اور خسارے میں اضافے کا مقابلہ جاری رہتا ہے۔ حکومت کہتی ہے کہ پی آئی سے کئی ہزار ملازمین پانچ برسوں میں فارغ کئے جائیں گے۔ مگر پھر مزید ملازمین رکھ لیے جاتے ہیں۔

سیانے کہتے ہیں معیشت کے بیشتر معاملات میں ہماری حکومتوں نے ایسے اُصول اپنائے ہیں جن کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ خسارے کو خسارے سے ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے! شاید کہیں سے سُن لیا ہے کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ کہتے ہیں دولت کو دولت کھینچتی ہے۔ کھینچتی ہوگی، ہمارے ہاں معاملہ بہت مختلف ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ بعد میں اور خسارے کو دیکھ کر خسارہ پہلے رنگ اور جڑ پکڑتا ہے! پی آئی اے کا خسارہ بھی آپس میں ضرب و جمع کے عمل سے گزرتے ہوئے اب تقریباً 140 ارب روپے تک پہنچ چکا ہے۔ اور اب رہی سہی کسر تنخواہوں میں اضافے کے ذریعے پوری کرنے کی کوشش

کی جارہی ہے۔ یہ تو ہم نے سُنا تھا کہ سفر کے دوران طیارے ایئر پاکٹس میں پھنس جاتے ہیں مگر انوکھی مثال یہ ہے کہ ایک پوری کی پوری ایئر لائن ایئر پاکٹ میں پھنس کر رہ گئی ہے!

پی آئی اے کو طیاروں کے لیے انجن کا انتظام کرنے کی فکر لاحق رہتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ادارے کا انجن بند ہوچکا ہے۔ ہم نے دُبئی میں دیکھا تھا کہ چھوٹے سے کمرے میں پچیس تیس ملباری رہتے ہیں۔ ان میں سے نصف ہی اُس کمرے میں سو سکتے ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ ایک شفٹ کام پر جاتی ہے تو دوسری سوتی ہے! عام تعطیل کے دن مصیبت ہو جاتی ہے کیونکہ سبھی گھر پر ہوتے ہیں! بس کچھ ایسی ہی حالت پی آئی اے کی بھی ہے۔ طیارے اُڑتے رہیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اب چونکہ بیس پچیس طیارے خرابی کے باعث یا انجن نہ ہونے سے کھڑے ہوئے ہیں، اس لیے رن وے چھوٹے پڑگئے ہیں!

ملک بھر میں حکومت کی ناقص کارکردگی پر احتجاج معمول بن چکا ہے۔ ایئر پورٹس بھی اِس رجحان سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ تکنیکی خرابی سے پروازوں میں تاخیر پر مسافروں کا احتجاج معمول بن چکا ہے۔ کراچی میں نشتر پارک اور نمائش چورنگی ہی ایجیٹیشن پوائنٹس نہیں بلکہ ایئر پورٹ بھی اب احتجاج، نعرے بازی اور دھرنے ہی کے لیے استعمال ہو رہا ہے!

طیارے اُڑنے اور اُڑانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں طیارے اُڑتے کم اور اَڑتے زیادہ ہیں! ایک زمانے سے سُنتے آئے ہیں.... باکمال لوگ، لاجواب سروس! پی آئی اے کی کارکردگی تلاش کرتے کرتے لوگ تھک گئے ہیں۔ ہم اِس معاملے میں بدگمانی سے گریزاں رہتے ہیں۔ جس طرح طیارہ بہت بلندی پر ہو تو نظر نہیں آتا اُسی طرح پی آئی اے کی کارکردگی بھی شاید بہت بلند ہو گئی ہے اِس لیے ہمیں دِکھائی نہیں دے رہی!

پی آئی اے شاید دنیا کی واحد ایئر لائن جو اُڑانے سے زیادہ طیاروں کو گراوَنڈیڈ رکھنے کے لیے بنائی گئی ہے! اور اگر ایسا ہے بھی تو حیرت یا افسوس کیوں؟ آخر کو ہماری ایئر لائن اور دیگر باقی دنیا کی ایئر لائنز میں کوئی تو فرق اور انفرادیت ہونی ہی چاہیے! ویسے طیارے بہت اُڑ لیے، اب اُنہیں آرام کرنا چاہیے۔

گزشتہ دنوں مسلم لیگ (ن) کے رہنما اور قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر نے مارچ کرنے اور دھرنا دینے کے نام پر اپوزیشن جماعتوں کے رہنماؤں کو جمع کیا اور آخری لمحات میں، یعنی جب ڈراما کلائمیکس پر تھا، خود "اُڑن چُھو" ہوگئے! ہماری قومی ایئر لائن بھی کچھ اِسی طرح اُڑن چُھو ہوتی دکھائی دے رہی ہے!

وفاقی مشیر پٹرولیم ڈاکٹر عاصم حسین نے کچھ دن قبل کہا تھا کہ ہمارے ہاں بعض سرکاری
ادارے ریٹائرڈ افسران کے پارکنگ لاٹ میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ ہمارے خیال میں
پارکنگ لاٹ اِس حوالے سے کوئی معقول اصطلاح نہیں۔ ڈمپنگ گراؤنڈ یا اسکریپ
یارڈ کہنا زیادہ مناسب ہوگا! اور ایمان داری کی بات یہ ہے کہ پی آئی اے، ریلوے اور
پاکستان اسٹیل جیسے ادارے اب قومی وسائل کے قبرستان کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں!

سیاسی محبت کے اظہار کا موسم

ہر سال جب ویلنٹائن ڈے وارد ہوتا ہے تو آنکھوں میں کئی رنگ اور سانسوں میں حسین یادوں کی خوشبوئیں ڈیرا ڈال لیتی ہیں۔ جواز و عدم جواز سے قطع نظر، یہ دن کچھ دیر کے لیے زندگی کے جھمیلوں سے دور، یادوں کی حسین دنیا میں لے جاتا ہے۔

اب کے ویلنٹائن ڈے ایسے موقع پر آیا ہے کہ حکومت جانے جانے کو ہے یعنی میعاد ختم ہو رہی ہے۔ ایسے میں حکمرانوں کو اچانک عوام یاد آ گئے ہیں اور ویلنٹائن ڈے کی آمد سے قبل ہی اُنھوں نے عوام سے محبت کا بھرپور اظہار شروع کر دیا ہے۔ جمہوری ادوار میں ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ جب بھی حکومت کی میعاد ختم ہونے پر آتی ہے تو اُس کے دل میں عوام سے محبت کے دریا بہنے لگتے ہیں۔ ادھورے منصوبوں کو تیزی سے تکمیل کی پٹاری میں بند کرنے کی تیاری کی جاتی ہے۔ کھدی ہوئی سڑکیں بننے لگتی ہیں اور ٹوٹے ہوئے پُل تیزی سے بن کر لوگوں اور گاڑیوں کو اپنے اوپر سے گزارنے لگتے ہیں۔

پنجاب حکومت نے میٹرو بس سروس کے ذریعے تحائف دینے کی ابتداء کی ہے۔ چلیے، کسی نہ کسی بہانے عوام کو کچھ تو ملا۔ تھوڑی بہت تو اشک شوئی ہوئی۔ جب بہت عرصے کے بعد کسی سے پیار کا اظہار کیا جاتا ہے تو اُس کے حواس کام نہیں

کرتے۔ عوام کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ جاتی ہوئی حکومتوں نے چاہت کے خزانوں کے منہ تھوڑے سے کھولے ہیں تو محبت کو ترسے ہوئے عوام حواس باختہ ہو چلے ہیں۔ لاہور میں میٹرو بس سروس کے ذریعے پنجاب حکومت نے محبت کا جو اظہار کیا ہے اُس کا عوام نے بھرپور جواب دیا ہے۔ ن لیگ نے تو سیاسی بس مِس کر دی تھی مگر عوام میٹرو بس مِس کرنے کے موڈ میں نہیں!

پاکستان میں اپنی مرضی کے مطابق وارد ہونے والے انتخابی تہوار کی گہما گہمی شروع ہوتے ہی کئی تہوار ایک ساتھ آ گئے ہیں۔ بھارت میں 55 دن کا کُمبھ کا میلہ چل رہا ہے۔ ہمارے ہاں بھی احتجاج، مارچ اور دھرنوں کا میلہ چل رہا ہے جو یقیناً ڈھائی تین مہینوں پر محیط رہے گا۔ کُمبھ کے میلے میں لاکھوں افراد روزانہ لاکھوں افراد گنگا اور جمنا میں ڈبکی لگا رہے ہیں۔ مگر شاید یہ ڈبکیاں کافی نہ تھیں یا مزا نہیں دے رہی تھیں اِس لیے بھارتی حکومت نے موقع کی مناسبت سے افضل گرو کو پھانسی دیکر سفاکی، بے حِسی اور بے ضمیری کے مہاساگر میں خاصی گہری ڈبکی لگالی! آپ چاہیں تو افضل گرو کی پھانسی کو بھارتی قیادت کی طرف سے امن عمل کے لیے "سلامی" بھی قرار دے سکتے ہیں! کشمیریوں کو یہ pre-Valentine تحفہ مدتوں یاد رہے گا۔ اور یاد رہنا ہی چاہیے۔

سینٹ ویلنٹائن کو تو ہم نے نہیں دیکھا مگر کینیڈا سے ایک سنیٹ نے آ کر

پُرجوش باتوں کے ذریعے عوام کے دِل و دِماغ پر کیوپڈ کا تیر مارنے کی کوشش کی ہے۔
لانگ مارچ اور دھرنے کا تیر قوم اور میڈیا کے دِل میں ایسا گڑا کہ معاملہ سپریم کورٹ تک پہنچ گیا۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے الیکشن کمیشن اور انتخابی ضابطوں کے حوالے سے محبت کا جو اظہار کیا ہے اُس پر سپریم کورٹ نے اُنہیں سیدھے ہاتھوں لینا مناسب نہ سمجھا۔ اب عالم یہ ہے کہ آئینی درخواست کی سماعت میں ڈاکٹر طاہر القادری کو اعلیٰ ترین عدلیہ کی طرف سے محبت کا اظہار بھگتنا پڑ رہا ہے! دونوں ایک دوسرے پر جو پھول نچھاور کر رہے ہیں اُن کی خوشبو سے عوام کے دِل و دِماغ مُعطّر کم اور ماؤف زیادہ ہوئے جاتے ہیں!
محبت کے اظہار کا موسم ابھی پوری طرح وارد بھی نہیں ہوا تھا کہ بسنت کی تیاریاں بھی شروع ہوگئیں۔ الیکشن کی فضاء میں سبھی اپنے وعدوں اور دعووں کی پتنگیں زیادہ سے زیادہ اونچی اُڑانے کی کوشش میں عوام کو بہت نیچے چھوڑ گئے ہیں۔ پتنگیں فضاء میں ہیں اور ڈور ایک دوسرے کے گلے پر۔ مخالفین کے اتحادیوں کو اپنے کیمپ میں لانے اور بھرپور طاقت کے ساتھ "بو کاٹا" کی محفل سجانے کی تیاریاں ایسی شدت سے جاری ہیں کہ عوام سہمے ہوئے یہ سوچ رہے ہیں کہ آسمان پر گُڈیوں کی بہار دیکھیں یا پتنگ بازوں کے رنگ ڈھنگ! سیاسی بسنت میں لوگوں کو اُڑتی ہوئی گُڈیوں سے زیادہ لطف کرارے نوٹوں کی گڈّیاں دیکھنے

میں آتا ہے!

صدر زرداری کو کیوپڈ نے ایسا تیر مارا کہ وہ ویلنٹائن ڈے سے بہت پہلے ن لیگ سے بھرپور محبت کے اظہار کے لیے لاہور پہنچ گئے۔ خیمہ بلاول ہاؤس میں گاڑا گیا اور خدشات کا تیر لیگی قیادت کے دِل میں گڑ گیا! ایوان صدر سے ہٹ کر جہاں صدر قیام کرتے ہیں اُسے صدارتی کیمپ آفس قرار دیا جاتا ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے، ہمارے ہاں صدور اپنی آئینی میعاد کے دوران کیمپنگ ہی تو کرتے رہتے ہیں۔ سارا وقت اپنے کیمپ کو مستحکم کرنے اور مخالف کیمپ کی بنیادیں ہلانے میں گزر جاتا ہے۔اِس دوران کبھی ملک اور قوم کی یاد آ گئی تو ٹھیک اور نہ بھی آئی تو کیا ہوا؟ ملک اور قوم کہاں بھاگے جارہے ہیں؟ جب سب کچھ نمٹ جائے گا تو ملک اور قوم کو بھی دیکھ ہی لیں گے۔

اِس بار ویلنٹائن ڈے کے موقع پر صدر عجیب مخمصے میں ہیں۔ طے نہیں ہو پارہا کہ کس سے محبت کا اظہار کریں اور کسے سائڈ لائن کریں۔ ق لیگ نے محبتیں بکھیرنے کے اِس موسم میں صدر زرداری کو کنفیوژن کا شکار کردیا ہے۔ فریال تالپور نے بات چیت کے ذریعے ق لیگ کے منتخب ارکان اور وزرا کو پیپلز پارٹی میں شمولیت کے لیے تیار کرلیا ہے مگر صدر زرداری نے محترمہ کو "پیش رفت" سے روک دیا ہے۔ اُنہیں یہ ڈر ہے کہ کہیں چوہدری.برادران ناراض ہو کر "محبت" کا

اظہار نہ کر بیٹھیں ! چوہدری.برادران کو داد ملنی چاہیے کہ پانچ.برسوں میں کوئی تو ہے !جس نے صدر زرداری کو کنفیوز کرنے کی "سعادت" حاصل کی

سیاسی ویلنٹائن سیزن کی مناسبت سے یعنی انتخابات نزدیک آنے پر پیپلز پارٹی اور ن لیگ نے درون خانہ پریم راگ الاپنے کی کوشش کی تھی مگر دشمنوں کو "ٹک مُکا" کی خبر ہو گئی اور پھر سبھی لٹھ لیکر دوڑ پڑے۔ اب بظاہر طاہر القادری، متحدہ اور تحریک انصاف مل کر اپنی پریم کہانی ترتیب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سندھ کی سطح پر فنکشنل لیگ اور ن لیگ نے آٹھ دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر "گرینڈ الائنس" کے نام پر انتخابی اُخوت کو پروان چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر سینٹ ویلنٹائن واقعی تھے تو !سیاسی محبت کے یہ شاندار لشکارے دیکھ کر اُن کی آتما کو شانتی مل گئی ہو گی

ہم تو یہ سوچ سوچ کر حیران اور پریشان ہیں کہ جب رات اِس قدر متوالی ہے تو پھر صبح کا عالم کیا ہوگا! ویلنٹائن ڈے کی مناسبت سے محبت کے اظہار کے لیے پھول تحفے میں دیئے جاتے ہیں۔ یہاں حالت یہ ہے کہ گل پر گل کِھل رہے ہیں اور کِھلائے جا رہے ہیں۔

بہار کا موسم بھی وارد ہونے کو ہے۔ تب جو پھول کھلے ہیں وہ اپنی جگہ اور

سیاسی موسم بہار کا گل کھلانا اپنی جگہ۔ دُعا یہ ہے کہ اب کے چند ایک پھول عوام کے نصیب کے بھی کھل جائیں۔ سیاسی ویلنٹائن سیزن میں اہل سیاست ایک دوسرے کو حیران اور پریشان کر دینے والے تحائف دینے کی تیاری کر رہے ہیں۔ کاش کہ یہ اہتمام عوام تک نہ پہنچے۔ اب کے ایسی بسنت آئے کہ عوام کے ارمانوں کی گُڈیاں بہت اونچی اُڑیں اور اُن گُڈیوں کے نصیب میں "بو کاٹا" کی صدا نہ ہو!

ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

بات زیادہ پرانی نہیں۔ چند عشرے ہی تو گزرے ہیں۔ کبھی یہ شہر حکومت کی مَسند تھا۔ تب سب کچھ توازن میں اور اعتدال پر تھا۔ اجتماعی طرزِ عمل میں ٹھہراؤ اور انفرادی رویّوں میں سنجیدگی تھی۔ سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہروں کو ڈوبنے سے بچنے کے لیے حد میں رہنا پڑتا ہے۔ کراچی بھی حد میں رہتا تھا اور اِس کے متنوع مکین بھی اپنی حدود پہچانتے تھے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب دِل خوف سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ محبتیں جولانی پر تھیں۔ ایک دوسرے کو قبول کرنے کا جذبہ توانا تھا۔ زبان، رنگ، نسل، ثقافت، مسلک، مذہب یا کسی اور بنیاد پر اجنبیت نے اخلاص اور فراخ دِلی کی راہ میں دیوار بننا نہیں سیکھا تھا۔ طبقاتی فرق بھی تھا مگر خُوں خوار نہ تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ تیس پینتیس سال پہلے کا کراچی جنت تھا۔ ہاں، جنت نشان ضرور تھا۔ لوگوں میں خرابیاں تو تھیں مگر انہیں دور کرنے کا شعور و ارادہ بھی تھا۔ گناہ کرکے اُس پر فخر کرنے کو فیشن کا درجہ حاصل نہ ہوا تھا۔ اگر گناہ سرزد ہوتے تھے تو ساتھ ہی ضمیر کی خلش اور چُبھن بھی برقرار تھی۔ غلط کام کر گزرنے والے نادِم بھی ہو لیتے تھے کہ غلطی کا اِعادہ نہ ہو۔

پھر یہ ہوا کہ ملک بھر میں بہتر امکانات کے ٹکراؤ سے کراچی بے ہنگم طور پر پھیلنے لگا۔ شہر کا صرف جغرافیہ ہی نہیں بدلا، معاشرتی ڈھانچا بھی کچھ کا کچھ ہوتا چلا گیا۔ شہروں کو پھیلنا ضرور چاہیے کہ یہ فطری امر ہے مگر کوئی ڈھب تو ہو، کوئی سلیقہ تو دکھائی دے۔ جب شہروں اور معاشروں کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو صرف آبادی اور جغرافیہ نہیں بڑھتے، آبادی کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔اِس کُلیے سے کراچی بھی مستثنیٰ تھا نہ ہے۔ شہر بھی ذی تنفس اور ذی روح ہوتے ہیں۔اِنہیں مویشیوں کی طرح آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا کہ جہاں چاہیں، جو چاہیں چَرتے پھریں۔ پالتو جانوروں کے معمولات پر بھی تھوڑی بہت نظر رکھی جاتی ہے مگر ستم دیکھیے کہ ایک بڑے اور اچھے خاصے جیتے جاگتے شہر کا پٹّا کھول دیا گیا ہے اور اِس سے کِسی کو بظاہر کچھ غرض نہیں کہ وہ کِس طرف کو لپکتا ہے، کسے کاٹ کھاتا ہے۔

ہر چیز ایک خاص مدت کے بعد تجدید مانگتی ہے۔ ہم اپنے گھروں کو بھی ہر چار چھ سال بعد تزئین نو کے مرحلے سے گزارتے ہیں۔ اور ہم خود روزانہ تجدید کے مرحلے سے گزرتے ہیں۔ گاڑی بھی صرف ایندھن سے نہیں چلتی، وقتاً فوقتاً نگہداشت لازم ہوتی ہے۔ ایندھن کی فراہمی اور معقول وقفے سے نگہداشت یعنی

مینٹیننس ہی کافی نہیں۔ ڈرائیور بھی ہوش مند ہونا چاہیے۔ کراچی کے کیس میں شاید یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ صرف ایندھن فراہم کرتے رہنا کافی ہوگا۔ تلخ تر حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے عاقبت نا اندیش تو ایندھن کی فراہمی بھی ضروری نہیں سمجھتے!

طیاروں میں آٹو پائلٹ سسٹم شاید بعد میں آیا ہوگا، کراچی بہت پہلے سے آٹو سسٹم پر ہے۔ شہر کو چلایا نہیں جارہا، چلنے دیا جارہا ہے۔ ملک کے سب سے بڑے اور کماؤ شہر کو یوں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے جیسے اِس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا قدرت نے ہم پر فرض کیا ہی نہیں۔ جس طرح جنگل میں درندے معصوم چرندوں کو گھیر کر بھنبھوڑتے ہیں بالکل اُسی طرح کراچی کو بھی مفاد پرستوں کی ٹولیوں نے گھیر کر اپنے مفادات کے دانت اِس کے نازک جسم میں گاڑ رکھے ہیں۔ اور سادگی کی انتہا دیکھیے کہ ہم گھبرا کر اِس صورتِ حال کے تدارک کے لیے اُنہی کی طرف دیکھتے ہیں جو اِن درندوں کے ماسٹر مائنڈ اور پیٹرن انچیف ہیں!

کراچی کوئی منفرد مثال نہیں۔ کسی بھی ملک میں اگر صرف ایک بڑا اور ساحلی شہر ہو تو اُس پر ملکی معیشت کا مدار اور انفرادی معاشی امکانات کا دباؤ ہوتا ہے۔ ملک بھر سے لوگ تابناک مستقبل کی تلاش میں اُسی کا رُخ کرتے ہیں۔

کراچی کا بھی یہی کیس ہے۔ مگر صاحب! یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ ایک شہر میں کئی شہروں کو بسنے دیا جائے اور یہ ذیلی شہر بھی باہم ایسے گڈمڈ ہوں کہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں کھٹکنے اور ایک دوسرے کی پسلیوں میں چُبھنے لگیں؟ دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمن دارالحکومت برلن کو دیوار کھڑی کرکے دولخت کردیا گیا تھا۔ کراچی میں ایسی کوئی دیوار تو نہیں اُٹھائی گئی مگر ہاں دِلوں میں دیواریں کھڑی کردی گئی ہیں۔ شہر میں کہنے کو صرف ایک کٹی پہاڑی ہے مگر لاکھوں دِل ہیں کہ جنہیں حالات کی خرابی نے بُری طرح چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ سڑکیں تو چوڑی ہوگئیں مگر ظرف سُکڑ کر فٹ پاتھ سے بھی چھوٹا رہ گیا۔ زبان، نسل، ثقافت، مسلک یا مذہب کی بنیاد پر لوگوں نے کا سُنتے آئے تھے، اُنہیں دیکھ بھی لیا۔ ghettos الگ بستیاں قائم کرلی ہیں۔ دُنیا بھر میں خودفریبی کی انتہا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ سے یکسر بیگانی بستیوں کے مجموعے کو ہم میگا سِٹی کہہ کر خوش ہو رہے ہیں!

شہر جل رہا ہے مگر اِس کے مکینوں کو بظاہر پروا نہیں۔ اب تک اپنے پرائے کی بحث ہو رہی ہے۔ اندرون اور بیرون ملک سے آئے ہوئے جو لوگ چھ سات عشروں سے شہر میں آباد ہیں اور اپنے مُردے یہیں دفناتے ہیں وہ بھی مائی کولاچی کی نگری کو گلے لگانے کے روادار نہیں۔ شہر سے کمانے کی سب کو پڑی ہے مگر اِس شہر کو اپنانے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ معاشرت کے نام پر چھچھورپن اور معیشت کے نام پر مکر وفریب چلن بن گیا ہے۔ علم کو زندہ گاڑا جاچکا ہے۔ عمل کی

لاش بے گور و کفن پڑی ہے۔ دانش کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ نیّتوں میں اخلاص، رویّوں میں تحمل نہیں۔ قدم قدم بے حِسی، گام گام بے دِلی۔ ایک بیزاری ہے کہ شہر پر محیط اور شہریوں پر مسلّط ہے۔ فضا مسموم بھی ہے، مغموم بھی۔

قتل و غارت کی وباء نے شہر میں خیمہ گاڑ رکھا ہے۔ جنہیں اِس وباء کے تدارک پر مامور کیا گیا ہے وہ اپنی تجوریاں بھرنے کے سفّاک مرض میں مبتلا ہیں۔ لوگ بلا سبب موت کے گھاٹ اُتارے جا رہے ہیں۔ جو قاتلوں کی زد میں آنے سے محفوظ رہتے ہیں وہ ہلاکتوں پر پَل بھر کو تاسف کا اظہار کرتے ہیں اور پھر اپنے اپنے معمولات میں گم ہو جاتے ہیں۔ مصروف زندگی کا یہی سب سے بڑا "مُعجزہ" ہے۔ شہر اِتنا پھیل گیا ہے کہ ایک علاقے کے حالات دوسرے علاقوں پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ اور اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کوئی ایک علاقہ بھی اپنے سنگین واقعات کے تمام اثرات قبول نہیں کرتا، یعنی زندگی کا سرکس اپنے ہر کرتب اور تماشے کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

لوگ اِس بات پر نازاں ہیں کہ سب کچھ جھیل کر بھی کراچی زندہ ہے، سانس لے رہا ہے اور متحرک ہے۔ اچھی بات ہے۔ مگر اِسے کیا کہا جائے؟ زندہ دِلی یا بے حِسی؟ سب کچھ برداشت کرکے زندہ رہنا اچھا وصف ہے، شجاعت کا نشان ہے مگر سب کچھ دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کرکے اپنے کام سے کام رکھنا کون سے درجے کی

زندگی ہے؟ سب کے دُکھ محسوس کرتے ہوئے پورے عزم کے ساتھ زندگی بسر کرنے اور دوسروں کا درد محسوس کرنے سے یکسر گریز کرتے ہوئے محض جیے جانے میں تو بہت فرق ہے! پاکستان میں بالعموم اور کراچی میں بالخصوص یہ فرق بُھلا دیا گیا ہے۔
حکمرانوں اور ذمہ داروں کو رحم سے کچھ غرض ہے نہ کرم سے۔ شاید اِسی لیے کراچی جیسے وسیع و عریض اور معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھنے والے شہر کو شر پسندوں اور مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اِتنے بڑے شہر میں امن ہے نہ امان۔ ہاں، امن و امان کی صورتِ حال برقرار و توانا ہے۔
تین عشروں کے دوران کراچی کے مکینوں نے سیلف بیلینسنگ کا فن سیکھ لیا ہے۔ لوگ خود کو حالات کے مطابق بدلتے جاتے ہیں۔ شہر نے کئی رنگ بدلے ہیں اور اِس کے مکین ہر رنگ میں رنگتے گئے ہیں۔ زندہ رہنے کا عمل تو خیر جاری ہے مگر زندگی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔
جس کسی کے دل میں کراچی سمیت پورے پاکستان کا درد ہو وہ اتنا تو ضرور سوچے گا کہ اگر اب بھی ہوش کے ناخن لینے کا وقت نہیں آیا ہے تو پھر کب آئے گا؟

مُبالغہ بھی چلے گا، مگر سوچ سمجھ کر

ایک طرف ہم جیسے ہیں جنہیں ذرا سی کالم نگاری پر خدا جانے کیا کیا ناز ہے اور دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں کہ بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں مگر غرور نہیں کرتے۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ ایس ایم صادق چالیس ہزار گیت لکھ چکے ہیں مگر مجال ہے جو اہل وطن کو معلوم بھی ہوا ہو کہ ایس ایم صادق نام کا کوئی گیت نگار بھی اُن کے درمیان ہے! "عظمت" اِسی میں ہے کہ چپ چاپ کام کرتے جایئے اور شہرت کے بارے میں سوچیے بھی مت۔ اگر شہرت کا تعاقب کیا جائے تو معاملہ بدنامی پر ختم ہونے کا احتمال رہتا ہے!

ہمارے ہاں سبھی کو کارکردگی پندرہ بیس گنا کرکے بیان کرنے کا شوق، بلکہ ہَوکا ہے۔ ایک بار کسی ٹی وی پروگرام میں مشہور گلوکار مجیب عالم سے میزبان نے فلمی کیریئر کے بارے میں پوچھا تو مرحوم نے خاصی سادگی سے کہا کہ فلمی دنیا میں آٹھ دس سال گزارے اور ڈھائی تین ہزار گانے گائے! مجیب عالم نے 1964 میں فلم "نرگس" کے لیے ایک گیت گاکر فلمی دُنیا میں قدم رکھا۔ پھر ناشاد کی موسیقی میں اُنہوں نے 1966 میں ریلیز ہونے والی فلم "جلوہ" میں "وہ نقاب رُخ اُلٹ کر ابھی سامنے نہ آئیں" گایا اور شہرت کی بلندی پر پہنچ

گئے۔ فلمی دُنیا میں مجیب عالم 1986 تک کسی نہ کسی طرح فعال رہے۔ مگر اِن 20 برسوں میں اُن کے گائے ہوئے فلمی گانے 100 سے کم ہیں!

شہنشاہِ غزل مہدی حسن مرحوم ہی کی مثال لیجیے۔ کئی بار اُنھوں نے سر محفل اپنے گائے ہوئے آئٹمز کی تعداد 54 ہزار بتائی! حقیقت یہ ہے کہ اُن کے اُردو، پنجابی اور دیگر زبانوں کے فلمی نغمات کی مجموعی تعداد تقریباً 650 ہے! ریڈیو اور ٹی وی کے لیے گائی ہوئی غزلوں اور گیتوں کی مجموعی تعداد بھی اِتنی ہی یا اِس سے تھوڑی سی زیادہ ہو سکتی ہے۔ مہدی حسن مرحوم نے درجنوں پرائیویٹ البم بھی گائے۔ مگر وہ تمام آئٹمز بھی 300 تا 500 ہیں۔ یعنی شہنشاہِ غزل کے گائے ہوئے آئٹمز کی مجموعی تعداد پونے دو ہزار تک ہے! اب کہاں 54 ہزار اور کہاں دو ہزار! واضح رہے کہ ہم مقدار کی بات کر رہے ہیں، معیار کی نہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ خاں صاحب کے گائے ہوئے بہت سے آئٹمز موتیوں میں تولے جانے کے لائق ہیں۔

حال ہی میں مہناز بیگم کا انتقال ہوا ہے۔ اِتنی کامیاب اور مقبول گلوکارہ کے گائے ہوئے فلمی گانوں کی تعداد 195 ہے! ہم یہ تعداد احتیاطاً درج کر رہے ہیں تاکہ مہناز بیگم کو خراج عقیدت پیش کرتے وقت کوئی جذباتی ہو کر یہ نہ کہہ دے کہ مرحومہ نے ہزاروں فلمی نغمے ریکارڈ کرائے!

فن کے معاملے میں ملکہ ترنم نور جہاں کی عظمت سے کون انکار کرسکتا ہے؟زندگی بھر
اردو اور پنجابی فلموں میں گاتے گاتے ملکہ ترنم کی آواز ہی نہیں، گلا بھی گِھس گیا مگر اُن
!کے (انڈین اور پاکستانی) فلمی گانوں کی تعداد بھی ڈیڑھ پونے دو ہزار سے زائد نہیں
اپنی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا مقابلہ محمد رفیع مرحوم اور لتا منگیشکر کے
درمیان بھی ہوا۔ ایک بار لتا جی نے کہا کہ وہ 22 ہزار سے زائد گانے گا چکی ہیں۔ اِس
کے جواب میں محمد رفیع مرحوم نے اپنے گائے ہوئے نغمات کی تعداد 26 ہزار بتائی !
تحقیق، بلکہ تحقیقات پر رفیع صاحب کے فلمی گانوں کی تعداد 5700 نکلی۔ تب تک لتا جی
بھی تقریباً 5 ہزار آئٹمز ریکارڈ کرا چکی تھیں۔ غنیمت ہے کہ محمد رفیع اور لتا منگیشکر نے
اپنی کارکردگی کو صرف 500 فیصد بڑھا کر یعنی پانچ گنا کرکے بتایا۔ ہمارے ہاں تو
کارکردگی میں دو ڈھائی ہزار فیصد کا اضافہ کوئی بات ہی نہیں۔ ہمارے کئی گلوکار ایسے ہیں
جن کا ایک آدھ گانا ہی ہٹ ہو سکا اور پھر وہ زندگی بھر اُسی کی کمائی کھاتے رہے۔ ایس بی
جان نے 1959 میں ماسٹر منظور حسین کی موسیقی میں فلم "سویرا" کے لیے فیاض
ہاشمی کا لکھا ہوا گیت "تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے" گایا اور راتوں رات ملک گیر
شہرت پائی۔ اِس کے بعد اُنہوں نے فلموں کے لیے کچھ خاص

نہ گایا، ٹی وی کے لیے البتہ چند آئٹمز گائے۔ اِس ایک گیت کی بنیاد پر بھی اُنہیں پرائڈ آف پرفامنس سے نوازا گیا۔ پچاس سال قبل فضل حسین نے فلم "طوفان" کیلئے "آج یہ کِس کو نظر کے سامنے پاتا ہوں میں" گا کر شہرت پائی مگر اِس کے بعد کچھ نہ گا سکے۔

اپنی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا ہمارے ہاں فیشن سے بڑھ کر عادت بن چکا ہے اور پھر لوگ بھی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ اِنسان کا دماغ قابو میں نہیں رہتا۔ عام سا فنکار بھی مر جائے تو خراج عقیدت پیش کرنے والے کہتے ہیں کہ ایسی عظیم ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں! ہر ایک کو افسانوی شہرت کی حامل (لیجینڈری) شخصیت قرار دینے کی وباء بھی پاکستان میں عام ہے! ایسے میں ہر فنکار خود کو لیجینڈ کیوں نہ سمجھے۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جُنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں!

ایس ایم صادق صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک رات میں 100 گیت لکھ سکتے ہیں! ہم سُوئے ظن نہیں رکھ سکتے۔ وہ صادق ہیں، سچ ہی کہا ہوگا۔ ساتھ ہی اُن کا شِکوہ ہے کہ صدر نے اُنہیں اب تک پرائڈ آف پرفارمنس کے قابل نہیں سمجھا۔ اُن کا شِکوہ بے جا نہیں۔ جب چند نغمات کی بنیاد پر ایس بی جان پرائڈ آف

پرفارمنس لے سکتے ہیں تو پھر ایس ایم صادق نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے کہ اُنہیں اِس اعزاز سے محروم رکھا جائے! ویسے ہمیں بھی حیرت ہے کہ صدر صاحب کی نظر سے ایس ایم صادق کیسے چُوک گئے۔ وہ تو پانچ سال سے چُن چُن کر پرائڈ آف پرفارمنس بانٹ رہے ہیں! جب ہما شُما کو اعزازات بانٹنا ہی ٹھہرا تو ایس ایم صادق پر بھی کرم کی نظر ہو جائے! جو کام ہمارے ہاں چالیس پچاس شُعراء مل کر نہ کر پائیں وہ ایس ایم صادق نے تنہا کر دِکھایا ہے۔ والیوم کے لحاظ سے دیکھیے تو وہ اپنی ذات میں ادارہ، بلکہ !پورا مُشاعرہ ہیں

روزنامہ دنیا سے ایس ایم صادق کی گفتگو نے ہمارے اِس خیال کو مزید پُختہ کر دیا کہ شاعری اب اداریہ نویسی جیسی ہو کر رہ گئی ہے یعنی جو کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے وہ ضبطِ تحریر میں لے آیئے۔ اب اِسے آپ جو بھی چاہیں وہ نام دے لیں۔ گیت، غزل، نثری نظم، آزاد نظم۔ یاد رکھیے کہ آج کی شاعری کے لیے سوچنا زہر ہے یعنی ذہن کسی بھی مرحلے پر استعمال نہیں ہونا چاہیے! بے ذہنی کی حالت میں آپ ایک رات میں سو کیا، ہزار گیت بھی لکھ سکتے ہیں۔ اور اگر ذہن کو زحمت دی تو ایک ماہ میں بھی ایک گیت مکمل نہ ہوسکے گا! ویسے بھی شاعری دِل کا کام ہے، دِماغ کا نہیں! اور آج کی شاعری کو برداشت یا ہضم کرنے کے لیے اہل ذوق کے دِل، دِماغ، گُردے اور جگر سب بہترین !حالت میں ہونے چاہئیں

ہمیں تو اُن پر ترس آتا ہے جو رات رات بھر کروٹ بدل بدل کر ڈھنگ سے ایک غزل بھی نہیں کہہ پاتے۔ ادھوری غزل کا عذاب اُنہیں دائمی قبض میں جکڑے رہتا ہے! کیا ہی اچھا ہو کہ ایس ایم صادق کچھ راہ نُمائی فرمائیں۔ وہ تو خیر سے چالیس ہزار گیت لکھ چکے ہیں۔ کچھ تو بتائیں کہ اِس بسیار گوئی کے باوجود اُن کے دِل و دماغ کِس طور سلامت ہیں! اچھا ہے، دوسرے بھی کچھ سیکھ لیں اور شعر کہنے کے نام پر اندھیرے میں !ٹامک ٹوئیاں مارتے نہ رہ جائیں

سچی بات تو یہ ہے کہ جب ہم نے ایس ایم صادق کی گفتگو پڑھی تو اپنا سا مُنہ لیکر رہ گئے۔ احباب نے بھی طعنے دیئے کہ چند کالم کیا لکھ مارے، خود کو طُرّم خاں سمجھنے لگے ہو۔ ذرا ایس ایم صادق صاحب کو دیکھو۔

!اِس طرح سے کہتے ہیں سُخن ور سہرا

اگر ہم یومیہ کالم بھی لکھیں تو سال بھر میں 365 کالموں سے زیادہ کیا لکھ پائیں گے؟ اور اگر معاملہ اِسلامی کیلینڈر کا ہو تو اِن میں سے بھی 11 کالم گھٹا دیجیے! ہم نے کم و بیش اٹھائیس سال قلم گِھسا ہے مگر کیا تیر مار لیا؟ یہی کوئی ہزار بارہ سو کالم اور آرٹیکلز لکھے ہوں گے۔ ہاں، مختلف اخبارات کی نیوز ڈیسک کے لیے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ہماری بنائی ہوئی خبریں پچپیں

تیس ہزار ضرور ہوں گی۔اِن خبروں کو ہم ایس ایم صادق کے گیتوں کی ٹکر پر رکھ سکتے ہیں کیونکہ اِن کی تیاری میں ذہن کچھ خاص استعمال یا خرچ نہیں ہوا!

بولتے رہیے ملک صاحب، مزا آ رہا ہے

رحمٰن ملک صاحب کو بلا خوفِ تردید '{ '{ وزیر اطلاعات برائے تخریبات" قرار دیا جاسکتا ہے۔ اُن کا دم غنیمت ہے کہ دہشت گردی اور تخریب کاری کے بہت سے واقعات کا ہمیں پہلے سے علم ہو جاتا ہے۔ سیاسی پیش گوئی کے معاملے میں رحمٰن ملک صاحب اپنے چاہنے والوں یعنی اہل وطن کو "حق الیقین" کی منزل تک پہنچا کر دم لیتے ہیں! اگر رحمٰن ملک نہ ہوں تو ٹی وی اینکرز کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے کہ کیا بولنا ہے اور کیوں بولنا ہے۔ سیاست دان ٹامک ٹوئیاں ہی مارتے رہیں کہ دہلا مارنے کے لیے نہلا کہاں سے لائیں! یہ ہمارے پیارے وفاقی وزیر داخلہ ہی کا کمال ہے کہ جب بھی زبان کھولی ہے، کسی دھماکے یا قتل و غارت کا "مژدہ جاں فزا" ہی سُنایا ہے! ایسا لگتا ہے اُن کے پاس کوئی جادو کا گولا ہے جس میں وہ مستقبل کے واقعات دیکھ لیتے ہیں۔ ملک صاحب شاید دنیا کے واحد وزیر داخلہ ہیں جو وارداتوں کی روک تھام کریں نہ کریں، ہمیں اُن پر مطلع ضرور کردیتے ہیں تاکہ سَند رہے!

وزیر داخلہ نے تازہ بیان میں کہا ہے کہ وہ اب بھی اپنی اِس بات پر قائم ہیں کہ کراچی اور کوئٹہ میں بڑے پیمانے پر دہشت گردی اور تخریب کاری ہونے والی

ہے۔ چشمِ فلک نے شاید ہی کوئی اور وزیر داخلہ دیکھا ہو جو اپنے موقف پر اِس قدر ڈٹا رہتا ہو۔ رحمٰن ملک نے دونوں شہروں کے مکینوں کو خبردار کردیا ہے۔ اب تاریک راہوں میں مارے جانے کا شکوہ نہیں کرسکتا کیونکہ وزیر داخلہ نے اپنے چشم کشا بیانات، انکشافات اور اعلانات سے تخریب اور قتل و غارت کی راہوں کو روشن کردیا ہے!

اب یہ راہیں دُور سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ پھر بھی کوئی اِن پر چلے تو اُس کا نصیب۔ رحمٰن ملک صاحب کی باتوں پر ہمیں مہدی حسن اور نور جہاں کا گایا ہوا 1970 کے عشرے کا ایک فلمی دوگانا یاد آگیا جس کا مکھڑا تھا۔

میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ محبت نہ کرو
تم مِرے پیار کو ٹھکراؤ گے، پچھتاؤ گے!

دہشت گردوں، تخریب کاروں اور شرپسندوں کو ایسی سہولت کہاں ملے گی؟ اُنہیں الگ سے کوئی "اعلانچی" مقرر کرنے کی ضرورت نہیں! رحمٰن ملک ترجمانی کے لیے حاضر ہیں۔ اور ایسی قطعیت کے ساتھ کہ جدید ترین ٹیکنالوجی سے بنائے جانے والے آلات بھی دیکھیں تو شرما جائیں!

رحمٰن ملک جب اپنے بیانات میں مزاح کا پہلو سمونے پر آتے ہیں تو قیامت ڈھاتے ہیں۔ تین دن قبل اُنہوں نے کہا کہ اب جبکہ منتخب حکومت کی میعاد ختم

ہونے کو آئی ہے، بعض لوگ اپنے بیانات کے ذریعے حکومت کے ناکام رہنے کا تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں! ملک صاحب نے یہی نہیں کہا بلکہ ایک قدم آگے جا کر یہ بھی کہا کہ اُنہوں نے یہ بات پانچ ماہ قبل کہہ دی تھی! یہاں تھوڑا سا ابہام ہے۔ رحمٰن ملک صاحب نے پانچ ماہ قبل کون سی بات کہی تھی؟ یہ کہ حکومت ناکام رہی ہے؟ یا یہ کہ لوگ یہ تاثر دینے کی کوشش کریں گے کہ حکومت ناکام رہی ہے؟ رحمٰن ملک ہی وضاحت فرمائیں کہ پانچ برسوں کے دوران عوام نے کب حکومت کو ناکام قرار نہیں دیا!

ہمارے وزیر داخلہ ملٹی پرپز ثابت ہوتے رہے ہیں۔ روٹھے ہوؤں کو منانے کے لیے بھی ان کی خدمات حاصل کی جاتی رہی ہیں۔ ایسے میں معاملات میں اِن کا تحرّک فہم سے بالا ہے۔ رابطہ کاری میں کوئی اِن کی سی پُھرتی دکھائے تو سہی۔ اتحادیوں کو منانا ہو یا مخالفین کو رام کرنا ہو، اِن کی "آنیاں جانیاں" دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں! رحمٰن ملک صاحب نے اور ہی کمال کیا ہو یا نہ کیا ہو، سب سے زیادہ سفر کرنے والے وزیر داخلہ کا عالمی ریکارڈ تو شاید قائم کر ہی دیا ہے۔ اور اُن کے دور میں اہل وطن نے بھی شاید suffer کرنے کے ریکارڈ توڑ ڈالے ہیں!

رحمٰن ملک کو گزشتہ دنوں ڈاکٹرز نے گلے کے آپریشن کا مشورہ دیا ہے۔ ساتھ ہی

بولنے میں احتیاط برتنے کی ہدایت بھی کی ہے۔ یہ ہدایت ہمارے حلق سے نہیں اتری۔ اگر رحمٰن ملک نے بولنے میں احتیاط برتنا شروع کر دیا تو ہم جیسوں کا کیا ہوگا جو اُن کی باتوں سے مزاح کشید کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں؟ ڈاکٹرز کو اِتنا بے رحم نہیں ہونا چاہیے۔ اب چند افراد ہی تو رہ گئے ہیں جن کی لب کُشائی سے قوم کو تفریح کے چند لمحات میسر ہوتے ہیں۔ کیا اُنہیں بھی چپ کرا دیا جائے گا؟

خسارے کی فارمنگ

دنیا نے پتہ نہیں کیا کیا سیکھ لیا ہے مگر اب تک معیشت کو سُبک رفتاری سے چلانے کا ہُنر نہیں سیکھا۔ قدرت کے کارخانے میں کوئی بھی چیز نِکمّی نہیں ہوتی۔ یہ اُصول ہم نے ساٹھ سال قبل معلوم، دریافت یا ایجاد کرلیا تھا مگر دُنیا اب تک تحقیق میں جُتی ہوئی ہے۔ معیشت کے معاملے میں تحقیق کی منزل ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ وہ اور ہیں جو تحقیق کی بازی کھیلنے پر مجبور ہیں، ہم تو اب ایک قدم آگے جاکر تحقیق کا موضوع ہیں! ہم وہ ہیں کہ نفرت کی انتہا سے بھی محبت کشید کریں اور دُنیا سے داد چاہیں۔ ادب کی اِس نکتہ سَنجی کو ہم نے معیشت کی دنیا میں بھی بخوبی داخل اور استعمال کیا ہے۔ منفعت کو تو سبھی گلے لگاتے ہیں۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ع

منفعت ایک ہے اِس قوم کی، نقصان بھی ایک!

علامہ اقبال کے اِس مصرع سے ہم نے خاصا منفرد مفہوم کشید کیا ہے یعنی بات جب کاروبار کی آ جائے تو صرف نفع کو گلے نہ لگاؤ کہ نقصان یا خسارے کو بھی التفات کے قابل سمجھو کہ وہ بھی تو وجود رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں تشکیل پانے والی حکومتوں نے علامہ اقبال کی یہ بات ذہن میں گرہ کی طرح باندھ لی ہے کہ

جب منفعت اور نقصان ایک ہے تو نقصان کو بھی، بلکہ نقصان ہی کو گلے لگانے میں کیا مضائقہ ہے!

دُنیا بھر میں رائے عامہ کے ادارے جب بھی کسی مثبت امر کے حوالے سے تحقیق کا نچوڑ پیش کرتے ہیں تو پاکستان کو آخری پائیدان پر رکھتے ہیں۔ 45 ممالک کے ایک حالیہ سروے میں بتایا گیا ہے کہ دور اندیشی کے حوالے سے جرمنی سب سے آگے اور پاکستان سب سے پیچھے ہے۔ دُنیا شاید اب تک دور اندیشی کے مفہوم سے آشنا نہیں۔ دُور اندیشی کا لفظی مفہوم یہی ہے نا کہ اندیشوں کو دور کردیا جائے یا اُن سے دور رہا جائے! ہماری حکومتوں کی دانش مندی ملاحظہ فرمایئے کہ بڑے اداروں کو چلانے کا ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ نفع و ضرر کی باہمی کشمکش ختم ہوچکی ہے۔ جب منافع ہوگا تو خسارے کا خدشہ بھی زندہ رہے گا۔ یعنی بہتر یہ ہے کہ اداروں کو خساروں کی پرورش پر لگا دیجیے، خسارے کا اندیشہ ہی نہ رہے گا! حیران نہ ہوں، اِسی نکتے کو غالب نے یوں بیان کیا ہے

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو!

ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے اداروں کے بزرجمہر آج تک اندازہ نہیں لگا سکے کہ پاکستان کا اصل مسئلہ وسائل کی کمی نہیں، بہتات ہے! ہماری حکومتیں ثابت کرتی آئی ہیں کہ وسائل اِس قدر ہیں کہ اُنہیں ٹھکانے لگانے کے

لیے ادارے قائم کرنے اور چلانے پڑتے ہیں! عالمی سطح پر تسلیم شدہ معاشی اُصولوں کی حد جہاں ختم ہوتی ہے وہاں ہمارے معاشی نظریات کی دُنیا شروع ہوتی ہے۔ دُنیا اثاثوں پر مرتی ہے۔ اگر ہم بھی ایسا ہی کریں تو نئی بات کیا ہوئی؟ کوئی جگرا تو دیکھے کہ ہم نے اثاثوں کو لات مار کر واجبات سے محبت اپنے آپ پر واجب کرلی ہے! اپنی اولاد کو تو سبھی پالتے ہیں۔ عظمت اُن بچوں کو پالنے میں ہے جن کا حسب نسب معلوم نہ ہو!

قومی وسائل کو حیران کن رفتار سے ٹھکانے لگانے کے لیے ویسے تو اور بھی کئی ادارے ہیں مگر پی آئی اے، ریلوے اور پاکستان اسٹیل کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اِن تین اداروں کی مثلّث نے قومی وسائل کے ایک بڑے حصے کو مُربّہ بنا کر چاٹ لیا ہے! یہ وہ تکون ہے جس کا ہر کونا قومی معیشت کے نازک بدن میں چُھری کی نوک کی طرح چُبھ رہا ہے!

پی آئی اے کے معاملے میں ہم اب تک طے نہیں کرسکے کہ اِس کے طیاروں کی پرواز زیادہ بلند ہے یا خسارے کی۔ باکمال لوگوں کی سروس ایسی لاجواب ہے کہ تیزی سے پنپتا خسارہ دیکھ کر قوم اور قومی خزانہ دونوں "ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم" کی مثال بن کر رہ گئے ہیں! لوگ اب تک یہی سمجھتے آئے تھے کہ طیارے پرواز کے لیے ہوتے ہیں۔ پی آئی اے کی مہربانی کہ اُس نے گراؤنڈیڈ رکھے جانے

والے طیارے بھی مارکیٹ میں پیش کر دیئے ! لوگوں کو زمین پر سُکون سے کھڑے ہوئے طیاروں پر اعتراض ہے کہ اُڑ نہیں رہے۔ کسی نے اِس بات پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ چیل، کوّے اور کبوتر جیسے معمولی پرندے اربوں روپے مالیت کے طیاروں سے ٹکراتے اور شدید نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ محض اُڑانے کا شوق پورا کرنے کے لیے تو اربوں روپے کے طیاروں کو داؤ پر نہیں لگایا جاسکتا !

جمہوریت کے کھاتے میں ڈالی جانے والی ایک اور حکومت نے جاتے جاتے پی آئی اے کا خسارہ کم کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ تنخواہوں میں 45 فیصد اضافے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اگر پی آئی اے کا سالانہ خسارہ 12 سے 15 ارب روپے ہے اور مجموعی خسارہ 140 تک جا پہنچا ہے تو کیا لازم ہے کہ اِس کے ملازمین کو بھی خسارے میں رہنے دیا جائے؟ ادارہ نہ سہی، کم از کم ملازمین تو خسارے میں نہ رہیں! دُنیا بھر کے معاشی ماہرین مل کر بھی اب تک خسارہ کم کرنے کا ایسا عمدہ طریقہ وضع نہیں کرسکے !

ریلوے کا جائزہ لیجیے تو یہ طے کرنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ ادارہ ٹرینیں چلانے کے لیے بنایا گیا ہے یا پاکستانی قوم اِس ادارے کو چلانے کے لیے پیدا کی گئی ہے! ہماری ٹرینیں شاید شاعرانہ مزاج رکھتی ہیں۔ یعنی

!حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے

ہمارے خیال میں یہ بھی لوگوں کو اپنے ہی وطن کے مختلف حصوں سے رُوشناس کرانے کا ایک طریقہ ہے۔ جن علاقوں سے ٹرین میں لوگ بس یونہی گزر جاتے ہیں وہاں ٹرین کے رُکنے پر تھوڑا سا گھوم لیں، ماحول کا جائزہ لیں اور مقامی لوگوں سے واقف ہولیں! ریلوے کا محکمہ لوگوں کو قریب لانے کے لیے ہے اور لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب !لانے کی ایک صورت یہ بھی ہے

ریلوے کی زبوں حالی پر قوم کا واویلا ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم قوانین پر عمل کے بغیر جی رہے ہیں۔ تعلیم نہ ہونے سے بھی کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔ اخلاقی اقدار کا جنازہ اٹھ چکا ہے مگر ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہیں۔ تو پھر ایک ریلوے کے نہ ہونے سے کون سی قیامت آ جائے گی؟ افغانستان سمیت کئی ممالک میں ریلوے نہیں ہے تو کیا یہ ممالک صفحۂ ہستی سے مِٹ گئے؟

کراچی میں سرکلر ریلوے کو ختم ہوئے زمانہ گزر گیا۔ اِس کے ریلوے سسٹم کے پلیٹ فارم سڑ سڑا گئے، کچرا کنڈی بن گئے۔ اِنہیں پارک کی شکل دیکر لوگوں کو تفریح کا بہتر ذریعہ فراہم کیا جاسکتا تھا! سرکلر ریلوے کی بندش کا واویلا اب تک کیا جارہا ہے۔ جب پورے ملک میں ریلوے کو بندش کا سامنا ہے تو پھر ایک

سرکلر ریلوے کا رونا روتے رہنے سے فائدہ؟
پاکستان اسٹیل ملک کا ایک اہم ادارہ ہے۔ یہ نہ ہو تو ہر حکومت اپنے بندے کہاں کھپائے؟ پاکستان اسٹیل کی کوئی بھی پروڈکٹ اِس کے خسارے سے مضبوط نہیں! یہ خسارہ واقعی اسٹین لیس یعنی بے داغ ہے! پاکستان اسٹیل کو ناکام قرار دینے والے یہ بھول جاتے ہیں یہ ادارہ سابق سوویت یونین کے تعاون سے قائم کیا گیا تھا۔ جب دُنیا کے نقشے پر سوویت یونین ہی کا وجود نہ رہا تو پاکستان اسٹیل کو زندہ رہ کر کیا کرنا تھا؟ مالک نہ رہے تو پالتو جانور اُداس ہو کر کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں۔ کیا پاکستان اسٹیل اِتنی وفاداری بھی نہ دِکھاتا! خسارے کے معاملے میں یہ ادارہ بھی پی آئی اے کے نقش قدم پر گامزن ہے یعنی ملازمین خسارے میں نہیں رہتے!
پاکستان اسٹیل، پی آئی اے اور ریلوے پر مبنی مثلّث میں ہر زاویہ دیگر دو کو تقویت بہم پہنچا رہا ہے۔ پی آئی اے کی طرح دیگر دو ادارے بھی اڑان نہیں بھر رہے۔ ریلوے کی طرح دیگر دو بھی خسارے کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ اور پاکستان اسٹیل کی طرح دیگر دونوں اداروں کا خسارہ بھی خالص فولاد سا مضبوط ہے!

کسی دریا کے کنارے ایک شخص اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ وہ کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ باقاعدگی سے عبادت کر کے اللہ کے شکر گزار بندوں میں شامل رہنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ ایک دن وہاں ایک بزرگ پہنچے۔ اُنھوں نے کسان سے پوچھا صرف کھیتی باڑی کرتے ہو یا کبھی کوئی وظیفہ وغیرہ بھی کیا ہے، معرفت کی کوئی منزل بھی طے کی ہے۔ کسان نے کہا کہ دُنیا کے جھمیلوں میں وظیفہ کہاں سے ہو سکتا ہے۔
بزرگ نے بتایا کہ کہ اُنھوں نے کئی وظیفے کیے ہیں، کئی چلّے کاٹے ہیں۔ اور یہ کہ اُنہیں کئی برس کی ریاضت اور مجاہدے کے بعد چند "کرامات" ملی ہیں۔ یہ کہہ کر بزرگ اُس کسان کے ساتھ دریا کے کنارے پہنچے۔ اُنھوں نے کسان کا ہاتھ پکڑا اور دریا میں اُتر گئے۔ دونوں پانی پر چلتے ہوئے دوسرے کنارے تک پہنچے اور پھر اسی طرح واپس بھی آ ئے!
کسان تھوڑا سا مرعوب دِکھائی دیا۔ بزرگ نے تحسین طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ کسان خاموش رہا۔ پھر اُس نے ایک کشتی والے کو بلایا، بزرگ کے ساتھ کشتی پر سوار ہوا۔ دونوں دوسرے کنارے تک گئے۔ پھر کسان نے کشتی والے سے واپس چلنے کو کہا۔ واپسی پر کشتی سے اُتر کر کسان کشتی والے کو کرائے کی مد

میں دو آنے دینے کے بعد بزرگ سے مخاطب ہوا۔ "محترم! جو کام دو آنے میں ہو سکتا ہے اُس کے لیے اِتنی شدت تک ریاضت اور مجاہدہ کیوں؟ وقت ضائع کرنے کے بجائے کچھ محنت مشقت کیجیے، دُکھی انسانوں کی کام آئیے۔"

ہم بھی اِس کہانی کے بزرگ کی طرح زندگی بھر پانی پر چلنے کا ہنر سیکھنے کے لیے اُتاولے اور باولے ہوئے جاتے ہیں۔ سبھی چاہتے ہیں کہ سب کچھ پلک جھپکتے میں یا راتوں رات مل جائے، دیکھتے ہی دیکھتے کام ہو جائے، بات بن جائے۔ جس طرح پریشر ککر میں کھانا تیزی سے پک جاتا ہے بالکل اُسی طرح ہم ہر معاملہ پریشر ککر میں ڈال کر پکانا چاہتے ہیں۔

کچھ کئے بغیر سب کچھ پانے کی ذہنیت پورے معاشرے پر محیط ہے۔ جو بچے کرکٹ کھیلتے ہیں وہ بیٹ پکڑتے ہی خود کو میانداد، ظہیر عباس یا شاہد آفریدی سے کم نہیں سمجھتے۔ گیند پھینکتے وقت ہر لڑکا خود وسیم اکرم یا عمران خان تصور کرتا ہے۔ جنہوں نے ابھی گانا سیکھا ہی نہیں وہ مائکروفون ہاتھ میں آتے ہی خود کو محمد رفیع یا مہدی حسن سے کم سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

کامیابی کے لیے درکار محنت سے جان چھڑانے کے لیے لوگ شارٹ کٹ تلاش کرتے ہیں۔ تعویذ کی طلب ہوتی ہے، وظیفہ پڑھا اور کیا جاتا ہے تاکہ نہ ہوتا کام دیکھتے

ہی دیکھتے ہو جائے۔ ایسی ذہنی حالت میں لوگوں کو گھوم پھر کر صرف کالا جادو یاد رہ جاتا ہے۔ جن کی زندگی میں مسائل کا انبار لگا ہو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کالا جادو اُن کا نجات دہندہ بن کر ہر مشکل حل کردے گا۔

جو لوگ عمل کی دُنیا سے ناتا توڑ لیتے ہیں وہ "عامل" کہلاتے ہیں اور دوسروں کو بھی عمل ترک کرکے "عملیات" کی راہ پر گامزن ہونے پر اُکساتے ہیں! زیادہ پیچیدہ مسائل حل کرنے کے لیے اُلّو کا عمل کرانے کا مشورہ دیا جاتا ہے اور بہت سے بے پَر کے اُلّو اِس کے لیے تیار بھی ہو جاتے ہیں! قوم چاہتی ہے کہ برسوں، بلکہ عشروں کی ہڈ حرامی اور مُفت خوری کا تدارک معمولی تعویذ سے ہو جائے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ چند آڑی ترچھی لکیروں اور مبہم کلمات پر مبنی عملیات میں اگر واقعی اِتنا دم خم ہوتا تو دنیا ویسی کب ہوتی جیسی ہے! سڑکیں، بازار، کارخانے اور ادارے سُنسان ہوتے۔ سب کچھ وظیفوں کی مدد سے گھر بیٹھے ہو رہا ہوتا! تھوڑی بہت رونق ہوتی تو بس قدیم قبرستانوں میں ہوتی!

لوگ اپنے طور پر طے کرچکے ہیں کہ کالا جادو ہر مسئلے کا حل ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ معمولی گھریلو جھگڑے ختم کرنے اور "ناپسندیدہ" شخصیات پر قابو پانے کے لیے بھی کالا جادو ہی حرکت میں لایا جاتا ہے۔ اب کیا کسی بہو کے

لیے ساس اِتنا بڑا مسئلہ ہے کہ کالا جادو کیا اور کرایا جائے؟ کیا کسی عورت کے لیے اُس کی نند اِتنی بڑی مصیبت ہے کہ اُس سے نجات پانے کے لیے بابا سے تعویذ لایا جائے؟ رشتہ نہ آ رہا ہو تو لڑکیاں تعویذ گنڈے کے چکر میں پڑ جاتی ہیں۔ گویا خوابوں کے شہزادے کو نہیں بلکہ جنّات کی نگری سے تعلق رکھنے والے کسی "گُل فام" کو متوجہ کرنے کی تیاری ہے! لوگ ایسے ایسے مسائل لیکر آستانوں پر حاضر ہوتے ہیں کہ بابا تو بابا، خود کالا جادو بھی سوچ میں پڑ جاتا ہے! بے چارا کالا جادو پریشان ہی رہتا ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ جو کام دو تین گالیوں اور چار چھ تھپڑوں سے بخوبی ہو سکتا ہے اُس کے لیے بھی شمع کالے جادو کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ یعنی لوگ توپ سے چڑیا کا شکار کرنا چاہتے ہیں!

ہمارے ہاں بیشتر سیاسی مسائل اِس لیے حل نہیں ہو پا رہے کہ کالے جادو کو چھوٹے موٹے گھریلو کاموں سے فرصت ہی نہیں مل پا رہی! وہ فارغ ہو تو سیاست دان اُس سے کچھ کام لیں۔ پانچ برسوں کے دوران منتخب حکومت نے اپنے طور پر ذرا مختلف قسم کا کالا جادو متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ "مفاہمت کی سیاست" کے نام پر کالے جادو کا ایسا عمل متعارف کرایا گیا کہ سرکش مخالفین بھی رام ہوگئے۔ مگر اِس عمل پر خرچ بہت کرنا پڑتا ہے! آپ سوچیں گے مال خرچ ہوتا ہے تو حکومت کو کیا فرق پڑتا ہے؟ کون سا اپنے پلّے سے کچھ دینا ہے؟ اِس وظیفے

میں بھی صدقہ تو عوام ہی کو دینا پڑتا ہے کیونکہ اُنہی کے خون پسینے کی کمائی کام میں آتی ہے!

حکومت نے وفاقی وزیر داخلہ کے ذریعے بھی سیاست میں کالے جادو کو داخل کرنے کی بھرپور اور بہت حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔ جس طرح کوئی بکرا ذبح ہو کر آپ کی تمام بلائیں اپنے سَر لیتا ہے بالکل اُسی طرح رحمٰن ملک نے قدم قدم پر حکومت کی بلائیں اپنے سَر لی ہیں! کامیاب کالے جادو کی یہ ایک اچھی مثال ہے! مگر یہ ہے کہ اِس ٹائپ کے کالے جادو میں "آنیاں جانیاں" بہت کرنی پڑتی ہیں۔ سُنا ہے کسی بزرگ نے صدر صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ جب بھی مشکل وقت ہو، سمندر کے کنارے وقت گزارا کریں۔ اِسی لیے وہ کراچی میں خیمہ زن رہتے ہیں۔ دوسری طرف رحمٰن ملک کو شاید یہ ہدایت ہے کہ سمندر کے کنارے خیمہ زن والوں کی مشکلات ٹالنے کے لیے سمندر پار چلے جایا کریں!

ملک میں قدم قدم پر کالے جادو کی خدمات درکار ہیں۔ جمہوری حکومتیں اپنی میعاد پوری نہیں کر پاتیں۔ شاید یہ کام اب کالے جادو کی مدد ہی سے ہو پائے۔ ہماری منتخب حکومتیں سڑکیں، پُل اور دیگر بنیادی سہولتیں فراہم تو کرتی ہیں مگر صرف دستاویزات پر۔ اِس دستاویزی لعنت سے چھٹکارے کے لیے ہمیں کالے جادو سے مدد لینی ہے۔ جب بھی بجٹ کی میعاد ختم ہونے کو آتی ہے تو راتوں رات بہت

سے کام کرائے جانے لگتے ہیں۔ اِس تیزی و طرّاری کو سمجھنے میں بھی شاید کالا جادو ہماری کچھ مدد کرے۔ تمام خرابیاں گزشتہ حکومت کے کھاتے میں ڈالنے کی وباء پر قابو پانے کے لیے بھی ہمیں کالے جادو سے مدد چاہیے۔

عوام اپنے آپ کو تھوڑا سا تبدیل کریں۔ ہر معاملے میں کالے جادو کو زحمت نہ دیں۔ اِس طرح تو کالا جادو تنگ آ کر ملک چھوڑ جائے گا۔ عوام چھوٹے موٹے کام خود کر لیا کریں اور کالے جادو کو تھوڑی فراغت بخشیں تاکہ وہ ملک کا نظام درست کرنے میں کوئی کردار ادا کرسکے!

گدھے پن کی کوئی حد نہیں

ایسا لگتا ہے سب نے طے کرلیا ہے کہ کسی بھی اصول، ضابطے اور قانون کو خاطر میں لانا ہی نہیں ہے۔ معاشرے اِسی صورت پھلتے پھولتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سہولت بہم پہنچائیں، آسانیاں فراہم کریں۔ معاشرے کا ہر فرد دوسروں کو پریشان کرنے ہی کو زندگی کا بنیادی مقصد سمجھے تو کسی بہتری کی کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟ کراچی میں ہر طرف ایسے نظارے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اور شاید یہ تصور کرلیا گیا ہے کہ دوسروں کو تکلیف دینے سے قاصر رہنے میں ذلت اور توہین کا کوئی پہلو ہے!

کہنے کو کراچی بین الاقوامی شہر ہے مگر اطوار سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں دیہی کلچر بھی ڈھنگ سے کار فرما نہیں۔ چھوٹے دیہات میں بھی لوگ ایسی لا پروائی کی زندگی بسر نہیں کرتے جیسی کراچی جیسے میگا سٹی میں گزاری جارہی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ خود کو تعلیم یافتہ کہنے اور کہلوانے والے بھی جہالت کے مظاہرے کرتے پھرتے ہیں۔ ایسے میں عام آدمی کی تو بات ہی کیا کی جائے؟ شعور کی پست سطح کے حامل عام شہری مزدوری کے ذریعے گزر بسر کرتے ہیں۔ ان سے کسی بہتر معاشرتی کردار کی توقع رکھنا عبث ہے۔ مہذب معاشرے میں زندہ رہنے اور دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ کار آمد ثابت ہونے کا تصور عنقا ہے۔ ہر شخص صرف اپنی سہولت دیکھتا ہے اور اپنا آرام یقینی بنانا چاہتا ہے۔ اس کا نتیجہ دوسروں کے لیے پریشانی کی صورت ہی میں برآمد ہوتا ہے۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ پھل فروش اپنی گدھا گاڑی صدر جیسے پُرہجوم علاقے میں سڑک کے بیچ میں کھمبے سے باندھ کر چلا گیا ہے۔ اس عمل سے ٹریفک میں کس حد تک خلل واقع ہوسکتا ہے، اِس کا اندازہ لگانا کچھ دشوار نہیں۔ یہ کوئی انوکھا منظر نہیں۔ شہر میں آپ کو جا بجا گدھے کسی نہ کسی شکل میں دوسروں کے لیے مشکلات پیدا کرتے دکھائی دیں گے۔ اس تصویر میں جو گدھا آپ کو دکھائی دے رہا ہے وہ بے قصور ہے۔ اصل گدھا پن تو یہ ہے کہ اُسے گاڑی

!سمیت یوں باندھ کر دوسروں کو الجھن سے دوچار کیا جائے

زندگی زیادہ سہل اِسی صورت ہو سکتی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ اشتراکِ عمل کا فلسفہ یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کے کام آنا چاہیے، اُن کے لیے زیادہ آسانیاں پیدا کرنی چاہئیں تاکہ وہ اپنا کام عمدگی سے انجام تک پہنچائیں اور بہتر نتائج .برآمد ہونے پر ہمیں اچھے الفاظ میں یاد کریں۔ اگر ہم اپنی اپنی گدھا گاڑیاں سڑک کے بیچ میں کھڑی کرکے دوسروں کے لیے دشواریاں پیدا کرتے رہیں گے تو زندگی کی گاڑی کیسے چلے گی؟ اور اِس سے بھی .بڑھ کر یہ کہ کراچی جیسے شہر کو آگے .بڑھنے کا موقع کیسے ملے گا؟ جب تک ہم اپنے اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا نہیں سیکھیں گے اور جب تک ہمارے قول و فعل سے گدھا پن دور نہیں ہوگا تب تک گدھا گاڑیاں کسی نہ کسی صورت رکاوٹ بن کر ہماری راہوں میں کھڑی ہوتی رہیں گی اور ہم اپنا سفر سُبک رفتاری سے جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

سیاسی زچّہ خانہ

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انتخابات کے ساز کی لَے تیز ہوتی جارہی ہے۔
انکشافات اور الزامات کے ڈھول بجائے جارہے ہیں اور اُن کی تھاپ پر رقص کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے۔ عوام کے منتخب کئے ہوئے ادارے میعاد پوری کرنے والے ہیں۔ ایسی حالت میں اقتدار کے انتقال کا مرحلہ آتا ہے۔ مگر یہ کیا؟ اقتدار کو ہر حال میں زندہ رکھنے یعنی انتقال سے بچنے اور بچانے کی کوششوں میں بھی تیزی آتی جارہی ہے! یاروں نے اقتدار کے انتقال کو اپنے مفاد کی موت سے تعبیر کر رکھا ہے! منتخب اداروں کے لیے طے شدہ وقت کا پیمانہ بھرگیا مگر نیت شاید نہیں بھری۔
جاتے جاتے بھی بے سَر وپا اقدامات سے قومی وسائل پر شب خون مارا جارہا ہے۔
فضا بے یقینی اور خوف سے مامور ہے۔ اہل وطن تشویش میں مبتلا ہیں کہ
دیکھیے اِس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا!
باضابطہ انتخابی مہم ابھی شروع بھی نہیں ہوئی اور حالت یہ ہے کہ ایک دوسرے کے گلے پر چُھری پھیرنے کے مواقع تلاش کئے جارہے ہیں۔ جب باضابطہ انتخابی نقطہ عروج پر پہنچے گی تب کیا ہوگا یہ سوچتے ہی جُھرجُھری سی آجاتی ہے!

حکومت کا مینڈیٹ ختم ہو رہا ہے۔ نئی حکومت کی پیدائش کا وقت نزدیک آ رہا ہے۔ پورا ملک سیاسی زچہ خانہ بنا ہوا ہے۔ ایک طرف سیاست دانوں کے پیٹ میں مفادات کے مروڑ اُٹھ رہے ہیں اور دوسری طرف جمہوریت کے پیٹ میں دردِ زہ اُٹھا ہے۔ اِس ملک میں کوئی کام نارمل طریقے سے ہو، اِس کی توجیہے اب گنجائش رہی نہیں۔ حکومت کی تبدیلی بھی بظاہر سیزرین سے ہوتی دِکھائی دے رہی ہے!

رابطے بڑھ گئے ہیں، انتخابی اتحاد کی کوششوں کا دائرہ وسعت اختیار کر رہا ہے، سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے لیے ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ ملک بھر میں سیاسی حوالے سے آنیاں جانیاں لگی ہوئی ہیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے نام پر اپنے اپنے مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ دینے کا عمل پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ اقتدار کے انتقال کا موسم کچھ اِس انداز سے وارد ہوا ہے کہ بہتوں کو انتقال کی منزل تک پہنچا گیا ہے۔ جب کوئی جنگ ختم ہونے لگتی ہے تو باضابطہ سیز فائر سے کچھ دن قبل قبضے کی جنگ تیز ہو جاتی ہے تاکہ مذاکرات کی میز پر اپنا کیس زیادہ مستحکم انداز سے اور بہتر دلائل کے ساتھ پیش کیا اور لڑا جاسکے۔ اِس وقت پاکستانی سیاست میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ جمہوریت کے دعویدار انتخابی شیڈول کے باضابطہ اعلان سے قبل قبضہ مافیا کا روپ دھار گئے ہیں۔

حکومت نے تمام رُکے ہوئے کام مکمل کرنے اور اچھے خاصے چلتے کام روکنے پر کمر باندھ لی ہے۔ مخالفین کو نیچا دِکھانے کے لیے گڑے مُردے اکھاڑے جا رہے ہیں۔ تمام فرسودہ اِشو کباڑ خانے سے نکال کر، جھاڑ پونچھ کر منظر عام پر لائے جا رہے ہیں تاکہ بے یقینی کی آنچ تھوڑی اور بڑھائی جاسکے ! اِس مشق کا بنیادی مقصد کسی سے محبت کا اظہار نہیں بلکہ مخالفین کو زیادہ سے زیادہ کنفیوز کرنا ہے۔ یہ معاملہ دو دھاری تلوار جیسا ہے۔ یعنی ایک طرف تو معاملات کو چھانٹ چھانٹ کر نکالا اور بظاہر نمٹایا جارہا ہے اور دوسری طرف اچھے خاصے چلتے ہوئے معاملات کو اٹکایا اور لٹکایا جارہا ہے۔

انتخابی اتحادوں کی تشکیل کا عمل جس بھونڈے انداز سے جاری ہے اُسے دیکھ کر خوف آتا کرنے کے نام پر عوام کے منہ سے آخری نوالہ تک facilitate ہے۔ ایک دوسرے کو چھیننے کی تیاری ہو رہی ہے ! عوام یہ سب تماشا دیکھ کر پریشان ہیں۔ جن سے حساب طلب کرنا چاہیے اُن سے دوستی بڑھاکر اتحاد کی راہ ہموار کی جارہی ہے۔ مگر کسی بات پر حیرت کیوں ہو؟ پانچ برسوں میں جمہوریت کے نام پر اپنے اپنے مفادات کو تحفظ بخشنے کے سوا سیاسی جماعتوں نے کیا ہی کیا ہے؟ ہر اقدام کی پُشت پر یہ سوچ کارفرما رہی ہے کہ پہلے اپنا پیٹ بھرا جائے، کچھ بچ رہا تو عوام کا نصیب !

بات بات پر وردی والوں کا رونا رونے والے اپنی طالع آزمائی پر بھی تو غور فرمائیں۔ اسمبلیوں کی میعاد ختم ہونے کو آئی ہے۔ ایسے میں جو ضمنی انتخابات ہوئے ہیں اُن میں فتح کے حصول کے لیے کیسے کیسے جتن کئے گئے! ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے اسمبلی کا رکن بننے کی اِتنی ہوس!

جمہوریت میں تو منتخب اداروں کی میعاد ختم ہوتی ہی ہے۔ پھر عوام کے سامنے جانا پڑتا ہے۔ مینڈیٹ کے مطابق کام نہ کرنے کی صورت میں حکمرانوں کا احتساب ہوتا ہے۔ مگر ایسا کہاں ہوتا ہے کہ اسمبلیوں کی میعاد ختم ہونے کو آئے تو اقتدار بچانے کے لیے سبھی کچھ، حتّٰی کہ ملک و قوم کو بھی داؤ پر لگا دیا جائے؟

مفاہمت کی سیاست متعارف کرائی گئی تو اہل وطن نے سوچا شاید کچھ بھلا ہو جائے، مفادِ عامہ کے رُکے ہوئے منصوبے تکمیل سے ہمکنار ہوں۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ مفاہمت کے فلسفے نے عجیب ہی گل کِھلائے ہیں۔ اُصول، اقدار اور نظریات .... ہر چیز پر سوالیہ نشان لگ گیا۔ معاملہ یہ ہے کہ سب چاہتے ہیں رند کے رند رہیں اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جائے! عشروں پہلے آں جہانی کشور کمار نے ایک فلم میں آدھے مرد اور آدھی عورت کا کردار ادا کیا تھا۔ بعد میں یہ

کردار عمر شریف نے اپنے مشہور اسٹیج ڈرامے "بکرا قسطوں پہ" میں پیش کیا۔ مفاہمت کی سیاست نے بھی کچھ ایسا ہی منظر پیش کیا۔ یکسر مخالف نظریات رکھنے والے بھی اقتدار اور مفاد کے پلیٹ فارم پر آ گئے۔ یہ ایسی سیاست ہے جس نے نظریاتی کشمکش اور سرد جنگ ختم کر ڈالی! یہ بھی خوب رہی، یعنی نظریاتی شناخت بھی برقرار رہے، کوئی مفاد داؤ پر نہ لگے، کوئی الزام بھی نہ آئے، بات بھی رہ جائے اور کام بھی ہو جائے! کیسی دوستی اور کیسی دشمنی؟ مشترکہ مفادات کے گھاٹ پر مختلف النسل سیاسی جانور برسوں ساتھ ساتھ پانی پیتے رہے اور "نظریاتی جنگ" بھی ختم نہ ہوئی! لہو گرم رکھنے کے لیے کبھی کبھی ایک دوسرے کو گالیاں بھی دی جاتی رہیں، رُوٹھنے کا ناٹک رچایا جاتا رہا اور پھر منانے کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ خود کو حسینی قرار دے کر مخالفین کو یزیدی ٹھہرانے والے آخر میں نام نہاد یزیدیوں سے گلے بھی ملتے رہے تاکہ سارے گلے شکوے جاتے رہیں!

پانچ برسوں میں قوم نے کچھ خاص سیکھا ہی نہیں۔ عوام اور کچھ نہیں تو اتحاد و یگانگت تو سیکھ ہی سکتے تھے۔ اپنے مفادات کے لیے سیاست دان جس طور ایک ہو گئے اُسی طور اگر عوام بھی اپنے عمومی مفادات کے لیے متحد ہو کر زندگی بسر کریں تو کیا ہرج ہے! اہل وطن کو یہ بات اب تو سمجھ لینی چاہیے کہ اُن کے مفادات کے خلاف سبھی ایک ہو جاتے ہیں۔ اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہونے اور

وہیں مستقل قیام کی خواہش رکھنے والوں نے طے کرلیا ہے کہ جب مقصد ایک ہے تو مفادِ عامہ کے لیے فسادِ عامہ کیوں؟

اُمیدوں اور اُمنگوں کی شکست و ریخت سے عبارت مزید پانچ سال پورے ہونے کو آئے۔ جمہوری طالع آزماؤں کے عزائم نصف النہار پر چمکتے دمکتے سورج کے مانند سب پر عیاں ہیں۔ کیا اب بھی کچھ ایسا رہ گیا ہے جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے؟ فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ جس نے جو کیا ہے اُس کا صِلہ اُسے ملنا ہی چاہیے۔ آنے والے انتخابات میں ووٹ کو حق کے بجائے فیصلے کی تلوار کی حیثیت سے استعمال کرنا عوام پر فرض ہوچکا ہے۔ ہمارے تمام سیاست دان زمینی حقائق کو بخوبی سمجھ چکے ہیں۔ سمجھنے کی باری اب عوام کی ہے۔ ع

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی

جو لوگ اب بھی اُصولوں، اقتدار اور نظریات کا راگ الاپ رہے ہیں، غالب کا یہ شعر اُن کی نذر ہے

وہ بادہ شبانہ کی سَرمستیاں کہاں؟
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سَحر گئی!

کیا کسی کے گرنے کا انتظار ہے؟

ہم نے من حیث القوم شاید یہ قسم کھالی ہے کہ کسی بھی معاملے میں اُسی وقت جاگیں گے جب پانی سر سے گزر جائے اور کوئی سانحہ رونما ہو جائے۔ ترقیاتی کاموں کے نام پر سڑکوں کو اکھاڑ کر، ادھیڑ کر رکھ دیا جاتا ہے اور پھر اُنہیں دوبارہ مسطح کرنے کو شاید گالی سمجھ لیا جاتا ہے۔ کہیں پانی یا گیس کی پائپ لائن کے لیے کھدائی کی گئی ہو تو گڑھے کو بھرنے پر برائے نام توجہ دی جاتی ہے۔ اول تو گڑھا بھرنے کے بعد سطح ہموار نہیں کی جاتی اور اگر کی بھی جائے تو مٹی بُھربُھری رہ جاتی ہے۔ یعنی ذرا سا پانی پڑے اور کوئی بھاری گاڑی گزرے تو سمجھ لیجیے ہوگیا کام!

شہر میں جا بہ جا ایسے گڑھے پائے جاتے ہیں جو کسی بھی وقت سانحے کا باعث بن سکتے ہیں۔ بچوں کے لیے یہ گڑھے موت کے کنویں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معصوموں کو کیا پتہ کہ موت کہاں عفریت کی طرح منہ کھولے کھڑی ہے۔ شہر کے پس ماندہ علاقوں میں بہت سے بچے نالوں اور بغیر مین ہول کے گٹروں میں گر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور والدین و دیگر رشتہ داروں کو زندگی بھر کے لیے جی کا روگ دے جاتے ہیں! مگر خیر، معاملہ صرف پس ماندہ علاقوں تک محدود نہیں۔ شارع فیصل شہر کی مرکزی سڑک ہے۔ ائیر پورٹ سے ملحق ہونے کی بہ دولت اِس شاہراہ سے وی آئی پیز کی آمد ورفت رہتی ہے۔ اور اسی سڑک پر نرسری کے نزدیک اوور ہیڈ برج کے سرے پر نالے کا یہ کھلا حصہ متعلقہ محکمے کی نا اہلی اور غفلت شعاری کی منہ بولتی تصویر بنا ہوا ہے۔ نالے کا کھلا حصہ اوور ہیڈ برج کے پہلے پائیدان سے اس قدر نزدیک ہے کہ اترتے وقت ذرا سی بے احتیاطی کسی بھی سانحے کا سبب بن سکتی ہے۔ روزانہ سیکڑوں افراد کو اس کھلے ہوئے نالے کے باعث غیر معمولی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ کوئی اگر جلدی میں ہو تو بے احتیاطی اسے گڑھے میں دھکیلنے سے ذرا بھی گریز نہیں کرے گی۔ شہر کی مرکزی شاہراہ پر لوگوں کی سہولت کے لیے بنائے جانے والے اوور ہیڈ برج کے سرے پر اِس کھلے نالے کو دیکھ کر یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ شاید متعلقہ حکام یہ

دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں چلنے پھرنے میں احتیاط برتنے کا رجحان کس حد تک ہے؟ عوام کس حد تک الرٹ رہتے ہیں، یہ بات جانچنے کا یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں! یہ مشق پھر کبھی سہی، فی الحال تو لوگوں کو محفوظ رکھنے پر توجہ دی جانی چاہیے۔ شہر کی حالت بہتر بنائے رکھنے کے ذمہ دار حکام کا فرض ہے کہ عوام کو صرف سہولت فراہم نہ کریں بلکہ اُن کی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ تحفظ یقینی بنانے پر بھی متوجہ ہوں۔ اس کھلے ہوئے نالے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جن کے ہاتھ میں اختیار ہے وہ اپنے کام پر پوری توجہ نہیں دے رہے اور عوام کو سہولت بھی دیتے ہیں تو ایسے خطرناک انداز سے کہ ان کے لیے جان بچانا بھی ایک مشکل مرحلہ بن جاتا ہے۔ عوام کا اتنا حق تو بنتا ہے کہ اُنہیں سڑک پار کرنے کی محفوظ سہولت فراہم کی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ اب جبکہ تصویر اور کالم کے ذریعے نشاندہی کر دی گئی ہے، متعلقہ حکام اس نالے کو احسن اور ٹھوس طریقے سے ڈھکنے اور اوور ہیڈ برج استعمال کرنے والوں کی زندگی کو لاحق خطرہ ختم کرنے پر فوری توجہ دیں گے۔

گدھے اور عوام

اللہ کے دستِ قدرت میں کیا نہیں؟ اللہ چاہے تو کسی کو بے حساب نوازے اور کسی پر بے حساب مصائب لاد دے۔ کبھی اِس بات پر غور کیجیے کہ اللہ کے کرم اور فضل کی تو کوئی حد نہیں مگر مصیبت اور پریشانی کے معاملے میں وہ عادل ہے۔ اللہ نے اپنے کلام میں وضاحت کردی ہے کہ وہ کسی پر اس کی استطاعت سے زیادہ (پریشانیوں اور مصائب کا) بوجھ نہیں ڈالتا۔ اور پھر اِس نکتے پر غور فرمایئے کہ ہم اِنسان کبھی سوچتے ہی نہیں کہ کسی پر کتنا بوجھ لادنا چاہیے! بات انسانوں تک ہو تو کوئی بات نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ بے زبان جانوروں پر اِتنا بوجھ لادا جاتا ہے کہ ان کی حالت دیکھ کر دِل کو صرف دکھ پہنچتا ہے۔ یہ جانور بتا بھی نہیں سکتے کہ انہیں کتنی تکلیف کا سامنا ہے۔ ذرا سی گدھا گاڑی پر رکشہ کی پوری باڈی لادنا افسوس ناک اور شرم ناک ہے۔ اگر رکشہ کی باڈی کو مضبوطی سے باندھ دیا جائے تب بھی خود گاڑی پلٹ سکتی ہے! مگر اتنا کون سوچتا ہے؟ لوگوں کو دیہاڑی بنانے سے غرض ہوتی ہے۔ یہ فکر کسی کو لاحق نہیں ہوتی کہ جو کچھ کام کیا جارہا ہے اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔

آپ تصویر میں جس گدھے کو دیکھ رہے ہیں وہ سراسر عوامی معلوم ہوتا ہے! پاکستان کے عوام بھی تو اِسی طور دسیوں طرح کے بوجھ اٹھائے جئے جارہے ہیں۔ حکومت کی نا اہلی، مہنگائی، سرکاری اداروں کا خسارہ، امن و امان کی صورتِ حال، خفیہ اداروں کی ناکامی، اخلاقی اقدار کا زوال، معاشی ابتری اور پتہ نہیں کون کون سا بوجھ عوام کے ناتواں کاندھوں پر لاد دیا گیا ہے۔ عوام میں گدھوں کی خوئے تسلیم و رضا پائی جاتی ہے یعنی بے زبانی کو شعار بنائے رہتے ہیں اور ہر طرح کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں! عوام کی زندگی بھی گدھا گاڑی جیسی ہوگئی ہے جس پر گنجائش سے زائد سامان لادنا معمول بن گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کبھی کبھی بوجھ کی زیادتی سے عوامی زندگی کی گاڑی پلٹ بھی جاتی ہے۔ ایک کے بعد ایک مصیبت لادی جاتی رہے اور ممکنہ نتائج کے بارے میں سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوگا۔

معاشرے میں توازن اُسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب تمام معاملات متوازن ہوں۔ کسی پر ظلم اور زیادتی کا بوجھ نہ لادا جائے۔ اگر حکومتیں سوچے سمجھے بغیر عوام پر بوجھ لادتی جائیں تو معاملات بالآخر خرابی پر منتج ہوتے ہیں۔ عوام کو یاد رکھنا چاہیے کہ اُن کے چند بنیادی حقوق ہیں اور اِن حقوق کی پاس داری کے بغیر معاملات صرف خرابی کی طرف جاتے ہیں۔ اگر توجہ نہ دلائی جائے تو زیادتی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ گدھے بے زبانی کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ اِنسان کا معاملہ مختلف ہے۔ اُسے کسی بھی ظلم یا زیادتی کے خلاف خود بھی آواز اٹھانی چاہیے اور حیوانات سے روا رکھی جانے والی زیادتی کے تدارک کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہر انسان کو بہتر انداز سے زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ جتنی جدوجہد کی جائے اس کا صلہ بھی ملنا چاہیے۔ جس طور محنت کے بغیر کچھ لینا بری بات ہے بالکل اُسی طرح محنت کے باوجود کچھ نہ پانا بھی مستحسن نہیں۔ انسان کو ظلم کرنے کے ساتھ ساتھ ظلم سہنے سے بھی باز رہنا چاہیے۔

اسقاطِ عمل

دُنیا اب تک ہزاروں سال پہلے کی دُنیا میں جی رہی ہے۔ ٹی وی کی اسکرین یا کمپیوٹر کے مانیٹر پر نظر ڈالیے تو ایسا لگتا ہے جیسے دُنیا کو کام کے سِوا کوئی کام ہی نہیں! بات کیڑے نکالنے کی ہو تو دُنیا ہم پاکستانیوں میں سو طرح کے کیڑے تلاش کرتی ہے مگر جب تحسین کا معاملہ آ جائے تو بُخل کی کوئی حد دِکھائی نہیں دیتی! دُنیا بھر میں طریقہ یہ ہے کہ لوگ کام کیے جاتے ہیں اور آرام کا نام نہیں لیتے۔ اور اِدھر ہم ہیں کہ کام کا بوریا بستر لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا ہے! اور کوئی دیکھے کہ کام کے بغیر بھی ہم زندہ ہیں!

آپ نے بھی سُنا ہو گا نیکی برباد، گناہ لازم۔ عملی زندگی کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ جسے کوئی ہُنر آتا ہے اُس کی تو شامت ہی آ جاتی ہے! یہ بھی کیجیے، وہ بھی کیجیے۔ اور بس کرتے ہی رہیے۔ جسے کام آتا ہے وہ تو سمجھ لیجیے گیا کام سے۔ ع

اُس کو چُھٹّی نہ مِلی جس نے سبق یاد کیا!

اپنے ماحول پر ایک نظر ڈالیے، اندازہ ہو جائے گا کہ جو لوگ عمل کی دُنیا کو

خیر باد کہہ چکے ہیں وہ خاصے سُکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انفرادیت اِسی کیفیت میں تو پوشیدہ ہے۔ دُنیا بھر کے لوگ کام کر ہی تو رہے ہیں۔ اُنہوں نے کیا تیر مار لیا؟ اور اگر ہم بھی اُن کی طرح کام کرتے کرتے گِھس گِھسا جائیں تو پھر ہم میں اور اُن میں فرق کیا رہا؟ سوال جدّت اور نُدرت کا ہے۔ نُدرت کا پتہ دینے کا ایک اچھا طریقہ یہ ہے کہ عمل کی دُنیا سے دُور رہا جائے۔ خواندگی کی کم شرح کے باوجود پاکستانی قوم یہ نکتہ سمجھ گئی، دُنیا والے اب تک سمجھ نہیں پائے کہ ع

جو لوگ کچھ نہیں کرتے، کمال کرتے ہیں!

اہلِ جہاں کو کام کرتے دیکھ کر شرمندہ ہونے اور دِل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر دوسروں کو کام میں جُتا ہوا دیکھ کر آپ شرمندہ ہوتے رہے تو جان لیجیے کہ عمل سے دُور رہنے اور پُرسکون زندگی بسر کرنے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے گا! ہم نے عمل کی دُنیا کو ترک کرکے "عملیات" کی دُنیا کو اپنا لیا ہے! یہ کیا کہ اِدھر سے اُدھر مارے مارے پھریے، دو وقت کی روٹی کے اہتمام میں جسم و جاں کو غارت کرتے رہیے۔ آسان سا طریقہ ہے۔ ایک کارگر قسم کا تعویذ لائیے، کپڑے کی گُڑیا بنا کر اُس میں چار چھ سُوئیاں چُبھوئیے۔ بس، بن گئی بات اور ہوگیا کام۔ اور یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ عمل کو ترک کرکے "عملیات" کو اپنانا بھی پیش رفت ہے کیونکہ عمل واحد ہے اور عملیات جمع۔

!دُنیا عمل یعنی صیغہ ِ واحد پر اٹکی ہوئی ہے اور ہم جمع کے صیغے تک پہنچ چکے ہیں
اگر دُنیا سے الگ دِکھائی دینا ہے تو عمل کی دُنیا سے باہر آ جایئے ! اور اگر اپنے ہی
معاشرے میں زبردست انفرادیت کا مظاہرہ کرنے کی خواہش ہے تو عمل کو گلے لگا لیجیے !
ذرا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے وجود کا جائزہ لیجیے اور اندازہ لگایئے کہ جس
!معاشرے میں سبھی کام سے بھاگ رہے ہیں وہاں آپ کام کرتے ہوئے کیسے لگیں گے
معاشرے میں بے عملی کی ایک سے بڑھ کر ایک مثال موجود ہے۔ مسابقت ایسی ہے کہ
فاتح کا تعین شاید ہزار سال میں بھی ممکن نہ ہو ! آپ نے کبھی کچھ ہوتے ہوئے دیکھا
ہے؟ جس کے ذِمّے جو کام ہے بس وہی کام وہ نہیں کر رہا۔ ٹرینوں کا کام چلنا بلکہ چلتے رہنا
!ہے مگر یہ اگلے وقتوں کی بات ہے۔ اب ٹرینیں فراغت کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہیں
سرکاری اداروں کا بنیادی فریضہ عوام کو خدمات فراہم کرنا ہے مگر بے چارے عوام اِن
اداروں کی خدمت میں جُتے ہوئے ہیں ! یعنی عوام کی خون پسینے کی کمائی اِن اداروں کو
چلانے میں ٹھکانے لگ رہی ہے ! اور تو اور، قرضوں کی بھی

عوام کے ناتواں کاندھوں پر آن پڑی ہے debt servicing خدمت یعنی!

قومی کرکٹ ٹیم کا بنیادی کام کرکٹ کھیلنا ہے مگر بے چاری اِتنے کھیلوں میں اُلجھی ہوئی ہے
کہ اب کرکٹ کھیلنا ہی بُھول بیٹھی ہے! کرکٹرز اب ماڈلنگ کی پچ پر زیادہ اچھا کھیلتے
ہیں!

کرکٹرز ماڈلنگ کی طرف آئے تو ماڈلز نے جوہر دِکھانے کے لیے دوسرے میدان تلاش
کرلیے!

قومی ہاکی ٹیم کھیلنے سے گریز کرتے کرتے اب مکمل فُل بیک ہوچکی ہے! ہاکی میں اِتنا مال
ہی نہیں کہ کوئی ایڈہاک ازم چھوڑ کر اِس کھیل کو فُل ٹائم پروفیشن کے طور پر اپنائے!

ع

کھیل اچھا ہے وہی جس میں کہ مال اچھا ہے!

گلوکار گانے کو لات مار کر ٹی وی پروگراموں کی میزبانی پر تُل گئے ہیں اور ٹی وی اینکرز
نے لگے ہاتھوں گلے کو کیش کرانا شروع کردیا ہے!

ٹی وی سیٹ آن کیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جنہیں بولنا نہیں آتا وہ بول رہے

ہیں اور جو بولنا جانتے ہیں وہ چُپ سادھے گوشہ نشینی اختیار کر بیٹھے ہیں!
تعلیمی اداروں کا کام علم کی دولت بانٹنا ہے مگر یہ عمل کب کا ترک ہوچکا۔ اب تعلیمی ادارے سیاست کی بساط کے مُہرے بن چکے ہیں!
جہاں عملی زندگی کے نام پر سبھی کچھ اُلٹ پلٹ چکا ہو، وہاں کچھ کرکے آپ کیا کرلیں گے؟ بہتر یہ ہے کہ عمل کا تصور ذہن سے نکال دیجیے۔ اور اگر آسانی سے ایسا ممکن نہ ہو تو کسی ماہر نفسیات سے ملیے، اپنا مسئلہ بیان کیجیے۔ اگر گھی سیدھی اُنگلی سے نہ نکلے تو اُنگلی کو تھوڑا سا ٹیڑھا کرلیجیے۔پُرسکون زندگی بسر کرنے کے لیے ذہن سے عمل کا تصور کسی نہ کسی طور نکال پھینکیے۔ بہت سے لوگ نفسیات کے ماہرین کی مدد سے "اسقاطِ عمل" کی منزل سے بھی گزرتے ہیں!
ملک کی مجموعی کیفیت ایسی ہے جیسے لوگ اِس الزام سے بھی بچنا چاہتے ہیں کہ اُنہیں کوئی کام آتا ہے! کوئی بھی اپنے آپ پر کام جاننے یا کام کا عادی ہونے کی چھاپ نہیں لگوانا چاہتا! کام کرتے رہنا اور خود کو عملی ثابت کرنا کبھی کبھی نفسیاتی مرض بھی تو بن جاتا ہے۔ بہت سے لوگ باقاعدگی سے کام پر

اِس لیے بھی آتے ہیں کہ کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ اُن کے بغیر بھی کام چل ہی جاتا ہے! ہم نہیں چاہیں گے کہ آپ ایسے کسی خوف میں مبتلا ہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ صبح گھر سے کام پر نکلے اور شام کو تھکے ہارے گھر آ کر سو گئے۔ اگر یہی زندگی ہے تو ذرا سوچیے کہ زندگی کے موج میلے کی بہار کا لُطف کیسے پائیں گے؟ جہاں کوئی کچھ نہ کرتا ہو یا کرتے ہوئے بھی نہ کرنے کی اداکاری کرتا ہو وہاں عمل پسند ہونا آپ کو کیا دے گا؟ اچھا ہے کہ آپ پر ایسا کوئی الزام نہ لگے۔ آپ جیتے جی عمل سے دُور بھی رہیں تو بہر حال عمل آپ کے ساتھ ہی رہے گا۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ ایک دن آپ کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ضرور دیا جائے گا! جب عمل کے بغیر بھی اعمال نامہ مِل کر ہی رہنا ہے تو پھر عمل کے چکر میں پڑ کر زندگی کو بے لُطف کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟

پھرتے ہیں "مَرد" خوار، کوئی پُوچھتا نہیں

ہر سال جب خواتین کا عالمی دن آتا ہے تو مرزا تنقید بیگ تھوڑے سے مشتعل ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میڈیا پر خواتین کی مظلومیت کا راگ اِتنا الاپا گیا ہے کہ اب مرزا اِس حوالے سے ہر وقت "بھنّوٹ" سے رہتے ہیں! بات کچھ یوں ہے کہ بھابی کے ہاتھوں وہ خود اچھے خاصے بلکہ کنفرمڈ مظلوم ہیں! مگر کوئی اُنہیں اِنصاف دلانے کے بارے میں سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا! کرے بھی کیسے؟ بھابی کا تعلق قصاب برادری سے ہے!

مرزا کہتے ہیں۔ "جو باتیں ہم شاید کبھی سمجھ نہ پائیں اُن میں خواتین کا عالمی دن بھی شامل ہے۔ کون سا دِن ہے جو خواتین کا نہیں؟ سال کے 365 دِنوں میں کون سا پَل ہے جس پر خواتین کی حُکم رانی نہیں؟ کب خواتین اپنی بات منوانے میں کامیاب نہیں ہوتیں؟ اور کب بے چارے مرد کوئی ایک دِن بھی اپنی مرضی سے گزار پاتے ہیں؟"

کل شام مرزا بہت بہت غُصّے میں تھے۔ ہم نے کہا اگر چند تقریبات خواتین کے نام پر اور اُن کے اعزاز میں منعقد کرلی جائیں تو اِس میں ہرج ہی کیا ہے۔

شُغل میلے میں کچھ وقت اچھا کٹ جاتا ہے ! بس اِتنا سُننا تھا کہ مرزا تقریباً اُسی طرح پھٹ پڑے جس طرح دہشت گردوں کے ہاتھ میں دستی بم پھٹ جاتا ہے۔ "تم جیسے مَردوں ہی نے یہ کھڑاگ کھڑا کیا ہے۔ الگ سے تقریبات کی ضرورت کیا ہے؟ کون سی تقریب ہے جو خالصاً خواتین کے لیے نہیں ہوتی؟ کبھی لفظ 'تقریب' کی ترکیب پر غور کیا ہے؟ تقریب کا مطلب ہے قریب آنے کا موقع یا اہتمام۔ اور خواتین کِس اہتمام سے ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں ! تقریب ختم ہو جاتی ہے مگر یہ ایک دوسرے سے دور ہونے کو تیار نہیں ہوتیں ! کئی بار یاد دلانا پڑتا ہے کہ چلو، ہال میں تالا بھی لگانا ہے !"

ہم نے دیوار سے سَر پھوڑنے یعنی مرزا کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اور بپھر گئے ! کہنے لگے۔ "شادی کی کِسی تقریب میں اپنے ہم منصب یعنی شادی شدہ مَردوں کو غور سے دیکھا ہے؟ وہ بے چارے بھی تمہاری طرح مُنہ لٹکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ چکن بریانی، مٹن قورمہ، یخنی پُلاؤ .... کوئی بھی ڈِش مزا نہیں دیتی۔ دے بھی کیسے؟ ذہن میں بس یہی چل رہا ہوتا ہے کہ واپسی پر ٹیکسی کے کرائے کی مَد میں تین سو روپے دینے کے بعد اگلے تین دن تک ناشتے میں انڈوں کا اہتمام کِس طرح ہوگا! خواتین تمام بچوں کو شوہر کے متّھے مار کر رشتہ داروں اور سہیلیوں کے ساتھ پُرلطف لمحات کو گلے لگالیتی ہیں۔ تقریب خوشی کی ہو یا غم کی، خواتین کے لیے مِل بیٹھنے کا بہانہ ہوتی ہے۔ اور جہاں .... چار یار

یعنی چار سہیلیاں مِل جائیں وہاں کیسا غم، کیسی افسردگی؟ یہ جھمیلے پالنے کے لیے مَرد ہیں تو سہی! اور پھر تم جیسے مَرد! سُبحان اللہ۔ یعنی خواتین کو پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔"

مرزا کا خیال ہے کہ ٹی وی چینلز کی پلاننگ شاید نفسیات کے ماہرین سے کرائی جاتی ہے۔ چینلز خواتین پر مظالم کی ایسی داستانیں سُناتے اور ڈراموں کے ذریعے خواتین کی مظلومیت کچھ اِس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ گھر کے مَرد بے چارے سَہمے سَہمے رہتے ہیں! مِنی اسکرین پر مَرد کا ظالم و جابر روپ دیکھنے کے بعد خواتین جب اپنے گھر میں مَردوں کو مشکوک نظروں سے دیکھتی ہیں تو وہ غریب خود کو "زندہ در حوالات" محسوس کرنے لگتے ہیں!

ویسے تو چینلز سے مرزا کو کئی شکایات ہیں۔ مثلاً یہ کہ بولنے کے نام پر چیخنے اور دہاڑنے کا فن چینلز کے ذریعے پاکستانیوں میں منتقل ہوا ہے! اور یہ کہ جیب میں پُھوٹی کوڑی بھی نہ رکھنے والے اربوں روپے کی کرپشن پر سَیر حاصل گفتگو کرنے کو بے تاب رہتے ہیں! مگر نمایاں شِکوہ یہ ہے کہ پاکستانی چینلز نے اچھی خاصی خواتین کو دانشور اور اِنسانی حقوق کی چیمپین جبکہ انڈین چینلز نے انہیں "بزنس جینئس" میں تبدیل کردیا ہے! ٹی وی ڈراموں کے موضوعات نے گھر کی چار دیواری میں زندگی بسر کرنے والی عام خواتین کے دِماغ

اپنے حقوق کے لیے کچھ کرنا ہوگا" کے ساتویں آسمان پر پہنچادیئے ہیں! وہ خود کو حقوق" نسواں کی تحریک کی روح رواں سمجھنے لگی ہیں! منی اسکرین پر اپنے حقوق کے لیے لڑنے اور مَردوں کو للکارنے والی خواتین کو دیکھ کر گھریلو خواتین کے ذہن بَھڑک اُٹھتے ہیں۔ کام سے واپسی کے بعد مَرد گھر میں داخل ہوتے ہیں تو خواتین کے تیور دیکھ کر کونے میں دُبک جاتے ہیں اور چائے پانی کی فرمائش سے بھی گریز کرتے ہیں! حقوق نسواں کی علم .برداروں نے خالص مَردانہ انداز اختیار کرتے ہوئے خواتین خانہ پر ایسا منتر پُھونکا ہے کہ اُن کے لہجوں میں پُھنکار سی در آئی ہے! وہ مَردوں سے کچھ منگواتی بھی ہیں تو انداز سے حکم کے ساتھ ساتھ انتباہ بھی جھلکتا ہے، گویا نہ لائے یا اوٹ پٹانگ اُٹھا لائے تو !کیس کردیں گی

مرزا کا کہنا ہے کہ شادی شدہ مَرد کو کبھی چڑیا گھر نہیں جانا چاہیے کیونکہ جنگل کے سارے جانور اُس میں آ بسے ہیں۔ مرزا، یقینی طور پر اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں، بیان فرماتے ہیں۔ "اِنسان یعنی اشرف المخلوق کی حیثیت سے دُنیا میں آنے والے شوہر زندگی بھر گدھے کی طرح کرتے ہیں، کام سے واپسی پر تاخیر کی صورت میں جو بچا کھچا مل جائے وہ بخوشی چَر لیتے ہیں، دفتر میں ماتحت کے سامنے شیر اور گھر میں بیوی کے سامنے بھیگی بلّی بنے رہتے ہیں، بچوں کی سواری کے لیے گھوڑے بنتے ہیں، شادی بیاہ اور تہوار کے موقع پر

قُربانی کے بکرے کا کردار ادا کرتے ہیں، گھر والوں کو زیادہ سے زیادہ آسودگی فراہم کرنے کے لیے لومڑی کی سی چالاکی اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں، کام کی تلاش میں پرندوں کی طرح ڈال ڈال گھومتے اور ڈیرے ڈالتے ہیں، بیوی اور بچوں کے لیے مختلف تجربات کی نذر ہوتے ہوتے نفسیاتی طور پر چوہے ہو جاتے ہیں ! اِتنا کچھ سہنے کے بعد بھی مَرد "ظالم اور خواتین مظلوم!

شادی شدہ ہونے کے ناتے ہم، اپنی بھلائی کے لیے، اپنے دِل میں کم از کم ایک خاتون کے لیے نرم گوشہ رکھنے پر مجبور ہیں مگر جب مرزا سامنے ہوں تو خود کو محفوظ رکھنے کی خاطر اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں!

کُتّا کب تک کاٹتا رہے گا

کہتے ہیں مُقدّر خراب چل رہا ہو تو اونٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو بھی کُتّا کاٹ لیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اہلِ پاکستان پر یہی اونٹ اور کُتّے والا زمانہ آیا ہوا ہے! کہیں سے کیسا ہی اونٹ لے آیئے، قتل و غارت اور بدامنی کا کُتّا کاٹ ہی لیتا ہے!

کوئی اگر سمجھ سکے تو ہمیں بھی سمجھائے کہ ہم کیا ہیں اور اب کیا بننا چاہتے ہیں۔ بنانے پر آئیں تو ایٹمی ہتھیار بنا ڈالیں اور اگر نہ بنانا چاہیں تو چھوٹے سے نالے پر معمولی سی پُلیا بھی عشروں تک نہ بنائیں! توڑنے پر آئیں تو آسمان پر ٹمٹماتے تارے توڑنے کی ضد کریں اور اگر طے کرلیں کہ کسی بھی بُرائی اور خرابی کی گردن نہیں توڑنی ہے تو برسوں اُس کے ساتھ نباہ کرتے چلے جائیں!

بات توڑنے کی چلی ہے تو خیال رہے کہ دہشت گردی کے جن کو بوتل سے نکالنے کے بعد بوتل توڑ دی گئی ہے! جب بوتل ہی نہ رہی تو جن بھی بے فکری سے من چاہی وارداتیں کرتا پھر رہا ہے۔ نئی بوتل کا اہتمام ہونے تک تو کوئی بھی اسے روکنے ٹوکنے کی پوزیشن میں دِکھائی نہیں دیتا!

جن اداروں پر عوام اپنے تحفظ کے حوالے سے تکیہ کرتے ہیں اُنہیں چند شخصیات کی حفاظت پر مامور کردیا گیا ہے۔ لیجیے، قصہ ختم ہوا۔ اب جسے اپنے جان و دِل عزیز ہوں وہ اُس کی گلی میں جائے کیوں؟ یعنی اپنی گلی تک محدود رہے۔ ہر قدم پُھونک کر اُٹھائے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ گھر سے نکلتے وقت کئی دُعائیں پڑھ کر اپنے آپ پر دَم کرتے کہ حکومتی نااہلی سے محفوظ رہیں!

مگر یہ کل کی بات ہے۔ کل تک لوگ سڑکوں پر سفر کے دوران اور گلیوں میں چلتے ہوئے خوف زدہ رہا کرتے تھے، اب تو گھر میں محفوظ نہیں۔ گھر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو گولی نہیں ماری جاسکتی تو کیا ہوا؟ بم دھماکوں کی نذر کرنے میں کون مانع ہوسکتا ہے؟

جمہوریت کے نام پر بننے والی حکومتوں نے شاید تہیہ کرلیا ہے کہ حالات کو اُس نہج تک جانے دینا ہے کہ لوگ خود ہی کہیں کہ اُنہیں اُن کے ووٹوں سے بننے والی کوئی حکومت نہیں چاہیے! ایک طرف دہشت گردی نقطہ عروج پر ہے اور دوسری طرف "مُنہ کی کھانے والے" وفاقی وزیر داخلہ نے قوم کے زخموں پر بوری بھر کر نمک چھڑکنے کی ایک اور کوشش فرمائی ہے۔ موصوف کہتے ہیں کہ دہشت گردوں کی کمر توڑ دی گئی ہے! کوئی وضاحت چاہے تو کہتے ہیں کہ پے در پے

اقدامات (!) نے طالبان کو کونوں کُھدروں میں دُبکنے اور مُنہ چھپانے پر مجبور کردیا ہے! اگر پوچھا جائے کہ طالبان کی کمر توڑی جاچکی ہے تو پھر یہ سب کیا ہے جو ہو رہا ہے تو جواب ملتا ہے کہ کالعدم لشکر جھنگوی کے کارکنان حالات خراب کرنے پر تُلے ہوئے ہیں!

آپ سوچیں گے یہ لشکر جھنگوی اچانک کہاں سے آگیا؟ ہماری دُور اندیش جمہوری حکومتیں بعض پوٹلے سنبھال کر رکھتی ہیں تاکہ ضرورت پڑنے پر کھول کر سیاسی کے فٹ پاتھ پر نئے پتھارے لگائے جاسکیں! کالعدم لشکر جھنگوی کا پوٹلا سیاسی اسٹور سے نکالا گیا ہے کہ جھاڑ پونچھ کر کھولا جائے اور جو کچھ کہیں اور نہ ڈالا جاسکتا ہو اِس میں سے برآمد کرلیا جائے! لشکر جھنگوی کا گڑا مُردہ اکھاڑ کر دو فائدے بٹورنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ایک طرف تو پنجاب حکومت پر دباؤ ڈالنا مقصود ہے کہ وہ نام نہاد فہرست مل جانے پر بھی دہشت گردوں کے خلاف کچھ نہیں کر رہی۔ اور دوسری طرف شیعوں اور سُنّیوں کو "قریب" لانا ہے! ملک بھر میں شیعہ، سُنّی دونوں مارے جارہے ہیں۔ چند عناصر فرقہ واریت کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر شیعہ اور سُنّی دونوں جانتے ہیں کہ کِس کے اشارے پر کیا ہو رہا ہے۔ مُلک بھر کی مساجد اور امام بارگاہوں پر جو قیامت ڈھائی جاتی رہی ہے اُس کے نتیجے میں یہ تصور عوام کے ذہنوں میں راسخ ہوچکا ہے کہ حکومت خواہ کوئی اشارا دے، قتل و غارت فرقہ واریت کی بُنیاد پر

نہیں بلکہ بعض خفیہ مقاصد کے لیے ہے! اب بھی معاملہ یہی ہے۔ بلوچستان میں ہزارہ کمیونٹی پر ڈیڑھ ماہ میں دو مرتبہ قیامت ڈھائی گئی۔ ملک بھر میں احتجاج ہوا مگر احتجاج کرنے والوں نے عام سُنّیوں کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے حکومتی نا اہلی پر لعن طعن کی۔ اب رحمٰن ملک بار بار کالعدم لشکر جھنگوی کا نام لیکر معاملات کا رُخ کس طرف موڑنا چاہتے ہیں؟ اگر حکومت اپنے "اقدامات" سے طالبان جیسے طاقتور حریفوں کو زیر کر سکتی ہے تو لشکر جھنگوی جیسے گروپ کو زیر وزبر کرنے میں کون سا امر مانع ہے!

اور اگر بہت سی وارداتیں کالعدم لشکر جھنگوی کے کھاتے میں ڈالنے سے بھی بات نہ بن پائی تو کیا اگلے مرحلے میں کالعدم سپاہِ محمد کا کھاتہ دوبارہ کھول کر کچھ وارداتیں اُس میں ڈپازٹ کرائی جائیں گی؟

جن کے ہاتھ میں اختیار ہے وہ عوام اور اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ جس کام کا مینڈیٹ ملا ہے وہ تھوڑا بہت تو انجام دیں۔ نیم دِلانہ ہی سہی، دہشت گردی اور قتل و غارت روکنے کی کوشش تو کی جائے۔ یہ کہاں کی غیرت ہے کہ کہیں بم دھماکہ ہو اور قانون نافذ کرنے والے اداروں موقع پر پہنچنے کے لیے احکام کے منتظر رہیں؟ کراچی کے عباس ٹاؤن میں بم دھماکے کے بعد بہت دیر تک امدادی کارروائی شروع نہ کی جا سکی۔ کیا یہ بھی حکومتی پالیسی کا حصہ ہے کہ زخمیوں

کو بر وقت طبّی امداد نہ پہنچائی جائے یا نہ پہنچانے دی جائے؟

کراچی جیسے پھیلے ہوئے اور متنوع آبادی والے شہر کو بے لگام چھوڑ دیا گیا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاتھ بظاہر باندھ دیئے گئے ہیں تاکہ کسی خرابی کی صورت میں وہ کوئی مثبت کردار ادا نہ کر سکیں۔ ہر گام پر سیاسی مصلحتیں آڑے آ رہی ہیں۔

مُقدّر خراب ہونے اور مُقدّر کو خراب کرنے میں تو بہت فرق ہے۔ حالات جان بوجھ کر خراب کئے جا رہے ہیں یا اُنہیں بد سے بدتر ہونے دیا جا رہا ہے۔ اور کسی کے ماتھے پر شرمندگی کی ایک رَمق بھی دِکھائی نہیں دیتی۔ قوم کسی نہ کسی طرح قتل و غارت، بد امنی اور دہشت گردی کے شُتّے سے بچنا چاہتی ہے مگر دوسری طرف یاروں کی پوری کوشش ہے کہ مُقدّر خراب رہے اور اونٹ پر چڑھ بیٹھنے والی قوم کو بُرے حالات کا کتّا کاٹتا ہی رہے! یہ تماشا کب ختم ہوگا؟ ختم ہوتا ہوا مینڈیٹ مزید کتنے گُل کِھلائے گا؟ قوم کو انتخابات کے فِلٹر سے گزرنے سے پہلے کتنی خرابیوں کی پائپ لائن سے گزرنا ہے؟ قوم کا نصیب کب جاگے گا یعنی جنہیں حالات درست کرنے کے لیے کچھ کرنا ہے اُن کی نیند کب پوری ہوگی اور اُن کا ضمیر جب بیدار ہوگا؟ قوم دُعاؤں کی منزل سے گزر کر بد دعاؤں کے مرحلے میں ہے۔ تو کوئی ہے جسے کچھ شرم آئے!

سیاسی اسٹیک ہولڈرز کیا غیر سیاسی اِسٹک ہولڈرز کے منتظر ہیں؟

بُھوک کی موت

آج ہماری زندگی میں موبائل فون اور ٹی وی چینلز کا عمل دخل اِس قدر بڑھ گیا ہے کہ یاد بھی نہیں کہ جب یہ سب کچھ نہیں تھا تو ہم رابطے میں کس طرح رہتے تھے اور پرائم ٹائم کس طور گزارا کرتے تھے ! بس کچھ ایسا ہی معاملہ کوکنگ شوز اور بالخصوص زبیدہ آپا کا بھی ہے۔ ذہن پر لاکھ زور ڈالیے مگر یاد نہیں آتا کہ جب ٹی وی چینلز کی معرفت زبیدہ آپا ہماری زندگی میں وارد نہیں ہوئی تھیں تب خواتین کھانا پکانے کی تراکیب کہاں سے سیکھتی تھیں اور چھوٹی موٹی اُلجھنوں سے نجات پانے کے تیر بہ ہدف ٹوٹکے کہاں سے حاصل کیا کرتی تھیں !

زبیدہ آپا کی صلاحیت اور لیاقت سے کِس کو انکار ہو سکتا ہے؟ کِس کی مجال ہے کہ زبیدہ آپا کے بارے میں کوئی ایسی ویسی رائے دیکر اپنی اہلیہ کی ناراضی مول لے؟ ہم بھی اُن کے قدر دان ہیں مگر ساتھ ہی وضاحت بھی کئے دےتے ہیں کہ ہم آپا کے سگے نہیں بلکہ سوتیلے پرستار ہیں ! سوتیلے اِس لیے کہ جب سے زبیدہ آپا نے ٹی وی پر طرح طرح کے کھانے تیار کرنا سکھایا ہے، ہم اپنے آپ کو چوہا سمجھنے لگے ہیں !

بات یہ ہے کہ جس طرح نئی ادویہ کے تجربے چوہوں پر کئے جاتے ہیں بالکل اُسی طرح جب بھی زبیدہ آپا کی بتائی ہوئی ترکیب کے

مطابق گھر میں کوئی ڈِش تیار کی جاتی ہے تو تجربے کے طور پر ہمیں کِھلائی جاتی ہے! ہماری اولوالعزمی اور استقامت (یعنی ڈِھٹائی) ملاحظہ فرمایئے کہ دَسیوں، بلکہ بیسیوں تجربات سے گزر کر بھی زندہ ہیں!

زبیدہ آپا سے ہمیں ایک نمایاں شکایت یہ ہے کہ جب اُن کا پروگرام چل رہا ہوتا ہے تو ہم کوئی اور چینل دیکھنے سے یکسر محروم رہتے ہیں۔ آپا والے چینل کو ہٹا کر ہم گھر کے ماحول کو تو خراب نہیں کر سکتے نا! ہم خبریں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر چینل بدلنے کی بات کیجیے تو اہلیہ کہتی ہیں کہ بس، ذرا آلو گَل جائیں تو آپ نیوز چینل پر چلے جایئے گا! ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ آلو دس منٹ میں گلیں گے۔ اب ہم کس طرح سمجھائیں کہ اِتنی دیر میں تو اسلام آباد میں بہت کچھ گل سَڑ جائے گا! تو جناب! دل چاہے کہ نہ چاہے، خاتون خانہ کی مرضی کے مطابق کوکنگ شو میں چولھے پر رکھی ہوئی پتیلی نِہارتے رہیے۔ آلوؤں کے گلنے کا تماشا ختم ہونے پر کوئی نیوز چینل لگایئے تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام آباد میں پارلیمنٹ کے باہر کِھچڑی پکی بھی اور یاروں نے چٹ بھی کرلی! یا پھر یہ کہ آپ تو ٹی وی اسکرین پر دال میں لگائے جانے والے تڑکے کا نظارہ کرتے رہے اور اُدھر جوتوں میں دال بٹ گئی!

سُنا ہے ایک جادوگر یعنی شعبدہ باز ایسا بھی تھا جو اپنے شو میں بالعموم

پندرہ بیس منٹ کی تاخیر سے پہنچتا تھا اور پھر ہال میں حاضرین کے سامنے دعویٰ کرتا تھا کہ وہ مقررہ وقت پر آیا ہے! لوگ حیران ہوتے تھے تو وہ اُن سے کہتا تھا کہ گھڑی دیکھیں۔ سب اپنی اپنی گھڑیاں دیکھتے تھے تو حیران رہ جاتے تھے کیونکہ گھڑیاں پندرہ بیس منٹ پیچھے جاچکی ہوتی تھیں! یعنی آتے ہی سب کی گھڑیاں پیچھے کرنا جادوگر کا پہلا آئٹم ہوا کرتا تھا۔ زبیدہ آپا کا پہلا آئٹم یہ ہوتا ہے کہ جب اِن کا کوکنگ شو شروع ہوتا ہے تو خواتین چینل بدلنے کی اجازت نہیں دیتیں!

زبیدہ آپا کی مہربانی ہے کہ خواتین جو آلو گوشت، دال گوشت، چکن کڑھائی، مٹن کڑھائی، بیف بریانی اور دیگر ڈِشیں ایک زمانے سے پکاتی اور اُن پر داد وصول کرتی آئی ہیں اُنہیں نئے سِرے سے سیکھتی ہیں تاکہ سَند رہے!

آپ نے اکثر سوچا ہوگا کہ ملک میں دانش ہے نہ نظم و ضبط۔ عام آدمی میں بھی برائے نام شعور نہیں۔ تعلیمی ادارے بچوں کو بہتر زندگی کے لیے کچھ دے ہی نہیں پا رہے۔ سرکاری ادارے عوام کو کماحقہ خدمات اور سہولتیں فراہم نہیں کر پا رہے۔ جس کے ذِمّے جو کام ہے وہ اُس کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اِس سوال کا جواب زبیدہ آپا نے روزنامہ دُنیا کراچی کے سنڈے میگزین سے انٹرویو میں بخوبی دے دیا ہے۔ محض ایک جملے میں آپا نے جو کچھ

کہا ہے اُسے غالب کے بقول گنجینۂ معنی کا طلسم سمجھیے! کوئی بھی جج جب کبھی سزائے موت کا فیصلہ لکھتا ہے تو دستخط کرنے کے بعد قلم توڑ دیتا ہے۔ آپ بس یہ سمجھ لیجیے کہ آپا نے بھی قلم توڑ دیا ہے! انٹرویو کے دوران جب آپا سے پوچھا گیا کہ کھانے کا شوق کس حد تک ہے تو اُنہوں نے کہا کہ کوکنگ شوز میں پکاتے پکاتے اب بُھوک مَر چکی ہے! یعنی کھانے کا کچھ خاص شوق اب نہیں رہا!

ہمیں یقین ہے کہ آپا نے یہ بات محض یکسانیت اور بیزاری ظاہر کرنے کے لیے کہی ہوگی۔ یہ نتیجہ ہرگز اخذ نہ کیا جائے کہ وہ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے سے بچنا چاہتی ہیں! یہ بھی زبیدہ آپا کی مہربانی ہے کہ اپنے آفاقی ٹوٹکوں کے ذریعے اُنہوں نے خواتین خانہ کو سوچنے کی زحمت سے بچالیا ہے۔ ویسے خواتین خانہ خیر سے سوچنے کی عادی ہوتی بھی نہیں! یہی سبب ہے کہ اگر کبھی کسی معاملے میں سوچنا پڑ جائے تو ذہن کی جان پر بن آتی ہے!

آپا کا انٹرویو پڑھا تو ہماری سمجھ میں آیا کہ ہمارے ہاں تعلیمی ادارے بچوں کو ڈھنگ سے کچھ سِکھا کیوں نہیں پا رہے۔ چھ عشروں سے تعلیم بانٹتے بانٹتے

اِن اداروں کی بُھوک ہی ختم ہو چکی ہے! یعنی علم بچا ہی نہیں تو بانٹیں کیا؟ ایک ہی کام کئے جایئے تو یکسانیت سے بیزاری جنم لیتی ہے۔ اگر تعلیمی ادارے صرف تعلیم پر مامور رہیں گے تو بالآخر اُن کی تعلیمی صلاحیت گِھس ہی جائے گی نا! چند ایک تعلیمی ادارے تھوڑا سا "ری چارج" ہونے کے لیے تعلیم کے ساتھ تربیت کے بجائے "طربیت" جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں تو لوگ اعتراض کے تیر برسا رہے ہیں!

سرکاری ادارے چھ عشروں سے عوام کو خدمات کی فراہمی پر مامور ہیں۔ اب کیا اِتنے طویل عرصے میں بھی خدمات کا اسٹاک ختم نہیں ہوگا؟ عوام کی خدمت کرتے کرتے سرکاری اداروں اور محکموں پر بیزاری مسلط ہو چکی ہے۔ اب اگر وہ مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے تھوڑی سی نا اہلی، ہڈ حرامی اور کرپشن کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو اعتراض کیسا! یہ تو ہم نے فرض کرلیا ہے کہ سرکاری ادارے ہماری خدمت پر مامور ہیں۔ ذرا خود اُن اداروں سے بھی تو پوچھا جائے کہ وہ کیا چاہتے ہیں!

چھ عشروں کے دوران سیاست دان اِتنے مصروف رہے ہیں کہ اب سیاست بھی گِھس گئی ہے! اداکاروں نے اِتنی اداکاری کی ہے کہ اب اُن کے فن میں اور تو سب کچھ ہے، بس ایک اداکاری ہی دکھائی نہیں دیتی! گانے والوں نے گا گا کر گائیکی کا

گلا گھونٹ دیا ہے ! بعض گانے والوں کو سُن کر تو جی چاہتا ہے کہ عوام کے بہترین مفاد میں اُن کا گلا گھونٹ دیا جائے ! لوگ زندگی بھر کام کرتے کرتے اِتنے تھک گئے ہیں کہ اب اُن میں کام کرنے کی سکت اور لگن نہیں رہی۔ جب پکا پکا کر بُھوک ختم ہو سکتی ہے تو کام کرتے کرتے کام کرنے کی لگن بھی ختم ہو سکتی ہے!

ایک زمانہ تھا کہ صبح کے وقت لوگ اخبار پڑھتے اور چند ایک ہلکی پھلکی باتیں کیا کرتے تھے تاکہ دن اچھا گزرے۔ اب ٹی وی پر مارننگ شوز دیکھ کر اُوٹ پٹانگ حرکتیں ہضم کرنی پڑتی ہیں ! بعض آئٹمز دیکھنے کے بعد تو مُوڈ دِن بھر خراب رہتا ہے۔ یہی حال شام کا ہے۔ شوہر تھکے ہارے گھر پہنچتے ہیں کہ چلو، شام کے حسین لمحات میں بیوی سے کچھ بتیائیں گے، چائے شائے پئیں گے۔ اور وہاں تو ٹی وی پر کوکنگ شو چل رہے ہوتے ہیں ! شام کی خوب صورت ساعتوں کو ٹی وی کے کوکنگ شوز سے بچانے کا کوئی ٹوٹکا شوہروں کے پاس نہیں ! اور ظاہر ہے زبیدہ آپا تو ایسا کوئی ٹوٹکا کبھی بُھول کر بھی نہیں بتائیں گی!

جاتے جاتے بھی

معاملات کو ٹالتے ٹالتے ڈیڈ لائن یعنی آخری لمحات تک لے جانے کی روش یا فن جب پوری قوم پر ختم ہے تو پھر حکومت اپنے آپ کو کیوں استثنٰی دے؟ طلبا و طالبات کی سی سوچ حکومتوں کی نفسیاتی ساخت میں بھی در آئی ہے۔ یعنی وقت کو گزارتے، بلکہ قتل کرتے رہیے اور جب امتحانات سر پر آ جائیں تو اچانک بیدار ہو کر ٹامک ٹوئیاں مارنا شروع کیجیے!

منتخب حکومت کو پانچ برسوں میں اتحادیوں سمیت کچھ بھی آسان نہیں ملا۔ حالات نے قدم قدم پر محاذ کھولے۔ عوام کی خدمت پر مامور حکومت کو ملک کی بقاء اور سلامتی یقینی بنائے رکھنے کا مینڈیٹ ملا تھا۔ مگر جمہوریت کے نام پر یہ تماشا بھی قوم نے دیکھا کہ حکومت کا بیشتر وقت اپنی بقاء کا اہتمام کرنے پر صرف ہوا۔ یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ ان پانچ برسوں میں سیکیورٹی کے ادارے زیادہ لڑے ہیں یا حکومت نے ایوان ہائے اقتدار کے مختلف مورچوں پر زیادہ "دادِ شجاعت" دی ہے! جمہوریت کو بچانا ضروری، بلکہ لازم ہے۔ عوام کا کیا ہے، وہ تو ہر دور میں رہے ہیں اور رہیں گے!

ویسے تو زمانے کا چلن یہ ہے کہ رات گزرتی ہے تو سُورج نکلنے پر آنکھ کھلتی ہے۔ جمہوریت میں کائنات کے اُصول پلٹ جاتے ہیں۔ عوام کے ووٹوں سے ملنے والے مینڈیٹ کی شام ہونے کو آئی ہے تو حکومت ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی ہے۔ معاملات کو تیزی سے سمیٹ پر پوٹلے باندھے جارہے ہیں۔ تمام مسائل راتوں رات حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جارہا ہے کہ کوئی شعبہ رہ نہ جائے یعنی بچنے نہ پائے!

کراچی میں ایک زمانے سے قتل و غارت کی آگ لگی ہوئی ہے۔ پارلیمنٹ میں اِس صورتِ حال پر کئی بار آواز بلند ہوئی مگر حکومت چوہدری شجاعت کی طرح کراچی کی بدامنی پر "مِٹّی پاؤ" کے فارمولے پر عمل پیرا رہی۔ کراچی کے حالات درست کرنے کا معاملہ چند نمائشی اقدامات تک محدود رہا۔ بظاہر یہی یقینی بنایا جاتا رہا کہ کراچی کے شہریوں کو خاک و خون میں غلطاں کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو۔ کراچی کے معاملات کو اِس قدر نظر انداز کیا گیا ہے کہ شہر اب بارود کے ڈھیر میں تبدیل ہوگیا ہے۔ کوئی ایک آدھ غلط بیان کی دِیا سلائی بھی پھینک دے تو شہر کے کئی علاقے بم کی طرح پھٹ پڑتے ہیں! شہر کئی شہروں میں تقسیم ہوچکا ہے۔ نو گو ایریاز کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ شہریوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے خوف کا یہ عالم ہے کہ کہیں واشنگ مشین کا ٹائمر بھی پڑا ہو تو بم کا گمان گزرتا ہے!

میعاد ختم ہونے کو آئی ہے تو حکومت کو اچانک بہت کچھ یاد آگیا ہے۔ گویا جمہوری فلم کے دی اینڈ میں ہیروئن کی یادداشت واپس آ گئی ہے۔ زہے نصیب ! یادداشت کی واپسی کے بعد حکومت نے سب سے پہلے کراچی کو پہچانا ہے۔ لوٹ مار، قتل و غارت، اغوا برائے تاوان اور اسٹریٹ کرائمز میں ملوث افراد کے خلاف آپریشن کا عندیہ دیا جارہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ حکومت کی یادداشت کا لَوٹ آنا کس کس سے ہضم ہوسکے گا۔ کراچی میں معاملات کی دُرستی کے لیے سخت اقدامات کی دُہائی سَبھی دیتے ہیں مگر اپنے مفادات پر ضرب پڑتی دیکھ کر یوٹرن لینے میں دیر نہیں لگائی جاتی۔ جس کے مفادات متاثر ہوتے ہیں وہ اُنہی اقدامات کو بُرا گردانا شروع کردیتا ہے جن کا مطالبہ اُس نے برسوں کیا ہوتا ہے! کراچی کے حالات کا قبلہ دُرست کرنے کا عندیہ تو دیا جارہا ہے مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ رکوع میں جانے کی تیاری کرنے والی حکومت غش کھاکر گرے اور خود بخود واقع ہونے والے سَجدے میں جان دے دے! عوام کو میڈیا نے تھوڑا بہت شعور بخش دیا ہے۔ ایسے کسی بھی واقعے کو وہ "شہادت" کا درجہ دینے کے لیے کسی طور تیار نہ ہوں گے!

اگر اشعار خود بخود موزوں ہوں تو "آمد" کہلاتے ہیں۔ جب طبیعت شعر کہنے پر

مائل نہ ہو تو شُعراء کو زور لگانا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں موزوں کیئے جانے والے اشعار "آورد" قرار پاتے ہیں۔ اگر زیادہ عام فہم زبان استعمال کی جائے تو یہ بھرتی کے اشعار کہلائیں گے۔ حکومت کے پاس آمد کے شعر کہنے کی جو تھوڑی بہت صلاحیت تھی اُس کا معقول حصہ اپنی بقاء کی خاطر اور اپنی ہی صفوں میں موجود بد نظروں کی نوحہ گری پر نچھاور ہوا۔ رہی سہی کسر مفاہمت کے فلسفے کی قصیدہ خوانی نے پوری کردی۔

اب حکومت جاتے جاتے مختلف اداروں، وزارتوں اور محکموں میں اندھا دھند بھرتی کے ذریعے اپنا دیوان بھرتی کے اشعار سے مکمل کرنے پر تُلی ہوئی دِکھائی دیتی ہے۔ ہنگامی، بلکہ جنگی بُنیاد پر سرکاری محکموں اور اداروں میں بھرتی کیئے جانے والوں یا متعلقہ اداروں کا مستقبل کیا ہوگا، اِس کے بارے میں سوچنے کی فُرصت کسی کو نہیں۔ بے روزگاری ختم کرنا لاکھ مستحسن سہی، مگر اِس عمل کے نام پر اداروں کے وجود ہی کو اُلٹ پلٹ دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟

مورچوں کی تعداد شاید کچھ کم تھی، اِس لیے سپریم کورٹ کے خلاف پھر سے مورچہ لگانے کی کوشش کی گئی۔ وفاقی وزیر خورشید شاہ نے یہ بیان داغا کہ پارلیمنٹ کے خلاف بولنے والے ججوں کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ اُن کا کہنا تھا کہ پانچ برسوں می بہت کچھ برداشت کیا۔ اداروں کو حدود اور قانون کے دائرے میں

رہنا چاہیے۔ اور یہ کہ پارلیمنٹ کو آخری دن تک قانون سازی کا اختیار حاصل ہے !
قانون سازی کا اختیار تو ٹھیک مگر ججوں کو معاف نہ کرنے کا انتباہ؟ یہ تو اعلیٰ ترین عدالت سے .براہِ راست تصادم کی راہ ہموار کرنے کے مترادف ہے !
خورشید شاہ نے درست کہا کہ حکومت نے پانچ .برسوں میں بہت کچھ .برداشت کیا ہے۔ بے چاری کا آدھا وقت تو اتحادیوں کو منانے اور بہلانے پُھسلانے میں صرف ہوا۔ تحفظات دور کرنے سے فُرصت ملتی تو عوام کو تحفظ فراہم کرنے کا سوچتی۔ تھوڑی سی فراغت نصیب ہوتی تھی تو وہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کا انتظام کرنے پر خرچ ہو جاتی تھی ! حکومت کو بُھولنے کی بیماری لاحق تھی مگر دو معاملات میں اُس کا حافظہ خوب کام کرتا رہا.... نوٹ چھاپنا اور بینکوں سے قرضے لینا۔ عوام پریشانی سے دوچار رہے۔
سیکیورٹی کا معاملہ بھلے ہی کھٹائی میں پڑا رہا مگر سیکیورٹی پرنٹنگ پریس کو خوب کام پر لگایا جاتا رہا۔ پاسپورٹ چھاپنے والی مشینیں چھ چھ ماہ خراب رہیں اور قوم کے پڑھے لکھے اور ہنر مند افراد کا مستقبل مِٹّی میں ملتا رہا مگر نوٹ چھاپنے کی مشینوں کا سانس پُھولا نہ خراب ہوئیں ! حکومتی مشینری میں لے دے کر بس یہی وہ مشینیں ہیں جو ڈھنگ سے اپنا کام کرتی اور قوم کا کام اُتارتی آئی ہیں ! یہ عمل کچھ اِس تواتر سے جاری رہا ہے کہ State Bank بے چارا Estate Bank ہو کر رہ گیا

ہے!

جس میں ذرا بھی عقل تھی، دیوانہ ہو گیا

شاعر خُدا جانے کِس دُنیا کی مخلوق ہیں اور کِس عالم میں رہتے ہیں۔ خود چاہے بے راہ رَوی کا شکار ہوں مگر، از خود نوٹس کے تحت، قوم کو راہ دِکھانا اپنا فریضہ گردانتے ہیں! منزل تک جانے والی راہ پر چلنا ہے یا نہ چلنا قوم پر منحصر ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ شاعر راہ دِکھاتا ہے اور قوم ٹھینگا دِکھاتی ہے! یہ تو شُعراء کا احسان ہے کہ دور و نزدیک کے رشتہ داروں کی طرح قوم کے کِسی بھی رویّے کا بُرا نہیں مانتے اور راہ نُمائی کا فریضہ ترک نہیں کرتے!

آں جہانی برج نرائن چکبست نے کہا تھا

یہ سَودا زندگی کا ہے کہ غم اِنسان سہتا ہے
وگرنہ ہے بہت آسان اِس جینے سے مَر جانا!

سَمجھانا اُن کا کام تھا اور نہ سمجھنا اہلِ وطن کا! شاعر کا خیال یہ تھا کہ اِنسان غم اُسی وقت سہتا ہے جب زندگی کا سَودا سَر میں سمایا ہوا ہو۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو جینے سے بہت آسان مَر جانا ہے۔ چکبست تو یہ کہہ کر پرلوک سِدھار گئے مگر قوم کا پرنالہ وہیں بہتا رہا۔ کیسا سَودا، کہاں کا سَودا؟ زندگی کا سَودا سَروں میں سمایا بھی نہیں اور سانسوں کا تسلسل بھی برقرار

رہا! زندگی کی جو شرط چکبست نے بیان کی تھی وہ آج بھی جُوں کی تُوں ہے۔ لوگ شرط پوری کئے بغیر بھی جی رہے ہیں۔ زندگی سے محبت کئے بغیر مَر جانے کو آسان چکبست نے جانا ہوگا، اُن کے کلام سے فیض یاب ہونے والوں نے نہیں! شُعراء خدا جانے کیا کیا کہہ جاتے ہیں۔ اگر سب اُن کی باتوں پر چلیں تو دُنیا کا چلنا محال ہو جائے!

چکبست کے مقابلے میں آں جہانی نریش کمار شاد نے ایسا مشورہ دیا جو آسانی سے اپنایا جاسکتا تھا اور اپنایا گیا۔ شاد فرماتے ہیں

اے ہم نشیں! اذیتِ فرزانگی نہ پوچھ

جس میں ذرا بھی عقل تھی، دیوانہ ہوگیا!

اِسے کہتے ہیں روانی ہی روانی میں حرفِ آخر کہہ جانا، حتمی تصویر کھینچ کر قلم توڑ دینا! کون ہے جو اپنے ذہن کے ناتواں کاندھوں پر زندگی بھر عقل اور شعور کا بوجھ اُٹھاتا پھرے؟ مرتے دم تک پوری آگہی کے ساتھ دن کو رات اور رات کو دن کرنے کا کس کو یارا ہے؟ صَد شُکر کہ نریش کمار شاد کے مشورے کی روشنی میں ہم میں سے بہتوں کو عقل آگئی ہے یعنی عقل سے کام لینا ترک کرچکے ہیں! زمانے کی

روش دیکھتے ہوئے خود کو بدلنے والوں یعنی عقل سے کام لینے کا نہ مُصمّم اِرادہ کرنے والوں میں ہمارے احباب بھی شامل ہیں۔ اور اِن میں مرزا تنقید بیگ نمایاں ہیں۔ میڈیا کی ترقی نے اِنہیں اور کچھ سکھایا ہو یا نہ سکھایا ہو، عقل کو سات سلام کرکے سکون سے زندگی بسر کرنے کا ہُنر بخوبی سکھا دیا ہے! ویسے مرزا نے زندگی کے کسی بھی دَور میں اپنے ذہن کو کبھی زیادہ تکلیف نہیں دی۔ شادی کے بعد سے، یعنی یہی کوئی چالیس سال سے (!)، مرزا نے سوچنے کا کام پُورا کا پُورا اہلیہ پر چھوڑ رکھا ہے! اِس بات کو تھوڑی سی حقیقت پسندی سے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ شادی کے کچھ ہی دن بعد سے گھر کے تمام فیصلے اہلیہ کرتی آئی ہیں یا یہ کہ ازدواجی زندگی کی ہَماہَمی نے مرزا کو سوچنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں!

مرزا کو ہم نے بیشتر معاملات میں انتہائی مُشکل فیصلے خاصی آسانی سے کرتے دیکھا ہے۔ آپ سوچیں گے اِس کا راز کیا ہے۔ راز واز کیسا؟ بات یہ ہے کہ مرزا دِماغ کو اللہ کی امانت سمجھ کر استعمال سے گریز کرتے ہیں اور فیصلے کر گزرتے ہیں! "راسخ النتیجہ" مسلمان ہیں یعنی کچھ بھی کر جاتے ہیں اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں! لُطف دیکھیے کہ بالعموم بھنور سے صاف نکل آتے ہیں۔ یعنی قدرت بھی اُنہیں سوچنے کی طرف آنے کی تحریک نہ دینے پر تُلی ہوئی ہے!

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، ذہن استعمال نہ کرنے والوں کو خاصے سُکون سے زندگی بسر کرتے دیکھا ہے! سرکاری دفاتر میں ذہن کے عدم استعمال کے خوشگوار نتائج کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے! سرکاری ملازمین کے معمولات پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہو جائے گا کہ اُن کی زندگی میں کس قدر سُکون اور توازن ہے۔ جو ذہن پر زور نہیں دیتے اُنہیں فُرصت کے لمحات خوب میسر آتے ہیں۔ وہ ماحول سے معقول حد تک محظوظ بھی ہوتے ہیں اور محفوظ بھی رہتے ہیں!

ہماری ریاستی مشینری بھی کچھ اِس نوعیت کی ہے کہ جو ذہن کو بہتر انداز سے استعمال نہ کر پائیں اُنہیں مایوسی کے گڑھے میں گرنے سے صاف بچالیتی ہے۔ اگر کوئی کچھ نہ کر پائے، ذہن کو ذرا بھی حرکت نہ دے پائے تو ہرگز نہ گھبرائے کہ کم از کم سرکاری اسکول ٹیچر بننا تو اُس کا استحقاق ہے! اور بعض حالات میں تو یہ فرض کے مساوی ہے! آسانی یہ ہے کہ ناقص کارکردگی کی صورت میں رپورٹ کا خطرہ بھی نہیں ہوتا۔ معصوم بچے بے چارے کہاں سمجھ پاتے ہیں کہ اُنہیں جو کچھ پڑھایا جانا چاہیے وہ پڑھایا جارہا ہے یا نہیں!

جو مل گیا اُسی کو مُقدّر سمجھ لیا!

میرزا نوشہ کو بھی بہتر اور پُرسُکون زندگی کے نُسخے سُجھانے میں کمال حاصل

تھا۔ فرماتے ہیں

بے خودی بے سبب نہیں غالب

!کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مفہوم یہ ہے کہ جب زندگی بسر کرنے کے معاملے میں کچھ نہ بن پڑے تو فرزانگی ترک کیجیے اور بے خودی کو گلے لگا لیجیے۔ کام کاج سے جان چُھوٹ جائے گی۔ اور لوگ ہوش و !خرد سے بیگانگی پر کسی اور عالم کی مخلوق گردانتے ہوئے خواہ مخواہ احترام کریں گے

جو لوگ اِس دُنیا میں عقل استعمال کرتے ہیں، ذہن کو بروئے کار لاتے ہیں اُن کا معاملہ یہ ہے کہ

!اُس کو چُھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ نریش کمار نے تخلّص شاد کیوں رکھا تھا! عقل مندی تو !اِسی میں ہے کہ عقل استعمال نہ کی جائے اور دیوانگی اپنا کر شاد رہا جائے

جو ہر معاملے میں عقل سے کام لیتا ہے وہ باالآخر اپنا کام تمام کر بیٹھتا

ہے۔ میڈیا کا شعبہ اِس معاملے میں بہت سفّاک ہے! جو بھی اُصولی رہا وہ سُولی چڑھا! جس نے عقل اور اُصول کے مطابق لِکھا وہ اچھا خاصا غیر مطبوعہ ترکہ چھوڑ کر دُنیا سے گیا!

اب یہی دیکھیے کہ ایک زمانے تک پی ٹی وی پر لوگ ذہن کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے ڈرامے لکھتے رہے۔ مگر مِلا کیا؟ اِتنا معمولی سا معاوضہ جسے بُلبُل کے اشکوں ہی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے! اور ذرا اِس حقیقت پر غور فرمایئے کہ فی زمانہ لوگ ذہن استعمال کرنے کے بارے میں سوچے بغیر ڈرامے اور شو لِکھ رہے ہیں اور مال بنا رہے ہیں! لُطف یہ ہے کہ بے ذہنی کا ہر نمونہ رجحان ساز قرار پاتا ہے! بے دِماغی سے کیا جانے والا کام کچھ اور سیٹ کرے نہ کرے، ٹرینڈ تو سیٹ کر ہی دیتا ہے!

بول کہ لب "آزار" ہیں تیرے

"یہ تو ناکام ریاست ہے۔"

"اب تو کچھ بھی نہیں بچا۔ اب صرف تباہی آنی ہے، مکمل تباہی۔"

"یہ مُلک بنا ہی کیوں تھا؟ یا بنایا ہی کیوں تھا؟"

"ایسی آزادی سے تو انگریزوں کی غلامی اچھی تھی۔"

"یہ ہم کس مُلک میں پیدا ہو گئے؟"

"مُلک ٹوٹتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اب اِس کے حصے بخرے ہو کر رہیں گے۔"

"دیکھ لینا، ایک نہ ایک دن باقی ماندہ مُلک بھی ٹکڑوں میں بٹ کر رہے گا!"

"بس موقع ملنے کی دیر ہے۔ پھر دیکھنا، میں کبھی اِس مُلک میں دکھائی نہیں دوں گا!"

یہ اور اِن سے ملتے جلتے جملے آپ نے ٹی وی پر، تقریبات میں اور دوستوں سے گفتگو کے دوران سُنے ہی ہوں گے۔ "آزاد" مُلک کیسا ہوتا ہے، کوئی یہ بات پاکستان کو دیکھ کر سیکھے۔ ہم ایک ایسے مُلک میں جی رہے ہیں جس میں ہر شخص از خود نوٹس کے تحت کسی قسم کا فرمان جاری کر سکتا ہے۔ حکومتی مشینری کو ہر معاملے میں موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ ترین عدلیہ کو سرِ عام گالی

دی جا سکتی ہے۔ ریاستی اداروں کے بارے میں کسی بھی نوع کی ہرزہ سرائی سے کوئی روکنے والا نہیں۔ مذہب کے نام پر دِلوں میں نفرت اور تفرقہ ڈالنے والی کوئی بھی بات کہہ جایئے، کس کی مجال ہے کہ ٹوکے اور روکے۔ سیاست، مصلحت اور قومی مفاد کے نام پر کسی بھی شخصیت کو، سبب بتائے بغیر، مطعون کیجیے کہ یہ تو آپ کا پیدائشی حق ہے!

کسی زمانے میں یہ لطیفہ مشہور ہوا تھا کہ پاکستان کے ایک ہٹّے کٹّے کتے کی ملاقات بھارت کے لاغر اور مریل کتے سے ہوئی۔ پاکستانی کتے نے باتوں باتوں میں حالات کی خرابی کا شِکوہ کیا تو بھارتی کتے نے پوچھا کس بات کی پریشانی ہے؟ کھا کھا کر دُنبے تو ہو رہے ہو۔ پیٹ بھر کھانا مِل تو رہا ہے۔ پھر شِکوہ کیسا؟ پاکستانی کتا بولا۔ "یار! پیٹ بھر کھانے کو تو مِل رہا ہے، مُنہ بھر بولنا نصیب نہیں ہو رہا۔ کھانے پینے کی آزادی ہے مگر بھونکنے پر پابندی ہے!"

آج سب کچھ بدل چکا ہے، بلکہ پلٹ گیا ہے۔ لطیفے کا نیا ورژن یہ ہے کہ آج کے پاکستانی کتے اپنا استحقاق مجروح ہونے پر آزردہ ہیں! کھانے کو جو کچھ بھی مِل جائے، ہنسی خوشی قبول کر لیتے ہیں۔ بھونکنے پر بھی پابندی نہیں۔ آپ سوچیں گے اگر ایسا ہے تو پھر رونا کس بات کا ہے اور کون سا استحقاق مجروح

ہوگیا؟ آج کتوں کا بُنیادی شِکوہ یہ ہے کہ صرف اُنہی کے نہیں بلکہ کِسی کے بھی بھونکنے پر کوئی پابندی نہیں ! بھونکنا صرف کتوں کا پیدائشی اور فطری حق اور فرض ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ حق اِنسانوں کو بھی مِل جائے ! اب عالم یہ ہے کہ اپنے اپنے مفادات کی ہڈیاں بھنبھوڑنے کے لیے سب بے تاب ہیں اور بھونک بھونک کر ایک دوسرے کو اِن ہڈیوں سے دور بھگا رہے ہیں !

معدہ ہمیں اِس لیے مِلا ہے کہ جو کچھ کھائیں وہ اُس میں جائے اور ہضم ہو۔ تو کیا اِس کا یہ مطلب ہے کہ ہر وقت کچھ بھی کھاتے اور چرتے رہیے ؟ کان اِس لیے ہیں کہ ہم سُنیں۔ مگر کیا الا بلا سُنتے رہنا ہی کانوں کا دُرست استعمال ہے ؟ آنکھیں دیکھنے کے لیے عطا ہوئی ہیں مگر غیر ضروری طور پر بہت کچھ دیکھتے رہنا ہی آنکھوں کا حقیقی مَصرف ہے ؟ مُنہ اور اُس میں زبان اِس لیے ملی ہے کہ ہم بات کریں۔ اِنسان جو کچھ سوچتا ہے وہ زبان کے ذریعے دُنیا والوں تک پہنچتا ہے۔ مگر یہ کیا کہ ہر وقت بولتے ہی رہیے ! بولنے کا مزا تو جب ہے کہ پہلے انسان سوچے، سمجھے اور خیالات ترتیب دے لے۔ یہ کیا کہ بولنے پر آیئے تو ذہن کو زحمت دینے کا خیال بھی ذہن سے نکال بیٹھیے اور انٹ شنٹ بولتے جایئے ! ایسا لگتا ہے کہ اہل پاکستان خاموش رہنے کو "نیکی برباد، گناہ لازم" والا معاملہ سمجھ بیٹھے ہیں ! ہر شخص بظاہر اِس خوف میں مبتلا ہے کہ کچھ نہ کچھ بولتا نہ رہا تو دھر لیا جائے گا ! کچھ دیر خاموش رہیے تو لوگ

تھوڑے سے حیران اور تھوڑے سے خوفزدہ ہو کر دیکھتے ہیں، ذہنی صحت پر شک کرنے لگتے ہیں! خاموش بیٹھے رہنے والوں کو "خفیہ والوں کا بندہ" قرار دینے میں بھی دیر نہیں لگائی جاتی! بہت سے لوگ جسم کے ہر نظام کی بہتر کارکردگی کے لیے بولتے رہنے کو فرض قرار دے بیٹھے ہیں! وہ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ آکسیجن پھیپھڑوں میں اُسی وقت جاتی ہے جب ہم کچھ بول رہے ہوتے ہیں!

حکومتی مشینری سے وابستہ شخصیات نے تو شاید طے کرلیا ہے کہ ایسا بولنا ہے کہ سمجھ میں بھی نہ آئے اور آزار بھی دے۔ جب کوئی بات پالیسی بیان قرار دیکر کہی جائے تو سمجھ لیجیے کہ مقصد معاملے کو بیان کرنا نہیں، اُلجھانا ہے تاکہ عوام صرف پریشانی سے دوچار ہوں!

فیض احمد فیض نے کہا تھا ع

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

فیض صاحب تو بولنے کی تحریک و دعوت دیکر چل دیئے، یاروں نے ایک بڑے کے مشورے کو احترام دینے اور اُس پر عمل کرنے کے چکر میں بول بول کر آزاد لبوں کو آزار دینے کا ذریعہ بنالیا! بولتے وقت یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ ڈرون سے داغے جانے والے میزائل کی طرح کتنوں کی دُنیا تباہ کردیں گے۔

بات بات پر قسمیں کھانے والی قوم نے شاید بولنے کے معاملے

!میں خاموش رہنے کی قسم کھا رکھی ہے

انتخابات سر پر ہیں تو بولنے والے بھی ہمارے سَروں پر ناچ رہے ہیں۔ بم ہی نہیں، الفاظ اور جملے بھی پھٹ رہے ہیں اور اِن دھماکوں سے ہونے والی تباہی بھی کچھ کم نہیں۔ بم دھماکوں کا ملبہ تو جیسے تیسے ہٹادیا جاتا ہے، الفاظ اور بیانات کے دھماکوں سے تباہی کے بعد ملبہ ہٹانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاتا ! وزراء کی وقعت یہ رہ گئی ہے کہ کہیں کچھ ہو جائے تو ملزمان کو پکڑنے کی یقین دہانی کرانے کے بجائے فرماتے !ہیں ملزمان پکڑے جانے چاہئیں

پنجاب کے خادم اعلیٰ شہباز شریف نے وفاق المدارس کے طلباء میں لیپ ٹاپ کمپیوٹرز تقسیم کرتے ہوئے فرمایا کہ مُلک کمزور ہونے کے بعد اب بکھرتا اور ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اللہ کرے یہ اندازہ غلط ہو۔ مُلک کے سب سے بڑے صوبے کے اعلیٰ ترین انتظامی منصب پر فائز شخصیت ہی مُلک کے ٹوٹنے کی بات کرے گی تو ہما شُما کو باتوں ہی باتوں میں مُلک کی تِکّہ بوٹی کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ اور شہباز شریف صاحب کو یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وطن کے حوالے سے دِلوں میں وسوسوں اور ذہنوں میں خدشات کی فصل اگانے کے لیے رحمٰن مُلک کیا کم ہیں ! کیا اِس وقت کسی بھی مُلک میں

ایسا وزیر داخلہ ہے جو دہشت گردی کی اطلاع چار پانچ دن پہلے دے؟ اور سانحہ رونما ہو جانے پر پہلے سے مطلع کرنے کا "کریڈٹ" لے؟ ہمارا خیال ہے رحمٰن کو اب "وزیر اطلاعات برائے تباہیات" کا اضافی چارج دینے میں کوئی ہرج نہیں! لوگ صبح کام پر جاتے وقت گاڑی میں ایف ایم ریڈیو سُنتے ہیں تاکہ پتہ چل سکے کہ کن شاہراہوں پر ٹریفک جام ہے اور کہاں سے آسانی سے گزرا جاسکتا ہے۔ اِسی طرح وفاقی وزیر داخلہ کو روزانہ صبح دہشت گردی، قتل و غارت اور بم دھماکوں کے حوالے سے قوم کواپ ڈیٹ کرنا چاہیے!

جمہوری مذاق کی حد .... پانچ سال

کتنی بڑی نعمت ہے اور کس قدر شکر کی بات ہے کہ قدرت نے ہر رات کے مُقدر میں خاتمہ اور اُس کے بعد سویرا لکھا ہے۔ قدرت کے در سے کوئی نامُراد نہیں لوٹتا۔ بخیلی و رزاقی کی بحث رہنے دیجیے۔ پیاسے کو سمندر سے اور کچھ نہ سہی، شبنم تو مِل ہی جاتی ہے! اچھی خاصی خرابی کے بعد تھوڑی بہت اچھائی کے بھی دَرشن ہو ہی جاتے ہیں۔ پاکستان اور پاکستانی بھی اِس کُلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ جس طرح آمریت کی ہر رات جمہوریت کے اُجالے پر منتج ہوتی ہے بالکل اُسی طرح وہ رحیم و کریم ذات جمہور کو ہر جمہوری دور کی اِبتلا سے بھی بچاتی ہے! اللہ کا ایک خاص کرم یہ بھی ہے کہ ہر منتخب حکومت کی ایک میعاد مقرر ہے! دِل کو یقین رہتا ہے کہ

سِتم کی رات ڈھلے گی وہ دِن بھی آئے گا!

جمہوریت کے نام پر مچائے جانے والے اندھیر کے بعد کسی نہ کسی طرح پھر کوئی طالع آزما اُبھرتا ہے اور عوام کے مُرجھائے ہوئے دِل کِھل اُٹھتے ہیں!

اُمید بھی کیا نعمت ہے۔ جب کبھی ہم آمریت سے بیزار ہو اُٹھتے ہیں، جیسے تیسے جمہوریت نصیب ہو ہی جاتی ہے۔ اور جب جمہوریت کے جھنڈے گاڑنے والے عوام کی اُمیدوں کے سینوں میں اپنی بُری نیت کے نیزے اُتارنے لگتے ہیں تب آمریت کے لیے مانگی جانے والی دُعائیں رنگ لے آتی ہیں! کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ جو مُلک کے سیاہ و سفید پر کامل اختیار رکھتے ہیں اُنہیں کس قدر قطعیت کے ساتھ معلوم ہے کہ جمہوریت کو کب کب لانا ہے اور کب اُسے پردہ کرانا ہے!

جمہوریت اور پاکستانیوں کا تعلق خاصا کھٹا میٹھا رہا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اِس میں کھٹے کی مِقدار اِتنی زیادہ ہے کہ میٹھے کو تو لوگ بُھول بھال گئے ہیں! اِس تعلق کو برسوں، بلکہ عشروں قبل مُلکہ ترنّم نورجہاں نے اپنے ایک گیت میں یوں بیان کیا تھا

نہ مہرباں، نہ اجنبی، نہ دوستی، نہ دُشمنی

نہ جانے پھر بھی کیوں ہمیں اُسی کا انتظار ہے!

جب گڑبڑ بڑھ جاتی ہے تو کچھ لوگ تحریک چلانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ معاملات دُرست ہو جائیں، سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلنے لگے۔ مگر جب معاملات دُرست ہونے لگتے ہیں تو پھر ایک تحریک چلتی ہے! بیشتر بڑے اداروں میں آئی ٹی کے شعبے سے وابستہ افراد سال ڈیڑھ سال کوئی نیا سسٹم متعارف کراتے ہیں۔ یعنی

جب بھی لوگ کسی سسٹم کے عادی ہو جاتے ہیں تو اُسے بدلنے کا وقت آ جاتا ہے! آئی ٹی والے اِسی طور اپنی نوکری بچاتے ہیں کیونکہ کوئی ایک سسٹم ڈھنگ سے چلتا رہے تو اُنہیں کون پوچھے گا! اب اِس اُصول کا اطلاق مُلک پر بھی کر دیا گیا ہے!

پاکستان کو ہم نے اللہ کے نظام کے تحت چلانے کا وعدہ کیا تھا مگر اِس وعدے کو بھول بیٹھے۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اب تک کوئی نظام طے نہیں ہو سکا۔ جمہوریت اور آمریت اِس مُلک کو گدھا سمجھ کر باری باری سواری کرتے ہیں، قربانی کا بکرا سمجھ کر ذبح کرتے ہیں اور باپ دادا کی جاگیر سمجھ کر کھا پی جاتے ہیں! نظام کو بدلنے کی بڑھک مارنے والے موقع ملتے ہی نظام کا حصہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ عوام کے حقوق کی بات کرنے والے طاقت پا کر فِسطائیت کی بدترین شکل میں سامنے آتے ہیں! جو لوگ جاگیر داری کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی بات کرتے ہیں ذرا سا اختیار ملنے پر وہ خود جاگیر دار بن بیٹھتے ہیں!

جو بھی نمک کی کان میں پہنچا، نمک ہوا!

آمریت کے سوا آٹھ سالہ دور میں جمہوریت کا راگ الاپتے رہنے والے جب اقتدار میں آئے تو لوگوں کی آنکھوں میں اُمید کی چمک ایک بار پھر پیدا ہوئی۔ یقین

سا تھا کہ تمام معاملات دُرست ہو جائیں گے، سارے پَرنالے اپنے اپنے حقیقی مقام پر بہنے لگیں گے۔ مگر اِس بار بھی اُمیدیں بار آور ثابت نہ ہو سکیں۔

!اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ

پانچ برسوں میں لوگوں نے قدم قدم پر (اب تک کی) آخری آمریت کو یاد کیا ہے! اور کیوں نہ کریں؟ عوام نے جن سے بہتری کی آس لگائی وہ مزید خرابیاں پیدا کرنے پر تُل گئے۔ قوم چاہتی تھی کہ زخموں پر مرہم رکھا جائے، درد کا علاج ہو۔ مگر ہوا کیا؟

!جنہیں چارہ گر سمجھ لیا گیا تھا وہ مَرض کی شِدت میں اضافے کا باعث بن گئے

کوئی دوا نہ دے سکے، مشورہ دُعا دیا

!چارہ گروں نے اور بھی درد کا دِل بڑھادیا

جمہوریت کے نام پر اِتنے اور ایسے تماشے ہوئے کہ عوام کے لیے ڈھنگ سے صبح کو شام کرنا جُوئے شیر کا لانا ٹھہرا! اُنہوں نے ایک بار پھر دیکھا کہ قومی وسائل کو شیر مادر سمجھ کر کس طرح پیا اور ڈکارا جاتا ہے! سیاست دان کہتے ہیں کہ طالع آزما قومی وسائل کھا جاتے ہیں۔ یہ شِکوہ بھی بجا۔ آمریت میں بھی بہتوں کو کما، کھانے کا موقع ملتا ہے۔ وسائل پر چند لوگوں یا ایک گروہ

کا اختیار ہوتا ہے۔ مگر اُن کے کرتوتوں میں کچھ ترتیب دِکھائی دیتی ہے۔ تھوڑا بہت نظم و ضبط (نظم اُن کا اور ضبط ہمارا!) نظر آتا ہے۔ کچھ نہ کچھ نِشانات تو بچتے ہیں جن کی مدد سے خرابی کی جڑ تک پہنچا جاسکتا ہے۔ جمہوری طالع آزما تو ایسا اندھیر مچاتے ہیں کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا۔ جمہوریت کے علم بردار جب مینڈیٹ کے مطابق تمام اختیارات کے ساتھ خوب کھا پی کر، مُدت پوری کرکے چل دیتے ہیں تو اِدارے اور عوام احتساب کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔ احتساب تو تب ہو جب کچھ اتا پتا معلوم ہو۔

نشاں بھی کوئی نہ چھوڑا کہ دِل کو سمجھائیں
!تری تلاش میں جائیں تو ہم کہاں جائیں

عوام کو پیٹ بھر سبز باغ دِکھانے والے بہت آرام سے ایسے اُڑن چُھو ہو جاتے ہیں کہ ہاتھ آنے کا نام نہیں لیتے۔ جاتے جاتے بھی وہ جمہوریت سے جی بھر کے کِھلواڑ کرتے ہیں۔ اور پھر یہ کہتے ہوئے رختِ سفر باندھتے ہیں۔

!تُو کہاں جائے گی، کچھ اپنا ٹھکانہ کرلے

باری کا نظام بھی کیا خوب تماشا ہے۔ کل تو ہم نے یہ سمجھ کر خوش تھے کہ چلو، باری طے ہو گئی۔ کچھ مُدت کے لیے جمہوریت ہوگی اور پھر طالع آزمائی کا دور چلے گا۔ اب سُنید ہے کہ جمہوریت کے دو بڑوں نے باری طے کرلی ہے! بہتر

زندگی تو کیا گزارنے دیتی، مفاہمت کی سیاست نے عوام کو ڈھنگ سے سانس لینے کے قابل بھی نہ چھوڑا!

اب پھر انتخابات کے نام پر عوام کو قیادت چُننے کی زحمت دی جا رہی ہے۔ بد امنی، مہنگائی اور بے یقینی کی چکّی میں پسنے والے غریب یہ سوچ کر حیران ہیں کہ وہ کسی کو ووٹ دیں یا نہ دیں، اِس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ نظریات اور منشور کی بنیاد پر منتخب ہونے والے کل کو نظام چلتا رکھنے کے نام پر ایک ہو بیٹھیں تو عوام کو کیا ملے گا؟ اگر اقتدار میں آنے والوں کو قومی وسائل بھنبھوڑنے ہی ہیں تو پھر عوام کو بیچ لا کر مزید دُکھی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بھیڑوں کو اپنے آخری لمحات میں کم از کم یہ اطمینان تو ہونا ہی چاہیے کہ بھیڑیوں کے انتخاب کا گناہ اُن سے سرزد نہیں ہوا! قومی خزانے میں دانت گاڑے رہنے والے سیاسی و جمہوری درندے جنگل کا قانون ہی اپنالیں۔ درندوں کے پیٹ بھر جائیں تو اِدھر اُدھر مُنہ نہیں مارتے پھرتے۔ محض از راہِ تفنّن چرندوں کی چیر پھاڑ نہیں کرتے!

سُلگتے نشیمن سے جلتے چمن تک

فراغت کے دستیاب لمحات کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو پاکستان سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ملک ہو۔ لگتا ہے تمام بنیادی اور ثانوی نوعیت کے مسائل حل کئے جا چکے ہیں۔ پاکستانیوں کے پاس اب کرنے کو بظاہر کچھ نہیں اِس لیے گنیز بُک والوں کی آسانی کے لیے عالمی ریکارڈ بنانے پر تُلے ہیں! ایک ساتھ ہزار افراد کے درمیان پنجہ آزمائی کا معاملہ ہو یا پھر ایک منٹ میں زیادہ گیندیں کھیلنے کا قِصہ، پاکستانی آگے آگے ہیں اور گنیز بُک آف ورلڈ ریکارڈز کے حکام پیچھے پیچھے۔ پنجاب حکومت بھی اسٹیڈیم اور دیگر سہولتیں فراہم کرکے بے چارے گنیز بُک والوں کا کام بڑھا رہی ہے!

ایک ریکارڈ گنیز بُک آف ورلڈ ریکارڈز والوں سے چُوک گیا ہے۔ ہم وہ ریکارڈ بنا چکے ہیں اور اب تک خود ہی کو اِس حوالے سے اپنی "عظمت" کا احساس نہیں! بڑے لوگوں کی بڑی باتیں! جو پیدا ہی ریکارڈ قائم کرنے کے لیے ہوئے ہوں وہ بھلا کِس کِس بات کو یاد رکھیں؟

عرض یہ کرنا تھا کہ اپنے ہی وطن کے ٹوٹنے کی بات دَھڑلّے سے کرنے والوں کی

تعداد کے لحاظ سے بھی کوئی مُلک پاکستان سے مقابلہ نہیں کر سکتا! کسی بھی پاکستانی کے مُوڈ پر منحصر ہے کہ جب چاہے، مُلک کے ٹوٹنے کا "مُژدہ" سُنادے!
اِنسان کی فطرت میں کجی ہی کجی ہے۔ اِس کجی کو دور کرنے کے لیے اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار رُسل بھیجے۔ اِن افضل ترین ہستیوں نے اپنے حصّے کا کام پوری دیانت، دیانت اور قطعیت کے ساتھ کیا مگر ہائے رے اِنسان کی حرماں نصیبی! بشر کی جبلّت میں نصب بے عملی کے باعث بہت کچھ ہے جو دُرست ہونے سے رہ گیا ہے! جسے دیکھیے وہ ذاتی مفاد کو ہر شے پر مقدم رکھتا ہے۔ صرف اپنی جان کی فکر ہوتی ہے کہ کہ کسی طرح تیرتا ہوا کنارے تک پہنچ جائے۔ کشتی؟ کشتی جائے دریا کی بھاڑ میں! ہر شخص اِس سوچ کا حامل دکھائی دیتا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے، اُس کے مفادات کو ضرب نہ لگے! بہت سے ایسے ہیں جو اپنی بوٹی کے لیے بکرا ذبح کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے جسے دیکھیے وہ اپنے گھر کو آگ سے بچانے کی تگ و دَو میں مصروف دِکھائی دیتا ہے۔ پوری گلی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوتی ہے تو ہو جائے۔ سبھی معاشرے کا جُز ہیں مگر کُل کے بارے میں بھول کر بھی نہیں سوچتے۔ اِس دُنیا میں ایک بھی اِنسان جزیرہ نہیں۔ معاشرے کے سمندر میں سب کا مُقدّر ایک ہے۔ مگر پھر

!بھی کچھ لوگ ہیں جو خود کو جزیرہ سمجھنے کے معاملے میں ضِد پر اڑے ہیں

احمد آباد کے حزیں قریشی مرحوم نے کیا خوب کہا تھا

سُلگ رہا ہے نشیمن کہ جل رہا ہے چمن

!چلو، قریب سے دیکھیں یہ روشنی کیا ہے

یہ شعر اِنسانی نفسیات کا اچھا عکّاس ہے۔ چمن کی بات ہو تو بے فِکری سے جلنے کا تذکرہ کیجیے، بلکہ خاکستر ہو جان کا امکان بھی بلا خوفِ تردید بیان کر دیجیے۔ اور اپنے نشیمن کا معاملہ ہو تو؟ اول تو کوئی ایسی ویسی بات زبان پر مت لائیے۔ اور اگر چمن کے جلنے کا امکان ظاہر کر ہی بیٹھیں ہو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے نشیمن کے معاملے میں سُلگنے تک پہنچ کر رُک جائیے! یعنی چمن جلتا ہے تو جلے، نشیمن سُلگنے کی منزل سے آگے نہ بڑھے! اِسی خود غرضی کو غالب نے یوں بیان کیا ہے

!قفس میں مُجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہم دَم

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

بے حِسی کا درجہ کمال مُلاحظہ فرمائیے کہ جو تین چار بھائی ترکے میں باپ سے ملنے والے مکان میں اپنے اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہتے ہوں وہ دن رات لڑتے

جھگڑتے رہنے پر بھی کبھی بُھولے سے مکان کے لیے ٹوٹنے کا لفظ زبان پر نہیں لاتے۔ اور یہی لوگ حالات پر تبصرہ کرتے وقت کمال اطمینان سے مُلک کے ٹوٹنے کی بات کر جاتے ہیں! اُن کی راہ میں احساس رُکاوٹ بنتا ہے نہ خوف۔

کئی بھی اپنے دہی کو کھٹا کہنے کے لیے تیار نہیں۔ معمولی سی یعنی تانگہ پارٹی کے "لیڈر" بھی تقریر فرماتے ہیں تو بات فتح سے شروع ہو کر فتح پر ختم ہوتی ہے۔ شکست بالکل یقینی اور سامنے کی بات ہو تب بھی وہ اپنی گفتگو میں شکست کا معمولی سا خدشہ بھی شامل نہیں ہونے دیتے۔ کِسی ایک حلقے سے ہارنے کا امکان بھی کبھی اُن کی زبان پر نہیں آتا۔ ہاں، مُلک کا ذکر آئے تو طبیعت کی جولانی ملاحظہ فرمائیے۔ قومی سلامتی کو لاحق خطرات سے شروع ہونے والی بات دیکھتے ہی دیکھتے خانہ جنگی کے مرحلے سے ہوتی ہوئی مُلک کی شکست و ریخت تک جا پہنچتی ہے!

حکمرانوں نے طے کرلیا ہے کہ جب بھی حالات قابو میں نہ آ رہے ہوں اور شر پسندوں کو کنٹرول کرنا ممکن نہ رہے تو ڈبل سواری پر پابندی لگادی جائے تاکہ دِل کو کچھ تسلّی ہو جائے۔ اِسی طور عوام و خواص دونوں کا حال یہ ہے کہ حالات پر بحث کے دوران جب کوئی کام کی بات نہ سُوجھ رہی ہو اور گفتگو کو کِسی انجام تک پہنچانا مشکل ثابت ہو رہا ہو تو جھٹ سے ملک کی بقاء پر سوالیہ

نشان لگا دیتے ہیں!

تحریک منہاج القرآن کے سربراہ ڈاکٹر طاہر القادری پانچ سال کے بعد جب گزشتہ دسمبر میں کینیڈا سے پاکستان آئے تھے تب بھی اُنھوں نے خاصا ہنگامہ برپا کیا تھا۔ بظاہر کسی جواز کے بغیر اور نامعلوم مقاصد کے لیے کیا جانے والا لانگ مارچ اور دھرنا لوگ اب تک نہیں بھولے۔ پھر وہ کینیڈا چلے گئے۔ اور اب پھر واپس آئے ہیں تو میڈیا سے گفتگو میں فرمایا ہے کہ اگر انتخابات پُرانے نظام کے تحت ہوئے تو مُلک ٹوٹ بھی سکتا ہے! مُلک نہ ہوا، موم کی ناک ہوگیا کہ جس طرف چاہو موڑ دو! اگر پُرانے نظام میں ایسی ہی خامیاں تھیں تو اُس کے تحت انتخابات کے بعد بھی ملک اب تک کیوں سلامت ہے؟ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے جب کچھ بھی نہ سُوجھتا ہو تو جھٹ سے کہہ دیجیے کہ مُلک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ یہ جُملہ سُنتے ہی لوگ سہم جائیں گے اور آپ کو یوں احترام سے دیکھیں گے جیسے آپ اِنسان نہ ہوں، "بابا" ہوں! اچھی خاصی گفتگو کا رُخ قومی سلامتی کو لاحق خطرات کی طرف موڑ دیجیے اور پھر دیکھیے کہ آپ کی باتوں کا رنگ کِس طرح جمتا ہے!

جو کچھ دِل میں ہو وہی زبان پر آتا ہے۔ جن کے دِل میں وطن کی محبت ہو وہ

کبھی بھول کر بھی نہیں کہتے کہ مُلک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے، خانہ جنگی ہوا چاہتی ہے، مُلک شکست و ریخت کے مرحلے سے گزر سکتا ہے۔ یہ تمام باتیں کمال بے باکی کے ساتھ، دَھڑلّے سے وہی لوگ اپنی زبان پر لا سکتے ہیں جنہیں صرف اپنا مفاد عزیز ہو اور ملک کے اندر "محفوظ جنت" قائم کر چکے ہوں۔ یا پھر وہ جو اپنی اولاد سے املاک تک سبھی کچھ مُلک سے باہر پہنچا کر سُکون سے بیٹھے ہوں۔ مُلک کا جو بھی حال ہو، اُنہیں کیا فرق پڑتا ہے؟

گاجر کا سالن، مُرغی کا حلوہ

کِس کو کیسا "کمال" ملنا چاہیے، یہ فیصلہ اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ بعض بچے ڈرائنگ میں کچھ ایسا "یدِطولیٰ" رکھتے ہیں کہ کیلا بنائیں تو ڈھول کا گمان گزرتا ہے! پتیلی بنانے بیٹھیں تو اجمیر شریف کی درگاہ پر نصب بڑی دیگ کے درشن ہو جاتے ہیں! اور ایسے بچے اگر کوئی فطری منظر پیش کرنا چاہیں تو لگتا ہے کہ کائنات کا نظام اُلٹ پلٹ گیا ہے! اسکول کے زمانے میں ہماری ڈرائنگ کا بھی ایسا ہی حال تھا۔ ہم سوچتے کچھ تھے، بناتے کچھ تھے، بنتا کچھ تھا اور لوگوں کی سمجھ میں آتا کچھ اور تھا۔ ایک صاحب نے خاصا زور دیکر ہمیں اِس مشق سے دور کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تجریدی آرٹ کی دُنیا میں نام رکھتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اُن کا ہمسر ہو! ویسے ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ سوچیں کچھ، بنائیں کچھ، بنے کچھ اور سمجھ میں آئے کچھ والی کیفیت ڈرائنگ سے نکل کر اب ہمارے کالموں میں در آئی ہے! ہم لکھتے کچھ ہیں اور پڑھنے والے سمجھتے کچھ ہیں۔ یوں بھرم رہ جاتا ہے!

فی زمانہ لڑکیاں بھی امور خانہ داری میں کچھ ایسی "مہارت" رکھتی ہیں کہ لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ گھر داری کے معاملے میں وہ کرتی کچھ ہیں اور دِکھائی کچھ

دیتا ہے۔ اور اگر سمجھ میں آ جائے تو سمجھ لیجیے کہ سمجھنے والا تو گیا کام سے ! ایک نئی نویلی دلہن نے پہلی بار کھانا پکایا۔ شام کو شوہر گھر آیا تو بولی۔ "آج میں نے مُرغی کا سالن اور گاجر کا حلوہ پکایا ہے۔" اِتنا کہہ کر اُس نے دونوں چیزیں ڈِش میں ڈال کر شوہر کے سامنے رکھ دیں۔ شوہر نے کھانوں پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ "یہ تو بتاؤ اِن میں گاجر کا حلوہ کون سا ہے !" کمال دیکھا آپ نے نئی نویلی دُلہن کا؟

دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی!

ٹی وی پر کوکنگ شو دیکھ کر جو تجربات کئے جاتے ہیں اُن کی بدولت لوگوں کو دستر خوان پر کئی برِاعظم ایک دوسرے میں خلط ملط دکھائی دیتے ہیں!

اگر کبھی ایسا ہو کہ کِسی گھر کے لوگ اچانک شور مچاتے، توبہ کرتے نِکل بھاگیں تو زیادہ حیران نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دِن پہلے اُس گھر میں شادی ہوئی ہو اور نئی دلہن نے پہلی بار کھانا پکایا ہو! سُسرال والے دُلہن کو تو کچھ دنوں میں سمجھ لیتے ہیں مگر اُس کے پکائے ہوئے کو سمجھنے میں خاصا وقت لیتے ہیں!

بچیاں چھوٹی عمر میں کارٹون اور تھوڑی بڑی عمر سے ڈرامے دیکھتی آ رہی ہوں تو

یہی ہوگا۔ اگر تعلیم کے ساتھ تربیت کے بجائے محض "طربیت" کا دُم چھلّا لگا ہو تو زندگی کے ہر معاملے میں سالن کی بکری اور اور حلوے کا شیر ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہوئے ملیں گے!

بات گھر چلانے والیوں کی ہو یا مُلک چلانے والوں کی، قدرت کے اُصول سب پر ایک ہی انداز سے اطلاق پذیر ہوتے ہیں۔ جو لوگ پیدا ہی ملک کے معاملات چلانے کے لیے ہوئے ہیں اُنہیں اگر چھوٹی عمر سے بہتر تعلیم و تربیت نہیں ملے گی اور بیشتر وقت کھیل تماشوں میں گزرے گا تو عمل کی دُنیا میں آ کر وہ کھیل تماشے ہی کریں گے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کھیل سیاست دانوں کا ہوتا ہے اور تماشے کا کردار ملک و قوم کو ادا کرنا پڑتا ہے!

عوام جنہیں ملک کے بہتر نظم و نسق کے لیے منتخب کرتے ہیں اُن کی بھی ڈرائنگ بہت کمزور ہے۔ بے چارے بناتے کچھ ہیں اور بن کچھ جاتا ہے! نیت تو بہبودِ عامہ کے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ہوتی ہے مگر ہائے رے ہماری حرماں نصیبی کہ یہ منصوبے چند قدم چل کر ہانپنے لگتے ہیں اور ذاتی مفاد کی منزل پر دم توڑ دیتے ہیں! جنہیں عوام بہ رضا و رغبت اپنی خدمت پر مامور کرتے ہیں وہ کام شروع تو "کارروائی" کی نیت سے کرتے ہیں مگر نا اہلی کے ہاتھوں پہنچ جاتا ہے "واردات" کی منزل تک!

ہم جنہیں بہت چاؤ سے اور ڈھیر سارے ارمانوں کے ساتھ منتخب کرکے ایوانوں میں بھیجتے ہیں وہ عمل کی دنیا میں نئ نویلی دلہن کی سی ذہنیت کے حامل ثابت ہوتے ہیں۔ وہ رات دن ایک کرکے مُرغی کا سالن اور گاجر کا حلوہ بناکر بہت پیار سے عوام کے سامنے رکھتے ہیں مگر بُھوک کی شِدت کے ہاتھوں حواس سے بیگانے عوام سالن اور حلوے کا فرق سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے ! اور یوں نا اہلی اور بدنیتی کا الزام "منتخب ڈُلہنوں پر عائد کردیا جاتا ہے!

اب پھر جمہور اور جمہوریت کے نکاح کی تجدید کا وقت آیا ہے۔ رسمیں ادا کی جارہی ہیں۔ اللہ کرے کہ اِس بار لوگوں کو ڈھنگ کی ڈِشیں ملیں۔ ایسا نہ ہو کہ ایوان میں پہنچنے والے نئے نویلے ارکان اختیارات کے چولہے پر صوابدیدی پتیلی میں قومی وسائل کا چکن قورمہ پکاکر چٹ کر جائیں اور عوام دیکھتے ہی رہ جائیں!

عوام کی سمجھ کی بھی ہمیں تو سمجھ نہیں آتی۔ جمہوریت کا لبادہ اوڑھ کر آنے والے نئ سیاسی ڈِشیں تیار کرتے ہیں تو اُنہیں سراہنے کے بجائے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے قصوروار تو عوام ہوئے نا جو نئ نویلی

حکومت کی تیار کی ہوئی ڈِشوں کو سمجھ ہی نہیں پاتے۔ یہی دیکھیے کہ حال ہی میں سابق ہونے والی حکومت نے مفاہمت کی سیاست کے ذریعے شیر اور بکری کا ایک گھاٹ پر پانی پینا ممکن بنایا تو لوگ مخالفت اور تنقید پر تُل گئے! حکومت اور اپوزیشن نے بیشتر معاملات میں اتفاق رائے کو یقینی بنایا تو اہل وطن نے نُک مُکا کا شور مچا کر آسمان سر پر اُٹھالیا۔ اب لوگ الزام لگاتے پھر رہے ہیں کہ حکومت نے جاتے جاتے اپنا پیٹ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ بات پھر وہی آگئی کہ لوگ سالن کو حلوہ سمجھ بیٹھے ہیں! قصہ یہ ہے کہ لوگوں کو خوب فیض پہنچانا تھا اور ساتھ میں کچھ اپنا بھلا بھی کرنا تھا۔ تحلیل ہوتی ہوئی اسمبلیوں کے ارکان نے اپنے لیے "چند" فوائد یقینی بنائے۔ اور عوام کے لیے پاک ایران گیس پائپ لائن جیسے عظیم منصوبے کا سنگِ بنیاد رکھ دیا! لوگ بہت طنز کیا کرتے تھے کہ صدر صاحب ہر منصوبے کا سنگِ بنیاد ایوان صدر یا کسی گورنر ہاؤس میں رکھتے ہیں اور افتتاح بھی وہیں کرتے ہیں۔ اِس بار وہ ایران تشریف لے گئے اور سنگِ بنیاد رکھتے وقت سائٹ پر بہ نفس نفیس موجود تھے!

حکومت کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتے وقت لوگوں کو وہی کچھ کرنا چاہیے جو رشتہ طے کرنے کے معاملے میں کیا جاتا ہے۔ رشتے کے معاملے میں دیکھا جاتا ہے کہ لڑکی امور خانہ داری میں ماہر ہو۔ نمائندے منتخب کرنے کے معاملے میں یہی بات پیش نظر رہنی چاہیے۔ ملک کو بدلنا ہے تو قوم کو اپنا ووٹ کا حق بہت

سوچ سمجھ کر استعمال کرنا ہوگا۔ کوشش ہونی چاہیے کہ ایسے لوگ منتخب ہوں جن کے
تیار کئے ہوئے منصوبے اور کئے ہوئے اقدامات سمجھ میں آئیں۔ یعنی عوام کو اُن سے
یہ نہ پوچھنا پڑے کہ مُرغی کا سالن کون سا ہے اور گاجر کا حلوہ کون سا ہے!

نسوار کی بھی کچھ عزت ہوتی ہے

رحمٰن ملک، منظور وسان، غلام احمد بلور اور رانا ثناء اللہ خان کی طرح نواب اسلم رئیسانی کا دم بھی غنیمت ہے کہ جب وہ لب کُشا ہوتے ہیں تو قوم کچھ ہنس لیتی ہے اور ہم کچھ لکھ لیتے ہیں! اللہ اُنہیں اور اُن کے فارمولوں کو سلامت رکھے۔ ڈگری کے معاملے میں آفاقی حقیقت کو فارمولے کا درجہ دیکر اُنہوں نے گویا قلم توڑ دیا تھا! مگر خیر، ہٹ دھرمی کی انتہا یہ ہے کہ قلم توڑنے کے بعد بھی اسلم رئیسانی نے فارمولے دینا جاری رکھا! معاشرے میں جن کی برائے نام عزت نہیں ہوتی وہ بھی بلوچستان کے سابق وزیر اعلیٰ کے فرمودات سے بہت خوش تھے کیونکہ اسلم رئیسانی کے فارمولے کے مطابق عزت عزت ہوتی ہے چاہے ہو، چاہے نہ ہو!

نواب اسلم رئیسانی پانچ سالہ دور اِس طرح گزارا کہ اُن کی حکومت کے دامن پر کوئی داغ نہ لگ سکا۔ لگتا بھی کیسے؟ حکومت کہیں ہوتی تو داغوں کی لپیٹ میں بھی آتی! آپ سوچیں گے جب حکومت تھی ہی نہیں تو اسلم رئیسانی پانچ سال کیا کرتے رہے؟ سیدھی سی بات ہے۔ حکومت حکومت ہوتی ہے، چاہے ہو چاہے نہ ہو!

اسلم رئیسانی نے پانچ برس اُسی طرح گزارے جس طرح اُن کی حکومت نے گزارے۔ بلوچستان میں بدامنی تھی، قتل و غارت تھی، دھماکے تھے، اغواء کی وارداتیں

تھیں۔ سب کچھ تھا، ریاست کی عملداری نہیں تھی۔ یہی حال حکومت کا تھا۔ وہ خود صوبے میں نہیں تھی ! کابینہ اسلام آباد میں سکونت پذیر رہتی تھی اور وزیراعلیٰ رئیسانی کا ایک پیر کراچی میں ہوتا تھا اور دوسرا اسلام آباد میں۔ جب وزیراعلیٰ اوران کی کابینہ ہی کو بلوچستان کے دارالحکومت میں رہنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی تو حکومت کی عملداری وہاں کیونکر دِکھائی دیتی؟

ایک بات کی داد تو دینی پڑے گی۔ جب نام نہاد حکومت تھی تب اوراب کے اسلم رئیسانی میں کچھ بھی فرق نہیں۔ بلوچستان کے نگراں وزیراعلیٰ نواب غوث بخش باروزئی کی تقریب حلف۔برداری کے موقع پر گورنر ہاؤس (کوئٹہ) میں میڈیا سے گفتگو کے دوران اسلم رئیسانی نے شگفتہ مزاجی کا خوب مظاہرہ کیا۔ ہم نے قوسین میں کوئٹہ اِس لیے لکھا ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ تقریب اسلام آباد میں رکھی گئ تھی ! میڈیا سے گفتگو میں اسلم رئیسانی نے کہا کہ سیاست میں آنے سے بہتر نسوار بیچنا ہے !

بلوچستان کے سابق وزیراعلیٰ کا دعوی ہے کہ اُنھوں نے پانچ سال تک عوام کی خدمت کی۔ شکوہ یہ ہے کہ جو لوگ پانچ سالہ اقتدار کے دوران اُن کے ساتھ بیٹھ کر پکوڑے کھاتے رہے وہ مُشکل گھڑی میں (یعنی حکومت پر "شب خون" مارے

جانے پر) اُن کی فون کال بھی اٹینڈ نہیں کرتے تھے ! ساتھ ہی اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ پیپلز پارٹی نے اُن کی رکنیت پانچ ماہ قبل معطل کر دی تھی۔ اب وہ آزاد ہیں۔ چاہیں تو سیاست میں رہیں اور چاہیں تو نسوار بیچیں !

اسلم رئیسانی کی شگفتہ مزاجی اپنی جگہ، حقیقت یہ ہے کہ سیاست اور نسوار کا کوئی جوڑ نہیں۔ نسوار غریب محنت کشوں کا من پسند شغل ہے۔ مختلف ورائٹی میں دستیاب نسوار بہت محنت سے تیار کی جاتی ہے۔ نسوار کی تیاری کا عمل سیاست کی طرح ہڈ حرامی سے عبارت نہیں۔ نسوار تیار کرنے والے بھی محنت کش اور نسوار خرید کر داڑھ میں اُڑسنے والے بھی محنت کش۔ دوسری طرف اہل سیاست ہیں جن کی زندگی میں محنت اور حلال خوری نام کی کوئی چیز شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے۔ ہاں، نشا دونوں میں قدر مشترک ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نسوار کا نشا بار بار ری چارجنگ کا تقاضا کرتا رہتا ہے جبکہ سیاست کا نشا وہ ہے کہ اُتارے نہیں اُترتا۔ ایک بار چڑھ گیا تو گیا بندہ کام سے۔

سیاست ترک کرنے کا ارادہ لاکھ نیک سہی مگر ترجیحی شعبے کا ذکر کرتے وقت نسوار سازی کا ذکر کرنا درست نہیں۔ نسوار تیار کرنا اور بیچنا تو محنت طلب کام ہے۔ سیاست سے نکل کر کئی ایسے شعبے اپنائے جا سکتے ہیں جن میں سیاسی ذہنیت اور تربیت بہت کام آ سکتی ہے۔ بالخصوص خالص جرائم کے شعبے میں ! اور اب

تو یہ دونوں شعبے آپس میں ایسے گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ فرق کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

طاقت کی مثلث میں دونوں معاون زاویے ہیں۔

فنڈنگ ” اللہ کی طرف سے ہو تو اچھا“

اقوام متحدہ کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو اسلامی دُنیا کے پس ماندہ مُلک سُوڈان بھیجا گیا۔ مقصود صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ شدید پس ماندگی کے عالم میں اہل سُوڈان کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے۔ اُن نے یومیہ تجارت پیشہ، اُجرت پانے والے اور تنخواہ دار سُوڈانیوں سے پوچھا گزارا کیسے ہوتا ہے۔ جواب ملا مہنگائی زیادہ ہے، تنخواہ، اُجرت یا کسی اور شکل میں ملنے والی آمدن تو تیسرے ہفتے ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔ اقوام متحدہ کے عہدیدار نے پوچھا پھر باقی سات آٹھ دن گزارا کیسے ہوتا ہے؟ جواب آیا اللہ کریم! ہر طرف سے یہی جواب پایا تو اُس عہدیدار نے اپنے افسران بالا کو لکھا۔ ”سُوڈان میں بہت غربت ہے۔ لوگ اپنی آمدن میں بمشکل تین ہفتے گزارا کر پاتے ہیں۔ کوئی ’اللہ کریم‘ ہے جو مہینے کے آخری عشرے میں سب کے لیے ’فنڈنگ‘ کا اہتمام کرتا ہے!“

جو لوگ اللہ کریم سے لَو لگاتے ہیں اور اُنھی سے کرم کی بھیک مانگتے رہتے ہیں وہ یونہی برکت پایا کرتے ہیں۔ یعنی گزارا مشکل ہو تب بھی شُکر گزار رہتے ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ جہان بھر کی نعمتیں پا کر بھی اللہ کے شُکر گزار بندوں میں شمولیت کا اعزاز پانے کی کوشش تک نہیں کرتے۔

جن چند محاوروں کو پاکستانیوں نے اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دیا ہے اُن میں
چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا" بھی شامل ہے، بلکہ نُمایاں ہے۔ چادر دیکھے بغیر پاؤں"
پھیلانے کی روش پر گامزن رہنے ہی کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ اب ہم ساری دُنیا کے
سامنے جھولی پسارے رہتے ہیں۔

اللہ کریم سے آس لگانے والوں کو تھوڑے میں بھی بہت ملتا ہے۔ وہ کم کھا کر بھی
سیری کا احساس پاتے اور اللہ کا شُکر بجا لاتے ہیں۔ اور جنہیں شُکر ادا کرنے کے آداب
سِکھائے ہی نہ گئے ہوں وہ جتنا کھاتے ہیں اُس کا دُگنا یا تِگنا کچرے کے ڈھیر پر پھینک کر
!اللہ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں

کِسی بھی گھر میں کِتنا پکنا چاہیے؟ ظاہر ہے اُتنا جتنا اُس گھر کے لوگ کھاتے ہیں۔ بھارت
زیادہ دور نہیں، ہمارے پڑوس میں ہے۔ وہاں آج بھی بُھوسی ٹکڑے والے خال خال
دِکھائی دیتے ہیں۔ گھر والوں کو جتنی روٹیاں درکار ہوں اُتنی، بلکہ اُس سے ایک دو کم ہی
پکائی جاتی ہیں۔ جب روٹی بچے گی ہی نہیں تو پھینکنے یا بیچنے تک نوبت کیسے پہنچے گی؟
سُوڈانی عقل مند ہیں کہ تین ہفتوں میں کمائی ختم ہونے پر معاملہ اللہ کے

حوالے کر دیتے ہیں۔ اور جب معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہو تو خرابی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ جو تنخواہ ابھی ہاتھ میں نہ آئی ہو یا بینک اکاؤنٹ میں نہ پہنچی ہو اُسے دَھڑلّے سے خرچ کر بیٹھتے ہیں! مہمان آ جائیں اور گھر میں کچھ زیادہ سامان نہ ہو تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ گلی کا دُکاندار حاضر ہے، جی بھر کے اُدھار لیجیے۔ تنخواہ آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ اور پُوری تنخواہ بھی اُدھار چُکانے میں کَھپ جائے تو کوئی غم نہیں۔ نیا مہینہ اور نیا اُدھار! تنخواہ جب آئے گی تب آئے گی، دُکاندار کہیں بھاگا تھوڑی جا رہا ہے! وہ اُدھار کی گنگا بہاتے رہنے پر آمادہ ہے۔ آپ اشنان فرماتے رہیے

بُری یا بھلی سب گزر جائے گی
یہ کشتی یونہی پار اُتر جائے گی!

لُطف اِس بات کا نہیں کہ اُدھار پر زندگی بسر ہو رہی ہے بلکہ لطیفہ یہ ہے کہ جی بھر کے اُدھار کھاتے پیتے رہنے کے باوجود خوش گمانی یہ ہے کہ "ہم ہیں پاکستانی، ہم تو جیتیں گے!" ہر محاذ پر شکست سے دوچار ہو کر، مُردوں کی طرح جیئے جانے پر بھی خوش فہمی یہ ہے کہ ہم زندہ قوم ہیں، پائندہ قوم ہیں! ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی سے نشر ہونے والے ملّی نغموں نے ایسا فُسوں پھونکا ہے کہ ہَما شُما کی تو اوقات کیا، ہم امریکا کو بھی پیروں تلے روندنے کا

عزم رکھتے ہیں! عمل چاہے دو ٹکے کا نہ ہو، خوش فہمی اور خوش خیالی کی دُنیا آباد ہے! دُنیا ہے کہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور ہم اپنی پس ماندگی کی مارکیٹنگ پر تُلے ہوئے ہیں!

زندگی بھر اُدھار کے سہارے "اِک گونہ بے خودی" کا اہتمام کرنے والے مرزا غالب نے کہا تھا ع

زندگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن!

غالب کی فاقہ مستی رنگ لاکر رہی۔ قدرت نے ہمیں بھی استثنٰی نہیں دیا۔ ہماری فاقہ مستی بھی رنگ لاچکی ہے۔ اور رنگ بھی ایسا پکّا کہ چُھٹائے نہ چُھٹے! ایک دُنیا ہے کہ دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہی ہے۔ پاکستانی قوم کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ معاشرے میں ہر طرف خرابیاں ہیں اور اِن خرابیوں کے تدارک پر غور کرنے کے بجائے لوگ اِن سے محظوظ ہو رہے ہیں!

روز مرہ اعمال اور معاشی تگ و دَو کے صِلے میں برکت مانگنے کے بجائے لوگ چیل کوّوں کی طرح پنجہ مار کر سب کچھ ہوس کی چونچ میں دبوچ لینے پر کمربستہ ہیں۔ رات دن حرام کھانے والوں کی شامتِ اعمال دیکھ کر بھی کوئی سبق سیکھنے کو تیار نہیں۔ حرام اور حلال کا فرق سمجھنے اور نتائج دیکھنے کے

باوجود لوگ حرام کو گلے لگانے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ تماشا یہ ہے کہ لوگ حلال کی طرف جانے سے صاف گریز کر رہے ہیں اور جب اُلٹے سیدھے ذرائع سے بہت کچھ جمع ہو جاتا ہے تو اُسے اللہ کا فضل قرار دینے پر تُل جاتے ہیں! دیدہ دِلیری کی انتہا یہ ہے کہ ناجائز ذرائع سے کمانے والے بھی جب تین چار منزلہ عمارت کھڑی کرتے ہیں تو اُس کی پیشانی پر "ہٰذا مِن فَضلِ رَبّی" لکھوا کر اپنی بد اعمالیاں اللہ کریم کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں! یہ سب دیکھ کر اللہ کریم کے جلال کا کیا عالم ہوتا ہوگا، اِس کا اندازہ ہم سب بخوبی لگا سکتے ہیں!

اے کاش ہم سُوڈان اور دیگر پس ماندہ مسلم ممالک کے لوگوں سے کچھ سیکھیں۔ وسائل کی کمی کو اللہ کی برکت سے پورا کرنا ہی دانش کا تقاضا ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی ادارے بھی ہمارا پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اِس کے جواب میں وہ ہم سے غیرت، حمیت، اخلاص، وطن دوستی، فیصلہ کرنے کی صلاحیت .... سبھی کچھ لے اُڑتے ہیں! جب معاملات اللہ کے حوالے کئے جاتے ہیں تو جواب میں کوئی conditionality اطلاق پذیر نہیں ہوتی۔ اللہ کریم ہر حال میں ہمارا بھلا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے کرم کے عوض ایسی کوئی شرط عائد نہیں کرتے جس کی تعمیل میں ہمیں اپنی غیرت

اور حمیت سے محروم ہونا پڑے یا ہمارے وجود کی سرحد تبدیل ہو۔ ضرورت پڑنے پر فنڈنگ کسی سے بھی کرائی جاسکتی ہے۔ مگر اللہ کریم کی فنڈنگ میں پوشیدہ شرائط نہیں ہوتیں۔ عالمی بینک ہو، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ یا کوئی اور ادارہ، ضرورت کے وقت فنڈنگ تو کرسکتا ہے مگر کریم نہیں ہوسکتا! جو ہماری ضرورت بھی پوری کرے اور کریم بھی ثابت ہو وہ تو صرف اللہ کی ذات ہے! جو ایک سے نہیں مانگتے وہ سب سے مانگتے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جو ایک دَر کے نہیں ہو پاتے وہ دَر دَر کے ہو رہتے ہیں! رہے نام اللہ کا۔

مینار پاکستان کے آنسو

(کل رات خواب میں دیکھا کہ لاہور کے اقبال پارک میں ایستادہ مینار پاکستان بہت اُداس ہے اور آنسو بس ٹپکنے ہی والے ہیں۔ اُداسی اور افسردگی کا سبب پوچھا تو بھرّائی ہوئی آواز میں بولا کہ وطن اور اہل وطن کو دیکھ دیکھ کر دِل بیٹھا جارہا ہے۔ مینار پاکستان نے دُکھی مَن سے جو کچھ کہا وہ ہم یہاں بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔)

....

میں چھ عشروں سے ایک جگہ کھڑا ہوں مگر اِس دوران مُلک کہیں سے کہیں نکل گیا ہے اور اہل وطن خدا جانے کون کون سے کوچوں کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ میں کہیں جانا بھی چاہوں تو نہیں جاسکتا۔ قراردادِ پاکستان کی نشانی ہوں۔ یہ وہ قرارداد ہے جس پر ہند کے مسلمان ڈٹ گئے تھے، اِس لیے احتراماً میں بھی اب تک ڈٹا ہوا ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ لوگ مجھے بھول گئے ہیں۔ اہل پاکستان کے دِل میں میرا تھوڑا بہت تو احترام ہے۔ اِس کا سب سے بڑا ثبوت میرا اب تک برقرار رہنا ہے ! اگر

عوام کے دِلوں میں میرے لیے پائے جانے والے احترام کا خوف نہ ہوتا تو اختیار رکھنے والے مجھے بھی بیچ کر دُبئی یا ملائیشیا میں ذاتی سرمایہ کاری کر چکے ہوتے!

لوگ میری طرف آتے وقت بہت جوش و جذبہ دکھاتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ اقبال پارک میں داخل ہوتے ہی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اُنھیں یاد نہیں رہتا کہ جس جگہ میں آج بھی گردن اونچی کرکے کھڑا ہوں وہاں برِصغیر کے مسلمانوں نے اللہ کے دین کو عملی شکل دینے کے لیے بھارت کی اکھنڈ سرزمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور پھر اُس ارادے پر ڈٹ گئے۔ یہ اُن کا مُصمّم ارادہ ہی تھا جس نے خواہش کو نتیجہ خیز ثابت کیا۔ مگر افسوس کہ خوابوں کی جنت پاکستان حاصل کرنے کے بعد ارادوں میں مضبوطی، خیالات میں گہرائی و گیرائی اور کردار میں عظمت باقی نہ رہی۔

میری خواہش ہے کہ جو لوگ میری زیارت کو آئیں وہ میرے سینے پر لکھی ہوئی قراردادِ پاکستان پڑھیں، کچھ تحریک پائیں اور مُلک کے لیے کچھ کر گزرنے کے عزم کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کریں۔ یہ بات بھی میرے دِل کو دُکھاتی ہے کہ میرا مسکن یعنی اقبال پارک اب صرف وقت گزارنے کا مقام ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ میں سَر اُٹھائے کھڑا ہوں۔ مگر سچ یہ ہے کہ میرا سَر جُھکا

ہوا ہے۔ کیوں نہ جُھکے؟ اب ایسا کیا ہے کہ فخر سے سَر اُٹھا کر جیوں؟ اہل وطن نے کبھی سوچا ہے کہ بانیان پاکستان کے ارادوں کی بلندی کیا تھی اور وہ کن پستیوں میں جا گرے ہیں!

لوگ میرے دامن میں آ کر وطن اور وطن پرستی دونوں کو بُھلا کر دُنیا بھر کی لغویات کے پہلو نشیں رہتے ہیں۔ کون سا کھیل تماشا ہے جو میرے دامن میں اور میرے پہلو بہ پہلو نہیں ہوتا۔ میرا وجود کیا اب اِس کام کے لیے رہ گیا ہے کہ دُنیا بھر سے چھانٹے ہوئے دعوے میرے سائے میں بڑھک کے سے انداز سے دُہرائے جائیں؟ کیا میرا یہی مصرف ہے کہ لوگ آئیں اور صرف موج میلہ کر کے چلے جائیں؟ اہل وطن کو یاد ہوگا۔ علامہ اقبال نے کہا تھا

زائران کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زم زم کے سوا کچھ بھی نہیں!

میں بھی اہل وطن سے ایسا ہی سوال کرنے پر مجبور ہوں۔ کیا علامہ اقبال سے موسوم اِس پارک کے قلب میں میرا وجود اب صرف اِس لیے ہے کہ لوگ آئیں، کچھ دیر عجیب و غریب قسم کا ہنسی مذاق کریں اور دامن جھاڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیں؟

میں جس جگہ کھڑا ہوں اُسے اقبال پارک سے قبل منٹو پارک کہا جاتا تھا۔ لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ شاید علامہ اقبال سے قبل یہ پارک سعادت حسن منٹو سے موسوم تھا! یہی سبب ہے کہ میرے سائے میں بیٹھ کر اُنھوں نے منٹو کے افسانوں کی زبان میں بولنا اور اُن افسانوں میں بیان کردہ حرکات و سکنات کو اپنانا شروع کر دیا! منٹو کی زبان کو صرف پڑھا جاسکتا ہے، دُہرایا اور اپنایا نہیں جاسکتا!

رہی سہی کسر اہل سیاست نے پوری کر دی ہے۔ جس کسی کو جلسے کے نام پر سیاسی کھیل تماشا کرنا ہو وہ میری طرف دوڑا چلا آتا ہے۔ میرے سامنے، بلکہ میرے سائے میں سیاست دان عوام کو بہلانے پُھسلانے کے لیے ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ میں تو کھڑا رہتا ہوں مگر میرا سَر شرم سے جُھکا رہتا ہے! کاش کوئی میرے سَر کا جُھکنا دیکھ سکے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اِن سبز باغ دِکھانے والوں کو کیسے روکوں؟ کبھی کبھی تو ایسی بڑھکیں ماری جارہی ہوتی ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے اُردو اور گفتار کے اِن غازیوں کی زبان اور دِل میں کُھب کر سیاسی شہادت کو اِن کا نصیب کر ڈالوں! مگر کیا کروں، اہل وطن کی طرح میں بھی دِل کی تمنا دِل ہی میں دَبا کر صبر کے گھونٹ پیتا رہتا ہوں۔

وطن اور اہلِ وطن کا جو حال ہے اُسے دیکھ دیکھ کر کُڑھتا رہتا ہوں اور دِل مَسُوس کر رہ جاتا ہوں۔ کاش ایسا ہو کہ لوگ میرے پاس آئیں اور وطن کے لیے کچھ کر گزرنے کا عزم لے کر جائیں۔ اللہ نے برِ صغیر کے مسلمانوں پر جو احسان کیا تھا اُس کا شُکر ادا کرنے کی توفیق اب تک کسی کو نہیں ہوئی۔

چھ عشرے بیت چکے ہیں مگر اب تک طے نہیں ہو پایا کہ 23 مارچ 1940 کو منظور ہونے والی قرارداد پر عمل کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آنے والے ملک کا کیا کرنا ہے۔ سبھی اِس سے کھیلتے آئے ہیں۔ اور میرے نصیب میں صرف تماشا اور تماشائی بنا رہنا لکھ دیا گیا ہے۔ امن اور بد امنی کے درمیان چوہے بلی کا کھیل جاری رہتا ہے۔ کچھ دِن ڈھنگ سے گزرتے ہیں اور پھر مُلک کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ آج پھر قوم یہ عہد کر رہی ہے کہ اِس سرزمین کے لیے سب کچھ قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔ مگر صاحب! یہ سب تو بس دعوے ہیں، باتیں ہیں۔ اور باتوں سے بھی کبھی کسی کا بھلا ہوا ہے؟ سب کچھ قربان کرنے کی باتیں کرنے والے کچھ نہیں کرتے۔ اور میں کب کہتا ہوں کہ قربانیاں دیجیے؟ سوال مَر مِٹنے کا نہیں، ڈھنگ سے جینے کا ہے۔ میری حسرت ہے کہ لوگ اِس سرزمین کے لیے صرف مَر مِٹنے کا جذبہ نہ رکھیں بلکہ جینے کا حوصلہ بھی پیدا کریں۔

کچھ مُشکلات تو دُشمنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ اور وہ تو فِطری ہیں۔ اُن کا تدارک قوم کو کرنا ہے۔ مگر اُن پریشانیوں کا کیا علاج جو اپنوں کی "عنایت" ہیں؟ اُن سے بھی ہمی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ اچھا ہے کہ دُشمنوں سے نمٹنے سے قبل اپنوں کو مَنا لیا جائے، قومی دھارے میں لے آیا جائے۔ ہاں، جن کی فِطرت یا جبلّت میں شرارت لکھی ہو اُن سے سختی کے ساتھ ہی نمٹا جانا چاہیے۔

سال قبل منظور کی جانے والی قرارداد پر پوری دیانت اور لگن سے عمل ہوتا تو آج 73 مُلک کا یہ حال نہ ہوتا اور میں آزردہ و شرمسار نہ ہوتا۔ رب سے دعا ہے کہ اِس قوم کے ارادے ایسے بلند ہوں کہ میں دیکھوں تو کوتاہ قامتی کا احساس ہو۔ اللہ اِس قوم کو میرے دُکھ دُور کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے

ایک اور عہدِ ستم ختم ہوا۔ ایک عجیب سی کیفیت ہے جو پورے مُلک میں پائی جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اہل وطن اِس کیفیت سے دوچار ہیں یا سرشار! اُنہیں ایک بار پھر حکومت کی تشکیل میں مرکزی کردار ادا کرنے کا بھرپور "چانس" ملا ہے۔ گویا ایک بار پھر چانس کا سودا ہے!

جمہوریت کے شُبھ نام پر تشکیل پانے والی حکومت کی میعاد ختم ہوئی تو فراق گورکھ پوری یاد آئے۔ ایسے ہی موقع کے لیے اُنہوں نے کیا برمحل کہا ہے ع

رُکی رُکی سی شب ہجر ختم پر آئی!

جمہوریت کے نام پر قومی وسائل کی بندر بانٹ کا پنجسالہ منصوبہ ختم ہوا۔ اِس دوران مثال پالیسیوں کے ہاتھوں دِل و دماغ پر جو کچھ گزری عوام اُسے بیان کرنے کے قابل بھی نہیں رہے! کسی ایسے ہی موقع کے لیے میرزا نوشہ نے کہا تھا ع

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

آمریت کے زیر سایا متعارف کرائے جانے والے جمہوری دور میں عوام کرپشن کے ہاتھوں تنگ تھے۔ نام نہاد حقیقی جمہوریت وارد ہوئی تو عوام نے چاہا کہ کرپشن پر قابو پانے کے اقدامات کئے جائیں۔ مگر اقدامات کے نام پر جو کچھ کیا گیا اُس سے معاملہ مزید اُلجھ گیا۔ یعنی

!مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی

جن سے اُمید تھی کہ اختیارات کے بے محابا استعمال سے باز رہیں گے اور اِس بار عوام کو کچھ نہ کچھ ضرور دیں گے اُنھوں نے ایسا اندھیر مچایا کہ راتوں رات سب کچھ اُن کے اختیارات کی حدود میں سمٹ کر رہ گیا۔ لوگ انقلاب چاہتے تھے مگر یہ کیسا انقلاب تھا کہ راتوں رات، چُپکے چُپکے تمام وسائل اقتدار کے ایوانوں کا صدقہ اُتارنے پر صرف ہوگئے! شاید یہی وہ "انقلاب" تھا جس کی رفتار کے بارے میں فراق گورکھ پوری نے کہا تھا ع

!کِتنی آہستہ .... اور کِتنی تیز

نواز شریف کے مینڈیٹ کی بساط لپیٹی گئی تو معاملات بگڑے ضرور مگر ایسے اندوہ ناک تو نہ تھے۔ نائن الیون کے بعد دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر جو کچھ ہوا اُس نے البتہ زیادہ خرابیاں پیدا کریں۔ اِس جنگ کو ہمارے حکمرانوں نے مدعو کیا اور اپنے آنگن میں ٹھہرا لیا۔ اہل وطن کہتے ہی رہ

گئے۔

تُجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو!

مگر صاحب! سُننا جن کا مزاج ہو نہ مینڈیٹ وہ کسی کی ایک نہیں سُنتے۔ پرویز مشرف کے دور میں خرابیاں اِس قدر بڑھیں کہ غُنچوں نے اپنی فریادوں میں بجلی کو پکارنا شروع کر دیا! پھر یہ ہوا کہ آمریت کو، دیر ہی سے سہی، پاؤں چادر دیکھ کر پھیلانے کا خیال آیا! مگر یہ کیا؟

دِن گِنے جاتے تھے جس دِن کے لیے

وہ دِن آیا تو لوگ اماوس کی رات کو یاد کرکے ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے! لوگ حیران تھے کہ کِس جنجال پورے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یا تو دُعا قبول نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو اِس طرح کہ سانس لینا، ڈھنگ سے جینا دُوبھر ہو جاتا ہے! اُستاد قمر جلالوی برمحل کہہ گئے ہیں۔

دُعا بہار کی مانگی تو اِتنے پُھول کِھلے

کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو!

منتخب حکومت پر الزام عائد کیا جارہا ہے کہ اُس نے جاتے جاتے بھی بہتی گنگا میں اشنان کیا اور قومی خزانے کو لُوٹنے میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی

وہ پوری کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی تو کیا ہاتھ آتی، وہ تو صاحب خانہ کے کپڑے بھی لے بھاگا! مگر اِس پر حیرت کیسی؟ پانچ برسوں میں کوئی ایک معاملہ بھی سیدھا رہا ہے؟ تو پھر آخری میں کچھ بھی سیدھا کیوں ہوتا؟

ہوسکتا ہے قصور عوام کا ہو۔ اور ہوسکتا ہے کو چھوڑیے، عوام ہی کا قصور ہے کہ وہ جمہوریت کو ہضم

کرنے کی صلاحیت رکھتے نہیں اور بار بار جمہوری ڈِش مانگ بیٹھتے ہیں! بُھوک لگے تو کچھ نہ کچھ پیٹ میں ضرور ڈالنا چاہیے مگر یہ بھی تو دیکھ لینا چاہیے کہ کیا اور کِتنا کھایا جاسکتا ہے! اب تو ہماری جمہوریت ایسی شکل اختیار کر گئی ہے کہ اُس کے لیے دُعا مانگتے وقت دِل لرزتا بھی رہتا ہے کہ اگر دُعا قبول ہو گئی تو کیا ہوگا! بقول جاذب قریشی

کیوں مانگ رہے ہو کسی بارش کی دُعائیں

!تم اپنے شکستہ در و دیوار تو دیکھو

جمہوری حکومت کی میعاد ختم ہوئی۔ اب نئی میعاد کے لیے حکومت تشکیل دینے کی تیاریاں ہیں۔ سیاسی جماعتیں انتخابی معرکہ آرائی کے لیے پر تول رہی ہیں۔ نگراں سیٹ اپ کا مرحلہ خدا ہی جانے کِتنی سودے بازیوں کے بعد طے ہوا ہے! اب

ذرا سوچیے کہ دو ماہ کے سیٹ اپ کے لیے اِتنی سودے بازیاں ہو رہی ہیں توآئندہ پانچ برسوں تک ٹکٹ پر راج کرنے کے لیے کتنے توڑ جوڑ ہو رہے ہوں گے، کتنی سودے بازیاں کی جارہی ہوں گی!

انتخابات کے شیڈول کا اعلان ہوچکا ہے۔ ٹکٹوں کی تقسیم کا میلہ بھی سج گیا۔ پارٹی بدلنے کا مقابلہ بھی زور و شور سے جاری ہے۔ سب اپنے طور پر ہوا کا رُخ دیکھ کر زیادہ مضبوط پارٹی کی بس میں سوار ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے ٹی وی چینلز کو بہت جلد چارٹ یا اسکور بورڈ متعارف کرانا پڑے گا تاکہ عوام کو یومیہ بنیاد پر معلوم ہوسکے کہ کون کسی پارٹی میں ہے!

جلسوں کی بہار ہے۔ وہی چہرے ہیں جو ہر جلسے میں دِکھائی دیتے ہیں۔اِس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ سیاسی جماعتیں بھی چند چہروں ہی کی بدولت چل رہی ہیں۔ جب سیاست دان صرف جیب بھرنے پر یقین رکھتے ہیں تو عوام کیوں نہ بھریں؟ وہ بھی دیہاڑی کے لیے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ مقررین جو سیاسی کھچڑی پیش کر رہے ہوتے ہیں اُسے بھول کر لوگ جلسہ گاہ کے کونے میں رکھی ہوئی بریانی کی دیگوں پر نظر رکھتے ہیں! جو طمع انسان کو سیاست میں لاتی ہے وہی طمع جلسہ گاہ میں بھی لاتی ہے! فرق صرف شِدّت کا ہے۔

جو کچھ طے کرنا ہے وہ اہل سیاست کرتے ہیں اور عوام صرف تماشائی کے کردار میں خوش رہتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ عوام بھی کچھ طے کریں۔ اور کچھ نہ سہی، اِتنا تو ہو تو کہ اِس بار عوام انتخاب کو احتساب میں تبدیل کردیں! جو لوگ ذرہ بھر حیا کے بغیر قومی خزانہ ڈکارتے رہے ہیں کم از کم اُنہیں تو مسترد کردیا جائے، دُھتکار دیا جائے۔ ایک دوسرے کے کردار اور کرتوت بے لباس کرکے سیاست دانوں نے انتخاب کے معاملے میں ووٹرز کے لیے تھوڑی بہت آسانی کا اہتمام تو کر ہی دیا ہے۔

جمہوریت محض چانس نہیں، امتحان بھی ہے۔ بیلٹ پیپر ضمیر کی آزمائش ہے۔ تعصب کی پست سطح سے بلند ہوکر، نظریات اور اُصولوں کو اپنانا ہی ووٹرز کے لیے بہترین آپشن ہے۔ ووٹ صرف اُسے دیا جائے جو ہر اعتبار سے متعلقہ معیار پر پورا اترتا ہو، قوم کی حقیقی خدمت کا جذبہ اور صلاحیت رکھتے ہوں۔ جمہوریت کے بہت سے تقاضے بھی ہیں۔ محض ووٹ ڈال دینے سے حق ادا نہیں ہو جاتا۔ جمہوریت احتساب بھی چاہتی ہے۔ محض ووٹ ڈالنے سے جمہوریت کے درشن نہیں ہو جایا کرتے۔ اگر جمہور کا معدہ بہتر حالت میں نہ ہو تو جمہوریت بدہضمی کا سبب بھی بن جایا کرتی ہے۔

اِن بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فراز

کچا ترا مکان ہے، کچھ تو خیال کر!

حکمرانوں کے انتخاب میں مرکزی کردار ادا کرنا عوام کے لیے اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب وہ جمہوریت کے محض دیوانے نہ ہوں بلکہ شعور سے بھی کام لیں۔

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے

کے مِصداق جمہوریت کی زُلفوں کا اسیر ہو رہنا کافی نہیں۔ اور میر تقی میر کی طرح عطّار کے لونڈے سے دوا لینے ہی پر اکتفا کرلینا بھی درست نہیں، دوا کا استعمال بھی ناگزیر ہے۔

واعظ کے مُنہ سے آنے لگی بُو شراب کی

سَردی اور دُھند خاصی گھٹ چکی ہے اور سیاست کی گرم بازاری بڑھتی جارہی ہے۔ بہت کچھ واضح ہو جانے کے باوجود ہر طرف بے یقینی، انتشار اور بد حواسی کی دُھند سی چھائی ہوئی ہے۔ جیسے ٹرین شہر سے باہر سگنل پر رُک گئی ہو! قوم کو اپنی باری کا انتظار ہے یعنی ووٹ ڈالنے کے لیے بے تاب ہوئی جاتی ہے۔ انتظار کے لمحات خاصے جاں گُسل ہوتے ہیں۔ جاں نثار اختر نے کہا ہے

ہائے یہ انتظار کے لمحے
جیسے سِگنل پہ رُک گئی ہو ریل!

محسوس یہ ہوتا ہے کہ قوم کی ٹرین منزل سے کچھ دور بے یقینی کے ویرانے میں رُکی ہوئی ہے۔ معاملہ بے یقینی کے ویرانے کا ہے تو جمہوریت کی جمع پونجی کے لُٹ جانے کا خوف بھی بڑھتا جارہا ہے۔ بہت کچھ ہے جو سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آسانی سے سمجھ میں آ جانے والی بات یہ ہے کہ مُلک کی رہبری کے دعویدار نہیں چاہتے کہ لوگ کچھ سمجھیں! شعوری کوشش ہے کہ بد حواسی، بلکہ بے حواسی برقرار رہے۔ یعنی عوام میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا نہ ہو اور اگر یہ صلاحیت موجود ہو تو بروئے

کار نہ لائی جاسکے۔

انتخابات کا زمانہ کیا وارد ہوا، قوم کے لیے تو تماشوں کا اہتمام ہوگیا۔ قدم قدم پر دنگل ہو رہے ہیں۔ اور دنگل بھی نُورا کشتی کے! مفاہمت کی سیاست عجیب رنگ بکھیر رہی ہے اور عجیب تر گل کِھلا رہی ہے۔ رُوٹھنے کا ناٹک رچایا جارہا ہے اور مَنانے کی اداکاری ہو رہی ہے۔ سیاسی جماعتیں یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہی ہیں جیسے وہ ایک دوسرے کو دھوکا دے رہی ہیں۔ اور یہ سب کچھ خاصی بے فکری اور اِس یقین کے ساتھ کیا جارہا ہے کہ قوم تو کچھ سمجھے گی نہیں۔ ہاں، قوم تو جیسے گھاس کھاتی ہے!

نام نہاد جمہوریت کو تسلسل سے ہمکنار رکھنے کے نام پر ہونے والا ہر تماشا دیکھ کر لوگ حیران ہیں۔ جمہوری تماشے کے مرکزی کرداروں نے ایک بڑی کامیابی تو حاصل کرلی۔ قوم واقعی فیصلہ کرنے کی

صلاحیت سے محروم ہوچلی ہے! کوئی اندازہ نہیں لگا پارہا کہ کون کتنا بڑا اداکار ہے! عوام یہ سوچ کر حیران ہیں کہ یہ سارے ڈرامے کیا کیا سین دِکھائیں گے؟ ہر ڈراما درجنوں کہانیاں اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ہر سین میں درجنوں سین اور ہر ایکٹ میں بیسیوں ایکٹ پیوست ہیں! یہ سارے تماشے مل کر کچھ ایسا منظر پیش کر رہے ہیں جیسے پردے پر اُلٹی فلم چل رہی ہو!

کچھ عرصہ قبل "نان اسٹیٹ ایکٹرز" کا غلغلہ بلند ہوا تھا۔ اصطلاح نئی ضرور تھی مگر الفاظ جانے پہچانے تھے۔ بس، ذرا ترتیب بدل گئی تھی۔ ہم پانچ سال سے "اسٹیٹ نان ایکٹرز" کو بھگتتے تو آئے ہیں! اب اسٹیٹ تو پتہ نہیں کِس کونے کُھدرے میں جا چُھپی ہے۔ اور ہمارے سامنے صرف ایکٹرز رہ گئے ہیں! اور اِن میں بھی خاصے بھونڈے قسم کے اوور ایکٹرز زیادہ ہیں!

پاکستان کے عوام نے اپنا سیاسی مُقدّر خاصی محنت کے بعد تراشا ہے۔ جمہوریت کے نام پر شخصیت پرستی کا طوق گلے میں ڈال کر چند چہروں کی غلامی اختیار کرلی گئی ہے! حالات بہتر بنانے کے وعدوں سے بہل جانے کی وباء عام ہے۔ طبیعت زیادہ گھبرائے تو پنجابی فلموں کی معروف و مقبول جُگت اور بڑھک کے چٹخارے والے دعووں سے لُطف اُٹھایئے! ہزار منّتوں، مُرادوں کے نتیجے میں جمہور کی سُلطانی (!) کا زمانہ آتا ہے مگر کوئی بھی نقش کُہن مِٹ نہیں پاتا یعنی جمہور کُش اقدامات کِسی صورت جان نہیں چھوڑتے۔ جمہوریت کے نام پر نازل ہونے والے ایسی مار مارتے ہیں کہ لوگ طالع آزماؤں کی دُہائی دینے لگتے ہیں۔ اور عوام کے بے حد اِصرار پر تشریف لانے والے طالع آزما ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ بے چارے عوام گھبرا کر پھر اُنہی کو یاد کرنے لگتے ہیں جو جمہوریت کا صرف راگ الاپتے ہیں، مفادِ عامہ کے لیے کرتے کچھ نہیں۔ اب کچھ برسوں سے.

!شاید باری طے ہو گئی ہے

جمہوری معاشروں میں ویسے تو سیاست دان عوام سے رابطے میں رہتے ہی ہیں مگر جب انتخابات سر پر ہوتے ہیں تو یہ سلسلہ تیز کر دیا جاتا ہے۔ عوام ووٹ کے ذریعے احتساب کے خواہش مند ہوتے ہیں اور چار یا پانچ سال تک مُلک کا نظام چلانے والے خود کو خوشی خوشی احتساب کے لیے پیش کرتے ہیں۔ (ذرا سوچیے کہ ایسے ماحول میں جمہوریت کا کیا خاک لُطف آتا ہوگا!) ہم شاید کسی اور دُنیا کا جمہوری کلچر رکھتے ہیں۔ یہاں سیاست دان عوام اور اُن کے مفادات کو سَرد خانے میں ڈال کر آپس میں رابطے بڑھاتے ہیں! اچھا ہے، پہلے طے کرلیں کہ قربانی کے بکروں کو کس طرح ذبح کرنا ہے! جن کی شکل دیکھنا گوارا نہ ہو، اُن سے محبت کی پینگیں بڑھائی جاتی ہیں۔

کیسے اُصول؟ کون سے نظریات؟ کہاں کی اقدار؟ مشترکہ مفادات کی سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے! پولنگ کا مرحلہ ابھی دور ہے مگر انتخابی نتائج کے تعین کی کوشش ہو رہی ہے! قوم کی رہبری کے دعویدار ہر معاملے میں صرف اپنے یعنی انفرادی مفاد کو تحفظ دینے کی سوچ رہے ہیں۔ اِن کے مُنہ سے نکلنے والی ہر بات اور اِن کا ہر عمل مفاد پرستی کی چُغلی کھا رہا ہے۔ اِسی کیفیت کو بابائے خُمریات ریاض خیر آبادی نے یوں بیان کیا ہے۔

کم بخت نے شراب کا ذِکر اِس قدر کیا

واعظِ کے مُنہ سے آنے لگی بُو شراب کی!

سیاسی جماعتوں کو انفرادی و "اتحادی" استحکام سے فُرصت ملے تو سوچیں کہ اِس مُلک میں عوام بھی بستے ہیں اور اُن کی بھلائی کے بارے میں بھی سوچنا ہے! مُلک اور قوم کو اتحاد کی اشد ضرورت ہے مگر اتحاد کا میلہ بھی بظاہر مُلک اور قوم کے خلاف ہی سجایا جارہا ہے!

پتہ نہیں قوم کی مشکلات کا تدارک بھی سیاسی جماعتوں کی ترجیحات میں کہیں ہے یا نہیں۔ اور ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے اہلِ سیاست نے کیا طے کیا ہے۔ قوم کو رہنے دینا بھی ہے یا نہیں! سرحدیں جس انداز سے کُھلی ہوئی ہیں اور دُنیا بھر سے لوگ جس قدر آزادی سے مُلک میں آ رہے ہیں اُس سے تو ایسا لگتا ہے جیسے یاروں نے قوم ہی کو replace کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے! اقتدار کی چراگاہ میں چَرنے والے قوم کو بھول گئے ہیں اور کسی کو اِتنا ہوش نہیں کہ اُنہیں یاد ہی دِلا دے!

جمہوریت کے تحت ملنے والے مینڈیٹ کی میعاد بھی پانچ برس ہے اور قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے بنائے جانے والے منصوبے بھی پنجسالہ ہوتے ہیں۔ لوگ

جمہوری لوٹ مار کے پنجسالہ منصوبوں کو بھگتتے بھگتتے اب پنجسالہ ترقیاتی منصوبوں کو بُھول بھال گئے ہیں! جو مزید پانچ سال کے لیے مُلک کے نظم و نسق کے نئے سیٹ اپ کا حصہ بننے کو اُتاولے ہوئے جارہے ہیں کوئی اُنہیں یاد دِلائے کہ قوم منتظر کھڑی ہے۔ آپس کی کشمکش، مکّاری اور رسّا کشی سے کچھ فُرصت ملے تو قوم کی طرف بھی دیکھ لیں جس کی ابتر حالت چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے۔

جب ہم ہی نہ مہکے، پھر صاحب
تم بادِ صبا کہلاؤ تو کیا!

لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

منتخب حکومتیں ختم ہوئیں۔ نگراں سیٹ اپ منصہ شہود پر آچکے ہیں۔ سیاسی جماعتیں ایک بھرپور جُھرجُھری لیکر میدان میں نکل آئی ہیں۔ بیان بازی کے مینا بازار میں طرح طرح کے اسٹال سج گئے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سُنائی دے رہی ہیں۔ وعدے ہیں کہ ختم نہیں ہو رہے۔ دعوے ہیں کہ اُمڈے چلے آرہے ہیں۔ یقین دہانیوں کا سلسلہ ہے کہ دراز ہوتا جارہا ہے۔ عزائم کے بازار کی گرم بازاری لوگوں کو حیران کئے دیتی ہے۔ سابق صدر پرویز مشرف اور بلوچ رہنما اختر مینگل کی وطن واپسی نے تھوڑی بہت ہلچل پیدا کی ہے۔ پرویز مشرف نے کراچی آمد پر خطاب میں چند ایسی باتیں کہی تھیں جنھیں سُن کر قوم کو تفریح طبع کا موقع میسر ہوا۔ کراچی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پھر چند ایسی باتیں کہیں جن سے پیدا ہونے والی مسکراہٹ نے لوگوں کے چہروں کو کچھ تازگی بخشی۔ موصوف کا کہنا تھا کہ اُمید ہے اب قوم جاگ گئی ہوگی۔ (افسوس کہ نیند ابھی پوری نہیں ہوئی اِسی لیے اُن کے استقبال کو زیادہ لوگ ایئرپورٹ نہ پہنچ سکے!) ان کا کہنا تھا کہ چونکہ وہ بیرون ملک تھے اِس لیے پارٹی میں کچھ پرابلم تھا۔ اب وہ آگئے ہیں تو جھگڑنے والوں سے نمٹ لیں گے کیونکہ پچاس سال سے اُنھوں نے جھگڑوں کو tackle کرنا ہی تو سیکھا ہے! ہمیں یقین ہے کہ کم از کم اپنی پارٹی میں شَر پھیلانے

!والوں کو تو کنٹرول کر ہی لیں گے

سابق صدر کا دعوی ہے کہ اُن کے درست فیصلوں ہی کی بدولت آج قوم سلامت ہے! نائن الیون کے بعد تیزی سے درست فیصلے نہ کئے گئے ہوتے تو بہت تباہی ہوتی۔ ساتھ ہی اُنھوں نے اخبار نویسوں سے کہا کہ اہم فیصلے آسان نہیں ہوتے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ !پاکستان میں بہت دم ہے وہ عالمی برادری سے جا ٹکرائے

مسئلہ اِتنا سا ہے کہ جنہیں اقتدار نصیب ہوتا ہے (یا جو اقتدار کے دانوں پر اپنے نام کی مہر لگالیتے ہیں!) وہ قوم سے صرف محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ تمام مزے لوٹنے کے بعد وہ (اقتدار کا سورج ڈوبنے پر) مُلک سے چل دیتے ہیں۔ اور طویل مدت کے بعد وطن کے دورے پر آتے ہیں تو احسانات گِنواتے ہیں! قوم کو یاد دِلایا جاتا ہے کہ وہ اب تک سلامت ہے تو اُن کے فیصلوں کی بدولت اور کسی نہ کسی طرح سانس لے رہی ہے تو اُن کے اقدامات کی مہربانی سے! قوم کی بدنصیبی یہ ہے کہ جن بُرے دِنوں کو وہ بھول !بھول چکی ہوتی ہے وہی دِن اُسے یاد دِلانے کا خاصا اہتمام کیا جاتا ہے

اِضافی بدنصیبی یہ ہے کہ قتل و غارت میں اِضافے پر وزرائے داخلہ جیسے بااختیار افراد شر پسندوں کو سخت سزا دی جائے گی" کہنے کے بجائے "شر پسندوں"

کو سخت سزا ملنی چاہیے" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں! قوم حیرت زدہ رہتی ہے کہ جن سے یقین دہانی اور ٹھوس اعلان کی توقع ہے اُن کی سُوئی محض خواہش پر اٹکی ہوئی ہے!

سابق صدر نے بڑے فخر سے بتایا کہ جہاں گاڑی نہیں جاسکتی تھی وہاں جاکر بھارتی فوج کو گردن سے پکڑا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے کہ قوم کی گردن مہنگائی اور بدامنی سے کیوں نہ چُھڑائی اور جمہوری عمل کی گردن کیوں اور کس خوشی میں دبوچی تھی!

انتخابی گہما گہمی شروع ہوتے ہی مسلم لیگ (ن) کے صدر میاں محمد نواز شریف بھی بیان بازی کے محاذ پر صرف نکل آئے ہیں۔ سابق وزیر اعظم فرماتے ہیں کہ حکمرانوں کا محاسبہ فوج یا کسی اور ادارے کی نہیں، عوام کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ کہ اگر عوام نے اپوزیشن کا محاسبہ نہ کیا تو اللہ بھی نہیں کرے گا! یہ بھی خوب رہی۔ عوام کی ذمہ داری تک تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ مگر یہ کیا بات ہوئی کہ عوام محاسبہ نہیں کریں گے تو اللہ بھی نہیں کرے گا؟ یہ طے کرنے والے ہم یا نواز شریف کون ہوتے ہیں؟

مسلم لیگ ن کے سربراہ مزید کہتے ہیں کہ یہاں منتخب حکومت کو چلنے نہیں دیا

جاتا۔ بات ٹھیک ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ حال ہی میں ختم ہونے والے پانچ سالہ جمہوری دور میں حکومت کو چلتا رکھنے کے لیے مفادِ عامہ کے ہر منصوبے کو چلتا کردیا گیا! اِن پانچ برسوں میں جو کچھ ہوا ہے اگر وہی جمہوریت ہے تو عوام سوچنے پر مجبور ہیں کہ جن منتخب حکومتوں کو چلنے نہیں دیا گیا اُنہیں اگر چلنے دیا گیا ہوتا تو کیسی کیسی قیامتیں برپا ہوئی ہوتیں!

عوام سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہر معاملے میں اگر ذمہ داری اُن کی ہے تو سارے ادارے اور اہل سیاست کیا گھاس کھودنے کے منصب پر فائز ہیں؟ اگر سبھی کچھ عوام کو کرنا ہے تو وہ لوگ کس مرض کی دوا ہیں جو رات دِن عوام کے مسائل حل کرنے کے دعوے کرتے رہتے ہیں؟

نواز شریف کہتے ہیں کہ محاسبہ عوام کریں۔ عوام محاسبہ کس طرح کرسکتے ہیں؟ اگر ووٹ سوچ سمجھ کر بھی استعمال کیا جائے تو اِس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جو منتخب ہوکر آئیں گے وہ ایک نہیں ہوجائیں گے؟ اور اگر منتخب نمائندے اپنے مفادات کے لیے ایک ہوگئے تو عوام کیا کریں گے؟ محاسبے کے لیے مزید چار پانچ سال انتظار؟

ایک طرف تو عوام سے کہا جارہا ہے کہ محاسبہ کریں؟ محاسبہ کس کا ہوتا ہے؟

ظاہر ہے۔ کرپٹ لوگوں کا؟ اور پھر یہ بھی کہا جارہا ہے کہ عوام جنہیں منتخب کریں گے یعنی حکومت بنانے کی پوزیشن میں لائیں گے اُنہیں قبول کرکے اُن سے تعاون کیا جائے گا! کیا نواز شریف صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انتخابی نتائج کی رُو سے کرپٹ افراد پھر حکومت میں آ گئے تو اُنہیں قبول کرلیا جائے گا! جمہوری یا غیر جمہوری کی بحث چھوڑیے، کیا کسی بھی معاشرے میں محاسبہ اِسی طور ہوا کرتا ہے؟

مسلم لیگ ن کے سربراہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ 2008 کے انتخابات میں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو کیا 2008 کے انتخابی نتائج کی روشنی میں گٹھ جوڑ کے ذریعے عوام کے ہاتھ کیا انتقاماً باندھ دیئے گئے؟ نواز شریف ہاتھ بندھے ہونے کا رونا رو رہے ہیں اور دوسری طرف عوام یہ سوچ کر ہنس رہے ہوں گے کہ ع

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

یعنی ہاتھ اگر بندھے ہوئے ہیں تو عوام کے۔ جو سیاست کے بازار میں دُکانیں چلا رہے ہیں وہ تو کہیں سے بھی مجبور دکھائی نہیں دیتے!

انتخابی مہم شروع ہوچکی ہے اور تیزی سے زور بھی پکڑ رہی ہے۔ اِس تیزا تیزی

میں عوام کو سبز باغ دِکھانے کے لیے دُور کی کوڑیاں لائی جارہی ہیں۔ ایک دلچسپ خبر یہ ہے کہ توانائی کا بحران ختم کرنے کے لیے صدر نے بجلی کی پیداوار اور تقسیم و ترسیل کے عمل کی نگرانی اپنے ذِمّے لے لی ہے۔ اِس خبر میں لوگوں کے لیے حیرت کے جھٹکے کے سِوا کچھ نہیں! یہ بیان بازیاں اور یہ نیم دِلانہ اقدامات (عوام کا نہیں، اپنا) لہو گرم رکھنے کے بہانے کے سِوا کچھ نہیں۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اِس بار عوام صرف وعدوں، دعووں اور قلابازیوں سے بہلتے دِکھائی نہیں دیتے۔ اللہ کرے کہ ہمارا اندازہ کسی حد تک دُرست ہو!

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کسی جلسے میں ملیں

ایک زمانہ تھا کہ جسے دیکھیے وہ بچے کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانے پر تُلا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ڈاکٹرز کی تعداد کسی خطرناک بیماری کی طرح بڑھتی چلی گئی اور انجینئرز اِتنے ہوگئے کہ زندگی کا ہر معاملہ "انجینئرڈ" دِکھائی دینے لگا! اور جب آئی ٹی کا رجحان عام ہوا تو سب اپنے بچوں کو سوفٹ ویئر انجینئر بنانے کی ٹھان بیٹھے۔ اور اب حالت یہ ہے کہ سوفٹ ویئر انجینئرز پیروں میں آ رہے ہیں! یہی حال وکلا کا ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں وکلا کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اِتنا سارا قانون یا اِنہیں کنٹرول کرنے والے قوانین کہاں سے لائیں!

سیاسی جلسوں کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ انتخابی موسم کے آغاز نے جلسوں کے رجحان کو توانائی بخشی ہے اور اب اِس قدر جلسے ہو رہے ہیں کہ پیروں میں آ رہے ہیں۔ لوگ ذرا سا چلتے ہیں اور کوئی جلسہ راہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے! پورے ملک میں ایک رونق میلہ لگا ہوا ہے۔ ہر طرف مجمع بازی اور مجمع سازی ہے۔ موسم کی گرمی اور سیاست کی گرم بازاری مل کر ماحول کو دو آتشہ کئے دیتی ہیں!

بہار کی آمد پر پُھول تو کِھلے مگر اُس سے پہلے سیاست نے گُل کِھلانا شروع کر دیا! اور گُل بھی ایسے کہ جن کی "خوشبو" سے دِل و دِماغ ماؤف ہو کر رہ جائیں! اور سیاست کے کِھلائے ہوئے گُلوں نے رنگ بھی ایسے بکھیرے ہیں کہ آنکھوں میں چُبھ رہے ہیں!

جلسے تو ہماری سیاسی تاریخ کا ہمیشہ سے حصہ رہے ہیں مگر اب معاملہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ جلسوں کو ہر مرض کی دوا ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہر پارٹی یہ دعوے کرتی پھر رہی ہے کہ "اصلی تے وڈے جلسے" تو اُسی کے ہیں، باقی سب تو بُھٹے بُھون رہے ہیں! سیاسی قوت کو جلسوں کے گز سے ناپا جا رہا ہے۔

قوم نے کسی نہ کسی طور دل کو بہلاتے رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ قوم جلسوں میں شرکت کرتے کرتے اب "شوکن میلے دی" ہو کر رہ گئی ہے! گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ جس طرح کچھ لوگ جسمانی صحت کے لیے روزانہ دو ڈھائی سو بیٹھکیں لگاتے ہیں بالکل اُسی طرح اب بہت سے لوگ ہفتے میں دو تین سیاسی جلسوں میں شریک ہو کر دو تین درجن بڑھکیں نہ سُن لیں تو ادھورے پن کا احساس ستاتا رہتا ہے!

غور سے دیکھیے تو ہزاروں چہرے ہیں جو تمام جماعتوں کے جلسوں میں انٹری دیتے ہوئے ملیں گے۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ روزی روٹی کا معاملہ ہے۔ جو دیہاڑی دے گا اُس کے جلسے کو رونق بخشی جائے گی۔ لوگوں کو اب ہوش آیا ہے کہ مشغلے سے کچھ کمایا بھی جاسکتا ہے! پاکستان کے ہنستے گاتے لوگ جلسوں کے شوقین کب نہیں رہے؟ عوام نے ہر دور میں جلسوں سے دل بہلایا ہے۔ جلسوں میں حاضرین کی تعداد کے حوالے سے اہل سیاست کچھ بھی کہتے پھریں، عوام کا اپنا "ایجنڈا" ہے۔ یعنی اُنہیں کچھ رونق میلہ چاہیے۔ سیاسی جلسوں میں شرکت کو عوام کے شعور کی سطح سے تعبیر کرنے والے احمق ہی کہلائیں گے۔ جلسوں کے معاملے میں عوام کا معاملہ یہ ہے کہ

مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو

!اِک گونہ بے خودی مجھے دِن رات چاہیے

خواہ کوئی پارٹی جلسہ کرے، لوگ اُس کے لیے ہر گھڑی تیار، کامران ہیں۔ یعنی

!جو آئے، آئے کہ ہم دِل کشادہ رکھتے ہیں

شوق کی انتہا یہ ہے کہ جلسے کا اعلان ہی کافی ہے۔ لوگ خود بخود جلسہ گاہ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ پارٹی خواہ کوئی ہو، جلسے کا میدان سجتے ہی لوگ "آوے ای

آوے" کے نعرے لگاتے ہوئے چل پڑتے ہیں۔
سیاسی جلسوں کی رنگینی مثالی ہوا کرتی ہے۔ یہ ایک رنگ میں سو رنگ دِکھاتے ہیں۔ معاشرے کا کون سا انداز ہے جو جلسوں سے نہیں جھلکتا؟ جس طرح پرچون کی دُکان پر سب کو اپنے مطلب کی چیز مل جاتی ہے بالکل اُسی طرح جلسوں اور بالخصوص سیاسی جلسوں میں ہر قبیل کے شکر خورے کو اپنے مطلب کی شکر مل ہی جاتی ہے!
وہ زمانے گئے جب ڈیڑھ دو سو کا ٹکٹ لیکر سنیما کا سرکس دیکھا جاتا تھا۔ سلور اسکرین پر یا سرکس میں جو کچھ نظر آتا ہے وہی سب کچھ دیکھنا ہو تو جلسے حاضر ہیں! جلسوں میں کائنات کے تمام رنگ اور سرکس کے تمام آئٹمز پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ تقاریر سُننا اور ہضم کرنا خاصے ڈھیلے رَستے پر چلنے کے مترادف ہے، یعنی ہچکولے کھاتے رہیے! بعض مقررین تو حاضرین کے صبر کا امتحان آخری حد تک لیتے ہیں اور اُنہیں بانس کے سِرے پر اُلٹا لٹکا دیتے ہیں!
آج کے جلسوں میں کامیڈی کے تمام رنگ اِس خوبی سے جمع ہوتے ہیں کہ رنگیلا اور منور ظریف جیسے استاد کامیڈین بھی ہوتے تو تھوڑی بہت اِضافی فنکاری سیکھ لیتے! اور ایک کامیڈی پر کیا موقوف ہے، مظہر شاہ ہوتے تو چند نئ

بڑھکوں سے آشنا ہوتے اور بڑھک مارنے کے نئے انداز سیکھتے ! اسٹیج پر جو اداکاری چل رہی ہوتی ہے اُس میں ہیرو، ولن، کامیڈین سبھی کے لیے تھوڑی بہت "ٹپس" ضرور ہوتی ہیں۔ اب یہ تو بندے پر منحصر ہے کہ وہ دریا سے پیاس بُجھاتا ہے یا صرف لہروں کی روانی دیکھنے پر اکتفا کرتا ہے ! فلم اور ڈراما رائٹرز جلسے اٹینڈ کریں تو منظرنامہ، مکالمے اور کہانی سبھی کچھ لیکر خوشی خوشی گھر جائیں گے!

ویسے تو خیر سیاسی فنکار ہی کیا کم ہیں مگر اب اداکارہ مسرت شاہین کے ساتھ ساتھ لیلیٰ اور میرا نے بھی الیکشن لڑنے کا اعلان کردیا ہے۔ اور کیوں نہ کرتیں؟ جب عورت کے وجود سے کائنات کی تصویر میں رنگ ہے تو جلسوں کی تصویر بھلا کیوں پھیکی رہے!

خواتین ملاقاتوں کے لیے بچت بازاروں کو عمدگی سے استعمال کرتی ہیں۔ اور ہفتے کے ساتھ دنوں کے بچت بازاروں کی مناسبت سے معاملات یاد رکھتی ہیں۔ اُدھار وصول کرنا ہو تو یاد دلایا جاتا ہے کہ پیسے اتوار بازار میں دیئے تھے اور بدھ بازار میں یاددہانی بھی کرائی تھی ! اب مردوں نے جلسہ گاہوں کو ملاقات کے مقامات اور جلسوں کو یاد دہانی کے ذرائع میں تبدیل کرلیا ہے ! سب کچھ اِسی مناسبت سے یاد رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اب کیا یاد نہیں؟ جس دن"

عمران خان کا جلسہ تھا، میں نے تجھے 500 روپے دیئے تھے۔" یا یہ کہ "یار! یہ چوٹ اُسی دن لگی تھی جس دن مینار پاکستان پر فضل الرحمٰن کا جلسہ تھا۔" کل کو خواتین بھی جلسوں کو اپنی گفتگو کا حصہ اِس طرح بنایا کریں گی۔ "بہن! میرا چھوٹا والا اُس دن پیدا ہوا تھا جس دن عمران کے جلسے سے لوگ کرسیاں لے بھاگے تھے!"

جلسے یادگار بھی ثابت ہو رہے ہیں اور یاد دہانی کا ذریعہ بھی بنتے جا رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اِن جلسوں کے بطن سے کچھ کام کی سیاست بھی ہویدا ہو! بڑھک کے مقابلوں سے کوئی کام کی بات برآمد ہوتی ہوئی دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔

لال بیگ پریشان ہیں

دو لال بیگ نالی میں بیٹھے پیٹ پُوجا کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "ذرا سامنے دیکھو۔ ریسٹورنٹ میں لوگ اُجلے کپڑے پہنے، چمکتی ہوئی میز پر رکھا ہوا صاف سُتھرا کھانا کھا رہے ہیں۔"

دوسرا بولا۔ "بس کرو یار، ایسی باتیں مت کرو۔ کھاتے وقت صفائی کے ذکر سے مُجھے مَتلی ہونے لگتی ہے!"

الیکشن اور کمیشن اور سُپریم کورٹ نے نے بھی انتخابات سے قبل اچھی خاصی مَتلی کا اہتمام کرنے کی ٹھان لی ہے۔ یاروں نے جو آوا پینسٹھ برسوں میں خاصے انہماک اور جاں فشانی سے بگاڑا ہے اُسے "جیوڈیشو کریسی" نے درست کرنے پر کمر کَس لی ہے۔ جہاں چاروں طرف غلاظت ہی غلاظت ہو وہاں صفائی سُتھرائی کسے اچھی لگتی ہے؟ یقیناً اُنہیں صفائی کا اہتمام بُرا لگے گا جو رات دِن غلاظت میں اِضافے کے لیے سرگرم رہتے ہیں۔ قوم خوش ہے کہ چھ عشروں میں جمع ہونے والا کچرا کِسی بہانے ہٹایا اور جلایا تو جارہا ہے۔ مگر معترضین کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے۔ کیوں نہ بڑھے؟ اہلیت کا جھگڑا ہے۔ بات بات پر سوالات اُٹھ رہ ہیں، اعتراضات کئے جارہے ہیں۔ جس جس کی دُم پر پاؤں پڑے گا

وہ تو چیخے گا، چلّائے گا۔ پانچ سال کے بعد عوام کو پھر سبز باغ دِکھا کر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے کا راستہ کُھلا ہے مگر الیکشن کمیشن اور عدلیہ مل کر رکاوٹ بنے جا رہے ہیں۔

اقتدار کی ہوس رکھنے والوں کا "استحقاق" مجروح ہو رہا ہے! جنہیں اقتدار اور اختیار کا کھلونا چاہیے اُن کے دِل ٹوٹ جائیں گے! سیاسی موج مستی کی اچھی خاصی غزل کے مقطع میں یہ اسکروٹنی جیسی سُخن گسترانہ بات کہاں سے آ دھمکی!

اب کے تو سیاسی طالع آزماؤں کی جان پر بن آئی ہے۔ اچھا خاصا انتخابی میلہ لگا ہوا ہے۔ کرتب اور شعبدوں کی بہار جوبن پر ہے۔ ایسے میں انتخابی اہلیت کی شرائط نوالے میں کنکر کی طرح سارا مزا کرکرا کئے دے رہی ہیں۔ جعلی ڈگریوں کا معاملہ ایسا اُٹھا ہے کہ اب بیٹھنے کا نام نہیں لے رہا۔ یہ معاملہ بہتوں کی کھٹیا کھڑی کرتا اور بھٹہ بٹھاتا دِکھائی دے رہا ہے۔ ابھی سے شور اُٹھ رہا ہے کہ صادق اور امین کی شرائط بہت سخت ہیں۔ اِس طرح تو بہت سے رہ جائیں گے۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ اعتراض کِس قدر بُودا اور بھونڈا ہے۔ معترضین کے مَن کی مُراد یہ ہے کہ انتخابی امیدوار بننے کی اہلیت سے متعلق شرائط نرم کردی جائیں۔ یعنی اگر کِسی نے قوم کا مال کھایا ہے تو چھان بین نہ کی جائے۔ اثاثوں پر دیئے جانے والے ٹیکس کی تفصیل طلب نہ کی جائے۔ اگر کِسی نے بینک کے قرضے معاف کرائے ہیں تو حساب نہ مانگا جائے،

راکھ میں دبی چنگاریوں کو کرید کرید کر نہ نکالا جائے۔ نا اہلی کے خطرے سے دوچار امیدواروں سے ہمدردی رکھنے والوں نے یہ بھی لکھ مارا ہے کہ اسکروٹنی ایسی سخت نہیں ہونی چاہیے کہ چھلنی میں کچھ نہ بچے! اِن تحریروں اور بیانات پر ناطقہ سر بہ گریباں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ کِسی کے اقتدار کا سُندر سپنا توڑا نہ جائے، کِسی کے ریت گھروندے کو لات نہ پڑے! ایک ٹی وی اینکر نے فرمایا ہے۔ "کسی کے صادق اور امین کا فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں؟ یہ تو اللہ کا معاملہ ہے!" اِس کا مطلب یہ ہوا کہ عدالت میں کوئی مقدمہ چلایا ہی نہیں جانا چاہیے کیونکہ حقیقت کا علم تو اللہ کو ہے۔ کوئی بیچ چوراہے پر کسی کو خنجر گھونپ دے تو کسی عدالت کو اس کیس کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ قاتل کی نیت کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے!

مُدعا کیا ہے؟ صرف یہ کہ جو کچھ اب تک ہوا وہ بُھلا دیا جائے، چھان بین کے بکھیڑے میں نہ پڑا جائے۔ کِسی نے قومی خزانے سے کچھ ہڑپ کر لیا ہے تو اُس کے منہ میں انگلی ڈال کر کھایا پیا نکالا نہ جائے بلکہ ہاضمے کا چُورن تحفے میں دیا جائے! یہی لوگ ہیں جو آگے دیکھنے کی بات کرتے ہیں۔ یعنی ماضی کا حساب نہ مانگا جائے۔ اِن کی دلیل یہ ہے کہ بے خیالی میں کہیں انگلیاں جل جائیں گی

راکھ گزرے ہوئے لمحوں کی کُریدا نہ کرو!

سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر چوہدری اعتزاز احسن فرماتے ہیں کہ آئین کی دفعہ 62 اور 63 پر تو قائدِ اعظم بھی پورے نہیں اترتے! محترم مجیب الرحمٰن شامی نے بر وقت اور برحق لکھا ہے کہ اِس معاملے میں بابائے قوم کی شخصیت کو نہ گھسیٹا جائے۔ اُن کی صداقت اور امانت داری کی گواہی تو دُشمن بھی دیا کرتے تھے۔ کوشش کرنے پر بھی کوئی اُن کے کردار میں جھول دریافت نہ کرسکا۔ کیا اعتزاز احسن یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آئین اور قانون پر اِتنا عمل کیا جائے کہ یہ کِسی جھوٹے، خائن، چور اور ڈاکو کی راہ میں مزاحم نہ ہوں؟ یعنی پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو پہاڑ کو کاٹ پیٹ کر چبوترے میں تبدیل کردیا جائے تاکہ کوئی بھی انتخابی مینڈک پُھدک کر بیٹھ سکے!

اب بیلٹ پیپر میں ایک ایسا خانہ بھی رکھنے کی بات چلی ہے جس کے تحت ووٹر تمام امیدواروں کو مسترد کرسکے گا۔ اِس پر بھی واویلا مچایا جارہا ہے کہ یوں ٹرن آؤٹ کم ہو جائے گا۔ اگر بیلٹ پیپر پر جلوہ گر ہونے والے امیدواروں میں کوئی بھی ڈھنگ کا نہ ہو تو کوئی کِسی کو خواہ مخواہ ووٹ کیوں دے؟ مال ڈھنگ کا نہ ہو تو کوئی کیوں خریدے؟ ایسے میں عدم اعتماد کا اظہار ووٹر کا بنیادی حق ہے۔ اگر کسی حلقے میں 50 فیصد یا اِس سے زائد ووٹرز اگر عدم اعتماد کا خانہ استعمال کریں تو پولنگ دوبارہ کرنے کی تجویز پیش کی گئی

ہے۔ یہ اقدام بالکل درست ہے۔ اِس صورت میں سیاسی جماعتوں کو کچھ تو شرم آئے گی کہ ڈھنگ کا امیدوار میدان میں کیوں نہ اُتارا۔ یعنی اب بھی وقت ہے کہ سوچ سمجھ کر ٹکٹ دیا جائے۔

سُپریم کورٹ چاہتی ہے کہ منتخب ایوان کی رکنیت جیسا منصب جھوٹ بول کر حاصل کر دیا جائے۔ اور دوسری طرف بے کردار سیاست cut to size کرنے والوں کو cut to size دان اور اُن کے طرف دار ہیں کہ آئین کی دفعات اور اُن پر عمل ہی کو کرنے کے درپے ہیں! کم بخت اِتنے "صاحب کردار" بھی نہیں کہ بقول ظفر اقبال اپنے جھوٹ ہی پر قائم رہ کر دِکھادیں! علامہ اقبال نے ایسی ہی کیفیت کے لیے کہا تھا۔ ع

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
! ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے درست کہا ہے کہ ان پڑھ کو تو الیکشن لڑنے کی اجازت دی جاسکتی ہے، جعلی ڈگری رکھنے والے کو نہیں۔ ان پڑھ ہونا کوئی جرم یا خطا نہیں مگر قوم سے جھوٹ بولنے والے کو تو کسی بھی حال میں.برداشت نہیں کیا جانا چاہیے۔

خدا خدا کرکے برف پگھلنے لگی ہے تو کچھ لوگ سیاسی درجہ حرارت کو نیچے لانے پر تُلے ہوئے دِکھائی دے رہے ہیں۔ اِس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ بہت حد تک سیاسی عمل اور قوم کے مفاد میں ہے۔ اسکروٹنی جتنی سخت ہوگی اُسی قدر بہتر امیدوار میدان میں رہ جائیں گے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ چھلنی میں زیادہ لوگ نہیں رہ پائیں گے تو حیرت کیسی اور افسوس کیوں؟ اچھا ہے کہ سارا کچرا نیچے جا گرے۔ اسکروٹنی کی ہوا چلی ہے تو خطرہ اُنہی پودوں کو ہے جن کی جڑ کمزور ہے۔ وہی چراغ واویلا مچا رہے ہیں جن کی لَو تھرتھرا رہی ہے۔ سیاسی عمل میں بہتری کی خواہش رکھنے والے تو خیر سے مطمئن ہیں۔

محسن بھوپالی درست کہہ گئے ہیں

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ

جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا!

پتلی گلی اور ٹیڑھی انگلی

کاغذاتِ نامزدگی کی جانچ پڑتال نے بہتوں پر قیامت ڈھادی ہے۔ جعلی ڈگری میں کئی سابق ارکان اسمبلی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیجا جاچکا ہے۔ کوئی نا اہل قرار پا کر کونا پکڑ چکا ہے۔ کِسی کو اعتراضات کی سُوئیاں چُبھ رہی ہیں۔ جن کے معاملات زیر التواء ہیں وہ سہمے ہوئے ہیں۔ کِس نے سوچا تھا کہ اب کے اسکروٹنی ایسی "کُٹنی" ثابت ہوگی!

نفسیات کے ماہرین نے ایک ایسی کیفیت پر بھی بحث کی ہے کہ بہت سے لوگ زندگی بھر کامیابی کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں مگر نیم دِلانہ انداز سے۔ خوف یہ ہوتا ہے کہ کہیں کامیاب نہ ہو جائیں کیونکہ اُنہیں اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ کامیابی کے حصول کے لیے جو محنت کرنی پڑ رہی ہے اُس سے کہیں زیادہ محنت کامیابی کو برقرار رکھنے کے لیے کرنی پڑے گی! ہم بھی اِس وقت ایک ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہیں۔ بہار کی دُعائیں مانگ مانگ کر ہم تھک چُکے اور اب بہار آئی ہے تو یہ خوف دامن گیر ہے کہ کہیں خزاں ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نہ جاتی رہے! سیدھی سی بات ہے، خزاں کے ہم عادی ہیں اور وہ ہماری نفسیاتی ساخت کا حصہ ہے!

انتخابی عمل اپنے ساتھ کئی پیچیدگیاں لایا ہے۔ یہ پیچیدگیاں اُمیدواروں اور اُن کی جماعتوں کے لیے ہیں۔ عوام کے من کی مُراد تھوڑی بہت تو پوری ہو رہی ہے۔ جو لوگ جھوٹ بول کر، دھوکا دے کر اسمبلیوں تک پہنچے اُن کا کسی حد تک تو محاسبہ ہوا ہے اور جن کی غلط بیانی ثابت ہو گئی اُنہیں جیل کی ہوا کھانی پڑی ہے۔ کیا یہ سب عوام کی اُمنگوں کے مطابق نہیں؟ کاغذاتِ نامزدگی کی جانچ پڑتال کے دوران ریٹرننگ افسران نے اُمیدواروں سے جو سوالات پوچھے اُن کے عجیب و غریب اور شرم ناک جواب سامنے آئے۔ عوام حیران ہیں کہ جو لوگ اُن کی نمائندگی کے لیے میدان میں اترے ہیں اُن کی معلومات کس قدر ناقص ہیں! بے ڈھنگے جواب دے کر اپنے آپ کو تماشا بنانے والوں کے طرف دار کہہ رہے ہیں کہ الیکشن کمیشن نے انتخابی عمل کو تماشا بنا ڈالا ہے! یہ بھی خوب رہی۔ جو پانچ سال تک قوم کے سیاہ و سفید کے مالک بننا چاہتے ہیں اُن کی قابلیت کو پرکھا بھی نہ جائے؟

پاکستان میں آمریت اور جمہوریت کے درمیان میوزیکل چیئرز کا کھیل ہوتا رہا ہے۔ آپ چاہیں تو اِسے چوہے بلی کا کھیل بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اب شاید باری طے کر دی گئی ہے۔ یعنی جب ایک فریق تھک جائے تو دوسرا آ جائے۔ اور جب وہ تھک جائے تو پہلا والا پھر آ جائے۔ چہروں اور انداز کی تبدیلی سے کوئی حقیقی

تبدیلی رُونما نہیں ہو رہی۔ مُلک مسلسل ترقی کر رہا ہے مگر افسوس کہ یہ ترقی معکوس ہے! کئی عشروں سے یہ قوم اِس تماشے کو "ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم" کی تصویر بنی دیکھ رہی ہے۔ عوامی سطح پر وقفے وقفے سے نیم دِلانہ احتجاج بھی ہوتا رہا ہے مگر باری والوں کو کچھ احساس نہیں۔

دُعائیں شاید کچھ رنگ لا رہی ہیں، مُرادیں کسی حد تک پوری ہونے کو ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بالا ہی بالا کچھ طے ہوا ہے جس کے تحت سیاست کے تالاب سے گندی مچھلیوں کو نکالا جارہا ہے۔ کاغذاتِ نامزدگی کی جانچ پڑتال کا عمل سخت بنا کر پہلا جال پھینکا گیا ہے۔ جن کی صداقت شعاری اور امانت داری دونوں ہی مشکوک ہیں وہ (ظاہر ہے اپنے) سَر پکڑے بیٹھے ہیں۔

جسٹس (ر) طارق محمود کہتے ہیں کہ انتخابی عمل اِسی طور جاری رہا تو انتخابات ہوچکے۔ !اور یہ کہ بنگلہ دیش ماڈل کسی نہ کسی پتلی گلی سے پاکستان میں داخل ہو رہا ہے

جنہیں عوام پورے سیاسی خشوع و خضوع سے منتخب کرتے ہیں اُن کا حافظہ بھی کمال کا ہے، ایوان ہائے اقتدار میں پہنچتے ہی لاپتہ ہو جاتا ہے! اُنہیں کچھ یاد نہیں رہتا کہ اِن ایوانوں سے باہر ایک قوم رہتی ہے جس نے چند اُمیدیں

پال رکھی ہیں، کچھ آس لگا رکھی ہے۔ اگر کچھ یاد رہتا ہے تو بس اپنی تجوری اور مفادات۔ مفادات کا تحفظ یقینی بنا کر اپنی تجوری بھرنے کے بعد وہ بھول جاتے ہیں کہ مینڈیٹ کے تحت ووٹرز کے لیے بھی کچھ کرنا تھا۔

اب اُٹھا پٹخ ہو رہی ہے، بہت کچھ ٹٹولا اور کھنگالا جا رہا ہے۔ الیکشن کمیشن چند اختیارات کے ساتھ میدان میں آیا ہے۔ جو لوگ منتخب ہو کر قوم کو بھول بھال جاتے ہیں اور بدعنوان عناصر کا محاسبہ کرنے کے بجائے اُن سے ٹک مُکا کر لیتے ہیں اُن کی گردن دبوچنے کا اور کون سا طریقہ ہو سکتا ہے؟ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی تو کچھ کر نہیں پاتی اور پارلیمانی کمیٹیاں بھی نُمائشی اقدامات یعنی "نشستند و گفتند و برخاستند" تک محدود رہتی ہیں۔ قومی مفادات اور بہبودِ عامہ کے معاملات صرف بحث کی نذر ہوتے رہتے ہیں اور ارکان کے مُشاہرے اور مراعات میں اِضافے سے متعلق قرارداد روشنی کی رفتار جیسی تیزی سے منظور کر لی جاتی ہے!

جب جمہوری فلم کی کہانی کا ہر "ٹوئسٹ" قوم کے خلاف جا رہا ہے تو نیا اسکرپٹ لکھنے کے بارے میں کیوں نہ سوچا جائے؟ جن سیاسی اداکاروں، بلکہ نوٹنکی بازوں نے قوم کا ناطقہ بند اور جینا حرام کر دیا ہے اُنہیں گُدی سے پکڑ کر ایک طرف کیوں نہ ہٹا دیا جائے؟ جو قوم کی خون پسینے کی کمائی کو شیر مادر

سمجھ کر پی گئے ہیں اُن کے حلق میں اُنگلی ڈال کر تے کیوں نہ کرائی جائے؟ جب گھی سیدھی اُنگلی سے نکل ہی نہیں پا رہا تو اُنگلی تھوڑی سی ٹیڑھی کیوں نہ کی جائے؟ جہاں سبھی کچھ اُلٹا پلٹا ہے وہاں تھوڑی سی کجی اپنانے میں کیا مضائقہ ہے؟

بنگلہ دیش ماڈل ہو یا ترک ماڈل، جو قوم کی ضرورت ہے وہ تو متعارف ہونا ہی چاہیے۔ ہم زمانے بھر کے فیشن اور نظریات اپناتے رہتے ہیں تو کسی کامیاب سیاسی ماڈل کو انٹری دینے میں کیا ہرج ہے؟ بنگلہ دیش میں جب بہت کچھ بگڑ گیا تھا تو عدلیہ نے ٹیکنوکریٹس کے ساتھ مل کر حکمرانی (یا معاملات کی دُرستی) کا متبادل انداز متعارف کرایا تھا۔ سپریم کورٹ نے سیاسی عمل کو بائی پاس کرکے ایک عبوری حکومت قائم کی جس نے گند صاف کرنے کی اپنی سی کوشش کی اور وہ کوشش بہت حد تک کامیاب رہی۔ اِس اقدام کے نتائج پر بحث ہو سکتی ہے مگر کیا پاکستان میں بھی معاملات دُرست کرنے کے لیے مُہم جوئی کا وقت نہیں آگیا؟ ممکن ہے کہ بنگلہ دیش ماڈل جیسی مُہم جوئی پسندیدہ نہ ٹھہرے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اِس کے نتیجے میں سیاسی جماعتیں کچھ سیکھیں اور اصلاح پر مائل ہوں۔ جو لوگ منتخب ہو کر صرف اپنے مفادات کے تحفظ کو جمہوریت کے تسلسل کا نام دینے پر تُلے ہیں اُن کے لیے کوئی تو تازیانہ ہونا چاہیے۔

اگر کوئی متبادل سیٹ اپ تیار ہو رہا ہے اور کسی پتلی گلی سے آ رہا ہے تو

کیا قباحت ہے؟ کم از کم چور دروازے سے تو نہیں آ رہا! پتلی گلی صرف چوروں کے نکل بھاگنے کے لیے تو نہیں ہونی چاہیے۔ کبھی کبھی کسی پتلی گلی سے کوئی کام کی چیز بھی ہمارے آنگنوں تک آ نکلے تو اِس میں ہرج ہی کیا ہے؟

اندھی مچی ہوئی ہے

مُغلوں کے دور میں ایک بار جنگ کے آثار نمایاں ہوئے۔ لڑائی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ دِلّی کے تمام قصّاب بھی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ بادشاہ نے اُنہیں حیرت سے دیکھا اور کہا۔ "یہ جنگ ہے، بچوں کا کھیل نہیں۔" قصّاب برادری کے سربراہ نے دست بستہ جواب دیا۔ "حضور! ہم روزانہ جانور پچھاڑتے ہیں، کُشتوں کے پُشتے لگا دیتے ہیں۔ ہم سے اچھی جنگ کون لڑے گا؟"

بادشاہ نے سمجھانے کی کوشش کی مگر جب دیکھا کہ قصّاب جنگ میں شریک ہونے پر بضد ہیں تو اُن کا دستہ بنانے کی اجازت دی۔ قصّابوں کا دستہ بنا۔ جنگ کا طبل بجا۔ تمام دستے روانہ ہوئے۔ قصّابوں کا دست جنگ کے میدان میں پہنچا تو سہی مگر کچھ ہی دیر میں غائب ہوگیا! تین چار دن بعد جنگ کچھ تھمی تو بادشاہ نے فوج کے تمام دستوں کی کارکردگی دریافت کی۔ قصّابوں کا دستہ غائب تھا۔ اِس دستے کے ارکان کو تلاش کرکے دربار میں لایا گیا۔ بادشاہ نے قصّاب دستے کے "کمانڈر" کو مخاطب کیا۔ "تم لوگ تو بڑی بڑی باتیں کرتے تھے کہ کُشتوں کے پُشتے لگانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جنگ کے میدان میں کیا ہوگیا تھا؟"

قصّاب دستے کے "کمانڈر" نے دست بستہ وضاحت کی۔ "حضور! کُشت و خون تو ہمارے خون میں ہے۔ ہم لڑنے سے کب بھاگے؟ بات یہ ہے کہ جنگ کے میدان میں تو اَندھی مچی ہوئی تھی اور ہم لوگ رَگ پٹھا دیکھ کے کاٹتے ہیں!"

اگلے وقتوں میں لوگ اپنے حصے کا کام کرنے پر یقین رکھتے تھے۔ جس راہ کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو اُس پر گامزن ہونے سے اجتناب برتا جاتا تھا۔ کوئی بھی غلط کام کرتے ہوئے دس پندرہ مرتبہ سوچا جاتا تھا۔ دِلّی کے قصّابوں کو بھی اُصولوں کا پاس تھا، اقدار کا احترام ملحوظِ خاطر تھا۔ جو کام کرنے کا نہ تھا یا کرنا نہیں آتا تھا وہ نہ کیا، پیچھے ہٹ گئے۔ جنگ کا تجربہ نہ تھا تو خاصے پُرامن طریقے سے گوشہ نشینی اختیار کی۔ یہ نہیں کہ انٹ شنٹ ہاتھ چلاکر جنگ ہی کا مزا کِرکِرا کرنے بیٹھ گئے! غور فرمایئے کہ لوگ چُھرے، بُغدے اور بِڈّھی رکھتے ہوئے بھی اُصولوں کی پاس داری کیا کرتے تھے، اقدار کا خیال رکھا کرتے تھے! آج حالت یہ ہے کہ لونڈے لپاڑے معمولی سا پستول لہراتے ہوئے شہر کو لُوٹنے نکل پڑتے ہیں!

پہلی بار یہ قصہ پڑھا تو ہمیں خیال آیا کہ جنہیں ہم ملک چلانے کے لیے منتخب کرتے ہیں اگر وہ بھی ایسی ہی وضع داری اور اُصول پسندی دِکھائیں تو کیا بات

ہے! ایک زمانہ تھا جب ٹیکس افسران کھال اُتارنے کا فن سیکھنے کے لیے قصابوں سے رابطہ کیا کرتے تھے! اور یہ ہُنر اُنہوں نے ایسی توجہ اور جامعیت کے ساتھ سیکھا کہ بعد میں قصاب اپنے بچوں کو کھال اُتارنے کا ہنر سیکھنے کے لیے ٹیکس کے دفاتر میں اپرنٹس شپ کرانے لگے! اب قصاب اور ٹیکس افسران مل کر ذبح کرنے اور کھال اُتارنے کا فن سیاست دانوں سے سیکھتے ہیں! جن کے ہاتھ میں مُلک کی باگ ڈور آتی ہے اُنہیں دیکھ کر آسانی سے سیکھا جاسکتا ہے کہ قومی خزانے کو کس طرح ذبح کرنا ہے کہ نرخرے سے خرخراہٹ تک نہ نکلے! اور کھال بھی اِس قدر پیار سے اُتارتے ہیں کہ بُھولے سے بھی کہیں کوئی کٹ نہیں لگ پاتا!

وہ زمانے ہوا ہوئے جب لوگ اپنے منصب اور مشرب سے ہٹ کر کوئی بھی کام کرنے سے واضح طور پر گریز کیا کرتے تھے۔ اب حال یہ ہے کہ ہسپتال چلانے والوں کو تیل اور گیس کی وزارت سونپ دی جاتی ہے اور وہ اِس منصب کو سنبھالنے سے انکار کو حرام کے درجے میں رکھتے ہیں! پھر ہوتا یہ ہے کہ وہ نا اہلی کے انجیکشن لگا لگا کر تیل کی وزارت کا تیل نکال دیتے ہیں!

ماحول صاف سُتھرا ہو تو تھوڑی بہت خرابی دور سے دکھائی دے جاتی ہے۔ شرافت کا چلن عام ہو تو لوگ بدمعاشی کرتے ہوئے ڈرتے اور جھجکتے ہیں۔ شرم دامن

گیر ہوتی ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ مگر جب آوے کا آوا بگڑ چکا ہو تو ہر اُلٹا کام سیدھا اور آسان دِکھائی دیتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی شرافت کی بات کر ہی بیٹھے تو پھر اپنے آپ سے شرمندہ ہو رہتا ہے۔ پاکستانی قوم آج کل اِسی مرحلے سے گزر رہی ہے۔

سیاست کا حال سب سے بُرا ہے۔ اگر مُغل دور کے "نجیب الطرفین" قصاب اِس کوچے میں آنکلتے تو آوے کا آوا بگڑا ہوا دیکھ کر اپنی عزت بچاتے ہوئے بھاگ نکلتے۔ مگر دِلّی کے قصابوں اور ہماری سیاست کے قصابوں میں بہت فرق ہے۔ اُنھوں نے جب جنگ کے میدان میں انٹ شنٹ معاملات دیکھے تو اپنے اُصولوں کو گلے لگائے ہوئے ایک طرف ہٹ گئے۔ ہمارے سیاسی قصاب جب چُھرے، بغلی اور بِڈھی لیکر اقتدار کی جنگ لڑنے نکلتے ہیں تو بھول بھال جاتے ہیں کہ رَگ پٹّھا دیکھ کر ذبح کرنا ہوتا ہے۔ پھر تو وہ بھی وہی کرنے لگتے ہیں جو دوسرے کرتے آئے ہیں۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ اناڑی کھیلنے پر بضد ہو تو کھیل کا ستیاناس ہو کر رہتا ہے!

گئے زمانوں کے لوگ بھی خدا جانے کس دُنیا سے آئے تھے کہ ہر وقت اُصولوں کا خیال رہتا تھا۔ اعلیٰ طبقات کے چلن کا تو ذکر ہی کیا، قصاب بھی ایسے اعلیٰ درجے کے تھے کہ آموختہ نہیں بُھولتے تھے۔ ہر وقت یہ خوف دامن گیر رہتا تھا

کہ کچھ ایسا ویسا کرنے کی صورت میں ساکھ داؤ پر نہ لگ جائے۔ کہاں تو جنگ کے وہ میدان کہ رُگ پٹھا دیکھ پانا ممکن نہ ہو تو سامان سمیٹ کر ایک طرف ہٹ جایئے۔ اور کہاں آج کی سیاست کہ اِس میں آیئے تو اِسی کے اور اِس جیسے ہی ہو جایئے ! یعنی
!جو بھی نمک کی کان میں پہنچا، نمک ہوا

جو لوگ عوام کی تائید سے حکمراں طبقے میں پہنچتے ہیں اُن میں بھی حکمرانی کی خُو اور بُو رچ بس جاتی ہے۔ جس طرح جنگل میں تنہا بھینسے کو بُھوکے شیروں کا گروہ گھیر لیتا ہے اور جسم پر جگہ جگہ دانت گاڑ کر اُسے پچھاڑنے پر تُل جاتا ہے بالکل اُسی طرح ہمارے ہاں بھی یار لوگ جب قومی وسائل پر مُتصرف ہوتے ہیں تو درندے بننے میں دیر نہیں لگاتے۔ قومی خزانے پر وہ بُھوکے شیروں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں ! کوئی اُنہیں روک نہیں پاتا۔ روکے بھی تو کیسے ؟ تماشا دیکھنے والے ہی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے !کہ یہ تماشا ختم ہو۔ یا کم از کم مینڈیٹ کی مُدت پوری ہونے تک تو چلے

بے شعور اور پس ماندہ معاشروں کی جمہوریت کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ جن کے وسائل ہیں وہی اِن پر شب خون مارنے والوں کا انتخاب کرتے ہیں ! اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جن کی درندگی تمام شکوک سے بالا ہو اُنہیں بھی تین

تین چار چار مرتبہ دانت گاڑنے کا موقع دیا جاتا ہے ! اِسی کیفیت کے لیے انگریزی میں کہتے ہیں کہ شو چلتا رہنا چاہیے۔ لوگوں کا کیا ہے، وہ تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ اہمیت تماشے کی ہے۔اِس کی رنگینی اور تابانی ماند نہ پڑے !

جب کچھ بھی ڈھنگ سے نہ ہو رہا ہو، سبھی کچھ بے ہنگم چل رہا یا چلایا جا رہا ہو تو دِلّی کے کرخنداروں کی زبان میں کہا جاتا ہے کہ اَندھی مچی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں بھی سیاست اور حکمرانی کے نام پر اَندھی ہی مچی ہوئی ہے۔ اور اللہ ہی جانتا ہے کہ اِس قید سے اب کیسے نِکلنا ہوگا؟

کوئی جل گیا اور کسی نے دُعا دی

تماشے ہیں کہ ختم نہیں ہوتے۔ رونق میلہ سیلاب کے مانند ہے۔ شروع ہوتا ہے تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ بارش کا موسم سال میں ایک بار آتا ہے اور سیلاب لاتا ہے۔ سیلاب آکر، چند بڑوں کو امداد کی مد میں آئے ہوئے کروڑوں بلکہ اربوں روپے کمانے کا موقع فراہم کرکے اور غریبوں کے ارمانوں کی زمین پر مزید خشک سالی پھیلاکر، گزر جاتا ہے مگر تماشوں کا سیلاب کہیں دم لیتا دکھائی نہیں دیتا۔
الیکشن آیا ہے تو بہتوں کے بھاگ جاگ اُٹھے ہیں۔ گویا الیکشن نہ ہوا، چھینکا ہوا جو بلّیوں کے بھاگوں ٹوٹا ہے! ہر انتخابی مرحلہ قوم کو مست الست رکھنے کا ذریعہ ثابت ہو رہا ہے۔ جنہیں یقین ہو چلا ہو کہ بہتر زندگی بسر کرنا اب ممکن نہیں وہ ہر معاملے میں دل بستگی کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔ مِل جائے تو ٹھیک ورنہ تراش لیتے ہیں! انتخابات کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ ہر مرحلہ سُپر اسٹور کی طرح ہے جس میں سب کو اپنی مرضی کا مال مِل کر ہی رہتا ہے۔ اب ٹکٹوں کی تقسیم ہی کا معاملہ لیجیے۔ اِس ایک تماشے نے پُھول کِھلنے کے موسم میں غضب کے گل کِھلائے ہیں! سیاسی جماعتیں عجیب مخمصے میں ہیں۔ ٹکٹوں کی تقسیم نے جانے کِتنوں کا پتّہ کاٹ دیا اور ٹکٹ کٹوا دیا ہے۔ جو سیاسی

جماعتیں الیکشن کے شیڈول کا اعلان ہونے سے بہت پہلے ٹکٹ الاٹ کردیا کرتی تھیں وہ اِس بار کاغذاتِ نامزدگی منظور ہو جانے کے بعد بھی طے نہیں کر پا رہیں کہ کون اپنا ہے اور کون بیگانہ ! مقطع کس نے دیکھا ہے، یہاں تو مطلع ہی میں سُخن گسترانہ بات آ پڑی ہے !

کسی زمانے میں پی ٹی وی ایوارڈز کی تقریب کے دعوت نامے نصیب والوں کو ملا کرتے تھے۔ ضمیر جعفری مرحوم نے کہا تھا

شہر میں بٹنا پی ٹی وی تقریب کے دعوت ناموں کا

منظر تھا راشن ڈپو پر پبلک کے ہنگاموں کا !

اب کے الیکشن ٹکٹوں کی تقسیم نے بھی کچھ ایسا ہی منظر پیدا کیا۔ ٹکٹ بانٹنے کے معاملے نے پیپلز پارٹی، ن لیگ اور تحریکِ انصاف کو یکساں پریشان اور ہراساں کیا ہے۔ ایک طرف پارٹی قیادت کا دِماغ گھوما ہوا ہے اور دوسری طرف متوقع امیدوار پریشان ہیں کہ وفاداری کے معاملے میں حتمی فیصلہ کس کے حق میں کریں۔ مکلی کے قبرستان والا ضلع ٹھٹھہ پیپلز پارٹی کی اُمیدوں کا مرگھٹ ثابت ہونے پر تُلا ہوا ہے۔ سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ کو اِس پیرانہ سالی میں شیرازی برادران کے خلاف پریس کانفرنس کرنی پڑی ہے ! اُنہوں نے الیکشن کمیشن سے مطالبہ کیا ہے کہ کسی سے وفا نہ کرنے کی پاداش

میں شیرازی برادران کو لوٹے کا انتخابی نشان الاٹ کیا جائے۔ الیکشن کمیشن کے حکام بھی حیران تو ہوں گے کہ یہ تو پیپلز پارٹی اور شیرازی برادران کا اندرونی معاملہ ہے، کوئی تیسرا کیا کرسکتا ہے! شیرازی برادران ضلع ٹھٹھہ میں پیپلز پارٹی کا شیرازہ بکھیرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ویسے شیرازی برادران کو یاد رکھنا چاہیے کہ بھنگ کے پودے کا انتخابی نشان کسی کو الاٹ نہیں ہوا ہے!

ن لیگ اور تحریکِ انصاف بھی پریشان ہیں کہ ٹکٹوں کی تقسیم کے اسٹیشن سے اپنی ٹرین کو بحفاظت کس طرح آگے بڑھائیں۔ کئی ہیں جو رُوٹھ کر بیٹھ گئے ہیں۔ بعض نے تو ٹکٹ بھی واپس کر دیئے۔ اور یہ بھی نہیں بتایا کہ ٹکٹ کے ساتھ وہ اور کیا چاہتے تھے یا چاہتے ہیں! ٹکٹ نہ ملنے پر کوئی کھمبے پر چڑھ گیا، کسی نے کنپٹی پر گولی چلانے کی دھمکی دے ڈالی۔ میڈیا والوں کو تو لوگوں کی پریشانی سے محظوظ ہونے اور قوم کو محظوظ ہونے کا موقع فراہم کرنے کا بہانہ چاہیے۔ کوئی بے چارا ٹکٹ نہ ملنے پر احتجاجاً کھمبے پر چڑھا اور ڈی ایس این جی پہنچ گئی لائیو کوریج کے لیے! ایک کیس میں تو یہ بھی ہوا کہ بندہ کھمبے پر چڑھا۔ اور پھر انتظار ہی کرتا رہا کہ کوئی اُتارے یا اُترنے کو کہے۔ مگر لوگوں کو محظوظ ہونے سے فُرصت مِلتی تو اُسے اُتارنے کا سوچتے یا اُترنے کو کہتے! مایوس ہو کر بے چارا خود کو سَچّا پاکستانی ثابت کرتے ہوئے نیچے اُتر

!آیا
جب بھی سیاسی جماعتوں کی قیادت نے ٹکٹ فائنل کرنے کے لیے اجلاس کیا، ہنگامہ برپا ہوا۔ پارٹی کارکنوں ہی نے ایسی کیفیت پیدا کردی کہ ع
!تماشا ختم ہو جائے ہمارا، پھر چلے جانا
پارلیمانی بورڈ جب ٹکٹ الاٹ کرنے بیٹھے تو سب دِل تھام کر بیٹھے۔ اور جب ٹکٹ کا اعلان ہوا تو عجیب ہی کیفیت دِکھائی دی۔ کسی کی حالت "دِل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے" والی تھی اور کسی کا دِل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ ع
!کوئی جل گیا اور کسی نے دُعا دی
جن کے دامن میں ٹکٹ کا پُھول کِھلا وہ لپک کر میڈیا سے بتیانے لگے۔ اور جن کی مُراد بر آنے سے رہ گئی وہ مُنہ پھیر کر، دامن جھاڑ کر چل دیئے۔ ع
!اپنی بَلا سے بُوم بسے یا ہُما رہے
تاریک راہوں میں وہ مارے گئے جو کشتیاں جلاکر آئے تھے۔ آگے کچھ دِکھائی نہیں دیتا اور پَلٹنے کی گنجائش نہیں۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ یعنی

خُدا بھی نہ ملا اور صنم سے وصال کا آسرا بھی گیا! ایسے میں چند ایک ذہین ہیں جو اب تک بچ بچا کر چل رہے ہیں۔ شاہ محمود قریشی تحریکِ انصاف کے وائس چیئرمین ہونے کے باوجود ایک حلقے سے آزاد اُمیدوار ہیں۔ گویا پارٹی کچھ کرنے کے قابل نکلی تو ٹھیک ورنہ بوریا بستر اٹھا کر کسی بڑی پارٹی میں ڈیرا ڈال لیا جائے گا! مخدوم کو تو خدمت !کرانے سے غرض ہے۔ یہ کرے یا وہ کرے

ٹکٹوں کی تقسیم ایسا سِتم ظریف معاملہ ہے کہ بندہ عدلیہ سے از خود نوٹس لینے کی فرمائش کر سکتا ہے نہ الیکشن کمیشن کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ رہ گئے الیکٹرانک میڈیا والے تو وہ حاضر ہیں۔ اُنہیں تو ایسے مواقع کی تلاش رہتی ہے جن میں بی جمالو کا کردار پوری سہولت، آسانی اور روانی سے ادا کیا جاسکے! اگر پارٹی نے کسی کو نظر انداز کردیا ہے تو ہرگز مایوس نہ ہو، میڈیا والے نظر انداز نہیں کریں گے! اُس کی دُکھ بھری کہانی تمام ضروری وژوئل اور میوزیکل ٹچز کے ساتھ پیش کی جائے گی۔ قوم کو ہر "المیے" سے باخبر رکھنا آخر کو میڈیا کی ذمہ داری ہے! حالات کو بس اِتنا کرنا ہے کہ کسی بندر نُما معاملے کو آگے کردے، کوریج کی ڈگڈگی حاضر ہے۔ یہ ڈگڈگی بج رہی ہے، بجتی رہے گی۔ چینلز کا معاملہ تو یہ ہے کہ

!جو آئے، آئے کہ ہم دِل کشادہ رکھتے ہیں

بتانے والے بتاتے ہیں کہ کئی ایسے بھی ہیں جو ٹکٹ نہ ملنے پر سُکون کا سانس لیتے اور شکرانے کا سجدہ کرتے پائے گئے کہ آبرو بچ گئی ! الیکشن لڑتے اور ہارتے تو پلّے کیا رہ جاتا؟ ٹکٹ سے محروم رہ کر میڈیا پر جلی کٹی باتیں سُنانے کا جو موقع ملا اُسے اُنھوں نے بونس جانا! کئی سیاسی جماعتوں نے بیشتر دیرینہ کارکنوں کو ایسے بونس دینے ہی پر تو اکتفا کیا ہے!

لوگ جل جائیں گے

منتخب حکومت کے پانچ سال پورے ہوئے تو اہل وطن سے اظہار یکجہتی کے طور پر ہم نے بھی سُکون کا سانس لیا تھا۔ مگر دِل میں تھوڑی سی کسک بھی تھی۔ "ہر دِل عزیز" وزیر داخلہ رحمٰن ملک کے بچھڑنے کا زیادہ دُکھ تھا کہ اب دِل کو بہلانے والی باتیں کون کرے گا! ساتھ ہی ساتھ منظور وسان کے رخصت ہونے کا بھی رنج تھا کہ اب کون ہمیں اپنے خواب سُنا کر کچھ دیر کے لیے دُنیا کے غموں سے دور کیا کرے گا! اب احساس ہو رہا ہے کہ ہم ایسے بدنصیب بھی نہیں کہ رحمٰن ملک اور منظور وسان جیسے "نابغوں" سے زیادہ دور رہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ منظور وسان کی کمی پوری کرنے کے لیے عمران خان نے خوابوں کا قلمدان سنبھال لیا ہے! اور ہمیں یقین ہے کہ اُن کے بیان کردہ پہلے خواب ہی نے منظور وسان کے اوسان خطا کر دیئے ہوں گے!

جہاں امن بحال کرنے کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے ہماری فورسز کو سَر دَھڑ کی بازی لگانی پڑی ہے اُسی سوات کے صدر مقام مینگورہ میں گزشتہ دنوں انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے تحریکِ انصاف کے سربراہ نے ایک خواب عوام سے شیئر کیا۔ عمران خان نے بتایا کہ اُنھوں نے خواب میں تحریک انصاف

کو کلین سوئیپ کرتے دیکھ لیا ہے، چند ہفتوں بعد وہ وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھا کر حکومت تشکیل دیں گے۔

خواب دیکھنے پر تو شاید دُنیا بھر میں کہیں بھی پابندی نہیں مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں تھوڑی بہت پابندی عائد کی جانی چاہیے۔ بات یہ ہے کہ لوگ خواب دیکھنے کے معاملے میں منطق کے تقاضوں کو بھی بُھلا دیتے ہیں۔ لاٹری کا ایک ٹکٹ یا ٹکٹوں کی ایک سیریز خرید کر بمپر پرائز کا خواب دیکھنا بُری یا غیر منطقی بات نہیں۔ مگر صاحب ! ٹکٹ خریدے بغیر لاٹری جیتنے کا خواب کس طور دیکھا جاسکتا ہے؟ اگر خواب دیکھنے پر پابندی عائد کرنا ممکن نہ ہو تو کم از کم اُن کے بیان کرنے ہی کی کچھ حُدود مقرر کردی جائیں۔ لوگ آخر کب تک اور کِتنا ہنسیں !

ممکن ہے سیاست دان اپنے عجیب و غریب خواب یہ سوچ کر بیان کرتے ہوں کہ قوم کو اِتنے دُکھ دیئے ہیں تو تھوڑا بہت سُکھ بھی دیا جائے ! اگر واقعی اُن کی سوچ یہ ہے تو ہم اُن کے جذبے کی قدر کرتے ہیں مگر وہ بھی تو ذرا سوچیں کہ قوم کِتنی کامیڈی برداشت کرسکتی ہے !

عمران خان نے زندگی بھر خواب دیکھے ہیں۔ کینسر اسپتال کا خواب دیکھا اور

پھر اُسے شرمندہ تعبیر بھی کیا۔ اِس سے پہلے کرکٹ ٹیم کو بلندی پر پہنچانے کا خواب دیکھا اور اُس خواب کے مقدر میں بھی تعبیر لکھ دی۔ ورلڈ کپ جیتا۔ مگر ہم یہ بھولتے ہیں کہ سیاست اور کرکٹ میں بہت فرق ہے۔ ورلڈ کپ ٹیم ورک کا نتیجہ تھا۔ جب ٹیم ورک غائب ہوا تو ہماری کرکٹ ٹیم ہی نہیں خود کرکٹ بھی خواب ہو کر رہ گئی! عمران کو صفِ اول کے کرکٹرز ملے تھے جنھوں نے ٹیم کے لیے رفعت یقینی بنائی۔ کیا تحریک انصاف میں صفِ اول کے ایسے سیاسی کھلاڑی ہیں جو میچ کا پانسا پلٹنے کی صلاحیت رکھتے ہوں؟

خواب بھی بڑی ستم ظریف ہوتے ہیں۔ اِدھر آنکھ کُھلی اور اُدھر سب کچھ غائب۔ خوابوں کی بسی بسائی جنت پلک جھپکتے میں اُڑن چُھو ہو جاتی ہے۔ اِنسان تلملا کر رہ جاتا ہے اور پھر انتقاماً خواب کو بیان کرکے اپنے دِل کو ٹھنڈک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ عمران خان کو یاد رکھنا چاہیے کہ سیاست خواب دیکھتے رہنے کے سوا کچھ نہیں۔ مگر ہر خواب بیان نہیں کیا جاتا۔ کچھ خواب تُرپ کے پتّے کے طور پر بچا کر بھی رکھے جاتے ہیں تاکہ مناسب ترین موقع پر بیان کئے جائیں! خواب اِس لیے بھی بیان نہیں کرنے چاہئیں کہ حاسدوں کی نظر لگ جاتی ہے!

دیکھ لو خواب مگر خواب کا چرچا نہ کرو
لوگ جل جائیں گے، سورج کی تمنا نہ کرو!

آپ کو یاد ہوگا کہ 2002 کے انتخابات میں عمران خان قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ اور اُس ایک سیٹ کی بنیاد پر بھی اُنھوں نے وزارتِ عظمیٰ کا خواب دیکھا تھا۔ لوگ حیران ہوئے کہ اگر کرکٹ ٹیم کے ارکان کی طرح گیارہ نشستیں بھی تحریک انصاف نے جیتی ہوتیں تو خواب دیکھنے میں کچھ مضائقہ نہ تھا۔ جمہوریت میں تو اکثریت والوں کی چلتی ہے۔ اگر ایک نشست کی بنیاد پر بھی عمران خان وزیر اعظم بننا چاہتے تھے تو ذرا یہ بھی فرمائیں کہ کیا ایسا کرنا چور دروازے سے اقتدار میں آنے کے مترادف نہ ٹھہرتا! غیر منطقی خواب کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ سورج چُھونے کی کوشش میں پنچھی کے پَر جل گئے! ایسی ہی کیفیت کو غالب نے یوں بیان کیا ہے۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
!جب آنکھ کُھل گئی تو زیاں تھا نہ سُود تھا

سوات کی حسین وادیوں میں عمران نے جو خواب دیکھا ہے اُسے شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے چولستان کے ریگ زار کی سی تپش سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ شاہ محمود قریشی نے بظاہر پارٹی لائن کے خلاف جا کر چولستان کی تپش بڑھادی ہے! قیادت کی سطح پر یہ نیم دِلی کسی بھی اعتبار سے اچھا شگون نہیں۔

بعض خواب ٹاس کی طرح بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر محض ٹاس جیت لینے سے میچ ہاتھ میں نہیں آ جاتا۔ ہر گیند پر پانسا پلٹتا رہتا ہے۔ رَستے پر چلنا بڑی فنکاری ہے۔ مگر خیر، رَسا تنا ہوا ہو تو مشق کے ذریعے اُس پر چلنا سیکھا جا سکتا ہے۔ اور اگر رَسا ڈھیلا ہو تو؟ ہماری سیاست بھی ڈھیلا رَسا ہے۔ ہچکولے کھاتے رہیے۔ اب گِرے کہ تب گِرے!

سیاسی خواب واقعی بہت سیاسی ہوتے ہیں۔ اِن پر بھروسہ کرنے والوں کو بالآخر خود ساختہ جلا وطنی اختیار کرنی پڑتی ہے اور پھر واپسی کے لیے این آر او کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

خواب دیکھنا اِنسان کی فطرت ہے۔ اور اگر اِنسان سیاست دان بھی ہو تو خوابوں کا لطف دو بالا سمجھیے۔ وہ خواب دیکھنے پر آتے ہیں تو عقل اور منطق کے حلقے کی حد بندی بھی بھول جاتے ہیں! خواب میں سیاست دان پتہ نہیں کون کون سی آرزوؤں کو تکمیل سے ہمکنار ہوتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ اگر تمام خواب بیان کر دیئے جائیں تو جلسہ گاہ میں قیامت برپا ہو جائے!

ہماری سیاست خوابوں سے عبارت رہی ہے۔ بیشتر سیاست دان سوتے بھی تو خواب میں تاکہ سُندر سپنا ٹوٹ بھی جائے آنکھ کھلنے پر خود کو خواب ہی میں پائیں! بقول غالب

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!

اقتدار کے خواب کم بخت ہوتے ہی ایسے ہیں کہ حواس اور اعصاب سبھی کچھ مَسخ کر ڈالتے ہیں! یہ خواب اچھے خاصے اِنسان کو منظور وسان اور عمران بنا کر دَم لیتے ہیں تحریک انصاف کے چیئرمین کو ہمارا مشورہ ہے کہ جو کام کرنے کا ہے وہ کریں۔ خوابوں کی ڈگڈگی بجانے سے تماشا زیادہ دیر چلے گا نہیں۔ یہ اچھی بات نہیں کہ خود تو ہنستے نہیں اور قوم کو ہنسا ہنسا کر بے حال کرنے پر تُل گئے ہیں! اور یہ بھی تو سوچیے کہ سویا ہوا شیر جاگ گیا یعنی منظور وسان بھی خواب بیان کرنے پر تُل گئے تو قوم اِتنی کامیڈی کس طرح برداشت کر پائے گی! الیکشن کمیشن کے جارہ کردہ ضابطہ اخلاق میں اِس کی بھی کچھ صراحت ہونی چاہیے تھی!

نوٹ چھاپنے کی بیماری

دودھ کے جلے چھاچھ کو بھی پُھونک پُھونک کر پیتے ہیں۔ اور دہشت گردی کے ستائے ہوئے واشنگ مشین کے ٹائمر کو بھی بم یا بم کا حصہ سمجھ کر شدید خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہماری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی جب ہم نے ٹی وی پر ٹِکر دیکھا کہ فوج نے سیکیورٹی پرنٹنگ پریس کارپوریشن کی تنصیبات کا کنٹرول سنبھال لیا ہے۔ ماضی میں جب بھی فوج نے طالع آزمائی کی ہے، سب سے پہلے پی ٹی وی، ریڈیو پاکستان اور سیکیورٹی پرنٹنگ پریس کو کنٹرول میں لیا ہے۔ لوگوں نے تو یہ بھی دیکھا کہ مین گیٹ کھلا ہونے پر بھی دیواریں کود کر عمارت کو کنٹرول میں لیا گیا! خیر، اس طرز عمل کے نفسیاتی اسباب و نتائج پر بحث پھر کبھی سہی۔ بات ہو رہی تھی کہ سیکیورٹی پرنٹنگ پریس کو کنٹرول کرنے کی۔ جوانوں کو تعینات دیکھ کر ہم سہم سے گئے۔ طرح طرح کے وسوسوں نے مکھیوں اور مچھروں کی طرح ہمیں گھیر کر کاٹنا شروع کردیا۔ خیر گزری کہ چند ہی لمحات کے بعد ٹی وی اسکرین پر نمودار ہونے والے ایک اور ٹِکر نے ہماری تشویش اور اندیشوں کا گلا بروقت گھونٹ دیا۔ یہ دیکھ کر دِل کو سکون ملا کہ سیکیورٹی پرنٹنگ پریس کو اِس لیے کنٹرول میں لیا گیا ہے کہ وہاں بیلٹ پیپرز کی طباعت شروع ہو رہی ہے۔

مگر پھر خوشگوار حیرت بھی ہوئی۔ حیرت یوں کہ اب تک ہم یہی سمجھتے آئے تھے کہ سیکیورٹی پرنٹنگ پریس کا کام صرف کرنسی نوٹ چھاپنا ہے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ اِس پریس کی مشینوں پر ٹکٹ چلانے والے کاغذی ٹکڑوں کے علاوہ بھی کچھ چھپتا ہے۔

مینڈیٹ کے مطابق حال ہی میں میعاد پوری کرنے والی جمہوری حکومت پانچ برسوں کے دوران سیکیورٹی کا مسئلہ تو خیر حل نہ کر سکی مگر ہاں، سیکیورٹی پرنٹنگ پریس کی سیکیورٹی اُس نے ٹائٹ رکھی تاکہ مشینیں کام کرتی رہیں اور معیشت چلتی رہے!

منتخب حکومت کو پانچ برسوں میں اتحادیوں سمیت کچھ بھی آسان نہیں ملا۔ حالات نے قدم قدم پر محاذ کھولے۔ عوام کی خدمت پر مامور حکومت کو ملک کی بقاء اور سلامتی یقینی بنائے رکھنے کا مینڈیٹ ملا تھا۔ مگر جمہوریت کے نام پر یہ تماشا بھی قوم نے دیکھا کہ حکومت کا بیشتر وقت اپنی بقاء کا اہتمام کرنے پر صرف ہوا! یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ اِن پانچ برسوں میں سیکیورٹی کے ادارے زیادہ لڑے یا حکومت نے ایوان ہائے اقتدار کے مختلف مورچوں پر زیادہ "دادِ شجاعت" دی! جمہوریت کو بچانا ضروری، بلکہ لازم تھا۔ عوام کا کیا ہے، وہ تو ہر دور میں رہے ہیں اور رہیں گے!

ویسے تو زمانے کا چلن یہ ہے کہ رات گزرتی ہے تو سُورج نکلنے پر آنکھ کھلتی ہے۔ جمہوریت میں کائنات کے اُصول پلٹ جاتے ہیں۔ عوام کے ووٹوں سے ملنے والے مینڈیٹ کی شام ہونے کو آئی تو حکومت ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ معاملات کو تیزی سے سمیٹ کر پوٹلے باندھے گئے۔ تمام مسائل راتوں رات حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ کوئی شعبہ رہ نہ جائے یعنی بچنے نہ پائے!

کراچی میں ایک زمانے سے قتل و غارت کی آگ لگی ہوئی ہے۔ پارلیمنٹ میں اِس صورتِ حال پر کئی بار آواز بلند ہوئی مگر حکومت چوہدری شجاعت کی طرح ''مِٹّی پاؤ'' کے فارمولے پر عمل پیرا رہی۔ کراچی کے حالات درست کرنے کا معاملہ چند نمائشی اقدامات تک محدود رہا۔ بظاہر یہی یقینی بنایا جاتا رہا کہ کراچی کے شہریوں کو خاک و خون میں غلطاں کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو۔ کراچی کے معاملات کو اِس قدر نظر انداز کیا گیا کہ شہر بارود کے ڈھیر میں تبدیل ہوگیا۔ کوئی ایک آدھ غلط بیان کی دِیا سلائی بھی پھینک دے تو شہر کے کئی علاقے بم کی طرح پھٹ پڑتے ہیں! شہر کئی شہروں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ نو گو ایریاز کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ شہریوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے خوف کا یہ عالم ہے کہ کہیں واشنگ مشین کا ٹائمر بھی پڑا تو بم کا گمان گزرتا ہے!

میعاد ختم ہونے کو آئی تو حکومت کو اچانک بہت کچھ یاد آگیا۔ گویا جمہوری فلم کے دی اینڈ میں ہیروئن کی یادداشت واپس آگئی ! زہے نصیب ! یادداشت کی واپسی کے بعد حکومت نے سب سے پہلے کراچی کو پہچانا۔ برسوں پوری آزادی سے لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم رکھنے والوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلانے کا عہد کیا گیا، چند نمائشی اقدامات بھی کئے گئے۔ مگر اِس کا نتیجہ کیا نکلنا تھا۔ وہی، ڈھاک کے تین پات۔ سابق وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ شر پسندوں کو جس طرح للکارتے تھے اُسے ڈرانے سے زیادہ ہنسانے کی کوشش ہی کہا جاسکتا ہے !

اگر اشعار خود بخود موزوں ہوں تو "آمد" کہلاتے ہیں۔ جب طبیعت شعر کہنے پر مائل نہ ہو تو شُعراء کو زور لگانا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں موزوں کئے جانے والے اشعار آورد" قرار پاتے ہیں۔ اگر زیادہ عام فہم زبان استعمال کی جائے تو یہ بھرتی کے اشعار" کہلائیں گے۔ منتخب حکومت کے پاس آمد کے شعر کہنے کی جو تھوڑی بہت صلاحیت تھی اُس کا معقول حصہ اپنی بقاء پر صرف اور اپنی ہی صفوں میں موجود بد نظروں کی نوحہ گری پر نچھاور ہوا۔ رہی سہی کسر مفاہمت کے فلسفے کی قصیدہ خوانی نے پوری کردی۔

حکومت جاتے جاتے مختلف اداروں، وزارتوں اور محکموں میں اندھا دھند بھرتی کے ذریعے اپنا دیوان بھرتی کے اشعار سے مکمل کرنے پر تُلی ہوئی دکھائی دی۔ ہنگامی، بلکہ جنگی بُنیاد پر سرکاری محکموں اور اداروں میں بھرتی کئے جانے والوں یا متعلقہ اداروں کا مستقبل کیا ہوگا، اِس کے بارے میں سوچنے کی زحمت کسی نے گوارا نہ کی! بے روزگاری ختم کرنا لاکھ مستحسن سہی، مگر اِس عمل کے نام پر اداروں کے وجود ہی کو اُلٹ پلٹ دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟

بے چاری منتخب کا آدھا وقت تو اتحادیوں کو منانے اور بہلانے پُھسلانے میں صرف ہوا۔ حلیفوں کے "تحفظات" دور کرنے سے فُرصت ملتی تو عوام کو تحفظ فراہم کرنے کا سوچا جاتا۔ تھوڑی سی فراغت نصیب ہوتی تھی تو وہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کا انتظام کرنے پر خرچ ہو جاتی تھی! جمہوریت کو نوٹ چھاپنے اور مال سمیٹنے کا ذریعہ سمجھنے والی حکومت کو بُھولنے کی بیماری لاحق تھی مگر دو معاملات میں اُس کا حافظہ خوب کام کرتا رہا..... نوٹ چھاپنا اور بینکوں سے قرضے لینا۔ عوام پریشانی سے دوچار رہے۔ سیکیورٹی کا معاملہ بھلے ہی کھٹائی میں پڑا رہا مگر سیکیورٹی پرنٹنگ پریس کو خوب کام پر لگایا جاتا رہا۔ پاسپورٹ چھاپنے والی مشینیں چھ چھ ماہ خراب رہیں اور قوم کے پڑھے لکھے اور ہنر مند افراد کا مستقبل مِٹّی میں ملتا رہا مگر نوٹ چھاپنے کی مشینوں

کا سانس پُھولا نہ خراب ہوئیں ! حکومتی مشینری میں لے دے کر بس یہی وہ مشینیں ہیں جو ڈھنگ سے اپنا کام کرتی اور قوم کا کام اُتارتی آئی ہیں ! یہ عمل کچھ اِس تواتر سے جاری رہا کہ State Bank بے چارا Estate Bank ہو کر رہ گیا !

اب سیکیورٹی پرنٹنگ پریس میں بیلٹ پیپر چھپ رہے ہیں تو قوم حیران ہے۔ مگر قوم سے زیادہ حیرت تو شاید مشینوں کو ہوگی کیونکہ اُنہیں تو صرف کرنسی نوٹ چھاپنا یاد رہ گیا تھا ! اللہ کرے کہ جو بیلٹ پیپر چھاپے جا رہے ہیں اُن کی بدولت ایسی حکومت قائم ہو جو سیکیورٹی پرنٹنگ پریس کو دوبارہ صرف کرنسی نوٹ چھاپنے کے دھندے پر نہ لگائے !

دیکھیے اِس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا

انتخابات جب جب وارد آئے ہیں، قوم کو ایسا لگا ہے جیسے اُس نے اوکھلی میں سَر دیا ہے! پہلے عام انتخابات (1970) وہ تھے جو ملک ہی کو لے ڈوبے۔ اُس کے بعد جب قوم نے 1977 میں پولنگ کی سعادت حاصل کی تو جمہوریت ہی کی بساط لپیٹ دی گئی۔ 1985 میں انتخابات کو غیر جماعتی بنانے کے نام پر جمہوری عمل کو بانجھ بنانے کی کوشش کی گئی۔ اِس کے بعد بھی جمہوریت کے نام پر تماشوں کا سلسلہ جاری رہا۔
پولنگ تو وقفے وقفے سے ہوتی رہی مگر منتخب حکومت کو چلنے نہیں دیا گیا۔ بہانے تراش کر جمہوریت کی بساط لپیٹنے کی پوری کوشش کی گئی۔ قوم کو باور کرانے کی کوشش کی جاتی رہی کہ سیاست دان ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہیں۔ اور یاروں نے بھی خود کو قابل مذمت بنانے میں کم ہی کسر چھوڑی!
تقریباً چودہ سال قبل ایک بار پھر جمہوریت کا بوریا بستر گول کردیا گیا۔ اور قوم نے یہ چودہ برس اُسی طرح کاٹے ہیں جس طرح رام چندر جی نے بن واس کاٹا تھا! خدا جانے یہ اہل پاکستان کا سیاسی بن واس کب ختم ہوگا اور قوم حقیقی استحکام اور خوش حالی کی منزل تک کیسے پہنچے گی؟
اب ایک بار پھر قوم انتخابات کی دہلیز تک پہنچی ہے تو عالم یہ ہے کہ ہر دِل

میں خدشات اور وسوسے ہیں۔ انتخابی عمل کے بنیادی افعال مکمل ہو چکے ہیں۔ کاغذاتِ نامزدگی منظور ہونے کے مرحلے نے جو گل کھلائے ہیں اُن کی "مہک" سے سیاست کے مشام ہائے جاں اب تک "مُعطّر" ہیں! کئی بُت گرے ہیں یا گرائے گئے ہیں۔ قوم اب تک سمجھ نہیں پارہی کہ پہلے کسی کو نا اہل قرار دینا اور سزا سُنانا کس حساب میں تھا کہ بعد میں کلین چٹ دے دی گئی! کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زیادہ سے زیادہ انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اہلِ سیاست کے لیے بدحواسی کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ یعنی ایسا ماحول پیدا کرنا مقصود ہے جس میں کوئی درست فیصلے کرنے کی پوزیشن میں نہ رہے، سب کچھ اُلجھ کر یا اُلٹ پلٹ کر رہ جائے۔

سیاسی جماعتیں اب تک ذہن نہیں بنا سکیں کہ انتخابی مہم کس طور چلانی ہے۔ پولنگ میں اب بیس دن رہ گئے ہیں مگر انتخابی مہم کی گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی ہے۔ اب تک آئل اور پانی ہی چیک کیا جارہا ہے۔ انتخابی سڑک پر جلسوں کی ٹریفک برائے نام ہے۔ رونق دکھائی نہیں دے رہی!

پرویز مشرف کے خلاف مقدمات کے آغاز اور اُنہیں حراست میں لیے جانے سے تھوڑی بہت ہلچل مچی ہے۔ یہ بات فہم سے بالا ہے کہ وہ کس بنیاد پر واپس آئے۔ مقدمات تو موجود تھے اور اُنہیں اندازہ بھی ہوگا کہ واپسی پر عدالت کا

سامنا ہو سکتا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ تو کیا وہ ضمانت یافتہ ہیں؟ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے اُنہیں کوئی ضمانت فراہم کی ہے؟ اگر ہاں تو کیوں؟ ایک مدت سے ملک میں بحث ہو رہی ہے کہ پرویز مشرف پاکستانی سیاست میں کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ قومی تاریخ شاہد ہے کہ کسی آمر اور طالع آزمانے کبھی سیاسی میدان میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ اور اس کا سبب یہ تھا جس کسی نے جمہوریت کی بساط لپیٹی اُس میں کبھی اِتنی ہمت ہی پیدا نہیں ہوئی کہ سیاسی جماعت بنا کر عوام کے سامنے آسکے۔ پرویز مشرف نے کمانڈو ہونے کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ جمہوریت کا چراغ گل کرکے اقتدار کے مزے لوٹنے کے بعد سیاسی جماعت بنا کر جمہوریت کا چیمپئن بننے کے لیے کمانڈو ہی کا جگرا چاہیے!

انتخابات قریب آ رہے ہیں تو قتل و غارت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ امیدواروں کے جلسوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کراچی میں ٹارگیٹ کلنگ کا دائرہ وُسعت اختیار کر رہا ہے۔ سیاسی جماعتوں کے تحفظات ہیں کہ اُن کی انتخابی مہم سبوتاژ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ تحفظات کچھ ایسے بے بنیاد بھی نہیں۔ کراچی میں معاملات کو خراب کرنے کی کوشش صاف دِکھائی دے رہی ہے۔ اغوا کے بعد قتل کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ خیبر پختونخوا میں بھی معاملات حوصلہ افزاء دکھائی نہیں دیتے۔ ایسے میں ہر ذہن میں خدشات اور وسوسوں کی فصل کا

اُٹھنا فطری کا امر ہے۔ قوم یہ سوچ کر ہلکان ہوئی جارہی ہے کہ پولنگ میں تو ابھی بیس دن پڑے ہیں۔ گزشتہ پندرہ بیس دنوں کا ریکارڈ بتا رہا ہے کہ کسی جامع منصوبے کے تحت حالات بگاڑے جارہے ہیں۔ ہر دن خرابی میں اضافہ کر رہا ہے۔ انتخابات تک قوم کو کِن کِن مراحل سے گزرنا ہوگا؟

لوگ یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ جمہوری عمل اِس قدر جاں گُسل کیوں ثابت ہوتا ہے۔ جب حکمران منتخب کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو قوم کو سخت نامساعد حالات کی سُرنگ سے کیوں گزرنا پڑتا ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ حالات اچانک خرابی اور عدم توازن کی طرف چلے جاتے ہیں؟ کیا یہ سب ناگزیر ہے؟

پاکستان ایک بار پھر فیصلہ کن دوراہے پر آگیا ہے۔ ایک بار پھر انتخابات کے نام پر مارو یا مر جاؤ" والی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ ذرا سا غور کرنے پر یہ بات تو سمجھ میں آسکتی ہے کہ جن کے ہاتھ میں سب کی ڈور ہے وہ چاہتے ہیں کہ ایک بار پھر ایسا منقسم مینڈیٹ آئے کہ مخلوط حکومت کے نام پر چُوں چُوں کا مِثالی مُربّہ تیار ہو! کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا کے مصداق جب مختلف الخیال اور مختلف العزائم لوگ حکومت بنائیں گے تو کوئی گاڑی کو آگے لے جانا چاہے گا اور کوئی ریورس گیئر لگانے پر تُلا ہوگا! جب مُعلّق پارلیمنٹ ہوگی تو مفادِ عامّہ کے منصوبے اور قومی مفادات بھی بے

یقینی کی سُولی ہی پر لٹکے رہیں گے!

قوم جمہوریت چاہتی ہے۔ مگر ایسی جمہوریت کِس کام کی جس کے بطن سے ڈھنگ کی کوئی بات ہویدا ہی نہ ہو؟ ملک کے اہم ترین اُمور پر متصرف پس پردہ قوتیں چاہتی ہیں کہ جمہوریت کے نام پر صرف تماشا ہو۔ اِس کے لیے اُنھوں نے اپنے مُہرے بھی تیار کر رکھے ہیں۔ اِن شہزادگان کی پانچوں انگلیاں گھی میں رہتی ہیں اور سَر کڑھائی میں۔ وہ رند کے رند رہتے ہیں اور جنّت بھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ ملک پر اب تک مسلط رہنے والے یہ اہلِ ہُنر قوم کی آنکھ سے کاجل چُرانے کا ہُنر جانتے ہیں۔ قول و فعل کا تضاد نمایاں ہے مگر چرب زبانی سے یہ اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالتے آئے ہیں۔

اور عوام؟ اُن کا مقدر آسانی سے کہاں بدلتا ہے؟ آمریت کی شعبدہ بازی ہو یا جمہوریت کا پُتلی تماشا، عوام کو تو گزارے ہی کی سطح پر جینا پڑتا ہے۔ اب پھر حکمرانوں کے انتخاب کے لیے جمہوریت کو زحمت دی جارہی ہے۔ آثار تو اچھے نہیں مگر دِل سے یہی دُعا نکلتی ہے کہ اللہ نصیب اچھا کرے۔ قوم پھر جمہوری، انتخابی عمل کے بحر میں غوطے کھا رہی ہے۔ موتی پانے کی آرزو ہے۔ دِلوں میں اُمنگیں پروان چڑھ رہی ہیں۔ حق تعالیٰ خیر کرے۔ اِس بار اللہ جمہوریت کی تہہ سے چند ایک موتی بخش دے تو قوم نہال ہو۔ ع

دیکھیے اِس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا!

جیسی روح ویسے فرشتے

ببول کا پودا لگا کر گلاب کے اُگنے کی آرزو کی جا سکتی ہے؟ کی تو جا سکتی ہے مگر اِسے نری حماقت سے تعبیر کیا جائے گا۔ کچھ نہ کرنے پر بھی کسی صِلے کی تمنا ممکن ہے؟ کسی چیز کی تمنا کرنے میں کون سا کچھ خرچ ہوتا ہے! سوال تو نتیجے کا ہے کہ ایسی تمنا رنگ کیا لائے گی۔ ہم سب کچھ جانتے، بوجھتے انجان بنے رہنے پر یقین رکھتے ہیں۔ مشکل حالات جب بلّی کی طرح ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم بھی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرکے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ خطرہ ٹل گیا۔ اور پھر خطرہ ہم سے بہت کچھ اور ہم میں سے بہتوں کو لیکر ٹلتا ہے! پوری قوم اِس نفسیاتی خلجان میں مبتلا ہے۔ اور جن کے ہاتھ میں نام نہاد قیادت ہے وہ عوام کی نفسیاتی کمزوریوں کا بھرپور فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

اہلِ پاکستان کی خواہشات، تمناؤں، آرزوؤں اور امنگوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ امکانات کی ایک پوری کائنات اِن میں سمائی ہوئی ہے۔ جب پاکستانی کچھ سوچتے (!) ہیں تو منطقی حدود کا خیال نہیں رکھتے اور کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں! ع

نکلے تھے کہاں جانے کیلئے، پہنچے ہیں کہاں معلوم نہیں!

مثلاً تعلیم کے لیے برطانیہ اور آسٹریلیا جانے کے خواب اپنی پلکوں پر سجوتے ہیں مگر جاب امریکا یا متحدہ عرب امارات میں چاہتے ہیں! بیدا چاہے چیچوں کی ملیاں یا خیر پور ناتھن شاہ میں ہوئے ہوں، کینیڈا میں مستقل رہائش کے آرزو مند رہتے ہیں!
وہ کون سی چیز ہے جو اہل پاکستان کی خواہشات کے دائرے میں شامل ہونے سے رہ گئی ہے؟ اچھی خاصی، اُردو جیسی زبان کے ہوتے ہوئے بیشتر پاکستانی انگریزی بولنے کی تمنا میں مَرے جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی بات چلے تو سلسلہ کلام اطالوی پیزا، چینی چاول اور روسی سلاد تک جا پہنچتا ہے! اپنی ڈِشوں میں کچھ بھی پسند نہیں۔ کباب بھی کھانے ہیں تو پاکستان کے نہیں، شام کے!
الیکٹرانکس جاپانی ہونی چاہئیں۔ اور جاپانی میوزک پلیئر پر گانے انڈین ہوں تو کیا بات ہے! فلمیں ہوں تو انگلش ہوں، ورنہ نہ ہوں! اور جب زندگی کی کشاکش سے دِل گھبرا جائے، ماحول کی یکسانیت شدید بیزاری کا احساس پیدا کرنے لگے تو تعطیلات یورپ کے کسی مُلک، بالخصوص سوئٹزر لینڈ میں گزاری جانی چاہئیں!
بیشتر پاکستانی برطانیہ یا آسٹریلیا میں تعلیم حاصل کرنے کی تمنا پوری ہونے

پر امریکا یا متحدہ عرب امارات میں جاب کی خواہش کو بھی تعبیر سے ہمکنار کرلیں اور عمر کے آخری ایام کینیڈا کی پُرسکون فضاؤں میں گزارنے میں بھی کامیاب ہو جائیں تو سکرات یعنی موت کی گھڑیاں مکہ مکرمہ میں گزارنا چاہتے ہیں! یعنی چاہتے یہ ہیں کہ دَم اللہ کے شہر میں نکلے۔ اور تدفین؟ تدفین کے لیے مدینہ سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں۔ اِس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے کہ جان خانہ کعبہ کی سرزمین پر جان آفریں کے سُپرد کی جائے اور مٹّی مدینے کی نصیب ہو؟ مگر صاحب! اِتنی سعادت پانے کے لیے زندگی بھی تو ایسی ہو جو اللہ کے دین کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو!

تعلیم، ملازمت، تعطیلات، ریٹائرمنٹ کی زندگی، کھانے پینے کے طور طریقوں، موت اور تدفین .... غرض ہر معاملے میں پاکستانی مکمل "عالمگیریت" پر یقین رکھتے ہیں! پوری دُنیا کو اپنانے کا ایسا جامع تصور کسی اور قوم میں خال خال ہی ملے گا! ہم عالمگیریت" کے اِس قدر دِلدادہ ہو چکے ہیں کہ اب اپنی سرزمین کسی کام کی دِکھائی نہیں" دیتی۔ آپ سوچیں گے ہم پاکستانی کچھ ایسا بھی چاہتے ہیں جو خالص پاکستانی ہو؟ یقیناً۔ ایک معاملہ ایسا ہے جس میں ہماری سوچ سراسر، یکسر پاکستانی ہے۔ ہم اور کچھ چاہیں نہ چاہیں، اِتنا ضرور چاہتے ہیں کہ جو ہماری قیادت کا فریضہ انجام دیں وہ خالص پاکستانی ہونے چاہئیں! ع

اِس سادگی پہ کون نہ مَر جائے اے خُدا!

جب سبھی کچھ ہم دنیا بھر لینا چاہتے ہیں تو پھر قائدین اپنی سرزمین کے کیوں؟ یہ تو سراسر بد دیانتی، بلکہ اُس سے بھی ایک قدم آگے جاکر، بے دیانتی ہے! اپنی سرزمین سے ہماری بیزاری ہی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ قائدین بھی باہر سے آتے ہیں یعنی بھیجے جاتے ہیں اور جو قائدین اپنے ہاں ہوا کرتے تھے وہ جلا وطنی اختیار کرکے دُور سے ڈور ہلاتے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں! وہ جانتے ہیں کہ قوم اپنے ہی ڈھول ذرا دُور سے سُنتی ہے تو سُہانے محسوس ہوتے ہیں!

دس برس پہلے کی بات ہے۔ ہم اپنے دفتر کے نزدیک واقع فلنگ اسٹیشن کے اسٹور میں داخل ہوئے۔ ارادہ ریفریشمنٹ کے چند آئٹمز خریدنے کا تھا۔ شیلف بھرے ہوئے دیکھے تو سوچا دیکھیں دُنیا میں کیا کیا بن رہا ہے۔ ریک پر چھوٹی بوتلیں دَھری تھیں۔ ان بوتلوں میں کنچوں کے حجم کی سفید گولیاں سی پڑی تھیں۔ غور سے دیکھا اور ٹیگ پڑھا تو معلوم ہوا کہ اسپین کی پیاز ہے جو شفاف سِرکے میں ڈوبی ہوئی ہے! پیاز اور سِرکے کا مجموعی وزن 90 گرام تھا اور قیمت کی مد میں 75 روپے درج تھے! ذرا یاد کیجیے، یہ تذکرہ دس سال پہلے کا ہے۔ اِس قوم کی عیاشی ملاحظہ فرمایئے کہ اسپین کی سِرکے میں ڈوبی ہوئی پیاز

کھائی جارہی ہے اور وہ بھی تقریباً سوا آٹھ سو روپے فی کلو کے نرخ پر! اگر وہ آئٹم آج بھی درآمد کیا جارہا ہوگا تو 90 گرام کی بوتل کی قیمت ڈیڑھ پونے دو سو روپے سے کیا ہی کم ہوگی! اگر اسپین سے زیتون یا اپنی سرزمین پر نہ اُگنے والی کوئی اور چیز منگوائی جائے تو کچھ ہرج نہیں۔ مگر کیا اب گوروں کی پیاز بھی خشک میوے کے نرخ پر خرید کر کھائی جائے گی؟

ایک طرف تو وطن سے محبت کے دعوے اور اِس کے لیے سب کچھ نچھاور کردینے کا عزم۔ اور دوسری طرف یہ عالم کہ اپنی زمین پر اُگنے والی نعمتوں سے مستفید ہونے کے بجائے دور اُفتادہ ممالک بلکہ براعظم سے پھل منگواکر کھانا۔ کراچی کی سڑکوں پر چین کی بے لذت ناشپاتی اور جنوبی امریکا کے ملک چلی سے درآمد شدہ سیب بھی ملتے ہیں۔ اگر یہ سیب لذیذ بھی ہوں تو کیا ہے، نرخ تو 500 روپے فی کلو تک ہے! ویسے تو خیر ہمیں پھل اور خشک میوہ جات کہیں سے منگوانے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر ضرورت محسوس بھی ہو تو ایسی چیزیں کیوں نہ منگوائی جائیں جو ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوتیں؟ جو کچھ اپنے ہاں پیدا ہوتا ہے وہی، کمتر معیار کے ساتھ، درآمد کرنے پر زرِ مبادلہ کیوں ضائع کیا جائے؟

فکر اور عمل میں ہم آہنگی نہیں ہوگی تو بھیانک نتائج ہی برآمد ہوتے رہیں گے۔ اگر ہم وطن سے محبت کرنے والے رہبر چاہتے ہیں تو پہلے وطن سے ہمیں خود

محبت کرنی ہوگی اور عمل سے اِس محبت کو ثابت بھی کرنا ہوگا۔ اِس سرزمین پر جو کچھ بھی اُگتا ہے اُس کے لیے ہمارے دِل میں احترام ہونا چاہیے۔ پیاز کوئی ایسی نعمت نہیں جسے اسپین سے منگوانے کا اہتمام کیا جائے۔ قومی دولت کو یوں ضائع کرنا کسی بھی اعتبار سے دانش کی دلیل نہیں۔ ہمیں وطن سے حقیقی محبت نہیں ہوگی تو قائدین بھی ویسے ہی میسر ہوتے رہیں گے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ کیا وقت نہیں آگیا کہ ہم اپنی روح کو نکھاریں تاکہ فرشتے بھی نکھرے ہوئے ملیں؟

کھیل کُود سے اداکاری تک

ہم بھی کتنے خوش نصیب ہیں کہ ایک ٹکٹ میں کئی مزے لُوٹتے ہیں۔ کرکٹ دیکھنے بیٹھتے ہیں کہ تو بہترین قسم کی اداکاری کے درشن ہوتے ہیں اور اداکاری سے محظوظ ہونے کا سوچیں تو کچھ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ اسکرین پر کون کون سے کھیل کھیلے جارہے ہیں! ہمارے ہاں کھیل اور اداکاری کو یہ کمال حاصل ہے کہ ایک رنگ میں سو رنگ دِکھاتے ہیں اور ہم، بخدا، بخوشی دیکھتے ہیں!

خبر گرم ہے کہ سابق مِس یونیورس سُشمیتا سین اپنی اصلی دُنیا کی تنہائی سے گھبرا کر ایک نئی کائنات تلاش کر رہی ہیں اور ساڈے شہر لہور دے اوکھے مُنڈے وسیم اکرم کو محبت کے فریم میں لینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ وسیم اکرم بھی خیر ننھے کاکے نہیں ہیں۔ اُنھوں نے بھی کئی دُنیائیں بلکہ کائناتیں دیکھ رکھی ہیں! کسی زمانے میں وہ گیند گھماتے تھے، اب فلمی ستاروں کے دِماغ گھماتے ہیں۔

میڈیا پر جب وسیم اکرم اور سُشمیتا سین کی شادی کے حوالے سے قیاس آرائیاں نشر ہوئیں تو وسیم اکرم نے کہا کہ یہ شادی میڈیا والے کرا رہے ہیں! وسیم اکرم کا یہ جوابی "یارکر" ہمیں پسند نہیں آیا۔ آتا بھی کیسے؟ ہمارے پیٹی بھائی یعنی الیکٹرانک میڈیا

والے رائی کو پربت بناتے ہیں مگر صاحب! رائی ہوتی ہے تبھی تو پربت بنتا ہے! ایک ٹی وی چینل سے گفتگو میں وسیم اکرم نے ہنستے ہنستے کہا۔ "میری شادی ہو رہی ہے اور مُجھی کو معلوم نہیں!" یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ خود جوڑے کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ محبت ہو گئی ہے۔ پھر جب میڈیا والے کاندھے پکڑ کر ہلاتے ہیں اور یاد دِلاتے ہیں تب یاد آتا ہے کہ پیار ویار ہوگیا ہے اور اقرار وقرار بھی کرنا ہے!

اب تو عالم یہ ہے کہ محبت پائی جاتی ہو نہ شادی کا ارادہ تب بھی "کمپنی کی مشہوری" کے لیے میڈیا والوں کو دور کی کوڑیاں لانے اور جی بھر کے ہانکنے سے نہیں روکا جاتا! باٹم لائن یعنی حتمی نتیجے پر نظر ہوتی ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کسی کام کے نتیجے میں بالآخر حاصل کیا ہوگا۔ بات میڈیا تک پہنچ جائے تو بگڑی ہوئی بات بھی کچھ نہ کچھ دے جاتی ہے! گویا

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا!

ایک زمانہ تھا جب کھیل کُود میں کھیل کُود کے سِوا کچھ نہ تھا۔ پھر یہ ہوا کہ کھیل کُود میں کُودنے کا تناسب بڑھ گیا۔ لوگ تھوڑا سا کھیل کر، ذرا سا نام کمانے کے بعد دوسرے شعبوں میں کُودنے لگے۔ تھوڑی بہت اداکاری کی آمیزش ہوئی تو معاملہ کچھ کا کچھ ہوگیا۔ فلمی ستاروں نے کھیل کُود میں دلچسپی لینا شروع کیا تو کھلاڑیوں نے سیکھا کہ

کھیلنے کے نام پر اداکاری میں زیادہ چانس اور مال ہے! کرکٹ میں رینا رائے کی دلچسپی بڑھی تو اُنھوں نے محسن حسن خان سے محبت پر مبنی فلم تیار کی جو شادی کے تھیٹر پر ریلیز ہوئی! اِس کے بعد رینا رائے تو جیسے تیسے اداکاری کرتی رہیں مگر محسن خان کرکٹ کے نہ رہے۔ اُنھوں نے پہلے تو فلموں میں انٹری دی اور "بٹوارہ" میں ونود کھنہ اور دھرمیندر کے مقابل کام کیا۔ پھر یہ ہوا کہ اُن کی شخصیت کا بٹوارہ ہوگیا اور وہ کرکٹ کے رہے نہ شوبز کے۔ ہاں، اداکاری کچھ کچھ باقی رہی۔ کرکٹ کی کوچنگ اور رننگ کمنٹری اب اداکاری ہی کے زُمرے میں آتی ہیں!

ویسے محسن خان ہیں بہت خوش نصیب۔ کرکٹ کی دنیا سے نکل کر شوبز کی طرف گئے اور وہاں بھی خاصی اچھی اننگز کھیلی اور پھر کرکٹ کی دنیا میں واپس آکر چند ایک اضافی فوائد بٹور ہی لیے۔ یہ اُن کے لیے خسارے کا سَودا نہیں رہا کیونکہ ع

رند کے رند رہے، ہاتھ سے "جنت" نہ گئی!

رینا رائے کو کامیاب دیکھا تو زینت امان نے ہماری ٹیم کی زینت عمران خان کو اپنی امان میں لینا چاہا! عمران خان نے زینت امان کی تحریک بر وقت سمجھ لی اور اپنے آپ سے انصاف کرتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئے! کرکٹر تھے، گیند کی لائن میں آکر کھیلنا جانتے تھے! مگر اُن کا یہ فن کرکٹ ہی تک محدود رہا۔ سیاست میں وہ کئی بار باہر جاتی ہوئی گیندوں کو خواہ مخواہ کھیل کر نتیجہ بُھگت چکے ہیں!

شعیب ملک اور ثانیہ مرزا کی شادی نے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا مگر لوگوں کو زیادہ حیرت اِس شادی کے اب تک برقرار رہنے پر ہے! بہتوں کو اِس پر بھی حیرت ہے کہ ایک کرکٹر کو اچانک ٹینس کی کھلاڑی سے محبت کیسے ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ ہارڈ بال سے پہلے شعیب ٹینس بال سے کرکٹ کھیلتے رہے ہوں جیسا کہ پاکستان میں عام ہے۔
وسیم اکرم کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ شادی میڈیا نے نہیں کرائی تھی۔ اور اُن دونوں نے بھی تاحال انکشاف نہیں کیا کہ شادی کرائی کس نے تھی!
وسیم اکرم خواہ مخواہ شرما رہے ہیں۔ اُنہیں دوستی کا قافلہ چلتا رکھنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ پاکستان اور بھارت کو کسی نہ کسی طرح جوڑے رکھنے کا ٹھیکا اب
کھلاڑیوں نے لے رکھا ہے یا فنکاروں نے! بھارت سرکار ہماری کرکٹ پر اِتنا دباو ڈالے رکھتی ہے کہ اب وینا ملک اور سارہ لورین (مونا لیزا) کو بولی وڈ کی پچ پر آگے بڑھ کر چھکّے لگانے پڑ رہے ہیں! پاک بھارت دوستی کو مضبوط کرنے کی میرا نے اپنی سی کوشش کی تھی۔ وینا ملک نے زیادہ جی داری کا مظاہرہ کیا اور تھوڑا آگے نکل گئیں۔ رہی سہی کسر سارہ لورین نے پوری کی ہے۔ مرڈر تھری میں اُنھوں نے اپنی آبرو اور قوم کے وقار کو مردانہ وار داؤ پر لگایا ہے!
میڈیا اگر شادی کرا رہا ہے تو اِس میں کچھ ہرج بھی نہیں۔ کمپنی کی تھوڑی مشہوری اور

سہی۔ وسیم اکرم اور سُشمیتا سین چاہیں تو کچھ دِن دِل پشوری ہی کے لیے ہنس ہنس کر ملتے رہیں۔ اچھا ہے، شُغل میلے میں ایک بڑے اسٹال کا اضافہ ہو جائے گا۔ اور ویسے بھی دونوں فارغ ہی ہیں۔ وسیم اکرم کوچنگ کو ایک طرف ہٹا کر اب واشنگ پاؤڈر اور دیگر مصنوعات کی فروخت بڑھانے کے لیے کوشاں ہیں۔ سُشمیتا سین بالی وُڈ کو تو بہت پال چکیں، اب گود لیے ہوئے بچوں کی پرورش پر توجہ دے رہی ہیں۔ اداکارائیں تو اب پوری پوری ٹیموں کو ایڈاپٹ کر رہی ہیں۔ ایسے میں ایک کامیاب کرکٹر کو ایڈاپٹ کرنے میں کون سا امر مانع ہے؟ کرکٹرز تو شلپا شیٹی اور پریتی زنٹا کی طرف سے بولی لگائے جانے کے منتظر رہتے ہیں اور کبھی کبھی تو بندہ بے دام نظر آتے ہیں! ایسے میں ہمارے وسیم اکرم کو شرمانے کی ضرورت نہیں۔

ہمارے سابق یارکر اسپیشلسٹ کے لیے بھارت نیا اور انوکھا نہیں۔ وہاں وہ بہت کھیل چکے ہیں۔ آنا جانا اب بھی لگا ہی رہتا ہے۔ ایسے میں کہانیوں کا سینہ در سینہ چلتے رہنا فطری امر ہے۔ لوگ داستانوں کے تانے بانے تو بُنتے ہی رہیں گے۔ جب اپنی کرکٹ کے میدان سے نکل کر وسیم اکرم بھارتی سرزمین تک پہنچ ہی گئے ہیں تو چند گام اور چل کر بالی وُڈ میں بھی قدم رکھ دینے میں کیا مضائقہ ہے؟ ع

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضاء اور سہی!

اور جیب کٹ گئی

ایک دیہاتی میلہ دیکھنے شہر گیا۔ میلے کی رنگینیوں میں وہ ایسا گم ہوا کہ کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو پتہ چلا کہ کسی نے جیب کاٹ لی ہے۔ بڑی مشکل سے گھر واپس پہنچا۔ کسی نے پوچھا میلہ کیسا تھا۔ اُس نے تپ کر جواب دیا۔ "کاہے کا میلہ ؟ میرا مال لُوٹنے کے لیے یہ سارا تماشا کھڑا کیا تھا!"

ہمارے ہاں بھی جب کبھی انتخابی میلے کی رونقیں جلوہ افروز ہوتی ہیں، بہتوں کی جیبیں کٹ جاتی ہیں۔ سابق صدر پرویز مشرف کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ الیکشن کے میلے کی رونقیں دیکھنے اور اِس میں دو چار کرتب دِکھانے کے ارادے سے وہ آئے تو منچلوں نے اُن کی جیب کاٹ لی ہے!

انگریزی میں کہتے ہیں کہ سارے راستے روم کی طرف جاتے ہیں۔ اِس وقت پاکستان میں تمام مقدمات پرویز مشرف کی طرف جاتے، بلکہ آتے دِکھائی دے رہے ہیں! وہ ابھی آکر ٹھیک سے بیٹھے بھی نہ تھے، سانس لیا تھا نہ دامن سنبھالا تھا کہ دَھر لیے گئے! سابق کمانڈو صدر کے پاس منصب نہیں رہا تو سبھی اُن کے خلاف کمانڈو بننے پر تُل گئے

ہیں۔ عمران خان اور پرویز مشرف کا مخمصہ مشترکہ ہے۔ دونوں کو مُشیر لے ڈوبے ہیں! عمران خان کے پاس تو خیر سے تھوڑے بہت آپشنز ہیں مگر پرویز مشرف کیا کریں، کہاں جائیں؟ اُنہیں تو "بندہ بے دام" جیسے لِکھاری بھی میسر نہیں جو کالموں کے ذریعے کُشتوں کے پُشتے لگادیں۔ اگر فضاء بنانے کے لیے حاشیہ بردار لکھاریوں کا پیٹ پالنے لگے تو آنے والی نسلوں کے لیے کیا بچے گا!

گوروں کو اُن کے اپنے دیس میں لیکچر دینا کیا کم مزے کا کام تھا؟ پرویز مشرف دُنیا بھر کی سیر بھی کر رہے تھے اور جیسے تیسے کچھ نہ کچھ بول کر مال بھی پیٹ رہے تھے۔ پتہ نہیں قریبی حلقے میں پائے جانے والے کِس گھامڑ نے سابق مردِ اوّل کے دماغ میں "مسٹر پاکستان" بننے کی ہوا بھری اور وطن واپسی کا مشورہ دیکر دوبارہ تنازعات اور مقدمات کی دلدل میں دھکیل دیا۔ محتاط الفاظ میں بھی اِسے نمک حرامی ہی کہا جائے گا! اور سابق صدر کو کیا ہوا تھا؟ اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مارنے بیٹھ گئے! لندن سے خوشی خوشی چلے اور دُبئی میں مختصر قیام کے بعد کراچی پہنچ کر پتہ چلا ع

!ناداں تھے ہم جو آپ کی محفل میں آ گئے

میڈیا والے تو جیسے چُھروں اور بُغدوں کی دھار تیز کرکے تیار بیٹھے تھے۔ سابق صدر کے طیارے کی کراچی میں لینڈنگ کی دیر تھی۔ ایک مُدت سے اُنہیں تلاش کرتی ہوئی پریشانیاں بھی فضاؤں کی سنگت ترک کرکے زمین پر اُتر آئیں! پُھولوں کی پتّیاں تو

بعد میں نچھاور ہوتیں، سوالات کے ڈونگرے پہلے برسنے لگے۔ ایک زمانے تک "میں کسی سے ڈرتا ورتا نہیں ہوں" کی گردان کرنے والے پرویز مشرف کی آنکھیں کراچی ایئر پورٹ کے باہر اپنے پرستاروں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھنے کو بے تاب تھیں۔ اور بے تاب ہی رہیں۔ تین چار ہزار افراد جمع ہوسکے اور اُن میں شارع فیصل سے گزرنے والے اور وہاں کچھ دیر ٹھہر کر تماشا دیکھنے والے بھی شامل تھے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کوئی نہ ڈرنے کا دعوٰی کرے اور پھر اِس دعوے کو درست ثابت کرنے کے لیے اِس دھرتی پر دوبارہ قدم رکھ بھی دے تو ایسا پھیکا سا خیر مقدم کیا اُس کی دِل شکنی کا سبب نہیں بنے گا! جس طرح عوام اپنے نمائندوں کی بے حِسی پر بار بار اپنا سامنہ لیکر رہ جاتے ہیں بالکل اُسی طرح بے چارے سابق صدر بھی اپنا سامُنہ لیکر رہ گئے۔ رہی سہی کسر میڈیا والوں نے پوری کردی جو اُن سے طرح طرح کے سوالات کرنے کو اُتاولے ہوئے جارہے تھے۔ اِس اُتاولے پن نے صدر کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

ہمارے محترم سابق کمانڈو صدر نے کراچی کے ایک پُر تعیش ہوٹل میں قیام فرمایا تو سیکیورٹی کے نام پر اُن کا اور بہت سے دوسرے لوگوں کا ناک میں دم کردیا گیا۔

تیسرے دن جب سابق صدر نے پریس کانفرنس کی تو اُس میں ایسے چُبھتے ہوئے سوالات داغے گئے کہ جناب کے لیے جُھکائی دینا مشکل ہوگیا۔ لوگوں نے تو بس دو تین معاملات دانتوں سے پکڑ لیے ہیں۔ بات کہیں سے بھی شروع ہو، گھوم پھر کر غداری اور لال مسجد پر ختم ہوتی ہے۔ یہ دونوں داغ جس سے دُھل جائیں وہ پاؤڈر سابق آرمی چیف کو اب تک کسی سیاسی اسٹور

اسے مل نہیں سکا!

نواب اکبر بگٹی قتل کیس بھی جی کا جنجال ہو کر رہ گیا ہے۔ سابق صدر کو کیا معلوم تھا کہ اکبر بگٹی پر گرنے والا پہاڑ بعد میں مقدمے کی صورت اُنہی کے سر پر آ گرے گا! اکبر بگٹی کی عینک بچ گئی تھی مگر لگتا ہے کہ مقدمے کے پہاڑ تلے سابق صدر کی عینک کے لیے بھی جان بچانا دشوار ہو جائے گا!

مقدمات نے تو ہمارے "ممدوح" کے لیے ٹھیک سے سانس لینا بھی دشوار کر دیا ہے۔ پہلے عدالت میں پیشی، پھر جوتا مارنے کی کوشش۔ ضمانت منسوخ کرکے سابق صدر کو بھاگنے پر مجبور کرنا اور پھر اُن کے فارم ہاؤس کو سب جیل قرار دینا۔ "مہمانوں" کی ایسی "تواضع" تو کبھی ہماری "درخشاں" روایات کا حصہ نہ تھی!

ایک طرف تو ہم اِس بات کا رونا روتے رہتے ہیں کہ جو باہر جا بستے ہیں وہ واپس آنے کا نام نہیں لیتے۔ اور اگر کوئی ہمت سے کام لیکر واپس آ جائے تو اُس کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے کہ ہم ایسا کریں گے تو کون آئے گا! الیکشن کا میلہ سجا کر کسی کو دوبارہ اقتدار کے خواب دیکھنے کی تحریک دینا اور پھر گہری نیند سے جھنجھوڑ کر اُٹھا دینا کوئی اچھی بات تو نہیں۔ طالع آزماؤں کا دور ختم ہوتا ہے تو میڈیا اور سوشل میڈیا کی طالع آزمائی شروع ہو جاتی ہے۔

الیکشن کے میلے میں پرویز مشرف کی جیب کٹ گئی ہے تو بُھگتان کون کرے گا؟ کل تک اُن کی رفاقت کا دم بھرنے والے ایک ایک کرکے کھِسکتے جارہے ہیں۔ چند سَر پھرے اُنہیں اب بھی میسر ہیں جو عدالت کے باہر مخالف وکلا سے ٹکراتے ہیں۔ مگر اُن کا بھروسہ بھی کب تک ہے؟ وقت بھی بہت ظالم ہے، کِسی کو نہیں بخشتا۔ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ کوئی کبھی صدر، آرمی چیف، کمانڈو اور خدا جانے کیا کیا تھا!

بہتوں نے اِس خدشے کا بھی اظہار کیا ہے کہ ایک ساتھ کئی پوٹلے کھول دیئے گئے ہیں اور یوں بہت سی چیزیں آپس میں اُلجھ کر رہ گئی ہیں۔ بے چاری نگراں حکومت بھی پریشان ہے کہ کِس کِس معاملے پر توجہ دے۔ دھماکے بھی ہو رہے ہیں، نا اہلی کے فیصلے بھی سُنائے جارہے ہیں، بہتوں کو اہلیت سے نوازا جارہا ہے، اربوں روپے کی کرپشن میں ملوث قرار پانے والے ایک طرف بیٹھ کر مزے سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ایسے میں نگراں وزیر اعظم کی ذہنی اُلجھن بھی بڑھتی جارہی ہے۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پارہے

حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں!

وہ بھی آجائیں تو مزا آجائے

"مَسلز" دِکھانے کا مقابلہ شروع ہوچکا ہے۔ سیاسی جماعتیں انتخابی مہم شروع کرچکی ہیں اور دوسری طرف عدلیہ نے بھی احتسابی مہم کا آغاز کردیا ہے۔ خاصی محنت سے تیار کیا ہوا جال پھینکا تو پہلے ہی ہلّے میں خاصی بڑی مچھلی آن پھنسی ہے۔ جال پھینکنے والے یہ سوچ کر پریشان ہیں کہ اِتنی بڑی اور تگڑی مچھلی کو اُن کا جال سہار بھی سکے گا یا نہیں! پرویز مشرف کو دیکھ کر آغا حشر کشمیری کا وہ مشہور جملہ یاد آرہا ہے کہ شیر لوہے کے جال میں ہے!

سڑک ہو یا میدان، اخبارات کے صفحات ہوں یا ٹی وی اسکرین .... ہر جگہ رونق میلہ لگا ہوا ہے اور اِس رونق میلے کے اسٹال دن بہ دن بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ جو بے دم بیٹھے تھے، وہ پرویز مشرف کے خلاف مقدمے کی سماعت اور اُنہیں مُقید کئے جانے سے تازہ دم ہوکر میدان میں نکل آئے ہیں۔ ہمارے سیاسی شکر خوروں کو بھی اللہ شکر دے ہی دیا کرتا ہے! میڈیا والوں کے بھی بھاگ جاگ اُٹھے ہیں۔ مُدّت سے چند ایک نئے اِشوز کا انتظار تھا۔ ایک ہی جوڑا دھو دھو کر کب تک پہنا جاسکتا ہے! بعض موضوعات تو گِھس گِھسا کر پھٹ گئے تھے۔ بھلا پرویز مشرف کا کہ وہ باہر سے آئے اور اپنے ساتھ میڈیا کے لیے چند نئے

!تازہ سانسیں بھی لائے

پرویز مشرف کی گرفتاری سے نواز شریف اور عمران خان میں تازہ ولولہ پیدا ہوا ہے۔ دونوں کمر، بلکہ لنگوٹ کس کر میدان میں آ گئے ہیں۔ عمران خان کہتے ہیں کہ وہ بچپن میں صرف کرکٹ ہی نہیں کھیلتے تھے بلکہ نشانہ بازی بھی کرتے تھے۔ اور اب وہ کاغذی شیروں کو نشانہ بنائیں گے! ہم سمجھ نہیں پائے کہ خود کو کاغذی شیروں کا شکاری قرار دے کر وہ کس بات کی داد چاہتے ہیں! عمران خان کا یہی مخمصہ ہے۔ وہ کبھی ایک گیند سے دو یا تین وکٹیں گرانے کی بات کرتے ہیں۔ کبھی سُونامی لاکر سب کچھ بہالے جانے کا راگ الاپتے ہیں۔ اب نشانہ بازی پر اُتر آئے ہیں۔ اُن کے مشیر بھی بڑے ستم ظریف ہیں، اچھے خاصے معقول آدمی کو بڑھکیں مارنے پر لگادیا ہے! عمران کی اداکاری میں ایک بڑی خامی یہ ہے کہ جلسے میں بڑھک مارتے ہوئے اُن کی ہنسی چُھوٹ جاتی ہے! یہ کچے پن کی نشانی ہے۔ ہنسانے والے خود نہیں ہنسا کرتے! عوام کو سبز باغ !دِکھاتے وقت سنجیدہ رہنا چاہیے! یہی تو سیاسی تھیٹر کا بنیادی اُصول ہے

نواز شریف کا انداز بتا رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ تو پہلے ہی طے ہوچکا ہے۔ وہ ابھی سے وزیر اعظم کے سے انداز سے بات کرنے لگے ہیں! اور یہ انداز پچھلی دو بار کی وزارتِ عُظمٰی والا نہیں! وزیر اعظم کے منصب پر فائز رہنے سے وہ

اچھی طرح جانتے ہیں کہ کب آواز میں وزیر اعظم والا لہجہ گھولنا ہے! مگر ابھی سے اِس قدر اعتماد! ابھی پولنگ کا جاں گُسل مرحلہ باقی ہے۔ ابھی تو اُن کے شیر کو "باگڑ بلّے" کا سامنا کرنا ہے! میاں صاحب کا اعتماد دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ اللہ خیر کرے، کہیں ٹک مُکا والی قیاس آرائیاں حقیقت سے قریب تو نہیں؟

نگراں حکومت کے سَر پر بوجھ بڑھتا جارہا ہے۔ بے چاری جان بھی نہیں چُھڑا سکتی۔ ع

!کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

کیا ہے جو پیار تو پڑے گا نبھانا" کے مِصداق نگرانوں کو اب اپنے حصے کا کام تو کرنا ہی" پڑے گا۔ اوکھلی میں سَر دے ہی دیا ہے تو مُوسل سے کیا ڈرنا! ہاں، یہ بات ضرور اُلجھنیں بڑھا رہی ہے کہ کئی پوٹلے بیک وقت کھولے جارہے ہیں۔ ابھی تو پرویز مشرف کے خلاف مقدمات کا آغاز ہوا ہے۔ دوسری بڑی مچھلیاں سُکون کا سانس نہ لیں، اُن کا نمبر بھی آسکتا ہے۔ رینٹل پاور کیس بھی موجود ہے جو کسی بھی وقت بم کی طرح پھٹ سکتا ہے۔ اربوں روپے کی کرپشن اور ترقیاتی فنڈز کی بندر بانٹ کا معاملہ بھی سُپریم کورٹ کی نظر میں ہے۔ سابق صدر کے خلاف کیسز کھول کر سُپریم کورٹ نے اپنے لیے ایک اور چیلینج تیار کرلیا ہے یعنی یہ کہ دوسری بڑی مچھلیوں کو بھی جال میں لانا !پڑے گا

جب بھی عوام سے رائے طلب کرنے کا مرحلہ آتا ہے، معاملات کو اِس قدر اُلجھا دیا جاتا ہے کہ رائے دینے والے پریشان اور بدحواس ہو جاتے ہیں! اب کے بھی عجیب ہی جمہوری بہار عجیب ہی انداز کے گل کِھلانے پر تُلی ہوئی ہے۔ لوگوں کو انتخابی مہم کے دوران ایسے عجیب تماشے دیکھنے کو ملتے ہیں کہ وہ ٹوپی سے کبوتر اور رومال سے انڈا نکالنے جیسے شُعبدے بھی بُھول بھال جاتے ہیں! سیاسی جلسوں میں لوگ تھیٹر، سرکس اور چڑیا گھر کا مزا ایک ساتھ پاتے ہیں!

حامیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھ کر سیاست دان اپنے حواس میں نہیں رہتے اور بڑھکیں مارتے مارتے کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں! پھر اُنہیں خیالی جنت کی بُھول بُھلیّوں سے کھینچ کھانچ کر حقیقت کی دُنیا میں واپس لانا پڑتا ہے! کئی ایسے بھی ہیں کہ پھر واپس نہیں آتے! بے نظیر بھٹو کو آپ شاید بُھول گئے؟ وہ بھی معاملات طے کرکے آئی تھیں مگر جب وطن کی فضاوءں میں اپنے حامیوں اور جاں نثاروں کا والہانہ انداز دیکھا تو ہر سمجھوتہ بُھول گئیں! اِس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ ہے! جیالوں، متوالوں اور دِل والوں کے لیے مشورہ ہے کہ اپنے قائدین کو چاہنے کے معاملے میں چند ایک حدود میں رہا کریں۔ ع

!اب اِس قدر بھی نہ چاہو کہ دَم نِکل جائے

انتخابی مہم زور پکڑ رہی ہے اور شُغل میلے کا گراف بلند ہوتا جارہا ہے تو چند ایک شخصیات کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ "شیخ الاسلام" ڈاکٹر طاہر القادری بھی ہوں تو مزا ہی آجائے! کچھ عرصہ قبل بھی تو اُنھوں نے دھماچوکڑی مچائی تھی۔ انتخابی ڈرامے میں ایک شاندار اور دھانسو قسم کے ایکٹ کی کمی محسوس کی جارہی ہے جو "شیخ الاسلام" کے آنے سے پوری ہو سکتی ہے۔ پہلے کسی کی فرمائش پر آئے تھے، اب ہماری فرمائش پر آجائیں! اُن کی کمی اُسی طرح محسوس ہو رہی ہے جس طرح سالن میں نمک کی کمی محسوس ہوتی ہے! اور سچ تو یہ ہے کہ اُنھوں نے ایک ہنگامے کی طرح آکر چند ایک !حریفوں کو تو نمک، ہمارا مطلب ہے خاک چٹا ہی دی تھی

ڈاکٹر طاہر القادری نے اعلان کیا تھا کہ اُن کی جماعت انتخابات کے موقع پر ملک بھر میں دھرنے دے گی۔ بھئی، وہ تو بہت دور کی بات ہے۔ ہر جماعت کے جلسوں میں جوش و خروش سے شریک ہونے والے "بھائی جان، مہربان، قدر دان" ڈاکٹر طاہر القادری کی آمد کے منتظر ہیں۔ وہ بھی میدان میں نکلیں تو انتخابی مہم کا رنگ کچھ اور نِکھر جائے، لطف دو بالا ہو جائے! جنھیں اُنھوں نے بہ بانگِ دُہل "سابق" قرار دے دیا تھا وہ بھی اب سابق ہو چکے! آکر ذرا اِن

سابقین کا تماشا ہی دیکھ لیں۔ کینیڈا کی حکومت سے التماس ہے کہ تھوڑی سی مہربانی کرے، ڈاکٹر صاحب کو کچھ دِن کے لیے ریلیز کرے تاکہ ہماری سیاست کے تن نازک کو تھوڑا سا ٹانک میسر آ جائے، کچھ اور جان پیدا ہو !

مزادرکار ہے.... مگر کیوں؟

پاکستانی قوم کی نفسیات کیا ہے، اِس سوال پر دُنیا بھر میں نفسیات کے ماہرین نے بہت غور کیا ہے اور اُن میں سے بہت سے بدنصیب خود نفسیاتی ہو چلے ہیں! دُنیا خواہ مخواہ ہماری نفسیاتی ساخت کے تعین میں مگن ہے۔ ہم نے خود ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ ہماری کوئی نفسیاتی ساخت ہونی چاہیے یا اِس آئین کو غیر تحریری ہی رہنے دینا ہے! لوگ کہتے ہیں کہ مغرب کے لوگ ہر معاملے میں مسرت کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔ اور یہ کہ وہی ہیں جو جانتے ہیں کہ زندگی کا بھرپور مزا کِس طور لُوٹا جاسکتا ہے۔ ہمیں تو ایسے لوگوں کی سوچ خاصی دقیانوسی معلوم ہوتی ہے۔ شاید اُنھوں نے کبھی پاکستانیوں کے مزاج پر غور نہیں کیا جو ہر بات میں، ہر چیز میں مزا چاہتے ہیں۔

مَیّت کو دفنانے کے بعد جب سوگوار خاندان مَیّت کو کاندھا دینے اور مٹّی ڈالنے والوں کو رسماً کچھ کِھلانے کا اہتمام کرتا ہے تب بھی لوگ مزے ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں اور تیز مَسالے کے ساتھ ساتھ بُوٹیوں کی فرمائش کرنے سے بھی

نہیں چُوکتے ! آپ سوچیں گے یہ تو سنگ دِلی ہے۔ سوگ میں ڈوبے ہوئے خاندان کو کچھ کِھلانے کے بجائے اُس کے ہاں کھانا اور اُس پر بھی تیز مَسالے اور بُوٹیوں کی فرمائش کرنا کوئی اچھی بات تو نہیں۔ مگر صاحب ! اِس میں حیرت کی بات کیا ہے۔ جب زندگی کا ہر معاملہ مزا تلاش کرنے تک محدود ہو کر رہ جائے تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اور پھر یہ بھی تو سوچیے کہ مرنے والا تو مَر کھپ گیا، ہم کیا ذرا سے سوگ کے چکّر میں اپنا وہ مزاج ترک کردیں جو ہم نے عشروں میں پروان چڑھایا ہے؟

مزے تلاش کرتے رہنے کی عادت کے ہاتھوں اب ہمارا حال یہ ہوگیا ہے کہ اگر کوئی حالات سے تنگ آکر خود کشی کے لیے نیلا تھوتھا خریدنے بھی نکلتا ہے تو چاہتا ہے کہ فلیور اچھا ہونا چاہیے ! جان کا کیا ہے وہ تو جانی ہی ہے۔ بات تو جب ہے کہ مَرتے وقت بھی مُنہ کا ذائقہ خراب نہ ہو ! کیا دوسری دُنیا میں مُنہ بسورے ہوئے پہنچیں گے؟ ہو سکتا ہے کل کلاں کو لوگ وصیت میں یہ بھی لِکھ جایا کریں کہ کفن کِسی نامی گرامی فیشن ڈیزائنر سے تیار کرایا جائے اور پرفیوم کِسی بھی حالت میں نان برانڈیڈ نہ ہو ! یعنی جیو ! تو مزے سے اور دُنیا سے جاؤ تب بھی شان برقرار رہے، مزے کم نہ ہونے پائیں

ہر معاملے میں مزے تلاش کرنے والی قوم انتخابات کے معاملے میں بھی اپنے

مزاج کو معطل کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جُوں جُوں انتخابات قریب آ رہے ہیں، کیا بچے، کیا جوان اور کیا بُوڑھے، ایک شِکوہ سب کی زبان پر ہے۔ کیا؟ یہی کہ کچھ مزا نہیں آ رہا! جسے دیکھیے وہ انتخابی مہم کی بے رونقی کا رونا رو رہا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ بے رونقی کہاں ہے؟ اور مزید کون سی رونق کا انتظار ہے؟

قوم نے انتخابات کو بھی شُغل میلے میں تبدیل کر دیا ہے اور اُس میں رونقیں اور انبساط کی کیفیت کشید کرنے پر تُلی ہوئی ہے! جلسوں کے نام پر تماشے درکار ہیں۔ لگتا ہے سنجیدگی سے برائے نام بھی تعلق اور شغف نہیں رہا۔ لوگ چاہتے ہیں کہ سیاسی گفتگو میں بھی جادو کا اثر ہو۔ لفّاظی کچھ ایسی ہو کہ رنگ جم جائے اور مزا آ جائے۔ اِس اجتماعی خواہش نے سیاسی بڑبولوں کو لفظوں کے سوداگروں اور شعبدہ بازوں میں بدل ڈالا ہے۔ سارے معاملات باتوں کی حدود میں سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ سیاسی بازی گر باتوں ہی باتوں میں سبز باغ کِھلاتے ہیں اور ایک چھب دِکھلا کر اُنہیں غائب بھی کر دیتے ہیں!

اب کے ایسا کیا ہے جس پر بے رونقی کا گمان ہے؟

بے یقینی؟ مگر بے یقینی تو ہم پر ایک مدت سے مسلط ہے۔ اُس کا کیا رونا اور کیا ڈرنا؟

خوش گمانی؟ وہ بھی کس مرحلے پر برقرار نہیں رہی؟ جلسوں میں لوگ سیاسی قائدین سے صرف سُندر سپنوں جیسی باتیں اور میٹھی میٹھی لوریاں سُن کر تصور کی حسین دُنیا ہی میں رہنا چاہتے ہیں۔ قائدین بھی قوم کی دُکھتی رگ پہچانتے ہیں اور پہلی فُرصت میں اُس پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں! جلسوں میں وہی راگ الاپے جاتے ہیں جو عوامی سماعت پر گراں نہ گزریں۔ وہی بات کی جاتی ہے جو عوام کے حلق سے حقیقت کی تلخیاں، کچھ دیر کے لیے، ختم کرکے اُس میں خوش فہمی اور خوش گمانی کا شربت ٹپکا دے!

میں تو غزل سُنا کے اکیلا کھڑا رہا
سب اپنے اپنے چاہنے والوں میں کھو گئے!

سیاسی شعبدہ باز جب بولنے پر آتے ہیں تو ایک دِن کا فرق یکسر مٹا کر آن کی آن میں انڈوں سے چُوزے نکال کر دِکھا دیتے ہیں! فلموں میں ولن کی پٹائی ہوتی ہے تو ہال میں بیٹھا ہر شخص خود کو ہیرو سمجھ رہا ہوتا ہے۔ فلموں میں کاسٹ اور ڈائریکٹر مل کر جو جادو جگاتے ہیں ویسا ہی جادو سیاسی جلسوں میں بھی اُتنی ہی خوبی سے جگایا جاتا ہے۔ فلم ختم ہونے پر شائقین کا دِماغ بہرحال کام کر رہا ہوتا ہے، کبھی کبھی سیاسی جلسوں کے اختتام پر حاضرین کو یہ رعایت بھی نہیں ملتی!

اب ایک بار پھر اِس نکتے پر غور فرمایئے کہ وہ بات نہیں، وہ مزا نہیں۔ یارو

کے مزاج کو بھی اللہ ہی سمجھے۔ پتہ نہیں کون سا مزا چاہتے ہیں، کون سی بات تلاش کر رہے ہیں؟ انتخابی مہم ایک بڑے عمل کا محض ایک حصہ ہے۔ ایک بڑے محل میں اِس کی حیثیت ایک بڑے کمرے کی سی ہے۔ یہ راستہ ہے، منزل نہیں۔ ہم بھی کِس مزاج کے ہیں کہ راہوں سے منزل کا مزا چاہتے ہیں!

یہ فیصلے کی گھڑی ہے، طے کرنا ہے کہ ہم پر اب کون حکمران ہو۔ عوام کو بھی احتساب بیورو کا سا اختیار مل رہا ہے۔ اُنہی کو طے کرنا ہے کہ مُلک پر اب کِس کی حکمرانی ہو۔ قومی وسائل میں دانت گاڑنے والوں کی یا اُن کی جو مُلک کو احسن طریقے سے چلانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں اور نیّت بھی۔ مُلک ایک بار پھر مشہورِ زمانہ دوراہے پر کھڑا ہے! ہمیں درست راہ کا تعین کرنا ہے۔ فیصلے کی اِس گھڑی میں بھی ہمیں درست سوچ اپنانے سے زیادہ مزے کی فکر لاحق ہے!

اِس بار الیکشن کمیشن کی "ریسیپی" لوگوں سے ہضم نہیں ہو پارہی۔ کئی ایک کو ابھی سے شدید بدہضمی کا وہم سا ہو چلا ہے! بہتوں نے ابھی سے سوچ لیا ہے کہ اِس بار بھی نتیجہ وہی نکلے گا یعنی ڈھاک کے تین پات۔ یہ بھی ہماری اجتماعی نفسیات کا بڑا کمال ہے۔ عمل کی نیّت سے پہلے ہم نتیجے کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ دُنیا ابھی پُل بنانے کا سوچ ہی رہی ہوتی ہے اور ہم اُس کے نیچے سے

!گزرنے والے پانی کی مقدار کا تعین بھی کر لیتے ہیں

ہر بات میں، ہر معاملے میں مزا تلاش کرنے کی عادت مستحسن نہیں۔ جب مرض شدت اختیار لے تو کڑی گولیاں بھی نگلنی پڑتی ہیں۔ انتخابات کوئی میلہ نہیں جس کی رونقیں ہمیں دم بخود کریں اور کچھ دیر کے لیے دُنیا کے جھمیلوں سے نجات دِلانے کے کام آئیں۔ یہ عمل تھوڑی سی متانت کا طالب ہے۔ ہر معاملے میں مزے تلاش کرنے کی عادت سے، عارضی طور پر ہی سہی، گلا خلاصی کرکے ہمیں اُن کڑوی گولیوں کو نگلنے کی تیاری !کرنی ہے جن کی تاثیر سے قومی امراض کی شدت میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور واقع ہوگی

شُکر ہے، ایمان بچ گیا

مرزا تنقید بیگ کے خون میں تنقید شامل ہے۔ نہیں نہیں، آپ اُن کے والد کے بارے میں بدگمانی نہ پالیں۔ مرحوم نقاد نہیں تھے۔ وہ تو خاصے شریف آدمی تھے۔اِس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ مرزا میں شرافت نہیں۔ مگر خیر، اُن میں جو تھوڑی بہت شرافت پائی جاتی ہے وہ اُن کے مرحوم والد ہی کا موروثی صدقہ ہے ورنہ مرزا نے تو خود کو "عظیم الدّہر" ثابت کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی!

کون ہے جس پر مرزا تنقید نہیں کرتے؟ کون ہے جو اُن کی زبان سے نکلے ہوئے ملامتی تیروں سے بچ سکا ہے۔ ہم تو خیر نامعلوم زمانوں سے اُن کے نشانے پر ہیں۔ مگر ہاں، ڈاکٹر طاہر القادری کے مُقدّر پر رشک آتا ہے جنہیں مرزا نے بخوشی استثنٰی دے رکھا ہے!

ہم سوچ رہے تھے کہ الیکشن نزدیک ہے تو جلسوں کی گرم بازاری بڑھتی ہی جا رہی ہے مگر "شیخ الاسلام" خاموش ہیں۔ خوشا کہ لاہور میں ایک ریلی سے خطاب کرتے ہوئے موصوف نے لَب کُشائی فرمائی ہے اور وہ بھی اِس انداز سے کہ ہم تو سہم گئے۔ ڈاکٹر صاحب نادیدہ لَٹھ لیکر الیکشن کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ پہلے تو

اُنھوں نے الیکشن کمیشن پر تحفظات کا اظہار کیا۔ پھر کہا کہ انتخابات ہونے ہی نہیں چاہئیں۔اِس کے بعد پولنگ کے دن دَھرنے دینے کا اعلان کیا۔ یہ سب تو میٹھی گولیاں تھیں، اب وہ خاصی کڑوی گولیوں کی بوتل کھول کر میدان میں آئے ہیں۔

انتخابات کے خلاف لاہور میں نکالی جانے والی ریلی میں شریک اپنے مُریدوں اور جاں نثاروں سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر طاہرالقادری نے 11 مئی کے الیکشن میں ووٹ ڈالنے کو گناہِ کبیرہ قرار دے دیا ہے۔ یہ سیاسی فتویٰ ہے تو خاصا دِل دہلانے والا مگر پھر بھی ہم نے سُکون کا سانس لیا۔ کیا؟ سُکون کا سانس؟ آپ حیران ہو رہے ہوں گے۔ ہم تو اِس بات پر اللہ کا شُکر ادا کر رہے ہیں کہ موصوف نے یہ نہیں کہا کہ جو اِس بار الیکشن میں ووٹ کاسٹ کرے گا اُس کا نکاح فسخ ہو جائے گا۔ اور اِس سے بھی ایک قدم آگے جاکر وہ ووٹ کاسٹ کرنے والوں کو اسلام کے دائرے ہی سے خارج کر سکتے تھے! گناہِ کبیرہ کا الزام ہم سہہ لیں گے، مگر شُکر ہے، ایمان بچ گیا!

ڈاکٹر طاہرالقادری کے ڈائی ہارڈ ٹائپ پرستاروں کو شمار کیا جائے تو مرزا تنقید بیگ یقیناً پہلی صف میں ملیں گے۔ اپنے ممدوح کے خلاف وہ ایک لفظ بھی نہیں سُن سکتے۔

جنوری میں ہم نے اسلام آباد میں کنٹینر میں بیٹھ کر دھرنے

کے شرکاء سے خطاب کرنے پر تنقید کی تھی تو اُن کا کہنا تھا۔ "اِس میں حیرت کی بات کیا ہے؟ ہمارے ہاں ہر دور میں قیادت کو contain کرنے کی ہی تو کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ایسے میں اگر ڈاکٹر صاحب نے "کنٹینر لیڈرشپ" متعارف کرادی تو کون سا گناہ کیا؟"

مرزا کا استدلال ہے کہ جیسی رُوح ویسے فرشتے کے اُصول کی بنیاد پر ڈاکٹر طاہر القادری کا وجود اِس قوم کے لیے بالکل موزوں ہے۔ ہم نے جب کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے پر اعتراض کیا تو مرزا کا کہنا تھا۔ "یہ قوم اہل علم اور اہل فن کی قدر ہی کہاں کرتی ہے؟ ناقدری ہی سے پریشان اور مایوس ہو کر ڈاکٹر صاحب کینیڈا کا انتہائی سرد موسم جھیلنے پر مجبور ہوئے۔ اور یہ بھی خُلوص ہی کے اظہار کی ایک صُورت ہے کہ خود سخت سردی جھیلتے رہتے ہیں مگر وطن واپس آ کر تھوڑی بہت گرما گرمی اور گرم بازاری کا اہتمام کرتے ہیں!"

گزشتہ روز ہم نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب الیکشن نہیں لڑتے تو نہ لڑیں، دوسروں کی راہ میں دھرنے تو نہ اٹکائیں!

یہ سُننا تھا کہ مرزا نے ڈاکٹر طاہر القادری کا پرستار ہونے کا بھرپور ثبوت دیا یعنی ہتّھے سے اُکھڑ گئے اور پھٹ پڑے۔ "ہم ایک آزاد ملک کے شہری ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بھی اپنے معاملات میں آزاد ہیں، جیسی چاہیں طرزِ عمل اختیار کریں۔ یہاں سبھی اپنی مرضی سے جی رہے ہیں۔ ایسے میں اگر ڈاکٹر صاحب بھی اپنی مرضی کی راہ پر گامزن رہنا چاہتے ہیں تو کسی کو کیا تکلیف ہے؟"

ہم نے عرض کیا کہ ایسا کرنے سے ہوگا کیا؟ الیکشن کا بائیکاٹ تو سمجھ میں آتا ہے۔ مگر اُس کی مخالفت اور پھر پولنگ اسٹیشنز پر دھرنے دینے کا اعلان کس ایجنڈے کے تحت ہے؟

مرزا تلملا اُٹھے۔ "تم جیسے لوگ تو ہر معاملے میں ایجنڈا تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ لازم تو نہیں کہ ہر معاملے کی پُشت پر کوئی سازش کارفرما ہو۔ کوئی ایک آدھ کام آدمی اپنی صوابدید سے بھی کر ہی لیتا ہے۔ ڈاکٹر قوم کی راہ نُمائی فرما رہے ہیں تو اِس پر بھی معترض ہو؟"

ہم نے "نکتہ اعتراض" پر کہا کہ ڈاکٹر صاحب راہ کہاں دِکھا رہے ہیں، وہ تو الیکشن کی راہ سے لوگوں کو ہٹانے پر تُلے ہوئے ہیں، ووٹ ڈالنے سے متنفر کر رہے ہیں!

مرزا ہماری "ڈی بریفنگ کی۔" یہ بھی راہ نُمائی ہی کی ایک شکل ہے۔ وہ لوگوں

کو ووٹ نہ دینے کی راہ دِکھا رہے ہیں ! مگر سیاست کے جدید اُصول اور اُن کا اطلاق تم کیا جانو۔"

ہم نے استفسار کیا کہ قوم کو حکمران منتخب کرنے ہیں مگر پولنگ کا بائیکاٹ کرکے حکمران کِس طور منتخب کئے جاسکتے ہیں؟

مرزا نے جوابی سوال داغا۔ "قوم نے اب تک بھی تو حکمران منتخب کئے ہیں۔ کیا نتیجہ نکلا؟ کیا راستے مزید تباہی کی طرف نہیں گئے؟"

ہم نے عرض کیا کہ حکمران غلط ثابت ہوتے بھی رہے ہیں تو اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انتخابی عمل ہی کو ترک کردیا جائے۔ پولنگ کے ذریعے حکمرانوں کا احتساب ہوسکتا ہے۔ جو توقعات پر پورے نہیں اُترے اُنہیں مسترد کرکے ردی کی ٹوکری میں ڈالا جاسکتا ہے۔

مرزا چِڑ کر بولے۔ "تم پھر کتابی باتوں پر اُتر آئے۔ کئی بار کہا ہے کہ اِتنا مت سوچا کرو کہ دِماغ کام کرنے سے انکار کردے! سوچتے رہنے ہی کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ تمہارا دماغ اب کام نہیں کرتا اور اِس خامی کو چھپانے کے لیے کالم لِکھ لِکھ کر لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو!"

مضبوط اعصاب کے حامل کالم نگاروں کی طرح ہم نے بھی مرزا کی بات کا ذرا بُرا نہ مانا! جواباً عرض کیا کہ یہ کتابیں باتیں نہیں۔ دُنیا بھر میں جمہوری عمل ایسا ہی ہوتا ہے۔ لوگ حکمرانوں کو اُن کے بُرے اعمال کی سزا بیلٹ پیپر کے ذریعے دیتے ہیں۔ پولنگ بُوتھ عدالت بن جاتا ہے۔ انتخابی عمل کو مسترد کرنا ایسا ہی ہے جیسے چور، ڈاکو، قاتل دندناتے پھر رہے ہوں تو تعذیرات کے نظام ہی کو کچرا کنڈی کی نذر کر دیا جائے!

مرزا بولے۔ "تم بھی کہاں کی بحث لے بیٹھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ووٹ ڈالنے کو گناہِ کبیرہ "کیا قرار دے دیا تم تو لَٹھ لیکر اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ اب اُنہیں معاف بھی کر دو۔
ہمارا استدلال تھا کہ لوگوں کو ووٹ نہ ڈالنے پر اکسانا اچھی بات نہیں۔ چند لوگوں کی خرابی پر جمہوری ہی کو ترک کرنے کی تعلیم نہ دی جائے۔
مرزا "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کے مِصداق اپنے ممدوح کی حمایت کے کھونٹے سے "بندھے رہے۔ "مگر دھرنا دینا تو اُن کا حق ہے۔ اِس پر کسی کو اعتراض کیوں ہو؟

ہم نے سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر کسی کو شادی نہیں کرنی تو نہ کرے مگر دوسروں کی شادی میں کافور کی بُو نہ پھیلائے، لوبان کی دُھونی نہ دے! یہ تو ضِد والی بات ہوئی۔

مرزا لہک اور چہک کر بولے۔ "یہاں ضِد ہی تو چل رہی ہے۔ جو منتخب ہوتے ہیں وہ کرپشن پر بضِد رہتے ہیں۔ لوگ اُنہیں بار بار منتخب کرنے پر بضِد ہیں۔ اور میڈیا والے بھی کم ہَٹھ دھرم نہیں۔ وہ ایک ہی لکیر پیٹتے رہنے پر بضِد رہتے ہیں۔"

ہماری گزارش تھی کہ کچھ بھی ہو، سسٹم کے اندر رہتے ہوئے خرابی دور کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

مرزا بولے۔ "تم نہیں مانوگے، سسٹم کے چمچے! تم جیسوں کے اعتراض کرنے سے ڈاکٹر صاحب کے دھرنوں کا گلشن اُجڑ نہیں جائے گا! تمہارا پرنالہ اپنی جگہ گرتا رہے گا اور اُن کا دریا اپنے مقام پر بہتا رہے گا!"

فکاہیہ سے مزاحیہ تک

لوگ کہتے ہیں کہ اگلے وقتوں میں اخباری کالم واقعی فکاہیہ ہوا کرتے تھے۔ اب فِکاہیہ کم اور مزاحیہ کالم زیادہ شائع ہوتے ہیں! اِس میں حیرت کیسی؟ جب ہر معاملے میں بُھد اُڑنے کا گماں ہوتا ہو اور بات بات پر غالب کے پُرزے اُڑانے کی بات ہوتی ہو تو احتیاط سے سُپردِ قلم کی جانے والی فِکاہیہ تحریر بھی مِزاحیہ سی ہو کر رہ جاتی ہے!

بہت سے جہاں دیدہ ٹائپ قارئین کا اِصرار ہے کہ اگلے وقتوں کے کالم نگار بات سے بات پیدا کرنے کا ہُنر بخوبی جانتے تھے۔ ذرا سی بات میں بہت کچھ بیان کر جاتے تھے۔ ہم اِس حوالے سے "نکتہ اعتراض" پر کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اگلے وقتوں کے کالم نگار بے شک صحافت کے اجداد سہی مگر اُن کی عظمت کے لیے صرف اُن کی صلاحیتوں کو کریڈٹ نہ دیا جائے۔ تیس چالیس سال قبل اگر اخباری کالم معنی خیز اور فکر انگیز ہوا کرتے تھے تو اِس میں صرف لِکھنے والے کا کمال نہ تھا۔ نعمتِ غیر مترقبہ کے طور پر کاتب اور پروف ریڈر بھی اپنا حصّہ ڈالنے کے لیے موجود تھے! اخباری کالموں میں پایا جانے والا مزاح محض لِکھاری کی اُفتادِ طبع اور شگفتہ مزاجی کا محتاج اور مُکلّف نہ تھا بلکہ کاتب اور پروف ریڈر بھی بساط بھر طبع آزمائی کرتے تھے جو کبھی کبھی طالع آزمائی کی

منزل کو چُھو لیا کرتی تھی! اگلے وقتوں کے اخباری مزاح کے لیے اگر کریڈٹ دینا ہے تو "ٹیم ورک" کو دیا جائے، سب کچھ ایک رُکنی کابینہ کے کھاتے میں نہ ڈالا جائے!

تحریر میں شگفتگی اور مزاح پیدا کرنے کا فن کیا ہے؟ چند الفاظ کی ترتیب کا پلٹ جانا یا ایک نُقطے کا اِدھر سے اُدھر ہو جانا! کراچی میں دہشت گردوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں کے ایصال ثواب کے لیے ایک تنظیم نے قرآن خوانی کرائی۔ تصویر کا کیپشن کچھ یوں شائع ہوا۔ "....کے زیر اہتمام کراچی میں ہلاک ہونے والوں کے لیے قرآن خوانی کرائی جارہی ہے!" نُقطے کی کارفرمائیوں پر نظر دوڑایئے گا تو آخر میں یہ ہوگا کہ ع

پھر نظر لَوٹ کر نہیں آئی!

جو نُقطہ "دُعا" کو "دَغا" میں تبدیل کرتا ہے وہی نُقطہ "محرم" کو "مجرم" بھی بنا دیتا ہے! احتیاط نہ برتی جائے تو "بابو" کو (کسی آپریشن کے بغیر) "بانو" بننے میں دیر نہیں لگتی! یہ تو ہوا نُقطے کے اوپر نیچے ہو جانے کا افسانہ۔ اگر یہی نُقطہ لکھنے یا چھپنے سے رہ جائے تو اچھے خاصے "نامزد" شخص کو.... خیر جانے دیجیے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ ذرا سی غلطی اخبارات کے صفحات پر معانی کا ایک نیا جہان اُسی طرح آباد کیا کرتی ہے جس طرح سابق وزیر داخلہ رحمٰن ملک کے بیانات میں ہمیں عمران خان کے خوابوں کا "نیا پاکستان" آباد مِلتا تھا!

جب کمپیوٹرز نہیں آئے تھے اور کمپوزنگ عام نہیں ہوئی تھی تب فکاہیہ ادب کو پروان

چڑھانے میں کاتب اور پروف ریڈرز مرکزی کردار ادا کیا کرتے تھے۔ مُسوّدے میں اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی تو کاتب اپنی "صوابدید" کے مطابق کتابت کر دیا کرتے تھے اور پروف ریڈر لکیر کے فقیر ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے کاتبوں کے لِکھے کو کِراماً کاتبین کا لکھا سمجھ کر احتراماً صرفِ نظر کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے! اِن دو پیشوں نے مِل کر معانی کے کئی نئے جہان آباد کئے! کاتبوں کی طرف سے "صوابدیدی اختیار" کا استعمال بھی قیامت ڈھانے میں کچھ کم نہ تھا۔ یہ کیفیت پروف ریڈرز کی بے نیازی اور صرفِ نظر سے بغل گیر ہوکر تحریر کے ماحول کو دو آتشہ کر دیتی تھی! ع

!جیسے کوئی شراب مِلا دے شراب میں

اخباری مِزاج کے اُس "سُنہرے" دور میں تحریر کی "خرابی" سے صرفِ نظر یا درگزر معیوب فعل سمجھا جاتا تھا اور آن کی آن میں "اِصلاح" پر کمر کَس لی جاتی تھی! یہ اِصلاح پسندی" کبھی کبھی تحریر کا "مُثلہ" بنا ڈالتی تھی! کاتبوں کا اِصلاحی مزاج کبھی کبھی" تحریر کو ایسے مفاہیم عطا کرتا تھا کہ خود لکھاری ورطہ حیرت میں پڑ جاتا تھا کہ داد دے یا

!اپنا) سَر پیٹے)

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ لکھاری کسی غلط العام لفظ کو تحقیق کرکے صحیح ہجّے کے ساتھ لکھتا تھا تو کاتب اُس کی "جہالت" پر لعنت بھیجتے ہوئے اپنی طرف سے

تصحیح" فرمادیا کرتے تھے! یہ "تصحیح" ایسی "فصیح" ہوتی تھی کہ تحریر کے "حُسن" کو چار چاند لگ جاتے تھے اور لکھنے والا (پیٹ بھر ڈِھٹائی کے ساتھ) شہر بھر سے داد وصول کرتا پھرتا تھا! آج کے کمپوزر ایسے "صاحب نظر" کہاں؟ اب تو لِکھاری ہی کو کمپوزنگ کرنی پڑتی ہے اور پروف ریڈنگ بھی خود ہی کرتا ہے۔ اِن دونوں ذمہ داریوں سے سُبک دوش ہونے کے عمل میں اگر نیند کے جھونکے یا دھیان کے بھٹکنے سے کچھ مزاح پیدا ہو جائے تو ہو جائے! یعنی اب کالم میں مزاح پیدا کرنے کی ذمہ داری لکھاری کے اپنے کاندھوں پر آ پڑی ہے۔ ع

!اپنا کالم" آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے"

آپ جانتے ہیں کہ شعوری کوشش سے کبھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ہوا۔ ہم تو ویسے بھی حادثاتی قوم ہیں۔ یہاں سبھی کچھ گیارہویں گھنٹے پر یعنی حادثاتی انداز سے ہوتا ہے! کسی تحریر کو فِکاہیہ بنانے کی شعوری کوشش کی جائے تو وہ مِزاحیہ بن جاتی ہے! کچھ لوگ فِکاہیہ لکھنے کی کوشش میں مِزاحیہ لکھتے رہتے ہیں اور جب لوگوں کے سمجھانے بُجھانے پر !اپنی اِصلاح کی طرف آتے ہیں تو تحریر کے مِزاحیہ پن کا گراف مزید بُلند ہو جاتا ہے

جب سے مِزاح پیدا کرنے کی ذمہ داری کالم نگار یا لکھاری کے کاندھوں پر آ پڑی ہے، مِزاح پیدا کرنا واقعی جاں گُسل مرحلہ ہوگیا ہے! اِس راہ میں بہتوں نے ٹھوکر کھائی

ہے اور انتہا یہ ہے کہ گرنے کے بعد اُٹھنے سے پہلے پھر ٹھوکر کھاتے ہیں! اخبار میں فِکاہیہ کالم لکھنا اب اِس لیے بھی بڑا چیلنج بن چکا ہے کہ اخبار میں خبر سے اشتہار تک ہر چیز مزاح کا اچھا خاصا رنگ لئے ہوئے ہے! سیاست دان کب کوئی کسر چھوڑتے ہیں جو لکھنے والے پوری کریں! ایسے میں "ذرا ہٹ کے، ذرا بچ کے" ٹائپ کا مزاح لکھنا پاسپورٹ بنوانے جیسا سخت اور اعصاب شکن مرحلہ ہو چلا ہے! ایک مصیبت تو یہ ہے کہ اخبار کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے۔ سیاست دان، ماہرین اور مبصرین اپنی تقاریر، تجزیوں اور گفتگو میں اچھا خاصا مزاح فرمانے لگے ہیں۔ اخباری تالاب میں اِن مگر مچھوں کے درمیان رہتے ہوئے خود کو بچانا اور اپنا آپ منوانا اب جُوئے شیر لانے سے کم نہیں!

صحافتی یا اخباری مزاح لکھنے کی کوشش نے کئی فرزانوں کو دیوانہ کیا ہے اور کئی مُستند دیوانے توبہ کرتے ہوئے فرزانگی کی طرف آ گئے ہیں! ایک مشہور معاصر میں سٹی پیج پر ہنسانے کی نیت اور شعوری کوشش کے ساتھ سُپردِ قلم کیا جانے والا "تجزیہ" ڈبل کالم خبر کے سے انداز سے شائع ہوتا ہے اور لکھنے والے یا سُرخی نکالنے والے کو ذیلی کے آخر میں وضاحت بھی کرنی پڑتی ہے کہ یہ "فِکاہیہ تجزیہ" ہے! فی زمانہ احتیاط کا یہ بھی ایک بُنیادی تقاضا ہے۔ لکھنے والے اور چھاپنے والوں کو یہ خوف لاحق ہے کہیں آپ اچھے خاصے فِکاہیہ (یعنی مزاحیہ) تجزیے کو سنجیدہ سمجھ کر نہ پڑھ جائیں اور پھر آپ کو ہوش میں لانا محال ہو جائے!

فکاہیہ کالموں کے معاملے میں "قحط الرّجال" کا عالم یہ ہے کہ اب لوگ سیاسی تجزیوں کو مزاح کے زُمرے میں شمار کرکے پڑھنے پر مجبور ہیں! اِن تجزیوں میں جب خیالات لڑکھڑا کر گرنے لگتے ہیں تو مزاح جنم لیتا ہے اور گرتے ہوئے خیالات کو سنبھالا دینے کی کوشش مزید مزاح پیدا کر جاتی ہے! کالم نگار جب کسی ممدوح کو سراہنے پر تُل جاتے ہیں تو ہزار بارہ سو الفاظ کے کوزے میں دریا کو بند کرکے قارئین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں! پڑھنے والوں کو ایک ہی کالم میں دیو مالائی کہانیاں، محبت کی داستانیں، رزمیہ قصے، قصیدے، شہر آشوب، واسوخت، ہجو.... غرض ادب کی ہر صنف کا ذائقہ نصیب ہو رہتا ہے! کالم میں بھرپور لذت کے اہتمام کی ترکیب کچھ ایسی مُشکل نہیں۔ موجودہ ممدوح کے لیے زمین آسمان کے قلابے ملایئے اور سابق ممدوح کی مٹی پلید کیجیے، حشرات الارض کے ماہر کی طرح اُس کی ذات میں غیر دریافت شدہ کیڑے تلاش کیجیے! بعض کالم فاؤنڈری کا سا ماحول پیش کر رہے ہوتے ہیں یعنی کسی کو پگھلایا اور کسی کو ڈھالا جارہا ہوتا ہے! اور کئی کالم ڈیپارٹمینٹل اسٹور کا منظر آنکھوں کے سامنے دَھر دیتے ہیں۔ گویا صلائے عام ہے.... بولو جی، تم کیا کیا خریدوگے! اب جس کے جی میں جو آئے وہ کالم کے بین السطور سے کشید کرتا پھرے!

سیاسی سرکس کا آخری آئٹم

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ جب لالی وُڈ کے اسکرپٹ رائٹرز اور ڈائریکٹرز نئے آئیڈیاز کی تلاش میں سرکس کے چکر لگایا کرتے تھے۔ سرکس کی بے مثال اُچھل کود اور چکرم باری کو فلموں میں شامل کرکے وہ شاہکار تخلیق کیا کرتے تھے! فلموں کے خاکے میں سرکس کے رنگ بھرنے کا سلسلہ چلتا رہا اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ سرکس کے کرتا دھرتا نئے کرتب متعارف کرانے کے لیے ہماری فلموں اور بالخصوص پنجابی فلموں سے "انسپیریشن" لینے پر مجبور ہوئے!

کچھ دِن پہلے تک حالت یہ تھی کہ لالی وُڈ کے اسکرپٹ رائٹرز اور ڈائریکٹرز کھیل کے میدانوں میں زیادہ پائے جانے لگے تھے۔ پوچھا گیا کہ کھیل میں ایسا کیا ہے جو آپ اپنا زیادہ وقت کھیل کے میدانوں میں گزارتے ہیں۔ وضاحت فرمائی گئی کہ اب کھیلوں کی دُنیا میں کھیل کم، اداکاری زیادہ ہے! اور اداکاری بھی ایسی نیچرل کہ کھلاڑی کھیل ہی کھیل میں بہت کچھ کر جاتے ہیں اور شائقین اُن کی پرفارمنس دیکھ کر عَش عَش کرنا بھی بُھول جاتے ہیں! ڈیڑھ دو گھنٹے کے کھیل میں اداکاری، کرتب، ہاتھ کی صفائی اور کھیل سے کِھلواڑ سبھی کچھ دیکھنے کو مل جاتا ہے اور وہ بھی گھر بیٹھے!

اب سُنا ہے کہ فلمیں لکھنے اور بنانے والے سیاسی جلسوں میں خاصے جوش و خروش کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ جلسوں کی بھرپور کوریج کے لیے تو خیر سے میڈیا کے نمائندے بھی بہ نفسِ نفیس موجود ہوتے ہیں۔ مگر اُن کے لیے تو یہ معمول کی بات ہے۔ کسی حد تک گناہِ بے لذت بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ سیاست دانوں کی ہر انٹ شنٹ بات کو قلمبند کرکے اخبار کا پیٹ بھرنا پڑتا ہے!

فلم والے سیاسی جلسوں کے گلشن سے اپنی مرضی کے پُھول اور کانٹے سبھی کچھ چُنتے ہیں۔ اور کیوں نہ چُنتیں کہ جلسوں میں سبھی کے لیے کچھ نہ ہوتا ہے۔ یہ وہ در ہے جس سے کم ہی شوقین خالی ہاتھ لَوٹتے ہیں! اُس سے بڑا بدنصیب کون ہوگا جو جلسے میں مُنہ بسورتا ہوا آئے اور ویسا ہی "رُخِ روشن" لیکر واپس چلا جائے!

زمانے بھر میں سیاسی شعور کا بہت غلغلہ ہے۔ وائے نادانی اور ہائے رے تغافل کہ کسی نے ہمارا "سیاسی شعور" ملاحظہ فرمانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ ہم نے عشروں کی محنت کے بعد سیاسی مارکیٹ میں ایسی فنشڈ پروڈکٹ متعارف کرائی ہے کہ اُس پر خود ہی فِدا ہو جانے کو جی چاہتا ہے! اپنے "ملٹی پرپز" سیاسی جلسوں میں ہم نے کئی عالم سَمو دیئے ہیں، ایک نئی کائنات بسادی ہے! کسی کو

اگر ضبطِ نفس کا دعویٰ ہے تو اِس سُپر اسٹور سے اپنی مرضی کے آئٹمز خریدے بغیر نکل کر تو دِکھائیے! رنگینی ایسی ہے کہ آنکھوں میں بس جائے تو نکلتی نہیں۔ کامیاب مارکیٹنگ یہ ہے کہ اِنسان وہ آئٹمز بھی خرید لے جن کی ضرورت نہیں۔ ہمارے سیاسی جلسوں کا بھی تو یہی کمال ہے۔ جو کچھ پسند نہیں وہ بھی اِن جلسوں میں اچھا لگتا ہے!

ایک فلم رائٹر سے گفتگو کے دوران ہم نے پوچھا کہ آپ آج کل سیاسی جلسوں میں کیوں دِکھائی دے رہے ہیں۔ کیا سیاست میں دلچسپی بڑھ گئی ہے یا فلموں سے شغف نہیں رہا؟ جواب مِلا فلموں سے محبت ہے تبھی تو جلسوں کا رُخ کرتے ہیں! ہم سمجھ نہ پائے۔ اُنھوں نے وضاحت فرمائی کہ اہل سیاست کے تماشے فلموں میں سموئے جائیں تو کامیاب فلم بنتی ہے۔ اِس کی مثال اُنھوں نے ٹکٹوں کی تقسیم کے ہنگامے سے دی۔ سیاسی جماعتوں پر ٹکٹوں کی تقسیم کے مرحلے میں جو کچھ گزری اور جو دھینگا مُشتی اِس دوران دِکھائی دی اُس میں کئی ایسے فارمولے تھے جو فلموں کو سُپر ہٹ کرانے کے لیے درکار ہوا کرتے ہیں!

جس طرح ہمارے ہاں مُستنصر حسین تارڑ صاحب کو مختلف شعبوں میں عمدگی سے بروئے کار لایا گیا ہے بالکل اُسی طرح اب سیاسی تقاریر بھی "ملٹی پرپز" ہو چکی ہیں! ایک ہی تقریر چاہنے والوں کے کلیجے کی ٹھنڈک بھی بنتی ہے اور

دُشمنوں کے سینے پر تیر بھی چلاتی ہے! مُنوّر ظریف، رنگیلا اور لہری کی کمی شدّت سے محسوس کرنے والے اِنہی تقاریر سے اپنی ضرورت کے مطابق کامیڈی بھی کشید کر لیتے ہیں! پُرانی پنجابی فلموں کی جان سمجھی جانے والی جُگت اور بڑھک بھی سیاسی تقاریر کا "پارٹ اینڈ پارسل" ہیں۔ آپ اِس موڑ سے گزرے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے! فلمیں لکھنے والے یوں تو مُدت سے سیاسی جلسوں کو "سورس آف انسپیریشن" سمجھتے آئے ہیں مگر اب اُن کے دِل کی کلی ایسی کِھلی ہے کہ مُرجھانے کے آثار نہیں۔ ایک فلم ڈائریکٹر کے دِل کی کِھلی ہوئی کلی دیکھ کر ہم نے "وجہِ تسمیہ" پوچھی تو اُنہوں نے جو کچھ بیان کیا اُس نے ہمارے دِل میں سیاسی جلسوں کی "توقیر" دو آتشہ کردی! کہنے لگے۔ "ویسے تو خیر پورا جلسہ ہی اب ہٹ فلم کے مانند ہوتا ہے۔ ایموشن، ڈراما، کامیڈی، ایکشن، کلائمیکس اور اینٹی کلائمیکس سبھی کچھ ہوتا ہے۔ تحریکِ انصاف نے بیک گراؤنڈ میوزک شامل کرکے محض ایک کمی پوری نہیں کی بلکہ جلسوں سے کماحقہ انصاف کیا ہے! یہ سب تو ٹھیک ہے مگر اصل مزا تو اب آخر میں آتا ہے۔ سیاسی جلسوں کا بمپر پرائز جاتے جاتے مِلتا ہے۔ فلموں میں تو سب کچھ اینڈ سے پہلے ہوتا ہے۔ اینڈ میں رسمی کارروائی کے طور پر ولن کی پٹائی ہوتی ہے اور 'سب اچھا ہے' کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ شائقین فلم ختم ہونے پر ہال سے نکلیں تو دِل پر کوئی بوجھ نہ

ہو۔"

ہم نے پوچھا کہ سیاسی جلسوں کے آخر میں ایسا کون سا بمپر پرائز ہوتا ہے جو فلموں کی روایت سے ہٹ کر ہے۔ موصوف نے وضاحت فرمائی۔" سیاسی جلسوں کا اینٹی کلائمکس ہی دراصل سُپر کلائمکس ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ٹکٹوں کی تقسیم میں بڑی بندر بانٹ، چھینا جھپٹی اور دھینگا مُشتی ہوتی ہے مگراِس تماشے میں وہ لطف کہاں جو سیاسی جلسے کے آخر میں کھانے کی تقسیم (یا لُوٹ مار) میں پوشیدہ ہے! یہ پولیٹیکل سرکس کا آخری ہی نہیں، سب سے دلچسپ آئٹم بھی ہے۔ بلکہ آج کی زبان میں اِسے جلسوں کا 'آئٹم "سونگ' قرار دیا جانا چاہیے۔

ایک جہاں دیدہ فلم ڈائریکٹر کی زبان سے سیاسی لنگر کی ایسی زبردست توصیف نے ہمیں چند لمحات کے لیے شرمسار کردیا! ہم نے کبھی سیاسی لنگر کے "مَحاسِن" پر غور کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ جلسے کے کلائمکس کے بعد لنگر کی تقسیم یا لُوٹ مار واقعی سُپر کلائمکس ہے۔اِس ایک کھیل میں کبڈی، کِک باکسنگ، فری اسٹائل کُشتی اور خدا جانے مزید کون کون سے کھیل اور تماشے چُھپے ہوئے ہیں!

سیاسی لنگر کے لیے چھینا جھپٹی کے دوران جس کے ہاتھ بریانی سے بھرا تسلا

لگ جائے وہ بھنگڑا ڈالنے لگتا ہے اور جو محروم رہے اُس کے چہرے پر مُردنی قابل دید ہوتی ہے۔ اگر یہ تماشے پہلے کبھی ہوا کرتے تو محرومین سے ٹریجڈی کنگ دلیپ کمار تھوڑا بہت اکتساب کرکے اپنے فن میں مزید گہرائی اور گیرائی ضرور پیدا کرتے ! اور ذرا سوچیے کہ بریانی سے بھرے ہوئے تَسلے کو لیکر درخت پر چڑھ بیٹھنا کوئی معمولی فن ہے !کیا؟ بڑے بڑے جمناسٹ دیکھیں تو شرمندہ ہوکر سَر جُھکالیں

سیاسی لنگر کی خاطر ہونے والی دھکم پیل اور زور آزمائی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جن کے منعقد کیۓ ہوئے جلسوں میں یہ سب کچھ ہوتا ہے وہ بھی اقتدار کے ایوانوں میں پہنچ !کر قومی وسائل کو بھنبھوڑنے کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہوں گے

آپ بھی سوچتے تو ہوں گے کہ سیاسی جلسے کے آخر میں بریانی اور قورمے کی دیگیں بانٹنے کا رواج کیوں پڑا ہے۔ کیا اہل سیاست عوام کے "جوش و خروش" سے تحریک پانا چاہتے ہیں تاکہ اقتدار پانے کی صُورت میں قومی خزانے پر شب خُون مارنے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں؟ یا پھر لُوٹ مار کے چند نئے ڈھنگ سیکھنا مقصود ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جن غریبوں کے حصے کا سب کچھ ہضم کرچکے ہیں اُن کے آگے چند دانے ڈال کر لُوٹ مار کا نظارہ کرکے اپنے کلیجوں کو ٹھنڈک

پہنچانا اور یہ اطمینان کرلینا مقصود ہے کہ یہ غریب اِسی سطح پر رہیں گے !

قدیم روم میں اشرافیہ اپنا دِل بہلانے کے لیے بڑے پنجرے یا کُھلے میدان میں کئی وقتوں کے بُھوکے شیر کے آگے باغیوں کو ڈال دیا کرتی تھی اور اُن بدنصیب انسانوں کی نُچتی اور بھنبھوڑتی ہوئی بوٹیوں کی دید سے اپنے "ذوق" کی تسکین کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ ہمارے ہاں بھی اِسی خُوں آشام رسم کو زندہ کیا جارہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ باغی تو اشرافیہ سے آ ملے ہیں اِس لیے شوق پُورا کرنے کی خاطر مُطیع و فرماں بردار ہی لنگری شیر کے آگے ڈالے جارہے ہیں !

ذرا ہٹ کے، ذرا بچ کے

مرزا تنقید بیگ کئی دِنوں سے اللہ کی مخلوق کو راحت بخش رہے ہیں یعنی گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے ہیں ! اب اُن کے "شَر" سے محفوظ رہنے کی ایک بہتر صُورت اِسی صُورت نکل سکتی ہے کہ وہ "از خود نوٹس" کے تحت لوگوں سے کم کم ملیں ! اوروں کا تو علم نہیں، ہم اپنے آپ کو ایسا خوش نصیب نہیں گردانتے کہ مرزا ہم سے مِلنا کم کردیں۔ مگر جب ہم نے دیکھا کہ مرزا کی گوشہ نشینی روپوشی کی حد کو چُھو رہی ہے تو کچھ تشویش لاحق ہوئی اور اُن کے گھر جا پہنچے تاکہ رُوپوشی نما گوشہ نشینی کی "وجہِ تسمیہ" جان سکیں۔

مِرزا کمبل اوڑھے ایک کونے میں دُبکے ہوئے تھے۔ ہم سمجھے طبیعت ناساز ہے اِس لیے پوچھا کہیں بیمار تو نہیں پڑگئے؟ مرزا نے بیماری سے متعلق ہمارے استفسار پر لعنت بھیجتے ہوئے کہا۔ "تم تو یہی چاہوگے کہ میں بیمار پڑجاؤں تاکہ ملنا نہ ہو اور تمہارے دِل کو سُکون ملے۔"

ہم نے سُکون سے جواب دیا جناب ! ہم تو رسمی کارروائی کے طور پر پوچھ رہے تھے، ورنہ بیمار پڑیں آپ کے دُشمن !

!تو پھر پڑ جاؤ نا بیمار۔" مرزا نے جواباً فرمائش داغ دی"

ہم نے استفسار کیا کہ اِتنے دِنوں سے گھر میں کیوں بند ہیں۔ خیر سے ابھی رمضان کا ماہِ !مبارک بہت دور ہے۔ آپ کو تو رمضان میں قید کیا جاتا ہے

مرزا نے تِلملا کر جواب دیا۔ "تم سے بڑا بے خبر بھی دُنیا میں بھلا کون ہوگا؟ خدا جانے "!وہ سب کچھ کیسے لکھ لیتے ہو جسے کالم قرار دیکر داد پانے کی ہوس ہے

ہم نے وضاحت چاہی کہ ہماری نظر سے کیا چُوک گیا ہے، کون سی بات جاننے سے ہم رہ گئے ہیں۔ ڈینگی فیور تو پھیلا نہیں جو کوئی یوں قرنطینہ میں جا بیٹھے۔ اور کسی چھوٹی موٹی !بیماری کی کیا مجال کہ مرزا کے نزدیک بھی پھٹکے

ارشاد ہوا۔ "فضاء میں خرابی کی بُو تو ہم نے بہت پہلے سُونگھ لی تھی مگر مسلم لیگ (ن) "کے سربراہ میاں نواز شریف نے بھی کہا تو سمجھ لو تصدیق ہو گئی۔

ہم نے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا تو اُنہوں نے بات آگے بڑھائی۔ "میاں صاحب نے کہا ہے کہ نوجوان ہوشیار رہیں، شکاری اُن کے شکار پر نکلے ہیں۔ کسی بھی وقت ہلّا "بولا جاسکتا ہے۔

ہم سہم گئے۔ بہت پہلے کی بات ہے، اُستادِ محترم رئیس امروہوی مرحوم نے کہا تھا

بہت دِنوں سے یہی شغل ہے سیاست کا

!کہ جب جوان ہوں بچّے تو قتل ہو جائیں

اور یہ رُجحان اِس لیے پروان چڑھا تھا کہ بعض شُعراء شعوری یا لاشعوری طور پر نوجوانوں کو سچ بولنے کے نام پر سسٹم سے ٹکرا جانے کی تحریک دیکر ایک طرف ہٹ جاتے تھے ! بعض اشعار میں سچ بولنے کے صِلے کی "نوید" بھی سُنادی جاتی تھی۔ مثلاً

کبھی نہ روکیے سچ بولنے سے بچّوں کو

!اِنہی کے دم سے تو مقتل میں رونقیں ہوں گی

ہم نے نوجوانوں کے شکار سے متعلق خدشات کا اظہار کیا۔ جب بات قتل اور مقتل تک پہنچی تو مرزا نے کمال شفقت سے کام لیتے ہوئے ہمیں سمجھایا۔ "ہر معاملے میں اپنی عامیانہ یعنی صحافیانہ دانش سے کام مت لیا کرو ورنہ فلسفیوں کی طرح ہمیشہ تاریک کمرے میں ایسی کالی بلّی تلاش کرتے رہوگے جو وہاں ہے ہی نہیں ! ضروری تو نہیں کہ شکار کا مطلب مار دینا یا پھاڑ کھانا ہی ہو۔ نوجوانوں کے شکار پر نکلنے یا اُنہیں ٹارگٹ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نئی نسل کے ووٹ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔"

مرزا کی وضاحت سے ہم مطمئن تو ہو گئے مگر حیران بھی ہوئے کہ اگر نواز شریف نوجوانوں کو خبردار کر رہے ہیں تو مرزا کیوں پریشان ہیں۔ اُن کی جوانی کو گزرے ہوئے تو کئی عشرے بیت چکے ہیں! اب کون بے وقوف اُن پر "شب خون" مارے گا؟ جب ہم نے جوانی سے متعلق تحفظات مرزا کے گوش گزار کئے تو وہ بدک گئے اور "دِل ہونا چاہی دا جوان، عُمراں چ کی رکھیاے" والی نظروں سے ہمیں گھورتے ہوئے پھر "لب کُشا ہوئے۔ "جوانی کا تعلق ارادوں سے ہے۔ دِل جوان ہے تو ہم بھی جوان ہیں۔ ہم نے جلتی پر مزید تیل چھڑکنے کی نیت سے مرزا کے گوش گزار کیا کہ آپ میں جوانی یقیناً پائی جاتی ہے کیونکہ آپ کا بڑھاپا عہدِ شباب سے گزر رہا ہے! اِس پر مرزا نے بہ آوازِ بلند، بلکہ بہ بانگِ دُہل لاحول پڑھی۔ ہم ڈر گئے کہ کہیں وہ غائب نہ ہو جائیں! خیر گزری کہ مرزا لاحول پڑھ کر بھی "برقرار" رہے اور سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ تیسری عالمی جنگ آبی وسائل کیلئے ہوگی۔ ہمارے ہاں دسویں انتخابی جنگ نوجوانوں پر قبضے کیلئے ہو رہی ہے! دہشت گردی کی نذر ہونے والے نوجوانوں کو سیاسی جماعتیں اپنا کارکن ثابت کرنے کے لیے لڑتی آئی ہیں۔ اب وہ زندہ نوجوانوں کو اپنا ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں! ویسے تو خیر نئی نسل کے کرتوت ہیں ہی ایسے کہ اُس پر منہ چُھپانا واجب ہو چکا ہے۔ سیاسی جماعتوں کے عزائم بھانپ کر وہ مُنہ مزید چُھپاتی پھر رہی ہے۔ اب نوجوان گھر سے نکلتے بھی ہیں تو 'ذرا ہٹ کے، ذرا بچ کے' والے انداز سے۔ خدا جانے کِس موڑ پہ کون سی سیاسی جماعت

گھات لگائے بیٹھی ہو۔"
ہم نے عرض کیا کہ اگر سیاسی جماعتیں نوجوانوں کو ساتھ لیکر کچھ کرنا چاہتی ہیں تو اِس میں ہرج یا بُرائی کیا ہے۔ مرزا نے کہا۔ "نئی نسل کا تو لوگوں نے ایک زمانے سے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ توقعات کا پوٹلا اُس کے سَر پر دَھرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ توازن برقرار رکھ کر دِکھاؤ۔ ہر سیاسی تقریر میں اُسے مستقبل کا معمار ٹھہرایا جاتا ہے۔"

ہم نے استفسار کیا کہ نوجوانوں کو مستقبل کا معمار قرار دینے میں بُرائی کیا ہے۔ مرزا نے وضاحت کی۔ "بہت سے نوجوان جب معمار کا مفہوم سمجھنے کیلئے لُغت کی ورق گردانی کرتے ہیں تو وہاں 'راج مِستری' مُنہ چڑا رہا ہوتا ہے! جب کوئی نوجوانوں کو قوم کا سُتون قرار دیتا ہے تب بھی وہ سہم کر رہ جاتے ہیں کیونکہ پوری عمارت کا بوجھ سُتون کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور ہلنے کی اجازت ہوتی ہے نہ گنجائش!"
ہم نے کہا یہ تو اچھی بات ہے کہ نئی نسل کیلئے کوئی ڈھنگ کی مصروفیت نکل آئے۔ یہ سُن کر مرزا نے لپکتا ہوا جواب دیا۔ "تم ڈھنگ کی مصروفیت کا راگ الاپ رہے ہو۔ پہلے نئی نسل سے پوچھ تو لو کہ اُس کے پاس وقت ہے بھی یا نہیں۔ چار دن کی جوانی میں سو جھمیلے ہوتے ہیں یا پالنے پڑتے ہیں۔ دِل دینا ہوتا ہے، لینا ہوتا ہے۔ دِل میں درد بھی سمیٹا جاتا ہے، پھر اُس درد کا علاج بھی کرنا ہوتا ہے۔ رات بھر کے پیکیج پر جی

بھر کے باتیں بھی کرنی ہوتی ہیں۔ ون وھیلنگ کا ٹنٹا بھی ساتھ لگا ہوا ہے۔ ہوٹلوں کے باہر شب بیداری بھی کرنی ہوتی ہے۔ بجلی کے کھمبوں پر چڑھ کر بینر اور پرچم بھی لگانے ہوتے ہیں۔ شادی کی تقریبات میں ناچ گانا اور ہلّا گُلّا بھی کرنا ہوتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ "کہ نئی نسل سیاست دانوں کی خواہشات پوری کرنے کیلئے وقت کہاں سے نکالے؟

ہم نے ملتجیانہ انداز سے عرض کیا کہ نئی نسل کو اِن تمام جھمیلوں میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے۔ یہ تو وقت کا ضیاع ہے۔ مرزا نے نئی نسل کی طرف داری جاری رکھی۔ "میاں تمہیں کہا پتہ جوانی ہوتی کیا ہے۔ تمہارا تو عہدِ شباب بھی صفحے کالے کرنے میں گزر گیا۔ نوجوان اگر مختلف مشاغل پروان چڑھا کر وقت کو ٹھکانے نہ لگائیں تو اِتنا سارا وقت تو "!پڑے پڑے سَڑ جائے

ہم نے کہا یہ بات تو ہے تو اچھا ہے کہ نوجوانوں کا کچھ وقت سیاست کی نذر ہو کر قوم کے !کام آ جائے

مرزا نے پھڑکتا ہوا جواب داغا۔ "سیاست کی نذر ہو کر کون کام کا رہا ہے جو نوجوان کچھ کر پائیں گے؟ جسے ٹھکانے لگانا ہے اُسے سیاست میں لے آیئے۔ بے چارے نوجوان چار دن اپنا دِل بہلائیں تو وہ بھی اہل سیاست سے ہضم نہیں ہو پا رہا۔ بعد میں انہی نوجوانوں

کو زندگی بھر دال روٹی اور گھر بار کے جھمیلے سے نبرد آزما ہوتے رہنا ہے۔ دِل لینے اور دینے کا کھیل بھی چھین لیا تو اُن کی زندگی میں کیا رہ جائے گا! سیاست دان اِتنی مہربانی تو کریں کہ زندگی کے خوبصورت ترین لمحات سے محظوظ ہونے والوں پر شب خُون نہ ماریں!"

کپتان بھی بڑھک کی راہ پر رواں دواں

تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان کا ایک بنیادی مخمصہ یہ ہے کہ اُنہیں بیشتر باتوں کی سمجھ دیر سے آتی ہے۔ جب شادی کی عمر تھی تب کرکٹ کھیلنے میں لگے رہے۔ خدا خدا کرکے گھر بسانے کی سمجھ آئی تو شادی کی عمر گزر چکی تھی ! شادی کے بعد جیسے جیسے جب گھر چلانے کی سمجھ آئی تو چڑیاں پھر کھیت چُگ چکی تھیں یعنی گھر والی ہی جاچکی تھیں !

بات کو دیر سے سمجھنے کی ذاتی روایت عمران خان نے سیاست میں بھی برقرار رکھی ! لوگوں نے بہت سمجھایا کہ جلسوں میں عوام ہوتے ہیں اِس لیے خطاب بھی عوامی انداز ہی سے کرنا ہوتا ہے، نیٹ پریکٹس میں ینگسٹرز کو ٹپس دینے والا انداز نہیں اپنانا ہوتا ! مگر اُن کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اب "کپتان" نے سیاسی میچ میں فیلڈ پلیسنگ بہتر کرنے پر تھوڑی سی توجہ دی ہے اور "دیر آید، درست آید" کے مِصداق انتخابی مہم کے روایتی پاکستانی انداز سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے بڑھکیں مارنے کا آغاز کردیا ہے اور بڑھکیں سُن کر عوام کو اُن کے لیے اپنائیت سی محسوس کرنے لگے ہیں ! اب تک وہ "گورا صاحب" لگتے تھے اور باتیں بھی ویسی ہی کرتے تھے۔

کرک اور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں جلسوں سے خاصے دبنگ انداز سے خطاب کرتے ہوئے عمران خان نے پاکستان کی سیاسی وکٹ پر ایک نیا بَلّا متعارف کرایا ہے۔ یہ کوئی ایسا ویسا بَلّا نہیں۔ یہ جاں نثار اور عوامی خدمت گار ٹائپ بَلّا مُلک کی ہر بَلا اپنے سَر لے گا اور صرف چوکے اور چھکّے ہی نہیں بلکہ دُشمنوں کی پھینٹی بھی لگائے گا! عمران خان کی کَڑلکے دار اور پَلّے باز قسم کی بَڑھک سُن کر ہمیں اکبر الٰہ آبادی یاد آ گئے۔ فرماتے ہیں

بُوٹ ڈاسن نے بنایا، ہم نے اِک مضموں لکھا
مُلک میں مضموں نہ پھیلا اور جُوتا چل گیا!

یہاں بھی مضمون تو کوئی نہیں پھیل سکا، ہاں جُوتا چل رہا ہے اور خوب چل رہا ہے۔ لاتوں ہی میں نہیں، باتوں میں بھی جوتا بہ درجہ اتم پایا جاتا ہے! کرکٹ بورڈ، سَٹّے بازوں اور حکمرانوں کی مِلی جُلی مہربانی سے ایسا لگتا ہے کہ مُلک میں اب بَلّا کرکٹ کھیلنے سے زیادہ پھینٹی لگانے کی چیز رہ گیا ہے! ڈریسنگ رُومز کی سیاست میں بھی بَلّا اب بات منوانے کا موثر ترین ہتھیار بن چکا ہے! کِسی زمانے میں یہ اعزاز ہاکی کے پاس تھا۔

ڈنڈے بازی تو ہمارے قومی مزاج میں گُندھی ہوئی ہے، شاید اِسی لیے ڈنڈے نُما ہاکی سے کھیلے جانے والا کھیل ہمارا قومی کھیل قرار پایا! ڈنڈے کو اِتنی عِزّت ملے گی یہ کبھی کِسی

نے سوچا بھی نہ تھا مگر یاروں نے اپنا کام نہ چھوڑا۔ صرف آلہ کار تبدیل کیا یعنی ڈنڈا ترک کرکے ہاکی سنبھال لی۔ گراؤنڈ کے باہر ذاتی اِسکور برابر کرنے کے لیے ہاکی اِس قدر اور اِس طرح چلائی گئی کہ ہاکی کا کھیل شرمندہ ہوکر ایک طرف ہٹ گیا!

1978 کی بلیک اینڈ وھائٹ فلم "لاہوری بادشاہ" میں سُلطان راہی نے ایک ہاکی کے ذریعے پورے شہر کو کنٹرول کرکے دِکھا دیا تھا۔ شاید عمران خان بھی ایسا ہی کرنے نکلے ہیں۔ فرق صرف تعلیم کا ہے۔ سُلطان راہی معمولی سے خواندہ تھے اِس لیے اُن کا وژن چھوٹا تھا۔ وہ اللہ سے ڈرتے تھے اور قناعت پسند تھے اِس لیے لاہور تک محدود رہے۔ عمران خان بِلّے کی مدد سے پورے مُلک کو کنٹرول کرنے کے درپے ہیں! سُلطان راہی نے تو وہ کیا جو ڈائریکٹر نے کہا۔ عمران خان کو اپنے ڈائریکٹر(ز) کی سادگی یا حماقت پر زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت غور ضرور کرنا چاہیے!

کرکٹ کے میدان میں بدنامی سے دوچار بِلّے کو تحریک انصاف کے دَربار سے نیا منصب عطا ہوا ہے۔ بَلّا دیکھنے میں چونکہ گٹار جیسا ہے اِس لیے اب اُس میں سے چھینٹی کے سُر نکالنے کا عِندیہ دیا جارہا ہے! ہماری کرکٹ تو اب کِسی کام کی رہی نہیں۔ اور بَلّا بھی ڈھنگ کے شاٹ لگانا بُھول گیا ہے۔ ایسے

میں چوکے اور چھکّے اب سیاسی میدان ہی میں لگائے جاسکتے ہیں ! چھینٹی کا لفظ استعمال کرکے عمران خان نے واضح کردیا ہے کہ اُن کے خوابوں میں بسا ہوا "نیا پاکستان" کِس ٹائپ کا کلچر لیکر حقیقت کا رُوپ دھارے گا!

عمران خان دوسروں کو الزام دیتے آئے ہیں کہ سیاست میں شائستگی نہیں اپناتے اور اب وہ خود سُلطان راہی کے نقش ہائے قدم پر چل پڑے ہیں ! مرحوم کے کئی پرستار ایسے ہیں جو اب عمران خان میں اپنا ممدوح دیکھتے ہیں ! اور کیوں نہ دیکھیں؟ ہر گزرتا ہوا دِن اور گزرتا ہوا جلسہ عمران خان کے بڑھک پن میں اضافہ کر رہا ہے۔ مُشیروں نے کب کِسی کو صحیح ذہنی حالت میں چھوڑا ہے جو عمران خان کو بخشیں گے!

مسلم لیگ (ن) کے شیر کو رام کرنے کے لیے کہیں کوئی ڈھنگ کا کی بگ کیٹ نہ مِل سکی تو تحریک انصاف کے چیئرمین نے اپنے بلّے کو "باگڑ بلّے" میں تبدیل کرکے سیاسی انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کی ہے!

ایسا لگتا ہے خود عمران خان کو بھی اندازہ ہوگیا ہے کہ اُن کا بلّا انتخابات میں چوکے اور چھکّے نہیں لگاسکے گا اِس لیے وہ ابھی سے اپنی "ذہنی اولاد" یعنی نئے پاکستان میں بلّے کو نیا ٹاسک دینا چاہتے ہیں تاکہ نئے پاکستان میں یہ ناشاد و ناکارہ نہ پھرا کرے۔ ضیائُ الحق قاسمی مرحوم نے

ایک قطعے میں قلم کا متبادل مصرف یہ بتایا تھا کہ اِس سے نیفے میں "ناڑا" ڈالا جاسکتا ہے ! سُلطان راہی کے ساتھ ساتھ ضیائُ الحق قاسمی کے بھی نقش ہائِ قدم پر چلتے ہوئے عمران خان نے پَلّے کو چھینٹی لگانے کا منصب سونپنے کی بات کی ہے !

ایک اہم بات عمران خان کو اُن کے مشیروں نے اب تک نہیں سمجھائی۔ لاکھ خطرات اور عدم مقبولیت کے باوجود آصف علی زرداری نے دانش مندی کا ثبوت دیا کہ بیٹے کو انتخابی مہم چلانے کے لیے وطن بُلالیا۔ سیاسی شعبدہ بازی میں ٹائمنگ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ذرائع کے مطابق عمران خان نے فیصلہ کیا ہے کہ سیکیورٹی خدشات کے باعث بیٹوں کو انتخابی مہم کے دوران پاکستان نہ بُلایا جائے۔ یہ فیصلہ عمران خان کے لیے ایسا ہی ثابت ہوسکتا ہے جیسا ٹاس ہارنا ہوتا ہے ! میڈیا تو خیر بات اُچھالے گا ہی، مخالفین اور جلسوں میں عوام بھی پوچھیں گے کہ جب اہل وطن خطرات میں گِھر کر جی رہے ہیں تو تحریک انصاف کے قائدکے بچے کیوں عوام کے درمیان نہیں ! اچھا ہے کہ یہ بات عمران خان کی سمجھ میں بر وقت آجائے !

روشنی کے شہر میں ظُلمت مقدّر ہو گئی

روشنیوں کا شہر۔ رونقوں کی بستی۔ قہقہوں کا معمورہ۔ زندہ دِلی سے مزّین گلیاں۔ ہنستے گاتے گلیارے،پُر مسرت زندگی۔پُر کیف شب و روز۔ محنت کرتے لوگ۔ پسینے کے موتیوں سے چمکتی جبینیں۔ مشقت کا صِلہ پاتے ہاتھ۔ علم کی توقیر۔ فن کا احترام۔

کبھی الفاظ کے یہ مجموعے کراچی کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوا کرتے تھے۔اِن میں سے کوئی بھی لفظ ایسا نہیں جو جانا پہچانا نہ ہو۔ تب کراچی بھی جانا پہچانا تھا۔زندگی کو بیان کرنا ہو تو زیست کہیے، حیات کہیے، حیاتی کہیے، جیون کہیے، جندڑی کہہ جائیے۔ مگر جب زندگی کے نام پر محض سانسوں کا ربط باقی رہ جائے، سُورج کے طلوع اور غروب ہونے، محض شب و روز کے گزرنے کا عمل زندگی کا متبادل قرار پائے تو کیا اور کیوں بیان کیجیے اور دِل کی حالت کے بیان کو الفاظ کہاں سے لائیے؟

جن گلیوں میں زندگی چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی اُن میں خوف اور بے یقینی نے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ جو بستیاں کبھی اُجالوں کا مسکن تھیں اُن میں اب بے

یقینی کے اندھیرے ہیں۔ جن راستوں پر عشروں سے چلتے آئے ہیں وہی اب اجنبی ہوئے جاتے ہیں۔ شہر کی سیرت تو بہت پہلے بدل گئی تھی، اب صورت بھی کچھ کی کچھ ہو گئی ہے۔ شہر کی حالت اور حلیہ یہ ہے کہ

! پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی ....

جہاں درختوں سے بھرے آنگنوں والے گھر تھے وہاں اب کنکریٹ کا جنگل کھڑا ہے۔ جو بستیاں سانس لیا کرتی تھیں وہ اب محض سُتونوں، دیواروں، دروازوں اور کھڑکیوں کے مجموعے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ دولت کی ہوس نے مکانات پر تو منزلیں چڑھادی ہیں !مگر قناعت اور سُکون کی منزل ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں

زندگی کی اے ٹی ایم سے سب کچھ نکالنے کی ہوس تو ہے مگر عمل کے کھاتے میں کچھ جمع کرانے کی توفیق ہے نہ سکت ! دُنیا کو مُٹھی میں بند کرنے کی آرزو ہے مگر پیروں کو اِتنی زمین بھی مُیسر نہیں کہ ڈھنگ سے کھڑا ہوا جاسکے ! دیدہ بینا کی اشد ضرورت ہے مگر اُس کا تو نشان تک نہیں ملتا۔ جو کچھ بھی دیکھنا ہے، تصور کی آنکھ سے دیکھا جارہا ہے۔ خوش گمانیوں کی غیر حقیقی فضاء میں سانس لینے کو بصیرت سمجھ لیا گیا ہے ! کہاں کا دیدہ بینا اور کیسی بصیرت ؟ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے بس وہی حقیقت ہے۔ اور دِل کی آنکھ ؟ ہوتی ہوگی کہیں، ہمیں اُس سے کیا کام ! جب دِل ہی نہں رہا تو دِل کی آنکھ کہاں سے

لائیں؟

جن کے دِل کی زمین پر اب تک محبت کی کسی کلی نے کِھل کر پُھول کی شکل اختیار نہیں کی وہ پُھولوں سے بسے شہر کو کانٹوں کے ڈھیر میں تبدیل کرنے کی سازش پر عمل پیرا ہیں۔ بے عملی کا پودا اگا کر وہ پھل پانے کی تمنا ہے جو عمل کا بیج بونے پر ملتا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ فطرت اپنے اُصول کہاں بدلتی ہے؟

دھارے کے خلاف جا کر تیرنا کس کے بس کی بات ہے؟ اور اگر یہ بس میں ہو تب بھی منطق تو بہر حال لازم ہے۔ ضرورت نہ ہو تو محض خواہش کی غلامی اختیار کرکے ایسا کرنا نِری حماقت کے سِوا کچھ نہ ٹھہرایا جائے گا۔ دھارے خلاف تیرنا شجاعت کی نشانی ہے۔ جن کی آنکھوں پر ناپختہ شعور کے پردے پڑے ہوئے ہیں اُنھوں نے فطرت کے اُصول ترک کرنے کے قبیح عمل کو بھی دھارے کے خلاف بہنا سمجھ لیا ہے! خام خیالی کو دانش تسلیم کرلیا جائے تو پھر کچھ کا کچھ سمجھ میں آتا ہے!

کبھی جو شہر روشنیوں سے عبارت تھا اُس کے مکین اب تاریکی کو اپنا مُقدر بنا بیٹھے ہیں۔ باہر کی دنیا کو کسی نہ کسی طور روشن رکھنے کا اہتمام کرلیا

گیا ہے مگر باطن میں تو اندھیرا ہی اندھیرا بسا ہوا ہے، ظلمت ہی ظلمت کُنڈلی مارے بیٹھی ہے۔ جہاں ظلم کو زندگی کے چلن اور معمول کا درجہ حاصل ہو رہے، وہاں ظلمت ہی کا تو راج ہوگا!

جس نے متوازن اور ٹھوس اُصولوں کی بنیاد پر یہ کائنات اُستوار کی ہے وہ ہمارے لیے اپنے اُصول کیوں بدلے گا؟ وہ چاہے تو بدل بھی سکتا ہے مگر کوئی پہلے خود کو پہلے ایسی مسندِ عالی پر فائز تو کرے کہ تقدیر کا تعین اُس سے پوچھ کر ہو، تقدیر لکھنے والا خود اُس سے رضا پوچھنے پر مائل ہو!

جو شہر پُورے ملک کے لیے زندگی کی سب سے توانا علامت تھا وہ اب مُردنی سے عبارت ہوتا جارہا ہے۔ محض زندہ رہنے (یا بچ پانے) کو سب کچھ، بلکہ زندگی کا مقصدِ اوّلیں مان لیا گیا ہے! امکانات کی نگری کو سب نے مِل کر بانٹ لیا ہے۔ کہیں بھی معاملہ قانون پر عمل تک پہنچے تو "اسٹیک ہولڈرز" آستینیں چڑھاکر میدان میں نکل آتے ہیں! دھونس، دھمکی، طاقت، چالبازی اور خوشامد یا پھراِن سب خصلتوں کے ملے جُلے استعمال سے جس نے جو کچھ حاصل کرلیا ہے اُس سے بال برابر بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔

ایک بسا بسایا شہر لاوارث سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اِس گائے سے دُودھ تو سبھی دوہنا چاہتے ہیں مگر اِسے بروقت دانہ اور چارا ڈالنے، صحت کا خیال رکھنے کی

فکر بظاہر کسی کو لاحق نہیں۔ سب نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اِنسانوں کو تو خوراک، علاج اور آرام کی ضرورت پڑتی ہے مگر شہر کو کبھی بھوک لگتی ہے نہ وہ بیمار پڑتا ہے۔ "اسٹیک ہولڈرز" کو کس زبان میں سمجھایا جائے کہ شہر بھی زندگی سے متّصِف ہوتے ہیں۔ اُنہیں بھی بُھوک لگتی ہے، وہ بھی تھک جاتے ہیں، اُنہیں بھی آرام اور تیمار داری کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ بھی چاہتے ہیں کہ اُن کے لیے فراغت کے لمحات کا اہتمام کیا جائے۔ زندہ اِنسانوں کو جو اپنے دامن میں سَمولے اور شفیق ماں کی طرح بُھوکا نہ سونے دے وہ بستی، وہ شہر زندگی سے عاری کیونکر ہو سکتا ہے؟

بے حِسی کس مقام پر لے آئی کہ ٹارگٹ کلنگ میں معذوروں کو بھی استثنٰی نہیں مِل رہا، بچوں کو بھی بخشا نہیں جارہا اور خواتین کا احترام اب قِصّوں، کہانیوں میں پڑھی ہوئی بات لگتی ہے! اسٹیک بچانے کے نام پر ہر عمل، بلکہ بد اعمالی کو درست اور جائز قرار دیا جاچکا ہے۔ خُون کی حُرمت کا تقاضا یہ ہے کہ اِسے بچانے پر توجہ دی جائے۔ تماشا یہ ہے کہ صرف بہہ جانے والے خُون کو پُر وقار سمجھا جانے لگا ہے۔ رگوں میں موجود اور گردش کرتے ہوئے خُون کی تو جیسے کوئی وقعت ہی نہیں رہی۔

،ایک جیتا جاگتا، ساحل پر آباد شہر سفاکی، سنگ دِلی، ہلاکت پسندی

لاقانونیت، ظلم، بے انصافی، بے حِسی، وحشت اور بے بسی کی لہروں میں ہچکولے کھاتا ہوا عدم آباد کے ساحل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کشتی بھنور میں پہنچے تو اُس پر سوار سبھی لوگ پریشان ہو اُٹھتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی کوئی سفینہ گزرا ہے جس کے بھنور میں پہنچنے پر تمام مُسافر شادیانے بجائیں اور "ایونٹ" کو پورے جوش و خروش سے "سیلیبریٹ" کریں؟ اگر کسی نے ایسا کوئی سفینہ نہیں دیکھا تو غم نہ کرے، کراچی کو دیکھے! دو، سوا دو کروڑ اِنسانوں کا ایسا معمورہ کہاں پایئے گا جو رشکِ دشت ہوا جاتا ہے! اینٹوں اور گارے سے بنی عمارتوں میں زندگی ہوتی ہے نہ احساس۔ ٹھیک ہے، مگر جب چلتے پھرتے اِنسانوں کے وجود سے احساس کی صفت خارج ہو جائے تو؟ اُن میں اور عمارتوں میں کیا فرق رہ گیا؟ احساس سے عاری انسانوں اور عمارتوں کا ایسا اِمتزاج دُنیا نے کم کم دیکھا ہوگا۔

معیشت کی شہہ رگ چاہتی ہے کہ اُس پر توجہ دی جائے، اُس کی تکالیف دور کی جائیں تاکہ وہ پوری توانائی کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر قوم کے لیے کچھ کر سکے۔ لکیر پیٹنے سے بہت پہلے سانپ کو پیٹنے کی ضرورت ہے۔

"گھونگھٹ اُٹھالوں کہ گھونگھٹ نِکالوں؟"

اب کسی کو کیا بتائیں کہ حال ہی میں اختتام کو پہنچنے والے ایک اور جمہوری دور نے کیا کیا ستم ڈھائے ہیں، کیسے کیسے گل کِھلائے ہیں! مینڈیٹ نے خوشی کے مارے مینڈک کی طرح پُھدک پُھدک کر ہماری توجہ بُنیادی مسائل سے ایسی ہٹائی کہ پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی! روشنی کے ختم ہونے پر ویسے تو پتہ نہیں کون کون سی چیزیں تاریکی میں گم ہوئی ہیں مگر ریلوے کا شعبہ تو واقعی خاک میں مِل گیا! پلیٹ فارم ویران ہیں اور ٹرینوں نے زیادہ آمد و رفت سے معذرت کرلی ہے۔ اپنے مُقدّر پر رشک کیجیے کہ سیاست کا پلیٹ فارم سلامت ہے، آباد ہے۔ اِس پلیٹ فارم سے اب تک ڈرانے، دھمکانے اور اشتباہ کرنے کی اداکاری پر مبنی ٹرینیں روانہ کی جارہی ہیں!

1957 کی سُپر ہٹ فلم "سات لاکھ" کے لیے کوثر پروین کا گایا ہوا گیت "گھونگھٹ اُٹھالوں کہ گھونگھٹ نِکالوں؟" بے حد مقبول ہوا تھا۔ یہ خوبصورت ٹکڑا ہمارے سیاست دانوں کی فِکری ساخت کے فریم میں فِٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ کبھی وہ گھونگھٹ اُٹھانے کی دھمکی دیتے ہیں، کبھی گھونگھٹ نِکالنے سے ڈراتے ہیں!

یہ کردوں گا، وہ کردوں گا" ٹائپ کے جملوں کا مزید پروان چڑھ رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے "بس، زبان نہ کھلوائی جائے ورنہ سب کا کچا چٹھا کھل جائے گا۔ کوئی بھرے جلسے میں انتباہ کرتا ہے کہ سینوں میں مدفون راز سینے ہی میں مدفون رہنے دیئے جائیں تو اچھا ہے ورنہ "قبر کشائی" بہتوں کو رُسوائی کی قبر میں لِٹادے گی! جلسوں میں حاضرین کو بجلی کے سے جھٹکے دینے والی تقاریر میں مخالفین کو انتباہ کیا جارہا ہے کہ زبان کو لگام دی جائے، زیادہ بول کر زبان کھولنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ اگر زبان کھل گئی تو بہت کچھ سامنے آ جائے گا۔ گویا قیامت ہی برپا ہو جائے گی۔ مگر صاحب! اب کون سی قیامت ہے جو برپا ہونے سے رہ گئی ہے؟ جو لوگ ایک دوسرے کو لتاڑتے ہوئے بند مُٹھی کھولنے کی دھمکی دے رہے ہیں اُن کے اعمال، بلکہ کرتوت سب کے سامنے ہیں۔ کردار بے لباس تو ہو ہی چکا ہے، اب کیا کردار کی کھال بھی اُتاری جائے گی؟

خورشید شاہ نے شہباز شریف کو متنبہ کیا ہے کہ (اپنی) زبان کو لگام دیں اور پی پی پی کے قائدین کے کردار (!) پر کیچڑ اُچھالنا بند کریں ورنہ وہ (خورشید شاہ) بھی بول پڑیں گے اور اُن کے پاس بیان کرنے کو بہت کچھ ہے۔ ذرا فِلمی انداز سے کہیے تو خورشید صاحب نے پردہ اُٹھانے کی دھمکی دی ہے یعنی پردہ جو

!اُٹھ گیا تو بھید کُھل جائے گا! اور "اللہ میری توبہ" کے الفاظ عوام کی زبان پر ہوں گے قوم منتظر ہی رہتی ہے کہ جو دو چار پردہ نشین مشتہر ہونے سے رہ گئے ہیں اُن کے نام بھی بتا ہی دیئے جائیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کرپشن کے دریا میں ڈبکیاں لگانے والوں کی فہرست طشت از بام ہوتی ہے تو بہت سے لوگ اپنا نام نہ پاکر اُداس ہو جاتے ہیں! کرپشن کی پٹاری کھولی جائے تو نام اُچھلتا ہے اور کمپنی کی تھوڑی بہت مشہوری ہو جاتی ہے۔ اور اگر کبھی کوئی اپنے وعدے یا وعید کے مطابق کچھ بتانے پر تُل بھی جائے تو لوگوں کو مایوسی ہوتی ہے کیونکہ کچھ بتانے کے نام پر جو کچھ کیا جارہا ہوتا ہے وہ کچھ نہ بتانے کی کوشش کے سِوا کچھ نہیں ہوتا! پردہ اُٹھنے کے انتظار میں پتھرائی ہوئی آنکھیں پتھرائی ہی رہ جاتی ہیں۔

بہت شور سُنتے تھے پہلو میں دِل کا
!جو چیرا تو اِک قطرہ خُوں نہ نِکلا

1971 میں جو کچھ ہوا اُس کے بے لاگ تجزیے اور ذمہ داران کے تعین پر مبنی حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ مدتوں سَرد خانے میں پڑی رہی۔ ایک جنگ میں کی جانے والی نادانیوں سے متعلق اِس رپورٹ کو منظر عام پر لانے کے لیے یاروں

کو باضابطہ جنگ لڑنی پڑی ! مگر کسی کے بھی خلاف کوئی کارروائی نہ ہو سکی۔ ہوتی بھی کیسے ؟ وعدوں اور دعووں کی زمین پر ایسے ہی گل کِھلا کرتے ہیں۔

اربوں روپے کی کرپشن میں گلے تک دھنسے ہوئے لوگ اب ایک دوسرے کو نمائشی دھمکیاں دے کر عوام کی توجہ حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ مگر یہ تماشا بھی کب تک ؟ لوگ "ورائٹی" چاہتے ہیں۔ وہ بے وقوف بننے کو تیار ہیں مگر بے وقوف بنانے کے طریقے تو نئے ہوں، کچھ تو جدت دِکھائی دے ! باطن بدلنا ممکن نہ ہو تو کم از کم ظاہر ہی بدل لیا جائے۔ تن وہی رہے تو رہے مگر کپڑے تو نئے ہوں ! لوگ گھر میں ورائٹی پیدا کرنے کے لیے اور کچھ نہ سہی، فرنیچر کی سیٹنگ ہی بدل لیا کرتے ہیں۔ سیاست دان اِتنی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے!

بیشتر سیاسی تقاریر "ورنہ" سے شروع ہو کر "ورنہ" پر ختم ہوتی ہیں۔ سُننے والے دم بخود بیٹھے رہتے ہیں کہ "ورنہ" کا پردہ ہٹے اور جو کوئی ایک آدھ ستمگر دِکھنے سے رہ گیا ہے اُس کے بھی درشن ہو ہی جائیں۔ مگر اے وائے ناکامی کہ ہوتا کچھ بھی نہیں۔ پرنالہ وہیں بہتا رہتا ہے۔ یہ اہل سیاست کا وتیرہ ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف انتباہ جاری کرکے عوام کا دِل بہلاتے رہتے ہیں۔ اُنہیں باالآخر وہی کرنا ہے جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہوگا وہی جو ہوتا آیا ہے۔ مارکیٹ میں وہی پروڈکٹ لائی جاتی ہے جس کی ڈیمانڈ ہو یعنی خریدار

موجود ہوں۔ لوگ انتباہ کے نام پر سیاست دانوں کی بڑھکیں اور ایک دوسرے پر لعن طعن سُننے کے عادی ہیں تو کوئی نئی پروڈکٹ مارکیٹ میں پیش کرنے کا خطرہ کیوں مول لیا جائے؟ کہیں اسٹاک پڑا کا پڑا رہ گیا تو!

قوم عشروں سے یہ تماشا دیکھ رہی ہے۔ ایک گروہ آتا ہے اور خوب کھاتا ہے۔ جب کھاتے کھاتے تھک جاتا ہے تو تھوڑا سا بے دم ہو کر ہٹ جاتا ہے اور دوسرے کی باری آتی ہے۔ وہ تھکتا ہے تو پہلا پھر آ جاتا ہے۔ دونوں کھاتے ہیں اور خوب ڈکارنے کے بعد ایک دوسرے پر غُرّانے، ڈرانے اور سب کچھ بیان کرنے کے انتباہ کی شاندار اداکاری کرتے رہتے ہیں!

اب ایسا کیا رہ گیا ہے جو بیان ہو؟ اور کس خرابی کے بیان میں کون سی باریکی رہ گئی ہے؟ کس کا کچّا چٹھا ہے جو کون نہیں جانتا؟ پھر کس بات سے ڈرایا جارہا ہے؟ اور اگر واقعی کوئی بات تھی بھی تو اب تک بتائی کیوں نہیں گئی؟ اُس بات کو محض ڈرانے کے لیے چُھپا کر کیوں رکھا گیا؟ جو کچھ بیان کر دینا چاہیے اُسے بیان کرنے کے بجائے محض انتباہ پر گزارا کیوں کیا جارہا ہے؟ مُٹھی بند رکھنے کی قیمت درکار ہے یا کھولنے کی؟ قوم کی قیادت کے آرزو مند کب تک یہ چوہے بلی کا نمائشی کھیل کھیلتے رہیں گے؟

نورا کُشتی کب تک چلے گی؟ اپنے اپنے دائرہ اختیار کا تعین کرکے، اپنے اپنے اسٹیک کی حدود متعین کرکے کب تک عوام کو صرف وعدوں یا وعیدوں سے بہلایا جاتا رہے گا؟ دس سال قبل متعارف کرایا جانے والا فرینڈلی اپوزیشن کا نظریہ اب جوبن پر ہے۔ عوام منتظر ہیں کہ کوئی تو اُن کے لیے آواز اُٹھائے مگر ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن جانے والوں نے طے کرلیا ہے کہ جیسے بھی بن پڑے، گٹھ جوڑ برقرار رہے گا۔ ہاں، اِس گٹھ جوڑ سے اُٹھنے والے تعفن کو دبانے کے لیے وقتاً فوقتاً جوشیلے اور بھڑکیلے بیانات کا چھڑکاو ٔ کیا جاتا رہے گا تاکہ عوام حقیقت کی "خوشبو" نہ سُونگھ سکیں!

ہم، خدا ناخواستہ، ماہرین میں سے تو ہیں نہیں کہ سوچے سمجھے بغیر ہر معاملے میں رائے دیتے پھریں اِس لیے اللہ کی اُس مخلوق کے بارے میں کچھ کہنے سے گریز ہی کرتے ہیں جسے خُدا ہی مِلا نہ وصال صنم! طب کے ماہرین خَسرے کی وباء سے نبٹنے کے طور طریقے سوچ رہے ہیں مگر سماجیات کے ماہرین کو کچھ فکر ہی نہیں کہ معاشرے میں "کُھسرے" کی وباء بھی تیزی سے پھیل رہی ہے! اور سچ تو یہ ہے کہ یہ وباء اب اُسی طرح پھیل چکی ہے جس طرح بعض لوگ کہیں سے شہ پاکر بہت پھیلتے ہیں!

ہم خواجہ سراؤں کے دُشمن نہیں مگر معاشرے کی رنگینی میں خواجہ سرا ایسے ہی ہیں جیسے سالن میں نمک۔ لیکن سارا سالن ہی نمک کی کان بننے پر تُل جائے تو!

مرزا تنقید بیگ کو ہر وہ معاملہ اچھا لگتا ہے جس سے ہم اُلجھن میں مبتلا ہوں۔ اُنہیں صرف پتا چلنا چاہیے کہ ہمیں کِس چیز سے تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اِس کے بعد اُن کی زبان قینچی کی طرح چل کر اُس چیز کے فوائد گنوانے لگتی ہے۔ مُلک میں خواجہ سراؤں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد پر ہم نے تشویش کا اظہار

کیا تو مرزا لب کُشا ہوئے۔ "اِس میں حیرت یا افسوس کی کیا بات ہے؟ اب یہاں کون سا شعبہ ہے جو بانجھ پن کے دور سے نہیں گزر رہا؟ تعلیمی اداروں کی کوکھ سے دانش پیدا نہیں ہو رہی۔ صحتِ عامہ کا شعبہ صحت مند معاشرے کو جنم دینے سے قاصر ہے۔ سرکاری صنعتی اداروں نے وسائل کی بندر بانٹ اور بے ضابطگی کو صنعت میں تبدیل کرلیا ہے۔ وزارتِ داخلہ کے پہلو سے امن اور تحفظ نام کی کوئی چیز ہویدا نہیں ہو رہی۔ ابلاغ کے ذرائع تجزیے اور رہنمائی کے لیے ہوتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ اِن دونوں معاملات میں اُن کی گود خالی سی ہے۔"

عراق کے منتظر الزیدی نے جس جوتے سے سابق امریکی صدر جارج واکر بش کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی اُسے ایک صاحب نے، اللہ ان کی ذہانت کو بُری نظر سے بچائے، بجا طور پر "اشرف المصنوعات" قرار دیا تھا! اِس بے ذہنی کے زمانے میں ایسی عمدہ تراکیب کبھی کبھار پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ہونٹوں کو مُسکراہٹ بخشنے والی باتیں کرکے لوگوں کے دِل جیتنے والے معروف فنکار سلیم آفریدی نے اپنے ایک آئٹم میں خواجہ سراؤں کو "اشرف المُشکلات" قرار دیا تھا! اِس مظلوم طبقے کو بیان کرنے کے لیے اِس سے اچھی اور تیر بہ ہدف ترکیب ہو ہی نہیں سکتی۔ ویسے عمر شریف اور سلیم آفریدی نے اپنے آئٹمز میں خواجہ سراؤں کا اِتنا بینڈ بجایا ہے کہ وہ بے بے چارے تنگ ہیں اور اُن کے لیے بھی یہ

دونوں بہت حد تک "اشرف المشکلات" کا درجہ رکھتے ہیں!

تین بھائیوں میں مَنجھلا یعنی بیچ والا بیشتر معاملات میں مُعلق ہی رہتا ہے۔ بیچ کے بے چاروں کا یہی حال اور انجام ہوا کرتا ہے۔ خواجہ سراؤں کا بھی یہی مخمصہ ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ اب تک ہم طے نہیں کر پائے کہ خواجہ سرا جی رہے ہیں یا جی رہی ہیں!

خواجہ سرا بضد ہیں کہ اُن کا احترام کیا جائے اور ہم احترام کرنے کو تیار بھی ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اُنہیں محترم سمجھا جائے یا محترمہ! ہم فیصلہ نہیں کر پاتے کہ اُنہیں ماموں کہیں یا خالہ، چچا سمجھیں یا پھوپی!

خواجہ سراؤں کی اُلجھنیں ہیں کہ کم نہیں ہوتیں۔ بس میں سفر کریں تو مصیبت، رکشا میں بیٹھیں تو مصیبت۔ شادی کی تقریب میں خود پہنچیں تو پہنچیں، کوئی بُلاتا تو ہے نہیں۔ اور بُلائیں بھی کیا؟ جو کام اِن کے کرنے کا تھا وہ اب لونڈے لپاڑے بخوبی کر لیتے ہیں!

جُھومنا گانا اور مٹک مٹک کر چلنا تو اب گھر کی کھیتی ہے، پھر باہر کی فصل کون خریدے! حالات سے تنگ آکر خواجہ سرا اپنی الگ دُنیا بسانے پر مجبور ہیں۔ یہ دوسروں کی خوشی میں تو شریک ہو رہتے ہیں مگر اپنے غموں کا سایا اُن پر نہیں پڑنے

دیتے۔ حد یہ ہے کہ اپنا جنازہ بھی دُنیا کی نگاہوں سے چُھپاتے ہیں کہ اِن کے لیے کوئی اور کیوں غمگین ہو!

دوسروں کی خوشی میں خوش رہنے والے (یا رہنے والیاں) کسی کو بظاہر دُکھ نہیں دیتے مگر پھر بھی لوگ اِن سے کتراتے ہیں۔ شاید اِس کا سبب یہ ہے کہ لوگ دوسروں کی خوشی میں خوش ہونے والوں کو پسند نہیں کرتے! یا پھر یہ بات ہے کہ خوشی کی تقریب میں "خانہ ساز" رقاص اِتنے ہوتے ہیں کہ اِضافی ٹھمکوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی!

اب خواجہ سراؤں کی دُنیا سے کچھ لوگ انتخابی آنگن میں ناچنے نکلے ہیں۔ بیس تیس سال پہلے کی بات ہوتی تو اِن کی انتخابی مہم انوکھی کہلاتی۔ ڈھول کی آواز، جھانجھر کی جھنکار اور "ولولہ انگیز" ٹھمکے تو اب ویسے ہی انتخابی ماحول کا حصہ ہیں۔ اِس میلے کی رنگینی میں خواجہ سرا کیا اِضافہ کر سکتے ہیں؟

خواجہ سراؤں کی طرف سے امیدوار میدان میں اُتارے جانے پر مرزا تنقید بیگ بہت خوش ہیں۔ خوشی اُنہیں اِس بات کی ہے کہ سِسٹم کے بانجھ پن کو خواجہ سراؤں نے آخر پہچان ہی لیا! مرزا کہتے ہیں۔ "ہمارا سیاسی نظام بھی کئی

عشروں سے یکسر بانجھ چلا آ رہا ہے۔ اور اِسی بانجھ پن کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ اِس سے وابستہ لوگ اب ناچ گانے تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ انتخابات کے موقع پر ووٹ مانگنے والے وہی انداز اپناتے ہیں جو خواجہ سرا بچوں کی پیدائش پر والدین سے کچھ وصول کرنے کے لیے دُعائیں دیتے وقت اپناتے ہیں!" ہم مرزا سے متفق ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ خواجہ سرا عوام کی بلائیں اپنے لیتے ہیں اور عوام سے ووٹ لینے والے دُنیا بھر کی بلائیں عوام کے سَروں پر لا پٹختے ہیں!

مرزا سیاسی نظام سے مایوس اور شاکی ہیں۔ بنیادی شِکوہ یہ ہے کہ سیاسی نظام سے جُڑی ہوئی جماعتوں نے اب تک کچھ خاص "ڈِلیور" نہیں کیا۔ کچھ ڈِلیور نہ کرنے کی صفت یعنی بانجھ پن ہی کے باعث لوگوں میں مایوسی بڑھ رہی ہے۔ ایسے میں خواجہ سراؤں کو سیاسی جماعتوں اور انتخابی سیاست میں اپنائیت کیوں محسوس نہ ہو!

ایک خواجہ سرا جب کاغذاتِ نامزدگی منظور ہونے کے بعد عوامی رابطہ مہم پر نکلا تو کسی نے پوچھا ایجنڈا کیا ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ "سُہاگ کے جوڑے کے رنگ کا ہے۔"

سوال کرنے والے نے وضاحت کی کہ وہ جھنڈا نہیں، ایجنڈا پوچھ رہا ہے۔

بے چارا (یا بے چاری) امیدوار تو پریشان ہوگیا کہ کیا جواب دے۔ سوال کرنے والے نے مزید وضاحت کی کہ حکومت مِل گئی تو کیا کروگے۔

جواب ملا۔ "وہی جو سب کرتے ہیں۔ حکومت ملنے پر سب خوشی مناتے ہیں اور خوشی مناتے مناتے پانچ سال گزار دیتے ہیں۔ ہم تو ویسے ہی خوش رہتے ہیں۔ اب سوچو کہ حکومت ملنے پر ہماری خوشی کا عالم کیا ہوگا!"

سوال کرنے والے نے (اپنا) سر پیٹ لیا! امیدوار کو مزید سمجھایا کہ حکومت میں آگئے تو عوام کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ اب بات امیدوار کی سمجھ میں آئی اور اُس نے جواب دیا۔

"جس کِسی کے بھی گھر بچہ ہوگا، حکومت مُفت ناچے گی۔"

یہ غنیمت ہے۔ جن کا بانجھ پن مُسلّم ہے اُن کی نیت، بہر حال، عوام کو کچھ دینے کی تو ہے۔ اور کچھ نہیں تو چار چھ "فری آف کاسٹ" ٹُھمکے ہی سہی! اب تک ہم جنہیں بیلٹ کے ذریعے اپناتے آئے ہیں اُنھوں نے تو اقتدار پا کر تگنی کا ناچ نچانے کے سِوا کچھ نہیں کیا!

انتخابی میدان میں نکل آنے والے خواجہ سرا ہار بھی جائیں تو دِل چھوٹا نہ کریں۔ جو کچھ اُن سے نہیں ہو پاتا وہ دوسرے بھی نہیں کر پائیں گے۔ جو خواجہ سراؤں کو شکست دیں گے وہ بھی کچھ ڈِلیور کرنے والے نہیں! ایک طرف نئی نسل تعلیمی امتحانات دے رہی ہے اور دوسری طرف انتخابات بھی سَر پر آ چکے ہیں۔ سَر پر آ چکے ہیں کہنا اِس لیے دُرست ہے کہ اِس میں بھی لوگوں کو اچھا رزلٹ لا کر دِکھانا ہے۔ گزشتہ پارلیمنٹ ہنگ (مُعلّق) تھی۔ نتائج کے اعتبار سے وہ خواجہ سراؤں کی (hung کی بے چاری تھی یعنی پارلیمنٹ آئی تو مزید hung میں۔ اگر اب پھر ویسی ہی she میں تھی نہ he طرح ہو جائے گا اور عوام کچھ ڈِلیور ہونے کا انتظار ہی کرتے رہ جائیں گے! hang بہت کچھ خدا کرے کہ ماہِ رواں کے دوسرے عشرے میں بننے والی پارلیمنٹ "اشرف المُشکلات" نہ ہو بلکہ "دافعُ البلا" ہو!

"انتخابی نشانات کا" گول دائرہ

سُنتے آئے ہیں کہ بادشاہوں کے زمانے میں کوئی جنتر منتر ہوا کرتا تھا۔ جو اِس میں گیا، لَوٹ کر نہیں آیا۔ شاہی محلّات کی غلام گردشوں کا ذکر بھی قدیم داستانوں میں مِلتا ہے۔ ویسے موجودہ دور کے ایوان ہائے اقتدار کی غلام گردشیں بھی کچھ کم نہیں۔ عہدِ رفتہ کی کہانیوں میں بُھول بُھلیاں بھی مذکور ہیں۔ اِن میں لوگ گم ہو کر رہ جایا کرتے تھے، واپسی کا راستہ نہ سُوجھتا تھا۔ بادشاہ، ملکہ، شہزادہ، شہزادی اور دیو کی کہانیوں میں طِلسمات کی ایسی دُنیا کا بھی بیان ملتا ہے جس میں مُڑ کر دیکھنے والا پتھر کا ہو جایا کرتا تھا!

آج کی دُنیا کو اُداس ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ داستانوں میں پایا جاتا ہے وہ ہم نے بھی منصہ ٔ شہود پر لانے کی حتّی المقدور کوشش کی ہے اور بہت حد تک کامیابی نے ہمارے بھی قدم چُومے ہیں۔ جنتر منتر، بُھول بُھلیاں اور طِلسمات متعارف کرانے کے معاملے میں ہم بھی کِسی سے کم نہیں۔ ہمارا طِلسماتِ سیاست ہر اعتبار سے زندہ طِلسمات ہے! کون سا تماشا ہے جو اِس عجائب خانے میں موجود اور دستیاب نہیں؟ جو سوچیے وہ پایئے اور جو پایئے اُس پہ قربان ہو جایئے۔

انتخابی دنگل جوبن پر ہے۔ فائنل راؤنڈ شروع ہوا چاہتا ہے۔ تمام جماعتوں کے ہیوی ویٹس لنگوٹ مزید کَس کر میدان میں آ چکے ہیں۔ ہر ایک کو اپنی لنگوٹ بچانے سے زیادہ حریف کی لنگوٹ اُتارنے کی خواہش سے بھی پنجہ آزمائی کرنی پڑ رہی ہے!

ہم سب ایک دوسرے کا عکس ہی تو ہیں۔ جیسے ہم ہیں ویسے دوسرے ہیں، جیسے وہ ہیں ویسے ہم ہیں۔ سیاست دان بھی کوئی آسمان سے تو اُترے نہیں کہ دُودھ کے دُھلے ہوں اور ہم اُن کے مُطہر ہونے کی شہادت دینے سے نہ کترائیں! جس طرح معاشرے میں دوسرے سب لوگ باہم دست و گریباں ہیں بالکل اُسی طرح سیاست دان بھی ایک دوسرے کی پگڑی اُچھال رہے ہیں۔ کہیں کہیں تو پگڑی بھی نہیں رہی اور ٹوپی بھی عَنقا ہے۔ ایسے میں سَر کے بالوں ہی کو ہدفِ استہزاء بنایا جارہا ہے! جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کا بال بھی بیکا نہیں کیا جاسکتا اُن کی پوری وگ مخالفین کے جُملوں کی زد پر رہتی ہے!

انتخابی نشانات نے ایک نئی دُنیا کو جنم دیا ہے۔ عوامی تھیٹر میں شاہکار کا درجہ پانے والے جُملے اب انتخابی نشانات کی "شان" بڑھانے کے لیے استعمال کئے جانے لگے ہیں! انتخابی حریف تھیٹر کے فنکاروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

جلسوں میں ایک دوسرے کو رکیک جُملوں سے نشانہ بنایا جارہا ہے۔ حاضرین کو ایک ٹکٹ میں کئی تماشے دیکھنے کو مِل رہے ہیں۔ عوامی تھیٹر کے ڈرامے چند چلتے جُلتے جُملوں کے گرد گھومتے ہیں۔ انتخابی تھیٹر کا حال بھی کچھ خاص مختلف نہیں۔اِس میں بھی تمام معاملات چھوٹے سے "گول دائرے" میں گھوم رہے ہیں! اور گھومتے رہنے کے اِس عمل میں اُمیدواروں کے دِماغ گھوم گئے ہیں۔ اپنے گھومتے ہوئے دِماغوں کے ذریعے وہ جلسوں کے حاضرین کو بھی گھما ڈالتے ہیں!

اپنے انتخابی نشان کی شان میں رطب اللسان رہنے اور دوسروں کے انتخابی نشان کو کچرے کا ڈھیر ثابت کرنے کی کوشش نے سیاست دانوں کو گھن چکّر بنا ڈالا ہے۔ عمران خان کا کہنا ہے کہ بلّا صرف چوکے اور چھکّے ہی نہیں لگاتا، اِس سے چھینٹی بھی لگائی جاسکتی ہے۔ ایسے ہی جُملوں میں بلّے کو خوبصورتی سے استعمال کرکے عمران خان نے حامی اور مخالفین دونوں کی سماعتوں کی خوب چھینٹی لگائی ہے! لوگ سُننے آئے ہوں شیر کی بُرائی اور اُن سے خود اُن کا "بلّا بردار" ہیرو کہے کہ شیر پر مُہر لگایئے تو ذرا سوچیے کہ سامعین کے دِلوں پر کیا گزرے گی! جب مخالفین کا انتخابی نشان حواس پر سوار ہو جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ شیر پر سواری کے دعویدار اُس کے تصور کو اپنے ذہن پر سوار ہونے سے نہیں روک پائے!

انتخابی نشانات کا میل ملاپ کرانے میں شہباز شریف کا کوئی ثانی نہیں۔ عمران خان کا بلّا اُن کے حواس پر ایسا سوار ہوا ہے کہ دِماغ سے عقل کی ساری ملائی چاٹ گیا ہے! کئی انتخابی جلسوں میں شہباز شریف نے کہا کہ بلّا اور تیر ایک ہو چکے ہیں۔ لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ ملاپ کیسے ہو سکتا ہے! عمران تو آصف زرداری کو اپنے بیانات میں کئی بار بولڈ کر چکے ہیں۔ تیر اور بلّے کے ایک ہو جانے کے الزام سے متعلق کوئی ثبوت شہباز شریف کے پاس تھا نہ ہے۔ ویسے سیاسی الزام کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہوا کرتا! بات یہیں تک رہتی تو کوئی بات نہ تھی۔ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ نے سوچا تیز اور بلّے کو ایک تو کر دیا، اب کہیں پہنچانا بھی چاہیے۔ ایک قدم آگے جا کر اُنھوں نے کہا کہ تیر اور بلّا مِل کر سائیکل پر سوار ہو چکے ہیں! اِس "انکشاف" سے یہ ثابت ہوا کہ تیر، بلّا اور سائیکل مِل کر سابق خادم اعلیٰ کے اعصاب پر سوار ہو چکے ہیں! اب اُن سے کون پوچھے کہ کبھی کوئی تیر بھی سائیکل پر سفر کرتا ہے! اور بلّے کا سائیکل سے کیا جوڑ؟ گھوڑا ہوتا تو ہم سوچیں کہ چلو، چوگان یا پولو کی طرز کا کوئی نیا کھیل ایجاد ہوا ہے جس میں گھڑ سوار بیٹ کی مدد سے گیند کو گول پوسٹ کی طرف ہٹ کرتا ہے! ویسے عوام یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ بلّا، تیر اور سائیکل تینوں ہی بے جان ہیں تو پھر اُن سے شیر کیوں خوف کھا رہا ہے؟ شیر سرکس ہی کا کیوں نہ ہو، شیر ہوتا ہے!

سائیکل کا معاملہ یہ ہے کہ چوہدری برادران کی انتخابی مہم ٹرک نہ سہی تو چھکڑے کی محتاج ضرور تھی۔ مگر جب چھکڑے کا وزن سائیکل پر لاد دیا جائے تو کیا ہوتا ہے؟ ٹائرز کو کیا رویئے، پوری سائیکل ہی پنکچر ہو جاتی ہے! یہی حال ق لیگ کی سائیکل کا بھی ہوا ہے۔ ن لیگ والے کہتے ہیں کہ شیر پر مہر لگائیے۔ چلیے، ہم مان لیتے ہیں کہ لوگ اِس کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ شیر کے پاس جانے کی ہمت کہاں سے پیدا کی جائے۔ مُہر لگانے میں شیر نے پہل کر دی تو؟ ن لیگ والے کے قائدین کہہ چکے ہیں کہ گیارہ مئی کو شیر دَہاڑے گا تو سب بھاگ کھڑے ہوں گے؟ اگر سبھی بھاگ کھڑے ہوں گے تو کیا ووٹرز میں اِتنا دم ہے کہ شیر کے سامنے کھڑے رہیں؟

لوگ بَلّے کو بھی آزمانا چاہتے ہیں مگر اشتہارات میں بَلّے کو کسی اور انداز سے استعمال ہوتے ہوئے دِکھایا جارہا ہے۔ بالخصوص سُلطان راہی والے انداز سے! نوجوان ہاتھوں میں بَلّے تھام کر جس طرح کرپٹ پٹواری کو سیدھا اور ٹریفک کو کنٹرول کر رہے ہیں بالکل اُسی طرح 1978 کی بلیک اینڈ وھائٹ فلم "لاہوری بادشاہ" میں سلطان راہی نے ہاکی کی مدد سے پورے لاہور کے

بدمعاشوں کو خاک چٹادی تھی! ہم یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتے کہ تحریک انصاف نے سلطان راہی سے اکتساب کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے سلطان راہی کو اِلقاء ہوا ہو کہ کبھی کوئی ایسی جماعت بھی آئے گی جو بَلّے کی مدد سے تمام بدمعاشوں کی چھٹی لگائے گی اور یوں اُنھوں نے ایک عظیم سیاسی آئیڈیا پیدا ہونے سے پہلے ہی چُراکر سِلور اسکرین پر استعمال کر ڈالا!

اگلے وقتوں کے سیاست دان بھی کیسے سادہ لوح تھے کہ ایک دوسرے کو منشور کی بنیاد پر نشانہ بنایا کرتے تھے۔ "کوتاہ بینی" کا وہ زمانہ کب کا ہَوا ہو چکا ہے۔ اب منشور کا رونا نہیں رویا جاتا اور وعدے کئے جاتے ہیں نہ دعوے۔ اپنی عظمت کا راگ بھی نہیں الاپا جاتا۔ آج کی سیاسی اور انتخابی سرگرمی کچھ اور ہے۔ اب مخالفین کو نشانہ بنانے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور نشانہ بھی انتخابی نشان کی بنیاد پر بنایا جاتا ہے۔ کون دُور کی کوڑیاں لاتا پھرے۔ زیادہ دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ حریف کے انتخابی نشان میں کیڑے تلاش کیجیے۔ پھر چُن چُن کر یہ کیڑے نکالتے جائیے اور پرستاروں کو دِکھاتے جائیے! جب چھوٹے سے دائرے میں گھومنے سے بات بن سکتی ہو تو زیادہ محنت کرنے اور دور افتادہ مقامات کی خاک چھاننے کی کیا ضرورت ہے؟

ایک اور واپسی

ڈاکٹر طاہر القادری کتابیں لکھتے لکھتے ہمارے لیے ایسی کتاب بن گئے ہیں جس کے ایڈیشن آتے رہتے ہیں۔ گزشتہ دسمبر میں اُن کا تیسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا جب وہ کینیڈا سے پلٹے۔ اِس ایڈیشن میں خاصے ضمیے جُڑے ہوئے ہیں۔ تازہ ترین ضمیمہ اُن کا لندن سے لاہور پہنچنا ہے تاکہ پولنگ کے دن ملک بھر میں دھرنے دیکر انتخابی عمل کی خرابیوں پر احتجاج کیا جاسکے۔

مرزا تنقید بیگ کا شُمار ڈاکٹر صاحب کے شدید ترین "متاثرین" میں ہوتا ہے یعنی اُن پر فِدا ہیں، فریفتہ ہیں۔ ممدوح کا ذکر چھڑتے ہی مرزا میں جناتی قسم کا ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اپنے "ہیرو" سے متعلق تحفظات سُن کر وہ ہم سے ایک بار ایسے خفا ہوئے کہ پندرہ دن بات نہیں کی۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے ہمیں مرزا سے بچنے کا کارگر نُسخہ سُجھایا! خیر، مرزا بھی کم چالاک نہیں۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ معاملہ طُول پکڑ رہا ہے تو از خود نوٹس کے تحت خود ہی مَن گئے اور ایک دن ہم سے ملنے آدھمکے! کچھ دن بعد ہم نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں چند تحفظاتی ریمارکس دیکر مرزا کو پھر ناراض کردیا۔ اُن کے رُوٹھے رہنے کا ایک اور پندرہ روزہ دور چلا۔ مگر ہماری کون سی خوشی زیادہ دن رہی ہے جو یہ رہتی؟ ہمارے کسی بدخواہ نے اُن کے کان بھرے کہ

باتوں میں نہ آیا کریں، آپ کو جان بوجھ کر ناراض کیا جارہا ہے! وہ دِن ہے اور آج کا دِن، اپنے ممدوح سے متعلق ہمارے تحفظات سے مرزا نہ صرف یہ کہ پریشان نہیں ہوتے بلکہ اپنی بات منوانے کے لیے ڈٹ جاتے ہیں!

دسمبر میں کینیڈا سے "شیخ الاسلام" کی آمد ایسی ہیبت ناک تھی کہ مخالفین پر سکتہ سا طاری ہوگیا! بہت سے معترضین تو اُن کی ایک آدھ تقریر ہی سے انٹا غفیل ہوگئے! ڈھائی تین ماہ سے عالم یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو الٹی میٹم سے شروع ہو کر الٹی میٹم پر ختم ہوتی ہے۔ وہ جیسے ہی میدان میں آتے ہیں، قیاس آرائی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ جنوری میں لانگ مارچ کے ذریعے ڈاکٹر صاحب نے سیاسی تالاب میں خاصا بڑا پتھر پھینکا تھا۔ سبھی کو بولنے اور لکھنے کے لیے موضوع مل گیا۔ اُن کی تقاریر سے فلم اور ٹی وی کے مکالمہ نگاروں کی تو چاندی ہوگئی! لانگ اور دھرنے کے دوران کئی ایسے منظر نامے تخلیق ہوئے کہ شوبز والے استفادہ کریں تو ہٹ فلمیں اسکرین کی زینت ہوں!

اِتنا تو ہم بھی کہیں گے ڈاکٹر صاحب خاصی تیاری کے ساتھ میدان میں اُترتے ہیں۔ اِسی بات کو ذرا کینیڈا اور امریکا تک گھما کر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُنہیں اچھی طرح تیار کرکے میدان میں اُتارا جاتا ہے! شُنید ہے کہ دسمبر کے آخر میں پاکستان واپسی قبل اُنہوں نے تین ہفتے واشنگٹن میں گزارے۔ گورے بہت پکّے ہیں، ایک آنچ کی بھی کسر نہیں رہنے دیتے۔ اُنہیں اندازہ ہے کہ معمولی وائرس پورے سوفٹ ویئر کا تیا پانچا

کر دیتا ہے! گورے رات دن ہمارے ہی بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ سوچ کہیں کم نہ پڑ جائے اِس خیال سے احتیاطاً اُنھوں نے چھوٹا موٹا پتیلا یا ڈرم نہیں بلکہ سوچ کے پورے ٹینک بنا رکھے ہیں!

جب سبھی ہاتھ دھوئے بغیر "شیخ الاسلام" کے پیچھے پڑگئے تو مرزا بہت جُزبُز ہوئے۔ اپنے "مرشد" کے بارے میں طرح طرح کے تبصرے اور تجزیے پڑھ کر اُن کا پارہ ایسا چڑھا کہ ہفتوں نیچے نہ اُترا! ہم نے سبب پوچھا تو بولے۔ "ہم بھی عجیب قوم ہیں۔ روتے رہتے ہیں کہ کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔ اور اگر کوئی از خود نوٹس کے تحت راہ نمائی کے لیے وارد ہو تو اُس میں کیڑے نکالنے لگتے ہیں۔"

ہم نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب کو انقلاب و نقلاب کے چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ عِلمی آدمی ہیں، عِلمی کام کریں۔ سیاست جیسی فضول مشق کے لیے اِتنے بہت سے لوگ ہیں تو سہی۔ مرزا یہ سُن کر ہم پر برس پڑے۔ "ڈاکٹر صاحب کے عِلمی تبحر کا سامنا کرنے کی ہمت کسی میں نہیں۔ غامدی صاحب نے کچھ مُنہ دینے کی کوشش مگر اپنا سا مُنہ لیکر رہ گئے۔ تم اِس لیے ڈر رہے ہو کہ کہیں ڈاکٹر صاحب کے سامنے تمہارے پسندیدہ چراغ گُل نہ ہو جائیں!"

ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا جناب! قیادت کوئی ایسا منصب نہیں جو از خود نوٹس کے تحت

حاصل کیا جائے۔ قوم جسے مُنتخب کرتی ہے وہ قائد بنتا ہے۔ مرزا کا جواب تھا۔ "تمہیں کیا معلوم قیادت کیا ہوتی ہے۔ جو پیدائشی قائد ہو وہ کیا اِس بات کا محتاج ہوگا کہ کوئی اُسے منتخب کرے؟"

ہم نے مرزا کو یاد دلایا کہ ڈاکٹر صاحب اِسی سسٹم کا حصہ رہ چکے ہیں پھر کیوں اِس کے خلاف میدان میں آئے۔ جس انتخابی نظام کی خامیوں کا رونا رو رہے ہیں اُسی کے تحت اُنہوں نے 2002 کا الیکشن لڑا اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

مرزا نے خاصا بُرا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "ایک تو یہ بڑی مشکل ہے کہ تم بے دِماغ ہوتے ہوئے بھی بڑی بڑی باتیں کرنے کی کوشش کرتے ہو! ڈاکٹر صاحب نے کوئی غلطی کی تھی تو کیا لازم ہے کہ دُہرائیں؟ جب اِنسان میں شعور کی سطح بلند ہوتی ہے تو وہ اپنی اِصلاح کرتا ہے، تمہاری طرح کالم نگاری نہیں کرتا رہتا!"

ہم نے مرزا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں سُوئے ظن رکھنے کی ہم میں ہمت نہیں۔ ہم تو معاشرے اور میڈیا کی بات کر رہے ہیں۔ مرزا کا جواب تھا۔ "میڈیا والوں کو تو بُھوسے میں چنگاری ڈالنے کا موقع ملنا چاہیے۔ قربانی کا جانور نالے میں گر جائے تو میڈیا والے لائیو کوریج کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔"

ہم نے یاد دلایا کہ قوم یہ گمان بھی کرتی رہی کہ نامعلوم ذرائع نے ڈاکٹر صاحب پر خطیر رقوم خرچ کرکے "کمپنی کی مشہوری" کا اہتمام کیا۔ مرزا کا پھڑکتا ہوا جواب تھا۔ "جلنے والے ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔ ویسے اُنہوں نے کچھ خرچ ہی کیا ہے، لُوٹا تو نہیں۔ کیڑے نکالنے والی قومیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ قیادت فریضہ ہے۔ کِسی کو فریضہ ادا کرنے سے روکنے کے عذاب پر کبھی ہم نے غور کیا ہے؟"

ہم نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب کو قیادت کی دعوت ہم نے کب دی تھی، وہ تو خود چلے آئے۔ مرزا نے تقریباً پُھنکارتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اب کیا ڈاکٹر صاحب اِس بات کے محتاج ہیں کہ کوئی اُنہیں مدعو کرے؟ وہ سمندر نہیں کہ اپنے ساحل پر کسی کی آمد کا انتظار کریں۔ قائدین تو دریا کی طرح ہوتے ہیں جس کا کام بہنا اور جہاں تہاں پہنچنا ہے۔"

مرزا سانس لینے کو رُکے تو ہم نے موقع غنیمت جان کر عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی عجیب و غریب بیانات داغنا شروع کردیا۔ اُنہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ قوم کیا سُننا چاہتی ہے۔ مرزا نے فوراً ہمیں جھڑک دیا۔ "قوم کیا چاہتی ہے؟ اِسے ہنگامہ آرائی، احتجاج، جلسوں، جلوسوں، لانگ مارچ اور دھرنوں ہی سے تو محبت ہے نا۔ اگر ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی لانگ مارچ کیا اور دھرنا دیا تو حیرت کیسی؟ اِس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ کینیڈا میں پانچ چھ سال رہنے کے بعد بھی اُن میں "کینیڈیت" پیدا نہیں

"ہوئی! اور کیا چاہیے؟ اب کیا اُن کی جان لوگے؟
ہمیں چُپ سی لگ گئی۔ عوامی تھیٹر کی زبان میں کہیے تو بولتی بند ہو گئی! کہتے بھی کیا؟ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کچھ بھی کہتے ہوئے ہم ویسے بھی ڈرتے ہیں۔ پتہ نہیں کب، کیسا فتوٰی جاری کردیں؟ ووٹ ڈالنے کو اُنہوں نے گناہِ کبیرہ قرار دے دیا ہے۔ ہم اللہ کا شُکر ادا کرتے ہیں کہ اُنہوں نے ووٹ ڈالنے کی صورت میں نکاح فسخ ہونے کی بات نہیں کہی! اگر وہ پولنگ کے خلاف اپنے دھرنوں میں شریک نہ ہونے والوں کو اسلام کے دائرے سے خارج قرار دے دیتے تو ہم کیا بگاڑ لیتے!
ڈاکٹر صاحب وعدے کے پکّے اور سچّے ہیں۔ پولنگ کے دن دھرنے دینے کا اعلان کیا تھا اِس لیے لندن سے آ گئے۔ نئے نظام کا خاکہ اُنہوں نے بغل میں داب رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب سڑے ہوئے، فرسودہ نظام کا بھیانک انجام قوم اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی تب وہ نیا نظام پیش کریں گے۔ ایک انوکھا نکتہ یہ بیان کیا کہ اِس بار حکومت سازی ہی نہیں بلکہ اپوزیشن کی تشکیل کے لیے بھی ہارس ٹریڈنگ ہوگی! مزید فرماتے ہیں کہ نظام کو بغاوت کی قوت کے ساتھ تبدیل کرنا ہوگا۔ اُن کی باتیں ایک بار پھر بُھوسے کو چنگاری دِکھاتی محسوس ہو رہی ہیں۔ اِس قوم کا بُھوسا کم ہوتا ہے نہ چنگاریاں!

یہ گھڑی محشر کی ہے

ایک بار پھر نظریں آپ پر ہیں۔ کل تک آپ محض انسان تھے۔ آج آپ مرکز ہیں۔ جی ہاں، اُمیدوں کا مرکز۔ پاکستان کا مستقبل مُڑ کر آپ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ آج تو آپ ہیں اور آنے والے دن ہیں۔ آپ کی طرف سے کوئی اور فیصلہ نہیں کرے گا۔ آپ ہی کو فیصلہ کرنا ہے کہ پانچ سال تک مُلک کے اہم ترین فیصلے کون کرے گا۔

مرزا تنقید بیگ کئی دِن سے خاصے پژمُردہ اور مضمحل ہیں۔ انتخابات جب جب ہوئے ہیں، لوگوں نے اُنہیں اِسی طور پژمُردہ پایا ہے۔ جمہوری ادوار کے تجربات نے اُن کے اعصاب پر اضمحلال کی دبیز پرت چڑھادی ہے۔ ہم نے کئی بار (اپنا) سَر پھوڑا ہے یعنی اُنہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ جمہوریت چاہے جیسی بھی ہو، آمریت سے بہتر ہوتی ہے۔ مگر وہ اِس رائے کے حوالے سے ہمیں جاہل قرار دینے میں ذرا تامل نہیں کرتے!

سیاست دان ووٹ پانے کے لیے جس طور ایک دوسرے کے کردار کو بے لباس کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُسے دیکھ کر مرزا پر جُزبُز ہونے کا دورہ پڑتا رہتا ہے۔ ایک ماہ سے قوم انتخابی مہم کے نام پر بدامنی اور خرابی حالات کی سُرنگ سے گزری ہے۔ معاملات کی خرابی اور قیمتی جانوں کے ضیاع نے مرزا کو مزید.برہم اور اُن کے حواس و اعصاب کو

درہم برہم کر دیا۔ چلنے کی ہمت نہیں مگر ذرا سی بات پر بھی کاٹنے کو دوڑتے ہیں!

کل شب ہم نے اپنی شامتِ اعمال کو دعوت دے ڈالی یعنی مرزا سے پوچھ بیٹھے کہ ووٹ ڈالنے کتنے بجے گھر سے نکلیے گا! بس یہ سمجھیے کہ ہم نے مصرع طرح دیا اور مرزا نے پورا مشاعرہ کھڑا کر دیا! جب وہ شروع ہوئے تو اُن پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ کہنے لگے۔ قوم اب تک اُمید کے کھیتوں کو پانی دے رہی ہے۔ ارمانوں کی فصل کب اُگے گی، " کوئی نہیں جانتا۔ اور کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ فصل اُگ بھی گئی تو کٹ پائے گی یا نہیں۔ تم جیسے لوگ اُمید کی فصل کو پانی دیتے رہتے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ پانی کی زیادتی بھی فصل کو لے ڈوبتی ہے! "

ہم نے جان جوکھم میں ڈال کر دخل در معقولات کی جسارت کی اور استفسار کر ڈالا کہ آپ ووٹ ڈالنے جائیں گے یا نہیں۔ مرزا ہتّھے سے اُکھڑتے ہوئے بولے۔ "تم تو یہی چاہتے ہو کہ میں کہیں کا نہ رہوں۔ ووٹ ڈالنے جاؤں اور دونوں صورتوں میں دُنیا سے چل دوں۔ تخریب کاری ہو تو اُس کی نذر ہو جاؤں اور اگر وہاں سے بچوں تو اپنے ہی کاسٹ کئے ہوئے ووٹ کے ذریعے منتخب ہونے والوں کے غلط اعمال پر ماتم کرتا رہوں۔ "

ہم نے عرض کیا کہ ووٹ ایک امانت ہے۔ مرزا کو نیا نکتہ سُوجھ گیا۔ بولے۔ "میں بھی تو لوگوں سے یہی کہتا ہوں کہ ووٹ امانت ہے اور ہم امین۔ امانت کا تحفظ ہم پر فرض

ہے۔ جانتے بوجھتے بے فیض لوگوں کو ووٹ دینے سے کہیں بہتر ہے کہ اِس امانت کو ضائع ہونے سے بچایا جائے یعنی ووٹ کاسٹ ہی نہ کیا جائے!"

مرزا کی بات ہم سے ہضم نہ ہو سکی۔ ہوتی بھی کیسے؟ موقف پر قائم رہنے اور اڑے رہنے میں تو بہت فرق ہے۔ کبھی کبھی تو ہمیں گمان گزرتا ہے کہ ٹٹّوؤں نے اڑیل ہونا شاید اُنہی سے سیکھا ہے! جب وہ (مرزا) اڑیل رہنے پر بضد ہوں تو اِنسانوں کے بس میں نہیں ہوتا کہ اُن سے بحث کریں۔ ہم ہمت نہیں ہارتے اور اُن سے متصادم رہتے ہیں۔ اِس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ ہم اِنسان نہیں! بات یہ ہے کہ ہم اُن کے دوست ہیں اور اُن کی خُو۔بُو تھوڑی سی ہم میں بھی در آئی ہے۔ عادت سے مجبور ہو کر ہم نے اُن سے بحث جاری رکھی اور سمجھانا چاہا کہ ووٹ نہ ڈالنا امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہے۔ ایسا کرکے ہم اپنے نظام کی جڑ کمزور کرتے ہیں۔ مرزا نے تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔ "اِس نظام میں ایسے کون سے ہیرے موتی جڑے ہیں کہ اِس کی جڑ کمزور کرنے سے گریز کیا جائے؟ جمہوریت کے نام پر ایک اور پانچ سالہ مدت کے لیے خود کو بے ایمان اور بے ضمیر لوگوں کے حوالے کر دینا کہاں کی دانش مندی اور امانت داری ہے؟"

ہم نے عرض کیا کس نے مشورہ دیا ہے کہ جنہیں آزما اور بُھگت چکے ہیں اُنہی کو منتخب کیا جائے۔ تھوڑی بہت دانش سے اللہ نے ہر پاکستانی کو نوازا ہے۔ بیلٹ پیپر بہت سے آپشنز دیتا ہے۔ مُہر لگانا بھی اپنی مرضی کا سَودا ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر مُہر لگائی جائے۔ جنہیں بُھگت بُھگت کر تھک چکے ہیں اُنہیں ایک بار پھر اپنے سَروں پر

مُسلّط کرنا اور قومی اُمور کا نگراں مقرر کرنا دانش مندی نہیں۔

مرزا بضد تھے کہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ "بے چارے ووٹرز کیا کریں؟ جو دو چار آپشنز ہوتے ہیں اُن میں بظاہر کچھ خاص فرق نہیں۔ کچھ بھی کر لو، گھوم پھر کر وہی لوگ آئیں گے جو خرابی میں اِضافے پر تُلے ہوئے ہیں۔"

ہم نے دست بستہ عرض کیا کہ لوگ ووٹ جیسا اہم اثاثہ سوچ سمجھے بغیر استعمال کرتے ہیں اور پھر خسارے کا رونا روتے ہیں۔ انتخابی مہم کے دوران دیکھا جائے کہ کون کِتنا جھوٹ بول رہا ہے اور کِس کی باتوں میں سَچّائی کا تناسب زیادہ ہے۔ اندازہ لگانا زیادہ مُشکل نہیں ہوتا۔ مفاد پرست دُور سے پہچانے جاتے ہیں۔"

مرزا نے قطع کلامی کی۔ "پھر وہی کتابی باتیں لے بیٹھے۔ لوگوں میں اِتنا شعور کہاں؟ امیدواروں کا موازنہ کرکے کھرے اور کھوٹے میں تمیز کا شعور ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔ عوام بڑی بڑی باتوں کی لہروں میں بہہ جاتے ہیں۔"

ہم نے نکتہ اعتراض پر کہا کہ عوام بھی گیہوں کی روٹی کھاتے ہیں۔ اِتنا شعور تو اُن میں ہونا ہی چاہیے کہ اپنے فائدے اور نقصان کی بات سمجھ سکیں۔ جب وہ ٹھیلے سے خریداری کرتے وقت تھوڑا بہت سوچ بچار کر سکتے ہیں تو اپنے نمائندوں اور حکمرانوں کے

انتخاب کے معاملے میں ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

مرزا نے خاصا حوصلہ افزاء اشارہ دیا یعنی ہماری بات سمجھنے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ یہ ہمارے لیے بہت بڑا لمحہ تھا کہ مرزا کی سمجھ میں ہماری کوئی بات آ گئی تھی اور وہ متفق بھی دِکھائی دے رہے تھے! چند لمحوں کے تامل کے بعد بولے۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔"

ہم نے متفق ہونے پر شکریہ ادا کرنے کا سا انداز اختیار کرتے ہوئے عرض کیا کہ میرے کہنے پر نہ جایئے، حقیقت پسندی کے آئینے میں اپنا سراپا دیکھیے۔ اپنا ووٹ مُلک اور قوم کے مفاد میں کاسٹ کیجیے۔ ووٹ ڈالنے سے قبل اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑے ہو جایئے۔ ضمیر کی آواز پر لبیک کہیے اور نیت کے مکمل اخلاص کے ساتھ صرف اُسے ووٹ دیجیے جو آپ کا نمائندہ اور حکمران بننے کی پوری اہلیت رکھتا ہو۔

مرزا نے ہماری بات سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے گردن جُھکالی اور خیالات کی دُنیا میں کھو گئے۔ ہم مطمئن ہو گئے کہ چلیے

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں

اور کُھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں!

آج بہت کچھ بدلنے کا دن ہے۔ اور تبدیلی کی ہوا چلے گی آپ کے ووٹ سے۔ آپ کا کاسٹ کیا ہوا ووٹ بہت کچھ تہہ و بالا کر دے گا۔ ہماری دُعا ہے کہ اِس ملک کے ہر مرزا

تنقید

بیگ کی سمجھ میں ہماری بات آجائے، اپنا فرض یاد آجائے۔

اِس ملک میں انتخابی عمل قیامت سے کم ثابت نہیں ہوا کرتا۔ اور ایسے مواقع پر غلط فیصلے مزید قیامت ڈھاتے ہیں۔ ووٹ کاسٹ کرنے کی اہلیت رکھنے والے ہر پاکستانی کو یاد رکھنا چاہیے۔ قیامت کی اِس گھڑی میں اُسے نیت کے اخلاص اور شعور کا مظاہرہ کرنا ہے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

امن کی آشا کا کریا کرم

جو لوگ دوستی اور امن کے نام پر سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے بے تاب ہوئے جاتے ہیں اُن کی آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹانے کے لیے سربجیت سنگھ کا کیس کافی ہے۔ جس ملک سے دوستی کی پینگیں بڑھانے اور مفاہمت کو پروان چڑھانے کی باتیں ہو رہی ہیں اُس نے مُصدّقہ و تسلیم شدہ دہشت گرد کو نہ صرف own کیا بلکہ بلکہ ہیرو کا درجہ دیکر پرلوک بھیجا!

بھارت کے ایک انٹیلی جنس افسر نے میڈیا کو بتایا ہے کہ ''سربجیت سنگھ مرکزی خفیہ ادارے 'را' کا ایجنٹ تھا۔ اُسے دھماکوں کے لیے پاکستان بھیجا گیا تھا۔ 'مشن' کامیاب تکمیل پر (یعنی دھماکے کرنے اور درجنوں پاکستانیوں کو موت کی وادی میں دھکیلنے کے بعد) وہ بھارت میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ سرحد پر پاکستانی فورسز نے دَھر لیا۔''
آپ حیران ہوں گے کہ بھارت کا کوئی انٹیلی جنس افسر اِتنی بات کہہ سکتا ہے۔ کبھی کبھی سچائی خود کو ہونٹوں تک لے آتی ہے۔ مزید حیرانی آپ کو یہ جان کر ہوگی کہ اِسی بھارتی انٹیلی جنس افسر نے خفیہ اداروں کے لیے ایجنٹ یعنی

جاسوس اور تخریب کار کی حیثیت سے کام کرنے والوں کا انجام بھی بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ''1990 کے عشرے میں 'را' نے بہت سے ایجنٹ دھماکوں اور دیگر وارداتوں کے لیے پاکستان بھیجے۔ اِن میں سے کئی ایک ایجنٹوں کا تو کوئی خاص مشن بھی نہ تھا، نہ اہداف واضح تھے۔ مقصود صرف یہ تھا کہ پاکستان کی سرزمین پر گڑبڑ پھیلائی جائے، خرابیاں پیدا کی جائیں۔ جو ایجنٹ پاکستان میں پکڑے جاتے ہیں ان کے اہل خانہ کو بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ اُنہیں واجبات کے لیے عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ سربجیت سنگھ کے اہل خانہ خوش نصیب تھے کہ یہ کیس میڈیا نے بہت اُچھالا۔ اب اُنہیں بہت کچھ آسانی سے مِل جائے گا۔''

جو بات من میں ہو وہی کوئی اور کہہ دے اور ہمیں کہنے کی زحمت سے بچالے تو اُس پر فِدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ آپ نے ایسے مواقع پر پیش کیا جانے والا یہ شعر ضرور سُنا ہوگا۔ ؎

مُوذن مرحبا بر وقت بولا
تِری آواز مکّے اور مدینے

بھارتی انٹیلی جنس افسر نے بھی کچھ ایسا ہی کام کیا ہے۔ جو امن کی آشا کے نعرے کا سہارا لیکر بھارت سے کسی بھی قیمت پر دوستی کے لیے بے تاب، بلکہ

اُتاوُلے ہوئے جاتے ہیں اُن کے لیے سربجیت سنگھ کے بارے میں اُسی کے ملک کے انٹیلی جنس افسر کی گواہی تازیانے سے کم نہیں۔ کیا اب دوستی کی قیمت تسلیم شدہ دہشت گردوں اور جاسوسوں کو رہا کرکے چکانی پڑے گی؟

مذکورہ انٹیلی افسر نے جو کچھ کہا اُس پر غور تو کیجیے۔ کئی جاسوسوں کو تخریب کاری کا مشن سونپ کر بھیجا گیا۔ یعنی اُنھوں نے جی بھر کے تباہی پھیلائی اور دوستی کی بنیاد رکھی ! جس طرح کسی عمارت کو مستحکم کرنے کے لیے اُس کی بنیاد میں مضبوط ترین پتھر رکھے جاتے ہیں بالکل اُسی طرح بھارت نے بھی دوستی کی منزل تک پہنچنے کے لیے تخریب کا راستہ اپنایا ! جن کی نیت میں فتور ہو وہ دوستی کی بنیاد بھی تخریب سے رکھتے ہیں!

دوستی کے نام پر کرکٹ کو نُورا کشتی میں تبدیل کرنے والوں نے قومی مفادات کو بھی بُھلادیا اور ہمسائیگی کا حق ادا کرنے کا راگ ہی الاپتے آرہے ہیں۔ اِس ماحول میں معاملات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ جاسوسوں اور دہشت گردوں کو بھی چھوڑنے کا عندیہ دیا جانے لگا۔ بھارتی انٹیلی جنس افسر کا بیان بروقت ہے۔ اِس بیان کو دُنیا کے سامنے نمایاں انداز سے پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ سب کو اندازہ ہو کہ مہاراج کیا گُل کِھلاتے آئے ہیں!

جو لوگ میڈیا کے نقصانات گنواتے نہیں تھکتے اُنہیں اپنی سوچ تھوڑی سی تبدیل کرنی چاہیے۔ سربجیت کے کیس میں میڈیا کی بدولت اُس کے اہل خانہ کا بھلا ہوگیا! لگے ہاتھوں بھارت کی کم ظرفی بھی طشت از بام ہوگئی کہ وہ دُشمن کو نقصان پہنچانے والوں کو بھی واجبات ادا نہیں کرتا! اب سوچیے کہ دُشمنوں کی طرف سے دوستی کا راگ الاپنے والوں کو وہ کیا دے گا؟

ہم تو سمجھے تھے کہ وطن سے محبت اور اُس کے لیے جان کی بازی لگانے والوں کی ناقدری کے معاملے میں ایک ہم ہی منفرد ہیں۔ اب اندازہ ہوا کہ اِس معاملے میں بھی پاکستان اور بھارت کی ''ثقافت'' ایک ہے! یہ بھی خوب رہی کہ جو دوستی کے نام پر باضابطہ طریقے سے بھارت جائے، تِھرک تِھرک کر ناچ گائے اُس کے قدموں پر تو دولت واری جاتی ہے اور شہرت سے بھی نوازا جاتا ہے مگر جو جان کی بازی لگاکر دُشمن کی سرزمین پر قدم رکھے، تباہی پھیلائے، قتل و غارت کا بازار گرم کرے اُسے پورا مختتانہ'' بھی ادا نہیں کیا جاتا! اور اُس کے اہل خانہ کے لیے واجبات کی وصولی مسئلہ'' بن جاتی ہے۔ یہ روش تو خاصی جانی پہچانی لگتی ہے۔ یہی سب کچھ ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے۔ لگتا ہے بھارت اِس شعبے میں بھی ہمیں ٹف ٹائم دینے پر تُل گیا ہے! ہمارے ہاں بھی وطن کے لیے جان کی بازی لگانے والوں کو اپنا ''مختتانہ'' وصول کرنے کے لیے پھر جان کی بازی لگانی پڑتی ہے! اِس کا مطلب یہ ہوا کہ کئی شعبوں میں بہت آگے نکل جانے

والا بھارت اب تک متعدد شعبوں میں پاکستان ہی کی سطح پر ہے!

دوستی کسی بھی اعتبار سے کوئی ناقابل قبول وصف یا کیفیت نہیں۔ امن کی آشا بہت بھلی سہی مگر اِس دیوی کے چرنوں میں سبھی کچھ تو قربان نہیں کیا جاسکتا، ہر معاملے کی تو بَلی نہیں چڑھائی جاسکتی! امن کی آشا کے نام پر اور دوستی کی آڑ میں مہاراج ایڈوانٹیج لے رہے ہیں اور پاکستان میں اثرات کا دائرہ وسیع کرتے جارہے ہیں۔ اور ہمارے ہاں ایسے امن پرستوں کی کمی نہیں جو دوستی اور مفاہمت کو دیوی بناکر اُس کی آرتی اُتارنے کے نام پر بھارت کی حاشیہ۔برداری کا حق ادا کر رہے ہیں۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہر معاملے میں دوستی اور مفاہمت کو اپناکر معاملات درست کئے جاسکتے ہیں تو وہ ذرا پاکستان کے حالات ہی پر غور کرے۔ مفاہمت کی سیاست ہی نے ہمیں آج پھر تباہی کے دہانے تک پہنچادیا ہے۔ حقیقت کو تسلیم نہ کرنے اور ہر جھوٹ کی بدبو چھپانے کے لیے مفاہمت کا چھڑکاؤ ایسے ہی حالات کو جنم دیا کرتا ہے۔ ریاست کا اندرونی معاملہ ہو یا کسی دوسری ریاست سے تعلقات کا، سچائی سے چشم پوشی خرابیوں میں صرف اضافہ کرتی ہے!

امن کی آشا تیرتھ دھام رہے تو اچھا ہے۔ اور جنہیں اِس تیرتھ کی یاترا کرنے

کا شوق ہے وہ اپنا شوق بہت شوق سے پُورا کرتے رہیں۔ مگر ہاں، اِس تیر تھ دھام کو مرگھٹ نہ بنایا جائے۔ ایسا مرگھٹ جس میں خوشامدی مزاج رکھنے والے بعض بھارت نواز پاکستانی قومی مفادات کو حاشیہ بَرداری کی چتا میں ڈال کر اگنی دان پر تُلے ہوں! جو دلیش 80 سال کے ڈاکٹر خلیل چشتی پر ترس کھانے کو تیار نہ ہوا اور جس نے سربجیت سنگھ جیسے مُصدّقہ و تسلیم شدہ دہشت گرد کو ہیرو بنانے میں شرم محسوس نہ کی اُس سے دوستی کے لیے سب کچھ داؤ پر لگانا پرلے درجے کی حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ سربجیت سنگھ کی آخری رسوم کا سرکاری اعزاز کے ساتھ انجام دیا جانا کیا کوئی ایسی بات ہے جسے سمجھنے کے لیے ذہن پر زیادہ زور دیا جائے؟ ہر موڑ پر امن کی آشا کا راگ الاپنے والے ہی بتائیں کہ دوستی نبھانے میں وہ کہاں تک جا سکتے ہیں؟ دوستی کے جواب میں ایڈوانٹیج لیتے رہنے کی روش کو کس حد تک برداشت کیا جا سکتا ہے؟ اور کیوں؟ ایسی دوستی کے مرگھٹ پر اپنا سب کچھ بھسم کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ ہم نام نہاد امن کی آشا سے جُڑی سطحی خواہشات ہی کا کریا کرم کر ڈالیں! کیا پتہ ایسا کرنے سے ہمارے پُرکھوں کی آتما کو تھوڑی سی شانتی مِل جائے!

.... کیڑے کھائیے، اِس سے پہلے کہ

گزشتہ دنوں امریکا سے خبر آئی تھی کہ فوج میں خواتین اہلکاروں کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کے واقعات کی روک تھام کے لیے قائم شعبے کا سر.براہ ایک شاپنگ مال کے پارکنگ ایریا میں خاتون سے دست درازی کر بیٹھا! یہ خبر دلچسپ ضرور ہے مگر حیرت انگیز نہیں۔ دُنیا بھر میں یہی تو ہو رہا ہے۔ جس کا جو بھی کام وہ اُس کے بر عکس کرتا ہے اور داد بھی پاتا ہے! گانے کے نام پر بے سُرے پن کو فروغ دیا جارہا ہے اور ہاتھ کے ہاتھ مُنہ مانگے دام بھی کَھرے کئے جارہے ہیں! تعلیمی اداروں کو لوگ علم کی ترسیل اور تحصیل کا ذریعہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اب تعلیمی اداروں کے قیام کا بُنیادی مقصد دانش اور فراست کو پھیلنے اور پروان چڑھنے سے روکنا ہے! نصاب اِس ڈھنگ سے تیار کیا جاتا ہے کہ خوش نُما دِکھائی دیتا ہے۔ اور اگر پردہ ذرا سا سَرکایئے تو مذموم مقاصد کی ساری غلاظت پوری "جلوہ سامانی" کے ساتھ ہماری آنکھوں پر بے نقاب ہو جاتی ہے!

بین الاقوامی تنازعات کے تدارک کی خاطر قائم کئے جانے والے ادارے اِن تنازعات کی فصل تیار کرنے کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ غربت، بے روزگاری اور کساد

بازاری ختم کرنے کے لیے معرض وجود میں لائے جانے والے ادارے اِن علّتوں کو پروان چڑھارہے ہیں۔ جب کسی خطے کی تقدیر بدلنے کے لیے بڑی طاقتیں میدان میں آئیں تو سمجھ لیجیے اُخطے کی کھٹیا کھڑی کرنے کا حتمی مرحلہ شروع ہوچکا ہے!

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر 1919 میں "لیگ آف نیشنز" قائم کی گئی تھی۔ اِس بین الاقوامی تنظیم کے قیام کا بُنیادی مقصد اقوام عالم کے درمیان تنازعات اور مناقشوں کو لگام دیکر حقیقی امن کی راہ ہموار کرنا تھا۔ یہ راہ کچھ اِس طور ہموار ہوئی کہ 1939 میں دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی!

دوسری جنگِ عظیم جب اختتامی مرحلے میں داخل ہوئی تو 1945 میں لیگ آف نیشنز کو تھوڑی بہت لیپا پوتی کرکے، نئے کپڑے پہنا کر "اقوام متحدہ" کا نام دیا گیا۔ دونوں بین الاقوامی اداروں کا منصب یہ تھا کہ دُنیا سے جھگڑے ختم ہوں۔ طاقتور ممالک کی پالیسیوں، نیت اور عمل میں پائے جانے والے کیڑے ختم کرنے کے لیے یہ دونوں ادارے کیڑے مار اسپرے کے طور پر متعارف کرائے گئے تھے مگر کڑوی سچّائی یہ ہے کہ کیڑے کم تو کیا ہوتے، اور بڑھ گئے۔ اور یہ اِضافہ بھی اِتنا ہے کہ دُنیا کیڑوں سے بھر گئی ہے۔

چند خطّے کمزور رہ گئے ہیں یا اُنہیں کمزور کر دیا گیا ہے تاکہ طاقتور خطّوں کے لیے خطرہ نہ بنیں۔ پس ماندہ خطّوں کے جسم میں کیڑے پنپ رہے ہیں۔ کہیں خانہ جنگی ہے، کہیں ملک گیر اضطراب۔ کہیں توانائی کا بحران ہے اور کہیں لوگ افلاس اور بے روزگاری کی چکّی میں پس رہے ہیں۔

کیڑے مار اسپرے کے طور پر متعارف کرایا جانے والا ادارہ ہی کیڑوں کی افزائش کا وسیلہ بن جائے تو کیا ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے اب وہی ہو سکتا ہے جو منطقی ہے یعنی کیڑوں کو اپنایا جائے، بروئے کار لایا جائے۔ ایسے میں اگر اقوام متحدہ نے کیڑوں کو اپنانے کا مشورہ دیا ہے تو حیرت کیسی؟

اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے عالمی ادارہ خوراک و زراعت نے دُنیا بھر کے عوام سے اپیل کی ہے کہ کیڑوں کو خوراک کا حصہ بنائیں۔ ایک رپورٹ میں ادارہ کہتا ہے کہ دُنیا بھر میں دو ارب افراد نے کیڑوں کو خوراک کا حصہ بنا رکھا ہے۔ اور باقی آبادی کا بڑا حِصّہ بھی ایسا ہی کرے تو خوراک کا مسئلہ تسلّی بخش حد تک حل ہو سکتا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پتنگے، بھنورے اور جھینگر میں لحمیات کے علاوہ کیلشیم اور فولاد کا غیر معمولی تناسب پایا جاتا ہے۔

عالمی ادارہ خوراک و زراعت کا مشورہ یا اپیل پڑھ کر ہماری تو ہنسی چھُوٹ

گئی۔ اِتنے بڑے ادارے کی سادگی پر ہنسی کیوں نہ آئے؟ پاکستان کے بارے میں دُنیا یہ گمان کرتی ہے کہ کیڑے مکوڑے خوراک کا حصہ نہیں۔ عام تصور یا تاثر یہ ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک ہی میں کیڑے مکوڑے کھائے جاتے ہیں۔ چین، جاپان، فلپائن، ویت نام، شمالی و جنوبی کوریا، تھائی لینڈ اور کمبوڈیا میں لوگ پتہ نہیں کیا الا بلا کھا جاتے ہیں۔ کُتّے، بلّیاں اور دیگر جانور تو وہاں جان بچاتے پھرتے ہیں! اب یہ خِطّہ عالمی معیشت کو بھی اُسی طرح بھنبھوڑ رہا ہے جس طرح کیڑوں اور حیوانات کو بھنبھوڑتا رہا ہے!

جنوب مشرقی ایشیا والے اقوام متحدہ کے مشورے کے مُکلّف نہیں تھے۔ وہ بہت پہلے سے کیڑوں کو خوراک کا حِصّہ بناتے آئے ہیں۔ ویسے ہمیں اِس معاملے میں دِل چھوٹا کرنے اور زیادہ شرمندہ و افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم بھی، چشم بد دُور، کیڑوں سے کچھ ایسے نا آشنا کبھی نہیں رہے! ایک زمانے سے کیڑے مکوڑے ہماری خوراک کا حصہ رہے ہیں۔ عالمی ادارہ خوراک و زراعت نے دُنیا والوں کو کیڑا خوری پر مائل کرنے کے لیے کہا ہے کہ کیڑوں کی افزائش زیادہ مشکل کام نہیں۔ کم وقت میں اور بہت کم وسائل سے بہت سے کیڑوں کی غیر معمولی افزائش ممکن ہے۔ یہ بات پڑھ کر ہمیں ہنسی نہیں آئی بلکہ ہنسی چُھوٹ گئی! کیا واقعی ہم پر یہ وقت آ گیا ہے؟ کیا اب عالمی ادارہ خوراک و زراعت والے ہمیں بتائیں گے کہ کیڑوں مکوڑوں کی افزائش کیسے ہوتی ہے؟

دُنیا میں اگر واقعی قدر شناس ہے اور اُس میں اعلیٰ ظرفی ہے تو آئے اور ہم سے سیکھے کہ کیڑے کس طور پروان چڑھتے اور چڑھائے جاتے ہیں۔ مُلک بھر میں صفائی پر مامور اداروں، انتظامی مشینری، صحت کی وزارت اور محکموں نے مل کر، شالا نظر نہ لگے، ایسا ماحول پیدا کیا ہے کہ کیڑوں کی افزائش اب خودکار نظام کے تحت ہوتی ہے! پُورا مُلک گھوم کر دیکھ لیجیے۔ ہر طرف "کیڑا فارمنگ" ہو رہی ہے۔ اہل پاکستان کے لیے کیڑے کھانا حلال تو نہیں مگر مُلک کا نظم و نسق چلانے والوں نے ایسا اہتمام کیا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہم کیڑوں کو خوراک کا حِصّہ بنا بیٹھے ہیں! کُھلے نالوں کے کنارے قائم ہوٹلوں میں لوگ چائے بھی پیتے ہیں اور کیڑوں مکوڑوں کی سنگت سے بھی فیض یاب ہوتے ہیں! مکھیاں چائے میں گر کر اُسے مُقوّی کرنے میں دیر نہیں لگاتیں! بعض مقامات پر مچّھروں کی ایسی بھرمار ہے کہ بات کرنے یا جماہی لینے کے لیے مُنہ کھولیے تو مچّھر گھسنے میں دیر نہیں لگاتے! کھانے پینے کی اشیاء میں کئی انواع کے کیڑے کچھ اِس طرح پائے جاتے ہیں کہ "مَن تُو شُدم، تُو مَن شُدی" والی کیفیت پائی جاتی ہے! مُلک بھر میں ایسے سڑک چھاپ ہوٹلوں کی کمی نہیں جن کی "انتظامیہ" کیڑوں کو خوش آمدید کہنے کے معاملے میں خاصی فراخ دِل واقع ہوئی ہے اور اُنہیں خوشی خوشی کھانوں میں ایسا کھپاتی ہے کہ لذّت دو آتشہ ہو جاتی ہے!

کیڑا خوری کے حوالے سے اقوام متحدہ کی اپیل پاکستان کے معاملے میں بر وقت ہے۔ ابھی ابھی انتخابات ہوئے ہیں۔ پولنگ سے قبل ایک ڈیڑھ ماہ انتخابی مہم چلائی گئی۔ اِس مہم کے دوران سیاست دانوں نے ایک دوسرے میں جو کیڑے صرف تلاش ہی نہیں کئے بلکہ قوم کے سامنے پیش بھی کئے اُن کا مصرف کیا ہو سکتا ہے؟ سیاسی مخالفین میں سے چھانٹ چھانٹ کر قوم کے سامنے پیش کئے جانے والے کیڑے ایسے اور اِتنے ہیں کہ ہماری برآمدات میں ایک نئے شعبے کا اِضافہ ہو سکتا ہے! ہمارے لیے تو مسلمان بھائی کا گوشت حرام ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اُس کے کردار میں پنپنے والے کیڑے بھی حرام ہی ٹھہریں گے۔ ایسے میں بہتر یہ ہے کہ یہ عجیب نسل کے کیڑے ہم دُنیا والوں کے حوالے کریں اور پھر اُن کی حیرانی اور پریشانی دیکھیں!

کیڑوں سے اہل پاکستان کی پُرانی دوستی ہے۔ عالمی ادارہ خوراک و زراعت چاہتا ہے کہ ہم یہ دوستی ختم کردیں اور امریکا بن جائیں۔ امریکا کی یہی تو روش ہے۔ جس سے دوستی کرتا ہے اُسے کھا جاتا ہے!

حقیقی فتح کا انتظار

قوم ایک بار پھر انتخابات کی سُرنگ سے گزر گئی۔ صد شُکر کہ اِس جاں گُسل عمل میں بہت کچھ سہنے کے باوجود قوم کا وجود کسی نہ کسی طور سلامت رہا۔ جادو کا ڈبا یعنی بیلٹ بکس کھلا تو اُس میں سے نتائج کا پینڈورا بکس کُھل کر سامنے آگیا۔ قوم پانچ برس کے دوران خدا جانے کیا کیا بھگتتی رہی۔ اُدھار کھائے بیٹھی تھی کہ ووٹ ڈالنے کا موقع ملے تو اپنے "پیاروں" کے حلق میں ہاتھ ڈالے! ووٹ کی پرچی نے کئی بُرج اُلٹ دیئے ہیں۔ بُہتوں کو قوم نے آئینہ دِکھا دیا ہے۔ مگر خیر، وہ پھر بھی خوش نصیب ہیں کہ آئینے میں اپنا جائزہ لیکر اصلاح پر مائل ہو سکتے ہیں۔ ذرا اُن کے بارے میں تو سوچیے جن کے چہرے بھی بگڑ گئے اور آئینہ بھی نہ رہا!

شیر شِکار پر نکلا اور کامیاب لَوٹا۔ مخالفین کو مار بھگانے کے دعوے بہت حد تک درست ثابت ہوئے۔ لاہور کے محاذ پر مسلم لیگ (ن) نے خوب دادِ شجاعت دی اور سُرخ رُو ہوئی۔ ابھی کئی معرکے باقی ہیں مگر خیر، سب سے بڑا معرکہ تو وہ جیت ہی چکی ہے۔

پلّے نے جتنے چھکّے لگانے کا دعویٰ کیا تھا اُتنے تو نہ لگا سکا مگر خیر اُس کی کارکردگی بھی کچھ ایسی بُری نہیں رہی۔ عمران خان نے اسپتال کے بستر پر آرام کرنے کے ساتھ ساتھ اب سُکون کا سانس بھی لیا ہوگا۔ وہ حکومت بنانے کے قابل نہ ہو پائے تو کیا ہوا؟ اپوزیشن میں رہ کر خود کو منوانے کے قابل تو ہوئے ہیں۔ یہ نئی زندگی ہے۔ لِفٹر دَغا دے گیا تو کیا ہوا، الیکشن تو اُن کی پارٹی کے لیے "فیس لِفٹ" ثابت ہوا ہے! قوم یہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہے کہ وقت آنے پر تحریکِ انصاف اپنا وعدہ کس طور وفا کرتی ہے۔ یعنی قوم کے وسائل پر شب خُون مارے جانے کی صورت میں پلّے سے "چھینٹی" لگائی جائے گی یا مصلحت کے چشمے سے "آبِ حیات" پینے پر اکتفا کیا جائے گا!

تیر کے بارے میں خیال تھا کہ وہ کمان سے نکلا ہی نہیں، سو یہ خیال کچھ ایسا غلط بھی ثابت نہ ہوا۔ ہائی کمان کی مہربانی سے نیم مُردہ ہو جانے والے تیر کا شکریہ کہ اُس نے اندازے کی بنیاد پر بات کرنے والے بہت سے اینکرز، رپورٹرز اور تجزیہ نگاروں کی لاج رکھ لی! پانچ برسوں کے دوران عوام کے مسائل نظر انداز کرکے جو کچھ کیا گیا، جس طور صرف جیبیں بھری گئیں اور محض ذاتی بینک بیلنس بڑھانے پر توجہ دی گئی اُس نے دُشمنوں کا کام آسان کردیا۔ جو کچھ مخالفین تیس برس میں نہ کرسکے وہ خود پیپلز پارٹی کی قیادت نے محض پانچ برسوں میں کر دکھایا! پورس کے ہاتھی ثابت ہونے والی پی پی پی "ہائی

کمان" کو اگر ایسا ہی ایک اور "پنجسالہ منصوبہ" مل جاتا تو حالت یہ ہوتی تھی کہ ضیاءُ الحق کی باقیات تو کہیں کسی کونے میں مِل بھی جاتی ہیں، پیپلز پارٹی کی تو باقیات کا بھی نشان نہ مِلتا! "کارکردگی" کا اندازہ اِس بات سے لگائیے کہ بُھٹو فیکٹر بھی اب کے جادو جگانے میں ناکام رہا۔

مگر خیر، سب سے زیادہ شکریہ تو عوامی نیشنل پارٹی کا ادا کیا جانا چاہیے جس نے خود مِٹ کر کئی جماعتوں کو نئی زندگی دی ہے! اے این پی کی شکست اِس امر کی طرف واضح اشارا ہے کہ عوام شعور کے معاملے میں ایسے گئے گزرے نہیں۔ آخر آخر میں دہشت گردی کی چند وارداتوں کا نشانہ بننے کے بعد اے این پی نے شہید کا درجہ پانے کی کوشش کی مگر یہ ہُنر بھی کچھ کام نہ آیا۔ دہشت گردوں نے میاں افتخار حسین کو جوان بیٹے کی موت کا دُکھ دیا۔ بشیر احمد بلور بھی جان سے گئے۔ یہ دونوں واقعات انتہائی افسوسناک تھے مگر لوگ محض اِس بنیاد پر تو پارٹی کو ووٹ نہیں دے سکتے تھے۔ غلام احمد بلور کے دور میں پوری کی پوری ریل ہی ڈی ریل ہو گئی تو اب لوگ اُنہیں شکستِ فاش کے پلیٹ فارم پر دَھکّا کیوں نہ دیتے! ایک اچھی خاصی پارٹی کا قومی اسمبلی میں محض ایک نشست بھی نہ جیت پانا کئی جماعتوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ اور سلام ہے اُن ووٹرز کو جنہوں نے شفاف، آزادانہ اور بے لاگ محاسبہ کیا۔ ہر طرح کی مصلحت کو نظر انداز کرکے آئینہ دِکھانا باضمیر ہونے کی زندہ علامت ہے۔

مسلم لیگ (ن) قومی اسمبلی میں کم و بیش 125 نشستوں کے ساتھ سر فہرست ہے اور حکومت بنانے کی پوزیشن میں آچکی ہے۔ 30 کامیاب آزاد امیدوار بھی فِطری طور پر اکثریتی جماعت سے آملیں گے۔ یعنی حکومت مسلم لیگ (ن) کی بنے گی۔ پنجاب میں تو خیر مسلم لیگ (ن) کو دو تہائی سے بھی زائد اکثریت مِل چکی ہے۔ قوم تبدیلی چاہتی تھی۔ تبدیلی رُونما ہوچکی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ وہی تبدیلی ہے جو قوم چاہتی تھی؟ ابھی کچھ بھی کہا نہیں جاسکتا۔ اِس بار جن جماعتوں کے حق میں ووٹ پڑا ہے اُنہیں اپنی صلاحیتوں سے کہیں بڑھ کر مُقدر پر نازاں ہونا چاہیے۔ ووٹرز نے اُن سے محبت کا اِظہار کم اور ہارنے والوں سے نفرت کا اِظہار زیادہ کیا ہے! پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ق) اور اے این پی کے انجام سے یہ بات سامنے آ گئی کہ اِس بار عوام نے احتسابی ووٹ دیا ہے۔ یہ ووٹ فتح پانے والی جماعتوں کے لیے خوش آئند سہی مگر خطرے کی گھنٹی بھی ہے۔ کامیابی میں یہ پیغام بھی پوشیدہ ہے کہ عوام کی توقعات پر پُورا نہ اُترنے کی سزا یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آئندہ انتخابات میں اُن کی بھی جڑ کٹ جائے، نشان تک نہ رہے!
11 مئی 2013 کو عوام نے کوئی انقلاب وغیرہ تو برپا نہیں کیا مگر ہاں، بہت سے اشارے ضرور دیئے ہیں۔ واضح ترین اشارا یہ ہے کہ جو جیسا کرے گا ویسا

پائے گا۔ جس کی کارکردگی اچھی نہیں ہوگی وہ گھر بیٹھے گا۔ اگر ریاستی ادارے محاسبہ نہ کر پائیں تو عوام کریں گے۔ ووٹ کی پرچی کسی کے لیے جاں بخشی کا پروانہ بنے گی تو کسی کے لیے ڈیتھ وارنٹ! عوام چل پڑے ہیں۔ اُنہوں نے انتخابات کو منزل نہیں سمجھا بلکہ راہ میں تبدیل کیا ہے۔ یہ بلوغت کی نشانی ہے، شعور کے پنپنے کی علامت ہے۔ پانچ تا آٹھ سال اقتدار کے مزے لُوٹنے والی جماعتوں کا تیاپانچا اور حشر نشر چیخ چیخ کر ہمیں بتا رہا ہے کہ بڑی بڑی باتیں کرنے والوں کو سوچ سمجھ کر دعوے کرنے چاہئیں۔ جن جماعتوں کو یہ زُعم ہے کہ عوام نے اُنہیں بخش دیا وہ زیادہ خوش گُمان نہ ہوں۔ چھوٹے صوبوں میں کسی نہ کسی طور، جوڑ توڑ کے ذریعے حکومت بنانے کی کوششیں اِس بار بھی ہوں گی۔ اچھا ہے کہ وہ دوسروں کے انجام سے کچھ سیکھیں اور محض اقتدار کے حُصول کو منزل کو نہ سمجھیں بلکہ عوام کو بھی کچھ دیں۔

عوام کے دِلوں میں گھر کرنے اور محض بڑے صوبے کی پارٹی ہونے کا لیبل مٹانے کا ایک اور موقع مسلم لیگ (ن) کے ہاتھ آیا ہے۔ آج سب ایک بار پھر مسلم لیگ (ن) کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ وہ قوم کی نَیّا کیسے پار لگاتی ہے۔ گزرے ہوئے پانچ برسوں کا کچرا ہٹائے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہ ہوگا۔ مگر اِس حقیقت کو جواز بناکر اپنی کارکردگی کا کوئی سُقم چُھپایا نہ جاسکے گا۔ میاں نواز شریف کے لیے اچھا موقع ہے کہ حقیقی مُلک گیر لیڈر بن کر اُبھریں، چھوٹے

صوبوں کی بات سُنیں اور شکایات دور کریں۔ انتخابات کے پوائنٹس ٹیبل پر تو اُنہیں فتح مل گئی ہے مگر حقیقی فتح یہ ہوگی کہ وہ عوام کے دُکھ درد دور کرنے میں جُت جائیں۔ اللہ سے دُعا ہے کہ میاں صاحب اور عوام کی یہ حقیقی فتح زیادہ دُور نہ ہو!

حکومت سازی کا طلسمات

قوم انتخابات کی منزل سے گزر گئی۔ یہ بھی واضح ہوچکا ہے کہ کسے کیا ملا ہے۔ اب کیا ہوگا؟ یہ سوال پوری قوم کو ستا رہا ہے اور سیاسی جماعتوں کو کھائے جارہا ہے۔ بقول اطہر نفیس (مرحوم) کہ کوئی نیا احساس ملے گا یا پچھلا ہی سا احوال ہوگا! جمہوریت کی جنگ میں ایک اور معرکہ سَر ہوا۔

اہل وطن دِلوں میں ارمانوں کی مالا پروئے، سَروں پر اُمیدوں کا کوہِ گراں اُٹھائے کھڑے ہیں۔ مگر بڑھنے کی تاب نہیں کہ قدم قدم پر اندیشوں اور خدشوں کی فصل بھی تو کھڑی ہے! ہم جمہوریت کی راہ سے کئی بار گزرے ہیں۔ اور اب تو حالت یہ ہے کہ جمہوریت ہم میں سے ہو کر اور ہم پر گزر رہی ہے مگر اب تک ایک دوسرے کما حقہ شناسا نہیں ہو پائے! جب بھی ہم انتخابی مرحلے سے گزرتے ہیں، کچھ دیر کو ششدر سے رہ جاتے ہیں۔ قدم بڑھاتے ڈر لگتا ہے۔

دِل میں کیا کیا خیال آئے ہیں
جب تری رہ گزار آئی ہے!

انتخابی نتائج تقریباً تمام آ چکے ہیں اور قیاس آرائیوں کا بازار گرم ہو چلا ہے۔ پوری قوم حساب کتاب میں جُتتی ہے کہ کون کس سے جا ملے گا یا آ ملے گا اور کون کس سے رفاقت ختم کرکے وقت کے دھارے میں بہنا، وقت کا بیٹا بننا پسند کرے گا!

الیکشن کا پوائنٹس ٹیبل جیسے ہی تکمیل کی منزل سے گزرتا ہے، حکومت سازی کا جاں گُسل مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ حکومت سازی کے مرحلے کو کیا کہیے؟ کوہِ گراں؟ یا پہاڑی سلسلہ؟ اِس پہلے مرحلے ہی میں سیاسی جماعتوں کا بہت کچھ، اور کبھی کبھی تو سبھی کچھ داؤ پر لگ جاتا ہے۔ جن کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہ ہو اُن سے ہاتھ مِلانا پڑتا ہے! فراز کہہ گئے ہیں۔ ع

دِل مِلیں یا نہ مِلیں، ہاتھ مِلاتے رہیے!

اور ایسی ہی کیفیت کو بیان کرنے کی غرض سے نظام رام پوری نے کہا تھا۔

دینا وہ اُس کا ساغرِ مے یاد ہے نظام

مُنہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ!

حکومت سازی کا مرحلہ ایسا اعصاب شکن ہوتا ہے کہ سیاست کا وسیع تجربہ رکھنے والے بھی حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ ہاتھ آتی منزل ہاتھ سے جاتی دِکھائی دے تو

اِنسان تمام نظریات اور اُصول لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ اِس کے بعد جمہوریت کے نام پر صرف شخصی یا گروہی مفادات کا کھیل رہ جاتا ہے۔ اقتدار کے طلسمات میں جلووں کی ایسی فراوانی ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں کی حیرانی نہیں جاتی۔ اور جو محروم رہیں اُن کی آنکھیں تو خُشک ہو جاتی ہیں، طُغیانی نہیں جاتی! اقتدار کے گلیارے دراصل طلسمات کی دُنیا ہیں۔ یہ دُنیا اپنی طرف آنے والوں سے کہتی ہے۔ ع

مُڑکے دیکھوگے تو ہو جاؤگے تُم پتّھر کے!

نظر ہدف پر رہنی چاہیے۔ معمولی سی غلطی کی یا کوتاہی سَرزد ہوئی اور گئے کام سے! اِس بار بھی مینڈیٹ کم و بیش منقسم ہی ہے۔ ایسے میں کہیں چُوں چُوں کا مُربّہ بنے گا اور کہیں ساجھے کی ہنڈیا چولھے پر چڑھے گی۔ ہر جماعت چاہتی ہے کہ حکومت نہ بھی بنا سکے تو کم از کم حکمراں سیٹ اپ کا حصہ ضرور بنے۔ بعض اوقات، بلکہ عموماً حکومت میں شامل ہونے کی خواہش تیزی سے شِدّت اختیار کرتے ہوئے ہوس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کئی جماعتیں ایسی ہیں جو اقتدار سے الگ رہ کر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ گویا ع

زندہ رہنے کی تگ و دَو نے ہمیں مار دیا!

ن لیگ کو پنجاب میں دو تہائی سے زائد اکثریت حاصل ہو چکی ہے۔ اور وہ وفاق میں بھی حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہے۔ ایسے میں وہ دیگر صوبوں میں بھی ایڈوانٹیج لینے کی کوشش کرے گی۔ ایسا کرنا ہوگا تو فطری مگر شاید جمہوریت کے لیے کچھ زیادہ موزوں نہ ہو۔ خیبر پختونخوا میں ن لیگ کے لیے حکومت تشکیل دینا مشکل ہوگا مگر وہ اِس کے لیے بھی متحرک ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ خیبر پختونخوا میں تحریکِ انصاف کو حکومت سازی سے روکنا ہے تو کم نشستیں جیتنے والی جماعتوں اور آزاد امیدواروں کو ساتھ ملانا پڑے گا۔ یہ عمل اچھی خاصی جماعتوں کو پھر پریشر گروپ میں تبدیل کرے گا اور وہ اپنی شرائط منوانے کے لیے ایسا ایڈوانٹیج چاہیں گی جس کا بھگتان عوام کے حصے میں آئے گا۔ اور اگر مرحلہ زیادہ جاں گُسل ہوا تو کم نشستوں والی جماعتوں کو محض قیمت نہیں بلکہ مُنہ مانگی قیمت ملے گی۔ ہمارے ہاں ہوتا تو یہی رہا ہے کہ حکومت سازی کے مرحلے میں سب اپنے اُصولوں اور نظریات کو یکسر نظر انداز یا ترک کرتے ہوئے وہی سب کچھ کرنے لگتے ہیں جو اقتدار کی ہوس میں کیا جاسکتا ہے۔

خیبر پختونخوا کے انتخابی نتائج ن لیگ کے لیے آزمائش کا درجہ رکھتے ہیں۔ بڑی آزمائش یہ ہے کہ ن لیگ کی قیادت اعصاب کس طور قابو میں رکھتی ہے اور بظاہر موافق صورتِ حال نہ ہونے پر بھی حکومت سازی کی خواہش کو کس طور لگام

دیتی ہے! ن لیگ کو اِس بار بہت کچھ ثابت کرنا، اور اِس سے کہیں بڑھ کر، بہت کچھ ثابت ہونا ہے۔

پیر کو جاتی عمرہ (رائیونڈ) میں محمد شہباز شریف نے میڈیا سے گفتگو میں کہا کہ خیبر پختونخوا میں تحریکِ انصاف کو حکومت بنانے کا موقع ملنا چاہیے۔ یہ بیان خوش آئند ہونے سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ ایسی وسیع النظری اگر سابق ادوار میں بھی پائی جاتی تو جمہوریت کا چراغ بار بار گُل نہ ہوا ہوتا! خیبر پختونخوا کی زمینی حقیقت یہ ہے کہ تحریکِ انصاف حکومت بنائے یا اُسے حکومت بنانے دیا جائے۔

سندھ میں پیپلز پارٹی تنہا حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہے۔ یہ حقیقت متحدہ قومی موومنٹ بھی جانتی ہے۔ اگر وہ حکومتی سیٹ اپ کا حصہ نہ بنی تو؟ یہ سوال بہت اہم ہے۔ اتوار کی شام تک پیپلز پارٹی کی طرف سے عِندیہ دیا جانے لگا تھا کہ صوبے کے مجموعی مفاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ سندھ حکومت میں متحدہ کو ساتھ لیکر چلے گی۔ پیر کو بلاول ہاؤس میں صدر آصف علی زرداری کی صدارت میں پیپلز پارٹی کا اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ متحدہ قومی موومنٹ کو صوبائی حکومت میں شمولیت کی باضابطہ دعوت دی جائے گی۔ سندھ کے گورنر ڈاکٹر عشرت العباد خان نے بھی بلاول ہاؤس میں صدر زرداری سے ملاقات کی اور

سندھ میں حکومت سازی سے متعلق اُمور پر تبادلہ خیال کیا۔

جمہوریت اپنے نئے دور (یا دورانیے) میں داخل ہو رہی ہے۔ بجٹ سر پر ہے۔ ن لیگ کو حکومت سنبھالتے ہی بجٹ پیش کرنا ہے۔ اِس مرحلے پر اختیار کی جانے والی دانش مندی اور فراست ہی طے کرے گی کہ پانچ برس تک اُس کی حکمرانی کس نوعیت کی اور کتنی طاقتور ہوگی۔

عوام کی حمایت سے تقدیر ایک بار پھر ن لیگ کو اقتدار کے ایوانوں تک لائی ہے۔ یہ وقت ویسے تو اور بھی بہت کچھ پانے اور کمانے کا ہے مگر توجہ نام کمانے پر دی جائے تو فائدہ طویل المیعاد ہوگا۔ اقتدار کی وسعت کا تعین سب سے بڑی جماعت کو خود کرنا ہے۔ ہے یعنی گنجائش over-stretched امریکی فوج کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ اور سکت سے کہیں بڑھ کر پَیر پسار رکھے ہیں۔ اب امریکی حکومت اپنے وسائل کا متعدبہ حصہ اِس کیفیت کو برقرار رکھنے پر صرف کر رہی ہے! میاں نواز شریف نے اتوار کو کہا تھا کہ امریکا کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ ہے اور آئندہ بھی مل کر کام کریں گے۔ اِس تجربے سے میاں صاحب کو اِتنا ضرور سیکھنا چاہیے کہ اقتدار اُتنا ہی اچھا ہوتا ہے جتنا کیا جاسکے۔ دستر خوان زمانے بھر کی نعمتیں بھی سجی ہوں تو اِنسان کو اُتنا ہی maintain کھانا چاہیے جتنا کسی دُشواری کے بغیر ہضم ہو سکتا ہو! ایک بڑی

اور ملک گیر جماعت کی حیثیت سے ن لیگ کو جو کچھ کرنا ہے اُس کا تقاضا ہے کہ ساری توانائی اقتدار کو برقرار رکھنے پر صرف (یا ضائع) نہ ہو! مخالفین ٹف ٹائم دینے کے لیے بے تاب ہوں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اِس ٹف ٹائم کو میاں صاحب کس طرح ٹف ٹائم دیتے ہیں۔ مُشیروں کی کہکشاں میں سلیم الطبع سِتارے شامل کرنا بھی اُن کی ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے۔

اِنکاری قبیلہ

ہمیں تسلیم و رضا سے عار ہے۔ اقرار کی عادت نہیں، اِنکار ہی بُنیادی شعار ہے۔ انتخابی مہم ختم ہوئی تو احتجاجی مہم چل پڑی ہے۔ انتخابی نتائج تسلیم نہ کرنے کی "درخشاں" روایت نے ایسی "روشنی" بکھیری ہے کہ بقول فراز ہم سے راستہ بھی دیکھا نہیں جاتا!

جوش و خروش کے چولھے پر انتخابی مہم کی دیگ چڑھی ہوئی تھی۔ وہ دیگ ہم نے پولنگ ڈے پر اُتاری اور جمہوریت کی نذر و نیاز سے فارغ ہوئے۔ مگر خیر سے جوش و خروش کا چولھا بند نہ ہوا۔ اب اُس پر احتجاج کی دیگ چڑھی ہوئی ہے اور سبھی مقدور بھر حِصّہ ڈال رہے ہیں!

منتخب ایوانوں میں جسے جو کچھ بھی ملا ہو اُسے وہ اپنا حتمی و ابدی مقدور اور باپ کی جاگیر سمجھ لیتا

ہے۔ ووٹ کی پرچی احتساب کی پرچی بھی تو ہوتی ہے۔ جو لوگ کاندھوں پر بٹھاتے ہیں وہی زمین پر پٹخ بھی دیتے ہیں۔ سَر آنکھوں پر بٹھایا جانا تو قبول کرلیا جاتا ہے مگر زمین پر پٹخا جانا ہضم نہیں ہو پاتا۔ یعنی جمہور کی رائے

بھی وہی قابل قبول ہے جو اپنے حق میں ہو۔ بیشتر جماعتوں اور سیاست دانوں کا یہی وتیرہ ہے۔ اے این پی نے اچھا کیا کہ دھاندلی کا راگ الاپنے کے بجائے انتخابی نتائج کو عوام کی رائے سمجھ کر قبول کرلیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہی بات عوام کو پسند آجائے اور وہ آئندہ انتخابات میں اے این پی کے لیے اپنی رائے کسی حد تک بدلنے کی تحریک پائیں۔

اِنکار جن کی فطرت میں گندھا ہوا ہو وہ ہر معاملے میں بات "نا" سے شروع کرتے ہیں۔ انتخابی نتائج کے حوالے سے بھی "اِنکاری" قبیلے کے لوگ تیزی سے متحرک ہوئے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن نے خیبر پختونخوا میں تحریک انصاف کا مینڈیٹ تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔ نتائج کو متنازع قرار دیتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ تحریک انصاف نے کئی حلقوں میں دھاندلی کی۔ بات بہت عجیب ہے۔ جو جماعت اب تک اقتدار کے ایوان یا انتظامیہ کے گلیاروں تک پہنچی ہی نہیں وہ دھاندلی کس طور کرا پائے گی؟ خیبر پختونخوا میں تحریک انصاف کا مینڈیٹ تسلیم کرتے ہوئے مسلم لیگ (ن) نے عندیہ دیا ہے کہ وہ حکومت نہیں بنائے گی۔ یعنی اگر ٹاس تحریک انصاف نے جیت لیا ہے تو اُس سے بیٹنگ بزور نہیں لی جائے گی! پنجاب کے سابق اور متوقع وزیر اعلیٰ محمد شہباز شریف نے کہا ہے کہ تحریک انصاف کو خیبر پختونخوا

میں حکومت بنانے کا موقع ملنا چاہیے۔ مگر مولانا فضل الرحمٰن بضد ہیں کہ چھوٹی جماعتوں کو مل کر حکومت بنانی چاہیے۔ اُنھوں نے مسلم لیگ (ن) کو بھی حکومت سازی کے لیے متحرک ہونے کی دعوت دی تھی! اِسے کہتے ہیں مدّعی سُست، گواہ !چُست

فضل الرحمٰن نے میڈیا پر جانب داری کا الزام عائد کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ بعض اینکرز کو اب تحریکِ انصاف میں شمولیت اختیار کرلینی چاہیے! مولانا سے ہم کہیں گے بے فکر رہیے۔ اینکرز نے جہاں دُنیا بھر سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے، مولانا صاحب سے بھی یہ بات سیکھ ہی لی ہوگی! مولانا کا شِکوہ بجا ہے۔ مسلم لیگ (ن) خیبر پختونخوا میں حکومت بنانے کی خواہاں دِکھائی نہ دی مگر مولانا اُسے متوجہ کرتے دِکھائی دیئے تو ایک بڑے چینل نے مین بُلیٹن کے ہیڈ لائنز میں کہا کہ مولانا فضل الرحمٰن کو بہت دُور کی سُوجھی۔ اور نیوز اینکر نے "دُور" کو خاصا کھینچ کر ادا کیا! کیوں نہ کھینچتی؟ لاہور سے پشاور کا فاصلہ !اچھا خاصا ہے

شدید گرمی میں انتخابی مہم کی گرما گرمی نقطہ عروج کو پہنچی اور پولنگ ڈے پر ختم ہوئی۔ مگر "رونق" میلہ ختم نہ ہوا۔ انتخابی سلسلہ ختم ہوا تو احتجاجی سلسلے کو راہ مل گئی۔ احتجاجی سلسلے کے مُریدین پورے خشوع و خضوع کے ساتھ کمر کَس کے میدان میں نکل آئے ہیں۔ انتخابی نتائج تسلیم کرنے سے

انکار کرتے ہوئے دھرنے دیئے جا رہے ہیں۔ ملک بھر میں یہ تماشا جاری ہے مگر کراچی خاص طور پر نشانہ بنا ہے۔ دھرنوں کے باعث کئی شاہراہیں جام رہتی ہیں اور لوگوں کو مشکلات کا سامنا ہے۔ اللہ کا کرم ہے کہ شکر خورے کو کہیں نہ کہیں سے شکر مل ہی جاتی ہے۔ میڈیا والے پریشان تھے کہ انتخابات تو ختم ہوئے۔ اب کیا ہوگا؟ احتجاجی ماحول شروع کرکے یاروں نے میڈیا والوں کی پریشانی بھی ختم کردی!

لوگ سمجھ رہے تھے کہ انتخابات ہوں گے تو مسائل کے حل کی راہ نکلے گی۔ مگر یہاں تو سب کچھ اُلٹا، پَلٹتا دِکھائی دے رہا ہے۔ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد کچھ کچھ ایسی ہی کیفیت اُبھرتی دیکھ کر اُستادِ محترم رئیس امروہوی نے کہا تھا۔

کوئی گناہ تھا اے دِل! حصولِ آزادی؟

یہ کِس عذاب میں ہم ہیں، یہ کِس عذاب میں تُو!

تحریکِ انصاف، جماعتِ اسلامی اور دیگر جماعتوں نے کراچی میں انتخابی نتائج تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اندرونِ سندھ مسلم لیگ (فنکشنل) نے بھی نتائج مسترد اور بلوچستان میں بی این پی نے دھاندلی پر احتجاج کرتے ہوئے ہڑتال کی کال دی۔ مسلم لیگ ن) کے لیاقت جتوئی نے انتخابی عمل میں صریح بے قاعدگیوں)

کا الزام عائد کرتے ہوئے دادو کے تمام حلقوں میں نئے سرے سے پولنگ کا مطالبہ کیا۔
تحریک انصاف لاہور میں دھاندلی کا راگ الاپ رہی ہے۔

معاملہ محبت کا ہو یا نفرت کا، ہم اظہار میں دیر نہیں لگاتے۔ کرکٹ ہو یا اداکاری، پراپرٹی بزنس یا سیاست، دوستی ہو یا دُشمنی.... یا کوئی اور معاملہ، سارا کھیل ٹائمنگ کا ہے۔

سسی پلیجو سمیت پیپلز پارٹی کے پانچ کامیاب اُمیدواروں نے غیر معمولی خود اعتمادی کو کلہاڑی میں تبدیل کیا اور اپنے ہی پیروں پر دے مارا! کامیاب قرار دیئے جانے پر بھی اِن کے دِلوں کو سُکون نہ ملا۔ خُدا ہی جانے دِماغ کی کون سی رَگ ڈھیلی ہوئی کہ شکست خوردہ حریف کے متحرک ہونے سے پہلے اِن جیتے ہوئے اُمیدواروں نے دوبارہ گنتی کی درخواست دے ڈالی۔ اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی! دوبارہ گنتی ہوئی تو چند سو ووٹوں کے فرق سے حریف جیت گئے!

اِنکار صرف یہ نہیں ہے کہ آپ حریف کی کامیابی قبول نہ کریں۔ اِنکار کی ایک بدلی ہوئی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے اور حریف کے معیار کا معمولی فرق مُسترد کرتے ہوئے اپنی کامیابی کو قبول کرنے سے بھی انکار کر دیں!

شکست تسلیم نہ کرنے یعنی دوسروں کے مینڈیٹ کو مکمل طور پر تسلیم نہ کرنے کے

کئی طریقے ہیں۔ مثلاً پیپلز پارٹی سندھ میں جارحانہ مزاج کا وزیر اعلیٰ لانا چاہتی ہے تاکہ وہ وفاقی حکومت کو ٹونگے مارتا رہے، اُلجھنیں پیدا کرتا رہے! آغا سراج دُرانی، میر ہزار خان بجارانی اور نثار کھوڑو کے ناموں پر غور ہو رہا ہے۔ ذوالفقار مرزا بیمار نہ ہوتے تو اُنہیں بھی کوئی جارحانہ منصب دینے پر ضرور غور کیا جاتا! اویس مظفر المعروف بہ ٹپی کو سینئر وزیر بنانے کا عندیہ دیا جارہا ہے۔

انتخابی نتائج کے غیر حتمی، غیر سرکاری نتائج کے اعلان کے بعد وفاق اور صوبوں میں پوزیشن واضح ہونے پر میاں نواز شریف نے غیر معمولی دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقرار اور انکار کا حسین امتزاج اپنایا ہے۔ ایک طرف تو اُنھوں نے تحریک انصاف کا مینڈیٹ قبول کرتے ہوئے عمران خان کی عیادت کی اور بعد میں میڈیا سے گفتگو کے دوران کہا کہ تحریک انصاف کے چیئرمین صحت یاب ہوجائیں تو فرینڈلی میچ کھیلیں گے۔ اشارا یہ ہے کہ وفاق میں تصادم کیفیت پیدا کرنے سے گریز کیا جائے گا اور جیسی فرینڈلی اپوزیشن پانچ سال خود چلائی ویسی ہی عمران خان سے چاہیں گے! اچھا ہے تصادم نہ ہو اور پارلیمنٹ کے ساتھ ساتھ مُلک بھی اچھی طرح چلتا رہے۔

یہ تو ہوئی اِقرار کی بات۔ اِنکاری قبیلے سے بھی وابستگی برقرار رکھتے ہوئے

میاں صاحب نے، انتخابی فتح کے آثار نمایاں ہوتے ہی، بھارت نواز رونے کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ حلف برداری میں من موہن کو شرکت کی دعوت دینا اور بھارت نہ بلائے تب بھی دورہ کرنے کا عندیہ دینا گویا سوئے ہوئے شیر کو جگانے کی کوشش کرنا تھا! اور میاں صاحب سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ اپنا تحفظ یقینی بنائے بغیر شیر سے چھیڑ خانی !کیا رنگ لا سکتی ہے

اِس دھرتی کو اب اقراری قبیلے کے لوگ درکار ہیں۔ انکاری قبیلے سے وابستگی نے پُورے ماحول کو مُکدر اور پراگندہ کر دیا ہے۔ جنہیں انتخابات نے نئی زندگی اور بہتر مواقع عطا کئے ہیں اُنہیں رب کا شکر ادا کرتے ہوئے انکار کے خول سے باہر آ کر اپنے خیالات کو اقرار کی خلعتِ فاخرہ سے آراستہ کرنا چاہیے۔ اِسی کو سیاسی جامہ زیبی کہا جا سکتا ہے۔ قوم !اِقرار کی حالت اور اُس کے نتیجے میں قرار چاہتی ہے

منظور وسان کا نیا خواب

ہم تو مایوس ہو چلے تھے۔ رحمٰن ملک نے بھی چُپ سادھ لی ہے، بلکہ ہونٹوں پر تالا لگا لیا ہے۔ ڈاکٹر ذوالفقار مرزا پہلے ہی علالت کے باعث مُہر بہ لب ہیں۔ جتنا قہر وہ ڈھا سکتے تھے، ڈھا چکے۔ اور پارٹی سے جس قدر مہر و وفا کی توقع تھی وہ بھی پا چکے۔ بقول اطہر نفیس ع

کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں، پھر "سَچّا شعر" سُنائیں کیا!

ذوالفقار مرزا کی "شگفتہ بیانی" کا معاملہ بھی عجیب ہی تھا۔ بقول احمد ندیم قاسمی

چُھپ چُھپ کے روؤں اور سرِ انجمن ہنسوں

مُجھ کو یہ مشورہ مِرے دردآشنا کا تھا

وہ جب بھی بولتے تھے، سچ بولنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ مگر اب اُن کی اپنی پارٹی شکست جیسی عظیم ترین سَچّائی سے ٹکرائی ہے تو موصوف کو آئینہ دیکھنے سے حیا آرہی ہے۔

چوہدری شجاعت حسین کو ناموافق انتخابی نتائج کے سانپ نے سُونگھ لیا ہے!

سمجھ میں نہ آنے والی گفتگو کا فن تو اُن پر ختم ہے۔ مگر اب لگتا ہے وہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی باتیں کرنے سے بھی گئے کیونکہ انتخابی نتائج اُن کی اپنی لایعنی گفتگو جیسے ہوگئے ہیں جو خود اُن کی سمجھ میں بھی نہیں آرہے! قوم نے اُن کی گفتگو سے صرف ایک جُملہ اچھی طرح سمجھ کر کشید کیا اور ووٹ کی پرچی ہاتھ میں آتے ہی اُن کی پارٹی پر مِٹّی ڈال دی!

انتخابات کے بعد سب جاگتی آنکھوں سے اقتدار کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور اہل وطن یہ تماشا دیکھ کر اُوب سے گئے ہیں۔ خیر ہو منظور وسان کی جنہوں نے خانہ ساز پریس کانفرنس میں اپنا ایک اور خواب بیان کرکے اہل وطن کے ہونٹوں کے لیے تھوڑی سی مُسکان کا اہتمام کیا ہے۔ منظور وسان کی شخصیت پر خواب خوب جچتے ہیں۔ جب بھی لوگ پیپلز پارٹی سے نالاں ہوکر کچھ ایسا ویسا سوچنے لگتے ہیں، منظور وسان نئے خوابوں کے ساتھ میڈیا مارکیٹ میں آتے ہیں اور تھوڑی بہت ہلچل پیدا کرکے لوگوں کا غم غلط کرتے ہیں!

پیپلز پارٹی نے مینڈیٹ کے مطابق پانچ برس کی جو میعاد پوری کی ہے وہ بھی اِس قوم کو ایک بھیانک خواب کے مانند یاد رہے گی! بہت کچھ تھا جو حقیقت سے خواب میں تبدیل ہوا۔ پھر محض خواب و خیال ہوکر رہ گیا! بعض چیزوں کا نام و نشان تو ایسا مٹا ہے کہ بُھولے بھٹکے سے کبھی خواب میں نہیں پدھارتا! ریلوے

ہی کی مثال لیجیے۔ اُجڑے ہوئے پلیٹ فارم بھیانک خواب بھی ہیں اور اُنھی خوابوں کی تعبیر بھی۔ بجلی بھی ایسی گئی ہے کہ ظالم خواب میں بھی درشن دینے سے کتراتی ہے۔ اب اگر کسی کو بجلی چاہیے تو ناہید اختر کا "بجلی بھری ہے میرے انگ انگ میں" والا گانا سُنے۔ کم از کم تصور کی حد تک تو چند ایک جھٹکے پا ہی لے گا! انتخابات کے بعد درشن دینے والے نیم خوابیدہ ماحول میں منظور وسان کا لب کُشا ہونا خوش آئند ہے کہ ہم جیسے خوشہ چینوں کو اُن کے خِرمن سے کچھ تو عطا ہوا!

خوابوں کی ڈگڈگی بجاکر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے والے منظور وسان سندھ کے وزیر داخلہ رہ چکے ہیں۔ خوابوں کی مناسبت سے یہ بھی اُن کے لیے بُرا سَودا نہیں تھا کیونکہ محکمہ داخلہ بہتوں کے لیے بھیانک خواب سے کم نہیں! شاید محکمہ داخلہ کی نوعیت کا تاثر زائل کرنے اور لوگوں کی دل بستگی کا سامان کرنے کی نیت ہی سے منظور وسان سُہانے خواب سُناتے آئے ہیں! تازہ ترین پریس کانفرنس میں موصوف نے بتایا ہے کہ بی بی (بے نظیر بھٹو) خواب میں آئیں اور نوید سُنائی کہ اِس بار سندھ میں جوان وزیر اعلیٰ آئے گا! خواب کی تفصیل کے مطابق بی بی نے یہ مژدہ جاں فزا بھی سُنایا کہ اب کے سندھ میں گڈ گورننس ہوگی۔ منظور وسان سے جب پوچھا گیا کہ متحدہ سے اتحاد ہوگا یا نہیں تو اُنھوں نے کہا کہ اِس حوالے سے کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

بی بی نے حالات کا رُخ دیکھتے ہوئے منظور وسان کے خواب میں جو کچھ کہا ہے وہ کچھ ایسا غلط یا بعید از حقیقت بھی نہیں۔ شُنید ہے کہ پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت میں کئی اہم شخصیات چاہتی ہیں کہ سید قائم علی شاہ کو سندھ کے وزیر اعلیٰ کی کرسی پر بیٹھا رہنے دیا جائے۔ اگر قائم علی شاہ پھر وزیر اعلیٰ بنائے گئے تب بھی بی بی کا کہا غلط ثابت نہیں ہوگا۔ جوانی کا تعلق عمر سے نہیں، دِل سے ہے۔ دِل ہونا چاہی دا جوان، عُمراں چ کی رکھیا اے! ویسے بھی یار لوگ چاہتے ہیں کہ سندھ کا وزیر اعلیٰ وہ ہو جس کا صرف دِل جوان ہو، ہاتھوں میں جنبش نہ ہو بلکہ صرف آنکھوں میں دم ہو۔ اُس کے آگے ساغر و مینا دَھرنے کے بعد سب اقتداری شراب کے مَستی میں غرق ہونا چاہتے ہیں۔ جوان ہڈیوں والا کوئی متحرک وزیر اعلیٰ آگیا تو بات بات پر حساب مانگے گا اور یاروں کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے!

گڈ گورننس کی نوید بھی غلط نہیں ہو سکتی۔ پچھلی بار پیپلز پارٹی نے مرکز اور سندھ میں حکومت بنائی تھی اِس لیے کام کی زیادتی نے "پریشر کا دباؤ" بڑھا دیا تھا۔ ایسے میں گڈ گورننس کیسے ممکن ہو پاتی؟ ویسے بھی پارٹی کی قیادت اہم سرکاری اداروں سے نمٹنے یعنی گڈز گورننس" میں مصروف رہی! اب پیپلز پارٹی کے پاس سندھ رہ گیا ہے اِس لیے" وہ مرکز کے بکھیڑوں میں اُلجھنے محفوظ

رہے گی۔ محض ایک صوبے کی حکومت چلانا اُس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ثابت ہوگا۔
!یہ اندازہ لگانا آپ کا کام ہے کہ دایاں ہاتھ اپنے لیے کون سی مصروفیت ڈھونڈے گا
متحدہ سے اتحاد کا معاملہ منظور وسان گول کر گئے۔ روکا کس نے تھا؟ جہاں اور بہت سی
باتیں اُنہوں نے بی بی کے کھاتے میں ڈالی ہیں وہیں متحدہ سے اتحاد کا معاملہ بھی ڈال
دیتے! خواب کیا بیان کیا، منظور وسان نے اچھی خاصی مُرصّع سیاسی غزل ہم سب کی
نذر کی۔ مگر کیا کیجیے کہ غزل کے ختم ہوتے ہوتے متحدہ کا معاملہ وارد ہوگیا۔ ع

مقطع میں آپڑی ہے سُخن گسترانہ بات

اپنے خواب کے حوالے سے جو کچھ منظور وسان نے بیان کیا اُس کی صداقت کے بارے
میں تو ہم بدگمان نہیں ہو سکتے مگر یونہی ذہن میں ایک خیال، بلکہ سوال بجلی کی طرح
کوندا ہے۔ جو کچھ پیپلز پارٹی نے پانچ برسوں میں کیا ہے کیا اُسے دیکھتے ہوئے بی بی کسی
کے خواب میں آکر اِس پارٹی کے بارے میں کوئی رائے دینا پسند کریں گی؟
منظور وسان خواب بیان کرنے کے بہانے میڈیا کی توجہ پانے کے لیے متحرک ہوئے

تو سندھ کے سابق وزیر اطلاعات شرجیل انعام میمن بھلا کیوں پیچھے رہتے؟ شرجیل میمن نے قوم کی معلومات میں اِضافے کی خاطر اپنے گھر میں پریس کانفرنس کر ڈالی۔ تمام بڑے چینلز کی ڈی ایس این جیز جمع کرکے بتانا صرف یہ تھا کہ سندھ میں وزیر اعلیٰ پیپلز پارٹی کا ہوگا کیونکہ صوبائی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل ہوچکی ہے! شرجیل میمن نے شاید یہ سوچا کہ اِتنا زبردست نکتہ کافی نہ ہو اِس لیے ضمیمے کے طور پر یہ بھی فرمایا کہ تاریخ ایک دن انتخابی نتائج کا پول کھول دے گی! موصوف کا یہ بھی کہنا تھا کہ دھاندلی کے ثبوت موجود ہیں مگر میڈیا کے سامنے کوئی شکوہ شکایت نہیں کرنا چاہتے! عقل حیران ہے کہ سندھ اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی واضح اکثریت کے بارے میں تو پوری قوم پہلے ہی سے جانتی ہے، اِس لیے کوئی بچہ بھی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ وزیر اعلیٰ بھی پیپلز پارٹی ہی کا ہوگا۔ شرجیل میمن نہ بتاتے تو کیا ہم اندازہ نہ لگا پاتے کہ وزارتِ اعلیٰ کس پارٹی کی جھولی میں گرنے والی ہے؟ اور اِس نکتے کی کیا منطق ہے کہ دھاندلی کے ثبوت موجود ہونے پر بھی میڈیا کے سامنے کوئی گلہ شکوہ نہیں کرنا چاہتے؟ کیا کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی کے پاس حریف کی دھاندلی کا ثبوت ہو اور وہ میڈیا کے میلے میں آکر ڈھول نہ بجائے؟ شرجیل میمن تو منظور میمن کے خواب کا مزا کِرکِرا کرنے

پر تُل گئے! فی الحال ہمیں منظور وسان صاحب کے تازہ خواب کے سحر میں گم رہنے دیجیے۔ دھاندلی کے ثبوت ہونے پر بھی حریفوں کا بھرم رکھنے کی کوشش سے ہم پھر کبھی محظوظ ہولیں گے!

احتجاجی قیام نہیں، شُکر کا سجدہ

ایک طرف موسم ہے اور دوسری طرف سیاسی موسم۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف سُورج آگ برسا رہا ہے۔ دوسری طرف سیاسی آفتاب نصف النہار پر ہے۔ ایک طرف گرمی ہے اور دوسری طرف گرما گرمی۔ مئی چل رہا ہے۔ جُون اور جُولائی میں خدا جانے کیا حال ہوگا۔ اور سیاسی موسم کا تو جنوری ہی جُون یا جُولائی ثابت ہونے پر کمربستہ ہے!

سُورج کی گرمی ناقابل برداشت سہی، ناقابل فہم نہیں۔ پارہ چڑھ رہا ہے اور گرمی بڑھتی جارہی ہے تو اِس میں اللہ نے کچھ مصلحت بھی رکھی ہے، کچھ فوائد بھی ہیں۔ آم اور خربوزوں کی فصل پک رہی ہے۔ سیاسی پارے کا چڑھنا کِس کام کا ہے؟ سُورج کی گرمی کا زور توڑنے کے لیے لوگ لَسّی پیتے ہیں مگر سیاسی درجۂ حرارت کی بلندی تو دِماغ کی لَسّی بنانے پر تُلی ہوئی ہے!

موسم کی گرمی اور سیاست کی گرما گرمی شاید کافی نہ تھی اِس لیے اب یاروں نے اِس میں ہٹ دھرمی اور احتجاج کا تڑکا بھی لگا دیا ہے! الیکشن سے قبل نعرے بازی کی فضاء میں مستقبل کے لیے چند وعدے بھی کیے جارہے تھے۔ ایک نعرہ یہ

بھی تھا کہ معاملات کو دُرست کرنے کے لیے پلّے سے چھینٹی لگائی جائے گی۔ سمجھ لیجیے کہ چھینٹی لگانے کا موسم بھی وارد ہوچکا۔

جو الیکشن جیت گئے وہ تو کنارے لگے ہی لگے، جو ہارے تھے وہ بھی اب دھندے سے لگ گئے ہیں۔ دھندا وہی پُرانا ہے یعنی کھیلیں گے نہ کھیلنے دیں گے۔ جو اپنے مفاد کو ہر شے پر مقدم رکھتے ہیں وہ اپنی بوٹی کے لیے پورا بکرا ذبح کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ الیکشن سے پہلے جو ماتم تھا وہی الیکشن کے بعد بھی ہے۔ ایک منتخب حکومت مرضی کی نہیں تھی سو اُس کے نام کا احتجاج تھا۔ اب وہ حکومت نہیں رہی اور انتخابات کا مرحلہ تمام ہوا تو انتخابی نتائج کا رونا رویا جارہا ہے۔ غالب نے کہا تھا

مے سے غرض نشاط ہے کِس رُو سیاہ کو
اِک گونہ بے خودی مُجھے دِن رات چاہیے!

کچھ لوگوں کی نفسی ساخت نے اِس شعر کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ کام ایک ہے، بہانے بدلتے رہتے ہیں۔ احتجاج کرنا ہے، رونا اور سَر پیٹنا ہے، ہر معاملے کو غلط قرار دینا ہے، جو ملے اُس پر تشکر کا اظہار کرنے کے بجائے اُس پر گریاں کُناں رہنا ہے جو نہ مل سکا۔ ڈیڑھ دو ماہ قبل ٹکٹ کی تقسیم کا غلغلہ بلند ہوا تو ماتم کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھی۔ ہر سیاسی جماعت میں سب لوگ

یہ طے کر بیٹھے تھے ٹکٹ اُنہی کے لیے ہے اور ہر لنا ہی ہلنا ہے۔ جب نہ ہلا تو ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا۔ ایسی دھماچوکڑی مچی یا مچائی گئی کہ دیکھنے والوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ایسے منچلے بھی پائے گئے جو ٹکٹ نہ ملنے پر پارٹی سے ناراض ہوئے اور کھمبوں پر چڑھ گئے! مسلم لیگ (ن) کے مرکزی دفتر کے سامنے تو یہ تماشا اِس قدر ہوا کہ پارٹی کے صدر میاں محمد نواز شریف نے بالآخر تنگ آ کر وہ کھمبا ہی اُکھاڑ پھینکنے کا حکم دیا جس پر چڑھ کر لوگ پارٹی کا نام "بلند" کرنے پر تُلے ہوئے تھے!

ٹکٹوں کی تقسیم کا معاملہ تو کب کا رفع دفع ہوا۔ مگر رونا اِس بات کا ہے کہ کھمبے پر چڑھنے کا سِلسِلہ ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا۔ قوم نے ووٹ ڈالا تو سُکون کا سانس لیا کہ چلو، اب نیا سیٹ اپ بنے گا اور نئے چہرے آ کر کچھ نیا کرنے پر کمر بستہ ہوں گے۔ مگر اِس قوم کے نصیب میں سُکون اور راحت کہاں؟ کھمبے تو اب بھی گڑے ہوئے ہیں۔ اب انتخابی نتائج کا رونا ہے۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے ہفتے کو کہا تھا کہ الیکشن کا کمال یہ ہے کہ ہارنے والوں کے ساتھ ساتھ جیتنے والے بھی رو رہے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی معاملہ ہے کہ کوئی مَر جائے تو لوگ روتے ہیں۔ اور کبھی کبھی حالات کے ستائے ہوئے اِس بات پر بھی روتے ہیں کہ اگر مَر نہ سکے یعنی جینا پڑا تو کیا کریں گے!

پیپلز پارٹی والے کہتے آئے ہیں ہر گھر سے بھٹو نکلے گا، تم کتنے بھٹو مارو گے۔ اور پھر یہ ہوا کہ ہر گھر سے بھٹو نکل گیا۔ اِس بار اہل وطن نے پانچ سالہ کارکردگی سے پیدا ہونے والے اشتعال کو بروئے کار لاتے ہوئے بھٹو فیکٹر کو بھی نظر انداز کردیا اور پیپلز پارٹی کو زمین پر دے مارا۔ گویا پارٹی کی "شاندار" کارکردگی نے اب کے بانی کے نام کو بھی پھانسی گھاٹ تک پہنچادیا! اِس معاملے میں ایک بس سندھ کو استثنٰی مِل سکا ہے۔ اور یہ نام نہاد اِستثنٰی بھی کب تک کے لیے ہے، کون جانتا ہے؟

تُم کتنے بھٹو مارو گے" کا نعرہ تو اب قِصۂ پارینہ ہوچلا ہے۔ ہاں، نیا نعرہ یہ ہے کہ تُم" کِتنے کھمبے اُکھاڑو گے! احتجاج کا کھمبا قدم قدم پر گڑا ہے۔ اور اب تو یہ احتجاجی کھمبے ہمارے تمام تعمیری عزائم کے سینے میں گڑ چلے ہیں۔

احتجاج بھی ایک عجیب ہی کیفیت ہے۔ ایک دور وہ بھی تھا جب اِس سرزمین کی سیاست میں اپوزیشن بھی ہوا کرتی تھی۔ سیاسی مقابلے حقیقی اور کانٹے کے ہوا کرتے تھے۔ اپوزیشن فرینڈلی میچ کھیلنے پر یقین نہ رکھتی تھی۔ حکومت سے اختلاف ہوا بھی کرتا تھا تو کِسی کے اشارے پر نہیں بلکہ خالص اُصولی بُنیاد پر۔ سیاست میں کِسی سے محبت کِسی اور سے نفرت کی محتاج اور مُکلّف نہ تھی۔

وہ دِن ایسے ہوا ہوئے ہیں کہ اب یادوں میں بھی دُھندلا سے گئے ہیں ! ع

اب اُنہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

جمہوریت کے دامن میں بہت کچھ ہے مگر ہم نے احتجاج اور تنقید کو چُن لیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جمہوریت کا دستر خوان بچھا کر ہم نے اُس پر صرف احتجاج اور تنقید کو چُن دیا ہے ! بعض "اہل کرم" کو تو احتجاج کی ایسی عادت پڑی ہے کہ کچھ دِن احتجاج نہ کریں تو اِسی بات پر احتجاج کرنے لگتے ہیں کہ اِتنے دِنوں سے احتجاج کیوں نہیں کیا تھا ! جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو احتجاج کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ گویا

بے چینیاں سمیٹ کے سارے جہان کی

!جب کچھ نہ بن سکا تو مِرا دِل بنا دیا

جمہوریت کا سفر جاری رکھنے کے نام پر جو تماشے ہو رہے ہیں اُنہوں نے لوگوں کو suffer کی منزل پر اُتار دیا ہے ! ڈاکٹر طاہر القادری کا کہا سچ اور دُرست ثابت ہو رہا ہے کہ الیکشن کے بعد دھرنے ہی دھرنے ہوں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ بعض قوتوں نے انتخابی نتائج کے خلاف احتجاج کے نام پر ایک اور جن کو بوتل سے نکالا ہے اور شاید بوتل ہی کو ٹِھکانے لگانے کا منصوبہ بنا رکھا ہے تاکہ احتجاج اور دھرنوں کا جن بے گھری اور دربہ دری کے عالم میں جہاں تہاں ڈیرا

!ڈالتا پھرے

قوم کا یہ حال ہے کہ دو قدم چلتی ہے اور رُک جاتی ہے کیونکہ راستے میں کوئی دھرنا آ جاتا ہے! کیا اِسی تعبیر کے لیے جمہوریت کا خواب دیکھا تھا؟ سیاسی راگ مالا کا تازہ ترین راگ مینڈیٹ چُرائے جانے کے الزام کے سُروں سے ترتیب دیا گیا ہے۔

پیپلز پارٹی بہت عقل مند ہے کہ عوام کے غُصّے کو بھانپتے ہوئے شکست کو تسلیم کرکے خاموش بیٹھی ہے۔ تحریکِ انصاف کا احتجاج تھمنے کا نام نہیں لے رہا۔ اُس نے بھی مینڈیٹ چُرائے جانے کا الزام شد و مد سے لگایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کہیں کپتان کو دَھکّا دیکر احتجاج کے تالاب میں تو نہیں گرایا جارہا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُنہیں مُبیّنہ دھاندلیوں کے خلاف احتجاج میں اُلجھا کر وہاں کچھ ڈھنگ کا کام کرنے کے قابل نہ چھوڑا جائے جہاں وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی پوزیشن میں ہیں؟ تحریکِ انصاف کے قائد کو یہ نکتہ سمجھنا چاہیے کہ احتجاج طُول پکڑتا ہے تو لوگ بدظن ہونے لگتے ہیں۔ ٹائمنگ اور پریکٹس ہر معاملے میں اہمیت رکھتی ہے۔ اور یہ بات کپتان سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے؟ عمران خان کو میچ کے شروع ہی میں تمام اوورز کرانے سے گریز کرنا چاہیے۔ احتجاج بھی آج کی سیاست کا ایک اہم کارڈ ہے۔ اِسے وقت

احتجاج قیام کا نہیں، یہ وقت فتح پر سجدہ شکر بجا لانے کا ہے۔ آنے ہی پر شور کرنا چاہیے!

بس، اب کام شروع کیا جائے

دُعائیں مستجاب ہونے کے انتظار میں ہیں۔ بُلٹ کلچر پورے ملک پر محیط ہو چکا ہے۔ جسے دیکھیے وہ طاقت سے بات منوانے پر تُلا ہوا ہے۔ ایسے میں بیلٹ کی طاقت پر یقین رکھنے والے گھٹتے جارہے ہیں۔ عوام کی خیر ہو کہ اُنھوں نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ اُن کا سیاسی ایمان ووٹ کی پرچی پر ہے۔ پانچ برس سے پیپلز پارٹی کی قیادت بے نظیر بھٹو کا یہ جُملہ دُہراتی آئی ہے کہ جمہوریت بہترین انتقام ہے۔ اور سب نے دیکھا کہ پارٹی نے جمہوریت کے نام پر قوم سے بہترین انتقام لے بھی لیا! اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو بھارت کے ایٹمی دھماکوں کی سالگرہ کے دن قوم حکمراں جماعت پر شدید ناراضی کا ایٹم بم نہ گراتی! قدرت نے ایک بار پھر اپنے اُصول کو دُرست ثابت ہونے کا موقع فراہم کیا۔ پیپلز پارٹی نے جو بویا وہی کاٹا۔

بیلٹ کا مرحلہ تمام ہوا تو پھر بُلٹ کی باری آ گئی۔ لوگ حکومت سازی کے منتظر ہیں۔ جن ایوانوں کی خَر مستیوں سے پانچ سال تک قوم پریشان رہی اُن میں ایک بار پھر گھوڑوں کی خرید و فروخت کے آثار ہیں۔ سوچنے والے سوچ سکتے ہیں کہ گھوڑے اب کہاں رہے۔ ذاتی مفاد کے لیے مختلف نظریات کے آغوش میں سونے والے

خچّروں کی بھرمار ہے۔ دوغلا پن ہے کہ ختم ہوتا نہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ یار لوگ دوغلے پن کو ختم ہونے بھی نہیں دیتے!

قوم نے قطار بند ہو کر ووٹ کی پرچی کے ذریعے دِل کی بات کہہ دی۔ انتخابی مہم میں اور منشور کے ذریعے جو وعدے کئے گئے تھے اُن کے سانچے میں عمل کو ڈھالنے کا وقت آگیا ہے۔ قوم دیکھنا چاہتی ہے کہ دعوے عمل کی دُنیا میں وارد ہو کر کون سا رُوپ دھارتے ہیں۔ ہر بار یہی تو ہوتا ہے۔ دِل اُمیدوں سے لب ریز بھی ہوتے ہیں اور اندیشوں سے لرزتے بھی رہتے ہیں۔ خدشات اور وسوسے ہیں کہ دِل و دِماغ کی جان نہیں چھوڑتے۔ اب پھر اندیشے سَر اُٹھا رہے ہیں۔

مُقدر بن گئے ہیں خار و خَس کیا؟

نہ آئے گی بہار اب کے برس کیا؟

ایک موسم آسمان سے آگ کے برسنے کا ہے۔ دوسرا موسم انتخابات اور مابعدِ انتخابات کا ہے۔ اور اب تیسرا موسم بھی وارد ہو چکا ہے۔ یہ موسم ہے ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے کا۔ قوم کچھ پانا چاہتی ہے۔ اُس نے بیلٹ بکس میں اپنا دِل کھول کے رکھ دیا۔ مگر جب بیلٹ بکس کھلے تو پریشانی کے صندوق بھی کُھل گئے! سب کی زبان پر ایک ہی شِکوہ ہے کہ مینڈیٹ پر شب خُون مارا گیا۔ دِن کے اُجالے میں ہونے والی پولنگ کے ذریعے شب خُون کیسے مارا جاسکتا ہے؟

یہ تو عوام کو طے کرنا ہے کہ کون حکمراں ہوگا اور کون اقتدار سے محروم رہے گا۔ کوئی بھی سیاسی جماعت یا ذاتی حیثیت میں الیکشن لڑنے والا سیاست دان کس طور طے کر سکتا ہے کہ عوام اُسی کو چاہیں؟ عوام نے یہ نکتہ سمجھ لیا ہے کہ جو توقعات پر پُورا نہ اُترے اور مینڈیٹ کو نیت کے مکمل اِخلاص کے ساتھ عمل سے ہمکنار نہ کرے اُس سے انتقام لینا چاہیے۔ جمہوریت کو بہترین انتقام قرار دینے کی پُشت پر یہی فلسفہ کام کر رہا ہے۔ دُنیا بھر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو لوگ عوام کی توقعات پر پُورے نہیں اُترتے اُنہیں عوام بیلٹ پیپر کے ذریعے رَدّی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ ہمارے اہل سیاست کا معاملہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو" والا ہے۔ خود کو جن کا نمائندہ قرار دیتے نہیں" تھکتے جب وہی لوگ مخالف رائے دیتے ہیں تو اُس رائے کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا جاتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ مینڈیٹ میں نقب لگائی گئی یا شب خُون مارا گیا تو یہ سمجھ لیجیے کہ وہ عوام پر نقب لگانے اور شب خُون مارنے کا الزام عائد کر رہا ہے!
منتخب ایوانوں میں واضح اکثریت کے ساتھ اُبھرنے والی جماعتوں کو حکومت سازی ریگ زار سے گزرنا ہے۔ اِس کٹھن سفر کی تیاری کرنے کے بجائے وہ دھاندلی کے

الزامات لگا کر، احتجاج کا اہتمام کرکے سیاسی فضاء کو مزید مُکدّر کر رہی ہیں۔پُراسرار قوتیں پھر متحرک ہو گئی ہیں۔

مینڈیٹ چُرانے کا الزام ایک خاص حد تک دُرست ہے۔ اگر یہ راگ زیادہ دیر یا مینڈیٹ کی پُوری میعاد کے دوران الاپا گیا تو اُن مسائل کا کیا ہوگا جن کا حل عوام کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہیں؟ لوگوں کو احتجاج نہیں، کام چاہیے۔ مسائل حل ہونے چاہئیں۔ ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرانے کی وباء کو پھیلنے سے روکنا ہے۔ یہ ایسی روش نہیں جس پر زیادہ دیر گامزن رہا جائے۔

جمہوریت کے نام پر عوام نے پانچ سال تک غم کی سیاہ رات کاٹی ہے۔ خُدا خُدا کرکے ایک عہدِ ابتلا ختم ہوا۔ اب جمہوریت کا سُورج پھر طلوع ہوا ہے، صبح کا نُور پھیلا ہے تو اِسے دُھندلانے کی کوشش نہ کی جائے۔ عوام ایسی کوئی صدا سُننے کو تیار نہیں کہ ع

!چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

دُکاندار بھی جب صبح دُکان کھولتے ہیں تو ابتدائی لمحات میں کسی گاہک سے اُلجھنا پسند نہیں کرتے۔ دھندے کے آغاز میں ایسا کرنا بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔ اور عام طور پر دِن کے پہلے گاہک کو اُدھار دینے سے گریز کیا جاتا ہے۔

مینڈیٹ کی چابی نے ایک نئے جمہوری عہد کو غیر مُقفّل کر دیا ہے۔ منتخب ایوانوں کی دُکانیں کھلنے والی ہیں۔ ابھی جمہوری دھندے کا آغاز بھی نہیں ہوا اور سب ایک دوسرے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں!

جب ایک دوسرے کا مینڈیٹ ہی تسلیم نہیں کیا جائے گا تو پانچ سالہ مُدت میں منتخب ایوان کیا کریں گے؟ جمہوریت کے کھیت میں احتجاج کے بیج ڈالے جائیں گے تو ہم آہنگی کی فصل کیسے اُگے گی؟ ایک عشرے کے دوران قوم نے جو کچھ بُھگتا ہے اُس کا ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ سب کچھ بُھول کر جمہوریت کو یاد رکھا جائے۔

جنہیں عوام نے اپنی نمائندگی کا اعزاز بخشا ہے اُنہیں منتخب ایوانوں میں ایک دوسرے کا احتساب کرنا ہے۔ اِس احتساب ہی کی بنیاد پر طے ہوگا کہ کس نے قوم کو کس حد تک فائدہ یا نقصان پہنچایا ہے۔ عوام کی خواہش صرف اِتنی ہے کہ اُن کے مسائل حل ہوں اور اِس کے لیے لازم ہے کہ منتخب ایوانوں میں احتساب کی روایت کا احیاء ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ابھی تو ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالا جارہا ہے، ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی جارہی ہے اور حکومت سازی کے مراحل مکمل ہونے پر مفاہمت کو فروغ دینے کے نام پر سب اپنا اپنا حِصّہ طے کرکے سُکون سے بیٹھ جائیں! عوام اب فرینڈلی اپوزیشن نام کی کسی بلا کو گلے

لگانے کے لیے تیار نہیں۔ قومی مفاد کے معاملات پر اشتراکِ عمل الگ چیز ہے۔ مفاہمت کی سیاست کے نام پر حِصّہ لیکر چپ بیٹھے رہنا کوئی اور ہی کیفیت ہے۔ پیپلز پارٹی کا سندھ تک محدود ہو جانا سب کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ لوگ کام چاہتے ہیں، دُشنام طرازی اور احتجاج نہیں۔ لانگ مارچ، مظاہرے اور دھرنے کی سیاست اور کسی کی ہو تو ہو، عوام کی ترجیح نہیں۔ اہل سیاست انتخاب کے مرحلے سے گزر چکے۔ بس، اب اُنہیں سیاست چھوڑ کر کام شروع کرنا چاہیے۔

آئی پی ایل .... بولو جی، تم کیا کیا خریدو گے

بُرا ہو کمرشل ازم کا جس نے ہر شعبے کو چُوں چُوں کا مُربّہ بنا دیا ہے۔ اگر کوئی اداکار گر پڑے تو خبر بن جاتی ہے، چینلز کی گاڑیاں دوڑی آتی ہیں۔ اگر اداکار تب تک اُٹھ کر اپنے پیروں پر چلنے لگا ہو تو فرمائش ہوتی ہے کہ ایک بار پھر گرنے کا سین فلم بند کرا دے تاکہ ناظرین کے دِلوں کو تسکین پہنچانے کے ساتھ ساتھ ریٹنگ کو برقرار رکھا جا سکے!

کمرشل ازم نے کرکٹ کو بھی نہیں بخشا۔ ایک کھیل میں سو کھیل سما گئے ہیں۔ آج کرکٹ ملٹی پرپز، ملٹی لیئر اور ملٹی ریسورس کھیل ہے۔ یعنی مقاصد بھی کئی ہیں، پَرتیں تو خیر کوئی گِن ہی نہیں سکتا اور وسائل بھی ہر طرف سے طوفان کی طرح اُمڈے آتے ہیں! بقول قمر جلالوی

دُعا بہار کی مانگی تو اِتنے پُھول کِھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو!

بہت سے نوجوان اب کرکٹ کی طرف اِس لیے آتے ہیں کہ کسی اور شعبے کی طرف آسانی سے جا سکیں! کرکٹ کے میدان میں گزارے ہوئے چند سال ایسی شہرت بخشتے

ہیں کہ پھر اِنسان زندگی بھر اُس شہرت کو کیش کراتا رہتا ہے۔ ماڈلنگ کرنی ہو تو کرکٹ کھیلیے۔ اداکاری کرنی ہو تو کرکٹ کھیلیے۔ چند ایک شعبے اور بھی ہیں مگر ہم خوفِ فسادِ خلق سے یہاں اُن کا ذکر نہیں کرتے!

اور بہت سے معاملات کی طرح بھارت سٹّے بازی کا بھی گڑھ ہے۔ بھارتی سٹّے بازوں نے ہر شعبے کو کچھ کو کچھ بنادیا ہے۔ اب لوگ اداکاری دیکھنے جاتے ہیں تو سنیما کی اسکرین پر کئی کھیل دِکھائی دے رہے ہوتے ہیں۔ کرکٹ دیکھنے کے لیے اسٹیڈیم کا رُخ کیجیے تو وہاں میدان کے بیچوں بیچ کرکٹ کے سِوا تمام کھیل براجمان ہوتے ہیں۔ اور اداکاری تو خیر ایسی چل رہی ہوتی ہے کہ پُونا فلم انسٹی ٹیوٹ والے دیکھیں تو نیا نصاب مرتب کریں!

شارجہ سے شروع ہونے والا سٹّے کا سلسلہ ایسے جلوے بکھیر رہا ہے کہ دیکھنے کی تاب نہیں۔ کوئی ہمت کرکے دیکھے تو آنکھیں چُندھیا جاتی ہیں۔ یہ وہ جنتر منتر ہے جس میں کئی ایسے پھنسے کہ پھر نکل نہ سکے۔ یہ مکڑی کا وہ جال ہے جس میں لالچی مکھیاں آئے دن پھنستی ہیں اور شہرت، عزت اور کیریئر کی موت سمیت اپنا سب کچھ کھو بیٹھتی ہیں!

سِری سنتھ نے کرکٹ تو سیکھی مگر آج کی کرکٹ کے تقاضے نہ سیکھ پایا۔ دُنیائے

کرکٹ میں آمد پر جب اُس نے مال دیکھا تو رال ٹپکی اور پھر لالچ نے اپنا رنگ جمایا۔ رہی سہی کسر بُکیز نے حُسن کے جلوے فراہم کرکے پوری کردی! اور پھر دِل و دِماغ کی لائن اور لینتھ پر سِہری سنتھ کا کچھ اختیار نہ رہا! نتیجتاً وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ راتوں رات بہت کچھ، بلکہ سب کچھ پانے کی تمنا نے اسٹیپ غلط کر دیئے اور سِہری سنتھ کیریئر کی پچ پر سب سے جان لیوا، بلکہ خود کش نو بال کرا بیٹھا!

سِہری سنتھ نے اسپاٹ فکسنگ کے ڈرامے میں کردار ادا کیا اور معاوضہ پایا۔ مگر یہ معاوضہ اُس سے ہضم نہ ہو پایا۔ کسی بھی بولر کو اپنی تمام خفیہ گین دیں ایک ہی اوور میں نہیں کرالینی چاہئیں۔ سِہری سنتھ اِتنی سی بات سمجھ نہ پایا اور گرل فرینڈ کو پا کر آپے سے باہر ہوگیا۔ ایک ایک دن میں دو دو لاکھ روپے سے زائد کی شاپنگ کرائی۔ دو لاکھ روپے کے تو صرف ملبوسات دِلائے۔ بلیک بیری بھی لیکر دیا۔ سیر سپاٹے کا شوق بھی پورا کیا۔ میڈیا میں چند تصاویر بھی آئی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سِہری سنتھ کرکٹ کے علاوہ کون کون سے کھیل جانتا تھا! میڈیا والوں نے تصاویر میں لڑکی کا چہرہ blur کردیا۔ بے چارا سِہری سنتھ تو سب کے سامنے ہے اور جو فساد کی جڑ تھی اُسے بچالیا گیا۔ شاید اِس لیے جب وہ نیا شِکار پھانسنے نکلے تو شناخت نہ کرلی جائے! عزت اور کیریئر داؤ پر لگا کر جو کچھ کمایا اُسے گرل فرینڈ پر لگادیا! اور پھر پکڑا

گیا۔ سِری سنتھ کی تو نوکری بھی گئی۔ وہ بھارت پیٹرولیم میں اسسٹنٹ ڈپٹی مینیجر تھا۔
یعنی آدھی کو چھوڑ پوری کو جائے تو آدھی بھی ہاتھ سے جائے!

سِری سنتھ جیسے نوآموز سارا کھیل بگاڑ دیتے ہیں۔ سٹّے باز بھی عقل سے کام نہیں لیتے۔ کِسی کو اپنی صف میں شامل کرنے سے پہلے تھوڑی بہت ٹریننگ تو دے لیا کریں!
اِتنی محنت سے اُنھوں نے یہ تاج محل کھڑا کیا ہے اور ایک آدھ غلط اینٹ عمارت کا حُسن غارت کردیتی ہے!

سِری سنتھ بوڑم نکلا۔ گیند سے کھیلنا سیکھا مگر یہ نہ سیکھا کہ راتوں رات ملنے والی دولت کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے کیسے باز رہنا ہے! سٹّے بازوں کو اب ایک انسٹی ٹیوٹ کھولنا چاہیے جس میں سِکھایا جائے کہ دولت خرچ کیسے کرنی ہے! نو دولتیوں کی ذرا سی نادانی پورے شعبے کو "بدنام" کرتی ہے۔

دارا سنگھ رندھاوا اپنے زمانے کے مانے ہوئے پہلوان تھے۔ جب تک پہلوان تھے، صرف پہلوانی کی۔ ہم نے نہیں سُنا کہ اُنھوں نے کبھی میچ فکسنگ کی ہو یعنی کبھی نُورا کشتی کا حِصّہ نہیں بنے۔ بعد میں وہ اداکاری کی طرف آئے اور جیسے تیسے کچھ عرصہ ایکشن ہیرو کی حیثیت سے گزارا۔ اداکاری اُنھوں نے محنت

سے سیکھی۔ یہ کوئی نُورا کشتی کلچر کا نتیجہ نہ تھی۔ مگر افسوس کہ دارا سنگھ کے بیٹے وندو کو میچ فکسنگ یعنی نُورا کشتی نے پچھاڑ دیا!

میچ فکسنگ کے الزام میں زیر حراست وندو نے بُکیز سے رابطوں کا اعتراف بھی کرلیا ہے۔ مگر اُمید ہے کہ یہ معاملہ اعتراف تک رہے گا، انکشاف کی منزل تک نہیں پہنچے گا! سَٹّے بازی وہ اکھاڑا نہیں جس میں وندو کا داؤ چل سکے۔ اُس نے ہالی وڈ کی مشہور اداکارہ فرح ہاشمی سے شادی کی تھی۔ افسوس کہ فرح کو کئی سال اپنے گھر میں رکھنے کے باوجود وہ اُس سے تھوڑی بہت اداکاری بھی نہ سیکھ سکا!

بُکیز بھی بہت سِتم ظریف ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ نئے کھلاڑیوں کو پھانسنے میں زیادہ وقت لگتا ہے نہ محنت۔ پیسوں سے تو چند ایک ہی کو لُبھانا پڑتا ہے۔ بیشتر تو لڑکیوں کے جال ہی میں پھنس جاتے ہیں!

ہمیں حنیف محمد اور فضل محمود کا زمانہ یاد آگیا۔ کیا دور تھا کہ وہ لوگ سائیکل پر سوار ہوکر اسٹیڈیم جایا کرتے تھے اور کھانا بھی گھر سے لے جانا پڑتا تھا۔ شہرت بھی برائے نام تھی۔ اور دولت تو خیر خال خال ہی تھی۔ ہاں، عزت تھی جو بچی رہ گئی اور اب تک کام آرہی ہے! سیدھے اور سادہ لوگ تھے۔ خود

کو کرکٹ تک محدود رکھتے تھے۔ ایسی کرکٹ سے تو اُن کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا جس میں نہ کھیلنے کے زیادہ پیسے ملتے ہوں!

انڈین کرکٹ بورڈ (بی سی سی آئی) کے سربراہ شر نواسن کے داماد گرو ناتھ میئپن نے ممبئی پہنچ کر گرفتاری دے دی ہے۔ اب کرائم برانچ اُس سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ بی سی سی آئی کے سربراہ شری نواسن پر مستعفی ہونے کے لیے دباؤ بڑھ رہا ہے۔ آئی پی ایل میں میچ اور اسپاٹ فکسنگ کا پنڈورا بکس کھلنے پر پاکستانی کرکٹرز نے یقیناً سُکون کا سانس لیا ہوگا۔ مگر ہاں، ہمارے امپائر اسد رؤف کی گردن اِس شکنجے می پھنستی دِکھائی دے رہی ہے! خیر، دُنیا کو اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ سٹّہ بازی کا ہیڈ کوارٹرز کہاں ہے اور کس نے کرکٹ کے نام پر جُوئے کی سُپر مارکیٹ کھول رکھی ہے۔ اب ساری اُنگلیاں ہماری طرف نہیں اُٹھنی چاہئیں۔ آئی پی ایل کیس یہ بھی بتاتا ہے کہ پکڑے جانے سے بچنے کے لیے کون سی احتیاطی تدابیر اختیار کرنی ہیں! بہر حال، ہماری دُعا یہ ہے کہ کرکٹ صرف کرکٹ رہے، غریب کی جورو یعنی سب کی بھابی بن کر نہ رہ جائے کہ جو آئے اُس کے ساتھ اور اُس کے نام پر کچھ بھی کرتا پھرے!

اپنی پولیس کو سمجھنا پڑے گا

اِس میں کوئی شک نہیں کہ بحیثیت قوم ہماری پاس کی نظر کمزور ہے۔ اور کمزور بھی ایسی کہ آنکھوں کے سامنے کی چیز بھی دِکھائی نہیں دیتی۔ کوئی بھی مثال دینی ہو تو مغرب پر نظر دوڑائی جاتی ہے اور کئی سمندر پار کرکے مثالیں لائی جاتی ہیں۔ گھر کی مُرغی دال برابر ہوتی ہے۔ ہماری پولیس کی بدنصیبی یہ ہے کہ ہم اب تک اُس میں صرف خامیاں تلاش کر رہے ہیں، کیڑے نکال رہے ہیں۔ دیکھنے والی نظر ہو تو دیکھ پائیں نا! ہمیں تنقید کے سِوا آتا کیا ہے؟ پرائم ٹائم کے ٹاک شو دیکھ دیکھ کر مُنہ کو تنقید کا ایسا خُون لگا ہے کہ ع

چُھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی!

اللہ نے یہ سوچنے کی کبھی توفیق ہی نہیں دی کہ ہماری پولیس فورس نے دُنیا کو کیسے کیسے تصورات دیئے ہیں۔ اِن میں سے کئی تصورات تو وژن کا درجہ رکھتے ہیں۔

اللہ سے صرف یہ دُعا ہے کہ ہماری پولیس کو بُری نظر سے بچائے۔ اُس کے دَم

سے نئے تصورات کا جہاں آباد ہے۔ دُنیا بھر میں تفتیش اور تحقیقات کے درجنوں طریقے معروف ہیں اور اُنہی کے دائرے میں رہتے ہوئے تفتیش کی جاتی ہے۔ ہماری پولیس طبعاً، فطرتاً اور خصلتاً آزاد ہے۔ بقول اقبال

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد

ہمارے ہاں جب پولیس تحقیقات پر مائل ہوتی ہے تو کہیں سے کہیں جا نکلتی ہے اور جہاں سے کچھ یافت یا امکان ہو وہاں تک تو ضرور جا پہنچتی ہے۔ اِس کی تحقیقات کے ہر طریقے پر پی ایچ ڈی کی جا سکتی ہے! انہماک کا یہ عالم ہے کہ جس سے تفتیش کی جارہی ہو بعد میں اُسے تلاش کرنے کے لیے ٹیم تشکیل دینی پڑتی ہے کیونکہ ہماری پولیس اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ جُرم کا نام و نشان مٹانے کے لیے مُجرم کا نام و نشان مٹانا لازم ہے!

معیشت کی خستہ حالی کا رونا روتے رہنے کی ہمیں عادت سی پڑ گئی ہے۔ ماہرین درآمد میں اِضافے اور برآمدات میں کمی کا درد بھرا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی ہے کہ برآمدات کے شعبے کو مستحکم کرنے میں پولیس کلیدی کردار ادا کرسکتی ہے؟

پوری دیگ میں کیسی بریانی ہے اِس کا اندازہ لگانے کے لیے چاول کے چند دانے

چکھ لینا کافی ہوتا ہے۔ مُشتِ از خروارے یعنی چند نمونے پیش خدمت ہیں تاکہ آپ کو بھی پولیس کے معاملے میں کم نگاہی کا اندازہ ہو اور کچھ (اپنی) اصلاح پر مائل ہوں!
جام شورو (حیدر آباد) پولیس نے تقریباً ایک ماہ قبل چار افراد کو گیارہ بھینسیں چُراتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کرکے مسروقہ بھینسیں برآمد کیں۔ بھینسوں کے مالک نیاز چانڈیو نے سُکون کا سانس لیا مگر یہ سانس جلد ہی اُکھڑ گیا۔ پولیس نے گیارہ بھینسیں تھانے میں باندھ دیں۔ کچھ دن بعد پولیس اہلکاروں نے بھینسوں کے گرد اور مالک نے عدالت کے چکر کاٹنا شروع کردیا۔ دُودھ سے مکھن نکالا جاتا ہے اور مکھن بلو کر گھی بنایا جاتا ہے۔ مگر اِس عمل سے بہت پہلے معاملات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ پولیس اہلکاروں کی پانچوں انگلیاں گھی میں ڈل گئیں اور سَر کڑھائی میں! اُنہوں نے تھانے میں بندھی ہوئی بھینسوں کا دودھ بیچنا شروع کردیا!
نیاز چانڈیو نے دُہائی دی مگر کچھ نہ ہوا۔ پولیس اور بھینس دونوں کو سمجھانا اُن کے آگے بین بجانے کے مترادف ہوتا ہے! بے چاری مسروقہ بھینسوں کو کیا معلوم کہ اُن کے وجود نے پولیس کو متبادل آمدنی کا ذریعہ سُجھا دیا ہے! سندھ میں سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ ایسے میں اگر پولیس بھینسوں کا دودھ

بیچنے کے بجائے دہی جما کر لَسّی بیچے تو موسم سے مطابقت بھی پیدا ہو جائے گی اور آمدنی کا گراف بھی بلند ہوگا! اچھا ہے، پولیس ملزمان سے تفتیش یا شہریوں سے احوال پوچھنے کے نام پر اُن کے دِماغ کی لسّی بنانے کے بجائے تھانے کے باہر لَسّی کی دُکان کھول لے! اِس میں ہرج ہی کیا ہے جب اِس ملک میں "فوجی فرٹیلائزر" ہو سکتی ہے تو "پولیس لَسّی" کیوں نہیں ہو سکتی!

میر پور خاص میں تجاوزات کے خلاف آپریشن کے دوران بلدیاتی ملازمین اور پولیس اہلکاروں نے بلدیہ شاپنگ سینٹر کے باہر ٹھیلے لگائے اور بریانی سے بھری ہوئی تین دیگیں بھی ضبط کرلیں۔ پولیس اور بلدیاتی ملازمین کو جو بریانی ہاتھ لگی وہ اُنھوں نے خود بھی کھائی اور رشتہ داروں میں بھی تقسیم کی۔ سُنا ہے ڈپٹی کمشنر آصف اکرام اِس حرکت پر برہم ہوئے۔ اُن کی ناراضی بے محل اور بے سُود ہے۔ کھانے کی چیز تھی، کھالی۔ اور اچھا ہے کہ رشتہ داروں میں بھی بانٹ دی۔ اِس سے تعلقات مضبوط ہی ہوں گے۔ ساری بریانی خود کھاتے تو بدہضمی بھی ہوتی اور صِلہ رحمی سے گریز کا عذاب بھی جھیلنا پڑتا! اینٹی انکروچمنٹ آپریشن کے دوران ضبط کیا ہوا مال اگر پڑا رہے تو سڑ جاتا ہے۔ ایسی سڑی ہوئی گرمی میں بریانی جیسی چیز تو ویسے بھی اِس بات کی مُتقاضی ہوتی ہے کہ ریپڈ ایکشن فورس کی طرح کارروائی کرتے ہوئے فٹافٹ کھالیا جائے! ہمیں معلوم نہیں ہو سکا کہ تجاوات کے خلاف آپریشن میں زیادہ تیزی تھی یا

.بریانی کو ٹھکانے لگانے والے آپریشن میں ! اچھا ہے، کچھ غریبوں کا پیٹ بھر گیا۔ اور .بریانی ایسی چیز بھی نہیں جس کی بازیابی کے لیے بعد میں کلیم کیا جائے۔ پولیس .بریانی کو جس حالت میں واپس کرنا چاہے گی وہ کسی طور قابل قبول نہ ہو گی۔ قصور ٹھیلے والوں کا ہے کہ وہ ایسی چیز بیچنے نکلے ہی کیوں جسے بعد میں قبول نہ کیا جاسکے ! اب کوئی یہ دعویٰ نہ کرے کہ .بریانی پر کِس کا حق مُقدم تھا۔ رند وہی ہے جس کے ہاتھ میں جام آ جائے۔ جو جیتا وہی سِکندر۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس، اور .بریانی بھی ! زبان سے نکلا ہوا لفظ، کمان سے نکلا ہوا تیر اور پیٹ میں گئی ہوئی .بریانی کبھی واپس نہیں آتی ! ٹھیلے والوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ اگر وہ پولیس والوں کو تھوڑی بہت .بریانی بھتہ یا صدقہ سمجھ کر نہیں دیں گے تو قُدرت اُنہیں اِس طرح "اینٹی .بریانی آپریشن" کے ذریعے نوازے گی ! اور صاحب ! جب بعض شُعراء پورا کا پورا مشاعرہ لُوٹ سکتے ہیں تو کیا پولیس والے .بریانی کی دو تین دیگیں نہیں لُوٹ سکتے !

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مسروقہ بھینسوں کا دُودھ بیچنا یا .بریانی کی دیگیں ضبط کرکے ضیافت اُڑانا شرافت نہیں بلکہ بُزدِلی کا مظاہرہ ہے تو غم مت کیجیے۔ پولیس اُن کاموں میں بھی آگے ہے جن میں جُراتِ رندانہ درکار ہوا کرتی ہے۔ جام شورو میں خدا کی بستی پولیس چوکی کے انچارج علی بخش چانڈیو کا

بیٹا امام چانڈیو ملوث سائیکل چھیننے میں ملوث نکلا ہے۔

یہ چند مثالیں ہماری توجہ چاہتی ہیں۔ ہماری پولیس اب اپنے لیے وسائل خود پیدا کر سکتی ہے۔ دُنیا میں ایسی پولیس کہاں ہوگی جو خود روزگار فارمولے کے تحت اپنے کھانے پینے کا بندوبست کرے اور اِضافی آمدنی بھی یقینی بنائے؟ لوگ منشیات کا رونا روتے رہتے ہیں۔ کئی شہروں میں پولیس نے "نارکوٹکس فری زون" بنائے ہیں۔ یہ وہ علاقے ہیں جن میں نارکوٹکس آزادانہ فروخت ہوتی ہے! ذرا وژن تو دیکھیے کہ ایک طرف تو منشیات خریدنے اور بیچنے والوں کو سہولت۔ اور دوسری طرف منشیات استعمال نہ کرنے والوں کو اِس بات کا اطمینان اُن کی آنکھوں کے سامنے یہ مکروہ دَھندا نہیں ہو رہا! یعنی کام بھی چلتا رہے اور کسی کا دِل بھی نہ ٹوٹے!

مسروقہ بھینسوں کا دودھ فروخت کرکے اور اینٹی انکروچمنٹ آپریشن کے دوران بریانی سے بھری دیگیں ٹھکانے لگا کر ہماری پولیس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ تھوڑی سی توجہ دی جائے تو وہ قوم کو سیلف ایمپلائمنٹ کے نئے طریقے سکھا سکتی ہے! سُنا ہے ن لیگ کے مرکزی رہنما اسحاق ڈار بجٹ تیار کر رہے ہیں۔ اُنہیں اضافی آمدنی یقینی بنانے کے حوالے سے پولیس کی صلاحیتوں کو ضرور یاد رکھنا چاہیے!

اِتنا "سنّاٹا" کیوں ہے بھائی

کارل مارکس زندگی بھر غور و فکر کی راہ پر گامزن رہا۔ لوگ اُس کی باتوں میں پتہ نہیں کیسے کیسے فلسفے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ہم سے پوچھیے تو ہم بتائیں کہ اُس نے کوئی تیر نہیں مارا۔ چند باتیں کُلیے کے طور پر بیان کیں جو غلط نکلیں۔ مثلاً اُس نے نظریاتی ڈنکے کی چوٹ پر کہا تھا کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ ہم نے اِس نکتے پر غور کیا تو جی چاہا کارل مارکس کی رُوح کو بے نقط سُنائیں۔ اُس نے آنے والے زمانوں کو بصیرت کی آنکھ سے دیکھ لیا تھا اور جو کچھ ہونا ہے اُس کا خاکہ کھینچنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر یہ بات اُس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ کبھی پاکستان کے نام سے ایک ملک قائم ہوگا جس کے لوگ ماحول نہیں، شور کی پیداوار ہوں گے!

محکمہ موسمیات سے وابستہ ماہرین فضا میں نمی کا تناسب جانچتے پھرتے ہیں۔ کبھی فضا میں شور کے تناسب کی پیمائش کی ہے؟ آپ سوچیں گے شاید اب اِس کی ضرورت نہیں رہی۔ اِنسان صحرا میں ہو تو پانی تلاش کرتا ہے اور پانی بہت دور بھی ہو تو لپک کر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ سمندر میں کون پانی کی طرف دیکھتا ہے؟

مشہور جرمن فلسفی شوپنہار نے شور یعنی صوتی آلودگی کو سنگین ترین جرائم میں شمار کرتے ہوئے انہماک کی موت قرار دیا تھا۔ 22 فروری 1788 کو اِس دنیا میں آنے والا آرتھر شوپنہار 21 ستمبر 1860 کو دُنیا سے رُخصت ہو چکا تھا۔ اُس کے زمانے تک کی ایجادات میں ایسی اشیا کم تھیں جن سے غیر معمولی شور پیدا ہو۔ مشینی یا صنعتی دور مکمل وارد نہیں ہوا تھا۔ آج سے کئی ہزار گنا پُرسکون ماحول کو شوپنہار صوتی اعتبار سے انتہائی آلودہ تصور کرتا تھا تو تصور کیجیے کہ آج اگر دوبارہ اِس دنیا میں بھیجا جائے تو اُس کا کیا حال ہو!

شوپنہار کے دور کا جرمنی تھا ہی ایسا کہ صوتی آلودگی سے شدید نفرت کی جاتی تھی۔ مُوسٰی علیہ السلام کو اللہ نے کوہِ طُور پر دس احکام سے نوازا تھا۔ جرمن قوم نے "غیر ضروری طور پر مُخل نہ ہوں" کو گیارہویں حکم کا درجہ دیا تھا!

ہم ایک منفرد معاشرے کا حصہ ہیں۔ اِس معاشرے میں بہت کچھ شور تلے دب کر رہ گیا ہے۔ منفرد آوازوں کی ایک کائنات آباد ہے۔ گاڑیوں میں ایسے ایسے ہارن لگے ہیں کہ کسی گاڑی کے عین پچھواڑے پہنچ کر بجایئے تو اُس کا ڈرائیور یہ سوچ کر کلمہ پڑھنے لگے کہ شاید اسرافیل علیہ السلام نے صُور پُھونکنے کا

عمل شروع کر دیا ہے!

دُنیا بھر میں گاڑیاں پٹرول، ڈیزل یا گیس سے چلتی ہیں۔ ہمارے ہاں منفرد انجن ہیں جو شور پیدا کرتے ہیں اور شور ہی کی مدد سے چلتے ہیں۔ بہت سی گاڑیاں بجتی ہوئی چلتی ہیں۔ اور لوگوں کو اُن سے بچتے ہوئے چلنا پڑتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ایسی گاڑیوں میں ہارن بھی نصب ہوتے ہیں!

جن کارخانوں میں مشینوں کا شور کان کے پردے پھاڑنے کے لیے کافی ہوتا ہے وہاں بھی لوگ کیسٹ پلیئر یا جدید میوزک سسٹم آن رکھ کر اپنی طرف سے حِصّہ ڈالتے ہیں تاکہ سارا "کریڈٹ" مشینیں نہ لے اُڑیں! سمجھ میں آنا تو دُور کی بات ہے، اگر سُنائی نہ دے رہے ہوں تب بھی گانے بجانا ناگزیر سا ٹھہرتا ہے!

شور نے گفتگو کے لازمی جُز کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ جس طرح پانی کے بغیر آٹا گوندھنا ممکن نہیں بالکل اُسی طرح شور کے بغیر گفتگو ممکن بھی نہیں اور کچھ لُطف بھی نہیں آتا! جس طرح کچھ لوگ تدفین کے بعد میّت والے گھر میں کھانے کے دوران بھی بوٹیوں کا خیال ذہن سے نہیں نکالتے بالکل اُسی طرح بہت سے لوگ گفتگو کی بریانی میں شور کی بوٹیاں تلاش کرتے ہیں۔ اور اگر نہ ملیں

تو شامل کرتے ہیں!

لکھنے کے لیے "برین اسٹارمنگ" ناگزیر ہے۔ یعنی آپ دیگر کاموں سے فراغت پا کر کسی گوشہ عافیت میں بیٹھیں اور ذہن میں خیالات کو حرکت دیں۔ سادہ اور عوامی الفاظ میں کہیے تو لکھنے کے لیے دِماغ میں خیالات کی لَسّی بنانی پڑتی ہے! اب جناب آپ لکھنے بیٹھے ہیں۔ ذہن میں طوفان اُٹھا چکے یعنی برین اسٹارمنگ سیشن مکمل ہو چکا ہے۔ سوچے ہوئے کو تحریر کی شکل دینے کا مرحلہ آگیا۔ اب آپ لکھنے بیٹھے ہیں۔ ہاتھ میں قلم ہے جو کاغذ پر گامزن ہونے کو بے تاب ہے۔ آپ اپنی جون آتے جا رہے ہیں۔ اچانک شور سا اُٹھتا ہے۔ خیالات کا سِلسِلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ آپ گھبرا اُٹھتے ہیں اور پھر اُٹھ کر کھڑکی سے جھانکتے ہیں تو سڑک پر چار ٹھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ چند ٹھیلے پھلوں کے ہیں اور چند ایک پر کاٹھ کباڑ لَدا ہوا ہے۔ شور کی نوعیت آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ شاید ٹھیلوں کا تصادم ہوگیا ہے۔ آپ تین منزلیں اُتر کر سڑک پر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چند پھل پھروش اور کباڑی ہوٹل پر چائے کی چُسکیاں لیتے ہوئے چیف جٹس آف پاکستان کے تازہ ترین ریمارکس کا پوسٹ مارٹم فرما رہے ہیں!

آپ کے خیالات کا سِلسِلہ ٹوٹا ضرور مگر پھر بھی آپ نے سُکون کا سانس لیا کہ

چلو گپ شپ ہی ہو رہی ہے، دنگا فساد تو بہر حال نہیں ہو رہا! چیف جسٹس کے ریمارکس پر پھل فروشوں اور کباڑیوں کی "گراں قدر" آراء کو ذہن سے جھٹک کر آپ دوبارہ لکھنے بیٹھتے ہیں۔

کون سی قیامت آ جائے گی؟

اُصول ہمیشہ سیدھے اور سادہ ہوتے ہیں۔ ہم ہی نہ سمجھ پائیں تو کوئی کیا کرے؟ مثلاً غربت کو ختم کرنا ہے تو غریبوں کو ختم کردو! جرائم کی ٹارگٹ کلنگ کرنی ہے تو مجرموں کا انکاؤنٹر کردو! سرکاری تعلیمی اداروں کا معیار گرنے لگا تو ہم نے یہ آسان سا اُصول اپنایا اور سرکاری تعلیمی اداروں کو ٹھکانے لگادیا! اب بجلی کے بحران کی باری ہے۔ کوئی بھی چیز چلتے چلتے اچانک نہ چلنے لگے تو بُری طرح کھلتی ہے۔ یہی حال بجلی ہے۔ لوگوں کو جب بجلی نہیں ملتی تب وہ بلبلا اُٹھتے ہیں۔ یعنی بجلی کا بحران ختم کرنے کے لیے بجلی کو ٹھکانے لگانا پڑے گا! اور یہ کام کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ ؎

ذرا سی ہمتِ پرواز کی ضرورت ہے\
نہیں ہیں دور بہت شاخ آشیاں سے ہم!

ریلوے کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ خواہ مخواہ کا ٹنٹا لگا ہوا تھا۔ درجنوں ٹرینیں اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھرتی تھیں اور لوگوں کو پریشان کرتی رہتی تھیں۔ ٹرینیں چل رہی تھیں تو لوگوں کو اُن میں بیٹھنا بھی پڑتا تھا۔ آنیاں جانیاں لگی رہتی تھیں۔ درجنوں غیر منافع بخش ٹرینوں کو بند کرکے حکومت نے

لوگوں کو گھر بیٹھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اچھا ہے وہ گھر والوں کو بھی کچھ وقت دے لیتے ہیں۔ گھریلو زندگی مستحکم ہو رہی ہے۔ یہ ہے ٹرینوں کی بندش کا معاشرتی فائدہ!

کِسی بھی شعبے میں خدمات مِلتی رہتی ہیں تو مسائل پیدا کرتی ہیں۔ مسائل اُن خدمات کی فراہمی کا سِلسِلہ منقطع ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ مِلتا رہتا ہے تو دَھڑکا سا بھی لگا رہتا ہے کہ پتہ نہیں کب مِلنا بند ہو جائے! ایسے خدشات کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کا ایک اچھا طریقہ غالبؔ نے یوں سُجھایا تھا۔ ؎

نہ لُٹتا دِن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو!

ہم آزاد قوم ہیں۔ غلامی ہمیں کِسی طور قبول نہیں، خواہ سہولتوں کی ہو۔ ہر طرح کی سہولتوں کا ہر وقت میسر رہنا بھی اُن کی غلامی میں زندگی بسر کرنے جیسا ہی ہے!

بجلی نے ہمیں غلام ہی تو بنا ڈالا ہے۔ ہم ذاتی ڈرامے چھوڑ کر ٹی وی اسکرین کے ڈراموں کے غلام ہو چکے ہیں۔ آپس کی بک بک چھوڑ کر ٹی وی پر سیاسی مُرغوں

کی یومیہ لڑائی نے ہمیں اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے! میوزیکل پروگرامز اور ڈانس شوز کی اوٹ پٹانگ حرکتوں نے ہمیں دیوانہ بنا رکھا ہے، حالانکہ ہماری زندگی میں اوٹ پٹانگ معاملات پہلے بھی کچھ کم نہ تھے!

بجلی کا بحران اِس لیے پیدا ہوا کہ بجلی پائی جاتی تھی۔ اُس کا نہ پایا جانا بحران کا باعث بنا۔ افلاس بہت بُرا لگتا ہے مگر افلاس کو پچھاڑ کر کھڑی کی جانے والی خوش حالی کا رُخصت ہو جانا اور افلاس کا دوبارہ انٹری دینا جی کا جنجال ہو جاتا ہے! ہمارے ہاں بجلی کبھی کبھی آتی ہے تو اُس کا نہ آنا زیادہ پریشانی کو جنم دیتا ہے۔ ٹرینوں کی آمد و رفت نے مسائل پیدا کئے تو اُن کی بندش کے ذریعے حل ڈھونڈ نکالا گیا۔ بجلی کا بحران ختم کرنے کی ایک بہتر اور قابل قبول صورت یہ ہے کہ بجلی کی وزارت اور متعلقہ اداروں کی بساط لپیٹ دی جائے! ایک ذرا سی بجلی نے پورے معاشرے کا مزاج بدل دیا ہے۔ بجلی کی بندش نے لوگوں کو جھنجھلاہٹ، جھلّاہٹ، اشتعال اور احتجاج کا مُرقّع بنا ڈالا ہے۔ لوگ بات بات پر کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ یہ حیوانی جبلّت تبھی ختم ہوگی جب بجلی نہ رہے گی!

ہم اور بہت سی چیزوں کے بغیر بھی جی ہی رہے ہیں، بلکہ ایسے جینے میں زیادہ آسانی ہے! قانون کے نفاذ کا چلن عام نہیں تو کیا ہم ختم ہوگئے؟ کسی کو

انصاف نہیں مِل رہا تو کیا زندگی ختم ہو گئی؟ پہلے علم کی ترسیل و تحصیل کم تھی تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا؟ اور اب تعلیمی ادارے ہی نہیں رہے تو ہماری زندگی میں کون سی کمی واقع ہو گئی؟ کیا ہم ہم آہنگی کے بغیر کروڑوں جوڑے ''خوش گوار'' ازدواجی زندگی بسر نہیں کر رہے؟ گڈ گورننس کو کیا روئیں، یہاں تو اب کسی بھی سطح پر گورننس ہی نہیں رہی!

تو کیا ملک نے سانس روک لیا؟ حساس ادارے قومی سلامتی کو لاحق خطرات کا رونا روتے رہتے ہیں۔ اب اُن سے کون پوچھے کہ جس کو لاحق خطرات کا راگ الاپتے رہتے ہو وہ قومی سلامتی ہے کہاں؟ اُس کا دیدار بھی تو کراؤ!

بجلی نہیں ہوگی تو کون سی قیامت آ جائے گی؟ اور اب جب نہیں ہے تو کون سی قیامت آ گئی ہے؟ ہم، بحمدِ اللہ، مسلمان ہیں۔ ہم پر گرنے کے لیے آسمان پر برق کی کیا کمی ہے جو اِس قدر اہتمام کرکے بجلی پیدا کی جائے! ویسے بھی ہماری پیدا کی ہوئی بجلی میں وہ کرنٹ کہاں جو کرنٹ افیئرز کے پروگرامز میں پایا جاتا ہے۔ اینکرز تو مسلسل جھٹکے دیتے رہتے ہیں۔ بعض اینکرز میں اِتنا کرنٹ پایا جاتا ہے کہ اِنہیں پاور جنریشن پلانٹ میں کھڑا کردیں تو اوور پروڈکشن کا مسئلہ کھڑا ہو جائے!

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ اگر بجلی 24 گھنٹے آنے لگے تو کیا ہو؟ ہمیں تو اِس

کی عادت ہی نہیں رہی۔ سب سے پہلے تو پوری قوم کو نفسیاتی تربیت دینی پڑے گی کہ 24 گھنٹے بجلی آنے کا مطلب ہوتا کیا ہے! چین نے دوستی کے نام پر توانائی کا بحران حل کرنے کی پیشکش کی تو ہے مگر ایسا خلوص تو بدہضمی پیدا کردے گا۔ چینیوں کو کیا پتہ ہمارے مسائل کیا ہیں۔ ہم اب اُس منزل میں ہیں کہ مسائل حل ہونے لگیں تو زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں! ع

!پھر دِل میں کیا رہے گا جو حسرت نکل گئی

پاکستان کے لیے الیکٹرانک اشیاء تیار کرتے وقت متعلقہ اداروں کو بعض معاملات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ سُنا ہے اب پاکستان جیسے ممالک کے لیے ایسی الیکٹرانک اشیاء تیار کرنے پر غور ہو رہا ہے جو کبھی کبھار آنے والی بجلی کو جذب اور ہضم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں! بعض الیکٹرانک آئٹمز میں تو خصوصی کِٹ بھی لگانی پڑے گی جو بجلی کے اچانک وارد ہونے کی صورت میں اُن اشیاء کے میکینزم کو بتائے گی کہ جو محترمہ (بجلی صاحبہ) تشریف لائی ہیں وہ کوئی غیر نہیں اِس لیے ڈرنے کی ضرورت بھی !نہیں

الیکٹرانک آئٹم بنانے والے ادارے وارنٹی بھی دیتے ہیں۔ ایک دکاندار نے ریفریجریٹر خریدنے کے خواہش مند کو وارنٹی 30 سال بتائی۔ اُس نے حیران ہو کر کہا کہ کمپنی کے بروشر میں تو وارنٹی 5 سال درج ہے۔ دکاندار نے کہا کہ بجلی.

نہ ہونے سے ریفریجریٹر کم کم چلتا ہے اس لیے ہم نے از خود نوٹس کے تحت وارنٹی 30 سال کردی ہے! اور اگر حکومت کی مہربانی شاملِ حال رہی تو ہم لائف ٹائم وارنٹی بھی دینے لگیں گے! نہ ہوگی بجلی، نہ چلے گا ریفریجریٹر۔ مال ڈبہ پیک ہی رہے گا، دیکھتے رہیے اور خوش ہوتے رہیے!

بجلی نہ ہونے کے اِتنے فائدے ہیں اور ہم اِس بحران کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم بجلی سے جان چُھڑالیں۔ بجلی وہ شے ہے جس نے منتخب حکومتوں کو بھی کہیں کا نہیں چھوڑا۔ گزری ہوئی حکومت کو یہ بجلی جھٹکے دیتی رہی۔ اب نئی جمہوری حکومت کی آمد آمد ہے تو اُس کے سر پر بھی بجلی کے بحران کا سایا منڈلا رہا ہے۔ بے چاری نئی حکومت شروع ہی سے دباؤ میں رہے گی۔ اچھا ہے کہ بجلی رہے نہ اُس کا بحران۔ اور نہ ہی نئی حکومت کے لیے کوئی دردِ سر پیدا ہو!

اِک اور دریا کا سامنا؟

پہلو میں جس الیکشن کا بہت شور سُنتے تھے وہ آیا بھی اور چلا بھی گیا۔ یہ تو خیر نہیں کہا جاسکتا کہ جو چیرا تو اِک قطرہ خُوں نہ نکلا، مگر ہاں خُون کچھ زیادہ نہیں نکلا۔ شاید اِس کا ایک سبب یہ ہو کہ الیکشن سے پہلے ہی قوم کی رگوں سے خاصا خون نکالا جاچکا تھا! ہر بیان کے تالاب میں مینڈیٹ کا مینڈک سب سے زیادہ پُھدک رہا تھا۔ "اسٹیک ہولڈرز" ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ سبھی یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اراضی کی طرح مینڈیٹ بھی ترکے میں ملتا ہے۔ قوم اِس دلیل، منطق یا خوش فہمی کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ اور پھر یہ ہوا کہ مینڈیٹ کا راگ الاپنے والوں نے رائے دہندگان کے مزاج کی حشر سامانی دیکھ کر چُپ سادھنے میں عافیت جانی!

مینڈیٹ تقسیم ہوچکا۔ جسے جو مِلنا تھا، مِل چکا۔ یا جسے جو دیا جانا تھا، دیا جاچکا۔ اب نئی منتخب حکومت کی تشکیل کا جاں گُسل مرحلہ درپیش ہے۔ جاں گُسل یوں کہ کوئی بھی محروم رہنے کو تیار نہیں۔ سبھی اقتدار کی ٹرین میں سوار ہونا چاہتے ہیں۔ آنیاں جانیاں اب تک لگی ہوئی ہیں۔ کسی کو بھی اپنے اُصولوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر پڑے پڑے اگلی ٹرین کا انتظار کرنا گوارا نہیں۔

اقتدار کی عادت پڑ جائے تو پروٹوکول کے بغیر جینا کس کے اختیار میں رہتا ہے؟ اقتدار کی جو ٹرین کچھ ہی دِنوں میں روانہ ہونے والی ہے اگر اُس میں اُصولوں کے ساتھ سوار ہونا ممکن نہ ہو تو یار لوگ سارے اُصول تجنے کو بھی تیار ہیں۔ اُصولوں کا کیا اچار ڈالنا ہے؟ ویسے بھی اُصول تو گھر کی کھیتی ہوتے ہیں۔ جب چاہو فصل کاٹ لو اور جب چاہو، دوبارہ اگالو! اگر کِسی کو حکومت بنانے کے لیے کِسی کی ضرورت نہیں ہے تو کیا ہوا؟ جو اپنی تصویر کو بہر صورت اقتدار کے فریم میں فِٹ دیکھنا چاہتے ہیں وہ ریشہ خطمی ہوئے جاتے ہیں، تلوے چاٹنے میں بھی اُنہیں کچھ عار نہیں۔

دُنیا اور کچھ سیکھے نہ سیکھے، ہم سے اِتنا تو سیکھ ہی لے کہ بے داغ جمہوریت کیونکر پروان چڑھائی جاتی ہے۔ ہم بھی سُنتے آئے ہیں کہ اختلاف میں برکت ہے مگر اختلاف میں برکت تلاش کرنے کے زمانے گئے۔ قوم ایک زمانے سے رو رہی ہے کہ اتفاقِ رائے کی روایت قائم کرکے اُسے پروان چڑھایا جائے۔ سیاست کی ڈگڈگی بجانے والوں نے قوم کی یہ بات دانتوں سے پکڑلی۔ کامل ہم آہنگی، یگانگت اور مفاہمت کی سیاست کو ایسا پروان چڑھایا گیا ہے کہ قوم حیران و پریشان ہے۔ اور شاید یہ بھی سوچ رہی ہے کہ اتفاقِ رائے کا خواب دیکھا ہی کیوں تھا!

خیبر پختونخوا میں اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کا بلا مقابلہ انتخاب قوم کو مُبارک۔ دِل ڈرے ہوئے ہیں۔ کہیں ایک بار پھر فرینڈلی اپوزیشن کی باری تو نہیں! باری کا انتظار فریقین کو رہتا ہے۔ خصلتوں کی باری واری کچھ نہیں ہوتی۔ مثلاً سرکاری اداروں کی رگوں سے خُون نچوڑ لینے کی کوئی باری واری طے نہیں ہوتی۔ قومی خزانے میں نقب لگانے کی بھی کوئی باری نہیں ہوتی۔ سب اِس پر ہر بار واری ہوئے جاتے ہیں! خیبر پختونخوا کے اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کا بلا مقابلہ انتخاب تھوڑا سا تشویشناک بھی ہے۔ کہیں اندر ہی اندر کچھ طے تو نہیں پا گیا؟ ع

!مَن تُرا حاجی بگویم، تو مَرا حاجی بگو

مسلم لیگ (ن) کی قیادت نے پندرہ دنوں میں کئی بار عندیہ دیا ہے کہ وہ سب کو ساتھ لیکر چلنے کو ترجیح دے گی۔ یہ سُن کر تھوڑا سا خوف محسوس ہوتا ہے۔ قوم کو اِس بات سے کوئی غرض نہیں کہ مسلم لیگ (ن) یا کوئی اور حکمراں جماعت کسے ساتھ لیکر چلنا چاہتی ہے اور کسے داغِ مفارقت دینے کے مُوڈ میں ہے۔ قوم کو مسائل کے حل سے غرض ہے۔ مسائل حل ہو جائیں گے تو سَت بسم اللہ۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ بادشاہ وہی ہے جو بادشاہوں جیسا کام کر دِکھائے، بادشاہ بن کر دِکھادے! قوم منتظر ہے کہ مسائل کی رگوں سے کچھ خُون نُچڑے، کچھ اُن کی بھی ہڈیاں چٹخیں اور ٹوٹیں۔ مسائل کو، بحرانوں کو اِتنا خوش

نصیب تو نہیں ہونا چاہیے کہ وہ قوم کو ہر وقت جھنجھوڑتے ہی رہیں اور کبھی پکڑائی نہ دیں۔ کوئی دِن ایسا بھی تو ہو جو اُن کا نہ ہو!

ایک جمہوری میعاد ختم ہوئی۔ پانچ سال یوں گزرے کہ کوئی بنیادی مسئلہ حل نہ ہوا۔ سیاسی جنگل کے باسی مفاہمت کے تالاب پر شیر و شکر ہوکر پیاس بُجھاتے رہے۔ سیاست کے جنگل میں ویسے تو خیر کوئی قانون نہیں چلتا مگر ہمارے ہاں یہ ثابت ہوا کہ جب اِس کے باسی طے کرلیں تو ایسا قانون بھی سامنے آسکتا ہے جس کے آگے لاقانونیت کی دال سو جتن کرنے سے گل نہیں سکتی! شیر اور بکری (کہانیوں کے سِوا) ایک گھاٹ پر کب دیکھے گئے ہیں؟ مگر ہم نے دیکھے۔ ایک دوسرے پر درندگی کا الزام لگاتے نہ تھکنے والے مفاہمت کی چادر اوڑھ کر سوگئے! مفاہمت کی سیاست تو اب قوم کے لیے گالی بن کر رہ گئی ہے۔ قوم نہیں چاہتی کہ جمہوریت کے نام پر ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی روش اپنائی جائے۔

مسلم لیگ (ن) نے اچھا کیا کہ پیپلز پارٹی کو مینڈیٹ کی میعاد پوری کرنے کا موقع عطا کیا۔ مگر یہ سب صرف سیاست کی حد تک اچھا تھا۔ قوم کو کیا ملا؟ توانائی کا بحران وہ جن تھا جسے پورے پانچ برس کی مدت میں بھی دوبارہ بوتل میں بند نہ کیا جاسکا۔ اور بند ہوتا بھی کیسے، ایسا کرنے کے بارے میں سوچنا

بھی گوارا نہیں کیا گیا! اب جواب میں مسلم لیگ (ن) بھی چاہے گی کہ اُسے پانچ سال پورے کرنے کا موقع دیا جائے۔ کچھ وعدے اُس نے بھی کئے ہیں جنہیں قوم پورے ہوتے ہوئے دیکھنا چاہے گی۔ یہ سب کیسے ہوگا؟

گمان ہمیشہ اچھا رکھنا چاہیے۔ میاں نواز شریف کی طرف قوم بہت پُرامید ہو کر دیکھ رہی ہے۔ ہمیں تو بس یونہی مُنیر نیازی مرحوم یاد آ گئے ہیں۔

اِک اور دریا کا سامنا تھا مُنیر مجھ کو

! میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

کیا کریں، حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ ذرا سی ایسی ویسی بات سے دِل بیٹھ بیٹھ جاتا ہے۔ وسوسوں کو گھٹاؤں کو گھر گھر آنے میں دیر نہیں لگتی۔ ابھی ابھی ہم نے

جمہوریت کا ایک دریا پار کیا ہے۔ اور بقول جگر مُرادآبادی ڈوب کر پار کیا ہے۔ اب پھر شاید ایک اور دریا کا سامنا ہے۔ اللہ کرے کہ یہ دریا زری مفاہمت کا نہ ہو! قوم یہ گھاس بہت چَر چکی! جہاں شیر اور بکری ساتھ ساتھ پانی پیتے ہوں ایسے گھاٹ قوم کو مزید پیاسا مار دیں گے۔ منتخب ایوانوں کو پاکستان ٹیلی وِژن کی طرح "سب ٹھیک ہے" کا راگ الاپنے کے بجائے عملی سطح پر کچھ ایسا کرنا چاہیے جس سے قوم کا بھلا ہو، معیشت رواں ہو، معاشرہ ہم آہنگی کی طرف بڑھے۔ مفاہمت اور ہم آہنگی ایوان تک محدود نہیں رہنی چاہیے۔ قوم کے نصیب میں صرف ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم والی کیفیت نہیں ہونی چاہیے۔

اہلِ اختیار کو کبھی کبھی مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے معاملات کی دُرستی کی طرف بھی جانا چاہیے۔ قوم ایسے ہی لمحات کے انتظار میں سُوکھ کا کانٹا ہوئی جارہی ہے۔

اقتدار کا انتقال

جب جسٹس (ر) فخر الدین جی ابراہیم نے چیف الیکشن کمشنر کا منصب سنبھالا تھا تو بہت سے لوگ جُزبُز ہوئے تھے۔ معترضین کا استدلال تھا کہ اِتنی مُعمّر شخصیت کو چیف الیکشن کمشنر جیسا اہم منصب دینا کِسی اعتبار سے دانش مندی نہیں کیونکہ وہ ضرورت یا طلب کے مطابق مُتحرّک نہیں ہو سکیں گے۔ پھر جب میر ہزار خان کھوسو کو نگراں وزیر اعظم بنایا گیا تب بھی اعتراض کرنے والے کمر کَس کر میدان میں آ گئے۔ میر ہزار خان کھوسو کو بھی مُعمّر ہونے کی بُنیاد پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

جب لوگ فخر الدین جی ابراہیم اور میر ہزار خان کھوسو کو تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے تب ہم یہ سوچ کر خوش تھے کہ چلیے، کچھ تو ہے تو تسلسل سے ہمکنار ہے۔ اور کچھ نہیں تو اقتدار کے ایوانوں میں بُڑھاپے کا تسلسل برقرار ہے! سندھ کی وزارتِ اعلیٰ جب دوسری بار "انتہائے عُمر" سے ہم آغوش سید قائم علی شاہ کو دی گئی تو کوئی مُعترض نہ ہوا۔ اور اب تیسری بار اُنہیں وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز ہونے کا موقع ملا ہے تو لوگ مُعترض ہیں کہ اِس عمر میں وہ کیا کریں گے؟ سوال یہ ہے کہ جوانوں کو بھی تو بڑے بڑے منصب دیئے گئے۔ اُنھوں نے

کیا تیر مار لیا؟

سید قائم علی شاہ کو تیسری بار وزارتِ اعلیٰ کا منصب ملنا اِس بات کی علامت ہے کہ اب ہمارے ہاں جمہوریت کا ہر پہلو تسلسل سے ہمکنار ہے۔ یعنی جو کچھ بھی ہو سکتا ہے وہ مُسلسل ہو رہا ہے۔ بُڑھاپے میں کِسی کو اقتدار دینا بادشاہ گروں کی انتہائے دانش کا مظہر ہے۔ شاہ صاحب عمر کی اُس منزل میں ہیں جہاں اِنسان میں اور کچھ ہو تو ہو، اقتدار کی ہوس باقی نہیں رہتی۔ اور پھر اُن کے سَر پر ہُما کوئی پہلی بار بیٹھا ہے جو وہ آپے سے باہر ہوں۔ ہمارے ہاں آج کل باری کا تذکرہ ہے۔ باری کے بیک ڈراپ میں سوچیے تو یہ شاہ صاحب کی تیسری باری ہے۔ خیر پور سے تعلق رکھنے والے یہ قسمت کے دَھنی تقریباً پوری زندگی خیر سے گزار چکے ہیں۔ کھا پی کر بیٹھے ہیں۔ اب کوئی وہ مزید کھا پی کر بُڑھاپے کی "بیزتی" خراب تھوڑی کریں گے! کِسی زمانے میں اشتیاق اظہر مرحوم کو ایم کیو ایم میں نگراں کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ وہ جلسے کے شرکاء پر صرف نظر رکھتے تھے۔ شریف آدمی تھے اِس لیے کِسی سے اُلجھتے نہیں تھے۔ شاہ صاحب بھی مرنجان مرنج ہیں۔ حال ہی میں ختم ہونے والے جمہوریت کے پنجسالہ منصوبے کے دوران بھی اُنہوں نے کِسی "ٹھیکیدار" سے اُلجھنے کی کوشش (یا حماقت!) نہیں کی۔ اب بھی یہی توقع ہے کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں گے یعنی وزیر اعلیٰ کی مسند پر بیٹھ رہنے کو کافی جانیں گے۔ وزیر اعلیٰ

!بننے کی کوشش نہیں کریں گے

دیسی اور بدیسی مبصرین اور تجزیہ نگار ہماری سیاست اور اہلِ سیاست کے بارے میں پتہ نہیں کیا اناپ شناپ بکتے رہتے ہیں۔ اقتدار کی منتقلی کے مرحلے کو ہَوّا بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اب اہلِ سیاست نے "تمہاری بھی جے جے، ہماری بھی جے جے" کا ایسا منتر پُھونکا ہے کہ ہر طرف شانتی ہی شانتی ہے۔ آپس کے اختلافات کو اہلِ سیاست نے مفاہمت اور مصالحت کی اجتماعی قبر میں دفنا دیا ہے۔ انتقالِ اقتدار کا جاں گُسل مرحلہ ایسی آسانی سے طے کرلیا جاتا ہے کہ سیاسی نظام کو کہیں کوئی خراش نہیں آتی! بالخصوص سندھ میں تو انتقالِ اقتدار کا مرحلہ ایسے پُرسکون انداز سے طے ہوا ہے کہ اِس پر اقتدار !کے انتقال کا گمان گزرتا ہے

ہمارے ہاں بہت سے نفسیاتی عوارض ایسے ہیں جن کے علاج کی تلاش میں نکلنے ماہرین کو تلاش کرنے پر ہمیں خاصی محنت کرنی پڑے گی! اب اِسی بات کو لیجیے کہ جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہوتا ہے، کہیں کوئی گڑبڑ دِکھائی نہیں دے رہی ہوتی تو لوگوں کے دِلوں میں ہَول سے اُٹھتے ہیں۔ مرزا تنقید بیگ کو بھی ہر معاملے کی تہہ میں کوئی نہ کوئی خرابی تلاش کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ کرنٹ افیئرز کے ٹاک شو دیکھتے دیکھتے اب اُن کا ذہن متنوع پیچیدگیوں کا

گودام بن چکا ہے! کوئی اگر اُن سے راستہ پوچھ بیٹھے تو ملک کو ترقی کی منزل تک پہنچانے
!کا روڈ میپ بتانے لگتے ہیں

مرزا کا خیال ہے کہ سیاست دانوں کا کوئی بھی معاملہ پس پردہ مُحرّکات سے عاری نہیں ہوتا۔ ہم نے بارہا سمجھایا ہے کہ اہلِ سیاست کے ہر معاملے میں بدبو سُونگھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے مگر وہ کب مانتے ہیں۔ اُنہیں تو صرف وسوسے پالنے سے غرض ہے۔ اور وسوسے بھی ایسے کہ جن کا سَر دِکھائی دے نہ پَیر۔

جب سے ہماری سیاست میں win win والی طرزِ فکر عام ہوئی ہے، مرزا کا ذہن lose lose والے تصورات کی طرف چلا گیا ہے۔ مرزا کا خیال یہ ہے کہ جب گاڑی کسی رکاوٹ کے بغیر چلی جارہی ہو تو سمجھ لیجیے کہ ڈھلوان سطح پر ہے، یعنی فراز گیا اور نشیب آیا۔ ہم نے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ سیاست دانوں نے اپنی صفوں سے اختلافات اور تنازعات کو نکال باہر کرنے پر اچھی خاصی محنت کی ہے۔ اب وہ ملک کو مِل جُل کر پُرسکون انداز سے چلا رہے ہیں تو ہم بدگمانی کے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں! مِرزا کے خیال خرابی کا اصل سبب یہی ہے کہ سب مِل جُل کر کام کر رہے ہیں! اُن کا استدلال یہ ہے کہ سیاست دانوں کا باہمی اختلاف قوم اور ملک کے مفاد میں ہوتا ہے۔ اب ہم اُنہیں کیا

بتائیں کہ اختلاف تو سیاست دانوں میں اب بھی ہوتا ہے مگر اسٹیج کے پیچھے۔ کتنی اچھی بات ہے کہ وہ اسٹیج پر لڑ جھگڑ کر تماشائیوں کا بلڈ پریشر نہیں بڑھاتے ! اور ہم ہیں کہ اُن کے بارے میں صرف بدگمان رہتے ہیں۔ مرزا کا کہنا ہے کہ مُکّا سیاست ختم ہوئی، اب ٹُکڑ مُکّا سیاست کا زور ہے ! ہمارا خیال یہ ہے کہ قوم کو جو اتفاقِ رائے درکار تھا وہ سیاست دانوں نے اقتداری دستر خوان پر سجا دیا ہے۔ مگر مرزا بضد ہیں کہ جو کچھ بہت اچھا دِکھائی دے رہا ہے وہ درونِ خانہ اُتنا ہی بگڑا ہوا ہے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ سیاست دان اور کیا کریں۔ کئی عشروں تک اقتدار کے لیے آپس میں لڑتے رہنے کے بعد اُنہوں نے ایک ہُنر سیکھا ہے۔ یہ کہ مِل بانٹ کر کھایا جائے۔ انصاف یہی تو ہے کہ جس کا جِتنا حصہ بنتا ہو، دیا جائے۔ ایک اقتدار ہی تو تھا جس نے پورے سیاسی نظام کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اب یاروں نے مل کر اِسے قابو کر لیا ہے۔ یہ تو سیاست دانوں ہی کا جگرا تھا کہ اُنہوں نے اقتدار کے بھینسے کو سامنے آ کر سینگوں سے پکڑ کر پچھاڑا ہے۔ اور مرزا ہیں کہ داد کے ڈونگرے برسانے کے بجائے تنقید کی بارش فرمانے پر تُلے ہوئے ہیں !

اقتدار جماعتوں کے درمیان تقسیم کرنا ہو یا کسی ایک جماعت میں اندرونی سطح

پر اُس کی بندر بانٹ کرنی ہو، ہر دو معاملات میں مفاہمت کی سیاست ہی کام آتی ہے۔ اہلِ سیاست نے پہلا مرحلہ کامیابی سے طے کرلیا ہے یعنی اپنے بارے میں اچھی طرح سوچنا اور اُس پر عمل کرنا سیکھ لیا ہے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ قوم بے صبری کا مظاہرہ نہ کرے۔ قوم کے لیے سیاست دان اُسی صورت لڑ سکتے ہیں جب اُن میں طاقت پائی جاتی ہو۔ وہ ذرا سے اور طاقتور ہولیں تو قوم کے لیے بھی سوچیں گے اور جو سوچیں وہ کر گزریں گے۔

خود فریبی کا نرالا سنسار

مجرم تو اور بھی بہت ہوں گے اور طرح طرح کے ہوں گے مگر آئینے سے بڑا مجرم کوئی نہیں۔ ایک آئینہ ہی تو ہے جس نے قدم قدم پر خوش فہمی کے جال بچھائے ہیں اور جسے دیکھیے وہ خوش فہمی، خوش گمانی اور خود فریبی میں مُبتلا ہے۔ آئینے میں جھانکنے والا سمجھتا ہے کہ اِس کائنات میں صرف وہ ہے، اور کوئی نہیں۔ اور پھر وہ کبھی گریبان میں جھانکنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

سیاست ہو یا معیشت، اُمورِ خانہ داری ہوں یا معاشرت، ساری خرابیاں صرف اپنے وجود کی حد میں رہتے ہوئے سوچنے سے پیدا ہوئی ہیں۔ ہم سب "میں ہوں نا" کے خبط میں مبتلا ہیں۔ اِس ایک خبط نے ایسی ان گنت "ہستیاں" پیدا کی ہیں جو دُنیا کو تنِ تنہا چلانے کی دعویدار ہیں اور دعویٰ بھی ایسا ٹھوس جیسے دوسروں کے عزم اور حوصلے کی تو کوئی حیثیت ہے ہی نہیں۔

"مجھ سے اچھا کون ہے؟" والی سوچ نے سب سے زیادہ ہنگامے علم و فن اور سیاست کی دنیا میں برپا کیے ہیں۔ کچھ نہ کرنے والے بھی اِس خبط میں مُبتلا ہیں کہ اُن کا شعبہ کچھ اُنہی کے دم قدم سے آباد ہے، چل رہا ہے۔ مرزا تنقید بیگ

بھی ایک زمانے سے اِسی خبط میں مبتلا ہیں کہ اُن سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ ہم نے بھی
!بہت غور کرنے پر محسوس کیا ہے کہ واقعی اُن سے بڑا .... کوئی نہیں

ہم نے بارہا سوچا ہے کہ ہمارے ہاں نرگسیت (خود پسندی، خود فریبی) کا مرض کیوں عام ہے۔ مرزا نے، جو دُنیا کے ہر سوال کا جواب جانتے ہیں یا سوچ لیتے ہیں، چند جُملوں میں بحث سمیٹ دی۔ فرماتے ہیں۔ "اپنے آپ میں گم رہنا اور اپنے آپ کو سب سے بہتر اور برتر تصور کرنا مرض نہیں، علاج ہے۔"

ہم نے حیران ہو کر کہا کہ دُنیا بھر میں نفسی اُمور کے ماہرین نرگسیت کو مرض قرار دیتے ہیں اور آپ اِس علاج ٹھہرا رہے ہیں۔ کس بُنیاد پر؟

مرزا نے ماہرین کے ذکر پر پہلے تو آنکھیں بند کر کے لاحول سے صوتی مشابہت رکھنے والا کوئی وظیفہ پڑھا۔ پھر آنکھیں کھول کر بہ آوازِ بلند ماہرین پر لعنت بھیجتے ہوئے کہا۔

ماہرین کو کیا خاک معلوم ہے؟ اگر اُنہیں کچھ آتا تو ماہرین نہ ہوتے، کوئی ڈھنگ کا کام" کر رہے ہوتے۔ نرگسیت کو مرض قرار دینے والوں سے یہ تو پوچھو کہ جب اِنسان کے بس میں کچھ بھی نہ ہو تو کیا کرے۔ ایسے میں اپنے آپ میں گم رہنا اور خود کو دوسروں سے بہتر اور برتر تصور

کرنا ہی بہترین آپشن ہوتا ہے۔"

ہم نے اعتراض کیا کہ یہ کیفیت تو منشیات کے استعمال سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ جب اِنسان کسی نشہ آور چیز کے زیرِ اثر ہوتا ہے تو زیادہ سکون پاتا ہے۔

مرزا نے حیرت انگیز طور پر ہماری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اِس میں کیا شک ہے کہ نرگسیت بھی نشا ہے۔ اور نشا بھی ایسا کہ اِنسان جان سے جاتا ہے تو جائے، نشاہرن ہونے کا نام نہ لے۔ شراب، ہیروئن، چرس، افیم اور دوسرے بہت سے نشوں کا سردار کہیے تو یہی نرگسیت۔ جب نرگسیت کے آغوش میں بیٹھ لیے تو پھر کون سا نشا ہے کہ قریب پھٹک بھی سکے؟"

ہم نے ایک بار پھر مرزا سے اختلاف کرتے ہوئے گزارش کی کہ اِنسان کو چھوٹی سی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں یہ نرگسیت اگر ساتھ لیکر ایک طرف بیٹھ جائے تو وہ سارے کام ادھورے پڑے رہ جائیں گے۔"

مرزا نے جو کچھ ماہرین کے بارے میں کہا وہی کچھ ہمارے "حق" میں دُہراتے ہوئے جواب دیا۔ "زندگی چھوٹی سی اور ارمان بڑے بڑے۔ کون ہے جو اپنے سارے

ارمان نکال سکا ہے؟ لوگ زندگی بھر دِل کی مُرادیں پانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور بار بار ناکام ہونے پر غم کے دریا میں ڈوبتے جاتے ہیں۔ ایسے میں کیا یہ اچھا نہیں کہ اِنسان اپنے آپ میں گم رہے؟ ارمان پالے گا تو ناکامی پر دُکھ بھی ہوگا۔ ایک تو ہے ہماری، تمہاری دُنیا۔ اور ایک ہے نرگسیت کی دُنیا۔ اِس دُنیا میں قدم رکھو اور سارے دُکھوں سے نجات پا جاؤ"

ہمارے اہلِ سیاست کا المیہ یہ تھا کہ وہ غُلیل جیسی صفات کے حامل ہونے پر بھی خود کو توپ سمجھتے تھے۔ اِس ذہنی مرض نے خرابیوں کا ایک طویل سلسلہ پیدا کیا۔ قوم حیران اور پریشان تھی کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو راہ نُمائی کا دعوی کرتے ہیں اور خود راہ سے ہٹے ہوئے ہیں!

ہر سیاست دان نے سیاسی سرگم کے دیگر تمام سُر اور راگ مالا چھوڑ کر "میں ہوں نا" کا راگ دانتوں سے پکڑ لیا۔ جسے دیکھیے وہ یہی کہتا پھرتا تھا کہ سب کچھ اُس کے دم قدم سے ہے۔ اگر وہ نہیں ہوگا تو کچھ نہ رہے گا۔ بعض منچلے جاتے جاتے "ملک کا خدا حافظ" کہنے کے بجائے "ملک کا خدا ہی حافظ" کہا کرتے تھے! گمان اور بھرم یہ تھا کہ وہ نہ ہوں گے تو سب کچھ ختم ہو جائے گا! کوئی اُن سے پوچھے جب وہ نہیں تھے تب دُنیا تھی یا نہیں تھی!

ہمارے نصیب میں اہلِ سیاست بھی وہ آئے ہیں جو چھوٹے موٹے مسائل کو کسی گنتی میں رکھنے کے قائل نہیں۔ کوئی بڑا مسئلہ سامنے نہ ہو تو کیا روئیں اور کیا گائیں؟ لوڈ شیڈنگ، مہنگائی، بے روزگاری، کساد بازاری، اسٹریٹ کرائمز اور دہشت گردی جیسے چھوٹے موٹے مسائل کے بارے میں کوئی کیا فکر مند ہو! کوئی بڑی الجھن ہو تو کچھ کیا بھی جائے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اب تو قومی سلامتی کو لاحق خطرات کی بھی کوئی وقعت نہیں رہی۔ اقتدار میں شرکت کا جھگڑا کیا کم ہے جو کسی اور جھگڑے کی طرف دیکھیں؟ عوام کو مسائل کے مگر مچھوں کے حوالے کرکے اہلِ سیاست مفاہمت یعنی اقتدار کی کشتی میں سوار ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔

فی الحال تو حالت یہ ہے کہ کسی کو بظاہر کچھ فکر لاحق نہیں کہ ملک اور قوم کا کیا بنے گا۔ سبھی فُرصت کے دریا میں تیر رہے ہیں اور مزید فُرصت تلاش کر رہے ہیں۔ بقول غالب

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فُرصت کے رات دِن
!بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

اب اگر ایسے میں عوام کا بھی خیال آگیا تو ذہن بھٹکتے بھٹکتے عوام کی طرف چلا گیا تو ایک آدھ بیان مفادِ عامہ میں بھی داغ دیا۔ ورنہ تو وہی نرگسیت

ہے۔ یہ بھی خُدا کی قدرت ہے کہ جو لوگ قوم کے لیے مسئلہ بن چکے ہیں وہ اب تک خود کو تمام مسائل کا حل گردانتے ہیں ! سِتم بالائے سِتم یہ کہ ماحول سے متاثر ہو کر عوام بھی خود فریبی میں مبتلا ہیں اور مسائل پیدا کرنے والوں کو حل سمجھتے ہیں۔ جنہیں زندگی بھر قریب سے دیکھا ہے اُن کی اصلیت بھی اب تک کُھل نہیں پائی۔ بقول باقی صدیقی

خود فریبی سی خود فریبی ہے
!پاس کے ڈھول بھی سُہانے لگے

میڈیا کا اِضافی کمال یہ ہے کہ اُس نے عوام کے دِل و دِماغ سے تمام مسائل نکال دیئے ہیں۔ چھوٹے موٹے مسائل کو تو کوئی خاطر میں لانے ہی کے لیے تیار نہیں۔ اب ایک عام آدمی بھی خود کو تمام مسائل کا حل سمجھنے لگا ہے۔ جو اپنے ذہن میں دُنیا، بلکہ کائنات کے تمام مسائل کے پائیدار حل کی دُکان سجائے بیٹھا ہو وہ کیونکر تسلیم کر سکتا ہے کہ اُس !کے بھی مسائل ہو سکتے ہیں ! خود فریبی زندہ باد

کباب میں ہڈی

اگر درد کا علاج بس میں نہ رہا ہو تو انسان زیادہ درد کی تمنا کرتا ہے تاکہ علاج کی فکر ہی ختم ہو جائے۔ بقول غالب

دردکا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

امریکا اور یورپ کے لیے چین بھی اب لاعلاج مرض یا درد کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ تین عشروں سے مغرب کو یہ فکر لاحق تھی کہ شیر جاگے گا اور سب کو پھاڑ کھائے گا۔ شیر جاگ چُکا ہے اور دور دور تک نیند کے آثار بھی نہیں۔ امریکا اور یورپ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب ڈیڑھ دو سو سال تک کوئی اُن کے پیر کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ اُن کی سوچ تھی اور قدرت کے اپنے اُصول ہوتے ہیں۔ آپ ارادے باندھتے رہیے، قدرت اپنی چال چلتی رہے گی۔ جہاں آپ آپے سے باہر ہو کر سزا کے مستحق ٹھہرے، قدرت آپ کی گردن میں ناکامی اور ذِلّت کا طوق ڈال دے گی۔ قدرت کے اُصول کُلیے ہوتے ہیں اور کوئی کُلیہ کسی کے لیے بدلا نہیں کرتا۔ امریکا کے لیے بھی نہیں۔

مغرب کے سیاسی تجزیہ کاروں نے اپنی توپوں کا رُخ بیس پچیس سال قبل چین کی

طرف کر دیا تھا۔ ایک طرف چین معاشی ترقی کے زینے چڑھتا گیا اور دوسری طرف مغربی تجزیہ کار اُسے ترقی ہی سے ڈراتے گئے! کبھی یہ کہا گیا کہ غیر معمولی ترقی سے ماحول کو شدید خطرات لاحق ہوں گے۔ کبھی اِنسانی حقوق کے ریکارڈ کا رونا رویا گیا۔ چین کی معاشی قوت میں تیز رفتار، بلکہ ہوش رُبا اِضافے نے اہلِ مغرب کو پہلے حیران اور پھر پریشان کیا۔ امریکیوں نے ترقی ہی کو معاشی بحران کی بنیاد اور جڑ بھی قرار دیا! اُن کے پاس اہلِ چین کو بدگمانیوں میں مُبتلا کرنے کی کوشش کے سِوا چارا نہ رہا۔ مگر یہ سب کچھ خاصا مضحکہ خیز تھا۔ امریکا اور یورپ سمجھ بیٹھے تھے کہ ترقی اور خوش حالی پر صرف اُن کا استحقاق ہے، بہتر زندگی صرف اُن کی جاگیر ہے۔ پھر یوں ہوا کہ چینیوں پر جُنون سوار ہوا تو وہ اِس دنیا میں ایک اور دنیا بسانے پر تُل گئے۔

افسوس اِس بات کا ہے کہ چینیوں نے امریکا اور یورپ کی ایک نہ سُنی۔ سُنتے بھی کیسے؟ علامہ اقبال کہہ گئے ہیں ع

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

اب وہ سنبھل چکے ہیں اور عالمی معیشت کو سنبھالنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ دوسری طرف کمزور پڑتے ہوئے عالمی حکمرانوں کو اب سنبھلنے کی تیاری کرنی پڑ رہی ہے۔

میں ریلیز ہونے والی فلم "مدھومتی" کے ایک منظر میں دلیپ کمار جب 1958 دوسرے گاؤں کے میلے میں جانے کی تیاری کرتا ہے تو جانی واکر اُس سے کہتا ہے۔ "بابو جی! میلے میں مت جانا۔ سُنا ہے اُس گاؤں میں کوئی جادو ہے۔ جو جاتا ہے وہ وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ سُندریاں اُسے اپنے بس میں کرلیتی ہیں۔ میں آپ کو وہاں نہیں "جانے دوں گا۔

جب دلیپ کمار نہیں مانتا اور جانے پر بضد رہتا ہے تو جانی واکر کہتا ہے۔ "اچھا، یہ بات "ہے تو پھر میں بھی چلوں گا۔

چین اور امریکا کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ پہلے تو چینیوں کو ترقی سے ڈرایا گیا۔ جس راہ پر گامزن ہو کر مغرب نے منزل پائی ہے اُسی راہ کو چین کے لیے ناموافق قرار دیا گیا! یہ بھی خوب رہی۔ جب امریکیوں نے دیکھا کہ چین ترقی کی راہ پر گامزن ہونے سے مجتنب ہونے کا نام نہیں لے رہا تو اُسے اِسی حالت میں قبول کرلیا۔ کچھ لوگ اپنی بات نہ ماننے کی صورت میں "ورنہ" کے ذریعے دھمکی دیتے ہیں۔ دو تین بار دھمکی ملنے پر جب فریقِ ثانی استفسار کرتا ہے ورنہ کیا تو فریقِ اوّل بھیگی بلّی کی طرح کہتا ہے۔ "ورنہ کیا، آپ جو چاہیں گے وہی ہوگا!" یعنی امریکا بھی پُرانی تنخواہ پر کام کرنے کو راضی

ہوگیا ہے۔

امریکی صدر نے چینی ہم منصب سے حالیہ ملاقات میں ایسی ہی بات کہی ہے۔ کل تک چین کو ترقی سے ڈرایا جارہا تھا۔ کیلی فورنیا میں چین ہم منصب شی جن پنگ سے ملاقات کے بعد میڈیا سے گفتگو میں امریکی صدر براک اوباما نے کہا۔ "چین کی ترقی امریکا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے مفاد میں ہے۔ بڑی طاقتوں کے درمیان مسابقت کے ساتھ ساتھ "اشتراکِ عمل بھی جاری رہنا چاہیے۔ مسائل کا حل مل کر تلاش کرنا ہوگا۔

چین کی جس ترقی سے امریکا کو شدید خوف لاحق تھا اُسے روکنے میں ناکامی کے بعد امریکا اُسے اپنے اور عالمی مفاد حق میں قرار دے رہا ہے! سپر پاورز کی قلابازیاں واقعی بہت مضحکہ خیز ہوتی ہیں! سوال یہ ہے کہ جو مسائل امریکا نے تنِ تنہا پیدا کئے ہیں اُن کا حل تلاش کرنے میں چین مدد کیوں کرے؟ جس نے غلاظت پیدا کی ہے وہی صاف بھی کرے۔ ہاں، امریکا کو سائبر کرائمز کے حوالے سے بھی چین سے شکایات ہیں۔ براک اوباما نے میڈیا سے گفتگو میں اِس کا ذکر بھی کیا مگر چینی ہم منصب نے میڈیا سے گفتگو میں اِس پر ایک لفظ بھی کہنا گوارا نہ کیا۔ امریکا کئی ممالک میں جاسوسی کے ذریعے اربوں معلومات حاصل کرتا ہے۔ کیا وہ سلسلہ رُکنا نہیں چاہیے؟ اب اگر چین بھی ایسا ہی کر رہا ہے

تو حیرت کی بات کیا ہے؟

امریکا اور یورپ کے لیے چین کی ترقی سے کہیں بڑا دردِ سر یہ ہے کہ وہ دنیا پر حکمرانی کے خبط میں مبتلا نہیں۔ اور دنیا تو کیا، چین علاقائی برتری و بالادستی میں بھی زیادہ دلچسپی لیتا دِکھائی نہیں دے رہا! یہ تو بہت بُری بات ہوئی۔ امریکا چاہتا ہے کہ کوئی تو ہو جو اُس کی وحشتوں کا ساتھی ہو! اور چین ہے کہ کہیں سے پکڑائی نہیں دے رہا۔ وہ علاقائی سطح پر بھی مناقشوں کی محفل سجانے کے موڈ میں نہیں۔

چین کا بچ بچ کے چلنا امریکیوں کے لیے مستقل دردِ سر ہے، عذاب ہے۔ امریکی پالیسی میکرز منفی سرگرمیوں میں اپنے لیے مثبت نتائج تلاش کرتے آئے ہیں۔ دوسروں کی خرابی میں اپنے لیے تعمیر کا سامان تلاش کرنا امریکیوں کا وتیرہ رہا ہے۔ چین کا پیراڈائم یکسر مختلف ہے۔ وہ ایسی کوئی بھی حرکت نہیں کر رہا جس سے اُس کے عزائم اور منصوبوں کے بارے میں دنیا تشویش یا شک میں مبتلا ہو۔

چین کو الجھانے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطٰی میں حالات خراب کرکے چین کو آزمائش میں ڈالا گیا ہے۔ لیبیا میں چین نے 25

ارب ڈالر سے زائد کی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ اِس ملک کا استحکام داؤ پر لگا دیا گیا۔ مصر، تیونس اور شام میں بھی حالات کو ایسی نہج تک پہنچایا گیا ہے کہ چین سرمایہ کاری کا خیال ذہن سے کھرچ کر پھینک دے۔

یورپ دانا نکلا۔ بہت پہلے ہی اُس نے امریکا سے راہیں الگ کرکے مختلف خطوں سے تعلقات بہتر بنالیے۔ ہم آہنگی اور مفاہمت پیدا کرکے یورپ نے نرم قوت کے ذریعے راستہ بنایا ہے۔ امریکا اب تک طاقت یعنی عسکری مہم جوئی کا پیراڈائم اپنائے ہوئے ہے۔ روس میں تو حریف بننے کی سکت نہ تھی۔ چین منہ دے رہا ہے۔ اب امریکا کو تبدیل ہونا پڑے گا۔

ہر فرعون کے لیے مُوسٰی پیدا کیا جاتا ہے۔ امریکا کی اکڑی ہوئی گردن کو نرم کرنے کا بھی قدرت نے اہتمام کر دیا ہے۔ فیصلے کی گھڑی آچکی ہے۔ بیشتر امریکیوں کے حلق سے یہ بات اُتر نہیں رہی کہ اب وہ حقیقی مفہوم میں نمبر ون نہیں رہے۔ چین کو روکنے کی کوشش میں اُنھوں نے اپنی راہیں مسدود کرلی ہیں۔ امریکا اور کچھ نہیں کرسکتا تو کم از کم ڈھنگ سے جینا ہی سیکھ لے، حالات کے مطابق تبدیل ہوجائے۔ اور عالمگیر حکمرانی کا خنّاس دِماغ سے نکال دے۔ یہی راستہ اُسے خیر کی طرف لے جاسکتا ہے۔ چین کا بڑی طاقت بننا دنیا کے مفاد میں ہو یا نہ ہو، امریکا کا تھوڑا بہت سُدھر جانا ضرور دنیا کے مفاد میں

ہو سکتا ہے۔ طاقت کی زندگی کو تو امریکی قابلِ احترام نہ بناسکے، طاقت کی موت ہی کو باوقار بنالیں!

وقت کم، مقابلہ سخت؟ ہاہاہا

"بس یار، میں ابھی آیا۔"
"وہیں انتظار کرو، میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"
"بس یہ سمجھو کہ میں یوں گیا اور یوں آیا۔"
"پریشان مت ہو۔ میں آندھی کی طرح گھر سے نکلا ہوں اور طوفان کی طرح تم تک پہنچوں گا۔"

یہ اور ایسے ہی دوسرے درجنوں جملے آپ نے ضرور سُنے ہوں گے۔ اور سُنے کیا ہوں گے، اپنی زبان سے ادا بھی کئے ہوں گے۔ یہ تمام جُملے اِس بات کے غماز ہیں کہ ہم وقت کو کم از کم زبانی حد تک تو اہم سمجھتے ہی ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ اگر ہم اِتنا بھی نہ کریں تو کوئی ہمارا کیا بگاڑ لے گا؟ اگر کسی کو دینے کے لیے گُڑ نہ ہو تو کم از کم میٹھی بات ہی کرلینی چاہیے۔

اہلِ جہاں کا عجیب چلن ہے کہ وقت کی کمی کا رونا روتے روتے پتہ نہیں کیا کیا ایجاد کرنے تُلے رہتے ہیں تاکہ وقت کی بچت ہو۔ ہر اِنسان کے حصے میں آنے والا وقت کِتنا ہوتا ہے یہ تو آپ ہم سب ہی جانتے ہیں مگر یہ سوال ہم اب تک سمجھ نہیں پائے کہ دِن رات کی مشقت اور نظم و ضبط کے نتیجے میں بچائے

ہوئے وقت کا لوگ کیا کرتے ہیں؟ جب تمام کام اپنے طے شدہ وقت سے کم مدت میں انجام پارہے ہوں تو بچے ہوئے وقت کا کیا اچار ڈالنا چاہیے؟ مغرب میں تو عجیب حال ہے۔ لوگ کسی کو پانچ دس منٹ دینے سے بھی کتراتے ہیں۔ اور کسی کو دو چار منٹ اِضافی انتظار کرنا پڑ جائے تو آسمان سَر پر اُٹھا لیتا ہے۔ یہ تو وقت کو سَر آنکھوں پر بٹھاتے بٹھاتے سَر پر چڑھانے والی بات ہوئی!

وقت نے ہر دور میں اِنسان کو گِھن چکّر بنایا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے کہا تھا

وقت سے دِن اور رات، وقت سے کل اور آج

وقت کی ہر شے غلام، وقت کا ہر شے پہ راج

آج اگر وہ ہوتے تو وقت پر پاکستانیوں کی حکمرانی دیکھ کر اپنے آپ سے شرمندہ ہوتے! ہم نے کمال ہوشیاری سے وقت کو غُچّہ دے دیا ہے۔ جو وقت دُنیا کو تِگنی کا ناچ نچاتا ہے اُس کی ہم نے چوکڑی بُھلادی ہے۔ اب وقت ہاتھ باندھے ہمارے سامنے کھڑا رہتا ہے اور زبانِ حال سے کہتا ہے.... بھائی صاحب! جس طرح چاہو خرچ یا ضائع کرو۔ میں تمہارا ہوں اور تمہارا ہی رہوں گا!

دُنیا کو یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ وقت کو زیادہ سے زیادہ بار آور بنانے کی کوششیں ہیں کہ دم نہیں توڑتیں۔ ایمان کی بات تو

یہ ہے کہ یہ سب دیکھ کر ہماری ہنسی چُھوٹ جاتی ہے۔ کیوں نہ چُھوٹے؟ وقت کم اور مقابلہ سخت والی بات ہمارے حلق سے آج تک نہیں اُتر سکی۔ کیسی کمی؟ اور مقابلہ؟ کیسا مقابلہ، کہاں کا مقابلہ؟ پتہ نہیں دُنیا نے بھی کیسے کیسے جھمیلے پال رکھے ہیں۔ جسے دیکھیے وہ لمحوں کے بُخارات کی شکل میں اُڑن والے وقت کو تھامنے، بلکہ دانتوں سے پکڑنے کے لیے بے تاب ہے۔ ہر اِنسان کو روزانہ چوبیس گھنٹے ملتے ہیں۔ اِن چوبیس گھنٹوں میں جو کرنا ہے، کیجیے۔ لوگوں کو پتہ نہیں کتنے کام کرنے ہوتے ہیں کہ چوبیس گھنٹے بھی کم پڑتے ہیں۔ اب کیا اُن کے لیے کائنات کے اُصول اور ہیئت کا نظام تبدیل کردیا جائے؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کسی قوم کے وقت میں ڈنڈی مار کر دوسری قوم کو نوازا جائے!

پاکستانی قوم کو دیکھ کر اہلِ جہاں کو اندازہ ہو جانا چاہیے کہ اِس دُنیا میں وقت کی کمی ہے نہ مقابلہ سخت ہے۔ کوئی بھی تکلیف اُسی وقت تکلیف ثابت ہوتی ہے جب اُسے محسوس کیا جائے۔ وقت کے معاملے میں بھی ہم نے یہی "طریقِ واردات" اپنا کر تمام تکالیف کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا ہے! اب ہر طرف سُکون ہی سُکون ہے۔ راوی کا کام اب صرف چَین لکھنا رہ گیا ہے۔ دُنیا والوں نے اپنے طور پر فرض کرلیا ہے کہ ایک مقابلہ بھی ہوتا ہے اور اُس میں شریک بھی ہونا چاہیے۔ کیوں ہونا چاہیے؟ کیاپُرسکون زندگی بسر کرنے میں کوئی قباحت

ہے؟ اِس دُنیا کو عزت راس آتی ہے نہ سُکون۔ اِس مسابقت پسندی ہی نے سب کی حالت پتلی کردی ہے۔ بقولِ غالب ع

صُبح کرنا شام کا لانا ہے جُوئے شیر کا!

ہم پاکستانیوں نے ہر طرح کی قباحت سے آزاد زندگی بسر کرنے کے انوکھے تصورات متعارف کرائے ہیں۔ پُرسکون زندگی کی راہ میں سب سے بڑی دیوار یہ ہے کہ دَم بہ دَم وقت کی کمی کا رونا رویا جائے اور اِس غم میں بہت سے کام چوپٹ کرلیے جائیں! وقت کے معاملے میں ہم نے غالب کے مشورے پر بہت پہلے عمل شروع کردیا تھا

نہ لُٹتا دِن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا

رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو!

کوئی دیکھے کہ وقت کو گھاس نہ ڈال کر ہم نے ایک انوکھی دُنیا پیدا کی ہے۔ اِس دُنیا میں وقت کی قِلّت کا تصور ہے نہ شائبہ! اب ہر پاکستانی کے پاس خیر سے اِتنا وقت ہے کہ اپنی سہولت کے لیے اُسے وقت کو قتل کرنا پڑتا ہے! اگر ہم وقت کو ٹھکانے نہ لگائیں تو یہ خودرَو پودوں کی طرح بڑھتا ہی چلا جائے اور ہماری پوری زندگی پر ایسا مُسلّط ہو کہ سانس لینا دُوبھر ہوجائے! نئی نسل کو دیکھیے۔ اُس کے پاس کِتنا وقت ہے، اِس کا اندازہ دُنیا کو کبھی

نہیں ہو سکتا۔ رات رات بھر موبائل فون پیکیج پر باتیں کرتے رہنے سے بھی نئی نسل کا وقت ختم تو کیا ہوگا، کم ہونے کا نام بھی نہیں لیتا! خواتینِ خانہ چار چار گھنٹے ڈرامے دیکھتی ہیں مگر وقت ہے کہ گزرنے کا نام نہیں لیتا۔ ٹی وی پر کوکنگ شو دیکھیے تو لگتا ہے وقت ٹھہر سا گیا ہے! اور مارننگ شوز میں دُلہنوں کی آرائش تو وقت (اور ناظرین کی نظر) کو واقعی ٹھہرنے پر مجبور کر دیتی ہے!

وقت کی کمی کے احساس کو ٹھکانے لگانے کے لیے ہم نے طرح طرح کے وتیرے اپنا رکھے ہیں۔ اہلِ جہاں چاہیں تو اِس معاملے میں ہم سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اور اگر وقت سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی روش ہی پر گامزن رہنا ہے تو اُن کی مرضی۔ کوئی اگر پانچ منٹ کا وعدہ کرکے آدھے گھنٹے میں آئے تو کیا ہوا؟ اگر وہ واقعی پانچ منٹ میں آ جاتا تو پچیس منٹ بچ جاتے۔ مگر جب تک ہمارے پاس پچیس منٹ کا مصرف نہ ہو وقت کو بچا کر ہم کریں گے کیا؟ دُنیا والوں کو صرف طنز کرنا آتا ہے۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ وقت بچا کر ہم کہاں رکھیں گے؟ قدرت کی طرف سے وقت کا مقرر کردہ کوٹا جب کل بھی مِل کر ہی رہنا ہے تو آج کا وقت کیوں بچایا جائے! وقت کے حوالے سے یہ خالص پاکستانی "نظریہ" ہے جس کی ہر اعتبار سے عقلی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ وقت کو ٹھکانے لگانے، سرکاری وسائل کو

شیر مادر کی صورت پی جانے، بنیادی مسائل کو زندگی کے سب سے بڑے بحران میں تبدیل کرنے اور کام کے ماحول میں آرام کا مواقع پیدا کرنے کے حوالے سے پاکستانیوں نے ایسے ایسے تصورات متعارف کرائے ہیں کہ دُنیا اگر بغور دیکھے تو اپنے تصورات اور نظریات سے تائب ہو کر ہمارے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے پر مجبور ہو ! مگر صاحب ! اب نئے تصورات کی قدر کہاں ؟ دُنیا والے "میں نہ مانوں" کی ڈگر ہی پر گامزن رہیں تو کوئی کیا کرے!

آگیا اور چھاگیا..... ٹھاہ کرکے

قوم کو کڑوی گولی نگلنی پڑی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ سَر مُنڈاتے ہی اولے پڑے ہیں۔ لوگ پہلے ہی اُلٹی سیدھی بولیاں بول رہے تھے اور اب حالت یہ ہے کہ اول فول بکنے کی بھی ساری حدیں پار کرلی گئی ہیں۔ کوئی یاد دلا رہا ہے کہ ہم نہ کہتے تھے پچھتاؤگے۔ کسی کا دعویٰ ہے کہ اُس نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پردہ نہ اُٹھاؤ، اُسی کافر صنم کی رُو نُمائی ہوگی! بہتوں کو اِس بات پر فخر ہے کہ مسلم لیگ (ن) کے بارے میں اُن کے اندازے درست نکلے۔ یعنی پیپلز پارٹی کے سِکّے کا رُخ تبدیل ہوا ہے! اور اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حکمراں جماعت نئے اندازے قائم کرنے کی تحریک دے رہی ہے!

بجٹ میں کڑوی گولی دینا لازم تھا؟

مرزا تنقید بیگ کے خیال میں شاید ہاں۔ ”معیشت ابتری کے دور سے گزر رہی ہے۔ سب کچھ ٹھہرا ہوا سا لگتا ہے۔ ایسے میں معاملات درست کرنے کے لیے کچھ تو ہٹ کر کرنا ہی پڑے گا، کوئی نہ کوئی ایسا قدم اُٹھانا ہی پڑے گا جو روایت سے تھوڑے سے انحراف پر مبنی ہو اور بہتری کی طرف لے جائے۔ لازم تو نہیں کہ بجٹ میں ہر بار دل بہلانے ہی کی بات کی جائے اور جھوٹ اور تصنع کا سہارا لیا

جائے۔"

ہم نے جان کی امان چاہتے ہوئے عرض کیا کہ اسحاق ڈار صاحب نے وفاقی بجٹ کے نام پر جو کچھ بھی کہا ہے اُس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ اینکرز چیخ پڑے ہیں۔ ردعمل کا طوفان سا آگیا ہے۔

مرزا نے واضح الفاظ میں لعنت ملامت کرتے ہوئے کہا۔ "اینکرز کا تو کام ہی انتہا سے گزرنا ہے۔ بجٹ کیا آیا ہے، لوگ لٹھ لیکر بجٹ اور اسحاق ڈار کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ایک اینکر نے لاہور کے ایک ویلڈر نوازش علی کے گھر کی فلم دکھائی اور سوال کیا کہ مسلم لیگ (ن) اِس غریب کے گھر کا بجٹ بنا سکتی ہے؟ نوازش علی کی 27 سالہ بیٹی جگر کے عارضے میں مبتلا ہے۔ اب معاملہ ٹرانسپلانٹ کی منزل میں پہنچ چکا ہے۔ اینکر نے سوال کیا کہ حکومت اِس لڑکی کے جگر کا ٹرانسپلانٹ کرا سکتی ہے؟ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِس لڑکی کی حالت دیکھ کر دِل کو بہت دُکھ ہوا مگر جگر کے ٹرانسپلانٹ کا بجٹ سے کیا تعلق؟ صحتِ عامہ کا معیار بلند رکھنا حکومت کی ذمہ داری ہے مگر انفرادی سطح پر چند بڑے خرچوں کے ذریعے مثال قائم کرنا تو غیر منطقی ہے۔"

ہم نے دست بستہ عرض کیا کہ انتخابات سے قبل مسلم لیگ (ن) نے چند وعدے کئے

تھے۔ لوگ اُن وعدوں کو کیسے بھول سکتے ہیں؟ مرزا نے جواب دیا۔ ”پانچ برس تک جو بویا گیا وہ تو کاٹنا ہی پڑے گا۔ وفاقی بجٹ میں چند سخت اقدامات تجویز کئے گئے ہیں۔ اگر ان اقدامات کے ذریعے کچھ بہتری آ سکتی ہے اور معاملات کچھ درست ہو سکتے ہیں تو ہرج ہی کیا ہے؟ محض نوٹ چھاپتے رہنا تو مسائل کا حل نہیں۔ لیپا پوتی جیسے اقدامات پر چند غیر لچکدار فیصلوں کو ترجیح دی جانی چاہیے۔“

ہم نے اُن کی بات سے اتفاق کیا تاہم نقطۂ اعتراض پر کہا کہ یہ سب تو مسلم لیگ (ن) کو اچھی طرح معلوم تھا۔ جو کچھ پانچ برس میں بویا گیا اُس کی بوائی کے وقت وہ خود بھی پیپلز پارٹی کے شانہ بہ شانہ موجود تھی اور خاموش تماشائی کا کردار ادا کیا۔ اب وہ آوے کا آوا خراب ہونے کا عُذر تراش نہیں سکتی۔

مرزا نے مسلم لیگ (ن) کی طرف داری کی انتہا کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب ہم نہیں جانتے۔ ہمیں تو بس یہ معلوم ہے کہ اب موقع ملا ہے تو کسی نہ کسی نا اہلی اور کرپشن کی غلاظت دور کی جائے۔ معیشت کی زبوں حالی متقاضی ہے کہ آئینے میں دیکھ کر، اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی جائے۔ سابق حکومت نے ہر حد سے گزرنے پر فخر کیا۔ نوٹ چھاپنے، اخراجات بڑھانے اور سرکاری وسائل کو

شیرِ مادر سمجھ کر پی جانے کو باعثِ افتخار سمجھا گیا۔ پانچ برس تک یہ سب ہوتا رہا۔ خسارہ بڑھتا گیا کہ بڑھنا ہی تھا۔ ملک و قوم کے لیے ہو تو ہو، حکمرانوں کے لیے یہ گھاٹے کا سودا نہ تھا۔ غریب عوام البتہ سودائی ہو گئے۔

مرزا کو کون سمجھائے کہ پانچ برس تک جو من مانی ہونے دی گئی اُس کا بالآخر یہی نتیجہ برآمد ہونا تھا۔ معیشت کو لونڈی سمجھا گیا۔ اور پھر ہم بدحالی کے مزید غلام ہوتے چلے گئے۔ یہ سب افسوسناک ضرور تھا، حیرت انگیز نہ تھا۔ جب ہوش و حواس کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی قبر کھودی جائے تو حیرت کیسی؟

آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو تو سنبھلنے اور سنبھالنے میں وقت لگتا ہے۔ مگر یہ سب مینڈیٹ پانے والوں کے علم میں بھی تو تھا۔ کیا اُنہیں اندازہ نہ تھا کہ راتوں رات کوئی بڑی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی؟ پھر دعووں کی محفل کیوں سجائی گئی؟

سونامی نہ آسکا اور تیز بھی کمان پر چڑھ نہ سکا۔ شیر البتہ کچھار (یا پنجرے) سے باہر آچکا ہے۔ لوگ یہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں کہ شیر دیرینہ و پیچیدہ مسائل کو کب چیر پھاڑ کر کھاتا ہے۔ شیر اور بکری کے ایک گھاٹ پر پانی پینے

کا دِل کُشا منظر دیکھنے کی کسی کو تمنا نہیں۔ ایسے فلمی مناظر کسی کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔
مسلم لیگ (ن) کو وقت ضرور ملنا چاہیے۔ مگر اِس وقفے میں لازم ہے کہ وہ ٹھوس اقدامات کی محفل سجائے۔ مخالفین کو رام کرنے کے عمل میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ یہ عمل حد سے گزرے تو مینڈیٹ کا تیا پانچا کر دیتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک بے بنیاد سوچ یہ پنپ چکی ہے کہ کسی بھی حکومت کو انتخابی فتح کی صورت میں ملنے والا مینڈیٹ پانچ سال کا ہے۔ مینڈیٹ کا تعلق میعاد سے نہیں، کارکردگی سے ہے۔ اگر کوئی پارٹی کام نہ کر پائے تو اسے اپنا بوریا بستر خود ہی لپیٹ لینا چاہیے۔ جاپان میں یہی تو ہوتا ہے۔ جو پارٹی حکومت کا گورکھ دھندا چلانے میں ناکام رہتی ہے، معذرت کرکے الگ ہو جاتی ہے۔
ہماری سیاسی جماعتوں کو یہ بات ذہن سے کھرچ کر پھینک دینی چاہیے کہ مینڈیٹ پانچ سال کا ہوتا ہے۔ مینڈیٹ صرف اُس وقت تک کا ہوتا ہے جب تک کارکردگی اچھی رہے، نتائج حاصل ہوتے رہیں، قوم کو ریلیف ملتا رہے!
وفاقی بجٹ حیرت اور سکتے میں ڈالنے والا ثابت ہوا ہے۔ مگر خیر، ابھی تو پوٹلی کھلی ہے۔ مزید بہت کچھ منظرِ عام پر آنا ہے۔ مسلم لیگ (ن) چودہ برس کا بن باس کاٹ کر دوبارہ، بلکہ سہ بارہ اقتدار کے سنگھاسن پر براجمان ہوئی

ہے۔ بجٹ نے سب پر واضح کر دیا ہے کہ شیر آ چکا ہے اور رن بھی کانپ اُٹھا ہے! بس یہ سمجھ لیجیے کہ آگیا اور چھا گیا ٹھاہ کر کے! مخالفین نے شیر کے تیور سے ڈرایا تھا۔ یہ اشتباہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ عوام کو بھی اندازہ ہے کہ شیر غضب ناک اور خطرناک حد تک شکار کے موڈ میں ہے۔ حد یہ ہے کہ شیر کے چاہنے والے بھی خوفزدہ ہیں! وہ کیوں متذبذب اور خوفزدہ ہیں، یہ ہم تو کیا خود وہ بھی نہیں جانتے! فرینڈلی اپوزیشن کرتے رہنے کا یہ نتیجہ تو نکلنا ہی تھا۔ دُعا یہ ہے کہ نفرت کے طوفان سے بچ نکلنے والے محبت کے ساحل پر نہ ڈوبیں!

سپنوں کا راج کمار

سیاسی تجزیہ بھی کیا خوب فن، بلکہ فنِ لطیفہ ہے! اِس فن میں مہارت رکھنے والوں نے فُل اسپیڈ بک بک کے دوران بھی ہمیشہ دامن بچاتے ہوئے زبان کھولی ہے اور گفتگو کی برق رفتاری سے زیادہ اُن کی احتیاط پسندی سے لوگ محظوظ ہوئے ہیں۔ زمانے بھر کی ہانکنے کے بعد احتیاطاً کہا جاتا ہے "دیکھنا یہ ہے کہ اب حالات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔" یا پھر یہ کہ "ابھی پورے یقین اور وثوق سے کچھ بھی کہا نہیں جاسکتا۔" بعض ماہرین اپنی ہر بات کو حالات سے مشروط کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ یعنی اپنا کہا غلط بھی ثابت ہو تو الزام حالات کے سَر جائے! بقول ساحر لدھیانوی

ویسے تو تمہی نے مجھے برباد کیا ہے
الزام کسی اور کے سَر جائے تو اچھا!

کرکٹ میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ لوگ پوری توجہ سے ماہرین کو سُنتے ہیں کہ وہ کوئی کام کی بات بتائیں گے۔ اور ماہرین ارشاد فرماتے ہیں کہ وہی ٹیم جیتے گی جو اچھا کھیلے گی! لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ بات تو اُنہیں بھی معلوم تھی، پھر ماہرین نے کیا تیر مارا! کرکٹ پر گہری نظر رکھنے والے بھی "کرکٹ

بائی چانس" کہتے ہوئے دامن بچا جاتے ہیں۔

کرکٹ کے ماہرین اور مبصرین کا فن سیاست دانوں نے بھی سیکھ لیا ہے۔ اب وہ میڈیا کے سامنے کچھ بھی کہتے وقت خاصے ڈپلومیٹک ہو جاتے ہیں۔ بہت تول مول کر بولتے ہیں۔ یعنی سیف سائڈ کھیلتے ہیں۔ جہاں بے لگام ہو کر بولنا ہو وہاں وہ بے لگام ہو جاتے ہیں اور جہاں معاملہ پیش گوئی تک پہنچے وہاں وہ کوئی بھی بات بہت سوچ سمجھ کر مُنہ سے نکالتے ہیں!

سیاسی تجزیے کے میدان میں منظور وسان نے نئی راہ نکالی ہے۔ اگر کوئی بات سوچ سمجھ کر کی جائے تو اُس کے غلط نکلنے پر معاملات خراب ہو سکتے ہیں۔ منظور وسان نے دامن بچاتے ہوئے اپنے تجزیوں اور پیش گوئیوں کو خوابوں کے آغوش میں ڈال دیا ہے۔ اُن کے خوابوں نے لکھنے والوں کو نئی راہیں سُجھائی ہیں۔ لوگ منتظر رہتے ہیں کہ وہ کچھ کہیں یعنی کوئی خواب بیان کریں اور لکھنا شروع کیا جائے۔

منظور وسان سے ہم نے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ ویسے تو خیر ٹی وی ٹاک شوز کے بزرجمہر بھی ہمیں بہت کچھ سکھانے پر تُلے رہتے ہیں۔ وہ اندر کی ایسی باتیں بتاتے ہیں کہ کلیجہ مُنہ کو آتا ہے، بلکہ مُنہ کے راستے باہر آنے کو بے تاب

رہتا ہے۔ تجزیوں کی کوکھ سے ایسے انکشافات جنم لیتے ہیں کہ وسوسے پنپنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی تجزیوں کے پیچ و تاب میں ہم ایسے اُلجھتے ہیں کہ اِشو کا نام و نشان بھی حافظے میں باقی نہیں رہتا۔ سیاسی ٹاک شوز وہ دھوبی گھاٹ ہیں جن پر موضوعات کو پیٹ پیٹ کر اُجلا کیا جاتا ہے اور بسا اوقات موضوعات کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے کسی محترمہ نے جلد کی رنگت اجالنے کے لیے تیزاب سے ہاتھ دھوئے ہوں!

منظور وسان کے خواب بھی دھوبی گھاٹ، بلکہ اُس سے ایک قدم آگے جا کر شمشان گھاٹ کا درجہ رکھتے ہیں۔ بہت سے معاملات منظور وسان کے خوابوں تک پہنچ کر کیفرِ کردار کو پہنچتے ہیں! منظور وسان نے نیا ٹرینڈ یہ دیا ہے کہ جب سیاست کے میدان میں کچھ اور کرنا ممکن نہ ہو تو خواب دیکھنا اور بیان کرنا شروع کردو۔ اِس میں آسانی یہ ہے کہ سیاسی معاملات خود کو اُلٹ پلٹ کر خوابوں کو ایک خاص حد تک تو سچا ثابت کر ہی دیں گے!

منظور وسان کا دم غنیمت ہے کہ ہم پیپلز پارٹی کے ڈراؤنے خواب جیسے دور کو چند حسین اور سلونے خوابوں کی مدد سے بخوشی گزار لیتے ہیں! ڈھائی تین سال قبل بھی اُنہوں نے خواب بیان کرنا شروع کیا تھا اور لوگ سارے غم بھول گئے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاکٹر ذوالفقار مرزا کی کڑوی کسیلی باتیں بھی منظور

!وسان کے میٹھے خوابوں میں ملفوف ہو کر قابلِ برداشت ہو گئی تھیں
عام انتخابات کے بعد منظور وسان نے کہا تھا کہ سندھ میں جواں سال وزیر اعلیٰ ہوگا۔ اُن کی بات غلط نہیں تھی۔ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ سندھ کی وزارتِ اعلیٰ ایک بار پھر 85 سالہ سید قائم علی شاہ کو ملی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ انسان کو جانچنا ہے تو دِل دیکھنا چاہیے۔ کیا آپ نے نہیں سُنا کہ دِل ہونا چاہیدا جوان، عُمراں چ کی رکھیا اے! شاہ صاحب کا دِل ابھی تک جوان ہے۔ اور اگر آپ کو بھی 85 سال کی عمر میں تیسری بار وزارتِ اعلیٰ مِل جائے تو آپ کا دِل بھی ایک بار پھر جوان ہو جائے! منظور وسان صاحب نے جوان وزیر اعلیٰ کے آنے کی پیش گوئی کی تھی۔ پیپلز پارٹی نے اُن کی بات کا بھرم رکھنے کے لیے شاہ صاحب کو تیسری بار وزارتِ اعلیٰ دیکر جوان کر دیا۔ اور یقین نہ ہو تو غور کیجیے کہ سندھ کی وزارتِ اعلیٰ تیسری بار سنبھالنے کے بعد سے وہ چھاپے مارتے پھر رہے ہیں۔ کبھی کسی بازار کا چکر لگا کر قیمتوں کا جائزہ لیتے ہیں اور کبھی کسی پولیس اسٹیشن میں غیر اعلانیہ طور پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ لوگوں کو اُن کے تیسری بار وزیر اعلیٰ بننے پر جس قدر حیرت تھی اُس سے کہیں زیادہ تعجب اُن میں اچانک پیدا ہو جانے والی چُستی اور پُھرتی پر ہے! ویسے منظور وسان چاہتے تو یہ خواب بھی دیکھ سکتے تھے کہ پیپلز پارٹی جسے سندھ کا وزیر اعلیٰ بنائے گی وہ بڑھاپے کو خیرباد کہتے ہوئے دوبارہ جوانی کی قلمرو

!میں قدم رکھ دے گا

منظور وسان نے یہ بھی کہا تھا کہ متحدہ قومی موومنٹ بہت جلد سندھ حکومت کا حصہ بنے گی۔ اور اب ایسا ہی ہونے والا ہے۔ سابق وزیرِ داخلہ رحمٰن ملک کی قیادت میں پیپلز پارٹی کی ٹیم نائن زیرو، عزیز آباد میں متحدہ رہنماؤں سے ملاقات کرکے اسے سندھ حکومت میں شمولیت کی دعوت دے چکی ہے۔ الیکشن کے بعد سے یہ خیال ظاہر کیا جارہا تھا کہ متحدہ سندھ حکومت کا حصہ بن جائے گی۔ پیپلز پارٹی سے ویسے بھی اُس کا فطری اتحاد بنتا ہے۔ منظور وسان نے سندھ حکومت میں متحدہ کی شمولیت کا امکان ظاہر کرکے سب کو ایک بار پھر حیران کردیا۔ لوگ حیران کیوں نہ ہوتے؟ سندھ حکومت میں متحدہ کی شمولیت کا خواب دیکھنے کی سِرے سے ضرورت ہی نہیں تھی! ایسا لگتا ہے کہ منظور وسان نے اپنے تحت الشعور کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کوئی بھی خواب اُسی وقت دیکھنا ہے جب اُس کی تعبیر تیار ہوچکی ہو! یہ ایسا ہی معاملہ ہے جیسے کسی ٹیم کے تین کھلاڑی آؤٹ ہوئے ہوں اور دس اوورز میں محض تیس چالیس رنز اسکور کرنے ہوں تو بے فکر ہوکر اُس کی فتح کی "پیش گوئی" کیجیے! منظور وسان بھی تیقن کی منزل پر پہنچنے کے بعد ہی اپنا خواب اہلِ وطن سے شیئر کرتے ہیں! یعنی ہوش خواہ کتنے جاچکے ہوں، فرزانگی برقرار رہتی ہے! یہی سبب ہے کہ اُن کی خواب ناک پیش گوئیاں سُن کر پہلے واہ واہ اور پھر مبارک سلامت کا شور بلند ہوتا ہے۔

حکومت میں متحدہ کی شمولیت کا معاملہ بھی ایسا ہے کہ منظور وسان کو خواب دیکھنے کی ضرورت ہے نہ تجزیہ کاروں کو اٹکل کے گھوڑے دوڑانے کی۔ منظور وسان نے خواب دیکھنے کا ہنر سیکھ رکھا ہے تو متحدہ نے خوابوں کو تعبیر سے ہمکنار کرنے میں ید طولیٰ حاصل رکھا ہے۔ ایک کو خواب راس آتے ہیں اور دوسری کو تعبیر۔ منظور وسان کو خواب دیکھنے کے بعد تعبیر کی حاجت نہیں رہتی اور متحدہ تعبیر کو یقینی بنانے کے بعد خواب دیکھنے کی زحمت سے چُھوٹ جاتی ہے!

یہ ہماری سیاست کا کمال ہے کہ خواب دیکھنے والوں کو تعبیر تلاش کرنے کے بکھیڑوں سے نجات دلادی ہے اور جن میں تعبیر کا اہتمام کرنے کی سکت پائی جاتی ہے وہ خواب دیکھنے کے مُکلّف نہیں رہتے۔ اِن دو انتہاؤں کے بیچ عوام کا وہی حال ہے جو سنت کبیر داس نے بیان کیا تھا۔ یعنی

دو پاٹن کے بیچ میں باقی بچا نہ کوئے

جی میں خوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

جی تو پتا نہیں کیا کیا چاہتا ہے مگر کیا کیجیے کہ کوئی بھی معاملہ اب اختیار میں دکھائی نہیں دیتا۔ وطن ایسی حالت میں ہے کہ لاکھ کوشش کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی بھی معاملے کا سِرا ہے کہاں؟ اور جب سِرا ہی ہاتھ نہ آرہا ہو تو آگے کیا بڑھیے اور کیا کیجیے۔

پاک سرزمین کو ہم نے مِل کر اِس حال سے دوچار کردیا ہے کہ بہت کچھ ہے جو مُتضاد ہے مگر ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ آگ اور پانی کا ملاپ ہو رہا ہے۔ اور اِس کے ساتھ ساتھ بہت کچھ ایسا بھی ہے جو ہے تو سہی مگر نہ ہونے کے برابر یعنی دکھائی دے کر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ غالب کی زبانی کہیے تو ع

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!

جسے ہم نام نہاد سسٹم کہ کر اپنا دِل بہلاتے آئے ہیں وہ تو جیسے اب رہا ہی نہیں۔ اِس پر بھی تماشا یہ ہے کہ ہم سسٹم کو درست کرنے کی تمنا میں دیوانے ہوئے جاتے ہیں۔ اور اِس تمنا کی تکمیل کی کوشش بھی عجیب ہی گل کِھلاتی ہے۔

حالات کو درست کرنے کی روش پر گامزن ہوئیے تو وہ مزید بگڑ جاتے ہیں۔ وہ اور ہوں گے جو مٹّی میں ہاتھ ڈالیں تو سونا بن جائے۔ یہاں تو برگشتہ طالعی کا یہ عالم ہے کہ اچھے خاصے کھرے سونے کو ہاتھ لگایئے اور مٹّی کے ڈھیر میں تبدیل کردیجیے ! کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی کی بد دُعا سَروں پر منڈلا رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وطن کے قیام کی خاطر جنھوں نے زندگی کی دولت ٹھکرادی تھی اُن سے کئے ہوئے وعدوں کو بُھلا دینے کا عذاب ہم پر اترا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُن پاک روحوں کی بد دُعائیں ہمیں قعرِ مذلّت میں دھکیلے جارہی ہیں؟ بادی النظر میں تو معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم تو کبھی یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ بد دُعا کیا ہوتی ہے اور کس نوع کے انجام سے دوچار کرسکتی ہے!

وطن کا چہرہ ہے کہ بار بار بے یقینی کی گرد سے اٹ جاتا ہے۔ یقین تو جیسے رُوٹھ سا گیا ہے۔ بے حِسی کو ہم نے زندگی کا لازمی جُز بنالیا ہے۔ احساس سے محرومی ہے کہ محکم ہوئی جاتی ہے۔ اور کوئی بھی اِس احساسِ محرومی کا رونا نہیں روتا۔ ہر اُمنگ، ہر اُمّید کمزور پڑتی جاتی ہے۔ مایوسی پنجے گاڑ رہی ہے۔ مگر کسی کو اِس بھیانک تبدیلی کی بظاہر کچھ پروا نہیں، ذرا بھی فکر لاحق نہیں۔

ہر شخص صرف اپنے وجود کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اور اِس کے لیے وہ کسی بھی حد سے بڑھنے کو تیار رہتا ہے۔ انفرادی مفادات قومی مفاد پر غالب آ چکے ہیں۔ اپنی جیب بھرنے کی تگ و دَو میں مصروف لوگوں کی کمی نہیں۔ اور اِس کے لیے حلال و حرام میں تمیز کا شعور بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب نے طے کر لیا ہے کہ دنیا کو جیب میں ڈالنا ہے اور آخرت کو کسی اور مخلوق کے لیے چھوڑ دینا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ جب انسان اپنے طور پر معاملات طے کرنا شروع کردے تو کچھ بھی ناممکن نہیں رہتا! ہم نے بھی اپنے رب کے بتائے ہوئے اُصولوں کو محترم گرداننے کے ساتھ ساتھ چند اُصول خود بھی وضع کر لیے ہیں، اپنی سہولت کے لیے۔

وطن کے لیے سوچنے اور اہلِ وطن کے غم میں گھلنے والے اب خال خال ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اب ہم ایسے لوگوں کی شکلیں بھی بھول بھال گئے ہیں۔ سامنے آ بھی جائیں تو مشکل ہی سے پہچان پائیں گے! پہچانیں بھی کیسے؟ وہ بے چارے خود کو بچا بچاکر، چُھپا چُھپاکر بھی تو رکھتے ہیں!

سیاست کی نیرنگیاں ملک کو اُس مقام تک لے آئی ہیں جہاں سبھی کچھ بے رنگ سا اور پھیکا پھیکا دِکھائی دیتا ہے۔ جس منظر کو دیکھیے بُجھی بُجھی سی رنگت کا اور ادھورا سا ہے۔ کسی شے میں دِل کشی محسوس نہیں ہوتی۔ کوئی بات من کو

نہیں بھاتی، کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ ہر معاملہ عدمِ تکمیل کے حصار میں مُقید نظر آتا ہے۔ پوری قوم پر نیم دِلی اور پژمُردگی سی طاری ہے۔ جیسے ہم اپنا ہی پتا بھول گئے ہوں۔ آنکھوں میں تجسّس کی چمک ہے نہ لگن کی تابندگی۔ دِل ہیں کہ کھوکھلے پن کا زندہ نشان بن کر رہ گئے ہیں۔ مغیث الدین فریدی کے بقول

اے راہبرو! تم اُسے آئینہ دِکھادو

دیوانہ خود اپنا ہی پتا پوچھ رہا ہے

اپنے پہ بھروسہ ہے نہ اوروں پہ یقیں ہے

!اِس دور کا ہر شخص دوراہے پہ کھڑا ہے

دہلی کے اُجڑے ہوئے دیار کو آباد رکھنے والے خواجہ میر درد نے دِل کی گہرائی سے کہا تھا ع

جی میں ہے خُوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

رونا مسائل کا حل نہیں ہوا کرتا۔ اور یہ بہادری کی علامت بھی نہیں۔ مگر دِل کا بوجھ اُتار پھینکنے کا ایک معقول طریقہ اور ذریعہ تو بہرحال ہے۔ اور کسی بھی معقول طریقے کو اپنانے میں کوئی ہرج نہیں۔ آنکھیں بے نُور ہوں اِس سے تو کہیں بہتر ہے کہ اُن میں اشک ہائے ندامت بھرے ہوں۔

جی کا بوجھ ہلکا ہونے کے بعد ہی ذہن سوچنے کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جہاں کھل کر رونا اور دِل پر پڑا ہوا غم کا بھاری پتھر ہٹانا ہو وہاں بھی ہم کھوکھلے قہقہے لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں۔ اور جہاں قہقہے لگانے ہوں وہاں ہم دِکھاوے کے آنسو بہانے لگتے ہیں۔ بہت کچھ ہے جو ہم پر لازم ہے مگر ہمیں چنداں پروا نہیں۔ سوچنا ہے مگر ہم سوچتے نہیں۔ اور کبھی یہ بھی نہیں سوچتے کہ سوچنا کِس قدر ضروری، بلکہ ناگزیر ہے۔ عمل واجب، بلکہ فرض ہوچکا ہے مگر ہمیں عمل سے رغبت ہی نہیں رہی۔ بے عملی کی چادر ایسی ہم نے اوڑھ رکھی ہے کہ کِسی صورت اُسے اُتارنے کے لیے تیار نہیں! قدم قدم، نَفَس نَفَس بدگمانیاں ہیں جن سے نجات پانے کی ضرورت ہے مگر ہم نجات پانے کا سوچتے بھی نہیں۔ جن چیزوں سے اُنس ہو جائے اُن سے الگ ہونے کا تصور بھی محال ہو جاتا ہے۔ دِل پر پتھر رکھ کر اِس مرحلے سے تو گزرنا ہی ہوگا۔ جو کچھ ترک کرنا ہے وہ ہر حال میں ترک تو کرنا ہی پڑے گا۔

دیکھیے سحر کب ہوتی ہے۔ آپ سوچیں گے سحر تو کب کی ہوچکی ہے۔ بات غلط نہیں۔ ہماری سحر تو تب ہی ہوگی جب ہماری آنکھ کھلے گی! مگر خیر، یہ کہنا بھی دِل کے بہلانے ہی کی ایک صورت ہے کہ جب آنکھ کُھلے تب سویرا ہوتا ہے۔ دِن ڈھلے آنکھ کُھلنے پر کیا ہاتھ آسکتا ہے؟ عمل کی دُنیا کا میلہ لُوٹنے کے شوقین

سُورج کی اولین کرنوں کی دستک پر بیدار ہو کر بستر چھوڑ دیتے ہیں، دِن بھر کَسل مندی کا

مظاہرہ نہیں کرتے رہتے!

پاکستانی معاشرہ جس ڈھنگ کو اپنائے ہوئے ہے وہ کِسی بھی اعتبار سے مستحسن ہے نہ قابلِ اعتماد۔ منزل سے دور رہ جانے والی راہوں کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ یہ بات ہم جس قدر جلد سمجھ کر اپنالیں اُسی قدر اچھا ہے تاکہ کہیں بیٹھ کر جی بھر کے رونے کی تمنا پیدا ہی نہ ہو!

اب ایسی بھی کیا جلدی ہے

اور بہت سے، بلکہ بیشتر پاکستانیوں کی طرح مرزا تنقید بیگ بھی آج تک سمجھ نہیں پائے کہ پاکستان بار بار نازک موڑ پر کیوں کھڑا ہو جاتا ہے اور مشکل مرحلے سے کیوں گزرنے لگتا ہے۔ لوگ نئی حکومت کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ اب نئی حکومت قائم ہوچکی ہے مگر ملک ہے کہ اب تک نازک موڑ پر کھڑا ہے! جب بھی کوئی یہ کہتا ہے کہ ملک تباہی کے دہانے اور نازک موڑ پر کھڑا ہے تو مرزا بھڑک اٹھتے ہیں۔ اُن کا استدلال یہ ہے کہ خطرات اور خدشات سے جس قدر ڈرایا گیا ہے اُس کی روشنی میں تو اب تک ہم سب کا وجود ہی، خدا نا خواستہ، مِٹ جانا چاہیے تھا! مگر دیکھ لیجیے کہ ہم زندہ ہیں۔ ہاں، یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ یہ استقامت ہے یا ہَٹھ دھرمی!

مرزا کو شاعری سے زیادہ شغف نہیں مگر چند کام کے اشعار یاد کر رکھے ہیں تاکہ بہ وقتِ ضرورت بیان کو مستند بنانا ممکن ہو۔ قوم کی عجلت پسندی نے مرزا کو شدید کوفت سے دوچار کر رکھا ہے۔ وہ عبدالحمید عدم کو دُعا دیتے ہیں جو کیا خوب کہہ گئے ہیں

عدم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے

!ستم ظریف۔بڑے جلد باز ہوتے ہیں

پاکستانی قوم کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ سبھی ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہیں۔ خواہش ہے تو بس اِتنی کہ جو کچھ عشروں میں بگڑا ہے وہ چند دِنوں میں سنور جائے۔ مسلم لیگ (ن) نے تیسری بار اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ ع

ابھی آئے، ابھی بیٹھے، ابھی دامن سنبھالا ہے

اور قوم ہے کہ پل بھر میں تمام مسائل کو پھانسی گھاٹ پر دیکھنے کے لیے بے تاب ہے۔ اس کیفیت نے مرزا تنقید کو بہت پریشان کیا ہے۔ قوم کی یہ روش اُن کی سمجھ میں نہیں آتی کہ راتوں رات سب کچھ درست ہوتا ہوا کیوں دیکھنا چاہتی ہے۔ مسلم لیگ (ن) کی حکومت سے وابستہ توقعات کے بارے میں مرزا کہتے ہیں۔ "جو کچھ برسوں، بلکہ عشروں میں بگڑا ہے وہ آن کی آن میں کیسے سنور سکتا ہے؟ ع

پَل میں کیسے کِسی کے ہو جائیں؟

!یہ تو اِک عمر کی ریاضت ہے

خُدا خُدا کرکے ایک جمہوری دور تکمیل کی منزل تک پہنچا ہے۔ بہت سی خرابیاں

موجود تھیں اور اُن میں اچھا خاصا اضافہ بھی ہوا۔ اب خرابیوں کو دور کرنے کی سبیل
"نکلی ہے، مسائل کے حل کی امید پیدا ہوئی ہے تو لوگ اُتاولے ہوئے جارہے ہیں۔
ہم نے سمجھایا کہ لوگ اِس لیے اُتاولے ہوئے جارہے ہیں کہ سابق دورِ حکومت میں
!جیب خالی ہو جانے پر وہ باولے ہوگئے تھے
مرزا بولے۔ "اگر سابق حکومت نے جسم و جاں کو عذاب سے دوچار کر رکھا تھا تو اِس کا
یہ مطلب نہیں کہ موجودہ حکومت کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا جائے اور تنقید کے
ڈونگرے برسا کر اُس کا ناطقہ بند کر دیا جائے۔ ابھی سے قومی اسمبلی کے فلور پر نئی
حکومت کو مطعون کیا جارہا ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ابھی تو انتخابات کی گرد بھی
نہیں چھٹی۔ مطلع صاف ہو جائے، کچھ دِکھائی دینے لگے تو کچھ کہا جائے۔ ابھی سے
"اندازوں کے تیر اور تنقید کے میزائل برسانا عجلت پسندی کی انتہا ہے۔
مرزا کی بات سے ہمیں اتفاق ہے مگر اِس قدر بھی نہیں کہ زمینی حقائق فراموش
کردیں۔ مرزا تو کسی بھی معاملے میں آنکھ بند کرکے آگے بڑھنے پر یقین رکھتے ہیں۔
اُنہیں اِس بات سے بظاہر کچھ غرض نہیں ہوتی کہ منطق کیا کہتی ہے۔ مسلم

میں grilling لیگ (ن) کو گریس مارکس ضرور ملنے چاہئیں مگر ابھی سے تھوڑی سی کچھ ہرج نہیں۔ اِس صورت میں پارٹی کو اپنے وعدے یاد تو رہیں گے۔ خُدا جانے مرزا کیوں جُز بُز ہوتے ہیں؟ اگر بحث کیجیے تو وہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔

ایک بار کسی نے پوچھ لیا کہ لوگ تیزی سے سارے وعدوں کی تکمیل کیوں نہ چاہیں کہ وعدے کرنے والے بھی آنکھ بند کرکے ہر طرح کے وعدے کرتے چلے جاتے ہیں!

سیاست دان بھی تو سبز باغ دِکھانا ترک نہیں کرتے۔ اُنہیں چکنی چُپڑی باتوں کے سوا آتا کیا ہے؟ کسی نہ کسی طرح عوام کو بہلا پُھسلا کر ووٹ حاصل کرنا اور اِس کے بعد سب کچھ بھول بھال جانا اُن کی پُرانی روش ہے۔ پھر لوگ کیوں نہ چاہیں کہ تیزی سے نتائج سامنے آئیں؟ یہ باتیں سُن مرزا بھڑک اُٹھے۔ جلا کر راکھ کردینے والے لہجے میں بولے۔ "لوگوں سے کس نے کہا ہے کہ توقعات کے پوٹلے سیاست دانوں کے سَروں پر دھریں؟ مسائل کو پیچیدہ ہونے میں وقت لگتا ہے تو حل کرنے کے لیے بھی وقت دیا جانا چاہیے۔"

ہم نے دست بستہ عرض کیا کہ اب قوم مزید تاخیر کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ جو ہونا ہے وہ تیزی سے ہو جانا چاہیے۔ یہ سُننا تھا کہ مرزا کا پارا چڑھ گیا۔ دندناتے ہوئے لہجے میں اُنہوں نے ہم پر چڑھائی کردی۔ "اِس قوم کو تو اللہ ہی سمجھے۔ پہلے سب کچھ جھیلتی رہتی ہے، معاملات کو بگڑنے دیتی ہے۔ اور جب

معاملات درست کرنے کی کچھ راہ نکلتی ہے تو پلک جھپکتے میں منزل تک پہنچنا چاہتی ہے۔ یہ تو سراسر بے ایمانی ہے۔"

بے ایمانی کیوں؟ ہم نے جان کی امان چاہتے ہوئے استفسار کیا۔

مرزا نے کمال شفقت سے وضاحت فرمائی۔ "ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ جس طرح مسائل کو پنپنے دیا گیا اُسی طور مسائل حل کرنے کے میکینزم کو بھی پنپنے دیا جائے۔ مگر اِس قوم میں صبر ہے کہاں؟ سب یہ چاہتے ہیں کہ کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کریں اور جب آنکھیں کُھلیں تو سب کچھ بدل چکا ہو۔ جادو کی چھڑی بھی اپنا کمال دکھانے میں کچھ وقت تو لیتی ہے۔ لوگ کسی بھی حکومت کو اِتنا وقت دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ ہر معاملے میں جب جادو کی چھڑی کے کمالات کی توقع وابستہ کی جائے تو پھر معاملہ ڈنڈے تک جا پہنچتا ہے!"

ہم نے وضاحت کی نیت سے کہا قوم وقت اِس لیے نہیں دینا چاہتی کہ کہیں پھر دیر نہ ہو جائے۔ مرزا کا استدلال تھا۔ "اب کیا دیر ہونی ہے؟ کس معاملے میں دیر نہیں ہو گئی؟ بہت کچھ ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ غالب کی زبان میں کہیے تو ہم پر اِتنی مشکلیں پڑی ہیں کہ سَر بہ سَر آسان ہو گئی ہیں! تھوڑی بہت تاخیر ہوتی ہے تو انسان پریشان ہوتا ہے۔ جب معاملات ہاتھ سے نکل ہی چکے ہوں تو کیسا افسوس، اور کیوں؟ معاملات جب ہاتھ سے نکلے جا رہے ہوتے ہیں تب تو

ہمیں ہوش نہیں آتا۔ اور جب اُنہیں درست کرنے کا محل ہو تو عجلت کے ہاتھوں مزید خرابیاں پیدا کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ خُدا جانے ہم عقل اور صبر سے کام لینا کب شروع کریں گے؟"

اب مرزا کو کون سمجھائے کہ قوم کے حافظے سے بہت کچھ مٹ گیا ہے۔ بالخصوص صبر اور تحمل۔ جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی ہے تو لوگوں کو کچھ بھی یاد نہیں رہتا کہ کوئی بھی مسئلہ حل ہونے میں کتنا وقت لے گا۔ سب چاہتے ہیں راتوں رات دُنیا کچھ کی کچھ ہو جائے۔ جب پورا ماحول ہی عجلت پسندی کا ہو تو مرزا جیسے عقل پرستوں اور منطق پسندوں کی بات پر کون کان دھرے؟

مسلم لیگ (ن) کے حصے میں مسائل سے زیادہ اُن کی پیچیدگی آئی ہے۔ بہت کچھ ہے جو خاصا اُلجھ گیا ہے۔ اب دُعا یہ ہے کہ یار کا پاؤں زُلفِ دراز میں اُلجھ کر نہ رہ جائے اور صیاد اپنے ہی دام میں نہ آ جائے! مُلک کی مجموعی حالت ایسی ہے کہ جنہیں مسلم لیگ (ن) ایک آنکھ نہیں بھاتی اُنہیں بھی اِس کی بھرپور کامیابی کے لیے دُعا گو رہنا چاہیے۔ اور اِس دُعا کے مانگنے میں بھی عجلت پسندی ہی کا مظاہرہ کرنا چاہیے!

نئی امریکی گولی

اگر آپ کے ذہن میں یہ گمان پایا جاتا ہے کہ امریکیوں کا ضمیر مُردہ ہوچکا ہے یا سوگیا ہے تو فوراً اِس گمان کا گلا دبا دیجیے۔ امریکیوں نے ثابت کردیا ہے کہ اُن کے سینوں میں بھی دِل ہیں اور وہ دھڑکنا بھی جانتے ہیں۔ آپ سوچیں گے ایسا کیا ہوگیا کہ اچانک امریکیوں کے سینوں میں دِل بھی نکل آئے اور وہ دھڑک بھی رہے ہیں۔

1960 کے عشرے میں فلم "چھومنتر" کے لیے محمد رفیع مرحوم کا گایا اور بدرالدین قاضی مرحوم (جانی واکر) پر فلمایا ہوا ایک نغمہ بہت مقبول ہوا تھا جس کے بول تھے

غریب جان کے ہم کو نہ تم مِٹا دینا

تمہی نے درد دیا ہے، تمہی دوا دینا!

امریکی ماہرین نے بھی شاید یہ نغمہ سُن لیا اور درد کی دوا تیار کرڈالی! اُصول کا تقاضا بھی تو یہی ہے کہ جس نے مشکل پیدا کی ہو وہی اُسے آسان بھی کرے۔ امریکی پالیسیوں کے نتیجے میں ساری دنیا میں خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔

ان خرابیوں نے کئی اقوام کو تباہ کیا ہے اور لاکھوں، بلکہ کروڑوں افراد شدید اذیت سے دوچار ہوئے ہیں۔ اِس اذیت کے ازالے کے لیے اب امریکی ماہرین ہی آگے بڑھے ہیں۔

میری لینڈ یونیورسٹی میں مینٹل ہیلتھ گروپ کے ماہرین نے ایک ایسی گولی تیار کی ہے جو ماضی کی تلخ یادوں سے چھٹکارا پانے میں غیر معمولی حد تک معاون ثابت ہوگی۔

پروفیسر کیٹ فرین ہالٹ کا کہنا ہے کہ بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے اِس گولی کا استعمال ناگزیر ہے۔ قتل و غارت، تشدد اور بچپن کی دیگر تلخ یادوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے میں یہ گولی جادو کا سا اثر دِکھائے گی۔

ایک زمانے سے امریکا ساری دنیا کو دُکھ دینے کے "مِشن" پر ہے۔ امریکی خارجہ پالیسی اور عسکری مہم جوئی کی حکمتِ عملی ترتیب دینے والوں پر لازم تھا کہ متنازع پالیسی اور اعصاب شکن حکمتِ عملی سے پیدا ہونے والی تلخ یادوں کے تدارک کی بھی کوئی صورت نکالی جاتی۔ اور وہ صورت اب نکال لی گئی ہے۔ یعنی امریکا صرف جان سے مارنے والی گولیاں نہیں بناتا بلکہ سکون بخشنے والی گولیاں بھی تیار کر رہا ہے۔

امریکیوں نے جنہیں بہت دُکھ دیے ہیں، جن پر عرصہ حیات تنگ کردیا ہے اُن کے

لیے اِس گولی کی مدد سے کچھ آسانی پیدا ہوگی۔ وہ بھی امریکا بہادر کی دی ہوئی تلخ یادوں سے دامن چُھڑا کر کچھ دن سکون سے جی سکیں گے۔ جنرل (ر) خالد محمود عارف نے کہا تھا

یہ بھی اُس کی مہربانی ہے کہ وہ

!مار تو دیتا ہے، تڑپاتا نہیں

اہلِ جہاں سمجھ بیٹھے تھے کہ امریکا کو صرف دُکھ دینا آتا ہے، وہ مسائل پیدا کرنے ہی کا ہنر جانتا ہے۔ امریکا واحد ہی نہیں، مہربان قسم کی سُپر طاقت ہے۔ کِسی بھی سُپر پاور کا سب سے بڑا کمال یہ ہوتا ہے کہ کمال تیزی سے مارتی ہے یعنی فریقِ ثانی کو جان سے جانے میں دیر نہیں لگتی یعنی تکلیف تادیر نہیں رہتی۔ ہاں، کم بخت تلخ یادیں باقی رہ جاتی ہیں اور بدنامی کا باعث بنتی ہیں۔ بعض سخت جان قسم کے مخالفین زندہ رہ جاتے ہیں اور تلخ اور گھناؤنی یادوں کے ساتھ زندگی بسر کرکے واحد سپر پاور کی (مزید) بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ اچھا ہے کہ امریکی ماہرین نے اِس معاملے کو نظر انداز نہیں کیا اور بہت سے حریفوں کے ساتھ ساتھ پریشان کرنے والی یادوں کا بھی ٹنٹا ختم کرنے کی ٹھان لی۔ اب امریکی پالیسی میکرز نے سکون کا سانس لیا ہوگا کہ اگر ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے کچھ لوگوں کے ذہن میں تلخ یادیں پھنس بھی جائیں تو کوئی غم نہیں۔ چند گولیاں نگلیے اور بھول جائیے کہ امریکا نے کیا

!کیا تھا

مانا کہ امریکا سپر پاور ہے، ظلم ڈھانے کا شوقین ہے مگر بھئی "بڑپّن" کے بھی تو کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب امریکیوں کے بارے میں کہا جاتا تھا

خوب کرتے ہیں یہ بیمارِ محبت کا علاج

!درد بڑھتا ہی رہے ایسی دوا دیتے ہیں

جس سے درد بڑھتا ہی رہے وہ دوا دینے کا زمانہ لد گیا۔ اب درد کی شدت کم کرنے پر زور ہے۔ واحد سپر پاور آخرِ کار تبدیلی کے دور سے گزر رہی ہے۔ سپر پاور کے ظلم و ستم سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کے دلوں کو کچھ قرار دینے کی راہ نکالی جارہی ہے۔ تلخ یادوں کی شِدّت کم کرنے کی گولی کوئی ایسی انوکھی چیز بھی نہیں۔ واشنگٹن کی سرپرستی میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیمیں بھی تو طویل مدت سے یہی کام کرتی آئی ہیں۔ ایک ہاتھ سے زخم لگا کر دوسرے ہاتھ سے مرہم لگانا اِسی کو تو کہتے ہیں۔ اگر تباہی سے دوچار کردیا ہے تو تعمیرِ نو کے نام پر کچھ امداد بھی دے دی جائے۔ سُپر پاورز کے لیے زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں

ہیں!

اب امریکیوں نے تلخ یادوں سے نجات دلانے والی گولی تیار کرہی لی ہے توإسے بڑے پیمانے پر تقسیم کرنے کا بھی اہتمام کرے۔ افغانستان، عراق، ویتنام اور نکارا گوا میں تو اُسے یہ گولی تیار کرنے کے پلانٹ لگادینے چاہئیں! ان ممالک میں قدم قدم پر تلخ یادیں بکھری پڑی ہیں اوراِن کی کوکھ سے امریکاکے لیے شدید نفرت جنم لے رہی ہے۔ اگرزیادہ گولیاں تیار کرکے تقسیم کرنا مہنگاپڑے توسستا اورآسان سودا یہ ہے کہ کمزور اقوام کو تباہ کرنے اور کروڑوں افرادکے ذہنوں میں تلخ یادوں کے بیج بونے سے گریز کرے! یہ شاید امریکا بہادر کے لیے کوئی آسان معاملہ نہیں۔ یعنی گولیوں کی پیداوار بڑھائے جانے کی توقع رکھنی چاہیے!

اور جناب، ماضی کی تلخ یادوں سے چھٹکارا پانا خود امریکیوں کا بھی تومسئلہ ہے۔ جو دوسروں کے لیے گڑھے کھودتا ہے وہ خود بھی تو کبھی اُن میں گرتا ہے۔ مورجب ناچتے ناچتے اپنے پیروں کی بدہیئتی دیکھتا ہے تو روتا ہے۔ اب ہمارے مور کو بھی اپنے بد ہیئت پیروں کا خیال آیا ہے۔ جوکچھ امریکیوں نے اہل جہاں اور بالخصوص کمزوراقوام کے ساتھ کیا ہے اُس کے نتیجے میں خوداُن کی نفسی ساخت بھی تو متاثر ہوئی ہے۔ اور کیوں نہ ہوتی؟ ضمیر تو مجرم کا

بھی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اُسے مسلسل خوابیدہ رکھتا ہے۔ نکاراگوا، ویتنام، کوریا، افغانستان اور عراق میں امریکیوں نے جو کچھ کیا اس پر ان کا اپنا ضمیر بھی تو ملامت کرتا ہوگا۔ اور پھر یہ بھی تو ہوا ہے کہ کہیں کہیں تو امریکیوں نے اوکھلی میں سر دیا ہے اور "آ بیل مجھے مار" والی کیفیت پیدا کی ہے۔ یعنی امریکیوں نے تلخ یادیں صرف بخشی نہیں، اپنے لیے پیدا بھی کی ہیں! سُپر پاورز کے یہی اطوار ہوا کرتے ہیں۔

ضیاء جالندھری مرحوم نے خوب کہا ہے

اُفتادِ طبیعت سے اِس حال کو ہم پہنچے

!شِدّت کی محبت میں شِدّت ہی کے غم پہنچے

امریکی پالیسی میکرز کو اب اندازہ ہوچکا ہے کہ شِدّت کے بطن سے شِدّت ہی ہویدا ہوا کرتی ہے۔ بُرائی کا نتیجہ بُرائی ہی کی شکل میں برآمد ہوا کرتا ہے۔ اچھا ہے کہ کبھی کبھی گریبان میں جھانک لیا جائے۔ اِس طرح اپنی حدود کا تھوڑا بہت احساس تو زندہ رہتا ہے۔

نظریہ سازش

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔"

"بہت دنوں سے معاملات پُرسکون ہیں۔ کہیں یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی نہ ہو۔"

"یار سمجھ میں نہیں آ رہا یہ کیا ہو رہا ہے۔ کہیں کوئی ہلچل نظر نہیں آتی۔ اللہ خیر کرے، کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔"

"ملک پتا نہیں کس طرف جا رہا ہے۔ لگتا ہے کوئی سازش ہے جس پر خاموشی سے عمل ہو رہا ہے۔"

اِس نوعیت کے بہت سے جملے آپ نے سُنے اور پڑھے ہوں گے۔ ہر معاملے میں کسی سازش کا سِرا پانے کی کوشش کو ہم نے قومی فریضے کا درجہ دے دیا ہے۔ "سیاسی شعور" اِتنی بلند سطح پر پہنچ چکا ہے کہ اب ہر معاملہ ہمیں پستہ قد دکھائی دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر معاملے نے کسی اور معاملے کو کاندھوں پر اُٹھا رکھا ہے! جسے دیکھیے وہ پرائم ٹائم کے ٹی وی ٹاک شو دیکھ کر عجیب الطرفین بُقراطیت میں مبتلا ہے اور دُنیا کے تمام مسائل کا حل پیش کرنے کے عزم اور دعوے کے ساتھ میدان میں ہے تاکہ کسی بھی معاملے کے بطن سے سازش نکال کر دِکھائے اور داد پائے!

مرزا تنقید بیگ کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو کچرے کے ڈھیر سے بھی کام کی چیزیں برآمد کر لیتے ہیں۔ اُن کی قوتِ شامّہ ایسی غضب کی ہے کہ جو بُو پیدا نہ ہوئی ہو اُسے بھی نہ صرف سُونگھ لیتے ہیں بلکہ اُس کے حدودِ اربعہ بھی بتا دیتے ہیں! ہم نے کئی بار اُنہیں مشورہ دیا ہے کہ اگر کوشش کریں تو ایئر پورٹ پر خاصی پُر وقار نوکری مل سکتی ہے۔ اِس مشورے کو سُن کر اُنہوں نے ہمیشہ ہمیں ایسی خشمگیں نظروں سے گھورا ہے کہ ہمیں اپنے پیٹ میں چودہ ٹیکے لگتے ہوئے محسوس ہوئے ہیں! ایک زمانے سے اُنہیں ہر معاملے میں کوئی نہ کوئی سازش تلاش کرنے کی عادت سی پڑی ہوئی ہے اور اب یہ عادت پختہ ہو کر اِس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ اگر کسی معاملے میں کوئی ایسی ویسی بات دکھائی نہ دے رہی ہو تو اُن کا اضطراب قابلِ دید ہوتا ہے!

مرزا بہت خوش نصیب ہیں کہ اُنہیں اِس ملک میں اپنے "ذوق" سے مطابقت رکھنے والے خاصی بڑی تعداد میں میسر ہیں۔ نظریہ سازش یہ ہے کہ ہر معاملے میں کسی اور معاملے کی بُو سُونگھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ نان اِشو کو اِشو بنانے کا ہُنر ہے، ایک ایسا فن ہے جس میں کمال کی کوئی حد نہیں۔ ہر معاملے میں کوئی سازش تلاش کرنے والے اپنے فن میں ایسے طاق ہوتے ہیں کہ کبھی کبھی تو دُنیا یوں حیران رہ جاتی ہے کہ داد دینا بھی یاد نہیں رہتا!

آپ نے شعبدہ باز تو دیکھے ہی ہوں گے جو ٹوپی سے کبوتر، جیب سے انڈے اور آستین سے نوٹ نکال کر آپ کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ نظریہ سازش پر یقین رکھنے والے بھی اپنے اندر شعبدوں کی ایک دُنیا بسائے پھرتے ہیں۔ جہاں کچھ بھی دِکھائی اور سُجھائی نہ دیتا ہو وہاں بھی یہ کوئی نہ کوئی سازش دریافت کر ہی لیتے ہیں۔ اور اگر دریافت کرنا ممکن نہ ہو تو پیدا کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔

نظریات کے مینا بازار میں نظریہ سازش کا اسٹال ہے جو بہت دور سے دِکھائی دے جاتا ہے۔ اِس سے مقبول اور "عوامی" نظریہ اب تک متعارف نہیں کرایا جاسکا ہے۔ آسان ایسا ہے کہ کوئی بھی سمجھ سکتا ہے، اپنا سکتا ہے۔ بس ذرا ذہن کو گھوڑا بنا کر دوڑانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک بار ذہن گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑنے لگے تو پھر کیسی حد اور کہاں کی حد؟ کچھ بھی سوچتے پھریے، کس میں دم ہے کہ روکے اور ٹوکے! اگر آپ نے ایک بار سوچنا شروع کیا تو پھر کس سازش کی مجال ہے کہ چُھپی رہے، سامنے نہ آئے؟ اور کس معاملے میں کا کون سا پہلو ہے جس میں پہلو تہی کی ہمت پیدا ہو؟ سوچیے اور سازش کا سِرا پایئے۔ اور جب سِرا مِل جائے تو

اُسے تھام لیجیے، رفتہ رفتہ آگے بڑھیے اور پھر دیکھیے کہ دوسرے سِرے تک پہنچتے پہنچتے کتنی دُنیاؤں کی سیر نصیب ہوتی ہے، کیسے کیسے مراحل سے گزرنے کا موقع ملتا ہے!

یاد رکھیے، نظریہ سازش کی رُو سے دنیا کے ہر معاملے میں کوئی نہ کوئی سازش چُھپی ہوئی ہوتی ہے اور کِسی سازش کا بظاہر نہ پایا جانا بھی سازش ہی کے زُمرے میں آتا ہے! یعنی اگر کِسی معاملے میں رد عمل ہو تو سازش، نہ ہو تو زیادہ بڑی اور خطرناک سازش! کچھ ہونے والا ہو تو دِل پریشان رہتا ہے۔ اور اگر تادیر کوئی ایسی ویسی بات واقع نہ ہو تو پریشانی بڑھ کر وحشت میں تبدیل ہوتی ہے اور دِل و دِماغ کو ماؤف کرکے دم لیتی ہے۔ یعنی

دِل گِھرا رہتا ہے اندیشوں میں
حادثے ہیں کہ گزرتے ہی نہیں!

مرزا کو ہم نے اکثر اِس حالت میں دیکھا ہے کہ کِسی معاملے پر غور کرتے کرتے خود فراموشی کی چادر اوڑھ لیتے ہیں اور سوچتے سوچتے، سازشوں کے سِرے پکڑنے کی دُھن میں کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔ پھر اُنہیں کاندھے ہلا کر جگانا یا گُدّی سے پکڑ کر حقیقت کی دُنیا میں واپس لانا پڑتا ہے۔ لوگوں کو حیران (اور پریشان) کرنے کے معاملے میں مرزا پہلے بھی کم نہ تھے مگر خیر، سازش

تلاش کرنے کے لیے سوچوں میں غرق ہو جانے کے مشغلے نے اُنہیں واقعی چلتا پھرتا عجوبہ بنا ڈالا ہے۔ جب وہ استغراق کے عالم میں ہوتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ کسی کو اُنہیں بغیر ٹکٹ دیکھنے نہ دیا جائے! ہر معاملے میں کسی سازش کا سِرا تلاش کرنے کی عادت ایسی پختہ ہوچکی ہے کہ بقول ذوق ع

!چُھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مرزا اور اُن کے قبیل کے دوسرے بہت سے بلکہ کروڑوں افراد کا مخمصہ اور المیہ یہ ہے کہ بات کسی کی ہو اور خواہ کہیں سے شروع ہوئی ہو، سازش تک پہنچ کر دم لیتی ہے۔ زمانے بھر کے مسائل کو بُھول بھال کر، نظر انداز کرکے تحت الشعور سازش کی بُو سُونگھنے کے لیے پیہم متحرک رہتا ہے۔ بات خواہ کسی تناظر میں ہو، ذہن کی آنکھ سازش یا ممکنہ سازش) کو گھورتی رہتی ہے۔ بقول فرید جاوید مرحوم ع)

گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے

کچھ لوگوں میں یہ معاملہ اِس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اگر معاملات صاف سُتھرے چل رہے ہوں تو وہ اُلجھن میں مبتلا رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنی صحت کے معاملے میں سوچتے سوچتے ہر وقت بیماری کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ اور پھر بیمار پڑ کر ادویہ کے سہارے زندگی بسر کرنا شروع کردیتے ہیں۔ یہ ذہنی روش

اُنہیں مستقل بیمار رکھتی ہے۔ اور اگر وہ کچھ دن بیمار نہ پڑیں تو پریشان ہو اُٹھتے ہیں اور گھبرا کر بیمار پڑ جاتے ہیں۔ نظریہ سازش کی اسیری میں زندگی بسر کرنے والوں کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اگر کسی معاملے میں کوئی سازش نہ پائی جائے یا اُس کا سِرا اِن کے ہاتھ میں نہ آئے تو سمجھ لیجیے کہ اِن کے دِل و دِماغ پر قیامت گزرنے لگتی ہے! آکسیجن کے بغیر شاید یہ جی جائیں، ہر بات میں سازش تلاش کئے بغیر جینا اِن کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ ماحول کو دُعا دیجیے کہ وہ نظریہ سازش پر یقین رکھنے والوں کے ذہنوں کو خوراک بہم پہنچاتا رہتا ہے۔ اہلِ سیاست کی مہربانی ہے کہ ہر معاملے میں کچھ نہ کچھ ایسا کر جاتے ہیں کہ نظریہ سازش پر یقین رکھنے والوں کا اپنے نظریے پر یقین مزید محکم ہو جاتا ہے!

جنّات کا سا حوصلہ درکار ہے جناب

مہنگے کپڑے، شاندار گاڑیاں اور ہر وقت مکھی کی طرح منڈلانے والے خوشامدی ہی نہیں، لیڈر کی اور بھی بہت سی نشانیاں ہوا کرتی ہیں۔ اور یہ بات ہم سے زیادہ کون جانتا ہوگا کیونکہ اب ہم میں لیڈر تو رہے نہیں، صرف نشانیاں رہ گئی ہیں!

انتخابی نتائج نے پاکستان میں بہت سے لوگوں کی ترجیحات یکسر تبدیل کردی ہیں۔ کل تک شریف برادران میں زمانے بھر کی خامیاں، خرابیاں اور بُرائیاں پائی جات تھیں۔ اور تقریباً اِتنی ہی تعداد اُنہیں مطعون کرنے والوں کی بھی تھی! وہ زمانہ ہوا ہوچکا ہے۔ اپ ڈیٹ یہ ہے کہ بہت سے لکھنے اور بولنے والوں کی نظر میں اب میاں نواز شریف اور شہباز شریف سے بڑی ہستیاں پاکستان میں پائی ہی نہیں جاتیں۔ وقت کے ساتھ اپنا لہجہ بدلنے میں کوئی قباحت نہیں۔ مگر جناب! ایک رب کی عبادت کرنے والے اُسی کی قدرت کے ایک مظہر یعنی سُورج کو چڑھتی حالت میں پُوجنے سے باز نہیں آتے۔ جس طرح سیاسی جماعتیں اقتدار کی ٹرین میں ریزرویشن کے لیے بے تاب رہتی ہین بالکل اُسی طرح بہت سے اخباری لکھاری بھی چاہتے ہیں کہ شاہ کے مصاحبین میں شُمار ہوں اور اِتراتے پھریں! تحریر کا لہجہ بدلتا جارہا ہے۔ ممکن ہے آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ لہجہ بدلنے اور بندر کی

طرح قلابازی کھانے میں تو بہت فرق ہوتا ہے۔اِن دونوں معاملات کو خلط ملط تو نہ کیا جائے!

آمدم بر سرِ مطلب۔ تہمینہ دولتانہ نے لوڈ شیڈنگ کے جن کو یہ کہتے ہوئے ڈرایا ہے اُسے بوتل میں بند کرنے کے لیے مسلم لیگ (ن) کے پاس بھی ایک جن ہے جس کا نام شہباز شریف ہے! اِس بات کا لوڈ شیڈنگ کے جن نے بُرا مانا ہو تو مانا ہو، شہباز شریف نے ذرا بھی بُرا نہ مانتے ہوئے جتادیا کہ اب وہ سیاست سیکھ گئے ہیں! اخبار نویسوں نے جب تہمینہ دولتانہ کے بیان کی طرف توجہ دِلائی تو شہباز شریف نے خود کو جن تسلیم کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ بُھوت ہرگز نہیں ہیں!

ہم سمجھ نہیں پائے کہ چھوٹے میاں صاحب کو یہ ضرورت کیوں پیش آئی کہ خود کو بُھوت قرار نہ دیں! ہوسکتا ہے اُن کے ذہن میں یہ بات رہی ہو کہ جن تو اللہ کے کلام میں بھی مذکور ہیں اِس لیے لوگ اُنہیں کسی نہ کسی طرح قبول کرلیتے ہیں، بُھوتوں کو قبول نہیں کرتے کیونکہ وہ چمٹ جاتے ہیں! اور شاید شہباز شریف نے یہ بھی سوچا ہو کہ خود کو بُھوت یعنی ghost سمجھنے سے گریز ہی بہتر ہے کیونکہ ریاستی مشینری میں پہلے ہی اچھے خاصے ghosts موجود ہیں جو سرکاری وسائل شیرِ مادر سمجھ کر پی جاتے ہیں! یہی سبب ہے کہ سرکاری

دِکھائی دیتا ہے! کہیں کہیں تو اِتنے اُلّو بول رہے ہوتے ghostly دفاتر کا ماحول خاصا ہیں کہ گمان گزرتا ہے شاید سِفلی عُلوم والوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں! عوام کا پسندیدہ شغل اب یہ رہ گیا ہے کہ قومی وسائل شیرِ مادر کی طرح پینے والوں کو دم بخود ہو کر دیکھیں اور دِل مسوس کر رہ جائیں۔

ہو سکتا ہے شہباز شریف نے خود کو بُھوت قرار دینے سے اِس لیے بھی گریز کیا ہو کہ مصاحبین بننے کے خواہش مند بھوت بن کر اُن سے چمٹنے سے گریز کریں! آج کل لوگ مصاحبین کی صف میں شامل ہونے کے لیے اُتاولے ہوئے جا رہے ہیں اور وہی دَھکّم پیل نظر آ رہی ہے جو لنگر کی تقسیم کے وقت مزارات پر دِکھائی دیا کرتی ہے!

ایک زمانے سے ایوان ہائے اقتدار بُھوت بنگلوں کی سی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اِن کے مکین ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ آئیں بھی کیسے؟ اِن کے اطوار خاصے مافوق البشر قسم کے ہوتے ہیں۔ آسیب زدہ عمارتوں کے باسیوں کی طرح ایوان ہائے اقتدار کی مخلوق بھی عوام تک آنا پسند نہیں کرتی اور یہ بات بھی وہ سخت ناپسند کرتی ہے کہ عوام اُس تک پہنچیں!

حالات کی چکّی میں پِسے ہوئے عوام کی حالت تو یہ ہے کہ ایوانِ صدر یا وزیر

اعظم ہاؤس کے سامنے سے گزرنا ہو تو تیزی پکڑتے ہیں۔ اور وہ تیز نہ بھی ہوں تو سیکیورٹی والے تیزی سے گزرنے پر مجبور کردیتے ہیں! اقتداری بُھوت بنگلوں کے مکین اگر اِنسانوں میں آنا، اُن کے دُکھ درد جاننا اور اُن کے مسائل حل کرنا صرف ناپسند نہیں بلکہ اپنی شان میں گُستاخی تصور کرتے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ یہ روش بھی مفادِ عامہ کو ذہن نشین رکھتے ہوئے اختیار کی گئی ہو۔ اقتدار کی ٹرین میں سوار ہونے والوں کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر عوام کے دِل مزید کُڑھیں گے۔ عوام کو تکلیف سے بچانے کے لیے اگر اہلِ اقتدار اُن سے دور رہتے ہیں تو یہ کچھ زیادہ قابلِ مذمت بات نہیں۔ اچھا ہوا کہ تہمینہ دولتانہ نے ہمیں بتادیا کہ جن کے ہاتھ میں اقتدار ہے اُنہیں جِن سمجھ کر اُن سے دور رہا جائے۔

مسلم لیگ (ن) مرکز میں تیسرا حکومتی سفر شروع کرچکی ہے۔ اِس بار واقعی جِناتی نوعیت کے چیلنج درپیش ہیں۔ پہاڑ کا سا حوصلہ درکار ہے۔ دس بارہ برس میں جس آوے کو مزید محنت اور انہماک سے مزید بگاڑا گیا ہے اُسے سنوارنا اِنسانوں کے بس کی بات نہیں۔ ایسے میں وہی لوگ کامیاب ہوسکتے ہیں جو خود کو جِنات سمجھ کر کام کریں۔

اگر شہباز شریف نے تہمینہ دولتانہ کی بات کا بھرم رکھتے ہوئے لوڈشیڈنگ کے

جن کو بوتل میں بند کرلیا تو سمجھ لیجیے قوم کی نَیا پار لگادی۔ پھر جو چاہیں گے، قوم دے گی۔ لوڈ شیڈنگ کے جن کا بوتل میں بند ہو جانا مسلم لیگ (ن) کے لیے بہت سے دروازے خاصی آسانی سے کھول دے گا۔ شہباز شریف ایک زمانے سے پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے جنّاتی نوعیت کے کام کرتے آئے ہیں۔ مخالفین میں تنقید کرنے کا تو حوصلہ تھا مگر اِتنی ہمت کسی میں نہ تھی کہ کام کی بُنیاد پر اُنہیں جِنّات کے زُمرے میں داخل کرتا۔ ایسا جِنّاتی حوصلہ تو تہمینہ دولتانہ ہی میں ہو سکتا تھا!

مارچ میں ختم ہونے والا جمہوری دور بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے کچھ کم جِنّاتی نہ تھا۔ جو کچھ اُس دور میں ہوا وہ اگر ختم کرنا ہے تو اِنسانوں جیسے دِکھائی دینے والے حکمرانوں کو جِنّاتی صِفات کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ یہی وقت کا تقاضا ہے۔ گزشتہ دورِ حکومت حکمرانی کے انداز کی رُو سے جِنّاتی تھا مگر نتائج پر نظر ڈالیے تو بُھوت بن کر ڈراتا ہے! ذرا سا یاد کیجیے تو خُون خشک ہونے لگتا ہے۔ قوم کی رگوں میں ویسے ہی خُون کم رہ گیا ہے۔ ایسے میں نئی حکومت کی طرف سے ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے جو بُھوت بن کر قوم کو ڈرائے۔ پہاڑ جیسے چیلنجز جِنّات کا سا حوصلہ چاہتے ہیں۔ توانائی کا بحران کسی بھی سیاسی جماعت کی تمام صلاحیتوں کو نچوڑ لینے کے لیے کافی ہے۔ مسلم لیگ (ن) کو بھی ثابت کرنا ہوگا کہ جِنّاتی مسائل کے سامنے وہ بھی جِنّاتی

قسم کے عزائم کے ساتھ سینہ سپر ہے۔ قوم نہیں چاہتی کہ جن کے ذکر سے شروع ہونے والا جمہوری دور فنشنگ لائن تک پہنچتے پہنچتے بھوت بن کر ڈرانے لگے۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے

دُنیا اب تک ہزار پندرہ سو سال پہلے کی دُنیا میں جی رہی ہے۔ اُس کے پاس آئیڈیاز کی کمی ہے۔ اور کمی کیا، قِلّت کہیے۔ دُنیا والے نئی بات سوچنے کے لیے پتا نہیں کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ مگر یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ع

یہ رُتبۂ بلند مِلا جس کو مِل گیا!

دُنیا والے ہر معاملے میں ندرت تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اِس کوشش میں کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کر جاتے ہیں کہ آدمی سُنے تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائے۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ دُنیا بھر میں کام کرنے کو ہر قسم کے تناؤ اور دباؤ سے پاک، پُرسکون زندگی بسر کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم ایسی باتوں پر ہنس ہی سکتے ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ہمارے ہاں اِس تصور کے برخلاف کام نہ کرنے کے تصور کو گلے لگاکر کِتنی آسانیاں پیدا کی گئی ہیں! دُنیا بھر میں عمومی تاثر اور تصور یہ ہے کہ کام کیجیے تو خوش حالی آئے گی۔ ہم تو یہ ساری باتیں سُن کر ہنس دیا کرتے ہیں۔ اپنے ماحول کا جائزہ لیکر ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جو لوگ کام کرتے ہیں وہ تاریک راہوں میں مارے جاتے ہیں! زندگی بھر کام کرنے والے اِس باریک نکتے کو سمجھ ہی نہیں پاتے

!کہ سارا وقت کام میں لگا دیا جائے تو آدمی زندگی کا لطف کب پائے گا

کام پر جانا اور واپس آنا اہلِ جہاں کے نزدیک کوئی دلچسپ بات ہوگی، ہمارے ہاں تو یہ ایک ایسی آزمائش ہے جس کا صِلہ صرف اللہ دے سکتا ہے! کام پر جانے اور وہاں سے واپس آنے سے محظوظ ہوا جاسکتا ہے؟ آپ شاید یہ سوال پڑھ کر ہنس رہے ہیں۔ یقین کیجیے دُنیا والے تحقیق میں جُتے ہوئے ہیں کہ کام کے ماحول کو کس طور زیادہ سے زیادہ پُرلطف بنایا جائے! آپ ہی بتایئے اِس سے بڑھ کر مضحکہ خیز بات کون سی ہو سکتی ہے؟ ارے صاحب! گھر بیٹھ کر سُکون سے ٹی وی دیکھنے یا جہان بھر کے موضوعات پر بتیانے سے زیادہ سُکون کسی عمل میں پایا جاسکتا ہے؟

معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینا اِنسان کے لیے لازم ہے کہ ایسا کئے بغیر وہ کچھ پا نہیں سکتا۔ یہ اہلِ جہاں کی سوچ ہے۔ ہمارے ہاں اِس حوالے سے بھی نئے تصورات پنپ چکے ہیں۔ اگر دُنیا اِن تصورات کی ایک جھلک بھی دیکھ لے تو عَش عَش کر اُٹھے اور پھر غش کھا کر گر پڑے۔ بُھوسے کے ڈھیر میں سُوئی تلاش کرنے کا ہُنر پاکستانی قوم پر ختم ہے۔ گنّے کے جس پُھوس سے مزید ایک قطرہ بھی کشید نہ کیا جاسکتا ہو اُس سے ہم گلاس بھر رَس نکال کر دِکھا سکتے ہیں۔ معاشی سرگرمیوں کے معاملے میں ہم نے ایسا ہی کیا ہے۔ کچھ نہ کرکے لوگ زیادہ

کماتے ہیں۔ اور محنت کرنے والے تاریک کمرے میں ایسی کالی بلی تلاش کرتے رہتے ہیں
!جو وہاں ہے ہی نہیں

ایک زمانہ تھا جب لوگ مہم جوئی کے لیے پہاڑوں پر چڑھا کرتے تھے، بیویوں کی چوٹیاں نظر انداز کرکے پہاڑی چوٹیاں سَر کرنے کے فراق میں رہا کرتے تھے۔ کوئی جنگلات میں عجیب الخلقت چیزیں تلاش کرنے نکلتا تھا اور کوئی ویرانوں کی خاک چھان کر مہم جوئی کے شوق کو تکمیل سے ہمکنار کیا کرتا تھا۔ مگر یہ سب گزرے ہوئے زمانے کی باتیں ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے بعض سَر پھرے اب بھی ایسا ہی کرتے پھرتے ہیں۔ اب کوئی اُنہیں کیسے سمجھائے کہ زمانہ بدلا ہے تو مہم جوئی کا مفہوم بھی بدل گیا ہے۔ ہم جس ٹائپ کی حکومتوں کو برداشت کرتے آئے ہیں وہ بھی مہم جوئی ہی کی ایک شکل ہے! دُنیا والے معاشی سرگرمیوں کو زیادہ سے زیادہ پُرلطف بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ کِسی کو کیا معلوم کہ ہم نے کام پر جانے کو بھی مہم جوئی کے زُمرے میں داخل کردیا ہے۔ جو لوگ ڈیوٹی پر جانے کے لیے گھر سے نکلتے ہیں ذرا غور سے اُن کے چہروں پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ حُزن و ملال کا درجۂ کمال کیا ہوتا ہے! اگر مُصوّر غور کریں تو کام پر جاتے ہوئے لوگوں کے چہروں پر بکھرے ہوئے تاثرات کی مدد سے تجریدی
!آرٹ کے بہترین نمونے معرضِ وجود میں لا سکتے ہیں

یہ ''اہلِ درد'' جب کام پر روانہ ہوتے ہیں یعنی گھر سے قدم باہر رکھتے ہیں تو ''مُغلِ اعظم'' کا کورس یاد آنے لگتا ہے۔ ع

! تمہاری دُنیا سے جا رہے ہیں، اُٹھو ہمارا سلام لے لو

یونان کی کِسی شپنگ کمپنی کے مالک کو اگر دو تین جہازوں کے ڈوبنے کی اطلاع ملے تب بھی اُس کے چہرے پر شاید وہ کرب پیدا نہ ہوگا جو ہمارے ہاں ہفتہ وار تعطیل کے بعد پیر کی صبح کام پر جانے والوں کے چہروں پر پایا جاتا ہے! میر تقی میرؔ فرماتے ہیں ۔

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے

! درد و غم کِتنے کئے جمع تو دیوان کیا

میرؔ کو کیا معلوم تھا کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا جب ہر پاکستانی اُن کے دیوان کی مجموعی

! کیفیت کو چہرے پر سجائے پھرا کرے گا

علامہ راشد الخیری کو بے حد احترام کے ساتھ ''مُصوّرِ غم'' کہا جاتا ہے۔ اُن کی تحریر خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ علامہ اگر اُکھڑے اُکھڑے قدموں سے کام پر جانے والوں کو ایک نظر غور سے دیکھتے تو تحریر میں مزید اور لازوال سوز پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے! خواہ میر دردؔ اور فانیؔ بدایونی کی زندگی غم

کی حقیقی کیفیت بیان کرتے گزری۔ ہمارا خیال ہے وہ بھی غم اور کرب کا حق ادا نہ کرسکے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کچھ دیر کو آج کی دُنیا میں آئیں اور ذرا دیکھیں کہ پاکستانی قوم کے جوانانِ باکمال ڈیوٹی پر جاتے ہوئے کس دردناک مرحلے سے گزرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حواس کی دُنیا میں ہیجان برپا کرنے والا یہ منظر اُن کے شعورِ غم کی سطح کچھ بلند کردے!

ایک زمانہ تھا جب فلموں میں ہیرو کی انٹری غضب ناک ہوا کرتی تھی۔ بہت سی فلمیں تو ہیرو کی انٹری والے سین کی بنیاد پر یاد رکھی جاتی تھیں۔ ہمارے بہت سے ہیروز جب صبح کام پر پہنچتے ہیں تو اُن کی انٹری بھی قابلِ دید اور قابلِ داد ہوتی ہے! چہرے پر اُداسی، پریشانی، وحشت، بے چینی، مایوسی اور خدا جانے کون کون سے احساسات کی دُکان سجی ہوئی ہوتی ہے! اُنہیں دیکھ کر دُنیا کی بے ثباتی کا پوری شِدّت سے احساس ہوتا ہے۔ یقین آنے لگتا ہے کہ اِس دُنیا میں اگر کچھ ہے تو وہ بس غم ہے، باقی تو سب مایا ہے!

بعض ہیروز جب دفتر یا فیکٹری میں انٹری دیتے ہیں تو اُنہیں دیکھتے ہیں محمد رفیع کا گایا ہوا فلم ''آن'' کا گانا کانوں میں گونجنے لگتا ہے۔ ؎

دِل میں چُھپاکے پیار کا طوفان لے چلے
ہم آج اپنی موت کا سامان لے چلے!

ڈیوٹی پر آ کر بہت بڑا معرکہ سَر کرنے والوں دیکھ کر اُن کے ساتھی سہم جاتے ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ مُنہ پر بارہ بجنے کا سبب پوچھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک لوگ دور دور رہتے ہیں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ اُنہیں کوئی کام نہ دیا جائے۔ خدشہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں پھٹ نہ پڑیں۔ بقول غالبؔ

پُر ہوں میں درد سے یوں راگ سے جیسے باجا

!اِک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

اگر آپ نے کچھ ہمت اپنے اندر پیدا کی اور چہرے کے ہَونّق پن کا سبب پوچھ بیٹھے تو سمجھ لیجیے گئے کام سے۔ آن کی آن میں دوغزلہ، سہ غزلہ اور پتا نہیں کون کون سا غزلہ، بلکہ شہر آشوب سُننے کو ملے گا! ابھی تھوڑی پہلے جو سراپا الم تھا، اوپر سے نیچے تک ملال ہی ملال تھا اُس نے شیر کی طرح دہاڑنا شروع کر دیا۔ اور آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اِس درندانہ مزاج کو کنٹرول کِس طرح کیا جائے! آپ سوچتے ہی رہ جائیں گے کہ یہ !کون سا شیر ہے جس کی آمد سے پورا دفتر رَن کی طرح کانپ رہا ہے

اِس بار آپ ہفتہ تعطیل کے بعد دفتر، فیکٹری یا دکان پہنچیں تو غور سے دیکھیے کہ آپ کے ماحول کا ہیرو کِس طرح انٹری دیتا ہے۔ اُسے دیکھ کر آپ کو

اندازہ ہوگا کہ دلیپ کمار کو لوگ خواہ مخواہ ''شہنشاہِ جذبات'' کہتے ہیں! اور تبّسم سُلطانہ مرحومہ کا غم بدوش چہرہ بھی آپ کو بے معنی سا لگنے لگے گا!

شیطان کا کُھلا خط

ایم ابراہیم خان

شیطان کا کُھلا خط

میرے عزیز ہم وطنو!

حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کو ہم وطن قرار دیا ہے تو یہ نہ سمجھیے کہ کسی مُغالطے کا شکار ہوا ہوں۔ یہ بات میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔ شرمندہ بھی نہ ہوں کہ میں آپ کا ہم وطن ہوں۔ یہ آپ کے لیے، بلکہ ہم دونوں کے لیے فخر کی بات ہے۔ ساری دُنیا گھوم کر دیکھ چکا ہوں۔ جب پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو اندازہ ہوا کہ صحیح جگہ پہنچا ہوں۔ جو کچھ میں نے دیکھا اُس کی بنیاد پر آپ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا اور پاکستان کو اپنا مستقل مستقر بنالیا۔

اِس خط کے لکھنے کی غایت یہ ہے کہ میں اب کوئی بھی الزام اپنے سَر لینا نہیں پسند نہیں کروں گا۔ رمضان کا آغاز ہوچکا ہے۔ اب میں ایک ماہ کے لیے قید کیا جاچکا ہوں۔ یہ قید بھی غنیمت ہے۔ میں قید ہو کر بھی مطمئن ہوں۔ اطمینان کیوں نہ ہو؟ اب ایک ماہ تک جو کچھ بھی ہوگا یا کیا جائے گا اُس کے

لیے مُجھے تو مُوردِ الزام ٹھہرانا ممکن نہ ہوگا۔ رمضان کے تین عشروں میں جو کچھ ہوگا اُس کی پوری ذمہ داری آپ پر عائد ہوگی یعنی ہر عمل کا حساب اُس کے کرنے والے سے لیا جائے گا۔ میں قید میں ہوں۔ اب کوئی مُجھے قربانی کا بکرا نہیں بنا سکے گا۔ اب کوئی کیسے کہہ سکے گا کہ اُسے تو شیطان نے بہکا دیا تھا؟

ہر سال رمضان کی آمد پر مسلمان بے حد مَسرّت محسوس کرتے ہیں۔ عبادت کے ذریعے رب کو منانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس بات پر بھی خاصی مَسرّت محسوس کی جاتی ہے کہ مُجھے ایک ماہ کے لیے قید کر دیا جاتا ہے۔ میں تو سُکون کا سانس لیتا ہوں کہ چلیے، ایک ماہ کے لیے ہی سہی، اہلِ پاکستان کے اعمال کا الزام میرے سَر تو نہیں تھوپا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب اِس مُلک کے لوگ کِسی بھی معاملے میں مُجھ سے تحریک پانے کے محتاج نہیں رہے۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اُس کے لیے مُجھے مُوردِ الزام ٹھہرانا تھوڑا بہت نہیں، اچھا خاصا مضحکہ خیز ہے۔ مگر خیر، آپ میری بات کہاں مانیں گے؟ حیران ہوں کہ اہلِ پاکستان کِس مِٹّی کے بنے ہیں۔ ہر وہ کام کیے جاتے ہیں جس میں سراسر خرابی ہو، بگاڑ ہو۔ کِسی کام کا نتیجہ چُھپا ہوا ہو تو اُس کام کے کرنے والے دھوکا کھا سکتے ہیں۔ تماشا یہ ہے کہ جس کام کا نتیجہ سب

پر عیاں ہو اُسے بھی بصد شوق کئے جانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی، بلکہ اُلٹا فخر کیا جاتا ہے۔ زمانے بھر کے حرام کام کرنے میں توقیر کا پہلو تلاش کرنا کوئی میرے ہم وطنوں سے سیکھے۔ ہر غلط کاری کو پورے اہتمام کے ساتھ انجام تک پہنچاتے ہیں اور پھر اُس کا ''کریڈٹ'' لینے کی کوشش بھی کرتے ہیں!

رمضان رحمتیں اور برکتیں سمیٹنے کا مہینہ ہے۔ ہر سال رمضان کے آغاز پر میں یہ سوچتا ہوں کہ شاید اِس قوم کے لوگ اپنی اصلاح پر کچھ توجہ دیں۔ مگر افسوس کہ ہر بار میں اپنی اِس سوچ پر شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ شیطان بھلا کیوں اِنسانوں کی بھلائی سوچنے لگا! دِل خراش حقیقت یہ ہے کہ اِس سرزمین کے لوگوں کو دیکھ کر میں اُلجھتا جاتا ہوں۔ میرے بہکانے کی کوئی حد ہو سکتی ہے مگر یہاں کے لوگوں کے بھٹکنے کی کوئی حد نہیں۔ اِنسان غلط راہ پر بھی چلتا ہے تو کچھ نہ کچھ سوچ سمجھ کر۔ کوئی حساب ضرور طے کیا جاتا ہے کہ کہاں تک اور کس طرح جانا ہے۔ اب ایسی بھی کیا بے اختیاری کہ چل پڑے تو بس چل پڑے! رات دن حیرت میں غلطاں رہتا ہوں کہ لوگ ایک کے بعد ایک غلط کام کئے جاتے ہیں اور جھجکتے ہیں نہ شرمندہ ہوتے ہیں۔

آپ سوچیں گے شیطان کو کیا پڑی ہے کہ اِنسانوں کا بھلا سوچے۔ آپ کا حیران ہونا اور ایسا سوچنا غلط یا حیرت انگیز نہیں۔ مگر یہ بات آپ ہر گز نہ بُھولیں کہ شیطان کے سینے میں بھی دِل تو ہوتا ہے۔ اُس کے بھی جذبات ہوتے ہیں، احساسات ہوتے ہیں۔ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب شیطان بھی رُک کر سوچتا ہے، کُڑھتا ہے۔ مجھے بہکانے میں بہت لطف محسوس ہوتا ہے۔ میں نے اِنسانوں کو ہمیشہ بے حساب بہکایا ہے مگر لوگ مزاحمت بھی تو کرتے ہیں۔ مزا اگر ہے تو اِس بات میں کہ میں بہکاؤں اور لوگ مزاحمت کریں۔ اور پھر تھک کر ہتھیار ڈال دیں۔ یہاں تو مزاحمت نام کی کوئی چیز ہی نہیں رہی۔ اِس حالت میں تو بہکانے کا مزا ہی جاتا رہا ہے!

ایک زمانہ تھا جب میں اِنسانوں کو بہت محنت سے بہکایا کرتا تھا۔ جب میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو دیکھا کہ یہاں لوگ پہلے ہی مائل بہ عِصیاں ہیں۔ یعنی بہکانا آسان ہے۔ میں نے سوچا اِسی سرزمین پر مستقل سکونت اختیار کرلوں کہ یہاں کام آسان ہے۔ آسانی تلاش کرنے کی خواہش نے میرے لیے بے حساب مُشکلات پیدا کردیں۔ اب کیا بتاؤں کہ اہل پاکستان تو میری ہر تحریک پر آمنّا و صدقنا کہنے کو تیار رہتے ہیں۔ ابتدا میں اچھا لگا کہ چلو، کام آسان ہوگیا ہے۔ مگر اب سوچتا ہوں تو کُڑھن بڑھتی جاتی ہے۔ آپ لوگوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو سوچتا ہی چلا جاتا ہوں۔ آپ بھی کیا لوگ ہیں! جو طے

کرلیا، بس طے کرلیا۔ کبھی انجام کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔
یہ کُھلا خط صرف اِتنی سی گزارش کے لیے لکھا گیا ہے کہ جس طرح میرے بہکانے کی ایک حد ہے بالکل اُسی طرح آپ کے بہکنے کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ میں شیطان ہو کر جب کبھی کبھی ضمیر کی خلش محسوس کرتا ہوں تو آپ انسان ہو کر اپنی اصلاح پر مائل ہونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ قعرِ مذلّت میں گرنے کی بھی بہر حال کوئی تو حد ہوتی ہے۔ میں بھی ذِلّت کے گڑھے میں گِرا مگر خیر، اپنا وقار بھی سلامت رکھا ہے۔ آپ کی طرف دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ جن پر بنانے والے کو بھی ناز ہے وہ کِس طرف رواں ہیں، کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ لوگ میری بتائی ہوئی راہوں پر چل چل کر کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ تلخ تر حقیقت یہ ہے کہ اب تو میرے قدم بہکنے لگے ہیں۔
سوچتا ہوں بہکانے سے توبہ کرلوں!
دِل کی گہرائی سے یہ گزارش کر رہا ہوں کہ ایک ماہ تک تو ہر بُرے کام سے مُجتنب رہیں تاکہ میری بندش کا فیصلہ برحق ثابت ہو۔ رب نے مُجھے باندھ کر آپ کو کُھلا چھوڑ دیا ہے مگر یہ آزادی ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور کاروبار کے نام پر نفع خوری کے لیے ہرگز نہیں۔ رمضان برکتوں کا مہینہ ہے اور برکت ایک دوسرے کو لُوٹنے اور نوچنے میں نہیں بلکہ ایک دوسرے کے درد کو سمجھ کر

اُسے بانٹنے میں ہے۔ آپ لوگ سال بھر ایک دوسرے کو لُوٹتے اور بھنبھوڑتے رہتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کم از کم ایک ماہ تک تو اِس روش پر چلنے سے گریز کریں۔ اِس کے بعد تو پھر وہی آپ ہیں اور پھر وہی میں ہوں۔ اچھی طرح سوچ لیجیے۔ اب ایک ماہ تک آپ جو کچھ کریں گے اُس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ میں تو بندھا پڑا ہوں۔ آپ کو اگر باندھا نہیں گیا ہے تو اِسے مادر پدر آزادی میں تبدیل نہ کریں۔

جو کبھی کبھی پیدا ہو پاتا ہے اُس خُلوصِ نیّت کے ساتھ،

آپ کا

شیطان

لکھنے کا مزا تو اب آیا

کِسی زمانے میں لِکھنا ایسا فن تھا جس میں صرف لِکھنا ہوتا تھا۔ مگر صاحب، یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ آج لِکھنے میں اداکاری کا عنصر اِس قدر غالب ہے کہ کبھی کبھی تو لِکھتے لِکھتے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے الفاظ ڈرامے بازی پر تُل گئے ہیں! سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں اب لِکھنے کا فن کئی فنون کا مجموعہ ہے۔ آپ نے یقیناً پڑھا یا سُنا ہوگا کہ گزرے ہوئے زمانوں میں داستان گو ہوا کرتے تھے جو سرِ راہ یا کِسی کھلی جگہ بیٹھ کر کوئی بات چھیڑتے تھے اور پھر چراغ سے چراغ جلاتے جاتے تھے۔ داستان کو آگے بڑھانے کے لیے وہ زمین کو آسمان سے مِلانے یا آسمان کو زمین پر لانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے! گزرے ہوئے زمانوں کا ایسا کوئی نابغہ آپ نے نہیں دیکھا تو ملول نہ ہوں۔ بات یہ ہے کہ آپ غور کرنے کے عادی نہیں۔ آج کے لِکھنے والے کل کے بکنے والوں کی کمی خاصی جاں فشانی سے پوری کر رہے ہیں! جب یہ داستان گوئی پر تُل جائیں تو زمین و آسماں کو پناہ مانگتے ہی بنتی ہے!

اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ لِکھنے والے راستہ دِکھاتے ہیں تو آپ کی سوچ غلط نہیں۔ مگر تھوڑی سی وضاحت لازم ہے۔ لِکھنے والے پڑھنے والوں کو کم اور اپنے

آپ کو پُر کشش معاوضوں کی راہ زیادہ دِکھاتے ہیں! پڑھنے والوں کو راہ ملے نہ ملے، خود کو بڑے سے بڑے پیکیج تک راستہ مِلنا چاہیے۔ زمانہ اب ایسی ہی ''راہ نُمائی'' کا ہے۔

کہتے ہیں جب لکھنے والوں پر لکھنے کا بھوت یا جُنون سوار ہو تو پڑھنے والوں کے مزے ہو جاتے ہیں۔ یقیناً ایسا ہوتا ہوگا مگر دوسرے مُلکوں میں۔ ہمارے ہاں تو اب یہ عالم ہے کہ جب لکھنے والے مُوڈ میں ہوتے ہیں تو پڑھنے والوں کی جان پر بن آتی ہے، اُن کے دِل و دِماغ کا تیا پانچا ہو جاتا ہے!

ایک زمانہ تھا جب لکھنے والے سوچ سمجھ کر لکھا کرتے تھے۔ اب یہ ذمہ داری اُنھوں نے پڑھنے والوں پر ڈال دی ہے! اِس روش کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ پڑھنے والوں کو پڑھنے سے پہلے اور بعد میں بہت سوچنا پڑتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ سوچنے کے معاملے میں اب پڑھنے والوں نے لکھنے والوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے! ایک زمانے تک ڈائجسٹوں نے عوامی ادب کی بے مثال خدمت کی ہے۔ ڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھ پڑھ کر بہتوں نے سوچنا سیکھا۔ اور بعد میں جب لکھنا بھی سیکھا تو سوچنا بھول گئے!

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب فِکشن رائٹرز ہر معاملے کو کہانی کی شکل دے دیا کرتے تھے۔ اگر وہ گٹر کے ڈھکن کو کچھ دیر گھورتے تھے تو لوگ سمجھ جاتے تھے کہ اب گٹر میں سے کوئی معرکہ آرا کہانی برآمد ہوگی۔ اور ایسا ہی ہوتا تھا!

پھر یہ ہوا کہ اخبارات نے فِکشن کے معاملے میں انقلاب برپا کر دیا۔ ڈائجسٹوں کے سکّہ بند رائٹرز نے کالم نگاروں کی صف میں جگہ بنالی۔ وقت ایسا پلٹا کہ اونٹ خیمے میں گھس گیا اور خیمے کے مالک کو باہر نکلنا پڑا! اخبارات کے ادارتی صفحات پر فِکشن رائٹرز کے براجمان ہونے کی دیر تھی۔

پھر اِس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی!

ڈائجسٹوں کے رائٹرز کہانی کی تلاش میں گٹر کے ڈھکن کو گھورا کرتے تھے۔ ثابت ہوا کہ وہ دور ذہنی پس ماندگی کا تھا۔ لکھنے کی ''تحریک'' پانے کے لیے گٹر اور اُس کے ڈھکن کے محتاج ڈائجسٹ کے رائٹرز رہے ہوں گے۔ اخباری کالم نگار اِس معاملے میں خود کفیل ہیں یعنی لکھنے کی تحریک پانے کے لیے کہیں باہر کوئی گٹر اور اُس کا ڈھکن تلاش نہیں کرنا پڑتا!

اخبارات میں لکھنے والوں کو کہانی تلاش نہیں کرنی پڑتی، وہ تو خود چل کر

اُن تک آتی ہے ! اونٹ کو رکشا میں بٹھانا آپ کے نزدیک ناممکن بات ہوگی، اخباری کالم نگاروں کے لیے تو یہ معمول کی مشق ہے۔ ایک ہی کالم میں کئی کہانیاں خود کو بیان کر رہی ہوتی ہیں ! اور ہر کہانی کے مرکزی کردار کو تلاش کرنا بھی کچھ دُشوار نہیں ہوتا۔ ڈائجسٹوں کے رائٹرز بہت روایت پسند تھے، تھیم یعنی مرکزی خیال کے بارے میں بھی سوچا کرتے تھے۔ اخباری کالم نگار عجب آزادہ و خود بیں ہیں یعنی تھیم کے پابند ہیں نہ طرزِ نگارش کے۔ فِکشن رائٹرز پڑھنے والوں کو ایک خاص بلندی تک لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اخباری لکھاری عوام کی ذہنی سطح پر آ کر لکھ رہے ہیں۔ عوام اخباری کالموں میں اپنی ذہنی سطح پا کر لکھنے والوں کو خوب داد دے رہے ہیں۔ لوگ یہ سوچ کر خوش رہتے ہیں کہ لکھنے والا اُن کے ذہن کو سمجھتا ہے اور لکھنے والے کو یہ اطمینان ہے کہ لکھنے کے لیے اب سوچنے کے تکلّف سے جان چھوٹی ! اِس مُلک میں جب کِسی بھی معاملے میں سوچنے کی ضرورت نہیں رہی تو پھر لِکھنے کے لیے کیا اور کیوں سوچا جائے؟ لوگوں کو سوچے بغیر لکھے گئے کالم پڑھنے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ اگر کبھی کوئی کالم خوب سوچ سمجھ کر لکھا جائے تو پڑھنے کے بعد لوگ سَر میں شدید درد کی شکایت کرتے پائے جاتے ہیں!

اخبار کے لیے لکھنا بھی ایک انوکھی دنیا میں قدم رکھنا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں کئی دُنیائیں قبضہ مافیا کی طرح ڈیرا ڈالے پڑی ہیں۔ اخباری لکھاری

کوزے میں دریا، بلکہ سمندر بند کرنے کے ہُنر میں طاق ہیں۔ ایسا لکھتے ہیں کہ ہر دو طرف کے فریق خوش ہو رہتے ہیں۔ بقولِ غالبؔ

دِل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی!

oblige کیا گیا ہے۔ اور یہ بات صرف لکھنے والا جانتا ہے ہر پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے اُسے camouflage کا ہے! اگر فوج چاہے تو ''کیموفلاج'' کا فن ہے کہ معاملہ کس حد تک آج کے کئی اخباری لکھاریوں سے سیکھ کر اپنی پیشہ ورانہ مہارت کے درجات بلند کر سکتی ہے!

اخباری کالموں میں فِکشن کے نئے پہلو تراشے گئے ہیں، فکر و نظر کی نئی دُنیائیں بسائی گئی ہیں۔ ایک ہی جُملے میں کسی کا تیاپانچا کر دیا جاتا ہے تو کسی کو ساتویں آسمان پر بٹھا دیا جاتا ہے! کالموں میں قدیم و جدید ہر طرح کی داستانیں پائی جاتی ہیں۔ دیو اور پری کے قصے ملتے ہیں۔ ممدوح کو سُپر مین اور معتوب کو بغلول ثابت کرنے کے لیے لڑی کے ساتھ اُس چوٹی کا بھی زور لگا دیا جاتا ہے جو پائی ہی نہیں جاتی!

زمانے کی ہوا کا رُخ ایسا پلٹا ہے کہ ڈائجسٹوں اور اُن میں لکھنے والوں کو

لوگ بھول بھال گئے ہیں۔ اخباری فِکشن کے چمن میں اِس وقت بہار کا موسم ہے۔ کچھ پُھول کِھل رہے ہیں اور بہت سے گُل کِھلائے جا رہے ہیں! ''خوش نصیبی'' یہ ہے کہ مسائل بدلتے ہیں نہ اُن کی شِدّت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ بقول دلاور فِگارؔ

حالاتِ حاضرہ کو کئی سال ہوگئے!

بیشتر معاملات ''ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم'' کی تصویر ہیں یعنی بدلنے کا نام نہیں لیتے۔ ایسے میں جو لکھیے وہ حالات پر منطبق ہو کر رہتا ہے!

میڈیا کے چمن میں لکھنے کا موسم ہے۔ جو کچھ بھی لکھیے، ڈالر کی طرح ہر مارکیٹ میں چل کر رہتا ہے۔ لکھنے کا مزا تو واقعی اب آیا۔ ہماری دُعا ہے کہ حالاتِ حاضرہ پر تبصرے کے پردے میں دِل کی بات کہنے اور آم کے ساتھ ساتھ گٹھلیوں کے بھی دام کھرے کرنے والے سلامت رہیں! اور اُن سے بھی بڑھ کر سلامت رہیں پڑھنے والے جو اِس اعتبار سے عظمت کے مینار ہیں کہ پڑھنے کے نام پر پتا نہیں کیا کیا جھیلنے کے بعد بھی داد دینا نہیں بُھولتے! جب تک پڑھنے والے ہیں، لکھنے والے ہرگز بُھوکے نہیں مَر سکتے!

گوگل وائف

بیویوں کو اللہ نے کئی ہُنر بخشے ہیں۔ اور ہر ہُنر اپنے آپ میں ایک انوکھی دنیا ہے۔ یہ ہُنر کیا کم ہے کہ بیویاں گھر کے سربراہ کی سربراہ بن کر اُنھیں اپنی مرضی کے سائز کی نکیل ڈالے رہتی ہیں! کائنات کے بارے میں سو نظریات پیش کئے جا چکے ہیں مگر کس میں ہمت ہے کہ جس سے تصویرِ کائنات میں رنگ ہے اُس کے بارے میں کوئی ایک بھی ٹھوس نظریہ پیش تو کرے۔ ایسا کرنے بیٹھیے تو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں دم بھر میں پانی بھرنے لگتی ہیں، حواس مختل ہونے لگتے ہیں اور شعُور دم توڑتا محسوس ہوتا ہے!

ہر اِنسان پر ایک ایسا دور بھی گزرتا ہے جو اُسے خوابوں اور خیالوں کی فضاؤں میں اُڑائے پھرتا ہے۔ یہ سُنہرا دور منگنی کے بعد شروع ہوتا ہے اور نکاح کے وقت تین بار ''قبول ہے'' کہتے ہی ختم ہو جاتا ہے! اِس کے بعد؟ یہ کیفیت ساحرؔ لدھیانوی نے یوں بیان کیا ہے۔

پلٹ کے سُوئے چمن دیکھنے سے کیا ہوگا؟
وہ شاخ ہی نہ رہی جو تھی آشیاں کے لیے!

جن سُہانے زمانوں کے خواب آنکھوں میں سَجوئے تھے وہ پتا نہیں کون سے خلا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ ٹھوکر کھا کر مُنہ کے بَل گرنے پر اپنی حماقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آئینہ دیکھیے تو اپنا ہی چہرہ اجنبی سا دِکھائی دیتا ہے۔ ساحر لدھیانوی ہی نے کہا ہے۔

کیا کہوں؟ پہچاننا بھی خود کو مُشکل ہوگیا

!جب نئی تصویر مُجھ کو میری دِکھلائی گئی

جو شادی کے بعد اَدھ موئی سی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ لاکھ سمجھائیں کہ بھائی ! اِس طلسمات میں مُڑ کے مَت دیکھنا ورنہ پتھر کے ہو جاؤگے مگر جو شادی کے لیے ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوں وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھتے یا شاید سمجھنا چاہتے ہی نہیں ! منگنی کے بعد جو لوگ شادی اور اُس کے بعد کی زندگی کے خواب آنکھوں میں سَجائے پھرتے ہیں اُن کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ہر معاملے میں منگیتر کو رول ماڈل سمجھتے ہیں۔ بعض تو ایسے سادہ لوح (یعنی احمق اور گھامڑ) ثابت ہوتے ہیں کہ ہونے والی بیوی کو گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی سَر پر بِٹھا لیتے ہیں یعنی جینیس قرار دے بیٹھتے ہیں ! اِسے کہتے ہیں اکھاڑے میں اُترنے سے پہلے ہی حریف کی برتری تسلیم کرلینا۔ جب ہونے والی بیوی کو جینیس سمجھ لیا تو اپنے آپ کو گھسیارا قرار دینے میں کیا کسر باقی رہ گئی؟ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک چھت کے نیچے دو جینیس کیسے رہ

! سکتے ہیں

منگنی سے شادی تک کا زمانہ بہت دِل فریب ہوتا ہے۔ فریقِ ثانی کا ہر عیب بے مثال خوبی جیسا دِکھائی دے رہا ہوتا ہے۔ آنکھوں دیکھی مکھی نِگلنے کا کچھ اپنا ہی، الگ سا مزا ہوتا ہے ! اِس عہدِ زریں میں ساون کے اندھوں کو ہر طرف ہرا ہی ہرا سُوجھ رہا ہوتا ہے۔ رات بھر کے پیکیج پر باتیں کرنے کا زمانہ گزرتا ہے اور دورِ سَحر میں آنکھ کھلتی ہے یعنی تین بار اقرار کرکے منگیتر کو قبول کیا جاتا ہے تب پتا چلتا ہے کہ

! خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

اپنی ہی آنکھوں پر یقین نہیں آتا کہ اِن میں کیسے کیسے خواب تھے ! اُس عہدِ زریں کے ہر ! خواب کی بھیانک تعبیر سامنے آتی ہے تو دِل پر قیامت سی گزر جاتی ہے

ورکیجیے تو اِنسان پر دراصل دو ہی زمانے گزرتے ہیں۔ ایک شادی سے پہلے کا اور دوسرا شادی کے بعد کا ! اِنسان کا وجود اِن دونوں زمانوں میں بٹ کر کچھ اِتنا گِھس گِھسا جاتا ہے کہ کسی تیسرے دور کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اب جو تیسرا دور ممکن ہے وہ محشر میں حساب کتاب کے بعد جنت یا پھر جہنم میں

!شروع ہوگا

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ شادی کے بعد جو کچھ گزرتی ہے وہ شادی سے پہلے کے زمانے کو ذہن کی تختی سے یکسر صاف کر ڈالتی ہے! بیشتر کیسز میں ہوتا یہ ہے کہ انسان شادی سے پہلے کی حسین یادوں کے ذریعے اُن دُکھوں کا ازالہ کرتا ہے جو شادی کے بعد ملتے ہیں! گرہستی چلانے کے نام پر گھن چکر ہو جانے والے مظلوم مَردوں پر !قُدرت اِسی طور مہربان ہوا کرتی ہے

بیشتر مَرد ازواجی زندگی اِس یقین کے ساتھ بسر کرتے ہیں کہ اللہ نے حساب کتاب سے پہلے ہی سزا دے ڈالی ہے! ایسی سوچ رکھنے والے مظلوم شوہروں کے جذبات کی ترجمانی شعرتی بھوپالی مرحوم نے یوں کی ہے۔

تصدّق تیری رحمت کے، جزا دے ہم کو محشر میں

!سزا کا جو زمانہ تھا وہ دُنیا میں گزار آئے

زمانہ لائن پر آچکا ہے یعنی ہم آن لائن زمانے میں جی رہے ہیں۔ انٹرنیٹ نے بہت سی مُشکلات آسان کردی ہیں اور دوسری بہت سی مشکلات اچھی خاصی تعداد میں پیدا کرکے ہمیں سوچنے کی زحمت سے نجات دِلا دی ہے! سیمابؔ اکبرآبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

دُعا دِل سے جو نِکلے کارگر ہو
!یہاں دِل ہی نہیں، دِل سے دُعا کیا

انٹرنیٹ پر کچھ تلاش کرنا ہے تو سرچ انجن حاضر ہیں یعنی چند الفاظ ٹائپ کیجیے اور مطلوبہ معلومات اُسی طرح آپ کے قدموں میں آگرتی ہیں جس طرح مستند عاملوں کی نگرانی میں اُلّو کے ایک ہی عمل سے سنگ دِل محبوب قدموں میں آگرتا ہے!

ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ انٹرنیٹ کمپنیوں نے سرچ انجن کا آئیڈیا بیویوں کے ''طریقِ واردات'' سے کشید کیا ہے! سرچ انجن کون سا نیا اور انوکھا کام کر رہے ہیں؟ بیویاں یہ کام ہزاروں سال سے کرتی آرہی ہیں اور کبھی بُھول کر بھی غرور نہیں کیا! سچ تو یہ ہے کہ معلومات فراہم کرنے کے معاملے میں بیویاں سرچ انجن سے ایک قدم آگے ہیں یعنی شوہر کے ایک سوال کے جواب میں مطلوبہ ہی نہیں، غیر مطلوبہ معلومات بھی فراہم کرتی ہیں! (آپ مانیں یا نہ مانیں، اصل مزا تو غیر مطلوبہ معلومات میں پوشیدہ ہے!) ''گوگل وائف'' تو ایسی ہی ہوتی ہیں جناب! سرچ انجنز کو اِس معاملے میں اپ ڈیٹنگ، ''بلکہ اپ گریڈنگ کی ضرورت ہے!

کائنات کا کون سا معاملہ اور مسئلہ ہے جو گوگل وائف کے ذہنی راڈار سے بچ سکتا ہے؟ عمدہ معلومات کشید کرنے کے لیے لازم ہے کہ سوال ہیجان پا کرنے والا ہو۔ یعنی ایسا ہو کہ سُنتے ہی مُحترمہ تن بدن میں آگ لگ جائے۔ اِس سِلسِلے میں تیر بہ ہدف نُسخہ یہ ہے کہ بیوی کے میکے والوں میں کوئی معمولی سی خرابی (یعنی جو اُن کے لیے معمول کا درجہ رکھتی ہو!) تلاش کرکے سب سے کم شِدت والی ہرزہ سَرائی کی جائے۔ دِیا سَلائی دِکھانے کی دیر ہے، پھر دیکھیے چراغ سے چراغ کیسے جلتے ہیں! لاشعور کے دُور افتادہ کونوں میں چُھپی ہوئی جو باتیں سگمنڈ فرائڈ تو کیا اُس کے باپ دادا بھی کُرید کر نکال نہیں سکتے تھے وہ باتیں بھی ایسی حالت میں اچانک زبان پر آ جاتی ہیں! گویا خزانے کا مُنہ کُھل جاتا ہے، دریائے نغز گوئی بہنے لگتا ہے! اِس کے بعد تو جناب وہ پینڈورا بکس کُھلتا ہے جو سیاست دانوں کے بیانات، حُکّام کے انتباہ اور جج صاحبان کے ریمارکس میں صرف مذکور ہوتا ہے، کبھی دِکھائی نہیں دیتا! اور پینڈورا بکس کھولنے والیوں کو بھی کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ اِس میں کون کون سے لعل و جواہر چُھپے ہوئے ہیں۔ جو جھیلے وہ جانے!

ٹماٹر نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

لاکھ سوچا، قیاس کے گھوڑے دوڑائے اور عقل کو بھی زحمت کی کہ کچھ سوچے، سمجھے اور توضیح و تشریح کی منزل تک پہنچے۔ مگر پھر یہ ہوا کہ سائنس دان ہار گئے۔ اُنہیں تو ہارنا ہی تھا۔ ساری دُنیا اِس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ اگر آکسیجن نہ ہو تو جینا ممکن نہ رہے کیونکہ سانسوں کا آنا جانا آکسیجن کے دم سے ہے۔ اگر آکسیجن نہ ہو تو سانسوں کا صرف جانا ہی جانا رہ جائے۔ پاکستان میں یہ آکسیجن والا کُلیہ بھی دَم توڑ گیا۔ ہم آکسیجن کے بغیر تو زندہ رہ سکتے ہیں، مگر..... سالن میں ٹماٹر ڈالے بغیر زندہ رہنا جُوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا!

سبزی کے آڑھتی کِسی زمانے میں کُھلے بازار کی معیشت کے اُصول کی بُنیاد پر کام کرتے تھے۔ سَودے نیلام کے ذریعے ہوا کرتے تھے۔ اب اُنھوں نے نیلام کے نظام کی بساط لپیٹ کر بند کمرے کی معیشت متعارف کرادی ہے یعنی اجارہ داری قائم کرلی ہے! چند بڑے مِل بیٹھتے ہیں اور پھر مُشاورت سے فیصلہ کرتے ہیں کہ کِس سبزی کو "انڈیکس" میں اوپر لانا ہے اور کِسے ذِلّت اور گراوٹ سے دوچار کرنا ہے۔ کبھی پیاز اوپر ہوتی ہے تو کبھی آلو کا وقار بڑھ جاتا ہے۔ مگر ٹماٹر میں خدا جانے ایسی کیا بات ہے کہ اِس کی گُڈی اونچی ہی اُڑتی

رہتی ہے۔ سبزی منڈی میں کبھی بھنڈی کے دام بڑھتے ہیں تو کبھی لوکی کے۔ کبھی آلو بُلندی پر جاتا ہے اور کبھی پیاز کے نخرے بڑھ جاتے ہیں۔ کبھی اروی مہنگی ہو جاتی ہے تو کبھی ادرک گاہکوں کا مُنہ چِڑانے لگتی ہے۔ مگر صاحب، ٹماٹر ہے کہ اپنی جگہ سے ہِلنے کا نام نہیں لیتا۔ جس بھارت سے بیشتر وقت ہماری ٹھنی رہتی ہے اُس کے آگے بھی ہماری ناک یہ ٹماٹر ہی نیچی کرتا ہے! ہاں، کبھی کبھی دِلّی سرکار بھی ٹماٹر خریدنے کی خاطر ہم سے جُھک کر مِلتی ہے!

سلیم کوثر کا دعویٰ ہے کہ

عالمِ ذات میں درویش بنا دیتا ہے

عِشق اِنسان کو پاگل نہیں ہونے دیتا!

ہم نے تو عِشق کے ہاتھوں اِنسانوں کو پاگل ہی ہوتے دیکھا ہے۔ اور بعض اہلِ ظرف تو اِس سے بھی ایک قدم آگے جاکر عِشق کے ہاتھوں "چِڑیا" ہونے سے بھی گریز نہیں کرتے! مگر اِنسان کو پاگل کرنے کے معاملے میں اگر کِسی نے عِشق سے ٹکر لی ہے تو وہ ٹماٹر ہے! ایک انار اور سو بیمار والی بات بھی ہمیں تو افسانہ طرازی ہی لگتی ہے۔ شاید کِسی نے یونہی انار کیلیۓ کمپنی کی مشہوری کا اہتمام کیا ہے! اب کِس کے پاس اِتنا وقت ہے کہ ٹائم مشین میں بیٹھ کر ماضیٔ بعید کا سفر کرے اور دیکھے کہ انار کے لیے بیمار کِس طرح لڑا کرتے

تھے۔ پاکستانی قوم نے از خود نوٹس کے تحت ٹماٹر کو انار کے منصب پر فائز کر دیا ہے!
ہر سبزی کی الگ تاثیر ہوتی ہے۔ کسی کا ذائقہ تیکھا ہوتا ہے اور اثر اُس سے بھی تیکھا۔ کوئی سبزی ذرا کڑوے ذائقے کی ہوتی ہے اور اثر کے معاملے میں زیادہ کڑوی ثابت ہوتی ہے۔ ٹماٹر کہنے کو کَھٹا ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب اِس کی گُڈّی اُونچی اُڑ رہی ہو تو ذائقے میں کَھٹاس کے ساتھ ساتھ تیکھا پن بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اور اگر گھر سے حکم مِلا ہو کہ سبزی والے سے ٹماٹر کسی بھی قیمت پر خرید کر ہی دوبارہ گھر میں قدم رکھنا ہے تو سمجھ لیجیے کہ آپ کو ٹماٹر میں کھٹاس اور تیکھے پن کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت کریلے کی تاثیر بھی ملے گی!
جب ٹماٹر بہت مہنگے ہو جاتے ہیں تو بہت سی خواتین سالن میں دَہی ڈالتی ہیں یا لیموں نچوڑ لیتی ہیں۔ ایسا کرنے سے سالن کَھٹا تو ہو جاتا ہے مگر وہ ٹماٹر والی بات بہر حال پیدا نہیں ہوتی۔ شاید ایسی ہی کیفیت کو خواجہ الطاف حسین حالؔی نے یوں بیان کیا تھا۔

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں!

سبزی کے ٹھیلے پر ٹماٹر کے درشن ہوں تو دام پوچھنے پر اُن کی قیمت ہی نہیں وقعت بھی بڑھ جاتی ہے! لاکھ سوچیے کہ اُن کا نعم البدل کہاں سے لایا جائے مگر ذہن کام نہیں کرتا، کوئی فیصلہ نہیں کرپاتا، دو چار قدم چل کر ہی تھک کے گر پڑتا ہے!

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

ٹماٹر کے دام بڑھنے پر کبھی کبھی خواتین یہ سوچ کر سالن میں کیچ اپ ڈال لیتی ہیں کہ کیچ اپ کی رگوں میں بھی خون تو ٹماٹر ہی کا دوڑ رہا ہے! ایسی صورت میں کچن تجربہ گاہ کا درجہ اختیار کرلیتا ہے۔ کیا پکانے نکلے ہیں یہ تو سب کو معلوم ہوتا ہے مگر کیا پکے گا، یہ کوئی نہیں جانتا! ایسے عالم میں خواتین وہی طرزِ عمل اختیار کرتی ہیں جو پاکستان کے معاملے میں اختیار کی گئی ہے، یعنی سب کچھ اللہ کے کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے! سالن میں اگر کیچ اپ اندازے سے زیادہ ہو جائے تو بیٹھے بٹھائے، اضافی محنت کے بغیر کانٹی نینٹل ڈِش تیار ہوجاتی ہے! فِطری عُلوم کی تجربہ گاہوں میں بہت سی چیزیں اتفاق سے ایجاد ہوئی ہیں۔ یہی حال کچن کا بھی ہے۔ پکایا جاتا ہے کچھ اور پک جاتا ہے کچھ! ویسے آج کل سفارت کاری بھی یونہی random کے اُصول پر کام کر رہی ہے! کِسی مسئلے کو حل کرنے بیٹھیے تو اُس بنیادی مسئلے کے سِوا سبھی

کچھ راہ پر آ جاتا ہے! پاک بھارت سفارت کاری ہی کو لیجیے۔ کشمیر کا مسئلہ وہیں کا وہیں ہے اور ہم آلو، پیاز اور سب سے بڑھ کر ٹماٹر سے متعلق معاملات طے کرنے میں مصروف رہتے ہیں! دونوں ممالک کشمیر جیسے انتہائی بُنیادی مسئلے کو ''بالائے طاق کے اُوپر'' رکھ کر سبزی کی تجارت کو ترجیحات میں سرِ فہرست رکھے ہوئے ہیں۔ اور سبزیوں میں بھی ٹماٹر کے معاملات سب سے آگے ہیں!

کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم زندہ رہنے کی خاطر نہیں کھاتے بلکہ کھانے کے لیے زندہ ہیں۔ اور کھانے کا اہتمام کرنے کے نام پر بھی ساری دوڑ دھوپ صرف ٹماٹر کی موجودگی یقینی بنانے کے لیے ہے! جس طرح غالبؔ کا شکوہ یہ تھا کہ مقطع میں سُخن گسترانہ بات آن پڑی ہے بالکل اُسی طرح ہمارے خیالات کے گھوڑے بھی گھر گرہستی کے معاملے میں ٹماٹر کی منزل پر پہنچ کر اِس طرح رُک جاتے ہیں کہ پھر ٹَس سے مَس نہیں ہوتے!

پنجاب کے وزیر خوراک بلال یاسین نے لاہور کے بچت بازاروں کے دورے میں میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر عوام کو یہ شکایت ہے کہ ٹماٹر بہت مہنگے ہیں تو ٹماٹر کھانا چھوڑ دیں! ہمیں توقع نہیں تھی کہ پنجاب کے وزیر خوراک سیاست دانوں کی روایتی لے کاری تج کر یوں سیدھا سُر لگائیں گے! یہ کیا بات ہوئی کہ جو چیز مہنگی ہوئی اور قابو میں نہیں آ رہی اُسے کھانا چھوڑ دیا

جائے۔ عوام نے تو کبھی سیاست دانوں سے یہ نہیں کہا کہ جب مُلک چلانا نہیں آتا اور بہبودِ عامہ یقینی بنانے کی اہلیت نہیں ہے تو سیاست چھوڑ دیں اور اقتدار کے ایوانوں سے نکل جائیں! اگر عوام بلال یاسین کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ''ترکِ موالات'' پر تُل گئے تو اُن کی زندگی میں رہ کیا جائے گا؟

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ہماری زندگی میں ٹماٹر نہ ہو تو کیا ہو؟ ہم نے سُنا ہے کہ ٹماٹر یورپ میں پھل کی حیثیت سے معروف تھا، ہم نے یہاں اُگایا اور سبزی بنا ڈالا۔ یعنی ٹماٹر مہنگا ہی نہیں، متنازع بھی ہے! خیر، ٹماٹر متنازع ہو یا نہ ہو، ہمیں ہر حالت میں جیسا ہے، جہاں ہے'' کی بُنیاد پر قبول ہے۔ قبول کیوں نہ ہو؟ یہ ہماری روز مرّہ اور'' بالخصوص گھریلو زندگی کا آئٹم سانگ ہے! اِسی کے دم سے ذہن سوچنے کی تحریک پاتا ہے۔ اگر ٹماٹر کو سالن اور زندگی سے نکال دیا جائے تو ہمارے پاس ایسا کون سا موضوع رہ جائے گا جس پر کسی بھی وقت بحث کی جاسکے! پھر تو بے دِلی ہی بے دِلی رہ جائے گی۔

اور جون ایلیا کہہ گئے ہیں۔

بے دِلی! کیا یونہی دِن گزر جائیں گے؟

!صرف زندہ رہے ہم تو مَر جائیں گے

شُعرا، دانشور، فلسفی ہمیں پتا نہیں کون کون سی دُنیاؤں کی خبر دیتے ہیں۔

اُن کی پوری کوشش ہے کہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں پائے جانے والے تمام دلچسپ معاملات کی بساط لپیٹ دیں اور فارغ ہو کر غور و فکر کی دُنیا میں گم اور سوچوں کے سمندر میں غرق ہو جائیں۔ اچھا ہے کہ ٹماٹر جیسی معمولی سی دِکھائی دینے والی چیز ہماری زندگی میں رہے اور رونق میلہ لگا رہے۔ نہ فُرصت ہوگی اور نہ ہم غالبؔ کی طرح پری چہرہ لوگوں، غمزہ و عشوہ و ادا، سبزہ و گل، ابر، ہوا اور دوسری بہت سی ''فضول'' سی چیزوں کے بارے میں سوچیں گے! ذرا سوچیے، ایک معمولی سے ٹماٹر نے ہمیں کتنے فِکری بکھیڑوں سے بچا رکھا ہے! سارے دُکھڑے بھول جایئے، بس اِتنا یاد رکھیے کہ زندگی سالن ہے۔ اور

ٹماٹر کے دَم سے یہ سالن حسیں ہے

ٹماٹر نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے!

وہ دِماغ ہی نہ رہا

اسپتال میں تو ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔

رحمانی صاحب کی طبیعت اچانک خراب ہوئی تھی۔ نہیں نہیں، آپ یہ نہ سمجھیں کہ اُن کی طبیعت خراب ہونے سے اسپتال میں ہنگامہ برپا ہوا! ایسی کوئی بات نہیں۔ رحمانی کے سَر میں اچانک شدید درد اُٹھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بستر پر لُڑھک گئے۔ اُنہیں اِس حال میں دیکھ کر اہلِ خانہ کی حالت بھی غیر ہو گئی۔ فوراً ایمبولینس منگوا کر رحمانی صاحب کو اسپتال منتقل کیا گیا۔

اسپتال پہنچنے پر بھی رحمانی صاحب ماہیَ بے آب کے مانند تڑپ رہے تھے۔ ڈاکٹرز نے فوراً چیک اپ کیا۔ مگر اُن کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ نہ آ سکا۔ تکلیف تھی کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ طے پایا کہ سَر کا ایکس رے لیا جائے۔ رحمانی صاحب کو ایکس رے تھیٹر لے جایا گیا۔

کچھ دیر بعد ایکس رے کا نتیجہ سامنے آیا تو ٹیکنیشین پریشان ہوگیا۔ ایکس رے شیٹ پر کچھ بھی نہ تھا۔ شاید کوئی ٹیکنکل فالٹ آگیا تھا۔

ایکس رے دوبارہ لیا گیا۔ دوسری بار بھی ایکس رے شیٹ خالی ہی رہی۔ ڈاکٹرز بھی پریشان دِکھائی دیئے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ شیٹ سادہ نکل آئے؟ اب تو ایکس رے ٹیکنیشین کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ایکس رے مشین نے کام کرنا تو نہیں چھوڑ دیا۔ اس دوران ایک اور مریض کی پسلیوں کا ایکس رے لیا گیا جو بالکل درست آیا۔ اس کے بعد رحمانی صاحب کو تیسری بار بلا کر سَر کا ایکس رے لیا گیا۔ اِس بار بھی ایکس رے شیٹ سادہ ہی رہی!

ڈاکٹرز کے غُصّے کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ ایکس رے ٹیکنیشین پر برس پڑے۔ ایک سینئر ڈاکٹر نے کہا۔ ''تم کیا ایکس رے کے رِیزلٹ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ اِس مریض کا دِماغ نہیں ہے؟''

ایکس رے ٹیکنیشین بے چارا سہم گیا۔ کیا کہتا؟ مشین رحمانی صاحب کے معاملے میں کام نہیں کر رہی تھی اور سُبکی کا سامنا اُسے کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر پھر تقدیر کو اُس پر رحم آ گیا۔ رحمانی صاحب کے ایک دوست اسپتال پہنچے۔ جب اُنہیں معلوم ہوا کہ تین بار ایکس رے لینے پر بھی شیٹ سادہ رہی ہے تو اُنہوں نے ڈاکٹرز کو بتایا کہ مشین خراب ہے نہ ایکس رے ٹیکنیشین نا اہل ہے۔ بات یہ ہے کہ رحمانی صاحب ...... کمرشل رائٹر ہیں! اخبار، ڈائجسٹ، ریڈیو اور ٹی

!وی کے لیے لکھتے لکھتے اب اُن کا دِماغ غائب ہو چکا ہے

ڈاکٹرز یہ سُن کر حیران رہ گئے۔ اُنھوں نے استفسار کیا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی دماغ کے بغیر زندہ بھی رہے اور لکھتا بھی رہے؟''

رحمانی صاحب کے دوست نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر رحمانی صاحب کا دِماغ نہیں ہے تو اِس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ ایک اُن پر کیا موقوف ہے، یہاں تو پوری کی پوری قوم دِماغ کے بغیر یا دِماغ کو ہلائے بغیر جی رہی ہے۔ بہت سے کمرشل رائٹرز کا دِماغ ہوتا تو ہے مگر دِکھائی نہیں دیتا۔ سچ تو یہ ہے کہ دِماغ کو زحمت دیئے بغیر وہ زیادہ موثر لکھتے ہیں اور اِس طور لکھنے کا معاوضہ بھی زیادہ ملتا ہے! بالخصوص اشتہارات کے لیے ''جنگلز'' لکھنے کا۔

ہم نے مرزا تنقید بیگ کو جب رحمانی صاحب کا کیس سُنایا تو وہ ذرا بھی حیران نہ ہوئے۔ اِس پر ہمیں بھی حیرت نہ ہوئی۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ دِماغ کے بغیر کام کرنے والوں میں مرزا بھی شامل ہیں! ہم نے اُن کے سازِ گفتار کے تار چھیڑنے کے لیے رحمانی صاحب کی بے دِماغی کا ذکر کیا تھا! مقصود یہ تھا کہ مرزا ہمیں (اور ہمارے توسط سے ہمارے محترم قارئین کو) بتائیں کہ دِماغ کے بغیر کام کس طور کیا جاتا ہے اور اِس کے کیا فوائد ہیں۔

مرزا ہمارا اِنڈ عا سمجھ گئے۔ پہلی ہی کِک میں اسٹارٹ ہوتے ہوئے بولے۔ ''دِماغ کا استعمال کام کو بگاڑ دیا کرتا ہے۔ تمھیں یاد ہوگا شیخ ابراہیم ذوقؔ نے کہا تھا۔

اے ذوقؔ! تکلّف میں ہے تکلیف سراسر

!آرام سے ہیں وہ جو تکلّف نہیں کرتے

دِماغ کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ وہ لوگ آرام سے ہیں جو دِماغ کو تکلیف نہیں دیتے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ دِماغ کا استعمال ترک کرنے والی سرزمین پر آباد ہیں! ویسے یہ کوئی بالکل نیا تجربہ نہیں۔ ذرا یاد کرو۔ غالبؔ نے کہا تھاع

!دِل تو دِل، وہ دماغ بھی نہ رہا

اور غالبؔ کے پاس تو ہنسنے کے لیے بھی دِماغ نہیں تھا۔ ع

!مُجھے دِماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

پس ثابت ہوا غالبؔ کے دور تک دِماغ تقریباً متروک ہو چکا تھا۔ اب اگر غالبؔ کے اشعار ہمارے دِماغوں میں آسانی سے داخل نہیں ہوتے تو اِس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ بے دِماغی کی حالت میں کہے ہوئے اشعار کو سمجھنے کے لیے بے

"!دِماغی لازم ہے

ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ مرزا بے دِماغی کی حالت میں خاصا طویل زمانی فاصلہ طرتے ہوئے غالبؔ کی دُنیا میں جا گھسیں گے ! خیر، جب دِماغ کو زحمتِ کار نہ دی جائے تو انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔

باقاعدگی سے ٹی وی دیکھتے رہیے، کچھ ہی دنوں میں آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ دِماغ کو زیادہ استعمال کئے بغیر کس طرح اور زیادہ آسانی سے زندہ رہا جاسکتا ہے ! ٹی وی چینلز پر کام کرنے والے ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ہم اُن کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ ہم تو اُنہیں !خراج تحسین اور دِماغ کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں

آج کل ٹی وی ڈراموں کے گلشن میں بے دِماغی کی بہار آئی ہوئی ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا دِماغ اب تک کام کر رہا ہے تو ذرا ٹی وی ڈراموں میں تھیم تو تلاش کرکے دکھایئے ! چھکّے چُھوٹ جائیں گے، ہاتھوں کے طوطے اُڑ جائیں گے۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا !لیجیے اور لاکھ پاپڑ بیل لیجیے، کوئی تھیم ویم ہاتھ نہ آئے گی

اگر ڈرامہ نگاروں کو والوں کو مطعون کیجیے تو وہ کوئی اور ہی راگ الاپتے ہیں۔ اُن کی پہلی کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ اپنی بے دِماغی کو میڈیا میں رُونما ہونے والے انقلاب" کے کھاتے میں ڈال دیں! جب کوئی یاد دِلاتا ہے کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں" وہ عوام کی بے دِماغی سے ہم آہنگ ہو کر خوب رنگ جما رہا ہے تب وہ اپنی رائے سے رجوع کرتے ہیں!

ایک صاحب نے خواب میں سامری جادوگر کو شدید پریشانی کی حالت میں دیکھا۔ پوچھا کہ ایسا کیا ہوگیا جس سے پریشان ہوگئے۔ کیا طلسمات کی دنیا میں کوئی نیا جادوگر آگیا ہے؟ شعبدوں کی دُکانداری کمزور پڑ گئی ہے؟ سامری جادوگر نے بمشکل حواس بحال کیے اور کہنے لگا۔ ''کچھ دن پہلے دُنیا کی سیر کا اتفاق ہوا۔ تھوڑا سا کام تھا۔ اب تم سے چُھپانا کیا؟ میں جادو کے چند نئے کمالات سیکھنے گیا تھا۔ سُنا ہے کہانیاں لکھنے والوں اور داستانیں سُنانے والوں نے طرح طرح کے کمالات میرے کھاتے میں ڈال دیئے ہیں! سوچا میں بھی کچھ جان لوں گا اور جو مجھے فیورٹ موضوع بنا بیٹھے ہیں اُنہیں بھی کچھ نیا لکھنے کو مل جائے گا۔ چند روز پاکستان میں رہا۔ بس کچھ نہ پوچھو، دِل اور دِماغ کی کیا حالت ہوئی۔ جو چیز دیکھو اُس میں جادو ہی جادو بھرا ہوا دیکھا۔ بعض چیزیں تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آئیں۔ مثلاً بجٹ۔ بہت غور کرنے پر بھی مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ جب وسائل برائے نام ہیں تو ملک کس طور چلایا.

جارہا ہے! بجٹ دستاویزات کھول کر دیکھیں تو مجھے اپنے جادوگر ہونے پر شرم سی محسوس ہوئی۔ میں کیا اور میرا جادو کیا! بجٹ ایسا جادو ہے کہ میرے جیسے بیس تیس جادوگر بھی سمجھنا چاہیں تو پورا مال سال گزر جائے گا! جب متعلقین سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بجٹ کی تیاری میں بھی اس نکتے کو ذہن نشین رکھا جاتا ہے کہ عوام کو دِماغ استعمال کرنے کا موقع نہ ملے! میرا جادو دیکھ کر تو لوگ پھر بھی دِماغ استعمال کرنے کے قابل رہتے ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ بجٹ بنانے والے دِماغ کو ایسا رگڑا دیتے ہیں پھر وہ صرف جھٹکے وصول کرنے کے قابل رہ جاتا ہے!"

سامری جادوگر نے حرف بہ حرف درست کہا۔ اگر ایسے بجٹ دنیا بھر میں عام ہوں تو حکومتوں کا کام آسان ہو جائے کیونکہ لوگوں کے دِماغ کام کرنا چھوڑ دیں اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آئے!

آپ ہمارے قاری ہیں اِس لیے بہت محترم ہیں۔ آپ ہی کے فائدے کے لیے ہم یہ مشورہ مُفت دے رہے ہیں کہ دِماغ کو کم کم استعمال کیجیے۔ اب دِماغ استعمال کرنے کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہے کہ آپ خود کو تماشا بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ہر معاملے میں دِماغ لڑاتے رہیں گے تو دوسروں کو چھوڑیے، اہلِ خانہ بھی مشکوک سمجھنے لگیں گے!

عام آدمی کا فسانہ

آیئے، عام آدمی کی بات کریں۔ وہ عام آدمی جسے گنڈیریوں کی طرح چُوس کر پھینک دیا گیا ہے۔ حساب کتاب کے معاملے میں دُنیا بہت آگے جاچکی ہے مگر اب تک ماہرین وہ گِنتی رائج نہیں کرپائے جس میں عام آدمی پایا جاسکے۔ شمار کرنے کو بہت کچھ ہے اور قطاریں بھی بہت ہیں مگر عام آدمی بے چارا کسی قطار میں ہے نہ شمار میں۔ زندگی گزرتی ہے مگر یوں کہ اُس پر سے گزر جاتی ہے! اور زندگی کیا گزرتی ہے، قیامت ہی گزر جاتی ہے!

انسانوں کی دنیا بھی عجیب ہے۔ تمام معاملات کا شعور ہے، عقل ہر جگہ کام کرتی ہے۔ ایک بس حقوق کا معاملہ ہے جس میں مَت ماری جاتی ہے یا اُسے مار ہی دیا جاتا ہے۔ حقوق دینے کا معاملہ ہو تو انسان کو اللہ کی طرف سے بخشا ہوا نیابت کا منصب راس نہیں آتا اور وہ جھٹ حیوانوں کو بھی شرمندہ کرنے والی سطح پر اُتر آتا ہے۔ اور اپنا حق وصول کرنے کا معاملہ ہو تو ایسی تیزی دکھاتا ہے کہ روشنی کی رفتار بھی دیکھے تو شرمسار ہو!

عام آدمی کی بھی کیا زندگی ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ ایسے جینے کو

زندگی قرار دیا جاسکتا ہے؟ وہ غریب زندگی کیا گزارتا ہے، گویا سانسوں کی گنتی پوری کرتا ہے۔ گننے کے لیے عام آدمی کے پاس ارمانوں اور حسرتوں کی بھی کمی نہیں۔ اور داغ ہائے دل بھی تو ہیں۔ جب اِتنی ''مصروفیت'' ہو تو کسی اور کام میں کیا جی لگے اور اُس کے لیے کہاں سے وقت آئے یا نکل پائے؟

دیوار اینٹوں سے بنتی ہے۔ ایک ایک اینٹ پوری احتیاط اور توازن سے رکھی جاتی ہے تاکہ دیوار ٹیڑھی نہ ہو، سیدھی اُٹھے اور ثریا تک سیدھی ہی جائے۔ ایسا بے وقوف کون ہوگا جو دیوار میں کہیں سے بھی دو چار اینٹیں نکالنے کا سوچے گا؟ دیوار گر پڑے گی نا! عقل یہی کہتی ہے کہ بگاڑ کو روکنے کا پہلے سے اہتمام کئے بغیر دیوار سے کوئی اینٹ نہ نکالی جائے۔ حسرت سی ہے کہ جتنی توجہ اینٹ اور دیوار کے معاملے پر دی جاتی ہے کاش اُتنی ہی توجہ عام آدمی اور معاشرے کے تعلق پر بھی دی جائے!

معاشرہ ایک دیوار ہے جس میں عام آدمی اینٹ کا کردار پوری ایمانداری سے اور کماحقہ ادا کر رہا ہے۔ اُسے ستائش کی آرزو ہے مگر ہائے ری بے حِسی اور عدم تشکر کہ اِس زندہ اینٹ سے مستفید ہونے والے اُس کا احسان ماننے اور اُسے کریڈٹ دینے کو تیار نہیں۔ دیوار سے اینٹ نکالنے کی کوشش کیجیے تو لوگ روکتے اور ٹوکتے ہیں کہ کہیں دیوار گر نہ پڑے۔ مگر اِس زندہ اینٹ کو معاشرے کی

دیوار سے نکال کر پھینکنے کے عمل پر کوئی روکتا ہے نہ ٹوکتا ہے۔

اِس دِل خراش حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اینٹ کی تیاری میں استعمال ہونے والی ریت اور روڑوں کی کچھ وقعت ہو تو ہو، عام آدمی اِتنی حیثیت کے لیے بھی ترستا ہے؟ معاشرے کی دیواریں کمزور پڑتی ہیں تو پڑا کریں۔ کسے پروا ہے، کون سوچتا ہے؟ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ ہم سبھی اِس عقیدے کی بنیاد پر سانس لیتے ہیں مگر کبھی ہم نے سوچا ہے کہ عام آدمی کتنی بار مرتا اور کتنی بار جیتا ہے؟ قدم قدم پر موت اُس کے استقبال کے لیے کھڑی ہوتی ہے مگر وہ کمال ہوشیاری سے جھکائی دیکر نکل جاتا اور نئی زندگی پاتا ہے۔ بچ نکلنے میں کامیاب ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرنے ہی میں اُس کی زندگی بسر ہوتی ہے۔

عام آدمی کو شکر گزار بنانے میں ہماری حکومتوں نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ وہ قدم قدم پر ایسے حالات پیدا کرتی ہیں جن کے دام میں آنے بچنے کی کوشش ہی سے عام آدمی کی رگوں میں لہو گرم رہتا ہے۔ یعنی لہو گرم رکھنے کے بہانے قدم قدم پر بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ بھی حکومتوں کی مہربانی ہے کہ عام آدمی کی رگوں میں جو خون بچا ہی نہیں اُسے بھی گرم رکھنے کا سامان کرتی رہتی ہیں! عام

آدمی کو اپنے مقدر پر ناز کرنا چاہیے کہ اُس کے لیے قدم قدم پر حالات کی للکار ہے۔ مشکلات سے بچنے کی کوشش ہی اُسے مہم جُو بنائے ہوئے ہے۔ ہماری حکومتیں جس طرح کے حالات پیدا کرتی رہتی ہیں اُن کی دست بُرد میں آنے سے بچنے کے لیے اب انسان کو مہم جُو ہونا ہی چاہیے! لیجیے، جس مہم جُوئی کے لیے لوگ سلسلۂ ہمالیہ کی چوٹیاں سَر کرنے کو سرگرداں رہتے ہیں وہ ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ، بلکہ خاصہ ہوئی! عام آدمی مہم جُو نہیں تو اور کیا ہے؟ زندگی بھر مخدوش حالات کی چوٹیاں ہی تو سَر کرتا رہتا ہے!

حکمرانوں سے سماجی کارکن تک سبھی عام آدمی کو نحیف و ناتواں گردانتے ہوئے اُس کے حقوق کے لیے گریاں سُناں دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ مگرمچھ کے آنسو ہیں۔ عام آدمی کمزور ہے؟ کہاں ہے کمزوری؟ جس ضعف اور بے کسی کا رونا رات دن رویا جاتا ہے وہ تو اُس میں پائی ہی نہیں جاتی۔ حکومتیں عام آدمی کو رات دن نشانے پر لیے رہتی ہیں۔ اِس کا سیدھا اور سادہ مفہوم اِس کے سِوا کیا ہے کہ حکومتیں اُسے طاقتور گردانتی ہیں؟ اقدامات پر اقدامات ہو رہے ہیں کہ عام آدمی ڈھنگ سے جی نہ سکے، سَر نہ اُٹھاسکے، بول نہ سکے، مانگ نہ سکے، چھین نہ سکے! یعنی حکومتوں کو اب بھی یقین ہے کہ ادھ موؤں کی طرح جینے اور زندگی کے نام پر چند اُکھڑی ہوئی سانسوں کو زہر مار کرنے والا عام آدمی موقع ملتے ہی کسی بھی ساعت اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر ''سسٹم'' کے لیے خطرہ بن سکتا

ہے! کمال دیکھیے کہ جس کی ناتوانی پر خود ناتوانی بھی شرمندہ ہو اُس سے خطرات لاحق ہیں!

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

جسے جلا ڈالا ہے اُسی کے خاکستر سے ڈر لگ رہا ہے۔ سبحان اللہ!

یہ رُتبہ بلند مِلا جس کو مِل گیا!

عام آدمی اپنے رُتبے کو سمجھ لے تو خوشی کے مارے (مزید) پاگل ہو جائے! ہارے ہوؤں کو ہرانے کے منصوبے تیار کئے جاتے ہیں۔ حکومتیں باؤلی ہوئی جاتی ہیں کہ عام آدمی کو کِس طور پکڑ کر، جکڑ کر رکھا جائے تاکہ وہ خطرہ نہ بن سکے۔

اب سوال یہ رہتا ہے کہ بے چارا عام آدمی کرے تو کیا کرے۔ اُس کا زندہ رہنا زندگی پر الزام سا ہے۔ دعوے کئے جاتے ہیں کہ اُس کے مفاد کو ہر حال میں ترجیح دی جائے گی، ہر شے پر مقدم رکھا جائے گا۔ مگر پھر پتا چلتا ہے کہ بڑی بڑی باتیں بھی آخر باتیں ہی تو ہیں۔ حکومتوں کے وعدوں اور دعووں میں کیا ہے؟

صرف جذبات ہیں، جذبات میں کیا رکھا ہے؟

اقبال نے کہا تھا

شیرازہ ہوا امتِ مرحوم کا ابتر

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟

عام آدمی کا بھی کچھ ایسا ہی فسانہ ہے۔ جائے تو کہاں جائے؟ فریاد کرے تو کس سے کرے؟ داد پائے تو کس سے پائے؟ حادثے میں مر جائے تو دو تین لاکھ کی امداد۔ بس یہی وقعت رہ گئی ہے۔ اور کہیں کہیں تو اِتنا بھی نہیں! عام آدمی کو یہ بات کون سمجھائے کہ کہیں سے کوئی نہیں آئے گا؟ کوئی نجات دہندہ یا مسیحا اب مقدر میں نہیں۔ جو کرنا ہے خود کرنا ہے۔ اپنے ہی زورِ بازو کو آزمانا ہے۔ مگر اِس سے بہت پہلے زورِ بازو پیدا بھی کرنا ہے!

مال و منال کے بچھڑے کی پُوجا

ہزاروں سال قبل زندگی بہت مختلف تھی۔ غار کے زمانے کا اِنسان ہر معاملے میں شدید عدمِ تحفظ کا شکار تھا۔ اُس کی زندگی محدود تھی۔ چند معمولات تھے جن کی تکمیل سے زندگی بظاہر مکمل ہو جاتی تھی۔ خواہشات کی ایک حد تھی۔ وسائل بھی، ظاہر ہے، کم ہی تھے۔ ہم نے پڑھا ہے کہ معاشیات میں اِنسان کی اُس طرزِ عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو وہ کم سے کم وسائل صرف کرکے زیادہ سے زیادہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ اِس حساب سے دیکھیے تو غار کے زمانے کا اِنسان خاصا مکمل تھا! ہزاروں سال کے عمل میں اِنسان پتا نہیں کیسے کیسے فکری اور عملی مراحل سے گزرا ہے۔ اِس دوران اُس نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یہ سب کچھ اجمالاً بھی بیان کرنے کو ہزاروں، بلکہ لاکھوں صفحات درکار ہیں۔ بہتوں نے کوشش کی ہے کہ اِنسان کے علم کا قاموس تیار کریں اور کئی ایسے ہیں جو قابلِ ستائش حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ اِس کالم میں ایسی کاوشیں کرنے والوں کے نام پیش کرنے کی بھی گنجائش نہیں۔ بیان یہ کرنا ہے کہ اِنسان نے ہزاروں سال کی محنت کے بعد بہت کچھ سیکھا ہے مگر کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ کچھ بھی نہیں سیکھا۔ ع

!سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں اختیار میں

غار کے زمانے کا اِنسان کیا چاہتا تھا؟ دو وقت کی روٹی۔ اِس کے لیے وہ اپنے پورے وجود کو داؤ پر لگا دیتا تھا۔ شکار پر نکلتا تھا تو ایسے ہتھیاروں کے ساتھ جن پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کوئی درندہ گھیر لے تو جان بچانا دشوار ہو جاتا تھا۔ جب زمین سے اناج اُگانے کے عمل کا آغاز نہیں ہوا تھا تب اِنسان کے لیے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کا بنیادی وسیلہ شکار تھا۔ گوشت خوراک کا لازمی جُز تھا۔

اب ذرا آج کے اِنسان پر غور کیجیے۔ اُس کی فکر و عمل سے کِس امر کی غمّازی ہو رہی ہے؟ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا کر رہا ہے؟ آج کے اِنسان نے ایک بڑی سہولت تو سبھی کو عطا کردی ہے۔ اگر کوئی چاہتا ہے کہ غار کے اِنسان کی زندگی کا مطالعہ کرے تو اِس کے لیے ٹائم مشین ایجاد کرکے چار چھ ہزار سال یا اُس سے پہلے کے زمانے کی سیر لازم نہیں۔ آج کے اِنسان کی زندگی بھی غار کے زمانے کی ذہنیت کی بھرپور عکّاس ہے!

ہزاروں سال پُرانے رویّے پوری آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ افروز ہیں۔ تابانی ایسی ہے کہ آنکھیں چُندھیا جائیں۔ جس میں حوصلہ ہے وہ آنکھیں کھولے۔ .بصارت کو تقویت مِل کر رہے گی

بصیرت کا البتہ خدا حافظ ہے!

اِنسان نے شاید طے کر رکھا ہے کہ زندگی کی غزل میں مطلع کے فوراً بعد مقطع لا کر رہے گا اور مقطع میں بھی سُخن گسترانہ بات لازمے کی حیثیت سے موجود رہے گی۔ گزرے ہوئے ہر کل کا اِنسان جن چند خواہشات کا اسیر تھا وہ برقرار ہیں۔ ہزاروں سال کی محنت بھی اِنسان کو تبدیل نہیں کر سکی۔ غار کے زمانے سے جدید ترین عمارتوں تک اِنسان کا سفر گاڑی کے اُس پہیے کے "سفر" کے مانند ہے جو گڑھے میں پھنس گیا ہو اور ایکسیلریٹر پر دباؤ بڑھانے کے نتیجے میں صرف گھومتا رہا ہو! صدیاں، بلکہ سیکڑوں صدیاں گزر گئیں مگر سوچ کی سُوئی وہیں یعنی مال و منال پر اٹکی ہوئی ہے۔ اِنسان نے بہت کچھ سیکھ کر بھی اب تک کچھ خاص نہیں سیکھا۔

چار پانچ برس سے پاکستانی سرزمین پر رمضان کا ماہِ مبارک چند عجیب تماشوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا رہا ہے۔ اِن تماشوں کا خود رمضان سے کوئی تعلق ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ایک دوڑ ہے جس میں بیشتر ٹی وی چینلز شریک ہیں۔ ریٹنگ کی ریس نے سب کچھ بُھلا دیا ہے۔ ویسے بھی اِنسان کو مال و منال کے سامنے کچھ اور یاد رہتا ہی کب ہے؟

ٹی وی چینلز کی رمضان نشریات نے قوم پر بُرا وقت ڈال دیا ہے۔ ریٹنگ بڑھانے کے لیے ہر فارمولے اور آئیڈیا کو جائز قرار دیا جاچکا ہے۔ ناظرین کی توجہ پانے اور اُن کی آنکھوں میں بسے رہنے کے لیے ٹی وی چینلز کسی بھی حد سے گزرنے کو تیار ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک ڈگڈگی بجائی جارہی ہے۔ اور ہر ڈگڈگی پر ناچنے کے لیے دیدہ و نادیدہ بندر حاضر ہیں۔ جو ہمیں اپنے ڈراموں میں کبھی بُھولے سے بھی دِکھائی نہیں دیتے وہ سیٹ رمضان نشریات میں دِکھائی دے رہے ہیں۔ اِن سیٹس میں اِتنی روشنی بھر دی گئی ہے کہ پُورے ملک کی تاریکی کہیں خلاؤں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ تاریکی میں بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا اور روشنی کی انتہا بھی دیکھنے کی صلاحیت چھین لیتی ہے۔ فراز نے خوب کہا ہے ؎

یہ میرے ساتھ کیسی روشنی ہے
کہ مُجھ سے راستہ دیکھا نہ جائے!

تجارتی ادارے انعامات کا سیلاب، بلکہ انقلاب لے آئے ہیں۔ ایسے میں لوگ اللہ کے انعام و اکرام کو بھی بھول بھال گئے ہیں۔ کسی کسی کو یاد رہ گیا ہے کہ رمضان اللہ کی طرف سے نازل ہونے والے فیوض و برکات بٹورنے کا مہینہ ہے، تجارتی اداروں کی بانٹی ہوئی بھیک سمیٹنے کا نہیں! خُرافات کا دریا بہہ رہا ہے اور سب اُس میں ڈبکی لگانے کو بے تاب ہوئے جارہے ہیں۔ کوئی یہ نہیں

سوچتا کہ سارے تماشے ماہِ صیام کے نام پر اور اُسی کے کھاتے میں ہو رہے ہیں۔ جس مبارک مہینے میں ہمیں ہر بُرے کام اور بالخصوص لالچ اور ریاکاری سے روکا گیا ہے اُسی کو ہم نے پوری شِدّت سے گلے لگا رکھا ہے۔ مگر خیر، اِتنا اور ایسا سوچنے کی اب فُرصت ہی کِسے ہے؟

ہزاروں سال پہلے کا اِنسان بھی تو ذرا سے مال و منال پر مَر مِٹتا تھا۔ آج کا اِنسان بھی ایسا ہی ہے۔ تو پھر فرق کیا پڑا ہے؟ یہ واقعی سوچنے کی بات ہے۔ اگر ہزاروں برس کا فِکری سفر بھی ہماری جبلّت کا رُخ تبدیل نہیں کرسکا تو پھر حاصل کیا ہے؟ سوال باٹم لائن کا ہے۔ سفر خواہ کیسا رہا ہو، دیکھا یہ جاتا ہے کہ منزل ملی یا نہیں۔ اِنسان اب بھی اپنی منزل سے بہت دور دِکھائی دیتا ہے۔ اہلِ پاکستان کے لیے سوچنے کو بہت کچھ ہے۔ دُنیا کہاں پہنچ چکی ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں؟ عمومی معیارِ زندگی بلند کرنے کی کوشش ہر قوم کرتی ہے، چند ضابطے اپناتی ہے اور اُن ضابطوں پر عمل کرکے اپنے وجود کو رفعت بخشتی ہے۔ یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ مُوسیٰ علیہ السلام جب اللہ سے احکامِ عشرہ لینے کوہِ طُور پر گئے تو نیچے اُن کی قوم کچھ ہی دیر میں ساری تعلیمات بھول کر دوبارہ لہو و لعب میں غرق ہو گئی۔ سونے کا بچھڑا بنا کر اُس کی پُوجا شروع

کردی گئی۔ ہمارے ہاں بھی بیشتر ٹی وی چینلز پر رمضان نشریات میں انعامات کے ذریعے ایک شاندار بچھڑا بنا کر اُس کی پُوجا شروع کرائی گئی ہے۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ صرف ریٹنگ کے لیے؟ اگر ایسا تھا تو یہ سب کچھ بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا؟ تجارتی اداروں کو اچانک یہ سب کچھ کیسے یاد آگیا ہے؟ مارکیٹنگ والے تو ایسے آئیڈیاز بہت پہلے بھی "فلوٹ" کرتے رہے ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ اچانک ہی بہت کچھ "ایگزسٹ" کرنے لگا ہے؟ یہ سب تو کسی باضابطہ منصوبے کا حصہ لگتا ہے۔ پہلے تو" معاشرہ اُس سطح پر پہنچایا گیا جو حیوانیت سے بہت دور نہیں۔ مسائل کی چکّی میں پسنے والے انسانوں کو ایک ایک بنیادی ضرورت کے لیے حیوان بننے پر مجبور کردیا گیا ہے۔ جنہیں پوری مزدوری بھی نہیں دی جاتی اُنہی کی جیب بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے نام پر پھر خالی کرالی جاتی ہے۔ پست ترین معاشروں ہی میں ایسا ہوتا ہے۔ یعنی ہم بھی پست ترین معاشرہ ہیں۔ یہ اعتراف بہت کچھ سمجھنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ جس طرح لیبارٹریز میں چوہوں پر تجربے کئے جاتے ہیں اور جس طرح کسی پنجرے میں بند جانوروں کو کھلانے پلانے کے نام پر نچایا اور کُدوایا جاتا ہے بس کچھ ایسا ہی منظر ٹی وی چینلز کی رمضان نشریات میں دِکھائی دے رہا ہے۔ چند انعامات کے لیے ستم زدہ اِنسانوں کی عزتِ نفس سے کھیلا جاتا ہے اور وہ بھی اِس کھلواڑ کو بخوشی جھیل رہے ہیں۔ ذہن کی یہ سطح دیکھ کر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اللہ نے ہمیں ذہن عطا کیا ہے! جن ساعتوں میں عبادات اور وظائف

کے ذریعے اللہ کی رحمت کا حصول یقینی بنانے کی سعی کی جاتی ہے اُنہی ساعتوں میں ہم سب کچھ بھول کر اپنی خواہشات اور مال و منال کی ہوس کے غار میں بند ہو کر رہ گئے ہیں! دُنیا ہمیں دیکھتی ہو گی تو کیا سوچتی ہو گی؟ یہی کہ کیا اِس بھیڑ کو قوم کہا جائے؟ مجبور اور لاچار اِنسانوں کو ذرا سے لالچ کے ذریعے کسی بھی حد سے گزرنے پر مجبور کرنے کے لیے ٹی وی چینلز پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ فطری طور پر زیادہ حیرت انگیز نہیں۔ دُکھ کی بات صرف یہ ہے کہ یہ سب کچھ دین کے نام پر ہو رہا ہے۔ جس دین میں دُنیا اور اُس کے مال و منال سے زیادہ دِل لگانے کی شدید حوصلہ شِکنی کی گئی ہے اُسی دین کے نام پر غریبوں کو لالچ کے سمندر میں غوطے لگانے پر اکسایا جا رہا ہے۔ کمرشل ازم کے نام پر ہر سطح کی کم ظرفی کو جائز اور قابلِ قبول قرار دیا جا چکا ہے۔ اے وائے ناکامی

ع

شرم ''ہم'' کو مگر نہیں آتی!

"بے فضول" کی "کُتّا گیری"

گزشتہ دنوں یہ خبر آئی کہ کراچی میں پولیس کے خاص یونٹ کے نائن کے 12 خصوصی تربیت یافتہ سُراغ رساں کتوں میں سے ایک چل بسا۔ یہ غیر ملکی کُتّا تین سال قبل 5 لاکھ روپے میں خریدا گیا تھا۔ ایک اور (غیر مصدقہ) خبر کے مطابق کُتّے کی قیمت 20 لاکھ روپے تھے۔ اہمیت اِس بات کی نہیں کہ پولیس کے خصوصی کُتّے کی قیمت 5 لاکھ تھی یا 20 لاکھ روپے تھی۔ پاکستان میں ہر نسل اور نوع کے غیر ملکی کُتّوں کو ہمیشہ اچھی قیمت ہی ملتی رہی ہے۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ پولیس کو کُتّوں کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ اِس ملک میں اب کون سا کام ایسا ڈھکا چُھپا ہے جس کا سُراغ پانے کے لیے سُراغ رساں کُتّوں سے مدد لی جائے؟ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، سرِ عام اور دَھڑلّے سے ہو رہا ہے۔ ایسے میں یہ "کُتّا گیری" فضول لگتی ہے۔ غیر ملکی کُتّے بھی شاید یہ سوچ کر ہنستے ہوں کہ جو کچھ بچہ بچہ جانتا ہے اُس کا سُراغ لگانے کے نام پر سرکاری وسائل کی گنگا بہا کر سب اُس میں ڈبکیاں لگا رہے ہیں!

پولیس کے پاس کُتّوں کی موجودگی سے ایک اطمینان تو ہوا۔ دہشت گردوں اور جرائم پیشہ افراد کا سُراغ ملے نہ ملے، اِن تربیت یافتہ کُتّوں کی مدد سے

ہم ایک دِن پولیس کا سُراغ پانے میں یقیناً کامیاب ہو جائیں گے ! جن کا سُراغ لگانے کے لیے پولیس نے کُتّے پالے ہیں وہ تو ہمارے سامنے دندناتے پھرتے ہیں۔ اُنہیں موٹر سائیکلوں پر اور گاڑیوں میں اسلحے کی نمائش کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ اصل مسئلہ تو پولیس کا سُراغ پانے کا ہے ! عوام یہ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ پولیس کو کِس طرح، کِس کی مدد سے ڈھونڈیں ! صورتِ حال ذرا سی بگڑے تو پولیس ایسی غائب ہوتی ہے کہ اُس کی فوری موجودگی یقینی بنانی ہو تو کِسی مستند اور بہت دُور تک پہنچے ہوئے عامل سے اُلّو کا عمل کرانا پڑے !

پولیس چاہے تو یہ منطق پیش کر سکتی ہے کہ ہمارے ہاں جب دہشت گرد باہر سے آتے ہیں تو پھر اُن سے نمٹنے کے لیے کُتّے بھی باہر ہی سے آنے چاہئیں۔ ویسے بھی اب پولیس کے اعلیٰ افسران کا بُنیادی فریضہ منصبی فرائض کی بجا آوری سے زیادہ نا اہلی کا جواز پیش کرنا رہ گیا ہے !

کراچی پولیس کے خصوصی کے نائن یونٹ میں اب گیارہ کُتّے رہ گئے ہیں۔ یعنی بارہواں کھلاڑی چلا گیا ! کوئی بات نہیں۔ پوری ٹیم سلامت ہے۔ دیکھتے ہیں گیارہ کُتّوں کی ٹیم دہشت گردوں اور جرائم پیشہ افراد کے خلاف میچ جیتنے میں پولیس کے محکمے کی خاطر خواہ مدد کر پاتی ہے یا نہیں۔ ہم زیادہ پُرامید

اِس لیے نہیں کہ بارہویں کُتّے کی ہلاکت بیماری سے ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اُسے ناقص دیسی خوراک دی جاتی رہی تھی۔ اعلیٰ نسل کے اِن کُتّوں کے لیے خوراک بھی درآمد کی جاتی ہے۔ اور یہی نہیں، خود ہمارے ہاں کے بعض اعلیٰ نسل کے کُتّے بھی باہر ہی کی چیزیں کھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کیا نہیں مِلتا؟ مغربی طرز کے سُپر اسٹورز میں آپ کو چھوٹے سے جار میں سِرکے میں ڈوبی ہوئی غیر مُلکی (بالخصوص ہسپانوی) پیاز بھی فنائل کی گولیوں کی سی ہیئت میں مِل جائے گی!

اب کے نائن یونٹ کے پاس جو گیارہ کُتّے رہ گئے ہیں اُن میں سے بیشتر کی حالت اچھی نہیں۔ اِن میں سے جو دو بالکل صحیح حالت میں ہیں اُنہیں صدارتی کیمپ آفس بلاول ہاؤس کی سیکیورٹی پر تعینات کیا گیا ہے! شہر کے دیگر تمام علاقے باقی 9 کمزور کُتّے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ یعنی اللہ ہی حافظ و محافظ ہے! ہم نے کب پولیس اور اُس کے کُتّوں پر انحصار کیا ہے، اُنہیں محافظ سمجھا ہے؟ ہمارا تو اللہ ہی پر بھروسہ تھا، ہے اور رہے گا۔

ہمیں حیرت اِس بات پر بھی ہے کہ ڈھائی کروڑ کی انتہائی متنوّع آبادی والے شہر کراچی میں پولیس اب بھی اِس بات پر یقین رکھتی ہے کہ سُونگھ کر یا سُنگھوا کر مشکوک اشیا کا سُراغ لگایا جائے۔ اِس قدر غیر معمولی آبادی اور

اُس سے زیادہ غیر معمولی رقبے کے حامل شہر کی حالت یہ ہے کہ اگر پولیس کے پاس دس پندرہ ہزار کُتّے بھی ہوں تو سُونگھ سُونگھ کر بے دَم، بلکہ بے دُم ہو جائیں ! کراچی کے شہریوں کا حال یہ ہے کہ جگہ جگہ کچرے کے ڈھیروں سے اُٹھنے والے تعفّن کو سُونگھ سُونگھ کر قُوّتِ شامّہ سے محروم ہو چلے ہیں ! اب کسی بھی طرح کی بدبو میں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔

کُتّوں کی خاصیت یہ ہے کہ ہر اجنبی چیز اور اجنبی چہرے کو دیکھ کر بھونکتے ہیں۔ کراچی میں سڑکوں پر قبضہ جمائے ہوئے آوارہ اور پولیس کے تربیت یافتہ غیر ملکی کُتّے حالات کی چکّی میں پِسے ہوئے غریب لوگوں پر بھونکتے ہیں کہ وضع قطع سے تو یہی لوگ اجنبی اور نامانوس لگتے ہیں ! باہر سے آئے ہوئے کُتّے سُوٹ بُوٹ پہچانتے ہیں اور اُن میں موجود لوگوں کا احترام کرتے ہیں ! اعلیٰ درجے کے سُوٹ میں ملبوس افسران نے جو خوشبو لگائی ہوتی ہے اُسے بھی یہ کُتّے خوب پہچانتے ہیں۔ غریبوں کے کپڑوں سے پُھوٹنے والی پسینے کی بُو البتہ اِن کُتّوں کے لیے اجنبی ہوتی ہے اِس لیے بھونکنا لازم ہے ! منشیات کی بُو تو اِن کُتّوں کی تربیت کا حصہ ہوتی ہے۔ شاید اِنہیں منشیات سُنگھائی ہی اِس لیے جاتی ہیں کہ اِن چند اشیا کے سِوا تمام چیزوں کو دیکھ کر چونکیں اور اُن پر بھونکیں !

ویسے پولیس کو اپنے کام میں مدد کے لیے کُتّے درآمد کرنے کی کچھ خاص ضرورت تو نہیں ہے۔ معاملہ ''کھانچے'' کا ہو تو اور بات ہے! پولیس کو جو کام درآمد شدہ، تربیت یافتہ کُتّوں سے لینا ہے وہ دیسی کُتّے پہلے ہی بخوبی کر رہے ہیں۔ جن پر بھونکنے کا اشارا کیا جائے اُن پر بھونکنا ہی تو ہے! ہر گلی اور ہر سڑک پر براجمان آوارہ کُتّے وردی پہنے ہوئے پولیس اہلکاروں اور جرائم پیشہ افراد کے سِوا سبھی پر بھونکتے، پیچھے بھاگتے اور کاٹ کھاتے ہیں! ایک طرف آوارہ کُتّوں اور دوسری طرف پولیس اہلکاروں کو دیکھ کر بے چارے شہری اپنی وہ دُم دبا کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو حالات کے دباؤ سے بہت پہلے گِھس یا جَھڑ چکی ہے!

پولیس اپنے حصے کے کام کر رہی ہے یا نہیں یہ تو ہم نہیں جانتے مگر ہاں اِتنا ضرور پتا چل گیا کہ کُتّے پال رہی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ غیر ملکی کُتّوں کی ناز برداری کے نام پر اپنے لیے کچھ اِضافی وسائل کا اہتمام کر رہی ہے! قوم کی خون پسینے کی کمائی کو شیر مادر سمجھ کر پی جانے میں ہماری سرکاری مشینری کا جواب نہیں۔ کُتّوں وغیرہ کو ساتھ رکھنے اِضافی سہولت یہ ہے کہ کرپشن کا الزام دَھرنے کے لیے چند سَر آسانی سے دستیاب ہوتے ہیں! پولیس اور دیگر محکموں کے زیرِ سایا پلنے والے کُتّے بھی سرکاری وسائل کو بھنبھوڑنے کا عمل دیکھ کر سوچتے تو ہوں گے کاش ہمارے دانت بھی ایسے ہی

! نوکیلے اور کارگر ہوتے

عید کی شاپنگ

ویسے تو خیر مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں لیکن اگر آپ کو بھرپور جوش و خروش کا حقیقی انداز دیکھنا ہو اور اپنے اندر نیا ولولہ پیدا کرنا ہو تو دو مقامات خاص طور پر مفید ہیں۔ ایک مقام تو ہے شادی بیاہ میں کھانا کھلنے کا۔ اور دوسرا ہے مزار یا خیراتی دستر خوان پر لنگر کی تقسیم کا! تیسرا ہم بتائے دیتے ہیں۔ یہ بھی کوئی نیا مقام نہیں۔ ع

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے!

اور رمضان میں تو خیر اِس طرح کا جوش و خروش محنت سے کمانے والوں کے ہوش اُڑا دیتا ہے۔ جی ہاں، ہم شاپنگ کی بات کر رہے ہیں۔ عید کے لیے شاپنگ وہ ایونٹ ہے جس میں سارے زمانے کا جوش و خروش کانٹ چھانٹ کر بھر دیا گیا ہے۔ شاپنگ سینٹرز پر جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ مُردہ ضمیر کو بھی جگا دینے کے لیے کافی ہے۔ ایسا بھرپور جوش و خروش اگر کِسی فورس میں ہو تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا فتح کر لے!

رمضان المبارک کی آمد فیوض و برکات کی ابتداء سمجھی جاتی ہے۔ اِس میں کوئی

شک نہیں ہو سکتا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ آزمائش بھی تو شروع ہوتی ہے۔ رمضان کا پہلا عشرہ رحمت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ اٹل حقیقت ہے مگر اہلِ وطن نے رمضان کی مبارک ساعتوں سے خدا جانے کیا کیا کشید کرنا شروع کر دیا ہے کہ اب رحمت، برکت اور مغفرت تو کہیں پیچھے رہ گئی ہے اور رونق میلہ ہر شے پر چھاگیا ہے! بھلا ہو کُھلے بازار کی معیشت چلانے والوں کا جنہوں نے رمضان کو بھی ایونٹ میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہم ایک زمانے سے دیکھتے آئے ہیں کہ رمضان کی پُر کیف اور بابرکت ساعتوں میں لوگ اپنے لیے نجات کی راہ ڈھونڈا کرتے تھے مگر زمانہ ایسا پَلٹا ہے، یا پَلٹا گیا ہے، کہ اب رمضان کے آغاز ہی سے کسی کو کپڑے بنوانے کی فکر لاحق ہوتی ہے اور کوئی اِس پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے کہ گھر بھر کے کپڑے بنوانے کے عمل میں اپنے بدن کے کپڑوں کو نیلام ہونے سے کیسے بچایا جائے!

ہمارے بعض دوست معترض ہیں کہ ہم اپنے کالموں میں بس ذرا سا موقع ملتے ہی خواتین کی ''واٹ'' لگاتے ہیں۔ ہم اُن کی سادگی پر ''زیرِ لب کے نیچے'' مُسکراتے رہتے ہیں۔ کیوں نہ مُسکرائیں؟ وہ خود بھی اپنی اپنی خواتین کے ہاتھوں بہت کچھ جھیل رہے ہوتے ہیں مگر الزام دوسروں کے سَر دَھرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں! اور ہمیں تو اِس بات پر بھی ہنسی آتی ہے کہ جن کالموں کو خود خواتین ''خراجِ تحسین'' کے زُمرے میں رکھتی ہیں اُنہیں ''واٹ'' لگانے

کی کوشش کیوں قرار دیا جارہا ہے ! شاپنگ دُنیا کا واحد موضوع ہے جس کے حوالے سے خواتین پر شدید تنقید کی جائے تو وہ داد و تحسین کے ڈونگروں کی طرح قبول کرتی ہیں !

خواتین عید کی شاپنگ سے قبل بازار کے کئی چکر کاٹتی ہیں تاکہ حالات کا جائزہ لے سکیں۔ یہ وارم اپ میچ ہوتا ہے۔ بقول میرؔ ع

یعنی آگے چلیں گے دَم لے کر

شاید کھیلوں کی دُنیا میں بھی وارم اپ میچ کا آئیڈیا خواتین کی ''شاپنگ دَر شاپنگ'' سے ہاتھ آیا ہے !

جو لوگ شاپنگ کے دریا کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کرتے ہیں اُنہیں کسی بھی نوعیت کے تکلف کے بغیر دُنیا کے سب سے بڑے احمق قرار دیا جاسکتا ہے۔ شاپنگ دنیا کا واحد مرض ہے جو اپنے علاج کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے ! اسلام کی طرح قدرت نے خواتین کی شاپنگ کی فطرت میں بھی لچک دی ہے۔ یعنی اُتنی ہی یہ اُبھرے گی جتنی کہ دباؤگے ! گویا ع

مَرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی !

دُنیا بھر کے ماہرینِ نفسیات اگر خود کو بہت بڑا ظُرم خاں سمجھتے ہیں تو ذرا آگے آئیں اور ہمارے ہاں عید کی شاپنگ کا جوش و خروش گھٹانے کا کوئی نُسخہ تجویز کرکے تو دِکھائیں۔ ذرا سی دیر میں لگ پتا جائے گا! نفسیات کے ماہرین جب بھی گفتگو کرتے ہیں، نظریات سے شروع ہو کر تجربات تک پتا نہیں کیا کیا بَک جاتے ہیں۔ کبھی عید کی شاپنگ پر کچھ کہیں تو اُنہیں معلوم ہو کہ چند لمحوں میں گونگے بن جانا کیا ہوتا ہے!

بعض لوگوں کا مزاج اُلٹا ہوتا ہے۔ یعنی کِسی کام سے روکنا ہو تو وہ کام کرنے کو کہیے۔ یہ اُصول مَردوں اور خواتین دونوں پر کارگر ثابت ہوتا ہے۔ شاپنگ کو البتہ ''استثنٰی'' حاصل ہے۔ خواتین کو شاپنگ سے روکیے یا نہ روکیے، نتیجہ سِتم بالائے سِتم ہی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے!

رمضان کی آمد اِس بات کی نوید ہے کہ اب عید الفطر بھی وارد ہوگی۔ مگر صاحب! بیشتر شوہروں کے لیے رمضان کا وارد ہونا عیدالاضحٰی کی آمد سے کچھ کم نہیں! اُنہیں رمضان کے پہلے عشرے ہی میں چُھریاں نظر آنے لگتی ہیں! بازاروں کی رونق کسے اچھی نہیں لگتی مگر یہ ساری رونق دیکھ دیکھ کر شوہروں کے دِل بیٹھتے جاتے ہیں۔ ماہِ مُبارک کے دوران عبادات کا لطف کچھ اور ہی ہے۔ جنہیں اللہ سے بہت کچھ چاہیے وہ عبادات میں مصروف رہتے ہیں۔ بیشتر (بالخصوص حق حلال

کی آمدنی والے) شوہر معروف و مقبول عبادات کے ساتھ شاپنگ کے عذاب سے بچنے کے لیے بھی مختلف وظائف پڑھتے رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ رمضان کے ختم ہوتے ہوتے بیشتر شوہر کسی نہ کسی روحانی درجے پر فائز دکھائی دینے لگتے ہیں ! چہرے کی مِسکینی بڑھ جاتی ہے۔ طبیعت میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے اور گھر بھر کی خوشیوں کا خیال رکھنے کے صِلے میں اللہ چہرے پر تھوڑا بہت نور بھی پیدا کر ہی دیتا ہے !

اگر کوئی شاپنگ کے حوالے سے خواتین کو مطعون کرنا چاہے تو اُس کی سادگی اور کم عِلمی پر ہنسی ہی آئے گی۔ شاپنگ تو خواتین کی نفسیاتی ساخت میں ''اِن بلٹ'' ہے، یہ وصفِ حمیدہ اُن کے دِماغی کمپیوٹر کے ڈیفالٹ میں ہے ! علامہ اقبالؔ نے کہا ہے کہ کائنات کی تصویر میں رنگ عورت کے وجود سے ہے۔ عیدالفطر جُوں جُوں قریب آتی ہے، یہ رنگ اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ تصویرِ کائنات کے سارے رنگ شاپنگ سینٹرز میں ڈیرے ڈال کر اُنہیں ایک نئی کائنات کی شکل بخشتے ہیں ! اِس پورے عمل میں بے چارے شوہر سوچتے ہی رہتے ہیں ع

دِل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک !

شاپنگ کے بُنیادی اُصولوں پر غور کرتے وقت یاد رکھیے کہ اِس کا کوئی بُنیادی اُصول نہیں ہوتا۔ پہلے نمبر پر یہ یاد رکھیے کہ شاپنگ اور بالخصوص

عید کی شاپنگ کبھی ایک ''ہلّے'' میں نہیں ہوتی۔ بازار کے پہلے دو تین چکّر تو صرف سروے'' کے لیے ہوتے ہیں۔ یعنی دیکھا جاتا ہے کہ کون کون سی (اوٹ پٹانگ)''
چیزیں آئی ہوئی ہیں۔اِس کے بعد یہ طے کیا جاتا ہے کہ کیا اور کیوں خریدنا ہے۔
کیوں'' کی غایت یہ ہے کہ بہت سی چیزیں اپنی پسند سے نہیں خریدی جاتیں بلکہ''
!حریفوں کو نیچا دِکھانا مقصود ہوتا ہے

عید کی شاپنگ بھی ایک پورا تہوار ہے، میلہ ہے، ایونٹ ہے۔ سب سے پہلے تو ٹوہ لگائی جاتی ہے کہ کِس نے کیا خریدا ہے۔ اس کے بعد موازنہ شروع ہوتا ہے۔ کِسی نے کچھ اچھا خریدا ہے تو اب اُس سے اچھا خریدنا ہے۔ اگر کِسی نے بے ڈھنگی شاپنگ کی ہے تو اُسے نیچا دِکھانے کے لیے مزید شاپنگ کرنی ہے۔ شاپنگ سینٹرز کا چکّر ایک نئی فہرست کو جنم دیتا ہے۔ گویا ٹارگٹ کلنگ کی تیاری کی جارہی ہو! ویسے شوہروں کی کمائی کی تو یہ
!ٹارگٹ کلنگ ہی ہے

اللہ کا کرم ہم پر ہر آن جاری ہے اور ہم مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں۔ مگر کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ اہلِ خانہ کو عیدالفطر کی تیاریاں کرانے کے بعد بھی ہر صاحبِ خانہ کا زندہ رہنا
!اللہ کا کتنا بڑا کرم ہے

خواتین جس تیزی سے ایک دکان سے دوسری دکان اور دوسری سے تیسری میں داخل

ہوتی اور باہر آتی ہیں وہ منظر قابل دید ہوتا ہے۔ مگر اس سے زیادہ قابل دید تو
شوہروں کی پھُرتی ہوتی ہے جو سامان اور بچوں کو سنبھال کر بیویوں کو فالو کر رہے
ہوتے ہیں ! ایسی حالت میں شوہروں پر ٹکٹ بھی لگایا جاسکتا ہے !
لفظوں میں کیا سمائیں گے کرتب جناب کے !
گھر سے نکلتے وقت جو سرکس کا شیر تھا، بازار سے واپسی پر فوج کے خَچر میں تبدیل ہوچکا
ہوتا ہے، یعنی خریدے ہوئے سامان اور بچوں کی بار برداری کے کام آتا ہے ! مختصر یہ
کہ ناز برداری میں کام آ جاتا ہے !

ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے!

عام انتخابات کے بعد حکومت بھی بن چکی اور صدارتی انتخاب بھی ہو چکا۔ مسائل کی سیاہ رات میں گِھرے ہوئے لوگوں کو جس سَحر کا انتظار تھا اُس کے آثار اب تک ہویدا نہیں ہوئے۔ کیسے کیسے سپنے سجائے تھے مگر آنکھوں کو ملا کیا؟ وہی ویرانی اور بے یقینی۔ دِل کا عجیب عالم ہے۔ جو کچھ دیکھتا ہے اُسے ماننے کے لیے تیار نہیں مگر ماننا تو پڑے گا۔ دِل کے ساتھ بھی تو کچھ اچھا نہیں ہوا۔ ؎

دِل شاد تھا کہ پُھول کِھلیں گے بہار میں

مارا گیا غریب اِسی اعتبار میں!

اب کوئی کِس کے آگے روئے؟ جمہوریت کے نام پر ایک بار پھر آنکھوں دیکھی مکھی نِگلی ہے، ایک بار پھر فریب کھایا ہے۔ اور فریب بھی ایسا کہ رات کی سیاہی دُور سے دِن کے اُجالے کی سی دِکھائی دی۔ ایک بار پھر آنکھ بند کرکے فیصلے کیے گئے۔ ووٹ کے ذریعے جس نوعیت کی تبدیلی یقینی بنائی جاسکتی ہے وہ اب تک دِکھائی نہیں دی ہے۔ اور اب کیا دِکھائی دے گی کہ پانی ایک بار پھر اپنی پنسال میں آچکا ہے۔ جس طرح گاڑی کا پہیہ گڑھے میں پھنسنے پر صرف

گھومتا رہتا ہے، گاڑی کو آگے بڑھانے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتا بالکل اُسی طرح ہماری سوچ بھی لاحاصل سی ہو گئی ہے۔

عوام نے پانچ سالہ جمہوری دور رو رو کر گزارا۔ ایک موہوم سی اُمید تھی کہ بیلٹ بکس تک جانا نصیب ہوگا تو وہاں سے کسی بڑی تبدیلی کی راہ سُجھائی دے گی۔ مُلک میں بہت کچھ تیزی سے بدلنے کی ضرورت ہے۔ اِس کے لیے انقلاب چاہیے۔ عوام منتظر ہیں کہ کوئی انقلاب برپا ہو تو "آوے ای آوے" کا نعرہ بُلند کرتے ہوئے اُس کے پیچھے ہو لیں۔ یہ سوچنے کی فُرصت کسے ہے کہ انقلاب برپا ہوتا نہیں، برپا کیا جاتا ہے!

حالات خواہ کچھ ہوں، ہمارے ہاں جو ہوتا آیا ہے وہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ جب یہ حال ہو تو کسی تبدیلی کی راہ کیسے نِکلے؟ مسائل خواہ کچھ ہوں، ہم وسائل کے بارے میں سوچے بغیر اپنی اپنی من پسند روش پر گامزن رہتے ہیں۔ ایسے میں کوئی بھی تبدیلی آئے تو کیسے؟ خیر کی صورت نکلے تو کس طرح؟

ملک کِتنا بدل گیا ہے۔ یہاں بدلنے کو بگڑنے سے تعبیر کیجیے۔ ہمیں اللہ کی مہربانی سے کیسا شاندار خِطّہ عطا ہوا تھا۔ اِسے زمین کی جنّت بنانے میں کون سا امر مانع ہو سکتا تھا؟ مگر ہم نے کیا کیا؟ پینسٹھ برس کے عرصے میں اِس پاک خطّے کو ہم صرف کھاتے آئے ہیں۔ اور یہ بھی اللہ کے کرم ہی کی ایک

شکل ہے کہ اِتنی تندہی اور فُرصت سے کھائے جانے کے باوجود یہ خِطّہ اب تک سلامت ہے!

چند برسوں سے قدرت کا معمول یہ ہے کہ رمضان اور عید کے دنوں میں مون سون کی صورت بارانِ رحمت بھی عطا کرتی ہے مگر ہم ہیں کہ اِس رحمت کو بھی زحمت میں تبدیل کرنے پر کمربستہ ہیں۔ تین سال قبل سیلاب آیا تھا یا لایا گیا تھا۔ اُس میں ایک پورا صوبہ ڈوب گیا یا ڈبو دیا گیا۔ لاکھوں ایسے ہیں جو اب تک بحال نہیں ہو پائے ہیں۔ زندگی ایسی مشکل ہوچکی ہے کہ جس کے قدم لڑکھڑائے، سمجھ لیجیے وہ تو گرا ہی گرا۔ مگر اے وائے ناکامی! ہوش کے ناخن لینے کا کسی کو ہوش نہیں۔

اب کے عید پھر بارش کے دنوں میں وارد ہوئی ہے۔ ملک کے بہت سے حصے طغیانی کی زد میں ہیں۔ دریاؤں کی تو بات ہی کیا، ندی نالے تک بپھرے ہوئے ہیں۔ کراچی، لاہور اور دیگر بڑے شہروں کا بھی بُرا حال ہے۔ اِن بڑے شہروں میں بھی کئی علاقے تالاب بن گئے۔ کروڑوں کے مالی نقصان کے ساتھ ساتھ جانی نقصان بھی ہوا ہے۔ بہتوں کے روزگار کے ذرائع تباہ ہوگئے۔ اب اُنہیں دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں کئی ماہ لگ جائیں گے۔

یہ سب اپنی جگہ اور عید کی تیاریاں اپنی جگہ۔ اہلِ وطن نے سوچ لیا ہے کہ جو ہوتا ہے وہ ہوتا رہے، جو کرنا ہے وہ کرتے رہیں گے۔ سوچنے والوں کی پہلے بھی کمی تھی۔ اب تو خیر معاملہ قحط الرّجال کا سا ہے۔ اِس بند گلی سے نکلنے کا راستہ سُوجھتا بھی نہیں اور راستہ بنانے کی ہمت یا توفیق بھی نہیں۔

رمضان کی مبارک ساعتیں اللہ کی طرف سے نازل کی جانے والی برکات تلاش کرنے کے لیے ہوتی ہیں مگر ہم نے اِن سعید ساعتوں کو رمضان نشریات میں برپا کئے جانے والے تماشوں کی نذر کردیا۔ علامہ اقبالؔ نے برمحل کہا ہے۔ ؎

وائے ناکامی ! متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دِل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

کِس کِس کو روئیے اور کِس کِس کو یاد دلائیے کہ ہم کیا تھے اور کیا کرنا تھا مگر کیا ہوگئے ہیں اور کیا کر رہے ہیں ! زندگی کے بازار کی رونق کبھی ماند نہیں پڑتی۔ پڑنی بھی نہیں چاہیے مگر کِسی کے درد کو محسوس کرنا بھی کوئی بات ہے یا نہیں؟ اِس وقت بھی کروڑوں افراد عید کی تیاریوں میں اِس طرح گم ہیں کہ اُنہیں دیکھ کر اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ بھی پاکستان کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کے عذاب ہی کی ایک شکل ہے کہ ہم ٹی وی پر کِسی تباہی اور جانی نقصان کا منظر دیکھتے ہیں اور چند لمحوں کے بعد

سب کچھ ذہن سے جھٹک کر پھر معمولات میں گم ہو جاتے ہیں۔ اور معمولات کیا ہیں؟ وہی شگفتہ مزاجی، ہنسی مذاق اور ٹھٹھول۔ جس طرح کوئی دوا کثرتِ استعمال سے اپنا اثر کھو بیٹھتی ہے بالکل اُسی طرح آفاتِ ناگہانی، دہشت گردی اور جانی نقصان نے بھی ہم پر اثر انداز ہونا چھوڑ دیا ہے۔ جب زمین بنجر ہو جائے تو اُس پر بہترین کھاد، اعلیٰ بیج اور عمدہ پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

بنجر زمینوں جیسے بے فیض اور بے احساس دِلوں کو زندہ کرنا ہے۔ ایک بار پھر عید کی مبارک ساعتیں ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمیں اِن ساعتوں میں اپنے آپ سے یہ عہد کرنا ہے کہ جو کچھ وطن اور اہلِ وطن پر بیت رہی ہے اُس پر غور کریں گے، درد محسوس کری گے اور معاملات کی دُرستی میں جو کردار ادا کرنا چاہیے وہ ادا کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ بے حِسی کی چادر کو اُتار پھینکنے کا وقت آگیا ہے۔ یہ وقت وہ نہیں کہ ہم ایک طرف بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں۔ سب کو ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہونا ہے۔ بارش میں اپنا گھر سلامت ہے تو پُرسکون ہو کر بیٹھ رہنے کے بجائے اُن کی مدد کا سوچنا چاہیے جن کی دیواریں پانی میں گھِر اور گر گئی ہیں۔ اپنی سلامتی پر اللہ کا شکر ادا کرنا اچھی بات ہے مگر جن پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے ہیں اُن کے بارے میں سوچنا اور اُن کی مدد کرنا بھی تو اظہارِ تشکر ہی کی ایک صورت ہے!

علامہ اقبالؔ ہی نے کہا تھا۔ ع

ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

اور سچ تو یہ ہے اب تک ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑا رہا ہے۔ ہم اپنے اعمال سے اُسے ہنسنے کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم اِس سلسلے کو اب ختم کریں اور کچھ ایسا کریں کہ ہلالِ عید ہمیں دیکھ کر ہنسی اُڑانے کے بجائے شاداں و فرحاں ہو۔

دِل کی دیوار خالی ہے

ایک بہار رمضان المبارک کی شکل میں ہمارا نصیب بنی۔ اِس کے بعد مسرتوں کے مزید پھول کھلے یعنی عیدالفطر بھی حصے میں آئی۔ اور اِس کے بعد جشنِ آزادی آیا ہے۔ قوم شادمانی کے سمندر میں غوطے لگا رہی ہے۔ مون سون نے بھی کچھ کم غوطے نہیں لگوائے۔ مگر یہ مون سون ہی تھا جس کی بدولت ماہِ صیام ٹھنڈا ٹھنڈا گزرا۔ مگر خیر یہ ٹھنڈک عام آدمی تک محدود رہی۔ جنہیں رمضان میں بھی کاروبار کے نام پر دُنیا سمیٹنی تھی اُن کے لیے بازار گرم ہی رہا۔ منافع خوروں کے لیے رمضان کے بعد عید کا موسم دوآتشہ ثابت ہوا۔ پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں اور سَر کڑھائی میں۔

جشنِ آزادی کی ساعتوں میں بھی موسم خوشگوار ہے۔ ملک بھر میں بارانِ رحمت کا سلسلہ جاری ہے۔ کراچی میں بھی گھٹائیں سایا کئے ہوئے ہیں۔ رمضان کے دوران اور عید کے موقع پر جو رِم جھم ہوتی رہی ہے وہی جشنِ آزادی پر بھی جاری رہی ہے۔ کئی برسوں سے معاملہ یہ ہے کہ جشنِ آزادی مون سون کے سائے میں آتا ہے اور ملک کو ٹھنڈا ٹھار کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔

وطنِ عزیز کی فضائیں ایک بار پھر سبز ہلالی پرچم سے معمور ہیں۔ ہر طرف جھنڈیوں اور پرچموں کی بہار ہے۔ دو ڈھائی عشروں کے دوران جشنِ آزادی کچھ زیادہ ہی جوش و خروش سے ہماری زندگی کا حصہ بنا ہے۔ سابق صدر ضیاء الحق مرحوم نے جشنِ آزادی کو شاندار طریقے سے منانے کی روایت ڈالی۔ اب قوم جشنِ آزادی جوش و خروش سے منانے کا تھوڑا بہت اہتمام ضرور کرتی ہے۔

گلی گلی جھنڈیاں لہرا رہی ہیں، فضاؤں میں سبز ہلالی پرچم بلند ہیں۔ رہبرانِ ملت کی تصاویر آویزاں ہیں۔ اِن ہورڈنگز کو دیکھ کر ایک طرف تو یہ سوچ کر فخر کا احساس ہوتا ہے کہ ہم میں بھی کچھ ڈھنگ کے لوگ پیدا ہوئے تھے اور دوسری طرف خیال آتا ہے کہ اب آگے کیا ہے؟ لگتا ہے سارے سُورج بُجھ گئے ہیں کیونکہ راہ میں بہت دُور تک اندھیرا ہے۔

جوش و خروش کی قدر کی جانی چاہیے۔ بُلند حوصلگی ایسا وصف ہے جو ہزار جتن سے پیدا ہوتا ہے اِس لیے اِسے کِسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہ کیا کہ ہم نے اپنے ہر اچھے وصف کو سَرد خانے میں ڈال رکھا ہے اور تمام بُرے خصائل کو دِل سے لگائے بیٹھے ہیں؟

رمضان میں اللہ کی رضا کے حصول کا شوق جتنی تیزی سے اُبھرتا ہے اُتنی ہی تیزی

سے دَم توڑ دیتا ہے۔ عبادات کا مہینہ عیدالفطر منانے کے اہتمام کی نذر ہو جاتا ہے۔ جن میں اللہ کی خوشنودی کے حصول کا حکم دیا گیا ہے ہم نے اُن مبارک ساعتوں کو ٹی وی کی خصوصی نشریات کے حوالے کردیا ہے۔ یہ سب کیا ہے، کوئی اِس کی توضیح بھی نہیں کرسکتا۔

عیدالفطر اللہ کی طرف سے انعام ہے۔ یہ مسرت کا ایسا موقع ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ مگر ہم نے عیدالفطر کے سعید لمحات کو بھی مال وزر کی نذر کردیا ہے۔ اللہ کی رضا چاہنے سے زیادہ یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ تن پر قیمتی کپڑے ہوں اور پیروں میں ایسی جُوتی جِسے دیکھ کر لوگ متاثر کم اور مرعوب زیادہ ہوں! جب نیّتوں کا یہ عالم ہو تو کسی بھی عمل کی زمین پر برکت کے پُھول کیسے کِھل پائیں گے؟

ہم کئی عشروں سے جشنِ آزادی منا رہے ہیں۔ بیس برس پہلے تو اِسے باضابطہ قومی تہوار کا سا درجہ حاصل تھا۔ سرکاری ریڈیو اور ٹی وی پر خصوصی نشریات ہوا کرتی تھیں۔ اخبارات بھی وطن کی محبت دِلوں میں زندہ رکھنے کے حوالے سے خاص محنت کیا کرتے تھے۔ مگر پھر سب کچھ بدلتا گیا۔ خُلوص کی جگہ صرف دِکھاوا رہ گیا۔ اب حال یہ ہے کہ گھر پر پرچم لہرا کر، چند جھنڈیاں لگا کر، سینے پر بیج سجا کر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وطن کی محبت کا قرض چُکتا کردیا!

وطن کی مِٹّی ہم سے محنت اور اِخلاص طلب کرتی ہے اور ہم دو تین دِن تک وطن کے گیتوں کی لَے میں تھوڑا سا جُھوم کر یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ وطن کا حق ادا ہوگیا! کوئی اپنی مِٹّی کا قرض چُکا سکتا ہے؟ جان تو دی جا سکتی ہے مگر قرض چُکتا کرنے کا دعوی نہیں کیا جا سکتا۔ جو ایسا سوچتے ہیں اُن کی سادہ لوحی پر ہنسا ہی جا سکتا ہے۔

کیا وطن کی محبت صرف اِس بات کی متقاضی ہے کہ گھر پر دو چار دن پرچم لہرا لیا جائے؟ کیا جشنِ آزادی صرف اِتنے سے عمل کا نام ہے کہ ہم جھنڈیوں کی چند قطاروں سے اپنی گلیاں سجالیں؟ اور سینے پر بیج سجائے پھریں؟ وطن کی محبت سے معمور نغمات سُن کر جُھوم اُٹھنا بے حد مستحسن سہی مگر اِس منزل سے آگے بھی تو بہت کچھ ہے جو کرنا ہے۔

فضائیں قومی پرچم سے معمور ہیں، سبز رنگ کی بہار آئی ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ دِل کی فضا کب بدلے گی؟ کب ہمارے دِل کی فضا میں قومی پرچم ہمیشہ کے لیے لہرائے جانے کا آغاز ہوگا؟ دِل کی دیوار کب تک خالی رہے گی؟ اِس دیوار پر رہبرانِ ملت کی تصاویر کب آویزاں ہوں گی؟ ہم نوشتۂ دیوار نہیں پڑھتے یا پڑھنا

نہیں چاہتے تو کم از کم نوشتۂ دِل ہی کا اہتمام کرلیں۔ دِل پر کچھ ایسا لکھیں اور کچھ ایسا آویزاں کریں جو دیرپا ہو اور وطن سے محبت کے جذبے کو نئی بلندیوں سے آشنا کرتا رہے۔

فیصلے کی گھڑیاں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ ہم سوچتے ہیں اور پھر سوچتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اپنے آپ سے کھیلنے کا یہ طریقہ سنگین نتائج پیدا کرتا ہے۔ اور کر رہا ہے۔ ہم ہر اہم لمحے کو ایک روایت سمجھ کر گزارنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ماہِ صیام بھی اب تزکیۂ نفس کی راہ پر گامزن ہونے کے موقع سے بڑھ کر محض ایک روایت بن چکا ہے۔ یعنی ایک خاص سیزن کو آنا ہے اور گزر جانا ہے۔ عیدالفطر بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اور جشنِ آزادی بھی۔ دیواروں پر تصاویر چِپکانے سے کہیں آگے جاکر اب ہمیں اپنے دِل کی دیوار پر کچھ چِپکانا ہے، چند ایسے نقش قائم کرنے ہیں جو تادیر اور تازہ رہیں۔ اور جنہیں دیکھ کر ہم کچھ کرنے کی، کچھ کر گزرنے کی تحریک پاتے رہیں۔

ماہِ صیام ہو، عیدالفطر یا جشنِ آزادی ..... اب ہر معاملہ ہم سے غیر معمولی روایت شِکنی کا طالب ہے۔ ماہِ صیام عید کی شاپنگ کے لیے نہیں ہوتا، بالکل اِسی طرح جشنِ آزادی بھی محض وطن کی گیت سُننے اور کچھ دیر سرخوشی کے عالم میں رہنے کے لیے نہیں ہوتا۔ ہر اہم موقع ہم سے ہمارے پورے وجود کا تقاضا

کرتا ہے۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم انفرادی اور قومی سطح پر ترجیحات کا حتمی تعین کریں اور اُن ترجیحات کے مطابق خود کو بدلیں؟ اب نوشتۂ دیوار سے کچھ ہٹ کر نوشتۂ دیوارِ دل کے بارے میں سوچنا ہے۔ نوشتۂ دیوار تو اوروں کی طرف سے ہوتا ہے، نوشتۂ دیوارِ دل کا اہتمام ہمیں خود کرنا ہے۔ اِسی سے اندازہ ہوگا کہ ہم کیا دیکھنا اور پڑھنا چاہتے ہیں۔

چمن میری مکھیاں

دُنیا میں اگر مکھیاں نہ ہوتیں تو بہتوں کے دِماغ کو دُرستی کا راستہ نہ ملتا۔ یوں تو چھوٹی ہے ذات مکھی کی مگر قیامت دیکھیے کہ اِتنی چھوٹی سی ذات کی ہو کر بھی مکھی قیامت ڈھانے پر تُلی رہتی ہے۔ اگر یہ ذرا سی مکھی تنگ کرنے پر آ جائے تو سرکاری خرچ پر تعمیر کئے جانے والے پارک میں چند رومانی لمحات گزارنے کے لیے آیا ہوا پریمی جوڑا بھی بالآخر خود پر اور پورے ماحول پر لعنت بھیجتا ہے اور پھر فریقین چُپ چاپ گھر کی راہ لیتے ہیں! جو لوگ مکھی کو ناک پر نہیں بیٹھنے دیتے وہ آخرِ کار اُن کے دِماغ میں گھس کر کچھ اِس طرح پیر پسار کر بیٹھتی ہے کہ پھر اچھا خاصا کھڑاگ کھڑا کر دیتی ہے!
سندھ کے وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ خبروں میں رہنے کا منفرد ہُنر جانتے ہیں۔ اِسی بات کو ذرا گھما کر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ خبروں میں رہنے کا ہُنر شاہ صاحب پر مہربان ہوگیا ہے۔ وہ کچھ کہیں تب بھی خبر بنتی ہے اور کچھ نہ کریں تب بھی خبر بن ہی جاتی ہے! دُنیا بھر میں انتظامی سربراہان کو خبروں میں جگہ بنانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب اِس کے ذرا بھی مکلّف نہیں۔ گیارہ مئی کے عام انتخابات سے قبل سندھ کی وزارتِ اعلیٰ کے پانچ سال مکمل کرنا اُتنا بڑا کمال نہ تھا جتنا بڑا

کارنامہ اِن پانچ برسوں میں کچھ بھی نہ کرنا تھا! شاہ صاحب نے ٹھنڈا ٹھار مزاج پایا ہے اور یہی مزاج اُن کی کارکردگی میں بھی در آیا ہے! پتہ نہیں اُنہوں نے ایسی کون سی بُوٹی پائی ہے جس کے استعمال سے سخت گرم سیاسی ماحول میں بھی اُن کا مزاج ٹھنڈک کا آئینہ دار رہتا ہے! اُن کے دور میں سبھی کچھ ٹھنڈے اور پُرسکون انداز سے چلتا رہتا ہے۔ واقعی ع

جو لوگ کچھ نہیں کرتے، کمال کرتے ہیں!

ہو سکتا ہے کہ کل کو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں شاہ صاحب کا نام ایسے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے درج ہو جائے جو کچھ نہ کرکے بھی پانچ سال تک منصب پر فائز رہا اور اب مزید پانچ سال کی ایکسٹینشن مل گئی ہے!

وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز ہو کر شاہ صاحب نے اُنہوں نے کچھ اور کیا ہو یا نہ کیا ہو، عجیب و غریب اتفاقات کے ذریعے خبروں میں جگہ ضرور پائی ہے! "باوثوق ذرائع" شاہ صاحب کے بارے میں کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ بتاتے ہی رہتے ہیں۔ اور یہ شاہ صاحب کا خُلوص، عجز اور اِنکسار ہے کہ کبھی غُرور نہیں کیا!

قُدرت جب مہربان ہوتی ہے تو مکّھی جیسی ناچیز سی مخلوق کے ذریعے بھی اِنسان کو میڈیا میں نمایاں کردیتی ہے۔ شاہ صاحب کے معاملے میں کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ویسے تو خیر وہ خبروں میں رہنے کے لیے مکّھی جیسی مخلوق کے محتاج ہرگز نہیں مگر پھر بھی

قُدرت نے اپنا کام کیا اور 14 اگست کی صبح قائدِ اعظم کے مزار پر مرکزی تقریب میں مکّھیوں نے شاہ صاحب کو بہت تنگ کیا۔ (واضح رہے کہ شاہ صاحب کو تنگ کرنے کے حوالے سے ہم مکّھیوں کے پردے میں اویس مظفر اور دیگر جیالوں کی بات نہیں کر رہے!) محسوس یہ ہو رہا تھا کہ جشنِ آزادی کی تقریب میں مکّھیاں بھی آزادی کا جشن منا رہی ہیں! خطاب کے دوران مکّھیوں نے شاہ صاحب کو اِس قدر تنگ کیا کہ وہ بدحواسی کی سی حالت میں (اِس بار بھی یعنی عمر کے تقاضوں کے عین مطابق) کچھ کا کچھ بول گئے۔ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو اُن کی شاندار خدمات پر خراج عقیدت پیش کرتے وقت اُن کے منہ سے ''شہید آصف'' نکل گیا!

لوگ اگر مکّھی، مچھّر اور دیگر کیڑے مکوڑوں سے خار کھاتے ہیں تو اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک ذرا سی مکّھی نے کسی اور کو نہیں، ملک کے دوسرے بڑے صوبے کے وزیر اعلیٰ کو بدحواس کردیا۔ مُلک کے قیام کی سالگرہ پر آزادی کا جشن منانے کا حق سب کو ہے مگر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ مکّھیوں اور مچھّروں کو بھی کُھلی چُھوٹ دے دی جائے۔ اگر اِنہیں یوں ہی مادر پدر آزاد چھوڑا جاتا رہا تو یہ ''وچّن میری مکّھیاں'' عوام کے ''ہر دِل عزیز'' رہنماؤں کے حواس مختل کرکے اُن سے مُنہ سے ایسی باتیں نکلواتی رہیں گی جو بے چاروں کے لیے (مزید) شرمندگی کا باعث بنیں گی! اب دیکھیے نا، پیپلز پارٹی کے لیے پہلے ہی کیا کم پریشانیاں ہیں جو شاہ صاحب کی زبان نے پھسل کر اُن میں اِضافہ کردیا! شاہ صاحب ایک مکّھی کے

ہاتھوں پریشان ہو کر وہ بات بھی اپنی زبان پر لے آئے جو دِل کی کائنات کے کسی انتہائی دُور اُفتادہ گوشے میں پڑی ہوئی تھی! ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ تفتیشی اداروں کے افسران بھی چاہیں تو جیالوں کے مُنہ سے ایسی کوئی بات آسانی سے نِکلوا نہیں سکتے! یہ تو مکھیوں کی مہربانی ہے کہ شاہ صاحب ”فرسٹریشن“ کا شکار ہو کر پارٹی کے شہیدوں میں ایک کا اِضافہ کرگئے۔ ہم نے مرزا تنقید بیگ سے اِس واقعے کا ذکر کیا تو اُنہیں ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ ہم نے حیران ہو کر اُن سے حیران نہ ہونے کا سبب پوچھا تو کہنے لگے۔ ”پیپلز پارٹی کو نئی زندگی پانے کے لیے کوئی بڑا شہید درکار ہے۔ جب پارٹی کے اندرونی حلقوں میں ہر وقت شہید اور شہادت ہی کی بات ہوتی ہو تو قائدین کی زبان پر بھی وہی بات آئے گی! اور یہ تو شاہ صاحب کا بھولپن ہے کہ وہ پارٹی لائن بتاگئے ورنہ ہم جیسے تو بس اندھیرے میں تیر چلاتے رہ جاتے ہیں۔“

شاہ صاحب عمر کے اُس مرحلے میں ہیں جہاں اُن کی طرف سے کہی جانے والی ہر بات برداشت کی جانی چاہیے۔ ہم نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اُن کے کچھ نہ کرنے کو بھی تو پانچ سال برداشت کیا ہے۔ اب اگر وہ عمر کے تقاضوں کو پوری طرح نبھاتے ہوئے کچھ انٹ شنٹ بول رہے ہیں تو سُوئے ظن رکھنا تہذیب کے منافی ہے۔ مرزا تنقید بیگ کو بس بولنے سے غرض ہے۔ اُن جیسے لوگوں کی ہر بات سنجیدگی سے نہیں لی جاسکتی۔ اگر شاہ صاحب نے کچھ ایسا ویسا کہہ بھی دیا ہے تو صدر صاحب کو بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بھی سیاست دان ہیں اور اِس حوالے سے اُنہیں اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ سیاست دانوں کے دِل میں کچھ

ہوتا ہے اور زبان پر کچھ۔

کچھ عرصہ قبل پیپلز پارٹی کے سینئر فیصل رضا عابدی نے بھی ایک جلسے سے خطاب کے دوران اپنے ون اینڈ اونلی ممدوح صدر آصف علی زرداری کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا اللہ اُنہیں جنّت ..... '' اور پھر دِماغ کی بتّی جل گئی اور اُنھوں نے زبان کو سنبھال لیا۔'' فیصل رضا عابدی اچھی طرح جانتے ہیں کہ زبان کو کہاں سنبھالنا ہے اور کہاں انتہائے سادگی سے اُس کا پٹّا کھول دینا ہے!

اِس قوم کو مکھی اور مچّھر جیسی حقیر دِکھائی دینے والی مخلوق کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اُس کی مہربانی سے کچھ اندر کی باتیں باہر آتی ہیں اور دُکھی مَن کے ساتھ زندگی بسر کرنے والوں کے ہونٹوں پر کچھ دیر کے لیے مُسکراہٹ بکھیر دیتی ہیں!

شاہ صاحب ہرگز پریشان نہ ہوں۔ اور صدر بھی اپنے دِل میں کوئی ایسا خیال نہ لائیں۔

بہت پہلے کسی نے ایسے ہی موقع پر فریقین کو دِلاسا دیا تھا۔

نہ ہم سمجھے، نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے!

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

ایک زمانے سے چلن یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کی ذِلّت میں عِزت تلاش کرتے آ رہے ہیں۔ ہم کسی ٹورنامنٹ میں آگے نہ بڑھ سکیں تو بھارت میں عوام خوش دکھائی دیتے ہیں۔ پھر ہماری دُعا صرف یہ ہوتی ہے کہ بھارت بھی آگے نہ بڑھے۔ اور جب اُس کی ٹیم بھی ٹورنامنٹ سے نکل جاتی ہے تو دِل کو سُکون سا ملتا ہے کہ ہم ڈوبے ہیں تو کیا ہوا، وہ بھی تو ڈوب ہی گئے! ہم دو ہمسایوں میں سے ہر ایک کی شادمانی کا مدار دوسرے کی ناکامی پر ہے! روایتی حریفوں کی خوشیاں ایسی ہی باتوں سے برقرار رہا کرتی ہیں۔

شرمندگی تھی کہ کم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ یہ کیا کہ ہم ایٹمی طاقت بھی ہوں اور معمولی اشیاء کی قِلّت پر قابو نہ پاسکیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم آلو، پیاز، ٹماٹر اور دیگر معمولی اشیائے خور و نوش کے اسیر تھے اور پلکوں کے ساتھ ساتھ گردن بھی جُھکی رہتی تھی۔ دُنیا ہنستی تھی کہ ایٹمی ہتھیار بنانے والے سبزی کی پیداوار بھی طلب کی سطح پر لانے کے قابل نہیں! توانائی کا بحران بھی ایسی حالت کو پہنچ گیا کہ ہمارے پاس شرمندہ ہونے کے سِوا چارہ نہ رہا۔ لکھنے والے بھی تو ذلیل ہی کرتے رہتے ہیں۔ ’’بے چاری‘‘ حکومت ایٹمی طاقت ہونے کا طوق گردن میں ڈالے خجالت کا شکار رہی۔

اب شاید اسلام آباد کے یخ بستہ کمروں میں رہنے والوں کو سُکون کی تھوڑی سی گرمی میسر آئی ہو۔ بات یہ ہے کہ خود کو علاقائی سُپر پاور گردانتے والے بھارت میں بھی حکومت کو پیاز اور ٹماٹر نے پچھاڑ دیا ہے۔ ایک طرف تو دِلّی کی مرکزی حکومت ہے اور دوسری طرف دِلّی کی ریاستی (صوبائی) حکومت۔ اور دونوں کو تگنی کا ناچ نچایا ہے پیاز، ٹماٹر اور دیگر سبزیوں نے۔ دِلّی کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کو اپوزیشن نے اُتنا تنگ نہیں کیا جتنا پیاز نے رُلایا ہے! جی ہاں، ایک ذرا سی پیاز نے۔ کبھی سوچیے تو سہی کہ پیاز کی اوقات ہی کیا ہے؟ چھلکے اُترتے جاتے ہیں اور پیاز ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی ٹائیں ٹائیں فِش۔ اِس پر بھی پیاز کا غرّہ ملاحظہ ہو کہ حکومت کو ہلانے پر تُلی رہتی ہے۔ اِس معمولی سے اشک آور پیاز کے ہاتھوں شیلا دکشت کو یہ دیکھنا پڑا کہ اُن کے گھر کے آگے اپوزیشن ارکان نے ٹھیلے لگا کر پیاز بیچی! اِس خطے کی سیاست بھی کیسے کیسے تماشے کھڑے کرتی ہے اور دُنیا کو کس کس طرح ہنسنے کے مواقع فراہم کرتی ہے! اِسے بلا خوفِ تردید انگریزی میں politicomedy قرار دیا جاسکتا ہے!

شیلا دکشت کی ساری ''گڈ گورننس'' دھری کی دھری رہ گئی اور اب اُنہیں ''گڈز'' گورننس کی فکر لاحق ہے۔ شیلا جی کو اِس ڈھلی ہوئی عمر میں پیاز اور ٹماٹر جیسی ٹکے ٹکے کی چیزوں کے ہاتھوں یہ دن بھی دیکھنا تھا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی واقعی اپوزیشن والے مزاج کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ بات کا بتنگڑ بنانے کا صرف موقع ملنا چاہیے۔ باقی کام اُس کا ہے۔ پیاز اور ٹماٹر نے بی جے پی کو حکومت کی صرف اُنگلی پکڑائی، کلائی اُس نے خود پکڑ لی اور اِس طرح کہ حکومت کی کلائی مُڑی جارہی ہے مگر جان نہیں چُھوٹ پارہی۔

متعدد بھارتی ریاستوں میں کئی ماہ سے پیاز کا بحران ہے۔ اور ٹماٹر نے بھی اُس کا خوب ساتھ دیا ہے۔ مگر خیر، دونوں میں مُسابقت بھی رہتی ہے۔ کبھی پیاز برتری پاتی ہے اور کبھی ٹماٹر سَر چڑھ کر ناچنے لگتا ہے۔ جس طرح کوئی ضِدی بچہ پیڑ پر چڑھ کر اُترنے کا نام نہیں لیتا بالکل اُسی طرح پیاز اور ٹماٹر کے دام چڑھ جائیں تو نیچے آنے کے ذِکر سے بھی چِڑتے ہیں!

عام آدمی کے گھریلو بجٹ کی تو مٹّی پلید ہو کر رہ گئی ہے۔ بے چارہ بنیادی اشیاء کا غلام ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک کو مناؤ تو دوسری روٹھ جاتی ہے۔ دوسری کو منانے کی فکر کیجیے تو تیسری کا مُنہ پھول جاتا ہے۔ کیا زندگی اِسی میں گزر جائے گی؟ لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔ دوایٹمی طاقتیں سبزی ترکاری کی غلام ہو کر رہ گئی ہیں۔ توانائی کا بحران تو سمجھ

میں آتا ہے کہ تکنیکی معاملہ ہے، تگنی کا ناچ نچا بھی سکتا ہے۔ مگر اب کیا ٹکے ٹکے کی سبزیاں بھی ہم سے کھلواڑ کریں گی؟ اور کریں گی کیا، کر رہی ہیں! دُنیا ہمیں دیکھتی اور ہمارے بارے میں پڑھتی ہوگی تو کیا سوچتی ہوگی؟ اور کیا سوچنے کے قابل رہ پاتی ہوگی؟ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتی ہوگی!

دو قومی نظریے کی تکذیب کی خاطر اور 1947 کی تقسیم کو غلط ثابت کرنے کے لیے بھارتی سیاست دان یہ کہتے نہیں تھکتے کہ دونوں ممالک کے جغرافیائی حالات، ثقافتی پس منظر سب کچھ ایک سا ہے۔ اُن کی بات آلو، پیاز اور ٹماٹر کی حد تک تو درست ثابت ہو گئی ہے! یہ تمام اشیاء کبھی گھروں میں رُلتی پھرتی تھیں اور کوئی پوچھتا نہ تھا۔ اب یہی چیزیں پہنچے ہوئے عاملوں کی طرح دونوں حکومتوں کا ناک میں دَم کر رہی ہیں۔ جس طرح دیگ پکنے کے بعد دَم پر رکھی جاتی ہے بس کچھ اُسی طرح پاکستان اور بھارت کی حکومتیں بھی اِن معمولی سبزیوں کے ہاتھوں دَم پر ہیں! صورتِ حال کی سنگین نوعیت کا تقاضا ہے کہ کچھ کیا جائے۔ ؎

ہم کو بھی غم نے مارا، تم کو بھی غم نے مارا
ہم سب کو غم نے مارا، اِس غم کو مار ڈالو!

ہم بھارت کو دُشمن گردانتے ہیں، وہ ہمیں دُشمن نمبر ون سمجھتا ہے۔ مگر دونوں ممالک کی قیادت کو یہ اندازہ نہیں کہ اِن دونوں کے مشترکہ دُشمن پیاز اور ٹماٹر ہیں! کبھی

کبھی اِن دونوں کے ساتھ ساتھ آلو، مرچ، ادرک، لہسن وغیرہ بھی دُشمنی میں حِصّہ ڈالتے ہیں! غریب آدمی بے چارہ کبھی پیاز ٹماٹر سے کچومر بناکر پیٹ بھرلیا کرتا تھا۔ اب کچومر بھی فائیو اسٹار ہوٹلز کا آئٹم ہو کر رہ گیا ہے۔ جن چیزوں کو کھاکر غریب پیٹ بھرا کرتا تھا وہ چیزیں اب غریب کا بجٹ کھاکر اُسے بھوکا رہنے پر مجبور کر رہی ہیں۔

وقت آگیا ہے کہ لائن آف کنٹرول اور ورکنگ باؤنڈری پر ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے اقدامات سے قبل پیاز، ٹماٹر اور اِن دونوں کے ''ہم نواؤں'' کو شکستِ فاش دی جائے۔ یہ چھوٹے چھوٹے ٹنٹے ختم ہوں گے تو ہم ایٹمی جنگ کی بات کرتے ہوئے کچھ اچھے بھی لگیں گے! صوفی تبسم نے خوب کہا ہے ۔

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لا دوا

!ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کرسکو

جو کچھ کرنا ہے، فوری کرنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ پانی بھی سَر سے گزر جائے اور ہم صرف دیکھتے رہ جائیں۔

نمرود کے لیے مچھر پیدا کیا گیا تھا اور ہمارے لیے پیاز، ٹماٹر کو میدان میں لایا گیا ہے۔ جب بھی حکومت کا دماغ خراب ہوتا ہے تو پیاز اور ٹماٹر کے نرخ بُلند ہو کر

اُسے درست کرنے پر تُل جاتے ہیں! ہم جب پیاز اور ٹماٹر کے نرخ نیچے لانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تو امریکی ڈرون کس طرح گرائیں گے؟ ہر سال رمضان کے آخری عشرے میں ٹماٹر بھی کہیں چُھپ جاتا ہے اور لوگ اُس کی رویت کو بھی ترستے رہتے ہیں۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ اب عید پر رویتِ ہلال کے ساتھ ساتھ رویتِ ٹماٹر کے لیے بھی کمیٹی بنانی پڑے گی!

ایٹمی ہتھیاروں سے لیس دو ممالک کے لیے پیاز اور ٹماٹر جیسی اشیاء چیلنج بن گئی ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ یہ مِل بیٹھیں اور پیاز، ٹماٹر کو جامع مذاکرات کے ایجنڈے میں سرِفہرست رکھیں تاکہ دُنیا کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے! جن چیزوں سے دو ایٹمی طاقتوں کی بَھد اُڑ رہی ہے اُنہیں شکست دینے کے لیے مِل بیٹھ کر ہی کچھ کرنا ہوگا۔ قدم قدم پر دو معمولی سبزیوں کے ہاتھوں ذلیل ہونا کوئی ایسی بات نہیں جسے برداشت کیا جائے۔

اچھا ہے دونوں ممالک ایک بار ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پیاز، ٹماٹر اور دیگر سبزیوں کو اُن کی اوقات پر لے آئیں۔ اِن دو تین چیزوں کے ہاتھوں دونوں ہی حکومتوں کو مشکلات کا سامنا ہے۔ ع

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی!

یہ آگ بُجھے تو ہم تھوڑا سُکھ پائیں، عالمی برادری میں ناک اُونچی رکھنے کا کچھ تو سامان ہو۔ رہا جنگ و جدل کا معاملہ تو اُس کی تیاریوں کے لیے تو عمر پڑی ہے!

! وہ پانچ ماریں، تُم پچاس مارو

ہم اب تک یہ سمجھتے آئے تھے کہ یوگا میں جسم کو متوازن رکھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ یعنی جو لوگ باقاعدگی سے یوگا کرتے ہیں اُن کا جسم درست حالت میں رہتا ہے، سانسوں کی آمد و رفت میں توازن برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ مگر بہت سے دوسرے معاملات کی طرح اِس معاملے میں بھی ہم نے اپنی ''روایت'' برقرار رکھی۔ یعنی غلط ثابت ہوئے! بات یہ ہے کہ بھارت میں یوگا کے بڑے گرو بابا رام دیو ہزاروں، بلکہ لاکھوں چیلوں کو تنفس بہتر بنانے کی مشق کراتے آئے ہیں مگر اب اُنھوں نے موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے سیاسی تنفس بہتر بنانے پر بھی توجہ دینا شروع کردیا ہے!

لائن آف کنٹرول کی ایک بڑی کرامت یہ ہے کہ اِس کے قرب و جوار میں رُونما ہونے والے واقعات بُہتوں کو آؤٹ آف کنٹرول کردیتے ہیں۔ مرتے تو دو چار بدنصیب ہی ہیں مگر بیانات اور الزامات داغ کر میڈیا کی بَھٹّی میں مِٹّی کو سونا بنانے والوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ اِن میں بابا رام دیو بھی شامل ہیں۔ رام دیو کے ساتھ بابا کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔ وہ ابھی جوان ہیں۔ اِس سے پہلے کہ کوئی اُنہیں بوڑھا سمجھ لیتا، رام دیو نے ایسا دھانسو قسم کا بیان

داغا ہے کہ سبھی کو اُن کی رگوں میں لہو کے گرم ہونے کا احساس ہوگیا ہے۔ لائن آف کنٹرول پر نامعلوم افراد کی فائرنگ سے پانچ بھارتی فوجیوں کی ہلاکت پر دوسروں کی طرح بابا رام دیو کے بھاگوں بھی چھینکا ٹوٹا اور وہ بھی بھڑک اُٹھے۔ اپنے چیلوں کو علی الصباح تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے کی ہدایت کرنے والے بابا رام دیو کے سَر پر ہندو راشٹر واد'' کا جنون ایسا چڑھا کہ وہ عسکری قیادت کو مشورہ دینے پر تُل گئے۔ اُن'' کا کہنا ہے کہ پاکستانیوں کو سبق سکھانے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے کہ وہ پانچ ماریں تو تُم پچاس مارو!

میڈیا کی بہتی گنگا میں کون ہے جو ہاتھ دھوتے دھوتے اشنان کرنے پر مائل نہیں ہوتا؟ بابا رام دیو نے بھی موقع غنیمت جانا اور بیان کی لنگوٹ کر میڈیا کی گنگا میں ڈُبکی لگالی۔

لائن آف کنٹرول پر جو کچھ ہو رہا ہے اُس میں مزید خرابی پیدا کرنے کے حوالے سے بھارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جارہی۔ سبھی مقدور بھر اِس جلتی پر تیل چھڑک رہے ہیں۔ تنفس کی مشق کرانے والے رام دیو کا سانس واقعی بہت مضبوط ہے تبھی تو وہ ایک سانس میں اِتنی بڑی بات کہہ گئے۔ ہم نہیں اب تک یوگا گرو اور امن کا داعی سمجھ رہے تھے وہ تو مہا سنگرام کے پرچارک نکلے! بھارت کے مہا اَدھیاپکوں کی ایک بڑی سَمسیا یہی ہے کہ وہ سبق پڑھانے سے زیادہ سِکھانے پر زور دیتے آئے ہیں! مگر اِس میں بھی

احتیاط ملحوظِ خاطر رکھی جاتی ہے۔ چھوٹے اور کمزور ہمسایوں ہی کو سبق سکھانے کا درس دیا جاتا ہے۔ ہمسایا چین جیسا یعنی بہت بڑا ہو تو دُم پر پاؤں آ جاتا ہے اور پسپائی کو بہترین حکمتِ عملی کی حیثیت سے اختیار کرنے پر دھیان دیا جاتا ہے!

کنٹرول لائن پر اپنے چار پانچ فوجی مار کر بھارت کی عسکری قیادت نے ماحول تو بنا دہی دیا ہے۔ میڈیا کے چولھے پر شَر انگیز بیانات اور الزامات کی دیگ چڑھائی جا چکی ہے اور سب اِس میں مقدور بھر اشتعال ڈال رہے ہیں! بیان بازی کا بازار گرم ہوتا جارہا ہے۔ تبصروں اور تجزیوں کی بھرمار ہے۔ زور اِس بات پر ہے کہ پاکستان کو سبق سکھایا جائے۔ الزامات کا معاملہ یہ ہے کہ نہلے پہ دہلا مارا جارہا ہے۔ لائن آف کنٹرول پر فائرنگ سے شروع ہونے والی بات آؤٹ آف کنٹرول ہوکر آسمانوں پر گئی اور دیوتاؤں کو زمین پر اُتار لائی! بابا رام دیو کے بیان پر گرما گرم اور چٹ پٹے تبصروں نے عجیب سماں پیدا کر دیا ہے۔ حامیوں نے بابا رام دیو کی ''ذہانت'' کو خوب سراہا ہے۔ دوسری طرف مخالفین چاہتے ہیں کہ پاکستان سے معاملات کو مزید نہ بگاڑا جائے۔ رام دیو کے حامی کرشن جی کا حوالہ دے رہے ہیں کہ اُنہوں نے جنگ کے میدان میں ارجن کو یہی سبق دیا تھا کہ دُشمن پر کاری ضرب لگائی جائے۔ رام دیو کے مخالفین کہتے ہیں کہ اِس معاملے میں کرشن جی کا حوالہ دینا درست نہیں۔ رام دیو چونکہ یوگی

ہیں اِس لیے اُن کے حامیوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ کرشن جی بھی یوگی تھے۔ بعض نے اُنہیں ''کرم یوگی'' یعنی عمل پر غیر متزلزل یقین رکھنے والی ہستی قرار دیا ہے۔ دوسری طرف مخالفین میں سے دو ایک نے کرشن جی کو ''کام یوگی'' قرار دیا۔ ''کام یوگی'' کو محتاط ترین لفظوں میں بھی عورتوں کا رسیا کہا جاسکتا ہے!

میڈیا کے بازار میں تمام اسٹال شہرت اور نیک نامی کے نہیں ہوتے، بدنامی رُسوائی کے ٹھیے بھی جا بہ جا پائے جاتے ہیں۔ لائن آف کنٹرول اور پاکستان سے شروع ہونے والی بات شری کرشن اور مہا بھارت تک جا پہنچی ہے اور تبصروں کے میدان میں وہ دھماچوکڑی مچی ہے کہ خود بابا رام دیو بھی پریشان سے ہیں کہ یہ کہاں بھڑوں کے چھتّے میں ہاتھ دے بیٹھے! پاکستان پر اُچھالے جانے والے کیچڑ کا رُخ اب دیوتاؤں کی طرف ہوگیا ہے! مگر صاحب ع

اِس طرح تو ہوتا ہے اِس طرح کے کاموں میں!

بابا رام دیو کے بیان پر تبصرہ کرنے والوں نے اِس بات پر بھی زور دیا ہے کہ اب بھارت کو سیکیولر ازم اور گاندھی ازم کا لبادہ اُتار کر پھینک دینا چاہیے۔ اِس بات پر صرف ہنسی ہی آسکتی ہے۔ کون سا سیکیولر ازم اور کون سا گاندھی ازم؟ بھارت میں اب بھی لوگ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ گاندھی جی تعلیمات

اپنانے سے کچھ نہیں ملا۔ اِس بات پر گاندھی جی کی آتما تڑپ جاتی ہوگی۔ آزاد بھارت میں گاندھی جی تعلیمات کو قبول ہی کب کیا گیا ہے؟ کون ہے جس نے گاندھی جی کی امن پسندی کو زندگی بسر کرنے کے بنیادی طریقے کی حیثیت سے اپنایا ہے؟ جب بھی موقع ملا ہے، بھارتی قیادت نے پاکستان کی پیٹھ میں چُھرا گھونپنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی ہے اور اِس پر بھی امن پسندی کے دعوے؟ ع

وہی قتل بھی کرے ہے، وہی لے ثواب اُلٹا!

بابا رام دیو شاید ''آج کا ارجن'' بننا چاہتے تھے مگر حتمی تجزیے میں راکشس بنتے دِکھائی دے رہے ہیں! لائن آف کنٹرول کے واقعات اور پاکستان سے نفرت نے اور کچھ نہ سہی، ایک اور بھارتی لیڈر کے اندر چُھپے ہوئے چانکیہ کو باہر نکلنے پر تو مجبور کردیا! لائن آف کنٹرول کے اُس طرف سے پانچ کے بدلے پچاس مارنے کی بات کی جارہی ہے اور ہم اب تک امن کی آشا کا راگ الاپ رہے ہیں۔ بھارت اچانک پانی چھوڑ کر فصلوں سے مکانات تک سبھی کچھ ڈبونے پر کمربستہ ہے اور ہم اب تک آلو، پیاز اور ٹماٹر کی تجارت کو دوطرفہ تعلقات کا محور بنائے ہوئے ہیں!

سمجھوتہ ایکسپریس دھماکے، پارلیمنٹ ہاؤس پر حملے اور ممبئی حملوں کی طرح لائن آف کنٹرول کی اصل کہانی بھی کچھ ہی دنوں میں منظرِ عام پر آ جائے گی۔ اور یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ بھارت نے اپنے فوجی خود ہی مارے تاکہ پاکستان پر دباؤ بڑھایا جاسکے۔ مگر شاید ہماری قیادت کو تب بھی ہوش نہ آئے گا اور وہ دوستی ہی کی ڈفلی بجاتی رہے گی۔ وہ پانچ کے بدلے پچاس مارنے کی بات کرنے کے ساتھ ساتھ اوکھلی تیار بھی کر رہے ہیں اور ہم اِس اوکھلی میں سَر دینے کو بے تاب ہیں۔ ع

ناطقہ سَر بہ گریباں ہے، اِسے کیا کہیے!

ہم ہیں پاکستانی، ہم تو ''جھیلیں'' گے

بُزرگوں کی ایک روایتی عادت یہ ہے کہ چُھوٹتے ہی لمبی عُمر کی دُعا دیتے ہیں۔ کسی زمانے میں اِسے دُعا سمجھا جاتا ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیا ہے جسے دیکھنے کے لیے لمبی عُمر پائیں! اب اگر کوئی لمبی عُمر کی دُعا دیتا ہے تو دِل لرز اُٹھتا ہے، سہم جاتا ہے۔

ہاں وہی لوگ ہیں دراصل ہمارے دُشمن
جو ہمیں عُمرِ درازی کی دُعا دیتے ہیں!

شُعرائے کرام سمجھا سمجھا کر تھک گئے کہ اپنے لیے کوئی دُعا مانگنے یا دوسروں کے لیے دُعا کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ اگر ہماری کوئی دُعا قبول ہو گئی تو کیا ہوگا! اُستاد قمر جلالوی نے یونہی تو نہیں کہا تھا کہ ۔

دُعا بہار کی مانگی تو اِتنے پُھول کِھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو!

محترم جاذب قریشی نے بھی کہا ہے ۔

کیوں مانگ رہے ہو کسی بارش کی دُعائیں

!تم اپنے شکستہ در و دیوار تو دیکھو

دُعاؤں کی قبولیت کے نتائج اِس قدر بُھگتے ہیں کہ کچھ ہٹ کر جینا لازم ہوگیا ہے۔ کوئی رزقِ حلال کی دُعا دے تو قبولیت کی صورت میں محنت بھی کرنی پڑتی ہے اور ''بالائی'' تج کر صرف دُودھ پر گزارا کرنا پڑتا ہے! کوئی محنت کو شعار بنانے کی دُعا دے تو قبولیت !کی صورت میں ہڈ حرامی ترک کرنی پڑتی ہے

دُعاؤں کی قبولیت نے اِتنے اور ایسے گل کِھلائے کہ متبادل طرزِ زندگی تلاش یا وضع کرنا لازم ہوگیا۔ قوم نے بہت مشکل سے ایک آسانی ڈھونڈی ہے۔ اب پاکستانیوں کے ہاتھ ایک ایسا نُسخہ آگیا ہے جس کے مطابق جینے میں آسانی ہی آسانی ہے۔ ہم تو حیران ہیں کہ جگر مراد آبادی کے اُستاد اصغر گونڈوی نے کیوں کہا تھا کہ ۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے

!اگر آسانیاں ہوں زندگی دُشوار ہو جائے

ممکن ہے اصغر گونڈوی کے زمانے کی آسانیاں بس نام کی آسانیاں ہوں۔ اگر وہ آج ہوتے تو دیکھتے کہ ہم نے کیسی عمدہ آسانی دریافت، بلکہ وضع کی ہے جو

تمام مسائل کو آن کی آن میں حل کر دیتی ہے۔

دوسری اقوام کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اُنھوں نے خود کو کتنے محاذوں پر اُلجھا رکھا ہے۔ عُلوم و فُنون کا حصول، تحقیق در تحقیق اور آگے بڑھنے کے لیے اعصاب شکن مسابقت۔ چار دِن کی زندگی میں اِتنے پاپڑ کون بیلے ؟ زندگی کیا اِتنے سارے بکھیڑے پالنے کے لیے ہوتی ہے ؟ یقیناً نہیں۔ کوئی دیکھے کہ ہم نے کتنی آسانی اور خوبی سے خود کو صرف ایک کام تک محدود کرلیا ہے۔ اور کام بھی ایسا آسان کہ جسے کرنے کے لیے کچھ کرنا بھی نہیں پڑتا۔ جی ہاں، اب پاکستانی قوم کا کام صرف جھیلنا رہ گیا ہے۔

زندگی کس قدر آسان ہے اور دُنیا والے اِسے پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنانے پر تُلے ہوئے ہیں ! بڑی کمپنیاں تحقیق و ترقی پر خطیر رقوم خرچ کرکے جو مصنوعات مارکیٹ میں لاتی ہیں اُن سے ہم جیسی پس ماندہ اقوام کے لوگ بھی فوری طور پر اور اچھی طرح مستفید ہو لیتے ہیں۔ دُنیا والے سوچتے ہیں کہ ہم تحقیق و ترقی کے عادی نہیں اور ہم یہ سوچتے ہیں کہ جب ہم جدید ترین مصنوعات کو آسانی سے حاصل کر ہی لیتے ہیں تو پھر اِس قدر ہاؤ ہُو کی ضرورت کیا ہے؟

جھیلنے کا عمل متبادل دریافت یا ایجاد کرنے کی منزل تک لے جاتا ہے۔ اگر

کبھی متبادل آسانی سے نہیں ملتا تو ہم نظریۂ ضرورت کے تحت اُسے وضع یا ایجاد کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے! ''زندہ'' قومیں ایسی ہی ''جی داری'' دِکھایا کرتی ہیں! ہوگا کوئی زمانہ جب ہم وطن کی محبت سے سرشار تھے۔ اب ہم وطن کے گیت سُن اور گنگنا کر خود کو وطن کی محبت میں سَر سے پیر تک ڈوبا ہوا محسوس کرلیتے ہیں، چند پُرجوش قومی نغمے سُن کر خُون کو تھوڑا گرمالیتے ہیں! دُنیا والوں نے پتہ نہیں کن کن باتوں کو وطن پرستی سے تعبیر کر رکھا ہے۔ اور ذرا غور کیجیے کہ ہم نے وطن کی محبت کو کتنی عمدگی سے چند پُرجوش نغموں کے صندوق میں قید کردیا ہے۔ صندوق کھولیے، چند قومی نغمے سُنیے اور وطن کی محبت سے سرشار ہوجائیے، بس۔

شعور اور احساس سے کام لیجیے تو ذہن میں ہر وقت چند باتیں کیڑوں کی طرح کلبلاتی رہتی ہیں، پریشان رکھتی ہیں۔ غریبوں کو بنیادی سہولتیں نہ ملیں تو دِل کُڑھتا ہے۔ بچوں کو ڈھنگ سے تعلیم حاصل کرنے میں ناکامی سے دوچار دیکھ کر ذہن میں گِرہ سی پڑ جاتی ہے۔ جب شعور اور احساس کی آنکھوں پر پٹّی باندھ کر سب کچھ جھیلنے کو زندگی بنالیا جائے تو کیسی مُشکل، کہاں کی پریشانی؟

جب سے ہم نے جھیلنے کو شعار بنایا ہے، کوئی غم نہیں رہا۔ دہشت گردی سے

ہم خائف اور پریشان رہا کرتے تھے۔ اب اِسے مُقدر سمجھ کر جھیل رہے ہیں تو اِس کی تباہ کاری ذہن پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالتی۔ دُور تک لاشیں بِکھری ہوں تب بھی ہم پر لرزہ طاری نہیں ہوتا۔ دہشت گردوں کو ناکامی مُبارک!

کل تک سیلاب کے نام سے ڈر لگتا تھا۔ اب ہم نے سیلاب کو جھیلنے کا ہُنر سیکھ لیا ہے۔ نتیجہ دیکھ لیجیے کہ ریلے آتے ہیں اور ہم اُنہیں گھاس ہی نہیں ڈالتے۔ سیلاب اپنی چالیں چلتا ہے اور ہم اپنی مَوج میں بہتے رہتے ہیں۔ دریا بپھرتے ہیں اور تباہی مچاکر خاموش ہوجاتے ہیں۔ ہماری مَوج مَستی کا میلہ دَم نہیں توڑتا۔ جھیلنے کی عادت کے ذریعے ہم نے سیلاب کو کتنی آسانی سے پچھاڑ دیا ہے! یہ سیلاب کی ناکامی نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ ہمارے خوابِ مَسرّت میں رخنہ نہیں ڈال پاتا؟

منافع خوری کسے اچھی لگتی ہے، سِوائے منافع خوروں کے؟ ابھی کل تک ہم اِس بات پر کُڑھا کرتے تھے کہ رمضان المبارک کے دوران اور عیدین کے موقع پر منافع خوری نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ دُکھڑا بھی محسوس کرنے سے مشروط تھا۔ اب ہم منافع خوری کو بخوشی جھیل ہی نہیں رہے، اِس میں بہ قدرِ توفیق حِصّہ ڈال رہے ہیں۔ نتیجہ دیکھ لیجیے کہ کوئی کِتنا ہی منافع بٹور رہا ہو، ہمیں پریشانی نہیں ہوتی۔

تعلیم کے نام پر جہالت تقسیم کی جارہی ہے اور ہم اِسے بھی جھیل رہے ہیں۔ بہتوں کے نزدیک فی زمانہ دانش سے جہل غنیمت ہے۔ علم اپنے ساتھ کئی طرح کے مسائل لاتا ہے۔ علم کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ یہ ذہن کو بیدار رکھتا ہے۔ ذہن بیدار ہو تو بہت کچھ محسوس کرتا اور دَم بہ دَم اذیت سے دوچار رہتا ہے۔ تعلیمی ادارے ذہن کو سُلانے کا اہتمام کر رہے ہیں اور ہم اِس کیفیت کو جھیل کر اپنی آسانیوں میں اضافہ کر رہے ہیں!

کھیلوں کے نام پر سیاست ہو رہی ہے اور سیاست کے نام پر قوم سے کھیلا جارہا ہے اور قوم اِس تماشے کو جھیل کر پورا لُطف کشید کر رہی ہے۔

پسی ہوئی مِرچوں میں سُرخ بُرادہ اور ثابت کالی مِرچوں میں پپیتے کے بیج ملا کر فروخت کرنا عام ہے اور ہم نے اِس روش کو بھی جھیلنا سیکھ لیا ہے۔ دُودھ میں پانی ملانے کی "صحت بخش" روایت کو ہم اِس قدر جھیل چکے ہیں کہ اب اگر کوئی ایمانداری پر تُل جائے اور خالص دُودھ بیچنے لگے تو ہماری صحت کا بیڑا دیکھتے ہی دیکھتے غرق ہو جائے!

کسی زمانے میں لکھنے والے جی جان سے لکھا کرتے تھے۔ پھر جب اُنہوں نے ڈنڈی

مارنا شروع کیا تو پڑھنے والے اِس روش کو بھی جھیلنے لگے۔ یہ سِلسِلہ اب اِس نہج تک پہنچ چکا ہے کہ لکھنے کے نام پر صرف لفّاظی رہ گئی ہے۔ فکشن کے نام پر صرف بڑھکیں ماری جارہی ہیں، کالم نویسی کے نام پر صرف اپنی مدح سَرائی بچی ہے اور پڑھنے والے جھیلے جارہے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی لکھنے کے تمام تقاضے نبھانے پر کمربستہ ہو تو لوگوں کو پڑھتے ہوئے اُبکائیاں آنے لگتی ہیں!

کل تک اقتدار کے ایوانوں میں پہنچنے والوں سے ہم طرح طرح کی توقعات وابستہ کیا کرتے تھے اور وہ اِن توقعات کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان رہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے اِس اُن کی ''کارکردگی'' بھی متاثر ہوا کرتی تھی! اب طے ہے کہ اقتدار اور اختیار پانے والے خواہ کچھ کریں، ہم جھیلیں گے۔ یعنی سُکون ہی سُکون ہے۔

جب زندگی اِس قدر ''آسان'' اور ''پُرسُکون'' ہو تو دِل کی گہرائی سے یہ صدا کیوں نہ اُبھرے کہ ہم ہیں پاکستانی، ہم تو ''جھیلیں'' گے!

پانچواں موسم سیلاب کا

نیا جمہوری دور ابھی شروع ہی ہوا ہے اور سیلاب نے پھر پاکستان کے دروازے پر دستک دے دی ہے۔ جس طرح بالی وڈ کے فلم میکرز قابلِ رحم حد تک توہم پرست واقع ہوئے ہیں بالکل اُسی طرح بہت سے دوسرے مغالطوں کی طرح یہ مغالطہ بھی ہمارے سیاست دانوں کے ذہن میں گرہ کی طرح پڑا ہوا ہے کہ ایک دن میں دو خطبے حکومت پر بھاری گزرتے ہیں ! مسلم لیگ ن نے تیسرا دورِ حکومت ابھی شروع ہی کیا تھا کہ عیدالفطر جمعہ کی پڑ گئی۔ یعنی ایک دن میں دو خطبے۔ گویا سَر مُنڈاتے ہی اولے پڑے ! ایک دن میں دو خطبوں کے بھاری پڑنے کا عقیدہ خاصی آسانی پیدا کرتا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، دو خطبوں کے کھاتے میں ڈال دیجیے !

اہلِ اقتدار تو ایک دن میں دو خطبوں کو بھاری قرار دیکر جان چُھڑا لیتے ہیں، عوام کیا کہیں اور کس سے کہیں؟ کس پر الزام دَھریں؟ جمہوریت ہو یا آمریت، عوام کے لیے تو ہر دِن دو خطبوں والے دِن جیسا بھاری ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اقتداری ٹولے کا پہاڑ سا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے اب پاکستان کا ہر شہری ہو کولیس کے خطاب کے لیے کوالیفائی کرچکا ہے !

سیلاب نے ایک سال کے وقفے سے پھر دستک دی ہے تو ڈرنا کیا، گھبرانا کیا؟ دس بارہ سال سے جمہوریت کے ریلے بھی تو ہمارا سب کچھ تہس نہس کر ہی رہے ہیں۔ کیا ہے جو دہشت گردی کی لہریں اپنے ساتھ بہا کر نہیں لے گئیں؟ جو اقتدار میں آتے ہیں وہ من مانی کے ریلوں میں سبھی کچھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ دریاؤں کی طغیانی کو کیا روئیں کہ ایک بڑا ریلا اختیارات سے تجاوز کا بھی تو ہے جو قومی وسائل کی زمین میں مسلسل کٹاؤ پیدا کر رہا ہے!

تین سال قبل بھی سیلاب آیا تھا اور قدرے نامُراد لوٹا تھا۔ چند ادھورے ترقیاتی منصوبے تھے جن پر پانی پھرا اور الزام سیلاب کے سَر گیا! اللہ یاروں کی ذہانت اور موقع شناسی" کو سلامت رکھے کہ اُنہوں نے سب کچھ پہلے ہی اِدھر اُدھر کر لیا تھا!" سڑکوں کے نام پر کچھ روڑی پڑی تھی اور پشتوں کے نام پر چند بڑے پتّھر دریاؤں کے کنارے نصب تھے۔ اچھا تو نہیں لگتا نا کہ سیلاب اِتنے چاؤ سے آئے اور ہم اُس کی راہ میں دیواریں کھڑی کریں! ع

وہ آئے، آئے کہ ہم دِل کشادہ رکھتے ہیں!

خاصی توجہ اور محنت سے سیلاب کے خیر مقدم کا اہتمام کیا گیا۔ پھر جو سیلاب آیا تو بس آتا ہی چلا گیا۔

سیلاب کی وُسعتِ قلب کا کیا کہنا۔ یہ ہر الزام اپنے سَر لے لیتا ہے۔ کچی پکی سڑکیں بہہ جائیں تو الزام سیلاب کے سَر۔ سرکاری خرچ پر ناقص اور کمزور عمارتیں کھڑی کیجیے۔ گر جائیں تو الزام سیلاب کے سَر۔ کوئی سرکاری منصوبہ شروع کرنے میں تاخیر ہو تو سیلاب کو موردِ الزام ٹھہرا دیجیے۔ اگر ادھورا رہ جائے تو یہ تہمت اُٹھانے کے لیے بھی سیلاب حاضر ہے۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سیلاب کی تباہ کاری بھی اپنے دامن میں چند خوش نصیبوں کے لیے سات نسلوں کی روزی روٹی کا بندوبست لیکر آئی! جن کا نصیب سویا ہوا تھا اُنھوں نے تھوڑی بہت حرکت پذیری سے اپنے لیے خوش نصیبی کا اہتمام کیا۔ کچھ سیلاب تو آیا اور کچھ آنے دیا گیا تاکہ دُنیا کو تباہ کاری کے مناظر دِکھا کر بھیک مانگی جاسکے۔ کشکول پھیلانے کی عادت بھی کیسے کیسے ہُنر سِکھا دیتی ہے۔ دُنیا والے اب تک نہیں سمجھ پائے کہ مِٹّی کو سونا بنانا کِتنا آسان ہے۔ ایک ذرا سا ہاتھ بڑھا کر کشکول ہی تو پھیلانا ہے۔ اور جب کشکول پھیلانا ہی ٹھہرا تو شرم کیسی؟ سیلاب ہو یا زلزلہ، ساری دُنیا سے امداد بٹور کر ہر قدرتی آفت کی زمین پر ذاتی منفعت کی فصل کھڑی کی جاسکتی ہے! جنھیں اللہ نے ''دانش'' سے نوازا ہے وہ زحمت کی کوکھ سے رحمت برآمد کرلیا کرتے ہیں! دریا جب جوش میں آتے ہیں تو کناروں کو بھول جاتے ہیں۔ مگر اُن کی طغیانی میں بھی کچھ لوگ اپنے لیے کنارے تلاش کرلیتے ہیں۔ بس، دیکھنے والی

آنکھ ہونی چاہیے۔ علامہ اقبالؔ نے خوب کہا ہے ۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

!ہو دیکھنا تو دیدۂ دِل وا کرے کوئی

جو سیلاب بہتوں کا بہت کچھ، بلکہ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے وہ کچھ لوگوں کے لیے بہت کچھ بہا بھی لاتا ہے۔ چار پائیاں اور جانور تو آپ نے بہتے دیکھے ہوں گے۔ دیدۂ بینا ہو تو سیلاب میں ڈالر کی موجیں بھی آپ کو آتی ہوئی دِکھائی دے جائیں گی! تحسین اور تبریک کے لائق ہیں وہ لاکھوں، بلکہ کروڑوں مفلوک الحال پاکستانی جو سیلاب اور دوسری قدرتی آفات کے ہاتھوں تباہ ہو کر اعلیٰ طبقے کے چند غریبوں کو تجوریاں بھرنے کا !موقع فراہم کرتے ہیں

اب پھر (اصلی) غریبوں کے دِل دَہلے ہوئے ہیں۔ مون سون نے زور پکڑا تو غریبوں نے التجا کی ۔

وہ نقابِ رُخ اُلٹ کر ابھی سامنے نہ آئیں

کوئی جاکے اُن سے کہہ دے ہمیں یوں نہ آزمائیں

مگر سیلاب نے ایک نہ سُنی اور چہرے سے نقاب اُلٹ کر بہت کچھ پلٹ دیا ہے۔ حیرت !اِس پر ہے کہ تباہی کا خوف اُنہیں لاحق ہے جن کے پاس کچھ رہا ہی نہیں

سیلاب کو اپنے علاقوں کی طرف بڑھتا دیکھ کر لاکھوں افراد سہمے ہوئے ہیں۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں ڈالر کے ریلے اپنی طرف آتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں! قدرتی آفات غریبوں کے چولھے ٹھنڈے کرتی ہیں مگر دوسری طرف عالمی برادری کو متحرک اور امداد کا بازار گرم بھی کرتی ہیں۔

ایک زمانے سے سُنتے آئے ہیں کہ موسم چار ہوتے ہیں۔ پاکستان میں پانچ موسم ہیں۔ اگر نفع خوری کو کچھ دیر کے لیے بھول جائیں تو پانچواں موسم سیلاب کا ہے۔ اور اِس میں بھی کھری کمائی ہے۔ دُرست کہ سیلاب سے فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ مگر فصلوں کا جو حصہ رہ جاتا ہے اُن کا انڈیکس پلک جھپکتے میں شُوٹ کر جاتا ہے!

سیلاب ہمیں ٹکے ٹکے کی سبزیوں کا محتاج کر دیتا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ مگر یہ بھی تو دیکھیے کہ سبزیوں کی فصل بھی نقد آور فصل میں تبدیل ہو جاتی ہے، کپاس اور تمباکو سے مہنگی بکتی ہے!

اب ہمارے ہاں سب کچھ فطرت کے اُصولوں کے مطابق ہو رہا ہے۔ ڈیم نہیں بنائے جارہے اِس لیے سیلاب آتا ہے۔ سیلاب آتا ہے تو فصلیں تباہ ہوتی ہیں، دیہی معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، بے روزگاری بڑھتی ہے۔ بے روزگاری بڑھتی ہے

یعنی افلاس زور پکڑتا ہے تو جرائم کی شرح بلند ہوتی ہے۔ افلاس قتل اور خود کشی کی طرف بھی لے جارہا ہے۔ یعنی سب کچھ عین فطری انداز سے ہو رہا ہے۔ مگر خیر، مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہماری اسٹاک مارکیٹ اب بھی فطرت کے اُصولوں کے خلاف جانے پر تُلی ہوئی ہے۔ یہ وہ مچھلی ہے جو دھارے کے خلاف زیادہ اچھا تیرتی ہے! ہم نے سیلابی موسم میں بھی اسٹاک مارکیٹ کو اِستثنٰی سے ہمکنار پایا ہے۔

دُنیا حیران ہے کہ پاکستان کے حالات دگرگوں ہیں مگر اسٹاک مارکیٹ بلندی پر رہتی ہے۔ حالات کا گراف تحت الثّریٰ میں اور اسٹاک مارکیٹ کا گراف اوجِ ثُریّا پر! جو سیلاب سب کچھ پلٹ دیتا ہے وہ پاکستان کی اسٹاک مارکیٹ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے! جی میں آتا ہے کہ جب بھی کوئی دریا بپھرنے کے مُوڈ میں ہو تو اسٹاک مارکیٹ کو اُس کے سامنے کھڑا کردیں۔ پھر دیکھتے ہیں وہ کیسے بپھرتا ہے!

!سیکیورٹی" کا جادو"

پہلے ہم پر انگریزوں نے راج کیا۔ یہ بلا واسطہ راج تھا جو کسی نہ کسی طور ختم کیا گیا یا ہوا۔ اِس کے بعد انگریزوں نے بالواسطہ راج کرنا شروع کیا۔ یہ راج انگریزی کے ذریعے تھا۔ انگریز چلے گئے مگر انگریزی ہمارے گٹّوں میں ایسی بیٹھی کہ اِس نے اب تک جانے کا نام ہی نہیں لیا۔

ہم انگریزوں سے (برائے نام ہی سہی) نفرت کرتے ہیں مگر انگریزی سے نفرت ہے نہ برطانوی ویزے اور شہریت سے! شاید اِسی کیفیت کے لیے غالبؔ نے کہا تھا ع

سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہُشیاری

انگریزی محض زبان نہیں، جادوئی زنبیل ہے۔ جب جی چاہے، اِس میں سے اپنی مرضی کا مَنتر نکالیے، پُھونکیے اور بگڑتا کام بنائیے۔ انگریزی کے کئی الفاظ ایسے ہیں کہ بڑی سے بڑی مصیبت کو ٹال دیتے ہیں۔ کسی کو خنجر گھونپ دیجیے اور پھر sorry کہہ کر جاں بخشی کرالیجیے! جاں بخشی ہو نہ ہو، لوگ لفظ sorry کو اِسی نیت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں! لفظ security ہی کو لیجیے۔ اِس ایک

لفظ میں ایک انوکھی، پُراسرار کائنات بند ہے۔ جب جی میں آئے، اِس لفظ کی گرہ کھولیے اور اپنی الگ کائنات بسالیجیے۔ پاکستان جیسے ممالک میں تو یہ لفظ گھونگھٹ کا کردار ادا کر رہا ہے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے ضمیر پر کسی بھی قسم کا بوجھ محسوس کئے بغیر کر گزریے اور سیکیورٹی'' کا گھونگھٹ کاڑھ لیجیے! کس میں دم ہے کہ ساعت سے اِس لفظ کے ٹکرانے'' کے بعد کسی بھی قسم کا استفسار کرے، وضاحت مانگے۔ روکنا تو بہت دور کی بات ہے، کوئی ٹوکتے ہوئے بھی دس بار سوچے گا۔ کون چاہے گا کہ قوم کی ''سیکیورٹی'' سے متعلق اقدامات پر سوال اُٹھا کر خود کو غدّاروں کے زُمرے میں داخل کرے؟

مُلک ترقی یافتہ ہو، ترقی پذیر یا پس ماندہ ..... ہر معاشرے، ہر سیاسی نظام میں سیکیورٹی'' کے نام پر سات خون معاف ہیں۔ دفاعی بجٹ ہڑپ کرنا ہو تو بڑا حِصّہ'' ٹھکانے لگا دیجیے اور تمام معاملات پر ''سیکیورٹی'' کا پردہ گرا لیجیے۔

ذہین حکومتوں نے اب ''سیکیورٹی'' کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے نئے امکانات تلاش کئے ہیں۔ عوام دو وقت کی روٹی آسانی سے حاصل کرلیں تو بہت سی حکومتیں پریشان ہو اُٹھتی ہیں کہ کہیں پیٹ بھرے لوگ اُن کے اقتدار کا تختہ اُلٹنے کے درپے نہ ہو جائیں۔ اِس مسئلے کا بہت آسان سا حل تلاش کرلیا گیا ہے۔ ایک

زمانہ تھا جب حکومتیں قدرتی آفات نازل ہونے پر ایمرجنسی یعنی ہنگامی حالت نافذ کردیا کرتی تھیں۔ ایمرجنسی اب گِھسا ہوا لفظ ہے کیونکہ اِس میں ہنگامے کا مفہوم پوشیدہ ہے! خوش سوچ بچار کے بعد اب حکومتوں نے ''سیکیورٹی'' کے مفہوم کو نئی جہت دی ہے۔ اگر سیلاب آئے اور فصلیں خراب ہوجائیں تو ''فوڈ سیکیورٹی'' نافذ کردیجیے۔ اہلِ سیاست کا نیا وژن یہ ہے کہ خوراک کی قِلّت خطرناک کیفیت ہے جو قومی سلامتی کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ ایسے میں دیگر اُمور کے ساتھ ساتھ اشیائے خور و نوش کی رسد کا معاملہ بھی حکومت آسانی سے اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے، بلکہ لے لیتی ہے۔ گویا عوام کی دو وقت کی روٹی پر شب خون مارنے کا ایک اور نرالا طریقہ وضع کرلیا گیا ہے۔

کسی بھی مُلک کے عوام لفظ ''جنگ'' سُنتے ہی ہیبت زدہ ہو جاتے ہیں اور بہت سے معمولات ترک کرنے کا ذہن بنانے لگتے ہیں اِس لیے اب حکومتیں کسی بھی مُلک گیر یا قومی مسئلے کو حل کرنے کے لیے دَھڑلّے سے کہتی ہیں کہ جنگی بُنیاد پر اقدامات کئے جارہے ہیں! جب کوئی کام جنگی بُنیاد پر کرنے کی بات کی جائے تو عوام سہم جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بیرونی دُشمن سے کوئی خطرہ دِکھائی نہ دے رہا ہو تو اندرونی مسائل کو حل کرنے کے لیے بھی جنگی بُنیاد پر اقدامات کا راگ الاپا جاتا ہے! ہمارے ہاں توانائی کے بحران سے نمٹنے کے سلسلے میں اِسی نوعیت کے دعوے کئے جاتے رہے ہیں۔ اب خوراک کا معاملہ بھی

جنگی بُنیاد پر اقدامات کا طالب دِکھائی دیتا ہے۔

بھارتی قیادت اپنے اور پاکستانی معاشرے میں مُشترک اقدار کا راگ الاپتے تھکتی نہیں۔ اب یہ راگ کچھ کچھ قابلِ قبول سا لگنے لگا ہے۔ اقدار ہوں نہ ہوں، مسائل تو ایک سے ہی لگتے ہیں! جو سیلاب ہمارے ہاں تباہی پھیلاتا ہے وہ وہاں بھی کچھ کم ہنگامہ برپا نہیں کرتا۔ زمین کا کِھسکنا یعنی تودوں کا گرنا (لینڈ سلائیڈنگ) جیسا خطرناک ہمارے ہاں ہے ویسا ہی خطرناک اُن کے ہاں بھی ہے۔ خُشک سالی ہر سال صرف ہمارا نہیں، اُن کا بھی مُنہ چِڑاتی ہے اور ناک میں دَم کرکے دَم لیتی ہے!

بھارت کی حکمراں جماعت کانگریس نے اپنے اقتدار والی چار ریاستوں (صوبوں) میں فوڈ سیکیورٹی نافذ کردی ہے۔ بے چاری کانگریس سخت پریشانی کے عالم میں ہے۔ چومُکھی نہ سہی، تین مُکھی لڑائی تو لڑنی ہی پڑ رہی ہے۔ کنٹرول لائن اور بین الاقوامی سرحد پر پاکستان کو مُنہ دینا پڑ رہا ہے، بھارتیہ جنتا پارٹی نے خطے کی روایتی اپوزیشن ہونے کے ناطے الگ نام میں دم کر رکھا ہے اور سیلاب کے ہاتھوں اُجڑنے والی فصلوں نے بھی ہوم فرنٹ پر حالتِ جنگ کو جنم دیا ہے۔ کبھی ٹکے ٹکے میں فروخت ہونے والی سبزیاں اب حکومت کے سَر پر چڑھ کر ناچ رہی ہیں۔ گویا کانگریس کی حکومت چوراہے کی رونقیں بٹورنے کے بعد

پہلے تو دوراہے پر کھڑی ہوئی اور اب تراہے پر آ گئی ہے! سونیا گاندھی پریشان ہیں۔ اور اِتنے ہی پریشان اُن کے فرزندِ ارجمند راہُل گاندھی بھی ہیں۔ ؎

نظر میں اُلجھنیں، دِل میں ہے عالم بے قراری کا
سمجھ میں کچھ نہیں آتا، سُکوں پانے کہاں جائیں!

قدرتی آفات کے ہاتھوں تباہی کے معاملے میں پاکستان اور بھارت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ یا یوں کہیے کہ ایک ہی سیلاب کے ڈبوئے ہوئے ہیں۔ پوری پوری ریاستیں زیر آب آ ئی جاتی ہیں۔ فصلیں تباہ ہو رہی ہیں۔ لینڈ سلائیڈنگ کے نام پر پتہ نہیں کیا کیا کِھسک رہا ہے۔ خُشک سالی خُون خُشک کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ اور اِتنا کچھ سہنے کے بعد بھی دونوں ملکوں کے پاس اِتنی فُرصت اور سکت ہے کہ جنگی جُنون کو پروان چڑھا سکیں! دُنیا والوں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا چاہیے کہ ہم کتنے بکھیڑوں کو جھیل کر، اُن سے نپٹ کر بھی جنگی جُنون کو پروان چڑھا سکتے ہیں! دوستی کے لاکھ راگ الاپے جائیں، جب ہم معاملات کو بگاڑنے پر آتے ہیں تو پلک جُھپکتے میں. برسوں کی محنت یوں داؤں پر لگا بیٹھتے ہیں کہ اپنی ''صلاحیتوں'' پر یقین ہی نہیں آتا، خود پر مَر مِٹنے کو جی چاہتا ہے! ؎

حوصلے کی تڑپ بھی کیا شے ہے

!فاصلہ ایک جست میں طے ہے

ایک طرف ہم ہیں کہ ہمارا ہر شعبہ .بربادی کی حدود میں قدم رکھ چکا ہے۔ دوسری طرف بھارت ہے جو مختلف شعبوں میں بھرپور ترقی کا دعویٰ کرتے نہیں تھکتا مگر جب باٹم لائن'' پر نظر ڈالیے تو نتیجہ وہی دکھائی دیتا ہے یعنی ڈھاک کے تین پات ! شوبز،'' آئی ٹی اور نالج مارکیٹ میں کامیابی کا ڈھول پیٹنے والے بھارت کے طول و عرض میں آج بھی کم و بیش 50 کروڑ افراد انتہائے افلاس کے عالم میں جی رہے ہیں۔ ''چمکتا بھارت'' اور ''میرا بھارت مہان'' کی گردان کرنے والوں کو یہ دِکھائی نہیں دیتا کہ .بڑے شہروں اور دیگر شہری علاقوں میں سات کروڑ افراد فٹ پاتھ پر شب و روز ہی !نہیں، پوری زندگی بسر کرتے ہیں

مگر خیر، یہ کوئی بغلیں بجانے کا محل نہیں۔ ہمارے ہاں بھی غریب کی مِٹّی پلید ہی ہے۔ دونوں ممالک ایٹمی ہتھیاروں کے حامل بھی ہیں اور پستی کا عالم یہ ہے کہ چند بُنیادی سہولتوں کی فراہمی قومی اِشو میں تبدیل ہوچکی ہے۔ یہاں جو بجلی پائی ہی نہیں جاتی وہ جھٹکے دے رہی ہے۔ وہاں یہ عالم ہے کہ خوراک اپنے کھانے والوں کو کھانے پر تُلی !ہوئی ہے

دونوں ممالک میں 60 کروڑ سے زائد افراد افلاس کے ہاتھوں تنگ ہیں۔ زندگی

مستقل بوجھ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اور اِس پر بھی جنگی جنون ہے کہ سَر چڑھ کر بول رہا ہے۔ یا پھر یہ کہ اِس جنون کو سَر پر چڑھا کر بولنے پر مجبور کیا جا رہا ہے! دفاعی تیاریوں کی فکر لاحق ہے۔ ایک طرف فوڈ سیکیورٹی اور دوسری طرف بارڈر سیکیورٹی۔ یعنی ایک چکّی کے دو پاٹ۔ کبیر داس نے خوب کہا ہے کہ دو پاٹن کے بیچ میں باقی بچا نہ کوئے!

کبھی ایسا بھی تو ہو کہ قرضے اُتارنے کے لیے "لون سیکیورٹی" نافذ کی جائے۔ یہ کیا کہ دریاؤں کے پُشتے مضبوط نہیں اور ایک دوسرے کو ایٹمی ہتھیاروں سے ڈرایا جا رہا ہے! گڈ گورننس کے دعوے کرنے والوں کو "گڈز گورننس" نے گھیر لیا ہے۔ چند معمولی اشیاء کی قلّت دونوں حکومتوں کے سارے کس بل نکال رہی ہے۔ دونوں کو قدرت نے ثُریّا سے دبوچ کر زمیں پر دے مارا ہے۔ عقل مندوں اور احساس رکھنے والوں کے لیے اشارے کافی ہوا کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ عقل اور احساس کہاں سے لائیں؟

اندھی رقابت کی بند گلی

دوستی کا مختصر دورانیہ ختم ہوا۔ پانی پھر اپنی پنسال میں آگیا ہے۔ مفاہمت، خیر سگالی اور دوستی کا "اِستثنائی" دور اختتام کو پہنچا۔ میڈیا کے شیر تازہ دم ہو کر کولوزیم میں نکل آئے ہیں اور مفاہمت کا ماحول غلام کی صورت اپنے مقدر کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے!

میاں نواز شریف نے تیسری بار وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہونے سے قبل بھارت سے دوستی کو پروان چڑھانے پر زور دیا تھا۔ دونوں ملکوں کے عوام یہی چاہتے ہیں مگر دوستی کی بات بھی بڑھک کے انداز سے کی جائے تو "اسٹیک ہولڈرز" کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ ہوشیار ہو جاتے ہیں! میاں صاحب نے بھی دوستی کی بات خاصی عُجلت میں اور تیزی سے کہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خیر سگالی کے جذبے کی کوکھ سے اچھی خاصی تشویش نے جنم لیا۔ دونوں طرف ہی لوگ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ایسا کیا ہے کہ دوستی بڑھانے کو ہر شے پر ترجیح دی جارہی ہے اور وہ بھی اِس قدر عُجلت کے عالم میں۔

عبدالحمید عدمؔ نے اپنے مقطع میں کُلیہ سا بیان کر دیا ہے۔ ؎

عدمؔ! خُلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے

ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں!
جن پر سَر پر مسائل کی گٹھڑی دَھری ہو وہ بوجھ کو مرحلہ وار کم کرنے کے بجائے گٹھڑی کو کسی نہ کسی طور اُتار پھینکنے کی سوچتے ہیں۔ یہ عُجلت پسندی ہی بنتے کام کو بھی بگاڑ دیا کرتی ہے۔ دو حکومتی ادوار اِس بات کے گواہ ہیں کہ مسلم لیگ (ن) کی قیادت نے سارے بگڑے ہوئے کام راتوں رات دُرست کرنا چاہے اور جو کچھ دُرست حالت میں تھا اُسے بھی بگاڑ کی منزل تک پہنچادیا!
ایک زمانے سے پاکستان اور بھارت اندھی رقابت کی بند گلی میں کھڑے ہیں۔ دونوں ملکوں کے سیاست دان اور میڈیا پرسنز ایک دوسرے میں پائی جانے والی خامیاں اور کیڑے مُحدّب عدسے کی مدد سے تلاش کرکے منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کرکے دِل کے لیے تسکین کا سامان کیا جائے۔ ایک کی خوشی کا مدار دوسرے کے غم پر ہے۔ مَسرّت درکار ہے تو فریقِ ثانی کی پریشانی کا انتظار کیا جائے! دِل کو خوش کرنے اور خوشی سے ہمکنار رکھنے کے ایسے ایسے فارمولے وضع کئے گئے ہیں کہ دُنیا دیکھے تو حیران رہ جائے۔
ایک زمانے سے حالت یہ ہے کہ جب بھی کسی بین الاقوامی ٹورنامنٹ میں پاکستان

اور بھارت کی ٹیمیں شریک ہوتی ہیں تو اپنی پوزیشن بہتر بنانے کے بارے میں سوچنے سے زیادہ فریقِ ثانی کے بُرے حشر کی فکر لاحق رہتی ہے! بہت پہلے کی بات ہے۔ ہاکی کے ایک بین الاقوامی ٹورنامنٹ میں 12 ٹیمیں شریک ہوئیں۔ پاکستانی ٹیم گیارہویں اور بھارتی ٹیم بارہویں نمبر پر آئی۔ وطن واپسی پر پاکستانی ہاکی ٹیم کے کپتان اور منیجر نے کارکردگی کے بارے میں پوچھے جانے پر کہا تھا اطمینان کی بات یہ ہے کہ ہم بھارت سے بہرحال "برتر" رہے!

کسی نہ کسی طور "برتری" پانے کی ذہنیت نے نہ صرف یہ کہ دم نہیں توڑا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستحکم تر ہوتی چلی گئی۔ اب حالت یہ ہے کہ رہ رہ کر ہمیں یاد آتا ہے کہ "باوقار" قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لیے ایک دوسرے کو کسی نہ کسی طرح نیچا دِکھانا ہے! جہاں کامیابی کا معیار خود کو بلند تر کرنے سے کہیں بڑھ کر فریقِ ثانی کو نیچا دکھانا ہو وہاں بہتری کی امید رکھنا حماقت سے کم نہیں۔

"پاک دامن" میں میڈم نُور جہاں کے گائے ہوئے ایک گانے کے انترے میں یہ پُر اثر شعر شامل تھا۔ ؎

بند ہیں موت کی راہیں بھی اسیروں کے لیے
جانے اِس قید سے اب کیسے نکلنا ہوگا!

پاکستان اور بھارت کی بھی کچھ یہی کہانی ہے۔ روایتی حریف ہونے کے نام پر دونوں رقابت کے ایک رَسّی سے بندھے ہوئے ہیں جو کبھی کبھی اچانک زور پکڑ کر کسی ایک کے گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔ پاک بھارت اندھی رقابت ایک ایسا گڑھا ہے جس میں بہت سا کچرا بے حد آسانی سے اور اِس یقین کے ساتھ پھینک دیا جاتا ہے کہ کوئی سوال اُٹھے گا نہ کچھ استفسار کیا جائے گا!

یہ بھی زبردست تکنیک ہے۔ جنوبی ایشیا کی سیاست میں جب کوئی کھاتا کُھل جاتا ہے تو سب کچھ اُس میں پھینکا جانے لگتا ہے۔ لوگ آنکھ بند کرکے ہر اُس بات پر یقین کرلیتے ہیں جو اُن سے کہی جارہی ہوتی ہے۔ اگر کوئی جماعت دہشت گردی کے حوالے سے بدنام ہو تو سب کچھ اُس کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ آپس کا پُرانا حساب بھی اِسی طریقے سے چُکتا کردیا جاتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کی حکومتوں نے بھی یہی طریقہ اپنالیا ہے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے، اندھی رقابت کے کھاتے میں کرتے رہیے۔ کس میں ہمت کہ ''قومی سلامتی'' کے معاملے پر کوئی سوال کرے یا اُنگلی اُٹھائے؟

سوچے سمجھے بغیر ایک دوسرے کی مخالفت کرتے رہنے کا کیا نتیجہ نکلا ہے؟ کیا اِس روش سے کچھ بہتری کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اب تک تو اِس بے عقلی کی کوکھ سے کوئی مثبت رجحان ہویدا نہیں ہوا۔ اور اِس بات کی امید بھی نہیں کہ

مستقبلِ قریب میں کوئی بہتری پیدا ہوگی۔ پھر کیا بہتر نہ ہوگا کہ حالات پر غور کیا جائے، تمام معاملات کا معروضی جائزہ لیکر حقیقت پسندی پر عملی حکمتِ عملی اپنائی جائے؟ زمانہ بدل چکا ہے۔ ہم کب تک ایک دوسرے کی تذلیل میں اپنی توقیر ڈھونڈتے رہیں گے؟ اندھی رقابت کی بند گلی میں ہمارا ماضی اور مستقبل دونوں بند ہیں۔ رہ گیا حال؟ تو وہ بے حال ہے! حقیقت پسندی ہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم اپنی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ آنکھیں بند کرکے ایک دوسرے کی مخالفت پر کمربستہ رہنا، ایک دوسرے کو گرا کر آگے بڑھنے کی روش پر گامزن رہنا پرلے درجے کی حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

پاکستان میں نئی حکومت بنی ہے اور بھارت میں حکومت کے لیے مشکلات بڑھ رہی ہیں۔ یہ عجیب صورتِ حال ہے جس کا تقاضا ہے کہ ہم ہوش کے ناخن لیکر رقابت ترک کریں اور حقیقی دوستی اور محبت اپنائیں۔ اب تو ایک دوسرے کو قبول کرنے ہی کا آپشن رہ گیا ہے۔ اگر کسی کے پاس کوئی اور آپشن ہو تو سامنے لائے۔ صرف مفاہمت اور رواداری ہی وہ سِکّہ ہے جو سفارت کاری کے بازار میں ڈھنگ سے کچھ خریداری کرنے کے قابل بناتا ہے۔

قوموں کی زندگی میں مفاہمت اور رواداری ہی آگے بڑھنے کے راستے ہوا کرتے ہیں۔ بے عقلی پر مبنی رقابت کو اپنا کر کچھ بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں ملکوں کے عوام کا حق ہے کہ اُن کے اجتماعی مفاد کی خاطر اندھی رقابت ترک کی جائے، بند گلی سے نکل کر کُھلی فضا میں سانس لینے کی عادت ڈالی جائے۔ جنہیں بند گلی میں رہنے کی عادت پڑ جائے وہ کُھلی فضا کا مفہوم بھی بھول جایا کرتے ہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ ہم ابھی اِس مقام تک نہیں پہنچے۔

!ہم، جِن پرست

بہت کچھ ایسا ہے جسے کہیں جگہ نہ ملی تو ہم میں بس گیا۔ ناشکری ہے کہ ہمارے رگ و پے میں بس گئی ہے۔ حقیقت سے نظر چرانا ایسی خصلت ہے کہ اب ہم سے جُدا ہونے کو تیار نہیں۔ جو ملا ہے اُس سے ہم ذرا بھی خوش نہیں۔ خواہش ہے تو بس اِتنی کہ جو کچھ ہم ہیں وہ نہ رہیں، کچھ اور ہو جائیں۔ تماشا یہ ہے کہ جس کا ملنا کم و بیش ناممکن ہے اُسے بھی پانے کی ہوس ہے۔ اور اُس کے لیے کسی بھی سطح پر عمل دکھائی نہیں دیتا!

ایک زمانے سے قوم کی یہ عادت سی ہے کہ مسائل کو حل کرنے کے لیے بھری ہوئی بوتل کا سہارا لیتی ہے تاکہ نشے میں ڈوبنے کے بعد کچھ یاد نہ رہے۔ یا پھر اِس خواہش کی اسیر رہتی ہے کہ دریا کے کنارے یا سمندر کے ساحل پر کوئی ایسی بوتل مِل جائے جسے کھولتے ہی جِن آزاد ہو کر ہاتھ باندھے سامنے کھڑا ہو جائے اور ہیبت ناک آواز میں فرمائشی سوال داغے ''کیا حکم ہے میرے آقا؟'' جنہیں بوتل کی طلب نہیں ہوتی وہ چراغ ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ جیسے ہی ملے، اُسے گِھسیں، جِن باہر نکلے اور غلامی اختیار کرنے پر بضد ہو!

جِن پرستی بجائے خود کسی جِن کی طرح ہمارے لاشعور کی بوتل میں بند ہو چکی ہے۔

جب بھی ضرورت پڑتی ہے، ہم اِس بوتل کا ڈھکن ہٹا کر جن کو باہر نکالتے ہیں اور تمام معاملات اُس کی صوابدید پر چھوڑ کر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ہماری خواہشات اور لاشعور میں بسا ہوا ہر جن (ہماری توقعات کے عین مطابق) مسائل حل کرنے کا وعدہ کرکے کام پر نکل جاتا ہے!

پاکستانی معاشرے میں ہر طرف جن پرستی رقص کر رہی ہے۔ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہر معاملے میں کسی جن کی آمد کی منتظر رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اب ہر معاملے میں جِناتی انداز در آیا ہے۔ ہر معاملے کو جِناتی انداز سے درست کرنے کی روش اپنانے کا رُجحان دن بہ دن پروان چڑھتا جا رہا ہے۔ حکومتیں اِسی انداز کو اپنائے ہوئے ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ کسی بوتل سے کوئی جن نکلے اور بگڑے کام بنادے۔ یا کہیں سے کوئی چراغ ملے جسے رگڑتے ہی جن برآمد ہو، آن کی آن میں سب کچھ درست کرنے کا وعدہ کرے اور کام پر روانہ ہو جائے!

جن پرستی کیوں پروان نہ چڑھے؟ اگر مسائل حل کرنے پر قومی خزانہ صرف ہو تو یاروں کے ہاتھ کیا آئے گا؟ مسائل حل کرنے کے لیے جن کی تلاش کا رُجحان اب اِس قدر زور پکڑ چکا ہے کہ ہر وزارت، محکمے اور ادارے کے معاملات کی دُرستی کے لیے ایک ''فل فلیجڈ'' جن درکار ہے! حکومتی سطح پر بھی عمل سے زیادہ ''عامل

پر توجہ دی جاتی ہے! جِنّات پر قابو پانے کا دعوی کرنے والے "عامل" ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اہم سے اہم تر ہوتے جارہے ہیں۔ سوچ کے سُتون میں یہ نکتہ نصب ہوچکا ہے کہ جِنّات کا بندوبست نہ کیا گیا تو معاملات کبھی دُرست نہ ہوسکیں گے!

سوال یہ ہے کہ وزارتوں اور محکموں میں جِنّات کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ عشروں کی خرابی نے وزارتوں اور محکموں کو ویرانوں میں تبدیل کردیا ہے۔ ویرانوں میں بھوت بستے ہیں۔ بیشتر وزارتوں اور محکموں میں اِسی لیے بہت سے "گھوسٹ" ملازمین پائے جاتے ہیں! کسی بھی "گھوسٹ" سے لڑنا اور اُسے ہرانا انسانوں کے بس کی بات نہیں اِس لیے جِنّات کو زحمتِ کار دی جاتی ہے!

"گھوسٹ" بھی بہت عجیب لفظ ہے۔ عرفِ عام میں ہر اُس چیز کو گھوسٹ قرار دیا جاتا ہے جو نادیدہ ہو، دکھائی نہ دیتی ہو۔ وزارتوں اور محکموں میں جو ملازمین پائے نہیں جاتے وہ گھوسٹ کہلاتے ہیں۔ مگر تماشا یہ ہے کہ جو ملازمین گھوسٹ نہیں وہ بھی پائے نہیں جاتے! کوئی خوش نصیب اُنہیں کبھی کبھار ہی دیکھ پاتا ہے۔ اِس لحاظ سے سوچیے تو وزارتوں اور محکموں میں ہر طرف گھوسٹ ہی گھوسٹ ہیں۔ اور اِن کی ہلی جُلی کوششیں قومی وسائل کو بھی

گھوسٹ میں تبدیل کر دیتی ہیں۔
جن پرستی کے مستحکم ہوتے ہوئے رجحان نے ہم میں بہت سی تبدیلیوں کو راہ دی ہے۔ اب ہم انسانوں سے زیادہ تعلقات رکھتے ہیں نہ توقعات۔ قدم قدم پر یہی خواہش توانا رہتی ہے کہ کوئی آئے اور تمام مسائل حل کر جائے۔ جن پرستی کا عالم یہ ہے کہ اب اِنسان پرستی اور اِنسان دوستی عیوب کے زُمرے میں شامل کی جا چکی ہے! عالم یہ ہے کہ سبھی اِنسان پرستی کے الزام سے بچنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں!
ہمارے لیے جِنّات اور بھوت کوئی انہونی یا انوکھی مخلوق نہیں۔ ہماری دوستی مرزا تنقید بیگ سے ہے۔ اِس دوستی کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ ہم زمین پر بسنے والی غیر اِنسانی مخلوق سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں! ایک زمانہ تھا جب ہم جِنّات اور بھوت پریت پر زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے۔ مگر مرزا نے ہمیں اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنے فکر و عمل سے ثابت کرتے رہتے ہیں کہ اُن کا آبائی کہیں دور، کوہِ قاف میں ہے! دوستی ہی کو لیجیے۔ وہ اِس معاملے میں بھی جِنّاتی طرزِ عمل ترک نہیں کرتے۔ جب ملتے ہیں، ہمارے اِس تاثر کو پُختہ تر کر دیتے ہیں کہ اُن کا مزاج اور نوعِ تعلق اِنسانوں سے نہیں۔ جب بولنے پر آتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے کوئی چراغ رگڑ کر اُنہیں

نکالا ہے اور دوبارہ بند کرنا بُھول گیا ہے! ہمارا خیال یہ ہے کہ مرزا جس چراغ میں بند تھے اُس کچھ زیادہ ہی رگڑ دیا گیا ہوگا یعنی مرزا کا دماغ بھی تھوڑا سا گِھس گیا!

جب ہم نے مرزا سے جِن پرستی کا شِکوہ کیا تو تقریباً پھٹ پڑنے کے انداز سے بولے۔ ''یہ قوم جس حال میں خوش ہے اُسی حال میں خوش رہنے دو۔ یہی خوش خوش زندہ رہنے کا بہترین اور تیر بہ ہدف نُسخہ ہے۔''

ہم نے عرض کیا کہ اِس طور زندہ رہنا کِس کام کا؟ یہ تو حقیقت سے فرار کی ایک صورت ہے۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگلنا بھلا کب سے اچھا عمل ہوگیا؟

مرزا نے ہمیں گھورتے ہوئے کہا۔ ''اگر کسی عمل سے قوم کو سُکھ اور سُکون ملتا ہے تو تم جیسے لوگوں کو کیا پریشانی لاحق ہے؟ تم تو بس یہ چاہتے ہو کہ لوگ پریشان رہیں، اُلجھے رہیں۔ تم کیوں چاہوگے کہ لوگ کسی نہ کسی طور سُکھ کی نیند سوئیں اور تازہ دم اُٹھیں؟ اگر قوم نے جِن پرستی اختیار کرلی ہے تو کیا ہوا؟ جِنّات بھی تو اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ اُن سے مسائل کے حل کی توقع وابستہ کرنا کون سی بُری بات ہے۔''

مرزا کی باتیں ہم سے ہضم تو نہ ہوئیں مگر ہم نے بحث کو طول دینا مناسب نہ

جانا۔ مرزا جب کسی معاملے میں فریقِ ثانی کی تذلیل پر کمربستہ ہو جائیں تو جِناتی انداز اختیار کرنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے!

ہمیں بھی کاش کوئی پیر مل جائے!

ہر مشکل میں جس صدر کو پہاڑوں سے دور، ساحل کے نزدیک رہنے کا مشورہ دیا جاتا رہا ہے اب اُس کی کشتی کنارے پر آ لگی ہے۔ صدر زرداری کا پانچ سالہ دور ختم ہونے کو ہے۔اِس مدت کے دوران قوم کتنے ہی طوفانوں سے بِھڑتی رہی ہے۔ صدر کے لیے تو بہت آسان تھا کہ طیارے میں بیٹھیں اور کراچی پہنچ جائیں۔ کراچی میں وہ صدارتی کیمپ آفس میں اطمینان سے بحرانی کیفیت گزارتے تھے۔ قوم بے چاری کہاں جاتی؟ وہ ہر بحرانی کیفیت میں طوفانی لہروں ہی کے ''رحم و کرم'' پر رہی۔ غوطہ خور موتی لانے کی شہرت رکھتے ہیں۔ مگر ہر بحران کی تہہ میں قوم کے ہاتھ کنکر ہی آئے۔ بحرانوں کی تہہ میں عوام کے لیے کنکر ہی ہوا کرتے ہیں۔ موتی نیفے میں اُڑس کر اُڑن چُھو ہوجانے والوں کے لیے علامہ اقبالؔ نے کہا ہے ع

اب اُنہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر!

ایک زمانے سے یعنی چار پانچ برسوں سے ہم سُنتے آئے ہیں کہ صدر کے ایک پیر ہیں جو ہر معاملے میں اُن کی معاونت کرتے ہیں۔ ہم ابتدا میں حیران ہوئے تھے کہ آصف علی زرداری کو کیا واقعی کسی پیر کی ضرورت ہے؟ وہ بلا شرکتِ غیرے

ایسے کمالات کے حامل ہیں کہ ایک دُنیا اُنہیں ''مُرشد'' ماننے پر راضی ہے ! اِسی لیے تو چاہنے والے اُنہیں سب پر بھاری بھی قرار دیتے آئے ہیں۔ پھر خیال آیا ایوان ہائے اقتدار کی پیچیدہ گتھیاں سُلجھانے کے لیے ممکنہ طور پر اُنہیں کسی بڑے پیر کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ جو صدر زرداری کے لیے بھی پیر ہوں وہ تو واقعی بڑے پیر صاحب ہوئے! آصف علی زرداری بے حد خوش نصیب ہیں کہ اُنہیں ایک عدد مستند پیر صاحب مِل گئے۔ پیر صاحب نے اُن کی کشتی کو ڈوبنے اور کسی چٹان سے ٹکرانے سے بچایا۔ پانچ برسوں کے دوران کیسے کیسے نازک مراحل آئے مگر صدر کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ ہوتا بھی کیسے ؟ پیر صاحب جو موجود تھے ان کا مکمل تحفظ یقینی بنانے کے لیے ! چند برس پہلے تک حالت یہ تھی کہ صدر کی کرسی بچانے کے لیے ایوانِ صدر میں روزانہ کالے بکروں کی قربانی دی جاتی تھی۔ یعنی قوم کے ساتھ ساتھ بکروں کی بھی شامت آئی ! یا یہ کہ قوم اور بکروں کا مُقدر اور انجام یکساں تھا!

خیر، صدر کے پیر نے انہیں مختلف نازک لمحات میں محفوظ رکھا۔ کیسے محفوظ نہ رکھتے؟ پانچ سال کا ''ٹھیکا'' جو تھا۔ صحافیوں کے اعزاز میں صدر زرداری کی طرف سے الوداعی عشائیے میں اُن کے پیر اعجاز نے بتایا کہ آصف زرداری سے اُن

کا پانچ سال کا ٹھیکا تھا۔ جو وعدہ کیا، پورا کیا۔ آصف زرداری نے ایوانِ صدر میں مزید قیام کی خواہش ظاہر نہ کی ورنہ وہ اِس کا بندوبست بھی کر دیتے!

ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ آصف علی زرداری کے دِل میں ایک اور مدت کے لیے صدر بنے رہنے کی ہوس نہیں تھی۔ پیر صاحب کی گواہی کے بعد ہماری نظر میں صدر کی وقعت بڑھ گئی ہے۔

عشائیے کے بعد صحافیوں کو پیٹ بھرے کی مستی سُوجھی تو پیر اعجاز کو گھیر لیا اور اُن پر سوالوں کی بوچھار کر دی۔ سوالوں کے جواب پیر اعجاز نے جس انداز سے دیئے اُس سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوگیا کہ صحافیوں کا سامنا کرنے کی تربیت اُنہیں صدر زرداری نے دی ہے یا وہ اِس معاملے میں بھی صدر زرداری کے ''مُرشد'' ہیں! ہونٹوں پر ہنسی اور ماتھے پر کوئی شکن نہیں! پریشان ہونے کے لیے قوم ہے تو سہی، پھر ایوان ہائے اقتدار کے مکین بھلا کیوں کوئی بات دل پر لیں؟

پیر اعجاز فرماتے ہیں کہ وہ روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ جہاں دو وقت کی روٹی ملے گی، پڑ رہیں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آصف زرداری بادشاہ ہیں۔

وہ دوستوں کے دوست ہیں۔ اب جینا مرنا اُن کے ساتھ ہے، اُنہی کے ساتھ رہیں گے۔

صحافیوں سمیت پوری قوم کو یاد رکھنا چاہیے مُرید تو بھولے ہو سکتے ہیں، پیر کبھی بھولے نہیں ہوتے۔ وہ ''روکھی سوکھی'' کے لیے بھی مُرید سوچ سمجھ کر چُنتے ہیں! جیسی پیر اعجاز نے پسند کی ہے ویسی ''روکھی سوکھی'' اللہ پوری پاکستانی قوم کو عطا فرمائے! صحافی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ پیر اعجاز نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ پیر صاحب نے پُرسکون لہجے میں بتایا کہ وہ خالی ہاتھ ایوانِ صدر میں آئے تھے اور خالی ہاتھ ہی جارہے ہیں۔ ثبوت کے طور پر اُنہیں نے اپنی دونوں خالی جیبیں بھی صحافیوں کو دِکھائیں! اِس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُنہوں نے اقتدار کے اعلیٰ ایوان کو اپنے کمالات صرف دکھائے نہیں بلکہ چند ایک کمالات سیکھے بھی ہیں! صحافی بھی کیسے بھولے ہیں جو یہ توقع رکھتے ہیں کہ کوئی اگر مال بنائے گا تو جیب میں لیے لیے پھرے گا!

پیر اعجاز کا یہ بھی کہنا تھا کہ مقدمات سے آصف زرداری کا پہلے کچھ بگڑا ہے نہ اب بگڑے گا۔ رسمی کارروائی ہوتی رہے گی۔ صدر کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔

پیر اعجاز درست فرماتے ہیں۔ جس ملک میں رسم ہی یہ ہو کہ ہر معاملے میں صرف رسمی کارروائی سے کام چلایا جائے وہاں کسی بھی معاملے کے منطقی انجام تک پہنچنے کی توقع کیونکر کی جاسکتی ہے؟

مرزا تنقید بیگ نے جب صدر کے پیر کی باتیں اخبار میں پڑھیں تو اُن کے گرویدہ، بلکہ مُرید ہوگئے۔ جب نام ہی اعجاز ہو تو کمالات کیونکر ہویدا نہ ہوں؟ جو صدر بھی مُرشد ہوں اُن کی ذہانت کا کوئی کیا اندازہ لگائے؟ مرزا کہتے ہیں۔ ''اِس ملک کے پیر کوئی کچّا کام نہیں کرتے۔ صرف اُسی کے سَر پر دستِ شفقت پھیرتے ہیں جس کی نوکری پکّی ہو! مستقبل اُن کا محفوظ کرتے ہیں جو پہلے ہی بادشاہ گر ہوں! اگر ایسا کوئی مُرید میسر ہو تو ہم بھی پیری کے میدان میں قدم رکھنے کو تیار ہیں!''

آصف علی بہت سے معاملات میں ''قابلِ رشک'' رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ قوم اپنی ''بدنیتی'' کے ہاتھوں مجبور ہوکر کبھی کبھی رشک میں سے ''ر'' نکال دیتی ہے! اب یہی دیکھیے کہ اُنہیں سیاسی پلیٹ فارم ہی نہیں، روحانی پلیٹ فارم بھی مل گیا یعنی ہر پریشانی سے بچانے والے پیر کا دستِ شفقت بھی سَر پر رہا۔ دوسری طرف قوم ہے کہ اُس کے نصیب میں ایسا ایک تو کیا، آدھا پیر بھی نہیں جو لوڈ شیڈنگ کا عذاب ختم یا کم کرنے کا وظیفہ بتائے۔ اے کاش!

ہمارے نصیب میں بھی کوئی ایسا پیر ہوتا جو کرپشن کی لعنت جڑ سے ختم کرنے کا تعویذ عنایت کرتا!

آصف زرداری کو تو پیر اعجاز مل گئے جنہوں نے پانچ سال کا ٹھیکا پورا کر دکھایا۔
ہمارے نصیب میں کوئی پیر صاحب نہیں جو افلاس اور بے روزگاری ایک سال ہی کے لیے ختم کرنے کا ٹھیکا لیں! قوم اب تک کسی ایسے پیر صاحب کی راہ تک رہی ہے جو سخت بحرانی کیفیت میں کسی ایسی جگہ جانے کا مشورہ دیں جہاں جانا ممکن ہو۔ دیکھتے ہیں قوم کے دن کب پھریں اور کوئی بڑے پیر صاحب اِس غریب کی طرف بھی آ نکلیں!

!نصیب" پریشان ہے"

''امارا واسطے کوئی نوکری ڈھونڈو۔''

''نوکری تو تم کر ہی رہے ہو۔ چائے اور پراٹھے بنانا کیا نوکری نہیں؟ آمدنی بھی معقول ہے۔''

''یہ بھی کوئی نوکری ہے؟ بندے کی کوئی عزت ہی نہیں۔''

''اب نوکری میں کاہے کی عزت۔ تم نے سُنا نہیں کہ نوکری کی تو نخرا کی! دوسروں کو دیکھ کر کڑھنے کی ضرورت نہیں۔ سب کا ایک سا حال ہے۔''

''مگر صاحب! اب اِس نوکری میں امارا دِل نئی لگتا۔ بہت چھوٹی عمر سے اَم نے یہی کام کیا ہے۔ کام بھی کرو، گالی بھی سُنو۔ کبھی کبھی پیسہ بھی پُورا نہیں مِلتا۔

''وہ کیوں؟''

''بہت سے لوگ کھانے کے بعد پیسے دیئے بغیر بھاگ جاتے ہیں۔ پیسہ مانگو تو دھمکی دیتا ہے، کوئی بولتا ہے آڈر اَم نے نئی دیا تھا۔ جس نے دیا تھا وہ چلا گیا۔ اب اُس کو پکڑو۔ ایسے لوگوں کا پیسہ اَمارا جیب سے جاتا ہے۔''

یہ نصیب خان کی کہانی ہے جو ہوٹل پر چائے بناتا، پراٹھے لگاتا اور گاہکوں

کو بھگتاتا ہے۔ اُس کی زندگی چائے بناتے اور پراٹھے لگاتے گزری ہے۔ بندہ جوان ہے مگر زندگی کی بات ہم اِس لیے کر رہے ہیں کہ نو دس سال کی عمر سے اُس نے یہی کیا ہے۔ جس عمر میں لوگ کام دھندا شروع کرتے ہیں اُتنے سال کا ہوتے ہوتے وہ عملی زندگی کے کم و بیش اٹھارہ سال پورے کرچکا ہے!

نصیب خان کی کہانی آپ کو خاصی جانی پہچانی لگی ہوگی۔ کیوں نہ لگے؟ اِس ملک میں ہر نصیب خان کی یہی کہانی ہے۔ ایک ہی دُکھڑا ہے جو رنگ روپ بدل کر سامنے آتا رہتا ہے۔ محنت کے پورے صلے سے محرومی بیزاری اور پریشانی کو جنم دیتی ہے۔ اِس پریشانی کا راگ الاپنے کے ہم ایسے عادی ہوچکے ہیں کہ اب ذرا بھی پریشانی محسوس نہیں ہوتی! چائے کا ہوٹل ہو یا پھلوں کا ٹھیلا۔ درزی کی دکان ہو یا آئی ٹی کا دفتر۔ ٹی وی چینل ہو یا فٹ پاتھ کا پتھارا، ہر جگہ نصیب خان کی ایک ہی کہانی ہے۔ اِس قوم کے نصیب میں یہی لکھا ہے کہ حالات کی چکّی میں پستے ہوئے نصیب خان ڈھنگ سے سانس لینے کے قابل بھی نہ رہیں! ع

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

کچھ لوگ سادہ لوحی کی حد سے گزر جاتے ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا

معاشرہ جنگل میں تبدیل ہوچکا ہے۔ کبھی ہم نے سوچا ہے کہ جنگل میں کیا ہوتا ہے؟
جنگل میں سب کے معاملات طے ہیں اور حدود بھی۔ کوئی کسی کے حق پر ڈاکا ڈالنے کی جسارت نہیں کرتا۔ شیر درندہ ہے اِس لیے کبھی چرندہ نہیں بنتا۔ گوشت کھانے کو نہ ملے تو بھوک سے مَر جائے گا مگر گھاس نہیں چَرے گا۔ سب اپنے اپنے حساب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اِنسانی بستیوں کو جنگل سے تشبیہ دینا جنگل کی اُصولی زندگی کی صریح توہین ہے۔ جنگل میں سب کچھ فطرت کے قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ کسی جنگل میں کوئی بھی حیوان نصیب خان کی طرح معاشی اور معاشرتی نا انصافی کا شکار نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کسی کو گلے بھی لگایا جائے اور اچھوت بھی سمجھا جائے۔ جنگل میں اپنانا یا دُھتکارنا مکمل طور پر ہوتا ہے۔ جس حیوان کو ''دیس نکالا'' دے دیا جائے اُسے کوئی گلے تو کیا، منہ بھی نہیں لگاتا!

جنگل کے ماحول اور قانون کو اپنالیا جاتا تو ہمارے ہاں شاید کچھ بہتری آ ہی جاتی! خالصاً حیوانوں کی سطح پر جینے میں بھی کچھ تسکین کے پہلو ہیں۔ حیوانات میں برابری کا تصور عام ہے۔ پیٹ بھر جانے کے بعد کوئی نہیں کھاتا، کوئی نعمت کو ضائع نہیں کرتا، کوئی کسی کو بھوکا نہیں مارتا۔ کسی کو ذخیرہ اندوزی کی فکر لاحق نہیں ہوتی۔ پیٹ بھرے کی مستی حیوانیت کا مظہر نہیں بلکہ

خالص انسانی خصلت ہے۔

جنگل میں کوئی کسی کو اُس کے حق سے محروم نہیں رکھتا۔ کوئی کسی کو بلا ضرورت تنگ نہیں کرتا۔ جنگل کا کوئی بھی باسی درندگی کا مظاہرہ بھی کرتا ہے تو محض جبلّت کے زیرِ اثر۔ یہ عمل محض دِل پشوری کے لیے نہیں ہوتا۔ جنگل میں کوئی شوقیہ درندہ نہیں ہوتا۔ یہ ''ٹرینڈ'' اِنسانوں کا خاصہ ہے !

حیوانات یومیہ بنیاد پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ دس پندرہ.برس بعد کی پریشانی سے ہلکان نہیں ہوتے رہتے۔

یہ کیا ستم ہے کہ جو محنت کرے وہ ذِلّت بھی سہے؟

جو خدمت کا حق ادا کرتے ہوئے دوسروں کے لیے سہولتوں کا اہتمام کرے وہ خود سہولتوں کے لیے ترستا رہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟

یہ کیسا معاشرہ ہے؟ ہم کس دُنیا میں جی رہے ہیں؟ کیا ہمارا معاشرہ اِس دُنیا کا اور معلوم کائنات کا حصہ نہیں؟

یہ کیا غضب ہے کہ جن کے دم قدم سے معاشرہ متحرک رہے وہی ساکت اور جامد ہو کر

رہ جائیں؟ جو معاشرے کو تازہ دم رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرے وہی تازگی سے محروم رہے!

کس قدر ستم اور شرم کی بات ہے کہ جس کام میں جتنی زیادہ محنت ہے اُس کا صِلہ اُتنا ہی کم ہے! سڑک پر گڑھے کھودنے والا شدید گرمی میں ایک گلاس ٹھنڈا پانی مانگے تو لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ کوئی اگر کسی مزدور کو کام پر لگاتا ہے تو اُسے چائے پانی دیتے ہوئے دِل پر بوجھ محسوس کرتا ہے۔ ٹھنڈا پانی بھی دیتا ہے تو اِس انداز سے جیسے کوئی احسان کر رہا ہو۔ جو لوگ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی دیتے ہیں اُن کی جیب میں محنت کا پورا صِلہ نہیں ڈالا جاتا۔ اور اپنے دِل کو تھوڑی سی دیر کے لیے سُکون پہنچانے کی غرض سے بے ڈھنگے مشاغل پر لاکھوں لُٹا دیئے جاتے ہیں!

ہم جس نوع کے معاشرے میں جی رہے ہیں اُس میں قدم قدم پر نصیب خان موجود ہیں جو محنت کرتے ہیں مگر پورے اور جائز صِلے سے محروم رہتے ہیں۔ بڑی باتیں کرنے سے کوئی خود بڑا ہو پاتا ہے نہ اپنے ماحول کو بڑا کر پاتا ہے۔ معاشرہ اُسی وقت بہت کی طرف رواں ہوتا ہے جب محنت کرنے والوں کو صرف صِلہ نہیں دیا جاتا، توقیر سے بھی ہمکنار کیا جاتا ہے۔

جس نے یہ کائنات خلق کی ہے اُس نے سبھی کچھ اُصولوں کے تابع کیا ہے۔ بے اُصولی اُس کی اپنی فطرت میں ہے نہ وہ اپنی مخلوق میں یہ ''خصوصیت'' دیکھنا چاہتا ہے۔ کائنات کا خالق اِس بات کو کبھی برداشت کر ہی نہیں سکتا کہ کسی کو اُس کی محنت کے کماحقہ صِلے سے محروم رکھا جائے۔ یہ اُس کے ایک مُسلّمہ اُصول کی صریح خلاف ورزی ہے۔
بہتر زندگی ہماری منتظر ہے مگر صرف اِس حالت میں کہ ہم اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ فرائض کو بھی یاد رکھیں اور اُنہیں ادا کرنے پر پوری توجہ دیں۔ ایک قوم کی حیثیت سے بلند ہونے کی کئی صورتیں ہیں اور کسی کو اُس کی محنت کا پورا صِلہ دینے پر آمادہ رہنا بھی بلند ہونے کی ایک صورت ہے۔ اللہ وہ وقت ہم سے قریب کردے جب کوئی نصیب خان محنت کے صِلے سے محروم نہ رہے اور اپنے کام سے بیزاری محسوس نہ کرے۔ جب ہم اِس منزل تک پہنچیں گے تب ہی اگلی منازل کے لیے خود کو بہتر طور پر تیار کرپائیں گے۔

اچھا ہے، ہم دُور سے پہچانے جائیں!

”لگتا ہے آپ پاکستان سے آئے ہیں۔“

آٹو رکشا کے ڈرائیور نے یہ بات زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کچھ اِس انداز سے کہی کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

یہ واقعہ نومبر 1997 کا ہے جب میں پاکستان سے متصل بھارتی ریاست گجرات کے سب سے بڑے شہر احمد آباد گیا تھا۔ شہر میں کسی سے ملنے گیا تو رکشا سے اترنے پر ڈرائیور نے بتایا کہ 17 روپے ہوئے ہیں۔ میں نے 20 روپے دیے اور جانے لگا۔ تب ڈرائیور نے وہ بات کہی جو آپ پہلے جُملے میں پڑھ چکے ہیں۔

پاکستان کے ذکر پر چونکتے ہوئے میں نے پوچھا تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ ڈرائیور نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ کون سی مُشکل بات ہے صاحب؟ یہاں جب بھی کوئی رکشا سے اترتا ہے تو میٹر کی مدد سے ایک ایک پائی کا حساب لگا کر کرایا دیتا ہے۔ کوئی دس پیسے بھی نہیں چھوڑتا اور پاکستانی تو پانچ دس روپے تک چھوڑ دیتے ہیں!“

یہ بات سُن کر فوری طور پر تو عجیب سا احساس پیدا ہوا۔ دو تین ساعتوں کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ عجیب سا احساس دراصل تفاخر ہے۔ خِسّت (کنجوسی) سے عبارت، گھٹن زدہ بھارتی معاشرے میں پاکستانیوں کی فراخ دِلی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے کم نہیں ہوتی۔ ڈرائیور نے وضاحت کی کہ رکشا کا میٹر پیسے نہیں، پوائنٹس بتاتا ہے۔ ریٹ کارڈ میں پوائنٹس کے سامنے رقم لکھی ہوتی ہے۔ مسافر کسی بھی جنرل اسٹور سے کارڈ خرید کر اپنے پاس رکھ سکتا ہے تاکہ خود حساب لگا کر کرایا دے! اچھی بات یہ ہے کہ معاملہ حساب کتاب سے طے ہوتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ لوگ دس بیس پیسے بھی نہیں چھوڑتے! بات اُصولی طور پر تو درست ہے مگر انسانیت کے بھی کچھ تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ ہر معاملہ ہر بار اُصولی انداز ہی سے طے کیا جائے۔ ۔

اچھا ہے دِل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اِسے تنہا بھی چھوڑ دے!

جن معاشروں میں اُصولوں اور حساب کتاب کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اُن میں بہت کچھ درست انداز سے چل رہا ہوتا ہے مگر رویّوں میں اچھی خاصی سَفّاکی بھی در آتی ہے۔

بھارت میں آج بھی سائیکل رکشے چلتے ہیں۔ دِلّی جیسا بڑا اور بین الاقوامی انداز کا شہر بھی اِس سے نجات نہیں پا سکا۔ بھارت کے بیشتر چھوٹے بڑے شہروں میں سائیکل رکشے چلائے جا رہے ہیں۔ یہ رکشے، ظاہر ہے، انسان ہی چلاتے ہیں۔ اور چلانا کیا ہے، کھینچتے ہیں۔ سائیکل رکشے چلانے والوں کے گردے خاصی چھوٹی عمر میں جواب دے جاتے ہیں اور وزن کھینچتے رہنے سے جب پھیپھڑے کمزور ہو جاتے ہیں تو اُنہیں سانس کی بیماریاں بھی لاحق ہو جاتی ہیں۔ پاکستانی جب اِن سائیکل رکشوں میں بیٹھتے ہیں تو چڑھائی آنے پر اُتر جاتے ہیں اور چلانے والے کے ساتھ خود بھی سائیکل رکشے کو دَھکّا لگانے لگتے ہیں۔ کوئی بھی اس منظر کو دیکھ کر آسانی سے اندازہ لگا لیتا ہے کہ مُسافر پاکستان سے آئے ہیں! مقامی مُسافر چڑھائی آنے پر بھی رکشے سے نہیں اُترے، خواہ رکشے پر خاصا بوجھ بھی ہو اور چلانے والا ساٹھ سال سے زیادہ ہی کا کیوں نہ ہو!

بھارتی معاشرے میں پاکستانی دور سے اِس لیے بھی پہچان لیے جاتے ہیں کہ وہ خوب کھاتے ہیں، جی بھر کے خرچ کرتے ہیں، کسی ضرورت مند کو دینے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ کپڑوں کی نوعیت اور چال ڈھال ہی بتا دیتی ہے کہ بندہ پاکستان سے آیا ہے! اور ہاں، بھارت میں پاکستانیوں کی ایک اور آسان شناخت بھی ہے۔ بس میں سیٹ خالی ہو اور ساتھ والی سیٹ پر

!خاتون بیٹھی ہوں تو پاکستانی نہیں بیٹھتے

فراخ دِلی پاکستانیوں کی بُنیادی شناخت ہے۔ ہر طرح کے حالات میں زندہ دِلی کا مظاہرہ کرنا پاکستانیوں کا ایک نمایاں وصف ہے۔ ہزار خرابیوں اور علّتوں کو اپنانے کے باوجود پاکستانیوں کی اکثریت نے اب تک چند بُنیادی اوصاف ترک نہیں کئے۔ بیشتر پاکستانی اب تک غیر ضروری تو کیا، ضروری طور پر بھی خِسّت سے کام نہیں لیتے۔ ہر معاملے میں حساب کتاب کی عادت اِنسان کی نفسی اور حِسّی ساخت سے بہت کچھ کھینچ کر، نکال کر پھینک دیتی ہے۔ لین دین میں حساب کتاب لازم ہے مگر ایسی بند ذہنیت کے ساتھ نہیں کہ پورا روحانی اور اخلاقی ڈھانچا ہی داؤ پر لگ جائے۔ صد شُکر کہ ہم آج بھی، بہت سی خرابیوں کے باوجود، زندہ دِلی، فراخ دِلی، وسیع النظری، انسان دوستی اور بے جگری سے مُتّصف ہیں۔

اگر کسی کو اُس کی محنت کا تھوڑا سا زیادہ معاوضہ دے دیا جائے تو ایسا کرنے میں ہرج ہی کیا ہے؟ ضروری تو نہیں کہ پائی پائی کا حساب کرتے کرتے ''چمڑی جائے پر دَمڑی نہ جائے'' والی ذہنیت کا پودا ہم اپنے مزاج اور طینت میں اُگنے دیں۔ ہم عام طور پر بس میں سفر کے دوران ایک یا دو روپے چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ یہ عادت اب پُختہ ہوچکی ہے۔ اب اگر سوچیے تو بس کے کنڈکٹر کی تو

روزانہ چاندی ہو جاتی ہو گی۔ مگر دوسری طرف یہ بھی تو دیکھیے کہ اگر کسی کے پاس کرایا نہ ہو یا کم ہو تو ہمارے ہاں کنڈکٹرز زیادہ حیل حُجت نہیں کرتے، بٹھا لیتے ہیں! دو طرفہ فراخ دِلی مثبت نتائج پیدا کیا کرتی ہے۔

مرزا تنقید بیگ رشتہ داروں سے ملنے کئی بار بھارت جا چکے ہیں۔ اور ہر دورے میں ان کا تجربہ وہی رہا ہے جو آپ نے پڑھا۔ یہ بات مرزا کے حلق سے بھی نہیں اُترتی کہ ایسی اُصول پسندی کس کام کی جو انسان دوستی جیسے عظیم وصف ہی کا گلا گھونٹ دے؟ ہر معاملے کو حساب کتاب کی عینک سے دیکھنے کا کبھی کبھی بہت بھیانک نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے۔ انسان کو کسی بے کس اور لاچار عورت پر بھی ترس نہیں آتا۔ اِس کی سَند مرزا ہی کی زبانی سُنیے۔ ”پندرہ سولہ سال قبل میں بھارت گیا تو جس رشتہ دار کے ٹھہرا ہوا تھا اُس کے گھر سے تین مکان چھوڑ کر کوئی مکان بن رہا تھا۔ چند مزدور عورتیں وہیں ڈیرا ڈالے ہوئے تھیں۔ ہر مزدور عورت کو یومیہ پندرہ بیس روپے ملتے تھے۔ ایک دن صبح کے وقت دیکھا کہ ایک مزدور عورت گود میں بچہ لیے ہر دروازے پر جا رہی ہے اور کچھ مانگ رہی ہے۔ ساتھ میں اُس کی بوڑھی ماں بھی ہے۔ معلوم ہوا کہ پچھلی رات کو بچے کی ولادت ہوئی تھی اور مفلوک الحال زچہ گھر گھر جا کر مدد مانگ رہی ہے تاکہ کچھ اچھا پکا سکے۔ ساتھ ہی یہ دِل خراش حقیقت بھی سامنے آئی کہ سات آٹھ گھروں کے دروازے کھٹکھٹانے پر بھی بمشکل ڈھائی روپے جمع ہو پائے ہیں۔ جب وہ

عورت بچے اور بوڑھی ماں کے ساتھ ہمارے دروازے تک آئی تو میں نے اُسے سو روپے دیے تاکہ وہ کچھ اچھا پکالے۔ پندرہ سولہ سال پہلے بھی یہ کوئی بہت بڑی رقم نہیں تھی۔ اور کسی پاکستانی کے لیے تو یقیناً نہیں تھی! یہ منظر دیکھ کر میرے رشتہ دار نے کہا کہ تم پاکستانی نواب بن جاتے ہو اور پیسے لُٹا کر لوگوں کی عادت خراب کرتے ہو۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ اللہ کے بندے! اگر رب العُلیٰ نے کچھ دیا ہے تو غریبوں کی مدد کرنی چاہیے تاکہ اُن کا بھی تھوڑا سا وقت اچھا گزر جائے۔''

ہزار خرابیوں کے باوجود اللہ نے اب تک ہم میں چند خوبیاں رہنے دی ہیں۔ فراخ دِلی ہمارا ایک بنیادی اثاثہ ہے۔ اچھا ہے کہ ہمارے دِلوں کی یہ وُسعت برقرار رہے اور غیر ہمیں دُور سے پہچان لیا کریں!

☆☆☆

جھوٹ پکڑنے کی مشین

حکام کا تو کام ہی مکھی پر مکھی بٹھانا ہے۔ نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ وہ لکیر کے فقیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسلام آباد کے ریڈ زون کے نزدیک روڈ شو کے ہیرو سکندر کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

ایکٹ برپا ہوا۔ اور پھر برپا ہی رہا۔ کئی گھنٹے گزر گئے مگر حکام احکام کے منتظر رہے۔ پھر جب حکم ملا تو دو تین گولیاں داغ کر پردہ گرا کر ڈرامے کا ڈراپ سین کیا گیا۔

ہسپتال میں سکندر کو پولی گرافک ٹیسٹ کامیاب رہا۔ یعنی پانچ چھ گھنٹے تک قوم کو حیران و پریشان رکھنے والے سکندر کا جھوٹ پکڑا گیا۔ جھوٹ پکڑنے والی مشین نے کام کر دکھایا۔

ہم حیران ہیں کہ جھوٹ پکڑنے والی مشین کے استعمال کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور کیا اِس پورے معاملے میں کوئی جھوٹ تھا جسے پکڑنے کے لیے مشین استعمال کی جاتی؟ کیا قوم نے نہیں دیکھا کہ سکندر کے ڈرامے میں اُس کی بیوی بھی خاصے نمایاں کردار میں موجود تھی؟ اور جب بیوی ساتھ تھی تو پھر جھوٹ پکڑنے

والی مشین کو بروئے کار لانے کی کیا ضرورت تھی؟

حکام نے بتایا ہے کہ جو کچھ سکندر کی بیوی نے کہا وہ جھوٹ پکڑنے والی مشین پر درست ثابت ہوا جبکہ سکندر کے بیانات کو مشین نے جھوٹ پر مبنی قرار دیا۔

مرزا تنقید بیگ جھوٹ پکڑنے والی مشین ایجاد کرنے کے خلاف رہے ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ جب قدرت نے شادی کا ادارہ اور بیوی کی شکل میں اُس ادارے کیلئے سربراہ کا اہتمام کر ہی دیا ہے تو پھر جھوٹ پکڑنے کی مشین تیار کرنے کے تکلف کی ضرورت کیا ہے! مرزا کا کہنا ہے کہ جب تک دُنیا میں ایک بھی بیوی زندہ ہے، جھوٹ پکڑنے والی مشین ایجاد یا تیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور جو ایسا کرتا ہے وہ گناہِ بے لذت کا مرتکب ہوتا ہے!

ایک زمانے سے مرزا جھوٹ بولتے آئے ہیں اور جھوٹ پکڑے جانے پر تذلیل سے دوچار ہونا بھی اُن کا خاصہ رہا ہے۔ مرزا ہی نہیں، بھابی بھی مستقل مزاجی کا شاہکار ہیں۔ مرزا نے جھوٹ بولنا ترک نہیں کیا اور بھابی شوہر کے جھوٹ پکڑ کر اُس کی ''عزت افزائی'' سے باز نہیں آئیں!

ایک زمانہ تھا جب ہم بھی اِس بات پر نازاں تھے کہ کوئی ہمارا جھوٹ پکڑ نہیں سکتا۔ پھر یہ ہوا کہ ہم بھی مرزا کی صف میں جا کھڑے ہوئے یعنی گھر بسا کر اپنے ہر جھوٹ کی دنیا کو بے آباد کر دیا! اپنا جھوٹ پکڑے نہ جانے کا وہ سَودا، وہ افتخار اب کہاں؟ اب تو حالت یہ ہے کہ ع

بات پر واں زبان کٹتی ہے

اور اگر پروین شاکر کا انداز اختیار کرکے کہیے تو جھوٹ کا ذکر، اب تو عالم یہ ہے کہ ع

میں ''سچ'' کہوں گا مگر پھر بھی ہار جاؤں گا!

پکڑ کے جھوٹ وہ پھر لاجواب کر دے گی!

جب بھی ہم نے بیویوں میں پائی جانے والی جھوٹ پکڑنے کی صلاحیت کو خراج تحسین پیش کیا ہے، مرزا نے خاصے سَفّاک انداز سے ہماری عقل کو ''خراج عقیدت'' پیش کیا ہے! مرزا کا استدلال ہے کہ جس طرح بُلبُل اچھا گا کر کوئی تیر نہیں مارتی اور چیتا سب سے تیز دوڑ کر کوئی کمال نہیں کرتا بالکل اُسی طرح بیویاں جھوٹ پکڑ کر کوئی کارنامہ انجام نہیں دیتیں۔ جس طرح جھوٹ بولنا شوہروں کے مزاج کا حصہ ہے، اُن کی فطرت میں گُندھا ہوا ہے بالکل اُسی طرح غیبت کرنے کے ساتھ ساتھ شوہروں کا جھوٹ پکڑنا بھی بیویوں کی فطرت میں لکھا

ہے، اُن کے ذہن کے ڈیفالٹ میں ہے! اِس معاملے میں کمال اگر ہے تو اِتنا کہ کبھی کبھی شوہر کی سَچّی بات میں سے بھی وہ تھوڑا بہت جھوٹ برآمد کرلیتی ہیں!"

ہم نے مرزا سے پوچھا آخر کیا سبب ہے کہ شوہر کا جھوٹ بیوی کی گرفت میں آ ہی جاتا ہے۔ اب سکندر ہی کی مثال لیجیے جس کا جھوٹ مشین نے بھی پکڑا اور بیوی نے بھی۔ بیوی نے یوں کہ جھوٹ پکڑنے والی مشین پر اُس کی باتیں سَچ نکلیں اور شوہر مزید جھوٹا ثابت ہوگیا۔ مرزا نے ہماری تشفی کے لیے ایک گراں قدر آئیڈیا عنایت کیا۔ کہنے لگے۔ "جھوٹ بولنا شوہروں کی عادت ہی نہیں، مشغلہ بھی ہے۔ وہ جھوٹ بول کر گھر کے ماحول کو تر وتازہ رکھتے ہیں۔"

ہم حیران ہوئے اور اعتراض داغا کہ جھوٹ بول کر گھر کے ماحول کو تر وتازہ کیسے رکھا جاسکتا ہے؟ ہم نے تو اکثر یہ دیکھا ہے کہ جھوٹ کے گُل کِھلانے سے گھریلو زندگی کے پُھول مُرجھا جاتے ہیں! مرزا کو ہمارے استدلال پر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی، جیسے وہ اِس کے لیے تیار ہوں۔ کمالِ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "یہ بہت آگے کی منزلیں ہیں۔ تمہیں ہم بتا تو دیں مگر سمجھ نہیں پاؤگے۔ گھریلو زندگی کو ہنسی اور خوشی سے آباد رکھنے میں جھوٹ بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ شوہر اگر جھوٹ نہ بولیں تو گھر کا نظام درہم برہم ہو

جائے، جیسے جھوٹ نہ بولنے پر وزیر داخلہ کو اپنی نوکری خطرے میں پڑتی دِکھائی دیتی ہے! ذرا سوچو۔ اگر میڈیا پر سَچ ہی سَچ ہو تو کیا ہو؟ ہر طرف ہاہاکار مچ جائے۔ یہ جھوٹ ہی تو ہے جس کے دم سے میڈیا کا میلہ بارونق ہے! سَچ بولنے کا چلن عام ہو تو کئی پروگرام راتوں رات بند ہو جائیں۔ خیر، تم کیا جانو جھوٹ کتنے مزے کا سَودا ہے!''

ہم نے وضاحت چاہی کہ جھوٹ سے گھریلو زندگی کی آب و تاب کیسے برقرار رہتی ہے۔ مرزا نے اپنا نُدتلل بیان جاری رکھا۔ ''بات یہ ہے میاں کہ جھوٹ بول کر شوہر کے دِل کی کلی کِھل جاتی ہے کہ ایک بار پھر بیوی کو بے وقوف بنانے کی اپنی سی کوشش تو کی۔ اور دوسری طرف بیوی بھی اپنی کامیابی پر خوش ہو رہتی ہے کہ شوہر کا ایک اور جھوٹ پکڑلیا! اِس پورے کھیل میں ایک شاندار نکتہ لوگ نظرانداز کردیتے ہیں۔''

ہم نے استفسار کیا کہ وہ نکتہ کیا ہے۔ مرزا نے گھریلو زندگی کو پُربہار رکھنے کا نُسخہ بیان کیا۔ ''بات یہ ہے کہ بہت سے عقل مند شوہر جان بوجھ کر جھوٹ پر جھوٹ بولتے جاتے ہیں۔ بیویاں جھوٹ پر جھوٹ پکڑ کر خوش ہو رہتی ہیں۔ اور اِسی خوشی میں مست رہنا چاہتی ہیں۔''

ہم نے کہا اِس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بیویاں جھوٹ پکڑنے میں ہُنر مند ہوتی ہیں۔
مرزا نے تُرپ کا پتّا پھینکا۔ ''یہی بات تو سمجھنے کی ہے میاں ! بیویاں یہ سمجھتی ہیں کہ شوہروں کا جھوٹ پکڑ کر اُنھوں نے کوئی بہت بڑا تیر مارا ہے۔ دوسری طرف شوہر چاہتے ہیں کہ بیویاں ایسے تیر مارتی رہیں۔ یعنی وہ جان بوجھ کر ایسا جھوٹ بولتے ہیں جو ذرا سی کوشش سے پکڑ لیا جائے ! بس، یہ ہے کہ بیویوں کی خوشی کا راز ! اِسی اُصول پر عمل کرتے ہوئے بہت سے شوہر بازار سے سَودا لاتے وقت ایک آدھ گلی سڑی چیز بھی جان بوجھ کر اُٹھا لاتے ہیں تاکہ بیوی کو تنقید کرنے کا موقع ملے کہ 'آپ کو ڈھنگ سے سبزی ترکاری بھی خریدنا بھی نہیں آتے۔ اللہ جانے زندگی کہاں گزاری ہے؟' اِتنا کہنے سے اگر کسی کے دِل کو خوشی ملتی ہو تو موقع فراہم کرنے میں ہرج کیا ہے ! ''
مرزا کا بتایا ہوا نُسخہ ہم نے گھر میں آزمایا ہے اور اِسے تیر بہ ہدف پایا ہے۔ اب ہم سوچ سمجھ کر کمزور جھوٹ بولتے ہیں۔ بیگم ہمارا جھوٹ پکڑ کر اُسی طرح خوش ہوتی ہیں جس طرح میڈیا والے وزیر داخلہ کی طرف سے دانستہ طور پر بولا گیا کمزور جھوٹ پکڑ کر خوشی سے پُھولے نہیں سماتے اور پروگرام پر پروگرام کرتے جاتے ہیں !

جادو گر کیا بیچتے ہیں !

کم لوگ ہیں جو پاکستان کی سیاست کو سمجھ پانے کا دعوی کر سکتے ہیں۔ یہ دعوی کم از کم بی بی سی کو تو ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ آصف علی زرداری کی میعادِ صدارت کے پانچ برس مکمل ہونے پر اپنے تبصرے میں برطانوی نشریاتی ادارے نے کہا کہ وہ معروف ہنگری نژاد امریکی جادوگر ہیری ہوڈینی سے مماثلت رکھتے ہیں جس کے لیے کوئی بھی صورتِ حال پریشان کن ثابت نہیں ہوتی تھی۔ تبصرے میں مزید کہا گیا کہ آصف زرداری نے پانچ سال قبل صدر کے منصب کو جس حال میں پایا تھا اُس سے بہت مختلف کیفیت میں چھوڑ کر گئے ہیں۔ اِن پانچ برسوں میں کئی مسائل کا سامنا رہا مگر وہ اپنی دانش مندی اور سیاسی بصیرت کی بدولت ہر مسئلے کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔

ہم حیران ہیں کہ جو کچھ پاکستانی سیاست میں دس بارہ سال سے ہو رہا ہے اُسے دیکھتے ہوئے اب کیا کسی جادوگر یا اسٹنٹ مین کو خراج تحسین یا خراج عقیدت پیش کرنے کی کوئی گنجائش رہ گئی ہے !

ہیری ہوڈینی 24 مارچ 1874 کو بڈاپسٹ (ہنگری) میں پیدا ہوا۔ اُس کا ابتدائی

یا خاندانی نام ایرک وائز تھا۔ بہت چھوٹی عمر میں اُس نے والدین کے ساتھ امریکا کا رخ کیا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اُس نے اپنے اسٹنٹس سے عالمگیر شہرت پائی۔ وہ کئی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے خود کو آزاد کرانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ کئی بار اُسے باندھ کر پانی میں پھینکا گیا یا دفن کر دیا گیا مگر وہ زندہ نکل آیا۔ وہ کسی انتہائی تنگ ڈبے میں بند کیے جانے پر بھی تنفس برقرار رکھنے میں کمال رکھتا تھا۔ ہوڈینی نے کئی فلموں میں کام کیا مگر کامیابی اُسے شعبدے بازی کی دُنیا ہی میں ملی۔ ہوڈینی جس قدر عجیب تھا، اُس کی موت اُس سے بھی زیادہ عجیب ثابت ہوئی۔ ایک شو کے دوران ایک طالب علم نے اُس سے کہا کہ کیا وہ پیٹ پر لات برداشت کر سکتا ہے۔ ہوڈینی نے ہاں کہہ دی۔ طالب علم نے اُس کے پیٹ پر چار لاتیں رسید کیں۔ درد تو بہت ہوا مگر ہوڈینی جھیل گیا۔ اگلے ہی دن اُس کی حالت بگڑ گئی۔ معالجین نے اپینڈکس کے آپریشن کا مشورہ دیا مگر اُس نے شو جاری رکھنے کو ترجیح دی۔ اِس کا نتیجہ اُس کی موت کی شکل میں برآمد ہوا۔

1971 کی فلم ''سخی لٹیرا'' میں رونا لیلیٰ نے ایک گیت گایا تھا جس کے بول تھے۔

کوئی جادوگر آیا، میرے دل میں سمایا
ایسی بین بجائی مجھے اپنا بنایا

بس کچھ ایسی ہی کیفیت پرویز مشرف کی آورد پر پیدا ہوئی اور اُن کے بعد آصف زرداری نے اپنی آورد کو آمد میں تبدیل کرکے بھی یہی سماں پیدا کیا۔ اُنہوں نے مفاہمت کی بین ایسی بجائی کہ سبھی دیوانے ہوکر اُن کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

شعبدہ باز کیا کرتے ہیں؟ موجود چیز کو غائب کرتے ہیں اور جو کچھ ہے ہی نہیں اُسے ہماری آنکھوں کے سامنے اِس طرح پیش کرتے ہیں جیسے اُن کا کوئی وجود ہو۔ اب ذرا سوچیے کہ ہمارے سیاسی رہبران کیا کرتے رہے ہیں۔ کیا یہ شعبدہ اُنہوں نے قدم قدم پر نہیں دکھایا؟

ایک زمانے سے ہم اُن پُلوں پر سے گاڑیاں گزارتے آئے ہیں جو صرف کاغذی کارروائی میں پائے جاتے ہیں! ہم ایسے فٹ پاتھوں پر چلتے ہیں جو ع

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

کی زندہ مثال ہیں! ہمارے بچے اُن سرکاری اسکولوں میں پڑھتے ہیں جن کی عمارتیں صرف دستاویزات میں پائی جاتی ہیں۔ یہ تو ہوئی ہوکر نہ ہونے کی بات۔ اب آیئے اُس کی طرف جو ہے مگر نہیں ہے۔ سرکاری فنڈز منظور ہوتے ہی افسران اور اہلکاروں کی جیب میں جاتے ہیں۔ ماہانہ پندرہ بیس ہزار روپے کمانے والا سرکاری ملازم بھی 75 لاکھ کے مکان میں رہتا ہے اور کوئی پوچھے تو معلوم

ہوتا ہے کہ اُس ''بے چارے'' کے نام پر تو کچھ بھی نہیں! جب ملازمین کا یہ حال ہے تو سوچیے کہ افسران کا کیا عالم ہوگا! آج اگر مغل شہنشاہ دوبارہ زندہ کئے جائیں تو سرکاری افسران کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر شرمندہ ہوں اور شہنشاہیت پر لعنت بھیج کر کسٹمز یا ایسے کسی سرکاری ادارے میں جونیئر کلرک بھرتی ہونے کو ترجیح دیں!

ہم نے ایسے شعبدہ بازوں کے بارے میں سُنا ہے جو بھرے مجمع کے سامنے کسی بھی عمارت کو غائب کردیا کرتے ہیں۔ ایک بار کسی شعبدے باز نے پیرس کے ایفل ٹاور کو غائب کردیا تھا۔ آگرہ کے تاج محل کے بارے میں یہی سُنا ہے۔ مگر صاحب، یہ صرف شعبدہ ہی تھا۔ ایفل ٹاور غائب تو نہیں ہوا نا۔ آج بھی وہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور تاج محل بھی کہاں گیا؟ جہاں تھا وہیں ہے۔ ناقدری سی ناقدری ہے کہ ہم نے کبھی اپنے سیاسی اور سرکاری شعبدہ بازوں کو داد ہی نہیں دی کہ اُنہوں نے آدھا ملک غائب کردیا! اور جناب! یہ کوئی شعبدہ نہیں تھا۔ آدھا ملک صرف غائب نہیں ہوا، ہاتھ سے نکل گیا! اور اِس سے بڑا شعبدہ، بلکہ کمال یہ ہے کہ اِس سانحے پر کسی کو کچھ خاص افسوس بھی نہیں ہوا۔ پروفیسر عنایت علی خان نے خوب کہا ہے ؎

حادثے سے بڑا سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر!

ویسے تو خیر اہلِ سیاست کے کمال کو چُھونا ہما شُما کے بس کی بات نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ پوری پاکستانی قوم بھی بعض معاملات میں شعبدہ بازوں سے کم نہیں۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ ہم 66 برس سے آنکھوں دیکھی مکھیاں نگل رہے ہیں، ایک ہی مزاج اور نیت رکھنے والے سیاسی شعبدہ بازوں کو جھیلتے آ رہے ہیں۔ اِس اجتماعی شعبدے پر تو سیاسی بازی گروں کو بھی ہمارے آگے شرمندہ ہونا چاہیے!

بات چلی تھی سابق صدر آصف زرداری اور ہیری ہوڈینی کے موازنے سے اور پہنچ گئی عوام کے شعبدوں تک۔ عوام کے شعبدوں کو تو گنتے گنتے آپ تھک جائیں گے۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ پاکستان میں اعلیٰ معیار کا سیب چالیس پچاس روپے فی کلو کے نرخ سے فروخت ہو رہا ہے اور بُھنے ہوئے چنے 300 روپے فی کلو کے نرخ پر دستیاب ہیں! آم جیسی نعمت کو ٹماٹر مُنہ دینے پر تُلا ہوا ہے! صاف سُتھرے ایرانی آلوچے ساٹھ ستّر روپے فی کلو کے نرخ پر مل رہے ہیں اور دوسری طرف کڑوا کریلا بُلند نرخوں کے نیم پر چڑھا ہوا ہے۔ گھر آنگن میں ذرا سی محنت سے اُگ آنے والا کریلا ساٹھ ستّر روپے فی کلو کے نرخ کی بیل پر چڑھ گیا ہے!

بہر کیف، ہمارے اہلِ سیاست کہاں اور معمولی شعبدہ باز کہاں؟ سامری جادوگر کو بھی اگر اُس کی قبر سے نکال کر کچھ دیر کو زندگی دی جائے تو ہمارے اہلِ سیاست کے کمالات دیکھ کر آپ بھی شرمسار ہو اور ہمیں بھی شرمسار کرے کہ ہم نے خواہ مخواہ اُسے مہان جادوگر سمجھ رکھا ہے! سامری جادوگر جیسے شعبدہ باز کیا بیچتے تھے جو کسی بات پر فخر کرتے۔ کوئی دیکھے کہ ہمارے سیاسی شعبدہ بازوں نے باہم شیر و شکر ہوکر اِس بازار کی رونقوں میں کس قدر اضافہ کیا ہے۔ تاج محل اور ایفل ٹاور جیسی عمارتوں کو چند لمحات کے لیے غائب کرنے والے ذرا کرپشن کے مقدمات تو ڈھونڈ کر دِکھائیں! بجٹ میں منظور ہونے والے فنڈز دیکھتے ہی دیکھتے ایسے غائب ہوتے ہیں کہ سو چراغ لیکر ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتے!

لوگ منتخب ہوکر آتے ہیں، سب کچھ ڈکار کر چل دیتے ہیں اور ہم دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ ع

آئے بھی وہ گئے بھی وہ، ختم فسانہ ہوگیا!

مفاہمت کی سیاست نے ہمارے ہاں ایسے کمالات کو جنم دیا ہے کہ تاریخ کے ہر دور کے نامور ترین جادوگر بھی کسی طور دیکھ پائیں تو انگشت بہ دنداں رہ جائیں، بلکہ اُنگلی کیا پورا پنجہ ہی حیرت کے عالم میں چبا ڈالیں! آگ اور پانی کو ایک پلیٹ فارم پر لانے والے، ایک دوسرے کے لیے کُتّے بلی والا بیر

رکھنے والوں کو بھی مذاکرات اور مصالحت کی میز پر لانے والے فارمولے سے بڑھ کر
کوئی شعبدہ ہے تو دُنیا ذرا اُس کا چہرہ تو کرائے!

ہوڈینی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھولنے کے ہُنر میں طاق تھا۔ اللہ بُری نظر سے بچائے،
ہمارے سیاسی شعبدہ گروں نے تو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہی غائب کر دی ہیں! ہوڈینی کی
رُوح جواب دے کہ اُسے کِس کمال پر کیوں ناز تھا!

گونگی بدمعاشی

جس بازار میں قدم قدم پر صرف طاقت کا سِکّہ چلتا ہو وہاں کمزوری وہ کرنسی ہے جسے کوئی تول کے حساب سے بھی قبول نہیں کرتا۔

جو طاقت کی زبان سمجھتے ہیں اُن سے طاقت ہی کی زبان میں بات کرنی پڑتی ہے۔ اُن سے کسی اور زبان میں بات کرنا اپنی بات کھونے کے مترادف ہوتا ہے۔ جیسے بند ہو مُٹھی تو لاکھ کی، کُھل گئی تو پھر خاک کی!

پندرہ بیس منٹ تک بیوی گرجتی برستی رہی۔ اِس گرج چمک اور گھن گرج کو بے چارا شوہر سہم کر، دَم بخود اور مُہر بہ لب دیکھتا اور سُنتا رہا۔ بیوی جب بجلی کی طرح کڑکتے کڑکتے تھک گئی تو بولی۔ ''فی الحال تو میں یہ لڑائی (!) ختم کر رہی ہوں مگر اِتنا ضرور بتائے دیتی ہوں کہ تمہاری یہ 'گونگی بدمعاشی' اِس گھر کو جہنم بنا رہی ہے۔''

زبردست کا ٹھینگا سَر پر۔ گھر کا محاذ ہو یا بین الاقوامی سیاسی مناقشوں کا میدان، ہر جگہ گونگی بدمعاشی ماحول کو جہنم ہی بنا رہی ہے۔ ع

ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

1951 میں ریلیز ہونے والی بھارتی فلم ''بہار'' میں شمشاد بیگم کا گایا ہوا ایک گانا وجینتی مالا پر فلمایا گیا تھا۔ اِس گانے میں دُنیا سے نپٹنے کا ہُنر سِکھایا گیا تھا۔ گانے کے بول تھے۔

دُنیا کے مزے لے لو، دُنیا تمہاری ہے!

اور پھر یہ بھی بتایا گیا تھا کہ دُنیا کے مزے کس طرح لینے ہیں۔

دُنیا کو لات مارو، دُنیا سلام کرے

کبھی نمستے جی تو کبھی رام رام کرے

ہلکے پُھلکے، چہکتے ہوئے گیت کا مرکزی خیال یہ تھا کہ جینا ہے تو سَر اُٹھاکے، اکڑ دِکھاکے جیو۔ اگر مُنہ میں گھُنگھنیاں ڈالے، سب کچھ محض تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے اور جھیلتے رہے تو دُنیا سَر پر چڑھ کر ناچے گی۔ قصہ مختصر یہ کہ گونگی بدمعاشی زندگی کو صرف جہنم ہی بناکر دَم لے گی!

بات گھر کے محاذ سے شروع ہوئی اور عالمی سیاست کے اکھاڑے تک جا پہنچی۔ کیوں نہ پہنچتی؟ حقیقت ہر جگہ ایک ہی رہتی ہے۔ جو دَبے گا اُسے دَبایا جائے گا۔ جو پلٹ کر وار کرے گا یا مُنہ توڑ جواب دے گا اُس کی بات مانی جائے گی۔ امریکا جیسا بدمست ہاتھی بھی پلٹ کر وار کرنے والوں کے سامنے جُھکنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اِتنا یاد رہے کہ وار کرنے کی اداکاری کرنے اور وار کرنے

میں بہت واضح فرق ہے جو امریکا سمیت کسی بھی بدمعاش کو منہ دیتے وقت ذہن نشین رہنا چاہیے!

ایک زمانے سے اسلامی ممالک نے گونگی بدمعاشی کو اپنے بُنیادی اور امتیازی وصف کی حیثیت سے حرزِ جاں بنا رکھا ہے۔ اِس کا نتیجہ؟ عضوِ معطل ہو کر رہ جانے کے سِوا کیا نتیجہ برآمد ہوسکتا تھا!

ہم نے تو یہی سُنا اور دیکھا ہے کہ دولت آتی ہے تو اِنسان میں گھمنڈ اور عیاشی کے ساتھ ساتھ خود کو تھوڑا سا بدلنے کی لگن بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہی زمانے کا اُصول ہے۔ اسلامی دُنیا کے معاملے میں اِس اُصول نے استثنائی انداز اختیار کیا ہے۔ عرب دُنیا میں پیٹرو ڈالر آیا تو راتوں رات زندگی کچھ سے کچھ ہو گئی۔ مگر کچھ سے کچھ ہو جانے کا معاملہ محض عیاشیوں تک محدود رہا ہے۔ کسی نے خود کو نہیں بدلا بلکہ دولت کی فراوانی شب و روز تبدیل کرتی (یعنی بگاڑتی) گئی ہے! عرب کے شُیوخ کی دریا دِلی آج بھی ساری دُنیا میں معروف، بلکہ بدنام ہے۔ جو کچھ مستقبل کی تیاری اور اُمت کی بہبود پر صرف ہونا چاہیے تھا وہ ذاتی تعیشات پر خرچ یا برباد ہو رہا ہے۔ تازہ ترین مثال یہ ہے کہ ایک سعودی باشندے نے پسند آ جانے پر ایک بکرا ایک کروڑ 30 لاکھ ریال یعنی 36 کروڑ 40 لاکھ روپے میں خریدا ہے!

تصور یا فرض کرلیا گیا ہے کہ دولت یعنی پیٹرو ڈالر کی گنگا بہتی رہے گی۔ ایسا کبھی ہوا ہے جو اب ہوگا؟ دیکھا تو نہیں مگر سُنا ہے کہ سب سے بڑا خزانہ قارون کا تھا۔ بڑے بُوڑھے کہتے ہیں کہ بیٹھے بیٹھے کھاتے رہیے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جائے! بات سیدھی سی ہے، بچوں کی بھی سمجھ میں آسکتی ہے۔ مگر بڑوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید اِس لیے کہ بڑے ذہنوں میں چھوٹی باتیں آسانی سے فِٹ نہیں ہو پاتیں، خلاء زیادہ ہونے کے باعث اِدھر سے اُدھر لڑھکتی رہتی ہیں!

زمانہ جب کوئی چال چلتا ہے تو اُس کے جواب میں ویسی ہی یا ہلتی جُلتی قوت کی چال چلنی پڑتی ہے۔ گونگی بدمعاشی کا آپشن ترک کرکے، بولتی شرافت اپنانی پڑتی ہے۔ بات سیدھی سی ہے، بدلتے زمانے کے ساتھ خود کو تبدیل کئے بغیر زندگی میں معنویت پیدا کرنا ممکن نہیں۔

ایک زمانے سے ہم پاکستانیوں نے بھی گونگی بدمعاشی کے آپشن کو گلے لگا رکھا ہے، بدلتے حالات کے مطابق خود کو بدلنے کی بجائے کچھ نہ کرنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ اِس روش کا جو منطقی نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا، ہوا ہے۔ اب ہر چیز ہمارے سَروں پر چڑھ کر ناچ رہی ہے۔ مہنگائی، بے روزگاری، افلاس، بے امنی،

ٹارگٹ کلنگ، دہشت گردی، بھتہ خوری، کرپشن، اقربا پروری، بے عملی، ہڈ حرامی اور دوسری بہت سی عِلّتوں کا سامنا ہم نے گونگی بدمعاشی سے کیا ہے۔ ع

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خُدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

کچھ نہ کرنا ہمارا بُنیادی شیوہ بن چکا ہے اور یہ سوچ کر دِلوں کو بہلایا جارہا ہے کہ سب کچھ خود بخود ٹھیک ہوجائے گا۔ ٹھیک تو خیر ہوتا ہی گیا ہے مگر ہمارے لیے نہیں، ہمارے سَروں پر چڑھ کر ناچنے والوں کے لیے! ہر مدِ مقابل نے ہماری گونگی بدمعاشی کے مقابل ''بولتی شرافت'' کو بروئے کار لاکر کامیابی کے جھنڈے ہمارے سینوں میں گاڑے ہیں!

امریکا اور دیگر بڑی طاقتوں کا بھی ہم نے گونگی بدمعاشی ہی کے ''ہتھیار'' سے سامنا کیا ہے۔ اور اِس کا جو منطقی نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے، بخوبی برآمد ہوا ہے۔ وہ گرجتے برستے رہے ہیں اور ہم راضی بہ رضا رہتے ہوئے ریسیونگ اینڈ پر رہے ہیں!

عشروں تک گونگی بدمعاشی کا قہر اور عذاب سہنے کے بعد اب اِتنی دانائی تو ہم میں پیدا ہو ہی جانی چاہیے کہ کب خاموشی کا آپشن ترک کرکے بولنے کی ابتدا

کی جائے۔ قُدرت نے ہمیں کان سُننے کے لیے دیئے ہیں۔ باہر کی آوازیں سُننے میں کچھ ہرج نہیں مگر اچھا ہے کہ کبھی کبھی ہم دِل کی آواز بھی سُن لیا کریں۔ حلق صرف کھانے پینے کی اشیاء اور آنکھوں دیکھی مکھیاں نگلنے کے لیے نہیں ہوتا، کبھی کبھی اِس کی گہرائی سے کوئی صدائے حق و احتجاج بھی اُبھرنی چاہیے! محض برداشت کرتے رہنے سے کوئی تبدیلی رُونما نہیں ہوا کرتی۔ عمل کی دُنیا بہت کچھ مانگتی ہے۔ پہلی قُربانی یہ ہے کہ کوئی بھی لگا بندھا طریق نہ اپنایا جائے بلکہ خود کو ہر آن بدلا جائے۔ ایسا نہ کیا جائے تو حریف مَرضی کا بدلہ لیا کرتے ہیں! زندگی ہم سے قدم قدم پر گونگی بدمعاشی ترک کرکے بولتی شرافت اپنانے کا تقاضا کرتی ہے۔ اِس تقاضے کو نباہنے پر خود کو آمادہ کرنا ہی زندگی کا جوہر ہے۔ تحمل یقیناً قابلِ ستائش وصف ہے مگر حدود کا خیال رکھنا لازم ہے۔ کم لوگ ہی تحمل کے مُتحمل ہو پاتے ہیں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ برداشت کرتے رہنے کا وصف کِس مقام پر گونگی بدمعاشی میں تبدیل ہوتا ہے! بس، اِس مقام پر ہی آپ کی شرافت کو بولنے کا آغاز کرنا ہے۔

آپشن ٹمیل

عندلیبؔ شادانی مرحوم نے کہا تھا ۔

کہتے ہیں تاریخ ہمیشہ اپنے کو دُہراتی ہے

اچھا، میرا خوابِ جوانی تھوڑا سا دُہرائے تو!

باقی دُنیا کی تو اُس کے رہنے والے جانیں، البتہ کراچی میں ہم نے اِس بات کو کئی بار درست ثابت ہوتے دیکھا ہے۔ کراچی کا ''خوابِ جوانی'' کیا ہے؟ شر پسندوں اور جرائم پیشہ افراد کے خلاف آپریشن۔ اور اِس خواب کو تاریخ پوری دیانت کے ساتھ وقفے وقفے سے دُہراتی رہتی ہے۔ شاید اِس خیال سے کہ کہیں ذہنوں سے مِٹ نہ جائے۔ یہ رکاوٹوں والی دوڑ ہے۔ اہلِ کراچی تھوڑا سا چلتے ہیں کہ آپریشن کی ''ہرڈل'' سامنے آجاتی ہے۔ ۔

ہے انتہائے یاس بھی اِک ابتدائے شوق

پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم!

انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ تمام راستے روم کو جاتے ہیں۔ کراچی میں برپا کئے جانے والے آپریشن اور روم میں خاصی مماثلت ہے۔ اہلِ کراچی خواہ کسی راہ پر گامزن ہوں، آپریشن تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے۔ بقول شیونؔ رضوی

ع

لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے

!یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

کراچی کو ویسے تو اور بھی بہت کچھ درکار ہے مگر شدید ترین ضرورت امن کی ہے۔ کسی بھی معمورے کو امن سے ہمکنار رکھنا قانون نافذ کرنے والوں کا منصبی فرض ہے۔ جب وہ اپنے حصے کا کام نہیں کرتے تو لوگوں کو اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ ''از خود نوٹس'' کے تحت کراچی کے اصلی اور نام نہاد ہر دو طرح کے اسٹیک ہولڈرز ایک دوسرے کو ''پرامن'' رکھنے پر تُلے رہتے ہیں۔ ایسی حالات میں شہر امن سے ہمکنار کم اور دوچار زیادہ دکھائی دیتا ہے! ایک دوسرے کو ''پرامن'' رکھنے کی خواہش اور !کوشش نے آبادیوں کو قبرستان بنایا ہے اور قبرستان مزید ''آباد'' کئے ہیں

جو کام مرہم پٹّی سے ہوسکتا ہے اُس کے لیے آپریشن کے اہتمام کی روایت کچھ ہی پر ختم ہے۔ معمولی سی خراش کو فری ہینڈ دیا جاتا ہے کہ زخم میں تبدیل ہو اور زخم کو ناسُور بننے سے کوئی نہیں روکتا۔ ہر دبی ہوئی چنگاری کو اجازت، بلکہ صلائے عام ہے کہ اُبھرے، بھڑک کر شعلہ اور سب کچھ خاکستر میں تبدیل کردے! معمولی سے معاملات کواِس حد تک بگڑنے دیا جاتا ہے کہ لوگ

آپریشن کی تمنا کرنے لگیں۔ معاملات بے قابو ہونے لگتے ہیں تو اچانک آپریشن کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ شہر میں اپنے اسٹیک پر جن کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگتی ہے وہ آپریشن کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ بقول قمر جلالوی ع

غُنچے اپنی فریادوں میں بجلی کو پُکارا کرتے ہیں!

جن کا پلّہ بھاری ہو وہ آپریشن کے نام سے بِدکتے ہیں کیونکہ اُن کا اسٹیک داؤ پر لگ جاتا ہے۔ وہ آپریشن کو ایسی چُھری کے روپ میں دیکھتے ہیں جو اُن کے مفادات کے گلے پر پھرتی ہے!

آپریشن کے لیے بے ہوشی لازم ہے مگر یہ کیسا آپریشن ہے جس کے شروع ہوتے ہی لوگ ہوش میں آ جاتے ہیں بلکہ ہوش ٹھکانے آ جاتے ہیں!

کل جماعتی کانفرنس کے نام پر ہمارے ہاں تکّھی پر تکّھی بٹھانے کی روایت برقرار ہے۔ کسی زمانے میں گول میز کانفرنسز کا غلغلہ بلند رہا کرتا تھا۔ ان کانفرنسز میں شریک ہونے والے گھوم پھر کر اُسی بات پر واپس آ جاتے تھے جس مکالمہ شروع ہوا ہوتا تھا۔ آج کی اے پی سیز گول میز کانفرنسز کے تسلسل کے سوا کچھ نہیں۔ یہ بھی ''نشستند و گفتند و برخاستند'' سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتیں۔ اے پی سیز کو لہو گرم رکھنے کے بہانے سے بڑھ کر کچھ قرار نہیں دیا

جاسکتا۔ آج کی گول میز کانفرنسز بھی گول مول باتوں ہی کے لیے مختص ہیں اور اِس بے عملی کے نتیجے میں بہتر حالات کا بوریا بستر گول ہوتا رہتا ہے اور خرابی بڑھنے پر معاملہ آپریشن ٹیبل تک پہنچتا ہے!

کراچی ایک بار پھر آپریشن ٹیبل پر ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اِس شہر کے اسٹیک ہولڈرز ہنسی خوشی آپشن ٹیبل تک آ جاتے۔ مذاکرات کی میز کا بازار گرم نہیں ہوتا تو آپریشن ٹیبل کا میلہ لگتا ہے! جب آپشن کو گلے نہیں لگایا جاتا تو آپریشن گلے پڑتا ہے! آپشن ٹیبل کا آپشن تو ہمیشہ موجود رہتا ہے مگر لوگ اُسے اپنانے سے گریز کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نشتر چُبھونے کی روایت گرم جوشی سے برقرار رکھی جاتی ہے۔ آپریشن کب ہوتا ہے؟ جب جسم میں فاسِد مادّے ہوں۔ یعنی خاصی محنت سے فاسِد مادّے پیدا کئے جاتے ہیں یا پیدا ہونے دیئے جاتے ہیں۔ عام سی گولی سے دور ہو جانے والے درد کا تدارک ہم آپریشن سے چاہتے ہیں! شاید معمولی سی بیماری کا علاج تلاش کرنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ کوئی بھی درد جب تک دردِ سَر نہ بنے، لُطف ہی نہیں دیتا! معاملات خوب بگڑیں گے تب ہی تو درست کرنے میں لطف آئے گا!

بعض لوگ بات بات پر ڈاکٹر کی طرف دوڑتے ہیں۔ معمولی نزلہ بھی ہو تو بدحواس ہو جاتے ہیں۔ معمولی سی کھانسی اُٹھے تو گھبرا جاتے ہیں، دِل بیٹھنے لگتا

ہے۔ کہیں ہم بھی تو کسی ایسے ہی نفسیاتی مخمصے کا شکار نہیں ہو گئے؟ کہیں ایسی ہی بدحواسی ہماری نفسی ساخت کا حصہ تو نہیں بن گئی؟

آپریشن ٹیبل سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپشن ٹیبل کو تسلیم اور قبول کیا جائے مگر اِس آسانی کی طرف مشکل سے آتے ہیں۔ معاملات کو ٹال مٹول کی قبر میں لٹاتے رہیے یعنی مذاکرات کی میز کے گرد کرسیوں پر نہ بیٹھیے تو آپریشن ٹیبل پر لیٹنا پڑتا ہے!

کراچی ایک بار پھر آپریشن کے مرحلے میں ہے۔ ہم تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ع

دیکھیے اِس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا

ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ کیا اُچھلنا ہے۔ اُتھلے پانی سے کچھ نہیں اُچھلا کرتا۔ آپریشن کے نام پر لیپا پوتی سے کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد ہو سکا ہے نہ ہوگا۔ ہم گھوم پھر کر وہیں آ جاتے ہیں جہاں سے سفر کا آغاز کیا ہوتا ہے۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کا عمل ترک نہیں کیا جا رہا۔ امن بے چارا کسی کونے میں کھڑا پکار رہا ہے ع

ہم سے تو تم کو ضِد سی پڑی ہے!

یہ ضِد اب ختم ہونی چاہیے۔ بات بات پر بات آپریشن تک نہیں پہنچنی چاہیے۔اِس سے کہیں کم درجے کے آپشن بھی موجود ہیں اور آزمائے جانے کے منتظر ہیں۔ نشتر زنی ترک نہیں کی جائے گی تو نوبت نشتر سے علاج تک پہنچتی رہے گی۔ ہمارے لیے
operational ہونا rational ہونے سے کہیں زیادہ ضروری، بلکہ ناگزیر ہے!
کسی زمانے میں توپ سے گولے داغ کر فصیلیں توڑی جاتی تھیں، قلعے مُسخّر و مسمار کئے جاتے تھے۔ آج بھی توپ بڑی تباہی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اُس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو توپ سے چڑیا کا شکار کرے؟ کراچی میں آپریشن کے نام پر یہی تو ہوتا آیا ہے! چڑیا کو مارنا ہو تو گولا داغا جاتا ہے اور درندوں کا شکار کرنا ہو تو غلیل ’’آپریٹ‘‘ کی جاتی ہے! آپریشن تمام خرابیوں کے مکمل خاتمے کے لیے ہونا چاہیے۔ اور ویسی ہی تیاری بھی ناگزیر ہے۔ جیسا شکار ویسا ہتھیار۔ اور یہ بھی کافی نہیں۔ ساتھ ساتھ نیت بھی شکار کی ہونی چاہیے نہ کہ کِھلواڑ کی! سرکاری پروپیگنڈا مشینری اور میڈیا کے تال میل سے آنکھوں میں دُھول جھونکنے کے عمل کو آپریشن کلین اپ قرار دے کر اہلِ کراچی کے زخموں پر مزید نمک نہ چِھڑکا جائے!

کھر صاحب کی شگفتہ بیانی

چند ماہ پہلے تک صحافی اور کالم نویس منتظر رہا کرتے تھے کہ رحمٰن ملک، مولانا فضل الرحمٰن، ڈاکٹر ذوالفقار مرزا، حافظ حسین احمد اور شرجیل میمن کچھ کہیں تو بات سے بات نکال کر خبر بنائی جائے، بلکہ بات کو بتنگڑ میں تبدیل کرکے اُسے کالم نویسی کے گھاٹ پر دھوبی پٹخا مارا جائے! رحمٰن ملک تو وزیر داخلہ کے منصب سے ہٹنے کے بعد مُہر بہ لب ہیں، حالانکہ میڈیا والے تو چاہتے ہیں کہ وہ ''مِہر بہ لب'' ہوں! ڈاکٹر ذوالفقار مرزا نے بھی، بہ وجوہ، دَم سادھنے کے ساتھ ساتھ چُپ بھی سادھ لی ہے۔ کیا پتا حقیقت یہ ہو کہ جتنا بولنے کا حکم ملا تھا اُتنا وہ بول چکے! حافظ حسین احمد کے لیے وہ سیاق و سباق رہا نہیں جو اُن کی باتوں کو بامعنی، بلکہ معنی خیز بنایا کرتا تھا۔ ''کالم خیز'' مُوشگافیوں کا فریضہ خاصے طویل عرصے سے مولانا فضل الرحمٰن خود انجام دے رہے ہیں۔ ایک ذرا سی مشکل یہ ہے کہ مولانا آج کل جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ عمران خان کے لیے تو باعثِ تشویش، بلکہ توہین آمیز یا ''شرمناک'' ہو سکتا ہے مگر اُس میں میڈیا والوں کے لیے مسالا کم کم پایا جاتا ہے۔

صحافی اور کالم نویس وہ شکر خورے ہیں جن پر قدرت ہمیشہ مہربان رہتی ہے یعنی

کہیں سے کہیں سے اُنہیں شکر مل ہی جاتی ہے۔ شکر اور شُکر کا مقام ہے کہ وزیر داخلہ کے منصب پر چوہدری نثار علی خان فائز ہیں جو (سوچے اور سمجھے بغیر) بولنے کے شوق میں خبروں اور کالموں کا سامان کرتے رہتے ہیں! رحمٰن ملک نے چُپ کا روزہ رکھ کر جو قہر ڈھایا اُس کی تھوڑی بہت تلافی چوہدری نثار اب تک بخوبی کی ہے۔ سکندر جتوئی کے معاملے میں اُن کی وضاحتوں نے کالموں کی زمین میں عجب گُل بُوٹے کِھلائے ہیں
!

ایک زمانہ تھا جب صحافی اور کالم نویس غلام مصطفٰی کھر کی لب کُشائی کے منتظر رہا کرتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے جتنے سخت جان وہ خود تھے اُس سے کہیں زیادہ سخت جان اُن کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ جن کے بارے میں وہ لب کُشائی فرمایا کرتے تھے اُن پر
وخت'' پڑ جایا کرتا تھا۔ دوسری طرف خبروں اور کالموں کی ہنڈیا میں مسالا تیز ہو جایا''
کرتا تھا۔ مگر خیر ع
یہ تب کی بات ہے کہ جب آتش جوان تھا
ملک غلام مصطفٰی کھر میں اب وہ پہلی سی بات نہیں۔ پھر بھی چند ایک چنگاریاں ضرور باقی ہیں۔ خبروں میں رہنے اور کسی ایک پارٹی میں تادیر نہ رہنے کا ہنر وہ خوب جانتے ہیں! پیپلز پارٹی سے نکلنے اور پھر اُس میں شامل ہونے کے ہنر میں بھی جیسے وہ طاق
! ہیں ویسا شاید ہی کوئی اور ہو

دُنیا نیوز کے پروگرام "مذاق رات" میں کھر صاحب کی شگفتہ بیانی سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا۔ کھر صاحب سے گفتگو ہو اور معاملہ اُن کی شادیوں تک نہ پہنچے، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ شادیوں کی ٹکر پر اُنھوں نے صرف ایک کام کیا ہے، پارٹی بدلنے کا۔

کھر صاحب بھرپور مُوڈ میں ہوں تو جوابی جُملہ زبان سے صرف ادا نہیں کرتے، کیل کی طرح ٹھونکتے ہیں! خاصی ڈھلی ہوئی عمر میں بھی وہ شادی کا موقع ضائع کرتے ہیں نہ جُملہ داغنے کا!

کھر صاحب کسی زمانے میں شیر پنجاب بھی کہلاتے تھے۔ یہ تب کی بات ہے جب سیاست میں ایسے لوگ کم تھے جنہیں جنگل کی کسی مخلوق سے تشبیہ دی جائے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ تشبیہ دینے کا سوچیے تو جانور نہیں ملتے! ویسے تو خیر کئی معصوم جانور جنگل میں پائے جاتے ہیں مگر سیاست دانوں کو اُن جیسا قرار دینے کے لیے بندے کا بے عقل اور بے حِس ہونا لازم ہے!

سیاست دانوں کو شیر جیسا قرار دینے پر ہم ہمیشہ معترض رہے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں کہ کالم نویس ہونے کے ناطے ہر معاملے میں اختلاف کرنا اور الگ راہ

نکالنا ہمارا وتیرہ ہے۔ یہ چلن نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم پر ختم تھا۔ اُن کے بعد اب فضل الرحمٰن ہیں جن کے ہوتے ہم ہر معاملے میں الگ راہ نکالنے کا چلن اپنانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ احباب کہتے ہیں کہ شیر سے مشابہ قرار دیے جانے پر جب سیاست دانوں کو کوئی اعتراض نہیں اور خود شیر بھی راضی بہ رضا ہے تو پھر آپ کیوں معترض ہوتے ہیں۔ ہم نے بارہا وضاحت کی ہے کہ اِس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ ہم سیاست دانوں کے بارے میں سُوئے ظن رکھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ سیاست دان خود شکار کرکے کھاتے ہیں جبکہ شیر کو ہم نے نیشنل جیو گرافک کی ڈاکومینٹریز میں بیشتر اوقات شیرنیوں کا کیا ہوا شکار کھاتے دیکھا ہے! اِس اعتبار سے دیکھیے تو شاید معدودے چند سیاست دان ہی "شیریت" کے معیار پر پورے اُتریں گے!

کھر صاحب کو شیر سے تشبیہ دینا بہرحال کوئی ایسی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ بیگمات کی تعداد کے اعتبار سے اُنہوں نے lion's share والی بات کو درست ثابت کردکھایا ہے۔ شادیوں کی عادت ہی سے متعلق پوچھے جانے پر کھر صاحب نے بتایا کہ عورتیں تو اُن سے نہیں ڈرتی تھیں، ہاں اُن کے شوہر ضرور خوفزدہ رہا کرتے تھے۔ ہمارے خیال میں شوہروں والی کیفیت سیاسی جماعتوں کے قائدین کی بھی ہوا کرتی تھی جو یہ سوچ کر کانپتے رہتے تھے کہ پتا نہیں کب کھر صاحب اُن کی طرف آ نکلیں!

کھر صاحب سے پوچھا گیا کہ کیا وہ پیپلز پارٹی میں ایک بار پھر جائیں گے تو اُن کا کہنا تھا کہ سیاست میں کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہوتا۔ نہ دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہوتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ کھر صاحب پیپلز پارٹی کے کِواڑ صرف بھیڑ کر نکلتے ہیں۔ یعنی کنڈی نہیں لگاتے، کچھ حصہ اٹکا رہتا ہے۔ گویا جب ضرورت محسوس ہوئی، واپس چلے گئے۔
"مذاق رات" میں کھر صاحب سے پوچھا گیا کہ الطاف حسین، شہباز شریف اور نواز شریف میں سب سے سُریلا کون ہے تو اُنھوں نے نواز شریف کو سب سے سُریلا قرار دیا۔ اِس جواب سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اُن کی حِسِ مزاح ہی نہیں، حِسِ موقع شناسی بھی اب تک پورے جوبن پر ہے! الطاف حسین تک رسائی مشکل ہے۔ ویسے بھی وہ خود کہتے ہیں کہ برقع میں رہنے دو، برقع نہ اُٹھاؤ۔ زمینی حقیقت کا احترام کرتے ہوئے کھر صاحب نے اُن کے سُریلے پن پر برقع یا پردہ پڑا رہنے دیا! شہباز شریف لے دے کر بس وزیر اعلیٰ ہیں۔ اُن کا وہی معاملہ ہے کہ سگ باش، برادرِ خورد مباش! "اوریجنل" بننے کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ اب تک صرف "کاپی" ہیں! رہے نواز شریف تو وہ خیر سے وزیر اعظم ہیں اِس لیے ظاہر ہے کہ اِس وقت اُن سے سُریلا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا! اِس ایک تیر بہ ہدف جواب سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بہت کھر صاحب کی اگلی

منزل ن لیگ ہو سکتی ہے! ن لیگ میں وہ کب تک رہیں گے،اِس کا مدار اِس بات پر ہے کہ میاں نواز شریف اپنا سُریلا پن اُن کے لیے کب تک برقرار رکھتے ہیں!

کھر صاحب نے اپنے معمولات کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کھانے پینے اور فٹنس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جس نے آٹھ دس شادیاں کی ہوں اُس کا یہ کہنا قدرے غیر ضروری ہے کہ وہ فٹنس کا خاص خیال رکھتا ہے! شادی تو دُور کی بات ہے، فٹنس کے بغیر تو آدمی ڈیٹنگ کا بھی نہیں سوچ سکتا۔ آپ ہی سوچیے، ساحل پر کسی حسین کے ساتھ انسان گہرے سانس لیتا، کھانستا اچھا لگے گا؟

مذاق رات'' میں مجاہد عباس، امان اللہ، سخاوت ناز اور افتخار ٹھاکر جیسے منجھے ہوئے'' کامیڈینز پر مشتمل ٹیم نے کھر صاحب کو مختلف حوالوں سے گھیرنے کی کوشش کی۔ کہیں یہ ٹیم جیتی، کہیں وہ بالادست رہے۔ سامنے غلام مصطفٰی کھر جیسی شخصیت ہو تو وخت'' آتا جاتا رہتا ہے۔ جب شادی پر بات ہو چکی تو عشق کا ذِکر نکلا۔ سوال داغا گیا'' کہ کبھی عشق میں ناکامی ہوئی؟ ہمارے خیال میں تو یہ سوال پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ناکام عشق کا غم غلط کرنے ہی کے لیے تو شادیوں کا میلہ سجایا گیا ہے! خیر، کھر صاحب نے بتایا کہ جس نے ناکامی نہیں دیکھی اُس نے کچھ نہیں سیکھا۔ اُن کی

یہ بات سو فیصد درست ہے۔ اب دیکھ لیجیے، شادی پر شادی کرکے وہ مستقل یکھتے رہنے
!کے مرحلے میں رہے ہیں

کھر صاحب کا کہنا استدلال ہے کہ عشق کی تمام داستانیں ناکامی کے بطن سے ہویدا ہوئی
ہیں۔ شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، سوہنی مہیوال، ہیر رانجھا، مرزا صاحباں کوئی بھی جوڑا
ملن کی منزل تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اِن کی ناکامی نے عشقیہ داستانوں کے بازار کی رونق
.بڑھائی۔ ہم اِس نکتے سے بھی پوری طرح متفق ہیں۔ سیاست کے میدان میں بھی ناکام
ہونے والوں نے طرح طرح کی داستانوں کو جنم دیا ہے۔ میڈیا والے بھی دنگ اور
تنگ ہیں کہ کس کس اسٹوری پر کتنا کام کریں! ہم سیاست دانوں کی ناکامی کو روتے ہیں
اور وہ بضد ہیں کہ کھر صاحب کے فارمولے کے مطابق وہ سیاسی داستانوں کے بازار کی
!رونق.بڑھا رہے ہیں، یعنی ناکام ہوتے رہنے کے معاملے میں بھرپور کامیاب ہیں

خواب سے پیش گوئی تک

سیاست کے اہلِ کرم کی مہربانی ہے کہ لکھنے کے معاملے میں ہمارے لیے خاصی آسانی کا اہتمام کر رکھا ہے۔ وہ بولتے ہیں اور ہم لکھتے ہیں۔ آپ پڑھتے پڑھتے ہنستے ہیں اور ہم مُفت میں کریڈٹ پاتے ہیں! خیر، ہنسنے اور ہنسانے پر مائل کرنا اب کچھ اہلِ سیاست پر موقوف نہیں۔ حال اور ماحول یہ ہے کہ جو بھی زبان کھولتا ہے، خامہ فرسائی کی دعوت دیتا ہے! کبھی کبھی تو بیانات پڑھ پڑھ کر غش آ جاتا ہے اور فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ کس کی نکتہ آفرینی پر طبع آزمائی کریں اور کسے بخش دیں!

رحمٰن ملک، فضل الرحمٰن، عمران خان، شیخ رشید احمد، حافظ حسین احمد، عابد شیر علی، رانا ثناء اللہ خان، راجہ ریاض اور دوسرے بہت سے سیاسی کرم فرماؤں نے ہمیں بیشتر مواقع پر مایوس نہیں کیا۔ جب بھی ہمیں ذہن کے سَوتے خُشک ہوتے محسوس ہوئے، کسی نہ کسی نے آگے بڑھ کر یعنی کوئی مَن موہ لینے والا بیان داغ کر، تھوڑی سی شگفتہ بیانی فرماکر ہماری مشکل آسان کی ہے۔ مگر اِس معاملے میں منظور وسان صاحب کا جواب نہیں۔ وہ جب بھی پریس کانفرنس یا کسی موقع پر میڈیا سے بات کرتے ہیں، ہم الرٹ ہو جاتے ہیں کہ اب لِکھنے کے لیے مواد نازل ہوا سمجھیے! اُن کی باتیں ذہن کو متحرک کر دیتی ہیں اور ہم یہ سوچ

کر دِل بہلاتے ہیں کہ ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

منظور وسان کسی زمانے میں میڈیا سے باتیں کرتے وقت ایسی رَو میں بہنے لگتے تھے کہ اُن کے محکمے کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا تھا۔ وزیر داخلہ کی حیثیت سے اُن کا دائرۂ کار سندھ تک محدود تھا مگر دائرۂ خیال کی وسعت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے؟ وہ آن کی آن میں ذہنی جست لگاتے ہوئے خوابوں کی دُنیا میں داخل ہوجایا کرتے تھے۔ اور خوابوں کی دُنیا میں داخل ہونے کے بعد کسی کا اپنے آپ پر اختیار کب رہتا ہے؟ خوابوں کی دُنیا میں فاصلے کی کوئی قید تو ہے نہیں اِس لیے منظور وسان وہاں سے دُور کی کوڑیاں لایا کرتے تھے۔ ایک زمانے تک ہم اُنہیں ''وزیرِ خواب و خیال'' سمجھتے رہے۔ اُن کے عجائب خانۂ خواب کے تذکرے سے ہم نے کئی بار اپنے کالم میں تازگی اور شگفتگی کا سامان کیا۔ منظور وسان صاحب کی باتوں سے مُرصّع کالم لکھنے کے بعد ہم یہی محسوس کرتے تھے کہ ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!

کیا کیجیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ ایسا بدل گیا ہے کہ منظور وسان کے خواب بھی بیشتر قومی اداروں کی طرح ماضی کا قصہ ہوتے جارہے ہیں! جب سے سندھ

کے وزیر جیل خانہ جات کا منصب ملا ہے، اُن کی زندگی سلاخوں، پھاٹکوں اور سرچ لائٹس میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ قیدیوں کی بہبود کا غم اُنہیں کچھ اِس طرح کھائے جارہا ہے کہ اُنھوں نے کالم نگاروں کا بھلا سوچنا تقریباً چھوڑ ہی دیا ہے۔ اب وہ میڈیا سے زیادہ بتیاتے ہی نہیں۔ شگفتہ بیانی کا عملی مظاہرہ ہو تو کچھ بات بنے، کچھ رنگ جمے۔ جب سے جیلوں پر حملوں کے خدشے سے متعلق خبریں آئی ہیں، منظور وسان صاحب کی راتوں کی نیند اُڑ گئی ہے۔ اور جب نیند ہی اُڑ گئی تو کیسے خواب، کہاں کے خواب!

منظور وسان نے کراچی میں شرجیل میمن اور مُراد علی شاہ کے ساتھ پریس کانفرنس کرتے ہوئے ایک رُوح فرسا انکشاف کیا۔ (واضح رہے کہ ہم اپنی رُوح کی بات کر رہے ہیں!) ہم تو یہ سوچ کر پریس کانفرنس کی رُوداد پڑھنے بیٹھے تھے کہ شاید کچھ کام کی باتیں نکل آئیں اور ہمارے دو تین کالموں کا پیٹ بھرنے کا اہتمام ہو جائے۔ مگر ہمیں کیا معلوم تھا کہ منظور وسان صاحب ایک ایسا اعتراف آمیز انکشاف کریں گے کہ ہماری اور ہمارے قلم کی رُوح فنا ہوتے ہوتے رہ جائے گی۔

منظور وسان صاحب نے بتایا کہ پرویز مشرف دور میں پیرول پر رہا ہونے والے 70 ملزمان تاحال لاپتا ہیں۔ خدشہ ہے کہ اُن میں سے بیشتر بیرون ملک چلے گئے

ہیں۔ امن وامان کی صورتِ حال کے باعث سندھ کی چار جیلیں انتہائی حساس ہیں۔ حملے کے خدشے کے پیش نظر سیکیورٹی بڑھادی گئی ہے۔ سندھ کی 25 جیلوں میں 16 ہزار سے زائد قیدی ہیں۔ ان میں کالعدم تنظیموں سے تعلق رکھنے والے 221 قیدی اور 79 ٹارگٹ کِلرز بھی شامل ہیں۔ 27 قیدی سزائے موت پر عمل کے منتظر ہیں۔

ملاحظہ فرمایئے، کہاں خوابوں کی دُنیا اور کہاں جیلوں کا جہاں! قائم علی شاہ صاحب نے پورا خیال رکھا ہے کہ کسی کو موزوں قلم دان نہ ملے! ہلکی پھلکی باتیں کرنے والوں کو ثقافت یا پھر اطلاعات کا محکمہ دیا جانا چاہیے۔ اور سونپ دیا گیا جیلوں کے نظم و نسق کا معاملہ!

منظور وسان نے پریس کانفرنس میں یہ بھی کہا کہ جس جیل میں قیدی سے موبائل فون برآمد ہوگا اس کے سپرنٹنڈنٹ کے خلاف مقدمہ درج ہوگا۔ یہ پڑھ کر ہمیں ہنسی آ گئی۔ اِس طرح تو مقدمات کی تعداد کے لحاظ سے ہمارے جیلرز کے نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز کا حصہ بن جائیں گے! موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ پرویز مشرف دور کے جو قیدی پیرول پر رہائی کے بعد سے روپوش ہیں اُنہیں رہا کرنے کی اجازت کس مجبوری کے تحت دی گئی تھی۔

خبر پڑھتے پڑھتے ہم مایوس ہو چلے تھے کہ قدرت کو ہم پر رحم آگیا۔ آخری سطور میں دو شگفتہ نکات نظر سے گزرے۔ اور بس یہ سمجھیے کہ طبیعت بحال ہو گئی۔ منظور وسان کا کہنا تھا کہ بہتر سیکیورٹی کے لیے جیلوں کے پانچ ہزار اہلکاروں کو کمانڈو کی ٹریننگ دی جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ ان اہلکاروں کو اب تک کس کام کی ٹریننگ دی گئی تھی؟ کیا وہ بااثر قیدیوں کے لیے باہر سے کھانے پینے کی اشیاء لانے پر مامور رہے ہیں؟

سندھ کے وزیر جیل خانہ جات نے جو کام کی بات کہی وہ خبر کے آخر میں تھی۔ فرماتے ہیں کہ اب اُنھوں نے خواب دیکھنا ترک کرکے پیش گوئی کا شغل اپنالیا ہے۔ اور ساتھ ہی پیش گوئی بھی فرمائی کہ آئندہ وزیر اعظم بلاول بھٹو زرداری ہوں گے۔

منظور وسان صوبائی وزیر جیل خانہ جات کی حیثیت سے خواہ کتنے دباؤ میں ہوں، پیش گوئی کے معاملے میں خاصی ''سیف سائڈ'' کھیلنے کے مُوڈ میں دکھائی دیتے ہیں۔ پہلی پیش گوئی بھی کی ہے تو اچھی طرح چھان پھٹک کے بعد۔ منظور وسان صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ملک میں ''باری'' کا نظام چل رہا ہے۔ میاں صاحب کی باری ختم ہو گی تو ظاہر ہے چھوٹے میاں یعنی بلاول بھٹو زرداری کی باری آئے گی۔ سِکّے کے دو ہی رخ ہوتے ہیں۔ ایک رُخ سامنے ہو تو دوسرے کے بارے

میں کچھ کہنا پیش گوئی سے بڑھ کر ''حقیقت گوئی'' کہلائے گا۔ سندھ کے وزیر جیل خانہ جات نے خوابوں کا زندان تج کر پیش گوئی کا قفس منتخب کرکے کچھ عجب نہیں کیا۔ ویسے دونوں میں کچھ خاص فرق نہیں۔ خواب بند آنکھوں میں سماتے ہیں اور دل کی تمنا جب بھرپور بیداری کے عالم میں زبان پر آتی ہے تو پیش گوئی کہلاتی ہے۔ منظور وسان صاحب نے بلاول بھٹو زرداری کے وزیر اعظم بننے کی پیش گوئی کے ذریعے پارٹی اور بھٹو خاندان سے وفاداری کا حق بھی ادا کردیا! یعنی ایک تیر میں کئی نشانے!

منظور وسان صاحب کو خوابوں کی دُنیا سے باہر تو آنا ہی تھا۔ پیپلز پارٹی کے اقتدار کا سُندر سپنا بھی تو ٹوٹ ہی گیا ہے۔ بقولِ غالبؔ

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سُود تھا!

مگر یہ صرف کہنے کی بات ہے۔ قوم کی پانچ سالہ نیند ٹوٹی ہے تو ہر طرف زیاں کا دیدار ہو رہا ہے۔ سارا سُود وہ لے اُڑے جن کے محاسبے کی تمام کوششیں بے سُود رہی ہیں! پانچ سالہ پی پی پی دور نے بہت کچھ خواب و خیال کے طاق پر سجادیا ہے! ایسے میں اگر منظور وسان صاحب نے بھی اپنا مشغلۂ خواب گوئی طاقِ نسیاں پر سجادیا ہے تو کسی کو زیادہ حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ مگر خیر، ہم اب

بھی دُعا گو ہیں کہ منظور وسان خواب دیکھیں اور سُنائیں تاکہ ہم کچھ ہلکا پھلکا لکھنے کی تحریک پائیں۔ اور اِس بہانے آپ بھی کچھ ایسا پڑھیں جو دِل سے اُداسی کا غُبار مِٹادے!

دو مُردوں کی گفتگو

جس کسی کے ذہن میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ باتوں سے کیا ہوتا ہے وہ اپنی رائے سے رجوع کرے۔ ذرا ماحول پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ پوری کی پوری قوم باتوں کا کھا رہی ہے، باتوں ہی کے دم سے جی رہی ہے! جس طرف بھی نظر ڈالیے، صرف باتیں ہو رہی ہیں۔ لوگ ایک بات ختم کرکے دوسری بات شروع کرتے ہیں۔ دوسری ختم ہونے پر تیسری بات کی باری آتی ہے۔ ڈرائنگ روم، چبوترے اور ہوٹل آباد ہیں۔ لوگ رات رات بھر بَتیاتے ہیں مگر مُنہ تھکتا ہے نہ دِل بھرتا ہے۔

باتوں کا شوق اب اِس حد تک پہنچ چکا ہے کہ قبرستان میں مُردے بھی باتوں کے بغیر ''جی'' نہیں سکتے! آپ سوچیں گے مُردوں کو ''جینے'' سے کیا مطلب اور باتوں سے کیا غرض؟ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو معلوم ہی نہیں مُردے اب باتوں کے کتنے شوقین، بلکہ ''دُھتّی'' ہو چکے ہیں۔ باتوں پر گزارے کی حد تک اِس قوم کے زندہ اور مُردہ سب ایک ہیں!

کل رات ہم نے خواب میں دیکھا کہ قبرستان میں دو مُردے اپنی اپنی قبر پر بیٹھے حالاتِ حاضرہ پر گفتگو فرما رہے ہیں۔ اُن کی گفتگو جس قدر یاد رہ گئی

وہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

………………

پہلا مُردہ: حالات دِن بہ دِن بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔

دوسرا مُردہ: یہ کم بخت حالات جان چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ جیتے جی بھی حالات کا رونا تھا۔ اور اب مرنے کے بعد بھی حالات ہی نے ''جینا'' حرام کر رکھا ہے۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ مر گئے تو جان چھوٹ جائے گی مگر کیا معلوم تھا کہ مرنے کے بعد بھی سُکون کے چند لمحات میسر نہ پائیں گے۔

پہلا مُردہ: میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ جیتے جی میرا یہ خیال تھا کہ مر جاؤں گا تو حالات کے تذکرے سے نجات ملے گی۔ لوگوں کا ''سیاسی شعور'' پروان چڑھ کر میرے سَر پر چڑھ چکا تھا۔ مرتے وقت خوش تھا کہ چلو ''سیاسی شعور'' سے گلو خلاصی تو ہوئی۔ مگر یہ کیا؟ یہاں قبرستان میں بھی لوگ حالاتِ حاضرہ پر بحث کے ایسے شوقین ہوگئے ہیں کہ اب کچھ دیر بھی ''غیر سیاسی'' زندگی بسر نہیں کر سکتے! دن رات سیاسی گفتگو کے شوق نے قبرستان کا سُکون بھی غارت کر دیا ہے۔

دوسرا مُردہ: تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے پڑوس والی قبر کا مُردہ بھی اکثر غائب رہتا ہے۔ میں نے ایک دن پوچھا بھائی! شام ہوتے ہی کہاں چلے جاتے ہو؟ کیا لوگوں کو ڈرانے کا شوق چَرآیا ہے؟ کہنے لگا۔ ''میں کیا اور میرا ڈرانا

کیا؟ اب تو زندہ لوگوں سے ڈر لگتا ہے! ہم مُردوں کے بھی کچھ نہ کچھ اُصول تو ہیں۔ چل رہا ہو وہاں دھڑکا ہی لگا رہتا ہے کہ کب کیا ہو جائے! random جہاں سب کچھ ساتھ والی بستی کے ہوٹل میں ٹی وی لگا ہوا ہے۔ وہاں بیٹھ جاتا ہوں اور نیوز چینلز دیکھتا رہتا ہوں۔ حیران ہوتا ہوں کہ ہمارا ملک ہر روز کتنا تبدیل ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی تو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہی ملک جس میں کبھی میں نے چالیس سال گزارے تھے۔ مجھے قبرستان میں آباد ہوئے ابھی صرف سات سال ہوئے ہیں مگر ملک اِتنا بدل گیا ہے کہ ''پہچانا نہیں جاتا۔ لوگ بھی بہت بدل گئے ہیں۔

پہلا مُردہ: کئی دِنوں سے طبیعت بہت بوجھل سی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ کبھی کبھی تو دَم گھٹنے لگتا ہے؟

دوسرا مُردہ: تو کچھ دیر کیلئے قبر سے نکل آیا کرو۔

پہلا مُردہ: وہ تو ٹھیک ہے مگر دَم گھٹنے کا سبب قبر کی گھٹن نہیں۔ میری قبر تو خاصی کشادہ ہے۔ میں نے پنکھا بھی لگوا رکھا ہے۔

دوسرا مُردہ: وہ کیسے؟ میری قبر میں تو کوئی پنکھا ونکھا نہیں۔

پہلا مُردہ: میرے بیٹے پریشان رہا کرتے تھے کہ میرے لیے بعد از مرگ کچھ

کیا جائے۔ میں نے سوچا کہیں وہ رقم ایصالِ ثواب کے نام پر کسی فضول سرگرمی کی بھٹی میں رقم نہ جھونک بیٹھیں اِس لیے تینوں بیٹوں کے خواب میں جا کر پنکھا لگوانے کی فرمائش کر دی۔

دوسرا مُردہ: یہ تو اچھا آئیڈیا ہے۔ میں بھی اپنے بیٹوں کے خواب میں جا کر کوئی سہولت مانگ لوں گا۔

پہلا مُردہ: ضرور، مگر دیکھ بھال کر۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیٹوں کی "کھڑکی" چل رہی ہو اور تمہاری فرمائش سے وہ چِڑ کر پُھول چڑھانا بھی چھوڑ دیں!

دوسرا مُردہ: ٹھیک ہے۔ ہاں، یہ تو بتاؤ کہ گھٹن کس بات سے محسوس ہوتی ہے؟

پہلا مُردہ: کبھی کبھی میں بھی قبرستان سے باہر نکل کر ہوٹل پر اخبار پڑھتا، ٹی وی دیکھتا ہوں۔ جاتا تو دِل بہلانے کے لیے ہوں مگر دُکھے ہوئے دِل کے ساتھ واپس آتا ہوں۔ قبرستان واپس پہنچنے کے بعد یہ سوچ کر دِل کو تھوڑا سا سُکون ملتا ہے کہ ہم زندہ نہیں! اگر آج ہم "زندہ اور پائندہ قوم" کا حصہ ہوتے تو پتا نہیں کیا کیا جھیلنا پڑتا۔

دوسرا مُردہ: تم اخبار پڑھنا اور ٹی وی دیکھنا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟

پہلا مُردہ : کیا کروں ؟جب زندہ تھا تب کی کچھ عادتیں اب تک چمٹی ہوئی ہیں۔
دوسرا مُردہ : ہاں یار، یہ تو ہے۔بُری عادتیں مرنے پر بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ مُجھے دیکھو۔اِدھر میرا دَم نکلا، اُدھر صرف چھ ماہ بعد میری بیوی بھی زندگی کی بازی ہار کر میرے برابر والی قبر میں آ سوئی ! بے چارے زندہ پاکستانیوں پر ترس آتا ہے کہ کیسے کیسے عذاب جھیل رہے ہیں۔ کہنے کو زندہ ہیں مگر حال مُردوں سے بدتر ہے۔ اور اِدھر ہم یہ سوچ کر خوش ہیں کہ ایسے بے ہنگم ماحول میں زندہ نہیں۔
پہلا مُردہ : میں تو حیران ہوں کہ اِس قوم کو کیا ہوگیا ہے۔ ہوس کی کوئی حد رہی نہ بے شرمی کی۔ دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور ایک ہماری قوم ہے کہ اب تک ’’پستیوں کی بلندیاں‘‘ چُھونے میں مصروف ہے۔ ایک دوسرے کے گلے پر چُھری پھیرنے کے عمل سے بھی دِلوں کو سُکون نہیں ملا تو اب بچوں سے زیادتی کے بعد اُنہیں قتل کرنے پر کمر کَس لی گئی ہے۔ الحفیظ والامان۔ کہیں دو تین بہنیں حالات سے تنگ آ کر نہر میں کود جاتی ہیں۔ کہیں کوئی شخص بے روزگاری سے تنگ آ کر اپنے بچوں کے گلوں پر چُھری پھیر دیتا ہے۔ راہ چلتی عورتوں اور بچیوں کے کانوں سے بالیاں تک نوچ لی جاتی ہیں۔ اللہ نے جن مَردوں

کو عورتوں کا کفیل اور رکھوالا بنا کر بھیجا ہے وہ اُنہیں لُوٹنے اور اُن کی عصمت سے کِھلواڑ کرنے میں مگن ہیں۔

دوسرا مُردہ: سچ کہتے ہو بھائی۔ پستی کی بھی کوئی نہ کوئی حد تو ہوگی مگر ایسا لگتا ہے ہماری قوم نے طے کرلیا ہے کہ ہر پستی کو حد سے بے نیاز کرکے دَم لے گی۔ یہ بھی خیر درندگی ہی ہے کہ تین چار سال کے معصوموں سے بھی زیادتی کی جائے یا تاوان کے لیے اغوا کرنے کے بعد اُنہیں قتل کرکے پھینک دیا جائے۔ مگر اِس سے بھی ایک قدم آگے جاکر اب خبیثوں کو ضِد سی ہوگئی ہے۔ بچوں سے زیادتی کے کسی واقعے کو جب میڈیا میں اُچھالا جاتا ہے تو شیطان کے چیلے مزید دیدہ دِلیری کا مظاہرہ کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ نئے واقعات منظرِ عام پر آجاتے ہیں۔ درندگی اور سَفّاکی کی نئی حدود پار کرنے کی دوڑ سی شروع ہوجاتی ہے۔

پہلا مُردہ: ایسی خباثت کا تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ کیا اچھے دن تھے جب ہم زندہ تھے۔ بُرائیاں تھیں مگر ایک حد تک۔ لوگوں میں لالچ کی سطح بھی خطرناک اور شرم ناک حد تک بلند نہ ہوئی تھی۔ جُرم پسند ذہنیت تھی مگر خاصی شرم کے ساتھ۔ کوئی بُرا کام کرتا تھا تو چُھپ چُھپا کر، بچ بچا کر۔ اب تو چُھپ چُھپا کر کسی جُرم کا ارتکاب بجائے خود جُرم سا لگتا ہے! جس کا انتقال چالیس پچاس سال پہلے ہوا ہو اُسے دوبارہ زندہ کرکے موجودہ پاکستانی

معاشرہ دکھایا جائے تو ذرا سی دیر میں چکرا کر گر پڑے اور ایسے جینے پر مُردہ رہنے ہی کو ترجیح دے!

دوسرا مُردہ: جینے اور مرنے کا فرق ختم ہوگیا ہے۔ لوگ ایسے جی رہے ہیں کہ مُردے بھی دیکھیں تو شرمسار ہوں۔ جو زندہ ہیں اُنہیں کچھ تو ایسا کرنا چاہیے کہ کوئی مُردہ نہ سمجھے۔ اگر مرُدوں کا سا انداز اختیار کرنا ہے تو پھر زندہ رہنے کا تکلف کیوں؟

پہلا مُردہ: بس اتنا ہو کہ زندہ اِنسان کچھ ایسا نہ کریں کہ ہم مُردے اُن کے حالات جان کر پریشان پھریں۔ زندوں کو تو مرنے کا آسرا ہے۔ ہم اگر مرگئے پر بھی چین نہ پاسکے تو کہاں جائیں گے!

ڈالر کے آگے سجدہ ریز ہونے کا مقابلہ

جو لوگ پاکستان اور بھارت کے دُکھ سُکھ سانجھے ہونے کا ڈھول پیٹتے رہتے ہیں، حالات ایک بار پھر اُن پر مہربان ہیں۔ شکر خورے کو کہیں نہ کہیں سے شکر مل ہی جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ پاک بھارت مشترکہ اقدار تلاش کرنے والوں کا بھی ہے۔ بات جغرافیے، ثقافت اور تاریخ تک رہتی تو کوئی بات نہ تھی۔ اب تو امریکی ڈالر بھی ''قدرِ مشترک'' ہو کر رہ گیا ہے۔ ڈالر کے ذکر پر آپ چونک گئے ہوں گے۔ مگر کیا کیجیے کہ جنہیں چونکنا چاہیے وہ اب تک خوابِ غفلت میں ہیں۔ اب دیکھیے نا، دونوں ممالک کا روپیہ ڈالر کے آگے سجدہ ریز ہے۔ اور اِس سے کہیں بڑھ کر، حقیقت تو یہ ہے دو میں سے ہر روپیہ زیادہ سے زیادہ فرماں برداری ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے۔

ایک زمانے سے یہ بات کہی جارہی تھی کہ ہماری معیشت اور زری نظام مسابقت کے قابل نہیں رہا۔ اب ثابت ہوگیا کہ ہمارا روپیہ بھی ''مقابلے'' کی سکت رکھتا ہے۔ ڈالر کے مقابل قدر کی گراوٹ میں پاکستانی روپیہ بھارتی ''ہم منصب'' کو مُنہ دینے پر کمربستہ ہے! اور ایسا لگتا ہے کہ اِس ''معرکے'' میں ہم تھوڑا بہت میدان مار کر ہی لوٹیں گے!

ایک زمانے سے ہم سُنتے آئے ہیں کہ بھارت علاقائی سُپر پاور ہے اور خطے کی کوئی بھی معیشت اُس کے مقابل کھڑی نہیں ہو سکتی۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی، اشیائے صرف اور صنعتی برآمدات کے شعبے میں بھارت کے خلاف میدان میں اُترنا بظاہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ بھارت نے دُنیا بھر میں نالج ورکرز بھیج رکھے ہیں جو ڈھیروں زرِ مبادلہ وطن بھیج کر معیشت کو مستحکم کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ پھر راتوں رات کیا ہوا کہ بھارتی روپیہ، ڈھیروں زرِ مبادلہ کے باوجود، امریکی ڈالر کے سامنے ڈھیر ہوگیا، بلکہ ڈھے گیا؟ بات ہرگز ایسی نہیں کہ آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ جس ملک کو معیشت کے بل پر علاقائی سُپر پاور ہونے کا زُعم رہا ہے اور جو افغانستان کے ذریعے بیرونی مہم جُوئی کا شوق بھی پورا کرنا چاہتا ہے اُس کے لیے سفارت کاری کے سمندر میں راتوں رات یہ سنکٹ'' کا جزیرہ کہاں سے اُبھر آیا؟''

ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ بھارت عالمی معیشت میں مرکزی کردار ادا کرنے کے لیے پَر تول رہا تھا۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ راتوں رات سارے سپنے راکھ ہوئے؟ سپنوں کا تاج محل کیونکر زمیں بوس ہوگیا؟

پاکستان اور بھارت میں ڈالر کی قدر اِتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ عقل دنگ ہے اور ہاتھ تنگ ہوا جاتا ہے۔ ہر گزرتا ہوا دن ڈالر کے کھونٹے کو مضبوط کر رہا

ہے۔ اور سچ پوچھیے تو دونوں ہمسایا کرنسیوں کے سینے میں ڈالر کی کیل گڑی جارہی ہے! حیرت کی بات یہ ہے کہ عالمی منڈی میں ڈالر کمزور ہو رہا ہے۔ کئی کرنسیاں اُسے مُنہ دینے پر تُلی ہوئی ہیں اور اِدھر ہم ہیں کہ ہماری کرنسیاں اپنا سامُنہ لیکر رہ گئی ہیں! پاکستان ہو یا بھارت، روپے کی قدر میں گراوٹ کا یہ حال ہے کہ کچھ دن بعد شاید روپے کو ایک نظر دیکھنے کے بھی لوگ پیسے مانگا کریں گے!

دُنیا یہ تماشا دیکھ کر محظوظ ہو رہی ہے کہ ریزرو بینک آف انڈیا اپنےپَر سمیٹ کر ڈالر ہوگیا ہے۔ اب تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ریزرو بینک reserved کے سامنے خاصا کیا ہوئے جو ایسی ہی مشکل کی گھڑیوں میں کام آیا کرتے reserves آف انڈیاکے وہ ہیں! کیا اُنہیں کسی مزید بُرے وقت کے لیے بچاکر رکھا گیا ہے؟

اِدھر ہمارا اسٹیٹ بینک ہے کہ روپے کی قدر میں گراوٹ روکنے کے حوالے سے ہے۔ یہ ''زمیں جُنبد، نہ جُنبد گل محمد'' کے مصداق صورتِ حال کو محض static تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے۔ یہ روش خود اسٹیٹ بینک کو تماشا بنانے پر تُلی ہوئی بنا کر صرف کاغذ کے estate bank ہے۔ چند لوگوں نے اِسے باپ کی جاگیر یعنی نوٹ چھاپنے کا ادارہ بناڈالا ہے۔ وہ سُنہرا دور خیال و خواب کی

نذر ہوا جب چھاپی جانے والی کرنسی کی پُشت پر سونا ہوا کرتا تھا۔ روپے کی پُشت پناہی کے لیے سونا رکھنے کی روایت نے دم توڑا تو اندھا دُھند نوٹ چھاپنے کی روش پر گامزن رہنے والوں کی چاندی ہوگئی۔ اب ہر مسئلے کا صرف یہ حل رہ گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ نوٹ چھاپیے اور پھیلا دیجیے۔ دُنیا کس چیز پر مرتی ہے؟ زر پر! ہاتھ میں زر ہو تو مسائل حل ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں زری نظام کے مینیجرز نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ زر کا حجم بڑھانے سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہی سبب ہے کہ بازار میں زیادہ سے زیادہ (کاغذی) زر لایا جا رہا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض دِل جلے ماہرین اِس صورتِ حال کو ''افراطِ زر'' (زر کی زیادتی) قرار دے کر سرکاری مشینری ''بے فضول میں'' شرمسار کرنے پر تُلے ہوئے ہیں!

بازارِ زر میں ڈالر جیسے عفریت کو سامنے دیکھ کر ہمارے مانیٹری مینیجرز نے شُتر مُرغ کی طرح ریت میں مُنہ چُھپا لیا ہے۔ ڈالر نے قیامت ڈھانے کی قسم کھا رکھی ہے اور ہم اُسے خوش آمدید کہنے پر بضد ہیں! کبھی کبھی مہمان نوازی کا انداز مہمان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ ڈالر کے معاملے میں ہمارا رویہ کچھ ایسا ہی ہے۔ یعنی ع

''وہ آئے، آئے کہ ہم دِل کُشادہ رکھتے ہیں''!

طرح طرح کے بے بنیاد خدشات ہیں جو ڈالر کو مضبوط کئے جا رہے ہیں۔ عالمی

معیشت کے تمام اشاریوں کو یکسر نظر انداز کرکے ہم نے یہ فرض کرلیا ہے کہ ڈالر کی چھتری تان لینے سے معاشی و مالیاتی مسائل کے چھینٹوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے!

پاکستان میں اب ہر چیز اِس تیزی سے قدر کھو رہی ہے کہ اہلِ وطن کو ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر کے گھٹتے رہنے پر ذرا بھی حیرت نہیں۔ روپیہ کیوں اِس قدر بے قدر ہوا جارہا ہے، اِس کی توضیح اور توجیہ منفرد انداز سے کی جارہی ہے۔ کوئی کہتا ہے حج سیزن میں ڈالر کی طلب بڑھ ہی جایا کرتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہر سال حج سیزن میں ڈالر قیامت کیوں نہیں ڈھاتا؟ صرف اب کے ایسا کیوں ہے کہ ہم حج سے بہت پہلے اپنے ہی روپے کو کنکریاں مارنے پر تُل گئے ہیں؟ کسی کا استدلال ہے کہ بیرونی قرضوں کا دباؤ اور ادائیگیوں کا معاملہ ڈالر کی وقعت بڑھا رہا ہے۔ مگر یہ بھی کوئی انوکھی کیفیت نہیں۔ پاکستان پر تو قرضوں کا بوجھ ہر وقت رہتا ہے۔ پھر تو ہر وقت روپے کی قدر ایسی تیزی ہی سے گھٹتی رہنی چاہیے! اِتنی ساری بہانے بازی کرنے کے بجائے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ معاملات نا اہل مشینری کے ہاتھ میں ہیں؟

بھارت میں بھی کوئی سمجھ نہیں پارہا کہ ڈالر کے سامنے روپے نے کیوں ریت میں سَر دے دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پاکستان اور بھارت میں مقابلہ ہو رہا ہے کہ ڈالر کے آگے کون کس حد تک سجدہ ریز ہوسکتا ہے! شاید ''پیا'' کو رِجھانے کا

اِن کے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچا! اگر دونوں ممالک اِس روش پر گامزن رہے تو وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ڈالر کا چھوٹا سا بنڈل خریدنے کے لیے گاڑی بھر کرنسی دینی پڑے گی!

پاکستان کے فائنانشل مینیجرز اب بھی بیدار نہ ہوئے تو روپے کی بے توقیری بڑھتی جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم مال کے بدلے مال کے نظام (بارٹر سسٹم) کو گلے لگالیں! وقت آگیا ہے کہ ڈالر کے آگے سجدہ ریز ہونے کا عمل ترک کرکے قومی غیر و حمیت کے تقاضے کے طور پر اپنی کرنسی کو مضبوط کرنے پر توجہ دی جائے۔ دِل کی تسلی کے لیے صرف یہ خیال کافی نہیں کہ بھارتی روپیہ بھی تو ڈالر کے آگے سجدہ ریز ہے! اہمیت اِس بات کی ہے کہ ہماری کرنسی قیام کی حالت میں رہے۔

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے

ایک نوجوان رات کے تین بجے سڑک پر گھوم رہا تھا۔ پولیس والوں نے روک کر پوچھا اِس وقت سڑک پر کیا کر رہے ہو، گھر کیوں نہیں جاتے۔ وہ بولا گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے، ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔ ایک اور نوجوان کو روک کر پولیس والوں نے پوچھا شادی شدہ ہو؟ اس نے کہا ہاں۔ پولیس والوں نے ایک ملا تھا جو کہتا تھا شادی نہیں ہوئی، گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ تم کیوں گھر نہیں جاتے۔ وہ بولا اب گھر اور بیوی دونوں مل کر کاٹنے کو دوڑتے ہیں!

شادی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مُوتی چُور کا لڈو ہے۔ جو کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ یہ عجیب تیر ہے کہ چلے تو زخمی کرے اور نہ چلے تو چیر پھاڑ کر رکھ دے! شادی سے پہلے اور بعد کی بدحواسی کا فرق اِتنا باریک ہے کہ اِسے سمجھنے کے لیے روشن ضمیری اور دیدۂ بینا دونوں ہی درکار ہیں! فی زمانہ جس میں یہ دونوں اوصاف جمع ہوں اُسے نابغہ سمجھیے۔

اگر کوئی یہ سوچ کر شرمندہ ہے کہ باہر اچھی خاصی پُھوں پھاں کرنے کے بعد گھر میں بیگم کے سامنے گردن جُھکانی پڑتی ہے تو پورے اعتماد سے سیدھا کھڑا ہو اور اپنی ساری شرمندگی کو لات مار کر ایک طرف ہٹادے۔اِس معاملے میں وہ بڑے بڑوں کی صف میں کھڑا ہے! اگر کوئی یہ دعوی کرکے حلقۂ احباب میں اپنی دھاک بٹھانا چاہتا ہے کہ وہ اہلیہ سے نہیں ڈرتا تو جان لیجیے کہ وہ سفید جُھوٹ بول رہا ہے! بقول عدمؔ

کون ہے جس نے مَے نہیں چکھی؟

کون جُھوٹی قسم اُٹھاتا ہے؟

مَے کدے سے جو بچ نکلتا ہے

تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے!

یہی ہر گھر کا سچ ہے اور یہی گھر گھر کی کہانی ہے۔

امریکا سے زیادہ طاقتور اِس وقت کون ہے؟ کوئی نہیں۔ اور امریکی صدر سے زیادہ طاقتور سربراہِ مملکت کون ہو سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔ یکے بعد دیگر جُھوٹ بول بول کر قوم کو بہلانے پُھسلانے والے امریکی صدر نے حال ہی میں ایک آفاقی سچ بول کر بہتوں کو مستقل شرمندگی سے بچالیا ہے۔ صدر بارک اوباما نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کے بعد اپنے معاونین سے نجی گفتگو کے دوران اعتراف کیا کہ وہ اپنی بیوی سے ڈرتے ہیں! دُنیا کے کمزور

ترین فورم سے خطاب کے بعد مضبوط ترین سربراہِ مملکت کا یہ اعتراف بیویوں سے ڈرنے والے (یعنی تقریباً تمام ہی) مَردوں کے لیے خاصا حوصلہ افزا ہے۔ اللہ دُکھی شوہروں کی تالیفِ قلب کا اہتمام اِس طرح بھی کر دیا کرتا ہے!

صدر اوباما کی فرماں برداری کا عالم ملاحظہ فرمایئے کہ نجی گفتگو میں یہ بتایا کہ وہ تمباکو نوشی ترک کر چکے ہیں اور یہ کہ اِس کا ''کریڈٹ'' اُن کی اہلیہ یعنی خاتونِ اوّل مشل اوباما کو جاتا ہے! جس ادارے کی کوئی وقعت نہیں اُس سے رسمی اور پھسپُھسے خطاب کے بعد نجی گفتگو میں خاصی کام کی باتیں نکل آتی ہیں۔ ایسے مواقع پر چند حوصلہ افزا اعترافات بھی دُنیا کے سامنے آجاتے ہیں! تمباکو نوشی کیا چیز ہے، بیویاں تو دُنیا چُھڑوا دیا کرتی ہیں!

جو لوگ تمباکو نوشی چھوڑنے میں اب تک کامیاب نہیں ہو پائے وہ اِس بات سے سبق سیکھیں کہ امریکی صدر نے بھی بیوی کے دباؤ سے یہ عادت ترک کردی۔ اور جو بیوی کے دباؤ پر تمباکو نوشی ترک کرنے کے بعد اپنے آپ سے شرمندہ ہیں وہ ہرگز دِل چھوٹا نہ کریں۔ (کبھی کبھار) عزت اور (بیشتر اوقات) ذِلّت اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر وسیلہ اُس نے بیویوں کو بنا رکھا ہے!

مرزا تنقید بیگ کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو بیویوں سے صرف ڈرتے نہیں بلکہ اِس وصف" کو ہر معاملے میں کامیابی کا بہترین نُسخہ گردانتے ہیں۔ گھریلو محاذ پر پلک جھپکتے" میں شکست تسلیم کرنے کو وہ سب سے بڑا ہتھیار قرار دیتے ہیں! کامیاب گھریلو زندگی کے بارے میں بحث کے دوران مرزا نے ہمیں بیوی سے نہ ڈرنے کا حامی پاکر بارہا مطعون کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرزا کا استدلال یہ ہے کہ جس چیز سے بچنا ممکن ہی نہیں اُس سے بچنے کا ناٹک کیا ہی کیوں جائے! اِس معاملے میں وہ باقی صدیقی مرحوم کے اِس شعر کو حرفِ آخر قرار دیتے ہیں۔ ؎

اپنی قسمت سے ہے مَفَر کِس کو؟
!تیر پر اُڑ کے بھی نشانے لگے

مرزا کہتے ہیں کہ جو کام ہو کر رہنا ہے اُس سے بچنے کی کوشش وقت اور توانائی کے ضیاع سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اِس معاملے میں مرزا کا حرفِ آخر یہ ہے کہ انسان موت سے نہیں بچ سکتا اور شادی شدہ انسان بیوی سے! چالیس سالہ ازدواجی زندگی نے مرزا کا جو حال کیا ہے اُسے دیکھ کر اُن کی بات کو بالکل دُرست مان لینے کے سِوا چارہ نہیں۔
بیوی کی ناراضی کے خوف سے تمباکو نوشی ترک کرنے سے متعلق بارک اوباما کے

اعتراف کا سُن کر مرزا بہت خوش ہوئے۔ خوشی یہ سوچ کر نہیں تھی کہ واحد سُپر پاور کے سربراہ کو اللہ یونہی ذلیل کیا کرتا ہے بلکہ اِس خیال سے تھی کہ جس طرح دُنیا کا کوئی بھی کمزور ملک امریکی خارجہ پالیسی کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں بالکل اُسی طرح خود امریکی صدر بھی بیوی کی دسترس سے دُور نہیں! ـ

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
!اُن کی زُلفوں کے سب اسیر ہوئے

مرزا کا کہنا ہے کہ بیوی سے ڈرنے سے متعلق امریکی صدر کا اعتراف بہت سے شوہروں کے درجات بلند کرتا ہے۔ ایک طرف تواُنہیں یہ سوچ کر رُوحانی تسکین ملتی ہے کہ بیوی سے تو طاقتور ترین ملک کا صدر بھی محفوظ نہیں۔ اور دوسری طرف کروڑوں شوہر ایک ہے ہلّے میں ''پریزیڈنشل کلب'' کا حصہ بن گئے ہیں! صدر اوباما نے نجی گفتگو میں ایک حسین اعتراف کرکے کروڑوں دِلوں کی تالیف کی ہے۔ اور مرزا کے خیال میں !اِس ''نیکی'' کا اجر اللہ کے ہاں مقرر ہے

ریاست ہائے متحدہ امریکا کے لیے سُتون کا درجہ رکھنے والی شخصیات کی بیویاں چاہیں تو جنت کما سکتی ہیں۔ جس طرح مشل اوباما نے اپنی ناراضی کا پاؤں شوہرِ نامدار کی گردن پر رکھ کر تمباکو نوشی ترک کرائی ہے بالکل اُسی طرح دیگر

اعلیٰ امریکی عہدیداروں کی بیگمات بھی کچھ کریں۔ وہ اگر شوہروں کی چند بُری عادات چُھڑوائیں تو دُنیا کا بھلا ہو جائے۔ امریکی پالیسی میکرز کی بیویاں تھوڑا سا دباؤ ڈالیں تو وہ دوبارہ انسان بن سکتے ہیں۔ اور اگر وہ دوبارہ انسان بن گئے تو کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں کا بھلا ہو گا کیونکہ امریکی پالیسیاں خون پینے کی عادت ترک کریں گی! امریکی قائدین دنیا بھر کے غریبوں کو سگریٹ کی طرح پُھونکنے کے شوقین رہے ہیں۔ اگر اُن کی بیویاں تھوڑی کوشش کریں تو اُن کی یہ منحوس اور امن دُشمن عادت چُھڑا سکتی ہیں۔

!ایک کال، لاکھوں کا سپنا..... اور لُٹ گئے آپ

سب دُھتکار رہے ہیں۔ کوئی سہارا دینے کو تیار نہیں۔ زندگی دُشوار سے دُشوار تر ہوتی جاتی ہے۔ ہر طرف مایوسی کا اندھیرا ہے۔ ایسے میں کچھ بھی سُجھائی نہیں دے رہا۔ پھر اچانک حالات خاصا خوشگوار ٹرن لیتے ہیں۔ کہیں سے کوئی اجنبی نمودار ہوتا ہے جو سہارا بھی دیتا ہے اور اپنے ساتھ ایک نئی دُنیا میں لے جاتا ہے۔ یہ نئی دُنیا ذرا نیچے بھی ہوسکتی ہے۔ ایسی دُنیا کو اصطلاحاً ''انڈر ورلڈ'' کہا جاتا ہے۔

یا پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی خاصی مالدار شخصیت زمانے بھر کے دُھتکارے ہوئے شخص کو گلے لگاتی ہے، اپنے ساتھ رکھتی ہے، بہتر زندگی بسر کرنے کے وسائل فراہم کرتی ہے اور یوں اُس کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیتی ہے۔

آپ سوچیں گے یہ سب کچھ تو خاصا جانا پہچانا ہے۔ جی ہاں۔ فلموں میں ایسا ہی ہوتا ہے، بلکہ ایسا فلموں ہی میں ہوتا ہے! فلم میکرز ہماری نفسی ضرورتوں اور ناآسودہ خواہشات سے کھیلتے ہیں۔ جو کچھ حقیقت اور عمل کی دُنیا میں اچھی خاصی محنت سے بھی نہیں ہو پاتا وہ فلموں میں (بظاہر کسی جواز کے بغیر)

خاصی آسانی سے ہو جاتا ہے یا ہوتا ہوا دکھایا جاتا ہے۔

راتوں رات سب کچھ پانے کی آرزو، بلکہ ہوس ہے کہ پنپتی ہی جاتی ہے۔

ہاتھ پیر ہلائے بغیر دنیا کی ہر نعمت کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی خواہش کا یہ عالم ہے کہ اِسے سَمونے کے لیے کائنات کی وسعتیں بھی ناکافی محسوس ہوتی ہیں۔

شدید بے عملی کے پہلو بہ پہلو بھرپور دولت، شہرت اور عزت پانے کی تمنا ہے کہ پیر پسارے ہی جارہی ہے۔

ہم جس ماحول میں جی رہے ہیں اُس میں یہی سب کچھ ہے۔ جس طرح فلموں میں منظر بدلتا ہے بالکل اُسی طرح ہم عملی زندگی میں منظر بدلنے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ یہ سوچنے کی زحمت ہم کبھی گوارا نہیں کرتے کہ فلموں میں بھی منظر بدلتا نہیں، بدلا جاتا ہے! حقیقت اور عمل کی دُنیا میں بھی تبدیلی آتی نہیں، لائی جاتی ہے۔ ہم رات دن تبدیلی کے وارد ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ عمل کی دُنیا متقاضی رہتی ہے کہ تبدیلی کو یقینی بنانے کے لیے ہاتھ پیر ہلائے جائیں، دادِ عمل دی جائے، تحرک اپنایا جائے۔

پاکستانی معاشرہ عجیب دور سے گزر رہا ہے۔ ہر شخص دیکھتے ہی دیکھتے، بلکہ پلک جھپکتے میں کسی بھی شعبے کی تمام بُلندیاں چُھو لینا چاہتا ہے۔ کوئی ناکامی کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا اور اس بات کو بھی پسند نہیں کرتا کہ اُسے جاں فشانی سے کام کرنے کا مشورہ دیا جائے۔

ایسا تو فلموں میں ہوتا ہے کہ کوئی ایک واقعہ رُونما ہو اور سبھی کچھ بدل جائے۔ حقیقی زندگی میں سب کچھ ایسے اُصولوں کے تابع ہوتا ہے جنہیں تبدیل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ کچھ پانے کے لیے محنت لازم ہے۔ محنت کرنے کی سکت یا جگرا نہ ہو تو کوئی بات نہیں، خوشامد کو آزمایئے۔ اور اگر خوشامد پر بھی دِل مائل نہ ہوتا ہو تو سازش کا آپشن اختیار کیجیے۔ یعنی محنت، خوشامد یا سازش میں سے کسی ایک راہ پر تو گامزن ہونا ہی پڑے گا۔ اور اِدھر عالم یہ ہے کہ لوگ اِن میں کوئی بھی آپشن اپنانا نہیں چاہتے۔ الہ دین کے چراغ کی تلاش ہے تاکہ اُسے رگڑیں اور سب کچھ مل جائے۔ مگر اب اِس کا کیا علاج کہ لوگ الہ دین کے چراغ کو رگڑنے کی زحمت گوارا کرنے کو بھی تیار نہیں! یعنی چراغ خود ہی رگڑ جائے اور جن باہر نکل آئے!

لوگ ایک کال پر سب کچھ چاہتے ہیں۔ یعنی کہیں سے کوئی کال آئے اور مقدر جاگ جائے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ خواہش اور ہوس کی دنیا میں تو کچھ بھی، بلکہ سب

کچھ ہو سکتا ہے۔ جاگتی آنکھوں کے خواب ایسی دُنیاؤں کی سیر کراتے ہیں جن میں ہر طرف راحت ہی راحت ہوتی ہے، سب کچھ "دما دم مست قلندر" کے مصداق پورے جوش و خروش کے ساتھ چل رہا ہوتا ہے، کہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی اور سب مکمل خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ جاگتی آنکھوں کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے دیکھنے کی دُھن میں مگن رہنے والے رات دن کسی ایسے واقعے کے رُونما ہونے کا انتظار کرتے ہیں جو پل بھر میں سب کچھ بدل دے۔ فلموں کا سلسلۂ واقعات لوگ حقیقی زندگی میں چاہتے ہیں۔ اور کیوں نہ چاہیں؟ زندگی میں انقلابی تبدیلی تو اِسی طور واقع ہو سکتی ہے۔ سیاست دانوں کے بیانات اور میڈیا کی چیخ پُکار سے سب کچھ تو نہیں بدل سکتا۔ بس، تو پھر لازم ہے کہ کہیں سے کال آئے اور من موہنی آواز میں انتہائی پُرکشش انعامات کی نوید سُنائی جائے۔

پس ماندہ ممالک میں زندگی جتنی دُشوار ہوتی جاتی ہے، ہاتھ پیر ہلائے بغیر سب کچھ پانے کی تمنا بھی اُتنی ہی پنپتی جاتی ہے۔ اِس کیفیت کا فائدہ وہ لوگ اُٹھاتے ہیں جو مجبوروں اور مُفلسوں کی نَفسی کمزوریوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی کال کرکے بہت بڑے نقد انعام یا پلاٹ کے ملنے کی خوش خبری سُناتا ہے، سُننے والے کی آنکھیں جگمگانے لگتی ہیں۔ چند لمحات کے لیے حقیقت پسندی کو لپیٹ کر طاقِ نسیاں پر رکھ دیا جاتا ہے۔ کال ریسیو کرنے والا خیال

وخواب کی دُنیا میں گم ہو کر خوش حالی کی بے کراں فضاؤں میں اُڑنے لگتا ہے۔ ایک پل کے لیے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی کہ فی زمانہ لوگ اپنے مفاد کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے حقیقی بھائی کے مفاد کا گلا گھونٹنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تو پھر کوئی اِتنا مخلص کیسے ہو سکتا ہے کہ کہیں پوری ایمانداری سے قرعہ اندازی کرے اور جس کا نام نکلے اُس کال کر کے مطلع بھی کرے!

جنوبی ایشیا اور دیگر پس ماندہ خطوں کے لوگ آسرے پر زندہ رہتے ہیں۔ آسرا یہ کہ کوئی لاٹری نکل آئے اور زندگی کا رُخ تبدیل ہو جائے۔ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور خطے کے دیگر ممالک میں کروڑوں افراد لاٹری کے ٹکٹ خریدتے ہیں تاکہ ایک ہی جھٹکے میں ساری مشکلات کا جھٹکا ہو جائے۔ اِس نفسی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے والے بھی موجود اور متحرک ہیں۔ جب تک بے وقوف زندہ ہیں، عقل مند بُھوکے نہیں مر سکتے۔

فراڈیے اب موبائل فون پر بھی شروع ہو گئے ہیں۔ کسی دن اچانک انجانے نمبر سے کال آتی ہے۔ کال کرنے والا ایسی ملائمت سے لاکھوں روپے کا انعام یا قرعہ اندازی میں پلاٹ نکلنے کی خوش خبری سُناتا ہے جیسے کال ریسیو کرنے والے کا کوئی قریبی رشتہ دار کروڑوں کی جائیداد کا وارث بنانے والی وصیت چھوڑ کر

مرا ہے! انعام کا مژدہ سُنانے کے بعد پروسیسنگ کے نام پر چند سو روپے کا بیلینس بھیجنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اور اِس ہدایت پر عمل کرنے والوں کی بھی کمی نہیں! خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی آنکھوں پر بھی لالچ کے پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ اچھی خاصی رقم اِس بَھٹی میں جھونک بیٹھتے ہیں۔ حیران نہ ہوں؟ خواہشات اور اُمید کی فضا میں سانس لینے والوں سے ایسی ہی ''دانش'' کی توقع رکھی جانی چاہیے!

کہیں آپ کو بھی کسی ایسی کال کا انتظار نہیں جو آن کی آن میں دُنیا ہی بدل دے؟ یہ مایا جال ہے۔ انسان کی نفسی کمزوریوں کا فائدہ اُٹھانے والے بُھوکے بھیڑیوں کی طرف ہر طرف گھوم رہے ہیں۔ اِنہیں سادہ لوح ہرنوں کی تلاش رہتی ہے۔ ہر چمکیلی چیز سونا نہیں ہوتی۔ صحرا میں بہت دور لہریں مارتا پانی سراب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ خواہشات کے صحرا میں بھی بہت دور پانی لہریں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ نظر کا دھوکا جیسے ہی ختم ہوتا ہے، ہم خود کو تپتے صحرا میں پاتے ہیں۔ انجانی کالز کے ذریعے انعامات کی خوش خبری بھی سراب ہے۔ اپنی خواہشات اور اُمیدوں کے دائرے کو اِتنی وسعت مت دیجیے کہ باقی سب کچھ اِس سے باہر جا گرے!

جانے وہ دِن کب آئے؟

کوئی ایک کہانی ہو تو سُنائی جائے۔

کوئی ایک فسانہ ہو تو کسی نہ کسی طور بیان بھی ہو پائے۔

کوئی ایک دُکھڑا ہو تو کسی کے گوش گزار کرکے دل کا بوجھ ہلکا کیا جائے۔

یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ ایک مصیبت آتی ہے اور ایک جاتی ہے۔ اور یہ بھی صرف کہنے کی حد تک ہے۔ کوئی مصیبت آجائے تو پھر جاتی کہاں ہے؟ ہمارے اندر ہی کہیں نہ کہیں بیٹھ جاتی ہے اور وقتاً فوقتاً درشن دیتی رہتی ہے۔

عوام کی حالت اب عجیب بھی ہے، غریب بھی۔ یعنی اُنہیں دیکھ کر غُربت کا شدید احساس بھی ہوتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ تعجب بھی ہوتا ہے کہ اب تک زندہ ہیں! یہ سب کچھ اِس لیے ہے کہ اِس قوم میں بعض ایسے ہیں جو بہت "عجیب و امیر" ہیں!

ہمیں تو سڑک کے کنارے لگی ہوئی گنّے کا رس نکالنے کی مشینوں کے پہلو میں پڑے ہوئے پُھوس پر رشک آتا ہے۔ جب گنّے سے رس نکالا جاچُکتا ہے تو پُھوس کو ایک طرف ڈال دیا جاتا ہے۔ عوام کو یہ سہولت میسر نہیں۔ حکومتیں اُن سے رس نکالتی رہتی ہیں اور ایک طرف ڈالنے کا سوچتی بھی نہیں۔ یعنی اُنہیں پُھوس کی منزل میں بھی نہیں رہنے دیتیں۔ یہ تو عوام ہی کا حوصلہ ہے کہ کسی نہ کسی طور دوبارہ جی اُٹھتے ہیں۔ فی زمانہ یہ بھی معجزے سے کم نہیں۔ دنیا بھر کے سائنس دان دیکھیں اور غور کریں تو حیران رہ جائیں بلکہ غش کھا جائیں۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے کہ گائے سے صرف دودھ دوہ لیا جائے اور چارا نہ ڈالا جائے؟ یہ کس طور ممکن ہے کہ کھیت سے صرف فصل لی جائے اور صفائی کرکے، کھاد وغیرہ ڈال کر زمین کی زرخیزی بحال کرنے کا اہتمام نہ کیا جائے؟ کوئی بھی مشین کیا صرف پروڈکشن دینے کے لیے ہوتی ہے؟ کیا اُس کی مینٹیننس لازم نہیں ہوا کرتی؟ دنیا بھر کے ماہرین دیکھیں تو (اپنے) دانتوں تلے انگلیاں دبالیں بلکہ چبا ڈالیں کہ پاکستان کے عوام وہ مشین ہیں جنہیں بظاہر کسی سطح پر مینٹیننس کی ضرورت نہیں۔ ماہرین پاکستانیوں کی ذہنی ساخت (!) کا معائنہ کریں تو ایسی مشینیں تیار کرنے کے قابل ہوجائیں جو مینٹیننس کی خواہش کئے بغیر محض کام کرتی رہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑکوں پر رکشے دُھواں دیتے ہوئے گزرتے ہیں۔ بہت سے

گاڑیاں چلتے چلتے اچانک بند ہو جاتی ہیں۔ دھاتوں سے بنے ہوئے بے زبان انجن بھی مینٹیننس نہ ہونے پر بند پڑ کر احتجاج کرتے ہیں، اشارا دیتے ہیں کہ بس بہت ہو چکا۔ یعنی مینٹیننس کا اہتمام کیا جائے۔ اور ایک ہم ہیں کہ چلے جا رہے ہیں۔ تاسف ہے نہ احتجاج۔ ع

خوشی ہے غم کی، نہ غم خوشی کا

پڑولیم مصنوعات مہنگی ہوتی جا رہی ہیں، توانائی کے نرخ بلند ہوتے جا رہے ہیں اور جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنا انتہائی دشوار ہوتا جا رہا ہے مگر اِس کے باوجود سب کچھ چل رہا ہے۔ کہیں، کسی بھی سطح پر کچھ بند ہو تو ''گڈ گورننس'' کے دعویداروں کو اندازہ ہو کہ عوام کچھ چاہتے ہیں۔ پیغام ضرور جائے گا کہ اُن کی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی تو زندگی کی گاڑی نہیں چلے گی، ملک جہاں ہے وہیں پڑا رہے گا۔

ایک زمانے سے پاکستان سیلف بیلینسنگ سسٹم کے تحت چل رہا ہے۔ اکاؤنٹنگ میں سیلف بیلینسنگ ایک معروف طریقہ ہے۔ ہر انٹری کے بعد سب کچھ بدل جاتا ہے اور اکاؤنٹ کو اپ ڈیٹ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یعنی ایک انٹری جتنی تبدیلیاں لاتی ہے وہ تمام کی تمام خود بخود واقع ہوتی جاتی ہیں۔ یہی حال پاکستانی معاشرے کا ہے۔ جب پڑولیم کے نرخ بڑھتے ہیں تو نقل و حمل کے اخراجات بڑھتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں ہر چیز کے دام بڑھتے ہیں۔ چائے، پراٹھا، مکھن ،

پاپے، دودھ، ڈبل روٹی، سالن، چکن تکہ، چرغہ، مکانات اور بس کا کرایا، سنیما کا ٹکٹ، اسکول کی فیس، میڈیکل ٹیسٹ کے چارجز، کنسلٹیشن فیس، گڑھا کھودنے والے کی دیہاڑی غرض سبھی کچھ بڑھ جاتا ہے۔ سب اپنے اپنے دام بڑھاتے جاتے ہیں۔ یعنی جب حکومت ہمیں لُوٹنے کا اہتمام کرتی ہے تو ہم ایک دوسرے کو لُوٹ کر اپنا نقصان پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں! اِس کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت خواہ کچھ کرلے، ہم اپنے لیے کوئی بھی دباؤ پیدا ہی نہیں ہونے دیتے۔ مہنگائی سے نمٹنے کا اِتنا اچھا طریقہ کم اقوام ہی کو سُوجھا ہوگا!

ایک زمانے سے لوگ اخباری کالموں اور تجزیوں میں اندازے لگاتے آئے ہیں کہ مہنگائی بڑھتی رہی تو عوام کا کیا بنے گا۔ اور عوام تمام تجزیوں اور اندازوں کو غلط ثابت کرتے آئے ہیں۔ صحافتی دُنیا کے بزرجمہروں کی مُوشگافیوں پر یقین کیجیے تو اِس ملک کے عوام کب کے ختم ہوچکے۔ یہ تو بس عوام کا ملبہ ہے جو تا حال ہٹایا نہیں گیا!

مہنگائی زلزلے کے جھٹکوں کی طرح ہے۔ یعنی مہنگائی کے جھٹکے آتے رہتے ہیں اور ہم اپنی جگہ قائم و دائم رہتے ہیں۔ اہلِ وطن کی استقامت کا اندازہ لگانا ہے تو صرف اِس امر کا جائزہ لینا کافی ہے کہ وہ مہنگائی کو کسی بھی طور، کسی بھی سطح پر خاطر میں نہیں لاتے۔ جب بھی حکومت کچھ مہنگا کرتی ہے

تو لوگ بھی خم ٹھونک کر میدان میں آ جاتے ہیں۔ ۔

اِدھر آ ستم گر! ہنر آزمائیں

!تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں

گویا ستم گری اور ستم رسی کے درمیان مقابلہ ہے۔ کہنے کو ستم گر کامیاب رہتے ہیں مگر !ذرا سوچیے کہ وہ کہاں سے کامیاب ہوں اگر ستم جھیلنے والے نہ پائے جاتے ہوں

برِ صغیر کی عظیم فیچر فلم "مغلِ اعظم" میں انار کلی کے مسئلے پر شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر اور اُن کے لاڈلے اِکلوتے بیٹے نورالدین جہانگیر عرف شہزادہ سلیم میں ٹھن جاتی ہے۔ شہنشاہ اکبر پوری مغلیہ شان و شوکت کے ساتھ مجبور و بے کس انار کلی پر واضح "! کرتے ہیں۔ "سلیم تمہیں مرنے نہیں دے گا، اور ہم تمہیں جینے نہیں دیں گے

سنت کبیر داس نے اِسی بات کو یوں کہا ہے کہ دو پاٹن کے بیچ میں باقی بچا نہ کوئے۔ پاکستان کے عوام بھی انار کلی والا نصیب لیکر پیدا ہوئے ہیں۔ عالمی مالیاتی ادارے چاہتے ہیں کہ ہم زندہ نہ رہیں۔ اور ہمارے دیسی حکمران مجبور ہیں کہ ہر حال میں ہمیں زندہ رکھیں۔ اگر ہم ہی نہ رہے تو وہ حکومت کس پر

!کریں گے

دیکھیے آزمائے جانے کا سلسلہ کب ختم ہو، یہ پاپ کب کٹے، کب اِس الم نصیب شب کی سحر ہو، حکمرانی کے نام پر عوام سے صرف کِھلواڑ کرنے والوں کا ضمیر بیدار ہو اور وہ سِتم پر سِتم ڈھانے سے باز آئیں، اپنے گریبان میں جھانک کر کچھ سوچیں اور عوام کے لیے چند ایک آسانیاں یقینی بنانے پر متوجہ ہوں۔ جب ایسا ہوگا تو عوام بھی روش بدلیں گے اور مہنگائی کے ہر تازیانے پر اپنے دِل سے یہ کہنا چھوڑیں گے ۔

اُٹھائے جا اُن کے سِتم، اور جیئے جا

!یونہی مُسکرائے جا، آنسو پیے جا

"سِکّہ خائف الوقت"

ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے۔ اگر ایسا ہو تو کوئی کیسے آگے بڑھے ؟ صرف ایک صورت میں ایسا ہو سکتا ہے کہ اِنسان مُنہ پیچھے کی طرف کرلے ! مگر ایسا کرنے کی ہمت کوئی کم ہی پیدا کر پاتا ہے۔

اِس وقت پاکستان اور بھارت بازارِ زر کے اُتار چڑھاؤ کے حوالے سے ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہیں۔ دونوں کی کرنسی ایک قدم آگے بڑھتی ہے اور پھر دو قدم پیچھے ہٹتی ہے یا پسپا ہونا ہی پڑتا ہے۔

اگر کسی نے کبھی کوئی بَھٹّہ بیٹھتے نہیں دیکھا یا سمندر کے جھاگ کو بیٹھتے نہیں دیکھا تو غم نہ کرے، پاکستان اور بھارت کی کرنسی پر ایک طائرانہ سی نظر ڈال لے۔ جب اعتماد کا ریتیلا گھروندہ ڈھے جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ صرف ریت کا ڈھیر رہ جاتا ہے۔ ڈالر نے کچھ ایسا "وختا" ڈالا ہے کہ دونوں پڑوسیوں کا روپیہ اُس کے آگے سجدہ ریز ہے۔

حالات ایسے ہیں کہ ڈالر پر لوگوں کا اعتماد بڑھتا جارہا ہے اور یہ سب دیکھ کر دونوں ملکوں کی کرنسیوں پر لرزہ طاری ہے۔ یعنی پاکستان اور بھارت کا سِکّہ رائج الوقت ڈالر کے سامنے

!سکّہ خائف الوقت'' ثابت ہو رہا ہے''

سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے خزانہ کے اجلاس میں اسٹیٹ بینک کے گورنر یاسین انور نے بازارِ زر کے معاملات کو حسّاس قرار دیتے ہوئے ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر میں غیر معمولی گراوٹ کی وُجوہ بیان کرنے سے انکار کردیا۔ موصوف کا استدلال یہ تھا کہ اگر میڈیا میں ایک لفظ بھی غلط رپورٹ ہوگیا تو روپیہ اوپر نیچے ہوسکتا ہے۔ اُوپر تو خیر اُنہوں نے رسماً ہی کہا ہوگا، اب روپیہ صرف نیچے یعنی مزید نیچے ہوسکتا ہے! یاسین انور کہتے ہیں کہ بازارِ زر کی قیاس آرائیوں (سٹّے بازی) کے علاوہ تیل کے ایک سودے کی رقم ادا کرنے کے باعث بھی روپے کی قدر میں گراوٹ آئی۔ یہ بھی خوب رہی۔ کیا ہم تیل خریدتے نہیں رہتے؟ اگر تیل کے کسی سودے کے بُھگتان کا اِتنا منفی اثر مُرتب !ہوسکتا ہے تو روپے کی قدر میں یومیہ بُنیاد پر گراوٹ آتی رہنی چاہیے

اسٹیٹ بینک کے گورنر کا یہ بھی کہنا تھا کہ مُلک سے یومیہ ڈھائی کروڑ ڈالر کی اسمگلنگ ہو رہی ہے۔ اور یہ کہ اسمگلنگ روکنے کے لیے آئی ایم ایف سے جلد معاہدہ طے پا جائے گا۔ یاسین انور نے سب کچھ تو بیان کردیا، پھر وہ کیا تھا جسے بتانے سے انکار کیا؟ ہمارا دِل تو یہ سوچ کر کانپ اُٹھا کہ جو کچھ سامنے ہے وہ اِس قدر لرزہ خیز ہے تو پھر وہ ''حقائق'' کیسے ہیبت ناک ہوں گے

جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا ہے!

سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے خزانہ کے اجلاس میں اسٹیٹ بینک کے حکام کا کہنا تھا کہ آئی ایم ایف سے نیا قرض لینے سے اسٹیٹ بینک کی خود مختاری متاثر نہیں ہوئی! اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ آئی ایم ایف کو پاکستان میں زرِ مبادلہ کے ذخائر کے بارے میں یومیہ، ہفتہ وار اور ماہانہ بنیاد پر باخبر رکھا جائے گا! دیکھا آپ نے؟ اِس طرح محفوظ رکھی جاتی ہے خود مختاری!

جو اپنی ناکامی کو ناکامی سمجھنے کے لیے تیار نہ ہوں وہ تنزل میں بھی ترقی ڈھونڈ لیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ قومی معیشت کے تنزل کو "ترقیٔ مَعکوس" قرار دے کر بھی دِل بہلا سکتے ہیں! روپے کی قدر میں گراوٹ کسی طور حیرت انگیز نہیں۔ اپنے آپ کو مکمل طور پر امریکا کے درِ دولت سے وابستہ کرنے کا یہی نتیجہ برآمد ہونا تھا۔

روپے اور ڈالر کے درمیان چوہے بلی کا کھیل ہو رہا ہے۔ اس کھیل میں جیتنا بلی ہی کا مقدر ہے۔ روپیہ پہلے ہی چوہا ہے اور امریکا کے تابع دار حکمرانوں کی بُزدِلانہ پالیسیاں انوکھے تجربات کے ذریعے اِسے شاہ دَولہ کا چوہا بنانے پر تُلی ہوئی ہیں!

کیا یہ ممکن ہے کہ چوہے کو دیکھ کر بلی دُم دبا کر کونے میں دُبک جائے، بھیگی بلی بن جائے؟ آپ سوچیں گے ایسا تو خیال و خواب کی دُنیا ہی میں ممکن ہے۔ حقیقی دُنیا میں بھی ایسا ناممکن نہیں۔ کبھی آپ نے کانٹوں والا چوہا دیکھا ہے؟ اِس چوہے کو دیکھ کر بڑی سے بڑی بلی کے بھی اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے روپے کو چوہے کی طرح کچلنے، مَسلنے والے امریکی ڈالر کی بلی کے لیے کوئی بھی مضبوط کرنسی کانٹوں والے چوہے سے کم نہیں۔ پاؤنڈ، یورو، ین اور یوآن کو سامنے پا کر ڈالر سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے! اکڑنے کا ڈھونگ رچانے والوں کی یہی نفسیات ہوا کرتی ہے۔ جب تک کمزور کی گردن ہاتھ میں ہے اُس کی ہڈی پَسلی ایک کرتے رہو اور جب کوئی ٹکر کا حریف سامنے آ جائے تو چپ چاپ، پتلی گلی سے نِکل لو! اگر یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تو ممبئی میں بنائی جانے والی ''بھائی لوگ'' کی فلمیں دیکھیے۔

جس طرح امریکی پالیسیوں کے لیے فی زمانہ ہر طرف مشکلات ہی مشکلات ہیں بالکل اُسی طرح ڈالر کو بھی عالمی سطح پر شدید مُسابقت کا سامنا ہے۔ ترقی یافتہ معیشتیں مُنہ دے رہی ہیں۔ جاپانی ین، چینی یوآن، برطانوی پاؤنڈ اور یورو نے قدم قدم پر کانٹے بچھائے ہوئے ہیں جن سے بچ کر چلنا ڈالر کے لیے انتہائی

دُشوار ہوتا جا رہا ہے۔

آپ سوچیں گے امریکی ڈالر تو مضبوط ہو رہا ہے۔ آپ کا ایسا سوچنا غلط اور بے بُنیاد نہیں۔ مگر اِس بات پر بھی تو غور کیجیے کہ ڈالر صرف کمزور کرنسیوں کے مقابلے میں مضبوط ہو رہا ہے۔ ڈالر کی مضبوطی کا مدار دراصل مشکلات میں گھرے ہوئے ممالک کی کرنسی کے کمزور ہوتے رہنے پر ہے! ڈالر کا سارا زور صرف کمزور کرنسیوں پر چل رہا ہے۔ یعنی مرے کو مارے شاہ مدار۔ عالمی بازارِ زر کا یہ شاہ مدار طاقتور کرنسیوں کو اپنے مقابل پا کر جھٹ سے شاہ دَولہ کا چوہا بن جاتا ہے!

امریکی فوج اسٹریٹجک ایڈوانٹیج یقینی بنانے کے لیے افغانستان جیسی غیر موثر یا ناکام ریاستوں پر زور آزمائی کا آپشن استعمال کرتی ہے اور اُس کی کرنسی صرف کمزور کرنسیوں کے سامنے زورِ بازو دِکھاتی اور آزماتی ہے! عالمی بینک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ جیسے اداروں کے ذریعے کمزور کرنسیوں کو مزید کمزور کرنے کا عمل جاری ہے تاکہ ڈالر کی پتنگ کم از کم تھکے ہارے مُلکوں کے معاشی آسمان پر تو اونچی اُڑتی رہے!

امریکا اب بھی سُپر پاور ہے مگر یہ معاملہ مگرمچھ کا سا ہے۔ اُوپر سے جس

قدر سخت، نیچے سے اُسی قدر نرم اور نازک۔ کسی طور نیچے جاکر حملہ کیجیے تو مگرمچھ کچھ نہیں۔

طاقت کے عالمی جنگل میں امریکا بہت حد تک ڈائنوسار کی سی حیثیت حاصل کرتا جارہا ہے۔ ڈائنوسار اپنے غیر معمولی جُثّے کے لیے انتہائی ناکافی دماغ کے باعث ناپید ہوئے۔ امریکا کے پاس دماغ تو خیر اب تک سلامت ہے مگر وہ اُس کے ذریعے صرف عقل کو بروئے کار لارہا ہے، دانش کو زحمتِ کار نہیں دے رہا!

بازارِ زر اصل میں بازارِ خَر ہے۔ جس کرنسی میں تیز دوڑنے کی طاقت اور ہمت نہیں ہوتی وہ گھوڑوں کے بیچ گدھے کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اور پھر اُس کے ساتھ سُلوک بھی وہی کیا جاتا ہے جو گدھوں کے لیے مختص ہے۔ اُنہیں دوسروں کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑتا ہے۔

برِ صغیر کے دو بڑے ممالک کی کرنسیاں وقت اور حالات سے ڈری، سہمی ہوئی ہیں۔ جتنا ڈریں گی، حالات اُتنا ہی ڈرائیں گے۔ آپشن صرف یہ رہ گیا ہے کہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا جائزہ لیکر اُن سے نجات حاصل کی جائے۔ اِسی صورت پاکستان اور بھارت کے سِکّہ رائج الوقت کے ماتھے پر سے "سِکّہ خائف الوقت" کا "جُھومر" ہٹایا جاسکے گا!

قربانی کے بکرے

مویشی منڈی میں بکرے بہت خوش ہیں۔ خوش کیوں نہ ہوں؟ جو اُن کے گلوں پر چُھری پھیرنے کی تیاری کر رہے ہیں خود اُن کے گلوں پر چُھری پھر گئی ہے۔ حکومت نے عیدالاضحیٰ سے بہت پہلے، بلکہ ذی الحج کے ہلال کی رویت سے بہت پہلے بجلی اور پٹرولیم مصنوعات کے نرخ بڑھا کر عوام کے لیے دن کی روشنی میں تاروں کی رویت کا اہتمام کر ڈالا! سپریم کورٹ کی طرف سے برہمی کے اظہار پر بجلی کے پُرانے نرخ برقرار رکھنے کا فیصلہ سامنے آیا۔ مگر اسے آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کیونکہ چند ہی دنوں میں نیشنل الیکٹرک پاور ریگیولیٹری اتھارٹی (نیپرا) نے بجلی کے نئے نرخ بحال کر دیئے!

پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں نے پہلے ہی آگ لگا رکھی ہے۔ جو لوگ حالات سے تنگ آکر خود پر پٹرول یا مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگانے کا سوچا کرتے تھے اب وہ سہم کر کونے میں دُبک گئے ہیں۔ صورتِ حال ایسی ہے کہ اگر کوئی خود پر پٹرول یا مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا بیٹھے تو لوگ ہمدردی کا اظہار کرنے کے بجائے ''کفرانِ نعمت'' کے ارتکاب پر اُسے لعن طعن کا نشانہ بنانے لگتے ہیں!

حکومتی اقدامات نے تمام معاملات کو سمیٹ کر دو وقت کی روٹی کا اہتمام کرنے کی منزل تک پہنچادیا ہے۔ غالبؔ کی زبانی کہیے تو۔

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل

!کہاں کی رُباعی، کہاں کی غزل

مہنگائی نے عوام کی ایسی عجیب حالت کردی ہے کہ جانور بھی دیکھ کر ہنستے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اللہ کا شکر بھی ادا کرتے ہیں کہ اِس پُرآشوب دور میں اِنسان کی حیثیت سے پیدا نہیں ہوئے! اور اِنسان کی حیثیت سے خلق نہ کئے جانے پر جانور کیوں نازاں نہ !ہوں جب اُن کی وقعت دیکھ کر اِنسان شرمسار ہو کر سَر جُھکا لیتے ہیں

عیدالاضحیٰ کی آمد پر ہر بڑے شہر کے باہر ایک بڑی مویشی منڈی لگتی ہے۔ قُربانی کے جانور خریدنے والے تو معدودے چند ہوتے ہیں، تماشا دیکھنے والے البتہ بڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔ دینی تعلیمات یہ کہتی ہیں کہ قربانی کا جانور ہر اعتبار سے صحت مند ہونا چاہیے۔ منڈی میں خریداری کے لیے آنے والوں اور اُن کا ساتھ دینے کے لیے آئے ہوئے اِنسانوں کو دیکھ کر جانوروں میں اعتماد کا گراف بلند ہوتا ہے، اپنی وقعت دیکھ کر وہ !خوشی سے پُھولے نہیں سماتے یعنی اُن کی جسمانی اور صحت کا معیار بلند ہوتا ہے

دیہی علاقوں سے لائے جانے والے قدرے کم حُثے اور بُجھے ہوئے دِل و دماغ کے جانور بھی کراچی اور دیگر بڑے شہروں میں پہنچ کر کِھل اُٹھتے ہیں۔ جب وہ منڈی میں اپنی دن بہ دن بڑھتی قیمت پر نظر ڈالتے ہیں تو فخر سے سَر بلند ہوتا جاتا ہے۔ اور فروخت ہونے پر جب وہ نئے مالک کے گھر پہنچتے ہیں تو ایسی آؤ بھگت ہوتی ہے کہ اچھی خاصی رقم خرچ کرکے اُسے خریدنے والا اپنے آپ سے شرمسار سا دکھائی دیتا ہے!

جو بے چارے سال بھر کی قربانی دیتے رہتے ہیں اُنہیں عید الاضحیٰ پر بھی قربانی کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ ہم سے جب بھی اہل خانہ نے جانور لانے کی فرمائش کی ہے، ہم نے یہی کہتے ہوئے اُنہیں ٹالنے کی کوشش کی ہے کہ ہم روزانہ گھر آ تو جاتے ہیں۔ اب کسی اور جانور کی کیا ضرورت ہے؟ ارشاد ہوتا ہے کہ جانور قربانی کے لیے چاہیے۔ ہم جواب دیتے ہیں کہ ہم بھی تو سال بھر ذبح ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پھر بھلا بے زبان جانوروں کو زحمت کیوں دی جائے؟ ہمارے استدلال پر اہل خانہ نے ہمیشہ یہ جواب دیا ہے کہ بات ذبیحے کی ہو رہی ہے، جُھٹکے کی نہیں!

اگر کوئی اہلِ خانہ کے طعنوں سے تنگ آ کر مویشی منڈی کا رُخ کرے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گیدڑ نے شہر کا رُخ کیا ہے! مویشی منڈی پہنچ کر انسان کو

اپنی وقعت کا یعنی بے وقعت ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ گائے، بیل اور بکرے کی قیمت سُن کر ہم نے اچھے اچھوں کا پِتہ پانی ہوتے دیکھا ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ گھاس چرنے والوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر گھاس چرنے سے گریز کرنے والے جانور خود کو گھسیارا محسوس کرنے لگتے ہیں! آن کی آن میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ جو شان و شوکت قربانی کے جانوروں کو نصیب ہوئی ہے اُس کا عشرِ عشیر بھی مل جائے تو اِنسان اِس دُنیا میں سَر اُٹھاکر بھرپور شان سے زندگی بسر کرے!

قربانی کے جانور کی خریداری میں اگر خواتینِ خانہ بھی شریک ہوں تو اُن کی آنکھوں پر پڑے ہوئے بہت سے پردے اُٹھ جائیں گے۔ مویشی منڈی میں پہنچ کر خواتین کو اندازہ ہوگا کہ شاپنگ سینٹرز میں وہ کپڑے کے تاجر یا کاسمیٹکس کے دکاندار سے جو بارگیننگ کرتی ہیں وہ محض آنکھوں کا دھوکا ہے۔ قربانی کے جانور کی خریداری وہ مرحلہ جو تھوڑی سے محنت اور ”فرنشنگ“ سے سفارت کاری کے مرتبے کو چُھو لیتا ہے! خواتین کو ایک طرف تو قربانی کے جانوروں کی وقعت کا اندازہ ہوگا اور دوسری طرف ممکنہ طور پر اُن کے دِلوں میں شوہروں کے لیے کسی حد تک رحم کا جذبہ ضرور پیدا ہوگا۔ جس نظر سے قربانی کے جانوروں کو دیکھا جاتا ہے اُس سے مِلتی جُلتی یا تھوڑے سے کم درجے کی نظر سے شوہروں کو بھی دیکھا جانے لگے تو قربانی کے اِن ”بازبان“ جانوروں کی تھوڑی بہت

تشفّی ضرور ہوسکے گی!

قُربان ہونے تک

ہم سب جانتے ہیں کہ عید الاضحیٰ ہمیں ایک عظیم قُربانی کی یاد دلاتی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اور ہمارے قربان ہوتے رہنے کی حقیقت اپنی جگہ۔ اب عید الاضحیٰ کی آمد پر ہم جس بے ڈھنگے انداز سے قربان کئے جاتے ہیں اُس کی کوئی نظیر نہیں لائی جاسکتی!

قربانی کا جانور خریدنے کا ارادہ کرنے سے خریداری اور پھر ذبیحے تک ہر عمل، ہر مرحلہ ہمارے حلقوم پر سو سو بار چُھریاں پھیرتا ہے۔ اور سیانے اِسے ذبیحہ بھی نہیں سمجھتے کیونکہ انداز سراسر جھٹکے کا ہوتا ہے!

مویشی منڈی جائیے تو جانوروں کی قیمت سُن کر اپنی بے بضاعتی کا پوری شِدّت سے احساس ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آج کا انسان جانوروں کی سطح پر آگیا ہے۔ ہم کہیں گے بالکل غلط۔ ہم کہاں اور جانور کہاں؟ ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ اگر واقعی جانوروں کی سطح پر پہنچ جائیں یعنی جانور سمجھ لیے جائیں تو اپنی قدر و قیمت جان کر خوشی کے مارے چل بسیں گے! اور زندہ بھی رہے تو سَودا گھاٹے کا نہیں رہے گا کیونکہ اِتنی آؤ بھگت ہوگی کہ اپنی ''اِنسانیت'' پر شرمندگی سی ہونے لگے گی!

بہت سے لوگ قربانی کا جانور خریدنے منڈی کا رُخ کرتے ہیں تو خاصا وقت گزارنے کے بعد اپنا سامُنہ لیکر خالی ہاتھ واپس آ جاتے ہیں۔ دِل میں یہ خیال پنپ رہا ہوتا ہے کہ جتنی وقعت قربانی کے جانور کی ہے اُس کا 10 فیصد بھی میسر ہو تو آخرت نہ سہی، دُنیا ضرور پنپ جائے!

فی زمانہ قُربانی بڑے دِل گردے کا کام ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اِس کے لیے جگر نہیں، جگرا درکار ہے۔ قربانی کے جانور کی خریداری سے ذبیحے تک پورا عمل سراسر فن ہے، فنکاری ہے۔ کہیں کہیں یہ عمل کے ساتھ ساتھ علم کا درجہ بھی اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح بیماروں کو ٹوٹکے بتانے والوں کی کمی نہیں بالکل اُسی طرح قربانی کا جانور خریدنے نکلیے تو مشورے دینے والے شہد کی مکھیوں کی آپ پر حملہ کردیں گے! اِن خدائی فوجداروں میں سے کئی تو قربانی کے جانور خریدنے کے فن میں ایسے طاق ہو چکے ہیں کہ کسی طرح سفارت کاری کے میدان میں قدم رکھیں تو شاید ہی کوئی اُنہیں پچھاڑ پائے! منڈی میں قربانی کے جانور کو جس طرح تفصیلی طور پر چیک کیا جاتا ہے اگر رشتہ طے کرتے وقت لڑکے اور لڑکی کو بھی اُسی طرح جانچا اور پرکھا جائے تو ہمارے ہاں طلاق کی شرح اطمینان بخش حد تک گر جائے!

جانور کی خریداری کا مرحلہ اِس قدر دلچسپ ہے کہ شاید خود جانور بھی محظوظ ہوتے ہوں گے ! منڈی سے خریدے ہوئے جانور کو گھر لانے تک کا مرحلہ بھی کم دلچسپ نہیں۔ جانور کا خیر دار راستے میں لوگوں کو اُس کی قیمت بتاتے بتاتے اپنے وجود سے بیزار سا ہو جاتا ہے کیونکہ قیمت سُنتے ہی لوگ اُسے یوں گھور کر دیکھتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں "ابے گھامڑ! تجھ سے اچھا تو یہ جانور ہے جس کی کچھ قدر و قیمت تو ہے"

بچوں کو اگر اجداد کے بارے میں بتایا جائے تو اُن کا سَر فخر سے بلند نہیں ہوتا لیکن گھر کے آگے بندھے ہوئے قربانی کے جانور کو دیکھ دیکھ کر اُن سینہ فخر اور خوشی سے پُھولتا جاتا ہے ! یہ منظر دیکھ کر خاندان کے بزرگوں کی رُوحیں تڑپ تو جاتی ہوں گی !

ذبیحے کی گھڑیاں وارد ہونے سے قبل تین چار دنوں میں جانوروں کا دیدار کرانے کے مقابلے ہوتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں تگڑے جانور کی رِسّی ہو اُس کا پورا وجود بھرپور اعتماد کی تصویر بن کر یہ مصرع گنگنا رہا ہوتا ہے ع

دیکھو اِس طرح سے کہتے ہیں سُخن وَر سہرا

بچوں میں بھرپور خود اعتمادی پیدا کرنے کا ایک اچھا طریقہ یہ بھی ہے کہ تین

چار دن تک قربانی کے تگڑے جانور کی رَسّی تھما کر اُنہیں گھمانے کا موقع دیجیے۔ اِس طرف نفسیات کے ماہرین کی توجہ ابھی گئی۔ ہم نے راز کی بات بتادی ہے تو عمل کر کے !خوشگوار نتائج کا اندازہ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں

جانور کی خریداری اور اُس کی ناز برداری کا مرحلہ گزرتا ہے تو ذبیحے کی منزل آتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ نے کوئی اور شعبہ کیوں منتخب کیا، چُھریوں، بُغدوں اور بِڈھیوں سے دِل لگا کر قصاب کیوں نہ بنے! اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ معاشرے میں اُس کی کچھ وقعت ہے تو ذرا عید الاضحیٰ کے تین دِنوں میں کسی قصاب کے سامنے کھڑا تو ہو کر دکھائے، لگ پتہ جائے گا! اِن تین دِنوں میں پاکستان کا ہر قصاب قربانی کرنے والے ہر شخص کو شہنشاہ سمجھ کر اُس کے دربار میں اپنا مُنہ موتیوں سے بھروانا چاہتا ہے! جانور کی کھال بعد میں اُترتی ہے، اُس سے بہت پہلے صاحبِ خانہ" کی کھال اُتر چکی ہوتی ہے! اور یاد رکھیے، جانور کی کھال اُترتے وقت" نہ لگ جائے۔ قربانی کرنے cut قصاب اِس بات کا پُورا خیال رکھتے ہیں کہ کہیں کوئی !والے کی کھال اُتارتے وقت ایسی کوئی احتیاط بلحوظِ خاطر نہیں رکھی جاتی

ہمارے ہاں ٹین پرسنت کی روایت ایسی مستحکم ہو چکی ہے کہ اب قصاب برادری نے

بھی اپنالی ہے۔ وہ زمانے گئے جب قصاب کچھ بھی لے کر جانور پچھاڑ دیا کرتے تھے۔ اب تو قربانی کے جانور کی قیمت کا 10 فیصد اُسے ذبح کرنے پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جی ہاں، قصاب جانور دیکھ کر کٹائی کے چارجز طے کرتے ہیں۔ اگر جانور ایک لاکھ کا ہے تو کاٹنے کا محنتانہ دس ہزار روپے۔ اگر پچاس ہزار کی رینج کا ہے تو کاٹنے کے لیے پانچ ہزار دیجیے۔ یعنی اب عید الاضحیٰ کے تین دنوں میں ہر قصاب ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' بن بیٹھتا ہے!

جانور ذبح ہوچکا ہے تو یہ مت سمجھیے کہ آپ کا کام ختم ہوگیا۔ سب سے اہم مرحلہ تو اب شروع ہو رہا ہے۔ جی ہاں، گوشت کی تقسیم۔ اِس مرحلے سے بخوبی گزرنے ہی پر اندازہ ہوسکے گا کہ آپ کو رشتے نبھانے کا ہُنر آتا ہے یا نہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اندازہ ہوسکا ہے کہ خاتونِ خانہ پر آپ کا بس یا زور کس حد تک چلتا ہے۔ جو دِل کے جس قدر قریب ہوگا وہ اُسی قدر اچھا گوشت پائے گا۔ اِس حقیقت کو نظر انداز کرنے والے قربانی کے جانور کے ساتھ ساتھ نازک رشتوں کو بھی ذبح کر بیٹھتے ہیں۔ اگر آپ میں تھوڑی بہت بھی سمجھ پائی جاتی ہے تو قربانی کے گوشت کی تقسیم میں وہی کیجیے تو اہلیہ محترمہ کہتی ہیں! اگر اُن کی تجویز کردہ تقسیم نہ اپنائی تو اُن کے دِل میں آپ کے احترام کے حلق پر چُھری پھر جائے گی! اہلِ نظر ایسے مراحل میں کم آمیز رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ گھریلو دانش مندی کا یہی تقاضا ہے۔

قربانی کے گوشت کی تقسیم کے بعد کھانے کا مرحلہ آتا ہے۔ اگر تب تک آپ میں کچھ سکت رہ گئی ہے تو بہت بہت مبارک۔ ہمت سے کام لیجیے تو اپنا سب کچھ قربان کرکے خریدے ہوئے قربانی کے جانور کی چند بوٹیاں تناول فرمایئے۔

حالات اور زندگی بسر کرنے کے انداز نے قربانی کے انفرادی معاملے کو بھی اچھے خاصے extravaganza میں تبدیل کر دیا ہے! ایک سُنّت پر عمل کے دوران اِنسان پر کئی زمانے گزر جاتے ہیں۔ جانور کے پچھاڑے جانے سے پہلے وہ خود بے چارا کئی مقامات پر ڈگمگاتا ہے اور کہیں کہیں تو گر بھی پڑتا ہے۔ قربانی کے جانور کی خریداری سے اُس کے گوشت کی تقسیم اور پکائے ہوئے گوشت کو دستر خوان پر سجانے سمیت تمام مراحل سے آپ بخوبی گزر چکے ہیں یعنی اب تک سلامت ہیں تو آپ واقعی مبارک باد اور داد کے مستحق ہیں۔ قُربانی کے حقیقی جانوروں کو اللہ تعالیٰ ہر عید الاضحیٰ کے بعد نئی زندگی عطا فرمایا کرتا ہے تاکہ وہ بار بار قربان ہو کر اجر پاتے رہیں!

مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے

جادوگروں اور جِنّات سے متعلق بہت سے کہانیاں آپ نے پڑھی ہوں گی۔ اگر آپ کبھی یہ سوچ کر اُداس ہو جاتے ہیں کہ جادو نگری دیکھ نہیں پائے یا جِنّات کے درشن نہیں کر پائے تو ہرگز دِل چھوٹا نہ کریں۔ اپنے ماحول پر نظر دوڑائیے، کچھ ہی دیر میں یقین ہو جائے گا کہ آپ جادو نگری میں ہیں اور جِنات کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں۔

پاکستانی معاشرے میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ نہیں ہے اور جو کہیں وجود ہی نہیں رکھتا وہ دکھائی دے رہا ہے۔ حیرت اِس بات پر ہے کہ اب اِس پر کسی کو حیرت بھی نہیں ہوتی۔ جادو، ٹونے کے چکّر میں پڑنے والوں پر البتہ حیرت ہوتی ہے۔ اب ایسا کون سا کام ہے جس کے لیے جادو، ٹونے کا سہارا لیا جائے؟ اُن کے لیے اپنا ماحول گھر کی مُرغی ثابت ہو رہا ہے یعنی سراسر دال کے برابر ہے۔ موجودہ پاکستانی معاشرے میں کیا ہے جو شعبدہ نہیں؟ کس بات سے جادو نہیں جھلکتا؟ کون سا شعبہ ہے جو طلسمات سا نہیں جان پڑتا؟

طلسمات کیا ہے؟ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے وہ در حقیقت نہ ہو یا کچھ اور ہو۔ اور جو کچھ کسی بھی حیثیت میں وجود ہی نہیں رکھتا وہ آنکھوں کے سامنے موجود

ہو۔ یہاں دَم بہ دَم یہی تو ہو رہا ہے۔

شرت چندر چٹوپادھیائے کے ناول ''دیو داس'' پر سب سے پہلے 1936 میں اِسی نام سے فلم بنائی گئی جس کے ہیرو کندل لعل سہگل تھے۔ 2002 میں شاہ رُخ خان کو مرکزی کردار میں لے کر یہ فلم تیسری بار بنائی گئی جس میں دیو داس کو قدرے outrageous دکھایا گیا۔ اس سے قبل 1955 میں بھی ''دیو داس'' بنائی گئی تھی جس کے ہیرو دلیپ کمار اور ڈائریکٹر بمل رائے تھے۔ ہیرو کو ذہنی طور پر خاصا اُلجھا ہوا دکھایا گیا۔ دلیپ کمار کے اپنے الفاظ میں ''دیو داس کہتا تھا، کرتا کچھ تھا اور ہو کچھ اور جاتا تھا۔'' پاکستانی معاشرے کی بھی کچھ کچھ یہی کیفیت ہے۔ لوگ ہوتے کچھ ہیں، دکھائی کچھ دیتے ہیں۔ کیا کچھ جاتا ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے! کسی معاملے کا سَر دکھائی دیتا ہے نہ پَیر۔ کوئی اگر کچھ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو ایسے طلسمات میں کھو جاتا ہے جس میں مُڑ کر دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے! بہت مغز پاشی کرنے پر بھی کسی معاملے کو سمجھنا ناممکن کی حد تک دشوار ہی رہتا ہے۔ ع

ڈور کو سُلجھا رہا ہوں اور سِرا ملتا نہیں!

گزشتہ دِنوں پرٹی وی پر کسی مغربی ملک کے سرکس کی وڈیو دیکھی۔ ٹھنگنی نسل کے گھوڑے کو خاصی مہارت سے بال (ایال) لگا کر شیر کا ''لُک'' دیا گیا تھا۔

ہاتھ میں ہنٹر لیکر ایک لڑکی اِس شیر نُما گھوڑے کو رِنگ میں دوڑا رہی تھی اور وہ یوں دوڑ رہا تھا کہ دور سے اور بغور نہ دیکھنے پر شیر سا دِکھائی دیتا تھا۔ پھر اُس نے ''مالکن'' کے اشارے پر بندروں کی سی اُچھل کود شروع کر دی! ہنٹر اگر کسی حسین کے ہاتھ میں ہو تو اصلی شیر کو بھی بندر بننے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی، وہ تو پھر گھوڑا نُما شیر تھا! حاضرین یعنی تماشائی حیران رہ گئے کہ یہ کیسا گھوڑا ہے جو دِکھنے میں شیر ہے اور اُچھل کود بندروں والی کر رہا ہے۔

وڈیو میں لوگوں کی حیرت دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ کیوں نہ ہوتی؟ جو تماشا ہم 66 سال سے دیکھتے آئے ہیں جھیلتے بھی آئے ہیں اُسے دیکھ کر اہلِ مغرب محظوظ ہو رہے ہیں! ہمارا سیاسی سرکس ایک زمانے سے یہی سب تو پیش کر رہا ہے۔ گدھوں کا عالمِ شوق دیکھیے تو گھوڑے بننے کو بے تاب دکھائی دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گھوڑے بھی نہیں بن پاتے اور گدھا پن بھی ایسا جاتا ہے کہ پھر ہاتھ نہیں آتا۔ اور پھر اُن کی ''خَچّریت'' ہم عوام کو جھیلنا پڑتی ہے!

گھوڑے بھیس بدل کر شیر جیسے دِکھائی دینے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اور شیر کی سی ہیئت بنانے کے بعد جب لوگوں کو ہیبت زدہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو خوشی کے مارے ''بندرانہ'' حرکتوں پر اُتر آتے ہیں! بے چارے بندر باری کے

منتظر رہتے ہیں۔ اُن کا بیشتر وقت یہ سوچنے میں گزرتا ہے کہ موقع پر ملنے پر وہ کون سا آئٹم پیش کریں گے ! اُن کے حصے کی تمام ''خوش اعمالیاں'' یعنی اُچھل کود تو دیگر سیاسی جانور تماشائیوں کی نذر کر چکے ہوتے ہیں ! ایسے میں اصلی بندروں کی اُچھل کود پُر لطف تو نہیں، ہاں مزاحیہ ضرور دکھائی دیتی ہے

سیاسی بندر ذرا سا موقع ملنے اور اُفق پر امکانات کا اُجالا پھیلنے پر خود کو شیر اور ہاتھی سمجھنے لگتے ہیں اور پھر جب ایک ہی رگڑے سے مُلمع اُتر جاتا ہے تو اپنی اوقات سے بہت نیچے گر کر بھیگی بِلّی کی طرح کھرج کے سُروں میں میاؤں میاؤں کرنے لگتے ہیں !

سیاسی سرکس میں سب سے اہم چیز ہے مفاد کا تحفظ۔ مفادات بچانے کے لیے کسی بھی وقت، کچھ بھی کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہیے ! اچھے خاصے گھاس چرنے والے جانور درندگی پر تُلے ہوئے ہیں اور درندے اپنے مفاد کی خاطر گھاس چرنے سے بھی گریز نہیں کرتے !

جب ریس کے گھوڑوں کو ٹانگے میں جوتا جائے اور ٹانگے کے گھوڑوں کو ریس کورس میں دوڑایا جائے تو تماشا دیکھنے والوں کی دِل بستگی کا سامان تو ہو کر رہے

گا۔ سیاسی سرکس میں معاملہ کچھ یوں ہے کہ جانوروں کی اُچھل کود سے زیادہ دھماچوکڑی تو مسخروں نے مچا رکھی ہے۔ لوگوں کو ہنسانے کی کوشش میں وہ جو مسخرا پن پیش کرتے ہیں اُسے دیکھ کر تماشائی دَم بخود رہ جاتے ہیں کہ داد ہنستے ہوئے دیں یا روتے ہوئے!

ایک زمانہ تھا جب سرکس میں اسٹنٹس کے آئٹمز تمام تماشائی سانس روک کر دیکھا کرتے تھے۔ اب اسٹنٹس دیکھ کر تماشائی سانس تو نہیں روکتے، اسٹنٹ مین اپنے سَر البتہ ضرور تھام لیتے ہیں! اب وہ کیا پیش کریں؟ اُن کے آئٹمز مختلف انداز سے سبھی پیش کر رہے ہیں! سیاسی سرکس کی یہی تو خوبی ہے کہ سب بیک وقت سب کچھ کر رہے ہیں یا کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اپنا کام آئے یا نہ آئے، دوسرے کے میدان میں دوڑ لگانا پیدائشی حق گردانتے ہیں۔

ماحول ایسا ہے کہ کوّے کوک رہے ہیں اور کوئل کائیں کائیں کرنے پر مجبور ہے۔ جن کی ''راگنی'' سُن کر گدھے بھی اپنے ''سُر'' بھول جائیں وہ نغمہ سرائی کے منصب پر فائز ہیں! کسی کا گائیکی پر اختیار ہے نہ گانے والے پر۔ جو گانا جانتے ہیں وہ گانے سے توبہ کر بیٹھے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن کی فنکاری کو لوگ بے سُرا پن سمجھ کر جوتے نہ برسائیں! اور پھر ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اُنہیں صرف گانا آتا ہے۔ اداکاری اُن کے بس کی بات نہیں! اب

گانے میں اداکاری ہے اور اداکاری کے نام پر گانا بجانا ہو رہا ہے۔
مجموعی کیفیت یہ ہے کہ جو کچھ بھی دکھائی دے رہا ہے وہ اپنی اصلیت سے بہت دور ہے اور کچھ کا کچھ لگ رہا ہے۔ راتوں رات سبھی کچھ پانے کی تمنا ہوس کا درجہ اختیار کرچکی ہے۔ سبھی پر وحشت سی طاری ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ وحشت میں کیا ہوتا ہے؟ ؂

وحشت میں ہر اِک نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے!

ہارٹ بریکنگ نیوز

مرزا تنقید بیگ پر جب بے مزا ہونے کا دورہ پڑتا ہے تو اُن کے آس پاس بیٹھے ہوئے سبھی لوگ بے مزا ہو جاتے ہیں۔ کل جب ہم اُن سے ملنے پہنچے تو اِس طرح بیٹھے تھے جیسے کوئی ملے اور وہ اُس پر برس پڑیں۔ ہم چونکہ اُن کے مزاج آشنا ہیں اِس لیے صورتِ حال کو دُور ہی سے بھانپ گئے۔ سلام و دُعا کے بعد جب حال پوچھا تو مرزا اُسی طرح پھٹ پڑنے کو بے تاب ہوگئے جس طرح کوئی بم کسی حملہ آور کے ہاتھ میں پڑتا ہے!

مرزا کا مُوڈ بالعموم اُسی وقت خراب ہوتا ہے جب یا تو وہ اہلیہ سے خوب سُن کر بیٹھے ہوں یا پھر ٹی وی پر کچھ ایسا ویسا دیکھ لیا ہو۔ اور ٹی وی پر چونکہ کچھ نہ کچھ ایسا ویسا دکھائی دیتا ہی رہتا ہے اِس لیے مرزا کا مُوڈ بھی اکثر خراب رہتا ہے۔ ہم اِس کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔ آخر کسی کا اپنے دوستوں پر اِتنا حق تو ہوتا ہی ہے کہ اُسے جھیلا جائے!

ہم نے حال پُوچھا تو مرزا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، الیکٹرانک میڈیا کو غیر منقوط زبان میں ”خراجِ عقیدت“ پیش کرنا شروع کر دیا! میڈیا پر تابڑتوڑ

حملوں کے دوران جب وہ سانس درست کرنے کو رُکے تو ہم نے مزاج کے برہم ہونے کا سبب پوچھا۔ اُنھوں نے ایک معروف شعر کو توڑ مروڑ کر یوں پیش کیا۔

وہ آہ بھی کرتے ہیں تو مل جاتی ہے شہرت
ہم قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا!

چند لمحوں میں یہ عُقدہ کُھلا کہ مرزا کا مُوڈ خراب ہونے کی ''وجہِ تسمیہ'' ریما کی سینڈل کے تسمے کا ٹوٹنا ہے! جناب ریما پر برہم تھے کیونکہ اُس کی وجہ سے نیند ٹوٹی تھی۔ ہوا یہ کہ مرزا دفتر سے تھکے ماندے آئے تھے اور گہری نیند مین تھے کہ بچوں نے یہ کہتے ہوئے جگا دیا کہ تمام نیوز چینلز پر بریکنگ نیوز چل رہی ہے۔ مرزا کو چونکہ بریکنگ نیوز کا ہَوکا ہے اِس لیے اُنھوں نے فوراً ٹی وی آن کیا تو معلوم یہ ہے کہ لاہور کے ایک فیشن شو میں کیٹ واک کے دوران ریما کی سینڈل ٹوٹ گئی ہے! مرزا نے یکے بعد دیگر آٹھ نیوز چینلز کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ سبھی اِس ''قومی سانحے'' کو بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کر رہے تھے!

یہ منظر دیکھ کر مرزا ہتّھے سے اُکھڑ گئے۔ پہلے تو اُنھوں نے بچوں پر طبع آزمائی کی اور اُنھیں اچھا خاصا مطعون کرنے کے بعد میڈیا والوں کی طرف آئے کہ اُنھوں نے بریکنگ نیوز کا معیار اِس حد تک گرا دیا ہے کہ اب کسی

!اداکارہ کی سینڈل کا ٹوٹ جانا بھی اولین ترجیح والی .بریکنگ نیوز میں تبدیل کردیا گیا ہے

ہم نے مرزا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جس معاملے میں کچھ ٹوٹ گیا ہو یعنی break ہوا ہو اُس کا تو حق بنتا ہے کہ .بریکنگ نیوز میں پیش کیا جائے۔ ریما کی سینڈل کا ٹوٹنا ہر اعتبار سے .بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کیا جانے والا واقعہ تھا! اور سچ تو یہ ہے کہ جب سے ریما نے شادی کرکے فلمی دُنیا سے فاصلے پر رہنے کی عادت اپنائی ہے، اُن کے لاکھوں مدّاحوں کے لیے اُن کی ایک جھلک دیکھنا مشکل ہوگیا ہے۔ ایسے میں سینڈل کا ٹوٹنا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنا کہلائے گا۔ یعنی مدّاحوں کی دُعا رنگ لائی اور سینڈل نے ٹوٹ کر منی !اسکرین پر اُن کے درشن کا اہتمام کیا

یہ سُننا تھا کہ مرزا آگ بگولہ ہوگئے۔ ”تم جیسے لوگ ہی میڈیا کو اِس سطح تک لے آئے ہیں۔ کچھ نہیں ملتا تو کیٹ واک میں گڑبڑ کے منتظر رہتے ہو تاکہ کچھ بولنے اور لکھنے کا ”موقع ملے۔

ہم نے سمجھایا کہ ہم سب کمرشل دور میں جی رہے ہیں۔ اب ہر چیز کمرشل ویلیو کے اعتبار سے دِکھتی اور بکتی ہے۔

مرزا بولے۔ ''محنت کرتے کرتے ہماری بھی ''کرشل'' ہو گئی ہے مگر ہمیں تو کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔''

ہم نے تسلی دی کہ بالکل نہ گھبرائیں۔ اب سبزیوں کے دام جس تیزی سے بڑھ رہے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ کچھ دن بعد لوگ دستر خوان پر آپ کے آگے صرف گھاس ہی ڈالا کریں گے!

مرزا ہمیشہ میڈیا والوں پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ رائی کا پربت اور بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔ ہم نے بارہا سمجھایا کہ یہی اُن کا کام ہے، روزی روٹی ہے، مہارت ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر کیا کریں؟ گھوڑا گھاس سے دوستی کرے تو کھائے گا کیا؟ ریما کی سینڈل ٹوٹی تو ہماری آنکھوں میں بھی کالمانہ چمک پیدا ہوئی!

مرزا نے تپ کر کہا۔ ''میں نے کب کہا کہ گھوڑا گھاس سے دوستی کرے؟ نہ کرے دوستی اور خوب گھاس کھائے، مگر عوام کو تو گھاس کھانے پر مجبور نہ کرے!''

ہمیشہ کی طرح مرزا کا استدلال یہ تھا کہ اگر اُن کی چپل ٹوٹ جائے تو اہلیہ خشمگیں نظروں سے گھورتی ہیں اور راستے ہی میں اُلٹا سیدھا سُنانے لگتی ہیں۔ اور اگر کسی سیلیبریٹی کی سینڈل ٹوٹ جائے تو گھر بھر کے افراد ٹی وی سیٹ کے سامنے براجمان ہو جاتے ہیں!
ہم نے مرزا کے گوش گزار کیا کہ ریما ایک باصلاحیت فنکارہ ہے۔ اُسے اپنی خرابی اور کمزوری کو بھی خبر بنانا آتا ہے۔ آپ کی کمزوری تو خود آپ ہی کو خبر بنا سکتی ہے!
مرزا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "ہاں بھائی، وہ talented ہے اور ہم tail-ended ہیں! اُن کی کیٹ واک کو دیکھنے والے تو لاکھوں، بلکہ کروڑوں ہیں۔ ہماری 'ڈاگ واک' کون دیکھے گا! ہاں بھائی، بڑے کی ہر بات بڑی۔ ہم اچھا بھی گائیں تو لوگ بے سُرا قرار دیں۔ اور اگر کوئی خاندانی گویا بے سُرا ہو جائے تو لوگ لے کاری سمجھ کر داد دیتے ہیں!"
ہم نے ڈھارس بندھائی کہ دِل چھوٹا نہ کریں، جس طرح اہلیہ کے سامنے آپ کا کچھ نہیں آتا بالکل اُسی طرح ریما کے "مرزا" بھی بے دام کے ہیں! اگر کبھی ریما کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے اُن کے شوہر کے جوتے کا تلا نکل گیا تو بے

چارے اپنا سا مُنہ لیکر رہ جائیں گے کیونکہ کوئی چینل اِس ''سانحے'' کی بریکنگ نیوز نہیں چلائے گا!

ایک زمانہ تھا کہ نسیم حجازی مرحوم نے ''اور تلوار ٹوٹ گئی'' لکھ کر دِلوں کو گرمایا تھا۔ وہ مِلّی تاریخ کا معاملہ تھا۔ بات قومی تاریخ تک پہنچی تو کوثر نیازی مرحوم کی زبان میں ''اور لائن کٹ گئی'' کہلائی۔ اب ہم اپنی مِلّی و قومی تاریخ کے جس پُرفتن دور سے گزر رہے ہیں اُس میں معاملات ''اور سینڈل ٹوٹ گئی'' کی منزل میں اٹک کر رہ گئے ہیں۔

جب چینلز کے پاس دِکھانے کے لیے کچھ مثبت بچا ہی نہ ہو تو وہ ریما کی سینڈل کے ٹوٹ جانے اور قربانی کی گائے کے نالے میں گر جانے ہی کو بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کر سکتے ہیں! اور جو ایسا نہیں کرتا وہ ریٹنگ کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے! جب تک قوم میں کوئی ڈھنگ پیدا نہیں ہو جاتا تب تک اِسی قسم کی ہارٹ بریکنگ نیوز جھیلتے رہیے۔

امریکا کیلئے "ٹف ٹائم"

واحد سُپر پاور نے دُنیا بھر کے کمزوروں کو تگنی کا ناچ نچایا ہوا ہے۔ کوئی معترض ہوتا ہے تو ہوتا رہے کہ کمزوروں کو دبانا کسی بھی اعتبار سے شجاعت کی دلیل نہیں مگر سُپر پاورز ایسی بے وقوف نہیں ہوتیں کہ ایسی باتوں میں آ جائیں اور اپنی روش ترک کرکے اُنہی جیسی زندگی بسر کرنے لگیں جنہیں وہ دبا کر اعلیٰ معیار کی زندگی کے مزے لوٹتی ہیں! امریکا بھی جانتا ہے کہ وہ بیشتر معاملات میں بہتوں سے زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے مگر کیا کیا جائے کہ طاقت کا یہی تقاضا ہوا کرتا ہے۔

دُنیا بھر کے کمزور رات دن دُعائیں کرتے ہیں کہ امریکا کی توپوں میں کیڑے پڑیں اور اُس کا ککھ نہ رہے۔ ہم بھی امریکا کی بربادی کے لیے دست بہ دُعا رہتے ہیں۔ اِس پر امریکی پالیسی میکرز ذرا بھی جُزبُز نہیں ہوتے، خفیف سا بھی بُرا نہیں مانتے۔ وہ یہی تو چاہتے ہیں کہ ہر زیادتی کے مقابلے پر ہم بد دُعاؤں سے کام لیں، کوسنے پر اکتفا کریں! کبھی کبھی کمزوروں اور مظلوموں کی دُعائیں کسی حد تک مستجاب بھی ٹھہرتی ہیں۔ آخر سو برس میں گھورے کے بھی دِن پھرتے ہیں۔

امریکیوں نے بہت سے معاملات میں پاکستانی حکومت اور پاکستانیوں کو ٹف ٹائم دیا ہے اور دیتا ہی جارہا ہے۔ مگر خیر، ہمارے حکمران بھی کم نہیں۔ بد دُعائیں رنگ لاتی ہیں اور ہر چار پانچ سال بعد پاکستانی سیاست دان امریکا کو ایک انوکھا اور دلچسپ ٹف ٹائم دیتے ہیں۔ امریکا کے لیے تو ٹف ٹائم ہی ہوتا ہے، انوکھا اور دلچسپ ہمارے لیے ہوتا ہے کیونکہ اِس میں اچھی خاصی ورائٹی ہوتی ہے۔

آپ ذہن پر زیادہ زور مت ڈالیے۔ ہم نہیں چاہتے کہ امریکا کے حوالے سے آپ کو پھر ٹف ٹائم ملے۔ امریکی پالیسی میکرز اور حکمرانوں پر نازل ہونے والا ٹف ٹائم خود پاکستانی عوام پر نئی حکومت کے نزول کے دو ڈھائی ماہ بعد آتا ہے۔ جی ہاں، یہ ذکرِ خیر ہے منصب سنبھالنے والے پاکستانی وزیر اعظم کے پہلے دورۂ امریکا کا!

ہمارے ہاں اوّل تو کسی اصول کو اپنانے اور گلے لگانے کا رواج نہیں۔ اور اگر کبھی کوئی اصول اپنالیا جائے تو سمجھ لیجیے اُس اصول کی شامت آگئی۔ ہم اُسے ایسا بھینچ کر رکھتے ہیں کہ پھر اُس کا جنازہ اُٹھنے ہی پر سُکون کا سانس لیا جاتا ہے۔ ہمارے سیاست دانوں نے اقتدار میں آنے کے بعد خاصے طم طراق سے

امریکا یاترا کا اصول دانتوں سے پکڑ رکھا ہے۔ اقتدار سنبھالنے والے پہلی فُرصت میں امریکا کا رخ کرتے ہیں تاکہ قوم کو دِکھایا جاسکے کہ امریکا اُن سے خوش ہے۔ ساتھ ہی یہ عندیہ بھی دیا جاتا ہے کہ امریکا جاکر وہ تمام معاملات درست کرالیں گے۔ یعنی اُن کی امریکا یاترا کے بعد پاکستان کے کسی بحران کے چراغوں میں روشنی نہ رہے گی!

الیکشن کی کوکھ سے ہویدا ہونے والے اقتدار کو بپتسمہ دینے کا طریقہ بہت سادہ ہے۔ پہلے تو اللہ کے حضور پیش ہوکر عمرے کی سعادت حاصل کی جاسکتی ہے تاکہ انتخابی مہم کے دوران بولے جانے والے جھوٹے وعدوں اور بلند بانگ دعووں کا پاپ دھویا جاسکے۔ اِس مرحلے سے گزرنے پر سیاسی قبلے کا رخ کیا جاتا ہے تاکہ مزید پاک صاف ہوکر نئے اقتداری گناہوں کے ارتکاب کی سکت پیدا کی جاسکے!

انتخابی مہم کے دوران ہمارے سیاست دان اِتنے وعدے کرتے ہیں کہ امریکا یاترا کے مرحلے میں میزبان حکام کی جان پر بن آتی ہے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کون سے وعدے پورے کریں اور کون کون سی پریشانی رفع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اپنے چہیتوں کی چند ایک فرمائشیں واحد سُپر پاور کو پوری بھی کرنی ہوتی ہیں مگر مسئلہ چوائس کا آجاتا ہے۔ اور پھر کانگریس بھی ظالم سماج

کی طرح راہ میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

ہمارے حکمران بھی بہت بھولے ہیں۔ انتخابی مہم کے دوران عوام سے وعدے کرتے وقت امریکیوں سے مشورہ بھی نہیں کرتے۔ ڈرون حملے بند کرانے کا وعدہ انتخابی مہم میں تمام سیاست دانوں نے کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ امریکا اگر ڈرون حملے بند کردے تو دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر ''مرے کو مارے شاہ مدار'' والا ڈراما کیسے چلائے! امریکی پالیسی میکرز نے بڑی مشکل سے قوم کو ایک طرف لگایا ہوا ہے۔ دہشت گردوں کا ہَوّا کھڑا کرکے لوگوں کو ڈرایا جارہا ہے اور اِسی بہانے ڈرون حملے کرکے طاقت کا مظاہرہ بھی کیا جارہا ہے۔ بڑی مشکل سے اُنھوں نے ایک گورکھ دھندا پھیلایا ہے اور ہمارے سیاست دان ہیں کہ اُن کی مجبوریوں کو سمجھے بغیر قوم سے کئے ہوئے وعدوں اور دعووں کے پوٹلے سر پر لاد کر واشنگٹن پہنچ جاتے ہیں!

امریکی حکمران اور حکام سمجھ ہی نہیں پاتے کہ دورہ کس خوشی میں کیا جارہا ہے۔ وہ لوگ ایسے ملٹی پرپز دوروں کے عادی بھی نہیں ہیں نا! اور سچ تو یہ ہے کہ خود ہمارے حکمران بھی طے نہیں کرپاتے کہ ان کی امریکا یاترا کا بنیادی مقصد ہے کیا۔ امریکی حکومت کی تمام اعلیٰ شخصیات سے ملنا ہوتا ہے۔ پاکستانی کمیونٹی کے نمائندوں سے خطاب بھی کرنا ہوتا ہے۔ تین چار عشائیوں میں بھی

شرکت کرنی ہوتی ہے۔ ذاتی سرمایہ کاری کے امکانات کا جائزہ بھی لینا ہوتا ہے۔
عوام سے وعدہ کرلیا جاتا ہے کہ رکی ہوئی (یعنی جو روک لی گئی ہے وہ) امداد بحال کرالی جائے گی۔ یہ تو امریکی حکومت کو "سنکٹ" میں ڈالنے والی بات ہوئی۔ امریکا میں کوئی بھی کام محض فرمائش سے نہیں ہو جاتا۔ حکومت کو کانگریس سے منظوری کا کوہِ گراں سَر کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ مرحلہ ایسا جاں گُسل ہوتا ہے کہ ہمیں تو کچھ اندازہ ہی نہیں۔ کانگریس کوئی پاکستان کی پارلیمنٹ تو ہے نہیں کہ پندرہ بیس منٹ میں کوئی بھی بل یا قرارداد منظور کرکے معاملہ ہی ختم کر دے!

جہاں قومی خود مختاری اور قومی سلامتی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی معاملے کی منظوری کا عمل طول پکڑتا جاتا ہے۔ پارلیمنٹ میں بحث ہی ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے ہاں البتہ آسانی تلاش کرلی گئی ہے۔ ہمارے ہاں اِس حقیقت کو سمجھ لیا گیا ہے کہ قومی خود مختاری کے بارے میں زیادہ سوچنے سے ذہنی خلل واقع ہوتا ہے! سب بھول جاؤ، صرف یہ یاد رکھو کہ معاملات تیزی سے نمٹنے چاہئیں۔ امریکیوں نے تو حد ہی کردی ہے۔ پوری سیاسی سرگم کو صرف قومی مفاد کی راگنی کے گرد گھماتے رہتے ہیں۔

وزیر اعظم ابھی گزشتہ ماہ ہی تو پانچ دن نیو یارک میں گزار کر آئے تھے۔ امریکی بے چارے ابھی سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ پھر میزبانی کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ ع

!اُڑنے نہ پائے تھے گرفتار ہم ہوئے

آصف علی زرداری تو صرف دُبئی کا چکر لگا کر آ جایا کرتے تھے۔ میاں صاحب لندن جا کر دم لیتے ہیں۔ ع

!اِس ''شبنمی'' مزاج کو ''سردی'' ہی راس ہے

اہلِ وطن اُن کے دوسرے دورۂ امریکا سے پتا نہیں کیا کیا آس لگائے بیٹھے ہیں۔ دِل سے دُعا ہے کہ اِس دورے کی کوکھ سے جو کچھ بھی جنم لے وہ قوم کے حق میں ہو۔ ع

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا

اوباما انتظامیہ کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ امریکی پالیسیوں کا مزاج دیکھتے ہوئے کوئی بات پاکستان کے حق میں جاتی دکھائی نہیں دیتی۔ اگر اوباما اور ان کے رفقاء پاکستان کو کچھ دینے کے خواہش مند ہوں بھی تو پالیسیاں آڑے آ سکتی

ہیں۔ ویسے امریکیوں سے جب بھی وفا کی اُمید وابستہ کی گئی ہے، مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ؎

تو اور خیالِ خاطرِ اہلِ وفا کرے

اُمید تو نہیں ہے، مگر ہاں خدا کرے!

امریکیوں کا مزاج ایسا ہے کہ زمینی حقائق سامنے رکھ کر کام کرتے ہیں۔ یہ بات ہمارے حکمران بھی سمجھ چکے ہیں۔ اقتدار سنبھالتے ہی وہ امریکا کا رُخ کرتے ہیں۔ امریکی حکومت کی خوشنودی کا حصول ہی اُن کے نزدیک سب سے بڑی زمینی حقیقت ہے۔ رہ گئے پاکستانی عوام، تو وہ اِس زمینی حقیقت کی تہہ میں کہیں دبے پڑے ہیں۔

کھال اُتاری جاتی رہے گی!

عید الاضحیٰ گزری۔ زمانے کی نظروں کے سامنے چُھریاں جانوروں کے گلے پر ضرور پِھریں مگر اُن کے خریدار بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ جانوروں کی کھالیں اُتاری گئیں۔ یہ منظر سب نے دیکھا مگر سچ یہ ہے کہ ''بازبان'' جانوروں کی بھی کھال اُترتی، بلکہ اُتاری جاتی رہی۔ جانوروں پر رشک آیا کہ صرف ایک بار کھال اُتروا کر وہ تو پار اُتر گئے۔ اور ہم ہیں کہ ہماری کھال کے اُتارے جانے کا مرحلہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ جانوروں کا نجمِ مُقدّر اوج پر رہا کہ اُن کے گلے پر پِھرنے والی چُھری نے اُنہیں ذبیحے کا اعزاز بخشا اور ایک ہم ہیں کہ ہمارے نصیب میں ذبیحہ بھی نہیں، صرف جھٹکا رہ گیا ہے!

ہر حکومت ترحم کے جذبے کی تشہیر کرتی وارد ہوتی ہے۔ آتے ہوئے دِلاسے دیتی ہے کہ اب کوئی غم نہ رہے گا، کوئی دُکھ نزدیک نہ آئے گا، کوئی اُلجھن پاس نہ پھٹکے گی۔ اور یہ کہ سارے دُلدّر دیکھتے ہی دیکھتے یوں دُور ہو جائیں گے کہ پھر کبھی دکھائی نہ دیں گے۔ مگر کچھ وقت نہیں گزرتا کہ سارے وعدے مَنوں بلکہ ٹنوں مِٹّی تلے جا سوتے ہیں، ہر دِلاسا دم توڑ دیتا ہے۔ اور دیکھتے ہی

دیکھتے پر نالہ پھر وہیں بہنے لگتا ہے۔ جمہوریت کے تسلسل کے نام پر وارد ہونے والی نئی حکومت بھی ''قصابانہ'' خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ عوام کے گلے پر چُھری پھیرنے میں اِس نے بھی دیر نہیں لگائی۔ بجلی اب خال خال ہے اِس لیے اُس سے جھٹکا کسی کسی کو لگتا ہے مگر اُس کے نرخ بڑھا کر جھٹکے دیئے جا رہے ہیں اور پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں اضافہ کرکے آگ لگائی جارہی ہے۔ مگر خیر، اب اِس میں حیرت کا پہلو بھی کہاں رہا؟ ہر حکومت ایسی ہی نکلتی ہے۔ جھٹکے کی روایت پر عمل کیا جاتا ہے اور تڑپنے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی۔ اور اگر اِس روش کے خلاف احتجاج کیجیے تو رہا سہا جھٹکا پولیس کے ذریعے کرایا جاتا ہے!

11 مئی کے گرم موسم میں جو اُمیدیں پیدا ہوئی تھیں وہ اب سرد پڑتی جارہی ہیں۔ مہنگائی کا سیلِ بلا ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے اور ایسا تازہ دم ہے کہ کسی منزل پر رُک کر دَم لینے یا سانس دُرست کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔ دریاؤں کا سیلاب غنیمت ہے کہ آکر گزر تو جاتا ہے۔ مہنگائی کا سیلاب اَوّل تو آکر ٹھہر جاتا ہے اور اگر کسی حد تک گزر بھی جائے تو بہت سے مقامات پر پانی کھڑا رہ جاتا ہے!

الم پسندی کی طرح ہدف پذیری بھی کبھی کبھی نفسی مرض کی شکل اختیار کرلیتی

ہے۔ پاکستانی قوم ''ذہنی ارتقاء'' کے جس مرحلے سے گزر رہی ہے اُس میں مظلومیت بھی ''وصفِ حمیدہ'' کا درجہ پاچکی ہے! کل تک لوگ ظلم کا نشانہ بننے پر دُکھ محسوس کرتے تھے، اب مظلومیت سے لذّت کشید کی جارہی ہے۔ گویا ع

اِک گونہ بے خودی مُجھے دِن رات چاہیے!

جب حالات دُرست کرنے اور زندگی کا معیار بلند کرنے کی تگ و دَو سے جان چُھڑانے کی روش عام ہو تو ایسے ہی تماشے سامنے آیا کرتے ہیں۔

نیشنل جیو گرافک والوں کو اب اگر شکار کے نئے طریقے دُنیا کو دِکھانے ہیں تو اپنی ٹیموں کو پاکستان بھیج کر اسلام آباد اور ہر صوبائی دارالحکومت میں شامیانے گڑوادے۔ ہماری وفاقی اور صوبائی) حکومتوں کا بغور مشاہدہ کرکے یکھا جاسکتا ہے کہ شکار کو گھیرنے کے (نئے اور منفرد طریقے کیا ہیں اور ایک ہی شکار کو کس کس طرح بھنبھوڑا جاسکتا ہے!

ہمارے ہر سطح کے حکمران دُنیا کو بتا سکتے ہیں کہ محض ایک یا دو مدوں کا پھندا لگاکر عوام کو گھیرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ابھی تک دُنیا والوں کو شاید معلوم ہی نہیں کہ محض پٹرولیم مصنوعات اور توانائی کے نرخ بڑھا بڑھا کر بھی قومی معیشت کو چلایا جاسکتا ہے!

جن چیزوں کے نرخ کم رکھے جانے پر بہبودِ عامہ کا انحصار ہے ہمارے ہاں اُنہی اشیاء اور خدمات سے آمدن کشید کی جارہی ہے۔ گنّے سے رَس نچوڑنے کی کوئی حد ضرور مقرر کی جاسکتی ہے مگر حکومت عوام کو نچوڑنے کی کوئی حد مقرر کرنا نہیں چاہتی۔ عوام کے نُچڑے ہوئے چہرے دیکھ کر قربانی کے جانوروں کو بھی اپنی صحت اور مُقدر پر رشک تو آتا ہوگا۔

اگر کوئی قربان ہوتے رہنے کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول کرلے، ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دے تو کیا کیا جائے۔ مگر دُکھ تو اِس بات کا ہے کہ مُرغی جان سے جاتی ہے اور کھانے والوں کو مزا نہیں آتا۔ دَم بہ دَم مرنا بھی ناحق ٹھہرتا ہے۔ عوام نے قربان ہوتے رہنے کو اپنا مُقدر بنالیا ہے مگر صِلے میں اُنہیں اور کچھ تو کیا، اُتنا احترام بھی نہیں مل پاتا جتنا قربانی کے جانوروں کے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے!

عید الاضحیٰ قربانی کا پیغام لاتی ہے یعنی ہمیں یہ بات سیکھنی ہے کہ بہتر زندگی کے لیے قربانی دینی ہے، ایثار سے کام لینا ہے مگر اے وائے ناکامی کہ ہم ذبیحے سے صرف یہ سیکھتے ہیں کہ قربان کیسے ہونا ہے اور کھال کیسے اُتروانی ہے! حیوانات کے مقدر میں مرگِ مفاجات ہے اور ہم نے بھی اِسی کو مُقدر بنالیا ہے۔ بس اِتنا ہے کہ انداز ذرا مختلف ہے۔ کھال اُتروانے سے

پہلے جانوروں کی جس قدر تکریم کی جاتی ہے شاید اُسی کا مشاہدہ کرنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ ہماری بھی تھوڑی سی تکریم کی جائے۔ پھر چاہے شوق سے ہماری کھال اُتار لی جائے۔ کھال تو خیر اُتاری ہی جاتی ہے مگر تکریم کہاں رہ گئی؟ گدھے گھوڑے چار پیروں پر چلتے ہوئے تجارتی سامان کھینچتے پھرتے ہیں اور ہم دو پیروں پر چل کر ناقص پالیسیوں کا بوجھ ڈھوتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہم اِس کیفیت سے لطف پانے کا تاثر بھی دیتے جاتے ہیں!

جانور ذبح ہونے کو تیار رہتے ہیں۔ اور ہم بھی۔ یعنی دونوں ایک سطح پر ہیں۔ ہمیں اِس سطح سے بلند ہونا ہے۔ جب تک ہم چاہیں گے یعنی کھال اُتروانے پر آمادہ رہیں گے تب تک ہماری کھال اُتاری جاتی رہے گی۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ کسی ملکی شخصیت سے کھال اُتروانے میں لطف نہ آ رہا ہو تو ''اوپر والے'' کسی کو باہر سے بھیج دیتے ہیں۔ کیا آپ کو معین ''قریشی'' یاد نہیں؟

الم پسند طبیعت کو حقیقی انبساط سے اُلفت پر مائل کرنا ہوگا۔ فیصلے درکار ہیں، ہچکچاہٹ نہیں۔ محض خواہش سے کام نہیں چلے گا، ارادہ بھی لازم ہے۔ باتیں نہیں، کام چاہیے۔ محض ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے اور بحث پر بحث کرتے رہنے سے بات نہیں بنے گی۔ تخریب بدوش شور شرابہ نہیں، تعمیری خاموشی ہماری ضرورت ہے۔ حکمرانوں کی اطاعت لازم ہے تو کیا اُن کا احتساب ناگزیر

نہیں؟ ہر معاملے میں گردن جُھکا دینے کا نام تسلیم و رضا نہیں۔ جہاں بولنا لازم ہو وہاں خاموش رہنا گناہ، بلکہ اپنے وجود پر ظلم ہے۔ بے زبان حیوانوں کی طرح چُھری کے نیچے آتے رہنے کا نام تسلیم و رضا نہیں۔ وہ اُن کا مقسوم ہے۔ اور اُن کے لیے اِس کی جزا بھی مقرر ہے۔ ہم زبان ہی نہیں، سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ بے زبان حیوانات اپنی سطح سے بُلند ہونے کی صلاحیت اور سکت نہیں رکھتے۔ اِس پر وہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ ہم انسان ہو کر حیوانی سطح پر جئیں، یہ اللہ کے نزدیک کسی بھی طور پسندیدہ یا قابل برداشت نہیں ہو سکتا۔

training کی suffer ٹرین کا سفر یا

فولاد بے جان ہوتا ہے۔ اور فولاد سے بنائی جانے والی پٹڑیاں بھی بے جان ہی ہوتی ہیں۔ فولادی پٹڑیاں گرمی کا اثر قبول کرتی ہیں نہ سردی کا۔ گرمی سے وہ پگھلتی نہیں اور سردی میں سکڑنے کا نام نہیں لیتیں۔ فولادی پٹڑیوں پر دوڑنے والا انجن اور اُس سے جُڑی بوگیاں بھی فولاد کی بنی ہوتی ہیں۔ حیرت اِس بات پر ہے کہ فولادی ٹرین کی کوکھ سے جنم لینے والا خسارہ بے جان نہیں ہوتا! دن بہ دن پنپتا جاتا ہے، پروان چڑھتا رہتا ہے۔ جس ٹرین کو دیکھیے اُس کی حالت یہ ہے کہ شروع سے آخر تک بلکہ مُنہ تک بھری ہوئی۔ انجن پر بھی لوگ چڑھے ہوئے، مگر پھر بھی خسارہ! یہ تو جادو ہے اور ایسا جادو پاکستان ہی میں ممکن ہے کیونکہ یہ سرزمین ہر معاملے میں جیتا جاگتا ”زندہ طلسمات“ ہے!

ٹرینیں دنیا بھر میں چلتی ہیں اور کما کر دیتی ہیں۔ اور ایک ہماری ٹرینیں ہیں کہ ناکارہ اور ہڈ حرام جوان اولاد کی طرح بے عملی کی عملی تصویر بن کر رہ گئی ہیں۔ یہ ملک بھر میں دوڑتی پھرتی ہیں مگر اِن کی آمدن مارشلنگ یارڈ سے باہر نہیں نکلتی!

اہلِ جہاں نے بہت مَغز کھپایا ہے، بہت جَھک ماری ہے مگر اب تک ایسی ٹرین نہیں بنا پائے جس کے چلنے سے فاصلہ گھٹے اور خسارہ بڑھے ! دنیا بھر میں ٹرینیں آمد و رفت کے لیے ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ہر ٹرین یہی مقصد حاصل کرتی ہے مگر ذرا مختلف انداز سے۔ یعنی ٹرین آمد، وسائل رفت ! بھاپ کے انجن ہر وقت خدمت چاہتے تھے یعنی کوئلہ جھونکتے رہیے۔ ہماری ٹرینیں بھی بھاپ کے انجنوں کے اُصول کی بنیاد پر کام کرتی ہیں۔ اِنہیں چلانا ہے تو قومی خزانے سے وسائل نکال کر انجنوں میں جھونکتے رہیے۔ ٹرینیں تو کہیں کہیں رک کر سانس بھی لیتی ہیں مگر اب تک یہ طے نہیں کیا جاسکا کہ خسارے کو کس اسٹیشن یا پلیٹ فارم پر روکا جائے!

ایک زمانہ تھا جب لوگ سفر کے لیے ٹرین استعمال کیا کرتے تھے۔ اب ٹرین کے ذریعے سفر کم اور suffer زیادہ ہوتا ہے! یہ بھی مُجاہدے اور ضبطِ نفس ہی کی ایک شکل ہے۔ اہلِ جہاں مُہم جُوئی کے چکر میں پتا نہیں کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ کوئی پہاڑ پر چڑھتا ہے، کسی کو سمندر کی گہرائی ناپنے کا شوق ہے۔ کوئی گھنے جنگلات میں مٹر گشت کرتا پھرتا ہے۔ کسی کو درندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا شوق ہے۔ یہ سب لوگ پاکستان آکر ایک بار ٹرین کا سفر کریں اور بتائیں کہ دنیا میں کہیں اِس سے بڑی مُہم جُوئی بھی ہے!

ریلوے کی وزارت کا قصہ ہو یا ٹرین کے سفر کی کہانی، دونوں میں شروع سے آخر

تک موڑ ہی موڑ ہیں۔ دلچسپی ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ ریلوے کی وزارت کے خسارے کی داستانیں اِس قدر دلچسپ ہیں کہ اِن سے تحریک پا کر کئی شاہکار المیہ فلمیں بنائی جا سکتی ہیں!

پاکستان میں ٹرین کا سفر بہتوں کے ذوق کی تسکین کرتا ہے۔ کسی نے اگر کوئی گناہِ کبیرہ کیا ہے اور ضمیر کی خلش تنگ کر رہی ہے تو اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے کچھ اور نہ کرے، ٹرین میں سوار ہو جائے! ہمیں یقین ہے کہ اِس عمل کو دو تین مرتبہ دُہرانے پر وہ ''نِروان'' اور ''مُکتی'' پا جائے گا!

بہتوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ ٹرین کے طویل سفر کے ذریعے روحانیت کی کئی منازل طے کرتے ہیں۔ یہ سفر اُنہیں تحمل کی تعلیم ہی نہیں، تربیت بھی دیتا ہے۔ ٹرین کے مسافر ڈیڑھ دو دن کے سفر میں جس طور ایک دوسرے کو جھیلتے ہیں اگر زندگی بھر یوں ہی ایک دوسرے کو برداشت کرتے رہیں تو بہت سی معاشرتی اُلجھنیں خود بخود ختم ہو جائیں!

ٹرین کے طویل انتظار کے جاں گُسل ماحول میں بھی اگر آپ ہنس ہنس کر، گا گا کر باتیں کرنے کی تحریک پاتے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ کی نفسیاتی اور روحانی تربیت بہت حد تک مکمل ہو گئی!

اسٹیشن پر ہزاروں مسافر سامان باندھ کر تیار کھڑے ہوں اور ایسے میں محض چند سو نشستوں کی گنجائش والی ٹرین وارد ہو تو! تو کیا؟ کوشش تو سبھی کریں گے مگر ع

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

ٹرین میں سوار ہونا وہ مرحلہ ہے جس سے بخوبی گزرنے پر کوئی بھی اپنی "فِطری شُجاعت" پر فخر کرسکتا ہے! اِس مرحلے سے گزرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ آندھی کے سامنے سارے ہی چراغ جلتے رہنے کی دوڑ شروع کرتے ہیں مگر بقول محسنؔ بھوپالی ع

جس دِیے میں جان ہوگی وہ دِیا رہ جائے گا!

پاکستان کے قیام کی تحریک کے دوران یہ نعرہ بہت مشہور ہوا تھا۔

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

اکھنڈ بھارت سے اپنے لیے زمین کا ٹکڑا تو ہم نے حاصل کرلیا مگر بہت سے معاملات ادھورے رہ گئے۔ اِن میں ریلوے کی دُرستی بھی شامل ہے۔ مسلم لیگ سے متعلق نعرے ہی کے وزن پر اب ہر ریلوے پلیٹ فارم زبانِ حال سے کہہ رہا ہے ع

ہمت ہے تو ٹرین پہ چڑھ کے دِکھا!

ٹرین میں جگہ پانے کے لیے زورِ بازو پر بھروسہ کرنے کے ساتھ ساتھ قُلی بہادر سے بھی معاملات طے کرنا پڑتے ہیں۔ قُلیوں سے ڈیلنگ بجائے خود ایک فنی شعبہ ہے جس میں مہارت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ بیشتر قُلی ''مینوں نوٹ وَخا، میرا مُوڈ بنے'' کے اُصول کی بنیاد پر کام کرتے ہیں!

جنہیں ادب سے شغف ہے وہ جانتے ہیں کہ اُردو شاعری بالخصوص غزلوں میں پایا جانے والا روایتی محبوب کس کس طرح کے غمزہ و عشوہ و ادا سے مُزیّن و آراستہ ہے۔ جدید اصطلاح استعمال کیجیے تو اُردو شاعری کا روایتی محبوب ناز نخروں سے fully loaded ہوتا ہے! بات بات پر اینٹھنا، روٹھنا اور ٹھنکنا اُس کے لیے بہت حد تک built-in معاملہ ہے۔ یہ بات تو خیر سمجھ میں آتی ہے کہ ع

خُدا جب حُسن دیتا ہے، نزاکت آ ہی جاتی ہے!

غزلوں میں سانس لیتا ہوا محبوب اگر کچھ اکڑ دکھاتا ہے تو حیرت کی بات نہیں۔ اُس کا بے مثال حُسن (خیالی ہی سہی) رعونت پیدا کر سکتا ہے۔ مگر جناب! برائے نام بھی حُسن نہ پائے جانے پر قُلیوں کی ناز برداری کرنی پڑتی ہے۔ ٹرین میں

سیٹ حاصل کرنے کے لیے قُلیوں کے جتنے اور جیسے نخرے.برداشت کرنا پڑتے ہیں وہ اگر شُعراء تھوڑی سی توجہ سے اپنی غزلوں میں فِٹ کریں تو ایک الگ طرح کا، منفرد بلکہ مافوق البشر ٹائپ کا محبوب اُردو شاعری کو مل سکتا ہے!

ٹرین صفائی سُتھرائی اور دُھلائی کے بعد پلیٹ فارم پر لائی گئی ہو اور ہزاروں افراد اُس پر ہلّہ بولنے کے لیے بے تاب ہوں تب ذرا قُلیوں کا جائزہ لیجیے۔ پل میں تولہ، پل میں ماشہ۔ ابھی خوش ہیں اور ابھی ناراض ہوئے جاتے ہیں۔ یہ تُنک مزاجی، یہ خود سَری اگر اُردو غزل کے روایتی محبوب کے مزاج میں ''انسٹال'' کردی جائے تو غزل کی روایت مزید تابندہ اور درخشاں ہوجائے!

ریلوے پلیٹ فارم پر سامان کے ساتھ ٹرین کا طویل انتظار بہتوں کے لیے جاں گُسل ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی دیکھیے کہ آج کے مصروفیت زدہ دور میں اِس بہانے لوگ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ کچھ وقت زیادہ گزارنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں! اِس اعتبار سے دیکھیے تو ریلوے کا شعبہ فاصلے مِٹا کر لوگوں کو قریب لا رہا ہے جو بہت.بڑی معاشرتی خدمات ہے!

ریلوے پلیٹ فارم کو ''سوشل نیٹ ورکنگ'' کے لیے عمدگی سے استعمال کیا جاسکتا

ہے۔ ٹرین کے انتظار میں ہلکان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ انتظار کی ’’لذت‘‘ پانے والے دوسرے مسافروں سے رسم و راہ بڑھائیے، دوستی پروان چڑھائیے۔

ہمارے ہاں ہر چیز وہ کام کر رہی ہے جس کے لیے اُسے بنایا ہی نہیں گیا۔ ایسے میں اگر ریلوے کا شعبہ اپنے اصل کام سے ہٹ کر کچھ، بلکہ بہت کچھ کر رہا ہے تو حیرت کی کیا بات ہے۔ شکر کیجیے کہ کچھ کر تو رہا ہے! اب اِس کارکردگی کو اپنے حق میں بہتر انداز سے استعمال کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔

اِس تکلف کی ضرورت کیا تھی؟

قوم کی امیدیں بار آور ہوں نہ ہوں، خدشات ضرور درست ثابت ہو کر رہتے ہیں۔ اندازہ تھا کہ یارانِ وطن امریکا جا تو رہے ہیں مگر ملے گا کچھ نہیں۔ اور اِس خدشے یا اندازے کے درست ثابت ہونے سے قوم کچھ اور افسردہ ہو گئی ہے۔ حیرت خیر کم ہی لوگوں کو ہوئی ہوگی کیونکہ یہ تو معلوم ہی تھا کہ ہونا کیا ہے!

وزیر اعظم وفد کے ساتھ امریکا گئے تو خوب ڈھول پیٹا گیا اور کئی طرح کے تان پلٹوں میں لپٹے ہوئے راگ الاپے گئے۔ میڈیا نے دورۂ امریکا کے ایجنڈے کی ایسی تصویر کھینچی کہ بہت سے بھولے بادشاہ تیار ہو کر بیٹھ گئے کہ درخت سے پکے ہوئے اب گرے کہ تب گرے! پھل تو کیا ملنے تھے، درخت کی چھاؤں بھی نصیب نہ ہوئی۔ ہوتی بھی کیسے؟ جیسی کرنی ہوتی ہے ویسی ہی دھوپ یا چھاؤں ملتی یا نہیں ملتی ہے۔

قومی خود مختاری کے معاملے پر بات ہونی چاہیے تھی، نہ ہوئی۔ یعنی ڈرون حملوں کا معاملہ کسی کونے میں ایسا مُنہ چھپا کر بیٹھا کہ پھر باہر نہ نکلا، درشن نہ دیئے۔ قوم کی بیٹی ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو رہائی دلا کر وطن لانے کے بارے میں بڑھک آمیز باتیں کرنے والے اُس کا ذکر تک امریکیوں کی زبان پر

لانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

دورۂ امریکا کیا تھا، اُمیدوں کی گٹھڑی تھی۔ یہ گٹھڑی کھلی تو قوم پر کھلا کہ اندر تو کچھ بھی نہ تھا۔ ؎

بہت شور سُنتے تھے پہلو میں دِل کا
!جو چیرا تو اِک قطرۂ خُوں نہ نکلا

حق تو یہ ہے کہ اِس دورے پر ''کھودا پہاڑ، نکلا چوہا'' والی کہاوت بھی منطبق نہیں ہوتی۔ چوہا بھی نکلتا تو دِل کو تسلی ہو جاتی، چند آنسو پُنچھ جاتے۔ یہاں تو معاملہ یہ ہے !کہ پہاڑ کھودنے میں کدال بھی ٹھکانے لگ گئی

واشنگٹن میں تین روز تک وزیرِاعظم اور ان کے رُفقاء کی امریکی وزرا و حکام سے ملاقاتوں کے بعد ڈراپ سین کا لمحہ آیا۔ میاں نواز شریف کو وائٹ ہاؤس بُلوایا گیا۔ صدر براک اوباما سے ملاقات ہوئی۔ قوم پھر ٹی وی سیٹس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اُمید کم اور آسرا زیادہ تھا کہ شاید بِلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ جائے! چھینکا تو نہ ٹوٹا، دل البتہ ٹوٹ گئے۔ امریکی صدر سے ملاقات کے حوالے سے میڈیا پر جو راگنیاں الاپی جارہی تھیں وہ نرے بے سُرے پن کا ڈھیر ثابت

ہوئیں۔ قوم دم بخود ہو کر رات گئے ٹی وی سیٹس کے سامنے بیٹھی تھی کہ وزیر اعظم کوئی بڑی بات، کوئی خوش خبری لے کر باہر آئیں گے۔

ہم بھی خدا جانے کس مٹی کے بنے ہیں کہ بار بار جھوٹی امیدوں اور طفل تسلیوں کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ ع

!دِل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے

وزیر اعظم کی صدر اوباما سے ملاقات ختم ہوئی تو قوم بُت بن کر ٹی سیٹس کے سامنے بیٹھ گئی۔ چند یقین دہانیاں سُننے کا اشتیاق تھا۔ مگر یہ کیا؟ سرکاری بیان میں صدر اوباما نے ڈرون حملوں، عافیہ صدیقی کی ''متوقع'' رہائی اور سِول نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی منتقلی کا ذکر تک نہ کیا۔ دہشت گردی اور انتہا پسندی کا راگ الاپتے ہوئے اُنھوں نے جماعت الدعوۃ کے خلاف کارروائی اور اُسامہ بن لادن کے ٹھکانے کی نشاندہی میں امریکیوں کی مدد کرنے والے ڈاکٹر شکیل آفریدی کی رہائی کا مطالبہ ضرور کیا۔

شاید کسی نے صدر اوباما کو بتا دیا تھا کہ اِس ملاقات کے باعث پاکستان میں رت جگا ہے اِس لیے اُنھوں نے پاکستانیوں کی اشک شُوئی کی خاطر چند رسمی جُملے اپنے سرکاری بیان میں ضرور شامل کئے۔ مثلاً پاکستان اہم اسٹریٹجک

پارٹنر ہے، افغانستان سے محفوظ اور بر وقت انخلاء کے لیے پاکستان کا کردار اہم ہے، توانائی، دفاع، سلامتی، بنیادی ڈھانچے اور انسدادِ دہشت گردی وانتہا پسندی جیسے امور میں معاونت کرتے رہیں گے وغیرہ۔

صدر اوباما کی موجودگی وزیر اعظم نواز شریف نے جو لکھا ہوا سرکاری بیان میڈیا والوں کے گوش گزار کیا اُس میں ڈرون حملے روکنے، عافیہ صدیقی کی رہائی اور سول نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی منتقلی کا ذکر تک نہ تھا۔ ثابت ہوگیا کہ اِن تینوں معاملات پر سرے سے بات ہی نہیں ہوئی یا نہ ہونے کے برابر ہوئی۔

وائٹ ہاؤس میں پاکستانی میڈیا سے اردو میں گفتگو کرتے ہوئے وزیر اعظم نے دعوی کیا کہ صدر اوباما سے ملاقات کے دوران ڈرون حملوں اور عافیہ صدیقی کا معاملہ اُٹھایا گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ صدر اوباما نے جماعت الدعوۃ اور چند دوسری تنظیموں کی سرگرمیاں روکنے کا مطالبہ بھی کیا۔ پاکستانی میڈیا سے گفتگو میں وزیر اعظم نے اہم ترین نکتہ '' یہ بیان کیا کہ ہمیں اپنا گھر درست کرنا ہوگا کیونکہ اِسے ہم نے خود خراب کیا'' ہے۔

وزیر اعظم نے لندن پہنچنے پر میڈیا سے گفتگو میں دورۂ امریکا کا بھرم رکھنے

کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے کہا کہ ہم جو کہتے ہیں وہ کرکے دکھاتے ہیں! اور یہ کہ جہاں بات کرنی تھی وہاں بات کی ہے۔ نتائج جلد سامنے آئیں گے۔ ساتھ ہی یہ تسلی بھی دی کہ ڈرون حملوں کا معاملہ پاکستانی عوام کی خواہشات کے مطابق طے کیا جائے گا۔ قوم کی ڈھارس بندھانے اور چند ہی گھنٹوں میں خاصا گر جانے والا مورال بلند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ اِس مرتبہ امریکی حکومت نے ڈرون حملوں سے پاکستان کی خود مختاری کے متاثر ہونے کے معاملے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈرون حملوں اور عافیہ صدیقی کا معاملہ اُٹھا کر اُنہوں نے کسی پر احسان نہیں کیا۔ اور یہ کہ شکیل آفریدی کے معاملے پر ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

لندن میں وزیر اعظم کی میڈیا سے گفتگو کا ذائقہ ابھی کانوں میں رس گھول ہی رہا تھا کہ ہر وقت ستم ڈھانے کی باتیں کرنے والے امریکی حکام ستم ظریفی پر اُتر آئے۔ واشنگٹن میں پاکستانی میڈیا کو بریفنگ دیتے ہوئے محکمۂ خارجہ کے حکام نے کہا کہ عافیہ صدیقی پر مزید بات ہوگی نہ ڈرون حملوں سے متعلق پالیسی تبدیل کی جائے گی۔ نواز شریف نے عافیہ صدیقی کی بات کی اور ہم نے سُنی۔ اور یہ کہ ڈاکٹر شکیل آفریدی کا معاملہ ہر ملاقات میں اُٹھایا ہے۔ امریکی حکام نے یہ واضح نہیں کیا کہ میاں نواز شریف نے عافیہ کی بات کس سے کی۔ صدر اوباما سے، نائب صدر جو بائیڈن سے، وزیر خارجہ جان کیری سے یا مزید

نچلے درجے کے حکام سے؟

ویسے امریکی حکام کو ڈرون حملوں اور عافیہ صدیقی کے بارے میں کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ نواز اوباما ملاقات کے بعد جاری کئے جانے والے باضابطہ مشترکہ اعلامیے میں اِن دونوں معاملات کے ذکر تک سے گریز پوری کہانی عمدگی سے بیان کر دیتا ہے! اِس ملاقات کے زمینی حقائق اب مکمل بے نقاب، بلکہ بے لباس ہو چکے ہیں۔

وزیر اعظم کے خصوصی معاون سرتاج عزیز کے نزدیک دورہ امریکا کی اہم ترین کامیابی'' یہ ہے کہ امریکا اسٹریٹجک ڈائیلاگ کی بحالی پر رضامند ہو گیا ہے۔ کوئی ذرا'' بتلائے کہ اِس میں کامیابی کا کون سا پہلو ہے۔ اسٹریٹجک ڈائیلاگ کے نام پر کیا ہو گا؟ مزید ارب ڈیڑھ ارب ڈالر چارے کی طرح ہمارے اقتداری اصطبل میں ڈال دیئے جائیں گے اور تاکید ہو گی کہ قومی مختاری کا جو بھی حشر ہو، خاموش رہنا ہے۔

قوم یہ سوچ کر پریشان ہے کہ جب کسی امکان کی فصل تیار ہی نہیں ہوئی تھی تو واشنگٹن کا طواف کیوں کیا گیا؟ ایسی کون سی آفت ٹوٹ پڑی تھی جو اِس دورے کے بغیر ٹالی نہیں جا سکتی تھی؟ جو کچھ واشنگٹن میں اور پھر لندن میں میڈیا

نمائندوں سے وزیر اعظم کو کہنا پڑا وہ تو اسلام آباد یا لاہور میں بھی کہا جا سکتا تھا۔ پھر اِس قدر زحمت اُٹھانے کی ضرورت کیا تھی؟

بھارتی میڈیا نے جلتی پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا ہے۔ کولکتہ کے اخبار دی اسٹیٹسمین نے نے لکھا ہے کہ نواز شریف کو براک اوباما کے ناگوار اور تلخ سوالوں کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکی صدر نے (بظاہر بھارت کو خوش کرنے کے لئے) ممبئی حملوں کے ملزمان کے خلاف مقدمہ چلانے میں تاخیر پر پاکستانی وزیر اعظم سے بازپُرس کی۔ ہفت روزہ انڈیا ٹوڈے نے لکھا ہے کہ امریکی صدر نے کشمیر کے مسئلے پر ثالثی سے معذوری ظاہر کر دی۔ کشمیر کے معاملے پر بھارت کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے بھرپور مسرت کا اظہار کیا ہے جیسا کہ اُن کا حق تھا۔

اسلام آباد کے ٹھنڈے اور پُرسکون محلّات میں سکونت رکھنے والے اُلجھن میں مبتلا نہ ہوں۔ روزنامہ ٹائمز آف انڈیا نے لکھا ہے کہ امریکی صدر نے میزبان وزیر اعظم کو بہت زیادہ شرمندہ ہونے سے بچالیا! قوم افسرہ ضرور ہے، حیران بالکل نہیں۔ !حکمرانوں کی مہربانی ہے کہ قوم کو کم از کم حیرت کی منزل سے تو آگے بڑھا دیا ہے

چمچ، گلاس اور بالٹی

جگر مراد آباد کے استاد اصغر گونڈوی نے خوب کہا ہے ۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دُشوار ہو جائے !

اس شعر کی تشریح، مختصر ترین الفاظ میں، یہ ہے کہ زندگی مشکلات کا سامنا کرکے اُنہیں شکست دینے کا نام ہے۔ ہر طرف آسانیاں ہوں تو زندگی دشوار ہو جاتی ہے کیونکہ آسانیاں کسی بھی چیلنج سے لڑنے کی طاقت پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ اصغر گونڈوی کی بات کو ویسے تو خیر پوری پاکستانی قوم ہی نے کسی نہ کسی حد تک اپنایا ہے مگر ہماری قومی کرکٹ ٹیم نے اِسے دانتوں سے پکڑ رکھا ہے !

30 اکتوبر کو شارجہ میں جنوبی افریقہ کے خلاف پانچ ایک روزہ میچوں کی سیریز کے ابتدائی میچ میں قومی کرکٹرز نے ایک بار پھر ثابت کیا کہ اُنہیں مشکلات سے لڑنے ہی کا ہُنر نہیں آتا بلکہ وہ تو مشکلات پیدا کرنے کے فن سے بھی بخوبی واقف ہیں ! پہلے بیٹنگ کرتے ہوئے جنوبی افریقہ نے 184 رنز اسکور کئے

تو قوم نے سوچا 185 رنز کا ہدف بھی بھلا کوئی ہدف ہے۔ مگر لوگ یہ بات بھول بیٹھے تھے کہ آسانی سے جیت جانا ہماری ٹیم کے ''شایانِ شان'' نہیں! آں جہانی مہیندر سنگھ بیدی سَحَر نے خوب کہا ہے ۔

ہوا جو تیرِ نظر نیم کَش تو کیا حاصل؟

مزا تو جب ہے کہ سینے کے آر پار چلے!

اور جناب! تیر نے نیم کشی ترک کی تو سینے کے آر پار ایسا چلا کہ پورا میچ ہی آر پار یعنی اُس پار ہوگیا! جس میچ میں پاکستان کی گرفت ڈھیلی پڑنے کی کوئی گنجائش نہ تھی اُسے بھی ''فوٹو فِنِش'' کی منزل تک پہنچا کر مدِ مقابل کا دِل توڑنے سے گریز کیا گیا! ۔

لوگ حیران تھے کہ جس ''حلوہ میچ'' کو جنوبی افریقہ نے پلیٹ میں رکھ کر پاکستانی ٹیم کی نذر کیا تھا وہ راستے میں کہاں اٹک گیا؟ 185 کا ہدف دیکھ کر لوگ مطمئن ہوگئے تھے کہ یہ میچ تو اب کہیں نہیں جاتا! اور پھر اِسی لیے وہ ٹی وی سیٹس کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔ یہ قومی ٹیم کا کمال تھا کہ آسانی تج کر مشکل کو گلے لگایا اور میچ کی دال میں ایسا تڑکا لگایا کہ قوم پھر ٹی وی سیٹس کے سامنے بیٹھ گئی! اطمینان کی چادر اوڑھ کر سونے والے ہڑبڑا کر اُٹھے اور کلام اللہ جس قدر بھی یاد تھا اُس کا ورد کرنے لگے! آسان ہدف کو

خاصی ''مہارت'' اور ''جاں فشانی'' سے ایسا مشکل بنا دیا گیا کہ شائقین کے دِل و دماغ ڈپریشن کا ہدف ہو کر رہ گئے!

یہ قوم بھی کیا سادہ ہے۔ جس کے باعث بار بار بیمار پڑتی ہے پھر عَطار کے اُسی لونڈے سے دوا لیتی ہے! قومی کرکٹ ٹیم کو جب بھی کوئی آسان ہدف ملتا ہے، ہم اُمیدوں کے پوٹلے اپنے سَروں پر دَھر کر ہِٹی اسکرین کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اُمید یہ ہوتی ہے کہ میچ پکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں اب گرا کہ تب گرا۔ اور پھر میچ پکے ہوئے پھل کی طرح گرتا ضرور ہے مگر پرلی طرف۔ اور ہم ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ بات کچھ یوں ہے کہ جس طرح ہمارے فاضل پیداوار کو برآمد یا اسمگل کرکے قلت پیدا کی جاتی ہے بالکل اُسی طرح کرکٹ میں جو ممکن دکھائی دے رہا ہوتا ہے اُسے ناممکن بنا کر دوبارہ ممکن بنانے کی مشق فرمائی جاتی ہے! جب کسی قوم کی سوچ اُلٹی ہو گئی ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بقول مومنؔ

مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجرِ یار
آخر تو دُشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ!

یاد رکھیے، اب اگر آپ کو قومی کرکٹ ٹیم کی فتح مقصود ہے تو اُس کے ہارنے کی دُعا مانگیے!

یہ کیس ''چمچ، گلاس اور بالٹی'' کا ہے۔ صحافیوں کی ایک ٹیم ذہنی امراض کے اسپتال کے دورے پر پہنچی۔ ایک صحافی نے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا آپ لوگ اِس امر کا تعین کس طرح کرتے ہیں کہ کسی کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہے اور اُسے علاج کے لیے داخل کرلینا چاہیے۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ''بہت آسان پروسیجر ہے۔ ہم ایک باتھ ٹب بھرتے ہیں اور پھر متعلقہ فرد کو چمچ، گلاس اور بالٹی دیکر کہتے ہیں کہ اُسے خالی کرے۔''

صحافی بولا۔ ''نارمل انسان یقینی طور پر بالٹی سے ٹب خالی کرے گا کیونکہ وہ بڑی ہوتی ہے۔''

جی نہیں۔'' میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ''نارمل انسان تو 'ڈرین پلگ' کھینچ کر ٹب خالی کرے گا۔ اب آپ بستر نمبر 39 پر لیٹ جائیں!''

اب اِس قوم کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ بھرے ہوئے ٹب کو ڈرین پلگ کھینچ کر خالی کرنے کے بجائے باقی تین آپشنز استعمال کئے جارہے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ گلاس اور بالٹی کے مُقدّر میں فراغت ہی فراغت لکھی ہوئی ہے، صرف چمچ کو زحمت دی جارہی ہے!

شارجہ میں قومی کرکٹ ٹیم نے بھی میچ کے بھرے ہوئے ٹب کو ڈرین پلگ کھینچ کر خالی کرنے کے بجائے پہلے تو گلاس استعمال کیا اور پھر چمچ پر اُتر آئی۔ اور اِس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جن ستاروں کو تقریباً چُھو لیا تھا وہ ایک بار پھر آسمان کی چادر میں ٹنک گئے!
بھرے ہوئے باتھ ٹب کو چمچ سے خالی کرنا وہ ذہنیت ہے جس نے پاکستانی قوم کے ذہن میں گھر کرلیا ہے، بلکہ اُسے گھیر لیا ہے۔ یہ اندازہ لگانا اب دردِ سر سے کم نہیں کہ کون نارمل ہے اور کون ابنارمل۔ حق تو یہ ہے کہ اب یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے والا تقریباً ابنارمل ہو رہتا ہے!

جب قدریں بدل جاتی ہیں یا مسخ ہو جاتی ہیں تب کچھ بھی اپنی جگہ پر دکھائی نہیں دیتا۔ پاکستانی معاشرہ ایسی ہی اُتھل پُتھل سے گزر رہا ہے۔ کوئی بھی چیز اپنے متعین مقام پر نظر نہیں آتی۔ کل تک جو کچھ قبولِ عام کی سَند کا حامل تھا وہ اب پامالی کے مرحلے میں ہے۔ اور جو کچھ راندۂ درگاہ تھا وہ قبولِ عام کی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ ع

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا!

گزرے ہوئے زمانوں کے پاگل بھی اعلیٰ ظرف کے حامل تھے، اپنے پاگل پن کا اعتراف کرکے سلاخوں کے پیچھے چلے جایا کرتے تھے۔ آج کے پاگلوں کو اگر آئینہ دکھایا جائے تو ٹی وی اینکرز اور کالم نگاروں کی طرح بحث کرنے لگتے ہیں، بلکہ کٹھ حُجتی پر اُتر آتے ہیں! یعنی جو کچھ (ذہن نہیں) مُنہ میں آئے وہ خفیف سی بھی ہچکچاہٹ کے بغیر دلائل" کے طور پر داغتے چلے جاتے ہیں! آپ تھک جائیں گے، وہ نہیں تھکیں گے۔"

بقول ذکی عثمانی ؎

کوئی دلیل نہ تھی اور کوئی جواب نہ تھا

!عجیب لوگ تھے، بس اختلاف کرتے رہے

اور پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب آپ تنگ آکر اُنہیں اور خود کو ایک ہی کشتی میں سوار سمجھنے لگیں گے! اور جب یہ مقام آئے گا تو آپ بھی چمچ، گلاس یا بالٹی میں سے کوئی ایک یا ایک سے زائد آپشن اپنانے کا سوچیں گے اور بھول جائیں گے کہ بھرے !ہوئے باتھ ٹب کو خالی کرنے کے لیے کوئی ڈرین پلگ بھی ہوا کرتا ہے

ہے کیا جو کوئی سُونگھے؟

قوم کا چلن بدلنے پر آیا تو ایسا بدلا کہ جسے جو کام نہیں آتا یا جسے جس کام کے لیے رکھا نہ گیا ہو وہ اُسی کام میں مگن دکھائی دیتا ہے۔ اور جب اصل کام کرنے کا کہا جاتا ہے تو معاملہ آئیں بائیں شائیں کی منزل پر پہنچ کر دم توڑ دیتا ہے۔ ریلوے کا محکمہ بھی اِسی راہ پر گامزن ہے۔ جب ہر طرف کامیڈی کا بازار گرم ہے تو ریلوے والے بھلا کیوں پیچھے رہیں؟ محکمے کو چلانے کے نام پر مختلف سرگرمیوں کے ذریعے ریلوے والے کامیڈی کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ لوگ اُن کی نیت کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں اور ریلوے والوں کی کامیڈی ان کی نظر میں ٹریجڈی ٹھہرتی ہے۔ ٹرین سے سفر کرنے والے ہمیشہ صرف شکایت کرتے پائے جاتے ہیں۔ اگر وہ سفر کے دوران ذہن کے گھوڑے دوڑایا کریں تو اپنی تکالیف بھول کر مختلف سرگرمیوں سے ایسے محظوظ ہوں گے کہ کچھ دیر کیلئے بڑے بڑے کامیڈین بھی اُن کے ذہن سے نکل جائیں گے! شُنید ہے کہ ریلوے اسٹیشنز پر تعیناتی کے لیے منگوائے جانے والے سُراغ رساں کتے ٹرائل میں پھر ناکام ہوگئے۔ ریلوے کی اعلیٰ انتظامیہ نے سامان اور ٹرین

میں دھماکا خیز مواد کا سُراغ لگانے کے لیے 28 تربیت یافتہ کتوں کی ''خدمات'' کرائے پر حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جن لوگوں نے ٹینڈر جمع کرائے تھے اُن سے کہا گیا کہ اپنے اپنے کتے لیکر ٹرائل کے لیے پہنچیں۔ لاہور میں ٹرائل کے کوئی بھی کتا دھماکا خیز مواد کا سُراغ نہ لگا سکا۔ دو ماہ قبل بھی اسی نوعیت کے ٹرائلز ہوئے تھے جن میں حصہ لینے والے کتے بارودی مواد سُونگھنے سے زیادہ کتیائیں تلاش کرتے رہے اور اِس میں ناکامی پر ''کھسیانی بلی کھمبا نوچے'' کے مصداق بلیوں کے پیچھے بھاگتے رہے!

ریلوے والے آخر تربیت یافتہ کتے بھرتی کرنے پر کیوں تُلے ہوئے ہیں؟ ریلوے میں اب ایسا کیا رہ گیا ہے جسے سُونگھ کر سُراغ لگایا جائے؟ پھر خیال آیا کہ سوال ریلوے کی کسی چیز کو سُونگھنے کا نہیں، مسافروں کے سامان کو سُونگھنے کا ہے۔ کرپشن اور ہڈ حرامی کا اندازہ لگانے کے لیے اب کسی اصلی، نسلی کتے کی ضرورت نہیں! ٹرین کی بوگیوں میں رات کو بلب نہیں جلتے تو مسافر اپنے دل نہ جلائیں۔ اُجالے کے لیے خسارہ کیا کم ہے جو اظہر من الشمس ہے!

خبر حیرت انگیز لگتی ہے۔ ٹرائل کے لیے لائے جانے والے کتے تربیت یافتہ ہی تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تربیت یافتہ کتے دھماکا خیز مواد کا سُراغ لگانے

میں ناکام رہیں؟ مرزا تنقید بیگ کو کتوں کی ناکامی پر ذرا بھی حیرت نہیں۔ اُن کا استدلال ہے کہ ریلوے کے محکمے میں اب کچھ بھی معیاری نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ٹرائل میں استعمال کیا جانے والا دھماکا خیز مواد بھی غیر معیاری ہو!

ہم نے اعتراض کیا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

مرزا نے جھٹ جواب داغا۔ ''ہو کیوں نہیں سکتا؟ جب ٹرین کا سربراہ یعنی انجن غیر معیاری ہو سکتا ہے تو پھر ٹرائل میں بارود بھی غیر معیاری ہو سکتا ہے۔''

مرزا کی یہ بات ہم نے برداشت تو کرلی مگر ہضم نہ ہو سکی۔ مگر مرزا اپنی بات پر قائم رہے۔ ''ہو سکتا ہے کہ ٹرائل کے لیے لائے جانے والے بارود میں بُو ہی نہ ہو اور ہم خواہ مخواہ کتوں کو نااہل سمجھ رہے ہوں! ریلوے والوں کو دنیا بھر سے غیر معیاری چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے۔ جب بھی ادارے کے لیے کچھ خریدنا ہوتا ہے تو بازار سے اچھی طرح چھانٹ کر ناقص اشیاء لائی جاتی ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ چلتے چلتے ٹرین اچانک کہیں ویرانے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ جب تک خرابی دور نہیں ہو جاتی، مسافر بے چارے سہمے ہوئے

رہتے ہیں کہ پتہ نہیں کب ڈکیتوں کا کوئی گروہ کہیں سے وارد ہو اور پوری ٹرین کو لوٹ کر چلتا بنے!"

کتوں کے لیے مرزا کے دل میں نرم گوشہ دیکھ کر ہمیں حیرت تو کچھ خاص نہیں ہوئی مگر تھوڑا سا حسد ضرور ہوا۔ جی ہاں، کتوں سے! اگر مرزا ہمارے لیے بھی اپنے دل میں کچھ نرم گوشہ رکھتے تو کیا بات تھی! مگر خیر، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں "صفِ سگاں" میں نہ رکھنا چاہتے ہوں!

مرزا کو اِس بات سے دُکھ پہنچا کہ ٹرائل میں ناکام ہو جانے پر کتوں کو ریلوے والوں نے ملازمت کے لیے گرین سگنل نہیں دیا۔ اُنھوں نے اِس نکتے پر زور دیا کہ کتوں نے بارود وارود ایک طرف ہٹا کر بلیوں کے پیچھے بھاگ کر اپنے فطری رجحانات کا اظہار کیا ہے۔ جو کسی بھی طرح کی پیشہ ورانہ تربیت پانے کے بعد بھی اپنی اصلیت یعنی جبلت و فطرت نہ بھولے ہوں اُن "اصیل" کتوں کو تو پہلی فرصت میں ریلوے کی ورک فورس کا حصہ بنایا جانا چاہیے۔ مرزا نے یہ آئیڈیا بھی پیش کیا کہ اگر کتے بارود سُونگھنے میں ناکام بھی رہے تو کچھ غم نہیں۔ چند ایک بندر اور بکرے بھی اپائنٹ کرکے اِن کتوں کو مسافروں کا دِل بہلانے والے کرتب دکھانے کیلئے بھی بروئے کار لایا جا سکتا تھا! مگر پھر یہ آئیڈیا اُنھوں نے خود ہی مسترد کر دیا کیونکہ اِس کام کے لیے تو ڈانگنگ کار

کے ویٹرز اور وینڈرز موجود ہیں جو چلتی ٹرین میں جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک بوگی سے دوسری بوگی میں داخل ہوتے ہیں اور مسافر دل تھام کر یہ مناظر دیکھتے رہتے ہیں!

ہم نے سمجھایا کہ کتے جب ٹرائل میں یعنی اپنے کام میں ناکام ہو کر نا اہل ثابت ہو گئے تو اُنہیں نوکری کیوں کر دی جاسکتی تھی۔

مرزا کے پاس کوئی اور ہی دلیل تھی۔ بولے۔ ”ریلوے میں بھرتی کا اُصول اب تک تو یہی رہا ہے کہ جسے کام نہ آتا ہو اُسے نوکری دی جائے! پورے محکمے کی کارکردگی اِس امر کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ جسے کام نہیں آتا اُسی کو نہ صرف ملازمت دی جاتی ہے بلکہ سَر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے! ٹرینیں چلیں نہ چلیں، یہ لوگ چلتے رہتے ہیں۔ اور اِنہی کے دم سے خسارہ بھی رواں دواں رہتا ہے۔“

ہم نے عرض کیا کہ ایسا نہیں ہے۔ ریلوے میں کچھ کام کے لوگ بھی ہیں جن کے دم قدم سے یہ محکمہ جیسے تیسے چل رہا ہے۔

مرزا نے ہماری بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی تو اِس دنیا کا اُصول ہے۔

جن کے بغیر کام چل ہی نہ سکتا ہو اُنہیں ضرور رکھا جاتا ہے۔ یہ دنیا چند ایماندار اور محنتی لوگوں ہی کے دم سے چل رہی ہے۔ ادارے مشترکہ گھرانوں کے اُصول پر کام کرتے ہیں۔ جس طرح کسی بھی بڑے گھر میں دو ایک افراد کام کرتے ہیں اور باقی ہڈ حرامی کے ریکارڈ توڑنے پر تُلے رہتے ہیں بالکل اُسی طرح کسی بھی ادارے کی گاڑی کو کھینچنے کے لیے چند ایک کام کے گدھے ...... معاف کرنا، میرا مطلب ہے بندے تو رکھے ہی جاتے ہیں۔ اور اِن سے وہی سلوک روا رکھا جاتا ہے جو بوجھ ڈھونے اور کھینچنے والے گدھوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ اور پھر یہ بھی سوچو کہ جو ہستی اِتنی بڑی کائنات اور خود پاکستان کو چلا رہی ہے وہ کیا پاکستان ریلوے کو نہیں چلا سکتی! ''

بات کائنات کے خالق کی قُدرتِ کاملہ تک پہنچی تو ہمیں سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ حق تو یہ ہے کہ ہمارے بیشتر قومی اداروں نے وجودِ باری تعالیٰ کا شہود منوانے کی قسم کھا رکھی ہے! ہم سب کا خالق چاہے تو کیا نہیں کر سکتا؟ وہی ہے جو ہمارے اداروں کو اُن کے کردہ و ناکردہ خسارے کے ساتھ بخوبی چلا رہا ہے!

مرزا کا مشورہ ہے کہ پلیٹ فارم پر اور ٹرین میں مسافروں کا سامان سُونگھنے کے لیے ریلوے کے بعض انتہائی کرپٹ اعلیٰ افسران کی خدمات حاصل کی جانی چاہئیں۔ ہم نے حیران ہو کر توضیح چاہی تو مرزا نے یہ عظیم نکتہ ہمارے گوش

گزار کیا۔ ”بات یہ ہے بھائی کہ ریلوے کے کرپٹ افسران کی قوتِ شامہ غضب کی ہے یعنی اِس نے ریلوے پر غضب ڈھایا ہے۔ ادارے میں جہاں کہیں معاملات درست ہوں اور چار پیسے کی آمدنی ہو رہی ہو، یہ فوراً بُو سُونگھ کر اُس شعبے پر شب خون مارتے ہیں اور اپنے مفاد کی ہڈی لے اُڑتے ہیں!“

انوکھا لاڈلا، کھیلن کو مانگے ..... مریخ

بھارتی قیادت نے تمام پریشانیوں کا بہت اچھا حل تلاش کر لیا ہے۔ جب معاملات سمجھ میں نہ آ رہے ہوں تو انہیں یا تو ''بالائے طاق کے اوپر'' رکھ دینا چاہیے یا پھر بوریا بستر لپیٹ کر کہیں اور چل دینا چاہیے۔

جو لوگ زمین پر مسائل حل نہیں کر پاتے وہ آسمانوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ زندگی بھر کچھ نہ کرنے والے آسمان کو تکتے ہوئے دست بہ دعا رہتے ہیں۔ دِلّی سرکار خیر سے دعا کی منزل سے بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ چاند پر تو مغرب کے یاروں نے پہلے بستیاں بسالی ہیں اِس لیے چانکیہ کے چیلوں نے آسمان کی چادر میں ذرا آگے جاکر پیوند لگانے کا سوچا اور مریخ کا رخ کیا ہے۔

علاقائی سُپر پاور بننے کے چکر میں بھارت نے سفارتی دستر خوان پر ہر پڑوسی ملک کے سامنے خوب خوب تنازعات پروسے ہیں۔ ایک پاکستان پر کیا موقوف ہے، نیپال سے سری لنکا تک سبھی پریشان ہیں۔ لے دے کر بس چین ہے جس نے بھارت کا ناطقہ بند کیا ہے۔ چین نے 1962 میں بھارت کی مہم جُو طبعیت کو ایسی لگام دی

کہ دِلّی سرکار کو اگر وہ چند روزہ جنگ کبھی یاد بھی آ جائے تو سَر اور دِل دونوں تھام لیتی ہے!

نومبر 2011 میں چین نے مریخ کیلئے تحقیقی مشن روانہ کرنا چاہا مگر تجربہ ناکام رہا۔ اس سے قبل 1998 میں جاپان بھی ناکامی سے دوچار رہا تھا۔ چین کی ٹیکنالوجی کے بارے میں تو دو رائے ہو سکتی ہے مگر جاپان؟ وہ تو ٹیکنالوجی کا امام ہے۔ اُس کی ٹیکنالوجی بھی ناکام ہو گئی! مگر اِن دونوں کے تجربے سے نئی دہلی کے حکمرانوں نے کوئی سبق نہ سیکھا اور مریخ پر مشن بھیجنے کیلئے کمر کس لی۔

5 نومبر کو بھارت نے جنوبی ریاست آندھرا پردیش کے مشرقی حصے میں واقع سری ہری کوٹا لانچنگ گراؤنڈ سے اپنا مشن ''منگل یان'' مریخ کی طرف روانہ کر دیا۔ ''منگل یان'' 30 نومبر تک زمین کے مدار میں رہے گا جس کے بعد بنگلور کا خلائی مرکز اِسے مریخ کے 9 ماہ کے سفر پر روانہ کرے گا۔ 40 کروڑ کلو میٹر کا فاصلہ طے کرکے یہ خلائی جہاز 12 ستمبر 2014 کو مریخ کے مدار میں داخل ہوگا۔ ''منگل یان'' کو 500 سائنس دانوں نے 15 ماہ کی شبانہ روز محنت کے بعد تیار کیا ہے۔ اس منصوبے پر ساڑھے چار تا پانچ ارب روپے خرچ ہوئے ہیں۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم آٹھ ارب روپے تک جا پہنچتی ہے۔

منگل یان'' کے بطن سے اب تک کچھ برآمد نہیں ہوا مگر اِس کی لانچنگ نے بھارت'' میں ایک نئی بحث کو ضرور جنم دیا ہے۔ سائنس دان، دانشور اور سیاسی مبصرین یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ کیا بھارتی قیادت نے تمام بنیادی مسائل حل کر لیے جو اب زمین سے یاری ترک کرکے خلاء کی گہرائیوں کو کھنگالا جارہا ہے؟ ان تبصروں میں بھارتی قیادت کے لیے ایک ہی مشورہ ہے ع

!دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

کلو گرام کا ''منگل یان'' مریخ کی طرف اُسی بھارت نے روانہ کیا ہے جس کے 1350 کروڑ سے زائد باشندے آج بھی پینے کے صاف پانی سے یکسر محروم ہیں۔ اِتنی ہی 23 تعداد میں لوگ آج بھی ایک وقت بھوکے رہتے ہیں۔ 12 کروڑ سے زائد افراد خوراک کی مقدار اور معیار دونوں کے معاملے میں انتہائی پچھڑے ہوئے ہیں۔ 20 کروڑ سے زائد بھارتی گھرانے آج بھی گھر کے نام پر ایک تنگ و تاریک کمرے میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ ایک کمرے کے ان مکانات کے ایک کونے میں ''کچن'' اور دوسرے کونے میں برتن اور کپڑے دھونے کا چوکھٹا بھی بنا ہوتا ہے۔ کروڑوں افراد کو اپنے نام نہاد گھروں میں بیت الخلاء اور غسل خانے کی سہولت میسر نہیں۔ دہلی، مدراس، کولکتہ، ممبئی، حیدرآباد دکن اور احمدآباد سمیت 20 چھوٹے بڑے شہروں اور قصبوں میں کم و بیش 8 کروڑ افراد علی

الصباح فطرت کی پکار پر کھیتوں، ریل کی پٹڑیوں اور خالی پلاٹس کا رُخ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں!

منگل یان'' کی لانچنگ کی شکل میں کی گئی ''خلائی فضول خرچی'' پر خلائی تحقیق کے'' ادارے انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (اِسرو) کے سابق سربراہان میں شدید اختلافات سامنے آئے ہیں۔ ''اِسرو'' کے سابق سربراہ جی مادھون نایر کا کہنا ہے کہ اِس مشن سے زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کرنا چاہئیں کیونکہ خلائی تحقیق کا امریکی ادارہ'' ناسا' پہلے ہی واضح کرچکا ہے کہ مریخ پر زندگی کے آثار نہیں اور وہاں میتھین گیس' کے ذخائر کا سُراغ لگاکر اُن سے متعلق اعداد و شمار بھی انٹرنیٹ پر جاری کئے جاچکے ہیں۔ اب ایسا کیا ہے جو بھارت دریافت کرے گا؟ جب 'ناسا' نے مریخ کے بارے میں بہت سی بنیادی باتیں معلوم کر ہی لی ہیں تو بھارت کا مریخ پر تحقیق کرنا عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔'' خلائی تحقیق سے وابستہ سائنس ایمتابھ گھوش نے ''اِسرو'' کے سابق سربراہان ڈاکٹر کے کستوری رنگن اور یو آر راؤ کے بیانات پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ بھارت کا مریخ مشن کوئی نیا اور مفید کام نہیں! جوکچھ انٹرنیٹ کے ذریعے چند منٹوں میں معلوم کیا جاسکتا ہے اُسے جاننے کے لیے زرِ کثیر خرچ کرکے خلائی مہم جُوئی کا ''ارتکاب'' کسی طور قابل قبول نہیں!

معروف سماجی رہنما ہرش مندر نے بھی مریخ مشن پر 500

کروڑ روپے خرچ کیے جانے کو صریح فضول خرچی قرار دیا ہے۔

ہندی کے معروف اخبار ''جاگرن'' نے انکشاف کیا ہے کہ مریخ کی طرف مشن روانہ کرنے کی 9 کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئی تھیں۔ اگر بھارت 30 نومبر کے بعد منگل یان'' کو زمین کے مدار سے مریخ کی طرف روانہ کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ'' ایسا کرنے والا پہلا ایشیائی ملک ہوگا۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ بھارت مریخ تک اپنا تحقیقی جہاز پہنچا کر کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟ کیا پڑوسیوں اور دیگر علاقائی ممالک پر اپنی ٹیکنالوجیکل برتری کا رعب جمانا ہے؟ مریخ کے مدار میں داخل ہونے کا خواہش مند بھارت اب تک اپنے 50 کروڑ باشندوں کو غربت کی لکیر کے مدار سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اپنے ہاں معاشی ناہمواری دور کرنے میں قدم قدم پر ناکام رہنے والا ملک کبھی عالمی معیشت میں بڑا کردار ادا کرنے کی باتیں کرتا ہے اور کبھی اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں دائمی نشست حاصل کرنے کی دوڑ میں حصہ لیتا دکھائی دیتا ہے۔ بھارت نے کئی شعبوں میں ترقی کی ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی اُن میں نمایاں ہے مگر ایسی ترقی کس کام کی جو ملک کی آدھی سے زائد آبادی کو آج بھی بنیادی سہولتوں کی فراہمی یقینی بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکی؟ شمال مشرقی بھارت سمیت کم و بیش دس ریاستوں میں کسی نہ کسی سطح

پر علیحدگی کی تحریک چل رہی ہے۔ کئی ریاستوں میں باغی اِس قدر مضبوط ہیں کہ اِن کے بہت سے علاقوں میں ریاستی عملداری تقریباً ناپید ہو کر رہ گئی ہے۔ کشمیر ہی کی مثال لیجیے جہاں آج بھی کم و بیش سات لاکھ فوجی اور نیم فوجی دستے تعینات ہیں۔ یہ تمام مسائل اٹل حقیقت بن کر منصۂ شہود پر موجود ہیں مگر اِن سب کو بُھلا کر مریخ کو تسخیر کرنے کی ٹھانی گئی ہے !

خلائی تحقیق کے شعبے میں بھارت کی عظیم الشان کامیابی (!) کا دفاع کرتے ہوئے فزیکل ریسرچ لیبارٹری کے چیئرمین آر راؤ کہتے ہیں کہ مریخ مشن پر 500 کروڑ روپے خرچ ہوگئے تو کیا ہوا؟ دیوالی پر لوگ پانچ ہزار کروڑ روپے کے پٹاخے بھی تو پھوڑ ڈالتے ہیں ! راؤ صاحب کو یہ خیال نہیں آیا کہ لوگ اپنے پیسوں سے پٹاخے چلاتے ہیں، حکومت کی طرح عوام کی کمائی پر ڈاکا ڈال کر خلائی مہم جُوئی کی پھلجھڑیاں نہیں چھوڑتے !

دِلّی سرکار کو مریخ پر کس چیز کی تلاش ہے؟ کیا وہ اپنے 23 کروڑ باشندوں کے لیے پینے کے صاف پانی کے ذخائر دریافت کرنا چاہتی ہے؟ مبصرین تو یہ بھی کہتے ہیں کہ انتخابات سَر پر ہیں تو کانگریس نے ''منگل یان'' روانہ کرکے سیاسی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ''ناسا'' بتا چکا ہے تو مریخ پر زندگی کے آثار نہیں تو پھر بھارت وہاں زندگی کے امکانات کیوں تلاش کرنا چاہتا ہے؟

کہیں ایسا تو نہیں چین کی آبادی دیکھ کر دِلّی سرکار کو کمتری کا احساس ہوتا ہو اور وہ مریخ کی مخلوق کو اپنی دھرتی پر بسا کر چین کی برابری کرنا چاہتی ہے!

ہمیں ''منگل یان'' کے کامیاب سفر کی دُعا کرنی چاہیے کیونکہ مریخ مشن کا کوئی بھی ناخوشگوار نتیجہ سامنے آنے پر بھارت کی پروپیگنڈا مشینری آئی ایس آئی کی مزید مشہوری'' کے اہتمام میں دیر نہیں لگائے گی!''

اب پیاز بم سے مارے گا پاکستان!

پیاز نے علاقائی سُپر پاور پر "وختا" ڈالا ہوا ہے اور ٹماٹر بھی اُس کا خوب ساتھ دے رہا ہے۔ جو حکومت مریخ کی طرف تحقیقی مشن روانہ کرکے شادیانے بجارہی ہے اُسی کو پیاز اور ٹماٹر نے پریشانی میں مبتلا اور شرمندگی سے دوچار کر رکھا ہے۔ ایٹمی اثاثوں کے تحفظ سے زیادہ اب دِلّی سرکار کو فوڈ سیکیورٹی کی فکر لاحق ہے۔ سیاست کے ڈرامے میں رومانس نام کو بھی نہیں بچا، صرف ٹریجڈی رہ گئی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں پیاز حکومت اور عوام دونوں کو خون کے آنسو رلا رہی ہے۔ دِلّی کی وزیر اعلیٰ شیلا ڈکشٹ نے بھی یہ بیان دے کر لوگوں کو مزید دہلادیا کہ اُن کے گھر میں کئی کئی دن بعد پیاز والا سالن پکتا ہے!

چند ماہ کے دوران بھارت میں پیاز کے ستم ہائے بے جا نے ایک طویل تاریخ رقم کی ہے۔ بنی اسرائیل نے من و سلویٰ اتارے جانے پر بھی پیاز کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اللہ ہی جانے پیاز میں ایسا کون سا جادو ہے کہ برِ صغیر کے لوگ اس کے بغیر جینے کا تصور بھی کرنے کو تیار نہیں۔ پاکستان میں بھی عالم یہ ہے کہ پیاز کی ذرا سی قلت ہو جائے تو لوگ بستی بستی، قریہ قریہ، جنگل جنگل اِسے یوں ڈھونڈتے پھرتے ہیں جیسے نہ ملی تو قیامت آجاتی ہے۔ اور ایسے

! عالم میں پیاز کی خریداری کم از کم جیب پر تو قیامت ڈھا ہی جاتی ہے

پیاز نے بھارت میں چند ماہ کے دوران ایسے گل کھلائے ہیں کہ دِل و دِماغ اُن کی خوشبو'' سے پھٹے جاتے ہیں! پیاز سامنے ہو تو لوگ کسی کی جان بچانے کا تصور بھی'' ذہن سے کھرچ کر پھینک دیتے ہیں۔ مشرقی بھارت میں بہار سے متصل ریاست جھاڑ کھنڈ میں یہی ہوا۔ رانچی پٹنہ شاہراہ پر پیاز کی بوریاں لے جانے والا ٹیمپو تیز رفتاری کے باعث اُلٹا تو ایک راہ گیر اُس کے نیچے دب گیا۔ لوگوں نے سڑک پر پیاز کی بوریاں دیکھیں تو اُن کی آنکھیں چمک اٹھیں اور پیاز کی بوریاں اِس طرح لے بھاگے جیسے وہ کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی بوریاں ہوں! یہ تماشا بہت دیر تک جاری رہا۔ وہاں سے گزرنے والی چند گاڑیاں بھی رُکیں، اُن میں سے لوگ اُترے اور پیاز کی بوریاں لاد کر چل دیئے! کافی دیر بعد لوگوں کو اُس غریب کا خیال آیا جو ٹیمپو کے نیچے دبا ہوا تھا۔ خون زیادہ بہہ جانے سے اُس کی حالت غیر ہوچکی تھی۔ اُسے ہسپتال لے جایا گیا مگر کچھ ہی دیر میں وہ چل بسا۔

پیاز کا تنازع کبھی کبھی فائرنگ رینج میں بھی داخل ہو جاتا ہے۔ اُتر پردیش کے شہر اٹاوا کے علاقے علی گنج میں چند دوست ایک ہوٹل پر ناشتے کے لیے پہنچے۔ ہوٹل والے نے آملیٹ میں پیاز نہیں ڈالی۔ جب اِن نوجوانوں نے پیاز

ڈالنے کی فرمائش کی تو ہوٹل والے نے کہا یہ مُنہ اور مَسور کی دال ! یعنی پیاز اتنی مہنگی ہے کہ آملیٹ میں ڈالی ہی نہیں جاسکتی۔ معاملہ بڑھا، تکرار ہوئی اور پھر یہ ہوا کہ ایک نوجوان نے ریوالور نکال کر گولی داغ دی جس سے ہوٹل والا زخمی ہوگیا! پیاز کی ایسی عزت افزائی پر ہمیں تو رشک آ رہا ہے۔ نوجوان اِس تیزی سے تو ''پیار'' کے معاملے میں بھی جذباتی نہیں ہوا کرتے!

پیاز کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ وہ اب بھارتی عوام کے جسم سے خون بھی نچوڑنے پر تُلی ہوئی ہے۔ گجرات کے شہر سُورت میں ایک بلڈ ڈونیشن کیمپ کی انتظامیہ نے ایک پوائنٹ خون کے بدلے ایک کلو پیاز اور ایک پٹرول دینے کا اعلان کیا تو رگوں میں خون جس رفتار سے دوڑتا ہے اُس سے کہیں زیادہ رفتار سے سیکڑوں افراد بلڈ ڈونیشن کیمپ کی طرف دوڑے۔ کیمپ انتظامیہ نے خون کا ''عطیہ'' لینے کے بعد اُنہیں پیاز اور پٹرول دے کر رخصت کیا۔ اگر غالبؔ ہوتے تو اِس صورت حال کو یوں بیان کرتے ۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جو پیاز پر نہ ''نُچڑ'' جائے وہ لہو کیا ہے!

حالات کا چمتکار یہ ہے کہ دِلّی سرکار پیاز اور ٹماٹر پاکستان سے خریدنے پر

مجبور ہو گئی ہے۔ ایران، چین اور مصر سے بھی پیاز منگوانے پر غور کیا جارہا ہے مگر ترجیح پاکستان کو دی گئی ہے کیونکہ پڑوسی ملک ہونے کے ناطے پیاز سستی بھی ملے گی اور بار برداری کے اخراجات بھی برائے نام ہوں گے۔ اگر پاکستان کے تاجر دُگنی قیمت پر بھی پیاز بھارت کو بیچیں تب بھی اُسے سستی پڑے گی کیونکہ اس وقت بیشتر بھارتی ریاستوں میں پیاز کے نرخ 80 اور 100 روپے فی کلو کے درمیان ہیں۔ پاکستان میں پیاز 30 تا روپے فی کلو کے نرخ پر فروخت ہو رہی ہے۔ بھارت میں یہ نرخ 35 روپے فی کلو 50 تک بنتا ہے۔

پاکستان سے پیاز خریدنے کی بات سُن کر انتہا پسند ہندوؤں کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے ہیں۔ حالات کے چمتکار نے انتہا پسند ہندوؤں کے ''اہنکار'' کو خوب ہوا دی اور ملک کے مقبول ترین ہندی اخبار ''جاگرن'' نے پیاز درآمد کرنے کی خبر ''اب پیاز بم سے مارے گا پاکستان!'' کی سُرخی لگا کر شائع کی۔

حسد اور بغض کی شدت کا یہ عالم ہے کہ پاکستان سے خاصی سستی پیاز مل رہی ہے تب بھی یہ غم ستائے جارہا ہے کہ پاکستان سے کچھ لینا پڑ رہا ہے! یعنی خواہش یہ ہے کہ تجارت کے نام پر پاکستان ہی کچھ نہ کچھ منگاتا رہے، بھارت کو کچھ نہ لینا پڑے۔ یعنی توازنِ تجارت کبھی ناموافق یا متوازن نہ ہو بلکہ پاکستان کے خلاف ہی رہے۔ خوار اگر آنا ہی ہے تو پیاز پر آنا چاہیے نہ کہ پاکستان پر۔ ایک ذرا سی ڈلی نے علاقائی سُپر پاور کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ اور

انتہا پسند ہندوؤں کو زیادہ یا اصل دُکھ اِس بات کا ہے کہ دِلّی سرکاری اور انٹیلی جنس مشینری ''پیاز اسکینڈل'' کے ڈانڈے کسی بھی طور پاکستان سے نہیں ملا پارہی ! اِتنے بڑے دردِ سر نے ملک کی نصف ریاستوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے اور پاکستان پر الزام لگانے کا موقع ہاتھ نہیں آرہا!

بھارت میں تہواروں کا موسم چل رہا ہے۔ ایسے میں اگر سالن میں پیاز ہی نہ ہو تو کھانے کا کیا خاک مزا آئے گا۔ تہواروں کی لذت کو پھیکا پڑنے سے روکنے کے لیے پاکستان کو پیاز بھیجنے کی زحمت دی جارہی ہے! ویسے پاکستانی پیاز کئی ہفتوں سے دِلّی کے بازاروں میں فروخت ہو رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عوامی ردِ عمل سے بچنے کے لیے بوریوں پر لیبل افغانستان کا لگایا گیا ہے! ایک زمانہ تھا جب مسلم فنکار بالی وڈ کی فلموں میں ہندوانہ ناموں سے کام کرتے تھے کیونکہ اِس صورت میں اُنہیں فلم بین آسانی سے قبول کرلیتے تھے۔ پچاس ساٹھ سال پہلے کی ذہنیت نے دم نہیں توڑا۔ اب یہ ذہنیت پیاز کے معاملے میں اُبھر کر سامنے آگئی ہے۔ پاکستان کی پیاز کھانی ہے مگر لیبل افغانستان کا چڑھانا ہے! یہ تو ''مشرقی عورت'' والی ذہنیت ہوئی جو شوہر کا نام لیتے ہوئے شرماتی ہے!

گولڈن کامیڈی سرکس

اب کے دیوالی دِلّی سرکار اور اُتر پردیش کے مشہور یوگی شوبھن سرکار کے لیے بُجھے ہوئے چراغ لائی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ شوبھن سرکار نے دِلّی سرکار کو ایسے ''سنکٹ'' میں ڈالا ہے کہ وہ اب تک دِل تھام کر سَر پیٹ رہی ہے!

یہ معاملہ ایک خواب سے شروع ہوا جس کے بعد کئی سلسلے ہوئے۔ اب حالت یہ ہے کہ بہت سے گُل کھلے ہوئے ہیں اور مزید کِھلانے جا رہے ہیں! شوبھن سرکار نے ڈھائی تین ماہ قبل وزیر مملکت.برائے زراعت چرن داس مہنت سے رابطہ کیا۔ اُن کے مشورے پر شوبھن سرکار نے دِلّی سرکار کو ایک خط کے ذریعے بتایا کہ اُنیسویں صدی کے دوران ضلع اُنّاؤ اور اُس سے مُلحق علاقے کے حکمران راجہ رام بخش راؤ سنگھ نے اُنھیں خواب میں درشن دے کر بتایا ہے کہ اُن کے اُنّاؤ کے قلعے میں ہزار ٹن (جی ہاں، من نہیں ٹن!) سونا گڑا ہوا ہے۔ اُنھوں نے یہ سونا جنگِ آزادی کے دنوں میں لٹیروں سے بچانے کے لیے دفن کیا تھا۔ شوبھن سرکار نے دِلّی سرکار پر زور دیا کہ یہ خزانہ نکال کر معیشت کی حالت سُدھاری جائے! اپنی بات پر زور دینے کے لیے سوبھن سرکار نے یہ بھی کہا کہ

اگر اُن کے بتائے ہوئے مقام سے سونے کا ذخیرہ برآمد نہ ہو تو اُن کی گردن اُڑا دی جائے!

ایسا لگتا تھا کہ دِلّی سرکار کے پاس فُرصت ہی فُرصت تھی۔ شُغل میلے کی خاطر اُس نے شوبھن سرکار کی بات پر بھروسہ کرتے ہوئے جیالوجیکل سروے آف انڈیا (جی ایس آئی) کو کام پر لگا دیا۔ جی ایس آئی نے دو دن میں جدید آلات کی مدد سے اُناؤ کے قلعے کا سروے کیا اور ابتدائی رپورٹ میں بتایا کہ قلعے کی زمین میں چند دھاتوں کا سُراغ ملا ہے! اِس رپورٹ کو گرین سگنل کا درجہ دیتے ہوئے دِلّی سرکار نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا (اے ایس آئی) کو خزانے کی تلاش کا ٹاسک سونپ دیا۔ اے ایس آئی کے ماہرین کی نگرانی میں 18 اکتوبر کو اُناؤ کے قلعے میں کھدائی کا آغاز ہوا۔

یہ کوئی معمولی کھدائی تو تھی نہیں کہ کسی کو پتہ نہ چلتا۔ علاقے بھر کے لوگ تو اُمڈے سو اُمڈے، ٹی وی چینلز کی گاڑیاں بھی کوریج کے لیے پہنچ گئیں۔ ٹی وی چینلز کو تو ویسے بھی پربت بنانے کے لیے رائی کا دانہ درکار ہوا کرتا ہے۔ اُنگلی تھمایئے تو وہ پلک جھپکتے میں کلائی تھام لیتے ہیں اور وہ بھی لائیو! قلعے کے باہر تو میلہ لگ گیا۔ سونے کی تلاش کا سُن کر جتنے لوگ قلعے کے باہر جمع ہوئے اُتنے لوگ تو خود راجہ رام بخش راؤ سنگھ کی قلمرَو میں

بھی نہ ہوں گے!

خیر، ڈھول تاشے اور بینڈ باجے کے ساتھ اے ایس آئی نے کھدائی شروع کی۔ کئی دن گزر گئے مگر کچھ ہاتھ نہ لگا۔ پھر دُعائیں مستجاب ہوئیں۔ ایک کچن کے آثار ہویدا ہوئے۔ ایک چولھا، چند برتن، لوہے کی چند کیلیں اور چوڑیوں کے چند ٹکڑے۔ یہ تھی خاصے اہتمام کے ساتھ ایک ہفتے کی کھدائی میں ہاتھ لگنے والی کُل کائنات! اِتنا ضمنی فائدہ ضرور ہوا کہ راجہ رام بخش راؤ سنگھ کے خاندان سے نسبت کی بنیاد پر خزانے پر حق جتاتے ہوئے تین چار ہزار افراد میدان میں آ گئے!

سارے بھارت واسیوں کی طرح شوبھن سرکار نے بھی دیکھ لیا کہ ایک ہفتے کی کھدائی کے بعد بھی اُن کے خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کے آثار نہیں۔ مگر اِس پر وہ شرمندہ ہوئے نہ بدحواس۔ میڈیا کے ذریعے جنتا کو درشن دیتے ہوئے شوبھن سرکار نے یہ شوشہ چھوڑا کہ جب تک اُنہیں ''موقع'' پر مدعو نہیں کیا جائے گا، سونا ہاتھ نہ آئے گا! ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اے ایس آئی نے کھدائی صحیح ڈھنگ سے نہیں کی۔ اگر فوج سے کھدائی کرائی جاتی تو سونا مل چکا ہوتا! ساتھ اُنھوں نے اپنا ریکارڈ دُرست کرتے ہوئے بتایا کہ اُنہیں راجہ رام بخش راؤ سنگھ نے گڑے ہوئے سونے کی خبر خواب میں نہیں بلکہ مراقبے میں

دی تھی۔ گویا جاگتی سوتی آنکھوں کا مشترکہ خواب تھا!

شوبھن سرکار کے ایک چیلے مُنّا سنگھ نے 21 اکتوبر کو زی نیوز سے گفتگو میں کہا کہ اگر کھدائی تیز رفتاری سے نہ کی گئی تو سونے کا ذخیرہ ہاتھ نہیں لگے گا کیونکہ وہ اپنی پوزیشن بدل لے گا!

دو ہفتوں کی کھدائی میں سونے کا ایک ذرہ بھی ہاتھ نہ لگنے اور چند فضول سی اشیاء ملنے پر شرمندہ یا پریشان ہوئے بغیر اے ایس آئی (لکھنؤ سرکل) کے سپرنٹنڈنگ آرکیالوجسٹ پروین کمار شری واستو نے کہا کہ اے ایس آئی کو سونے سے غرض نہیں۔ اُس کے لیے تو گزرے ہوئے زمانوں کی کسی چھوٹی سی چیز کا ملنا بھی خزانے سے کم نہیں! اور پھر دیوالی کی تعطیلات کے باعث 2 نومبر کو کھدائی روک دی گئی۔

شوبھن سرکار نے 2 نومبر کو وزیر اعظم من موہن سنگھ اور اُتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ اکھیلیش یادو کو خط لکھا جس میں اِس بات پر زور دیا گیا کہ خزانے کی کھدائی شفاف ہونی چاہیے یعنی کھدائی کا عمل بڑے ٹی وی چینلز پر براہِ راست دکھایا جائے، عوام کو کھدائی کے مقام تک جانے دیا جائے۔ یہ گویا دِلّی سرکار پر عدم اعتماد کا اظہار تھا کہ وہ سونا لے اُڑے گی اور واویلا یہ کرے

!گی کہ کچھ ہاتھ نہیں لگا

قلعے میں سونے کا سُراغ لگانے کے لیے کھدائی کا دُنیا بھر میں پہلے تو چرچا ہوا مگر پھر دِتی سرکار کی جنگ ہنسائی ہوئی۔ لوگ حیران تھے کہ مریخ پر تحقیقی مشن بھیجنے والی حکومت کا !یہ حال ہے کہ ایک سادھو کے خواب کی بُنیاد پر سونا تلاش کرنے نکل پڑی

ایک جُھوٹ چُھپانے کے لیے انسان کو سو جُھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔ اور حکومتوں کو تو ہزار جُھوٹ بولنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا! اُناؤ کے قلعے میں سونے کا نام و نشان تک نہ ملنے پر مرکزی وزیر ثقافت چندریش کماری کٹوچ نے 24 اکتوبر کو میڈیا کے سامنے یہ انکشافیہ بیان داغا کہ حکومت اُناؤ کے قلعے میں سونے کا ذخیرہ تلاش کرنے کے لیے نہیں بلکہ 1857 کی جنگِ آزادی میں حُریت پسندوں کے طرف سے استعمال کئے جانے والے ہتھیاروں کا سُراغ لگانے کی خاطر کھدائی کرا رہی ہے! اور غایت یہ ہے کہ اِن ہتھیاروں کو محفوظ کرلیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ہتھیار اگر واقعی اُناؤ کے قلعے میں مدفون ہیں تو کیا اِتنی طویل مدت سے محفوظ نہیں؟ قلعے کی زمین کھود کر اِن ہتھیاروں کی نیند کیوں خراب کی جارہی ہے؟

اِس پورے معاملے میں اے ایس آئی کی خاصی بُھد اُڑی ہے۔ اِس ادارے کے اعلیٰ

افسران نے اِتنی احتیاط ضرور برتی ہے کہ کسی بھی باضابطہ بیان میں یہ نہیں کہا کہ کھدائی سونے کے ذخیرے کے لیے کی جارہی ہے! یعنی اُنہیں بھی سرکاری حماقت کا اندازہ تھا کہ پہاڑ کھودنے پر شاید چوہا بھی نہ نکلے!

جی ایس آئی کی ساکھ بھی داؤ پر لگ گئی۔ جب سونا نہ ملنے پر میڈیا نے شوبھن اور دِلّی سرکار کے ساتھ ساتھ اے ایس آئی کو بھی لتاڑا تو اُس نے یہ کہتے ہوئے جان چُھڑائی کہ وہ ''آرڈر پر مال بنا رہا تھا'' یعنی جی ایس آئی کی تجویز پر کھدائی کی جارہی تھی۔ جب جی ایس آئی نے یہ دیکھا کہ سارا ملبہ اُس پر گر رہا ہے یا گرایا جارہا ہے تو اُس نے انکشاف کیا کہ ستمبر کے آخر میں اُنّاؤ کے قلعے کی زمین کا جو دو روزہ سروے اُس نے کیا تھا اُس کی رپورٹ میں تو کہیں بھی یہ درج نہیں کیا تھا کہ وہاں دھاتوں کے ذخائر ہیں اور نہ ہی کھدائی کی تجویز پیش کی گئی تھی! 31 اکتوبر کو ریٹائر ہونے والے جی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل اے سُندرامُورتھی نے بھی بتایا کہ ابتدائی رپورٹ میں دھاتوں کا ذکر تھا نہ کھدائی کی تجویز۔

اُنّاؤ میں سونے کی تلاش کا معاملہ اب دِلّی سرکار کے حلق میں پھنس گیا ہے۔ لاج بچانے کا اب تو بس یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے ریزرو بینک آف انڈیا سے سونے کے بلاکس لاکر قلعے کی زمین میں گاڑے جائیں اور کھدائی کے ذریعے

انہیں ''برآمد'' کرکے میڈیا کے ذریعے جنتا کو درشن کرائے جائیں!

خواب یا مراقبے کی بنیاد پر سونے کی تلاش میں نکل کر دِلّی سرکار نے شاید جنتا کے لیے تھوڑی بہت کامیڈی کا اہتمام کیا ہے۔ اگر ایسے ہی ڈرامے وقفے وقفے سے پیش کئے جاتے رہیں تو لوگ اپنے سارے غم بھول کر ہنسی کے سمندر میں غرق ہو جائیں گے۔ کیا پتہ دِلّی سرکار یہی چاہتی ہو کہ بنیادی سہولتوں کا مطالبہ کرکے ناک میں دم کرنے والی جنتا کسی طور جان چھوڑے!

''تعلیم و ''طربیت

چینی قیادت نے تو ہر معاملے میں قیامت ڈھانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ دُنیا کی کون سی منڈی ہے جہاں چین نے اپنا مال ڈمپ کرکے اکھاڑ پچھاڑ نہیں کی؟ امریکا پریشان ہے کہ اِس معاشی عفریت کو کس طرح کنٹرول کیا جائے۔ اور دوسری طرف چینی قیادت کا یہ حال ہے کہ دُنیا بھر کی منڈیوں کو تاراج کرنے کے بعد اب پورس کے ہاتھی کی طرح اپنے ہی لوگوں کو دبوچنے، بلکہ دبوچ رکھنے پر کمربستہ ہے!

چین سے ایک دلچسپ خبر یہ آئی ہے کہ حکومت ہائی اسکولز میں طلبا اور طالبات کی ایک دوسرے میں بڑھتی ہوئی دلچسپی سے پریشان ہے۔ غور فرمایئے، طلبا و طالبات کے والدین کو پریشانی لاحق نہیں مگر حکومت تشویش میں مبتلا ہوئی جاتی ہے! اللہ ایسی حکومت سے بچائے۔ اگر حکومتیں یہ طور اپنالیں تو نئی نسل کے سارے مزے مٹی چاٹنے لگیں!

چینی حکومت کی پریشانی خاصی حیران کن ہے۔ نئی نسل سے تعلق رکھنے والے مخالف صنف میں دلچسپی لیتے ہی ہیں۔ لڑکے اگر لڑکیوں میں دلچسپی لیتے ہیں تو فطری

امر ہے۔ کیا چینی حکومت اِس کے برعکس کوئی رجحان فروغ دینا چاہتی ہے! فطری میلان کو غیر فطری طریقے سے روکنا یا تہس نہس کرنا ممکن نہیں۔

نئی نسل کے بارے میں چینی حکومت نے محض پریشان ہونے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ''پبلک کے بے حد اِصرار پر'' تھوڑی بہت کامیڈی کا بھی اہتمام کیا ہے! ہائی اسکولز میں طلبا و طالبات کو ایک دوسرے سے بچانے (!) کے لیے چینی حکومت نے چند ''رہنما اُصول'' وضع کئے ہیں اور اُنہیں نئی نسل تک پہنچا بھی دیا ہے۔ ویب سائٹس پر اِن اُصولوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اسکولز کے انتظامیہ سے کہا گیا ہے کہ وہ طلبا اور طالبات کو ہدایت کریں کہ وہ بات چیت اور کھیل کود کے دوران آپس میں فاصلہ رکھا کریں!

طلبا و طالبات کو آپس میں فاصلہ رکھنے کی ہدایت کرنا ویسے زیادہ حیرت انگیز نہیں کیونکہ چینی قیادت بھی باقی دُنیا سے خاصا فاصلہ برقرار رکھتی آئی ہے! مگر یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی کہ فاصلہ کتنا ہونا چاہیے۔ فاصلے کا تعین نئی نسل اور اسکولز کے منتظمین کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ بہر حال، زور اِس بات پر ہے کہ فاصلہ رکھا جائے یعنی ''ثوابِ دید'' پر گزارا کیا جائے! اب سوال یہ ہے کہ اگر فاصلے کا تعین اسکول کی انتظامیہ اور لڑکوں لڑکیوں کو کرنا ہے تو ''اصلاحِ احوال'' کیونکر ممکن ہوگی؟ پرنالہ تو وہیں گرتا رہے گا! جب معاملہ ذاتی صوابدید ہی پر چھوڑنا تھا تو خواہ مخواہ

!معترض ہو کر نئی نسل کو بے مزا کرنے کی کیا ضرورت تھی
فاصلہ رکھنے کے ذکر پر ہمیں جنرل ضیاء الحق مرحوم کا زمانہ یاد آگیا۔ اُنہوں نے معاشرے کو خرابی سے بچانے کے لیے حکم دیا تھا کہ فلموں میں ہیرو اور ہیروئن فاصلہ رکھیں! ایسا ظلم تو فلموں میں پائے جانے والے بدنامِ زمانہ ''ظالم سماج'' نے بھی کبھی نہیں ڈھایا تھا! فلموں کو اخلاق سوز مناظر سے پاک رکھنے کے حکم کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ سِلور اسکرین پر ہیرو اور ہیروئن کو گانوں میں محبت کا اظہار بھی چار فٹ کے فاصلے سے کرنا پڑتا تھا! گویا دونوں کسی متعدی مرض میں مبتلا ہوں! یہ منظر اچھی خاصی تبدیل ہو جاتا تھا! یہ genre سنجیدہ اور رومانی فلم میں کامیڈی پیدا کرتا تھا اور فلم کا سبب ہے کہ مارشل لا کے پورے دور میں الگ سے مزاحیہ فلمیں بنانے کی ضرورت !محسوس نہیں کی گئی
پاکستانی فلموں کو ''محبت کے اخلاقی اُصولوں'' سے ہم آہنگ کرنے کا معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ فلمی دنیا کے لوگ ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنے کا ہنر خوب جانتے ہیں! فلم میکرز نے جب یہ دیکھا کہ ہیرو اور ہیروئن کو قریب لانے پر پابندی ہے تو اُنہوں نے ہیرو کے ساتھ اُس کی جوان بہن یا ہیروئن کے ساتھ اُس کے جوان بھائی کو نچوانا شروع کر دیا! اُس دور کی ایک فلم ''روبی'' کے

گانے ''سَچّی سَچّی بول بہنا بول، سَچّی سَچّی بول بَھیا بول'' میں اظہار قاضی مرحوم اور سلمیٰ آغا کے درمیان ایک مُقدّس رشتے کو تھرکتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے !

چینی حکومت تقویٰ یقینی بنانے کے جُنون میں زاہدِ خُشک ہوئی جارہی ہے۔ زمانہ اسکول کا ہو یا کالج کا، رنگینیوں ہی سے عبارت ہوتا ہے۔ کچھ دن ہیں جو ہنسنے مسکرانے اور گنگنانے کے ہیں۔ اِس ''عہدِ زرّیں'' کے گزرتے ہی اِنسان کے نصیب میں صرف تاریکیاں رہ جاتی ہیں ! چار دن کی چاندنی کے بعد صرف وہی اندھیری رات سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ اور چینی حکومت ہے کہ چار دن کی چاندنی کو بھی میلی کرنے پر تُل گئی ہے !

مرزا تنقید بیگ کا موقف بھی یہ ہے کہ نئی نسل کے لیے صنفِ مخالف سے تعلق یکسر حرام قرار دینے کا انتہائی خطرناک نتیجہ برآمد ہوا کرتا ہے۔ اِس معاملے کو آمرانہ طور طریقوں کے بجائے جمہوری انداز سے یعنی ڈنڈے کے بجائے پیار سے نمٹانا چاہیے۔ مرزا کے خیال میں مخلوط تعلیم میں بُرائیاں بھی پائی جاتی ہیں مگر اِس طریقِ تعلیم کو بھونڈے طریقے سے ختم کرنے کے نتیجے میں اِس سے بھی زیادہ بھونڈی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے !

مرزا کہتے ہیں۔ ''ایک چینی معاشرے کو کیا روییے، ہر معاشرے کا بنیادی المیہ یہ ہے کہ کِسی بھی مسئلے کو حل کرنے پر توجہ مرکوز رکھنے سے زیادہ اہمیت اِس بات کو دی جاتی ہے کہ سائڈ اِشوز پر ہر وقت نظر رہے۔ ہر معاشرہ نئی نسل کے لیے یوں ہی ظالم سماج بن جایا کرتا ہے۔ کوئی بزرگوں کو لاکھ سمجھائے کہ آپ بھی تو جوانی کی منزل سے گزرے تھے۔ کچھ یاد ہے کہ آپ نے کیا گل کھلائے تھے۔ ایسی باتوں کا بزرگ بُرا مان جایا کرتے ہیں۔ احترام کا تقاضا ہے کہ بزرگوں کو آزار دینے والے سوالوں سے گریز کیا جائے! ''

بہت پہلے کی بات ہے۔ یہی کوئی پچیس تیس سال پہلے جب آتش جوان تھا یعنی ہم پر جوانی تھی تب ہمارے سوال سے ایک خاندانی (یعنی ہمارے اپنے خاندان کے) بزرگ ناراض ہوگئے تھے۔ موصوف ہمیں نصیحت فرمارہے تھے کہ دِل لگا کر پڑھا کرو۔ ہم نے استفسار کیا حضور! دِل لگانے کے بعد کبھی کوئی پڑھ سکا ہے؟

یہ تو خیر ماضی کے دُھندلکوں میں لپٹا ہوا جُملۂ معترضہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہوں تو پڑھنے میں من زیادہ لگتا ہے۔ اور کیوں نہ لگے؟ ایک دوسرے کو متاثر بھی کرنا ہوتا ہے، بہت حد تک ''گڈ وِل'' بھی تو قائم کرنا ہوتی ہے! مرزا تنقید بیگ نے اسکول اور کالج کے زمانے کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''مخلوط تعلیم کا ایک ضمنی فائدہ یہ ہے کہ جو کام گھر، بلکہ خاندان کے بڑے مل کر نہیں کر پاتے وہ ایک معمولی سی لڑکی کر

دِکھاتی ہے۔ لڑکا علم کی لگن میں نہ سہیں، کسی لڑکی کی لگن ہی میں کتابیں چاٹتا رہتا ہے تاکہ کلاس میں سب کے سامنے اور بالخصوص اُن محترمہ کے سامنے 'بیزتی' خراب نہ ہو! مخلوط تعلیم کا اِس سے بڑا فائدہ کیا ہو سکتا ہے کہ اِس کے ذریعے لڑکوں میں اپنی عزت' احساس پیدا ہوتا ہے! اگر اِس طریقے سے قوم کے بچّے تھوڑا بہت پڑھ لیں تو' اِس میں ہرج کیا ہے؟ بڑے فائدے کے آگے چھوٹے نقصان کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے۔''

مرزا کی اِس بات سے ہم متفق ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مگر خیر، تھوڑی سی اُداسی بھی طاری ہوئی۔ کیوں نہ ہوتی؟ ہمیں کبھی مخلوط طریقِ تعلیم سے بہرہ مند ہونے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ملتا تو ہم بھی دِل لگا کر پڑھتے، ''بیزتی'' خراب ہونے کے ڈر سے خوب تیاری کے ساتھ امتحان دیا کرتے۔ کلاس کی کوئی سی دو آنکھوں میں اپنی ''گڈ وِل'' قائم کرنے کی خاطر شاید کچھ پڑھ ہی جاتے۔ ڈھنگ سے پڑھ نہ پانے کا نتیجہ آپ کو بھگتنا پڑ رہا ہے یعنی ہم اب کالم نویسی فرما رہے ہیں!

ڈھنگ کا مزاح

11 نومبر 2013 کو ''اِک چراغ اور، چراغ اور.....'' کے زیر عنوان تحریر کئے گئے کالم میں محترم ہارون الرشید کے رشحاتِ قلم نظر سے گزرے۔ حالات پر ''قلم کوبی'' کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''کیا یہ محض اتفاق ہے کہ ملک میں ڈھنگ کا مزاح لکھنے والے ناپید ہوتے جارہے ہیں؟ چاروں چڑچڑے پن کی حکمرانی ہے۔''

مُلک جن حالات سے گزر رہاہے وہ فوری توجہ اور ہمدردی کے طالب و مستحق ہیں کیونکہ درحقیقت مشکل میں تو حالات ہیں جن پر سے یہ مُلک گزر رہا ہے! جن حالات پر محترم ہارون الرشید نوحہ کُناں ہیں وہ ایک دو نہیں بلکہ کئی عشروں کی ''محنتِ شاقہ'' کا ''حاصل'' ہیں۔ آپ تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ع

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اب الگ سے کوئی نوحہ گر رکھنے کا چلن اور گنجائش نہیں کہ زمانہ ''سیلف سروس'' کا ہے۔ اپنے کاندھوں پر اپنا جنازہ اور اپنے غم پر اپنا ماتم، یہی اب عصرِ حاضر کی ریت ٹھہری ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اِس قوم نے عشروں تک جو ''محنت'' کی

ہے اُس کی ''کمائی'' پر ہارون الرشید صاحب افسردہ ہیں، کبیدہ خاطر ہیں۔ اگر غریبوں کی یہ کمائی بھی لُٹ گئی تو اُن کے پاس بچے گا کیا؟ بقول ساحر لدھیانوی ۔

لے دے کے اپنے پاس یہی اِک ''نظر'' تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم؟

حالات کی خرابی پر کُڑھنا اپنی جگہ، لوگوں کا حال دیکھ کر ملول ہونا بھی درست مگر ہم لاکھ احترام کے باوجود محترم ہارون الرشید کی اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ مُلک میں ڈھنگ کا مزاح لکھنے والے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہمارے محترم کالم نگار معاملے کو اُس طرح نہیں دیکھ رہے جس طرح دیکھنا چاہیے۔ قصہ یہ ہے کہ مزاح لکھنے والوں کی تعداد اِتنی بڑھ گئی ہے اور مزاح کی فاضل پیداوار کا یہ عالم ہے کہ اب آنکھوں کے سامنے کا مزاح بھی دکھائی نہیں دے رہا! انگریزی میں اِس کیفیت کو eyes wide shut کہتے ہیں اور اگر احمد فراز کی زبانی کہیے تو ۔

یہ میرے ساتھ کیسی روشنی ہے؟
کہ مُجھ سے راستہ دیکھا نہ جائے!

مزاح لکھنے والے اب اتنی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں کہ موضوعات کے لیے

دامن اور آبرو بچانا انتہائی دشوار ہوگیا ہے! یہ تو وہ برادری ہے جو شِدّتِ بے نیازی کے عالم میں بے موضوع بھی لکھتی ہے اور خوب لکھتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے موضوع کے بغیر لکھنے اور پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ جب موضوع کے بغیر فلمیں بن سکتی ہیں، ٹاک شو ہو سکتے ہیں، سڑک چھاپ ہوٹلوں پر روزانہ گھنٹوں ''خوش کلامی'' کی جا سکتی ہے تو تو پھر موضوع سے مُعَرّی و مُبَرّا مزاح کیوں نہیں لکھا جا سکتا؟ کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ تحریر کے دوران اگر موضوع ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیچ میں آ دھمکے تو لکھنے والا انتہائی سَفّاکی سے کچلتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے! معاملہ لکھنے کا ہو یا کسی اور کام کا، آگے بڑھنے والوں کے یہی اطوار ہوا کرتے ہیں۔

زمانہ بدل چکا ہے۔ اور جب زمانہ ہی بدل چکا ہے تو مزاح کیونکر وہی رہے گا جو ہوا کرتا تھا؟ ہر شے اپنی ماہیت اور خصوصیت بھلا کر کچھ کی کچھ ہو گئی ہے۔ ایسے میں مزاح کو اُس کی اصل شکل اور روایتی پیکر میں تلاش کرنا تاریک کمرے میں ایسی کالی بلی تلاش کرنے جیسا ہے جو وہاں ہے ہی نہیں!

مزاح کا نیا رنگ روپ کچھ اتنا عجیب ہے کہ اب کسی بھی تحریر کو مزاح کے نمونے کی حیثیت سے شناخت کرانے کے لیے توضیحی الفاظ بھی تحریر کرنا پڑتے ہیں۔ بعض تحریروں کی ذیلی سُرخی کے آخر میں ''سیاسی تجزیہ'' لکھا ہوتا ہے

تاکہ پڑھنے والے فاضل مصنف کے ''رشحاتِ قلم'' کو کچھ اور سمجھنے سے باز رہیں!
قارئین کے صبر اور تحمل کا حقیقی امتحان تو یہ ہے کہ ایسی کسی بھی تحریر کو پڑھ کر ہنسی آ بھی رہی ہو تو ضبط کرنی پڑتی ہے کہ میاں مصنف بُرا نہ مان بیٹھیں! کبھی کبھی کسی تحریر کی ذیلی سُرخی میں ''فکاہیہ تجزیہ'' لکھا ہوتا ہے جو قاری کو ایک زور دار قہقہے کے دریا میں غوطہ زن کر کے دم لیتا ہے! اگر قاری کی نظر ایسی تحریر میں مزاح تلاش کرنے نکلے تو پھر مشکل سے لوٹ کر آتی ہے! جس تحریر کو فکاہیہ قرار دے کر قارئین کے سامنے پروسا جاتا ہے وہ خاصی ''مزاحیہ'' ثابت ہو کر دم لیتی ہے!

جس طرح دریا ایک طویل مدت میں رخ تبدیل کرتے ہیں بالکل اُسی طرح ہمارے ہاں مزاح کا دریا بھی رخ بدل کر کامیڈی کی راہ پر گامزن ہے! اور اِس عمل میں راستے کا بہت سا کچرا بھی مزاح کا حصہ بن گیا ہے جس کے باعث دریائے مزاح کا پانی خاصا گدلا ہو گیا ہے۔ اب دریائے مزاح کے پانی اصل ماہیت کا سُراغ لگانا جُوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

مزاح تو اب بھی ڈھنگ ہی کا لکھا جا رہا ہے مگر ہاں، ڈھنگ تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ بالکل ہماری فلم انڈسٹری والا معاملہ ہے۔ فلم میکر سسپنس تھرلر پیش کرتے ہیں تو لوگ کامیڈی سمجھ کر دیکھتے ہیں! اور جب کسی فلم کو کامیڈی کا لیبل

لگا کر پیش کیا جاتا ہے تو دیکھنے والوں کے آنسو نکل پڑتے ہیں! فیملی ڈراما کے قبیل کی بعض فلموں کو لوگوں نے ایکشن مووی سمجھ کر بھی انجوائے کیا ہے! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات کی عکاسی کرنے کے لیے بنائی جانے والی فلم کو لوگ ''آنے والے مستقبل'' کی جھلک پیش کرنے والی فلم سمجھ کر سَر دُھنتے کم اور پیٹتے زیادہ ہیں!

مزاح اب لکھنے سے زیادہ بولنے اور کرنے (یا کر دکھانے) کی چیز ہے۔ جتنے بھی مزاح لکھنے والے تھے وہ اب پڑھنے کے نام پر کرنے کی چیز لکھنے پر کمر بستہ ہیں۔ اور کئی ایک تو ایسے ہیں کہ خود بھی کامیڈی کے کنویں میں ڈول ڈالنے کو بے تاب رہتے ہیں یعنی موقع ملتے ہی اسکرین پر نمودار ہوکر ناظرین کے صبر اور تحمل کی حدود آزمانے لگتے ہیں!

جس چیز کا صرف پڑھ کر لُطف لیا جاسکتا ہے اُسے بھی عمل کی کسوٹی پر پرکھ کر پیش کیا جارہا ہے۔ یعنی زور پرفارمنس پر ہے۔ اِس روش نے مزاح کو بھی پرفارمنگ آرٹ میں تبدیل کردیا ہے۔ زمانہ پرفارمنس کا ہے اور جب سبھی پرفارم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں تو مزاح نگار کیوں پیچھے رہیں؟ وہ بھی اِس دیگ میں مقدور بھر حصہ ڈال کر گھوٹا چلا رہے ہیں! لوگ حیران ہیں کہ داد مزاح نگاری کی دیں یا مزاح کاری کی!

جن سیاسی تجزیوں میں لوگ بصیرت تلاش کرتے ہیں اُن میں در حقیقت اِتنا مزاح

پوشیدہ ہوتا ہے کہ دِکھائی دے جائے تو بصارت کا بوریا بستر گول ہو جائے ! سیاسی صورتِ حال کے تجزیے کے نام پر لکھاریوں نے اپنے کاندھے مختلف سیاسی و غیر سیاسی توپوں کو مستعار دے رکھے ہیں۔ اور اِس ''خدمت'' کا معاوضہ وہ ''مالکان'' اور اخباری مالکان دونوں سے بخوبی وصول کر رہے ہیں ! جب کسی کی خاطر (یعنی کسی کے خلاف) لکھا جائے تو منطق اور دلیل دونوں ہی کو خیرباد کہتے بنتی ہے۔ جب ایسا ہوگا تو یادگار مزاح کیونکر پیدا نہ ہوگا اور پھر اُس مزاح کو کامیڈی بننے میں کون سی دیر لگے گی؟ وہ زمانہ کب کا جاچکا جب لوگ اہلِ سیاست کی تضاد بیانی میں مزاح تلاش کیا کرتے تھے۔ اب تو خود لکھنے والوں کی تضاد بیانی مزاح کا خوب سامان کر رہی ہے۔ کسی کے لیے تمام حدود سے گزر جانا کبھی کبھی لافانی مزاح، بلکہ کامیڈی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ پڑھنے والے بھی چکرا کر رہ جاتے ہیں کہ لکھنے والے نے کِس صنف کی حدود سے نکل کر طبع !آزمائی کی ہے۔ یا کہیں کوئی نئی صنف معرضِ وجود میں لانے کی کوشش تو نہیں کی عمومی اندازِ تحریر میں مزاح اِس حد تک گھس بیٹھا ہے اور مزاح نگاروں کی ایسی کثرت ہے کہ سنجیدہ لکھنے والے جب قلم سنبھالتے ہیں تو سمجھ نہیں پاتے کہ تحریر میں مزاح کس طور پیدا نہ ہونے دیں۔ جس طرح کوئی اچھا فنکار اچھی

پرفارمنس سے دانستہ گریز کی کوشش میں خاصی بھونڈی حرکتیں کرنے لگتا ہے بالکل
اُسی طرح سنجیدہ لکھنے والے اپنی تحریر میں کہیں سے بھی مزاح کو داخل ہونے سے
روکنے کی کوشش میں اچھا خاصا مزاح پیدا کر بیٹھتے ہیں! مگر خیر، لکھنے والے تو لاگت
کو آگے بڑھا کر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ صحیح معنوں میں جو گزرنی ہے وہ تو قارئین پر
گزرنی ہے کہ حتمی صارف تو وہ ہیں!

کام کریں آپ کے دُشمن

کام کے معاملے میں مرزا تنقید بیگ کافرانہ طرزِ فکر و عمل کے حامل ہیں۔ کام پر اُن کا ایمان کبھی نہیں رہا۔ اُنھوں نے ہمیشہ کام سے گریز اور اجتناب کو رواج دینے کی بھرپور وکالت اور کوشش کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری اُن سے کبھی نہیں بنی۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ بے کام کئے بہتر زندگی بسر کرنے کے معاملے میں وہ اتنی اور ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ ہم ہر بار اپنے آپ سے شرمندہ سے ہو جاتے ہیں!

خواجہ الطاف حسین حالیؔ کہتے ہیں ؎

بُری یا بھلی سب گزر جائے گی
یہ کشتی یونہی پار اُتر جائے گی

جب کسی نہ کسی طور سب کی کشتی پار اُتر ہی جائے گی تو پھر کوئی طوفان کی موجوں سے اُلجھنے کی زحمت کیوں گوارا کرے؟ جب شعرا یہ پیغام دیں کہ جیو جیسے جینا ہے، سب کا انجام ایک ہے تو پھر کسی کو پاگل نے کتے نے کاٹا ہے کہ محنت کرے، پسینہ بہائے۔

لوگ اندھے نہیں ہیں۔ اُنہوں نے بارہا دیکھا ہے کہ کام کرنے والے بے چارے مشینوں کی طرح گِھس جاتے ہیں اور کام ختم ہونے کا نام نہیں لیتا! وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ

ع

اُس کو چُھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

یعنی جس نے کام میں دلچسپی لی وہ وہ تاریک راہوں میں مارا گیا!

کام کے معاملے میں ہر قوم کا کوئی نہ کوئی نظریہ ہوتا ہے۔ جاپانیوں کا نظریہ یہ ہے کہ جو کام کوئی اور کر سکتا ہے وہ ہمیں بھی کرنا چاہیے۔ اور اگر کوئی کام بظاہر کسی کے بس کی بات نہ ہو تو ہمیں ضرور کوشش کرنی چاہیے۔ مشرق وسطٰی کا عمومی رویہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی کام کر سکتا ہے تو اُسے وہ کام کرنے دیا جائے! اور اگر کوئی خاص کام بظاہر کسی سے نہیں ہو سکتا تو خواہ مخواہ سَر پھوڑنے کی ضرورت کیا ہے! اور مرزا جیسے پاکستانیوں کا ''نظریہ'' یہ ہے کہ کوئی خاص کام اگر کوئی کر سکتا ہے تو اسے ہر گز نہ کرنے دیا جائے! اور اِس سے بڑھ کر یہ کہ جو کام کوئی کر ہی نہیں سکتا اُس کام کے لیے اُنہیں ضرور مجبور کیا جائے جنہیں کام کرنے کا بہت شوق ہے!

مرزا کا دعوی ہے کہ ''بے کامی'' کے معاملے میں کوئی بھی قوم ہماری ہمسر نہیں ہو سکتی۔ اور ہمیں اُن کی بات پر کبھی کبھی یقین کرنا ہی پڑا ہے کیونکہ

خود اُنھوں نے بھی اِسی طور زندگی بسر کی ہے بلکہ اُنھوں نے مارکیٹ میں نیا تصور پیش کیا ہے۔ وہ زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ زندگی اُنہیں بسر کر رہی ہے۔ یعنی چُھری کو زحمت سے بچالیا ہے، خود ہی خربوزہ بن کر چُھری پر جا گرے ہیں!

مرزا نے کام پر یقین نہ رکھنے والوں کا گروپ تشکیل دے رکھا ہے۔ یہ "ماسٹر مائنڈ گروپ" اُن کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ کیوں نہ منڈلائے؟ اُسے اپنی مرضی کی ذہنی خوراک جو ملتی رہتی ہے۔ اگر کوئی اِنہیں یہ کہتے ہوئے شرمندہ کرنے کی کوشش کرے کہ فلاں شخص، ملک یا قوم نے محنت سے ترقی کی ہے تو سمجھ لیجیے اُس کی تو شامت آ گئی۔ سردی ہو یا گرمی، صبح کے چار بجے جو لوگ موٹر سائیکل یا سائیکل پر سوار ہو کر چھوٹے ہوٹلوں پر بیکری کے آئٹمز سپلائی کرتے ہیں اُن کی محنت بھی مرزا اور اُن کے ہم خیال افراد کے "پائے استقامت" میں لغزش نہیں لا سکتی! مرزا کا تصور یہ ہے کہ صبحِ کاذب سے "صبحِ ناطق" (یعنی شور شرابہ شور ہونے تک) کا وقت قدرت کے نظاروں کو نظر بھر دیکھنے اور تازہ ہوا کو پھیپھڑوں میں داخل کرنے کا ہوتا ہے۔ ایسے میں محنت کہاں سے ٹپک پڑتی ہے؟ یا اُسے مداخلت کا موقع دیا ہی کیوں جائے؟

اعصاب کی مضبوطی" کا یہ عالم ہے کہ جُون جُولائی کی گرمی میں کدال چلا کر"

سڑک کا سینہ چیرنے والوں کی مشقت سے بھی اِن کے دل نرم نہیں پڑتے! مرزا اور ان کے ہم خیال لوگوں کو دیکھ کر خیال آتا ہے ع

جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں!

مرزا جیسے لوگ محنت کی طرف کیوں آئیں جب ماحول میں بے حساب لوگ کچھ کئے بغیر بہت مزے سے زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں؟ لوگ ایس ایم ایس کے ذریعے کام سے گریز کی تلقین میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک ایس ایم ایس میں کام کرنے والوں کو اِن الفاظ میں ''خراج عقیدت'' پیش کیا گیا ہے۔ ''بنا رہ پگلا، کام کرے گا اگلا! جس نے لی ٹینشن، اُس کی بیوی کو ملی پنشن! کام سے ڈرو مت مگر کام کرو مت! کام کرو نہ کرو مگر کام کی فکر ضرور کرو! کام کی فکر کرو نہ کرو مگر باس سے اِس فکر کا ذکر ضرور کرو! کوئی کام کر رہا ہو تو کرنے مت دو اور اگر کوئی کام نہ کر رہا ہو تو اُس کی چُغلی کرو!''

مرزا کہتے ہیں کہ پاکستان کو جن لوگوں نے ناکام ریاست سمجھ رکھا ہے اُن کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ خزاں کو بہار کی ضِد سمجھنے والے بھول جاتے ہیں کہ جب درختوں پر ایک بھی پتّہ باقی نہیں رہتا تب خزاں کا موسمِ بہار چل رہا ہوتا ہے! مرزا کا استدلال ہے کہ دنیا بھر میں ہزار دِقّت کے بعد یہ ممکن بنایا جاسکا ہے کہ عام شہری کو زیادہ کام نہ کرنا پڑے اور اُن

کی زندگی میں سکون ہی سکون ہو جبکہ ہم کسی خاص دقت، محنت اور تحقیق کے بغیر اِس منزل تک بہت پہلے پہنچ گئے تھے! مرزا کو اِس بات کا زیادہ دُکھ ہے کہ کام سے بچانے والا ماحول پیدا کرنے پر پاکستان کو سراہنے کے بجائے ناکام ریاست قرار دے کر مذاق اُڑایا جارہا ہے!

کام کے خلاف مرزا کی بُنیادی دلیل یہ ہے کہ دُنیا بھر میں لوگوں کو پُرسکون زندگی بسر کرنے کا موقع ریٹائرمنٹ کے میسر ہو پاتا ہے مگر ہم یہ موقع بہت پہلے ہی حاصل کرچکے ہوتے ہیں! اور یہ کہ ریٹائرمنٹ کے بعد پُرسکون زندگی بسر کرنے کا موقع مل بھی جائے تو کس کام کا؟ ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی بچتی ہی کتنی ہے؟ زمانے بھر میں اصول یہ ہے کہ جسم کو تھکن سے چُور کرنے والی محنت کے بعد آرام کے چند لمحات نصیب ہوتے ہیں۔ یعنی آرام یقینی بنانے کے لیے محنت کا سسٹم رائج ہے۔ خاک ایسے سسٹم پر جس میں انسان مرکھپ جائے، آرام کو ترس جائے!

بے عملی کی بنیاد پر پاکستان کو ناکام ریاست قرار دینے والوں پر برسانے کے لیے مرزا کے ترکش میں دلائل کے تیر بھرے پڑے ہیں۔ مثلاً

☆ کیا کیا قدم قدم پر ہمارے عمل نے ثابت نہیں کیا کہ بے عملی ہی زندگی بسر کرنے کا سب سے آرام دہ تصور ہے؟

☆ جن اقدار کو دُنیا والوں نے آج بھی دردِ سر کی طرح گلے لگا رکھا ہے کیا ہم نے اُنہیں خیر باد کہتے ہوئے دائمی تسکین و مسرت کا سامان نہیں کیا؟

!☆ آرام کے بڑے دورانیوں کے درمیان ہم نے کام کا وقفہ متعارف کرایا ہے

کام کرنے والوں کی مذمت کے معاملے میں مرزا انتہا پسند ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ کام کو پاکستان کی حدود سے نکالا جاچکا ہے اِس لیے اب اگر کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو پاکستان میں رہنے کا خیال بھی دل سے نکال دے۔ اور جسے یہاں رہنا ہے وہ کام کا خیال اپنے !ذہن سے کھرچ کر پھینک دے

مرزا کے ہم خیال لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے اِتنی بڑی کائنات میں صرف زمین کو اِنسانوں یعنی سوچنے والی مخلوق سے نوازا ہے۔ تو کیا ہماری زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ کام کرتے کرتے مر کھپ جائیں؟ اللہ کی بنائی ہوئی اِس دنیا اور وسیع و عریض کائنات کا مشاہدہ نہ کریں، غور و فکر کی راہ پر نہ چلیں؟ اگر کام کرتے کرتے ہی چل بسے تو قدرت کی صنّاعی کے اِس شاہکار یعنی کائنات کا مشاہدہ کون کرے گا؟

کرکٹ کا خیمہ، میڈیا کا اونٹ

کھیل ہی کھیل میں جب بہت کچھ برباد ہوچکا ہے تو پھر کھیل کود کا معاملہ کیوں کر بچا رہتا؟ جس قوم کی نفسیات تمام معاملات میں اُلجھ چکی ہے وہ کھیل کے معاملے میں بھی عجیب و غریب رویّوں کے اظہار کی عادی ہوچکی ہے۔ کھیل کا میدان سجا ہو تو مقابلہ جنگ سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ اور نوبت جب واقعی جنگ تک پہنچ جائے تو کھیل تماشے کی سُوجھتی ہے! حال جب یہ ہو تو خرابی کے دریا کی طغیانی برقرار کیوں نہ رہے؟

بدلتے زمانے کے ساتھ کھیلوں کے معاملے میں بھی ہمیں نئے اطوار اپنانے پڑے ہیں۔ دُنیا بھر میں آج بھی کھیلوں کے مقابلے میدانوں میں ہوتے ہیں۔ ہم اِس معاملے میں بھی انوکھے واقع ہوئے ہیں۔ اب ہمارے ہاں کھیل کے لیے مٹی دُھول کے میدان لازم نہیں۔ اور اگر لازم ہوتے تب بھی ہم لاتے کہاں سے؟ وہ سب تو لینڈ مافیا پر نثار ہوچکے! جس طرح کرکٹ اپنی مرضی کی ہے بالکل اُسی طرح اب ہمارے ہاں میدان بھی ہماری ہی مرضی کے ہیں۔

دہشت گردی کی چھاپ نے جب دُنیا بھر کی کرکٹ ٹیموں کو پاکستان آنے سے روک

دیا تو یاروں نے نئی راہ نکالی۔ آئینے میں جھانکا تو اپنے آپ پر مر مٹے۔ یعنی اسٹوڈیوز ہی میں کرکٹ کا میدان سجالیا۔ تماشائی بھی خوش ہیں کہ اسٹیڈیم تک جانے کی زحمت سے پنڈ چھوٹا۔ کرکٹ میچ ٹی وی چینلز کے اسٹوڈیوز میں ہو رہے ہیں اور ناظرین گھر بیٹھے اِس کرکٹ نما کھیل کا لطف پا رہے ہیں۔

میڈیا کا معاملہ تو یہ ہے کہ ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

ٹی وی چینلز کے پرائم ٹائم کی سُولی پر قوم کا ہر اہم معاملہ لٹکا رہتا ہے۔ پھر بھلا کرکٹ جیسے پرائم ٹائم معاملے کی عزت کیونکر محفوظ رہتی؟ کرکٹ کے شوق کو جنگی جنون میں تبدیل کرنا تھا سو وہ کیا جاچکا۔ کرکٹ سے شغف رکھنے والا ہر نوجوان ٹی وی اسکرین کے سامنے کچھ دیر بیٹھ کر خود کو محاذِ جنگ پر ڈٹا ہوا مجاہد سمجھنے لگتا ہے۔ کسی بھی اہم میچ سے دو تین دن قبل ماہرین اور مبصرین مائکروفون کے بیٹ تھام کر اور اعداد و شمار کی کیپ سر پر سجا کر کیمرے کی پچ پر آ جاتے ہیں۔ اور اگر مقابلہ پاکستان اور بھارت کی کرکٹ ٹیموں کے درمیان ہو تو الیکٹرانک میڈیا والے (ماہرین اور مبصرین کی مدد سے) مہا سنگرام'' کا ماحول پیدا کرکے دم لیتے ہیں۔ اپنی اپنی ٹیموں کو کچھ کا کچھ ثابت کرنے'' کے لیے کرکٹ کی دُنیا کے بُزرجمہر بہت دُور نکل جاتے ہیں تاکہ جو

کچھ بھی وہ لائیں وہ واقعی ڈور کی کوڑی کہلائے! مقابلہ شروع ہونے سے بہت پہلے مُنہ کی حد تک ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور پچھاڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لفاظی کی جنگ زور اور طول پکڑتی جاتی ہے۔ باتوں ہی باتوں میں ایسے چوکے اور چھکے لگ رہے ہوتے ہیں کہ کرکٹرز بھی دیکھ کر سوچتے تو ہوں گے کہ اب ہم ایسے چوکے اور چھکے کس طرح لگائیں، ایسا ٹیلنٹ اور مہارت کہاں سے لائیں! میچ سے قبل میڈیا والے وارم اپ میچ کے طور پر عجیب و غریب پیش گوئیوں پر مبنی تجزیوں اور تبصروں کی ''شب دیگ'' تیار کرتے ہیں۔ اِس دیگ میں وہی کچھ پایا جاتا ہے جو قدیم زمانوں کی جادوئی داستانوں میں پایا جاتا تھا! شب دیگ کے کھچڑے کی لذت پر قربان جایئے۔ بہت سے لوگ میچ سے زیادہ اِس ''کھچڑا قبل از میچ'' کا یوں لطف لیتے ہیں کہ کرکٹ کے مزے اِس پر وار دیتے ہیں!

لت یعنی شدید عادت خواہ کسی چیز کی ہو، بُری ہوتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی انجام دینے کے باعث بیشتر صحافی سگریٹ اور دوسری بہت سی چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے ایک ساتھی کا قصہ سُناتے ہیں، لت کی شدت کا اندازہ آپ خود لگایئے۔ موصوف ایک دن مین نیوز ڈیسک پر بیٹھے ہوئے خبریں بنا رہے تھے کہ دفتر کے نمبر پر اُن کے لیے کال آئی۔ اُنھوں نے کال اٹینڈ کی اور ایڈیٹر صاحب کو بتایا کہ والد کی طبیعت خراب ہے، فوراً بلوایا ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے کہا فوراً جاؤ۔ موصوف نے اپنے حصے کی خبریں ساتھیوں میں تقسیم کیں اور اپنے

سسٹم (کمپیوٹر) کو شٹ ڈاؤن کرکے کمرے سے نکل گئے۔ تین چار منٹ بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے اور خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایڈیٹر صاحب نے، جو کام میں مگن تھے، چند لمحات کے بعد اُنہیں دیکھا تو حیرت سے پوچھا گھر کیوں نہیں گئے، آپ کے تو والد کی طبیعت خراب تھی۔ موصوف بولے۔ ''بس جی، میں جا ہی رہا تھا تو دیکھا کینٹین والا لڑکا ٹرے لیکر آ رہا ہے۔ میں نے سوچا اب چائے پی کر ہی جاؤں۔''

دیکھا آپ نے؟ ایسی ہوتی ہے چائے کی لت!

اِس قوم کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ حالات خواہ کچھ ہوں، یہ اپنی کوئی لت چھوڑتی ہے نہ مشغلہ۔ کرکٹ ہی کو لیجیے۔ کرکٹ کا معاملہ کچھ یوں ہے کہ ع

چُھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی!

حالات خواہ کوئی رخ اختیار کر رہے ہوں، قوم کرکٹ کی راہ پر گامزن رہتی ہے۔ اِسی دریا کی موجوں میں بہتے رہنا اِسے پسند ہے۔ ماحول بنانے میں مثالی مہارت رکھنے والے ہمارے میڈیا نے کھلواڑ کرتے کرتے اب کرکٹ کو بھی بارہ مسالوں کی چاٹ میں تبدیل کردیا ہے۔ کل تک جو صرف کھیل تھا وہ آج بہت سے عجوبوں کی آماجگاہ ہے، نقطۂ اتصال ہے۔ لوگ کرکٹ کے نام پر گلیمر، لفّاظی، ڈرامائیت، کامیڈی، چاپلوسی، تنقید اور پتہ نہیں کس کس چیز کے مزے پا رہے

ہیں۔ یاروں نے ایسا میلہ لگایا ہے کہ اسٹوڈیوز اب میدان کی ساری رنگینیاں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب لوگ ڈراموں کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ اب سیاست اور کرکٹ دونوں کے نام پر اِتنے ڈرامے پیش کئے جارہے ہیں کہ لوگ اصلی تے نسلی ڈراموں کو بھول بیٹھے ہیں!

نام کرکٹ کا ہے مگر جہاں کرکٹ تھی وہاں اب دُنیا بھر کے کھیل تماشے براجمان ہیں۔ نہیں ہے تو بس ایک کرکٹ ہی نہیں ہے۔ ۔

نشاں بھی کوئی نہ چھوڑا کہ دِل کو سمجھائیں

تری تلاش میں جائیں تو ہم کہاں جائیں!

کرکٹ کے مقابلوں کی کوریج کے نام پر جلووں کا ایسا اژدہام ہے کہ لوگ کرکٹ کا سُراغ لگانے میں ناکام رہتے ہیں۔ خیمہ کرکٹ کا تھا مگر اِس میں ''میڈیائی'' تبصروں اور تجزیوں کا اونٹ یوں گھس بیٹھا ہے کہ بے چاری کرکٹ کبھی کڑاکے کی سردی میں ٹھٹھر رہی ہوتی ہے اور کبھی تپتی دوپہر میں ایڑی سے چوٹی تک اُس کا پسینہ بہتا دکھائی دیتا ہے!

اے کاش کہیں سے، جادوئی داستانوں کی کتابوں سے کوئی جادوگر نکل کر آئے اور

کرکٹ کے خیمے سے اوٹ پٹانگ اور سنسنی خیز تبصروں اور تجزیوں کے اونٹ کو نکال باہر کرے۔ کھیل ہی کھیل میں کھیلوں کو ٹھکانے لگانے کا سلسلہ اب ختم ہونا چاہیے۔ لوگ ہر کھیل کی اُس کی اصل حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ کرکٹ بھی اِس خواہش سے مُستثنٰی نہیں۔ کھیلوں کے نام پر ڈرامائیت، سنسنی خیزی اور کامیڈی دیکھنا شائقین کی خواہش نہیں۔ یہ سارے تماشے تو اب پورے ماحول میں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ ٹی وی سیٹ آن کئے بغیر بھی لوگ اپنے ماحول کے ذریعے محظوظ ہو سکتے ہیں!

جینئیس" کی فاضل پیداوار"

ہم نے جب بھی مرزا تنقید بیگ کے سامنے مغرب کی کسی بڑی کامیابی کا ذکر کیا ہے اُنھوں نے بے ساختہ قہقہہ لگا کر اُس کامیابی کا مذاق اُڑایا ہے۔ اور جب بھی ہم نے سبب پوچھا ہے تو مرزا نے صرف اِتنا کہا ہے کہ اہلِ مغرب ہر معاملے میں تھوڑی بہت نہیں، اچھی خاصی دیر کر دیتے ہیں۔ ایک بار ہم نے بتایا کہ اہلِ مغرب نے کام کی جگہ یعنی workplace کو زیادہ سے زیادہ پُرسکون بنانے پر خاص توجہ دی ہے اور اب حالت یہ ہے کہ لوگ معاشی سرگرمیوں میں بھی اِس طرح مگن رہتے ہیں کہ ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا، گویا پکنک منا رہے ہوں۔ اِس پر مرزا نے انکشاف کیا تھا۔ ''اہلِ مغرب نے یہ آئیڈیا یقینی طور پر پاکستانی معاشرے اور بالخصوص سرکاری دفاتر سے لیا ہوگا! ہم نے من حیث القوم کچھ کئے بغیر کمانے، بلکہ سب کچھ حاصل کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اور اِس قسم پر عمل بھی کر دکھایا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے لوگ ہفتے کے پانچ دن سَر توڑ محنت کرتے ہیں اور دو دن تعطیل کا مزا لیتے ہیں۔ اور سادگی دیکھیے کہ اِسی پر خوش ہو رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں خیر سے ہفتے بھر کی تعطیل کا نظام رائج ہے!''

گزشتہ دنوں مرزا سے ملاقات ہوئی تو ہم نے بتایا کہ اہلِ مغرب اب سوچنے کی

صلاحیتوں کو بھی تجربہ گاہوں میں پروان چڑھا رہے ہیں اور تجربات کے ذریعے "جینئیس" تیار کرنے کی سمت سفر شروع کر دیا ہے۔ ہم نے سوچا تھا کہ مرزا یہ خبر سُن کر چونک پڑیں گے اور تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کر تفصیل جاننا چاہیں گے مگر یہ کیا؟ ہماری بات سُن کر اُن کی تو ہنسی چُھوٹ گئی۔ اُن کی ہنسی ایسی جامع اور ہمہ گیر تھی کہ ہم حیرت کی تصویر بن کر اُنہیں تکنے لگے۔ مرزا چیز ہی ایسی ہیں کہ دیکھنے سے زیادہ لُطف اُنہیں تکنے کا ہے! جب ہم نے بے لگام ہنسی کی "وجہِ تسمیہ" جاننا چاہی تو مرزا نے بمشکل ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میں آج تک سمجھ نہیں پایا کہ مغرب کے لوگ نئی شراب کو نئی بوتل میں پیش کرنے پر کیوں تُلے رہتے ہیں۔"

ہم نے کچھ بھی سمجھ نہ پانے کا اعتراف کرتے ہوئے مزید وضاحت طلب کی تو مرزا نے سلسلۂ توضیح آگے بڑھایا۔ "بات یہ ہے کہ بھائی کہ جن آئیڈیاز کو ہم روند کر، کچل کر آگے بڑھ جاتے ہیں اُنہیں مغرب والے ہنس کر گلے لگاتے ہیں اور ڈِھٹائی کی انتہا یہ ہے کہ کریڈٹ لینے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ جینئیس تیار کرنے کے معاملے ہی پر غور کرو۔ ہم یہ آئیڈیا کب کا پامال کر چکے ہیں اور اُنہیں اب خیال آیا ہے۔ ہمارا تو پورا ملک ہی جینئیس تیار کرنے کی تجربہ گاہ، بلکہ کارخانہ ہے۔"

مرزا کی بات سُن کر ہم نے سوچا اُن سے پوچھیں آج کیا کھایا ہے کیونکہ جب بھی اُن کے گھر میں اُن کی کوئی پسندیدہ چیز پکتی ہے تب وہ پیٹ بھرے کی مستی میں ایسی ہی باتیں خاصی بے فکری سے کرتے چلے جاتے ہیں! مگر پھر ہم نے اُن کی ''دانش'' پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ اُن کی بات یکسر بے بنیاد قرار نہیں دی جاسکتی۔

مرزا نے ہمیں حیرت کے سمندر میں غرق دیکھا تو شفقت کے اظہار کے طور پر اپنے خیال کو شرح و بسط سے بیان کرنا شروع کیا۔ ''ترقی یافتہ معاشرے اب تک تجربہ گاہوں کے محتاج ہیں۔ کوئی ہمیں دیکھے کہ ہم نے تو جینئیس کی تیاری جیسے عمل سے بھی تجربہ گاہ کو خارج کردیا ہے۔ اب کوئی شعوری کوشش نہیں کی جارہی، جینئیس اپنے آپ تیار ہو رہے ہیں! ''

ہم نے عرض کیا آپ جینئیس کی بات کر رہے ہیں، ہمیں تو عمومی عقل رکھنے والے بھی کہیں نظر نہیں آتے۔ اِس پر مرزا نے خاصی طنزیہ مسکراہٹ سے ہماری ''سادگی'' کو خراج عقیدت'' پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''عمومی عقل والوں کو پاکستان میں تلاش کرنا'' ایسا ہے جیسے بُھوسے میں سُوئی تلاش کی جائے! اِس ملک میں عمومی عقل والا کوئی بچا ہوگا تب تو ملے گا۔ اب اِس سرزمین پر صرف اعلیٰ ترین عقل رکھنے والے بستے ہیں۔
تمہیں ہر وقت سَر جُھکا کر لِکھنے سے

فُرصت ملے تو کچھ سوچو۔ اور سوچوگے تب ہی تو سمجھ پاؤگے نا۔ کبھی کچھ دیر سکون سے، جم کر ٹی وی کے سامنے بیٹھو اور چینل بدل بدل کر کرنٹ افیئرز کے تین چار ٹاک شو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اِس ملک میں کتنے اور کیسے کیسے جینئیس پائے جاتے ہیں۔ لاکھ کوشش کر دیکھو، اندازہ نہیں لگا پاؤگے اِن میں کون کِس سے اور کِتنا بڑا...... ہے!"

ہالی وڈ کی فلم "ماسکو آن ہڈسن" میں سابق سوویت یونین کے ایک ایسے منحرف کی کہانی بیان کی گئی تھی جو نیو یارک میں سکونت اختیار کرتا ہے۔ وہ جب پہلی بار ایک سُپر اسٹور میں داخل ہوتا ہے تو ہر چیز کی اِتنی ورائٹی دیکھتا ہے کہ چند ہی لمحوں میں چکرا کر گر پڑتا ہے اور بے ہوش ہو جاتا ہے! ہمارے ہاں بھی اب کچھ کچھ یہی کیفیت پیدا ہو چلی ہے۔ ہر طرف جینئیس اِتنی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں کہ عوام بے چارے چکرا جاتے ہیں اور فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کس کی پیروی کریں! لوگ تو یہ بھی سمجھ نہیں پاتے کہ اداکار کون ہیں؟ ڈراموں میں کام کرنے والے یا ٹاک شو میں شریک ہونے والے؟ جسے دیکھیے وہ "جینئیس پن" کی انتہا پر ہے۔ ع

جو ذرہ جس جگہ ہے، وہیں آفتاب ہے!

ٹی وی پر جوشِ خطابت میں تھوک اُڑاتے ہوئے سیاست کی گتھیاں سُلجھانے والے

آزاد طبیعت رکھتے ہیں۔ وہ کسی ایک موضوع کے پنجرے میں قید نہیں رہ سکتے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بسا اوقات کسی موضوع کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ بولنے پر آئیں تو کسی بھی لائن آف کنٹرول کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ آن کی آن میں کہیں سے کہیں جانکلتے ہیں۔ جس طرح تیز ہوا میں درختوں سے پتے جھڑتے ہیں بالکل اُسی طرح اِن giants ہیں جو کی باتوں سے تازہ نظریات جھڑتے ہیں۔ علم و حکمت کی دُنیا کے یہ وہ ہزار سال کی دانش کو دو تین جملوں میں سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ اندازِ بیان ایسا کہ مدِ مقابل کی گردن پر پاؤں رکھ کر اپنی بات منوالیتے ہیں!

گلوکاری میں سانس کی بہت اہمیت ہے مگر ٹی وی پر بولنے والوں کے فن اور ریاض کو بھی داد دیجیے کہ سانس توڑے بغیر بے تکان بولتے ہیں۔ اِن کا کام صرف بولنا ہے، اعصاب پر تھکن سوار کرنے کا ٹھیکا سُننے والوں نے لے رکھا ہے! یہ ایسے جینئس ہیں جو کبھی ہار اور کسی کی بات نہیں مانتے۔ اگر کبھی کسی اور کو تسلیم کرنا پڑے تو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر تسلیم کرتے ہیں!

جینئس کی تیاری کا عمل کچھ مِنی اسکرین پر موقوف نہیں۔ اپنے علاقے میں بکھرے ہوئے چائے پراٹھے کے ہوٹلوں پر ایک نظر ڈالیے۔ وہاں رات رات بھر جینئس صرف بیٹھے نہیں رہتے بلکہ باتوں کی پیالیوں سے نکات بھی لنڈھاتے چلے

جاتے ہیں ! اِس ملک، برِاعظم یا دنیا ہی نہیں بلکہ کائنات کے کسی بھی مسئلے میں دم ہے !تواِن سے بچ کر دِکھائے

اہلِ جہاں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر مغربی دُنیا یہ سمجھتی ہے کہ اُس کے ہاں جینئیس پیدا نہیں ہو رہے تو ہرگز دِل چھوٹا نہ کرے، ملول نہ ہو۔ ہمارے ہاں جینئیس اُسی طرح ضرورت سے زیادہ ہوگئے ہیں جس طرح کسی زمانے میں افغانستان میں افغانی زائد ہوگئے تھے اور کابل انتظامیہ نے اُنہیں دنیا بھر میں ایکسپورٹ کرکے معاشرے کا توازن برقرار رکھا ! ہمارے ہاں بھی ضرورت سے زائد جینئیس بگاڑ کا سبب بن رہے ہیں۔ اگر کسی ملک کو جینئیس درکار ہوں تو تجربات میں وقت ضائع نہ کرے بلکہ پاکستان آئے اور ضرورت کے مطابق جتنے چاہے جینئیس لے جائے ! اُن ملک کا کام !تمام) ہوجائے گا اور ہماری بقاء کا سامان)

کھائیں گے کیا!

وقت کا تو کام ہی گزرنا ہے، گزرتا رہتا ہے۔ اور اِس بات کی پروا کئے بغیر کہ کسی پر کیا گزرتی ہے! زمانے کو بدل جانے کے سوا آتا کیا ہے؟ اگلے وقتوں کی قدریں اب کہاں؟ ہر شعبہ اور ہر معاملہ انقلابات کی زد میں ہے۔ فتنے ہیں کہ سَر اُٹھاتے جاتے ہیں اور اِنسان ہے کہ زیرِ بار ہوا جاتا ہے۔ زمانے کی روش دیکھ کر کس کا ذہن ہے کہ ماؤف ہو کر نہ رہ جائے۔

بُزدِلی اور دِلیری دونوں ہی کا مفہوم بدل چکا ہے۔ کل تک جس کام کو ذرّہ بھر توقیر کے قابل نہ سمجھا جاتا تھا وہ اب سَر پر سوار رہتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ سَر پر سوار کرنے کے شوقین بھی تو دَم بہ دَم موجود ہیں!

رات گزرتی ہے، سُورج طلوع ہوتا ہے اور خلقت بیدار ہوتی ہے تو کام کی سُو جھتی ہے۔ یہ زمانے کا دستور اور معمول ہے۔ ہوتا ہوگا۔ ہمیں کیا؟ ہمیں تو اپنے معمولات کی فکر لاحق ہونی چاہیے۔ آج کل اہلِ پاکستان ''علی الصباح'' (یعنی دِن کے گیارہ بارہ بجے!) بیدار ہوتے ہیں تو یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ پکائیں گے کیا اور کھائیں گے کیا؟ کھانے پینے کی ہر چیز اب کھانے والوں کو کھانے

پر تُلی ہوئی ہے، اور وہ بھی ڈکار لیے بغیر! کھانے پینے کی یومیہ ضرورت کو ہم نے یوں لَت میں تبدیل کیا ہے کہ جو چیزیں کل تک برائے نام بھی وقعت نہ رکھتی تھیں وہ اب ہم سے ہماری حیثیت پوچھتی پھرتی ہیں!

طرح طرح کی سماجی خدمات کے بلند بانگ دعوے کرنے اور اُن پر ناز کرنے والوں کو اب تک خیال نہیں آیا کہ لوگوں کو مہنگائی کے جھٹکوں سے محفوظ رکھنا بھی لازمی خدمت ہے۔ ہر شے کے دام یومیہ بنیاد پر بڑھ رہے ہیں۔ گرانی کا ایک سیلاب ہے کہ اُمڈا آتا ہے اور سَمر گرنی میں اضافے کا بازار گرم رکھتا ہے۔ یہ کیفیت بلند فشارِ خون میں مبتلا افراد کی تعداد بڑھاتی جاتی ہے۔ یہ بھی عجب تماشا ہے کہ حکومت لوگوں کی رگوں سے خون نچوڑنے پر تُلی رہتی ہے اور دوسری طرف خون ہے کہ لوگوں کی آنکھوں میں اُترتا رہتا ہے! حکومت شاید مہنگائی کے ذریعے لوگوں میں اشتعال ختم کرنا چاہتی ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں خون تو تبھی اُترے گا جب رگوں میں موجود ہوگا!

روز افزوں مہنگائی نے ایک طرف آنکھوں سے نیند کا کاجل چُرا لیا ہے اور دوسری طرف خوابوں کو بھی بے طور و بے ہنگم کردیا ہے۔ کسی نہ کسی طور نیند کی آغوش میں پہنچیے تو سخت نامانوس نوعیت کے خواب ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھنے پر مجبور کردیتے ہیں۔

کل ہم نے خواب میں دیکھا کہ شامیانے کی چار دیواری میں قائم میڈیکل کیمپ میں لوگ قطار بند کھڑے ہیں۔ ڈاکٹر چیک اپ کرتا جاتا ہے اور متعلقہ فرد کو ایک پرچی تھماتا جاتا ہے۔ کسی کسی کو وہ روک کر ایک طرف بیٹھنے کی ہدایت بھی کرتا ہے۔ جنہیں پرچی ملتی ہے وہ خاصے پُرسکون اور تمتماتے چہرے کے ساتھ کیمپ سے نکل کر پڑوس میں مرکزی دروازے پر پہنچتے ہیں۔ اور وہاں کھڑا شخص پرچی دیکھ کر اُنہیں بچت بازار میں داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے!

ہم نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے تو اُنھوں نے بتایا کہ کئی ہفتوں سے یہ ہو رہا ہے کہ لوگ بازار میں داخل ہوتے ہیں اور پھر سبزیوں، پھلوں کے دام سُن کر اُنہیں غش آ جاتا ہے۔ کئی لوگ چکرا کر گرے اور زخمی ہوئے۔ اور ہوش میں آنے کے بعد بے چاری سبزیوں کو مغلظات سے نوازا! ہم نے ایک سماجی تنظیم کی مدد سے یہ انتظام کیا ہے تاکہ اختلاجِ قلب یا بلند فشارِ خون کے عارضے میں مبتلا افراد سبزیوں یا پھلوں کے دام سُن کر لڑھک نہ جائیں! اب مضبوط اعصاب اور مستحکم قلبی حالت والے ہی کلیئرنس ملنے پر بازار میں داخل ہو سکتے ہیں!

ڈاکٹر کی یہ بات سُن کر ہماری عجیب حالت ہوئی اور میرؔ کے بقول ع

پھر اِس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی!

یعنی ہماری آنکھ کھل گئی۔

ہماری آنکھ تو کھل گئی مگر قوم کی آنکھیں ہیں کہ کھلنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ مہنگائی کے ہاتھوں زخم کھانے سے دِل نہیں بھرتا، مہنگائی کا شکار ہوئے بغیر جی نہیں لگتا۔ ع

میرؔ کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عَطّار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں!

یہ بھی عجب ہنجار ہے کہ پاک سرزمین پر جو چیز جتنی مہنگی ہوتی جاتی ہے اُس کی طلب اُتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ اگر کسی چیز کی قلت کی افواہ اُڑ جائے تو لوگ گھروں سے اُڑتے ہوئے دکانوں اور ٹھیلوں پر پہنچتے ہیں اور اُس چیز کی طرف لپکتے ہیں۔ گویا وہ رخصت رُوئے زمین سے رُخصت ہو رہی ہو اور کبھی پلٹ کر اِس سَیّارے پر آنے کا کوئی ارادہ نہ ہو!

اللہ کا عذاب تو اپنے مقررہ وقت پر نازل ہوگا۔ اِس سے بہت پہلے ہم نے اپنے لیے چند عذاب منتخب ہی نہیں کیے، نافذ بھی کرلیے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء کے نرخوں کا آسمان سے باتیں کرنا بھی عذاب ہی کی ایک شکل ہے۔ یہ بھی کیا زندگی ہے کہ صبح آنکھ کھلے تو سب سے پہلے یہ فکر لاحق ہو کہ آج کیا اور

کیسے پکے گا؟ جس چیز کے پکانے کا سوچیے اُس کے نرخ کا سوچ کر دِل بیٹھا جاتا ہے۔ چیز تو بعد میں پکے گی، دِماغ پہلے پکنے لگتا ہے!

ٹی وی پر کوکنگ شو دیکھ کر خواتین جب دِل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کوئی اچھی ڈش تیار کرنے کا سوچتی ہیں تو مطلوبہ اشیاء کے دام سُن کر ہاتھوں کے طوطے ایسے اُڑتے ہیں کہ پھر کسی صورت واپس اپنی ڈال پر نہیں آتے۔ کوئی ڈھنگ کا آئٹم تیار کرنے کا بیڑا اُٹھایئے تو چار پانچ سُرخ نوٹ اپنی جان سے جاتے ہیں!

زندگی جیسی نعمت ہمیں ضائع کرنے کے لیے تو عطا نہیں کی گئی۔ ہم کون ہیں، روئے زمین پر ہمیں کیوں بھیجا گیا ہے، ہم اِس دنیا کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے لیے کیا کر سکتے ہیں اور اِسی قبیل کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن پر غور کرنا ہے، اپنے آپ کو دوسروں کے لیے زیادہ مفید بنانا ہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے محدود وقت کا ایک بڑا حصہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کی فکر پر صرف، بلکہ ضائع ہو رہا ہے۔ دو وقت کی روٹی کی فکر نے ہمیں چبا کر نگل لیا ہے۔ جسے دیکھیے وہ زندگی اور کائنات کے تمام معاملات بھول کر صرف اِس فکر میں غلطاں ہے کہ کل کیا پکا تھا اور آج کیا پکانا ہے!

خواتین کو اب فیشن زدہ ہونے کا طعنہ کیا دیجیے، اُن کی زندگی میں تو اب صرف چولھے اور ہانڈی

کی فکر رہ گئی ہے۔

ٹی وی اسکرین پر کوکنگ شو میں کھانے کی ترکیب بتاتے وقت جب اجزائے ترکیبی گنوائے جاتے ہیں تب اُن کی مقدار بھی بتائی جاتی ہے۔ فلاں چیز اِتنی اور فلاں چیز اُتنی۔ نمک حسبِ ذائقہ۔ کل کو یہ بھی ہوگا کہ کسی ڈش کی ترکیب بتاتے وقت کہا جائے گا نمک اور مرچ تو ضرورت کے مطابق ڈالیں اور پیاز، ٹماٹر اور ادرک لہسن کا پیسٹ اوقات کے مطابق! پیاز اور ٹماٹر کی وقعت دیکھ کر اپنی بے توقیری کا شِدّت سے احساس ہوتا ہے! جو چیز ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی وہ سَر چڑھ کر تو ناچے گی ہی۔ کل تک پیاز صرف رُلاتی تھی، اب خون کے آنسو رُلا رہی ہے! ٹماٹر کا یہ حال ہے کہ ایک آدھ کلو بھی خریدیں تو گھریلو بجٹ کا کیچ اپ نکل جاتا ہے! بہت سے غریب توٹھیلے والے سے سبزیوں کے دام سُن کر اپنا سامنہ لیکر رہ جاتے ہیں۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ سبزی کے ٹھیلوں اور ٹھیوں سے بچ بچ کے گزرنے لگتے ہیں۔ عزت تو غریب کی بھی ہوتی ہے اور اُسے پیاری بھی ہوتی ہے!

غالبؔ نے کہا تھا ؎

ہے اب اِس معمورے میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا!

اہلِ وطن کا بھی اب کچھ ایسا ہی حال ہے۔ کرپشن، لوٹ مار، دہشت گردی اور قتل و غارت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو جسم و جاں کا رشتہ کیسے برقرار رکھیں گے؟ کھائیں گے کیا؟ پیاز، ٹماٹر، ادرک اور لہسن جیسی اشیاء ہمیں بندۂ بے دام بنانے پر تُلی ہیں۔ زندگی کی جنگ میں یہ پہلا اور قریب ترین محاذ ہے۔ اور اِس محاذ پر ہی زندگی اپنی جنگ ہارتی دکھائی دیتی ہے!

ہم" سے اچھا کون ہے؟"

ہمارے گرد ہر سمت وسیع و بسیط کائنات ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جسے ہم اب درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے۔ کسی نے خوب کہا ہے ع
قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا
اور کائنات کہاں روز آتی جاتی ہے؟ یہ تو دَم بہ دَم برقرار ہی رہتی ہے۔ یہ کبھی ہمارے گرد و پیش سے معدوم، ناپید یا نادیدہ نہیں ہوتی۔ چار دیواری سے نکلیے، پلکیں اُٹھایئے اور کائنات کی پہنائیوں میں پنہاں ہو جایئے!

مگر یہ کوئی "ون وے ٹریفک" نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف ہم کائنات میں گم ہیں۔ کائنات بھی تو ہم میں گم ہے۔ کیا ہمارے اپنے وجود میں کوئی کائنات نہیں؟ حقیقت، بلکہ ابدی حقیقت یہ ہے کہ ہم خود اپنی ذات میں ایک مکمل کائنات ہیں۔ کائنات اگر ہم پر محیط ہے تو ہم خود بھی اِس کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اگر پوری کائنات ہم میں جھلک رہی ہے تو کیا ہوا؟ ہم بھی تو ہر شے میں، ہر ذرّے میں منعکس ہو رہے ہیں۔ غور سے، بلکہ ذرا پیار سے دیکھیے تو پوری کائنات شیش محل کی سی ہے جس میں ہمیں ہر طرف اپنی ہی ذات

منعکس ہوتی دکھائی دے گی۔

اپنی ذات کا پھیلاؤ اٹل حقیقت ہے مگر مشکل تب کھڑی ہوتی ہے جب اپنی ذات کے پھیلاؤ میں پوری کائنات سکڑتی دکھائی دیتی ہے۔ وسعت پذیر ہونا بڑا وصف ہے مگر توسیع اتنی ہو کہ سنبھالی جا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنے سے بڑھ کر کچھ بھی، کوئی بھی اہم محسوس نہ ہو۔

پاکستانی معاشرہ اُس مرحلے سے گزر رہا ہے جس میں ہر شخص اپنی ذات کے پھیلاؤ میں پوری کائنات کو سمیٹ لینے کے درپے ہے۔ مُٹھی میں دُنیا بند کرنے کا زمانہ گزر گیا۔ اب تو لوگ ہتھیلی کے کھیت میں پوری کائنات اگانا چاہتے ہیں! رائی اگر پربت بننے کا خواب دیکھے تو جائز ہے۔ ذرّہ اگر خورشیدِ جہاں تاب کا سا رتبہ پانے کا آرزو مند ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مگر یہ کیا کہ کچھ نہ ہونے پر بھی بہت کچھ، بلکہ سب کچھ ہونے کا خبط سَروں پر سوار ہے! خالی برتن خوب کھنکتا ہے۔ باطن کمزور ہو تو ظاہر بھی بھونڈے پن کی تصویر بن جایا کرتا ہے۔ اور پھر اِس میں تصنع اور بے ہودگی کی بھی آمیزش ہوتی جاتی ہے۔ اِن اجزائے ترکیبی سے چلتے پھرتے، سانس لیتے تماشے تشکیل پاتے ہیں! ہر انسان اپنی اصلیت جانتا ہے مگر اُسے بھول جانا بھی چاہتا ہے۔ ہم اچھی

طرح جانتے ہیں کہ ذہن کے پردے سے کوئی چیز مٹتی نہیں مگر پھر ہم اُسے مٹانا چاہتے ہیں۔ خصوصاً ہر اُس چیز یا بات کو جو ہمیں ذرا بھی پسند نہ ہو۔ اپنے دہی کا کھٹا پن سب جانتے ہیں مگر کوئی بھی اُسے کھٹا کہنے یا سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

اپنی ذات کی تفہیم دو انتہاؤں کا سفر ہے۔ ایک انتہا یہ ہے کہ ہم خود کو کچھ نہ سمجھیں، کچھ نہ گردانیں۔ ایسی حالت میں بے دِلی، بے حِسی اور بے عملی جنم لیتی ہے۔ جب اپنے ہی وجود کو اہمیت نہ دی جارہی ہو تو کون سی چیز یا بات اہم محسوس ہوگی؟ جب انسان اپنی نظر میں بلند نہ ہو تو ہر معاملہ اپنا مُنہ پستی کی طرف کرلیتا ہے۔

فہمِ ذات کے مرحلے میں دوسری انتہا یہ ہے کہ انسان خود کو بہت کچھ، بلکہ سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے۔ جب یہ مقام آ جائے تب بھی بے عملی ہی درشن دیتی ہے۔ ضیاؔ جالندھری مرحوم نے خوب کہا ہے ۔

اُفتادِ طبیعت سے اِس حال کو ہم پہنچے

!شِدّت کی محبت میں شِدّت ہی کے غم پہنچے

اپنی ذات کو کچھ نہ گردانے کا انجام؟ تباہی! اور خود کو سب کچھ سمجھ

بیٹھنے کے خبط کا نتیجہ بھی بربادی! انتہا خواہ کسی معاملے میں ہو اور کسی بھی چیز کی ہو، ایسے ہی گل کھلایا کرتی ہے!

ستم ڈھانے میں آئینے کا حریف کوئی ہو سکتا ہے؟ آپ کا جواب نفی میں ہونا چاہیے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو جائیے اور پھر دیکھیے کہ یہ کس کس طرح آپ کو شیشے میں اُتارتا ہے! آئینے میں اپنے وجود کا جائزہ لیجیے اور اپنی آنکھوں کے عکس میں جھانک کر دیکھیے، کئی داستانیں خاصی بُلند آواز سے خود کو دُہراتی محسوس ہوں گی۔ آئینے میں اپنے ہی وجود کا عکس کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے۔ اپنی آنکھوں کے عکس میں جھانک کر خود کو تلاش کیجیے تو سرگوشی شروع ہو جاتی ہے۔ کیسی سرگوشی؟ یہی کہ "ہم" سے اچھا کون ہے! اور ہو بھی کون سکتا ہے؟ لیجیے، بات ہی ختم ہو گئی۔ آئینہ پلک جھپکتے میں آپ کو فوٹو فنش" کی منزل تک پہنچا کر میچ جتوا دیتا ہے! جب آئینے نے طے کر دیا کہ آپ" سے اچھا، آپ سے بہتر اور آپ سے بڑھ کر کوئی ہے ہی نہیں تو پھر کسی کو، کسی بھی چیز کو کیوں اہمیت دی جائے؟

آئینے نے کتنوں کو بگاڑا ہے، کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اگر آپ کی خواہش ہے کہ آئینہ آپ کو کچھ کا کچھ بلکہ بہت کچھ بنا کر پیش کرے تو بس اِتنی شرط ہے کہ اُس کے سامنے کھڑے ہو کر صرف اپنی آنکھوں کے عکس میں جھانکیے۔ پھر کوئی

عیب دکھائی نہیں دے گا۔ اپنا سراپا دیکھیے گا تو دِل بیٹھتا چلا جائے گا۔ آئینے میں صرف چہرہ دیکھیے۔ اور ہو سکے تو قدِ آدم آئینے کے استعمال سے گریز کیجیے۔ یہ آئینہ آپ کے پورے وجود کو جُوں کا تُوں پیش کرکے حقیقت پر سے پردہ اُٹھانے کی گستاخی کر بیٹھے گا اور آپ کا دل دَورِ سحر کی شمع کی مانند بُجھ جائے گا۔

جب اِنسان کچھ نہ ہونے پر بھی خود کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تو ہر ایک کو اپنا بندۂ بے دام گرداننے لگتا ہے۔ میدان علم و فن کا ہو، سیاست کا یا پھر صنعت و تجارت کا، جب آپ نے ایک بار طے کرلیا کہ آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں تو پھر کس کی مجال ہے کہ آپ سے بلند ہو کر دکھائے۔ اور کوئی بلند ہو بھی جائے تو آپ کیوں اُسے بلند ماننے لگے؟ کوئی کچھ بھی ہو جائے، جب تک آپ ''ہم سے اچھا کون ہے؟'' کی ''خوشبو'' کو جسم و جاں میں بسائے رکھیں گے، تب تک کوئی بھی کوئی بھی اوجِ ثُریا کو چُھو نہ سکے گا۔ آپ خواہ تحت الثّریٰ میں ہوں!

جب اِنسان میں کوئی تعمیری وصف نہ ہو، کوئی خوبی نہ پائی جاتی ہو تب خود فریبی نعمتِ غیر مُترقبہ معلوم ہوتی ہے۔ باقیؔ صدیقی مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

خود فریبی سی خود فریبی ہے

پاس کے ڈھول بھی سُہانے لگے!

اہلِ وطن اِسی عالم اور کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ کسی میں لاکھ خوبیاں ہوں تو ہوا کریں، مدِ مقابل نہ مانے تو کس میں دم ہے کہ خود کون منوائے!

جنھوں نے کبھی ہاتھ میں گیند نہ تھامی ہو وہ اُن باؤلرز کی "خامیاں" گنوانے بیٹھ جاتے ہیں جو دو ڈھائی سو بین الاقوامی میچ کھیل چکے ہوں!

لیڈری کا خبط اُن کے ذہن پر بھی سوار رہتا ہے جن کی پارٹی کے تمام ارکان ایک تانگے یا سی این جی رکشے میں آسانی سے سما سکتے ہیں!

کالج یا یونیورسٹی کے زمانے میں دَرسی کتب کے "مطالعے" کے بعد جنھوں نے ایک کتاب بھی، جی ہاں ایک کتاب بھی نہ پڑھی ہو وہ نئی نسل کو پڑھانے پر مامور ہیں!

جو بھولے بھٹکے تین چار کتابیں پڑھ لیں اور دس بیس کتابوں پر اُچٹتی سی نظر ڈال لیں وہ موقع ملتے ہی ہزیانی کیفیت میں مُبتلا ہو کر دانش وری جھاڑنے لگتے ہیں! دانش وری تو کیا جَھڑے گی، اُن کے ذہنی برگد سے جہالت کے پتّے

!البتہ ضرور جھڑتے جاتے ہیں

”ہم سے اچھا کون ہے؟“ وہ جادو ہے جو اپنے ہی نہیں، دوسروں کے بھی سَر چڑھ کر بولتا ہے۔ چند سو افراد کو جمع کرنے میں کامیاب ہونے والا اپنے تئیں قوم کا نجات دہندہ اور مسیحا سمجھنے لگتا ہے۔ آئینہ اُسے مزید بانس پر چڑھاتا ہے۔ پارلیمنٹ میں ایک یا دو نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہونے والے بھی وزارتِ عُظمٰی سے کم کا خواب !دیکھنے پر راضی نہیں ہوتے

اپنے آپ سے گزر کر دیکھیے تو دنیا میں اور بھی کچھ ہے، بلکہ بہت کچھ ہے۔ مگر ہم تو سفر کی ابتداء ہی کو منزل قرار دے کر خوش ہو لیتے ہیں۔

خود پسندی وبا ہے مگر ہم نے اِسے گلے لگایا ہے۔ کیوں؟ اِس لیے کہ اپنے آپ پر مَر مِٹنا سب سے آسان آپشن ہے۔ اپنے تئیں برتر سمجھنے میں کون سے زمانے لگتے ہیں۔ جب !جی میں آئے اپنے آپ پر مَر مِٹیے، کس نے روکا ہے

خود پسندی اور خود فریبی کا زہر ہم نے ایسا پیا ہے کہ اب ڈھنگ سے جینے کے قابل نہیں رہے۔ ہر شعبے کی رگوں میں یہ زہر یوں اُترا ہے کہ رگیں کھنچ گئی ہیں، تشنّج کی کیفیت طاری ہے اور ہم اِس کیفیت سے نجات پانے کا سوچنے کے

بجائے اِس سے محظوظ ہو رہے ہیں!

اچھا ہے کہ آئینہ اپنا کام پوری ایمانداری سے کرے اور ہم اُس کام کا نتیجہ قبول بھی کریں۔ آئینے کا بیان کیا ہوا پورا سچ قبول کرنے ہی پر ہمارے قبول کئے جانے کی راہ بھی ہموار ہوگی۔ بہ صورتِ دیگر خود فریبی کا زہر تو ہر آن موجود ہے، پیجیے اور جیتے جی مَر رہیے!

اژدہے کا نیا پروگرام

امریکا سے اب کوئی بھی دُشمن برداشت نہیں ہو پا رہا۔ خواہ اُس کا تعلق حیوانوں کی دُنیا ہی سے ہو۔ صرف گدھوں اور ہاتھیوں کو استثنٰی حاصل ہے۔ امریکا میں سیاسی سطح پر گدھے اور ہاتھی کو چونکہ غیر معمولی مرتبہ حاصل ہے اِس لیے امریکی پالیسی میکرز جن ممالک کو نشانے پر لیتے ہیں اُن کے گدھوں کو الگ کرکے گلے سے لگاتے ہیں! اور پھر یہ گدھے اپنی قوم کے لیے ہاتھی ثابت ہوتے ہیں، پورس کے ہاتھی! وائٹ ہاؤس کے خوانِ نعمت سے چَرنے والے کئی سفید ہاتھی ہمارے نصیب میں بھی لکھے ہوئے ہیں اور آئے دِن پلٹ کر ہمیں روندتے ہیں!

بحر الکاہل میں امریکا کے زیر انتظام جزیرے گوام میں سانپوں کی بہتات سے اوباما انتظامیہ اِس قدر پریشان ہے کہ سانپ مارنے کا باضابطہ پروگرام شروع کردیا ہے۔ گوام کے معاملے میں زیادہ پریشانی یوں بھی ہے کہ یہاں امریکی فوج کا ایک بڑا اڈا بھی ہے۔ گوام میں سانپوں کی بہتات سے تو اوباما انتظامیہ پریشان ہے اور اُن علاقوں کا اُسے ذرا بھی خیال نہیں جہاں امریکی پالیسیاں اژدہوں کی طرح سب کچھ نگلتی جارہی ہیں۔ مگر کیا روئیے کہ چراغ تلے اندھیرا

ہی ہوتا ہے۔

گوام میں امریکی فوجی بھی تعینات ہیں۔ ظاہر ہے اِس علاقے میں ایک وقت میں ایک ہی نوع کے سانپ رہ سکتے ہیں اِس لیے اوباما انتظامیہ نے بے زبان سانپ ختم کرنے کے لیے زہریلے مُردہ چوہے گتّے کے پیراشوٹس کی مدد سے اُتارنا شروع کیا ہے۔ پورا پروگرام 80 لاکھ ڈالر کا ہے۔ ایک مُردہ چوہے کو زہر میں ڈبونے پر چار ہزار ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ پہلے مرحلے میں دو ہزار چوہے برسائے گئے جس پر امریکی چیخ پڑے ہیں۔ اور کیوں نہ چیخیں؟ اُن کی محنت کی کمائی ایک فضول اور بے ڈھنگے پروگرام پر ضائع ہو رہی ہے۔ اِس پروگرام کا بے ڈھنگا پن ثابت کرنے کے لیے اِتنا ہی کافی ہے کہ اِسے امریکی پالیسی میکرز نے تیار کیا ہے!

گوام میں چوہے برسائے جانے کی خبر کا شائع اور نشر ہونا تھا کہ تنقید کے پتھر برسنے لگے۔ ایک طرف تو اوباما انتظامیہ کو لتاڑا جارہا ہے اور دوسری طرف ''صائب'' مشوروں سے نوازا بھی جارہا ہے۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ اگر صدر براک اوباما اور ''خانۂ سفید'' میں اُن کے (کالے کرتوتوں کے) ساتھی مل کر گوام میں کود جاتے تو سانپ مارنا بہت آسان ہوجاتا کیونکہ یہ لوگ جہاں بھی جاتے ہیں وہاں کے زہریلے لوگ اِن کے گرد جمع ہوجاتے ہیں اور چند ایک کو

!تو یہ ساتھ بھی لے آتے ہیں

چند ایک امریکیوں نے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ اُن کا مشورہ ہے کہ چار ہزار ڈالر کا ایک مَرا ہوا زہریلا چوہا گوام میں پھینکنے سے بہتر ہے کہ اُنھیں سانپ مارنے پر مامور کر دیا جائے۔ وہ اِس سے کہیں کم خرچ پر گوام کے سانپوں کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ ہمیں تو یہ امریکی بڑھک باز معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وہ زہریلی مخلوق کے ایسے ہی شکاری !ہوتے تو واشنگٹن میں آج ہر طرف اژدہے نہ بھٹک رہے ہوتے

بہت سے امریکیوں نے زہریلے مُردہ چوہے کھلا کر سانپ مارنے کی کوشش پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے ہمیں معلوم تھا ایک دن یہ حماقت بھی سرزد ہو گی۔ ہماری ہمدردیاں امریکی عوام کے ساتھ ہیں جن کا کام اب حکومت کی حماقتیں اور ناکامیاں گننا !رہ گیا ہے

چند ایک تبصروں میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ گوام میں جو زہریلے چوہے پھینکے جا رہے ہیں اُن سے کہیں کم لاگت کے زہریلے چوہے امریکا میں دستیاب ہیں۔ بے چارے امریکی! کیا اُنھیں معلوم نہیں کہ ایسے چوہوں کی سیکیورٹی بہت سخت ہوا کرتی ہے؟

بہت سے امریکی یہ سوچ کر حیران ہیں کہ دو ہزار چوہوں سے ہو گا کیا؟ ایک لاکھ 63 ہزار کی آبادی والے گوام میں 20 لاکھ سے زائد بُھورے سانپ ہیں! امریکی فوجیوں کی تعیناتی کیا کم تھی جو اِن اِضافی و اصلی سانپوں نے بھی جزیرے میں سیاحت کی صنعت کو ڈس لیا! گوام میں پرندے بھی ناپید ہو چلے ہیں کیونکہ سانپ اُن کے انڈے اور بچے چٹ کر جاتے ہیں۔ جہاں امریکی ہوں وہاں ہر نوعِ حیات خطرے میں پڑ جایا کرتی ہے! گوام کے سانپ بجلی کی تنصیبات میں داخل ہو کر بریک ڈاؤن کا سبب بھی بنتے ہیں۔ اُنھوں نے یہ خصلت یقینی طور پر امریکیوں کی صحبت میں سیکھی ہو گی۔ امریکی بھی اپنے مفادات کو تحفظ دینے کی خاطر کمزور اقوام کے پورے گرڈ کو اِسی طور بریک ڈاؤن کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں!

20 لاکھ سانپوں کے لیے صرف دو ہزار چوہے! کیا امریکی حکومت ڈھیروں کے حساب سے پائے جانے والے زندہ سانپوں کو چند مَرے ہوئے چوہوں کے لیے آپس میں لڑوانا چاہتی ہے؟ پھر تو اِسے خاصا سیاسی اور اسٹریٹجک پروگرام کہیے! امریکا جہاں کہیں بھی اپنے دُشمنوں کو ختم کرنا چاہتا ہے ایسی ہی حکمتِ عملی اختیار کرتا ہے۔ کچلی ہوئی اقوام میں ایسے لالچی سانپوں کی کمی نہیں

جو امریکا کے پھینکے ہوئے زہریلے مُردہ چوہوں کو بھی نعمتِ غیر مرقبہ سمجھ نگلتے ہیں اور پھر قوم کی طرف دیکھتے ہوئے۔بڑے فخر سے سینہ پُھلا کر ڈکار لیتے ہیں!

امریکی ٹیکس دہندگان کا اعتراض اِس بات پر بھی ہے کہ سانپ مُردہ چوہے نہیں کھایا کرتے۔ ممکن ہے اوباما انتظامیہ نے سوچا ہو یہ سانپ 1950 کے عشرے سے ہمارے لوگوں کے درمیان ہیں تو شاید مُردار کھانا سیکھ لیا ہو! امریکی پالیسی میکرز بھی "مَرے کو مارے شاہ مدار" کے مصداق اُنہی لوگوں پر حملوں کے منصوبے بناتے ہیں جو حالات کے قمار خانے میں زندگی کی بازی ہار چکے ہوتے ہیں!

ویسے امریکی عوام کو زیادہ حیرت ہونی نہیں چاہیے۔ امریکی حکومت اپنی متعارف کرائی ہوئی ہر زہریلی مخلوق کو اِسی طور ختم کیا کرتی ہے! ایبٹ آباد آپریشن میں اُسامہ بن لادن کو مارنے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ امریکا نے پہلے چند مقامی چوہوں سے مدد لی، پھر ہیلی کاپٹرز کے ذریعے چند تربیت یافتہ، اسپیشل چوہے اُتارے۔ اور کام ہوگیا!

لوگ امریکا کو گالیاں دیتے نہیں تھکتے کہ وہ احسان فراموش ہے، کام نکل جانے

پر پلٹ کر نہیں دیکھتا اور سابق ساتھیوں کے مفادات کا خیال نہیں رکھتا وغیرہ وغیرہ۔
ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ امریکا اپنے پالے ہوئے سانپ بھی ختم کرتا ہے۔ مگر ایسا وہ صرف اُس وقت کرتا ہے جب اُس کے اپنے مفادات کو خطرات لاحق ہوں! جن میں عقل ہے وہ اپنی بھلائی کی خاطر امریکی مفادات کے لیے تھوڑے بہت خطرات پیدا کرتے رہتے ہیں!
گوام میں سانپ ختم کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہو سکتے تھے۔ اسنائپرز تعینات کرکے سانپوں کو نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ مگر صاحب! امریکی اسنائپرز کے لیے سانپوں کو نشانہ بنانے میں کیا کشش ہو سکتی ہے؟ وہ تو بے بس، نہتے اِنسانوں (بالخصوص مسلمانوں) کو نشانہ بنانے کے عادی اور ماہر ہیں! جہاں جوابی وار کا اور انتقاماً ڈسے جانے کا ذرا بھی خطرہ ہو وہاں امریکی اسنائپرز کا پایا جانا بعید از قیاس سمجھیے۔
دوسرا بہتر طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ سانپوں پر ڈرون حملے کیے جاتے۔ مگر اِس میں بھی ایک قباحت تھی۔ امریکا ہی کیا، دُنیا بھر میں سانپوں کے حقوق کے علم بردار اُٹھ کھڑے ہوتے! گوام کوئی مسلم اکثریت والا علاقہ تو ہے نہیں کہ بے فکری سے ڈرون برسائے جائیں! اور پھر ڈرون سے میزائل برسا تو دیئے جاتے مگر وہ میزائل سانپوں کو نشانہ کیسے بناتے؟ اِن میزائلوں کی پروگرامنگ کچھ ایسی ہے کہ صرف مسلمانوں کو پہچانتے اور اُنہی پر پھٹتے ہیں!

شور و غل" کے واسطے پیدا کیا انسان کو؟"

بولنا انسان کا بُنیادی اور ناگزیر وصف ہے۔ ہر انسان کچھ نہ کچھ بولنا چاہتا ہے۔ بولتے رہنے میں وہ اپنی بقاء محسوس کرتا ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے کہ انسان بولے بغیر اپنی بات بیان نہیں کر سکتا؟ سیانے تو کچھ اور کہتے ہیں۔ اُن کی نظر میں بولنے کا ماہر تو وہ ہے جو اچھی طرح جانتا ہو کہ کب خاموش رہنا ہے! مگر خیر، اب سیانوں کی بات سُنتا کون ہے۔

کیا دن رات بولتے رہنا ناگزیر ہے؟ کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ بہت سے لوگ غیر محسوس طور پر یہ ظاہر کر رہے ہوتے ہیں کہ بولنا اُن کی ''مجبوری'' ہے؟ بظاہر وہ اِس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ خاموش رہنے کی صورت میں یا تو وہ زندہ نہیں رہ پائیں گے یا پھر اپنے وجود کی معنویت سے محروم ہو جائیں گے! نہ بولنے کی صورت میں پیچھے رہ جانے کا خوف اُنہیں کچھ نہ کچھ بولتے رہنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔

جن مفید حقیقتوں کو پاکستانی معاشرے نے بھلادیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اچھا بولنے کے لئے خاموش رہنا لازم ہے۔ جو لوگ خاموش رہنے کا ہنر جانتے ہیں وہ اپنی بات بہتر انداز سے بیان کر پاتے ہیں۔ خاموش اور پُرسکون رہنے کی

صورت میں انسان اپنے آپ سے ملتا ہے اور اپنی خوبیوں اور خامیوں پر مطلع ہو کر اپنے وجود کو سمجھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ غیر ضروری گفتگو سے گریز انسان کو سوچنے اور سمجھنے پر مائل کرتا ہے۔ خاموشی اختیار کرنے کی صورت میں انسان پر اپنے وجود کے مختلف گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔ خاموشی ہی انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ کب اور کیا بولنا ہے۔ محض بولتے رہنے سے مافی الضمیر بیان نہیں ہوتا بلکہ موزوں ترین موقع پر مناسب ترین الفاظ میں بیان کی جانے والی بات کارگر ثابت ہوتی ہے۔ خاموشی ہی انسان کو بات کہنے کا وہ ڈھنگ سکھاتی ہے جو سب کو پسند آتا ہے۔ شخصیت کی مرکزیت خاموشی اور گفتگو کے فرق کو جاننے اور سمجھنے میں ہے۔ جہاں خاموش رہنا ہو وہاں گفتگو سے گریز اور جہاں بولنا لازم ہو وہاں کم از کم الفاظ میں عمدگی سے اظہار زندگی کو نئی معنویت اور پختگی سے ہمکنار کرتا ہے۔

جرمن فلسفی شاپنہار کو خاموشی اس قدر عزیز تھی کہ وہ شور و غل کو دنیا کے چار پانچ بڑے اور سنگین جرائم میں شمار کرتا تھا! شاپنہار اُس زمانے کا انسان تھا جب صنعتی انقلاب ابھی پوری طرح یا بھرپور طور پر رُونما نہیں ہوا تھا۔ آمد و رفت کے مشینی ذرائع ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ روز مرہ استعمال کی بیشتر اشیاء ہاتھ سے چلائی جاتی تھیں۔ یعنی شور مچانے والی چیزوں نے انسانوں کی دُنیا میں رہنا شروع نہیں کیا تھا۔ قدم قدم پر مشینی کارخانے

تھے ہی نہیں تو شور و غل کہاں سے پیدا ہوتا؟ آج کے مقابلے میں وہ ماحول کس قدر پُرسکون ہوگا اس کا اندازہ لگانا کچھ دشوار نہیں۔ اب ذرا سوچیے کہ شاہجہاں آج کے دور میں ہوتا تو اُس کی کیا حالت ہوتی، دل و دماغ پر کیا گزرتی!

ہم شور و غل پیدا اور برداشت کرنے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اب ہم میں سے بہتوں کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ خاموش رہنا کیا ہوتا ہے! سب کو شور اِس قدر پسند ہے کہ ایک دوسرے کی نازک مزاجی اور پرائیویسی کا تصور ذہنوں سے مٹ سا گیا ہے۔ آج کی گفتگو میں چیخ پکار اور بدگوئی کا رنگ نمایاں ہے۔ ہم چونکہ ایک دوسرے کی پرائیویسی، تنہائی اور نازک مزاجی کا احترام نہیں کرتے اس لئے ایک دوسرے کو مکمل طور پر تسلیم بھی نہیں کر پاتے۔ جنہیں بولنے کا "ہوکا" ہے وہ بس بولتے ہی رہتے ہیں۔ وہ بالعموم اس بات سے کچھ غرض نہیں رکھتے کہ اُن کے بولنے یا بولتے رہنے سے کسی پر کیا گزرے گی۔

رات دن ہمارے ارد گرد ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ شہر کی زندگی میں شور و غل کو نمایاں اور ناگزیر وصف تصور کرلیا گیا ہے۔ گاڑیوں، مشینوں اور ایسی ہی دوسری بہت سی چیزوں سے پیدا ہونے والا شور تو خیر ناگزیر ہے، لطف کی بات یہ ہے کہ ہم نے موسیقی بھی وہ اپنالی ہے جس میں صرف شور نمایاں ہے! فلمیں بھی

ہمیں وہ پسند ہیں جن میں چیختے، چنگھاڑتے مکالمے ہوں۔ آمنے سامنے بیٹھ کر بھی ہم چیخ چیخ کر بات کر رہے ہوتے ہیں۔ کسی ہوٹل میں بیٹھیے تو ڈھنگ سے دو باتیں کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف محسوس ہوتا ہے۔

اسٹاک مارکیٹ کی سیر کیجیے تو اُس پر مچھلی مارکیٹ کا گمان گزرتا ہے۔ ذرا اپنے محلے یا گلی پر نظر دوڑایئے تو ہر طرف شور برپا ملے گا۔ کبھی سبزی والا صدا لگاتا ہوا گزر رہا ہوتا ہے اور کبھی گول گپے والا احمد رشدی مرحوم کی میٹھی آواز کا سہارا لیکر آپ کو گاہک بنانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ سڑک پر ہر ڈرائیور اپنی گاڑی میں نصب ہارن بجانا عین فرض گردانتا ہے۔ حد یہ ہے کہ لوگ خالی سڑک پر بھی ہارن بجاتے ہوئے گاڑیاں گزارتے ہیں! گویا آج کا انسان محض شور پیدا کرنے کے مِشن پر نکلا ہے۔ جس شور سے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں اُسی شور کو ہم نے زندگی لازمی حصہ، بلکہ اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔

اپنی بات بیان کرنا تو ہماری ضروری یا مجبوری ہو سکتی ہے مگر کیا شور مچانا بھی ہماری مجبوری ہے؟ کیا شور و غل ہمارے لئے آکسیجن کی طرح ناگزیر ہے؟ کیا خاموش رہنے کی صورت میں ہم زندگی کی کسی بڑی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں؟ گفتگو ناگزیر ہو تو چپ رہنا حماقت کی دلیل ہوا کرتا ہے۔ مگر یہ کیا کہ ہم

کچھ نہ کچھ بولتے رہنے کے شوق میں اپنا بہت کچھ (اور کبھی کبھی تو سب کچھ) داؤ پر لگانے کے لئے بے تاب رہیں؟ ہمیں بالعموم اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ ہر وقت محض بولتے رہنے کی عادت کے ہاتھوں ہم اپنی کس قدر توانائی ضائع کر رہے ہوتے ہیں اور کتنی ذہنی پیچیدگیوں کو دعوت دے رہے ہوتے ہیں! گفتگو کے نام پر شور و غل کو اپنا کر ہم نے اچھی خاصی زندگی کو مستقل عذاب کی شکل دے دی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ دو گھڑی چپ رہنا بھی اچھا خاصا دُشوار محسوس ہوتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ بولنے کے لئے کچھ نہ ہو تب بھی ہم بولتے رہتے ہیں!

بلا ضرورت بولنے اور شور برپا رکھنے کی صورت میں ہم اپنے وجود کو مسلسل نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں۔ خاموش رہ کر ہم دراصل اپنی طرف آتے ہیں۔ جب شور و غل کی عادت سی پڑ جاتی ہے تو انسان ہر وقت کچھ نہ کچھ بولتا رہتا ہے یا کسی دوسری قسم کا شور پسند کرتا ہے۔ جن کارخانوں میں مشینوں کا غیر معمولی شور برپا ہو اُن میں بھی کاریگر میوزک سسٹم سے دل بہلا رہے ہوتے ہیں! اِس عمل کو موسیقی سے شغف نہیں بلکہ محض نفسیاتی پیچیدگی قرار دیا جاسکتا ہے۔ دل و دماغ کو ضرورت نہ ہو تب بھی ہم ٹی وی دیکھ رہے ہوتے ہیں یا محض عادتاً سنیما ہال جاکر فلم دیکھتے ہیں۔

خاموشی اپنے وجود سے شناسا ہونے کا عمل ہے۔ خاموش رہ کر انسان اپنی بات

بہتر ڈھنگ سے بیان کرنے کا ہنر سیکھتا ہے۔

یہ خامُشی ہی دلیل سُخن شناسی ہے
مُجھے نہ بولنا آتا تو بولتا رہتا !

گفتگو سے گریز انسان کو مُطالعے اور مشاہدے کی طرف لے جاتا ہے۔ مُطالعہ اور مُشاہدہ گفتگو کو بہتر بنانے میں خاصا معاون ثابت ہوتا ہے۔ مزاج میں یہ تبدیلی مشکل ضرور ہے، ناممکن ہرگز نہیں۔ ع

ذرا سی ہمتِ پرواز کی ضرورت ہے
نہیں ہیں دور بہت شاخِ آشیاں سے ہم

بے چاری جمہوری حکومتیں

عوام اپنے مسائل کا رونا روتے رہتے ہیں۔ کسی کو یہ غم ستاتا رہتا ہے کہ پانی نہیں آرہا۔ اور اس غم کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ آنکھوں سے پانی ٹپکاتا رہتا ہے۔ اگر لوگ پانی کے نام پر رونا بند کریں تو کتنا سارا پانی بچ جائے ! لوگ خود ہی آنکھوں کا پانی ضائع کرتے رہتے ہیں اور پھر شکوہ کرتے ہیں کہ آنکھوں کا پانی مرگیا ہے !
بجلی کے بحران کو روتے رہنا بھی عوام کی پُرانی عادت ہے۔ بجلی نہ آئے تو مصیبت اور آئے تو مصیبت۔ آپ سوچیں گے آنے پر کیسی مصیبت ! بجلی اگر آجائے تو بل زیادہ آتا ہے۔ توانائی کے بحران میں برقی آلات نہیں چلتے تو بل بھی کم آتا ہے۔ لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ حکومت بجلی کم کم دے کر اُن کا خرچ بچانا چاہتی ہے ! مگر جب عوام اپنے طور پر طے کرلیں کہ حکومت کا کوئی بھی کام سیدھا نہیں ہے تو پھر اُن سے یہ بات کوئی منوا نہیں سکتا کہ حکومت کچھ اچھا بھی کر سکتی ہے !
ایک زمانے سے لوگ روتے آئے ہیں کہ حکومت آمد و رفت کی بہتر سہولتیں فراہم

نہیں کرتی۔ جب حکومت اس مطالبے کو پورا کرتی ہے تو لوگ خرچے کا رونا رونے بیٹھ جاتے ہیں۔ ٹرینیں وقت پر آ رہی ہیں اور وقت پر جا رہی ہیں۔ یہ سہولت بہت خوب ہے مگر یہ ہے کہ ذرا سا خرچ بڑھ گیا ہے۔ ریلوے کا خسارہ پہلے ہی اچھا خاصا تھا۔ لوگوں نے ٹرینوں کا شیڈول درست کرنے کی ذمہ داری حکومت کے ناتواں کاندھوں پر ڈالی تو خرچ تو بڑھنا ہی سو بڑھ گیا۔ اب اگر اِس کے بدلے حکومت عوام سے کچھ وصول کر رہی ہے تو اِس میں غلط کیا ہے؟ ٹرینیں کوئی گھاس تو کھاتی نہیں، ڈیزل پر چلتی ہیں۔ اور اگر گھاس بھی کھاتی ہیں تو کیا گھاس مفت ملتی ہے!

عوام نے کبھی جمہوری حکومتوں کی ''مجبوریوں'' پر بھی غور کرنے کی زحمت گوارا کی ہے؟ بے چاری منتخب حکومتوں کے لیے ذمہ داریاں دو دھاری تلوار کی طرح ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو جمہوریت کو برقرار رکھنا ہوتا ہے اور دوسری طرف، اُس سے کہیں بڑھ کر، خود کو برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اگر حکومت برقرار رہے گی تو جمہوریت بھی برقرار رہ پائے گی! مُرغی ہوگی تو انڈا مل سکے گا نا! یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اِس بیلنسنگ ایکٹ کو دیکھنے اور انجوائے کرنے ہی میں منتخب کی معیاد گزر جاتی ہے۔

جاتی ہوئی حکومتیں اچھا خاصا کچرا جمع کر کے آنے والی حکومت کے لیے چھوڑ

جاتی ہیں۔ آنے والے بے چارے ابھی ٹھیک سے سانس بھی نہیں لے پاتے کہ مطالبات شروع ہوجاتے ہیں۔ عوام کی بے صبری کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ کسی نے چولھے پر ابھی دیگ چڑھائی ہے اور پانی میں صرف چاول ڈالے ہیں اور لوگ چاہتے ہیں کہ دو تین منٹ کے اندر بریانی کو دم دے دیا جائے! جمہوریت کے معاملے میں عوام کا رویہ عصر کے وقت روزہ توڑنے جیسا ہی ہے۔ جس منتخب حکومت نے ابھی دم بھی نہیں لیا ہوتا اُس کا ناک میں دم کرنے کا سلسلہ شروع کردیا جاتا ہے۔ عوام چاہتے ہیں کہ برسوں کا کچرا محض ایک پھیرے میں صاف ہوجائے۔ اب اِتنی بڑی جھاڑو کوئی کہاں سے لائے؟ اور اگر ایسی کوئی جھاڑو مل بھی جائے تو اُسے استعمال کرنے کی سکت کس میں پائی جائے گی؟

مرزا تنقید بیگ کو عوام کی روش ایک آنکھ نہیں بھاتی کہ ابھی کوئی حکومت اپنا سامان سفر کھول ہی رہی ہوتی ہے کہ اُس کا بوریا بستر گول کرنے کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ مصر میں بھی تو یہی ہوا۔ اخوان المسلمون کی حکومت کو محض ایک سال بھی ڈھنگ سے برداشت نہیں کیا گیا جبکہ حسنی مبارک کی آمریت کو تیس سال بخوشی برداشت کیا گیا۔ مسلم لیگ ن کو تیسری بار اقتدار ملا ہے۔ ہیٹ ٹرک ہوئی ہے مگر لوگ اِسے ہٹ ٹرک کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ گزشتہ حکومت نے توانائی کا بحران ترکے

میں چھوڑا ہے۔ یہ بحران موجودہ حکومت کو ناکوں چنے چبوانے کے لیے کافی ہے۔
حکومت کو ریاستی اُمور کی باگ ڈور سنبھالے چھ ماہ گزر چکے ہیں مگر اب تک کسی بھی معاملے کا سہرا اُس کے ہاتھ نہیں آ رہا۔ آئے بھی کیسے؟ جانے والوں نے کوئی کسر چھوڑی ہو تب نا۔ تمام معاملات کو اچھی طرح بگاڑ کر آنے والوں کو تھمایا گیا کہ لو، اب سب کچھ سیدھا کرکے دِکھاؤ!

مرزا کا کہنا ہے کہ مسلم لیگ ن کی تیسری حکومت اب تک سمجھ نہیں پائی ہے کہ معاملات درست کرنے کا سلسلہ کہاں سے شروع کیا جائے۔ ریلوے کا خسارہ سپر سانک طیارے کی رفتار سے پرواز کر رہا ہے۔ ٹرین چلے نہ چلے، خسارے کا میٹر چلتا رہتا ہے۔ نل سے پانی ٹپکے نہ ٹپکے، ہر ماہ بل ضرور ٹپک جاتا ہے۔ بجلی آنے سے انکار کرتی رہتی ہے مگر اُس کا بل آنے سے انکار کرتا ہے نہ جھٹکے دینے سے۔ بجلی کے بل میں ایسے جھٹکے پائے جارہے ہیں کہ بہتوں نے تو برقی آلات کو بجلی کے بل کی مدد سے چلانے پر غور شروع کردیا ہے!

امن و امان کے مسئلے نے قوم کو تو خیر بے امن کیا ہی تھا، حکومت کا بھی چین اور سکون غارت کردیا ہے۔ حد یہ ہے کہ اِس مسئلے کے ٹیڑھے پن کے باعث حکمرانوں کو زیادہ وقت ملک سے باہر گزارنا پڑ رہا ہے!

عوام کی بے صبری ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ وہ راتوں رات تمام مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ دوسری طرف حکمران بھی تو یہی چاہتے ہیں۔ اُن کے اپنے مسائل ہیں جن کے حل کے لیے اُنہوں نے چار پانچ سال انتظار کیا ہوتا ہے۔ یعنی سب کچھ پلک جھپکتے میں پالینے کی خواہش کے معاملے میں عوام اور حکمرانوں کے درمیان مقابلہ رہتا ہے۔ اس مقابلے میں فتح یقیناً حکمرانوں کی ہونی چاہیے۔ اور ہوتی بھی ہے۔ جو اپنے مخالفین کو ہٹانے کے لیے پانچ سال متحرک رہے ہوں وہ اقتدار پانے کے بعد کس طور متحرک رہ سکتے ہیں؟ کیا پانچ سال کی تھکن نہیں اتاریں گے؟ بس، اِتنی سی بات ہے جسے سمجھنے سے عوام قاصر رہتے ہیں! اقتدار کا حصول کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں۔ تھکن سے چُور چُور کردینے والے اِس کھیل میں حصہ لینے والوں کو سُکون کا سانس لینے کا موقع ضرور دیا جانا چاہیے۔

اب ایک بار پھر یہی ہو رہا ہے۔ جو لوگ پانچ سال سے اپنی باری کے منتظر تھے اُنہیں ذرا ذرا سی بات پر پریشان اور بدنام کیا جارہا ہے۔ کبھی ڈرون حملوں کا معاملہ اُٹھانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ کبھی نیٹو سپلائی روک کر واحد سُپر پاور سے ایک کمزور ملک کی قابلِ رحم حکومت کا ناطقہ بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مسلم لیگ ن کا سَر توانائی کے بحران کی اوکھلی میں دے کر اُس پر مُوصلی برسانے کی تیاری کی جارہی ہے۔ یہ تو عوامی دھاندلی ہے۔ اُنہیں

آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ع

ابھی آئے، ابھی بیٹھے، ابھی دامن سنبھالا ہے

ہر نئی جمہوری حکومت کے ساتھ عوام کا وہی برتاؤ ہوتا ہے جو وہ قربانی کے جانور سے روا رکھتے ہیں۔ کچھ دن چارا ڈالتے ہیں، جانور کو گھماتے پھراتے ہیں، ناز اٹھاتے ہیں۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پچھاڑ کر ذبح کرنے لگتے ہیں! جمہور ذرا سوچیں۔ اگر جمہوریت کے نام پر اُن کا یہی چلن برقرار رہا تو کون آئے گا!

کرکٹ اور کُوڑا کرکٹ

جہاں دانش وری کے نام پر صرف بَک بَک ہوتی ہو، علم کے نام پر بڑھکیں مارنے اور شعبدے دکھانے کا سلسلہ جاری رکھا جاتا ہو، کام کے نام پر صرف بے عملی کو رواج دیا گیا ہو، اداکاری کے نام پر بھونڈی حرکتیں پنپ رہی ہوں اور اپنائیت کے نام پر صرف چاپلوسی کو بڑھاوا مل رہا ہو وہاں اگر کھیلوں کے فروغ کے نام پر کھیلوں ہی سے کھلواڑ کی جارہی ہے تو حیرت کیوں ہو؟

کرکٹ نے عجب رنگ پکڑا ہے۔ محتاج اب وکٹ کی ہے نہ گراؤنڈ کی۔ جب کرکٹ نئی ہے تو گراؤنڈ نئے کیوں نہ ہوں؟ اور وکٹ میں بھی انفرادیت ہونی ہی چاہیے سو ہے۔ جنوبی افریقا کے دورے سے واپسی پر طیارے کی لینڈنگ کے ساتھ ہی شاہد آفریدی کے صبر کا تحمل کا طیارہ ٹیک آف کرگیا۔ فائر برانڈ شاہد آفریدی نے ایسی ''خوبیٔ گفتار'' کا مظاہرہ کیا کہ لوگ انگشت بہ دنداں رہ گئے۔ جو چوکے اور چھکے اُن کا بلّا نہ اُگل سکا وہ اُن کی زبان نے لگائے۔ شاہد آفریدی کو جو

غُصّہ جنوبی افریقا کے میدانوں میں میزبان ٹیم کے پَلّے بازوں اور گیند بازوں پر اُتارنا تھا وہ اُنھوں نے اپنے اُن سابق ساتھیوں پر اُتار دیا جو کرکٹ سے سُبک دوش ہونے پر خاصی سُبک سَری سے موجودہ کرکٹرز کی کارکردگی کے گلے پر تبصرے کی چُھری پھیرتے ہیں۔ میڈیا سے گفتگو میں شاہد آفریدی نے ''مسٹر بین'' اور ''ہیکل اینڈ جیکل'' کو سیدھا کرنے کے لیے آڑے ہاتھوں لیا اور جم کر ''سُنگلیاں'' کرائیں۔

کسی زمانے میں (ہمیں تو خیر ٹھیک سے یاد بھی نہیں کہ کب) کرکٹ کو شرفاء کا کھیل کہا جاتا تھا۔ کرکٹ کے حوالے سے ایسی کوئی بھی بات سُن کر فی زمانہ صرف ہنسا جاسکتا ہے۔ کرکٹ اگر شرفاء کا کھیل ہے تو پھر اصولی بات یہ ہے کہ کرکٹ کے کسی بھی مقابلے کے لیے میدان میں اُترنے والے ایک دوسرے سے بھائیوں جیسا برتاؤ کریں۔ خیر سے موجودہ اور سابق تمام ہی ٹائپ کے کرکٹرز اب ایک دوسرے کے لیے ''بھائی'' ہیں ! کسی معاملے پر اختلاف ہو تو ''مکالمے'' سُن کر ایسا لگتا ہے کہ انڈر ورلڈ کے گینگ آپس میں دست و گریباں ہیں!

بُوم بُوم آفریدی نے ناقدین کو آڑے ہاتھوں لیا اور ایئر پورٹ کے لاؤنج ہی میں میدان سجالیا۔ مسافروں اور اُنہیں چھوڑنے یا لینے کے لیے آنے والوں کی تو چاندی ہوگئی۔ کرکٹ کا سُپر اسٹار دیکھنے کو ملا اور وہ بھی ''فاسٹ اینڈ

فیوریس'' حالت میں ! ایسی حالت میں آٹو گراف سے زیادہ آڈیو گراف مزا دیتا ہے۔
میڈیا سے گفتگو کے دوران جو چٹخارا شاہد آفریدی کی باتوں میں لوگوں کو ملا وہ تو اُن کے نام سے قائم ریسٹورنٹ کے کھانوں میں بھی نہیں ملتا! اگر وطن واپسی پر قومی کرکٹرز کچھ ایسے ہی اطوار کا مظاہرہ کرتے رہے تو اُن کی واپسی پر تماشائیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جایا کریں گے۔ کون بے وقوف ہوگا جو مُفت میں ملنے والے ایسے تماشے سے محروم رہنا پسند کرے!
کیمرے کے سامنے شاہد آفریدی کے آنے کی دیر تھی کہ سکندر بخت، شعیب اختر اور محمد یوسف نے بھی مورچہ سنبھال لیا۔ ٹی وی اسکرین جنگ کے میدان میں تبدیل ہوئی۔ اور اِس کے بعد وہ گھمسان کا رن پڑا کہ الحفیظ و الامان۔
اللہ شعیب اختر کی عمر دراز کرے۔ آج کل وہ شائقین اور ناظرین کو ایسی تفریح فراہم کر رہے ہیں کہ حاسدوں کی بُری نظر سے بچانے کے لیے اُن کے بازو پر سیاہ پٹی باندھنے کو جی چاہتا ہے! ویسے ہمیں یا اُنہیں سیاہ پٹی کی تلاش میں زیادہ دُور نہیں جانا پڑے گا۔ تبصرے کے نام پر شعیب اختر جن کی کھنچائی کرتے ہیں وہ احتجاجاً جو (نادیدہ) سیاہ پٹیاں بازوؤں پر باندھتے ہیں اُنہی سے نظر بٹّو کا کام بھی لیا جاسکتا ہے! ہم (اور یقیناً آپ بھی) اب تک یہ سمجھ نہیں پائے کہ شعیب اختر ٹی وی پر مُبصر کی حیثیت سے کام کرنے سے قبل

غلط فیلڈ میں چلے گئے تھے یا یہ سلیکٹرز کی نااہلی تھی کہ مُنہ کے مہار تھی کو گیند کی دنیا کا طالع آزما بنا ڈالا تھا! ہمیں تو لگتا ہے بہت سے کرکٹرز اِس وقت غلط شعبے میں صلاحیتیں ضائع کر رہے ہیں! وہ جلد از جلد تبصرے اور ماہرانہ رائے کے میدان میں آجائیں، اُنہیں کچھ نہیں کہا جائے گا!

شعیب اختر جس دل جمعی سے تبصرے فرما رہے ہیں اگر ویسی ہی استقامت اُنہوں نے کرکٹ کے میدانوں میں دکھائی ہوتی تو آج کرکٹ میں بھی اُن کا کچھ نہ کچھ مقام ضرور ہوتا۔ گیند وہ بہت تیز کراتے تھے۔ مگر پھر بھی کچھ رفتار بچا کر رکھی تھی جو اب تبصروں میں کام آرہی ہے! امریکی بھی سوچتے ہوں گے کہ کاش یہ پُھرتی اُن کے پاس ہوتی تو آج افغانستان سے انخلاء میں کام آتی!

شعیب اختر نے شاہد آفریدی کی گگلی کے جواب میں باؤنسر پھینکتے ہوئے کہا۔ ''وہ اب تک بڑا نہیں ہوا۔ جاہل اور پڑھے لکھے میں یہی فرق ہوتا ہے۔ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ شاہد آفریدی کی اوقات کیا ہے۔'' ٹی وی اسکرین پر ''بے امنی کی آشا'' کو جلوہ افروز دیکھ کر ناظرین بے چارے ''سَنکٹ'' میں پڑگئے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ جاہل کون ہے!

محمد یوسف نے کہا قوم چاہتی ہے شاہد آفریدی اب یہ طے کرلیں کہ زبان سے

کھیلیں گے یا بلّے سے ! اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ شاہد آفریدی اب تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ اُنہیں کرنا کیا ہے اور یہ کہ ابھی اُنہیں بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے خیال میں محمد یوسف کی رائے بعد از وقت ہے۔ شاہد آفریدی کرکٹ کے ساتھ اور بہت کچھ سیکھ چکے ہیں جبھی تو ٹیم میں ہیں ! بیٹنگ میں نہیں چلتے تو بولنگ میں کچھ نہ کچھ کر دکھاتے ہیں۔ کبھی بولنگ میں فیل ہوئے تو تھوڑا بہت اسکور کر جاتے ہیں۔ اور فیلڈنگ تو معیاری ہے ہی۔ ہم نہیں چاہتے کہ محمد یوسف کا مشورہ مان کر شاہد آفریدی اوور لرننگ'' کے مرحلے سے گزریں ! کوچز کو شکایت رہی ہے کہ شاہد آفریدی اُن'' کی بات نہیں مانتے۔ کوچز اُنہیں سمجھنے میں غلطی کرتے رہے ہیں۔ بات صرف اِتنی ہے !کہ اُنہوں نے خود کو ہر مقام پر کھرا اور سچا آفریدی ثابت کیا ہے

بہت سے شائقین یہ سوچ کر خوش ہیں کہ کرکٹ میں تو اب مزا نہیں رہا۔ اچھا ہے کرکٹرز آپس میں کچھ مُنہ کی لڑائی لڑ لیا کریں اور ہمارا بھلا ہوتا رہے ! تبصروں میں ایک دوسرے پر چپکائے جانے والے جملوں میں کرکٹ کا پورا مزا موجود ہے۔ مُنہ سے چھکا مارا جائے تو گیند بالعموم انکلوژر سے بھی باہر جا گرتی ہے۔ لوگوں کو تو محظوظ ہونے کا موقع چاہیے۔ اسٹیڈیم کی وکٹ نہ سہی، اسٹوڈیو کی پچ سہی۔

یاروں نے کمال کر دکھایا ہے۔ کرکٹ بھی مزے کی ہوتی ہوگی۔ مگر اِس کا پتا تو اُس وقت چلے جب ہم کرکٹ دیکھیں۔ اب تو لوگوں کو تبصروں اور جائزوں میں زیادہ لطف محسوس ہونے لگا ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ کرکٹ سے زیادہ محنت اب تبصروں پر کی جارہی ہے۔ کرکٹ کے معاملے میں اب سفر اِتنا دلچسپ ہے کہ لوگ منزل کو بھول گئے ہیں! جو لوگ کسی زمانے میں اسٹیڈیم میں میچ دیکھتے ہوئے آپس کے جملوں سے محظوظ ہوا کرتے تھے وہ اب کرکٹ میچ کی لائیو کوریج کے دوران کرکٹ کے.بزرجمہروں کی جملے بازی سے زیادہ محظوظ ہوتے ہیں۔

دُکھ اگر ہے تو صرف اس بات کا کہ اس پورے قضیے میں سکندر بخت جیسا شریف النفس، کم آمیز اور خوش گفتار انسان بھی داؤ پر لگ گیا! مگر خیر ع

اِس طرح تو ہوتا ہے اِس طرح کے کاموں میں!

یومیہ تفریحی سفر

نیشنل جیوگرافک والوں کو اب تک خیال نہیں آیا کہ دُنیا بھر کی مُہم جوئی فلمانے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں روزانہ کام پر جانے کی مشقت بھی فلمالیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم علی الصباح جس طور گاڑیوں میں اور گاڑیوں پر سوار ہو کر کام پر جاتے ہیں اُس کے تفصیلی مناظر دُنیا والے دیکھ لیں تو اپنی ہر طرح کی مہم جوئی پر شرمندہ ہوں !

پاکستانیوں کو روزانہ صبح بیدار ہونے پر کام کرنے سے زیادہ کام پر جانے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ روزگار کا حصول تو جاں گُسل معاملہ ہے ہی، روزانہ روزگار کے مقام تک جانا بھی کچھ کم جاں سوز مرحلہ نہیں !

صبح کے اوقات میں پبلک ٹرانسپورٹ کی گاڑیوں میں سوار ہونے کی مشقت دیکھ کر خیال آتا ہے کہ شیریں کے لیے دودھ کی نہر کھودنے میں فرہاد نے کتنی محنت کی ہوگی ! مگر صاحب، فرہاد کا ہم سے کیا مقابلہ ؟ وہ کون سا روز روز دودھ کی نہر کھودتا تھا؟ اگر فرہاد مسافروں کو گاڑی میں ٹھونسے جانے کا منظر دیکھتا تو عشق کا بھوت سَر سے اُتر جاتا اور وہ کدال پھینک کر بھاگ کھڑا ہوتا !

جب بڑی بسوں، ویگنوں اور کوچوں میں مسافروں کو ٹھونسنے کی بھی گنجائش نہ رہی تو مارکیٹ میں چنگچی رکشے متعارف کرائے گئے۔ ابتداء میں لوگ یہ سمجھے کہ شاید شہر میں کوئی بڑی سرکس کمپنی آئی ہے اور مختلف مقامات پر اِس موٹر سائیکل نما گاڑی کے ذریعے کرتب دکھا رہی ہے! جب یہ بھید کھلا کہ یہ کوئی سرکس کا آئٹم نہیں تب وہ لپکے کہ ''ٹیکنالوجی'' کے اِس شاہکار سے مستفید اور محظوظ ہوں۔ دیو مالائی داستانوں میں ایسے جانداروں کا ذکر ملتا ہے جن کا بالائی دھڑ انسان کا اور زیریں دھڑ حیوان کا ہوا کرتا تھا۔ چنگچی کو دیکھ کر دیو مالائی داستانیں ذہن میں کوندنے لگتی ہیں۔ آگے سے موٹر سائیکل اور پیچھے سے ٹانگہ۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے! لوگ رکشا یا ٹانگہ سمجھ کر بیٹھتے ہیں اور ڈرائیور موٹر سائیکل سمجھ کر چلاتے ہیں!

ابتداء میں لوگوں نے اِس یکتائے زمانہ گاڑی کو فاصلہ مٹانے کے لیے کم اور تفریحِ طبع کے لیے زیادہ استعمال کیا۔ گاڑی میں جُھولے کا مزا کہاں ملتا ہے؟ اور جُھولے سے بھی بڑھ کر مہم جوئی کا لطف! چنگچی رکشا کبھی کشتی کے ہچکولوں سے روشناس کراتا ہے اور کبھی ٹانگے کا مزا دیتا ہے۔ زیادہ مُوڈ میں ہو تو رولر کوسٹر بننے میں بھی دیر نہیں لگاتا اور پھر پلک جھپکتے میں سڑک پلے لینڈ بن جاتی ہے!

کا تصور چنگچی کو دیکھنے کے بعد ذہنوں میں اُبھرا ہوگا۔ ایک multi-tasking لگتا ہے ڈش میں سو کھانوں کا مزا! چنگچی رکشے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ توفیق دے تو انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اور کر گزرتا ہے۔ چنگچی کی ننھی سی جان اور اُس پر بارہ پندرہ افراد کا بوجھ۔ چار پانچ پچھلی سیٹ پر، تین چار اگلی پر۔ دو ڈرائیور کے پیچھے۔ ڈرائیور ٹنکی پر اور ایک آدھ بچہ ہینڈل پر! ابھی گنتی ختم نہیں ہوئی۔ دو تین چھت پر بھی جلوہ افروز ہوتے ہیں! ع

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا!

اچھا ہے دُنیا والوں کو یہ تماشا دکھایا جائے تاکہ وہ بھی مان لیں کہ پاکستانی کچھ بھی کر سکتے ہیں! اب بھی آپ کو یقین نہیں آیا کہ ایک چنگچی پر اِتنے افراد سوار ہو سکتے ہیں؟ کیا آپ کو یاد نہیں کہ ایک چنگچی ٹرین کی زد میں آیا تو ڈرائیور سمیت 14 افراد دریائے زندگی کے اُس پار اُتر گئے!

کبھی کبھی یہ تماشا بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ پچھلے حصے میں زیادہ لوگ سوار ہو جائیں تو چنگچی رکشا مشتعل گھوڑے کی طرف پچھلے پہیوں پر کھڑا ہو جاتا ہے! یہی منظر سفر کے دوران پٹرول ختم ہو جانے پر بھی دِکھائی دیتا ہے۔ ٹنکی کے اگلے حصے سے پٹرول پچھے حصے میں لانے کے لیے تمام سواریوں کو سڑک پر کھڑا

کرکے ڈرائیور چنگچی کے پچھلے حصے کو جُھکاتا ہے اور مسافر حیرت کی تصویر بنے ڈرائیور کو تکنے لگتے ہیں!

کچھ مدت تک تو چنگچی کا کامیڈی سرکس چلتا رہا۔ پھر لوگوں کو خیال آیا کہ سفر کے نام پر موج مستی کب تک؟ کچھ سنجیدگی بھی اختیار کی جائے۔ یوں سی این جی رکشوں کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

سی این جی رکشوں میں زیادہ مسافروں کو قدرے سہولت سے بٹھانے کی گنجائش ہوتی ہے اور یہ زیادہ محفوظ بھی ہے۔ اِن رکشوں کو دیکھ کر ٹیکنالوجی میں پیش رفت کی تیزی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب آمدنی بڑھتی دکھائی دی تو مارکیٹ میں سی این جی رکشوں کے نئے ورژن آنے لگے۔ اب 9 نشستوں والے سی این جی رکشے عام ہیں جو بس کی طرح چلائے جارہے ہیں۔ شُنید ہے کہ 12 نشستوں والے سی این جی رکشے بھی جلد متعارف کرائے جانے والے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے سی این جی ٹرین تک نہ جا پہنچے!

سی این جی رکشے بھی وکھری مخلوق ہیں۔پُرانے ٹو اسٹروک انجن کے رکشوں کو سڑک کی فضا میں طیاروں کی طرح اُڑایا جاتا تھا۔ مسافر اُس میں دو یا تین ہوا کرتے تھے اِس لیے ایسا کرنا ممکن تھا۔ سی این جی رکشوں کے ڈرائیورز کو داد دینی پڑے گی کہ بارہ پندرہ بندے بٹھاکر بھی ہوا سے باتیں کرنے کی کوشش

کرتے ہیں! بھائی شہاب بھی اپنے سی این جی رکشا کو شہابِ ثاقب کی طرح چلاتے ہیں۔ کوئی پوچھ بیٹھے کہ ہوا سے کون سی باتیں کرتے ہو تو اُن کا جواب چند ایسے الفاظ میں لپٹا ہوا ہوتا ہے جنہیں خوفِ فسادِ خلق کے باعث یہاں نقل نہیں کیا جاسکتا!

گاڑیاں رنگ اور ہیئت بدل رہی ہیں مگر مسافروں کا مقدر اب تک نہیں بدلا۔ سفر کرنے والوں کو بڑی بسوں، ویگنوں اور کوچوں میں بھی ٹھونسا جاتا تھا اور سی این جی رکشوں میں ٹھونسنے ہی کی کوشش کی جاتی ہے۔ شاید اِس لیے کہ سی این جی بھی ٹُھنسی ہوئی گیس ہی تو ہوتی ہے!

مُلک بھیڑ چال کے اُصول کے تحت جی رہا ہے۔ چند افراد جس چیز کو اپناتے ہیں سب اُسے اپنانے لگتے ہیں۔ چنگچی مقبول ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے وباء کی شکل اختیار کرگیا۔ یہی حال سی این جی رکشوں کا ہے جن کی تعداد سائنس فکشن فلموں میں پائی جانے والی اِنسان دُشمن مخلوق کی طرح بڑھتی ہی جارہی ہے۔ اب فضا میں آکسیجن کم اور سڑکوں پر سی این جی رکشے زیادہ ہیں! ذرا زور سے سانس لیجیے تو کہیں سے کوئی سی این جی رکشا کھنچتا ہوا آجائے گا۔

سی این جی رکشوں کی خاص بات یہ ہے کہ اِس میں ڈرائیور اپنے دائیں اور بائیں

طرف ایک ایک سواری بٹھا سکتا ہے۔ بس، یہی سہولت فساد کی جڑ ہے۔ اگر پچھلی نشست پر دو افراد بیٹھے ہیں اور کوئی خاتون سوار ہونا چاہیں تو اُن دونوں مَردوں کو ڈرائیور کا ہم نشیں ہونا پڑے گا! اور خاتون کے اُترنے پر دونوں کو دوبارہ پچھلی نشست پر بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک دو اسٹاپ کے بعد پھر یہی تماشا ہوتا ہے۔ نصف سفر تو اِسی نشست و برخاست میں کٹ جاتا ہے۔ اور اگر کوئی خواتین کے لیے پچھلی نشست خالی کرنے سے انکار کردے تو سمجھ لیجیے سڑک کر تھیٹر سج گیا! پھر مسافروں اور ڈرائیور کے درمیان رُونما ہونے والا ڈراما لوگ رک رک کر، مڑمڑ کر دیکھتے ہیں!

مسافروں کو دبوچنے کے لیے رکشا ڈرائیورز کے درمیان جو کشمکش ہوتی ہے وہ کبھی کبھی انڈر ورلڈ والوں کے تصادم کا مزا دیتی ہے۔ دس پندرہ روپے کے مسافر کے لیے ڈرائیورز دنگل کا ماحول پیدا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بسا اوقات سوال دس پندرہ روپے کے مسافر کا نہیں، انا کا ہوتا ہے۔ مسافر کو کوئی اور کیوں اور کیسے لے اُڑے؟ اسٹاپ پر ایک شخص کھڑا ہو اور تین رکشے آکر رکیں تو بے چارا مسافر تماشا بن جاتا ہے! سب اُسے ہتھیانے کے لیے لپکتے ہیں۔ ایسی کشمکش تو کسی حسینہ کے لیے اُس کے جاں نثاروں میں بھی نہیں ہوا کرتی!

...ہزاروں خواہشیں ایسی

پاکستان میں کسی بھی حوالے سے پورے یقین کے ساتھ کچھ کہنا انتہائی دشوار ہے مگر اس معاملے میں مرزا تنقید بیگ نے ہماری مشکل بہت حد تک آسان کر دی ہے۔ کم از کم ایک بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے ..... یہ کہ جب بھی ملیے، مرزا حالات اور لوگوں سے نالاں ہی ملیں گے۔

کل بھی یہی ہوا۔ ہم خاصے طویل بریک کے بعد اُن سے ملنے گئے تاکہ ان کے خیالات میں تھوڑی بہت تبدیلی کی راہ تو ہموار ہو اور کچھ فرق دیکھنے کو ملے۔ مگر مرزا بھی تو اِسی معاشرے کے پروردہ ہیں، کیوں اور کیونکر بدلیں گے! جس وقت ہم اُن کی بیٹھک میں پہنچے، اُن کا ذہن اچھی خاصی اٹھک بیٹھک کی حالت میں تھا۔

مرزا سے کسی بھی معاملے میں اُن کی پریشانی کا سبب معلوم کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے اور اپنی قوتِ برداشت کی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ وہ بات بات پر ایسے ڈنک مارتے ہیں کہ کم ہی لوگ تاب لا پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ مرزا جب زورِ کلام دکھانے پر کمربستہ ہوں تو انہیں لگام دینا محض

خواب و خیال کا معاملہ معلوم ہوتا ہے! ہم نے جب بھی ایسی کوئی کوشش کی ہے، اُن کی منہ زوری کے ہاتھوں مُنہ کی کھائی ہے۔

کون سا معاملہ ہے جس سے مرزا نالاں نہیں؟ کون سی چیز ہے جو مرزا کو پیہم، دم بہ دم پریشان نہیں رکھتی؟ کبھی کبھی تو مرزا کا موازنہ حکمرانوں سے کرکے حیرت ہوتی ہے کہ جنہیں ملک اور معاشرے کی فکر لاحق ہونی چاہیے وہ تو مزے میں ہیں اور مرزا ہیں کہ قاضی کی طرح سو اندیشوں میں دُبلے ہوئے جا رہے ہیں۔ حالات کے ہاتھوں مرزا پر دُبلا پن اس تیزی سے سوار ہو رہا ہے کہ دو چار برس وہ بغور دیکھنے پر دکھائی دے سکیں گے!

مرزا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اُس آوے کو درست دیکھنے کے خواہش مند ہیں جسے بڑی مشکل سے بگاڑا گیا ہے! اُن کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ جتنی محنت معاملات کو بگاڑنے پر کی گئی ہے، اتنی محنت اگر معاملات کو درست کرنے پر کی گئی ہوتی تو آج سب کچھ درست ہوتا۔ ہم نے اُنہیں بارہا یہ سمجھانے کی (ظاہر ہے ناکام!) کوشش کی ہے کہ معاملات کو درست کرنے کے لیے پہلے اُنہیں بگاڑنا پڑتا ہے!

مرزا چاہتے ہیں کہ کرکٹ کے میدان میں کرکٹ کھیلی جائے' سیاست کے نام پر

جیبیں اور تجوریاں نہ بھری جائیں۔ اُن کی ایک تمنا یہ بھی ہے کہ میڈیا حقائق بیان کرے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ لوگ سچ بولیں، حرام و حلال میں تمیز کا شعور پیدا کریں اور ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکے ڈالنا چھوڑ دیں۔ ہم بارہا دیوار سے سر پھوڑ چکے ہیں یعنی اُنہیں سمجھانے کی ان گنت کوششیں کر چکے ہیں کہ سب کچھ درست ہو جانے سے تو معاملات مزید اُلجھ اور بگڑ جائیں گے! جہاں سب کچھ اُلٹ پلٹ چکا ہو وہاں اچانک بہت کچھ درست ہو جانے سے لوگ حواس باختہ ہو جاتے ہیں! مرزا خیالی جنت میں رہتے ہیں۔ سادہ لوحی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ چاہتے ہیں کہ کوئی معاملہ خرابی کی حالت میں نہ رہے، درستی کی راہ پر گامزن ہو۔ ایسی کیفیت کے مُضمرات پر اُن کی نظر کبھی نہیں گئی!

سیاست اگر وہ نہ رہے جو کہ وہ ہے تو کیا ہو؟ سارا لطف ہی غارت ہو کر رہ جائے۔ ذرا سوچیے کہ ہماری سیاست سنجیدہ ہو کر کتنی بھونڈی اور پھیکی لگے گی۔ ایسے سیاسی جلسے کس کام کے جن میں نعرے اور بڑھکیں نہ ہوں؟ سیاسی رہنماؤں کی ایسی تقاریر کیا خاک مزا دیں گی جن میں ایک دوسرے پر کیچڑ نہ اُچھالا گیا ہو؟ سیاسی جلوسوں کا کیا مزا اگر اُن میں میلوں کا ماحول نہ پایا جائے؟ کبھی آپ نے کسی ایسی پریس کانفرنس کا تصور کیا ہے جس میں کسی پر تنقید نہ کی گئی ہو، کسی کو نیچا دکھانے اور بے لباس کرنے کی کوشش نہ کی

گئی ہو؟ آپ کا جواب نفی میں ہوگا اور ہونا بھی چاہیے۔

ذرا سوچیے، اگر میڈیا پر سب کچھ سچ سچ بیان کیا جانے لگے تو؟ لینے کے دینے پڑ جائیں گے! جن لوگوں کو مسالے دار جھوٹ میں لطف محسوس ہونے لگا ہے وہ بھلا اِس چٹخارے سے کیوں محروم ہونا چاہیں گے؟ ایک زمانہ تھا جب جھوٹ بُرا لگتا تھا۔ اب تو یہ انجوائے کرنے کا معاملہ ہے! کون ہے جو یہ مزا ترک کرنے پر آمادہ ہوگا؟ اور یہ بھی سوچیے کہ لوگ جھوٹ کی تاب مشکل سے لا پاتے ہیں تو سچ کو کس طور جھیلیں گے؟

مرزا کی خواہش ہے کہ کھیل کو کھیل رہنے دیا جائے، سیاست اور مادی مسابقت و منفعت کا میدان نہ بنایا جائے۔ مگر افسوس کہ یہ معاملہ بھی اب اُن کی سادہ مزاجی سے بہت آگے جا چکا ہے۔ کھیلوں کی دنیا میں اِتنی دنیائیں بس گئی ہیں کہ انہیں اُجاڑا نہیں جا سکتا۔ ایک آوے کو درست کرنے کی کوشش میں کئی آوے ایسے بگڑیں گے کہ پھر قابو میں نہ آئیں گے۔ وہ زمانہ بھی اب لد گیا ہے جب لوگ کھیلوں سے کھیلوں ہی کا مزا پایا کرتے تھے۔ آج ہر کھیل کئی کھیلوں کا مجموعہ ہے بلکہ کھلواڑ کا ڈھیر ہے! کرکٹ ہی کو لیجیے۔ اس ایک کھیل نے خدا جانے کتنے میدانوں میں عجب طرز کے مقابلوں کو جنم دیا ہے۔ بہت سے حسابات کرکٹ پر رائے زنی کی آڑ میں بے باق کئے جا رہے ہیں اور مرزا ہیں کہ کرکٹ کی

اصلیت بحال کرکے کئی کھیلوں کی راہ مسدود کرنے پر تُلے ہیں۔

مرزا کی خواہش ہے کہ ملک سے کرپشن کا خاتمہ ہو۔ اب آپ ہی بتایئے کہ کرپشن نہ رہی تو کیا کیا نہ رہے گا۔ بہت سے دھندے چل ہی کرپشن کے بل پر رہے ہیں۔ اس ایک چراغ سے سو چراغ جلے ہیں! اِدھر کرپشن کا سوئچ آف ہوا اور اُدھر بہت سے معاملات کا بریک ڈاؤن شروع ہو جائے گا۔ کرپشن ہے تو کئی میلوں کی ''رونق'' ہے! اور مرزا ہیں کہ اِس شغل میلے کی جان کے در پے ہیں۔

پاکستانی معاشرے کی ساخت اب کچھ ایسی ہے کہ ہر سیدھی چیز الٹی نظر آتی ہے۔ نیکی کیجیے تو لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کسی کی مدد کا قصد کیجیے تو کئی ذہنوں میں شبہات جنم لیتے ہیں۔ کسی معاملے کو درست کرنے کی کوشش کیجیے تو لوگ حیرت کی تصویر بن کر دیکھتے ہیں اور کیوں نہ دیکھیں کہ اب درستی کی راہ پر گامزن ہونا لوگوں کو حیرت میں مبتلا کرنے کے لیے انتہائی کافی ہے!

ہم تو اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ مرزا جیسے لوگوں کی خواہشیں پوری نہیں ہوتیں اور معاملات درست نہیں ہوتے۔ ورنہ خدا جانے کیا ہو۔ پھر تو اپنے ہی معاشرے اور ماحول کو پہچاننا مشکل ہو جائے! پھر کیفیت یہ ہو کہ ع

پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
مرزا ہر معاملے کو درست دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس ایک خواہش میں ان گنت خواہشیں چھپی ہوئی ہیں، بسی ہوئی ہیں۔ اور خواہشیں بھی ایسی کہ ہر خواہش پر معاشرے کا) دم نکلے ! ہمیں یقین ہے کہ تمام خواہشیں پوری ہونے پر بھی مرزا یہی) کہیں گے ع
! بہت نکلے مِرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ولولہ توخوب ہے، مگر

کہتے ہیں جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ سچ یہ ہے کہ وہ تو لاہور دیکھنے کے بعد بھی پیدا نہیں ہوا جس نے واہگہ بارڈر پر مغرب سے قبل قومی پرچم اتارنے کی تقریب نہیں دیکھی !

لاہور کے قلب سے واہگہ بارڈر تک کا سفر طویل ہے اور تھکا دینے والا بھی۔ مگر خیر، تھکن برائے نام بھی یاد نہیں رہتی جب رینجرز کے جوان بھارت کی بارڈر سیکیورٹی فورس کے اہلکاروں کے مقابل نظم و ضبط اور پیشہ ورانہ مہارات کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ تھکن کے چند لمحات کے بعد بھرپور جوش و خروش اور حب الوطنی کے انتہائی پر کیف لمحات وارد ہوتے ہیں جو رگ وپے میں سما جاتے ہیں، سرایت کرجاتے ہیں۔
واہگہ بارڈر پہنچنے کے بعد پہلا مرحلہ ہوتا ہے تمام وزٹرز کو قطار بند ہونے کا۔ یعنی ع
''مطلع'' میں آ پڑی ہے سُخن گسترانہ بات !

منظر یہ ہوتا ہے کہ لوگ آتے جاتے ہیں اور اپنے وضع کردہ نظام کے تحت جمع

ہوتے جاتے ہیں! یعنی یہ کہ لاکھ ہدایات جاری کیجیے، انتباہ بھی کیجیے مگر اُنہیں قطار نام کی کسی چیز سے روشناس نہیں ہونا! ہمیں تو ایسا محسوس ہوا جیسے لوگ یہ سوچ کر خوفزدہ ہوں کہ اگر قطار میں سلیقے سے کھڑے ہوگئے تو کہیں حکام اور اہلکار اُنہیں پاکستانی تسلیم کرنے سے اِنکار نہ کردیں!

جب ہم اہل خانہ کے ساتھ داخلی دروازے کے نزدیک پہنچے تو حیرانی ہوئی کہ یہ قوم اچانک اِس قدر منظم کیسے ہوگئی کہ ایک نہیں، تین تین قطاریں بنائے کھڑی ہے! رینجر اہلکار کی جُھنجھلاہٹ سے یہ عُقدہ کُھلا کہ دس بار کہنے پر بھی لوگ ایک قطار میں کھڑے نہیں ہو رہے! اب منظر یہ تھا کہ ہر قطار کے لوگ اپنے آپ کو "جائز" قطار میں کھڑا ہوا سمجھ رہے تھے! یہ ہیں پاکستانی جو اگر اپنی ضد پر آئیں تو ایک کی جگہ تین قطاریں بنائیں اور ہر قطار کو درست قرار دینے پر تُل جائیں!

قصہ مختصر، قطار کا مرحلہ زار و قطار کا مرحلہ ثابت ہوا! ضمیر جعفری مرحوم نے کہا تھا ۔

شہر میں پٹناٹی وی کی تقریب کے دعوت ناموں کا
منظر تھا راشن ڈپو پر پبلک کے ہنگاموں کا!

ایسا ہی منظر، بلکہ مناظر ہمیں واہگہ بارڈر کے باہر کی سڑک پر بھی دکھائی دیئے۔ جب دروازہ کھلا تو ایسی دھکم پیل شروع ہوئی کہ ع

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے!

یہ کچھ کچھ ''من تو شُدم، تو من شُدی'' والا معاملہ تھا۔ آن کی آن میں منظر ایسا بدلا کہ پھر کوئی قطار تھی نہ کوئی قطار نواز!

سیکیورٹی اہلکار بھی تھک ہار کر چُپ ہو گئے۔ جو تھوڑی بہت اُلجھن قطار کے مرحلے میں محسوس ہوئی تھی اُس کا ازالہ اُس بھرپور ماحول نے کر دیا جو واہگہ بارڈر پر قومی پرچم اُتارنے کی تقریب کے لیے پیدا کیا جا رہا تھا۔ اللہ اکبر کے نعرے اور پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الااللہ کی للکار، یہ سب کچھ وہاں موجود تمام لوگوں کو کسی اور دُنیا کی سیر کراتا ہے۔ تقریب کے لیے تیار کیے جانے والے ماحول میں ہر فرق یکسر مٹ کر رہ جاتا ہے۔ تمام حاضرین ایک رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ کہاں تو عالم یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایک صف میں کھڑے ہونے کو تیار نہیں ہوتے اور کہاں یہ کیفیت کہ سب ایک ہی صف میں دکھائی دیتے ہیں۔ جو ایک قطار میں کھڑے ہونے سے انکاری رہے ہوں وہ شیر و شکر ہو چکے ہوتے ہیں۔ تقریب کے آغاز کا وقت جُوں جُوں قریب آتا جاتا ہے، حاضرین پر چڑھنے والا حب الوطنی کا رنگ گہرا اور پکا ہوتا جاتا ہے۔

حاضرین کی آتش شوق بھڑکانے کے لیے عمران پاکستانی پورے طمطراق کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ پھیپھڑوں کی ساری قوت صرف کرکے وہ حاضرین کو مہمیز دیتے رہتے ہیں۔ ایک مرحلے پر عمران پاکستانی نے یہ کہتے ہوئے بھی حاضرین کو جوش دلانے کی کوشش کی کہ شور اُسی طرح مچایئے جس طرح اسکول کے زمانے میں کلاس روم سے ٹیچر کے نکل جانے پر مچایا کرتے تھے! حاضرین بھی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتے کہ اگر اُنہوں نے بھرپور نعرے لگانے میں ذرا سی بھی کنجوسی دکھائی تو زندگی میں کوئی کمی سی رہ جائے گی اور اپنے آپ سے نظر نہیں ملا سکیں گے!

نعروں کی گونج کے ساتھ ہی ڈھول کی تھاپ سے حاضرین کا جوش و خروش لمحہ لمحہ یوں بڑھتا ہے کہ دل جُھومنے لگتا ہے اور ہونٹوں پر قومی نغموں کے بول رقصاں رہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ یہ عالم، یہ سماں برقرار رہے۔ شعیب منصور بروقت یاد آئے ۔

ایسی زمیں اور آسماں، اِن کے سِوا جانا کہاں

بڑھتی رہے یہ روشنی، چلتا رہے یہ کارواں

واہگہ بارڈر کی یومیہ تقریب پاکستان اور بھارت کے درمیان فوجی سطح کی واحد

تقریب ہے جسے عوام بھی دیکھ سکتے ہیں۔ تقریب کے دوران سرحد کے دونوں طرف عوام کا بھرپور جوش و خروش دکھائی دیتا ہے۔ پوری تقریب کے دوران حب الوطنی کا دریا پورے زور و شور سے بہہ رہا ہوتا ہے۔ قومی نغموں کی بھرپور گونج کے بعد اہلکاروں کی پُرجوش آوازیں اور پریڈ ایک ایسا رنگ پیدا کر دیتی ہیں جس میں رنگے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس ایک تقریب میں ایموشن بھی ہے اور ہائی وولٹیج پیٹریاٹک ڈراما بھی۔ یہ ”ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے“ والا معاملہ ہے۔

واہگہ بارڈر کی تقریب میں ایک بات شدت سے محسوس ہوئی کہ جو بھرپور جذبہ ملک کی سرحد پر پایا جاتا ہے وہ اگر ملک کے اندر بھی موجود اور جاری و ساری رہے تو؟ قوم کو ایسے ہی بھرپور جذبے کی تو ضرورت ہے۔

بچوں کا جوش و خروش واقعی قابلِ دید ہوتا ہے۔ ایسی بھرپور تقریبات اُن میں حب الوطنی کی جڑیں گہری کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کرتی ہیں۔ اور بچوں کا تو کیا مذکور، بڑوں کو بھی اِس وقت حب الوطنی کی اشد ضرورت ہے۔ یہ مٹی ہمیں بہت کچھ دے چکی ہے اور اب ہم سے بہت مانگ رہی ہے۔

واہگہ بارڈر کی تقریب سے جوش و جذبہ بھی مہمیز پائے تو اچھا ہے مگر ساتھ ہی

ساتھ ہمیں نظم و ضبط اختیار کرنے کی تحریک بھی تو ملنی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوش اور جذبہ ہم میں کم نہیں۔ مسئلہ نظم و ضبط کا ہے۔ نظم و ضبط نہ ہونے سے جوش و جذبہ ضائع ہو جاتا ہے۔ یعنی دریا تو بہہ رہے ہیں اب ڈیم بنا کر پانی روکنا ہے تاکہ بجلی بنائی جاسکے۔ ہمارے سینوں میں جذبہ جوان ہے مگر اسے بروئے کار لانے کی سبیل نہیں بن پارہی۔ وقت کا تقاضا صرف یہ ہے کہ ہم اپنے جذبوں کے طوفان کے آگے بند باندھیں اور اسے حقیقی توانائی میں تبدیل کریں۔

معاملہ دریاؤں کے پانی کا ہو یا جذبوں کی روانی کا، ہم ایسے ہر طریقے سے یکسر نابلد اور متنفر ہیں جس سے معاملات کی درستی کا امکان پیدا ہوتا ہو۔ زمانہ اس بات کا شدت سے متقاضی ہے کہ ہم اپنے جذبوں اور ولولوں کو اعتدال کی حالت میں لانا سیکھیں اور زندگی کے ہر مظہر کو نئی زندگی سے روشناس کریں۔

مگر کیا ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں؟

سوال چاہنے ہی کا ہوتا ہے۔

پانی بہتا رہتا ہے اور سمندر میں جا گرتا ہے۔ بالکل اِسی طرح ولولے اُبھرتے ہیں اور پھر سرد ٹھہرتے جاتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا ؎

ملتی نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

رُکتی ہے مِری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

!مگر ہم ابھی اِس منزل تک نہیں پہنچے کہ روکے جانے پر ہماری طبع اور رواں ہو

کامیڈینز کی ٹریجڈی

اسٹینڈاپ کامیڈی کرتے کرتے سلیم آفریدی کو ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس دوران اُن پر اور کامیڈی پر کئی زمانے بیت گئے ہیں۔ گزشتہ دنوں ''رات کی چائے پر'' ملاقات ہوئی تو بھائی سلیم خاصے افسردہ دکھائی دیئے۔

آپ ''رات کی چائے پر'' سے حیران ہوئے ہوں گے کہ اِس سے کیا مراد ہے۔ کسی سے شام کی چائے پر تو ملاقات ہو سکتی ہے اور ہوتی ہی ہے، مگر یہ رات کی چائے چہ معنی دارد؟ بات یہ ہے صاحب کہ اخبارات سے تعلق رکھنے والے ''رات کے راہی'' (رات کی ڈیوٹی کرنے والے) جب گھر پہنچتے ہیں تو ساڑھے تین چار بج چکے ہوتے ہیں۔ ایسے میں گھر کے نیچے ہوٹل پر ملاقات رات کی چائے پر ملاقات ہی تو کہلائے گی! تب تک رات بھی ڈھل چکی ہوتی ہے اور بھائی سلیم بھی مختلف فنکشنز میں لوگوں کو ہنسا ہنسا کر خاصے ڈھل چکے ہوتے ہیں۔

کِسی کامیڈین کو سنجیدہ اور افسردہ دیکھ کر ہنسی زیادہ تیزی سے چُھوٹتی ہے۔ خیر، ہم نے بھائی سلیم سے افسردگی کا سبب پوچھا۔ خاصے دل گرفتہ لہجے میں

کہنے لگے۔ ’’جب خشکی کے جانور اور پرندے بھی تیرنے پر تُل جائیں تو مچھلی کہاں جائے، کن پانیوں میں تیرے؟‘‘

ہم نے وضاحت چاہی تو بولے۔ ’’ایک زمانہ تھا جب ہم تھوڑی بہت کامیڈی کرکے اچھی طرح جی لیا کرتے تھے۔ زمانہ ایسا بدلا ہے کہ ہم سے بدلہ لینے پر تُل گیا ہے۔ ہر چیز میں کامیڈی ایسی گھسی ہے کہ نکلنے کا نام نہیں لے رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کامیڈی کے اِس سمندر میں ہم تیریں تو کِس طرح؟ کِس طرح اپنی بقاء ممکن بنائیں، کِس کِس سے بَیر نہ لیں؟‘‘

ہم نے یہ کہتے ہوئے بھائی سلیم کا حوصلہ بڑھایا کہ یہی تو آپ کی آزمائش ہے۔ جب سبھی کھلاڑی بننے پر تُلے ہوں تو مسابقت بڑھ جاتی ہے۔ تب انسان کو اپنے جوہر دکھانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ بقول برج نارائن چکبستؔ ؎

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کُھلتے ہیں
مبارک بُزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا!

ہماری بات سُن کر بھائی سلیم کے چہرے پر اُمید کی تھوڑی سی چمک پیدا ہوئی مگر پھر اُن کا چہرہ اچانک اُسی طرح بُجھ گیا جس طرح بجٹ تقریر سُننے کے بعد غریبوں کے چہرے فیوز ہو جایا کرتے ہیں! بھائی سلیم بُجھے اور تھکے ہوئے

لہجے میں بولے۔ ''سوال صرف ہماری صلاحیتوں کا نہیں۔ پبلک بھی تو پریشان ہے۔ ہم تو جیسے تیسے کامیڈی کر ہی لیں گے۔ ہم سے بُرا حال تو لوگوں کا ہے۔ اُن کے سامنے آپشنز کا ڈھیر لگا ہے۔ مارکیٹ میں کامیڈی کے اِتنے ورژن ہیں اور کامیڈین اِتنے زیادہ ہیں کہ لوگ بھی چکرا کر رہ گئے ہیں کہ کِس کی کِس کِس بات پر ہنسیں۔''

کسی زمانے میں ہر ہیرو کے ساتھ ایک کامیڈین ہوا کرتا تھا جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرکے شائقین کو ہنسایا کرتا تھا۔ کہانی جہاں بھی بیزاری پیدا کرنے لگتی تھی، کامیڈین اچانک نمودار ہوکر لوگوں کو دوبارہ فلم کی طرف لاتا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ہیرو ہی کامیڈی بھی کرنے لگا۔ اِس تبدیلی کے بطن سے یہ ٹریجڈی برآمد ہوئی کہ کامیڈینز کی چُھٹّی ہوگئی! اور ہمارے ہاں تو یہ بھی ہوا کہ ہیرو اپنا کردار اور اداکاری بھول بھال کر پوری فلم میں کامیڈی ہی کرنے لگے! یہ کیفیت پنپتے پنپتے مُتعدّی مرض کی طرح اب پورے معاشرے پر مُحیط ہوگئی ہے۔ جسے دیکھیے وہ لوگوں کو ہنسا ہنساکر بے دم کرنے پر کمربستہ دکھائی دیتا ہے۔ ہر سیاست دان روزانہ ہنسانے والی باتیں کرتا ہے۔ اخبار پڑھنے کے بعد لوگ مزید ہنسنے اور اِس کے لیے ٹی وی دیکھنے کی کچھ خاص ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ایسے میں سلیم آفریدی جیسے روایتی کامیڈینز آنسو نہ بہائیں تو کیا کریں؟ اُن کی اسٹینڈ اپ کامیڈی کھڑی کی کھڑی رہ گئی

!ہے اور شائقین کسی اور طرف نکل گئے ہیں

سیاسی سرگرمیوں اور جمہوریت کے نام پر لاجواب کامیڈی نے ہمیں دو عشروں کے دوران اِتنا ہنسایا ہے کہ اب اچھی خاصی کامیڈی فلمیں بھی پھیکی سی لگنے لگی ہیں۔ منتخب ایوانوں کی کارروائی میں فلم کے تمام شعبے جلوہ گر اور فعال دکھائی دیتے ہیں۔ اسمبلی اگر سیشن میں ہو تو لوگ ڈرامے دیکھنا چھوڑ دیتے ہیں کہ چینلز پر اور اخبارات میں جب کارروائی بیان کی جائے گی تو جُگتوں، بڑھکوں، جذبات کی بلندی، افسردگی کی پستی، !کلائمیکس، اینٹی کلائمیکس سبھی چیزوں کا بھرپور لطف پا ہی لیں گے

میں پی ٹی وی کا ڈراما ''وارث'' بہت مقبول ہوا تھا۔ اِس میں محبوب عالم نے 1981 چوہدری حشمت کا کردار ادا کیا تھا جو اُنہیں اَمر کرگیا۔ چوہدری حشمت کا للکارتا ہوا لہجہ بچے بچے کی زبان پر تھا۔ امجد اسلام امجد کا لکھا ہوا ''وارث'' آج ہماری سیاست ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے پر مُنطبق ہوچکا ہے۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ ''وارث'' میں ایک چوہدری حشمت تھا اور معاشرے میں اب ہر بندہ چوہدری حشمت بننے پر تُلا ہوا ہے، !اُدھار کھائے بیٹھا ہے

ہم نے بھائی سلیم سے پوچھا کہ آپ اِتنے دل برداشتہ کیوں ہیں؟ ایک وقت آئے

گا جب قوم سیاسی کامیڈی سے تنگ آکر پھر آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوگی۔ اِس پر بھائی سلیم بولے۔ ''اُمید پر دنیا قائم ہے۔ مجھے بھی یقین ہے کہ ایک دن پولیٹیکل اور سوشل کامیڈی کا زور ٹوٹے گا۔ مگر تب تک تو پوری قوم کے اعصاب اور قوتِ برداشت کا زور بھی ٹوٹ چکا ہوگا! ہر معاملے میں کامیڈی کا گراف جتنی تیزی سے ''بلند'' ہو رہا ہے اُسے دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ بہت جلد لوگ کسی بھی بات اور کسی بھی چیز سے محظوظ ہونے کے قابل نہ رہیں گے! جب لوگ کامیڈی کی اوور ڈوز کا شکار ہوکر سینس آف ہیومر ہی سے محروم ہوچکے ہوں گے تو ہم پیش کیا کریں گے؟''

بھائی سلیم جیسے پروفیشنل کامیڈینز کا پریشان ہونا غیر فطری اور حیرت انگیز نہیں۔ حالات ہمیں اُس موڑ پر لے آئے ہیں جہاں ہر چیز ہنسا ہنسا کر بے دَم کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ کسی بھی معاملے کو کھنگالیے تو مضحکہ خیز معاملات اُبھرتے ہیں۔ جب کوئی قوم پوری دُنیا کے لیے ''لافنگ اسٹاک'' میں تبدیل ہوجائے تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ہر معاملے سے لُطف کشید کرنے کی روش ایسے ہی گُل کھلایا کرتی ہے۔ انتہائی سنجیدگی کے متقاضی معاملات کو بھی ہنسی ہنسی میں اُڑایا جارہا ہے۔ سیاست کے نام پر عوام کے مفادات سے کِھلواڑ جاری ہے۔ اور بے چارے عوام میں یہ تماشا دیکھ کر ہنسنے کی بھی تاب نہیں رہی۔ حکمرانی کے نام پر ایسی ایسی مضحکہ خیز حرکتیں کی جارہی ہیں کہ دُنیا غور

کرنے پر آئے تو حیرت کے سمندر میں غرق ہو جائے! سرکاری مشینری کی حرکتیں ایسی ہیں کہ جنہیں شرم سے ڈوب مرنا چاہیے وہ تو سلامت ہیں، اُن کے کرتوت دیکھنے والے البتہ اپنے آپ سے شرمسار ہوئے جاتے ہیں! اوور آل کامیڈی کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا، کسی کو نہیں معلوم۔۔۔

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

مجبوری کا نام شُکریہ

سو طرح کے شُکوک کے درمیان اگر یقین کو دیکھنا اور برتنا ہے تو مکمل سرکاری کنٹرول والی کسی بھی ٹرین سے سفر کیجیے۔ مزانہ "جائے" تو پیسے واپس! گزرے ہوئے سال کے آخری لمحات میں عوام ایکسپریس سے سفر کا "اعزاز" نصیب ہوا۔ شاید ایسے ہی کسی سفر کے بارے میں فیض احمد فیضؔ نے کہا ہے ع

..... جو چلے تو جاں سے گزر گئے!

اِس سفر میں مہم جوئی کا مزا تو تھا ہی، قدم قدم پر یہ احساس بھی ہوا کہ ہم بہت کچھ دریافت کرتے جارہے ہیں! راولپنڈی سے کراچی تک 35 گھنٹوں کے سفر میں اور کچھ نہ سہی، دو صوبوں کے کم و بیش 40 شہروں اور قصبوں سے خاصی معقول واقفیت کا شرف ضرور حاصل ہوا! شادی کے شامیانے سے رُخصت ہوتی ہوئی دلہن جس طرح جھجھکتے اور ٹھٹھکتے ہوئے چلتی ہے کچھ اِسی طور ہماری ٹرین بھی شرماتی لجاتی، ہچکچاتی، کسمساتی سُوئے منزل روانہ ہوئی۔ انجن کی ذہنی کیفیت یہ تھی کہ ؎

اِرادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے!

ٹرین نے شاید ''اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم'' والا گانا سُن رکھا تھا اِس لیے کہیں کوئی محض خفیف سا اشارا بھی کرتا تو رُک کر خیریت دریافت کرتی اور فراخ دِلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے میں سمو بھی لیتی تھی! یوں ہر علاقے کی سوغات چکھنے کو ملی اور ثقافت کے ساتھ ساتھ جغرافیہ سے بھی رُوشناس ہونے کا موقع ملا۔

سفر کے دوران احباب کے فون اور ایس ایم ایس آتے رہے۔ اُنھوں نے جب بھی سفر کی کیفیت پوچھی تو یہ شعر بے ساختہ یاد آیا ۔

کچھ اِس ادا سے یار نے پوچھا مِرا مزاج
کہنا پڑا کہ شُکر ہے پروردگار کا!

پشاور سے آمد کے بعد 20 منٹ رُک کر ٹرین جب راولپنڈی سے چلی تو بوگیوں میں خاصی کشادگی تھی اور ماحول خاصا مُہذب تھا کیونکہ لوگ سیٹ بائے سیٹ تھے۔ پھر یہ ہوا کہ ٹرین ہر جانے انجانے اسٹیشن پر رُکتی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ع

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا!

ٹرین پر لوگ جس طرح لپکتے تھے اُس منظر کے بیان کو ہم خوفِ فسادِ خلق سے

رہنے دیتے ہیں کیونکہ اِس بیان کے لیے ہمیں قابلِ اعتراض تشبیہات کا سہارا لینا پڑے گا! آن کی آن میں ٹرین ایسی بَھری کہ اُستاد قمر جلالوی بروقت یاد آئے ع

!ذرا سی دیر میں کیا ہوگیا زمانے کو

مصرعِ اُولیٰ کو ہم رہنے دیتے ہیں کیونکہ اُس میں قبر کا، اُس میں لِٹانے کا اور جاتے وقت !دُعا سلام وغیرہ نہ کرنے کا ذکر ہے

مختلف چھوٹے بڑے اسٹیشنز سے لوگ سَروں پر پوٹلا رکھے، بغل میں صندوق دبائے سوار ہوتے رہے۔ اِن تین چار اسٹیشنز کے مسافروں کی آمد سے بوگی میں وقفے وقفے سے ایک نئی دُنیا بستی اور اُجڑتی رہی۔ کھچا کھچ بھری ہوئی ٹرین میں محض سوار ہونا ہی کمال نہ تھا، اُس سے ایک قدم آگے جاکر خود کو کسی کونے کھانچے میں فِٹ کرنا بھی چمتکار کا درجہ رکھتا تھا! اور یارانِ وطن یہ چمتکار دِکھاتے رہنے سے اُکتائے نہ !گھبرائے

راولپنڈی سے ایک ''مُنڈا شہر لہور دا'' سوار ہوا جس نے سالِ اوّل کی ''روزمرّہ اُردو'' تھام رکھی تھی۔ ٹرین کے خالص ''علم الکلامی'' ماحول کو دیکھتے ہوئے اِس طرح کی کوئی بھی کتاب پڑھنے والا عجوبے سے کم نہ تھا! ہم

نے اُس نوجوان سے کہا بھائی ! تم روز مرّہ اُردو کی بات کرتے ہو، ایسے ماحول میں تو روز مرّہ پنجابی بھی داؤ پر لگ جائے!

ٹرین اگر عوامی نوعیت کی ہو تو اُس میں کئی طرح کے عُلوم و فُنون سے رُوشناس ہونے کا موقع ملتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اچانک بھیڑ بڑھ جائے تو حواس پر کس طرح قابو پانا ہے، 78 کی گنجائش والی بوگی میں 178 افراد کو کس طور ایڈجسٹ کرنا ہے، کوئی عورت شیر خوار سمیت چار بچوں کو لیکر کس طور سفر کر سکتی ہے، بیچ بیچ کے اِس طرح کیسے چلا جا سکتا ہے کہ لوگ اِدھر اُدھر بھی ہو جائیں اور کِسی کی زبان پر کوئی شکوہ بھی نہ اُبھرے اور انتہائے ضبط سے ہم آہنگ رہتے ہوئے بھیڑ کو چیر کر باتھ روم تک کیسے جایا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مارکیٹنگ اور سیلز کے گُر سِکھانے میں بھی ریلوے کا محکمہ نہایت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ عوام سے کھچا کھچ بھری ہوئی ٹرین میں سفر کے دوران آدمی یہ بھی سیکھ سکتا ہے کہ کون سی چیز کس زبان میں کس طرح بیچنی ہے، پشاور سے کراچی تک کسی بھی طرح کے حلوے کو مُلتان کا خالص سوہن حلوہ قرار دے کر کس طور لوگوں کے معدے میں اُتارنا ہے، موقع اور گنجائش دیکھ کر چُونا کس طرح لگانا ہے، کون سے بکرے کو کتنے میں ذبح کرنا ہے، کم وقت میں زیادہ سے

زیادہ پھیرے لگا کر مال کی طلب کس طرح پیدا کرنی ہے اور کچرے کے طور پر بچ رہنے والی چیزیں بھی کس طریقے سے ٹھکانے لگانی یعنی فروخت کرنی ہیں وغیرہ وغیرہ۔
یہ تو ہوا معاشی اُمور کا بیان۔ معاشرتی سطح پر بھی عوامی ٹرینیں بہت کچھ سکھاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مختلف النسل لوگ کس طرح ایک دوسرے کو برداشت ہی نہیں کرتے، بلکہ ایک دوسرے سے محظوظ بھی ہوتے ہیں! کوئی بتائے تو سہی کہ گھر اور خاندان کا کون سا معاملہ یا جھگڑا ہے جس پر ٹرین کے سفر کے دوران بحث نہیں کی جا سکتی!
مگر خیر، ٹرین میں صرف ''رواداری'' کا ماحول نہ تھا، مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے لوگ چھوٹے موٹے جھگڑے بھی کرتے رہے! خود کو پاکستانی ثابت کرنے کے لیے بڑی باتوں پر عفو و درگزر سے کام لیا گیا اور چھوٹی باتوں پر تو تو میں میں کا سلسلہ جاری رہا! ''میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا؟'' کے مصداق کوئی مُعترض تھا کہ میری سیٹ پر بیٹھے کیسے یا پاؤں رکھا تو کیوں رکھا! کوئی اِس بات پر خفا تھا کہ سنگل سیٹ پر دن بھر جاگنے والا بندہ میری برتھ پر سویا تو کیوں سویا! روہڑی کے چند نوجوانوں نے ہماری سیٹ کے نیچے گتے کا ایک کارٹن رکھا ہوا تھا۔ بار بار آتے تھے اور چیک کرتے تھے۔ ہم پریشان

ہو گئے کہ پتا نہیں کیا رکھا ہوا ہے۔ دریافت کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ مُرغیاں ہیں ! ہم مزید حیران ہوئے کیونکہ ایک بار بھی اِن مُرغیوں کی آواز سُنائی نہیں دی۔ بے زبانوں کی خاموشی کا سبب پوچھا تو جواب ملا۔ ''سائیں، اِتنے سارے جناوروں میں بے چاری مُرغیاں بول کر کیا کریں گی''!

دِن ڈھلا تو لاہور آیا۔ شام تو آ پہنچی مگر بلب کے ہولڈر تک بجلی نہ پہنچی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ الف سے ی تک بھری ہوئی ٹرین میں اندھیرا بھی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ایسے میں جو لوگ اشیائے خور و نوش زہر مار کر رہے تھے اُنھوں نے کینڈل لِٹ ڈِنر کا لُطف پایا! اور کِس کِس لُطف کی بات کیجیے؟ داغ دہلوی کی رُوح سے معذرت کے ساتھ ع

وہ مزے ''ٹرین'' میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے!

کینڈل لِٹ ڈِنر کا سا ماحول خاصا سحر انگیز تھا۔ خیر گزری کہ عین اُس وقت پر بلب روشن ہوئے جب یہ سحر انگیز سماں بڑھتے بڑھتے ہارر فلم کے ماحول میں تبدیل ہونے لگا تھا!

صُبح ہوئی تو گاڑی کے جگہ جگہ رکنے اور اُس میں لوگوں کے سوار ہونے اور اُترنے کا سلسلہ بھی تیز ہوگیا۔ سفر کا بڑا حصہ بوگی میں جگہ نہ ہونے پر

دِلوں میں جگہ بناتے گزرا۔ سندھ کی حدود میں سفر صوبے کے مختلف علاقوں کے لوگوں کو ''بھلی کرے آیو'' اور خدا حافظ کہتے گزرا۔ منزل پر نظر تھی مگر منزل کب آئے گی، کچھ خبر نہ تھی۔ انتظار تھا کہ چیونگ گم کی طرح کھنچتا ہی جا رہا تھا۔ بقول غالبؔ ؎

کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں

!شب ہاءِ ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

سفر کے دوران جو کچھ ہوتا رہا تو وہ کہانی میں پائے جانے والے twists کے مترادف تھا۔ کلائمیکس تو منزل یعنی کراچی کے قدموں میں پہنچ کر واقع ہوا۔ جب رات کے نو بجے جنگ شاہی اسٹیشن کے نزدیک ویرانے میں انجن خراب ہوگیا! دو گھنٹے تک لوگ شدید خوف اور بے یقینی کے عالم میں بیٹھے رہے۔

خدا خدا کرکے نیا انجن آیا، گاڑی گھسٹتی گھسٹتی کراچی کینٹ اسٹیشن تک پہنچی اور مرحلۂ شوق'' طے ہوا! کراچی پہنچنے تک حالت یہ تھی کہ ع''

!شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا

عوام ایکسپریس سے اُترنے کے بعد اندازہ ہوا کہ سُکھ کا سانس کیا ہوتا ہے اور دِل کی گہرائیوں سے شُکر کب ادا کیا جاتا ہے! معاملہ شُکر کی منزل تک گزرتا ہوا توبہ پر ختم ہوا!

جانورستان

اہلِ سیاست کا تو کام ہی سیاست کے نام پر ستم ظریفی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اب دیکھیے نا آپس کی لڑائی میں جانوروں کو گھسیٹ رہے ہیں۔ جن کے اپنے خوں خوار ہونے میں کوئی شک نہیں وہ ایک دوسرے کو گوشت خور جانوروں سے مشابہ قرار دے رہے ہیں۔ اِس صورتِ حال نے بہت سے جانوروں کو شدید خفت سے دوچار کرکے بے مزا کیا ہے۔ بے چارے نظریں چراتے ہوئے، گردنیں جھکائے گھوم رہے ہیں۔

کل ایک بلی سے گفتگو ہوئی تو شکوہ کرنے لگی۔ ''سیاسی دودھ کی ساری ملائی تو ایوانِ اقتدار میں براجمان باگڑ بِلّے پی جاتے ہیں اور بدنام کیا جاتا ہے میرے سرتاج کو۔'' ہم نے سمجھانے کی کوشش کی کہ بی بی! اِسی کو تو سیاست کہتے ہیں۔ کام کسی کا، نام کسی کا! مگر وہ محترمہ نہ مانیں۔ میاؤں کی گردان کے درمیان بولیں۔ ''ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کے لیے تشبیہ دینے کو ہمیں رہ گئے ہیں؟ ہمارے بہرحال کچھ اُصول ہوتے ہیں۔ ہم جانور مصلحتوں کے اسیر نہیں۔ ہم مشیّت کی طے کردہ حدود میں رہتے ہیں۔ پیٹ بھرنے تک کھاتے ہیں، نیت بھرنے تک نہیں۔''

ہم نے پھر سمجھایا کہ سیاست دان مجبور ہیں۔ ان کے ڈیفالٹ میں شامل ہے کہ خوب پیٹ بھر کے اُٹھو اور دستر خوان اٹھانے اور صفائی کا معاملہ بعد میں آنے والوں پر چھوڑ دو۔

بلی صاحبہ بولیں۔ ''پھر تو ہم اچھے ہوئے۔ چوہدری شجاعت کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے ہم لوگ مٹی تو 'پا' دیتے ہیں۔ اِس ملک کے ست دانوں سے تو اِتنا بھی نہیں ہوتا کہ اپنی غلاظت کو مٹی سے ڈھانپ دیا کریں! یہ معاملہ بھی بعد میں آنے والوں کی صوابدید پر چھوڑ دیتے ہیں۔''

شریف امروہوی سے بھی یہ بات اب ہضم نہیں ہو پائی کہ سیاست دان اقتدار کے ایوانوں میں جو کچھ کرتے ہیں اُسے جانوروں کے معمولات سے مشابہ کیوں قرار دیا جاتا ہے۔ اُن کا اصل شکوہ یہ ہے کہ جانور اپنی دنیا میں مست رہتے ہیں، اُنہیں انسانوں کے درمیان گھسیٹنے کی ضرورت کیا ہے؟ ہم نے (بلی کی طرح) انہیں بھی سمجھایا کہ صاحب! اقتدار کے ایوانوں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ جانوروں کے بعض معمولات پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ ن لیگ نے شیر کو انتخابی نشان بنایا تو لوگ یہ سمجھے کہ وہ جنگل کا بادشاہ

ہونے کی دعوے دار ہے اور ایسی ہی جی داری کا مظاہرہ کرے گی۔ یہ عقدہ تو بعد میں کھلا کہ پارٹی قیادت کے ذہن میں سرکس کا شیر تھا! اب اگر کوئی شیر پر آٹا کھانے یا بجلی کے بحران سے ڈر جانے کی پھبتی کستا ہے تو اُس بے چارے کو یہ معلوم نہیں کہ سرکس کے شیر کا بھی یہی وتیرہ ہوا کرتا ہے!

سرکش کا شیر کوڑے سے ڈرتا ہے۔ ن لیگ کے شیر کے لیے بجلی کا بحران کوڑا ثابت ہوا ہے۔ سرکس کے شیر کو آگ کے رِنگ سے سے گزرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ن لیگ کا شیر آج کل مہنگائی کے جلتے ہوئے رِنگ سے گزرنے کی تربیت حاصل کر رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر جنگل کے شیر بھی اب گریبان کی کچھار میں جھانکتے رہتے ہیں!

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ سب سے زیادہ وزن گدھا اُٹھاتا ہے اور ہر معاملے میں تضحیک اور تذلیل کا نشانہ بھی وہی بنتا ہے۔ اور اِس سے بڑھ کر یہ کہ مار بھی بے چارا گدھا ہی کھاتا ہے! ہماری سیاست میں بھی سب سے زیادہ مخلص کارکنوں سے یہ گدھوں والا سلوک ہی روا رکھا جاتا رہا ہے۔ جلسوں سے سب سے آگے یہ مخلص کارکن ہی ہوتے ہیں۔ حلق پھاڑ کر، پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر نعرے لگاتے ہیں اور ثمرات کی تقسیم کا مرحلہ آئے قطار کے آخر میں کھڑے ملتے ہیں! آپ ایسے مخلص (اور ثمرات سے محروم) کارکنوں کے لیے اپنے دل میں ہمدردی

ابھرتی ہوئی محسوس کر رہے ہوں گے۔ آپ کی سادگی کا بھی جواب نہیں۔ ارے صاحب! یہ لوگ ”زمیں جنبد، نہ جنبد گل محمد“ کی عملی شکل ہیں۔ دس بار گندا سلوک روا رکھے جانے پر بھی یہ گیارہویں بار پھر قطار کے آخر میں کھڑے ملتے ہیں! اصلی اور نسلی گدھے اِنہیں دیکھ کر شرمائیں تو شرمائیں، یہ اپنا کھوتا پن ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے!

سیاست میں جانوروں کے اطوار اور خصائل قدم قدم پر ملتے ہیں۔ جن کے دل و دماغ پر سیاست سوار ہے وہ بھیڑ چال رہتے ہیں۔ ذرا سے قامت والے گدھے سارا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں اور دوسری طرف سفید ہاتھی مزے ایک طرف کھڑے ہو کر جھومتے، جھولتے رہتے ہیں۔ عوامی جانوروں کی خوراک میں ڈنڈی مار کر سفید ہاتھیوں کی پرورش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ملک کا نظم و نسق سنبھالنے والے خود کو عقاب کہتے نہیں تھکتے۔ اور شاہین کے مانند ہمیشہ اونچی اُڑان کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کبوتروں کی طرح ایک ایک ووٹ چُگنے کے لیے در در جانے والے سیاست دان کامیابی کے بعد شاہین ہی تو بن جاتے ہیں۔ اُن کی اُڑان اِتنی اونچی رہتی ہے کہ بے چارے عوام اُنہیں دیکھنے کو بھی ترس جاتے ہیں! ہاں، جب کبھی اپنی مرضی کی کوئی چیز دم توڑتی دکھائی دیتی ہے تو یہ فوراً نیچے اُتر آتے ہیں اور گِدھوں کی مانند مُردے کی

بوٹیاں نوچنے لگتے ہیں۔ ملک اللہ میاں کی گائے کی مثال ہوگیا ہے۔ مرتا ہے، اپنی بوٹیاں نُچواتا ہے اور پھر جی اُٹھتا ہے۔

بہت سے سرکاری ادارے سونے کے انڈے دینے والی مُرغی کی مانند تھے۔ مگر لومڑی صفت یارانِ اقتدار بے صبرے ہوئے اور یکے بعد دیگرِ اِن مُرغیوں کے پیٹ چاک کرتے گئے۔ انڈے تو کیا ملنے تھے، صرف آلائشیں ہاتھ آئیں!

ناقدری اور کم ظرفی کا یہ عالم ہے کہ مور پر کَوّا راج کر رہا ہے۔ بُلبُل کی صدائے دل نشیں پر کُتوں کے بھونکنے کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ کوئل کی کوک سے بھیڑیوں کی ہاؤہُو کو افضل گردانا جا رہا ہے۔ جن کے ہاتھ میں اقتدار کا بُغدا ہے اُنھوں نے ذاتی مفادات کے استھان پر ریاستی ملکیت کی ہر شے کو قربانی کے بکرے میں تبدیل کر دیا ہے۔ اگر بکرے کو ذبح کرکے کھالیا جائے تو کچھ ہرج نہیں کہ چلو، گوشت ٹھکانے تو لگا۔ یہاں تو سَفّاکی کا یہ عالم ہے کہ اپنی بوٹی کے لیے بکرا ذبح کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا!

قومی خزانے کی کو بدعنوانی اور پرچی کلچر کے بھیڑیے نے دبوچ رکھا ہے۔ تیزی سے بلند ہوتی ہوئی قیمتیں شکاری کُتّوں کی طرح کی گردن میں دانت گاڑے ہوئے ہیں۔ منتخب اداروں سے اصلاح احوال کے اقدامات کی توقع رکھی جاتی ہے مگر یہ

توقع بھی لاحاصل ثابت ہوتی آئی ہے۔ قوم جنہیں مسائل حل کرنے کے لیے منتخب ایوانوں میں بھیجتی ہے وہ بندر بانٹ میں مشغول رہتے ہیں۔

منتخب اداروں میں ہمہ وقت جنگل کا سا ماحول برقرار رہتا ہے۔ ملک اور قوم کے بارے میں سوچنے سے زیادہ توجہ آپس کے مفادات کا تحفظ یقینی بنانے پر دی جاتی ہے۔ شریف امروہوی اس بات پر بھی معترض ہوتے ہیں کہ اہلِ اقتدار کی باہمی کشمکش کو جنگل کے ماحول سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک میں جنگل کا قانون نافذ ہے۔ شریف امروہوی کہتے ہیں۔ ''سیاست کے نام پر ہمارے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھنے والے جنگل ونگل سب کو پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ جنگل میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ بہر حال چند اُصولوں کے تابع ہوتا ہے۔ کوئی جانور محض دِل پشوری کے لیے کبھی کسی کو نہیں مارتا۔ پیٹ بھر چکنے کے بعد کوئی بھی جانور کسی کے مال پر مُنہ نہیں مارتا۔ بیشتر جانور ذخیرہ اندوزی پر یقین نہیں رکھتے۔ جنگل میں ٹارگٹ کلنگ کا کلچر ہے نہ بھتہ خوری کا۔ کسی جانور کو راہ چلتے لُٹ جانے کا خوف نہیں ہوتا۔ جانور کسے اپنا سربراہ، سردار یا حکمران مقرر کرتے ہیں وہ کبھی ایموشنل بلیک میلنگ نہیں کرتا، منافرت نہیں پھیلاتا، دِلوں میں دیواریں کھڑی نہیں کرتا، تمام جانوروں کے وسائل پر قبضہ کرکے اپنے لیے محل تعمیر نہیں کرتا۔ کبھی نہیں سُنا گیا کہ جانوروں کے کسی قائد نے فارم ہاؤس بنوایا ہو۔ شیر جنگل کا

''بادشاہ گردانا جاتا ہے مگر اُس کی کچھار میں بھی مخمل کے گَدّے نہیں ہوتے۔

حکومت سازی کے لیے منتخب ارکان کی خرید وفروخت کو گھوڑوں کی تجارت کیوں کہا جائے؟ گھوڑے تو پھر کام کے ہوتے ہیں! جنھیں ہم اپنے معاملات کی درستی کے لیے ووٹ دیتے ہیں وہ امریکا کی رَسّی اپنے گلے میں ڈال کر اُس کی ڈگڈگی پر ناچتے رہتے ہیں۔ یہ تماشا اگرچہ مفت ہے مگر قوم دیکھتے دیکھتے تھک چکی ہے۔

جانور بے چارے بے زبان ہیں، بول نہیں سکتے۔ ان کی بے زبانی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا جارہا ہے۔ ایسے میں ہم جانوروں کی طرف سے التماس کرتے ہیں کہ ملک پر راج کرنے والے اور راج کے خواہش مند آپس کی کشمکش اور مناقشوں میں جانوروں کا نام لے کر اُنھیں ذلیل ورُسوا نہ کیا کریں۔

یہ ہے چنگچی میری جان!

جو عقل کو حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے پر مجبور کرنے والے واقعات پر یقین نہیں رکھتے وہ اپنے ماحول پر "دیکھ مگر پیار سے" والی نظر ڈالیں تو دنگ رہ جائیں گے کہ اب تک اُنھوں نے دیکھا ہی کیا تھا!

ہماری سڑکیں، اللہ بُری نظر سے بچائے، عقل کو چکرا دینے والے آئٹمز پیش کرنے میں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ زمانے ہوا ہوئے جب کھیل کے میدانوں یا خالی سرکاری پلاٹس پر سرکس لگا کرتے تھے۔ قبضہ مافیا کی مہربانی سے خالی سرکاری پلاٹس بچے ہی نہیں۔ ایسے میں لوگوں نے اپنی مدد آپ کے اُصول کی بنیاد پر خانہ ساز سرکس متعارف کرائے ہیں۔

نئی نسل نے سڑکوں کو موت کا کنواں سمجھ کر موٹر سائیکل پر کرتب دِکھانے کی روایت کو پروان چڑھایا ہوا ہے۔ جان جوکھم میں ڈالنے والی ون وھیلنگ کے آگے موت کا کنواں کیا چیز ہے؟ موت کے کنویں میں کرتب دِکھانے والے کے لیے تو میدان خالی ہوا کرتا تھا اور اُسے تھوڑا سا رسک لیکر موٹر سائیکل پر ون مین

شو کرنا ہوتا تھا۔ آج کے نوجوان بھری پُری، چلتی ہوئی سڑک پر تیز رفتار ہیوی گاڑیوں کے درمیان پیٹ کے بل لیٹ کر موٹر سائیکل چلاتے ہیں اور آن کی آن میں کہیں سے کہیں جانکلتے ہیں! کبھی کبھی تو وہ کسی بھی سمت ایسے بڑھتے جاتے ہیں کہ پھر اپنے پیروں پر چل کر واپس نہیں آ پاتے!

مگر خیر سڑکوں کی رونق کچھ ون وھیلنگ کی محتاج نہیں۔ چنگچی رکشے بھی تفریحِ طبع کیلئے پوری آب و تاب حاضر ہیں۔ صاحبِ طرز مزاح نگار شفیق الرحمٰن نے لکھا ہے کہ اُلّو کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت کچھ کرنے کی ٹھان لے تو کرکے دم لیتی ہے۔ یہی بات چنگچی کے حوالے سے بھی کہی جا سکتی ہے۔ جس کسی نے بھی یہ دوغلی گاڑی (آدھی موٹر سائیکل اور آدھا ٹانگہ) ڈیزائن کی اُسے خراجِ تحسین پیش کیا جانا چاہیے۔ خراجِ عقیدت ہم نے چنگچی میں سفر کرنے والوں کے لیے رکھ چھوڑا ہے!

اب تک یہ طے نہیں ہو پایا کہ چنگچی رکشے سرکس کی دُنیا سے آئے ہیں یا میلہ مویشیاں واسیاں سے! سچ تو یہ ہے کہ ہر چنگچی رکشا اپنے آپ میں لوک ورثہ ہے، میلہ ہے، سرکس ہے! جو لوگ روزانہ چنگچی رکشوں میں سفر کے عادی ہو چکے ہیں وہ بھی یہ دیکھ کر حیران ہوتے رہتے ہیں کہ بدمزاج بیوی کے دماغ کی طرح جس گاڑی کا اپنا توازن پل بھر میں بگڑ جاتا ہے وہ درجن بھر مسافروں کو اپنے اندر

سمو کر کس خوبی اور توازن کے ساتھ سڑک پر رواں رہتی ہے! بہت سے لوگ چنگچی رکشے میں بیٹھنے کے بعد اِس سوچ میں ڈوب جاتے ہیں کہ یہ چلے گا کیسے۔ اور جب وہ چل پڑتا ہے تو سفر اِس اُلجھن میں کٹتا ہے کہ یہ چل کیسے رہا ہے!

تین پہیوں کی اِس سواری میں مُسافر اِس طرح ایڈجسٹ ہوتے جاتے ہیں کہ خود بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ مُسافروں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ ڈرائیور کے ایثار'' کا گراف بھی بُلند ہوتا جاتا ہے۔ پہلے وہ اپنی سیٹ پر ہوتا ہے۔ پھر فراخ دِلی کا'' مُظاہرہ کرتے ہوئے آدھی سیٹ مُسافر کو دیتا ہے۔ تیسرے مرحلے میں وہ آدھی سیٹ بھی مُسافر کو دیکر ''ٹینکی'' کے پچھلے حصے پر بیٹھتا ہے۔ چوتھے اور حتمی مرحلے میں اُس کی سیٹ بننے کا اعزاز پاتا ہے ٹینکی کا ڈھکن! اور اِس کے بعد وہ گاڑیوں کی بھیڑ سے گزار کر چنگچی کو جس طرح دوڑاتا ہے اُس تماشے کو دیکھنے پر اب تک ٹکٹ نہیں لگا!

لوگ ٹی وی پر کار ریسنگ بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔ خالی ٹریک پر کار دوڑانا کون سی کمال کی بات ہے؟ مزا تو جب ہے کہ کار ریسنگ کے چیمپین چنگچی میں بارہ پندرہ افراد کو سوار کرکے بھری پُری سڑک پر پوری رفتار سے تین چار کلو میٹر کا فاصلہ طے کرکے دکھائیں۔ ذرا سی دیر میں لگ پتا جائے گا، ساری مہارت دست بستہ رخصت چاہے گی اور جتنی بھی پھنّے خانی ہے وہ جان کی امان چاہنے

کے چکر میں پڑے بغیر نو دو گیارہ ہو جائے گی!

کہتے ہیں دِل میں جگہ ہونی چاہیے۔ چنگچی رکشے اِسی اُصول کی بنیاد پر کام کرتے ہیں۔ ڈرائیور کو سڑک پر پیسنجر صرف نظر آنا چاہیے۔ بٹھانا یا ایڈجسٹ کرنا اُس کا کام ہے۔ بہت سے سیاست دانوں کی عادت ہے کہ بات بات پر ''ہے کوئی مائی کا لعل'' کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ایسے تمام سیاست دانوں کو چیلینج ہے کہ ذرا بھرے ہوئے چنگچی کے ڈرائیور کے سامنے اِتنا کہہ کر دیکھیں کہ ہے کوئی مائی کا لعل جو چنگچی میں سوار ہو کر دکھائے۔ اور پھر خود ہی دیکھ لیں کہ چنگچی ڈرائیور کس طرح ایک نہیں، کئی بندے فِٹ کرکے اُنہیں غلط ثابت کرتا ہے!

اب تو پورا پاکستانی معاشرہ چنگچی کے اُصول کی بنیاد پر کام کر رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ چنگچی رکشا پاکستانی معاشرے کی ساخت کو دیکھتے ہوئے ڈیزائن کیا گیا ہوگا۔ جہاں گنجائش کے گنّے سے آخری قطرہ تک نچوڑا جاچکا ہے وہاں بھی گنجائش پیدا کرنا پاکستانیوں کا سب سے بڑا ہُنر ہے۔ اور یہ ہُنر ہمیں چنگچی رکشے میں بدرجۂ اتم دکھائی دیتا ہے۔

ہمارا پُرخلوص مشورہ یہ ہے کہ انتخابات کے بعد جب حکومت سازی کا مرحلہ آئے

تو چنگچی ڈرائیورز کی خدمات حاصل کی جائیں تاکہ وہ مختلف ''اسٹیک ہولڈرز'' کو ساتجھے کی ہنڈیا یعنی مخلوط حکومت میں اچھی طرح ایڈجسٹ کر سکیں! یہ ایڈجسٹمنٹ اِس طرح کی ہوگی کہ اسٹیک ہولڈرز کو ڈھنگ سے سانس لینے کا موقع نہ مل سکے گا اور جب تک وہ کوئی شِکوہ زبان پر لانے کے قابل ہو پائیں گے، سفر ختم ہو چکا ہوگا!

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ ہر وزارت، ہر محکمے میں چنگچی کی رُوح حلول کر گئی ہے۔ ''ون ٹو کا فور'' کے فارمولے پر عمل ہو رہا ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں ایک یا دو کی گنجائش بھی مشکل سے نکل سکتی ہو وہاں چار افراد کو ایڈجسٹ کیا جا رہا ہے! یعنی بندے اِس طرح دِکھائی دے! آپ سوچیں گے اِس طرح تو وزارت، just کرو کہ سب کو معاملہ add محکمے یا ادارے کا سانس پُھول جائے گا، وہ اُلٹ یا پَلٹ بھی سکتا ہے۔ کوئی بات نہیں، سڑک پر ہم نے چنگچی رکشے بھی پَلٹتے دیکھے ہیں۔ تو کیا اُلٹنے، پَلٹنے سے یہ رکشے بند ہوگئے؟ ہمارے ہاں جمہوریت نے بھی چنگچیانہ مزاج اپنا لیا ہے۔ جمہوری حکومتیں بھی چنگچی رکشے کی طرح ڈولتی ہوئی سفر کرتی ہیں۔ ہر قدم پر گمان گزرتا ہے کہ شاید اب جمہوریت کی بساط اُلٹ جائے گی مگر ایسا ہوتا نہیں۔ لوگ بہت ناشکرے ہیں۔ چنگچی کے اُلٹنے یا پَلٹنے کا واقعہ تو اُنہیں یاد رہ جاتا ہے اور یہ جو ڈرائیور روزانہ سو بار چنگچی کو گرنے سے بچاتے ہیں اُس کی داد کون دے گا!

چنگچی رکشا ہمارے خاندانی نظام کا بھی بھرپور عکاس ہے۔ باپ کے چھوڑے ہوئے 80 گز کے مکان میں چار بھائی اپنے اپنے اہل خانہ کے ساتھ اِسی طرح تُھنس کر رہتے ہیں ! باپ کے گھر میں کوئی پورے فلور پر قبضہ کرلیتا ہے اور کسی کے حصے میں قبر سے مُشابہ کمرا بھی مشکل سے آتا ہے۔ چنگچی میں بھی کوئی پوری سیٹ پر قابض ہو رہتا ہے اور کسی کے حصے میں صرف ٹینکی کا ڈھکن آتا ہے!

"خاکم بہ "دہشکم

بچپن سے سُنتے آئے ہیں کہ کوئی بہت زیادہ کھا رہا ہو تو یوں کہنا چاہیے کہ پیٹ بھر گیا ہے، نیت نہیں بھری۔ مگر اب یہ بات مکمل طور پر غلط معلوم ہوتی ہے۔ کھانے کی عادت نے ایسا انقلاب برپا کیا ہے کہ اب ہماری نیت بھرتی ہے نہ پیٹ۔ دونوں معاملات اُلٹ پَلٹ گئے ہیں۔ نیت کے بھرنے تک لوگ پیٹ بھرتے رہتے ہیں اور پیٹ اچھی طرح بھر کر نیت کے بھرنے کا اہتمام کرتے ہیں! اور سچ پوچھیے تو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ نیت اور پیٹ کے درمیان قیامت تک جاری رہنے والی جنگ چھڑی ہوئی ہے! جب سے ہوش سنبھالا ہے، لوگوں کو کھانے پر مائل پایا ہے۔ اور یہ سب دیکھ کر ہوش اب تک پوری طرح سنبھل نہیں پایا ہے! ایسا لگتا ہے کہ ہر شخص نے اپنے طور پر یہ طے کرلیا ہے کہ زندگی کو صرف کھانے پینے کے لیے مختص ہونا چاہیے۔ ایک انتہائی وسیع کائنات کا حصہ ہم خود ہیں۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ اِس کائنات کی بہرحال ایک حد ہے۔ ہاں، اِتنا ضرور ہے کہ چادر کی طرح ہماری کائنات کبھی اِدھر سے کھنچ جاتی ہے اور کبھی اُدھر سے۔ حدودِ شکم کے معاملے میں البتہ سائنس دان خاموش ہیں۔ یہ ایسی کائنات ہے جس کی حدود کے بارے میں

سوچنا ابھی شاید شروع بھی نہیں کیا گیا۔ اور سب سے بڑا مسئلہ شاید یہ ہے کہ سوچنا کہاں سے شروع کیا جائے! بہت سے لوگ اِس طرح کھا رہے ہوتے ہیں کہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ جو کچھ وہ کھا رہے ہیں وہ جا کہاں رہا ہے! محسوس یہ ہوتا ہے کہ جیسے نوالے کو حلق سے اُترنے کے بعد عجیب کشمکش کا سامنا ہوتا ہے۔ گویا حلق کی منزل سے گزرتے ہی بے کراں خلاء کا شروع ہو جاتا ہو۔ اب نگلا ہوا کھانا جائے تو کہاں جائے؟ یوں کھایا پیا لاپتا ہو کر رہ جاتا ہے! سائنس دان پتا نہیں کیا کیا ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ ذرا کوئی ایسی مشین بھی تو ایجاد کرکے دکھائیں جو ہمیں بتائے کہ کھائی ہوئی اشیاء پیٹ کے کون سے زون یا سیکٹر میں جمع ہو رہی ہیں!

کھانا پینا اور بہت سے معاشروں میں بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے مگر ہم نے تو خیر سے اِسے زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔ اور یہ ایسا مقصد ہے جس کے حصول کے سرگرداں رہنے کے بعد کسی اور مقصد کے بارے میں سوچنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

لوگ شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے پہنچتے ہیں تو رشتوں اور رشتہ داروں کے بارے میں سوچنے اور پوچھنے کا مرحلہ بعد میں آتا ہے، پہلے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ کھانے میں کیا ہے؟ بریانی یا قورمہ روٹی؟ یا دونوں؟ اور میٹھے میں؟

اور ہاں، ''ٹھنڈی والی کولڈ ڈرنک'' ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مُنہ میں ٹھنسی ہوئی بریانی کو پانی کی مدد سے پیٹ میں دھکیلنا پڑے گا؟

شادی ہال میں نکاح اور رسوم کا طے پانا کبھی کبھی جاں گسل مرحلہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ حاضرین کی واضح اکثریت کھانے کے انتظار میں پہلو بدلتی رہتی ہے۔ ایسے میں لڑکے اور لڑکی والوں کے چونچلے آتشِ شوق کو بھڑکاتے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کھانا کُھلتے ہی لوگ اِس کڑھن کا بدلہ بریانی، قورمے، فرائیڈ چکن، کھیر اور فیرنی سے لیتے ہیں۔ شادی ہال میں آمد سے نکاح تک کم و بیش ڈیڑھ دو گھنٹے کے دوران جو مُنہ غیبت اور گِلوں شِکووں کے باعث کڑوے ہو چکے ہوتے ہیں اُنہیں ''لبِ شیریں'' سے میٹھا کیا جاتا ہے!

کھانے پینے کا معاملہ اِس قدر اہمیت اختیار کرگیا ہے کہ جہاں غم کھانا لازم ہو وہاں بھی کھانے پینے ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ میت کے گھر میں بھی لوگوں کو اس بات کی فکر لاحق رہتی ہے کہ تدفین کے بعد کھانا رکھا گیا ہے یا نہیں۔ اور اگر ہاں، تو بریانی ہے یا قورمہ روٹی۔ مرنے والے کے غم پر پیٹ بھرنے کی فکر تیزی سے غالب آ جاتی ہے۔ میت والے گھر میں بھی لوگ اِس قدر فُرصت سے پیٹ بھر رہے ہوتے ہیں جیسے یہ عمل بھی پس ماندگان کو پُرسہ دینے کا حصہ ہو!

ہمارے ہاں جب سیاست ہے ہی کھانے پینے کا نام تو پھر سیاسی جلسوں میں کھانا کُھلنے پر ہنگامہ کیوں برپا نہ ہو! سچ تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ سیاسی جلسوں میں آخر تک اِس لیے رہتے ہیں کہ کھانے کی تقسیم کا پُرلطف تماشا دیکھ سکیں! ٹی وی چینلز بھی اِس تماشے کو اِس قدر اہتمام سے پیش کرتے ہیں کہ کامیڈی شو کی ریٹنگ خطرے میں پڑ جاتی ہے!

جیالوں کی ایک "تابندہ" روایت یہ بھی ہے کہ پارٹی کے یوم تاسیس، کسی لیڈر کی سالگرہ یا یوم پیدائش پر تیار کئے جانے والے کیک کو متوازن حصوں میں تقسیم کرنے کے بجائے لُوٹ کر کھایا جائے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے جیالوں نے کہیں سے سُن رکھا ہے کہ کیک کو کاٹ کر، بہتر انداز سے تقسیم کرنے کی صورت میں اُس کی لذت کم ہو جاتی ہے! بہر کیف، جیالوں سے سیاسی دُنیا کے دوسرے دِل والوں نے بھی بہت کچھ سیکھا اور سیاسی تقریب میں کھانے کی تقسیم کو "آئٹم سانگ" کا درجہ دینے پر تُل گئے۔ اب حالت یہ ہے کہ سیاسی تقریب کے آخر میں کھانے کی "تقسیم" (یعنی لُوٹ مار) تقریب کا دلچسپ ترین سیگمنٹ بن چکی ہے!

ابھی کل تک کھانے کی تقسیم پر جو دھما چوکڑی مزارات کے ماحول کا خاصہ ہوا

کرتی تھی وہ اب سیاسی جلسوں میں در آئی ہے۔ معاملہ دونوں جگہ مَنّت ہی کا ہے۔ جن کی مُراد پوری ہوتی ہے وہ مزاروں پر لنگر تقسیم کرواتے ہیں۔ اور سیاسی جلسوں میں بھی اہل سیاست مُن کی مُراد پانے ہی کے لیے۔بریانی کی دیگیں عوام کی ندر کرتے ہیں ! فرق صرف یہ ہے کہ باباکے نام پر لنگر مَن کی مُراد بَر آنے پر تقسیم کیا جاتا ہے اور سیاست کے طور پر کھانا pre-emptive strike دان ووٹرز کو بہلانے پُھسلانے کے لیے تقسیم کرواتے ہیں ! پس ثابت ہوا کہ لوگوں کو بابا پر یقین ہو نہ ہو، سیاست دان اپنے ووٹرز پر یقینِ کامل کے حامل ہیں !

مزاروں پر لنگر کی تقسیم ہو یا سیاسی جلسوں کے اختتام پر کھانے کی بندر بانٹ، دونوں ہی معاملات میں لوگوں کا بھرپور جوش و خروش دیکھ کر خیال آتا ہے کہ کاش ہم ملک کو سنوارنے کے معاملے میں بھی ایسے ہی پُرجوش ہوا کرتے ! توبہ ہے صاحب، ہم بھی کھانے پینے کے تذکرے میں کہاں ملک کو سنوارنے کی بات لے بیٹھے !

لوگ اپنے سامنے کھانا دیکھ کر حواس پر قابو نہیں رکھ پاتے تو حیرت کی بات کیا ہے؟ آپ سوچیں گے کھانے پینے کی اشیاء سامنے پا کر حواس کھو بیٹھنا اِنسانیت کی توہین ہے، تحقیر ہے کیونکہ اپنے سامنے چارا دیکھ کر جانور بھی

پاگل نہیں ہوتے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جانوروں کے جذبات اور احساسات نہیں ہوا کرتے! اور اگر ہم بھی کھانے پینے کی اشیاء دیکھ کر جانوروں کی طرح اپنے حواس قابو میں رکھا کریں تو ہمارا شُمار بھی جانوروں ہی میں ہوا کرے گا! کھانا دیکھ کر پاگل ہو جانا خود کو جانوروں کے زُمرے میں شمار ہونے سے بچانے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں!

قدرت نے ہمارے لیے جو اُصول طے کر دیئے ہیں وہ ابدی ہیں۔ مگر کچھ لوگ ہیں جو اِن اُصولوں کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر ٹھہریے، ایسے لوگوں کو اللہ کا نافرمان قرار دینے میں عُجلت سے کام مت لیجیے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے اِسی دُنیا میں گناہوں کی سزا مقرر کر دی گئی ہو! ہم نے صحافت کی دُنیا سے تعلق رکھنے والے احباب کے ساتھ اِسی خوش گمانی میں رات کی ڈیوٹی کو برداشت کر رکھا ہے! ع

دِل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے!

ہمارے کئی صحافی دوست ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ کے اِس فرمان پر یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ رات آرام کے لیے بنائی گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہ احباب رات کی ڈیوٹی کا بیشتر حصہ سو کر گزارتے ہیں! اور جب تک یہ دفتر میں ہوتے ہیں تب تک اِن کے گھر والے بھی (اِن کے دور رہنے کی بدولت) ڈھائی تین پہر سُکون سے سوتے رہتے ہیں! یہ کچھ کچھ وہی کیفیت ہے جو ضمیرؔ جعفری مرحوم نے بیان کی ہے ۔

میری بیوی قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے

وہ بھی ہے آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے!

رات کی ڈیوٹی کے دوران ہم نے بہتوں کا مزاج برہم دیکھا ہے۔ مرزا تنقید بیگ ایک زمانے تک یہ سمجھتے رہے کہ رات کی ڈیوٹی شاید ماں کی بد دُعا کا نتیجہ ہے۔ ماں کے حوالے سے ایسا گمان رکھنا درست نہیں۔ مرزا کو ہم نے بارہا سمجھایا ہے کہ آپ کے اعمال ہی ایسے تھے کہ اللہ نے خالہ جان کو بد دعا کی زحمت سے بچالیا ہوگا!

28 سالہ صحافتی کیریئر کے دوران تقریباً دو عشروں تک رات کی ڈیوٹی دیتے ہوئے ہم نے اِتنا ضرور محسوس کیا ہے کہ رات بھر جاگنے اور اذانوں کے وقت سونے سے چہروں پر ایسا شدید قسم کا کھنچاؤ طاری رہتا ہے کہ شخصیت میں عجیب سا رعب جھلکنے لگتا ہے! محسوس یہ ہوتا ہے جیسے ہمالیہ کی چوٹیوں پر پندرہ بیس سال تپسیا کرکے ابھی ابھی اِنسانوں میں تشریف لائے ہیں! ہمارے بہت سے عامل صحافی دوستوں کے چہرے تین چار عشروں تک رات کی ڈیوٹی دینے کی بدولت اُس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اب اگر وہ ذرا سی توجہ دیں، چند مُستند جملے سیکھ لیں، آٹھ دس معروف وظائف ذہن نشین کرلیں تو لوگ سَروں پر ہاتھ بھی پِھروائیں اور تعویذ بھی لے جایا کریں! اور بد خطی اِن کا بھرم رکھ لے گی۔ اگر وظیفے کے نام پر کسی پریس ریلیز کا پیراگراف بھی لکھ ماریں گے تو کوئی پکڑ نہیں پائے گا!

ایک اِضافی فائدہ یہ ہے کہ رات کی ڈیوٹی والے صحافی جب کام ختم کرکے دفتر سے نکلتے ہیں تو اُن کے چہرے کا ''جلال'' دیکھ کرآوارہ کُتّے بھی سہم کرمزید دُم دبا لیتے ہیں اور رسمی طور پرایک آدھ مصرعِ طرح داغنے کی جُراٗت بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر پاتے ! کہتے ہیں حیوانات کو ''چیزیں'' نظر آتی ہیں۔ عوام میں پائی جانے والی اِس رائے کو عامل صحافی روزانہ دُرست ثابت کرتے رہتے ہیں۔

عامل صحافی کی اصطلاح عام ہونے کی بدولت اب لوگ بعض سینئر صحافیوں کو عامل'' سمجھ کراُن سے ملک کے ماضی و مستقبل کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں !''
اور قسمت کی خوبی دیکھیے کہ پیش گوئی کے نام پر سینئر صحافی جو انٹ شنٹ باتیں کرتے ہیں وہ بیشتر اوقات درست بھی ثابت ہوتی ہیں !

کراچی اچھا خاصا شہر تھا۔ تین ساڑھے تین عشروں تک اِس شہر کا معمول یہ تھا کہ رات آٹھ بجے کھا پی کر 9 بجے پی ٹی وی کا خبرنامہ دیکھنے کے بعد بستر لگادیئے جاتے تھے اور بجے تک لوگوں کی آنکھوں پر نیند کا تسلط قائم ہوجایا کرتا تھا۔ مگر پھر یہ ہوا کہ 10 ٹیکنالوجی نے پلٹا کھایا اور چند چیزوں کی آمد نے لوگوں کے معمولات تبدیل کردیئے۔ پہلے وی سی آر نے غضب ڈھایا، پھر

ڈش نے ہوش اڑائے اور اب موبائل فون قیامت ڈھانے پر تُلا ہوا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بعض عاقبت نا اندیشوں نے "روشنیوں کے شہر" کی ایسی گردان لگائی کہ اِس شہر کے باشندے رات بھر اُلّو کی طرح جاگنے کو بھی فخر کی بات سمجھنے لگے ! یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ اچھی خاصی پُر سکون نیند کا گلا گھونٹ کر رات بھر اُلّو کی طرح جاگتے رہیے اور سڑکوں پر خواہ مخواہ گھوم پھر کر اُنہیں اپنی موجودگی کا احساس دلایئے جو بے چارے دِن بھر کی لاحاصل بھاگ دوڑ کے بعد دُم دبائے سڑک کے کنارے یا کسی کونے کھدرے میں سُستا رہے ہوتے ہیں ! رات بھر کا بے مصرف جاگنا انسانوں کو تو کیا سکون دے گا، ہاں یہ عمل بعض بے زبانوں کا سکون ضرور غارت کرکے دم لیتا ہے!

کہتے ہیں رات کے پچھلے پہر جب انسان سو جاتے ہیں تو اللہ کی دوسری بہت سی مخلوقات جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ کراچی میں کئی علاقے ایسے ہیں جو رات بارہ بجے کے بعد بیدار ہوتے ہیں۔ اِن علاقوں میں رہنے والے زمانے سے اُلٹے چل رہے ہیں۔ یہ لوگ دن کے بارہ یا ایک بجے بیدار ہوتے ہیں، دو بجے دکان کھولتے ہیں اور رات دس بجے واپسی کے بعد ریفریش ہو کر گھر سے نکلتے ہیں اور پوری رات خوش گپّیوں میں گزارتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اِنہیں رات کو نکلنے والی مخلوق میں شمار کرلیں!

کراچی میں کھارادر، رنچھوڑ لائن، حسین آباد، برنس روڈ، صدر، سولجر بازار اور چند دوسرے علاقوں میں لوگ دن کو رات اور رات کو دن کے طور پر برتتے ہیں۔ اِن کی گھڑی اُلٹی ہے۔ یہ رات کے راہی ہیں۔ دِن میں ملیے تو اِن کے حواس ٹھکانے پر نہیں ملیں گے۔ سورج کی روشنی اِن کے لیے کاہلی کا پیغام لاتی ہے۔ اُدھر سُورج ڈوبا اور اِدھر یہ طلوع ہوئے۔ شام کا دُھندلکا پھیلتے ہی اِن کے دِل و دِماغ کا اُفق رنگ و نُور سے بھر جاتا ہے۔ شام ڈھلے سے صبح ہونے تک اِن کے لیے زندگی ہی زندگی ہے۔ ع

یہ کاروبارِ شب اِنہی سوداگروں سے ہے

رات بھر جگمگانے والے علاقوں میں ہر معاملہ رواج کے برعکس ہے۔ حلوہ پوری صبح کے وقت کھائی جانے والی چیز ہے، کھارادر وغیرہ میں یہ آئٹم رات بھر چلتا ہے۔ اِن علاقوں کے فوڈ اسٹالز پر توے رات بھر کھڑکھڑاہٹ پیدا کرتے رہتے ہیں۔ خوشبوئیں اُٹھتی رہتی ہیں اور لوگ کھا کھا کر ایسے بوجھل ہو جاتے ہیں کہ اُٹھ نہیں پاتے!

چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے ہوٹلوں نے بھی منزل کا کردار ادا کرکے قدم قدم پر رات کے راہی پیدا کئے ہیں۔ رات کی پُرسکون نیند سے الرجک اور دُنیا بھر کے لاحاصل موضوعات پر بحث کے شوقین اپنی لایعنی باتوں سے ہوٹل آباد کرتے

ہیں اور کراچی کو روشنیوں کا شہر ثابت کرنے پر تُلے رہتے ہیں! رات رات بھر باتیں کرنے پر بھی اِن کا دِل نہیں بھرتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اگر پوچھیے کہ بھائی رات بھر کیا باتیں کرتے ہو تو کوئی جواب نہیں بن پڑتا! کبھی اِن کے درمیان بیٹھ کر گفتگو سُنیے تو آپ پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ دو تین باتوں ہی کو رات بھر دُہراتے رہنا ممکن ہے؟ اگر آپ سمجھتے ہیں ممکن نہیں تو آپ غلطی پر ہیں۔ رات کے راہی جب بولنے کے فن میں طبیعت کی جولانی دِکھانے پر آتے ہیں تو دو تین جُملوں کو سو طریقوں سے رات بھر رگڑتے رہتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ ہر بار بات نئی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ ''اہلِ ذہن'' موضوع کے بھی مُکلّف نہیں ہوتے! سچ تو یہ ہے کہ جب یہ رات کے راہی ہائی پچ پر ہوتے ہیں تو ہر موضوع تپلی گلی سے نکل لیتا ہے!

جن کی زندگی رات سے وابستہ ہے اُن کے سَروں پر رات کا نشا ایسا سوار ہے کہ لاکھ منتر پُوچھیے، کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ اور سچ پوچھیے تو یہ مُلک بھی مزاجاً رات کا راہی ہے۔ دُنیا اُجالوں کی طرف بڑھ رہی ہے اور ہم اندھیرے کی رفتار ناپنے پر کمربستہ ہیں!

باتوں کے فیشن ڈیزائنز

ہر چیز کی ماہیت تبدیل ہو رہی ہے۔ کل تک جو کچھ بہت معیوب تھا وہ اب مقبول ہے۔ لوگ عشروں، بلکہ صدیوں کی روایات کا سینہ چاک کرکے اپنی مرضی کے اطوار پیدا کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یعنی دو عشروں میں سب کچھ ایسا بدل گیا ہے کہ ع
..... پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی !

فلم اسٹوڈیوز میں کام کرنے والے جہاں دیدہ افراد صرف خوش شکل ہی نہیں بلکہ عام سے نقوش والے نوجوانوں کو بھی احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ پتا نہیں کب کون ہیرو بن کر لاکھوں دِلوں پر راج کرے ! اِسی طور اب کچھ پتا نہیں کہ کب کون سی بُری عادت زمانے سے قبولیت کا درجہ پاکر سَر کا تاج بن بیٹھے !

اُس دور یا عہد کو گزرے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا جب خاموش رہنے کو دانائی کی علامات میں شمار کیا جاتا تھا۔ جنہیں بولنا نہیں آتا تھا وہ خاموش رہ کر گفتگو کے فن کی توقیر بڑھاتے تھے ! خاموش رہنے میں بھلائی ہے کیونکہ بسا اوقات خاموشی کی بدولت جہالت اور نیت چُھپی رہتی ہے۔ بات زبان سے نکلی،

کوٹھوں چڑھی۔ یعنی بند ہو مُٹھی تو لاکھ کی، کھل گئی تو خاک کی۔ وہ بھلے زمانے تھے کہ لوگ خاموش رہ کر زیادہ بولتے تھے یا بہتر بولنے کے لیے خاموش رہا کرتے تھے۔
.بروقت خاموشی کو گفتگو کا عرق اور نکھار سمجھنا چاہیے۔
آپ سوچ رہے ہوں گے ہم بھی کیا داستان لے بیٹھے۔ یہ سب تو گئے وقتوں کے قصے ہیں۔ اب تو خاموشی کے درشن ہی نہیں ہو پاتے۔ ہر طرف شور و غل ہے، ہنگامہ ہے۔ جسے دیکھیے وہ طرح طرح کی ہاؤہُو میں حصہ ڈالنے کے لیے بے تاب ہے۔ اور اِس میں ہرج ہی کیا ہے؟ جب گفتگو کے نام پر شور شرابے اور ہاؤہُو ہی کی قدر ہے تو انسان خاموش رہ کر کیوں اپنے نمبر گھٹائے؟
بدلتے زمانے کے رجحانات نے گفتگو کے فن کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔ وہ بھی کیا لوگ تھے جو "بے فضول" کی گفتگو سے الرجک رہا کرتے تھے۔ بے محل بولنے والوں کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن بھلے مانسوں کو کیا معلوم تھا کہ ایک دور ایسا بھی آئے گا جب سوچے سمجھے بغیر بولنے ہی کی وقعت ہوگی۔ عزت اُسی کو ملے گی جو، !انٹ شنٹ ہی سہی، بولے گا
خیر سے ہم اُسی دور میں جی رہے ہیں۔ اب اگر کچھ دیر (باجواز ہی سہی) خاموش رہیے تو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی جرم سرزد ہوگیا ہو! جو جتنا

اور جس قدر "بے فضول" بولے گا، اُتنا ہی زیادہ صلہ پائے گا یعنی مال بنائے گا۔ گفتگو کے فن پر غور فرمانے والا غور فرماتا ہی رہ جائے گا، یعنی اپنے بند مُنہ کے ہاتھوں مُنہ کی کھائے گا!

ایک قیامت ہم سب پر سوا یا ڈیڑھ ماہ بعد گزرتی ہے۔ جب ہم محلے کے ہیئر ڈریسر کے سامنے گردن جُھکا کر بیٹھتے ہیں تو وہ سَر کی کم اور دماغ کی حجامت زیادہ بناتا ہے! قینچی کم اور زبان زیادہ چلتی ہے۔ اور جب کوئی قینچی یا اُسترا لیکر سَر پر کھڑا ہو تو کسی بھی نکتے پر زیادہ بحث بھی نہیں کی جاسکتی اور اختلافِ رائے کا تو خیر سوچا بھی نہیں جاسکتا!

بولنے کے فن میں درزی بھی کسی سے کم نہیں ہوتے۔ قینچی کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی کٹنگ کرتے ہیں اور ایک سوال کے دس جواب دیکر گاہک کو لاجواب کرکے دم لیتے ہیں۔ اگر کوئی چیز غلط بھی سی دیں تو بخیے اُدھیڑے بغیر مُنہ سے آلٹریشن کردیتے ہیں! اب بدلتے زمانے کے فیض سے اپنی بات انگریزی میں بیان کرنے والے درزی فیشن ڈیزائنر کہلائے جانے لگے ہیں۔

بولنے کے فن میں باورچی بھی کسی سے کم تھے نہ ہیں۔ ابھی کھانا پکانے کا آغاز بھی نہیں کیا ہوتا کہ وہ شیخی بگھارنا شروع کردیتے ہیں! اگر دیگ یا

پتیلے میں کوئی چیز کچی رہ جائے تو باتوں کی آنچ سے پکا کر کرم فرماؤں کو مطمئن کر دیتے ہیں! اگر کبھی اعتراض کیجیے کہ فلاں چیز کچی رہ گئی ہے تو اِتنے دلائل دیتے ہیں کہ اعتراض کرنے والے کا دماغ پک جاتا ہے! کس میں ہمت ہے جو خواہ مخواہ اپنا بھیجہ فرائی کرائے؟

چھوٹی اور بڑی ہر دو طرح کی بسوں میں مسافروں کو اپنی چکنی چُپڑی باتوں سے لُبھا کر کسی بھی بے ڈھنگی چیز کو آسانی سے فروخت کرنے والے بھی گفتگو کے فن میں کسی سے کم نہیں۔ وہ جب بولنے پر آتے ہیں تو رفتار میں اُس گاڑی سے آگے نکل جاتے ہیں جس میں سفر کر رہے ہوتے ہیں! بہت سے روٹس تو بسوں سے زیادہ اُن میں سوار ہونے والے اِن دکانداروں کی بدولت زیادہ مقبول ہیں!

ہم جس میں جی رہے ہیں وہ کسی بھی چیز میں زیادہ سے زیادہ خصوصیات جمع کرنے کا زمانہ ہے۔ اپنے پاس پڑے ہوئے موبائل فون سیٹ پر ہی غور کیجیے۔ ایک ہی سیٹ میں کال سُننے اور ایس ایم ایس بھیجنے کے علاوہ تصاویر کھینچنے، مووی بنانے، آواز ریکارڈ کرنے، ای میل چیک کرنے، کتب پڑھنے اور محل وقوع تک معلوم کرنے کے آپشنز موجود ہیں۔ اب تو پروجیکٹر موبائل بھی عام ہیں جن کی مدد سے کوئی بھی فلم یا وڈیو کلپ بڑے پردے پر دیکھی جا سکتی ہے۔ موبائل فون سیٹ بنانے والے ادارے ذرا سے سیٹ میں درجنوں خصوصیات سمونے میں کامیاب ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِن کی کارکردگی کا گراف بھی بلند ہوتا جارہا ہے۔ مگر خیر، ٹیکنالوجی کے شاہکار پلاسٹک یا فولاد کی باڈی تک محدود نہیں۔ مختلف سطحوں پر گفتگو کے فن کو نقطۂ عروج تک پہنچانے والے بھی اب ایک پلیٹ فارم پر جمع کردیئے گئے ہیں۔ لیکچررز کا زورِ خطابت، اجتماعات سے خطاب کرنے والوں کی سی گھن گرج، "ماہرینِ آرائشِ گیسو" کی چرب زبانی، باورچیوں کی طرف سے شیخی کا بگھار، درزیوں کی کتر زبانی، بسوں میں مختلف اشیاء بیچنے والوں کے دِل نشیں دلائل، ٹھیلوں پر رکھے ہوئے مال میں سارے زمانے کی خوبیاں سمونے والوں کی خوبیِ گفتار اور ریڑھی پر گلی گلی گھومنے والوں کی شیریں بیانی اگر کسی ایک انسان میں دیکھنی ہے تو ریموٹ کنٹرول ڈیوائس اٹھایئے اور ٹی وی سیٹ آن کردیجیے۔ جی ہاں، اسمارٹ فونز کے مقابل ہم نے متعارف کرائے ہیں ہمہ صفت ٹی وی اینکرز۔ نئے ملبوسات تیار کرنے والوں کو ہم فیشن ڈیزائنر کہتے ہیں۔ اینکرز بھی باتوں کے فیشن ڈیزائنر ہیں۔

گفتگو کا فن ہمارے اینکرز سے شروع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اُن پر ختم ضرور ہے۔ یعنی یہ کہ اب اُن کی انٹری کے بعد گفتگو کا فن خطرے میں ہے! ہمارے میڈیا زدہ معاشرے میں یہ وہ بزرجمہر ہیں جن کے پاس دُنیا کے ہر مسئلے کا زبانی حل موجود ہے۔ تھوڑا سا وقت نکالیے، سکون سے بیٹھ کر چند اینکرز کو سُنیے اور پھر اندازہ لگایئے کہ اِس دنیا کا کون سا مسئلہ ہے جو اِن کے ذہن

کے راڈار سے بچ سکتا ہے؟ اِن کی گفتگو میں کئی ماہرین کی گفتگو کا نچوڑ ملتا ہے۔ کہیں یہ بس میں ’’ہر مال پانچ روپے‘‘ کی صدا لگانے والوں کا سا صوتی تاثر پیدا کرتے ہیں۔ کبھی یہ گلی سے گزرنے والے ریڑھی والے کی طرح پُکارتے، للکارتے ہوئے اپنے نظریات‘‘ کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کوئی اِن کی بات نہ ’’ مان رہا ہو تو یہ پہلوانوں کی طرح بڑھکیں لگانے سے بھی باز نہیں آتے۔ کبھی یہ کامیڈی پر تُل جاتے ہیں اور کبھی باتوں ہی باتوں میں اپنے پروگرام کے شرکاء کو کنفیوز کرنے کے لیے ہارر فلموں کا سا ماحول پیدا کرنے پر اُتر آتے ہیں! جس طرح لوگ چبوتروں پر بحث کے دوران بات بات پر پلٹا کھاتے ہیں اور موقف پر موقف بدلتے جاتے ہیں بالکل اُسی طرح ہمارے یہ عجوبۂ روزگار اینکرز بھی کسی مقام پر رُکتے نہیں، ایک موقف کو ترک کرکے فوراً اگلے موقف کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ بقول ساحرؔ لدھیانوی ؎

یہ زندگی کسی منزل پہ رک نہیں سکتی
ہر اِک مقام سے آگے قدم بڑھاکے جیو!

ہمارے محبوب اینکرز ہر مقام سے اِس آسانی کے ساتھ گزر جاتے ہیں کہ اِن کی ادائیں اور مہارت دیکھ کر بہت سے جان سے گزر جاتے ہیں۔
حتمی نکتہ یہ ہے کہ جناب کہ دنیا بھر میں مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں سیاسی ٹاک شو دیکھیے تو لاینکرز مسئلہ پیدا کرتے بھی دکھائی دیں گے۔ کوئی مسئلہ پایا جائے گا تبھی تو اُس کا حل بھی تلاش کیا جاسکے گا! یہ وصف اللہ دے تو دے، بندے کے بس کی بات نہیں!

جل بھی چکے پروانے، ہو بھی چکی رُسوائی

تسلیم شدہ اُصول تو یہ ہے کہ جو تکلیف دے اُس سے دور رہا جائے، تعلق ترک کردیا جائے۔ جس سے وفا کی برائے نام بھی اُمید نہ ہو اُس سے دامن کش ہو رہنے ہی میں فلاح پوشیدہ ہے۔ مگر ہم نے تو جیسے تمام مُسلّمہ اُصولوں کو نظرانداز، بلکہ تاراج کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ کم از کم امریکا کے معاملے میں تو قدم قدم پر یہی ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے۔

میر تقی میرؔ نے کہا تھا ۔

میرؔ کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عَطّار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں!

ہمارے لیے امریکا وہی عَطّار کا لونڈا ہے اور اُس کے باعث بیمار پڑنے کا ایسا چسکا پڑا ہے کہ ہم کسی طور کچھ بھی سیکھنے کی طرف مائل ہی نہیں ہوتے۔ ہوں بھی کیسے؟ کبھی شخصی یا انفرادی مفادات آڑے آجاتے ہیں اور کبھی معاملات ریاستی سطح پر ایسے اُلجھ جاتے ہیں کہ لاکھ سُلجھائے نہیں سُلجھتے۔ وارفتگی کا عالم یہ ہے کہ امریکا کی خوشنودی تو عزیز ہے ہی، اُس کی ناراضی بھی اچھی لگتی ہے کہ اِس صورت میں رُوٹھے یار کو منانے کا موقع ملے گا! اِس مرحلے

میں پھنسے ہوئے لوگ حاشیہ برداری کے کمالات دِکھانے پر تُل جاتے ہیں۔

نائن الیون کے بعد جب امریکا نے افغانستان میں پنجے گاڑے تو بہت سوں کی آنکھیں چمک اُٹھیں کہ اب واحد عالمی قوت کی خدمت کا بہتر موقع اور من چاہا، بلکہ مُنہ مانگا صِلہ بھی ملے گا۔ شہنشاہ جب نوازنے پر آتے ہیں تو کسی حد کا کب سوچتے ہیں؟ اور کون سا اپنی جیب سے کچھ جاتا ہے؟ کسی کو لُوٹا اور اُس لوٹ کے مال ہی سے کسی کو نواز دیا!

افغانستان میں بارہ برس کے دوران جو کچھ ہوا ہے اُس کے نتیجے میں ہمارے قومی مفادات کی ایسی تیسی ہو گئی ہے۔ مگر یہاں کون ہے جسے اب قومی مفادات کی فکر لاحق ہو؟ اور کیوں ہو؟ سب کو اپنی تجوریاں بھرنے سے غرض ہے۔ مُلک اگر بِک بھی جائے تو اُن کی بلا سے۔

دودھ دینے والی گائے کی لات کھانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی۔ امریکا ہمارے لیے کبھی دودھ دینے والی گائے ثابت نہیں ہوا مگر پھر بھی ہم اُس کی لاتیں کھاتے جاتے ہیں اور ستائش کے ڈونگرے برساتے جاتے ہیں۔ تمام معاملات میں غیرت اور شرم کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا گیا ہے۔ جو ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں اُنہیں شاید اب یہ بھی یاد نہیں غیرت اور شرم بھی کوئی چیز ہوا کرتی ہے!

افغانستان میں امریکا اور اس کے ہر طرح کے اتحادیوں کی آمد کے بعد ہماری طرف سے دستِ تعاون دراز کرنے کا سلسلہ یوں شروع ہوا کہ اب تک ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ افغانستان میں امریکا کو کون سی جنگ لڑنی یا جیتنی تھی؟ مقصود صرف یہ تھا کہ ایشیا میں کہیں بہتر ٹھکانہ قائم کرکے پورے خطے کو کنٹرول کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ امریکی ایوان صدر اور محکمۂ خارجہ اپنے عوام کو اِس قدر احمق سمجھتا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا نام لیا جائے گا اور وہ مطمئن ہوجائیں گے۔ اِتنے بھولے تو افغان عوام بھی نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُن کی سرزمین پر امریکی اور یورپی افواج کی آمد کسی اور ہی مقصد کے لیے تھی۔ غیر ریاستی عناصر کسی بھی حال میں اِتنے طاقتور نہیں ہو سکتے کہ اُن سے نمٹنے کے لیے باضابطہ بین الاقوامی جنگ چھیڑی جائے، اور وہ بھی واحد سُپر پاور کی قیادت میں!

ہم نے امریکا کی خوشنودی کی خاطر گردن جُھکاتے ہوئے اُس جنگ کی بھٹی میں کودنا گوارا کرلیا جو ہماری تھی ہی نہیں۔ دُنیا نے یہ تماشا خاصی دلچسپی سے دیکھا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی مخالفت میں یورپ بھر میں مظاہرے ہوئے، جنوب مشرقی ایشیا بھی میدان میں نکلا، جنوبی امریکا نے بھی مقدور بھر مذمت کی مگر اِس جنگ کے خلاف ٹھوس احتجاج کی توفیق اگر نہ ہو سکی تو بس ایک ہمی

کو نہ ہو سکی! غیر ہمارے لیے آواز اُٹھا رہے تھے۔ یہ ''مُدعی سُست، گواہ چُست'' والا معاملہ تھا۔

امریکا، مشکلات سے دوچار ہی سہی، ہے تو سُپر پاور۔ اُس کا کیا بگڑنا تھا؟ اور افغانوں کے پاس تھا کیا جو بگڑتا؟ پرائی آگ میں جل کر خاک ہوئے تو ہم۔ گھر جلا تو ہمارا، خاکستر ہوئے تو ہمارے مفادات، برباد ہوئی تو ہماری معیشت، نام ونشان مٹا تو ہمارے امن اور استحکام کا۔ نائن الیون کے بعد اگر امریکا کے دباؤ پر انسدادِ دہشت گردی کی جنگ میں شریک ہونا بھی تھا تو ایک خاص حد تک ایسا کیا جانا چاہیے تھا۔ ہو سکتا شروع میں ایسا کرنے کا سوچا بھی گیا ہو۔ مگر جب ڈالرز کی بارش ہوئی تو سبھی ''غُسلِ مفاد'' کے لیے بے تاب ہو گئے۔ خود کو واحد سُپر پاور کا زیادہ سے زیادہ وفادار ثابت کرنے کی دُھن میں یارانِ وطن کچھ زیادہ ہی آگے نکل گئے۔ بعض تو واپسی کے قابل بھی نہ رہے۔

افغانستان پر سابق سوویت یونین کی لشکر کشی کے دور میں اہل جہاں پُکارتے ہی رہ گئے تھے ع

تُجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو!

مگر ہم کب ماننے والے تھے۔ اور یوں ایک بار پھر پرائے پَھڈے میں ٹانگ اَڑا کر اپنے لیے معاملات اُلجھائے گئے۔ کہتے ہیں مومن ایک سُوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ ہم تو کئے بار ڈسے گئے ہیں۔ اب یہ مت کہیے گا کہ ہم کہاں کے مومن ہیں!

نائن الیون کے بطن سے پیدا ہونے والے حالات نے ہمارے امن اور استحکام کو قبر کی آغوش تک پہنچا دیا ہے۔ ایک تماشا تھا جو اب خاتمے کی منزل میں ہے۔ امریکا کو شمع صفت سمجھ کر ہم نے پروانوں کا کردار ادا کرتے ہوئے موجود سے معدوم ہو جانے کو مقسوم جانا۔ یہ تعبیر کی غلطی تھی۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ غلطی کو دُہرانے کا عمل بھی اعزاز سمجھ کر جاری رکھا گیا ہے!

امریکا بہادر کی خوشنودی کی خاطر جو کچھ بھی کیا جاتا رہا ہے اُس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ افغانستان کی لڑائی اب ہماری سرزمین پر لڑی جارہی ہے۔ اوکھلی میں سَر دینے کا یہ نتیجہ تو نکلنا ہی تھا۔ پانی گلے تک آگیا ہے تو اربابِ بست و کشاد کو فکر لاحق ہوئی ہے کہ دہشت گردی کے سَدِباب کے لیے ٹھوس بنیاد پر کچھ کیا جائے۔ اب کچھ کیا بھی جا سکتا ہے یا نہیں، اِس بحث میں پڑے بغیر دُعا یہ کرنی چاہیے کہ حکومت اپنے ارادے میں کامیاب ہو اور ساتھ ہی یہ اُمید بھی رکھنی چاہیے کہ اُس کا ارادہ واقعی وہ ہے جو دکھائی

دے رہا ہے۔

بہت سوں کا خیال یہ ہے کہ عسکریت پسندوں کے خلاف کارروائی میں اب بہت تاخیر ہو چکی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے جاں بہ لب ہونے پر علاج کے بارے میں سوچا جائے! جو کچھ وطن اور اہلِ وطن پر گزرنی تھی وہ تو گزر ہی گئی ہے۔ اب کیا رہ گیا ہے جسے دُرست کرنے کی فکر لاحق ہوئی ہے؟ مگر خیر، مایوسی کے باوجود لوگ کہہ رہے ہیں

ع

!اُمّید تو نہیں ہے مگر ہاں، خُدا کرے

سیکیورٹی پالیسی کے نام پر ہمارے حکمرانوں نے اپنے ہی لوگوں کے خلاف جو بلنڈرز کئے ہیں اُن کے ازالے کے لیے بہت کچھ کرنا ہوگا۔ شہزاد احمد نے خوب کہا ہے ؎

جل بھی چکے پروانے، ہو بھی چکی رُسوائی

اب خاک اُڑانے کو بیٹھے ہیں تماشائی

دہشت گردی ختم کرنے کے پر ہم نے جو ''کھنڈ'' فرمائے ہیں اُن کے نتیجے میں حالت یہی ہے کہ دُنیا دیکھ کر ہنس رہی ہے اور دُرستیِ حالات کی ہر کوشش کو کامیڈی سمجھ کر اُس سے محظوظ ہوا جارہا ہے۔

امریکا کی دوستی اچھی ہے نہ دُشمنی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دُشمنی شاید بہتر ہو، دوستی تو ہے ہی خسارے کا سَودا۔ شہزاد احمد ہی کا شعر ہے ۔

اب دِل کو کسی کروٹ آرام نہیں ملتا

!اِک عمر کا رونا ہے دو دن کی شناسائی

اور یہاں تو شناسائی بھی چھ عشروں سے زائدمُدت پر محیط ہے ! اگر ہُنود کی اصطلاح میں کہیے تو امریکا سے ہمارے تعلقات تو ہزاروں جنم کا رونا ثابت ہو رہے ہیں ! کسی کو اندازہ نہیں کہ خسارہ بدوش تعلقات کی یہ سیاہ رات کب ختم ہوگی۔ اور حتمی نتائج کا اندازہ لگانا بھی آسان نہیں۔ بقول حسرتؔ موہانی ع

اب دیکھیے کیا حال ہو ہمارا سَحر تک

!شیشہ" پلائی دیوار"

علامہ اقبالؔ کے کلام میں پوری اُمّت کے لیے جو درد اور سوز ہے اُس سے کون ہے جو ناواقف ہے۔ اُن کے کلام کو پڑھتے ہوئے جگر تھامنا پڑتا ہے اور آنسو تو خود ہی آنکھوں میں اُمڈ آتے ہیں۔ مگر خیر، وہ اور ہوں گے جو علامہ اقبالؔ کے کلام کو پڑھتے ہوئے اپنے آنسو روک نہیں پاتے۔ ہمارا معاملہ مختلف ہے۔ علامہ کے کلامِ بلاغت نظام سے مستفید ہوتے وقت جگر تو خیر ہم بھی تھامتے ہیں مگر ہنسی پر قابو پانے کے لیے کیونکہ علامہ کی سادگی پر ہنسی آتی ہے تو پھر تو رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ اور ہنسی رُکے بھی کیسے؟ علامہ نے اُمّتِ بیضہ اور بالخصوص اِس کے نوجوانوں کو مُخاطب کرکے پتا نہیں کیا کیا باتیں کی ہیں، کیسی کیسی توقعات باندھی ہیں، کیا کیا اُمّیدیں وابستہ کی ہیں۔ مثلاً ۔

مُحبت مُجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

کوئی نہیں جانتا کہ علامہ نے اِس شعر میں جن جوانوں کا ذکر کیا ہے وہ کہاں پائے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے ستاروں کی بھی وضاحت نہیں کی۔ اِس سادہ لوحی کا

نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جوانوں نے فلمی سِتاروں پر کمند ڈالنے کو زندگی کا مقصد بنالیا!
ایسی ہی اور بہت سی باتیں ہیں جن پر نوجوان غور نہیں کرتے ورنہ علامہ پر ضرورت سے زیادہ توقعات تھوپنے کا مقدمہ دائر کردیں!

جنوبی ایشیا کے خطے میں اور بالخصوص پاک و ہند میں جب کوئی لکھنے کی ابتدا کرتا ہے تو نوجوانوں کو مشقِ ستم کا نشانہ بنانے پر تُل جاتا ہے۔ ہر نئے لکھنے والے کے پسندیدہ ترین موضوعات میں اسلام اور خواتین، اُمّتِ مسلمہ کا زوال، مسلمانوں کا علمی و اخلاقی انحطاط، پاکستان کا مستقبل اور نوجوانوں کے مسائل و ذمہ داریاں خاصے نمایاں ہیں! کوئی بھی لکھاری اِس منزل سے گزرے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ توقعات کے بوجھ سے نئی نسل کی کمر جُھک گئی ہے اور ساری توانائی جواب دے گئی ہے۔ کوئی لکھنے والا اِس نکتے پر غور نہیں کرتا کہ نوجوانوں کے مسائل پر لکھنے کا حق اب اُن سے زیادہ ڈاکٹرز کا ہے!

نوجوانوں کے معاملات اور اُمور کو اپنی خوش گمانیوں اور شِکوہ سامانی کا نشانہ بنانے والوں میں نوآموز ہی نہیں، کہنہ مشق مصنفین بھی شامل ہیں۔ جب بھی موقع ملتا ہے وہ نوجوانوں کو اُن کے فرائض یاد دلانے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم اب تک سمجھ نہیں پائے کہ جو خود جوانی کے مرحلے سے گزر چکے ہیں وہ نوجوانوں

کو کون سے فرائض یاد دلاتے ہیں! اور خود اُنھوں نے جوانی میں کون سے تیر مار لیے تھے؟

اِس ملک میں، اور اِس پُر آشوب دور میں، لے دے کر ایک ذرا سا عہدِ شباب ملتا ہے۔ یار لوگ اُسے بھی سنجیدگی کی بھینٹ چڑھانے پر تُلے رہتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے، نوجوان اگر نوجوانی میں ہلّا گُلّا نہیں کریں گے تو پھر کب کریں گے؟ کوئی 80 سال کی عمر میں ون وھیلنگ کرتا اچھا لگے گا؟ سڑکوں پر مٹر گشت اور راتیں ہوٹلوں اور پتھاروں پر نہیں گزاریں گے تو عہدِ جوانی کیسے کٹے گا؟ کیا یہ تمام مشاغل 70 سال کی عمر میں اپنائے جائیں جب ہاتھ میں عصا ہوتا ہے اور کانوں میں نکیرین کے سوالات گونج رہے ہوتے ہیں؟

کبھی یہ رونا رویا جاتا ہے کہ نئی نسل دِل لگا کر نہیں پڑھتی؟ اب آپ ہی بتایئے کہ دِل لگانے کے بعد بھی کبھی کوئی پڑھ سکا ہے! ایک طرف تو نوجوانوں کو پڑھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے اور پھر مخلوط جماعتوں کا اہتمام کرکے اُنہیں تعلیم و تعلّم کو بیک وقت آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔ بے چاری نئی نسل کرے تو کیا کرے؟ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں اختلاط کا موقع ملتا ہے تو تعلیم مُنہ دیکھتی رہ جاتی ہے اور ''سادہ مزاج'' لڑکوں اور لڑکیوں کی ساری توجہ ''تربیت'' پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے!

لوگ سمجھتے ہی نہیں کہ پاکستان میں نئی نسل کے کاندھوں پر کیسی کیسی ذمہ داریاں ہیں۔ ایک زمانہ ہے جو وقت کی کمی کا رونا روتا رہتا ہے۔ کوئی ہماری نئی نسل سے رابطہ کرکے معلوم نہیں کرتا کہ اُن کے پاس اِتنا وقت کہاں سے آتا ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا، بلکہ بسا اوقات وقت کو قتل کرنا پڑتا ہے! ہماری نئی نسل کا بُنیادی مسئلہ وقت کی زیادتی ہے۔ قدرت اُسے وقت کی دولت سے اِس قدر نوازتی ہے کہ دن رات لُٹانے پر بھی وہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ اگر وقت کو ضائع نہ کیا جائے تو کہاں ذخیرہ کرکے رکھا جائے؟ اگر وقت کے بھینسے کو کسی طور بس میں کر بھی لیا جائے یا اِس شیر کو سِدھا بھی لیا جائے تو دوسرے بہت سے معاملات ہیں جو نوجوانوں کی صلاحیتوں کو چاٹنے پر کمربستہ رہتے ہیں۔ زمانے بھر کے نشے اِس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ نوجوانوں کی آدھی جوانی تو ہر نشے کو ایک ایک موقع دینے میں گزر جاتی ہے! جوانی بجائے خود نشا ہے اور وہ بھی ایسا کہ چڑھتا ہے تو اُترنے کا نام نہیں لیتا۔ ایسے میں اگر دوسرے نشوں کو بھی سر پر سوار کرلیا جائے تو؟ پھر کون سی ذمہ داری یاد رہ جاتی ہے؟ کوئی بتائے کہ نئی نسل نشوں سے مستفید ہو یا فرائض اور ذمہ داریوں کے بکھیڑے میں پڑے؟

مرزا تنقید بیگ ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور کوئی کام تو ہے نہیں اِس لیے رات قوم اور بالخصوص نوجوانوں کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ ڈھلی ہوئی عمر میں یہ بھی اِس ملک کے لوگوں کا ایک پسندیدہ مشغلہ ہے۔ مرزا کہتے ہیں۔ ”تین چار عشروں سے پاکستان کی نئی نسل کو مختلف نشوں کے ذریعے ایسا آزمائش میں ڈالا گیا ہے کہ اب سبھی کچھ مخمور سا ہو کر رہ گیا ہے۔ سوال صرف منشیات کا نہیں ہے۔ جس چیز کے استعمال سے نشا چڑھ جائے وہ منشیات کے زُمرے میں آتی ہے۔ پنجاب کے نوجوان لسّی پی کر جو لطف پاتے ہیں وہی کیف و مستی کراچی کے نوجوانوں کو گٹکے سے حاصل ہوتی ہے! اور سچ تو یہ ہے کہ لسّی میں وہ بات کہاں جو گٹکے میں پنہاں ہے۔ ایک ذرا سی پُڑیا سارے جہاں کے غموں سے جان چُھڑا دیتی ہے۔“

ہم نے جب بھی مرزا کو گٹکے کے نقصانات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے اُنھوں نے بپھر کر ہمیں یوں گھورا ہے کہ ہمیں اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑا ہے۔ مرزا کہتے ہیں۔ گٹکا وہ جادو ہے جو سَر چڑھ کر بولتا ہے۔“ گٹکا اور جادو؟ آپ بھی حیران ہو رہے ہوں گے۔

بات یہ ہے کہ مرزا ہمیشہ اُن لوگوں کو سخت ناپسند کرتے آئے ہیں جو ہر وقت بَک بَک کرتے رہتے ہیں۔ گٹکے کا نشا کرنے والوں کو مرزا بہت پسند کرتے ہیں

کیونکہ وہ ہر وقت چُپ رہتے ہیں! اور چُپ کیا رہتے ہیں، اُنہیں مُنہ بند رکھنا پڑتا ہے۔ گٹکے کو مُنہ ہی مُنہ میں گھماتے رہنے ہی کا تو سارا مزا ہے! پان کھانے والوں کو پیک تھوکتے رہنے کی زحمت گوارا کرنا پڑتی ہے، گٹکا چبانے والے اِس زحمت سے بھی چُھوٹے۔

کراچی میں چند برسوں کے دوران ایک ایسا نشا متعارف کرایا گیا ہے جسے نشوں کا سردار کہا جاسکتا ہے۔ یہ شیشہ۔ جہاں حُقّے کی جدید ترین شکل جس میں لگژری کا پہلو نُمایاں ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ایک گھنٹہ شیشہ پینا 200 سگریٹ پینے کے برابر ہے! لیجیے، جو نوجوان قوم کے لیے کبھی سیسہ پلائی ہوئی دیوار سمجھے جاتے تھے وہ اب شیشہ پلائی ہوئی دیوار میں تبدیل ہوگئے ہیں! نوجوانوں نے سوچا یہ کیا سیسہ، سیسہ کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ ذرا نقطے لگا کر دیکھتے ہیں۔ بغیر نقطوں کا سیسہ پیا بھی تو کیا پیا!

توقعات کے انبار لگانے والے جب لکھنے پر آتے ہیں تو نئی نسل کو پتا نہیں کیا سے کیا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ نوجوان جب اپنے وجود سے وابستہ توقعات کے بارے میں پڑھتے ہیں تو اُنہیں بھی یقین کرنا پڑتا ہے کہ اُن میں توانائی کے ذخائر پوشیدہ ہیں۔ یہ یقین اُنہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ خود سُپر مین سمجھیں۔ مگر کرنے کو کچھ ہے ہی نہیں اس لیے یہ سُپر مین توانائی کے ذخائر کو ٹھکانے لگانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ کوئی بھی چیز پڑے پڑے خراب اور

ناکارہ ہو جاتی ہے۔ اگر نوجوان اپنی بھرپور توانائی کو ٹھکانے نہ لگائیں تو کیا کریں؟ ضرورت سے زیادہ جوش اور ولولے کا وہ کیا اچار ڈالیں گے؟ اچھا ہے کہ چند ایک مُسلّمہ اور کارگر نشے دستیاب ہیں جو نئی نسل کی مشکل آسان کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو گھن کے ساتھ گیہوں بھی پس جانے والی کیفیت پیدا ہو جائے!

ہنسنے پر کوئی پابندی نہیں

اگر آپ کے پاس وقت کچھ زیادہ ہے، کاٹے نہیں کٹتا اور مارے نہیں مرتا تو پریشان نہ ہوں۔ کسی بک شاپ پر "وقت ضائع کرنے کے 100 آزمودہ طریقے" یا اِس سے ملتے جلتے عنوان کی کوئی اور کتاب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی بھی محفل میں بس ذرا حالات کا ذِکر چھیڑ دیجیے اور پھر دیکھیے کہ لوگ حالات کی سنگینی اور اہل وطن کی بے حسی ثابت کرنے کے لیے کتنی دور کی کوڑیاں لاتے ہیں اور کِس کِس طرح روتے، رُلاتے ہیں! اِس دھماچوکڑی میں آپ کا وقت ایسی خوبصورتی سے کٹے گا کہ کہیں cut کا نشان تک نہیں ملے گا!

ہمارے ہاں لوگوں کو رونے کا بہانہ چاہیے۔اِس معاملے میں کچھ لوگ تو بالکل چابی والے گڈے کی طرح ہوتے ہیں یعنی چند جملوں کے ذریعے چابی دیجیے اور پھر خاموشی سے کوئی کونا پکڑ کر تماشا دیکھیے! حالات کی خرابی، بدامنی، مہنگائی، حکومت کی بے حِسی، سرکاری مشینری کی کرپشن، اپنوں کی ناقدری، غیروں کی بے رغبتی، دوستوں کی بے اعتنائی، واقفیت رکھنے والوں کی اجنبیت، گلی کے دکاندار کا کمینہ پن، دودھ والے کی بے رُخی ..... غرض کون سا موضوع ہے جس میں ہمت ہے کہ بچ کر دِکھائے!

دوسری طرف اہل مغرب ہیں کہ شدید مصروفیت والی زندگی بسر کرنے کے باعث ہنسنے کو ترس کر رہ گئے ہیں۔ ایسے میں کوئی معمولی سی مضحکہ خیز بات نظر آئے تو وہ قہقہوں کی بارش کر دیتے ہیں۔ ہمیں رونے کے لیے بھی جواز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور وہ بے چارے ہنسنے کے لیے بھی جواز کی تلاش میں رہتے ہیں! ہالینڈ کا ہیو باس انتہائی خوش نصیب ہے کہ قدرت نے اُسے دائمی ہنسی کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ دو سال قبل ہیو باس کا آپریشن ہوا۔ اِس آپریشن میں ڈاکٹرز اللہ جانے کیا غلطی کر بیٹھے کہ ہیو باس کی کوئی عجیب و غریب رگ دب گئی اور اِس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آپریشن ختم ہونے پر ہوش میں آنے کے بعد اُس نے بات بات پر ہنسنا شروع کر دیا۔ پھر تو یہ ہوا کہ ہر معاملہ اُسے ہنسانے لگا۔ ٹھوکر کھا کر گرنے پر وہ ہنستا، کوئی ٹکرا جاتا تو ہونٹوں پر ہنسی سجی ہوئی ملتی اور ٹکرانے والا اُسے ''زندہ دِلی'' پر سراہتا ہوا چل دیتا! پھر تو یہ بھی ہونے لگا کہ ہیو باس کسی کے مرنے پر تعزیت کے لیے پہنچتا تو آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر ہنسی ہوتی۔ پس ماندگان یہ سوچ کر چپ رہتے کہ کیا پتا ! نفسیات کے ماہرین نے تعزیت کرنے کی کوئی نئی تکنیک متعارف کرائی ہو
رشتہ دار اور احباب یہ سمجھے کہ شاید آپریشن کے دوران ڈاکٹرز نے غلطی سے

ہیو باس کے دماغ کا کوئی اسکرو ڈھیلا کر دیا ہے ! اُنھوں نے ڈاکٹرز کے خلاف ہرجانے کا مقدمہ دائر کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ خیر گزری کہ ہیو باس نے اِس مشورے کو، جیسی کہ توقع تھی، ہنسی میں اُڑا دیا ! یعنی ڈاکٹرز سے اگر کوئی کوتاہی سرزد ہوئی بھی تھی تو اُسی کوتاہی نے اُنھیں بچالیا !

ہیو باس اگر ہمیں مل جائے تو ہم اُس سے اُن ڈاکٹرز کا پتا ضرور معلوم کریں گے جنھوں نے اُس کا آپریشن کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہماری زندگی میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو بات بات پر رونے اور رُلانے پر تُل جاتے ہیں۔ اُن کے پاس اور کوئی کام ہے ہی نہیں۔ ہم چاہیں گے کہ اُن کے دماغ کے چند اسکرو ڈھیلے کر دیئے جائیں تاکہ وہ بھی نارمل اور اِنسانوں والی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اِس صورت میں اُنھیں کچھ ملے نہ ملے، ہم جیسے مصیبت زدگاں کو تھوڑا بہت سُکون ضرور میسر ہو سکے گا !

ہمارے دفتری احباب میں ذوالفقار حسین نقوی بھی شامل ہیں۔ نقوی صاحب اِس قدر سیدھے ہیں کہ انتہائی ٹیڑھے ہیں ! سانس لینا ہم سب کے لیے لازم ہے۔ اور سانس لینے کے لیے آکسیجن ناگزیر ہے۔ نقوی صاحب نے آکسیجن کی طرح پریشانی اور بدحواسی کو بھی اپنے آپ پر لازم کرلیا ہے ! کبھی کبھی یہ کیفیت ایسی شدت اختیار کرتی ہے کہ اگر حالات میں کوئی خرابی دکھائی نہ دے رہی ہو تو نقوی

صاحب زیادہ پریشان ہو اُٹھتے ہیں ! اور اِس کے بعد اُن کی طرف سے پریشانی کا اظہار گرد و پیش میں سب کو بے حواس کرکے چھوڑتا ہے !

ایک زمانہ تھا جب کسی برقی آلے سے مستفید ہونے کے لیے تار سے کنکشن جوڑنا اور بٹن دبانا پڑتا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ریموٹ کنٹرول ٹیکنالوجی متعارف ہوئی یعنی تار کے بغیر دور ہی سے بٹن دبایئے اور مطلوبہ نتیجہ پایئے۔ اِس کے بعد یاروں نے ایسی پیش رفت کی کہ ٹیبل لیمپ اور کھلونوں کو تالی بجاکر چلایا جانے لگا ! یہ تیسرے مرحلے کی ٹیکنالوجی نقوی صاحب تک بھی بہ درجۂ اتم پہنچی ہے۔ اِن کی خوبی یہ ہے کہ کوئی بٹن دبانے کی ضرورت نہیں، کہیں سے کسی خرابی کا معمولی سا اشارا پاکر بھی یہ پیٹ بھر پریشان ہو لیتے ہیں !

نقوی صاحب کا شعبہ وہی ہے جو بیویوں کا ہوا کرتا ہے یعنی دُوسروں کی غلطی کی نشاندہی ! کام کی نوعیت ایسی ہے کہ اب وہ ہر معاملے میں غلطی تلاش کرتے ہیں اور مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہی سکون کا سانس لیتے ہیں۔ پروف کی غلطی پکڑنا بھی نقوی صاحب کے فرائض میں شامل ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ وہ اب خرابیوں کی نشاندہی میں قلبی راحت محسوس کرنے لگے ہیں ! یہ کچھ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے جیسے کسی کے مرنے کی اطلاع پاکر گورکن کی آنکھیں چمک اُٹھیں کہ اب دیہاڑی بنے گی ! مگر مشکل اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب نقوی

صاحب کسی کی غلطی پکڑنے کے بعد خود تو راحت محسوس کرتے ہیں مگر اُس کا رونا رو کر دوسروں کو شدید اُلجھن میں مبتلا اور کوفت سے دوچار کرتے ہیں!

ہم جس ماحول کا حصہ ہیں اُس میں ایسے لوگوں کی بھرمار ہے جو ہنسی خوشی جینے کی آرزو میں رونے کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ غالبؔ کے ایک خط میں مرقوم ہے ۔

پُر ہوں درد سے یوں راگ سے جیسے باجا
اِک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے!

بیشتر پاکستانیوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ بہت سے لوگ دو منٹ کی گفتگو ہی میں پھٹ پڑتے ہیں۔ اُنہیں صرف لٹر لگانے کی دیر ہوتی ہے۔ ذرا سی مہمیز ملتے ہی وہ رونے رُلانے کے سفر پر روانہ ہوجاتے ہیں۔ مگر اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارے ہاں صرف دُکھ اور پریشانیاں ہیں۔ رونا پیٹنا تو سدا کا ہے، اِسی گُدڑی سے ہم "لعل" بھی دریافت کرلیا کرتے ہیں! میرزا نوشہ نے خوب کہا ہے ع

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا!

یاروں نے اپنی مدد آپ کے اُصول کو بنیاد بناکر رنج و غم کی زمین پر مَسرت

کے محل کھڑے کر لیے ہیں۔ پریشانی میں رونا ہی لازم نہیں، کچھ گنگنانے میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ یعنی ؎

دِل کی تنہائی کو آواز بنا لیتے ہیں
درد جب حد سے گزرتا ہے تو گا لیتے ہیں!

حالات کی روش معاشرے کو اُس مقام پر لے آئی ہے کہ جنہیں کل تک موت کا خوف لاحق تھا وہ اب اِس خوف سے لرزاں رہتے ہیں کہ اگر بچ گئے تو کیا ہوگا! یہ خوف کا تازہ ترین ورژن ہے جو ابھی مارکیٹ میں آیا ہے۔ صبح کام پر جانے والے شام کو بہ گھر واپسی کو بھی کارنامہ سمجھنے لگے ہیں! ایسے ہی چند لطائف ہیں جو شدید بے کسی اور بے بسی کی حالت میں بھی ہمارے ہونٹوں پر مُسکراہٹ بکھیرتے رہتے ہیں۔ گویا ؏

مُشکلیں مُجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہو گئیں!

ہیو باس جیسے لوگ خوش نصیب ہیں کہ بیٹھے بٹھائے ہنسی کی دولت مل گئی۔ دل چاہے یا نہ چاہے، چہرہ تو کِھلکھِلاتا ہی رہتا ہے۔ اور کیا چاہیے؟ ترقی کے معاملے میں خوش بختی مغرب پر ختم ہے۔ وہاں کے ڈاکٹرز کے ہاتھوں میں بھی اللہ نے ایسی "شِفا" رکھی ہے کہ اُن سے سرزد ہونے والی کوتاہی بھی کسی کے لیے مَسرّت کا سامان کر جاتی ہے۔ اور اِدھر ہمارا مقدر دیکھیے کہ اونٹ پر بھی

بیٹھے تو کُتّا کاٹ لیا کرتا ہے ! ہمارے ہاں تو ڈاکٹرز بھی ایسے ہیں کہ آپریشن کے دوران غلطی کر بیٹھیں تو مریض مرتے دم تک اپنے وجود کا ماتم کرتا رہتا ہے !

!آپے میں رہیے مہاراج

مہاراج بہت خوش ہیں۔ خوش کیوں نہ ہوں؟ چاروں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔ ایک آدھ کے سِوا تمام بڑی قوتیں اُن کی دیوانی ہیں۔ ہر طرف سے لکشمی کی آمد ہو رہی ہے۔ مزید خوش ہونے کو یہ حقیقت کافی ہے کہ ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لینے کے 43 سال بعد وہ ہمیں بربادی اور تباہی کے دہانے تک پہنچانے میں کامیاب ہوچکے ہیں۔

مہاراج ویسے تو فطری طور پر بھی کم مستحکم اور طاقتور نہ تھے مگر اُنہوں نے کچھ فطرت ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے طور پر بھی تمام پڑوسیوں کو کمزور کرنے کا ارادہ کیا۔ اور پھر اِس ارادے کو پوری دیانت اور ولولے سے عملی جامہ بھی پہنایا، بلکہ پہناتے جارہے ہیں۔ اُنہیں یقین تھا کہ کوئی ایک (چھوٹا) پڑوسی بھی کمزور ہونے سے رہ گیا تو ''گھور انرتھ'' ہوجائے گا!

مہاراج کی چانکیہ نیتی نے تقریباً ہر پڑوسی کو مستقل نوعیت کی مشکلات سے دوچار کر رکھا ہے۔ لے دے کر بس ایک چین ہے جو اُن دست بُرد سے قدرے محفوظ رہا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ اُس نے مہاراج کی ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لیے

!از خود نوٹس کے تحت استثناء لے رکھا ہے

پاکستان اندرونی مناقشوں میں ایسا اُلجھا ہے کہ کم از کم فی الحال تو سَر اُٹھانے کی پوزیشن میں نہیں۔ مگر خیر، پاکستان ہے بہت سخت جان۔ بہت کچھ کھونے کے بعد بھی ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ہاتھ سے کچھ گیا نہیں۔اِس معاملے میں مہاراج کے دِماغ کی کشتی مخمصے کے بھنور میں گھومتی رہتی ہے۔ اُنھوں نے دبانے کی بہت کوشش کی ہے مگر اسلام کی طرح اللہ نے پاکستان کی فطرت میں بھی لچک دی ہے۔ جتنا دبایئے، یہ اُتنا ہی اُبھر آتا !ہے، مہاراج کے سینے پر مُونگ دَلنے کے لیے

بنگلہ دیش کو تو مہاراج کی چانکیہ نیتی نے ہر اعتبار سے طفیلیے میں تبدیل کرکے دم لیا ہے۔ اور یہ نتیجہ کیونکر حاصل نہ ہوتا؟ وہاں تو مہاراج کو غداروں کی ایک پوری لیگ مل گئی ہے جو ڈگڈگی کی صدا کے مطابق اور مداری کے اشارے پر ناچ رہی ہے۔ لیجیے، بات ہی ختم ہوگئی۔ سونار بنگلہ کی عظمت کی قسم کھانے والے جوئے بنگلہ کے نعرے لگاتے لگاتے جے ہند کے غلغلے بُلند کرنے والوں کے آغوش میں جا سوئے۔

سری لنکا میں بھی مہاراج نے بہت سے کھیل کھیلے ہیں اور بیشتر معاملات میں

ذِلّت سے دوچار ہوئے ہیں۔ مگر خیر، سری لنکا ایسی پوزیشن میں نہیں کہ کسی بھی معاملے میں مہاراج کو چیلنج کر سکے۔

نیپال بے چارہ خشکی اور خُشک مزاج ہمسائے سے گِھرا ہوا ہے۔ یہ دنیا کی واحد اعلانیہ ہندو ریاست ہے مگر اُسے سیکیولر ازم کے پردے میں لپٹی ہوئی اصل مگر غیر اعلانیہ ہندو ریاست نے دبوچ رکھا ہے۔ مہاراج سے نیپال کو صرف پریشانیاں اور بحران ملے ہیں۔

رہ گیا بھوٹان۔ وہ تو کسی گنتی ہی میں نہیں۔ اور مالدیپ کب اِتنا اور ایسا ہے کہ مہاراج کو آنکھ دِکھانے کا سوچ بھی سکے؟

غیر معمولی ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اب مہاراج کو پیٹ بھرے کی مستی سُوجھ رہی ہے۔ تجارت اور سیاحت کو تیزی سے فروغ دینے کے نام پر مہاراج نے خالص مغربی انداز سے 180 ممالک کے باشندوں کو آمد پر ویزا دینے کا نظام متعارف کرانے کا اعلان کیا ہے۔ خیر سے اِس بار بھی پاکستان کو ''استثناء'' دیا گیا ہے۔ یعنی پاکستان اُن معدودے چند ممالک میں شامل ہے جن کے باشندوں کو ایئر پورٹ پر ویزا کی سہولت میسر نہ ہوگی۔ اِن ممالک کے باشندوں کو بھارتی ویزا کے حصول کے لیے قطار بند ہونا پڑے گا۔

مہاراج کی طرف سے دوستی اور یگانگت کا یہ پُرخلوص اظہار ہمارے حکمرانوں کی طرف سے ہر وقت دوستی کا دم بھرتے رہنے کی روش کا نتیجہ ہے۔ اہلِ وطن ایک زمانے سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اربابِ بست وکشاد ریشہ خطمی ہوئے جاتے ہیں اور مہا راج ہیں کہ پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ گویا ع

ہم پر یہ سختی کی نظر؟ ہم ہیں فقیرِ رہ گزر!

کے جواب میں بے رُخی ملتی ہے اور اِس پر بھی ہمارے حکمران ۔

دے رہی ہے مزا بے رُخی آپ کی

آپ بولیں نہ بولیں، خوشی آپ کی!

کی تصویر ہوئے جاتے ہیں۔ جب بے رُخی میں بھی لذت محسوس ہونے لگے تو فریقِ ثانی لذت کا گراف بلند کرنے پر متوجہ کیوں نہ ہو؟ اِس کیفیت کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اب اِدھر سے راگ ملہار کا سہارا لے کر امن کی آشا الاپی جارہی ہے اور اُدھر سے ہماری ہر تان کا جواب دیپک راگ کی لپٹوں میں لپٹا ہوا آرہا ہے!

اِدھر سے دوستی اور محبت کے پیام مستقل بھیجے جاتے ہیں۔ جواب نہ آنے پر کوئی استفسار کر بیٹھے تو یارانِ وطن جواب داغتے ہیں ع

ہائے کیا کیجیے اِس دِل کے مچل جانے کو!

یعنی عزت کا کیا ہے؟ وہ تو آنی جانی چیز ہے، بندے کو مستقل مزاج یعنی ڈھیٹ

ہونا چاہیے !

ہزار کوششیں کر دیکھیے، مہاراج ہیں کہ مَن کر نہیں دیتے۔ اور رُوٹھنے کی "وجہِ تسمیہ" بتانے پر بھی آمادہ نہیں ہوتے ! پھر بھی ہم ہیں کہ اُن کے بچھائے ہوئے ہر دام کی راہ میں بندۂ بے دام کی صورت بچھے جاتے ہیں ! جب یار کو منانا ٹھہرا تو پھر کون سی ذِلّت، کہاں کی ملامت اور کیسا پندار؟ ۔

دِل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے !

یکِ طرفہ محبت کا یہ عالم ہے کہ یار کا پُھولا ہوا مُنہ بھی لُطف دے رہا ہے۔ اِس طرف سے دلداری کا اہتمام ہے۔ اور اُس طرف سے بہانہ جُوئی ہے، اِنکار ہے۔ مگر دوستی کی راہ میں ون وے ٹریفک کے اُصول پر ڈٹے ہوئے لوگ حیلہ سازی اور بہانہ جُوئی سے بھی لذّت کشید کرنے کا ہُنر سیکھ رہے ہیں۔ ۔

وہ مان کر بھی نہیں مانتے تو کیا غم ہے
کمال ہم تو "اگر" اور "مگر" کے دیکھتے ہیں !

مثبت یا منفی کی بحث تو بعد کا مرحلہ ہے، مہاراج کی طرف سے تو یارانِ وطن کی حاشیہ برداری کی رسید تک نہیں آتی ! اُردو کے شُعراء جس بُتِ کافر کی باتیں کرتے ہیں اُس کا پُوجنا تو پھر بھی کچھ نہ کچھ رنگ ضرور لاتا ہوگا

مہاراج ایسی ہٹھیلی مٹّی کے بنے ہیں کہ کسی صورت مَن کر ہی نہیں دیتے۔ خدا کو منایئے تو وہ مَن جائے مگر ایسے رُوٹھے یار کو منانا جُوئے شیر لانے سے زیادہ جاں گُسل مرحلہ ہے۔

یارانِ وطن نے مہاراج کو منانے کے معاملے میں جب بھی حد سے بڑھنے کی کوشش کی ہے، جواب میں ذِلّت کا ٹوکرا سَر پر دَھر دیا گیا ہے۔ اِدھر سے جب بھی دوستی اور محبت میں تخصیص کی بات کی گئی ہے، اُدھر سے جواب ''استثناء'' کی شکل میں وارد ہوا ہے۔ تجارت میں پسندیدہ ترین قوم کا درجہ دینے کی بات بھی کیجیے تو مہاراج ہمیں پسندیدگی کے معیار پر لانے کو تیار نہیں ہوتے۔ اُن کا مَن خدا جانے کیسا کٹھور ہے کہ کہیں کوئی نرم گوشہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اظہارِ اخلاص کے جواب میں اُس طرف سے کبھی یہ نہیں کہا جاتا کہ ع

مُجھ سے پہلی سی محبت مِرے محبوب نہ مانگ

!اور یہ جواب آئے بھی کیسے؟ محبت کبھی ہوتی تو یہ بات کی بھی جاتی

بات صرف اِتنی سی ہے کہ چانکیہ داس ہونے کے ناتے مہاراج پڑوسیوں سے تمام معاملات کو صرف تجارت تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ معاملہ لکشمی کی پُوجا کا ہے مگر مشکلات تب پیدا ہوتی ہیں جب لکشمی کی پُوجا یقینی بنانے کے لیے وہ

دُرگا اور کالی کی پُوجا سے بھی گریز نہیں کرتے! یعنی فریقِ ثانی کا "سَروناش" کرنے پر تُل جاتے ہیں! مہاراج ہر معاملے کو تجارت کی چوکھٹ پر ذبح کرنا چاہتے ہیں۔ اِس سے ہٹ کر کچھ کہیے یا مانگ بیٹھیے تو اُن کا مُنہ بن جاتا ہے۔

خطے کی صورتِ حال دیکھتے ہوئے مغرب اور دیگر خطوں کی بڑی قوتیں مہاراج کو اپنی گُڈ بُک میں رکھنا چاہتی ہیں۔ اِس میں بنیادی قباحت یہ ہے کہ دور پَرے کے لوگوں کا ایجنڈا مکمل کرنے کے لیے مہاراج پڑوسیوں کو "گڈ بُک" میں رکھنے کے درپے ہیں!

اپنوں سے تو کیسا شِکوہ کہ ع

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ہاں، مہاراج سے ہم اِتنی بِنتی اوشیہ کریں گے کہ اونچی اُڑان بھرتے سَمے نیچے والوں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں، تُچّھ اور مَلیچھ نہ سمجھیں کیونکہ اُڑان ختم ہونے یا تھکن سے چُور ہونے پر اُنہیں اِن نیچے والوں ہی میں آنا ہے! ؎

آنکھوں میں رہ نہ جائے کہیں پَستیوں کا عکس

اِتنی بُلندیوں سے مِرا گھر نہ دیکھیے!

منظور وسان کی تازہ انٹری

سندھ کی جیلیں منظور وسان کے اختیارات کی قید میں ہیں مگر خود منظور وسان کسی طرح کی قید میں رہنا پسند نہیں کرتے، بالخصوص بولنے کے معاملے میں۔ سندھ کے وزیر جیل خانہ جات گفتگو کے میدان میں ڈاکٹر ذوالفقار مرزا کی طرح بے باک تو خیر نہیں کہ پل میں حساب بے باق کردیں، نہ ہی رحمٰن ملک کے مانند شاطر ہیں مگر وہ جب میڈیا کے سامنے دِل کی دکان کھولتے ہیں تو انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں یعنی سادگی کی انتہا کو چُھونے لگتے ہیں! موصوف ایسا بہت کچھ بیان کر جاتے ہیں جو اُن کے اندر چُھپے ہوئے معصوم بچے کو بے نقاب کردیتا ہے۔ کبھی وہ خواب بیان کیا کرتے تھے۔ اور تب بھی سادگی ہی میں پُرکاری فرمایا کرتے تھے۔ گزرے ہوئے دور میں منظور وسان کے خواب خوب کارگر ثابت ہوئے۔ سُنا ہے جب وہ جیل کے دوروں میں خواب بیان کرتے تھے تو بہت سے قیدی گھبرا کر اعترافِ جرم کرلیا کرتے تھے!

خواب بیان کے پردے میں دِل کی بات بھی منظور وسان اِس خوبی سے کہہ جایا کرتے تھے کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے اور ہم جیسے خوشہ چینوں کو اُن کے خرمن سے لکھنے کو بہت کچھ مل جایا کرتا تھا۔ ہم اُن کے بولنے کی راہ تکا کرتے تھے۔ ع

وہ کہیں اور "لکھا" کرے کوئی!

گزشتہ دورِ حکومت میں پیپلز پارٹی نے کچھ ایسا وقت گزارا کہ اُس سے وابستگی رکھنے والوں کی نیند ہی اُڑ گئی۔ اور جب نیند ہی نہ رہی تو خواب کہاں سے آئیں اور کہاں سمائیں؟ منظور وسان کی سیاست خوابوں کے سہارے چل رہی تھی۔ اپنے خوابوں کے ذریعے وہ مستقبل قریب کا حال بتایا کرتے تھے۔ جب خواب چُھٹے تو منظور وسان نے براہِ راست "پیشین" گوئی فرمانا شروع کر دیا.

سالِ رواں کے آغاز پر صوبائی وزیر جیل خانہ جات نے کسی قیدی کو تو کسی رعایت سے نہیں نوازا مگر ہاں میڈیا سے گفتگو میں چند پیش گوئیوں کو ضرور آزاد یعنی ریلیز کیا۔ ایک پیش گوئی یہ بھی تھی کہ نئے سال میں بہت خوں ریزی ہوگی اور چند سیاسی جماعتوں کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔

ہمیں اِس پیش گوئی میں ایسا کچھ نظر نہیں آتا جس پر اعتراض کیا جائے۔ اِس ملک کے نصیب میں اب قتل و غارت کے سِوا ہے کیا؟ حالات نے ایک مشکل تو آسان تو کر دی ہے۔ خواب دیکھو یا پیش گوئی کرو، کسی بھی کام میں کوئی اُلجھن نہیں۔ حالات کو کہاں بدل جانا ہے؟ وہ تو ویسے ہی رہیں گے جیسے ہیں۔ یعنی بے فکری سے کوئی بھی پیش گوئی کیجیے، وہ درست ہی ثابت ہوگی۔ ثابت ہوا کہ پیش گوئی

ہمیشہ وہ کرنی چاہیے جو حالات سے مطابقت رکھتی ہو اور جس کے ناکام ہونے کا امکان ایک فیصد بھی نہ ہو! شکر ہے سیاست نے منظور وسان کو اِتنا تو سکھا ہی دیا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اُسی کی بنیاد پر پیش گوئی کی جائے تاکہ نوبت کبھی غلط ثابت ہونے تک نہ پہنچے!

ڈاکٹر ذوالفقار مرزا سے قربت کے باوجود منظور وسان نے محتاط ہوکر بولتے رہنے کو ترجیح دی ہے جو اُن میں فراست کا پتا دیتی ہے۔ اِس اعتبار سے دیکھیے تو وہ پیپلز پارٹی میں odd ہیں! اِس اعتبار سے منظور وسان کا وزیر جیل خانہ جات بننا حیرت انگیز نہیں کیونکہ اِس ملک میں (اور بالخصوص پیپلز پارٹی میں) جس کسی نے بھی ذرا سی فراست دکھائی ہے اُسے جیل کا مُنہ دیکھنا پڑا ہے!

پیش گوئی کا یہ طریق نیا نہیں۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ محکمۂ موسمیات نے ایک زمانے سے یہ طریق اپنا رکھا ہے۔ سَر پر کالے بادل کھڑے ہوں تو پیش گوئی فرمائی جاتی ہے کہ بارش کا امکان ہے اور دو تین دن مطلع ابر آلود رہے گا! کوئٹہ میں برف باری ہو تو بلا خوفِ تردید پیش گوئی فرمائی جاتی ہے کہ اب کراچی میں سَردی بڑھے گی اور کئی دن تک ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہیں گی! موسم میں اگر دم ہے تو ایسی پیش گوئی کے برعکس واقع ہوکر دکھائے۔

منظور وسان نے گزشتہ دنوں سندھ اسمبلی کے احاطے میں میڈیا سے گفتگو کے دوران پیپلز پارٹی اور متحدہ قومی موومنٹ کے تعلق کی وضاحت بھی فرمائی۔ کسی رپورٹر نے سندھ کابینہ میں ایم کیو ایم کی شمولیت کے امکان سے متعلق سوال کیا تو منظور وسان نے کہا کہ شادی تو بہت دور کی بات ہے، ابھی تو ایم کیو ایم سے منگنی بھی نہیں ہوئی! لیجیے، سندھ کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان تعلق کی وضاحت ہو گئی۔ اب تک لوگ پتا نہیں کیا کیا سوچ رہے تھے۔ ثابت یہ ہوا کہ لوگ کا سوچنا اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سِوا کچھ نہ تھا۔ لوگ دونوں جماعتوں کے شیر و شکر ہونے اور اِس عمل کے ممکنہ نتائج کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ اے وائے ناکامی! اچھا ہوا کہ منظور وسان نے بر وقت لب کُشائی کرکے لوگوں کو سوچنے کی زحمت سے نجات دلادی۔ منظور وسان کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ ابھی تو کورٹ شپ ہی چل رہی ہے۔ ذرا سا عامیانہ انداز اختیار کیا جائے تو کہا جائے گا کہ سندھ کی دونوں بڑی جماعتیں فی الحال dating کی منزل میں ہیں! دونوں کے لیے اِس نوعیت کے تعلق میں بڑی سہولت ہے۔ جب تک جی چاہا ساتھ رہے اور جب جی بھر گیا تو جُدا ہو لیے۔ کوئی رشتہ ہو تو توڑنا بھی پڑے۔ تعلق کا کیا ہے، جب جی میں آئے توڑ لیجیے اور پھر گنجائش دیکھ کر سہولت کے مطابق جوڑ لیجیے۔ اِس مقام پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ سگریٹ چھوڑنے کے حوالے سے بحث کے دوران ایک صاحب نے کہا۔ ’’سگریٹ چھوڑنا کون سا مشکل کام

''! ہے؟ میں کئی بار چھوڑ چکا ہوں

جہاں مفادات ہر معاملے حاوی اور برتر ہوں وہاں تعلقات اِسی نوعیت کے ہوا کرتے

پر کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض dating ہیں۔ ہمیں پیپلز پارٹی اور متحدہ کے درمیان

کی ضرورت ہے نہ سکت۔ مگر ہاں، دُکھ اِس بات کا ہے کہ سیاسی روابط کا یہ انداز سندھ

ثابت ہو رہا ہے! ''کبھی خوشی، predator کے وسائل اور باشندوں کے لیے سراسر

یعنی کھجور کی date کبھی غم'' والی سیاست صوبے کے عمومی یعنی عوامی مفادات کو

طرح کھا کر گٹھلیاں عوام کے سامنے پھینکتی آئی ہے۔ اور بسا اوقات عوام کو گٹھلی کے دام

! بھی چُکانے پڑے ہیں

لوگ منتظر ہیں کہ رُوٹھنے اور منانے کے اِس تازہ ایکٹ کا ڈراپ سین کب اور کیسے ہوتا

نہیں رہی۔ عوام جانتے ہیں کہ predictable ہے۔ ویسے اب کوئی بھی چیز کچھ خاص

جو کچھ ہوتا آیا ہے وہی ہوگا۔ ایسے میں پیش گوئی کا دَھندا خوب چمک رہا ہے۔ میڈیا کی

مہربانی سے یہ بھی ہوا ہے کہ لوگ جن باتوں کو پہلے سے اور اچھی طرح جانتے ہیں

اُنہی باتوں کو سیاست دانوں اور ''ماہرین'' کی زبانی ذرا مختلف انداز سے سُن کر خوش

ہو لیتے ہیں! جیسے آلو گوشت یا کوئی اور عام سی ڈش اچھی طرح پکانے والی خواتینِ خانہ

یہی ڈِش ٹی وی سے بھی (یعنی دوبارہ) سیکھتی ہیں تاکہ سَند رہے کہ فلاں ایکسپرٹ

سے سیکھا ہے! اِس

عمل میں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف ذائقے کے چکر میں پچھلا ذائقہ بھی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ میڈیا سے ''رہنمائی'' پانے کے خواہش مند اہلِ وطن بھی ایسے ہی انجام !دے دوچار ہوتے آئے ہیں

وفاقی حکومت طالبان سے مذاکرات کے معاملے میں جس بھونڈے پن کا مظاہرہ کرتی آئی ہے اُس کی روشنی (یا اندھیرے!) میں آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ اِن مذاکرات کے تِلوں میں تیل نہیں۔ منظور وسان نے تمام معاملات اور اخبارات کا اچھی طرح جائزہ لیکر پیش گوئی کی ہے کہ مذاکرات ناکام رہیں گے۔ ہمیں بھی یقین ہے کہ منظور وسان ناکام نہیں رہیں گے۔

یہ بات البتہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ چند سیاسی جماعتوں کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ گزشتہ عام انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کی جو حیثیت رہ گئی ہے وہ منظور وسان ہی نہیں، اہلِ وطن بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایسے میں وہ مزید کس جماعت کی بقاء کو لاحق خطرات کا ذکر کر رہے ہیں؟ اِس بات کو سمجھنے کے لیے شاید ہمیں خواب دیکھنا پڑے کیونکہ منظور وسان کا تو خوابوں نے بائیکاٹ کر رکھا ہے! مگر خوابوں کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ یہ ناآسودہ خواہشات ہی کا تو عکس ہوتے ہیں۔ ملک جن حالات سے دوچار ہے اُن کا تقاضا ہے کہ ۔

دیکھ لو خواب مگر خواب کا چرچا نہ کرو
لوگ جل جائیں گے، سُورج کی تمنا نہ کرو!

اور منظور وسان صاحب کے لیے ہمارا پُرخلوص مشورہ ہے۔

بے خیالی میں کہیں اُنگلیاں جل جائیں گی
پیش گوئی ہے" دبی راکھ کریدا نہ کرو"!

اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

امریکا میں اب کے ایسی سردی پڑی ہے کہ گرم دِماغ امریکیوں کے جذبے بھی سَرد پڑ چلے ہیں۔ اگر آپ کو جذبوں کے سَرد پڑنے کا یقین نہیں آ رہا تو ذرا اندازہ لگایئے کہ لوگ آزادی جیسی نعمت کو بھی داؤ پر لگا کر دوبارہ غلامی کو گلے لگا رہے ہیں۔ نیو یارک کی ایک جیل سے کسی قیدی نے بھاگنے کا سوچا اور بھاگ بھی گیا۔ وہ آزادی کے لیے، کھلی فضاء میں سانس لینے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ مگر یہ کیا؟ جیل سے نکلتے ہی اُسے اندازہ ہوگیا کہ سارا سُکون، ساری راحت تو جیل میں رہ گئی؟ سَردی اِس قدر تھی کہ اُس قیدی کے لیے چلنا بھی دوبھر ہوگیا۔ ایک پل بھی ضائع کئے بغیر وہ دوبارہ جیل کی حدود میں داخل ہوگیا!

ہم بھی 66 سال سے اِسی کیفیت کے دائرے میں جی رہے ہیں۔ غلامی کی چار دیواری میں ہمیں سُکون ملتا ہے، راحت محسوس ہوتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ غلامی میں کھانا پینا میسر ہے، بوریا بستر دستیاب ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ غلامی کی حدود سے باہر، آزادی کا موسم غیر معمولی شِدّت کا حامل ہے۔ ہڈیوں میں پیوست ہو جانے والی سَردی یا دِل و دِماغ کو پگھلا دینے والی گرمی سے

!پُرسکون غلامی بہتر ہے

اور اِس راحت بخش غلامی کی قیمت؟

!تھوڑی سی ضمیر فروشی اور ذرا سی بے حِسی۔ اور کیا

اب آپ سوچیں گے جب ضمیر ہی نہ رہا تو کیا رہ گیا۔ سوال یہ ہے کہ جب اور کچھ نہ بچا ہو تو ضمیر کا کیا اچار ڈالیں گے؟ اور یوں بھی آزادی اور غلامی میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کے معاملہ درپیش ہو تو غلامی جیت جایا کرتی ہے۔ دُنیا نے یہ تماشا بھی دیکھا ہے کہ جو اقوام آزادی کو بہت اہمیت دیتی ہیں وہ پھر اُسے ہر قیمت پر برقرار رکھتی ہیں، مگر یہ قیمت دوسری یعنی کمزور اقوام کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اِس زاویے سے دیکھیے تو آزادی بھی غلامی ہی کی ایک شکل ہے۔ آزادی پر سب کچھ لُٹانے کے لیے ہر وقت تیار رہنے والی اقوام بالآخر آزادی کی غلام ہو کر رہ جاتی ہیں! ''مقامِ شُکر'' ہے کہ ہمارے رہبرانِ مِلّت'' کو یہ نکتہ بہت پہلے سُوجھ گیا تھا۔ اُنہیں اندازہ تھا کہ مکمل آزادی کو گلے'' لگانے کی صورت میں بہت کچھ چلا جائے گا اِس لیے اُنہوں نے قوم کو مُشکلات سے !دوچار نہیں ہونے دیا

اپنے ماحول پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالیے۔ بہت سے لوگ غلط کام بھی بہت سُکون سے کرتے دکھائی دیں گے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر آپ

زیادہ حیران ہوں گے تو لوگ آپ کو دیکھ کر حیران ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ اُصول، ضمیر، غیرت، احساس ...... یہ سب کچھ ایک خاص مقام تک ساتھ دینے والی خصوصیات ہیں۔ بہت سے ''عقل مند'' جب دیکھتے ہیں کہ اِن ''اوصافِ حمیدہ'' کے ساتھ جینا جُوئے شیر لانے کے مترادف ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ اگر اِس پوری مشق کا حاصل دُودھ کا حصول ہے تو پھر نہر کھودنے کی زحمت کیوں گوارا کی جائے۔ ''سیانے'' بھی سمجھاتے ہیں کہ تھوڑی سی سودے بازی کیجیے، دُودھ کی نہر آپ کے پیروں کے نیچے بہنے لگے گی! اور پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اوّل اوّل تھوڑی سی اُلجھن ہوتی ہے۔ غیرت ویرت اور ضمیر ومیر کو لپیٹ کر ایک طرف رکھنا پڑتا ہے۔ اور جب بے حِسی اور بے ضمیری کو اپنالیا تو دِل میں چُبھنے والے کانٹے پُھول بن کر پُورے وجود کو سہلانے لگتے ہیں! کوئی خواہ مخواہ پریشان نہ ہو کیونکہ ضمیر کے لیے کوئی خاص الجھن باقی نہیں رہتی! یعنی ع

!دونوں طرف ہے آگ ''سَراسَر بُجھی'' ہوئی

اللہ اُنہیں سلامت رکھے اور ''جزائے خیر'' عطا فرمائے جو اب تک عقل کے تقاضوں کے مطابق کام کرتے آئے ہیں۔ عقل کیا کہتی ہے؟ یہی کہ جس میں طاقت ہو اُس کے سامنے زانوئے احترام تہہ کرنا چاہیے۔ بلکہ موقع اور گنجائش ہو تو کبھی کبھی سجدہ ریز بھی ہو رہنا چاہیے۔ پاکستان قائم ہوا تو ہمارے پالیسی میکرز نے

بھی عقل کو گلے لگالیا۔ علامہ اقبال نے عشق کو عقل پر ترجیح دینا تعلیم کیا تھا۔ اُن کی بات غلط نہیں تھی۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے اور پاکستان کو منصۂ شہود پر لانے کی تحریک کے دوران ہم نے عشق ہی کو تو گلے لگایا تھا۔ عشق نے کام کر دکھایا۔ ملک بن گیا تو عشق کا کام بھی ختم ہوگیا۔ اِس کے بعد عقل کی منزل تھی۔ مُلک چلانے والوں نے عالمگیر زمینی حقائق پر نظر ڈالی اور عشق کے بطن سے ہویدا ہونے والی آزادی کے پہلو بہ پہلو عقل کی غلامی اختیار کی!

1950 کے عشرے میں ہم نے طے کرلیا کہ آزادی پر غلامی کو ترجیح دینا ہے۔ اشتراکیت کو اسلام کے لیے خطرہ گردانتے ہوئے ہم نے مذہب کے علم بردار مغرب کو گلے لگالیا۔ مغرب کا سب سے بڑا مظہر امریکا تھا۔ فطری سی بات تھی کہ امریکا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا تھا، سو کیا۔

آزادی پر غلامی کو ترجیح دینے کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ نکلا۔ کوئلے کی دلالی میں ہاتھ پیر ہی نہیں، مُنہ بھی کالا ہوا کرتا ہے۔ اور ہوا۔ مگر اِس کالک کو بھی یارانِ وطن نے ہنس ہنس کر برداشت کیا کیونکہ کوئلے کے ڈھیر میں کہیں کہیں ڈالر کے چمکتے پتھر بھی تھے! اور ویسے بھی کوئلے کی دلالی میں اگر کالک آئی بھی تو عوام کے حصے میں آئی۔ پالیسیاں بنانے والوں کی تو

پانچوں انگلیاں گھی میں رہیں اور سَر کڑاہی میں!

ہم نے آزادی آگ اور خون کا دریا پار کر کے حاصل کی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ آزادی کے حصول ہی کے لیے نہیں بلکہ اُسے برقرار رکھنے کے لیے آگ اور خون کے دریا عبور کرنے پڑتے ہیں۔ گویا بہ قولِ جگرؔ مُرادآبادی ع

اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

جنہیں سوچنے کی توفیق ملی تھی اُنھوں نے سوچا کہ اب ایسا بھی کیا ہے کہ آزادی کی قیمت ادا کرتے کرتے بندگانِ خدا خود ہی بازار سے ناپید ہو جائیں۔ یعنی ابتدائی مرحلے ہی میں طے کر لیا گیا کہ آگ کے دریا کو "بائی پاس" کرتے ہوئے خُشکی کے راستے آگے بڑھنا ہے! آزادی بہت بڑی نعمت سہی مگر جی کا جنجال کون پالے اور قومی غیرت وغیرہ کے بکھیڑے میں کون پڑے؟ ؎

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے؟

ذوقِ نَظّارہ جمال کہاں!

گویا پہلے مرحلے میں طے کر لیا گیا کہ قوم کو اُلجھن میں نہیں ڈالنا اور آسانی تلاش کرنی ہے۔ سوچنے والوں نے شاید یہ سوچا ہو کہ ہر قوم زیادہ سے زیادہ سختی زیادہ سے زیادہ آسانیاں پیدا کرنے کے لیے برداشت کرتی ہے تو پھر

ریڈی میڈ آسانیاں حاصل کرنے میں کیا ہرج ہے؟ اب اگر اِس مقصد کے حصول کی چوکھٹ پر آزادی قربان ہوتی ہے تو ہو جائے۔ آگ اور خون کے دریا سے گزر کر آزادی کی قیمت تو ہم ادا کر ہی چکے تھے۔ اب مرحلہ تھا آزادی کو کیش کرانے کا! اِس ماحول میں یاروں نے آزادی کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا کہ کبھی ضرورت پڑی تو بروئے کار بھی لائیں گے۔ پھر تو یہ عالم تھا کہ جس طرف سے مال آئے اُسی طرف مُنہ رکھنا ہے! گویا بہ قولِ فیضؔ ع

!جو آئے، آئے کہ ہم دِل کُشادہ رکھتے ہیں

اب حالت یہ ہے کہ کوئی آزادی کی بات کرتا ہے تو ہنسی چُھوٹ جاتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہم کیا اور ہماری آزادی کیا۔ ع

!دِل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچّھا ہے

قوم بھی عقل مند نکلی ہے۔ آزادی کی غلامی اختیار کرنے پر اِس نے آزادی کو اپنے ”فکر و نظر“ کا اسیر بنانے کو ترجیح دی ہے! ایک زمانہ تھا جب دِل میں کچھ چُبھن سی رہا کرتی تھی۔ ضمیر کی خلش سے ڈر لگتا تھا ع

!کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اب خیر سے یہ دَھڑکا بھی نہیں۔ راوی چَین ہی چَین لکھتا ہے۔ اب یہ قوم راکھ

کریدتی رہتی ہے۔ چنگاریاں تلاش کرنے کے لیے نہیں بلکہ اِکّا دُکّا بچی ہوئی چنگاریوں کو ٹھکانے کے لیے!

اسیری یوں راس آئی ہے کہ اب رہائی کا تصور دِلوں کو دہلا دیتا ہے۔ ع

اِتنے مانوس صیّاد سے ہوگئے

اب رہائی ملے گی تو مَر جائیں گے!

اِک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

وقت کا کام گزر جانا ہے۔ مگر ستم یہ ہے کہ وقت صرف گزرتا نہیں، بلکہ اپنے ساتھ ہمیں کئی سُرنگوں سے گزار دیتا ہے! اور ہم زندگی بھر گزرے ہوئے زمانوں کو یاد کرکے کبھی ہنستے ہیں، کبھی روتے ہیں۔

جوانی وہ زمانہ ہے جو آنے سے پہلے ہمیں کئی مراحل سے گزارتا ہے اور گزر جانے کے بعد تو خیر کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ہم اِس میں سے کئی بار گزرتے ہیں۔

سوچا تھا ویلنٹائن ڈے پر کچھ ہلکا پُھلکا لکھا جائے۔ مگر صاحب جس کی جوانی کو گزرے ہوئے ڈھائی عشرے گزر چکے ہوں وہ دِل و دِماغ کے بھاری پن کو لپیٹ کر کون سے طاق پر رکھے؟ طاقِ نسیاں پر تو ویسے ہی بہت کچھ دَھرا ہے۔

چند برسوں سے ویلنٹائن ڈے اِس دُھوم سے منایا جارہا ہے کہ ہم جیسے بہت سے ''مورکھ'' حیرت و سکتے کی ملی جُلی کیفیت سے دوچار ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دُنیا میں محبت پہلی پہلی بار دریافت ہوئی ہے۔ ابتداء میں تو ہم بھی

یہی سمجھے کہ شاید اب تک جو کچھ محبت کے نام پر ہوتا آیا تھا وہ کچھ اور تھا۔ یا تو ہماری دنیا معلوم کائنات میں نہ تھی یا پھر اس کی محبت کچھ اور تھی۔ یاروں نے سینٹ ویلنٹائن کو نئے سِرے سے دریافت کیا اور دُنیا کو بتایا کہ جب جوانی آئے تو باقی سارے دھندے چھوڑ دو اور محبت کے ہو رہو۔ اور یہ مت سوچو کہ نشا اُترے گا تو کیا ہوگا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ سینٹ ویلنٹائن کو تو نئے سِرے سے دریافت کرلیا گیا مگر اُن کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اُس کا کوئی سِرا ہاتھ نہیں آرہا!

آج ہمیں اپنی جوانی کا زمانہ یاد آتا ہے تو شُکر کے سجدے کرنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ جس طور ہماری جوانی گزری تھی اُس کی رُو سے تو ہم آج کے شُرفا کی صفِ اول میں ہیں! اب سوچ سوچ کر ہنسی آتی ہے کہ تب جوانی وارد ہوتی تھی تو سوچا جاتا تھا کون سی لائن میں کیا کرنا ہے، زندگی میں کیا کرنا ہے اور کیا بننا ہے۔ بھری جوانی کے سَر پر زندگی کی فکر پہاڑ کی طرح براجمان ہوتی تھی۔ آج کی نئی نسل مزے میں ہے کہ جوانی ہی کو کُل زندگی سمجھ کر خوش ہو رہتی ہے۔

ہمارے زمانے میں سادگی کی انتہا یہ تھی کہ گلاب کا ڈھیر دیکھ کر گُل قند بنانے کے علاوہ کوئی خیال ذہن میں کوندتا ہی نہیں تھا! اور اگر کچھ گلاب

گُل قند کی تیاری سے بچ رہتے تھے تو اُن کی پتیوں سے خوشبودار پانی تیار کیا جاتا تھا تاکہ میلاد کی محفل یا قبر میں چھڑکنے کے کام آئے!

اُس بھلے دور میں دو دِلوں کو ملانے کے معاملے میں گلابوں کو کوئی کردار ادا کرنے کی زحمت نہیں دی جاتی تھی۔ یہ کانٹے دار مرحلہ خاندان کے بُزرگ طے کیا کرتے تھے۔ گلاب اگر یاد بھی آتے تھے تو اُس وقت جب دولھا میاں بارات کی سر براہی کے لیے نہا کر نئے کپڑے پہن چُکتے تھے۔ تب لوگ تھوڑی سی سجاوٹ کے لیے گلاب کا ہار گلے میں ڈال دیا کرتے تھے تاکہ چیز ذرا اچھی بن جائے!

شُکر ہے آج میڈیا والے نئی نسل کو گلاب کے دُرست استعمال سے آگاہ کر رہے ہیں۔ ذہنوں پر گلاب کی ایسی بمباری کی گئی ہے کہ اب اِس پُھول کو دیکھتے ہوئے دِل و دِماغ میں محبت کے گھنٹے بجنے لگتے ہیں! اب اگر کبھی گلاب کو دیکھ کر سُونگھنے کا جی چاہ رہا ہو تب بھی ہم اپنی خواہش کو دبا دیتے ہیں کہ کہیں ہاتھ میں گلاب دیکھ کر لوگ کسی تازہ محبت کی بُو نہ سُونگھتے پھریں!

میڈیا والے ’’رضاکارانہ طور پر‘‘ بہت کچھ سِکھانے پر تُلے ہوئے ہیں مگر صاحب! آج کی نئی نسل اِس بات کی مُکلّف کب ہے کہ اُسے کچھ سِکھایا جائے.

ہاں اُس کے اَن سیکھے پن سے ہم بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کریں تو کچھ ہرج نہیں۔ اب نئی نسل کھلے ہوئے پُھولوں سے کہیں بڑھ گُل کِھلانے پر یقین رکھتی ہے! عنفوانِ شباب کی کیفیت کو پُھولوں کی حاجت کیا ہو، اُس کی حیثیت تو خود ایک گلستان کی ہے! عمر کے اِس خطرناک موڑ پر تو بوندا باندی میں بھی سیلاب برپا کرنے کی طاقت ہوتی ہے!

پچیس تیس سال پہلے اگر محبت کا کوئی ''کیس'' ہو بھی جاتا تھا تو سات پردوں میں لپٹا ہوا ہوتا تھا تاکہ زمانے کی ہوا نہ لگے۔ فکر دامن گیر ہوا کرتی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ آج کے لڑکوں اور لڑکیوں کو فکر لاحق رہتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ زمانے کو اُن کی محبت کا علم نہ ہو اور مُحبّت کی ''توقیر'' داؤ پر لگ جائے! آگرہ کے نزدیک کِچوری گاؤں میں کسی نوجوان کی شادی ہو رہی تھی۔ وہ ہونے والی بیوی کے ساتھ سات پھیرے لینے ہی والا تھا کہ اُس کی محبوبہ آ دھمکی۔ وہ اپنے باپ اور دو نوجوانوں کے ساتھ موٹر سائیکل پر آئی تھی۔ شادی کے شامیانے میں قیامت برپا ہوئی۔ اُس نے دولھا سے صاف کہہ دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ شادی کے وعدے کسی سے اور شادی کسی سے۔ یہ انتباہ بھی کیا کہ کسی اور سے شادی کی تو جیل کی ہوا کھلاؤں گی! اور پھر سب کے سامنے وہ دولھا کو موٹر سائیکل پر لے اُڑی! اِس واقعے کو پڑھ کر ہمیں پھر اپنا جوانی کا زمانہ یاد آگیا۔ تب کے تو بدمعاش بھی اِتنے بدمعاش نہیں ہوا کرتے تھے!

محبت عین موقع پر کیا کیا گُل کِھلاتی ہے، اِس کا اندازہ کچھ اُنہی کو ہو سکتا ہے جو محبت کی اوکھلی میں سَر دے بیٹھے ہوں۔ ہم تو ذرا سے چاول دیکھ کر دیگ کا صرف اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کانپور کے علاقے کاکا دیو میں ایک لڑکی کی شادی ہو رہی تھی۔ تمام رسمیں انجام کو پہنچ چکی تھیں۔ سات پھیرے ہونے ہی والے تھے کہ لڑکی کا جی متلانے لگا۔ تھوڑی سی تازہ ہوا کھانے کے لیے وہ اپنی ماں کے ساتھ چھت پر چلی گئی۔ اور وہاں ماں کی نظر چوکی تو لڑکی پڑوسی کے لڑکے کے ساتھ اُڑن چُھو ہو گئی! معلوم یہ ہوا کہ دونوں کے گھر ہی نہیں، دِل بھی ملے ہوئے تھے! اب آپ سوچ رہے ہوں گے جب بھاگنا ہی تھا تو پہلے بھاگ جاتی، باپ کا شادی کا خرچہ تو بچ جاتا! اور جات برادری کے سامنے تو ناک نہ کٹتی۔ آپ کی سادگی پر ہمیں ہنسی آ رہی ہے۔ نئی نسل کوئی آپ سے پوچھ کر ایڈوینچر کرے گی! اُس کے اپنے طور طریقے ہیں۔ جو کچھ اُسے کرنا ہے، اپنی مرضی کے مطابق ہی کرنا ہے۔ اور اِسی میں تو مزا ہے! جہاں تک خرچے کا تعلق ہے تو صاحب وہ کہاں بچنا تھا؟ لونڈیا خالی ہاتھ نہیں گئی، ڈیڑھ لاکھ کے زیور بھی لے اُڑی! نئی نسل پاگل ضرور ہے، چریا نہیں ہے۔ اُسے اندازہ ہے کہ ہنگامی قدم اُٹھانے کے بعد سو طرح کے خرچے بھی بھگتنے ہوتے ہیں۔ اور اگر لڑکی زیور سمیت بھاگی تو حیرت کیوں؟ اُسی کے لیے تو بنائے گئے تھے!

یہ سینٹ ویلنٹائن ہی کی مہربانی ہے کہ بہت سی بیکار پڑی ہوئی چیزوں کو عمدگی سے ٹھکانے لگایا جارہا ہے۔ وقت ہی کی مثال لیجیے۔ پاکستانی معاشرے کا ایک بنیادی مسئلہ یہ رہا ہے کہ بے مصرف پڑے ہوئے وقت کو کس طور ٹھکانے لگایا جائے۔ نئی نسل نے محبت کا تیر کھاکے اب وقت کے سینے میں موبائل نائٹ پیکیج کا تیر اُتار دیا ہے! وقت کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہ پڑے پڑے .ڑھتا رہتا ہے۔ اچھا ہے کہ نئی نسل اِسے رات بھر قتل کرتی رہے اور صبح کو توبہ کرلیا کرے! جواں دِلوں کی رات بھر ''سرگوشیانہ'' گفتگو بھی دِلوں کا بوجھ کم کرنے ہی کے لیے ہے۔ ۔

دِلوں کی اُلجھنیں .ڑھتی رہیں گی

!اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

ویلنٹائن ڈے ہماری روایت نہیں مگر اِسے جس خوبصورتی سے ہمارا بلکہ سب کا بنادیا گیا ہے اُس کی داد نہ دینا ذوقِ سلیم کے منافی ہوگا۔ ویلنٹائن ڈے سے اِتنا تو ہوا کہ ہماری نئی نسل کہ جس کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا، ٹھکانے سے لگادی گئی ہے! کیوپڈ کا تیر ٹھیک نشانے !پر لگا ہے۔ کچھ کر گزرنے کی عمر کا مسئلہ قوم کو مبارک ہو

مذاکرات کی ڈگڈگی

کسی بھی بُری عادت کو ترک کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ آپ جب چاہیں ایسا کر سکتے ہیں۔ تمباکو نوشی ترک کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ کسی بھی ''چین اسموکر'' سے پوچھیے کہ بھائی سگریٹ ترک کرنا مشکل کام ہے؟ وہ بولے گا بالکل نہیں۔ اور بتائے گا کہ کئی بار ترک کرچکا ہے! یہی حال ہماری حکومتوں کا ہے۔ اُن سے پوچھیے کہ کیا وہ عسکریت پسندوں سے ڈرتی ہیں؟ جواب ملے گا قطعی نہیں، بالکل نہیں۔ اور پھر وہ مذاکرات کرکے دکھا بھی دیتی ہیں! یہ تماشا ہمارے ہاں اِس قدر برپا ہوا ہے کہ اب اِس میں کسی کے لیے دلچسپی کا کچھ سامان رہا نہیں۔

مرزا تنقید بیگ، جیسی کہ اُن کی عادت ہے، ہماری رائے سے متفق نہیں۔ اُن کے نزدیک حکومت عسکریت پسندوں سے جب بھی رابطہ یا مذاکرات کرتی ہے تب شاندار ڈرامے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ''اِن ڈراموں میں سیاسی شعبدہ گری کبھی مضمر اور کبھی اظہر من الشمس رہی ہے۔ لوگوں کو صرف یہ دیکھنے کا اشتیاق رہتا ہے کہ مذاکرات کی تازہ ترین قسط میں اداکاری کون سے 'اسکول آف تھاٹ' کے تحت کی گئی ہے!''

ہماری کسی بھی حکومت نے جب بھی عسکریت پسندوں سے مذاکرات کا ڈول ڈالا ہے یعنی سیاسی مُشاعرے میں طرح کا مصرع دیا ہے، میڈیا نے لپک کر مصرع اُٹھایا ہے۔ اور کیوں نہ اُٹھائے؟ میڈیا کا تو کام ہی یہ ہے کہ گرتے ہوئے معاملے کو ایسا اُٹھائے کہ لوگ اُٹھے ہوئے اصل معاملات کو بھول بھال جائیں!

اب پھر مذاکرات کی ڈگڈگی بج رہی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے بیشتر مداری اِس ڈگڈگی کی ڈُمک ڈُھمک پر قوم کو بندر کی طرح نچانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ مذاکرات کی ڈگڈگی پر جو تماشا ہو رہا ہے اُسے دیکھنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ میڈیا پر رونق میلہ لگ گیا ہے۔ اینکرز کو کئی ہفتوں کی خوراک یک مُشت مل گئی ہے۔ اُن کی دعائیں رنگ لے آئیں۔ موضوعات ختم ہو چلے تھے۔ عسکریت پسندوں سے مذاکرات کا طبل بجا تو اینکرز کی جان میں جان آئی۔ ماہرین، مبصرین اور تجزیہ کار بھی خوش ہیں کہ چہرہ دکھانے، آواز سُنانے کا کچھ جواز تو بنا۔ جب کوئی معاملہ ہی نہ چل رہا ہو تو میڈیا کا بازار شدید مندی کی لپیٹ میں آتا ہے۔ مگر صاحب، ایسے عالم میں بھی بہر حال لطائف جنم لیتے ہیں۔ ایک ڈیڑھ سال قبل اطالوی صدر پر کسی نے جوتا کھینچ مارا تو میڈیا والوں نے ڈھول پیٹنا شروع کر دیا۔ خبر نشر کرنے کی حد تک تو معاملہ سمجھ میں آتا ہے کیونکہ میڈیا والے رائی ملے تو پربت بنانے میں دیر نہیں لگاتے۔ مگر کمال یہ ہوا کہ ہمارے ہاں کئی چینلز نے سیاسیات کے مستند ماہرین کو فون پر لیا اور

وہ لیڈرز کو جوتا کھینچ مارنے کی نفسیات بیان کرنے بیٹھ گئے! بعد میں پتا چلا کہ جوتا مارنے والے کا ذہنی توازن درست نہیں تھا۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ جس کا ذہنی توازن درست ہو وہ کرپٹ اور عیاش سیاست دانوں کی طرف اُچھال کر جوتے کی توہین کیوں کرے گا؟

حکومت اور کالعدم تحریک طالبان پاکستان کے درمیان مذاکرات کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اُسے دیکھ کر قوم ''ٹُک ٹُک دیدم، دم نہ کشیدم'' کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ ہاؤ ہُو تو بہت ہے مگر محسوس یہ ہو رہا ہے کہ جو کچھ قوم چاہتی ہے وہ نہیں ہو پائے گا۔ معاملات کچھ ایسی نیم دِلی سے چلائے، بلکہ بھگتائے جارہے ہیں کہ بہت سوں کا دِل پُرامید ہونے کو تیار نہیں۔ ہو بھی کیسے؟ اچھی خاصی قتل و غارت ہوچکی ہے، معیشت کا بیڑا غرق ہوچکا ہے اور سیکیورٹی فورسز کا جانی نقصان اِس قدر ہے کہ وہ بُھول نہیں سکتیں۔ اور اگر بُھول گئیں تو ملک کے دیگر چھوٹے عسکریت پسند یا علیحدگی پسند گروپوں کے خلاف کارروائیوں کا جواز اپنی موت آپ مر جائے گا۔

پُلوں کے نیچے سے پانی اچھا خاصا بہہ چکا ہے تب مذاکرات کا خیال آیا ہے۔ حکومت کے لیے بھی عجیب یہ مخمصہ ہے۔ یہ ایک گال میں آگ اور دوسرے میں پانی بھرنے والا معاملہ ہے۔ مذاکرات کے معاملے میں بارہا یہ ہوا کہ ع

جاتے میں قدم اور تھے، آتے میں قدم اور

قوم آس لگائے رہتی ہے اور مثبت نتائج کے انتظار میں سُوکھ جاتی ہے۔ بہاروں کی تمنا میں جینے والوں کے لیے کوئی پُھول تو نہیں کِھلتا، ہاں یار لوگ گل کِھلانے پر ضرور تُلے رہتے ہیں!

عسکریت پسندی کو پروان چڑھانے کا شوق ہمیں بند گلی میں چھوڑ کر اُڑن چُھو ہوگیا ہے۔ اب حالات اِس نہج پر ہیں کہ کمپرومائز کے سِوا چارہ نہیں۔ اب تُھوکا ہوا چاٹنا کون پسند کرتا ہے مگر چاٹنا پڑے گا۔ جنہیں پال پوس کر بڑا کیا گیا ہو وہی اگر طاقت پاکر چڑھ دوڑیں تو کیا کیا جائے؟

ہمارا کیس بھی تو یہی ہے۔ ایک سپر پاور کو ناکوں چنے چبوانے کے لیے دوسری سپر پاور کی مدد سے راہ و رسم بڑھائی گئی۔ غیر ریاستی عناصر کو بڑھاوا دیا گیا۔ کسی کی جنگ ہم نے اپنے آنگن میں لڑی۔ نتیجہ جو نکلنا چاہیے تھا وہی نکلا۔ برباد ہوئے، ذلیل و خوار ہوئے۔ جن عسکریت پسندوں کو بھرپور سرپرستی ملی تھی وہ آخر میں پورس کے ہاتھی ثابت ہوئے۔ داستانوں میں پائے جانے والے دیو کے مانند وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی کام مانگتے تھے اور جب کام ملنا بند ہوا تو وہ ہمیں کو کھانے پر تُل گئے! ع

اِس طرح تو ہوتا ہے اِس طرح کے کاموں میں

مثالیں تو اور بھی بہت ہیں مگر ایک عامیانہ مثال یاد آ رہی ہے۔ ''کسی'' نے خصم کیا، بُرا کیا۔ چھوڑ دیا، یہ اور بُرا کیا۔ ہماری اسٹیبلشمنٹ نے عسکریت پسند پال کر ایک بُرا کام کیا۔ کام نکل جانے پر اُن سے لاتعلق ہو جانا بھی کچھ بُرا نہ تھا۔ مگر معاملہ یوں بگڑا کہ جن کے کہنے پر اپنایا تھا اُنہی کے کہنے پر اُن کا نام و نشان مٹانے کی راہ کا مُسافر ہونا پڑا۔ امریکا ہو یا کوئی اور، جب حکم مانتے رہنے کی عادت اپنالی جائے تو قدم قدم ذِلّت کا ٹوکرا سَر پر دَھر دیا جاتا ہے۔ ع

اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل

عسکریت پسندوں کو ختم کرنے کا ''ٹاسک'' کیا سونپا گیا، ہماری بربادی کا پروانہ لکھ دیا گیا۔ اب ایک بار پھر مذاکرات کو موقع دیا جا رہا ہے۔ صدر ممنون حسین تو کہتے ہیں کہ حُجّت تمام کی جا رہی ہے۔ حسّاس اور نازک موڑ پر اُنہیں پالیسی یوں کُھل کر بیان کرنے سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ مگر خیر، اُنہیں کبھی کبھار ہی تو بولنے کا موقع ملتا ہے اِس لیے موقع شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو بولنا ہو بول جاتے ہیں!

پندرہ بیس دن سے مذاکرات کا کھیل ہو رہا ہے۔ پیش رفت کے دعوے کئے جا رہے ہیں مگر معاملہ ''میری گو راؤنڈ'' جیسا لگتا ہے۔ یعنی بڑے تختے پر لکڑی کے گھوڑے نصب ہیں۔ تختہ گھوم رہا ہے اور لکڑی کے گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے ''شہسوار'' تختے کے گھومنے ہی کو سفر سمجھ کر خوش ہیں۔ ؎

اُس تشنہ لب کی نیند نہ ٹوٹے خُدا کرے
جس تشنہ لب کو خواب میں دریا دکھائی دے!

قوم اب بھی آس لگائے بیٹھی ہے کہ شاید کوّے کے انڈے سے کوئل کا بچہ برآمد ہو جائے! بے جا خوش گمانی یا خام خیالی کا نتیجہ صفر رہتا ہے۔ حکومت مذاکرات تو کر رہی ہے مگر بظاہر خود اُسے بھی اپنی کوششوں کے بارآور ہونے کا یقین نہیں۔ عسکریت پسندوں کے اِتنے گروپ ہیں کہ کسی ایک بڑے گروپ سے بات کر بھی لیں اور وہ قتل و غارت سے باز آ بھی جائے تو بات نہیں بنے گی۔ اور پھر اِس بات کا بھی کسی کو بالکل درست اندازہ نہیں کہ عسکریت پسندوں میں بڑی طاقتوں کے مُلکی اور غیر مُلکی ایجنٹ کتنے ہیں اور کتنے طاقتور ہیں!

خیالات پر مایوسی کا غلبہ سا ہے مگر پھر بھی دِل سے یہی دُعا نکلتی ہے کہ مذاکرات کی کشتی خیریت سے دوسرے کنارے لگے۔ ع

اِس ابتدا کی خدا انتہا بخیر کرے

میڈیا کے لیے مذاکرات کا یہ سلسلہ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا والا معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔
اچھا ہے کہ کوریج کی چند حدود خود ہی متعین کر کے اُن میں رہتے ہوئے کام کیا جائے۔
جلتی پر تیل چھِڑکنا کون سا مشکل کام ہے۔ میڈیا کو اِس معاملے میں مثبت رہنا چاہیے۔۔

نشہ پِلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی!

سیاسی ''انڈر ڈاگز'' اور ایڈیشنل گدھے

چیونٹی موٹر سائیکل چلا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر ہاتھی بیٹھا ہوا تھا۔ حادثہ ہوا تو ہاتھی شدید زخمی ہوگیا۔ چیونٹی محفوظ رہی! بتایئے کیسے؟ ارے..... آپ کس سوچ میں پڑگئے؟ سیدھی سی بات ہے، چیونٹی نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا نا!

آپ سوچ رہے ہوں گے کالم شروع کرنے کا یہ کون سا احمقانہ انداز ہے۔ ایسی بچگانہ باتیں تو دوسری تیسری جماعت کے بچے کیا کرتے ہیں۔ آپ اگر ایسا ہی سوچ رہے ہیں تو آپ کی رائے سَر آنکھوں پر۔ کہیں آپ کا ذہن اِس طرف تو نہیں چلا گیا کہ ہم نے اپنا کالم ایک بے سَر و پا لطیفے سے شروع کرکے کسی مشہور کالم نگار کی نقل فرمانے کی کوشش کی ہے! ایسا نہیں ہے جناب۔ ہم نے کسی کی نقالی کی ہے نہ ہمارے ذہن میں کوئی خلل واقع ہوا ہے۔ ہم کسی کی نقل کریں؟ شوق اگر ہو بھی تو سچ یہ ہے کہ ع
یہ تاب، یہ مجال، یہ جرأت نہیں مُجھے

ہم نے مانا کہ کسی معقول بات سے کالم شروع کرنے کی روش نے ہمیں قدم قدم رُسوا و ذلیل کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہمیں اِس امر کا اعتراف بھی کرنے

دیجیے کہ کسی انٹ شنٹ بات سے کالم شروع کرنا بھی کوئی کھیل نہیں، مذاق نہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے سَر وپا بات کہنے یا لکھنے والے کو لوگ ''دانشور'' سمجھ لیتے ہیں! محض دھاک جمانے کے لیے ایسی بات کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں جس کا کوئی سَر پیر نہ پایا جاتا ہو۔ ع

یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا!

کسی کسی کو اللہ یہ ''توفیق'' دیتا ہے کہ وہ سوچ سمجھے بغیر لکھے اور مقبولیت کے بامِ بُلند تک جا پہنچے! ہم کیا اور ہماری بساط کیا؟ صحافت کے بُزرگوں نے لکھنے کے جو مُسلّمہ اُصول سمجھائے اور سُجھائے ہیں اُنہی پر عمل کرتے ہوئے ہم لکیر پیٹنے کی زندہ مثال بن گئے ہیں اور اب تک نیک نامی کے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں!

آمدم بر سرِ مطلب۔ چیونٹی اور ہاتھی والا آئٹم جب ہمیں لختِ جگر صباحت نے سُنایا تو پہلے ہم یہ سمجھے کہ شاید اُس نے ایک مشہور ٹی وی پروگرام میں سُن لیا ہوگا کیونکہ آج کل اُس میں نام نہاد ''ذہنی آزمائش'' کے نام پر اِسی نوعیت کے سوالات پوچھ کر قیمتی انعامات دیئے، بلکہ لُٹائے جارہے ہیں! وضاحت چاہی تو صباحت نے کہا۔ ''بابا! یہ ٹی وی پروگرام کا آئٹم نہیں، لطیفہ ہے!''

ہمیں یہ تو اندازہ تھا کہ آج کے بڑے رکھیں نہ رکھیں، بچے سیاسی شعور ضرور رکھتے ہیں مگر یہ اندازہ ہرگز نہ تھا کہ اُن کے سیاسی شعور کی سطح اِس قدر بلند ہوچکی ہے۔ آپ پھر سوچ رہے ہوں گے کہ بچے اور سیاسی شعور؟ اِس لطیفے کا سیاسی شعور سے کیا تعلق؟ کیوں نہیں جناب۔ آج کل سیاسی شعور لطیفہ بن گیا ہے یا پھر لطائف کو سیاسی شعور قرار دے کر ہمارے کانوں میں اُنڈیلا جارہا ہے۔ چیونٹی اور ہاتھی والا لطیفہ ہماری سیاست پر انتہائی بلیغ اور جامع تبصرہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یہاں قدم قدم پر یہی تاثر تو مل رہا ہے کہ سیاسی موٹر سائیکل چیونٹی چلا رہی ہے اور ہاتھی بے چارا حادثات کی نذر ہوتا رہتا ہے!

انگریزی میں مختلف حوالوں سے underdog کی اصطلاح عام ہے۔ اُس شخص یا گروہ کو ''انڈر ڈاگ'' کہا جاتا ہے جس کی کامیابی یا فتح کا امکان برائے نام ہو اور جس کی کامیابی کی پیش گوئی کرنے کے لیے بظاہر کوئی تیار نہ ہو۔ اور وہ اچانک کامیابی سے ہمکنار ہو جائے!

جیت جانے والا معاملہ انگریزی میں ہوتا ہوگا، ہماری سیاست میں ہر طرف طرح طرح کے ایسے انڈر ڈاگ پائے جاتے ہیں جن کی فتح کے دور تک آثار نہیں مگر کامیابی حاصل کئے بغیر ہی وہ آنکھوں کے تارے بنے ہوئے ہیں۔ بعض تو خود کو

تاروں میں تبدیل کرکے آنکھوں میں کُھٹکے ہوئے ہیں۔
بچوں کی کتابوں میں ایک کہانی پڑھنے کو ملتی ہے کہ کسی دھوبی نے ایک کُتا پالا ہوا تھا۔ دھوبی جب اپنی بیل گاڑی پر کپڑے لاد کر دھونے کے لیے ندی تک جاتا تو اس کا کُتا گاڑی کے نیچے چلتا رہتا اور یہی سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہتا کہ پوری گاڑی کا بوجھ اُس نے اُٹھا رکھا ہے! یہی کیفیت اُس گدھے کی بھی ہوتی ہے جو گاڑی کو کھینچنے والے گدھے کے ساتھ محض دِل بستگی یا دِل پشوری کے لیے باندھ دیا جاتا ہے! اصل گدھے کے ساتھ باندھے جانے والے ایڈیشنل گدھے کو "بیخ" کہا جاتا ہے۔ ایڈیشنل گدھا یہی سوچ کر خوش ہوتا رہتا ہے کہ سارا بوجھ وہی اُٹھا رہا ہے جبکہ اصل گدھا تو وہ ہوتا ہے جو بیچ میں بندھا بوجھ برداشت کر رہا ہوتا ہے! اُس غریب کو سوچنے اور خوش ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا!
یہ کتے اور گدھے والی کیفیت اب خیر سے پورے ملک کی ہے۔ ملک کا بوجھ عوام نے اپنے کاندھوں پر اُٹھا رکھا ہے مگر اُن کے لیے اِتنی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی کہ اِس کارنامے کے بارے میں سوچیں اور فخر کریں۔
سیاسی گدھا گاڑیوں کے ایڈیشنل گدھے اور بیل گاڑیوں کے نیچے چلنے والے کُتّے

خود کو ناگزیر اور عقلِ کُل سمجھنے کے خبط میں مبتلا ہیں۔ کوئی لاکھ سمجھائے کہ زمینی حقیقت کچھ اور ہے، اِس خبط کے دائرے سے باہر آ جاؤ مگر ایسی تمام باتیں اُن سے کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی دیوار یا مُردے کے گوش گزار کی جائیں! سیاست کے ایڈیشنل گدھے اور انڈر ڈاگ اِس گمان کے نشے میں مست ہیں کہ اُنہی کے دم سے ایوان ہائے اقتدار کا رونق میلہ ہے! زبانِ حال سے وہ بار بار یاد دلاتے ہیں کہ ع

ہمیں کھو کر بہت پچھتاؤ گے جب ہم نہیں ہوں گے

خوش فہمی بھی کیسا قیامت کا نشا ہے کہ اِنسان کو دین کا رہنے دیتا ہے نہ دُنیا۔ سیاسی انڈر ڈاگ بھی اِس نشے کی موجوں میں بہتے ہوئے دھوبی کے کُتّے کی طرح گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ سیانے اور موقع شناس نسل کے انڈر ڈاگ البتہ گھاٹ بدلتے رہتے ہیں۔ کسی ایک گھر کا نہ ہو رہنا ہی اُنہیں بے گھر ہونے سے بچاتا ہے!

بڑی جماعتیں جب حکومت بناتی ہیں تو اِس گاڑی کو چلاتی بھی ہیں۔ دِل پشوری کے لیے وہ چند ایک چھوٹی جماعتوں کو بھی بزم آرائی اور تفنّنِ طبع کے طور پر ساتھ رکھتی ہیں۔ یہ "پخیں" رفتہ رفتہ خود کو اصلی یعنی مرکزی گدھا سمجھنے لگتی ہیں۔ اور پھر نتیجہ یہ برآمد" ہوتا ہے کہ بھرے ایوان میں ایک یا

دو نشستیں رکھنے والی جماعت کا لیڈر بھی وزیرِ اعظم بننے کے خواب دیکھنے لگتا ہے! جب بھی ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے، بہت سے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کائنات کے خالق نے خواب دیکھنے پر کوئی پابندی عائد کی ہے نہ کم از کم مطلوبہ قابلیت کی شرط رکھی ہے!

ہم نے سیاست کے میدان میں خود رَو پودوں کا صفایا کرنے کا اہتمام نہیں کیا جس کے باعث اب ہر طرف یہی لہلہاتے نظر آرہے ہیں۔ رائی کا ہر دانہ خود کو پربت ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ جس سے مشاورت کیجیے وہ عقلِ کُل کے درجے پر فائز ملتا ہے۔ اگر عمارت کی تزئین کے لیے لگائے جانے والے برقی قمقمے خود کو برقی رَو کا منبع سمجھنے لگیں تو کوئی کیا کرے؟ سیاست میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے والوں کا یہی المیہ ہے۔ اور اُن سے بڑھ کر تو یہ پوری قوم کا المیہ ہے۔ وہ بے چاری سمجھ نہیں پارہی کہ اِس صورت میں کس نوع کی طرزِ فکر و عمل اختیار کرے۔

حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

زخم اِتنے ہوگئے ہیں کہ بخیہ گری کی منزل گزر چکی۔ بے شک اب تو محل نوحہ خوانی کا ہے مگر اِس کی سکت کس میں ہے؟ اور اگر نوحہ گر کو ساتھ رکھنے کی بات کیجیے تو اِس کا بھی مقدور نہیں۔ سیاسی بازی گر نظر بندی کا جو کھیل

قوم سے کھیل رہے ہیں اُس کے نتیجے میں صرف وہی ہو سکتا ہے جو ہو رہا ہے یعنی قوم خون کے آنسو رو رہی ہے۔ مگر یہ آنسو بھی کب تک ساتھ دیں گے؟ سیاست کے انڈر ڈاگز اور ”اوور ڈاگز“ سے نجات پانے کی کوئی نہ کوئی صورت تو تلاش کرنی ہی پڑے گی۔ یہ منزل اِس وقت خاصی دور معلوم ہوتی ہے۔ تب تک دِل و جان پر کیا کیا گزر جائے، کون جانتا ہے۔ ؎

اب دیکھیے کیا حال ہمارا ہو سحَر تک
بھڑکی ہوئی اِک آگ سی ہے دِل سے جگر تک!

محققین کی کارستانیاں

تحقیق دنیا کا واحد شعبہ ہے کہ جس کی گرم بازاری نہیں جاتی۔ ہر گزرتا ہوا دن تحقیق کے گراف کو بلندی عطا کر رہا ہے۔ اب یہ ایک الگ بحث ہے کہ تحقیق سے مراد کیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحقیق کا مفہوم بھی تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ بہت سے محققین تو محض اِس امر پر دادِ تحقیق دے رہے ہیں کہ تحقیق ہے کیا اور جو کچھ آج تک تحقیق کے نام پر ہوتا رہا ہے کیا اُسے تحقیق قرار دیا جاسکتا ہے!

کام کی نوعیت اور اثرات کے اعتبار سے جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوگا کہ جسے تحقیق سمجھ کر خوش ہوا جاتا ہے وہ بسا اوقات تحقیقات سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتی! کاروباری دنیا میں اچھا خاصا زور مارکیٹ ریسرچ پر دیا جاتا ہے۔ یہ ریسرچ اچھی خاصی تفتیش ہی ہوتی ہے۔ خود کو بہتر بنانے سے زیادہ اِس بات پر دھیان دیا جاتا ہے کہ دوسروں کی مِٹّی کس طرح پلید کی جائے!

ہر بڑے ادارے میں تحقیق و ترقی کے نام پر مستقل شعبے کا قیام عمل میں لایا جاچکا ہے۔ یہ شعبہ دراصل یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ کُھلے بازار میں جن

اداروں سے مُسابقت درپیش ہے اُن کے لیے ”ترقّی معکوس“ کا اہتمام کس طرح کیا جائے۔ کاروباری دُنیا منافع میں کمی کو نقصان سمجھتی ہے اور حریف کو پہنچنے والا یا پہنچایا جانے والا نقصان بہت حد تک منافع تصور کیا جاتا ہے! دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ !یعنی حریف ادارے کو نقصان پہنچ رہا ہو تو خوش ہو رہنا چاہیے

ہم تحقیق و ترقی کے شعبے کو اِس لیے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ اِس کے ذریعے بہت سے ناکارہ ذہن کھپ جاتے ہیں اور معاشرے کو کسی اور طریقے سے نقصان پہنچنے کا !احتمال ختم ہو جاتا ہے

محققین کی بہتات نے بہت سے معاشروں کو شدید مشکلات سے دوچار کیا ہے۔ مغربی دنیا آج محققین ہی کے ہاتھوں انتہائی مصائب سے دوچار ہے۔ آج جو کچھ کہا جاتا ہے کل اُسی کو غلط قرار دے کر تیسرے دن پھر اُسی بات کو درست قرار دے دیا جاتا ہے۔ لوگ شش و پنج میں مبتلا رہتے ہیں کہ کون سے محققین کی کس بات کو درست اور کس بات کو غلط سمجھیں۔ قدم قدم پر محققین اور ماہرین سے مشاورت کرنے اور مدد لینے کے رجحان نے عام آدمی کا جینا حرام کر دیا ہے۔ بات جینا حرام کرنے تک رہتی تب بھی کوئی بات نہ تھی۔ مسئلہ یہ ہے کہ حرام کو حلال کرنے سے بھی یہ محققین نہیں چوکتے۔ اور اب اِس سے بھی ایک قدم آگے جا کر

اِنسانی مزاج کی لطافت اور نازک مزاجی ہی کو تحقیق کی چوکھٹ پر قربان کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔

اسپین میں ایک منفرد تجربہ کیا گیا ہے۔ کٹالونیا انسٹی ٹیوٹ آف فوڈ اینڈ ایگریکلچر ریسرچ کے ماہرین نے گائے، مُرغی، گھوڑے اور خنزیر کے گوشت سے بنائے ہوئے ساسیج اور سینڈوچ میں چار برس تک کی عمر کے صحت مند بچوں کی ''پوٹی'' کے اجزاء ملاکر ''طبع آزمائی'' کی تو فوڈ آئٹمز کو بہت لذیذ اور صحت بخش پایا! اب اِن فوڈ آئٹمز کو مارکیٹ میں متعارف کرانے کے حوالے سے بنانے کی تیاری ہو رہی ہے۔

حیران نہ ہوں، جب محققین کچھ کرنے پر تُل جاتے ہیں تو ایسے ہی گل کِھلاتے ہیں! جس چیز کو کہیں بھی قبول نہ کیا جارہا ہو اُسے ماہرین اور محققین کی مدد سے قابلِ قبول بنایا جاتا ہے۔ تحقیق کے بازار کی رونق اِس مہارت ہی کے دم سے ہے۔ اِس زاویۂ نگاہ سے دیکھیے تو تحقیق میں اب اداکاری اور صداکاری بھی نمایاں اجزاء کی حیثیت سے موجود ہیں!

ہسپانوی محققین کا احسان یہ ہے کہ اِس وقت پوری دنیا میں سب سے ناشُکری، ماحول کو نقصان پہنچانے والی اور مجموعی طور پر کُرۂ ارض کے لیے انتہائی

ناکارہ مخلوق اِنسان کے فُضلے میں کام کی کوئی چیز دریافت کرلی ! سوا سال قبل جاپانی ماہرین نے بھی اِنسانی فُضلے سے فوڈ آئٹمز تیار کرکے دُنیا بھر کے اِنسانوں کو سَر اُٹھا کر جینے کا موقع فراہم کرنے کی کوشش کی تھی !

آپ کی حیرت مزید کم کرنے کے لیے ہم عرض کئے دیتے ہیں کہ بھارت میں گائے کے پیشاب سے تیار کردہ ادویہ عام ہیں۔ گائے کا پیشاب ہندوؤں کے نزدیک انتہائی متبرک ہے اور وہ اشیائے خور و نوش میں چند قطرے ملانا فرض سمجھتے ہیں ! گائے کے گوبر سے بنی ہوئی اشیاء بھی بازار میں دستیاب ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ (ہم اِن ادویہ کے استعمال کی بات نہیں کر رہے !) ماہرین اور محققین کو بھی کوئی تکلیف برداشت نہیں کرنی پڑی ہے۔ یہ اشیاء اپنی مدد آپ کی بُنیاد پر مقبولیت حاصل کر رہی ہیں !

حرام جانور کے گوشت تک تو معاملہ واضح تھا۔ مگر یہ غلاظت بدوش خوراک ؟ اہلِ مغرب نے حد ہی کردی ہے۔ مرزا تنقید بیگ نے جب اسپین میں بچوں کے فُضلیے والے فوڈ آئٹمز کی خبر سُنی تو اُن کی رگِ تنقید پھڑک اُٹھی۔ بولے۔ " علامہ اقبالؔ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ مغرب کی تہذیب اپنے ہی خنجر سے خود کشی کرے گی۔ جب کوئی قوم ترقی کی حدیں پار کرجاتی ہیں تو ترقّیٔ معکوس کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ اہلِ مغرب بھی اپنے کئے جو اَن کیا کرنے پر تُلے ہوئے

ہیں۔ اِس اژدہے نے دُم کی طرف سے خود کو کھانا شروع کر دیا ہے! جب بُنیادی مسائل دم توڑ دیتے ہیں تو فارغ بیٹھے ہوئے دِماغ ایسی ہی باتیں سوچتے ہیں۔ اچھا ہے کہ ہمارے ہاں لوگ اب تک پانی و بجلی اور صفائی وغیرہ کے بکھیڑے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اِس صورت میں تحقیق جیسی عیاشی کے لیے وقت نہیں مل پاتا! اگر تمام بُنیادی سہولتیں آسانی سے دستیاب ہوگئیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ذہنوں میں پتا نہیں کیسے کیسے آئیڈیاز جنم لیں گے اور اُن پر عمل کی صورت میں خدا جانے کیسی کیسی چیزیں معرضِ وجود میں آئیں گی! مغرب میں فراغت کے مارے ہوئے دِماغ اب حرام و حلال سے گزر کر غلاظت پسندی اور فُضلہ پرستی تک پہنچ گئے ہیں! کون جانتا ہے اِس کے بعد کون سی منزل ہے؟''

جب کوئی چیز کم تر معیار یا زیادہ قیمت کے باعث مقبولیت حاصل نہیں کرپاتی تب تشہیر کے ماہرین سَر جوڑ کر بیٹھتے ہیں تاکہ صارفین کو متوجہ کرنے کے ہتھکنڈے سوچ سکیں۔ تحقیق کے بازار کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ جب کوئی چیز لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے تو محققین دور کی کوڑیاں لاتے ہیں تاکہ لوگ تیزی سے متوجہ ہوں اور اُس چیز کو اپنائیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ لہسن کھانے سے فلاں فلاں بیماریاں نہیں ہوتیں۔ پھر جب دوا ساز ادارے آنکھیں دکھاتے ہیں تو محققین کا کوئی اور گروہ ثابت کرتا ہے کہ لہسن کھانے سے فلاں فلاں بیماریاں لاحق ہوجاتی ہیں! کبھی محققین کہتے ہیں کہ روزانہ

ورزش سے فلاں فلاں بیماریاں ٹلتی ہیں اور پھر کچھ دن بعد خود ہی کہتے ہیں کہ ورزش کی زیادتی سے جسم کو فلاں فلاں نقصان پہنچ جاتا ہے! کبھی کہتے ہیں اِنسان کو بہادر ہونا چاہیے اور ہر معاملے میں کھل کر بات کرنی چاہیے۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ مصلحت بھی کوئی چیز ہے، ہر بات کھل کر اور کھول کر بیان کرنے والی نہیں ہوتی! محققین کی ایک واضح پہچان یا نشانی یہ ہے کہ یہ کبھی کسی بات پر قائم نہیں رہتے۔ جو آئے دن رائے بدلے وہی محقق اور ثبوت یہ کہ اُس نے سوچ سوچ کر، نئے تجربات کی روشنی میں رائے بدلی ہے!

ہم تو ماہرین کو آج تک سمجھ نہیں پائے۔ جب کبھی اِن کی محنت کے نتیجے کو اپنا کر کچھ کرنا چاہا ہے، ناکامی ہاتھ لگی ہے اور خِفّت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ہم نے جب بھی محققین کے فرمودات کی روشنی میں قلم سے طبع آزمائی کی ہے، لوگوں نے ہماری تحریر کو بے سَر و پا قرار دے کر تمسخر اُڑایا ہے اور جب بھی ہم نے اپنی جیسی تیسی عقل کے مطابق کچھ لکھا ہے، لوگوں نے خوشی خوشی قبول کرکے حوصلہ افزا فیڈ بیک دیا ہے! آپ بھی محققین کے سائے سے دور رہیں تو خیر ہے، ورنہ معاملہ حرام و حلال کے مرحلے سے گزار کر آپ کو بھی غلاظت پسندی اور فُضلہ پرستی تک پہنچا دے گا!

دردکا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا؟

جس طرف دیکھیے، جس معاملے کا جائزہ لیجیے، صرف خرابی دکھائی دیتی ہے۔ کیا ہماری آنکھیں صرف خرابی دیکھتی ہیں یا خرابی ہی دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں؟ لگتا ہے ہر معاملے میں دُرستی ہم سے روٹھ گئی ہے۔ کوئی یونہی تو نہیں روٹھا کرتا۔ اگر حالات ہم سے مُنہ پُھلائے بیٹھے ہیں تو کوئی نہ کوئی تو سبب ہوگا۔ ہم نے کچھ نہ کچھ تو ایسا کیا ہوگا یا ہم سے کچھ نہ کچھ تو ایسا سرزد ہوا ہوگا جس کی بنیاد پر خرابیوں نے ہمیں نشانے پر لیا ہوگا۔

زمانے گزر گئے ہیں کہ راہِ راست پر آنا تو دور کی بات رہی، ہم اِس حوالے سے سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ زندگی کو لاانتہا ہی سمجھ لیا گیا ہے۔ ذہنوں میں یہ گمان بس گیا ہے کہ زندگی کا ایک بڑا حصہ ضائع بھی کردیا جائے تو کوئی غم نہیں۔ وقت کا ساگر اتھاہ ہے؟ کیا اِس سمندر کی گہرائی کی کوئی حد نہیں؟ یقیناً وقت کا ساگر اتھاہ ہے، اِس کی گہرائی کی کوئی حد نہیں مگر اِس بحرِ ناپیدا کنار سے ہمارے حصے میں جو وقت آیا ہے وہ تالاب تو کیا، گلی میں پانی کے معمولی سے گڑھے کے برابر بھی نہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ ہمیں میسر مہلتِ عمل کو وقت کے سمندر کے مقابل چھینٹوں سے بھی تعبیر نہیں کیا

جاسکتا! اے وائے ناکامی کہ وقت کی اِتنی معمولی سی مقدار کو بھی ہم بامعنی انداز سے خرچ کرنے کی بجائے ضائع کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ع

!اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

کیا سبب ہے کہ ہم حالات کو دُرست کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتے؟ معاملات کی خرابی کی طرف دھکیلنے یا ٹالتے رہنے ہی کو زندگی کیوں سمجھ لیا گیا ہے؟ آخر وہ کون سا مقصد ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ہم صرف مصائب اور پریشانیوں کو بُلا بُلا کر گلے لگاتے جارہے ہیں؟ اِتنا سوچنے کا بظاہر کسی کے پاس وقت ہے نہ توفیق۔ اور توفیق ہو بھی تو لوگ ایسے معاملات پر سوچنے کو بلائے جاں تصور کرکے ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔ ممکن ہے انفعال پذیر ہو رہنے میں زیادہ سُکون ملتا ہو۔ کچھ کرنے میں تو کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کچھ نہ کرنے سے اچھی حالت کون سی ہو سکتی ہے؟ ایک طرف پڑ رہیے۔ عمل کی دُنیا میں فعال نہ ہونے سے کوئی مر تو نہیں جاتا۔ کچھ نہیں تو بھیک کے ٹکڑوں پر گزارا ہوتا ہے۔ یعنی زندگی بہرحال داؤ پر نہیں لگتی۔ اب یہ الگ بحث ہے کہ ایسی حالت میں !زندہ رہنے کو زندگی کہا جاسکتا ہے یا نہیں

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ جب کچھ نہ بن پڑے تو اپنی

ناکامیوں ہی سے محظوظ ہونا چاہیے۔ یہ آسان ترین درجے کا اور سب سے آسان آپشن ہے۔ گویا بہ قولِ قمرؔ جمیل ۔

اپنی ناکامیوں پہ آخرِ کار
!مُسکرانا تو اختیار میں ہے

بات بہت اچھی لگتی ہے۔ غور کیجیے کہ اچھی لگتی ہے، اچھی ہے نہیں ! یہ ایسا ہی معاملہ ہے جیسا کہ کسی سے پوچھا گیا کہ جنگل میں اکیلے جا رہے ہو اور سامنے شیر آ جائے تو کیا کروگے ؟ اُس نے کہا ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا ہے، جو کرے گا شیر کرے گا ! آلام و مصائب کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا بھی ایسا ہی تو معاملہ ہے۔ یہ تو زبردستی کا سودا ہوا۔ یعنی مجبوری کا نام شکریہ۔ اِسی بات کو غالبؔ نے یوں کہا تھا ع

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ایسی باتیں دُنیائے سُخن اور پیرایۂ شعری ہی میں اچھی لگتی ہیں۔ عمل کی دُنیا میں ایسی شوخئ زبان کس کام کی؟ غالبؔ نے تو بس یونہی از راہِ تفنّن اِنتہائے درد کو دوا کہہ دیا تھا، ہم نے اُن کی بات کو سنجیدگی سے پلّے باندھ لیا ! غالبؔ کے مزاج میں بلا کی شوخی تھی۔ اور یہی شوخی سُخن فہمی کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے بلا بن گئی ! بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ مسائل

ہی کو مسائل کا حل تصور کرلیا جائے؟ مگر کیا کیجیے کہ ہم اِسی پر خوش ہیں۔ یہاں تو عشروں سے ہر معاملے میں غالبؔ کے کہے کو علاج کی حیثیت سے اپنایا جارہا ہے۔ زندگی کے وسیع، بلکہ اتھاہ ساگر سے ہمیں چند بوندیں ملی ہیں۔ 6 عشروں سے بھی زائد مُدت گزری، ہم زندگی کے نام پر اپنے انفرادی اور اجتماعی وجود سے کِھلواڑ کرتے آئے ہیں۔ قدم قدم پر آلام کو مدعو کیا گیا ہے۔ راستے میں پڑی ہوئی اُلجھنوں کو ہم پُچکار کر اپنی متوجہ ہی نہیں کرتے، بلکہ گلے بھی لگا لیتے ہیں۔ بہ قول ناصرؔ کاظمی ع

اِس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں؟
آ، اے شبِ فراق! تجھے گھر ہی لے چلیں

راستے میں پڑی ہوئی ہر اچھی بُری چیز کو گلے لگانے اور گھر لانے کی عادت اب ایسی پُختہ ہوگئی ہے کہ اگر کسی دردِ سَر کو سَر چُھپانے کی جگہ نہ ملے تو ہم اپنا پتا دے دیتے ہیں! گویا بہ قولِ امیرؔ مینائی ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

یہ کوئی قابلِ مذمت یا قابلِ افسوس بات نہیں کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر

میں ہو، مگر پہلے اقبال کی نصیحت پر بھی غور کیجیے۔ ع

!پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ صمیم

اِس روش کا نتیجہ کیا نکل سکتا تھا؟ تباہی اور ذِلّت کے سِوا کوئی نتیجہ ممکن تھا؟ دُنیا دیکھ رہی ہے کہ آج ہمارے مقدر میں انتشار ہے، افتراق ہے، کدورت ہے، منافقت ہے۔ منافرت کے سائے ہمارے سَروں پر منڈلا رہے ہیں۔ تعصب اور علاقائیت کا زہر فکر و نظر کی رگوں میں اُتر چکا ہے۔ اعمال اونٹ کے مانند ہیں جس کی کوئی کَل سیدھی نہیں ہوا کرتی۔ پل کی خبر نہیں اور سو برس کا سامان جمع کرنے کی فکر ذہن پر سَوار رہتی ہے۔ صرف باتیں رہ گئی ہیں اور وہ بھی بڑی بڑی۔ اور یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ محض باتوں سے سارے کام ہوتے چلے جائیں گے۔ باتوں سے کسی معاشرے کا کوئی کام بنتا تو نہیں مگر ہاں، اُس کا کام ہو جاتا ہے! ع

!وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

زندگی عمل کے بغیر کچھ نہیں۔ اور ہم عمل سے دور رہنے کی قسم کھا بیٹھے ہیں۔ کوئی لاکھ کوشش کرے، ہم عمل کے قائل نہیں ہوتے، اُس کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ منزل کا تو تب سوچا جائے جب سمت درست ہو۔ کچھ لوگ متحرک تو ہیں مگر بے سمت ہونے کے باعث مطلوبہ نتائج کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔ باضابطہ سوچ کے

بغیر عمل بھی کسی کام نہیں ہوتا۔ گاڑی اگر اینٹوں پر کھڑی ہو تو پہیوں کے گھومتے رہنے کو سفر نہیں کہا جاسکتا۔ اب اگر کوئی اِسے سفر قرار دینے پر تُلا ہو تو اِسے اُس کی حماقت سے بڑھ کر کس چیز سے تعبیر کیا جائے گا؟ اور حماقت پر فخر واِصرار؟ یہی مقامِ عبرت ہے۔ جس آنکھ میں دیکھنے کا یارا ہو اور ذوق بھی ہو تو وہ دیکھے اور عبرت پکڑے۔

بہت دُور کی سُوجھی

بڑی مشکل سے قوم کی دُعائیں کسی حد تک مستجاب ہوئیں، امیدیں تقریباً بر آئیں۔ طالبان سے مذاکرات کا راستہ کھلا تو اہلِ وطن کے چہرے کِھل اُٹھے کہ ع

کفر ٹوٹا خُدا خُدا کرکے

اب تک تو حالت یہ تھی کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ صورتِ حال دیکھ کر کیا سمجھیں، کیا اندازہ لگائیں۔ ملک بھر میں ایسا بہت کچھ ہو رہا تھا جس کا سَر دِکھائی دے رہا تھا نہ پَیر۔ ؎

سُلگ رہا ہے نشیمن کہ جل رہا ہے چمن
چلو، قریب سے دیکھیں یہ روشنی کیا ہے!

سبھی پریشان تھے کیونکہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ کسی کی اُمنگوں کے مطابق نہ تھا اور جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہ کسی صورت ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں مبتلائے یاس ہونا فطری تھا۔

پھر یہ ہوا کہ اُمید کے بادل تھوڑے سے برس گئے۔ طالبان اور حکومت کے درمیان

مذاکرات کا دَر کھلا۔ مذاکرات کی راہ ہموار ہوئی تو قیاس آرائیوں کا بازار بھی گرم ہوا۔ سبھی اٹکل کے گھوڑے دوڑانے لگے۔ کوئی کہتا تھا کہ فریقین ٹائم آؤٹ کی راہ پر گامزن ہیں۔ کسی کا خیال تھا کہ حکومت کی نیت میں کھوٹ ہے۔ کوئی طالبان کے حوالے سے بدگمانی کا اظہار کر رہا تھا۔ جتنے مُنہ تھے اُتنی باتیں تھیں۔ ٹی وی اینکرز کی تو باچھیں کِھل گئیں کہ چلیے، کچھ سوچنے (!) اور بولنے کا سامان تو ہوا۔ مبصرین اور ماہرین بھی سجدۂ شکر بجا لائے کہ فراغت سے جان چُھوٹی اور قوم کو ''راہ'' دِکھانے کی سبیل نکلی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ مذاکرات کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ در حقیقت ویسا نہیں ہے جیسا بیان یا پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر لوگ مذاکرات کے عمل کو ٹوپی ڈراما قرار دے رہے ہیں تو اِس میں ایک حد تک تو صداقت ہے۔ فریقین اب تک کوئی مشترکہ یا متفقہ راستہ تلاش کرنے سے زیادہ ایک دوسرے کو اپنی مرضی کی راہ پر لانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ سَنجیدہ حلقے شِکوہ سنج رہے ہیں کہ مذاکرات میں سَنجیدگی کا عنصر عنقا ہے۔ یہ شِکوہ کچھ ایسا بے جا بھی نہیں۔ غالبؔ نے کہا ہے ؎

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

حکومت اور طالبان دونوں ہی ایک گال میں آگ اور دوسرے میں پانی لیے مِل رہے ہیں۔ ایک طرف مذاکرات کا ڈول ڈالا جارہا ہے اور دوسری طرف ایک دوسرے کو طاقت کے استعمال سے مَرعُوب کرنے کے جتن بھی ہو رہے ہیں۔ یہ تماشا دیکھنے والے حیران ہیں کہ کس کی نیت کو درست جانیں اور کس کے بارے میں بدگمانی کو پروان چڑھائیں۔ طالبان کا شِکوہ ہے کہ فورسز آپریشن ختم کرنا ہی نہیں چاہتیں۔ اور حکومت یہ کہتی ہے کہ طالبان قتل و غارت کی دُکان اب تک سجائے بیٹھے ہیں۔

مذاکرات پر یقین رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ کسی بھی معاشرے میں قتل و غارت کے خاتمے کی راہ اِسی طور ہموار ہوتی ہے۔ مذاکرات بھی چلتے رہتے ہیں اور طاقت کا مُظاہرہ بھی۔ فریقین ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ دباؤ میں لینے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ اِس وقت طالبان بھی یہی چاہتے ہیں کہ اُن کی پوزیشن ایسی کمزور نہ ہو کہ حکومت کی ہر بات ماننی پڑے۔ ریاست سے لڑنا اُن کے بس کی بات نہیں مگر پھر بھی وہ انا کا لبادہ اُتار پھینکنے کو تیار نہیں۔ قوم ایک بار پھر گومگو کی حالت میں ہے۔ ماحول پر شش و پنج کا عالم طاری ہے۔ کسی کو اندازہ نہیں کہ اِس بحر کی تہہ سے کیا اُچھلے گا۔ آنکھوں میں اُمیدوں کے روشن چراغ بھی ہیں اور مایوسی کا اندھیرا بھی۔ دِل کھلے ہوئے بھی ہیں اور بُجھے ہوئے بھی۔ معاملات پَل پَل بدلتے دکھائی دے رہے ہیں۔ نظر رکھنے والے

کہتے ہیں کہ یہ سب نظر کا دھوکا ہے، نظر بندی ہے، شعبدہ ہے۔ ہوگا وہی جو طے کیا جاچکا ہے۔ کیا طے ہوچکا ہے، یہ کوئی نہیں بتاتا۔ ایسے میں اہلِ وطن کیا سوچیں؟ یہی کہ جو کچھ ہوگا وہ کسی طور کم از کم اُن کے حق میں تو نہ ہوگا۔ اور وہ ایسا کیوں نہ سوچیں؟ اب تک یہی تو ہوتا آیا ہے۔

وفاقی وزیر داخلہ کو بے یقینی، بدگمانی اور مایوسی کے اندھیرے میں بہت دُور کی سُوجھی ہے۔ موصوف نے طالبان کو کرکٹ میچ کھیلنے کی دعوت دے ڈالی ہے۔ لوگ حیران ہیں کہ یہ دعوت سیاسی وکٹ پر چھکّا لگانے کی کوشش ہے یا کلین بولڈ ہونے کی خواہش کا اظہار!

مرزا تنقید بیگ حیران ہیں کہ چوہدری نثار علی خان کو خالص سنجیدہ و کشیدہ ماحول میں کرکٹ کی کیا سُوجھی۔ ہم نے سمجھانا چاہا کہ وفاقی وزیر داخلہ پر کام کے ''دباؤ کا پریشر'' بہت زیادہ ہے اِس لیے وہ تھوڑی بہت دِل پشوری چاہتے ہوں گے۔ ہمارا اِتنا کہنا قیامت ہوگیا۔ مرزا پھٹ پڑے۔ ''بھلا یہ کون سا موقع ہے دِل پشوری کا؟ قوم کی جان حلق میں اٹکی ہے اور وزیر داخلہ کو طالبان سے کرکٹ میچ کھیلنے کی پڑی ہے۔ چھکّے لگانے کی ایسی کوششوں ہی نے تو قوم کو بار بار رن آؤٹ کرایا ہے۔''

ہم نے عرض کیا کہ وزیر داخلہ نے تو بس یونہی علامتی طور پر ایک بات کہی تھی۔ آپ تو پیچھے ہی پڑ گئے۔ کیا وزیر داخلہ کو اِتنا حق بھی نہیں کہ دو چار ہلکی پھلکی باتیں بھی کرلے۔ آخر اُن کے پیشرَو رحمٰن ملک بھی تو ایسا ہی مزاج رکھتے تھے!

مرزا نے کہا۔ ''رحمٰن ملک کے کھلنڈرے پن نے جو گل کِھلائے ہیں اُن کی 'مہک' برقرار ہے۔ اُن کے مزاج کا اثر چوہدری نثار میں بھی در آیا ہے۔ مگر اب کسی بھی بات کو تمسخرانہ یا علامتی انداز سے کہنے کی گنجائش کہاں بچی ہے؟ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ جو کچھ سب کے سامنے ہے اُسے سات پردوں میں لپیٹنے کی کوشش صورتِ حال کے بھونڈے پن میں صرف اِضافہ کر سکتی ہے!''

مرزا کی طرف سے یہ تنقید ہم سے ہضم نہ ہو سکی۔ ضروری تو نہیں کہ قوم کو چند ہلکے پھلکے لمحات دینے کی کوشش کا تمسخر ہی اُڑایا جائے۔ شدید ذہنی اور اعصابی دباؤ کے شکنجے میں پھنسی ہوئی قوم کو وزیر داخلہ اگر طالبان سے کرکٹ کے نام پر ہنسنے کا موقع دے رہے ہیں تو اِس میں قباحت کیا ہے! مگر مرزا ہم سے متفق نہیں۔ اُن کا استدلال ہے کہ ہمارے ہاں جنہیں اقتدار اور اختیار ملا ہے اُنھوں نے اپنے لیے آسانیاں یقینی بنانے کی خاطر سیاست کو کھیل اور کھیل

کو سیاست بنا ڈالا ہے۔ ’’کرکٹ بے چاری پتہ نہیں کیسا نصیب لے کر پیدا ہوئی ہے۔ ڈھنگ سے کرکٹ کھیلنے کی توفیق تو کسی کسی کو ملتی ہے، ہاں خود کرکٹ سے کھیلنے والے قدم قدم پر موجود ہیں۔ پہلے سٹّے باز اِس کھیل سے کھیلا کرتے تھے۔ پھر حکومتیں اِس سے شغل فرمانے لگیں۔ فرینڈلی کرکٹ کے نام پر ایسا ڈراما اسٹیج کیا جاتا ہے کہ نگاہیں پَردہ اُٹھنے کی منتظر ہی رہ جاتی ہیں! اب عسکریت پسندوں سے کرکٹ کھیلنے کی خواہش ظاہر کی جارہی ہے۔‘‘

ہمیں حیرت ہے کہ مرزا کو حیرت کیوں ہے۔ جہاں اِتنا بہت کچھ ہو رہا ہے وہاں طالبان سے کرکٹ بھی سہی۔ ایک آدھ میچ کھیل لیا تو کون سی قیامت آجائے گی۔ کیا پتہ ایسا کرنے سے طالبان کے دِلوں میں حکومت کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا ہو جائے۔ جب مار کُٹائی سے بات نہ بن رہی ہو تو متبادل کے طور پر کرکٹ کو آزمانے میں کیا ہرج ہے۔ آخر بھارت کے ساتھ بھی ہم کرکٹ ہی راہ پر چلتے ہوئے مفاہمت کی منزل کی طرف رواں ہیں! اور دیکھیے، جب سے فرینڈلی کرکٹ عام ہوئی ہے، جنگ و جدل کا ماحول پس منظر میں چلا گیا ہے!

چوہدری نثار نے طالبان سے کرکٹ میچ کھیلنے کی خواہش کا اظہار کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ امن کے خواہاں ہیں، خواہ وہ کسی راستے سے ہوتا ہوا آئے۔ طالبان سے لڑ کر نہ سہی، اُن کے ساتھ کرکٹ کھیل کر سہی۔ ہاں، طالبان نے

کرکٹ کھیلنے سے معذرت کرکے اپنے سخت گیر اور غیر لچک دار ہونے کا ثبوت ضرور فراہم کیا ہے۔ ہمیں اُن سے ایسی ”سنگ دِلی“ کی توقع نہ تھی۔ اصلی و نسلی کرکٹ میں تو اب ہمیں محظوظ کرنے کا دم رہا نہیں۔ ایسے میں ریاستی اور غیر ریاستی عناصر کے میچ سے شاید طبیعت کچھ بہل جائے!

کاٹا کیک، نکلا چُوہا

فی زمانہ تقریباً ہر خرابی اور ''عجیب المفہوم'' بات کا تعلق امریکا سے ہے۔ یا ثابت کیا جاسکتا ہے! امریکا کے ڈسے ہوئے بہت سے ایسے بھی ہیں جو اب اُس کی طرف سے آنے والی کسی بھی خرابی کو حیرت سے نہیں دیکھتے۔ ع

رنج سے خوگر ہوا اِنساں تو مِٹ جاتا ہے رنج

نیویارک کے نزدیک لانگ آئی لینڈ پر سالگرہ کی ایک تقریب کے لیے منگوائے جانے والے خصوصی کیک کو جب کاٹا گیا تو کیک کاٹنے والوں کے دِلوں پر بھی چُھری چل گئی! کیوں نہ چلتی؟ جس طور بِلّی تھیلے سے باہر آ جایا کرتی ہے بالکل اُسی طرح کیک کا پیٹ چاک کئے جانے پر چُوہا نکل آیا! قصہ یہ ہے کہ 96 سال کا ہونے پر انکل جو کی سالگرہ منائی جارہی تھی۔ جرمن ایپل رِنگ کیک اُنہیں بہت پسند ہے اِس لیے اُسی کا آرڈر دیا گیا۔ جب انکل جو نے کیک کے دو تین ٹکڑے کھائے تو ذائقہ کچھ عجیب سا لگا۔ جب غور سے دیکھا تو اُنہیں کیک کے وسطی حصے میں چُوہے کی دُم دِکھائی دی۔ مزید غور سے دیکھنے پر کان کے علاوہ سَر کا کچھ اجزاء کے بھی درشن ہوئے۔ آن کی آن میں ہاہاکار مچ گیا۔

تم جیو ہزاروں سال" کے شور کی جگہ "اوہ مائی گاڈ" کی دَبی دَبی آوازیں پردۂ سماعت سے ٹکرانے لگیں!

انکل جو کے بھتیجے نیل گولڈ نے بیکری کے خلاف غفلت برتنے کے الزام پر مبنی تحریری شکایت مقامی انتظامیہ کو دی ہے۔ چُوہے والا کیک کھانے سے انکل جو کی حالت تھوڑی سی بگڑی مگر پھر سنبھل گئی۔ کیوں نہ سنبھلتی؟ گزرتے ہوئے اَچھے زمانوں کا کھایا ہوا خالص مال کام آگیا۔

اِس خبر کو پڑھتے ہی ہمارے ذہن میں سب سے پہلے یہ خیال بجلی کی طرح کوندا کہ شاید امریکیوں نے انتہائی مُعمّر اور کسی طور مرنے کا نام نہ لینے والے شہریوں سے گلوخلاصی کا کوئی طریقہ وضع کیا ہے! کیک میں سے چُوہے کے اجزاء برآمد ہوتے دیکھ کر انکل جو پر جو بیت گئی سو بیت گئی مگر کبھی اُنہوں نے اِس نکتے پر غور نہیں کیا کہ وہ جو بے فِکری سے جئے ہی جارہے ہیں اُس سے لوگوں پر کیا بیت رہی ہے! چُوہے سے مُزیّن کیک کھانے پر انکل جو نے شاید یہ سوچا ہو کہ 96 سال کی عمر میں کیا کیا دیکھنا پڑ رہا ہے۔ وہ اپنی غلطی بھی تو مانیں کہ اُن کی اِتنی طویل عمر دوسروں کو کیا کیا دِکھا رہی ہے۔ جب کوئی دُنیا سے جانے پر آمادہ ہی نہ ہو تو لوگ چُوہے والے کیک اور اِسی قبیل کی دُوسری اشیاء ہی کو تو زحمت دیں گے!

سالہ بزرگ کے لیے چُوہے والے کیک کا تحفہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کیونکہ 96 امریکیوں کو گزرے ہوئے زمانوں کی اقدار اور گزرتے ہوئے ادوار کے لوگوں سے کچھ خاص دلچسپی نہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ چِڑ ہے۔ ہر معاملے میں جِدّت طرازی امریکیوں کا شعار ہے۔ ممکن ہے انکل جو کے معاملے میں بھی جِدّت کی راہ نکالی گئی ہو۔ کام ہوگیا تو ٹھیک ورنہ اسٹور کے خلاف مقدمہ دائر کی گنجائش تو ہے ہی! یعنی یہ کہ داؤ چل جائے تو بُزرگ سے گلوخلاصی ہوجائے اور اگر نہ چل سکے تو ہرجانے کی مَد میں معقول رقم ہاتھ لگے! امریکیوں کے لیے کوئی بھی معاملہ خسارے کا سَودا نہیں۔

کیک سے چُوہا نکلنے سے زیادہ حیرت ہمیں اِس بات پر ہے کہ فوڈ ٹیکنالوجی کے ماہرین نے اب تک متعلقہ اسٹور پر مقدمہ دائر نہیں کیا۔ بات یہ ہے صاحب کہ اِس نوعیت کے تجربے کرنا فوڈ ٹیکنالوجی کے ماہرین کا خاصہ ہے! وہ رات دن نئے فوڈ آئٹمز متعارف کرانے کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ اپنی سوچ کو عملی شکل دینے کے لیے وہ انتہائی متضاد صفات والی اشیاء کو اُسی طرح یکجا کرتے ہیں جس طور گن پوائنٹ پر نکاح کرایا جاتا ہے! فوڈ ٹیکنالوجی کے ماہرین کا دَم غنیمت ہے کہ اُن کی کاوشوں کے طفیل ''غیر روایتی'' ڈِشوں کی تیاری کے نام پر مختلف خطوں کے درمیان ''ہم آہنگی'' بڑھتی ہے اور اہلِ جہاں کو مختلف

النوع حشرت الارض کی افادیت کے نئے پہلوؤں سے رُوشناس ہونے کا موقع ملتا ہے!
فوڈ ٹیکنالوجی کے ماہرین کو یقیناً اِس بات پر جز بُز ہونا چاہیے کہ اُن کے میدان میں بیکری کے معمولی کاری گروں نے قدم رکھ دیا۔ اگر اِس معیار کے تحت پرکھا جائے تو ہمارے ہاں بیشتر کاری گر صفِ اوّل کے ماہرین ثابت ہوں گے! ہمیں اُن کے ''کمالات'' دِکھائی نہیں دیتے؟ کیونکر دِکھائی دیں؟ بے ذوقی نے بصارت کا ''حُسن'''' زائل کردیا ہے۔ ''دیکھنے والا دیدۂ بینا'' میسر ہو تو کچھ دِکھائی دے نا! ہم کھاتے وقت مقدار کے ایسے دیوانے ہوجاتے ہیں کہ معیار کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیتے ہیں۔
شریف امروہوی نے جب امریکی کیک والی خبر پڑھی تو حیران ہوئے کہ امریکا میں بھی فوڈ آئٹمز کی تیاری میں غفلت اِس حد تک بڑھ گئی ہے۔ مگر پھر اُنہیں تھوڑا سا سُکونِ قلب بھی میسر ہوا کہ فوڈ آئٹمز تیار کرنے والے امریکی اور اُن کے پاکستانی ''ہم منصب'' اب ایک ہی ''پیج'' پر ہیں!
شریف امروہوی خوب پکی ہوئی اشیاء کھانا پسند کرتے ہیں۔ اُنہیں مغرب اور مشرقِ وُسطیٰ کی کوکنگ پسند نہیں جس میں چیزوں کو اُبالنے کے مرحلے سے گزارنے کے فوراً بعد گارنش کرکے دستر خوان کی زینت بنادیا جاتا ہے۔ اُن کی نظر میں کوکنگ کا یہ طریقہ خطرناک ہے کیونکہ جو اِضافی اجزاء یا مخلوق

چٹیلی میں گر جاتی ہے وہ دیگر اجزاء میں پوری طرح شیر و شکر نہیں ہو پاتی اور پکانے والے کا بھونڈا پن ظاہر ہو جاتا ہے! ہمارے ہاں، خیر سے، پکانے کا ڈھنگ ایسا پکا ہے کہ لوگ کھاتے وقت اُنگلیاں چاٹتے تو رہ جاتے ہیں مگر یہ اندازہ نہیں لگا پاتے کہ چولھے پر چڑھانے سے پہلے چٹیلی میں کیا کیا ڈالا گیا تھا! ع

!تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

بصارت سے محرومی کے معاملے میں تو خیر امریکی بھی ہمارے ہم پلّہ ہیں۔ اُنہیں اپنے فوڈ آئٹمز میں جانوروں کے اجزاء یا بال وغیرہ تو نظر آ جاتے ہیں مگر دُنیا بھر میں غصب کئے جانے والے بُنیادی حقوق کے ریزے دِکھائی نہیں دیتے! امریکی فوجیوں کے ہاتھوں بہنے والے مظلوموں کے خُون اور زیرِ دست معاشروں میں بکھرے ہوئے گوشت کے !لوتھڑوں پر بھی اُن کی نظر نہیں پڑتی

انکل جو کے لیے سالگرہ کا کیک تیار کرنے والی بیکری ہمیں تو امریکی محکمۂ خارجہ کا ذیلی ادارہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ آج تک امریکی خارجہ پالیسی بھی چُوہے والے کیک تیار کرنے کے اُصول کی بُنیاد پر وضع کی جاتی رہی ہے۔ جن ممالک سے امریکا کی نہیں بنتی اُنہیں اپنی شرائط پر دی جانے والی امداد کے

پردے میں ایسے ہی غیر معیاری کیک کھلائے جاتے رہے ہیں ! اور جس کسی کی مَت
ماری جاتی ہے وہ ہرجانے کی بات کر بیٹھتا ہے۔ ہرجانہ تو کیا ملنا ہے، پھر گھٹیا کیک کا
آسرا بھی ختم ہو جاتا ہے!

اور کرکٹ جیت گئی!

ایسا لگتا ہے جنگ بندی ہمارے مقدر میں لکھی ہی نہیں گئی۔ کالعدم تحریک طالبان پاکستان نے جنگ بندی کا اعلان کیا تو دِلوں کے لیے کچھ راحت و مسرت کا سامان ہوا مگر کس کو اندازہ تھا کہ طالبان کی طرف سے جنگ بندی کا اعلان ہوتے ہی آفریدی قبیلے کا جوان سینہ تان کر میدان میں کھڑا ہو جائے گا اور ایسی گولہ باری کرے گا کہ دشمنوں کو دُم دباتے ہی بنے گی۔ میدان کشت و خون کا ہو یا گیند بلّے کا، ہر طرف معاملہ مار دھاڑ کا ہے، اُٹھا پٹخ کا ہے۔

کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ چاروں طرف چھایا ہوا مایوسی کا اندھیرا یوں چھٹے گا کہ فتح و کامرانی کا مہرِ درخشاں آنکھوں کو چُندھیانے پر مجبور کر دے گا۔ ایشیا کپ میں پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کے مقابل کیا ہوئے، ایک اور میدانِ جنگ سج گیا۔ میڈیا نے بھی مورچے سنبھالے اور خوب دادِ شجاعت دی۔ کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی طرف سے کوئی کسر رہ جائے۔ رہتی بھی کیسے؟ کھیل کے میدان میں بھی جذبہ تو جنگی ہی تھا۔ ہمارے ہاں اب سب کچھ جنگی بُنیاد ہی پر ہوتا ہے۔ حکومت بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کا اعلان بھی

کرتی ہے تو جنگی بنیاد پر اقدامات کے ذریعے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ہمارا ہر بحران اب اِس قدر تگڑا ہوگیا ہے کہ اُس سے کما حقہ نپٹنے کے لیے جنگ کی سی تیاریوں کے ساتھ ہی میدان میں اُترنا پڑتا ہے!

بنگلہ دیشی دارالحکومت کے نواح میں میرپور کے مقام پر شیر بنگلہ اسٹیڈیم میں پاکستان اور بھارت کی کرکٹ ٹیمیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو ایک بار پھر وہی ماحول پیدا ہوگیا جو ہائی ٹینشن ٹرانسمیشن لائن میں پایا جاتا ہے۔ گویا ع
دونوں طرف ''تھی'' آگ برابر لگی ہوئی!

دونوں کی بجائے تینوں طرف کہنا زیادہ درست ہوگا کیونکہ بنگلہ دیشی بھی غیر جانب دار نہ رہ سکے۔ اسٹیڈیم میں بہت سے بنگلہ دیشی اپنے جذبات کو پاکستانیوں کے احساسات سے ہم آہنگ کرتے نظر آئے۔ میچ کیا تھا، تصادم تھا۔ کچھ دن پہلے اتنا کچھ ہوا تھا کہ دونوں ممالک کو اپنا آپ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا ہی تھا۔

بھارت نے آسٹریلیا اور انگلینڈ کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ''بگ تھری'' کے زیر عنوان مثلث تیار کی جو شاید

کرکٹ کو مُرغے کی طرح چٹ کر جانا چاہتی ہے۔ مالی اعتبار سے انتہائی مضبوط قرار پانے والے تینوں کرکٹ بورڈز کرکٹ کے معاملات کو اپنی مرضی کے تابع رکھنا چاہتے ہیں مگر خود کرکٹ شاید کسی کی غلامی اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ میرپور کے شیر بنگلہ کرکٹ اسٹیڈیم میں یہی ثابت ہوا۔ اور کیوں نہ ہوتا؟ جب کرکٹ یعنی واقعی کرکٹ کھیلی جاتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے! کھیل کا انداز صرف بتا دیتا ہے کہ جیت ٹیم کی ہوئی ہے یا کھیل کی۔ اور یہ بھی کہ جیتنے والی ٹیم جیتی ہے یا اُسے جتوایا گیا ہے۔

چند روز قبل یو اے ای میں تکمیل سے ہم کنار ہونے والے آئی سی سی انڈر 19 ورلڈ کپ سے بگ تھری یعنی کرکٹ کے تینوں ہی چودھریوں کُھڈے مار کر نکالا گیا۔ اُن کی عبرت ناک شکست نے اور کچھ نہ سہی، زخمی دِلوں پر کچھ مرہم تو رکھا۔ آئی سی سی میں من مانی پر تُلے ہوئے یہ تینوں چودھری حقیقی کرکٹ کے میدان میں بڑی طمطراق سے اُترے اور اپنے سے مُنہ لیکر باہر نکلے۔

ایشیا کپ کے انتہائی اہم میچ میں بھی یہی ہوا۔ انڈر 19 ورلڈ کپ میں ملنے والی ذِلّت شاید کماحقہ نہ تھی اِس لیے قدرت نے بنگلہ دیش کی سرزمین پر پاکستان کے ہاتھوں بھارت کی باضابطہ کرکٹ ٹیم کے سَر پر مزید ذِلّت کا ٹوکرا دَھر دیا۔

کرکٹ کے معاملات کی بیچ پر اپنی مرضی سے یعنی فکسڈ چوکے اور چھکے لگانے والی ٹیم شاہد آفریدی کے ہاتھوں محض دو چھکّوں کی مار نہ سہ پائی۔ 18 اپریل 1986 کو جاوید میاں داد نے شارجہ میں آسٹریلیشیا کپ کے فائنل میں بھارت کے چیتن شرما کو میچ کی آخری (فُل ٹاس) گیند پر چھکّا لگا کر بھارتی شائقین کرکٹ کے دِلوں میں کیل، بلکہ کِلّا گاڑ دیا تھا۔ شاہد آفریدی نے آخری اوور میں دو چھکّے لگا کر رہی سہی کسر پوری ہی نہیں کی بلکہ لطف دو بالا کر دیا، میچ کے نتیجے کو سہ آتشہ بنا ڈالا۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ بھارت نے 28 سال قبل شارجہ میں 245 رنز کا ہدف دیا تھا۔ اور اِس بار بھی ہدف 245 رنز ہی کا تھا۔ تب بھی چھکّے کی مار پڑی تھی اور اب بھی چھکّے ہی مار پڑی ہے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ پاکستان نے بھارت کے مقابل جیتا ہوا میچ آسانی سے ہارا ہے اور دیکھنے والوں کے دِلوں میں شکوک پیدا ہوئے ہیں۔ حکومتی سطح پر بھی ایسی ہلچل دکھائی دیتی رہی ہے کہ لوگ سوچنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ کہیں معاملات طے تو نہیں کر لیے گئے۔ ہر بار پردۂ زنگاری میں کسی نہ کسی معشوق کے بارے میں سوچا جاتا رہا ہے۔

اتوار کو بھی پاکستان نے خاصے آسان میچ کو انتہائی عرق ریزی سے مشکل مقابلے میں تبدیل کیا۔ گویا ع

! یہ ”ہمارامزاج“ ہے پیارے

مقابلہ پل پل کروٹ اور راستہ بدلتا رہا۔ کبھی ایسا لگتا تھا کہ بھارت تو کوئی ٹیم ہی نہیں ہے۔ پھر یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ ہم ایک بار پھر شکست کے گڑھے میں گرنے والے ہیں۔ کبھی اُمیدیں توانا ہوجاتی تھیں اور کبھی شائقین اچانک فضائے یاس میں سانس لینے لگتے تھے۔ اُمید و بیم کی یہ کیفیت ایسی بڑھی کہ کرکٹ کے میدان کا مقابلہ ہائی وولٹیج ایموشنل ڈرامے میں تبدیل ہوگیا۔ آخر آخر تک تو معاملہ ایسی حد کو چُھوگیا کہ بھارت کے بہت سے شائقین نے شاہد آفریدی کو ہارٹ اٹیک اسپیشلسٹ قرار دے دیا! شاہد آفریدی جس کام کے لیے شہرت رکھتے ہیں وہی کام اُنھوں نے کر دکھایا۔

قوم کو بر وقت فتح ملی ہے۔ اندرونی شدت پسندوں کے خلاف نہ سہی، بیرونی شدت پسندوں کے خلاف ہی سہی۔ ہر معاملے میں خود کو بند گلی میں پانے والی قوم نے محض دو چھکّوں کی بدولت خود کو کھلے میدان میں پایا اور کامرانی کے بھرپور احساس سے سرشار ہوئی۔ یہ ایسی عجیب و غریب فتح تھی کہ بھارت کے شائقین بھی پاکستانی کرکٹرز کو دِل کی گہرائیوں سے داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ ویب سائٹس

پر پوسٹ کئے جانے والے کمنٹس میں کئی شائقین نے کہا کہ بھارتی کرکٹ نے دم توڑ دیا۔ کرکٹ کی ایک ویب سائٹ پر پربھاش نے لکھا کہ پاکستان کے بغیر کرکٹ کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ ونود کمار نے لکھا کہ پاکستانی طلسماتی قوم ہے، کچھ بھی کر سکتی ہے۔
بھارت کے خلاف فتح نے صرف شاہد آفریدی کے کیریئر کو نئی زندگی نہیں بخشی بلکہ پاکستان کو کرکٹ کی دنیا میں بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ ہر فورم پر پاکستان کی مخالفت میں سینہ تان کر سامنے آنے والے اب سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ کسی بڑی ٹیم کی راہ روکنا فطرت کے خلاف جانا ہے۔ اِس ایک فتح نے بگ تھری کا غرور مٹی میں ملا دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بگ تھری کو "لِک تھری" جیسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ پاکستان کا بنگلہ دیش کی سرزمین پر کھیلنا شیخ حسینہ واجد کی حکومت کے مُنہ پر بھی زنّاٹے دار تھپّڑ ہے جس نے اپنی کرکٹ ٹیم کو سیکیورٹی رِسک کا بہانہ گھڑ کر پاکستان بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ راستہ صلاحیت کا روکا جاسکتا ہے نہ جذبے کا۔ اگر کسی کو فطری اظہار سے روکا جائے تو معاملہ "ہائپ" میں تبدیل ہوتا ہے۔ غالبؔ نے خوب کہا ہے ۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مِری طبع تو ہوتی ہے رواں اور!

ایشیا کپ میں بھارت کی درگت اور مجموعی طور پر بگ تھری کا کھیل کے میدان میں بُرا حشراِس بات کی دلیل ہے کہ معاملہ کھیل کا ہو تو پانسہ کسی بھی وقت پلٹ سکتا ہے۔
پاکستان کی شاندار فتح کرکٹ کھیلنے والی تمام چھوٹی اقوام کے حوصلے بلند کرے گی۔ قوم کو سرخوشی کے یہ حسین لمحات مبارک!

!رونق میلے کی خیر ہو

موئن جو دڑو میں جو لوگ بھی رہتے تھے وہ بڑے خوش نصیب تھے کہ ہزاروں سال بعد بھی اُن کے گھر آنگن میں خوشیاں ناچ رہی ہیں، اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ اُن پر مہربان ہیں اور سندھ کی ثقافت کو عروج بخشنے کے نام پر پندرہ روزہ پروگرام کے تحت جشن منائے گئے ہیں۔ اِس رونق میلے نے ہمارے دِل میں موئن جو دڑو کے آس پاس باقیات کی شکل میں بسے ہوئے قدیم سندھیوں کے لیے حسد کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں۔ جن کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا اُنہیں ایسے شاندار انداز سے پُوجا جارہا ہے کہ دیکھنے والے انگشت بہ دنداں ہیں۔

اور دوسری طرف انتہا یہ ہے کہ تھر کے زندہ غریب حالات کی چکّی میں پستے ہوئے زندہ در گور ہیں۔ مَرے ہوؤں کے نام پر جشن ..... اور زندوں کی خاطر تھوڑا سا سوگ بھی نہیں ! اِسی کو تو کُھلا تضاد کہتے ہیں۔

تھر کے مجبور و لاچار باشندوں پر موسم کی اُفتاد ایسی پڑی کہ اُن کے پُھول سے بچّے خزاں کی نذر ہوئے۔ خوراک کی شدید قِلّت نے تھر کے ریگستان کو کچھ اِس طرح لپیٹ میں لیا کہ معصوم زندگیاں بھی ریت کے ذرّوں کی سی ہو گئیں۔

اِس سے پہلے کہ کسی کی سمجھ میں کچھ آتا یا ہوش آتا، ڈیڑھ سے زائد پُھول مُرجھا چکے تھے۔ جہاں بچوں کی کِلکاریاں گونجا کرتی تھیں وہاں آہوں اور سِسکیوں کے سِوا کچھ نہ بچا۔

سندھ کے وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ کو خاصی دیر سے یاد آیا کہ تھر کا علاقہ بھی اُن کی قلمرو کا حصہ ہے اور وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے لیے اُن سے بھی بازپُرس ہو گی۔ کسی بڑے کو تو کیا پُوچھنا تھا اور قیامت کا حساب کتاب ابھی دور ہے۔ ایسے میں میڈیا والوں نے چند سوالات داغ کر شاہ صاحب کو لب کُشائی پر مجبور کیا۔ انتظامیہ کی نااہلی کا ملبہ موسم پر گراتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا کہ تھر کے بچّے نمونیا سے ہلاک ہوئے ہیں۔ ایک رپورٹر نے یہ سُن کر سوال داغا کہ کیا اب سردی کے خلاف تحقیقات کی جائے گی تو شاہ صاحب برہم ہوگئے اور پریس کانفرنس درہم برہم کردی۔

پاکستانی معاشرے اور حکومتی مشینری کو آزاد کہنا اُن کی توہین ہے کیونکہ یہ آزاد نہیں، مادر پدر آزاد ہیں۔ اب کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ کسی کے لیے من مانی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ جو سیاہ و سفید کے مالک ہیں اُن کی رگوں میں خون سفید تر ہوتا جاتا ہے اور تمام معاملات کو وہ سیاہ تر کرنے پر تُلے رہتے ہیں!

یہ نہ سمجھا جائے کہ کسی کو ہوش نہیں آتا۔ ہوش ضرور آتا ہے مگر پانی سَر سے گزر جانے کے بعد۔ سبھی جانتے ہیں کہ مون سُون میں سیلاب کا خطرہ برقرار رہتا ہے مگر پیش بندی کوئی نہیں کرتا۔ اور جب بہت کچھ زیرِ آب آچکا ہوتا ہے تب اربابِ بست و کُشاد کے ماتھے پر ندامت کی چند بُوندیں نمودار ہوتی ہیں۔

تھر کے ریگستان نے انسانوں کو بھی ریت کے ذرّات سمجھ کر اپنانا شروع کر دیا ہے۔ حکمرانوں کی عدم توجہ سے ایسا تو ہونا ہی تھا۔ بھوک سے بلکتے اور بیماریوں سے تڑپتے بچّوں پر کسی نے توجہ نہ دی اور معاملات بگڑتے ہی چلے گئے۔ بھوک اور بیماری نے مفاہمت کی پالیسی اپنائی اور یوں اِس مشترکہ عفریت نے بچّوں کو نگلنا شروع کیا۔ یہ سب کچھ ایسی خاموشی سے ہوا کہ کسی کا دھیان ہی اِس طرف نہیں گیا۔ تھر اور ایسے ہی دوسرے بہت سے علاقے بند پڑی ہوئی سِموں کی طرح ہیں۔ جن کے ہاتھ میں اقتدار اور اختیار ہے وہ اِن علاقوں کو activate کرنا بھول گئے ہیں۔ یا پھر یوں ہے کہ نیٹ ورک پر دباؤ کم کرنے کے لیے اِن علاقوں کو de-activated رکھا گیا ہے!

شرم و حیا ابتدائی مرحلے میں مانع ہوتی ہے۔ جب انسان اپنی آنکھوں سے شرم کا پانی بہانے پر تُل جائے تو دو تین تجربات میں ساری جھجک دور ہوجاتی ہے۔ ویسے تو خیر پورے ملک کا، اِنّا ماشاء اللہ، ایک سا حال ہے مگر سندھ حکومت نے

تھر میں بچّوں کی ہلاکت کے حوالے سے کمال کر دِکھایا ہے۔ وزیر اعلیٰ کے دورہ تھر کے موقع پر مِٹّھی کے سرکٹ ہاؤس میں جو کچھ ہوا وہ دیکھ کر قوم کے لیے شارٹ سرکٹ والی کیفیت نے جنم لیا ہے۔ جس علاقے میں بچّے خوراک نہ ملنے سے مر رہے ہیں اور لوگ مِرچی کھا کر پیٹ بھر رہے ہیں وہاں وزیر اعلیٰ اور ان کے رفقاء کے لیے شاندار و پُر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ اِسے زخموں پر نمک پاشی نہ کہیے تو اور کیا نام دیجیے۔ لوگ بھوک کے غار میں گر رہے تھے اور سرکاری مشینری درجن بھر ڈِشوں کا ہمالیہ سَر کرنے کے فراق میں تھی۔ کسی کے چہرے پر تفکر اور پریشانی کے آثار تک نہ تھے۔ کوئی بھی پریشانی اُسی وقت تکلیف دیتی ہے جب اُسے محسوس کیا جائے۔ اب شاید سرکاری اُصول یہ ہے کہ اگر کوئی منظر تکلیف دے رہا ہو تو آنکھیں مُوند لینا ہی بہترین دستیاب آپشن ہے۔

مِٹّھی کے سرکٹ ہاؤس میں ملائی بُوٹی، قورمہ، تِکّے،۔بریانی اور مچھلی کی ڈِشوں پر مشتمل ضیافت کے اہتمام نے ثابت کردیا کہ اب اہمیت صرف اس بات کی ہے کہ رونق میلہ چلتا رہنا چاہیے۔ اِنسانوں کا کیا ہے، وہ تو مرتے ہی رہتے ہیں۔ زندگی اٹل ہو نہ ہو، موت تو اٹل ہے۔ جو ہونا طے ہے اُس کے لیے کیا دِل گرفتہ ہونا اور آنسو بہانا؟ کسی کے آنے یا جانے سے شو کہاں رُکتا ہے؟ اور کیوں رُکے یا روکا جائے؟

یہ بیان بھی خوب ہے کہ تھر میں تو ہر سال یہی کچھ ہوتا ہے، نیا کچھ بھی

نہیں۔ یعنی جو ہوتا آیا ہے اُسے ہوتے رہنے دیا جائے۔ غریبوں کا تو کام ہی مرنا اور حکومت کو بدنام کرنا ہے۔ اُن کی اموات کا کوئی اثر نہ لیا جائے۔ چہ خوب۔ وزیر اعلیٰ فرماتے ہیں کہ بچّے بھوک سے نہیں، نمونیا سے مرے۔ عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ چلیے، یہی سہی۔ تو کیا نمونیا کے جن کو علاج کی بوتل میں بند کرنا محکمۂ صحت کی ذمہ داری نہیں؟ جب اہلِ اقتدار اور سرکاری مشینری کا یہ حال ہو تو لوگ زندگی پر موت کو ترجیح کیوں نہ دیں؟ ؎

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بِن آئے نہ رہے

!تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بُلائے نہ بنے

جو کچھ تھر کے معاملے میں ہوا ہے وہی کچھ ہر سال مون سُون میں سیلاب کے حوالے سے ہوتا ہے۔ سیلاب سالانہ معمول ہے۔ اُسے تو آنا ہی ہے تو پھر پریشان کیوں ہوا جائے۔ یعنی ع

!جو آئے آئے کہ ہم دِل کُشادہ رکھتے ہیں

کسی بھی ہنگامی حالت کو سالانہ معمول قرار دے کر نظر انداز کر دیا جائے؟ چشم پوشی برتی جائے؟ پیپلز پارٹی کے ''بوائے مین'' بلاول بھٹو زرداری کہتے ہیں کہ تھر سے ملحق بھارتی علاقے میں بھی ایسی ہی قیامت ٹوٹی ہے! گویا وہاں کچھ ہو تو اُس کی طرز پر یہاں بھی وہی کچھ ہونے دیا جائے؟ کیا تھر کے بچّے اِس

قوم کا حصہ نہیں؟ ریگستان میں رہنے سے کیا وہ ریت کے ذرّے ہو گئے؟ کیا بہتر زندگی پر، اور اُس سے بڑھ کر زندگی پر اُن کا حق نہیں؟

تھر میں پانی نہیں مگر سوالات کا ریلا رواں ہے۔ مگر سوالوں کی فکر تو اُنہیں دامن گیر رہتی ہے جو جواب دینے کو اپنی ذمہ داری گردانتے ہوں اور اپنے گریبان میں جھانکنے کے لیے تیار ہوں۔ جب طے کر لیا گیا ہو کہ سوچنا ہی نہیں ہے اور کسی سوال کا جواب بھی نہیں دینا تو پھر کیسی شرم اور کیسی حیا؟

تھر کے جو پُھول مُرجھا کر ابدی خزاں کی گود میں جا سوئے ہیں اُن کی عظمت کو سلام کہ اُنھوں نے جان دیکر رونق میلے میں کچھ جان ڈالی ہے، سرکاری مشینری کے چند بڑے پُرزے ہِلے ہیں اور ریت کے ٹیلوں کا رُخ کیا ہے

☆☆☆

ہم اِتنی ''ترقّی'' کیسے کریں؟

کہتے ہیں بڑے کی ہر بات بڑی ہوتی ہے۔ ہم تو اِس کہاوت کو درست مانے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جو کچھ بزرگوں نے کہا ہے اُس کے لیے ثبوت کی تلاش میں ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑتا۔ ذرا اپنے پڑوس میں جھانک لیجیے، کوئی ابہام باقی نہ رہے گا۔ غلط نہ سمجھیں۔ ہم پڑوس کے مکان میں جھانکنے کی بات نہیں کر رہے۔ جو ہم سے جُڑا ہوا ہے وہ ملک بھی تو پڑوسی ہی ہوا۔ بات ہو رہی ہے اُس بھارت کی جسے چمکتا دمکتا قرار دینے کی دوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنے دورِ حکومت میں چمکتا بھارت کی ایسی گردان لگائی کہ جن لوگوں نے ثبوت کے لیے بھارت پر نظر ڈالی اُن کی آنکھیں ''کثرتِ نُور'' سے چُندھیا گئیں! یہ تو ہونا ہی تھا۔ جو کچھ پڑوس کی سرزمین پر ہوتا ہے اُسے دیکھ کر کبھی کبھی تو ہمیں کمتر ہونے کا احساس شِدّت سے ستانے لگتا ہے۔ جو لوگ ہر معاملے میں پاکستان کا موازنہ بھارت سے کرنے بیٹھ جاتے ہیں اُنہیں کبھی کبھی اپنے گریبان میں بھی جھانک لینا چاہیے۔ ہم کہاں اور وہ کہاں! ع

دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ!

بات یہ ہے صاحب کہ ہم اب تک دامن اور بندِ قبا کی منزل میں ہیں۔ پڑوسیوں نے دامن اور بندِ قبا کو قِصّۂ پارینہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ دامن پر داغ لگنے کی فکر تو تب دامن گیر ہو جب دامن سلامت رہا ہو! اور جب قبا ہی کو سات سلام کرکے رخصت کر دیجیے تو کون سا بندِ قبا، کہاں کا بندِ قبا؟

بھارت کی سرزمین پر جو کچھ ہوتا ہے اُس سے تھوڑی بہت ''انسپیریشن'' پاکر ہمارے ہاں بھی اوٹ پٹانگ حرکات کی جاتی ہیں۔ مگر صاحب، اوریجنل تو اوریجنل ہوتا ہے! ہم اِس معاملے میں صرف نقل کی منزل میں رہتے ہیں، 43 سال قبل ہم سے ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لے چُکنے کا دعویٰ کرنے والے اب ہر معاملے میں ہم سے ہزار قدم آگے ہیں۔ پاکستان میں جن لوگوں کو مہاراج کی غلامی کا ٹوکرا سَر پر لادنے کا شوق ہے وہ سوچ لیں کہ اُن کی برابری ہمارے بس کی بات نہیں۔

امجد اسلام امجد نے کہا تھا ع

جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے

بھارت محبت کی سرزمین ہے، پریم کی دھرتی ہے۔ اور پریم کرنے والے پریم کو محدود کب رکھتے ہیں؟ محبت کرتے ہیں تو ''پھیلاؤ'' کی منزل تک پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ اہلِ ہند نے اپنے عمل سے ثابت کیا

ہے کہ محبت اور بے صبری مترادف الفاظ ہیں۔ محبت اُنہیں اِتنا کچھ سِکھاتی آئی ہے کہ اب وہ دوسروں کو سِکھانے پر مجبور ہیں۔ اور جب سیکھنے والے مرعوبیت پسند ذہنیت کے حامل ہوں تو معاملہ دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ پاکستان کی مِٹّی میں جنم لینے والے ''بھارت پریمیوں'' کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔

پریم کیا ہے، محبت کس بلا کو کہتے ہیں، لگاؤ کس حد تک پہنچا دیتا ہے یہ سب ذہنوں میں اچھی ٹھونکنے کے لیے بالی وڈ کی فلمیں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ اگر بالی وڈ کی رومانٹک فلمیں نہ ہوں تو دُنیا کو معلوم ہی نہ ہو پائے کہ محبت کیا ہوتی ہے اور اُس کے آغوش میں پناہ لیکر انسان کیا سے کیا ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے! مگر صاحب، محبت کی تشریح کچھ فلموں ہی پر موقوف نہیں۔ بے چارے اسکرین رائٹرز اور ڈائریکٹرز کی ذہنی سکت کی بھی کوئی نہ کوئی تو حد ہوتی ہی ہے۔ بھارت کے پریمی کسی حد کو جانتے ہیں نہ مانتے ہیں۔ اُن کا جوش و خروش قابلِ دید بھی ہوتا ہے اور قابلِ داد بھی۔ ہم تو یہ سوچ کر لرزاں و ترساں رہتے ہیں کہ اگر کبھی بھارت نے پریمیوں کو فوج میں بھرتی کرلیا تو ہمارا کیا ہوگا۔ پریمی تو کسی ''لائن آف کنٹرول'' کو نہیں مانتے!

بھارتی ریاست اُتر پردیش کے علاقے بسال پور میں رتن پور کے مقام پر ماں مہا

مایا دیوی کے مندر میں 5 دن قبل عجیب و غریب واقعہ رُونما ہوا۔ چندریکا کی شادی دیپک کونی سے طے تھی۔ مگر لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دلہن نے دولہا کی بجائے اُس کی پگڑی کے ساتھ پوترا اگنی کے گرد سات پھیرے لیے۔ آپ سوچیں گے ایسی بھی کیا بے صبری تھی کہ دولہا کی پگڑی کو دولہا کا درجہ دے دیا۔ بات یہ ہے کہ دیپک کونی بہت پڑھاکو ہیں۔ اُنہیں کیریئر بھی تو بنانا ہے۔ چندریکا سے پریم ہے تو کیا ہوا۔ شادی کے بعد کوئی ندی کنارے چھوٹا سا جھونپڑا بنا کر تو نہیں رہنا۔ گھر چاہیے، اچھی نوکری چاہیے۔ جس دن شادی طے ہوئی اُسی اُنہیں آئی ٹی آئی کا امتحان دینا پڑگیا۔ دیپک جی لگن منڈپ تک آئے، حاضری لگائی اور اپنی مجبوری دلہن کے گوش گزار کرکے چلے گئے۔ دلہن نے بھی بہ رضا و رغبت شادی کی باقی رسمیں دولہے راجہ کے بغیر پوری کیں۔ دیپک کونی جب امتحان دیکر لگن منڈپ میں دوبارہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ تمام رسمیں ہوچکی ہیں اور اُن کی پگڑی کو ساکشی مان کر چندریکا ہزاروں جنم تک ساتھ نبھانے کا عہد کرچکی ہے۔ آپ سوچیں گے پھیرے بعد میں لیے جاسکتے تھے۔ آپ بھی بہت بھولے ہیں۔ جنہیں پریم ہو جائے اُن کی ''بدھی'' کو دھار لگ جاتی ہے اور وہ کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور کبھی کبھی تو شام کے سائے جیسا دُھندلا سا موقع بھی گولڈن چانس میں تبدیل کرلیتے ہیں!

جو کچھ چندریکا اور دیپک نے کیا وہ تو ''مثالی'' تھا ہی۔ اُن سے ایک قدم

آگے جاکر مدھیہ پردیش کے ایک پریمی جوڑے نے ایسی انوکھی مثال قائم کی ہے کہ آپ تک جانکاری پہنچے گی تو دانتوں میں اُنگلی داب لینے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ بھوپال سے 446 کلومیٹر دور جبل پور کے نزدیک اِچھوار نام کے گاؤں میں شادی کی تقریب ہنگامے کی نذر ہوتے ہوتے بچی۔ آپ نے ایسے واقعات تو سُنے ہی ہوں گے کہ شادی سے کچھ دن پہلے، شادی والے دن یا شادی کے شامیانے سے دلہن گھر کے تمام لوگوں کو بیگانہ سمجھ کر ''آشنا'' کے ساتھ فرار ہو گئی۔ آپ سوچیں گے اِس میں ایسا کیا ہے کہ حیرت کا اظہار کیا جائے، ایسا صرف بھارت میں نہیں بلکہ ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے۔
آپ نے جو کچھ سوچا وہ بھی درست اور جو کچھ فرمایا وہ بھی غلط نہیں۔ مگر جناب، مدھیہ پردیش کے اِچھوار گاؤں کی الہڑ مٹیار نے جو کیا وہ تو شاید آپ نے بُھولے بھٹکے خواب میں نہ سوچا ہوگا۔ پنڈت جی پوتر اگنی کُنڈ تیار کر رہے تھے اور زیر لب منتروں کی گردان بھی کرتے جاتے تھے۔ مہمان آچکے تھے۔ لڑکے والے بھی جب براج گئے یعنی بیٹھ گئے تو اچانک شور سا اُٹھا۔ کچھ لوگ یہ سمجھے کہ شاید لڑکی بے ہوش ہو گئی ہے۔ کوئی پانی لانے دوڑا۔ کسی نے ہاتھ کا پنکھا تلاش کیا تاکہ دلہن کو جُھلا جاسکے۔ مگر شاید اِن دونوں چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ لگن منڈپ میں جو کچھ وقوع پذیر ہوا وہ ایسا تھا کہ پہلے تو لوگوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبالیں اور پھر (اپنے اپنے) سَر تھام لیے۔
!دلہن نے لگن منڈپ ہی میں بچے کو جنم دے دیا

آن کی آن میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ لڑکے والے جانے لگے۔ لڑکی والی اُن کے پاؤں پڑ گئے مگر لڑکے والے ماننے کا نام نہ لیتے تھے۔ ایسے میں لڑکے نے ساتھ نبھانے کا وعدہ نبھادیا۔ وہ شادی پر بضد تھا اور دلہن کو لیے بغیر گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ بیٹے کی ضد دیکھ کر باپ نے ہار مان لی۔ یوں دولہا دلہن اپنے لختِ جگر کے ساتھ گھر چلے۔

ہم نے اور آپ نے بارہا سُنا ہوگا کہ بچے والدین سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے مُجھے اپنی شادی میں کیوں نہیں بُلایا تھا! لیجیے، اب ایک بچے کی یہ شکایت تو ختم ہوئی! اُس نے والدین کی شادی میں صرف نہیں کی بلکہ اُس کی آمد ہی شادی میں ہوئی! کل کو لوگ پوچھیں گے سُنا ہے تم والدین کی شادی میں گئے تھے۔ اِس پر وہ کہے گا ''میں تو شادی ہی میں 'آیا' تھا!''

بات یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو ایک سال سے جانتے تھے۔ ایک دوسرے کو ''پرکھنے'' اور ''مطمئن'' ہونے کے لیے ایک سال کافی ہوتا ہے! ہم نے جب ایک مشہور ہندی اخبار میں یہ واقعہ پڑھا تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا۔ یہ ویسا ہی اندھیرا تھا جو شاہد آفریدی کے دو چھکّوں کے باعث بھارت کے کروڑوں کرکٹ پریمیوں کی آنکھوں کے سامنے چھاگیا تھا! ہم یہ سوچ کر

اپنا سا مُنہ لیکر رہ گئے کہ چمکتے دمکتے بھارت کی ہمسَری ہم سے کیا ہو گی۔ ابھی ہم اِتنے تیز رفتار اور ''جِدّت پسند'' نہیں ہوئے!

طیارہ ڈھونڈنے کا صحیح طریقہ

ملائیشیا کا طیارہ تو ایسا غائب ہوا ہے کہ کسی طور پکڑائی دینے پر آمادہ ہی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ملائیشین ایئر لائن کے طیارے کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ یہ طیارہ ایسا لاپتا ہوا ہے جیسے ہماری پالیسیوں سے معقولیت ناپید ہوئی ہے۔ تکنیکی اداروں کے اہلِ نظر ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکے ہیں۔ ماہرین کی ساکھ داؤ پر لگ گئی ہے۔ فی زمانہ ہر چیز پر نظر ہے، نگرانی ہے کہ ختم نہیں ہوتی۔ ایسے میں ایک پورے کے پورے طیارے کا یوں غائب ہو جانا انتہائی اچنبھے کی بات ہے۔ سوچنے والے سوچ سوچ کر باؤلے ہوئے جارہے ہیں کہ اب اُس طیارے کو لائیں تو کہاں سے لائیں۔

زمانے بھر کی ذہانت اپنی کھوپڑی میں سمونے کا دعویٰ کرنے اور بات بات پر مہارت جھاڑنے والے مہر بہ لب ہیں۔ ٹیکنالوجی کی ہوش رُبا پیش رفت والے اِس دور میں ایک پورا طیارہ غائب ہوگیا ہے اور کوئی اِس پوزیشن میں نہیں کہ پورے تیقّن سے اُس کے بارے میں کچھ بتاسکے۔ مانا کہ ہمارے سیاست دان بھی انتخابی کامیابی کے بعد غائب ہوجاتے ہیں مگر خیر، وہ کبھی کبھی منتخب ایوان میں تو دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ بہت سے لوگ اُدھار لینے کے بعد

غائب ہوجاتے ہیں اور کسی صورت ہاتھ آنے کا نام نہیں لیتے مگر ملائیشین طیارے نے تو ایسا گھونگھٹ کاڑھا ہے کہ کہیں نام رہا ہے نہ نشان۔ اب ایسا بھی کیا رُوٹھنا کہ مَن کر ہی نہ دیجیے۔ بے چارے ماہرین پریشان ہیں کہ ۔

نشاں بھی کوئی نہ چھوڑا کہ دِل کو سمجھائیں
تری تلاش میں جائیں تو ہم کہاں جائیں؟

متعدد ممالک کی بحریہ اور فضائیہ نے ملائیشین طیارے کے رُوٹ کا چپہ چپہ چھان مارا ہے مگر طیارے کا کہیں بھی سُراغ نہیں ملا۔ اِس سرچ آپریشن پر اب تک لاکھوں ڈالر خرچ ہوچکے ہیں۔ امریکی محکمہ دفاع نے 40 لاکھ ڈالر مختص کرنے کا اعلان کیا ہے۔

ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ اِس معاملے کا رُخ پاکستان کی طرف موڑنے کی کوشش کی گئی۔ زمانہ ایسا ہے کہ کسی پریشانی کو جب کہیں سَر چُھپانے کی جگہ نہیں ملتی تو وہ ہماری سرزمین کا رُخ کرتی ہے یا اُس کا رُخ اِدھر کردیا جاتا ہے۔ اِس بار بھی شک کی سُوئی پاکستان پر لاکر روکی گئی۔ مغربی میڈیا کو صرف اشارا درکار تھا۔ اُس نے پاکستان کے خلاف راگ الاپنا اور بینڈ بجانا شروع کردیا۔ ملائیشین وزیر اعظم بھی گھبرا گئے اور پاکستانی ہم منصب کو فون کر ڈالا۔ موصوف نے طیارے کی تلاش میں تعاون کی استدعا کی۔ ہمیں یہ خبر پڑھ کر

بہت حیرت ہوئی اور ہنسی بھی آئی۔ ہماری حکومت بے چاری کیا ڈھونڈ سکتی ہے؟ وہ اب تک گڈ گورننس ہی ڈھونڈ کر اپنا نہیں پائی! ہماری سرکاری مشینری کے پاس ایسی کون سی ٹیکنالوجی ہے کہ کچھ ڈھونڈ سکے یا کسی چیز کی نشاندہی کر سکے۔ اگر سرکاری مشینری میں کچھ معلوم کرنے کی صلاحیت ہوتی تو ہم اپنی تعلیم کا کھویا ہوا معیار نہ ڈھونڈ نکالتے۔ ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر کون سے پاتال میں جا چھپی ہے، یہ بھی ہم معلوم کر ہی لیتے۔ ہم اُس کا سُراغ پانے کے مرحلے سے بہت دور ہیں۔ ہم اپنے کھوئے ہوئے امن اور استحکام کو ڈھونڈ نکالنے میں بھی اب تک یکسر ناکام رہے ہیں۔ کرکٹ کسی زمانے میں کھیل کا نام تھا۔ اب کرکٹ کے نام پر اِتنا کچھ کھیلا جارہا ہے اِس گورکھ دھندے میں کرکٹ کو تلاش ایسا ہی ہے جیسے ملائیشین طیارے کو ڈھونڈ نکالنا۔ کسی زمانے میں ہماری ایک ہاکی ٹیم بھی ہوا کرتی تھی۔ پہلے تو ہاکی ٹیم سے ہاکی نکلی۔ پھر پوری ہاکی ٹیم ہی کہیں نکل گئی۔ کہاں گئی، کوئی نہیں جانتا۔

سرکاری مشینری اگر زیادہ گِھس گئی ہے اور بظاہر کسی کام کی نہیں رہی تب بھی کچھ زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہاں کسی بھی معاملے کی تہہ میں اُترنے کی صلاحیت رکھنے والے ماہرین کی کمی نہیں۔ اِن ماہرین کا تعلق میڈیا کی دُنیا سے ہے۔ میڈیا مشینری کے یہ کلیدی پُرزے جب قلم تھامتے یا بولتے ہیں تو انجانی دُنیاؤں کی خبر لاتے ہیں۔ اِن کی باتوں میں کائنات کے سربستہ

اسرار بھی آسانی سے تلاش کئے جا سکتے ہیں، ملائیشین طیارے کی تو اوقات ہی کیا ہے۔ تجزیہ کاروں کی فوج ظفر موج ناپید کو ہویدا کرنے کی صلاحیت سے متصف ہے۔ یہ کشید کرلے۔ اور اگر زیادہ جوش میں ہو تو somthing سے nothing چاہے تو everything کی منزل تک بھی پہنچ جائے!

چند برسوں سے میڈیا مشینری نے ایک ایسا آئٹم متعارف کرایا ہے جس کی مدد سے کچھ بھی کھوج نکالا جاسکتا ہے۔ اِس آئٹم کو کہتے ہیں کہ چھاپہ مار ٹیم۔ ٹی وی پر ایسی چھاپہ مار ٹیمیں کام کر رہی ہیں جو آن کی آن میں کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہیں اور کسی بھی کونے کھانچے سے بہت کچھ ایسا باہر نکال لاتی ہیں جسے دیکھ اور سُن کر لوگ دانتوں تلے انگلیاں دبالیتے ہیں۔

کرنٹ افیئرز کے پروگرام غور سے دیکھیے۔ اِن پروگرامز کے اینکرز کو اللہ نے ایسی فنکاری سے نوازا ہے کہ پلک جھپکتے میں اپنی کہکشاں سے نکل کر دوسری کہکشاؤں تک پہنچ کر وہاں سے یعنی بہت دُور کی کوڑیاں لاکر ناظرین کو حیران اور پروگرام کے شرکاء کو پریشان کردیتے ہیں! کسی بھی معاملے میں جب حقیقت کا سُراغ نہ مل رہا ہو تو اینکرز کسی نہ کسی حقیقت تک پہنچ ہی جاتے ہیں یا پھر کسی بھی چیز کو حقیقت کے روپ میں پیش کردیتے ہیں! چند ہی جملوں میں یہ سب کچھ کھنگال ڈالتے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں یہ قومی خزانے کی اسکریننگ کر

گزرتے ہیں کہ کون کتنا مال ڈکار رہا ہے! یعنی جمشید دستی کی طرح بتا سکتے ہیں کہ ع
!کس نے پی، کس نے نہ پی، کس کس کے آگے جام تھا

اِن کی مہارت کا عالم یہ ہے کہ زمین پر بیٹھے بیٹھے کسی بھی سیارے یا ستارے کی سطح کے بارے میں جامع رپورٹ جاری کر سکتے ہیں۔ اور کس کی مجال ہے کہ اُس رپورٹ کو درست تسلیم کرنے سے یا قبول کرنے سے انکار کرے؟

ہماری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ ملائیشین طیارے کی تلاش کا ٹاسک کسی ٹی وی پروگرام کی چھاپہ مار ٹیم کو سونپ دیا جائے تو کچھ بعید نہیں کہ اگلے ہی دن معلوم ہوجائے کہ طیارہ کہاں ہے اور اُس میں کیا ہو رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ اِس انکشاف سے حیران رہ جائیں کہ ملائیشین طیارے میں جعلی گھی اور تیل بنانے یا غیر معیاری مسالے تیار کرنے کی فیکٹری کام کر رہی ہے! اور اگر یہی ٹاسک اینکرز کو دے دیا جائے تو وہ یاتو اپنے سِفلی علم" کی مدد سے لاپتا طیارے کو ڈھونڈ نکالیں گے یا پھر اپنی چرب زبانی سے "
!کسی بھی بڑے ڈھانچے کو طیارہ ثابت کرکے دم لیں گے

اگر میڈیا مشینری سے کام میں کوئی کوتاہی رہ جائے تو عاملوں سے بھی مدد لی

جاسکتی ہے۔ وہ جب اچھے خاصے ڈھیٹ اور سنگ دل محبوب کو قدموں میں ڈال سکتے
ہیں تو ایک بے جان طیارہ اُن کے علم و فن کے آگے کیا بیچتا ہے! ہمیں یقین ہے کہ
ملائیشین طیارہ اُن کے لیے ایک آدھ وظیفے کی مار ثابت ہوگا۔ آزمائش شرط ہے۔

ایک قدم آگے جا کر

کہانی وہی دلچسپ ہوتی ہے جس میں وقفے وقفے سے موڑ آتے ہوں، کوئی نہ کوئی چونکانے والی بات پائی جاتی ہو۔ مغرب بھی ایک انتہائی دلچسپ کہانی جیسا ہی ہے۔ مغربی معاشروں میں جو کچھ ہوتا ہے، جو سوچیں پنپتی رہتی ہیں اور جو روئیے جنم لیتے رہتے ہیں وہ، صحیح اور غلط کی بحث سے قطعِ نظر، بے حد دلچسپ اور چونکانے والے ہوتے ہیں۔ مغرب ایسا افسانہ ہے جسے پڑھنے والا فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کس بات پر کتنا حیران ہو اور کس بات سے کس حد تک محظوظ ہوا جائے۔ پڑھتے چلے جایئے، دل کشی ہے کہ ختم ہونے کا یا ماند پڑنے کا نام نہیں لیتی۔

مغربی معاشروں میں ایسے بچوں کی کمی نہیں جن کے باپ نامعلوم ہوتے ہیں۔ مگر خیر، ایسے بچے بھی بڑی تعداد میں ہیں جن کی مائیں بھی نامعلوم ہیں۔ امریکی ریاست پنسلوانیا کی 27 سالہ کیتھرن ڈیرل اپنی ماں کی تلاش میں نکلی ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ ہوئی۔ جن بچوں کو ''ترک'' کر دیا جاتا ہے وہ زندگی بھر سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ اُن کے والدین کون ہیں۔ تو پھر کیتھرن کی کہانی میں نیا کیا ہے؟

کیتھرن کو اُس کی ماں نے پنسلوانیا کے شہر ساؤتھ وائٹ ہال ٹاؤن شپ کے نواحی علاقے ایلنٹاؤن کی ایک برگر شاپ کے باتھ روم میں اُس وقت چھوڑ دیا تھا جب وہ محض تین چار گھنٹے کی تھی۔ 24 گھنٹے کھلی رہنے والی برگر شاپ کا ایک ملازم جب صبح ساڑھے پانچ بجے ڈیوٹی پر پہنچا تو ایک آدھ گھنٹے بعد اُسے باتھ روم سے کسی بچے کے رونے کی آواز سُنائی دی۔ اُس نے سوچا شاید کوئی کسٹمر اپنے بچے کی نیپی بدل رہی ہوگی۔ مگر بیس پچیس منٹ بعد پھر بچے کے رونے کی آواز آئی۔ متجسّس ہو کر اُس نے ایک خاتون کسٹمر کو ساتھ لیا اور لیڈیز ٹوائلیٹ میں گیا۔ وہاں ایک باتھ روم میں فرش پر سوئیٹر میں لپٹی ہوئی بچی پڑی تھی۔۔ برگر شاپ کے ملازم نے بچی کو ہاتھ لگانے سے پہلے مقامی پولیس کو مطلع کیا۔ آن کی آن میں وہاں بھیڑ لگ گئی۔

بچی کو فوری طور پر ہسپتال منتقل کیا گیا جہاں ڈاکٹرز نے بتایا کہ وہ مکمل صحت مند ہے اور اُس کی پیدائش کو تین یا چار گھنٹے ہوئے ہیں۔ بچی کی نال کٹی ہوئی نہیں تھی مگر سُوکھ گئی تھی۔

بچی کو تین دن ہسپتال میں رکھا گیا۔ اِس دوران پولیس نے باتھ روم میں پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات اور دیگر شواہد کی مدد سے بچی کی ماں کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر ناکام رہی۔ چوتھے دن کارل ہولس اور اُس کی بیوی

.بریںڈا ہولس نے بچی کو گود لے لیا۔ اِس جوڑے کے دو بیٹے تھے۔ اِس بچی سے پہلے بھی وہ دو بچیوں کو گود لے چکے تھے اور تمام بچے بہت اچھی زندگی بسر کر رہے تھے۔

بچی کا نام کیتھرن رکھا گیا۔ اُسے گود لینے والا گھرانہ شفیق ہی نہیں، متموّل بھی تھا۔ اُس کی پرورش عمدگی سے ہوئی۔ وہ ناز و نعم میں پلی۔ .بریںڈا ہولس اکثر کہا کرتی تھیں۔ میرے بیٹے پیٹ سے ہیں اور بیٹیاں دِل سے!" کیتھرن نے اچھی تعلیم پائی۔ دو" بھائیوں اور دو بہنوں کے ساتھ جب وہ بڑی ہوئی تو اُسے بتادیا گیا کہ دو بہنوں کی طرح اُسے بھی گود لیا گیا ہے۔

کیتھرن جب بارہ سال کی تھی تب ایک دن اسکول میں اُسے ٹاسک ملا کہ اپنے گھرانے اور خاندان کی تاریخ بیان کرے۔ وہ گھر آئی اور اپنے خاندان کی تاریخ لکھنے کے لیے کارل اور بریںڈا ہولس سے مدد مانگی تو اُنھوں نے کیتھرن کو سب کچھ سچ سچ بتادیا۔

کیتھرن یہ تو جانتی تھی کہ اُسے گود لیا گیا ہے مگر یہ بات اُس کے علم میں نہ تھی کہ اُس کے اصل ماں باپ کا کسی کو علم نہیں۔ اُس کا ذہن اُلجھ گیا۔ بہت اچھی پرورش اور تعلیم و تربیت کے باوجود وہ جاننا چاہتی تھی کہ اُس کے ماں باپ کون ہیں۔ مگر یہ بات تو اُسے گود لینے والے گھرانے کو بھی معلوم نہ تھی۔

کیتھرن کچھ مدت تک اندر ہی اندر اُلجھی رہی مگر پھر اُس نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا اور عمومی حالت میں واپس آ گئی۔ جوان ہوئی تو اُس کی شادی کردی گئی۔ محبت کرنے والا شوہر ملا تو اُسے ماضی کے حوالے سے کوئی بھی تلخی یا کسک یاد نہ رہی۔ آج کیتھرن کے تین بیٹے ہیں۔ زندگی نے اُسے بہت کچھ دیا ہے۔ مگر پھر بھی زندگی میں ایک کمی تو ہے۔ وہ اب بھی نہیں جانتی کہ اُس کی رگوں میں کس کا خُون ہے۔ اُسے اپنی شناخت درکار ہے۔ اِس شناخت تک پہنچنے کے لیے وہ انتہائی بے تاب ہے۔

کیتھرن نے جنم دینے والی ماں کو تلاش کرنے کے لیے. برینڈا ہولس سے مشورہ کیا اور اُنہی کی تجویز پر اپنی ایک تصویر فیس بک پر اپ لوڈ کی جس میں وہ ایک بورڈ لیے کھڑی ہے۔ اِس بورڈ پر اُس نے اپنی کہانی مختصر الفاظ میں بیان کردی ہے۔ وہ اپنی ماں تک پہنچنا چاہتی ہے اور فیس بک یوزرز سے بھی اُس نے استدعا کی ہے کہ تصویر کو زیادہ سے زیادہ شیئر کریں تاکہ بات اُس کی ماں تک پہنچ جائے۔ اب تک تیس ہزار سے زائد فیس بک یوزرز اِس تصویر کو پسند کرکے دوسروں تک پہنچا چکے ہیں۔

کیتھرن ڈپرل کہتی ہے۔ ”میرے دل میں کسی کے لیے کوئی رنجش نہیں۔ میری پرورش

بہت اچھی طرح کی گئی۔ جس گھرانے نے مجھے پالا اُس نے کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ تعلیم بھی دلائی، تربیت دی بھی۔ اور پھر شادی کے ذریعے زندگی کے دوسرے مرحلے کا بھی اچھا آغاز فراہم کیا۔ مجھے پالنے والے ماں باپ، میرے دو بھائی، دو بہنیں، میرے شوہر اور تین بچے میرا اثاثہ ہیں۔"

تو پھر وہ اپنی اصل ماں سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟ کیتھرن کہتی ہے۔ "ایسی کوئی بات نہیں کہ میں اپنی حقیقی ماں کے لیے بُرے جذبات رکھتی ہوں۔ میں تو دراصل اپنے آپ کو تلاش کر رہی ہوں۔ میں اپنی ماں سے مل کر اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔
"

شکریہ؟ کس بات کا شکریہ؟

یہ تو میں نہیں جانتی کہ میری ماں نے مجھے کن حالات میں جنم دیا اور کیوں مُجھے یوں" چھوڑ دیا۔ ایک برگر شاپ کے باتھ روم میں چھوڑ دیئے جانے پر بھی میرے دل میں اپنی حقیقی ماں کے لیے کوئی رنجش یا کدورت نہیں۔ میں اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ اُنہیں نے مُجھے دُنیا میں آنے کا موقع فراہم کیا۔ وہ چاہتیں تو اسقاطِ حمل کے ذریعے اِس حسین دُنیا کے دروازے مُجھ پر بند کر سکتی تھیں۔ اور پیدائش کے بعد بھی وہ مُجھے قتل کر سکتی تھیں یا کچرے کے ڈھیر پر بھی پھینک سکتی تھیں جہاں آوارہ جانور یا کیڑے مکوڑے مُجھے کھا

جاتے۔ میں اپنی ماں سے مل کر اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ اُنہوں نے مجھے بہت اچھی حالت میں ایسی جگہ رکھا جہاں لوگوں کی مُجھ پر نظر پڑی اور مُجھے بحفاظت اُٹھا کر قبول کر لیا گیا۔ اگر میری پیدائش کے وقت میری حقیقی ماں کی عمر زیادہ نہیں تھی تو ہم اچھی سہیلیاں ثابت ہو سکتی ہیں! میں حقیقی ماں سے مل کر وہ حالات جاننا چاہتی ہوں جن کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُنہیں اپنے دِل کے ٹکڑے کو یعنی مُجھے یوں چھوڑنا پڑا۔ میں اِس بات پر بھی اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ وضعِ حمل کے بعد میری پیدائش تک اُنہوں نے شراب پی نہ نشہ آور ادویہ استعمال کیں۔ یوں میں بھرپور صحت مند پیدا ہوئی۔''

کیتھرن جاننا چاہتی ہے کہ اُس کے حقیقی بھائی بہن ہیں یا نہیں۔ اور یہ کوئی اِس دُنیا میں کوئی اور اُس جیسا دکھائی دیتا ہے یا نہیں!

کیتھرن کی کہانی فیس بک پر اور اخبارات کے آن لائن ایڈیشنز میں پڑھ کر اُس جیسے بہت سے لوگوں میں اپنے اصل ماں باپ تک پہنچنے کی لگن پیدا ہوئی ہے۔ وہ بھی شناخت چاہتے ہیں۔

کیتھرن کی کہانی میں بہت کچھ ہے۔ واضح نہیں کہ اُس کی پیدائش جائز تھی یا

ناجائز۔ حرام و حلال کی بحث سے ایک قدم آگے جاکر۔اِس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی اولاد کو یوں چھوڑ دیتے ہیں وہ اُن کی زندگی میں خلاء بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے بچے زمانے بھر کی نعمتیں پاکر بھی شناخت کے لیے تڑپتے اور ترستے رہتے ہیں۔ کیتھرن کی زندگی ایک ایسے محل کے مانند ہے جس کے اطراف جھونپڑے ہیں۔

ایک اور بات۔ معمولی باتوں پر خود کو اور زمانے کو کوسنے والوں کے لیے کیتھرن کی کہانی بہت کچھ سکھاتی ہے۔ یہ کہ زندگی کو اُس کے ہر رنگ میں قبول کرنا چاہیے اور جس نے بُرا کیا ہے اُس کے بارے میں صرف رنجش کو پروان چڑھانے کے بجائے مثبت سوچ کے ساتھ زمینی حقائق پر بھی غور کرنا چاہیے تاکہ خیالات میں کجی پیدا نہ ہو۔ اور یہ کہ معاف کرنے ہی میں دِل کا سکون ہے۔

حد کر دی آپ نے

شاہد آفریدی کے چھکّے تو ستم ظریفی ڈھانے پر تُل گئے۔ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ معاملہ اِتنا آگے بڑھے گا کہ حکومت کو حرکت میں آنا پڑے گا۔ ہم بنگلہ دیشی حکومت کی بات کر رہے ہیں۔ ایشیا کپ کے میچ میں شاہد آفریدی کے پے در پے چھکّوں نے ایسی قیامت ڈھائی کہ ڈھاکہ سرکار کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ جو پاکستان کا نام تک سُننا پسند نہیں کرتیں وہ شیخ حسینہ واجد کتنا تڑپی ہوں گی جب اُنہوں نے پاکستان کو اپنی سرزمین پر فتح سے ہمکنار ہوتے ہوئے دیکھا ہوگا!

دو سال قبل شیخ حسینہ نے پاکستان سے شدید نفرت اور بیزاری کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ سفارتی شائستگی کا جنازہ نکل گیا تھا۔ ایشیا کپ کے فائنل میں پاکستان نے بنگلہ دیش کو شکست دی تو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف فرما بنگلہ دیشی وزیر اعظم شیخ حسینہ واجد جلن اور کُڑھن کے مارے، فاتح ٹیم کو ٹرافی اور دیگر انعامات دیئے بغیر، اسٹیڈیم سے نکل گئی تھیں! کبھی سوچا بھی جاسکتا ہے کہ کسی ملک میں کوئی بین الاقوامی ٹورنامنٹ ہو رہا ہو اور وہاں کا وزیر اعظم تقریب سے یوں اُٹھ کر چل دے؟ شیخ حسینہ کے لیے ایسا کرنا کچھ مشکل نہ تھا کیونکہ اُن کے ذہن پر صرف اشتعال اور انتقام سوار رہا ہے۔ وہ

ذاتی انا کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہیں اور جا رہی ہیں۔ عبدالقادر مُلّا کی پھانسی سے یہ ثابت بھی ہو چکا ہے۔

ایشیا کپ کے میچ میں شاہد آفریدی کے چھکّوں نے بنگلہ دیشی کرکٹرز اور اُن کے پرستاروں پر قیامت ڈھادی۔ ہاتھ آیا ہوا شاہد آفریدی کی طوفانی بیٹنگ کے باعث میچ ہاتھ سے ایسا گیا کہ قیامت ڈھا گیا۔ ہر طرف شاہد آفریدی کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ اِس سے قبل بھارت کو شکست دینے میں بھی مرکزی کردار شاہد آفریدی ہی نے ادا کیا تھا۔ بھارت کے خلاف میچ کے دوران بنگلہ دیشی تماشائیوں نے پاکستانی ٹیم کا بھرپور ساتھ دیا۔ بھارتی قیادت کے سینے پر تو تب بھی سانپ لوٹے ہوں گے مگر خیر، وہ کڑوی گولی اُس نے نگل لی تھی۔

ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ کے افتتاحی میچ میں پھر وہی مناظر دکھائی دیئے۔ بھارت کے خلاف پاکستانی ٹیم کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے بنگلہ دیشی تماشائیوں نے سبز ہلالی پرچم بھی لہرائے اور پاکستانی کھلاڑیوں کے لیے نعرے بھی لگائے۔ پاکستان کی بیٹنگ کے دوران جب بھی چوکا لگتا، بنگلہ دیشی تماشائی کھل کر داد دیتے۔ اِس بار نئی دہلی کی حالت بُری ہو گئی۔ وہ بھلا یہ بات کس طور برداشت کر سکتا تھا کہ اُس کے گود لیے ہوئے بنگلہ دیش کی زمین پر پاکستان کے جے جے کار ہو؟ بنگلہ دیشی کرکٹ پریمیوں کا یہ جرم تو ناقابل معافی تھا!

بھارتی قیادت تواِس بات پر بھی خفا تھی کہ اُس کے ٹکڑوں پر پلنے والی حسینہ ایڈمنسٹریشن کی ناک کی نیچے یہ سب کچھ ہو رہا تھا اوراِسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ہاٹ لائن پر رابطے ہوئے اور ڈھاکہ سرکار کواُس کا فرض یاد دلایا گیا۔ دِلّی سرکار سے فرمان آیا کہ بنگلہ دیشی تماشائیوں کو پاکستان کے لیے دِل کے دروازے کھولنے کی اجازت نہ دی جائے۔ دِلّی سرکار کی مُطیع وفرماں بردار ڈھاکہ سرکارکے لیے اِس فرمان کی عدم تعمیل کسی بھی طور ممکن نہ تھی۔

دِلّی سرکار کی فرمائش پر شیخ حسینہ نے نزلہ شائقین پر گرادیا یعنی بھارتی فرمان کا جھنڈا اُن کے دِلوں میں گاڑ دیا۔ پاکستانیوں پر تو کسی طرح بس چلا نہیں اِس لیے ''مرے کو مارے شاہ مدار'' کے مصداق بنگلہ دیشی شائقین کو حکم دیا گیا ہے کہ اسٹیڈیم میں بنگلہ دیش کے سِوا کسی بھی ملک کا پرچم نہ لہرائیں۔ بنگلہ دیشی کرکٹ بورڈ نے سیکیورٹی اہلکاروں کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ اسٹیڈیم میں کسی بھی بنگلہ دیشی تماشائی کو کسی اور ملک کا پرچم لیکر داخل نہ ہونے دیں! حکم نامے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بنگلہ دیشی باشندوں کے لیے کسی اور ملک کا پرچم لہرانا قومی پرچم سے متعلق قواعد کی خلاف ورزی ہے! کوئی پوچھے کہ قواعد کی خلاف ورزی کا نوٹس لینے کی توفیق ایشیا کپ کے میچوں میں کیوں نہ ہوئی!

کرکٹ کی تاریخ میں یہ شاید اپنی نوعیت کا واحد حکم ہے۔ ڈھاکہ سرکار کی سوچ اور بھارت کے معاملے میں اُس کی فرماں برداری کے ساتھ ساتھ اِس حکم سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بنگلہ دیشی باشندوں کے دِل آج بھی بہت حد تک پاکستانی بھائیوں کے ساتھ اور پاکستان کے لیے دھڑکتے ہیں۔ ڈھاکہ سرکار کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ آج پرچم لہرانے پر پابندی لگائی ہے، کل کیا بیٹسمین یا بولر کو داد دینے پر بھی پابندی لگائی جائے گی؟ اور اُس کے بعد کیا یہ پابندی عائد ہوگی کہ تماشائی ہونٹوں پر اُنگلی رکھیں اور دوسرے ہاتھ سے دِل تھامیں یعنی کسی سے یکجہتی کیلئے دِل کا دھڑکنا بھی جائز نہیں!

ڈھاکہ سرکار جو کچھ کر رہی ہے اُس میں بنگلہ دیشی عوام کیلئے یہ پیغام بھی ہے کہ اُن کی وزیر اعظم ایک برادر اسلامی ملک سے تعلقات کو محض اِس لیے داؤ پر لگانا چاہتی ہے کہ نئی دِہلی کو اُس ملک کے پرچم کا لہرایا جانا قبول اور برداشت نہیں۔ عوام اور حکومت کی سوچ میں اِتنا واضح فرق اِس امر کی تحریک دیتا ہے کہ عوامی حلقے حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ وہ مخاصمت کی شدت سے اندھی ہوکر بے ڈھنگے اقدامات نہ کرے۔ شاہد آفریدی کو تو چھکے لگانے سے روکا نہیں جاسکتا مگر اُنہیں اُن کا فرض ضرور یاد دلایا جاسکتا ہے جو اپنی

ہی آگ میں جل بُھن کر کسی بھی لائن آف کنٹرول کو خاطر میں نہیں لاتے اور سفارتی آداب بھی فراموش کردیتے ہیں!

شیخ حسینہ اور ان کی ٹیم حد سے گزر گئی ہے۔ اُنہیں شائستگی کا مفہوم بھی شاید یاد نہیں رہا۔ کھیل کو کھیل رہنے دیا جائے تو اچھا۔ اُس میں سیاست ڈال کر معاملات کو زیادہ الجھانا کسی صورت ایسا عمل نہیں جس کی تعریف کی جائے۔ جو لوگ پیسے خرچ کرکے اور اسٹیڈیم میں آتے ہیں اور اپنے شوق کو وقت دیتے ہیں اُنہیں اس بات کی آزادی ہونی چاہیے کہ کھلاڑیوں کو کھل کر داد دیں، خواہ اس کا تعلق کسی ٹیم سے ہو۔ بنگلہ دیشی شائقین کا بھی یہ حق محفوظ ہے کہ جس ٹیم یا کھلاڑی کو چاہیں اُس کے لیے تالیاں بجائیں۔ کھیل سے اُن کی دلچسپی کی راہ میں ڈھاکہ سرکار کو حائل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایسا کرنا جذبات کو مجروح کرنا ہے۔ کھیل دِلوں کو جوڑنے والی چیز ہے، اِسے دِل توڑنے والے آلے میں تبدیل نہ کیا جائے۔ ڈھاکہ سرکار کا مزاج دیکھتے ہوئے ع

اُمّید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے!

''کرکٹ کا بخار اور ''خار

ایک بار پھر قوم کرکٹ کے بخار میں مبتلا ہے۔ ویسے یہ بخار والی بات کچھ مدت یا چند برس پہلے تک اچھی اور بر وقت لگتی تھی۔ اب کرکٹ بخار سے کہیں بڑھ کر ''خار'' کا معاملہ ہے! جو ممالک ایک دوسرے کو ایک پل کے لیے برداشت کرنے کو تیار نہیں یا کوئی ایک فریق دوسرے کو شدید ناپسند کرتا ہے وہ کرکٹ یا کسی اور کھیل کے میدان میں فتح کے ذریعے دِل کی تشفی چاہتا ہے۔ کرکٹ بہت سے معاملات سے بہ حُسن وخُوبی نپٹنے کا ذریعہ سی بن گئی ہے۔ کرکٹ کے میدان میں طرح طرح کے حساب چُکتے کئے جاتے ہیں۔ کسی کو تکلیف دینی ہو تو کرکٹ، کسی کو خوش کرنا ہو تو کرکٹ، دوستی نبھانی ہو تو کرکٹ، کسی دشمن کا دل جلانے کے لیے دوست سے ہار جانا ہو تو کرکٹ۔ کرکٹ تو ''ایک محبت، سو افسانے'' بن کر گئی ہے!

ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ چل رہا ہے۔ اِس وقت کرکٹ کے بُخار کا یہ عالم ہے کہ قوم کو کچھ اور نہیں سُوجھ رہا۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے تھے کہ شاید دیگر عوارض اور وباؤں نے ''اسٹے'' لے لیا ہے یا عدالت نے ''استثنٰی'' سے نواز دیا ہے مگر اب اندازہ ہوا کہ عدالت کو تو بیچ میں آنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ قوم نے خود ہی کرکٹ کو پوری طرح اپنا کر دیگر تمام وباؤں کو پندرہ بیس دن کی

! جبری رخصت پر بھیج رکھا ہے

ٹورنامنٹ کا پہلا میچ ''یارِ جانی'' بھارت سے ہارنے کے بعد آسٹریلیا سے میچ میں پوری قوم کی جان لبوں پر آئی ہوئی تھی۔ ہارنے کی صورت میں وہیں سے واپسی کا سفر شروع ہوچکا ہوتا۔ یہ میچ کیا جیتے، دم میں دم آگیا، جاں میں جاں آ گئی۔ امکانات کی بتّی بُجھتے بُجھتے بچی۔ قوم ایک بار پر تازہ دم ہو کر ٹیم کو سراہنے اور چاہنے لگی۔ ایک ہفتے کے وقفے سے جب بنگلہ دیش کو شکست دی تو معاملہ یہ ہوا کہ قوم جُھوم جُھوم کر ناچنے لگی۔

سابق مشرقی پاکستان کے باشندوں نے پاکستان سے الگ ہو کر بنگلہ دیش بنایا۔ اُصولی طور پر پاکستانیوں کو بنگلہ دیش اور اُس کے باشندوں سے شدید نفرت ہونی چاہیے مگر تماشا یہ ہے کہ بنگلہ دیشیوں کے دِلوں میں پاکستان سے نفرت بھر دی گئی ہے جس کے نتیجے میں دونوں ممالک کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ یہ ساری خرابی بنگلہ دیش بنانے کی ذمہ دار عوامی لیگ کی پیدا کردہ ہے۔ عوامی لیگ کے سربراہ اور بنگلہ دیشیوں کے نام نہاد بابائے قوم شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی موجودہ وزیر اعظم شیخ حسینہ واجد کو پاکستان کا نام سُننا بھی گوارا نہیں۔ بھارت نوازی کی تمام حدیں پار کرجانے والی حسینہ واجد نے پوری قوم کو پاکستان کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ کرکٹ نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے۔ کل تک

بھارت کھُلا اور ازلی حریف تھا مگر اب بنگلہ دیش کے ساتھ میچ میں بھی مخاصمت اور کشیدگی ہی کا رنگ جھلکنے لگا ہے۔ پاکستانیوں نے بنگلہ دیش کو برادر اسلامی ملک کے روپ ہی میں دیکھا اور قبول کیا ہے۔ حسینہ واجد یہ بھی بھول گئیں پاکستان نے بنگلہ دیش کو اُس کے قیام کے محض سوا دو سال بعد قبول کرکے شیخ مجیب الرحمٰن کو لاہور میں 22 فروری 1974 کو منعقد کی جانے والی اسلامی سربراہ کانفرنس میں مدعو کیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کو گلے لگا کر جن باتوں کو بُھلانے کی کوشش کی تھی حسینہ واجد وہ سب کچھ 43 سال بعد بھی بُھول نہیں پائی ہیں۔ لیڈر کے کوتاہ بین ہونے کی صورت میں بین الریاستی تعلقات کے داؤ پر لگ جانے کی یہ ایک انتہائی واضح اور روشن مثال ہے۔

بات ہو رہی ہے کرکٹ کی۔ عوامی لیگ کی حکومت نے بنگلہ دیشیوں کے دِلوں میں پاکستانیوں کے لیے ایسی نفرت بھر دی ہے کہ اب وہ پاکستانی ٹیم کو بھی ازلی دشمن کے روپ میں دیکھنے لگے ہیں۔ ایشیا کپ کے میچ میں شاہد آفریدی کے چھکّوں پر بنگلہ دیشی لڑکیوں کا بے بسی سے اُچھل اُچھل کر رونا جلتی پر مزید تیل چھڑک گیا۔ اب بنگلہ دیش کے شائقین پوری پاکستانی ٹیم کو ازلی دشمن سمجھتے ہیں۔ اتوار 30 مارچ کو پاکستان کے خلاف ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ میچ میں بنگلہ دیشی تماشائیوں نے پاکستانی ٹیم کو پھر دشمن کی نظر سے دیکھا۔

قومی ٹیم کے لیے بھرپور گرم جوشی کا مظاہرہ فطری حقیقت ہے مگر کھیل کو نفرت کی حد تک لے جانا کسی طور درست نہیں۔

جب معاملہ یہ ہو تو فریق ثانی بھی لا تعلق تو نہیں رہ سکتا۔ بنگلہ دیش کے خلاف میچ والے دن پاکستانیوں کا جوش و خروش بھی قابل دید تھا۔ کیوں نہ ہوتا؟ اِس میچ میں فتح ہی سے تو ٹورنامنٹ میں پاکستانی ٹیم کے امکانات وابستہ تھے۔ جب میچ پوری طرح ہاتھ میں آگیا اور تقریباً طے ہوگیا کہ اب صرف فتح ممکن ہے تو قوم عجیب سَر مستی سے سرشار ہو گئی۔

لاہور میں ایک حجام نے شیو بناتے ہوئے گاہک کے ''رخسارِ محترم'' پر ٹی وی اسکرین کو ترجیح دی۔ اُس دن احمد شہزاد کی بیٹنگ کے دوران شیو کرنا اور شیو کرانا واقعی امتحان تھا! اب عالم یہ تھا کہ حجام کا اُسترا گاہک کے گال پر ٹِکا ہوا تھا اور نظر ٹی وی اسکرین پر جمی تھی۔ احمد شہزاد نے جم کر ایک چوکا لگایا تو حجام بھی خوشی سے جُھوم اُٹھا اور وجد کی اِس کیفیت میں اُسترا کِھسکا اور گاہک کے گال پر ''اسکوائر کٹ'' لگ گیا!

اگر آپ نے کبھی شیو بنوائی ہو اور کٹ لگ جائے تو آپ کی کیا حالت ہوتی ہے؟ شیو بنانے والے کی پٹائی، بلکہ ٹُھکائی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر کرکٹ کا

نشے نے لاہور کو بچالیا۔ کٹ لگنے پر گاہک ابھی پیچ و تاب کے عالم ہی میں تھا کہ احمد شہزاد نے ایک چوکا جڑ دیا۔ اِس پر دُکان میں اُس کے باہر ایسا شور اُٹھا کہ گاہک بھی خوشی سے جُھوم اُٹھا اور اِسی جذب و مستی کے عالم میں اُس نے حجام کو اپنے رُخسار کا ''خون'' معاف کردیا!

کاش جذب و مستی کی یہ ملی جُلی کیفیت برقرار رہے اور ہم ایک دوسرے کو نادانستگی میں لگنے والے ''کٹ'' یوں ہی معاف کردیا کریں! شادمانی کے عالم میں اِنسان کسی بھی تکلیف کو ہنستے ہوئے برداشت کرلیتا ہے۔ بنگلہ دیش کے خلاف فتح نے بھی قوم کو پھر تازہ دم کردیا ہے۔ پہلے صرف بھارت حقیقی حریف تھا۔ بنگلہ دیش چونکہ بھارت کے لے پالک کی حیثیت اختیار کرگیا ہے اِس لیے اُصولی طور پر ہمارا حریف ہے۔ قوم نے بنگلہ دیش کے خلاف فتح کو پوائنٹس ٹیبل پر بہتر پوزیشن کے حصول کے ذریعے سے بڑھ کر بھارت کے دوست کی شکست کے روپ میں لیا ہے۔ یوں خوشی دوبالا ہوگئی۔

اِن تمام باتوں کے باوجود اچھا ہے کہ کرکٹ کو صرف کھیل رہنے دیا جائے۔ اِس کے بطن سے خوشی ضرور جنم لے مگر کوئی تنازع تو پیدا نہ ہو۔ بنگلہ دیش اور پاکستان کے تعلقات کو بگاڑنے میں شیخ حسینہ واجد کے رویّے نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ محترمہ نے کرکٹ کو بھی نفرت اور مخاصمت بڑھانے کے ہتھیار کے

طور پر استعمال کیا ہے۔ میچ کے دوران اسٹیڈیم میں بنگلہ دیشیوں کو کسی اور ملک کا پرچم لہرانے سے روکنے کا حکم نامہ بھی پاکستان پر خار اُتارنے ہی کا ایک ذریعہ تھا۔ جس طرح لاہور میں گاہک نے حجام پر اپنا ''خون'' معاف کیا تھا اُسی طرح حسینہ واجد کو پختگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک قدم آگے جا کر ماضی کی تلخ یادوں سے چھٹکارا پالینا چاہیے۔ وقت آگیا ہے کہ ماضی کی ہر تلخ یاد کو ایک قدم آگے بڑھ کر، ہاف وولی بناتے ہوئے اسٹیڈیم سے باہر پھینک دیا جائے۔

مارننگ سُپر مارکیٹ

ایک زمانہ تھا، جسے گزرے ہوئے یقیناً کئی زمانے گزر چکے ہیں، جب لوگ رات کو پُرسکون نیند سویا کرتے تھے اور تازہ دم ہو کر بیدار ہوتے تھے۔ یعنی دِن اچھا گزرتا تھا۔ اب اُس زمانے کو یاد کرکے صرف رویا جاسکتا ہے، کڑھن محسوس کی جاسکتی ہے۔ اب دن اپنا ہے نہ رات۔ اور رہی صبح تو وہ مارننگ شو کی چوکھٹ پر قربان ہو گئی ہے!

الیکٹرانک میڈیا کا شعبہ ''گلا کاٹ'' مسابقت کا ہے۔ ریٹنگ بڑھانے یعنی ناظرین کی تعداد میں اضافے کے لیے کسی بھی حد سے گزرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ ریٹنگ وہ خوش رنگ و خوش گلو پرندہ ہے جسے پکڑنے کے لیے کوئی سا بھی جال بچھایا جاسکتا ہے، کوئی سا بھی دانہ ڈالا جاسکتا ہے۔ جنگ، محبت اور کرکٹ کے بعد اب ریٹنگ میں بھی سب کچھ جائز ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اِس معاملے میں لفظ جائز اجنبی سا لگتا ہے!
گزرے ہوئے زمانوں میں مُستنصر حسین تارڑ بھی مارننگ شو کیا کرتے تھے۔ اُن شوز کی ریکارڈنگ دیکھ کر اب وہ یقینی طور پر شرمندہ ہو جاتے ہوں گے۔ ہونا ہی

چاہیے۔ بھلا وہ بھی کوئی مارننگ شو تھا کہ ایک جگہ بیٹھ کر قوم کو سُدھارنے کی کوشش فرماتے رہیے۔ تارڑ صاحب اپنے شو میں باتیں ہی باتیں کیا کرتے تھے۔ نہ اچھل کود نہ ناچ گانا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تارڑ صاحب کو اعضاء کی شاعری کرنی چاہیے تھی مگر صاحب! وہ ریٹنگ بڑھانے کے لیے دوسروں کو تو نچوا سکتے تھے۔ اِس میں کیا قباحت تھی؟ اور پھر اُن کے شو میں پالتو جانور بھی کہیں دکھائی نہ دیتے تھے۔ نہ کوئی گلے میں اژدہا لٹکائے ہوئے نظر آتا تھا اور نہ ہی کوئی پالتو شیر چیتے کے ساتھ شو میں شریک ہوتا تھا۔ کوئی ہنگامہ برپا ہوتا تھا نہ شور اٹھتا تھا۔ کیسے پروڈیوسر تھے جو مارننگ شو میں قیامت برپا کرنے پر یقین ہی نہ رکھتے تھے۔ ناصرؔ زیدی نے خوب کہا ہے ۔

کوئی ہنگامہ چاہیے ناصرؔ
کیسے گزرے گی زندگی خاموش

ناصرؔ زیدی کی خواہش جب پوری ہونے پر آئی تو پوری ہوتی ہی چلی گئی۔ اب سوال یہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے کہ مارننگ شوز میں برپا ہونے والے ہنگامے نہ تھے تو کیا ہوگا!

مارننگ شو دیکھنے کے شوقینوں کا یہ حال ہے کہ جب ٹی وی سیٹ کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں تو گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ۔

لوٹ کر پھر نظر نہیں آئی
اُن پہ قربان ہو گئی ہو گی!

بھائی منظور سے ہماری دُعا سلام پرانی ہے۔ موصوف الیکٹرک آئٹمز اور ہارڈ ویئر کی دکان چلاتے ہیں۔ مگر یہ تو اُن کی دکان کا صرف ایک پہلو ہے۔ بچوں کے لیے بسکٹ اور ٹافیاں چاہئیں تو منظور بھائی کی دکان پر جائیے۔ لنڈری لوڈ کرانا ہے تو اُن کی خدمات حاضر ہیں۔ عطر کی شیشی خریدنی ہو تو کہیں اور کیوں جائیے۔ اسٹیشنری آئٹمز بھی اُن کی دکان پر دستیاب ہیں۔ ٹونٹی خراب ہو گئی ہے تو اُن سے خریدیے۔ پیٹ میں درد ہے تو ہاضمے کا چُورن بھی بھائی منظور کی دُکان پر ملے گا۔ ایمرجنسی لائٹ خریدنی ہے تو غم نہ کریں، آپ کا اندھیرا منظور بھائی دور کریں گے۔ اُن کی شخصیت ''میں ہوں نا'' کی اِتنی روشن مثال ہے کہ قریب جانے پر آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی! منظور بھائی کا اُصول یہ ہے کہ کوئی اُن کی دکان تک آ جائے تو خالی ہاتھ نہ جائے۔ اُن کا تو بس نہیں چلتا ورنہ اپنی دکان میں بوئنگ طیارہ اور بحری جہاز بھی رکھ چھوڑیں!

ٹی وی پر مارننگ شو چلانے والے اینکرز بھی منظور بھائی ہی کی راہ پر گامزن ہیں۔ اُن کا ہر انداز ''بولو جی، تم کیا کیا خریدو گے؟'' کی عملی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اُن کی بھی یہی کوشش ہے کہ ''ہر مال ملے گا'' والی دکان چلائیں۔ اگر آپ ریموٹ کے ذریعے چینلز کو فلپ کرتے کرتے کسی مارننگ شو پر

رکے ہیں تو اینکر پوری کوشش کرتا ہوا ملے گا کہ آپ کہیں اور نہ جائیں۔ اب اِس کے لیے اُس غریب کو سب کچھ کرنا پڑے گا۔ اور جہاں معاملہ سب کچھ کا آ جائے وہاں اوٹ پٹانگ حرکتیں ہی تو کرنی پڑیں گی۔ جب گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا معاملہ ہو تو دکان میں ہر چیز رکھنی پڑے گی۔ ناظرین کی بھرپور توجہ پانے اور انہیں کسی اور چینل کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لیے اینکرز اپنی دکان میں جہاں بھر کا سامان بھرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اور یہی چیز بے مثالی رنگینی اور مثالی مزاح کو جنم دیتی ہے!

پاکستانی معاشرے کی خدمت کرنے والے اور بھی بہت ہوں گے مگر جو خدمت مارننگ شو کے اینکرز نے کی ہے اُس کا کوئی جواب نہیں۔ جتنے بھی ناکارہ نوجوان اہل خانہ، رشتہ داروں اور محلے والوں سے جھڑکیاں، گالیاں اور ناکارہ ہونے کے طعنے سُنتے تھے اُن کا "ٹیلنٹ" ٹھکانے لگا۔ اپنی اوٹ پٹانگ حرکتوں کو وہ اب مارننگ شوز میں کیش کراتے ہیں، اہل وطن سے داد پاتے ہیں اور فخر سے سینہ تانے پھرتے ہیں کہ ع
دیکھو، اِس طرح سے کہتے ہیں سُخنور سہرا!
جو کسی جواز کے بغیر بلا تکان بولا کرتے تھے وہ مارننگ شو میں پیش ہو کر قوم کو قوتِ برداشت کی سُولی پر لٹکاتے ہیں! جن کے بارے میں یہ گمان تھا کہ اُن

کا اٹکنا مٹکنا رقص کے ذیل میں نہیں آتا وہ مارننگ شو میں ''فن'' کا مظاہرہ کرکے رقاص کا درجہ پاتے ہیں! جن کی آواز خود اُنہی کو پسند نہ ہو وہ ناظرین کے کانوں میں ''رس'' گھول کر گلوکاروں کی صف میں آ کھڑے ہوتے ہیں! جن کی آڑی ترچھی لکیروں کو دیکھ کر لوگوں کے ماتھے پر غصیلی لکیریں اُبھر آتی تھیں وہ اب مارننگ شو میں اپنے دل نشیں اسٹروکس دکھا کر مال اور داد ساتھ ساتھ پاتے ہیں!

ہمارے ہاں اب تک ٹیلنٹ ہنٹ کا کلچر رہا ہے یعنی ٹیلنٹ کو شکار کرلیا جائے، ختم کردیا جائے! اور حق تو یہ ہے کہ بیشتر معاملات میں ٹیلنٹ کو پنپنے ہی کے مرحلے میں ختم کیا جاتا رہا ہے۔ خیر ہو مارننگ شو کے اینکرز کی جو کونوں کھدروں سے ''انمول ہیرے'' نکالتے ہیں اور انہیں دیکھ کر دنیا خوش گوار حیرت میں مبتلا ہوتی ہے کہ پاکستان میں کیسا کیسا ٹیلنٹ پایا جاتا ہے!

جو لوگ مارننگ شو کو محض دل پشوری کے لیے دیکھتے ہیں وہ فوری طور پر اپنی رائے بدل لیں۔ جس دکان میں اپنی پسند اور ضرورت کی ہر چیز مل سکتی ہے اُس میں بس یوں ہی دل پشوری کے لیے قدم رکھنا کفرانِ نعمت ہے۔ اگر آپ آجر ہیں تو آپ کو اپنی مرضی کا اجیر مارننگ شو سے مل سکتا ہے۔ اگر آپ پروڈیوسر ہیں تو مرضی کے فنکار دستیاب ہیں۔ اگر آپ کو کسی کا رشتہ درکار ہے تو اِسی نظر

!سے مارننگ شو دیکھیے، فلاح پا جائیں گے

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کچھ وکھری ٹائپ کے واقع ہوئے ہیں اور آپ کا کوئی دوست نہیں تو فکر مت کیجیے۔ مارننگ شو پوری توجہ سے دیکھیے، آپ کو اپنے جیسے کئی مل جائیں گے۔ پھر آپ کا یہ شکوہ (یا زعم) اپنی موت آپ مر جائے گا کہ ہم سا ہو تو !سامنے آئے

ہمارے کاروباری ادارے اب تک سمجھ نہیں پائے کہ مارننگ شو ہیومن ریسورس ڈیپارٹمنٹ کا کردار بخوبی ادا کر سکتے ہیں۔ اِن پروگراموں کے ذریعے مطلوبہ ٹیلنٹ تک آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے۔ ہائرنگ کے خواہش مند ادارے مارننگ شوز پوری توجہ اور انہماک سے دیکھیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹیں گے! بلکہ شاید یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ''اوور ٹیلنٹ'' کے باعث فیصلہ کرنے میں مشکل محسوس کریں کہ

ع

کس کس کی نظر دیکھوں، کس کس کی ادا دیکھوں

!ہر سمت قیامت ہے، اب اور میں کیا دیکھوں

ہمارے مارننگ شو ایسی سپر مارکیٹ کا درجہ اختیار کر چکے ہیں جس میں ضرورت کی ہر شے ملتی ہے اور وہ بھی بہت معقول، بلکہ معمولی نرخ پر۔ یعنی صرف آنکھیں

کھلی رکھیے، دیکھتے رہیے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر و بے نیاز ہو جایئے ! اِس سپر
مارکیٹ سے آپ خالی ہاتھ واپس نہیں آئیں گے۔ اب اِس پر بھی آپ تہی دامن رہیں
تو آپ کا نصیب !

بس، بندہ ڈھیٹ ہونا چاہیے!

بھارت میں سیاسی مہابھارت کا موسم چل رہا ہے۔ انتخابی معرکہ آرائی میں سبھی اپنا زورِ بازو دکھانے کے لیے ڈیڑھ دو ماہ سے طرح طرح کے تجربے کرتے آئے ہیں۔ ہر قابلِ ذکر سیاسی جماعت نے چاہا ہے کہ اقتدار کا ہُما اُس کے سر پر بیٹھے۔ کانگریس کی گرتی ہوئی ساکھ کا بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے بھارتیہ جنتا پارٹی نے ایک سے بڑھ کر ایک دعوے اور وعدے کئے ہیں۔ آخر آخر میں تو انتہا پسند ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے وزارتِ عظمیٰ کے امیدوار اور گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی نے یہ بھی کہا کہ وہ وزیر اعظم بننے کے بعد ملک بھر میں گوشت کی مارکیٹیں بند کر دیں گے۔

نریندر مودی گوشت کی مارکیٹیں بند کر پائیں گے یا نہیں یہ تو آنے والا وقت بتائے گا مگر ایک صاحب ایسے بھی ہیں جو مستقل ہارتے رہنے پر بھی آرزو اور اُمید مارکیٹ بند کرنے کو تیار نہیں۔ یہ ہیں ڈاکٹر پدم راجن۔ جنوبی ریاست تامل ناڈو میں یہ ایک ٹائر کمپنی کے مالک ہیں۔ اِنھوں نے ایک انوکھا شوق پالا ہے، الیکشن لڑنے کا شوق۔ اور صرف لڑنے کا نہیں بلکہ ہارنے کا بھی۔ ڈاکٹر پدم راجن کہتے ہیں کہ اُنہیں الیکشن ہارنے کا کوئی افسوس نہیں ہوتا۔

وہ تو الیکشن ہارنے کا ریکارڈ قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر پدم راجن کو انتخابی اکھاڑے میں مرکزی دھارے کے سیاست دانوں کے سامنے کھڑے ہونے کا شوق ہے۔ اب تک وہ اٹل بہاری واجپائی، من موہن سنگھ، ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام اور پرتیبھا پاٹل سمیت بہت سے بڑے سیاست دانوں کے مقابل انتخابی میدان میں اتر چکے ہیں۔ لوک سبھا، راجیہ سبھا، ودھان سبھا (صوبائی اسمبلی)، پنچایت کمیٹی، صدر اور نائب صدر کا انتخاب ..... کون سا انتخابی معرکہ ہے جس کے لیے ڈاکٹر پدم راجن میدان میں نہیں اترے ! گویا ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

ڈاکٹر پدم راجن 25 برس میں 158 الیکشن ہار چکے ہیں۔ اِس بار وہ وزارتِ عظمیٰ کے امیدوار نریندر مودی کے مقابل بڑودہ کے حلقے سے لوک سبھا کے الیکشن میں کھڑے ہوئے۔

ڈاکٹر پدم راجن اُن چند افراد میں سے ہیں جنھیں دیکھ کر دِل کو کچھ سکون ملتا ہے۔ اُن کی ناکامیوں کی فہرست دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ ہم ابھی اِتنے نہیں ہارے۔ مگر صاحب ! شکست کا سامنا کرنا یا نہ کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ اہمیت اِس بات کی ہے کہ آپ کس حد تک ثابت قدم رہتے ہیں۔ اور ڈاکٹر

پدم راجن نے توثابت قدم رہنے کی حد ہی کر دی ہے۔ وہ ہارے جا رہے ہیں اور اِس پر بے مزا ہونے کی بجائے ریکارڈ پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سب سے زیادہ الیکشن ہارنے کا عالمی ریکارڈ اُن کے نام ہو۔ یہ ثابت قدمی کچھ کچھ نریندر مودی اور اُن کے ہم خیال لوگوں میں بھی جھلک دکھا رہی ہے۔ مودی اینڈ کمپنی پر یہ الزام لگتا رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے مخالف ہیں۔ اور پھر جب وضاحت طلب کی جاتی ہے یا گوشالی کی جاتی ہے تو وہ اپنے موقف سے ہٹ جاتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے متعلق اُن کے بیان کو سیاق و سباق کے بغیر پیش کیا گیا۔ مگر پھر جب ضرورت پڑتی ہے تب وہ پھر ہتّھے سے اُکھڑ جاتے ہیں اور پھر مسلمانوں کے خلاف بیان داغ دیتے ہیں۔ اِس اعتبار سے دیکھیے تو اِس بار ڈاکٹر پدم راجن نے بڑودہ سے الیکشن لڑنے کا فیصلہ بالکل درست کیا ہے۔ نریندر مودی بھی مستقل مزاجی کی انوکھی مثال ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی سوچ کے مطابق نریندر مودی مسلمانوں کو کسی نہ کسی بیان سے تکلیف دینے کی روش پر گامزن رہتے ہیں۔

مرزا تنقید بیگ کو ہم نے ڈاکٹر پدم راجن کے بارے میں بتایا کہ تو اُنھوں نے کہا۔ ”یہ محترم تو ہمیں خالص پاکستانی معلوم ہوتے ہیں۔“ ہم نے وضاحت چاہی تو مرزا بولے۔ اللہ بُری نظر سے بچائے، ہم بھی تو کسی طور ہمت نہیں ہارتے اور جو کچھ نصیب سے ” ملتا رہے اُسے لیتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر پدم راجن ہارتے

جارہے ہیں اور تھکنے کا نام نہیں لے رہے۔''

ہم نے عرض کیا کہ اِس میں ڈاکٹر پدم راجن کا تو کچھ خاص کمال نہیں۔ یہ تو کچھ کچھ ویسا ہی معاملہ ہے کہ جنگل میں جارہے ہوں اور سامنے شیر آ جائے تو ہم کیا کرلیں گے، جو کرنا ہے شیر نے کرنا ہے! ڈاکٹر پدم راجن کاغذاتِ نامزدگی جمع کراتے ہیں۔ باقی کام ووٹرز کرتے ہیں یعنی اُنہیں ووٹ دینے سے گریز کرتے ہیں۔

مرزا نے تُنک کر جواب دیا۔ ''میاں! ساری بات ہمت کی ہے۔ اب یہی دیکھو کہ ہمارے ہاں بہت سے لوگ تنخواہ سے زیادہ اوپر کی آمدنی پر یقین رکھتے ہیں۔ اب آپ اِس رجحان پر اُنہیں کتنا ہی ذلیل کیجیے، اُن کے کانوں پر جُوں تک نہیں رینگتی۔ اُنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ 'مستقل مزاجی' بھی کوئی چیز ہے۔''

مرزا کی بات کو مکمل طور پر مسترد کرنا بھی درست اور ممکن نہیں۔ ڈاکٹر پدم راجن کو منہ دینے والے ہمارے ہاں موجود ہیں۔ بس یہ ہے کہ انداز تھوڑا سا مختلف ہے۔ پنجابی اور پشتو فلموں میں کام کرنے والے بھی اِسی ذیل میں آتے ہیں۔ چند برس پہلے تک پاکستان کی فلم انڈسٹری بھی ڈاکٹر پدم راجن کے اُصول پر کام کر رہی تھی یعنی جو ناکامی پر ناکامی کو گلے لگاؤ اور یہ سوچ کر خوش

ہو رہو کہ اور کچھ نہ سہی، ناکامی کا ریکارڈ تو بن ہی گیا ہوگا! پاکستان کے طول و عرض میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے اپنے شعبوں میں ناکامی پر ناکامی سے دوچار ہوتے رہے ہیں مگر ''عزیمت'' کے معاملے میں اب تک کامیاب رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہم ہاریں یا جیتیں، ہمیں اپنے آپ سے پیار ہے'' کے اُصول کو حرزِ جاں بنائے'' ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر پدم راجن مزاجاً واقعی پاکستانی ہیں کیونکہ ہم بھی مختلف شعبوں میں مستقل ہارتے آرہے ہیں مگر کسی بھی لمحے ہمت ہارنے کا کوئی اشارا نہیں دیا۔ ہم بھی ڈٹے ہوئے ہیں کہ ناکامیوں کے عالمی ریکارڈ بنا کر ہی دم لیں گے۔ کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ کہنا ہی پڑتا ہے کہ شالا نظر نہ لگے! ایسا لگتا ہے کہ گنیز بک آف ورلڈ والوں کو مستقل مصروف رکھنے کی ٹھان لی گئی ہے۔ ہمارے خطے کے لوگ اور کچھ کریں یا نہ کریں، طرح طرح کے ریکارڈز بنانے میں ضرور جُتے ہوئے ہیں۔ جو لوگ پسپائی کے میدان میں آگے !بڑھنا چاہتے ہیں اُن کے ایسے ہی اطوار ہوا کرتے ہیں

مرزا کہتے ہیں۔ ''ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے اپنے شعبوں میں ناکام ہیں۔ بعض گلوکار ایسے ہیں جو پینتیس چالیس سال سے گا رہے ہیں اور اب تو خود بھی اور اُنہیں جھیلنے والے بھی یہ بات بُھول چکے ہیں کہ اُنہیں

!گانا نہیں آتا

بھارت اور پاکستان میں ایک بنیادی فرق البتہ ضرور ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ بھارت میں تو ڈاکٹر پدم راجن جیسے لوگوں کو لوگ کسی جواز کے بغیر ووٹ نہیں دے رہے۔
ہمارے ہاں معاملہ یہ ہے کہ اگر کوئی مستقل مزاجی سے سامنے آتا رہے تو لوگ بالآخر قبول کر ہی لیتے ہیں۔ سیاست ہو یا فن کی دنیا، ہر جگہ ایسی بیسیوں مثالیں مل جائیں گی۔

نمک کی کان

کئی زمانے اِتنی تیزی سے گزر گئے ہیں کہ گویا ہمارے سَر سے گزر گئے ہیں۔ کوئی کہاں تک اور کس رفتار سے بھاگے؟ وقت کی رفتار ایسی ہے کہ دوڑنے والوں کا سانس آن کی آن میں پُھول جاتا ہے، ناک میں دم آ جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ ہم شام کے حسین لمحات دوستوں یا اہل خانہ کے ساتھ گزارا کرتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ اخباری ملازمت نے زندگی کے معاشرتی پہلو کو ذبح کر دیا۔ گویا اِس شعبے میں آنے سے پہلے ہم بھی نارمل انسان تھے۔ شام تک گھر پہنچ جاتے تھے اور اہلِ خانہ کو صرف درشن ہی نہیں دیتے تھے بلکہ اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھا لیا کرتے تھے۔ عام آدمی کی ایسی ہی زندگی تھی۔ تب تک ڈش اینٹینا نہیں آیا تھا۔ اور موبائل فون بھی نہیں تھے۔ یعنی وقت اچھا خاصا تھا اور اُسے باضابطہ یعنی منصوبہ بندی کے تحت خرچ کرنا پڑتا تھا۔ پہلے تو وی سی آر کی "بدولت" بیشتر گھر سنیما گھر میں تبدیل ہوئے۔ پھر یہ ہوا کہ بیسیوں چینلز گھر بیٹھے دیکھنے کی سہولت میسر ہو گئی۔ لوگ ٹی وی اسکرین کے غلام ہو کر رہ گئے۔ اِس منزل سے گزرے تو موبائل فون کا اونٹ

ہماری زندگی کے خیمے میں داخل ہوا۔ پھر یہ ہوا کہ ہم خود خیمے سے باہر ہوگئے۔
موبائل فون کی مہربانیاں تو خیر اب تک جاری ہیں مگر اِسی دوران انٹرنیٹ کی آمد نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ دوسری بہت سی ایجادات و اختراعات کی طرح انٹرنیٹ بھی ناگزیر تھا مگر ہم نے اِسے آسانیاں پیدا کرنے والے ذریعے کے بجائے مقصدِ حیات میں تبدیل کر ڈالا۔ منزل تک پہنچنے کے لیے راستہ لازم ہوا کرتا ہے۔ ہم نے ہر راستے کو منزل کا درجہ دے دیا ہے، اور وہ بھی از خود نوٹس کے تحت!
اب انٹرنیٹ ہے اور ہم ہیں۔ زندگی کا کون سا پہلو ہے جو انٹرنیٹ کی دست بُرد سے بچا ہے۔ اور کیا ہے جو انٹرنیٹ پر میسر نہیں۔ مگر ہم نے اِس سپر مارکیٹ سے صرف وہی چیزیں خریدی ہیں جو ہماری تن آسانی کو چھیڑنے سے باز رہیں۔ انٹرنیٹ کا استعمال بھی سوشل میڈیا کی اسیری اختیار کرنے، تفریحِ طبع کے ہر آئٹم میں دلچسپی لینے یا پھر چند مُخربِ اخلاق ویب سائٹس کے دیکھنے تک رہ گیا ہے۔ کچھ لوگ ڈراموں سے دل بہلاتے ہیں۔ کسی کو فلمیں دیکھنی ہوتی ہیں۔ بس، ہمارے لیے تو یہی انٹرنیٹ کی کُل کائنات ہے۔
سوشل میڈیا کی اصلاح بھی خوب ہے۔ جس چیز نے ہمیں نان سوشل، بلکہ بہت حد تک اَن سوشل کر ڈالا ہے اُسے سوشل میڈیا قرار دیا جارہا ہے! نئی نسل کو فیس

بُک اور ٹوئٹر سے فُرصت نہیں اور اِس سے آگے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ سچ تو یہ ہے کہ پیچھے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یعنی مُڑ کر دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اچھا خاصا وقت ضائع کر دیا ہے۔

نئی نسل کو ایک واضح لائن مل گئی ہے اور وہ ہے آن لائن۔ نوجوان فیس بُک کے پیج پر رہتے ہیں یا پھر ٹوئٹر پر براجمان دکھائی دیتے ہیں۔ فیس بُک کے پیج پر پائی جانے والی وال'' کو نئی نسل دیوارِ گریہ کے طور پر استعمال کرتی ہے یعنی اپنا اور دوسروں کا ماتم'' کرتی رہتی ہے۔ کسی کے پاس کچھ ہو تو اُس میں دوسروں کو شریک کرنے کا سوچنا معقول معلوم ہوتا ہے۔ ہماری نئی نسل کا کمال یہ ہے کہ کچھ نہ ہونے پر بھی بہت کچھ ''شیئر'' کرنا چاہتی ہے! طریقِ واردات وہی ہے یعنی شیئرنگ بھی ہوتی ہے تو فیس بُک کے پیج پر! ہم نے تو ایسے نوجوان بھی دیکھتے ہیں جو فیس بُک پیج کو کچن اور ڈائننگ ٹیبل کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں یعنی وہ اپنے پیج پر آن لائن رہنے ہی کو پیٹ بھرنے کا ذریعہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی زندگی سے باقی سب کچھ نکال کر ایک طرف رکھ دیا ہے۔ پھینکا اِس لیے نہیں کہ مبادا ضرورت پڑ جائے! فیس بک اور دیگر سوشل میڈیا کے رسیا نوجوانوں کا تو بس نہیں چلتا کہ وہیں سے آکسیجن بھی کشید کریں اور وہیں بستر ڈال کر سو بھی جائیں۔ اگر کسی دن فیس بُک یا ٹوئٹر پر نہ جا سکیں تو زندگی میں کوئی بڑی کمی سی محسوس ہوتی ہے، جیسے بہت

کچھ کہیں راستے میں گر گیا ہو! کسی بھی وجہ سے سوشل میڈیا پر دو تین دن غائب رہنے سے بعض نوجوانوں کو جتنا ملال ہوتا ہے اُتنا ملال تو بہت سوں کو اب کسی عزیز کے مرنے پر بھی نہیں ہوتا! سوشل میڈیا پر پوسٹ کیے جانے والے کمنٹس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئی نسل کو اندازہ ہی نہیں کہ جب سوشل میڈیا نہیں تھا تب بھی بہت کچھ تھا جو سوشل تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی اچھی خاصی سوشل تھی! مگر اب نئی نسل کو کیا سمجھائیں کہ جب یہ سب کچھ نہیں تھا تب زندگی کی کیا شکل تھی۔ ے

لطفِ مے تُجھ سے کیا کہیں زاہد!
ہائے کم بخت، تو نے پی ہی نہیں

جو نوجوان سوشل میڈیا کو زیادہ وقت دیتے ہیں اُنہیں خاصا متحرک سمجھا جاتا ہے۔

خوب! جو بظاہر کسی کام کا نہیں اور کچھ نہ کرے وہی متحرک اور کام کا قرار پائے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ دنیا بھر میں کاروباری ادارے اب ملازمین بھرتی کرتے وقت یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سوشل میڈیا پر اُن کا اسٹیٹس کیا ہے۔ یعنی جس کے دوست اور فالوئرز زیادہ ہوں وہ زیادہ موزوں قرار پائے گا۔ امریکی ریاست ورجینیا کی اولڈ ڈومینین یونیورسٹی کے عمرانیات کے ماہرین نے ایک اسٹڈی میں بتایا

ہے کہ آجروں کو بہترین افرادی قوت کے انتخاب میں فیس بُک غیر معمولی مدد فراہم کرتی ہے۔ فیس بُک پروفائل سے امیدوار کی شخصیت کا بہت حد تک درست اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فیس بُک پروفائل سے حاصل کردہ معلومات اور سیلف رپورٹیڈ پرسنلٹی ٹیسٹ میں غیر معمولی مطابقت پائی گئی۔ معاشرتی اُمور کی محقق کیٹھلین کاوانو کا کہنا ہے کہ سوشل میڈیا اور خاص طور پر فیس بُک سے ملازمت کے کسی بھی امیدوار کے بارے میں تازہ ترین اپ ڈیٹس ہی معلوم نہیں ہو پاتیں بلکہ پورا ٹریک ریکارڈ سامنے آ جاتا ہے۔

ہم سمجھ نہیں پائے یہ کیسے ماہرین ہیں جو سوشل میڈیا کے سمندر میں غرق ہو جانے والوں کو کام کے لیے موزوں قرار دے کر ہمارے خیالات پر مٹّی ڈال رہے ہیں! جس طرح دِل آ جانے کے بعد انسان کسی کام کا نہیں رہتا بالکل اُسی طرح سوشل نیٹ ورکنگ کی ویب سائٹس کے مایا جال میں پھنس جان والے ہمیشہ جاں بہ لب رہتے ہیں، کسی کام کے نہیں رہتے!

ہماری نئی نسل بہت زیادہ سوشل بننے کی کوشش میں خاصی unsocial اور unethical ہو گئی ہے۔ جب راہ کو منزل سمجھ کر خوش ہو رہنے کی ذہنیت پنپ جائے تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ سوشل میڈیا پر متحرک رہنے والے اچھے ملازم کیسے ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ جو اِس طلسمات میں گیا، پتھر کا

ہوگیا۔ کئی نوجوانوں کو ہم نے پتھر کا ہوتے دیکھا ہے۔ اور معاملہ نوجوانوں تک کہاں محدود ہے، اچھی خاصی عمر والے بھی سوشل میڈیا کی زُلفِ ناز کے اسیر ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بہت سوں نے اِس زُلفِ ناز کو خوشی خوشی اپنے گلے کا پھندا بنا ڈالا ہے۔
سوشل میڈیا کو جس نے گلے لگایا وہ پھر کسی اور کو پورے مَن سے اپنا نہ سکا۔ گویا بہ قول جوشؔ ملیح آبادی

تیری ہی زُلفِ ناز کا اب تک اسیر ہوں
یعنی کسی کے دام میں آیا نہیں ہنوز

سوشل میڈیا رابطوں کا موثر ترین ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ نمک کی کان بھی ہے۔ ہم نے جس کسی کو اِس راہ پر چلتے دیکھا ہے وہ پھر کسی منزل کا شیدائی دکھائی نہیں دیا۔ گویا۔

منزلیں ڈھونڈتی ہی رہ جائیں
راہ کی دِل کشی میں کھو جاؤں!

نمک کی اِس کان میں جو بھی گیا اُسے ہم نے نمک ہوتے دیکھا ہے۔ سوشل رہنے کا ہم نے تو یہ گُر کھوج نکالا ہے کہ سوشل میڈیا پر کم کم جاتے ہیں اور درست راہ پر گامزن رہنے کے لیے کم کم آن لائن ہوتے ہیں۔

آملیٹ

اگر زور کی، بلکہ زوروں کی بھوک لگی ہو اور کھانے کے لیے کچھ نہ ہو تو سب سے آسان ڈش شاید آملیٹ ہے۔ انڈا توڑیے، پیالی میں پھینٹیے اور فرائی پین میں گرم گھی پر اُنڈیل دیجیے۔ ایک منٹ کے اندر آملیٹ تیار!

ہماری سیاست بھی اب آملیٹ کی راہ پر گامزن ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ راتوں رات سب کچھ پکا پکایا مل جائے۔ محض پیٹ بھرنے اور باضابطہ کھانے میں تو بہت فرق ہوتا ہے مگر اس فرق کو ذہن سے کھرچ کر پھینک دیا گیا ہے۔ بہت سے دیرینہ اور پختہ نوعیت کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ہنگامی نوعیت کے اقدامات کو انتہائی کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ اِس سادہ سے نکتے پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی کہ جو بگاڑ کئی عشروں میں پیدا ہوا ہے وہ بھلا دو تین معمولی اقدامات سے ذرا سی دیر میں کیسے دور ہوگا؟ انگریزی میں اس نوعیت کے اقدامات کو quick fix کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک ہتھوڑا ماریں اور مشین چلنے لگے۔ ہم ''کوئِک فِکس'' کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی کا دھیان اِس نکتے کی طرف نہیں جاتا کہ کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کا ایک فطری عمل ہوتا ہے جسے پورا کئے

بغیر مثبت نتیجے کی توقع نہیں عبث ہے۔ جب مسئلے کا فطری عمل ہو سکتا ہے تو اُس کے حل کے لیے کسی باضابطہ عمل کا نہ پایا جانا کس طور ممکن ہے؟

کھیل ہو یا سیاست، معیشت ہو یا معاشرت یا پھر قومی سلامتی کے امور، ہم نے ہر معاملے میں پلک جھپکتے میں درست کرنے کی روش پر گامزن رہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ کرکٹ کے دو تین مقابلے جیت لینے پر ہم ساری ناکامیاں اور ذِلتیں بھول جاتے ہیں۔ اور پھر جب مزید شکست سے دوچار ہوتے ہیں تو فتح کا خُمار بھی ذرا سی دیر میں ذہن سے اُتر جاتا ہے۔ اِس کے بعد وہی کچھ ہوتا ہے جو ہوتا آیا ہے یعنی خرابیاں اور خامیاں چُن چُن کر سامنے لائی جاتی ہیں اور میڈیا پر اُن کا خوب ڈھول پیٹا اور راگ الاپا جاتا ہے۔ معیشت کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کبھی بیرونِ ملک مقیم پاکستانی اپنی محنت کی کمائی سے کچھ زیادہ رقوم وطن بھیجیں تو حکومت زرِ مبادلہ کے ذخائر میں اضافے کا کریڈٹ لینے کے لیے فی الفور حرکت میں آ جاتی ہے۔ لوگ لاکھ سمجھائیں کہ ترسیلاتِ زر سے معیشت مستحکم ضرور ہوتی ہے مگر اس کا کریڈٹ حکومت لے سکتی ہے نہ اُسے دیا جانا چاہیے۔ اور ترسیلاتِ زر کو زرِ مبادلہ کے ذخائر میں حقیقی اضافہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مگر جناب، ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ سبھی سرکاری راگ الاپنے میں حصہ ڈالنے لگتے ہیں۔

طالع آزما آتے ہیں اور اپنی مرضی کے سارے کھیل کھیلنے کے بعد سُکون سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ اُن کے جانے کے بعد ایک صفِ ماتم بچھتی ہے اور سب مقدور بھر گریہ و زاری کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی لاکھ سمجھائے کہ سانپ کے نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں مگر ''کون سُنتا ہے فغانِ درویش'' کے مِصداق ایسی ہر بات بے نتیجہ رہتی ہے اور سماعتوں پر اُس کا ایسا ہی اثر ہوتا ہے جیسا پہاڑوں پر برسات کا۔

جو بھی حکومت بناتا ہے وہ برسوں کے مسائل ایک رات میں حل کرنے کے دعوے کے ساتھ عمل کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ راتوں رات پورے نظام کو درست کرنے کی یعنی ''کوئک فِکس'' کی ذہنیت اچانک اُبھر کر سامنے آتی ہے، شدید ہڑبونگ کے عالم میں چند اقدامات کئے جاتے ہیں۔ خاصے نیم دِلانہ انداز سے چند دعووں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اِس کے نتیجے میں اچھے خاصے معاملات کے بھی کپڑے اُتر جاتے ہیں! جب یہ سب کچھ ہو تو خرابیاں مزید پروان چڑھنے سے کیوں باز رہیں؟ حالات کو درست کرنے کی ہر نیم دلانہ اور عاجلانہ کوشش بالآخر مزید پیچیدگی پر منتج ہوتی ہے۔ یعنی خرابی برقرار رہتی ہے اور پنپتی جاتی ہے۔ دلاور فگار مرحوم نے خوب کہا ہے

ع

حالاتِ حاضرہ کو کئی سال ہوگئے

سابق صدر اور سابق آرمی چیف جنرل (ر) پرویز مشرف کے معاملے میں یہی عجلت پسندی بنیادی فیکٹر کی شکل میں دکھائی دی ہے۔ غداری کا مقدمہ جس طریقے سے چلایا جارہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملات کو صرف ایک نکتے پر لاکر نمٹانے کی تیاری کی گئی ہے۔ جو کچھ پرویز مشرف نے تقریباً 9 برس میں کیا اس کا مواخذہ محض ایک مقدمے کے ذریعے کرلیا جائے، یہ تو بہت دور کی منزل ہے۔ مگر یار لوگ دور کی کوڑی لانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ کوشش کی جارہی ہے کہ کچھ نہ کچھ نیا ہوتا دکھائی بھی دے اور کسی معاملے کا کوئی سہرا کسی کے ہاتھ بھی نہ لگے! یعنی ''صاف چُھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں'' والی کیفیت برقرار رہے! اب اگر اِس دھما چوکڑی میں قوم کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہتا ہے تو رہا کرے، کس کو اِس بات کا غم ہے؟ ؎

جو گزرتی ہے قلبِ شاعر پر

!شاعرِ انقلاب کیا جانے

سارے مسائل راتوں رات حل کرنے کی نیت سے جو مہم جوئی دو عشروں سے فرمائی جاتی رہی ہے اُسے قوم ''ٹکٹ ٹکٹ دیدم، دم نہ کشیدم'' کی تصویر بنی دیکھ رہی ہے۔ اب تو داد دینے کا بھی یارا نہیں رہا! کئی ایسے بھی ہیں جنہیں یہ سب کچھ تفنّنِ طبع کی منزل میں دکھائی دیتا ہے اور وہ ایسا لطف کشید کر رہے

ہیں کہ داد دینے سے گریز کرتے ہیں کہ کہیں، بقول محسنؔ بھوپالی، تسلسل ٹوٹ نہ جائے!

جنہیں خاصے صبر آزما انتظار کے بعد اقتدار ملتا ہے وہ ذرا سا اقتدار و اختیار پا کر ایسے اُتاؤلے ہوئے جاتے ہیں کہ مجسّم بے صبری ہو کر قوم کو ڈکار جانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آملیٹ کی ذہنیت کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ اور دُکھ اِس بات کا ہے کہ اِس آملیٹ میں سے ایک لقمہ بھی وہ قوم کو دینے کے لیے تیار نہیں۔ قومی خزانے کو یہ لوگ سونے کے انڈے دینے والی مُرغی قرار دے کر اُس کا پیٹ چاک کرنے پر تُلے رہتے ہیں تاکہ سونے کے سارے انڈے یک مُشت نکال لیں۔ اور معاملہ یہیں تک نہیں رکتا۔ یہ بے صبرے اِن انڈوں کو یک مُشت ہی ہڑپ بھی کرنا چاہتے ہیں۔

مرزا تنقید بیگ کا خیال ہے کہ اب اِس ذہنیت سے چُھٹکارا پانا بہت مشکل ہے۔ ہم نے پوچھا کیا واقعی ایسے لوگوں سے نجات کی کوئی راہ نہیں نکل سکتی جو سب کچھ تیزی سے درست کرنے کے چکّر میں مزید خرابیاں پیدا کرتے جا رہے ہیں۔ مرزا نے کہا، ''بات یہ ہے کہ قوم بھی اِس ذہنی کیفیت کی عادی ہو چکی ہے۔ جس طور قوم کو لوٹنے والے راتوں رات سب کچھ ہڑپ کرنا، ڈکار جانا چاہتے ہیں بالکل اُسی طرح قوم بھی راتوں رات اپنا سب کچھ لُٹانے کے لیے بے تاب رہتی

ہے۔ عام آدمی بھی 'کوئیک فِکس' ذہنیت کا غلام ہو چکا ہے۔ وہ اِس بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں کہ ہر وقت آملیٹ کھا کر پیٹ بھرنا درست نہیں۔ یا تو باضابطہ کھانا تیار کرنا سیکھنا پڑے گا یا پھر کہیں سے لانا پڑے گا۔''

ہم نے بے تاب ہو کر پوچھا تو کیا ہم آملیٹ کی منزل میں پھنسے رہیں گے؟

مرزا بولے، ''جہاں گھوم پھر کر صرف یہ ذہنیت پروان چڑھتی رہتی ہو کہ محض پیٹ بھر لینا کافی ہے وہاں آملیٹ ہی بہترین ڈش قرار دی جاتی رہے گی۔ اور جب سبھی اِس انتظام سے خوش ہیں تو کسی کو دِل جلانے کی کیا ضرورت ہے؟ کھاؤ، پیو اور خوشی خوشی جیو۔''

مرزا کی یہ بات اب تک ہمارے منہ میں ہے، حلق سے نیچے نہیں اُتری۔ ذہن کے کسی کونے سے کبھی کبھی یہ صدا اُبھرتی ہے کہ مرزا ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ یعنی پانی اپنی پنسال میں آ جاتا ہے اور ہم بھی سکون کا سانس لیکر کچھ دیر کے لیے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ آخر کو ہم بھی تو اِسی قوم سے ہیں۔

اُلّو کے پٹّھے

ایک جھوٹ کو چُھپانے کی خاطر یعنی غلط بات یا فعل کو درست ثابت کرنے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ جُھوٹی انا کی غلامی اور حقیقت سے صریح گریز کا ایسا ہی نتیجہ برآمد ہوا کرتا ہے۔ مغرب آج جس حالت میں ہمارے سامنے ہے وہ کئی صدیوں تک اپنائے جانے والے معمولات کا ''ثمر'' ہے۔

2003 میں ریلیز ہونے والی بولی وڈ مووی ''گنگا جل'' میں مرکزی ولن سادھو یادو (موہن جوشی) کا بیٹا سُندر یادو (یشپال شرما) شہر کی ایک لڑکی اپوروا کماری (کرانتی ریڈکر) کو ہر حال میں ہتھیانا چاہتا ہے۔ اپوروا کماری کی شادی کہیں اور کی جارہی ہوتی ہے تو وہ دولہا کو قتل کردیتا ہے۔ اِس کے بعد وہ اپوروا کماری کو اغوا کرلیتا ہے۔ اپوروا کماری، اُس کی ماں اور چھوٹے بھائی کو سُندر یادو کے ہاتھوں اِتنی تکلیف پہنچتی ہے کہ ایک دن اپوروا کماری کی ماں غریبوں سے ہمدردی سے رکھنے والے فرض شناس سپرنٹنڈنٹ آف پولیس اِمت کمار (اجے دیوگن) کے سامنے روتے ہوئے کہتی ہے، ''ساری پریشانی اِس منحوس، نامُراد (اپوروا کماری) کے باعث ہے۔ یہ پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہ

’’گئی؟ جی تو چاہتا ہے کہ اِس کا گلا گھونٹ دیں۔

اہل مغرب کا بھی کچھ کچھ ایسا ہی کیس ہے۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ اگلے وقتوں کی شرافت اور اقدار کو برقرار رکھنا زندگی بھر کا سَودا اور آزمائش ہے تو اپنے آپ کو بدلنے اور حالات کا سامنا کرنے کے بجائے اقدار کا پوٹلا ہی سَر سے اُتار پھینکا۔

جو لوگ آج اہلِ مغرب کی بے مثال مادّی ترقی کو سب کچھ، بلکہ زندگی کا حاصل اور تہذیب و تمدن کا نچوڑ سمجھ بیٹھے ہیں اُن کے لیے اوسوالڈ اسپنگلر کی کتاب ’’دی ڈیکلائن آف دی ویس‘‘ (زوالِ مغرب) چشم کُشا ثابت ہو سکتی ہے جس میں اُنھوں نے اپنی تہذیب کی چمک دمک ہی کو زوال کی سب سے بڑی نشانی قرار دیا ہے۔ مادّی معاملات میں فقید المثال عروج پاتے ہوئے مغرب کی پیش گوئی کرنا کسی مغربی مورخ اور مفکر کے لیے بڑی آزمائش تھا۔ دنیا حیران ہوئی مگر پھر سمجھ گئی کہ اسپنگلر نے تہذیب کے زوال کی بات کی ہے۔

مغرب کے دورِ جہل میں مذہبی پیشواؤں نے تمام معاملات پر اجارہ داری قائم کرکے بے حساب سِتم ڈھائے تھے۔ غیر جانبدار سوچ رکھنے والے اہلِ دانش اور عوام کا ردِ عمل مذہبی پیشواؤں کے خلاف ہونا چاہیے تھا مگر نزلہ گرا دیا گیا

مذہب پر۔ پاپائیت کے علم بردار چونکہ مذہب، روایات اور اخلاقی اقدار کے محافظ ہونے کے دعویدار تھے اِس لیے اُن کی بدنیتی کو مذہب اور اخلاقی اقدار کی خرابی نتیجہ تصور کرلیا گیا۔ اِسی سوچ سے مذہب بیزار رویّے نے جنم لیا۔

مذہب بہت سے معاملات میں درست تلقین کرتا تھا۔ زندگی کا جنسی پہلو اِن میں سب سے نمایاں تھا۔ مرد و زن کے اختلاط کی مخالف تینوں عالمگیر الہامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) کا طُرۂ امتیاز رہی ہے۔ پاپائیت کے ڈسے ہوئے اہلِ مغرب نے یہ سمجھ لیا کہ سارا بگاڑ مرد و زن کے اختلاط سے گریز کی تعلیم اور شرم و حیا کی تلقین میں ہے۔ ساتھ ہی یہ تصور بھی تیزی سے پروان چڑھا کہ جب تک مرد و زن کے درمیان سے شرم و حیا اور جھجک کا پردہ اُٹھا نہ دیا جائے تب تک حقیقی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

چار صدیوں سے زائد مدت گزری، اہلِ مغرب نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہر معاملے میں مادر پدر آزادی ہی زندگی کا محور اور مقصد ہے۔ حد یہ ہے کہ جُرم کی راہ پر گامزن ہونے کو بھی آزادی ہی کی ایک شکل تصور کرتے ہوئے ''نفرت جُرم سے، مُجرم سے نہیں'' کو نظریہ اپنا لیا گیا ہے۔ یعنی کوئی کیسا ہی جُرم کر گزرے، دِل کی تسلی کے لیے اُسے تھوڑی سی سزا دے لیجیے اور پھر اُس کی اِصلاح پر

مائل ہو جایئے ! یہی سبب ہے کہ سزائے موت کو غیر حقیقت پسندانہ تصور قرار دے کر رد کیا جا رہا ہے۔ منطق یہ ہے کہ اگر کسی قاتل کو موت کی سزا دے دی گئی تو پھر اُس !فکر و عمل کی اِصلاح کیسے کی جا سکے گی

شرم و حیا بہت سے معاملات میں مانع تھی۔ ترقی کا پہیہ اچھی طرح گھوم نہیں پا رہا تھا اِس لیے مغرب کے بزرجمہروں نے سوچا آنکھوں سے حیا کا پانی نکال کر پھینک ہی دینا چاہیے۔ اور وہ پھینک دیا گیا۔ پھر کیا تھا، بے حیائی کا طوفان آگیا اور فکر و نظر کی آزادی کے نام پر مادر پدر آزادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر وہ رویّہ اپنایا گیا جس کے ذریعے اخلاقی اقدار کے دامن کو زیادہ سے زیادہ داغ دار اور تار تار کیا جاسکتا تھا۔

آنکھ سے حیا اور دِل سے خوفِ خدا ختم ہو جانے پر جو کچھ ہوا کرتا ہے وہی مغرب میں بھی ہوا۔ ناجائز رشتوں کو پہلے فیشن کا درجہ ملا، پھر عادت کا اور اب یہ طرزِ زندگی کا حصہ ہے۔ تازہ ترین مثال برطانیہ کے دو نوعمر پارٹنرز کی ہے۔ بارہ سالہ لڑکی نے تیرہ سالہ بوائے فرینڈ کے ناجائز بچے کو جنم دیا ہے ! اِس فعل پر ''پارٹنرز'' کو شرمندگی ہے نہ اُن کے ماں باپ کو۔ اور ہو بھی کیوں؟ بازار میں چلتے ہوئے سکّے کو کھوٹا کون کہتا ہے؟ قابل غور بات یہ ہے کہ قانونی وجوہ کے باعث (!) ''والدین'' کے نام پوشیدہ رکھے گئے ہیں ! بہت خوب۔ یعنی محض نام ظاہر کرنے پر پابندی ہے، ناجائز تعلقات اُستوار کرنے

!اور اُن تعلقات کا نتیجہ دُنیا کے سامنے لانے پر کوئی روک ٹوک نہیں

500 سال پہلے مغرب کے معاشرے بھی ہماری ہی طرح ''دقیانوسی'' اور ''پس ماندہ'' تھے۔ پھر اُنھوں نے سوچا حرام و حلال اور جائز و ناجائز کے چکّر میں رہے تو ''آگے'' نہیں بڑھ سکیں گے۔ پاؤں میں اخلاقی اقدار کی ''زنجیریں'' تھیں اور گلے میں مذہبی تعلیمات کا ''طوق'' پڑا ہوا تھا۔ اِن زنجیروں اور طوق سے گلوخلاصی ناگزیر تھی۔ مذہب کی بات کرنے والوں سے بیزاری کے اظہار کی خاطر مذہب ہی کو طاقِ نسیاں پر سجادیا گیا اور مذہبی صحائف چمکدار اور قیمتی کپڑوں میں لپیٹ کر ''محفوظ'' کر دیئے گئے۔ اِس کے بعد کون تھا جو کسی کو روکتا؟ شخصی آزادی کا گھوڑا تین صدیوں سے سرپٹ دوڑ رہا ہے اور ہر اُس خیال، رویّے اور عمل کو روند رہا ہے جس میں معقولیت کی ہلکی سی بھی رَمق پائی جاتی ہو۔ اِس بے لگام آزادی نے عجیب و غریب فکر کو جنم دیا۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ تمام اخلاقی حدود و قیود سے نکلے بغیر ترقی کرنا تو دور کی بات ہے، اُس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ پہلے مشترکہ خاندان کا نظام اِس مفروضے کی بھینٹ چڑھا اور خونی رشتوں کا تقدس پامال ہوگیا۔ پھر شادی کے ادارے ہی کو داؤ پر لگا دیا گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ مشترکہ رہائش کے نتیجے میں دو تین بچوں کی پیدائش کے بعد یعنی ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لینے اور مطمئن ہو جانے پر رسمی کارروائی یعنی شادی بھی کرلی

جاتی ہے!

خصوصی قوانین کے ذریعے شخصی آزادی کو اس حد تک تحفظ فراہم کیا گیا ہے کہ اب ماں باپ اپنے بچے کو ڈانٹ بھی نہیں سکتے۔ بچہ شکایت کردے تو ماں باپ کو جیل کی ہوا بھی کھانی پڑتی ہے۔اِس روش کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ مرد و زن نے شادی کے ادارے کو ایک طرف رکھ دیا ہے۔جب اولاد پر کوئی حق ہی نہیں تو پھر اُس کے معاملے میں ذمہ دارانہ رویہ کیوں رکھا جائے؟ شادی کے بندھن میں بندھے بغیر بچے پیدا کئے جاتے ہیں اور اُنہیں پالنے کی ذمہ داری ریاست کے کاندھوں پر ڈال دی جاتی ہے! ماں باپ جو کچھ ٹیکس کی شکل میں ریاست کو دیتے ہیں اُسی کی مدد سے بچے کی پرورش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

بے حیائی اگر ذاتی معاملہ ہو تو کسی کو کیا اعتراض؟ مگر یہ سب تو منصوبے کے تحت ذہنوں میں ٹھونسا اور ٹھوکا جاتا رہا ہے۔ بے حیائی کا سیلاب اب ہمارے گھروں میں داخ ہوچکا ہے۔ کچّے ذہنوں کو بہت میٹھے اور سُریلے انداز سے باور کرایا جارہا ہے کہ زندگی تو صرف اپنی مرضی کے مطابق گزارنی چاہیے۔

سنی لیون اِس وقت بولی وڈ کی مشہور اداکارہ ہے۔ یہ واحد اداکارہ ہے جو خالص مُخرّبِ اخلاق (پورن) فلموں سے مین اسٹریم سنیما میں آئی ہے۔ کینیڈا میں بسے

ہوئے سکھ ماں باپ کی اِس بیٹی نے جب ساری اخلاقی حدیں پار کرکے پورن فلموں میں کام کرلیا تو ماں باپ ”ناراض“ ہوئے۔ جب ”فرماں بردار“ بیٹی نے وضاحت کی تو باپ نے ناراضی ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، جو تمہارا جی چاہے وہ کرو۔ مگر جو کچھ بھی کرو، ہمیشہ اچھی طرح کرو!“ یہ ہوتا ہے ایک دوسرے کو قبول کرنے کا کلچر ہمارے آپ کے گھروں میں بھی دیکھے جانے والے انڈین پروگرام ”بگ باس“ کے بگ باس یعنی سلمان خان نے سنی لیون کو ”اہل خانہ“ کے سامنے پیش کیا۔ لڑکیاں اسکرپٹ کے مطابق) آپس میں کھسر پُھسر کرنے لگیں تو سلمان خان نے پوچھا کیا) بات ہے۔ ایک لڑکی نے نظریں جھکا کر شرمانے کی عمدہ اداکاری کرتے ہوئے سنی لیون کی طرف اشارا کرکے کہا کہ یہ تو پورن اسٹار ہیں۔ اِس پر سلمان نے ”بڑے بھائی“ کی طرح پیار بھرے لہجے میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”بھئی، وہ اِن کا کام ہے!“ لیجیے، قصہ ہی ختم ہوگیا۔ ”سلّو بھائی“ کے الفاظ میں چُھپا ہوا پیغام یہ ہے کہ جس طرح اور بہت سے کام ہیں اِس طور پورن فلموں میں کام کرنا بھی محض ایک کام ہے جسے قبول کرلینا چاہیے۔ کچّے ذہنوں کو دیا جانے والا یہ پیغام کِتنا پُختہ ہے اِس کا اندازہ لگانے کے لیے آئن اسٹائن ہونا لازم نہیں! ایک

پورن اسٹار کو جواں سال لڑکیوں کے لیے آئیڈیل بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ اور یہ وہ پورن اسٹار ہے جو پورن فلموں میں ''شوہر'' ڈینیل کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور !برملا کہتی ہے کہ اُس کا شوہر اور بھائی دونوں بہت ''معاون'' ہیں

مغرب کی اداؤں پر فِدا ہو جانے والے ہمارے پڑوسی بھی تمام حدوں سے گزرتے جارہے ہیں۔ کمل ہاسن اور ساریکا کی مثال واضح ہے جنھوں نے اپنی تین بیٹیاں بڑی ہونے پر شادی کی ! 1987 میں اداکارہ نینا گپتا کا ویسٹ انڈین کرکٹر ویوین رچرڈز سے ناجائز تعلق قائم ہوا جس کے نتیجے میں نینا نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ وہ بیٹی اب جوان ہو چکی ہے۔ نینا نے اپنی اِس قبیح حرکت پر کبھی خفیف سی بھی شرمندگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنی بیٹی کو بے غیرتی کے کارخانے کی فخریہ پیشکش کی حیثیت سے دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ میڈیا کے ذریعے اِس ''کلچر'' کو اب ہماری جھولی میں ڈالا جارہا ہے۔

اہلِ مغرب نے کچھ پانے کے لیے سب کچھ کھو دیا۔ اور اِس پر ملال بھی نہیں۔ اپنی مستی میں مست ہو رہنے کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔ بہ قول جون ایلیا۔

میں بھی بہت عجیب ہوں اِتنا عجیب ہوں کہ بس

خود کو تباہ کرلیا اور ملال بھی نہیں!

مغرب میں اُلّو دانش کی علامت ہے۔ تو پھر دانش کی اِس علامت کے پرستار اُلّو کے پٹّھے ہوئے! اُلّو کو تو کچھ نہیں ہوا مگر اُس کے پٹّھے اکڑے ہوئے ہیں۔ یہ اکڑن شرم وحیا اور غیرت کے تیل کی مالش سے دور ہو سکتی ہے۔ مگر اب یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ شرم وحیا کے تیل کا اہتمام اور مالش کا فیصلہ کئے جانے تک پٹّھے رہیں گے یا نہیں!

!ہاتھی کی سواری گزر رہی ہے

فی زمانہ کسی بھی متنازع معاملے میں دلچسپی رکھنے کا اعتراف گناہ، بلکہ کفر کے مترادف ہے۔ کرکٹرز جس طور راتوں رات باری باری عِزت اور ذِلّت سے ''سرفراز'' ہوتے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے یہ بتاتے ہوئے دل سہم سا جاتا ہے کہ کبھی ہم بھی کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ کھیل کے معاملے میں کوئی خاص تیر تو ہم نہ مار سکے مگر ہاں، کرکٹ کے نام پر خوب دل پشوری ضرور کی۔ کھیل کے میدان میں اُترتے تو کرکٹ سے زیادہ ہم ایک دوسرے کے جذبات اور انا سے کھیلا کرتے تھے۔ کسی کا پستہ قد یا بلند قامت ہونا جملے بازی کے لیے کافی تھا۔ کوئی بہت موٹا لڑکا اگر بولنگ کرا رہا ہو تو سمجھ لیجیے اُس کی تو شامت ہی آ گئی۔ غیر معمولی قد یا جسامت والے ہر لڑکے پر دل کھول کر جملے کسے جاتے تھے اور کھیل سے زیادہ مزا اِس کھیل میں تھا۔

جب کوئی لڑکا خاصا اونچا شاٹ لگاتا تھا تو فیلڈرز کیچ لینے کی کوشش کرتے تھے۔ گیند اگر فضا میں دیر تک رہے تو فیلڈر کو اُس کے نیچے آنے کا درست زاویہ طے کرنے میں دِقّت پیش آتی ہے۔ جب کوئی لڑکا کیچ کی تیار کر رہا ہوتا تھا یعنی اُس کی نظریں گیند پر ہوتی تھیں اور ٹانگیں مسلسل حرکت کر رہی

ہوتی تھیں تب ہم اُسے پریشان کرنے کے لیے خوب شور مچاتے تھے، ہُوٹ کرتے تھے تاکہ توجہ ہٹے اور وہ کیچ چھوڑ دے۔ کبھی ہم کامیاب ہوتے تھے اور کبھی فیلڈر۔

اِس وقت چین کے معاملے میں امریکا اور یورپ وہی کچھ کر رہے ہیں جو ہم کیچ لینے کی تیاری میں مصروف فیلڈر کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ چین نے ایسی اُڑان بھری ہے کہ ہاتھ آنے کا نام نہیں لے رہا۔ اُس کی معیشت نے اکنامک پاور ہاؤس کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ مینو فیکچرنگ کے شعبے میں چین نے ہر ترقی یافتہ ملک کی ''واٹ'' لگادی ہے۔ آبادی اِتنی زیادہ ہے کہ ہر چیز بہت بڑے پیمانے پر تیار کی جاتی ہے یا کرنی پڑتی ہے۔ نتیجہ لاگت کے انتہائی کم رہنے کی صورت میں برآمد ہوتے ہے۔ جب لاگت کم ہوگی تو عالمی منڈی میں مقابلہ آسان ہی ہوگا۔ یوں چین کا مال دنیا بھر کی منڈیوں میں تیزی سے پہنچتا ہے اور تیزی سے فروخت ہو جاتا ہے۔ کئی ممالک نے اپنے مینو فیکچرنگ کے شعبے کو چین سے درپیش مسابقت کے باعث تبدیل کیا ہے اور مقامی صنعت کاروں کے لیے حالات بہتر بنانے پر توجہ دی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ بُچھڑے ہاتھی سے ٹکر کس طرح لیں؟ آدمی لڑتا وہاں ہے جہاں گنجائش ہوتی ہے۔ جب فریقِ ثانی گنجائش ہی ختم کردے تو کوئی کیا کرے؟ چین نے عالمی منڈی میں مسابقت کی گنجائش یا تو چھوڑی ہی نہیں یا پھر اِتنی کم کردی ہے کہ اب تک راج کرنے والے تاراج ہو کر رہ گئے ہیں۔

سَر پر سجا ہوا ترقی کا تاج ہِل جُل رہا ہے، کسی بھی وقت گر کر ڈھول چاٹ سکتا ہے۔
چین نے ایسا ''وختا'' ڈالا ہے کہ مغرب کے بڑے بڑے دِماغوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔

جب کسی بھی مسابقت کی سکت نہ رہے تو؟ واویلا ہی رہ جاتا ہے۔ مغرب بھی چین کے معاملے میں واویلا ہی کر رہا ہے۔ جو کچھ چین نے پانچ عشروں کی محنت سے حاصل کیا ہے اُس سے خائف اور بدظن ہو کر اب مغرب کی پروپیگنڈا مشینری چین کو لتاڑنے پر تُل گئی ہے تاکہ اُس کی توجہ ہٹے اور وہ کیچ چھوڑ دے! مگر چینی بھی کچّی گولیاں نہیں کھیلے۔ اُنہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہاتھی کی سواری گزرتی ہے تو کُتّے بھونکتے ہی ہیں۔ کُتّے بھونکتے رہ جاتے ہیں اور ہاتھی کی سواری گزر جاتی ہے۔ اِس مشرق کی طرف سے ہاتھی کی سواری چلی ہے اور مغرب میں کُتّوں نے بھونکنا شروع کر دیا ہے۔ ''شِدّتِ بھونکٹ'' کا عالم دیکھیے کہ چین کے جن معاملات سے باہر کی دنیا کا کوئی تعلق نہیں اُن کا رونا بھی خاصی دل جمعی سے رویا جارہا ہے۔ بعض ''خواتین'' خیر سمجھدار ہوتی ہیں مگر بیشتر ''عورتوں'' کا شیوہ یہ ہے کہ جب کچھ نہ بن پڑے تو کوسا جائے، لتاڑا جائے، طعنے دیئے جائیں۔ چین کے معاملے میں مغرب کے بُرزجمہر یعنی پالیسی میکرز اور ''تِھنک ٹینکرز'' اِس وقت یہی کر رہے ہیں۔ جب کسی کی خوش حالی ایک آنکھ نہیں بھاتی تو عورتیں اُس خوش حالی میں بھی بدحالی کے پہلو تلاش کرتی ہیں اور اپنی

دانست میں کامیاب ہو کر مورچہ بند ہو جاتی ہیں۔ اِس کے بعد کوسنے اور طعنہ زن ہونے کی منزل آتی ہے۔ مغربی تِھنک ٹینک بھی چین کے خلاف مورچہ بند ہیں اور ہر اُس معاملے کو اُچھالا دینے کی کوشش کر رہے ہیں جس کا کسی بھی ملک، خطے یا علاقائی و عالمی منڈی سے کوئی تعلق نہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ چین کی ترقی پائیدار نہیں۔ اب کوئی پوچھے کہ بھائی ترقی چین کی ہے۔ پائیدار ہو یا نہ ہو، آپ سے مطلب۔ کوئی یہ راگ الاپ رہا ہے کہ چین کے لیے آگے چل کر ماحول کے حوالے سے سنگین مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ماحول بگڑے گا تو چین کا بگڑے گا، کسی کو کیا غرض؟ بعض تجزیہ کاروں کو یہ فکر لاحق ہے کہ چین کا انسانی حقوق کا ریکارڈ شاندار نہیں۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ انسانی حقوق کے شاندار ریکارڈ سے کیا مُراد ہے؟ کیا چینیوں کو عزت سے دو وقت کی روٹی نہیں مل رہی؟ کیا وہ رات دن دہشت گردی کا شکار رہتے ہیں؟ کیا اُن کی انفرادی ترقی کی راہ میں کوئی بڑی رکاوٹ ہے؟ کیا چین میں کسی خاص یا چند مخصوص علاقوں کو پس ماندہ رکھا گیا ہے؟ کیا چین کے دیہات کا نقشہ بعض ترقی پذیر ممالک کے شہروں سے بہتر نہیں؟ کیا چین میں تعلیم عام نہیں؟ خواندگی کی شرح گری ہوئی ہے؟ کیا چینی روزمرہ معاملات میں غُصیلے اور اشتعال پسند ہیں؟ کیا وہ محنتی نہیں؟ کیا اُنہیں تمام بنیادی سہولتیں میسر نہیں؟ آخر وہ کون سی چیز ہے جو اہلِ مغرب کو پریشان رکھتی ہے؟

مغرب نے بہت کچھ پایا ہے مگر بہت کچھ کھو کر۔ چینیوں نے بھی بہت کچھ پایا ہے مگر اب تک کچھ خاص کھویا نہیں۔ اُن کی قدریں سلامت ہیں، روایات زندہ ہیں۔ ترقی یافتہ قوم ہو کر بھی چینی اب تک اُن چونچلوں سے آشنا نہیں ہوئے جنہیں اہلِ مغرب نے دُم چھلّے کی طرح اپنے ساتھ لگالیا ہے۔ چینیوں نے بہت کچھ پاکر بھی خود کو قابو میں رکھا ہے، متوازن زندگی بسر کر رہے ہیں، وطن سے پیار کرتے ہیں، مذہب کو بھی اپنی زندگی میں جائز مقام دے رکھا ہے، بہت سے معاشرتی اور اخلاقی عُیوب سے دور اور پاک ہیں، فضول خرچی کے عادی نہیں، کھانے پینے میں اعتدال کی راہ پر گامزن ہیں اور بہت سے دوسرے معاملات میں بھی میانہ روی کے قائل ہیں۔

انٹرنیٹ پر تلاش کیجیے تو مغرب کے تجزیہ کار جا بجا چینیوں کو نصیحت کرتے اور ڈراتے ملیں گے۔ کوئی تیس مار خاں یہ کہتا ہے کہ چین ترقی کی دوڑ میں زیادہ دور نہیں جاسکے گا۔ کسی کا فرمان ہے کہ چینی قیادت کو اب ترقی کے بارے میں سوچنا چھوڑ کر اپنے باشندوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے پر توجہ دینی چاہیے۔ گویا یہ دونوں الگ معاملات ہیں ! چینی پالیسی میکرز کو مشوروں سے نوازنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ تائیوان کے تنازع کو اِشو بناکر چین کو گھیرنے کا مشورہ دینے والے بھی معقول تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اہلِ مغرب کا جتنا وقت دوسروں کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرتا ہے اُتنا وقت وقت اگروہ

!اپنے خطے کی اصلاح کے بارے میں سوچنے پر صرف کریں تو فلاح پا جائیں
چین کو بظاہر اِس بات کی پروا نہیں کہ اُس کے بارے میں کیا سوچا جارہا ہے۔ اُس کی قیادت تو فی الحال اِس فکر میں غلطاں ہے کہ کل اُس کے ملک کے بارے میں کیا سوچا جائے گا اور وہ ترقی کے زینے پر کہاں کھڑے ہوں گے۔ ترقی کے میدان میں کچھ لینے کے لیے سنجیدہ فیلڈرز یہی ایسی ہی سوچ رکھا کرتے ہیں۔

ہاتھی کی سواری گزر رہی ہے۔ کُتّوں کے بھونکنے میں شِدّت آتی جارہی ہے۔ مگر ہاتھی اپنی چال میں اور اپنے حال میں مست ہے۔ ترقی کرتی ہوئی اقوام کو بہت کچھ نظر انداز بھی کرنا پڑتا ہے، آنکھیں کہیں کہیں بند بھی رکھنی پڑتی ہیں۔ ع

دریا کو اپنی موجوں کی طُغیانیوں سے کام
!کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

"جا بیل، اُسے مار!"

جو کچھ قسمت میں ہوتا ہے وہ یا تو ہو کر رہتا ہے یا پھر انسان ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ اب عمران بھائی ہی کی مثال لیجیے۔ ایک زمانے سے لوگ سمجھا رہے ہیں کہ بھائی، اچھی خاصی زندگی ہے تو کیوں اُسے تلپٹ کرنے پر تُلے ہو۔ مگر وہ ہیں کہ ماننے کو تیار نہیں اور بضد ہیں کہ شادی کرنے تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ہم نے بارہا سمجھایا ہے کہ جناب! شادی کے بعد کبھی کوئی چین سے بیٹھ سکا ہے جو آپ بیٹھیں گے! مگر اُن کی آنکھوں پر تو سہرے اور شہنائی کی پَٹّی بندھی ہے۔
عمران بھائی کا کیس "آ بیل، مجھے مار" والا ہے۔ بلکہ "آ گائے، مجھے مار" کہنا زیادہ زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے ہمیشہ اپنی رائے کو احترام کی نظر سے دیکھا ہے کہ مَرد اللہ میاں کی گائے ہوتے ہیں اور بیشتر معاملات میں خواتین، اپنے مزاج میں پائے جانے والے کُھرّانٹ پن کے باعث، بیل ثابت ہوتی رہی ہیں! ہو سکتا ہے خواتین ہماری سادہ وپُرکار ٹائپ کی رائے سے متفق نہ ہوں۔ اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ خواتین کبھی کسی بھی سَچّی بات سے متفق نہیں ہوتیں۔ مَرد اگر ساری جیبیں چیک کرادے، بینک اسٹیٹمنٹ بھی پیش

کردے تب بھی خواتین زیرو بیلنس کی سچائی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے "زیرو ٹولرنس" کی راہ پر گامزن رہتی ہیں یعنی شاپنگ کے لیے کہیں نہ کہیں سے رقم کا بندوبست کرنے کی ضد پر اڑی رہتی ہیں اور بالآخر اپنی بات منوا کر دم لیتی ہیں۔

ہم نے بیسیوں مثالیں پیش کی ہیں۔ ہزار طریقوں سے سمجھایا ہے۔ حد یہ ہے کہ حسن جہانگیر کے گائے ہوئے ایک "چشم کشا" گانے "شادی نہ کرنا یارو، پچھتاؤ گے ساری لائف" کا حوالہ بھی دیا ہے مگر عمران بھائی ماننے کو تیار نہیں۔ تحریک انصاف کے چیئرمین کی مثال بھی پیش کی ہے کہ دیکھو، عمران خان نے ایک بار فرارِ دار سے لَوٹنے پر فریبِ ثانی کو گلے لگانے کی ہمت اپنے اندر نہیں پائی۔ اور سب سے بڑھ کر تو ہماری اپنی مثال ہے۔ ہم نے گھریلو معاملات میں اپنی مثالی مظلومیت کا حوالہ دے کر بھی ازواجی زندگی کے گڑھے میں گرنے سے روکنے کی کوشش کی ہے مگر عمران بھائی ہیں کہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں۔ گویا محض ہمارے دوست ہی نہیں بلکہ سچّے اور کھرے پاکستانی بھی ہیں! پس ثابت ہوا کہ وہ "خودخوشی" کا مُصمّم ارادہ کرچکے ہیں۔ ٹھیک ہے صاحب، ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟

جب ہم نے مرزا تنقید بیگ سے عمران بھائی کا ذکر کیا تو چند لمحات کے لیے وہ

گویا پتّھر کے ہوگئے۔ ہم ڈر گئے کہ کہیں اُن پر سکتہ تو طاری نہیں ہوگیا۔ کسی زمانے میں وہ شعر بھی کہا کرتے تھے۔ تب اُن کے اشعار میں کچھ ایسا ہی سکتہ پایا جاتا تھا! جب شادی ہو گئی تو اشعار والا سکتہ اُن کی زندگی کے بیشتر معاملات پر محیط ہوگیا۔ اُنھوں نے کئی شعراء کے لیے سہرے لکھے۔ اِس عنایت کا بدلہ یہ مِلا کہ بعد میں اُن کے ازواجی معاملات دیکھتے ہوئے شعراء میں سے بعض احباب نے مثنویاں نذرِ قرطاس کیں اور چند ایک نے تو اُنہیں "خراجِ عقیدت" پیش کرنے کے لیے مرثیہ نُما نظمیں بھی کہہ ڈالیں۔ حالات ایسے تھے کہ مرزا نے ایسی کسی بھی کاوش کا بُرا نہ مانا۔

عمران بھائی کا ذکر سُن کر اُن پر طاری ہونے والا سکتہ ٹوٹا تو ہم نے پوچھا کیا ہوا تھا۔ کہنے لگے۔ "یہ محترم تو انتہائی نامعقول اور ناشکرے معلوم ہوتے ہیں۔" ہم نے وضاحت چاہی تو فرمایا۔ "فی زمانہ لوگ شادی کے پھیر سے بچے رہنے پر اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتے اور یہ جناب رشتے کی فکر میں گھلنے سے نہیں تھک رہے۔" اِس کے بعد اُنھوں نے اپنے مخصوص ذخیرۂ الفاظ اور انتہائی منفرد انداز سے عمران بھائی کو ایسا خراجِ تحسین" پیش کیا کہ ہم طُرّم خاں ٹائپ کے لکھاری ہونے کے باوجود وہ سب کچھ" بیان کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے!

مرزا اپنے ذاتی تجربات (یعنی حوادث) کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ فی زمانہ جس کی شادی نہیں ہوئی ہے وہ ہر گز دِل چھوٹا نہ کرے بلکہ دن میں دو تین بار شُکر کے سجدے کیا کرے کہ چھوٹی سی زندگی مزید چھوٹی ہونے سے بچ گئی ہے! مرزا جب کسی کو شادی کے لیے اُتاؤلے پن کا مظاہرہ کرتا پاتے ہیں تب اُن کی رگِ مذمت پھڑک اُٹھتی ہے اور وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اِس میں اُن کا کوئی قصور نہیں۔ بھابی کے سامنے اُن کی نہیں ایک نہیں چلتی۔ دِل میں پائے جانے والے غُبار کو اخراج کا راستہ چاہیے۔ جب کوئی شادی نہ ہونے پر افسردہ نظر آتا ہے تو مرزا موقع غنیمت جانتے ہوئے اُس کے دِل و دِماغ کی مذمّت و مرمّت کر ڈالتے ہیں اور پھر ذرا سی دیر میں فریقِ ثانی کے چراغوں میں روشنی نہیں رہتی!

عمران بھائی بکروں کے دھندے سے وابستہ ہیں۔ یعنی ایک قصاب کی دُکان پر کاریگر ہیں۔ بُغدا چلانا اُن کا کام ہے اور آن کی آن میں سالم بکرے کا تیاپانچا کر ڈالتے ہیں۔ مرزا نے جب یہ سُنا کہ عمران بھائی "بُغدا نواز" ہیں تو مزید حیران ہوئے۔ کہنے لگے۔ "رات دن بُغدا چلانے پر بھی یہ صاحب شادی کے لیے بے تاب ہیں۔ کیا اِنہیں کسی نے بتایا نہیں کہ ازدواجی زندگی بھی بُغدے کی زد میں آنے جیسی ہی کیفیت کا دوسرا نام ہے۔ بُغدے کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا بکرا تو پھر بھی کام کا رہتا ہے یعنی پکا کر کھالیا جاتا ہے۔

مرد بے چارے ازدواجی زندگی کے بُغدے سے کٹنے کے بعد کسی کام کے نہیں رہتے، اِدھر سے اُدھر رُلتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا عمران بھائی یہ سوچ رہے ہیں کہ وہ بُغدا چلانے کا کام کرتے ہیں اِس لیے ہونے والی شریکِ حیات غریقِ حیات ہو رہیں گی یعنی بُغدے کے خوف سے بکری کی طرح سہی سہی گزر بسر کرلیں گی۔ اب انُہیں کون سمجھائے کہ دُلہن بکری کی طرح صرف دو چار دن ہی سہی رہتی ہے۔ اِس کے بعد وہ خود چُھری بن کر دولہا میاں کے گلے پر چل جاتی ہے!"

ہم مرزا کی کسی بھی بات کو تسلیم کرنے سے گریز نہیں کرتے کیونکہ اُن کی زندگی کا حشر نشر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مرزا کا معاملہ تو چلیے، اُن کا اپنا معاملہ ہے۔ ہم کیا حقیقت پسند نہیں؟ کیا ہم اپنی حقیقت بُھول جائیں؟ شادی کے بعد ہم نے زندگی کے معرکے میں ایسے کون سے تیر مار لیے ہیں جو عمران بھائی کو آگے بڑھنے کی تحریک دیں۔ عمران بھائی جس انہماک سے گھر بسانے کی کوشش کر رہے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے باقیؔ صدیقی مرحوم یاد آتے ہیں جو کہہ گئے ہیں ۔

اپنی قسمت سے ہے مَفَر کِس کو؟
تیر پر اُڑکے بھی نِشانے لگے!

مولانا محمد حسین آزادؔ نے سوا صدی پہلے قبل کہا تھا کہ انسان کسی حال میں

خوش نہیں رہتا۔ اب پتا چلا کہ اِنسان اُس حال میں تو کسی حال میں خوش نہیں رہتا جس میں وہ خوش رہ رہا ہوتا ہے! ہماری نیک تمنائیں عمران بھائی کے ساتھ ہیں کیونکہ آخر آخر میں اِس راہ میں صرف نیک تمنائیں ہی رہ جاتی ہیں! اب اگر عمران بھائی مُصر ہی ہیں تو ہم پورے خلوص سے کہیں گے "جا بیل، اُسے مار!"

یہ نصف صدی کا قصّہ ہے

خوش فہمی کتنی سطحی ہوتی ہے اور کس طرح بُلبُلے کی مانند پُھوٹ جاتی ہے اِس حقیقت سے روشناس ہونے میں مرزا تنقید بیگ نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے۔ ہم جب بھی اپنے ذہن میں یہ خوش فہمی پالنے لگتے ہیں کہ شاید مرزا کچھ سُدھر گئے ہیں اور اپنے خیالات سے رجوع کرلیا ہے تب وہ کوئی نہ کوئی انٹ شنٹ بات کرکے ہمارے تمام تصورات کو یکسر باطل ثابت کردیتے ہیں۔

ہم ایک ہفتے سے سوچ رہے تھے کہ کسی طرح اُنہیں بتائیں کہ ہم نے اب تک لکھنے لکھانے کے معاملے میں بھلے ہی کوئی تیر نہ مارا ہو مگر ماہ و سال کے حوالے سے ایک بڑا تیر مارنے والے ہیں یعنی 24 اپریل کو عمر کی نصف صدی مکمل کرنے والے ہیں۔ کل جب ہم نے مرزا کو تھوڑا سا سنجیدہ پایا تو موقع غنیمت جان کر عرض کیا کہ اب جبکہ ہم پچاس سال کے ہونے والے ہیں تو کیوں نہ وہ ہماری اب تک کارکردگی (اور زندگی) کا جائزہ لیں، تجزیہ کریں تاکہ ہمیں اندازہ ہو کہ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔

مرزا کی سنجیدگی دم بھر میں مفقود ہوئی اور چہک کر بولے۔ ''اِس ملک میں پتا نہیں کیا کیا سیلیبریٹ کیا جارہا ہے، اب تم بھی اپنے پچاس سال سیلیبریٹ کرلو۔ جہاں اِتنے تماشے منعقد ہو رہے ہیں، ایک اور سہی۔''

ہم یہ سُن کر بھڑکنے ہی والے تھے کہ خود پر قابو پایا (یعنی پچاس سال کا ہونے کا ثبوت فراہم کیا) اور عرض کیا۔ ''محترم! یہاں تو لوگ کچھ کئے بغیر ہی اپنے وجود کو سیلیبریٹ کرتے رہتے ہیں۔ ہم تو پھر بھی کچھ نہ کچھ کر گزرے ہیں اور اب پچاسویں سالگرہ مناکر اپنی کامیابیوں کو سیلیبریٹ کرنا چاہتے ہیں۔''

ہم تو نہیں بھڑکے تھے مگر مرزا یہ سُن کر بھڑک اُٹھے۔ ''زندگی اللہ نے دی اور اُسی نے برقرار رکھی۔ ہوتے ہوتے آپ پچاس سال کے ہوگئے۔ اِس میں آپ کا کیا کمال؟ کمال تو اُن لوگوں کا ہے جو آپ کو پچاس سال سے دیکھ ہی نہیں، جھیل بھی رہے ہیں اور زندہ ہیں۔ کبھی اِس بات پر اہل خانہ کا شکریہ بھی ادا کرو۔ اب ہماری ہی مثال سامنے رکھو۔ تم سے دوستی کے بعد بھی ہم اب تک برقرار ہیں۔ یہ الگ بات کہ بر سرِ قرار نہیں!''

اِس سے پہلے کہ مرزا کی سفّاک صاف گوئی سے ہم بُجھ جاتے، ذہن میں چند

چنگاریوں نے تھوڑی سی ہوا پا کر شعلوں کی شکل اختیار کی اور ہم تازہ دم ہو کر پھر سے مقابلے پر آ گئے۔ مرزا کی بات اَن سُنی کرتے ہوئے عرض کیا۔ ’’آپ ہمیں ایک زمانے سے یعنی کم و بیش پندرہ بیس سال سے جانتے ہیں۔ آپ نے ہم میں کیا کچھ بھی نہیں دیکھا۔‘‘

مرزا بولے۔ ’’ارے کیا خاک دیکھا؟ اچھے بُرے میں تمیز کرنے کا شعور بھی تم میں نہیں پایا جاتا۔ دوستی کے معاملے میں بھی تم بُودے ہی ثابت ہوئے ہو۔ جس تِس کو دوست بنا لیتے ہو۔‘‘

یہ سُن کر ہم نے جب مرزا کو غور سے دیکھا تو وہ ذرا جھینپ گئے۔ گفتگو کا سلسلہ تھم سا گیا۔ ہم نے یہ موقع بھی غنیمت جانتے ہوئے جملہ داغا کہ دوستی کے معاملے میں ہم واقعی بُودے ثابت ہوئے ہیں کہ آپ کو بھی دو عشروں سے جان کا روگ بنا رکھا ہے۔

مرزا پسپائی اختیار کرنے پر مجبور تھے مگر مزاجاً چونکہ ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں اِس لیے آن کی آن میں پھر تُنک کر بولے۔ ’’ہم کب سے تمہارے دوستوں میں سے ہونے لگے؟ تم جس طور ہم سے ملتے ہو اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم ہمیں اپنے بزرگوں میں شمار کرتے ہو۔‘‘

ہم نے اگلا وار کیا کہ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ بزرگوں کے انتخاب کے معاملے میں ہمارا معیار پست ہے!

مرزا کے سامنے اب اپنے مزاج کی اصلیت ظاہر کرنے کے سوا کوئی آپشن نہ رہا۔ گفتگو اور دلائل کے سارے اُصول ایک طرف ہٹا کر بولے۔ ”یہ کیا فضول کی بحث لے بیٹھے؟ صاف صاف کہو نا کہ عمر کے پانچ عشرے مکمل ہونے پر اپنی توصیف کے خواہش مند ہو۔ ہاں بھائی، ہم نے مان لیا کہ آپ نے اپنے پچاس سال مکمل کرکے بہت بڑا تیر مارا ہے۔ اب کہو گے کہ پچیس تیس سے لکھتے آئے ہو۔ اور جو کچھ لکھا ہے اُسے بھی تیر مارنے کے کھاتے میں رکھنا چاہو گے۔“

ہم نے مودبانہ عرض کیا کہ ہمارے لکھے کو کسی نہ کسی کھاتے میں تو رکھا ہی جاسکتا ہے۔ ٹھیک ہے ہم بہت بڑے لکھارے نہ سہی، اپنی سی کوشش تو کر گزرتے ہیں۔ پڑھنے والوں کے ہونٹوں پر اگر ہماری تحریر سے مسکراہٹ کی چند لکیریں نمودار ہو جائیں تو سمجھ لیتے محنت ٹھکانے لگی۔ لکھنے کا اِس سے بڑھ کر صِلہ کیا ہو سکتا ہے؟

مرزا کو تو جیسے اپنے نام کی لاج رکھنے یعنی تنقید کے ڈونگرے برسانے کا

موقع مل گیا۔ ”میں تو سمجھتا تھا تم حقیقت پسند ہو مگر اب معلوم ہوا کہ تم بھی محض کالم نویس ہی ہو۔ تم بھی اِس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ لکھنا کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دینا ہے۔ میاں! جو کچھ تم لکھتے ہو اگر اُس کے بارے میں لوگ رائے دینے لگیں تو تمہیں لگ پتہ جائے۔ ایک زمانہ تھا جب لکھنا واقعی لکھنا ہوا کرتا تھا۔ اب تو محض لفّاظی ہے، شعبدہ بازی ہے۔ جسے دیکھیے وہ قلم تھام کر خود کو جادوگر ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے۔“

ہم نے بتایا کہ جو کچھ ہم لکھتے ہیں اُس پر خاصی حوصلہ افزا آراء موصول ہوتی ہیں۔ جو لوگ ہمیں پڑھ کر متاثر ہوتے ہیں وہ ای میلز میں تعریف ہی نہیں اُن مقامات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جہاں ہم نے کچھ محنت کی ہوتی ہے۔ یہ بات مرزا کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکی۔ کہنے لگے۔ ”جو تمہاری تحریروں سے متاثر ہیں وہ دراصل ’متاثرین‘ ہیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ تمہاری تحریریں اُن پر کیسے ستم ڈھاتی ہیں۔ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری تحریریں لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتی ہیں تو یہ تمہاری خوش فہمی یا غلط فہمی ہے۔ دراصل اُن کی ہنسی چھوٹ رہی ہوتی ہے۔ اور جب وہ ہنسی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو مسکراہٹ میں سمٹ جاتی ہے! اور تمہاری تحریر پڑھنے کے بعد جب اُن کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا تو بے ذہنی کے عالم میں چند توصیفی جُملے ای میل کر دیتے ہیں۔ اور تم خوشی سے پُھول جاتے ہو۔“

ہم نے مرزا کو سمجھانے کی کوشش کہ لوگ کسی کی تعریف یونہی تو نہیں کرتے، کوئی تو بات ہوتی ہے۔ وہ کہنے لگے۔ ''یہ بھی تمہاری ایک اور خوش فہمی ہے۔ اب ایس ایم ایس اور ای میل کے ذریعے رائے بھیجنا آسان ہوگیا ہے۔ لوگوں کو تو عادت سی ہو گئی ہے کچھ نہ کچھ ٹائپ کرتے رہنے کی۔ اِس عادت کو تم جیسے لوگ خلوص سمجھ کر خوشی سے پاگل ہوجاتے ہیں۔ آج کل کے لکھنے والوں کو توصیفی ایس ایم ایس یا ای میلز بھیج کر لوگ دراصل 'تفریح' لے رہے ہوتے ہیں اور تم لوگ خواہ مخواہ سیر لیس ہوجاتے ہو۔''

ہم نے مرزا کی رائے سے متّفق نہ ہونے کا عندیہ دیا تو پھر بھڑک اُٹھے اور یوں گویا ہوئے۔ ''یہی تو مسئلہ تم جیسے لوگوں کا۔ صاف گوئی برداشت نہیں کر پاتے ہو۔ ذرا سا لکھنا آگیا تو خود کو طُرّم خاں سمجھ لیا۔ لوگ تو مزے لے رہے ہوتے ہیں اور تم اُنہیں اپنا پرستار، مدّاح اور پتہ نہیں کیا کیا سمجھ لیتے ہو۔ تم مزاح لکھتے ہو وہ مزاحیہ سمجھ کر پڑھتے ہیں! تم اپنے موج میں بہتے ہوئے کہیں سے کہیں جانکلتے ہو اور اپنے لکھے کو دانش گردانتے ہو جبکہ لوگ صرف یہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ آج کل کے لکھنے والے جب مُوڈ میں ہوتے ہیں تو داستان گوئی کی راہ پر سنگ ہائے میل عبور کرتے چلے جاتے ہیں!''

ہم سمجھ گئے کہ مرزا کچھ بھی تسلیم کرنے کے موڈ میں نہیں۔ ایسے میں چُپ ہو جانا ہی بہتر تھا۔ ہمیں خاموش دیکھا تو مرزا بولے۔ ”حوصلہ رکھو۔ پڑھنے والے موجود ہیں اور اللہ اُنہیں اُن کے گناہوں کی سزا بھی دینا چاہتا ہے۔ ایسے میں بہتر یہ ہے کہ تم لکھتے رہو۔ اگر تماری تحریر پڑھنے والوں کے لیے امتحان کی سی ہو تو سمجھ لو کہ تم اللہ کی مرضی پر پورے اترے۔ یعنی تمہارا وجود بے مصرف نہیں۔ لوگ گناہ کرتے رہیں گے اور ہماری دُعا ہے کہ تم بھی سلامت رہو تاکہ تمہارے لکھے سے اُن کے لیے سزا کا اہتمام ہوتا رہے! “

جھیلنے کے لیے اپنا وجود کیا کم ہوتا ہے؟ ستم بالائے ستم یہ کہ ہم بیس سال سے مرزا کو بھی برداشت کر رہے ہیں۔ اِس دوران قرطاس و قلم سے تعلق بھی نہیں ٹوٹا۔ عارف انصاری، یوسف انصاری، تنزیل الرحمٰن اور شاہد رام پوری جیسے احباب بھی ملے ہیں جو بہت غنیمت ہیں۔ روزنامہ کی وساطت سے عمار چوہدری، اسلم کولسری اور سجاد کریم بھی حصے میں آئے ہیں۔ خلوص کے اِس رشتے کی بنیاد اُن کی روزنامہ دنیاکے ادارتی صفحات سے وابستگی ہرگز نہیں! لوگ طولِ عمر کی دُعا سے ڈرتے ہیں۔ آپ ہمیں شوق سے طولِ عمر کی دعا دیجیے۔ اگر ایسے تمام احباب کی رفاقت نصیب رہی تو ہم آئندہ پچاس برس کا دریا بھی ہنستے کھیلتے عبور کرلیں گے!

بے وقوف بنانے کا دھندا

ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جس میں ہر معاملہ اپنے عروج پر ہے۔ بلندی صرف عقل کے حصے میں نہیں آئی بلکہ جہل بھی رفعتوں کو چُھو رہا ہے۔ پورا ماحول بازار میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ہر معاملہ گھوم پھر کر صرف مفاد کے چوراہے پر آ جاتا ہے۔ طرح طرح کی دُکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ ہر چیز قابلِ فروخت اور فروخت پذیر ہے۔ جو چاہیے، وہ اِن دکانوں میں حاضر ہے۔ عقل چاہیے تو عقل اور جہل چاہیے تو جہل۔ یہ سارا کا سارا عقل کا کاروبار ہے۔ جو چیز جس قدر بے وقعت ہے اور غیر متعلق ہے اُس کی قیمت اُسی قدر زیادہ ہے۔ بے وقوفی کی انتہا یہ ہے کہ جس چیز کی یکسر ضرورت نہ ہو اُسے زیادہ قابلِ فروخت بنایا جاتا ہے اور اُس کے حصول کے لیے زیادہ بے تابی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ عقل کے کاروبار کی کامیابی در حقیقت بے وقوفی اور بے وقوفوں کے دم سے ہے۔ اِسی لیے تو کہتے ہیں کہ جب تک بے وقوف زندہ ہیں، عقل مند بھوکے نہیں مر سکتے۔

ٹیکنالوجی نے یہ بات بہت حد تک ممکن بنادی ہے کہ بے وقوف بنانا ہے تو ذرا ہائی فائی انداز سے بنایئے۔ زورِ بیان ایسا ہو کہ سفید جُھوٹ سُنہرے سچ سے

بھی خوبصورت لگے۔اِس دھندے میں ہم نے فلکیات کے ماہرین سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔ ہم یہ سوچ کر شرمندہ ہوتے رہتے تھے کہ ہمارے ہاں فٹ پاتھ پر بیٹھے ستارہ شناس انٹ شنٹ پیش گوئیاں کرکے لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔اب معلوم ہوا کہ مغربی دنیا میں فلکیات کے ماہرین بھی کچھ کچھ ایسی ہی باتیں کرکے اپنی روزی روٹی کا اہتمام کرتے ہیں۔فرق صرف اِتنا ہے کہ ہمارے ستارہ شناس بے چارے زیادہ پڑھے لکھے نہیں۔ (پڑھے لکھے ہوتے تو ستاروں کا حال کیسے بتاتے!) اور مغرب کے ماہرینِ فلکیات ثقیل اصطلاحات کی مدد سے اپنی بات کو خاصی گنجلک اور متاثر کن بنا لیتے ہیں!

انتہائی طاقتور دوربینوں کی مدد سے ماہرینِ فلکیات کائنات کے گوشوں کی خبریں ہم تک پہنچاتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ پندرہ بیس ارب سال قبل یعنی بگ بینگ کے وقت جو کچھ ہوا تھا وہ اب تک ختم نہیں ہوا بلکہ انتہائی مدھم روشنی کی شکل میں ہم تک پہنچ رہا ہے۔ زندگی کی تلاش کے نام پر ماہرین نے جو جھک ماری ہے اس کا احوال پڑھ پڑھ کر لوگ اَدھ مُوئے ہوگئے ہیں۔ نظامِ شمسی سے بہت دور، کہکشاں کے سِرے پر موجود ستاروں کی باقیات وغیرہ میں زندگی کے آثار کی نوید سُنا کر ایسی باتیں کی جاتی ہیں کہ اگر آپ چاہیں تو فکاہیہ ادب کے ذیل میں رکھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں!

اور بہت سے شعبوں کی طرح فلکیات کے ماہرین کی بھی نمایاں خاصیت یہ ہے کہ یہ کبھی کسی منزل پر زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے یعنی رائے بدلتے رہتے ہیں۔ جواز یہ پیش کردیتی ہے! اب اُن سے یہ کون obsolete کرتے ہیں کہ نئی تحقیق پچھلی تحقیق کو پوچھے کہ ایسی تحقیق کرتے ہی کیوں ہو جو آن کی آن میں از کار رفتہ قرار پائے! کبھی کہتے ہیں کہ کائنات میں صرف ہماری دُنیا ہی زندگی کا مرکز ہے۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ زندگی کی معاونت کرنے والے عوامل کائنات میں کئی مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ اور اگر بحث کیجیے تو دونوں ہی باتوں کے حق میں بولنے والے سامنے آ جاتے ہیں۔ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس حد تک جُھوٹا ہے!

امریکی ریاست میساچوسیٹس کے شہر کیمبرج میں ہارورڈ اسمتھسونین انسٹی ٹیوٹ فار ایسٹرو فزکس کے ماہر ڈیوڈ چربونو کہتے ہیں کہ کائنات کے دور افتادہ گوشوں میں ستاروں کے مدار میں ایسے سیاروں کا وجود ممکن ہے جو ہماری زمین کی طرح زندگی پرور ماحول رکھتے ہوں۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ جو سیارے زندگی پرور ماحول رکھتے ہیں وہ خصوصیات کے اعتبار سے زمین سے مماثل ہیں۔ معاذ اللہ، کائنات میں ہماری دُنیا جیسی اور بھی دُنیائیں ہیں! اب آپ ہی بتائیے کہ یہ کائنات جہانِ خراب نہیں تو اور کیا ہے!

دریافت کیا ہے جس کے (Kepler-185f) ماہرین نے حال ہی میں ایک ایسا سیارہ

بارے میں انہیں پورا یقین ہے کہ وہ زمین جیسا ہے کیونکہ یہ سیارہ اپنے ستارے یعنی اپنے سورج سے جو توانائی کشید کرتا ہے وہ ہماری زمین کے مقابلے میں ایک تہائی ہے۔ زمین کے قطر سے اِس نو دریافت شدہ سیارے کا قطر خاصا مماثل یعنی محض 10 فیصد زیادہ ہے۔

Kepler-186f کے بارے میں ماہرین نے بہت کچھ ایسی وضاحت سے بیان کیا ہے جیسے یہ وہاں سے ہو آئے ہوں اور اب ہمیں وہاں بسانے کی تیاری کر رہے ہوں۔ پاکستان کے الیکٹرانک میڈیا کی مشہور اصطلاح کے تحت کہیے تو فلکیات کے ماہرین خاصے انہماک کے ساتھ ''منجن'' بیچ رہے ہیں! لاکھوں ارب میل کی دوری پر واقع کسی بھی ستارے یا سیارے کے بارے میں یہ لوگ اِس طرح بات کرتے ہیں جیسے دو چار دن میں وہاں جانا ہے اور حالات کا جائزہ لیکر مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرنا ہے۔ مرزا تنقید بیگ کو ویسے تو تقریباً تمام ہی محققین سے شدید نفرت ہے کیونکہ اُن کے خیال میں محققین اور ماہرین صرف ورغلانے کے منصب پر فائز ہیں مگر فلکیات کے ماہرین اُن کے ''فیورٹ'' ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ ایسی بات کرتے ہیں جس کا بظاہر کوئی سَر ہوتا ہے نہ پیر۔ جس طور بے ہنگم بولنے والے ایران، طوران کی ہانکتے ہیں بالکل اُسی طرح فلکیات کے ماہرین کائنات کی وُسعتوں

کے بارے میں ایسے مُستند لہجے میں بات کرتے ہیں جیسے اُنہوں نے خلائی مخلوق سے ملاقات کرکے مختلف دنیاؤں کے بارے میں مخصوص معلومات حاصل کر رکھی ہیں۔ مرزا کا استدلال یہ ہے کہ ہم اب تک زمین ہی کو پوری طرح کھنگال نہیں پائے ہیں تو کائنات کی وُسعتوں کے بارے میں ٹھوس اور مستند انداز سے کوئی بات کیسے کہی جاسکتی ہے۔ جب ہم نے اُنہیں بتایا کہ زمین کے سے حالات والا ایک سیارہ دریافت ہوا جس کا سُورج بھی ہمارے سورج سے چھوٹا ہے اور اُس سے توانائی بھی کم شدت کے ساتھ خارج ہو رہی ہے تو وہ ٹُنک کر بولے۔ ''اب یہ بھی بتادو کہ یہ سیارہ کتنے گھنٹے کی مسافت پر ہے۔'' ہم نے ماہرین کے بیان کردہ اعداد و شمار کی روشنی میں بتایا کہ یہ سیارہ تقریباً 500 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ بس، اِتنا سُننا تھا کہ مرزا نے ہمیں یوں گھور کر دیکھا جیسے ہم فلکیات کے ماہر ہوں! ٹُنک کر بولے۔ ''ایک نوری سال کا مطلب ہے کہ تقریباً 9 ٹریلین، 46 بلین کلومیٹر۔ ایک ٹریلین میں ہزار ارب ہوتے ہیں۔ اب ذرا سوچو کہ 500 نوری سال کا فاصلہ کتنا ہوا۔ کائنات میں حجم کے اعتبار سے ہماری زمین کی کوئی اوقات نہیں۔ 500 نوری سال کے فاصلے پر گھومتا ہوا سیارہ بھی فلکیات کے ماہرین نے دیکھ بھی لیا اور وہاں زندگی پرور حالات کی نوید بھی سُنادی۔ کیا کہنے! کوئی اگر دیکھنا چاہے گا تو روشنی کا کوئی بھی نقطہ نکال کر اُسے نئی دُنیا کے طور پر پیش کردیں گے۔ اور کس میں ہمت ہے کہ تسلیم کرنے سے انکار کرے؟ جواب میں یہ کوئی بھی انٹ شنٹ دلیل پیش کردیں گے۔

ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ فلکیات کے ماہرین کے دماغوں کی طرح اُن کی دور بینوں کی نزدیک کی نظر کمزور ہے۔ کوئی اِن ماہرین سے پوچھے کہ میاں ! کائنات کے کونوں کی خبر تو لاتے ہو، ذرا ہمارے سیکڑوں لاپتا افراد تو تلاش کرکے دکھاؤ ! ''

ہم لاجواب ہوگئے۔ کائنات کے گوشوں کی خبریں لانے والے روئے زمین پر پائی جانے والی خرابیوں کا سُراغ لگانے میں ناکام رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جدید ترین آلات سے مُزیّن دور بینوں کی مدد سے کائنات کی وسعتوں کو کھنگالنے والوں کو دوسرے ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کا مشورہ ہو کہ ع

تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو !

مرزا سچ ہی تو کہتے ہیں۔ اپنے سیارے کو ہم اب تک درست نہیں کرپائے اور کھربوں کلو میٹر کے فاصلے پر ایسی دُنیائیں تلاش کر رہے ہیں جن پر بود و باش ممکن ہو۔ چاند ہم سے کتنا دور ہے؟ 3 لاکھ 84 ہزار کلو میٹر۔ بے بسی کا عالم یہ ہے کہ اب تک اُسے آباد کرنے کے قابل نہیں ہوسکے۔ اور زندگی تلاش کی جارہی ہے مِرّیخ پر ! ہمارے ہاں میڈیا کا مقصد ہے بنیادی مسائل سے اہلِ وطن کی توجہ ہٹانا۔ ایسا لگتا ہے کہ فلکیات کے ماہرین کو بھی کچھ اِسی طرح کی ڈیوٹی سونپی گئی ہے۔ یعنی اِتنی دور دور کی کوڑیاں لاؤ کہ لوگ اُن کی دل

کشتی میں گم ہو کر اپنے ماحول کی ساری خرابیاں کچھ دیر کے لیے بُھول جائیں۔

مُرغیوں سے بَطخوں تک

دُنیا اب تک اِس گمان کے سائے میں جی رہی ہے کہ سوچنا تو بہت دُور کی بات ہے، ہم پاکستانیوں کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ سوچنا ہوتا کیا ہے! یہ بھی دُنیا والوں کی خام خیالی ہے۔ کوئی کیا جانے کہ زندگی گزارنے کے کتنے ''پیراڈائمز'' ہوتے ہیں اور ہم نے کیسے کیسے ''پیراڈائمز'' متعارف کرائے ہیں۔

کتنے کم نظر ہیں وہ جو ہم پر تن آسانی کے الزامات عائد کرتے ہیں۔ تن آسانی کیا ہوتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ آسانی کی خواہش اور اُس کے حصول کی کوشش۔ اِس کسوٹی پر پرکھیے تو بیشتر اقوام ہم سے کہیں زیادہ تن آسان ثابت ہوں گی۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں غیر معمولی پیش رفت کیوں یقینی بنائی جاتی ہے؟ صرف اِس لیے کہ جینا زیادہ سے زیادہ آسان ہو جائے۔ اب اگر ہم کسی ٹیکنالوجی یا نظریے کے بغیر اپنی زندگی میں آسانیاں پیدا کرتے جا رہے ہیں تو اہلِ جہاں کو پریشانی لاحق ہے کہ یہ لوگ آگے کیسے نکل رہے ہیں! صاف محسوس کیا جاسکتا ہے کہ دُنیا والے ہم سے کُڑھتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آسانیاں تلاش کرنے پر ہمیں تن آسانی کا طعنہ کیوں دیا جاتا ہے؟

ایک صاحب نے اپنے مکان مالک سے شکایت کی کہ ہر کمرے کی چھت کا بُرا حال ہے۔ بارش ہوتی ہے تو ہر چھت ٹپکتی ہے، گھر میں پانی بھر جاتا ہے۔ اور یہ کہ اِس حالت میں مُرغیاں بے چاری ڈوب جاتی ہیں۔ مکان مالک نے صاحب مشورہ دیا کہ ایسا ہے تو بطخیں پال لو جو ڈوبتی نہیں!

ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ ہم نے جب یہ دیکھا کہ حالات کے پانی میں ہمارے مفادات کی مُرغیاں ڈوبی جارہی ہیں تو اپنے آپ سے اور حالات سے زیادہ اُلجھنے کی بجائے بطخیں پالنا شروع کردیا۔ حالات کو شکست دینا ہمارے بس کی بات تھی نہ ہے۔ مگر خیر جب جب مشکلات کا پانی برسے، مُرغیوں کو بخش کر بطخوں کو اپنانا تو ہمارے لیے قابل عمل آپشن ہو ہی سکتا ہے۔

ہم پاکستانیوں نے اہل جہاں کو بتایا ہے کہ جب مشکلات بڑھ جائیں تو اُن سے نفرت نہیں، محبت کرنی چاہیے۔ یہی بہترین "دستیاب آپشن" ہے۔ تجزیہ کار تو خدا جانے کیا کیا کہتے پھرتے ہیں۔ اُن کی سُنتا کون ہے؟ اور کوئی کیوں اُن کی باتوں پر دھیان دے؟ اگر اُن کی باتوں پر دھیان دیتے ہوئے زندگی گزاری جائے تو دو دن میں انسان کا تیاپانچا ہوجائے۔ بھاری بھرکم الفاظ کی مدد سے وہ ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں کہ چند جُملے سُن کر عام آدمی کے حواس منتشر

ہونے لگتے ہیں اور وہ مرعُوبیت کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

ہم ہر مشکل کو گلے لگاتے ہیں۔ کیوں نہ لگائیں؟ کیا ضروری ہے کہ جن مشکلات کو سبھی لات مار کر دور کرتے ہیں ہم بھی اُن سے نفرت کا اظہار کریں؟ آخر کو مشکلات کی بھی تو عزتِ نفس ہوتی ہے! ایک زمانے سے ہمارا طور یہ ہے کہ جن مشکلات کو لوگ گلے لگانے سے کتراتے ہیں ہم اُنہیں بخوشی مدعو کرکے گلے لگاتے ہیں۔ ہر نئی پریشانی کو ہم امکانات کی ایک نئی دُنیا تصور کرتے ہیں اور پھر اُس دُنیا میں بسنے کا ایسا اہتمام کرتے ہیں کہ دُنیا حیران ہو جاتی ہے۔ یوں ہمیں مکان بدلنے کا خیال نہیں آتا یعنی مُرغیوں کے ہاتھوں مجبور ہو رہنے کی بجائے بطخوں کو اپناتے جاتے ہیں۔ اصغرؔ گونڈوی نے خوب کہا ہے ۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دُشوار ہو جائے!

دُنیا آسانیاں ڈھونڈتی رہتی ہے، ہم مشکلات کو تلاش کرتے ہیں۔ جب اچھی خاصی مشکلات جمع ہو جاتی ہیں تو ہم اُن میں سے اپنے لیے آسانیاں کشید کرتے ہیں۔ لوگ ہمیں عبث ہی تن آسان کہتے ہیں۔ ہمیں کب تن آسانی یا آسانی سے پیار ہے؟ اگر کچھ دن سکون سے گزر جائیں تو طبیعت میں عجیب سی بے چینی انگڑائیاں

لیکر بیدار ہو جاتی ہے۔ کوئی حادثہ نہ گزرے تو دِل اندیشوں میں گھِرا رہتا ہے۔
دُنیا بھر میں لوگ حالات کے مطابق تبدیل ہو رہنے کو زندگی کا ایک بنیاد مقصد گردانتے ہیں۔ ہم پر الزام ہے کہ ہم حالات کے مطابق خود کو تبدیل نہیں کرتے۔ اِس الزام سے بھی اہلِ جہاں کی کوتاہ بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ حالات سے مطابقت رکھنے والے سانچے میں ڈھلنے کی بات ہو تو ہم سے بڑھ کر کون ہے؟ ہم خود کو حالات کے مطابق تبدیل ہی تو کرتے آئے ہیں۔ جب آسانیاں تھیں تب زندگی کو آسان بنالیا تھا۔ مشکلات پیدا ہوئیں تو زندگی کو مشکل بناڈالا۔ حالات سے مطابقت رکھنا اور کیا ہوتا ہے؟ لوگ آسانیاں تلاش کرنے کا طعنہ تو دیتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ہم عملاً مشکلات کی تلاش میں رہتے ہیں کیونکہ یہ آسانی سے مل جاتی ہیں۔ زندگی کے بازار میں آسانیوں کے اسٹالز پر تو بھیڑ چھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ جب سبھی آسانی کے دلدادہ ہوں تو اُس تک پہنچنا انتہائی دُشوار ہوتا ہے۔ ایسے میں بہترین آپشن یہ ہے کہ مُشکلات کے اسٹالز سے خریداری کی جائے۔ اور ہم ایسا ہی کر رہے ہیں کیونکہ مُشکلات تک آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے!
دُنیا والے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ہم نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔

سوچنے اور لکھنے والے اگر ہمیں سمجھنے کی کوشش کریں تو حیران رہ جائیں۔ ہم نے سوچنے کا نیا ڈھنگ اپنایا ہے۔ یہ ڈھنگ ہے ہی اِتنا نرالا کہ لوگ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ شاید ہمیں سوچنا نہیں آتا! کسی بھی ملک میں چلے جائیے، کسی بھی معاشرے پر نظر دوڑائیے، سوچنے کے حوالے سے ایک دوڑ سی دِکھائی دیتی ہے۔ خدا جانے لوگوں کو کون سے ایوارڈ جیتنے ہیں کہ ہر وقت سوچتے رہتے ہیں اور سوچ ہوئے پر عمل کرنے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ ہم نے سوچنے کے عمل کو اِتنے پردوں میں لپیٹ دیا ہے کہ لوگ ایک نظر ڈال کر یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ شاید ہم "بے فِکری" سے جی رہے ہیں۔ دباؤ قبول کئے بغیر زندگی بسر کرنے کا یہ انداز ہمارا وضع کردہ ہے۔ اور اِس نئی وضع پر ہم جتنا بھی "فخر" کریں کم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دو ڈھائی سو سال بعد عمرانیات کے ماہرین غور کریں تو کچھ اندازہ لگا پائیں کہ پاکستانی قوم طرح طرح مشکلات میں گِھر کر کیسی آسان سی زندگی بسر کرتی تھی۔ یہ بات شاید سو سال بعد تسلیم کی جائے کہ جو خرابیاں پاکستان جیسے معاشروں میں پائی جاتی تھیں وہ ہر ترقی یافتہ معاشرے میں بھی تھیں مگر خاصی مختلف ہیئت کے ساتھ اور قدرے ڈھکے چُھپے انداز سے۔

اہلِ جہاں نے خوش ہونے کو کامیابی سے مشروط کر رکھا ہے۔ ہم ایسے سنگ دِل نہیں کہ کامیابی ملنے تک دِل کو ترسنے اور تڑپنے کے لیے چھوڑ دیں۔ ہم نے

ناکامیوں سے بھی فتح کا جشن کشید کرنے کا ہُنر سیکھ لیا ہے۔ واضح رہے کہ خود سیکھا ہے، کسی نے سکھایا نہیں۔ کسی اور قوم کو یہ ہُنر آتا ہو تو کسی کو سِکھائے! اور ذرا اللہ کا کرم تو ملاحظہ فرمایئے کہ اپنے لیے یہ شاندار طرزِ زندگی وضع کرنے پر ہم نے کبھی غرور نہیں کیا!

حاصلِ کلام و کالم یہ ہے کہ پریشانیوں، الجھنوں اور مشکلات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اِن سے محظوظ ہونے کے ہُنر میں کمال حاصل کیجیے۔ گھر میں پانی بھر جائے تو مُرغیوں کو بچانے کی فکر میں غلطاں رہنے سے بہتر یہ ہے کہ بطخیں پالی جائیں جو تیر کر ہمیں بحرِ افسوس میں غوطہ زن ہونے سے محفوظ رکھیں! پریشان کن حالات میں بہترین دستیاب آپشن اِسی نوعیت کے ہوا کرتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ خوش دِلی، مُسکراتے ہوئے کرنا ہے۔ قمر جمیل کہہ گئے ہیں ؎

اپنی ناکامیوں پہ آخرِکار
مُسکرانا تو اختیار میں ہے!

بُھوک لگتی نہیں، پیٹ بھرتا نہیں

اہلِ پاکستان عجیب منزلوں سے گزر رہے ہیں۔ جو محنت کرتے کرتے اَدھ مُوئے ہو جاتے ہیں اُنہیں ڈھنگ سے دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہو پاتی اور جو دن بھر پڑے اینڈتے رہتے ہیں اُنہیں گھر بیٹھے تنخواہ ملتی ہے، اوور ٹائم کے ساتھ! حصہ طے کر دیجیے اور پھر جو جی میں آئے، کرتے رہیے۔ کس میں دم ہے کہ ٹوکے اور روکے؟ ایک زمانہ تھا جب لوگ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے شرماتے تھے۔ کسی سے کچھ مانگنا بھی ہوتا تھا تو زبان کھولنے کی ہمت جُٹانے میں ایک ایک ہفتہ لگاتے تھے۔ مگر پھر یہ ہوا کہ ہمیں من حیث القوم مانگنے کی عادت پڑ گئی۔ یہ عادت حکمرانوں نے ڈالی۔ جب حکومتیں زمانے بھر کے آگے ہاتھ پھیلاتی پھرتی ہیں تو عوام کو بھی زیادہ شرم محسوس نہیں ہوتی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ حکومت کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھ کر لوگ اِس قبیح فعل کو اپنانے میں زیادہ کشش محسوس کرتے ہیں کیونکہ اُن میں اِس تفاخر کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ بڑوں کے نقوشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

ہماری ہر حکومت پیٹ بھر دعوی کرتی رہتی ہے کہ اُس نے لوگوں کو سَر اُٹھانے

کا موقع فراہم کیا ہے۔ یہ بات اِس قدر درست ثابت ہوئی ہے کہ ملک بھر کے غنڈوں، لُچوں، لفنگوں، موالیوں، حرام خوروں اور ہڈ حراموں کے ساتھ ساتھ اب بھیک کے ٹکڑوں پر پلنے والے بھی سَر اُٹھا کر چلنے لگے ہیں! اور بھکاریوں کو بھلا کِس بات پر شرم محسوس ہو؟ بھکاری کون ہوتا ہے؟ جو کچھ کیے بغیر کھاتا ہے۔ یہی کام ہماری سرکاری اور نیم سرکاری مشینری کی جڑوں میں بیٹھے ہوئے بہت سے لوگ کر رہے ہیں! جب وہ ذرہ بھر شرمندہ نہیں تو پھر بھکاری کیوں شرمائیں؟

بھکاری یہ سمجھتے ہیں کہ وہ معیشت پر بوجھ نہیں۔ اُن کی زبان پر کبھی بے روزگاری اور بے کاری کا رونا نہیں ہوتا۔ اوور ٹائم اور انکریمنٹ تو ایک طرف رہا، یہ لوگ نوکری مانگتے ہیں نہ تنخواہ۔ جب نوکری ہی نہیں مانگتے تو کیسی گریجویٹی اور کہاں کی پنشن؟ نوکری کے حاجت مند نہ ہونے کی بدولت، ظاہر ہے، برطرفی کے صدمے سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اِنہیں بھوک لگتی نہیں اور پیٹ بھرتا نہیں۔

کل ایک بھکاری سے ٹاکرہ ہوا۔ اُس کی صحت دیکھ کر خیال گزرا کہ ہم خواہ اِتنی محنت کرتے ہیں، لکھنے کے لیے دِل و جگر کا خون جلاتے ہیں۔ یعنی صحت کا ستیاناس کرتے رہتے ہیں۔ جب ہم نے اُس بھکاری کو ہٹا کٹا ہوتے ہوئے

بھیک مانگنے کا طعنہ دیا تو ہنستے ہوئے بولا۔ ”آپ کو حق ہے صاحب جی، جو چاہیں بول لیں۔اِس سے زیادہ آپ کے بس میں ہے بھی کیا؟ اب ’طعنہ پروف‘ ہیں یعنی کوئی بات اثر نہیں کرتی۔“

اُس کے بدن پر کپڑے بھی شاندار تھے۔ ہم نے جُملہ کسا کہ کپڑے تو ماشاء اللہ بہت اچھے پائے“ ہوئے ہیں۔ لگتا ہے تمہاری اوقات بدل گئی ہے۔“

ذرا بھی بُرا مانے بغیر اُس نے ڈِھٹائی سے جواب دیا۔ ”آپ نے ٹھیک پہچانا۔ مگر خیر، اب تو سبھی کی اوقات بدل گئی ہے۔ کل تک جو جُھوٹے کہلاتے تھے، اب سیاست دان کہلاتے ہیں۔ کل تک جنہیں لوگ بڑبولے کہہ کر ہُوٹ کیا کرتے تھے وہ اب ٹی وی پر اینکر کی جاب کر رہے ہیں۔ جو بے سَر پیر کی ہانکا کرتے تھے وہ ڈراما نگار ہو گئے۔ اور جنہیں سوچنا نہیں آتا وہ دانشور کہلاتے ہیں!“

ہم نے غیرت دلانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تم معاشرے میں کسی مقام کی خواہش نہیں رکھتے؟“

بھکاری نے تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔ ”جن کا مقام ہوتا ہے اُن کا مکان نہیں ہوتا۔ ہم جہاں ہیں ٹھیک ہیں۔ مقام و قام کے چکر میں ڈال کر ہماری توجہ منتشر نہ کریں۔“

بھکاریوں کی ویسے تو کوئی مستقل رہائش نہیں ہوتی مگر پھر بھی ہم نے پوچھ ہی لیا کہ آج کل رہائش کہاں ہے۔ اُس نے کہا۔ ''ہم وہاں ہیں جہاں سے ہٹیں گے تو پانی آئے گا۔ مطلب یہ کہ میں بیوی بچوں کے ساتھ ایک بڑے پائپ میں رہتا ہوں۔''

ہم نے اثاثوں کا پوچھا تو اُس نے گھور کر دیکھا اور بولا۔ ''یہ سوال تو مجھ سے میرے باپ نے بھی کبھی نہیں پوچھا۔ اور کیوں بتاؤں کہ میرے پاس کیا کیا ہے؟ مجھے کون سا الیکشن لڑنا ہے؟''

''تمہیں الیکشن لڑنے کون دے گا؟ تم کون سے گریجویٹ ہو؟''

اِس پر بھکاری تُنک کر بولا۔ ''کیا مطلب؟ کیا آپ نے مجھے جاہل سمجھ رکھا ہے؟ بھائی صاحب! پڑھا لکھا بھی ہوں اور سمجھدار بھی۔ بھیک مانگتا ہوں، کوچنگ سینٹر نہیں چلاتا!''

ہم نے گھیرنے کی کوشش کی۔ ''اگر تم پڑھے لکھے ہو تو شعور بھی رکھتے ہوگے۔ اگر شعور رکھتے ہو تو بھیک کیوں مانگتے ہو؟''

شعور ہے جبھی تو بھیک مانگ رہا ہوں۔ بے شعور ہوتا تو کسی دفتر میں بابو گیری کرکے آٹھ دس ہزار روپے مہینہ کما رہا ہوتا۔ آپ جیسے کچھ لوگوں نے پہلے بھی سمجھانے اور غیرت کے نام پر دلدل میں گرانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بہت غور کیا، حالات کا جائزہ لیا اور اِس نتیجے پر پہنچا کہ 'خاندانی ہُنر' کو سینے سے لگائے رکھنے ہی میں فائدہ ہے۔"

ہم نے پوچھا ہاتھ میں یہ فائل کیسی ہے۔ وہ بولا۔ "ایک سرکاری پروجیکٹ کی فائل ہے۔ کچھ اعلیٰ افسران میرے پاس آئے تھے۔ میں اپنی برادری کا صدر بھی تو ہوں۔" ہم نے حیران ہوکر پوچھا سرکاری افسران تم سے ملنے کیوں آئے تھے؟ اُس نے وضاحت کی۔ "امداد دینے والے ملکوں کا ایک اہم اجلاس پیرس میں ہو رہا ہے۔ سرکاری افسران اُسی سلسلے میں آئے تھے۔ حکومت کشکول توڑنے کا اعلان کرچکی ہے۔ افسران کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کشکول ہاتھ میں لیے بغیر عالمی برادری میں بھیک کس طرح مانگی جائے! میں نے اُن سے کہا یہ تو کوئی پرابلم ہی نہیں ہے۔ ہم بھکاریوں نے کشکول بہت پہلے توڑ دیا تھا۔ شاید حکومت نے ہماری ہی نقل کی ہے۔ پھر میں نے اُنھیں چند خاندانی نُسخے بتائے جن سے بھیک

''! بھی خوب ملتی ہے اور 'عزتِ نفس' بھی داؤ پر نہیں لگتی

لوگ کہتے ہیں بھکاری بہت کچھ پا کر بھی تبدیل نہیں ہوتے، اُن کی مجموعی اوقات وہی رہتی ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ ہم نے جب یہ سوال سامنے رکھا تو بھکاری نے کہا۔ ''وہ زمانے گزر گئے۔ اب ہم بھی تبدیلی چاہتے ہیں۔ اب میری مثال لیجیے۔ میں وقت کے ساتھ ساتھ خود کو بدلتا گیا ہوں۔ آج میرے پاس تین کریڈٹ کارڈ اور چار بینکوں میں اکاؤنٹ ہیں۔ ہماری برادری ایوننگ بینکنگ سے بھرپور استفادہ کر رہی ہے۔ شام تک ہم جو کماتے ہیں وہ اُسی علاقے کے کسی بینک میں جمع کرادیتے ہیں۔''

باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بھیک مانگنے کے دھندے کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ جب ہم نے اِس حوالے سے بات کی تو بھکاری بولا۔ ''ایسی بات نہیں ہے کہ ہمارے لیے ہر طرف سُکون ہی سُکون ہے۔ ہمارے بھی سو دشمن ہیں۔ آج کل آپ کو ٹریفک سگنلز پر ایک عجیب سی مخلوق دکھائی دے رہی ہوگی جو he ہے نہ she میں۔ یہ مخلوق ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ لوگوں کی جیب سے مال نکلوانے کے لیے یہ سجی سجائی مخلوق جو کچھ کرتی ہے وہ ہم نہیں کر سکتے۔ ہمارے بھی کچھ 'اصول' ہیں، کچھ روایات' ہیں۔ ہم عام لوگوں کی طرح ذرا سی دولت کے اپنا سب کچھ داؤ پر نہیں ' لگا سکتے۔''

یہ ساری باتیں ہم سے ہضم نہیں ہو پارہی تھیں کیونکہ ہم خود بھی اِن کی زد میں آ رہے تھے ! جان چُھڑانے کی غرض سے ہم نے رسمی نوعیت کا الوداعی سوال داغا۔ ''تمہیں اپنے دھندے کا مستقبل کیسا دکھائی دیتا ہے؟''

اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''معاملہ گڑبڑ ہے۔ ہمارے دھندے کے اُفق پر کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بھیک مانگنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ حالات نے سب کو ہاتھ پھیلانے پر مجبور کردیا ہے۔ لوگوں کو مانگنے کا ڈھنگ آتا نہیں اور مانگنے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمارا دھندا خراب کر رہے ہیں۔ اب میں کیا بتاؤں کہ غیر پیشہ ور بھکاریوں کو دیکھ کر ہم پر کیا گزرتی ہے۔ کبھی کبھی تو میں حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ لوگ کن کن طریقوں سے بھیک مانگ رہے ہیں ! اگر یہی حال رہا تو میری برادری کو بوریا بستر لپیٹ کر کینیڈا شفٹ ہونا پڑے گا !''

گدھے کے گوشت کی کہانی

قلب و نظر کی وُسعت تو اور بھی بہت سی اقوام میں پائی جاتی ہوگی مگر اِن دونوں کے ساتھ ساتھ اگر کسی کو معدے کی وُسعت دیکھنا ہو تو ہماری طرف دیکھے۔ کون سی چیز ہے جو ہم نے چھوڑی ہے؟ کھانے پینے کے معاملے میں پاکستانی قوم کا شعار یہ ہے کہ ع جو آئے آئے کہ ہم ”منہ“ کشادہ رکھتے ہیں!

حیرت تو ترقی یافتہ اقوام پر ہے کہ اُن کے افراد اگر کوئی بھی ایسی ویسی چیز کھالیں تو اُن کی جان پر بن آتی ہے۔ ایسی ترقی کس کام کی کہ انسان ڈھنگ سے کچھ ہضم بھی نہ کرسکے؟ اِدھر ہم ہیں کہ خواہ کچھ کھالیں، کچھ اثر نہیں ہوتا!

محققین اور ماہرین کھانے پینے کے بارے میں پتا نہیں کیا کیا بکتے رہتے ہیں۔ اگر اُن کے بیانات اور ہدایات کی روشنی میں کھانے پینے کو معمول بنایا جائے تو دو دن بھی ڈھنگ سے جینا مشکل ہوجائے۔ کبھی کسی چیز میں خوبیاں ہی خوبیاں گنواتے ہیں اور کچھ دن بعد اُسی چیز میں دُنیا بھر کے عیب جَڑ دیتے ہیں۔ جو لوگ اخبارات میں کھانے پینے سے متعلق تحقیق کے نتائج پڑھ کر کوئی

چیز کھانے کی طرف مائل ہوتے ہیں وہ کبھی کبھی منہ کا نوالہ بھی ایک طرف رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں! مزے میں وہ لوگ ہیں جو کھانے پینے سے متعلق کسی بھی تحقیق کے نتائج نہیں پڑھتے۔ بہتر یہی ہے کہ کھانے پینے کی راہ پر بے تکان بڑھتے جائیے اور منزل کا معاملہ اُس پر چھوڑ دیجیے جس نے کھانے پینے کی اشیاء تخلیق کی ہیں!

مرزا تنقید بیگ کا شمار اِس دُنیا (بلکہ کائنات) کے اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو کھانے پینے کے معاملے میں اِنکار کے قائل ہی نہیں۔ ہضم کرنے کی بات آ جائے تو لفظ ناممکن اُن کی لغت میں شامل ہی نہیں کیا گیا! یہی سبب ہے کہ وہ تقریبات میں تمام ڈِشیں خوب جی بھر کے معدے میں اُنڈیلتے جاتے ہیں اور آخر تک ڈکار نہیں لیتے۔ جب مرزا کھا رہے ہوتے ہیں تو لوگ محوِ تماشا رہتے ہیں کہ اُن کا "آخر" آخر کب آئے گا! کھانے پینے کے معاملے میں مرزا نے ہمیشہ فیض احمد فیضؔ کے اُصول پر عمل کیا ہے یعنی جو چلے تو جاں سے گزر گئے!

ہم نے جب کبھی مرزا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ زیادہ کھانے سے صحت پر شدید منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، ہمیں اُسی طرح منہ کی کھانی پڑی ہے جس طرح اسٹینڈ اپ کامیڈین منہ کی کھاتے ہیں! کھانے پینے کے معاملے میں مرزا کا بنیادی اُصول یہ ہے کہ کسی اُصول کو گلے نہ لگایا جائے۔ اگر کبھی یہ کہہ کر

ڈرایا جائے کہ فلاں چیز جسم سے موزونیت نہیں رکھتی اور اُس کے کھانے سے طبیعت میں تکدّر بھی پیدا ہو سکتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اچھا ہے، پیٹ کے کیڑے مر جائیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو چیز جسم کے لیے موزوں نہ ہو وہ زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتی کیونکہ وہ پیٹ میں زیادہ دیر رہے گی ہی نہیں ! اِن معاملات میں مرزا کے پاس ایسے ایسے اور اِتنے دلائل ہیں کہ اُن سے ٹاکرہ ہو تو ماہرین دُم دبا کر بھاگ نکلیں !

اخبار ہمارے سامنے پڑھا تھا جس میں خبر چھپی تھی کہ شہر کے مختلف علاقوں میں گدھے کا گوشت دَھڑلّے سے فروخت ہو رہا ہے اور بعض ہوٹل والے بھی یہ گوشت استعمال کر رہے ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر ہم جو سکتہ طاری ہوا وہ تو کبھی گدھوں کو گنجائش سے دُگنا بوجھ اُٹھے دیکھ کر بھی طاری نہ ہوا تھا ! ذہن تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ پالتو گدھے کا گوشت کھانے یا کھلانے کی واضح شرعی ممانعت کے باوجود کوئی اپنے مومن بھائیوں کو یہ گوشت کھلادے !

گدھے کے گوشت والی خبر ہمارے لیے حیرت انگیز تھی، مرزا کے لیے نہیں۔ اُن کے لیے تو خیر اب کوئی بھی خبر حیرت انگیز نہیں کیونکہ اُنھوں نے حیرت میں مبتلا ہونا ترک کر دیا ہے۔ کسی بھی عجیب سی خبر کو پڑھنے یا سُننے کے بعد

اُن کی طبیعت موج میں آجاتی ہے اور وہ اُس سے لطف کشید کرنے لگتے ہیں! فی زمانہ ایک کھرے پاکستانی کی یہ بھی ایک واضح نشانی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل کو یہی ہماری قومی شناخت میں تبدیل ہوجائے!

مرزا کہتے ہیں کہ پاکستانی قوم نے دیگر بہت سے معاملات کی طرح اب کھانے پینے کے حوالے سے بھی ناجائز و ناجائز کے بارے میں سوچنا ترک کردیا ہے۔ جب معدہ ''لکڑ ہضم، پتھر ہضم'' ٹائپ کا ہو تو کیا جائز اور کیا ناجائز۔ لوگ سوچتے ہیں کہ جب دوسرے بہت سے معاملات میں ذہن کو اُلجھن میں مبتلا نہیں رکھا جاتا تو کھانے پینے کے معاملات میں اِسے کیوں تکلیف دی جائے؟ مرزا کا بھی یہی فلسفہ ہے۔ واضح رہے کہ مرزا ہر معاملے میں اپنا فلسفہ رکھتے ہیں اور اِس فلسفے کو وہ عموماً دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں کیونکہ افشا ہوجانے پر فساد برپا ہونے کا خدشہ ہے!

جب ہم نے مرزا کو بتایا کہ شہر میں گدھے کا گوشت فروخت ہو رہا ہے تو وہ بولے۔ اِس شہر میں، بلکہ اِس ملک میں کیا ہے جو فروخت نہیں ہوتا؟ جب شرم و حیا اور'' غیرت ہی 'مارکیٹیبل کموڈٹی' بن گئی تو اور کسی چیز کو کیا روئیے؟ پوری قوم 'ھل من مزید' کی نفسیات پر عمل پیرا ہے۔ پیٹ بھرنے سے غرض ہے۔ اب گوشت مُردار کا ہو یا حرام جانور کا، اِس سے کسی کو کچھ غرض نہیں۔

لوگ آسانیاں چاہتے ہیں۔ زندگی کو آسان بنانے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ ناجائز و ناجائز اور حرام و حلال کے پھیر میں پڑنے سے گریز کیا جائے! ''

ہم معترض ہوئے کہ یہ تو صریح سہل انگاری ہے۔ زندگی اِس طرح تو نہیں گزاری جاسکتی۔ اِس پر مرزا نے صراحت کی۔ ''زندگی نہ صرف یہ کہ گزر رہی ہے بلکہ کچھ زیادہ سُکون سے گزر رہی ہے۔ تم جیسے لوگ دوسروں کو آسانی سے پُرسکون زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھ کر بس کُڑھتے ہی رہتے ہیں۔ کیا کھایا جائے اور کیا نہ کھایا جائے، یہی سوچ سوچ کر تم لوگ کچھ کھاتے نہیں ہو اور دوسروں کے کھانے پینے پر بھی نظر رکھتے ہو۔ ''

ہم نے سمجھانے کی کوشش کی کہ قوم کو پالتو گدھے کا گوشت کھلانا ایسا معاملہ نہیں جسے نظر انداز کردیا جائے۔ معاملہ شرعی نوعیت کا ہے۔ اِس پر مرزا نے کہا۔ ''اگر کوئی یہ کہے کہ قوم کو کتے بلی کا گوشت کھلایا جاتا رہا ہے تو میں آنکھ بند کرکے اِس بات کو درست مان لوں گا۔ آج ہم ایک دوسرے جو نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ یہ درندوں کے گوشت ہی کا اثر ہو۔ مگر یہ بات میں نہیں مان سکتا کہ قوم کو گدھے کا گوشت کھلایا جارہا ہے۔ ''

ہم نے حیران ہوکر پوچھا کہ اِس خبر کو درست ماننے میں تامّل کیوں ہے تو

مرزا نے سلسلۂ کلام آگے بڑھا۔ ''اگر بعض عاقبت نا اندیش لوگ ہمیں گدھے کا گوشت کھلا رہے ہوتے تو آج ہم میں گدھوں والی کوئی تو خصلت پائی جاتی۔''

ہم نے بتایا کہ قوم بیشتر معاملات میں گدھے پن ہی کا مظاہرہ کر رہی ہے مثلاً حالات کے ڈنڈے سہہ رہی ہے مگر بوجھ اُٹھائے جا رہی ہے۔ اور یہ کہ اِس قوم کا بُودا پن بھی گدھے پن سے مماثل ہے۔

مرزا بولے۔ ''اگر ہمیں دھوکے سے گوشت کھلایا جا رہا ہوتا آج ہم میں محنت و مشقّت سے تھوڑی بہت تو رغبت ہوتی۔ ہم یوں تن آسانی کو گلے لگا کر سُکون سے ایک طرف نہ بیٹھے ہوتے، بھاگ دوڑ کر رہے ہوتے اور محنت کے ذریعے اپنا مُقدّر سنوارنے کی کوشش کر رہے ہوتے! قوم کی ہڈ حرامی اور محنت سے بیزاری صاف کہہ رہی ہے کہ کسی نے اِسے گدھے کا گوشت نہیں کھلایا۔''

مرزا کی یہ دلیل اِتنی مضبوط تھی کہ ہم نے اپنے دلائل کو کمزور تسلیم کرتے ہوئے مُہر بہ لب ہونے میں عافیت جانی۔

دُکان پکوڑوں کی

اگر آپ نے سرگوشی ریکارڈ کرائی ہو تو پلے بیک کی صورت میں والیوم یعنی آواز بڑھانے پر سرگوشی کی نوعیت تبدیل ہو سکتی ہے؟ یقیناً نہیں۔ ہم والیوم خواہ کتنا بڑھائیں، سرگوشی تو سرگوشی ہی رہے گی۔

ریس کے لیے اعلیٰ نسل کے گھوڑے تیار کئے جاتے ہیں۔۔برف کی گاڑی کھینچنے والے مدقوق اور تھکے ہارے گھوڑے کسی اور ریس میں تو کیا جیتیں گے، وہ تو بقاء کی ریس میں بھی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ایسے گھوڑوں کو ریس میں دوڑانے کی کوشش نِری حماقت کہلائے گی۔

یہی حال ہماری سرکاری مشینری کا ہے۔ ہم نوعیت تبدیل کئے بغیر صرف details بدلنے پر توجہ دیتے رہتے ہیں، لیپا پوتی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ تزئین و آرائش کو عمارت کے استحکام میں اِضافے سے تعبیر کرنے کی ذہنیت اپنالی گئی ہے۔ یہ ذہن و نظر کا دھوکا ہے مگر سب خوشی خوشی دن رات یہ دھوکا کھائے جارہے ہیں۔

سرکاری مشینری کے جن اہلکاروں کا عوام سے براہِ راست رابطہ دن رات رہتا ہے وہ پولیس کے سپاہی ہیں۔ ہمارے ہاں پولیس اہلکاروں کی بھرتی اور تربیت کس طور ہوتی ہے، سبھی جانتے ہیں۔ سیاسی بنیاد پر کی جانے والی بھرتیوں سے پولیس کا دامن بھی اچھا خاصا داغدار رہا ہے۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی پولیس کو مکمل غیر جانبدار بنانے میں اب تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ ہو بھی کیسے ؟ جیسی بنیاد ہوتی ہے ویسی ہی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اگر پہلی اینٹ ٹیڑھی ہو تو ثُریا تک اُٹھائی جانے والی دیوار بھی ٹیڑھی ہی رہے گی۔ ہماری پولیس بھی ایسی ہی ٹیڑھی دیوار ہے۔

بھائی مظفر پولیس کی کرکٹ ٹیم سے وابستہ ہیں۔ ہم نے اُنہیں کرکٹ کھیلتے تو نہیں دیکھا مگر ہاں کرکٹ کی باتیں اُن کے منہ سے ضرور سُنی ہیں۔ اُن باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کھیل بھی لیتے ہوں گے۔ اب ہماری زندگی ایسے ہی اندازوں کے سہارے بسر ہو رہی ہے۔

گزشتہ دنوں دفتر سے واپسی پر یعنی رات تین بجے کی چائے (!) پر بھائی مظفر سے ملاقات ہوئی تو پولیس کی کارکردگی بہتر بنانے کا ذکر چھڑ گیا۔ جب کبھی ہمارے پاس دِل بہلانے کے لیے کوئی ڈھنگ کا موضوع نہیں ہوتا، ہم پولیس کی کارکردگی بہتر بنانے کے موضوع پر کچھ دیر بتیا کر تَفنّنِ طبع کا اہتمام

! کرلیا کرتے ہیں

پولیس کو دہشت گردوں کے سامنے کھڑا کرنا ہمارے چند بنیادی مسائل میں سے ہے۔ جن اہلکاروں کے پاس جدید ہتھیار ہیں نہ اختیارات، اُنھیں جدید ترین ہتھیاروں سے لیس اور واضح "مقاصد" کے تحت میدان میں اُترنے والے دہشت گردوں کے سامنے کھڑا کرنا ایسا ہی ہے جیسے اکشے کمار سے کہا جائے کہ اداکاری میں دلیپ کمار کو پچھاڑ کر دکھاؤ! بے چارہ اکشے ٹریجڈی کنگ سے تو کیا جیت پائے گا، اپنی جیسی تیسی اداکاری سے بھی جائے گا! دہشت گردوں سے مقابلے کے معاملے میں ہماری پولیس کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہوا ہے۔

بات ہو رہی تھی رات کی چائے پر بھائی مظفر سے ملاقات کی۔ باتوں ہی باتوں میں ذکر چِھڑ گیا پولیس کے حوصلے بڑھانے کا۔ پولیس کو دہشت گردوں کے سامنے کھڑی ہونے کے قابل بنانے کے لیے حکومت اور کچھ تو کر نہیں سکتی، اِس لیے ہر بار تان ٹوٹتی ہے شہادت کا "صِلہ" بڑھانے پر! پولیس کے جو اہلکار دہشت گردوں کے ہاتھوں شہادت کا جام نوش کرتے تھے اُن کے پس ماندگان کو پانچ سے دس لاکھ روپے ملا کرتے تھے۔ یہ صِلہ" ایسا پُرکشش نہ تھا کہ کوئی اپنی جان داؤ پر لگائے، شہادت کو اپنائے۔ پھر یہ ہوا" کہ شہید اہلکاروں کے پس ماندگان کو بیس لاکھ روپے تک دیئے جانے لگے۔ اولاد کو نوکری بھی ملنے لگی۔

!مگر شاید یہ بھی کم تھا۔ ''حوصلہ افزائی'' نہیں ہو پا رہی تھی

سندھ کے وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ نے ایک سمری کی منظوری دی ہے جس کے تحت ہر شہید پولیس اہلکار کے پس ماندگان کو ایک کروڑ روپے ملا کریں گے۔ ہم نے بھائی مظفر کو مبارک باد دی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ اِس خبر سے بہت خوش ہوئے ہوں گے اور ہمیں ''ٹریٹ'' دیں گے۔ مگر یہ کیا؟ بھائی مظفر تو سوچ میں ڈوب گئے۔ ہم نے اضمحلال کا سبب پوچھا تو کہنے لگے۔ ''شہادت پر ایک کروڑ کے 'انعام' سے خوف محسوس ہو رہا ''! ہے

ہم حیران ہوئے کہ اِس میں خوف کی بات کیا ہے۔ اچھا ہے، گھر والے بہترین آسائشوں کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ جب کسی اہلکار کو یقین ہو کہ دہشت گردی کی نذر ہونے پر اُس کے اہل خانہ کو ایک کروڑ روپے ملیں گے تو اُسے شہادت کو گلے لگاتے ہوئے کچھ ملال نہ ہوگا۔ ہم نے کہا کہ اب تو پولیس اہکاروں کو یہ شکایت نہیں ہونی چاہیے کہ اُن کے اور اُن کے اہل خانہ کے حقوق کا خیال نہیں رکھا جا رہا۔ اِس پر بھائی مظفر بولے۔ ''ایک کروڑ کا انعام ہی تو پریشانی کا باعث ہے۔ جب سے وزیر اعلیٰ نے سمری کی ''منظوری دی ہے، ہماری (یعنی پولیس اہلکاروں کی) آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی ہے۔

ہم مزید حیران ہوئے۔ کیا پولیس اہلکار جیتے جی ایک کروڑ روپے حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ بھائی مظفر نے وضاحت کی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ پریشانی یہ ہے کہ اب ہم پولیس والوں کو بیویوں اور اولاد سے خطرہ لاحق ہے! دہشت گردوں سے ٹاکرہ تو جب ہوگا تب ہوگا، اہل خانہ کے لیے ہم ایک کروڑ روپے کا جیتا جاگتا پرائز بونڈ ہیں! ہمارے جیتے جی تو گھر والوں کو ایک ٹکا نہیں ملے گا اور جیتے جی ہم اُن کے لیے ایک ٹکے کے بھی نہیں۔ اب پولیس اہلکار بیویوں سے لڑتے جھگڑتے ڈرا کریں گے۔ اگر بیویوں نے ایک کروڑ کے پرائز بونڈ کو 'کیش کرانے' کا فیصلہ کرلیا تو!''

اب ہم سمجھے کہ بھائی مظفر کیوں مضمحل دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بھی اہل و عیال والے ہیں۔ پریشان کیوں نہ ہوں گے؟ اب تو وہ بھی ایک کروڑ کا جیتا جاگتا، چلتا پھرتا پرائز بونڈ ہیں۔ وہ بھی یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہتے ہیں کہ اُن کے جانے کی دیر ہے کہ ایک کروڑ روپے آیا چاہتے ہیں! کہیں اہل خانہ نے کروڑ پتی بننے کا فیصلہ کرلیا تو؟

پس ماندگان کو ملنے والی رقم میں اضافے کے فیصلے سے پولیس اہلکاروں کی کارکردگی بہتر تو کیا ہونی ہے، وہ بے چارے مزید اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ پولیس کا محکمہ اب تک جو کچھ کرتا آیا ہے وہ محض ایسا ہی ہے جیسے پکوڑوں کی دُکان

چلائی جائے۔ صرف باتیں اور دعوے ہیں۔ دہشت گردوں کے خلاف فولادی عزم کی بات ہزار بار کہی جاچکی ہے جبکہ تلخ تر حقیقت یہ ہے کہ عملی طور پر پولیس پست معیار کے لوہے کی زنگ آلود چادر سے زیادہ کچھ نہیں۔ عمومی زبان میں اِس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے کہا جاتا ہے باتیں کروڑوں کی، دُکان پکوڑوں کی! مگر اب محض بات کروڑوں کی نہیں ہے مگر صِلہ بھی کروڑوں میں ہے! ایسے میں بے چارے پولیس اہلکار دہشت گردوں اور جرائم پیشہ عناصر سے زیادہ اہل خانہ سے نہ ڈریں تو اور کیا کریں!

بھائی مظفر پولیس کرکٹ ٹیم میں ہیں۔ گگلی اور باؤنسر سے وہ بخوبی واقف ہوں گے۔ اور یارکر کے بارے میں بھی جانتے ہی ہوں گے۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ نے پولیس کے ہر شہید اہلکار کے اہل خانہ کے لیے ایک کروڑ کے معاوضے کا اعلان کرکے گگلی کرائی ہے، یارکر کی ہے یا باؤنسر پھینکا ہے، اِس کا درست ترین اندازہ تو بھائی مظفر ہی لگا سکتے ہیں۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ سرکاری فیصلے سے فی الحال وہ ''ہٹ وکٹ'' ہوگئے ہیں!

پولیس کے شہید اہلکاروں کے اہل خانہ کے لیے ایک کروڑ روپے کے اعلان پر عبیداللہ علیم کا ایک مطلع بے ساختہ یاد آگیا ؎

عزیز اِتنا ہی رکھو کہ جی بہل جائے

!اب اِس قدر بھی نہ چاہو کہ دَم نکل جائے

عوام تو انقلاب نہیں چاہتے

پاکستان میں جمہوریت کا معاملہ تو ایسا ہے کسی کو بہت پیار سے کسی تقریب میں شرکت کی دعوت دی جائے اور وہ جیسے ہی تقریب میں شرکت کے لیے پہنچے، اُس سے کہا جائے کہ غلطی ہو گئی تھی۔ بلانا کسی اور کو تھا! یا پھر تقریب میں شریک کرنے کے بعد دَھکّے دیتے ہوئے نکال دیا جائے! ابھی جمہوریت کو آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ اُس سے گلوخلاصی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ گویا ع

آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے!

ہر سال بارش ہوتی ہے۔ اِس کا کوئی خاص موسم نہیں۔ جب اللہ کی رحمت جوش میں آئے، تھوڑا بہت پانی برس جاتا ہے۔ کبھی بہت تھوڑا اور کبھی بہت زیادہ۔ بارش طے ہو نہ ہو، سیلاب تو طے ہے۔ یاروں نے خاصی محنت سے سیلاب کو یقینی بنانے کا اہتمام کر رکھا ہے تاکہ جو تھوڑی بہت سرکاری محنت کاغذی کارروائی کے طور پر کی ہو وہ بہہ جائے اور بتانے کو ہو کہ سب کچھ تو سیلاب لے جائے، اب صرف رویا جاسکتا ہے! ہمارا خیال تھا کہ پاکستان میں پانچواں موسم سیلاب کا ہے مگر اب اپنی خام خیالی پر ہنسی آتی ہے۔ پانچواں اور سب سے مستحکم و پائیدار

موسم سیلاب نہیں، احتجاج کا ہے۔ اِدھر حکومت بنی اور اُدھر احتجاج شروع۔

عمران خان نے طرح کا مصرع دیا تو ڈاکٹر طاہر القادری نے اُس پر آمنّا و صدقنا کہتے ہوئے گرہ لگائی۔ یوں جمہوری سیاست کے احتجاجی مشاعرے کی تیاریاں زور پکڑ گئیں۔ طاہر القادری کو داد دینا پڑے گی کہ کینیڈا کے یخ بستہ ماحول میں رہ کر بھی اُن کے جذبے سَرد نہیں پڑے۔ وہاں کی پُرسکون زندگی میں چونکہ احتجاج وغیرہ کی گنجائش ہی نہیں اِس لیے وطن واپس آنا پڑتا ہے۔ وطن اور اہلِ وطن کی فراخ دِلی دیکھیے کہ جب بھی وہ آتے ہیں، دیدہ و دِل فرشِ راہ ہوئے جاتے ہیں۔ 11 مئی سے حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک شروع ہوا چاہتی ہے۔ عمران خان اور طاہر القادری نے لنگوٹیں کَس لی ہیں۔ عمران خان ایک سال سے انتخابی دھاندلیوں کا رونا رو رہے ہیں۔

طاہر القادری نے گزشتہ برس کے عام انتخابات کا یہ کہتے ہوئے بائیکاٹ کردیا تھا کہ اِس کے بطن سے دھاندلی ہی ہویدا ہوگی۔ اور اُن کی بات بہت حد تک درست بھی ثابت ہوئی۔ 11 مئی 2013 کے انتخابات نے صوبائیت کا کھونٹا مزید مضبوط کردیا۔

تازہ ترین عام انتخابات کو یاروں نے جمہوریت کے یومِ وفات میں تبدیل کرنے کا پُختہ ارادہ کر رکھا ہے۔ یہ بھی عجیب تماشا ہے۔ خدا خدا کرکے جمہوریت کی ٹرین پٹڑی پر آئی ہے مگر اُسے پھر ڈی ریل کرنے کی تیاریاں ہیں۔ ایک ہی برس

میں سب کچھ تبدیل ہوتا ہوا دیکھنے کے خواہش مند نری سادگی یا حماقت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اداروں میں تصادم اب کوئی ڈھکی چُھپی حقیقت نہیں۔ میڈیا نے سب کچھ طشت از بام کردیا ہے اور خود بھی متحارب ادارے کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ قوم حواس باختہ ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ عوام کے بنیادی مسائل نہ صرف یہ کہ حل نہیں ہوئے ہیں بلکہ مزید شِدّت اختیار کر گئے ہیں۔

جو کچھ اہلِ سیاست کر رہے ہیں اُسے دیکھ کر اہلِ وطن حیران کم ہیں اور پریشان زیادہ۔ جن کے ہاتھوں میں اختیار ہے اُنہوں نے ملک کے وسائل کو آپس میں تقسیم کرلیا ہے۔ جو قوم کی حفاظت پر مامور ہیں وہ اپنی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ قوم پر جان نچھاور کرنے والوں کے ورثاء کو اِس قدر نوازا جارہا ہے کہ بے کَس و لاچار عوام دیکھ دیکھ کر مزید حسرت زدہ ہوئے جاتے ہیں۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ نے حال ہی میں ایک سمری کی منظوری دی ہے جس کے تحت جرائم پیشہ افراد اور دہشت گردوں کے ہاتھوں شہادت کا جام نوش کرنے والے پولیس اہلکاروں کے ورثاء کو ایک کروڑ روپے ملا کریں گے۔ اچھی بات ہے مگر سوال یہ ہے کہ عوام کو کیا ملے گا؟ جرائم پیشہ افراد اور دہشت گردوں کا پہلا نشانہ تو عوام ہیں۔ جب کوئی عام آدمی مرتا ہے تو حکومت ورثاء کے لیے 2 سے 5 لاکھ روپے تک کا اعلان کرتی ہے۔ یہ عوام کے لیے واضح پیغام ہے کہ اُن کی جان کی اوقات اِتنی ہی ہے۔ یہ پیغام دینے کا موسم ہے۔ وزیر اعظم فوج کو پیغام دے

رہے ہیں، فوج میڈیا کو پیغام دے رہی ہے، میڈیا حکمرانوں کو پیغام دے رہا ہے، حکمران اپوزیشن کو پیغام دے رہے ہیں۔ اور عوام کے لیے پیغام یہ ہے کہ اُن کے حالات بدلنے کی فکر میں کوئی بھی غلطاں نہیں۔

ملک چُوں چُوں کا مُربّہ ہو کر رہ گیا ہے۔ قومی مفادات کے نام پر اداروں کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے پر کام ہو رہا ہے۔ عوام کا چونکہ کوئی ادارہ نہیں اِس لیے وہ سیاسی یتیم سے زیادہ کچھ نہیں۔ کوئی اُن کا پُرسانِ حال نہیں۔ جیو اور فوج کے درمیان جاری لڑائی میں فریقین کے حمایتی میدان میں ہیں۔ عوام کے لیے تو کوئی میدان میں نہیں آتا؟ عوام کے مفاد میں کسی جماعت یا ادارے کا ''مفاد'' مضمر ہو تو ضرور میدان میں آنے کی زحمت گوارا کرے۔ اشیائے خور و نوش کی قیمتیں کہیں سے کہیں جا پہنچی ہیں، کسی سیاسی جماعت نے سڑکوں پر آ کر فیصلہ کن اور نتیجہ خیز احتجاج نہیں کیا۔ قومی سلامتی کے لیے میدان میں آنا اچھی بات ہے مگر یہ راگ اُسی وقت الاپا جاسکتا ہے جب قوم مہنگائی کے ہاتھوں ذبح ہونے سے محفوظ رہے!

جمہوریت کی گاڑی ہزار کوشش اور دعاؤں سے دوبارہ درست ڈگر پر آئی ہے۔ صرف ایک سال میں اُسے بے راہ کرنے کی کوشش کیوں؟ جو بگاڑ عشروں کی پیداوار ہے وہ ایک پانچ سالہ مدت میں کیسے دور ہو سکتا ہے؟ اور وہ بھی نیم دِلانہ

کوششوں سے؟ تمام اہم ادارے بے لگامی کی حالت میں ہیں۔ سب کو اپنے اپنے stakes کی پڑی ہے۔ تمام stakeholders نے قومی وسائل کی بندر بانٹ کے ذریعے خود کو stockholders میں تبدیل کرلیا ہے! ہر طرف یہی شور ہے کہ اداروں میں تصادم نہیں ہونا چاہیے۔ کیا یہ پیغام دیا جارہا ہے کہ ادارے آپس میں نہ لڑیں، مل جل کر عوام کو بھنبھوڑیں؟ لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔ انفرادی مفادات نے تمام اہم اداروں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا ہے۔ کوئی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ ہر ادارے نے طے کرلیا ہے کہ قومی وسائل کا ایک مخصوص حصہ اُسے ملنا ہی چاہیے۔ عوام کا کیا ہے؟ وہ تو روتے آئے ہیں، روتے رہیں گے۔

احتجاج کا میلہ لگ رہا ہے۔ ایک بار پھر مداری میدان میں ہوں گے اور لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالیں گے۔ طاہرالقادری کے لیے ایک بار پھر سُنہرا موقع ہے۔ اب اللہ ہی جانے کہ یہ موقع پیدا ہوا ہے یا پیدا کیا گیا ہے۔ طاہرالقادری بھرپور موڈ میں دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ انقلاب سے کم کوئی بھی بات کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ڈیڑھ سال قبل بھی وہ ایسے ہی بھرپور موڈ میں دکھائی دیئے تھے۔ اِس مرتبہ ایجنڈا کیا ہے؟ انقلاب؟

اگر واقعی انقلاب لانے کی تیاری ہے تو کون سا انقلاب؟

کسی کی مرضی کا انقلاب؟ کس کی ضرورت کو پورا کرنے والا انقلاب؟
اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انقلاب کس کے لیے؟ عوام کے لیے؟ چلیے، مان لیتے ہیں کہ طاہرالقادری عوام کی مرضی کا انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ مگر پہلے عوام سے پوچھ لیجیے۔ اُنہیں انقلاب کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ وہ شاید انقلاب ونقلاب نہیں چاہتے۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ پھر وہی ہو یعنی کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے! ڈیڑھ سال پہلے بھی تو انقلاب لانے کے دعوے کئے گئے تھے، نظام کو بدلنے بلکہ پلٹ دینے کی باتیں ہوئی تھیں۔ مگر پھر کیا ہوا؟ ٹائیں ٹائیں فش! یعنی وہی ہوا جو ہونا تھا۔
لوگ بُنیادی اشیاء و خدمات کے حصول سے بڑھ کر کچھ نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انقلاب کے نام پر اُن کے جذبات سے کِھلواڑ بند کی جائے، جمہوریت کو جیسے تیسے چلنے دیا جائے۔ بقول عدیم ہاشمی

ساتھ دینا ہے تو دے، چھوڑ کے جانا ہے تو جا
!تو اضافہ تو نہ کر میری پریشانی میں

بچّوں کی دُنیا

یکم مئی کو عثمان ایک سال کا ہوگیا۔ عثمان اپنا زیادہ وقت ہمارے اپارٹمنٹ (فلیٹ) میں گزارتا ہے۔ ہم تیسری منزل پر رہتے ہیں اور وہ دوسری منزل پر۔ رہائش کے اعتبار سے ہم اُس سے اُوپر ہیں مگر اپنائیت کے معاملے میں ہم نے اُسے سَر آنکھوں پر بٹھا رکھا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ بہت سَر چڑھا رکھا ہے!

ہمارے ہاں عثمان کی آمد اِس دنیا میں اُس کی آمد کے پانچ ماہ بعد شروع ہوئی تھی۔ تب اُسے بیٹھنا نہیں آتا تھا۔ اور اب وہ بیٹھنا چاہتا نہیں۔ چُلبلے پن کا یہ عالم ہے کہ ایک پَل بھی چَین سے رہتا ہے نہ رہنے دیتا ہے۔ ذرا نظر چُوکی اور اِدھر سے اُدھر۔ چہکنے میں کمی آتی ہے نہ پُھدکنے میں۔ اور اب تو مشہور گانوں کے ٹکڑوں پر تھرکنا اور ٹُھمکنا بھی آگیا ہے۔ بچے اچھی طرح جانتے ہیں کہ بڑے کس بات سے متاثر ہوتے ہیں اور یوں بڑوں کی ''نفسی کمزوریوں'' کا جی بھر کے فائدہ اٹھاتے ہیں!

لوگ کبھی دردِ سر کا رونا روتے ہیں اور کبھی ڈپریشن کا۔ ذہن کی چتکبری

پیچیدگیوں سے نجات کے لیے رنگ۔برنگی ایلوپیتھک گولیاں بھی نگلتے رہتے ہیں مگر سکون کی منزل اُنہیں کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔ دکھائی کیسے دے؟ آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا علاج ہے مگر اُسے گلے نہیں لگاتے۔ گھر کی مُرغی دال برابر ہوتی ہے۔ گویا اچھی تان کھینچے، جاندار سرگم لگاکر محفل کو گرمادے تو حاضرین دِل کھول کر داد دیتے ہیں مگر یہی کمال وہ گھر میں ریاض کے دوران سو بار بھی دکھائے تو اہل خانہ متوجہ نہیں ہوتے۔ معمول کی بات کم ہی توجہ پاتی ہے۔

بات ہو رہی ہے ڈپریشن اور دردِ سر سے نجات پانے کی۔ کم ہی لوگ غور کرپاتے ہیں کہ بچّوں کی سنگت سے زیادہ فرحت بخش معمول کوئی نہیں۔ ماں باپ اور بالخصوص ماں کے لیے تو جگر گوشے دُنیا کی سب سے بڑی نعمت ہوتے ہی ہیں، آپ چاہیں تو اُنہی جگر گوشوں کو اپنے لیے بھی سراپا رحمت کی صورت اپنا سکتے ہیں۔ اِس سے اچھا ''نیچرل اینٹی ڈپریسنٹ'' اب تک مارکیٹ میں نہیں آیا۔

ذاتی تجربہ اِنسان کو بہت کچھ سکھاتا ہے۔ بچوں کے معاملے میں ہم چاروں بھائی بہنوں کا تجربہ ہمیشہ خوشگوار احساسات کا حامل رہا ہے۔ 2005 میں ذاتی اپارٹمنٹ کی خریداری تک ہم نے کرائے کے کم و بیش 15 مکانات یا فلیٹس میں زندگی بسر کی۔ 40 برس کے دوران ہم جہاں جہاں بھی رہے، بچوں کو گلے لگایا۔

جس محلے میں مکان کرائے پر لیتے وہاں کے بچوں سے بھرپور اپنائیت کا اظہار کرتے جس کے نتیجے میں بچے بھی ہم سے مانوس ہوتے جاتے۔ ہمارا تہی دست گھرانہ بچوں سے لگاؤ کے معاملے میں اِس قدر فراخ دِل اور مالدار تھا اور ہے کہ بچوں کی سنگت سے پہلے دِل بھرتا تھا نہ اب بھرتا ہے۔

حِنا ثناء اللہ سے شروع ہونے والا سلسلہ پپنو واحد، منّو (محمد حسین)، ہما 1978 شاہین، جنید ابو طالب، ثوبیہ پرویز، نمل، رافعہ، اریبہ، ارسلان، شہزادے فاطمہ، مومو اور سُبحان سے ہوتا ہوا اب عثمان تک آ پہنچا ہے۔ عثمان ہماری زندگی میں تازہ ترین انٹری ہے۔ دو تین ماہ کی محنت سے ہماری بیٹی صباحت نے اُسے دعا مانگنا، سوری کرنا اور فون سُننا سِکھا دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ چند مشہور گانوں کے ٹکڑوں پر "سیٹ" بھی کرلیا ہے یعنی اِدھر ٹکڑا گنگنایئے، اُدھر عثمان کا تھرکنا اور مٹکنا شروع ہو جاتا ہے۔ "تو نے ماری انٹریاں تو دِل میں بجیں گھنٹیاں ٹن ٹن ٹن" وہ تازہ ترین گانا ہے جسے سُن کر عثمان کے لیے خود پر قابو پانا انتہائی ناممکن ہو جاتا ہے!

عثمان کی سالگرہ کے موقع پر میجک شو کا بھی اہتمام تھا۔ بچوں کی موجودگی میں کسی میجک کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ بچے تو خود چلتا پھرتا جادو ہیں! کائنات میں کیا اُن سے بڑھ کر بھی کوئی "کمال" ہے؟

بچوں کی دنیا ہمارے لیے خزانے سے کم نہیں۔ اُن کے پاس ایسا بہت کچھ ہے جس سے ہم محروم ہو چکے ہیں یا ہم نے خود ہی ضائع کر دیا ہے۔ جن کی زندگی میں بچے ہمیشہ in رہتے ہیں اُن کی زندگی سے ہر دُکھ اور پریشانی سدا کے لیے out ہو جاتی ہے!

کبھی کبھی تو بچے اپنی معصومیت سے حیران کر دیتے ہیں۔ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ بڑے ہو کر ہم جیسے یعنی معصومیت سے محروم ہو جائیں گے! اور اِس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یقین نہیں آتا کبھی ہم بھی ایسے ہی معصوم تھے! یعنی ہم بڑے تو ہو جاتے ہیں، ہم میں ''بڑپّن'' پیدا نہیں ہو پاتا۔ اپنا جائزہ لیجیے تو یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اِنسانوں کے بچے بڑے ہو کر اِس قدر غیر اِنسانی ہو سکتے ہیں! کاش ایسا ہو کہ بچے بڑے ہو کر ہم جیسے نہ ہوں۔ اور اِس سے بھی بڑھ کر کاش ایسا ہو کہ ہم بچوں کی سادگی اور معصومیت سے کچھ سیکھ کر ذہن کی ٹائم مشین میں بیٹھیں اور ماضی میں جا کر اپنے وجود کو تمام آلائشوں سے پاک کر کے بچوں جیسے ہو جائیں!

اپنے ماحول میں یا پھر دنیا بھر کے معاشرتی و جنگلی ماحول کا جائزہ لیجیے، ہر جاندار کے بچے آن کی آن میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک بس

انسان کا بچہ ہی ہے جو ڈھائی تین سال تک ماں باپ اور دیگر افراد کی بھرپور توجہ کے بغیر بہتر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ یہ قدرت کی طرف سے ہمارے لیے واضح پیغام ہے کہ ہم بچوں سے بھرپور محبت کو شعار بنائیں، اُن پر توجہ دیں، اُن سے پیار کریں، اُنہیں سینے سے لگائیں اور بھرپور تحفظ کا احساس دلائیں۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ اِس پیغام کو کم ہی لوگ کماحقہ سمجھ پاتے ہیں۔ بیشتر بڑے اپنی ہی ڈگر پر چلتے رہتے ہیں اور واضح ضرورت محسوس ہونے پر بھی بچوں کی حسین دنیا میں قدم نہیں رکھتے۔ بچوں سے وہ محبت اور اپنائیت کا اظہار کرتے بھی ہیں تو محض رسمی کارروائی کے طور پر، خانہ پُری کے لیے۔ جیسے اپنے آپ پر یا بچوں پر کوئی احسان کر رہے ہوں! بڑوں کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ بچوں سے فاصلہ رکھ کر اپنی زندگی کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بناتے جاتے ہیں۔

بچوں کو زیادہ وقت دینے والے ڈپریشن سے محفوظ رہتے ہیں۔ بچوں کی سنگت اُنہیں بہت سے عُیوب سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ بچوں کی دنیا میں بہت کچھ ہے۔ اُن میں کوئی ایسی عادت نہیں پائی جاتی جو آپ کے لیے پریشانی، خِفّت یا دل آزاری کا باعث بن سکتی ہو۔

بچے کسی سے حسد رکھتے ہیں نہ نفرت کرتے ہیں۔ اُن میں غیر صحت مندانہ رقابت ہوتی ہے نہ مسابقت۔ وہ کچھ چُراتے ہیں نہ کسی کے حق پر ڈاکا ڈالتے ہیں۔ قتل

وغارت کیا ہوتی ہے، بچے جانتے بھی نہیں۔ بھتہ خوری اور اغوا برائے تاوان جیسے قبیح افعال کا اُن کی دنیا میں گزر نہیں۔ کسی کی راہ میں دیوار بنتے ہیں نہ کسی کو راستے سے ہٹانے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ بچوں کی زندگی میں آزادی ہی آزادی ہے۔ وہ کسی پر اپنی مرضی تھوپتے ہیں نہ کسی کی مرضی کو اپنی تقدیر سمجھتے ہیں۔ بچے ہمیں بہت کچھ سکھاتے ہیں مگر سیکھا اُس وقت جا سکتا ہے جب ہم سیکھنے کے لیے تیار ہوں۔

جو لوگ بچوں سے پیار کرتے ہیں وہ پیار کی شِدّت اور دورانیہ بڑھا کر دیکھیں۔ اور جو بچوں سے برائے نام لگاؤ رکھتے ہیں وہ اُنہیں قلب و نظر کی گہرائی سے اپنا کر دیکھیں تو اُنہیں خود بھی یقین نہیں آئے گا کہ زندگی اِتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔ زندگی واقعی حسین ہے مگر اِس کا حُسن نِہارنے کے لیے آپ کو تھوڑا سا جُھک کر بچوں کی سطح پر جانا پڑے گا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ، جُھک جائیے۔

ہم جب یہ کالم لکھ رہے تھے تب سوچتے ہی رہے کہ کہیں مرزا تنقید بیگ نازل نہ ہو جائیں اور کوئی ایسی ویسی بات کرکے کالم تحریر کرنے کا مزا خراب نہ کردیں۔ مرزا کا بچپن اب تک گیا نہیں۔ آپ خوش گمان نہ ہوں۔ وہ بیشتر معاملات میں child-like نہیں بلکہ childish ہیں! اُن کے وجود کا جائزہ لینے پر یقین

! نہیں آتا کہ کبھی وہ بھی سادہ و معصوم رہے ہوں گے

بندر کا ویزا

وقت سے پہلے اور مقدر سے زیادہ کسی کو کچھ ملا ہے نہ ملے گا۔ یہ جملہ آپ نے بیسیوں بار سُنا ہوگا۔ کئی فلموں میں یہ جملہ استعمال ہوا ہے۔ یہ امر البتہ بحث طلب ہے کہ مقدر کیا چیز ہے۔ ہم جس قدر محنت کریں گے وہی محنت ہے یا اِس سے ہٹ کر بھی کچھ ہے جسے ہم مقدر کا نام دے کر اطمینان کی چادر اوڑھیں؟

ایک شیخ صاحب افریقا گئے۔ "یا شیخ" کا کیا ہے، کسی پر بھی دِل آ سکتا ہے۔ افریقی جنگلات کی سیر کے دوران ایک ببر شیر پسند آ گیا۔ گائڈ اور میزبان سے پوچھا کہ کتنے میں ملے گا۔ وہ پہلے حیران اور پھر پریشان ہوئے۔ ببر شیر کوئی بچوں کا کھلونا تو ہے نہیں کہ ہاتھ بڑھا کر دکان سے اٹھالیا اور قیمت ادا کرکے چلتے بنے۔ بتایا گیا کہ حضور یہ ببر شیر ہے، بہت مہنگا ملے گا۔ کسی شیخ کے سامنے مہنگائی کی بات؟ یہ سراسر توہین ہوئی۔ شیخ صاحب نے کہا مانگو کیا مانگتے ہو۔ جواب میں جو قیمت ادا کی گئی وہ ادا کی اور ببر شیر کے ساتھ وطن لوٹے۔ ایک شاندار پنجرہ بنوایا گیا جس میں صفائی، فراہمی و نکاسیَ آب اور ٹھنڈک کا بھرپور اہتمام کیا گیا۔ پنجرہ ایسا شاندار تھا کہ کسی غریب ملک کا باشندہ دیکھے تو باقی زندگی اُسی میں بسر کرنے کو ترجیح دے!

شیخ صاحب کا شیر تھا، خدمت گار کے بغیر کیسے رہتا؟ ایک خادم مقرر کیا گیا جو شیر کے تمام امور کا خیال رکھتا۔ ہدایت کی گئی کہ اِسے بہترین خوراک دی گئی۔ بازار سے اعلیٰ ترین درجے کے بادام، پستے، کاجو، انجیر، کشمش، اخروٹ وغیرہ خریدے گئے۔ خادم نے جب یہ اشیاء فراہم کیں تو شیر نے اِنہیں چٹ کرکے بہت لطف پایا۔ اگلے دن بھی بہترین ڈرائی فروٹ پیش کئے گئے۔ شیر کو مزا تو آیا مگر یہ ''من و سلویٰ'' پاکر بھی وہ اپنی سرشت کو فراموش کیسے کر دیتا؟ خادم سے بولا۔ ''بھائی، گوشت کی دو چار بوٹیاں بھی دے دو تو مزا ہی آجائے۔'' خادم نے مسکرا کر ہاں میں گردن ہلائی اور چلا گیا۔ تیسرے دن بھی جب خادم نے شیر کے سامنے بہترین ڈرائی فروٹ رکھے تو وہ بھڑک اُٹھا، بدک گیا۔ اُس نے گرج کر خادم سے کہا۔ ''میں نے کہا تھا تھوڑا سا گوشت بھی ڈال۔ کیا میری بات سمجھ میں نہیں آئی؟''

خادم نے مُسکرا کر شیر کو دیکھا اور جیب سے کاغذ کا ایک ٹکرا نکال کر اُس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا، صفائی سُتھرائی کی قدر کر، ٹھنڈک کے مزے لے۔ جو کچھ بھی مل رہا ہے چُپ چاپ کھا۔ تو ہے تو ببر شیر مگر شیخ صاحب تجھے بندر کے ویزے پر لائے ہیں! اب اِس دیس میں رہنا ہے تو خود کو

''بندر سمجھنا ہے۔ سمجھ گیا نا؟

یہ کہانی ہماری داستان سے کتنی ملتی جلتی ہے! قدرت نے ہمیں بھی خاص کرم فرماتے ہوئے شیر بنا کر اِس دنیا میں بھیجا ہے اور ہم ہیں کہ اپنے مفاد کی خاطر سب کچھ اپنی اصلیت بھول جاتے ہیں۔ ذرا سا التفات بھرا اشارا ہو تو ہم خوشی خوشی کسی بھی جانور کے ویزے پر کہیں بھی چل دیتے ہیں۔ ایک زمانے سے ہمارے جوانان خلیجی ریاستوں میں خون پسینہ ایک کرکے قومی خزانے کو توانا رکھنے کا بندوبست کر رہے ہیں مگر حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ جو اپنے وطن کے جنگل میں شیر اور ببر شیر کی حیثیت سے کچھ خاص حاصل نہیں کر پاتا وہ حالات سے مجبور ہو کر کسی بھی جانور کے ویزے پر وطن چھوڑ کر شاندار مگر غیر فطری پنجرہ قبول کرلیتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ہمارے شیر موزوں ترین موقع نہ ملنے کی صورت میں بندر کے ویزے پر ملک سے باہر جاتے تھے اور افرادی قوت کے سرکس میں اُچھل کود کے ذریعے اہل خانہ کے لیے قابل رشک معیارِ زندگی کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ اب اِس کی کچھ خاص ضرورت نہیں رہی۔ اُچھلنے اور کودنے والوں کی تو وطن میں اب اچھی خاصی قدر کی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی لوگ بیرون ملک نام کمانے کے چکر میں بہت کچھ بالائے طاق رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وطن میں رہتے ہوئے کوئی

ڈھنگ کا کام کرنے سے محروم رہنے اور معیارِ زندگی بلند کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا والے اب بیرون ملک کسی بھی حیثیت میں کام کرنے کو زندگی کا مقصد بنا بیٹھتے ہیں۔ اپنے ہاں کا اعلیٰ نسل کا گھوڑا باہر جاکر گدھے کی حیثیت سے کام کرنے میں کوئی قباحت نہیں کرتا۔ لوگ عزت پانے کے لیے کیا کیا کرتے ہیں۔ گھوڑے ہو کر گدھے بننے کو تیار ہو جاتے ہیں! شُعراء نے بھی لوگوں کو اِس معاملے میں خوب ورغلایا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ۔

سَر پھول وہ چڑھا جو چمن سے نکل گیا
!عِزت اُسے ملی جو وطن سے نکل گیا

1970 کے عشرے میں جب خلیجی ریاستوں نے افرادی قوت کی منڈی میں پاکستانیوں کو کھپانا شروع کیا تب پاکستان میں بہت کچھ بدلا۔ جنہیں وطن میں کوئی پوچھتا نہ تھا وہ باہر جاکر کچھ کر دکھانے کی کوشش کرنے لگے۔ سعودی عرب، قطر، کویت، عمان، متحدہ عرب امارات اور دیگر ممالک میں پاکستان کے ہنر مند گئے اور حالات کے مطابق رچ بس گئے۔ 1980 کے اوائل میں پی ٹی وی کے پروگرام ''ففٹی ففٹی'' میں ماجد جہانگیر اور اسماعیل تارا کی ایک قوالی بہت مقبول ہوئی تھی جس کے بول تھے۔

میرے لڑکے تھے بے کار، جب سے گئے سمندر پار
!تو اِتنی چیزیں لائے، کہ گھر اب بھرتا جائے

اسی قوالی میں آگے چل کر یہ خوبصورت نکتہ بھی شامل کیا گیا کہ
وہ یہاں میکنک ہوتا تھا، تو سب کی نظر میں کھوتا تھا
اب وہاں پلیٹیں دھوتا ہے، اور سب کی نظر میں اچھا ہے

بہت کچھ بدل گیا ہے مگر افرادی قوت کو کھپانے کے معاملے میں ہمارے طور طریقے اب بھی نہیں بدلے۔ ہم آج بھی اپنے ببر شیروں کو بندر اور گدھے کے ویزے پر باہر بھیج رہے ہیں۔ کچھ تو حکومت کی عدم توجہی ہے اور کچھ لوگوں کی بھی عجلت پسندی کہ اپنی صلاحیتوں کو شناخت کئے بغیر ہی کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ کئی غریب ممالک کو دیکھ کر بھی ہم نے سیکھا نہیں کہ باہر جاکر کام ہی کرنا ہے تو صرف پیسے کا منہ نہ دیکھا جائے بلکہ اپنی اور قوم کی توقیر کا بھی کچھ خیال رکھا جائے۔ ترسیلاتِ زر پر انحصار کرنے والا ہم ملک چاہتا ہے کہ اُس کی افرادی قوت بہترین آپشنز کے ساتھ ملک سے باہر جائے۔ کوئی بھی اپنے لمبی ریس کے گھوڑے کو ملک سے باہر گدھا گیری کے لیے بھیجنا پسند نہیں کرتا۔ رہنمائی بھی کی جاتی ہے اور معاونت بھی۔ ایک ہم ہیں کہ بہترین افرادی قوت کو غیر متعلق کاموں کے گٹر میں پھینک کر خوش ہوتے ہیں اور اِس عمل کو !کامیابی قرار دینے سے بھی گریز نہیں کرتے

دُنیا میں ایسے اہلِ ثروت کی کمی نہیں جو اپنی تفریحِ طبع کے لیے کسی بھی

ببر شیر کو خرید کر بندر بنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ جن کی فطرت میں ''شیری'' لکھی ہے وہ چند ٹکوں کی خاطر ''بندری'' کا مظاہرہ کرنے کو اگر اپنے لیے موزوں سمجھیں تو اُن کی مجبوریوں پر غور کرنے سے زیادہ اُن کی عقل کا ماتم کرنا چاہیے! وطن کی حدود میں رہتے ہوئے بھی اِس بات کی گنجائش کم ہی ہے کہ کوئی اپنی صلاحیت اور فطرت کو ذرا سے مالی مفاد کے لیے کچرے کے ڈھیر پر ڈال دے۔ ایسے میں بیرون ملک اُسی حیثیت میں جانا چاہیے جو قدرت سے عطا کی ہے یا رب کے کرم سے محنت کی بدولت حاصل کی ہے۔ لمبی ریس کے گھوڑے کو دوڑنے کے لیے مناسب پلیٹ فارم تلاش کرنا چاہیے، تانگے میں جُت کر یا گدھے کی حیثیت سے بورے اُٹھانے سے اجتناب برتنا چاہیے۔

جن کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار ہے وہ اگر افرادی قوت کو موزوں طریقے سے برآمد کرنے پر توجہ دیں تو کچھ عجب نہیں کہ ہمارے شیر دُنیا بھر میں شیر ہی کی حیثیت سے نام پائیں اور دام کمائیں یعنی بندر کے ونڈے پر جا کر ذِلّت سے محفوظ رہیں!

انڈین چانکا شاپ

''گجرات کا قصائی'' کی عُرفیت سے دنیا بھر میں بھرپور بدنامی کمانے والے نریندر مودی کو قومی سطح کی سیاست میں آتے ہی احساس ہوگیا کہ ماضی کو دُہرانا انتہائی حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ حالیہ عام انتخابات میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے بھرپور کامیابی حاصل کی ہے۔ اور پارٹی کے مضبوط ترین لیڈر کی حیثیت سے نریندر مودی کو وزیر اعظم کا منصب ملا ہے۔

قومی سطح کی سیاست میں مودی کا یہ پہلا تجربہ ہے۔ اور یہ سمجھ لیجیے کہ پہلی ہی فلم سُپر ہٹ ہو گئی ہے۔ فلمی دُنیا میں ایسے بہت سے اداکار ہیں جن کی پہلی فلم نے شاندار کامیابی حاصل کی مگر اِس کے بعد اُن کی شہرت مُنہ کے بل گر گئی۔ نریندر مودی کو پہلی ہی کوشش میں وزیر اعظم کا منصب ملا ہے۔ اس حیثیت کو برقرار رکھنا اُن کے لیے سب سے بڑا دردِ سر ہوگا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اِس مرتبہ بی جے پی کو ووٹ ہندو ازم کی بنیاد پر نہیں ملے بلکہ سب سے نمایاں انتخابی نعرہ ترقی و خوش حالی کا تھا۔ نریندر مودی نے کچّی گولیاں نہیں کھیلیں۔ وہ گجرات کے وزیر اعلیٰ رہے ہیں۔ فروری

2002 کے شرمناک مسلم کش فسادات کے حوالے سے مودی پر دنیا بھر میں لعن طعن ہوئی۔ امریکا نے ویزا دینے سے انکار کرکے پیغام دیا کہ وہ مودی کو قبول نہیں کر سکتا۔ مگر مودی نے ایک عشرے سے زائد مدت کے دوران گجرات کو ترقی اور استحکام کے اعتبار سے قابلِ رشک بنادیا ہے۔ قومی معیشت میں گجرات کا حصہ ایک محتاط اندازے کے مطابق 15 تا20 فیصد ہے۔ بلا واسطہ بیرونی سرمایہ کاری کے معاملے میں بھی گجرات نے اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔ مودی نے انتخابی مہم میں گجرات کی ترقی اور استحکام کو کیش کرایا ہے، کسی بھی مرحلے پر ہندوازم کو اپنی قومی پالیسیوں کی بنیاد بنانے کا اشارہ نہیں دیا۔ بھارت میں مودی کو اِسی تصور کے ساتھ ووٹ دیئے گئے ہیں کہ وہ معیشت کو مستحکم کرکے ملک کو مضبوط بنائیں گے۔

نریندر مودی کی انتخابی مہم اور انتخابی نعروں کے انتخاب سے یہ پیغام ضرور ملا ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے نظریات اور پروپیگنڈے کی سطح پر اپنا بُنیادی ڈھانچا تبدیل کرلیا ہے۔ انتہا پسندی کی آڑ میں ووٹ مل تو سکتے ہیں مگر ایسی کامیابی پائیدار ثابت نہیں ہوتی۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ حکومت تشکیل دینے کے بعد بہت سے معاملات میں جُنونیوں کی بات ماننی پڑتی ہیں۔ وہ قدم قدم پر بلیک میل کرتے ہیں۔ بلیک میلنگ سے بچنے کا ایک اچھا طریقہ اِس کے سِوا کیا ہوسکتا تھا کہ نریندر مودی ہندوازم کی بات ہی نہ کرتے۔ اور

اُنھوں نے یہ طریقہ اپنایا۔

پاکستان کے خلاف چند سخت بیانات دے کر مودی نے ووٹرز کے ایک بڑے طبقے کی ہمدردیاں ضرور بٹوریں مگر معاملہ شاید یہیں تک تھا۔ حلف برداری کی تقریب میں سارک کے تمام ارکان کے سربراہانِ مملکت و حکومت کو مدعو کرکے مودی نے اچھا پیغام دیا۔ مودی نے پاکستان سمیت تمام پڑوسیوں کو مدعو کرکے یہ پیغام دیا ہے کہ اُنھیں بھارت کا مفاد زیادہ عزیز ہے۔ زمینی حقیقت صرف اِتنی نہیں ہے کہ بھارت ہمارا پڑوسی ہے بلکہ اِس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خطے کا سب سے طاقتور اور ترقی یافتہ ملک ہے۔ مختلف خطوں کو افرادی قوت کی فراہمی کے معاملے میں بھی بھارت بہت آگے ہے۔ ترسیلاتِ زر کے معاملے میں اُس کا ریکارڈ ایسا ہے کہ بہت سے ترقی یافتہ ممالک بھی دانتوں تلے انگلی دبانے پر مجبور ہیں۔ تعلیم اور تربیت کا اعلیٰ نظام تشکیل دے کر بھارت نے اپنی معیشت کو قابلِ رشک حد تک مستحکم کیا ہے۔ انٹرٹینمنٹ انڈسٹری ہی اربوں ڈالر کما کر دے رہی ہے۔ برآمدات کا شعبہ بھی خاصا مستحکم ہے۔ ملک میں کرپشن بھی ہے اور معاشرتی خرابیاں بھی۔ آبادی زیادہ ہی نہیں متنوع بھی ہے۔ شمال مشرقی ریاستوں میں علیحدگی کی تحریکیں بھی چل رہی ہیں۔ مقبوضہ جموں و کشمیر کا معاملہ بھی مرکزی حکومت کے حلق میں اٹکا ہوا ہے۔ مگر اِن تمام باتوں کے باوجود بھارت نے خود کو منوایا ہے۔

اب خطے میں امن اور استحکام پاکستان یا کسی اور ملک سے کہیں زیادہ بھارت کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے پالیسی میکرز کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ مغربی (یعنی پاکستان سے ملنے والی) سرحد کا تحفظ بھارتی پالیسی میکرز کی اولین ترجیح ہے۔ بھارت نے کئی عشروں کی محنت سے ترقی اور خوش حالی کی ایک شاندار ''چائنا شاپ'' تیار کی ہے۔ وہ بھلا کیوں چاہے گا کہ خطہ غیر مستحکم رہے اور کوئی بیل اُس کی چائنا شاپ میں گھس کر سب کچھ تہس نہس کردے۔

ترقی نازک ہوتی ہے۔ اور جو ترقی سے ہمکنار ہوچکا ہو وہ کبھی نہیں چاہتا کہ اُس نے عشروں کی محنت سے جو کچھ پایا ہے وہ دیکھتے ہی دیکھتے مٹّی میں مل جائے۔ بھارتی قیادت اور پالیسی میکرز بھی اِس بات کو سمجھتے ہیں۔ نریندر مودی نے اپنی تقریب حلف برداری میں خطے کے تمام لیڈرز کو بلاکر ایک مثبت اشارہ دیا ہے۔ اِس موقع سے فائدہ وہی اُٹھاسکے گا جو مثبت سوچ اپنائے گا۔ وزیر اعظم محمد نواز شریف نے نریندر مودی کی حلف برداری کی تقریب میں شریک ہوکر ثابت کردیا ہے کہ پاکستانی قیادت خطے میں استحکام چاہتی ہے۔ اور یہ بھی کہ بھارت ایک قدم بڑھے گا تو ہم پوری گرم جوشی سے دو قدم بڑھیں گے۔

مثبت سوچ کی جتنی ضرورت بھارت کو ہے اُس سے کہیں زیادہ پاکستان کو ہے۔ پاکستان کے اپنے حالات کون سے ایسے مستحکم ہیں کہ ہم کسی بھی پڑوسی سے

مخاصمت کے متحمل ہو سکیں! ہمیں بھی ایسے پڑوسیوں کی ضرورت ہے جن کے لیے امن اور استحکام ناگزیر حیثیت رکھتے ہوں۔ بھارت کو اپنی ترقی کے تحفظ کے لیے خطے میں امن اور استحکام درکار ہے۔ اگر نئی دہلی کی اسٹیبلشمنٹ خطے میں امن چاہتی ہے اور اِس کے لیے ایک قدم آگے جانے کو تیار ہے تو ہمیں دو قدم بڑھنا چاہیے۔ اپنے مفاد کو داؤ پر لگائے بغیر اگر خطے میں حقیقی اور پائیدار امن یقینی بنایا جاسکتا ہے تو ایسا کرنے میں کچھ ہرج نہیں۔

ایک دوسرے کے خُون کے پیاسے دوستی کی راہ پر گامزن ہوں، یہ تو پوری دُنیا بھر میں ہو رہا ہے۔ یورپی اقوام ایک دوسرے کے گلے کاٹتے کاٹتے اب اپنی بے مثال ترقی کے تحفظ کے لیے ساری باہمی مخاصمت بھول چکی ہیں۔ امریکا ایک زمانے تک یورپ کا غلام رہا۔ مگر اب وہ یورپ کے بغیر دو قدم نہیں چلتا۔ دوسرے بہت سے خطوں میں بھی دوستی ہی کا ٹرینڈ چل رہا ہے۔ اب ہمارے لیے مخاصمت کا ''پیراڈائم'' کسی صورت کارگر ثابت نہیں ہوسکتا۔ ہم بھارت سے کئی جنگیں لڑ چکے ہیں۔ مگر ایسے ممالک کی کمی نہیں جو آپس میں کئی جنگیں لڑنے کے بعد اب دوستی کے چبوترے پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ برطانیہ، جرمنی، فرانس اور دیگر یورپی اقوام ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی روادار نہ تھیں مگر اب اُن کے معاملات شیر و شکر سے ہیں۔ قومی مفادات سے دستبردار کوئی بھی نہیں ہوا مگر پھر سب ایک ''پیج'' پر ہیں یعنی خطے کا مفاد داؤ پر نہیں

لگنا چاہیے۔

پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور سری لنکا کو بھی اب ایک پیج پر آنا ہے۔ بنگلہ دیشی حکومت نئی دہلی کے آغوش میں ہے۔ اور بھارتی اسٹیبلشمنٹ کی شہہ پر وہ پاکستان سے فاصلہ بھی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ سری لنکا کو بہت سے معاملات میں بھارت سے شکوہ ہے جس کے باعث اُس نے زمینی فاصلے کو نظر انداز کرکے پاکستان سے سفارتی قُربت کو ترجیح دی ہے۔ خطے کا مفاد اِس میں ہے کہ تمام ممالک اپنی خود مختاری اور بنیادی مفادات داؤ پر لگائے بغیر ایک دوسرے کو قبول کرلیں تاکہ حقیقی ترقی، استحکام اور بہبودِ عامہ کی راہ ہموار ہوسکے۔

ہمیں ماضی سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ بھارت میں جب بھی بی جے پی کی حکومت آئی ہے، دو طرفہ تعلقات بہتر ہوئے ہیں۔ بی جے پی نے پاکستان مخالف باتیں کرکے ووٹ ضرور بٹورے ہیں مگر مجموعی طور پر اُس کا ہر دورِ حکومت پاکستان کے لیے بہتر ثابت ہوتا رہا ہے۔ تین عشروں کی محنت سے ترقی کی جو چائنا شاپ تیار ہوئی ہے اُس کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے بھارت کی سیاسی و عسکری قیادت اور سول بیورو کریسی ضرور چاہے گی کہ کوئی پڑوسی کسی حال میں بدمست سانڈ کی طرح اِس شاپ پر چڑھ نہ دوڑے۔

پڑوسیوں سے تعلقات بہتر بنانا بھارت کی ایک

بُنیادی ضرورت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان جیسے بڑے پڑوسی اِس معاملے میں
اُس سے کیسی ڈیلنگ کرتے ہیں، اُس کی جیب کس حد تک ڈھیلی کر پاتے ہیں!

ذبیحہ اور جھٹکا

بسنت گزر گئی مگر بیانوں اور پیش گوئیوں کی گڈیاں اب اونچی اڑ رہی ہیں۔ کلیوں کے چٹکنے اور پھول بننے کا موسم کیا بیتا کہ بیانات کے شگوفے چھوڑنے اور پیش گوئیوں کے ذریعے گل کھلانے کی رُت آ دھمکی۔ قیاس کے گھوڑے دوڑانے والے یہ بھی نہیں دیکھ رہے کہ میدان چھوٹے پڑتے رہے ہیں۔

اسلام آباد کا موسم شاید کھچڑی پکانے کے لیے سازگار نہیں اِس لیے یاروں نے لندن پہنچ کر شب دیگ چڑھائی جا رہی ہے۔ کینیڈا والے ڈاکٹر طاہر القادری اور گجرات والے چودھری برادران نے ولایت میں ڈیرا ڈال کر حکومت مخالف اتحاد کی بنیاد ڈالی ہے۔ معاملہ اگرچہ ابھی رابطوں کے مرحلے میں ہے مگر کچھ بعید نہیں کہ اپنے مُربّیوں سے اشارے پاکر یار لوگ کمر کَس لیں اور میدان میں اُتر آئیں۔

لال حویلی فیم شیخ رشید فرماتے ہیں کہ اِس بار قربانی عیدالاضحیٰ سے قبل ہوگی۔ ہم اُن کے مدّاح سہی مگر اختلاف کا حق تو رکھتے ہیں۔ شیخ صاحب میں شاید اگلے وقتوں کی تھوڑی سی مَروّت باقی ہے اِس لیے قربانی اور ذبیحے کی

بات کر رہے ہیں، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ذبیحے والی عید سے قبل جھٹکے کی تیاری کی جارہی ہے۔ ن لیگ کی حکومت کے گلے پرچُھری پھیرنے کے لیے سبھی بے تاب ہیں۔ وہ بھی جو جانتے ہیں کہ اُنہیں ایک بوٹی تک نہ مل پائے گی!

حکومت کے مشکل میں ہونے کا سب سے توانا اشارا مولانا فضل الرحمٰن نے دیا ہے۔ مولانا کو اللہ نے خطرے کی بُو سُونگھنے کی غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ جب بھی کوئی حکومت جانے والی ہوتی ہے یا خطرے میں پڑچکی ہوتی ہے تب سب سے پہلے فضل الرحمٰن اُس سے الگ ہوتے ہیں۔ فضل الرحمٰن اِس مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ ؎

یہ اِک اشارا ہے آفاتِ ناگہانی کا
کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا!

لندن میں طاہر القادری اور چودھری برادران کا مل بیٹھنا بہت خطرناک نہ ہو تب بھی تشویشناک تو ہے ہی۔ جنوری 2013 میں بھی طاہر القادری خاصی تیاری کے ساتھ کینیڈا سے تشریف لائے تھے اور اپنے مُریدوں اور مدّاحوں کو درشن دینے کے ساتھ ساتھ حکومت کو پریشانی کے درشن کرائے تھے۔ وہ شاید اب اُس درشن کی دوسری قسط پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام آباد کے یخ بستہ موسم میں طاہر القادری اینڈ کمپنی نے جو شب دیگ تیار کی تھی اُس میں کئی آنچوں کی کسر رہ گئی تھی۔

طاہرالقادری تو کنٹینر میں بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے ہدایات دیتے رہے اور جسم میں سُوئی کی طرح چُبھنے والی اسلام آبادی سردی سہتے ہوئے اُن کے جن کارکنوں اور مُریدوں نے شب دیگ تیار کی مگر اُن کی محنت اکارت گئی کیونکہ کھانے والوں کو خاک برابر بھی ذائقہ محسوس نہ ہوا۔ قوم ایسی گئی گزری بھی نہیں کہ سامنے کی بات نہ سمجھ سکے۔ جاننے والے جان گئے کہ طاہرالقادری نے جو کچھ کیا وہ ٹوپی ڈراما تھا۔ اور یہ بھی کہ کس کے اشارے پر اور کیوں یہ ڈراما رچایا گیا! اب ڈاکٹر صاحب جُھلسانے اور پگھلانے والی گرمی میں اپنے چاہنے والوں کے جذبوں کی گرمی آزمانا چاہتے ہیں!

ایک بار پھر دبئی سے لندن تک سیاسی سرگرمیوں کی بہار ہے۔ حکومت مخالف سازشوں کا جال سا بچھتا دکھائی دے رہا ہے۔ شیخ رشید اگر یہ سمجھ رہے ہیں کہ حکومت کا ذبیحہ ہو کر رہے گا تو ذرا یہ بھی بتادیں کہ حکومت کے گلے پر چُھری پھیرنے کی سعادت کون حاصل کرے گا؟ عمران خان کو اِس ڈرامے میں قصاب کا کردار ادا کرنا تھا مگر ہائے ری کم نصیبی کہ اُن کا تو اپنا جھٹکا ہوچکا ہے۔ اور وہ بھی کُند چُھری سے! نہایت باریکی اور ہوشیاری سے اُنہیں ٹرک کی بتّی کے پیچھے لگادیا گیا ہے۔ ایک طرف تو وہ چار نشستوں پر دھاندلی کا ڈھول پیٹ رہے ہیں اور دوسری طرف ایک بڑے میڈیا گروپ کے پیچھے ہاتھ دھوئے بغیر پڑے ہوئے ہیں۔ یاروں نے اُنہیں میڈیا کی دنیا کے کنگ میکر کے ہوش

ٹھکانے لگانے کا ٹاسک سونپا ہے۔ جس طرح کوئی بچہ کھلونے کی فرمائش کرکے رونا شروع کرتا ہے، روتے روتے تھک ہار کر سو جاتا ہے اور بیدار ہوتے ہی پھر کھلونے کا راگ الاپنے لگتا ہے بالکل اُسی طرح عمران خان بھی اُٹھتے بیٹھے، سوتے جاگتے دھاندلی کا راگ الاپ رہے ہیں۔ دھاندلی کی شکایت نے اُن کی سیاسی قوّالی میں ٹیپ کے مصرع کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ دھاندلی کے راگ میں اب ایک بڑے میڈیا گروپ کے خلاف ڈھول پیٹنے کی سرگم بھی شامل ہوگئی ہے۔ معاملہ اگرچہ ایسا ہے کہ مزا دوآتشہ ہو کر رہے مگر عمران خان کے لیے عجیب الجھن پیدا ہوئی ہے۔ یہ اُن کے لیے ع

حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

والا ہے۔ سنت کبیر کہہ گئے ہیں کہ دو پاٹن کے بیچ میں باقی بچا نہ کوئے۔ عمران بھی دو پاٹن کے بیچ میں پھنسے ہیں۔ شیخ رشید اور اُنہی کے قبیل کے دیگر افراد نے تحریک انصاف کے چیئرمین کو مخالفت کے قطب مینار پر چڑھا کر سیڑھی ہٹالی ہے۔ عمران خان کو شاید معلوم نہیں کہ اختلاف کی راہ پر چلنا کبھی کبھی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اِس طلسمات میں کسی نے مُڑ کر دیکھا اور پتھر کا ہوگیا! ''قدم بڑھاؤ، ہم تمہارے ساتھ ہیں'' کا فلک شگاف نعرہ لگانے والے ذرا سی دُھوپ نکلتے ہی سائے سے بھی پہلے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور اِنسان اپنے جوش و جذبے کا پوٹلا سَر پر اُٹھائے سوچتا ہی رہ جاتا ہے۔

یہ کیا جگہ ہے دوستو! یہ کون سا دیار ہے؟
! حدِ نگاہ تک جہاں غُبار ہی غُبار ہے
عمران خان کے ذہن میں اُن کے نام نہاد خیر خواہوں اور پرستاروں نے بہت پہلے سے یہ بات بٹھا رکھی ہے کہ نظام بدلنا ہے تو اُنہیں بدلنا ہے اور اگر نیا پاکستان بنانا ہے تو اُنہی کو بنانا ہے۔ نئے پاکستان کے چکر میں ہم پُرانے عمران سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں!
تحریکِ انصاف کو خیبر پختونخوا میں حکومت بنانے کا موقع ملا مگر عمران کو غیر متعلق معاملات میں ایسا الجھایا گیا کہ اب وہ اپنے حصے کی حکومت پر دھیان دینے کے قابل ہی نہیں رہے۔
جس حکومت کے ذبیحے کی بات ہو رہی ہے اُس کی مخالفت پر کمر کَس کے بہت سوں نے کم از کم اپنا جُھٹکا تو یقینی بنالیا ہے۔ پارلیمنٹ میں طاہر القادری ہیں نہ اُن کی جماعت۔ سیاسی افق پر اُن کی پوزیشن کسی بھی نوع کے سِتارے کی سی نہیں۔ ہاں، وہ بہت حد تک بلیک ہول سے تعبیر کئے جاسکتے ہیں جس کی طرف شکست خوردہ عناصر زیادہ کِھنچتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ چودھری برادران سیاسی اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت تو رکھتے ہی ہیں، پھر کیوں طاہر القادری کا سہارا لینے پر آمادہ ہیں؟ شیخ رشید پارلیمنٹ میں ایک نشست رکھتے ہیں۔ ایک نشست کے بِرتے پر وہ کیا کر سکتے ہیں، اِس کا اندازہ

کوئی بھی لگا سکتا ہے۔ (یہاں نہانے اور نچوڑنے والی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے مگر ہم وہ مثال پیش نہیں کر رہے کیونکہ اُس میں ایک نہایت.برہنہ سا لفظ بھی آتا ہے!) عید الاضحیٰ سے قبل جھٹکے کی بات کی جا رہی ہے۔ اُس سے بہت پہلے یعنی چند دنوں کے بعد شب.برات بھی ہے۔ مقبول عقیدہ ہے کہ اِس مبارک شب کے دوران بہت سے فیصلے ہوتے ہیں، زندگی کے پتّے جھڑتے ہیں۔ اب یہ تو اللہ جانے کہ اگر واقعی پتّے جھڑتے ہیں تو اب کے شب.برات میں سیاسی پیڑ سے کس کس کے پتّے جھڑیں گے۔

رمضان سے قبل ہی میڈیا کو چُپ کا روزہ رکھنے کا پیغام دیا جا رہا ہے۔ اہم ترین ریاستی اداروں کے درمیان کشیدگی اور تناؤ کو دیکھتے ہوئے اور اِس معاملے میں میڈیا کے کردار کا جائزہ لینے سے خیال آتا ہے کہ اب میڈیا کو بھی بولنے اور بہت (یعنی غیر متعلق اور بلاجواز) بولنے کا فرق سمجھنا ہوگا۔ ریاستی اداروں اور میڈیا کی لڑائی کا جو بھی نتیجہ .برآمد ہوگا وہ بھگتنا عوام کو ہے۔ وہ بے چارے "ٹکٹ ٹک دیدم، دم نہ کشیدم" کی تصویر بنے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ وہ اِس بات سے کچھ غرض نہیں رکھتے حکومت کے گلے پر چُھری کون اور کیوں پھیر رہا ہے۔ اُنہیں تو بس اُس دن کا انتظار ہے جب اُن کے بُنیادی مسائل کا جھٹکا ہوگا اور وہ سُکون کا سانس لینے کے قابل ہو سکیں گے۔ اور کسے خبر !کہ اُس دن کے آنے تک عوام ہوں گے بھی یا نہیں

نکلے تری تلاش میں

اِس سال کراچی کے موسم نے سیاسی ماحول کو ''یا اُستاد'' مان لیا ہے۔ اِدھر سیاست گرمی دکھا رہی ہے اور اُدھر سُورج آگ برسانے پر تُلا ہوا ہے۔ دِن کے وقت گھر سے نکل کر دس بیس قدم چلنے پر زبان اُسی طرح باہر آ جاتی ہے جس طرح ...... خیر جانے دیجیے، خواہ مخواہ ایک نجس پالتو جانور کا ذکر کرنا پڑے گا!

مہینہ جُون کا ہو اور موسم آپ کی آزمائش پر تُلا ہو تو گھر سے باہر قدم رکھنا بھی جُوئے شیر لانے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ ایسے میں گھریلو وزارتِ داخلہ یعنی اہلیہ کی سرکار سے حکم صادر ہوا کہ دہی لایا جائے۔ حکمِ حاکم، مرگِ مفاجات! ہم حیران ہوئے کہ جس موسم میں اچھی خاصی جمی ہوئی چیزیں بھی پگھل جاتی ہیں، ہم جما ہوا دہی کہاں سے لائیں؟ اپارٹمنٹ کی بالکونی میں جاکر ماحول پر ایک نظر ڈالی تو آنکھوں کے پسینے چُھوٹنے لگے۔ اہلیہ کو سمجھانے کی (ایک بار پھر) ناکام کوشش کی کہ ایسے موسم میں دہی کا کیا کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ لسّی کے لشکاروں کا اہتمام کرنا ہے اور کڑھی بھی بنانی ہے۔ اور ساتھ ہی بیسن لانے کی فرمائش یعنی ہدایت داغ دی۔ تپانے، جُھلسانے اور رنگ ''گورا'' کردینے والی گرمی میں پکوڑے والی کڑھی! ہم معترض ہوئے تو جواب ملا لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، گرمی کو پکوڑے والی کڑھی سے مارنے کا

!پروگرام ہے

ہم اُن مقامات کے بارے میں سوچنے لگے جہاں جہاں دہی کا حصول ممکن تھا۔ بھلا ہو سماعت کا کہ ہم نے ''ہمتِ مرداں، مددِ خدا'' والا مقولہ سُن رکھا تھا۔ اور پھر اللہ کا شُکر ادا کیا کہ اِس مقولے پر عمل کرنے کی توفیق بھی عطا ہوئی یعنی کمر اچھی طرح کَس کر ہم دہی کی تلاش میں نکل پڑے۔

دو دن پہلے ہی شہر کے حالات اچانک بگڑے تھے (یعنی مزید بگڑے تھے)، دکانیں اور بازار لوگوں نے بند کردیئے یا کرادیئے گئے۔ ہڑتال کا سا سماں پیدا ہوا۔ جب معاملات بہتری کی طرف آئے اور دکانیں کُھلیں تو لوگ گھروں سے بھاگے کہ چار چھ دن کے لیے اشیائے خور و نوش جمع کرلیں۔ ہم نے سوچا لوگ آٹا، دال، چاول وغیرہ خرید رہے ہیں۔ ایسے میں موقع اچھا ہے، دہی کا حُصول کچھ خاص جاں گُسل مرحلہ نہ ہوگا۔ مگر جب دودھ دہی کی دُکانوں کا رُخ کیا تو معلوم ہوا کہ دیارِ یار میں بھی وہ بھیڑ نہ ہوگی جو دہی !کے حُصول کے لیے تھی

دس قدم کے فاصلے پر دودھ دہی کی جو دُکان ہے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ لوگ دکان پر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دکان پر ٹانگے ہوئے بورڈ پر لکھا تھا کہ دہی کے بارے میں پُوچھ کر شرمندہ نہ ہوں! ہم چند لمحوں تک اپنا سا

مُنہ لیے کھڑے رہے۔ مزید دس قدم آگے دودھ دہی کی ایک اور دکان ہے۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ دہی ختم ہو چکا ہے اور دکاندار سارے تَسلے دھو کر اب سُکون کی نیند سو رہا ہے۔ اُسے پُرسکون نیند میں دیکھ کر پہلے تو رشک آیا، پھر شدید غُصّہ بھی کہ نامعقول نے ہمارے لیے پاؤ ڈیڑھ پاؤ جتنا دہی بھی بچا کر نہ رکھا۔ مگر پھر خیال آیا کہ ہم کون سے وی وی آئی پی ہیں جو ہمارے لیے کوئی دہی بچا کر رکھے گا اور تھیلی ہاتھ میں تھما کر سرپرائز دے گا!

آدھے گھنٹے تک ہم علاقے میں بھٹکتے رہے۔ جو شناسا تھے وہ تو سلام کرتے یا سلام کا جواب دیتے رہے۔ جو نہیں جانتے تھے کہ وہ مشکوک نظروں سے دیکھتے رہے کہ کہیں یہ پولیس یا کسی پارٹی کا مخبر تو نہیں جو سُن گُن لیتا پھر رہا ہے! ہم دور سے خاصے پڑھے لکھے دکھائی دیتے ہیں۔ چہرے پر کالمانہ سنجیدگی بھی اُبھر آئی ہے مگر صاحب! جب کوئی بدگمانی پر تُلا ہو تو ہم کیا کریں اور آپ کیا کریں!

دودھ دہی کی ہر دکان پر خلقت جمع تھی۔ ایک جگہ ڈیڑھ کلو جتنا دہی بچا تھا اور طلب گار ڈیڑھ درجن تھے۔ دکاندار کا تو یہ حال تھا کہ ع

حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!

ہم نے دکاندار کی طرف دیکھا تو وہ اچھی خاصی شناسائی کے باوجود ہمیں

پہچاننے سے گریز کرنے لگا۔ عقل مند کے لیے اشارا کافی ہوتا ہے مگر ہم کہاں کے عقل مند ہیں جو اشارا کافی ہوتا؟ ہم اُسے گریزپا دیکھ کر بھی نہ سمجھ سکے کہ دہی کے معاملے میں کوئی اُمید نہ رکھی جائے۔ ہمت کرکے اُس سے پوچھا کہ بھائی پاؤ بھر دہی مل جائے گا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ لیے اور بتایا کہ جو آتا ہے، دہی کا پوچھتا ہے۔ اب ڈیڑھ کلو دہی کتنے لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔ ہم نے سوچا اُس غریب کو مزید شرمندہ کرنے سے بہتر ہے کہیں اور قسمت آزمائی جائے۔

کراچی کے بارے میں بہت سی باتیں خواہ مخواہ مشہور ہو گئی ہیں۔ مثلاً یہ بین الاقوامی شہر ہے، میگا سٹی ہے۔ کوئی کوئی تو پیار سے کاسموپولیٹن سٹی بھی کہتا ہے۔ مگر یہ ساری باتیں کس کام کی جب آدھا کلو دستیاب نہ ہو! ہم دھوپ میں کھڑے سوچ رہے تھے کہ کراچی میں جہان بھر کی چیزیں دستیاب ہیں۔ ایک بس دہی کا حصول ہے کہ رگوں سے لہو نچوڑتا ہے۔ گویا اہل خانہ کے سامنے ہماری تذلیل کا قدرت نے پورا بندوبست کیا! تپتی ہوئی سڑکوں پر چلتے ہوئے پورے علاقے کا سروے کرلیا مگر ''پیر دہی شاہ'' نے کہیں درشن نہ دیئے۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے چُبھ رہے تھے مگر ہم دہی کی لگن میں چلتے رہے۔ کیا پتہ کہیں لاٹری نکل ہی آئے۔ نصف گھنٹے میں

ہماری حالت نے کئی رنگ بدلے۔ پہلے تو ایسی کیفیت طاری ہوئی جیسے کوئی مجنوں اپنی لیلیٰ کو ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہو۔ علاقے کے مختلف گوشوں تک کا فاصلہ ناپنے اور دکانیں کھنگالنے کے بعد کچھ ہی دیر میں ہماری حالت مجنوں سے زیادہ سگِ لیلیٰ کی حالت سے مشابہ ہو گئی! اگر کچھ دیر اور دہی کی تلاش میں بھٹکتے تو محبت کی داستان کا حوالہ بھی بدل جاتا اور جانور بھی!

مرزا تنقید بیگ نے جب ہماری درگت دیکھی تو شدید گرمی اور بیزاری کو پل میں بُھول کر کِھل اُٹھے۔ اِس کے بعد تو وہ ایسے کُھلے کہ اُنہیں سمیٹنا مشکل ہوگیا۔ ''میاں! جب گرمی جوبن پر ہو تو اچھے اچھوں کا پِتّہ پانی ہو جاتا ہے مگر دہی کا دیدار نہیں ہو پاتا۔ لَسّی کی خواہش کو عملی شکل دینے کی کوشش دِماغ کی لَسّی بنا ڈالتی ہے۔ شدید گرمی میں دِن کے دو بجے دہی کی تلاش میں نکلنے والوں کو علامہ اقبالؔ کی طرف 'دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ' والا مشورہ یاد رکھنا چاہیے۔ تم کیا سمجھ بیٹھے تھے کہ جس طرح بیٹھے بیٹھے کالم لِکھ مارتے ہو، دہی بھی کہیں سے پیدا کرلوگے؟ کالم لِکھنے میں کون سا کمال ہے؟ جب چاہو، لِکھ مارو۔ جب پورا ماحول لَسّی کا دیوانہ ہو رہا ہو تب کہیں سے پاؤ ڈیڑھ پاؤ دہی حاصل کرنے کی کوشش کرو تو پتہ چلے کِتنے پانی میں ہو!''

موسم گرمی کا ہو اور بھری دو پہر میں دہی جیسی معمولی شے کا بھی اہتمام نہ ہو پائے یعنی گھر والوں کے سامنے گردن جُھک سی جائے اور پھر مرزا جیسے ''دوست'' جلی کٹی سُنا کر کلاس لینے پر تُلے ہوں تو طبیعت تاؤ کھا ہی جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ دہی کے حصول میں ناکامی کے بعد صرف بیسن لیکر گھر پہنچے تو اہل خانہ کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ سب لَسّی کے مزے لُوٹنے کے لیے ہمارے لَوٹنے کے منتظر تھے ! اِس کے بعد کیا ہوا، یہ کہانی پھر سہی ! بس اِتنا بتائے دیتے ہیں کہ ہم نے جب اہلیہ سے کہا کہ جُوئے شیر لانے کو کہتیں تو ہمارے لیے کچھ مشکل نہ تھا تو وہ بولیں کہ جُوئے شیر کا کیا کرنا تھا، اُسے جماتا کون ؟

محکمہ موسمیات کا کہنا ہے کہ گرمی کی لہر کچھ دِن برقرار رہے گی۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ گرمی حال چال پوچھتی رہے گی اور اہل خانہ لَسّی کے مزے لُوٹنے کے لیے بے تاب رہیں گے۔ یعنی دہی کی تلاش میں نکلنا پڑے گا۔ گویا ع

!ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

مرزا کا مشورہ ہے۔ ''بہتر یہ ہوگا کہ تم دہی جمانے کا ہُنر سیکھ لو۔ فی زمانہ کالم لکھنا ہتھیلی پر سَرسوں جمانے جیسا ہے۔ معمولی سی ذہانت کے

ساتھ جب تم اِس مرحلے سے گزر سکتے ہو تو دہی جمانا کون سا مشکل کام ہے؟ بہتر تو یہ ہے کہ ہر وہ ہُنر سیکھ لو جو اہلِ خانہ کی نظر سُرخرو کرتا ہو!"

مرزا کا مشورہ صائب ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ بازار سے مٹّی کا تسلا خرید ہی لائیں!

☆☆☆

پوائنٹ اسکورنگ سے آگے

سیاست کولھو کے بیل کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ بات خواہ کہیں سے چلے، گھوم پر پھر اُسی نکتے پر آ جاتی ہے جس سے بحث کا آغاز ہوا ہوتا ہے۔ ایک زمانے سے اداروں کے جس تصادم کا راگ الاپا جارہا تھا اور رونا رویا جارہا تھا وہ تصادم بالآخر واقع ہو کر رہا۔ قوم نے یہ تماشا پہلے بھی کئی بار دیکھا ہے۔ ع

لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جُدا

معاملہ ایک دوسرے کو پیغام دینے تک محدود تھا مگر اب بات پوائنٹ اسکورنگ یعنی ایک دوسرے کے کمزور لمحات سے فائدہ اُٹھانے تک آ گئی ہے۔ کل تک عالم یہ تھا کہ ادارے برتری پانے کی کوشش میں اپنا اپنا زور آزماتے تھے اور میڈیا کو سہارا بنا کر اپنی پوزیشن بہتر بناتے تھے۔ اب معاملہ بہت عجیب ہے کہ بعض میڈیا خود بھی اداروں کے درمیان تصادم کا حصہ یا فریق بن گئے ہیں۔ سیاسی اور عسکری قیادت نے ایک دوسرے کو قبول کرنے کا سو بار عندیہ دیا ہے مگر قوم ایسی سادہ بھی نہیں کہ ہر بات کو سوچے سمجھے بغیر سچ مان لے۔ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے اُس کی مدد سے ایسا بہت کچھ بھی دیکھا جاسکتا ہے جو آنکھوں کے سامنے نہیں۔ اندازے لگانے میں اب اہلِ وطن کی مہارت کو کوئی چیلنج نہیں

کر سکتا۔

وزیر اعظم اور آرمی چیف کے درمیان جو بھی معاملات رہے ہیں وہ اِس قدر اظہر من الشمس ہیں کہ اٹکل کے گھوڑے دوڑا کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ کون سا معاملہ کہاں تک جا رہا ہے۔ میاں محمد نواز شریف اپنے تیسرے دورِ حکومت میں بھی فوج کو زیرِ دام لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسری طرف فوج ہے کہ اپنا ''اسٹیک'' کمزور ہونے سے بچانے کے لیے وہ سب کچھ کر رہی ہے جو کر سکتی ہے۔ کل تک میڈیا والے اِس کشمکش کی کوریج کیا کرتے تھے۔ اب کئی آؤٹ لیٹس واضح طور پر فریق بن چکے ہیں۔ اگر وزیر اعظم کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو فوج کو پسند نہیں تو جواب میں عسکری قیادت بھی اشارا یا پیغام دینے میں دیر نہیں لگاتی کہ بات اُسے بُری لگی ہے۔ آرمی چیف کا ایس ایس جی کے ہیڈ کوارٹرز کا دورہ سیاسی قیادت کے لیے واضح پیغام تھا کہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کراچی میں امن و امان کے حوالے سے اجلاس میں وزیر اعظم نے سابق صدر آصف علی زرداری کو بھی شریک کرکے فوج کو پیغام دینے کی کوشش کی کہ کسی ایسی ویسی صورت حال میں سیاست دان ایک ہوں گے۔

ٹی وی چینلز کی لڑائی میں بھی سیاسی اور عسکری قیادت نے ثابت کر دیا ہے کہ اُن کی راہیں ہر گز ایک نہیں۔ عمران خان کو اُن کے سرپرستوں نے خوب استعمال کیا ہے۔ ایک میڈیا گروپ کے خلاف سرگرم رکھ کر گویا اُنہیں ٹرک کی بتّی کے

پیچھے لگادیا گیا ہے۔ کارکن بھی حیران ہیں کہ قائدِ محترم کو آخر ہوا کیا ہے کہ ایک ہی راگ الاپے جارہے ہیں، سٹیٹک بھی تبدیل نہیں کر رہے! اِس سے کہیں زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ چار پانچ حلقوں میں دھاندلی کا رونا رو کر خیبر پختونخوا پر توجہ نہیں دے رہے جس پر حکمرانی کا تحریکِ انصاف کو موقع ملا ہے! بہت سے مبصرین عمران خان کی روش کو کفرانِ نعمت سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ تحریک انصاف کے چیئرمین کو کمال ہوشیاری سے غیر متعلق باتوں میں اُلجھا دیا گیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ عمران خان بھی کوئی ننھے کاکے تو ہیں نہیں کہ یوں باتوں میں آجائیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ سیاست کی رونقیں دیکھنے کے لیے اُنھوں نے جن کے کاندھوں پر سواری کی ہے وہ اب اُن سے کام لے رہے ہیں اور اُن کا کام اُتار رہے ہیں!

پوائنٹ اسکورنگ کی دُھن میں عمران خان یہ بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ اُن کے سیاسی فکر اور ساکھ کو گھن لگتا جارہا ہے۔ انتخابات میں اُن پر بھروسہ کرنے والوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ اب لوگ ووٹ دینے سے پہلے ضرور سوچیں گے کہ ایک صوبے کی حکومت ملنے پر بھی وہ چند حلقوں میں دھاندلی کا رونا رو کر اپنا وقت اور توانائی ضائع کرتے رہے۔ ایسے میں اُن پر دوبارہ کیونکر بھروسہ کیا جائے؟

میڈیا گروپس کی لڑائی میں بھی دیگر اداروں کی پوزیشن واضح ہو گئی اور سب نے حتی المقدور پوائنگ اسکورنگ کی۔ کیوں نہ کرتے؟ یہی کام تو سب سے اچھا آتا ہے!

معاملات دیکھتے ہی دیکھتے ایسا رُخ اختیار کر گئے کہ فوج غیر جانبدار رہ سکی نہ حکومت۔ آئی ایس آئی پر الزامات کے جواب میں فوج تو بھنائی مگر حکومت نے کچھ خاصا ناک بھوں چڑھانے سے گریز کیا۔ یہ گویا اِس امر کا اشارا تھا کہ سیکیورٹی کے حسّاس ترین ادارے کے معاملے میں وہ فوج سے پوری طرح ہم خیال اور ہم آہنگ نہیں ہو سکتی یا نہیں ہونا چاہتی۔

اِس وقت سب سے بڑا مسئلہ سویلین قیادت کی برتری منوانے کا ہے۔ نواز شریف اِس معاملے میں اِس قدر سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں کہ شاید وہ حکومت بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہ کریں۔ آصف علی زرداری سے اُن کے تعلقات کا اُستوار رہنا بہت سوں کے نزدیک گٹھ جوڑ ہو تو ہو مگر عسکری قیادت کی سیاسی مہم جُوئی کے آگے بند باندھنے کی یہ بھی تو ایک صورت ہے۔ یعنی یہ کہ بڑی سیاسی جماعتیں چاہتی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سویلین سیٹ اپ چلتا رہے اور فوج کو اِس طرف آنے کا راستہ نہ ملے۔

نریندر مودی کی حلف برداری نے اداروں میں تصادم کو مزید اظہر من الشمس کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وزیر اعظم کو جیسے ہی بھارت کی طرف سے مودی کی

تقریبِ حلف برداری میں شرکت کا دعوت نامہ ملا، ملک میں ہر طرف شور اُٹھا کہ ایک انتہا پسند اور متعصب ہندو لیڈر کی حلف برداری کے موقع پر موجود رہنا مناسب نہیں۔ یعنی یہ کہ وزیر اعظم کو بھارت نہیں جانا چاہیے۔ فوج بھی یہی چاہتی تھی۔ میاں صاحب نے برادرِ خورد کو جی ایچ کیو بھیجا تو قوم یہ سمجھی کہ شاید مشورہ مقصود ہے۔ مگر شاید شہباز شریف صرف یہ اطلاع دینے گئے تھے کہ بھائی جان نئی دہلی جا رہے ہیں! مخالفین نے تاثر دیا کہ دِلی چلے بھی جاؤ تو دِلّی ہنوز دور است! مگر میاں صاحب نہ مانے اور سارک کے رکن ملک کے سربراہِ حکومت کی حیثیت سے راشٹر پتی بھون میں اُس وقت موجود رہے جب مودی بھارت کی ترقی و استحکام کا حلف اُٹھا رہے تھے۔

قومی سیاست یہ کیسے موڑ پر کھڑی ہے کہ ہر معاملے میں پوائنٹ اسکورنگ کو پیدائشی حق سمجھ لیا گیا ہے؟ کوئی ایک آدھ معاملہ تو ایسا بھی ہونا چاہیے جس میں مقتدر حلقے صورت حال کا فائدہ اُٹھانے سے گریز کریں اور صرف ملک و قوم کے مفاد کا سوچیں۔ اداروں کا اسٹیک ملک اور قوم کے اسٹیک سے بڑھ کر نہیں ہونا چاہیے۔ ریاستی ادارے ہوں یا نجی ملکیت والے میڈیا گروپس، سبھی کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ اپنی منطقی حدود کا خیال رکھیں۔ پوائنٹ اسکورنگ کی جاسکتی ہے مگر ہر معاملے میں نہیں۔ اسکور کو لیول کرنے کی کوشش میں قومی مفادات کو لیول کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ معاملہ اُمورِ داخلہ کا ہو

یا اُمورِ خارجہ کا، ہر معاملے میں متعلقین یعنی فریقین کو اپنے اپنے کردار کا تعین تو کرنا ہی ہے۔ اگر الگ بیٹھ کر ایسا کرنا ممکن نہیں تو وسیع البنیاد مصالحتی عمل کے ذریعے سہی۔ ملک کو نیا نظام دینے کے لیے بات چیت کے ذریعے نئے عمرانی معاہدے کی منزل تک پہنچنے میں کیا ہرج ہے؟ کیا لازمی ہے کہ جو اسٹیک ہولڈرز ہونے کے دعویدار ہیں وہ اسٹاکسٹ'' بن کر رہ جائیں ! اگر سبھی اپنے مفادات سمیٹ کر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد'' بنالیں گے تو قوم کہاں جائے گی؟ جو غریب محفوظ اور پُرسکون زندگی کے خواب اپنی پلکوں پر سجائے بیٹھے ہیں کچھ اُن کے اسٹیک کا بھی خیال اور احساس کیا جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کسی ریاست میں عوام پوائنٹ اسکورنگ پر تُل جاتے ہیں تو اپنے جذبات اور اُمنگوں سے کھیلنے والوں کو پوائنٹ آف نو ریٹرن تک پہنچا کر ہی سُکون کا سانس لیتے ہیں!

ایک لفظ کی جادوگری

اگر ٹائمنگ درست نہ ہو تو بولتے رہنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا اور اگر بر وقت کہا جائے تو ایک لفظ بھی کافی ہوتا ہے۔ کوئی بھی لفظ کہنے کو چند حروف کا مجموعہ ہوتا ہے مگر حروف کا یہ مجموعہ کبھی کبھی پوری کتاب پر بھی بھاری پڑتا ہے۔ مثلاً لفظ ''گدھا'' ہی لیجیے۔ چار حروف کا یہ لفظ اگر بر وقت ادا کیا جائے تو مدِمقابل کے سَر پر گرز بن کے لگتا ہے اور وہ تپ کر دولتّیاں مارنے لگتا ہے۔ اگر کسی کو صرف ''پٹھّا'' کہہ دیجیے اور پھر دیکھیے کہ وہ اصلیت یعنی اُلّو تک پہنچنے میں کتنا کم وقت لیتا ہے!

سوشل میڈیا کی طاقت کا اندازہ ہمیں بھی تھا مگر اِس بات کا اندازہ نہ تھا کہ طاقت کس قدر ہے۔ ہم نے سوچا بھی نہ تھا کہ سوشل میڈیا پر پھیلنے والا یا پھیلایا جانے والا کوئی لفظ بجلی کی سی تیزی سے متعلقین پر قیامت ڈھا سکتا ہے۔ آج کل سوشل میڈیا پر بیانات، وضاحتیں، تصاویر اور وڈیو کلپس مطلوبہ نتائج کے لیے اپ لوڈ کی جاتی ہیں اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی رہتے ہیں۔ ہم بھی سوچا کرتے تھے کہ سوشل میڈیا کو اِس طور

استعمال کریں کہ لوگ متوجہ ہوں۔ مگر کوئی ڈھنگ کی ترکیب ہمیں سُوجھتی ہی نہ تھی۔
اللہ بھلا کرے شریف امروہوی صاحب کا جن کی ایک معصوم سی غلطی (یا غیر معصوم سی شرارت!) نے ایسا جادو جگایا کہ ہم راتوں رات بہت سوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے۔ آپ سوچیں گے کسی کی آنکھوں میں کھٹکنا کون سے اعزاز کی بات ہے۔ آپ نے کیا سُنا نہیں ہے؟ ع

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟

کالم لکھ لکھ کر ہمارے ہاتھ شَل ہوگئے (اور دِماغ کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہوگا) مگر خیر، اِس مشقت کا وہ نتیجہ برآمد نہ ہوا یعنی اُتنی توجہ نہ ملی جتنی شریف امروہوی صاحب کے بیان کردہ ایک لفظ نے عطا کردی۔

ہم 1980 سے شعر کہتے آئے ہیں۔ شعر گوئی نے توقیر کا اہتمام کیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ مُشاعرے پڑھنے یا اخبارات و جرائد میں غزلوں کی اشاعت سے وہ بات نہ بنی جو شریف امروہوی صاحب کے ''خراج تحسین'' سے بن گئی۔ اِس ''خراج تحسین'' کی تاثیر یہ تھی کہ بہت سے احباب نے انتہائے جذبات سے مغلوب ہوکر ہمیں ''خراج عقیدت'' پیش کرنا شروع کردیا۔

بات یہ ہے کہ موبائل فون پر ایس ایم ایس پیکیج کو ہم نے بھی اپنے اشعار

احباب تک پہنچانے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ تین دن قبل چند اشعار کہے۔ سوچا تازہ مال ہے تو چلو، احباب سے بھی شیئر کر لیں۔ یہی سوچ کر اپنی تازہ ترین طبع آزمائی سے چار اشعار چند احباب کے اِن باکس میں داخل کر دیئے۔ شریف امروہوی صاحب کے جی میں خدا جانے کیا آئی کہ ہمارے اشعار پڑھتے ہی دُکان کھول بیٹھے۔ ہم فوٹو شاپ کی بات کر رہے ہیں۔ موصوف فوٹو شاپ کی مدد سے بہت کچھ تیار کر لیتے ہیں۔ ہمارے اشعار کو ایک پُر کشش چوکھٹے میں فِٹ کرکے اُنھوں نے فیس بک پر اپ لوڈ کر دیا۔ اشعار کیا اپ لوڈ ہوئے، یہ سمجھ لیجیے کہ "بات ہونٹوں نکلی، کوٹھوں چڑھی" والا معاملہ ہوگیا۔ تبصروں کا سلسلہ چل نکلا۔ جب بھی کوئی شخص فیس بک کو وزٹ کرکے ہماری کسی بات پر تبصرہ کرتا ہے تو ای میل کے ذریعے ہمیں بھی نوٹیفکیشن ملتا ہے۔ ذرا سی دیر میں ہمارے ای میل اکاؤنٹ کا اِن باکس تبصروں سے بھر گیا۔ داد و تحسین کے ڈونگرے برسنے لگے۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ چلو، سوشل میڈیا نے ہمارے لیے بھی کوئی تو "انقلاب" برپا کیا۔

مگر پھر کچھ ہی دیر میں لوگوں نے ہمیں لتاڑنا شروع کیا۔ ای میل اکاؤنٹ میں پہنچنے والے نوٹیفکیشنز کی بُنیاد پر ہم نے خطرے کی بُو سُونگھی اور فیس بک پر اپنے پیج کا وزٹ کیا تو معلوم ہوا کہ لوگ اشعار کو سراہنے کے ساتھ ساتھ شریف امروہوی صاحب کی سادگی پر ہمیں ملامت کر رہے ہیں۔ آن کی آن میں ہمیں

اندازہ ہوگیا کہ شریف صاحب کی ایک معمولی سی غلطی یا مزاج کی شوخی نے ہم پر طنز کے تیر برسانے کا اہتمام کردیا۔ ہوا یہ کہ شریف صاحب نے ہمارے اشعار کے ساتھ "نوجوان شاعر محمد ابراہیم خان کی غزل" کے الفاظ بھی ٹائپ کردیئے!

اِس ایک لفظ "نوجوان" نے ہنگامہ برپا کیا۔ لوگ کہتے ہیں کسی ایک لفظ سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اِس ایک لفظ نے اپنے اور پرائے کا فرق واضح کردیا۔ یعنی بقول خاطرؔ غزنوی "...... اِتنا تو ہوا، کچھ لوگ پہچانے گئے" والی کیفیت پیدا ہوگئی! جن احباب کو ہم اپنا خیر خواہ سمجھتے تھے اُن سے اِتنا بھی ہضم نہ ہوسکا کہ ہمیں نوجوان" قرار دیا جائے! دیکھتے ہی دیکھتے یاروں نے فیس بک پر ہمیں لتاڑنا شروع" کردیا۔ برادرم مظہر ہانی نے لکھا۔ "نوجوان؟ ہاہاہا!" امجد چودھری نے لکھا۔ "لگتا ہے اب 'نوجوان' کی تعریف بدلنی پڑے گی!" محترم انور سعید صدیقی نے ٹائپ کیا۔ جب 'نوجوانی' کی شاعری ایسی ہے تو بڑھاپے کی کیسی ہوگی!" ایک صاحب نے ایس" "! لکھنا چاہتے تھے no jawan ایم ایس کیا۔ "شریف صاحب شاید آپ کو ہماری تذلیل کا سامان ہو اور مرزا تنقید بیگ کے من میں لڈّو نہ پُھوٹیں، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسے ہی اُن کے بیٹے نے فیس بک پر ہماری دُرگت کے

بارے میں بتایا وہ ہمارے گھر آ دھمکے۔ موقع بھی تھا اور جواز بھی اِس لیے وہ آتے ہی ہماری ''نوجوانی'' کی واٹ لگانے لگے! ہم نے سمجھانے کی کوشش کی کہ نوجوانی کا دعویٰ ہم نے نہیں کیا بلکہ ہم کسی کا لِکھا بُھگت رہے ہیں مگر وہ کب سُننے والے تھے؟ اُن کا خیال تھا کہ بدنامی کے ذریعے شہرت پانے کی کوشش کرنے والوں کا یہی طریقِ واردات ہوا کرتا ہے! وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح فلم کی ''مشہوری'' کے لیے ہیرو اور ہیروئن کے آف دی اسکرین رومانس کی خبریں چلائی جاتی ہیں بالکل اُسی طرح سوشل میڈیا کے ذریعے شہرت پانے کی خاطر بھی ایسی ہی ''کیمپین'' چلائی جاتی ہے! مرزا کی بات مکمل طور پر غلط بھی نہیں۔ مگر ہم یہ کیسے یقین دلائیں کہ ہمیں شعر کہنے کا شوق ضرور ہے مگر اُس نوجوانی کا ڈھول پیٹ کر لوگوں کی توجہ حاصل کرنا مقصود نہیں جو بہت پہلے گزر چکی ہے! ایک ذرا سی سادگی یا کوتاہی سے ہمیں ادھیڑ عمر کے مُنہ کا ذائقہ بدلنے کو چند لمحوں کے لیے نوجوانی دوبارہ مل گئی ورنہ ہم بھی جانتے ہیں کہ ہم کیا اور ہماری نوجوانی کیا! ع

دِل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے!

چند لمحوں کی مسرت بلکہ مسرت کے بھی صرف شائبے سے اگر کوئی غریب دِل کو ذرا بہلالے تو اِس میں ہرج ہی کیا ہے؟ اب کیا دوستوں کا یہ کام رہ گیا ہے کہ کسی کی معمولی سی خوشی کا مزا بھی کِرکِرا کریں اور رنگ میں بھنگ ڈالیں!

کبھی کبھی زحمت کی کوکھ سے رحمت بھی برآمد ہو جایا کرتی ہے۔ شریف صاحب نے جو مہربانی" فرمائی ہے اُس کا ایک ضمنی مگر خاصا قابل ذکر فائدہ یہ پہنچا کہ ''نوجوانی'' کی'' بنیاد پر ہمارا مذاق اُڑانے والے ہماری شاعری پر تبصرے یا تنقید کے ڈونگرے برسانا بھول گئے! جو ''احباب'' ہمارے اشعار میں خامیاں، بلکہ کیڑے تلاش کیا کرتے تھے اُن کے کان بھی ''نوجوانی'' کے تذکرے پر ایسے کھڑے ہوئے کہ دیگر تمام معاملات کو اُنھوں نے بالائے طاق رکھ دیا۔

شریف امروہوی صاحب سے ہمارے تعلقات کی نوعیت ایسی نہیں کہ اُن کی سادگی و پُرکاری سے جو مصیبت نازل ہوئی اُس پر ناراضی کا اظہار کریں۔ اب آپ سے کیا پردہ؟ سچ یہ ہے کہ شریف صاحب کی کوتاہی نے خاصا نہال کردیا۔ لوگوں کے طنزیہ جُملوں سے اُن کا متوجہ ہونا تو ثابت ہوتا ہی ہے! ؎

وہ بے رُخی سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں
میں خوش نصیب ہوں کہ کسی کی نظر میں ہوں!

شریف صاحب سے بس اِتنا سا اِلتماس ہے کہ ہمارے ''درجات'' ذرا سوچ سمجھ کر

بُلند کیا کریں کیونکہ ابھی ہمارا معاشرہ ذہنی طور پر اِتنا پُختہ نہیں ہوا کہ کسی کے نمبر بنتے دیکھ کر سچّے دِل سے خوش ہو!

! گرمی کا دُشمن ..... احتجاجی شربت

آم ابھی تک پکنے کے مرحلے میں ہیں۔ اہلِ وطن آموں کے پکنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ مگر اِس سے قبل انتخابی دھاندلی کا راگ سُن سُن کر لوگوں کے کان پک گئے ہیں۔ جُون وارد ہوچکا ہے۔ جُوں جُوں گرمی بڑھتی جاتی ہے، سیاسی سرگرمیوں کی حِدّت بھی جولانی دکھانے کو اُتاؤلی ہوتی جاتی ہے۔ جن کے دم سے سیاسی میلے کی رونق ہے اُنھوں نے طے کرلیا ہے کہ اب کے گرمی کا جواب سیاسی سرگرمی سے دیکھیں گے۔ شبِ برات کے آثار نمایاں ہوتے ہی سیاسی پٹاخے چلائے جانے لگے، اور وہ بھی لندن سے۔

لندن کی ٹھنڈی فضاؤں میں طے پایا ہے کہ آفت کی پرکالہ سمجھی جانے والی جُون کی گرمی کے زیر سایا پاکستان میں احتجاجی دھماچوکڑی مچائی جائے گی۔ ڈاکٹر طاہر القادری ایک بار پھر منتخب حکومت کے کَس بَل نکالنے کے لیے کمر کَس کے میدان میں اُترنے ہیں۔ نعرہ اِس بار بھی انقلاب ہی کا ہے اور کہہ بھی دیا ہے کہ یہ انقلاب عوام کے لیے ہوگا۔ کئی ذہنوں میں یہ سوال اُبھر سکتا ہے کہ کیا انقلاب برپا کرنے کی گزشتہ کوششیں خواص کے لیے تھیں؟ مگر خیر یہ سوال ڈاکٹر طاہر القادری سے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایک ترقی یافتہ ملک میں رہنے

کی برکت سے اب وہ دلائل بھی ایسے ترقی یافتہ دیتے ہیں معترضین وہی والا یعنی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں!

رانا ثناء اللہ بہت بے چین ہیں۔ اُنہیں ڈاکٹر طاہرالقادری کا انتظار ہے۔ یہ انتظار ویسا ہی ہے جیسا کہ اُردو کی قدیم داستانوں میں پائے جانے والے دیو کو ہوا کرتا تھا اور وہ جیسے ہی کسی انسان کو قرب و جوار میں پاتا تھا فوراً "آدم بُو، آدم بُو" چلّانے لگتا تھا! رانا ثناء اللہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر طاہرالقادری ذرا پاکستان آجائیں، پھر ہم اُن کا جِن نکالیں گے۔ اُنھوں نے اہلِ وطن سے کہا ہے کہ دُعا کریں ڈاکٹر صاحب جلد آجائیں۔ رانا صاحب نے یہ بات شاید دل لگی کے طور پر کہی ہے۔ کیا اِس طرح کی آمد کے لیے بھی دُعا کی جاتی ہے؟ یہ جِن نکالنے والی بات لُطف سے خالی نہیں۔ ہمیں مغالطے نے جکڑ رکھا تھا۔ ہم اب تک غیر معمولی جوش و خروش سے مُزیّن بیانات اور تیزا تیزی کی بُنیاد پر رانا ثناء اللہ کو جِن سمجھ رہے تھے۔ وہ تو "ملٹی پرپز" نکلے۔ یعنی جِن بھی ہیں اور عامِل بھی!

رانا ثناء اللہ ڈاکٹر طاہرالقادری کا جِن نکال سکیں گے یا نہیں یہ تو آنے والا وقت بتائے گا مگر یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میاں صاحب کی ٹیم میں ایسی ہستیاں بھی ہیں جو جِن نکال سکتی ہیں کیونکہ اِس وقت ملک کو خاصے جِنّاتی

قسم کے حالات کا سامنا ہے۔ مثل مشہور اور مشاہدہ برحق ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ تلوار کا مقابلہ امن کے پرچم سے نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی میں جِن گھس جائے تو اُسے نکالنے کے لیے جِن نکالنے کے ماہر ہی کی خدمات درکار ہوں گی۔ ڈاکٹر طاہرالقادری کی آمد کے آثار ہویدا ہوتے ہی رانا ثناءاللہ کا متحرک ہو جانا اور اُن کے استقبال کے لیے بے چین ہونا حیرت انگیز ہے نہ غیر فطری۔

اگر شیخ رشید بھی ڈاکٹر طاہرالقادری سے مل گئے تو سمجھ لیجیے احتجاجی ڈِش کا مزا دوآتشہ ہو جائے گا۔ عمران خان نے اعلان کردیا ہے کہ وہ کسی حکومت مخالف سیاسی اتحاد کا حصہ نہیں بنیں گے۔ اِس امر کی اُنھوں نے وضاحت نہیں کی کہ وہ خیبر پختونخوا حکومت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں یا حکومت مخالف احتجاج کے معاملے میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا چاہتے ہیں۔

میڈیا والے پریشان ہیں کہ کس کا ساتھ دیں اور کس کا نہ دیں۔ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ اب غیر جانبدار رہنے سے کام چلے گا نہ بات بنے گی۔ چند ماہ کے دوران اداروں کے درمیان معاملات کی نوعیت ایسی رہی ہے کہ میڈیا کو بھی بہت سے اُصول لپیٹ کر ایک طرف رکھنے پڑے ہیں۔

ملک جن حالات سے دوچار ہے ان کا تقاضا خواہ کچھ ہو، جنہیں احتجاج کے ذریعے خود کو نمایاں کرنا ہے وہ ایسا ہی کریں گے۔ اب تک کی کیفیت بتا رہی ہے کہ لندن میں کئے جانے والے اعلان میں چودھری برادران نیم دِلی سے شریک ہوئے تھے اور اب ڈاکٹر طاہر القادری کو بھی اندازہ ہو چلا ہے کہ اُن کی ٹائمنگ غلط تھی۔ مگر کیا کیا جائے کہ اُن کی تو سیاست ہی احتجاج کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ جیسے ہی لندن میں احباب مل بیٹھے، ملک میں حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ متحدہ کے قائد الطاف حسین کا حراست میں لیا جانا اور اُس کی بنیاد پر احتجاج کیا جانا لندن پلان کی راہ میں دیوار سا بن گیا۔ اور اِس کے بعد بجٹ پر بحث بھی شروع نہ ہوئی تھی کہ کراچی ایئر پورٹ پر حملہ ہوا۔ یہ سب کچھ یکے بعد دیگرے والے اُصول کے تحت ہوا اور احتجاجی تحریک ایک طرف رہ گئی۔ حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے عمران خان نے بھی فی الحال چُپ سی سادھی ہوئی ہے۔ اور دوسری طرف ڈاکٹر طاہر القادری بھی وطن واپسی کا ارادہ ملتوی سا کئے بیٹھے ہیں۔ سُننے میں تو یہ آیا تھا کہ وہ کینیڈا کی شہریت ترک کر کے مستقل نوعیت کی وطن واپسی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے معاون کو تمام کتابیں بھی واپس بھیجنے کی ہدایت کر دی ہے۔

انقلاب اب تک اُنہی کے پاس ہے جسے وہ شاید خود لے کر آنا چاہتے ہیں۔ انقلاب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی آمد کب تک ہو گی، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اور یہ بھی بتایا نہیں جا سکتا کہ اُن کی آمد کے بعد بھی انقلاب برپا ہو گا یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی مستقل وطن

! واپسی ہی کو انقلاب قرار دے رہے ہوں

قوم حیران ہے کہ شدید گرمی میں تحریک چلانے کا اعلان کرکے سب پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔ ملک بھر میں لوگ پینے کے صاف پانی کو ترس رہے ہیں۔ ایسے میں اگر تھوڑا بہت احتجاجی شربت مل جاتا تو پیاس بھلے ہی نہ بُجھتی، تھوڑی بہت اشک شُوئی تو ہو ہی جاتی۔ احتجاجی تحریک کی بات کرکے ایک طرف ہٹ جانا ہمارے پیٹی بند بھائیوں یعنی میڈیا والوں کے لیے تو ایسی ہی بات ہے جیسے کسی پیاسے کو ٹھنڈے پانی کی بوتل دِکھا کر ترسایا جائے۔ بہت دنوں سے کچھ ایسا ہو ہی نہیں رہا کہ اینکرز دھماچوکڑی مچائیں۔ کہیں سے رائی ہی نہیں مل پا رہی تو پربت کاہے کا بنائیں؟

ہم رانا ثناء اللہ صاحب کا فن دیکھنے کو بے تاب ہیں۔ ہم نے جِن نکالنے والے عاملوں کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا ہے۔ صحافت سے وابستہ رہنے کے طفیل بہت سے ایسے عامل صحافی بھی ہیں جو حُلیے سے تو جِن نکالنے والے ہی دکھائی دیتے ہیں مگر اُن کا بُنیادی فن جِن نکالنا نہیں بلکہ جِن کو کنٹرول کرکے صحافت کے شعبے میں لانا ہے! اپنے شعبے کے عاملوں یعنی عامل صحافیوں کی کاری گری ہم نے تین عشروں تک دیکھی ہے۔ اب تو بس یہ دیکھنا ہے ڈاکٹر طاہرالقادری کے رگ و پے میں قیام کرنے والا جِن کیسا ہے اور کون سا انقلاب برپا کرسکتا

ہے!

ملک کو درپیش جِناتی حالات ہمیں یہ دُعا مانگنے کی تحریک دے رہے ہیں کہ فی الحال کوئی احتجاجی تحریک نہ چلے اور سب کچھ یوں ہی چلتا رہے۔ مگر شاید گرمی کا علاج یاروں نے سوچ رکھا ہے۔ اور پھر رمضان کا ماہِ مبارک بھی وارد ہونے کو ہے۔ جو کچھ کرنا ہے اُس سے قبل ہی کرنا ہے۔ شعبان ختم ہوتے ہی لوگ سب کچھ عید کے بعد پر ٹالنے لگیں گے۔ اور یوں انقلاب بھی ٹل جائے گا اور ڈاکٹر صاحب کا جِن نکالنے کا معاملہ بھی۔ اچھا ہے یہ تماشا رمضان المبارک سے قبل ہو جائے۔

تلوار اور اخبار

نپولین بونا پارٹ کیا خوب کہا ہے کہ ہزار تلواروں کے مقابلے میں چار مخالف اخباروں سے زیادہ ڈرنا چاہیے !

اگر نپولین آج ہوتا (یا ہمارا زمانہ ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ اَیام تو'' کے اُصول کی بنیاد پر نپولین کو مل جائے) تو وہ اِسی بات کو کچھ یوں کہتا کہ ہزار ایٹمی ہتھیاروں کے مقابلے میں تین چار ایسے نیوز چینلز سے زیادہ ڈرنا چاہیے جو کئی ہفتوں کا راشن پانی لیکر مخالفت کے محاذ پر ڈٹ گئے ہوں !

نپولین کا قول پاکستانی معاشرے پر ایسا صادق آتا ہے کہ لگتا ہے اُس نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا اور اِس خواب میں اُسے صرف میڈیا کی کارستانیاں یاد رہ گئی تھیں !

ایک زمانے سے ہمارے ہاں میڈیا میں مخالفت بلکہ بے سَر پیر کی مخالفت ''پیشہ ورانہ ایمانیات'' کا حصہ ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ کوئی اخبار اگر رُوٹھ جاتا تھا تو اُسے منانا جُوئے شیر لانے کے مترادف ٹھہرتا تھا۔ اشتہارات سمیت خدا جانے کیا کیا دے کر منانا پڑتا تھا۔ کسی نے کہا ہے

کہ رُوٹھے رب کو منانا آسان ہے، رُوٹھے یار کو منانا مشکل ہے۔ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ رُوٹھا یار بھی دو چار تحائف میں مَن جاتا ہے مگر میڈیا والے تیوری پر بَل چڑھالیں تواِس بَل کو نکالنے میں فریقِ ثانی کے کَس بَل نکل جاتے ہیں! اگر حکومت میڈیا کو منانے کے مِشن پر نکلے تواُنہیں خوب نوازتی ہے اور وہ بھی عوام کے خرچ پر۔ سیدھی سی بات ہے، حکمرانوں کو کون سا اپنی جیب سے کچھ دینا ہوتا ہے؟

وہ زمانے ہوا ہوئے جب حزبِ اختلاف سڑک پر آکر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے یعنی بگاڑنے کا کریڈٹ لیا کرتی تھی۔ وہ سادہ زمانے تھے۔ ذرا سا شور مچایا اور بات بن گئی۔ بعد میں یہ ہونے لگا کہ یار لوگ اختلاف کی ہانڈی میں تھوڑا سا صحافت کا تڑکا لگانے لگے۔ جب حزبِ اختلاف تھوڑا سا جوش دکھاتی تھی تو صحافت کے جادوگروں کو بھی کچھ کر دکھانے کی فکر لاحق ہوتی تھی۔ یہ احساس ستاتا رہتا تھا کہ کہیں پیچھے نہ رہ جائیں اور سارا میلہ صرف حزبِ اختلاف نہ لوٹ لے! تب حزبِ اختلاف اہلِ صحافت کے لیے مُرغِ باد نما ہوا کرتی تھی۔ مگر یہ بھی بہت پُرانی بات ہے۔ اب تو میڈیا والے طے کرتے ہیں کہ حزبِ اختلاف کو کس سمت چلنا چاہیے! لیجیے، قِصّہ ہی ختم ہوگیا۔ پہلا غم تو یہ ہے کہ اب حقیقی معنوں میں حزبِ اختلاف رہی نہیں۔ اقتدار کی سَرکار میں پہنچ کر سبھی ایک ہوگئے ہیں۔ سب نے اپنے اپنے حصے بانٹ لیے ہیں۔ جو چھوٹے موٹے ہوا

کرتے تھے اُنہیں دو چار ہڈیاں ڈال کر چپ کرادیا گیا ہے۔ بُھولے بھٹکے اگر کوئی ایک آدھ گروپ محروم رہ جاتا ہے تو وہ میڈیا کے ذریعے تھوڑا بہت شور مچاتا ہے تاکہ بندر بانٹ کرنے والوں کو خیال آجائے اور اُس کی محرومی بھی ختم ہو۔

دنیا بھر میں ہوتا یہ ہے کہ حزبِ اختلاف کسی معاملے پر کَمر کَس کر میدان میں نکلتی ہے تو میڈیا والے ساتھ ہولیتے ہیں۔ ہمارے ہاں معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ حزبِ اختلاف والے اخبارات اور نیوز چینلز پر نظر رکھتے ہیں اور جو رجحان خبروں میں چل رہا ہو اُسی کے مطابق چلتے ہیں۔ یعنی مُدعی سُست، گواہ چُست!

آپ نے وہ کہانی تو سُنی ہی ہوگی کہ ایک صاحب اپنے گھر میں پلنے والی بلی سے بہت پریشان تھے۔ کئی بار پکڑ کر دو تین گلیاں دور چھوڑ آئے مگر وہ ہر بار واپس آ گئی۔ ایک دن بلی کو تھیلے میں بند کرکے گھر سے دس پندرہ میل دور لے گئے اور وہاں چھوڑ دیا۔ مگر پھر رستہ بھول گئے اور بلی کے پیچھے پیچھے چلتے چلتے گھر پہنچے!

پاکستان میں میڈیا اور حزبِ اختلاف کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اب حزبِ اختلاف والے میڈیا کی بلی کے پیچھے پیچھے چلتے چلتے گھر تک واپس آتے ہیں! ع

!بات تو سچ ہے مگر بات ہے رُسوائی کی

نپولین بونا پارٹ نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا مگر ہمارے ہاں یار لوگ اُسے کچھ زیادہ ہی سچ ثابت کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ تلوار تو زخم لگا کر چھوڑ دیتی ہے یا مار ڈالتی ہے۔ میڈیا کا معاملہ یہ ہے کہ جس کی گردن کٹتی ہے وہ پھر زندہ ہو کر ''گردن کٹائی'' کا مزا لینا چاہتا ہے! ''بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟'' کے اُصول کی بنیاد پر لوگ اب !میڈیا والوں کے معتوب ٹھہرنے میں بھی لطف لینے لگے ہیں

بہت سوں کو شکایت رہتی ہے کہ پاکستان میں میڈیا والے بے لگام ہو گئے ہیں۔ مگر اِس بے لگامی میں بھی تو بہت سوں کا فائدہ ہی ہے۔ پاکستان میں اخبار کو تلوار بنانے والے اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ اِس تلوار سے اپنی مرضی کے ذبیحے کرتے پھریں۔ بیشتر معاملات میں میڈیا والے محض مجبور ہوتے ہیں۔ وہ سیدھے راستے پر چلنا چاہیں تو یاروں کو زیادہ گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اگر میڈیا سچ بولنا چاہے تو قدغن کا مرحلہ فوراً آ جاتا ہے۔ اسٹیک ہولڈرز نے اِس کا حل یہ تلاش کیا ہے کہ آپس کی لڑائی میں میڈیا کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔

کبھی کبھی خبروں کی ہانڈی میں مسالا تیز ہو جاتا ہے۔ اور کا نتیجہ ہانڈی کے بے ذائقہ ہو جانے کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ مگر صاحب، ہانڈی پر جو کچھ گزرتی ہے اُس سے کسی کو کیا غرض؟ سب کو چٹخارے کی پڑی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اخبار کو تلوار کی حیثیت سے استعمال کرنے سے قبل بہت کچھ سوچا جاتا تھا، عواقب کی فکر لاحق ہوا کرتی تھی۔ اب وہ وضع داری کہاں؟ جن کے ہاتھ میں اختیار ہے وہ میڈیا کو ہتھیار کی طرح ہاتھ میں لیکر میدان میں آ جاتے ہیں اور مخالفین کو زیرِ دام لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قوم یہ تماشا اِس قدر مگن ہو کر دیکھتی ہے کہ پھر کسی اور بات کا ہوش اُسے رہتا نہیں۔ پیٹ بھر جاتا ہے، نیّت نہیں بھرتی۔

یہ سب کچھ نیا نہیں۔ جب سے اخبارات کا اجرا ہوا ہے یعنی صحافت میدان میں آئی ہے تب سے اِسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ وہ لطیفہ تو آپ نے سُنا ہی ہوگا کہ ہٹلر جنّت کے دروازے پر پہنچا تو دربان نے پوچھا تم نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا ہے کہ جنّت میں داخل کئے جاؤ۔ ہٹلر نے اپنے "کارنامے" گنوانا شروع کیا۔ جنّت کے دربان نے کہا کہ تمہارا نامۂ اعمال تو کچھ اور بتا رہا ہے۔ اِس پر ہٹلر نے کہا۔ "فرشتوں کے لکھے پر مت جاؤ، میرے دور میں شائع ہونے والے جرمن اخبارات کا مطالعہ

!کرو''

حالات نے پاکستانی میڈیا کو اُس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں وہ اپنی مرضی سے سچ بول سکتے ہیں نہ جُھوٹ۔ اخبارات ہوں یا ٹی وی چینل، سب وہی راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں جس کی اُن سے فرمائش کی جائے۔ اطلاعات اور تفریح کو اِس طور خلط ملط کر دیا گیا ہے کہ سچ مکمل سچ ہے نہ جُھوٹ مکمل جُھوٹ۔ یہ گورکھ دھندا میڈیا کے حق میں ہے نہ قوم کے۔ اِسے عذاب ہی کی ایک صورت سمجھیے اور اللہ سے نجات کے طالب ہو رہیے۔

جنگل کا قانون؟

جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے اور جب جنگل کے نصیب میں ذِلّت اور بدنامی لکھ دی جاتی ہے تب اُس کا ذکر اِنسانوں کی گفتگو میں ہونے لگتا ہے! کراچی ہو یا کوئی اور شہر، جب بھی حالات کی خرابی کا ذِکر چِھڑتا ہے تب یہ کہا جاتا ہے کہ جنگل کا قانون نافذ ہوگیا ہے۔ کبھی آپ نے جنگل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا ہے؟ ہم شہر کے ماحول کی خرابی کو جنگل کے ماحول سے مشابہ تو قرار دیتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ اِس کے نتیجے میں بے چارے جنگل اور اہلِ جنگل کے دِل پر کیا گزرتی ہوگی!

جنگل، ظاہر ہے، جنگل ہے۔ وہ ایک الگ دنیا ہے۔ اُس دنیا کا سبھی کچھ کسی اور طرح کا ہے، منفرد ہے۔ شہروں نے جو شاندار "ترقی" کی ہے اُس کی تو ابھی تک جنگل کے ماحول کو ہوا بھی نہیں لگی۔ جو لوگ شہروں کے ماحول کو جنگل کے ماحول سے مشابہ قرار دیتے ہیں اُنہیں اپنی سوچ کے محدود ہونے کا ماتم کرنا چاہیے۔ جنگل کے جانور اب بھی آٹھ دس ہزار سال پہلے کے ماحول میں جی رہے ہیں۔

جنگلوں میں آج بھی بہت کچھ ایسا ہے جس پر جانوروں کو شرمندہ ہونا چاہیے اور ایسا بہت کچھ نہیں ہے جن کے ہونے ہی پر ''ترقی یافتہ'' اور ''مہذب'' ٹھہرائے جانے کا مدار ہے۔ ہزاروں برس کے عمل میں اِنسان کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے اور جانور وہیں کے وہیں رہ گئے ہیں۔ جانوروں کی دُنیا میں ایسا ہے ہی کیا جس کی بنیاد پر وہ فخر کریں؟ اِنسان چار پانچ ہزار سال پہلے جس دُنیا میں رہتا تھا وہ اب ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ ملے بھی کیسے، اِنسان ہر نقشِ کہن کو مٹانے کی بھرپور کوشش کرتا آیا ہے۔ ہزاروں سال کیا، سو سال پہلے کی دنیا بھی تلاش کیجیے تو دِماغ کا چُولیں ہلنے لگتی ہیں۔ اور دوسری طرف جانور ہیں کہ قدامت پرستی ترک کرنے کو تیار نہیں۔ اُن کی یہی سوچ بعض انسانوں میں بھی در آئی ہے۔ اِس پر اُن انسانوں کو جتنا ''فخر'' کرنا چاہیے اُس سے کہیں زیادہ جانوروں کو شرمندہ ہونا چاہیے کیونکہ اُن کی قدامت پرستی تو فطری، خالص اور بے لوث ہے جس کا کسی غرض سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں!

معاشرے میں جنگل کا قانون نافذ ہونے کا رونا رونے والے اپنی سوچ سے رجوع کریں۔ جنگل میں ہر معاملہ چند طے شدہ اور مُسلّمہ اُصولوں کا پابند ہوا کرتا ہے۔ اور اِدھر اِنسان آزاد پیدا ہوا ہے اور مرتے دم تک آزاد ہی رہتا

!ہے۔ قدرت نے اب تک اِنسانوں کو کسی پابندی کی توفیق نہیں بخشی

جنگل میں غار کم کم پائے جاتے ہیں مگر درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان بھی جانور غار کے زمانے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ پیٹ بھر جائے تو کوئی کسی کو خُوں خوار نظروں سے نہ دیکھے؟ پیٹ بھر چکا ہو تو شیر اپنے سامنے گھاس چَرتے ہوئے ہرن کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔

اِنسان کو اللہ نے ''دُور اندیش'' ذہن سے نوازا ہے۔ وہ آج سے زیادہ گزرے ہوئے اور آنے والے کل میں رہتا ہے، بالخصوص آنے والے کل میں۔ جنگل میں کوئی اپنی ضرورت سے بڑھ کر جمع نہیں کرتا، بلکہ جمع کرتا ہی نہیں۔ جانور یومیہ بُنیاد پر رزق تلاش کرتے ہیں۔ اُنہیں صرف مشقّت سے پیٹ بھرنا آتا ہے۔ کسی کو اِس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ کسی کے پاس کیا ہے۔ بوٹیاں نوچنے کا فن تو جانوروں کی سرشت میں ہوتا ہے مگر بوٹیوں پر لڑنا اُنہیں کم کم آتا ہے۔ شہروں میں اِنسانوں کے درمیان پلنے والی بِلّیاں بھی اب تک اپنی ''جنگلیت'' نہیں بُھول سکیں۔ اُن کے سامنے بوٹی ڈالیے تو بوٹی اُس کی جس نے جھپٹ لی۔ اور پھر وہ اطمینان سے بوٹی کے مزے اُڑاتی ہے اور دوسری اُس کا منہ تکتی رہتی ہیں۔ افسوس کہ ایک زمانے سے اِنسانوں کے درمیان !رہ کر بھی بِلّیوں نے کچھ نہیں سیکھا

جنگل میں کوئی کوئی کسی کے حق پر ڈاکا نہیں ڈالتا۔ کسی جانور کو کسی کے پلاٹ یعنی ٹھکانے پر قبضہ کرنے کی فکر لاحق نہیں رہتی۔ ذرا ''قدامت پرستی'' ملاحظہ فرمایئے کہ رہنے کے لیے جتنی جگہ درکار ہوتی ہے بس اُتنی ہی جگہ گھیرتے ہیں! اِس قناعت پسندی ہی کے باعث جانور اِتنے پیچھے رہ گئے ہیں کہ اُن میں ذخیرہ اندوزی اور بلیک مارکیٹنگ کا ہنر'' پایا ہی نہیں جاتا۔ اور ڈِھٹائی کی انتہا یہ ہے کہ ہم نے کسی جانور کو اِس ''خامی'''' !پر کبھی شرمندہ ہوتے نہیں دیکھا

جنگل میں بچے ماں باپ کا کہنا مانتے ہیں یعنی شام کا دُھندلکا پھیلتے ہی اپنے اپنے ٹھکانوں اور آشیانوں میں بند ہوجاتے ہیں۔ جنگل میں کسی جانور کا بچہ رات کے تین فون پر !فُضول گفتگو کرتا ہوا نہیں ملے گا

اِنسانوں نے پانچ چھ ہزار سال میں ایسے ایسے ٹرینڈز دیئے ہیں کہ جانور غور کریں تو جانور نہ رہیں، تجزیہ کار ہوجائیں۔ (اِس جُملے پر ہم شرمندہ ہیں، جانوروں سے!) جنگل میں رُجحان ساز روتے ے پائے ہی نہیں جاتے۔ بھتہ خوری ہے نہ اغوا برائے تاوان۔ کوئی جانور کیسا ہی خُوں خوار ہو، کرائے کے قاتل کی حیثیت سے کام نہیں کرتا۔

جانوروں میں اب تک سیاسی شعور پیدا نہیں ہوسکا۔

جنگل میں فرشتوں کا گزر نہیں کیونکہ وہاں سیاسی سرگرمیاں ہیں نہ جمہوری ادارے۔ لے دے کے بس ایک بندر میں ذرا سی ''جموریت'' پائی جاتی ہے کیونکہ شہر پہنچ کر وہ مداری کا ''بچہ جمورا'' بن جاتا ہے! جنگل کے جانوروں کو اب تک معلوم نہیں الیکشن کیا ہوتے ہیں اور کیسے چُرائے جاتے ہیں۔ اور یہ کہ جمہوریت کے نام پر آمریت کیسے متعارف کرائی اور پروان چڑھائی جاتی ہے۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہے مگر اُسے اب تک پردہ داری نہیں آئی۔ اپنی چودھراہٹ بے پردہ ہو کر نافذ کرتا ہے، جمہوریت وغیرہ کا سہارا لے کر اُسے دِل کش نہیں بناتا!

جانوروں کی ''بے شعوری'' کا یہ عالم ہے کہ اُن میں مُنافقت ہوتی ہے نہ پوشیدہ عزائم۔ محض خوشامد سے کام نہیں چلتا۔ چاپلوسی کرنے والوں کو پیٹ بھر نہیں ملتا یعنی کام سب کو کرنا پڑتا ہے۔ گویا جنگل میں امریکن سسٹم کے تحت زندگی بسر کی جاتی ہے۔ (ہمیں اندازہ نہیں کہ امریکیوں سے تشبیہ دیئے جانے پر جانور متعرض ہوں گے یا مطمئن!)

جنگل میں چونکہ اب تک تعلیم دینے کے لیے ادارے بنانے کا رواج پروان نہیں چڑھا اِس لیے وہاں دُہرا معیار بھی نہیں پایا جاتا۔ کوئی جانور انگریزی میں گِٹ پِٹ کرکے ''ماں بولی'' میں بات کرنے والوں کا تمسخر نہیں اُڑاتا۔ جب

ذہنی سطح اِتنی "پست" ہو تو جانور کیا خاک ترقی کریں گے؟ یہی سبب ہے کہ وہ اب تک "ترقی پاس" قسم کی زندگی بسر کر رہے ہیں!

جانوروں نے اِنسانوں کے لیے ایک نفسیاتی مسئلہ پیدا کیا ہے۔ وہ خود کو بدلتے ہیں نہ ماحول بدلنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہزاروں سال پہلے کی دُنیا کو اصل حالت میں برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بے چارے اِنسان رات دن کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش میں جُتے رہتے ہیں۔ وہ حالات کو قبول بھی نہیں کرسکے اور بدل بھی نہیں پائے۔ جانوروں نے خود کو بدلنے کی کوشش ہی نہیں اِس لیے "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" جیسی کیفیت سے اب تک محفوظ رہے ہیں! خود نہ بدل کر اور حالات سے مطمئن رہ کر جانوروں نے اِنسان کے لیے شدید مخمصہ پیدا کیا ہے۔

اِنسان آج بھی اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کی کچھار میں ہے۔ علم و فن کی بلندیوں کو چُھو کر بھی وہ جہالت سے غار سے باہر نہیں آسکا۔ جُھوٹی اَنا، مفاد پرستی، مکّاری، چَھل کَپٹ، لالچ، خود غرضی، بے حِسی، بے دِلی، بے دماغی، بے نگاہی اور دوسرے کتنے ہی گڑھے ہیں جن میں وہ آج بھی گِرا ہوا ہے۔ پانچ ہزار سال کی معلوم دانش بھی اِنسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔

اچھا تھا کہ اِنسان جنگل کا بغور مُشاہدہ کرکے جانوروں ہی سے کچھ سیکھ لیتا۔ اِس دُنیا سے بے سیکھا تو نہ جاتا۔

اُمید ہے کہ اِن گزارشات کی روشنی میں وہ لوگ اپنی سوچ سے رجوع کریں گے جو بات بات پر کہتے ہیں کہ معاشرہ جنگل کے قانون کے مطابق چل رہا ہے یا چلایا جا رہا ہے۔ بے زبان جانوروں پر اِتنا بڑا بہتان تراشنا ہم اِنسانوں کو زیبا نہیں!

دِل جلانے کی بات کرتے ہو!

خاکسار نے 1981 میں ہندوستان کے مشہور شاعر کرشن موہن کو خط لکھا جس میں اُن سے آٹو گراف کی فرمائش کی۔ جواب میں اُنہیں جو خط لکھا اُس میں اپنے مجموعۂ کلام ''کمل کامناکے'' میں سے ایک قطعہ بھی شامل کیا جو کچھ یوں تھا۔

جلوہ ہائے شباب کھو ہی گئے
اپنے جذباتِ شوخ سو ہی گئے
کرشن موہن ! ہے من اُداس کہ ہم
ہوتے ہوتے بزرگ ہو ہی گئے

تب یہ خاکسار جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا۔ ایسے میں کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ ہوتے ہوتے بزرگ ہونا کیا ہوتا ہے۔ جوانی اپنے آپ میں ایک دُنیا ہوتی ہے۔ پھر بھلا کوئی کسی اور دُنیا کے بارے میں سوچے بھی کیوں؟

تین عشرے یُوں گزرے کہ کچھ پتا ہی نہ چلا۔ بیسویں صدی کے آخری اور اکیسویں صدی کے ابتدائی ماہ و سال اِس تیزی سے گزرے کہ ہوش اُسی وقت آیا جب ہوش آیا۔

خیر، عہدِ جوانی کے گزر جانے پر بھی کون یقین کرنا چاہتا ہے کہ عمر کی شام ہونے کو آئی ہے، سُورج ڈھل رہا ہے۔ جوانی وہ مَے ہے جس کا نشا اُترنے پر بھی لوگ اُس کی یادوں سے مخمور رہنا چاہتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ ایسا پلٹا ہے اور سب کچھ ایسا تلپٹ ہوا ہے کہ ہمیں بس میں سیٹ آسانی سے مل جاتی ہے۔ آپ سوچیں گے یہ کیا بات ہوئی، یہ بس کی سیٹ کا ذکر کہاں سے ٹپک پڑا؟ بات یہ ہے جناب کہ ہم تو یہ باور کرنے کو تیار ہی نہ تھے کہ پُلوں کے نیچے سے پانی اچھا خاصا بہہ چکا ہے اور آں جہانی کرشن موہن والی بات ہم پر بھی صادق آنے لگی ہے۔ یہ تو لوگوں کی مہربانی یعنی سِتم ظریفی ہے کہ ہمیں بار بار یاد دلاتے ہیں کہ عہدِ جوانی رُخصت ہوا چاہتا ہے اور بُزرگی اب کایا کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اب ہم جیسے ہی بس میں سوار ہوتے ہیں، کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ ہمارے سَر پر بُزرگی کا تاج رکھ دیتا ہے یعنی اپنی سیٹ چھوڑ کر ہمیں بیٹھنے کی دعوت دیتا ہے! بات تو بہت اچھی ہے کہ کوئی ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ کو سیٹ پیش کرے۔ پچیس تیس سال پہلے ہم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ اب جب بھی کوئی ہمیں سیٹ

پیش کرتا ہے تو ہم اُس کا شکریہ تو ادا کرتے ہی ہیں مگر ساتھ ہی دِل پر چُھری سی چل جاتی ہے۔ کیوں نہ چلے؟ بھری بس میں آسانی سے سیٹ کا ملنا گویا اِس امر کا اعلان ہے کہ اب بُڑھاپے کا خیر مقدم کرنے کی گھڑی آن پہنچی ہے!

سیٹ ملنے کی خوشی اُس وقت کافور ہو جاتی ہے جب کوئی نوجوان ہمیں دیکھ کر اپنی سیٹ سے اُٹھتے ہوئے کہتا ہے۔ ''بابا جی، یہاں بیٹھ جائیں۔'' اِسے کہتے ہیں بکری نے دودھ دیا مگر مینگنیاں ڈال کر! حسرت سی ہے کہ کوئی یہ کہتے ہوئے سیٹ پیش کرے کہ بھائی صاحب! یہاں بیٹھ جایئے۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ فی زمانہ ''بھائی'' کوئی ایسا منصب نہیں جو خوشی خوشی لیا یا دیا جائے!

صفدر آباد (ضلع شیخوپورہ) سے تعلق رکھنے والے نوجوان ثمران احمد ہمارے باقاعدہ قارئین میں سے ہیں۔ وہ آئے دن ہمیں ای میل کے ذریعے فیڈ بیک دیتے رہتے ہیں۔ ثمران احمد ایم فل کر رہے ہیں اور پڑھاتے بھی ہیں۔ اچھا ہے کہ مرزا تنقید بیگ کو ثمران احمد کا پتا نہیں ورنہ اُنہیں ورغلاتے کہ پڑھائی پر توجہ دو، ہر ایرے غیرے کا کالم پڑھنے سے گریز کیا کرو! مرزا کو جب بھی ہمارا کوئی قاری ملتا ہے وہ اُسے ورغلا کر ہمارا کالم پڑھنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ ہماری کمپنی کی مشہوری'' کو نقصان''

پہنچانے کی نیت سے کی جانے والی مرزا کی باتیں ہمیں کبھی کبھی اِتنا متنازع بنا دیتی ہیں کہ فریقِ ثانی متجسس ہو کر پہلے بھی زیادہ توجہ اور شوق سے ہمارا کالم پڑھنے لگتا ہے! مرزا ہمارے بارے میں خواہ کچھ کہتے پھریں، ہم نہیں روکتے۔ کیوں روکیں؟ ع

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟

ثمران احمد کا تازہ برقی نوازش نامہ ملا تو ہم مخاطب کرنے کے انداز ہی میں اُلجھ کر رہ گئے۔ ثمران احمد کو پتا نہیں کس نے ورغلایا کہ اچھے خاصے طریق کو چھوڑ کر زمانے کی روش پر چل پڑے ہیں۔ پہلے وہ ہمیں ''ڈیئر سر'' یا پھر ''مائی ڈیئر خان صاحب'' کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ یہ اندازِ تخاطب ہمارے جسم میں ایک آدھ کلو خُون بڑھا دیتا تھا۔ اِس بار ثمران احمد نے ہمیں ''مائی ڈیئر انکل خان صاحب'' کے الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ یہ جملہ ہمیں ایسا آکر لگا ہے جیسے گلو بٹ نے کسی گاڑی کے شیشے پر پولیس کا بخشا ہوا ڈنڈا دے مارا ہو! جس سے محبت کے اظہار کی توقع تھی اُس نے بھی حسبِ توفیق تابوتِ جوانی'' میں ایک بڑی سی کیل ٹھونک دی! ثمران احمد نے انکل کا خطاب تو'' ایسی روانی سے دیا ہے جیسے دریا اپنی روانی میں سبھی کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ ع

دریا کو اپنی موجوں کی طُغیانیوں سے کام

کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ گویا فریقِ ثانی un-kal کو uncle بہت سے لوگ لفظ سے کہا جارہا ہو کہ جناب آپ کا زمانہ لَد گیا۔ یعنی آج ہی آج کی بات ہے، آپ کے لیے کوئی کل نہیں بچا! اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ ثمران احمد کی نیت کیا تھی۔ ہمارے کالم کو سراہتے ہوئے کبھی کبھی وہ ایسے جملے لکھتے ہیں کہ گمان ہونے لگتا ہے ہم واقعی بڑے لِکھاری ہوگئے ہیں! مگر صاحب، یہ کیا؟ ہماری تحریر کو جوان قرار دینے والے نے ہمیں انکل" کی دہلیز پر لا کھڑا کیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ ہم مہینے میں دو بار کسی مشہور کمپنی کے" ہیئر کلر کی مدد سے جوانی کا کھونٹا مضبوط کرتے رہتے ہیں تاکہ بڑھاپے کی ہوا ہمیں اُڑا کر نہ لے جائے۔

جو لوگ ہمیں بزرگ قرار دینے پر تُلے رہتے ہیں اُنہی سے شہہ پا کر دفتری ساتھی اور چند احباب بھی بالوں کی سیاہ رنگت اور باقی پورے وجود کا موازنہ کرنے کے بعد کہتے ہیں۔ "تھوڑا سا خرچہ تو ہوگیا لیکن چلیے، چیز تو اچھی بن گئ!"

خدا جُھوٹ نہ بُلوائے (!)، ہمیں کوئی شوق نہیں خود کو جوان کہلوانے کا۔

ہماری جوانی کے معیار کا اندازہ لگانے کے لیے ہماری تحریر ہی کافی ہے۔ (کہنے میں کیا ہے!) مگر صاحب! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بات بات پر اِنسان کو یاد دلایا جائے کہ بُڑھاپے کی منزل آچکی ہے یا آیا چاہتی ہے۔ عمر چُھپانے یا نہ بتانے کے معاملے میں لوگ خواتین کو خواہ مخواہ بدنام کرتے ہیں۔ اچھی خاصی بڑی عمر کے مَرد بھی ہمارے سامنے ''ننھے کاکے'' بن جاتے ہیں اور اِس حرکت پر شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ ہم سے دس سال بارہ سال بڑا شخص بھی سڑک پر ہمارے نزدیک سے گزرتے ہوئے کہتا ہے۔

''انکل! ذرا سنبھل کے۔''

پہلے ہم سوچا کرتے تھے کہ شاید ہم کسی گئی گزری کمپنی کا ہیئر کلر استعمال کرتے ہیں جس کے نتیجے میں لوگ ہمارے بالوں کی اصلیت تک پہنچ کر ہماری عمر کا سُراغ پا لیتے ہیں۔ احباب کے مشورے پر ہیئر کلر اور ہیئر ڈریسر دونوں کو بدل کر دیکھ لیا۔ کچھ افاقہ نہ ہوا۔ اب خیال آتا ہے کہ سوال ہیئر کلر بدلنے کا نہیں، (لوگوں کی) کھوپڑی یعنی سوچ بدلنے کا ہے۔ اب لوگوں کی سوچ بدلنے کے بکھیڑے میں کون پڑے؟ اِس جھمیلے میں تو عمر گزر جائے گی اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اِنسان کی سوچ کہاں بدلتی ہے؟ مرزا تنقید بیگ دس برس سے کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارا لکھنا چُھڑوا دیں۔ طنز کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مگر وہ طنز سے باز آئے نہ ہم نے لکھنا چھوڑا۔

کبھی کبھی جی میں آتا ہے کہ جو لوگ ہمیں ابھی سے انکل اور بزرگ قرار دینے پر تُلے ہیں اُنہیں باری باری اپنے کالم میں اُسی طرح رَگڑ ادیں جس طرح فوج میں رنگروٹوں کو دیا جاتا ہے۔ مگر ہم آخر کس کس کو رَگڑا دیں گے؟ فی الحال ثمران احمد پر اکتفا کرتے ہیں۔ اُمید ہے کہ دوسروں کی نصیحت کے لیے اِتنا ہی کافی ہوگا۔ دوستو! اگر پھول نہیں بھیج سکتے تو نہ بھیجو، بات بے بات یہ ''انکلیت'' کا کانٹوں بھرا تاج تو ہمارے سَر پر نہ دھرو کہ ابھی تو ہم جوان ہیں!

اینٹ کا جواب دیوار؟

ایک طرف ملک کے بیشتر علاقے شدید گرمی کی لپیٹ میں ہے اور دوسری طرف اہلِ سیاست نے بھی طے کرلیا ہے کہ اہلِ وطن کو سیاسی سرگرمیوں سے جُھلسا کر دم لیں گے۔ سیر کا جواب سوا سیر سے دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ طے یہ پایا ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا زمانہ چونکہ لَد گیا ہے اِس لیے اب اینٹ کا جواب دیوار سے دیا جائے تاکہ جوابی کارروائی کا نشانہ بننے والے کو بھی سَواد آ جائے!

پیپلز پارٹی کے آخری دن اور نواز حکومت کا ابتدائی زمانہ خاصی مماثلت رکھتا ہے۔ دونوں پر ڈاکٹر طاہر القادری کا خاص کرم رہا ہے۔ انتخابات سے چار ماہ قبل ''نامعلوم'' حلقوں سے اشارے، بلکہ شہہ پاکر طاہر القادری نے اسلام آباد پر دھاوا بولا اور انقلاب کے نام پر خدا جانے کون سے ایجنڈے کی تکمیل کی کوشش کی۔ جنوری 2013 میں آصف علی زرداری صدر تھے اور حکومت پیپلز پارٹی کی تھی۔ سابق صدر کی سمجھ میں معاملہ آگیا اور اُنہوں نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ پاکستان عوامی تحریک کے کارکنوں کو روکنے کی کوشش مزید خرابی پر منتج ہوتی۔ اسلام آباد کے ڈی چوک میں 35، 40

ہزار افراد جمع ہوئے۔ ان میں خواتین اور بچے بھی بڑی تعداد میں تھے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ہر طرف کی کارروائی سے مجتنب رہنے کو کہا گیا۔ نتیجہ سب نے دیکھا کہ انقلاب برپا کرنے کے عزم کے ساتھ میدان میں اُترنے والے طاہر القادری چند انتہائی معمولی نوعیت کے مطالبات منوا کر کنٹینر سے باہر آ گئے اور تماشا ختم ہو گیا۔ ابھی نواز حکومت نے سامان کھولا ہی ہے کہ اُسے ہٹانے کی بھرپور تیاریاں اظہر من الشمس ہو چلی ہیں۔ عمران خان خیبر پختونخوا میں حکمرانی کا موقع ملنے پر بے ذہنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چار حلقوں کی دھاندلی کا رونا رو رہے ہیں۔ لوگ حیران ہیں کہ جب ایک صوبے کی حکمرانی مل ہی گئی ہے تو اُس پر توجہ دی جائے تاکہ آئندہ الیکشن میں لوگوں کے سامنے کوئی تو مثال ہو جس کی بنیاد پر وہ تحریکِ انصاف کو ووٹ دے سکیں۔ مگر شاید عمران خان اُن کے دباؤ کے آگے بے بس ہیں جن کے کاندھوں پر وہ یہاں تک پہنچے ہیں۔

یہ بات بہت حیرت انگیز ہے کہ طاہر القادری نے انتخابی عمل میں حصہ ہی نہیں لیا تو پھر وہ سسٹم کو بدلنے کی بات کس بنیاد پر کر رہے ہیں۔ وہ ایک طویل مدت تک ملک سے باہر رہے ہیں۔ ملک کے بیشتر معاملات سے اُن کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ایسے میں پاکستان کے لیے اُن کی طرف سے دردمندی کا اظہار بہت

عجیب لگتا ہے۔ اور اب تک یہ بھی واضح نہیں کہ جب وہ انتخابی عمل ہی پر یقین نہیں رکھتے تو پھر ملک میں کون سی تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ جنوری 2013 میں ڈاکٹر طاہرالقادری نے جو تماشا دکھایا تھا اُس کی غایت سمجھنے سے لوگ اب بھی قاصر ہیں۔ جب کچھ مقصود تھا ہی نہیں تو سمجھ میں کیا آئے۔ سبھی نے محسوس کیا کہ کچھ خرابی پیدا کرنی تھی، تھوڑی سی ہلچل مچانی تھی، اہلِ وطن کو کچھ اضطراب میں مبتلا کرنا تھا، تھوڑا سا انتشار برپا کرنا تھا، انتخابی عمل کو ''حسبِ ذائقہ'' متنازع فیہ بنانا تھا۔ اگر یہ مقصود تھا تو کسی حد تک حاصل ہو کر رہا۔

مگر اب کیا ہے؟ ایک منتخب حکومت نے ابھی ابھی تو سامان کھولا ہے۔ انتخابی عمل میں کارکردگی کی بنیاد پر فیصلے ہوتے ہیں۔ مگر جناب! کارکردگی کی گنجائش تو چھوڑی جائے۔ ہر جماعت میں خرابیاں ہیں۔ ن لیگ بھی خرابیوں اور خامیوں سے مُبرّا نہیں۔ مکمل پاک بازی کا دعویٰ تو کوئی بھی جماعت نہیں کر سکتی مگر جب بیلٹ باکس کے ذریعے عوام نے فیصلہ سُنا دیا تو کسی کو معترض ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ن لیگ کی حکومت بھی عوام کی امنگوں اور اُمیدوں کے مطابق نہیں مگر اُس کی منتخب حیثیت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ن لیگ کے ساتھ ''آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے'' والا گیم کرنے

کی کوشش کی جارہی ہے۔ عوام دم بخود ہیں۔ وہ تو بنیادی ضرورت کی اشیاء کے حصول کی کوششوں میں ایسے پھنسے ہیں کہ کچھ کرنا تو دور رہا، سوچنے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہے!

ن لیگ کے لیے یہ فیصلے کی گھڑی ہے۔ اُسے کچھ کرکے بھی دکھانا ہے اور اپوزیشن کو کنٹرول بھی کرنا ہے۔ پیپلز پارٹی کی طرف سے تو اُسے زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے۔ اپوزیشن لیڈر بھی صرف بیانات کی حد تک ہی تنقید کرتے ہیں۔ دونوں بڑی جماعتوں کے درمیان معاملات مفاہمت کی سیاست کی طرز پر چلائے جارہے ہیں۔ چند چھوٹی جماعتیں پُراسرار طور پر معاملات کو اُلجھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ بھی طے ہے کہ جو گڑھا وہ دوسروں کے لیے کھود رہی ہیں اُس میں خود بھی گریں گی۔ پاکستان کی سیاست میں ایسا تو ہوتا ہی آیا ہے۔

قادری فیکٹر سے نمٹنے کے معاملے میں ن لیگ نے اب تک دانش مندی کا ثبوت فراہم نہیں کیا ہے۔ لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں جو کچھ ہوا وہ بالیقین پنجاب حکومت کی مرضی کا آئینہ دار نہیں۔ پوری کوشش کی گئی کہ معاملات زیادہ سے زیادہ بگڑیں۔ اور بگڑے۔ ن لیگ کو اس معاملے میں پیپلز پارٹی سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ آصف زرداری نے گزشتہ برس جس عمدگی سے قادری فیکٹر کو

کنٹرول کیا اور اُس کا جوش و جذبہ ٹھنڈا کیا وہ قابلِ دید بھی تھا اور قابلِ داد بھی۔ ن لیگ کے لیے بھی اِس بار اقتدار آخری موقع جیسا ہے۔ جنھوں نے طے کر رکھا ہے کہ جمہوریت کو چلنے نہیں دینا وہ تو اپنا کام کرکے ہی دم لیں گے۔ سوال اُن کی کارکردگی پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپشنز کو بھی توبروئے کار لانے کا ہے۔ مفاہمت کی سیاست کافی نہیں، جمہوریت کے مخالفین کو لگام دینا بھی تو اولین ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے۔

ملک کے حالات اور اُن کی نزاکت کو یکسر نظر انداز کرکے جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ کسی بھی لحاظ سے قوم کے مفاد میں نہیں۔ جمہوریت کا سفر، خواہ کسی شکل میں، جاری رہنا چاہیے۔ آرڈر پر مال تیار کرنے والے حکومت کے خلاف لنگوٹ کَس کر میدان میں آگئے ہیں۔ جس جس کو جتنا حکم ملتا جاتا ہے وہ اُتنا کردار ادا کرتا جاتا ہے۔ گڈ گورننس کا مطالبہ کرکے حکومت کے خلاف دھما چوکڑی مچانے والے یہ بتانا پسند کریں گے کہ عوام سے مینڈیٹ پانے والوں کی راہ میں روڑے اٹکا کر قوم کی کون سی خدمت کی جا رہی ہے۔ ایک سال قبل معرض وجود میں آنے والی حکومت کی بساط لپیٹ کر قوم کو کس مقام تک پہنچایا جا رہا ہے؟ اگر مڈ ٹرم الیکشن ہوئے تو اِس بات کی ضمانت کون دے گا کہ ہر اعتبار سے شفاف پولنگ ہوگی اور عوام کی حقیقی نمائندہ حکومت ہی تشکیل پائے گی؟

ڈھائی عشروں کے دوران ن لیگ نے حکمرانی کا مزا خوب چکھا ہے۔ اب اُس کے لیے حقیقی امتحان کی گھڑی آئی ہے کہ حکمرانی کی راہ میں روڑے اٹکانے والوں سے خوش اسلوبی سے کس طرح نمٹا جائے۔ ن لیگ اور پیپلز پارٹی سمیت جو بھی جمہوریت کا کھونٹا مضبوط کرنا چاہتے ہیں اُنہیں رکاوٹیں دور کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ جمہوریت کسی بھی دور میں پکے پکائے حلوے کی طرح نہیں تھی۔ اب بھی نہیں ہے۔ جو عوام کی نمائندگی کے دعویدار ہیں اُنہیں کچھ ڈیلیور بھی کرنا ہے، بہتر حکمرانی کا مظاہرہ بھی کرنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مخالفین کی غیر ضروری معاندت کو غیر موثر بھی بنانا ہے۔ ن لیگ کو قادری فیکٹر اور اِسی نوعیت کی دیگر مشکلات سے خندہ پیشانی کے ساتھ نمٹنا ہوگا۔ اینٹ کا جواب دیوار سے دینے کی کوشش بہتر حکمرانی کی راہ میں مزید مشکلات پیدا کرے گی۔ اشارے پاکر، ایجنڈے کے تحت کام کرنے والے تو یہی چاہتے ہیں کہ اُن سے سختی سے نمٹا جائے تاکہ ری ایکشن میں صورت حال ابتر کرنے کا موقع ہاتھ آئے۔ اگر اینٹ کے جواب میں پھول پیش کرنے کی گنجائش نہ بھی ہو تو کم از کم اِتنا تو یقینی بنایا جائے کہ اینٹ کے جواب میں اینٹ نہ ماری جائے۔

کچن آف لائن

ایک زمانہ تھا جب خواتین خانہ واقعی خواتین خانہ ہوا کرتی تھیں۔ یہ تب کی بات ہے کہ جب ٹی وی چینلز کی دُنیا کا آتش جوان نہیں تھا۔ زمانہ ایسا بدلا ہے کہ اب خواتین کو کھانا پکانے سے زیادہ فکر اِس بات کی لاحق ہوتی ہے کہ گھسی پِٹی ڈش کو بھی اِس طرح کیسے تیار کریں کہ شوہر (اپنی انگلیاں) چاٹتے رہ جائیں! اِس فکر نے جِدّت طرازی کا ایسا بازار گرم کیا ہے کہ اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کھائیں اور جو کچھ کھائیں اُسے کیسے ہضم کر پائیں۔

ابھی کل تک ملک کی حالت یہ تھی کہ خواتین سیانی ہوتے ہی ماں یا بڑی بہن سے جو کچھ پکانا سیکھا کرتی تھیں اُسی پر اکتفا کرتی تھیں اور شوہروں کو زیادہ آزمائش میں نہیں ڈالتی تھیں! مگر اِس دور میں کون سا اچھا دور زیادہ دن رہا ہے جو یہ دور سلامت رہتا۔ نصیب میں لکھا تھا کہ خواتین کو نئے سِرے سے کھانا پکانا سکھایا جائے اور کھانے بھی ایسے کہ جن کا سِرا ڈھونڈے سے نہ ملے! اب حالت یہ ہے کہ خواتین ٹی وی پر مختلف ڈِشوں کی تراکیب نوٹ کرکے کچن میں مسالوں سے ڈِھشُم ڈِھشُم کرتی ہیں اور اُن کے تجربات کا نتیجہ گھر کے تمام افراد کو بھگتنا پڑتا ہے۔

ہم نے کئی بار اہلیہ کو ٹوکا ہے کہ ٹی وی پر پیش کی جانے والی تراکیب نوٹ کرکے کچھ نہ پکایا کریں کیونکہ اب ہمارے صبر کی حد آچکی ہے، پیمانہ لب ریز ہوچکا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے شوہروں کی طرح ہم بھی گھر کے سکون کی خاطر ہر وہ چیز خوشی خوشی کھا لیتے ہیں جسے پہلی بار پکایا گیا ہو۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ ایسے لمحات میں کیا جانے والا صبر ہی شاید ہمیں جنّت میں داخلے کا حقدار بنائے گا!

ایک دن ہم نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ ٹی وی پر کوئی کوکنگ ایکسپرٹ آلو گوشت پکانا سکھا رہی تھی اور اہلیہ بہت انہماک سے آلو گوشت کی ڈِش تیار کرنے کے مختلف مراحل دیکھ رہی تھیں۔ ہم نے حیران ہوکر پوچھا کہ آپ کو آلو گوشت پکانا آتا تو ہے پھر اِس میں نیا کیا ہے جو اِس قدر انہماک سے دیکھا جارہا ہے۔ اہلیہ نے ”جواب عرض ہے“ کے طور پر فرمایا کہ ہے تو آلو گوشت ہی مگر محترمہ نئے طریقے سے سکھا رہی ہیں۔ ہم نے پوچھا نیا طریقہ کون سا ہے۔ جواب ملا کہ گوشت کو ذرا سا کچّا رکھا جارہا ہے کہ ذائقے میں نئی بات (!) پیدا ہو۔ ہم نے مزید حیران ہوکر اہلیہ کو یاد دلایا کہ ٹی وی چینل کی کوکنگ ایکسپرٹ نے کون سا کمال کیا ہے۔ یہ کمال تو آپ تقریباً روز ہی دکھاتی ہیں!

اہلیہ نے خشمگیں نظروں سے ہمیں گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''کون سا کمال ہے جو میں روز دکھاتی ہوں؟''

ہم نے انجان بننے کی عمدہ اداکاری کرتے ہوئے کہا کہ آپ جو کچھ پکاتی ہیں اُس میں ایک آدھ آنچ کی کسر رہ جاتی ہے مگر اب شکایت اِس لیے نہیں کرتے کہ ایک تو ہم عادی ہو چکے ہیں اور دوسرے یہ کہ اب ہمیں اِس میں لُطف آنے لگا ہے! اگر کبھی کوئی چیز تمام بین الاقوامی یعنی خاندان و برادری کے معیارات کے مطابق پک جائے تو خاصی اجنبیت محسوس ہوتی ہے!

یہ سُن کر اہلیہ کا پارہ چڑھ گیا۔ اُنہوں نے کریلوں کی کھال اُتارنے کا عمل موقوف رکھتے ہوئے زبان کی چُھری سے ہماری کھال اُتارنے کا آغاز کیا! ہم نے سمجھایا کہ بات ہرگز وہ نہیں جو آپ کی سمجھ میں آئی ہے بلکہ ہم تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ گھر کی آبرو برقرار رکھنے کے لیے اب ہم ہر اُس چیز کو کُھلے دِل سے تسلیم اور قبول کرتے ہیں جو آپ کے ہاتھوں سے پک کر ہم تک پہنچے۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ آلو گوشت جب پکانا آتا ہی ہے تو پھر خواہ مخواہ تجربات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا ضروری ہے کہ کسی اچھی خاصی ڈِش کو تجربات کی نذر کرکے لذّت سے محروم کیا جائے؟

ہم نے یاد دلایا کہ ٹی وی چینلز تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی سوغات ہیں۔ جب یہ آن لائن آپائیں نہیں تھیں تب بھی تو گھریلو خواتین کھانا پکایا ہی کرتی تھیں۔ اور اُن کا کتابوں میں لکھی ہوئی ترکیبوں پر کم ہی انحصار تھا۔ یہی سبب ہے کہ شوہروں اور بچوں کو کچھ ڈھنگ کی ڈِشیں مل جایا کرتی تھیں!

ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جب ہمارے جوان ہونے تک ٹی وی چینلز کی بھرمار نہیں ہوئی تھی یعنی جو کچھ ہماری ماں نے ہماری خالہ یا نانی سے سیکھا تھا اُسی پر اکتفا کیا اور جب تک ہاتھوں دَم رہا، اچھا کھلایا۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اگر اُن کے دور میں ٹی وی چینلز آ گئے ہوتے تو کیا وہ آن لائن کچن سے عجیب و غریب ڈِشوں کی ترکیبیں سیکھ کر ہم پر تجربے کرتیں۔ ہمارا خیال ہے کہ کوئی بھی ماں اِتنی سَفّاک نہیں ہو سکتی کہ کھانا پکانے کے نام پر اپنی اولاد کا صبر آزمائے! مگر پھر خیال آتا ہے کہ آج کل کی خواتین بھی تو مائیں ہیں۔ خُدا جانے یہ کیسی مائیں ہیں! آن لائن کچن نے گھر کے اچھے خاصے کچن کو آف لائن کر دیا ہے۔

ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ زمانہ learn یعنی سیکھنے کا ہے۔ اور اِس سے بھی بڑھ کر relearn یعنی نئے سِرے سے اور مزید سیکھنا ہے۔ مگر اِن دونوں مراحل سے گزرنے سے بہت پہلے آپ کو unlearn

کی منزل سے گزرنا ہے۔ جو کچھ بہت پہلے سے بلکہ عشروں سے یکھا ہوا ہے یعنی جو بُھوسا دِماغوں میں بھرا ہوا ہے اُسے نکال پھینکنا ہے۔ ہمارا خیال ہے ٹی وی چینلز نے خواتین کے دِماغوں سے بُھوسا نکال پھینکنے کا ٹاسک سنبھال لیا ہے۔ جو کچھ بڑی بوڑھیوں نے سِکھایا تھا اُسے ذہن سے کُھرچ پھینکنے کے لیے خواتین انتہائی بے تاب دکھائی دیتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ بعض اوقات تو اُمورِ خانہ داری کی کوئی ماہر مِنی اسکرین پر خواتین خانہ کو قالین سے دُھول نکالنے کا ہُنر بھی سِکھا رہی ہوتی ہیں! برتنوں کو صاف رکھنے اور چمکانے کے اِتنے ٹوٹکے ٹی وی چینلز پر پیش کئے جاتے ہیں کہ برتن اگر جان لیں تو حیرت کے مارے جان دے دیں!

کچن آن لائن کی وباء نے زندگی کو آسانی سے محروم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ٹی وی پر پیش کی جانے والی ترکیبوں کی روشنی میں تیار کی جانے والی ایسی ایسی چیزیں کھانے کو ملی ہیں کہ ہمارا دِماغ پک گیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگر کسی ڈِش میں کوئی کسر رہ جائے تو اُسے خصوصیات قرار دے کر تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ مثلاً بریانی میں گوشت ذرا سا کَچّا رہ جائے تو یہ کہلائے گی کَچّے گوشت کی بریانی! اگر ٹی وی دیکھ کر گھر میں بنائے جانے والے پُلاؤ کے چاول ٹوٹ جائیں تو یہ کہلائے گا ٹوٹے ہوئے چاولوں کا پُلاؤ۔ اگر دال میں مرچ ذرا زیادہ ہوجائے تو ''مِرچوں بھری دال'' قرار دینے میں

کیا ہرج ہے! اِسی صورت پراٹھا توے پر زیادہ دیر رہ جائے تو آپ کو پیش کیا جائے گا جلا ہوا یا اَدھ جلا پراٹھا!

خواتین خانہ کچن میں جتنے تجربات کرتی ہیں اُتنے ہی تجربات اگر وہ کسی باضابطہ لیبارٹری میں کیا کریں تو سائنس دان کے درجے پر فائز ہوں! آپ سوچیں گے خواتین خانہ لیبارٹری میں کیا ایجاد کریں گی۔ ٹھیک ہے، وہ کچھ بھی ایجاد نہیں کر پائیں گی مگر ہمارے سرکاری اداروں کے سائنس دانوں کا بھی تو یہی حال ہے! اُنہیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔

تمام شوہروں کی بہبود کے پیش نظر ہم ملک بھر کی خواتین خانہ کو مشورہ دیں گے کہ ٹی وی پر کوکنگ شو کو محض دِل پشوری کے لیے دیکھیں، شوہروں کے معدے پر سینہ زوری کے لیے نہ دیکھیں۔ جو کچھ اچھی طرح پکا سکتی ہیں اُسے کوکنگ ایکسپرٹ کے مشوروں کی روشنی میں پکا کر ہمارے مُنہ کو لگا ہوا برسوں پُرانا ذائقہ برباد نہ کریں! کوکنگ ایکسپرٹس کا کیا ہے، اُنہیں تو انٹ شنٹ پکانے کا اچھا خاصا معاوضہ ملتا ہے۔ اور پھر اپنا پکایا ہوا اُنہیں کون سا کھانا پڑتا ہے! ذرا سا چکھ کر وہ تو ایک طرف ہٹ جاتی ہیں اور قوم کی مائیں، بہنیں، بیٹیاں لکیر پیٹتی رہتی ہیں!

انقلاب" سے انٹرویو"

ویسے تو قوم نے اور بھی بہت سے راگ پاٹھ سُنے ہیں تاہم ایک راگ ایسا ہے جسے سُن سُن کر کان پک گئے ہیں مگر کمال یہ ہے کہ جب بھی یہ راگ شروع ہوتا ہے، لوگ متوجہ ہوجاتے ہیں کہ شاید اِس بار کوئی ڈھنگ کی تان سُنائی دے جائے، کوئی خوش کن سرگم لگ جائے۔ مگر اے وائے ناکامی کہ قوم کی اُمیدوں پر پانی پھر کر رہتا ہے۔ ہم انقلاب کے راگ کی بات کر رہے ہیں۔ جسے چار چھ افراد کی حمایت حاصل ہوجائے وہ پہلی فُرصت میں یعنی موقع دیکھتے ہی انقلاب لانے پر تُل جاتا ہے۔

ہم نے سوچا کیوں نہ انقلاب سے معلوم کیا جائے کہ اُس پر کیا بیت رہی ہے اور وہ آنے کے موڈ میں ہے بھی یا نہیں۔ انقلاب تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ اُس نے گوشہ نشینی کے نام پر روپوشی اختیار کر رکھی ہے۔ یہ ہماری اور آپ کی خوش نصیبی ہے کہ انقلاب نے اپنی غیر معمولی مصروفیت (یعنی روپوشی و گوشہ نشینی!) کو کچھ دیر کے لیے بالائے طاق رکھتے ہوئے چند باتیں کرنے پر رضامندی ظاہر کی تاکہ اُس کے خیالات اُن لوگوں تک پہنچیں جن کے لیے اُسے لانے کا بیڑا اُٹھایا جاتا رہا ہے۔

☆☆☆

☆سب سے پہلے تو یہ بتایئے کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟

انقلاب: مزاج برہم ہے۔

☆ کیوں؟

انقلاب: کیوں نہ ہو؟ ایک زمانے سے میں برپا ہونے کو بے تاب ہوں مگر اِس منزل تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ پہنچوں کیسے؟ جو بھی سیاست میں قدم رکھتا ہے، مجھے برپا کرنے کی بات کرتا ہے۔ اور پھر خود ہی ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ میں برپا نہ ہو پاؤں یا پھر اُس کی مرضی سے برپا ہو رہوں۔ پریس کانفرنس کے نام پر چند حاشیہ بردار صحافیوں کو جمع کرکے انقلاب لانے کا مژدۂ جاں فزا سُنا دیا جاتا ہے۔ انقلاب نہ ہوا، موسمی پھل ہوا کہ آئے گا اور سب کھائیں گے۔

☆آپ نے گوشہ نشینی کیوں اختیار کر رکھی ہے؟

انقلاب: گوشہ نشینی کا تو بہانہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ میرے نام پر ایسی ایسی باتیں کی جارہی ہیں کہ میرے پاس اب مُنہ چُھپانے کے سِوا چارہ نہیں رہا۔ جو بھی سیاسی اکھاڑے میں اُترتا ہے وہ مجھے برپا کرنے سے کم کی بات نہیں کرتا۔ ایک ضِد سی ہے کہ ؂

نام لے لے کے ترا ہم تو جیے جائیں گے

!لوگ یونہی ''تجھے'' بدنام کیے جائیں گے

میرا نام لے لے کر پاکستانی قوم کو اِتنے سبز باغ دکھائے گئے ہیں کہ اگر وہ تمام باغ ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ایسی ہریالی ہو کہ چاند سے بھی دیکھیں تو چین کی عظیم !دیوار دکھائی دے نہ دے، ہریالی ضرور دکھائی دے

☆ بہت سے لوگ ہیں جو آپ کو لانا چاہتے ہیں۔ مگر آپ اب تک نہیں آ پائے۔ اب تک یہ پتا نہیں چلا کہ وہ آپ کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکے یا آپ آنا ہی نہیں چاہتے۔

انقلاب: میں تو آنے کے لیے تیار ہوں مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ بلا جواز اور بلا ضرورت ہی چلا آؤں۔ کچھ حالات بھی تو ہوں۔ بے بُلائے مہمان کی طرح جانا مجھے قبول نہیں۔ مجھے ''بے فضول'' میں ''بیزتی'' خراب کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ خواہش تو میری یہ ہے کہ میرے راستے میں بہترین قسم کے سُرخ قالین بچھائے جائیں مگر مجھے .برپا کرنے والوں کے پاس تو میری راہ میں بچھانے کے لیے دری بھی نہیں۔ ایسے میں بھلا میں کیسے آ سکتا ہوں؟ میں کوئی ایرا غیرا، نتھو خیرا تو ہوں نہیں کہ یونہی چلا آؤں؟ میرے لیے بھی بینڈ باجے کا انتظام کیا جائے، مجھ پر نچھاور کرنے کے لیے پُھول یا پُھول کی پتیاں ہونی چاہئیں۔ یہ کیا کہ سُوکھا سُوکھا چلا آؤں؟ ''میں صدقے، میں واری'' کی صدائیں سُننے

کے لیے تو میں بھی بے تاب ہوں۔ مزاجاً میں بھی اب پاکستانی ہوتا جارہا ہوں۔ اگر میں کبھی کسی نہ کسی طرح برپا ہوگیا تو دُنیا دیکھے گی کہ پاکستانیت کے رنگ میں رنگنے پر انقلاب کا کیا رنگ ہو جاتا ہے!

☆ آپ کو لانے کی بھرپور تیاری تو کی جارہی ہے مگر یہ بتایئے کہ اِس قوم میں آپ کو برداشت کرنے کا ہَتِیڑ بھی ہے یا نہیں؟ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ کے آنے سے کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا؟

انقلاب: بھئی اب ایسے سوالات نہ کرو کہ میں اپنی ہی نظروں میں گِر جاؤں اور پھر اُٹھ نہ پاؤں؟ کبھی کبھی میں بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ میں آخر ہوں کیا۔ پاکستان کے سیاست دان میرا نام لے لے کر ایسی تبدیلیوں کے راگ الاپتے ہیں کہ میں بھی حیرت سے سوچنے لگتا ہوں کہ میں کیا کیا کرسکتا ہوں! پھر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں اب تک برپا نہیں ہوا۔

☆ کیوں؟ برپا نہ ہونے پر اللہ کا شکر کیوں ادا کرتے ہیں آپ؟

انقلاب: پاکستانی سیاست دانوں کے دماغ کا کوئی سِرا نہیں ملتا۔ یہ کب کیا بول بیٹھیں، کچھ پتا نہیں۔ کب یہ کیا دعویٰ کر بیٹھیں، پورے یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جب یہ کسی چیز کی تعریف کرنے پر تُلتے ہیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اگلے میں اِتنا دَم خَم بھی

ہے یا نہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ لوگ قطب مینار پر چڑھا کر سیڑھی نہ ہٹالیں! اکثر اِنہوں نے ایسا ہی کیا ہے۔

☆ ڈاکٹر طاہرالقادری نے اپنے کارکنوں سمیت پوری قوم کو انقلاب کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا ہے اور چوہدری شجاعت حسین کو "انقلاب کا رابطہ کار" مقرر کیا ہے۔ اِس حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟ آپ اِس طریق کار سے مطمئن ہیں؟

انقلاب: مطمئن کیا ہونا ہے، میں تو پریشانی اور بے حواسی سے دوچار ہوں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ میرے نام پر یہ کیسے کیسے اعلانات کئے جارہے ہیں۔ انقلاب کیا کوئی فلم یا گانوں کا البم ہے جسے ریلیز کیا جائے؟ یا کیا یہ کوئی کتاب ہے جس کی رُونمائی ہو؟ طاہرالقادری نے تو یہ بھی کہا ہے کہ کارکن اور عوام تیار رہیں، وہ انقلاب کی تاریخ کا جلد اعلان کریں گے! انقلاب کیا کسی تاریخ پر برپا ہونے والا واقعہ ہوتا ہے؟ میرے نام پر یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟ کبھی کبھی جی میں آتا ہے کہ اِتنا ہنسوں کہ پھر اپنے آپ میں نہ رہوں۔ اور کبھی یہ سوچتا ہوں کہ ایسا کُھل کے روؤں کہ اِس قوم کے لیے قِلتِ آب کا بحران نہ رہے! انقلاب کے اِن ٹھیکیداروں نے میرا نام لے کر جو کچھ کرنے کی ٹھان رکھی ہے وہ ایک دن مُجھے خون کے اِتنے آنسو رُلائے گا کہ میں اپنے ہی آنسوؤں میں ڈوب مروں گا اور میڈیا والے انقلاب کی "موت ما قبلِ پیدائش" کا ماتم ہی کرتے تو بہت miscarriage رہ جائیں گے! میرے

!کے درپے ہیں still-birth ہوئے ہیں مگر اب شاید یار لوگ میرے
اضافی تشویش یہ ہے کہ طاہر القادری نے چوہدری کو شجاعت حسین کو میرے معاملے میں رابطہ کار مقرر کیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر کبھی کسی نے میرے بارے میں چوہدری صاحب سے کچھ پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دیں گے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں کچھ اور میرے بارے میں سمجھ لیا جائے کچھ اور! اُن کی باتوں میں مفاہیم کے کئی جہان آباد ہوتے ہیں۔ ایک ہی بات کا مفہوم ہر سُننے کے لیے کچھ اور ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ چوہدری صاحب کا کہا مکمل طور سمجھ لینا بھی انقلاب سے کم نہیں! چوہدری صاحب کو انقلابی تحریک کا رابطہ کار بنا کر طاہر القادری نے ملک میں انقلابی تبدیلی لانے کے خواہش مند افراد کے ساتھ ساتھ خود مجھے بھی الجھن میں مبتلا کر دیا ہے، بلکہ سچ پوچھیے تو مجھ پر ''وختا'' ڈال دیا ہے! انقلاب کا معاملہ چوہدری صاحب کے حوالے کرنے سے طاہر القادری کی چالاکی اور میری مظلومیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

انقلاب ؟کیا مذاق ہے جناب !

یاروں نے تو پوری یعنی بھرپور تیاری کر رکھی تھی کہ جمہوریت کے فروغ اور انتخابی اصلاحات کے نام پر کچھ نہ کچھ کرکے دم لیں گے، کوئی نہ کوئی انقلاب برپا کرکے ہی چین سے بیٹھیں گے۔ آثار بھی یہی تھے کہ ہر طرف افراتفری ہوگی، دھما چوکڑی مچے گی۔ سب اپنی اپنی لنگوٹیں کَس کر میدان میں نکل آئے تھے۔

مگر پھر وہی ہوا جو اِس ملک میں ہوتا آیا ہے۔ ہمیں کوئی بھی کام وقت پر کرنا کب آیا ہے۔ ہر کام کسی نہ کسی وقت پر تو ہوتا ہی ہے۔ بس، ہم اِسی کو وقت پر فیصلہ یا کام کرنا سمجھ لیتے ہیں۔ اب کے بھی یہی ہوا۔

بیرون ملک پُرسکون فضاؤں میں وطن اور اہلِ وطن کا بھلا سوچنے والوں نے طے کیا کہ اہلِ وطن کو اپنے وجود کا ایک بار پھر احساس دلایا جائے۔ یعنی ایک بار پھر بھرپور انٹری ماری جائے۔ انٹری ماری بھی گئی مگر معاملہ ''مرے کو مارے شاہ مدار'' کا سا تھا۔ یعنی ٹائمنگ غلط ہوگئی۔

انقلاب تو کیا برپا ہونا تھا، تھوڑا بہت ہنگامہ ضرور برپا ہوا۔ مگر پھر سب کچھ سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ بیٹھ ہی جانا تھا۔ لوگ لاکھ جذباتی اور

پُرجوش سہی، نرے احمق یا گھامڑ تو ہیں نہیں کہ ایک سُوراخ سے بار بار ڈسے جائیں۔ اگرچہ مَت ماری جاچکی ہے مگر پھر بھی تھوڑی بہت عقل باقی ہے جو عین وقت پر گڑھے میں جاگرنے سے بچالیتی ہے۔

ڈاکٹر طاہر القادری جس طور آئے اور جس جانے پہچانے انداز سے انہوں نے ایک بار پھر خود کو سیاسی مارکیٹ میں پیش کیا وہ حیران کن تھا نہ افسوس ناک۔ ہاں، اِتنا ضرور ہوا کہ شدید گرمی کے مارے اپنے آپ سے بھی اُکتائے ہوئے لوگوں کو ذرا کُھل کر ہنسنے کا موقع ملا۔ ہم نے شادی کی بعض تقریبات میں دیکھا ہے کہ نکاح سے قبل دولہا چند فرمائشیں کرتا ہے اور پھر ایک آدھ منوا کر نکاح پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً کار کی فرمائش ہوتی ہے اور موٹر سائیکل پر ''ڈن'' کر دیا جاتا ہے۔ طاہر القادری نے بھی طیارے کو شادی کا شامیانہ سمجھ کر خود کو دولہا فرض کر لیا۔ باراتیوں کے جِلو میں طاہر القادری نے ریڈ کارپٹ ویلکم مانگا۔ نئی سیاسی بارات کے دولہا میاں کسی طور طیارے سے اُترنے کو تیار نہ تھے۔ ایک مرحلے پر موصوف نے کہا کہ اُن کے استقبال کے لیے کسی اعلیٰ فوجی افسر کو آنا چاہیے۔ عقب سے کسی مُرید نے لقمہ دیا کور کمانڈر کو آنا چاہیے!

کئی گھنٹے چلنے والا یہ ڈراما ٹائیں ٹائیں فِش پر منتج ہوا۔ شادی کی تقریب

میں تو دولہا کار کا مطالبہ کرکے موٹر سائیکل پر ''ڈن'' کر دیتا ہے مگر طاہر القادری اپنے ہی جوش و جذبے کا شکار ہو کر بظاہر خسارے میں رہے۔ انھوں نے کار کی بجائے ہوائی جہاز مانگا اور پھر سائیکل پر راضی ہو گئے! شکر ہے، یہ مرحلہ طے ہوا۔ اگر وہ کہیں انقلاب مانگ بیٹھتے تو حکومت کہاں سے لاتی! ہو سکتا ہے طاہر القادری کے چاہنے والے طیارے میں چھ گھنٹے گزارنے اور طرح طرح کے مطالبات پیش کرنے ہی کو انقلاب سمجھ کر خوش ہو لیے ہوں! دعوے انقلاب لانے کے تھے اور اب گھر میں آرام کیا جارہا ہے! یہ تو سیاست کے نام پر اہلِ وطن سے مذاق ہوا!

سیاسی قائدین انقلاب لانے کی تیاری کر رہے تھے مگر انقلاب خدا جانے کس کونے میں گھس بیٹھا ہے کہ منہ دکھائی کا موقع ہی نہیں دے رہا۔ قوم حیران (کم) اور پریشان (زیادہ) ہے کہ تبدیلی کے نام پر یہ نیا ڈراما کس خوشی میں ہے اور اِس کی غایت کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جو لوگ انقلاب کے ٹھیکیدار بن بیٹھے ہیں اُنہیں کچھ اندازہ ہی نہیں کہ ٹائمنگ بھی کوئی چیز ہوا کرتی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ جب سلور اسکرین پر منور ظریف اور ننھا کے برجستہ جُملے جادو جگایا کرتے تھے۔ اُن کی ٹائمنگ کا کوئی جواب نہ تھا۔ دونوں کا اپنا

اپنا مقام تھا۔ کسی بھی سچویشن کا جُملہ یہ دونوں فنکار ایسی عمدگی سے ادا کرتے تھے کہ لوگ عش عش کر اُٹھتے تھے۔ کمال یہ تھا کہ معمولی سے اور بظاہر بے جان جُملے کو بھی یہ عظیم فنکار اپنی شاندار اور قابل رشک ٹائمنگ سے جاندار اور یادگار بنادیا کرتے تھے۔ ہمارے سیاسی قائدین کے پیٹ میں اگر کبھی انقلاب برپا کرنے کا مروڑ اُٹھے تو لازم ہے کہ اِن دونوں فنکاروں کے چند وڈیو کلپس دیکھیں تاکہ ٹائمنگ کا شعور پیدا ہوسکے!

اپوزیشن جماعتوں کے قائدین سے مل کر طاہر القادری نے انقلاب کے نام پر جو کچھ برپا کرنے کی کوشش کی اُس کی ٹائمنگ کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ کہتے ہیں ایک بار دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ یاروں کو صرف پیٹ یاد رہا، عشق بھی بھول گئے! جب شدید گرمی پڑ رہی ہو اور لوڈ شیڈنگ کا تازیانہ بھی سَر پر برس رہا ہو تو لوگ عشق کے ساتھ ساتھ انقلاب کو بھی بھول بھال جاتے ہیں! جہاں لوگ پینے کے صاف پانی کے حصول کی فکر میں ڈوبے ہوئے ہوں وہاں انقلاب کی بات کرنے والے کو شرم سے پانی پانی ہو جانا چاہیے۔ کیا ستم ہے کہ انقلاب جیسا سیاسی تھیٹر میں وکھری آئٹم پیش کرنے کی تیاری کی گئی اور ٹائمنگ کا فیکٹر نظر انداز کردیا گیا۔ اِس طرح کی حرکتیں ہی تو انقلاب کی شہرت کو داغدار کر رہی ہیں اور اُسے رُوپوش رہنے پر مجبور کر رہی ہیں۔

ہمیں پریشانیوں اور پشیمانیوں کے ساتھ جینے کی عادت پڑ گئی ہے۔ بے حِسی نے سب کچھ چھین لیا ہے۔ زندگی کا سفر کسی نہ کسی طور جاری ہے مگر زندگی میں وہ بات نہیں۔ کسی زمانے میں قتل کی بازگشت کئی دن تک جاری رہتی تھی۔ لوگ برسوں مثالیں دیا کرتے تھے۔ اب حالت یہ ہے کہ کسی مقام پر قتل کے محض دس منٹ بعد بھی گزریے تو اندازہ نہیں ہو پاتا کہ یہاں قتل ہوا تھا۔ بے حِسی اور بے دِلی ہر طرف، ہر معاملے پر چھائی ہوئی ہے۔

یہی حال سیاست اور اہلِ سیاست کا بھی ہے۔ بیشتر معاملات میں سیاسی قائدین بے ذہنی اور بے دِلی کے حوالے سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے پر تُلے رہتے ہیں۔ خوابِ غفلت کا اثر ٹوٹتے ہی ہڑبڑا کر اُٹھتے ہیں اور حکومت کے خاتمے کی تحریک کا اعلان کرتے ہوئے ایسی جَست بھرتے ہیں کہ چشم زدن میں انقلاب تک پہنچ کر دَم لیتے ہیں۔ کوئی لاکھ سمجھائے کہ بھائی صاحب! حکومت مخالف تحریک سے پہلے اور پھر اِس تحریک سے انقلاب تک کئی مراحل ہیں مگر اِن کے کانوں پر جُوں نہیں رینگتی۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کارنر میٹنگ ٹائپ کے چند ''اجتماعات'' منعقد کئے جاتے ہیں، میڈیا پر دو تین دن کچھ عجیب و غریب ٹِکر چلتے ہیں اور چوتھے دِن انکشاف ہوتا ہے کہ حکومت مخالف تحریک چلانے کی کوشش فرمائی گئی! لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ کیا اب حکومت مخالف تحریک چلانے کا یہ معیار رہ گیا ہے!

اہلِ وطن نے رمضان المبارک کی آمد پر سُکون کا سانس لیا ہے کہ عبادات کے اِس موسم نے سیاسی تبدیلیوں کے نام پر دھما چوکڑی مچانے والوں کے تعزیے ٹھنڈے کر دیئے ہیں اور اُنہیں اعتکاف کی سی حالت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ رمضان کی سعادت مآب ساعتوں نے لوگوں کو اللہ کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔

قوم کی عادت ہے کہ رمضان کا ماہِ مبارک وارد ہوتا ہے تو سارے کام عید تک موقوف کر دیئے جاتے ہیں۔ اب کوئی کتنے ہی اعلانات کرے اور کیسا ہی انقلاب برپا کرنے کا عزم ظاہر کرے، لوگ گھروں سے نکلنے والے نہیں۔ ایسے میں انقلاب برپا کرنے کے خبط میں مبتلا صاحبان کے لیے موقع ہے کہ کچھ دن ایک طرف بیٹھیں اور اپنی سَکت کا جائزہ لیں۔ جن میں معمولی سی تبدیلیوں کی راہ ہموار کرنے کی طاقت نہیں وہ انقلاب برپا کرنے اور پورے نظام کو تہہ و بالا کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ اپنے کہے پر کبھی شرمندہ بھی نہیں ہوتے! ع

دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ!

! کھاتے رہو مُنّا بھائی

جو لوگ پاکستان کو بہت سے معاملات میں پس ماندہ قرار دینے پر تُلے رہتے ہیں وہ کبھی اِس نکتے پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ہم بہت سے دوسرے معاملات میں دُنیاکے لیے قابلِ رشک ہیں۔ مثلاً دنیا بھر میں لوگ اچھا اور زیادہ کھانے کے محض شوقین ہوتے ہیں جبکہ ہم نے اِس شوق کو عادت میں تبدیل کیا ہے! دُنیا بھر میں لوگ اِس خیال کے حامل ہیں کہ زندہ رہنے کے لیے کھانا چاہیے۔ ہم نے طے کر رکھا ہے کہ کھانے کے لیے زندہ رہنا ہے۔ اور زندہ بھی اِس طرح رہنا ہے کہ دُنیا دیکھے اور اپنا نظریہ تبدیل کرلے۔

اِس وقت ہم ماہِ صیام کی برکات سے بہرہ مند ہیں۔ اللہ نے روزے فرض کئے ہیں۔ اِس فرض کو ہم نے بھلایا ہے نہ نظر انداز کیا ہے۔ دِن بھر کی بُھوک پیاس کو ہم بخوشی برداشت کرتے ہیں۔ مگر معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ دن بھر کی بھوک پیاس کو ہم افطار کے اَستھان پر جس بھرپور جذبے سے ذبح کرتے ہیں وہ بھی تو قابلِ دید اور قابلِ داد ہے!

مرزا تنقید بیگ ماہِ صیام کے دوران حیرت میں مبتلا اور صدمے سے دوچار ہوتے ہوئے خُون اور صبر کے گھونٹ پیتے رہتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ روزہ جسم کو

متوازن رکھنے کا طریقہ ہے جو اللہ نے ہمارے لیے فرض کردیا ہے۔ دن بھر کچھ کھانے اور پینے سے مجتنب رہ کر ہم اپنے جسم کو متوازن رکھتے ہیں۔ مگر افطار کے دسترخوان پر ہم اپنے ہی کئے دھرے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔

ہم نے مرزا کو بارہا سمجھایا ہے کہ آپ اچھے خاصے رونق میلے پر کیوں معترض ہوتے ہیں۔ رمضان المبارک کے دوران دن بھر بھوک پیاس برداشت کرتے کرتے اُکتا جانے والوں کو افطار کے وقت کچھ دل بستگی کا سامان میسر ہوتا ہے۔ مرزا اُس پر بھی قدغن لگانا چاہتے ہیں۔ اہلِ پاکستان جس انداز سے افطار کی تیاری کرتے ہیں اور پھر جس بے مثال جوش و جذبے کے ساتھ روزے کو ''منطقی انجام'' تک پہنچاتے ہیں وہ بجائے خود دیکھنے کی بات ہے۔ روزے میں خشوع و خضوع ہو نہ ہو، افطار میں تو ہو!

مرزا کو تو خیر اِس بات پر بھی اعتراض ہے کہ جگہ جگہ افطاری کے پیکٹ بٹ رہے ہوں تو لوگ بٹورتے چلے جاتے ہیں اور پھر کھا کھا کر اَدھ مُوئے ہو جاتے ہیں۔ جب بھی اُنھوں نے اِس قسم کا شِکوہ کیا ہے، ہم نے مرزا کو یاد دلایا ہے کہ انسان کے پاس پیٹ ہے تو وہ کھائے گا بھی۔ وہ کہتے ہیں کہ کھانے کی کوئی حد بھی ہونی چاہیے۔ ہمارا استدلال یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ نے رزق دینے کی کوئی حد نہیں رکھی تو ہم رزق سے مستفید ہونے کی کوئی حد کیوں مقرّر کریں؟

ایسی ہر دلیل پر مرزا نے ہمیشہ ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟ دوسروں کے کھانے پینے پر اعتراض ہے اور خود جو ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا کرتے ہیں اُس کا کچھ محاسبہ نہیں!

وہ زمانے ہوا ہوئے جب کھانے پینے کے حوالے سے شادی کی تقریب یا مزارات کے لنگر کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ آج کل ع

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

یعنی کھانے کی تقسیم پر ہڑبونگ کے مناظر اور بھی بہت سے مقامات پر دکھائی دیتے ہیں۔ سیاسی جلسوں ہی کو لیجیے۔ جلسوں کے آخر میں کھانے کے اہتمام کی روایت ڈال کر سیاست کے رونقیں دوبالا کرنے کی بھرپور سعی فرمائی گئی ہے۔ اگر جلسے میں تقاریر مزیدار نہ ہوں تو کچھ غم نہیں، کھانا تو بہرحال مزیدار ہی ہوتا ہے۔ یارانِ وطن اِس مزے سے ہمکنار ہونے کے لیے سیاسی تقاریر سُننے کی ذِلّت بھی بخوشی برداشت کرلیتے ہیں! بہت سے لوگ سیاسی قائدین کی تقاریر سُننے سے زیادہ جلسے کے آخر میں کھانا کُھلنے کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ نیت پر شک مت کیجیے۔ یہ لوگ کھانے کے بُھوکے نہیں ہوتے۔ یہ تو دوسروں کو کھانے پر ٹوٹتے ہوئے دیکھنے کا لُطف لیتے ہیں! ضمیؔر جعفری مرحوم نے کہا تھا۔

شہر میں بٹنا ٹی وی کی تقریب کے دعوت ناموں کا

!منظر تھا راشن ڈیپو پر پبلک کے ہنگاموں کا

اگر ضمیرؔ جعفری آج ہوتے تو اپنے کہے میں ترمیم پر مجبور ہوتے ! سیاسی جلسوں میں کھانے کی بندر بانٹ، بلکہ لوٹ مار نے بعض ایسے مناظر کو جنم دیا ہے کہ کامیڈی ڈرامے اُن کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ دیگوں کا مُنہ کب کھلتا ہے اور کب اُن میں موجود کھانا ختم ہو جاتا ہے، کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ چند افراد کا ڈش سے بُوٹیاں چُن کر ایک طرف جا بیٹھنا یا دیگ پر قابض ہو کر اپنوں کو نوازنا گئے وقتوں کی بات ہوئی۔ ہم نے بہت سے منچلوں کو بریانی کی ڈِش یا تَسلا لے کر درخت کی کسی اونچی شاخ پر براجمان پایا ہے۔ اگر آپ بھی یہ منظر دیکھیں تو محض ہنس کر مت ٹال جایئے گا۔ یہ معاملہ کامیڈی سے کچھ آگے کا یعنی سرکس کا ہے ! سُنا ہے بعض سرکس اِس کرتب کو اپنے بہترین آئٹمز میں شامل کرنا چاہتے ہیں ! پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اِس کے لیے اُنہیں سیاسی کارکنوں ہی کی خدمات حاصل کرنی پڑیں گی کیونکہ سرکس کے کسی فنکار !میں ایسا ٹیلنٹ پیدا ہو نہیں سکتا

مرزا ہماری بات سے متفق نہیں۔ اُن کی سوچ اب تک دقیانوسی ہے کہ کھانے پینے کے اُول جلول مناظر سے ملک بدنام ہوتا ہے۔ مرزا کو صرف اعتراض کرنا آتا

ہے۔ اُنہیں شاید یاد نہیں کہ ہم انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں جی رہے ہیں۔ اب ہمیں صرف یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی چیز کو انٹرنیٹ پر کتنے "ہِٹ" مل رہے ہیں!

ہم جب بھی شادی کی تقریب میں، کسی مزار کے لنگر کی تقسیم کے دوران یا افطار کے موقع پر لوگوں کو اشیائے خور و نوش سے دو دو ہاتھ کرتے دیکھتے ہیں تو رشک آتا ہے۔ رشک کا ذکر ہم کھانے سے متعلق نہیں بلکہ جوش و جذبے کے حوالے سے کر رہے ہیں! لوگ دعوتِ عام میں جس بھرپور جوش و جذبے سے کھاتے ہیں اگر کچھ ویسا ہی جوش و جذبہ قومی تعمیر و ترقی میں بھی دکھایا کریں تو مُلک کہیں سے کہیں پہنچ جائے! توبہ ہے صاحب، ہم بھی کھانے پینے کے تذکرے میں کہاں مُلک کو سنوارنے کی بات لے بیٹھے!

کھانے پینے کے معاملے میں مرزا اب تک 1950 یا اُس سے بھی پہلے کے پاکستان میں جی رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے محکمے سے ریٹائر ہوئے ہیں جس کا تعلق ہی کھانے پینے سے ہے۔ مگر مرزا نے اپنے اُصولوں کو گلے لگاکے ملازمت کی مُدت پوری کی اور اُس محکمے سے بھوکے پیاسے ہی نکل آئے۔ اور اب اُن کی خواہش یہ ہے کہ لوگ بھی اُن جیسے ہو جائیں۔ گویا وہ پورے سسٹم کو تلپٹ کرنا چاہتے ہیں! اب مرزا کو یہ بات کون سمجھائے کہ اگر لوگ اچانک کھانا پینا چھوڑ دیں گے تو

یہ سب کچھ کہاں کھپے گا؟ ہم سمجھا سمجھا کر تھک چکے ہیں کہ ۔

اچھا ہے دِل کے پاس رہے پاسبانِ عقل

لیکن کبھی کبھی اِسے تنہا بھی چھوڑ دے!

مگر وہ کب ماننے والے ہیں جو مانیں گے؟ وہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو کہتے ہیں کہ کھانے پینے کی اشیاء سامنے دھری ہوں تو آدمی کو پاگل نہیں ہو جانا چاہیے۔ اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ جانور بھی سامنے چارا دیکھ کر بے حواس نہیں ہوتے! اب اِنہیں کون سمجھائے کہ کھانا دیکھ کر پاگل نہ ہونا جانوروں کا وصف ہے، اِنسانوں کا نہیں! اگر ہم بھی کھانے پینے کی اشیاء دیکھ کر حواس قابو میں رکھیں تو، خدا ناخواستہ، ہمارا شمار بھی جانوروں میں ہونے لگے گا!

میچ تھا یا مذاق؟

فٹ بال ورلڈ کپ کا پہلا سیمی فائنل فی الواقع فٹ بال کا میچ تھا یا مذاق؟ یہ بات اب تک فٹ بال کے شائقین سے ہضم نہیں ہو پا رہی کہ برازیل کی ٹیم اِس طرح بھی ہار سکتی ہے۔ مگر یہ کھیل ہے اور کھیل میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

کھیل کی تکنیکی باریکیوں پر نظر رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ برازیل کی ٹیم نے جرمنی کے خلاف جو کھیل پیش کیا وہ کھیل کہاں تھا، بے حواسی کا مظاہرہ تھا۔ اور مظاہرہ بھی ایسا بھرپور کہ تبصرہ کرنے والے الفاظ تلاش کرتے رہ گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ برازیلین فٹ بالرز کو کس طور ''خراج عقیدت'' پیش کیا جائے!

1958 میں برازیل نے فرانس کو سیمی فائنل میں پانچ گول سے ہرایا تھا۔ اب سات گول کھا کر انہوں نے اپنا ہی ریکارڈ تڑوایا ہے۔ چھ منٹ میں چار گول! بات قابلِ یقین ہے نہ سمجھ میں آنے والی! برازیلین ٹیم یا اُس کے پرستاروں کی بات تو جانے ہی دیجیے، خود جرمن کھلاڑیوں کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُن کے ہاتھوں یہ کیسا چمتکار سرزد ہو رہا ہے!

اسٹیڈیم میں موجود تماشائی پہلے گول پر بھی چونکے تھے۔ مگر اِس کے بعد ع
!چراغوں میں روشنی نہ رہی .....
جب پے در پے گول ہوئے تو تماشائیوں کو ایسا لگا جیسے شہابیوں کی برسات ہو رہی ہے۔
دوسرے گول نے برازیل کی کمر توڑ دی۔ اور پھر پوری ٹیم نے جس انداز سے ہتھیار
ڈالے اُسے دیکھ کر میر تقی میرؔ کا شعر بے ساختہ یاد آیا۔
وے زور ور جواں جنہیں کہیے پہاڑ تھے
آئی جو موج حادثہ، تنکے سے بہہ گئے
کہنے کو میچ جرمنی اور برازیل کی ٹیموں کے درمیان تھا مگر در حقیقت جرمن ٹیم برازیل
سے کھیل رہی تھی یا یوں کہیے کہ کِھلواڑ کر رہی تھی! پاکستان میں فٹ بال کا کچھ خاص
کریز نہیں۔ ورلڈ کپ ہوتا ہے تو لوگ دیکھ لیتے ہیں۔ مگر اِتنا شعور تو فٹ بال کے
پاکستانی شائقین میں بھی پایا جاتا ہے کہ کھیل اور کِھلواڑ کا فرق سمجھ سکیں۔
یہ برازیل کو آخر ہوا کیا؟ سب کچھ یوں پلک جھپکتے میں کیونکر خاک میں مِل

گیا؟ میچ کے دوران عزیزم عارف انصاری کا ایس ایم ایس آیا۔ ”یورپ کی ٹیمیں سسٹم کے تحت کھیلتی ہیں اور ٹیم ورک پر یقین رکھتی ہیں۔ غیر یورپی ٹیموں میں انفرادی کھیل پر توجہ دی جاتی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ لوگ اُسے ہیرو قرار دے کر کاندھوں پر اُٹھالیں!“ بات سولہ آنے یہی ہے۔

برازیلین ٹیم کا پورا انحصار نیمار اور کپتان تھیاگو سِلوا پر تھا۔ نیمار اَن فِٹ ہو کر باہر ہوا۔ کپتان پر پابندی عائد ہونے کے باعث کھیل نہیں سکتے تھے۔ لیجیے، کام تمام ہوا۔ کھیل ختم، پیسہ ہضم۔ پوری ٹیم نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ عزیزم عارف انصاری کو غصہ اِس بات پر نہیں تھا کہ برازیل کی ٹیم ہار رہی تھی۔ ہار یا جیت کھیل کا حصہ ہو۔ مگر

ع

مقابلہ تو دِلِ ناتواں نے خوب کیا

والی کوئی بات دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اُنہیں اعتراض ہارنے کے انداز پر تھا۔ کیا شرمناک انداز تھا۔ فٹ بال ورلڈ کپ کے سیمی فائنل میں کوئی ٹیم ابتدائی پچیس تیس منٹ میں پانچ گول کھائے؟ اور اُن میں سے بھی چار گول صرف پانچ منٹ میں ہوں تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟ برازیلین ٹیم نے اپنے نام کی لُٹیا ہی ڈبو دی۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جرمن کھلاڑیوں نے دوسرے گول کے بعد گول کو سیلیبریٹ بھی کرنا چھوڑ دیا! آپ نے بھی سُنا ہوگا ع

قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا

طویل و صبر آزما انتظار کے بعد اور سخت جاں فشانی کے نتیجے میں گول اسکور ہو تو برتری لینے والی ٹیم اور اُس کے شائقین گول کا پورا مزا لیتے ہیں۔ چھ منٹ میں چار گول اسکور ہو جائیں تو کون ہے جو اُچھلے گا، ناچے گا؟

شریف امروہوی صاحب کو فٹ بال سے کچھ خاص شغف نہیں۔ چند خاص میچ دیکھ لیا کرتے ہیں۔ جرمنی اور برازیل کا سیمی فائنل دیکھ کر وہ بہت بے مزا ہوئے۔ جب برازیل نے پہلے ہی محاذ پر ہتھیار ڈال دیئے تو اُنھوں نے کہا۔ ”یہ کیا مذاق ہے؟ سیمی فائنل کی سطح پر کوئی اِس طور کھیلتا ہے؟ آناً فاناً پانچ گول؟ کیا کراچی کے کسی اُجڑے ہوئے میدان میں ’بچہ ٹیموں‘ کے درمیان پریکٹس سیشن ہو رہا تھا؟“

شریف امروہوی نے دو منٹ میں چار گول ..... معاف کیجیے گا، سوال داغ دیئے۔ ہم اِن سوالوں کے آگے ویسے ہی بے بس دکھائی دیئے جیسے جرمن اسٹرائیکرز کے سامنے برازیلین ڈیفینڈرز لاچار دکھائی دیئے تھے! عرض کیا کہ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ سوچا ہوتا ہے اُس کے برعکس ہو جاتا ہے۔

شریف امروہوی بولے۔ ”جب بھی کوئی ٹیم کچھ خاص تیاری کئے بغیر، محض اعتماد کے سہارے میدان میں اُترتی ہے تو اُس کا ایسا ہی حشر ہوتا ہے۔ اعتماد بہت کچھ ہے مگر سب کچھ نہیں ہے۔ اگر تکنیک میں تھوڑی بہت خامی ہو تو اعتماد سے دور ہو جاتی ہے، لیکن اگر تکنیک پائی ہی نہ جاتی ہو اور کوئی تیاری سِرے سے کی ہی نہ گئی ہو تو محض اعتماد کے ذریعے بازی جیتی نہیں جاسکتی۔“

اگر کسی فٹ بال میچ کے ابتدائی تیس منٹ میں پانچ گول ہو جائیں تو کوئی احمق ہی ہوگا جو پورا میچ دیکھے گا۔ مگر صاحب، بہت سوں نے تو پورا میچ محض اِس لیے دیکھا کہ وہ جاننا چاہتے تھے ذِلّت کے اِس سفر کی منزل کیا ہو سکتی ہے! بہت سوں کو یہ خوف تھا کہ تیس منٹ میں پانچ گول کھانے والی ٹیم کہیں بالآخر بارہ پندرہ گول سے نہ ہار بیٹھے! خیر گزری کہ معاملہ 7-1 ختم ہوا۔

ایک شریف امروہوی صاحب، عارف انصاری یا ہم پر کیا موقوف ہے، جس نے بھی فٹ بال ورلڈ کپ کا سیمی فائنل دیکھا وہ مایوسی کا شکار ہوا۔ ایسا کہاں ہوتا ہے کہ دو کھلاڑی ٹیم میں نہ ہوں تو ٹیم کا بُھٹّہ ہی بیٹھ جائے؟ پِٹی ہوئی فلم کا بھی ایک آدھ گانا تو ہِٹ ہو ہی جاتا ہے۔ برازیلین ٹیم نے اِتنا تیر ضرور مارا کہ انڈا چھوڑ دیا۔ آخری لمحات میں وہ ایک گول اسکور کرکے اُس نے صفر سے ہونے والی شکست ٹال دی!

یہی فائنل میں برازیل کا حشر نشر یہ پیغام چھوڑ گیا ہے کہ حسین یادیں محض نفسیاتی آسرا ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت کی دنیا میں کام آنے والی چیز نہیں۔ ''پدرم سلطان بود'' (میرا باپ سلطان تھا) کا راگ الاپنے والوں کو زیادہ توجہ اِس بات پر دینی چاہیے کہ وہ خود کیا ہیں۔ برازیل کی ٹیم نے کسی زمانے میں جو تیر مارے تھے اُن کی بنیاد پر کب تک فٹ بال کھیلی جاسکتی ہے؟ عالمی سطح کے مقابلوں کی تیاری بھی عالمی سطح ہی کی ہونی چاہیے۔ کیا میزبان ٹیم نے ورلڈ کپ کو بھی مذاق سمجھ لیا تھا کہ ذرا سی بھاگ دوڑ کریں گے اور جیت لیں گے؟ دفاعی چیمپین اسپین کا دوسرے مرحلے میں نہ پہنچ پانا اِس امر کا غَمّاز ہے کہ محض بڑھک مارنے اور دعوے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی بھی ٹیم میدان سے باہر خواہ کچھ کہتی پھرے، جب وہ میدان میں اُترتی ہے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔ کھیل ہو یا کوئی اور شعبہ، کامیابی اگر ملتی ہے تو محنت، فنی مہارت اور بر وقت اقدام کی بدولت۔ محسنؔ بھوپالی مرحوم نے کہا تھا

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دِیے میں جان ہوگی وہ دِیا رہ جائے گا

!زور کا جھٹکا، دِھیرے سے لگے

بالی وڈ کی سُپر ہٹ فلم ''دبنگ'' کو ہٹ کرانے میں کئی عوامل نے مرکزی کردار ادا کیا۔ سب سے زیادہ مشہور تو وہ گانا ہوا جس میں مُنّی کے بدنام ہونے کا راز فاش کیا گیا تھا! مگر خیر، فلم کی ہیروئن سوناکشی سنہا کی کارکردگی بھی کم نہ تھی۔ اُس کا ایک جُملہ تو ایسا ہٹ ہوا کہ ہیرو سلمان خان بھی دنگ رہ گیا۔ ایک سین میں سوناکشی سلمان خان سے کہتی ہے۔ ''تھپڑ سے ڈر نہیں لگتا صاحب! پیار سے لگتا ہے!''

بات عجیب ہے۔ کیا پیار بھی ایسا جذبہ ہے جس سے خوف کھایا جائے؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ اہلِ جہاں کی خباثت اور کمینگی کا کچھ غم ہے نہ پروا، ہاں اِس بات سے دِل خوف محسوس کرتا ہے کہ اگر کہیں دنیا بھر میں شرافت عام ہوگئی تو کیا ہوگا! گویا ؎

لائی ہے کس مقام پہ حالات کی روش
اپنی بقاء کے خوف سے لرزاں ہے زندگی!

پانی اور بجلی کو قابو میں رکھنے پر مامور عابد شیر علی نے بھی کچھ ایسی ہی

بات کہی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ بجلی کی قِلّت کو کیا روئیے، سسٹم ہی میں خرابیاں ہیں۔ اور خرابیاں بھی اِتنی اور ایسی کہ اگر کبھی پروڈکشن 15 ہزار میگا واٹ سے زائد ہو جائے تو پورا سسٹم لرزنے لگتا ہے!

یہ بیان پڑھ کر ہم بھی لرز کر رہ گئے۔ ویسے تو خیر عابد شیر علی کے نام کا وسطی حصہ بھی ایسا ہے کہ اُسے سُن کر کمزور دِل والے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ جب سے عابد شیر علی کو بجلی و پانی کی وزارت کا جونیر وزیر بنا کر سینیر وزیر کو گوشہ نشینی کی ہدایت کی گئی ہے تب سے وزارت کے معاملات کم از کم بیانات کی حد تو، بجلی کی پیداوار کے بغیر، زور دار جھٹکے دے رہے ہیں! شریف برادران سے قریبی نسبت کا ایسا اثر ہے کہ موصوف اپنی مرضی کے مطابق کچھ بھی کہہ دیتے ہیں اور پھر جب میڈیا والے ناک میں دم کرتے ہیں تو وہ وضاحت کے گھوڑے پر سوار ہو کر اُسے اور میڈیا والوں کو سرپٹ دوڑاتے رہتے ہیں!

شعبان المعظم کے اوائل ہی سے وزیر مملکت برائے پانی و بجلی نے ڈنکے کی چوٹ پر کہنا شروع کر دیا تھا کہ رمضان المبارک میں لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ کم سے کم ہوگا اور سَحر و افطار کے اوقات میں تو بجلی بالکل نہیں جائے گی۔ لوگوں کا ماتھا وہیں ٹھنک گیا تھا۔ سب کو اندازہ ہو چلا تھا کہ ماہِ صیام میں بھی

بجلی کی قلّت برقرار رہے گی۔ خلقِ خدا کے بارے میں کسی نے یونہی تو نہیں کہہ دیا کہ ۔

بجا کہے جسے دُنیا اُسے بجا سمجھو

!زبانِ خلق کو نقّارۂ خدا سمجھو

عوام کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ عابد شیر علی نے رمضان کے ابتدائی ایام ہی میں تسلیم کرلیا ہے کہ اُن کا اندازہ غلط تھا۔ یعنی رمضان المبارک میں بھی لوڈ شیڈنگ ہوتی رہے گی اور ملک کے تمام حصوں کو سَحر و افطار میں بیک وقت بجلی فراہم کرنا ممکن نہ ہوگا۔ عابد شیر علی نے جس ڈنکے کی چوٹ پر لوڈ شیڈنگ کو کنٹرول کرنے کا دعویٰ !کیا تھا وہ تو پتا نہیں کہاں گیا، ہاں چوٹ ضرور عوام کو سہنی پڑی ہے

جو حال بجلی کے سسٹم کا ہے وہی ہمارا ہے۔ ہماری توانائی بھی نچُڑتی جارہی ہے۔ کچھ تو روزہ داری سے جسم میں ناتوانی ہے اور کچھ حالات کی روش کے ہاتھوں قلم پر ضُعف طاری ہے۔ ایسے میں اِتنی ہمت کہاں کہ عابد شیر علی کی کسی بات پر نقد و نظر کا قصد کیجیے۔ جناب کو خانوادۂ اقتدار سے نسبت ہے اور اِدھر ہم ہیں کہ ہمارے وجود کا اختیار قلم چلانے تک محدود ہے۔ اور قلم ہی تو ہے، کوئی تلوار تو ہے نہیں کہ لوگ چلتا دیکھ کر !جان کی امان چاہیں

ہماری کیا مجال کہ میاں صاحب کے قرابت دار پر کوئی چوٹ کریں، کوئی جُملہ چُست کریں! ہاں، ایک ذرا سا گِلہ ہے جو غالبِؔ خستہ کے الفاظ میں ہماری زبان پر آگیا ہے۔ ۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے
کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے

ایک عشرے کے دوران پانی اور بجلی کے جتنے بھی وفاقی وزرا اور وزرائے مملکت ہوئے ہیں اُن کی بڑھکیں سُن سُن کر پنجابی فلموں کے رائٹرز اپنے آپ سے شرمندہ دکھائی دیئے ہیں! اِن اہلِ سِتم نے لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کے حوالے سے اِتنے راگ الاپے ہیں کہ قوم نے بارہا عاجز ہو کر ہاتھ جوڑے ہیں اور اُن سے، بہ زبانِ عدیمؔ ہاشمی، یہی استدعا کی ہے کہ ۔

ساتھ دینا ہے تو دے، چھوڑ کے جانا ہے تو جا
!تو اضافہ تو نہ کر میری پریشانی میں

بجلی نے اہلِ وطن سے ایسی کِھلواڑ کی ہے کہ دِل و دماغ کا باجا، بلکہ بینڈ بج گیا ہے۔ اُس زمانے کو گزرے ہوئے زمانے گزر گئے جب لوڈ شیڈنگ سے دِل و

دماغ پر تازیانے برسا کرتے تھے۔ فی زمانہ کہیں کہیں تو لوڈ شیڈنگ اِتنی زیادہ ہے کہ لوگ عادی ہو کر اُسے زندگی کا حصہ بنا بیٹھے ہیں۔ اب بجلی کا کبھی کبھار آ جانا بُرا لگنے لگا ہے! گویا ؂

اِتنے مانوس صیاد سے ہو گئے
اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

جو لوڈ شیڈنگ کو اپنا بنا بیٹھے ہیں اُن کے جینے میں زیادہ مشکلات نہیں ہوتیں۔ مرنے میں البتہ اُلجھنیں آ جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کا دَم نکل رہا ہو تب بھی اُنہیں لوڈ شیڈنگ کی زیادہ فکر لاحق رہتی ہے۔ ہجر کی شب سے مکمل مانوس ہو جانے پر کچھ کچھ ایسی ہی کیفیت سے حکیم مومن خاں مومنؔ بھی دوچار ہوئے تھے۔ ؂

!تو کہاں جائے گی؟ کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں، شبِ ہجراں !، ہوں گے

بجلی سے محروم رہنے والوں نے اپنے آپ کو حالات کے مطابق تبدیل کر لیا ہے۔ اُن کی حالت کو عدیم ہاشمی ہی نے یوں بیان کیا ہے ؂

آ کے بیٹھو تو کبھی تم مِری ویرانی میں
!کتنے سامان ہیں اِس بے سر و سامانی میں

اگر کبھی پانی و بجلی کے وزیر بیس بائیس گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ کا مزا چکھنے والے کسی علاقے کا دورہ کرتے ہیں تو وہاں کے مکین (ایک بار پھر بشکریہ عدیم ہاشمی !) زبانِ حال سے کہہ رہے ہوتے ہیں ۔

آج بھی دیکھ لیا اُس نے کہ میں زندہ ہوں
" !آج بھی ڈال دیا ہے اُسے حیرانی میں "

بجلی جیسی بنیادی نعمت سے محروم رہ جانے والوں میں اشتعال کا پایا جانا حیرت انگیز نہیں۔ مگر حیرت انگیز تو یہ بات ہے کہ ہم نے اُن میں سے بہت سوں کو انتہائی صابر و شاکر پایا ہے۔ استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ بجلی نہ ہونے سے ٹی وی نہیں چلتے یعنی پتا نہیں چلتا کہ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ گویا کہیں کا کوئی دُکھڑا بے چاہے بھی کان میں نہیں پڑتا اور ذہن میں ذرہ بھر خلفشار پیدا نہیں ہوتا ! یعنی اپنا بَلا سے ۔

بازی کسی نے پیار کی جیتی یا ہار دی
جیسے گزر سکی یہ شبِ غم گزار دی

قصہ مختصر یہ کہ جب جب بجلی نہیں ہوتی، زور کا جھٹکا دِھیرے سے لگتا ہے اور لوگ قدرے حواس میں رہتے ہیں۔ فی زمانہ اِتنا بھی غنیمت ہے ورنہ حکومتیں کب

چاہتی ہیں کہ لوگ حواس میں رہیں؟

!اِس غم کو مار ڈالو

آپ نے دیکھا ہو تو دیکھا ہو، ہم نے کہیں بھی نہیں دیکھا کہ کوئی ناسُور کو گلے بھی لگائے اور اُس پر فخر بھی کرے۔ یہ ہم ہی ہیں کہ اپنے لیے مسائل پیدا کرتے ہیں، اُن کا رونا روتے ہیں اور آخر میں اُن پر فخر کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ایک کیا، بیسیوں مثالیں مل جائیں گی۔ ذرا اپنے ''مثالی'' ماحول پر نظر تو ڈالیے۔ مسائل میں ایسی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ غالبؔ بے ساختہ یاد آتے ہیں ۔

روز اِس شہر میں اِک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے !

دو عشرے ہونے کو آئے ہیں، بجلی نے قوم پر ''وختا'' ڈالا ہوا ہے۔ اللہ ہر قوم کو اُس کے اعمال کی مناسبت سے عذاب دیتا ہے۔ ہم پر بجلی اور پانی کا عذاب اُترا ہے۔ اور ہمارے اعمال ہی ایسے ہیں کہ اِس عذاب کا تسلسل ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ بجلی اللہ کی بنائی ہوئی ہو یا انسانوں کی بنائی ہوئی، ہر دو اقسام نے قسم کھا رکھی ہے کہ انسانوں کو صرف تباہی سے دوچار کرنا ہے۔ آسمان سے نازل ہونے

والی بجلی تو پل بھر میں بھسم کر ڈالتی ہے۔ انسانوں کی بنائی ہوئی بجلی میں وہی تاثیر پائی جاتی ہے جو انسانوں کے مزاج کا حصہ ہے یعنی تڑپا تڑپا کر مارو! بجلی تاروں سے گزرتی ہوئی یوں آتی ہے کہ ہم جاں سے گزر جاتے ہیں۔ جنرل (ر) خالد محمود عارف نے اپنے محبوب کے ''اوصاف'' بیان کرتے ہوئے کہا ہے ۔

یہ بھی اُس کی مہربانی ہے کہ وہ

!مار تو دیتا ہے، تڑپاتا نہیں

مگر یہ بات شاید بجلی نے یا بجلی کی وزارت والوں نے نہیں سُنی۔ نتیجہ یہ ہے کہ تڑپائے جاتے ہیں اور مرنے نہیں دیتے۔

ایک عشرے سے زائد مدت گزری، بجلی نے حکمرانوں اور عوام دونوں کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ حکمرانوں کا حال یہ ہے کہ بجلی کے ہاتھوں بار بار خِفّت اور ذِلّت کا شکار ہوتے ہیں۔ وطنِ عزیز میں لے دے کر ایک بجلی ہے جس میں اِتنا دم خم ہے کہ حکمرانوں کو پریشان اور نادم کرسکے! عوام بھی کم پریشانی اور خواری نہیں جھیلتے مگر یہ سوچ کر خوش بھی رہتے ہیں کہ حکومت کو شرمندہ کرنے والا کوئی تو مسئلہ وطن کی !سرزمین پر پایا جاتا ہے

پانی و بجلی کے وفاقی وزیر خواجہ آصف بھی بجلی کی ستم ظریفی سے محفوظ نہیں۔ طلب و رسد کے بڑھتے ہوئے فرق نے وزارت کا سارا مزا ہی خراب کر دیا ہے۔ وزیر اعظم محمد نواز شریف نے خواجہ آصف کو وزیر دفاع شاید یہی سوچ کر بنایا ہوگا کہ پانی و بجلی کے وزیر کی حیثیت سے اُن کا بیشتر وقت اپنا اور وزارت کا دفاع کرنے ہی میں گزرتا ہے! عقل کا تقاضا تو یہی ہے کہ وزیر دفاع اُسی کو بنایا جائے جسے معلوم ہو کہ دفاع کیا ہوتا ہے اور کیسے کیا جاتا ہے!

ایک طرف پورا ملک شدید گرمی کی لپیٹ میں ہے اور پھر ماہِ صیام کی صبر آزما ساعتیں بھی چل رہی ہیں۔ ایسے میں بجلی نے خواجہ آصف پر ستم ڈھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ شارٹ فال میں اضافے سے خواجہ صاحب کا پارہ شُوٹ اپ کرگیا۔ اسلام آباد میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ بجلی کا نظام اللہ کی مدد سے چل رہا ہے۔ اب اللہ کی مدد آئے گی تو بجلی کا نظام بھی درست ہوسکے گا۔

صحافی حیران تھے کہ بجلی کے نظام کا اللہ کی مدد یا کرم سے کیا تعلق؟ تو کیا ہم بجلی کے بل بھی اللہ میاں کو ادا کیا کریں؟ اِس حوالے سے صحافیوں نے کچھ پوچھنے اور خواجہ صاحب نے کچھ کہنے سے گریز کیا۔ ہمیں یقین تھا کہ اگر کسی صحافی نے یہ سوال کیا ہوتا تو اُن کے مزاج میں جو تھوڑا بہت شارٹ فال رہ گیا تھا وہ ختم ہوجاتا اور پارہ ایسا چڑھتا کہ پھر اُترنے کا نام نہ لیتا!

بات بجلی کا نظام چلانے میں اللہ کی مدد کے ذکر پر ختم نہیں ہوئی۔ پانی و بجلی کے وفاقی وزیر نے بجلی کے بحران پر قوم سے معافی بھی مانگ لی۔ صحافی چند لمحات کے لیے مطمئن ہوگئے کہ ۔

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
!اور کُھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ خواجہ صاحب نے قوم سے معافی مانگنے کے ساتھ ہی موسم کی ٹانگ کھینچ لی۔ انہوں نے بجلی کے بحران کی ذمہ داری موسم پر ڈال دی۔ فرمایا کہ شدید گرمی نے بجلی کی پیداوار اور تقسیم و ترسیل پر شدید منفی اثرات مرتب کئے ہیں۔ یعنی اب جب اللہ کی رحمت برسے گی تو کچھ بہتری آئے گی۔ خواجہ صاحب نے غور نہیں کیا کہ اللہ کی رحمت تو برس رہی ہے۔ بھئی، بجلی کے بحران سے متعلق سوالات پر وہ !چراغ پا نہیں ہوئے۔ یہ بھی تو اللہ کی رحمت ہی کی ایک صورت ہے
بجلی کے بحران کے لیے موسم کو ذمہ دار ٹھہرانا! یہ بھی نکتہ سنجی کی انوکھی مثال ہے۔ اِسی کو کہتے ہیں طویلے کی بَلا بندر کے سَر! اب اگر یہی اُصول

ٹھہرا تو ہر معاملہ کہیں نہ کہیں جا کر موسم ہی کے سَر جائے گا!
جب سے پاکستان بنا ہے، حکومتوں کی توانائی کا بڑا حصہ ٹرینوں کو بہتر انداز سے چلانے میں خرچ ہوتا آیا ہے۔ لوگ کو ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانے سے فرصت نہیں اور سارا بوجھ حکومت پر ڈالا ہوا ہے کہ اُن کے لیے ٹرینیں چلاتی رہے۔ یہ تو ستم بالائے ستم والا معاملہ ہوا۔ حکومتوں کے لیے سب سے بڑا کام اپنے آپ کو چلتا رکھنے کا ہے! اب ایسے میں ریلوے کی وزارت کو چالو حالت میں رکھنا اور قوم کے لیے پانی و بجلی کی فراہمی کا اہتمام مُفت کا دردِ سَر ہے۔ اگر منتخب حکومت ایسے چھوٹے موٹے کاموں میں اُلجھی رہے گی تو بڑے کام کیسے کر پائے گی؟ افغانستان سے سیکھا جاسکتا ہے کہ اُس نے ٹرینوں کا چکّر پالا ہی نہیں۔ ریلوے کی وزارت ہوگی اور ٹریک پایا جائے گا تو لوگ ٹرینیں چلانے کا مطالبہ بھی کریں گے۔ آپ بھی دیکھ لیجیے کہ ریلوے کے بغیر بھی افغانستان چل ہی رہا ہے، بلکہ سُپر پاورز کو ناکوں چنے چبوا رہا ہے!
اگر ہمیں ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنا ہے تو پہلے مرحلے میں تو ریلوے سے نجات حاصل کرنی ہوگی تاکہ حکومت کوئی ڈھنگ کا کام کرنے کے قابل ہوسکے! دوسرے مرحلے میں بجلی و پانی کی وزارت کا خاتمہ لازم ہے۔ کسی بھی منتخب حکومت کو

مُفت کی اور دائمی ذِلّت سے بچانے کا ایک موثر طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔ جب تک بجلی اور پانی کی وزارت باقی ہے، جمہور کے ہاتھ میں ڈگڈگی رہے گی جسے بجا بجا کر وہ حکومت کو ناچنے پر مجبور کرتے رہیں گے اور جمہوریت کو تماشا بناتے رہیں گے۔

کسی نے خوب کہا ہے ۔

ہم کو بھی غم نے مارا، تم کو غم نے مارا

ہم سب کو غم نے مارا، اِس غم کو مار ڈالو!

بجلی و پانی کی فراہمی کا اہتمام کرنا بھی وہ غم ہے جس کا گلا گھونٹنا ہی پڑے گا۔ اچھا ہے کہ یہ ٹنٹا ختم ہو جائے۔ پانی اور بجلی جیسے معمولی اور غیر اہم معاملات سے گلوخلاصی ہو گی تو ہماری حکومتیں کوئی ڈھنگ کا کام کر پائیں گی، عالمی سطح پر کچھ نام کما پائیں گی۔

ریلوے اور پانی و بجلی کے انتظام و انصرام سے نجات پانا کون سا مشکل کام ہے؟ صحتِ عامہ کے معاملے میں بھی تو حکومت نے اپنا دردِ سر ختم کر ہی دیا ہے۔ اب یہ معاملہ پرائیویٹ میڈیکل پریکٹس کے ہاتھ میں ہے۔ لوگ زندہ ہیں تو بیمار بھی پڑتے رہیں گے۔ حکومت کب تک اُن کا علاج کراتی پھرے؟ صحتِ عامہ کی سہولتیں ختم کرنے پر بھی لوگ اپنا علاج کرا ہی رہے ہیں نا۔ ٹرینیں نہیں ہوں

گی تو لوگ سفر کے متبادل ذرائع کو بنیادی ذرائع میں تبدیل کرلیں گے۔ یہی حال پانی و بجلی کا ہے۔ گھر گھر جنریٹرز ہوں گے تو بجلی پیدا کی جاتی رہے گی اور حکومت سکون کا سانس لیتی رہے گی۔

ہر حکومت کی چند ایک ترجیحات ہوتی ہیں۔ ہم اُس پر اپنی ترجیحات تھوپنا چاہتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ حکومت کا بیشتر وقت اپنے آپ کو بچانے میں اور ہر معاملے کی صفائی پیش کرنے میں گزرے۔ چند ایک بنیادی ذمہ داریاں ختم کردی جائیں گی تو منتخب حکومتیں سکون سے، اپنی ترجیحات کے مطابق کام کرسکیں گی!

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکرے کی

پاکستانیوں پر اِس وقت حالات نے ایسا ''وختا'' ڈالا ہوا ہے کہ کوئی بھی چیز اِنہیں کمتر ہونے کا احساس دِلا سکتی ہے۔ زمانے بھر کے ناکارہ افراد بھی ہم سے بازی لے جاتے دکھائی دے رہے ہیں۔ بہت سے معاملات میں ہم اور ہماری حکومت وضاحت ہی کرتی رہ جاتی ہے اور یارانِ تیز گام منزل کو جا لیتے ہیں۔ عربی میں ایک کہاوت ہے کہ وقت بُرا چل رہا ہو تو اونٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو بھی کُتّا کاٹ لیتا ہے! ہم پر اِس وقت یہ اونٹ اور کُتّے والا وقت آیا ہوا ہے اور کچھ ایسا آیا ہوا ہے کہ جانے کا نام نہیں لے رہا۔

کوئی بھی معاملہ ہمیں کمتر ہونے کے احساس سے دوچار کرسکتا ہے۔ دور کیوں جایئے، ہماری ہی مثال لیجیے۔ جب ہم نے لکھنا شروع کیا تھا تو خود پر پتا نہیں کیا کیا ناز تھا۔ اُس وقت سیاست میں طاہرالقادری کا نام و نشان بھی نہ تھا اور اُن کے منہ سے کسی نے انقلاب کی اشتہا انگیز باتیں بھی نہیں سُنی تھیں، تب ہم اِس گمان میں مبتلا تھے کہ ہمارے لکھنے سے کوئی نہ کوئی ''انقلاب'' تو ضرور برپا ہوگا۔ ہماری سوچ غلط نہ تھی۔ ایک ''انقلاب'' گھر کی حدود میں ضرور برپا ہوا۔ ہمارے مسلسل لکھنے سے مشتعل ہوکر والد نے لتاڑنا شروع کیا

کہ یہ کیا ہر وقت انٹ شنٹ لکھتے رہتے ہو، کوئی ڈھنگ کا کام کرو تاکہ لوگ احترام کی نظر سے دیکھیں! دوسرا ''انقلاب'' یہ تھا کہ جب ہم نے لوگوں کو انٹ شنٹ لکھ کر نام اور دام کماتے دیکھا تو لکھنے لکھانے کے عمل کی رفتار گھٹانے کا فیصلہ کیا!

سولہویں سال میں لوگ بالعموم کسی حسین سے نین ملاتے ہیں، دِل لگاتے ہیں۔ ہم نے شعر و سُخن سے رسم و راہ پیدا کی۔ دسویں جماعت میں تھے کہ شعر کہنا شروع کیا۔ لوگوں نے (کیا پتا سازش کے تحت!) سراہنا شروع کیا تو دماغ پارے کی طرح شُوٹ کرتے ہوئے ساتویں آسمان پر جا پہنچا۔ ذہن میں ہر وقت یہ گمان گردش کرتا رہتا تھا کہ ہم ضرور کچھ نہ کچھ بن کے دم لیں گے۔ سولہ سال کی عمر میں شعر کہنا کیا کم ''کمال'' تھا! مگر جب ہم نے مُشاعروں میں شُعراء کو گائیکی کی بدولت کامیاب ہوتے دیکھا تو اپنی آواز کی بے نوائی کا بھرپور شدت سے احساس ہوا۔ یوں ہم نے شاعری پر بھی ہاتھ ہلکا رکھنے کا فیصلہ کیا۔

اب خیال آتا ہے کہ ہم نے ڈھائی تین عشروں تک جیسے تیسے صحافت کی خدمت کرکے کیا تیر مار لیا۔ اشرف المخلوق ہونے کے باوجود ہم اپنی ذات کی حد تک بھی کوئی انقلاب برپا نہ کرسکے۔ ہم سے اچھی تو اللہ کی دیگر مخلوق ہے جو کسی نہ کسی حد تک قوم کی خدمت کر رہی ہے۔ بکروں ہی کی مثال لیجیے۔ اُن کے دم سے کِتنے میلوں میں کِتنی رونق ہے۔ بچپن سے سُنتے آئے ہیں کہ بکرے کی ماں کب

تک خیر منائے گی۔ مگر اِس ملک میں معاملہ اب اِس محاورے کے برعکس ہے۔ دانہ اور چارا تو ڈال دیا جاتا ہے مگر کوئی بکری کو گھاس ڈالنے کے لیے تیار نہیں۔ دُھوم ہے تو بکرے کی، شہرہ ہے تو بکرے کا، لشکارے ہیں تو بکرے کے۔ اور، ظاہر ہے، چُھری ہے تو بکرے کے حلق کا مُقدّر۔

یہ تو ہم ہیں جو مرزا غالبؔ کی زبانی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ ۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

بکرا جان دیتا ہے تو حق ادا ہو جاتا ہے۔ ہر بکرا فخر سے سَر اُٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ اُس کی گردن پر پِھرنے والی چُھری بہت سوں کو زندگی عطا کرتی ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ اپنی خیر منانے میں کامیاب نہ ہونے والے بکرے کیسے کیسے کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ فٹ پاتھ سجائے جانے والے دَستر خوان پر کھانے والے صدقے کے بکروں کا گوشت کھا کھا کر پروان چڑھ رہے ہیں۔ بکروں کی عظمت ملاحظہ فرمایئے کہ خود جان سے جاتے ہیں مگر اُن کے مزے کراتے ہیں جو حالات کے ہاتھوں جان سے جا چکے ہیں! اِس ملک میں طُرفہ تماشا ہے کہ رات دن ایک کرکے مہینے بارہ پندرہ ہزار روپے کمانے والا بکرے کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ اور جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ فٹ پاتھ پر خوب چوڑے ہو کر بیٹھتے ہیں اور بکرے کی بوٹیاں اُڑاتے ہیں! یعنی یہ طُرفہ تماشا بھی بکرے کے دم سے ہے۔

!!کیا یہ کُھلا تضاد نہیں
اور اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ صدقے کی مد میں گردن پر چُھری پھروا کر بکرے صرف غریبوں کا پیٹ بھرتے ہیں تو یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ اِس ملک میں جمہوریت اور صدارت کا تسلسل بھی بکروں کا احسان مند رہا ہے! سابق صدر آصف علی زرداری کے دور میں ایوانِ صدر میں اور بہت سی مخلوق کے پہلو بہ پہلو بکروں کا بھی مستقل قیام تھا۔ آصف زرداری اپنی صدارت برقرار رکھنے کے لیے روزانہ ایک سیاہ بکرا ذبح کیا کرتے تھے تاکہ دوسرے بکروں کو ذبح کرنے کی اہلیت سلامت رہے! محاورہ ہے کہ مُرغی جان سے گئی، کھانے والے کو مزا نہ آیا۔ یہ بات آصف زرداری اور بکروں کے حوالے سے نہیں کہی جاسکتی۔ بکرے جان سے گئے اور !اُنہیں پورا مزا دے گئے
بہت سوں کو حیرت ہوتی تھی کہ کیا بکروں کی قربانی سے صدارت چل سکتی ہے۔ ارے صاحب، قربانی کے بکروں ہی کی بدولت تو یہ نظام چل رہا ہے! اور ویسے بھی اقتدار میں رہنے والوں اور بکروں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جنہیں اقتدار کو ہر صورت برقرار رکھنا ہو وہ قربانی کے بکروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جنہیں ہر شے سے بڑھ کر اپنے اقتدار سے محبت ہو وہ اپنی چند بوٹیوں کے لیے پورا بکرا ذبح کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے! اگر حکمرانوں نے

! یہ روش نہ اپنائی ہوتی تو آج پورا ملک قربانی کے بکرے میں تبدیل نہ ہوا ہوتا
جو کچھ ایوانِ صدر میں ہوا کرتا تھا وہ اب پورے ملک میں جگہ جگہ ہو رہا ہے۔ خیراتی اداروں نے ہر عمر اور سائز کے بکرے باندھ رکھے ہیں۔ دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے بھی لوگ صدقے کی مد میں بکرے کٹواتے ہیں۔ مگر ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ معاشرے میں جب بے ایمانی بڑھ جاتی ہے تو سزا کا خوف بہت سے لوگوں کو بکروں تک لے آتا ہے اور وہ اپنی بَلا بکروں سے سَر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایوانِ صدر میں بھی بکرے اِسی تصور کے تحت ذبح کئے جاتے تھے۔ بعض دِل جلوں کو ہم نے کہتے سُنا ہے کہ اِس تصور کے تحت تو ایوانِ صدر میں روزانہ ایک بڑا بیل ذبح کیا جانا چاہیے
! تھا

عید الاضحیٰ کی آمد پر ہم نے بہت سے لوگوں کو قربانی کے جانور خاصے اناڑی پن سے خریدتے دیکھا ہے۔ مویشی منڈی میں سودا ہو رہا ہو تو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ گائے یا بکرے کو گدھا خرید رہا ہے! ہم جب بھی قربانی کا جانور خریدنے مویشی منڈی گئے ہیں، قدم قدم پر اپنے آپ کو قربانی کا بکرا محسوس کیا ہے! مگر خیر، یہ بھی صرف کہنے کی بات ہے۔ شادی کے بعد ہر شخص خود کو قربانی کا بکرا سمجھتا ہے مگر اُس احترام سے بہر حال محروم ہی رہتا ہے جو

قربانی کے بکروں کے حصے میں آتا ہے!

بکرے کہاں نہیں ہیں؟ اب سبزی کے ٹھیلے پر بھی بکرے خریداری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایسے کہ حالات کی چکّی میں پسے جانے والے لوگ جب سبزی خریدنے کا ارادہ کرتے ہیں تو دام سُن کر پہاڑی بکرے جیسا مُنہ نکل آتا ہے! کبھی کبھی تو ہم نے بھی ٹھیلے پر سبزی یا پھل کے دام سُن کر سوچا ہے کہ کاش ہمارے سینگ ہوتے اور ہم وہ سینگ ٹھیلے والے کے پیٹ میں گھسیڑ دیتے!

شاپنگ رے شاپنگ!

ماہِ صیام رحمتوں اور برکتوں سے عبارت ہے۔ شیاطین مُقید رہتے ہیں تاکہ جو رب سے لَو لگانا چاہیں اُنہیں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اہلِ ایمان رب کو راضی کرکے مُرادیں پاتے ہیں۔ مگر اہلِ ایمان کا معاملہ صرف رب کو راضی کرلینے پر ختم نہیں ہوجاتا۔ اُنہیں اہلِ خانہ کو بھی تو راضی کرنا چاہتا ہے۔ کہتے ہیں رُوٹھے رب کو منانا آسان ہے، رُوٹھے یار کو منانا زیادہ مشکل ہے۔ اور جناب، رب کو بھی کیا منانا؟ وہ کب ہم سے رُوٹھا ہوا ہے؟ بس، یہ ہے کہ ہم بہک جاتے ہیں یا اُسے بھول جاتے ہیں تو وہ ذرا سا رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اور چند ہی سجدوں میں پھر مَن جاتا ہے!

ہاں، اہلِ ایمان کی زیادہ سخت آزمائش تو یہ ہے کہ عید کی تیاریوں کے حوالے سے اہلِ خانہ کو کس طور راضی کریں، کیسے منائیں۔ اور اہلِ خانہ کو بھی ہم رسماً ہی بیچ میں ڈال رہے ہیں، زحمت دے رہے ہیں۔ اصل معاملہ تو اہلیہ کو منانے کا ہے۔ یہ ایک رکاوٹ عبور کرلی تو سمجھ لیجیے پورا میدان آپ کا ہے۔ ؎

حوصلہ ہو تو کیا نہیں ہوتا

! ہاں مگر حوصلہ نہیں ہوتا

ماہِ صیام رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ ساتھ اہل ایمان کی آزمائش کا بھی دور ہے۔
روزہ ایک آزمائش ہی ہے جس کے نتیجے میں جسم و جاں کو راحت نصیب ہوتی ہے۔
روزے کی غایت یہ ہے کہ دن بھر جسم کو بھوک اور پیاس سے نبرد آزما رکھ کر اُس کے ہر نظام کی بھرپور تہذیب و تطہیر کا اہتمام کیا جائے۔ ہم نے کیا غضب کا مزاج پایا ہے کہ روزے کی غایت کو پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ جو جسم دن بھر بھوک پیاس سے لڑتے لڑتے اپنی بھرپور تطہیر کرچکا ہوتا ہے اور بہتری کی طرف نئے سِرے سے سفر شروع کرنے ہی والا ہوتا ہے کہ اُسے ہم دوبارہ اشیائے خور و نوش کے سمندر میں غرق کردیتے ہیں ! یعنی اِدھر افطار کا سائرن بجا اور اُدھر گئی بھینس پانی میں ! اور بھینس کیا پانی میں ! جاتا ہے، سارا پانی بھینس میں چلا جاتا ہے

اب آیئے ماہِ صیام کے دیگر معاملات کی طرف۔ پہلے عشرے کے دوران تو اللہ کو یاد کرنے کی تھوڑی بہت گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ بازاروں کی رونقیں ابھی جوبن پر نہیں آئی ہوتیں اِس لیے عبادت کا بازار تھوڑا بہت گرم رہتا ہے۔ دوسرا عشرہ شروع ہوتا ہے تو خواتین کی پریشانیوں کا بھی آغاز ہوتا ہے۔ فکر لاحق ہوتی ہے کہ کس نے کیا بنوایا ہے تاکہ اُس کا بھرپور توڑ پیدا کیا

جاسکے! اور جب یہ سوچ بیدار ہو جائے تو پھر کیسی عبادت، کہاں کے وظائف؟ رہا شوہروں کا معاملہ تو جناب! جو وقت عبادات اور اوراد و وظائف میں صرف ہونا چاہیے وہ اِس فکر میں غلطاں رہتے ہوئے ضائع ہو جاتا ہے کہ اہلِ خانہ کے لیے عید کی تیاریوں کو کس طور حتمی شکل دی جائے۔ عید کی تیاریوں میں سب سے اہم مرحلہ ہے اُنہیں حتمی شکل دینے کا۔ اور یہ حتمی شکل ہے کہ درشن دینے کا نام نہیں لیتی! گویا ع

اِک مُعمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

ماہِ صیام کا تیسرا عشرہ اپنے ساتھ جہنم کی آگ سے نجات کی نوید لاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہم نے وعید کا بھی اہتمام کر ڈالا ہے۔ یعنی اِس عشرے کو شاپنگ کے جہنم کی آگ کے سامنے لا کھڑا کیا ہے! رمضان المبارک کا دوسرا عشرہ ختم ہوتے ہوتے بازاروں کی رونقیں اِس طرح بڑھنی شروع ہوتی ہیں کہ پھر گھر میں جی نہیں لگتا۔ جس طرف جا نکلیے، میلے کا سماں ملتا ہے۔ ایسے میں تیسرا عشرہ شروع ہوتے ہی گھر میں بیٹھ رہنا ایک دو دن تو مکروہ لگتا ہے اور اِس کے بعد تو حرام کے درجے میں پہنچتا دکھائی دیتا ہے!

جس طرح ساری خدائی ایک طرف اور جورو کا بھائی ایک طرف، بالکل اُسی طرح ہر طرح کی شاپنگ ایک طرف اور عید کی شاپنگ ایک طرف، بلکہ ہر طرف! عید قریب آتی

ہے تو ہر علاقہ شاپنگ سینٹر کا منظر پیش کرنے لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کرنے کیلئے اب شاپنگ کے سِوا کوئی کام نہیں رہ گیا۔ خواتین کے لیے اِس سے زیادہ شاندار موقع اور کوئی نہیں ہوتا کہ جو چاہیں، عید کی شاپنگ کے نام پر کر گزریں۔ جو کسر اُنھوں نے سال بھر ہرگز نہیں چھوڑی ہوتی وہ بھی پوری کرنے پر تُلی رہتی ہیں! جیسے کسی نے شوقِ ناتمام کا پِٹارا کھول دیا ہو! شوہر بے چارے (چارہ نہ کہ چارا!) مجبور ہوتے ہیں کہ سب کچھ ہنستے ہنستے سہیں۔ اگر عید کی شاپنگ میں ذرا بھی رخنہ ڈالیں تو عید الاضحیٰ تک طعنے سُننے پڑتے ہیں۔

شاپنگ کا ٹنٹا ختم ہو تو کیسے ہو؟ خواتین کی نفسیات (!) سے کِھلواڑ کے لیے دکاندار ورائٹی ہی اِتنی رکھتے ہیں کہ وہ بے چاری انتخاب کے مرحلے میں پھنس کر رہ جاتی ہیں! فیصلے کی قوت دَم توڑ دیتی ہے۔ صرف ایک فیصلہ حدِ امکان میں باقی رہ جاتا ہے، یہ کہ جو کچھ بھی پسند آتا جائے وہ لے لیا جائے! خواجہ الطاف حسین حالؔی نے خوب کہا ہے ؎

ہے جُستجو کہ خوب سے ہے خُوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جاکر نظر کہاں

بعض خواتین نے تو اب انتخاب کے معاملے کو بھی حرام کے درجے میں رکھ دیا ہے۔

یعنی وقت ضائع مت کرو اور جب تک پرس خالی نہ ہو جائے، خریدتی چلی جاؤ۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز خریدی جاچکی ہوتی ہے مگر کسی اور دکان میں اُسی کا نیا ورژن دیکھ کر خریدے بغیر چارہ نہیں ہوتا! ع

!میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بعض خواتین کو آخری عشرے کے آخری دنوں میں شوہر پر ترس آتا ہے اور وہ شاپنگ کا گراف تھوڑا نیچے رکھنے کا سوچتی ہیں مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلتا ہے۔ حالی ہی نے کہا ہے ع

دِل چاہتا نہ ہو تو دُعا میں اثر کہاں؟

عید کی شاپنگ کے خاصے منفرد لشکارے ہیں جن کا مقابلہ سال بھر کی جانے والی شاپنگ کر ہی نہیں سکتی۔ عام دنوں میں ہونے والی شاپنگ انسان کو اَدھ مُوا کرکے چھوڑ دیتی ہے، عید کی شاپنگ دل سے دھڑکن اور رگوں سے خُون تک نچوڑ لیتی ہے۔ خواتین چاند رات تک شوہروں کی جیب اور صبر دونوں کو آزماتی رہتی ہیں۔ اور ایک جیب یا صبر پر کیا موقوف ہے، اُن غریبوں کا تو پورا وجود ہی آزمائش کی بَھٹّی میں تپتا رہتا ہے۔ جب تک شوہروں کے دَم میں دَم دکھائی دیتا ہے، خواتین بھی متحرک رہتی ہیں۔ مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ شوہروں کو

منطقی انجام تک پہنچا کر دم لیا جائے۔ بقولِ غالبؔ ع

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟

اور دوسری طرف بے چارے شوہر ایک بازار سے دوسرے بازار اور دوسرے سے تیسرے کی طرف سفر کے دوران انتہائے ضبط کی تصویر بنے رہتے ہیں۔ کل سَحری کے وقت جس مقام سے لَوٹے تھے آج افطار کے بعد پھر وہیں کھڑے ہیں۔ ۔

ہے انتہائے یاس بھی اِک ابتدائے شوق

پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم!

عید کی شاپنگ کے دوران جو بھرپور ولولہ دکھائی دیتا ہے ہمیں وہی جوش اور ولولہ قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے بھی درکار ہے۔ گویا ملک بھی تعمیر و ترقی کی منزل تک پہنچ سکتا ہے، اگر رمضان المبارک بارہ مہینوں پر محیط ہو!

برفانی تودے کا سہرا

غزہ ایک بار بار خاک و خون میں غلطاں ہے۔ اسرائیل نے درندگی کی نئی مثالیں قائم کی ہیں۔ جنگی جہازوں سے موت برسائی جارہی ہے۔ بنیادی سہولتوں کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے تاکہ بمباری سے زخمی ہونے والوں کو بروقت طبّی امداد پہنچانا بھی ممکن نہ رہے۔ نہتے فلسطینیوں پر توڑی جانے والی اس تازہ قیامت کے حوالے سے اسلامی ممالک سمیت پوری عالمی برادری کا مجموعی ردعمل نیم دِلانہ ہے۔ امریکا اور یورپ نے، جیسا کہ اندازہ لگایا جارہا تھا، ایک بار پھر اسرائیل کے حقِ دفاع کا راگ الاپا ہے۔ حماس کے خلاف کارروائی کو مغرب نے برحق اور جائز قرار دیا ہے مگر بمباری میں خواتین اور بچوں کے سفاکانہ قتل کے حوالے سے مجرمانہ خاموشی اختیار کرنے کو ترجیح دی ہے۔ کیا فلسطینیوں کو شہید کرنا اور ان پر زندگی کا دائرہ تنگ کرنا صرف اسرائیل کا فیصلہ ہے؟ کیا یہ صرف اسرائیلی ہیں جو فلسطینیوں کو برداشت نہیں کرنا چاہتے؟ کیا سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ہمیں دکھائی دے رہا ہے؟

سوچنا پڑے گا۔ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے مابین جو کچھ بھی چھ عشروں سے چل رہا ہے وہ ہرگز ایسا نہیں کہ نظر انداز کر دیا جائے یا ہلکا لیا جائے۔ فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلی جارحیت ہر اعتبار سے قابلِ مذمت سہی مگر سوچنا یہ ہے کہ یہ کہیں برفانی تودے کا سِرا تو نہیں؟ سمندر میں برفانی تودے کا صرف سِرا دکھائی دیتا ہے یعنی اصل مصیبت تو پانی میں چُھپی ہوتی ہے۔

اسرائیل جو کچھ فلسطینیوں کے خلاف کرتا آیا ہے وہ کہیں چوہے دان میں لگایا جانے والا پنیر کا ٹکڑا تو نہیں؟

جنگل کے ماحول سے متعلق ایک دستاویزی فلم میں ہم نے دیکھا تھا کہ ایک چیتے نے ہرن کے بچے کو پکڑ لیا اور اُس کی گردن میں دانت گاڑنے کے بجائے اُسے ''پیار'' سے جکڑ کر اُس کی ماں کا انتظار کرنے لگا۔ ہرنی دور سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ چیتا بھی اُسی پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ وہ بچے کے ذریعے اُس کی ماں کو دبوچنا چاہتا تھا۔ خاصا وقت گزرنے کے بعد بھی ہرنی قریب نہ آئی تو چیتے نے بچے کو چیر پھاڑ کر کھالیا۔

ذرا سا غور کرنے پر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ اسرائیل کو چیتے کا کردار عطا کرکے اُسے بھی ہرنی کو دام میں لانے کا فریضہ ہی سونپا گیا ہے۔ اسرائیل

اسلامی دنیا کے سینے میں خنجر کی طرح گڑا نہیں بلکہ اُسے گاڑا گیا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر ممالک پر بے ضمیر اور انفرادی مفاد کے غلام حکمران تھوپ کر رہی سہی کسر پوری کردی گئی ہے۔ جس طور ایک مچھلی پورے تالاب کو گندا کرتی ہے بالکل اُسی طرح اسرائیل کے وجود نے پورے خطے کی سلامتی اور استحکام کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔

مگر کیا واقعی اسرائیل اِس قدر طاقتور ہے کہ ہر معاملے میں من مانی کرسکے؟

مشرقِ وسطیٰ یعنی اسلامی دنیا کی نئی نقشہ گری یقینی بنانے کے لیے اسرائیل کو انتہائے ذہانت کے ساتھ آلۂ کار بنایا گیا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ طے کردیا گیا تھا کہ مسلم دنیا کو کسی بھی طرح سَر اُٹھانے کا موقع نہیں دینا ہے۔ مغربی قوتوں نے جمہوریت، لبرل ازم، رواداری، کشادہ ذہنی اور وسیع القلبی کے ہزار دعووں کے باوجود اب تک اسلامی دنیا سے اپنی ماضی کی لڑائیوں کو فراموش نہیں کیا۔ صلیبی جنگوں میں صلاح الدین ایوبی جیسے سُورماؤں کے ہاتھوں جو مار سہنی پڑی تھی اُس کا انتقام لینے کا جذبہ مغرب کے عیسائیوں کے دِلوں سے اب بھی گیا نہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اسلامی دنیا کو زیرِ نگیں رکھنے کے لیے فساد کی جڑ پیدا کرنا بھی تو مقصود تھا، سو اسرائیل کو جنم دیا گیا۔ مغرب اپنی منصوبہ بندی میں بھرپور انداز سے کامیاب رہا ہے۔ اہلِ مغرب چھ عشروں سے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہودیوں نے اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ دنیا کو باور کرایا جارہا ہے کہ یہودیوں سے زیادہ ذہین اور فطین کوئی نہیں۔ اور یہ کہ وہ جو کچھ بھی چاہیں کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو باور کرایا جارہا ہے کہ اللہ نے جس قوم کو مردود قرار دے رکھا ہے وہ تو علم و فن اور معیشت کے محاذ پر کامیاب جارہی ہے! اِس نکتے پر غور کرنے کی زحمت کوئی گوارا نہیں کرتا کہ بیشتر خرابیاں یہودیوں کی پیدا کردہ ہیں یا پھر اُن کے نام پر متعارف کرائی گئی ہیں۔

کیا اہلِ مغرب واقعی یہودیوں کے سامنے بے بس ہیں؟ اگر ایسا ہے تو چین کو برداشت کرنے سے انکار کیوں کیا جارہا ہے؟ اُس کے پاس تو عددی برتری بھی ہے۔ امریکا کے مُٹھی بھر یہودی کیا واقعی اِتنے طاقتور ہیں کہ منتخب ایوانوں کی تقدیر کا فیصلہ صادر کریں اور وہ فیصلہ تسلیم بھی کیا جائے؟ امریکی عوام کو نفسی طور پر اِس قدر مغلوب کیوں کر دیا گیا ہے کہ وہ یہودیوں کی برتری تسلیم کرنے پر مجبور ہیں؟ میڈیا کے ذریعے یہ پیغام تواتر کے ساتھ کیوں دیا جارہا ہے کہ کھلونے جیسا چھوٹا سا اسرائیل دنیا کی واحد سُپر پاور کو ناکوں

اِس لیے ہے کہ اسرائیل اور یہودیوں کی eye-wash چنے چبوا سکتا ہے؟ کیا یہ سارا طرف دیکھ کر مسلمان نفرت کا اظہار کریں اور عیسائی نفسی طور پر مغلوب ہوں؟

امریکا اسرائیلی قیادت سے کوئی بی مطالبہ اِس طرح کرتی ہے جیسے کوئی ہرن خوفزدہ ہو کر درندوں سے بچتا پھر رہا ہو۔ یعنی اپنی مرضی کا ایک بدمعاش کھڑا کرکے اُسے خوب مضبوط کیا جارہا ہے تاکہ سب مکر و فریب اور طاقت و حشمت کے اِس بچھڑے کی پُوجا کرنے پر مجبور ہوں!

چھ عشروں سے یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ یہودیوں کا کوئی دشمن ہے تو صرف مسلمان۔ یہ بات میڈیا کے ذریعے ذہنوں سے کھرچ کر پھینک دی گئی ہے کہ اسلام کے ظہور پذیر ہونے سے بہت پہلے عیسائی اور یہودی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ عیسٰی علیہ السلام کی نبوت سے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ ہو گئی تھی۔ یہودی اِس بات کو برداشت نہ کرسکے۔ اور اُنہوں نے عیسٰی علیہ السلام پر سُولی پر لٹکادیا۔ بیشتر عیسائی آج بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جسے وہ خدا کا بیٹا مانتے ہیں اُسے سُولی پر مسلمانوں نے نہیں، یہودیوں نے چڑھایا تھا۔ یہ تلخ حقیقت پروپیگنڈے کے ذریعے عیسائیوں کے اذہان سے مٹادی گئی ہے۔

یہودی دعویٰ کرتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم میں جرمن آمر ایڈولف ہٹلر نے کم و بیش ساٹھ لاکھ یہودیوں کو قتل کیا۔اِس دعوے کو غلط قرار دینے کی گنجائش بھی نہیں چھوڑی گئی۔ امریکا کی مدد سے یہودیوں نے یورپ اور باقی دنیا کو پابند کیا کہ دوسری جنگ عظیم میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کے قتل یعنی ''ہولوکاسٹ'' کو درست تسلیم کرے۔ یورپ کے کئی ممالک میں آج بھی ہولوکاسٹ کے خلاف بولنا جرم ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی ساٹھ لاکھ یہودیوں کو قتل کیا گیا تھا تو آج کے یہودیوں کو ہر جرمن کے خون کا پیاسا ہونا چاہیے۔ یہودیوں نے اپنے ساٹھ لاکھ نفوس سے محروم ہو جانے پر جرمنوں کو قبول کرلیا مگر مسلمان اُن سے برداشت نہیں ہو پا رہے۔ مسلمانوں کی کسی بھی حکومت یا سلطنت نے کبھی یہودیوں کو بڑے پیمانے پر قتل نہیں کیا۔

کیا امریکا اور یورپ یہ چاہتے ہیں کہ فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم سے مشتعل ہو کر مسلم ممالک اسرائیل پر چڑھ دوڑیں؟ ایسی صورت میں مغربی افواج کو پورے خطے پر قابض ہونے کا بہترین بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔ فلسطینیوں پر انسانیت سوز مظالم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھ کر آپ اور مجھ سمیت دلِ درد مند رکھنے والا ہر مسلمان یہی چاہتا ہے کہ اسرائیل کے خلاف کھلی جنگ چھیڑ دی جائے۔ امریکا اور یورپ یہی چاہتے ہیں۔ مغرب کے سامراجیوں کے ترتیب دیئے

ہوئے نئے عالمی نظام کے تحت پورے مشرقِ وسطیٰ کی نئی صورت گری کا یہی ایک قابلِ عمل راستہ ہے۔

اسرائیل کا راستہ لازم ہے۔ مگر اُس سے کہیں بڑھ کر معصومیت کا ڈھونگ رچانے والے امریکا اور یورپ کو بھی یہ باور کرانا لازم ہے کہ ساری خرابی کے اصل ذمہ دار وہی ہیں۔ امریکا اور یورپ چاہتے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کی پوری بساط اُلٹنے کی گنجائش بھی پیدا ہو اور الزام صرف اسرائیل کے سَر جائے!

مسلم دنیا کے سامنے بہت بڑا چیلنج ہے۔ ایک طرف اسرائیل کو جارحیت سے روکنا ہے اور دوسری طرف اُس کے خلاف کھلی اور مکمل جنگ سے احتراز بھی کرنا ہے۔ ایسے میں امریکا اور یورپ پر دباؤ بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اسرائیل کو چابی بھرنے سے باز رہیں۔ کسی صلاح الدین ایوبی کی آمد کا انتظار کرنے کے بجائے مسلم حکمرانوں کو خود ہی صلاح الدین ایوبی والا کردار اپنے اندر پروان چڑھانا ہوگا۔

مُرغے کا انڈا

عید آئی اور گزر بھی گئی۔ گلے مل مل کر مبارک باد دینے کے دن گزر گئے۔ اب عید الاضحیٰ آئے گی۔ مگر اِس سے قبل انقلاب کا انتظار ہے۔ اہلِ وطن نے ہر موسم اور ہر موقع کو دِل پشوری کے ذریعے میں تبدیل کرلیا ہے۔ انسان کے لیے بہتر تو یہی ہے کہ خود کو حالات کے مطابق تبدیل کرلے یا پھر حالات کو اپنی مرضی کے آئینے میں دیکھے۔ درد کا علاج ممکن نہ ہو تو درد ہی کو دوا سمجھ لینے میں کیا ہے؟ غالبؔ نے کہا تھا ع

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اور اگر یہی بات ذرا فلمی انداز سے کہیں تو ؎

دِل کی تنہائی کو آواز بنالیتے ہیں

درد جب حد سے گزرتا ہے تو گالیتے ہیں

ایک طرف عوام ہیں جو درد کے حد سے گزرنے پر اُسے دوا بنانے پر تُلے ہیں اور دوسری طرف قوم کے راہ نُما ہیں جنہیں اور کچھ نہیں سُوجھتا تو اپنے کسی پُرانے، پھٹے ڈھول کو کباڑ خانے سے نکالتے ہیں، جھاڑ پونچھ کر خوب پیٹتے ہیں۔ لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ راہ دکھانے کے نام پر ایک بار پھر بے وقوف بنانے

کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔
ڈیڑھ دو ماہ سے ڈاکٹر طاہر القادری اور اُن کے رفقاء نے ''انقلاب'' کا راگ اِس تواتر سے الاپا ہے کہ اب تو لوگوں کو مَتلی سی ہونے لگی ہے! سُننے والے اُوب گئے ہیں مگر ڈاکٹر طاہر القادری اور اُن کے رفقاء کی ہمت کو داد دیجیے کہ وہ تھکے ہیں نہ اُکتائے ہیں۔
اِس بات کی بھی داد دینی پڑے گی کہ جو فلم گزشتہ برس شدید ناکامی سے دوچار ہوئی تھی اُسے چند نئے مکالموں اور ایڈیٹنگ کے ساتھ پھر ریلیز کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔اِس مرتبہ بھی اسلام آباد کے تھیٹر کا انتخاب کیا گیا ہے۔
مشکل ہے تو بس اِتنی کہ اِس مرتبہ عمران خان بھی اپنی فلم کے لیے میدان میں اُترنے کو ہیں۔ فلم کی جگہ آپ لفظ ڈراما بھی استعمال کر سکتے ہیں۔
اہلِ وطن یہ دیکھنے کو بے قرار ہیں کہ کون کیا کر دکھاتا ہے۔ ایک طرف ''نیا پاکستان'' کے نام پر شور و غوغا ہے اور دوسری ''انقلاب'' کا غلغلہ ہے۔اِس سیاسی دکانداری میں کون کیا پیش کر رہا ہے، یہ جاننے کی سبھی کو جلدی اور بے تابی ہے۔ سبھی جاننا چاہتے ہیں کہ ''انقلاب اور ''نیا پاکستان'' کے نام پر متعلقہ سیاسی جادوگر اِس بار ٹوپی سے کون سا کبوتر اُڑاتے ہیں یا کیسا

انڈا نکال کر دِکھاتے ہیں!

مرزا تنقید بیگ کو یہ سب کچھ بہت عجیب لگتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اب سیاسی ڈراما بازی بند ہو اور لوگوں کو سُکون کا سانس لینے کا موقع ملے۔ ہم اُنہیں یاد دلاتے ہیں کہ اُن کی سوچ زمینی حقائق کے بالکل برعکس ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ عوام کو بے وقوف بنایا جارہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عوام صورت حال کو ''انجوائے'' کر رہے ہیں۔ بے وقوف بنانے کی تمام حدیں کب کی گزرچکیں۔ اب تو مرحلہ درد کے دوا میں تبدیل ہوجانے کا ہے۔

عمران خان، ڈاکٹر طاہرالقادری، شیخ رشید اور اِسی قبیل کی چند دیگر نابغۂ روزگار قسم کی شخصیات کے دم سے سیاسی میلے کی رونق ہے اور اہلِ وطن بھرپور لطف کشید کرتے ہیں۔ مرزا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ ایک طرف بیٹھ رہیں۔ ہم اُنہیں باور کراتے کراتے تھک چکے ہیں کہ اِس قبیل کے لوگ گوشہ نشین ہوگئے تو سیاسی ہلچل اور ''جمہوری تحرّک'' کا بھٹہ بیٹھ جائے گا اور گوشے کی بھی مِٹّی پلید ہوجائے گی۔

ایک طرف جشنِ آزادی ہے اور دوسری طرف آرڈر پر مال تیار کرنے والوں کی طرف سے دھما چوکڑی کی منصوبہ سازی۔ حکومت بھی کمر کَس کر میدان میں اُترتی دکھائی دیتی ہے۔ ابھی ابھی ماہِ صیام گزرا ہے اور حکومت ''ماہِ آزادی

منانے پر کمربستہ دکھائی دیتی ہے۔ آگ پر پانی ڈالنے کے بجائے لوہے کو لوہے سے کاٹنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ حکومت کی صفوں میں جو "عقاب" بیٹھے ہیں وہ وزیرِاعظم کو مشورہ دے رہے ہیں کہ بُردباری کا مظاہرہ کرنے کے بجائے حریفوں کو للکارا جائے۔ ے

اِدھر آ ستم گر! ہُنر آزمائیں

!تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں

عوام حیران ہیں کہ اگر حریفوں نے اپنا ہُنر آزمانے کا فیصلہ کیا بھی ہے تو حکومت جواب میں تصادم کی راہ پر کیوں چلنا چاہتی ہے۔ یہ تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ ہم اِس مرحلے پر عوام کو یاد دلادیں کہ ن لیگ کے لیے اپنے پاؤن پر کلہاڑی مارنا کسی بھی لحاظ سے نئی بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ دونوں ادوارِ حکومت اُس نے !اپنے پاؤں پر کلہاڑے مار کر ختم کئے تھے

سیاسی اور معروضی حالات کا موسم بہت عجیب ہے۔ فضا سوگوار ہے۔ جو شاندار اور جوشیلے نغماتِ وطن کافروں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کرنے والوں کیلئے تیار کئے گئے تھے وہ شمالی وزیرستان میں اپنوں کا نشانہ بننے والوں کی یاد میں اہلِ وطن کے گوش گزار کئے جارہے ہیں! کس نے سوچا تھا کہ اپنے ہی وطن میں

لڑی جانے والی لڑائی میں کام آنے والوں کے لیے ''اے راہِ حق کے شہیدو!'' بجانا پڑے گا!

ایک طرف شمالی وزیرستان میں آپریشن جاری ہے اور دوسری طرف وفاقی دارالحکومت کو عین جشنِ آزادی کے لمحات میں سیاسی اکھاڑا بنانے کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ اہلِ جہاں اب تک محروم ہیں۔ اُنہیں بُلا کر دکھایا جائے کہ دیکھو ''سیاسی بصیرت'' ایسی ہوتی ہے! جو کچھ عمران خان اور ڈاکٹر طاہرالقادری کرنا یا کر دکھانا چاہتے ہیں وہ ہما شُما کے بس کی بات نہیں۔ کوئی آئے اور ذرا ہمارے راہ نُماؤں کی اہلیت و سکت پر ایک نظر ڈالے۔

دیکھواِس طرح سے کہتے ہیں سُخن ور سہرا!

ملّی نغموں اور حب الوطنی کی دال میں سیاسی نعرے بازی اور شور و غوغا کا تڑکا لگانے کی بھرپور تیاری دیکھ کر اہلِ وطن دم بخود ہیں کہ کس بات سے محظوظ ہوں اور کس اَمر پر کبیدہ خاطر ہوا جائے۔

جہاں سب کچھ بانجھ ہوچکا ہو وہاں کسی بھی بڑی تبدیلی کی توقع عبث ہے۔ اور پھر انقلاب! کسی کو اندازہ بھی ہے کہ انقلاب ہوتا کیا ہے؟ اوراِس نکتے پر بھی کسی نے غور کیا ہے کہ انقلاب لایا نہیں جاتا، برپا ہوتا ہے! کوئی اُسے

پیدا نہیں کرتا، وہ اپنے اندر سے خود پُھوٹتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے ایک ماہ تو اِس ڈرامے میں گزار دیا کہ انقلاب کی تاریخ کا اعلان کیا جائے گا۔ انقلابات کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی انقلاب کی تاریخ کا اعلان کیا جارہا ہے۔ گویا انقلاب کی شادی طے ہو گئی ہے اور اب تاریخ کا اعلان رہ گیا ہے!

عمران خان نیا پاکستان معرضِ وجود میں لانا چاہتے ہیں۔ نئے پاکستان کے اجزائے ترکیبی وہ کہاں سے لائیں گے؟ یہاں تو سینوں میں جذبوں کی گرمی بھی ختم ہو چلی ہے۔ ہر طرف بے حِسی اور بے دِلی ہے۔ اور اگر کوئی بے دِلی کو پچھاڑ بھی دے تو نیم دِلی کی منزل میں پھنس کر رہ جاتا ہے! جس معاشرے میں سبھی کچھ کرپشن کی نذر ہو چکا ہو، بے ایمانی نے ہر دِل میں گھر کرلیا ہو، ذاتی مفاد ہر معاملے میں قومی مفاد پر غالب آچکا ہو، تمام اقدار کو دیس نکالا دیا جاچکا ہو اور کردار کے تمام اوصافِ حمیدہ محض کتابوں تک محدود ہو چکے ہوں وہاں کیا انقلاب آئے گا اور کیا نیا پاکستان اُبھر سکے گا؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے مُرغے سے کہا جائے کہ انڈا دے! مُرغے اصیل اور انتہائی طاقتور ہوں تب بھی انڈے بہرحال نہیں دے سکتے۔ اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ مُرغے بھی مَریل ہیں۔ گویا ہر معاملے نے دَھنیا پی رکھا ہے۔

کیا عمران خان اور ڈاکٹر طاہر القادری جیسے ذہین افراد کو بھی یہ سمجھانا پڑے گا کہ کسی مکان کی جگہ نیا مکان بنانے کیلئے پُرانے مکان کا ملبہ ہٹانا پڑتا ہے؟ جب تک ملبہ نہیں ہٹایا جائے گا، نئے مکان کی بنیاد کہاں ڈالی جائے گی؟ یہ نکتہ معمولی راج مستری کو معلوم ہے تو قوم کے معمار ہونے کے دعویدار کیوں بُھول بیٹھے ہیں؟

پکا پکایا تازہ انقلاب

جو کچھ ہو رہا ہے وہ حیرت انگیز اور افسوسناک ہے۔ کیا ہو رہا ہے، یہ بحث اب ختم ہو چکی ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ حیرت کا سلسلہ ''کیا'' سے چلا اور اب ''کیوں'' پر آ کر رک گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ کسی بھی منتخب حکومت نے ابھی بوریا بستر کھولا بھی نہیں ہوتا کہ اُس کا بوریا بستر گول کرنے کی تحریک شروع کر دی جاتی ہے؟ ن لیگ کی تیسری حکومت نے ابھی سانس بھی درست نہیں کیا ہے کہ اُسے چلتا کرنے کی کاوشیں منظر عام پر آ گئی ہیں۔ آرڈر پر مال تیار کرنے والے میدان میں ہیں۔ اور اِس قدر تیاری کے ساتھ کہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہے ہے کہ کب کیا کرنا ہے اور کتنا کرنا ہے!

کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

جسے بھی دیکھیے روتا ہے رونا اپنی بیوی کا\
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ آخر ماجرا کیا ہے\
مزا تو جب ہے لے کر ہاتھ میں موٹا سا اِک ڈنڈا\
میاں، بیوی سے خود پوچھے بتا! تیری رضا کیا ہے؟

یہاں معاملہ بیوی کا نہیں، حالات اور اُن کی تبدیلی کا ہے۔ بیویاں تو شاید جیسے تیسے سُدھر بھی جاتی ہوں، حالات کہاں بدلتے یا سُدھرتے ہیں؟ اور حالات سے بھی کئی قدم آگے جاکر اب معاملہ انقلاب تک آ پہنچا ہے۔ دوسری طرف حکومت نے جب ہاتھ میں ڈنڈا تھام کر احتجاجیوں سے اُن کی ''رضا'' جاننے کی کوشش کی تو ٹائمنگ غلط ہونے سے کچھ گڑبڑ ہو گئی اور پھر معاملات اُلجھتے ہی چلے گئے۔

قوم کو راہ دکھانے والے کیا کیا دِکھانا چاہتے ہیں، کچھ پتا نہیں چلتا۔ قوم حیران و پریشان ہے کہ اِن ''کرم فرماؤں'' کے ہاتھوں ابھی اور کیا کیا دیکھنا ہے۔ نیت اور ارادوں پر دو چار کیا، درجنوں پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک پردہ ہٹتا ہے تو دوسرا دِکھائی دیتا ہے۔ دوسرا ہٹایئے تو تیسرے کے درشن ہوتے ہیں۔ گویا ع

صاف چُھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں!

اسکولوں میں بچوں کو ''جادو کے کمالات'' دکھانے والے بھی تھوڑی بہت حیرت برپا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہمارے راہ نماؤں میں تو اب اِس قدر چونکانے کی صلاحیت و سکت بھی نہیں رہی۔ اُن کے ''کمالات'' دیکھ کر اب کوئی چونکتا ہے نہ خوش ہوتا ہے۔ ہاں، اُن کی پژمُردگی کی سطح دیکھ کر قنوطیت کا

گراف ضرور بلند ہوتا جاتا ہے۔ ۔

اہلِ ستم کے طُرفہ ''کمالات'' دیکھ کر

اہلِ کرم کا عزم ہُنر ختم ہوگیا

ایک مدت سے یہ تماشا ہو رہا ہے۔ راتوں رات سب کچھ بدل ڈالنے کے دعوے کئے جارہے ہیں۔ اللہ جانے مغرب میں ایسی کون سی دوا ملتی ہے جسے پینے کے بعد ہمارے یہ مہربان تازہ دم ہو کر پھر کمر کَس کے واپس آتے ہیں اور ہمیں راہ دِکھانے پر تُل جاتے ہیں!

مرزا تنقید بیگ کہتے ہیں کہ اِس میں بے چارے راہ نماؤں کا کیا قصور؟ ہم ہیں ہی اِتنے بھٹکے ہوئے کہ ہمارے راہ نماؤں کے سَروں میں بار بار راہ دکھانے کا خنّاس سَماجاتا ہے۔ ہم راہ پر آنے کا نام نہیں لیتے۔ اور ہماری ہی وجہ سے قائدین بھی راہ پر نہیں آتے یعنی جب تک ہمیں راہِ راست پر نہیں لے آتے، وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

ایک بار پھر وہی پرانا راگ الاپا جارہا ہے۔ یعنی یہ کہ سب کچھ راتوں رات تبدیل ہو رہے گا۔ پبلک ٹرانسپورٹ کی گاڑیوں میں منجن اور ہاضمے کا چُورن بیچنے والے بھی ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔ یعنی صرف ایک بار استعمال

کیجیے اور تمام تکالیف سے نجات پائیے۔ ہماری سیاست اب چُورن اور منجن بیچنے ہی کی سطح پر آچکی ہے۔ سب کی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہے۔ سیاست ہو یا مذہب، سب اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا بیٹھے ہیں۔ ہر ایک کو زعم ہے کہ سارے جہاں کا درد اُسی کے جگر میں اور سارے مسائل کا حل اُسی کی زنبیل میں ہے۔ دماغ خالی ہیں اور غَرّہ اِس بات کا ہے کہ اُن میں سارے جہاں کی دانائی بھری ہوئی ہے۔ انتہائے حماقت کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے کہ حکومت کے خلاف، بلکہ حکومت کا دھڑن تختہ کرنے کے لیے وفاقی دارالحکومت جانے کی خاطر حکومت ہی سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ خصوصی ٹرینوں کا بندوبست کیا جائے! یعنی حکومت سے کہا جارہا ہے کہ آپ کو ذبح کرنا ہے، ذرا چُھری تو مرحمت فرمایئے!

راتوں رات تو ایک گھر کا ماحول بھی تبدیل نہیں ہوتا، یہاں ملک کو بدلنے کے دعوے کئے جارہے ہیں۔ ایسے دعوے سُننے اور پڑھنے والا سوچتا ہے ع

حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

مرزا تنقید بیگ مزاجاً انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ وہ جب بھی مشورہ دیتے ہیں تو انتہا پسندی پر اُتر آتے ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ راتوں رات سب کچھ درست کرنے کی باتیں کرنے والوں کو پاگل خانے پہنچا دینا چاہیے۔ ہم انتہائی رحم

دل واقع ہوئے ہیں اِس لیے ایسے کسی بھی مشورے کی تائید نہیں کر سکتے۔ سیدھی سی بات ہے، بے چارے پاگلوں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے! اِس ملک میں ایک وہی تو ہیں جو سُکون سے ہیں۔ اُنہیں سُکون ہی سے رہنے دیا جائے۔

مرزا تنقید بیگ تبدیلی اور انقلاب کے نعروں سے خاص الرجی رکھتے ہیں۔ ان کا استدلال کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ The End ہے کہ فلم ابھی شروع نہیں ہوئی ہوتی اور لوگ فلم میں بُرا انجام ولن کا ہوتا ہے۔ ہماری سیاسی و جمہوری فلم میں ہیرو کو بُرے انجام سے دوچار کرنے کی کوششیں جاری رہتی ہیں۔ اور ولن دور کھڑا، یہ تماشا دیکھ کر ہنستا رہتا ہے۔ انقلاب کے نعرے لگانے والے کبھی یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ لوگ یہ باتیں سُن کر کس قدر ہنستے ہوں گے۔ اتنی بات تو بچے بھی جانتے ہیں کہ برسوں بلکہ عشروں کا بگاڑ دو چار دن میں دور نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے ماحول میں انقلاب کا مذکور کامیڈی کا درجۂ کمال معلوم ہوتا ہے۔

نواز شریف تیسری بار وزیر اعظم بنے ہیں اور مسلسل تیسری بار پریشان ہیں۔ پریشان کیوں نہ ہوں؟ اِس بار بھی اُن کے اقتدار کی بساط ابتدائی مرحلے ہی میں لپیٹنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ میاں صاحب کا معاملہ تو یہ ہے کہ ۔

ابھی آئے، ابھی بیٹھے، ابھی دامن سنبھالا ہے

”! سبھی کی ’جاؤ، جاؤ‘ نے تو اُن کا دَم نکالا ہے“

یار لوگ ہاتھ دھوئے بغیر میاں صاحب کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ موقع دیکھا جا رہا ہے نہ محل۔ طے کر لیا گیا ہے کہ معقولیت کو لپیٹ کر ایک رکھ دینا ہے اور وہ سب کچھ کر گزرنا ہے جس میں معقولیت کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ سب چاہتے ہیں کہ میاں صاحب ایک بار پھر ع

آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

والے انجام سے دوچار ہوں۔

سیاسی ہنگامہ آرائی کے میلے میں وہ شور و غوغا ہے کہ کان پڑی آواز کا سُننا محال ہو گیا ہے۔ ایک طرف دھاندلی کا راگ الاپا جا رہا ہے اور دوسری طرف انقلاب کا الاؤ دہکایا جا رہا ہے۔ جس طرح کا انقلاب لانے کی بات کی جا رہی ہے اُس سے تو ہمیں ذوالفقار علی بھٹو کا دور یاد آ گیا۔ 1974 میں کراچی میں پکی پکائی تازہ روٹی متعارف کرائی گئی۔ پلاسٹک کی تھیلی میں ایک روپے کی پانچ روٹیاں ملا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر طاہر القادری پاکستان میں پکا پکایا انقلاب متعارف کرا رہے ہیں۔ گویا کنٹینرز میں انقلاب کے پیکٹ درآمد کئے جائیں گے جو اسٹورز پر دستیاب ہوں گے۔ جس کے جی میں آئے وہ اپنی ضرورت کے مطابق انقلاب خرید کر گھر لے جائے! ۔

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دِل جلا کے سرِ عام رکھ دیا

☆☆☆

!یہ ہنگامہ اے خُدا کیا ہے

انداز ایسا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔ بنیادی شعبہ چونکہ علم الکلام ہے اِس لیے طرزِ کلام بھی کچھ ایسی ہے کہ اُس کے پُراثر ہونے میں کسی کو کچھ کلام نہیں۔ جب وہ پورے جوش کے ساتھ خطابت کے جوہر دکھا رہے ہوتے ہیں تو داد نہ دینا بہت عجیب لگتا ہے۔ مگر کیا کیجیے کہ جب وہ رطب اللسان ہوتے ہیں تو کبھی کبھی سُننے والوں کی محویت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ داد دینا بھی بھول جاتے ہیں ! بقول محسنؔ بھوپالی اگر دادِ سُخن بھی دی، تسلسل ٹوٹ جائے گا !

ڈاکٹر طاہر القادری کا اندازِ خطابت کچھ ایسا ہے کہ سُننے والے ہی نہیں خود الفاظ بھی پناہ مانگتے اور (اپنے) کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں ! وہ بھی الفاظ کو کب چھوڑتے ہیں۔ بھرپور جوش کے عالم میں وہ الفاظ کو یوں پکڑتے ہیں جیسے عقاب کبوتر پر جَھپٹّا مارتا ہے ! اور پھر دم بھر میں الفاظ یہ کہتے ہیں بے دَم سے ہو کر گر پڑتے ہیں کہ جناب ! جس طرح بھی استعمال کرنا ہے، کر ڈالو !

ڈاکٹر صاحب نے حال ہی میں منائے جانے والے یومِ شہداء پر ایسا خطاب کیا کہ

خطابت کے فن سے محفوظ ہونے کا ذوق و شوق رکھنے والوں کو شہید کر ڈالا۔ خطاب کے دوران اُن کا جوش وجذبہ (حسبِ معمول) ایسا تھا کہ سُننے اور دیکھنے والوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبالیں۔ جلال ایسا تھا کہ نظر ٹھہرتی نہ تھی۔ رگ و پے میں ایسی توانائی کہ حاضرین اور ناظرین دم بخود ہو کر سوچتے ہی رہ گئے کہ اُن کو دیکھیں یا اُن کی بات سُنیں!

ڈاکٹر طاہر القادری کی وطن (کینیڈا) سے آمد طرح طرح کے گل کھلانے پر تُل جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی تو پورا چمن کِھلانے پر بضد دکھائی دیتی ہے۔ اب کے بھی یہی ہوا ہے، بلکہ کچھ بڑھ کے ہوا ہے۔ اُنھوں نے ایک بار پھر انقلاب کا غلغلہ بلند کیا ہے۔ اب تک 20 سے زائد کارکن انقلاب کی چوکھٹ پر قربان ہوچکے ہیں۔

خدا جانے وہ کون سی جادو نگری ہے جہاں پورے معاشرے کو پلٹنے، بدلنے اور سُدھارنے کی صلاحیت رکھنے والا ریڈی میڈ انقلاب ملتا ہے کہ بس لایئے اور نافذ یا برپا کر دیجیے۔ کوئی بتائے کہ یہ کیسا انقلاب ہے کہ جس کی جڑ میں صرف خرابی ہے، تباہی ہے، بربادی ہے۔ یہ سارا ہنگامہ کیوں اور کس کے کہنے پر برپا کیا گیا ہے؟ کون ہے جو معاملات کو پتلی تماشے کی طرح چلا رہا ہے؟ ڈاکٹر صاحب ہی کچھ فرمائیں کہ اُن کے تانے ہوئے پردۂ زنگاری میں کون سا

معشوق چُھپا بیٹھا ہے! اہلِ پاکستان تو حیران ہیں۔ ۔

سوچیے تو خیال کے اطراف

!دائرے گھومنے سے لگتے ہیں

دوسری طرف خان صاحب ہیں جو ماننے کو تیار نہیں۔ اُن کے احتجاج کی بنیاد کیا ہے، یہ بھی کسی پر واضح نہیں ہوتا۔ حیرت اِس پر ہے کہ ایک صوبے کی حکومت اُن کے پاس ہے مگر وہ اُسے ڈھنگ سے چلانے کے بجائے وفاق کے فراق میں ہیں۔ حکومت کے خلاف احتجاج کے لیے عمران خان نے انداز اختیار ہے وہ ''انوکھا لاڈلا، کھیلن کو مانگے چاند'' والا ہے۔ چھوٹے موٹے کھلونے سے وہ بہلنے کو تیار نہیں۔ محترم نذیر ناجی کا تجزیہ درست ہے کہ کھلونوں سے بہلنے والے کو حکومت نے اپنے لیے خطرے میں

!تبدیل کرلیا

اب معاملہ یہ ہے کہ عمران کسی بھی طور ماننے کے لیے تیار نہیں۔ چار دن قبل جب وزیر اعظم نے مذاکرات کا عندیہ دیا تو عمران خان نے ملاقات یا رابطے سے انکار کرتے ہوئے کہہ دیا کہ اب تو 14 اگست کے بعد ہی بات ہوگی۔ بات یہ ہے کہ عمران خان کردیا ہے کہ اب اگر وہ motivated نے لانگ مارچ کے لیے لوگوں کو اس حد تک پیچھے ہٹیں گے تو یہ اقدام پارٹی کے لیے پورس کا ہاتھی ثابت ہوگا! اِس نکتے پر غور کیا جاسکتا ہے کہ کیا وزیر اعظم نے جان بوجھ کر اِتنا وقت

گزرنے دیا کہ عمران خان بلائے جانے پر بھی مذاکرات کی میز تک آنے کی پوزیشن میں نہ رہیں hype ! مگر ساتھ ہی یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عمران خان نے ایسی کیوں پروان چڑھائی جو خود اُن کے گلے کی ہڈی بن جائے۔ ایسی کون سی مجبوری تھی کہ وہ قدرے کمزور بنیاد پر حکومت مخالف تحریک کی عمارت قائم کرنے پر تُل گئے؟ کسی کے حکم کی تعمیل میں اُنہیں اِس حد تک کیوں جانا پڑا کہ اب واپسی کا راستہ بچا ہی نہیں ! ذہنوں میں طرح طرح کے سوالات اُبھر رہے ہیں مگر کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ اہلِ وطن کی صدائیں دیواروں سے سَر ٹکرا کر پلٹ آتی ہیں۔ کیا یہ سب کچھ ضمیر کی آواز پر کیا جارہا ہے؟ اور ہاں تو یہ کیسا ضمیر ہے جو صرف خرابی اور فساد کی کال دیتا ہے؟ کینیڈا کی انتہائی غیر آلودہ فضا میں ایسی آلودہ سوچ کیونکر پروان چڑھ سکتی ہے؟

اگست کی شب وزیر اعظم نواز شریف کے خطاب سے یاروں نے کیا کیا توقعات 12 وابستہ کر رکھی تھیں۔ عام خیال اور تاثر یہ تھا کہ وہ عمران خان اور طاہر القادری سے مذاکرات کی بات کریں گے۔ مگر میاں صاحب نے وہی کہا جو عقل کا تقاضا تھا۔ انہوں نے اپنے تیسرے دورِ اقتدار کے 14 ماہ کی کارگزاری گنواتے ہوئے قوم سے سوال کیا کہ یہ ساری ہنگامہ آرائی کیوں ہے؟ ساتھ ہی یہ

بھی کہا کہ اِس فساد کی کوئی ایک وجہ تو بتائی جائے۔
مرزا تنقید بیگ کو وزیر اعظم کی تقریر بہت پسند آئی۔ تقریر کے ختم ہوتے ہی ہمارے گھر آ دھمکے اور فرمایا۔ ''وزیر اعظم کی حیثیت سے اُنہیں جو سوچ اپنانی چاہیے تھی وہی سوچ اُنہوں نے اپنائی۔''
ہم نے عرض کیا کہ عمران خان اور طاہر القادری سے بات کرنے میں ہرج کیا ہے؟ کچھ دن پہلے بھی تو اُنہوں نے مذاکرات پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے قوم سے باضابطہ خطاب میں بھی مذاکرات کا عندیہ دینے میں تکلف کیوں؟ مرزا نے جواب دیا۔ ''اگر وہ لانگ مارچ پر نکلنے والے ہر سیاست دان سے بات کرنے بیٹھ گئے تو لانگ مارچز کی لائن لگ جائے گی۔ اگر میاں صاحب عمران خان یا طاہر القادری کو منانے کی کوشش کرتے تو رُوٹھنے والوں کا مجمع لگ جاتا۔''
ہم معترض ہوئے کہ جمہوریت کو بچانے کی خاطر تھوڑی سی لچک دکھانے میں ہرج ہی کیا ہے۔ مرزا نے جھٹ جواب دیا۔ ''جب بھی جمہوریت بحال ہوتی ہے، کچھ لوگ ہنگامہ و فساد برپا کرنے کے لیے اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ گھر سے نکل آتے ہیں۔ یہ لوگ جمہوریت کے لیے خطرہ بن کر اُبھرتے ہیں اور پھر جمہوریت کو

ٹھیس نہ پہنچانے کی قیمت وصول کرنے کے درپے ہوجاتے ہیں۔ میاں صاحب کا موقف درست ہے کہ اگر جمہوری حکومت کو ہاتھ پاؤں باندھ کر کام کرنے سے روک دیا جائے تو پھر ایسی جمہوری حکومت کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔"

ہم نے دست بستہ عرض کیا کہ احتجاج تو جمہوری حق ہے۔ مرزا کا استدلال تھا کہ ڈاکٹر طاہرالقادری جب جمہوریت اور انتخابی نظام پر یقین ہی نہیں رکھتے تو اُنہیں احتجاج کا حق بھی کیوں دیا جائے؟ اور جب وہ پاکستان میں رہتے ہی نہیں تو اُن کا کسی بھی احتجاجی تحریک کی قیادت کا حق کیوں تسلیم کیا جائے؟ مرزا کی یہ بات سُن کر ہم اُسی طرح خاموش ہوگئے جس طرح قوم عمران خان اور ڈاکٹر طاہرالقادری کا احتجاجی تماشا دیکھ کر دم بخود ہے۔

آج ملک کے قیام کو 67 سال مکمل ہوگئے۔ قوم آزادی کا جشن منا رہی ہے۔ ایسے میں احتجاج کی فضاء پیدا کرنا کہاں کی حُب الوطنی ہے، یہ تو وہی لوگ بتا سکتے ہیں جو یہ فضاء پیدا کر رہے ہیں۔ احتجاج کرنے والوں کو پُرامن رہ کر دکھانا ہے اور حکومت کو تصادم سے بچ کر دکھانا ہے۔ احتجاج روکنے کے لیے طاقت کے استعمال میں بھی توازن اور اعتدال درکار ہے۔ جمہوریت کی بساط لپیٹنے کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ پاکستان میں منتخب حکومتوں کو گھر بھیجنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ مگر اِس کی بنیاد تو ہونی چاہیے۔ آلہ کار بننے والوں

کو بھی تو کچھ سوچنا چاہیے۔ کسی بھی منتخب حکومت کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے میں کوئی قباحت نہیں مگر اِس کی بھی کوئی بنیاد تو ہو۔

گلاس توڑا، بارہ آنے

آزادی اور انقلاب کے متوالے خطرے کی علامت سمجھے جانے والے رنگ کے حامل علاقے میں داخل ہو چکے ہیں۔ قوم دم بخود ہے اور ''ٹُک ٹُک دیدم، دم نہ کشیدم'' کی تصویر بنی یہ تماشا دیکھ رہی ہے۔ ذہنوں میں ''کہاں کی آزادی اور کیسا انقلاب'' جیسے سوالات گھوم رہے ہیں۔ اور اِن دونوں نعمتوں سے قوم کو بہرہ مند کرنے کے دعویدار اسلام آباد میں اقتدار کے ایوانوں کے سامنے گھوم اور جھوم رہے ہیں۔

آزادی اور انقلاب کے نام پر برپا ہونے والا ہنگامہ اب تک قوم کو کیا دے سکا ہے، اِس سوال پر بحث کرنے کا موقع تب آئے گا جب لِکھنے اور جُھومنے کا دور ختم ہوگا۔

عمران خان کی رجحان ساز پارٹی نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، احتجاج کی دال میں شاندار اور جاندار میوزک کا تڑکا ضرور لگایا ہے۔ حکومت کے ''مظالم'' سے تنگ آئے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کو کچھ دیر کے لیے پُرمسرّت لمحات تو میسر آ ہی جاتے ہیں۔ احتجاج کا پنڈال دیکھتے ہی دیکھتے میوزیکل کنسرٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ درد ہی کو دوا سمجھنے والی قوم کو اِس سے زیادہ چاہیے بھی کیا؟ ؎

دِل کی تنہائی کو آواز بنالیتے ہیں

درد جب حد سے گزرتا ہے تو گا لیتے ہیں

یہ ترکیب اوروں کو نہ سُوجھی۔ بے نظیر بھٹو مرحومہ بھی آکسفورڈ ہی کی پڑھی ہوئی تھیں مگر اُن کی سیاست سُر، تال اور لَے سے محروم رہی۔ خدا جانے وہ کسی اور دنیا کی تھیں یا اُن کا آکسفورڈ کسی اور کائنات میں تھا! یہی حال اوروں کا بھی تھا۔ اب جاکر قوم کو معلوم ہوا کہ سیاست کے بھرپور احتجاجی ڈرامے کے حقیقی اجزائے ترکیبی کیا ہوتے ہیں اور طویل مارچ کے دوران نعرے لگا لگا کر بے دَم سے ہو جانے والوں کو کون سا ٹانک درکار ہوتا ہے۔ یاروں نے سخت کشیدگی کے لمحات میں بھی دل بستگی کا راستہ ڈھونڈ نکالا ہے۔

اسلام آباد کے ریڈ زون میں پہنچنے والے احتجاجیوں کو بھی معلوم نہیں کہ اُنہیں یُوں متحرّک کئے جانے کا مقصد اور مفہوم کیا ہے۔ حکومت کے خلاف سخت سے سخت زبان استعمال کرکے لوگوں کا لہو گرمایا گیا ہے اور اُنہیں حد سے گزر جانے کی بھرپور ترغیب دی گئی ہے۔ دوسری طرف حکومت نے طاقت کے استعمال سے گریز کی راہ پر گامزن ہو کر بظاہر تصادم کی گنجائش ختم کر دی۔ بہت سوں کو اِس سے بھی پریشانی لاحق ہوئی ہوگی۔ وہ چاہتے تھے کہ چند لاشے گرتے دیکھیں تاکہ کچھ رنگ جمے۔ ع

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا!

مسلم لیگ ن کی حکومت نے اب تک قوم کو کچھ نہیں دیا۔ 14 ماہ کے دوران پاکستان جیسے ملک میں کوئی بھی حکومت کسی بھی سطح پر کوئی انقلاب بر پا نہیں کر سکتی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انقلاب کی باتیں پاکستانی ماحول میں بڑھک اور مزاح سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ایس ایم ایس کے ذریعے ایسے ایسے آئیڈیاز آتے رہتے ہیں کہ اگر لکھنے بیٹھیے تو ایک دن میں چار کالم تیار ہو جائیں۔ جس ملک میں پانی کا گلاس زنجیر سے باندھا جاتا ہو اور نماز پڑھنے والوں کو سجدے میں بھی چپل یا جُوتے کی فکر لاحق ہو وہاں کیسا انقلاب اور کہاں کا انقلاب ؟ اگر ذہن سازی نہ کی گئی تو اہلِ پاکستان کسی بھی بڑی تبدیلی سے ہمکنار تو نہیں، دو چار البتہ ہوتے رہیں گے۔ اور اِس وقت یہی ہو رہا ہے۔
نئی نسل کے جذبات بھڑکانے کی روایت ہر دور کے اہلِ سیاست میں مقبول رہی ہے اور اب بھی اِسی روایت کو دُہرایا جارہا ہے۔ جو لوگ انقلاب کی بات کر رہے ہیں انہیں خود بھی نہیں معلوم کہ اُنہیں کیسا انقلاب لانا ہے۔ اور جو آزادی کا ڈھول پیٹ رہے ہیں وہ بھی نہیں جانتے کہ اِس قدر آزاد ماحول میں زندگی بسر کرتے ہوئے اُنہیں مزید کتنی اور کیسی آزادی درکار ہے۔
عمران خان اور طاہر القادری نے جو کچھ اپنی تقاریر میں کہا ہے وہ کسی بھی

اعتبار سے روشن ضمیری اور بصیرت کا عکاس نہیں۔ مارچ کے شرکا سے اُن کا ہر خطاب محض سطحی جذباتیت کا عکاس اور ترجمان تھا۔ جو کچھ کہا گیا اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جذبات بھڑک جائیں اور نوجوان مَرنے مارنے پر تُل جائیں۔ عمران خان نے احتجاج کا نیا تصور دیا ہے کہ جب تھک جاؤ تو گھر جاکر سو جاؤ اور تازہ دَم ہو کر پھر آ جاؤ۔ اور اگر لوگ بضد ہوں کہ چھوڑ نہ جاؤ تو پھر میوزیکل ارینجمنٹ والوں سے کہا جائے کہ کوئی زبردست ترانہ بجاؤ! حاضرین بھی خوش تھے کہ احتجاج میں جشن کا ٹانکا لگ گیا ہے۔ اگر احتجاج کرتے کرتے تھک جایئے تو جشن منانا شروع کر دیجیے۔ اور اگر جشن مناتے مناتے یاد آ جائے کہ احتجاج کرنا اصل مقصد ہے تو کوئی بات نہیں، پھر احتجاج کی ڈگر پر چل دیجیے۔ ع

ہنسنے پہ کبھی رو دیتا ہوں، رونے پہ ہنسی آ جاتی ہے!

اگر احتجاج کے نام پر ہزاروں لوگ جمع ہو جائیں تو ایک بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ اُنہیں کِس ایجنڈے کے تحت یکجا رکھا جائے۔ وقفے وقفے سے کچھ نہ کچھ ایسا کہنا پڑتا ہے جس سے اُن کی رگوں میں لہو گرم رہے۔ عمران خان اور طاہر القادری کو اِسی ضرورت کے تحت ایسا بہت کچھ بولنا پڑا ہے جو معقولیت کی ہر حد سے خاصا پَرے تھا۔ ایک (جیسی تیسی) منتخب حکومت کے خلاف جانا اور وہ بھی کسی ٹھوس جواز کے بغیر، اُن تمام لوگوں کے لیے انتہائی حیرت کا باعث ہے

جو اب تک اِس پورے تحرّک کے سبب کا سوچ سوچ کر پریشان ہیں۔ ایوانِ صدر، پارلیمنٹ ہاؤس اور وزیر اعظم سیکریٹریٹ کے سامنے ہزاروں افراد کو کھڑا تو کر دیا گیا ہے مگر کوئی تو بتائے کہ اِس ''یوتھ فیسٹیول'' کی غایت کیا ہے۔

طاہر القادری کی علمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اُن کی شعلہ بیانی کے سبھی معترف ہیں مگر یہ بات کوئی بھی عقل پرست انسان پسند نہ کرے گا کہ اِس شعلہ بیانی سے بُھوسے کے لیے چنگاری کا کام لیا جائے۔ پیر کی شب بارہ بجے طاہر القادری نے انقلاب مارچ کے شرکا سے جو خطاب کیا اُس میں اُنھوں نے ایک بار پھر حکمرانوں کو فرعون اور یزید سے تشبیہہ دی۔ یہ نوجوانوں کو قتل و غارت پر اُکسانے کی حتمی اور فیصلہ کن کوشش کے سِوا کچھ نہ تھا۔

عمران خان اِس پورے کھیل میں کس کے اشارے پر متحرک ہوئے اور اب تک دوسروں کے اشارے ہی پر کیوں کھیل رہے ہیں، کچھ پتا نہیں چلتا۔ اُن کی صلاحیتوں پر بے اعتباری کا عالم تو یہ ہے کہ اُنہیں ہدایات بھی یکمشت نہیں دی جاتیں۔ وہ مجمع سے خطاب بھی کر رہے ہوں تو یاروں کو سرگوشیاں کرنی پڑتی ہیں!

قوم نے دیکھ لیا ہے کہ جمہوریت ہر بار کیوں ناکام ہوتی ہے۔ جمہوریت کے نشیمن پر گرنے والی بجلیاں خواہ کہیں تیار کی جاتی ہوں، گرانے والے تو اپنے

ہی ہوتے ہیں۔ جو سیاسی بحران پیدا کیا گیا ہے اُس کی کوکھ سے اب تک کوئی بھی مثبت حقیقت ہویدا نہیں ہوئی۔ اور شاید ہوگی بھی نہیں۔ یہ سب کچھ قوم کو بہت کچھ سکھانے کے لیے کافی ہے۔ اب بیلٹ بکس تک جانے کا موقع ملے تو ووٹ کاسٹ کرنے سے قبل ذہن کو اچھی طرح تیار کرنا لازم ہے۔ یہ عوام کا حقیقی اختیار ہے اور اِس اختیار کو استعمال کرنے کے لیے ذہن کو استعمال کرنا ہی پڑے گا۔ اور اُس بے ذہنی سے بچنا بھی ناگزیر ہوگا جس کا مظاہرہ مجمع لگانے والوں نے کیا ہے۔ اب تک معاملہ ''کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے'' والا رہا ہے۔ تحریک اور مہم سیاسی ماحول کا حصہ ہیں مگر جواز اور دلیل کے ساتھ۔ محض جوش و خروش کی بنیاد پر کسی تبدیلی کی راہ ہموار کرنا کہاں کی سیاست ہے، کوئی سمجھائے۔ ملک کے حسّاس ترین شہر کے حسّاس ترین علاقے میں جو ڈراما پیش کیا گیا ہے اُس کے ڈراپ سین کے بارے میں کسی نے سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ سب جانتے تھے کہ معاملہ ٹائیں ٹائیں فِش کی منزل پر پہنچ کر دَم لے گا۔ اِس بار اِتنا ضرور ہوا ہے کہ ''قائدین'' کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ احتجاجی بساط لپیٹیں کیسے۔ مگر خیر ع

اِس طرح تو ہوتا ہے اِس طرح کے کاموں میں

!کام میرا چل رہا ہے

جو کچھ وفاقی دارالحکومت میں ہو رہا ہے اُس سے اہلِ وطن بہت پریشان ہیں۔ عام آدمی کا تو خیر کیا مذکور کہ پریشانی اُس کا مقدر بھی ہے اور جبلّت بھی۔ مشکل یہ ہے کہ اب اچھے خاصے پروفیشنل افراد بھی پریشان ہیں۔ اب کامیڈینز ہی کو لیجیے۔ جب سے اسلام آباد کے ریڈزون میں ''یوتھ فیسٹیول'' شروع ہوا ہے، کامیڈینز کے چہرے بُجھ سے گئے ہیں۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہیں کہ اگر ایسے میلے سال میں کئی بار سجنے لگے تو اُن کے دھندے کا کیا ہوگا! یہی حال گانے بجانے والوں کا ہے۔ اُنہیں بھی اپنے اپنے پیٹ پر لات پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔

ہزاروں ''رنجور'' پاکستانیوں نے پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے جس طور وزیر اعظم کے خلاف ''احتجاج'' کیا ہے اُسے دیکھ کر ہمیں اجمیر شریف کی درگاہ پر نصب دیگیں یاد آگئیں۔ 1980 میں ہم نے بھی اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی رحمت اللہ علیہ کے عُرس میں شرکت کی سعادت پائی تھی۔ تب بڑی دیگ پک کر تیار ہوئی تھی۔ اور پھر اُس کے لُٹنے کا یعنی اُس میں سے تبرک نکالے جانے کا منظر! وہ سب کچھ اب تک آنکھوں میں بسا ہوا ہے۔ اجمیر کی دیگ میں تمام ممکنہ متضاد چیزیں ڈال دی جاتی ہیں۔ کوئی دال کی بوریاں ڈالتا ہے۔ کوئی چھواروں کی بوری

کے منہ کھول دیتا ہے۔ کوئی مِصری ڈالتا ہے اور کوئی خشک میوہ جات۔ اُس میں آلو بخارے بھی ہوتے ہیں اور خوبانیاں بھی۔ کھٹے میٹھے ذائقے والا یہ تبرّک بہت اہتمام سے تقسیم ہوتا ہے اور ملک کے کونے کونے میں پہنچتا ہے۔ یہ تبرّک خشک کرکے بھی فروخت کیا جاتا ہے۔

اسلام آباد میں جو احتجاجی میلہ سجا اُس میں بھی اجمیر شریف کی دیگ کی طرح سبھی کچھ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ اگر کوئی تقریر سے گھبرائے تو پُرجوش پارٹی ترانے حاضر ہیں۔ کوئی ترانوں سُن سُن کر ہوش کھونے کے قریب پہنچ جائے تو قائدِ محترم چُٹکلے سُنانے کے لیے موجود ہیں۔ اگر قائد کی باتیں سُن سُن کر کوئی بیزار ہوجائے تو ناچنا شروع کردے کہ ریڈزون کی سڑک کو ڈانس فلور میں تبدیل کیا جاچکا ہے۔ کوئی معترض نہ ہو کہ یہ بھی انقلاب ہی کی ایک شکل ہے !

احتجاج کی دُکان سجی ہے۔ اور اِس میں سب کی مرضی کا سبھی کچھ ہے۔

بولو جی، تم کیا کیا خریدو گے ؟

کون ہے جو کاروباری سوجھ بوجھ کے معاملے میں سیاسی دکانداروں کی برابری کرسکے ؟ اُنہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کب کون سا مال گاہک کے سامنے رکھنا ہے۔ اُن کی دکان میں آنسو بھی ہیں، ہچکیاں بھی ہیں اور سِسکیاں بھی۔ آپ کو

چاہیے تو قہقہے بھی، ناچ گانا بھی اور لہکنا جُھومنا بھی۔ منگنی اور مہندی کی تقریب کا رنگ بھی اور دلھن کی رخصتی کے دِل گداز لمحوں کا تاثر بھی۔

اسلام آباد میں دھرنوں کی دھماچوکڑی جمانے والوں نے پوری کوشش کی ہے کہ آڈینس'' بیزار نہ ہو۔ جسے جو چاہیے وہ پیش کیا جاتا رہا ہے۔ احتجاج کے نام پر کچھ دیر'' دل کو بہلانا اب کچھ خاص مشکل نہیں رہا۔ جس فتح کے دور تک آثار نہیں اُس کا جشن تین دن سے منایا جارہا ہے۔ اور عمران خان نے تو وزیراعظم سے ''گزارش'' بھی کی کہ ابھی دو دن مستعفی نہ ہوں، لوگوں کو ذرا جشن منا لینے دیں۔ تحریک انصاف کے قائد اپنے کارکنوں سے ناانصافی کیسے کر سکتے تھے؟ اُنھوں نے دھرنے کو میوزیکل کنسرٹ میں تبدیل کیا تاکہ کوئی دل گرفتہ نہ ہو کہ کہاں نعرے بازی میں پھنس گئے۔

طاہر القادری بھلا کیسے پیچھے رہ سکتے تھے؟ سوال لوگوں کی دلچسپی کا گراف بلند رکھنے کا تھا۔ عمران خان نے میوزیکل کنسرٹ کا سماں پیدا کیا تو طاہرالقادری نے کنٹینر کی چھت پر محفلِ سماع کا اہتمام کر ڈالا! احتجاج میں تھوڑا سا عقیدت کا رنگ بھی مل جائے تو ہرج ہی کیا ہے۔ چراغ جلائے رکھنا ہے تو اُس میں تیل تو ڈالتے رہنا پڑے گا۔ اب تیل سرسوں کا ہو یا چمبیلی کا، اِس سے چراغ کو کیا غرض۔ یہ الگ کہ احتجاجی چراغ کو روشن رکھنے کی کوشش میں

بہت سے غریبوں کا تیل نکل گیا ہے اور اُن کے چہروں کا اُجالا دُھندلا گیا ہے۔

دھرنوں سے کیا ملے گا اِس سوال پر بحث قوم اُس وقت کرے گی جب فراغت نصیب ہوگی۔ ساحرؔ لدھیانوی نے خوب کہا ہے ؎

بربادیوں کا سوگ منانا فضول تھا

بربادیوں کا جشن مناتا چلا گیا!

اچھا ہے ہر لمحے سے لطف کشید کیا جائے، بھرپور حِظ اٹھایا جائے۔ قوم کو اپنے مسائل حل کرنے ہیں۔ اگر مسائل حل نہ بھی ہوں تو چند پُر مسرّت لمحات کا اہتمام کرنے میں کیا ہرج ہے؟ ؎

ملے نہ پُھول تو کانٹوں سے دوستی کرلی

اِسی طرح سے بسر ہم نے زندگی کرلی!

ریڈ زون میں جب عوام داخل ہوئے تو رنگوں کی ایسی بہار آئی کہ سُرخ رنگ کہیں دب دبا کر رہ گیا۔ اب وہاں صرف خوشیوں کے رنگ ہیں۔ لوگ حسّاس ترین عمارتوں کے سامنے اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا جشن منا رہے ہیں۔ ع

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

یاروں نے طے کرلیا ہے کہ مسائل حل ہوں نہ ہوں، احتجاج کے نام پر کچھ اچھا وقت تو گزار لیا جائے۔ سَر دَھڑ کی بازی لگانے کی باتیں کرنے والوں کو بھی اندازہ تھا کہ کارروائی ہوئی تو کوئی دکھائی نہیں دے گا۔ میچ فکس کرلیا جائے تو کچھ خاص فکر لاحق نہیں ہوا کرتی۔ اور دھرنے میں شریک ہونے والوں کو بھی ابتداہی میں اندازہ ہوچکا تھا کہ کوئی ایسی ویسی کارروائی نہیں ہوگی لہٰذا بے فکر ہوکر دھرنا دیجیے اور فراغت کی ساعتوں کو انجوائے کیجیے۔ ع

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ہم زندہ قوم ہیں، پائندہ قوم ہیں'' جیسے نعرے اب کھوکھلے پن کی حد سے گزر چکے'' ہیں۔ جب وہاں کھڑے ہیں جہاں اِنسان کو اپنی ناکامیوں سے بھی حِظ اُٹھانے کی سُوجھتی ہے۔ بات سیدھی سی ہے، بظاہر اِس کے سِوا کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا۔ قمر جمیل بر وقت یاد آئے ؂

اپنی ناکامیوں پہ آخرِکار

!مُسکرانا تو اختیار میں ہے

دنیا والے حکمت و دانائی کی تلاش میں کہاں کہاں بھٹکتے ہیں۔ ہم نے اپنی

جہالت اور نادانیوں سے حکمت کشید کرنے کا ہُنر سیکھ لیا ہے۔ خرابیوں سے خُوبیاں تشکیل دینے پر تحقیق کا بازار گرم ہے۔ ہر تخریب میں تعمیر کی صورت تلاش کی جاتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ع

روٹی تو کسی طور کما کھائے مُچھندر

بس اپنا بھی کچھ ایسا ہی حال ہوا ہے۔ دھرنے کے شرکاء نے کچھ لوگوں کی روزی روٹی کا بھی بندوبست کیا۔ فروٹ چاٹ، دہی بڑے، آلو چھولے، گولا گنڈا اور فروٹ جوس بیچنے والوں کی چاندی ہوگئی۔ یہ بھی خوب رہی۔ قوم مخمصے میں ہے، کاروباری اور صنعت کار طبقہ شش و پنج میں مبتلا ہے اور چند ٹھیلے والے غریبوں کا روزگار ''چمک'' اُٹھا۔ گھو پُھونک کر اُجالا کرنا شاید اِسی کو کہتے ہیں۔ ایک گولا گنڈا بیچنے والا ریڈ زون سے کچھ فاصلے پر ٹھیلا لگائے ہوئے تھا۔ ٹی وی چینل والوں نے اُس سے صورت حال پر رائے طلب کی تو بولا۔ ''لوگ آرہے ہیں، گولے کھارہے ہیں، کام میرا چل رہا ہے۔''
کسی بڑی خرابی کے بطن سے کسی غریب کے لیے ذرا سی بھی خُوبی پیدا ہوگی تو وہ یہی کہے گا کہ میرا کام تو چل رہا ہے۔ ہمیں ایسی آزادی یا ایسا انقلاب نہیں چاہیے جس میں بہت سوں کا بہت کچھ داؤ پر لگے اور چند لوگوں کا کام چل نکلے!

قوم کو اب دھرنوں، ریلیوں اور مظاہروں کے مرحلے سے گزر کر یگانگت کے گرین زون میں آ جانا چاہیے۔ ہر سیاسی بحران کا یہی موزوں ترین حل ہے۔ جب گلی میں گلی میں ڈگڈگی بجتی ہے تو گھروں سے بچے نکل آتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ بچے نکل آتے ہیں، بڑے نہیں! یہ ثابت کرنے کا وقت آگیا ہے کہ ہم بڑے ہو چکے ہیں۔

خیر گزری

حالات نے ایسی روش اختیار کی ہے کہ اب اِس مملکت میں کسی بھی کام یا واقعے کی غایت تلاش کرنا بُھوسے میں سُوئی تلاش کرنے جیسا ہے۔ یہ بات تو اب قصۂ پارینہ ہے کہ کچھ بھی سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔ حال یہ ہے کہ اب یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کچھ بھی سمجھ میں کیوں نہیں آتا!

اللہ کپتان کا بھلا کرے کہ اُنہوں نے اپنے شاندار اور یادگار دھرنے کی غایت بھی بیان کردی تاکہ کسی کے دل میں ایسا ویسا کوئی گمان بھی نہ رہے اور سَند بھی رہے۔ موصوف کو نیا پاکستان بنانے کی جلدی ہے۔ بہت سے لوگ اِس عُجلت پسندی کو دیکھ کر خلجان میں مبتلا ہیں کہ ع

..... یہ ہنگامہ اے خُدا کیا ہے!

تحریکِ انصاف کے چیئرمین نے قدم قدم پر شدید عُجلت کا مظاہرہ کرکے ایسا تاثر دیا ہے جیسے اُن کی ٹرین چُھوٹی جارہی ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ عمران خان اب عمر کی ساتویں دہائی میں ہیں۔ 62 سال کے ہوچکے ہیں۔ میاں صاحب تو بھرپور جوانی میں بھی وزارتِ عظمٰی کے مزے لُوٹ چکے ہیں۔ عمران خان اب تک اِس

چوکھٹ کو چُھو بھی نہیں سکے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے، عمر کے گزرنے کا احساس ہر انسان کو بہت شِدّت سے ہوتا ہے۔ عمران خان کو بھی ہوتا ہوگا، آخر وہ بھی انسان ہیں۔ اور ہوتا ہوگا کیا، ہو رہا ہے۔

ہم سمیت بہت سے لوگوں کا اندازہ درست ہو کر بھی غلط نکلا۔ اِس میں کیا شک ہے کہ عمران خان کو ڈھلتی عمر کا پوری شِدّت سے احساس ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ وہ وزارتِ عظمٰی کی دیوی کے چرنوں میں سَر رکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔ اب پتا چلا کہ جس دیوی کی اُنہیں تلاش ہے وہ اُسے وہ من مندر میں بسانا چاہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اُنہیں گھر والی کی تلاش ہے۔ اُنھوں نے اپنے جاں نثاروں اور ''جاں نثارنیوں'' سے کہا ہے کہ نیا پاکستان جلد بناؤ تاکہ شادی کر سکوں!

لیجیے، کھودا پہاڑ اور نکلی گھر والی۔ پُوچھنے والے یہ پُوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ جناب، جیون ساتھی کی تلاش تھی تو میرج بیورو کا رُخ کرتے۔ پوری قوم کو مخمصے کا شکار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کئی دوستوں نے ایس ایم ایس کے ذریعے ہمیں یاد دلایا ہے کہ جنہیں کوئی نکیل نہ ڈالے وہ پورے معاشرے کو نکیل ڈالتے پھرتے ہیں۔ جن سیاست دانوں کی زندگی میں بیوی نہیں وہ قوم کا ناک میں دم کئے ہوئے ہیں۔ یعنی سوچ یہ ہے کہ جب ہم سُکون سے نہیں تو قوم کیوں سُکون کا سانس لے! ہم نہیں مانتے تھے مگر بھلا ہو عمران خان کا کہ

اُنھوں نے دل کی بات بیان کر کے ہماری مشکل آسان کر دی۔

مرزا تنقید بیگ کسی زمانے میں سیاست کو آزمانا چاہتے تھے یعنی سیاست میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے خواہش مند تھے۔ یہ تب کی بات ہے جب وہ شیخ رشید تھے یعنی کنوارے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ اُن کی شادی ہوئی اور وہ گھر کی سیاست کے گڑھے میں دفن ہو کر رہ گئے۔ اب وہ سیاست دانوں کی دَھجیاں اُڑا کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ جن سیاست دانوں نے اپنے گھر بسانے سے زیادہ قوم کو اُجاڑنے کی قسم کھا رکھی ہے اُن سے مرزا کو شدید چِڑ ہے۔ کہتے ہیں اگر یہ سب کنوارے یا رنڈوے شادی کر لیں تو قوم کی جان چُھوٹے۔ سیاسی دُکان بند کر کے جب اِنہیں پرچون کی دکانوں کے چکر لگانے پڑیں گے تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔

عمران خان کے دھرنے میں احتجاج کے نام پر جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ مایوں اور مہندی کی تقریب کے ہَلّے گُلّے سے خاصا ملتا جلتا ہے۔ عمران خان کو ہم نے اِس احتجاجی میلے میں بیشتر اوقات دولھا کے رنگ ڈھنگ میں دیکھا ہے۔ وہ گلے میں رنگین چادر اُسی طرح ڈالے رہتے ہیں جس طور مہندی کی تقریب میں دولھا ڈالتے ہیں۔ تحریکِ انصاف کے جواں سال کارکن اسٹیج کے سامنے اُسی طور بھنگڑا ڈال رہے تھے اور لُڈی ''پا'' رہے تھے جیسے اپنے قائد کی مہندی میں شرکت کر

رہے ہوں۔ اُن کا جوش و جذبہ دیکھ کر اور لڈی "پانے" کے انداز سے عمران خان بھی بھید پاگئے اور دل کی بات زبان پر لے آئے۔ قائد کے دل میں بارود کا جو ڈھیر تھا اُسے محض چنگاری درکار تھی۔ اور کارکنوں نے تو اپنے قائد کے لیے لپکتے جھپکتے شعلوں کا اہتمام کر ڈالا تھا!

مرزا کا شکوہ یہ ہے کہ عمران خان نئے پاکستان اور حقیقی آزادی کی خاطر برپا کئے جانے والے رونق میلے میں اپنی شادی کی بات نہیں کرنی چاہیے تھے۔ اُن کا خیال ہے کہ اِس سے کارکنوں کا مورال گرے گا۔ ہم نے پوچھا اِس میں مورال گرنے والی بات کیا ہے؟ مرزا نے بھرپور دانش مندانہ جواب عنایت کیا۔ "دیکھو میاں! ایک طرف تو عمران خان قوم کو آزادی دلانے کی بات کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف خود دوبارہ ایک عورت کی 'غلامی' اختیار کرنے کا عندیہ دے رہے ہیں۔ ہزاروں نوجوانوں کو گھروں سے نکال کر وہ حکومت کا کھونٹا اُکھاڑنے کی بات کر رہے ہیں اور خود ایک بار پھر گھریلو کھونٹے سے بندھنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ تو کُھلا تضاد ہے۔"

ہم نے عرض کیا کہ عمران خان نے شادی کا ارادہ ظاہر کرکے دُشمنوں کے منہ بند کرنے کی کوشش کی ہے جو یہ پُوچھتے نہیں تھک رہے کہ اسلام آباد کے ریڈ زون میں اِس دھاچوکڑی کا آخر مقصد کیا ہے۔ اب "مقصد" سامنے آگیا ہے۔ لوگ سوچ

سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ اِس بحر کی تہہ سے آخر اُچھلے گا کیا۔ چلیے، کچھ تو اُچھلا۔ خان صاحب اِتنا لاؤ لشکر لے کر اسلام آباد تک آ ہی گئے ہیں تو کیا خالی ہاتھ لَوٹ جائیں۔ ناصؔر کاظمی نے ایسی ہی کسی حالت کے لیے کہا ہے ۔

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اِس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں!

اِسی غزل میں ناصؔر کاظمی نے شبِ فراق پر ترس کھاتے ہوئے اُسے گھر لے جانے کی بات بھی کہی ہے۔ اُس بات سے عمران خان متفق نہیں۔ وہ اِس بار شبِ وصال کو گھر لے جانے کے فراق میں ہیں!

مرزا کا خیال ہے کہ عمران کی طرح شیخ رشید بھی شادی کرلیں تو قوم کا بھلا ہو جائے اور یہ لوگ قوم کو معافی دے کر گھر کی چار دیواری میں سُکون سے رہیں۔ تحریک انصاف کے کارکنوں کو بھی تحریک ملے گی کہ گھر بسا کر بیویوں کو خوش رکھیں اور قوم کو شکایت کا موقع نہ دیں۔ دھرنوں میں ویسے ہی ہزاروں باراتی ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ایسے میں اگر سوڈیڑھ سو جوڑے ازدواجی بندھن میں بندھ جائیں تو کیا ہرج ہے؟ پہلے ذرا غلامی کا مزا چکھ لیں تو آزادی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا اور زیادہ پُرجوش ہوکر آزادی کے لیے مارچ کرسکیں

!گے، دھرنے دے سکیں گے

قوم خوش نصیب ہے کہ نیا پاکستان بنانے کا خیال عمران خان کے دل میں آیا۔ نیا پاکستان بنانے کے ارادے کی کوکھ سے بالآخر عمران خان کی یہ خواہش ہویدا ہوئی کہ وہ شادی کرنا چاہتے ہیں، گھر بسانے کے خواہش مند ہیں۔ ہم سوچ رہے ہیں اگر کہیں غلام مصطفٰی کھرنے نیا پاکستان بنانے کا سوچا ہوتا تو کیا دھماچوکڑی مچتی۔ عمران خانی !فارمولے کے تحت تو وہ کم و بیش آٹھ دس نئے پاکستان بنا کر سکون کا سانس لیتے

ہماری دُعا ہے کہ عمران خان جلد از جلد اپنا گھر دوبارہ بسائیں تاکہ ہم بھی (ضمیر جعفری مرحوم سے معذرت کے ساتھ) کہہ سکیں۔۔

میرا لیڈر ہوگیا بیوی کا جس ہنگام سے

!وہ بھی آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے

بند گلی کا دیس

جو لوگ پاکستان کے تازہ ترین یعنی جاری و ساری بحران کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہیں اُنھیں اب اپنی طرزِ فکر پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ یہ کوئی پہلا موقع تو نہیں کہ ہم نے نہایت عقیدت مندانہ انداز سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی آیا ہے۔

زمانے گزر گئے ہیں اہلِ دانش کو یہ راگ الاپتے ہوئے کہ کچھ سنجیدگی اپنایئے، کچھ بُرد باری کا مظاہرہ کیجیے۔ جو اُڑتی چڑیا کے پَر گِن لیا کرتے ہیں اُن کی کور چشمی کا یہ حال ہے کہ اگر بُرد باری اور سنجیدگی جیسی صفات ہاتھی جیسی کایا لے کر بھی آ جائیں تو اُنھیں نہ دیکھ پائیں گے۔ نیتوں کا حال یہ ہوگیا ہے کہ دیکھنے پر آئیں تو اندھیروں کی رفتار بھی ناپ کر دکھادیں اور نہ دیکھنا چاہیں تو نصف النہار پر چمکتے دمکتے سُورج کو بھی اَن دیکھا کر دیں!

اسلام آباد کے ریڈ زون کا سُنتے ہی آئے تھے، دیکھ بھی لیا۔ یہ وہ زون ہے جس میں قومی استحکام اور معیشت کا خُون ہوا ہے۔ اِسی زون کی زمین پر قومی

مفادات کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔ اِسی ریڈ زون میں ایسے خطاب فرمائے گئے ہیں کہ جس میں غیرت کی تھوڑی سی بھی رمق باقی ہو تو ذرا سی دیر میں شرم سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو اُٹھے۔ سُرخ رنگ خطرے کی گھنٹی ہوا کرتا ہے۔ ریڈ زون میں جو کچھ ہوا ہے وہ بھی ملک اور قوم کے لیے خطرے کی گھنٹی، بلکہ گھنٹا ہے جو مسلسل بج رہا ہے مگر یاروں نے طے کرلیا ہے کہ اور تو سب کچھ سُنیں گے، خطرے کے اِس گھنٹے کو نہیں سُنیں گے۔

جشن آزادی کے بعد سے وفاقی دارالحکومت "جشن غلامی" کی زد اور لپیٹ میں ہے۔ ملک کے حساس ترین شہر کے حساس ترین علاقے میں جو دھما چوکڑی مچائی گئی ہے اُس نے قوم کو خلجان میں اور باقی دُنیا کو وسوسوں اور تحفظات میں مبتلا کیا ہے۔ ملک پہلے کون سی اچھی حالت میں تھا کہ اب وفاقی دارالحکومت کو بھی داؤ پر لگادیا گیا ہے۔ اور اس بھی بڑھ کر یہ کہ اِسے داؤ پر لگنے دیا گیا ہے۔

احتجاج کے نام پر جو کچھ ہوا ہے وہ قوم سے بھونڈے مذاق کے سِوا کچھ نہیں۔ اور پھر جس طرح اِس پورے معاملے کو ہینڈل کیا گیا اُس نے جلتی پر تیل چھڑک دیا۔ سوال یہ نہیں کہ اِس نام نہاد جنگ میں کون جیتا اور کون ہارا۔ معاملہ تو کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے "کوئی جیتا نہیں، سب ہار گئے ہیں اور ہار کا "مزا

چکھنے والوں میں قوم سب سے آگے کھڑی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی لگتا ہے کہ اِس کھیل میں ہار صرف قومی مفادات کا مقدر بنی ہے۔ اور باقی سب ''فتح'' کا جشن منانے کے حقدار قرار دیئے جاسکتے ہیں!

ایک ہی سُوراخ سے خود کو کتنی بار ڈسوایا جاسکتا ہے؟ سُنا ہے مومن کو ایک سُوراخ سے ایک ہی بار ڈسا جاسکتا ہے۔ تو کیا ہم مومن نہیں؟ اگر ایک بار ڈسے جانے کا اُصول یا کلیہ درست مان لیا جائے تو سمجھ لیجیے ہمارا کام تو تمام ہوچکا ہے۔ احتجاج کے نام پر دھرنے بازی اور مارچ کا ڈراما وہ سُوراخ ہے جس سے ہم بار بار ڈسے گئے ہیں۔ ایک بار ڈسے جانے والے اُصول کے تحت تو ہم مومن نہ رہے مگر معترضین کو کیا معلوم کہ اب ہم نے احتجاج کرنے اور اُس سے لطف کشید کرنے کو ایمان کا درجہ دے دیا ہے!

تین ہفتوں سے قوم شدید خلجان میں مبتلا ہے۔ ہر طرف خدشات اور تفکرات کی فصل اگی ہوئی ہے۔ جسے دیکھیے وہ شدید پریشانی کے عالم میں ہے اور رات دن یہی سوچ سوچ کر دُبلا ہوا جارہا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ اِس ''اب کیا ہوگا؟'' نے قوم کا جینا حرام کردیا ہے۔ یہ وہ سوال ہے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے اور ہمارا جینا حرام کردیتا ہے۔ اور اُن کی بھی کوئی کمی نہیں جو اپنی ''اصولی'' جدوجہد سے اِس سوال کو بار بار جنم دینے کا کارن بنتے ہیں۔ آرڈر

پر مال تیار کرنے والوں نے اِس ملک کو بندگلی کے دیس میں تبدیل کر دیا ہے۔ جب بھی کہیں سے اشارہ ہوتا ہے، آرڈر پر مال تیار کرنے والے کمر کس کر میدان میں آ جاتے ہیں اور قوم کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔ یہ پورس کے ہاتھی ہیں جو پلٹ کر اپنے ہی لشکر (یعنی عوام) کو کچلتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب لوگ سیاسی جدوجہد کو اپنے لیے خیر و برکت اور بہت سے مسائل سے نجات کا وسیلہ سمجھا کرتے تھے۔ تب اُصولوں کی جنگ ہوا کرتی تھی۔ لوگ جو زبان دیتے تھے اُس پر قائم رہتے تھے اور اُس پر مر بھی جاتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ پانی اپنی پنسال میں آتا چلا گیا یعنی اُصولوں کو بالائے طاق رکھنے کے رجحان نے جنم لیا۔ معاملہ اِس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اب بے اُصولی ہی اُصول کا درجہ پا گئی ہے۔ ایک دور تھا کہ احتجاج کے لیے کوئی نہ کوئی اِشو تلاش کیا جاتا تھا یا خود کوئی اِشو کھڑا کر لیا جاتا تھا۔ یعنی کسی بھی تحریک کا کوئی نہ کوئی جواز یا حقیقی محرک ہوا کرتا تھا۔ اب اِس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ کوئی اِشو نہ بھی ہو تو میدان میں نکل آیئے۔ جس طور کسی اُصول کا نہ ہونا اب اُصول ٹھہرا ہے بالکل اُسی طور کسی اِشو کا نہ ہونا بھی اِشو بن گیا ہے۔ سیاسی جدوجہد کے نام پر اپنی دکان چلانے والے کبھی کبھی اِس بات سے بھی چڑ جاتے ہیں کہ فریق ثانی کوئی اِشو ہی نہیں دے رہا کہ جس کی بنیاد پر حلوے مانڈے کا اہتمام کیا جائے۔

اور یوں وہ دِل کے

ہاتھوں بے تاب ہو کر میدان میں آ جاتے ہیں۔

وہ بھی کیا دن تھے کہ کوئی اپوزیشن ہوا کرتی تھی جو عوام کی بات کیا کرتی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ مفاہمت کے نام پر سب کچھ ایک فارمولے کے تحت بانٹ لینے پر اکتفا کر لیا گیا۔ اِس صورت میں عوام کے ہاتھ کچھ نہ آتا تھا۔ اب سیاسی جماعتوں میں ٹھن گئی ہے۔ اور ٹھنی بھی ایسی ہے کہ عوام کے پاس جو کچھ رہ گیا تھا وہ بھی داؤ پر لگ گیا ہے۔ اِس لڑائی میں ملک اور قوم کو کیا ملے گا، کسی کو معلوم نہیں۔ یا شاید قوم سب کچھ جانتی ہے۔ یہ بھی اللہ کا کرم ہے کہ قوم کو سب کچھ پہلے سے معلوم ہے، لہٰذا کسی بات پر حیرت ہوتی ہے نہ دُکھ۔ ع

مشکلیں مجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہو گئیں

قوم نے تین ہفتوں کے دوران ایک بار خود کو بند گلی میں پایا ہے۔ منتخب حکومت کی غلطیاں اور خامیاں اپنی جگہ مگر جو کچھ ہوا ہے یا کیا گیا ہے اُس کا کوئی جواز عوام کو ریوڑ کی طرح ہانکنے والے کبھی ڈھنگ سے دے پائیں گے؟ یہ سوال بہت سوں کے ذہنوں میں گردش کر رہا ہے۔ اور ابھی بہت دنوں تک کرتا رہے گا۔ تین جماعتوں کی اِس لڑائی میں جو کچھ بھی ہوا ہے اُس کا نتیجہ صرف قوم کو بھگتنا ہے۔ ملک ایک بار پھر بند گلی میں کھڑا ہے۔ دنیا کو اندازہ

ہو چکا ہے کہ یہ بند گلی کا دیس ہے۔ وقفے وقفے سے ہر راستہ کسی نہ کسی بند گلی میں پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔ جو راستہ دکھانے کے دعویدار ہیں وہ تو بربادی کی منزل تک پہنچانے کو بے تاب ہیں۔ ایسے میں اللہ ہی سے مدد مانگی جاسکتی ہے کہ وہ راہ دکھانے کے شوقینوں کو سیدھا راستہ دکھائے۔ مشرکین مکہ بہت سے بُتوں کو پوجتے تھے مگر جب کشتی طوفان میں گِھر جاتی تھی اور ساحل کے دور دور آثار نہیں ہوتے تھے تب وہ بھی اللہ ہی سے مدد مانگا کرتے تھے۔ ہماری کشتی بھی پھر طوفان میں ہے اور ہمیں اللہ ہی سے مدد مانگنی چاہیے۔ دعا ہے کہ اللہ ہمیں بھٹکے ہوئے رہبروں سمیت ہر مصیبت سے نجات عطا فرمائے۔

کون سُنے فریاد؟

کالم کے عنوان سے دھوکا مت کھایئے۔ یہ مت سمجھیے کہ ہم نیر سلطانہ مرحومہ کی کسی دُکھ بھری فلم کی کہانی بیان کرنے والے ہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہونے والا۔ ہم تو حالات کا رونا رونے والے ہیں۔ آج کل کالم نگاروں کا یہی کام رہ گیا ہے کہ جو بھی دُکھڑے لوگوں کی نظر سے چُوک گئے ہیں اُنہیں تلاش کرکے، جھاڑ پونچھ کر منظر عام پر لایا جائے یعنی عوام کی نظروں کے سامنے لا بٹھایا جائے۔

آج کل مرزا تنقید بیگ کی عجیب حالت ہے۔ مگر خیر، اُن کی تو پوری شخصیت ہی عجیب و غریب ہے۔ جب سے اُنہوں نے دوستوں کے ساتھ ہوٹلوں اور چبوتروں پر بیٹھنا شروع کیا تھا، بھابی صاحبہ نے سُکون سانس لیا۔ اُن کی شادی کو چالیس برس ہوچکے ہیں۔ اب ''بیٹھ مِرے پاس تجھے دیکھتی رہوں'' والا زمانہ تو رہا نہیں۔ جب کوئی مرد اور عورت میاں بیوی کی حیثیت سے خاصا طویل عرصہ ساتھ گزار لیں تو دونوں میں عجیب و غریب تبدیلیاں رونما ہوتی جاتی ہیں۔ ایک بار شہنشاہِ غزل مہدی حسن خاں صاحب سے اُن کے گھر پر ملاقات ہوئی تو باتوں ہی باتوں میں وہ سنگیت کی دُنیا سے بہت دور چلے گئے اور ازدواجی زندگی کو گھسیٹ کر بہت قریب لے آئے۔ رشتوں کے اُتار چڑھاؤ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں

فرمایا۔ ”جب شادی کو تیس چالیس سال گزر جائیں تو میاں بیوی کی شکلیں آپس میں ملنے لگتی ہیں اور وہ بھائی بہن جیسے دکھائی دینے لگتے ہیں!“ ہم یہ سُن کر سَٹ پٹا گئے۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ شاید خاں صاحب باتوں ہی باتوں میں آٹھوں سُر لگا کر ہماری کھوپڑی گھمانا چاہتے ہیں مگر جب اُن کی طرف دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ تو خاصے سنجیدہ ہیں۔ خیر اِسی میں تھی کہ ہم اُن سے متفق ہو جاتے۔ اور ہم نے اتفاقِ رائے ہی کیا۔
مرزا پر بھی اب ایسا وقت آیا ہوا ہے کہ اُنہیں گھر میں دیکھ کر بھابی ذہنی طور پر اُلجھتی رہتی ہیں۔ وہ گھر سے باہر دوستوں کے ساتھ گھنٹوں بتیاتے رہتے تھے تو وہ بے حد خوش رہتی تھیں۔ اِس صورت میں وہ بھی گھر میں سہیلیوں کے ساتھ محفل جمالیا کرتی تھیں۔ بُرا ہو اِس سیاسی بحران کا جس نے بھابی سے یہ چھوٹی سی خوشی بھی چھین لی۔ مگر خیر، کیا رویئے کہ سیاسی بحران ایسے ہی چمتکار دکھایا کرتے ہیں۔
دو ہفتوں کے دوران مرزا کا بیشتر وقت گھر میں گزرا ہے اور اِس دوران گھر والوں پر کیا گزری ہے یہ اللہ جانتا ہے یا گھر والے۔ کچھ کچھ ہم بھی جانتے یا سمجھتے ہیں کیونکہ مرزا کے ساتھ ہم نے بھی بہت وقت گزارا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ مرزا ایک دشت ہیں اور ہماری تو

عمر گزری ہے اِسی دشت کی سَیّاحی میں

!مگر یہ مُدت اتنی طویل نہیں کہ ہماری اور اُن کی شکلیں ملنے لگیں

بھابی کو (بیشتر بیویوں کی طرح) یہ ایڈوانٹیج حاصل ہے کہ وہ جب چاہیں مرزا کو ڈانٹ ڈپٹ کر گھر سے نکال دیتی ہیں تاکہ کچھ دیر کے لیے راحت نصیب ہو۔ ایسا ہر موڑ ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوتا ہے کیونکہ گھر والوں کو راحت دینے کے لیے وہ ہماری !طرف آ جاتے ہیں

سیاسی بحران نے مرزا کو دوآتشہ کر دیا ہے۔ وہ کسی بھی نکتے کو دانتوں سے پکڑ کر پلک جھپکتے میں ہتّھے سے اُکھڑ جاتے ہیں۔ گفتگو کے دوران وہ کب کہاں سے کہاں جا نکلیں، پورے یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ قوم کو راہ دِکھانے کے دعویداروں نے مُلک کی جو گَت بنائی ہے وہ مرزا سے ہضم نہیں ہو پا رہی۔ آن کی آن میں وہ لعن طعن سے دُشنام اور پھر تبرّے تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اُنہیں روکنے کی کوشش انتہائی خطرناک ثابت ہوتی ہے کیونکہ اُن کی زبان چشم زدن میں مادر پدر آزاد ہو کر واہی تباہی بکنے لگتی ہے۔ ایسے عالم میں اُن کی زبان سے نکلنے والے بیشتر جُملے عوام کے منتخب نمائندوں کی زبان سے نکلنے والے جملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں یعنی جس طرح منتخب نمائندوں کی بہت سی باتیں ایوان کی کارروائی سے حذف کرنی پڑتی ہیں بالکل اُسی طرح ہمیں مرزا کے بھی بہت سے جُملے اپنے کالم کی حدود سے

باہر رکھنے پڑتے ہیں!

بعض احباب نے مرزا کو مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ کوشش کرکے کسی ٹی وی چینل سے وابستہ ہوجائیں تو اُن کے دِن پھر سکتے ہیں کیونکہ سیاست اور سیاست دانوں کے بارے میں وہ جو کچھ کہتے ہیں اُس کی ٹی وی چینلز پر بہت مانگ ہے! مرزا بھی ایسے بے نیاز واقع ہوئے ہیں کہ اِس مشورے پر اب تک سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ مرزا میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو سیاست دانوں اور اُن کے عیب گنوانے والوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ جب بولنے پر آتے ہیں تو آنکھ بند کرلیتے ہیں کیونکہ وہ کسی کو اذیت میں دیکھ نہیں سکتے! اُنہیں بچپن ہی سے بولنے کا ہَوکا رہا ہے۔ اب یہ ہَوکا ایسا پروان چڑھ چکا ہے کہ سُننے والے (اپنے) کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ وہ سیاست دانوں کی طرح بے تکان بولتے ہیں اور اِس معاملے میں موضوع وغیرہ کے مُکلّف نہیں۔ تجزیہ کاروں کی وہ جب سیاست دانوں کے عیب گِنوانے پر آتے ہیں تو پتہ نہیں کون کون سے سمندر کے ساحل تک پہنچ کر عجیب و غریب کوڑیاں لاتے ہیں۔ یہی ایک خوبی ہے جو اُنہیں صفِ اوّل کے تجزیہ کاروں میں کھڑا کرسکتی ہے۔

اسلام آباد کے ریڈ زون میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس پر جی ایچ کیو کے علاوہ امریکا نے بھی گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔ امریکا نے تو نگرانی کا اعلان کرنے

میں بھی شرم محسوس نہیں کی۔ ہاں اُسے یہ پڑھ کر ضرور شرمندگی سی ہو سکتی ہے کہ ریڈ زون کی صورت حال پر مرزا نے بھی گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔ وہ رات دن پلنگ پر بیٹھے بیٹھے ٹی وی اسکرین کو تکتے رہتے ہیں اور ریموٹ ہاتھ میں رکھتے ہیں تاکہ کسی چینل کی کوریج میں اگر مصالحہ کم ہو تو اُس چینل پر چلے جائیں جو ذرا سی بات کو نمک مرچ لگاکر بتنگڑ میں تبدیل کر رہا ہو، رائی کو پربت بنانے کی کوشش کر رہا ہو! کہتے ہیں شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ سیاسی ایونٹ کی کوریج میں مصالحہ تلاش کرنے کی مرزا کی ہر کوشش بھرپور کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے کیونکہ سیاست کی طرح میڈیا کے یاروں نے بھی اِس کا خوب اہتمام کر رکھا ہے۔ میڈیا پر مرزا کے لیے نمک مرچ والی شکر تھوک کے حساب سے دستیاب ہے اور وہ بھی بن دام۔ گویا ؎

پیو کہ مفت لگادی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مے لالہ فام کہتے ہیں

مرزا کو سیاست نے بہت دکھ دیئے ہیں۔ وہ قاضی ہیں جو شہر سے متعلق اندیشوں کے باعث دُبلے ہوئے جارہے ہیں۔ اُن کا رونا یہ ہے کہ سیاست دان اپنے استحقاق کا رونا روتے رہتے ہیں۔ جو ایوان میں بیٹھے ہیں اُنہیں اپنی مراعات کی فکر لاحق ہے۔ جو سڑک پر ہیں وہ عوام کو بھی سڑک پر لانے کے موڈ میں ہیں مگر عوام کے مسائل کی بات کوئی بھی نہیں کر رہا۔ سیاسی بحران کو حل کرنے کی

کوششوں کے دوران کسی نے بھی عوام کا ذکر نہیں کیا۔ پارلیمنٹ نے بھی وزیر اعظم کی حمایت کے اظہار کی گھڑیوں میں عوام کے مسائل کو حل کرنے کی ضرورت پر رسمًا بھی زور نہیں دیا۔ جو باتیں سیاست دان گھما پھرا کر رات دن کہہ رہے ہیں وہ ٹی وی چینلز خوب سُنوا رہے ہیں۔ اور اِن پر تبصروں کی بھی بھرمار ہے مگر عوام کی فریاد سُنوانے کی زحمت کوئی گوارا نہیں کر رہا۔ جن کے مسائل حل کرنے کے نام پر وفاقی دارالحکومت کو سرکس کے پنڈال میں تبدیل کر دیا گیا ہے اُن کی بات اَن سُنی رہ گئی ہے۔

خان صاحب فٹ پاتھ پر میلہ سجائے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔ ’’ہمارا مال بہت اچھا ہے۔ کسی کو اگر بولنا ہے تو بولو۔‘‘ ایک دُبلا پتلا، مریل کا شخص آگے بڑھا اور بولا۔

’’مجھے۔۔۔‘‘ خان صاحب نے کہا۔ ’’خوچہ تم بکواس بند کرو، کوئی اور صاحب لوگ؟‘‘

عوام کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ وہ جب کچھ کہنا چاہتے ہیں تو جواب ملتا ہے۔ ’’تم منہ بند رکھو، کسی اور کو کچھ اعتراض ہے تو سامنے آئے۔

لنگوٹی ہی سہی

ہم اہلِ ایمان ہیں اِس لیے اِس اَمر پر تو کامل یقین رکھنا ناگزیر ہے کہ ہر کام اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اُس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے، کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو ضرور برآمد ہوتا ہے۔ ایسے میں یہ سوچنا ایمان کے تقاضوں کے عین برعکس ہوگا کہ اسلام آباد میں آزادی اور انقلاب کے نام پر جو کچھ ہوا ہے وہ قوم کے لیے صرف خسارے کا سودا تھا۔

خسارہ ابھی پوری طرح سامنے نہیں آیا۔ پھر بھلا کیوں ہم صرف خسارے کا سوچیں؟ اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو ہر معاملے میں اللہ سے اچھا گمان ہی رکھنا چاہیے۔ عمران خان اور طاہرالقادری نے جو کچھ بھی کیا وہ بظاہر غیر منطقی سا لگتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ اُن کے تمام مطالبات ناجائز تھے۔ بعض باتوں میں خاصا دم تھا۔ ہاں، مطالبات کو تسلیم کرنے کے لیے دباؤ ڈالنے کے معاملے میں وہ حد سے گزر گئے۔ چند ایک باتوں میں ذرا بھی دم نہ تھا مگر اُنہوں نے ضرورت اور گنجائش سے کچھ زیادہ ہی زور لگادیا۔ مگر خیر، سیاسی جلسوں میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ خطابت ایسا فن ہے جو اپنے حامل کو پاگل کرکے چھوڑتا ہے۔ ہمارے کئی رہنماؤں کو اُن کا جوشِ خطابت ہی تو کھاگیا۔ بڑبولا پن انسان کو

کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔ اب کے بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ پبلک اسپیکنگ سے عمران خان کا کبھی زیادہ تعلق نہیں رہا۔ وہ بولنے والوں میں سے نہیں۔ طاہر القادری کے لیے یہ بنیادی میدان ہے۔ وہ ہمیشہ مُنہ ہی کی کھاتے آئے ہیں! اور اِس بار؟ بس، اللہ معاف کرے۔ مگر خیر، یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ ہر بار وہ اپنی قائم کردہ ہر حد سے بڑھتے ہی دکھائی دیئے ہیں۔

عمران خان اور طاہر القادری نے دردِ دل کی دوا بیچنے کے لیے اسلام آباد کے ریڈ زون میں دُکان سجائی۔ دُکان کیا تھی، دِل بہلانے کے سامان کی سُپر مارکیٹ تھی۔ قوم اِس غلغلے میں ایسی مست و گُم ہوئی کہ کچھ ہوش نہ رہا کہ دُنیا میں اور کیا ہو رہا ہے۔ یا یہ کہ کوئی اور دُنیا بھی ہوتی ہے! تین ہفتے ہونے کو آئے ہیں اور تماشا ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ نئی نسل کو پہلی بار اندازہ ہوا ہے کہ احتجاجی تحریک بھرپور جوش و جذبے کے شانہ بشانہ خوشیوں کی راہ ہموار کرنے والے سامان کے ساتھ بھی چلائی جاسکتی ہے۔ عمران خان اور طاہر القادری نے احتجاجی تحریک کے چلن کو نیا ٹرینڈ دیا ہے۔ ویسے بھی دونوں رجحان ساز ہی رہے ہیں۔ اِس بار اُنہوں نے فلم ساز کا سا انداز بھی اختیار کیا۔ دونوں کے دَھرنے فلم کی شوٹنگ کا تاثر لیے ہوئے ہیں۔ اور آخر آخر میں تو "شوٹ آؤٹ ایٹ لوکھنڈ والا" کا سماں پیدا ہوگیا!

عمران خان احتجاج کو رنگِ انبساط دینے میں زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ اُنہوں نے pre-emptive strike کا تصور بھی متعارف کرایا ہے۔ یعنی پاکستانی سیاست میں کامیابی جب ملے گی تب ملے گی، کیوں نہ پہلے اُس کا جشن منالیا جائے! ٹھیک ہی تو ہے، زندگی کا کیا بھروسہ اور کامیابی کا بھی کیا بھروسہ کہ ملے نہ ملے۔ کامیابی کا جشن منانا تو خیر اپنے اختیار کی بات ہے۔ تو پھر اختیار کو بروئے کار لانے میں کسی کا کیا جاتا ہے!

آزادی اور انقلاب کے نام پر جو کچھ اِس قوم نے تین ہفتوں تک جھیلا ہے اُس کے پہلو سے کیا برآمد ہوسکتا ہے؟ یہ سوال بہت اہم ہے کیونکہ ہر خرابی میں بھی اللہ نے کہیں نہ کہیں کوئی خوبی ضرور رکھی ہوتی ہے۔ اب تو یہ ہماری بصارت کا فریضہ ہے کہ اُس خوبی کو دیکھ پائیں۔

نواز شریف اور اُن کے رفقاء کے لیے یہ تین ہفتے سخت اعصابی کشمکش سے عبارت رہے ہیں۔ اُن کے چہروں سے پریشانی ایسی ہویدا تھی کہ عمران خان اور طاہرالقادری کے متوالے خوش اُٹھے کہ استعفٰی اب آیا کہ تب آیا۔ پارلیمنٹ نے کھل کر وزیر اعظم کی حمایت کی اور تمام ارکان مل کر اُن کے دفاع کے لیے دیوار کی مانند کھڑے ہوگئے۔ اِس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ جو لوگ پارلیمنٹ کے اندر ہیں وہ جمہوریت کو بچانے کے لیے ایک ہیں۔ یہ تو ہوا عمران و قادری

کے دھرنوں کا ایک فائدہ۔ دوسری بڑا فائدہ یہ ہے کہ اب نواز شریف کو بھی اچھی طرح اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اقتدار کو جمہوریت کی طشتری میں رکھا ہوا حلوہ سمجھ کر ڈکارا نہیں جاسکتا۔ اقتدار پھولوں کی سیج ہے لیکن اگر کام نہ کیا جائے اور ''ڈلیور'' نہ کیا جائے تو یہی اقتدار کانٹوں کا بستر بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ عمران و قادری نے وزیر اعظم کے استعفے کے معاملے میں حد سے زیادہ جوش و خروش اور اشتعال دکھایا۔ مگر اُن کے تمام ہی مطالبات ایسے نہیں کہ یکسر نظر انداز کردیئے جائیں۔ انتخابی دھاندلی کی تحقیقات کا مطالبہ ہر اعتبار سے جائز تھا۔ اور اِسی لیے عدالتی کمیشن بنانے پر اتفاق بھی ہوا۔ انتخابی عمل کو زیادہ سے زیادہ شفاف بنانے سے متعلق اصلاحات بھی ناگزیر ہیں۔

عمران خان اور طاہرالقادری کی احتجاجی تحریک کی غایت خواہ کچھ رہی ہو، دونوں نے سیاسی محاذ پر کچھ گولہ باری تو کی ہے، دھماچوکڑی تو مچائی ہے، کچھ اُلٹنے پلٹنے میں کامیاب تو ہوئے ہیں۔ پارلیمنٹ میں بیٹھی ہوئی جمہوری قوتوں کو اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا کہ اب گڈ گورننس ناگزیر ہے۔ دانش کا تقاضا ہے کہ معاملات صرف منتخب عوامی نمائندوں کا اعزازیہ اور مراعات بڑھانے تک محدود نہ رکھے جائیں۔ اگر حکمرانی کے طور طریقے تبدیل نہ کئے گئے اور عوام کی توقعات پر پورا اُترنے سے گریز کیا جاتا رہا تو صبر کا ہر پیمانہ اب لبریز ہونے میں دیر نہیں لگائے گا۔ پارلیمنٹ میں جن لوگوں نے

جمہوریت اور نظام کے حق میں پُرجوش تقریریں کی ہیں اب اُنہیں عوام کے بنیادی مسائل کی بات بھی کرنی ہوگی۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو اُن کی منافقت اظہر من الشمس ہو رہے گی۔ قوم کو تقریریں نہیں، نتائج درکار ہیں۔ دو بڑے دھرنوں کے بعد قومی موڈ یہ ہے کہ اگر کچھ دے سکتے ہو تو دو، ورنہ گھر کی راہ لو۔ جمہوریت یقیناً اچھا تصور ہے اور اِس کے لیے بہت کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔ مگر جو لوگ جمہوریت کے کاندھوں پر سوار ہو کر آتے ہیں اُن پر سب کچھ تو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ قوم کو قربانی کا بکرا بناکر ذبح کرتے رہیں اور قوم قربان ہوتی رہے۔ ایک زمانے سے اہلِ سیاست کی روش یہ ہے کہ مال بٹورنے کا کوئی موقع ضائع نہ کرو اور مقدور بھر سمیٹ کر تپلی گلی سے نکل لو۔ اِس روش ہی نے ملک کو بند گلی میں لا پھینکا ہے۔

ریڈ زون کی صورت حال نے بہت کچھ اُلٹ پَلٹ دیا ہے۔ طریق کار تھوڑا غلط سہی مگر جو کچھ ہوا وہ بہت سوں کے دِل کی آواز سے تھوڑی بہت مطابقت ضرور رکھتا تھا۔ اختلاف رکھنے والوں نے بھی دِل ہی دِل میں تحریک انصاف اور عوامی تحریک کو تھوڑی بہت داد تو ضرور دی ہوگی۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا بھلے ہی نہ ہو، ہلا ضرور ہے۔ بھرپور جمود سے عبارت معاشرے میں اِتنا بھی کیا کم ہے۔

قوم نے تین ہفتوں تک جو کچھ دیکھا اور جھیلا ہے اُس کی کوکھ سے اگر کوئی کام کی چیز برآمد ہو جائے تو تھوڑے بہت آنسو تو پُونچھ ہی جائیں گے۔ کچھ نہیں ہے تو بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ برسوں سے ترسی ہوئی قوم اب چاہتی ہے کہ آسمان پر کوئی ایسا بادل بھی نمودار ہو جو اُس کے دیرینہ مسائل کا حل برسائے۔ نام نہاد نظام تو ٹھہرے ہوئے، پُرتعفن پانی کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ جو کچھ زمین پر ہے اُسے دیکھ کر شرم سے پلکیں جُھکی جاتی ہیں۔ ایسے میں بار بار آسمان کی طرف دیکھنا فطری امر ہے کہ وہیں سے کوئی بہتری آئے تو آئے۔

انتہا سے انتہا تک

قوم کا مجموعی مزاج انتہا پر مَر مٹنے کا ہے۔یُوں جی رہی ہے کہ ہر انتہا پر مَر مٹی ہے۔ کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جس سے وابستہ لوگوں کا رویہ اعتدال کی راہ پر گامزن دکھائی دے۔ محبت ہے تو انتہا کی اور نفرت ہے تو انتہا کی۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

بات یہ ہے کہ آدمی شاعر
یا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا!

قوم کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ اگر کچھ نہیں دینا یعنی جیب ڈھیلی نہیں کرنی تو پھر کوئی سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مَر بھی جائے تو جیب سے پھوٹی کوڑی نہیں نکلتی۔ اور اگر کسی پر لُٹانے کا مَن ہو تو جس پر لُٹایا جارہا ہو وہ تھک جائے گا، لُٹانے والے کا اسٹیمنا دم نہیں توڑے گا۔ عام روش ہے کہ کسی سے محبت کی جائے تو وہ فرطِ حیرت کی منزل میں رہتا ہے کہ ایسا کیا کردیا ہے کہ اِس قدر محبت کی جائے۔ اور اگر کسی سے نفرت کا روگ پالا جائے تو وہ اِسی اُدھیڑبُن میں رہتا ہے کہ آخر ایسی کون سی قیامت آ گئی ہے کہ صرف نفرت کی آگ برسائی جارہی ہے۔

سیاست پر ایک زمانے سے جمود طاری ہے۔ دھماچوکڑی تو بہت مچتی اور مچائی جاتی ہے مگر اُس کی پُشت پر کوئی ٹھوس سبب یا جواز نہیں ہوتا۔ لوگوں کو سڑکوں پر نکالا جاتا ہے، نعرے بازی ہوتی ہے، اشتعال انگیز تقریریں کی جاتی ہیں، سرکاری و نجی املاک کی توڑ پھوڑ بھی ہوتی ہے مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیوں ہے۔ جب ہر معاملہ مصلحت کے سَو پردوں میں لپٹا ہوا ہو تو کچھ بھی کیا خاک سمجھ میں آئے؟

لوگ (اقتدار کے ''فیوض و برکات'' سے محروم) اہلِ سیاست کے احتجاج کا سِرا ڈھونڈتے رہتے ہیں اور پھر ناکامی کے سِرے پر واپس آجاتے ہیں۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب قتل کرنے والے کو معلوم نہ ہوگا کہ وہ کیوں قتل کر رہا ہے اور قتل ہونے والے کو معلوم نہ ہوگا کہ اُسے کیوں قتل کیا جارہا ہے۔ یہ زمانہ ہماری سیاست پر آیا ہوا ہے اور پورے جوبن پر ہے۔ کسی بھی سیاسی سرگرمی کی کسی منطق کا سِرا ہاتھ نہیں آتا۔ جنھیں سڑکوں پر لایا جارہا ہے اُنہیں کچھ اندازہ نہیں کہ ایسا کیوں کیا جارہا ہے۔ اُنہیں سڑکوں پر لانے والوں کو بھی اپنے اِس عمل کا جواز دکھائی یا سُجھائی نہیں دیتا۔

ہر معاملے میں بلا جواز طور پر حد سے گزرنے کی روش ایسی پختہ ہو چکی ہے کہ اب قوم کسی اور روش پر گامزن ہونے کا سوچتی بھی نہیں۔ دستر خوان سجا ہو تو لوگ پیٹ کے بجائے نیت بھرنے تک کھاتے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ نیت بھی بھر جاتی ہے مگر پیٹ نہیں بھرتا! یہی حال بولنے کا ہے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر گھریلو حالات اور سیاست پر بتیانے والوں سے قوم کو راہ دکھانے کے دعویداروں تک سبھی کو بولنے بلکہ بولتے رہنے کا ہَوکا سا ہے۔ ویسے تو بولنے والے کسی سہارے کے مُکلّف نہیں ہوا کرتے لیکن اگر سامنے مائکروفون ہو تو سمجھ لیجیے سُننے والوں کے ذہنوں کا تیا پانچا ہو کر ہی رہنا ہے۔ حالیہ سیاسی بحران کے دوران بھی خطابت کے ریکارڈز ٹوٹتے بنتے رہے ہیں۔ تین ہفتوں کے دوران عمران خان نے اپنے پرستاروں اور طاہر القادری نے اپنے عقیدت مندوں سے جس قدر خطاب کیا ہے وہ چند نئے ریکارڈز کی طرف اُن کی شاندار پیش رفت ہے!

رات کو کسی ہوٹل کی کرسیوں پر یا کسی چبوترے پر بیٹھ کر کچھ دیر گپ شپ کرنا کبھی ہفتہ وار معمول ہوا کرتا تھا۔ اب یہ زندگی کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ بات وہی انتہا پسندی کی ہے۔ اب لوگ رات رات بھر ہوٹلوں میں بیٹھ کر قوم کو درپیش مسائل کا تجزیہ کرتے اور نیند جیسی نعمت کو قوم کے غم پر نچھاور کرتے ہیں!

ستم تو یہ ہے کہ غریبوں کی مدد کرنے کے معاملے میں بھی ہم حد سے یُوں گزرتے ہیں کہ خود ہی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جن کے حُلیے ہی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیشہ ور بھکاری ہیں اُنہیں بھی لوگ مشینی انداز سے نوازتے رہتے ہیں۔ جیسے یہ معمول مشیت نے ہماری جبلّت میں لکھ دیا ہو۔ خیرات دینے میں بھی کسی کی مدد کرنے کے جذبے سے کہیں بڑھ کر ہم یہ سوچتے ہیں کہ حد سے گزر جائیں۔ یہی سبب ہے کہ کسی کو ضرورت نہ ہو تب بھی نوازتے رہنا ہمارے مزاج کا حصہ ہو کر رہ گیا ہے۔

جب کوئی قوم اپنے فکر و عمل سے انتہا پسندی ثابت کرتی ہے تو قدرت کی طرف سے بھی اُسی کے مواقف ''عنایات'' ہوا کرتی ہیں۔ اگر کوئی شخص پائی پائی جوڑتا رہے اور کہتا جائے کہ بُرے وقت کے لیے کچھ جمع کر رہا ہوں تو اللہ اُسے اُس کی نیت کے مطابق نوازتا ہے یعنی اُس پر بُرا وقت لا کر رہتا ہے۔ ہم بھی اِسی منزل میں ہیں۔ جب ہم یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہمیں پانی ذخیرہ کرنے سے کچھ غرض نہیں۔ تو اللہ کو بھی خیال آتا ہے کہ جب اِس قوم کو پانی سے محبت ہی نہیں تو پانی کے معاملے میں فَیاضی کیوں دکھائی جائے۔ ہم پانی سے صرفِ نظر کے معاملے میں حد سے گزرتے ہیں تو قدرت بھی پانی نہ برسانے کے معاملے میں انتہا کر دیتی ہے۔ اور پھر جب ہمارا رب یہ دیکھتا ہے کہ پانی نہ ہونے پر بھی یہ قوم پانی کی قدر دان نہیں تو ہمیں پانی ہی کی مار مارتا ہے۔ پھر اچانک

اِتنا پانی ملتا ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھلتا بلکہ ہر چیز پر بکھر جاتا ہے۔ آج پھر دریا لب ریز ہیں۔ اور چونکہ ہم نے بھرے ہوئے دریاؤں سے اپنی ضرورت کے مطابق پانی ذخیرہ کرنے کا اہتمام نہیں کر رکھا اِس لیے رحمت کی صورت زمین پر برسنے والا پانی ہمیں زمین میں گاڑنے کا سبب بن رہا ہے۔ معاملہ پھر وہی یعنی انتہا کا ہے۔

انتہا پسندی کی تازہ ترین مثال پارلیمنٹ میں حزب اقتدار اور (نام نہاد) حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والی شخصیت کا مناقشہ ہے۔ قومی اسمبلی اور سینیٹ کے مشترکہ اجلاس کے دوران تلخ و شیریں روابط کی حامل ن لیگ اور پیپلز پارٹی نے ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے کی کوشش کی۔ چند پوٹلے کھولے بھی گئے مگر پھر فوراً بند کر دیئے گئے۔ ایسا اِس لیے کیا گیا کہ جس انتہا پسندی سے ایک دوسرے کی اصلیت مزید کُھل سکتی ہو وہ ہرگز پسندیدہ نہیں! چوہدری نثار علی خان اور چوہدری اعتزاز احسن نے ایک دوسرے کے بارے میں قوم کو کچھ بتانے کی کوشش کی۔ معاملہ ابھی انتہا پسندی کی طرف بڑھا بھی نہیں تھا کہ بڑے بیچ میں آ گئے۔ جمہوریت کو بچانے والوں کی یہی شان ہوا کرتی ہے! ایک دوسرے کے ساتھ کچھ بھی کرتے رہو مگر قوم کو تو نہ بتاؤ!

تین ہفتوں کے دوران پارلیمنٹ کے سامنے جو کچھ ہوا وہ پارلیمنٹ کے اندر بھی

طوفان برپا کرنے کا سبب بنا۔ باہر کی انتہا پسندی کو اندر والوں نے یوں ختم کرنے کی کوشش کی کہ حکومت کو ''غیر مشروط'' حمایت سے نواز دیا۔ یعنی باہر مخالفت کی انتہا اور اندر حمایت کی انتہا۔ مگر حقیقی انتہا پسندی تو یہ ہے کہ سسٹم بچانے کی کوششوں کے دوران کی جانے والی انتہائی پُرجوش تقریروں میں کہیں بھی عوام کے مسائل حل کرنے اور گڈ گورننس کو یقینی بنانے پر کچھ کہنے کی کسی نے بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ سسٹم بچالیا جائے، بس اِتنا کافی ہے۔ ملک کو بچانا اور قوم کو راحت عطا کرنا اللہ کا کام ہے۔ اللہ لاکھوں معصوموں کی قربانیاں رائیگاں کیسے جانے دے گا؟

ہم نے بھی اِس کالم میں انتہا پسندی کے ذکر اور اُس کے بارے میں مثالیں ٹانکنے کی انتہا کردی ہے اِس لیے بس یہیں تک لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اُمید ہے آپ خلوص کی انتہا کرتے ہوئے اُسی طرح درگزر فرمائیں گے جس طرح چوہدری اعتزاز احسن کے معاملے میں چوہدری نثار نے درگزر سے کام لیا ہے!

دم نہ کشیدم

ہر سال بارشیں ہوتی ہیں اور دریا بھی بپھرتے ہیں مگر اب کے سیاسی دریا ایسا بپھرا ہے (یا بپھرایا گیا ہے!) کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ مون سون گزر رہا تھا اور لوگ حیران تھے کہ جن بادلوں کو برسنا تھا وہ تو برسے نہیں اور اسلام آباد کی فضاء سے اُٹھنے والے احتجاجی بادل ایسے برسے ہیں کہ اب کسی مقام پر رُکنے اور سانس لینے کا نام نہیں لے رہے۔ ریڈ زون میں ہونے والی احتجاجی بارش نے سیاست کی سڑک کو محض زیر آب لانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اچھی خاصی دلدل کی سی کیفیت پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

قوم حیران ہے کہ اب کے ایسا کیا ہوگیا ہے کہ حالات کی نزاکت بھی دھرنوں کو ختم کرنے میں ناکام ہے۔ آپ حالات کی نزاکت کو کوئی الزام نہ دیں۔ مرہم کا کام ہے زخم کو مندمل کرنا۔ اب اگر مرہم استعمال کرنے سے گریز کرے بلکہ مرہم کی شکل دیکھنا بھی پسند نہ کرے تو اِس میں مرہم کا کیا قصور؟

منتخب وزیر اعظم سے استعفے کا مطالبہ کرنے والوں نے ''ثابت قدمی'' اور ''اولوالعزمی'' کے معاملے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حد یہ ہے کہ قدرت نے

اتمامِ حجت کا اہتمام کرتے ہوئے دریاؤں کو بھر ہی نہیں دیا بلکہ بے قابو بھی کر دیا ہے مگر دھرنے دینے والوں کا دِل ابھی بھرا نہیں۔ وہ ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں۔ لاکھوں افراد نقل مکانی کر گئے ہیں مگر لے دے کر ایک دھرنے والے ہیں کہ معمولی سی نقل مکانی کا بھی نہیں سوچ رہے۔

انسانوں کی پیدا کردہ ہنگامی حالت کے مقابلے میں قدرت کی پیدا کردہ ہنگامی حالت فوری ریسپانس کی متقاضی ہوتی ہے۔ وسطی پنجاب کے بیشتر علاقے اور آزاد کشمیر سیلاب کی لپیٹ میں ہے مگر قوم حیران ہے کہ اُسے بے یقینی کی کیفیت سے دوچار کرنے والے اب بھی کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں۔ خدا جانے اِس بار کون سے خفیہ حکیم کی معجون کھائی ہے کہ احتجاجی اسٹیمنا ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔

ایسا پہلی بار نہیں ہوا کہ قوم مصیبت میں ہو اور قوم کو مشکل سے نکالنے کے دعویدار وطن میں یا وطن سے دور سیر و تفریح میں مشغول ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ چار سال قبل سندھ میں سیلاب آیا تھا تب بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اُس وقت کے صدر آصف علی زرداری اہل خانہ کے ساتھ فرانس میں تعطیلات گزارتے رہے۔ سندھ میں سیلاب کی تباہ کاریوں کے پیش نظر تجزیہ کاروں نے اُس تفریحی دورے کو سفّاکی قرار دیا۔ اور ایسا کہنا کچھ غلط بھی نہ تھا مگر اِسے کیا کہیے کہ قوم کے تازہ ترین نجات دہندہ ملک کے دارالحکومت میں ہیں اور سیلاب کی

تباہ کاریاں دیکھ کر بھی جذبات کی رَو میں بہنے کو تیار نہیں؟

عمران خان اور طاہر القادری نے جن نکات کی بنیاد پر احتجاج کا ڈول ڈالا تھا وہ سارے کے سارے غلط یا بلا جواز نہ تھے۔ سبھی چاہتے ہیں کہ نظام کو درست کرنے کی راہ ہموار ہو۔ مگر درست کرنے کی کوشش میں نظام کو مزید خراب کرنے میں کہاں کی دانش مندی ہے؟ 2013 کے انتخابات میں کی جانے والی مبینہ دھاندلی اور انتخابی نظام کی خرابیوں کو دور کرنے کے نام پر احتجاج شروع ہوا تو ہزاروں افراد ساتھ ہو لیے۔ سب کو یقین تھا کہ حکومت پر دباؤ بڑھے گا تو بہتری کی کوئی تو صورت نکلے گی۔ قوم حیران و پریشان ہے کہ ابتلا کی اِس گھڑی میں بھی یارانِ وطن سیلاب زدگان کی مدد کے لیے کمر کَسنے کے بجائے احتجاجی ریلے ہی میں بہے جا رہے ہیں!

سیاست دان کون ہوتے ہیں؟ وہ جو حالات اور واقعات پر نظر رکھتے ہیں اور وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اپنے فکر اور حکمتِ عملی میں تبدیلی لاتے ہیں۔ پھر ہمارے سیاست دانوں کو کیا ہوگیا ہے کہ حالات پر نظر رکھنے سے بھی کترا رہے ہیں۔ اور حالات بھی کیا؟ ہنگامی حالت کہیے۔ ملک کا ایک بڑا حصہ سیلابی ریلوں میں غلطاں ہے۔ کچے مکانات گرتے جا رہے ہیں، اُن میں دب کر لوگ جاں بحق ہو رہے ہیں، کھڑی فصلیں تباہی سے دوچار ہو چکی ہیں، مال مویشی بھی سیلابی

ریلوں کی نذر ہوئے۔ ایسی حالت میں بھی یاروں کو سسٹم کی پڑی ہے۔ احتجاج برحق ہے مگر یہ کیسا احتجاج ہے کہ وقت اور حالات کی نزاکت کو بھی خاطر میں لانے سے اِنکاری ہے؟

قوم کو خلفشار سے لڑتے ہوئے ایک ماہ ہوچکا ہے۔ احتجاج اور انتشار کی کیفیت ایک ماہ قبل پیدا ہوئی تھی۔ اِس دوران میڈیا کے ذریعے جو کچھ اِس قوم کے گوش گزار کیا گیا ہے اور جو مناظر اہلِ وطن نے دیکھے ہیں وہ کسی بھی اعتبار سے اطمینان بخش نہیں۔ اسلام آباد کی ہتھیلی پر دھرنوں کی سرسوں جمانے والوں نے سیکڑوں بار یقین دلایا ہے کہ خوش خبری ملنے والی ہے مگر اب تک ایک بھی ایسی خبر نہیں آئی جو اہلِ وطن کے مُرجھائے ہوئے چہروں پر مسکراہٹ کی تابانی بکھیر دے۔ ذہانت بلا کی ہے اِس لیے اپنی ہر خوش خبری اور پیش گوئی کو یہ لوگ open-ended رکھتے ہیں، یعنی کوئی بھی مفہوم کشید کیا جاسکتا ہے۔ اگر اِتنا بھی نہ جانتے ہوں تو سیاست کیا خاک کریں گے!

تحریک انصاف کی کور کمیٹی نے بدھ کی شام عمران خان کے کنٹینر پر اجلاس میں طے کیا کہ وزیر اعظم کے استعفے تک دھرنا جاری رہے گا۔ گویا ملک سیلابی نالوں میں بہتا رہے، تحریک انصاف کا پرنالا وہیں گرتا رہے گا! ملک کی مجموعی صورت حال میں دھرنا چھوڑ کر امدادی سرگرمیوں میں حصہ نہ لینا کیا

ایسا فیصلہ ہے جو عمران خان کو سیاسی معاملات میں کوئی ایڈوانٹیج دلا سکتا ہے؟ یہ وقت تو اور سب کچھ بھول بھال کر سیلاب زدہ علاقوں میں غریبوں اور لاچاروں کی مدد کرنے کا ہے۔ ملک میں سیلاب زدگان کی بھرپور امداد کا ماحول بن رہا ہے۔ ایسے میں تحریک انصاف اور عوامی تحریک کی ساری پبلک سپورٹ کہیں دھرنوں میں نہ بہہ جائے!

سندھ اِس اعتبار سے خوش نصیب صوبہ ہے کہ وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ اور اُن کی کابینہ کے ارکان ہر طرح کی صورت حال سے چند پُر لطف لمحات کشید کر لیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ڈاکٹر ذوالفقار مرزا دل فریب باتوں سے عوام کا دل بہلایا کرتے تھے۔ یہ منصب اب خاصے پُر لطف انداز کے ساتھ منظور وسان صاحب کو مل گیا ہے۔ اور خود شاہ صاحب کیا کم ہیں۔ پیر جو گوٹھ (خیرپور) میں دریائے سندھ کے حفاظتی پُشتوں کا معائنہ کرتے ہوئے اُنھوں نے یہ پتے کی بات بتائی کہ ''دریا تو بادشاہ ہے۔ وہ اپنی مرضی سے رُخ بدلتا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ وہ سیدھے راستے سے سمندر میں جائے۔''

شاہ صاحب کی حِسِ مزاح کے قُربان جایئے۔ اگر وہ دریا کو سیدھے راستے سے سمندر میں بھیجنے کی کوشش کر سکتے ہیں تو ذرا دھرنے والوں کو بھی کوئی سیدھا راستہ دکھا دیں۔ یہاں شاہ صاحب کو ذرا زیادہ محنت کرنی پڑے گی کیونکہ دھرنے

والے ہیں تو دریا مگر سمندر میں گرنے کے بجائے اِس امر کے لیے کوشاں ہیں کہ سمندر اُن میں آ گرے! یہ سب کچھ ایسا سحر انگیز ہے کہ قوم ''ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم'' کی تصویر بن کر رہ گئی ہے۔

کوکنگ ایکسپرٹ سے انٹرویو

ہم ایک ایسے معاشرے میں جی رہے ہیں جس میں کوئی بھی رجحان جڑ پکڑتا ہے تو سب کے دل و دماغ کو بجلی کی سی رفتار سے جکڑ لیتا ہے۔ اور جب پانی سَر سے گزرتا ہے تب اہلِ وطن کو خیال آتا ہے کہ یہ کیا حماقت سرزد ہو رہی تھی۔ ایک زمانے تک ہم گھر کا پکا ہوا کھاتے رہے۔ پھر خیال آیا کہ قیمتی وقت کھانے پر کیوں ضائع کیا جائے۔
اِس خیال کے آتے ہی ہم نے ہوٹلوں، ٹھیلوں اور ڈھیوں پر فروخت ہونے والی ہر انٹ شنٹ چیز کھانے کو معمول بنالیا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ سب کچھ الٹ پلٹ گیا ہے۔ کسی زمانے میں ہوٹل والے یہ کہتے ہوئے گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے کہ بالکل گھر والا مزا ملے گا۔ اب بعض مصالحوں کے پیکٹ پر لکھا ہوتا ہے ...... اب آپ کی خدمت میں بالکل وہی ریسٹورنٹ والا ذائقہ!
جب خواتین خانہ نے دیکھا کہ لوگ چٹور پن کے عادی ہوگئے ہیں تو محنت کرنے پر لعنت بھیجی اور چند بازاری مصالحوں کی مدد سے صرف چٹخارے کو اہمیت دینا شروع کیا۔
اِس کا نتیجہ وہی برآمد ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ لوگ کھانے میں اب صرف مزا یعنی ذائقہ تلاش کرتے ہیں۔ غذائیت کے خیال کو ذہن کے کسی دور افتادہ کونے میں دفن کردیا گیا ہے۔

گھر میں پکانے سے گریز نے خواتین کو مجبور کر دیا ہے کہ ٹی وی پر ''آپاؤں'' سے سیکھیں کہ کم وقت میں بہتر کھانا کیسے پکایا جاسکتا ہے یا کچھ پکائے بغیر بھی کوئی چیز کیسے پکائی جاسکتی ہے! ٹی وی پر جلوہ افروز ہونے والی کوکنگ ایکسپرٹس نے جو کچھ سکھایا ہے اُس سے اِتنا تو ہوا ہے کہ دستر خوان پر کوئی بے ذائقہ چیز دھری ہو تو خواتین خانہ سارا الزام کوکنگ ایکسپرٹ کے سَر پر تھوپ دیتی ہیں! کھاتے وقت شوہر منہ بنائے تو بیوی یہ کہتے ہوئے جان چُھڑالیتی ہے کہ ''آپا کے بتائے ہوئے نُسخے کے مطابق پکایا ہے۔ اگر کچھ بولنا ہے تو آپا کو بولو، مجھے نہیں۔'' اب شوہر دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے آپا کو کہاں ڈھونڈتا پھرے۔ لاچار ہو کر اپنی قسمت کو کوسنے پر اکتفا کیا جاتا ہے!

گزشتہ دنوں ایک کوکنگ ایکسپرٹ سے ملاقات ہوئی تو اُن سے چند ٹریڈ سیکرٹ جاننے کی کوشش کی۔ محترمہ نے اپنی مصالحے دار اور لچھے دار باتوں سے ہمارا دماغ ایسا پکایا کہ ہم نے کچھ نہ جاننے میں عافیت جانی۔ آیئے، اُن سے ہونے والی لذیذ گفتگو سے ہم آپ کو بھی مستفید کریں۔

☆ یہ بتایئے کہ پکانے کی ابتداء کب اور کیسے کی؟

کوکنگ ایکسپرٹ : یہ قیامت بہت پہلے برپا ہو گئی تھی۔ میرے گھر والے میرے اولین فین (یعنی تختۂ مشق) تھے۔ لڑکی ہوں تو بولنا میری سرشت میں تھا۔ طبیعت بھی کچھ تیز پائی تھی۔ ذرا سی دیر میں اپنی باتوں سے لوگوں کا دماغ میں ایسا پکا دیا کرتی تھی کہ چند سیانیوں یعنی خاندان کی بڑی بوڑھیوں نے پیش گوئی کر دی کہ کہ لڑکی بڑی ہو کر بہت پکائے گی۔ میری والدہ یہ سمجھیں کہ وہ (گھر کے افراد کی تعداد کے اعتبار سے) کسی بڑے گھرانے میں شادی کی پیش گوئی کر رہی ہیں۔ مگر جب میں نے ہوش سنبھالتے ہی باورچی خانے کی خبر لینے کی ابتداء کی تو والدہ کی سمجھ میں بڑی بوڑھیوں کی بات آئی۔

☆ کچن میں اولین تجربے کیسے رہے؟

کوکنگ ایکسپرٹ : میں نے میٹرک سائنس گروپ سے کیا تھا۔ انٹر بھی سائنس ہی سے کیا تو بی ایس سی کی طرف جانا فطری امر تھا۔ ذہن کچھ ایسا بن گیا کہ اب تو تجربے ہی کرنے ہیں۔ کالج کی لیب میں تو مجھے کچھ خاص ہنر دکھانے کا موقع ملتا نہیں تھا اِس لیے کچن ہی کو میں نے (از خود نوٹس کے تحت) لیب کا درجہ دے دیا۔ کیمسٹری کی کتابوں میں جتنے بھی تجربات پڑھے تھے اُنہیں جب کچن میں اپلائی کیا تو عجیب و غریب ڈِشیں معرض وجود میں آتی گئیں۔ یوں میری شہرت کا آغاز ہوا۔ خاندانی حلقوں میں یہ بات پھیل گئی کہ یہ لڑکی سائنسی کتابوں کی مدد سے کھانا پکاتی ہے۔ لوگوں نے مجھے حیرت، حسد، رشک اور شک کی ملی جُلی

نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ کیوں نہ دیکھتے؟ میں کچن میں بھی لیب کوٹ پہن کر داخل ہوا کرتی تھی!

☆آپ کی تیار کی ہوئی ڈِشیں خاندان والوں کو پسند بھی آتی تھیں یا معاملہ صرف حیرت و حسد تک رہتا تھا؟

کوکنگ ایکسپرٹ: پسند کیسے نہ آتیں؟ میری شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ بہت سے لوگ مرعوب ہو کر کھالیا کرتے تھے۔ میں سائنس دان کے گیٹ اپ میں کھانا پیش کیا کرتی تھی۔ کوئی کچھ پوچھ بیٹھتا تو سائنسی اصطلاحات کی مار مارتی تھی۔ خاندان کے بہت سے جاہلوں کو میں نے بھاری بھرکم سائنسی اصطلاحات ہی کی مدد سے خاموش کیا۔

☆آپ صرف لذت پر توجہ دیتی ہیں یا ورائٹی کو بھی ترجیحات میں شامل رکھتی ہیں؟

کوکنگ ایکسپرٹ: دونوں ہی میری ترجیحات میں سرفہرست رہتی ہیں۔ سیدھی سی بات ہے، لوگ آخر لذت اور ورائٹی ہی پر تو مرتے ہیں۔

☆آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ لوگ آپ کے کھانے پر مرتے ہیں؟

کوکنگ ایکسپرٹ: جی ہاں۔ مگر ایسے سوالات نہ کریں۔ میں کہتی ہوں کہ لوگ

میرے ''کھانے پہ'' مرتے ہیں۔ کہیں پڑھنے والوں کو یہ مغالطہ نہ ہوجائے کہ لوگ میرے ''کھانے سے'' مرتے ہیں!

☆اپنے کن آئٹمز پر آپ کو فخر ہے؟

کوکنگ ایکسپرٹ: ویسے تو میں نے بہت سے ایسی چیزیں بنائی ہیں کہ بس یوں سمجھ لیجیے قلم (یا کفگیر) توڑ کر رکھ دیا ہے۔ کوفتے میری مشہور ترین ورائٹی ہیں۔

☆کیا خاص بات پائی جاتی ہے آپ کے پکائے ہوئے کوفتوں میں؟

کوکنگ ایکسپرٹ: جب میں نے لوگوں کے دماغ پکانا ترک کرکے کچن میں باضابطہ پکانے کی مشق شروع کی تھی تب پہلی پہلی بار ایسے کوفتے بنائے کہ دستر خوان پر لوگ منہ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ چنے زیادہ ڈل جانے سے کوفتے ایسے سخت ہوگئے کہ لوگوں کو رومال میں رکھ کر زمین پر پچھاڑنے پڑے۔ تب کہیں جاکر وہ ٹوٹے اور کھانے کے قابل ہو پائے۔ اگلے دن میرے گھر پر بھیڑ لگی تھی۔ کسی نے کوفتوں کی خاصیت سیاسی کارکنوں کو بتادی تھی۔ وہ لوگ پتھراؤ کے لیے مجھ سے کوفتے لینے پہنچ گئے! اُس دن سے میری شہرت اور آمدنی میں اضافے کا سلسلہ شروع ہوا۔ لوگ مجھے ''باجی کوفتے والی'' کہنے لگے۔

☆ کوئی اور اسپیشل آئٹم؟

کوکنگ ایکسپرٹ: کچن لیب کے ابتدائی دنوں میں ایک بار میں نے دال میں بھگار لگانے کی کوشش کی تو کچھ اور ہی معاملہ ہوگیا۔

☆ کیوں؟ کیا آپ شیخی بگھارنے بیٹھ گئیں؟

کوکنگ ایکسپرٹ: نہیں بھئی۔ شیخی بگھارنے کا سلسلہ تو بہت بعد میں، ٹی وی اسکرین پر شروع ہوا۔ میں نے کچھ ایسے مصالحے کڑھائی میں ڈال دیئے جن کی کیمیائی خصوصیات ایک دوسرے سے خار کھاتی تھیں۔ بس پھر کیا تھا، کچن میں انتہائی تیز بُو والا دھواں بھرگیا۔ گھر والے سمجھے شاید میں نے کوئی بم بنانے کی کوشش کی ہے! سب منہ پر کپڑا رکھ کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ذرا سی دیر میں گھر بھر میں دھواں بھرگیا۔ گھر والوں نے مجھے بہت بُرا بھلا کہا۔ مگر کچھ ہی دیر میں قدرت نے میری لاج رکھ لی۔ بگھار کے دھویں نے کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے لال بیگ اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کو ادھ موا کرکے نکال باہر کیا۔ مکھیاں اور مچھر بھی چکرا کر گرنے لگے۔ میرے بگھار نے وہ کام کر دکھایا جو فیومیگیشن والے چار پانچ ہزار روپے میں کرتے ہیں! اِس کے بعد تو مجھے فیومیگیشن کے لیے بھی بلاوے آنے لگے! کئی اہل نظر نے میرے بگھار کو فیومیگیٹیو کوکنگ" کا نام دے دیا! بس کچھ اِسی طرح کے "کارناموں" سے میری" شہرت کو چار چاند لگے، ٹی وی والوں نے سُنا تو بُلا بھیجا۔ اور آج آپ

جیسے مہربان میرا ''ایکسپرٹ اوپینئین'' اہل وطن تک پہنچا رہے ہیں۔

☆ قوم کے نام کوئی پیغام؟

کوکنگ ایکسپرٹ : میں کیا اور میرا پیغام کیا؟ بس یہ ہے کہ انسان کو محنت کرتے رہنا چاہیے۔ جو چیز دنیا بھر میں نہ چلے وہ پاکستان میں چل جاتی ہے۔ میں کیا پکاتی ہوں اور کیا نہیں پکاتی، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ من آنم کہ من دانم۔ مگر جسے اللہ رکھے اُس کا پکایا کون نہ چکّھے! ہمارے ہاں سیلیبریٹیز سوچتی تو ہوں گی کہ آخر اُن میں ایسا کیا ہے کہ لوگ مَر مٹتے ہیں۔ میں بھی شروع شروع میں سوچا کرتی تھی۔ اب سوچتی ہوں جب اللہ عزت دے رہا ہے تو تردّد میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے! ہاں، انسان کو کچھ خاص کئے بغیر بھی بہت کچھ مل جائے تو غرور نہیں کرنا چاہیے!

وہ سیلاب کب آئے گا؟

جو کچھ بھی اِس قوم کی فطرت کا حصہ ہوگیا ہے وہ مرزا تنقید بیگ کو بہت بُرا لگتا ہے۔ اب چونکہ احتجاج بھی پاکستانی قوم کے مزاج کا جزوِ لاینفک ہے اِس لیے مرزا کو احتجاج اور احتجاج کرنے والوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ مگر خیر، وہ بیر رکھنے اور چِڑنے کے معاملے میں توازن برقرار رکھتے ہیں اور حالات دیکھ کر ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ بھابی بھی اُن کے بعض رویّوں پر شدید احتجاج کرتی ہیں مگر اِس احتجاج کو مرزا ہنس کر جھیل جاتے ہیں۔ گھر کے ڈی چوک میں اُنہیں کوئی دھرنا پسند نہیں۔ جیسے ہی بھابی کسی بات پر احتجاج کرتی ہیں، مرزا مذاکرات پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور تمام مطالبات مانتے چلے جاتے ہیں۔ کامیاب گھریلو سیاست کا یہی تو ایک راز ہے۔

ایک طرف قوم سڑکوں پر آئی ہوئی ہے اور دوسری طرف دریاؤں میں پانی آیا ہوا ہے۔ اِدھر کچھ لوگ احتجاج کر رہے ہیں اور اُدھر قدرت ہماری عاقبت نا اندیشی پر احتجاج کر رہی ہے۔ سیاست دان احتجاج کی فصل اگائیں یا نہ اگائیں اور دھرنے دیں یا نہ دیں، دریاؤں میں طغیانی تو موسم کا معمول ہے۔ ہر سال ہی کسی نہ کسی درجے کا سیلاب ہماری زمینوں کا رُخ کرتا ہے۔ دریاؤں کے ساغر

چھلک جاتے ہیں اور پھر کناروں پر آباد لوگوں کو بُرے وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
مرزا کہتے ہیں کہ جب ہم قدرت کے اُصولوں کو نظر انداز کرتے ہیں تو قدرت بھی ہمیں نظر انداز کرنے پر تُل جاتی ہے۔ ملک میں کئی دریا ہیں۔ اور جب دریا ہیں تو اُن میں پانی بھی ہوگا۔ کبھی سطح بڑھے گی، کبھی گرے گی۔ جب گرے گی تو ہم بُوند بُوند کو ترسیں گے۔ فصلیں سُوکھ جائیں گی۔ اور اگر دریاؤں میں پانی زیادہ آ جائے تب بھی مصیبت ہی مصیبت۔ فصلیں جس پانی کو ترس رہی ہوتی ہیں اُسی کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں۔
دریا جب اپنی جولانی پر ہوں تو اُن میں پایا جانے والا پانی بچا لینا ہماری ذمہ داری ہے۔ قدرت کا کام پانی دینا ہے، ڈیم بنانا نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قدرت کپاس کی نعمت سے نوازتی ہے، اُسے دھاگے میں بدلنا اور دھاگے سے کپڑا بُننا ہمارا فرض ہے۔ مرزا کو اِس بات کا شدید دُکھ ہے کہ ہم اب تک اِتنی سادہ سی بات بھی سمجھ نہیں سکے۔ مرزا کیا جانیں کہ ہم مشکل پسند قوم ہیں، آسان باتیں ہماری سمجھ میں آسانی سے نہیں آتیں۔
مرزا کا کو رِاشو یہ ہے کہ وہ قوم کے بارے میں سوچ سوچ کر دُبلے ہوئے جاتے ہیں۔ صحت اِس قدر گر چکی ہے کہ دور سے دیکھ کر بھی کوئی پورے یقین سے

بتا سکتا ہے کہ یہ صاحب قوم کے غم میں مَرے جا رہے ہیں۔ ہم نے بارہا سمجھایا ہے کہ جناب! کیوں اپنے دشمن ہوئے جاتے ہیں۔ محض سوچنے سے کچھ ہوا ہے نہ ہوگا۔ یہ عمل کی دُنیا ہے۔ محض تفکرات کا سِکّہ چلا کر آپ اِس بازار سے کچھ بھی خرید نہیں سکتے۔ مگر مرزا کہاں مانتے ہیں؟ کبھی وہ اہلِ سیاست کو بُرا بھلا کہتے ہیں اور کبھی سرکاری مشینری کے لتّے لیتے ہیں۔ بھابی صاحبہ بھی کئی بار ہاتھ جوڑ چکی ہیں کہ بس، اب یہ واویلا بند کیا جائے۔ مگر جس طور بھارت ''اٹوٹ انگ'' کی رَٹ لگائے رہتا ہے بالکل اُسی طرح مرزا بھی ہر وقت مقنّنہ اور منتظمہ کو روتے رہتے ہیں۔

آج کل سیلاب نے مرزا کے ذہن کو جکڑ رکھا ہے۔ عمران خان اور طاہر القادری نے حساس ترین سرکاری عمارات کے سامنے اور مرزا نے ٹی وی سیٹ کے سامنے ڈیرا ڈالا ہوا ہے۔ سیلاب کی لپیٹ میں آئے ہوئے علاقوں کی تباہی دیکھ دیکھ کر کُڑھتے ہیں، دل مَسُوس کر رہ جاتے ہیں۔ اُدھر پانی کے ریلے اور اِدھر مرزا کے دریائے لب پر مغلظات کے ریلے۔ ٹی وی پر سیلاب کی کوریج دیکھ کر طبیعت میں بھی طغیانی اور مزاج میں گرانی آتی جاتی ہے۔ مرزا کبھی سَر پیٹتے ہیں، کبھی گھٹنوں پر ہاتھ مار کر قوم کی ناتوانی کا ماتم کرتے ہیں۔

ایک مرزا پر کیا موقوف ہے، جس کسی کے بھی سینے میں دِل ہوگا وہ یہ سب کچھ

دیکھ کر کڑھے گا، دکھی ہی ہوگا۔ مگر وہ کیوں دُکھی نہیں ہیں جن کے ذمے ہنگامی صورت حال کے لیے ہر طرح کی تیاریوں کو یقینی بنانا ہے؟ وہ کیوں پریشان نہیں جن کا کام ہی سیلاب اور دیگر قدرتی آفات سے نمٹنے کے اسباب کا اہتمام کرنا ہے؟ مرزا کی طرح وہ ہیجان میں مبتلا کیوں نہیں جن کی ڈیوٹی ہی یہ ہے کہ دریاؤں میں طغیانی کے آنے سے پہلے ممکنہ متاثرین کو نہ صرف آگاہ کریں بلکہ اُن کی بھرپور پیشگی مدد بھی یقینی بنائیں؟

یہ تماشا تو چھ عشروں سے جاری ہے۔ ہر سال مون سون آتا ہے یعنی بارشیں ہوتی ہیں۔ جب بارشیں زیادہ ہوتی ہیں تو سیلاب بھی آتا ہے۔ سیلاب کو تو ہم شاید مکمل طور پر نہ روک پائیں مگر چھلکے ہوئے دریاؤں کو سمندر میں گرنے کی اجازت دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟ ڈیم بنانا تو ہمارے بس کی بات ہے۔ اِس راہ میں تو قدرت کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کرتی۔ دریاؤں کا کٹاؤ روکنا تو بہت حد تک ہمارے بس کی بات ہے۔ دریاؤں کے پُشتے بھی ہمیں مضبوط کرنے ہیں اور کناروں پر آباد لوگوں کو ہٹاکر محفوظ مقامات پر بسانا بھی ہمارا ہی فرض ہے۔ قدرت کو جب اپنے کام کا پورا اندازہ ہے تو ہمیں اپنے فرائض کا احساس کیوں نہیں؟ جن کے پیر نہیں ہوتے وہ آمد و رفت کے لیے بہتر تکنیکی اور میکانیکی سہارے تلاش کرتے ہیں، خصوصی گاڑیاں بنواتے ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ پیر سلامت ہونے پر بھی گھسٹ گھسٹ کر چلنے کا ''آپشن'' سینے سے لگائے ہوئے

ہیں! جن ملکوں کے پاس دریا نہیں (یا کم ہیں) کوئی اُن سے پوچھے کہ پانی کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہاں قدرت نے دل کھول کر جھرنوں، جھیلوں، تالابوں، دریاؤں اور سمندر سے نوازا ہے تو رونا پیٹنا لگا ہوا ہے کہ اِتنے پانی کا کیا کریں؟ یعنی خوب ضائع کرو اور جب ڈھونڈے سے نہ ملے تو اُسی کمیاب پانی کو کمرشل کو موڈٹی میں تبدیل کردو! قدرت کی طرف سے فَیاضی اور ہماری طرف سے ناقدری..... کیا سِتم ہے۔ اپنے مُقدر سے یہ کھلواڑ کب تک ..... اور کیوں؟ کب ہمیں یہ خیال آئے گا کہ جب آسمان کے دروازے بند ہونے پر آتے ہیں تو انسانوں کی ساری اوقات کھل کر سامنے آجاتی ہے؟ قدرت اپنے حصے کا کام کرتی رہے گی۔ بارشیں بھی ہوتی رہیں گی۔ دریاؤں میں طغیانی بھی آتی رہے گی۔ دریا چھلکتے بھی رہیں گے یعنی سیلاب بھی آتے رہیں گے۔ یہ تو قدرت اور فطرت کا معمول ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے معمولات کب تبدیل ہوں گے؟ ہمارے قومی وجود پر روشن ضمیری کی بارش کب ہوگی؟ سیلاب کے بند باندھنے کا جذبہ کب ہمارے ارادوں کی بنجر زمین کو سیراب کرے گا؟ وہ دن کب آئے گا جب ہم ہر قدرتی آفت کے لیے بہت پہلے سے جاگ اُٹھیں گے اور ساری تیاریوں کے ساتھ اُس کا سامنا کریں گے تاکہ ربّ العالمین بھی عرش سے نظر

ڈالے تو ہمارے جذبوں کی بھرپور داد دے اور اِس بات پر نازاں ہو کہ اُس کے بندوں کو ایک دوسرے کا خیال آگیا ہے!

زمینی دریاؤں میں تو سیلاب آیا ہی کرے گا۔ سوال صرف یہ ہے کہ ہمارے دریائے عمل میں طغیانی کی کیفیت کب پیدا ہوگی؟ ہمارے فکر و عمل کے تمام دھارے پوری دیانت اور رفتار سے کب بہیں گے اور بنجر زمینوں کو سیراب کرنے کا اہتمام کرکے قدرت کی فَیاضی پر شُکرانے کا حق ادا کریں گے؟ مرزا کی طرح ہم بھی اُس دن کے منتظر ہیں جب اِس قوم کے ارباب بست و کشاد محض اپنی جیبیں بھرنے کے لیے کسی قدرتی آفت کے منتظر نہ ہوں (اور نہ اُس قدرتی آفت کو یقینی بنانے کا اہتمام کریں!) بلکہ اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑے ہو کر اہل وطن کے حق میں چند فیصلے کریں۔ جب ایسا ہوگا تب کسی بھی درجے کا سیلاب ہمارا کچھ بگاڑ نہ پائے گا۔ اور تب تک جو کچھ بھی ہونا ہے اُس سے نمٹنے کیلئے گڑگڑا کر اللہ سے مدد مانگنے کے سوا چارہ نہیں۔

☆☆☆

مُنہ چِڑاتی تصویر

خطے کی سب سے بڑی طاقت کے صدر نے مالدیپ اور سری لنکا کے بعد بھارت کا دورہ بھی کرلیا۔ یہ بہت اہم دورہ تھا۔ جنوبی ایشیا کی اِس ملاقات میں ایک پڑاؤ پاکستان بھی تھا جو ناممکنات کے سمندر میں غرق ہوگیا۔

بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی نے چین کے صدر شی جنپنگ کا بھرپور اور والہانہ خیر مقدم کیا۔ چین جنوبی و جنوب مشرقی ایشیا ہی کی سب سے بڑی قوت نہیں ہے بلکہ اب ایک بڑی عالمی قوت بننے کے مرحلے میں ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ بھارت بھی ابھرتی ہوئی قوت ہے اور اُسے بخوبی اندازہ ہے کہ ایک بڑی قوت بننے کا مرحلہ کیا ہوتا ہے۔ بھارت چاہتا ہے کہ چین سے معاملات میں جو بھی خرابی ہے وہ بروقت دور کرلی جائے تاکہ انتہائی مشرقی و شمال مشرقی سرحد محفوظ ہوجائے۔

چینی صدر کا بھارت میں استقبال شاندار ہی ہونا تھا مگر اِس سونے پر سہاگے کا کردار اُن کے دورۂ پاکستان کے التواء نے ادا کیا۔ اسلام آباد کی صورت حال اور پورے ملک کی غیر یقینی صورت حال نے چینی صدر کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ملک کے اہم ترین دوست کا درجہ رکھنے والے پاکستان کے دورے پر جانے سے

باز رہیں۔ اور اُنھوں نے وہی فیصلہ کیا جو منطقی تھا۔ اسلام آباد میں دھرنوں نے جو صورت حال پیدا کر رکھی ہے اُس کے پیش نظر سفارتی سطح پر بہت کچھ اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ کئی سفارت خانوں سے ویزا کے اجرا کا معمول کا معاملہ بھی کچھ کا کچھ ہوگیا ہے۔ ایسے میں یہ توقع کیونکر کی جاسکتی تھی کہ ایک اُبھرتی ہوئی عالمی قوت کا صدر اسلام آباد میں قدم رکھنے پر آمادہ ہوتا؟ سابق امریکی صدر جارج واکر بش نے بھی اپنے دوسرے عہدِ صدارت کے آخری دنوں میں چند گھنٹوں کے لیے اسلام آباد آکر پاکستان پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ اُن کی آمد پر پورے اسلام آباد کو ''سربمہر'' کردیا گیا تھا۔ ایسے میں یہ توقع کیونکر کی جاسکتی تھی کہ چینی صدر اسلام آباد میں قدم رکھتے جبکہ وفاقی دارالحکومت کی حساس ترین عمارات کے سامنے ہزاروں افراد ایک ماہ سے بھی زائد مدت سے دھرنا دیئے ہوئے ہیں۔

نریندر مودی نے اپنی آبائی ریاست گجرات کے سب سے بڑے شہر احمد آباد میں دریائے سابرمتی کے کنارے چینی صدر کی شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ یہ شاندار ضیافت اِس بات کا اعلان تھی کہ خطے کے دو سب سے بڑے ممالک ایک دوسرے کو اپنانے کی طرف چل پڑے ہیں۔ بھارت کا مفاد کاروبار سے وابستہ ہے۔ بھارتی قیادت چاہتی ہے کہ چین کے سرمایہ کار پانچ برس کی مدت میں زیادہ نہیں تو کم از کم 20 ارب ڈالر بھارت کی اسٹاک مارکیٹ میں لگائیں۔ بھارتی میڈیا اِس

معاملے میں مبالغے کی حدیں پار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ بعض مبصرین نے یقین ظاہر کیا ہے کہ چند ہی برسوں میں بھارتی اسٹاک مارکیٹ میں چینیوں کی سرمایہ کاری 100 ارب ڈالر سے زیادہ ہوجائے گی۔ یہ سب کچھ اِس لیے ناقابل یقین لگتا ہے کہ اِس وقت بھارتی اسٹاک مارکیٹ میں چینیوں کی سرمایہ کاری 40 کروڑ ڈالر سے کچھ زائد ہے۔

چینی صدر شی جنپنگ اور بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی کی مصافحہ کرتی ہوئی جو تصویر علاقائی اور عالمی پریس میں شائع ہوئی ہے وہ پاکستانی سیاست و سفارت کے منہ پر زنّاٹے دار تھپّڑ ہے، دھچکا اور تازیانہ ہے۔ اِس ایک تصویر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور بھارتی قیادت کہاں پہنچ گئی ہے۔ جس صورت حال نے چینی صدر کو پاکستان آنے سے روک دیا اُس کا ذمہ دار خواہ کوئی ہو، جو نقصان ہماری ساکھ کو پہنچنا تھا وہ تو پہنچ ہی گیا۔ اب حقیقت کو بِلّی کی طرح سامنے پاکر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلینے سے کچھ بھی تبدیل نہیں ہوگا بلکہ رہا سہا بھی جاتا رہے گا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ چینی صدر کے دورے کے التواء (یا تنسیخ) کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کئی بار یہ کہا جاچکا ہے کہ دورے کے التواء سے کچھ فرق نہیں پڑے گا، چین کو جو 34 ارب ڈالر لگانے ہیں وہ لگائے گا۔ جب صورت

حال اِتنی غیر یقینی ہو کہ سرمایہ کار ملک کا صدر دورہ بھی نہ کرسکے تو سرمایہ کاری کیوں اور کیونکر کی جاسکے گی؟ ہم نے یہ کیوں فرض کرلیا ہے کہ ہمارے تمام حالات کو چین یکسر نظر انداز کرکے دوستی اور ہم آہنگی کی بانسری بجاتا رہے گا؟

بھارتی قیادت چین کو ہر معاملے میں مکمل فراخ دِلی کے ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ دونوں ممالک کی تجارت پہلے ہی 70 ارب ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔ دونوں کے مفادات ایک دوسرے کے مفادات سے وابستہ ہیں۔ بھارت خام مال فراہم کرنے والا بڑا ملک ہے۔ چین کے لیے بھارت ہر اعتبار سے ایک feasible ملک ہے۔ وہ چاہے گا کہ سرمایہ کاری وہاں کی جائے جہاں سیاسی ہی نہیں، معاشی استحکام بھی ہے۔ بھارت کاروباری ذہن رکھنے والا ملک ہے۔ 80 لاکھ سے زائد بھارتی ہنر مند دنیا بھر میں اعلیٰ درجے کی خدمات فراہم کر رہے ہیں۔ بھارتی نالج ورکرز ہر ملک کے لیے قابل قبول ہیں۔ تربیت یافتہ افرادی قوت کی برآمد کے معاملے میں پاکستان ابھی بہت پیچھے ہے۔ ایک سبب تو غیر یقینی سیاسی حالات ہیں۔ دہشت گردی نے الگ وختا ڈالا ہوا ہے۔ اور پھر ملک میں تعلیم اور تربیت کا ڈھانچا ایسا نہیں کہ عالمی سطح پر جس افرادی قوت کی غیر معمولی طلب ہے وہ بروقت اور مطلوبہ معیارات کے ساتھ فراہم کی جاسکے۔ ایسے میں ہم خطے میں بھی مقابلہ نہیں کرسکتے، عالمی منڈی تو بہت دور کی بات ہے۔

چین ہمارا دوست ملک ہے۔ مگر یہ دوستی محض دوستی نہیں بلکہ مفاد کا رشتہ ہے۔ اگر چین کی جگہ ہم بھی ہوتے تو مفاد ہی کو ہر شے پر فوقیت دیتے۔ یہ سوچنا نری حماقت ہے کہ ہم خرابیوں کی زد میں رہیں گے اور چین ہمیں دوست کا درجہ دیتا رہے گا۔ جب تک ہم چین کے لیے feasible ہیں تب تک ہی وہ ہمیں اپنا بنا کر رکھے گا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ چین نے ہر مشکل گھڑی میں ہمارا ساتھ دیا ہے مگر کسی جواز کے بغیر تو ساتھ نہیں دیا جاتا۔ اور اگر دو ایک مرتبہ ایسا کر بھی دیا تو سلسلہ بہر حال زیادہ دیر تک چلایا نہیں جاسکتا۔ ہمیں بھی ثابت کرنا ہوگا کہ ہم چین کے دوست اور اتحادی ہیں۔ اِس وقت تو صاف پتا چلتا ہے کہ سیاسی قیادت اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان ملک کے دوستوں کے حوالے سے بھی کشیدگی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کی سوچ واضح ہے کہ امریکا اور یورپ کی طرف جھکاؤ رکھا جائے جبکہ سیاسی قیادت بھارت اور چین کی طرف جھکنا چاہتی ہے اور بظاہر دانش کا بھی یہی تقاضا ہے کہ قریب ترین طاقتوں سے معاملات درست رکھے جائیں۔ بھارت اور چین سے بہتر اقتصادی روابط ہمارے لیے زیادہ سودمند اور کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔ مغرب کی منڈیوں تک مکمل رسائی بھی میسر نہیں۔ وہ لوگ ہمیں صرف صارف کی سطح پر رکھنا چاہتے ہیں۔ اب تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

اگر ہم اقتصادیات کے میدان میں اپنا کھونٹا مضبوطی سے گاڑنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ متوازن پالیسیاں اپنائیں اور (علاقائی) زمینی حقائق کو نظر انداز نہ کریں۔ ایسا کرنے کی صورت میں ہم خود کو صرف پریشانیوں سے دوچار کرتے رہیں گے۔ ہمیں ایسے حالات پیدا کرنے سے گریز کرنا ہے جن کے نتیجے میں عالمی لیڈر ہماری زمین پر قدم رکھنے سے گریز کریں اور پھر کوئی تصویر اُبھر کر ہمارا مُنہ چڑائے! نریندر اور شی جنپنگ کا مصافحہ درد مند دل رکھنے والے پاکستانیوں کو ہرگز نہ کھلتا اگر چینی صدر نئی دہلی تک پاکستان کی راہ سے ہو کر گئے ہوتے۔ ہمارا اور چین کا معاملہ تو معانقے کا ہے۔ مگر کیا کیجیے کہ ہم مصافحے کے قابل بھی نہ رہے۔ سیاسی اور سفارتی سطح پر بھرپور کوشش ہونی چاہیے کہ اب کوئی تصویر ہمارا مُنہ نہ چڑائے، دِل نہ دُکھائے۔

...... سمجھوتہ غموں سے کرلو

غم کو گلے لگا کر جینے کا درس دینے والی فلموں کی کمی نہیں۔ اب تو خیر رجحان ہی تبدیل ہوگیا ہے ورنہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب غم کو پوری شدت کے ساتھ سلور اسکرین پر پیش کیا جاتا تھا اور خواتین کی آنکھ سے آنسو نکلتے تھے تو فلم ہٹ ہو پاتی تھی۔ یہی حال رنج و غم کے جذبات سے بھرے ہوئے نغموں کا تھا۔ غم کسی کی زندگی میں نہیں اور کسی نہ کسی الم سے کون آشنا نہیں؟ پچاس سال پُرانے المیہ گیت آج بھی اِسی لیے مقبول ہیں کہ اِن آئینوں میں سامعین کو اپنا آپ دکھائی دیتا ہے۔

1970 کے عشرے کے اوائل میں ریلیز ہونے والی فلم ''سمجھوتہ'' کے تھیم سانگ کا مکھڑا ہے ''سمجھوتہ غموں سے کرلو، زندگی میں غم ہی ملتے ہیں۔''

کہنا آسان ہے اور کرنا بہت مشکل۔ غموں سے سمجھوتہ؟ بات عجیب سی ہے۔ غموں سے سمجھوتہ کرلیا تو اُن سے نجات پانے کی فکر کسے لاحق ہوگی؟ اور کیا واقعی غموں سے سمجھوتہ ممکن ہے؟ یہ سوال غور طلب ہے۔

زندگی انگور کا دانہ ہے۔ تھوڑا کھٹا، تھوڑا میٹھا۔ زندگی اِسی طور گزرتی رہی ہے اور گزرتی رہے گی۔ کسی بھی مشکل گھڑی سے کسی نہ کسی طور جان چھڑانے کی کوشش اِنسان کو مزید مشکلات سے دوچار کرتی ہے۔ ہر طرح کے درد و غم سے نجات کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جان چُھڑانے کے بجائے اُس درد یا غم کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ایسا کرنے سے غم کو سمجھنے اور بہتر انداز سے برتنے میں غیر معمولی مدد ملتی ہے۔

خاکسار نے ''نیچرل اینٹی ڈپریسنٹ'' کے عنوان سے ایک کالم سپرد قلم کیا تھا جو روزنامہ دنیا میں 17 مئی 2014 کو شائع ہوا تھا۔ یہ کالم عثمان کے بارے میں تھا جس کی پہلی سالگرہ یکم مئی 2014 کو تھی۔ تقریب 2 مئی کو منعقد کی گئی۔ عثمان ہمارے فلیٹ کے عین نیچے والے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جب وہ چار ماہ کا تھا تب سے ہماری بیٹی صباحت (ثوبیہ) اُسے لے آیا کرتی تھی۔ عثمان نے ہمارے ہی گھر میں بیٹھنا، کھڑا ہونا، چلنا اور دوڑنا سیکھا۔ جب اُس نے ہمارے گھر میں آنا شروع کیا تھا تب خود آسانی سے کروٹ بھی نہیں بدل پاتا تھا۔ اور اب وہ ہمیں سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ ہمارا یہ حال ہے کہ عثمان کو دیکھے بغیر آنکھوں کو آرام نہیں ملتا۔ وہ روزانہ دن کے بارہ بجے اُٹھ کر ہمارے ہاں آجاتا ہے اور پھر رات دس بجے تک اُس کا آنا اور جانا لگا رہتا ہے۔

خاکسار نے اُس کالم میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہم نے جہاں بھی رہائش اختیار کی ہے، اِسی طور اڑوس پڑوس کے بچوں کو اپنایا ہے۔ ایسا کرنے سے زندگی میں فرحت و شادمانی رہتی ہے، ذہنی توازن برقرار رہتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈپریشن قریب بھی نہیں پھٹکتا۔

یہاں تک تو سب ٹھیک ہے مگر کیا کیجیے کہ عثمان کی اِس خوشیوں بھری زندگی کو کسی حاسِد کی نظر لگ گئی۔ 17 ستمبر کو دن کے تین بجے یہ جانکاہ خبر ملی کہ عثمان کے والد حکیم محمد حفیظ نُوری کو کسی نے گولی مار دی ہے۔ اور ابھی اِس خبر کے جھٹکے کو برداشت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم ہسپتال جانے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ یہ اندوہ ناک خبر ملی !کہ عثمان کے سَر سے والد کا سایا اُٹھ چکا ہے

حفیظ بھائی کو ہمارے فلیٹ کے نیچے والے فلیٹ میں منتقل ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال گزرا تھا۔ اِس دوران عثمان سے ہمارے ربط نے حفیظ بھائی کو بھی ہمارا بنادیا تھا۔ ڈیڑھ سال کی مدت میں اُن سے خاکسار کی جتنی بھی گفتگو ہوئی اُس سے کہیں بھی یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ اُن کی زندگی میں کوئی اُلجھن ہے، کوئی غم ہے۔ وہ ہمیشہ مسکرا کر ملے اور اپنی دواساز فیکٹری آنے

کی دعوت دی جو ہماری اپارٹمنٹ بلڈنگ سے ڈھائی کلومیٹر دور تھی۔ مگر یہ اتفاق ہے
کہ خواہش ہے باوجود خاکسار اُن کی فیکٹری نہ جاسکا۔ کسی زمانے میں وہ حکیم سعید شہید
کے بھی قریب تھے۔ وہ حکیم صاحب کی گاڑی میں اُن کے مرکزی مطب پہنچا کرتے تھے۔
جس دن حکیم سعید کو شہید کیا گیا اُس دن حفیظ بھائی اُن کی گاڑی میں نہیں تھے۔ تفتیش
کے دوران اُنہیں بھی کئی بار طلب کیا گیا اور وضاحت چاہی گئی کہ اُس دن وہ گاڑی میں
کیوں نہیں تھے۔ حفیظ بھائی کے والد آئی سی یو میں تھے۔ کئی افراد سے تصدیق کے بعد
!حفیظ بھائی کی جاں بخشی ہو سکی

حفیظ بھائی متموّل تھے اِس لیے عثمان کے بہتر مستقبل کے بارے میں کوئی شک یا شبہ رکھنا
ممکن نہ تھا۔ زندگی ایسی پُرسکون گزر رہی تھی کہ دور دور تک کوئی خطرہ تو درکنار،
خدشہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب سے عثمان نے چلنا اور دوڑنا سیکھا ہے، ہمیں
پاگل کر رکھا ہے۔ ہماری زندگی میں اُس کا اتنا عمل دخل ہے کہ روزنامہ دنیا کراچی کے
دفتر کے ساتھی بھی ہمارے اور عثمان کے تعلق کو جانتے ہیں۔ خاکسار نے عثمان کی
شرارتوں کے بارے میں دفتر کے لوگوں کو اِس طرح بتایا ہے بہت سے تو سمجھتے ہیں کہ
!وہ ہمارا ہی بیٹا ہے

حفیظ بھائی ایک اندھی گولی کا نشانہ کیا ہے۔ ہمارے لیے تو دِل پر قابو پانا عذاب ہو گیا۔ 17 ستمبر کی شب خاکسار کے لیے مصیبت جیسی ہو گئی۔ پوری رات عثمان کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا اور مُجھ غریب کے ہونٹوں پر ''ہائے میرا بچہ'' کی گردان رہی۔

جب کبھی ہم یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ اب کوئی انہونی نہیں ہو گی اور سب کچھ بحسن و خوبی چلتا رہے گا، اچانک کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جاتا ہے جو سب کچھ اُلٹ پلٹ دیتا ہے۔ ہمیں یہ سب کچھ بہت عجیب محسوس ہو رہا ہوتا ہے کیونکہ اِس میں بہت کچھ ہماری توقعات کے مطابق نہیں ہوتا۔ اللہ ہماری بہتری اور بھلائی ہم سے زیادہ جانتا ہے۔ ہماری زندگی میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اُس کی پشت پر اللہ کی مشیّت ہی کارفرما ہوتی ہے۔ جب کچھ بھی سمجھ میں نہ آ رہا ہو (اور ایسا تو اکثر ہوتا ہے) تب ہمارے لیے صرف یہی آپشن رہ جاتا ہے کہ اللہ کی مرضی کے آگے سَرِ تسلیم خم کر دیں، راضی بہ رضا ہو جائیں۔ مولانا محمد علی جوہؔر نے خوب کہا ہے ؎

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دُنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنّت کی فضا دیکھ

قدم قدم پر ملنے والی مشکلات ہی تو ہمیں بتاتی ہیں کہ زندگی وہ نہیں جو

ہمیں دکھائی دیتی ہے مگر دراصل اُن واقعات پر مبنی ہے جو اچانک رونما ہوتے ہیں اور ہمارے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ جب سبھی کچھ پلٹ جاتا ہے تب ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ارادے اور منصوبے کتنے کمزور تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قولِ برحق ہے کہ میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اپنے رب کو پہچانا۔

عثمان اور دوسرے بہت سے بچوں سے ہمارا محبت بھرا تعلق ہماری زندگی کا سب سے بڑا سرمایا ہے۔ بہت سی پریشانیوں کی دھوپ میں یہی تو ایک سایا ہے۔ اِس دور میں کہ جب لوگ خُون کے رشتوں کو بھول بھال جاتے ہیں، یہ اللہ کا کرم نہیں تو کیا ہے کہ ہمیں اللہ نے غیروں کے بچوں سے بھی پیار کرنے کی توفیق عطا کر رکھی ہے اور ہم اُنہیں اپنی زندگی کا حصہ بنائے رہتے ہیں۔ اچھی زندگی کے لیے اور کیا چاہیے؟

غموں سے سمجھوتہ کرنے میں ہرج نہیں۔ مگر ہاں، یہ اُصولوں پر سمجھوتہ کرنے سے جیسا معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہر غم کو ایک ٹھوس حقیقت کی حیثیت سے قبول کرنے کی صورت میں اُس کے تدارک کی سبیل دکھائی دیتی ہے۔ ہماری خوشیوں پر بہت سے غم پردوں کی صورت پڑے رہتے ہیں۔ اِن پردوں کو محض قبول نہیں کرنا بلکہ ہٹانا بھی ہے۔ غم کے پردے ہٹیں گے تب ہی تو خوشیوں کا چہرہ دکھائی دے

گے

”رخصتی“ سے آگے کا معاملہ

دوسرے بہت سے معاملات کی طرح ہم جمہوریت کے حوالے سے بھی تذبذب کے مرحلے میں ہیں۔ اب تک یہ طے نہیں ہو پایا کہ ہمیں جمہوریت درکار بھی ہے یا نہیں۔ اگر درکار نہیں تو پھر جمہوریت کے نام پر یہ ہنگامہ کیوں برپا ہے؟ بس اب جمہوریت کا نام نہاد بوریا بستر گول کر دیجیے۔ اور اگر جمہوریت چاہیے تو پھر طے کر لیجیے کہ کتنی اور کیسی ہو۔ کتنی اور کیسی جمہوریت کا طے کرنا اِس لیے ناگزیر ہے کہ اب تک ہمیں جمہوریت کی جتنی doses دی گئی ہیں وہ کبھی زیادہ ہو جاتی ہیں اور کبھی کم رہ جاتی ہیں!

ہمارے لیے تو سیاست و ریاست کا معاملہ بُوفے جیسا ہے۔ کبھی ہمارے سامنے آمریت کی ڈِشیں دھری ہوتی ہیں اور کبھی آمرانہ جمہوریت یا جمہوری آمریت کی۔ بُوفے کا بنیادی اُصول یہ ہے کہ ڈِشیں اِتنی دَھری جائیں یعنی ورائٹی اِتنی ہو کہ اِنسان کا دماغ چکرا کر رہ جائے اور کچھ بھی نہ کھا پائے۔ گویا ع

سب مُرادیں پاگئے، ہم غور فرماتے رہے

سیاسی اور انتظامی بُوفے میں بھی یہی ہوتا ہے۔ بہت کچھ سمجھ میں تو آ رہا

ہوتا ہے مگر اِس کے باوجود سمجھ میں نہیں بھی آ رہا ہوتا۔ اِنسان تذبذب ہی میں مبتلا رہتا ہے، انتخاب کے مرحلے میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ ورائٹی دیکھ کر دل قابو میں نہیں رہتا یعنی کچھ زیادہ ہی کام کرنے لگتا ہے اور دماغ کام کرنے سے انکار کردیتا ہے! لوگ ابھی یہ سوچ ہی رہے ہوتے ہیں کہ کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں ..... اور ''سمے سماپتی کی گھوشنا'' ہوجاتی ہے!

جمہوریت سے ہمارا وہی تعلق ہے جو صارف اور اشتہاری مہم کا ہوا کرتا ہے۔ دکھایا جاتا ہے کچھ اور دیا جاتا ہے کچھ۔ اگر اشتہار اچھا ہو تو ذہن کو گرفت میں لے لیتا ہے اور اِس کے بعد صارف سوچنے کے مرحلے سے گزرنا چھوڑ دیتا ہے۔ ایک مشہور اشتہاری جُملہ ہے کہ کھلی آنکھوں سے دیکھا، آنکھ بند کرکے خریدا۔ اِس اشتہار میں ایک اور جُملہ ''ہم نے مال بدل دیا'' بھی ہونا چاہیے تھا! ہمارا اور جمہوریت کا معاملہ یہی تو ہے۔ جب ہم نے کوئی جمہوری پیکیج خریدا ہے، دھوکا کھایا ہے۔ ہم نے سوچا کچھ، دکھایا گیا کچھ اور نکلا ہے کچھ اور۔ جو کچھ ہمیں جمہوریت کے نام پر ملتا ہے اُسے پاکر ہم حیران و پریشان رہ جاتے ہیں۔ ؎

کھلی جو آنکھ تو وہ تھا، نہ وہ زمانہ تھا
دہکتی آگ تھی، تنہائی تھی، فسانہ تھا

کب ایسا نہیں ہوا کہ باتوں کے جادوگروں نے پُرجوش اور دل لُبھانے والی تقریروں کے ذریعے سماں باندھا، سبز باغ دکھائے۔ اور سُننے والے خوش ہولیے۔ سیاسی ''بول بازوں'' کی باتیں ایسی چِکنی چُپڑی ہوتی ہیں کہ سُننے والے آن کی آن میں خوش فہمیوں کے طلسمات کی سَیر کرنے لگتے ہیں! اور پھر وہ ''چشم تصور کی آنکھ'' سے اُس دنیا میں گھومنے لگتے ہیں جو اُن کے ذہن کی دُنیا میں پائی جاتی ہے۔ یہی کیفیت ذرا طول پکڑتی ہے تو لوگ مست و سرشار ہوکر پولنگ بُوتھ تک پہنچتے ہیں اور خوشی خوشی قطار بند ہوکر ووٹ کاسٹ کرتے ہیں۔ ووٹ کاسٹ کرتے ہی جاگتی آنکھوں میں پھر خواب سمانے لگتے ہیں۔ یہ خواہش بہت سے پَر لگا کر اُڑنے لگتی ہے کہ ببول کے درخت پر گلاب اُگ آئیں۔ یہ کچھ دیر کی بات ہوتی ہے۔ خواہشوں کو مٹی میں ملتے کیا دیر لگتی ہے۔ پھر جب آنکھ کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

جب ہر بار ایسا ہی ہوا ہے تو اِس بار کچھ نیا کیوں ہوتا؟ گزشتہ حکومتوں کے جمع کردہ مسائل نے نئی حکومت کے لیے کچھ خاص کرنے کی گنجائش چھوڑی نہیں۔ اور آنے والی حکومت بھی خود کو مشکلات ہی میں گِھرا ہوا پائے گی۔ ایسے میں کسی بھی جمہوری آئیڈیل کے حقیقت میں تبدیل ہونے کا خواب کیونکر دیکھا جاسکتا ہے؟ مسلم لیگ ن کوئی جادوگر نہیں کہ سارے مسائل آن کی آن میں حل

کرکے دودھ اور شہد کی نہریں بہادے گی۔ باتوں کا مُلمّع ایک ہی رگڑ سے اُتر جایا کرتا ہے۔ اوراِس بار تو رگڑ لگنے کے آثار نمایاں ہوتے ہی مُلمّع اُترنے لگا ہے۔ جو عمارت محض باتوں کی بُنیاد پر کھڑی کی جائے گی وہ زلزلہ تو کیا، تیز ہوا کا جھٹکا بھی برداشت نہیں کر پائے گی۔

اب کے اگر کچھ نیا ہوا ہے تو بس یہ کہ ابتدائی مرحلے ہی میں مخالفت پر کمر کَس لی گئی ہے۔ نام نہاد جمہوری حکومت نے ابھی بوریا بستر کھولا بھی نہ تھا کہ یار لوگ اُس کا بوریا بستر گول کرنے پر تُل گئے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ نئی یعنی ن لیگی حکومت بھی برائے نام ہی جمہوری ہے اور بہت کچھ پہلے جیسا ہی ہے مگر اُسے رخصت کرنے کے لیے پورے نظام اور ریاستی علمداری ہی کو داؤ پر لگادیا گیا ہے۔

بیماری کو ختم کرنے کا اُصول یہ ہے کہ دوا کے ذریعے اُسے مرحلہ وار کمزور کیا جائے، غیر موثر بنایا جائے۔ دوائیں پلا کر بیماری کو مضبوط کرنا دانش کے منافی ہے۔ مگر ہم ایسا ہی کر رہے ہیں تاکہ دُنیا کو بتا سکیں کہ چھوٹی موٹی بیماریوں سے کیا ہوتا ہے، ہم تو بڑی بیماریوں سے لڑنے کی سکت رکھتے ہیں! اِس وقت بھی کچھ ایسا ہی کیا جارہا ہے۔ چند چھوٹی خرابیوں کو بہت بڑی خرابی میں تبدیل کیا جارہا ہے تاکہ دُنیا والوں پر ہم اپنی "سکت" ثابت کرسکیں!

ایک نئی بات یہ بھی ہے کہ اِس بار حکومت کی بساط لپیٹنے کی کوشش محض وہ نہیں جو دکھائی دے رہی ہے۔ بات کچھ اور ہے۔ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ معاملہ حکومت کی رخصتی پر ختم نہیں ہوگا۔ ارادے اِس سے بہت آگے کی کسی منزل تک پہنچنے کے ہیں۔ ذرا سا غور کرنے پر اندازہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں کی لڑائی ہماری سرزمین پر لڑی جارہی ہے۔ ہتھیاروں کی لڑائی اب سیاسی مناقشوں تک آ پہنچی ہے۔

امریکا اور اس کے مغربی اتحادی افغانستان سے نکلنے ہی والے ہیں۔ مگر کیا وہ خطے سے بھی نکلنے والے ہیں؟ لگتا تو نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عالمی استبداد کا پنچھی اب ہماری ڈال پر بیٹھنے کی تیاری کر رہا ہے؟ بلوچستان کی سنگلاخ سرزمین پر پنجے گاڑ کر پورے خطے کو کنٹرول کرنے کی تیاریاں تو نہیں کی جارہیں؟ مغرب کی استبدادی قوتوں کو اپنی مرضی کا پاکستان اُسی وقت میسر ہوتا ہے جب یہاں منتخب حکومت اور پارلیمنٹ وغیرہ کا ٹنٹا نہ ہو۔ نائن الیون کی ساعتوں میں امریکا اور یورپ نے پاکستان سے مرضی کے فیصلے اس لیے پائے کہ منتخب حکومت پہلے ہی رخصت کی جاچکی تھی۔ پاکستان میں منتخب حکومت کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیج کیا جانے والا ''دھرنائی'' ڈراما کہیں بڑی طاقتوں کی خواہش کا احترام تو نہیں؟ ایک طرف امریکا ہے جو پاکستان میں کھلا میدان

چاہتا ہے۔ اور دوسری طرف سعودی عرب اور ایران کی باہمی مخاصمت ہے۔ کہیں اُن دونوں کی سرد جنگ بھی نون لیگ کی حکومت کے گلے کی ہڈی نہیں بن رہی کیونکہ میاں صاحب واضح طور پر سعودی کیمپ میں ہیں۔ سعودی عرب سے ڈیڑھ ارب ڈالر کا تحفہ ملنے پر بھی اُن کا ناطقہ بند کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

جمہوری اداروں اور جمہوری کلچر کے فروغ سے کہیں بڑھ کر مملکت کی فکر کی جانی چاہیے۔ کسی بڑے گیم پلان کے لیے جو کچھ کرنا ہے اُس کے لیے جمہوری کلچر کو بدنام کرنے کی کوشش ترک کی جانی چاہیے۔ ملک کو تبدیل تو ہونا ہی ہے۔ مگر اِس تبدیلی کی کوکھ سے ایسی خرابی برآمد نہیں ہونی چاہیے جو پچھلی تمام خرابیوں اور خامیوں کو گہنادے۔

عمران خان اور طاہر القادری نے جو کچھ کیا ہے وہ عوام کے دل کی آواز ہے۔ سیاسی اور معاشرتی سطح پر جمود توڑنے اور عوام کو متحرک کرنے میں اُن کا حصہ بڑا ہے۔ لوگ اصلاحات اور تبدیلی چاہتے ہیں۔ سب کی خواہش ہے کہ کرپشن ختم ہو مگر اِس تحریک کے حتمی نتائج کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے۔ خان صاحب کو باٹم لائن پر ضرور نظر رکھنی چاہیے۔ وہ اپنے پورے سیاسی کیریئر کا سَر موجودہ ''گو نواز گو'' کی اوکھلی میں دے بیٹھے ہیں۔ پورے میچ کی کارکردگی کہیں آخری اوور میں داؤ پر نہ لگ جائے۔ ع

-کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے

...... میٹر گھوم چکا ہے، مگر

ہمارے ہاں بجلی نے روٹھی ہوئی محبوبہ کا مزاج پایا ہے۔ بات بات پر ٹھنکنا اور مُنہ پُھلا کر چُھپ جانا ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ لوگ اِس کی دید کو ترستے رہتے ہیں اور بجلی صاحبہ ہیں کہ سات پردوں سے نکلنے کا نام نہیں لیتیں۔ مگر خیر، یہ لیلیٰ ایسی سنگ دِل بھی نہیں۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ لیلیٰ کا ایک کُتّا بھی ہوا کرتا تھا اور مجنوں اُس کُتّے کو بھی چاہتا تھا۔ بجلی نے بھی شاید یہ سوچ رکھا ہے کہ وہ ملے نہ ملے، اگر اُس کے دیوانوں کو اُس کے کُتّے مل جائیں تو وہ اُسی پر اکتفا کرلیں گے۔ یہی سوچ کر وہ اپنے کُتّوں یعنی بِلوں کو باقاعدگی سے بھیجتی رہتی ہے تاکہ اُس کے دیوانوں کو کچھ تو آس رہے اور وہ یہی سوچ کر خوش رہیں کہ بِل آرہے ہیں تو کبھی نہ کبھی بجلی بھی آہی جائے گی۔ مگر لیلائے بجلی کے دیوانے محض اُس کے بِل سے بہلنے والے نہیں۔ وہ اِس لیلیٰ کے مزاج کو سمجھ چکے ہیں۔

گھر میں لگے بجلی کے میٹر کو مسلسل رُکی ہوئی حالت میں دیکھ کر عام آدمی کے دماغ کا میٹر گھوم چکا ہے۔ کم از کم میڈیا والے تو یہی دعویٰ کر رہے ہیں۔ بجلی کا میٹر گھومے۔ یہ میٹر گھومتا ہے تو سب کچھ رواں ہوجاتا ہے۔ اور جب

یہ بند ہو تو زندگی تھم سی جاتی ہے۔ مگر شاید حکومت نے طے کر رکھا ہے کہ چلنے کے معاملے میں بجلی کے میٹر کو استثنیٰ دیئے رہنا ہے۔ ایک بس یہ میٹر بند ہے اور باقی تو سارے ہی میٹر ہوش رُبا رفتار سے گھوم رہے ہیں۔ سب سے تیز تو کرپشن اور اقرباء پروری کا میٹر گھوم رہا ہے۔ اِس میٹر کی رفتار دیکھ کر قوم کا سَر کچھ یُوں گھوم رہا ہے کہ وہ چکرا کر گرتی ہے، اُٹھتی ہے اور پھر گر جاتی ہے۔

بجلی کے بحران نے قوم پر ایسا وختا ڈالا ہوا ہے کہ کِھسکنے کا نام نہیں لے رہا۔ جھٹکا اب بجلی میں کم اور اُس کے بِل میں زیادہ ہے۔ جس بجلی کو خرچ کرنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی ہو اُس بجلی کے بِل جب بڑھ بڑھ کر گلے ملتے ہیں تو شہری بلبلا اُٹھتے ہیں۔ پہلے تو وہ روہانسے ہو کر بجلی کے بِلوں کو تکتے ہیں اور پھر شدید اشتعال کی حالت میں اپنی ہی راہ کی دیوار بن جاتے ہیں یعنی سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔

آج کل بجلی کے تاروں کے سِوا ہر چیز میں کرنٹ ہے۔ سب سے زیادہ کرنٹ پایا جاتا ہے کرنٹ افیئرز میں۔ اور یہ خاصا اَن فیئر اور خُرانٹ کرنٹ ہے کہ بِلاضرورت بھی جھٹکے دیتا ہے۔ اور لطف بالائے لطف یہ کہ لوگ بھی یہ جھٹکے بخوشی برداشت کرتے رہتے ہیں۔

قومی سیاست کی قدآور شخصیات ہوں یا سیاسی کارکن، سبھی چارجڈ ہیں۔ جو بجلی کہیں دکھائی نہیں دیتی وہ سیاست سے جُڑے ہوئے ہر شخص میں سما گئی ہے۔ سب کی کوشش ہے کہ اپنی گفتگو اور خاموشی دونوں سے قوم کو خوب جھٹکے دیتے جائیں۔ اور قوم بھی ہر گھڑی تیار، کامران ہے۔ ع

جو آئے آئے کہ ہم دِل کشادہ رکھتے ہیں

سیاست کے لاشے میں کسی نہ کسی طرح کچھ رُوح پُھونکی گئی ہے تو عوام میں بھی کچھ جان آئی ہے۔ جہاں کل تک سَنّاٹا تھا وہاں اب ہنگامہ ہے۔ سیاست کی تیزا تیزی کا نشا ایسا چڑھا ہے کہ اُتارے نہیں اُتر رہا۔ اُترے کیسے؟ بیسیوں کروڑ روپے خرچ ہوئے ہیں عوام کو مخمور کرنے میں! اب وفورِ خمار میں عوام کی حالت تو یہ ہے کہ ۔

اپنی ہی وفا یاد نہ اوروں کی جفا یاد
!اب کچھ بھی نہیں ہم کو ''سیاست'' کے سِوا یاد

مملکتِ خداداد میں اب ایسا کیا ہے جو ٹھکانے پر ہے؟ کون سا معاملہ ہے جو ذہن کی حدود میں سماتا ہے یعنی سمجھ میں آتا ہے؟ زندگی اُسی طرح گزر رہی ہے یا گزاری جارہی ہے جس طرح کنڈا لگاکر بجلی چُرائی جاتی ہے۔ ہر طرح کی اُصول

پسندی، رواداری اور وضع داری سے زندگی کا کنکشن کٹ گیا ہے۔ ایسے میں اُن تمام پاکستانیوں کے دماغ کا میٹر کیوں نہ گھومے گا جو تسلیم شدہ اُصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے پر یقین رکھتے ہیں؟

مگر کیا واقعی عوام کا میٹر گھوم چکا ہے؟ اگر واقعی ایسا ہے تو اِسے انقلاب سمجھیے۔ مگر کیوں؟ انقلاب تو خون خرابے کے بغیر درشن نہیں دیتا۔ آپ کہیں گے خون خرابہ ہو تو رہا ہے۔ ٹھیک ہے خون خرابہ ہو رہا ہے مگر یہ ساری ہنگامہ آرائی انقلاب ہر گز نہیں اور دہشت گردی یقیناً ہے۔ دہشت گردی کو ہم انقلاب کے کھاتے میں کیسے ڈال دیں؟ ایسا کرنا تو اُصولوں کے منافی اور بے اُصولی پر مبنی ہوگا۔ آپ سوچیں گے اب کیسے اُصول اور کہاں کے اُصول؟ مگر جناب، بے اُصولی کی بنیاد پر آنے والی تبدیلی کو انقلاب کیوں کہیے؟ انقلاب تو نام ہی اُصولی یعنی اُصولوں پر مبنی تبدیلیوں کا ہے۔

عوام کے دماغ کا میٹر گھوم ضرور چکا ہے مگر دھوکا مت کھائیے۔ یہ ''از خود نوٹس'' کے تحت نہیں گھوما بلکہ اِسے گھمایا گیا ہے۔ اُصولوں کی لڑائی کے نام پر عوام کو قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔ لڑائی کل بھی بڑوں کی تھی اور آج بھی بڑوں ہی کی ہے۔ اِس آگ کا ایندھن بننے پر بھی وہ بہت خوش ہیں جن کا اِس لڑائی سے کوئی بنیادی تعلق نہیں۔ میڈیا کو اِس لڑائی کے اصل میدان

میں تبدیل کیا گیا ہے۔ اِس میدان میں سب اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار کمالات کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ میڈیا نے صرف میدان کا نہیں، ہتھیار کا بھی کردار ادا کیا ہے۔ اِس بار میڈیا والوں نے بھی تقسیم ہو کر ''اُدھر تم، اِدھر ہم'' والی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

عوام کا میٹر گھوما تو ہے مگر خاطر خواہ حد تک نہیں۔ ابھی بہت کچھ ہے جو سلامت ہے جبکہ اُسے سلامت رہنا نہیں چاہیے۔ موروثی سیاست کو ختم کرنے کے دعوے کئے جارہے ہیں مگر یہ پہاڑ اپنی جگہ پر ہے۔ جو اِس پہاڑ کو ہٹانے کا اعلان کر بیٹھے ہیں وہ اِسے دیکھ دیکھ کر ہانپ رہے ہیں! اُصولوں کی جنگ کے نام پر نُورا کشتی ہو رہی ہے۔ سب شکار پر نکلے ہوئے ہیں۔ ہانکا لگا کر عوام کو ہر طرف سے گھیرا جارہا ہے۔ شدید بے بسی میں اُبھرنے والی اُن کی چیخ پکار کو ''صدائے انقلاب'' قرار دے کر زخموں پر مزید نمک چھڑکا جارہا ہے۔

احتجاج کے نام پر عوام کو سڑکوں پر لایا تو جاچکا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اِس بار جن کو بوتل سے نکالنے کے بعد یار لوگ بھول بھال گئے ہیں کہ بوتل کہاں رکھ چھوڑی ہے! اننگز ذرا لمبی ہو گئی ہے۔ جو میدان میں ہیں اُنہیں بھی کچھ اندازہ نہیں کہ کب کس طرح سے کھیلنا ہے۔ تماشائی بھی یہ دیکھنے اور جاننے

کو بے تاب ہیں کہ یہ انگز ختم کیسے ہوگی۔ عوام کو چارج کرنے والے اب کے کچھ ایسی باتیں کرگئے ہیں کہ خود اُن کے لیے بھی بوریا بستر لپیٹنا محال سا ہوگیا ہے۔ ساحرؔ نے کہا تھا ؂

وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اُسے اِک خوبصورت موڑ دیکر چھوڑنا اچھا

یاروں نے احتجاج کے افسانے کو ایسا آغاز دیا ہے کہ اب انجام دکھائی تو کیا، سُجھائی بھی نہیں دے رہا۔ دھرنوں کے شُرکاء ایسے مست و بیخود ہیں کہ اُنہیں اِس افسانے کے آغاز سے غرض ہے نہ انجام سے۔ اُن کے لیے تو یہی کافی ہے کہ جذبات کے اظہار کا رنگا رنگ اور سُریلا طریقہ وضع کیا گیا ہے۔ سبھی چاہتے ہیں کہ ع

بڑھتی رہے یہ روشنی، چلتا رہے یہ کارواں

کرپشن، اقربا پروری، نا اہلی، فرض ناشناسی، نا انصافی، بے حِسی، بے دِلی اور دوسری بہت سی قباحتوں کے میٹر دن رات گھوم رہے ہیں۔ اِن کے مقابل عوام کے دماغ کا میٹر بھی گھوم رہا ہے مگر معاملہ صرف اشتعال تک محدود ہے۔ عقلِ سلیم، اولوالعزمی اور عمل پسندی کا میٹر بھی تو گھومنا چاہیے۔ ایک بس دماغ کا میٹر گھومنے اور اشتعال کی کیفیت کے پیدا ہوجانے سے کیا ہوگا؟ یہ تو

ایسا ہی معاملہ ہے جیسے کسی گڑھے میں پھنسا ہوا گاڑی کا پہیہ گھومتا رہے۔ احتجاج کیسا ہی ولولہ انگیز اور دِلکش ہو، اُس سے کہیں آگے جا کر عوام کو دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو بدلنا بھی تو ہے۔ ایسا ہوگا تب ہی تو عمل پسندی کا میٹر گھومے گا۔ اور معاملات کے بے نتیجہ رہنے کی سُوئی اٹکے گی۔

☆☆☆

احترام جانوروں کیلئے ہے

بہار آتی ہے تو کلیاں چٹک کر پھول بنتی ہیں۔ ہر طرف رنگ بکھر جاتے ہیں، خوشبو پھیل جاتی ہے۔ ماحول معطر ہو جاتا ہے۔ عیدالاضحیٰ کی آمد پر بھی قربانی کے جانوروں کی ریل پیل سے شہر کی ہر گلی "گل و گلزار" ہو جاتی ہے، ہر طرف "خوشبو" بکھر جاتی ہے۔

ہر سال جب عیدالاضحیٰ آتی ہے تو ہم قربانی کے جانوروں کو دیکھ کر اُداس ہو جاتے ہیں۔ آپ عُجلت میں ہماری اُداسی سے متعلق کوئی غلط اندازہ نہ لگائیں۔ ہماری اُداسی یہ سوچ کر نہیں ہوتی کہ جانوروں کے حلق پر چُھری پھرے گی۔ یہ کون سی نئی بات ہے، یہ تو ہم جیسے شادی شُدہ مَردوں کا مشترکہ مُقدر ہے! مویشی سال بھر ایویں ای جان سے جاتے رہتے ہیں۔ دو تین دن براہِ راست اللہ کی راہ میں جان دینے سے اُن کے درجات کچھ بلند ہی ہو جاتے ہیں۔ اب آپ ہی سوچیے کہ کسی کے درجات کو بلند ہوتے دیکھ کر ہم کیوں اُداس ہونے لگے۔

جب بھی کوئی قربانی کا جانور خریدنے کے لیے ہمیں مویشی منڈی چلنے کی دعوت دیتا ہے، ہم بہت احترام سے انکار کر دیتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید

inner circle ہمیں قربانی کے جانوروں کے نزدیک جانا پسند نہیں، یعنی ہم اُن کے میں پائی جانے والی ’’خوشبو‘‘ سے ناک کا دامن بچاتے ہیں۔ جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنا احترام ہم انسانوں کا کرتے ہیں اُس سے کچھ زیادہ احترام جانوروں کا اور بالخصوص قربانی کے جانوروں کا کرتے ہیں۔ اِس میں کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ ہم نے بہت سے اِنسانوں کو کسی کام کا نہیں پایا۔ اور اگر کسر نفسی سے کام نہ لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ ہم نے بیشتر اِنسانوں کو بے مصرف ہی پایا ہے۔ مگر جانوروں کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ہر جانور کو ہم نے اُس کے حصے کا کام کرتے دیکھا ہے۔ وہ ماحول کو کچھ نہ کچھ فیض پہنچا ہی دیتا ہے۔ ایک انسان ہی ایسی مخلوق ہے کہ بے فیض پہنچائے بھی زندہ رہ لیتی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ایسی حالت میں زیادہ مَسرّت سے ہمکنار رہتی ہے!

خیر، مصرف و توقیر کی یہ بحث پھر کبھی سہی۔ بات ہو رہی ہے قربانی کے جانوروں کی۔ ہم عیدالاضحٰی پر لگنے والی مویشی منڈیوں میں جانے سے اِس لیے گریز کرتے ہیں کہ وہاں جانوروں سے آنکھ ملاتے شرم آتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ چار ٹانگوں والے مویشیوں کی وقعت اور توقیر دیکھ کر اپنی بے توقیری کا احساس مزید شِدّت اختیار کرلیتا ہے۔ اُن کے دام سُن کر جی چاہتا ہے کہیں ڈوب مَریں مگر کیا کریں کہ اب ڈوب مَرنے جتنا پانی بھی آسانی سے میسر نہیں!

آپ سوچیں گے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس ملک میں سیلاب آیا ہوا ہو وہاں ذرا سا پانی میسر نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ ڈبونے والا پانی تو بہت ہے، وہ پانی کمیاب ہے جس میں ڈوب مَرا جائے!

جب ہم قربانی کے جانوروں کو لاکھوں میں فروخت ہوتا دیکھتے ہیں تو اپنے گریبان میں جھانکنا ہی پڑتا ہے۔ اور ہم نے مویشی منڈی میں کھڑے ہو کر جب بھی اپنے گریبان میں جھانکا ہے، اپنی حقیقت اور حیثیت پر شرمندہ ہی ہوئے ہیں۔ قربانی کے جانوروں کے مقابل ہم خود کو اِنسانوں کے نمائندے کی حیثیت سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ جانور تو دس دس پندرہ لاکھ میں فروخت ہوتے ہیں اور اِنسانوں کی بے توقیری یہ ہے کہ حادثے میں مر جایئے تو حکومت فی کس دو لاکھ روپے کا اعلان کرکے جان چُھڑا لیتی ہے! ذہن میں یہ خیال اُبھرتا ہے کہ یہ بھی غنیمت ہے ورنہ اِنسان نے خود کو مکمل بے توقیر کرنے میں اب کیا کسر چھوڑی ہے!

کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اللہ نے جانور قربان کرنے کی رسم اِنسانوں کو آئینہ دکھانے کی خاطر رکھی ہے۔ یعنی ہر سال ہم مویشی منڈی جائیں، قربانی کے جانوروں کی قیمت دریافت کریں اور اُن فلک بوس قیمتوں کے آئینے میں اپنی حیثیت کا جائزہ لے کر شرمسار ہوں۔ اگر ضمیر مَر نہ گیا ہو

تو اِنسان قربانی کے جانوروں کے قیمت سُن کر سوچ ضرور سکتا ہے کہ میں بھی کچھ ایسا کروں کہ لوگ زیادہ قیمت دیں، احترام کی نظر سے دیکھیں۔ یعنی قربانی کے جانوروں کی بھی کر سکتی ہیں۔ شخصی ارتقاء کے ماہرین motivate اور inspire قیمتیں ہمیں چاہیں تو ایک نئے موضوع پر طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔ موضوع ہے قربانی کے جانوروں کی قیمتیں اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل!

مرزا تنقید بیگ کے سامنے جب ہم قربانی کے جانوروں کی قیمت کی بات کرتے ہیں تو وہ بھی اپنا سا مُنہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ ہم اُن کی مجبوری سمجھتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے گھر میں مرزا کی حیثیت بُوڑھی مریل گائے کی سی ہو گئی ہے جو کسی کو دیتی کچھ نہیں مگر زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھانے کو ضرور مانگتی ہے!

جب گلی کے بچے قربانی کے جانوروں کو سیر کرانے نکلتے ہیں تب مرزا کے دل پر قیامت سی گزرنے لگتی ہے کیونکہ بھابی آنکھوں ہی آنکھوں میں اُنہیں جتانے لگتی ہیں کہ آپ سے اچھے تو قربانی کے جانور ہیں جو لاکھوں میں بِکتے ہیں اور لوگ اُن کے ناز بھی اُٹھاتے ہیں! ایسے لمحات میں ہم نے مرزا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ دل چھوٹا نہ کریں، آپ کوئی انوکھے بکرے۔ ہر گھریلو مویشی منڈی کی یہی کہانی ہے!

مرزا کا استدلال ہے کہ گھر والے اُنہیں کچھ سمجھتے ہی نہیں، گھاس ہی ڈالتے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ کوئی کیوں گھاس ڈالے گا، گھاس کوئی مفت ملتی ہے؟ مرزا یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ فی زمانہ اگر کوئی اِنسان دوسرے اِنسان کو گھاس نہیں ڈالتا تو یہ معاملہ ایک دوسرے کو غیر اہم سمجھنے کا نہیں بلکہ جانوروں کو اہم سمجھنے کا ہے! اب گھاس کے دام بھی اِتنے بڑھ چکے ہیں کہ یہ صرف کارآمد جانوروں ہی کو ڈالی جاسکتی ہے!

جب مرزا زِچ ہوجاتے ہیں تو زندگی بھر اہل خانہ کی بھرپور خدمت کا حوالہ دینے بیٹھ جاتے ہیں۔ اُن کا زور اِس بات پر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے پوری جوانی، بلکہ زندگی رات دن گدھے کی کام کرتے گزار دی۔ مگر اِس کا صِلہ دینے کی کسی کو توفیق نہیں۔ سب نے ہمیشہ ''دل مانگے اور'' کے اُصول پر عمل کیا ہے۔ یعنی دُم ہلا کر سب کا بوجھ اُٹھاتے جایئے اور کوئی صِلہ طلب نہ کیجیے۔ مرزا کا مطالبہ ہے کہ قربانی کے جانوروں کی طرح اُن کا بھی احترام کیا جانا چاہیے کیونکہ اُنہوں نے بھی زندگی بھر اپنے حلق پر چُھری پھروائی ہے۔ اب ہم اُنہیں کیا سمجھائیں کہ قربانی کے جانور اور اُن میں واضح فرق ہے۔ قربانی کے جانور کا باضابطہ ذبیحہ ہوتا ہے جبکہ شادی شدہ مَرد کو ہمیشہ جھٹکے کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے! یعنی بے چارہ بار بار جان سے بھی جاتا ہے

اور ذبیحے کی سعادت سے بھی محروم رہتا ہے! اور مرزا یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ جب اُنھوں نے زندگی بھر گدھے کی طرح محنت کی ہے تو گھر والے اِس عمر میں اُنہیں بکرے کا، بلکہ قربانی کے بکرے کا درجہ کیوں دیں! گھر والے اِتنے گدھے تو نہیں ہیں کہ گدھے اور بکرے کا فرق نہ سمجھ پائیں!

ہم آپس کی گفتگو میں کسی بھی مظلوم شخص کو قربانی کے بکرے سے تشبیہہ دینے میں بُخل سے کام نہیں لیتے۔ کبھی ہم نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی ہے کہ قربانی کے بکرے کی کتنی قیمت اور توقیر ہے؟ اِنسان تذلیل کے جن مراحل سے گزر رہا ہے اُن کے پیش نظر اگر قربانی کے بکروں کو معلوم ہو جائے کہ بہت سے دو ٹانگوں والے بکروں کو اُن سے تشبیہہ دی جاتی ہے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ یعنی چار ٹانگوں والے حقیقی بکرے پانی کی آمد کا انتظار کئے بغیر ہی شرم سے ڈوب مَریں!

آنا جانا بھی روز کا ہے عذاب

سب سے بڑا اور جامع شواہد کے ساتھ پایا جانے والا طلسماتی دور تو وہ ہے جس میں ہم جی رہے ہیں۔ مگر خیر، گزرے ہوئے زمانوں میں پائے جانے والے طلسمات کو سچ مان لیجیے تب بھی آج ایسا بہت کچھ ہے جو اُس طلسمات سے بڑھ کر ہے۔ کراچی کا ماس ٹرانزٹ سسٹم اِس سلسلے میں ایک ''روشن'' مثال کا درجہ رکھتا ہے۔

ایک زمانے سے کراچی میں ماس ٹرانزٹ سسٹم بہتر بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ آپ سوچیں گے یہ کیسا مذاق ہے؟ جب کوئی سسٹم ہے ہی نہیں تو کیا بہتر بنانے کی کوشش ہو رہی ہے! آپ کا سوچنا بھی غلط نہیں۔ ایک بڑے اور عالمی نوعیت کے شہر کو جس طرح چلایا جارہا ہے اُس سے تو لگتا ہے کہ شہر اور اُس کے رہنے والوں سے کھلواڑ کی جارہی ہے۔ مگر خیر ایک کراچی کو کیا رویئے، ملک کا ہر بڑا شہر ایسے ہی سُلوک سے دوچار ہے۔

دیو مالائی داستانوں میں ایسے عجیب الخلقت حیوانوں کا ذکر ملتا ہے جو ٹھیک نشانہ لیے جانے پر بھی مرنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ بعض طلسماتی قصوں میں پائے جانے والے جانور کو اگر کوئی بہادر شہزادہ دو لخت بھی کر دیتا تو

ہر ٹکڑا اپنی جگہ الگ، مکمل جانور کی حیثیت اختیار کرلیتا! کچھ ایسا ہی معاملہ کراچی کے پبلک ٹرانسپورٹ سسٹم کا ہے۔ کراچی میں روزانہ کم و بیش 90 لاکھ افراد گھر سے نکلتے ہیں۔ اِن میں مزدوروں اور آفس ملازمین کے علاوہ اسکول کے بچے بھی شامل ہیں۔ 70 لاکھ سے زائد افراد کو کام پر جانے کے لیے یومیہ بنیاد پر ٹرانسپورٹیشن کی سہولت درکار ہے۔ اپنی کار میں یا موٹر سائیکل پر جانے والوں کی تعداد تقریباً 15 لاکھ ہے۔ یعنی 50 لاکھ سے زائد افراد کے لیے بسیں، ویگنیں، کوچیں، رکشے اور ٹیکسیاں درکار ہیں۔

ایک زمانے تک پبلک ٹرانسپورٹ ویگن اور کوچ مافیا کے کنٹرول میں رہی۔ اِس کا زور توڑنے کے لیے چار پانچ سال قبل بڑے پیمانے پر موٹر سائیکل رکشے یعنی چنچی رکشے متعارف کرائے گئے۔ یہ رکشے ہاضمے کے چُورن کے طور پر لائے گئے تھے مگر اب ہاضمے کو مزید خراب کرنے کا باعث بن چکے ہیں۔ ابتدا میں لوگ یہ سمجھے کہ چنچی رکشے شاید تفریحِ طبع کا سامان ہیں! اِن رکشوں میں سواری کرنا تفریح اور مہم جوئی کا مرقّع تھا۔

مرزا تنقید بیگ کو چنچی رکشوں سے شدید نفرت ہے۔ وہ جب بھی مجبوری کی حالت میں اِن رکشوں کی سواری کرتے ہیں، کئی دن تک اُن کا مُوڈ خراب رہتا ہے۔ کہتے ہیں۔ کوئی بھی تمیز کے دائرے میں رہتے ہوئے حلیم اور نہاری کا لُطف ”

نہیں پا سکتا۔ یعنی حلیم اور نہاری کھاتے وقت اِنسان کو شائستگی و آداب کے تقاضے بالائے طاق رکھنے پڑتے ہیں۔ بالکل اِسی طرح چنچی رکشے میں بھی کوئی پوری تمیز اور شائستگی کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا۔ چنچی رکشہ ایسی نامعقول چیز ہے کہ کوئی دوسروں کا ''احترام ملحوظِ خاطر رکھے تو اِس میں سفر کر ہی نہیں سکتا۔

چنچی کی منزل تو گزرے تو اہلِ کراچی 6 نشستوں سی این جی رکشوں تک پہنچے۔ اور اب نشستوں والے رکشے عام ہیں۔ یعنی تین نشستیں پیچھے اور اندر آمنے سامنے چھ 9 نشستیں۔ ڈرائیور اپنے دائیں بائیں بھی ایک ایک مسافر بٹھاتا ہے۔ گویا کم از کم بارہ مسافر تو بیٹھتے ہی ہیں۔ بچوں کو ملایئے تو 20 افراد کو لے کر خاصے کمزور انجن والے یہ رکشے کھانستے، چھینکتے کراچی کی سڑکوں پر ''رواں دواں'' نظر آتے ہیں۔

ویگنوں اور کوچوں کا زور توڑنے کے لیے جو منتر پھونکا گیا تھا وہ بیک فائر کر گیا یعنی چنچی اور سی این جی رکشے برآمد ہوئے ہیں۔ وہی دیو مالائی جانور والی بات۔ چند ہزار ویگنیں اور کوچیں کئی ہزار رکشوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ کراچی کی سڑکوں پر سی این جی رکشے کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے پھر رہے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو پیروں میں آ رہے ہیں!

چنیچی کو پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ سی این جی رکشے بھاری باڈی کے ساتھ خاصے متوازن ہیں۔ ذرا سا لہرانے پر یہ چنیچی کی طرح ڈھول چاٹتے دکھائی نہیں دیتے مگر اِن کے مسافروں کے نصیب میں توازن نہیں۔ سی این جی رکشے کے سفر میں مسافروں کے لیے ویسے ہی پلٹے ہوتے ہیں جیسے کلاسیکی آئٹمز میں تان پلٹے ہوتے ہیں۔ خواتین کی آمد پر مردوں کو پوزیشن بدلنا پڑتا ہے۔ اندر آمنے سامنے کی نشستوں پر چار مسافر اور پچھلی نشست پر دو خواتین بیٹھی ہوں تو مزید تین خواتین مسافروں کے لیے پچھلی نشست کی خواتین کو اندر کی طرف آنا پڑتا ہے اور اندر والے مسافروں کو پچھلی نشست پر جانا پڑتا ہے۔ اگر کوئی اضافی مرد ہو تو ڈرائیور اپنے پاس بٹھا لیتا ہے۔ چند اسٹاپس کے بعد تمام خواتین اُتر جائیں تو مردوں کو دوبارہ اندر آکر سکون سے بیٹھنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اگر کسی کو پندرہ بیس کلو میٹر کا سفر کرنا ہے تو کئی بار اِس عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یعنی گاڑی تو وہی رہتی ہے مگر ع

مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں

سی این جی رکشوں کے ڈرائیوروں نے ایک جُملہ رٹا ہوا ہے۔ یہ کہ دل میں جگہ ہونی چاہیے۔ ہم نے بارہا وضاحت چاہی ہے کہ کیا پہلے سے موجود لوگوں کے پیٹ چیر کر مزید مسافر بٹھاؤ گے!

ویگنوں اور کوچوں کا زور تو ٹوٹ گیا مگر اب چنچی اور سی این جی رکشوں کا زور کون توڑے گا؟ 10 روپے والا مسافر بٹھانے کے لیے نصف درجن رکشوں میں بیچ سڑک پر جنگ ہو رہی ہوتی ہے۔ دنیا بھر کے ماہرین معاشیات ایسی بھرپور مسابقت کا مشاہدہ کریں تو کتابوں پر کتابیں لکھیں اور سَیر نہ ہوں۔

جس کے پاس کوئی ہنر نہ ہو اور نوکری کرنے کا مزاج بھی نہ پایا جاتا ہو وہ کہیں سے بیس تیس ہزار روپے کا بندوبست کرکے قسطوں پر رکشہ حاصل کرکے سڑک پر کرتب دکھانے لگتا ہے۔ جس نے کبھی سائیکل بھی ڈھنگ سے نہ چلائی ہو وہ بھاری بھر کم رکشہ میں دس بارہ افراد بٹھاکر اپنا ہنر اور دوسروں کا صبر آزماتا ہے! کراچی کی سڑکوں پر یہ تماشا صبح و شام ہے اور بن دام ہے۔ دو تین دن تک انٹ شنٹ چلانے کے بعد لوگ رکشہ چلانا سیکھ جاتے ہیں۔ حیرت کیسی؟ اِنسان اِسی طرح تو سیکھتا ہے۔ اب اگر ہزاروں رکشہ ڈرائیوروں کے گھروں میں چولھے جلتے رکھنے ہیں تو قوم کو تھوڑی بہت قربانی تو دینی پڑے گی۔

عام آدمی کے لیے کام پر جانا کل بھی جاں گُسل مرحلہ تھا اور اب بھی ہے۔ کل تک کوچ سے جانے کے لیے 20 روپے خرچ کرنے پڑتے تھے۔ اب سی این جی رکشوں میں طویل فاصلے کے 40 یا 50 روپے تک خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اور جس دن سی این جی بند ہو اُس دن پانچ دس روپے اضافی دیجیے۔ ویگنوں اور کوچوں سے نجات پانے کی

کوشش یہ رنگ لائی ہے کہ اب چنچی اور سی این جی رکشے گلے کی ہڈی بن گئے ہیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا یہ "رخِ پُرنور" دیکھنے کی سب میں تاب نہیں۔ سی این جی رکشوں کا سفر کئی مراحل پر مشتمل ہے۔ جو منزل پر پہنچ کر صحیح ذہنی حالت کے ساتھ رکشے سے خارج ہو اُسے اپنے مقدر پر ناز کرنا ہی چاہیے۔

جو قوم پانی اور بجلی کو ترس رہی ہے وہی قوم یہ بھی چاہتی ہے کہ حکومت ماس ٹرانزٹ سسٹم بھی بہتر بنائے۔ یعنی عوام کے لیے روزانہ کام پر جانا اور واپس گھر آنا ایک سہل اور پُرلطف مرحلہ ہونا چاہیے۔ کراچی، لاہور اور دیگر بڑے شہروں میں ماس ٹرانزٹ سسٹم انقلابی اقدامات کا طالب ہے۔ لگتا تو یہی ہے کہ اِس کے لیے بھی لوگوں کو دھرنے دینے پڑیں گے۔ اہلِ وطن کے لیے یاروں نے دُنیا میں آنا عذاب بنادیا ہے مگر روز کام پر آنا جانا تو عذاب نہ ہو۔ پانی و بجلی کے ماروں کو کم از کم اِتنا ریلیف تو ملنا ہی چاہیے۔ تب تک قوم کو یومیہ عذاب جھیلتے رہنا پڑے گا۔ ع

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

انجام بخیر ہونا چاہیے

لوگ رونا رو رہے تھے کہ جمود ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ اور جمود ٹوٹا ہے تو اب لوگوں کو یہ فکر لاحق ہے کہ جو ہلچل مچی ہے وہ کہاں جاکر سُکون کا سانس لے گی۔ لوگوں کا بھی عجیب حال ہے۔ مُراد پانے کو بے تاب رہتے ہیں اور مُراد مل جائے تو پریشان ہو اُٹھتے ہیں۔ اُنہیں منزل سے بڑھ کر سفر اور رہنما عزیز ہوتا ہے۔ بہت سے ''سیانے'' تو اِس امر کیلئے کوشاں رہتے ہیں کہ مُراد پوری نہ ہو پائے۔ ع
پھر دل میں کیا رہے گا جو حسرت نکل گئی
سیاسی شاہراہ کو دیکھیے تو ایسا لگتا ہے کہ آگے راستہ بند ہے۔ اور بظاہر واپسی کا محل ہے نہ توفیق۔ ایسے میں محسوس کرنے اور سوچنے والوں کے دِل و دماغ کام کرنے سے انکار کریں تو حیرت کیسی؟ اور اب تو کسی بھی بات پر حیرت کیسی؟
''اسٹیٹس کو'' ختم کرنے کے نام پر جشن آزادی کے دن سے شروع ہونے والے احتجاج کے باعث بہت کچھ اب standstill کی منزل پر آگیا ہے۔ یہ ہمارا ہی

نصیب ہے کہ کسی مسئلے کو حل کرنے کوشش کے بطن سے بھی مسائل ہی پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ فریقین کے درمیان مذاکرات کی کوشش کرنے والوں کو اندازہ نہیں ہو پارہا کہ وہ (فریقین) آخر چاہتے کیا ہیں۔ اور اِس سے بھی زیادہ ستم کی بات یہ ہے کہ خود فریقین کی سوچ اور ارادے بھی واضح نہیں۔ اُنہیں خود اندازہ نہیں کہ اُن کی منزل کیا ہوسکتی ہے یا کیا ہونی چاہیے۔ کسی بھی سیاسی تحریک کو شروع کرنا سب سے بڑا مسئلہ ہوا کرتا ہے۔ لوگوں کو متحرک کرنا سیاست کا حقیقی دردِ سر ہے مگر یہاں طرفہ تماشا یہ ہے کہ لوگ متحرک ہیں مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ تحریک کو ''ہیپی دی اینڈ'' تک کیسے پہنچایا جائے!

احتجاج کا دُھواں سیاسی فضا میں بلند ہوکر پھیلتا جارہا ہے۔ ہماری سیاست نے بھی اب chain reaction کا اُصول اپنالیا ہیں۔ مارچ کے بطن سے دھرنے ہویدا ہوئے۔ اور اب دھرنوں کی کوکھ سے جلسوں نے جنم لیا ہے۔ گویا ع

وہ پَو پھٹی، وہ کرن سے کرن میں آگ لگی

کراچی کے بعد لاہور میں بھی تحریک انصاف نے کامیاب جلسہ کیا ہے۔ تبدیلی کی خواہش دلوں میں اب حقیقی انگڑائیاں لینے لگی ہے۔ ہنگامہ برپا ہے، ہلچل مچی ہوئی ہے۔ جمود نے تحرّک کی شکل اختیار کی اور تحرّک اب تحریک میں تبدیل

ہو چکا ہے۔ کھلی فضا کا جائزہ لے کر کوئی بھی آسانی اور یقین سے کہہ سکتا ہے کہ تحریک انصاف کی گُڈی اونچی اُڑ رہی ہے۔ عمران خان کے معترفین اور معتقدین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جن کی صفوں سے لوگ نکل کر تحریک انصاف کی طرف آ رہے ہیں اُن کے دریائے غضب میں بھی طغیانی آئی ہوئی ہے۔ گویا خان صاحب کے معترضین بھی بڑھ رہے ہیں۔ اِس پر بھی خان صاحب خوش ہیں ۔

وہ بے رُخی سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں
میں خوش نصیب ہوں کہ کسی کی نظر میں ہوں!

پی ٹی آئی کے چیئرمین چاہتے تھے کہ خبروں میں رہیں۔ اب وہ خبروں میں ہیں۔ اور اُن کی پارٹی کی ریٹنگ بھی بظاہر بڑھ رہی ہے۔ یہ سب تو ٹھیک ہے مگر سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اِس احتجاجی تحریک کا آخری باب کیا ہوگا اور کس طور لکھا جائے گا۔ قوم شدید مخمصے میں ہے۔ دھرنا دینے والوں نے جو باتیں کی ہیں وہ کروڑوں دلوں میں مدت سے تھیں، بس زبان تک نہیں آ پائی تھیں۔ مگر اِس کے باوجود غیر یقینی فضا برقرار ہے۔ لوگوں کو اب اِس بات سے کچھ غرض نہیں کہ اِس پردۂ زنگاری میں کوئی معشوق ہے یا نہیں۔ لوگوں کو ڈور ہلانے والوں کے بارے میں جاننے کا زیادہ شوق نہیں رہا۔ وہ تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ جن کی ڈور ہلائی جارہی ہے وہ کچھ دے پائیں گے یا نہیں۔ وہ تو صرف یہ جاننے کے مشتاق ہیں کہ اُن کی امیدیں کب اور کس طور بر آتی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ

پرنالہ وہیں بہتا رہے اور لوگ دیکھتے ہی رہ جائیں۔ ع

آئے بھی وہ، گئے بھی وہ، ختم فسانہ ہوگیا

پاکستان کو ''پیراڈائم'' تبدیل کرنا ہے۔ فکر و عمل کا پورا ڈھانچا تبدیل کرنے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ تحریک انصاف اور عوامی تحریک نے جو ہنگامہ برپا کیا ہے وہ بہت سے معاملات میں غلط سہی مگر دوسرے بہت سے معاملات میں درست بھی ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے۔ جیسے اندھیرے سے اُجالا پُھوٹے یا اُجالے کے دامن میں اندھیرا چُھپا ہوا ہو! ہستی کا تماشا ایسے ہی تضادات سے مُزیّن ہے۔

یہ دھرنے قوم کو بہت مہنگے پڑے ہیں۔ عمران خان اور طاہرالقادری سے متاثر ہو کر دھرنوں میں شرکت کرنے والوں سے کہیں زیادہ تعداد دھرنوں کے متاثرین کی ہے۔ اِن دھرنوں کے بطن سے انقلاب اور آزادی دونوں کو ہویدا ہونا ہی چاہیے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ اِس تحریک سے عوام کو کچھ نہ کچھ ضرور ملے۔ محض طاقت کا مظاہرہ کس کام کا؟ قوم نے یہ تماشا تو پہلے بھی بہت دیکھا ہے۔ سیاست میں اسٹریٹ پاور ناگزیر ہے۔ تحریک انصاف اِس مرحلے سے بھی کامیاب گزری ہے۔ مگر معاملہ محض طاقت کے مظاہرے تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ سیاسی قوت محض ذریعہ ہے، مقصد ہرگز نہیں۔ چند ایک حقیقی اور بامعنی اصلاحات کا راستہ نکل آئے تو

قوم مطمئن ہو رہے گی کہ چلیے محنت اور زحمت ٹھکانے لگی۔

فکر و عمل کے اعتبار سے پاکستانی قوم بانجھ پن کی سی کیفیت سے دوچار ہے۔ نابغوں نے اِس قوم میں پیدا ہونا چھوڑ دیا ہے۔ سطحی ذہنیت اِس قدر عام ہوئی جارہی ہے کہ اب تو وحشت سی ہونے لگی ہے۔ لوگ بہت نچلی سطح پر رہنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ایک خوف سا ہے کہ کسی معاملے میں دماغ استعمال کرنے سے کہیں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہوجائے!

نفسیات کے حوالے سے ایک بڑا مغالطہ پایا جاتا ہے کہ عام آدمی عمر بھر اپنے دماغ کا محض 10 فیصد استعمال کرپاتا ہے۔ کُلیوں کی طرح اب پاکستانی مغالطوں سے بھی مستثنیٰ ہیں۔ پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ عام پاکستان عمر اپنے دماغ کے ایک فیصد کا عشر عشیر بھی شاید ہی استعمال کرپاتا ہو! لگتا ہے ہم نے اپنے پروردگار کو دماغ ''ڈبا پیک'' حالت میں واپس کرنے کا عہد کر رکھا ہے!

کون ہے جو تبدیلی نہیں چاہتا؟ مگر ہاں، تبدیلی کے نتیجے میں کوئی بھی اپنے کسی ایک خفیف سے مفاد سے بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ تبدیلی کے حوالے سے یہ بہت کٹھن مرحلہ ہوا کرتا ہے۔ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ اُس کے مفادات

داؤ پر لگیں۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ گلشن میں آگ لگتی ہے تو لگے، اُس کے نشیمن تک کوئی ایک چنگاری بھی نہ پہنچے۔ تبدیلی کے نعرے پہلے بھی بہت لگائے گئے ہیں۔ تبدیلی آئی بھی ہے مگر اپنے دامن میں بگاڑ زیادہ لائی ہے۔ ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے نہ گنجائش۔ لوگ آسانی کی تلاش میں ہیں۔ اُنہیں مشکل راہوں پر چلنے کو کہا گیا تو متنفر ہو جائیں گے، بپھر جائیں گے۔ تحریکِ انصاف اور عوامی تحریک کو بھی پوری طرح اندازہ نہیں کہ کوئی حقیقی اور مُفید تبدیلی کیونکر لائی جاسکے گی مگر خیر، کسی بڑی تبدیلی کے لیے ماحول تیار کرنے میں کامیابی بھی جشن ہی کا محل ہے۔ اِتنا بھی ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ ہم بھر پائے۔ پہلے اِس مسرّت کو دامن میں سمیٹ لیں۔ جشن کے مرحلے سے گزریں گے تو اگلے مرحلے کا سوچیں گے۔

ڈنڈے سے تسبیح تک

قومی سیاست میں گلو بٹ نے کیا انٹری دی، ہمارا تو ناک میں دم ہوگیا۔ بات آپ کو بھی عجیب لگ رہی ہوگی۔ گلو بٹ نے اگر سیاست میں انٹری دی ہے تو ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم بھلا کیوں پریشان نہ ہوتے؟ اِدھر گلو بٹ نے ڈنڈا سنبھالا اور اُدھر اُسے سنبھالنا دردِ سر ہوگیا۔ اُس نے جس دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑیوں کے شیشے توڑے اُسے دیکھ کر میڈیا والوں کے منہ میں تو پانی بھر آیا۔ اُنہیں تو پربت بنانے کے لیے بس رائی کا دانہ درکار ہوتا ہے۔ بات میڈیا والوں کے ہاتھ میں آئی نہیں کہ بتنگڑ بنی۔

جو بات میڈیا پر آئے وہ مرزا تنقید بیگ کی نظروں سے کیسے بچ سکتی ہے؟ وہ رات دن کئی چینلز کو انتہائے انہماک سے مانیٹر کرتے رہتے ہیں۔ جب اُنہوں نے گلو بٹ کی شاندار پذیرائی دیکھی اور یہ بھی کہ اُسے راتوں رات ملک گیر، بلکہ "خطہ گیر" شہرت مل رہی ہے تو اُنہوں نے ہم پر طنز کے تیر برسانا شروع کردیا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ قلم گھسنے کا فائدہ کیا اگر برسوں کی مشقت کے بعد بھی شہرت ہاتھ نہ آئے۔ اِس سے بہتر تو یہ ہے کہ اِنسان گلو بٹ بنے، ڈنڈا تھامے اور شہرت پکڑے۔ اُن کی بات سُن کر ہمارا دل تو چاہا کہ گلو

بٹ کی طرح کوئی ڈنڈا دونوں ہاتھوں سے تھام کر مرزا کے سر پر دے ماریں۔ مگر پھر خیال آیا کہ مرزا کا کیا نقصان ہونا ہے، ڈنڈا جان سے جائے گا!

گزشتہ روز چینلز پر عجیب منظر دیکھا۔ لاہور میں انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالت میں پیشی کے بعد گلو بٹ واپس جا رہا تھا۔ وضع قطع ایسی کہ خوش گوار حیرت نے ہمیں جکڑ لیا۔ ہاتھ میں تسبیح، سر پر ٹوپی۔ تیس مار خاں ٹائپ کی مونچھوں میں شائستگی کا عنصر نمایاں۔ چہرے پر پائی جانے والی سختی کو نرمی میں تبدیل کرنے کی شعوری کوشش۔ ٹی وی کیمروں کی طرف دیکھ کر موصوف نے سلیوٹ نما سلام بھی کیا۔ ہم یوں بھی حیران ہوئے کہ انقلاب۔برپا کرنے کے لیے تگ و دَو تو کر رہے ہیں طاہر القادری اور انقلاب۔برپا ہوگیا گلو بٹ کی زندگی میں۔ کہاں ڈنڈا اور کہاں تسبیح! عوام کے ہاتھوں پٹائی اور جیل میں گزارے ہوئے دنوں نے گلو بٹ کو بدل ڈالا؟

ڈنڈے کی مدد سے گاڑیوں کے اور مخالفین کے دلوں کے شیشے توڑنے والے گلو بٹ کے ہاتھ میں تسبیح دیکھ کر ہمیں بے نظیر بھٹو یاد آ گئیں۔ اُن کے ہاتھ میں بھی تسبیح ہوا کرتی تھی۔ آپ سوچیں گے بے نظیر بھٹو کے معاملے میں تسبیح کا حوالہ تو درست ہے مگر ڈنڈے کے ذکر کا یہ کون سا محل ہے؟ بات یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو بھی، دیگر بہت سے سیاست دانوں کی طرح، کسی حد تک توہم پرست تھیں

اور کُرسی مضبوط رکھنے کے لیے کسی بھی ٹوٹکے سے پرہیز نہیں کرتی تھیں۔ وہ ایک بار تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیرتی ہوئی ڈنڈا پیر کی خدمت میں بھی حاضر ہوئی تھیں۔

مشہور تھا کہ ڈنڈا پیر جسے ڈنڈا رسید کرتے تھے اُس کا بھلا ہو جاتا تھا۔ ڈنڈا پیر نے حسب معمول بے نظیر بھٹو کو بھی پیار سے ڈنڈا رسید کیا۔ اور یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اِس ڈنڈے کی برکت سے بے نظیر بھٹو کا بھی بھلا ہوا۔

گلو بٹ کو کسی ڈنڈا پیر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اُس کے معاملے میں خود ڈنڈے نے ڈنڈا پیر کا کردار ادا کیا ہے۔

ڈنڈا چلا کر اُس نے ایسی شہرت پائی کہ لوگ دانتوں تلے انگلیاں دابے رہ گئے۔ گلو بٹ کی انٹری نے قومی سیاست کا ایک نیا پہلو متعارف کرایا۔ قوم حیران رہ گئی کہ کوئی یوں ذرا سا بھی خوفزدہ ہوئے بغیر، بھرپور دیدہ دلیری سے نقصِ امن کا باعث بن سکتا ہے اور قانون کی گرفت سے دور بھی رہ سکتا ہے!

لوگ بھی کیا سادہ ہیں، کیا کیا سوچتے ہیں۔ جو پیا کے من کو بھائے وہی تو دلھن ہوا کرتی ہے۔ گلو بٹ پولیس کے ٹاؤٹ کی حیثیت سے ماڈل ٹاؤن کے سانحے میں سیاسی دادا گیری کا انوکھا ماڈل بن کر میڈیا کے اُفق پر طلوع ہوا۔ ویسے تو خیر اب کچھ بھی ایسا نہیں جسے دیکھ کر حیران ہوا جائے مگر گلو بٹ نے تو

واقعی پوری قوم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

جو کچھ گلو بٹ نے کیا اُس نے ماہرینِ لسانیات کو بھی لغت میں ایک نیا لفظ شامل کرنے کی طرف مائل کیا ہے۔ آکسفورڈ کی مشہورِ زمانہ لغت میں لفظ ''گلّو'' اور اُس سے بننے والے کئی الفاظ شامل کرنے کی سفارش کی گئی ہے تاکہ سیاسی کلچر کے ایک نئے رجحان کو باضابطہ ''علمی'' حیثیت مل جائے!

سچ یہ ہے کہ ہم گلو بٹ سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ بات حسد کی نہیں۔ ٹھیک ہے، قلم گِھس گِھس کر ہمیں برسوں، بلکہ عشروں میں وہ ''نیک نامی'' اور کوریج نہ مل سکی جو ایک ڈنڈے کے بے محابہ استعمال نے پلک جھپکتے میں گلو بٹ کے قدموں میں ڈال دی۔ عزت اور ذلت تو خدا کے ہاتھ ہے۔ مگر خیر، گلو بٹ نے ڈنڈا تھام کر نام کمایا تو اُسے اِس کی ''توفیق'' ہوئی تھی۔ اور ہم نے ڈنڈے کو چھوڑ کر قلم تھاما تو یہ ہمارا مقدر۔ اور اب کیسا حسد اور کیسی حیرت؟ بچپن سے سُنتے آئے ہیں کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ اب یوں کہہ لیجیے کہ جس کا ڈنڈا اُس کی شہرت! یہ تو ہونا ہی تھا۔ اِس طرح تو ہوتا ہے اِس طرح کے معاشروں میں!

گلو بٹ کی گُڈی میڈیا والوں نے اِتنی اونچی اُڑائی کہ لگے ہاتھوں شہرت بٹورنے ن لیگ کی طرف سے کئی اور بٹ میدان میں آ گئے۔ سیاست کے گراؤنڈ میں

دیکھتے ہی دیکھتے ''بٹ میلہ'' لگ گیا۔ گلو بٹ کو دیکھ کر پومی بٹ میدان میں آئے۔ اُن کے بعد اب توفیق بٹ اور مانی بٹ کے درشن ہوئے ہیں۔

گلو بٹ سے ''تحریک'' پاکر دوسرے کئی بٹ بھی میدان میں آگئے ہیں تو کون سا تعجب کا محل ہے؟ ہمارے ہاں لوگ یہی تو کرتے ہیں۔ پہلے ڈنڈا چلاتے ہیں تاکہ دہشت اچھی طرح بیٹھ جائے۔ جب دہشت اور دھاک اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے تو ڈنڈاایک طرف رکھ کر تسبیح تھامی جاتی ہے تاکہ اُس کے دانوں پر ہاتھ پھیر کر کچھ روحانیت کا ٹچ بھی دیا جائے۔ سیاسی دال اُس وقت زیادہ مزا دیتی ہے جب اُس میں تقدّس کا تڑکا بھی لگا ہو۔

ہماری سیاست میں گلو بٹ والا انداز بہت پہلے سے موجود ہے۔ پہلے ڈنڈا گھما کر دھاک بٹھایئے اور پھر تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیر کر دہشت کی دال میں تقدّس اور روحانیت کا تڑکا لگایئے۔ ڈنڈے اور تسبیح کے تال میل سے راہ ہموار ہو جاتی ہے، فضا بن جاتی ہے اور کامیابی یقینی ہوجاتی ہے۔

ہماری اجتماعی زندگی میں بٹ صاحبان کی کمی نہیں رہی۔ بٹ برادری میں باڈی بلڈنگ کا کلچر عام رہا ہے۔ اب تک جتنے بھی بٹ ہماری زندگی میں آئے ہیں وہ محض گورے ہی نہیں، تنومند بھی ہیں۔ کراچی میں جب ہم پاک کالونی میں رہا کرتے تھے تب وہاں ایک جاوید بٹ تھے جو باڈی بلڈنگ کیا کرتے تھے۔ بعد میں

کرکٹر بن گئے تو باڈی بلڈنگ کی بدولت پُھول پُھول کر کُپّا ہو جانے والے بازوؤں کو چھکّے مارنے پر مامور کردیا! ایک زمانے میں نصراللہ بٹ سِلور اسکرین کی زینت تھے۔ باڈی بلڈر تھے اِس لیے اُنھوں نے زورِ بازو کے مظاہرے پر مبنی کئی فلموں میں کام کیا اور لاکھوں پاکستانیوں کے دِلوں میں جگہ بنائی۔ بعد میں جماعت اسلامی میں حافظ سلمان بٹ بھی زورِ بازو کی توانا علامت بن کر اُبھرے۔

خیر، وہ بہت اچھا زمانہ تھا۔ لفظ بٹ سے طاقت کا تصور وابستہ تھا، دادا گیری کا نہیں۔

گزشتہ دنوں بٹ برادری کے لوگوں نے گلو اور ن لیگ کے دیگر بٹ صاحبان کے مذموم کردار کے خلاف احتجاج کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اِس نوعیت کے بٹ سامنے آکر پوری برادری کو بدنام کر رہے ہیں۔ بات برحق ہے مگر نقار خانے میں طوطیوں کی آواز کون سُنتا ہے! میڈیا کو اُچھالنے کے لیے کوئی نہ کوئی اِشو چاہیے اور بٹ صاحبان، اللہ بُری نظر سے بچائے، اِشو فراہم کرنے پر تُل گئے ہیں! میڈیا والے بٹ برادری میں اُنھیں تلاش کر رہے ہیں جو زیادہ سے زیادہ مشتعل ہو کر قوم کی آنکھوں کے تارے بن جائیں اور میڈیا کا پیٹ بھی بھریں۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی نے خوب کہا ہے ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جاکر نظر کہاں!

بٹ.برادری سے ابھی پتا نہیں کتنے جوانانِ رعنا کو مطلع شہرت پر طلوع ہونا ہے مگر جو بات گلو میں ہے وہ شاید ہی کسی اور بٹ میں دِکھائی دے۔ ایک بار پھر بقول حالیؔ ۔

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تُو مگر کہاں !

وہ چُھری کب پِھرے گی؟

پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے دھرنے کے شرکاء سے خطاب کے دوران تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان کو بار بار مشورے دینے والے شیخ رشید غلط تو نہ کہتے تھے۔

عیدالفطر کے بعد سے، بلکہ رمضان کے دوران شیخ صاحب نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ عیدالاضحیٰ سے قبل قربانی ہو گی۔ اُن کا اشارا، ظاہر ہے، میاں صاحب کی طرف تھا۔ اللہ نے شیخ صاحب کا بھرم رکھ لیا مگر ایک ذرا سی کسر رہنے دی۔ اگر ایسا نہ ہو تو اِنسان اپنے رب کو کیسے پہچانے؟

شیخ صاحب کی پیش گوئی کے مطابق قربانی کی صورت میں حکومت کو جان سے ہاتھ دھونا تھے۔ یعنی کسی کو جان سے جانا تھا۔ اِس اعتبار سے شیخ صاحب درست ثابت ہوئے۔ دو ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ ملک زبردستی سیاسی تعطل کی حالت میں ہے۔ جیسے کوئی کچّے آم کی پھانکیں مسالا لگا کر تیل میں ڈالے اور بُھول جائے!

ایک مُدت سے "اسٹیٹس کو" کے تیل میں پڑے ہوئے سیاسی لاشے میں تھوڑی سی جان کیا آئی (یعنی ڈالی گئی) کہ بہت کچھ اُلٹ پلٹ گیا۔ سیاسی لاشے میں پُھونکی جانے والی رُوح کے ہاتھوں بہت کچھ ہے جو مرحلہ وار دم توڑتا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو لاہور کے شہریوں کا سُکون قربان ہوا۔ عمران خان اور

طاہر القادری نے وہیں سے اسٹارٹ لیا اور خاصی دھما چوکڑی کے بعد اسلام آباد کی راہ لی۔ جب دو سیاسی باراتیں جشنِ آزادی کے لمحات میں اسلام آباد پہنچیں تو اُن کا دھوم دھڑکا دیکھ کر اسلام آباد کے شہری لڑکی والوں کی طرح سہم گئے۔ وفاقی دارالحکومت کے شہریوں کا سُکون غارت ہوا یعنی اُن کی پُرسکون زندگی کے گلے پر احتجاجی شور شرابے کی چُھری پھر گئی۔ شیخ صاحب کی پیش گوئی کے مطابق رُونما ہونے والا یہ پہلا جھٹکا تھا۔ اب وہ اپنے سچّے ہونے کا حلفیہ اعلان کر سکتے ہیں۔ ذبیحہ نہ سہی، جھٹکا سہی۔ سوال چُھری پھرنے کا تھا، سو پِھر گئی۔

دو ماہ سے قوم خلجان میں مُبتلا ہے۔ سیاسی جمود توڑنے کے نام پر برپا کی جانے والی تحریک نے قوم کا خُون کسی حد تک گرمایا ضرور ہے مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ بہت کچھ ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔ ابتدا میں حکومت کا بوریا بستر گول کرنے کا عزمِ مصمّم ظاہر کیا گیا۔ خیر، حکومت نے بھی خودکُشی میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی۔ جن باتوں کی بُنیاد لوگ حکومت کے خلاف چلے اور ریڈ زون تک پہنچے وہ تمام باتیں جُوں کی تُوں ہیں۔ گویا ہوش کے ناخن لینے کی قسم کھالی گئی ہے۔ احتجاجی تحریک چلانے اور دھرنے دینے والوں نے حکومت اور جمہوریت دونوں ہی کا تیاپانچا کرنے کا عزم ظاہر کرنے میں بُخل سے کام نہیں لیا۔

ایک مرحلے پر ایسا لگتا تھا کہ حکومت کا سانس پُھول گیا ہے۔ چند لمحات کے لیے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دُنبے کی طرح اب لِٹائی گئی کہ تب لِٹائی گئی۔ اور ذبیحہ یا جَھٹکا اب ہوا کہ تب ہوا۔ خیر گزری کہ ہر بار ''قصابانِ محترم'' ہی سے کوئی نہ کوئی کوتاہی سَرزد ہوئی اور ہاتھ آئی ہوئی منزل دور چلی گئی۔

عیدالاضحیٰ سے قبل قربانی سے متعلق شیخ صاحب کی پیش گوئی کو درست ثابت کرنے کے لیے یاروں نے سسٹم کو بھی احتجاج کے ''استھان'' پر پچھاڑنے کی بہت کوشش کی ہے۔ مگر سسٹم بھی ایسا ہٹھیلا جانور ہے کہ ہر بار ہاتھ چُھڑا کر، رَسّی تُڑا کر بھاگ نکلا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ قَصّاب اور جانور دونوں ہی کے مورال کا گراف گرتا جارہا ہے۔ معاملہ ایسا ہے جیسے رنگ میں باکسرز لڑتے لڑتے انتہائی تھک چکے ہوں، دونوں کی شکست ایک بھرپور پنچ کی دوری پر ہو مگر کسی میں بھرپور پنچ مارنے کی سکت نہ رہی ہو!

جو حکومت اور سسٹم کا ذبیحہ دیکھنے کے آرزو مند تھے وہ تھوڑے سے مایوس ہوئے ہیں۔ اب ایسی بھی کیا مایوسی؟ ذبیحہ نہ سہی، جَھٹکا سہی۔ بہت کچھ ہے جو چُھری کے نیچے آیا ہے یعنی جان سے گیا ہے۔ غور سے دیکھیے تو ریڈ زون کے دَھرنائی استھان پر قوم کا بہت کچھ جَھٹکے کی نذر ہوا ہے۔ دو ماہ سے زیادہ مُدت ہونے کو آئی ہے کہ قوم کے گلے پر مخمصے کی چُھری پھِرتی ہی جارہی ہے۔ ایک طرف دھرنے دینے والوں کی ضِد اور دوسری طرف حکومت کا ''ٹس میں مَس نہ

جُنبد گل محمد'' والی روش۔ سیاسی سطح پر بے چینی اور اُس کی کوکھ سے جنم لینے والی بے یقینی۔ اِن دونوں نے مل کر بہت سے معاملات کو اٹکا اور لٹکا رکھا ہے۔ عوام (اپنے مفادات سمیت) تذبذب کی کھونٹی پر ٹنگے ہوئے ہیں۔

قربانی کے جانوروں کی آمد سے بہت پہلے جن چُھریوں کی دھار تیز کرائی گئی اُن کے نیچے بہت کچھ آگیا ہے۔ ریڈ زون میں مچائی جانے والی دھما چوکڑی نے چینی صدر کے دورے کا بھی جَھٹکا کر ڈالا۔ یہ جَھٹکا ''اسکیجول'' کا حصہ تھا یا نہیں یہ بعد کی بحث ہے۔ مگر ہو تو گیا۔

عوام کے لیے تو ہر سیاسی گھڑی آزمائش اور ابتلا کی ہے۔ نظام کو تلپٹ کرنے کے نام پر فرمائشی احتجاجی پروگرام ہو یا حکومت کی انا پسندی و بے حِسی، دونوں کی کوکھ سے عوام کے لیے تو مشکلات ہی جنم لے رہی ہیں۔ ذبیحہ ہو یا جَھٹکا، شامت عوام کی آتی ہے۔ چُھری کہیں بھی اور کسی پر بھی پھرے، کھال عوام کی اُترتی ہے۔ اور حتمی تجزیے میں تو ایسی ویسی ہر بات کی چُھری عوام ہی کے مفادات پر پھرتی ہے یا پھرائی جاتی ہے۔

اب عمران خان نے یہ دعویٰ کیا ہے (یا پیش گوئی کی ہے) کہ اگلی عید سے قبل اُن کی حکومت ہوگی یعنی وزیر اعظم تحریک انصاف کا ہوگا۔ اللہ اُن کی زبان مبارک کرے۔ اگر تحریک انصاف کی تحریک واقعی انصاف کی تحریک ثابت ہو جائے تو

قوم کو اور کیا چاہیے۔ مگر دل ڈر رہا ہے۔ خان صاحب نے بیسیوں مرتبہ کہا ہے کہ وزیر اعظم کے استعفے تک احتجاج ختم نہ ہوگا۔ تو کیا وہ اگلی عید سے قبل اپنی پارٹی کی حکومت کے قیام تک اسلام آباد کے ریڈ زون ہی میں براجمان رہیں گے؟ کسی خان کو یہ زیبا تو نہیں کہ زبان سے پھر جائے! ذرا صراحت بھی فرمادی جائے کہ جب تک حکومت غیرت" کا مظاہرہ نہیں کرتی یعنی مستعفی نہیں ہوجاتی تب تک احتجاجی چھُرا کتنی بار نئی" دھار کے ساتھ نکالا جاتا رہے گا اور مزید کیا کیا جھٹکے کی منزل سے گزرے گا۔ مگر صراحت کرے کون؟ جنہیں سسٹم کا تیاپانچا کرنے کا شوق ہے وہ خود نہیں جانتے کہ اگلے مرحلے میں اُنہیں کیا کرنا ہے۔

قوم نے ایک بار پھر جانوروں کے گلے پر چُھری پھیر کر سُنّتِ ابراہیمی کے اِتّباع کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ہماری چُھریاں جانوروں کے حلقوم تک کیوں محدود ہو گئی ہیں؟ جُھوٹی اَنا، کھوکھلے تفاخُر اور ہر حد سے بڑھی ہوئی مفاد پرستی نے ہمیں بند گلی میں لا کھڑا کیا ہے۔ فریقین سیاسی محاذ کے ہوں یا کسی اور شعبے کے، سبھی اپنی جُھوٹی انا اور تنگ نظری کے حِصار میں ہیں۔ سسٹم لپیٹنے کی باتیں کرنے والے اور سسٹم بچانے کے لیے پورے جوش و جذبے کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہنے والے قوم کا کیا بھلا کر رہے ہیں؟ دونوں ہی اپنے مفادات کو بچانے کی تگ و دَو میں مصروف ہیں۔

طاہرالقادری کئی سال

سے سسٹم، جمہوریت اور پارلیمنٹ پر لعنت بھیجتے آئے ہیں اور اب انتخابات کے ذریعے پارلیمنٹ میں پہنچ کر تبدیلی لانے کی بات کر رہے ہیں! منحوس و مذموم پارلیمنٹ اب دُودھ کی دُھلی کیسے ہو گئی؟

قوم نے اچھا خاصا تماشا خاصی بے بسی سے دیکھا ہے۔ ستم یہ ہے کہ اب بے بسی سے بھی لطف کشید کرنے کا چسکا سا قوم کو پڑ گیا ہے۔ آیئے، اب یہ عہد کیا جائے کہ بے حِسی اور لاتعلّقی کے گلے پر چُھری پھیر کر قومی مفادات کے ٹھیکیداروں کو پابند کریں گے کہ وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے نام پر قوم سے کِھلواڑ بند کریں۔ اب وقت آچکا ہے کہ عوام اپنے فکر و عمل کی چُھری تیز کریں اور ہر سطح پر جمود کا جھٹکا کر گزریں۔ اِس چُھری کے پِھرنے ہی سے ہماری خرابیوں کا تیاپانچا ہوسکے گا۔ دیکھیں یہ چُھری کب پِھرتی ہے۔ یہ پِھرے گی تو دِن پِھریں گے۔

دروازہ اور روشن دان

سیاسی تعطل ختم کرنے کے لیے جماعت اسلامی پاکستان کے امیر سراج الحق اینڈ کمپنی نے جو آنیاں جانیاں لگا رکھی ہے اُس کا اب تک تو کوئی قابل ذکر نتیجہ نہیں نکلا جسے دِکھا کر ہم یہ کہیں کہ دیکھیے، اِس بحر کی تہہ سے یہ اُچھلا ہے۔ ہاں، سراج الحق صاحب کا بھلا ضرور ہوگیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ سیاسی بحران ختم کرنے کا اُنھوں نے کوئی صِلہ چاہا ہوگا مگر قوم نے اُنھیں بابائے جمہوریت کا لقب دے ڈالا ہے۔ جمہوریت تو کسی نہ کسی شکل میں برقرار تھی مگر قوم کو ایک بابائے جمہوریت کی تلاش تھی۔ سراج الحق نے قوم کی مشکل آسان کردی۔

اشفاق احمد مرحوم ہوتے تو سراج الحق کو لے اُڑتے۔ مرحوم باباؤں کی تلاش میں رہتے تھے۔ گفتگو کے فن سے خوب واقف تھے اور گفتگو میں کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی بابا کی انٹری ڈالنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں کسی بابا کو تذکرہ اشفاق احمد کی مجبوری تھی۔ جو باتیں وہ کہنا چاہتے تھے وہ کسی بابا کے مُنہ ہی سے اچھی لگتی ہیں۔ اشفاق احمد خود بابا بننے سے گریز کرتے تھے۔ جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کسی بابائی کردار کے مُنہ سے نکلواتے تھے اور نتائج، اثرات اور عواقب سے بری الذمہ ہوجایا کرتے تھے۔

ڈیڑھ ماہ سے زائد مدت گزری ہے کہ سراج الحق، رحمٰن ملک اور دیگر ہم خیال افراد سیاسی بحران کے فریقین کے درمیان شٹل کاک بنے ہوئے ہیں۔ ''اِک طرف اُس کا گھر، اِک میکدہ'' والی کیفیت برقرار ہے۔ فریقین اُن کی بات پورے دھیان اور خلوص سے سُنتے ہیں مگر مانتے ہیں نہ عمل کرتے ہیں! یقین دہانی ہر وقت تیار رہتی ہے جو کرادی جاتی ہے۔ سراج الحق، رحمٰن ملک اور دیگر شخصیات پر مشتمل سیاسی جرگہ جب اِس طرف سے اُٹھ کر اُس طرف جاتا ہے تو ایک بار پھر یقین دہانی کا بازار گرم ہوتا ہے۔ بات توجہ سے سُنی جاتی ہے مگر جب جواب میں مُنہ کھلتے ہیں تو صرف انکار برآمد ہوتا ہے۔

سراج الحق بھی دُھن اور تربیت کے پکّے ہیں۔ جو کچھ اُنھوں نے جماعت اسلامی میں تربیت کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے سیکھا ہے وہ خوب کام آرہا ہے۔ تحمل اور استقامت جماعت اسلامی کے ارکان کا خاصہ ہے۔ پھر بھلا سراج الحق میں یہ اوصاف کیوں نہ ہوں کہ وہ تو جماعت اسلامی کے امیر ہیں! فریقین کو اُنھوں نے کئی بار منانے کی کوشش کی ہے مگر اُدھر سے پیہم انکار کے باوجود اِدھر اولوالعزمی ہے کہ ماند پڑتی ہے نہ واماندہ ہوتی ہے۔ ایک آدھ موقع پر سراج الحق نے جمود برقرار دیکھ کر جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا مگر تحمل، مستقل مزاجی اور اولوالعزمی نے اُنھیں پھر اپنے حصار میں لے لیا۔

سراج الحق کو اچھی طرح معلوم ہے کہ قوم کا حافظہ کمزور ہے اور قوم پر حکمرانی کے خواب دیکھنے والوں کا حافظہ کمزور تر ہے۔ یاد دہانی کے طور پر جماعت اسلامی کے مرکزی امیر نے کہا ہے کہ جمہوریت میں داخل ہونے کا دروازہ موجود ہے۔ اِس دروازے کو انتخابات کہتے ہیں۔ اور جب دروازہ موجود ہے تو کوئی روشن دان کے ذریعے جمہوریت میں داخل نہ ہو۔ پشاور میں نیوز کانفرنس کے دوران سراج الحق نے کہا کہ حکومت اور دھرنا دینے والوں کے درمیان چند اسپیڈ بریکرز آ گئے ہیں جنہیں دور کرنا ہی پڑے گا۔ اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ سیاسی جرگے نے لاشیں گرنے کا انتظار کرنے والوں کو مایوس کیا ہے۔ ساتھ ہی اُنہوں نے انتخابات میں حصہ لینے پر طاہرالقادری کے آمادہ ہو جانے کو نیک شگون سے تعبیر کیا۔

سراج الحق خاصے ذہین ہیں۔ جمہوریت میں نقب لگانے والوں کو روشن دان تک تو پہنچا دیا مگر ''چور دروازہ'' کی اصطلاح استعمال کرنے سے گریز کیا۔ یہ اصطلاح وہ کیوں استعمال کرتے؟ ''چور دروازہ'' میں بھی دروازہ تو موجود ہے! ایک بات اور بھی ہے۔ جمہوریت کے کمرے یا ہال میں ''غیر روایتی'' طریقے سے داخل ہونے والوں کو سراج الحق چور نہیں کہنا چاہتے! سیدھی سی بات ہے، سراج الحق کے پاس کینیڈا، امریکا یا برطانیہ کی شہریت تو ہے نہیں۔ کل کو اُنہیں

!منتخب ہو کر چوروں ہی کے ساتھ بیٹھنا ہے

طاہرالقادری کی طرف سے انتخابات میں حصہ لینے کے اعلان کو نیک شگون قرار دینا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اول تو یہ بات جماعت اسلامی کے فلسفے کے خلاف ہے۔ خالص اسلامی تعلیمات کے تناظر میں تو کوئی اچھا یا بُرا شگون نہیں ہوا کرتا۔ اور اگر مان لیجیے کہ ایسا ہوتا بھی ہے تو منحوس و مذموم پارلیمنٹ کو قبول کرنے پر طاہرالقادری کی آمادگی کو نیک شگون کیوں کہیے؟ ہم تو اُس وقت کا سوچ کر ڈر رہے ہیں کہ جب طاہرالقادری اپنی جماعت کے دیگر منتخب ارکان کے ساتھ اسپیکر کی نشست کے سامنے دھرنا دیں گے۔

!قومی اسمبلی کے اسپیکر کی نشست کے سامنے بھی توڈی چوک جتنی جگہ ہے

جماعت اسلامی کے امیر فرماتے ہیں کہ وسط مدتی انتخابات کی راہ ہموار کرنے میں حکومت ہی مرکزی کردار ادا کرسکتی ہے۔ یہ بات بھی ہم سمجھ نہیں پائے کہ ن لیگ اقتدار کی فلم ادھوری چھوڑ کر کیوں ہال سے نکلے گی؟ کہیں سراج الحق یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ ن لیگ کی حکومت چلنے دو، اقتدار کی آئینی مدت کا ہاف ٹائم آنے تک اِتنے !بلنڈرز ہوچکے ہوں گے کہ وسط مدتی انتخابات کی راہ خود بخود ہموار ہوجائے گی

سراج الحق صاحب کی احتیاط پسندی کا یہ عالم ہے کہ کسی کی دل آزاری کا سوچنے سے بھی کتراتے ہیں۔ حکومت اور اُس کے مخالفین کے درمیان بات چیت یا رابطوں کی راہ میں کھڑی کی جانے والی دیواروں یا رکاوٹوں کو بھی وہ اسپیڈ بریکرز قرار دے رہے ہیں! لاشیں گرنے کے منتظر افراد میں مایوسی پھیلنے والی بات البتہ درست ہے کیونکہ ہم بھی دیکھ رہے ہیں کہ جس سسٹم پر لعنت بھیجی جارہی ہے اب اُسی سے معانقے کا عندیہ دیا جارہا ہے! چلیے، برف کچھ تو پگھلی، ماتھے پر بَل کچھ تو کم ہوئے! ؂

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

ایک بار جب سسٹم کو اپنا لیا جائے تو اُس کے خلاف جانے کی بات کون کرتا ہے؟ بارہا ایسا ہوا ہے کہ جو لوگ سسٹم کو اُلٹنے، پلٹنے کی باتیں کرتے تھے وہ جب سسٹم کا حصہ بنے تو پچھلی باتیں محض بُھول نہیں گئے بلکہ حافظے ہی کو کہیں رکھ کر بُھول گئے! ع

جو بھی نمک کی کان میں پہنچا، نمک ہوا!

جب قوم کے سیاہ و سفید کے فیصلے کرنے کا اختیار اور قومی خزانے سے ''حسبِ توفیق'' مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے تو اِنسان ہر گزری ہوئی بات کو ذہن سے کُھرچ کر پھینک دینا چاہتا ہے۔ ؎

اپنی ہی وفا یاد نہ اوروں کی جفا یاد
اب کچھ بھی نہیں ہم کو ''حکومت'' کے سِوا یاد

سراج الحق ایسے اصحاب کا دم غنیمت ہے جو سیاسی حبس کے ماحول میں نقب لگا کر تازہ ہوا کے چند جھونکوں کا اہتمام کرنا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے سیاست کے منچلوں کو روشن دان کا غلط استعمال ترک کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اچھا ہے کہ روشن دان سے تازہ ہوا آئے، تعفّن کے بھبکے جمہوریت کی چار دیواری میں داخل نہ ہوں۔

احتجاجی تحریک سے لوگوں نے بہت کچھ کشید کیا ہے۔ انقلاب اور آزادی کے وحشت انگیز نعروں کی کوکھ سے نغموں اور ٹھمکوں نے بھی جنم لیا ہے۔ بہت سوں نے حکومت مخالف تحریک سے برآمد ہونے والی تفریح کو سرپرائز سمجھ کر آنکھوں سے لگایا ہے اور چُوم کر دِل میں بسایا ہے! ایسے میں دُعا کرنی چاہیے کہ سراج الحق اور اُن کے ہم خیال اصحاب کی پُرخلوص کاوشوں کے بطن سے کوئی سرپرائز ہویدا نہ ہو۔ قوم کو جمہوریت اور جمہوری روایات کا استحکام درکار ہے، محض دل

بہلانے والا سرپرائز نہیں ! کوشش کی جائے کہ دھرنوں کے خاتمے کو قوم کسی ہنی مُون پیریڈ کے خاتمے سے تعبیر نہ کرے !

پیپلز پارٹی کا توپ خانہ

کنٹرول لائن پر جھڑپیں جاری ہیں مگر اِس سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ ملک کے اندر اہلِ سیاست کو اب کوئی کنٹرول لائن یاد ہے نہ سرحد۔ مُنہ کی توپوں کے دہانے ایسے کُھلے ہیں کہ بیانات پر بیانات داغے جارہے ہیں۔ ع

وہ پَو پھٹی، وہ کرن سے کرن میں آگ لگی

کا سماں ہے۔ میڈیا کے محاذ پر ایک دوسرے کی پچھاڑنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ لگن کا یہ عالم ہے کہ سب کا حافظہ جواب دیتا جارہا ہے۔ جس سے سیاست نے ایک دوسرے کا مُنہ نہ دیکھنے والوں کو ملایا تھا وہی سیاست اب ایک بار پھر اُنہیں فاصلے سے رہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ سارا کھیل مفادات ہے۔ جب تک اپنا کام چل رہا ہو تب تک سب اچھا لگتا ہے۔ جہاں گوٹ پھنسی، اصلیت کھل کر سامنے آ گئی۔

دھرنوں کے چولھے سے پُھوٹنے والی چنگاریوں نے کئی جماعتوں کو لپیٹ میں لیا ہے۔ ڈی چوک کا محاذ اُٹھ کر پہلے مُلتان پہنچا اور اب سندھ تک آگیا ہے۔ ’’فطری اتحادیوں‘‘ یعنی پیپلز پارٹی اور متحدہ قومی موومنٹ میں ٹھن گئی ہے۔

پیپلز پارٹی کی توپیں عرصے سے خاموش تھیں۔ ڈی چوک کا شکریہ کہ مُنہ سے گول کرنے والے ڈی میں داخل ہو کر گول کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ حالاتِ حاضرہ پر لکھنے والے پیپلز پارٹی والوں کا شکریہ ادا کریں کہ وہ وقفے وقفے سے بیدار ہو کر چُپ کا روزہ توڑتے ہیں اور پھر اِتنا اور ایسا کہہ جاتے ہیں کہ تجزیوں کی ہانڈی میں پکا کر عوام ا کے سامنے پروسا جاتا ہے تو ''خوشبو'' ہی سے طبیعت ''تروتازہ'' ہو جاتی ہے

پیپلز پارٹی نے ہر دور میں ایسے لوگ دیئے ہیں جو مُنہ کی توپ سے گولے داغ کر دشمنوں کے قلعے مِسمار اور میڈیا والوں کی روزی روٹی کے محل تعمیر کرتے آئے ہیں۔ چند برس پہلے تک ڈاکٹر ذوالفقار مرزا کے زورِ بیان کا عہدِ شباب تھا۔ وہ جب بولتے تھے تو عوام اپنے دِل اور لکھنے والے قلم تھام لیا کرتے تھے۔ اُن کا ایک بار کا کہا کئی دن کام آتا تھا۔ مگر پھر یہ ہوا کہ اُنہیں دشمنوں کی نظر کھا گئی۔ ایسے بیمار پڑے کہ زبان کی صحت بھی دم توڑ گئی۔

فوزیہ وہاب بھی بیان داغنے کے کام میں کسی سے کم نہ تھیں۔ ٹی وی کے ٹاک شوز میں مخالفین کے سامنے ڈٹ جانا اُنہیں خوب آتا تھا۔ مرحومہ بھی ایسا بولتی تھیں جو لکھنے کے جاں گُسل مرحلے کو آسان کر جاتا تھا۔ بُرا ہو حاسدین کا

جن کی بُری نظر نے فوزیہ وہاب کی زبان ہی نہیں، پورے وجود کو ڈس کر اُنہیں دنیا سے رخصت کر دیا۔

تین چار سال قبل پیپلز پارٹی نے میڈیا کے محاذ پر منظور وسان کو متحرک کیا۔ پیپلز پارٹی میں جوش کے ہاتھوں ہوش کھونے والوں کی کمی نہیں۔ مگر منظور وسان خاصے دانش مند قسم کے جیالے ثابت ہوئے۔ موصوف نے ہر ایسی ویسی بات کو بیان کرنے اور ردِ عمل سے بچنے کے لیے خوابوں کا سہارا لیا۔ ہر بات کو خوابوں کے سَر منڈ ھنے کا فائدہ یہ تھا کہ پیش گوئی یا تجزیہ غلط ثابت ہونے پر موردِ الزام ٹھہرایئے تو خوابوں کو ٹھہرایئے۔ ع

صاف چُھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

والا انداز منظور وسان کو بہت سے بکھیڑوں سے بچا گیا۔

خورشید شاہ صاحب کی اب اگرچہ عمر نہیں رہی کہ کسی مناقشے میں پڑیں مگر وہ بھی بیان بازی کے محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ قومی اسمبلی کے فلور پر اُنھوں نے باتوں کی چنگاریوں سے کشیدگی کے بُھوسے میں آگ لگانے کی بھرپور کوشش کی۔ اُن کا دم خم دیکھ کر مخالفین چند لمحوں کے لیے تو سکتے میں آ گئے۔ شاہ صاحب جذبات کی رَو میں بہتے ہوئے اِتنا کچھ کہہ گئے کہ تجزیہ کاروں اور کالم نگاروں کی چاندی ہو گئی۔

شرجیل انعام میمن اور شرمیلا فاروقی نے بھی بیان بازی کی دیگ میں حصہ ڈالنے

کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اِن دونوں نے بھی خود کو پیپلز پارٹی کے توپ خانے کی فعال اور کارگر توپ ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ڈیڑھ دو سال سے شرجیل میمن کو فرنٹ پر رکھا جارہا ہے۔ کہیں سے کسی مخالف بیان کی چڑیا اُڑتی ہوئی آئے تو اُسے مار گرانے کی ذمہ داری شرجیل میمن کے سَر ہے۔ مگر اُن کا کردار چڑیوں کے شکار تک محدود نہیں، کبھی کبھی وہ عُقابوں سے بھی بِھڑ جاتے ہیں!

شرمیلا فاروقی دھان پان سی ہیں مگر بولنے میں کسی سے کم نہیں۔ ہم جیسے تو منتظر ہی رہتے ہیں کہ اُن کے ہونٹوں سے کچھ "پُھول" جَھڑیں اور ہم قلم سے مزید کچھ گُل کِھلانے کی راہ پائیں!

ایسا لگتا ہے کہ شرجیل میمن اور شرمیلا فاروقی کا بیڈ لک خراب چل رہا ہے! اِن دونوں کو ہٹا کر اب پارٹی کے سربراہ بلاول زرداری میدان میں، بلکہ فرنٹ پر آگئے ہیں۔ یا یُوں کہا جاسکتا ہے کہ بلاول فرنٹ پر لائے گئے ہیں۔ دو ڈھائی ماہ سے "اسکرپٹ" کی بحث چِھڑی ہوئی ہے۔ دوسروں کا تو ہمیں پتا نہیں، ہاں بلاول کے معاملے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسکرپٹ کے مطابق بولتے ہیں۔ اُنہیں دیکھ اور سُن کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسکرپٹ کے مطابق کس طرح بولا جاتا ہے!

کوئی بے وقوف ہی یہ سوچے گا کہ بلاول جو مُنہ میں آ رہا ہے، بول رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ بلاول وہی بول رہے ہیں جو اُن کے مُنہ میں ڈالا جارہا ہے ! صاف محسوس کیا جاسکتا ہے کہ کوئی اُن کی زبان کی ڈور ہلا رہا ہے۔ یعنی ع

وہی" معشوق ہے اِس پردہ رنگاری میں "

بلاول نے اپنی ہی پارٹی میں بہت سوں کے پیٹ پر لات مار دی ہے۔ ایک تو اُٹھتی جوانی اور پھر اُس سے بھی زیادہ اُٹھتا ہوا جوشِ خطابت۔ جذبات کی شِدّت ایسی کہ جب وہ بولتے ہیں تو عمر سے چار پانچ سال بڑے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ چہرے پر بچپن اور لڑکپن اب تک سلامت ہے۔ بھرپور جوانی آیا چاہتی ہے مگر بچپن کی سادگی ہے کہ جایا نہیں چاہتی ! بلاول کا اُردو نہ جاننا اُن کے فنِ خطابت کو دو آتشہ کرگیا ہے۔ جو لکھ کر دیا جائے، بول جاتے ہیں۔ جب آڈینس کا رسپانس بتاتا ہے کہ وہ کچھ ایسا ویسا بول گئے ہیں تب اُن کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ خطاب کرنے لگتی ہے ! بہت سے لوگ باقی سب کچھ چھوڑ کر یہی تماشا دیکھنے پی پی پی کے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں !

کل کے بچے کو بہت خوبصورتی سے "لانچ" کردیا گیا ہے۔ پیپلز پارٹی کی فلم میں بلاول کی انٹری بھرپور رہی ہے۔ سیاسی فلم کے پہلے ہی فریم میں اُنہیں

قومی سیاست کے نو گزے پیروں سے بھڑا دیا گیا ہے۔ بلاول نے اپنی زبان سے جو دھما چوکڑی مچائی ہے اُس کی پُشت پر یہ ''فلسفہ'' کام کر رہا ہے کہ سیاست کے بڑے بلاول کی باتوں کے جواب میں کچھ کہنے سے گریز کریں گے کہ کل کے بچے کو کیا جواب دیں۔ اور اگر چھوٹے میاں کبھی کچھ زیادہ ہی بول جائیں تو یہ کہتے ہوئے جان چُھڑائی جاسکتی ہے کہ یہ تو بچہ ہے جی، زبان کا کچّا ہے جی!

پیپلز پارٹی کا توپ خانہ فُل سوئنگ میں آتا جا رہا ہے۔ بلاول زرداری نے آرٹلری کمانڈر کا منصب اختیار کرتے ہوئے مخالفین کے شکون کا بیڑا غرق کرنے کا بیڑا اُٹھالیا ہے۔ پیپلز پارٹی میں ''مُنہ کی کھانے والے'' فی الحال مُنہ کی کھائے بیٹھے ہیں یعنی اپنے کمانڈر'' کے احترام میں خاموش ہیں۔ بلاول کی ''گلابی'' اُردو نے قوم کو وہ زمانہ یاد'' دلا دیا ہے جب اُن کی والدہ بھی ایسی ہی معصوم سی اُردو میں اظہارِ خیال فرما کر بہت سے ہونٹوں کے لیے مسکراہٹ کا سامان کیا کرتی تھیں! پیپلز پارٹی کے پردۂ زنگاری میں بیٹھا ہوا ''معشوق'' جو اسکرپٹ تحریر کر رہا ہے وہ ایک بچے کو وقت سے بہت پہلے بالغ بنا رہا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے چُوزے کو انتہائی طاقتور فیڈ دے کر تین ہفتوں میں مُرغے میں تبدیل کر دیا جائے! اِس حرکت کو کسی بھی طور بالغ نظری قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ہم جیسے بہت سے قلم باز تو چاہیں گے کہ

بلاول روز کچھ کہیں اور قلم گھسیٹنے کی سبیل نکلے مگر بلاول پر ترس آتا ہے کہ جو عہدِ جوانی اُنہیں مغرب کے رنگین گلیاروں میں ہیلووین پارٹیز کو انجوائے کرتے ہوئے گزارنا چاہیے وہ پاکستانی سیاست کے خارزاروں میں گزارنا پڑ رہا ہے! ہیوی ویٹس کے مقابل فیدر ویٹ کو رِنگ میں اُتارنا خاصی اور خالص گھریلو قسم کی بے ایمانی ہے!

کچّی شراب کا فسانہ

عید الفطر پر کراچی کے ساحل نے درد رجن سے زائد افراد کو نگل لیا تھا۔ عید الاضحیٰ پر یہ کام کچّی شراب نے کر ڈالا۔ جسے لوگ کچّی شراب کہتے ہیں وہ کام پکّا کرتی ہے۔ بندے کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی۔ جان بچ بھی جائے تو بینائی جاتی رہتی ہے۔ یا پھر سماعت کا بھرم ختم ہو جاتا ہے۔

سندھ کے وزیر اعلیٰ بہت معصوم ہیں۔ ہر معاملے کو وہ بچوں کی سی سادگی سے لیتے ہیں اور اچھے خاصے بحران کے غبارے میں ایسی پِن مارتے ہیں کہ وہ پھُوٹ کر غائب ہو جاتا ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ کچّی شراب پینے والے معصوم لوگ تھے، اُنہوں نے عید الاضحیٰ پر تھوڑا سا شوق پورا کیا۔ اور یہ کہ ہم تو اُنہیں بھی شہید ہی کہیں گے! سید قائم علی شاہ نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ جن لوگوں نے عید الاضحیٰ پر خوشی منانے کے لیے کچّی شراب کا سہارا لیا اُنہیں ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ محض معطّلی کافی نہیں، ذمہ داران یعنی کچّی شراب بیچنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

آپ نے کیا محسوس کیا یہ ہمیں معلوم نہیں، ہم تو شاہ صاحب کا یہ بیان پڑھ کر چکرا گئے۔ کَچّی شراب پی کر مرنے والوں کے لیے شہید کا رُتبہ! ایسا کچھ بھی کہنا ہما شُما کا کام نہیں۔ اِتنی بات کہنے کے لیے اِنسان کے سینے میں جیالے کا جگرا چاہیے! اور 87 سال کی عمر میں بھی اِس قدر جیالا پن کچھ شاہ صاحب ہی پر پَھبتا ہے! یہ بھی خوب رہی کہ عید پر معصوم لوگوں نے کچھ شغل میلہ کیا، شوق پورا کرلیا تو کیا ہوا۔ کَچّی ہو یا پَکّی، کسی بھی طرح کی شراب بیچنا انتہائی قبیح فعل ہے۔ مگر شراب پینا بھی کیا کم قبیح فعل ہے؟ اپنے ہی گلے پر چُھری پھیرنے والوں کو سادہ و معصوم قرار دے کر پورے معاملے سے اپنی جان چُھڑانا کہاں کی دانش ہے؟ اگر شراب پینے والے معصوم تھے اور بھولپن میں اپنے آپ پر یہ قیامت گزار گئے تو شراب بیچنے والوں کے خلاف کارروائی کس کھاتے میں کی جائے گی؟ ایک طرف تو کَچّی شراب پی کر جان سے ہاتھ دھونے والوں کو شہید قرار دینا اور دوسری طرف کَچّی شراب بیچنے والوں کے خلاف کارروائی کا عندیہ! ع

ناطقہ سر بہ گریباں ہے، اِسے کیا کہیے!

مرزا تنقید بیگ بھی "نشئی" ہیں مگر اُن کا نشا تا حال چائے تک محدود ہے۔ اگر کبھی طبیعت زیادہ جوش مارتی ہے تو بھابی سے کافی کی فرمائش کرتے ہیں۔

مگر اِس کے لیے پہلے وہ بھابی کے مُوڈ کا اندازہ لگاتے ہیں کیونکہ بھابی کو کافی کی تلخ بُو سے شدید نفرت ہے!

ہم نے جب مرزا سے کَچّی شراب کا ذکر کیا تو کہنے لگے۔ ’’ہمیں تو کَچّی شراب حکومت کی سازش معلوم ہوتی ہے۔ غریبوں کا جینا مشکل ہے اِس لیے اُن کا مرنا آسان کیا جارہا ہے۔ اور پھر اِس زہریلی شراب کے پینے سے مرنے والوں کو شہید ٹھہرانا! شاہ صاحب کے اِس بیان میں سادگی و معصومیت بھی ہوگی مگر اُس سے بڑھ کر تو کَچّی شراب پینے والوں کے لیے تحریک ہے کہ شوق پُورا کریں اور اِس یقین کے ساتھ جان دیں کہ اُن کا کفن سفید نہیں رہے گا، اُس میں تقدس کا رنگ شامل کردیا جائے گا!‘‘

عید الاضحیٰ کے مبارک موقع پر جن لوگوں نے شراب ایسی قبیح چیز سے شوق پُورا کرکے جان دی اُن کا معاملہ تو اللہ کے ہاتھ ہے مگر ہمیں حیرت اِس امر پر ہے کہ اِس ملک میں طرح طرح کے نشوں کے ہوتے ہوئے کَچّی شراب کا اِضافی نشا پالنے کی ضرورت کیا ہے۔ اور عید الاضحیٰ کے ایام میں قربانی کا نشا کیا کم ہوتا ہے کہ کوئی اور نشا تلاش کرکے سَر اور حواس پر سوار کیا جائے؟

کون سا نشا ہے جو معاشرے کی نَس نَس میں سِکّہ رائج الوقت کی طرح بسا ہوا

نہیں؟ کئی زمانے گزر گئے ہیں مگر حب الوطنی کا راگ الاپنے کا نشا ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ یاروں نے حب الوطنی کا راگ الاپنے ہی کو حب الوطنی سمجھ لیا ہے!

بے عملی کا نشا بھی وہ ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ایک بار یہ نشا چڑھ جائے تو اُترنے کا نام نہیں لیتا۔ اور جس پر چڑھ جائے وہ بھی اُترنے نہیں دیتا۔ کچھ نہ کرو اور جیے جاؤ۔ زندہ رہنے کا اِس سے سکون بخش اور پائیدار طریقہ کون سا ہو سکتا ہے؟

ہمارے معاشرے کو جن نشوں نے پوری قوت کے ساتھ گرفت میں لے رکھا ہے اُن میں بے حِسی کا نشا بھی نمایاں ہے۔ حکمرانوں پر تو یہ نشا سوار رہتا ہی ہے، جن پر حکومت کی جا رہی ہے وہ بھی اِس نشے میں غرق ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کسی معاملے میں کسی بہتری کے آثار نہیں۔ گویا ع

دونوں طرف ہے آگ برابر "لگی" ہوئی!

کبھی کبھی بے حِسی میں بے حواسی بھی مل جائے تو نشا دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ فراز نے کہا ہے ع

نشّہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

حکومت کرنے کا نشا بھی وہ ہے کہ چڑھ جائے تو کسی طور اُترنے کا نام نہیں لیتا۔ جس پر
یہ نشا چڑھ جائے وہ سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی اقتدار کی بوتل کو سینے اور مُنہ سے لگائے
رکھنا چاہتا ہے۔ انسان اپنے اہل خانہ کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے مگر اقتدار اور حکمرانی کا
!نشا وہ ہے کہ اہل خانہ کو بھی چٹ کر جاتا ہے

ایک نشا غلامی کا ہے جس میں ہم صدیوں سے غرق ہیں۔ جب بھی اِس کا زور ٹوٹنے لگتا
ہے، ہم مزید چند جام لُنڈھا کر اِس نشے کی گہرائی اور گیرائی میں اضافہ کر بیٹھتے ہیں۔
دو نشے ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے مخالف ہیں مگر لوگ دونوں سے ایک ساتھ
لطف'' کشید کرتے ہیں۔ ایک نشا احساسِ برتری کا ہے اور دوسرا احساسِ کمتری کا۔''
احساسِ برتری کا نشا اِس لیے کہ لوگ مَرعوب ہو کر جُھکیں اور سلام کریں۔ اور احساسِ
کمتری کا نشا اِس لیے کہ اگر ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑے تو ''ضمیر'' کی عدالت میں کھڑے
!ہو کر اپنی تمام ناکامیوں کو درست ثابت کرنے کے لیے ٹھوس دلائل دیئے جا سکیں
اِتنے سارے اور چنگے نشوں کے ہوتے ہوئے لوگ پتا نہیں کِس نشے کی خاطر

کچّی شراب کو مُنہ لگاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو لوگ شراب پی کر نشے میں گم رہنا چاہتے ہیں وہ اِتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ تو پہلے ہی سے نشے میں غرق ہیں۔ ٹھیک ہے، شراب پینے سے نشا ہوتا ہے مگر شراب پینا بھی تو ایک نشا ہے!

اور پھر ایسی بھی کیا بے تابی کہ ذرا سے نشے کے لیے زندگی کے نشے کا طوق گردن سے اُتار پھینکا جائے؟ جو چیز خود کچّی ہو وہ پکّا اثر کیسے پیدا کر سکتی ہے؟ ایک ذرا سے نشے کے معاملے میں اِتنا کچّا پن! جگر مراد آبادی کے شاگردِ رشید حبابؔ ترمذی نے خوب کہا ہے

ے

حبابؔ! ایسی بھی کیا بے اعتمادی
ڈبو دے گی ہمیں موجِ نفس کیا؟

اور پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ جیتے جاگتے انسان میں زندگی کا نشا اِس قدر مُحکم ہوتا ہے کہ مزید کسی نشے کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔ کیا نشا کرنے والوں نے سُنا نہیں کہ ع

نشا شراب میں ہوتا تو ناچتی بوتل!

اور مے پرستی کا مزا کب آتا ہے؟ مے میں بھی مستی ہوتی ہوگی مگر کندن لعل سہگل کی گائی ہوئی فلم ''یہودی کی لڑکی'' کی ایک غزل میں یہ خوبصورت شعر

بھی شامل ہے۔

مے پرستی کا مزا جب ہے کہ ساقی کہہ اُٹھے

!مے میں وہ مستی کہاں جو میرے مستانے میں ہے

اور آخر میں ایک ''دانش مندانہ'' مشورے کا ذکر جسے سُن کر ہم پھڑک اور بھڑک اُٹھے۔ ہم روزنامہ دنیا کراچی کی مین نیوز ڈیسک پر کچّی شراب سے ہلاکتوں کی خبر کو فائنل ٹچز دے رہے تھے کہ کرائم رپورٹر عاطف رضا بھی سامنے آ بیٹھے۔ ہم نے یونہی پُوچھ لیا کہ کچّی شراب کا معاملہ ہے کیا۔ موصوف نے کچّی شراب کے اجزائے ترکیبی گنوانے کے بعد ہم سمیت وہاں موجود تمام احباب کو ''مشورہ'' دیا کہ بھائیو! کبھی بُھول کر بھی کچّی شراب مت پینا! (یعنی یہ کہ پینا تو پکّی، برانڈیڈ پینا!) اِس خالص تکنیکی'' مشورے پر جب لوگوں نے قہقہے لیے تو عاطف رضا بھی اُسی طرح غائب'' !ہوئے جس طرح شرابی پر بالٹی بھر پانی پھینکنے سے اُس کا نشا غائب ہو جایا کرتا ہے

ایک دن کا ہفتہ

ایک زمانے سے ہم یہ تماشا دیکھ رہے ہیں کہ دنیا بھر میں کام ہو رہا ہے اور ہمارے ہاں کام سے بچنے ہی کو کام کا درجہ دیا جاچکا ہے۔ اہل جہاں رات دن کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ اگر پوچھیے کہ بھائی! رات دن کام کیوں کرتے رہتے ہو تو جواب ملتا ہے زیادہ کام اِس لیے کرتے ہیں کہ زیادہ آرام ملے۔ ہم اب تک سمجھ نہیں پائے کہ زیادہ کام کرکے کوئی کس طرح آرام کرسکتا ہے۔ آرام تو اُسی وقت نصیب ہوتا ہے جب کام کم کیا جائے۔ تو کیا دُنیا بھر میں اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے؟

دنیا کی امیر ترین شخصیات میں سے ایک میکسیکو کے بزنس ٹائیکون کارلوس سلِم (Carlos Slim) نے مشورہ دیا ہے کہ دُنیا کو پریشانیوں سے بچانے کا ایک اچھا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے زیادہ کام نہ لیا جائے یعنی اُنہیں زیادہ سے زیادہ آرام کا موقع دیا جائے۔ کارلوس سلِم کا مشورہ ہے کہ ورکنگ ویک یعنی کام کا ہفتہ تین دن کا ہونا چاہیے۔ اُن کے مشورے کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ ہفتے میں صرف تین دن کام کیا جائے اور باقی چار دن آرام۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو پُرسکون زندگی بسر کرنے کا موقع اِسی طور دیا جاسکتا ہے۔

اِس ایک مشورے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ترقی یافتہ دنیا کے اعلیٰ ترین ذہن بھی سوچ کے معاملے میں ہم سے کتنے پیچھے ہیں۔ جن معاشروں نے بے انتہا اور ہوش رُبا ترقی کی ہے وہ آج پچھتا رہے ہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ترقی کو ہوش رُبا اِس لیے کہا جاتا ہے کہ پس ماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے لوگ یہ ترقی کے ثمرات دیکھ کر ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ بالکل غلط اندازہ ہے۔ ترقی معاشروں کے اعلیٰ ترین اب تک یہ نکتہ نہیں سمجھ پائے کہ اُن کی ترقی اگر ہوش رُبا ہے تو صرف اُن کے لیے ہے، ہم جیسوں کے لیے۔ ہمارے ہوش بھلا کیوں جاتے رہیں؟ ہمارے حواس سلامت ہیں۔ ہاں، ترقی یافتہ معاشروں کے لوگ ترقی برقرار رکھنے کے لیے ہوش کھوتے جارہے ہیں! غور کیجیے تو یہ خسارے کا سودا ہوا۔ ایسی ترقی کس کام کی جسے برقرار رکھنے ہی میں سب کچھ صرف ہوجائے، ہاتھ سے جاتا رہے؟

مرزا تنقید بیگ کو ترقی یافتہ معاشروں سے سخت چِڑ ہے۔ کیوں نہ ہو؟ مرزا کو دُنیا میں اگر کچھ عزیز ہے تو بس آرام۔ اور ترقی یافتہ معاشروں نے اِنسان سے آرام اور سُکون چھین لیا ہے۔ کام اور آرام کے تعلق کو سمجھانے کے لیے مرزا وہی دلائل بروئے کار لاتے ہیں جو تقریباً ہر ''ذی شعور'' پاکستانی کا وتیرہ ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ جو آرام اور سُکون رات دن محنت کرنے سے حاصل ہوتا ہو وہ محض دھوکا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی کایا کو گھِسنے کے بجائے کام

سے گریز کرکے آرام کی دولت بٹوری جائے! یہی سبب ہے کہ اُنھوں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر ڈھلتی عمر کو آرام کے آغوش میں ڈالنے کو ترجیح دی۔ آج وہ جس پُرسکون انداز سے آرام کرتے ہیں اُسے دیکھ کر لوگ (اپنے) دانتوں تلے اُنگلیاں دبا لیتے ہیں! ہم نے تو اُنہیں کئی بار مشورہ دیا ہے کہ کوئی نظر بٹّو لگالیا کرو، کہیں کسی مختی حاسِد" کی نظر نہ لگ جائے! مگر مرزا کو کچھ پروا نہیں۔ اُن کا قولِ فیصل ہے کہ " نظر کام کرنے والوں کو لگتی ہے، آرام کرنے والوں کو نہیں۔

زمانہ کس قدر پیچھے رہ گیا ہے اِس کا اندازہ یوں لگایئے کہ وہ ہم سے کام کے بارے میں کچھ سیکھنے کو تیار ہی نہیں۔ ہم نے تو کام کے بارے میں سوچنے ہی کو کام کا درجہ دے دیا ہے۔ دُنیا دیوانی ہے۔ بس کام کئے جارہی ہے۔ کام کے بارے میں سوچنے کی توفیق قُدرت نے اُسے دی ہی نہیں۔ رات دن کام کرنے سے کس طور بچا جائے، رات دن یہی سوچتے رہنا بھی پاکستانی معاشرے میں ایک نوعیت کا کام ہے! دُنیا ہے کہ مہم جُوئی پر تُلی رہتی ہے، سختیاں جھیلتی ہے تاکہ کام اچھے طریقے سے ہو۔ دُنیا میں اگر عقل ہو تو کبھی ہماری طرف آئے اور ہم سے سیکھے کہ کام کو آسان کیسے بنایا جاتا ہے۔

زمانے بھر میں یہ ایک تسلیم شدہ اُصول ہے کہ زیادہ سے زیادہ آرام دہ زندگی

بسر کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے۔ ہمیں حیرت ہے کہ یہ گھسا پٹا تصور دُنیا نے اب تک سینے سے لگا رکھا ہے بلکہ اِسے گلے کا طوق بنا رکھا ہے۔ اہلِ جہاں کو معلوم ہی نہیں کہ کچھ کئے بغیر بھی پُرسکون زندگی بسر کی جا سکتی ہے! اور اِس سے بھی بڑی حقیقت یہ ہے کہ کام کئے بغیر ہی زیادہ پُرلُطف زندگی بسر کی جا رہی ہے!

بہت سے پاکستانیوں کے ذہن میں یہ غلط تصور جڑ پکڑ گیا ہے کہ ہم ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ شاید نہیں جانتے کہ ہماری ذہنی ترقی جاری رہی ہے۔ ہم محض کام نہ کرنے کی منزل پر نہیں رُکے بلکہ اِس سے کئی قدم آگے بڑھ چکے ہیں۔ کچھ کئے بغیر جینا تو کسی نہ کسی طور کوئی بھی سیکھ سکتا ہے۔ کوئی ہم سے سیکھے کہ دوسروں کی محنت پر کیسے جیا جاتا ہے! اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ دوسروں کی محنت پر جینا کوئی بہت بڑا کارنامہ ہے تو آپ یقیناً غلطی پر ہیں۔ ہم اِس منزل کو بھی کب کا پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ کام سے محفوظ رہتے ہوئے پُرسکون زندگی بسر کرنے کے ہُنر کا درجۂ کمال یہ ہے کہ کچھ نہ کرنے کے باوجود سَر ''فخر'' سے بُلند کرکے جیا جائے!

کام نہ کرکے مزے کی زندگی بسر کرنے کے دیگر معاشروں میں بھی ہوں گے کہ یہ عالمگیر حقیقت ہے۔ مگر ہم نے اِس حوالے سے بہت سے ایسے تصورات متعارف کرائے

ہیں جو مزے کو خراب ہونے سے بچاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہاں بھی لوگ کام کرنے سے گریز تو کرتے تھے مگر دِل میں خلش بھی محسوس کرتے تھے۔ کچھ نہ کرنے کا دُکھ سا رہتا تھا۔ یہ بہت غلط بات تھی۔ کچھ نہ کرنے پر اگر خلش محسوس ہو تو یقین کرلیجیے کہ ضمیر اب تک سانس لے رہا ہے۔ ضمیر بھی عجیب آئٹم ہے۔ یہ غلط کام سے تو نہیں روکتا مگر اُس غلط کام کا سارا مزا کِرکِرا کردیتا ہے! پُرسکون زندگی بسر کرنے کی طرف جانا ہے تو پہلے قدم پر ضمیر کا گلا گھونٹ دیجیے۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو یہ قدم قدم پر سامنے آتا رہے گا، آئینہ دکھاتا رہے گا اور سارا مزا مِٹّی میں ملاتا رہے گا۔
کارلوس سلِم جیسے لوگ ترقی تو کرلیتے ہیں مگر اُنہیں یہ نہیں معلوم کہ پُرسکون زندگی کیسے گزاری جاتی ہے۔ معلوم ہو بھی کیسے؟ کام سے فُرصت ملے تو کچھ سوچیں! کارلوس سلِم کہتے ہیں کہ ہفتے میں تین دن کام ہونا چاہیے۔ وہ کیا جانیں کہ ہم ہفتے میں ایک دن کام کا تصور کب کا متعارف کراچکے ہیں۔ اور ایک دن کا کام بھی وہ جو چُھٹّی کے دن گھر میں بیوی کا ہاتھ بٹاتے ہوئے کرایا جائے! گویا کارلوس سلِم کے مشورے کے مقابل ہم پہلے ہی ایک دن کا ہفتہ متعارف کراچکے ہیں! افسوس کسی نے اُنہیں مطلع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

دوسرے معاشروں میں دفاتر کام کرنے کی جگہ ہوتے ہوں گے۔ ہم نے دفاتر کو تفریحی مراکز میں تبدیل کرکے دِل کا بوجھ اور ضمیر کی خلش دونوں کو دفن کردیا ہے! کام کرنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر ہم پر تنقید کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ کام نہ کرنا بھی کچھ سہل نہیں۔ اپنے آپ کو کام سے بچانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اچھا لکھنا جانتا ہو مگر پوری گارنٹی کے ساتھ بُرا لکھ کر دِکھائے! یہ ایسا میدان ہے جس میں پاکستانیوں نے بھرپور کامیابی کے کئی جھنڈے گاڑے ہیں۔ اور گاڑے ہی جا رہے ہیں۔ آپ نے بھی یہ کہاوت تو سُنی ہی ہوگی کہ کام کریں آپ کے دُشمن۔ ہم نے اِسے عمل کی کسوٹی پر سچ کر دکھایا ہے۔ یعنی اب ہمارے دُشمن ہی کام کر رہے ہیں۔ اب دُنیا بھر میں کام ہو رہا ہے تو کسی کو تو آرام کرنا ہی تھا سو آرام کرنے کی ذمہ داری ہم نے اپنے سَر لے لی ہے!

بس اب ع

دَھڑکن سے کہو خاموش رہے، دُنیا سے کہو آواز نہ دے

!بچپنے کا شباب، کیا کہیے

عمر کم ہو تو بہت سے کام نہیں ہو پاتے۔ کم از کم عمر کی حد تک پہنچنے سے پہلے کوئی شناختی کارڈ نہیں بنوا سکتا، ووٹ کاسٹ نہیں کر سکتا، سرکاری ملازمت حاصل نہیں کر سکتا۔ اور صدر یا وزیر اعظم نہیں بن سکتا۔ مگر بلاول بھٹو زرداری کے لیے کم عمر ہونا ایڈوانٹیج میں تبدیل ہو گیا ہے۔

آزادی کا راگ عمران خان نے الاپا ہے اور انقلاب کی راگنی ڈاکٹر طاہر القادری نے گائی ہے۔ لوگ منتظر ہیں کہ آزادی کے درشن ہوں اور انقلاب برپا ہو۔ لوگ بھلے ہی منتظر ہوں، ہم نے تو دونوں کے درشن کر لیے۔ پیپلز پارٹی نے حکمتِ عملی تبدیل کی ہے۔ سال خوردہ اور آزمودہ کار فائر برانڈ بیان بازوں کو ایک طرف ہٹا کر بولنے کے محاذ پر بلاول کو کھڑا کر دیا گیا ہے۔

ہماری سیاست کو نئے خُون کی ضرورت ہے مگر اب ایسی بھی کیا عجلت پسندی کہ نیا خُون متعارف کرانے کے نام پر کسی کی معصومیت ہی کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ بلاول کو فُل سوئنگ میں دیکھ کر 1974 کی فلم ''انمول'' کا ایک گانا یاد آ رہا ہے۔ جس کا مکھڑا کچھ یُوں تھا......

ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے؟

اجی پیار میں کیا رکھا ہے؟

کچھ کچھ ایسی ہی کیفیت بلاول کی بھی ہے۔ اُنہوں نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔۔بڑے صاحب نے یہ کیا غضب کیا کہ چھوٹے میاں کو ابھی سے میدان میں اُتار دیا۔ ایک طرف ہماری سیاست کا خارزار اور دوسری طرف بلاول کی اَدھ کِھلی کلی جیسی عمر! ع

ابھی آئے، ابھی بیٹھے، ابھی دامن سنبھالا ہے

اور سچ یہی ہے کہ بلاول نے ابھی صرف دامن سنبھالا ہے، ہوش نہیں۔ وہ ہوش کا دامن بھی سنبھال لیں مگر جوش اُنہیں ایسا کرنے نہیں دیتا۔ سیاست کے تیور تو ایسے ہیں کہ کوئی بھی، کسی بھی وقت داؤ پر لگ سکتا ہے۔ بہت سوں نے سیاست میں طبع آزمائی کی کوشش کی ہے مگر ع

! ہوش جاتے رہے تو ہوش آیا

کی عملی تصویر بن کر رہ گئے ہیں۔ ایک ذرا سی ٹائمنگ آؤٹ ہوئی اور بندہ گیا کام سے۔ بلاول کی لانچنگ دیکھ کر قدیم روم کا کولوزیم یاد آتا ہے جس میں غلاموں کو

بُھوکے اور بپھرے ہوئے شیروں سے ''لڑنے'' کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ بلاول کو بھی ایسے سیاسی تالاب میں پھینک دیا گیا ہے جس میں جبڑا کھولے، شکار کے منتظر مگر مچھوں کی بھرمار ہے۔

حالات کی روش دیکھ کر اور مصلحت کے تمام تقاضوں کو ذہن نشین رکھتے ہوئے بولنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ سیاست میں یہی ایک ہُنر حقیقت ہے، باقی سب افسانہ ہے۔ جسے بروقت اور برمحل بولنا آگیا، سمجھ لیجیے مُراد پاگیا۔

بلاول کے معاملے میں ظُرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ لکھا ہوا پڑھنے پر مجبور ہیں۔ اور ایسے معاملات میں کبھی کبھی بھرپور تفریحِ طبع کی راہ بھی ہموار ہوجایا کرتی ہے۔ جب ہم نے مرزا تنقید بیگ کی توجہ اِس نکتے کی طرف دلائی وہ تو ''بلاول نوازی'' پر اُتر آئے۔ کہنے لگے کہ سیاست کو نئے خُون کی ضرورت ہے۔ ہم نے کہا کہ عمران خان اور طاہرالقادری نے کوشش کی تھی کہ دھرنوں کی سرنج کے ذریعے سیاست کی رگوں میں تھوڑے سے نئے خُون کی ٹرانسفیوژن ہو مگر میاں صاحب نے ''کُکھ نہ ہِلیا'' والا معاملہ کردکھایا۔ ساتھ ہی ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ نیا خُون شامل کرنے کے معاملے میں کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ یہ کہتے پھریں کہ سیاست کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا ہے! یہ سُن کر مرزا پھٹ پڑے اور بولے۔ ''اب یہ بھی تم طے کروگے کہ سیاست کے لیے

نیاخُون کیسا ہو؟ میاں! ہوش کے ناخن لو۔ آزمائے ہوؤں کو آزماتے آزماتے ہم اب تھک چکے ہیں۔ کچھ تو نیا پن دکھائی دے۔ اور کچھ نہیں تو تر وتازہ چہرہ ہی سہی۔ بلاول لڑکپن اور شباب کے درمیان جُھولا جُھول رہے ہیں۔ اُن کی باتوں میں معصومیت بھی ہے اور چنگھاڑ بھی۔ آگ اور پانی کا یہ میل دیکھنے اور سُننے والوں کو خوب مزادے رہا ہے۔ اور ایک تم ہو کہ بس اعتراض کرنے ہی پر تُلے رہتے ہو۔"

ہم نے مرزا کو یاد دلایا کہ بلاول کے ابھی کھیلنے کُودنے کے دن ہیں۔ جواب آیا۔ "میاں! سیاسی خانوادوں کے برخوردار اِسی طور کھیلا اور کُودا کرتے ہیں۔ اُن کے لیے تو کارکنوں کا اجتماع ہی پلے گراؤنڈ یا ری کری ایشن ایریا ہوا کرتا ہے۔ تم جیسوں کو اُن کا کھیلنا بھی بُرا لگتا ہے۔"

ہم نے مرزا کو مزید یاد دلایا کہ ابھی تو بلاول کے سیکھنے کے دن ہیں، اُنہیں مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہے۔ اِس کے بعد ہی وہ بھرپور زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ مرزا مزید بھپرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "اور کتنا سیکھے گا بے چارا بچہ؟ اچھی خاصی تعلیم تو پا چکا ہے، اب ذرا تربیت بھی ہو جائے۔ اور یہ بھی تو دیکھو کہ بلاول کی تربیت کے پہلو بہ پہلو ہمارے لیے 'طربیت' کا سامان بھی ہے۔ پُرجوش جلسے کی سیپ سے اگر تفریحِ طبع کے چند

"! موتی بھی برآمد ہو جائیں تو کیا ہے

ہم نے مرزا سے کہا اللہ سے ڈریں۔ یہاں قوم پر بحرانی کیفیت سوار ہے اور آپ کو سیاست کے ذریعے تفریحِ طبع کی سُوجھ رہی ہے۔ مرزا نے پہلے جیسے ہی بپھرے ہوئے لہجے میں ہماری کلاس لی۔ "یہاں کون سا معاملہ ہے جس میں سنجیدگی رہ گئی ہے؟ ہر بحر کی تہہ سے تفنّن کے موتی ہی برآمد ہو رہے ہیں۔ ہر شخص ہر طرح کی کیفیت سے صرف دل بہلانے والے چند لمحات کشید کرنا چاہتا ہے۔ سیاسی جلسوں کے ذریعے عوام کا دل بہلانے کی روایت پیپلز پارٹی ہی کی متعارف کرائی ہوئی ہے۔ تحریکِ انصاف نے اِس 'تابندہ' روایت کو پروان چڑھا کر آگے بڑھایا ہے۔ اور اِس میں کون سی بُری بات ہے؟ سیاست کے ہاتھوں تھکن سے دوچار ہونے والے ذہنوں کو اگر سیاست ہی کے "ذریعے کچھ تفریح مل جائے تو اِس میں کسی کے باپ کا کیا جاتا ہے؟

مرزا ہمیشہ ہماری ہر بات کو غلط ثابت کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔ پھر بھلا اِس بار وہ اپنی روایت" کیسے بھولتے؟ ہم نے جب شِکوہ کیا کہ بلاول کا سیاسی تجربہ نہ ہونے کے برابر" ہے اور اِتنی بڑی سیاسی جماعت کا سربراہ بنا کر اُنہیں عملی سیاست میں لانچ کرنا دانش مندی کی علامت نہیں تو وہ جیالوں کے سے پُرجوش انداز سے بولے۔ "ہماری سیاست میں اب عمر کی کوئی اہمیت نہیں

رہی۔ تم اِس بات کو رو رہے ہو کہ بلاول میں ابھی لڑکپن ہے۔ یہ تو غنیمت ہے۔ ہمارے بہت سے بزرگ سیاست دانوں کا بچپنا اب تک نہیں گیا! اُس کی حرکتیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی جُھولے سے نکلے ہیں! لگتا ہے اُنہیں لڑکپن کی منزل تک پہنچنے میں بھی ابھی کچھ وقت لگے گا۔ ایسے میں بلاول لڑکپن کے ساتھ میدان میں آئے ہیں تو پریشانی کیوں؟ اور خوف کیسا؟ اور تجربہ کار بھی وہ ہو ہی جائیں گے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِنسان کچھ نہ کچھ سیکھ ہی جاتا ہے۔ اور بلاول کا تعلق تو اُس طبقے سے ہے جس میں لوگ سیکھے سِکھائے پیدا ہوتے ہیں۔ ذرا اِس معاشرے پر ایک نظر تو ڈالو۔ جو سیکھتا ہے وہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ اور جنہیں کچھ نہیں آتا سب کچھ اُنہی کے دامن میں سمٹ آتا ہے!"

ہم نے آخری اعتراض کا کارڈ پھینکا کہ بلاول اب تک اسکرپٹیڈ تقریریں کر رہے ہیں۔ مرزا نے فیصلہ کن انداز سے جواب دیا۔ "ارے بھائی! تم کب سمجھوگے؟ تم جس عمل پر اعتراض کر رہے ہو وہی تو مستقبل کی اصل سیاسی تیاری ہے۔ ہمارے ہاں اب سبھی کچھ اسکرپٹیڈ ہوتا ہے۔ اور سیاست بھی اِس ٹرینڈ سے مستثنیٰ نہیں۔ جب ہر طرف اسکرپٹ کی بات ہو رہی ہے تو بلاول کو اسکرپٹ کے مطابق لب کُشائی کی تربیت کیوں نہ دی جائے؟"

ہم بلاول کے خیر خواہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ سیاست کے خار زار سے دُور ہی

رہیں۔ مگر اللہ کو یہی منظور اور اِس قوم کو یہی پسند ہے کہ بلاول کا لڑکپن سیاست کی نذر ہو کر بچپنے میں تبدیل ہو۔ ے

یہ عجب انقلاب، کیا کہیے
بچپنے کا شباب، کیا کہیے !

انگور کا دانہ

ایک بار پھر سندھ کا سیاسی پینڈورا بکس کھل گیا ہے۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان مناقشے نے میڈیا پر رنگ جمانا شروع کر دیا ہے۔ بیانات و الزامات کی دیگ کو دَم دے کر تیار رکھا گیا تھا۔ اب حالات کا اشارا پاتے ہی اِس دیگ کا مُنہ بھی کھول دیا گیا ہے۔ جوش و جذبے کا گراف بلند ہوتا جا رہا ہے۔ ماحول کچھ اِس طرح بنا ہے کہ میڈیا والوں کی تو دِلی مُراد بر آئی ہے۔ اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ لکھنے اور بولنے والے کیا چاہیں؟ دو باتیں! اور یہاں تو باتیں ہی باتیں ہیں۔ اپنے طور پر کچھ لکھیں اور اندازے لگائیں، ہماری بساط کہاں؟ سیاست دانوں کے بیانات ہم ایسوں کے لیے خِرمن کا درجہ رکھتے ہیں۔ موقع پا کر ہم تھوڑی سی خوشہ چینی کرتے ہیں، کچھ لکھ مارتے ہیں اور آپ کی خدمت میں پیش کرکے اپنا کچھ بھرم رکھ لیتے ہیں!

اہلِ سیاست کا اِضافی کرم ہے، احسان ہے کہ اُنہوں نے ''باوثوق ذرائع'' تلاش کرنے کی زحمت سے بھی ہمیں چُھٹرا دیا ہے۔ اب ایسا کیا ڈھکا چُھپا ہے جسے طشت از بام کرنے کی خاطر کوئی مستند ذریعہ تلاش کیا جائے! سیاست کے بازار کی رونق جن کے دَم سے ہے اُنہوں نے سبھی کچھ تو بے نقاب کر ڈالا ہے۔

کنٹرول لائن اور ورکنگ باؤنڈری پر پاکستانی اور بھارتی فورسز کے درمیان جو صورتِ حال پائی جاتی ہے کچھ کچھ ویسی ہی صورتِ حال اب سندھ اسمبلی کے فلور پر بھی نمودار ہوئی ہے۔ الزامات کے گولے داغے جارہے ہیں۔ تُند و تیز بیانات کی ''بااشتعال'' فائرنگ سے ایک دوسرے کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ سیاسی لائن آف کنٹرول کا مسئلہ یہ ہے کہ اِس کی خلاف ورزی کے معاملے میں سبھی آؤٹ آف کنٹرول ہونے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ بیانات و الزامات کا کوئی کنٹرول ریٹ مقرر نہیں۔ فوجوں میں اِتنا شعور تو بہر حال پایا جاتا ہے کہ کب، کیا اور کتنا کرنا ہے!

سیاسی مناقشوں کو اگر ادبی پیرائے میں بیان کیجیے تو کیفیت کچھ یوں بنتی ہے کہ فریقِ اول نے اگر غزل ارشاد فرمادی ہے تو فریقِ ثانی جوابِ آں غزل کی مد میں دو غزلہ، بلکہ سہ غزلہ کہنے پر تُل جاتا ہے۔ سید خورشید شاہ نے ''مہاجر'' والا بیان داغا تو ایم کیو ایم بھی کمر کَس کر میدان میں آ گئی۔ ؎

غزل اُس نے چھیڑی، مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے تعلقات کی عمرِ رفتہ ضروری و غیر ضروری مناقشوں ہی سے تو بھری ہوئی ہے۔ ایک فریق کسی معاملے میں شکوہ کرکے ابتدا کرتا ہے تو فریقِ ثانی جوابِ شکوہ" کے نام پر ہوش کھو کر اِس ابتدا کو انتہا میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا" ہے۔ اِس کے بعد وہ تماشا کھڑا ہوتا ہے کہ دونوں طرف کے لوگ ذرا سی دیر میں اللہ سے پناہ چاہنے لگتے ہیں! کبھی کبھی پورے معاملے پر بیت بازی کا گمان ہوتا ہے۔ ہر فریق !کی کوشش ہوتی ہے کہ بدِ مقابل کا قافیہ تنگ کردے

پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کا تعلق ہر دور میں نشیب و فراز سے "آراستہ و پیراستہ" رہا ہے۔ اِس تعلق کی راہ میں متلوّن مزاجی کی کئی منزلیں گزر چکی ہیں۔ جُدائی کے بغیر ملن میں خاک لطف آئے؟ اور ملن ہی نہ ہو تو جُدائی کب تک سہی جائے؟ اپنے اپنے ووٹ رکھنے کے لیے دونوں جماعتوں نے سیاسی رزم آرائی کے intact بینک کو ہر حال میں کئی ٹرینڈز متعارف کرائے ہیں۔ اُنہیں خوب اندازہ ہے کہ پیاس کب کتنی بھڑکانی ہے اور کب کتنی بُجھانی ہے۔ دونوں طرف کے لوگ بھی اپنی اپنی پارٹی کے مزاج آشنا ہو چکے ہیں۔ شدید اختلافات کو وہ اختلافات نہیں گردانتے یعنی زیادہ خوفزدہ نہیں ہوتے اور بھرپور ہم آہنگی سے بہلتے نہیں یعنی جانتے ہیں کہ ذرا سی دیر میں کیفیت یہ ہوگی کہ ع !خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

ہوا کا رُخ دیکھ کر لوگ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ غُبار کِدھر کا ہے اور کِس طرف جائے گا۔ میں تبدیل ہوگی اور کب اختلافات overdose سبھی جان لیتے ہیں کہ ہم آہنگی کب کے بچھڑے کو سینگوں سے پکڑ کر پچھاڑا جائے گا! اب ایک بار پھر وہی کیفیت پیدا ہو چلی ہے جو 1980 کی فلم "نقشِ قدم" کے ایک گانے کے ٹکڑے میں مرحومہ مہناز بیگم اور مرحوم اسد امانت علی خاں نے بیان کی تھی۔ ۔

ہم اِک دوسرے سے خفا ہو کے دیکھیں

! بہت مل چکے، اب جدا ہو کے دیکھیں

بیانات والزامات کی توپوں کے دہانے کھلے ہیں تو ایک بار پھر اٹکل کے گھوڑے دوڑانے والے سیاسی مبصرین کی چاندی ہو گئی ہے۔ ۔

نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی

مُجھے بخش دی آپ نے زندگانی

کا راگ الاپتے ہوئے لکھنے والے قلم کے گھوڑے دوڑانے میں اور بولنے والے زبان کے شعلے لپکانے میں مصروف ہیں۔

پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کا تعلق انگور کے دانے جیسا رہا ہے۔ تھوڑا کھٹا، تھوڑا میٹھا۔ کبھی کھٹاس بڑھ جاتی ہے اور کبھی مٹھاس باری لے جاتی ہے۔ کبھی کبھی جب یہ دونوں جماعتیں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے زیادہ دور ساتھ چلتی دکھائی دیتی ہیں تو "باپردہ" قوتیں حرکت میں آجاتی ہیں اور انگور کے دانے کو بادام کے کڑوے دانے میں تبدیل کردیا جاتا ہے! اور جب کبھی تلخیاں بہت بڑھ جاتی ہیں تب شیرینی کا گراف تھوڑا بلند کردیا جاتا ہے تاکہ متعلقین کی تمام اُمیدیں مایوسی کی تلخی میں غرق ہوکر نہ رہ جائیں!

پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے سیاسی رومانس کی داستان بہت عجیب ہے۔ ایک دوسرے بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی تاثر یہ دیا جاتا ہے جیسے وہ ایک دوسرے کو بالکل نہیں چاہتیں! ساتھ رہنا بھی ہے، ساتھ رہنے سے انکار بھی ہے۔ دونوں فطری حلیف اور ناگزیر اتحادی ہیں۔ جیسے دو اِنسانوں کا ایک دَھڑ ہو۔

سندھ اسمبلی میں گرما گرمی کا بازار ابھی گرم ہوا ہی تھا کہ سابق وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے انٹری ڈالنے کی کوشش کی۔ موصوف نے بہت چاہا کہ اُبال آنے سے پہلے ہی پتیلی کو چولھے سے اُتار لیں۔ نائن زیرو جاکر معاملات کو زیرو پر لاکر ڈی فیوز کرنا چاہا مگر ایم کیو ایم کی رابطہ کمیٹی نے رابطے پر رضامندی ظاہر نہ کی۔ سابق وزیر داخلہ فرماتے ہیں کہ فی الحال پارٹی یعنی

پیپلز پارٹی کے لوگوں کو بیان دینے سے روک رکھا ہے۔ بہت خوب! اگر واقعی ایسا ہے تو پھر یومیہ بُنیاد پر داغے جانے والے الزامی بیانات کس کھاتے ہیں ڈالے جانے چاہئیں؟ مزید فرمایا کہ گھروں میں تو ناچاقی ہوتی رہی رہتی ہے اور ناراضی بھی چلتی رہتی ہے۔ رحمٰن ملک کا ''استدلال'' سَر آنکھوں پر مگر وہ اِس امر کی بھی تو وضاحت فرمادیں کہ اِس ناچاقی اور ناراضی کا بُھگتان عوام کیوں کریں؟ سارے کام کس کھاتے میں رُکے ہوئے ہیں؟

سندھ میں پیپلز پارٹی کے اقتدار کا تسلسل برقرار ہے۔ پانچ سال مزے سے گزارے۔ اب پھر سوا سال گزر چکا ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ ؎

کوئی اُمید بَر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

عوام سوچتے سوچتے تھک چکے ہیں کہ یہ سیاسی بکھیڑا کب اور کیسے ختم ہوگا۔ جب اِنسان کے بس میں کچھ بھی نہیں رہتا تو وہ اپنے حال پر ہنس لیتا ہے۔ مگر اب یہ منزل بھی گزر چکی ہے۔ ؎

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی!

کچھ نئی بات نہیں۔ کم و بیش پچیس برس سے دو سندھ ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اور

جب ساتھ ساتھ ہی چلنا ہے تو ریل کی پٹڑیوں جیسا فاصلہ کیوں کہ مل ہی نہ سکیں؟ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے میں کیا ہرج ہے؟ دیہی اور شہری سندھ کے اسٹیک ہولڈرز کے لیے بہترین اور کارگر آپشن تو یہی ہے کہ پورے صوبے کے اجتماعی اسٹیک کا سوچیں۔ یہ سوچ آئے گی تو عوام کا سوچ سوچ کر پریشان ہونا ختم ہوگا۔ انگور کے دانے کو کڑوے بادام میں تبدیل ہونے سے روکنے کی پائیدار تدبیر ان فطری حلیفوں اور ناگزیر اتحادیوں کو مل کر کرنی ہے۔ ایسا نہ ہوا تو کوئی نہ کوئی تھرڈ پارٹی درشن دے گی۔ مگر یاد رہے کہ یہ تھرڈ پارٹی ہلانے نہیں، فرسٹ اور سیکنڈ پارٹی کو اپنے مقام سے ہٹانے، ہٹانے آئے گی!

خوابوں کی جنّت

پاکستانی معاشرے اور خوابوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کیوں نہ ہو؟ پاکستان بجائے خود ایک خواب کی تعبیر کی صورت منصۂ شہود پر نمودار ہوا۔ خواب عظیم تھا اور تعبیر عظیم تر۔ ہم نے خواب کو تو خیر بہت پہلے بُھلا دیا تھا، اب تعبیر کا بھی وہ حشر کیا ہے کہ اگر علامہ اقبالؒ کی روح کو اندازہ ہو جائے تو کہیں سے ٹائم مشین کا انتظام کریں اور اُس کے ذریعے ماضی میں جا کر وہ خواب ہی نہ دیکھیں جس کی تعبیر آج اُنہیں خُون آنسو رُلانے کے لیے کافی ہے!

خواب کیوں نہ دیکھے جائیں؟ جو کچھ بھی سنگین حقائق کی دُنیا میں ممکن نہیں وہ خوابوں کی حسین وادیوں میں ممکن سے بڑھ کر ہے۔ اِنسان زندگی بھر محنت کیوں کرتا ہے؟ زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانے کے لیے۔ خوابوں کے ذریعے اگر چند آسانیاں آسانی سے میسر آ جائیں تو خواب تو اچھے ہوئے نا!

ویسے تو ہمارے ہاں خواب کون نہیں دیکھتا مگر اپنے خوابوں کو بیان کرنے کا حوصلہ کم ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ منظور وسان اپنے خوابوں کو سات پردوں میں لپیٹ کر ایک طرف نہیں رکھ دیتے بلکہ بخوشی بیان کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھیے

رہنا چاہتے ہیں۔ منشاء غالباً یہ ہوتا ہے کہ in گا کہ وہ خوابوں کے ذریعے خبروں میں ایک عام آدمی سیاسی تبدیلیوں کو آسانی سے سمجھ لے۔ ہم منظور وسان صاحب کے احسان مند ہیں کہ باقاعدگی سے خواب دیکھتے ہی نہیں، بیان کرکے ہمارے لیے کچھ آسانی بھی پیدا کرتے ہیں۔ منظور وسان صاحب کے بیان کردہ خوابوں سے چند نکات کشید کرکے ہم قلم گھسیٹتے ہیں اور داد پاتے ہیں۔

منظور وسان فرماتے ہیں کہ اُنھوں نے خواب دیکھا ہے کہ عمران خان جلد دھرنا ختم کریں گے اور متحدہ بھی جلد دوبارہ سندھ حکومت کا حصہ بنے گی۔ ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ شیر کا شکار صرف پیپلز پارٹی کرسکتی ہے۔

پیپلز پارٹی میں اب ذہانت رکھنے والوں کی شدید کمی ہے۔ جوش میں ہوش کھونے والے بہت ہیں۔ منظور وسان کو داد دینا پڑے گی کہ وہ خواب دیکھنے کے معاملے میں بھی ہوش کا دامن نہیں چھوڑتے! یعنی بہت سوچ سمجھ کر، عین اُس وقت خواب دیکھتے ہیں جب تعبیر کی ضرورت ہی باقی نہ رہی ہو! سیاست نے منظور وسان کو بخوبی سکھا دیا ہے کہ اُتنا سوچو جتنا ضروری ہو اور اُتنے ہی خواب دیکھو جتنے ڈھنگ سے بیان کئے جاسکتے ہوں۔ منظور وسان اچھی طرح پکی ہوئی صورتِ حال کے خواب دیکھنے میں یدِطُولیٰ رکھتے ہیں۔

شریف امروہوی کو اِس بات پر اعتراض ہے کہ منظور وسان صوبائی وزیر جیل خانہ جات ہونے کے باعث خوابوں کی کال کوٹھڑی میں قید رہتے ہیں۔ آنکھیں کھول کر حقیقت کی فضا میں سانس لیں، آئینے میں اپنا سراپا دیکھیں تو کچھ اندازہ ہو کہ کتنے پانی میں ہیں۔ ہم نے شریف امروہوی کو منظور وسان کا تازہ ترین خواب سُنایا تو کہنے لگے۔ منظور وسان خوابوں کی کال کوٹھڑی میں ہیں اور خود اُن کی پارٹی غلط فہمیوں یا خوش'' فہمیوں کی سلاخوں کے پیچھے ہے۔ کارکن بھی خوابوں اور خیالوں کی منزل میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ ہمیں تو حیرت ہے کہ منظور وسان نرم و نازک اور بے ضرر قسم کے خواب کیونکر دیکھ لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب پیپلز پارٹی کا سُنہرا دور بھی خواب و خیال ہو کر رہ گیا ہے اور پارٹی کے بہت سے رہنما اپنے ہی کارکنوں کے لیے ڈراؤنے خواب میں تبدیل ہوگئے ہیں!'' شریف امروہوی صاحب کی ہر بات سے ہمارا یا آپ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ویسے ہمیں شریف امروہوی صاحب کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے کہ بعض حقائق بڑی روانی اور بے خوابانہ انداز سے بیان کرجاتے ہیں!

خواب تو شاہ سائیں یعنی سندھ کے وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ بھی دیکھتے ہیں۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ منظور وسان نیند کو زحمت دیتے ہیں جبکہ شاہ سائیں دِن کے اُجالے میں، کُھلی آنکھوں سے بھی خواب دیکھ لیتے ہیں! سیاسی روحانیت کا یہ بہت بڑا درجہ ہے۔

ابنِ انشاء نے اپنے مشہور اِنشایئے ''اُستادِ

محترم'' میں اپنے محترم اُستاد کے جو ''اوصاف'' گِنوائے ہیں اُن میں بیٹھے بیٹھے کچھ دیر کے لیے نیند کے مزے لینے اور پھر اُٹھ بیٹھنے کا ''کمال'' بھی شامل تھا۔ یہ ''خوبی'' اللہ نے شاہ سائیں کو بھی عطا کی ہے۔ وہ بھی دِن کے اُجالے میں، حالتِ بیداری میں بھی نہ صرف یہ کہ نیند کی مطلوبہ dose لے لیتے ہیں بلکہ اِسی دوران خواب بھی دیکھ لیتے ہیں۔ شاہ سائیں فرماتے ہیں کہ بھائیوں میں تو ناچاقی اور ناراضی چلتی رہتی ہے۔ ہم شاہ سائیں سے اختلاف کے اظہار کا تو حوصلہ نہیں رکھتے مگر اِتنا ضرور پوچھنا چاہیں گے کہ بھائیوں میں ناچاقی و ناراضی ضرور پائی جاتی ہے مگر یہ ضروری تو نہیں کہ موقع ملتے ہی ایک دوسرے کے لیے برادرانِ یوسفؑ ثابت ہونے کی کوشش کی جائے!

شیر کے شکار پر نکلنے والی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ منظور وسان نے وضاحت نہیں فرمائی کہ یہ محض بیان ہے یا اُنھوں نے ''باضابطہ'' خواب دیکھا ہے کیونکہ ایسا تو اب محض خواب ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ جو پارٹی اب خود معمولی درندوں کا شکار بنتی جارہی ہے وہ بھلا شیر کے شکار پر کیا نکلے گی؟ اور اگر شریف امروہوی صاحب کی طرح حقیقت بیانی سے کام لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ اب پیپلز پارٹی پنجرے میں بند شیر کو بھی آسانی سے شکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔

ہم منظور وسان صاحب کے خواب پر طبع آزمائی کر رہے تھے کہ شاہ سائیں کے بھارت کی ملنے والی سرحد سے ملحق علاقے نگر پار کرکے دورے کی خبر آئی۔ معلوم ہوا کہ اِس دورے میں اُنھوں نے پورا دن سو کر گزار دیا! خوراک کی قلت سے دوچار غریب عوام امداد کے منتظر رہے۔ شاہ سائیں خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے کے بعد بیدار ہوئے، مختصر خطاب کیا اور امداد تقسیم کئے بغیر ہی چل دیئے۔

چینلز پر یہ خبر پڑھ کر ہم سوچتے ہی رہ گئے کہ شاہ سائیں نے نگر پار کر میں خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹتے ہوئے کون سا خواب دیکھا ہوگا۔ شاہ سائیں اب عمر کے اُس مرحلے میں ہیں جہاں اُنہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیے۔ وہ جب بیداری کی حالت میں ہوتے ہیں تو خاصے ''باہوش'' انداز سے گفتگو یا خطاب کرکے سُننے والوں کے حواس لُوٹ لیتے ہیں۔ اور آنکھیں جاگتے رہنے پر آمادہ نہ ہوں تو شاہ سائیں خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کا کرم ہے کہ شاہ سائیں حواس یا پھر خوابِ خرگوش کے مزے لوٹتے ہیں، ورنہ آج کل تو اہلِ سیاست نے ملک کی ہر چیز کو لُوٹ کا مال سمجھ رکھا ہے!

منظور وسان خواب دیکھنے کے ٹاسک کا کچھ حصہ ''آؤٹ سورس'' کردیں یعنی شاہ سائیں تو دے دیں تو کچھ ہرج نہیں۔ ایک مثالی وزیر اعلیٰ ایسا ہی ہونا چاہیے

جو کسی بھی ٹینشن کو ذہن یا دل پر نہ لے اور حکومت کے اہم ترین اتحادیوں کے ناراض ہو جانے پر بے فکری و بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈٹ کر سوتا رہے۔ جب غالبؔ خستہ کے بغیر کام بند نہیں ہوئے تھے تو ایک شاہ سائیں کے ذرا سے سو لینے سے کون سی قیامت آ جائے گی!

سندھ میں پیپلز پارٹی اور متحدہ قومی موومنٹ کے تلخ و شیریں تعلقاتِ کار نے اب ہر ذی ہوش کے لیے لازم سا کر دیا ہے کہ آنکھیں بند کرکے اپنے تمام تمناؤں کی تکمیل کا خواب دیکھتا رہے۔ ترقی و خوش حالی کی منزل تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ بچا ہی نہیں۔ کوئی یہ نہ سوچے کہ وزیر اعلیٰ اور وزیر جیل خانہ جات خوابوں کی جنّت میں مزے کر رہے ہیں۔ عوام کو بھی اِس راہ پر گامزن ہونے سے کسی نے نہیں روکا۔ اُن کے لیے بھی intact خوابوں کی جنّت میں آباد ہونے کا آپشن موجود اور ہے۔ جس کا جی چاہے وہ اِس جنّت کی سَیر کرکے حالات کے جبر سے اُسی طور آزاد ہو سکتا ہے جس طور وزیر اعلیٰ اور اُن کے وزیر جیل خانہ جات آزاد ہو لیتے ہیں۔

عظمت اور پاگل پن

ذوق بھلے ہی بلند نہ ہو، مرزا تنقید بیگ کو مطالعے کا شوق بہت ہے۔ اور یہ شوق بے سُود بھی نہیں، اُنہیں بہت کچھ دیتا بھی ہے۔ وہ جو کچھ پڑھتے ہیں اُس میں سے کام کی چند باتیں اپنے مفاد میں بروئے کار لانے سے نہیں چُوکتے۔ جب کسی معاملے میں اُنہیں کوئی دلیل نہیں سُوجھتی تو مطالعے کے ذخیرے سے کوئی ہتھیار نکال کر مخالف کو مُنہ توڑ جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مختلف زبانوں کی کہاوتیں وہ خوب یاد رکھتے ہیں اور موقع کی مناسبت سے استعمال کرتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ مطالعے نے اُن کے ذہن کو کسی حد تک سیاسی کر ڈالا ہے۔

مرزا ایک زمانے سے بلا کے جُنونی ہیں۔ اور ہمارا جُنون بھی ملاحظہ فرمایئے کہ ہم اُنہیں طویل مُدت سے صرف جانتے ہی نہیں بلکہ اُن کی زندگی میں ہیں یعنی اُنہیں برداشت کر رہے ہیں! مرزا کی جُنون پسندی دیکھ کر لوگ دل تھامے رہ جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی اُنہیں شادی کی تقریب میں کھانے کی میز پر "سرگرمِ جُنوں" دیکھ لے تو دل کے ساتھ ساتھ اپنی خالی پلیٹ بھی تھام کر رہ جاتا ہے! مرزا جب کھا رہے ہوتے ہیں تب قابلِ دید بھی ہوتے ہیں اور قابل

داد بھی۔ ایسے میں لوگ اپنا پیٹ بُھول کر اُن کے پیٹ کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ اور محویت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ۔

لَوٹ کر پھر نظر نہیں آئی

اُن پہ قربان ہو گئی ہو گی!

مطالعے کے معاملے میں بھی مرزا میں وہی جُنون پایا گیا ہے جو کھانے کے معاملے میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ ''کثیر المطالعہ'' ہی نہیں بلکہ ''وسیع المطالعہ'' بھی ہیں یعنی علاقے میں ہیئر ڈریسرز کی دکانوں اور ہوٹلوں کے چکّر لگا کر کئی اخبارات پڑھتے ہیں۔ اخبار خوش نصیب ہے کہ اتوار کے اتوار اُسے خریدتے ہیں اور پورا ہفتہ چلاتے ہیں مگر کتابوں کے معاملے میں مرزا جیب ڈھیلی نہ کرنے کے جُنون میں مبتلا ہیں۔ مرزا ہاضمے کی دُرستی کے لیے کئی طرح کے چُورن پھانکتے رہتے ہیں مگر کتابیں ڈکارنے کے لیے اُنہیں کسی چُورن کی محتاجی اختیار نہیں کرنی پڑتی۔ کتابیں مستعار لے کر واپس نہ کرنے کا ہُنر مرزا میں پاگل پن کی شکل اختیار کر گیا ہے اور اب یہ ہُنر شاید اُنہی پر ختم ہے!

مرزا سے اُن کے مزاج کی کسی خصوصیت پر بات کرنا کبھی کبھی اپنے حواس کی موت کو دعوت دینا ثابت ہوتا ہے۔ اُن کے دماغ اور زبان کی گاڑی چل پڑے تو اُسے

بریک لگانا پھر اُن کے اختیار میں بھی نہیں ہوتا۔ ایک دن موقع غنیمت جان کر ہم نے مرزا سے پوچھا کہ بعض معاملات میں وہ اِس قدر جُنونی کیوں واقع ہوئے ہیں۔ مرزا، ہمارے اندازے کے برعکس، تھوڑا سا شرمائے اور خاصے انکسار آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک فرانسیسی کہاوت ہے کہ ہر عظیم اِنسان میں تھوڑا بہت جُنون ضرور پایا جاتا ہے۔''

ہم حیران رہ گئے کہ اُنھوں نے اپنے اُول جلول مزاج کے لیے کیسا خوبصورت جواز ڈھونڈ نکالا ہے۔ کس خوبصورتی سے اُنھوں نے اپنے پاگل پن پر فرانسیسی کہاوت کا پردہ ڈال دیا۔ جی چاہا کہ ہم مرزا کی ''ذہانت'' پر قربان ہو جائیں۔ مرزا یہ بات ہمیں ماضی کی سَیر پر لے گئی۔ بیس سال قبل ہم روزنامہ جسارت کی نیوز ڈیسک کا حصہ تھے۔ وہاں ایک پروف ریڈر شاہد الانوار روزانہ شیروانی زیبِ تن کر کے آیا کرتے تھے۔ ایک دن ہمارے میگزین ایڈیٹر راشد عزیز نے پوچھ لیا جناب ! آپ شیروانی کیوں پہنتے ہیں۔ شاہد الانوار صاحب نے جواب دیا۔ ''میاں ! یہ شُرفا کا لباس ہے۔'' اِس پر راشد عزیز نے کہا۔ ''اِسی لیے تو پوچھا ہے۔ شُرفا کا لباس ہے تو آپ کیوں پہنتے ہیں !''
ہمارے جی میں آیا کہ مرزا سے اِس معاملے پر بحث کریں مگر مشکل یہ ہے کہ کسی بھی موضوع پر بحث چھڑتے ہی مرزا ''عظمت'' کا ثبوت دینے لگتے ہیں یعنی پاگل

پن کے گھوڑے پر سوار ہو جاتے ہیں ! اور اِس گھوڑے کو ایڑ لگانے کے بعد وہ بہت دیر تک نیچے نہیں آتے، ہوا سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔

مرزا نے فرانسیسی کہاوت کے ذریعے عظمت کا جو معیار یا علامت بیانی کی ہے اُس کی رُو سے تو پاکستان میں تقریباً ہر دوسرا آدمی ''عظیم'' ہے ! ہمیں من حیث القوم اپنی عظمت سے محروم ہوئے کئی زمانے بیت چکے ہیں۔ اہل جہاں عظمت کے حصول کے لیے جُنون کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں اور ہم عظمتِ رفتہ کی تلاش میں پگلائے پگلائے پھرتے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اِس عمل کو بھی عظمت کے کھاتے ہیں ڈال رکھا ہے ! اب ایک مرزا کو کیا روئیں، یہاں تو پورا معاشرہ ہی خود کو عظیم ثابت کرنے کے لیے پاگل پن کے گھوڑے پر سَوار ہے۔ پاگل پن کا گھوڑا انٹ شنٹ دوڑ رہا ہے، اُچھل کُود بھی رہا ہے مگر ہم ہیں کہ اِس گھوڑے پر سے اُترنے کو تیار نہیں۔ گھوڑے میں دم ہے تو کسی کو گرا دے، مگر جو اُس کی پیٹھ پر بیٹھا ہے وہ اللہ کا بندہ اُترنے کا نام ہرگز نہ لے گا !

خود کو ''عظیم'' ثابت کرنے کے لیے کوئی کرپشن کو پاگل پن کی حد تک گلے لگائے ہوئے ہے۔ کسی کو ہر حال میں زیادہ سے زیادہ کمانے کے پاگل پن نے اپنے

شکنجے میں کَس رکھا ہے۔ کسی کے گلے میں بے حِسی کے پاگل پن کا طوق ہے۔ کوئی بے عملی کے پاگل پن کا دیوانہ وا اسیر ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگوں پر پڑھنے کا جُنون سوار تھا۔ اب نہ پڑھنے کا پاگل پن ہے کہ خُون کی طرح سَر پر سوار ہے۔ جس طرح سوفٹ ویئرز کے نئے ورژن آتے رہتے ہیں بالکل اُسی طرح پاگل پن کے مختلف ورژنز کے ذریعے خود کو ''عظیم'' ثابت کرنے کا رُجحان دن بہ دن ''جُنونِ اعظم'' کی شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔

جو لوگ عظمت کے نئے مینار تعمیر کرنے کے بجائے عظمتِ رفتہ بحال کرنے کی فکر میں غلطاں رہتے ہوں اُن کے فکر و عمل میں پاگل پن نہ در آئے تو پھر کیا ہو؟

جُنونی کیفیت کے ذریعے خود کو عظیم ثابت کرنے کا ہُنر اہلِ سیاست پر ختم ہے۔ آج کل اِس حوالے سے اپنی ''عظمت'' ثابت کرنے کی دوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ دھرنوں کا عظیم الشان جوش ماند پڑا ہے تو اب جلسوں کے جُنون نے جادو کی شکل اختیار کی ہے اور سَر چڑھ کر بول رہا ہے۔ دیکھنے اور سُننے والے دم بخود ہیں۔

کسی بھی سطح کی عظمت پر اِس سے بُرا وقت شاید کوئی نہیں ہو سکتا کہ اُسے

پاگل پن کے بطن سے برآمد کیا جائے یا پاگل پن کے ذریعے "پہنچوایا" جائے۔
اِس میں تو خیر کوئی شک نہیں کہ کوئی بھی نارمل اِنسان عظمت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ ہر عظیم اِنسان میں تھوڑا بہت جُنون ضرور پایا جاتا ہے۔ جُنون نہ ہو تو کوئی بھی اِنسان کوئی بڑا کام کیسے کرسکتا ہے؟ مگر جناب! اِسے اُصول یا بنیاد بناکر خود کو عظیم تو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ محض پاگل پن یا سَر پھرے پن کو جُنون قرار دے کر اُس کے بطن سے عظمت برآمد نہیں کی جاسکتی۔ ایسا کرنا تو نرا پاگل پن ہی شمار ہوگا۔ کیا کیجیے کہ لوگ اِس روش پر گامزن ہیں اور کسی نئی راہ پر چلنے کو تیار نہیں۔
دوسرے بہت سے شعبوں کی طرح لکھنے کا معاملہ بھی جُنوں کا اظہار کیے بغیر ممکن نہیں۔ جس میں جُنون نہ ہو وہ اچھا لکھ ہی نہیں سکتا۔ کبھی کبھی ہم نے بھی کوشش کی ہے کہ مرزا سے تھوڑا سا "اکتسابِ جُنوں" کرکے کچھ لکھ ماریں مگر بیشتر مواقع پر ناکامی ہی ہاتھ آئی ہے۔ خُدارا ہمارے لکھے کو پاگل پن یا پاگل پن کا نتیجہ نہ سمجھیے گا ورنہ مرزا یہ بات بھرپور جوشِ جُنوں کے ساتھ جگہ جگہ بتاتے پھریں گے۔ ہماری "بیزتی" خراب کرنے کا کوئی موقع ہاتھ آجائے تو اُن کا جوشِ جُنوں قابل دید بھی ہوتا ہے اور قابل داد بھی۔ لگتا

ہے وہ ایسے مواقع پر جھپٹا مارنے ہی کے لیے زندہ ہیں۔

جلسوں میں اٹکے !

سب کچھ بدل ڈالنے کی ہوا کچھ ایسی ادا سے چلی ہے کہ اب وباء کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ فرسودہ نظام کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے دعووں میں تھوڑا بہت دم ضرور ہے کیونکہ اسلام آباد کے ریڈ زون میں لگائے جانے والے خوش رنگ پودوں کی جڑیں اُکھڑ چکی ہیں، سبزے نے کچرے کے ڈھیر میں مُنہ چھپالیا ہے۔ احتجاج اور دھرنوں کی لالی چل دی ہے تو ریڈ زون کی ہریالی بھی رُخصت ہو چلی ہے۔ کل تک جو چیز جتنی خوبصورت تھی وہ اب اُتنی ہی بدنما دکھائی دیتی ہے۔ لوگوں کو یقین ہو چلا ہے کہ اب ملک میں کوئی نہ کوئی بڑی تبدیلی آ کر رہے گی کیونکہ ریڈ زون اپنی رنگت اور ''رونق'' سے محروم ہو چلا ہے۔

قوم نے سوچا تھا کہ دو چار کے دھرنے ہیں، ختم ہوں گے تو پھر وہی شب و روز ہوں گے۔ مگر دھرنے تو کھنچتے ہی چلے گئے۔ ریڈ زون میں جو کچھ ہوا وہ دنیا بھر کی توجہ پاکستان کی طرف منعطف کرنے کے لیے کافی تھا۔ اب ہم ایسے ہی معاملات کے ذریعے توجہ پا سکتے ہیں۔ دنیا حیران تھی کہ یہ کیسا ملک ہے جو اپنے دارالحکومت کو احتجاج کرنے والوں کے حوالے کرنے پر رضامند ہے۔ دھرنوں نے طول پکڑا تو قوم دست بہ دعا ہوئی کہ دھرنوں کا عذاب ٹلے تو کچھ بہتری

آئے، معاملات درستی کی طرف گامزن ہوں۔

قوم کی دعا قبول تو ہوئی مگر اِس طور کہ مزید دعاؤں کی ضرورت کو جنم دے گئی۔ اسلام آباد میں دھرنوں کا زور ٹوٹا تو قوم نے سکون کا سانس لیا مگر یہ سکون کا یہ سانس چند ساعتوں کے لیے تھا۔ ذرا سی دیر میں قوم کو اندازہ ہوگیا کہ دھرنوں کا زور ٹوٹا نہیں بلکہ اُس کی شکل بدل دی گئی ہے۔ احتجاجی تحریک کو کسی نہ کسی شکل میں ملک گیر بنانے کا عمل شروع کردیا گیا۔ جو احتجاجی فلم اب تک صرف ریڈ زون کے تھیٹر میں چل رہی ہے اُسے اب ملک بھر کے کھلے میدانوں اور اسٹیڈیمز میں ریلیز کردیا گیا ہے۔

نظام کو بدلنے کی دعویدار جماعتوں نے اب جلسوں کی راہ پر گامزن ہونے کی ابتدا کی۔ تحریک انصاف نے کراچی، لاہور اور ملتان میں کامیاب جلسے کئے ہیں۔ اِن جلسوں کی حاضری دیکھ کر عوامی تحریک کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ جلسوں کی راہ پر ڈاکٹر طاہرالقادری نے بھی فیصل آباد سے سفر کی کامیاب ابتدا کی ہے۔

دو سیاسی جماعتوں نے جب کامیاب جلسے کرلیے تو ظاہر ہے قومی سیاست میں ’’طاقت کا توازن‘‘ تو بگڑنا ہی تھا۔ اور اِسے درست کرنے کے لیے دوسروں کو بھی میدان میں آنا ہی تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ سیاست کا سارا ’’رونق میلہ‘‘ ایک بس تحریک انصاف یا عوامی تحریک کو لوٹنے دیا جاتا؟ لیجیے، جلسوں

کی ریس شروع ہو گئی۔ پیپلز پارٹی پر فرینڈلی اپوزیشن کا الزام اِس شدت اور تواتر سے لگایا گیا کہ حالات دیکھ کر اُس کے خون نے بھی جوش مارا اور اُسے بھی جلسے کی چھابڑی سَر پر سجائے اپنا مال بیچنے عوامی طاقت دکھانے کے بازار میں آنا پڑا ہے۔ کراچی کے جلسے کے لیے پیپلز پارٹی نے جو زبردست تیاریاں کی ہیں وہ بہت سے ذہنوں میں طرح طرح کے سوالات کو جنم دے رہے ہیں۔ سوال صرف جلسہ کرنے کا نہیں تھا، پیپلز پارٹی کو طاقت کا بھرپور اظہار کرنا تھا اور اظہار بھی ایسا کہ تحریک انصاف والے دانتوں تلے انگلیاں داب کر رہ جائیں اور قوم بھی حیران و پریشان ہو کر سوچے کہ پیپلز پارٹی کا "جلسائی" گراف کہاں جا پہنچا ہے!

قوم تبدیلی چاہتی ہے۔ سب کی خواہش ہے کہ اشرافیہ اپنی چال بدلے اور راستہ بھی۔ جو لوگ کم و بیش سات عشروں سے ملک پر حکومت کر رہے ہیں اور سیاہ و سفید کے مالک ہیں اُنہیں بہت سے معاملات میں احساس دلانے، کچھ یاد دلانے کی کوشش کی جارہی ہے مگر اِس کوشش کی قیمت اچھی خاصی ہے۔ ایک طرف وہ ہیں جن پر جمہوریت کو نقصان پہنچانے کا الزام ہے۔ اور دوسری طرف وہ ہیں جو جمہوریت کو بچانے کے دعویدار ہیں۔ ہاتھوں کی اِس لڑائی میں گھٹنے پِس رہے ہیں۔ عوام جاننا چاہتے ہیں کہ اُن کا قصور کیا ہے۔ اپوزیشن کی غزل اور حکومت کی طرف سے جوابِ آں غزل نے عوام کا قافیہ تنگ کر دیا ہے۔ سیاسی چکّی چل رہی ہے اور آپ کو بھی یاد تو ہوگا کہ کبیر داس کہہ گئے ہیں ع

دو پاٹن کے بیچ میں باقی بچا نا کوئے

مڈ ٹرم الیکشن کا امکان دکھائی دے رہا ہے نہ ری الیکشن کا، مگر موقع شناسوں نے انتخابی مہم شروع کر دی ہے۔ بڑبولے پن سے نام کمانے والے تبصرہ باز جلسوں کی بھرمار کو نئے انتخابات کی آمد سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ جلسوں کی تہہ سے انتخابات اُچھل کر دم لیں گے۔

لوگ حیران ہیں کہ یہ کیا اُفتاد آن پڑی ہے۔ اسٹریٹ پاور کا مظاہرہ کرنے پر کمربستہ جماعتوں نے چھوٹے بڑے شہروں کا ناطقہ بند کرنے کی قسم کھالی ہے۔ سبھی جلسوں کے محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ جن سے قوم کا تھوڑا سا بھی بھلا نہیں ہو پاتا وہ اسٹریٹ پاور دکھانے کے لیے جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کر رہے۔ جلسوں کی دوڑ شروع ہو چکی ہے اور کوئی بھی اِس دوڑ میں ایک قدم پیچھے رہنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ جلسوں کو ہر قیمت پر یعنی خاصی بھاری قیمت پر کامیابی سے ہمکنار کرنا سب سے بڑا سیاسی نصب العین ٹھہرا ہے۔ ہر جلسے کو قومی رنگ دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور یہ مجبوری بھی ہے۔ اگر مقامی طور پر زیادہ لوگ جمع نہ پا رہے ہوں تو دور افتادہ مقامات سے لوگ بلانے میں ہرج نہیں۔ ایسے میں پیسے کا منہ کون دیکھتا ہے۔ احتجاجی دریا کو ہر حال میں بہنا ہے۔ اور ۔

دریا کو اپنی موجوں کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
!

جلسوں کے لیے دوسرے صوبوں، بلکہ ملک بھر سے لوگ بُلائے اور لائے جا رہے ہیں۔ یہ ساری دھما چوکڑی دیکھ کر کبھی کبھی یونہی، بے وقوفانہ سا خیال ذہن کے پردے پر اُبھرتا ہے کہ سیاسی جماعتیں جتنی محنت جلسوں پر کر رہی ہیں اگر اُس کا دسواں حصہ بھی عوام کی خدمت پر صرف کریں تو اُن غریبوں کا کچھ بھلا ہو جائے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ ایسے خیالات ذہن میں اُبھرنے پر ہم اپنی نظر میں شرمندہ ہوتے ہیں اور سیاسی جماعتوں سے غائبانہ معافی مانگتے ہیں! اچھی خاصی سیاست میں عوام کی بہبود کا ذکر چہ معنی دارد؟ عوام کا بھلا کرنے کی نیّت ہے کس کی؟ اور اگر ہو بھی تو عمل کچھ اور ہی کہانی سُنا رہا ہے۔ پھر ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اگر نیّت درست ہے تو اُس پر عمل تکلیف دہ کیوں ہے؟ عوام کا بیڑا پار کرنے کے دعویدار مزید غرقابی کی راہ کیوں ہموار کر رہے ہیں؟ قوم کے لیے سہولتیں پیدا کرنے کی کوششیں مزید مشکلات کا مآخذ کیوں ثابت ہو رہی ہیں؟

قوم کا معاملہ تو یہ ہے کہ دھرنوں سے گری ہے تو اب جلسوں میں اٹک گئی ہے۔ کل تک دارالحکومت کا ریڈ زون جام تھا، اب ملک کے تمام چھوٹے۔بڑے شہر جام ہوتے جا رہے ہیں۔ اسٹریٹ پاور دکھانے کا جنون سیاسی جماعتوں کے سر پر یُوں سوار ہوا ہے جیسے آنکھوں میں خُون اُتر آیا ہو۔ ہر چیز کی کوئی نہ کوئی حد تو ہوتی ہی ہے۔ بے موسم کے جلسوں کی بھی کوئی نہ کوئی حد ضرور ہونی چاہیے۔ جلسوں اور جوابی جلسوں کے پاٹوں کے بیچ عوام کو کچلنے سے گریز کیا جائے۔ جلسے طاقت دکھانے کے لیے ہوتے ہیں مگر تب کہ جب ایسا کرنے کی ضرورت ہو۔ بے وقت راگنی سے لوگوں کی سماعت کا بیڑا غرق نہ کیا جائے۔ اسٹریٹ پاور کا کارڈ شو کرنے کے شوق میں عوام کا جینا مزید دُوبھر کرنے سے گریز کیا جائے۔ جو حکمرانی کے شوقین اور عادی ہیں وہ یہ تو سوچیں کہ جن پر حکمرانی کرنی ہے وہی نہ رہے تو حکمرانی کا شوق کہاں پورا کریں گے!

تھوڑا سا پاگل پن

کوئی مانے یا نہ مانے، عمران خان پاکستانیوں میں کسی حد تک سیاسی شعور پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ مگر معاملہ یہیں تک نہیں رُکا۔ تحریک انصاف کے چیئرمین اپنے اندر سیاسی جوہر پیدا کرنے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ نیا پاکستان بنانے کا دعویٰ اور اُسے عملی شکل دینے سے متعلق اقدامات پر بحث پھر کبھی سہی، عمران خان اپنی باتوں، بیانوں اور تقریروں سے مُرجھائے ہوئے ہونٹوں کو مُسکان عطا کرنے لگے ہیں۔ جس میں یہ وصف پیدا ہوگیا، سمجھ لیجیے اُس نے پاکستانی سیاست کے میدان میں بازی اپنے نام کرلی۔

عمران خان نے انتہائی معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ نیا پاکستان بنانے کے لیے تھوڑا سا پاگل پن ضروری ہے۔ موصوف نے یہ بھی کہا ہے کہ کوئی بھی بڑا کام منطقی انداز سے نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ بھی کہ ملک میں تبدیلی عید سے قبل آئے گی۔

ہم نے یہ بیان پڑھا تو مبہوت (بھوت نہیں) ہوگئے۔ بات یہ ہے کہ خان صاحب نے ڈھائی تین ماہ کے دوران جو کچھ کیا ہے وہ اگرچہ غیر ضروری یا بلا جواز نہیں مگر اُس کی کوکھ سے اچھے خاصے پاگل پن نے بھی جنم لیا ہے۔ تحریک انصاف کے

کارکنوں اور عمران خان کے عام سے چاہنے والوں نے اسلام آباد، کراچی اور دیگر شہروں میں دیئے جانے والے دھرنوں میں جس جوش و جذبے سے شرکت کی ہے اُسے پاگل پن کے سِوا کیا نام دیا جاسکتا ہے؟ اب خان صاحب فرمارہے ہیں کہ زیادہ نہیں، تھوڑا سا پاگل پن ضروری ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پاگل پن کی فاضل پیداوار کس کھاتے میں ڈالی جائے گی؟

مرزا تنقید بیگ بہت سے اُمور میں عمران خان سے اختلاف رکھتے ہیں مگر پھر بھی اُن پر فِدا ہونے کو تیار رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مرزا کے مزاج سے ناواقفیت کی بنیاد پر عمران خان اِس وار فتگی کو اعزاز سمجھیں مگر ہم اِسے دیوانگی کو خود کش حملے کے زُمرے میں شمار کرتے ہیں۔ مرزا کبھی کبھی تو عمران خان کی کسی بات کو دُرست ثابت کرنے کے لیے پاگل پن کی حدود کو چُھونے لگتے ہیں۔ ہم نے جب بھی عمران خان کے کسی بیان پر بحث کے دوران اُنہیں غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مرزا لنگوٹ کَس کر اپنے ممدوح کے دفاع کے لیے میدان میں نکل آئے ہیں۔

ہم نے جب مرزا کو پاگل پن سے متعلق عمران خان کے بیان کے بارے میں بتایا تو وہ چند لمحات کے لیے چُپ ہوگئے۔ ہمیں حیرت ہوئی کیونکہ مرزا تو ہماری زبان سے عمران خان کا ذکر سُنتے ہی پھڑک اُٹھتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بھڑکنے

لگتے ہیں۔ پھر آج کیا ہوا؟ آج کیوں چُپ سی لگ گئی ہے؟ اِس سے پہلے کہ ہم اِس خاموشی کا سبب دریافت کرتے، مرزا حواس میں واپس آئے اور بولے۔ ”میں خان صاحب کے بیان پر غور کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اُنہوں نے ایسا بیان کیوں داغ مارا ہے؟ پاگل پن کا گراف بلند نہ ہو تو کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہیں ہو پاتا۔ حد یہ ہے کہ اگر پاگلوں میں بھی پاگل پن کا گراف ٹھیک ٹھاک بلند نہ ہو تو اُنہیں پاگل خانے میں بھرتی نہیں کیا جاتا! “

ہم نے عرض کیا کہ عمران خان کے بیان نے ہمیں اِس لیے حیرت میں مبتلا کیا ہے کہ وہ اب تھوڑے سے پاگل پن کو گلے لگانے کے مشورے سے نواز رہے ہیں جبکہ خود ساری زندگی بھرپور پاگل پن کے آغوش میں رہے ہیں۔ اپنے شعبے یعنی کرکٹ اور اُس کے بعد سیاست کے حوالے سے اُن کا پاگل پن دیکھ کر ہی تو اُن کے پرستار اُن پر مَر مِٹنے کے معاملے میں پاگل پن کا مظاہرہ کرتے آئے ہیں۔ اب خان صاحب نے نئے پاکستان کے لیے محض تھوڑے سے پاگل پن کو ضروری قرار دے کر اپنے چاہنے والوں اور پرستاروں کے جوش و جذبے کی وکٹ گرادی ہے!

ہماری معروضات سُن کر مرزا خاموش تو رہے مگر یوں سنبھل کر بیٹھ گئے جیسے چودہ طبق روشن ہوگئے ہوں۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ ہماری کسی بات پر مرزا خاصی دیر تک چُپ رہے، بلکہ الفاظ ڈھونڈتے رہے گئے۔ ابھی ہم اپنی کامیابی پر

اندر ہی اندر خوشی سے پُھولے نہیں سما رہے تھے کہ مرزا ''اسٹارٹ'' لیتے ہوئے بولے۔ ''میں بہت سوچنے کے بعد اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عمران خان پاگل پن کا گراف نیچے لانا چاہتے ہیں۔ اور ایسا شاید اِس لیے ہے کہ اُنھوں نے پاگل پن کا نتیجہ دیکھ لیا ہے۔''

......ہم نے پوچھا خان صاحب نے کِس کا پاگل پن دیکھ لیا ہے؟ پرستاروں کا یا

ہماری بات پُوری ہونے سے پہلے ہی مرزا نے پھٹ پڑنے کی تیاری شروع کردی۔ نتھنے پُھلاتے ہوئے اُنھوں نے زبان کے ہتھیار سے حملہ کیا۔ ''سیدھی سی بات ہے، خان اوروں کے پاگل پن کی بات کر رہے ہیں۔ نئے پاکستان میں پاگل پن کی کچھ خاص گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ پُرانے یعنی موجودہ پاکستان میں خان صاحب پاگل پن کے جلووں کا جادوئی اثر دیکھ چکے ہیں۔ وہ بھلا کب چاہیں گے کہ جس پاگل پن نے ہر شعبے میں پُرانے پاکستان کی واٹ لگائی ہے وہی پاگل پن نئے پاکستان میں بھی انٹری دے!''

ہم نے پوچھا جب خان صاحب کے نزدیک پاگل پن کچھ خاص ضروری نہیں تو پھر اب تک وہ اپنے پرستاروں اور کارکنوں میں اِس وصف کو پروان چڑھانے پر اِس قدر توجہ کیوں دیتے رہے ہیں؟

مرزا تو جیسے ہمارے اِس سوال کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ ہتّھے سے اُکھڑنے کا اشارا دیتے ہوئے مرزا نے خاصے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیڈر عمران خان ہیں یا تم؟ اب کیا تم طے کروگے کہ اُنہیں کب کِتنے پاگل پن سے کام لینا چاہیے؟ جس طرح عقل ہمیں سِکھاتی ہے کہ ہر معاملے میں عقل سے کام لینا فائدہ مند نہیں ہوتا بالکل اُسی طرح اپنے پرستاروں اور شیدائیوں کا بھرپور پاگل پن ہی تو لیڈر کو بتاتا ہے کہ نِرے پاگل پن میں کچھ نہیں رکھا! یہ بات خان صاحب نے بھی سمجھ لی ہے۔ تم جیسے قلم گھسیٹنے والے تو بس اُن کے خِرمن سے خوشہ چینی ہی کر سکتے ہیں۔ سچ ہی تو ہے، مُلّا کی دوڑ مسجد تک۔ جِتنا ذہن ہے اُتنا ہی تو سوچوگے! ''

ہم نے محسوس کرلیا کہ مرزا کے ذہن پر پاگل پن سوار ہوتا جارہا ہے۔ وہ عمران خان کی طرف سے کم پاگل پن اپنانے کے مشورے کا دفاع کرتے کرتے خود جوش و جذبے کی منزل سے آگے بڑھ کر اب پاگل پن کے میدان میں قدم رکھ رہے تھے۔ ہمیں مرزا کا یہی پاگل پن تو پسند ہے۔ ایسی ہی کیفیت میں اُن کے ذہن کی پتیلی میں عجیب و غریب خیالات کی کھچڑی پکتی ہے اور زبان کے کفگیر سے وہ شاہکار نوالے یعنی لاجواب جُملے عطا کرتے ہیں!

ہمیں معلوم نہیں کہ بہتر زندگی کے لیے کتنا پاگل پن ضروری ہے اور کتنا غیر ضروری۔
نئے پاکستان میں عمران خان کی ہدایت یا مشورے کی روشنی میں اور کسی کے پاگل پن کی گنجائش ہو نہ ہو، مرزا کا پاگل پن برقرار رہنا چاہیے۔ ہمارے اور اُن کے تعلقات کے میلے میں ساری رونق اُن کے پاگل پن ہی سے تو ہے!

پولیس کی مہربانی

تقریباً ہر پاکستانی کے مزاج میں منفی رجحانات در آئے ہیں۔ بات بات پر اختلاف کرنا فطرتِ ثانیہ کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پورا ملک اختلافات کی دلدل میں دھنس کر رہ گیا ہے۔ بیڈ لک کا نصیب بلندی پر ہے! سونے کی ڈلی کو ہاتھ لگایئے تو مٹّی کے ڈھیر میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔

صورتِ حال ایسی گنجلک ہو گئی ہے کہ اب نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ ''جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے'' کے مصداق کوئی بھی اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ کہیں پسپائی ناگزیر ہو تو بھی کوئی پسپا نہیں ہوتا۔ کوئی اپنے ''اسٹیک'' میں سے ذرہ بھر بھی داؤ پر لگانے کا روادار نہیں۔ ہر گزرتا ہوا دن عوام میں اِس یقین کو پُختہ تر کر رہا ہے کہ کسی پر بھروسہ کرنے کا مطلب ہے گئے کام سے۔ بے یقینی یُوں بڑھتی جاتی ہے کہ دل بیٹھا جاتا ہے۔ آنے والے دنوں کا سوچ سوچ کر من میں ہَول سا اُٹھتا ہے کہ یہ سلسلہ کہاں رُکے گا۔

مرزا تنقید بیگ کو ہم نے ہر طرح کے ماحول میں زندہ دل پایا ہے۔ اِس پر ہم

اُنہیں حیرت نہیں، رشک سے دیکھتے ہیں۔ حیرت اِس لیے نہیں ہوتی کہ مرزا کسی بھی بات کو دل پر لینے کے قائل نہیں۔ جب کچھ محسوس ہی نہیں ہوگا تو تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ اُنہیں ''ٹپیکل'' پاکستانی قرار دیا جاسکتا ہے۔

گزشتہ روز معمول کی ڈرائنگ روم ملاقات میں ہم نے مرزا کی توجہ معاشرے کی عمومی روش یعنی بے چینی اور افسردگی کی طرف دلائی تو اُنہوں نے حسبِ عادت پہلے تو ہماری سوچ کو ''خراج عقیدت'' پیش کیا۔ اِس ''نیکی'' سے فراغت پاکر کہنے لگے۔ ''مایوس ہونا تو اب ہمارے لیے آپشنل معاملہ ہوگیا ہے۔ یعنی جب جی چاہے، مایوسی کے گڑھے میں گر جایئے۔ خواہ مخواہ مایوس ہونے اور دل مسُوس کر رہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ابھی ایسا بہت کچھ ہے جو دل بہلانے کے لیے انتہائی کافی ہے۔''

ہم حیران ہوئے کہ ایسا کیا ہے جو دل بہلانے کے لیے انتہائی کافی ہے۔ وضاحت چاہی تو مرزا نے بات آگے بڑھائی۔ ''پورا کا پورا سیاسی عمل کامیڈی تھیٹر میں تبدیل ہوچکا ہے۔ اور کیا چاہتے ہو؟ ایسے میں یہ غم کیوں پالا جائے کہ دل کیسے بہلے گا؟ دل بہلانے والے موجود ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ دل کو بہلنا آتا بھی ہے یا نہیں۔''

ہم نے مرزا کو یاد دلایا کہ آپ دل کو بہلانے کی بات کرتے ہیں، اب تو دل ہی نہیں رہے! یہ سن کر مرزا نے ایک بار پھر ”عزت افزائی“ کے طور پر ہماری ”بصیرت“ کے حوالے سے چند ”توصیفی“ کلمات ادا کئے! پھر کہنے لگے۔ ”اب اِس قدر بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی اللہ کے ایسے بندے ہیں جو دُکھی دلوں کو راحت اور بے ''قرار روحوں کو سُکون پہنچانے کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں۔

ہم نے وضاحت چاہی کہ ایسے بندے ہیں کہاں، ذرا ہمیں تو درشن کرایئے۔ مرزا نے پولیس کے محکمے کا نام لے دیا۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ہم سوچنے لگے یہ محکمہ تو خود سِتم ظریفی کا شکار ہے۔ ایک طرف تو اِس میں طرح طرح کے کرپٹ لوگ بھرے ہوئے ہیں اور جو کرپٹ نہیں ہیں اُنہیں عوام مطعون کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پولیس والے گھر کے رہے ہیں نہ گھاٹ کے۔ سیاست دان اِنہیں ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتے ہیں اور عوام موقع ملتے ہی سارا غُصّہ اِن پر اُتار بیٹھتے ہیں۔ جو خود مذاق بن کر رہ گئے ہیں وہ بے چارے کسی کو کیا ہنسائیں گے، کسی کا دل کیا بہلائیں گے؟

ہمیں سوچوں میں گم دیکھ کر مرزا نے کہا۔ ”پولیس میں ایک شعبہ ایسا ہے جو اپنے ’حسنِ کارکردگی‘ کی بنیاد پر عوام کی تفریحِ طبع کا سامان کرتا رہتا

ہے۔ ہم شعبۂ تفتیش کی بات کر رہے ہیں۔اِس شعبے کے کِھلائے ہوئے گُل ہر مشامِ جاں کو معطر کر دیتے ہیں۔ تفتیش کے نام پر جو طبع آزمائی کی جاتی ہے وہ اگر پوری توجہ اور ڈھنگ سے ضبطِ تحریر میں لائی جائے تو لافانی اور کلاسک قسم کا مزاح اہلِ ذوق کو میسر ہو!"

ہم نے مرزا کی بات پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ہم تفنّنِ طبع کے کتنے عظیم مآخذ کو مِس کر رہے تھے! کم ہی لوگ اِس نکتے پر غور کرتے ہیں کہ پولیس کے تفتیشی افسران خاطر خواہ ٹی اے ڈی اے پائے بغیر پتا نہیں کہاں کہاں جاکر یعنی بہت دُور کی کوڑیاں لاتے ہیں! کسی بھی کیس میں بظاہر باہم کوئی مطابقت نہ رکھنے والی باتوں کو وہ کڑیوں کی شکل میں جس طور ملاتے ہیں وہ فن کچھ اُنہی پر ختم ہے! ایسی ایسی تھیوریز لاتے ہیں کہ مجرم بھی پڑھتے ہوں گے تو اُن کے سَر چکرا جاتے ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ اخبارات میں بھی لوگ جرائم اور اُن کی تفتیش سے متعلق خبریں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ سوچنے والے سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ پولیس کے تفتیش کاروں کو ایسے عظیم نُکات سُوجھتے کیسے ہیں۔ ع

یہ اُس کی "دَین ہے، جسے پروردگار دے!

مرزا نے مزید وضاحت فرمائی۔ "عوام کو ہنسانے کے معاملے میں یُوں تو پولیس

کا خفیہ اطلاعات کا شعبہ بھی کسی سے کم نہیں مگر تفتیشی شعبہ بازی لے جاچکا ہے۔ اور اِس شعبے میں بھی چند ماہرین ایسے ہیں جو اپنے فن میں انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اِن کی مہارت نے قومی ہم آہنگی کو فروغ دینے اور تمام پاکستانیوں کو ایک 'مرکز' پر لانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔''

پولیس کے ماہرین اور قومی ہم آہنگی کا فروغ؟ یہ بات اول تو ہمارے حلق سے اُتری نہیں۔ اور بمشکل اُتار پائے تو ہضم نہ کرپائے۔ وضاحت چاہی تو مرزا نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ''پولیس کے شعبۂ تفتیش میں کام کرنے والے ماہرین نے ایک ایسا آئینہ بنایا ہے جس میں ہر پاکستانی دکھائی دیتا ہے۔ کوئی اگر خود کو کہیں نہیں پاتا تو اِس آئینے میں جھانک لے، اپنے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوجائے گا۔''

ہم نے کہا مرزا! یُوں پہیلیاں نہ بُجھواؤ۔ ہمارے تجسّس اور اضطراب کی آگ بھڑکتی جارہی ہے۔ اِس سے پہلے کہ ہم اِس آگ میں بھسم ہوجائیں، دیگ پر سے ڈھکّن ہٹادو اور سب کچھ صاف صاف بتادو۔

مرزا نے ہماری حالت دیکھی تو تمہید و پیش لفظ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم ملزمان کے اُن خاکوں کی بات کر رہے ہیں جو کسی بھی واردات کے

عینی شاہدین کے بیانات کی روشنی میں تیار کئے جاتے ہیں! ماہرین کا کمال یہ ہے کہ اِن خاکوں میں مُلک کے ہر حصے کی نمائندگی ممکن بناتے ہیں۔ کسی بھی ملزم کے خاکے کو ذرا انہماک سے دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ چہرے کے مرکز سے ہر صوبے کو ایک راستہ جارہا ہے۔ بسا اوقات خد و خال میں آزاد کشمیر، گلگت بلتستان اور قبائلی علاقوں کی بھی خوب نمائندگی ہو رہی ہوتی ہے! عینی شاہدین جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ سب کا سب ماہرین اِن خاکوں میں سَجا دیتے ہیں۔ رپورٹ میں درج ہوتا ہے کہ عینی شاہد کے مطابق ملزم کا رنگ خاصا کُھلا ہوا یعنی سفید تھا۔ مگر خاکے میں بال گھنگریالے دکھائے جاتے ہیں اور چہرے کے نقوش بھی خاصے 'حبشیانہ' ہوتے ہیں۔ عینی شاہد کے بیان کے مطابق ملزم دیہاتی یا مزدور قسم کا تھا مگر خاکہ دیکھیے تو پیشانی اور آنکھوں سے دانشوری جھلک رہی ہوتی ہے۔ ایک ہی خاکے میں چار پانچ نسلوں کے نقوش.براجمان ملتے ہیں! کبھی عینی شاہدین کو حُسنِ بیان کی داد دینے کو جی چاہتا ہے اور کبھی خیال آتا ہے کہ بیان کردہ 'حقائق' کی بنیاد پر خاکے بنانے والوں کے ہاتھ چُوم لیے جائیں!"

مرزا کی بات میں دم ہے۔ جب بھی پولیس کے تیار کردہ ملزمان کے خاکے اخبارات میں شائع ہوئے ہیں، ہم نے خاصے دھڑکتے دل کے ساتھ اُن پر نظر ڈالی ہے! نقوش کچھ اِس طرح کے بنائے جاتے ہیں کہ ہر دیکھنے والے کو خاکے میں اپنی ہی جھلک

دکھائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا ہے کہ ملزمان کے خاکوں والا اخبار مرزا گھر اور محلّے والوں سے چُھپاتے پھرے ہیں! یعنی پولیس کے شعبۂ تفتیش کی مہربانی سے کم از کم ایک نقطہ تو ایسا ہے جس پر تمام پاکستانی جمع دکھائی دیتے ہیں!

آؤ سو جائیں!

سارا جھگڑا حواس کا ہے۔ حواسِ خمسہ نے انسان کو رات دن عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ایک قیامت ہے کہ اِن حواس کے باعث برپا رہتی ہے۔ اِنسان دیکھتا، سُنتا، سُونگھتا، چکھتا اور چُھوتا ہے تو مشکلات سے دوچار رہتا ہے۔ حواسِ خمسہ کے اشتراک سے پنپنے والی چھٹی حِس بھی کم دُکھ نہیں دیتی۔ خواہ مخواہ کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے، سیدھی سی بات میں بھی نظریۂ سازش کارفرما محسوس ہوتا ہے!

دیکھنے کا بھی عجیب ہی معاملہ ہے۔ دیکھیے اور سوچیے، سوچیے اور پریشانی سے دوچار رہیے۔ اقبالؔ نے کہا تھا ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

دیکھنا کیا ہے؟ آنکھوں کا قصور! آنکھوں کا قصور دِل کو اُلجھن میں مبتلا کرتا ہے۔ یعنی ع

آنکھوں کا تھا قصور، چُھری دِل پہ چل گئی!

دیکھنے پر بھی کچھ بیان کرنے کی طاقت نہ ہو تو دِل ہی دِل میں اُلجھن کا شکار رہیے اور دِل پر قیامت ڈھاتے رہیے۔ ایسے میں عقل کیا کہتی ہے؟ یہی کہ کچھ مت دیکھیے۔ اگر دیکھنے سے پریشانی کا گراف بلند ہوتا ہو تو کامن سینس کا تقاضا ہے کہ کچھ نہ دیکھا جائے۔

ہماری حکومتیں عشروں سے یہی ایک کام تو مستقل مزاجی اور عمدگی سے کرتی آئی ہیں۔ عوام کے مسائل کو دیکھ دیکھ کر اُلجھنے سے کہیں بہتر ہے کہ کچھ نہ دیکھیے اور سُکھ کے سانس لیتے رہیے۔ ہمارے ہاں کی سیاسی کامن سینس تو یہی ہے۔ مگر ستم یہ ہے کہ سندھ کے وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ نے کامن سینس کا مظاہرہ کیا تو ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اخبارات چیخ اُٹھے۔ ایک لمحے کو تو ایسا لگا جیسے کوئی قیامت برپا ہو گئی ہے۔ میڈیا والوں نے بات کا بتنگڑ بنادیا۔ رائی کا دانہ کیا ہاتھ آیا، اُسے پربت میں تبدیل کردیا۔ بات اِتنی سی تھی کہ شاہ سائیں سندھ کے دُور افتادہ (سرحدی) علاقوں میں خوراک کی قلت کا جائزہ لینے کی خاطر نگرپارکر پہنچے تو قحط زدہ لوگوں کو دیکھ کر اُلجھن میں مبتلا ہونے پر اُنھوں نے کچھ دیر سو رہنے کو ترجیح دی۔ شاہ سائیں نے ذرا سی نیند کیا لی، اعتراضات اور تنقید کے گولے داغنے والے بیدار ہوگئے! ہم نے یہ منظر دیکھا تو چکرا گئے۔ ہمارے ہاں لوگ روتے رہتے ہیں کہ سیاست دان عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور جب کوئی سیاست دان عقل سے کام لے تو لٹھ لے کر

اُس کے پیچھے پڑجاتے ہیں۔

ہر زمانے میں چند رجحان ساز شخصیات ہوتی ہیں۔ ایسی شخصیات تیار کرنا معاشرے کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ وہ چند ایک شخصیات ہماری جھولی میں ڈال دیتا ہے اور معاشرے کو چند نئے رجحانات مل جاتے ہیں۔ اِن رجحانات کی مدد سے لوگ تھوڑی سی ''آف بیٹ'' زندگی بسر کرنے کے قابل ہوپاتے ہیں ورنہ لکیر کے فقیر ہی رہیں۔ سید قائم علی شاہ یعنی شاہ سائیں اِس لیے ہمارے فیورٹ ہیں کہ اُنھوں نے دو ٹکے کی سیاست کو موتیوں میں تولے جانے والے رجحانات بخشے ہیں!

شاہ سائیں کو دیکھ کر ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے کسی کو تپتی دوپہر میں گھنے درخت کا سایا نصیب ہوجائے، شدید گرمی میں گلاس بھر سَردائی پینے کو مِل جائے۔ شاہ سائیں بہت ٹھنڈے چلتے ہیں۔ پورا ملک ہر معاملے میں جوش و جذبے کا مظاہرہ کرتا پھر رہا ہے۔ ایسے میں شاہ سائیں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جوش و جذبے کے بغیر جینا کیا ہوتا ہے! اور صاحب، جوش و جذبہ دکھاکر کرنا بھی کیا ہے؟ پورا ملک یہی تو کرتا آیا ہے۔ اُس نے کیا پالیا جو شاہ سائیں کچھ حاصل کرلیں گے؟ اور اِس عمر میں اب شاہ سائیں کو حاصل بھی کیا کرنا ہے؟

شاہ سائیں پریشان ہوتے ہیں نہ کسی کو پریشان کرتے ہیں۔ جو لوگ ہر معاملے میں بدگمانی کو راہ دیتے ہیں وہ شاہ سائیں کے پُرسکون انداز کو بھی سیاست سمجھ کر کچھ کا کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ ہم تو بس یہی کہیں گے کہ ایسا کروگے تو کون آئے گا!

لوگوں کی یادداشت بہت کمزور ہے۔ اُنہیں تو یہ بھی یاد نہیں کہ شاہ سائیں 86 سال کے ہوچکے ہیں۔ یہ اُن کے آرام کے دن ہیں۔ ایسے عالم میں وزارتِ اعلیٰ کا بوجھ سر پر آن گرا ہے تو شاہ سائیں اُسے بھی آرام سے نبھا رہے ہیں۔ کوئی وزیر اعلیٰ اپنی ذمہ داری پُرسکون اور آرام دہ انداز سے نبھا رہا ہو تو اُس پر رشک آنا چاہیے مگر لوگ حسد کر رہے ہیں۔ لوگوں کا یہی تو مسئلہ ہے کہ کسی بھی طور خوش نہیں ہوتے۔ سیاسی مُرغیاں اپنی جان سے جاتی ہیں مگر عوام کو سواد نہیں آتا۔

شاہ سائیں ہر بحران کو انتہائی قابلِ رشک ملائمت سے ختم کرتے ہیں۔ یہ ہُنر اب کسی کسی میں پایا جاتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے اب دو چار لوگ ہی رہ گئے ہیں۔ مگر اب ''اہلِ ہُنر'' کی قدر کرنے کا چلن ہی کہاں ہے؟ صحرائے تھر کے مختلف علاقوں میں جب قحط کی سی صورت حال نے سَر اُٹھایا تو شاہ سائیں نے

بہت ملائمت سے معاملات نمٹائے۔ قحط زدہ علاقوں میں جا کر اگر شاہ سائیں نے تھوڑی سی نیند لے لی تو یہ نہ سمجھا جائے کہ اُنہیں لوگوں کی پریشانی کا احساس نہیں تھا۔ اِس کا اصل سبب یقیناً یہ تھا کہ وہ بہت نرم دِل کے انسان ہیں، کسی کی تکلیف اُن سے دیکھی نہیں جاتی۔ اب اگر وہ مصیبت زدہ افراد کو دیکھ کر بھی کچھ نہ کر پاتے تو لوگ مزید تنقید کرتے کہ بس دیکھتے رہتے ہیں، کرتے کچھ نہیں۔ میڈیا والوں کو پھر بہانہ مل جاتا بات کا بتنگڑ بنانے کا۔ اور عوام بھی خوب مزے لیتے۔ لوگوں کو بھی کسی صورت قرار نہیں۔ ہر معاملے میں تنقید کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر ہی لیتے ہیں۔

ہم تو شاہ سائیں کو داد دیں گے کہ وہ بہت سے معاملات میں رُجحان ساز ہیں۔ شور شرابے اور ہنگامہ آرائی کے بغیر اُنہوں نے پانچ سال وزارتِ اعلیٰ چلائی۔ اب پھر وہ اُسی راہ پر گامزن ہیں۔ سَر پر آسمان بھی ٹوٹ پڑے تو وہ ''زمیں جنبد، نہ جنبد گل محمد'' کے مصداق ٹس سے مس نہیں ہوتے یعنی اپنی جگہ ڈٹے رہتے ہیں۔ ایسی اولوالعزمی'' اب کہاں پائی جاتی ہے؟ ہر بحران کا شیشہ اُن کی پُرسکون شخصیت سے'' ٹکرا کر کِرچی کِرچی ہو جاتا ہے۔ کوئی مخالفت کی رَو میں بہتے ہوئے اناب شناپ بک دیتا ہے تب بھی شاہ سائیں جذباتی ہوئے بغیر ٹھنڈے اور میٹھے لہجے میں جواب دے کر اُس کے دِل و دِماغ کی ٹیوب سے جوش و جذبے کی ساری ہوا نکال دیتے ہیں۔ شاہ سائیں کی کوشش ہوتی ہے کہ بانس ہی کا

وجود مِٹ جائے تاکہ کوئی بانسری بجانے کے قابل نہ رہے۔ اپنی ملائمت اور نرم رَوی سے شاہ سائیں نے مخالفت کے کئی بانس یوں اُکھاڑ پھینکے ہیں کہ غور کیجیے تو یقین ہی نہیں آتا!

اب ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اُسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے ہی میں آنکھوں کے ساتھ ساتھ دِل و دِماغ کی بھی بھلائی ہے۔ کوئی کب تک کیا کیا دیکھے اور کُڑھتا رہے؟ آنکھیں تھک جائیں گی مگر تماشے ختم ہوں گے نہ دُکھڑے دم توڑیں گے۔ جن معاشروں میں ہر طرف اُلجھنیں ہوں وہاں نظّارگی سے جان چُھڑا کر بے عملی کے بستر پر سو رہنا ہی دانائی کی علامت ہے۔ پاکستانی معاشرے میں ایک ذی ہوش سیاست دان کو وہی کچھ کرنا چاہیے جو شاہ سائیں نے نگرپارکر میں کیا۔ ماحول کا تو کام ہی اُلجھنیں پیدا کرنا اور دیکھنے والوں کو پریشان کرتے رہنا ہے۔ اگر کوئی سیاست دان اپنے ماحول کو دیکھ کر رنجیدہ اور آبدیدہ ہوتا رہے تو سیاست کیا خاک کرے گا! سیاست دانوں پر قومی خزانے میں نقب لگانے اور سرکاری وسائل کی لُوٹ مار کا الزام عائد کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹنا حقیقی لُوٹ مار سے بہرحال بہتر ہے!

ایک ہفتہ ہوچکا ہے، مرزا تنقید بیگ خاصی مقبوضہ حالت میں ہیں یعنی قبض نے اُن کے معدے اور دِل و دماغ پر قبضہ کر رکھا ہے! چہرے پر ہر وقت ایسا کِھنچاؤ رہتا ہے کہ لوگوں کو اُن پر فلسفی یا دانشور ہونے کا گمان ہونے لگا ہے! حال پوچھیے تو مشتعل ہو اُٹھتے ہیں، بتانے کی کوشش کیجیے تو کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ وہ جب بھی کسی عارضے میں مبتلا ہوتے ہیں تو قابل دید اور قابل داد ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی عارضے میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ عارضہ اُن میں مبتلا ہوتا ہے!

سیاست کی کشتی بیچ دریا میں ٹھہر گئی ہے۔ درجۂ حرارت خاصا بلند تھا مگر اب موسم میں خُشکی پیدا ہوتے ہی وہ بھی نیچے آرہا ہے۔ مرزا اِس کیفیت سے بہت پریشان ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مِرزا نے خاصا ''قاضیانہ'' مزاج پایا ہے۔ محاورہ ہے کہ قاضی جی دُبلے کیوں؟ اندیشہ سارے شہر کا! یہ حال مِرزا کا ہے۔ اُنھوں نے بھی سارے شہر کے اندیشے پال رکھے ہیں۔ رات دن طرح طرح کے اندیشوں کو جسم و جاں کا حصہ بنائے رہتے ہیں۔ دِل میں اگر خدشات اور وسوسوں نے گھر کرلیا ہو تو اِنسان کب اپنے حواس میں رہتا ہے؟ ذہن میں جب میں اندیشوں اور خدشات کا گوبر بھرا ہوا ہو تو تعفّن کا اُٹھنا لازمی امر ہے۔

ہم نے کئی بار (اپنا) چھوڑا ہے یعنی مرزا کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ بہتر ڈھنگ سے زندگی بسر کرنے کا ایک اچھا طریقہ یہ ہے کہ انسان تھوڑا سا بے حِس ہو جائے یعنی گرد و پیش کے بارے میں زیادہ نہ سوچ بلکہ ہو سکے تو اِدھر اُدھر کم کم ہی دیکھے۔ بہت سے معاملات میں نابینا سا بن جانا ہی قرینِ عقل ہے! مگر وہ مِرزا ہی کیا جو سمجھ جائیں۔

طاہر القادری جب ملک میں تھے اور مخالفین کے سینے پر مونگ دَل رہے تھے تب مِرزا کی تشویش کا گراف ساتویں آسمان پر تھا۔ بات فطری تھی۔ طاہر القادری نے قوم پر بالعموم اور حکومت پر بالخصوص ''وختا'' ڈالا ہوا تھا۔ ہر ذی نفس حیران و پریشان تھا کہ کرے تو کیا کرے، سیاسی بحران کے ضمنی اثرات سے کیسے نمٹے؟ ایسے میں مِرزا کا تشویش اور فکر میں مبتلا ہونا کچھ حیرت انگیز نہ تھا۔ طاہر القادری کے پیدا کردہ بحران کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، یہ سوچ سوچ کر مِرزا رات دن مُبتلائے قبض رہا کرتے تھے! تب اُن سے بات کرنے میں جان کا جوکھم تھا۔ کاٹ لیتے تو جان بچانے کے لیے ٹیکے بھی مشکل سے ملتے!

اور اب طاہر القادری مغرب سِدھار چکے ہیں تب بھی مِرزا کی پریشانی کا گراف ساتویں آسمان ہی پر ہے۔ کس میں اِتنا جگرا ہے کہ مِرزا کو سمجھانے کا خطرہ

مول لے؟ وہ کسی کی بات مانیں گے تو تب جب سُنیں گے۔ اُنہیں کچھ سُننے پر آمادہ کرنا ایسا کمال ہے جو اب تک بھابی صاحبہ کیک سِوا کسی کے پاس نہیں!

کل کی نشست میں ہم پھر پُرانی ڈگر پر گامزن ہوئے یعنی مِرزا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جو کچھ اسلام آباد کے ریڈ زون میں ہوتا رہا ہے اُس کے بارے میں زیادہ سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ اب سوچنے سے آگے کی منزل میں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوتے رہنے کے بجائے انسان صورت حال پر ایک آدھ نظر ڈال کر آنکھوں پر پلکیں گرالے یا پھر دیکھتے ہوئے بھی نابینا بن جائے۔

ہمارے مشورے کو، حسبِ معمول، انتہائی ناگفتہ بہ الفاظ کے ذریعے ''خراج تحسین'' اور ہماری عقل کو ''خراج عقیدت'' پیش کرتے ہوئے مِرزا نے کہا، ''تم جیسے بے حِس لوگوں کے تعلق رہنے سے ملک اِس حال کو پہنچا ہے۔ صرف دیکھتے رہنے سے معاملات کو درست کرنے کی راہ کبھی ہموار نہیں ہوتی۔ ریاست اُس وقت پنپتی ہے اُس کا ہر باشندہ اپنا کردار پوری ایمانداری اور جاں فشانی سے ادا کرتا ہے۔''

ہم نے مرزا کی خود کلامی کے گھوڑے کو لگام دینے کی کوشش کرتے ہوئے وضاحت چاہی کہ ریاست کے ہر باشندے سے ہو کس طرح کے کردار کی توقع رکھتے ہیں تو وہ بولے، جمہوریت کے لیے سب کو میدان میں آنا ہوگا۔ احتجاج کیے بغیر کسی کو حق نہیں ملتا۔'' طاہر القادری نے جو احتجاج کیا وہ اگرچہ بعض معاملات میں سُوءِ ظن کی طرف بھی لے ''جاتا ہے مگر بہر کیف، قوم کو اپنا احتجاج ریکارڈ تو کرانا ہے۔

ہم حیران رہ گئے۔ مرزا تو طاہر القادری کے ہاتھوں واقع ہوتے والے دھرنے سے پریشان تھے۔ اب کیوں احتجاج کی وکالت کر رہے ہیں؟ جس دھرنے نے مرزا کے دِل و دِماغ اور حواس کو یرغمال بنا رکھا تھا اب وہ اُسی دھرنے کی وکالت کیوں کر رہے ہیں؟ کہیں یہ ''اسٹاکہوم سِنڈروم'' والا معاملہ تو نہیں؟ گویا ع

!جو بھی نمک کی کان میں پہنچا، نمک ہوا

مرزا کا جواب تھا، ''تم جیسے لوگ تو بس اٹکل کے گھوڑے دوڑاتے رہتے ہیں۔ زمینی حقائق دیکھنے کی زحمت تم کبھی گوارا نہیں کرتے۔ ہم بھی یہی سوچتے تھے کہ احتجاج میں کیا رکھا ہے۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ احتجاج نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ طاہر القادری دھرنا دیے ہوئے تھے تو ذہن میں اُلجھن سی تھی۔ اب وہ نہیں ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ قوم کے جسم سے جان ہی نکل گئی ہے۔ جیسے جینے

میں کچھ رہا ہی نہیں۔ ہر طرف بے رونقی سی ہے۔ ایک محفل ہے کہ اُجڑ گئی ہے، ایک باغ ہے کہ خزاں رسیدہ ہوچلا ہے۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!"

ہم نے عرض کیا کہ مرزا! اللہ سے کچھ توڈریں۔ لوگ احتجاج کے ہاتھوں ہونے والے نقصان کو اب تک رو رہے ہیں اور آپ کو رونق میلے کی فکر لاحق ہے!

مرزا نے تپ کر جواب دیا، "قوم کو کب کسی نقصان کی فکر لاحق ہے؟ یہ تو تم جیسے لوگ بار بار یاد دلاتے ہیں تو قوم کو اپنے ہونے کا اپنے نقصان کا احساس ہوتا ہے۔ قوم اچھی خاصی مستی و سرخوشی سے سرشار ہے مگر جب محفل رنگ پہ آنے لگتی ہے تب تم جیسے لوگ اُس کا سُندر سپنا توڑے دیتے ہیں! یعنی سارا مزا کرکرا کردیتے ہو۔ اب قوم کو جگا کر کرنا کیا ہے؟ بیداری کی حالت میں کون سے لڈو پیڑے مل جاتے ہیں؟ اچھا ہے کہ خواب کی سی کیفیت طاری رہے اور گرد و پیش کے غم حواس پر طاری نہ ہوں!"

ہم معترض ہوئے کہ یہ تو سراسر خود فراموشی ہے۔ ایسا کرنے سے تو کسی کو اپنے نفع و نقصان کی فکر لاحق ہی نہیں ہوگی۔ یہ تو سراسر انفراد اور اجتماعی زیاں ہے۔ مرزا ٹُنک کر بولے، "پوری قوم کی ٹھیکیداری چھوڑو۔ اپنے کام سے کام رکھو یعنی قلم گِھس کر صاف سُتھرے صفحات سیاہ کرتے رہو۔ مگر کچھ ایسا

لکھو کہ قوم کی سرخوشی و سرمستی میں اضافہ ہو۔ انٹ شنٹ لکھ کر قوم کا میٹر مت گھماؤ۔"

ہم سمجھ گئے کہ ماحول مِرزا پر بُری طرح اثر انداز ہو چکا ہے بلکہ اُنہیں لپیٹ میں لے چکا ہے۔ اُنہیں تو عام حالت میں سمجھانا دردِ سر ہے۔ ایسے بھرپور عالم میں تو وہ بارہ مسالے کی چاٹ بن جاتے ہیں۔ جو سمجھانے کا جوکھم اُٹھائے اُس کے دِماغ کی واٹ لگ جاتی ہے۔

ہم طاہر القادری کی صلاحیت کا لوہا مان گئے۔ اُنھوں نے مِرزا جیسے اپنے کٹّر مخالف کو بھی اپنا کرلیا ہے۔

احتجاج کے معاملے میں ہم ایک مِرزا کو کیا روئیں؟ اب تو پوری قوم ہی احتجاج پسند ہوتی جارہی ہے۔ سبھی کو جلسوں، جلوسوں اور دھرنوں میں لذت محسوس ہونے لگی ہے۔ اگر کچھ دن کوئی جلوس نہ نکلے، کہیں دھرنا نہ دیا جائے تو ذہن میں وسوسے پنپنے لگتے ہیں۔ سیاسی میدان کا کچھ دن خالی رہنا طوفان سے پہلے کی خاموشی جیسا دکھائی دیتا ہے۔ حالات کی مہربانی سے ہم اُس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہر مصیبت مزا دینے لگتی ہے۔ لگتا ہے قوم کی نفسی ساخت کو خارش ہوگئی ہے اور کُھجانے سے لطف کشید کیا جارہا ہے!

!خدا محفوظ رکھے ..... ماہرین سے

اِس دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کبھی چینی زبان میں غیر معمولی مہارت کے حامل ہو جائیں۔ الجبرا اور جیومیٹری سے ہمیں ہمیشہ بے رغبتی رہی ہے مگر ممکن ہے کبھی ہم اِن دونوں کو اپنالیں اور کچھ کر دکھائیں۔ ایکشن فلمیں ہمیں کبھی پسند نہیں رہیں مگر ناممکن نہیں کہ ہم یہ فلمیں بھرپور دلچسپی سے دیکھنا شروع کردیں۔ ہاں، ایک بات کا ہمیں پورا یقین ہے اور یوں سمجھ لیجیے کہ شکست تسلیم کرچکے ہیں۔ یہ کہ ہم کبھی ماہرین کو سمجھنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے!

چار پانچ عشروں کے دوران ماہرین خود رَو پودوں کے مانند عام ہوئے ہیں۔ اب معاملہ اِس نہج تک پہنچ چکا ہے کہ اُن کے نہ ہونے کا تصور محال ہے۔ ذہن پر کتنا ہی زور دے لیجیے، یاد نہیں آتا کہ 1950 کے عشرے میں یا اُس سے قبل لوگ کس طور زندگی بسر کیا کرتے ہوں گے۔ اُنہیں کون بتاتا ہوگا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے، کیا کھانا ہے اور کیا نہیں کھانا ہے!

کون سا شعبہ ہے جسے ماہرین نے اپنی انٹ شنٹ آراء سے پامال نہیں کیا؟ اور کون سا معاملہ جس میں ماہرین نے اپنی طبیعت کی جَولانی اور روانی نہیں

دکھائی یعنی لوگوں کا ناک میں دم نہیں کیا؟ ماہرین کا اب شاید یہی کام رہ گیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کوئی ایسی ویسی بات کیجیے تاکہ ذہنوں میں خدشات کی فصل اُگے اور لوگ پہلے سے زیادہ پریشان ہو جائیں! یہ ماہرین ہی تو ہیں جو دِلوں میں وسوسے ڈال کر ذہنوں میں خلفشار پیدا کرتے ہیں۔ اِس معیار کی رُو سے کامیاب ماہر وہ ہے جو لوگوں کو تشویش میں زیادہ سے زیادہ مبتلا کرے!

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یعنی جب سے شعور کی حالت میں جینا شروع کیا ہے تب سے ماہرین کی بے شعوری بُھگتی ہے۔ مختلف ادوار میں ہمیں ہر شعبے کے ماہرین نے بے حواس کیا ہے۔ اُن کی بے مثال "ذہانت" نے کئی مواقع پر ہمارے حواسِ خمسہ کو "حواسِ خفتہ" میں تبدیل کیا ہے! ہم کیا اور ہماری ہستی کیا۔ ماہرین کی نویدیں اور وعیدیں سُن کر تو اچھے اچھوں کے حواس لمبی چُھٹی پر چلے جاتے ہیں!

کچھ دن ہوئے، یہ خبر پڑھی کہ دودھ پینا بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ خبر پڑھتے ہی ہم دِل اور سَر دونوں تھام کر بیٹھ گئے۔ دِل میں وسوسے اُبھرنے لگے کہ کہیں ہم دودھ کی لہر میں بہتے ہوئے موت کے دریا میں نہ جا گریں! ہم ایک زمانے سے دودھ پیتے ہی نہیں آئے بلکہ اُس کی کوکھ سے جنم لینے والی بہت سی اشیاء کھاتے بھی آئے ہیں۔ جو دودھ ہم نے پیا ہے اور اُس سے بنی ہوئی جو اشیاء کھائی ہیں اگر اُن کی مقدار کا اندازہ لگائیں تو یقین سے کہا جاسکتا

!ہے کہ ہم موت کی منزل سے کب کے گزر چکے ہیں

سویڈن کی اپسلا یونیورسٹی کے محققین کی ایک ٹیم نے پروفیسر کارل مائیکل سن کی سربراہی میں 20 سال تک دودھ کے ایسے ویسے اثرات پر تحقیق کی۔ 39 سے 74 سال کے 61 ہزاراور 45 سے 79 سال کے 45 ہزار افراد کی کھانے پینے کی عادات اور انفرادی صحت کے تمام اشاریوں کا عمیق جائزہ لینے کے بعداِس ٹیم نے بتایا ہے کہ دودھ کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں یا خوش فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ تصور بے بنیاد ہے کہ دودھ پینے سے ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں یا فریکچر کا خطرہ گھٹ جاتا ہے۔

دودھ سے متعلق یہ تحقیقی نتائج پڑھ کر ہم خوفزدہ ہوگئے تھے مگر پھر یہ سوچ کر دِل کو سکون ملا کہ حکومت کی مہربانی سے دودھ اب اِس قدر مہنگا ہوچکا ہے کہ چند روز باقاعدگی سے پینے پر جیب کی موت واقع ہوجاتی ہے! وہ زمانے ہوا ہوئے جب بچوں کو صحت مند رکھنے کے لیے روزانہ سوتے وقت گلاس بھر دودھ پلایا جاتا تھا۔ اب اگر بچوں کے لیے روزانہ گلاس بھر دودھ کا اہتمام کیجیے تو گھر کے بجٹ کا گلاس خالی رہ جاتا ہے! ایسا نہیں ہے کہ دودھ پینے سے مضبوطی نصیب نہیں ہوتی۔ بچوں کو باقاعدگی سے !دودھ پلانے کی صورت میں دودھ بیچنے والے کی تجوری کو تو مضبوطی ملتی ہی ہے

پھر یہ خبر بھی پڑھی کہ گائے کا دودھ پینے سے جوانی میں موت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ہم یہ خبر پڑھ کر بھی کچھ دیر سہمے سہمے رہے۔ پھر یہ سوچ کر بہت دیر تک ہنستے رہے کہ ہم میں اب کون سی جوانی رہ گئی ہے! گائے کا دودھ پینے سے جوانی میں مرنے کے امکان کا ہم سے کیا تعلق؟ ع

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ ماہرین نے ہم جیسوں کو ہنسا ہنسا کر مار ڈالنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ عجیب و غریب امکانات پر تحقیق کرتے ہیں اور اُس سے بھی عجیب ہوتے ہیں تحقیق کے نتائج۔

ایک مدت سے ہم ماہرین کے مشوروں اور اَنکل بچّو ٹائپ کی "پیش گوئیوں" کے ہاتھوں دردِ سَر میں مبتلا رہے ہیں۔ جب وزن 90 کلو گرام کی منزل تک پہنچا تو ہمیں صحت کی فکر لاحق ہوئی۔ بچپن سے سُنتے آئے ہیں کہ باقاعدگی سے ورزش کرنے پر جسم متوازن رہتا ہے اور وزن بھی گھٹتا ہے۔ یقین تو نہ آتا تھا مگر عدنان سمیع کو اچھا خاصا وزن گھٹا کر دوبارہ انسان بنتے دیکھا تو ہماری "سینس آف ہیلتھ" بھی بیدار ہوئی اور ہم روزانہ ورزش کرنے کا ذہن بنانے لگے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ ورزش کرنے کا ارادہ کرنے کا بھی کچھ نہ کچھ تو اجر

ضرور ملے گا کیونکہ اللہ نیت کا پھل بھی دیتا ہے!

مگر یہ کیا؟ ابھی ہم نے ورزش شروع بھی نہیں کی تھی کہ ماہرین نے جانے پہچانے طریق واردات کے مطابق یعنی تازہ ترین تحقیق کے ذریعے یہ وعید سُنائی کہ ڈھلتی ہوئی عمر میں ورزش کے شدید منفی نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں! وعید سُنانے والی خبر میں ماہرین کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کسی نو گو ایریا میں جانے سے روک رہے ہوں یا بھتہ طلب کر رہے ہوں!

کالم لکھ لکھ کر ذہن بھلے ہی بوڑھا ہوگیا ہو، ہمارا دِل اب بھی جوان ہے۔ اللہ اہلِ پنجاب کو سلامت رکھے۔ اُنہوں نے بعض سدابہار قسم کے اُصول مرتب کرکے ہم جیسوں کا دِل رکھ لیا ہے! دِل کی تسلّی کے لیے اہلِ پنجاب کی یہی بات کافی ہے کہ دِل ہونا چاہیدا جوان، عمراں چ کی رکھیا اے! خیر، ورزش کے نتائج سے متعلق وسوسہ انگیز خبر پڑھ کر ہم نے ورزش کے ارادے اور وزن گھٹانے کے عزم کو ''بالائے طاق کے اُوپر'' رکھ دیا!

ماہرین کے پیدا کردہ اور پھیلائے ہوئے وسوسوں نے ہمارا جینا دُوبھر کردیا ہے۔ کبھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ کافی پینے سے دِماغ میں تیزی آتی ہے، اُس کی کارکردگی کا گراف بلند ہوتا ہے، چُستی اور پُھرتی بڑھتی ہے۔ ایسی ہی کسی

خبر سے متاثر ہو کر جب ہم کافی پینا شروع کرتے ہیں تاکہ آپ کو ہمارے کالم میں چُستی اور پُھرتی دکھائی دے تو کہیں سے یہ خبر نازل ہوتی ہے اور ہم پر بجلی بن کر گرتی ہے کہ باقاعدگی سے کافی پینے سے کئی بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔ ایک تازہ ترین تحقیق کے مطابق روزانہ کیفین کی ہزار ملی گرام سے زائد مقدار لینے سے نیند اُڑ جاتی ہے، دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، مزاج میں اشتعال بڑھ جاتا ہے، سانس لینے میں دِقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے خبر یہیں تک پڑھ کر اخبار رکھ دیا۔ کیا پتا آگے لکھا ہو کہ کافی زیادہ پینے سے کالم لکھنے کی صلاحیت سَلب ہو جاتی ہے!

سچ تو یہ ہے کہ ماہرین نے ہمیں کھلونے میں تبدیل کر لیا ہے۔ جب چاہتے ہیں کھیلتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے توڑ کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ پھر جب کھیلنے کا مُوڈ ہو تو جوڑ کر کھیلنے لگتے ہیں۔ اپنے جیسے دُکھی لوگوں کو ہم یہی مشورہ دیں گے کہ جب بھی جدید تحقیق پر مبنی ماہرانہ مشوروں والی کوئی خبر پڑھیں، اللہ سے پناہ ضرور مانگیں کہ وہ بے بُنیاد وسوسوں سے محفوظ رکھے!

جانوروں اور بالخصوص گدھوں، گھوڑوں کا بے لگام ہونا تو سُنتے آئے تھے مگر کسی شہر کے بے لگام ہونے کے بارے میں سُنا نہیں تھا۔ اب دیکھ لیا ہے کہ جب کوئی شہر بے لگام ہوتا ہے تو کون سی شکل اختیار کرتا ہے۔ کراچی کو شہرِ قائد یعنی قائدِ اعظم کا شہر کہا جاتا ہے مگر حال یہ ہے کہ اب اِس کا قیادت سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ کسی چلتی گاڑی سے اگر ڈرائیور کود جائے تو؟ بس کچھ ایسی ہی کیفیت سے کراچی آج کل ''ہمکنار'' ہے۔

زمانہ آٹومیشن کا ہے۔ فطری علوم پر مبنی فنون کے ماہرین نے بھرپور کوشش کی ہے کہ زندگی آسان سے آسان تر ہو جائے، کسی کو بہتر اور باسہولت زندگی بسر کرنے کے لیے زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔ کم سے کم محنت میں زیادہ سے زیادہ کام ممکن بنانا ماہرین کا ایسا خواب ہے جسے شرمندۂ تعبیر کرتے رہنے کے لیے وہ بے تاب رہتے ہیں۔ وقت انسان کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ اِس اثاثے کو ضیاع سے بچانے پر محنت ہو رہی ہے۔ مغربی دنیا اِس معاملے میں غیر معمولی بلکہ حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین حد تک حسّاس ہے۔ مغرب کے ماہرین چاہتے ہیں کہ زندگی کے کاروبار میں اِنسان کی محنت برائے نام رہ جائے یعنی بیشتر کام خود بخود

ہوتے رہیں۔

اب تک تو آپ نے مشینیں دیکھی ہیں جو آٹومیشن کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرتی ہیں۔

اگر کسی شہر کو آٹومیشن کے اُصول کی بنیاد پر کام کرتے ہوئے دیکھنا ہے تو کراچی پر نظر دوڑائیے۔ یاروں کی مہربانی ہے، عنایت ہے کہ کراچی میں تقریباً سبھی کچھ خود بخود ہو رہا ہے۔ ویسے تو خیر پورا ملک ہی اب آٹومیشن کی راہ پر گامزن ہے مگر کراچی کا طمطراق حواس و عقل کو حیران و پریشان کیے دیتا ہے۔

چند برس پہلے کراچی میں سگنل فری کوریڈور بنائے گئے تھے تب ہمیں حیرت ہوئی تھی کہ کراچی جیسے شہر میں کہ جہاں ٹریفک انتہائی بے ہنگم ہے، گاڑیوں کی آمد و رفت کسی رکاوٹ یا تعطل کے بغیر کیسے برقرار رکھی جاسکے گی۔ سگنل فری کوریڈورز قائم کئے گئے اور اب تک کامیاب ہیں۔ اِس کامیاب تجربے نے شہر کے ذمہ داران کو حوصلہ بخشا اور اُنھوں نے پورے شہر ہی کو سگنل فری کوریڈور میں تبدیل کردیا!

شہریوں سگنل فری ہوا ہے کہ اب کہیں سے کسی سگنل کے موصول ہونے کی فکر ہے نہ حاجت۔ جو اِس شہر کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں وہ چاہتے ہیں کہ سب کچھ

اِسی طرح اپنے طور پر چلتا رہے۔ سگنل فری کوریڈور سے ہٹ کر جو چوراہے ہیں ان پر بھی اب سگنل کی ضرورت نہیں رہی۔ ٹریفک پولیس کا کوئی اہلکار دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے میں لوگ اپنے طور پر گاڑیاں چلاتے ہیں اور اندازے کے بُنیاد پر اِدھر سے اُدھر ہوتے رہتے ہیں۔ یہی حال اب شہر کے نام نہاد نظم و نسق کا ہے۔

مگر ایسا ہمیشہ سے تو نہیں تھا۔ ایک زمانہ تھا جب کراچی کا کچھ حساب کتاب تھا۔ نظم و ضبط تھا۔ انگریزوں نے اِس شہر کو خاصے سُکون سے ترقی دی تھی۔ منصوبے بھرپور توجہ سے تیار کئے گئے تھے اور اُن پر عمل کے معاملے میں بھی یک سُوئی اب تک محسوس کی جاسکتی ہے۔ آبادی کو بہت عمدگی سے کھپایا جاتا تھا۔ ہر معاملہ نپا تُلا تھا۔ کسی بھی معاملے کو ایک خاص حد سے بڑھنے نہیں دیا جاتا تھا۔ مگر خیر، اب تو یہ سب خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ ع

وہ بادۂ شبانہ کی سَرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سَحر گئی

جب نظم و ضبط، منصوبہ بندی اور حُسنِ انتظام کو خیرباد کہہ دیا تو کسی بھی بات پر حیرت کیوں اور کسی بھی چیز کا ملال کیسا؟ کراچی کی روز افزوں آبادی اِسے بے لگام کرنے والا سب سے بڑا فیکٹر ہے۔ کسی بھی سطح پر اور کسی بھی

طرح کی منصوبہ بندی کیجیے، چند ہی برس میں ہر منصوبے کے ٹائر سے ساری ہوا نکل جاتی ہے! کچھ بھی کر دیکھیے، تبدیلی محض چند روزہ ثابت ہوتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرنالہ پھر وہیں بہنے لگتا ہے۔

یہ کوئی دو چار برس کی بات نہیں۔ ایک زمانے سے شہرِ قائد کسی بھی طرح کی قیادت سے ہم کنار و ہم آغوش ہوئے بغیر جی رہا ہے۔ پہلے جو روش معمولی سی لاپروائی اور غفلت شعاری پر مبنی تھی وہ اب مکمل اور ہمہ گیر سَفّاکی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ نہ جانے کس کی بد دُعا کا اثر ہے کہ شہر میں آنکھ کھولنے اور یہاں عمر کی نصف درجن دہائیاں مکمل کرنے والے بھی اِس طرح رہتے ہیں جیسے کہیں سے آئے ہوں اور چند روزہ قیام کے بعد کہیں اور جانا ہو! اِس شہر نے جن کی جھولیاں اور تجوریاں بھر دی ہیں وہ بھی اِس کی بہبود پر اپنی خوشی سے دھیلا خرچ کرنے کو تیار نہیں!

ہوتے ہوتے شہر تو بڑا ہوگیا ہے مگر یہاں پیدا ہونے یا کہیں سے خوشی خوشی اِسے اپنا مستقل مستقر بنانے والے اب تک بڑے نہیں ہو پائے۔ اُن میں بڑپّن اب تک جنم نہیں لے سکا۔ اِس گائے کا دُودھ دوہنا تو سب کو پسند ہے مگر اُسے بہتر چارا یا دانہ ڈالنے کی توفیق کِسی کِسی کو ہے۔

کراچی میں بسنے اور اِس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کرنے والوں نے شاید طے کرلیا ہے کہ اِس شہر کو اب بے قیادت اور بے لگام ہی رہنے دینا ہے۔ ہو سکتا ہے دُنیا کو یہ دِکھانا مقصود ہو کہ دیکھو! ماسٹر پلان وغیرہ کے چکر میں نہ پڑا کرو۔ بڑے شہر کسی بھی نوع کی واضح منصوبہ بندی کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں، چل سکتے ہیں! کراچی صرف سانس ہی نہیں لے رہا ہے، اپنے مکینوں کے سانسوں کا تسلسل بھی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ہاں، اِس عمل کے دوران اُس پر کیا بیت رہی ہے یہ کہانی پھر کبھی سہی۔ ۔

جو تار سے نکلی ہے وہ دُھن سب نے سُنی ہے
!جو ساز پہ گزری ہے وہ کِس دِل کو پتا ہے

نصف عشرے سے کراچی کا یہ حال ہے کہ کوئی پُرسان حال نہیں۔ جیسے اچھی طرح چلتے چلتے کوئی اچانک گڑھے میں گر جائے! لوگ بُنیادی سہولتوں کو اِس قدر ترس گئے ہیں کہ ریاست پر اُن کے اعتماد کی بُنیاد ہِل گئی ہے۔ لوگ بجلی، پانی، گیس اور صحتِ عامہ کی سہولتوں کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ غور و فکر کرنے کو اب یہی کچھ رہ گیا ہے۔ برس میں پبلک ٹرانسپورٹ کا کوئی موثر نظام وضع نہیں کیا جاسکا۔ لوگ روزانہ یُوں 67 کام پر جاتے ہیں کہ شام کو گھر آتے ہیں تو ایک زمانے کی تھکن اُن کے رگ و پے میں سرایت کرچکی ہوتی ہے! زندگی کس بلا کا نام ہے، اُس کے تقاضے کیا ہیں اِتنا سوچنے کی فُرصت کسی کو

مل جائے تو اُسے خوش نصیب سمجھیے۔ لوگوں کو یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ پانی کب آئے گا، بجلی کب درشن دے گی، گیس کا پریشر کب بحال ہوگا! بُنیادی سہولتیں زندگی کے بُنیادی اِشوز کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ اِس مایا جال سے نکلیے تو کچھ نیا سوچیے، کچھ نیا کیجیے۔

کراچی سے ابتدا ہوئی ہے۔ تجربہ ناکام نہیں رہا۔ ثابت ہوگیا کہ کوئی نظام وضع کیے بغیر اور منصوبہ سازی کے ہُنر کو زحمت دیے بغیر بھی ایک بہت بڑا شہر چلایا جاسکتا ہے۔ ملک کے کرتا دھرتا مطمئن ہوگئے ہوں گے۔ پورے ملک کو باضابطہ قیادت کے بغیر چلانے کا بھرپور تجربہ اب زیادہ دور کا معاملہ نہیں لگتا۔ ملک کو قیادت کے بغیر چلانے کا جُزوی تجربہ تو کئی بار کیا گیا ہے اور ہر تجربہ طالع آزماؤں کو مطلوبہ نتائج و فوائد دے گیا ہے۔ جن کے ہاتھ میں سب کچھ ہے اُن کے ہاتھ سے کچھ گیا نہیں۔

جن سے کسی بھی طرح کے قائدانہ کردار کی آس لگائی جاتی رہی ہے وہ تو اب تک کچھ نہیں کرپائے۔ یا یُوں کہیے کہ اپنی جیبیں بھرنے ہی سے اُنہیں فُرصت نہیں مل سکی۔ رات دن بڑھتے، پھیلتے شہر بلکہ میگا سِٹی کو مایا نگری میں تبدیل ہونے کی کھلی چُھوٹ دی جاچکی ہے۔ نظم و ضبط کو طویل رُخصت پر بھیج دیا گیا ہے۔ حساب کتاب سے کہہ دیا گیا ہے کہ اب زحمت نہ کرے۔ بھرپور اور بے

پناہ کوشش کی جاتی رہی ہے کہ کوئی پہلو مکمل نہ ہو، ہر بات ادھوری ہو۔

کراچی کی مایا نگری اُن قائدین کی منتظر ہے جو واقعی راہ دکھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، ڈھنگ سے کچھ ڈلیور کر سکتے ہوں، مایا کے پُجاری نہ ہوں۔ اگر ایسے قائدین کے آنے میں مزید تاخیر ہوئی تو یہ مایا نگری مکمل اندھیر نگری بننے میں مزید تاخیر سے کام نہیں لے گی۔

اسٹیک ہولڈرز ہُشیار باش!

جو نہ مانے اُس کی مرضی مگر سچ یہ ہے کہ سیاست کے جُھوٹ کا پیٹ کچھ چاک ہوا تو ہے،،برف کچھ پگھلی تو ہے اور بات کچھ آگے بڑھی تو ہے۔ اپنی ناقص کارکردگی کے تعفّن کو گڈ گورننس کا چھڑکاؤ کرکے غیر موثر بنانے کی کوشش کرنے والے اب چوکنّے ہوگئے ہیں۔ اُنہیں یہ احساس بھی ہوچلا ہے کہ محض باتیں بنانے سے بات نہ بن پائے گی۔ لوگ گڈ گورننس کو اب بیانات کے دائرے سے باہر یعنی عمل کی دُنیا میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ شیخیاں بگھار کر ایک خاص حد تک کام چلایا جاسکتا ہے۔ ووٹرز جمہوریت کی بقاء کے نام پر ایک ہی سُوراخ سے کِتنی بار ڈسے جائیں گے؟ سیاسی شعور کے ریلے کی سطح بلند ہوتے ہوتے اب اسٹیک ہولڈرز کے حلق تک آ پہنچی ہے۔

طاہرالقادری دھرنا ختم کرکے مغربی ممالک کے دورے پر جاچکے ہیں۔ اِدھر عمران خان اب تک دھرنے کے محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں اور جواب میں حکومت بھی ڈٹے رہنے کے محاذ پر ڈٹی ہوئی ہے۔ عمران خان اور طاہرالقادری سے اختلاف رکھنا ہر پاکستانی کا حق ہے مگر اُنہوں نے کسی نہ کسی شکل میں قومی سیاست کی جو خدمت کی ہے اُس کا اعتراف نہ کرنا دونوں سے ناانصافی ہی کہلائے گا۔

ماننا پڑے گا کہ کائنات میں کوئی بھی واقعہ عِلّت و معلول کے اُصول اور کُلیے سے مُستثنیٰ و ماورا نہیں۔ جو کچھ محض ''شر'' دکھائی دے رہا تھا اُس کے بطن سے تھوڑا بہت خیر بھی برآمد ہوا ہے۔ وسط مدتی انتخابات کا ہانکا لگایا جا رہا ہے۔ ابھی کل تک یہ محض خواب تھا۔ اب بعض سیاسی مہربانوں کا جوشِ خطابت دیکھ کر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وسط مدتی انتخابات زیادہ دور کی بات نہیں۔ جمہوریت کی مایا نگری میں جادو جگانے والوں کو داد دیجیے کہ اُنھوں نے میڈیا کی مدد سے ایسا جادو جگایا ہے کہ قبل از وقت انتخابات ایک نمایاں حقیقت بنتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ محض تاثر بھی ہے تو کیا غم ہے؟ جلسوں، جلوسوں اور دھرنوں کے پہلو سے ایسا کچھ تو ہویدا ہوا ہے جو دِل و دِماغ کو معطّر کر رہا ہے۔

سِسٹم کو ختم کرنے کی باتیں اِس قدر جوش اور تواتر سے کی گئیں کہ بے چارے ''اسٹیک ہولڈرز'' پریشان ہو اُٹھے۔ دھرنوں میں عوام کی بھرپور شرکت اور اب جلسوں میں خاصی پُرجوش حاضری نے موجودہ سِسٹم کے ہر کرتا دھرتا کو متوجہ ہونے اور سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہلچل شروع ہو گئی ہے، بھاگ دوڑ جاری ہے۔ سب اپنے اپنے ووٹ بینک کو بچانے میں لگ گئے ہیں۔ یہ کوشش وکھری ٹائپ کے ڈراموں کو جنم دے رہی ہے۔ جو ایک دوسرے کو بلیک میل کرنے سے آگے کچھ سوچتے

ہی نہ تھے وہ شیر و شکر ہوئے جاتے ہیں۔ آنیاں جانیاں لگی ہوئی ہیں۔ قوم حیران ہے کہ راتوں رات یہ کیا دھماچوکڑی مچ گئی ہے، ایسا کیا ہوگیا ہے کہ سبھی ہڑبونگ کی زد میں دکھائی دے رہے ہیں؟ عوام بے چارے کیا جانیں کہ ''اسٹیک'' کیا ہوتا ہے اور اُس کا داؤ پر لگنا کیا قیامت ڈھاتا ہے! جن کی برسوں، بلکہ عشروں کی ''محنت'' خاک میں مِلتی نظر آ رہی ہو وہ اگر اُتاؤلے اور باؤلے ہوئے جا رہے ہیں تو حیرت کی کیا بات ہے!

وسط مدتی انتخابات کی گردان کرنے والوں کو اُن کے مخالفین تمسخر کا نشانہ بنا رہے تھے مگر اب ایسا ماحول بنتا جا رہا ہے کہ سبھی جلسوں کی چوکھٹ پر سَر جُھکا رہے ہیں۔

اسٹریٹ پاور وہ کارڈ ہے جسے سبھی کسی نہ کسی بہانے سے شو کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کھیل خوب فنڈنگ مانگتا ہے۔ مگر فنڈز کی کمی ہے کہاں؟ بھری ہوئی تجوریوں کے مُنہ کھول دیئے گئے ہیں۔ انگریزی کی مشہور کہاوت ہے کہ فری لنچ نام کی کوئی چیز نہیں ہوا کرتی۔ سیدھی سی بات ہے کہ لوگوں کو دو ماہ سے زائد مدت تک دھرنے میں بٹھا کر بھی مفت لنچ تو نہیں کرایا گیا۔ ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے!

مگر خیر، دھرنوں کی مَشق سے اِتنا تو ہوا کہ سیاسی میدان میں کھیل تماشے دکھا کر کام چلانے والے خوابِ غفلت سے بیدار ہوئے۔ سب کو فکر لاحق ہوئی کہ

کسی ناگہانی صورتِ حال کے لیے تیار رہا جائے۔ کون جانتا ہے کہ کب، کس بِلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ جائے!

موسم عجیب چل رہا ہے۔ گرمیوں کے دِن ختم ہوئے مگر گرمی ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ موسم اور سیاست کی گرمی نے مل کر وہ گرما گرمی پیدا کی ہے کہ بہت سے ''اسٹیک ہولڈرز'' آپس کی سرد مہری ختم کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ حکومت مشکل میں ہے مگر اُس سے زیادہ مشکل میں تو وہ ہیں جو سِسٹم کو بچانے کے نام پر اب تک اُس کا ساتھ دیتے آئے ہیں۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ حکومت کا ساتھ دیتے رہیں، مخالفین سے جا ملیں یا پھر کوئی کونا پکڑ کر محض تماشا دیکھیں۔

دھرنوں کے بعد جلسوں کی ریس شروع ہوئی۔ اور اِس دوسری ریس میں حصہ لینے والے دراصل ووٹ بینک بچانے کے لیے دوڑ رہے ہیں۔ مزید نشستوں کا تو بعد میں سوچیں گے، اِس وقت تو فکر لاحق ہے کہ جو کچھ ہاتھ میں ہے اُسے کیسے بچایا جائے۔ ناکامی سے محفوظ رہنا بھی اُن کے نزدیک کامیابی سے کم نہیں۔

عمران خان اور طاہر القادری کے دھرنوں اور جلسوں نے کراچی، لاہور، ملتان، فیصل آباد، میانوالی اور دیگر شہروں میں نئی نسل کو چارج کردیا ہے۔ اِس بدلتی ہوئی صورتِ حال نے اُن کی راتوں کی نیند اُڑا دی ہے اور دِن کا چین

حرام کردیا ہے جو اب تک مُنہ کی کھاتے آئے ہیں یعنی ایوان میں پہنچنے کے بعد عوام کو صرف وعدوں اور دعووں سے بہلاتے رہے ہیں۔ جو اب تک سیاہ و سفید کے مالک رہے ہیں وہ سوچ سوچ کر پریشان ہیں کہ کہیں اُن کے تمام سفید جُھوٹ کُھل کر سامنے نہ آجائیں اور ساری سیاہی پانی کی طرح اعمال پر نہ پھر جائے۔ سبھی کو خدشہ لاحق ہے کہ

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لادوا

"ایسا نہ ہو کہ "ہم بھی مداوانہ کرسکیں!

اب وہ ایک بار پھر بھرپور تیاری کے ساتھ اپنے اپنے ووٹرز کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ زبان پر نئے وعدے ہیں۔ اور یہ دعویٰ بھی کہ ؎

شاید تمہیں بھی چین نہ آئے مِرے بغیر

شاید یہ بات تم بھی گوارانہ کرسکو!

دوسری طرف ووٹرز بپھرے ہوئے ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں ؎

تم ہو" ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی"

تم" نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی"!

عوام بھی کیا کریں؟ ایک ہی سیاسی سُوراخ سے خود کو کتنی بار ڈسوائیں؟ کب

تک جُھوٹے اور بے بنیاد وعدوں پر بھروسہ کرکے اپنے آپ کو دھوکا دیں اور اپنی ہی نظروں سے گرتے رہیں؟ کب تک ووٹ کاسٹ کرنے کے بعد روتے ہوئے گنگنایا کریں ع

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا

دھرنوں سے بہت کچھ بگڑ بھی گیا مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ بنا بھی تو ہے۔ لوگ متحرک ہو رہے ہیں اور اپنے سوالوں کے جواب چاہتے ہیں۔ کراچی میں بھی فضا تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ تین عشروں سے مسائل کے حل کی راہ تکنے والے بیدار ہو کر آنکھیں مل رہے ہیں۔ بیداری کی لہر نے اُنہیں بھی جمود کی دیواریں گرانے کی تحریک دی ہے۔ وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کہیں اِس بار بھی ٹرین مِس نہ کردیں!

عمران خان نے چند ایک غلطیاں بھی کی ہیں مگر یہ کیا کم ہے کہ وہ سیاسی شعور کسی حد تک جگانے میں کامیاب رہے ہیں۔ طاہرالقادری نے ڈھائی ماہ تک چیخ چیخ کر سمع خراشی ضرور کی ہے مگر شُکر ہے کہ اِس چیخ پُکار نے سوئے ہوئے ''اسٹیک ہولڈرز'' کو بیدار ہو کر کچھ کرنے کی راہ بھی تو سُجھائی ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات اور ووٹرز کے بدلتے ہوئے موڈ سے کچھ تحریک پائیں اور اپنے اپنے اسٹیکز بچانے کے لیے کچھ ڈلیور کرنے پر کمربستہ ہوں۔

عوام ٹرین مِس نہ کرنے کا سوچ رہے ہیں تو اُن کے ووٹوں کے بَل پر جیبیں اور تجوریاں بھرنے والوں کو بھی ٹرین مِس نہ کرنے کا سوچنا ہی چاہیے۔ عوامی حمایت کی ٹرین نکل گئی تو مشکل ہی سے ہاتھ آئے گی۔

فیصلہ کُن جنگ

موسم سرد ہے مگر جذبوں کا موسم گرما ہے کہ جانے کا یا ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ آپ سوچیں گے جذبوں کی گرمی تو برقرار ہی رہنی چاہیے۔ ٹھیک ہے، مگر جذبے بھی درست ہوں۔ ملک سردی کے ساتھ ساتھ دھرنوں، جلسوں اور جنگوں کے موسم سے بھی گزر رہا ہے۔ ایک جنگ وہ ہے جو ہمارے جوان شمالی وزیرستان اور دیگر قبائلی علاقوں میں لڑ رہے ہیں۔ یہ ملک کی بقاء کی جنگ ہے۔ اور دوسری طرف وفاقی دارالحکومت سمیت ملک کے تمام بڑے شہروں میں بھی ایک جنگ لڑی جارہی ہے۔ یہ جنگ بظاہر اقتدار کی بقاء کی ہے مگر اُس سے کہیں بڑھ کر جھوٹی انا کی ہے۔ اِس میں فریقین برابر کے ہیں۔ کوئی کسی سے کم نہیں۔ یا کم از کم اپنے آپ کو کم سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

عمران خان اور طاہر القادری نے مل کر جو محاذ کھولا تھا وہ اب دو لخت ہوچکا ہے۔ کوئی بھی اپنے مفادات یا ''اصولی سیاست'' کے ''ما حصل'' کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہیں۔ ہر ایک کو یہ خطرہ ہے کہ کہیں فریقِ ثانی میلہ نہ لُوٹ لے ! طاہر القادری تازہ دم ہو کر یورپ سے واپس آ چکے ہیں۔ اُن کے یورپ جانے سے یہ تو ثابت ہو ہی گیا کہ وہ تھک گئے تھے اور کچھ دن محاذ سے دور رہ کر نئ

حکمت عملی تیار کرنا چاہتے تھے۔

تحریک انصاف کے چیئرمین اسپورٹس مین رہے ہیں مگر اب اُن کا سیاسی قد اِتنا بلند ہوچکا ہے کہ ہم اُن پر ''اسپورٹس مین اسپرٹ'' کا ''الزام'' عائد نہیں کر سکتے۔ اگر کسی نے ''اسپرٹ'' کے ترجمے میں غلطی کردی تو خان صاحب خواہ مخواہ ناراض ہوجائیں گے۔ ہم ابھی اُن کی باتوں سے بہت کچھ پانا اور کشید کرنا چاہتے ہیں اِس لیے اُن کی ناراضی کسی قیمت پر مول نہیں لیں گے۔

یہ بات تو ماننا پڑے گی کہ عمران خان کا دم خم ماند پڑنے کا نام نہیں لے رہا۔ کھیلوں کی دنیا میں گزارے ہوئے زمانے کی بدولت اُن میں ایک اچھی عادت ضرور پیدا ہوئی، یہ کہ ورزش کا دامن اُنھوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہ نکتہ بھی اُنھوں نے اچھی طرح ذہن نشین کر رکھا ہے کہ سیاست میں بھی اسٹیمنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ عمران خان جسمانی ورزش کے معاملے میں زیادہ پُختہ ہیں یا سیاسی مشق کے معاملے میں ۔

شیخ رشید کو اپنے خیر خواہوں اور معاونین میں شمار کرکے عمران خان نے ثابت کردیا کہ وہ مہم جُو طبیعت کے مالک ہیں اور رکاوٹیں عبور کرنے میں دلچسپی

رکھتے ہیں۔ شیخ رشید کی شبانہ روز محنت اور باقاعدگی سے جاری رہنے والی مشاورت نے عمران خان کو بھرپور اور جامع احتجاجی سیاست دان میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ خود بھی تو یہی ہیں۔ کپتان کے لیے شیخ رشید سَر بہ سَر نمک کی کان ثابت ہوئے ہیں۔ جو بھی نمک کی کان میں پہنچتا ہے، نمک ہو جاتا ہے۔ عمران خان بھی اِسی مرحلے سے گزر رہے ہیں۔

شیخ رشید کے چند حالیہ بیانات اور بالخصوص تقریروں نے خاصا اُدھم مچایا ہے۔ دوسروں کے قائم کئے ہوئے اسٹیج پر شیخ صاحب نے مزے سے اپنے دِل کی بھڑاس نکالی ہے۔ اُن کی ہر تقریر ''ایسا موقع پھر کہاں ملے گا؟'' ثابت ہوئی ہے۔ حکومت بجا طور پر برہم دکھائی دے رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شیخ صاحب کچھ زیادہ ہی بول گئے ہیں۔ مگر خیر، وہ کب زیادہ نہیں بول جاتے! بعض سادہ دل یہ کہہ رہے ہیں کہ شیخ رشید کو حکومت کے خلاف جذبات بھڑکانے کے معاملے میں اِس حد تک نہیں جانا چاہیے تھا۔ اب شیخ صاحب اُس مقام سے گزر چکے ہیں کہ کچھ کہنے سے کچھ بگڑے۔ اُن کی سیاست میں اب رہا ہی کیا ہے جو بگڑے گا؟ اُن کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، فکر عمران خان کو کرنی چاہیے۔ خان صاحب کا بہت کچھ داؤ پر لگ سکتا ہے، بلکہ شاید لگ بھی چکا ہے۔ شیخ رشید جن جلسوں میں حکومت کے خلاف گل افشانیاں کر رہے ہیں وہ اُن کی پارٹی یعنی عوامی مسلم لیگ کے نہیں، تحریکِ انصاف کے ہیں۔ اگر تحریکِ انصاف کے جلسے میں عوام کو خرابی پر اُکسانے والی کوئی بات کی جائے گی تو جواب عمران خان سے مانگا جائے گا۔ اگر

بات جواب طلبی تک پہنچی تو عمران خان کے چاہنے والوں کو بہت دُکھ ہوگا کہ ع
پکڑے جاتے ہیں "وہ اوروں کے کہے" پر ناحق
اگر شیخ رشید کو جُملۂ معترضہ کی طرح ایک طرف کردیا جائے تو عمران خان کو اِس بات کی داد تو دینا ہی پڑے گی کہ اُنھوں نے اپنی بات پر قائم رہ کر دکھایا ہے۔ دھرنے کے موقف پر وہ اب تک قائم ہیں اور بظاہر پسپائی کے لیے تیار بھی نہیں۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے پندرہ بیس دن کے لیے میدان چھوڑنا گوارا کرلیا مگر عمران خان فی الحال کریز چھوڑنے کے موڈ میں نہیں۔
نومبر کو کیا ہوگا، اللہ جانتا ہے۔ عمران خان نے فیصلہ کن جنگ کا اعلان کردیا ہے۔ 30 بات عجیب سی ہے۔ ایک طرف وہ کہتے ہیں شاید حکومت ایک سال اور نکال جائے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو فیصلہ کن جنگ کیوں؟ یہ واضح نہیں کہ 30 نومبر کو فیصلہ کن جنگ ہوگی یا جنگ کا آغاز ہوگا۔ لوگ یہ دیکھ کر بھی حیران ہیں کہ جنگ کا فیصلہ اور اعلان عمران خان نے کیا ہے مگر طبلِ جنگ بجانے، بلکہ بجاتے رہنے کا فریضہ شیخ رشید انجام دے رہے ہیں۔
اب آیئے، اِس سوال کی طرف کہ فیصلہ کن جنگ سے آخر کیا مراد ہے۔ کیا حکومت

یا جمہوریت کا بوریا بستر گول کرنے کی حتمی لڑائی شروع کی جانے والی ہے؟ کیا عمران خان کوئی خفیہ ہتھیار آزمانا چاہتے ہیں؟ اگر ہاں تو کون سا؟ اور اِس سے بڑھ کر یہ سوال کہ اب اُن کے پاس کون سا خفیہ ہتھیار رہا ہے؟ قوم میں بیداری کی لہر تو اُنھوں نے دوڑا ہی دی ہے۔ اُن کے لیے اِس سے بڑا ہتھیار کون سا ہو سکتا ہے؟ حکمران اگر چاہتے تو تھوڑی سی گڈ گورننس کا اہتمام کرکے ''ڈیٹرنس'' کھڑا کر سکتے تھے۔ مگر شاید وفاداروں نے یقین دلا دیا ہوگا کہ ایسا کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں!

عمران خان فیصلہ کن جنگ تو بہت پہلے شروع کر چکے ہیں۔ عوام کو حقوق کے لیے بیدار کرنے سے بڑی فیصلہ کن جنگ کون سی ہو سکتی ہے؟ اِس کے بعد تو کسی کا کوئی بھی ہتھیار کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔ عمران خان نے عوام کا شعور تو بیدار کر دیا مگر خود اُن کا ذہن مکمل بیداری کی حالت میں نہیں۔ وہ یہ بات نہیں سمجھ پا رہے کہ شیخ رشید اور اِس قبیل کے دیگر ''احباب'' پورس کے ہاتھی کا کردار ادا کرتے ہوئے تحریکِ انصاف کے ایڈوانٹیج کو ڈِز ایڈوانٹیج میں تبدیل کر رہے ہیں!

عمران خان اِس وقت کچھ ایسی ہی کیفیت میں ہیں کہ کسی کی کوئی بھی خیر خواہانہ بات، کوئی بھی صائب مشورہ سُننے کے لیے تیار نہیں۔ اِس کیفیت کو

جون ایلیا نے یوں بیان کیا تھا۔
میں بھی بہت عجیب ہوں اِتنا عجیب ہوں کہ بس
!خود کو تباہ کرلیا اور ملال بھی نہیں
عمران خان کچھ اور سمجھنا نہیں چاہتے تو اُن کی مرضی مگر اِتنا ضرور سمجھیں کہ قوم کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے، ورغلانے اور اُکسانے کی نہیں۔ اندازے کی غلطی اِنسان کو پلک جھپکتے میں ہدف یا منزل سے بہت دور لے جاتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اندازے کی کوئی بڑی غلطی کر بیٹھیں اور پھر اپنے ہی فیصلوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنی پڑے! سیاست محض فیصلے کرنے کا نہیں بلکہ درست اور بروقت فیصلے کرنے کا فن ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عمران خان پتّے کھیلنے کے شوقین ہیں نہ شو بازی کے مگر اب اُنہیں !اپنے پتّے بہت سوچ سمجھ کر شو کرنا ہوں گے

خطرے کی گھنٹی

تحریک انصاف نے ایک اور معرکہ جیت لیا ہے۔ پیپلز پارٹی کے گڑھ میں کامیاب جلسہ کوئی معمولی کامیابی نہیں۔ لاڑکانہ کے نواحی قصبے علی آباد میں تحریک انصاف کے جلسے کو حالات اور زمینی حقائق کی روشنی میں غیر معمولی کامیابی قرار دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ عمران خان کو دیکھنے اور سُننے کے شوقین اہل سندھ نے خاصے جوش و خروش اور خاموشی سے پیغام دے دیا ہے کہ اُنہیں نئی قیادت درکار ہے جو تازہ دم بھی ہو اور کچھ کرنے کا عزم بھی رکھتی ہو۔

پیپلز پارٹی کے گڑھ میں تحریک انصاف کے جلسے کو کامیابی سے ہمکنار تو ہونا ہی تھا۔ پیپلز پارٹی اِس بار بھی توقعات پر پوری اترنے میں ناکام رہی ہے۔ عملی سطح پر اُس نے ایسا کچھ نہیں کیا جس کی بنیاد پر کہا جائے کہ وہ عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے میں زبانی دعووں سے آگے جانا چاہتی ہے۔ ایک بڑی جماعت کے ایسے رویّے کا صرف ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔

پیپلز پارٹی کے لیے حقیقی لمحۂ فکریہ آچکا ہے۔ زمینی حقائق کے ادراک میں وہ اب تک ناکام رہی ہے۔ یا شاید یہ اُس کی ''شانِ بے نیازی'' ہے! عوام اب محض

وعدوں اور دعووں سے بہلنے کو تیار نہیں۔ اُنہیں اور بہت کچھ درکار ہے۔ خوش کن نعروں سے اُن کا پیٹ نہیں بھرے گا۔ عمل کی دُنیا میں بھی کچھ تو دکھائی دینا چاہیے۔ تجزیہ کاروں نے پیپلز پارٹی کو ڈرانا شروع کردیا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ تحریک انصاف خطرے کی گھنٹی ہے، وہ سندھ میں تیسری قوت کی حیثیت سے اُبھر رہی ہے۔ تجزیہ کار کہتے ہیں کہ اگر تحریک انصاف ایسے ہی مزید تین چار جلسے کرنے میں کامیاب ہو گئی تو لوگ اُسے سندھ میں تیسری یا پیپلز پارٹی کی متبادل قوت کے طور پر قبول کرلیں گے۔ جی تو چاہتا ہے کہ ہم تجزیہ کاروں کی سادگی پر مِٹ جائیں۔ پیپلز پارٹی کوئی ایسی گئی گزری جماعت نہیں کہ دو چار "چھوٹے موٹے" جلسوں سے خوفزدہ ہو کر میدان چھوڑ دے۔ جیالوں نے ڈرنا سیکھا ہی نہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ کسی بھی معاملے کے انجام سے باخبر ہونے پر بھی اپنی روش ترک نہیں کرتے! اب اِسی بات کو لیجیے کہ جن لوگوں کا پیپلز پارٹی سے کوئی تعلق نہیں وہ اِس کے انجام کے بارے میں سوچ کر لرزاں و ترساں ہیں مگر خود جیالوں کو بظاہر کچھ پروا نہیں!

ٹیکنالوجی کے شعبے میں روز افزوں ترقی نے کئی کام آسان کر دیئے ہیں۔ بہت سے کام کم محنت سے اور کم وقت میں ہو رہے ہیں۔ اور اِس کے نتیجے میں لوگوں کو فراغت نصیب ہو رہی ہے۔ سیاسی اُمور پر غور کرنے والے بھی فراغت کے کُلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ پیپلز پارٹی نہ ہوتی تو اللہ جانے اُنہیں میسر ہونے والی فراغت کا کیا ہوا ہوتا۔ اب تجزیہ کاروں کا بیشتر وقت پیپلز پارٹی کے مستقبل کے بارے میں اٹکل کے گھوڑے دوڑانے میں صرف ہوتا ہے!

جو لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تحریک انصاف نے پیپلز پارٹی کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے اُنہیں شاید یہ اندازہ ہی نہیں کہ جیالے کسی سے نہیں ڈرتے، خوف نہیں کھاتے۔ ڈرتے تو وہ ہیں جو سوچتے ہیں! جیالوں کو سوچنے کی فُرصت ہے نہ عادت۔ اُن کا کام تو صرف جی داری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ خطرے کی گھنٹی بجے یا گھنٹہ، وہ جیالا ہی کیا جو ٹس سے مس ہو جائے!

سندھ میں دیہی اور شہری کی تقسیم اِس قدر جڑ پکڑ چکی ہے کہ فی الحال اِس کے ختم ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ رات دن ایسے حالات کو پروان چڑھایا جارہا ہے جن کے ہاتھوں یہ تقسیم مزید پختہ ہوتی جاتی ہے۔

خطرے کی گھنٹی بجتی ہے تو بجتی رہے، سندھ میں جنھوں نے اپنے لیے کوئی ڈگر

مختص کرلی ہے انہیں یقین ہے کہ حمایت کا دریا بہتا رہے گا، ووٹ بینک برقرار رہے گا۔ سندھ میں دیہی اور شہری کی تقسیم ہی نے یہاں کے سیاسی اسٹیک ہولڈرز کا ووٹ بینک برقرار رکھا ہے۔

سندھ میں جب بھی کسی تیسری قوت کے اُبھرنے کا امکان پیدا ہونے لگتا ہے، اسٹیک ہولڈرز اپنے اپنے ووٹ بینک کو توانا کرنے کے لیے میدان میں نکل آتے ہیں۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ ووٹ بینک کو نئی زندگی کیسے دی جاتی ہے؟ جی نہیں، آپ کا اندازہ غلط ہے۔ کارکردگی بہتر بنانے کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور گڈ گورننس بھی کوئی لازمی چیز نہیں۔ اپنے اپنے ووٹ بینک کو توانا کرنے کے لیے لوگوں کو ایک دوسرے سے ڈرانا ہی کافی ہے! جب ایک کمیونٹی دوسری سے یا دیگر کمیونٹیز سے خوفزدہ ہو تو اپنے نمائندوں کی کارکردگی کے بہتر ہونے کا انتظار کیے بغیر اُنہیں پہلے سے بھی بڑھ کر حمایت سے نوازتی ہے۔ اُسے ایسا کرنے پر مجبور کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ''ہوّا'' کھڑا کیا جاتا ہے کہ فلاں کمیونٹی کھاجائے گی یا فلاں گروپ تمام حقوق سلب کرلے گا۔

جب نوکری پکّی ہوگئی ہو تو لوگ کام پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ ایک سندھ پر کیا موقوف ہے، پورا ملک اِسی نوعیت ہے۔ یہی حال سیاست کا بھی ہے۔ اگر حالات

کے جبر کی مہربانی سے ووٹ بینک پکّا ہوگیا ہو تو کسی کے آنے سے خوف محسوس ہوتا ہے نہ جانے سے۔ اگر سیاسی جماعتوں کا ووٹ بینک پکّا ہو تو عام انتخابات میں اُسے ملنے والا مینڈیٹ "کھمبا ووٹ" کہلاتا ہے۔ یعنی ووٹ بینک اِس قدر مضبوط ہے کہ کھمبے کو بھی امیدوار بنایا جائے تو اُسے ووٹ ملیں گے ! یہ "کھمبا ووٹ" کی مہربانی ہے کہ کسی سیاسی جماعت پر حد سے بڑھ کر مہربان ہونے والے بعد میں کھسیانی بلّی کی طرح کھمبے نوچتے رہ جاتے ہیں!

وقت آگیا ہے کہ لوگ سوچنے کے آپشن کو اپنائیں اور "کھمبا ووٹ" کی ذہنیت ترک کریں۔ جو لوگ مینڈیٹ کا حق ادا نہ کرپائیں اُن سے گلو خلاصی ناگزیر ہے۔ نئی قوتوں یا نئے لوگوں کو آزمانے میں کچھ ہرج نہیں۔ سندھ میں گورننس کا مسئلہ ایک زمانے سے ہے اور حل ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ جنہیں لوگ عشروں سے ووٹ دیتے آرہے ہیں اُنہوں نے مسائل حل کرنے میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لی۔ بھاری مینڈیٹ لے کر پدھارنے والے اپنی جیبیں اور تجوریاں بھرتے ہیں اور ہاتھ جھاڑ کر چل دیتے ہیں۔ اُنہیں اپنے امکانات کے معدوم ہونے کی ذرہ بھر فکر لاحق نہیں ہوتی، ووٹ بینک کے کمزور پڑنے کا خوف دامن گیر نہیں ہوتا۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی خوف ووٹرز کو پھر اُن کی طرف لے آئے گا۔ جو خود کو اسٹیک ہولڈرز کہتے نہیں تھکتے وہ عمل کی دُنیا میں ایسا کچھ

نہیں کرتے جس سے اندازہ ہو کہ اُنہیں اپنے اسٹیکر کا کچھ خیال ہے!

تیسری قوت محض جلسوں کی کوکھ سے جنم نہیں لے سکتی۔ تحریکِ انصاف واقعی خطرے کی گھنٹی بننا چاہتی ہے تو اُسے خیبر پختونخوا میں کچھ نہ کچھ ڈیلور کرنا ہوگا۔ نمونہ دکھائی دے گا تو لوگ بڑھ کر تحریکِ انصاف کے قدم چُومیں گے۔ خیبر پختونخوا پر حکمرانی تحریکِ انصاف کے لیے ٹیسٹ کیس بھی ہے اور لٹمس ٹیسٹ بھی۔ خیبر پختونخوا میں کچھ کر دکھانے پر تحریکِ انصاف کو مال بیچنے کے لیے وعدوں اور دعووں کا منجن نہیں بیچنا پڑے گا۔ اور اگر وہ خیبر پختونخوا میں کچھ نہ کر پائی، عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے میں ناکام رہی تو خود اُس کے لیے خطرے کی گھنٹی بج جائے گی۔ فکر ہو یا عمل، دونوں معاملات میں تحریکِ انصاف کے لیے یہ آزمائش کی گھڑی ہے۔ وہ سندھ میں تیسری قوت بن سکتی ہے اور پیپلز پارٹی کی متبادل بھی ثابت ہو سکتی ہے مگر اِس کے لیے زمینی حقائق نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ لوگ عمل کی دُنیا سے کوئی بڑا نمونہ چاہتے ہیں اور تحریکِ انصاف کو یہ نمونہ خیبر پختونخوا کے پلیٹ فارم سے پیش کرنا ہوگا۔

خود خوش" سیاست دان"

ہمیں اہل سیاست کی یہی ایک ادا بہت پسند ہے کہ اگر کچھ کرنے کی ٹھان لیں تو ہر قیمت پر کرکے دم لیتے ہیں۔ قیمت کا سوچیں اُن کے دشمن۔ کون سی اُنہیں قیمت ادا کرنی ہوتی ہے! بیشتر سیاسی یاروں نے ''تخت یا تختہ'' والا مزاج پایا ہے۔ یعنی خود نہ کھیل پائیں تو کسی کو کھیلنے بھی نہیں دیں گے۔

سیاست کے اسٹیج پر ''منہ کی کھانے والے'' یوں تو بہت ہیں بلکہ ایک ڈھونڈو تو ہزار ملتے ہیں مگر جو بات شیخ رشید میں ہے وہ کسی اور میں دکھائی نہیں دیتی۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی کی زبانی کہیں تو ؎

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں!

حالات کی خرابی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ شیخ رشید جیسے سیاسی مہربان نہ ہوں تو انسان ہنسنا بھول کر اور تفکرات کے دریا میں غرق ہو جائے۔ شیخ رشید اور اُن کے قبیل کے چند احباب کا دم غنیمت ہے۔ وہ حالات کی تلخی میں پائے جانے والے زہر کا اپنے بیانات کے ذریعے تریاق پیدا کرنے کے ماہر ہیں۔

شیخ رشید کی باتوں میں اب ''شیخی'' کا عنصر نمایاں ہوچلا ہے۔ جو لوگ پنجابی فلمیں دیکھنا محض اِس لیے ترک کرچکے ہیں کہ ''معیاری'' بڑھکیں سُننے کو نہیں ملتیں وہ ہرگز دل چھوٹا نہ کریں اور شیخ صاحب کی تقریروں کو آزما دیکھیں! ہم پورے یقین اور ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں کہ شیخ صاحب اُنہیں مایوس نہیں کریں گے۔ اُنہوں نے مایوس کرنا سیکھا ہی نہیں۔ جلسوں میں شریک ہوکر اُن کی باتوں پر سَر دُھننے والے گواہ ہیں۔ آج کل شیخ صاحب بہت بھرپور موڈ میں ہیں۔ اُن کے زورِ بیان کا ستارا خاصی بلندی پر ہے۔ مٹی میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو وہ سونا بن جاتی ہے یعنی معمولی بات بھی کہتے ہیں تو بڑھک معلوم ہوتی ہے! عمران خان کے جلسوں میں شیخ رشید کا جوش و خروش قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی۔ اُنہوں نے اپنی جاندار اور شاندار تقریروں سے اہل وطن کی بہت سی مشکلات دور کردی ہیں۔ آج کل کی بے ڈھنگی اور بور پنجابی فلمیں دیکھ دیکھ کر بیزاری کی چادر اوڑھے ہوئے لوگ چاہیں تو اُن کی تقریروں سے سلطان راہی اور مظہر شاہ والی بڑھک بھی کشید کرسکتے ہیں اور موڈ خراب ہو تو مزاح کی مطلوبہ خوراک بھی نچوڑی جاسکتی ہے۔ شیخ صاحب کی تقریریں بچت بازار کی سی ہوتی ہیں جن میں ہر شخص کے مزاج کی چیزیں پائی جاتی ہیں! اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کی شعلہ بیانی کے

! بازار سے لوگ کچھ نہ کچھ بلا ضرورت بھی خرید لیتے ہیں
تین چار دن سے شیخ صاحب کے فنِ خطابت کا ستارا ہی نہیں، پارا بھی خاصی بلندی پر ہے۔ وزیر وہ ریلوے کے رہے ہیں مگر تقریروں میں طیاروں والی اسپیڈ پائی جاتی ہے ! اُن کی بہت سی باتیں سُننے والوں کے سَر سے گزر رہی ہیں۔ شیخ صاحب کے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا جارہا ہے اور اِس کے نتیجے میں وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ جلسوں کے شرکاء یا گھر بیٹھے اُن کی باتوں سے محظوظ ہونے والوں کے ساتھ ساتھ خود حکومت کے لیے بھی آزمائش سے کم نہیں ! ساہیوال میں تحریکِ انصاف کے جلسے میں شیخ صاحب بِپھر گئے۔ اِس میں بھی قصور حکومت کا ہے جو اُن کی باتوں پر ٹس سے مس نہیں ہو رہی۔ اور عوام بھی کم ذمہ دار نہیں جو اُن کی طرف سے بار بار ''دعوتِ گناہ'' ملنے پر بھی جمہوریت کی عزت پر ہاتھ ڈالنے سے گریزاں ہیں ! حکومت اور عوام کی بے حِسی کے باعث پیدا ہونے والے شدید غصے کی حالت میں شیخ صاحب نے فرمایا کہ ''اگر عمران خان کو گرفتار کیا گیا تو پورے ملک میں آگ لگادوں گا!'' (اِتنا کہنے کا یارا تو خود عمران خان میں بھی نہ تھا!) اور یہ کہ ''میں خودکش سیاست دان ہوں، تابوت کاندھوں پر لیے پھرتا ہوں، ہتھکڑی زیور ہے اور جیل سُسرال! ''
ہم میں اتنا حوصلہ نہیں کہ شیخ صاحب کی تقریریں براہِ راست سُنیں اور اُن

کی تاب بھی لا سکیں اِس لیے اخبارات میں شائع ہونے والے اُن کے فرمودات پر گزارا ہے۔ سُورج کو فلٹر کی مدد ہی سے دیکھا جاسکتا ہے! اور سچ تو یہ ہے کہ اخبارات میں شیخ صاحب کی تقریروں کی رپورٹ پڑھ کر بھی ہمارے حواس مختل ہونے لگتے ہیں۔

ساہیوال میں کے جلسے میں شیخ صاحب نے اپنے آپ کو پاکستانی سیاست کا انسائیکلو پیڈیا بھی قرار دیا۔ ہم ذرا نیند میں تھے اِس لیے انسائیکلو پیڈیا کو ری سائیکل بن پڑھ گئے۔ اور پھر دیر تک ایک "نابغہ" کو غلط سمجھنے کا ماتم کرتے رہے۔ اِسی تقریر می شیخ صاحب نے ایک نیا فارمولا بھی عنایت کیا۔ یہ کہ "اگر گھی سیدھی اُنگلی سے نہ نکلے تو اُنگلی ٹیڑھی کیجیے۔ اور ایسا کرنے سے بھی کام نہ بنے تو کنستر ہی کاٹ ڈالیے!" یعنی گھی اگر میرا نہیں بنتا نہ بنے، تیرا بھی نہیں بننے دوں گا!

ہم نے شیخ صاحب کی شعلہ بیانی کا تذکرہ جب مرزا تنقید بیگ سے کیا تو ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔ ہم نے سبب پوچھا تو مزید سرد آہ کھینچ کر بولے۔ "کسی زمانے میں ہم بھی ایسے ہی شعلہ ہوا کرتے تھے۔ مگر پھر وقت کی آندھی (یعنی بھابی صاحبہ) نے شعلہ بیانی کا چراغ بجھادیا۔ اب تو ہم ہیں اور ٹھنڈا ٹھار لہجہ ہے۔"

مرزا کا استدلال ہے کہ شیخ صاحب کی ساری شوخی اور گرم گفتاری اِس لیے ہے کہ موصوف اب تک گرہستی کے وبال سے دوچار نہیں ہوئے۔ مزید فرمایا۔ "ایک بار

شادی ہو جائے، گھر بس جائے تو پھر دیکھیں گے کہ شیخ صاحب کون سے جلسے میں جاتے ہیں اور کون سی حکومت کو للکارتے ہیں۔ جب گھر کی ذمہ داری سر پر پڑے گی تو لگ پتا جائے گا۔ فی الحال تو زندگی مزے میں گزر رہی ہے۔ کوئی روکنے والی ہے نہ ٹوکنے والی۔ یہ تو گھر والیوں ہی کا دم ہے کہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کو اپنی اوقات میں رکھا ہے یعنی 'خود کش' سیاست دان بننے سے روک لیا ہے!

مرزا کی بات میں دم ہے۔ جو لوگ خود کو سیاست کی دنیا میں اسٹیک ہولڈرز سمجھتے ہیں در حقیقت ان کا تو کچھ بھی داؤ پر نہیں لگا ہوا۔ جب لُٹانے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں تو پھر کوئی بھی خطرہ مول لینے میں کیسا خطرہ! جو حال شیخ رشید کا ہے وہی عمران خان کا ہے۔ بچے بڑے ہو چکے ہیں اور گھر میں گھر والی نہیں۔ ایسے میں کاہے کی فکر اور کیسی پریشانی؟ سیاست کے نام پر جو جی میں آئے کرتے رہیے۔ ہے کیا جو ہاتھ سے جائے گا؟ شیخ صاحب نے خود کش سیاست دان ہونے کے دعوے کے ساتھ اپنے کاندھوں پر جس تابوت کا ذکر کیا ہے، گھر والیاں اُسی تابوت میں اپنے اپنے گھر والوں کو بند کرکے اُنہیں یومیہ بنیاد پر سانس روکنے کی مشق کراتی ہیں!

عمران خان ہوں یا شیخ رشید دونوں ہی کسی عورت کو قوم کی بھابی بنانے کی

منزل سے بہت دور کھڑے اوروں کے دُکھ بھرے ازدواجی سفر کا نظارا کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اُنہیں کیا معلوم کہ حکومت چلانے سے کہیں بڑا دردِ سَر گھر چلانا ہے۔ یہ تو وہ ذمہ داری ہے جسے نبھاتے نبھاتے اِنسان کا دِماغ چل جاتا ہے۔ اور جب گھر داری میں دِماغ چل جائے تو جلسوں میں شعلہ بیانی خیال و خواب کا معاملہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ مجمع کو دیکھ کر آواز بیٹھنے لگتی ہے! جب تک گھر خالی ہے، ''خود کش'' سیاست دان ہونے کا دعویٰ ہے۔ اگر گھر داری کا ٹوکرا سَر پر آن پڑا تو عمران خان نیا پاکستان اور شیخ صاحب ''خود کش'' سیاست کو بھول بھال جائیں گے۔ صبح اُٹھ کر بیوی سے ٹاکرا ہوگا تو معلوم ہوسکے گا کہ دن کیسے گزرتا ہے۔ روز یہی کہتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا کریں گے کہ

ے

آج کا دن بھی خیر سے گزرا

!سَر سے پا تک بدن سلامت ہے

! کتھے کُڑی دا یار

ٹھیک سے یاد نہیں کہ ایسا کب سے ہو رہا ہے۔ حق یہ ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے، ہم نے یہی دیکھا ہے کہ پریشانیاں ہمیں تلاش کرتی پھر رہی ہیں۔ ''ہم'' سے مُراد قوم ہے۔ (اگر ہم سے مُراد اپنی ذات لی جائے تو معاملہ صرف ایک پریشانی تک محدود ہے!) بحیثیت قوم ہم پریشانیوں کا صرف انتظار نہیں کرتے، اُنہیں ڈھونڈتے بھی پھرتے ہیں۔ اور جہاں بھی کوئی پریشانی دکھائی دے، اُسے ''مومن کی کھوئی ہوئی میراث'' سمجھ کر گلے لگانے کے لیے بے تاب ہوجاتے ہیں! الم پسندی ہمارے قومی مزاج سے چپک کر، چمٹ کر رہ گئی ہے! اور ایسا کیوں نہ ہو؟ جب سبھی کو آلام سے لگاؤ ہے تو آرام بھی اُنہی سے ملتا ہے۔ اور قوم کیوں کہیے، اب تو پُوری اُمّت کا یہی مزاج ہوگیا ہے۔ جو چیز جس قدر دُکھ دے اُسی قدر اچھی لگتی ہے۔ (اِس معاملے میں ''استثنٰی'' صرف بیگمات کو حاصل ہے!)

کتنے ہی بُحران ہیں جو ہم نے بڑے چاؤ سے، بہت ہی خُشوع و خُضوع سے اپنائے ہیں۔ اور ایسا خیر مقدم کیا ہے کہ وہ بوریا بستر کھول کر یہیں کے ہوگئے، کہیں اور جانے کا خیال دِل سے نکال دیا۔ کتنے ہی مسائل ہیں جو کہیں اور جارہے تھے مگر ہم نے اُنہیں آواز دی اور ایسی آؤ بھگت کی کہ اب وہ اپنا

رستہ بھول کر ہی کو منزل سمجھ بیٹھے ہیں۔ کوئی بُحران اگر رخصت ہونے کی اجازت طلب کرے تو ہم ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں ع

!ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دِل ابھی بھرا نہیں

اور دِل بھرے بھی تو کیسے؟ الم پسندی کے معاملے میں ہم بیک دِل پھینک اور دِل کے بہت بڑے واقع ہوئے ہیں۔ زمانے بھر کے روگ ہم نے یُوں خوشی خوشی اپنائے ہیں کہ اب طرح طرح کی پیچیدگیاں پھرتی پھراتی، گھومتی گھماتی ہم تک پہنچتی ہیں اور ہم اُنہیں دِل و جان سے اپنا لیتے ہیں۔ ع

!جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

کسی کو اگر غم بہت ملے ہوں تو گھبرا کر کہتا ہے ۔

بے تابیاں سمیٹ کے سارے جہان کی

جب کچھ نہ بن سکا تو مِرا دِل بنا دیا

ہم نے کبھی قدرت کے ہاتھوں ایسے کسی بھی واقعے کے رونما ہونے کا انتظار کرنا مناسب نہیں جانا اور اپنے حصے کی بے تابیاں اور پریشانیاں ''از خود نوٹس'' کے تحت تلاش کرکے !جسم و جاں میں سموئی ہیں

کوئی لاکھ کہتا پھرے ع

تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تُو

ہم پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور کوئی نصیحت کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ جسے لڑنے میں مزا آنے لگے وہ فارغ کیوں بیٹھے گا؟ کوئی آ کر نہ بھڑے تو صاف توہین محسوس ہوتی ہے! اِس توہین'' کا بدلہ لینے کے لیے لڑائی کا اپنی طرف سے آغاز کرنے یا پرائے پھَڈے میں'' ٹانگ اَڑانے میں کچھ ہرج نہیں۔

قصہ کچھ یُوں ہے کہ ایک سردار جی اپنے دوست کی شادی میں گئے۔ وہاں سے لہو لہان ہو کر واپس آئے۔ بیوی نے سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ عجیب نامعقول لوگ تھے۔ بیاہ میں رسمیں بھی ایسی رکھتے ہیں کہ کوئی آگے بڑھے تو مار کھائے۔ بیوی نے وضاحت چاہی تو بولے۔ ''پہلے میرے دوست کا اَبا اُٹھا اور بولا میں مُنڈے دا اَبا، کِتّھے کُڑی دا اَبا؟ (میں دولھا کا باپ ہوں، دلھن کا باپ کہاں ہے؟) دلھن کا باپ آیا اور اُنھوں نے پگڑیاں تبدیل کیں۔ پھر ایک اور صاحب اُٹھے اور بولے میں مُنڈے دا چاچا، کِتّھے کُڑی دا چاچا۔ دلھن کا چاچا اُٹھا اور اُنھوں بھی بھی پگڑیاں تبدیل کیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے کھڑے ہو کر آواز لگائی میں مُنڈے دا یار، کِتّھے کُڑی دا یار! ''

اِس کے بعد بارات میں دونوں طرف کے ''یاروں'' نے مل کر سردار جی کی وہ ٹُھکائی لگائی کہ طبیعت صاف ہو گئی اور سردار جی بیوی کو بقیہ تفصیل بتانے

!کی زحمت سے بھی چُھٹ گئے کیونکہ جوڑ جوڑ دُکھتا ہوا اُن کا جسم سب کچھ بیان کر رہا تھا

ہم اہلِ پاکستان کا بھی کچھ ایسا ہی مزاج ہو چکا ہے۔ موقع کی نزاکت کا اندازہ لگائے بغیر ہی ہم جہاں تہاں ''دِکِتّھے کُڑی دا یار'' کی صدا لگا بیٹھتے ہیں اور اِس کے بعد جو گت بنتی ہے !وہ پوری دنیا دیکھتی ہے اور مزے لیتی ہے

ہمیں پرائی بارات میں پگڑی بدلنے کا بہت شوق ہے۔ دوسروں کی رسوم کیا ہیں، اِس سے ہم واقف نہیں ہوتے اور بظاہر اِس سے کچھ غرض بھی نہیں ہوتی۔ اِسی کیفیت کو آ بیل ! مجھے مار'' بھی کہتے ہیں۔''

ساڑھے تین عشرے پہلے کی بات ہے۔ افغانستان میں بھی دو بڑی عالمی قوتوں کے درمیان پگڑیاں بدلنے کی تقریب ہو رہی تھی۔ امریکا بہادر نے ہماری پُشت پر ڈالر کی تھپکی دی اور ہم تن کر کھڑے ہوگئے۔ شہر کا سب سے بڑا غُنڈا سرپرستِ اعلیٰ بن جائے تو ڈیڑھ پسلی والے میں بھی تھوڑی بہت اکڑفوں تو پیدا ہو ہی جایا کرتی ہے ! امریکا کی طرف سے نوازے جانے کا گرین سگنل ملنے کی دیر تھی۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پڑوس کی بارات میں ''دِکِتّھے کُڑی دا یار'' کی صدا لگادی۔ یہ صدا سُن کر برفانی ریچھ مشتعل ہوگیا۔ مگر وہ علاقے پر حکمرانی کے طور طریقوں سے واقف ہونے ہونے کی بدولت ایسا بے وقوف نہ تھا کہ براہِ

راستہ بھٹرتا۔ برفانی ریچھ نے ایسے حالات پیدا کئے کہ ہم بارات ہی میں اُلجھے رہیں اور تقریب ختم ہونے کے بعد بھی باراتی ہمارے ہی کھاتے میں رہیں! اِس پگڑی بدل کھیل میں امریکا کا حقِ نمک ادا کرتے ہوئے ہم نے جو کچھ کیا وہ صرف ہم نے بُھگتا۔ امریکا کو بھلا کیا بُھگتنا تھا، وہ تو پے منٹ کرکے الگ کھڑا رہا۔ جو ہم پر گزری وہ ہمی جانتے ہیں مگر کمال یہ ہے کہ ہم اب تک اِس کا ''کریڈٹ'' بھی لیتے ہیں!

پرائے پَھڈے کی کھولتی کڑاہی میں کودنے کے حوالے سے افغانستان واحد کیس نہ تھا۔ اِس کے بعد بھی کئی بین الاقوامی باراتوں میں ہم نے یہی کیا ہے اور کبھی پچھتائے نہ شرمندہ ہوئے! غالبؔ نے کہا تھا ۔

رنج سے خُوگر ہوا اِنساں تو مِٹ جاتا ہے رنج
مُشکلیں مُجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہو گئیں

مُشکلات سے نپٹنے کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہے کہ اُنہیں حرزِ جاں بنالیا جائے۔ ہم بھی مُشکلات کو اپنے آپ پر آسان کر بیٹھے ہیں۔ گھر کے مسائل دِل میں گھر کر جائیں تو اُنہیں حل کرنا پالتو جانور کو ذبح کرنے جیسا محسوس ہوتا ہے۔ جب اپنے دیرینہ مسائل سے محبت ہو جائے تو اُن کے حلق پر کسی معتبر حل کی چُھری پھیرتے ہوئے ہاتھ کپکپاتے ہیں۔ ہمیں بھی طرح طرح کی مشکلات اور

مسائل سے پیار ہوگیا ہے۔ اور یہ پیار دن بہ دن بڑھتا ہی جارہا ہے۔

جب تک ہم ''کتھے کُڑی دایار'' کی صدا لگا کر مشکلات اور اُلجھنوں کی ''دستارِ فضیلت'' اپنے سَر پر سجانے کو بے تاب رہیں گے، علاقائی اور عالمی باراتی ہمیں ''نوازتے'' رہیں گے۔

کتھے کُڑی دایار'' کے نعرے میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ اِسے سُن کر غیر تو'' غیر، اپنے بھی ناراض ہوجاتے ہیں کیونکہ اُن کی عزت پر بھی داغ لگ رہا ہوتا ہے۔ یہ صفت بھی ہمی پر ختم ہے کہ پرائی لڑائی میں اِس طور کُودتے ہیں کہ کوئی بھی فریق ہمیں اپنا نہیں سمجھتا اور ہم وکٹ کے دونوں طرف کھیلنے کی کوشش میں ساری وکٹیں گنواتے چلے جاتے ہیں!

سُوکھی زمین کا سیلاب

یہ اِس ملک میں ہو کیا رہا ہے؟ دریا بپھرتے ہیں، ممکنہ سیلاب سے خوفزدہ کرتے ہیں مگر پھر سیلاب کے ٹائر سے ہوا نکل جاتی ہے۔ سمندر میں طوفان سَر اُٹھاتا ہے، اچھا خاصا خوفزدہ کرتا ہے اور پھر پتلی گلی سے نکل لیتا ہے۔ اور دوسری طرف سُوکھی زمین سے ایسا سیلاب اُبھرتا ہے کہ بہت کچھ اپنے ساتھ بہا لے جانے پر تُلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

صحرائے تھر ہی کی مثال لیجیے۔ تھر میں پیدا ہونے والے خوراک کے بحران نے سندھ حکومت پر ''وختا'' ڈال رکھا ہے۔ غذا اور غذائیت کی قِلّت ہے کہ دھرنا دیے بیٹھی ہے، ہٹنے اور کِھسکنے کا نام نہیں لے رہی!

سُوکھی، پیاسی زمین سے ایسا سیلاب اُٹھا ہے جو بہت کچھ ڈبونے پر تُلا ہوا ہے۔ تھر میں حالات کب اچھے رہے ہیں؟ کب وہاں قحط کے خنجر نے بے بس انسانوں کو ذبح نہیں کیا؟ پھر اِس بار ایسا کیا ہوگیا ہے کہ ہاہاکار مچ گیا ہے؟ میڈیا والوں نے تو جیسے بات کا بتنگڑ بنانے کی قسم کھا رکھی ہے، رائی کے دانے کو پربت میں تبدیل کرنے پر کمربستہ ہیں۔

ہم خاصی خوشگوار حیرت کے ساتھ بتا رہے ہیں کہ مرزا تنقید بیگ بھی اِس معاملے میں ہمارے ہم خیال ہیں۔ تھر کی صورت حال پر جو ہنگامہ برپا ہے اُس پر مرزا کو بھی بجا طور پر حیرت ہے۔ وہ کہتے ہیں، ’’صحرائے تھر پر جب اللہ کی رحمت نہیں برستی تو خوراک کی قلت سے موت برستی ہے۔اِس پر حیرت کیسی؟ غریبوں کا مقدر تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ دنیاکے ہر خطے میں غریب اِسی طور جیااور مرا کرتے ہیں۔ مگر میڈیا والوں کو اللہ سمجھے۔ وہ صوبائی حکومت کا شگون غارت کرنے کے مشن پر نکلے ہوئے ہیں! تھر کی صورت حال پر چینلز نے ایسی دھماچوکڑی مچائی کہ بوڑھی اور ضعیف پیپلز پارٹی کے ’’جواں سال چیئرمین کو بھی بیدار ہو کر تھر کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

تھر میں خوراک کی قِلّت سے متعدد افراد اور بالخصوص بچوں کی ہلاکت پر سندھ کے وزیر اعلیٰ اور وزیر جیل خانہ جات کو اظہار وجوہ کا نوٹس جاری کیا ہے۔ بلاول بھٹو زرداری چاہتے ہیں کہ تھر میں غذا اور غذائیت کی شدید قِلّت سے واقع ہونے والی ہلاکتوں کا سبب اُنہیں بھی بتایا جائے!

اظہار وجوہ کا نوٹس جاری ہونے پر ہم حیران تھے۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے سید قائم علی شاہ یعنی شاہ سائیں کی کارکردگی کچھ ایسی بُری بھی نہیں رہی۔ سبھی تو مزے میں ہیں۔ جس کے راج میں سب مزے سے اور مزے میں ہوں

اُس سے کیسا استفسار اور کیوں؟ اور صوبائی وزیر جیل خانہ جات کی حیثیت سے منظور وسان بھی کسی سے کم ثابت نہیں ہوئے۔ پھر اُن سے کس وجہ کے اظہار کا مطالبہ؟ معلوم ہوا کہ شاہ سائیں کو پیپلز پارٹی سندھ کے صدر اور منظور وسان کو پارٹی کے ڈپٹی سیکریٹری جنرل کی حیثیت سے نوٹس جاری ہوا ہے۔ پارٹی کے عہدے ایسے ہی ستم ڈھایا کرتے ہیں۔

ہم بلاول بھٹو زرداری کے بارے میں کسی طرح کا سُوءِ ظن نہیں رکھتے۔ اُن کی قابلیت سے انکار کرنے کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ ولایت سے پڑھ کر آئے ہیں۔ ہمیں جہاں کی خاک دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوسکا وہاں سے وہ علم کے موتی سمیٹ کر آئے ہیں۔ ایسے میں ہم حیران نہ ہوں تو کیا کریں؟ تھر کی صورت حال میں ایسا کیا ہے جس کی تحریری وضاحت طلب کی جائے؟ پی پی پی چیئرمین کی لیاقت مُسلّم مگر گستاخی معاف، اظہارِ وجوہ کے نوٹس کا اجرا تو مکھی پر مکھی بٹھانے والی فرمائش ٹھہرا!

شاہ سائیں کی زندگی میں بکھیڑے کیا کم ہیں؟ اُنہیں سندھ میں پارٹی کو مزید کمزور ہونے سے بچانا ہے۔ ہر محکمہ مویشیوں کی طرح چرتا ہوا کہیں سے کہیں جا نکلتا ہے۔ اُسے ایسا کرنے سے روکنا بھی ہے۔ پارٹی کے ناراض کارکنوں کو تھوڑا بہت نواز کر منانا بھی ہے۔ ایسے میں تھر کا قحط کہاں سے آ ٹپکا؟ یہ

تو توجہ ہٹانے والی بات ہوئی۔ قدرت پر ہم سازش کا اِلزام عائد کر نہیں سکتے مگر بد قسمتی کو تو رو سکتے ہیں۔ شاہ سائیں کا کمال یہ ہے کہ اِس پیرانہ سالی میں بھی خوش مزاجی کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ایسے میں خشک سالی ''دخل در معمولات'' کرے یعنی پُرسکون زندگی کو تہس نہس کرنے پر تُل جائے تو عالی جاہ کو غصہ تو آئے گا ہی!

کہا جارہا ہے کہ تھر کی صورت حال پر بروقت اور خاطر خواہ اقدامات نہیں کیے گئے۔ مگر کوئی بلاول بھٹو زرداری کو بتائے کہ یہاں کسی بھی ناگہانی کے وارد ہونے کی اطلاع پر تھوڑا انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وہ واقعی آ بھی رہی ہے یا آنے کا محض دھوکا ہے! اب سمندری طوفان ''نیلوفر'' ہی کی مثال لیجیے۔ اِس طوفان کی آمد کے بارے میں سوچ سوچ کر لاکھوں افراد ہائی بلڈ پریشر کو مزید بلند کر بیٹھے! رہی سہی کسر میڈیا والوں نے پوری کردی۔ صوبائی حکومت کو بھی جاگنا پڑا کیونکہ میڈیا والے خاصی بلند آواز میں اُس کے خوابِ غفلت کو ''خراج عقیدت'' پیش کر رہے تھے! بے چاری صوبائی حکومت نے سمندری طوفان سے نمٹنے کے لیے اپنے طور پر چند ایک اقدامات کیے۔ جب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو طوفان کراچی سے چار پانچ سو کلومیٹر کے فاصلے ہی پر دم توڑ گیا۔ کراچی سمیت سندھ کے بہت سے ساحلی علاقوں میں وسیع تباہی کے خدشات پیدا کرنے والا طوفان کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا جیسا معاملہ ثابت ہوا۔ یہ کوئی پہلا موقع نہیں

کہ سندھ حکومت کو کسی قدرتی آفت نے فریب دیا ہو۔ ڈیڑھ دو ماہ قبل پنجاب میں سیلاب نے تباہی مچائی۔ اِس تباہی کو دیکھ کر سندھ حکومت کو بھی ہوش کے ناخن لینا پڑے۔ سیلاب سے نمٹنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ الرٹ پر الرٹ جاری ہوئے۔ دیہی علاقوں میں دریا کے کنارے آباد لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مگر جس کی آمد کا خدشہ تھا وہ سیلاب نہ جانے کہاں رہ گیا؟ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ تباہی ٹل گئی مگر سیلاب کی شرارت بھی تو دیکھیے کہ اچھی خاصی سکون سے سوئی ہوئی حکومت کو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھنے پر مجبور کر دیا! کسی منتخب حکومت سے ایسا مذاق اچھا نہیں ہوا کرتا۔ قدرت کے کارخانے کو ایسی شرارتیں تیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے!

تھر میں خوراک کے بحران پر شاہ سائیں اور منظور وسان سے تحریری جواب طلب کرنا زیادتی ہے۔ شاہ سائیں سے تو اِس عمر میں تحریری جواب طلب کرنا سُوءِ ادب ہے۔ جواب طلبی کرنے کے بجائے ہمیں تو اُن کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اُن کی ٹھنڈی ٹھار شخصیت کو دیکھ کر سمندری طوفان اور سیلاب کے ''پریشر کا دباؤ'' منزل سے بہت دور دم توڑ دیتا ہے!

منظور وسان صاحب کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ خوابوں کی دُنیا کے مکین ہیں۔ اُن سے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذرا خواب دیکھ کر بتائیں

آئندہ سال کوئی طوفان یا سیلاب اِس سرزمین کے نصیب میں لکھا ہے یا نہیں۔ مگر خواب کو بیان کرنا بھی ہنر ہے۔ کسی کو کیا پتا کس کے خواب میں کیا کیا دکھائی دیتا ہے۔ خواب میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے اُسے بیان کرنے کے حوالے سے قمر جمیل مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ع

آئینے میں پھول کھلا ہے، ہاتھ لگانا مشکل ہے

منظور وسان کے آئینے میں پتا نہیں کیسے کیسے پُھول کِھلتے رہتے ہیں مگر وہ ہاتھ لگانے سے قاصر ہیں۔ صوبائی وزیر جیل خانہ جات کو خوابوں نے اِس قدر پریشان کیا ہے کہ وہ بے حواسی کی سلاخوں کے پیچھے دکھائی دینے لگے ہیں۔ ایسے میں وہ اپنے محکمے کی کارکردگی پر کیا خاک متوجہ ہوں؟

پیپلز پارٹی کے جواں سال چیئرمین نے شاہ سائیں اور منظور وسان کو اظہار وجوہ کا نوٹس جاری کرکے کوئی اچھی روایت قائم نہیں کی۔ کسی بھی قدرتی آفت پر جواب طلبی عجیب سی بات ہے۔ معاملہ اِنسانوں کی لائی ہوئی آفات پر جواب طلبی تک محدود رہنا چاہیے۔ اگر جواب طلب کرنا ہی ٹھہرا تو راستے میں دم توڑنے والے سمندری طوفان نیلوفر اور سیلاب کی بھی گوشالی کی جانی چاہیے کہ اِس قدر ہنگامی اقدامات کئے جانے پر وہ کیوں نہ آئے! یہ تو دھوکا دینے والی بات ہوئی۔ کل کو اگر کوئی سمندری طوفان یا سیلاب آتا دکھائی دے گا تو سندھ

حکومت گزشتہ برس کے تجربے کی بنیاد پر مطمئن بیٹھی رہے گی۔ ”شیر آیا، شیر آیا“ کی سی کیفیت پیدا کرکے دِل پشوری کرنا اچھی بات نہیں۔ کل کو اگر واقعی شیر آگیا تو سندھ حکومت بے چاری تاریک راہوں میں ماری جائے گی!

"سیکنڈ کی" دوستی 32

نیپال میں سارک سربراہ اجلاس ختم بھی ہوگیا مگر خطے کی سَرد مہری ختم نہ ہوسکی۔ بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی سے خاصی گرم جوشی کی توقع کی جارہی تھی مگر اے وائے ناکامی کہ اِس بار بھی بھارتی قیادت نے علاقائی توقعات کا گلا گھونٹ کر دم لیا۔ نریندر مودی کی تقریب حلف.برداری میں شرکت کرکے وزیر اعظم نواز شریف نے دُنیا کو بتادیا تھا کہ دو طرفہ تعلقات بہتر بنانے کی زیادہ خواہش پاکستان میں پائی جاتی ہے۔ تعلقات کے حوالے سے معمول کا لفظ ہم نے اس لیے استعمال نہیں کیا کہ جب ہم کہتے ہیں کہ پاک بھارت تعلقات معمول پر آچکے ہیں تو اِس کا عمومی مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کشیدگی پھر پیدا ہوچکی ہے۔ جب کشیدگی معمول ہو تو یہی کہا اور سمجھا جائے گا۔ خیر، وزیر اعظم محمد نواز شریف نے کھٹمنڈو میں سارک کے توسط سے لگنے والے علاقائی سفارتی سرکس میں تَنے ہوئے رَستے پر چلنے کا تاثر دینے سے گریز کیا۔ اُن کی بھرپور کوشش رہی کہ برف تھوڑی تو پگھلے، معاملات کچھ تو بہتری کی طرف رواں ہوں۔ یہ ناگزیر ہے کیونکہ خطے کے عوام سفارتی سطح پر پائی جانے والی سَرد مہری سے بہت پریشان ہیں۔ اِس سَرد مہری اور کشیدگی سے عوامی

رابطے بھی متاثر ہو رہے ہیں۔

بھارتی وزیراعظم نے پاکستان کی طرف سے دکھائی جانے والی گرم جوشی کا کماحقہ جواب دینے سے گریز کیا۔ پاکستان سے تعلقات بہتر بنانا شاید اِس وقت بھارتی قیادت کی ترجیحات میں شامل نہیں۔ یا اگر اِس فہرست میں ہے بھی تو بہت نیچے ہے۔ پاکستان میں حکومت کی بڑھی ہوئی مشکلات اور بالخصوص وزیراعظم کے لیے جنم لینے والے مسائل نے بھارتی قیادت کو خاصی توانائی بخشی ہے۔ پاکستان کی اندرونی سیاسی کشمکش سے بھارت کو تقویت نہ ملے، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟

سارک سربراہ اجلاس کے دوران نواز شریف جب تقریر کرنے کے لیے بھارتی ہم منصب کے عقب سے گزرے تو اُنھوں نے ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ نریندر مودی نے اِس مرحلے پر اپنے سامنے پڑا ہوا جریدہ اُٹھایا اور ورق گردانی شروع کردی۔ یہ ہے بھارتی ترجیحات کی سطح اور معیار۔ رسمی گفتگو اور اخلاقاً سر کو جنبش دے کر نیک خواہشات کا خلوص سے جواب دینا بھی سفارتی تماشا ہوگیا ہے۔ سارک سربراہ اجلاس سے پاکستان اور بھارت کے عوام نے بہت سی توقعات وابستہ کرلی تھیں۔ خطے کے دیگر قائدین بھی چاہتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان قربت بڑھے تاکہ خطے مستحکم ہو۔ اُنہیں اندازہ ہے کہ جب تک

یہ جوہری قوتیں کشیدگی کو خیر باد کہتے ہوئے دوستی اور مفاہمت کی راہ پر گامزن نہیں ہوں گی، علاقائی استحکام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں کیا جاسکے گا۔

سارک سربراہ اجلاس کے اختتامی لمحات میں بھارتی قیادت کو اجلاس کے میزبانوں اور خطے کے عوام پر کچھ رحم آگیا۔ بھارتی وزیر اعظم نے مناسب جانا کہ پاکستانی ہم منصب کو مصافحے کا شرف بخش دیا جائے۔ نریندر مودی نے میاں صاحب کا ہاتھ تھاما اور 32 سیکنڈ تک تھامے رہے۔ یہ منظر سارک سربراہ اجلاس کے شرکاء ہی نہیں بلکہ پورے خطے کے عوام کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھا۔ کسی کو توقع نہ تھی کہ نریندر مودی وہ سَرد مہری ترک کردیں گے جس کا مظاہرہ اُنھوں نے اِسی اجلاس میں پہلے کسی مرحلے پر کیا تھا۔ بڑی سرکار کو خطے کے غریبوں پر ترس آ ہی گیا اور اُنھوں نے تھوڑے سے دان پُن کے ذریعے ایونٹ کو مکمل ناکامی کے آغوش میں جانے سے بچالیا۔ فوٹو گرافرز کی دِلی مُراد بر آئی۔ اُن کی دِلی مُراد تو اُس وقت بھی بر آئی تھی جب نواز شریف عقب سے گزرے اور نریندر مودی نے مُنہ پھیر کر اُنھیں ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

چلیے، بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی۔ نیپال کی قیادت بھی تو خوش تو ہو ہی گئی

ہوگی کہ سارک سربراہ اجلاس یکسر ناکام نہیں رہا۔ اگر اِس بھرپور سفارتی تماشے کے نتیجے میں خطّے کے قائدین نے 32 سیکنڈ کا مصافحہ بھی کرلیا تو بڑی بات ہے۔ اِتنا بھی غنیمت ہے۔ تھوڑے کو بہت اور خط کو تار سمجھ کر خوش ہو رہنا ہی بہتر ہے۔ اگر اِتنا بھی نہ ہوا ہوتا تو کوئی کیا کرلیتا؟

چند ماہ کے دوران بہت کچھ بدلا ہے، بہت کچھ ٹھکانے لگا ہے۔ سوال صرف پاکستان کی اندرونی سیاست کا نہیں۔ بھارت میں بھی خاصی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ طاقت کا مظاہرہ کرنے کا رُجحان ایک بار پھر تقویت پا رہا ہے، گویا پاکستان کو مرعوب یا زیرِ نگیں کرنا مقصود ہو۔ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے، کچھ واضح نہیں ہو پا رہا۔ نئی دہلی کی اپروچ میں اچانک رونما ہونے والی تبدیلیوں کی غایت جان پانا بچوں کا کھیل نہیں۔ پتا نہیں کب مہاراج کے ذہن میں کیا آ جائے اور وہ کیا کرنے کی ٹھان لیں۔ اِس وقت بھی تو کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ پاکستان دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے مگر دوسری طرف سے یہ ہاتھ جھٹکا جا رہا ہے۔ سرحدی کشیدگی کا گراف خاصی محنت اور توجہ کے ساتھ بلند کیا جا رہا ہے۔ خاردار تاروں والی باڑ لگانے پر اکتفا نہیں کیا جا رہا، دِلوں کے بیچ دیواریں بھی کھڑی جا رہی ہیں تاکہ دوستی اور مفاہمت کا امکان کمزور سے کمزور تر ہوتا جائے۔

امن کی آشا کا راگ الاپنے والوں کے جذبے بھی ٹھنڈے پڑتے جا رہے ہیں۔ دوستی اچھی چیز ہے مگر اِس کے لیے یا اِس کے نتیجے میں سب کچھ داؤ پر تو نہیں لگایا جاسکتا۔ اچھے تعلقات ناگزیر ہیں مگر اُن کی خاطر یا اُن کے نتیجے میں گردن جُھکا لینا تو ناگزیر نہیں۔ علاقائی چوہدری بننے کی کوشش میں کمزوروں کی گردن دبوچنا کہاں کی سفارت کاری ہے؟ جب کوئی برابری کی بات کرے تو کچھ زیادہ ہی بُرا ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ جنوبی ایشیا میں بہت کچھ بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ اِس بدلتے ہوئے ماحول میں بھارت کو صرف اپنے مفادات کی پڑی ہے۔ وہ کسی اور خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں۔ امریکا نے پشت پناہی کی ٹھانی ہے تو اب بھارت کی قیادت علاقے کو مُٹھی میں لینے پر تُلی ہوئی ہے۔ امریکا کو سالِ رواں کے آخر تک افغانستان سے رخصت ہونا ہے۔ مگر پاکستان اور طالبان کو سبق سکھانے اور زیر نگیں رکھنے کے لیے وہ بھارت کو افغانستان میں غالب حیثیت عطا کرنا چاہتا ہے۔ مہاراج اِتنے خوش ہیں اور اِتنے اُتاؤلے ہوئے جا رہے ہیں کہ کم و بیش پانچ عشروں تک بے مثال انداز سے دوستی نبھانے والے روس کو بھی بھول بیٹھے ہیں۔ اور اِس کے نتیجے میں روس کو پاکستان یاد آگیا ہے! ابھی تو جنوبی ایشیا میں بادشاہت پوری طرح نصیب بھی نہیں ہوئی اور بدمزاجی کا یہ عالم ہے۔ علاقائی سطح پر چوہدراہٹ قائم ہو گئی تو کیا ہوگا؟ ع

!جب رات ہے ایسی متوالی، پھر صبح کا عالم کیا ہوگا

پاکستان کو مرعوب کرنا آسان نہیں مگر خطے کے کمزور ممالک کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا آنے والا وقت اُن کی مشکلات میں اِضافہ نہیں کرے گا؟

پاکستان نے بھارت سے دوستی کی ایک نہیں، کئی کوششیں کی ہیں۔ اور ہر بار بہت حد تک ناکامی و نامُرادی ہی حصے میں آئی ہے۔ فریقِ ثانی معاملات کو صرف اُس وقت تک چلنے دیتا ہے جب تک برابری کا سوال نہیں اُٹھایا جاتا۔ جہاں برابری کی بنیاد پر کچھ مانگیے، سب کچھ داؤ پر لگ جاتا ہے۔ جیسے ہی انصاف کی بات کیجیے، مہاراج کی نیت کا فتور !بے پردہ، بلکہ برہنہ ہوکر سامنے آ جاتا ہے

جنوبی ایشیا کو ایسا بھارت درکار ہے جو وقت کے تقاضوں اور حالات کی نزاکت کو کماحقہ سمجھتا ہو۔ سب کو دباکر، دبوچ کر رکھنے کی پالیسی اُسے زیادہ دیر تک مستحکم نہیں رکھ سکتی۔ خطے کو حقیقی استحکام درکار ہے جس میں تمام ہی ممالک کے مفادات کا احترام کیا جائے۔ پاکستان کے لیے علاقائی استحکام اُسی وقت سُودمند ثابت ہو سکتا ہے جب اُسے محض 32 سیکنڈ کے مصافحے پر نہ ٹرخایا جائے بلکہ اُس کے مفادات کا پورا خیال رکھا جائے۔ بھارتی قیادت کو پاکستان

سے بہتر سُلوک کی توقع اُسی وقت رکھنی چاہیے جب وہ خود بہتر سُلوک پر یقین رکھتی ہو۔ دوستی اور مفاہمت باہمی احترام اور برابری کی بنیاد ہی پر پنپ سکتی ہے۔ جمہوری بھارت کو مہاراجاؤں والے اطوار ترک کرنے ہوں گے۔

اور پانی مرگیا

دریاؤں کی سرزمین پر پانی ناپید سا ہوچلا ہے۔ دریا بہتے رہتے ہیں۔ پانی دکھائی تو دیتا ہے مگر ملتا نہیں یا ہاتھ نہیں آتا۔ پکنک منانے، کشتیاں چلانے اور ڈوب مرنے کے لیے پانی کی کمی نہیں۔ ہاں، پینے کے صاف پانی کا معاملہ ہو تو قِلّت عِفریت کی طرح مُنہ کھول کر سامنے آجاتی ہے۔ دوسرے بہت سے شعبوں کی طرح اب مملکتِ خداداد کے باشندوں اور پانی کے درمیان بھی ٹھیکیدار آگئے ہیں۔ پانی بُنیادی شے ہے جس کے بغیر سُکون سے جینا تو کیا، جینا ہی ناممکن ہے۔ قُدرت کا یہ رقیق راز وہ بھی جان گئے ہیں جو اپنے تئیں اِس ملک کے سیاہ و سفید کا مالک گردانتے ہیں۔

پانی کو برسنے کی اجازت ہے اور بہنے سے بھی کوئی روک نہیں رہا۔ ٹھہرنے پر البتہ پابندی ہے۔ پانی کے بحران کو دائمی حیثیت دینے پر مامور چند شخصیات کو کہیں سے اٹل اشارا مل چکا ہے کہ پانی کو کہیں ٹھہرنے کا، سُکون کا سانس لینے کا موقع نہ دیا جائے۔ اُنہیں باور کرادیا گیا ہے کہ پانی ٹھہر گیا تو اُن کے ایجنڈے کا جانا ٹھہر جائے گا۔ موسلا دھار بارش سے دریا بھرتے ہیں تو بھر جائیں مگر زیادہ دیر بھرے نہ رہیں۔ پانی کا نصیب پہاڑ سے اُترنا اور

سمندر میں جا گرنا ہے۔ یعنی یہ قُدرتی عمل ہے جس کی راہ میں کسی ڈیم کی دیوار حائل نہیں ہونی چاہیے ! دُنیا والوں کو سمندر کیوں عطا ہوا ہے، ہمیں معلوم نہیں۔ ہم تو اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے حصے کا سمندر شاید صرف اِس لیے ہے کہ ہمارے دریاؤں کے پانی کو اپنے اندر سمولے ! سمندر جیسی نعمت کا بھی اِس سے اچھا ''مصرف'' ہم اب تک سوچ نہیں سکے۔ کوئی چاہے تو سمندر کو ڈیم تصور کرکے خوش ہولے !

ایک مشہور فلمی گانے کا ٹکڑا آپ نے بھی سُنا ہوگا ع

پانی رے پانی ! تیرا رنگ کیسا؟

ہم تو اب اِس پوزیشن میں بھی نہیں رہے کہ پانی سے اُس کا رنگ پوچھ ہی سکیں۔ پانی کہیں ٹھہرے اور ہاتھ آئے تو اُس سے کچھ بتیائیں، پوچھیں کہ اِتنا کم کم کیوں برستے ہو؟ مگر کیا پوچھیں؟ یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ اگر اُس نے کوئی سوال داغ دیا تو کہیں ہم شرم سے پانی پانی نہ ہوجائیں !

گئے زمانوں میں لوگ پانی کی قدر نہیں کرتے تھے۔ قُدرت کے اِس عظیم ترین اور کوئی قیمت ادا کئے بغیر ملنے والے خزانے کو درخورِ اعتناء سمجھنے کا رواج نہ تھا۔ یہ بات قُدرت کو پسند نہ آئی۔ اُس کے اصول سب کے لیے ہیں اور اٹل ہیں۔ کوئی اگر قدر ناشناس ہو تو قُدرت بھی جوابی کارروائی میں دیر نہیں

لگاتی۔ قُدرت بھلا یہ بات کیسے برداشت کرلیتی کہ اُس کی طرف سے انتہائی وافر مقدار میں عطا کئے جانے والے پانی کو گھاس نہ ڈالی جائے؟ قُدرت جب انتقام لینے پر آتی ہے تو عجیب ہی ڈھنگ اختیار کرتی ہے۔ دُنیا کیوں نہ ہنسے؟ جس سرزمین پر دریاؤں کا ڈھیر لگا ہے اور بارشیں بھی خوب ہوتی ہیں وہیں پانی کا بُحران ہے! یعنی گھر میں کنواں ہے اور لوگ پانی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ پیاس بُجھانے جتنا پانی حاصل کرنے کے لیے بھی پِتّہ پانی کرنا پڑتا ہے!

پاکستان کو بہت سے معاملات میں انفرادیت قائم کرنے کا موقع ملا ہے۔ بُنیادی سہولتوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ پاکستان کا شمار اُن چند ممالک میں کیا جاسکتا ہے جنہوں نے قُدرت کی طرف سے یکسر مُفت ملنے والی بُنیادی اشیاء کو بھی مالِ تجارت میں بدل ڈالا ہے۔ ہمیں اندازہ نہیں کہ ڈھائی تین ماہ سے وفاقی دارالحکومت میں کاہے کا غلغلہ بلند کیا جارہا ہے۔ عمران خان کون سا نیا پاکستان بنانا چاہتے ہیں اور ڈاکٹر طاہرالقادری کون سا انقلاب برپا کرنے کے مُوڈ میں ہیں۔ یہ دونوں کام تو بہت پہلے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ بُنیادی سہولتوں کو تجارتی اشیاء و خدمات میں تبدیل کرکے ہم ''انقلاب'' کب کا برپا کرچکے ہیں۔ اور یہی ''نیا پاکستان'' ہے!

زندگی ہم سے ہر معاملے میں بھرپور سنجیدگی کا تقاضا کرتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ڈھنگ سے اور تمام تقاضوں کو نبھاتے ہوئے ہنس بھی وہی سکتا ہے جو انتہائی سنجیدہ ہو! دُنیا کا عجیب حال ہے۔ بہت سے بُنیادی سوالوں پر غور کرتے کرتے دُنیا والے حواس سے بیگانہ ہو چلے ہیں۔ ہمارے بزرجمہروں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ کیفیت اِس لیے وارد ہوئی کہ اہل جہاں بُنیادی سہولتوں کی فراہمی کے جھنجھٹ سے نپٹ چکے ہیں۔ وہ فکر کی گہرائیوں میں اِس لیے جاگرے ہیں کہ اُن کی حکومتوں نے بہت سے انتہائی مُفید اور روزمرہ قسم کے جھنجھٹ ختم کر ڈالے ہیں۔ ہماری حکومتوں کا احسان اور کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے ہمیں کائنات کے عمیق سوالوں کی نذر ہونے سے بچالیا ہے۔ حکمرانوں کی مہربانی ہے کہ ہمارا بیشتر وقت بُنیادی سہولتوں کا حصول یقینی بنانے پر صرف ہوتا ہے۔ انتظامی مشینری کا چمتکار یہ ہے کہ ہم یہ کام اب عبادت کے درجے میں رکھ کر کرتے ہیں!

عملی زندگی میں تعلق خواہ کسی شعبے سے ہو اور کسی بھی منصب پر خدمات انجام دی جارہی ہوں، اب گھر کے استعمال کے لیے پانی کا حصول ہر پاکستانی کے لیے اولین فرضِ منصبی کا درجہ حاصل پاچکا ہے!

صبح آنکھ کھلتی ہے تو ذہن میں سب سے پہلے پانی کی گھنٹی بجتی ہے۔ رات بھر جو خواب دیکھے تھے وہ پانی کے حُصول کی فکر میں بہہ جاتے ہیں! پہلے تو

علاقے کی دکانوں کا سروے کرکے فلٹر کیا ہوا یعنی پینے کا پانی لانا پڑتا ہے۔ اِس کے بعد دیگر اُمور کی انجام دہی کے لیے درکار پانی کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ یہ ہے پانی کی خاصیت۔ جب لوگ متوجہ نہیں ہوتے تو یہ سب کی پوری توجہ بہالے جاتا ہے! ایک بار پانی سے بے اعتنائی برت کر دیکھیے، ایسی جگہ لے جاکر مارے گا کہ دُور دُور پانی نہ ملے گا! بھرے بھرے بادلوں کو تکتے تکتے آنکھوں کا پانی خشک ہوتا ہے تو ہوجائے، پانی برسنے کا نام نہ لے گا۔ ہم نے پانی کی ایسی اور اِتنی ناقدری کی ہے کہ اب بہت سے علاقے برسوں بارش کو ترستے ہیں۔ اور منّتوں مُرادوں سے بارش ہوتی بھی ہے تو بہ قدرِ اشکِ بلبل! اطہرؔ نفیس مرحوم نے ایسی ہی کیفیت کے لیے کہا تھا ع

دیکھیے میری پذیرائی کو اب آتا ہے کون
لمحہ بھر کو وقت کی دہلیز پر آیا ہوں میں

خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ایک بار لکھا تھا کہ جب اوس پڑتی ہے تو ہاتھی بھیگ جاتا ہے مگر چڑیا کی پیاس نہیں بُجھتی۔ پانی کی بات کیجیے تو اہل وطن کا حال بھی چڑیا کا سا ہے۔ موسلا دھار بارش سے مُلک کے بیشتر حصے ہاتھی کی طرح بھیگ جاتے ہیں مگر ہم اِنسان چڑیا کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہ جاتے ہیں!

پانی کے معاملے میں جو حال پورے ملک کا ہے وہی کراچی کا بھی ہے۔ بہت سے دیہی علاقوں میں لوگوں کو پینے کا پانی حاصل کرنے کے لیے میلوں سفر کرنا پڑتا ہے۔ کراچی جیسے شہر میں میلوں کی مسافت کو جیب ڈھیلی کرکے ختم کیا جاتا ہے۔ پیاس بُجھانی ہے تو متعلقہ مشینری کی طمع کے الاؤ پر پانی ڈالیے! کراچی میں جو لوگ پانی کے نظم و نسق پر مامور ہیں اُن کی آنکھوں کا پانی ایسا مرا ہے کہ زندہ ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ کچھ بھی کہیے، کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پتھر کو بھی اگر لعنت ملامت کیجیے تو شاید شرم سے پانی پانی ہوجائے مگر ''اربابِ آب'' کی ''ہمت'' کو سلام ہے کہ اُن کی پیشانی پر ندامت کا ایک قطرہ نمودار نہیں ہوتا! یہ ایسی ''اولوالعزمی'' ہے کہ اگر سرحد پر ہمارا دُشمن دیکھ لے تو شرمسار اور خوفزدہ ہوکر دُم دباتے ہوئے بھاگ نکلے!

خط نہیں، خطِ مُستقیم!

ہماری سادگی کی انتہا اور مُغالطے کا درجۂ کمال دیکھیے کہ ہم خط لکھنے کی رسم یا رُجحان کو یکسر متروک و معدوم سمجھ بیٹھے تھے۔ اچھا ہوا کہ حکومتوں کی سطح پر پائے جانے والے مُناقشے نے یہ مُغالطہ یا ابہام دُور کردیا۔

دورِ جدید کے ابلاغی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے بعد ہم تو یہ بھی بھول بیٹھے تھے کہ اُردو شاعری خط لکھنے اور اُس کے نتائج کے دلچسپ بیانات سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً ۔

خط کے پُرزے ہیں دستِ قاصد میں

ایک کیا، سو جواب لایا ہے!

کسی زمانے میں خط لکھنا ایسا عام ہوگیا تھا کہ کسی جواز یا سبب کے بغیر بھی خط لکھنا ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔ اور بہت سوں نے تو خط لکھنے ہی کو شاعری کا درجہ دینا شروع کردیا تھا۔ غالبؔ نے کہا تھا ۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے!

سوال یہ ہے کہ آپ کسی کے نام کے عاشق ہوں تو خواہ مخواہ کاغذ، قلم اور دوات ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے!

خط کے ذریعے دِل و دِماغ پر قیامت ڈھانے کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ مثلاً داغ دہلوی فرماتے ہیں۔

اُن کے خط میں مجھے غیروں کے سلام آتے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے مِرے نام آتے ہیں!

یہ واضح نہیں کہ آیا داغ نے قیامت محبوب کو کہا تھا!
داغ نے یہی مضمون کہیں اور اِس طرح بھی باندھا۔

تمہارے خط میں نیا اِک سلام کس کا تھا؟
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا؟

ڈیڑھ دو سو سال پہلے کا زمانہ تھا ہی ایسا کہ ذرا سی دیر میں سارے شہر میں خط کا چرچا ہو جایا کرتا تھا۔ چند گرام کے مکتوب کو مکتوب الیہ تک پہنچانے کا نظام ہی ایسا تھا کہ ہرکارہ گلی میں قدم رکھتا تو ہر گھر کے دورازے یہ دیکھنے کے لیے کُھل جاتے کہ کون خوش نصیب ہے جو مکتوب الیہ کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہوا ہے! اور اگر کوئی ایسا ویسا خط ہاتھ لگ جاتا تو اُس کی نمائش اِس اہتمام سے کی جاتی تھی کہ اماوس کی رات میں بھی عزت'' کو چار چاند''

لگ جاتے تھے! غالبؔ نے ایسی ہی کیفیت کے لیے کہا تھا۔

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر

!کوئی پُوچھے کہ یہ کیا ہے تو چُھپائے نہ بنے

ہم تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ جدید دور کے تقاضوں نبھانے کے چکر میں لوگ خط وَط لکھنا بھول بیٹھے ہیں۔ اور اِس میں غلط بھی کیا ہے؟ موبائل فون اِس قدر عام ہو گئے ہیں کہ لوگ اب وہ ساری باتیں فون پر کر لیتے ہیں جو کبھی وقت نکال کر خط کے نام پر قلم کے ذریعے قرطاس پر منتقل کی جاتی تھیں۔ اور کبھی کبھی تو معاملہ ایسی شِدّت سے دوچار ہوتا تھا گویا ع

!کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

مگر ”حُسنِ بیان“ کی وہ شِدّت اب تو محض خیال و خواب کا حصہ ہو کر رہ گئی ہے۔ رہی سہی کسر ایس ایم ایس کلچر نے پوری کر دی ہے۔ چند جُملوں میں مافی الضمیر کا ضمیر غائب تک بیان ہو جاتا ہے! ایسے میں کوئی کیا خط لکھے؟ اور کیوں؟

خیر گزری کہ اقتدار کے ایوانوں میں جلوہ افروز جماعتوں کی آپس کی لڑائی نے خط لکھنے کی روایت کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ سندھ کے وزیرِ اعلیٰ سید قائم

علی شاہ نے سندھ کی حق تلفی پر وزیر اعظم محمد نواز شریف کو خط لکھ کر اپنے ہونے کا ایک اور ثبوت پیش کیا ہے! بقول عدیم ہاشمی ۔

آج بھی دیکھ لیا اُس نے کہ میں زندہ ہوں
چھوڑ آیا ہوں اُسے آج بھی حیرانی میں

شاہ سائیں کے بارے میں لوگوں نے بہت سی بے سَر و پا باتیں پھیلا رکھی ہیں۔ یہ تاثر پیدا کیا گیا ہے کہ شاہ سائیں کچھ نہیں کرتے۔ تھر کے دورے کے ذریعے (جس میں اُنھوں نے افلاس اور بُھوک کے ہاتھوں لُٹے پِٹے لوگوں کے درمیان خوابِ خرگوش کے مزے بھی لُوٹے) اور میاں صاحب کو خط لکھ کر شاہ سائیں نے اپنے مخالفین اور ناقدین کو ایک اور ''دندان شکن'' جواب دیا ہے۔

شاہ سائیں کا شِکوہ ہے کہ وفاقی بیورو کریسی میں سندھ کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ سندھ کو پورا کوٹا نہیں دیا جاتا۔ اور یہ کہ سندھ سے زیادتی کے ازالے کے لیے انقلابی اقدامات کئے جائیں۔ شاہ سائیں لکھتے ہیں کہ وفاقی بیورو کریسی میں سندھ کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے جس کے باعث سندھ میں شدید احساس محرومی جنم لے رہا ہے۔

شاہ سائیں کی سادگی ملاحظہ فرمایئے کہ وزیر اعظم سے چاہتے ہیں کہ وہ سندھ

کا احساس محرومی ختم کرنے کے لیے انقلابی نوعیت کے اقدامات کریں۔ کیا شاہ سائیں کو معلوم نہیں یا اندازہ نہیں کہ میاں صاحب آج کل انقلاب اور اِس سے ملتے جُلتے ہر لفظ سے سخت متنفر ہیں! ''انقلابیوں'' ہی نے تو ریڈ زون کا تقدس پامال کرکے میاں صاحب کا جینا حرام اور بیرونی دوروں پر جانا مکروہ کر رکھا ہے! ایسے میں وزیر اعظم سے بھلا کسی بھی سطح پر انقلابی اقدام کی توقع کیونکر کی جاسکتی ہے! اور یوں بھی سندھ نے میاں صاحب کو کون سا سُکھ دیا ہے وہ اِس کے مفاد کا سوچیں۔ سندھ میں اُن کی پارٹی سخت محرومی کی حالت میں ہے۔ شاہ سائیں نے تو خط لکھ کر اپنا یا صوبے کا رونا رو دیا۔ میاں صاحب اپنا دُکھڑا کِس کے آگے روئیں؟

شاہ سائیں کا خط ابھی منظر عام پر آیا ہی تھا کہ اُس کا تاثر یا تاثیر زائل کرنے کے لیے متحدہ کے بابر غوری میدان میں آگئے اور ایک خط داغ دیا۔ یہ خط اُن زیادتیوں کے بارے میں ہے جو سندھ میں شہری آبادیوں سے روا رکھی جارہی ہیں۔ بابر غوری نے اِس خط میں لکھا ہے کہ سندھ کے محکموں میں ملازمت کی تقسیم کے حوالے سے تمام قواعد و ضوابط کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ بابر غوری نے پولیس، ایکسائز، ریونیو، آب پاشی، زراعت، قانون اور دیگر محکموں کا ذکر کیا ہے جن میں شہری آبادیوں سے تعلق رکھنے والوں کو ملازمت دینے سے گریز کیا جارہا ہے۔ بابر غوری کا استدلال ہے کہ شہری آبادیوں کو نظر انداز

کرنے اور بے لیاقت افراد کو بھرتی کرنے ہی کے باعث آج نا اہلی اور بدانتظامی صوبائی حکومت کا ''طرۂ امتیاز'' بنی ہوئی ہے!

شاہ سائیں کے خط لکھنے پر ہمیں حیرت ہوئی۔ حیرت یُوں ہوئی کہ بہت دنوں کے بعد وہ حرکت میں آئے ہیں اور اُن کی طرف سے کوی اقدام (قلمی ہی سہی) سامنے آیا ہے۔ اور مزید حیرت اِس بات پر ہوئی شاہ سائیں اِس طور حرکت میں آئے ہیں کہ جواب میں کسی اور کو بھی متحرک ہونا پڑا ہے۔ بابر غوری کو فوری جواب دینا پڑا۔ اُنھوں نے اپنے خط میں شاہ سائیں کے اُس خط کا حوالہ دیا ہے جو اُنھوں نے میاں صاحب کو لکھا ہے۔

محبت کرنے والے خط کا جواب بہت تیزی سے دیا کرتے ہیں مگر شاید اِتنی تیزی تو اُن کے ہاں بھی نہیں پائی جاتی! بابر غوری کا خط بالکل غوری میزائل کی سی تیزی سے آیا ہے!

قوم پریشان ہے۔ بُنیادی مسائل حل نہیں ہو رہے۔ دو وقت کی روٹی کا اہتمام کرنا اب زندگی کا مقصد سا ہو کر رہ گیا ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ بعض شہروں میں لوگ کام پر جاتے ہیں تو گھر والے دعا مانگتے ہیں کہ وہ شام کو خیریت سے لوٹ آئیں! اور جب وہ شام کو تھکے ماندے لوٹتے ہیں تو دِل کو ایسی خوشی ملتی ہے

جیسے خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو! ایسے میں کسی کو اِس بات سے کیا غرض کہ کس نے کس کو خط میں کیا لکھا۔ سب چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے پتے پر خط بھیجنے کے بجائے عوامی کیا جائے! قوم کو اُس خط کا انتظار ہے جس میں اُن کے مسائل address مسائل کو حل کرنے کی نوید سُنائی گئی ہو۔ مگر شاید ایسا کوئی بھی خط لکھنے والی روشنائی اور قرطاس و قلم فی الحال ہماری کسی بھی سطح کی حکومت کے پاس نہیں۔

عوام کے مسائل حل کرنا جن کی ذمہ داری ہے وہ اب تک آپس میں دست و گریباں ہیں۔ کبھی میمو کا معاملہ اُٹھتا ہے، کبھی خط لکھنے کی بات ہوتی ہے۔ عوام کو یہ سب نہیں چاہیے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اہل اقتدار اب اُن کا مزید خط نہ بنائیں بلکہ خطِ مستقیم پر چل کر دکھائیں یعنی گڈ گورننس کا اہتمام کریں! اِسی صورت عوام کی توقعات پر خطِ تنسیخ پھرنے کا سلسلہ رُک سکے گا!

خطرناک" قوم"

اب تو ہم، آپ ..... سبھی کہانیاں بن کر رہ گئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہم بھی کہانیاں سُنا کرتے تھے اور داستان گوئی سے لطف کشید کیا کرتے تھے۔ تب کی بات ہے کہ ہم نے اُس عجیب دیو کی کہانی سُنی جو فراغت پاتے ہی تباہی کا بازار گرم کر دیتا تھا، قیامت ڈھانے پر تُل جاتا تھا۔ اُس کے شَر سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی ..... اُسے زیادہ سے زیادہ یعنی ہر وقت مصروف رکھا جائے۔

ایسا لگتا ہے کہ ہمارے حکمران طبقے نے پوری قوم کو کہانی والا دیو سمجھ رکھا ہے اِس لیے ہر وقت کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار رکھتا ہے، کہیں نہ کہیں اُلجھائے رکھنے پر تُلا رہتا ہے۔ یعنی یہ خوف دامن گیر ہے کہ قوم فارغ بیٹھے گی تو قیامت ڈھانے پر تُل جائے گی، سب کچھ تہس نہس کر ڈالے گی۔ اور کبھی کبھی ایسا ہوا بھی ہے۔ ذرا سی فُرصت ملتے ہی لوگ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، کچھ کے کچھ دکھائی دینے لگتے ہیں۔ عُرفِ عام میں اِسے پیٹ بھرے کی مَستی کہتے ہیں!

میڈیا کے جُغادری کہتے ہیں کہ اشرافیہ یعنی حُکمراں طبقے نے قوم کو جکڑ

رکھا ہے، اُس کے گرد شکنجہ کَسا ہوا ہے۔ ہمارا خیال اِس کے برعکس ہے۔ جیسی تیسی عقل کو بروئے کار لاکر بہت غور و فکر کے بعد ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قوم اپنے مزاج کے ہاتھوں اِس حال کو پہنچی ہے۔ حکمراں طبقہ تو بے چارا معصوم و مظلوم ہے۔ وہ اِس خوف سے کانپتا رہتا ہے کہ فراغت سے ہمکنار ہوتے ہی یہ قوم کہیں اُس کا تیا پانچا نہ کردے! اگر ایسا ہوا تو تباہی کا بازار گرم ہوگا۔ یعنی یہ کہ قوم کا فارغ بیٹھ رہنا بہت سوں کو فارغ کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ ایسے میں بہتر اور قرین عقل یہی ہے کہ قوم کو کسی نہ کسی ٹرک کی بتّی کے پیچھے لگائے رکھو۔ ٹرک چلتا رہے گا، قوم مصروف رہے گی۔ اِس دوڑ کو قوم کا سفر بھی کہا جائے تو کچھ ہرج نہیں، ورنہ یہ suffer تو ہے ہی!

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بُنیادی سہولتوں کی فراہمی میں ناکامی نے حکمرانوں کی نا اہلی ثابت کی ہے۔ ذہن پر ذرا سا زور ڈالیے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ قوم کو بُنیادی سہولتوں کے حصول میں اُلجھا کر اُن کے لیے دائمی اور سدا بہار قسم کی مصروف کا اہتمام کیا گیا ہے۔ لگے رہو مُنّا بھائی! بس یُوں سمجھ لیجیے کہ ع

لہو ''سرد'' رکھنے کا ہے اِک بہانہ

مرزا تنقید بیگ کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو حکمراں طبقے کی سازشوں کو غچہ دینے میں کامیاب رہے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں سب کچھ ہے وہ چاہتے ہیں کہ قوم کو سوچنے کی فُرصت اور مہلت نہ ملے، وہ غور و فکر کی طرف جا ہی نہ سکے۔ مگر مرزا کا دَم دیکھیے کہ وہ بہت سی اُلجھنوں کے باوجود اب تک سوچ بچار کے لیے وقت نکال ہی لیتے ہیں! مگر خیر، مرزا کی ''مشقِ فکر'' سے ملک و قوم کے سیاہ و سفید کے مالک محفوظ رہتے ہیں اور

ع

برق گرتی ہے تو بے چارہ مسلمانوں پر.

کے مِصداق مرزا کا سوچا ہوا ہمی کو بھگتنا پڑتا ہے! اگر کبھی مرزا سے شکایت کیجیے کہ اُن کے ''افکارِ عالیہ'' سُن سُن کر ہمارے کان اور دماغ دونوں انتہائی قابل رحم حالت کو پہنچ چکے ہیں تو فرماتے ہیں کہ دوستوں کا آخر کوئی تو مصرف ہو! یہ سُن کر کبھی کبھی ہم جل بُھن کر کباب ہو جاتے ہیں مگر پھر یہ سوچ کر دِل کو سکون ملتا ہے کہ ہمارا بھی کچھ تو مصرف ہے، دُنیا میں آنا بے کار نہیں گیا!

مرزا کی خوبی یہ ہے کہ بہت کچھ سوچتے ہیں اور اِس سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو کچھ سوچتے ہیں اُس کی کوالٹی کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے! گویا خالص پاکستانی واقع ہوئے ہیں! نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ وہ سوچنے سے

تھکتے ہیں نہ باز آتے ہیں۔ مرزا کے ذہن میں پیدا ہونے والے بے ہنگم ارتعاش یعنی خیالات کو ہضم کرتے رہنے کی مشق نے ہمیں سُلوک کی کئی منزلوں سے گزار دیا ہے! کبھی کبھی ہم اپنے آپ کو بہت "پہنچا ہوا" سمجھتے ہیں کیونکہ مرزا نے ہمارے حواس کو تباہی کے دہانے تک تو پہنچا ہی دیا ہے! اب ہم میں اِتنی "روحانی بالیدگی" پیدا ہوچکی ہے کہ لفافہ دیکھتے ہی خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں۔ مرزا کو ایک نظر دیکھتے ہی ہم اندازہ لگا لیتے ہیں کہ ہمارے دِل و دِماغ کو تازگی نصیب ہوگی یا اُن کی واٹ لگنے والی ہے! لفافہ دیکھ کر خط کا مضموں بھانپ لینے کی صلاحیت نے ہمیں کئی بار مرزا کے شر سے محفوظ رکھا ہے یعنی اُنہیں دُور ہی سے دیکھ کر ہم تپلی گلی سے نکل لیے ہیں اور پھر دیر تک خود کو شاباش دی ہے!

مرزا کا استدلال ہے کہ قوم کی صلاحیتوں کو دبوچ کر رکھنے کے لیے بہت سے مسائل صرف پیدا نہیں کئے گئے بلکہ برقرار رکھنے پر بھی خاصی محنت کی گئی ہے۔ علامہ اقبالؔ اُمّت کے معاملے میں انتہا کے شِکوہ نصیب اور گریہ شعار واقع ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اُمّت کے روایات اور خرافات میں کھو جانے کا بہت رونا رویا ہے۔ شُکر ہے کہ سُخن گوئی کے ابتدائی دور میں داغؔ دہلوی کے رنگِ سُخن سے متاثر ہوکر اُنھوں نے چند ایک شوخ غزلیں بھی کہہ ڈالیں ورنہ ہم تو اُن کے کلام میں جا بجا برپا ہونے والے اُمتِ بیضہ کے ماتم کی نذر ہو جاتے!

حکمرانوں نے علامہ سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا ہے۔ جامع منصوبہ بندی کے ذریعے اِس قوم کی حقیقت کو بجلی، پانی اور گیس جیسی بنیادی سہولتوں کے حُصول کی خرافات میں گم کردیا گیا ہے۔ ہر طرف سے زور لگایا جارہا ہے، بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ قوم کو ذرا بھی فراغت میسر نہ ہو۔ حکمرانوں کے اِس خوف کا گراف نیچے ہی نہیں آتا کہ قوم کہیں بنیادی مسائل کو پچھاڑ کر فارغ ہوگئی تو افسانوی دیو کی طرح چڑھ دوڑے گی، سب کچھ روند ڈالے گی، تہس نہس کردے گی!

جو قوم اپنی مظلومیت اور محرومیوں کا رونا روتی ہے وہ کبھی اپنی ''اداؤں'' پر بھی تو غور کرے! جو لوگ قوم کے نفع و نقصان کے بارے میں سوچنے کا خود ساختہ فریضہ انجام دے رہے ہیں اُن پر تو خود اِس قوم نے امکانات و خدشات کا عذاب مسلّط کر رکھا ہے! اِس قوم نے اپنے بھرپور جوش و جذبے سے اپنے سر پر آسمان خود گرایا ہے۔ قوم نے اپنے لیے دم بہ دم ع

لو، آپ اپنے دام میں صیّاد آگیا

والی کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔

جب کرنے کو کچھ نہ ہو تو جوش و جذبہ ہر حد سے گزر جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے، جوش و جذبہ جب بروئے کار لایا ہی نہیں جائے گا تو اُس کا حجم تو بڑھتا

ہی جائے گا۔ یہ کیفیت اِتنی پُختہ اور ایسی توانا ہوچکی ہے کہ اب ہم سرسری جائزہ لینے پر بھی انتہائی خطرناک دکھائی دیتے ہیں۔ حکمراں طبقہ بہت کچھ کرنا چاہتا ہے مگر اُس کی تان اِس خوف پر آکر ٹوٹتی ہے کہ اِس قوم کے جوش و جذبے کا کیا کرے! جنہیں مُلک چلانا ہے اُن کا بیشتر وقت تو قوم کے ''ولولے'' کو ''کیپ'' کرنے کی فکر میں غلطاں رہتے ہوئے ضائع ہوجاتا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو اِس مُلک کے اربابِ بست و کشاد قوم کی ''بھلائی'' کا سوچنے کی فُرصت کہاں سے پائیں گے؟ قوم کو بھی چاہیے کہ جوش و جذبے کے معاملے میں ہاتھ ذرا ہلکا رکھے۔ یعنی اپنی طرزِ عمل سے ایسی خطرناک دکھائی نہ دے کہ اربابِ اختیار اختیار دیکھیں تو اُنہیں اپنے اختیارات خطرے میں دکھائی دیں!

"خطابت کی "بہار

گزشتہ ہفتے ایک صبح کراچی کے مشہور تعلیمی ادارے ''کامیکس'' کی انیلہ ندیم کے فون نے جگادیا۔ ہم معمول کے مطابق روزنامہ دُنیا میں نائٹ شفٹ کرکے صبح پانچ بجے سوئے تھے۔ دو سال پہلے کی طرح انیلہ ندیم نے ایک بار پھر ہمیں مقابلۂ خطابت میں گیسٹ آف آنر کے طور پر مدعو کیا۔ ہم نے پہلے کی طرح پھر جاں بخشی چاہی کہ ہم کہاں اور یہ ''منصبِ جلیلہ'' کہاں! بات یہ ہے کہ نوجوانوں کی محفل میں جاتے ہوئے اب دِل دُکھتا ہے۔ بیٹھے بٹھائے اپنی گزری ہوئی (یعنی تقریباً ضائع شدہ) جوانی یاد آ جاتی ہے۔ ''ضائع'' ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ جوانی میں بھی ہم لکھنے پڑھنے کے سوا کوئی تیر نہ مار سکے۔ ہاں، نوجوانی کے دور کو یاد کرکے اور آج کے no-jawani کے دور پر ڈال کر وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو کلکتہ کو یاد کرکے غالبؔ کے دل و دماغ میں پیدا ہوا کرتی تھی۔ ع

اِک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

ہم نے انیلہ صاحبہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ گیسٹ آف آنر بننا بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ اور اگر بولنا بھی پڑے تو مزید اُلجھن ہوتی ہے کیونکہ اہلیہ سامنے نہ ہوں تب بھی مجمع کو دیکھ کر ہماری آواز بیٹھ جاتی ہے۔ ایسے میں

گھرانوں والے اُستادوں کی طرح گلے سے کھرج کے سُروں کے سِوا کچھ برآمد نہیں ہوتا !

ذمہ داری کا ذکر ہم نے صفیر اللہ عرف لہری مرحوم کی مناسبت سے کیا۔ کئی سال پہلے ایک ملاقات میں لہری صاحب نے بتایا تھا کہ کبھی وہ بھی مضمون نگاری کیا کرتے تھے۔ ایک مضمون اُنھوں نے ہسپتال میں اپنے علاج کے حوالے سے لکھا تھا۔ لہری صاحب لکھتے ہیں کہ جب بھی نرس آتی تو وہ کہتے نرس ! فلاں دوا لاؤ، نرس ! انجیکشن لگاؤ، نرس ! پانی لادو۔ تھوڑی ہی دیر میں نرس چڑ گئی اور کہنے لگی۔ ''آپ نرس نرس کیوں کر کر رہے ہیں، مجھے سِسٹر کیوں نہیں کہتے ؟'' اِس پر لہری صاحب نے کہا۔ ''ہم تمھیں سِسٹر نہیں کہہ سکتے۔'' نرس نے سبب پوچھا تو لہری صاحب نے کہا۔ ''بھئی سمجھا کرو، یہ بہت ذمہ داری کا کام ہوتا ہے !''

ہم نے بھی انیلہ صاحبہ کو یہی سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمیں گیسٹ آف آنر نہ بناؤ، یہ بہت ذمہ داری کا کام ہوتا ہے مگر وہ نہ مانیں اور حکم دیا کہ کل صبح حاضر ہوجایئے۔ اور ہمیں سرِ تسلیم خم کرتے ہی بنی۔

تقریری مقابلے کے شرکاء یعنی طلباء وطالبات نے روسٹرم پر آکر دھواں دار تقریریں کیں۔ خود کو انعام کا حقدار ثابت کرنے کے لیے طالبات ہی نہیں طلباء نے بھی ایڑی کے ساتھ ساتھ ''چوٹی'' کا زور لگا دیا۔ لوگ حلق پھاڑ کر خطاب

فرماتے ہوئے عزت پانے کی کوشش کر رہے تھے اور ایک صاحب خاموش رہ کر عزت پاگئے۔ شرکاء کے نام پُکارنے والے صاحب دائیں جانب بیٹھے تھے۔ طلباء اور طالبات نے اپنی اپنی تقریروں کے دوران بار بار اُن کی طرف دیکھ کر "جنابِ صدر" کہا اور اُنہوں نے ایک بار بھی تردید یا تصحیح کی زحمت گوارا نہ کی!

نئی نسل کو روسٹرم پر زورِ خطابت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھ کر اپنا "دورِ خطابت" یاد آجاتا ہے۔ اللہ بخشے، ہماری جوانی خطابت سے مُزیّن ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جس زمانے میں ہمارے ساتھیوں کے دِل محبت کے جذبات اور سُریلی آوازیں سُن کر دھڑکا کرتے تھے، ہمارا دل خطابت کی دعوت ملتے ہی ریلوے انجن کی طرح دھک دھک کرنے لگتا تھا! جب کبھی اساتذہ نے بے حد اِصرار کے ساتھ ہمارا نام تقریری مقابلے کے شرکاء کی فہرست میں شامل کیا، روسٹرم کی طرف جاتے ہوئے ہمیں اپنے پاؤں من من بھر کے یعنی بہت ہی بھاری محسوس ہوئے! بھرے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے ہمارے چھکّے ایسے چُھوٹتے تھے کہ پھر اُنہیں پکڑنے پر خاصا وقت ضائع ہوتا تھا!

ایک بار یاروں نے ہمیں تقریری مقابلے میں حصہ لینے کی تحریک دینے کی غرض سے کہا کہ لڑکیاں عمدہ بولنے والے لڑکیوں پر مرتی ہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ

بھائی! مری ہوئی لڑکیوں کا ہم کیا کریں گے!

کالج کے زمانے میں ایک بار دوستوں نے بہت اِصرار کرکے ہمیں بین الکلیاتی تقریری مقابلے میں کھڑا کردیا۔ وہ (سامعین کے لیے بھی) قیامت کی گھڑی تھی۔ ہم کسی نہ کسی طور روسٹرم تک پہنچ تو گئے مگر الفاظ کہیں راستے ہی میں دھرنا دے بیٹھے! الفاظ کو ہم تک پہنچنے میں چند لمحات لگے مگر اِتنی دیر میں تو لوگ بے صبرے ہوگئے اور شور مچانا شروع کردیا۔ ہم نے بولنا شروع ہی کیا تھا کہ پورے جسم کا خون سمٹ کر سَر میں سماگیا اور پھر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاگیا۔ دو تین سیکنڈز کے بعد اندازہ ہوا کہ بجلی چلی گئی ہے! بجلی کی فراہمی بحال ہونے میں دس سیکنڈ لگے۔ تب تک ہم ذہن بناتے رہے کہ کن کن جملوں سے آڈینس کو متاثر کرنا ہے۔ دوسری طرف لوگ غالبؔ کے پُرزے اُڑتے ہوئے دیکھنے کو بے تاب تھے!

جب ہم نے بولنا شروع کیا تو پورے ہال پر سنّاٹا سا چھاگیا۔ یہ دیکھ کر ہم میں کچھ ہمت پیدا ہوئی اور ہم نے ساری ''تیاری'' ایک طرف کرتے ہوئے ''فی البدیہہ'' بولنا شروع کیا۔ مجمع کی خاموشی مزید گہری ہوگئی۔ اپنی ہی دُھن میں بولتے بولتے خیال آیا کہ ہر مُقرر کو زیادہ سے زیادہ تین منٹ بولنا ہے۔ تین منٹ گزر گئے مگر گھنٹی نہ بجی۔ ہم سمجھے شاید گھنٹی بجانے والا بھی

ہمارے مسحور کُن خطاب کی تاب لانے سے قاصر ہے! مزید دو منٹ گزر گئے مگر گھنٹی نہ بجی۔ مجمع خاموش، مہمان خصوصی خاموش، منصفین خاموش۔ ہم حیران تھے کہ یہ سب کو ہوا کیا ہے۔ جب ہم نے متعلقین کو یاد دلایا کہ گھنٹی بجائیں تو صدرِ محفل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''بولتے رہو، مزا آ رہا ہے!''

یہ سُننا تھا کہ پورا ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ ہم ذہین تو تھے ہی، فوراً سمجھ گئے کہ ہمیں اُلّو بنایا جا رہا ہے! ہمارے انٹ شنٹ جُملوں سے لوگ محظوظ ہو رہے تھے اور اِدھر ہم اپنی دُھن اور دانست میں یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم سے خطاب سَرزد ہو رہا ہے! فلک شگاف قہقہوں سے ہم نے اندازہ لگایا کہ ہمارا خطاب دراصل کامیڈی کا ارتکاب تھا! ہم نے روسٹرم چھوڑا، اسٹیج سے اُترے اور منتظمین سے شکایت کی کہ یہ تو سَفّاکی ہے، کسی کے ''بھولپن'' کا یُوں فائدہ نہیں اُٹھانا چاہیے!

ہال سے کچھ ہوٹنگ نُما صدائیں بلند ہوئیں تو ہم نے ناراض ہو کر دوبارہ اسٹیج کی طرف قدم بڑھائے۔ ہمیں انتقام کے موڈ میں دیکھ کر حاضرین کو پھر سانپ سُونگھ گیا۔ ہم نے اِتنے ہی پر اکتفا کیا اور لمبے چوڑے پنڈال کی پتلی گلی سے نکل لیے۔

بولنے کا مرحلہ ہم پر ہمیشہ ہی گراں گزرا ہے۔ شادی سے بہت پہلے بھی ہم کم کم ہی بولا کرتے تھے! خاندان کے بُزرگوں سے سُنا ہے کہ ہم نے خاصی بڑی عمر میں بولنا سیکھا تھا۔ گویا دُنیا میں شادی شدہ آئے تھے! چند برس قبل جب ایک ٹی وی چینل سے وابستہ ہوئے تو مارننگ شو کے لیے ایکسپرٹ کی حیثیت سے بولنے کو کہا گیا۔ ہم نے معذرت چاہی مگر پروڈیوسر نہ مانے اور بولے اچھا ہے کہ ناظرین صبح کی تازہ ہوا کے ساتھ تھوڑا بہت مزاح سے لطف اندوز ہوں! یہ سلسلہ دو تین ماہ چلا۔ پھر فریق ثانی نے معذرت کرلی۔ ہم نے سبب پوچھا تو بولے ناظرین کی طرف سے شکایت آئی ہے کہ آپ سوچ سوچ کر بولتے ہیں! ہم نے وضاحت کی کہ ہم انسان ہیں، کوئی لینکر نہیں!

طلباء و طالبات اپنی تقریر کو موثر بنانے کے لیے اُن میں اشعار ٹُھونس دیتے ہیں۔ ایسی ہر تقریر پر کھچا کھچ بھری ہوئی منی بس کا گماں ہوتا ہے! چند ایک طلباء چاہتے ہیں کہ تین یا چار منٹ میں تیس چالیس منٹ کا مواد بول جائیں۔ ایسی تقریر سُن کر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بہت سا چارا لے کر باڑے میں آئے اور ہر بھینس یہ سمجھے کہ سارا چارا اُسی کو کھانا پڑا ہے!

اگر طلباء تقریر کا فن سیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے والد کو دیکھیں۔ وہ گھر میں کتنا بول پاتے ہیں؟ بس یہی مَردوں میں خطابت کا فن ہے! اور لڑکیوں کو

ہوتا built-in کبھی تقریر کے فن پر کوئی کتاب نہیں پڑھنی چاہیے۔ یہ فن اُن میں ہے۔ اگر ہوسکے تو لڑکیاں کبھی کبھار

Why and When not to Speak

!ٹائپ کی کوئی کتاب پڑھ لیا کریں

معذور سہی، مجبور نہیں'' قسم کے موضوعات پر بولنے والے طلباء و طالبات ہیلن کیلر'' کا حوالہ ضرور دیتے ہیں جو پیدائشی طور پر قوتِ گویائی و سماعت اور بصارت سے محروم تھیں۔ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اسکول اور کالج کے زمانے میں لڑکوں کو تقریری مقابلے میں ضرور حصہ لینا چاہیے۔ اُن کے پاس بولنے کے لیے یہی تین چار سال تو !ہوتے ہیں۔ اِس کے بعد تو اُنہیں ہیلن کیلر کی طرح زندگی بسر کرنی ہوتی ہے

مہمان خصوصی محترم ڈاکٹر شکیل الرحمٰن فاروقی نے اپنے پُر مغز خطاب میں خطابت کے حوالے سے چند سنجیدہ مشورے دیئے۔ خیر گزری کہ ہمیں اُن سے پہلے خیالات کے اظہار کا موقع عنایت کیا گیا۔ ہم چند ہلکے پھلکے جملوں سے حاضرین کو کچھ ہنسانا چاہتے تھے۔ گو کہ مقابلہ خطابت کے شرکاء نے اِس کی گنجائش کم ہی چھوڑی تھی ! خیر، ہماری سازش'' کامیاب رہی۔ چند ہلکے پُھلکے جملوں کی مدد سے ہم حاضرین کے ہونٹوں کو'' مزید مُسکراہٹ بخشنے میں کامیاب رہے۔ اگر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن فاروقی پہلے خطاب کر جاتے تو سب سنجیدگی میں ڈوبے رہتے

!اور ہماری باتوں کا اُتنا اثر بھی نہ ہوتا جتنا گھر میں ہوتا ہے

لائیو کا چسکا

کوئی بھی معاملہ خواہ کہیں سے چلے، گھوم پھر کر لائیو کوریج کی چوکھٹ تک پہنچ کر سکون کا سانس لیتا ہے۔ لوگوں کو ہر معاملہ لائیو دیکھنے کا ایسا چسکا لگا ہے کہ اب اگر کسی معاملے کی لائیو کوریج نہ ہو تو چینلز کی ریٹنگ ہی دھڑام سے زمین پر نہیں گرتی بلکہ قوم کا اعتماد بھی مُنہ کے بل گر پڑتا ہے۔ جب تک کوئی واقعہ لائیو نہ دیکھ لیا جائے، یقین ہی نہیں آتا کہ وہ ہوا بھی ہوگا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ماضیٔ بعید میں لوگوں کو کسی بھی بات کا براہِ راست مشاہدہ کئے بغیر کیسے یقین آتا ہوگا!

مُلتان کی ڈسٹرکٹ جیل میں بالی وڈ کی مشہورِ زمانہ فلم ''شعلے'' کا ٹنکی والا سین ایسی پرفیکشن کے ساتھ شُوٹ ہوا کہ قوم حیران رہ گئی۔ قتل کا ملزم غلام محمد جیل کی ٹنکی پر چڑھ گیا اور وہیں ویمین جیل میں قید اپنی گرل فرینڈ نجبہ سے ملاقات کی فرمائش کی۔ فرمائش پوری نہ کئے جانے کی صورت میں اُس نے خودکشی کی دھمکی دی اور خود کو پھندا لگا بھی لیا۔ خیر گزری کہ ریسکیو والے بروقت پہنچے اور اُس سے بحفاظت اُتارا۔

غلام محمد کی فرمائش کا بھرم رکھتے ہوئے گرل فرینڈ لائی گئی۔ غلام محمد نے شکوہ کیا کہ قتل کیس میں اُس کے خلاف گواہی کیوں دی۔ گویا معاملہ خالص نجی اور دوطرفہ تھا۔ چینلز کی مہربانی سے قوم نے یہ تماشا لائیو دیکھا اور رَج کے دیکھا یعنی مزے بھی لیے۔

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہوں گے مگر یہ کون سا مقام ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا اب اِس قوم کا مقدور یہی رہ گیا ہے کہ ہر معاملے کو تماشے میں بدل کر زیادہ سے زیادہ لذت کشید کی جائے؟ اِس منزل یا کیفیت کو قمر جمیل مرحوم نے یوں بیان کیا ہے ۔

اپنی ناکامیوں پہ آخرِ کار
!مُسکرانا تو اختیار میں ہے

قوم اب کسی بھی راہ پر محوِ سفر نہیں بلکہ محض چل رہی ہے۔ اور کس راہ پر چل رہی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جب راستے ہی کو سمجھنا ممکن نہیں تو منزل کا کون سوچے اور کیونکر؟ جب لوگ قوم بننے پر توجہ دینے کے بجائے محض گروہوں میں بٹ کر جینے پر بضد ہوں تو ایسے ہی تماشے ہوا کرتے ہیں۔ جنہیں سوچ سمجھے سفر سے غرض نہ ہو اُنہیں کسی نہ کسی ٹرک کی بتّی کے پیچھے لگادیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی محض چلتے رہنے کو سفر سمجھ کر خوش ہو رہے تو

اُس کی مرضی۔
مُلتان کے جیل تماشے نے ایک بار پھر ثابت کردیا کہ ہم نے سوچنے اور سمجھنے کے عمل کو جبری رخصت پر بھیج رکھا ہے! ہم ہر اُس بات کو گلے لگانے کے لیے بے تاب ہیں جس کا فہم و خرد سے دُور کا بھی تعلق نہ ہو۔ کوشش کی جارہی ہے کہ سوچنے کی زحمت کو زحمتِ کار نہ دی جائے۔ اہلِ وطن کی خواہش سی ہے کہ دِماغ کو کم سے کم استعمال کیا جائے یعنی تقریباً ''ڈبا پیک'' حالت ہی میں واپس لے جاکر اپنے رب کے حضور پیش کرنے کا ارادہ ہے! ذہنوں میں شاید یہ خوش فہمی جڑ پکڑ چکی ہے کہ دِماغ کو ''ڈبا پیک'' حالت میں واپس کرنے پر ہم امین ثابت ہوں گے اور امانت داری کے صلے میں بخش دیئے جائیں گے!
جو ہمیں راہ دکھانے پر ''از خود نوٹس'' کے تحت مامور ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہمیں ہر وہ راہ دکھائیں جس پر چلنا درحقیقت نہ چلنے کے مترادف ہو۔ یعنی ذہن کی گاڑی کے پچھلے پہیئے گڑھے میں دھنس کر گھومتے رہیں۔ اگر کہیں کوئی شخص کسی سرکاری دفتر کے کلرک یا افسر کے رویّے سے تنگ آکر کسی کھمبے پر چڑھ جائے اور کود کر جان دینے کی دھمکی دے تو انتظامیہ کی کوشش ہوتی ہے کہ لائیو کوریج ہو اور مِنی اسکرین پر یہ تماشا دو ڈھائی گھنٹے تو چلے تاکہ قوم دھندے سے لگی رہے! جن معاملات کا سرسری تذکرہ بھی وقت کا ضیاع ہے اُن

پر پوری ''شان و شوکت'' سے متوجہ ہونا چہ معنی دارد؟ یہ کیا زندگی ہے؟ وقت اور توانائی ضائع کرنے میں لذّت کیوں محسوس کی جارہی ہے؟ کیا ہمیں زندگی جیسی نعمت محض اِس لیے دی گئی ہے کہ جی بھر کے ضائع کرتے پھریں؟

حماقت کے مظاہر کی لائیو کوریج سے دل بہلانا ہمارے ذہنوں کا کھوکھلا پن ثابت کرتا ہے۔ سبھی اِس بات پر تُلے ہیں کہ اپنے وقت کو رات دن ضائع کریں، دماغ کی واٹ لگائیں اور بربادی کے کھونٹے سے بندھے رہیں!

ایک زمانہ تھا جب قربانی کے جانور گھمانا بچوں کے لیے تفریح کا درجہ رکھتا تھا۔ اب یہ عمل خیر سے ''ایونٹ کا موقع'' ہے! ایسی بھرپور کوریج ہوتی ہے کہ جانور دیکھ لیں تو اُن کا بھی متّھا گھوم جائے۔ اگر کہیں قربانی کی گائے سڑک کے ساتھ واقع کسی خشک برساتی نالے میں گر پڑے تو سمجھ لیجیے چینلز کو مصروفیت مل گئی۔ آن کی آن میں ڈی ایس این جیز کی لائن لگ جاتی ہے۔ ہر چینل اِس ''ایونٹ'' کو لائیو دکھانا چاہتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں پورا علاقہ میلے کا سماں پیش کرنے لگتا ہے۔ اہل علاقہ کو گھر بیٹھے تفریح میسر ہو جاتی ہے۔ گائے کو نکالنے کی کوشش بھی کیجیے تو میڈیا والوں کی مجبوری سامنے آجاتی ہے یعنی گائے کچھ دیر اور نالے میں پڑی رہنے دی جائے تاکہ دیگر چینلز بھی اچھی طرح لائیو کوریج دے کر اپنی ریٹنگ کم از کم نصف گھنٹے کے لیے تو بہتر

بنا سکیں!

قوم کو سب کچھ لائیو دیکھنے کی ایسی عادی ہو چکی ہے کہ اگر کہیں کسی بازار میں میاں بیوی میں شاپنگ کے حوالے سے جھگڑا ہو جائے تو بھی چینل والے پہنچ جاتے ہیں۔ ایسے پَھڈے جتنی تیزی سے شروع ہوتے ہیں اُتنی ہی تیزی سے ختم بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر معاملہ سَر دپڑ چکا ہو تب بھی خواہش ہوتی ہے کہ ری ٹیک ہو جائے تاکہ ناظرین محروم نہ رہیں!

ہم نے چینلز پر گھریلو جھگڑوں کے بھی ٹکرز دیکھے ہیں۔ کہیں میاں بیوی میں لڑائی ہوئی۔ میاں نے بیوی کو گھر سے نکال دیا یا بیوی نے بیلن دے مارا جو میاں کے سَر پر لگا۔ بس، اِتنا ہی کافی ہے۔ اِسی کو تو ''ایونٹ'' کہتے ہیں! آن کی آن میں میڈیا کے نمائندے ''اسپاٹ'' پر پہنچتے ہیں۔ تب تک میاں بیوی میں صُلح بھی ہو چکی ہو تب بھی کچھ نہ کچھ سُن گُن لینے کی بھرپور کوشش ہوتی ہے تاکہ ناظرین کچھ تو ''اپ ڈیٹ'' ہوں! مگر چینلز کیا صُلح دکھانے کے لیے قائم کئے گئے ہیں؟ ارے بھائی، کچھ لڑو بھڑو تو بات بنے۔

قوم کو طرح طرح کے چسکے لگے ہوئے ہیں۔ جب لذت کشید کرنا ہی ٹھہرا تو معیار کا کون سوچے؟ ہر معاملے کو لائیو دیکھنا ایسا چسکا ہے جو قوم کے منہ کو خُون کی طرح لگ چکا ہے۔ یہ ایسی عادت ہے کہ چینلز والوں کے لیے یومیہ

بنیاد پر تماشے کا اہتمام کرنا دردِ سر ہوگیا ہے۔ اگر کہیں کوئی معمولی سا بھی خلافِ معمول واقعہ رونما ہو تو چینلز پر لائیو کوریج کے ذمہ داروں کی دوڑیں لگ جاتی ہیں۔ بے چارے شہر کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے کی طرف بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔
گیس سلنڈر کا دھماکا بھی ہو تو چینلز کی گاڑیاں ذرا سی دیر میں سڑکوں پر دوڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ ''اسپاٹ'' پر پہنچ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا!

جاں فِشانی سے پہاڑ کھود جائیے مگر نکلتا ہے چُوہا۔ پھر کوشش ہوتی ہے کہ اِس چُوہے کو شیر بنا کر پیش کیا جائے! یہ سب کب ختم ہوگا، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ہاں، یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ جب تک یہ سب ختم ہوگا تب تک ہم ضرور ختم ہو چکے ہوں گے!

طوفان کی آنکھ

سوچ لیا گیا ہے کہ محشر بدوش رہنے میں زیادہ لطف ہے۔

طے کرلیا گیا ہے کہ اب اِس طور ہی جینا ہے کہ دنیا کی توجہ ہم پر مرکوز رہے۔

ٹھان لی گئی ہے کہ سکون کو مکمل طور پر تج کر، یعنی اپنے دِل و دِماغ سے دیس نکالا دے کر ہر لمحے کو آفتِ جاں بناتے ہوئے زندگی بسر کرنی ہے۔

اہل سیاست کی باہمی کشمکش نے پوری قوم کو تین چار ماہ سے عجیب مخمصے میں ڈال رکھا ہے۔ دِن گزرتے جاتے ہیں اور الجھنیں توانا تر ہوتی جاتی ہیں۔ آگے بڑھنے سے خوف آتا ہے اور کوئی پیچھے ہٹنے کو بھی تیار نہیں۔ سب نے اپنی اپنی سکت کے مطابق دائرے متعین کر رکھے ہیں اور اُنہی دائروں میں رہتے ہوئے قیامت برپا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ حد سے گزرنے کا تاثر دینے میں بُخل سے کام نہیں لیا جاتا اور کوئی حد سے آگے بڑھتا بھی نہیں!

جمہوریت کو بچانے اور پروان چڑھانے کے نام پر رچایا جانے والا یہ ڈراما اہلِ پاکستان کو ایک بار پھر جمہوریت سے متنفر کرنے کا باعث بنتا جارہا ہے۔ جمہوریت جن اقدار کو پروان چڑھاتی ہے وہ تو جیسے ہم سے روٹھ گئی ہیں۔ جمہوری کلچر جس رواداری کا درس دیتا ہے وہ اب ہمارے اجتماعی ذہن کے کسی کونے میں نہیں ہے۔ سیاست کسی دور میں شجرِ ممنوعہ تھی، اب یہ تفننِ طبع کا گھنا درخت ہے۔ جو عمل ملک کو چلانے کا ذمہ دار ہے وہ اب قوم کے لیے دل بستگی کا سامان کر رہا ہے!

ہم بہت کچھ بھول چکے ہیں۔ یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہمیں ہر حال میں اور کچھ نہ سہی، اپنا مفاد تو یاد رکھنا ہے۔ بھولتے جانے کی بیماری نے ہمیں اُس مقام تک پہنچا دیا ہے جہاں ہمیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ زندگی حسین یادوں کے سہارے ہی ڈھنگ سے گزرتی ہے۔ اِس کائنات میں سب کا بنیادی خاکہ ایک سا ہے۔ فرد سے قوم تک سب کا ایک ہی پیراڈائم ہے، ایک ہی ساخت ہے۔ ہر شخص حسین یادوں کے سائے میں رہنا چاہتا ہے۔ قوموں کی بھی یہی نفسیات ہوا کرتی ہے۔ ہر قوم کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ حسین یادیں اُس کے اجتماعی ذہن کا حصہ بنیں۔ مگر یہ کیا؟ یہاں تو بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ جو تھوڑی بہت دل نواز قسم کی یادیں حافظے کا حصہ ہیں اُنہیں بھی تہس نہس کردیا جائے۔ دوسری طرف نئی خوشگوار یادوں کی راہ ہموار ہونے کا امکان بھی داؤ پر لگایا جارہا ہے۔

یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ یا کیوں ہونے دیا جا رہا ہے؟

ایسا کیوں ہے کہ ہم ہر مثبت چیز کو خیر باد کہتے جا رہے ہیں، بلکہ بعض کیسز میں تو اُن پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں؟ اور دوسری طرف ہر منفی چیز کو بخوشی گلے لگایا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو ہم منفی باتوں میں ایسی بھرپور دلچسپی لیتے ہیں جیسے خوف لاحق ہو کہ کہیں محروم نہ رہ جائیں!

طوفان کی آنکھ میں زندگی بسر کرنے کا شوق اب جادو کی طرح سَر چڑھ کر بول رہا ہے۔ جسے دیکھیے وہ زیادہ سے زیادہ خرابی کو گلے لگانا، اپنانا چاہتا ہے۔ ہوگ ہر معاملے میں گنجائش اور سکت کو بھولنے کی عادت اپنا بیٹھے ہیں۔ اور اِس کا نتیجہ؟ صرف بربادی، اور کیا؟ جس راہ پر ہم بخوشی گامزن ہیں وہ بربادی کے سوا کس منزل لے جا سکتی ہے؟

ایک بار پھر اسلام آباد کے قلب میں شدید احتجاج کا پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ حکومت کی بنیادوں کو مزید ہلانے کی ایک اور سَر توڑ کوشش کی جانے والی ہے۔ معاملہ ایسا زوردار دکھائی دے رہا ہے جیسے کوئی جنگ چھڑنے والی ہے۔ کیا واقعی؟ جلسوں میں تقریروں اور چینلز پر انٹرویوز میں قوم کو باور کرایا

جارہا ہے کہ ''ابھی نہیں تو کبھی نہیں'' اور ''مارو یا مر جاؤ'' والا دن آیا چاہتا ہے۔ سبھی کے ذہن میں یہ تصور ٹھونسا جارہا ہے کہ 30 نومبر حتمی معرکے کا لمحہ ہے۔

تحریکِ انصاف عوام کے ذہنوں پر اپنا نقش مزید گہرا کرنے کی ایک اور سر توڑ کوشش کرنے والی ہے۔ دوسری طرف حکومت نے بھی نئی احتجاجی لہر سے نمٹنے کی بھرپور تیاری کا دعویٰ کیا ہے۔ آبی توپوں اور اشک آور گیس کے گولوں کا اہتمام کیا جاچکا ہے۔ پولیس کی بھاری نفری الرٹ ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیا گیا ہے کہ اِس بار اسلام آباد پولیس دوسری دفاعی لائن میں ہوگی۔ سب سے آگے فرنٹیئر کانسٹیبلری اور دیگر پیرا ملٹری فورسز کے دستے ہوں گے۔ عمران خان کہتے ہیں کہ تشدد ہوا تو بھرپور جواب دیا جائے گا۔ حکومت کہتی ہے کہ کسی کو حد سے آگے بڑھنے نہیں دیا جائے گا۔ وفاقی وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان بھی یومیہ بنیاد پر انتباہ کر رہے ہیں کہ ریڈ زون میں داخل ہونے یا اہم ترین سرکاری عمارتوں پر دھاوا بولنے کی کوشش کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔

30 نومبر کا غلغلہ اِس قدر بلند کیا گیا ہے کہ امریکا اور چین کے سفیر نے عمران خان سے ملاقات کرکے وضاحت چاہی ہے۔ عمران خان نے اُنہیں بتایا ہے کہ

احتجاج نئے مرحلے میں داخل ہو رہا ہے۔ یعنی بعض مطلوبہ اقدامات نہ کئے جانے پر 30 نومبر کے جلسے کے ذریعے حکومت سے شدید ناراضی کا اظہار مقصود ہے۔ یہ بات کتنی عجیب ہے کہ دو بڑے ممالک کے سفیر ہمارے کسی اپوزیشن لیڈر سے کھلّم کھلّا ملاقات کرکے اپنے ''تحفظات'' دور کریں! کسی بھی ملک کے معاملات میں مداخلت اور کیا ہوتی ہے؟ ساتھ ہی یہ امر بھی انتہائی شرمناک ہے کہ ہمارے حالات اِس قدر غیر یقینی ہو جائیں کہ بڑی طاقتوں کو ملاقاتیں کرکے وضاحت طلب کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

چار ماہ سے جاری احتجاجی تحریک کے دوران احتجاج کرنے والوں کا رویہ مثالی نہیں رہا۔ اُنہوں نے معاملات کو اُلجھانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کیا۔ اُن کے چند مطالبات جائز ہیں۔ گڈ گورننس کا مسئلہ خوب اٹھایا گیا ہے۔ ساتھ ہی سرکاری وسائل کی لُوٹ مار کی طرف بھی قوم کو متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ سب ٹھیک ہے مگر انداز ایسا ہے کہ بہت کچھ اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ دوسری طرف حکومت نے بھی اب تک اصلاح احوال کا بھرپور اشارا نہیں دیا۔ حکومتی اُمور کے چمن سے اقربا پروری کے کانٹے نکالنے پر اب تک آمادگی ظاہر نہیں کی جارہی۔ مریم نواز نے نوجوانوں کے لیے وزیر اعظم کی قرضہ اسکیم کی سربراہ کے منصب سے استعفیٰ دے دیا ہے مگر یہ کوئی بڑی کامیابی نہیں۔ وزیر اعظم کو اپنے عمل سے ثابت کرنا ہے کہ وہ گڈ گورننس پر یقین رکھتے ہیں، اقربا پروری پر نہیں۔

وفاقی کابینہ کی اب تک کی کارکردگی ایسی نہیں کہ نواز شریف سُکون کا سانس لے سکیں۔ ابھی بہت کچھ کیا جانا ہے۔ اگر وہ اصلاحِ احوال کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے تو اُن کی پوزیشن مزید کمزور ہوتی جائے گی۔ احتجاجی تحریک نے اُنہیں خاصا کمزور کیا ہے۔ فوج سے ''تعلقاتِ کار'' کے معاملے میں طاقت کا توازن اب کسی بھی طور وزیرِ اعظم کے حق میں نہیں۔ احتجاجی تحریک نے گڈ گورننس کو بہت حد تک ناگزیر بنادیا ہے۔

دُکھ اگر ہے تو صرف اِس بات کا کہ اِس دھماچوکڑی میں وفاقی دارالحکومت کا سُکون اور استحکام داؤ پر لگ گیا ہے۔ اسلام آباد کے حسّاس ترین علاقے میں تین ماہ سے جاری دھرنا عالمی برادری میں ہمارے نام کے جھنڈے گاڑ چکا ہے! دُنیا سوچ رہی ہے کہ یہ کیسا ملک ہے کہ وفاقی دارالحکومت میں بھی احتجاجی تحریک کو چلنے دیا گیا ہے۔ حکومت کی جہاں نشست ہو وہاں یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ اور نہیں ہونا چاہیے۔

اقرباء پروری کے خاتمے اور گڈ گورننس کے لیے آواز بلند کرنے والوں کے عزائم چاہے کتنے ہی نیک ہوں، نتیجہ منفی برآمد ہو رہا ہے۔ اسلام آباد کی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد کئی ممالک نے پاکستان میں سرمایہ کاری سے ہاتھ کھینچا ہے۔ سب سے بڑا دھچکا تو چینی صدر کے دورے کا منسوخ کیا جانا تھا۔ عمران خان

اور طاہر القادری آخرش چاہتے کیا ہیں یہ تو ہم نہیں جانتے مگر ہاں، یہ بات قابل غور ہے کہ اُن کے لگائے ہوئے میلے میں پریشانی کے تماشے زیادہ ہیں۔ طاہر القادری تو الگ راہ پر چل پڑے ہیں۔ خدا کرے کہ عمران خان 30 نومبر کو ایسا کچھ نہ کریں جس سے انتشار کی کیفیت توانا ہو۔ ایسا ہوا تو اُن کی اپنی تین چار ماہ کی محنت پر پانی پھر جائے گا اور قوم ایک بار پھر طوفان کی آنکھ میں جا بیٹھے گی۔

"کیکٹس"

ہم کیا ہیں، کون ہیں یہ سوال اکثر پریشان کرتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ اس سے زیادہ پریشان کن سوال یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہم ہیں یعنی جیسے ہیں ویسے کیوں ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں سمجھنے اور سوچنے والے خال خال ہیں۔ جنہیں دیکھے کو سمجھنے اور پھر اس پر سوچنے کی توفیق نصیب ہو وہ اس معاشرے میں از کار رفتہ تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کا انجام دیکھ کر لوگ چوکنّے ہو جاتے ہیں، تھوڑے کو بہت اور خط کو تار سمجھ کر احتیاط کا دامن تھام لیتے ہیں۔

ہم روزنامہ دنیا میں جو کالم لکھتے آئے ہیں وہ تمام کے تمام مشہور ویب سائٹ ہماری ویب ڈاٹ کام پر بھی دستیاب ہیں۔ اور ہماری ویب کی ٹیم نے جن چند لکھاریوں کے کالموں اور مضامین پر مشتمل ای بکس اپنی ویب سائٹ پر لانچ کی ہیں ان میں ہم بھی شامل ہیں۔ گزشتہ دنوں ہماری ویب کی ٹیم نے حکومتِ پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز دیے جانے پر پروفیسر ڈاکٹر سحرؔ انصاری کے اعزاز میں تقریبِ پذیرائی کا اہتمام کیا۔ ہماری ویب کے چیف ایگزیکٹیو ابرار احمد نے برادرم مصدّق خواجہ کے توسط سے نہایت خلوص کے ساتھ ہمیں بھی مدعو کیا۔ ڈاکٹر سحرؔ انصاری نے صدارتی خطاب میں جہاں اور بہت کچھ کہا وہیں

پاکستانی قوم کی ایک ایسی خاصیت بھی بیان کی جو کم لوگ بیان کر پاتے ہیں۔
کون ہے جو یہ بات نہیں جانتا کہ پاکستانی ایک ایسی قوم واقع ہوئے ہیں جو کسی بھی صورت حال کا ڈٹ کر سامنا کرتے ہوئے صلاحیتوں کا لوہا منوا سکتی ہے۔ اور منواتی رہی ہے۔ ڈاکٹر سحر نے نامساعد حالات کا سامنا کرتے ہوئے زندہ رہنے والی پاکستانی قوم کو کیکٹس" سے مشابہ قرار دیا۔ کیکٹس صحرائی پودا ہے جسے پانی دیا جاتا ہے نہ کھاد" ڈالی جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ پودا صحرا کی ریت میں پروان چڑھتا ہے اور دنیا پر یہ بات واضح کرتا ہے کہ ارادہ مضبوط ہو تو کسی بھی صورت حال میں خود کو زندہ ہی نہیں رکھا جاسکتا بلکہ پروان بھی چڑھایا جاسکتا ہے۔
ڈاکٹر سحر انصاری نے مختلف شعبوں میں نوجوانوں کی صلاحیتوں کا ذکر کیا تو بات پوری قوم کی مجموعی صلاحیت تک پہنچی۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ پاکستانی قوم نے ہر دور میں دنیا کو حیران کیا ہے۔ پاکستان کے قیام کے ابتدائی دور کے سخت نامساعد حالات کا سامنا جس پامردی سے کیا گیا اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی کسی بھی طرح کے حالات میں سر اٹھانے اور مصائب کو منہ دینے کی صلاحیت اور ہمت رکھتے ہیں۔ جس طور کیکٹس

ریگستان کے سخت گرم ماحول میں کسی بھی طور نگہداشت نہ کیے جانے کے باوجود نہ صرف زندہ رہتا ہے بلکہ اپنی بہار بھی دکھاتا ہے بالکل اِسی طور پاکستانی قوم بھی ریتیلی اور سنگلاخ زمینوں پر سَر اٹھا کر جینے والے پودوں کی طرح ہے۔ جس طرح کے حالات کا سامنا پاکستانیوں کو رہا ہے وہ کسی بھی قوم کے اعصاب مکمل طور پر منتشر کرنے کے لیے انتہائی کافی ہیں۔

ہم نے مرزا تنقید بیگ سے جب ڈاکٹر سحرؔ انصاری کی نکتہ آفرینی کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی، خلافِ عادت، ڈاکٹر صاحب سے متفق ہوتے ہوئے پاکستانی قوم کے لیے ''نرم گوشہ'' ظاہر کیا! عمومی گفتگو میں جب پاکستانیوں کا بحیثیت قوم ذکر ہوتا ہے تو مرزا کسی بھی ایندھن کے بغیر بھڑک اٹھتے ہیں اور پھر شرکاءِ محفل کا باقی وقت اُنہیں بُجھانے میں کٹ جاتا ہے!

مرزا کے نزدیک پاکستانی قوم اب صرف اس لیے رہ گئی ہے کہ کوئی نہ کوئی کمال دکھا کر دنیا کو حیران کرتی رہے۔ ایک تماشا ختم ہو نہیں چُکتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ کئی عشروں سے یہی تماشا جاری ہے۔ کبھی ہم تماشا ہوتے ہیں، کبھی تماشائی۔ کام کی کسی بھی بات پر توجہ دینے کا وقت بظاہر کسی کے پاس نہیں۔ دنیا بھر کی غیر متعلق باتیں اِس قوم میں یوں در آئی ہیں کہ اب ان سے پنڈ چھڑانا کبھی کبھی ''مہاسنگرام'' میں تبدیل ہو جاتا ہے!

پاکستانیوں کی صلاحیتوں سے انکار کرنے والے خواہ کسی قوم کے ہوں، مرزا کے نزدیک وہ کافر کے درجے میں رکھے جانے کے قابل ہیں! ہم نے ہر دور میں خود کو منوایا ہے۔ ایک نہیں، کئی طاقتوں نے راہ میں دیوار نہیں بلکہ دیواریں کھڑی کی ہیں اور ہم ہیں کہ دیواریں یا تو گراتے گئے ہیں یا ٹاپ گئے ہیں۔

مگر کیا ہم محض اس لیے رہ گئے ہیں کہ لوگ دیواریں کھڑی کرتے رہیں اور ہم دیواریں گراتے رہیں؟ ایک قوم کی حیثیت سے اپنی بھرپور صلاحیت کا اظہار کیا اب اس امر کا محتاج رہ گیا ہے کہ دنیا ہمیں دہشت گردی کا نشانہ بنائے اور ہم ہر وار سہنے کے بعد مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں اور دنیا سے کہیں کہ ہمت ہے تو اب مار کے دکھا! پھول صحرا میں بھی کھلتے ہیں اور بہارِ جاں فزا بھی دکھا جاتے ہیں مگر جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا اور صحرا میں پھول کھلا تو کس نے سُونگھا؟ بات تو جب ہے کہ مردانے'' میں آکر بات کی جائے۔ اور ''مردانے'' میں کی جانے والی بات خالص'' مردانہ وجاہت کی حامل ہونی چاہیے۔

ایک قوم کی حیثیت سے ہمیں طے کرنا ہے کہ صحرا کا پھول بننے میں کچھ بات ہے

یا میدان کا پھول بننے میں۔ سختیاں جھیلنا بہت بڑا وصف ہے مگر سوال یہ ہے کہ ایسے حالات ہی کیوں پیدا کیے جائیں یا پیدا ہونے دیے جائیں کہ نوبت سختیاں جھیلنے تک پہنچے! ترجیحات کا نئے سرے سے تعین لازم ہے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہوئے ایک بار طے کرنا ہے کہ قوم کی حیثیت سے ایسا کیا کرنا ہے جو دنیا والوں کو ہماری طاقت اور ہمتِ مرداں کا چہرہ کرائے۔

پاکستانی دنیا بھر میں جہاں بھی گئے ہیں، اپنا آپ منوانے میں انتہائی کامیاب رہے ہیں۔ تقریباً ہر شعبے میں بہترین صلاحیتوں کے حامل پاکستانی فن اور محنت دونوں کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یورپ میں پاکستانیوں نے خصوصاً زیادہ اور بھرپور کامیابی پائی ہے۔ اور زیادہ دور کیوں جایئے، ڈراموں کی اداکاری اور موسیقی میں ہم ایک بار پھر بھارت کو پریشان کرنے کی پوزیشن میں آ گئے ہیں! بالی وڈ کے دروازے پاکستانی فنکاروں پر کھلتے جا رہے ہیں۔ بالی وڈ سپر اسٹارز کے مقابل پاکستانیوں کی اداکاری کسی بھی اعتبار سے گری پڑی نہیں۔ کیکٹس کی طرح سخت نامساعد حالات میں پنپنا غیر معمولی اور قابلِ رشک صلاحیت سہی مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ گل کارانہ صلاحیتوں کے اظہار کا میدان گلشن ہے نہ کہ صحرا۔ زمین، ماحول اور موسم کی سختیاں جھیل کر کیکٹس کی طرح زندہ رہ پانا بڑی بات ہے مگر کیکٹس اپنے وجود کی حدود تک ہی کچھ ہے، اُس سے باہر وہ محض کانٹوں کا مجموعہ ہے۔

پاکستانی جہاں بھی گئے ہیں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا کر، بھرپور کامیابی کا جھنڈا گاڑ کر نمایاں ہونے میں کامیاب رہے ہیں۔ ثابت یہ ہوا کہ جب صلاحیتوں کو اظہار کا راستہ ملتا ہے تو منزل سامنے دکھائی دینے لگتی ہے۔ ہماری نئی نسل بھرپور توجہ اور مواقع چاہتی ہے۔ اور اس کے لیے پالیسیوں میں جوہری تبدیلی ناگزیر ہے۔

پاکستانی معاشرہ جس نوع کی تبدیلیوں سے نبرد آزما ہے ان کا شکار ہونے سے بچنا واقعی فن ہے۔ اور یہ فن پاکستانیوں کو ایسا آتا ہے کہ دنیا دیکھ دیکھ کر انگشت بدنداں رہتی ہے۔ کئی بڑی طاقتوں کی پالیسیوں کے صحرا نے ہماری جڑوں، ٹہنیوں اور پتوں سے نمی کی رمق تک نچوڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر ہم بھی بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانے والوں کی اولاد ہیں۔ بین الاقوامی اور بین الریاستی تعلقات کے صحرا میں ہم کیکٹس کی طرح ثابت قدم اور پُرعزم رہے ہیں۔ یہی وقت ہے کہ صحرائی ماحول کا سبب بننے والے اعمال ترک کرکے ہم میدانوں میں کِھلنے والے پھول بھی بنیں اور اپنی خوشبو سے آس پاس ہی نہیں، دور دراز کے ماحول کو بھی مہکائیں۔ محترم ڈاکٹر سحر انصاری نے جو کچھ کہا وہ بالکل درست لیکن اگر کیکٹس والی سخت جانی نسبتاً آسان زمین اور کم مشقت طلب ماحول میں بروئے کار لائی جائے تو؟ یقیناً ہم یوں بدل

جائیں گے کہ دنیا بھر مزید ورطۂ حیرت میں پڑ جائے گی!